فتاوی حقانیہ

۱

از افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

و دیگر مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ

ترتیب

مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

فتاویٰ حقانیہ مشاہیر علماء اور رسائل و جرائد کی نظر میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ صدر وفاق المدارس پاکستان و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی کا فتاوی حقانیہ پر عالمانہ تاثرات وتبصرہ

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ ودیگر مفتیان کرام جامعہ حقانیہ
نگرانی واہتمام: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ ترتیب: مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی ممتاز صفات سے نوازا تھا۔ وہ علم وعمل، اخلاص وللھیت، تواضع وانکساری میں اسلاف کا نمونہ تھے اللہ جل شانہ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ان سے دین اسلام کی بڑی سنہری خدمات لیں۔ ان کی خدمات و ماثر میں سے عظیم الشان کارنامہ دارالعلوم حقانیہ کا قیام ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہ دارالعلوم دیوبند میں درجہ عالیہ کے استاذ تھے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں اپنے آبائی علاقے اکوڑہ خٹک تشریف لائے اور جب تقسیم ہند کے ہنگاموں اور بد امنی کے سبب واپس نہیں جاسکے تو اپنے علاقے کی مسجد میں درس شروع فرمایا، طلباء کا بکثرت رجوع ہوا مسجد چھوٹی پڑی تو دارالعلوم حقانیہ کی موجودہ جگہ منتقل ہوئے اس طرح بغیر کسی سابقہ منصوبے اور ارادے کے پاکستان کی اس عظیم دینی ادارے کی بنیاد پڑی اور اللہ تعالیٰ نے اس ادارے سے دین کے متنوع شعبوں میں جو رجال دین پیدا فرمائے شاید کوئی دوسرا ادارہ اس پہلو سے اس کی ہمسری کر سکے۔ دارالعلوم حقانیہ نے جہاں دین اسلام کے دوسرے شعبوں میں قابل قدر امور انجام دیئے ہیں وہاں شعبہ نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف میں بھی وسائل طباعت سے دوری کے باوجود بڑا مفید کام انجام دیا ہے "الحق" کے نام سے ایک موقر اور علمی ماہنامہ تقریباً ۳۷ سال سے نکل رہا ہے اس کے علاوہ دارالعلوم

حقانیہ کے اشاعتی ادارے موتمر المصنفین سے بیسیوں علمی تحقیقی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اور اب سال ہاسال کی محنت کے بعد دارالعلوم کے فتاوی کا زیرنظر مجموعہ چھ جلدوں میں چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے۔

دارالعلوم حقانیہ کے شعبہ افتاء کی طرف ملک وبیرونی ملک سے لوگ بکثرت شرعی مسائل کے متعلق سوالات بھیجتے ہیں صوبہ سرحد کے مسائل خاص طور سے یہاں آتے رہتے ہیں اور دارالعلوم کے مفتی حضرات باقاعدگی کے ساتھ ان کا جواب لکھتے رہتے ہیں۔ ان فتاوی کی نقول کو محفوظ رکھنے اور ان کو الگ رجسٹروں میں نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا ہے، دارالعلوم کے منتظمین نے ان فتاوی کی اشاعت کا ارادہ کیا اور شعبہ تخصص کے سرپرست مفتی حضرات کی نگرانی میں درجہ تخصص کے طلبہ کو مختلف سالوں میں جاری شدہ فتاوی کی ترتیب وتحقیق کے لیے مختلف حصے حوالے کئے جاتے رہے۔ چنانچہ ترتیب وتحقیق کے مراحل سے گزرنے کے بعد یہ علمی خزینہ مرتب ہوکر اب سامنے آگیا ہے۔

اس کی جلد اول ۵۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کی ابتداء میں مولانا سمیع الحق صاحب کا مرتب کردہ فقہ، تدوین فقہ، اور آداب افتاء واستفتاء سے متعلق ایک پرمغز مقدمہ شامل ہے۔ اس کے بعد جن مفتی حضرات نے یہ فتاوی تحریر کئے ہیں ان کا تعارفی خاکہ دیا گیا ہے۔ ان میں استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحبؒ، مولانا مفتی محمد فرید صاحب، مولانا عبدالحلیم زروبی صاحبؒ، مولانا محمد علی سواتیؒ، مولانا عبدالحلیم کوہستانی صاحب، مولانا مفتی غلام الرحمان صاحب اور اس فتاوی کے مرتب مولانا مفتی مختاراللہ حقانی صاحب کے وغیرہ کے سوانح خاکے شامل ہیں۔

اس کے بعد صفحہ ۱۳۵ سے اصل فتاوی کی ابتداء ہوتی ہے سب سے پہلے کتاب العقائد والفرق ہے، عقائد اور فرقوں سے متعلق دوسرے سوالات کے علاوہ اس میں فتنہ قادیانیت آئین پاکستان میں اس کی تکفیر کی رویدات، فتنہ انکار حدیث وغیرہ جدید فرقوں سے متعلق سوالات کے جوابات بھی آگئے ہیں۔

جلد دوم ۶۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اس جلد میں کتاب الاجتہاد والتقلید، کتاب البدعۃ والرسوم، کتاب العلم، کتاب التفسیر، کتاب مایتعلق بالحدیث، کتاب السلوک، کتاب السیاسۃ، کتاب الکراہیت و

الاباحۃ، اور کتاب الطہارت شامل ہے۔

جلد سوم ۶۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اس جلد میں کتاب الصلوۃ، کتاب الجنائز اور کتاب الزکوۃ ان تین کتابوں سے متعلق فتاوی آگئے ہیں۔

جلد چہارم ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اس میں کتاب الزکوۃ کا بقیہ حصہ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح، اور کتاب الطلاق کے مسائل شامل ہیں۔

جلد پنجم ۵۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اس جلد میں ان گیارہ کتابوں کے فتاوی جمع کئے گئے ہیں کتاب النفقات، کتاب الایمان والنذور، کتاب الوقف، کتاب الحدود والتعزیرات، کتاب الاشربہ، کتاب القصاص والدیۃ، کتاب الجہاد، کتاب القضاء، کتاب الشہادۃ، کتاب القسمۃ، اور کتاب الاکراہ۔

جلد ششم ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اس جلد میں مندرج ذیل کتب کے فتاوی جمع ہیں۔

کتاب البیوع، کتاب الرباء، کتاب الرھن، کتاب الاجارۃ، کتاب الشفعہ، کتاب الشرکۃ، کتاب المضاربۃ، کتاب الوکالہ، کتاب الحوالہ، کتاب الھبہ، کتاب الغصب، کتاب الودیعہ، کتاب احیاء الموات، کتاب المزارعۃ، کتاب الذبائح، کتاب الصید، کتاب الاضحیہ، کتاب الوصیہ، اور کتاب الفرائض اس طرح تقریبا ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ان چھ جلدوں میں ہزاروں سوالات کے عام فہم اسلوب میں جوابات آگئے ہیں۔ان جوابات کی ترتیب و تحقیق میں جن امور کا خیال رکھا گیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ ہر جواب کا مراجع ومصادر اور فقہ کے معتبر کتابوں سے حوالہ ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ ہر کتاب میں ذیلی ابواب قائم کئے گئے ہیں اور ہر سوال کیساتھ مسئلہ کا عنوان ذکر کیا گیا ہے ہر جلد کی پشت پر اس جلد میں درج کتابوں کی فہرست بھی لکھ دی گئی ہے۔

۳۔ عصر حاضر کے پیدا کردہ جدید فقہی مسائل کا بھی ایک معتد بہ حصہ اس میں آگیا ہے اس ضمن میں جامعہ حقانیہ کے دارالافتاء سے لکھے گئے جدید مسائل جو ماہنامہ "الحق" میں شائع ہو چکے ہیں مناسبت کو محفوظ رکھ کر متعلقہ ابواب میں درج کئے گئے ہیں۔

مثلا کتاب الجہاد کے تحت "سی ٹی بی ٹی کی شرعی حیثیت" کتاب البیوع میں "ٹیلیفون کے ذریعے عقد بیع کا حکم" "ٹریڈ مارک کی خرید وفروخت کا حکم" "انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم" "الکحل کی تجارت کا حکم" کتاب الصوم میں "ہلال کمیٹی کی موجودگی میں عالم دین کے فیصلے کا حکم" کتاب الصلوۃ کے تحت "کرفیو کی وجہ سے نماز میں قصر واتمام کا حکم۔۔۔۔" غرض یہ کہ عصر حاضر کے اس طرح کے بہت سے استفسارات کا حل اس میں آ گیا ہے۔

فتاوی حقانیہ اردو فتاوی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے امید ہے کہ فتاوی حقانیہ کے اس ذخیرے سے عوام وخواص سب فائدہ اٹھائیں گے۔اور دارالافتاء سے متعلق مفتیان کرام اور تخصص کے طلباء اس سے استفادہ کرسکیں گے۔ (ماہنامہ الفاروق جامعہ فاروقیہ کراچی ۶۰۔۶۱ ربیع الاول ۱۴۲۳ھجری)

جسٹس حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نائب مہتمم دارالعلوم کراچی کا حضرت مولانا سمیع الحق کے نام مکتوب اور فتاوی حقانیہ پر جامع ومانع تاثرات:

برادر گرامی قدر جناب مولانا سمیع الحق زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت دراز کے بعد تحریر دلنواز فردوس نظر بنی تو قلب وذہن میں یادوں کا ایک تلاطم پیدا ہوا اس انداز خطاب سے میں سال ہا سال سے محروم تھا اب اس کیف تخاطب کونئی زندگی دینے پر آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں؟

کاش میں اتنا بے ھنگم نہ ہوتا کہ پچھلے دور کے خطوط محفوظ نہ رکھ سکا ہوں جہاں تک یاد ہے میں نے شروع میں خطوط محفوظ رکھے تھے مگر فائلوں کی ترتیب سے دور تھے۔لہذا انقلابات زمانہ میں یہ خزانہ گم

ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فتاوی حقانیہ کی اشاعت سے مزید مسرت ہوئی اور حسب الحکم اس پر چند سطور لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔
عزیزان راشد و حامد سلمہما کو بہت بہت سلام اور دعائیں کاش کہ آئیندہ بھی اس محبوب تحریر کی توفیق ملتی رہے

والسلام!

محمد تقی عثمانی

الحمدللہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی رسولہ الکریم، و علی اللہ اصحابہ اجمعین۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ (بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) ہمارے عہد کی ان شخصیات میں سے تھے جن پر پوری ملت جتنا فخر کرے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں انہیں سلف صالحین کا نمونہ بنایا تھا، اکوڑہ خٹک میں ان کے قائم کردہ دارالعلوم حقانیہ نے ہزارہا علماء پیدا کئے اور علوم اسلامیہ کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، انہی خدمات جلیلہ کا ایک شعبہ یہ تھا کہ وہاں کا دارالافتاء سالہا سال سے اطراف عالم کے دینی سوالات کا جواب دے رہا ہے۔ یہ فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ کے رجسٹروں میں نقل چلے آ رہے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ انہیں مدون کر کے افادہ عام کے لئے شائع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ حضرت قدس سرہ کے فاضل صاحبزادے برادر گرامی قدر جناب مولانا سمیع الحق صاحب (مہتمم دارالعلوم حقانیہ) کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے اپنے مدرسے کی ایک ٹیم کے ذریعے بڑی عرق ریزی کے بعد ان فتاویٰ کو ابواب پر مرتب کر کے چھ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ فتاوی دارالعلوم حقانیہ کے مختلف مفتی حضرات کے لکھے ہوئے ہیں لیکن چونکہ یہ تمام فتاویٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں، اس لئے ان کو انہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور مجموعے کا نام ''فتاویٰ حقانیہ'' رکھا گیا ہے، فتویٰ نویسی میں ہر مفتی کا انداز و اسلوب جدا ہوتا ہے اور بعض جگہ

مسائل میں بھی اہل علم وافتاء کے لئے اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے لیکن جہاں تک ان فتاویٰ کے مستند ہونے کا تعلق ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ دارالعلوم حقانیہ جیسے مستند ادارے سے جاری ہوئے ہیں۔اور حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہٗ جیسے جبل علم کی نگرانی میں جاری ہوئے ہیں' بلاشبہ یہ علم وفقہ' کے ذخیرے میں ایک عظیم اضافہ ہے۔اور انشاءاللہ عوام اور اہل علم دونوں کی رہنمائی کرے گا۔دارالعلوم حقانیہ اور حضرت مولانا سمیع الحق صاحب اس علمی خزانے کو منظر عام پر لانے کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فتاوی حقانیہ پر ماہنامہ البینات کا پرمغز تبصرہ

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ و دیگر مفتیان کرام

نگرانی واہتمام: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ ترتیب: مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

فتویٰ کے منصب جلیلہ کی قدر ومنزلت کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے منصب افتاء کو اپنا ذات عالی سے منسوب فرمایا ہے' چنانچہ ارشاد ہے: قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ ...... (الایۃ)

کلالۃ سے متعلق استفتاء کے جواب میں خود اللہ تعالیٰ فتویٰ صادر فرماتے ہیں' اس عظیم تر نسبت سے اس منصب جلیلہ کی طرح اس کی نزاکت بھی دوبالا ہو جاتی ہے' کوئی بھی مفتی جب کوئی فتویٰ دیتا ہے تو گویا وہ مستفتی کو درپیش مسئلہ میں حکم الٰہی بتارہا ہوتا ہے' اگر خدانخواستہ حقیقت میں معاملہ مفتی کے دیئے ہوئے فتویٰ کے برعکس ہو جائے تو گویا حق تعالیٰ کی طرف ایسی بات کی نسبت کردی گئی' جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی تھی' تو مفتی اور مستفتی دونوں کے لئے وبال کا ذریعہ ہے (ضلوا واضلوا) اس کا معنی یہ ہوا کہ فتویٰ کے بارے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے' ہر کس وناکس کو اس میدان میں اترنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے' اسی طرح فتویٰ دینے میں شرعی تقاضوں سے صرف نظر کرتے ہوئے فتویٰ کی روح کو مجروح کرنا بھی

سنگین جرم ہے جو مداہنت فی الدین کے زمرے میں آتا ہے' اس منصب کی اس سنگینی سے خائف ہوکر اسلاف اہل علم کی اکثریت کسی امر میں فتویٰ صادر کرنے سے کترایا کرتی تھی' بلکہ بعض تو فتویٰ دینے سے کلی اجتناب کیا کرتے تھے' اور سلف صالحین میں منصب افتاء کی ذمہ داری ان اہل علم کو سونپی جاتی تھی جن کے علم وعمل اور امانت دیانت پر سب کا پوری طرح اتفاق ہوتا' کیونکہ اسلاف کے ہاں کسی کے منصب افتاء پر فائز ہنے کے لئے محض صاحب علم ہونے کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا' بلکہ ماضی قریب تک ہر دور میں ارباب علم سے منصب افتاء کے لئے چند ہستیاں منتخب ہوا کرتی تھیں اور انہی کی علمی رائے گرامی فتویٰ کا درجہ رکھتی تھی (جس کی ایک طویل فہرست مرتب ہوسکتی ہے)

جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ فتویٰ کے لئے صرف علم' معلومات کے ذخیرہ یا کتب کے مطالعہ اور مراجعت کو ہی قطعاً معیار نہیں بنایا جاسکتا' ورنہ درجہ بدرجہ علم کا حامل تو تقریباً ہر کوئی ہوتا ہے لہٰذا اسے منصب افتاء پر فائز ہونا چاہیے تھا' لیکن تاریخ میں آج تک ایسا نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فن کے لئے خصوصی مہارت ومشق درکار ہوتی ہے جس کے لئے اہل فن کی رہنمائی اور ان کے عملی نمونہ کا موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے' الحمدللہ کہ فتاویٰ کے اس میدان میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے ایک بہترین باب کا اضافہ کیا ہے جسے ''فتاویٰ حقانیہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''فتاویٰ حقانیہ'' دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ سے جاری ہونے والے ان گرانقدر فتاویٰ پر مشتمل ہے جن میں کچھ تو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کے خود نوشت ہیں' جبکہ بعض دوسرے مفتیان کرام اور اساتذہ کرام کے تحریر کردہ ہیں' اس مجموعہ میں ایک اضافی چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ بعض ایسے مضامین ومقالات جو ماہنامہ الحق میں شائع ہوچکے ہیں وہ بھی شامل کرکے اس فتاویٰ کا حصہ بنادیئے گئے ہیں۔ فتاویٰ حقانیہ کے شروع میں فقہی مباحث پر مشتمل ایک ایسا مقدمہ لکھا گیا ہے جو بجائے خود ایک ضخیم مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے' مقدمہ میں فقہی مباحث کے مقدمات کو حتی الوسعت احاطہ تحریر میں لانے کیساتھ ساتھ ان تمام مفتیان کرام کا تعارف بھی پیش فرمایا گیا ہے جن کے تحریر کردہ فتاویٰ اس مجموعہ میں درج ہوئے ہیں۔ فتاویٰ حقانیہ اپنے بہترین سرورق' مناسب کاغذ اور عمدہ کتابت کا باعث حسن باطنی کے ساتھ ساتھ ظاہری دلکشی کا مظہر بھی ہے۔ ''فتاویٰ حقانیہ'' اپنی تحقیق وتخریج اور سلاست وروانگی تحریر کے پیش نظر علماء وطلباء' وکلاء اور دینی شغف رکھنے والے عوام الناس سب کیلئے یکساں مفید ہے۔

دعا ہے کہ اسے عوام وخواص کیلئے امفید اور محررین ومرتبین اور جملہ معاونین کیلئے صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین ولا نزکی علی اللہ احداً۔ ماہنامہ بینات کراچی (جون ۲۰۰۲)

ماہنامہ الحسن لاہور کا فتاویٰ حقانیہ پر جامع تاثرات

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق و دیگر مفتیان کرام
نگرانی واہتمام: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ ترتیب: مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

زیر تبصرہ ''فتاویٰ حقانیہ'' ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو حضرت اقدس مولانا عبدالحق محدث اکوڑوی قدس سرہٗ اور اکابرین مفتیان کرام دارالعلوم حقانیہ کی علمی، فقہی اور خداداد بصیرت کے بے مثال شاہکار ہے یہ فتاویٰ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جن کی مجموعی ضخامت ساڑھے تین ہزار صفحات سے زائد ہے۔ فتاویٰ حقانیہ کی تقدیم میں فقہی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ان جلدوں کو جن مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے۔

گویا عقائد سے لے کر فرائض تک ہر فتاویٰ اس میں شامل ہیں۔ فتاویٰ حقانیہ کی تقدیم وترتیب کا یہ کام شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے صاحبزادے اور دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ کی زیرنگرانی انجام دیا گیا ہے۔ اس فتاویٰ کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس میں دور حاضر کے جدید مسائل کو اس خوبی سے حل کیا گیا ہے کہ دیکھنے سننے اور پڑھنے والے کو کسی بھی قسم کا خلجان یا تشنگی باقی نہیں رہتی

حضرت مولانا عبدالحق محدث اکوڑوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، اخلاص، للٰہیت، زہد اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسلاف اور اکابرین کے علوم کے محافظ ہی نہیں بلکہ امین بھی تھے، حضرت کا شمار ان اکابرین میں ہوتا ہے جن پر عالم اسلام کو بجا طور پر ناز ہے، حضرت اقدس علوم تفسیر، حدیث اور فنون کے بحر ذخار تو تھے ہی ساتھ ساتھ فقیہانہ بصیرت میں بھی یکتا تھے۔ حضرت والا کے فتاویٰ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فتویٰ دیتے وقت صرف فقہی جزئیات کو ہی مدنظر نہیں رکھتے تھے بلکہ حالات حاضرہ پر بھی آپ کی گہری نظر ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کے فتاویٰ کو افتاء کی دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے، حضرت کی کمال احتیاط اور دوراندیشی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ آپ کی عموماً یہ کوشش ہوتی کہ سائل کو اس کا جواب پورا سمجھایا جائے، اس لئے جواب لکھتے وقت بات کھل کر بیان فرماتے اگرچہ بیان طویل ہو جاتا۔

۲۔ فتویٰ لکھتے وقت آپ فقہ حنفی کی مشہور کتب بدائع الصنائع، ہدایہ اور ردالمختار سے استفادہ فرماتے تھے۔

۳۔ فتویٰ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ خود تو کیا دارالعلوم حقانیہ کے دیگر مفتیان بھی جب فتویٰ لکھتے تو انہیں اپنے سامنے سنانے کا حکم فرماتے۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمان صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۷۸ء میں سالانہ چھٹیوں کے دوران ناظم دارالعلوم حضرت مولانا سلطان محمود صاحبؒ نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کا یہ پیغام مجھے پہنچایا کہ چھٹیوں میں یہاں رہ کر دارالافتاء کی خدمت سرانجام دو گے' تو مجھ پر یہ بوجھ بہت بھاری لگا' خود یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی فتویٰ تصویب کے بغیر دے دوں' اور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں اس سے قبل مسائل و جزئیات پیش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا'' جب میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا' کہ جو مسئلہ بھی تم لکھو گے تو پہلے مجھے سناؤ گے۔ یہ اس لئے اگر کوئی جدید مسئلہ ہو تو ذہن میں آ جائے۔ اس سے آپ کا مقصد استحضار مسائل نہیں بلکہ احتیاط ملحوظ تھی۔ چونکہ کسی بھی مسئلہ کا جواب آپ کو سنائے بغیر بھیجنے کی مجھے اجازت نہیں تھی' اس لئے میں مسائل کے جواب لکھ کر حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرتا' اگر آپ تائید فرماتے تو سائل کو وہ جواب بھیج دیتا۔ لیکن دس دن کی نگرانی کرنے کے بعد جب اعتماد پیدا ہو گیا تو فرمایا کہ مجھے سننے کا وقت کم ملتا ہے اس لئے سنائے بغیر ہی بھیج دیا کرو۔

۴۔ حضرت شیخ الحدیثؒ مسائل کے بیان کرنے یا لکھنے میں ماحول' حالات' اور اس کے نتائج و عواقب کا بھی لحاظ رکھتے تھے اور مصلحت کو سامنے رکھ کر جواب دیا کرتے تھے تاکہ معاشرہ میں بدمزگی پیدا نہ ہو اور لوگ شریعت کے کسی مسئلہ کا مذاق نہ اڑائیں۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

۵۔ ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم کی سالانہ تعطیلات کے دوران میں نے قضاء عمری کے بارے میں فتویٰ دیا جس میں قضاء عمری کی روایت کو موضوع ثابت کرنے کے بعد لکھا کہ مروجہ قضاء عمری کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور بدعت قبیحہ ہے جب آپؒ کو یہ جواب سنایا تو فرمایا کہ جواب تو ٹھیک ہے اس میں کوئی شک نہیں' لیکن ہمارے پٹھانوں کے علاقہ میں لوگ نہایت تدین کی وجہ سے قضاء عمری کے ایسے عاشق ہیں کہ ایسے سخت الفاظ کے نتیجے میں کہیں طیش میں آ کر فتنہ و فساد اور سب و شتم پر نہ اتر آئیں اس لئے ان الفاظ میں یوں ترمیم کرو: "قضاء عمری کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہمارے اسلاف نے اس کو بدعت میں شمار کیا ہے۔"

۶۔ اسی طرح ایک موقع پر کسی سڑک کی تعمیر میں ایک پرانی قبر سڑک کی زد میں آتی تھی، حکومت اس قبر کو مسمار کر کے سڑک سیدھا کرنا چاہتی تھی، لیکن مقامی لوگ اس پر خوش نہیں تھے، جب سرکاری اہلکاروں نے دارالعلوم سے فتاویٰ لینا چاہا تو میں نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا اگرچہ پرانی قبر مسمار کرنا از روئے شرع جائز ہے، لیکن ہمارے اس فتویٰ سے لوگ مطمئن نہیں ہوں گے، بلکہ مذہبی جنون کی وجہ سے شاید یہ لوگ دارالعلوم کو بھی فریق شمار کریں گے، اس لئے اس انداز سے فتویٰ دیا جائے کہ قبر کے اوپر پل بنا کر اس پر سے سڑک گزار لی جائے۔ چنانچہ آپ کی حسن تدبیر اور حزم واحتیاط کی بدولت سڑک بھی تعمیر ہوگئی اور لوگ بھی شرکیہ اعتقاد سے بچ گئے۔

۷۔ ایک دفعہ کسی صاحب نے تصوف کے سلاسل کے بارے میں سوال کیا تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے جواب میں فرمایا: ''سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ ایک ہی تالاب کی دو نہریں ہیں، دونوں کا مخزن اور مرکز ایک ہے۔ پانی ایک ہے صرف راستے جدا جدا ہیں، دوسرے سلاسل تصوف اور مختلف فقہی مذاہب کا بھی یہی حال ہے۔ حنفیت، حنبلیت اور مالکیت سب کو ایک ہی تالاب سے پانی پہنچتا ہے، سب اسی ایک تالاب کے پانی سے دنیا کی سیرابی کرتے ہیں، صرف راستے جدا ہیں، منزل اور مقصد سب کا ایک ہے بعض لوگ دانستہ طور پر تصوف کے ان سلسلوں اور فقہی مذاہب کو فرقہ واریت پر محمل کر کے دنیا کو گمراہ کرتے اور دھوکہ دیتے ہیں، مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے'' (ماہنامہ ''الحق'' شیخ الحدیث نمبر)

۸۔ اس کے علاوہ آپ مسائل کے جوابات نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں دیا کرتے تھے، اور اس میں حوالہ جات کا خصوصیت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔

(ماخوذ از صفحہ ۸۸، ۹۸، ۹۰، فتاویٰ حقانیہ ج ۱)

اس فتاویٰ میں جن جید مفتیان کرام کے فتوؤں کو شامل کیا گیا ہے ان کی تعداد اٹھارہ ہے لیکن ان میں مرکزی حیثیت حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کو ہی حاصل ہے یہ ان ہی کے فیض کا نتیجہ ہے۔ فتاویٰ حقانیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو کسی اور فتاویٰ میں بہت کم پائی جاتی ہے، وہ ہے اس کا ایک مربوط و مبسوط مقدمہ، یہ مقدمہ حضرت مولانا سمیع الحق مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے قلم سے مرقوم ہے۔ اس مقدمے میں فقہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف، کے ساتھ فقہی ماخذ قرآن کریم، سنت، اجماع، قیاس، استحسان، عرف وعادت، استصحاب، مصالح مرسلہ، لطائف افتاء، فتاویٰ دور نبویؐ میں، فتاوی دور صحابہؓ میں،

فتاویٰ دور تابعین میں' مفتیان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اوران کی اقسام وطبقات' تابعین فقہاء کام اورانکے طبقات' مفتی کے شرائط وآداب مستفتی سمیت کئی ایک اہم مسائل اور موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔فن افتاء سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اوراس فن کے متخصصین کے لئے خصوصاً اس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔اگرایسے ادارے جہاں تخصص فی الفقہ کرایا جاتا ہے وہ اس مقدمے کوعقود رسم المفتی کے ساتھ ساتھ طلبہ کے نصاب میں داخل کردیں تو طلبہ کے لئے بہت ہی مفید رہے گا'اسی طرح فتاویٰ کی اہمیت'ضرورت اوراس کی تاریخ پرمولانا انوارالحق حقانی کاوہ مقالہ بھی قابل دیداور اہل علم کے لئے موجب استفادہ ہے جو''فتاویٰ حقانیہ'' کے مقدمے کا ایک اہم جزو ہے'مولانا انوارالحق حضرت الشیخ قدس سرہٗ کےوہ صاحبزادے ہیں جنہیں حضرت کی خدمت کا سب سے زیادہ موقع ملا ہے'سفر وحضر میں اکثر مولانا انوارالحق ہی حضرت اقدس کے ساتھ ہوتے تھے۔اس تبصرہ نگارکواچھی طرح سے یاد ہے کہ جب حضرت شیخ الحدیث آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں لاہورتشریف لائے تو اس وقت بھی مولانا انوارالحق صاحب ہی آپ کے خادم تھے۔مولانا انوارالحق صاحب نے مقدمے میں شامل کئے جانے والے مقالے میں فن افتاء کی عظمت کے سلسلے میں لکھتے ہیں' کہ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ جس کی نسبت حق سبحانہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایاہے **یفتیکم فی الکلالۃ** 'مولانا انوارالحق نے اپنے مقالے میں جن موضوعات پراظہار خیال فرمایا ہے ان میں قضاء وافتاء میں فرق' منصب افتاء کی عظمت' منصب افتاء وخطرات' اسلامی مملکت میں دارالافتاء کا قیام'اوراس کی ضرورت اور اہمیت' مسلک احناف میں فتویٰ کی عظمت' جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں دارالافتاء کا قیام شامل ہیں۔مولانا انوار الحق مدظلہٗ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے نائب مہتمم اوراستاذ الحدیث ہیں۔درویش منش انسان ہیں' ریاونمود سے کوسوں دور بھاگنے والے عالم باعمل ہیں۔فتاویٰ حقانیہ کی طباعت اوراس کی ترتیب وتقدیم میں ان کا حصہ قابل قدر ہے۔

موتمر المصنفین اورفتاویٰ حقانیہ کی طباعت واشاعت پر مامورین سے ایک گزارش ہے'وہ یہ کہ آئندہ طباعت میں اس امرکی وضاحت فرمائیں کہ کون کون سا فتویٰ کس کس کا ہے؟ تاکہ اس طرح سے حضرت الشیخ کے اپنے فتاویٰ کا علم ہوسکے اور یہ بھی معلوم ہو کہ حضرت نے اپنے دست مبارک سے کتنے فتاویٰ صادرفرمائے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جن کی تصویب فرمائی ہے' جیسا کہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند وغیرہ

میں ہے۔اس سے فتاویٰ کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوگا...... تبصرہ نگار کے نزدیک فتاویٰ حقانیہ ہر دارالافتاء کی ہی نہیں بلکہ ایک اچھی لائبریری کی بھی ضرورت ہے۔فتاویٰ حقانیہ ہر بڑے کتب خانے کے علاوہ براہ راست ناشر سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (محمد اکرم کاشمیری ماہنامہ ''الحسن'' لاہور)

فتاوی حقانیہ پر ماہنامہ الخیر ملتان کا وقیع تبصرہ

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق و دیگر مفتیان دارالعلوم حقانیہ

نگرانی واہتمام: حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ ترتیب: مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

کسی پیش آمدہ مسئلہ کے متعلق شریعت راسخ فی العلم کا ادلہ شرعیہ کو سامنے رکھتے ہوئے حکم بیان کرنا فتوی کہلاتا ہے افتاء واستفتاء کا یہ طریق کار نیا نہیں بلکہ دور نبوت سے چلا آرہا ہے حضرات صحابہ کرامؓ اپنے مسائل کا حل براہ راست حضرت اقدس ﷺ کے وصال کے بعد عام صحابہ اور تابعین اپنی مشکلات اصحاب فتوی اجلہ صحابہ کرام سے بیان کر کے شرعی حکم معلوم کرتے تھے بکثرت فتوی دینے والے صحابہ کرامؓ میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت سیدہ عائشہؓ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ شامل ہیں حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد یہی متوارث ومبارک عمل امت میں طبقاً عن طبق منتقل ہوتا چلا آیا۔آج بھی کسی سلیم العقل مسلمان کو انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی مشکل یا الجھن پیش آتی ہے تو وہ کسی دارالافتاء سے رجوع کرتا ہے۔

علماء کرام کے ان فتاوی کی حیثیت عدالتی فیصلوں جیسی ہے جو آئین کی شقوق وجزئیات کی توضیح اور اطلاق کی تشریح کرتے ہیں۔یہ فتاویٰ علماء امت کی محنتوں اور کاوشوں کا نچوڑ اور بیش قیمت علمی سرمایہ ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے صراط مستقیم پر چلنے کیلئے زادراہ ہے۔پاکستان کے بڑے دینی مدارس اور

جامعات میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لئے قائم "دارالافتاء" شب و روز متلاشیانِ حق کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان مراکز فتاویٰ سے جاری ہونے والے فتاویٰ باضابطہ محفوظ رکھے جاتے ہیں بعض جامعات نے ان تحقیقی جواہر پاروں کو افادہ عام، کے لئے شائع فرما کر ایک اہم دینی خدمت انجام دی ہے۔ حال ہی میں ملک کی معروف دینی درسگاہ "جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع "نوشہرہ" کی طرف سے ٦ جلدوں پر مشتمل "فتاویٰ حقانیہ" کے نام سے ایک عظیم فقہی خزینہ منظر عام پر آیا ہے۔ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ۱۹۴۷ء سے ہمہ نوع کی دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جامعہ کے بانی مہتمم اول شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ، کی ذات گرامی کو علماء و مشائخ میں ایک مرجع کی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان بھی اپنے علمی دینی اور دنیوی مسائل کے لئے حضرت مرحوم کے قائم کردہ جامعہ کے دارالافتاء کی طرف رجوع کرتے تھے اب تک دارالعلوم کے دارالافتاء سے ہزارہا فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں۔ جن کا ریکارڈ رجسٹروں میں محفوظ تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے اہل علم کی طرف سے بیش از بیش جزائے خیر عطا فرمائیں خلف الرشید حضرت مولانا سمیع الحق صاحبؒ دامت برکاتہم، جنہوں نے اس انمول خزانہ کو رجسٹروں سے نکال کر افادہ و استفادہ امت کے لئے عام کر دیا ہے۔

فتاویٰ کے وسیع و عظیم مگر غیر مرتب ذخیرہ سے انتخاب اور پھر ترتیب و تدوین اور تحقیق و تخریج دشوار گزار گھاٹی ہے جو مولانا موصوف کی شبانہ روز محنت، ذاتی توجہ وانہماک اور خدمت علم کا جذبہ کی بدولت بالآخر طے ہوگئی۔ اس مجموعہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ، کے علاوہ دیگر بزرگوں علماء راسخین اور مفتیان کرام کے فتاویٰ شامل ہیں جو دارالعلوم کے دارالافتاء کے منصب پر فائز رہے۔ [illegible] حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم نے بھی اپنے تحریر کردہ "نقش آغاز" میں فرمایا ہے۔

مبصر کی ناقص رائے کے مطابق یہ مجموعہ مدارس و جامعات کے علاوہ ذاتی علمی لائبریریوں کی بھی ضرورت ہے۔ ماہنامہ "الخیر" ملتان مبصر مولانا محمد ازہر (جولائی ۲۰۰۲ء)

ر

فتاوی حقانیہ کے متعلق ماہنامہ القاسم کے مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی کا جامع تبصرہ

افادات: شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیان کرام

نگرانی واہتمام: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ ترتیب: مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

اسلامی تاریخ کا ماضی علماء، فقہا،، جامعات، دارالعلوم اور ارباب فضل وکمال کی بصیرت وتفقہ مجتہدانہ تگ ودو، مسائل میں قرآن وسنت کی روشنی میں بروقت رہنمائی کی شاندار شہادت دیتا ہے اور بلاشبہ یہ علماء فقہاء اور دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم حقانیہ جیسی عظیم جامعات ہی کا مقام ومنصب ہے کہ وہ حال اور مستقبل میں بھی ملت کی سچی اور حقیقی رہبری اور رہنمائی کریں۔ غالبًا کہنے والے نے ایسے ہی اداروں اور علماء کے متعلق خوب کہا کہ " آپ جب فیصلہ کرتے ہیں تو صحیح وصائب فیصلہ کرتے ہیں، جب کوئی اقدام کرتے ہیں تو بہتر وموزوں اقدام کرتے ہیں اور جب گفتگو کرتے ہیں تو حتمی وقطعی انداز اختیار کرتے ہیں"۔

آج ملت کے مسائل کیا ہیں؟ سماجی، اقتصادی حالات میں کیا پیچیدگیاں ہیں اور کیا توجہ طلب گھتیاں ہیں؟ اسلام ہر مختلف سطح سے علمی اعتراضات کے جوابات کیسے دیئے جائیں؟ علماء، فقہاء اور مفتیان کرام ملت کے تحفظ وانسانیت کی رہنمائی اور اس عظیم مسئولیت اور ذمہ داری کو کیسے نبھائیں؟

فتاویٰ حقانیہ اس کا علمی اور عملی جواب، جو...... لتحکم بین الناس بما اراك اللہ ...... کے مطابق قوانین شرعیہ کی تعبیر وتشریح، انضباط وتدوین، ترویج فقہ واشاعت کے عظیم مقصد کی تکمیل اور پوری ملت کے لئے بڑی سعادت اور مسرت کا پیغام ہے۔ مادر علمی مرکز علم دارالعلوم حقانیہ جنوبی ایشاء میں دارالعلم دیوبند کے بعد دوسری عظیم آزاد اسلامی یونیورسٹی ہے۔ فروغ علم کی بات ہو، درس وتدریس کا تسلسل ہو، درس نظامی کے بقاء وتحفظ کا مسئلہ ہو، ملک میں نفاذ شریعت اور پارلیمنٹ میں شریعت کے غلبہ کی جدوجہد ہو، فرق باطلہ کے خلاف جنگ ہو یا مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے خلاف بغاوت ہو، جہاد کا فتویٰ ہو یا علمی اقدام، اسلامی نظام حکومت کی تشکیل واستحکام ہو، فقہ وفتویٰ اور قضاء کے مسائل

ہوں، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اس کے بانی ومہتمم اساتذہ اور فضلاء کا کردار مثالی اور تاریخی رہا ہے۔

استاذی واستاذ العلماء، محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نور اللہ مرقدہ اس کے بانی ومہتمم تھے اور آج کل انکے جانشین مخدوم العلماء، استاذ محترم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم اسکے مہتمم ہیں۔ جب سے جامعہ حقانیہ قائم ہوا تب سے فقہ وفتویٰ اور قضا کا شعبہ بھی قائم ہوا اور مفتیان کرام کے فقہی اور تحقیقی، علمی جواہر سے گزشتہ دس سال سے دارالعلوم حقانیہ کے نصف صدی پر مشتمل فتاویٰ کی ترتیب وتدوین کا کام شروع ہوا۔ علماء، فقہاء، مفتیان کرام، اور درجہ تخصص کے طلباء حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کی سرپرستی میں اس عظیم علمی اور تاریخی اور فقہی دستاویز کی ترتیب اور تدوین میں لگے رہے۔ بالآخر وہ عظیم فقہی انسائیکلو پیڈیا فتاویٰ حقانیہ کی صورت میں ٦ جلدوں میں منظر عام پر آ گیا ہے۔

دینی مدارس ہوں یا دارالافتاء اصل مقصد دین کا تحفظ ودفاع اور اسلامی تمدن وتہذیب وثقافت کی حفاظت دین کی دعوت واشاعت نیز اس پر فکری یلغار کا نفسیاتی وعقلی جواب دیتا ہے جو مخاطب کی زبان ہو۔

اس پہلو سے تعلیم تشنہ ہے۔ سماجی مسائل سے عدم واقفیت کا رجحان بھی اس کا ایک جزو ہے اس روح کا فقدان مسلم معاشرے کی پہچان بن گئی ہے۔ فتاویٰ حقانیہ نے الحمدللہ اس ضرورت کی تکمیل کر دی اور علمی ودینی اور فقہی قیادت وسیادت کو برقرار رکھے ہوئے ماحول اور گردوپیش میں اٹھتے ہوئے بخارات، اضطراب کی لہروں، وغیرہ کی تیاریوں اور ریشہ دوانیوں کو مدنظر رکھا اور ایک بہترین فقہی انسائیکلو پیڈیا کی صورت میں ایک عظیم علمی پیشکش کے طور پر سامنے آئی۔ فتاویٰ حقانیہ کی ترتیب وتدوین میں استاذ محترم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ، کی مساعی، علماء امت، مفتیان کرام بالخصوص حقانی برادری کے لئے قابل قدر اور ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔

شاندار طباعت، عمدہ ترین کتابت، مضبوط جلد بندی اور بہترین کاغذ، ہر دارالافتاء، دارالقضاء، دارالمطالعہ، لائبریری، کتب خانہ، مدرسہ بلکہ ہر گھر کی ضرورت۔ ٦ جلدوں کی قیمت 2200/- روپے بھیج کر موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے منگوائی جا سکتی ہے۔ (ماہنامہ "القاسم" نوشہرہ، شمارہ جون جولائی ۲۰۰۲ء)

فقیہ العصر شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا مفتی محمد زر ولی خان صاحب مدظلہ

رئیس دارالافتاء، جامعہ عربیہ احسن العلوم گلشن اقبال کراچی

دارالعلوم دیوبند کے مسلک کے ترجمان ادارے ہندوپاکستان میں بے شمار ہیں حق تعالیٰ ان کو روزافزوں رکھے ان میں بعض مدارس خود دیوبند کا نمونہ اور کامیاب وارثِ مجسم بن کر شجر طوبیٰ کی طرح مثمر اور سایہ دار ہیں ان میں جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد بھی ہے جس کے بانی شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ تھے۔ موصوف کی جامع علمی اور عملی بلندیوں کی آئینہ دار حیات جاوداں پر قدر دانوں کے مجلدات آچکے ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کا ہر دن اور ہر مہینہ بلکہ ہر گھڑی اور ہر سانس اور اس کا ذرہ ذرہ روح اور ایمان کی حلاوت ولذت عظمت اور حسن پہنچانے کا حامل ہے۔ حال ہی میں دارالعلوم حقانیہ نے نصف صدی سے زیادہ قیمتی اوقات اور گراں قدر لحات کے زاویوں میں جن محققین فقہا اور مفتیان نے افتاء کا عظیم منصب نبھایا ہے ان کے گراں قدر فتاویٰ کمال تحقیق احسن ترتیب اور دیدہ زیب طباعت سے آراستہ پیراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ چھ ضخیم جلدوں پر اسلامی فقہ کا یہ انسائیکلو پیڈیا اور حنفی فقہ کا برہان مسلم اور مسلک دیوبند کے میزان حق ورشد کو منوانے والا یہ فتاویٰ تھوڑے ہی عرصے میں جامہ طباعت سے آراستہ ہوکر اہل علم سے شکروسپاس اور داد تحقیق لے چکا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے محسن ومخدوم یادگار سلف اور فخر الخلف زعیم ملت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی خصوصی توجہات کا یہ حامل دائرۃ معارف بہت تھوڑے عرصے میں سابقہ فتاویٰ کی شرح صف اول میں اپنا مقام پیدا کر چکا ہے، مولانا موصوف مدظلہ نے کرم بالائے کرم کرتے ہوئے سب سے پہلے مجھ عاجز اور فقیر کو یہ سوغات علم ارسال فرمایا۔ اور یہ بھی خوشی ہے کہ میرے عزیز مولانا مفتی مختار اللہ حفظہ اللہ مفتی واستاد شعبہ تخصص فی الفقہ نے اس پر جواہر شباب اور بہترین صلاحیتیں صرف کر کے کتابوں کی ترتیب، تدوین اور حسن طباعت میں معراج ترقی تک پہنچانے کی جو کوششیں فرمائی ہیں حق تعالیٰ اس عظیم اور مقتدر فتاویٰ کو دارالعلوم حقانیہ کیلئے اولاً اور پوری امت کیلئے ثانیاً فقہ اسلام اور منہج اسلاف کا ترجمان اور آئینہ دار ذخیرہ کاملہ ثابت فرمائے۔

خدا کا شکر وکرم ہے کہ جہاں تک میں نے نظر ڈالی اور تحقیق وتجسس کیا تو فتاویٰ حقانیہ ہر قسم کی نظریات اور شطحات سے کافی حد تک محفوظ رہا ہے اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر خدمت کو قبول فرمائے اور دارالعلوم حقانیہ کے عزو شرف کے لئے معراج ترقیات ثابت فرمائے۔ (ماہنامہ الحسن)

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ (الآية)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی کے فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ حقانیہ

جلد اوّل

افادات

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیانِ کرام

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذِ حدیث

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

(جملہ حقوق واشاعت وطباعت بحق ادارہ محفوظ ہیں)

نام کتاب .... فتاویٰ حقانیہ (جلد اول)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دار العلوم حقانیہ و دیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبۃ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت .... ۵۹۴ صفحات

تاریخ طبع ششم .... ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

نقشِ آغاز

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الرسالۃ

بحمداللہ عزّ وجل دارالعلوم حقانیہ کے وقیع علمی مقام، قبولیتِ خداوندی کی بناء پر اس کے دارالافتاء کو بھی ملک و بیرونِ ملک علمی، تحقیقی اور عدالتی حلقوں میں سندِ اعتماد اور عوام میں مقبولیت حاصل ہے، دارالعلوم کے سنۂ تاسیس ۱۹۴۷ء ہی سے مسلمانوں کو پیش آنے والے علمی، دینی اور دنیاوی مسائل میں دارالعلوم کا دارالافتاء مرجع خلائق بنا، دارالعلوم کے بانی اور مہتمم اوّل سیدی و والدی شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہٗ خود ان فتاویٰ کو نہایت غور سے دیکھتے، ان میں کمی بیشی کراتے اور پھر بڑے اہتمام سے ان تحقیقی جواہر پاروں کو رجسٹروں میں نقل اور محفوظ کراتے رہے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط یہ فتاویٰ دارالعلوم کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں عرصہ سے علمی حلقوں اور عامۃ المسلمین کی تمنا اور خود ناچیز کی شدید خواہش تھی کہ یہ انمول خزانہ رجسٹروں سے نکال کر افادہ و استفادۂ امت کا ذریعہ بنے اور یہ فقہ و فتاویٰ کی دنیا میں ایک وقیع اضافہ ثابت ہو مگر دارالعلوم کے محدود وسائل، مختلف ظروف و احوال اور ناچیز کے گوناں گوں متنوع مشاغل (جبکہ میں اس مشکل اور نازک کام کو اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا) کی وجہ سے یہ آرزو جلد شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی مگر بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ عظیم اور وسیع ذخیرہ ترتیب و تدوین، انتخاب و تحقیق، تخریج و تنقیح کے دشوار گذار مراحل سے گذر کر فتاویٰ حقانیہ کی شکل میں ظہور پذیر ہو رہا ہے جو بلاشبہ وقت کا ایک عظیم فقہی اضافہ اور کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک تشنگانِ علم و دین اور متلاشیانِ حق و صداقت کی راہنمائی کا ذریعہ بنتا رہے گا، انشاء اللہ العزیز۔ یہ سب محض توفیقِ خداوندی اور فضلِ ایزدی کا نتیجہ ہے۔

علماء کا مقام وراثتِ نبوت ہے، ان کی تمام ذمہ داریوں اور فرائضِ تعلیم و تعلم، تدریس و تصنیف، دعوت و تبلیغ کے لیے بے پناہ صلاحیت و استعداد، اساتذۂ فن کی صحبت و تربیت، طلبِ علم کی راہ میں جانکاہی و جگر سوزی، تقویٰ و تدینِ ربط و استناد کی ضرورت ہے جس کے بغیر یہ فریضۂ وراثت ادا نہیں ہو سکتا مگر ان تمام ذمہ داریوں میں پلصراط پر چلنے جیسی نازک ذمہ داری قضاء و افتاء کی ہے جس کی شرائط و صفات اتنی ہی نازک، حساس اور عمیق ہیں۔ صرف ذکاوت و ذہانت اور وسعتِ مطالعہ نہیں بلکہ علماء راسخین کا رسوخ، تبحرِ علمی، کتاب و سنت کے وسیع متنوع قدیم و جدید ذخیروں پر عبور، تغیرات و تبدلاتِ زمانہ سے باخبری اور ہر لمحہ پیدا ہونے والے تہذیبی، معاشرتی اور سماجی و عرفی حالات اور عہدِ جدید کے پیدا کردہ مسائل اور چیلنجوں سے واقفیت پھر سائل اور مستفتی کے سوال اور ماخذِ شریعت

کے نصوص کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت لازمی ہے جسے فقہ کی ایک تعریف میں "فہم غرض المتکلم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور حدیث میں جسے "خیر" کا ایک عظیم سرمایہ قرار دیا گیا ہے۔ من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین (الحدیث) یہ سارے امور مفتی اور قاضی کے منصب کے تقاضوں کو بہت ہی نازک بنا دیتے ہیں۔ الحمد للّٰہ کہ دار العلوم کو روزِ اول سے حق تعالیٰ نے ان صفاتِ فضل و کمال سے مزین و متصف مدرسین و مفتیان عطا فرمائے جن کے تبحرِ علم و رسوخ تقویٰ و تدین پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے ـــــ اور اس مجموعہ فتاویٰ میں ایسے درجنوں علماء راسخین اور مفتیان کرام کی محنت اور جگر سوزی شامل ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو اعلیٰ علیین میں علماء راسخین و فقہاء امت کے زمرہ میں جگہ عطا فرمائے۔

ـــــ کتاب کے آغاز میں فقہ و فتاویٰ سے متعلق ضروری مباحث، ماخذ فقہ، ائمہ اربعہ کے مذاہب خمسہ و اجتہاد پر بھی ایک مقالے میں روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ اس سے عام قاری بھی استفادہ کر سکے، متقنین کرام کے مختصر حالات بھی دیئے گئے ہیں عربی عبارات اور حوالوں کی تصحیح، اصل ماخذِ محولہ سے تطبیق پھر تائید مزید کیلئے اضافی حوالوں کی تعبیر جلد و صفحات کے اضافہ کی بھی کوشش کی گئی ہے ـــــ ان مفتیان کرام کی اکثریت وہ ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی، ان کے تحریر کردہ جوابات میں اردو کے محاورہ گرائمر، سلاست اور تذکیر و تانیث کی پاسداری نہیں کی جا سکتی جبکہ فتویٰ کا اصل مقصد بھی حکم اور مسئلہ بیان کرنا ہوتا ہے نہ کہ مضمون نویسی اور لفظی فصاحت و بلاغت کا اظہار، تاہم حتی الوسع فتاویٰ کے مرتبین اور اکثر مجھ ناچیز نے بھی اردو عبارات کی تصحیح اور غلطیوں کے تدارک کی سعی کی ہے اس کے باوجود عبارات کی اصلاح کی بڑی گنجائش ہے اور اگر قارئین اس کی لفظی و معنوی اغلاط اور خامیوں کی نشاندہی فرما سکیں تو آئندہ اس کا ازالہ ہوتا رہے گا، ان شاء اللّٰہ ـــــ یہ فتاویٰ دار العلوم کے برگزیدہ اساتذہ و مفتیان کی علمی کاوشوں کا تو ثمرہ ہے ہی مگر درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء کے درجنوں تلامذہ و فضلاء، ان کے مایۂ ناز اساتذہ اور مشرفین کی عرق ریزی، پھر تدوین و تحقیق میں کئی رجالِ کار شامل ہیں جن کا ذکر مقدماتِ کتاب میں آرہا ہے۔ اور پھر عزیز مکرم مولانا مفتی مختار اللّٰہ حقانی جنہوں نے پچھلے کئی سال اس کٹھن کام میں صرف کئے۔

الغرض کتابت و اشاعت کے مراحل اور تصحیح تک۔ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط یہ عظیم شاہکار ان تمام حضرات اور ایک بڑی ٹیم کی مشترکہ محنتوں سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ ان سب کی اس سعی کو قبولیت سے نوازے اور امت کی تعلیم و ارشاد کا ذریعہ اور ہم سب کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین

خادم العلوم بدار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۷ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ / ۲۲ جنوری ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین جلد اوّل

فہرست مضامین جلد دوم

کتاب السیاسۃ ۲۸۹

عنوانات	صفحہ

کتاب الکراهیة والاباحة

عنوانات	صفحہ

رسالۃ

عورتوں کے حقوق آزادی اور بے حجابی کا مسئلہ

کتاب الطہارۃ

بابُ الوضوء

عنوانات	صفحہ

فہرست مضامین جلد سوم

باب القراءۃ

باب التراویح ۲۶۷

باب صلوٰۃ المسافر

باب الجمعة والعيدين

فہرست مضامین جلد چہارم

کتاب الصوم

کتاب الحج

باب شرائط الحج وارکانہ

عنوانات	صفحہ

کتاب النکاح

باب آداب النکاح وشرائط

باب الاولیاء و الاکفاء

باب الولیمۃ

کتاب الطلاق

مسائل شتّٰی — ۵۷۵

فہرست مضامین جلد پنجم

كتاب الجهاد

عنوانات	صفحہ

فہرست مضامین جلد ششم

کتاب الفرائض

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از

فضیلۃ الشیخ، مفکر اسلام، قائد ملت اسلامیہ حضرت العلامہ مولانا سمیع الحق صاحب مد ظلہ العالی

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الرسالۃ، اما بعد!

دنیا بھر میں جتنے بھی علوم رائج ہیں لوگ ان کی تحصیل میں ہمہ وقت مصروف و مشغول رہتے ہیں، اس کے حصول کے لیے جان، مال اور وقت خرچ کرتے ہیں، اس کے لیے بڑی بڑی یونیورسٹیاں، مدارس، سکول اور کالج وغیرہ بنائے جاتے ہیں جن پر حکومت اور عوام کی ایک خطیر رقم صرف ہوتی ہے۔ ان اداروں میں پڑھائے جانے والے علوم کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) علوم عقلیہ | اس قسم کے علوم صرف عقل سے متعلق ہوتے ہیں نقل کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، اس کا سارا دارومدار عقل ہی پر ہوتا ہے جیسے علم ریاضی، علم نجوم وغیرہ۔

ان علوم میں بعض محض کذب اور جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں، سچائی کا ان میں شائبہ تک نہیں ہوتا مثلاً سحر، جادو وغیرہ۔ اس لیے ایسے علوم کا حصول شرعاً ناجائز اور حرام ہے، جبکہ بعض علوم سچائی پر مبنی ہوتے ہیں مگر ان کے حصول کا کوئی نفع نہیں ہوتا، اس میں صرف وقت کا ضیاع ہوتا ہے، نہ اخروی فائدہ ہوتا ہے اور نہ دنیاوی فائدہ، اور لایعنی علوم کا حصول شریعت میں ممنوع ہے، البتہ جن علوم کے ساتھ کوئی دینی یا دنیاوی منفعت وابستہ ہو تو ان کا حصول مطلوب ہے۔

(۲) علوم نقلیہ محض | ان علوم کا تعلق محض نقل سے ہوتا ہے، عقل کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی، نصوص اور روایات سے وہ علوم ہم تک پہنچے ہیں، جیسے احادیث مبارکہ اور تفاسیر آیات قرآنی۔ ان علوم کے لیے راوی کی ثقاہت روایت اور حافظہ کی قوت ہی

کافی ہوتی ہے، اس میں غور کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہوتی، ان علوم کا حصول دینی فریضہ ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :-

نضر الله امرأ سمع مقالتی فوعاها ثم اداها کما سمعها۔

اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری کوئی بات سنی پھر اس کو محفوظ رکھا اور دوسروں کو اسی طرح سنایا جیسا کہ اس نے سنا تھا۔

ان علوم کے ماہرین کو محدثین و مفسرین کہا جاتا ہے۔

(۳) مجموعہ علوم عقلیہ ونقلیہ ان علوم کا تعلق نہ عقل سے ہوتا ہے اور نہ نقل سے بلکہ دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں، ان کو اشرف العلوم کہا جاتا ہے، اس میں علم الفقہ اور علم اصولِ فقہ شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان علوم کے حاملین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

وَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ۔ (سورۃ التوبۃ)

ہر قوم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو دین کی سمجھ حاصل کرے اور اپنی قوم کو ڈرائے جب ان کی طرف واپس آجائے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :-

من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین (الحدیث)

جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے۔

ان علوم کے ماہرین کو فقہاء کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی احکام و مسائل کے جاننے اور سمجھنے کے لیے ایسے لوگوں سے پوچھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا :-

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ (سورۃ النحل آیت ۴۳)

پس اہلِ ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

باجماعِ مفسرین اہلِ ذکر سے مراد علماء و فقہاء اُمت ہیں جو دین کے احکام و مسائل کا علم رکھتے ہوں، اور جب یہ حضرات مسئلہ کا حل بیان کریں تو ان کی اطاعت شرعاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور

وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (سورۃ النساء ۵۹)	اس کے رسول اور اپنے ارباب اختیار کی اطاعت کرو۔

فقہ کا لغوی معنیٰ فقہ کا لغوی معنیٰ ہے کسی شے کو کھولنا، اس کو واضح کرنا اور کسی چیز کو جاننا، اسی سے فقیہ ہے، فقیہ اُس عالم دین کو کہا جاتا ہے جو شرعی احکامات کو کھول دے، اس کو واضح کر دے اور اس کے حقائق کا سراغ لگائے، اسی طرح مسائل کی پیچیدگیاں دور کرے اور انہیں سلجھائے۔ لفظِ فقہ اگرچہ مطلق جاننے اور کھولنے کے معنی میں آتا ہے مگر اب یہ لفظ علمِ شریعت کے ساتھ مختص ہو گیا ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف فقہ کی اصطلاحی تعریف مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عہدِ اولیٰ میں فقہ کا لفظی مفہوم خاص حد تک محدود نہ تھا، جیسا کہ آجکل محض نکاح و طلاق اور بیع و میراث کی تفصیلات جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے، بلکہ اُس وقت راہ آخرت کے علم، آفاتِ نفسانی، اعمال کی خرابیوں کے اسباب اور ان کی وجوہات کو جاننے اور معلوم کرنے، دنیا کو حقیر اور آخرت کو بڑی شے سمجھنے، خوفِ خدا کا دل پر غالب آنے کا نام فقہ تھا۔ (احیاء العلوم الدین للغزالیؒ ج ۱ ص۳۲ بیان ما بدل من الفاظ العلوم)

اس لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فقہ کی تعریف یوں کی ہے:۔

ھو معرفۃ النفس ما لھا وما علیھا۔ (التوضیح والتلویح ج ۱ ص۱۰)

اسی طرح بہت جامع تعریف ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے کہ الفقہ فھم غرض المتکلم یعنی متکلم کے کلام کے مقصد کو سمجھنا اور اس کی تہہ تک پہنچنا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ سے فقیہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ فقیہ کسے کہتے ہیں تو آپ نے فرمایا:۔

انما الفقیہ المعرض من الدنیا، الزاھد فی الاخرۃ، البصیر بعیوب نفسہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۱ ص۳۷)	بیشک فقیہ وہ شخص ہے جو دنیا سے بیزار ہو، آخرت کی رغبت رکھتا ہو اور اپنے عیوب پر گہری نگاہ رکھنے والا ہو۔

فقہ کی یہ تعریف علم العقائد، تصوف، آدابِ معاشرت اور مروجہ علم فقہ سب کو شامل ہے۔

متاخرین کی تعریف مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فنوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے علمِ عقائد اور علم تصوف نے الگ الگ علم کی شکل اختیار کر لی تو فقہ کا محور بھی

کچھ محدود ہوگیا، اس لیے متاخرین نے اس علم کی مختلف تعریفات کی ہیں مگر مشہور و معروف تعریف جو ہے وہ یہ ہے کہ:۔

العلم بالاحکام الشرعیۃ الفرعیۃ المکتسب من ادلتھا التفصیلۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۶) | فقہ اُن فروعی احکامات کے جاننے کا نام ہے جو ادلہ تفصیلی سے مستنبط ہوں۔

احکام شرعی کی قسمیں

اسلامی احکامات کی دو قسمیں ہیں: (۱) اعتقادی: جو عقیدے سے متعلق ہوں، ان احکام کو اصلی بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) عملی: ان احکامات کا تعلق صرف عمل سے ہوتا ہے، ان کو احکام فروعی اور عملی بھی کہا جاتا ہے۔ متاخرین کی تعریف میں الاحکام الشرعیۃ الفرعیۃ کی قید سے اعتقادی احکامات خارج ہو گئے، اس لیے احکام اعتقادی سے بحث علم الکلام میں ہوتی ہے جو کہ ایک مستقل علم ہے۔

علم فقہ کا حکم

ہر مسلمان پر اتنی معلومات کا حصول فرض عین ہے جن کی طرف دین میں احتیاج پایا جاتا ہو، بغیر اس کے کوئی شخص شریعت کے مطابق کام نہیں کر سکتا، اور ضرورت سے زیادہ علم حاصل کرنا تاکہ لوگ محرمات اور منہیات سے بچ جائیں، فرض کفایہ ہے۔ اور اس میں تبحر حاصل کرنا اور جمیع انواع طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق اور عتاق کا حصول مستحب اور مندوب ہے۔ اس کے علاوہ جن اشخاص کا جن جن شعبوں سے تعلق ہے چاہے تجارت ہو یا نوکری، ملازمت، ان کے مسائل کو حاصل کرنا اور ان کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ محرمات میں ملوث ہونے سے بچ جائے۔

فقہ کی تدوین

صحابہ کرامؓ کے آخری دور تک اسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکا تھا اور ہر جگہ اسلام کا بول بالا تھا، لوگ اپنے مسائل کا حل حضرات صحابہ کرامؓ سے پوچھتے تھے، ان میں جو حضرات منصب اجتہاد پر فائز تھے وہ لوگوں کو ان کے مسائل کا حل بتلاتے تھے۔ ایسے ہی یہ سلسلہ چلتا رہا، جب صحابہ کرام کا دور ختم ہوا تو اس عظیم منصب کو ان کے اجلہ تلامذہ حضرات تابعین نے سنبھال لیا، اُس وقت سات مقامات پر بڑے بڑے دار الافتاء موجود تھے۔ (۱) مدینہ منورہ (۲) مکہ معظمہ (۳) کوفہ (۴) بصرہ (۵) شام (۶) مصر (۷) یمن ـــ ان سات مقامات میں مسائل کا حل نکلتا تھا اور لوگ اس پر عمل کرتے تھے۔

مگر ان ساتوں مقامات میں سے کوفہ ایک الگ خصوصیت کا حامل تھا، یہاں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور دوسرے اجلہ صحابہ کرامؓ کے تلامذہ موجود تھے۔ وہ علم فقہ و حدیث کا مرکز تھا۔ دنیا کے

اطراف واکناف سے لوگ علم فقہ وحدیث کے حصول کے لیے آتے تھے اور یہاں سے اپنی علمی تشنگی دور کر کے اپنے اپنے علاقوں میں اشاعت دین کے لیے واپس چلے جاتے تھے۔
امام ابوحنیفہؒ بھی اسی عظیم درسگاہ کے ایک ممتاز اور ذہین وفہیم طالب علم تھے۔ ۱۲۰ھ کو جب مشہور فقیہ ومحدث امام حماد بن ابی سلیمانؒ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے تو آپ کے جانشین کے لیے امام ابوحنیفہؒ کا انتخاب کیا گیا اور آپ اس منصب پر فائز ہو کر یہاں کے استاد اور مفتی مقرر ہوئے۔

علامہ خوارزمیؒ نے لکھا ہے کہ امام صاحبؒ سے پہلے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے علم فقہ کے ابواب ومسائل پر مشتمل کوئی تصنیف نہیں کی تھی، ان کو اپنی یادداشت پر اعتماد تھا، لیکن امام ابوحنیفہؒ نے متاخرین کے سوء حفظ کے پیش نظر یہ ضرورت محسوس کی کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے مسائل فقہ کو مدون ومرتب کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کا دنیا کی دیگر اقوام اور مذاہب کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا جہاں مختلف قسم کے رواج جڑ پکڑ چکے تھے، مختلف قسم کے فتنے پیدا ہو چکے تھے، وضع حدیث کا فتنہ بھی سر اٹھا چکا تھا اور عالم میں بہت تغیر وتبدل پیدا ہو چکا تھا جس کو روکنا آسان کام نہ تھا، اہل علم حضرات رفتہ رفتہ دنیا سے جا رہے تھے اور لوگ زوال کی طرف گامزن تھے، انہیں احساس ہوا کہ اگر اس علم کو ایک جگہ جمع نہ کیا گیا تو یہ ضائع ہو جائے گا، علم وفضل کے جو مینار اس وقت حیات ہیں ان کے علم وفراست سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے ورنہ آئندہ اس بار گراں کو اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

تدوین فقہ کے لیے کمیٹی کا قیام اس کام کے لیے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے ہزاروں تلامذہ میں سے چالیس وہ حضرات جو علم وفضل، فہم وفراست، زہد وتقویٰ اور ذکاوت میں اپنی مثال آپ تھے، کا انتخاب کیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی، اس کمیٹی کے صدر خود امام ابوحنیفہؒ تھے، اس کمیٹی میں ہر علم وفن کے ماہرین حضرات شامل تھے اور اپنی علمی مہارت کے ساتھ ساتھ زہد وتقویٰ، خدا ترسی اور فرض شناسی جیسے عمدہ اوصاف کے ساتھ متصف تھے، اس کمیٹی کے جملہ ممبران درجہ اجتہاد پر فائز تھے، کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے ہر مسئلہ پر پوری آزادی اور شرح وبسط کے ساتھ بحث ہوتی تھی اور ہر ایک کو اپنی بساط کے مطابق اپنی رائے پر دلائل پیش کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ ان حضرات کے علاوہ بھی دوسرے محدثین اور فقہاء اکثر اوقات ان حدیثی اور فقہی ابحاث کو سنتے تھے، ان کو بھی

اپنے اپنے علم وصوابدید کے مطابق کہنے اور سننے کا برابر حق دیا جاتا تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود پھر بھی اس چالیس رکنی کمیٹی میں دس افراد کا ایک الگ خصوصی بینچ قائم تھا جس میں امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ، امام عبداللہ بن مبارکؒ، عافیہ ازدیؒ، قاسم بن معنؒ، اسد بن عمروؒ اور خود امامِ اعظم ابوحنیفہؒ شامل تھے۔

طریقۂ استدلال

علامہ ابن حجر مکیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ استدلال واستنباط کے بارے میں لکھا ہے:۔

انه اولاً یأخذ بما فی القرآن فان لم یجد فبالسنة فان لم یجد فبقول الصحابةؓ فان اختلفوا اخذ بما کان اقرب الی القرآن والسنة من اقوالهم و لم یخرج عنهم فان لم یجد لاحد منهم قولاً ولم یأخذ بقول احد من التابعین بل یجتهد کما اجتهدوا۔ (الخیرات الحسان ص ۶۹ الفصل الحادی عشر)

بیشک اولاً آپؒ قرآنِ کریم سے استدلال کرتے تھے اگر قرآن میں نہ پاتے تو سنتِ رسولؐ کو لیتے تھے، اور اگر وہاں بھی نہ پاتے تو پھر قولِ صحابہؓ کو لیتے تھے اور اگر ان میں اختلاف ہوتا تو ان حضرات کے اقوال میں سے جس کا قول قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہوتا اس کو لیتے اور ان کی مخالفت نہ کرتے تھے، اور اگر ان میں سے کسی کا بھی قول مروی نہ ہوتا تو تابعین میں سے کسی کے قول کو نہیں لیتے تھے بلکہ اسی طرح اجتہاد کرتے جیسا کہ تابعین نے اجتہاد کیا تھا۔

ضعیف حدیث کی قیاس پر تقدیم

مسائل کے استنباط میں رائے اور قیاس پر ضعیف حدیث کو بھی ترجیح دیتے تھے اور کبھی رائے و قیاس کو کسی ضعیف حدیث پر بھی مقدم نہیں کیا، علامہ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں:۔

اصحاب ابی حنیفةؒ مجمعون علی ان مذهب ابی حنیفةؒ ان ضعیف الحدیث اولیٰ عنده من القیاس والرائی۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۲)

ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔

طریقہ تدوین

چونکہ امام ابوحنیفہؒ نے اس کمیٹی کے ہر ممبر کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنا مؤقف پیش کرے اور احادیث وآثار الصحابہؓ، اجماع

اور قیاس کی روشنی میں آزادی کے ساتھ گفت گو کرے۔ ایک موقعہ پر آپؒ نے فرمایا کہ میں نے خود ان کو یہ اختیار دے رکھا ہے اور ان کو اس امر کا عادی بنا دیا ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہ ہوں اور ایک دوسرے کے دلائل حتیٰ کہ میرے دلائل پر بھی نکتہ چینی کر سکیں تاکہ بات بالکل واضح اور صاف وشفاف ہو کر سامنے آئے۔ بحث وتمحیص کے بعد جب کسی مسئلہ پر سب کا اتفاق ہو جاتا تو پھر اس کو لکھنے کا حکم فرماتے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :۔

روی الامام ابوجعفر الشیرمازیؒ عن شقیق البلخیؒ انہ یقول کان الامام ابوحنیفۃؒ من اورع الناس واعبد الناس واکرم الناس واکثرھم احتیاطاً فی الدین وابعدھم عن القول بالرأی فی دین اللّٰہ عزّوجل کان لا یضع مسئلۃ فی العلم حتی یجمع اصحابہ علیھا ویعقد علیھا مجلساً فاذا اتفق اصحابہ کلھم علی موافقتھا للشریعۃ قال لابی یوسفؒ اوغیرہ ضعھا فی الباب الفلانی۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۶۳)

امام ابوجعفر الشیرمازیؒ شقیق البلخیؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار، عبادت گذار، زیادہ کریم النفس اور دین کے بارے میں سب سے زیادہ احتیاط کرنے والے اور دین کے باب میں ذاتی رائے زیادہ استعمال کرنے میں لوگوں سے کوسوں دُور تھے، آپؒ اُس وقت تک کسی مسئلہ کو حتمی شکل نہیں دیتے تھے جب تک آپؒ کے تمام اہلِ مجلس متفق نہ ہو جاتے اور جب سب کا اتفاق ہو جاتا تو امام ابو یوسفؒ یا کسی اور کو فرماتے کہ اس مسئلہ کو فلاں باب میں رکھ دو۔

اسی طرح بعض مسائل پر کئی کئی دن بحث ہوا کرتی تھی اس کے بعد کہیں جاکر وہ مسئلہ رجسٹر میں لکھا جاتا تھا، علامہ کوثریؒ فرماتے ہیں :۔

قال اسد بن عمرو کانوا یختلفون عند ابی حنیفۃؒ فی جواب المسألۃ فیأتی ھذا بجواب وھذا بجواب ثم یرفعونھا الیہ ویسئلونہ عنھا فیأتی بجواب من کثب ای من قرب وکانوا یقیمون فی المسألۃ ثلاثۃ ایام ثم یکتبونھا فی

اسد بن عمرو فرماتے ہیں کہ کمیٹی کے ممبر امام صاحبؒ کے سامنے کسی مسئلہ کے جواب میں اختلاف کرتے تھے، کوئی ایک جواب لاتا تو دوسرا کوئی اور جواب لاتا، پھر اس مسئلہ کو امام صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرتے اور آپؒ سے اس کے بارے میں دریافت کرتے تو آپؒ تحقیقی جواب تحریر فرماتے، پھر آخر میں اس کو رجسٹر میں لکھا جاتا۔

الدیوان ۔ (مقدمہ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۸)

اس طرح ایک ایک مسئلہ پر تین تین دن بحث و تمحیص ہوتی تھی۔

بلکہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

فکان اذا وقعت واقعۃ شاورھم و ناظرھم و حاورھم وسألھم فیسمع ماعندھم من الاخبار والآثار و یقول ما عندہ و یناظرھم شھرا او اکثر حتی یستقر اخر الاقوال فیثبتہ ابو یوسف حتی اثبت الاصول علی ھذا المنہاج شوری لا انہ تفرد بذلک۔
(رد المحتار ج ۱ ص ۶۲)

جب کوئی واقعہ پیش آتا تو امام ابو حنیفہؒ اپنی کمیٹی کے تمام ارکان سے مشورہ کرتے، ان سے بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات کرتے، پہلے ان سے فرماتے کہ ان کے پاس احادیث اور اقوالِ صحابہؓ کا جو کچھ ذخیرہ ہے وہ پیش کریں، پھر اپنا ذخیرۂ دلائل سامنے رکھتے، اس کے بعد پھر ایک ماہ یا اس سے زیادہ اس مسئلہ پر بحث کرتے تاآنکہ آخری بات طے پا جاتی اور امام ابو یوسفؒ اسے قلم بند کرتے۔ اسی طرح شورائی طریقہ پر سارے اصول منضبط ہوتے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تنہا کوئی بات کہی ہو۔

احتیاط کا عالم یہ تھا کہ بحث کے دوران اگر کمیٹی کا رکن قاضی عافیہ نہ ہوتے تو آپؒ فرماتے کہ جب تک عافیہ نہ آجائے اس مسئلہ کو ملتوی کردو، اُن کے آنے کے بعد جب دوسرے ممبران سے اتفاق ہوجاتا تو آپؒ فرماتے کہ اب اس کو لکھو۔

خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی صرف ایک شخص کی رائے نہیں بلکہ ان چالیس جبال العلم حضرات کی شوریٰ کا مرتب کردہ قانون ہے، اور جب تک کوئی مسئلہ خوب تحقیق و تفتیش کے مراحل طے نہ کرلیتا آپؒ اس کو رجسٹر میں لکھنے سے منع کر دیتے، حتیٰ کہ ایک دن قاضی ابو یوسفؒ سے فرمایا:۔

ویحك یا یعقوب لا تکتب کل ما تسمع منی فانی قد اری الرأی الیوم و اترکہ غدًا واری الرأی غدًا و اترکہ فی غدہ۔
(مقدمہ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۸)

اے یعقوب! جو کچھ مجھ سے سنو اس کو فوراً مت لکھو، اسلئے کہ میں کبھی آج کے دن ایک مسئلہ کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہوں اور کل اس کو ترک کرتا ہوں اور کل دوسری رائے رکھتا ہوں اور پرسوں اس کو چھوڑتا ہوں۔

کسی بھی مسئلہ پر کمیٹی کے ہر ممبر کو اپنی رائے پیش کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی اور وہ خوشی سے اپنی اپنی آراء پیش کرتے تھے اور اس پر خوب جرح و قدح ہوتی تھی، اس کے بعد آخر میں اسے قبول کیا جاتا ۔

امام ابوحنیفہؒ نے جس طرز پر تدوینِ فقہ کا کام کیا وہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی نظیر غیر اسلامی تاریخوں میں بھی نہیں ملتی ۔ اس طریقۂ تدوین سے آپؒ نے باختلافِ اقوال ساڑھے پانچ لاکھ مسائل استنباط فرمائے ۔

علامہ خوارزمیؒ فرماتے ہیں کہ ان پانچ لاکھ مسائل میں اڑتیس ہزار مسائل کا تعلق عبادات سے ہے اور باقی معاملات سے متعلق ہیں ۔

فقہ کے ماخذ

جیسا کہ فقہ کی تعریف میں ذکر کیا گیا ہے کہ المستنبط من الادلۃ الشرعیۃ جو ادلہ شرعیہ سے ماخوذ ہو ۔ یہاں ادلہ کا کسی قدر ذکر کیا جاتا ہے ۔ عموماً تو احکام شرعیہ کے چار دلائل ذکر کئے جاتے ہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں ماخذ میں قرآن و سنت دو بنیادی اصول ہیں اور باقی دو یعنی اجماع و قیاس اِن دونوں کے تابع ہیں ۔ اس لیے جو اجماع و قیاس قرآن و سنت کے معارض ہو تو وہ ناقابلِ اعتبار ہے ۔ اس لیے کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

ان الاحکام تؤخذ من نص او حمل علیٰ نص ۔ (اسلامی فقہ کے اصول ص۲۹ باب دوم)

(ترجمہ) "احکامِ شرعیہ یا تو نص سے اخذ کئے جاتے ہیں یا اس امر سے اخذ کئے جاتے ہیں جو نص پر محمول ہو"۔

یہ چاروں دلائل فقہاء اُمت کے ہاں متفق علیہ ہیں مگر ان کے علاوہ بھی چند ماخذ ہیں ۔ جو فقہاء کرام کے ہاں مختلف فیہ ہیں، بعض دلائل کو ایک فقیہ و مجتہد ماخذ کا درجہ دیتا ہے مگر دوسرا فقیہ ان کو ماخذ تسلیم نہیں کرتا ۔ یہاں ان ماخذ کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے ۔

القرآن الحکیم احکام شرعیہ کا سب سے پہلا اور اصل الاصول ماخذ قرآنِ کریم ہے، اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس کو الکتاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ قرآنِ کریم کا ایک نام ہے، اس کے علاوہ اور اسماء بھی ذکر کیے جاتے ہیں

جن میں مشہور ترین پانچ اسماء ہیں یعنی القرآن، الفرقان، الکتاب، الذکر، التنزیل۔
قرآنِ کریم میں یہ اسماء جابجا ذکر کئے گئے ہیں ۔
اس کتاب میں جزئیات اور فروعات کا ذکر بہت کم ہے ۔ اکثر اصول و قواعد اور کلیات کا ذکر ہے۔
علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں لکھا ہے :۔

القرآن علیٰ اختصاره جامع ولا یکون جامعا الا والمجموع فیه امر کلیات لان الشریعة تمت بتمام نزوله لقوله الیوم اکملت لکم دینکم (الایة) وانت تعلم ان الصلوٰة والزکوٰة، والجهاد واشباه ذٰلك لم یبین جمیع احکامها فی القرآن انما بینتها السنة وکذٰلك العادیات من الانکحة والعقود والقصاص والحدود وغیرها۔
(الموافقات ج۳ ص۳۶۷ المسئلة الخامسة)

قرآنِ کریم اختصار کے باوجود ایک جامع کتاب ہے اور یہ جامعیت تب ممکن ہے جب اس میں کلیات ذکر ہوں، اس لیے کہ شریعتِ مطہرہ کامل اور مکمل ہو چکی ہے اور اس بات کی طرف اللہ تعالےٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم الخ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کیا، سے اشارہ فرمایا ہے ۔ اور تم جانتے ہو کہ نماز، زکوٰۃ، جہاد اور اس جیسے احکامات کی تفصیلات اور جزئیات مثلاً اوقاتِ صلوٰۃ کا قرآن میں ذکر نہیں آیا ہے البتہ اس کو سنت نے بیان کیا، اسی طرح نکاح، بیع و شراء، قصاص و حدود وغیرہ جیسے معاملات کی جزئیات کا ذکر بھی قرآن میں نہیں مگر احادیث نے ان کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔

علامہ شاطبیؒ ایک اور مقام پر ذرا واضح اور صریح الفاظ میں لکھتے ہیں :۔

تعریف القرآن بالاحکام الشرعیة اکثرہ کلی لا جزئی وحیث جاء جزئیا فماخذہ من الکلیة۔ (الموافقات ج۳ ص۳۶۶)

قرآن میں اکثر شرعی احکامات کلی مذکور ہیں لیکن جہاں جزئی حکم کا ذکر ہوا ہو تو کسی کلی سے اخذ کیا گیا ہو گا ۔

قرآنِ کریم اگرچہ کسی تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں، اس لیے کہ یہ ایک بدیہی کلام ہے مگر بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر علماء اصولِ فقہ نے یوں تعریف کی ہے :۔

هو القرآن المنزل علی رسول الله علیه وسلم المکتوب فی المصاحف المنقول عنه نقلاً متواتراً بلا شبهه ۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہو اور مصاحف میں منقوش ہو اور ہم تک تواتر

(نور الانوار ص ۸، ۹) | کے ساتھ بلاشبہ کے منقول ہو۔

قرآن کا کتنا حصہ ماخذ ہے | قرآن اگرچہ فقہ کا ماخذ ہے مگر خصوصیت سے آیات الاحکام ماخذ ہیں جن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں جس کی تائید کسی نے پانچسو کسی نے سینکڑوں سے متجاوز ذکر کئے ہیں جو کہ فقہ کا ماخذ ہیں اور ایک فقیہ کے لیے اس پر عبور رکھنا ضروری ہے۔

مہارت کے لیے شرائط | مگر اس عبور کے لیے چند چیزوں کا علم ضروری ہے۔
(۱) **ناسخ و منسوخ کا علم**: یعنی اس فقیہ کو یہ معلوم ہو کہ کونسی آیت ناسخ ہے اور کون سی منسوخ۔
(۲) **مجمل و مفسر کا علم**: یعنی فقیہ کو یہ علم حاصل ہو کہ ان آیات میں کون سی آیت مجمل ہے اور کون سی مفسر۔
(۳) **خاص و عام کا علم**: ایک فقیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو یہ پتہ ہو کہ کونسی آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے خاص ہے اور کون سی عام ہے۔
(۴) **محکم اور متشابہ کا علم**: اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ ان آیات میں کون سی آیت متشابہ ہے اور کون سی محکم ہے۔
(۵) **نوعیت کا علم**: اور اس کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان آیات میں جو اوامر کی آیات ہیں ان میں امر کی نوعیت کیا ہے، کون سا امر وجوب کا مقتضی ہے اور کون سا فرض، مستحب، یا اباحت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور جن آیات کا تعلق نواہی سے ہے اس میں کونسی نہی حرام کا تقاضا کرتی ہے اور کون سی کراہت تحریم یا کراہت تنزیہی کا۔

السُّنّۃ | فقہ کا دوسرا ماخذ سُنت ہے۔ سنت کا لغوی معنیٰ ہے طریقہ اور عادت، عربی زبان میں یہ لفظ جب بلا کسی قید کے استعمال ہو جائے تو عمدہ طریقہ اور اچھی سیرت کے معنیٰ میں ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہٗ اجرھا واجر من عمل بھا ومن سن فی الاسلام سنۃ سیئۃ فلہ وزرھا ووزر من عمل بھا۔	جس شخص نے اسلام میں ایک اچھی سُنت جاری کی تو اس کیلئے اس کا اجر ملے گا اور جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں گے اس کا بھی، اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کا وبال اسی پر ہوگا

(ابن ماجہ ص۱۸) | اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے اُن کا بھی۔

اور فقہ کی کتابوں میں سنت کا اطلاق اس عمل پر ہوتا ہے جو فرض اور واجب نہ ہو مگر اصطلاح میں سنت کا اطلاق وسیع پیمانہ پر ہے کہ:

السنۃ تطلق علیٰ قول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم) وفعلہ وسکوتہ وعلی اقوال الصحابۃ وافعالھم۔
(نور الانوار ص۱۷۵ باب اقسام السنۃ)

سُنت کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور سکوت پر ہوتا ہے اور اسکے ساتھ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال و افعال پر بھی سُنت کا اطلاق ہوتا ہے۔

سُنت اور حدیث میں فرق

اس بارے میں علماء امت کے اقوال مختلف فیہ ہیں:-

(۱) فقہاء کرام کے ہاں حدیث خاص ہے، اس کا اطلاق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالِ مبارکہ پر ہوتا ہے، اور سُنت عام ہے، اس میں قول وفعل اور تقریر وغیرہ سب شامل ہیں۔

(۲) مگر محدثین حضرات کے ہاں حدیث اور سُنت دونوں مترادف ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:-

المراد بالحدیث فی عرف الشرع ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
(نزھۃ النظر ص۸)

حدیث سے مراد شرع کی رُو سے وہ شے ہے جس کی اضافت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہو۔

اب جس طرح اقوال کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے تو افعال و تقریرات اور صفات کی نسبت بھی ہوتی ہے، اس لیے ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اقوال و افعال، تقریرات و صفات چاہے عالمِ بیداری میں ہوں یا عالمِ خواب میں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ حرکات و سکنات حدیث کہلاتی ہیں، سنت و حدیث باہمی مترادف ہیں"

(۳) جبکہ بعض حضرات کی ایک تیسری رائے بھی ہے، ان کے ہاں سُنت خاص ہے اس کا اطلاق صرف اعمال پر ہوتا ہے۔ اور حدیث عام ہے جس کا اطلاق تمام امور پر ہوتا ہے۔

سُنت کی حُجیت

علامہ تقی امینیؒ نے سنت کی عجیب تشریح کی ہے کہ قرآنِ حکیم نقشۂ تعمیر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت اس نقشۂ تعمیر کے مطابق

تیار کی ہوئی عمارت ہے۔ نقشہ (کتاب) کے ساتھ انجنیئر (رسول) بھیجنے کے اصول پر اُس وقت سے برابر عملدرآمد رہا ہے جب سے ہدایتِ الٰہی کے سلسلہ کی ابتداء ہوئی ہے۔ اسی بنا پر حالات و زمانہ کے تقاضا کی مناسبت سے عمارت کی تعمیر میں انجنیئر کی بتائی ہوئی ہدایات کو قطعاً نظر انداز کرنے سے اصل نقشہ کی مطابقت نہیں ہوسکتی۔ (فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص۹۴)

تو جس طرح قرآنِ کریم کا ماننا اور اس کو حُجت تسلیم کرنا ضروری ہے اُسی طرح سُنت کو حُجت ماننا بھی اشد ضروری ہے، ورنہ اصل قرآن پر عمل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے قرآنِ کریم کُلیات سے بحث کرتا ہے، اس کی جزئیات اور تشریح کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے، قرآنِ کریم خود اس کی حجیت کا داعی ہے، مثلاً:- (۱)

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝ (سورۃ النجم آیت ۱ تا ۴)

قسم ہے ستاروں کی جب وہ غروب ہوجائیں، یہ تمہارے ساتھ رہنے والے (رسولؐ) نہ راہِ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ پر ہوئے، اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد خالص وحی ہے۔

چاہے وہ وحی متلو (قرآن) ہو یا غیر متلو (سُنت) دونوں کی وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔

(۲) يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ (سورۃ المائدہ آیت ع)

اے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم! جو کچھ آپ پر پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسکی تبلیغ کیجئے۔

اِس آیت میں لفظ مَا عام ہے، اس میں بھی وحی متلو اور غیر متلو دونوں شامل ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقوال و افعال اور تقریرات سے قرآنِ کریم کی جو بھی تبلیغ و تشریح کریں گے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہوگی، علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں:-

ليس في السنة الا واصله في القرآن انما هي تبيين له وتفصيل۔ (الموافقات ج۴ ص۲۱ المسئلة الثالثة)

سُنت میں کوئی بھی ایسا عمل نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو بلکہ سُنت قرآن کی وضاحت اور اس کی تفصیل ہے۔

اس کی حیثیت تفسیر و شرح جیسی ہے، شارح یا مفسر تو متن کے مراد کی وضاحت کرتا ہے اس کے خلاف نہیں کرتا، علامہ شاطبیؒ نے لکھا ہے کہ:-

فكان السنة بمنزلة التفسير والشرح

سُنت قرآنِ کریم کے احکام کی تفسیر اور اس کی

احکام الکتب۔ (الموافقات ج۴ ص۱۰ المسئلۃ الثالثۃ) | شرح جیسی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصبِ تشریع و تفسیر عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○
(سورۃ النحل آیت ۴۴)

ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) نازل فرمایا تاکہ آپ واضح کر دیں لوگوں پر وہ چیز (قرآن) جو ان کی طرف بھیجی گئی ہے، اس لیے کہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔

اس آیتِ کریمہ کے تحت علامہ شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:۔

فلا تجد فی السنۃ امرًا الا والقراٰن قد دل علیٰ معناہ دلالۃ اجمالیۃ او تفصیلیۃ۔
(الموافقات ج۴ ص۱۲ المسئلۃ الثالثۃ)

تم سنت میں کوئی ایسا امر نہیں پاؤ گے جس پر قرآن کریم میں کوئی دلالت اجمالی و تفصیلی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○
(سورۃ النساء آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہیں، پھر اگر تمہارے مابین کسی چیز (معاملہ) میں نزاع پیدا ہو جائے تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

علامہ شاطبیؒ "الموافقات" میں لکھتے ہیں:۔

الرد الی اللہ ھو الرد الی الکتاب و الرد الی الرسول ھو الرد الی سنتہ۔
(الموافقات ج۴ ص۱۴ المسئلۃ الثالثۃ)

اللہ کی طرف رجوع کرنا دراصل کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور رسول کی طرف رجوع کرنا دراصل ان کی سنت کی طرف رجوع کرنا ہے۔

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید کی ایسی بے شمار آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جس طرح قرآن حجت ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی حجت ہے۔ اور اس موضوع پر علماء امت کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

الاجماع تیسرا ماخذ اجماع ہے، اجماع کا لغوی معنیٰ ہے عزم اور اتفاق کرنا۔ فقہاءِ امت نے اجماع کی مختلف تعریفات کی ہیں۔ علامہ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:۔

اتفاق مجتهدی امة محمد صلی اللہ علیه وسلم بعد وفاته فی عصر من الاعصار علی امر من الامور۔ (ارشاد الفحول ص۱۷، التیسیر ج۳ ص۸۱)

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجتہدین کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانہ میں کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا۔

امام غزالیؒ نے یہ تعریف کی ہے:۔

اتفاق امة محمد صلی اللہ علیه وسلم خاصة علی امر من الامور الدینیة۔ (المستصفی ج۱ ص۱۷۳)

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دینی معاملات میں سے کسی معاملہ پر متفق ہونا۔

مگر علامہ آمدیؒ نے اس تعریف پر مختلف وجوہات سے اعتراض کیا ہے:۔

(۱) اس تعریف میں اتفاق سے امتِ محمدیہ کے الفاظ ہیں جو قیامت تک آنے والوں کو شامل ہیں جس میں اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امت کا کس بات پر اتفاق ہو چکا ہے۔

(۲) اگر بالفرض امت سے کوئی عہد مراد ہے تو ممکن ہے کسی زمانے میں امت کے اندر اربابِ حل و عقد نہ ہوں اور لازماً عوام الناس کے کسی دینی مسئلہ پر اتفاق کو اجماع کیا جائے تو شرعاً یہ صحیح نہیں۔

(۳) تعریف میں من الامور الدینیة کی قید سے عقلی اور معاشرتی مسائل پر اجماع خارج ہو جائے گا جو عقلاً بھی صحیح نہیں۔

علامہ آمدیؒ نے امام غزالیؒ کی تعریف پر اعتراض کے بعد اجماع کی یہ تعریف کی ہے:۔

الاجماع عبارة من اتفاق جملة اهل الحل و العقد من امة محمد صلی اللہ علیه وسلم فی عصر من الاعصار علی حکم واقعة من الوقائع۔ (الاحکام فی اصول الاحکام ج۱ ص۲۸۱)

اجماع اس اتفاق سے عبارت ہے جو امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اربابِ حل و عقد کا کسی زمانے میں کسی واقعہ پر ہو جائے۔

اور اسی قسم کی تعریف قاضی بیضاویؒ نے بھی کی ہے۔ اور اسی طرح کی تعریف کرتے ہوئے

ملا محمد یعقوب اللبنانی رح لکھتے ہیں :۔

اتفاق المجتھدین من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی کل عصر علیٰ امر من الامور (المولوی حاشیہ حسامی ص۳۸۳ باب الاجماع)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مجتہدین کا کسی زمانے میں کسی معاملہ پر متفق ہونا۔

اجماع کی ان جملہ تعریفات سے معلوم ہوا کہ اجماع کسی زمانے یا کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر دور کے اہلِ اجتہاد کسی مسئلہ پہ اتفاق کر سکتے ہیں اور ان کا یہ اتفاق مقبول ہوگا۔ ہمارے ہاں صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر زمانے کے اہلِ اجتہاد صاحبِ عدالت حضرات کا اجماع معتبر اور حجتِ شرعی ہے۔ ملا محمد یعقوب اللبنانی رح لکھتے ہیں :۔

والصحیح عندنا ان اجماع علماء کل عصر من اھل العدالۃ والاجتھاد حجۃ۔ (المولوی حاشیہ حسامی ص۳۸۴ باب الاجماع)	ہمارے ہاں صحیح یہ ہے کہ ہر زمانے کے اہلِ عدالت و اجتہاد کا اجماع حجت ہے۔

اجماع کن کا معتبر ہے

یہ مسئلہ بھی علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے کہ اجماع کن حضرات کا معتبر ہوگا؟ تو اہلِ ظواہر کا کہنا ہے کہ اجماع کے لیے صرف صحابہ کرام رض متعین ہیں، ان کے اجماع کا اعتبار ہوگا۔ زیدیہ اور امامیہ کے نزدیک صرف اہلِ بیت متعین ہیں۔ اور امام مالک رح کے ہاں صرف اہلِ مدینہ کے اجماع کا اعتبار ہوگا۔

اجماع کی حجیت

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، آپ کا لایا ہوا دینِ متین قیامت تک کے لیے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو مسائل کا حل وحی الٰہی سے کراتے تھے لیکن آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد وحی کا سلسلہ قیامت تک بند رہے گا جبکہ قیامت تک امتِ محمدیہ کے لیے نئے نئے مسائل پیش آتے رہیں گے جن کا کوئی نہ کوئی حل لازمی ہوگا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا راستہ بتلایا کہ ہر زمانے کے جید علماء اہلِ اجتہاد نئے پیش آنے والے مسائل پر غور و فکر کریں اور ان کا حل تلاش کریں۔ قرآنِ کریم نے اسی حجیت کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَ	اور جو مخالفت کرے رسول کی اسکے بعد کہ اس پر کھل چکی ہے ہدایت اور چلے مسلمانوں کے راستے کے علاوہ پر تو ہم اسکو اس رستے کے حوالہ کر دیں گے جس پر وہ چلا ہے اور ڈال دیں گے اس کو جہنم میں

سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝
(سورۃ النساء آیت ۱۱۵)

اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔
(سورۃ النساء آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب الرائے ہیں۔

(۳) كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۝
(سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۳)

اسی طرح ہم نے بنایا تم کو بہترین اُمت تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ آیتِ بالا سے اجماعِ اُمت کی حجیت کے لیے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

(۱) فی هٰذہ الاٰیة دلالة علی صحة اجماع الامة من وجهین احدهما وصفه ایاها بالعدالة وانها فیاز وذلك یقتضی تصدیقها والحکم بصحة قولها وناف لاجماعها علی الضلال والوجه الاٰخر (قوله) لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ عَلَى الْحُجَّةِ عَلَيْهِمْ۔
(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۰۹ سورۃ البقرۃ)

یہ آیت اجماعِ امت کی صحت پر دو وجوہ سے دلالت کرتی ہے (۱) اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو صفتِ عدالت کے ساتھ متصف کیا ہے اسلئے کہ یہ بہترین امت ہے اور یہی صفت ان کی تصدیق کی مقتضی ہے اور اس کے قول پر صحت کا تقاضا کرتی ہے اور ان کے اجماع پر گمراہی کے لیے منافی ہے (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کہ تم لوگوں پر حجت ہو۔

علامہ رازیؒ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:۔

فدل علی ان الاجماع فی ای حال حصل من الامة فهو حجة الله عزوجل غیر صائغ لاحد ترکه ولا الخروج عنه ومن حیث دلت الاٰیة علی صحة الصدر الاول فهی دالة علی

پس یہ آیت اس بات پر دال ہے کہ بیشک جو اجماع کسی بھی حال میں اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منعقد ہو جائے تو وہ حجۃ اللہ ہے کوئی بھی اس کو ترک نہیں کر سکتا اور نہ اس سے نکلا جا سکتا ہے جس طرح یہ آیت قرونِ اولیٰ کے اجماع کی

صحة اجماع اھل الاعصار۔ | صحت پر دال ہے اسی طرح ہر دور کے اجماع پر بھی
(احکام القرآن ج ۱ ص۱۱۵ سورۃ البقرۃ) | دلالت کرتی ہے ۔

اسی طرح مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرطبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:۔

"یہ اجماعِ اُمت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنا دیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا کسی مسئلہ پر اجماع حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے، اس طرح کہ صحابہؓ کا اجماع تابعین پر تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔" (معارف القرآن جلد ۱ ص ۳۷۲)

(۴) ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۰۳) | اللہ کی رسی کو سب کے سب مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ کرو۔ (آپس میں پھوٹ نہ ڈالو)

اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام کے اجماعی فیصلوں کی مخالفت کرنا ان میں پھوٹ ڈالنے کے مترادف ہے جو شرعاً ممنوع ہے، تو گویا ان کا اجماعی فیصلہ ایک حجتِ شرعی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی مخالفت کو ممنوع قرار دیا۔

احادیث سے حجیتِ اجماع

اجماعِ امت کی حجیت کے بارے میں اتنی روایات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں کہ وہ تواتر قدرِ مشترک کی حد تک پہنچتی ہیں، یہاں ان میں سے چند ایک کو درج کیا جاتا ہے :۔

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ اور مسئلہ پیش آجائے جس کے بارے میں قرآنِ کریم اور سنتِ رسول میں کوئی وضاحت نہ ہو تو پھر ہم اس کے حل کے بارے میں کیا طریقہ اختیار کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

شاوروا فیہ الفقہاء العابدین ۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۴۲۸ رقم الحدیث ۸۳۴) | کہ تم اس معاملہ میں متقی اور پرہیزگار فقہاء کرام سے مشورہ کرو ۔

یہ روایت وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ فقہاء عابدین کی رائے اور ان کا

اجماع واجب الاتباع حجت ہے۔

(۲) اسی طرح ایک اور روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لن یزال امر ھذہ الامۃ مستقیماً حتی تقوم الساعۃ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص۱۷ کتاب العلم)	اس امت کی حالت ہمیشہ درست رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ساری کی ساری اُمت حق پر رہو۔ مشاہدات اور پیشینگوئی والی روایات سے ثابت ہے کہ بعض لوگ غیر حق پر بھی ہوں گے۔ لہٰذا اس روایت سے معلوم ہُوا کہ اُمت کی ایک جماعت نیکوکار اور ہدایت یافتہ رہے گی اور اس کی رائے واجب الاتباع ہوگی۔

(۳) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد گرامی ہے:۔

ان اللہ لا یجمع امتی او قال امۃ محمد علی ضلالۃ و ید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ علی النار۔ جامع الترمذی ج۲ ص۳۹ ابواب الفتن، باب لزوم الجماعۃ	اللہ تعالیٰ میری امت کو یا یہ فرمایا کہ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گمراہی پر جمع (متفق) نہیں کرے گا۔

امام الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کئی صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہے حتیٰ کہ بعض تابعین نے بھی اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں سب صحابہ کرامؓ کے سامنے فرمایا:۔

ثلاث لا یغل علیھن قلب مسلم اخلاص العمل للہ والنصیحۃ للمسلمین ولزوم جماعتھم فان دعوتھم تحیط من ورائھم۔ (سنن ابن ماجۃ ص۲۱۹ کتاب المناسک، باب الخطبۃ یوم النحر)	تین خصلتوں کی موجودگی میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرے گا (۱) اللہ کیلئے عمل میں اخلاص ہو۔ (۲) مسلمانوں کیلئے خیر خواہی ہو (۳) اور مسلمانوں کی جماعت کی اتباع کا لزوم، کیونکہ ان کی دعا پیچھے سے ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

مذکورہ بالا جملہ روایات اور آیاتِ قرآنی اس امر پر دال ہیں کہ اجماعِ اُمت حُجت ہے، اسکے علاوہ آثار صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور تعامل امت بھی حُجیتِ اجماع پر دلالت کرتے ہیں اور اس کو فقہ اسلامی کے ایک اہم ماخذ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اجماع کرنے والوں کے شرائط و اوصاف

چونکہ اجماع ہر ایک کا معتبر نہیں بلکہ اس کے لیے وہ لوگ درکار ہیں جو اہلِ حل و عقد ہوں مگر ان میں بھی ایسے اوصاف کا موجود ہونا ضروری ہے کہ وہ اہلِ حل و عقد کہلانے کے مستحق ٹھہرائے جاسکیں اور لوگ ان کے فیصلہ پر عمل کرسکیں اور وہ بطور سند حق بجانب ہوں اجماع کرنے والوں میں مندرجہ ذیل شرائط و اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے :۔

(۱) قرآنِ کریم میں پوری مہارت رکھتا ہو صرف ترجمہ جان لینا کافی نہیں ۔

(۲) سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر روایتاً و درایتاً پورا عبور رکھتا ہو۔

(۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی سے واقفیت اور ان کے اجماعی فیصلوں کا علم رکھتا ہو۔

(۴) قیاس و اجتہاد کے ذریعے نصوص، مسائل کے استنباط کے اصول و قواعد کا علم رکھتا ہو۔

(۵) زمانہ کے حالات، تقاضوں، قوم کی عادات و اطوار، ان کے رسم و رواج اور ان کے مزاج سے واقفیت رکھتا ہو۔

(۶) اجماع میں ایسے لوگ ہوں جو جدید رجحانات اور ان کے تقاضوں کے نشیب و فراز سے واقفیت رکھتے ہوں تاکہ وہ پیش آمدہ معاملات پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کرکے اپنی رائے دے سکیں ۔

اس لیے کہ کسی فنی مسئلہ کے لیے اس فن کے ماہرین کا ہونا ضروری ہے ۔

الاجماع المعتبر فی فنون العلم هو اجماع اهل ذلك الفن العارفین به دون من غیرهم فالمعتبر فی الاجماع فی المسائل الفقهیة قول جمیع الفقهاء وفی المسائل الاصولیة قول جمیع الاصولیین وفی المسائل النحویة قول جمیع النحویین ومن اهل ذلك الفن هو فی حکم العوام۔

فنونِ علم کے لیے ان لوگوں کا اجماع معتبر ہے جو اس فن کے ماہر ہوں، ان کے علاوہ کسی دوسرے کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے فقہی مسائل میں جمیع فقہاء کا قول معتبر ہوگا اصولی مسائل میں جمیع اصولیین کے قول کا اعتبار ہوگا نحو کے مسائل میں تمام نحویین کا قول معتبر ہوگا ان کے علاوہ لوگ عوام الناس کے درجے میں ہیں ۔

(حصول المامول من علم الاصول بحوالہ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص۱۱۸)

(۷) عملی اعتبار سے اجماع کرنے والے بلند اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہو، اوامر پر عمل کرتے اور نواہی سے بچتے ہوں، فسق و فجور، بدعات اور دیگر بری عادات سے پاک و صاف ہوں، متقی اور پرہیز گار ہوں، اس کے ساتھ ساتھ غیر محتاط نہ ہوں، البتہ خفیہ فسق مانع اجماع نہیں۔

اسی لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ:۔

ان کان معلنا بفسقه فلا یعتبر بقوله فی الاجماع وان کان غیر مظهر له یعتبر بقوله فی الاجماع۔ (التقریر والتحبیر ج ۳ ص ۔ ماخوذ از فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص ۱۱۸)

جو شخص اعلانیہ فاسق ہو اجماع میں اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں اور جو شخص ظاہرًا فاسق نہ ہو اجماع میں اس کے قول کا اعتبار ہوگا۔

اجماع کی اقسام

عموماً اجماع کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں، ۱۔ اجماعِ قولی ۲۔ اجماع عملی ۳۔ اجماع سکوتی۔

(۱) اجماع قولی: اجتہاد کے اہل حضرات کسی دینی مسئلہ پر زبانی طور سے اتفاق ظاہر کریں، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابۂ کرام نے زبانی طور پر اقرار کرکے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

(۲) اجماع عملی: اہلِ اجتہاد لوگ کسی دینی مسئلہ پر اتفاق کا اظہار زبانی طور پر تو نہ کریں مگر عملاً اپنے اتفاق کو ظاہر کرکے اس مسئلہ پر مباح، مستحب یا جائز کے درجہ میں عمل کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ اجماع کی اس قسم سے وجوب ثابت نہیں ہوتا البتہ اباحت یا استحباب کا سبب بن سکتا ہے۔ جیسے ظہر سے قبل چار رکعت سنن کے سنتِ مؤکدہ ہونے پر صحابہؓ کا عملی اجماع ہے، حضرت ابوعبیدہ السلمانیؒ فرماتے ہیں:۔

ما اجتمع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی شیء کاجتماعهم علی محافظة الاربع قبل الظهر والاسفار بالفجر وتحریم نکاح الاخت فی عدة الاخت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کسی شے پر اس طرح جمع نہیں ہوئے جس طرح ان کا اجماع ہوا ہے ظہر سے قبل کی چار رکعت سنتوں پر، فجر کو خوب روشن کرکے پڑھنے پر اور بہن کی عدت میں دوسری بہن سے نکاح کرنے پر۔

(۳) اجماع سکوتی، بعض مجتہدین ایسے ہیں کہ اگر وہ کسی مسئلہ پر اتفاق کریں اور وہ بات انتہائی شہرت پا جائے کہ اس زمانے کے ہر مجتہد کو اس کی خبر ہو جائے اور وہ خوب غور و فکر کے بعد اس پر اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے ہوئے سکوت اختیار کر جائے اور اس فیصلے کے ساتھ اختلاف نہ کرے۔

حکم | اوّل و دوم قسم کے اجماع کا حجت ہونا متفق علیہ ہے البتہ تیسری قسم کے اجماع (اجماعِ سکوتی) کی حجیت مختلف فیہ ہے، اکثر حنفیہ، حنابلہ اور بعض شافعیہ اس کو حجتِ قطعی مانتے ہیں جبکہ اکثر مالکیہ و شافعیہ حتیٰ کہ خود امام شافعی رحمہ اللہ بھی اس اجماع کو حجت نہیں مانتے۔ اور بعض فقہاء کے ہاں یہ حجتِ ظنی ہے قطعی نہیں۔

اجماعِ سکوتی کے ثبوت کے لیے شرائط | اجماعِ سکوتی کے ثبوت اور اس کو اعتبار دینے کے لیے چند شرائط ہیں:-

(۱) سکوت اختیار کرنے والوں کی طرف سے دلالۃً، اشارۃً یا صراحتہً کوئی ایسا قول مروی نہ ہو جس سے ان کی مخالفت یا موافقت کا پتہ چلتا ہو۔

(۲) مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لیے کافی وقت موجود ہو مگر اس کے باوجود انہوں نے سکوت کیا ہو۔

(۳) مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہو۔

(۴) سکوت کرنے والے مجتہدین علماء ہوں۔

(۵) وہ مجتہد اس قول / فعل کو اتنا واضح کرے کہ وہ کسی پر مخفی نہ رہے اور ہر ایک کو اس کی خبر ہو۔

ان شرائط کی موجودگی میں اجماعِ سکوتی معتبر ہے ورنہ نہیں۔

اجماع کا حکم | جب کسی مسئلہ پر علماءِ امت متفق ہو جائیں تو اس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے اس لیے کہ اب وہ مسئلہ قطعی الثبوت بن گیا ہے۔

اجماع حکمِ شرعی کو ثابت کرتا ہے، قیاس کی طرح مظہر نہیں مثبت ہے لیکن یہ اثبات وصفِ حکم کا ہوتا ہے ذاتِ حکم ثابت نہیں کرتا، اس کے لیے صرف قرآن و سنت کافی ہے بناء بر ایں وجہ بعض علماء اصول نے اجماع کو بھی قیاس کی طرح مظہرِ حکم کہا ہے۔

وضاحت | اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ

ادلہ اربعہ میں تین دلائل (قرآن، سنت اور اجماع) مثبت للحکم ہیں اور قیاس مظہر للحکم ہوا جبکہ اثبات ذات کا ہوتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ اصول اور فقہاء ذات حکم اور وصف حکم دونوں پر حکم ہی کا اطلاق کرتے ہیں، وہ ذات حکم کی طرح وصف حکم کو بھی حکم کہتے ہیں، اس لیے انہوں نے وصف حکم پر حکم کا اطلاق کر کے اجماع کو مثبت للحکم قرار دیا ہے ورنہ اجماع صرف وصف حکم کے لیے مثبت ہے ذات حکم قرآن و سنت ہی سے ثابت ہوتا ہے۔

القیاس فقہ اسلامی کا چوتھا ماخذ قیاس ہے، قیاس کا لغوی معنیٰ ہے اندازہ لگانا، برابر کرنا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے قاس النعل بالنعل کہ انہوں نے ایک جوتے کو دوسرے جوتے کے ساتھ برابر کر دیا۔ تو قیاس شرعی میں بھی فرع کو حکم میں اصل کے مماثل اور برابر کیا جاتا ہے۔

اور اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ کے ساتھ یوں کی گئی ہے:-

(۱) علامہ ابوالحسن البصری فرماتے ہیں:

تحصیل حکم الاصل فی الفرع لاشتباھما فی علۃ الحکم عند المجتھد۔ (اسلامی فقہ کے اصول ومبادی ص ۱۴۶)	اصل کا حکم فرع میں جاری کرنا اس لیے کہ مجتہد کے نزدیک دونوں میں علت حکم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

(۲) علامہ ابوبکر باقلانیؒ فرماتے ہیں:-

حمل معلوم علیٰ معلوم فی اثبات حکم لھما او نفیہ عنھما بامر جامع بینھما۔ (اسلامی فقہ کے اصول ومبادی ص ۱۴۶)	ایک معلوم امر کو دوسرے معلوم امر پر اس طور پر حمل کرنا کہ دونوں میں کسی جامع امر کی وجہ سے حکم ثابت ہو جائے یا نفی ہو جائے۔

(۳) صاحبِ "نورالانوار" ملاجیونؒ فرماتے ہیں:-

تقدیر الفرع بالاصل فی الحکم والعلۃ۔ (نورالانوار ص ۲۲۴ باب القیاس)	فرع کو اصل کے ساتھ حکم اور علت میں مساوی اور برابر کرنا۔

اس کے علاوہ بھی مختلف تعریفات کی گئی ہیں، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ جس امر (جزئیہ) کے بارے میں شریعتِ اسلامی کی نصوص (قرآن وسنت) سے کوئی حکم ثابت نہ ہو اور یہ فرع علت میں ثابت شدہ امر کے ساتھ مشابہ ہو تو اس اصل کا حکم اس فرع کو دے دینا قیاس کہلاتا ہے۔

قیاس کی ضرورت

بعض لوگ جو قیاس کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ قیاس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حالانکہ قرآن و سنت ہمارے لیے کافی ہے، ان دونوں میں سب کچھ ہے، جبکہ قیاس کا عمل سب سے پہلے شیطان نے کیا تھا اور شیطانی عمل ممنوع ہوتا ہے مشروع نہیں، لہٰذا قیاس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس سے کام لینا ممنوع ہے۔

اس کے برعکس اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے اور رہے گی۔ قرآن و سنت اگرچہ بنیادی ماخذ ہیں مگر قیاس سے ثابت شدہ مسئلہ بھی اصلاً قرآن و سُنت کے مسئلہ پر قیاس کیا جاتا ہے کوئی نیا حکم نہیں گھڑا جاتا۔ قیاس کی ضرورت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کلیات بیان کیے گئے ہیں جزئیات کم ہیں اور وہ کلیات اپنے ظاہر مفہوم سے محدود ہیں، بلکہ ہر زمانے کے حالات کے نئے تقاضے ہوتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، نئی نئی ایجادات و انکشافات اور سائنسی ترقیات سامنے آتے ہیں جو قدیم زمانے میں نہ تھے، ان کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل کرنا لازم امر ہے۔

تو ان کلیات اور اصول میں غور و فکر کر کے اس کے مفہوم کو سمجھنے اور ان کی علت سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد فرع (نئے مسائل) میں علت کی مشابہت کی وجہ سے حکم ثابت کیا جاتا ہے، بغیر اس طریقہ کار کے کوئی دوسرا طریقہ ان جدید مسائل کو حل کرنے کا نہیں ہے ورنہ ہر ایک ان مسائل میں اپنے ذہن و رجحان کا رنگ بھر دے گا اور یوں شریعتِ اسلامی کا ستیاناس ہو جائے گا۔

جہاں تک سب سے پہلے شیطان کے قیاس کرنے کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ بھی بے بنیاد ہے، اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرات ملائکہ سے تخلیقِ آدم کے بارے میں مشورہ لیا تھا، چونکہ انسان سے قبل اس کرۂ ارضی پر صرف جنّات کا وجود تھا جو فتنہ پرور اور مفسد تھے، اس بناء پر ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان پر قیاس کرتے ہوئے عدمِ تخلیق کا مشورہ دیا، تو گویا سب سے پہلے قیاس کرنے والے ملائکہ ہیں۔ بخلاف اس کے اُمت کے متقدر علماء میں کوئی (الاماشاءاللہ) ایسا نہیں جو اس نظریئے کا قائل ہو۔

تو قیاس کی ہر دور اور زمانہ میں بہت اہمیت اور ضرورت رہی ہے اور رہے گی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور جو کرتے ہیں ان کا انکار عناد اور تعصب کی وجہ سے ہے۔

قیاس کا ثبوت شرعی

قیاس کوئی ایسا عمل نہیں جس کو بے بنیاد اور خود ساختہ قرار دیا جائے قرآن و سُنت میں اس کی اساس موجود ہے، آیاتِ مبارکہ کی

کثیر تعداد اور قولی، فعلی اور تقریری روایات مبارکہ اس کی مشروعیت پر دال ہیں، اور ان سے وضاحت کے ساتھ اس کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

فَاعْتَبِرُوْا یَاُولِی الْاَبْصَارِ (سورۃ الحشر ۲)	اے آنکھوں والو! اعتبار کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل بصیرت کو اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے، اور فقہاء کرام نے اعتبار کا معنیٰ یوں کیا ہے :۔

ردّ الشئ الیٰ نظیرہ ای الحکم علی الشئ بما هو ثابت لنظیرہ۔ (توضیح وتلویح ج ۲ ص۱۱۶ باب القیاس)	کسی شئے کو اس کی نظیر کی طرف پھیرنا یعنی اس شئے پر وہ حکم لگانا جو اس کی نظیر میں ثابت ہے (اور اسی کا نام قیاس ہے)

(۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے :۔

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی (حاکموں کی) اطاعت کرو، پس اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

اس آیت میں جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں چاروں ادلہ شرعی کا ذکر ہے فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ تک کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع کا ثبوت ہے، اور فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ والے جملہ سے قیاس کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو (البتہ امراء کی اطاعت اللہ اور رسول کے موافق ہونے ہونے پر موقوف ہے) اور امراء کو حکم دیا گیا کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ الخ اگر کسی حکم میں تمہارے مابین نزاع پیدا ہو جائے جس کے بارے میں قرآن وسنت کا صریح حکم نہ ہو تو ایسے امر میں حکم ثابت کرنے کے لیے اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو، اس رجوع کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح حکم پر قیاس کر کے اس غیر منصوص امر میں حکم کو ثابت کرو۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۔

(سورۃ النساء آیت ۱۰۵)

بیشک ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے مابین اللہ تعالیٰ کے دکھائے ہوئے راستے کے مطابق فیصلہ کریں۔

قیاس کی مشروعیت کے لیے علامہ ابن رشد قرطبیؒ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بِمَا أَرَاكَ اللهُ سے مراد استنباط اور قیاس سے حاصل ہونے والے نتائج ہیں۔

(بحوالہ اسلامی فقہ کے اصول و مبادی ص ۱۵)

قیاس کی حجیت کا احادیث سے ثبوت

قیاس کی حجیت کے لیے احادیث مبارکہ میں بھی کافی ذخیرہ موجود ہے جو اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے کافی ہے اس ذخیرہ میں احادیثِ قولیہ، فعلیہ اور تقریریہ تینوں پائی جاتی ہیں۔

(۱) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بہت زیادہ مشہور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کا والی مقرر کیا تو الوداع کہتے وقت آپؐ سے پوچھا:-

بما تقضى يا معاذ؟ قال بكتاب الله قال فان لم تجد فی كتاب الله؟ قال فبسنة رسوله، قال فلم تجد فيهما؟ قال اجتهد برائی، فقال الحمد لله الذى وفق رسول رسوله بما يحب ويرضى۔

(ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۹ باب اجتهاد الرأس فی القضاء)

اے معاذؓ! جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ اور مقدمہ پیش ہو تو کس چیز کے ساتھ فیصلہ کرو گے؟ تو آپ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ، اس پر آپؐ نے فرمایا اگر تم اس معاملہ کا حل کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ آپؓ نے عرض کیا اللہ کے رسولؐ کی سنت کے ساتھ، آپؐ نے فرمایا اگر ان دونوں میں اس معاملہ کا حل نہ پاؤ تو؟ آپؓ نے عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اس پر آپؐ نے فرمایا سب تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے اپنے رسولؐ کے رسول کو اس بات کی توفیق دی کہ جس سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح ابن ماجہ میں بھی ایک روایت یوں مذکور ہے :۔

اذا حَکَمَ الحاکم فاجتھد فاصاب فلہٗ اجران فان اخطاء فلہ اجر واحدٌ۔

(ابن ماجہ ص۱۶۷ ابواب الاحکام)

جب کوئی حاکم کسی معاملہ میں حکم کے لیے اجتہاد کرے اور اس اجتہاد میں وہ مصیب ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر وہ مخطی ہو جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفسِ نفیس کئی مسائل کو دوسرے منصوص مسائل پر قیاس کر کے ان غیر منصوص مسائل کا حل فرمایا۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ بہت کمزور ہے، اس میں نہ تو سواری پر بیٹھنے کی طاقت ہے اور نہ وہ حج کے لیے سفر کرنے کے قابل ہے، تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

کان علی امک دین اکنت قاضیہ قالت نعم قال فدین اللہ احق ان تقضیہ۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص)

اگر تمہاری ماں پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتی؟ اس نے عرض کیا ہاں ضرور ادا کرتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس کے دَین (قرض) کو ادا کرو۔

اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی ادائیگی کو عام قرض پر قیاس کر کے جواب دیا جس سے معلوم ہوا کہ قیاس حجتِ شرعی ہے۔

صحابۂ کرام رض سے قیاس کا ثبوت

علماءِ امت نے لکھا ہے کہ قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر صحابۂ کرام رض کا اجماع ہے، چنانچہ صاحبِ کشف الاسرار علامہ فرماتے ہیں :۔

ان مدرك الاحتجاج بالقیاس اجماع الصحابة فقد علمنا من تتبع احوالھم فی مجری اجتھادھم انھم کانوا یقیسون الفرع

بیشک قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر صحابۂ کرام رض کا اجماع ہے، صحابۂ کرام رض کے اجتہادات میں تتبع کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرع کو اصل پر قیاس کرتے

علی الاصل (کشف الاسرار ص) | تھے۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب کلالہ کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا:۔

اقول فیھا برائی فان یکن صوابًا فمن اللہ وان یکن خطاءً فمنی ومن الشیطان۔ (منہاج الاصول۔ الکتاب الرابع القیاس)

میں اس مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے سے کہتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر خطاء ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دادا کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

اقضی فیہ برائی۔ (منہاج الاصول، الکتاب الرابع القیاس)

میں اس معاملہ کے بارے میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔

(۳) جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس اس عورت کا معاملہ پیش آیا جس کو طلاق کا اختیار دیا گیا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں اس بارے میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں اگر صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر درست نہ ہو تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں"۔

(۴) خود حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا والی مقرر کرتے وقت ایک شاہی فرمان میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی تحریر فرمایا تھا:۔

اعرف الاشباہ والنظائر وقس الامور برأیک۔ (منہاج الاصول، الکتاب الرابع القیاس)

آنے والے مسائل کے نظائر اور اشباہ کی معرفت حاصل کرو اور ان میں اپنی رائے سے قیاس کرکے فیصلہ کرو۔

مندرجہ بالا آیات، احادیث اور اعمال و اقوالِ صحابہؓ قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر دال ہیں، اور اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ قیاس حجتِ شرعی ہے اور اس سے احکام مستنبط ہوسکتے ہیں۔

قیاس کے ارکان

قیاس کے چار ارکان ہیں:۔

(۱) اصل (۲) حکم (۳) فرع (۴) علتِ مشترکہ

(۱) **اصل**، وہ مسئلہ ہے جس میں حکم منصوص ہو اور نئے مسائل میں حکم کے اثبات کے لیے اس کی طرف احتیاج پایا جاتا ہو۔

(۲) **حکم**: وہ امر جو دلیل کی وجہ سے کسی معاملہ کے لیے ثابت کیا جاتا ہو جیسے حرمت، حلت، کراہت وغیرہ۔

(۳) **فرع**: وہ نیا مسئلہ جس میں حکم منصوص نہ ہو بلکہ اس میں حکم کے اثبات کے لیے اصل کا احتیاج پایا جاتا ہو۔

(۴) **علّتِ مشترکہ**، وہ مشترک وصف جو اصل اور فرع میں پایا جاتا ہو اور اصل میں حکم کے لیے شارع علیہ السلام نے مؤثر قرار دیا ہو۔

قیاس کا اصل مدار

قیاس کے لیے تین چیزوں کا ہونا نہایت ضروری ہے:۔ (۱) اصل جسے مقیس علیہ کہا جاتا ہے (۲) فرع، وہ نیا مسئلہ جس کا حل مطلوب ہو جسے مقیس کہتے ہیں (۳) علّت، وہ شئے مشترکہ جو دونوں کے مابین پایا جاتا ہو جس کی وجہ سے فرع میں اصل کا حکم جاری کیا جاتا ہو، گویا قیاس کے اندر سارا دارو مدار علّت ہی پر ہوتا ہے۔

علّت کے ماخذ

کسی اصل میں حکم کے لیے علّت کی پہچان یا تو قرآن کریم سے ہوگی کہ قرآن نے اس کو علت ٹھہرانے کے لیے تصریح یا اشارہ کیا ہو یا سنت نے اس کا بالفاظِ صریح یا بالفاظِ کنایہ علت کا ذکر کیا ہو، اگر ان دونوں میں اس کا کوئی پتہ نہ ہو تو علّت کا تعین اجماعِ امت سے ہوگا اور اگر اس سے بھی معلومات نہ ہوں تو پھر مجتہد اس حکم کی علّت معلوم کرنے کے لیے غور و فکر کرے گا تاکہ اجتہاد اور استنباط سے علّتِ حکم کا پتہ لگایا جاسکے۔ گویا کہ یہ چار طریقے علّت کے ماخذ شمار کیے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے ہی مقیس علیہ میں علّتِ حکم تلاش کیا جائے گا۔

الاستحسان

قیاس کی دو قسمیں ہیں (۱) قیاسِ جلی (۲) قیاسِ خفی
قیاسِ خفی کا دوسرا نام استحسان کہلاتا ہے۔

استحسان کی تعریف

استحسان حسن سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو اچھا بنانا' اور اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ سے کی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ ابوالحسن الکرخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(۱) الاستحسان هو ان یعدل المجتهد عن ان یحکم المسئلۃ بمثل ما حکم بہ فی نظائرھا لوجہ اقوی یقتضی العدول عن الاول۔
(الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید، للشیخ زرقاء ص ۹۰۹)

استحسان یہ ہے کہ مجتہد کا کسی مسئلہ پر اس کے نظائر والے حکم سے قوی دلیل کی بناء پر عدول کرنا جو دلیل حکم اوّل سے انحراف کا مقتضی ہو۔

(۲) قطع المسئلۃ عن نظائرھا بما ھو اقوی۔ (فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص ۱۷۲)

کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ کی بناء پر اس کے نظائر سے الگ کرنا۔

(۳) العدول عن قیاس الی قیاس اقوی العدول فی مسئلۃ من مثل حکم بہ فی نظائرھا الی خلافہ بوجہ ھو اقوی۔ (منہاج الاصول، الاستحسان)

ایک قیاس چھوڑ کر اس سے زیادہ قوی قیاس اختیار کرنا مسئلہ کے نظائر میں جو حکم موجود ہے کسی قوی وجہ کی بناء پر اس کو چھوڑ کر اس کے خلاف حکم لگانا۔

استحسان اور فقہاء اسلام

احناف، مالکیہ اور حنابلہ اس کو دلیلِ شرعی کے طور پر مانتے ہیں، جبکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

”کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ استحسان کا قول اختیار کرے، استحسان درحقیقت لذت حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔“

(الرسالۃ ص ۲۹۴، ۲۹۵ باب استحسان کا بیان)

اور منہاج الاصول میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ :۔

من استحسن فقد شرع ای وضع شرعاً جیداً۔ (منہاج الاصول۔ الاستحسان ص ۔۔)

جس نے استحسان سے کام لیا اس نے نئی شریعت بنائی۔

مگر دوسری طرف محققین شوافع فرماتے ہیں کہ :۔

ان الحق ما قالہ ابن الحاجب واشار الیہ الآمدی انہ لا یتحقق استحسان مختلف فیہ۔ (منہاج الاصول بحوالہ فقہ اسلامی کا پس منظر ص ۱۹۱)

حق بات وہ ہے جو ابن حاجب نے کہی ہے اور آمدی نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ مختلف فیہ استحسان کا وجود نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ استحسان کی حجیت اور قابلِ اعتماد ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں بلکہ

ائمہ اربعہ کی متفقہ دلیل شرعی ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ اور استحسان

امام شافعیؒ کے مشہور قول کی طرح امام شاہ ولی اللہؒ نے بھی استحسان کی مخالفت کی ہے بلکہ اس کو دین میں تخریب کاری قرار دیا ہے، چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:۔

ومن اسباب التحریف الاستحسان۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۳۵)	تحریف کے اسباب میں سے استحسان ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ ان حضرات کا استحسان سے مطلق استحسان مراد نہ ہو بلکہ وہ استحسان مراد ہو جس میں شرعی اصول وضوابط کی کوئی رعایت نہ رکھی جائے اور اپنے نفس کی خواہش کے سہارے کوئی مسئلہ مستنبط کیا جائے۔ جو تحریف فی الدین کے مترادف ہے۔

بہر حال اسلامی احکامات میں استحسان کے ذریعہ مستنبط احکام کا کافی سارا ذخیرہ کتب فقہ میں موجود ہے اور فقہاء امت نے اس کو بطور دلیل شرعی استعمال کیا ہے اور اسی کے ذریعے بے شمار مسائل مستنبط کئے ہیں۔

استحسان کی مشروعیت

استحسان کوئی نیا عمل نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ قدیم بین الاقوامی قوانین میں بھی ایسی دفعات ہوتی تھیں جن سے استحسان کا مفہوم واضح ہوتا ہے، یونانیوں کے قوانین میں اسے پاکیا (EPIEKEIA) کے نام سے اور رومیوں کے قوانین میں ایکوٹی (AEQUITA) کے نام سے اصول موجود ہیں جس سے استحسان مفہوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے بھی اس اصل کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ۔ (سورۃ الزمر ع ۔۔۔)	آپؐ میرے ان بندوں کو خوشخبری دیں جو بات کو سنتے ہیں اور احسن کی اتباع کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ اس بارے میں ارشاد ہے:۔

وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا۔ (سورۃ الاعراف آیت ۔۔۔)	آپ اپنی قوم کو حکم دیں تاکہ وہ احسن کام کو اختیار کرے۔

استحسان کے اندر بھی احسن کی اتباع اور اس کو اختیار کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس میں یُسر یعنی آسانی ہے جس کا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ارادہ کرتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (سورۃ البقرہ آیت ع ۲)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی یُسر کو اچھا اور بہتر دین قرار دیتا ہے۔

خیر دینکم الیسر۔ (الاشباہ والنظائر)

کہ تمہارا اچھا دین آسان ہے۔

لہٰذا دین میں آسانی اور یُسر کے بارے میں جتنی بھی روایات، آثار صحابہ وتابعین مروی ہیں اُن سے استحسان کی مشروعیت اور ثبوت ملتا ہے۔

عرف وعادت

عرف اور رسم ورواج قدیم زمانہ سے قانون کے لیے ایک ماخذ چلا آرہا ہے، رومی قوانین میں بھی اس کو قانون سازی کے لیے بطور اصل استعمال کیا ہے، اسلام نے بھی بعض فروعی احکامات میں عرف وعادت کو ماخذ کا مقام دیا ہے، علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:۔

والعرف فی الشرع لہٗ اعتبار لذا علیہ الحکم قد یدار

عرف کا شرع میں اعتبار ہے اور اس لیے اس پر کبھی کبھی حکم کا دارو مدار ہوتا ہے۔

(رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۴۳ الرسالۃ الاولیٰ)

حتیٰ کہ عادت وعرف کی تبدیلی وتغیّر سے بعض احکام شرع میں بھی تغیّر وتبدل واقع ہوا ہے جس کی مثالیں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں، علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

واعلم ان اعتبار العادۃ والعرف رجع الیہ فی مسائل کثیرۃ حتی جعلوا ذلک اصلاً فقالوا فی الاصول فی باب ما تترک بہ الحقیقۃ تترک الحقیقۃ بدلالۃ الاستعمال والعادۃ ...... الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی وفی المبسوط الثابت بالعرف کالثابت بالنص۔

{رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۱۱۵}

جان لو کہ بیشک عادت اور عرف کو اعتبار دے کر کافی سارے مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے حتیٰ کہ انہوں نے اس کو اصل بنا دیا ہے اور انہوں نے اصول میں لکھا ہے کہ عادت اور عرف کی بناء پر حقیقت کو چھوڑ دیا جائے گا...... عرف کے ساتھ ثابت شدہ مسئلہ دلیلِ شرعی کے ساتھ ثابت شدہ مسئلہ کی طرح ہے اور مبسوط میں ہے کہ عرف کے ساتھ ثابت شدہ مسئلہ نص کے ساتھ ثابت شدہ مسئلہ کی طرح ہے۔

اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں عرف کو تشریعی امور کا مادہ (اصل) قرار دیا ہے، آپؒ فرماتے ہیں:۔

هی مادة تشريعية (حجة الله البالغة ج ۱ ص۱۳۶)	کہ وہ تشریعی مادہ ہے۔

ایک اور مقام پر آپؒ لکھتے ہیں کہ:۔

نهى عن الرسوم الفاسدة وامر بالصالحة۔ (حجة الله البالغة ج ۱ ص۱۶۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فاسد رسوم سے منع کیا اور صحیح اور درست رسوم کی اجازت دی۔

عرف کی تعریف

فقہاء کرام نے عرف کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں، طوالت کے پیشِ نظر یہاں چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

العادة عبارة عما يستقر في النفوس من الامور المتكررة المقبولة عند الطباع السليمة۔ (رسائل ابن عابدین ج ۲ ص۱۱۵)	عادت اس مکرر امر سے عبارت ہے جو نفوس میں استقرار پکڑے اور طبائع سلیمہ اس کو قبول کریں۔

(۲) امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:۔

"عرف و عادت یہ ہے کہ کوئی فعل یا طریقہ عقلی طور پر لوگوں کے نفوس میں اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ فطرتِ سلیمہ اسے قبول کرے اور اسلامی دنیا کے سلیم الطبع لوگ اس کے عادی ہو جائیں بشرطیکہ وہ نصِ شرعی کے خلاف نہ ہو۔"

(اسلامی فقہ کے اصول و مبادی ص۱۸۳)

(۳) امام ابو زہرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

العرف ما اعتاده الناس من معاملات واستقامت عليه امورهم۔ (اسلامی فقہ کے اصول و مبادی ص۱۸۴)	عرف وہ ہے کہ لوگ اپنے معاملات میں اس کے عادی ہو چکے ہوں اور اپنے امور کو اس پر قائم کر چکے ہوں۔

مقبول عرف کیلئے شرائط

مگر عرف و عادت مطلقاً مقبول نہیں۔ جو عرف عند الشرع مقبول ہو اور اس کو مادہ (اصل) کی حیثیت حاصل ہو، فقہاء کرام نے اس کے لیے چند شرائط ذکر کی ہیں:۔

(۱) وہ عرف منصوص حکم کے معارض نہ ہو۔
(۲) معاشرے میں اس کو ایسا مقام حاصل ہو کہ اس کا کرنا امر ضروری ہو۔
(۳) وہ عرف معاشرے میں عام اور غالب ہو۔
(۴) اس حکم کے وقت وہ عرف موجود ہو۔
(۵) متعاقدین اس عرف کے خلاف کو معاہدہ یا شرط نہ لگائیں۔

(فقہ اسلامی کے اصول ومبادی ص ۱۹۱)

الاستصحاب فقہی ذخائر کے استنباطات میں استصحاب بھی بطور ماخذ استعمال ہوتا ہے لیکن یہ کوئی مستقل ماخذ نہیں ہے اس لیے اکثر حضرات نے ماخذِ فقہ میں اس کا کم ذکر کیا ہے، یہ اس وقت کارآمد ہوتا ہے جہاں کوئی اور ماخذ موجود نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماقبل میں جو چیز ثابت ہو یا ثابت نہ ہو اس کو اب بھی اپنے حال پر رکھا جائے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہ کیا جائے تا وقتیکہ کوئی دلیل تغیر قائم نہ ہو اس لیے کہ اس کے بارے میں ظنِ غالب یہ ہے کہ یہ صورت ثبوت یا عدم میں بدستور باقی ہے۔

تعریف اصطلاحی اس لیے اصولیین نے اس کی تعریف یوں کی ہے:۔

ماثبت فی الزمن الماضی فالاصل بقاءہ فی الزمن المستقبل مالم یوجد مایغیرہ ھول المامول من علم الاصول۔ (اسلامی فقہ کے اصول ومبادی ص ۲۱۸)	کہ جو چیز زمانہ ماضی میں ثابت ہو تو اصل یہ ہے کہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک باقی رکھا جائے جب تک کوئی دلیل مغیر نہ آجائے۔

اور دوسری تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے:۔

الحکم ببقاء امر متحقق لم یظن عدمہ [الاشباہ والنظائر ج۱ ص۲۲۳ القاعدۃ الثالثۃ]	کسی متحقق امر کے حکم کو اس وقت تک باقی رکھنا جب تک کہ اس کے عدم پر کوئی ظن غالب پیدا نہ ہو۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اس کی توضیح یوں کرتے ہیں کہ:۔

"ثابت شدہ امر کو ثابت شدہ ہی رہنے دے اور غیر ثابت شدہ کو غیر ثابت شدہ کو اس وقت تک کہ کوئی متغیر دلیل سامنے نہ آجائے، اسی کو استصحاب کہا جاتا ہے۔"
اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پر کسی کا دس ہزار روپے قرض ہے اور اس قرض پر گواہ

بھی ہیں اور دونوں کے مابین تحریری ثبوت بھی ہے تو یہ قرضہ اس کے ذمہ دس سال بعد بھی بحق رہے گا جب تک اس کی ادائیگی پر کوئی دلیلِ شرعی نہ لائی جائے"۔

استصحاب کی اقسام

فقہ کے اس ماخذ کی چار اقسام بیان کی جاتی ہیں :-

(۱) استصحاب براءۃ الاصلیہ : یعنی انسان تکالیف سے اس وقت تک بری الذمہ ہے جب تک اس کے مکلف ہونے پر کوئی دلیل پیش نہ کی جائے۔ مثلاً کوئی کسی پر قرضہ کا دعویٰ کرے اور دوسرا شخص اس کا منکر ہو تو جب تک مدعی کوئی دلیل پیش نہ کرے اس وقت تک منکر بری الذمہ ہے

(۲) استصحاب شرعی یا عقلی : یعنی شرع یا عقل کسی امر کے بارے میں ثبوت یا عدم ثبوت کے برقرار رہنے کا حکم کر دے تو وہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کوئی دوسری دلیل اس حکم کو تبدیل نہ کر دے۔

مثلاً کسی شخص کو وراثت میں کچھ زمین ملی ہے تو وہ اس وقت تک اس کا مالک متصور ہوگا جب تک زوالِ ملک کا کوئی ثبوت قائم نہ ہو۔

(۳) استصحاب حکم اصلی : کسی امر شرعی کے بارے میں جائز یا ناجائز ہونے پر کوئی دلیلِ شرعی کے موجود ہونے کی صورت میں وہ حکم اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کوئی دوسری تبدیل کرنے والی دلیل موجود نہ ہو۔

مثلاً جمیع مافی الارض میں مفید اور کار آمد اشیاء حلال ہیں اور دنیا کی جمیع عورتیں حرام ہیں مگر وہ اشیاء اور عورتیں جن کی حلال اور حرام ہونے پر دلیل موجود ہو۔

(۴) استصحاب وصفی : یعنی جس امر کے ساتھ کوئی صفت زمانہ ماضی میں لگ چکی ہو تو وہی صفت مستقبل میں بھی اسی طرح ہوگی۔

استصحابِ وصف میں اختلاف

پہلی تین اقسام میں اگرچہ فقہاء کا جزئی اختلاف موجود ہے مگر اصولی طور پر سب متفق ہیں۔ البتہ استصحابِ وصف میں اختلاف زیادہ ہے۔

مالکیہ اور احناف کے ہاں استصحاب وصف تو کسی امر کے دفع کرنے میں مفید ہے مگر کوئی امر ثابت نہیں کر سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ جو حقوق اور ذمہ داریاں اول سے ثابت شدہ ہوں وہ ختم نہیں ہوتیں اور نئی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں۔

مثلاً ایک شخص مفقود الخبر ہے تو اس کی بیوی اس وقت تک اس کی منکوحہ رہے گی جب تک اس کے فوت ہونے پر کوئی دلیل قائم نہ ہو یا عدالت حالات اور شواہد کی روشنی میں اسکے مرنے کے نتیجہ پر نہ پہنچی ہو، البتہ اگر کسی نے اس کے لیے وصیت کی یا اس کا مورث وفات پا گیا تو اس کو میراث میں حصہ نہیں ملے گا اور نہ وصیت کا حقدار ہوگا اس لیے کہ یہ نئی ذمہ داری ہے جو اس پر عائد نہیں ہوتی۔

مگر شوافع اور حنابلہ اس قسم کو بھی دفع اور ثبوت دونوں میں مؤثر قرار دیتے ہیں اس لیے ان کے ہاں مفقود الخبر اپنی املاک کا بھی مالک ہوگا اور وراثت اور وصیت کا بھی مالک ہوگا۔

مصالح مرسلہ

فقہ اسلامی میں مصالح مرسلہ کو بھی بطور ماخذ ذکر کیا جاتا ہے جس کو استصلاح بھی کہا جاتا ہے جس میں صرف ضرورت اور مصلحت کو بنیاد بنا کر مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔

(۱) **تعریف**: علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں اس کی تعریف یوں ذکر کی ہے:-

المصالح المرسلہ وھی التی لم یشھد لھا اصل بالاعتبار فی الشرع ولا بالالغاء وان کانت علیٰ سنن المصالح وتلقتھا العقول بالقبول۔ (الموافقات ج ۱ ص ۳۹ فصل)

مصالح مرسلہ وہ ہیں جن کے اعتبار کیلئے شرعاً نہ اصل اس کے لیے شہادت دے اور ان کو لغو قرار دے بلکہ وہ مصالح کے طریقوں پر ہوں اور عقل ان کو قبول بھی کرے۔

(۲) دوسری تعریف یہ بیان کی گئی ہے:-

المصالح المرسلہ وھی التی لم یشھد لھا اصل شرعی من نص او اجماع لا بالاعتبار ولا بالالغاء۔ (منھاج الاصول)

مصالح مرسلہ وہ ہے کہ اصل شرعی چاہے وہ نص (قرآن وسنت) ہو یا اجماع، نہ انکے اعتبار کی گواہی دے اور نہ ان کو لغو کرنے کی۔

مصالح مرسلہ کی شرائط

مصالح مرسلہ فقہ اسلامی کا ماخذ تب بن سکتے ہیں جب اس میں مندرجہ ذیل شرائط موجود ہوں:-

(۱) مصالح اُن مصالح کے مشابہ ہوں جن کا شارع علیہ السلام نے اعتبار کیا ہے۔

(۲) ان مصالح کا حصول یقینی ہو۔
(۳) ان مصالح میں جو عموم پایا جاتا ہو وہ قوم و ملک کے فائدہ کے لیے ہو کسی خاص شخص یا جماعت کے لیے نہ ہو۔ (الموافقات ج۲ ص۳۷۳ القسم الثانی۔ المسئلة الثامنة)

امام مالکؒ اور مصالح مرسلہ

ائمہ مجتہدین میں سے امام مالکؒ نے مسائل کے استنباط کے لیے مصالح مرسلہ سے بہ نسبت دوسرے ائمہ کرامؒ کے زیادہ کام لیا ہے، اس لیے یہ اصل (ماخذ) انہی کی طرف منسوب ہے اگرچہ دوسرے ائمہ مجتہدین نے بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا ہے۔ اس بات سے امام غزالیؒ کا استحسان اور استصلاح کو موہوم دلائل میں شمار کرنا بھی بے جا و بے محل رہ جاتا ہے اس لیے کہ دوسرے ائمہ مجتہدین نے بھی مصالح مرسلہ سے کسی نہ کسی عنوان کے تحت ضرورت کی خاطر کام لیا ہے۔

ان ماخذ کے علاوہ دوسرے ماخذ مثلاً شرائع من قبلنا، تعامل، اقوالِ صحابہؓ، ملکی قانون، ذرائع، تعامل اہل مدینہ وغیرہ بھی ہیں۔

فقہاء اسلام نے فقہ کی تدوین کے لیے ان کو بنیاد بنایا ہے مگر غور و خوض کرنے کے بعد یہ تمام کے تمام ماخذ ان چار بنیادی اصول کے تحت داخل ہو جاتے ہیں اور پھر مزید غور و خوض کرنے کے بعد وہ چاروں اصول بھی صرف دو یعنی قرآن و سنت کے تحت داخل ہو جاتے ہیں۔

ہم نے یہاں اس مقدمہ میں ان کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، تفصیل کے لیے دوسرے مطولات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، علماء امت نے اِن پر مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔

ذخیرۂ فقہ کی تقسیم

ان ماخذ سے اب تک جتنے مسائل مستنبط ہوئے ہیں اور کتب فقہ میں درج ہیں، تو فقہ اسلامی کا یہ ذخیرہ کتب تین اقسام پر مشتمل ہے، اصول ۲۔ شروع ۳۔ فتاوٰی۔

فتاوٰی اُن حوادث اور واقعات کے حل کا مجموعہ ہے جو مختلف حالات اور ازمنہ میں علماء امت کے سامنے بصورت سوال پیش ہوئے اور انہوں نے ان ماخذ کے تحت حل تلاش کر کے امت کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس حل کو فتوٰی، مجموعہ کو فتاوٰی، حل کرنے والے کو مفتی اور حل طلب کرنے والے کو مستفتی کہا جاتا ہے جبکہ یہ عمل افتاء کے نام سے بھی موسوم ہے۔

چونکہ فتاوٰی حقانیہ بھی انہی ماخذ کے قبیل سے ہے اس لیے اب ہم فتوٰی اور افتاء کی تعریف لغوی و اصطلاحی اور آداب وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔

فتوٰی کا لغوی معنٰی

لغت میں فتوٰی دو طرح پڑھا جاتا ہے (۱) بفتح الفاء الفَتوٰی (۲) بضم الفاء الفُتوٰی ۔ لیکن قول اول زیادہ صحیح ہے ۔ مصباح المنیر ص۴۶۲ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فاء کا ضمہ صحیح نہیں ہے اصل میں فاء کا فتحہ ہے ۔ صاحب قاموس نے دونوں کو جائز لکھا ہے، جبکہ دیگر محققین نے لکھا ہے کہ: ان الفتیا بالیاء لایکون الا مضمومۃ وان الفتوٰی بالواو لاتکون الا مفتوحۃ ۔ (المصباح ج۱ ص۱۵۰) "یعنی فتوٰی کا استعمال جب یاء سے ہو تو مضموم الفاء ہوگا اور جب واؤ سے ہو تو مفتوح الفاء ہوگا"۔

عربی زبان میں فتوٰی کے بجائے فتیا زیادہ استعمال ہوتا ہے مگر معنٰی اور مقصد دونوں کا ایک ہی ہے ۔ جیسا کہ ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے : الفتوٰی والفتیا اسمان یوضعان من موضع الافتاء الا ان لفظۃ الفتیا اکثر استعمالا فی کلام العرب من لفظۃ الفتوٰی الخ (لسان العرب ج۵ ص۲۷) لیکن استعمال دونوں کا درست ہے ۔

فتوٰی کا جمع اَلْفَتَاوِیُ اور اَلْفَتَاوٰی آتا ہے ۔ (مصباح اللغات ص۶۱۸) اگرچہ صاحب مصباح المنیر نے بکسر الواؤ الفتاوِی کو اصل قرار دیا ہے اور بفتح الواؤ الفتاوٰی صرف تخفیف کے لیے جائز کہا ہے لیکن آجکل عموماً بفتح الواؤ پڑھا جاتا ہے ۔

مادۂ اشتقاق | فتوٰی کے اشتقاق میں اختلاف ہے ، بعض کے نزدیک فتوٰی اَلْفُتُوَّۃ سے ماخوذ ہے جس کا معنٰی ہے کرم، سخاوت، مروت اور زور آوری ۔ فتوٰی کو بھی فتوٰی اس لیے کہا جاتا ہے کہ مفتی اپنی سخاوت، مروت اور عالمانہ قوت سے کام لے کر کسی دینی مسئلہ کو حل کرتا ہے ۔ جبکہ بعض کے نزدیک فتوٰی دراصل الفتی سے ماخوذ ہے جس کا معنٰی ہے الشابت القوی، ایک مفتی مسائل کو چونکہ اپنے دلائل سے قوت اور ثبوت مہیا کرتا ہے اس لیے فتوٰی گویا مدلل ثبوت والا جواب ہے ۔

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں : الفتوٰی مشتقۃ من الفتی وھو الشاب القوی وسمیت بہ لان المفتی یقوی السائل بجواب حادثۃ ۔ (مقدمہ رد المحتار ج۱ ص۴۲) اسی سے افتاء ہے ۔

الافتاء | افتاء لغت میں ھو الجواب لای سوال کان سواء کان متعلقا بالاحکام

الشرعیۃ او بغیرھا من المعاملات الاخری الدنیویۃ المحضۃ (المصباح ج ۱ ص۱۵)
یعنی فتوٰی سوال کا جواب دینے کو کہا جاتا ہے، سوال چاہے احکام شرعیہ کے متعلق ہو یا کسی دنیاوی امور کے بارے میں ہو۔۔۔ جیسے قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ۔ (سورۃ یوسف ۴۶/۱۲) اور عزیز مصر کا اپنے وزراء سے یوں کہنا: یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ (سورۃ یوسف ۴۳) ان دونوں آیات میں دنیاوی امور کے بارے میں سوال لفظِ فتوٰی سے کیا گیا ہے۔

امام رازیؒ افتاء کے آٹھ معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: معنی الافتاء اظہار المشکل"۔ مگر امام رازیؒ کے ہاں فتوٰی اور فتیا دونوں افتاء کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ بنابریں مفتی کو مفتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ کانہ یقوی بیانہ ما اشکل ویصیر قویا فتیا۔ (البشرٰی لاصول افتاء ص۷ من تفسیر کبیر سورۃ النساء)

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں: الفتیا والفتوی، الجواب، عما اشکل من الاحکام۔ (مفردات ص۳۷۳ کتاب الفاء)

تو گویا کہ فتوٰی اس شرعی مسئلہ کے حل کو کہا جاتا ہے اور مفتی حل کرنے والا ہوتا ہے، جبکہ مستفتی وہ سائل ہے جو اپنی مشکل کو حل کرنے کے لیے مفتی سے سوال کرتا ہے۔

افتاء کی اصطلاحی تعریف

محققین علماء نے افتاء کی اصطلاحی تعریف یوں کی ہے: ھو الاخبار بحکم اللہ تعالیٰ من مسئلۃ دینیۃ بمقتضی الادلۃ الشرعیۃ عن سائل عنہ فی امر نازل علیٰ جھۃ العموم والشمول لا علیٰ وجہ الالزام۔ (المصباح شرح اصول افتاء ج ۱ ص۱۶)

بعض نے یوں تعریف کی ہے: ھو بیان حکم اللہ تعالیٰ بمقتضی الادلۃ الشرعیۃ علیٰ جھۃ العموم والشمول۔ (الاساس الشرعی والقانونی ص۱۲۸)

علامہ قرآفیؒ لکھتے ہیں: اخبار حکم اللہ تعالیٰ فی الالزام والاباحۃ۔
(الفروق ج۴ ص۵۳)

مگر ان سب تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بتا دینا"۔

لطائف افتاء

علامہ عبدالنبی احمد نگریؒ نے دستور العلماء میں فتوٰی کے سلسلے میں سات اہم نکات بیان کئے ہیں جو ایک مفتی کو اپنے پیش نظر

رکھنے چاہئیں۔

(۱) افتاء جو دراصل فَتِیَ سے ماخوذ ہے، باعتبار ثلاثی مجرد کے افعالِ غیر متصرّف میں سے ہے، اس میں اشارہ یہ ہے کہ ایک مفتی بنیادی اصول اور نصوص میں کسی قسم کا تصرّف نہیں کر سکتا البتہ فروعات میں تصرّف کر سکتا ہے۔

(۲) افتاء ایک متعدی فعل ہے اس لیے مفتی کا علم بھی متعدی ہونا چاہیئے۔

(۳) افتاء بابِ افعال سے ہے جو ثلاثی مزید فیہ کے ابواب میں پہلا باب ہے اس لیے اس میں عبرت یہ ہے کہ جو شخص درجہ افتاء کو پہنچ گیا اس کے سامنے کامیابی کے اور مزید ابواب بھی کھلیں گے۔

(۴) مفتی کے لیے مناسب ہے کہ وہ صاحبِ فتوت ہو کیونکہ فتویٰ اور فتوۃ کے درمیان اخوت ہے، اس لیے مفتی نہ تو فتویٰ پوچھنے والے سے کسی قسم کا طمع یا لالچ کرے اور نہ فتویٰ کی کثرت سے کسی قسم کے ملال یا بیزاری کا اظہار کرے۔

(۵) افتاء کے اول و آخر میں الف ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ مفتی کو ابتداء سے انتہاً تک امورِ دین کے بارے میں استقامت و صداقت کا پیکر ہونا چاہیئے۔

(۶) افتاء کی باعتبارِ ابجد عددی قیمت ۴۸۲ ہے جس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مفتی کے پاس اصول و فروع کی کتابوں کی تعداد اس سے کم نہ ہو، چنانچہ کتب ظاہر الروایہ کے تفحص و مطالعہ کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کتبِ افتاء کی تعداد بھی اس عددی قیمت کے برابر ہے۔

(۷) افتاء میں پانچ حروف اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مفتی ظاہر الروایہ کی پانچ کتب پر نظر رکھنے کے علاوہ اسلام کے ارکانِ خمسہ کا بھی پورا پورا خیال رکھے۔

(دائرۃ المعارف اردو جلد ۱۵ ص۱۴۰)

فتاویٰ دورِ نبویؐ میں

فتویٰ اور افتاء کوئی نیا عمل نہیں بلکہ اس کا تاریخی دور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے زمانے میں مسائل کا حل براہ راست آپؐ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ تھا، جب کبھی صحابہؓ کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر اس کا حل طلب کرتے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی یا کبھی ذاتی اجتہاد سے صحابہ کو اس مسئلہ کا حل بتا دیتے۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

بنفسِ نفیس تعلیمِ قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ قانون سازی، فتاوٰی اور قضاء وغیرہ کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے اس لیے آپؐ کے زمانہ اقدس میں فقہ کی نہ تو باقاعدہ ترتیب تھی اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ کے فیصلے، فتاوٰی عموماً ایک دستور اور اصولی رنگ میں تھے اس لیے بعض صحابہ ان کو محفوظ کر چکے تھے جس کی لاتعداد مثالیں کتبِ حدیث میں موجود ہیں، مثلاً:-

(۱) آپؐ نے سود اور ربٰو کے تعین اور جاننے کے لیے اور متفق الاجناس اشیاء کی باہمی بیع کے لیے اشیاءِ ستہ کے بارے میں فرمایا: الحنطة بالحنطة، والشعیر بالشعیر والذهب بالذهب والفضة بالفضة والملح بالملح والتمر بالتمر مثلاً بمثل یداً بید والفضل ربٰو۔ (مشکوٰۃ ص۲۴۴ باب الربٰو)

یہ حدیث اگرچہ بظاہر صرف چھ اشیاء کی بیع کے بارے میں حکم بیان کرتی ہے کہ ان اشیاء کی ہاتھوں ہاتھ اور برابر سرابر خرید و فروخت جائز ہے، مگر غور و فکر کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس حدیث میں ہر ہم جنس شے کی تجارت باہمی جنس سے کرنے کا حکم بیان ہوا ہے۔

اس لیے امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث سے تعین ربٰو کے لیے ایک اصل نکالا کہ جس چیز میں قدریت اور جنسیت ہو اُس کی بیع کا طریقہ کار یہ ہے اور اگر اس میں زیادتی کا ارتکاب ہو تو وہ ربٰو (سود) ہے۔

(۲) دوسری مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ کل قرضٍ جرّ نفعاً فهو حرام۔ (مسئلہ سود از مفتی محمد شفیعؒ)

یہ اساسی جواب ہر اس نفع کو شامل ہے جو قرض دہندہ مقروض سے لینا چاہے خواہ وہ نفع بدنی ہو یا مالی، یا قرض کے بدلہ میں مقروض نے کوئی چیز رہن رکھوائی ہو اور قرض دہندہ اس سے کسی بھی قسم کا نفع لیتا ہو۔

یہ سب اس حدیث کے تحت میں آتے ہیں، اس قسم کے اساسی جوابات کافی تعداد میں جمع ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جوابات جس طرح وحی غیر متلو کی شکل میں تھے اسی طرح وحی متلو میں بھی موجود ہیں، مثلاً:-

(۱) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ۔ (سورۃ البقرہ)

(۲) يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ (سورۃ البقرہ)

(۳) يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۔ (سورۃ البقرہ)

گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات وحی جلی یعنی قرآنی آیات کی شکل میں ہوتے تھے یا پھر وحی خفی یعنی احادیث غیر متلو کی شکل میں ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جوابات اجتہادی صورت میں ہوتے تھے اور مسئلہ کا حل اپنی رائے سے فرمایا کرتے تھے لیکن بعد میں قرآنِ کریم یا وحی غیر متلو سے اس کی توثیق ہو جاتی تھی۔

چنانچہ علامہ آمدیؒ نے الاحکام میں امام شعبیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مسئلہ میں اجتہاد فرمانے تو بعد ازاں قرآنِ کریم اور وحی سے یا تو اس کی توثیق ہو جاتی یا پھر اس کے خلاف ہوتا، اگر خلاف ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ اجتہادی مسئلہ چھوڑ دیتے۔

اس قسم کے کئی واقعات کتبِ احادیث میں موجود ہیں کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد فرمایا اور بعد میں منجانب اللہ کبھی تو اس کی توثیق ہو جاتی اور مسئلہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور کبھی اس کی تردید نازل ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ترک فرما دیتے۔ گویا کہ آپؐ اپنی حیاتِ طیبہ میں صحابہ کرامؓ کے مسائل کو اولاً وحی کی روشنی میں حل فرماتے اور کبھی کبھی اجتہادی فرمایا کرتے تھے۔ اپنے دور میں فتویٰ صرف آپؐ ہی دیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ اس کو یاد فرما لیا کرتے تھے جو آجکل کتبِ حدیث کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں اگرچہ بعض صحابہ کرامؓ کو آپؐ نے فتویٰ دینے کی اجازت دی تھی۔

فتویٰ دورِ صحابہؓ میں | بعض صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی فتویٰ دیا کرتے تھے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ۔

(الطبقات لابن سعد جلد ۲ صـ۱۱)

امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے چھ اصحاب سے علم لیا گیا۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ علم میں ایک دوسرے کے مشابہ تھے، ان میں بعض بعض سے اخذ کرتے تھے۔ اور حضرت علیؓ، حضرت ابی ابن کعبؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک دوسرے سے مشابہت فی العلم رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے اکتساب کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۲ صـ۱۱)

مُفتیانِ صحابۂ کرامؓ کی اقسام و طبقات

صحابہ کرامؓ میں سے جو حضرات فتویٰ دیا کرتے تھے ان کی دو قسمیں ہیں ۔

(۱) کوئی صحابیؓ کوئی کام یا بات اپنی رائے و اجتہاد سے کرتے یا کہتے اور جب وہ بات حضورؐ تک پہنچ جاتی اور آپؐ صحابیؓ کو اس عمل یا فتویٰ پر برقرار رکھتے ان پر کوئی نکیر نہ فرماتے تو وہ فتویٰ حجت ہوتا۔

(۲) کئی صحابیؓ کسی قول یا عمل کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سن چکے ہوتے اور اسی کو نقل کرکے لوگوں کو بتا دیتے، یہ حضرات اس فتویٰ میں بطورِ رُوات کے ہوتے تھے ۔

(اعلام الموقعین ج۲ ص۲۴۳، ص۲۴۴)

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو جملہ صحابۂ کرام میں سے بقول علامہ ابن قیمؒ کے ۱۳۰ یا ۱۶۰ اصحاب فتویٰ دیا کرتے تھے مگر ان کے بھی تین طبقات تھے، مثلاً:۔

(۱) **مکثّرین**: یعنی جو زیادہ فتویٰ دیتے تھے ۔

(۲) **متوسّطین** : وہ جو کچھ کم فتویٰ دیتے تھے ۔

(۳) **مقلّلین** : وہ جو بہت کم فتویٰ دیتے تھے ۔

مکثّرین فقہاء صحابۂ کرامؓ سات تھے جن میں ۱۔ حضرت عمرؓ ۲۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۴۔ ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ۵۔ حضرت زید بن ثابتؓ ۶۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ شامل ہیں۔

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ان حضرات کے فتاویٰ کو اگر جمع کیا جائے تو ہر ایک کا فتاویٰ ایک ضخیم کتاب بن جائے گا۔

امام ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوبؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ کو بیس ۲۰ جلدوں میں جمع کیا ہے ۔

متوسّطین کی تعداد مکثرین سے زیادہ ہے ان کی تعداد تیرہ ۱۳ تک پہنچتی ہے ۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ شامل ہیں ۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان حضرات کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے تو ہر ایک کے فتاویٰ کی ایک ایک جلد بن جائے گی۔

بعض علماء نے ان صحابۂ کرام میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابوبکرہؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو بھی شمار کیا ہے

متقلّین میں ان صحابہؓ کے علاوہ کئی دوسرے صحابہؓ بھی شامل ہیں، گو ان صحابہؓ سے زیادہ فتاویٰ منقول نہیں ہیں مگر بوقتِ ضرورت ایک یا دو مسئلوں یا اس سے زیادہ کے بارے میں فتاویٰ منقول ہیں، اگر ان تمام کے فتوؤں کو جمع کیا جائے تو ایک چھوٹی جلد بن جائے گی۔ ان صحابہؓ میں حضرت ابو درداء، حضرت ابوالیسر، حضرت ابوسلمہ المخزومی، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت سعد بن زید، حضرات حسن وحسین ابناء حضرت علی، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت ابوطلحہ، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت براء بن عازب، حضرت اسامہ بن زید، حضرت حفصہ، حضرت صفیہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر وغیرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ (اعلام الموقعین جلد ا ص ۱۲، ۱۳)

تو گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابۂ کرامؓ نے دین کے دیگر شعبوں کی طرح اس اہم اور انتہائی ضروری کام کو بھی سنبھالا اور اس کی پذیرائی فرمائی، اس کی ترویج اور اشاعت میں بڑھ چڑھ کر کام کیا جس کی وجہ سے دین کا یہ اہم شعبہ آج تک زندہ ہے۔

فتاویٰ دورِ تابعینؒ میں

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد فتوٰی کا کام حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے سپرد ہوا۔ ان حضرات میں آخری صحابیؓ جن کے ہاتھوں میں یہ منصب باقی رہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے، ان حضرات کے ہاں کبار تابعین جن میں فقہاء سبعہ اور دیگر حضرات شامل تھے نے فتوٰی کی تربیت پائی۔

(المصباح فی رسم المفتی ومناھج الافتاء ج ۱ ص ۶۲)

یہ حضرات اپنے وقت کے عظیم مفتی اور قاضی شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے فتاویٰ آج بھی بطور دلیل پیش کیے جاتے ہیں۔

چنانچہ صحابۂ کرامؓ کے زمانے کے بعد اس منصبِ نبویؐ کو حضرات تابعینؒ نے سنبھالا اور الحمدللہ یہ سلسلہ رکا نہیں، ان حضرات نے گلشنِ نبویؐ کی آبیاری اپنے ذمہ لے لی اور اس کام کو

مختلف بلاد (شہروں) میں (جو مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں آباد کیے تھے) شروع کیا۔

تابعینؒ فقہاء کے طبقات

ان فقہاء تابعینؒ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ تابعینؒ جو اپنا سارا وقت روایتِ حدیث میں صرف کرتے تھے اور فقہی مسائل کے استنباط میں کوئی توجہ نہیں دیتے تھے مگر ان مسائل کو جو قرآن و سُنت میں صراحتاً ذکر ہوں یہ حضرات رائے اور قیاس میں انہماک کو مکروہ سمجھتے تھے اور فتویٰ و استنباطِ مسائل سے بلاضرورت خوف زدہ رہتے تھے مگر پھر بھی اس سے چھٹکارا مشکل تھا، اسی طرح بعض کبار صحابۂ کرامؓ بھی کسی واقعہ کے حدوث سے قبل اس کے حل کو ناپسند فرماتے تھے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپؓ فرماتے ہیں کہ، لا تعجلوا بالبلاء قبل نزوله۔

اسی طرح حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے بھی قبل نزولِ حادثہ میں تکلم اور بحث کی کراہیت کے اقوال مروی ہیں۔

(۲) دوسرے وہ فقہاءِ تابعین تھے جنہوں نے اپنے آپ کو فقہ اور فتویٰ نویسی کیلئے وقف کر رکھا تھا، یہ حضرات صرف روایتِ حدیث اور آثار پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہر مسئلہ کے حل میں اجتہاد سے بھی کام لیتے تھے اور آنے والے واقعات کے حل کی کوشش فرماتے تھے، اور بعض نے تو فقہ کو کتاب کی شکل میں بھی مدون فرمایا جیسے امام شعبیؒ اور امام مکحول۔

(اصولِ افتاء صـ۲۰۶)

چونکہ یہ حضرات مختلف بلاد میں آباد تھے اس لیے ان کو وہاں کا امام تصور کیا جانے لگا، چنانچہ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں منتبانِ تابعین میں سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، خارجہ بن زید، ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام اور سلیمان بن یسار رحمہم اللہ فقہاء سبعہ کے نام سے موصوف ہیں، بقولِ شاعر ؎

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر
روایتهم لیست عن العلم خارجة
فقل هو عبید الله، عروة، قاسم
سعید، ابو بکر، سلیمان وخارجة

ان کے علاوہ ابان بن عثمان، سالم بن عبداللہ اور نافع رحمہم اللہ وغیرہ مدینہ منورہ میں فتویٰ دیتے تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۴)

مکہ مکرمہ میں عطاء بن ابی رباحؒ، طاؤس بن کیسانؒ، مجاہد بن جبیرؒ، عبید بن عمیرؒ وغیرہ مفتیان اہلِ فتویٰ تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۵)

بصرہ میں عمرو بن سلمہ الجرمیؒ، ابو مریم الحنفیؒ، کعب بن اسودؒ، حسن بصریؒ وغیرہ۔ ان کے بعد ایوب السختیانیؒ، سلیمان التیمیؒ، قاسم بن ربیعہؒ وغیرہ فتویٰ کا کام کرتے تھے اور ان کا فتویٰ چلتا تھا۔

صحابۂ کرامؓ کے بعد کوفہ میں علقمہ بن قیس الہمدانیؒ، مسروق بن اجدعؒ، شریح بن الحارث القاضیؒ، سلیمان بن ربیعہ الباہلیؒ، سوید بن غفلہؒ، حارث بن قیس الجعفیؒ وغیرہ بہت سارے علماء فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ان کے بعد ابراہیم النخعیؒ، عامر الشعبیؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ۔ ان کے بعد حماد بن ابی سلیمانؒ، سلیمان بن معتمرؒ، سلیمان اعمشؒ وغیرہ۔ اور ان کے بعد امام اعظم ابو حنیفہؒ، قاسم بن معنؒ اور سفیان الثوریؒ وغیرہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۶)

شام کے اہلِ فتویٰ میں ابو ادریس الخولانیؒ، شرجیل بن سمطؒ، عبداللہ بن ابی زکریا الخزاعیؒ، قبیصہ بن ذؤیب الخزاعیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مصر میں یزید بن ابی حبیبؒ، بکیر بن عبداللہ بن الشجعؒ۔ ان کے بعد عمرو ابن الحارثؒ، لیث بن سعدؒ، عبید اللہ بن ابی جعفرؒ وغیرہ اور دیگر فقہاء فتویٰ دینے کا عہدہ سنبھال چکے تھے۔

یمن میں مطرف بن مازنؒ قاضی صنعاء، عبدالرزاق بن ہمامؒ اور ہشام بن یوسفؒ وغیرہ کا فتویٰ چلتا تھا۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلیفہ منصور نے جب بغداد شہر تعمیر کیا تو اس میں جید ائمہ کرام، فقہاء عظام اور کثیر تعداد میں محدثین بسا دیئے جن میں ابو عبید، قاسم ابن سلام، ابو ثور ابراہیم بن خالد الکلبی رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶ تا ۲۹)

مفتی کے شرائط وآداب

مسندِ افتاء پر بیٹھنے والے ہیں۔ چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً
مفتی قرآن وسُنّت کا ماہر عالم ہو اس لیے کہ غیر عالم کو فتویٰ دینا شرعاً درست نہیں، اسی کے پیشِ نظر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

لایجوز الفتیا الّا لرجل عالم بالکتاب والسنۃ۔ (اعلام الموقعین ج۲ ص۳۵۲)

(۱) مفتی مسلمان ہو (۲) عادل ودیندار اور خدا ترس ہو، فاسق وفاجر کا فتویٰ دینا ممنوع ہے، البتہ ظاہری عدالت کافی ہے، باطنی فسق مضر نہیں۔ (۳) مفتی کا عاقل بالغ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ سید طحطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

شرط المفتی اسلامہ وعدالتہ و لزم منہا بلوغہ وعقلہ فیرد فتویٰ الفاسق والکافر وغیر المکلف۔
(طحطاوی علی الدر المختار ج۳ ص۱۷۵)

مفتی کے لیے مسلمان اور عادل ہونا شرط ہے اور فتویٰ کے لیے اس کا بالغ اور عاقل ہونا لازم ہے، پس کافر، فاسق اور غیر مکلف کا فتویٰ مردود ہوگا۔

البتہ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں، چاہے وہ جوانی کی عمر میں ہو یا بڑھاپے کی عمر میں، البتہ علمی رسوخ لازمی ہے۔

صاحب معین الحکام فرماتے ہیں:۔

ولا یعتبر السّن ولا کثرۃ العدد لان الاصغر لواحد قد یوفق للصواب فی حادثۃ مالا یوفق الاکبر والجماعۃ۔
(معین الحکام ص۳۰)

عمر اور کثرتِ عدد کا کوئی اعتبار نہیں اسلیئے کہ چھوٹی عمر کے آدمی کو کسی حادثے میں زیادہ تصویب کی توفیق ہوتی ہے جو کسی بڑی عمر والے کو حاصل نہیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ کبار صحابہؓ کے موجود ہوتے ہوئے بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مشورہ لیتے تھے حالانکہ وہ کم سن تھے۔

اسی طرح مفتی میں بیدار مغزی، قوتِ ضبط اور اہلِ اجتہاد جیسی صفات کا ہونا بھی ضروری ہے۔
علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ویشترط بتیقظہ و قوۃ ضبطہ واھلیۃ اجتہادہ۔ (البحرالرائق ج۶ ص۲۶۶)

اسی طرح مفتی میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اغنیاء، سلاطین، امراء اور وزراء کی طرف مائل نہ ہوتا ہو۔ صاحبِ نورالہدیٰ فرماتے ہیں :۔

ومن شرائط المفتی کون المفتی لا یمیل الی الاغنیاء و اعوان السلطان والامراء۔ (فتاوٰی نورالھدٰی ص۱۹۵)	مفتی کے شرائط میں سے یہ بھی کہ وہ مالدار لوگوں، وزراء اور سلاطین کی طرف میلان نہ رکھتا ہو۔

ایک مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ماہر مفتی کا شاگرد رہ چکا ہو اور اس کی نگرانی میں فتوٰی نویسی کی تربیت حاصل کی ہو۔ (عقود رسم المفتی)

اس لیے کہ صرف کتب بینی پر اعتماد کرنا ہی کافی نہیں بلکہ معتمد علمائے کرام کی صحبت لازمی ہے بشرطیکہ ان کو اس فن میں مہارتِ تامہ بھی حاصل ہو۔ اور ان میں ایک نفسانی ملکہ بھی موجود ہو تو وہ شخص فتوٰی دینے کا اہل ہوگا ورنہ نہیں۔

ایک مفتی میں دُور اندیشی کی صفت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ :۔

قلت وھذا شرط لازم فی زماننا والحاصل ان من غفلتہ المفتی یلزم ضررٌ عظیمٌ فی ھٰذا الزمان۔ (ردالمحتار ج۴ ص۴۱۵)	میں کہتا ہوں اس زمانے میں یہ شرط اس لیے بہت ضروری ہے کہ مفتی کی ذراسی غفلت کی وجہ سے ایک عظیم نقصان پیدا ہوسکتا ہے۔

مفتی میں بلند کرداری کے ساتھ بردباری اور نرم خوئی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مفتی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے عرف کو جانتا ہو یعنی زمانہ کے عرف سے واقف ہو، اس لیے کہ اگر ایک طرف ظاہرالروایہ ہو اور دوسری طرف عرف اس کے خلاف ہو تو مفتی عرف کو چھوڑ کر ظاہرالروایہ پر فتوٰے نہیں دے سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :۔

وفی القنیۃ لیس للمفتی ولا قاضی ان یحکما علیٰ ظاھر المذھب ویترکا العرف وھٰذا صریح فیما قلنا ان المفتی لا یفتی بخلاف عرف زمانہ۔ (رسم المفتی ص۴۲)	قنیہ میں ہے کہ مفتی اور قاضی ظاہر مذہب پر فیصلہ کر کے عرف کو نہیں چھوڑ سکتا اور یہ ہمارے کہنے میں صریح ہے تو بیشک مفتی اپنے زمانے کے عرف کے خلاف فتوٰی نہیں دے سکتا۔

بلکہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ :-

من جهل باهل زمانه فهو جاهل۔ (رسم المفتی ص۴۲)	جو اپنے زمانے کا عرف نہ جانتا ہو تو وہ بھی جاہل ہے۔

یعنی مفتی حالات کو دیکھ کر مبتلی بہ کے حالات و حیثیت کے مطابق آسان فتویٰ دے تاکہ لوگ دین سے متنفر نہ ہوں، لہٰذا مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سہل، آسان اور رخصت پر عمل کرنے کا فتویٰ دے اور عوام الناس کے لیے آسانی پیدا کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :-

و فی عمدة الاحکام من کشف البزدوی یستحب للمفتی الاخذ بالرخص تیسرا علی العوام مثل التوضی بماء الحمام والصلوٰة فی الاماکن الطاهرة بدون المصلّٰی۔ (عقد الجید ص۳۷)	اور عمدۃ الاحکام میں بزدوی کی کتاب کشف سے منقول ہے کہ مفتی کے لیے مستحب ہے کہ عوام پر آسانی کی غرض سے رخصت پر فتویٰ دے مثلاً حمام کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہوں پر بدون جانماز کے نماز پڑھنا۔

لیکن جو لوگ محتاط اور خواص ہیں ان کو عزیمت پر عمل کرنا چاہیئے، اس لیے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :-

ولا یلیق ذٰلك باهل العزلة بالاخذ بالاحتیاط والعمل بالعزیمة اولیٰ بهم۔ (عقد الجید ص۳۷)	اور یہ رخصت گوشہ نشینوں کے لائق نہیں بلکہ ان کے حق میں بہتر یہ ہے کہ وہ احتیاط پر کاربند رہیں اور عزیمت پر عمل کریں۔

اغلاط سے بچنا اور محفوظ رہنا بھی مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اس سے اغلاط کم واقع ہوں ورنہ جس مفتی سے بکثرت غلطیاں واقع ہوتی ہوں وہ قابلِ اعتماد نہیں رہتا۔ علامہ سید احمد طحطاویؒ فرماتے ہیں :-

وذكر فی الملتقط اذا كان صوابه اكثر من خطاه حل له ان یفتی وان لم یكن من اهل الاجتهاد۔ (طحطاوی علی الدر المختار ج۳ ص۱۷۲)	اور ملتقط میں ہے کہ جب مفتی کا صواب اغلاط سے زیادہ ہو تو وہ فتویٰ دینے کا اہل ہے اگرچہ وہ درجۂ اجتہاد پر فائز نہ ہو۔

اگر مفتی مقلد ہو تو سب سے بڑھ کر اس میں یہ وصف ہونا ضروری ہے کہ اس کو اپنے امام کے مستنبط مسائل و قواعد اور امام کے طرزِ اسلوب پر مہارت حاصل ہو۔

علامہ سید احمد طحطاوی فرماتے ہیں کہ "مفتی نرم خو، شگفتہ مزاج اور متواضع ہو۔ تند خوئی، درشت مزاجی، غرور و تکبر اور انانیت مفتی کے لیے سخت معیوب ہے۔ مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خوب اطمینان کے ساتھ جواب دے، جب تک وہ خود مطمئن نہ ہو تو جواب دینے سے پرہیز کرے اٹکل سے جواب نہ دے۔ اسی طرح اگر مفتی مقلد ہو تو جس کتاب سے جواب دینا ہو تو اُسے اُس کے مصنف کا حال معلوم ہونا چاہیئے، سوال کا خوب اطمینان کے ساتھ جواب دے۔"

(رسم المفتی ص ۳، ۵)

آداب (۱) فتویٰ دینے کے آداب میں سے یہ بھی ضروری ہے کہ مفتی کتب مذہبیہ سے صریح جزئیہ کو تلاش کرے جب تک صریح جزئیہ نہ ملے محض کلیات و تعلیلات سے جواب نہ دے۔

(۲) تاہم اگر ضرورت پڑ جائے یعنی کافی تلاش اور تتبع کرنے کے بعد بھی جزئیہ نہ مل سکے تو جواب میں یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ جزئیہ نہیں ملا لہٰذا جواب قواعد سے لکھا جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا یہی طریقہ تھا، آپ فرماتے ہیں: "قواعد سے جواب لکھتا ہوں تو اس میں یہ احتیاط کرتا ہوں کہ یہ لکھ دیتا ہوں کہ قواعد سے یہ جواب لکھا ہے جزئیہ نہیں ملا۔"

(اشرف المعمولات ص ۳۲ بحوالہ تحفۃ العلماء جلد ۲ ص ۲۳۷)

(۳) اور نہ صرف ایک جزئیہ ایک کتاب میں دیکھ کر اس پر فتویٰ دیا جائے بلکہ متعدد کتابیں دیکھ کر تحقیق کے بعد فتویٰ دیا جائے، اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی ہو چکی ہو، مثلاً شاتم رسول کی توبہ کی قبولیت کے مسئلہ پر کئی کتابوں میں احناف کا مذہب عدم قبولیت کا لکھا ہے حالانکہ احناف کے ہاں اس کی توبہ قبول ہوگی۔ (تحقیق رسالہ ابن عابدین)

(۴) جواب ظاہری عبارت کے موافق دینا چاہیئے اگرچہ حقیقت میں معاملہ کچھ اور ہو مگر یہ توضیح لازمی ہے کہ یہ لکھا جائے کہ بناء بر صورتِ مسئولہ یا صورتِ مسئولہ کے مطابق جواب یہ ہے۔

(۵) مفتی کو جواب واضح، صریح اور سلیس زبان میں دینا چاہیئے، الفاظ کے پیچھے پڑنے سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "جو سوال کیا جائے اس کا بلا تکلف صاف صاف جواب دینا چاہیئے، گول اور پیچدار الفاظ ہرگز نہ ہونے چاہئیں، تکلّف اور تصنّع جو آجکل بطور عادتِ ثانیہ کے ہو گئے ہیں بالکل خلوص کے خلاف اور نہایت تکلیف دہ چیزیں ہیں۔" (ملفوظاتِ اشرفیہ ص ۱۹۸)

(٦) جو مستفتی معترض یا معاند ہو اور صرف امتحان یا اعتراض کی غرض سے سوال کرتا ہو، عمل کرنے کا قصد نہ ہو تو اس کو جواب نہیں دینا چاہیئے اس سے خاموشی بہتر ہے، کیونکہ اس کو جواب دینا مفید نہیں۔

حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ معاند کو جواب دینا مفید نہیں بلکہ خاموشی بہتر ہے مگر مولویوں کو کب آتا ہے جوش اٹھتا ہے، جس کو محض اعتراض ہی مقصود ہو اس کو کہہ دینا چاہیئے کہ جاؤ یونہی سمجھو البتہ جو سمجھنا چاہے اس کو سمجھانا چاہیئے۔ (تحفۃ العلماء جلد ۲ ص۲۵۲)

(٧) ہر مسئلہ پر فتویٰ دینے سے گریز کرنا مناسب ہے بلکہ فتویٰ کا جواب نہایت غور و فکر کے بعد دینا ضروری ہے کہ کہیں فتویٰ مفاسد کے اٹھنے کا ذریعہ نہ بن جائے، اگر مفاسد کا خطرہ ہو تو اس سے خاموشی بہتر ہے۔

حکیم الامتؒ فرماتے ہیں بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ گو فی نفسہٖ صحیح ہو مگر مفضی ہو جاتے ہیں مفاسد کی طرف جہاں عوام کو ان کی اطلاع ہوئی اور آفتیں کھڑی ہو جائیں گی، اس لیے ایسے مسائل کو بیان نہیں کرنا چاہیئے، میں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ علم دین بعض لوگوں کو مضر ہوتا ہے، تو یہاں بھی ضرر سے بچانا مقصود ہے۔

(٨) اگر کسی استفتاء میں کوئی فتنہ انگیز سوال پوچھا گیا ہو مثلاً کسی عالم دین، واعظ یا کسی شخص کا کوئی عقیدہ بیان کر کے اس کے بارے میں سوال ہو تو اس کو اس طرح جواب دیا جائے کہ ایسا عقیدہ کسی عالم دین یا مسلمان کا نہیں ہو سکتا اگر اس شخص کا یہ عقیدہ ہو تو وہ خود زبانی یا تحریری لکھ کر پوچھیں، یہی طریقہ حکیم الامتؒ کا تھا۔ (تحفۃ العلماء جلد ۲ ص۴۵۵)

(٩) اگر فتویٰ لمبا ہوا اور ایک کاغذ پر جواب تمام نہ ہوتا ہو تو دوسرے کاغذ پر لکھنے کے بعد دونوں کاغذات کو مُہر کرے یا دونوں پر دستخط کرے تاکہ تحریف کا شبہ نہ رہے۔

(١٠) فتویٰ مختصر اور جامع ہونا چاہیئے طوالت کی ضرورت نہیں اس لیے کہ فتویٰ سے غرض مستفتی کو شرعی حکم بیان کرنا ہے کوئی مناقشہ مقصود نہیں۔

(١٠) تاہم جہاں اختصار، وضاحت اور بیان مطلوب میں مخل ہو تو وہاں طوالت کے ساتھ فتویٰ دینا واجب ہے مثلاً کسی شخص کے کسی موجب کفر عقیدے کے بارے میں پوچھا جائے تو بغیر بینہ شرعیہ یا اقرار کے فتویٰ نہ دیا جائے۔ اور اسی طرح اگر دو معنوں والے لفظ کے بارے میں پوچھا جائے تو بغیر وضاحت اور تفصیل کے فتویٰ نہ دیا جائے۔ (اصول الدعوہ ص۱٦٨ المطلب الرابع لفتویٰ)

(۱۲) فتویٰ دینے میں زمانے اور مکان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ زمانہ اور مکان سے فتویٰ بدل جاتا ہے بشرطیکہ حکم شرعی کسی خاص شہر کے عرف پر مبنی ہو اور جدید عرف نصِ شرعی کا مخالف نہ ہو یا حکمِ شرعی کسی خاص معنیٰ پر مبنی ہو اور وہ معنیٰ زمانہ کی وجہ سے متغیر ہو جائے ۔

(اصول الدعوہ ص۱۶۹ المطلب الرابع الفتویٰ)

(۱۳) ضرورت اور مصلحت کی بناء پر فتویٰ میں سخت الفاظ لکھنا اور سختی کے ساتھ فتویٰ دینا جائز ہے، مثلاً فتویٰ دینے کے بعد یوں لکھے کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور جو شخص اس کے خلاف کرے گا گنہگار ہوگا۔ (اصول الدعوہ ص۱۷۰ المطلب الرابع الفتویٰ)

اور اگر جواب نہیں آتا ہو تو صاف الفاظ میں کہے کہ میں نہیں جانتا اس لیے کہ لا ادری بھی نصف علم ہے۔ امام مالکؒ سے ۴۸ مسائل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے ۳۲ کے بارے میں لا ادری فرمایا۔ (اصول الدعوۃ ص۱۵۹)

(۱۴) مفتی فتویٰ دیتے وقت صریح جزئیہ نقل کرے اور جزئیہ کے نقل کرنے میں بھی معتبر کتابوں پر اکتفاء کرے ۔ (معین الحکام ص۳۱)

(۱۵) مفتی فتویٰ دیتے وقت غیر مشہور اور غیر معروف کتابوں سے اجتناب کرے ہاں اگر معتبر کتابوں سے ان کی تائید ہوتی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

وعلیٰ هٰذا تحرم من الكتب الغريبة التي لم تشتهر حتى تتظاهر عليها الخواطر ويعلم صحة ما فيها۔ (معین الحکام ص۳۲)

اسی بناء پر غیر مشہور کتابوں سے فتویٰ دینا حرام ہے یہاں تک کہ عقل اس کو قبول کرے اور اس کی صحت کا پتہ چل جائے ۔

(۱۶) مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جواب استفتاء کے مطابق دے، استفتاء سے خارج جواب سے پرہیز کرے تاکہ مستفتی کو اصل مقصود حاصل ہو۔ (اصول الدعوۃ ص۱۶۷)

(۱۷) مفتی جب جواب لکھے تو دلیل سے جواب دے تاکہ مستفتی کو اطمینانِ قلبی حاصل ہو سکے۔

علامہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں: وان یذکر دلیل الحکم و ماخذہ ما امکنه من ذٰلك - کہ مفتی حتی الامکان جواب کی دلیل اور اس کا ماخذ ذکر کرے۔

(۱۸) مفتی جب فتویٰ لکھنا شروع کرے تو سرورق پر تسمیہ لکھے یا الجواب و باللّٰہ التوفیق لکھے اور آخر میں واللّٰہ اعلم و ھو الموفق لکھے ۔

علامہ طحطاویؒ نے لکھا ہے کہ:-

ینبغی ان یکتب عقب جوابه واللہ اعلم وقیل یکتب فی العقائد واللہ الموفق۔ (طحطاوی علی الدر المختار ج ۱ صفحہ ۴۹)

مفتی کے لیے مناسب ہے کہ جواب کے آخر میں واللہ اعلم کے الفاظ تحریر کرے اور اگر مسئلے کا تعلق عقائد سے ہو تو آخر میں واللہ الموفق لکھے۔

(۱۹) مفتی کو چاہیئے کہ جواب لکھتے وقت اپنا دل اللہ کی طرف متوجہ کرے اور محتاج محض بن کر اپنے آپ کو خدا کے آگے پیش کرے اور کثرت سے دعا کرے۔ یلیق بالمفتی ان یکثر الدعاء۔ (اعلام ج ۲ صفحہ ۲۷۱)

(۲۰) مفتی کو چاہیئے کہ تغیرِ خلق اور اشتغالِ قلب کی حالت میں فتوٰی نہ دے، مثلاً غصہ کی حالت، اسی طرح غمی وخوشی، تکلیف، غلبۂ نیند اور بھوک وپیاس کی حالت یعنی ہر اس حالت میں جس میں طبیعت اعتدال سے نکل جاتی ہے فتوٰی دینا جائز نہیں، البتہ اگر اعتدال سے نہ نکلے تو پھر بعض ایسے حالات میں فتوٰی دینا جائز ہے۔ (شرح المہذب ج ۱ صفحہ ۴۶)

(۲۱) جس فتوٰی کا تعلق ایمان واقرار یا اس جیسے دیگر امور سے ہو تو جب تک لافظ کے احوال اور عرف یا کسی معتبر ومعتمد عالم سے جو ان الفاظ وعرف کا ماہر ہو، پوچھ کر معلوم نہ کرے تب تک جواب نہ دے۔ (شرح المہذب ج ۱ صفحہ ۴۶)

(۲۲) فتاوٰی میں تساہل کرنا حرام ہے، جو شخص تساہل میں معروف ہو تو اس سے استفتاء کرنا بھی درست نہیں۔ تساہل میں یہ داخل ہے کہ کما حقہ استفتاء دیکھنے سے قبل جواب لکھنے میں جلد بازی کرے، اسی طرح سائل نے سوال نہ کیا ہو اور مفتی جواب دینے لگے، البتہ اگر سوال کا پہلے سے علم ہو تب تو جواب دینے میں جلد بازی کرنا درست ہے۔ اسی طرح تساہل میں یہ بھی شامل ہے کہ حرام اور مکروہ حیلوں کو تلاش کرنے لگے اور درمیان میں کوئی غرضِ فاسد ہو۔ (شرح المہذب ج ۱ صفحہ ۴۶)

(۲۳) مفتی جب فتوٰی مکمل کرلے تو اپنے ہم نشین علماء وفضلاء کو (چاہے وہ اس کے شاگرد ہی کیوں نہ ہوں) بطور مشورہ کے سنائے اگر اشکال ہو تو نرمی اور انصاف کے ساتھ اُن سے بحث ومباحثہ کرے اور جو حق بات سامنے آئے اُسے بلا تامل قبول کرلے۔ (مقدمہ شرح مہذب، فصل آداب المستفتی والمفتی)

(۲۴) اگر فتوٰی میں کسی کتاب کی عبارت نقل کی ہو تو اس کتاب کی جلد نمبر، صفحہ نمبر اور اگر ہوسکے باب اور فصل بھی تحریر کرے، اور اگر اس کتاب کے مختلف الطبع نسخے ہوں تو مطبع (پریس)

کا نام بھی تحریر کرے۔

(۲۵) اگر کسی کتاب کی عبارت دوسری کتاب میں دیکھی ہو تو اوّلاً تو خود اس کتاب میں دیکھ کر نقل کرے ورنہ بصورتِ دیگر اس کتاب کی عبارت بحوالہ کتابِ ثانی لکھے۔ مثلاً ایک مسئلہ مفتی نے امداد الفتاوٰی میں بحوالہ شامی دیکھا ہے اور شامی مفتی کے پاس ہے نہیں تو وہ مسئلہ کے جواب میں یوں تحریر کرے: ھٰکذا فی ردّ المحتار بحوالہ امداد الفتاوٰی۔

(۲۶) مفتی جواب دینے میں میانہ روی سے کام لے، نہ بہت باریک لکھے اور نہ بہت جلی، اور نہ ہی ایک جواب میں مختلف قسم کی روشنائی استعمال کرے تاکہ جعل سازی کا احتمال نہ رہے بلکہ ایک ہی قسم کے قلم اور روشنائی سے جواب لکھے۔ (مقدمہ شرح مہذب ج۱ صـ۱۲ آداب الفتوٰی)

(۲۷) جواب لکھنے میں استفسارات کی ترتیب کا خیال رکھے یعنی جو پہلے ہے اس کا جواب پہلے دے علیٰ ھٰذا الترتیب، البتہ مسافر اور خواتین کا لحاظ رکھ سکتا ہے جبکہ تاخیر کرنے سے ان کا نقصان ہو رہا ہو۔ (البحر الرائق جلد ۶ صـ۲۶۸)

(۲۸) اگر استفسار یعنی سوال کے درمیان یا آخر میں جگہ خالی ہو جس میں جعلسازی ہو سکتی ہو تو مفتی از خود وہاں نکتے (.....) یا کراس (× × ×) کا نشان لگا دے تاکہ جواب دینے کے بعد کوئی شخص اس میں جعلسازی نہ کر سکے جو آئندہ کسی فتنہ اور فساد کا باعث نہ بنے۔ اگر سوال کے مختلف اجزاء ہوں تو مفتی اجزاء کی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے نمبروار جواب لکھے تاکہ مستفتی پر التباس نہ آئے۔ اور اگر بالفرض تحریری جواب میں فتنہ اور فساد کا اندیشہ ہو مثلاً مسئلہ کا تعلق قضاء کے ساتھ ہو یا تحریری فتوٰی فتنہ انگیزی کا باعث بنتا ہو تو زبانی جواب دینے پر اکتفاء کرے تحریری جواب نہ دے، اس لیے کہ کسی مسئلہ کا تحریری جواب دینا لازمی نہیں۔ اگر کسی واقعہ کا بذاتِ خود مفتی کو علم ہو اور استفسار واقعہ کے خلاف ہو تو اس صورت میں جواب دینے سے گریز کرے اور از سرِ نو صحیح صورتحال کے مواقف جب سوال ہو جائے تو پھر جواب تحریر کرے، اس لیے کہ بعض اوقات لوگ محض دنیاوی اغراض کی تکمیل کے لیے فتوٰی کی آڑ لیتے ہیں جس سے فتنہ کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔ (فتوٰی نویسی کے رہنما اصول صـ۳۸)

(۲۹) اگر مفتی کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جو دو فریقوں کے مابین متنازع ہو اور وہ تنازع بھی مشہور ہو تو اسے چاہیئے کہ کسی حیلہ سے کام لے کر اس سے اپنا دامن چھڑا لے، اور اس طرح کے مسائل میں الجھنے سے پرہیز کرے۔

(۳۰) اگر مستفتی کی نیت استفسار کی نہ ہو بلکہ اعتراض کی ہو تو اس کو بالکل جواب نہ دے۔
(۳۱) اگر مفتی کے پاس وراثت کا مسئلہ آجائے تو اس میں بہت احتیاط سے کام لے، اس لیے کہ میراث کا مسئلہ بسا اوقات نزاع اور جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے لہٰذا اچھی طرح تحقیق کر کے مستفتی سے ورثاء کی تعداد معلوم کر کے جواب لکھے اور آخر میں یہ چند الفاظ لکھے :۔

"بناء بر صحتِ واقعہ مذکورہ اگر ورثاء کی تعداد صورتِ مسئولہ کے موافق ہے تو جواب یہ ہوگا" تاکہ مفتی عنداللہ اور عندالناس ماخوذ نہ ہو۔ اور جملہ ورثاء کے حصص کو الگ الگ کر کے لکھے۔

(۳۲) اپنے دیئے ہوئے فتوے کی ایک نقل اپنے پاس رکھے تاکہ بوقتِ ضرورت فتنہ سے بچنے کا ذریعہ بنے اور ایک علمی سرمایہ بھی تیار ہو جائے۔
(۳۳) مفتی کو چاہیئے کہ مسئلہ کا جواب لکھنے کے بعد اس پر نظرِ ثانی کرے تاکہ خلط و التباس جواب سے بچ جائے اور اگر تصحیح کی ضرورت ہو تو جواب کو درست کیا جا سکے۔ (شرح مہذب جلد ۱ ص ۱۲)

تو فتوٰی دینے میں ان جملہ امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، بغیر اس کے فتوٰی صادر کرنا اکثر فتنہ اور فساد کا باعث ہوتا ہے جبکہ اسلام نے فتنہ اور فساد سے منع کیا ہے۔

آدابِ المُستفتی

مُستفتی ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالمِ دین سے کسی دینی مسئلہ کے بارے میں حل دریافت کرے۔

چونکہ دین سارے کا تعلق ادب اور احترام کے ساتھ ہے اور دین نام ہی ادب کا ہے اسی لئے فقہاء نے مستفتی کے لیے چند آداب مقرر فرمائے ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مفتی سے مسئلہ کا حل دریافت کرنا ضروری ہے۔ اور وہ آداب درج ذیل ہیں :۔

۱۔ مستفتی کو جب کوئی حادثہ پیش آئے تو اُسے چاہیئے کہ وہ کسی معتمد مفتی سے مسئلہ کا حل طلب کرے۔ اگر اپنے شہر میں قابلِ اعتماد مفتی نہ ملے تو مسئلہ کا جواب معلوم کرنے کیلئے کسی دوسرے شہر کا سفر کرے۔
۲۔ مسئلے کا حل کسی ایسے شخص سے دریافت کرے جو فتوٰی دینے کا اہل ہو، اس کی اہلیت کے لیے یہ کافی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو، یا بقولِ متاخرین علماء کہ وہ خود

دعویٰ کرے کہ انا اھل للفتویٰ ۔

۳۔ مفتی کے سامنے ادب واحترام سے بیٹھے، گفتگو میں سبقت سے کام نہ لے اور نہ ہاتھ سے مفتی کے چہرے کی طرف اشارہ کرے ۔

۴۔ استفتاء کے وقت مفتی سے یہ نہ کہے کہ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے یا اس کے بارے میں آپ کے امام یا امام شافعیؒ کا کیا مذہب ہے۔ بلکہ مفتی کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرے اور اس کا حل پوچھے، ہاں اگر مسئلہ کسی امام معین کے مذہب کے بارے میں دریافت کرنا ہو تو تب یہ کہنا بجا ہے کہ اس بارے میں فلاں امام صاحب کا کیا مذہب ہے ؟

۵۔ مفتی کے جواب دینے کے بعد یہ نہ کہے کہ میرا بھی یہی خیال تھا یا میری بھی یہی رائے ہے اور یہ بھی نہ کہے کہ فلاں شخص نے بھی یہ کہا تھا، اور نہ یہ کہے کہ اگر آپ کا فتویٰ فلاں شخص کے موافق ہو تو لکھیں ورنہ نہ لکھیں ۔

۶۔ مفتی سے اس کی حالتِ قیام، اونگھ یا ایسی کسی دوسری حالت میں مسئلہ کا حل نہ پوچھے اسی طرح جس وقت مفتی کا دل کسی اور کام میں مشغول ہو تو اس وقت بھی مسئلہ کا حل دریافت کرنے سے اجتناب کرے ۔

۷۔ اگر سوال تحریری طور پر کرنا مقصود ہو تو اگر خود نہ لکھ سکتا ہو تو پھر کسی ایسے کاتب سے لکھوائے جو سوال کی غرض و غایت کو پوری طرح واضح کر سکتا ہو اور وہ صاف ستھرا اور خوش خط لکھ سکتا ہو

۸۔ مستفتی کے آداب میں یہ بھی داخل ہے کہ مفتی سے دلیلِ فتویٰ کا مطالبہ نہ کرے، البتہ اگر اسی مجلس میں دلیل کا مطالبہ ضروری ہو تو چاہیئے کہ پہلے مفتی کے فتویٰ کو قبول کرے پھر بعد میں دلیل طلب کرے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس قسم کا مطالبہ مفتی سے کسی دوسری مجلس میں کرے ۔

۹۔ مستفتی کو چاہیئے کہ اپنے مسئلہ کو سوال کی شکل میں بڑے سائز کے کاغذ پر واضح کر کے لکھے ۔ بڑے کاغذ پر لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات جواب تفصیل طلب ہوتا جس کا مفصّل جواب لکھنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ چھوٹے کاغذ پر جواب بھی مختصر لکھا جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ جواب مستفتی کے ضرر اور نقصان کا باعث بن جائے، اسلئے استفتاء (سوال)

بڑے کاغذ پر لکھنا ضروری ہے۔

۱۰۔ استفتاء میں دعائیہ کلمات لکھنے چاہیئں۔ اگر کسی معین شخص سے سوال کرنا مقصود ہو تو خاص اس کے لیے دعائیہ کلمات لکھے ورنہ دعائیہ کلمات عمومی الفاظ میں تحریر کرے۔

۱۱۔ اگر فوراً جواب مطلوب ہو تو مستفتی کو چاہیئے کہ کاغذ کھول کر بڑے ادب کے ساتھ مفتی کے سامنے رکھے، اس کو کاغذ کھولنے کی تکلیف نہ دے اور نہ ہی اس کو بند کرنے کی زحمت دے۔

فتوٰی کی اہمیّت

— اور —

جامعہ حقانیہ میں دارالافتاء کا قیام

حضرت مولانا حافظ انوار الحق صاحب استاذ الحدیث و نائب مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ

الحمد للہ رب العالمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم، امّا بعد!

کائناتِ عالم میں اللہ تعالیٰ کا ہر تصرف اور حکم بیشمار حکمتوں، اسرار و رموز اور لطائف کا خزانہ ہے۔ جب بھی کسی عاقل، بالغ اور ذی شعور شخص نے اس میں غور و فکر کیا تو اس کی عقل حیران رہ گئی اور آخر کار اسے یہ کہنا پڑا کہ سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۔

اور پھر خالقِ کائنات نے اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کے لیے ایک ایسا عجیب و غریب اور فطرت کے مطابق قانون اور نظام نازل فرمایا کہ جس پر عمل کرنے سے بنی نوع انسان کے تمام مسائل حل ہوجاتے ہیں، اس میں امیر و غریب، سید اور غیر سید، آقا و غلام، خوبصورت اور بدصورت کا کوئی امتیاز نہیں اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا فلاں مسئلہ اسلامی قانون کے تحت حل نہیں ہوا۔ اس لیے امارتِ اسلامی میں جہاں محکمہ قضاء کے قیام کا حکم ہے وہاں محکمہ افتاء کا قیام بھی انتہائی ضروری ہے۔

قضاء و افتاء میں فرق قضاء اور افتاء قریب قریب دونوں ایک ہی ہیں، بیشتر شرائط اور اصول میں دونوں برابر ہیں۔ اس لیے فقہاء کرام نے جہاں قاضی یا قضاء کے شرائط و آداب بیان کیے ہیں تو وہاں آخر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ یہ جملہ شرائط مفتی کے لیے بھی ہیں اور جہاں مفتی کی شرائط کا ذکر ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ قاضی ان شرائط میں مفتی کی مانند ہے، البتہ قاضی اور مفتی میں فرق صرف اتنا ہے کہ قاضی اکثر اوقات میں معاملات کے مسائل حل کرتا ہے تو مفتی عبادات کے مسائل، دوسرا فرق یہ ہے کہ قاضی کا فیصلہ لوگوں پر جبرًا نافذ کیا جاتا ہے کیونکہ قاضی قوتِ نافذہ کا مالک ہوتا ہے اس کے برعکس مفتی کا

فتویٰ لوگوں پر جبراً نافذ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مفتی صرف مُبَیِّن ہوتا ہے۔

یہاں میں پہلے قضاء اور افتاء کے معانی واضح کرکے بعد میں افتاء کی عظمت و اہمیت پر مختصراً عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ قضاء کا لغوی معنیٰ ہے کسی چیز کو مضبوط بنانا، اور شرعی معنیٰ یہ ہے کہ اسلامی معاملات اور مسائل میں فیصلہ دینا۔ اور فتویٰ کا لغوی معنیٰ قوی کرنا، واضح کرنا اور بیان کرنا ہے، اور یہی معنیٰ قرآنِ کریم کی سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے، ارشادِ ربانی ہے:
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ الخ یعنی جواب دیجیے ——— اور فتویٰ کا اصطلاحی اور شرعی معنیٰ ہے کسی شرعی مسئلے کا جواب دینا، اور یہی معنیٰ اس ارشادِ ربانی کا ہے، يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ "یعنی حکم پوچھتے ہیں آپ سے، سو آپ فرمادیں کہ اللہ تعالٰی حکم بیان فرماتے ہیں تم کو کلالہ کا۔"

جب فتویٰ کا معنیٰ معلوم ہو جائے یعنی شرعی مسئلے کا جواب دینا، تو اس کے بعد فتویٰ کی اہمیت سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

منصبِ افتاء کی عظمت

فتویٰ یا افتاء ایک عظیم اور مہتم بالشان امر ہے اور اس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ جل جلالہٗ نے فتویٰ کی نسبت اپنی طرف کی ہے، ارشادِ ربانی ہے: يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ۔ (سورۃ النساء ۱۷۶) "یعنی حکم پوچھتے ہیں آپ سے، سو آپ فرمادیں کہ اللہ تعالٰی فتویٰ دیتا ہے یعنی حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا۔"

فتویٰ کی عظمتِ شان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ اور اسلامی مسئلے کے جواب کی نسبت اپنی ذاتِ اقدس کی طرف فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اس عظیم اور پُروقار عہدہ کو سنبھالے رکھا اور بیشمار فتوے جاری کیے۔ اگرچہ اُس وقت فتویٰ یا مفتی کی اصطلاح رائج نہ تھی، لیکن ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ فتویٰ کا اصل معنیٰ کسی شرعی مسئلے کا جواب دینا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر علیہ السلام کے زمانے میں مسائل کے جوابات فتاوٰی ہی تھے اور آپؐ اپنے زمانے کے مجیب اور مفتی اعظم بھی تھے۔ چونکہ لفظِ رسول مفتی سے بدرجہا بہتر و افضل ہے اسی وجہ سے آپؐ رسول کے مقدس نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اگرچہ حضور علیہ السلام اپنے زمانے کے قاضی القضاۃ اور مفتی اعظم بھی تھے اور آپؐ کے فتاوٰی حدیثِ نبویؐ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد یہ

یہ منصب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سپرد ہوا مگر زیادہ نازک اور پُرخطر ہونے کی وجہ سے اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ یہ کام کسی اور صاحب کے سپرد کیا جائے اور خود اس ذمہ داری سے بچ جائیں۔ اسی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں فتوٰی دینے والوں کی تعداد بہت کم رہی۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی شہرۂ آفاق "اعلام الموقعین" میں صحابۂ کرامؓ میں سے مفتی حضرات کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر بتائی ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے دور میں زیادہ فتوٰی دینے والے کل سات حضرات تھے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں، حضرت عمرؓ بن الخطاب حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین۔

منصب افتاء اور خطرات

منصب افتاء اگرچہ ایک عظیم مقام ہے لیکن اس عظمت کے ساتھ ساتھ اس میں عظیم خطرات بھی موجود ہیں۔ کیونکہ بلند مقام پر چڑھنے والا جب گرتا ہے تو بلند مقام ہی سے گرتا ہے۔ تو منصب افتاء کی عظمت کے پیش نظر اس میں لاپرواہی سے فتوٰی دینا یا غفلت کرنا باعث عذاب ہوتا ہے، مثلاً:۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جس نے بغیر علم کے فتوٰی دیا تو اس کا گناہ اسی (فتوٰی دینے والے) پر ہوگا۔ (ابوداؤد ص کتاب العلم)

(۲) یہ بھی آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ تم میں سے فتوٰی دینے پر زیادہ جرأت مند وہ ہوگا جو تم میں سے جہنم کی آگ پر جرأتمند ہو۔ (مقدمہ دارمی باب ص۱۷۵)

(۳) علامہ ابن قیمؒ نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ جو شخص بغیر علم کے لوگوں کو فتوٰی دیتا ہے تو اس پر زمین و آسمان کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔
(اعلام الموقعین جلد۲ ص۲۰۲)

(۴) یہاں تک کہ اگر کوئی شخص فتوٰی دیتا ہو اور حقیقت میں وہ فتوٰی دینے کا اہل نہ ہو تو حاکم وقت کو اختیار ہے کہ وہ اسے فتوٰی دینے سے روک دے بصورت دیگر حاکم بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔

حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ: من افتی الناس ولیس باھل للفتوٰی فھو اٰثم عاص ومن اقرہ من ولاۃ الامور علیٰ ذٰلک فھو اٰثم ایضاً۔ (اعلام الموقعین ج۲ ص۲۵۶)

(ترجمہ "یعنی جو شخص لوگوں کو فتوٰی دینے لگے اور وہ فتوٰی دینے کا اہل نہ ہو تو وہ گنہگار و نافرمان ہے اور جو صاحب اختیار شخص اس کو اس منصب پر برقرار رکھے گا وہ بھی گنہگار ہوگا۔"

اس سخت وعید کی وجہ سے اس پُر خطر منصب میں اکابرینِ اُمت بہت احتیاط کرتے تھے۔

(۵) چنانچہ ابن ابی لیلیٰؒ فرماتے ہیں کہ میں نے انصار صحابہ میں سے ایک سو بیس صحابہ کرامؓ کو ایسا پایا کہ جب ان میں سے کسی سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ اس مسئلے کو ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف بھیجتے، یہاں تک کہ سائل اول مسئول ہی کی طرف واپس آجاتا۔ (مباحث فی احکام الفتوٰی ص ۱۹۶)

(۶) حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو مفتی ہر مسئلے کا جواب دے تو وہ مجنون ہی ہوتا ہے۔

(۷) اسی طرح حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ کے پاس ایک آدمی فتوٰی پوچھنے کے لیے آیا تو آپ نے اس کو جواب دیا کہ میں اچھی طرح نہیں جانتا، اس پر سائل نے کہا کہ میں آپ کے علاوہ کسی اور کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتا۔ تو آپؒ نے جواب میں فرمایا کہ لا تنظر الیٰ طول لحیتی وکثرۃ الناس حولی۔ (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۵۷) یعنی تم میری لمبی داڑھی اور میرے گرد لوگوں کے ہجوم کو مت دیکھو۔

(۸) امام شعبیؒ اور حسنؒ (دونوں حضرات تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک شخص کسی مسئلہ میں فتوٰی دیتا ہے، اگر یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوتا تو آپ خود اُسے حل نہ فرماتے بلکہ اس مسئلے کے حل کے لیے بدریین صحابہؓ کو جمع کرتے۔ (امام نوویؒ شرح المہذب ص)

(۹) امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ علم ضائع ہو جائے گا تو میں کبھی بھی فتوٰی نہ دیتا، مستفتی حضرات کو بغیر مشقت کے مسئلہ مل جاتا ہے اور گناہ میرے سر پہ عائد ہو جاتا ہے۔

(۱۰) امام مالکؒ فتوٰی دینے میں اتنی احتیاط کرتے تھے کہ بعض اوقات پچاس مسائل میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہ دیتے۔ (شرح عقود رسم المفتی ص)

(۱۱) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے آپ کو افتاء کے لیے پیش کیا تو اُس نے ایک عظیم کام سر پر اٹھا لیا، اسے چاہیئے کہ جب تک شدید ضرورت نہ ہو فتوٰی دینے کی جرأت نہ کرے۔

(۱۲) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں فتوٰی دینے سے احتراز کرتا رہا حتیٰ کہ میرے بارے میں ستر اکابر علماء نے یہ شہادت دی کہ میں فتوٰی دینے کا اہل ہوں تب میں نے استفتاء کا جواب دینا شروع کیا۔

اسلامی مملکت میں دارالافتاء کا قیام

لہٰذا ان خطرات کے پیش نظر دارالافتاء کا قیام اور اس میں منجھے ہوئے اور ماہر مفتیان کی تقرری حکومت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے اور حکومت کے ذمہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان دارالافتاء کی پوری نگرانی کرے، اہل اشخاص کو مقرر کرے اور کم علم، عدم صلاحیت رکھنے والے، غیر عادل فسق و فجور میں مبتلا اور حیلہ باز مفتیان پر پابندی لگا کر ان کو فتوٰی دینے سے روکے، جیسا کہ امیرالمؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

"اسلام میں اس کا ایک خاص محکمہ تھا جس کا نام افتاء تھا اس کا یہ طریقہ تھا کہ نہایت لائق قانون دان یعنی فقہاء ہر جگہ موجود رہتے تھے اور جو شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنا چاہتا تھا ان سے دریافت کرسکتا تھا، اس لیے کوئی شخص یہ عذر نہیں کرسکتا تھا کہ وہ قانون کے مسئلہ سے ناواقف تھا۔ یہ طریقہ آغازِ اسلام میں خود بخود پیدا ہوا اور اب تک قائم ہے لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جس پابندی کے ساتھ اس پر عمل رہا زمانہ مابعد بلکہ ان سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی نہیں رہا۔ اس طریقے کے لیے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ عام اجازت نہ ہو بلکہ خاص قابل لوگ افتاء کے لیے نامزد کر دیئے جائیں تاکہ ہر کس و ناکس غلط مسائل کی ترویج نہ کرسکے، حضرت عمرؓ نے اس تخصیص کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جن لوگوں کو انہوں نے افتاء کی اجازت دی تھی مثلاً حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ، معاذ بن جبلؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابوہریرہؓ اور ابوالدرداءؓ وغیرہ ان کے سوا اور لوگ فتوٰی دینے کے مجاز نہ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں: سابق وعظ و فتوٰی موقوف بود بر رائے خلیفہ وعظ می گفتند و فتوٰی می دادند" (الفاروق ص۲۲۱)

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ اس معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ کوئی غیر مقرر شدہ شخص فتوٰی دینے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا حتیٰ کہ مقرر شدہ مفتیان کے فتاوٰی کی بھی جانچ پڑتال ہوتی تھی

علامہ نعمانیؒ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں :۔

”بلکہ ان کو یہاں تک احتیاط تھی کہ مقرر شدہ مفتیوں کی بھی جانچ کرتے رہتے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بارہا پوچھا کہ تم نے اس مسئلہ میں کیا فتویٰ دیا؟ اور جب انہوں نے اپنا جواب بیان کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس مسئلے کا اور کچھ جواب دیتے تو آئندہ تم کبھی فتویٰ دینے کے مجاز نہ ہوتے۔“ (الفاروق ص۲۲۱)

مسلکِ احناف اور فتویٰ کی عظمت

امتِ مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دینِ اسلام میں اکثر فروعی مسائل میں مجتہدین کا اختلاف رہا ہے، لیکن یہ اختلاف مجتہدین کے کسی ذاتی مفاد و اغراض پر مبنی نہ تھا بلکہ یہ اختلاف مسائل کی بنیاد اور اصل نوعیت کی وضاحت پر مبنی تھا، اور خصوصاً مسلک احناف میں مسئلہ کی بنیاد واضح کرنے کے ساتھ یہ بات بھی مدنظر ہے کہ کسی مسئلہ میں قوی دلیل کے باوجود ضعیف دلیل پر عمل نہ کیا جائے، یہاں تک کہ علمائے احناف نے ضعیف کے مقابلے میں قوی دلیل پر عمل واجب قرار دیا ہے اور قوی کے مقابلے میں ضعیف دلیل پر عمل کو ناجائز قرار دیا ہے، دلیل کی قوت بعض اوقات ماخذ اور مصدر کے اعتبار سے ہوتی ہے اور بعض اوقات جمہور علمائے کرام کے اتفاق رائے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنی احتیاط کی کہ صرف اپنے ہی فتویٰ اور تحقیق کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اپنے دارالتحقیق والافتاء میں مسائل کی تحقیق و جستجو کے لیے اس وقت کے مجتہدین اور جید علماء کرام کی شوریٰ بنائی، یہ شوریٰ حالات کے اعتبار سے کم و بیش ہوتی رہتی تھی، لیکن مؤرخین علماء کرام نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دارالتحقیق والافتاء کے محققین اور مشاورین کی تعداد چالیس تھی۔

حضرت العلامہ امام الکردریؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی علمی مجلس شوریٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب ”مناقب الامام الاعظمؒ“ میں فرماتے ہیں کہ : امام الانام نے اپنے مذہب کی بنیاد کے لیے ایک شوریٰ بنا کر مسائل کے اجتہاد و تحقیق میں فقط اپنے آپ پر اعتماد نہیں کیا تاکہ دینِ مقدس میں صحیح اجتہاد ہو جائے اور دین کی صحیح خیرخواہی کی جائے، ایک ایک مسئلہ پر شوریٰ میں بحث ہوتی تھی اور امام الانام اپنی شوریٰ کے ارکان سے باقاعدہ مسئلے کے بارے میں دلائل کا پوچھتے بعض اوقات ایک مسئلہ میں ایک مہینہ تک بلکہ مہینہ سے بھی زیادہ بحث جاری رہتی اور کمال

تحقیق و تنقیح کے بعد مسئلہ جب مدلل ہو جاتا تو امام ابو یوسفؒ کو حکم فرماتے کہ اب اس مسئلے کو قلمبند کریں۔ گویا امام اعظم نے نہ کبھی تخمین سے فتویٰ دیا اور نہ فقط اپنی رائے سے۔

علامہ اسد بن الفرات اپنی کتاب "حسن التقاضی" میں لکھتے ہیں کہ: امام صاحب کی شوریٰ کے وہ ارکان جو کتابیں مدون کرتے تھے چالیس افراد تھے ان میں سے دس حضرات متقدمین کے نام سے مشہور ہیں جن میں امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، داؤد الطائیؒ، اسد بن عمروؒ، یوسف بن خالدؒ، یحییٰ بن زکریاؒ قابل ذکر ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے فتویٰ اور تحقیق میں کمال احتیاط کا یہ نتیجہ نکلا کہ علمائے امت نے درجہ اجتہاد میں ان کو مجتہد مطلق اور امام اعظم کے لقب سے ملقب کیا، اعظم کا لقب کسی اور مجتہد کو نہیں دیا گیا۔

علامہ ابن نجیم المصریؒ اپنی کتاب "الاشباہ والنظائر" میں لکھتے ہیں: ھو کا الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ای ان الصدیق رضی اللہ عنہ اول من آمن من الرجال وابا حنیفۃؒ اول من دوّن الفقہ۔ "یعنی امام اعظم رحمۃ اللہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مانند ہیں، یعنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مردوں میں وہی شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور ایمان لائے، اور امام اعظمؒ بھی وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے فقہ کی تدوین کی"۔ یہی حال امام ابو یوسفؒ کا تھا جو اپنے وقت کے مجتہد تھے، آپؒ نے بھی اجتہاد میں امام ابو حنیفہؒ ہی کی اتباع کی اور بالانفراد اپنے اجتہاد پر اعتماد نہیں کیا، یہ ان کے احتیاط کی دلیل ہے، اور اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی دنیا میں قاضی القضاۃ کا لقب سب سے پہلے آپؒ ہی کو ملا۔

امام سمعانیؒ اپنی کتاب الانساب میں لکھتے ہیں: فاولھم واجلھم ای من اعضاء الشوریٰ قاضی القضاۃ فقیہ العراقین حافظ الحدیث ابو یوسف یعقوب بن ابراھیم وھو اول من دعی بقاضی القضاۃ فی الاسلام واول من وضع الکتب فی اصول الفقہ واملی المسائل ونشرھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ منصب افتاء کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "منصب افتاء علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل، دقیق اور اہم ترین سمجھا گیا ہے، فقہ کی لاکھوں متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا

تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے جو ہر عالم کے بس کی بات نہیں، جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن وذکاوت، خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادۂ تفقہ نہ ہو۔ اس وجہ سے مدارس دینیہ میں افتاء کے لیے شخصیت کا انتخاب نہایت پیچیدہ مسئلہ سمجھا گیا ہے جو کافی غور وفکر اور سوچ بچار کے بعد ہی حل ہوتا ہے اور پھر بھی تجربات کا محتاج رہتا ہے۔

(فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص۲۶)

الغرض فتویٰ نویسی کوئی بچوں کا کھیل نہیں کہ ہر شخص کو اس کا اہل سمجھا جائے اور اُسے فتویٰ دینے کی اجازت دی جائے۔ آجکل حکومتی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے مصنوعی اور نا اہل مفتیوں کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے ابوالفضل اور فیضی مزاج کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ چونکہ ملک عزیز پاکستان ابھی تک اسلامی دارالقضاء والافتاء سے محروم ہے اور نہ برسراقتدار طبقہ کی نظر میں اس کام کی کوئی اہمیت ہے، اس لیے مدارس عربیہ نے حقیقی و اہل مفتی اور غیر اہل مفتی کے مابین امتیاز پیدا کرنے اور امت مسلمہ کی صحیح راہنمائی کے لیے اپنے ہاں دارالافتاء قائم کرکے قابل قدر اور مستند مفتیان کو سائلین کے سوالات کے جوابات دینے کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔

جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں دارالافتاء کا قیام

الحمدللہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ علوم دینیہ کے میدان میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، پورے عالم میں جامعہ حقانیہ کی عظمت وشرافت اتنی پھیل چکی ہے کہ شاید جامعہ حقانیہ کی طرح بے سروسامان، دور افتادہ کسی اور ادارہ کو یہ عظمت حاصل نہ ہو۔ یہاں بطور تحدیث نعمت عرض ہے کہ حقانیہ کی یہ آفاقی شہرت وسائل واسباب کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اللہ کا کرم اور عصر حاضر کے ولئ کامل، بانئ حقانیہ والدی وسیدی شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے اخلاص، مجاہدہ اور دعاؤں کی برکت ہے، حقانیہ کی تاسیس کا نہ کوئی باقاعدہ منصوبہ تھا اور نہ کوئی پروگرام، بلکہ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ عالم اسلام کے عظیم دینی مرکز دارالعلوم دیوبند سے فراغت اور پھر وہاں تدریسی مشاغل میں مصروف رہنے کے دوران رمضان کی چھٹیوں میں اکوڑہ خٹک تشریف لائے، اسی دوران برصغیر پاک وہند تقسیم ہوگیا اور ملکی حالات نے دوبارہ دارالعلوم دیوبند جانے کی اجازت نہ دی، ادھر دیوبند سے ساتھ آئے ہوئے طلباء اور قرب وجوار کے تشنگان علوم نبویہ نے حضرت شیخ

کو اپنے گھر سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد میں اشاعت گاہِ علم ومعارف جامعہ حقانیہ کی تاسیس پر مجبور کر دیا، رفتہ رفتہ طلباء کا ہجوم بڑھتا گیا اور تنگیٔ مسجد کی وجہ سے درس وتدریس کا سلسلہ مزید وہاں جاری رکھنا ناممکن ہو گیا، شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے دل میں اللہ کی طرف سے گویا یہ الہام ہو گیا تھا کہ مسجد سے باہر کھلی جگہ میں حقانیہ کی بنیاد رکھی جائے۔

اس مختصر سی تمہید کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کو مجبوری کی حالت میں الہامی انداز میں وجود ملا، اللہ کے فضل وکرم سے دارالعلوم اور حضرت شیخ الحدیثؒ پر لوگوں کا اعتماد بڑھتا گیا جس کی وجہ سے اطراف واکناف سے محبینِ اسلام کثرت سے آنے لگے، لوگ مسائلِ دینیہ سے واقفیت حاصل کرنے اور اس سلسلہ کے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے دن رات دارالعلوم آتے اور حضرت شیخ الحدیث ان کے مسائل شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں حل فرماتے رہے، اُدھر علاقائی وتدریسی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ حضرتؒ کو عوامی مسائل حل کرنے اور فتویٰ دینے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو گیا اور مستفتی حضرات کو فتویٰ کے حصول کے لیے انتظار کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس ضرورتِ شدیدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالعلوم میں باضابطہ طور پر دارالافتاء کا شعبہ قائم کیا گیا اور بحمداللہ دارالعلوم کے قیام سے لے کر آج تک لاتعداد فتاویٰ کا اجراء ہو چکا ہے جبکہ بعض سائل زبانی سوال کر کے جواب حاصل کر لیتے ہیں، اس کے علاوہ ہزاروں مسائل اور ان کے جوابات رجسٹروں میں درج کیے جا چکے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ اپنی حیاتِ طیبہ میں شعبۂ افتاء کے علاوہ دیگر شعبہ جات کے نگران وانچارج خود ہی تھے، ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی احسان اور حضرتؒ کے اخلاص، خصوصی دعوات کی برکت سے دارالعلوم ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

دارالعلوم حقانیہ کے اوائل میں صرف ایک دارالافتاء تھا بعد میں کام کی زیادتی کی وجہ سے دوسرا دارالافتاء قائم کیا گیا جس میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی صوابدید کے مطابق جید علمائے کرام اور مفتی حضرات افتاء کی ذمہ داریاں نبھانے پر مامور ہیں۔ دارالافتاء میں ریکارڈ شدہ فتاویٰ کی ترتیب کا کام حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نائب مفتی جامعہ حقانیہ کی نگرانی میں درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کے طلباء تحقیق وتخریج اور حذفِ مکررات کی صورت میں شروع ہو کر کافی حد تک ہو چکا تھا کہ حضرت مفتی صاحب موصوف اپنی مجبوریوں کی وجہ سے دارالعلوم

سے تشریف لے گئے اور یہ کام کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا۔

اب پھر مخدومی و محترمی برادر مکرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ مہتمم جامعہ حقانیہ کے حکم پر اور ان کی سرپرستی میں نوجوان عالمِ دین اور جامعہ کے شعبۂ تخصص فی الفقہ الاسلامی کے استاذ مولانا مفتی مختار اللہ صاحب حقانی اور شعبۂ تخصص کے بعض طلباء نے دن رات ایک کرکے اب تک کے جاری شدہ فتاویٰ کی دوبارہ چھان بین کی اور سارا وہ ذخیرہ جو دورِ اول سے رہ چکا تھا مرتب کیا۔

اِظہارِ تشکر اس عظیم کام کے جملہ مراحل کی تکمیل پر ہم اللہ جل شانہٗ کے حضور سجدہ ریز ہوکر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ رب کریم نے اس گرانقدر اور عظیم علمی خزانے کو مکمل کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اُن حضرات مفتیان اور شعبۂ تخصص کے طلباء کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے شبانہ روز محنت اور لگن سے کام کرکے اس بارِ گراں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ہماری دعا ہے کہ ربِّ ذوالمنن ان حضرات کی مساعیٔ جمیلہ کو اپنی بارگاہِ ایزدی میں ثمرات سے نواز کر اس فتاویٰ حقانیہ کو شرفِ قبولیت سے نوازیں اور یہ سلسلہ مزید در مزید تاقیامت قائم و دائم رہ کر ہم سب خُدامِ جامعہ حقانیہ کی مغفرت کا ذریعہ بنے۔ آمین

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

(مولانا) حافظ انوار الحق عفی عنہ

نائب مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ

۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۲ھ / ۵ جون ۲۰۰۱ء

مُفتیانِ حضرات کا مختصر سوانحی خاکہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء کو اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا حاجی معروف گل ولد الحاج میر آفتاب ولد عبدالحمید کے گھر پیدا ہوئے۔ ایک تحقیق کے مطابق آپ کے آباؤ اجداد کا وطنِ اصلی غزنی (افغانستان) ہے۔ ممکن ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ جہاد کی غرض سے ہندوستان آنے والے مجاہدین کے ساتھ آئے ہوں اور پھر یہیں مقیم ہوگئے۔

آپ کے والد ماجد اپنے قصبہ کے خوشحال اور صاحبِ ثروت افراد میں شمار ہوتے تھے، دینی خدمت کے ساتھ تجارت اور کاروبار ان کا ذریعۂ معاش تھا، اس زمانے میں آپ نے دینی غیرت وحمیت کی خاطر منکرات، بدعات اور غیر شرعی امور کے خاتمے کے لیے علماء کا بھرپور ساتھ دیا، یہاں تک کہ اپنے دور کے عظیم مجاہد حاجی صاحب ترنگزئی کے ساتھ تحریکِ جہاد میں ممد و معاون رہے۔

ابتدائی تعلیم وتربیت گھر کے پاکیزہ ماحول اور والدین کے زہد وتقویٰ کی برکت تھی کہ بچپن ہی سے آپ کے دل میں دینی تعلیم کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہوگیا، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور گاؤں کے مشہور بزرگ حاجی صاحب تصابان اور ممتاز بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ سے حاصل کی۔

آپ نے آٹھ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے سفر کا آغاز کیا اور مختلف مقامات پر

جید اور ممتاز علماء کرام سے تعلیم حاصل کی، یہاں تک کہ آپ ۱۳۴۷ھ کو ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، وہاں درسِ نظامی کی باقیماندہ کتابوں کی تکمیل کی اور ۱۳۵۲ھ میں سندِ فراغت حاصل کی۔

دیوبند میں اساتذۂ کرام دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذۂ کرام سے آپ نے استفادہ کیا ان میں سرِفہرست شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہیں، ان کے علاوہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا رسول خان ہزارویؒ، مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا مرتضیٰ حسنؒ، مولانا عبدالسمیع دیوبندیؒ وغیرہ سے بھی آپ نے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

تدریس کا آغاز دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ اپنے آبائی گاؤں اکوڑہ خٹک تشریف لے آئے اور یہاں اپنی ایک چھوٹی سی مسجد (جو اب مسجد قدیم مولانا عبدالحق کے نام سے مشہور ہے) میں مختلف علوم وفنون کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تدریس شروع کی اور صبح وشام درس وتدریس میں مشغول رہے، جلد ہی دور دراز اور قرب وجوار سے شائقینِ علومِ دینیہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے آنے لگے اور آپ کا حلقۂ درس وسیع ہونے لگا، طلباء کی کثرت کی وجہ سے آپ کے والدِ محترم نے اپنے خرچ پر ایک اور جید عالمِ دین کو بطور معاون مدرس مقرر کیا۔

ان ہی دنوں آپ نے انجمن تعلیم القرآن کے نام سے ایک اسلامی سکول کی بنیاد رکھی اس کی ایک ابتدائی تقریب میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ بھی شریک ہوئے اور افتتاح کیا، حضرت مدنیؒ اس کام پر بہت خوش ہوئے اور کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔

دارالعلوم دیوبند میں تقرری یہاں آپ کا حلقۂ درس دن بدن وسیع ہوتا رہا کہ ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ نے آپ کو مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی پیشکش کی جسے آپ نے بخوشی قبول فرمالیا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوی علمی استعداد سے نوازا تھا اس لیے بہت جلد اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھانے لگے اور آپ کا شمار اکابر اساتذہ میں ہونے لگا۔

دارالعلوم حقانیہ کا قیام دارالعلوم دیوبند سے آپ ۱۳۶۶ھ کو رمضان المبارک کی تعطیلات میں

اکوڑہ خٹک تشریف لائے تو اسی دوران (۱۹۴۷ء میں) ہندوستان تقسیم ہو گیا اور مسلمان پاکستان کو اور ہندو ہندوستان کو جانے لگے تو راستے میں لوٹ مارا ور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا جسکی وجہ سے آپ کا دارالعلوم دیوبند واپس جانا مشکل تھا، اس پر حضرت مدنیؒ نے حکومتی سطح پر آپ کو بحفاظت دیوبند پہنچانے کا خصوصی انتظام بھی کیا مگر آپؒ کے والد صاحب اس پر آمادہ نہ ہوئے اور آپ کو دیوبند جانے سے روک دیا۔

اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ جلد ہی اکوڑہ خٹک میں دارالعلوم دیوبند کی نہج پر ایک چشمۂ فیض جاری ہو گیا، آپ نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں توکلاً علی اللہ ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۶ھ کو دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی۔ جس کی ابتداء ایک چھوٹی سی مسجد سے ہوئی مگر اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ یہ ادارہ علوم و معارف کا گنجینہ بنے گا، پھر وہ وقت بھی آیا کہ دارالعلوم حقانیہ کی تبلیغی، تعلیمی اور دینی خدمات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "دیوبند ثانی" کا خطاب دیا۔

بیعت و سلوک

آپ نے عارف باللہ، عظیم مجاہد حضرت حاجی صاحب ترنگزئی رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر چکے تھے، ان کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے مشفق استاد حضرت مدنیؒ سے بیعت کی اور سلوک کے جملہ مراحل ان سے طے کیے۔

دیگر خدمات

آپ نے اپنی پوری زندگی دین اور علوم دین کی ترویج و اشاعت میں گذاری لیکن درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے ملی، سیاسی اور سماجی خدمات میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ آپؒ نے بدعات و رسومات کے خلاف حکیمانہ انداز میں کامیاب جہاد کیا جس کے نتیجہ میں اکوڑہ خٹک اور اس کے گرد و نواح سے بدعات و غیر شرعی رسومات کا خاتمہ ہو گیا۔ فتنۂ خاکسار اور فتنۂ قادیانیت کے تعاقب اور تحفظِ ناموسِ رسالت کے لیے دیگر علماء حق کے دوش بدوش کام کیا۔

اس کے علاوہ آپ نے ملکی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا اور ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں بھاری اکثریت سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ایوان میں شریعت کے نفاذ کے لیے انتھک کوشش کی۔

۱۹۷۷ء میں جب نظامِ مصطفیٰ کی تحریک شروع ہوئی تو باوجود علالت، ضعف اور پیرانہ سالی کے آپ نے اس میں دیگر علماء کے شانہ بشانہ کام کیا ۔۔۔۔ اور خصوصیت کے ساتھ جہادِ افغانستان

میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

طرزِ فتویٰ اور احتیاط

حضرت الشیخ رحمہ اللہ جس طرح ایک عظیم محدث، مدبر سیاست دان اور روحانی پیشوا کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اسی طرح عوام و خواص میں ایک عظیم فقیہ اور محتاط مفتی کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے، لوگ آپ سے بالمشافہ ہزاروں مسائل کا حل طلب کرتے تھے، اپنے ذاتی تنازعات اور گھریلو جھگڑے بھی آپ ہی سے حل کرواتے تھے۔ یہاں مختصراً آپ کے اندازِ فتویٰ اور اس میں احتیاط کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:-

۱۔ آپ کی عموماً یہ کوشش ہوتی کہ سائل کو اس جواب پورا سمجھایا جائے، اس لیے جواب لکھتے وقت بات کھل کر بیان فرماتے اگرچہ بیان طویل ہو جاتا۔

۲۔ فتویٰ لکھتے وقت آپ فقہ حنفی کی مشہور کتب بدائع الصنائع، ہدایہ اور رد المحتار سے استفادہ فرماتے تھے۔

۳۔ فتویٰ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ خود تو کیا دارالعلوم حقانیہ کے دیگر مفتیان بھی جب فتویٰ لکھتے تو انہیں اپنے سامنے سنانے کا حکم فرماتے۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء میں سالانہ چھٹیوں کے دوران ناظم دارالعلوم حضرت مولانا سلطان محمود صاحبؒ نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کا یہ پیغام مجھے پہنچایا کہ چھٹیوں میں یہاں رہ کر دارالافتاء کی خدمت سرانجام دو گے، تو مجھ پر یہ بوجھ بہت بھاری لگا، خود یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی فتویٰ تصویب کے بغیر دے دوں۔ اور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں اس سے قبل مسائل و جزئیات پیش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا، جب میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جو مسئلہ بھی تم لکھو گے تو پہلے مجھے سناؤ گے، یہ اس لیے کہ اگر کوئی جدید مسئلہ ہو تو ذہن میں آجائے۔ اس سے آپ کا مقصد استحضارِ مسائل نہیں بلکہ احتیاط ملحوظ تھی۔ چونکہ کسی بھی مسئلہ جواب آپؒ کو سنائے بغیر بھیجنے کی مجھے اجازت نہیں تھی اس لیے میں مسائل کے جواب لکھ کر حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرتا، اگر آپ تائید فرماتے تو سائل کو وہ جواب بھیجدیا جاتا لیکن دس دن نگرانی کرنے کے بعد جب اعتماد

پیدا ہوگیا تو فرمایا کہ مجھے سننے کا وقت کم ملتا ہے اس لیے سنائے بغیر ہی بھیج دیا کرو۔

۴۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ مسائل کے بیان کرنے یا لکھنے میں ماحول، حالات اور اس کے نتائج و عواقب کا بھی لحاظ رکھتے تھے اور مصلحت کو سامنے رکھ جواب دیا کرتے تھے تاکہ معاشرہ میں بدمزگی پیدا نہ ہو اور لوگ شریعت کے کسی حکم کا مذاق نہ اڑائیں۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب لکھتے ہیں :۔

۵۔ ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم کی سالانہ تعطیلات کے دوران میں نے قضاء عمری کے بارے میں ایک فتویٰ دیا جس میں میں نے قضاء عمری کی روایت کو موضوع ثابت کرنے کے بعد لکھا کہ مروجہ قضاء عمری کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور بدعت قبیحہ ہے ــــ جب آپؒ کو یہ جواب سنایا تو فرمایا کہ جواب تو ٹھیک ہے اس میں کوئی شک نہیں، لیکن ہمارے پٹھانوں کے علاقہ میں لوگ نہایت تدین کی وجہ سے قضاء عمری کے ایسے عاشق ہیں کہ ایسے سخت الفاظ کے نتیجہ میں کہیں طیش میں آکر فتنہ و فساد اور سب و شتم پر نہ اُتر آئیں، اس لیے ان الفاظ میں یوں ترمیم کرو "قضاء عمری کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہمارے اسلاف نے اس کو بدعت میں شمار کیا ہے"۔

۶۔ اسی طرح ایک موقع پر کسی سڑک کی تعمیر میں ایک پرانی قبر سڑک کی زد میں آتی تھی حکومت اس قبر کو مسمار کر کے سڑک کو سیدھا کرنا چاہتی تھی لیکن مقامی لوگ اس پر خوش نہیں تھے۔ جب سرکاری اہلکاروں نے دارالعلوم سے فتویٰ لینا چاہا تو میں نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے مشورہ کیا تو آپؒ نے فرمایا اگرچہ پرانی قبر کو مسمار کرنا از روئے شرع جائز ہے لیکن ہمارے اس فتویٰ سے لوگ مطمئن نہیں ہوں گے بلکہ مذہبی جنون کی وجہ سے شاید یہ لوگ دارالعلوم کو بھی فریق شمار کریں گے، اس لیے اس انداز سے فتویٰ دیا جائے کہ قبر کے اوپر

پُل بنا کر اس پر سے سڑک گزار لی جائے۔ چنانچہ آپ کی اس حسن تدبیر اور حزم و احتیاط کی بدولت سڑک بھی تعمیر ہو گئی اور لوگ بھی شر کیہ اعتقاد سے بچ گئے۔

۷۔ ایک دفعہ کسی صاحب نے تصوف کے سلاسل کے بارے میں سوال کیا تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے جواب میں فرمایا "سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ ایک ہی تالاب کی دو مختلف نہریں ہیں، دونوں کا مخزن اور مرکز ایک ہے، پانی ایک ہے صرف راستے جدا جدا ہیں، دوسرے سلاسلِ تصوف اور مختلف فقہی مذاہب کا بھی یہی حال ہے۔ حنفیت، حنبلیت اور مالکیت سب کو ایک ہی تالاب سے پانی پہنچتا ہے، سب اسی ایک تالاب کے پانی سے دنیا کی سیرابی کرتے ہیں، صرف راستے جدا ہیں، منزل اور مقصد سب کا ایک ہے، بعض لوگ دانستہ طور پر تصوف کے ان سلسلوں اور فقہی مذاہب کو فرقہ واریت پر حمل کر کے دنیا کو گمراہ کرتے اور دھوکہ دیتے ہیں، مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔" (ماہنامہ "الحق" شیخ الحدیث نمبر)

۸۔ اس کے علاوہ آپ مسائل کے جوابات نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں دیا کرتے تھے اور اس میں حوالہ جات کا خصوصیت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ دارالعلوم حقانیہ کے قدیم اساتذہ میں سے ہیں، دارالعلوم میں فوقانی درجات کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ موصوف علمِ معانی، علم اصول اور فقہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اس لیے ہدایہ آخرین، مختصر المعانی، مطول، حسامی اور تلویح و توضیح جیسی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہیں، دورۂ حدیث کی بعض کتابیں بھی آپ کے پاس ہوا کرتی تھیں لیکن مذکورہ کتب میں آپ طلباء کو بلادِ بعیدہ سے بھی کھینچ لاتے تھے۔

پیدائش | آپ ضلع بونیر سوات کے ایک پسماندہ گاؤں باچکڈہ میں پیدا ہوئے، چونکہ قدیم زمانہ میں دیہات میں تاریخ پیدائش لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے آپ کی تاریخ پیدائش دستیاب نہیں ہوسکی، تاہم جناب ہدایت الرحمٰن صاحب، شاکر بونیری اور آپ کے ایک ہمعصر عالم دین مولانا عبدالکریم صاحب ساکن کلیانی کے بیان کے مطابق وفات کے وقت آپ کی عمر ۹۰ سال تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ۱۹۰۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔

خاندانی پس منظر | پسماندگان کے بیان کے مطابق آپ نسلاً "پختون" تھے اور پختونوں کے ایک ذیلی قبیلے "اخون خیل" سے تعلق رکھتے ہیں، یہ قوم جو میاں قوم سے بھی زیادہ شہرت رکھتی ہے سوات میں آباد ہے۔

اخون خیل قبیلہ حقیقت میں ایک بزرگ کے نام کی طرف منسوب ہے جو اخون بابا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کا مزار بونیر کے مشہور قصبہ کابگرام میں واقع ہے، یہی اخون بابا "اخون خیل" قوم کے جدامجد ہیں، یہ قوم برسوں سے بونیر سوات آباد ہے۔

ابتدائی تعلیم | ابتدائی تعلیم آپ نے مختلف مراحل سے گذر کر حاصل کی، آپ اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جن کو اللہ رب العزت نے علم دین کا وافر حصہ عنایت فرمایا۔

آپ کو علم دین حاصل کرنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا، قرآن مجید ناظرہ آپ نے اپنے علاقہ کے مقامی عالم سے پڑھا، اس کے بعد شوق علم کی بدولت آپ نے اپنے علاقے میں (کلیانی، پیلئے، آمنور وغیرہ وغیرہ) میں مختلف علماء سے مختلف ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۵ ہجری میں تکمیل درس نظامی اور علوم نبوت کے حصول نے آپ کو آبائی وطن چھوڑنے اور سفر کی سختیاں اور صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور کیا اور آپ نے اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ہندوستان کی مشہور علمی و دینی درسگاہ دارالعلوم امینیہ دہلی میں داخلہ لیا جس کے اس وقت مہتمم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تھے اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی، دارالعلوم امینیہ میں آپ نے پورے سات سال دین الٰہی سے وابستگی پیدا کرنے میں صرف کیے اور دورۂ حدیث تک آپ نے یہیں استفادہ کیا اور وقت کے عظیم عالم بن کر واپس اپنے گاؤں لوٹے۔

ابتدائی اساتذہ کرام | آپ کے ہمعصر مولانا عبدالکریم صاحب کے بیان کے مطابق جن علماء سے آپ نے استفادہ کیا ان میں مولانا عبدالمالک صاحب سکنہ آمنور، مولانا سید جبّار صاحب باچکنڑ، مولوی محمد فاضل صاحب بیلئے اور مولوی محمد انبیاء کاکاکلیانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ ہندوستان جانے کے بعد وہاں جن علماء کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان میں حضرت العلامہ مولانا عبدالغفور صاحب آف سوات مدرس دارالعلوم امینیہ دہلی اور بعدہٗ اوّلین صدر مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، مولانا سکندر الدین صاحب آف ہزارہ، مولانا خدا بخش مرحوم آف مشرقی پنجاب (ہندوستان) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دورۂ حدیث کی سعادت | ہندوستان کی مایۂ ناز دینی درسگاہ دارالعلوم امینیہ دہلی سے سندِ فراغت حاصل کی، حدیث کی کتابوں میں سے آپ نے بخاری شریف اور ترمذی شریف حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سے پڑھیں، جبکہ مسلم شریف اور ابوداؤد شریف حضرت مولانا ضیاء الحقؒ سے پڑھیں۔

فراغت کے بعد علاقائی قاضی کے عہدہ پر تقرری | دارالعلوم امینیہ دہلی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب آپ اپنے گاؤں واپس آئے تو گاؤں ہی میں آپ نے تدریس کا آغاز کیا، طلباء علوم دینیہ کی آمد شروع ہوگئی۔ اسی اثناء میں آپ کو ریاست سوات کے عہدۂ قضاء کی پیش کش کی گئی جو آپ نے قبول کرلی جس پر آپ کو ریاست سوات کا قاضی مقرر کر دیا گیا اور آپ لوگوں کے فیصلے شریعت کے مطابق کرنے لگے، تین سال تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے، بعد میں سیاسی اختلاف کی بناء پر قضاء کے عہدہ سے آپ کو معزول کر دیا گیا۔

دارالعلوم حقانیہ سے وابستگی | شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ نے آپ کو دارالعلوم حقانیہ آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کرلی اور ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ کو دارالعلوم حقانیہ میں آپ کی تقرری ہوئی۔ بعد میں آپ کی اعلیٰ علمی اور تحریری صلاحیتوں کے پیشِ نظر دارالافتاء کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کردی گئی جو آپ نے نہایت احسن طریقے سے نبھائی، ان کے فتاویٰ کا بہت بڑا ذخیرہ پیشِ نظر

کتاب میں محفوظ ہے، موصوف ہر مسئلہ پر نہایت جامع اور وسیع روشنی ڈالنے اور نہایت سلیس انداز میں فتوی کو براہین کرتے، تحریر نہایت شستہ ہوتی تھی۔

۱۱ شوال ۱۳۷۸ھ کو آپ نے بعض وجوہات کی بناء پر استعفا دے دیا اور جامعہ اسلامیہ (اکوڑہ خٹک) چلے گئے وہاں تقریباً تین سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ اور ۱۰ شوال ۱۳۸۱ھ کو حقانیہ میں آپ کی دوبارہ تقرری ہوئی اور رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو سبکدوش کر دیئے گئے، مجموعی طور پر تقریباً چودہ سال آپ نے دارالعلوم حقانیہ میں افتاء و تدریس کی خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم حقانیہ سے سبکدوشی کی وجوہات

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ مولانا مودودی کے نظریات اور ان کی تحریرات و آراء سے بہت زیادہ متاثر تھے جس کا اظہار آپ نجی محافل کے علاوہ عموماً دوران درس بھی کرتے تھے، دارالعلوم حقانیہ کا ماحول اکابر علماء دیوبند کے افکار و نظریات کے زیر اثر تھا اس لئے انکی تدریسی صلاحیتوں کی بناء پر حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ حق الوسع آپ سے صرفِ نظر کرتے رہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ مولانا سید گل بادشاہ طورڑو وغیرہ سب اکابر کا دارالعلوم حقانیہ سے نہایت عمیق تعلق تھا۔ اور مودودی نظریات رکھنے کی بناء پر انہیں دارالعلوم حقانیہ سے الگ کرنے پر مُصر تھے۔ ادھر آپ اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کرتے ہوئے بعض طلباء کو ہم خیال بنانے کی کوشش میں رہے لیکن مجموعی طور پر آپ کو اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے مجلات اور رسائل میں مضامین اور مستقل تصانیف کے ذریعہ بھی اکابر علماء امت کے مودودی صاحب پر اعتراضات کے جوابات اور ان کا دفاع کرنے لگے، اور دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد تو آپ کی تحریرات میں جذباتی ردِ عمل کا ثبوت بھی ملتا ہے اور اسلاف کے مسلّمہ مؤقف سے متصادم مؤقف کی شدت سے ترجمانی کرنے لگے۔

آخر کار حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ العزیز نے اکابرین کی خواہش اور ان حالات کے پیشِ نظر رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو انہیں دارالعلوم حقانیہ سے الگ کر دیا۔

اس کے بعد راولپنڈی وغیرہ کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر پشاور کے مدرسہ حدیقۃ العلوم میں منتقل ہوگئے اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے ۔

تلامذہ آپ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے ، دارالعلوم حقانیہ میں قیام کے زمانہ میں ہزاروں طلباء اور فضلاء آپ سے مستفید ہوئے ۔ دارالعلوم حقانیہ کے موجودہ نامور اساتذہ میں سے حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ حضرت العلامہ مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب المدنی اور مولانا عبدالحلیم دیر وی استاذ تفسیر دارالعلوم حقانیہ وغیرہ بھی آپ کے شاگرد ہیں ۔

حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ

ولادت آپ یکم شوال المکرم ۱۳۴۴ھ بمطابق اپریل ۱۹۲۶ء بروز جمعہ بوقت طلوع فجر مولانا حبیب اللہ صاحب کے گھر زروبی ضلع صوابی میں پیدا ہوئے ، آپ کے والد محترم مولانا حبیب اللہ صاحب ایک جید اور متبحر عالم دین تھے ، بعض فنون اور کتابوں میں آپ کی علمی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں کے علاوہ بلوچستان اور افغانستان کے طلباء بھی آپ کے حلقۂ درس میں پہنچتے اور کسبِ فیض کرتے ، اور آج بھی ان علاقوں کے بڑے بڑے علماء بلاواسطہ یا بالواسطہ ان کے شاگرد ہیں ۔

چونکہ گھر میں علمی ماحول تھا اس لیے آپ کو حصولِ علم کے لیے ابتداء میں سفر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ، فنون کی تمام کتابیں از ابتداء تا انتہاء اپنے والدِ محترم ہی سے پڑھیں ۔ ۱۳۶۸ھ میں جب آپ کے والد محترم وفات پاگئے تو آپ نے منطق و فلسفہ اور ریاضی کی منتہی کتابیں حضرت العلامہ مولانا خان بہادر صاحب عرف مارتونگ مولانا صاحب ، حضرت مولانا محمد نذیر صاحب چکیسر اور حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب شاہ منصور اور بعض دیگر اساتذہ سے پڑھیں ، حدیث میں کتب صحاح ستہ آپ نے محدثِ کبیر حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتوی قدس سرہ سے پڑھیں اور

۱۳۷۱ھ بمطابق ۱۹۵۲ء کو اکابر اساتذہ نے آپ کو دستار فضیلت سے نوازا۔ مولانا غورغشتوی کے علاوہ دارالعلوم حقانیہ کے بانی و مہتمم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ نے بھی آپ کو کتب حدیث پڑھانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

تدریس اور افتاء تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے گاؤں زروبی میں آبائی درس گاہ میں پڑھانا شروع کیا، ایک سال کے بعد اکوڑہ خٹک کی معروف دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ کے منتظمین کی دعوت اور اصرار پر بحیثیت مدرس جامعہ اسلامیہ تشریف لائے، یہاں آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کا کام بھی شروع کیا اور سات سال تک بحیثیت مدرس و مفتی خدمات انجام دینے کے بعد بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر مستعفی ہوکر دارالعلوم اسلامیہ چارسدہ چلے گئے۔ یہاں آپ صدر المدرسین اور استاذ الحدیث کی حیثیت سے لائے گئے تھے، چنانچہ تین سال تک مختلف علوم و فنون کی کتب کے علاوہ صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد آپ کے زیر درس رہیں اور ساتھ ساتھ افتاء کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۹۶۶ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیوبند ثانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول فرمالی۔ ۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم حقانیہ میں آپ کی تقرری ہوئی اور آپ دارالعلوم حقانیہ تشریف لے آئے ۔۔۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب نے ایک دفعہ مولانا سمیع الحق صاحب سے فرمایا کہ جب حضرت مولانا مرحوم نے مجھے دارالعلوم حقانیہ آنے کی دعوت دی تو میں استخارہ کا سوچ ہی رہا تھا کہ رات کو خواب میں دیکھا کہ دارالعلوم حقانیہ کے بیرونی گیٹ پر ایک بڑا بورڈ یا بینر لگا ہے جس پر نہایت نمایاں الفاظ میں آیت کریمہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا لکھی ہوئی ہے، اس کے بعد فوراً شرح صدر ہوا اور دارالعلوم آنے کی دعوت قبول کرلی۔

دارالعلوم حقانیہ میں تقریباً تیس سال (۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۵ء) تک درس و تدریس اور افتاء کی خدمت انجام دی، اس طویل عرصہ میں آپ نے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں، عموماً نماز جامع مسجد دارالعلوم میں آپ خود پڑھاتے، ایک دن ( ) نماز فجر کے دوران آپ پر فالج کا حملہ ہوا جس سے زبان اور جسم کا کچھ حصہ متاثر ہوا، ہر ممکن علاج معالجہ کے باوجود آپ تدریس و افتاء کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہوسکے اور دارالعلوم حقانیہ آپ کی

اعلیٰ خدمات سے محروم ہو گیا۔

بیعت آپ ۱۳۶۹ھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا خواجہ عبدالمالک صدیقیؒ سے قادری، چشتی، نقشبندی تینوں سلسلہ میں بیعت ہوئے، جلد ہی شیخ کی طرف سے بیعت کرنے کی اجازت مل گئی، چنانچہ اصلاحِ باطن کے لیے علماء، طلباء اور عوام کی کثیر تعداد آپ سے بیعت ہونے لگی۔

تصانیف ایک مقبول مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بلند پایہ مصنف بھی ہیں۔ آپ کی کئی تصانیف و تالیفات طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو کہ علمی و دینی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں: (۱) ھدایۃ القاری شرح صحیح البخاری پہلا حصہ (۲) منہاج السنن شرح جامع الترمذی ۵ جلد (۳) العقائد الاسلامیہ (۴) البشریٰ (۵) المقالات (۶) مسائلِ حج (۷) رسالۃ التوسل —— ان کے علاوہ آپ کے سینکڑوں فتاویٰ، مقالات اور وقیع علمی مضامین بھی دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ "الحق" میں چھپتے رہے ہیں جو اس مجموعہ (فتاویٰ حقانیہ) میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

قضاء و افتاء جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ آپ ایک جیّد مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مفتی بھی ہیں، دارالعلوم حقانیہ میں عرصہ دراز تک صدر مفتی کے عہدہ پر فائز رہے ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کی علمی عظمت و مرتبہ کی وجہ سے ملک اور بیرونِ ملک میں آپ کے فتاویٰ کسی بھی مسئلے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ نہایت مختصر مگر جامع فتویٰ لکھتے ہیں جو کہ فقہ پر آپ کے عبور کا بیّن ثبوت ہے۔ اتنے بڑے دینی ادارے کے صدر مفتی ہونے اور ہزاروں فتاویٰ لکھنے کی بناء پر اگر آپ کو مفتی اعظم سرحد کہا جائے تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہ ہو گی۔

چونکہ آپ دارالعلوم حقانیہ میں عرصہ دراز تک دارالافتاء کی خدمت پر فائز رہے ہیں اس لیے آپ کے فتاویٰ کی تعداد دارالعلوم کے دوسرے تمام مفتیانِ کرام سے زیادہ ہے۔ ہر ایک مفتی کا فتویٰ دینے کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے جو اس کے ہر فتویٰ میں جھلکتا ہے حضرت مفتی محمد فرید صاحب دام ظلہٗ کے ہزاروں فتاویٰ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے فتاویٰ کا انداز

اورخصوصیت محسوس کی گئی وہ مختصر الفاظ میں درج ذیل ہے:-

(۱) آپ کے تمام فتاویٰ میں نہایت ہی ایجاز و اختصار ہوتا ہے اور آپ اطناب سے بھی پہلوتہی فرماتے ہیں۔ تاہم فتویٰ کی نوعیت کے اعتبار سے اگر ضرورت محسوس فرماتے ہیں تو بقدرِ ضرورت تفصیل بھی فرما دیتے ہیں، لیکن آپ کے جن فتاویٰ میں ایجاز و اختصار ہوتا ہے اہلِ علم حضرات کو ان کے سمجھنے میں کوئی دقت یا دشواری پیش نہیں آتی بلکہ ایجاز و اختصار اہلِ علم حضرات کے لیے ایک عجیب علمی رونق اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔

(۲) کمال فقاہت سے باریک قیود ذکر فرما کر مسئلے کو جامع بنا دیتے ہیں تاکہ اس بنیاد پر کوئی اپنے لیے غلط استدلال نہ کر سکے اور مسئلہ بھی پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اس احتیاط کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا فتویٰ ایک قانونی دستاویز اور آئینی دفعہ کی طرح جامع اور مختصر ہوتا ہے۔

(۳) آپ کے فتوؤں میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ آپ کو فقہی جزئیات پر مکمل عبور حاصل ہے، آپ فتویٰ لکھتے وقت پہلے معتبر فقہی جزئیات سے استدلال کرتے ہیں، گویا فتویٰ نویسی میں آپ انہی جزئیات کو بنیاد و اساس بناتے ہیں۔ ہاں اگر کسی مسئلے میں قرآنِ پاک کی کوئی واضح نص یا احادیثِ مبارکہ میں سے کوئی صحیح حدیث موجود ہو جو حکم کو ذکر کرتی ہو تو اس کو بھی بطورِ دلیل کے ذکر فرماتے ہیں۔ اور اگر کسی مسئلے میں قرآن و حدیث سے کوئی واضح حکم موجود نہ ہو یا کوئی فقہی جزئیہ موجود نہ ہو تو آپ قواعد کلیہ و اصول کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے مطابق حکم فرماتے ہیں۔

(۴) مسندِ افتاء پر فائز ہوتے ہوئے یہ ضروری نہیں کہ آپ کا فتویٰ جزئیات کے نقل کرنے تک محدود رہے بلکہ کبھی کبھار آپ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش رو فقہاء و مفتیانِ دین سے اختلاف کا اظہار فرما دیتے ہیں، تاہم بغیر کسی سند اور حوالے کے فتویٰ نہیں دیتے بلکہ اس میں مضبوط دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔

(۵) آپ کے فتویٰ میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ جہاں کہیں حوالہ دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو زیادہ تر شامی، عالمگیری، بدائع الصنائع، البحر الرائق اور دوسرے قدیم فقہی ذخائر

کا سہارا لیتے ہیں، تاہم جدید مسائل میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تحقیقات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ آج کا دور جدید دور ہے اور نت نئے مسئلے سامنے آتے رہتے ہیں، ایسے مسائل میں بھی دیگر اہلِ علم کی طرح آپ کے فتاویٰ بھی موجود ہیں، مثلاً بیمہ زندگی، انعامی پرائز بانڈ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت العلّامہ مولانا عبدالحلیم زروبوی صاحب رحمہ اللہ

ولادت اور ابتدائی تعلیم آپ ۱۹۰۸ء کو مولانا خلیل الرحمٰن کے ہاں موضع زروبی (صوابی) میں پیدا ہوئے۔ انتہائی کمسنی ہی میں آپ تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پرائمری تک سکول پڑھنے کے بعد خاندانی روایت کے مطابق فارسی نظم اور صرف و نحو کے ابتدائی رسائل اپنے والد بزرگوار سے شروع کیے، والدین بزرگوار نے جب اپنی فراستِ ایمانی سے آپ کے چہرے پر ذہانت و فطانت کے آثار دیکھے تو فرمایا کہ "میرا یہ بچہ انشاء اللہ بہت بڑا عالم و فاضل بنے گا کیونکہ اس کی جبین سے علم و فضل کا نور جھلکتا دکھائی دے رہا ہے"۔ آپ فطرتاً انتہائی کم گو اور عزلت پسند طبیعت کے مالک تھے، اسی وجہ سے ہمہ تن اور ہمہ وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔

مختلف ابتدائی رسائل، فارسی نظم اور کافیہ تک کتابیں اپنے علاقہ میں پڑھنے کے بعد علاقہ چھچھ تشریف لے گئے اور وہاں پر بمقام ویسہ اور جلالیہ میں شرح جامی اور الفیہ و سعدیہ کی تکمیل۔ ان ہر دو مقامات پر علمِ نحو و صرف کا مشہور درس ہوا کرتا تھا اور مختلف مقامات کے طلباء یہاں پر صرف و نحو کی کتابیں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔

بعدازاں آپ علاقہ دوابہ ضلع پشاور کے موضع صریخ آئے اور یہاں پر مشہور عالمِ دین مولانا صاحب حق صاحبؒ صریخ سے منطق کے چند رسائل اور بعض بڑی کتابوں میں درس لیا۔ یہاں کا درس علمِ منطق میں مشہور تھا اور دور دراز سے یہاں پر شائقین علمِ منطق اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔

چونکہ اس زمانے میں اس علاقہ میں باقاعدہ مدارسِ دینیہ کا رواج نہ تھا صرف مسجدوں

میں علمی درس ہوا کرتے تھے، اس لیے طالبانِ علمِ دین ان درسوں میں شرکت کے لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مختلف کتابیں پڑھنے کے لیے جاتے۔ اس لیے حضرت صدر صاحب رحمہ اللہ نے کچھ عرصہ موضع شاہ منصور میں مولانا عبدالرزاق صاحبؒ عرف لالہ مولوی صاحبؒ سے استفادہ کیا، علاوہ ازیں مردان میں مولانا سمندر خان صاحبؒ سے بھی بعض روایات کے مطابق مستفید ہوئے۔

موضع کڈی جو کہ صوابی کے قریب ایک گاؤں ہے یہاں پر استاذِ کل حضرت مولانا عبدالرؤف صاحبؒ سے علمِ نحو اور کئی دوسری کتابوں میں درس لیا۔

مختلف مواضعات اور درسوں میں شرکت کرنے کے بعد آپ علاقہ چھچھ کے مشہور موضع غورغشتی تشریف لائے اور یہاں پر علامہ دوراں حضرت مولانا قطب الدین صاحب غورغشتویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، مولانا قطب الدین صاحبؒ کی نگاہِ شفقت ہمیشہ آپ پر مرکوز رہی، اس لیے کہ آپ نہ صرف ایک ذی استعداد اور ذہین و فطین طالب علم تھے بلکہ علامہ صاحبؒ حضرت صدر صاحبؒ کے نانا مولانا شاہ صاحبؒ کے شاگرد بھی تھے۔ یہاں پر ان سے آپ نے سلّم العلوم، ملاحسن، نورالانوار، غلام یحییٰ، قاضی مبارک، امورِ عامہ اور خیالی جیسی اہم کتابوں میں درس لیا، حضرت علامہ صاحبؒ کو اپنے اس ہونہار شاگرد اور تلمیذِ رشید کی ذہانت و فطانت پر از حد ناز تھا اور بعض کتابیں باوجودیکہ آپ کے پاس وقت نہیں تھا، آپ کو پڑھائیں اور سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے ؎

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

بعد ازاں آپ موضع گیدڑپور ضلع ہزارہ تشریف لے گئے اور وہاں پر حضرت مولانا قاضی غلام نبی صاحب رحمہ اللہ محشی حمد اللہ سے منطق اور دوسری فنون کی کتابوں میں درس لیا۔ حضرت صدر صاحبؒ ان کے ہاں جتنی مدت رہے اُن کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ان سے استفادہ کا کافی موقعہ ملا۔ آپ نے ان سے شرح عقائد، سبع المعلقات، مفتاح العروض، میبذی، صدرا اور حمد اللہ وغیرہ کتابیں پڑھیں اور ان کی زندگی کے آخری لمحات تک ان سے

وابستہ رہے۔

گیدڑپور سے واپسی پر آپ اپنے ماموں مولانا محمد صاحب قدس سرہٗ کے ساتھ چکوال چلے گئے اور وہاں پر مختصر المعانی، مطول، مشکوٰۃ شریف، جلالین اور بست باب (ریاضی) پڑھیں۔

ان تمام ادوار میں ضعف و نقاہت اور بیماری آپ کے بدن کا جزو لاینفک رہی لیکن اس کے باوجود یہ تمام عوارض آپ کے شوق علم کے سامنے زنجیر پا ہونے کی بجائے ریت کی دیوار ثابت ہوئے اور جس غرض اور لیلائے مقصود کی تلاش میں نکلے تھے اس کے حصول میں مگن رہے ؎

دست از طلب نہ آرم تا کام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

فنون کی تکمیل کے بعد آپ نے جامعہ انسانیت، برصغیر کی عظیم اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۵۱ھ میں داخلہ لیا۔ وہاں پر آپ نے صحاح ستہ و دیگر کتب فقہ، تفسیر و حدیث مجاہد حریت اسیر مالٹا شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا رسول خان ہزارویؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ وغیرہم حضرات سے پڑھیں۔ موقوف علیہ اور دورۂ حدیث پڑھ کر آپ نے ۱۳۵۳ھ میں سندِ فراغت حاصل کی۔

تدریسی سفر کا آغاز

۱۳۵۴ھ میں آپ نے مدرسہ رحیمیہ دہلی سے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا، جہاں ابتداء ہی سے اہم کتابوں کی تدریس آپ کو تفویض کی گئی اور بہت جلد آپ کا شمار کامیاب مدرسین میں ہونے لگا۔

۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ہند عمل میں آئی تو آپ دوبارہ دہلی نہ جا سکے اور اپنے ہی گاؤں میں محلہ کی مسجد بھائی خیل میں حسبۃً للہ درس شروع کیا، دور دراز سے طلباء آپ کے درس میں شرکت کے لیے آتے۔ بیضاوی شریف اور خیالی و شرح عقائد جیسی مغلق اور مہتم بالشان کتابوں کی تدریس میں آپ کا بہت شہرہ تھا۔ اس کے بعد آپ کچھ عرصہ کے لیے ملکھڈ (ضلع اٹک) تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی پر جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک میں خدمتِ تدریس پر مامور ہوئے۔

دارالعلوم حقانیہ آمد

خرابیٔ صحت کی بناء پر آپ جامعہ اسلامیہ سے اپنے گاؤں آگئے اور وہاں پر بشرطِ صحتیابی پڑھاتے رہے اور ذریعہ معاش کے طور پر مطب کھولا۔ جب حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کو معلوم ہوا تو آپ کو مؤرخہ ۱۵ شوال ۱۳۶۸ھ کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک لے آئے مگر یہاں بھی خرابیٔ صحت درس و تدریس میں حائل رہی اور چار ماہ بعد مؤرخہ ۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۹ھ دوبارہ اپنے گاؤں تشریف لے آئے، اس دوران آپ اپنے علاج میں مصروف رہے۔

دارالعلوم مظہرالعلوم کھڈہ کراچی

علاج معالجہ اور تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر آپ کراچی تشریف لے گئے۔ محدثِ عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ آپ کے خصوصی مراسم تھے اس لیے انہی کے مشورہ اور تعاون سے آپ دارالعلوم مظہرالعلوم کھڈہ میں مدرس مقرر ہوگئے۔

دارالعلوم حقانیہ دوبارہ تشریف آوری

کراچی سے واپسی کے بعد کچھ عرصہ گاؤں میں رہے، اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہٗ کی خواہش پر ۲۷ شوال المکرم ۱۳۷۷ھ کو دوبارہ دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے اور تادمِ واپسیں دارالعلوم حقانیہ میں ہی خدمتِ دینِ متین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کوشاں رہے۔ اس دوران دُوسرے اداروں اور مدارس سے بڑی بڑی پیشکشیں ہوئیں جنہیں آپ نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میرا مقصد حصولِ دین ہے نہ کہ حصولِ معاش، اور خدمتِ دین یہاں پر بطریقہ احسن ہو رہی ہے ــــ یہاں دورۂ حدیث میں مسلم شریف، بخاری شریف جلد ۲، تفسیر میں بیضاوی اصولِ فقہ میں تلویح توضیح اور مسلّم الثبوت زیرِ درس رہیں، اس کے علاوہ شرح عقائد خیالی اور جلالین شریف بھی پڑھائیں۔

بیعت وارادت

دورانِ قیام دیوبند آپ کا تعلق بیعت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ تھا۔ بعدازاں آپ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیرالدین صاحب غورغشتویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، قریب تھا کہ شیخ آپ کو خلافت سے نوازتے کیونکہ آپ نے تمام اسباق مکمل کر لیے تھے، لیکن شیخؒ کا وقتِ موعود

آن پہنچا اور یوں اپنے شیخؒ سے خلافت کی تمنا دل میں ہی رہ گئی ۔

قطب الارشاد حضرت مولانا خواجہ عبدالمالک صاحب صدیقی آف خانیوال جن کے حلقہ ارادت میں علماء و صلحاء شامل تھے اور خود شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ بھی آپ کے خلفاء میں سے تھے اس لیے جب کبھی آپ صوبہ سرحد کے دورہ پر تشریف لاتے تو ایک رات قیام کے لیے ضرور دارالعلوم حقانیہ ورود فرماتے، اس دوران علماء، صلحاء اور مریدین و مسترشدین کا ایک جم غفیر خانقاہ اشرفی کا عجیب و غریب منظر پیش کرتا۔ چنانچہ اپنے دونوں شیوخ (شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الحدیث مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ) کی وفات کے بعد آپ نے حضرت خواجہ صاحبؒ سے بیعت کا عندیہ ظاہر کیا تو پہلے ہی مراقبہ میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔ بعدازاں سفر افغانستان کے دوران مجددی خاندان کے مشہور بزرگ اور پیر طریقت حضرت ضیاء المشائخ مولانا محمد ابراہیم جان المجددیؒ نے بھی آپ کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں اجازت دی تھی اور خرقہ بھی عطا فرمایا تھا ۔

سفر سعادت ہر مسلمان کی طرح آپ کی بھی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ مہبط وحی دیار رسولؐ اور گذرگاہ جبریل امینؑ کی زیارت نصیب ہو، ایک سچے عاشق رسولؐ کی طرح آپ کے دل میں بھی یہ تڑپ تھی کہ ایک بار اس حیات مستعار میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہو جاؤں، چنانچہ دس سال تک آپ مسلسل درخواست دیتے رہے تاآنکہ آپ کی منظوری آئی اور شاداں و خراماں اس سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے ۔

تلامذہ آپ اپنے مضبوط حافظہ اور قوی استعداد کے باعث دوران طالب علمی ہی سے فارغ اوقات میں طلبہ کو کتابیں پڑھاتے رہے اور فراغت کے بعد تو ہمہ تن اس اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہو گئے، سوائے ان اوقات کے جن میں آپ صاحب فراش رہے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا، تو اس حساب سے محتاط اندازے کے مطابق آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ مجاہد کبیر اور جہاد افغانستان کے مدارالمہام مولانا جلال الدین حقانی، مولانا محمد یونس خالص، مولانا سید شبیر علی شاہ صاحب شیخ الحدیث والتفسیر و فاضل مدینہ یونیورسٹی، مولانا فضل الرحمٰن بن مولانا مفتی محمود صاحبؒ، مولانا عبدالغنی صاحب ایم این اے، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب،

مولانا عبدالخالق رحمانی کراچی، مولانا احمد گل حقانی شہید قابلِ ذکر ہیں ۔

اندازِ فتویٰ جیسا کہ تفسیر و حدیث، فقہ اور عقائد و معقولات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ و ارفع مقام سے نوازا تھا اسی طرح فتاویٰ کی اکثر کتابیں بھی آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں فتاویٰ قاضی خان، شامی، عالمگیری، ہدایہ، البحرالرائق اور فتح القدیر کی بعض عبارتیں آپ کو ازبر تھیں مگر چونکہ افتاء وغیرہ آپ کا شعبہ نہ تھا اس لیے آپ کے فتاویٰ کی تعداد بہت قلیل ہے۔ آپ کے فتاویٰ زیادہ تر عقائد و کلامیات کے متعلق ہوتے اور انہی استفسارات کے بارے میں آپ جواب تحریر فرماتے، اور خاص کر وہ معرکۃ الآراء مسائل جن میں علماء و مدرسین حضرات کو الجھنیں پیش آتیں آپ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ فتاویٰ عام اذہان کے فہم سے بالاتر ہوتے، البتہ عام استفسارات کے متعلق آپ کا جواب انتہائی واضح، دوٹوک اور مدلل و مفصل ہوتا ۔

تصانیف گو کہ آپ علمی دنیا میں ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے اور ایسے لطیف و باریک نکات دورانِ درس بیان فرماتے کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی، لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی کسی تصنیف یا تالیف کا ارادہ ظاہر نہ فرمایا۔ چنانچہ راقم نے ارادہ کیا کہ آپ کی حیات ہی میں آپ کے معتمد اور ثقہ تلامذہ سے آپ کی تقریریں اور درسی افادات منگوا کر ان پر کام شروع کیا جائے اور خود بھی حضرت صدر صاحبؒ کی توجہ اس اہم ضرورت کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن حضرتؒ کی خاکساری ملاحظہ ہو کہ باوجود اس علمی تفوق و تعمق کے ارشاد فرماتے کہ "حضرات اکابر کی بیسیوں تصانیف کی موجودگی میں میری کسی تصنیف یا تالیف کی کیا وقعت ہو گی اور ان حضرات کی تصنیفات یا تالیفات میں کون سی تشنگی باقی ہے کہ میں اس کو پُر کر دوں"۔ لیکن بالآخر بندہ کے شدید اصرار پر آپ نے حامی بھر لی۔ مسلم شریف کتاب الایمان کا کافی حصہ بندہ نے دورانِ درس قلمبند کیا تھا وہ مسودہ آں محترم کے حوالہ کیا، آپ نے اس پر نظرِ ثانی اور اس کی تبییض کرنے کا آغاز کیا، لیکن بقول شاعر ؎

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ
تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

ابھی آپ نے لکھنے کا ارادہ فرمایا ہی تھا کہ نامعلوم وجوہ کی بناء پر دائیں ہاتھ میں درد شروع

ہوگیا، تقریباً چار ماہ اسی دردوکرب میں گذارے، بہر حال وہ کام تشنۂ تکمیل رہا۔

(۱) **آمالی ترمذی** دورانِ تعلیم دارالعلوم دیوبند آپ نے اپنے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے ترمذی شریف کے افادات اور آمالی قلمبند کیے تھے بندہ نے اس کی تخریج وغیرہ کا کام شروع کیا ہے، انشاء اللہ بہت جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوں گے۔

(۲) **تقریر مسلم شریف** آپ کے تلامذہ دورانِ درس آپ سے مسلم شریف کی تقریر قلمبند کرتے رہے، بندہ نے بھی "کتاب الایمان کا کافی حصہ قلمبند کیا ہے، اس کے علاوہ کتاب الایمان اور مقدمہ مسلم شریف بشمول کتاب البیوع بندہ کے پاس محفوظ ہے۔

(۳) **تقریر بیضاوی شریف** تفسیر بیضاوی شریف پر آپ کے درسی افادات اور آمالی آپ کے مختلف تلامذہ کے پاس موجود ہیں۔

(۴) **حل مُغلقات مسلم الثبوت** تلویح وتوضیح اور مسلم الثبوت کے مشکل مقامات کی توضیح وتشریح پر مشتمل افادات۔

(۵) **مباحث کلامیہ بخاری ج ۲** بخاری شریف میں جہاں پر علم کلام سے متعلق بحث ہے حضرت صدر صاحبؒ نے اپنی شانِ تکلم سے بہت خوبصورت اور دلنشیں انداز میں اس کی تشریح کی ہے۔

(۶) **آمالی شرح عقائد وخیالی** آپ جس وقت اپنے گاؤں میں درس دیتے تھے اُس وقت کے تلامذہ نے شرح عقائد وخیالی کے افادات آپ سے قلمبند کیے۔

(۷) **افاداتِ حلیم** راقم نے یہ مختصر رسالہ جو کہ بخاری شریف کی آخری حدیث کی تشریح اور مسلم شریف کے باب الکبائر واکبرہا پر مشتمل ہے، اور ساتھ ساتھ حضرت صدر صاحبؒ کی مختصر سوانح[۱] بھی اس میں شامل ہے، شائع کیا ہے۔

اولاد آپ کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں، بڑے صاحبزادہ مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی دارالعلوم حقانیہ میں مدرس ہیں اور دوسرے دو صاحبزادے محمد اسمٰعیل اور عبدالحفیظ تجارت وغیرہ سے وابستہ ہیں۔

---

[۱] آپ کے مفصل حالاتِ زندگی اور مکمل سوانح جاننے کے لیے "حیات صدر المدرسین" مؤلفہ مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی ملاحظہ ہو۔

سفرِ آخرت ۶ جنوری ۱۹۸۳ء کو آپ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء، صلحاء، طلباء اور عوام الناس نے شرکت کی۔ رحمہ اللہ

حضرت مولانا مفتی محمد علی سواتی رحمہ اللہ

نام و نسب و جائے پیدائش مولانا محمد علیؒ ۱۹۱۹ء کو جناب عنایت اللہ صاحب کے گھر موضع خوازہ خیلہ ضلع سوات مالاکنڈ ڈویژن میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ آپ نے ابتدائی تعلیم سوات میں حاصل کی، آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالرشید صاحب، مولانا محمد صدیق صاحب، مولانا مفتاح الدین صاحب کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان حضرات سے آپ نے مطول، مختصر المعانی، شرح عقائد، کافیہ اور شرح جامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم اور اساتذہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۴۳ء میں آپ مظاہر العلوم سہارنپور (ہند) تشریف لے گئے، وہاں آپ نے تین سال تک مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد دورۂ حدیث سے فراغت کی سند حاصل کی۔

دورۂ حدیث میں آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ صدر المدرسین مظاہر العلوم اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، مہتمم مظاہر العلوم جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں شامل ہیں۔

تدریسی خدمات فراغت کے بعد ایک سال آپ نے دارالعلوم سہارنپور میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے، تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے وطن (پاکستان) آ گئے اور حکمت آباد چارسدہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو کہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ ۱۹۵۵ء میں بحیثیت مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں آپ کی تقرری ہوئی اور آخری دم تک یہاں سلسلۂ تدریس جاری رہا۔

اولاد آپ کی اولاد میں مولانا عبد الصمد، مولانا عبدالاحد اور مولانا صدیق احمد جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے فاضل ہیں۔

فقہی مقام آپ اپنے وقت کے نامور فقیہ تھے۔ ہدایہ آخرین جیسی مشکل کتاب پڑھانے میں خاص مہارت رکھتے تھے جس کی وجہ سے دور دراز کے طلباء آپ سے ہدایہ پڑھنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک آتے تھے۔ آپ اپنے وقت میں ایک خاص حلقے کے اندر فقہ کے امام سمجھے جاتے تھے۔

فقہ کے علاوہ آپ علمِ معانی اور علمِ نحو سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔

سفرِ آخرت ۱۱ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ کو آپ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ آخرین" کے درس سے فارغ ہو کر اٹھ ہی رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور کتاب ہی پر سر رکھ کر بیٹھ گئے اور دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ یوں آپ ۷۱ برس کی عمر میں آپ اپنے رب کے پاس پہنچ گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

حضرت مولانا مفتی قاضی انوارالدین صاحب مدظلہ

نام و نسب مولانا قاضی انوارالدین صاحب قاضی زین العارفین کے گھر ۱۹ ء کو اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے، قاضی زین العارفین صاحب قاضی نظیف الدین کے فرزند تھے نسب کے لحاظ سے آپ حسنی سادات میں سے ہیں۔

خاندانی پس منظر قاضی صاحب کی تحریرات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کے آباؤ اجداد علمی لحاظ سے اچھی شہرت کے حامل رہے ہیں۔

قاضی صاحب کے آباؤ اجداد اشاعتِ دین کے لیے مدینہ منورہ سے نکلے اور بلخ و بخارا میں علمِ دین کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے فرغانہ کی طرف چلے گئے۔

آپ کے آباؤ اجداد نے اپنی علمی بصیرت کی وجہ سے ظہیرالدین بابر کے دربار میں نمایاں مقام پایا، جب بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو قاضی صاحب کے اسلاف منصبِ قضا

پر فائز تھے۔

پہلے افغانستان اور پھر ظہیرالدین بابر کے ساتھ ہندوستان آنے کے بعد آپ کے اسلاف مختلف ادوار میں منصبِ قضاء پر فائز رہے اور حق کی اشاعت کرتے رہے، بابر کے لیے مختلف خدمات اور وفاداریوں کی وجہ سے بابر کے دربار میں صاحبِ مقام لوگ تھے ___ قاضی انوارالدین صاحب خود بھی منصبِ قضاء پر فائز ہیں اور اکوڑہ خٹک میں اپنے فرائض بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز اکوڑہ خٹک ہی سے کیا اور دارالعلوم حقانیہ کے شعبہ "تعلیم القرآن سکول" سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیم القرآن سکول میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے مدرسہ تعلیم القرآن میں جاری کردہ "درجہ عربیہ" مولانا قاضی حبیب الرحمٰن صاحب فاضل دیوبند سے پڑھا۔ اس درجہ میں صرف، نحو، منطق، فقہ اور اصولِ فقہ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، بعض ابتدائی کتابیں اپنے والدمحترم سے پڑھیں۔ کافیہ، شرح جامی اور ھدایۃ الحکمۃ وغیرہ اکوڑہ خٹک ہی میں حضرت مولانا سید محمد کرم علی شاہ المعروف باچاگل صاحب سے پڑھیں۔

اساتذہ کرام آپ کے ابتدائی اساتذہ کرام مندرجہ ذیل ہیں:۔
(۱) شیخ غلام حیدر صاحب (۲) شیخ محمد عمر صاحب (۳) شیخ غلام جیلانی صاحب (۴) شیخ عبداللطیف صاحب۔

یہ حضرات تعلیم القرآن سکول میں آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ آپ کے دیگر اساتذہ میں آپ کے والدماجد مولانا قاضی زین العارفین صاحب، قاضی حبیب الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا سید مبارک شاہ صاحب اور شیخ عبدالرحیم صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

قاضی صاحب نے فارسی نظم کی کتابیں مثلاً گلستان، بوستان، تحفہ نصائح، سکندرنامہ، یوسفؑ زلیخا اور مثنوی مولانا روم وغیرہ شیخ عبدالرحیم صاحب سے پڑھیں۔

آپ نے دورۂ حدیث شریف دارالعلوم حقانیہ سے مکمل کر کے سندِ فراغت حاصل کی، علمِ حدیث میں آپ جن حضرات سے فیضیاب ہوئے ان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ

صاحبؒ، صدر المدرسین مولانا عبد الحلیم زروبویؒ اور مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

تدریسی خدمات | فراغت کے بعد ۱۳۷۸ھ میں آپ کا دار العلوم حقانیہ ہی میں بحیثیت مدرس و نائب مفتی تقرر ہوا جبکہ بعد میں مفتی مقرر ہوئے۔

قاضی صاحب نے افتاء میں مولانا مفتی محمد یوسفؒ صاحب، مولانا عبد الحق قندھاریؒ اور مولانا عبد الحلیم زروبوی صاحبؒ سے استفادہ کیا ہے۔ عرصۂ تدریس میں آپ نے صرف، نحو، فقہ، اصولِ فقہ، علم معانی اور علم بیان کی کتابیں پڑھائیں۔ بحیثیت مدرس و مفتی تقریباً دس سال آپ نے مادرِ علمی دار العلوم حقانیہ کی خدمت کی۔

افتاء و قضاء | قاضی صاحب نے دار العلوم حقانیہ میں تدریس کے دوران ہی افتاء کا کام شروع کر دیا تھا، اُس وقت سے لے کر تا دمِ تحریر بندگانِ خدا کے تنازعات کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل فرما رہے ہیں، آپ یہ سب خدمات بلا معاوضہ انجام دیتے ہیں، اور مقصود صرف رضائے الٰہی ہے۔

اندازِ فتوٰی | آپ کے اکثر فتاوٰی مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ کے فتوؤں سے ماخوذ ہیں۔ کچھ وقت تک تو آپ صرف مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ کے تحریر کردہ فتوؤں کو رجسٹر میں درج کرتے تھے، بعد ازاں ترقی دے کر آپ کو مفتی مقرر کیا گیا۔ اندازِ بیان میں آپ پر مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ کا اثر زیادہ ہے لیکن آپ فقہی ذخائر پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اب بھی علاقے میں آپ کے فتوٰی اور فیصلے کو اہمیت دی جاتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ فتاوٰی میں آپ کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے فتاوٰی کا ایک بڑا ذخیرہ شامل ہے۔ ۱۳۸۸ھ میں بعض ذاتی مجبوریوں اور معاشی تقاضوں کی وجہ سے از خود جامعہ دار العلوم حقانیہ سے الگ ہو گئے۔

بیعت | تصوف و سلوک میں آپ سلسلہ قادریہ و نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا عبد الغفور صاحب مہاجر مدنیؒ مدینہ منورہ سے پہلی مرتبہ جب اکوڑہ خٹک تشریف لائے تو آپ نے اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، اور مریدی کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حضرت مولانا عبدالحلیم کوہستانی

نام ونسب ومولد | مولانا عبدالحلیم کوہستانی ۱۹۱۴ء کو مولانا رستم خان کے گھر علاقہ کوہستان میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم | آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں اپنے والد محترم سے کیا، ان سے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد تکمیلِ علم کے لیے دارالعلوم حقانیہ سیدو شریف سوات میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۶۲ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

اساتذہ کرام | آپ نے اپنے والد محترم کے علاوہ بہت سے دیگر اساتذہ کرام سے علم کی پیاس بجھائی۔ صرف ونحو مولانا بنارس خان سے پڑھی، شرح مُلاجامی مولانا عبداللطیف صاحب سے، معقولات مولانا خان بہادر صاحب عرف مارتونگ مولانا صاحب اور مولانا محمد نذیر صاحب حق صاحب چکیسری سے اور علم بلاغت مولانا عبدالحلیم سواتی سے حاصل کیا۔

تدریس | فراغت کے بعد آپ نے ایک سال جامع مسجد لیشین میں اور دو سال مارتونگ میں گزارے، اس کے بعد ۱۳۷۷ھ کو جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں بحیثیت مدرس آپ کی تقرری ہوئی اور سات سال تک علم وفضل کے موتی بکھیرتے رہے۔

افتاء | مولانا مفتی محمد یوسف صاحب بونیری رحمہ اللہ کے جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے چلے جانے کے بعد افتاء کی اہم ذمہ داری بھی آپ کو سونپ دی گئی، فتویٰ دینے میں آپ بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے تھے اور خوب غور وخوض کے بعد فتویٰ دیا کرتے تھے۔

بیعت | تزکیۂ نفس کے لیے آپ نے پیرِ طریقت حضرت مولانا عبدالمالک صاحب نقشبندی رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔

تصانیف | مولانا موصوف نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف

کا سلسلہ بھی جاری رکھا، آپ کی ایک مایۂ ناز کتاب "ھدایۃ العلوم" منظر عام پر آچکی ہے، مزید چھ عدد تصانیف مکمل ہیں لیکن ابھی تک ان کی اشاعت نہیں ہو سکی۔ ان میں تفسیر میں "ھدایۃ آیات"، "رسالہ توحید" اور فقہ میں "الاستدلال فی القرآن" کے مسودات آپ کے ہاں محفوظ ہیں۔

تلامذہ ویسے تو آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، مولانا قاضی حمید اللہ صاحب، مولانا فضل الحق صاحب، مولانا عصمت اللہ صاحب اور مولانا عبدالباقی صاحب قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

نام و نسب حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم ۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد سلطان محمود غزنویؒ کے ساتھ جہاد کے سلسلے میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور پھر اکوڑہ خٹک میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ابتدائی تعلیم آپ نے پرائمری تک عصری تعلیم اپنے ہی گاؤں میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کے قائم کردہ انجمن تعلیم القرآن اسلامیہ پرائمری سکول میں حاصل کی اور دینی تعلیم ابتدائی درجات سے لے کر درجۂ علیا تک جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں حاصل کی اور ۱۹۵۷ء کو دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد الامام الکبیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ سے ۱۳۷۸ھ کو دورۂ تفسیر کیا۔

اعزازی اسناد جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے سندِ فراغت کے علاوہ بعض دوسرے اکابرین مثلاً قطب العالم شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ، حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا فخرالدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبندؒ

اور مکہ مکرمہ کے شیخ علوی مالکیؒ نے آپ کو اعزازی اسناد اور اجازتِ حدیث سے نوازا۔

اساتذہ آپ کے اساتذہ میں ولی کامل حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم زروبویؒ، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، اور محدث العصر حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ وغیرہ اکابرین شامل ہیں۔

تدریس تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء کو جامعہ دارالعلوم حقانیہ ہی میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور جلد ہی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ابتدائی کتب سے کتبِ حدیث کی تدریس تک پہنچ گئے جو کہ آج تک جاری و ساری ہے ــــ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء میں آپ نے ماہنامہ الحق کے نام سے ایک دینی و علمی جریدے کا آغاز کیا، جسے بہت جلد ہی ملک اور بیرونِ ملک مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی، اور تادمِ تحریر نہایت آب و تاب سے جاری ہے۔

تحریکات اور ملّی خدمات درس و تدریس کے ساتھ آپ نے مختلف تحریکات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب ماڈرن ازم کے داعی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے فتنہ نے سر اٹھایا تو آپ نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جس پر ماہنامہ الحق میں شائع شدہ آپ کے اداریئے دال ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب تحریک ختمِ نبوت شروع ہوئی تو آپ نے اس تحریک میں بھی اپنے والدِ محترم اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ اور دوسرے اکابر علماء کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے قومی اسمبلی میں امتِ مسلمہ کی ترجمانی کرتے ہوئے "قادیانیت کے بارہ میں ملّتِ اسلامیہ کا مؤقف" جو سنایا تھا اس کا اکثر حصہ آپ ہی نے لکھا تھا۔

۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظامِ مصطفےٰ شروع ہوئی تو اس میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا جس کی پاداش میں آپ نے ہری پور جیل میں قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

تصنیف و تالیف تدریسی، سیاسی اور دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے بوجھ کے باوجود آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے، آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف خاص و عام میں بے حد مقبول ہیں۔

(۱) قادیانیت کے بارہ میں ملتِ اسلامیہ کا موقف (۲) شریعت بل کا معرکہ
(۳) کاروانِ آخرت (۴) قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ (۵) اسلام اور عصرِ حاضر،
(۶) دعواتِ حق ۲ جلد (۷) نظامِ اکل و شرب میں شریعت کی راہنمائی،
(۸) شرح شمائل ترمذی ۔

اندازِ فتویٰ درس و تدریس، ماہنامہ الحق کی ادارت اور دیگر مصروفیات کے باوجود آپ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی دیا کرتے تھے، اسی طرح آپ کے اکثر فتاویٰ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں ـــ جس طرح آپ کی طبیعت تحقیق پسند ہے تو وہی رنگ آپ کے فتاویٰ پر بھی غالب ہے، آپ کے اکثر فتاویٰ طویل اور اپنے موضوع کے جملہ پہلوؤں کو شامل ہوتے ہیں ۔

اسی حوالہ سے آپ کے چند اہم مضامین القضایا، حوادث ونوازل، خاندانی منصوبہ بندی، فتن، حقوقِ انسانی اور خصوصاً خواتین کے حقوق وغیرہ پر ماہنامہ "الحق" میں شائع ہوتے رہے ہیں جو کہ افادۂ عام کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں بھی شامل کیے گئے ہیں ۔

سیاسی خدمات درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ماہنامہ الحق کی ادارت اور دارالعلوم کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی آپ نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں ۔ ۱۹۷۰ء میں جب اکابرینِ جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور مجاہدِ ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ صاحبؒ کو عام انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا تو آپ (مولانا سمیع الحق صاحب) نے مجبوراً حصہ لیا اور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی تمام انتخابی مہم کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے کامیابی سے ہمکنار کیا، حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی کامیابی کے بعد قومی اسمبلی میں ساری کاروائی پسِ پردہ آپ ہی چلاتے رہے، تحاریکِ التواء کی قرار دادیں اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم پیش کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے ۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ مارشل لاء میں آپ کو وفاقی مجلسِ شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا تو زکوٰۃ وعشر، حدود، قصاص و دیت اور امتناعِ قادیانیت آرڈیننس کا نفاذ اور آئین میں بیشمار اسلامی

شقوں اور دفعات کا شمول آپ ہی کی شبانہ روز جدوجہد کی بدولت ممکن ہوسکا۔ اور جب (۱۹۸۵ء میں) سینٹ آف پاکستان کے آپ ممبر بنے تو آٹھ سال کی طویل تاریخی جدوجہد کے بعد سینٹ سے شریعت بل منظور کروایا۔

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام

مملکتِ خداداد پاکستان پر جب سیکولرزم کے منحوس سائے دوبارہ پھیلنے لگے تو اس کے تدارک کے لیے آپ ہی نے اس وقت اسلامی جمہوری اتحاد کی بنیاد رکھی جس میں نو سیاسی و مذہبی جماعتیں شامل ہوئیں اور متفقہ طور پر آپ کو اس اتحاد کا سینئر نائب صدر منتخب کیا گیا۔

متحدہ علماء کونسل کا قیام

۱۹۸۸ء میں جب بینظیر کی حکومت قائم ہوئی تو آپ نے اس کے خاتمہ کے لیے متحدہ علماء کونسل کے پلیٹ فارم پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء اور اکابرین کو جمع کیا جس کی بدولت نسوانی حکومت کا خاتمہ ممکن ہوسکا۔

متحدہ دینی محاذ کی تشکیل

بھارت میں جب بابری مسجد کے انہدام کا دلخراش حادثہ پیش آیا تو ملک میں دینی اقدار و آثار کو تباہی سے بچانے کے لیے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایک بار پھر تمام دینی جماعتوں کے قائدین کو جمع کرکے "متحدہ دینی محاذ" کی تشکیل کی۔

تحریک تحفظ مدارسِ دینیہ

۱۹۹۴ء میں جب بینظیر حکومت نے مدارسِ دینیہ کے خلاف بے بنیاد الزامات لگاتے، مدارس کی انکوائریاں اور تحقیقات کرانے کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا صاحب نے یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو تمام مکاتبِ فکر کے علماء اور اربابِ مدارس کو جمع کرکے "تحریک تحفظ مدارسِ دینیہ" قائم کی اور حکومت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

اب جبکہ جنرل مشرف کی فوجی حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش وزراء نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مدارسِ دینیہ کے خلاف مہم شروع کی تو اسی مردِ مجاہد نے ۳۰ اپریل ۲۰۰۰ء کو دارالعلوم حقانیہ میں تمام مدارس کے مہتممین کو جمع کرکے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

ملی یکجہتی کونسل کا قیام

۱۹۹۶ء میں ملک عزیز میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اٹھی اور حکومتی سطح پر امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کی سازشیں شروع ہوئیں تو اس نازک وقت میں آپ ہی نے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے "ملی یکجہتی کونسل" قائم کی۔

سی ٹی، بی ٹی

۱۹۹۸ء میں جب نواز حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے لیے ہوئی تو مولانا صاحب نے نہ صرف اپنے ادارہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے اس کی مخالفت میں مدلل شرعی فتویٰ شائع کر کے راتوں رات سینٹ اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں تقسیم کروایا بلکہ ۵ مئی ۱۹۹۸ء کو تمام دینی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے اس ناپاک سازش کو ناکام بنا دیا۔

دفاعِ افغانستان و پاکستان کونسل کا قیام

جہادِ افغانستان اور تحریکِ طالبان میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کا کلیدی کردار کسی سے مخفی نہیں کہ انہوں نے اس جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ تحریکِ طالبان میں شامل طلباء اور ان کے قائدین کے نہ صرف مربی ہیں بلکہ دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہزاروں کی تعداد میں علماء اور طالبان لیڈر آپ کے براہ راست شاگرد ہیں، آج سے تقریباً ایک سال قبل جب امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا تو مولانا صاحب نے ملک کی تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کے مرکزی قائدین کو دارالعلوم حقانیہ میں جمع کیا۔ اس کانفرنس میں امریکی استعمار اور سامراج کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہوئے "دفاعِ افغانستان و پاکستان کونسل" کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا اور اتفاق رائے سے مولانا صاحب کو اس کونسل کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔

سود کے خلاف آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد

پاکستان کے اعلیٰ عدالتی ادارے سپریم کورٹ نے حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک سودی نظام ختم کرنے کا حکم دیا تو حکومت نے حسب سابق اس سلسلہ میں لیت و لعل کی پالیسی اختیار کرنی شروع کی تو مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے

۱۹ مئی ۲۰۰۱ء کو کراچی میں تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ سربراہی اجلاس طلب کیا اور حکومت کو سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عمل کرنے کا نوٹس دیا اور بصورتِ دیگر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

حضرت مولانا محمد ہارُوت صاحب

مولانا محمد ہاروت صاحب نے ضلع سوات کے ایک پسماندہ گاؤں میں آنکھیں کھولیں۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز ریاست سوات سے کیا، اس وقت سوات میں بلند پایہ علماء و فقہاء موجود تھے جس کی وجہ سے ریاست سوات کو علمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور تشنگانِ علومِ نبوت دور دراز علاقوں سے یہاں آکر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ آپ کے ابتدائی اساتذہ میں مولانا خان بہادر صاحب مارتونگؒ، مولانا عبدالحلیم صاحبؒ، مولانا محمد نذیر صاحب حق صاحب، مولانا عبدالرشید صاحب اور مولانا عبدالحنان صاحب کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

۱۳۷۰ھ میں جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ اور دوسرے اکابر اساتذہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، آپ کا شمار دارالعلوم حقانیہ کے ممتاز فضلاء میں ہوتا ہے۔

درس و تدریس فراغت کے بعد آپ نے مردان اور شمس آباد (اٹک) میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ بعد ازاں ۱۳۷۳ھ بمطابق ۱۹۵۴ء کو دارالعلوم حقانیہ میں بحیثیتِ مدرس آپ کا تقرر ہوا اور آخری دم تک اسی مرکزِ علومِ نبوت میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آخر کار اگست ۱۹۹۰ء میں اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔

افتاء اگرچہ افتاء میں آپ نے مستقل طور پر کسی سے استفادہ تو نہیں کیا لیکن فقہ و منطق میں کمال مہارت کی وجہ سے اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ چونکہ آپ تدریس اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے فتویٰ نویسی کے لیے مستقل طور پر فارغ نہیں تھے اس لیے دارالعلوم کی طرف سے آپ کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی تاہم سالانہ تعطیلات میں مفتیانِ کرام نہ ہوتے اور آپ کے دارالعلوم میں ہی مقیم ہونے کی وجہ سے دارالعلوم

کی انتظامیہ نے آپ کو یہ ذمہ داری سونپی تھی۔ رجسٹروں میں درج شدہ فتاوٰی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اکثر میراث کے مسائل کے جوابات دیئے ہیں جبکہ فنِ میراث میں آپ کو مکمل عبور حاصل تھا۔

بیعت و سلوک

تصوف و سلوک میں آپ نے حضرت مولانا خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔

تصانیف

چونکہ آپ کا زیادہ تر وقت تدریس میں گذرتا تھا اس لیے آپ تصنیف و تالیف کی طرف بھرپور توجہ نہ دے سکے، لیکن اس کے باوجود آپ نے منطق کی ابتدائی کتاب "ایساغوجی" پر کچھ تعلیقات لکھی تھیں جو "افاداتِ فاروقی" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ میراث میں "میزان الاعتدال" نامی کتاب لکھی جو آپ کی حیات میں تو شائع نہ ہو سکی البتہ بعد از وفات شائع ہو چکی ہے۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہٗ

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب ایک ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، آپ ۱۲ اگست ۱۹۵۴ء کو ضلع مانسہرہ تحصیل اوگی کے ملحقہ علاقے بیلیاں میں مولانا شمس الحق صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول بیلیاں میں حاصل کی، پرائمری کی تکمیل کے ساتھ ساتھ آپ نے قاری غلام حبیب صاحب سے ۱۹۶۹ء میں قرآن کریم بھی حفظ کر لیا، دینی علوم کی تحصیل کے لیے دو سال کا عرصہ جامعہ فرقانیہ راولپنڈی میں گذارا اور مزید تعلیم کے لیے ۱۹۷۱ء میں برصغیر کے دیوبند ثانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا اور عرصہ چھ سال تک دارالعلوم میں رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی، دینی علوم کے ساتھ ساتھ آپ نے عصری تعلیم کی تحصیل بھی جاری رکھی اور ۱۹۷۳ء میں میٹرک پاس کر لیا۔ ۱۹۷۷ء میں آپ نے وفاق المدارس العربیہ کے تحت دورۂ حدیث کا امتحان پاس کیا اور ملک بھر کے مدارس میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء میں جامعہ ازہر (مصر) سے دورۂ تدریبیہ کیا۔ علوم دینیہ کے

ساتھ ساتھ آپ علومِ عصریہ سے بھی فیضیاب ہوتے رہے، چنانچہ ۱۹۸۰ء میں پشاور یونیورسٹی سے بی اے، ۱۹۸۴ء میں ایم اے اسلامیات اور ۱۹۹۶ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

اساتذۂ حدیث آپ کے حدیث کے مشائخ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، مولانا عبدالحلیم زروبویؒ صاحب، مولانا محمد علی سواتی صاحبؒ، مولانا مفتی محمد فرید صاحب زروبوی، مولانا محمد حسن جان صاحب مدنی، مولانا سمیع الحق صاحب اور مولانا انوارالحق صاحب جیسی نامور ہستیاں شامل ہیں۔

تدریسی خدمات دارالعلوم حقانیہ سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۷ء/۱۳۹۷ھ میں آپ بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی ہدایت پر دارالعلوم میں ہی تدریس کا آغاز کیا، آٹھ سال درسِ نظامی کی تدریس کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی شفقت سے جامع ترمذی جلد۲، اور سنن نسائی کی تدریس آپ کے حوالہ کی گئی اور ۱۹۸۵ء میں مستقل طور پر سنن ابی داؤد جلد ا کی تدریس آپ کے سپرد کر دی گئی۔ تدریس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم حقانیہ کے ناظمِ تعلیمات، نائب مفتی اور شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کے نگران بھی رہے۔ اور ـــــء میں آپ پشاور میں اپنے قائم کردہ دینی ادارے جامعہ عثمانیہ تشریف لے گئے۔

افتاء ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم حقانیہ میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالنے کے ساتھ ساتھ فتوٰی نویسی کا فریضہ بھی آپ کو سونپا گیا۔ ابتداء میں حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فتاوٰی رجسٹر میں درج کرنے کی ذمہ داری تھی، بعدازاں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کے حکم پر خود فتوٰی لکھنا شروع کیا۔

تصانیف حضرت مفتی صاحب نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں (۱) دفاعِ ابوہریرہؓ، (۲) عقیقہ کی شرعی حیثیت (۳) حیاتِ بیلیانی (۴) دارالعلوم حقانیہ سے جامعہ ازہر تک "سفرنامہ" (۵) ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت، وغیرہ اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد مقام کی حامل ہیں۔ آجکل آپ ماہنامہ "العصر" پشاور کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔

حضرت مولانا مفتی سیف اللہ ہاشم خان صاحب مدظلہ

نام و نسب مولانا مفتی سیف اللہ حقانی صاحب ۲۶ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جناب ہاشم خان صاحب کے گھر واقع سالار خیل تحصیل و ضلع لکی مروت میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت میں حاصل کی اور دورۂ حدیث اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے، یہاں سے آپ نے ۱۹۷۱ء میں دورۂ حدیث کر کے سندِ فراغت حاصل کی۔

اساتذۂ کرام آپ کے اساتذۂ کرام میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب، مولانا عبدالحلیم زروبوی صاحب، مولانا محمد علی صاحب، مولانا مفتی محمد فرید صاحب، مولانا سید شیر علی شاہ صاحب، مولانا عبدالغنی دیروی صاحب، مولانا سمیع الحق صاحب، مولانا مفتی محمد یوسف صاحبؒ و مولانا عبداللہ صاحب درخواستی شامل ہیں۔

تدریس فراغت علوم دینیہ کے بعد آپ نے دارالعلوم حسینیہ میرانشاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور نورِ علم کو پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔

افتاء کچھ عرصہ دارالعلوم حسینیہ میں گذارنے کے بعد مادرِ علمی دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت تشریف لائے، یہاں تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۷۳ء میں افتاء کا سلسلہ بھی شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔

دارالعلوم حقانیہ میں تقرری ۱۹۸۶ء میں آپ نے مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش اور حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے حکم پر دارالعلوم حقانیہ میں تدریس کا کام سنبھالا، کچھ عرصہ حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب اور دیگر مفتیان کے ساتھ معاون مفتی اور بعد میں مستقل مفتی کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالیں، اب تک ہزاروں فتاویٰ آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ اور تادمِ تحریر آپ حقانیہ میں ہی یہ فریضہ بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں۔

بیعت آپ نے رئیس المشائخ حضرت مولانا خواجہ عبدالمالک صدیقیؒ کے دستِ حق پرست پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت فرمائی اور ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ سے بیعت فرمائی۔

☼ ☼

حضرت مولانا مفتی عبدالحلیم کلاچوی

سلسلۂ نسب آپ حضرت مولانا عبدالکریم صاحب کے ہاں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مشہور و معروف گاؤں کلاچی میں پیدا ہوئے۔

آپ کے سلسلۂ نسب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نجیب الطرفین اور ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔

ابتدائی تعلیم آپ بچپن ہی سے تعلیم کے شوقین تھے اس لیے آپ نے بچپن ہی میں اپنے والد صاحب کے قائم کردہ دینی مدرسہ نجم المدارس کلاچی سے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا، زیادہ تر کتابیں اپنے والد صاحبؒ ہی سے پڑھیں، اس کے ساتھ ساتھ دوسرے اساتذۂ کرام سے بھی مستفید ہوتے رہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے ایشیاء کی عظیم دینی یونیورسٹی، دیوبند ثانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک تشریف لائے اور ۱۹۵۵ء میں یہاں سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔ تکمیل کی کتابیں جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حضرت مولانا موسیٰ خان صاحبؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد التخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کے لیے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی تشریف لے گئے اور وہاں محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی سے استفادہ کیا۔

اساتذۂ کرام آپ کے اساتذۂ کرام میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ، شیخ الاسلام علامہ شمس الحق صاحب افغانی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب زروبوی رحمہ اللہ اور آپ کے والد محترم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

درس وتدریس فراغت کے بعد آپ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ہی سے درس وتدریس کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نائب مفتی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ خانیوال کی مشہور دینی درسگاہ   میں بحیثیت صدر المدرسین تشریف لے گئے، وہاں ایک سال گذارنے کے بعد آپ جامعہ انوریہ اسلام آباد تشریف لائے، یہاں بھی آپ صرف ایک سال رہے۔ اس کے بعد آپ اپنے والد صاحب کے قائم کردہ مدرسہ "نجم المدارس کلاچی" چلے گئے اور تا دم تحریر ہذا اسی مدرسہ میں تدریسی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

بیعت وسلوک ۱۹۶۷ء میں آپ نے حضرت العلامہ شمس الحق افغانی صاحبؒ سے بیعت کی، ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا جمیل احمد صاحبؒ سواتی سے بیعت اور اصلاحِ نفس کا تعلق وابستہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلیفۂ مجاز حضرت العلامہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالحق قندہاروی

آپ کا شمار بھی جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے جید مدرسین میں ہوتا ہے۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے جامعہ کے دارالافتاء میں بھی بہت خدمت کی اور آپ کے قلم سے سینکڑوں فتوے جاری ہوئے، آپ کے فتاویٰ نہایت محققانہ ہیں۔ آپ کے لقب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افغانستان کے صوبہ قندہار کے رہنے والے ہیں۔ کوشش وتلاشِ بسیار کے باوجود آپ کے مزید حالات کا پتہ نہیں چل سکا اس لیے صرف نام پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محبوب الرحمٰن صاحب

پیدائش | آپ مؤرخہ ۲۸، دسمبر ۱۹۴۵ء کو حکیم عبدالرحمٰن کے ہاں زنڈ وڈھیری ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔

تعلیم | ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد آپ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۳ء میں یہاں سے سندِ فراغت حاصل کی۔

اساتذہ حدیث | اساتذہ حدیث میں آپ نے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ، مولانا عبدالحلیم صاحب زروبوی رحمہ اللہ، مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ جیسے عباقرہ سے کسبِ فیض کیا۔

درس و تدریس | تعلیم سے فراغت کے بعد آپ جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں مدرس مقرر ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے دارالافتاء میں نقل فتویٰ نویسی کا کام بھی آپ کے سپرد کر دیا گیا۔

اندازِ فتویٰ | چونکہ آپ اکثر نقلِ فتاویٰ کا کام کرتے تھے اس لیے از خود فتویٰ لکھنے کا ان کو کم ہی موقع ملتا تھا۔ لیکن جو فتاویٰ آپ کے قلم سے صادر ہوئے ان میں آپ کی کوشش یہ رہی کہ جواب مکمل، مفصل، مدلل اور باحوالہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جواب میں سلیس انداز اختیار کیا ہے جو کہ انتہائی عام فہم ہے اور ہر خاص و عام اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب صدیقی مدظلہ

نام، نسب اور مولد مولانا رشید احمد صاحب صدیقی حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب کے گھر زروبی ضلع صوابی میں ۱۹۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد چھ پشتوں سے اسلام کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل چلے آرہے ہیں اور دنیا کے کونے کونے میں علم و معرفت اور رشد و ہدایت کی روشنی پھیلائے ہوئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز ایشیاء کی مشہور و معروف دینی درس گاہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے کیا اور یہیں سے فارغ ہوئے۔

یہاں پر آپ کو انتہائی قابل اور شفیق و مہربان اساتذۂ کرام ملے جن میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب زروبویؒ، اور خود آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، حضرت مولانا انوار الحق صاحب کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

افتاء درسِ نظامی سے فراغت کے بعد آپ نے فتویٰ نویسی اور افتاء میں اپنے والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور دارالعلوم ہی میں منصبِ افتاء پر فائز ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا جو کہ بیس سال تک جاری رہا، اس دوران ہزاروں کی تعداد میں طالبانِ علومِ نبویہ آپ سے مستفید ہوئے۔

بیعت و سلوک آپ نے اپنے والد محترم مولانا مفتی محمد فرید صاحب کے دستِ حق پر سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور انہی کے خلیفہ مجاز بھی ہیں۔

تصانیف درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور کافی مفید کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں آپ کی گرانقدر تالیف "ضروری مسائل" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو کہ مقبولِ خاص و عام ہے۔ اس کے علاوہ "مفید الواعظین" اور "دعا بعد السنۃ" وغیرہ بھی آپ کی مایہ ناز تصنیفات ہیں۔

حضرت مولانا مفتی غلام قادر نعمانی صاحب مدظلہ

نام و نسب آپ ۱۹۶۴ء میں سید محمود بن غلام رسول کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب آگے چل کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے، یعنی آپ نسباً ہاشمی ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد عرصہ ۱۵۰ سال سے علاقہ مہمند ایجنسی، قوم خویزی، گاؤں خلوڈاگ میں آباد ہیں۔

تعلیم آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا فضل معبود صاحب عرف صاحب حق فاضل دار العلوم حقانیہ سے حاصل کی اور درجۂ ثانیہ سے لے کر درجۂ تخصص فی الفقہ الاسلامی تک کی کتابیں مرکزِ علوم نبوت جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں جید علماء کرام سے پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ جامعہ دار العلوم حقانیہ کے درجۂ تخصص کے پہلے طالب علم اور اس شعبہ میں پہلی سند درجہ ممتازہ میں حاصل کرنے والے ہیں۔

آپ جامعہ دار العلوم حقانیہ اور وفاق المدارس کے سند یافتہ ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کراچی سے تخصص فی الدعوۃ والارشاد اور جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء بھی کر چکے ہیں۔ اسی طرح ایم اے اسلامیات و عربی کی ڈگری پشاور یونیورسٹی سے حاصل کی۔

تصانیف اب تک آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں: (۱) وحدت رمضان و عیدین (۲) مسائلِ سفر (اردو و پشتو) (۳) زیارت الحرمین الشریفین۔

اساتذہ کرام حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب، شیخ الحدیث مولانا سید شیر علی شاہ صاحب، شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی (جامعہ اشرفیہ لاہور)، شیخ الحدیث مولانا محمد حسن جان صاحب، شیخ القرآن مولانا عبد الہادی صاحب (شاہ منصور صوابی)، شیخ التفسیر مولانا سرفراز خان صفدر صاحب، مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ (کراچی)، مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، مولانا انوار الحق صاحب نائب مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مہتمم جامعہ عثمانیہ پشاور آپ کے مشہور اساتذہ ہیں۔

تدریس ۱۹۸۹ء/۱۴۰۹ھ سے جامعہ دار العلوم حقانیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ۱۹۹۷ء سے اب تک جامعہ حقانیہ کے درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء میں بحیثیت استاد چلے آرہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی مختار اللہ صاحب حقانی

(مرتب فتاویٰ حقانیہ)

نام، نسب و مولد آپ ۲۳ رمارچ ۱۹۶۹ء کو جناب حبیب اللہ صاحب کے ہاں جہانگیرہ ضلع صوابی میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندانی تعلق یوسف زئی خانخیل قبیلہ سے ہے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے مڈل تک عصری تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول جہانگیرہ سے حاصل کی، اس کے ساتھ ساتھ اپنے علاقہ کے جید عالم دین مولانا عبدالحنان صاحب مدظلہ فاضل دیوبند سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مڈل کے بعد حضرت الاستاذ ہی کے مشورے سے مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جون ۱۹۸۵ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی چلے گئے اور فروری ۱۹۹۳ء میں وہاں سے درس نظامی کی تکمیل کی، اس کے بعد تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا اور مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ کے زیرنگرانی فتویٰ نویسی سیکھتے رہے۔ تخصص سے فراغت کے بعد پشاور یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں ایم اے (ماسٹر) کی ڈگری حاصل کی۔

تدریسی خدمات ۱۹۹۶ء میں جامعہ مظہر العلوم قادریہ تورڈھیر (صوابی) تشریف لے گئے اور وہاں دو سال تک درس وتدریس کے علاوہ افتاء کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے۔ بعدازاں جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے وابستہ ہو گئے اور تادم تحریر جامعہ دارالعلوم حقانیہ ہی میں افتاء اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اساتذۂ کرام آپ کے اساتذۂ کرام میں مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار (کراچی)، مولانا سید مصباح اللہ شاہ، مولانا مفتی نظام الدین شامزئی، مولانا

مفتی عبدالسلام چاٹگامی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب جیسے اکابرین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

تصنیفی خدمات درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے بعض اہم موضوعات پر تحقیقی مضامین اور رسائل بھی لکھے ہیں، مثلاً (۱) اختلافِ مطالع اور رؤیتِ ہلال کی شرعی حیثیت (۲) جماعۃ النساء کی شرعی حیثیت (۳) تعزیر بالمال کی شرعی حیثیت (۴) اس کے علاوہ "فتاویٰ حقانیہ" کی ترتیب تو بھی آپ ہی کے سپرد ہے (۵) شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کے "درسِ ترمذی" کی ضبط و ترتیب بعنوان "اسلام کا نظامِ اکل و شرب اور مروجہ کرنسی کیلئے معیار نصاب سونا یا چاندی وغیرہ" قابل ذکر ہیں۔

اندازِ فتویٰ فتویٰ نویسی میں آپ کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں، آپ کے جوابات اکثر متقدمین فقہاء کرام کی عبارات سے مزین ہوتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ آپ جواب لکھتے وقت حالات و واقعات کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی صاحب

آپ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۵۴ء کو ضلع صوابی کے مشہور قصبہ زروبی میں متکلم اسلام حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم حقانیہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ ناظرہ قرآن مجید اپنے گھر ہی میں پڑھا، مڈل تک عصری تعلیم اپنے گاؤں زروبی میں حاصل کی اور میٹرک ٹوپی ہائی سکول سے کیا، میٹرک کے بعد جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہوئے اور قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد درس نظامی کی تکمیل کر کے سندِ فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد اپنی مادر علمی میں ہی مدرس مقرر ہوئے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ کے زیرِ سایہ فتویٰ نویسی کی مشق اور تمرین بھی کرتے رہے، چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ کے مدونہ دفاتر اور رجسٹروں میں آپ کے کئی فتاویٰ موجود ہیں جن میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف ہے اور کئی کتابیں نثر اور نظم میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

پیش لفظ

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد ن المصطفیٰ و
علیٰ آلہ النجباء واصحابہ الشرفاء الیٰ یوم الجزاء۔

تقسیمِ ہند سے پہلے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نوراللہ مرقدہٗ دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے، رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کی سالانہ تعطیلات میں جب اکوڑہ خٹک تشریف لائے تو جلد ہی تقسیمِ ہند کا مسئلہ درپیش آیا، جس کی وجہ سے ہر جگہ وحشت و بربریت اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، ان حالات کی وجہ سے دیوبند واپس جانا آپ کے لیے ممکن نہ رہا، چنانچہ ذی القعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے اپنے گھر کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں توکلاً علی اللہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو جلد ہی ایک عظیم اسلامی درسگاہ کی صورت اختیار کر گیا۔

تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ اسی مسجد میں شہتوت کے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر شروع ہوا تھا، اس لحاظ سے جامعہ حقانیہ کی تاسیس دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی ہے کہ اس کی ابتداء بھی ایک مسجد میں انار کے درخت کے نیچے محمود معلم اور محمود متعلم سے ہوئی تھی مگر اخلاص نیت اور للّٰہیت کی برکت سے ترقی کرتے کرتے دارالعلوم دیوبند نے بے پناہ شہرت حاصل کر لی اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا جامعہ حقانیہ کی خدمات اور مختصر عرصہ میں ہر دلعزیزی دیکھ کر اسے دیوبند ثانی کا خطاب دینا بھی اخلاص اور للّٰہیت ہی کا ثمرہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کی افادیت کا چرچا بہت ہی کم مدت میں چار سُو ہونے لگا اور ملک کے کونے کونے سے علوم دینیہ کے شائقین طلبہ تحصیل علم کے لیے جامعہ حقانیہ کا انتخاب کر کے یہاں آکر مستفید ہوتے رہے اور اسی طرح عوام الناس میں سے دین کا درد رکھنے والے حضرات بھی خط و کتابت، سوال و جواب، استفتاء و فتاویٰ کے ذریعہ اپنے مسائل کے حل کے سلسلہ میں جامعہ حقانیہ سے رجوع کرنے لگے۔

شعبہ دارالافتاء | جس طرح ابتداء ہی میں جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں تبلیغ دین اور اشاعت علم کے شعبے قائم کیے گئے اسی طرح دارالافتاء جیسا اہم ترین شعبہ بھی قائم کیا گیا

چنانچہ عوام ہی نہیں بلکہ دنیا بھر سے علماء کرام، سکالرز اور وکلاء حضرات اپنے پیش آمدہ مسائل کا حل جامعہ ھٰذا سے طلب کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے ذاتی تنازعات اور جھگڑوں کو بھی جامعہ کے اسی شعبہ سے حل کراتے ہیں اور یہاں سے کیے گئے فیصلوں کو بھرپور اعتماد کے ساتھ بلا چون وچرا قبول کر لیتے ہیں اور بفضلِ اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ ابتداء سے آج تک قائم و دائم ہے اور دارالافتاء میں کسی دنیاوی عدالت کی طرح فیصلے کروانے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔

اس اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ دارالافتاء سے جن استفسارات کے جوابات جاری ہوتے ہیں ان میں سے اہم مسائل کے بارے میں جامعہ کے اکابر اساتذہ کرام سے بھی مشورہ لیا جاتا ہے اور ان پر ان سے تصدیقات لیے جاتے ہیں، خصوصاً رئیس دارالافتاء (جو بھی ہوں) کی نظروں سے تقریباً تمام فتاویٰ گذرتے ہیں جن پر وہ اپنے تصویبی کلمات اور دستخط ثبت کرتے ہیں جنہیں اصل ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ ملکی و بین الاقوامی اہم مسائل پر خود بھی اشارات کرتے تھے اور دیگر اساتذہ سے بھی مشورہ لیتے تھے اسی طرح جامعہ کے موجودہ مہتمم مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ بھی فتاویٰ سے متعلق تمام خطوط اور ڈاک خود کھولتے ہیں اور فتاویٰ کو ان کی نوعیت و اہمیت کے مطابق حضرات مفتیان میں تقسیم کرتے ہیں اور بعض پر اپنی رائے لکھ کر متعلقہ مفتی کو اپنے ساتھ مشاورت کرنے کی ہدایات دیتے ہیں۔

ان احتیاطی مراحل کی بناء پر ملک کی اکثر عدالتوں، خصوصاً صوبہ سرحد، شمالی علاقہ جات، قبائل اور ایجنسیوں میں زیر سماعت مقدمات کے بارے میں دارالعلوم حقانیہ ہی سے شرعی حل طلب کیا جاتا ہے، اور اس کی روشنی میں جج صاحبان قانونی تقاضوں کے تحت مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جامعہ ھٰذا کے شعبۂ دارالافتاء کے کام میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، ابتداء میں دو ماہر مفتیان اس فریضہ کو سرانجام دیتے تھے، جب اس کام میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوگئی اور بیرونِ ملک سے بھی استفسارات کثرت سے موصول ہونے لگے تو اس کام کو نمٹانے کے لیے جلیل القدر مفتیان کرام اور معاونین کی تعداد بھی برابر بڑھتی رہی۔ اور جامعہ حقانیہ کے شعبۂ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کے طلباء بھی دارالافتاء کے اس عظیم اور اہم

کام میں ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں ۔

فتاویٰ کا ریکارڈ ابتداء ہی سے فتاویٰ کی نقول رکھنے کا اہتمام جامعہ ھٰذا میں موجود ہے اور اس کے لیے کئی محررین حضرات دارالافتاء سے جاری شدہ فتاویٰ کو رجسٹروں میں نقل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ بالمشافہ سوالات اور استفتاء کے جوابات کی فوٹو کاپیاں بھی ریکارڈ میں رکھی جاتی ہیں ۔

فتاویٰ کا یہ ریکارڈ درجنوں رجسٹروں اور ہزاروں صفحات کی فوٹو کاپیوں پر مشتمل ہے دارالعلوم حقانیہ سے تادمِ تحریر جاری شدہ فتاویٰ کی تعداد بلاشبہ ہزاروں سے متجاوز ہو چکی ہے ۔ یہ فتاویٰ فقہ، عقائد، حدیث، تفسیر، عصرِ حاضر کے جدید مسائل اور حوادث و نوازل کے احکامات پر مشتمل ہیں ۔

دارالافتاء کی اہمیّت دارالافتاء کا قیام تمامتر دینی مدارس میں اس خلوصِ نیت سے عمل میں لایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے مسائل کا حل یہاں سے بلا فیس طلب کریں اور اپنے تنازعات بغیر کسی تاخیر اور ٹال مٹول کے ختم کرا سکیں ۔

ہماری عدالتوں میں تنازعات اور مقدمات کے حل کا طریقہ کار کسی سے مخفی نہیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں روپیہ وکلاء فیس، کورٹ فیس وغیرہ جیسے بارگراں کا کندھوں پر اٹھانے کا تحمل استطاعت سے باہر ہے، اور اس کے ساتھ طویل مدت تک تاریخوں اور پیشیوں سے گذر جانے کے بعد فیصلہ کا انتظار الگ کرنا پڑتا ہے اور نتیجہ پھر بھی دادرسی اور انصاف کی شکل میں بڑی رشوت اور مدّعی و مدّعیٰ علیہ کے مالی مقابلہ کے تابع ہوتا ہے ۔

اس کے برعکس دینی مدارس کے شعبۂ دارالافتاء میں تنازعات کے تصفیہ کے لیے نہ تو تاریخ پر تاریخ دی جاتی ہے، نہ کورٹ فیس وغیرہ کی لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے، بلکہ اسلامی شریعت کے عادلانہ قانون کے مطابق انصاف مفت فراہم کیا جاتا ہے، اس لیے کہ اسلام میں انصاف خریدنے اور بیچنے کی چیز نہیں ۔ اگر لوگ اس کو غنیمت جان کر اور شرعی حکم پر متفق ہو کر ان مراکزِ اسلامیہ کی طرف رجوع کریں تو لاکھوں پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچ سکتے ہیں ۔ مگر افسوس کہ لوگ اپنی اَنا کی جنگ میں ہزاروں لاکھوں روپیہ برباد کر کے مختلف قسم کے سینکڑوں مسائل اور پریشانیاں سر پر اٹھا کر عدالتوں میں دھکے کھاتے رہتے ہیں، اس دوران ایک تنازعہ سے دیگر کئی تنازعات اور عداوتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ۔

بحمداللہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کا شعبۂ افتاء اس کام کو بخوبی سرانجام دے رہا ہے، روزانہ متعدد متنازعات کو فریقین کی باہمی رضامندی سے بہت ہی مختصر وقت میں حل کر دیا جاتا ہے اور فریقین بخوشی اس فیصلے کو قبول کر لیتے ہیں اور شریعت مطہرہ کی برکات سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔

فتویٰ میں احتیاط

فتویٰ نویسی اپنی نوعیت کا اہم منصب ہے اس میں احتیاط سے کام لینا نہایت ضروری ہے۔ اکابر علماء امت کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے کہ وہ اپنے تبحرِ علمی کے باوجود کتاب دیکھ کر خوب تحقیق کرنے کے بعد سوال کا جواب بصورتِ فتویٰ دیتے تھے، کبھی کبھار بناء بر احتیاط جواب دینے سے گریز بھی کیا کرتے تھے۔

جامعہ دارالعلوم حقانیہ بھی اپنے اکابرین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس اہم ذمہ داری کی ادائیگی میں کافی احتیاط سے کام لیتا چلا آرہا ہے۔

زیادہ اہمیت کے حامل فتاویٰ کے حل کے سلسلہ میں جامعہ ھذا کے علماء کا فل بنچ بیٹھتا ہے اور خوب غور وخوض کرنے کے بعد باہم متفق ہو کر مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔

اختلافی مسائل، ملکی سیاسی مسائل اور متنازعہ مسائل میں بڑے استدلال سے فتویٰ جاری ہوتا چلا آرہا ہے جن پر صدر دارالافتاء کی تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ کسی شخص یا جماعت کی تکفیر یا تفسیق کے بارے میں حتی الامکان تمام تر تحقیقات کے بعد ایسا عمومی فتویٰ جاری کیا جاتا ہے کہ وہ حتی الوسع کسی مشخص فرد اور جماعت کے بارہ میں غلط استعمال نہ کیا جاسکے۔ اکثر استفتاء کے جواب میں کسی معتمد اور معتبر کتاب کا سہارا لیا جاتا ہے اور بعض اوقات ایک سے زیادہ کتابوں سے حوالہ دینے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور بسا اوقات کثرتِ کار کی وجہ سے صرف ایک کتاب سے حوالہ دینے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اسی طرح جو سوالات ڈاک یا دوسرے ذرائع سے دارالافتاء کو موصول ہوتے ہیں، اگر سوال پوری طرح منقح نہ ہو، مبہم اور گول مول ہو جس سے صورتِ مسئولہ واضح طور پر سمجھ میں نہ آسکے اور مستفتی اس سے غلط فائدہ اٹھانا چاہتے تو ایسے سوالات کو نظر انداز کر کے اس سے دوبارہ مسئلہ واضح طور پر لکھ کر بھیجنے کا کہا جاتا ہے۔

اہم اور متنازعہ استفسارات کی تنقیح کے لیے مبتلیٰ بہ یا فریقین کو سوال کی وضاحت کے لیے طلب کیا جاتا ہے، خصوصاً متنازعہ مسائل میں فریقین کی حاضری کے بغیر جواب

دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔

فتاویٰ کی اشاعت

چونکہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے اس محتاط شعبہ کے جاری شدہ فتاویٰ کی مقبولیت ہر خاص و عام کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی اور جامعہ حقانیہ کے فضلاء، دیگر علماء کرام اور عوام الناس کی خواہش اور تمنا تھی کہ ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر افادۂ عام کا ذریعہ بنے اور ہر کوئی اس سے مستفید ہو۔ ان سب کے اس بے حد اصرار پر جامعہ کے اربابِ اہتمام خصوصاً حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ) نے ان فتاویٰ کو جدید ترتیب اور تحقیق کے بعد باحوالہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے آپ نے جامعہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کو منتخب کیا اور مفتی صاحب نے اپنی تدریسی اور افتاء کی مصروفیات کے باوجود اس بارِ گراں کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

فتاویٰ کی تحقیق و ترتیب

۱۴۰۹ھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم نے شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء قائم کیا تو اس وقت اس شعبہ کی تمام تر ذمہ داری حضرت جناب مولانا مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ کے سپرد ہوئی۔

شعبۂ تخصص کے آغاز سال سے جو طلباء درجہ تخصص میں داخل ہوئے تو باہمی مشورہ سے ان طلباء کو اختتامی مقالہ کے طور پر جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے جاری شدہ فتاویٰ کی ترتیب و تحقیق اور تخریج کے لیے ایک خاص جزء حوالہ کر دیا گیا، اور شعبہ تخصص کے نگران استاذ کی نگرانی میں یہ طلباء کام کرتے رہے اور یہ سلسلہ تادمِ این تحریر جاری ہے۔ اس طویل اور انتہائی محنت طلب کام میں مندرجہ ذیل نشر کا شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامیؒ والافتاء نے حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب کی زیرِ نگرانی اور اپنے وقت کے رئیس دارالافتاء و رئیس شعبۂ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ کی سرپرستی میں بھرپور حصہ لیا:۔

(۱) مولانا غلام قادر نعمانی صاحب، یکہ غنڈ، مہمند ایجنسی (۲) مولانا مسعود الرحمٰن صاحب، مانسہرہ (۳) مولانا فضل ہادی، بے سود۔ (۴) مولانا عمر شیر، گندھاب، مہمند ایجنسی۔ (۵) مولانا حسین احمد، جدون۔

(۶) مولانا جاوید اقبال، کرک۔ (۷) مولانا محمد حنیف، معیار، مردان (۸) مولانا عبد الولی، کنڑ، افغانستان۔ (۹) مولانا حبیب حضرت، ننگرہار، افغانستان (۱۰) مولانا محمد عقیل سواتی (۱۱) راقم الحروف مختار اللہ، جہانگیرہ۔ (۱۲) مولانا محمد عارف، چارسدہ (۱۳) مولانا گوہر علی، تنگی چارسدہ (۱۴) مولانا نجم الرحمٰن، تمبولک، مردان۔ (۱۵) مولانا ذاکر حسن، مصری بانڈہ، نوشہرہ (۱۶) مولانا محمد اجمل، ڈومیل، بنوں (۱۷) مولانا نور الحق، بنوں (۱۸) مولانا امام الدین مہدی، فرمان خیل، افغانستان (۱۹) مولانا عبد الحمید، نوشہرہ (۲۰) مولانا ارشاد احمد، مرغز، صوابی (۲۱) مولانا محمد کمیل، شموزئی، سوات۔ (۲۲) مولانا دلبر شاہ، ڈاگئی، صوابی (۲۳) مولانا محمد فرید، پشوڑی، ہزارہ (۲۴) مولانا گلزار احمد، سلیم خان، صوابی (۲۵) مولانا فدا محمد، لاہور، صوابی (۲۶) مولانا امداد اللہ، راولپنڈی، (۲۷) مولانا حیات اللہ، شہروان، افغانستان۔

اس طرح ہر سال ایک خاص مجموعہ تیار ہوتا رہا، یہاں تک کہ حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ اپنے قائم کردہ مدرسہ جامعہ عثمانیہ پشاور تشریف لے گئے۔ ان کے بعد درجہ تخصص کے اساتذہ اور مشرفین کو تخصص کی نگرانی و تدریس کا موقع ملا، ان میں علامہ مولانا ڈاکٹر سید شبیر علی شاہ الحقانی المدنی (جو جامعہ حقانیہ کے فیضیافتہ، فاضل اور اب استاذ الحدیث ہیں) حضرت مولانا مفتی غلام قادر صاحب، اور حضرت مولانا مفتی سیف اللہ صاحب حقانی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب کے جامعہ حقانیہ سے پشاور چلے جانے کے بعد فتاویٰ کی ترتیب کا کافی کام باقی رہ گیا تھا، مسائل کی تخریج تقریباً نصف باقی تھی، بعض مسائل میں حوالہ جات کی تخریج بھی نامکمل تھی، لہٰذا حضرت مفتی صاحب کے جامعہ ھٰذا سے جاتے وقت فتاویٰ کے حوالہ جات کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کے لیے جامعہ کی انتظامیہ نے باہمی مشورہ سے راقم الحروف کا نام تجویز کیا، چنانچہ یہ اہم اور مشکل کام اس ناچیز کے حوالے کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ بارگراں مجھ جیسے کمزور و ناتواں طالب علم کے لیے اٹھانا بہت مشکل تھا لیکن جامعہ کے مشفق اور اکابر اساتذہ کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ کتاب الطہارۃ سے لے کر کتاب الحج تک جب مقالہ جات پر نظر ثانی کی گئی تو فی الجملہ ان میں کافی کمی پائی گئی، جسے محنتِ شاقہ کے بعد پورا کیا گیا۔ اس کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر کچھ عرصہ کے لیے یہ کام معطل رہا۔

۱۹۹۷ء کو اس ناچیز کی دارالعلوم حقانیہ میں تقرری ہوئی تو حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ کے حکم پر فتاویٰ کی ترتیب و تحقیق اور فتاویٰ حقانیہ کے مدونہ دفاتر سے مزید فتاویٰ کی

تخریج (جو مقالہ جات میں درج نہیں ہوئے تھے) کا کام اور اس کے ساتھ ساتھ کتابت کی نگرانی بھی سونپی گئی، کام اگرچہ مشکل اور ذمہ داری کا تھا مگر احقر نے اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کے باوجود حضرت مہتمم صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ جہاں جہاں مشکلات پیش آتی رہیں حضرت مہتمم صاحب اور جامعہ حقانیہ کے مشفق اساتذہ و مفتیان کرام سے مشورہ کرتا رہا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور ان حضرات کی راہنمائی سے کام آسان ہوتا گیا۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات درس و تدریس، جامعہ حقانیہ کے اہتمام اور ملک بھر کی سیاسی تگ و دو کے ساتھ ساتھ اول سے آخر تک اس سارے کام کی ترتیب و تخریج و تبویب اور کتابت کی نگرانی کے لیے بھی وقت نکالتے رہے، اس سارے کام کی دیکھ بھال کے لیے احقر کی ان کے ساتھ کئی طویل نشستیں بھی ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی مساعی کو بار آور اور مقبول فرما کر ذخیرۂ آخرت بنا دے۔ (آمین)

اس نئی ترتیب کا آغاز ۱۹۹۸ء میں ہوا تھا اور تین چار سال کے اس عرصے میں فتاوی کے مدونہ دفاتر کے نصف حصہ کی تخریج مع تحقیق و ترتیب (جو ترتیب کنندگان سے رہ گئی تھی) مرتب شدہ مقالہ جات کی نظر ثانی اور ان میں پائی گئی کمی کی تکمیل اور اس کے ساتھ جدید طرز پر حوالہ جات کی تحریراً تکمیل ہوئی۔ فتاوی کے مدونہ دفاتر سے مسائل کی تخریج و تحقیق کا کچھ حصہ ارباب جامعہ نے بعض شرکاء شعبۂ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کو بطور مقالہ جات تفویض کیا جس کی نگرانی جامعہ نے راقم الحروف کے حوالہ کی، ان طلباء میں (۱) مولانا محمد وہاب منگلوری۔ سوات (۲) مولانا عبد العزیز جہانگیروی (۳) مولانا سجاد احمد کتوزئی، چارسدہ کے اسماء شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان جملہ شرکاء شعبۂ تخصص کی مساعی کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے اور ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

طرزِ ترتیب اور خصوصیات فتاوی دار العلوم حقانیہ کی ترتیب کا انداز اور طریقۂ کار دیگر عصری فتاوی سے مختلف رکھا گیا ہے تاکہ عوام الناس کے ساتھ ساتھ علماء کرام اور مفتیان عظام کو مسئلے کا حل باحوالہ مل سکے۔ حوالہ جات کے سلسلہ میں صرف ایک کتاب پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ کئی کتابوں سے حوالہ جات نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فتاوی کی ترتیب میں مندرجہ ذیل طریقۂ کار پیش نظر رکھا گیا ہے۔

(۱) فتاوی حقانیہ چونکہ سینکڑوں دفاتر اور ہزاروں فوٹو کاپیوں پر مشتمل تھا جن سے حتی الامکان تکرارات حذف کر کے فتاوی کو حتمی شکل دی گئی ہے۔

(۲) فتاویٰ کی اشاعت جدید اردو فتاویٰ کے طرز ترتیب پر کی گئی ہے جن میں کتاب العقائد، تفسیر، حدیث، بدعات و رسومات وغیرہ کا ذکر مقدم رکھا گیا ہے اور باقی فقہی ابواب کا ذکر قدیم طرز ترتیب کے مطابق رکھا گیا ہے، البتہ کتاب الکراہیۃ والاباحۃ کو بدعات و رسومات کے ساتھ رکھا گیا ہے۔

(۳) جواب مختصر الفاظ میں مگر اس کے جامع و مانع ہونے کا لحاظ کر کے دیا گیا ہے۔

(۴) تمہیدی کلمات کو اکثر مقامات سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ہر جلد کے ساتھ تفصیلی فہرست مرتب کی گئی ہے جس کی وجہ سے مسائل کی تخریج میں سہولت رہے گی۔

(۵) ہر جواب کا حوالہ تلاش کیا گیا ہے اور ہر جواب کے دو تین حوالے تحریر کیے گئے ہیں، جواب کے ساتھ جواب دینے والے مفتی کا نام نہیں لکھا گیا کیونکہ بعض فتاویٰ میں مفتی کا نام نہیں مل رہا تھا مگر ہر مفتی کا تبحر علمی اور ثقاہت مسلم رہی، اس لیے تمام فتاویٰ کی نسبت مجموعی طور پر دارالافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ کی طرف کی گئی۔

(۶) حوالہ جات کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ ایک حوالہ جواب کے ساتھ رکھا گیا ہے اور دو حوالے حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں مگر ان میں سے ایک حوالہ مع عبارت تحریر کیا گیا ہے جبکہ دوسرے حوالے کے لیے صرف کتاب کی جلد نمبر اور صفحہ نمبر پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ حوالہ جات میں کتاب کا نام، جلد نمبر، صفحہ نمبر کے علاوہ باب و فصل ذکر کرنے کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ قدیم و جدید نسخوں اور ایڈیشنوں کے اختلاف کی وجہ سے اصل مراجع کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہو۔

(۷) کوشش یہ کی گئی ہے کہ فتاویٰ کے جملہ مسائل اپنے متعلقہ ابواب میں اس کے ذیلی عنوانات کے تحت ذکر کیا جائے لیکن اگر کسی جگہ ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو ہر کتاب کے آخر میں مسائل شتیٰ کا عنوان دے کر اس کتاب سے متعلق مسائل اس میں درج کیے گئے ہیں۔

(۸) ہر کتاب میں جو ذیلی ابواب ہیں ان کو جلی حروف سے لکھ کر اس کے متعلقہ مسائل اسی میں لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ مسئلہ تلاش کرنے والے کے لیے آسانی ہو۔

(۹) دارالعلوم حقانیہ کے مؤقر جریدہ ماہنامہ "الحق" میں وقتاً فوقتاً حالات حاضرہ سے متعلق جدید مسائل کے حل میں دارالعلوم کے مفتیان اور دارالافتاء کی جانب سے جو مضامین اور فتاویٰ شائع ہوتے رہے انہیں بھی مناسبت کی وجہ سے اپنے متعلقہ ابواب میں درج کر کے فتاویٰ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

بالخصوص موجودہ جدید مسائل، درپیش حوادث و نوازل میں حضرت مہتمم صاحب کے تحریر کردہ یا اسمبلی میں پیش کردہ مباحث وغیرہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔

اظہارِ تشکر راقم الحروف اول اس ذاتِ عالی کا شکر گذار ہے جس نے اس عظیم کام کی تکمیل کی ہمت عطا فرمائی اور پھر ان حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے اس گراں قدر اور مشکل کام کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں حصہ لیا، ان میں مولانا محمد ابراہیم فانی صاحب استاد جامعہ دارالعلوم حقانیہ، مخدوم زادہ مولانا حافظ راشد الحق سمیع استاد جامعہ دارالعلوم حقانیہ اور مدیر ماہنامہ الحق، جناب سراج الاسلام سراج صاحب، جناب پروفیسر محمد افضل رضا صاحب، جناب پروفیسر مفتی محمد الیاس صاحب خصوصی طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔

محترم جناب ابو عثمان محمد لطیف کیلانی صاحب (کاتب فتاویٰ حقانیہ) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اردو محاورات کی تصحیح میں کافی معاونت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

ضروری گذارش اہلِ علم حضرات کی خدمت میں التجا ہے کہ اگر فتاویٰ حقانیہ کی تصحیح و درستی کے کام پر خاص توجہ دی گئی ہے مگر پھر بھی الانسان مرکب عن الخطاء والنسیان کے مطابق اغلاط کا کام رہ جانا ممکنات میں سے ہے، اس لیے اگر کسی قسم کی کوئی غلطی یا خامی کہیں نظر آجائے تو ازراہِ کرم اس کی نشاندہی فرمائی جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔ تشکر

(مولانا مفتی) مختار اللہ حقانی
خادم شعبۂ تخصص و دارالافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ
اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)
۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

کتاب العقائد والفرق

الحمد للہ رب العلمین

الرحمن الرحیم

مالک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین

اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم

غیر المغضوب علیهم و لا الضالین

اللهم افتح لنا بالخیر

واختم لنا بالخیر واجعل عواقب

امورنا بالخیر - آمین یا رب العلمین

لاہور - ٣ محرم الحرام ١٣٩٣ھ

کتاب العقائد والایمانیات

(ایمان اور عقائد کے مسائل واحکام)

اللہ تعالیٰ کی شان میں توہین آمیز کلمات کہنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کے ساتھ ذاتی عناد کے باعث اللہ تعالیٰ کی شانِ عالیہ میں توہین آمیز کلمات بکے ہیں، اس شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کے اوامر و نواہی کے لیے گستاخانہ کلمات استعمال کرنا موجبِ کفر و ارتداد ہے، تاہم اگر یہ شخص توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہے اور اگر شادی شدہ ہو تو توبہ کے بعد تجدیدِ نکاح کرنا بھی لازمی ہے۔

لما قال فی الهندیة: ویکفر اذا وصف الله تعالیٰ بما لا یلیق به او سخر باسم من اسمائه او بامر من اوامره او انکر وعده او وعیده۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۲۵۸ باب التاسع فی المرتدین) [1]

قرآن مجید کی توہین موجب کفر ہے

سوال:۔ قرآن مجید کی اہانت کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شعائرِ الٰہی میں قرآنِ مجید سب سے بڑا شعیرہ ہے اور اس کا احترام اور تعظیم مسلمانوں پر فرض ہے۔ قال الله تعالیٰ: وَمَنْ یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب۔ (سورة الحج آیت ۳۲) اور اس کی توہین و اہانت سے کفر لازم ہوتا ہے۔

لما قال ملا علی القاری رحمه الله، ومن استخف بالقرآن او بالمسجد او بنحوه مما یعظم فی الشرع کفر۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۶۸ فصل فی القرأة والصلوٰة)

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: فیکفر اذا وصف الله تعالیٰ بما لا یلیق به او سخر باسم من اسمائه او بامر من اوامره او انکر وعده او وعیده ..... الخ

(البحر الرائق ج۵ ص۱۲۰ احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۳۸۳ کتاب الفاظ الکفر۔ الفصل الثانی۔

لہٰذا قرآن مجید کی توہین کرنے والے کو تجدیدِ ایمان و نکاح ضروری ہے کیونکہ وہ اپنے فعلِ بد کی وجہ سے مرتد ہو جاتا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ما یکون کفراً اتفاقاً یبطل العمل والنکاح و اولادہ اولاد الزنا وما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار و التوبۃ وتجدید النکاح۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۳ ص۲۴۵ باب المرتد، مطلب جملۃ من لایقتل اذا ارتد) [1]

کلمہ طیبہ کو گالی دینے والا کافر ہے

سوال: اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ کو گالی دے تو از روئے شرع اس شخص کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جو شخص کلمہ طیبہ کو گالی دے تو اس سے وہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ "کلمہ طیبہ" کو گالی دینا دینِ اسلام کے ساتھ استخفاف ہے اور استخفافِ دین موجبِ کفر و ارتداد ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ ویظھر من ھٰذا ان ما کان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد الاستخفاف لانہ لو توقف علیٰ قصدہ لما احتاج الیٰ زیادۃ عدم الاخلال بما مر لان قصد الاستخفاف مناف للتصدیق۔ (رد المحتار جلد۳ ص۲۲۲ باب المرتد قبل مطلب فی منکر الاجماع) [2]

اسلامی نظام کو "فرسودہ نظام" کہنا کفر ہے

سوال: اگر کوئی مسلمان ہوش و حواس کے قائم ہوتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ "اسلامی نظام فرسودہ ہے" تو شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اللہ تعالیٰ نے اسلام کو قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات، امن و سلامتی کا نظام ٹھہرایا ہے، لہٰذا اس کو "فرسودہ نظام کہنا" شریعت کا

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: رجل یقرأ القرآن فقال رجل این چہ بانگ طوفان است فھٰذا کفر۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۹۱ کتاب احکام المرتدین ... فیما یتعلق بالقرآن)

وقال الملا علی القاریؒ: من قال لا ادری صفۃ الاسلام فھو کافر۔ قال شمس الائمۃ الحلوانیؒ: فھٰذا رجل لادین لہ ولا صلوٰۃ ولا صیام ولا طاعۃ ولا نکاح واولادہ اولاد الزنا۔

(شرح الفقہ الاکبر ص۲۶۷ فصل فی الکفر صریحا وکنایۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۱۲ ص۳۶۲ احکام المرتد۔

[2] قال العلامۃ مُلّا علی القاریؒ:۔ من اھان الشریعۃ او المسائل التی لابد منھا کفر۔

(شرح الفقہ الاکبر ص۱۷۴ فصل فی العلم والعلماء)

استہزاء ہے اور بقائمی ہوش و حواس شریعتِ مقدسہ سے استہزاء کرنے سے مسلمان کافر ہوجاتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ما کان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد الاستخفاف۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۱۱ باب المرتد) لہ

شاتمِ رسول کی توبہ کا حکم

سوال:- اگر کوئی مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گالی دے اور بعد میں پشیمان ہوا اور توبہ بھی کرے تو از روئے شریعت اس کی توبہ مقبول ہے کہ نہیں؟

الجواب:- جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والا مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: اجمع المسلمون ان شاتمہ کافر وحکمہ القتل۔ (ردالمحتار ج۴ ص۲۳۲ باب المرتد۔ مطلب مہم فی حکم ساب الانبیاء)

تاہم اگر شاتمِ رسول اپنے اس فعل پر نادم ہو کر توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہے اور تجدیدِ ایمان کے بعد دوبارہ مسلمان سمجھا جائے گا۔

قال ابوالحسن علی بن الحسین السعدیؒ: من سبّ رسول اللہِ فانہٗ مُرتد ویفعل بہ مایفعل بالمرتد۔ (المنتف فی الفتاویٰ ج۲ ص۶۹۴ باب المرتد)

قال العلامة ابن عابدینؒ: ظاهر فی قبول توبته کما لا یخفٰی۔ (منحة الخالق علی البحرالرائق ج۵ ص۱۳۵ باب المرتد) ۲ہ

انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہنا

سوال:- ایک شخص کا یہ کہنا کہ انبیاء کرامؑ (نعوذ باللہ) گندے

لہ قال العلامة مُلاّ علی القاریؒ: ومن قال الشرع وامثالہ لا یفید نی ولا ینفذ عندی کفر۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۲۶۳ فصل فی العلم والعلماء)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج۱۲ ص۳۵۳ احکام مُرتد۔

۲ہ قال ابن عابدینؒ: وان مذهب ابی حنیفةؒ والشافعیؒ ان حکمہ حکم المرتد وقد علم ان المرتد تقبل توبته ویؤیدہٗ ما نقلہ هنا عن النتف۔ (رسائل ابن عابدین ج۱ ص۳۳۳ تنبیہ الولاة والحکام علی احکام شاتم خیر الانام)

نطفے سے پیدا ہوئے ہیں تو ایسا نازیبا کلمہ بولنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب: ہر مسلمان پر تمام انبیاء علیہم السلام کا احترام واجب ہے کیونکہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور معصوم بندے ہوتے ہیں اُن پر کوئی عیب لگانا یا ان کی شان میں بے ادبی کے کلمات بولنا موجب کفر ہے، مسلمان کو ایسے کلمات سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة ابن البزازؒ:- ولو عاب نبيًّا كفر..... وقيل قال ان آدم عليه السلام نسج الكرباس فقال نحن اذن اولاد الحائك يكفر۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص۳۲۷ احكام المرتدين۔ الثالث فى الانبياء) ـلـه

صحبت صدیق اکبرؓ کا منکر کافر ہے

سوال: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر کافر ہے یا نہیں ؟

الجواب: حضرت ابوبکر صدیقؓ کا صحابیٔ رسول ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔

قال الله تبارك وتعالىٰ: إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا۔ (سورة التوبة آيت ۴۰)

قال الامام الرازيؒ: ان الامة مجتمعة على ان المراد من [اذ يقول لصاحبه] هو ابوبكر۔ (تفسير الكبير ج ۱۶ ص۶۵ سورة التوبة)

اس لیے جو کوئی بھی آپؓ کی صحابیت کا انکار کرے فقہائے کرام نے اس کو کافر اور مرتد قرار دیا ہے۔ ـه۲

قال ابن عابدينؒ: نعم لاشك فى تكفير من قذف السيدة عائشةؓ او انكر صحبة الصديقؓ الخ (رد المحتار ج ۳ ص۲۳۷ باب المرتد)

ـلـه وفى الهندية: ولو قال محمد درويشك بود او قال جامهٔ پيغمبر ريمناك بود (ترجمه) محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم كان درويشًا او قال كانت ملابس الرسول قذرة او قال قد كان طويل الظفر فقد قيل يكفر مطلقًا وقد قيل يكفر اذا قال على وجه الاهانة۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۶۳ الباب التاسع فى احكام المرتدين)

ومثله فى التاتارخانية ج۵ ص۵۱۸ احكام المرتدين فصل فيما يعود الى الانبياء عليهم السلام۔

ـه۲ قال العلامة ملا على القاريؒ:- فقد اجمعوا على ان من انكر صحبة ابى بكر الصديقؓ كفر بخلاف انكار صحبة غيره لورود النص فى حقه حيث قال الله تعالىٰ: "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِى الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" فاتفق المفسرون ان المراد بصاحبه هو ابوبكر الصديق و فيه ايماء الى انه الفرد الاكمل من اصحابه حيث يحمل الاطلاق على بابه۔

(شرح الفقه الاكبر ص۱۰۱ تفضيل الخلفاء بعد الانبياء)

سبِّ شیخینؓ موجبِ فسق ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! شیعہ حضرات شیخینؓ کو گالیاں دیتے ہیں تو کیا سبِّ شیخینؓ سے کفر لازم آتا ہے کہ نہیں؟

الجواب: شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی شان میں گستاخی کرنا اور گالیاں دینا محققین علماء کے نزدیک کفر نہیں ہے البتہ فسق اور گمراہی ضرور ہے اور اس فعلِ بد سے توبہ لازم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اتفق الائمۃ علی تضلیل اھل البدع اجمع تخطئتھم وسبّ احدٍ من الصحابۃ وبغضہ لا یکون کفراً لکن یضلل۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۲۱ باب المرتد مطلب فی حکم سب الشیخین)[1]

البتہ اگر کوئی شیخینؓ کی توہین کو حلال سمجھنے کا عقیدہ رکھے تو پھر کفر سے خالی نہیں۔

قال العلامۃ ملّا علی القاریؒ: لو استحل السبّ او القتل فھو کافر لا محالہ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۸۲)

امیرِ معاویہؓ کی شان میں گستاخی جائز نہیں ہے

سوال: بعض لوگ حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں زبان درازی کرتے ہیں اور ان کے مشاجرات کو اعلانیہ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؓ اہلِ بیتِ رسول کے دشمن تھے، تو ان باتوں کی شرعاً کیا حقیقت ہے؟ اور بحیثیتِ مسلمان آپؓ کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟

الجواب: جتنی احادیث حضرت امیرِ معاویہؓ کے مناقب میں وارد ہیں وہ سب اس بات کی شاہد ہیں کہ آپؓ اجلّہ صحابہؓ میں سے ہیں۔ عن عبد الرحمٰن بن ابی عمیرۃ وکان من اصحاب النبیّ صلعم عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال لمعاویۃ اللّٰھمّ اجعلہ ھادیًا مھدیًا واھدبہ۔

(ترمذی ج۲ ص۲۲۴ مناقب معاویۃؓ بن ابی سفیانؓ)

اور ان کے درمیان جو مناقشات جاری ہوئے تھے تو وہ بظاہر اعتقادِ تصویب کے تھے۔

قال العلامۃ ملا علی القاریؒ قال ابو منصور البغدادیؒ: واما معاویۃ فھو من العدول الفضلاء والصحابۃ الاخیار والحروب التی جرت بینھم کانت لکل طائفۃ شبھۃ اعتقدت تصویب انفسھا بسببھا وکلھم متأولون فی حروبھا ولم یخرج بذلک

---

[1] قال العلامۃ ملّا علی القاری رحمہ اللّٰہ: ان سبّ الشیخینؓ لیس بکفر کما صححہ ابو الشکور السالمی فی تمہید ہ وذلک لعدم ثبوت مبناہ وعدم تحقق معناہ فان سبّ المسلم فسق کما فی حدیث ثابت۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۸۶ الکبیرۃ لا تخرج المؤمن عن الایمان)

احدٌ منهم من العدالة لانهم مجتهدون اختلفوا فی مسائل کما اختلفت المجتهدون فی مسائل ولا یلزم من ذلك نقص احد منهم۔ (مرقاۃ ج ۱۱ ص۲۷۲ باب مناقب الصحابۃ)[1]

صحابیتِ حسینؓ کا ثبوت

سوال:۔ بعض لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صحابیت کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بوقتِ وفات نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم آن کی عمر پانچ سال تھی اور آپ نا بالغ تھے، اسکے بارے میں وضاحت مطلوب ہے؟

الجواب:۔ جمہور محدثین اور اربابِ فتویٰ کے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جملہ فضائل و مناقب کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی حاصل ہے، بلکہ تمام فضائل میں ام الفضائل صحابیت ہے اور ثبوتِ صحابیت میں کم سنی کو مانع سمجھنا کوئی قابلِ توجہ بات نہیں۔ عام محدثین کے نزدیک صحابی وہ کہلاتا ہے جس نے ایمان کی حالت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، خواہ کسی بھی عمر میں ہو۔ بعض علماء نے صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بلوغ کی قید لگائی ہے لیکن جمہور محدثین کے نزدیک یہ قول ضعیف و مردود ہے، باقی بوقتِ وفاتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر کا پانچ سال ہونا قطعی اور یقینی نہیں بلکہ اس بارے میں سات سال تک کی روایات ملتی ہیں، اور سات سال کی عمر میں بچہ فہم و شعور کو پہنچ جاتا ہے بلکہ کتبِ حدیث میں آپ کی روایات اپنے نانا حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے موجود ہیں اور محدثین نے ان کو معتبر قرار دیا ہے۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں آپ کی عدمِ صحابیت کا قائل ہونا بے اصل و بے بنیاد ہے۔

لما قال الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: من صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم او رآہ من المؤمنین فهو صحابی۔ (بخاری شریف ج ۱ ص۵۱۵ باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

وقال العلامۃ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ:۔ ومنهم من اشترط فی ذلك ان یکون حین اجتماعه بالغًا وهو مردود لانه یخرج مثل الحسین بن علیؓ ونحوه من احداث الصحابۃ والذی جزم به البخاری هو

---

[1] قال العلامۃ ابن تیمیۃ: ان هذہ الآثار المرویۃ فی مساویهم ..... والصحیح منه هم فیه معذورون اما مجتهدون مصیبون واما مجتهدون مخطئون وهم مع ذلك لا یعتقدون ان کل واحد من الصحابۃ معصوم من کبائر الاثم وصغائرہ بل یجوز علیهم الذنوب فی الجملۃ ولهم من الفضائل والسوابق ما یوجب مغفرته ما یصدر منهم ان صدر۔ (شرح العقیدۃ الواسطیۃ ص۱۹۸ تفصیل مراتب القدر)

قول احمد والجمهور من المحدثین۔ (فتح الباری شرح البخاری ج۳ ص۷ فی باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ صلوٰۃ اللیل والنوافل) لے

علماء دیوبند کو وہابی کہنے کا حکم | **سوال:** علماء دیوبند کے لیے وہابی کا لفظ استعمال کرنا کیسا ہے؟ نیز یہ لفظ کس فرقے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؟

الجواب: علماء دیوبند کے متعلق لفظ "وہابی" کا استعمال بے بنیاد اور بے اصل ہے "وہابی" اصل میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں کو کہا جاتا ہے اور آپ حنبلی تھے جبکہ علماء دیوبند امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، اس لیے ان کو غیر مقلد یا وہابی کہنا سراسر جہل اور تعصب ہے۔

عالمِ دین کی تحقیر کرنا موجب کفر ہے | **سوال:** علماء دین کو گالی دینا یا ان کو سکھ، ہندو، برہمن کی طرف منسوب کرنے سے انسان کافر ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ذاتی رنجش و عداوت یا دنیوی معاملات کی وجہ سے کسی کو گالی دینا موجب فسق ہے۔ لقولہ علیہ السلام: سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر۔ (ترمذی ج۲ ص۱۹ باب ماجاء فی الشتم)

ہاں اگر کسی عالمِ دین کی اس کے علم کی وجہ سے تحقیر کرنا مقصود ہو تو فقہاء کرام نے ایسے شخص پر کفر و ارتداد کا فتویٰ دیا ہے۔

لما قال العلامۃ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ: من ابغض عالماً من غیر سبب ظاہر خیف علیہ الکفر۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۳۸۸ کتاب الفاظ الکفر)

قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: قلت الظاہر انہ یکفر لانہ البغض العالم من غیر سبب دنیوی او اخروی فیکون بغضہ لعلم الشریعۃ ولا شک فی کفر من انکر۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۷۳) کلہ

لے قال العلامۃ ابن کثیرؒ: فانہ من سادات المسلمین وعلماء الصحابۃ وابن بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التی ھی افضل بناتہ وقد کان عابداً وشجاعاً وسخیاً۔

(البدایۃ والنہایۃ ج۸ ص۲۰۴ قبیل بحث واما قبر الحسین رضی اللہ عنہ)

وَمِثْلُہٗ فی المشکوٰۃ ص۵۷۰ فی مناقب اہل بیت۔ وکذا فی المرقاۃ المفاتیح۔

کلہ قال العلامۃ ابن البزاز الکردریؒ: وشتم العالم والعلوی لامر غیر صالح فی ذاتہ وعداوت لخلافہ الشرع لایکون کفراً ولا خطاءً۔ (فتاویٰ البزازیۃ علیٰ ہامش الہندیۃ ج۶ ص۳۳۷ الثامن فی الالفاظ جن علم)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاویٰ ج۵ ص۳۹۳ کتاب العقائد والکلام۔

اسی طرح کسی عام مسلمان کو سکھ، ہندو یا برہمن کی طرف منسوب کرنا بھی موجب کفر ہے۔

لما قال العلامة مُلّا علی القاریؒ: ومن قال یا کافر فسکت المخاطب کان الفقیہ ابوبکر البلخیؒ یقول یکفر ھٰذا القاذف ای الشاتم۔ الخ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۸۱ فصل فی الکفر صریحاً وکنایۃ)

کسی مسلمان کو گدھا کہنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کسی مسلمان کو گدھا کہنے سے آدمی کافر ہوتا ہے کہ نہیں؟

الجواب: بلا کسی سبب کے کسی مسلمان کو قبیح چیز کی طرف منسوب کرنا جرم اور گناہ ہے، لیکن کسی مسلمان کو گدھا کہنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا ہے تاہم ایسا کہنے والا شخص قابلِ تعزیر ضرور ہے کہ حاکم وقت ایسے شخص پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ تعزیر نافذ کرنا صرف حکومت کے دائرۂ اختیار میں ہے، رعایا میں سے کسی قانون ہاتھ میں لے کر از خود تعزیر جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: رَجُلٌ قال لصالح یا فاسق یا حمار یا فاجر یا خبیث یا خنزیر ــــ ذکر الفاطفیؒ: ان علیہ التعزیر فی ھٰذہ الالفاظ۔

(فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۴۷۹ فصل فیما یوجب التعزیر)[۱]

داڑھی رکھنے والوں کو گالی دینے والے کا حکم

سوال: داڑھی رکھنے والے مسلمانوں کو کافر اور ان کو بُرا بھلا کہنے والے کا از روئے شریعت کیا حکم ہے؟

الجواب: داڑھی رکھنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبوب سنت نہیں بلکہ سنت الانبیاء ہے اور شعائر دینِ اسلام میں سے ہے، اس لیے داڑھی کی وجہ سے کسی مسلمان کی تحقیر کرنے اور اس کو بُرا بھلا کہنے سے ایمان زائل ہوجاتا ہے، لہٰذا اس قسم کے کلمات سے ایک مسلمان کو پرہیز کرنا چاہیئے۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال ایں چہ رسم است سبت بست کردن و دستار بزیر گلو آوردن

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ان المسبوب من الاشراف کالفقہاء والعلویۃ یعزر لانہ یلحقھم الوحشۃ بذلک وان کان من العامۃ لا یعزر۔ (ردّ المحتار ج۴ ص۷۱ باب التعزیر۔ مطلب فی الجرح المجرد)

(ای ماھٰذہ العادۃ تقصیر الشارب وارخاء الطیلسان تحت الرقبۃ) فان قال ذٰلک علیٰ سبیل الطعن فی سُنّۃ رسول اللہ فقد کفر کذا فی المحیط۔

(فتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۲۶۵ الباب التاسع فی احکام المرتدین)

سنن اور نوافل کی توہین موجب کفر ہے

سوال: سُنن (رواتب) اور نوافل کو استخفافاً ادا نہ کرنا اور اس کو چوپٹہ (پہاڑی زبان میں جانور کی دُم) کہنے والے کا از روئے شریعت کیا حکم ہے؟

الجواب: سنن ہدٰی اور سنن مؤکدہ کا چھوڑنے والا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور استخفافاً چھوڑنا موجب کفر ہے لہٰذا اس قسم کے شخص کو اپنے اس قول سے توبہ اور ایمان کی تجدید کرنی چاہیئے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ تحت (قولہ لو عامداً غیر مستخف) فلو غیر عامد فلا اساءۃ ایضاً بل تندب اعادۃ الصلوٰۃ کما قدمناہ فی اوّل بحث الواجبات ولو مستخفا کفر لما فی النحر عن البزازیۃ: لو لم یر السنۃ حقاً کفر لانہ استخفاف۔ (ردالمحتار ج۱ ص۴۷۴ مطلب سنن الصلوٰۃ) [۲]

بتوں کے تاجر اور ان کو تراشنے والے کو کافر کہنے کا حکم

سوال: فتاویٰ قاضیخان میں ہے "ومن رضی بکفر الغیر یعید کافر" تو اگر کوئی شخص بتوں کی خرید و فروخت یا ان کو تراشنے کا کام کرتا ہو تو کیا اس کو کافر کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بتوں کو تراشنا یا ان کی خرید و فروخت کرنا نہ بت پرستی ہے اور نہ ہی اس سے بت پرستی پر رضامندی لازم آتی ہے، ایسے شخص کو کافر کہنا جہالت اور لاعلمی ہے فقہاء کی عبارات میں اسکے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامۃ قاضیخانؒ: ولو استاجر رجلاً لینحت لہ اصناماً او لیزخرف لہ بیتاً بالتماثیل فلا اجر لہ۔ (فتاویٰ قاضیخان مع سراجیۃ ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات) [۳]

---

[۱] قال العلامۃ مُلّا علی القاریؒ: وقص رب من سنن الانبیاء فتقبیحہ کفر بلا اختلاف بین العلماء۔ (شرح فقہ اکبر ص۱۷۳)

[۲] وفی الہندیۃ: رجل ترک سنن الصلوٰۃ ان لم یر السنن حقا فقد کفر لانہ ترکہا استخفافاً وان رأٰہا حقاً فالصحیح انہ یأثم لانہ جاء الوعید بالترک کذا فی المحیط۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۱۳ الباب التاسع فی النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۲ لفظ القرآن اسم للنظم والمعنی۔

[۳] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو استاجر رجلاً لینحت لہ اصناماً او یجعل علی الثواب تماثیل والصبغ من رب الثوب لاشیٔ لہ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۱۵۱ کتاب الاجارات)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۴ ص۴۵ کتاب الاجارات۔

سنتِ نبوی کی توہین کرنا کفر ہے

سوال:۔ سنتِ نبوی کی توہین کرنے اور اس کے ساتھ استہزاء کرنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جب کسی بھی عمل کا سنت ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہوجائے تو اس کی توہین اور تضحیک کرنا موجب کفر ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: درروزِ عاشوراء یکے را گویند کہ سرمہ دریں روز سنت است اوگوید کارزنان ومخنثان بود کافر گردد۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۶۵ الباب التاسع فی احکام المرتدین) لہ

نماز کی تحقیر کرنا

سوال:۔ ایک شخص کو کہا گیا کہ نماز پڑھے تو اس نے جواب میں کہا کہ نماز کوئی چیز نہیں اور نماز میں کیا رکھا ہے، تو نماز کے متعلق ایسے الفاظ کہنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز شعائر اللہ میں سے ہے اور واجب التعظیم عمل ہے، دینِ اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس کے بارے میں ایسے تحقیر آمیز الفاظ کہنا موجب کفر ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: اوقال نماز میکنم چیزے برسر نمی آید، اوقال تو نماز کردی چہ برسر آوردی ..... فھذا کلہ کفر کذا فی الخزانۃ المفتین۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۶۸ احکام المرتدین) ۲ہ

علماءِ کرام کے حق میں توہین آمیز کلمات بولنا

سوال:۔ ایک عالمِ دین کو بُرا بھلا کہنا اور اس کو بے دینی کی طرف منسوب کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ ایک عالمِ دین اور متبع شریعت شخص کی اہانت کرنا اور عدم تدین یعنی بے دینی

لہ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: بل بالمواظبۃ علی ترک سنۃ استخفافاً بھا بسبب انہٗ فعلھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم زیادۃ او استقبا حھا کمن استقبح من آخر جعل بعض العمامۃ تحت حلقہٖ واحفاء شاربہ۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۲ باب المرتد)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۲ استحلال المعصیۃ صغیرۃ ..... کفر۔

۲ہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ قلت ویظھر من ھذا ان ماکان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد الاستخفاف۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۲ باب المرتد)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۷۵ باب مایکون کفراً من المسلم الخ۔

کی طرف اس کی نسبت کرنا اگر دنیاوی یا کسی ذاتی عداوت کی بناء پر ہو تو اگرچہ یہ کفر و ارتداد تو نہیں ہے لیکن فسق اور عدم مروت ضرور ہے، البتہ اگر کسی عالم دین کے ساتھ کوئی ذاتی عداوت اور دشمنی نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ ایک عالمِ دین، متبع شریعت ہے اور اس کی وضع قطع سنتِ نبوی کے عین مطابق ہے تو بناء بریں اس کی اہانت و تذلیل کرنا درحقیقت شریعتِ مطہرہ کی اہانت و تذلیل کے مترادف ہے اور شریعتِ مطہرہ کی اہانت اور اس کے ساتھ بغض و استہزاء موجب کفر ہے۔ لہٰذا کسی عالم دین کی اسکی دینداری کی وجہ سے توہین کرنا کفر کے مترادف عمل ہے ۔

لما قال العلامة ملا علی القاریؒ وفی الخلاصة : من ابغض عالماً من غیر سبب ظاهر خیف علیه الکفر قلت الظاهر انه یکفر لانه اذا ابغض العالم من غیر سبب دنیوی او اُخروی فیکون بغضه لعلم الشریعة ولا شكّ فی کفر من انکر فضلاً عمن ابغضه ۔

(شرح الفقه الاکبر ص۱۷۶ فصل فی العلم والعلماء) [1]

مسجد کے متعلق نازیبا کلمات کہنا

سوال :- ایک شخص نے مسجد کے متعلق ایسے نازیبا کلمات کہے ہیں کہ انہیں الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا ایسے شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب :- مسجد شعائر اللہ میں داخل ہے اور شعائر اللہ کی توہین بعض اوقات موجبِ کفر بنتی ہے اور گالی دینے سے زیادہ توہین اور کیا ہوگی! ایسے شخص پر کفر کا شدید خطرہ ہے، اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک اپنے اس قول سے توبہ اور استغفار نہ کرے، تاہم کسی مسلمان کی طرف بلا تحقیق ایسے کلمات منسوب نہیں کرنے چاہئیں جو اُس نے نہ کہے ہوں ۔

لما قال العلامة ملا علی القاری رحمه الله ، من استخف بالقرآن او بالمسجد او بنحوه

---

[1] وقال فی الهندیة : فی النصاب من ابغض عالماً من غیر سبب ظاهر خیف علیه الکفر و اذا قال لرجل مصلح دیدار وے ترین چنان است که دیدار خوک یخاف علیه الکفر کذا فی الخلاصة: اذا شتم عالماً او فقیهاً من غیر سبب۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۲۷۰ ومنها ما یتعلق بالعلم والعلماء)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص۳۳۶، ۳۳۷ الثامن فی الاستخفاف بالعلم ۔

مما يعظم فی الشرع کفر۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۲۵ فصل فی القرأۃ والصلوٰۃ) [1]

ختمِ نبوت کا منکر کافر ہے

سوال:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا عقیدہ رکھنا فرض ہے یا سنت یا مستحب؟ اور انکارِ ختمِ نبوت کفر ہے یا معمولی گناہ؟

الجواب:۔ عقیدۂ ختمِ نبوت بنصِ قرآن وحدیث فرض ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء والمرسلین اور آپ کے لائے ہوئے دین کو خاتم الادیان سمجھنا فرض ہے، آپ کی ختمِ نبوت کا منکر اور آپ کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کا معتقد کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)

عن ابی هریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلی ومثل الانبیاء کمثل قصرٍ احسن بنیانہٗ تُرِكَ منہ موضع لبنۃٍ فطاف بہ النظار یتعجبون من حسن بنیانہ الا موضع تلك اللبنۃ فکنتُ اَنا سددتُ موضع اللبنۃ ختم بی البنیان وختم بی الرسل وفی روایۃ فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔ متفقٌ علیہ۔

(مشکوٰۃ ج۳ ص۱۶۰۱ حدیث ۵۷۴۵) [2]

حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے

سوال: عوام الناس میں حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ اللہ کے نبی تھے یا ولی؟

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: (من هزل بلفظ کفر) ای تکلم بہ باختیارہ غیر قاصد معناہ .....لان التصدیق وان کان موجوداً حقیقۃ لکنہ زائل حکماً لان الشارع جعل بعض المعاصی امارۃ علی عدم وجودہ کالهزل المذکور.....وبالجملۃ فقد ضم الی التصدیق بالقلب او بالقلب واللسان فی تحقیق الایمان امور الاخلال بها اخلال بالایمان اتفاقاً کترك السجود بصنم وقتل نبی والاستخفاف بہ وبالمصحف والکعبۃ۔

(رد المحتار ج۴ ص۲۲۲ باب المرتد)

[2] قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: دعوی النبوۃ بعد نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کفر بالاجماع۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۲۰۳ فصل والکفر صریحاً وکنایۃ)

شرعاً ان دونوں میں کون سے قول پر عقیدہ رکھنا چاہیئے؟

الجواب: جمہور علماء اُمت حضرت خضر علیہ السلام کی نبوّت کے قائل ہیں اور آپ کی نبوّت پر قرآن مجید کی چند آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

قال العلامة القرطبیؒ تحت قوله تعالیٰ (وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا) والآية تشهد بنبوته لان بواطن افعاله لا تكون الا بوحی وايضاً فان الانسان لا يتعلم ولا يتبع الا من كان فوقه وليس يجوز ان يكون فوق النبی من ليس بنبی۔ (تفسیر قرطبی ج ۱۱ ص۱۶)

قرآن مجید میں مذکور آپ کے افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اللہ کے نبی تھے۔ مثلاً بچے کا قتل کرنا وغیرہ، کیونکہ وحی الٰہی کے بغیر ایسا اقدام جائز نہیں۔

قال العلامة الآلوسیؒ تحت قوله (وَاٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا) والجمهور على انها الوحی وقد اطلقت على ذلك فی مواضع من القرآن۔ (روح المعانی ج ۵ ۱ ص۳۲۰)[1]

البتہ اگر کوئی ان کے نبی ہونے کا معتقد نہ ہو تو اس کو کافر نہیں سمجھا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام قبل النبوۃ بھی معصوم تھے

سوال: ایک شخص کا عقیدہ ہے کہ چند انبیاء علیہم السلام سے نبوّت سے پہلے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہو چکا ہے جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے جنّت میں قصداً گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور یہ شخص قرآن کریم کی آیت رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا... الخ پیش کرتا ہے بطور استدلال اور اس عقیدہ پر مُصر ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: تمام اہل سنت والجماعت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے کبھی بھی قصداً جان بوجھ کر کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، نہ قبل از نبوّت اور نہ بعد از نبوت، البتہ بعض مواقع میں بشری تقاضے کی بناء پر بعض انبیاء سے بلا قصد سہوا ور لغزش کا ارتکاب ہوا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے کوئی کام اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی و تقرب کے لیے کیا لیکن فی الواقع وہ کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور

---

[1] قال العلامة اسمٰعیل حقی البروسویؒ: وفی تفسیر ابن حیان والجمهور على ان الخضر نبی وكان علمه معرفة بواطن امور اوحيت اليه۔ (روح البیان ج ۵ ص۲۸۱ سورۃ الکهف پ ۱۶)

وَمِثْلُهٗ فی عمدة القاری ج ۲ ص۶۰ باب ما ذكر فی ذهاب موسیٰ فی البحر۔

منشاء کے خلاف نکلا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی حالت میں بھی اپنے برگزیدہ انبیاء کو اپنی منشاء کے خلاف کام پر برقرار نہیں رکھا بلکہ وقتاً فوقتاً تنبیہ نازل فرماتے رہے، لہٰذا اس طرح کی لغزش و سہو انبیاء کی عصمت پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لیے کہ حقیقت میں گناہ اس کو کہتے ہیں کہ بندہ جان بوجھ کر گناہ کو گناہ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بنیاد پر کرے، اس قسم کی معصیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام منزّہ اور پاک ہیں۔ مخالفین نے جو قرآنِ پاک کی آیت عصیان و غوایت ظلم سے حضرت آدم علیہ السلام کا ارتکاب کبیرہ پر استدلال کیا ہے اور اس کو حقیقی عصیانِ ظلم پر محمول کیا ہے، یہ قرآن پاک کی ایک دوسری آیت کے مخالف، ارشادِ خداوندی ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۵) یعنی حضرت آدم علیہ السلام نے قصداً و عمداً نافرمانی سے شجرِ ممنوعہ نہیں کھایا تھا بلکہ ہمارے وعدے کو بھول گئے تھے اور بھول کر بلا قصد ان سے یہ فعل سرزد ہوا۔ دوسرا یہ کہ جو جتنا زیادہ مقرّب و نزدیک ہوتا ہے اس کے خلافِ اولیٰ کام کو بھی قابلِ عتاب سمجھا جاتا ہے جیسا کہ کہتے ہیں حسنات الابرار سیئات المقرّبین۔ اور لفظ ظلم سے دلیل پکڑنا بھی صحیح نہیں اس لیے کہ وضع الشئ فی غیر محلّہ ظلم ہے اور یہ عام ہے، کبیرہ صغیرہ ترک اولیٰ وغیرہ۔ لہٰذا اس آخری معنیٰ پر محمول کرنا نصِ قرآن کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا جو شخص عصمتِ انبیاء کا قائل نہیں وہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے البتہ احتیاط کی بنا پر اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ لوجود الاختلاف۔

لما قال ابو محمد علی بن احمد بن حزم الظاهری رحمه الله، و ذهبت جميع اهل الاسلام من اهل السنة والمعتزلة والنجارية والخوارج والشيعة الى انه لايجوز البتة ان يقع من نبي اصلاً معصية بعمد لا صغيرة ولا كبيرة وهو قول ابن مجاهد الاشعري شيخ ابن فورك والباقلاني المذكورين۔ قال ابو محمد وهذا قول الذي ندين الله تعالى به ولا يحل لاحد ان يدين بسواه ونقول انه يقع من الانبياء السهو عن قصد و يقع فيهم ايضاً قصداً الشئ يريدون به وجه الله تعالى والتقرب به منه فيوافق خلاف مامراد الله تعالى الا انه تعالى لايقرهم على شئ من هذين الوجهين اصلاً بل ينبههم على ذلك ولا يد اثرو وقوعه منهم ويظهر عزّ وجل

ذٰلک لعبادہ ولیبین لھم۔ (الفصل فی الملل واھواء والنحل ج۴ ص۲ ھل تعصی الانبیاء) [1]

لغزشاتِ انبیاء عصمت کے منافی نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ انبیاء کرام سے بمقتضائے بشریت غلطی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر غلطی نہیں ہوسکتی تو بعض انبیاء کرام جیسے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام سے غلطی ہوئی تو اس کو کس پر محمول کریں گے؟

الجواب:۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ نہیں کرتے ہیں اور جو کچھ عمل ان سے سرزد ہوچکا ہے وہ از قسم لغزشات ہیں گناہ قصداً نہیں ہے، لغزشات و زلات کا صدور انبیاء کرام کی عصمت کے منافی نہیں، اس میں قصد اور ارادہ کا دخل نہیں رہتا۔

لما قال الامام الاعظم ابوحنیفۃ النعمان بن ثابت رحمہ اللّٰہ: والانبیاء علیہم السلام کلّھم منزھون عن الصغائر والکبائر وقد کانت منھم زلّات وخطیئات۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۵۷) [2]

---

[1] قال الامام ابوحنیفۃ رحمہ اللّٰہ: والانبیاء علیہم السلام کلھم منزھون عن الصغائر والکبائر والکفر والقبائح وقد کانت منھم زلات وخطیئات۔ وقال ملاعلی قاریؒ: تحت قولہ وقد کانت منھم زلات ای تقصیرات وخطیئات ای عثرات بالنسبۃ الیٰ مالھم من اعلی المقامات و سنی الحالات کما وقع لآدم علیہ السلام فی اکلہ من الشجرۃ علیٰ وجہ النسیان اوترک العزیمۃ واختیار الرخصۃ ظنا منہ ان المراد بالشجرۃ المنھیۃ المشار الیھا بقولہٖ تعالیٰ: "ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ" ھی الشخصیۃ لا الجنسۃ فاکل الجنس لامن الشخص بناءً علی الحکمۃ الالٰھیۃ لیظھر ضعف قدرۃ البشریۃ وقوۃ اقتضاء مغفرۃ الربوبیۃ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۵۷ الانبیاء منزھون عن الکبائر والصغائر)
وَمِثْلُہٗ فی شرح العقائد ص۱۳۹ (طبع خیرکثیر)

[2] وقال ابومحمد علی بن احمد بن حزم الظاھریؒ: ونقول انہٗ یقع من الانبیاء السھو عن غیر قصد ویقع منھم ایضاً قصد الشیٔ یریدون بہ وجہ اللّٰہ تعالیٰ والتقرب بہٖ منہ فیوافق خلاف مراد اللّٰہ تعالیٰ الا انہٗ تعالیٰ لایقرھم علیٰ شیٔ من ھٰذین الوجھین اصلاً بل بنبھم علیٰ ذٰلک۔ الخ (الفصل فی الملل والاھوا والنحل ج۳ ص۲ ھل تعصی الانبیاء)
وَمِثْلُہٗ فی شرح العقائد النسفی ص۱۳۹ طبع خیرکثیر۔

مسئلہ تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے

سوال :۔ زید نے بکر کو قتل کیا، ایک دوست اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ ازل سے دونوں کی تقدیر میں لکھا ہوا تھا ۔ دوسرا دوست کہتا ہے ایسا نہیں! اگر تقدیر میں لکھا ہو تو انسان قاتل کیوں ٹھہرتا ہے! یہ تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے، اس نے تو گناہ نہیں کیا اس کا حکم بجالایا ہے جو اللہ کو منظور تھا، اصل یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس آدمی کے فعل کی وجہ سے ہے اور اس کی ساری ذمہ داری قاتل کے سر ہے اور یہ بات ازل سے ان دونوں کی تقدیر میں لکھی ہوئی نہیں ہوتی ہے ۔ ازراہِ کرم اس مسئلہ پر قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

الجواب :۔ تقدیر پر ایمان رکھنا فرض ہے کیونکہ عقیدۂ تقدیر ایمان کا ایک لازمی جزء ہے، اس کے بغیر مؤمن مومن نہیں رہ سکتا اور نہ اس کے بغیر کوئی عمل خدا کے ہاں مقبول ہوسکتا ہے قرآن وحدیث سے بلاکسی ابہام کے یہی ثابت ہے، اس کے خلاف کے لیے شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے پاس جانے کے بعد اس پر کوئی سزا وجزا انہیں ملے گی اور بندے اس کے بارے میں مجبور محض ہیں۔ بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بندوں کے اعمال وافعال اگرچہ بندوں سے تقدیرِ الٰہی کے تحت صادر ہوتے ہیں مگر ان پر بندے جزا وسزا کے مستحق ہیں اور ہونے چاہئیں، کیونکہ دنیا میں بندوں سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں تو وہ ان کے اپنے اختیار و اراد ے سے صادر ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے افعال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوجائے گا کہ بندہ سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں ان میں وہ مجبور نہیں ہے جو بھی کام آپ لیں اس میں بندے کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ اسے کرے یا اسے چھوڑ دے، کرنے اور نہ کرنے پر کوئی مجبوری نہیں ہے، مثلاً کھانے پینے کی چیزیں روزمرہ ہم استعمال کرتے ہیں تو اس میں کوئی مجبوری نظر نہیں آتی، جب چاہتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں، نہ کھانے پینے میں ایسی مجبوری ہے کہ چھوڑنے کا بالکل اختیار نہ ہو اور نہ چھوڑ دینے میں ایسی مجبوری پائی جاتی ہے کہ کھانے پینے کا اختیار بالکلیہ مفقود ہو۔ یہی حالت تمام ان افعال کی ہے جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں، خواہ وہ دین کے اعمال ہوں یا دنیا کے معاملات، جائز کام ہو یا ناجائز، قتل ہو یا کوئی اور کام، ان میں سے کوئی بھی کام ایسا نہیں کہ جس میں انسان مجبور ہو کیونکہ مجبوری ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کام کا ایک پہلو (کرنا یا نہ کرنا) انسان کے بس میں ہو اور دوسرا

پہلو اس کے بس ہی میں نہ ہو، مثلاً کرنے پر قدرت ہو اور نہ کرنے پر قدرت ہی نہ ہو، اسی کا نام مجبوری ہے اور اسی طرح کی مجبوری بندوں کے کسی فعل میں نہیں پائی جاتی ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بندوں کے تمام افعال اختیاری ہیں تو اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ اختیاری افعال کے ساتھ تعلق کا معنیٰ یہ نہیں کہ وہ افعال بہر حال لازمی طور پر صادر ہوں گے ورنہ پھر تو بندہ ان افعال میں مجبور ہو جائے گا بلکہ ان کے ساتھ تقدیر کے تعلق کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر وہ ان افعال پر مصمم ارادہ کر کے باختیار خود اس کی طرف اقدام کر جائے تو وہ صادر ہو جائیں گے اور اگر وہ ان کا ارادہ کر کے باختیار خود اس کی طرف اقدام نہ کرے گا تو وہ صادر نہ ہوں گے۔ تقدیر کے اس تعلق سے بندہ اپنے تمام افعال میں مجبور نہیں بن جاتا بلکہ مکمل خود مختار رہتا ہے، اور جب اس کو مکمل خود مختاری مل گئی تو جائز اور نیک اعمال پر اس کو اجر ملنا چاہیئے کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہے اور حرام و ناجائز کاموں پر اس کو سزا ملنی چاہیئے کیونکہ پورے اختیار سے اس نے ارادتاً اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔

اب قتل کے معاملہ کو لیجیئے کہ زید نے بکر کو جب قتل کر دیا تو اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک بکر کی موت دوسری چیز زید کا مار ڈالنا، جسے ہم قتل کہتے ہیں۔ موت بھی تقدیر ہی ہے اور قتل بھی تقدیر ہی ہے۔ مگر موت کی تقدیر مُبرم (اٹل) ہے، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ بکر بہر حال اس ساعت میں مر ہی جائے گا یا کسی کے مار ڈالنے سے یا اپنی موت سے، اور قتل کی تقدیر مبرم نہیں بلکہ زید کے اختیار اور ارادے پر مُعلّق ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ زید اگر اپنے اختیار سے بکر کے قتل کا ارادہ کر کے اقدام کرے گا تو قتل پایا جائے گا ورنہ نہیں، اب چونکہ زید قتل کے اختیار اور ارادے پر مجبور نہیں بلکہ خود مختار ہے، اس لیئے قتل اس ہی کا فعل شمار کر کے بکر کا وہ قاتل قرار دیا جائے گا۔ اور چونکہ زید کا یہ اختیاری فعل قانون کی رُو سے حرام بھی ہے، اس لیے اس سے وہ سزا کا بھی مستحق ہو گا تو قتل اس معنیٰ کے لحاظ سے تقدیر ہو کر ہی زید کا سنگین جرم قرار دیا جا سکتا ہے اور زید اس پر سزا کا مستحق گردانا جا سکتا ہے۔ جب یہ تحقیق آپ کو معلوم ہو گئی تو مذکورہ دو دوستوں میں سے ایک کا یہ کہنا کہ "یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور دونوں کی تقدیر میں لکھا ہوا ہوتا ہے"۔ بالکل درست ہے، لیکن اگر اس سے اس کا مطلب یہ ہو کہ قتل کی وجہ سے زید مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ قتل زید کا ایک اختیاری فعل ہے اور اختیاری افعال کے تقدیر ہونے سے ان کا جرم ہونا زائل نہیں ہوتا، جیسا کہ اس کی

تحقیق گذر گئی۔ اور دوسرے کا یہ کہنا کہ "یہ تقدیری نہیں ہے" سراسر غلط ہے، اسے چاہیئے کہ اس سے توبہ کرے، تقدیر سے انکار کرنا اسلام کے ایک اجتماعی عقیدے سے انکار کرنا ہے جو قرآن اور احادیث سے ثابت ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: (۱) انا کل شیٔ خلقناہ بقدر (۲) خلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا (۳) والذی قدر فھدیٰ۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بخمسین الف سنۃ۔

(مشکوٰۃ ص باب الایمان بالقدر) [۱]

حیاتِ عیسیٰؑ کا عقیدہ نص قرآنی سے ثابت ہے

سوال:۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے یا دوسرے انبیاء کی طرح وفات پا چکے ہیں؟ بحیثیت ایک مسلمان کے اس بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟

الجواب:۔ تمام امتِ محمدیہ کا یہ منصوص اور بنیادی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ سلامت اٹھایا گیا ہے اور بعض فرائض کی انجام دہی تک زندہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ۔ (سورۃ النساء آیت نمبر ۱۵۷)

اور اسی طرح احادیثِ نبویہ بھی آپ کی زندگی پر ناطق ہیں۔

اخرج اسماعیل بن کثیرؒ: قال الحسنؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عیسیٰ لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیامۃ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۶ سورۃ النساء) [۲]

---

[۱] قال الامام الرازیؒ: قال القاضی اما الاجل والرزق فہما مضافان الی اللہ اما الکفر والفسق والایمان والطاعۃ فکل ذٰلک مضاف الی العبد فاذا کتب اللہ تعالیٰ ذٰلک فانما یکتب بعلمہ من اختیار العبد وذٰلک لا یخرج العبد من ان یکون ھو المذموم او الممدوح۔
(تفسیر الکبیر ج ۹ ص ۲۴ من یرد ثواب الدنیا)

[۲] قال الامام البخاریؒ: ان سعید بن المسیب سمع ابا ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم مقسطا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۶)۔ ومثلہ فی عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام۔

عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چند شبہات کا ازالہ

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم صبح و شام سنتے ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے اسلام وہ کہتا ہے، اور جب حوالہ پوچھا جائے تو کبھی کسی طبری، کسی ابن کثیر یا کسی غزالی کا نام بتا دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات مولانا روم، بلھے شاہ تک کے حوالے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لیے کسی انسان کے منہ کی بات دلیل نہیں ہوسکتی ہے، خدا اور رسول کے علاوہ کسی کو حوالے کے طور پر پیش کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اسلاف کا خیال و مقال جزء اسلام نہیں ٹھہرایا جاسکتا، کیونکہ عہدِ رسالت میں دین کامل ہوچکا ہے، براہ کرم درج ذیل سوالات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل فرما کر عند اللہ ماجور ہوں:۔

(۱) مریم سلام اللہ علیہا صاحب حال ہیں، اچھا تو یہ تھا کہ وہ خود فرماتیں: وُلِدْتُ وَلم اتزوج۔

(۲) کیا کبھی عیسیٰ علیہ السلام نے خود اقرار کیا ہے: ولدتنی اُمی مریم الصدیقۃ ولم تتزوج۔

(۳) کیا قرآن مجید میں کہیں اس کا ذکر ہے کہ: ولدتہٗ مریم ولم تتزوج۔

(۴) کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ فرمایا ہے کہ مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰؑ کو بغیر نکاح جنا ہے۔

(۵) یا کبھی یوں فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں باپ کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر ان سب صورتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر بتایا جائے کہ مسلمانوں میں یہ نظریہ کب سے رائج ہے اور سب سے پہلے کس نے اس کا اظہار کیا ہے؟ نیز بغیر نکاح کے حمل کی کیا حقیقت ہے؟

کیا ہر نبی علیہ السلام کا حلال نکاح سے پیدا ہونا لازم تھا؟ جیسا کہ طبرانی میں ارشادِ نبوی ہے کہ میرے سلسلۂ نسب میں کوئی بھی بغیر نکاح کے پیدا نہیں ہوا ہے، جس قدر بھی انبیاء نبوت سے سرفراز ہوئے سب شریف النسب اور نجیب الطرفین تھے۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اعتقادیات اور ایمانیات سے ہے تو پھر اس کا ثبوت اہلِ فن کے نزدیک متواتراتِ صریحہ سے لازم ہے اور استدلالات پر اس کا ثبوت درست نہیں۔ ہاں عیسیٰ علیہ السلام کے باپ کا ثبوت میرے ذمہ نہیں بلکہ نظامِ الٰہی میں یہ طے شدہ ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے اور کلامِ الٰہی میں بھی اصل ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى۔ (سورۃ الحجرات ۱۳) وَبَثَّ مِنْهُمَا

رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (سورۃ النساء آیت ۱) بچہ میاں بیوی دونوں سے ہوتا ہے صرف احدالزوجین سے نہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے: وکانت النفخۃ التی نفخھا فی درعھا فنزلت حتی ولجت فرجھا بمنزلۃ نکاح الاب الام۔ (تفسیر ابن کثیر) جبریلؑ نے حضرت مریمؑ کے گریبان میں جو پھونک ماری تھی وہ اس طرح ان کی فرج میں داخل ہوئی جس طرح کسی کا باپ حمل ٹھہرانے کے لیے اس کی ماں سے میل ملاپ کرتا ہے۔

آپ لوگ تو اس عبارتِ محولہ کو مانتے ہیں جبکہ میں اس سے انکار کرتا ہوں کیونکہ یہ فعل ملائکہ کا نہیں بلکہ شوہر کا ہے، مجھے ہم جنس شریف انسان کو باضابطہ شرعی نکاح سے باپ ٹھہرانا پسند ہے جبکہ آپ لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔

حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے متعلق لوگوں نے من گھڑت عقیدے بنا رکھے ہیں، کسی نے بلا نکاح کے باپ ٹھہرایا، کسی نے غیر جنس فرشتے کو باپ ٹھہرایا۔ **خلاصہ** یہ ہے کہ باپ کا کوئی منکر نہیں ہم جنس اور نکاح کا انکار ہے" اور یہ سارے عقیدے شریعت کے خلاف ہیں، میں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہم جنس مسلمان پاکباز سے نکاح مان کر باپ ٹھہراتا ہوں چاہے عیسٰیؑ ہوں یا کوئی دیگر بنی آدم میں سے ہو۔ جو کوئی بھی نبوت سے سرفراز ہوا ہے وہ شریف النسب اور نجیب الطرفین ہے، کسی نبی کا نسب اس کے معاصروں کے نزدیک اندھیرے میں نہیں ہوتا؟

الجواب:۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے باپ کے ثبوت کے لیے جتنے مقدمات آپ نے بیان کئے ہیں وہ تمام باطل اور استدلالات غلط اور ناقص ہیں۔ عیسٰی علیہ السلام کے بن باپ ہونے کے لیے قرآن مجید کی یہ ایک آیت ہی کافی ہے: وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ (سورۃ مریم آیت نمبر ۲۰) اس میں حرام و حلال دونوں قسم کے جماع کی نفی ہے، نیز اس آیت کے سیاق و سباق سے خارق العادت طور سے پیدا ہونا بھی ظاہر ہے۔

مہاتما بدھ کے متعلق عقیدۂ نبوت درست نہیں ہے

سوال:۔ قرآن مجید میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

(۱) لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورۃ الرعد آیت ۷)۔ (۲) وَمَا مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (پ ۲۲) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی پیغمبر آیا ہے تو ہندوستان میں بھی کوئی پیغمبر آیا ہوگا، جبکہ مہاتما بدھ کی تعلیمات بھی انبیاء کرام کی تعلیمات کے مطابق ہیں، تو کیا اس کو بھی نبی ماننا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ بالا آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی قوم یا امت ایسی نہیں گذری ہے جس میں ہادی (راہ بتلانے والا) نذیر (ڈرانے والا) نہ آیا ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صریح غلطی ہے کہ جو بھی مذہبی راہنما دنیا میں گذرے ہیں وہ پیغمبر ہی ہوں۔ گوتم بدھ "مہاتما بدھ" بھی نبی بن سکے۔

گذشتہ اقوام کے نبیوں کے بارے میں اسلامی شریعت کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ جن انبیاء کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی تصریح نہ ہو تو ان کے متعلق ہم اجمالی طور پر یہ عقیدہ رکھیں گے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے وہ نبی ہوگا اور جس کو یہ منصب نہیں ملا وہ نبی نہیں اگرچہ اس کی تعلیمات شرائع آسمانی کے مطابق ہی کیوں نہ ہوں، زیادہ سے زیادہ اگر اس کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ یہ کہ اس کی تعلیمات اگر شرک سے پاک اور توحید پر مشتمل ہوں تو وہ ایک نیک آدمی ہوگا۔ الحاصل: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بجز ان حضرات کے جن کی نبوت پر قرآن وحدیث میں تصریح کی گئی ہو کسی دوسرے شخص کے بارے میں خصوصی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نبی ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نبی نہیں، احتمال ہے کہ نبی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبی نہ ہو۔

باقی رہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کا معاملہ تو اس کے متعلق اسلام کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تا قیامت کسی شخص کو کسی قسم کی نئی نبوت نہیں مل سکتی، خواہ وہ تشریعی ہے یا غیر تشریعی! اور جس کسی نے بھی نئی قسم کی نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ کافر ہو کر دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا اور جو بھی اس کو نبی مانے گا وہ بھی کافر ہوگا۔

قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ قال الموفق فی "المغنی": ومن ادعی النبوۃ او صدق من ادعاھا فقد ارتد لان مسیلمۃ لما ادعی النبوۃ فصدقہ قومہ صاروا بذلک مرتدین۔ الخ

(اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۵۹۸ من ادعی النبوۃ او صدق من ادعاھا) [1]

---

[1] وقال الشیخ المفتی محمد شفیع رحمہ اللہ: اس لیے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی و رسول پیدا ہوا ہو البتہ دعوتِ رسول کے پہنچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے۔ (معارف القرآن ج ۵ ص ۱۶۴ تحت الآیۃ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ ۔)

عقیدۂ حیاتِ انبیاء علیہم السلام کا ثبوت

سوال :- جناب مفتی صاحب! مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن و حدیث اور اجماعِ اُمت کا متفقہ فیصلہ کیا ہے، دلائل و براہین سے وضاحت فرمائیں؟

الجواب :- حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تمام اہل سنت والجماعت اور جملہ اکابرین علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ وفاتِ موعود کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کے ابدانِ مقدسہ بعینہٖ محفوظ و مامون ہیں اور جسدِ عنصری کے ساتھ عالمِ برزخ میں ان کو حیات حاصل ہے جو حیاتِ دنیوی کے مماثل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کے مکلف نہیں ہیں لیکن فطرتی تقاضے کی بناء پر مشغول بالعبادت ہیں، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے قریب جو درود و سلام پڑھا جائے اس کو آپ بلاواسطہ سنتے ہیں اور یہی تمام محدثین و متکلمین اہلِ سنت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے، اکابر علماء دیوبند کے مختلف رسائل میں اس کی تصریح موجود ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی مستقل تصنیف حیاتِ انبیاء پر "آبِ حیات" کے نام سے موجود ہے، حضرت مولانا خلیل احمد جو مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے خلیفہ راشد ہیں اُن کی تالیف "المہند علی المفند" بھی قابلِ دید ہے۔ اس کے علاوہ "حیاتِ انبیاء کرام" مرتبہ مفتی سید عبدالشکور صاحب رح مطالعہ کے لیے مفید ہے۔ مسئلہ ھٰذا پر چند دلائل ملاحظہ ہوں :-

وعن انس بن مالك رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلّون ۔ مسند ابی یعلی (جامع الصغیر ص۱۰۳ وصححه ابن حجر فی فتح الباری ص۱۳، والقاری فی مرقاة ج۲ ص۲۱۲ وفیض الباری ج۲ ص۶۴ باب رفع الصوت، کتاب الصلوٰة۔

قال الله تعالیٰ : وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (سورة البقرة رکوع ۱۹)

جب شہید کے لیے وقوعِ قتل کے باوجود یہ حیاتِ طیبہ حاصل ہے تو انبیاء علیہم السلام کے لیے اس سے بھی ارفع اور اعلیٰ حیات بطریقۂ اولیٰ ثابت ہوگی۔ یہ آیت دلالۃ النص کے اعتبار سے انبیاء کرام کی حیات بعد الوفات پر ایک واضح دلیل ہے۔ چنانچہ علامہ قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں :- ورد النص فی کتاب الله فی حق الشهداء انهم احیاء یرزقون وان الحیاة فیهم متعلقة بالجسد فکیف بالانبیاء

والمرسلین۔ (نیل الاوطار ج ۳ ص۲۱۲) [1]

سوال:۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ ابلیس کا علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات سے زیادہ ہے زیادہ ہے" درست ہے کہ نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو پھر "البراہین القاطعہ" میں جو اس کا دعویٰ کیا گیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے علم کا اتنا حصہ دیا ہے کہ پوری کائنات میں کوئی بھی آپ کے علم کی برابری تک کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ بطور مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ اوّلین و آخرین کے تمام علوم جو شانِ نبوت کے مناسب ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا مجموعی حصہ آپ کو عطا فرمایا ہے۔ رہی "البراہین القاطعہ" کی بات تو وہ اپنی جگہ بجا اور درست ہے کہ "شیطان کا علم حضورؐ سے زیادہ ہے" سے مراد علمِ غیر نافع ہے، اور علم غیر نافع شیطان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے، کیونکہ آپؐ نے خود اس قسم کے علم سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم انی اعوذ بك من علمٍ لا ینفع وقلب لا یخشع۔ (الجامع الترمذی ج ۲ ص۱۸۶ کتاب الدعوات۔ باب ماجاء فی جامع الدعوات)

اور یہی علم اللہ تعالیٰ کی رضا، خوشنودی اور شرف واکرام کا باعث نہیں ہے۔

اور جو کوئی علمِ نافع شیطان کے لیے زیادہ ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اس کے متعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

وان سیدنا وشفیعنا محمد اعلم الخلق وافضلھم جمیعًا فمن سوّی بین علمہ صلی اللہ علیہ وسلم والصبیّ والمجنون او علم احد من الخلائق اوتفوہ بان ابلیس اللعین اعلم منہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو کافر ملعون لعنۃ اللہ علیہ۔ (امداد الفتاوی ج ۶ ص۳۲۷ کتاب العقائد والکلام)

---

[1] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من صلّی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیًا ابلغتہ۔ (المشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۸۷ فی باب الدعاء فی التشھد فی الفصل الثالث)۔

ومثلہٗ فی سنن ابی داؤد ج ۱ ص۱۵۷ باب تفریع ابواب الجمعۃ۔

جمیع مَاکَانَ وَمَایَکُوْنُ کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے

سوال: اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْن کا علم دیا گیا ہے اور آپؐ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: علم غیب کلی اور علم محیط اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے ساتھ علم غیب ہے اور نہ ہی علم محیط ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی علم غیب کلی نہیں تھا بلکہ بعض مغیبات کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے تو بعض مغیبات کی اس کو اطلاع کر دیتے ہیں، اس بات کا اعلان آپؐ کی زبان مبارک سے یوں کرایا :۔

(۱) قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہ ۔ (سورۃ النمل آیت ۲۵)

(۲) وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَا سْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۱۸۸)

لہٰذا ہمارے نزدیک حق بات بھی یہی ہے کہ یہی علم اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاصہ ہے۔ اور جو کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ کے علم کا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ نصِ قطعی کا مخالف ہے اس لیے ایسا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے، اس کو تجدید ایمان اور اگر شادی شدہ ہو تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے۔

لما صرح بہ ملا علی القاری رحمہ اللہ : فالعلم بالغیب امر تفرد بہ سبحانہ وتعالیٰ ولا سبیل للعباد الیہ الا باعلام منہ والہام بطریق المعجزۃ او الکرامۃ او الارشاد الی الاستدلال بالامارات فیما یمکن فیہ ذلک ولہذا ذکر فی الفتاویٰ ان قول القائل عند رؤیۃ ھالۃ القمر ای دائرتہ یکون مطر مدعیا علم الغیب لا بعلامۃ کفر ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۸۵ تصدیق الکاھن بما یخبر)[1]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : واما ما وقع لبعض الخواص کالانبیاء والاولیاء بالوحی او الالہام فھو باعلام من اللہ فلیس مما نحن فیہ ــــ قلت وحاصلہ ان دعوی علم الغیب معارضۃ لنص القرآن فیکفر بھا ۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۴۳ باب المرتد، مطلب فی دعوی علم الغیب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں نور نہیں

سوال :- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں یا نور ؟ اور قرآن مجید میں جو جا بجا آپ کیلئے نور کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اُن کا معنیٰ کیا ہے، وضاحت سے بیان کریں ؟

الجواب :- اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں لیکن یہ نور دو معنوں میں آتا ہے، ایک یہ کہ کیفیۃ ظاھرۃ بنفسھا مظھرٌ لغیرہٖ - اور دوسری یہ کہ عالم عناصر کی کیفیات و آثار مخصوصہ سے علیحدہ ہو کر ہوا کی طرح غیر مرئی ہو۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور بمعنی اوّل ہیں بمعنی ثانی نہیں۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بمعنی ثانی نور ہیں اور بالکل ہی بشر نہیں ہیں اور دلیل میں سورۃ المائدہ کی یہ آیت پیش کرتے ہیں : لَقَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ ٥ اور یہ حدیث بھی دلیل میں لاتے ہیں: اوّل ما خلق اللہ نوری - اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں بھی فرمایا ہے، واجعلنی نورًا۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلقت کے اعتبار سے بشر ہیں اور قرآن حکیم آپ کی بشریت پر گواہ ہے :-

(۱) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ٥ (سورۃ کہف آیت ۱۱۰)
(ترجمہ) تو کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے یعنی میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں خدا نہیں۔

(۲) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹۴)۔ (ترجمہ) اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے، جب پہنچی ان کو ہدایت مگر کہنے لگے کہ اللہ نے بھیجا آدمی پیغام دے کر۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت سب کی نظروں میں مسلّم تھی تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یوں دیا[۱] : قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ٥ (سورۃ الاسراء آیت ۹۵) اگر زمین پر رہنے والے فرشتے ہوتے تو ہم ان کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے، مگر چونکہ زمین پر رہنے والے لوگ بنی آدم ہیں اسلئے ہم نے ان کی راہنمائی کے لیے بنی آدم کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ افادہ و استفادہ آسان ہو۔

(۲) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (سورۃ آل عمران آیت ۱۶۴)

مِنْ اَنْفُسِهِمْ میں اس کی تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرح بشر ہیں فرشتوں کی طرح نور نہیں۔
سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: کَمَا اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ۔ (آیت ۱۵۱) مِّنْکُمْ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں نور نہیں ہیں۔
بعض مقامات پر اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں لفظ نُوْر استعمال ہوا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نور کا اطلاق مجازاً ہے، اس معنیٰ پر کہ النور کیفیۃ ظاھرۃ بنفسھا مظھر لغیرھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ظاہر بنفسہا اور بالصفت جو کہ نبوت ہے اور مظہر ملحق ہے۔ اور حدیث اوّل ما خلق اللّٰہ نوری کا جواب یہ ہے کہ بشرطِ صحتِ حدیث اس میں بھی نور کا اطلاق مجازاً ہے۔
قال اسماعیل بن کثیر رحمہ اللہ: تحت قولہ "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" ای من جنسھم لیتمکنوا من مخاطبتہ وسوالہ ومجالستہ والانتفاع بہ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص۴۲۴) [1]

یا محمد اور یارسول اللہ کہنا

سوال: یا محمد اور یارسول اللہ کہنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟
الجواب: یا محمد اور یارسول اللہ درود و سلام کے ساتھ پڑھنے والا اگر یہ سمجھ کر ندا کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری آواز بذاتِ خود ہر وقت اور ہر جگہ سنتے ہیں یا یہ کہ بنفسِ نفیس خود مجلسِ درود میں تشریف فرماتے ہیں تو یہ ندا ناجائز بلکہ موجب کفر ہے اس لیے کہ یہ صورتیں غیر اللہ کے لیے علمِ غیب کو ثابت کرنے کی متضمن ہیں، اور علمِ غیب اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی صفتِ خاصہ ہے۔ اور شریعت کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفاتِ مختصہ بذاتہٖ یا عبادت میں کسی غیر خدا کو شریک کرنے کا نام شرک ہے۔ کما ھو مصرح فی کتب الکلام۔
ومنہا ما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: وبالجملۃ العلم بالغیب امر تفرد بہ سبحانہٗ وتعالیٰ ولا سبیل للعباد الیہ الا باعلام منہ والہام بطریق المعجزۃ والکرامۃ والارشاد

---

[1] قال العلامۃ الزرکشی رحمہ اللہ، بانہ صلی اللہ علیہ وسلم سراج ونور کالشمس فی ھذا العالم مثال نورہٖ فی العوالم کلّھا مثل نور الشمس فکما ان الشمس یردّھا من المشرق الی المغرب فی ساعۃ واحدۃ وبصفات مختلفۃ کذٰلک ھو صلی اللہ علیہ وسلم۔ (قطب الارشاد ص۳۹۱ المقصد السادس فی الصلوٰۃ علی النبیؐ۔ الفصل الثالث)

الی الاستدلال بالامارات فیما یمکن فیہ ذٰلک ..... وذکر الحنفیة تصریحًا بالتکفیر باعتقاد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضة قولہ تعالیٰ: "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ"۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۱ حکم تصدیق الکاھن الخ)

قال العلامة ابن البزاز رحمہ اللہ: وعلیٰ ھٰذا قال علماءنا من قال ارواح المشائخ حاضرة تعلم یکفر۔ (الفتاوی البزازیة علی ھامش الہندیة ج۶ ص۳۲۶ الثانی فیما یتعلق باللہ)

اور اگر مذکورہ بالا عقیدہ نہیں ہے بلکہ محض تخیل کے طور پر شاعرانہ اور عاشقانہ انداز میں خطاب کرتا ہے تو یہ صورت فی ذاتہ جائز ہے جیسا کہ اہل معانی و بلاغت نے بیان کیا ہے کہ بعض اوقات معدوم کو موجود فرض کر کے یا غیر حاضر کو حاضر فرض کر کے خطاب کیا جاتا ہے اور یہ ایک نوع بلاغت ہے جو قرآن پاک میں بھی بکثرت موجود ہیں، اشعار اور نظم میں یہ نوع بلاغت بلا کسی نکیر کے تمام علماء کے نزدیک جائز ہے، بلکہ خود بڑے بڑے علماء کا معمول رہا ہے اور اس میں درحقیقت کسی باطل عقیدہ کا دخل نہیں ہوتا بلکہ ایسا کرنا محبت کے آثار میں سے ہے، لہٰذا فرط محبت میں اور ذوق میں اگر بلا عقیدہ حاضر ناظر کے کلمات خطابیہ بولے تو کوئی مضائقہ نہیں البتہ موہم معنیٰ شرک ہونے کی وجہ سے مجالس و مجامع میں پڑھنا ناجائز ہے اس لیے کہ اس سے عوام الناس کا عقیدہ خراب ہوتا ہے اور شرعًا ایسا لفظ یا فعل جو مفضی الی القبح ہو منع ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ کو جو کہ پکے اور سچے مسلمان تھے لفظ "راعنا" بولنے سے منع فرمایا حالانکہ صحابۂ کرامؓ معنیٰ قبیحہ مراد نہیں لیتے تھے۔ قال اللہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا ۔ (سورة البقرة آیت ۱۰۴)

قال العلامة ابن عابدینؒ: فینبغی او یجب التباعد عن ھٰذہ العبارة (ای موھم المعنیٰ الشرک)۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۴۹ باب المرتد)

البتہ بلا درود و سلام یا محمد، یا رسول اللہ کہنا کسی صورت میں جائز نہیں، اس لیے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی باطل عقیدہ علم غیب، حاضر ناظر استمداد وغیرہ کا نہ بھی ہو تب بھی ناجائز ہے، اور اگر کوئی کفر و شرک کا اعتقاد بھی ہو تو پھر ہلاکت در ہلاکت ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قرآن کریم کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ (الحجرات ۵) کے شان نزول میں اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ آداب نبوت سے ناواقف دیہاتی لوگ آکر حجرۂ نبوی کے پیچھے کھڑے ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمد یا محمد وفی روایة یا رسول اللہ کے ساتھ آوازیں دینے لگے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناگواری ظاہر فرما کر جواب نہ دیا۔ چنانچہ علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ آیت اقرع بن حابس التمیمی کے متعلق نازل ہوئی جو حجرہ مبارکہ کے باہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بایں الفاظ یا محمد یا محمد وفی روایۃ یا رسول اللہ زور زور سے آوازیں دے رہا تھا، لہٰذا جن الفاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حین حیات میں پکارنا منع کیا گیا تو بعد الوفات ان الفاظ سے پکارنا کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن کثیرؒ: وقد ذکر انہا نزلت فی الاقرع بن حابس التمیمی فیما اوردہ غیر واحد۔ قال الامام احمد فی سندہ حدثنا عفان تذکر السند عن الاقرع بن حابس انہ نادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد یا محمد وفی روایۃ یا رسول اللہ فلم یجبہ الخ (تفسیر ابن کثیر ج۴ ص۳۷۱ سورۃ الحجرات)

وقال فی تفسیر القرآن العظیم: تحت قولہ تعالیٰ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ الخ" وقد ذکر انہا نزلت فی الاقرع بن حابس التمیمی فیما اوردہ غیر واحد قال الامام احمد حدثنا عفان تذکر السند عن اقرع بن حابس التمیمی انہ نادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد یا محمد وفی روایۃ یا رسول اللہ فلم یجبہ الخ۔ (تفسیر القرآن العظیم ج۴ ص۲۱۹) [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمد یا محمد یا رسول اللہ کے لفظ سے پکارنا بیوقوفوں کا کام ہے اور ان الفاظ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں ناگواری ہوتی تھی لامحالہ بعد الوفات بھی ناگواری ہوگی، لہٰذا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمد اور یا رسول اللہ کے الفاظ سے پکارنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے نہ زندگی میں اور نہ بعد الوفات، البتہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سامنے موجود ہوں تو لفظ یا رسول اللہ سے ہلکی آواز میں مخاطب کرنا عین ادب ہے اور جب پس پردہ تشریف فرما ہوں تب بھی لفظ یا رسول اللہ کے ساتھ زور زور سے آوازیں دینا بے ادبی ہے، لہٰذا اتنی دور مسافت پر زور زور سے آوازیں دینا ضرور بے ادبی ہوگی جیسا کہ آیت کے شانِ نزول سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

حیاتِ حضرت خضر علیہ السلام کا عقیدہ

سوال:۔ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ ان دونوں میں کونسا عقیدہ

---

[1] ومثلہٗ فی تفسیر روح المعانی للعلامۃ آلوسیؒ ج۲۶ ص۱۳۹ تا ۱۴۳

شریعت سے موافق ہے ؟

الجواب :۔ حضرت خضر علیہ السلام کے زندہ یا انتقال کے ساتھ کوئی شرعی عقیدہ وابستہ نہیں ہے، اگر کوئی دلائل کی رُو سے ان کی حیات کا قائل ہو جائے تو اس کے عقیدۂ اسلام پر کوئی آنچ نہیں آتی اور جو کوئی ان کی وفات کا قائل ہو تب بھی وہ مسلمان ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کے ساتھ کوئی شرعی عقیدہ متعلق نہیں ہے اس لیے کسی پر نکیر نہیں کرنی چاہیئے۔ تاہم ان دونوں میں احوط یہ ہے کہ لما فی بحرالمحیط: والجمھور علی انہ مات (ج ۶ ص ۱۴۷) اور جن بزرگوں کے ساتھ ان کی ملاقات ثابت ہے تو اس کے بارے میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح فرماتے ہیں:۔

عن المجدد الف ثانیؒ فانہ حین سُئل عن حیٰوۃ الخضر علیہ السلام ووفاتہ توجہ الی اللہ سبحانہ مستعلماً من جنابہ عن ھٰذ الامر فرأی الخضر علیہ السلام حاضراً عندہ فسئالہ عن حالہ فقال أنا والیاس لسنا من الاحیاء لکن اللہ سبحانہ اعطیٰ روا حنا قوۃ نتجسد بھا ونفعل بھا افعال الاحیاء من ارشاد الضال واغاثۃ الملھوف اذا شاء اللہ وتعلم العلم اللدُنی ۔ (تفسیر المظہری ج ۶ ص ۶۲ سورۃ الکہف)[1]

امام مہدیؑ کے آنے کے مُنکر کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی شخص مہدی آخرالزمان کے بارے میں واردشدہ احادیث کو موضوع اور من گھڑت کہے اور نزولِ مہدی سے صاف انکار کرے تو از روئے شریعت اس شخص کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ قیامت کے قریب امام مہدی کا آنا صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے ثابت شدہ مسئلہ ہے اس سے انکار کرنا صحیح احادیث اور اجماع سے انکار کرنے کے مترادف ہے جبکہ احادیث سے انکار کفر ہے۔

عن ابی سعیدؓ قال ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاءً یصیب ھٰذہ الامّۃ

---

[1] قال العلامۃ البغوی رحمہ اللہ : اختلف الناس فی ان الخضرؑ حیٌّ ام میّتٌ قیل ان الخضر والیاس حیان یلتقیان کل سنۃ با لموسم کان سبب حیاتہ فیما یحکی بہ ان شرك من عین الحیٰوۃ ۔ الخ

(تفسیر المظہری ج ۶ ص ۶۱ سورۃ الکہف)

حتیٰ لایجد الرجل ملجاء یلجاءُ الیه من الظلم فیبعث اللّٰہ رجلاً من عترتی اهل بیتی فیملاء به الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً یرضٰی عنه ساکن الارض۔ رواه الحاکم وقال صحیح وهو ابوعبداللّٰہ محمد بن عبداللّٰہ النیسابوری امام الحدیث فی وقته۔ (مشکوٰة باب اشراط الساعة ص۴۷۱ الفصل الثانی)

اس روایت سے امام مہدی کی پوری تفصیل واضح ہوتی ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر کتب احادیث میں بھی متعدد صحیح روایات موجود ہیں، تو اتنی صحیح روایات کے انکار کا کیا جواز ہے اور زبان کی ایک جنبش سے صحیح احادیث کے ایک مکمل باب سے انکار کیا معنی رکھتا ہے؟ تاہم جو شخص مہدی آخرالزمان کا انکار کرتا ہے تو دراصل وہ احادیثِ نبوی کا انکار کرتا ہے اور اس پر وہی حکم لگایا جائے گا جو ایک منکرِ حدیث پر لگایا جاتا ہے۔

قال العلامة ملا علی القاری رحمه اللّٰہ: وفی المحیط من قال لفقیه یذکر شیئاً من العلم او یروی حدیثاً صحیحاً ای ثابتاً لاموضوعاً هٰذا لیس بشئ کفر۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۷۵ فصل فی العلم والعلماء)

کرامت کی حقیقت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کرامت کی حقیقت کیا ہے؟

الجواب:۔ کسی متبع شریعت نیک شخص سے ایسے خارق عادت کام کا صادر ہونا جس سے عام لوگ عاجز ہوں شریعت کی روشنی میں "کرامت" کہلاتا ہے، تاہم منصبِ ولایت کے لیے کرامت کا ظہور لازم نہیں اور نہ یہ کوئی کمال کی نشانی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰہ: فالحاصل ان الامر الخارق للعادة بالنسبة الی النبی معجزة...... وبالنسبة الی الولی کرامة لخلوه عن

لہ قال العلامة التفتازانیؒ: قد وردت الاحادیث الصحیحة فی ظهور امام من وُلد فاطمة الزهراءؓ۔ (شرح المقاصد ج۲ ص۳۰۷)

قال العلامة ملا علی القاریؒ: واما ظهور المهدی فی آخر الزمان وانه یملاء الارض قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً وانه من عترته من وُلد فاطمة رضی اللّٰہ عنها فثابتٌ۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۳۷ مسئله نصب الامام)

دعوی النبوۃ ۔ (رد المحتار ج ۳ ص۵۵۱ فصل فی ثبوت النسب ۔ مطلب فی ثبوت کرامات الاولیاء)[1]

کراماتِ اولیاء کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ کراماتِ اولیاء شرعاً ثابت ہیں یا نہیں؟ اور اس کے منکر کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ اللہ تعالیٰ کے نیک اور متبع الشریعت بندوں سے مختلف زمانوں میں بے شمار کرامات کا ظہور ہوا ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ وغیرہم کی حیاتِ طیبہ اور بعد ماتہم بیں کثرت سے ایسے مستند واقعات پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی جو لوگ کراماتِ اولیاء کو نہیں مانتے اور ان کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ اہل سنت والجماعت سے خارج ہیں اور معتزلہ کے گروہ میں داخل ہیں ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : وعبارة النسفی فی عقائدہ وکرامات الاولیاء حق منتظرا لکرامة علیٰ طریق نقض العادة للولی من قطع المسافة البعیدة فی المدة القلیلة........ ولا لبس بالمعجزة جواب عن قول المعتزلة المنکرین لکرامات الاولیاء ۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۵۵۱ فصل فی ثبوت النسب مطلب فی ثبوت کرامات الاولیاء)[2]

قرآنِ کریم کو مخلوق کہنا کفر ہے

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص قرآنِ کریم کو حادث اور مخلوق کہتا ہے جبکہ دوسرا شخص قرآنِ کریم کو قدیم کہتا ہے اور مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہے۔ ان دونوں میں

---

[1] قال الشیخ ابن ابی العز الحنفیؒ : فالمعجزة فی اللغة تعم کل خارق للعادة وکذٰلک الکرامة فی عرف ائمة المتقدمین ولکن کثیر من المتأخرین یفرقون فی اللفظ بینهما فجعلوا المعجزة للنبی والکرامة للولی ۔ (شرح العقیدة الطحاویة ص۵۵۸ فی قوله : ونؤمن بما جاء من کراماتهم وصح عن الثقات من رویاتهم)

وَمِثْلُهٗ فی النبراس ص۲۷۳ فی بحث علی المعجزات واقسام الخوارق سبعة ۔

[2] قال العلامة ملا علی القاریؒ : والکرامات للاولیاء حق ای ثابتٌ بالکتاب والسنة ولا عبرة بمخالفة المعتزلة واهل البدعة فی انکار الکرامة ۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۱۳ بحث فی ان الخوارق العادات للانبیاء والکرامات للاولیاء حقٌّ)

وَمِثْلُهٗ فی النبراس ص۲۹۵ کرامات الاولیاء ۔

کس کا قول درست ہے ؟

الجواب :- قائل ثانی کا قول اسلامی عقیدہ کے موافق ہے اور قائل اول کا قول شریعت اسلامی اور عقیدہ اہل سنت والجماعت کے مخالف ہے، معتزلہ خلق وحدوث کلام کے قائل ہیں، اہلسنت والجماعت حدوث اور خلق قرآن کے قائل کو کافر اور معتقد کو مرتد سمجھتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کے مابہ النزاع کلام نفسی اور کلام لفظی ہے، اور یہ ایک طویل الذیل مسئلہ ہے جو علم کلام کے معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے اور نزاع لفظی کے مترادف ہے۔

قال العلامة ملا علی القاریؒ : ان لا نزاع فی ھٰذہ القضیة اذ لا خلاف لاھل السنة فی حدوث الکلام اللفظی ولا نزاع للمعتزلة فی قدم الکلام النفسی۔
(شرح الفقه الاکبر ص۲۹ القرآن کلام الله)

اہلسنت کلام لفظی کے حدوث کے قائل ہیں مگر بدرجہ قرأۃ نہ بدرجہ مقروء، مقروء قدیم، قرأۃ باصوات کلمات وحروف حادث ہیں، مگر یہ نزاع علمی بحث ہے جس کے ساتھ عوامی عقیدہ کا تعلق نہیں بلکہ عوام کے لیے فقہاء نے جو راستہ بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ عوام مخلوق اور حادث کا اطلاق نہ کریں کیونکہ موجودہ کلام لفظی اس مدلول نفسی کا اطلاق ہے اور احکام شرعیہ کا مظہر اور مدار یہی الفاظ ہیں، اگر اس پر مخلوق اور حادث کا اطلاق کیا جائے تو اس کے مدلول کی طرف افضاد کا احتمال ہے اس لیے منع کیا گیا ہے اور مخلوق کے اطلاق کو کفر کہا گیا ہے۔

کماذکرہ ملا علی القاریؒ فی عدۃ مواضع : والقرآن کلام الله تعالیٰ فی المصاحف مکتوب وفی القلوب محفوظ وعلی الالسن مقروء ای بحروفه الملفوظة المسموعة وھٰذا من قولھم المقروء قدیم والقرأۃ حادثة۔ وعلی النبی صلی الله علیه وآله وسلم منزل ــــ غیر مخلوق۔ وقال فخر الاسلام قد صح عن ابی یوسفؒ انه قال ناظرت ابا حنیفةؒ فی مسئلة خلق القرآن فاتفق رأئی ورأیه وعلیٰ ان من قال بخلق القرآن فھو کافر، وصح ھٰذا القول ایضاً عن محمد رحمه الله (ص۲۶) وما ذکرہ الله تعالیٰ فی القرآن عن موسیٰ وغیرہ من الانبیاء علیھم السلام ای اخباراً منھم او حکایةً عنھم وعن فرعون وابلیس ونحوھما فان ذٰلک کله کلام الله اخباراً عنھم قد کتب الکلمات الدالة علیه فی اللوح المحفوظ قبل خلق السماء والارض والروح لا بکلام حادث حصل بعد علم حادث عند سمعه من موسیٰ وعیسیٰ وغیرھما

من الانبیاء علیہم السلام ومن فرعون وابلیس وھامان وقارون وسائر الاعداء فاذن لافرق بین اخبار اللہ تعالیٰ عن اخبارھم واحوالھم واسرارھم کسورۃ تبت وآیۃ القتال الخ (ص۲۸) ومع ھذا لا یجوز لاحد ان یقول القرآن اللفظی مخلوق لما فیہ الایھام المؤدی الی الکفر ـــــ فاذا ذکر مطلقاً یحمل علی الصفۃ الازلیۃ (ص۲۹) فلا یجوز ان یقال القرآن مخلوق علی الاطلاق ـــــ وبالجملۃ اھل السنۃ کلھم من اھل المذاھب الاربعۃ وغیرھم من السلف والخلف متفقون علی ان القرآن غیر مخلوق۔ (ص۳۵) ـــ (شرح الفقہ الاکبر ص۲۸ تا ۳۰ القرآن کلام اللہ)

انبیاء کرامؑ کو فواحش کی طرف منسوب کرنے سے ایمان زائل ہو جاتا ہے

سوال: ایک شخص جو ذیل کے واقعہ کے سچ ہونے کا عقیدہ رکھے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت پر فریفتہ ہو گئے تھے اور ایک بار اس سے اس کے نفس کا مطالبہ بھی کیا تھا جس پر وہ عورت بہت برہم ہوئی" تو اس واقعہ کے سچ ہونے کا عقیدہ رکھنے والے کا ایمان سلامت رہ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: عصمتِ انبیاء ایمان کا بنیادی اور انتہائی اہم مسئلہ ہے، بحیثیتِ مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام قبل از نبوت اور بعد از نبوت تمام ناشائستہ امور سے محفوظ و مامون ہیں۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: الانبیاء معصومون قبل النبوۃ وبعدھا عن کبائر الذنوب وصغائرھا ولو سھواً علی ما ھو الحق عند المحققین۔ (مرقاۃ ج۱ ص۱۲۷ باب الکبائر الفصل الاول) [۱]

یاد رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی فواحش کی نسبت کرنے سے اور خصوصاً امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے واقعات کی نسبت کرنے سے ایمان کب سلامت رہ سکتا ہے۔

پشتو زبان میں حضور انورؐ پر "کمینہ" کا اطلاق موجبِ کفر نہیں

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کو سراہتے ہوئے

---

[۱] وفی الھندیۃ: سئل عمن ینسب الی الانبیاء الفواحش کعزمھم علی الزنا ونحوہ قال یکفر لانہ شتم لھم استخفاف بھم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۶۳ الباب التاسع فی احکام المرتد)

اگر کوئی پشتو زبان میں آپ کو "کمینہ" کی طرف نسبت کرے تو از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- پشتو زبان کے محاورے کے مطابق "کمینہ" کا لفظ متواضع اور منکسر المزاج شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے (لہٰذا اس کا قائل گنہگار نہیں ہے) اور قائل نے خود بھی اس کو مقامِ مدح میں استعمال کیا ہے تو دوسرے احتمالات خود بخود ختم ہو کر اس کی مراد متعین ہوئی ہے لہٰذا اس کے کہنے پر وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوا ہے چونکہ اس لفظ کا استعمال دوسری زبانوں میں باعثِ توہین ہے اس لئے اس لفظ کے استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام کے افعال واقوال کو مجنونانہ کہنے والا کافر ہے

سوال:- انبیاء علیہم السلام کے افعال واقوال کو مجنونانہ کہنے والا ازروئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- قرآن مجید سے صراحتاً ثابت ہے کہ کفار ہی انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی نسبتیں کیا کرتے تھے، درج ذیل قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:-

(۱) وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (سورۃ القلم آیت ۵۱)

(۲) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝ (سورۃ القمر آیت ۹)

(۳) افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ۔ (سورۃ السباء آیت ۸)

فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء کرامؑ پر جنون کا اثر نہیں ہو سکتا اسلئے اس کے قائل کو انہوں نے کافر قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ ابن البزاز الکردری الحنفیؒ: ولو قال جن النبیؐ ذکر فی نوادر الاصول انہ کفر۔ (فتاویٰ البزازیہ علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۶ ص ۳۲۷ الثانی مایتعلق الانبیاء)

جب کسی کے افعال واقوال کو "مجنونانہ" کہنا اس کی ذات کو مجنون کہنے کے مترادف ہے تو انبیاء علیہم السلام کے افعال واقوال کو یہ نسبت کرنا مذکورہ حکم کے ضمن میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے زوجیت اور ولدیت کا عقیدہ رکھنا کفر ہے

سوال:- اگر کوئی عورت زبان سے یہ الفاظ نکالے کہ

لہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ویکفر بقولہ جن النبیؐ ساعۃ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۱ باب المرتد)

شاید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو اس عورت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اللہ تعالیٰ کی ذات زوجیت اور ولدیت سے پاک اور منزہ ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے نہ تو زوجہ ہے نہ بیٹا، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے زوجیت اور ولدیت ثابت کرنا یا اس میں شک کرنا موجب کفر ہے۔

وقال اللّٰہ تعالیٰ : قل ھو اللّٰہ احد۔ اللّٰہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔ (سورۃ الاخلاص آیت ۱تا۳)

وقال ایضاً : تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۔

(سورۃ مریم آیت ۹۰،۹۱)

تاہم اگر کسی کی زبان سے نادانستہ طور پر ایسا کلمہ نکل جائے تو موجب کفر نہیں اسلئے جہالت وجہ سے ایسا کلمہ زبان سے نکالنا اکثر علماء کے ہاں عذر نہیں۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ : من اتی بلفظۃ الکفر مع علمہ انہا لفظۃ الکفر عن اعتقادہ فقد کفر ولو لم یعتقد او لم یعلم انہا لفظۃ الکفر ولکن اتی بہا علی اختیار فقد کفر عند عامۃ العلماء لا یعذر بالجہل وقال بعضھم الجاھل اذ تکلم بکفر ولم یدر انہ کفر لا یکون کفراً ویعذر بالجہل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وقال ایضاً، وفی الاجناس عن محمد: ان من اراد ان یقول اکلت فقال کفرت انہ لا یکفر۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۵۸،۴۵۹ کتاب احکام المرتدین)[۱]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمیع وبصیر ہونے کے عقیدہ کی وضاحت

سوال:- جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمیع وبصیر ہونے کا عقیدہ رکھے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- سمیع اور بصیر دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر سمیع وبصیر حضور انورؐ کی

---

[۱] وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللّٰہ : فیکفر اذا وصف اللّٰہ تعالیٰ بما لا یلیق بہ او سخر باسم من اسمائہ ۔۔۔۔۔۔ او جعل لہٗ ولداً او زوجۃً ۔۔۔الخ
(البحر الرائق ج۵ ص۱۲۰ کتاب احکام المرتدین)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۸۳ کتاب الفاظ الکفر۔ الفصل الثانی۔

ذاتِ اقدس میں اس معنیٰ پر لیے جائیں کہ آدمی خواہ کتنا ہی دُور ہو جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتا ہے تو حضورؐ اس کی پکار کو سُنتے اور اس کو دیکھتے ہیں اور اس کی امداد کو پہنچ جاتے ہیں، تو ایسے عقیدہ کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ بایں معنیٰ سمیع و بصیر صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ہر جگہ دیکھتا ہے اور ہر کسی کی آواز ہر جگہ سنتا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جب کوئی دور سے مجھ پر دُرود بھیجتا ہے تو خدا کے حکم سے فرشتے اس درود کو مجھ تک پہنچا دیتے ہیں اور جب کوئی قریب سے (روضۂ اطہر پر آکر) مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں خود سنتا ہوں۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صلّی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلّی علیّ نائیًا ابلغتہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۸۷ باب الدعاء فی التشہد)

معراج النبیؐ سے متعلق ایک بے بنیاد واقعہ کی حقیقت

سوال: بعض تواریخ میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی تفصیل بیان فرما رہے تھے کہ وہاں بیٹھے ایک یہودی نے اس واقعہ کی تکذیب کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھ کر بازار میں آیا اور ایک بڑی سی مچھلی خرید کر اپنی بیوی کو دی اور کہا کہ جلدی سے اس کے کباب بناؤ میں غسل کر کے آتا ہوں، جب وہ غسل سے فارغ ہؤا تو اپنے آپ کو جوان عورت کی شکل میں پایا، اسی طرح اس نے سات سال گذارے اور اس سے بچے بھی پیدا ہوئے، سات سال کے بعد اس کی جنس پھر بدلی تو اپنے گھر آیا، کیا دیکھتا ہے کہ بیوی ابھی تک مچھلی صاف کر رہی ہے، تب اس نے ایمان لایا۔ کیا اس واقعہ کے بیان کرنے سے معراج النبیؐ پر روشنی پڑ سکتی ہے؟ اور اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بسلسلہ معراج مذکورہ واقعہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، واقعۂ معراج کے اثبات کے لیے قرآن اور صحیح احادیث ہمارے لیے کافی ہیں، اس کا ثبوت غلط اور بے بنیاد حکایات سے درست نہیں اور اس کی صحت کا عقیدہ عقلاً و نقلاً قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

لہ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ ملٰئکۃ سیاحین یبلغونی من امتی السلام۔ (مشکوٰۃ ص۸۶ کتاب الصلوٰۃ)
وقال العلامۃ ملا علی القاریؒ: ھو مخصوص بمن بعد عن حضرۃ مرقدہ المنور۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۲ ص۱۰)

واقعہ مذکورہ کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گذرا، البتہ جہانگیر بکڈپو لاہور والوں نے "قصص الانبیاء" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس کے نامعلوم مؤلف نے اس واقعہ کے علاوہ اور بھی بہت سے رطب ویابس اکٹھے کئے ہیں، ایسی کتابوں کے مطالعہ سے عوام کا عقیدہ ٹھیک نہیں رہ سکتا اس لیے ان کے مطالعہ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صیغۂ خطاب سے درود بھیجنے کا حکم

سوال: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر خطاب کے صیغہ سے الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول درود بھیجنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حالتِ غیبت میں دُور سے صیغۂ خطاب کے ساتھ درود شریف اگر اس نیت سے پڑھا جاتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں اور "صلوٰۃ وسلام" کو خود سنتے ہیں تو یہ ناجائز و حرام ہے اور اگر نیت یہ ہو کہ صلوٰۃ وسلام فرشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو پھر جائز ہے، البتہ ایسے مشتبہ الفاظ میں درود پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال الشیخ رشید احمد گنگوھیؒ: جب انبیاء علیہم السلام کو علم غیب نہیں تو یارسول اللہ کہنا بھی ناجائز ہوگا، اگر یہ عقیدہ کرکے کہے کہ وہ دُور سے سنتے ہیں بسبب علم غیب کے تو یہ کفر ہے اور جو یہ عقیدہ نہ رکھے تو کفر نہیں مگر کلمہ مشابہ کفر ہے، البتہ اگر اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ ملائکہ اس درود شریف کو آپ کے پیش عرض کرتے ہیں تو درست ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ ص۴۷ کتاب الایمان والکفر) لـہ

اگر میں نے فیصلہ کی خلاف ورزی کی تو قرآن کو جھوٹا سمجھوں گا۔

سوال: زید نے ایک فیصلہ کے بارے میں کہا "اگر میں اس فیصلہ کی خلاف ورزی کردں گا تو قرآن کو جھوٹا سمجھوں گا" بعد میں زید اس فیصلہ سے منحرف ہوگیا، تو کیا

لـہ قال الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: بارادۂ استعانت و استغاثہ یا باعتقاد حاضر و ناظر ہونے کے منہی عنہ ہے اور بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً و استلذاذاً ماذون فیہ ہے، چونکہ اشعار پڑھنے کی غرض محض اظہارِ شوق و استلذاذ ہوتا ہے اس لیے نقل میں توسع کیا گیا لیکن اگر کسی جگہ اس کے خلاف دیکھا جائے گا منع کردیا جائے گا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص۳۸۵ کتاب العقائد والکلام)

وَمِثْلُہٗ فی معارف القرآن ج ۷ ص۲۲۴ سورۃ الاحزاب۔

زید اپنے قول کی وجہ سے کافر ٹھہرایا جاسکتا ہے یا نہیں؟
الجواب:۔ مذکورہ الفاظ موجب کفر نہیں ہیں، عام طور پر ان کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ قرآن کو جھوٹا نہیں سمجھ سکتا اس لیے یہ فیصلہ ضرور تسلیم کروں گا، اور کفر کا فتویٰ تب دیا جاتا ہے جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، البتہ ان الفاظ سے یمین لازم ہو جاتی ہے اور یمین کا کفارہ ادا کرکے گناہ سے بچ سکتا ہے۔

لما فی الهندية: ولو قال ان فعلت كذا فأنا برئ من القرآن او القبلة او الصلوٰة او صوم رمضان فالكل يمين هو المختار۔ (الفتاویٰ الهندية ج۲ ص۵۳۔ الباب الثانی فی الحکام المرتد) [1]

لا اله الا الله ایوب خان رسول الله کا قائل کافر ہے

سوال: ایک شخص نے بھری مجلس میں کہا کہ اگر صدر صاحب غلہ روک دیں اور لوگوں کو غلہ نہ ملے تو ہم لا اله الا الله ایوب خان رسول الله کہیں گے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کلمہ طیبہ میں ایوب خان رسول الله کے الفاظ اگر اعتقاد اور اس معنیٰ سے کہے گئے ہوں کہ کسی وقت "ایوب خان" بھی "رسول الله" ہو سکتا ہے تو یہ کفریہ عقیدہ ہے، کیونکہ رسول الله صلی الله علیہ وسلم کے بعد کسی کیلئے بھی نبوت و رسالت کا اعتقاد رکھنا کفر ہے۔ اور اگر یہ اعتقاد کی وجہ سے نہ ہو بلکہ کسی پر بطور تعریض کہے گئے ہوں، مثلاً قوم کی خوشامدی اور ذہنی غلامی پر طنز کے طور پر یہ کلمات کہے گئے ہوں کہ یہ قوم اب اس قدر ذہنی غلامی میں گرفتار ہے کہ اپنے حکمرانوں کو کسی وقت بھی خدا کا پیغمبر کہنے کو تیار ہو سکتی ہے، تو یہ کفر نہیں۔
صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایوب خان رسول الله کہنے والے کے اعتقاد کا ہمیں پورا علم نہیں ہے اس لیے یقینی حکم اس پر نہیں لگایا جاسکتا۔ [2]

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وقال العينيؒ وعندي ان المصحف يمين لاسيما فی زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وكلام الله يمين زاد احمد والنبي ايضاً ولو تبرأ من احدها فيمين اجماعاً۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان مطلب فی القرآن)

[2] قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: قال الموفق فی المغنی ومن ادعی النبوة او صدق من ادعاها فقد ارتد لأن مسيلمة لما ادعى النبوة فصدقه قومه صاروا بذلك مرتدين۔
(اعلاء السنن ج۱۲ ص۶۳۶ من ادعی النبوة او صدق من ادعاها)

امام غزالیؒ کے کسی قول سے انکار کفر نہیں ہے

سوال:- جناب مفتی صاحب! آجکل دین اور دینی تعلیمات سے دُوری کی وجہ سے بعض لوگ علماء حق کی بے ادبی اور گستاخی کرتے ہیں اور جب کسی شرعی مسئلہ میں کسی ثقہ عالم دین کا حوالہ دیا جائے تو بلا خوف و خطر انکار کردیا جاتا ہے، اسی طرح ہمارے گاؤں میں ایک صاحب نے امام غزالیؒ کے حوالہ سے ایک مسئلہ بیان کیا تو دوسرے شخص نے اس سے انکار کردیا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص امام غزالیؒ کے کسی قول سے انکار کردے تو از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- اگر کسی عالم یا فقیہ کا قول قرآن وسُنت سے متصادم نہ ہو تو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا اگر استخفافِ دین کی وجہ سے انکار کیا جائے تو پھر باعثِ زوال ہے، البتہ اگر یہ انکار استخفافِ شریعت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس عالم کے ساتھ ذاتی عناد اور بغض کی وجہ سے ہو تو پھر موجبِ فسق ہے کفر نہیں ـــــ واضح رہے کہ دوسرے مذاہب کے فقہ میں ان کی تقلید نہ کرنا اس حکم میں داخل نہیں ہے۔

قال فخرالدین الاوزجندیؒ:- ولو قال انا لا اعمل بفتوی الفقهاء اولیس کما قال العلماء فانه لا یعذر ولا یکفر۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۶۹ کتاب الکراهیة)

اہل فترت کے بارے میں شرعی عقیدہ

سوال:- بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور جناب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چھ سو سال تک فترت کا زمانہ تھا جس میں کوئی نبی نہیں آیا، تو کیا زمانۂ فترت میں جو لوگ گذرے ہیں ان کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟ کیا وہ جنتی ہوں گے یا جہنمی؟

الجواب:- زمانہ فترت میں جو لوگ کسی رسول کی تعلیمات سے روشناس نہ ہو سکے بلکہ صرف توحیدِ باری تعالیٰ کے قائل گذرے ہوں تو جمہور علماء ان کے جنتی ہونے کے قائل ہیں، ہاں اگر کوئی بعثتِ نبویؐ سے پہلے کفر اور شرک کے عقیدے پر مرگئے ہوں تو ان کے مشرک اور جہنمی ہونے میں کوئی شک نہیں، البتہ اگر ان میں سے کسی کے عقیدے کا حال معلوم نہ ہو تو ان کے بارے میں توقف کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فقد صرح النوویؒ والفخرالدین الرازیؒ بان من مات قبل البعثة مشرکاً فهو فی النار ـــــ وبخلاف من اهتدی منهم

بعقلہ کقیس بن ساعدہ و زید بن عمرو بن نفیل فلا خلاف فی نجاتہم۔
(رد المختار ج ۵ ص۴۱۹ کتاب الحظر والاباحۃ) لہ

عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال :- کیا یہ درست ہے کہ عبداللہ بن اُبی ابن سلول حالتِ ایمان پر مرا تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیض اس کے کفن کے لیے دی تھی اور اس کی مغفرت کی دعا بھی مانگی تھی جس سے اس کا مسلمان ہونا معلوم ہوتا ہے، قرآن وحدیث سے اس بارے میں وضاحت مطلوب ہے ؟

الجواب :- قرآن وحدیث کی تصریحات سے منافقین کا جہنم میں جانا ثابت ہے۔ لما قال اللہ تعالیٰ : اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔ (سورۃ النساء ع ۱۴۵)

اور عبداللہ بن اُبی کا کفر پر مرنا اور جہنمی ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، مفسرین قرآن فرماتے ہیں کہ : اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ (سورۃ التوبہ ۸۴)

یہ آیت عبداللہ ابن اُبی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عبداللہ ابن اُبی کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا اور جنازہ پڑھنا، تو اس واقعہ سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے لیے دعائے مغفرت سے صراحتاً منع نہیں کیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ جنازہ پڑھتے وقت جب حضرت عمرؓ نے مزاحمت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا : لتدعنی یا عمرؓ ان اللہ خیرنی فاخترت فقال (اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (التوبہ ۸۰)) فواللہ لو اعلم یا عمرؓ انی لو زدت علی سبعین مرۃ ان یغفر لہ لزدت ۔ ثم مشٰی رسول اللہ صلعم معہ وقام علی قبرہ حتی دفن ثم یلبث الا قلیلاً حتی انزل اللہ (وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (التوبہ ۸۴)) فواللہ ما صلی اللہ رسول اللہ صلعم علی احدٍ من المنافقین۔ الخ (احکام القرآن للجصاص ج ۴ ص۳۵۰ سورۃ التوبۃ)

لہ قال الشیخ عبدالوہاب الشعرانیؒ : ایاك ان تحکم علی اھل الفترات (ای بین نوح وادریس وبین عیسٰی ومحمد) کلھم بحکم واحدٍ ۔ (الیواقیت ج ۲ ص۵۲)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۵ ص۳۸۸ کتاب العقائد والکلام۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو کفن کے لیے اپنی قمیض عطا فرمانے کی چند وجوہات ہیں :-

قال الشیخ الرازی رحمہ اللہ : اما دفع القمیص الیہ فذکروا فیہ وجوھا الاول ان العباس عم رسول اللہ لما اخذ اسیرا ببدر لم یجد والہ قمیصا وکان رجلا طویلا فکساہ عبداللہ قمیصہ ــــ ان اللہ تعالیٰ امرہ ان لا یرد سائلا بقولہ واما السائل فلا تنھر فلما طلب القمیص منہ دفعہ الیہ لھذا المعنیٰ ــــ وان ابنہ عبداللہ بن عبد اللہ بن ابی کان من الصالحین وان رسول اللہ اکرمہ لمکان ابنہ ۔

(التفسیر الکبیر ج ۱۶ ص۱۵۳ سورۃ یوسف) [۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے انکار کفر نہیں

سوال :- کسی معاملہ پر زید اور عمر کے درمیان تلخ کلامی پیدا ہو گئی تو زید نے کہا کہ اگر اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بھی مجھ سے سفارش کریں تو میں ان کی بھی سفارش نہیں مانوں گا۔ شریعتِ مطہرہ کی رو سے زید اپنے اس قول کی وجہ سے کافر ہوا یا نہیں ؟

الجواب :- اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے تاہم زید پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا کہا ہوا جملہ تفصیل طلب ہے ۔ زید نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان کی سفارش ماننے سے انکار کیا ہے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کے ساتھ جب حتمی حکم نہ ہو تو محض سفارش خود حتمی حکم نہیں ہے [۲] اس لیے بعض اوقات صحابہ کرام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش و مشورہ پر عمل نہیں کرتے تھے ۔

لما ورد فی الحدیث : عن ابن عباس قال کان زوج بریرۃ عبدا اسود یقال لہ مغیث

---

[۱] قال العلامۃ ملا علی القاری : قال الخطابی ھو منافق ظاھر النفاق وانزل فی کفرہ ونفاقہ ومن القرآن ۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۴ ص۴۰ باب غسل المیت وتکفینہ۔ الفصل الثالث)

[۲] قال العلامۃ الکردری : وقعت بین الرجلین منازعۃ فقال لو امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم اتمر بامرہ لا یکفر ۔ (فتاویٰ البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۳۴۵)

كانى انظر اليه يطوف خلفها فى سكك المدينة يبكى ودموعه تسيل على لحيته فقال النبىؐ للعباس: "يا عباس! الا تعجبُ من حب مغيث بريرة ومن بُغض بريرة مغيثا فقال النبىؐ لو راجعتيه فقالت يا رسول الله أتامرنى قال انما اشفع قالت لاحاجة لى فيه، رواه البخارى۔ (مشکوٰة ج ۲ ص۲۸۵ باب المباشرة)

قال بدرالدين العينىؒ: علمت ان امرهٔ واجب الامتثال فلما عرض عليها ما عرض استفصلت هل هو امر فيجب عليها امتثاله او مشورة۔
(عمدة القارى ج ۹ ص۳۴۲) [1]

بعض لوگوں پر عذابِ قبر منکشف ہوسکتا ہے

سوال:۔ اکثر سننے میں آتا رہتا ہے کہ فلاں جگہ عذابِ قبر کا مشاہدہ کیا گیا، تو کیا ازروئے شریعت دنیا میں عام لوگوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ عذابِ قبر کا مشاہدہ کر سکیں؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "یسمع صوته کل شیء الا الثقلین"۔ تو اس کے باوجود اس قسم کی روایات کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دنیا میں عذابِ قبر کا مشاہدہ لوگوں کے لیے ممکن اور واقع ہو چکا ہے، خاص کر اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ بعض اوقات اہلِ قبور کے حالات سے آگاہ فرما دیتے ہیں۔

قال الشيخ عبدالوهاب الشعرانىؒ: قال الشيخ فى الباب الثامن والسبعين وثلثمائة ان كل رزقه الله تعالى الامانة من الاولياء سمع عذاب القبر۔ (اليواقيت ج ۲ ص۱۲۶) [2]

لیکن عذابِ قبر منکشف ہونے کے لیے ولایت شرط نہیں ہے بلکہ بعض اوقات فاسق اور فاجر بھی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے، اور حدیثِ مبارک میں غیر الثقلین کی قید عادیہ ہے جبکہ خلافِ عادت ثقلین کا مشاہدہ کرنا بھی بعید نہیں۔

---

[1] قال العلامة ملا على القارى رحمه الله: وفيه ايماء الى عذرها فى عدم قبول الشفاعة، حيث قال الله تعالى: وبعولتهن احق بردهن فى ذلك ان ارادوا اصلاحا۔ (مرقاة شرح مشكوٰة ج ۳ ص۴۴۴ باب المباشرة)

[2] قال ابن قيمؒ: فرؤية هذه للنار فى القبر كرؤية الملائكة والجن تقع احيانا لمن شاء الله ان يريه ذلك۔ (كتاب الروح ص۸۹ المسألة السابعة۔ فصل الامر الخامس)

جمعہ کے دن مرنے والے پر عذابِ قبر نہ ہونے کا عقیدہ

سوال: کئی لوگوں سے سُننے میں آیا ہے کہ جو کوئی جمعہ کے دن فوت ہو جائے تو اُسے عذابِ قبر نہ ہوگا، تو کیا اگر جمعہ کے دن کوئی فاسق یا فاجر بھی فوت ہو جائے تو اُسے بھی عذابِ قبر نہ ہوگا؟ ایسا عقیدہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حدیثِ مبارک میں ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما من مسلم یموت یوم الجمعۃ اولیلۃ الجمعۃ الا وقاہ اللہ فتنۃ القبر۔

(ترمذی ج ۱ ص ۲۰۵ باب ما جاء فی من یموت یوم الجمعۃ)

جمعہ کی عزّت وتکریم کی وجہ سے جو کوئی بھی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو فوت ہو جائے خواہ کتنا ہی عاصی ہو یا کوئی صالح مسلمان اور نیک ہو تو اس کو عذابِ قبر کی ایک جھلک اور فقط ضغطہ قبر ہونے کے علاوہ باقی عذابِ قبر سے مامون ومحفوظ ہو جاتا ہے۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ۔ وفیہ تجمع الارواح وتزار القبور ویامن المیت من عذاب القبر ومن مات فیہ او فی لیلتہ اُمن من عذاب القبر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۱۵۴ باب الجمعۃ۔ مطلب ما اختص بہ یوم الجمعۃ)[1]

جمعہ کی رات تک قبر کی حفاظت کرنے سے عذابِ قبر نہیں ہوتا

سوال: کنز کے حاشیہ "باب الجمعۃ" پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: "وان مات فی ھذا الیوم اوفی لیلۃ الجمعۃ لا یکون عذاب القبر ساعۃ واحدۃ وان حفظہ القبر الیٰ لیلۃ الجمعۃ یقع العذاب ولا یعود الیٰ یوم القیٰمۃ" (غرائب) جمعہ کے دن فوت ہو جانے والے پر عذابِ قبر اٹھ جاتا ہے، اگر جمعہ سے پہلے دفن ہو کر جمعہ کی رات تک اس کی قبر کی حفاظت جائے تب بھی عذابِ قبر سے

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: والمؤمن المطیع لا یعذب بل لہٗ ضغطۃٌ یجد ھول ذٰلک وخوفہ والعاصی یعذب ویضغط لکن ینقطع عنہ العذاب یوم الجمعۃ ولیلتھا ثم لا یعود وان مات یومھا لیلھا قد یکون العذاب ساعۃ واحدۃ وضغطۃ القبر ثم یقطع۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۱۶۵ باب الجمعۃ مطلب ما اختص بہ یوم الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص ۱۰۲ ضغطۃ القبر وعذابہ حق۔

محفوظ رہے گا"۔ ازروئے شریعت "غرائب" کی عبارت پر عقیدہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟
الجواب:۔ جو مومن جمعہ کی رات یا دن کی کسی ساعت میں فوت ہو جائے تو اس کے بارے میں احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اس پر عذابِ قبر نہیں ہوگا۔

لماورد فی الحدیث: عن عبد اللہ ابن عمرؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مامن مسلم یموت یوم الجمعة اولیلة الجمعة الا وقاہ اللہ فتنة القبر۔ رواہ احمد۔ (مشکوٰۃ باب الجمعة ص۱۲۱ ضغطة القبر وعذابہ حق)

فقہاء اسلام نے بھی اپنی تصنیفات میں اسی طرح لکھا ہے: قال العلامة ملا علی القاری رحمہ اللہ: نعم ثبت فی الجملة ان من مات یوم الجمعة اولیلة الجمعة یرفع العذاب عنہ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۰۲ عذاب القبر حق)

رہا یہ کہ" جو کوئی دوسرے دن یا رات میں انتقال کر جائے اور پھر جمعہ کی رات تک اس کی قبر کی حفاظت کی جائے تو یہ بھی عذابِ قبر سے محفوظ رہے گا"، اس کے بارے میں نہ تو کوئی صحیح روایت اور نہ ہی کسی فقیہ کا قول ثابت ہے کہ حفاظتِ قبور کی وجہ سے قبر کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

باقی رہا کنز کے محشی ابوالمکارم یا غرائب کا مسئلہ تو یہ قابلِ اعتماد اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ابوالمکارم کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک رجل مجہول ہے اور اس کی کتاب بھی غیر معتبر ہے۔

لما قال الشیخ عبدالحیؒ: من الکتب الغیر المعتبرة شارح مختصر الوقایة للقہستانی المشہور بجامع الرموز وشرح الوقایة لابی المکارم۔ (مقدمہ عمدۃ الرعایہ ص۱)

اسی طرح "غرائب" بھی غیر مشہور کتاب ہے جس کے مصنف کا حال بالکل نامعلوم ہے اس لیے اس کے مسائل بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جاتے ہیں۔

قال ابن عابدینؒ: فی تنقیح الفتاوی الحامدیة فی بحث کراھة لبس الثوب الاحمر ان فی اثناء الرد علی الشرنبلالی القائل بجوازہ المستند الی کلام ابی المکارم والقہستانی علی ان الذی یجب علی المقلد اتباع مذھب امامہ۔ والظاھر ان ما نقلہ ھؤلاء الائمة ھو مذھب الامام لاما نقلہ ابوالمکارم فانہ رجل مجہول وکتابہ کذلک والقہستانی کجارف سیل وحاطب لیل خصوصاً واستنادہ الی کتب الزاھدی المعتزلی۔ انتہی (مقدمۃ عمدۃ الرعایۃ ص۱۱)

لہ قال السید الحمویؒ: نقلاً عن بعض رسائل مؤلف الاشباہ لاتجوز الفتوی من التصانیف الغیر المشہورة۔ انتہی (مقدمۃ عمدۃ الرعایۃ ص۱۱ فائدۃ الکتب التی لاتجوز بہا الفتوی)

عالمِ برزخ میں جسم و رُوح کو عذاب و ثواب ہوتا ہے

سوال :- بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قبر (برزخ) میں عذاب و ثواب روح کو ہوگا اور بعض روح مع الجسم کا قول کرتے ہیں۔ تو جناب مفتی صاحب! عذابِ قبر کے بارے میں جمہور علماء کی رائے کیا ہے؟ کیا یہ عذاب جسمانی ہے یا روحانی؟ نیز قرآن و حدیث سے اس کے کیا دلائل ہیں؟

الجواب :- جمہور علماء اہلسنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ برزخ میں جسم اور روح دونوں کی تعذیب یا تنعیم ہوگی۔

لما قال العلامة ملا علی القاریؒ : واعلم ان اھل الحق اتفقوا علیٰ ان اللہ تعالیٰ یخلق فی المیت نوع حیاۃ فی القبر قدر ما یتألم او یتلذذ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۰۱ ضغطة القبر)

اِسی طرح قرآن و حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا۔ (ای فی البرزخ)۔ (سورۃ المؤمن آیت ۴۶)

زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تعوذوا باللہ من عذاب القبر۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۵ باب اثبات عذاب القبر)[۱]

قبر میں نابالغ بچوں سے سوال و جواب کی وضاحت

سوال : جناب مفتی صاحب! نابالغ فوت شدہ بچوں سے قبر میں سوال و جواب ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- قبر میں نابالغ بچوں سے منکر نکیر کے سوال و جواب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ قبر میں منکر نکیر کے سوال ہر ایک سے ہوں گے لیکن نابالغ بچوں کو ان کے سوالوں کے جواب کا منجانب اللہ الہام ہوگا، بعض علماء فرماتے ہیں کہ کوئی سوال وغیرہ نہیں ہوں گے، اس لیے کہ نابالغ بچے غیر مکلف ہیں اور راجح یہی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : والاصح ان الانبیاء لا یسئالون

---

[۱] قال الشیخ ابوالمعینؒ : فیعذب اللحم متصلاً بالروح والروح متصلاً بالجسد یتألم الروح مع الجسد وان کان خارجاً عنہ ۔ اھ (ابوالمعین علیٰ ھامش شرح العقائد ص۷۲ عذاب القبر)
ومثلہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۲۹ الباس من رحمۃ اللہ کفر۔

ولا اطفال المؤمنین ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۱۹۲ فی مطلب فی التلقین بعد الموت) [1]

قبر یا برزخ عذاب وثواب میں دونوں برابر ہیں

سوال :۔ اگرکسی فوت شدہ شخص کو دفن نہ کیا جائے بلکہ اس کو جلا کر راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے یا دریا بُرد کر دیا جائے توکیا اس کو بھی قبر کا عذاب وثواب ہو گا یا نہیں ؟ نیز عذابِ قبر اور عذابِ برزخ میں کوئی فرق ہے یا نہیں ؟ وضاحت فرمائیں۔

الجواب :۔ میت کو قبر میں عذاب وثواب کا ہونا قرآنِ مجید اور احادیث سے صراحتًا ثابت ہے۔ اور قبر اس جگہ کا نام ہے جہاں میت کے اجزاء پڑے ہوں خواہ حسی یعنی معروف قبر میں ہوں یا نہ۔ [2] جملہ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ میت کے اجزاء کو خواہ ہوا میں اڑا دیا گیا ہو یا دریا بُرد کر دیا گیا ہو یا کوئی درندہ اس کو ہڑپ کر جائے تو بھی اس کو عذاب وثوابِ قبر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ برزخ اور قبر دونوں ایک ہی نام ہیں اور مرنے کے بعد تا قیامت زندگی کو برزخی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قال الحافظ ابن القیمؒ : ومما ینبغی ان یعلم ان عذاب القبر ھو عذاب البرزخ فکل من مات وھو مستحق العذاب نالہ نصیبہ منہ قبر اولم یقبر فلو اکلتہ السباع او احرق حتی صار رمادًا ونسف فی الھواء اوصلب اوغرق فی البحر وصل الیٰ روحہ وبدنہ من العذاب مایصل الی القبور۔ (الروح ص۵۸ المسألۃ السادسۃ)

قبر کو سجدہ کرنے کی اقسام کی تفصیل

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! قبر کو سجدہ کرنے سے آدمی صرف گنہگار رہوتا ہے یا کافر ؟ برائے کرم اس

---

[1] قال العلامۃ مُلا علی قاریؒ : واستثنیٰ من عموم سوال القبر الانبیاء والاطفال والشھداء۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۰۱ سوال منکر ونکیر فی القبر حق)

وَمِثْلُہٗ فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص۴۵۳ فی تشریح وسؤال منکر ونکیر فی قبرہ۔

[2] قال العلامۃ فخر الدین الرازیؒ : ان عرض النار علیھم غدوًا وعشیًّا ما کان حاصلاً فی الدنیا فثبت ان ھذا العرض انما حصل بعد الموت وقبل یوم القیامۃ ذٰلک یدل علیٰ اثبات عذاب القبر فی حق ھٰؤلاء واذا ثبت فی حقھم ثبت فی حق غیرھم لانہ لاقائل بالفراق۔ (التفسیر الکبیر ج ۲۷ ص۷۳ سورۃ المومن)

اس کی وضاحت فرمائیں ؟

الجواب :- قبر کے قریب سجدہ کرنا جبکہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور قبر کو سجدۂ تعظیمی کرنا حرام ہے اور سجدۂ عبادت کرنا شرک ہے اور بعض نے سجدۂ تعظیمی کو بھی شرک قرار دیا ہے، لہٰذا کسی بھی قبر کو سجدہ کرنے سے پرہیز کیا جائے اور جو کرتے ہوں ان کو اس سے منع کیا جائے اور توبہ واستغفار کی تلقین کی جائے ۔

لما قال فی الھندیۃ :من سجد للسلطان علیٰ وجه التحیّة او قبل الارض بین یدیه لا یکفر ولکن یأثم لارتکابه الکبیرة وھو المختار و قال ابوجعفر رحمه الله وان سجد للسلطان بنیة العبادة او لم یحضره النیة فقد کفر کذا فی الجوھر الاخلاطی۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۳۶۸ الباب الثامن والعشرون فی ملاقاۃ الملوک)[1]

غیر اللہ کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جو جانور کسی ولی یا بادشاہ کی تعظیم یا خوشنودی کے لیے ذبح کیا جائے یا بایں نیت کہ بادشاہ کی نظروں میں مقبول ہو جاؤں اور وہ مجھے کوئی عہدہ دے دے یا موجودہ عہدہ پر برقرار رکھے تو اس مذبوحہ جانور اور ذبح کرنے والے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- جو جانور کسی ولی کی تعظیم و تکریم یا بادشاہ کی خوشنودی کے لیے ذبح کیا جائے یا اس نیّت سے ذبح کرے کہ بادشاہ کے ہاں مقبول ہو جاؤں یا یہ کہ مجھے کوئی عہدہ دے دے یا اپنے عہدہ پر برقرار رکھے تو ان سب صورتوں میں مذبوحہ جانور حرام اور مُردار ہو جاتا ہے اگرچہ ذبح کرتے وقت ہزار مرتبہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اور اکثر فقہاء کرام اس فعل کو موجبِ کفر بتاتے ہیں، البتہ بعض نے کفر قرار دینے میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے ۔ بہرحال ایسا مذبوحہ مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ، مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاری رحمہ اللہ : وفی الخلاصۃ ومن سجد لھم اراد به التعظیم کتعظیم اللہ سبحانه کفر وان اراد به التحیۃ اختار بعض العلماء انه لا یکفر اقول ھٰذا ھو الاظھر (شرح الفقہ الاکبر ص۱۹۳ فصل فی الکفر صریحًا وکنایۃ)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۸۳ کتاب الکراھیۃ ۔

اور لعن اللہ من ذبح لغیر اللہ میں فقہاء، محدثین اور مفسرین کے نزدیک داخل ہے، تاہم اگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی نعمتوں کے شکریہ میں ذبح کر دیا یعنی اس نیت سے کہ نیک اور خیر خواہ بادشاہ کا ہم پر مقرر ہونا بہت بڑی نعمت ہے، محض اس نعمت کے شکریہ میں کوئی جانور ذبح کر دیا بادشاہ کی خوشنودی مقصود نہ تھی تو یہ صورت جائز ہے اور مذبوحہ کا کھانا جائز اور حلال ہے، اور اگر بادشاہ وغیرہ کی دعوت پر ذبح کیا جائے تو بھی جائز اور حلال ہے۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: ذبح لقدوم الامیر ونحوہ کواحد من العظماء یحرم لانہ اھل بہ لغیر اللہ ولو وصلیۃ ذکر اسم اللہ تعالیٰ ولو ذبح للضیف لا یحرم لانہ سُنّۃ الخلیل واکرام الضیف اکرام اللہ تعالیٰ والفارق ان قدم لیأکل منہ کان الذبح للہ والمنفعۃ للضیف او للولیمۃ او للربح وان لم یقدمھا لیأکل منھا بل یدفعھا لغیرہ کان لتعظیم غیر اللہ فتحرم وھل ھو یکفر؟ قولان بزازیۃ شرح وھبانیۃ قلت وفی صید المنیۃ انہ یکرہ ولا یکفر لانہ انظن بالمسلم انہ یتقرب الی الآدمی بھذا النحر ونحوہ فی شرح الوھبانیۃ عن الذخیرۃ ونظمہ فقال، وفاعلہ جمھورھم قال کافر۔ وفضلی واسماعیلی لیس یکفر۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۹ کتاب الذبائح)[1]

جانور قبروں پر لے جاکر ذبح کرنا

سوال: بعض لوگ قبروں پر بکرے وغیرہ لے جاکر وہاں ذبح کرتے ہیں، شرعاً ایسے جانوروں کا کیا حکم ہے؟

الجواب: کسی بزرگ یا ولی کے ایصالِ ثواب کے لیے کسی جانور کو ذبح کر کے اس کا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کرنا ایک جائز صورت ہے لیکن بکرا وغیرہ ان کے

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وفی التتمۃ رجل ذبح للضیف شاۃ فذکر اسم اللہ تعالیٰ علیھا فقال یحل اکلہ ولو ذبح لاجل قدوم الامیر او قدوم واحد من العظماء وذکر اسم اللہ تعالیٰ یحرم اکلہ لانہ ذبح لاجلہ تعظیماً لہ۔

(البحر الرائق ج ۸ ص ۱۶۸ کتاب الذبائح)

ومِثلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۰۲ نوع من کتاب الصید۔

ان کے مزارات پر لے جا کر ان کے نام پر ذبح کرنا حرام ہے اور اس سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے خواہ ذبح کرتے وقت کئی مرتبہ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا گیا ہو۔

لِمَا قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ذبح لقدوم الامیر او لواحد من العظماء یحرم ولو ذکر اللہ تعالیٰ۔ (الاشباہ والنظائر ج ۳ ص۲۳ کتاب الصید والذبائح) [1]

قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا اور چراغ روشن کرنا

سوال:۔ اولیاء اللہ کی قبروں کو چومنا، ان پر پھولوں کی چادریں چڑھانا اور غلاف ڈالنا، ان کے مزاروں کو چومنا اور ان پر چراغاں کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ تمام افعال قبیحہ اور مفضی الی الشرک ہیں اس لیے کہ یہ امور بطور تعظیم کے کئے جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے ماسوی کسی کی ایسی تعظیم کرنا ناجائز ہے، اور اس میں مال کا ضیاع بھی ہے اور بے فائدہ کاموں میں مال کو صرف کرنا شرعاً منع ہے، لہٰذا ایسے امور شنیعہ سے بچنا ضروری ہے اور جو کام طریقہ محمدیہ (قرآن وحدیث) سے ثابت ہو اسے اختیار کرنا چاہیئے۔

لما ورد فی الحدیث: وعن جابرؓ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ وان یقعد علیہ۔ رواہ مسلم۔ وقال ایضاً: عن ابی الھیاج قال لی علیؓ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ. رواہ مسلم۔ (مشکوٰۃ ص۱۴۸ باب فی دفن المیت)

قال العلامۃ عینیؒ: قال الفقہاء الخراسانیون لا یمسح القبر ولا یقبلہ ولا یمسہ فان کل ذٰلک من عادۃ النصاریٰ۔ (البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج۳ ص۲۸۵ باب الجنائز) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وفی التتمۃ رجل ذبح للضیف شاۃ فذکر اسم اللہ تعالیٰ علیھا فقال یحل اکلہ ولو ذبح لاجل قدوم واحد من العظماء وذکر اسم اللہ تعالیٰ یحرم اکلہ لانہ ذبح لاجلہ تعظیماً لہ۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۶۸ کتاب الذبائح) ۔۔۔ ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۰۲)

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الدراھم والشمع والزیت ونحوھا الی ضرائح الاولیاء الکرام تقرباً الیھم فھو بالاجماع باطل حرام ما لم یقصد واصرفھا لفقراء الانام وقد ابتلی الناس بذلک۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۳۹ الصوم مطلب فی النذر الخ) ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۱ الباب السادس عشر فی زیارۃ القبور)

پیر (مُرشد) کو سجدہ کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں ایک پیر آتا ہے لوگ اس کی قدمبوسی کرتے ہیں اور اسے سجدہ بھی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تمام امتِ مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا جائز نہیں بلکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا موجبِ کفر و شرک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں"۔ لہٰذا کسی صورت میں بھی غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے البتہ قدم بوسی کو بعض علماء نے جائز لکھا ہے بشرطیکہ اس میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ ہو۔

قال العلامة الحصكفيؒ: وكذا ما يفعلون من تقبيل الارض بين يدي العلماء والعظماء فحرام والفاعل والراضي به آثمان لانه يشبه عبادة الوثن وهل يكفران على الوجه العبادة والتعظيم كفر وان على وجه التحية لا وصار آثماً مرتكباً للكبيرة۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۸۳ الكراهية۔ باب الاستبراء)[1]

قبر بوسی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اولیاء کرام کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں، تو کیا قبروں کو بوسہ دینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ قبر کو بطور تعظیم و تکریم بوسہ دینا کفر و ضلالت ہے اور بلا نیّتِ تعظیم گناہ کبیرہ اور حرام ہے، اس لئے کہ یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: وكذا ما يفعلون من تقبيل الارض بين يدي العلماء والعظماء فحرام والفاعل والراضي به آثمان لانه يشبه عبادة الوثن وهل يكفران كان على وجه العبادة والتعظيم كفر وان على وجه التحية لا۔ وصار آثماً مرتكباً للكبيرة۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۸۳ الكراهية۔ باب الاستبراء)[2]

---

[1] قال العلامة ملا علي القاريؒ: وفي الخلاصة ومن سجد لهم ان اراد به التعظيم كتعظيم الله سبحانه كفر وان اراد به التحية اختار بعض العلماء انه لا يكفر اقول هذا هو الاظهر۔ (شرح الفقه الاكبر ص۲۹۴ فصل في الكفر صريحاً وكناية)۔ ومثله في الهندية ج۵ ص۳۶۸ الباب الثامن والعشرون في ملاقاة الملوك۔

[2] قال العلامة ملا علي القاريؒ: وفي الخلاصة ومن سجد لهم ان اراد به التعظيم كتعظيم الله سبحانه كفر وان اراد به التحية اختار بعض العلماء انه لا يكفر اقول وهذا هو الاظهر۔ واما تقبيل الارض فهو قريب من السجود۔ (شرح الفقه الاكبر ص۲۹۴ فصل في الكفر صريحاً وكناية)۔ ومثله في الهندية ج۵ ص۳۶۸ الباب الثامن والعشرون في ملاقاة الملوك۔

قبر کا طواف کرنا اور اسکی مٹی بدن پر ملنا

سوال:۔ کسی بزرگ کی قبر کی مٹی یا پتھر وغیرہ بدن پر ملنے یا اس کے ارد گرد طواف کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی بزرگ کی قبر کا مسح کرنا، چھونا، بوسہ لینا یا اس کی مٹی اور پتھر وغیرہ کو بدن پر ملنا یہ سب امور ناجائز اور بدعاتِ قبیحہ ہیں، اسی طرح قبر کا طواف کرنا بھی حرام ہے اسلئے کہ طواف عبادت جو بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے، ان سب امور سے تمام مسلمانوں کو بچنا ضروری ہے، ایک مسلمان کو ایسے افعال بجالانا زیب نہیں دیتا۔

قال العلامة بدر الدين العينيؒ: قال الفقهاء الخراسانيون لا يمسح القبر ولا يقبله ولا يمسه فان كل ذلك من عادة النصارى قال وما ذكروه صحيح۔ وقال الزعفرانيؒ: لايستلم القبر بيده ولا يقبله قال وعلى هذا مضت السنة ومايفعله العوام الآن فهو من البدع المنكرة شرعًا۔ (البناية شرح الهداية ج۳ ص۵۱۲ في آخر باب الجنائز)[1]

مدد کُن شاہِ جیلانیؒ، مدد کُن شاہِ بغدادؒ کے الفاظ سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو پکارنا

سوال:اگر کوئی شخص شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اگر آپ کو مصیبت کے وقت مندرجہ ذیل الفاظ سے پکارا جائے تو آپ پکارنے والے کی مدد کرتے اور اس کی مصیبت کو دور کرتے ہیں:۔

اغثني وامددني في قضاء حاجتي يا قاضي الحاجات ۔ يا شيخ عبدالقادر جيلانيؒ۔

مدد کُن شاہ شہانی ۔ مدد کُن شاہِ جیلانیؒ ۔ مدد کُن شاہِ بغدادؒ ۔

اور یہ الفاظ خود بھی بطور وظیفہ پڑھتا ہو اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہو تو از روئے شرع ایسا عقیدہ رکھنے والے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اس نیت اور عقیدہ کے ساتھ پکارتا ہے کہ آپ ہماری پکار کو سنتے ہیں اور پکارتے پر پہنچکر امداد بھی کرتے ہیں تو یہ ایک

---

[1] وفي الهندية: ولا يمسح القبر ولا يقبله فان ذلك من عادة النصارى۔
(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۵۱ الباب السادس عشر في زيارة القبور۔ الخ)

مشرکانہ عقیدہ ہے اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور اس میں اس کا کوئی ہمسر و شریک نہیں ہے۔

لما قال العلامة الكردري رحمه الله : من قال ان ارواح المشائخ حاضرة تعلم يكفر۔ (فتاوىٰ بزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۲۶ الفصل الثانی فیما یتعلق باللہ تعالیٰ)[۱]

فوت شدہ بزرگوں کو حاضر و ناظر سمجھنا

سوال:۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اولیاء اللہ وفات کے بعد بھی حاضر و ناظر ہیں اور مشکلات میں ان کو مدد کے لیے پکارنا صحیح ہے، اس کے خلاف ایک دوسرا شخص ان صفات کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرنے کا قائل ہے، شرعاً کس کی بات درست ہے؟

الجواب: مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے، اس کو ہر چیز پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے، قرآنِ پاک اور احادیثِ نبویہ سے ثابت ہے کہ ان صفات میں کوئی نبی کوئی ولی اللہ تعالیٰ کا ساجھی اور شریک نہیں ہے، البتہ انبیاء اور اولیاء کے وسیلہ سے دُعا کرنا جائز ہے، قرآن پاک میں ہے کہ: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۳۵)" باقی غیر اللہ کو بایں معنیٰ پکارنا کہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے شرکِ جلی ہے جو دائمی جہنم کا ذریعہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۴۸) وقال الله تعالیٰ: وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (سورۃ الاحقاف آیت ۵)[۲]

---

[۱] قال العلامة عبد الحی اللکھنوی رحمه الله : جواب او کافراست فی البزازية من قال ارواح المشائخ حاضرون یعلمون یکفر۔

(مجموعة الفتاوىٰ فارسی ج۳ ص۵ باب العقائد)

[۲] وقال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله : ومنها ان ظن ان الميت يتصرف فی الامور دون الله اعتقاده ذلك كفر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۹۸ فصل عقد بيان مايوجب العين على نفسه بعد ماذكر ما اوجبه الله تعالیٰ عليه)

وَمِثْلُهٗ فی البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۲۶ الفصل الثانی فیما یتعلق بالله۔

اولیاء کرام کو متصرف فی الامور سمجھنا موجب کفر و شرک ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اولیاء اللہ ہم پر بارشیں برساتے ہیں اور بارشوں کا بند ہو جانا ان کی ناراضگی کی دلیل ہے، وہ مصائب و مشکلات میں ہماری مدد کرتے ہیں، یعنی تمام امور میں ان کو متصرف سمجھتا ہو تو ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اولیاء کرام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے مقربین اور محبوب ترین بندے ہوتے ہیں مگر ان کو خدائی کا درجہ دینا اور متصرف فی الامور سمجھنا موجب کفر و شرک ہے۔ بارشیں برسانا، لوگوں کو نفع و نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے غیر اللہ کو اس میں شریک کرنا شرک جلی ہے، اسلئے اس قسم کے عقیدہ سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ومنها ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ اعتقادہ ذٰلک کفر۔ (البحرالرائق ج ۲ ص ۲۹۸ فصل عقد لبیان مایوجب العبد علیٰ نفسہ بعد ماذکر ما اوجبہ اللہ تعالیٰ علیہ)[1]

غیر اللہ کے متعلق یَعْلَمُ مَا فِی الصُّدُوْرِ کا عقیدہ رکھنا

سوال:۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی نبی یا ولی کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ دلوں کے راز جانتے ہیں، اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: دلوں کے راز اور بھید جاننے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان کے مافی الضمیر پر بغیر کسی اخبار کے باخبر ہو سکے، غیر اللہ کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (سورۃ النمل آیت ۶۵)

قال اللہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۴)

بلکہ فقہاء کرام نے غیر اللہ کو عالم الغیب ماننے اور متصرف فی الامور سمجھنے والے کو

---

[1] قال اللہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (سورۃ الاعراف)
وقال اللہ تعالیٰ: قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۔ (سورۃ الجن)

کافر تک کہا ہے ۔

لما فی الهندیة : رجل تزوج امرأة و لم یحضره الشهود قال خدائے را ورسول را گواہ کردم، قال خدائے را و فرشتگان را گواہ کردم کفر۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۲۶۶ الباب التاسع فی احکام المرتدین)[1]

مصائب و مشکلات میں غیر اللہ کو پکارنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ کسی مشکل یا مصیبت میں غیر اللہ کو پکارنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مصائب و مشکلات میں غیر اللہ سے استمداد اور اعانت ناجائز اور حرام ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فوت شدہ نبی یا ولی دنیا میں بندوں کے امور میں مداخلت اور تصرف کر سکتے ہیں اور لوگوں کی مشکلات حل کرتے ہیں، یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے یعنی مافوق الاسباب بغیر کسی سبب کے سہارا لینے کے شریعت نے اللہ تعالیٰ سے استعانت و استمداد کا حکم دیا ہے۔

کما قال اللہ تعالیٰ : وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۃ یونس آیت ۱۰۶)[2]

یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھنا شرک ہے

سوال:۔ یا شیخ عبد القادر جیلانی

---

[1] قال العلامۃ قاضیخانؒ : رجل تزوج امرأۃ بغیر شهود فقال الرجل والمرأۃ خدائے را و پیغامبر را گواہ کردیم قالوا یکون کفراً لانه اعتقد ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف بعد الموت ۔
(فتاوی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۵۷۶ باب ما یکون اسلاماً من الکافر وما لا یکون)
وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۲۶ الثانی فیما یتعلق باللہ ۔

[2] وقال اللہ تعالیٰ ایضاً : وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔ (سورۃ الاحقاف آیت ۵)
لما ورد فی الحدیث : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا سألت فاسأل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ ۔ (مشکوۃ ص۴۳۵ باب الصبر والتوکل)

شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کا وظیفہ اس عقیدے کے ساتھ پڑھنا کہ آپ حاضر و ناظر ہیں اور ہماری اس نداء اور وظیفے کو سنتے ہیں صریح شرک ہے اور اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة الکردریؒ: تزوج بلا شھود وقال رسول خدا ی را و فرشتگان را گواہ کردم، یکفر لانہ اعتقد ان الرسول والملک یعلمان الغیب۔
(الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۲۵ الثانی فیما یتعلق باللہ)[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشکل کشا سمجھنا کفر ہے

سوال:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشکل کشا ہونے کا عقیدہ رکھنا شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق سے ما فوق الاسباب افعال سرزد ہونے کا عقیدہ رکھنا شرک ہے کیونکہ اس صفت کے ساتھ مخلوق کے مصائب اور مشکلات دور کرنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، البتہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجازاً مشکل کشا کہا جائے تو اس سے شرک لازم نہیں آتا، تاہم عوام جو اس امتیاز کو پہچان نہیں سکتے اُن کو اس قسم کے عقائد رکھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: منھا ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ اعتقادہ ذلک کفر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۹۸ فصل عقد لبیان ما یوجب العبد علی الخ)

داڑھی منڈانے کو جائز اور گناہ نہ سمجھنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ایسے شخص کے بارے میں جس کا یہ عقیدہ ہے کہ داڑھی منڈانا جائز ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور وہ زبان سے بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار

---

[1] قال العلامۃ قاضیخانؒ: رجل تزوج امرأۃ بغیر شھود فقال الرجل والمرأۃ خدائے را و پیغامبر را گواہ کردیم قالوا یکون کفراً لانہ اعتقد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف بعد الموت۔
(فتاویٰ قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۷۶ باب ما یکون اسلاماً من الکافر ما لا یکون)

کرتا ہے، ازروئے شرع اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ داڑھی رکھنا شعائر اسلام میں داخل ہے اور روایات سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سنتِ متواترہ میں سے ہے، فقہاء کے نزدیک اس کی حد مقرر ہے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے داڑھی منڈوانا حرام اور ناجائز ہے، اگر ایک شخص ایسے گناہ کو گناہ نہ سمجھے اور دیدہ دانستہ اس کی جرأت کرے اور داڑھی رکھنے کو اپنی طرف سے خودساختہ طریقہ سمجھے تو ایسے شخص کا عقیدہ موجبِ کفر ہے۔ تاہم اگر داڑھی منڈوانے کی حِلّت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو صرف زبانی طور پر اس پر اصرار کرتا ہو تو پھر بھی یہ اندیشۂ کفر سے خالی نہیں، ایسا عقیدہ رکھنے یا اس کا اظہار کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ملا علی القاریؒ: ومنها ان استحلال المعصية صغيرة كانت او كبيرة كفر اذا ثبت كونها معصية بدلالة قطعية وكذا الاستهانة بها كفر بان يعدها هينة سهلة ويرتكبها من غير مبالات بها ويجريها مجرى المباحات في ارتكابها۔ (شرح الفقه الاكبر ص۲۲۵ مسئلة فی استحلال المعصية) [1]

ضروریاتِ دین سے استہزاء کرنا کفر ہے

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس شخص کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ: توحیدِ باری تعالیٰ (نعوذ باللہ) ایک مذاق ہے، اور شریعت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی حامی ہے، نماز روزہ کوئی چیز نہیں ہے، میرا ایک مستقل دین ہے جس کے قبول کرنے میں لوگوں کی کامیابی ہے، شرعاً ایسے شخص کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص مرتد اور کافر ہے کیونکہ ضروریاتِ دین کا منکر اور گستاخ ہے، با اثر اہلِ اسلام (حاکمِ وقت) کے لیے ضروری ہے کہ تائب نہ ہونے کی صورت میں اس کو مرتد کی سزا دیں اور تمام اہلِ اسلام اس سے قطع تعلق اختیار کریں۔

لما قال العلامة ملا علی القاریؒ: ومن وصف الله بما لا يليق به او سخر باسم من

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: لكن فی شرح العقائد النسفية استحلال المعصية كفر اذا ثبت كونها معصية بدليل قطعی۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۹۲ مطلب استحلال المعصية القطعية كفر)
ومثله فی شرح العقيدة الطحاوية ص۳۶۳ لا نكفر احداً من اهل القبلة الخ

اسمائہٖ او بامر من آوامرہ اوانکروعدہ اووعیدہ یکفر وکذا مخالفۃ ما اجمع علیہ وانکارہ بعد العلم بہ یعنی من امور الدین کفر۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۲۲۷ مسئلۃ استحلال المعصیۃ ولو صغیرۃ کفر) لہ

قرآن پاک کے اوراق کو پھاڑنا اور بیحرمتی کرنا موجب کفر ہے

سوال: قرآن حکیم کے اوراق کو توڑ پھوڑ کر بے ادبی اور بیحرمتی سے زمین پر گرانے والے شخص کا شرعًا کیا حکم ہے؟

الجواب: فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ قرآن پاک کی توہین اور استخفاف کفر ہے اگرچہ توہین کرنے والا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل اور معتقد ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص جس کے دل میں قرآن پاک کی عظمت نہ ہو یہاں تک کہ قرآن مجید کے اوراق کو پھاڑ کر زمین پر پھینکے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اووضع مصحفاً فی قاذورۃ فانہ یکفر وان کان مصدقاً لان ذلک فی حکم التکذیب۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۲ باب المرتد) ۲ے

حرام پر حلال کا عقیدہ رکھنا موجب کفر ہے

سوال: اگر کوئی شخص حرام چیز پر حلال ہونے کا عقیدہ رکھے تو اس کا شرعًا کیا حکم ہے؟

الجواب: فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ باوجود علم کے حرام پر حلال اور حلال پر حرام کا اعتقاد رکھنا موجب کفر ہے البتہ بعض استثنائی صورتوں کا حکم فقہاء نے علیحدہ ذکر کیا ہے کہ مذکورۃ الصدر حکم تب لازم ہوتا ہے کہ جب حرام لعینہٖ کو حلال سمجھے حرام لغیرہٖ کی حلت

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وکذا فی مخالفتہ اوانکارما اجمع علیہ بعد العلم بہ لان ذلک علی ان التصدیق مفقود۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۲ باب المرتد)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ هامش الھندیۃ ج۶ ص۳۲۳ کتاب الفاظ الکفر ثانیاً۔ الثانی فیما یتعلق الخ

۲ے قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: من استخف بالقرآن او بالمسجد اوبنحوہٖ مما یعظم فی الشرع کفر ومن وضع رجلہ علی المصحف حالفًا استخفافًا کفر۔ انتہیٰ۔

(شرح الفقہ الاکبر ص۲۳۹ فصل فی القرأۃ والصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۶۶ الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

کا عقیدہ موجبِ کفر نہیں ہے، حرام لعینہ کا عقیدہ بھی اس وقت موجبِ کفر ہے جبکہ اس کی حرمت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو، اگر اس کی حرمت خبرِ واحد سے ثابت ہو تو پھر یہ موجبِ کفر نہیں ہے۔

لما فی الهندیة: ومن اعتقد الحرام حلالاً او علی القلب یکفر اما لو قال لحرام هذا احلال لترویج السلعة او بحکم الجهل لا یکون کفراً وفی الاعتقاد هذا اذا کان حراماً لعینه وهو یعتقده حلالاً حتی یکون کفراً واما اذا کان حراماً لعینه انما یکفر اذا کان حراماً لعینه انما یکفر اذا کانت الحرمة ثابتة بدلیل مقطوع به اما اذا کانت باخبار الاحاد فلا یکفر کذا فی الخلاصة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۲۷۲ الباب التاسع فی احکام المرتدین)[1]

رقص وسرود کو حلال اور جائز سمجھنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص رقص وسرود اور گانے بجانے کو حلال اور جائز سمجھتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ گانا بجانا اور رقص وسرود از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے مگر اس کے ارتکاب سے ایک مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، البتہ جو شخص کسی حرام فعل کو حلال سمجھ کر کرے اور اس کو حرام نہ سمجھے تو یہ موجبِ کفر ہے لہٰذا جو شخص رقص وسرود اور گانے بجانے کو حلال اور جائز سمجھتا ہو تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردری: قال القرطبی علی ان هذا الغناء وضرب القضیب والرقص حرام بالاجماع عند مالک وابی حنیفة والشافعی واحمد فی مواضع کتابه وسید الطائفة شیخ احمد صرح بحرمته ورأیت فتوی شیخ الاسلام سید جلال الملة والدین (الکیلانی) ان استحل هذا الرقص کافراً ولما علم ان حرمته بالاجماع لزم

---

[1] قال العلامة ابن نجیم: والاصل ان من اعتقد الحرام حلالاً فان کان حراماً لغیره کمال الغیر لا یکفر وان کان لعینه فان کان دلیله قطعیاً کفر والا لا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۳۲ باب المرتد)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۸۳ الفصل الثانی فی الفاظ الکفر الخ۔

ان یکفر استحلہ ۔ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۳۴۹ کتاب الفاظ القرآن تکون اسلاماً اوکفراً اوخطاء۔ المتفرقات فی آخر الکتاب) لہ

یزید پر لعنت بھیجنا جائز نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میدانِ کربلا میں اہلبیت یعنی حضرت حسینؓ اور آپ کے رفقاء پر یزید اور شمر نے ظلم کئے تھے اور ان کو بیدردی سے شہید کیا تھا تو ایسے سخت دل ظالم آدمی کو کافر اور لعنتی کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یزید اور اس کے متبعین کے فسق وفجور اور ظلم وزیادتی میں کوئی شک وشبہ نہیں لیکن اس ظلم اور فسق کی وجہ سے ان پر کفر اور ارتداد کا حکم لگانا مشکل ہے اس لیے کہ ان سے کوئی ایسا امر متحقق نہیں ہوا ہے جو ان کے ارتداد پر دلالت کرے اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حلال سمجھ کر قتل کیا ہو، اسی طرح ان (یزید وشمر) پر لعنت کرنے سے بھی احتراز اولیٰ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیوں اور اہل قبلہ پر لعنت کرنے سے منع فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء محققین نے اس مسئلہ میں توقف کے پہلو کو اختیار فرمایا ہے، اس لیے کہ ایمان کا دارو مدار خاتمہ پر ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا یا نہیں۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: واما اختلفوا فی یزید بن معاویۃ حتی ذکر فی الخلاصۃ وغیرہ انہ لاینبغی اللعن علیہ ای ولا علی الحجاج لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن لعن المصلین ومن کان من اھل القبلۃ......وعلی الجملۃ ففی لعن الاشخاص خطر فیجتنب ولا خطر فی السکوت من لعن ابلیس فضلاً عن غیرہ۔ انتھی۔ ولان الامر بقتل الحسینؓ لایوجب الکفر فان قتل غیر الانبیاء علیھم السلام کبیرۃ

لہ وقال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ: وفی السراج ودلت المسئلۃ ان الملاھی کلھا حرام ویدخل علیھم بلا اذنھم لانکار المنکر۔ قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ صوت اللھو والغناء ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء النبات۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۴۸، کتاب الحظر والاباحۃ) وفی ج ۴ ص۲۵۹ ومن یستحل الرقص قالوا بکفرہ (باب المرتد) ومثلہ فی رد المحتار ج ۴ ص۲۵۹ باب المرتد۔

عند اهل السنۃ والجماعۃ الا ان یکون مستحلاً وھو غیر مختص بالحسین ونحوہ مع ان الاستحلال امر لا یطلع علیہ الا ذو الجلال۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۲ الکبیرۃ لا تخرج المؤمن عن الایمان)[1]

شریعتِ مطہرہ پر فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے

سوال:۔ دو آدمیوں کا آپس میں کسی بات پر تنازع پیدا ہوگیا، ایک نے کہا کہ ہم شریعتِ محمدی پر فیصلہ کریں گے، دوسرے نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا اور کہا کہ میں انگریزی قانون کے مطابق فیصلہ کراؤں گا شریعت پر فیصلہ کرانے کے لیے تیار نہیں ہوں، اور وہ برابر اس بات پر مصر ہے بلکہ حاکم کے سامنے انکارِ شریعت پر دستخط بھی کر دیئے ہیں، شرعاً اس آدمی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایمان کی نشانی یہ ہے کہ مومن اپنے تمام معاملاتِ زندگی میں فیصلہ کن قانون صرف اور صرف خدائی قانون اور اسلامی شریعت کو تسلیم کرے، اور جو شخص دل سے اسلامی شریعت کو معاملاتِ زندگی میں فیصلہ کن قانون تسلیم نہیں کرتا وہ ہرگز ہرگز مومن نہیں بلکہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن اگر وہ دل سے اسلامی شریعت کو فیصلہ کن قانون تو مانتا ہے مگر اس پر فیصلہ کرنے سے گریز کرتا ہے تو ایسا کرنا منافقوں کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء ع۶۵) اور منافقین کے بارے میں یوں فرمایا ہے: وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُولِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲) اس لیے کسی بھی مسلمان کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: رجل قال لآخر اذھب معی الی الشرع فقال الآخر تا پیادہ نیاوری نروم لا یکفر......ولو قال

---

[1] وقال العلامۃ تفتازانیؒ: انما اختلفوا فی یزید بن معاویۃ حتی ذکر فی الخلاصۃ وغیرھا انہ لا ینبغی اللعن علیہ ولا علی الحجاج لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن لعن المصلین ومن کان اھل القبلہ۔ (شرح العقائد ص۱۱۶ کف عن ذکر الصحابۃ الا بخیر)
وَمِثْلُہٗ فی مجموعۃ الفتاوی (اردو) ج ۱ ص۵۹ کتاب العقائد۔

من شریعت چه دانم اَوْ قَالَ دبوس هست مرا بشریعت چه کنم یکفر۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص۳۸۸ کتاب الفاظ الکفر۔ الجنس الثامن) لہ

"مجھے شریعت کی ضرورت نہیں" کہنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارہ میں کہ سسر اور داماد کے مابین خانگی تنازعہ تھا، سسر نے داماد سے کہا کہ میرے ساتھ شریعت مطہرہ کے مطابق فیصلہ کرلو، داماد نے جواب میں کہا کہ "مجھے شریعت کی ضرورت نہیں"۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت مطہرہ کیا حکم دیتی ہے؟

الجواب:۔ "مجھے شریعت کی ضرورت نہیں" کے الفاظ میں کچھ ابہام پایا جاتا ہے، اور اگر اس سے کہنے والے کا مقصد یہ ہو کہ میں اس مسئلہ میں شریعت پر فیصلہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں، ظاہر بات ہے کہ یہ الفاظ موجب کفر نہیں ہیں۔ لیکن اگر ان الفاظ سے مقصد شریعت سے انکار ہو تو شریعت چونکہ عالم انسانیت کے لیے پورے ضابطۂ حیات کا نام ہے اس لیے اس سے انکار کرنا موجب کفر ہے۔

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید بخاریؒ: من بہ رسم کنم نہ بحکم قال الحاکم عبد الرحمٰن ان کان مرادہ فساد الخلق وترک الشرع واتباع الرسم لا رد الحکم لا یکفرون ان کان مرادہ فساد الخلق وترک الشرع والحکم یکفر۔ (خلاصۃ الفتاویٰ جلد ۴ ص۳۸۴ الفصل الثانی فی الفاظ الکفر الخ)

لما قال فی الھندیۃ: رجل قال لخصمہ اذھب معنی الی الشرع او قال بالفارسیۃ بامن بشرع روو قال خصمہ بپادہ بیارتا بروم بے جبر نروم یکفر لانہ عاند الشرع۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۲۷۱ الباب التاسع فی احکام المرتدین ومنھا ما یتعلق بالعلم والعلماء) ۲ہ

لہ قال العلامۃ قاضیخانؒ: رجل بینہ وبین غیرہ خصومۃ فقال رجل حکم خدائی چنین است فقال آخر من حکم خدا راچہ دانم قال ابو قاسم رحمہ اللہ ھو کفر لانہ استخفاف بامر اللہ۔
(الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۵۷۵ باب ما یکون کفرا وما لا یکون)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۲۷۲ کتاب احکام المرتدین، ومنھا ما یتعلق بالعلم والعلماء۔

۲ہ قال العلامۃ ابن بزاز الکردریؒ: قال من شریعت چہ دانم او قال دبوس ھست من شریعت راچہ کنم یکفر۔
(فتاوی بزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۳۳۸ کتاب الفاظ تکون اسلاما او کفرا او خطاءً، الباب الثامن فی الاستخفاف بالعلم)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۵۷۵ باب ما یکون کفرا من المسلم وما لا یکون۔

خدا اور رسول سے برأت کا اعلان موجب کفر ہے

سوال:- ایک شخص نے غصہ کی حالت میں یہ کہا کہ میرا خدا اور رسول سے کچھ واسطہ نہیں میں ان سے بری ہوں، اس قسم کا کلمہ بولنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:- "میرا خدا اور رسول سے کچھ واسطہ نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ مجھے خدا اور رسول کی ضرورت نہیں، لہٰذا اگر سمجھ بوجھ سے اس کلمہ کو کلمۂ کفر جان کر بولا گیا ہو تو اس بول سے خدا اور رسول کا استخفاف لازم آتا ہے جو کہ موجب کفر ہے، لہٰذا ایسا شخص مرتد اور واجب القتل ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو قال لوجل حکم خدا تعالیٰ چنیں است فقال من چہ کنم حکم خدا چہ دانم فهٰذا استخفاف بالله فیکفر۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۴۶۸ کتاب احکام المرتدین۔ المتفرقات) ؎

نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور دل میں لانا

سوال:- حالتِ نماز میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور دل میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ تشہد میں "صلوٰۃ وسلام" کے وقت آپ کا خیال مبارک دل میں لانا ناگزیر ہے، تو ایسی حالت میں آپ کے شمائل کا تصور کرتے ہوئے "صلوٰۃ وسلام" کہنے کا از روئے شریعت کیا حکم ہے؟

الجواب:- نماز ایک ایسی عبادت ہے جو اول تا آخر خالصتہً عبادتِ خداوندی ہے اس لیے بطور عبادت وبندگی اس کا ہر ہر جزء یادِ خداوندی اور اس کے خشوع وخضوع میں ڈوبا ہوا ہونا چاہیئے، تو بطور عبادت وبندگی نماز میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی ذہن میں لانا فرض ہے۔

قال شرف الدین اسماعیل بن المقریؒ فی قصیدة تائیة: تخاطبه ایاك نعبد۔ علیٰ غیره فیها بغیر ضرورة - الیٰ ان قال وبالجملة فالتفکر فی الصلوٰة بغیر مایتعلق بها الحال ان کان دنیویاً فهو مکروه اشد الکراهة بل مفسد عند اهل الحقیقة

؎ قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: ولو قال الله یعلم انی افعل اولا افعل او بریٔ من الانبیاء والملٰئکة یکفر اذ علم انه کاذب۔
(فتاوی بزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۲۶ الثانی فیما یتعلق بالله)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۸۵ کتاب الفاظ الکفر۔

لقوات الرکن الاصلی المقصود بالذات ۔)

ہاں اگر بطور عقیدت واحترام تشہد کے ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور ذہن میں آجائے اور ذہن ان کی طرف منتقل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال الامام الغزالیؒ : واحضر فی قلبك النبی صلی اللہ علیہ وسلم وشخصہ الکریم وقل "سلام علیك ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ لیصدق املك فی انہ یبلغہ ویرد علیك ما ھو اوفی عنہ ۔ (احیاء علوم الدین ج ۱ ص۱۶۹ ما ینبغی ان یحضر فی القلب)

اسی طرح "صلوٰۃ وسلام" کہتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حاضر وناظر اور براہ راست درود سننے کا عقیدہ رکھا جائے بلکہ اس عقیدہ سے پڑھا جائے کہ اللہ تعالیٰ بذریعہ ملائکہ یا دیگر ذرائع سے میرا صلوٰۃ وسلام آپؐ تک پہنچاتے ہیں ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونے کے عقیدہ کی وضاحت

سوال :۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی : اللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا ۔ اور قرآن مجید میں بھی جا بجا آپؐ پر نور کا اطلاق ہوا ہے ، جب آپ نور تھے تو پھر نور کا سایہ بھی نہیں ہونا چاہیئے ؟ جبکہ آپؐ کا سایہ نہ ہونے کا بعض کتب میں تذکرہ بھی ملتا ہے ، تو کیا یہ ٹھیک ہے کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا؟ مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے ؟

الجواب :۔ اگر نقل صحیح سے ثابت ہو جائے کہ بطور معجزہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا تو کوئی مسلمان اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتا ہے ، لیکن اس باب میں کوئی صحیح نقل موجود نہیں ، حدیث کی کتب متداولہ صحاح ستہ میں اس مضمون کی کوئی حدیث وارد نہیں ہے ، البتہ علامہ شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے "خصائص کبریٰ" میں اس مضمون کی ایک حدیث مرسلاً روایت کی ہے :۔

عن ذکوان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یُرٰی لہ ظل فی شمس ولا قمر ولا اثر قضاء حاجۃ ۔ قال السیوطیؒ قال ابن سبع من خصائصہ ان ظلہ کان لا یقع علی الارض وانہ کان نورا فکان اذا مر فی الشمس او القمر لا ینظر لہ ۔

(خصائص الکبریٰ ج ۱ ص۶۸ باب الایۃ فی انہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یری لہ ظل)

لیکن یہ روایت چند وجوہات کی بناء پر ثابت ومعتبر نہیں ہے :۔

(۱) اس لیے کہ دھوپ اور چاندنی میں چلنے پھرتے اور اٹھنے بیٹھنے کے واقعات جو سفر و حضر، مجامع صحابہ کے سامنے تمام عمر نبوی میں پیش آتے ہیں اور یہ غیر محصور اور نہایت کثیر التعداد ہیں، پھر دیکھنے والے صحابہ ہزاروں میں ہیں، پھر صحابہ کرام کی عادت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور انور کی ذرا ذرا سی بات، نقل و حرکت اور آثار و حالات کے بیان کرنے کا انتہائی اہتمام فرماتے تھے۔ ان امور کا مقتضی یقینی طور پر یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ معجزنما ثابت ہوتا تو اس کی روایات صحابہ کرام کی ایک عظیم جماعت سے منقول ہوتی اور یقیناً حد تواتر کو پہنچتیں، لیکن جب ذخیرۂ حدیث پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس بارہ میں صرف ایک مرسل حدیث اور وہ بھی سنداً ضعیف ملتی ہے جو قرینہ قویہ اس امر کا ہے کہ یہ بات خلافِ واقع ہے۔

(۲) یہ حدیث مرسل ہے اور محدثین کی ایک عظیم جماعت مرسل حدیث کو حجت نہیں مانتی۔

(۳) یہ کہ اس حدیث کا پہلا راوی عبدالرحمٰن ابن قیس زعفرانی ضعیف و مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے

قال الشیخ العلامۃ الذہبی رحمہ اللہ: کذب بہ ابن مہدی وابوزرعۃ وقال البخاری ذہب حدیثہ وقال احمد لم یکن بشیء وصرح لہ الحاکم حدیثاً منکراً وصححہ۔ (میزان الاعتدال ج۲ ص۵۸۳ ومثلہ فی التقریب ص) وقال العلامۃ ابن حجر: کان ابن مھدی یکذبہ۔ وقال احمد حدیثہ ضعیف ولم یکن بشیء متروک الحدیث۔ وقال النسائی متروک الحدیث۔ وقال زکریا الساجی ضعیف کتبت عن حوثرۃ المنقری عنہ۔ وقال صالح بن محمد کان یضع الحدیث۔ وقال ابن عدی عامۃ ما یرویہ لا یتابعہ علیہ الثقات قلتُ۔ وقال الحاکم روی عن محمد بن عمرو وحماد بن سلمۃ احادیث منکرۃ منہا حدیث من کرامۃ المؤمن علی اللہ ان یغفر لمشیعیہ قال وھذا عندی موضوع ولیس الحمل فیہ الا علیہ۔ وقال الحاکم ابواحمد ذاھب الحدیث۔ وقال ابونعیم الاصبھانی لا شیء۔ (تہذیب التہذیب ج۶ ص۲۳۱ رقم ۱۳۰۱)

اور دوسرا راوی عبدالملک بن عبداللہ بن الولید بھی مجہول الحال ہے، کتب متداولہ میں اس کا حال مذکور نہیں۔

الحاصل:- اوّل تو ایک ایسے عامۃ الورود واقعہ میں تمام صحابہ کرامؓ کا سکوت اور صرف مرسل حدیث کا اس میں مذکور ہونا ہی علامت قویہ روایت کے غیر ثابت و غیر معتبر ہونے کی

ہے ۔ ثانیاً روایت مرسل ہے ۔ ثالثاً اس کا راوی بالکل کاذب اور واضع حدیث ہے ۔

اور بعض حضرات نے جو سایہ نہ ہونے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں نور فرمایا ہے، یا آپؐ اپنی دعاؤں میں اجعلنی نوراً فرمایا کرتے تھے، سو یہ استدلال بالکل ناقابلِ التفات ہے ۔ ظاہر ہے کہ آیت میں نیز "حدیثِ دعائیں نور ہونے سے یہ کسی کے نزدیک مراد نہیں کہ عالم عناصر کے کیفیات و آثار آپؐ میں نہ تھے یا آپؐ کی دعا و خواہش یہ تھی کہ عالمِ عناصر کے آثارِ مخصوصہ سے علیٰحدہ ہو کر (معاذ اللہ) ہوا کی طرح غیر مرئی ہو جائیں، بلکہ باتفاقِ عقلاء و علماء مراد یہ ہے کہ جس طرح نور ذریعۂ ہدایت و بصیرت ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذریعۂ ہدایت ہیں، اور چونکہ نبی کا انتہائی کمال اسی میں ہے کہ شانِ نبوت و ہدایت درجہ کمال میں ہو اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنی دعاؤں میں اس کا کمال طلب فرماتے تھے ۔ اور اسی معنیٰ کی بناء پر قرآن کو اور توریت کو بنصِ قرآن نور کہا گیا ہے، اسی معنیٰ میں صحابۂ کرامؓ کو بھی نجوم ہدایت فرمایا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ دعا (اللّٰھم اجعلنی نوراً) تو تمام امت کو تلقین فرمائی گئی ہے، اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت بھی نہیں ہے ۔

بعض حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونے کی یہ توجیہہ کی ہے کہ آپؐ جس طرف چلتے تھے سر مبارک پر فرشتے یا ابرِ رحمت سایہ فگن رہتا تھا ۔ یہ روایت اگر ثابت بھی ہو تو دوسرے صحیح و صریح روایات اس کے معارض موجود ہیں ۔ مثلاً صحیح بخاری کی حدیث میں دربارہ ہجرت بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے : ان ابا بکرٍ قام للناس وجلس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صامتاً فطفق من جاء من الانصار ممن لم یریٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یحیی ابا بکر حتی اصابت الشمس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاقبل ابو بکر حتی ظلّ علیہ بردائہ فعرف النّاس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عند ذٰلک، کذا فی المواھب، وقال الزرقانی فی شرح المواھب : وعن ابی عقبۃ عن الزھری فطفق من جاء من الانصار یحسبہ ایاہ حتی اصابتہ الشمس اقبل ابوبکر بشیئ یظلہ بہ ۔

(شرح المواھب للزرقانی ج ۱ ص ۲۵۰)

وبمثلہ یرویٰ تظلیلہ علیہ السلام فی حجۃ الوداع وھو مشھور و مذکورٌ فی عامۃ الکتب ۔)

اس لیے یا تو سایہ نہ ہونے کی حدیث کو بمقابلہ ان روایات کے غیر ثابت قرار دیا جائے

اور یا یہ کہا جائے کہ پہلے ایسا ہوگا بعد میں یہ صورت نہ رہی، علامہ ابن حجر قسطلانیؒ نے مواہب میں اسی صورت کو اختیار کیا ہے، چنانچہ حدیث ہجرت مذکور الصدر کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے[1]۔

کسی غوث یا قطب کو مافوق الاسباب متصرّف سمجھنا شرک ہے

سوال: کسی غوث یا قطب کو مافوق الاسباب متصرّف کہنا درست ہے یا نہیں؟ اور ان القاب کا استعمال ان کے لیے از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: احادیث میں نیک اور صالح لوگوں پر ابدال، اولیاء اور مجددینؒ کا اطلاق ثابت ہے۔

عن اُمّ سلمۃؓ عن النبیؐ قال یکون اختلاف عند موت خلیفۃ فیخرج رجل من اهل المدینۃ هاربًا الی مکۃ فیاتیه ناسٌ من اهل مکۃ فیخرجونه فیبایعونه بین الرکن والمقام ویبعث الیه البعث من الشام فیخسف بهم بالبیداء بین مکۃ والمدینۃ فاذا رای الناس ذلک اتاه ابدال الشام۔ (الحدیث)

(مشکوٰۃ ص۴۷۱ باب اشراط الساعۃ۔ الفصل الثانی)

جبکہ قطب اور غوث کا اطلاق احادیث رسول اللہ میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا ہے، تاہم علماء کرام اور صوفیاء عظام ان الفاظ کو بھی اولیاء اللہ کے لیے استعمال کرتے ہیں

قال العلامۃ مُلا علی القاریؒ: قلت فهم الاقطاب فی الاقطار یأخذون الفیض من قطب الاقطاب المسمّٰی بالغوث الاعظم فهم بمنزلۃ الوزراء تحت حکم الوزیر الاعظم الخ (مرقاۃ المصابیح ج۱۰ ص۱۲۸)[2]

---

[1] قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: سایہ نہ ہونے کی ایک بھی صریح روایت نہیں گذری، صرف بعض نے واجعلنی نورًا سے استدلال کیا ہے کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا کیونکہ سایہ ظلمت ہوتا ہے مگر ضعف اس کا ظاہر ہے ---- روایت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے سر پر بعض اوقات سفر میں کپڑے کا سایہ کئے ہوتے تھے۔ (امداد الفتاوی ج۵ ص۳۰۶ کتاب العقائد والکفر)

[2] قال الشیخ عبدالوهاب الشعرانیؒ: المبحث الخامس واربعون فی بیان ان اکبر اولیاء بعد الصحابۃ القطب ثم الافراد علی خلاف فی ذلک ثم الامامان ثم الاوتاد ثم الابدال۔
(الیواقیت الجواهر ج۲ ص۷۹)

ہاں اگر کوئی آدمی کسی غوث، قطب یا کسی دوسرے ولی اللہ کو مافوق الاسباب متصرف سمجھتا ہو یا یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالےٰ نے سارے عالم کا انتظام و انصرام ان کے حوالے کیا ہے اور جزوی امور کو خود ہی حل کرتے ہیں، از روئے شریعت جائز نہیں بلکہ اس کا معتقد مشرک قرار دیا جائے گا۔

کسی مخلوق کے بارے میں اللہ کے نور سے جدا ہونے کا عقیدہ رکھنا خلافِ اسلام ہے

سوال:۔ انبیاء کرام یا پنج تن پاک (حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ) کو اللہ تعالیٰ کے نور کا جزء ماننا اور اس سے جدا ہونے کا عقیدہ رکھنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انبیاء کرامؑ، پنجتن پاک یا کسی بھی دوسری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے نور سے جدا ہونا اور اس کا جزء ماننا باطل اور غلط عقیدہ ہے۔ باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہمارا عقیدہ بحیثیت مسلمان یہ ہے کہ آپؐ نور ہیں مگر اس معنیٰ سے کہ "کیفیۃٌ ظاھرۃٌ بنفسھا مظھرۃٌ لغیرھا"۔ انبیاء کرامؑ پر اس معنیٰ سے نور کا اطلاق صحیح ہے۔ اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کے نور سے علیٰحدہ ہوئے ہیں اور اسی عقیدہ کے پس منظر میں ان کی بشریت سے انکار کرنا قرآن و حدیث کی رو سے باطل ہے۔ اور آپؐ کی بشریت سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ ہی کے ذریعے یہ اعلان کروایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (سورۃ الکہف ع۱۱) البتہ اگر نور بمعنیٰ نورِ ہدایت ہو تو پھر اس کا اطلاق انبیاء کرام اور دیگر مقتدایانِ دین پر درست ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے متعلق شرکیہ اور بے بنیاد حکایات

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ معراج کے موقع پر جب جبریل امینؑ نے سدرۃ المنتہیٰ پر آپؐ کا ساتھ چھوڑ دیا تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کندھا دے کر آپؐ کو وہاں سے اوپر لے گئے؟ اور جنت کی سیر کرتے وقت جب آپؐ کا پاؤں کیلے کے چھلکے سے پھسلا تو سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے آپؐ کو گرنے سے بچا لیا، یاد رہے کہ یہ چھلکا ایک حور نے کیلا کھانے کے بعد پھینکا تھا۔ تو کیا یہ واقعات شریعت سے متصادم ہیں کہ نہیں؟ اور ان پر عقیدہ رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ آپؒ ایک عالم باعمل اور

متبع شریعت ولی اللہ تھے، آپؒ کی ولایت اور مقام و مرتبہ خود ان کی کتب سے معلوم ہوتا ہے اس قسم کی کہانیاں بے اصل اور من گھڑت ہیں، اور اس قسم کی کہانیوں کی صداقت پر اعتقاد رکھنے سے ایمان سلامت نہیں رہتا، تاہم اس قسم کی من گھڑت اور بے اصل کہانیوں کو ماننے والوں پر تو یہ لازم ہے اگر توبہ نہ کریں تو اعتقاد صریحاً کفر اور شرک ہے۔

جنت کی پیمائش دنیا میں ممکن نہیں

سوال:۔ کیا جنت کا طول و عرض معلوم کرنا دنیاوی پیمائشوں سے ممکن ہے؟

الجواب:۔ جنت کا طول و عرض دنیاوی پیمانوں سے کس طرح معلوم کیا جا سکے گا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (سورۃ آل عمران آیت ۱۳۳) اور اسی طرح متعدد احادیث میں بھی جنت کی وسعت کے متعلق مختلف قسم کے تشبیہات ذکر ہوئے ہیں۔

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائۃ درجۃ مابین کل درجتین کما بین السماء والارض والفردوس اعلاھا درجۃ منھا تفجر انھار الجنۃ الاربعۃ ومن فوقھا یکون العرش فاذا سألتم اللہ فاسئلوا الفردوس۔

(مشکوٰۃ ص ۴۹۶ باب صفۃ الجنۃ۔ الفصل الاول)[1]

تقویۃ الایمان کی بعض عبارات کی وضاحت

سوال:۔ "تقویۃ الایمان" مؤلفہ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مندرجہ ذیل عبارات از روئے شریعت درست ہیں یا نہیں؟

(۱) وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ اور یہ یقین جان لینا چاہیئے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ (تقویۃ الایمان ص ۱۲-۱۴ فصل دوم شرک فی العلم کی برائی کا بیان)

---

[1] قال الشیخ فخر الدین الرازی رحمہ اللہ: المقصود المبالغۃ فی وصف سعۃ الجنۃ وذٰلک لانہ لا شیء عندنا اعرض منھما ونظیرہ۔ قولہ تعالیٰ "خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" فان اطول الاشیاء بقاءً عندنا ھو السمٰوٰت والارض فخوطبنا علی وفق ما عرفناہ فکذا ھٰھنا۔ (تفسیر الکبیر ج ۳ ص ۴۲ آل عمران ۱۳۳)

(۲) قال اللہ تعالیٰ: اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ یعنی جیسے سور، لہو اور مردار ناپاک حرام ہے، ایسا ہی وہ جانور بھی ناپاک و حرام ہے جو کہ خود گناہ کی صورت بن رہا ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کا ٹھہرایا۔ (تقویۃ الایمان ص۳۳ کتاب العقائد)

(۳) حدیث مشکوٰۃ "باب عشرۃ النساء" اونٹ کے سجدہ کرنے کے تحت آپ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انبیاء و اولیاء، امام و امام زادہ، پیر و پیرزادہ و شہید یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر اُن کو اللہ نے بڑائی دی وہ بڑے بھائی ہوئے۔ (تقویۃ الایمان ص۵۰ کتاب العقائد)

ان عبارات کی شرعی حیثیت واضح کریں کہ ان عبارات کی رو سے حضرت شہید پر کفر کی نسبت درست ہے کہ نہیں؟ اگر درست نہ ہو تو پھر حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کو کافر کہنے والے کا از روئے شریعت کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ "تقویۃ الایمان" کی مذکورہ عبارات کا مطلب یہ ہے کہ:۔

(۱) اس عبارت سے مراد حق تعالیٰ کی نہایت بڑائی ظاہر کرنا ہے کہ اس کی سب مخلوقات اگرچہ کسی درجہ کی ہو اس سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی، مثلاً کمہار مٹی کا خوبصورت اور پسندیدہ لوٹا بنا کر اسے نہایت احتیاط سے رکھتا ہے مگر وہ اسے توڑنے کا بھی اختیار رکھتا ہے لیکن لوٹے کو کسی بھی درجہ میں مساوات کمہار سے نہیں ہوتی، پس حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک جو کہ خالق محض قدرت سے ہے اس کے ساتھ کسی مخلوق کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ چمار کو شہنشاہِ دُنیا سے اولادِ آدم ہونے میں مناسبت اور مساوات ہے اور شہنشاہ چمار کا نہ خالق ہے نہ رازق ہے، تو چمار کو تو شہنشاہ سے مساوات بعض وجوہ سے ہے مگر حق تعالیٰ کے ساتھ اس قدر بھی کسی کو مناسبت نہیں ہو سکتی۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ تمام مخلوق سے برتر و معزز اور افضل و اعلیٰ ہیں کہ کوئی ان کی مثل نہ ہوا ہے نہ ہو گا مگر حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے مقابلہ میں وہ بھی بندۂ مخلوق ہیں تو یہ سب حق ہے لیکن کچھ کم فہم اپنی کم فہمی سے اعتراضِ بیہودہ کر کے شانِ حق تعالیٰ کو گھٹاتے ہیں اور اس کا نام حُبِ رسول صلعم رکھتے ہیں۔ (فتاوی رشیدیہ ص۴۳ کتاب العقائد)

(۲) تقویۃ الایمان کی عبارت یعنی جیسے سُور، لہو اور مُردار..... الخ

یہ عبارت بالکل صحیح ہے کیونکہ مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے اصلی مطلب اور بچھڑے کو ملّونا شہید

نے نکالا ہے اور بہت بڑے مشرکانہ عقیدے اور طریقے سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا ہے کیونکہ حضرت شیخ الہند وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللہ (الآیۃ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: "ان جانوروں پر اللہ کے سوا بُت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت، جن یا کسی خبیث روح یا پیر یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان اُن کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو تو ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے گو بوقتِ ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا گیا ہو کیونکہ جان کو جان آفریں کے سوا کسی دوسرے کے لیے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں" اس لیے کہ جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی اور اس جانور کی جان تو غیر اللہ کے نامزد کر دی گئی جو کہ عین شرک ہے، سو جیسے خنزیر اور کتے کو تکبیر کہہ کر ذبح کرنے سے وہ حلال نہیں ہو سکتے اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہو سکتا، ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کر دی گئی ہو اُس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینا ہرگز کوئی نفع اور حلت اس میں نہیں آ سکتی، پس شاہ صاحبؒ نے کیسے اچھے الفاظ میں یہ حقیقت ظاہر کی۔

اسی طرح امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس کی یوں وضاحت فرمائی ہے:-

قال الرازیؒ قال العلماء لو ان مسلماً ذبح ذبیحۃً وقصد بذبحها التقرب الی غیر اللہ صار مرتداً و ذبیحتہ ذبیحۃ المرتد۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۲ سورۃ البقرۃ)

(۳) مشکوٰۃ شریف باب عشرۃ النساء میں اونٹ کے سجدہ کرنے کی حدیث یہ ہے:

وعن عائشۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی نفر من المهاجرین والانصار فجاء بعیر فسجد لہ فقال اصحابہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تسجد لك البهائم والشجر فنحن احق ان نسجد لك فقال اعبدوا ربکم واکرموا اخاکم ولو امرت احداً ان یسجد لاحدٍ لأمرت المرأۃ ان تسجد لزوجها ولو امرها ان تنقل من جبل اصفر الی جبل اسود ومن جبل اسود الی جبل ابیض کان ینبغی لها ان تفعلہ۔ رواہ احمد۔ (مشکوٰۃ ص ۲۸۲)

لما قال محمد الطیبیؒ: یعنی اکرموا من ھو بشرٌ مثلکم ومفرع من صلب ابیکم آدم۔ (شرح طیبی ج ص باب عشرۃ النساء وما لکل واحدٍ من الحقوق۔ الفصل الثالث)

اس سے معلوم ہوا کہ اخ کا اطلاق شریک فی الوصف پر جائز ہے۔ تو اگر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے "اکرموا اخاکم" سے استنباط کر کے یہ فرمایا کہ انبیاء و اولیاء وغیرہم اللہ کے مقرب بندے اور ہمارے بھائی ہیں، تو انہوں نے کچھ بُرا نہیں کیا کیونکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو ہمارے بھائی کہتے ہیں، تو جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظ بھائی کا اطلاق درست ہے تو دیگر انبیاء و اولیاء، ائمہ و پیر پر تو بطریق اولیٰ بھائی ہونے کا اطلاق درست ہے کیونکہ وصفِ بشریت میں تو تمام شریک ہیں، اس لیے سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ بالا عبارت بالکل صحیح ہے اور شرعاً اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔

صراطِ مستقیم کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:- "اور شیخ یا اس جیسے اور بزرگوں کی طرف خواہ رسالتمآبؐ ہی ہوں اپنی ہمت کو لگا دینا اپنے اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے بہتر ہے"۔ (صراطِ مستقیم ص۹۷)

اس عبارت کی وضاحت فرمائیں، نیز کیا یہ شریعتِ مطہر کے مطابق ہے یا نہیں؟

الجواب:- یہ مسئلہ تصورِ شیخ کے نام سے مشہور ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک ذاکر ذکرِ خداوندی میں لگ جاتا ہے اور مراقبہ کر لیتا ہے تو شیطان اس سالک کے دل میں وسوسے ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے ذاکر کا خیال و فکر دوسری طرف مائل ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ سالک دفعِ وساوسِ شیطانی کی غرض سے اپنے شیخ کا تصور کر لیتا ہے اور جب وسوسہ دور ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول ہو جاتا ہے، یہ تصور دفعِ وساوسِ شیطانی کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ محمد معصومؒ کے سلسلے میں ایک طریقہ تھا، اور اس قسم کے تصور کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے۔

اسی طرح دیگر اُن احادیث میں جو صحابۂ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی حالت بیان کرتے ہیں تو وقتِ بیان میں اس زمانے کا تصور کرتے ہیں۔

الحاصل:- یہ تصورِ شیخ کافی عرصہ تک سلسلۂ تصوف میں دفعِ وساوسِ شیطانی کے لیے جاری رہا لیکن بعد میں بعض جہال نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا کہ تصورِ شیخ کو ذریعۂ نجات بنا کر اس اسی پر بھروسہ کر کے ذکر و فکرِ الٰہی کو بالائے طاق رکھ دیا اور بس تصورِ شیخ ہی کو اصلی مقصد جان کر اس میں مستغرق ہو گئے، پس علماء دین نے اس طریقہ سے تصورِ شیخ کو منع فرمایا اور ایسا کرنے والے کو

مشرک قرار دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کی طرف لوگوں کے خیالات مبذول کر کے فرمایا: "شیخ یا اس اس جیسے اور بزرگ کی طرف خواہ جناب رسالتمآبؐ ہی ہوں اپنی ہمت کو لگا دینا یعنی اس کے خیالی تصور پر بھروسہ کر کے اسے کارساز و حاضر ناظر جان کر تقرب کے لیے کافی سمجھنا اپنے اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے برا ہے"۔ جیسا کہ گدھے اور بیل کی صورت میں مستغرق ہونے سے کچھ منفعت نہیں اسی طرح بزرگوں کے صرف تصور میں مستغرق ہو کر ذکر و فکر الٰہی کو چھوڑنا اس سے برا ہے اور کوئی نفع اس میں نہیں ہے، یہ تشبیہ عدم منفعت میں ہے۔[1]

ارواح کی دنیا میں واپسی کا عقیدہ غلط ہے

سوال:۔ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو ایک سال تک مسلسل اس کی روح ہر جمعہ کو گھر آتی رہتی ہے، شریعت میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ موت کے بعد روح کا گھر یا دنیا میں واپس آنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں اور نہ ہی عقل اس کی تائید کرتی ہے بلکہ موت کے بعد روح کا جنت یا دوزخ میں ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے، اس لیے ایسا عقیدہ رکھنا خلافِ شرع ہے، عوام الناس کو اس غلط عقیدے سے منع کرنا چاہیے۔

لما وردفی الحدیث: وعن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان ارواح الشھداء فی اجواف طیر خضر تعلق من ثمر الجنۃ او شجر الجنۃ۔ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن۔ (الترغیب والترھیب للمنذری ج ۲ ص۳۱۶۔ ما جاء فی فضل الشہید۔ کتاب الجہاد)

بعض صالحین کو بوقتِ وفات منجانب اللہ نجات کی خوشخبری ملنا

سوال:۔ احتساب کے لیے تو اللہ تعالٰی نے قیامت کے دن کو مقرر فرمایا ہے لیکن بعض اولیاء اللہ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے خواب میں اپنے حساب و کتاب میں کامیابی کی خوشخبری سنی ہے کہ میرے اعمال اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوئے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ قیامت سے پہلے کسی کو اپنے حساب و کتاب سے آگاہی ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اللہ تعالٰی نے قیامت کے دن کو "یوم الحساب" فرمایا ہے لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ

---

[1] شاہ صاحبؒ کی بات نماز کی حالت میں بجز اللہ کے تصور کے ساتھ متعلق ہے۔ اسلئے کہ نماز اللہ تعالٰی کیلئے پڑھی جاتی ہے۔ اگر آدمی کسی اور کی تعظیم کی طرف اپنی ہمت لگا دے تو یہ عبادت کے اندر شرک ہوگا۔ کما قال اور غیر کی تعظیم اور بزرگی جو نماز میں ملحوظ ہو وہ شرک کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ الخ (صراط مستقیم ص۱۶۹، ۱۷۰ ۔ ...)

مؤمن صالح کو مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ فرشتگان یہ بشارت دی جاتی ہے کہ آپ کی نجات ہوگئی اور آپ کے اعمال قبول ہوئے۔

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ (سورۃ فصلت آیت ۳۰)

برزخ میں بھی بشارت کا ثبوت حضرت براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ہوتا ہے۔

قال - فینادی منادٍ ان قد صدق عبدی فافرشوہ من الجنۃ والبسوہ من الجنۃ وافتحوا بابًا لہٗ الی الجنۃ۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵ باب اثبات عذاب القبر - الفصل الثانی)[له]

جب یہ معلوم ہوا کہ مومن صالح کو مرتے وقت اور عالم برزخ میں جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو مؤمن صالح کا بذریعہ خواب کسی کو اپنے حساب و کتاب کی اطلاع دینا بھی یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ مجھے جنت میں جانے کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ حکومت کا کوئی وفادار ملازم کسی بڑے عہدے کا امیدوار ہو اور حکومت اس کو اطلاع دے دے کہ فلاں تاریخ سے فلاں عہدے پر تمہاری ترقی ہوگی اور وہ شخص خوشی کے مارے اپنے عزیز و اقارب سے کہہ دے کہ فلاں عہدے پر میری ترقی ہوگئی ہے۔

شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور آپ کی تصنیف تقویۃ الایمان کا تذکرہ

سوال:- کیا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ واقعی ایک عالمِ باعمل اور ولی اللہ تھے؟ نیز ان کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کیسی کتاب ہے؟ بعض لوگ آپ کو کافر کہتے ہیں، آیا درست ہے یا غلط؟

الجواب:- حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا ایک عالمِ باعمل، ولی کامل اور مجاہد فی سبیل اللہ ہونا ناقابلِ انکار ہے، اہل اسلام آج تک آپ کے کردار کو سراہتے ہیں، آپ ہی کی تعلیمِ جہاد نے مسلمانانِ ہند میں جذبۂ جہاد پیدا کیا جو آزادئ ہند پر منتج ہوا۔ اور آپ کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا

له عن البراء بن عازب قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ رجل من الانصار ... فینادی منادٍ من السماء ان صدق عبدی فافرشوہ من الجنۃ والبسوہ من الجنۃ وافتحوا لہ بابًا الی الجنۃ - (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۹۸ کتاب السنۃ - باب فی المسألۃ فی القبر وعذاب القبر)

فتوٰی یہ ہے کہ "اسماعیل شہیدؒ کی تالیف "تقویۃ الایمان" نہایت عمدہ اور سچی کتاب ہے اور موجب قوت و اصلاح ایمان کی ہے اور قرآن و حدیث کا پورا مطلب اس میں ہے، اس کا مؤلف شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک مقبول بندہ تھا اُن کو جو کافر جانتا ہے وہ خود شیطان ملعون حق تعالیٰ کا ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ، کتاب الایمان و الکفر)

دنیا میں جنت جیسی زمین تیار کرنا ناممکن ہے

سوال:۔ کیا جنت جیسی زمین دُنیا میں تیار کرنا کسی انسان کے لیے ممکن ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جنت کی ایک بالشت زمین جیسی دنیا میں تیار کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں، کیونکہ جنت کی زمین کے اوصاف، لوازمات دنیا کی زمین سے بالکل مختلف ہیں مثلاً یہاں کی زمین کی حقیقت مٹی ہے اور جنت کی زمین کی حقیقت مُشک و زعفران ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبنۃ من فضۃ ولبنۃ من ذھب وملاطھا المسك الاذفر وحصباء ھا اللؤلؤ والیاقوت وتربتھا الزعفران۔ (ترمذی ج۲ ص۹۵ باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ ونعیمہا)

اسی طرح وہاں بھوک، پیاس اور برہنگی نہیں ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: اَنَّ لَا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی۔ (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۸)

اور یہی اوصاف زمین دنیا میں پیدا نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ اسی بناء پر جنت جیسی معمولی زمین دنیا میں تیار کرنا کسی کے بس کا کام نہیں ہے، لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا سراسر اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔[1]

ماہِ صفر میں نزولِ بلیات و آفات کا عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے

سوال:۔ ماہِ صفر کو منحوس اور نزولِ بلیات و آفات کا مہینہ کہنا کیسا ہے؟ یہ عقیدہ رکھنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماہِ صفر کے متعلق لوگ مختلف قسم کے نظریات و خیالات رکھتے ہیں، جو سارے کے سارے لغو اور بے بنیاد ہیں، اور اس کو آفات و بلیات کا مہینہ کہنا محض توہم پرستی

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن ابی ھریرۃؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا وما فیھا۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ ص۴۹۶ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

ہے، شریعتِ مطہرہ میں اس قسم کی توہم پرستی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے ۔
لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا عدوٰی ولا ھامۃ ولا ولا صفر۔ (مشکوٰۃ ص۳۹۱ باب الفال والطیرۃ۔ الفصل الاول)
قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: قال القاضی ویحتمل ان یکون نفیا لما یتوھم ان شہر صفر تکثر فیہ الدواھی والفتن۔ (مرقاۃ المصابیح ج۹ ص۲ الفصل الاول)

قیمتوں میں کمی یا زیادتی منجانب اللہ ہوتی ہے

سوال:۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں ارزانی اور گرانی منجانب اللہ ہوتی ہے، اور یہ عقیدہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں کمی اور زیادتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے کیونکہ بسا اوقات لوگوں کی مرضی کے خلاف اس میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔
لما ورد فی الحدیث: عن انس بن مالکؓ قال غلا السعر علیٰ عہد رسول اللہ فقالوا یا رسول اللہ قد غلا السعر فسعر لنا فقال ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق انی لأرجو ان القی ربی ولیس احدٌ یطلبنی بمظلمۃ فی دم ولا مال۔ (ابن ماجۃ ص۱۵۹)
ہاں اگر لوگ قیمتوں میں بے اعتدالیاں کرنا شروع کر دیں تو حکام اہل الرائے کے مشورہ سے کسی چیز کی قیمت متعین کرنے کے مجاز ہیں ۔
لما صرح ابن عابدینؒ: الا اذا تعدّی الارباب عن القیمۃ تعدیًا فاحشًا فیسعر بمشورۃ اھل الرأی ۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۵ ص۲۸۳ کتاب الحظر والاباحۃ)[1]

نماز باجماعت کا تارک منافق ہے

سوال:۔ جو شخص اپنے رُتبہ اور متموّل ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کو حاضر نہیں ہوتا اور عام لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں عار محسوس کرتا ہوا اور کہتا ہو کہ اس سے میرا مقام و مرتبہ گھٹتا ہے

---

[1] قال الشیخ سعد الدین التفتازانیؒ: السعر تقدیر ما یباع بہ الشئ ویکون غلاءً ورخصًا باسباب من اللہ تعالیٰ ولو کان البعض فی اکتساب العباد فالمسعر ھو اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔
(المقاصد فی علم الکلام علیٰ ھامش شرح المقاصد ج۲ ص۱۶۲)
ومثلہٗ فی مجموعۃ الفتاویٰ (اردو) ج۲ ص۲۸۴ کتاب الحظر والاباحۃ۔

ازروئے شریعت اس شخص کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ یہ شخص اگر نماز باجماعت میں اس لیے حاضر نہیں ہوتا کہ اس کے نزدیک نماز باجماعت دلائلِ شرعیہ سے ثابت نہیں تو اس عقیدہ کے مطابق دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

قال فی الھندیۃ : رجل ترک سُنن الصّلوٰۃ ان الصّلوٰۃ ان لم یرالسنن حقاً فقد کفرلانہ ترکھا استخفافاً وان رآھا حقاً فالصحیح انہٗ یأثم لانہٗ جاء الاستحسانا کذا فی المحیط۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۱۱۲ الباب التاسع فی النوافل)

اور اگر وہ نماز باجماعت کے وجوب کا تو معتقد ہو لیکن دوسری وجوہات سے بغیر شرعی عذر کے حاضر نہ ہوتا ہو تو حدیث کی رُو سے عملی منافق ہے، لہٰذا اس کو توبہ کرنی چاہیئے۔

لما فی الحدیث : وعن معاذ ابن انس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ قال الجفاء کل الجفاء والکفر والنفاق من سمع منادی اللہ الی الصّلوٰۃ فلا یجیبہٗ۔ رواہ احمد والطبرانی۔ (الترغیب والترھیب للمنذری ج ۱ ص ۲۷۲)[1]

بے وضو نماز پڑھنے والے کا حکم

سوال :۔ بے وضو نماز پڑھنے اور دوسروں کو نماز کی امامت کرانے والے شخص کا ازروئے شریعت کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ غفلت اور بلا قصدِ استخفاف بغیر وضو کے نماز پڑھنا موجبِ فسق ضرور ہے مگر موجبِ کفر نہیں، البتہ اگر اس فعل کو حلال سمجھتے ہوئے یا عمداً بقصدِ استہزاً ایسے کرنے والا شخص کافر ہو کر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

قال العلامۃ ملا علی القاری رحمہ اللہ : من صلّی الیٰ غیر القبلۃ مُتعمّداً ھو کافر کالمستخف وکذا اذا صلّی بغیر طہارۃٍ۔

(شرح الفقہ الاکبر ص ۱۷۲، ۱۷۳ فصل فی القراءۃ والصلوٰۃ)

---

[1] قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ : وسننھا ترک السنۃ لایوجب فساداً ولا سہواً بل اساءۃ لوعامداً غیرمستخف۔ قال العلامۃ ابن عابدینؒ .... ولو مستخفا کفر لما فی النھر عن البزازیۃ لولم یرالسنۃ حقاً کفر لأنہ استخفاف۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۷۴ مطلب سنن الصلوٰۃ)

کوئی شخص عمل کی وجہ سے صحابہؓ سے سبقت نہیں لے جاسکتا

سوال:۔ ایک شخص کا عقیدہ ہے کہ اگر موجودہ امت میں کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جس کا کردار واخلاق صحابہ کرامؓ جیسا ہو تو وہ فضیلت میں صحابہؓ سے افضل ہوگا، اس پر دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ صحابہ چونکہ حضورؐ کی صحبت میں رہے، حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، وحی ان کے سامنے نازل ہوئی، لہٰذا اُن کا آپؐ پر ایمان لانا ضروری تھا، اور ہم نے چونکہ حضورؐ کو نہیں دیکھا اور نہ نزول وحی کو دیکھا پھر بھی آپؐ پر ایمان لے آئے ہیں، بناء برایں اگر کوئی شخص صحیح مسلمانی اختیار کرے تو درجہ میں صحابہ کرام سے بڑھ سکتا ہے، اس کی وضاحت فرماویں؟

الجواب: ۔صحابہ کرامؓ کی شان ومرتبہ بوجہ صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کوئی غیرصحابی، بڑے سے بڑا ولی اللہ جس کو آپؐ کی بابرکت صحبت میسر نہ ہوئی ہو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا ہے، تمام اہل حق کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاء کرام کے بعد صحابہؓ تمام انسانوں سے افضل اور بہتر ہیں۔ مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ نے "ارشاد الطالبین" میں تحریر فرمایا ہے کہ "عبداللہ بن مبارک تابعین است میگوید الغبار الّذی دخل انف فرس معاویۃؓ خیرمن اویس قرنیؒ وعمر بن عبد العزیز المروانیؒ" لہٰذا سب مسلمانوں کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ امت کے تمام اولیاء اللہ سے افضل اور بہتر ہیں، کسی بھی عمل کی بناء پر ان سے درجے میں بڑھ نہیں سکتے۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکرموا اصحابی فانھم خیارکم۔ (مشکوٰۃ ص۵۵۴ باب مناقب الصحابۃ) [1]

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاری رحمہ اللہ: ومنھا تفضیل سائر الصحابۃ بعد الاربعۃ رضی اللہ عنھم۔ فقال ابومنصور البغدادیؒ من اکابر الشافعیۃ اجمع اھل السنۃ والجماعۃ علی ان افضل الصحابۃ ابوبکر، فعمر، فعثمان، فعلیؓ فبقیۃ العشرۃ المبشرۃ بالجنۃ فاھل بدرٍ فباقی اھل الاُحد فباقی اھل بیعۃ الرضوان بالحدیبیۃ فباقی الصحابۃ رضی اللہ عنھم۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۱۹ تفضیل سائر الصحابۃ بعد الاربعۃ) وَمِثْلُہٗ فی العقیدۃ الطحاویۃ ص۵۳۱ فضیلت الصحابۃ۔

"یہ چیز مجھ سے خدا بھی نہیں لے سکتا" کہنا موجب کفر ہے

سوال:۔ دو آدمیوں کا کسی چیز کے متعلق آپس میں تنازع تھا، ان میں سے ایک نے بصورتِ جرگہ چند آدمی لے کر حق کا مطالبہ کیا، اس پر دوسرے نے کہا کہ یہ چیز مجھ سے کوئی بھی نہیں لے سکتا حتیٰ کہ خدا بھی نہیں لے سکتا، نیز اُس نے یہ بھی کہا کہ نہ تو میں جرگہ کو مانتا ہوں اور نہ خدکو، اس قسم کے کلمات کہنے والے شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے، کوئی چیز اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں وہ واجب الوجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ یا وجود کی نفی ہوتی ہو فقہاء کے نزدیک موجب کفر ہے صورتِ مسئولہ میں بظاہر اس شخص کے یہ کلمات موجبِ کفر معلوم ہوتے ہیں لہٰذا توبہ و استغفار کرکے تجدیدِ نکاح کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: اذا وصف اللہ تعالیٰ بما لا یلیق بہ سخر باسم من اسماءہ او بامر من اوامرہ او انکر وعدہ او وعیدہ یکفرہ۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۶۱) وقال ایضاً: رجل قال لآخر از خدا بترس فقال خدا کجا است یکفرہ۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۷۳ احکام المرتدین)[1]

ختنہ کو موجبِ امراض سمجھنا کفر کا باعث ہے

سوال:۔ ایک شخص شرعی ختنہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ڈاکٹری اصولوں کے مطابق نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ پیشاب کے لگنے سے جراثیم پیدا ہو کر بیماری

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو ان رجلاً طالب رجلاً بحق وقال بالفارسیۃ اگر وے خدائے جہاں است از وے بستانم۔ قال الشیخ ابو القاسم یصیر مرتدًا لانہ ادعیٰ انہ یغلب اللہ تعالیٰ۔ وقال بعضھم لا یکون کفرًا لان المراد من ھٰذا الکلام فی العرف التھویل دون التحقیق۔ (الفتاوی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۷۵ باب ما یکون اسلامًا من الکافر وما لا یکون)
وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۲۳ الثانی فیما یتعلق باللہ۔

پھیلتی ہے اور مسلمان ختنہ کرنے کی وجہ سے بیمار ہوتے ہیں، ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اگر تو اس سے متکلم کا مقصد توہین اور استخفاف ختنہ شرعیہ ہے جو اکثر فقہاءؒ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اور اسلام اور اہلِ اسلام کی ایک شناخت ہے تو اس پر کفر کا شدید خطرہ ہے، اس لیے کہ فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ جب کسی عمل کا سنتِ نبوی ہونا ثابت ہو جائے کہ یہ کام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے یا کرنے کو فرمایا ہے تو اس کا استخفاف اور توہین کرنا موجبِ کفر ہے، تاہم اگر یہ قول طبی نقطہ نظر سے کہا گیا ہو تو اگرچہ خلافِ واقعہ ہے مگر موجبِ کفر نہیں لیکن ایسے کلمات سے اجتناب کرنا ضروری ہے ۔

لما قال فی الهندیة : ولو قال این چه رسم است سلت بست کردن ودستنار بزیر کلوآوردن ۔ (ترجمہ) ماهذه العادة تقصیر الشارب وارخاء الطیسان تحت الرقبة فان قال ذٰلک علیٰ سبیل الطعن فی سنة رسول الله فقد کفر کذا فی المحیط ۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۲۶۵ الباب التاسع فی احکام المرتدین)[1]

تکفیرِ مسلم میں احتیاط ضروری ہے

سوال:۔ بقائمی ہوش وحواس اللہ تعالیٰ کی شان میں یوں کہنا کہ "اللہ تعالیٰ بھی غریبوں کی ـــــــ" تو ایسے کلمات کہنے والے کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ مذکورہ الفاظ انتہائی خطرناک ہیں جن سے ایمان زائل ہونے کا اندیشہ ہے تاہم بعید احتمالات کے امکان کی وجہ سے اس پر بصورتِ یقین کفر کا فتویٰ نہیں دیا سکتا ہے اس لیے کہ تکفیرِ مسلم میں احتیاط نہایت ضروری ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمه الله : اذا کان فی المسئلة وجوهٌ توجب الکفر وواحدٌ یمنعه فعلی المفتی المیل لما یمنعه ثمّ لو نیّتهٗ ذٰلک فمسلم

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ : والحاصل انهٗ اذا استخف بِسُنَّةٍ اوحدیث من احادیث النبی صلی الله علیه وسلم کفر۔ (الفتاویٰ البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۲۸ کتاب الفاظ تکون اسلاماً اوکفراً اوخطاءً۔ الفصل الثالث فی الانبیاء)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الفقه الاکبر ص۱۰۲ بحث فی ان الکبیرة لاتخرج المؤمن عن الایمان ۔

والا لم ينفعه حمل المفتى على خلافه. (الدر المختار على هامش رد المختار ج ۳ ص ۳۱۶ باب المرتد)[1]

فقہ حنفی کو معتزلہ کی تصنیف کہنے والے پر توبہ لازم ہے

سوال:- ایک بار زید نے "علمِ فقہ" کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ "علمِ فقہ دریائے دجلہ میں غرقاب ہو گیا ہے اور موجودہ فقہ حنفی معتزلہ کی لکھی ہوئی ہے۔" زید پر از روئے شریعت عقیدہ مذکورہ کی بناء پر کیا حکم لگایا جاسکتا ہے؟

الجواب:- زید کے مذکورہ جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک غالی قسم کا غیر مقلد ہے اور اس کی یہ بات غلط اور سراسر جہالت پر مبنی ہے، کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ ھدایہ، فتح القدیر، بحر الرائق، قاضی خان، بزازیہ اور مبسوط کیا یہ سب معتزلہ کی تصنیف کردہ کتابیں ہیں؟ زید کو اگر اتنا علم نہیں کہ موجودہ فقہ کی اصلیت معلوم کر سکے تو آخر یہ ذمہ داری اُس پر کہاں سے عائد ہو گئی ہے کہ تمام فقہاء اسلام کی تصانیفِ فقہ کو یک جنبش زبان سے معتزلہ کی تصانیف قرار دیدے، زید کو اس عقیدہ سے توبہ کرنا ضروری ہے ورنہ خدانخواستہ اسکی یہ بیباکی اس کے خسران کا باعث نہ بن جائے۔

حدیثِ نبوی کے منکر کا ایمان سلامت نہیں رہ سکتا

سوال:- اگر کوئی شخص صحیح حدیث کے ماننے سے انکار کرے اور یوں کہے کہ میں فلاں فلاں حدیث کو نہیں مانتا، تو از روئے شریعت اس پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ وضاحت مطلوب ہے؟

الجواب:- واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث دراصل وحیِ الٰہی ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ہ (سورۃ النجم ع ۴) اس لیے حدیثِ نبوی سے انکار موجبِ ضلالت ہے، اگر عقیدتاً حقارت کی بنیاد پر احادیث کو ٹھکرا دیا جائے تو اس فعل کی وجہ سے معتقد کافر ہو جاتا ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الكردري: اذا كان فى المسئلة وجوه توجب الكفر ووجه واحد يمنعه يميل العالم الى ما يمنع الكفر ولا يرجح الوجوه على الوجه.... الخ (فتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۲۱ الثانى فيما يكون كفرا من المسلم الخ) ومثله فى مرقاة المصابيح ج ۵ ص ۱۸ الفصل الاول۔

لما فی الهندیة : من انکر المتواتر فقد کفر ومن انکر المشهور یکفر عند البعض وقال عیسٰی بن ابانؒ: یُضلل ولا یکفر وهو الصحیح۔ ومن انکر خبر الواحد غیر انه یأثم بترك القبول هٰکذا فی الظهیریة ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۲۶۵ الباب التاسع احکام المرتدین)[1]

توسّل بالصالحین جائز ہے

سوال :۔کسی نبی یا ولی کے توسل سے دُعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب :۔ اہلِ سنت و الجماعت کے نزدیک مسئلہ توسّل خواہ بالاحیاء ہو یا بالاموات اسی طرح ذوات سے ہو یا اعمال سے، بہرحال جائز ہے بلکہ ارجیٰ للقبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لیے کہ اس کی حقیقت اور مرجع توسّل برحمۃ اللہ تعالیٰ ہے، بایں طور کہ فلاں مقبول بندہ پر جو تیری خصوصی رحمت ہے اس کے توسط اور وساطت سے دُعا کرتا ہوں، یا اعمالِ صالحہ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے تو یہ جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، اس کی مشروعیّت قرآنی آیات، احادیثِ نبوی اور سلف صالحین کے اقوال وافعال سے ثابت ہے۔ حضرتِ زکریا علیہ السلام کا حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے توسل سے دُعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا قرآنِ پاک میں مذکور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضعفاء مہاجرین کے وسیلہ سے فتحیابی کی دُعا کیا کرتے تھے، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قحط سالی میں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے توسل سے بارانِ رحمت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا صحیح احادیث و آثار سے ثابت ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کے توسل سے مانگی ہوئی دعا کا اللہ تعالیٰ پر قبول کرنے کو واجب قرار دینا زیادت علی الشرع کے مترادف ہے اس لیے اس قسم کے اعتقاد سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ : یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ۔ (المائدۃ ع ۳۵)

قال محی الدین الخطیبؒ ، عن اُمیّة بن خالد بن عبد اللہ بن اُسید رضی اللہ عنه

---

[1] قال العلامة ملا علی القاری رحمه اللہ :۔ وفی المحیط من قال لفقیه یذکر شیئاً من العلم او یُروٰی حدیثاً صحیحاً ای ثابتاً لا موضوعاً هٰذا لیس بشیء ..... کفر۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۷۵ الفصل فی العلم والعلماء)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۲ ص۴۳ احکام المرتد ۔

عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یستفتح بصعالیك المھاجرین۔ رواہ فی شرح السنۃ۔ (مشکوٰۃ ص۴۴۷ باب فضل الفقراء۔ فصل الثانی)[۱]

معتوہ کے ارتداد کا حکم

سوال:۔ میرا ایک دوست گوناں گوں مسائل کی وجہ سے پاگل ہو چکا ہے۔ اسی حالت میں کبھی کبھار اس کے منہ سے کفریہ کلمات بھی نکل جاتے ہیں، ایک بار انتہائی مفلوک الحالی کے عالم میں اُس نے کہا کہ ''مجھے ایسے خدا سے نفرت ہے جس نے مجھے اس مصیبت اور تکلیف میں ڈالا ہے'' چند دنوں بعد پھر اسی حالت میں اس نے کہا'' میں خدا کی اس مہربانی پر پیشاب کرتا ہوں جو وہ میرے ساتھ کر رہا ہے''۔ شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کلمات کی وجہ سے وہ مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس شخص کی حالت کے پیشِ نظر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص معتوہ ہے جس کی بعض باتیں دیوانوں (مجانین) کی سی ہیں اور بعض باتیں صحیح العقل آدمی کی باتوں سے مشابہ ہیں، ایسے شخص کو فقہاء اور علمِ اصول کی اصطلاح میں معتوہ کہا جاتا ہے اور معتوہ شخص صبی عاقل کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے

قال العلامۃ الحسامیؒ: واما العتۃ وھو اختلال العقل بحیث یختلط کلامہ فیشبہ کلام العقلاء مرۃ وکلام المجانین مرۃ أخرٰی قال الاخسیکثی واما العتۃ بعد البلوغ فمثل الصباء مع العقل یمنع العھدۃ۔ (الحسامی ص۱۶۷ القیاس مجتبائی)

اب ارتداد کے بارے میں جو حکم صبی عاقل کا ہے وہ اس کا بھی ہوگا، اور صبی عاقل کا ارتداد امام ابو یوسفؒ کے نزدیک معتبر نہیں اور نہ ہی اس پر ارتداد کے احکام جاری ہو سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس کا ارتداد معتبر ہے اور اس پر ارتداد کے

---

[۱] لما ورد فی الحدیث: وعن انس رضی اللہ عنہ ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کان اذا قحطوا استسقٰی بالعباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیك بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فتسقینا وانا نتوسل الیك بعم نبینا فاسقنا فیسقوا۔
(مشکوٰۃ ص۱۳۲ باب الاستسقاء۔ الفصل الثالث)

وَمِثْلُہٗ فی فتح الباری شرح البخاری ج۲ ص۳۹۹ فی باب تحویل الرداء فی الاستسقاء۔

احکام جاری ہوں گے۔

قال العلامۃ البابرتیؒ: وارتداد الصبی الذی یعقل ارتداد عند ابی حنیفۃ و محمد رحمہما اللّٰہ یعنی یجری علیہ احکامہ فیبطل نکاحہ ویحرم عن المیراث وقال ابویوسفؒ ارتداد ہ لیس بارتداد۔ الخ (العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج۵ ص۳۲۸ احکام المرتدین)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واذا ارتد العاقل صح خلافاً للثانی۔ (ردالمحتار جلد۳ ص۳۳۵)

لیکن فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے امام ابویوسفؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے۔ قال ابن عابدینؒ: وفی التتارخانیۃ عن الملتقیٰ ان الامام رجع الیہ۔

(ردالمحتار ج۳ ص۳۳۵ باب المرتدین)

اب صبی عاقل کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ قرار پائے گا کہ اس کا ارتداد معتبر نہیں ہے۔ اور جب یہ بات پہلے واضح ہوچکی ہے کہ معتوہ صبی عاقل کے حکم میں ہے، تو جس طرح صبی عاقل کا ارتداد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک بنا بر قول مرجوع الیہ معتبر نہیں تو معتوہ کا ارتداد بھی آپؒ کے نزدیک معتبر نہ ہوگا[1]

لہٰذا اگر مذکورہ شخص واقعی معتوہ ہو تو مذکورہ کفریہ کلمات کی وجہ سے وہ مرتد نہیں گردانا جائے گا، البتہ چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف ضرور ہے تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے اسلام کی تجدید کرے اور دوبارہ گواہوں کی موجودگی میں بغیر کسی حلالہ کے نکاح پڑھوائے۔

فاسق وفاجر کی تعریف

سوال:۔ فاسق وفاجر کا کیا معنیٰ ہے اور اس کی کیا تعریف ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ کی اصطلاح میں فاسق اُس شخص کو کہتے ہیں جو ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں ملوّث رہے اور شریعت کے بعض یا تمام احکامات کو پسِ پشت ڈال کر عملی بے راہروی اختیار کرے اور اپنے گناہوں سے غفلت

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فی المغرب المعتوہ الناقص العقل وقیل المدھوش من غیر جنون۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۱۳ کتاب الطلاق)

وقال العلامۃ قاضی خانؒ: واما ردۃ المعتوہ والمجنون لم تذکر فی الکتب المعروفۃ قال مشائخنا رحمہم اللّٰہ تعالیٰ ھو فی حکم الردۃ بمنزلۃ الصبی۔

(الفتاوی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۷۷ باب مایکون کفراً من المسلم)

برتتے رہے۔

لما قال ابوالقاسم الراغب الاصفہانیؒ :۔ تحت لفظ "فسق": فسق فلان خرج عن حجر الشرع وذلك من قولهم فسق الرطب اذا خرج من قشره وهو اعم من الكفر والفسق يقع بالقليل من الذنوب وبالكثير لكن تعورف فيما كان كثيرًا واكثر ما يقال لمن التزم حكم الشرع واقرّ به ثم اَخلّ بجميع احكامه او ببعضه۔ (مفردات القرآن للراغب ص۳۹۴)

اور فاجر وہ ہے جو خلافِ شرع کاموں میں مبتلا ہو کر توبہ کا ارادہ کرتے ہوئے بھی توبہ نہ کرے۔

قال ابوالقاسم الراغب الاصفہانیؒ: قيل معناه يذنب ويقول غدًا اتوب ثم لا يفعل فيكون ذلك فجورًا لبذله عهدًا لا يفي به۔ (مفردات القرآن للراغب ص۳۷۳) [1]

فسق وفجور موجبِ کفر نہیں

سوال:۔ کیا فسق وفجور کی وجہ سے ایک مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نفسِ فسق وفجور کی وجہ سے کوئی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ ان کے استحلال کا عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ اور نہ اس پر مُصر ہو۔

لما قال ابوحنیفةؒ: لَا نُكَفِّرُ مسلمًا بذنبٍ من الذنوب وان كانت كبيرةً اذا لم يستحلها

(شرح الفقه اکبر ص۱۰۷ الكبيرة لاتخرج المؤمن عن الايمان)

قتلِ عمد سے توبہ مقبول ہے

سوال:۔ قتلِ عمد سے اگر قاتل توبہ کرنا چاہے تو کیا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟

الجواب:۔ قاتل اگر خلوصِ دل سے توبہ کرے تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائینگے۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ (سورۃ النساء آیت ۴۸)

قرآن وسنت کی روشنی میں اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی عقیدہ ہے کہ گناہِ کبیرہ سے جب سچے دل سے توبہ کرلی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے، البتہ ورثاء سے خون معاف

[1] قال العلامۃ محمود الآلوسیؒ: الفاسقين جمع فاسق من الفسق وهو شرعًا خروج العقلاء عن الطاعة فيشمل الكفر ودونه من الكبيرة والصغيرة واختص في العرف والاستعمال بارتكاب الكبيرة۔

(روح المعانی ج۱ ص۲۱۰ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶)

کروانا یا ان کو قصاص ادا کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة ملا علی القاریؒ: وفی عمدة النسفیؒ ومن تاب عن كبيرة صحة توبة مع الاصرار على كبيرة اخرى ولا يعاقب بها على الكبيرة التي تاب۔
(شرح الفقه الاكبر ص۱۵۶ مطلب يجب معرفة المكفرات)

قال العلامة فخر الدین الرازیؒ: دلت الاية على ان التوبة من كل ذنب مقبولة وقول من قال التوبة غير مقبولة خطاء لان الشرك اشد من القتل فاذا قبل الله توبة الكافر مقبولة توبة القاتل۔ (تفسیر کبیر ج۵ ص۱۳۲ سورة البقرہ۔ المسألة الثالثة)[1]

کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا گویا تمام لوگوں کو قتل کرنا ہے

سوال:۔ کسی مسلمان کو بلا وجہ قتل کرنے سے آدمی کافر ہوجاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنا ایک عظیم گناہ اور بدترین جرم ہے، قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (سورة المائدہ آیت ۳۲) (ترجمہ) "کہ جس نے کسی شخص کو ناحق بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔" لیکن بایں ہمہ تمام اہل السنة والجماعة کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی کو حلال جان کر قتل نہ کیا گیا ہو تو قاتل کافر نہیں ہوتا ہے البتہ بہت بڑا گنہگار اور مجرم ضرور ٹھہرے گا اور اگر مسلمان کے قتل کو حلال سمجھ کر کیا گیا ہو تو یقیناً اس سے قاتل کافر ہوجاتا ہے کیونکہ

---

[1] قال العلامة التفتازانی رحؒ فی المبحث الثانی عشر اتفقت الامة ونطق الكتاب والسنة بان الله تعالیٰ عفوٌّ غفورٌ يعفو عن الصغائر مطلقاً وعن الكبائر بعد التوبة۔ (شرح المقاصد ج۲ ص۲۳۵)

قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: اتفق الائمة كما فی رحمة الامة على ان لا يخلد فی النار وتصح توبته من القتل۔

(اعلاء السنن ج۱۸ ص۴۳ کتاب الجنایات، باب وجوب القصاص الخ)

ومثلهٗ فی مرقاة المصابيح ج ۷ ص۶۱ کتاب القصاص، الفصل الثانی)

حرام قطعی کو حلال سمجھنا موجب کفر ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والاصل ان من اعتقد الحرام حلالاً فان کان حراماً لغیرہٖ کمال الغیر لایکفر وان کان لعینہٖ فان کان قطعیۃ کفر والا لا۔

(ردّ المحتار ج۳ ص۲۲۳ باب المرتد)[1]

والدین اور استاد کا نافرمان کافر نہیں

سوال:۔ جو شخص والدین یا استاد کا نافرمان ہو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے کافر ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اور استاد کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے لیکن ان کا نافرمان کافر نہیں ہوگا البتہ فاسق، فاجر اور ظالم ضرور شمار ہوگا۔

لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احدثکم باکبر الکبائر قالوا بلی یارسول اللہ قال الاشراك باللہ وعقوق الوالدین۔ (ترمذی ج۲ ص۱۲ ابواب البر)

قال امام ابوحنیفۃؒ: ولا تکفر مسلماً بذنب من الذنوب وان کانت کبیرۃ اذا لم یستحلها۔ (فقہ اکبر ملک الکبیرۃ لاتخرج المؤمن عن الایمان)[2]

توبہ سے حقوق اللہ معاف ہوسکتے ہیں حقوق العباد نہیں

سوال:۔ کیا توبہ سے سب صغائر وکبائر معاف

---

[1] وقال فی الھندیۃ: من اعتقد الحرام حلالاً او علی القلب یکفر امّا لو قال لحرام ھذا حلال لترویج السلعۃ او بحکم الجھل لا یکون کفر وفی الاعتقاد ھذا اذا کان حراماً لعینہٖ وھو یعتقدہ حلالاً حتی یکون کفراً اما اذا کان حراماً لغیرہٖ فلا وفیما اذا کان حراماً لعینہٖ انما یکفر اذا کانت الحرمۃ ثابتۃ بدلیل مقطوع بہٖ اما اذا کان باخبار الاحاد فلا یکفر کذا فی الخلاصۃ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۲ ص۲۷۲ الباب التاسع فی احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۲ استحلال المعصیۃ ولو صغیرۃ کفر۔

[2] قال العلامۃ التفتازانیؒ: ان الکبیرۃ التی ھی غیر الکفر لاتخرج العبد المؤمن من الایمان۔ (النبراس علی شرح العقائد ص۲۲۶ الکبیرۃ لاتخرج عن الایمان)

ہو سکتے ہیں یا کہ صرف حقوق اللہ معاف ہی معاف ہوں گے اور حقوق العباد ذمے پر باقی رہیں گے ؟

الجواب : توبہ اگر اپنی پوری شرائط سے ہو تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے قبول فرما کر اپنے سارے حقوق معاف فرما دیں ۔

لما قال العلامة مُلا علی القاری رحمہ اللہ: فاما وقوع قبولها شرعًا هو مرجوٌّ غیر مقطوعٌ ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۵ التوبة وشرائطها)

البتہ حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے بلکہ حقوق العباد حقوق کی ادائیگی ہی سے معاف ہوتے ہیں یا خود صاحبِ حق بطیبِ خاطر معاف کر دے ۔

لما قال العلامة ملا علی القاری رحمہ اللہ : وان کانت عما یتعلق بالعباد فان کانت من مظالم الاموال فتتوقف صحة التوبة منها مع ما قدمناه فی حقوق اللہ تعالیٰ علی الخروج عن عهدة الاموال وارضاء الخصم فی الحال والاستقبال بان یتحلل منهم او یردها الیهم او الی من یقوم مقامهم من وکیل او وارث هذا- (شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۸ مطلب یجب معرفة المکفرات)

والدین کے نافرمان کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی

سوال :- والدین کو زد و کوب کرنے اور گالیاں دینے والے کے بارے میں شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے ؟ جب تک والدین اس سے ناراض ہوں تو بیٹے کی کوئی عبادت قبول ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، اس فعلِ بد سے توبہ کرنا اور والدین کو راضی کرنا نہایت ضروری ہے، اور جب تک وہ اپنے اس فعلِ بد سے توبہ نہ کرے تو والدین سے عاق رہے گا اور عاقِ والدین کی کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں

---

[1] عن عائشة رضی اللہ عنها قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدواوین ثلاثة دیوان لا یغفر اللہ الاشراک یقول اللہ عزوجل ان اللہ لا یغفر ان یشرک به ودیوان لا یترکه اللہ ظلم العباد فیما بینهم حتی یقتص بعضهم من بعض الخ ـــ قال الملا علی قاری تحت حدیث اخر وفیه اشعار بانه اشعار لا عفو و شفاعة فی حقوق العباد الا ان شاء اللہ یرضی بما اراد ۔

(مرقاة المصابیح ج۸ ص۸۵ کتاب الاداب الفصل الثانی والثالث)

ہوتی اور نہ وہ جنت میں جا سکتا ہے، احادیثِ نبوی میں والدین کے نافرمان کی سزائیں بیان ہو چکی ہیں"۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابی امامۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ لایقبل اللہ عزوجل منہم صرفاً ولا عدلاً: عاق ومنان ومکذب بقدر رواہ ابن ابی عاصم فی کتاب السنۃ باسناد حسن۔ (الترغیب والترھیب ج ۳ ص ۳۲۸) [1]

شبِ معراج رؤیتِ باری تعالیٰ کے عقیدہ کی وضاحت

سوال: کیا لیلۃ الاسریٰ (شبِ معراج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنی "ظاہری آنکھوں" سے دیکھا ہے یا کہ "دل کی آنکھوں" سے؟ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیل بیان فرماویں؟

الجواب: لیلۃ الاسریٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤیتِ باری تعالیٰ کی نوعیت کے بارے میں عہدِ صحابہؓ ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عدم رؤیتِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں جبکہ ابن عباسؓ، کعبؓ و حسنؒ رؤیتِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں، قائلینِ رؤیتِ باری تعالیٰ کا آپس میں پھر اختلاف ہے، ان میں سے بعض رؤیتِ بصری کے قائل ہیں اور بعض رؤیتِ قلبی کے قائل ہیں۔ فذھب جماعۃ الیٰ انہ رأی ربہ بفوادہ دون عینہ وذھب جماعۃ الیٰ انہ رأہ بعینہ۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۳۴۹) اول الذکر قول کو علماء کرام ترجیح دیتے ہیں۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: وعلیٰ ھٰذا رأی بقلبہ ربہ روایۃ صحیحۃ وھو ان اللہ تعالیٰ جعل بصرہٗ فی فوادہٖ او خلق لفوادہ بصراً حتی رأی ربہ رؤیۃ صحیحۃ کما یری بالعین قلتُ وھٰذا قول حسن ووجہ مستحسن یمکن بہ الجمع بین متفرقات الاقوال۔ (مرقاۃ علی المشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۴۹) [2]

---

[1] قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: ایسا شخص فاسق و ظالم و عاقِ والدین ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی شانِ مقدس میں کوئی کلمہ گستاخی کا کہنا کفر و ارتداد ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۱۲ ص ۳۶۶ احکام المرتد)

[2] قال العلامۃ النوویؒ: والحجج فی ھٰذہ المسئلۃ وان کانت کثیرۃً ولکنا نتمسک الا بالاقویٰ وھو حدیث ابن عباسؓ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۹۷)۔ (کذا فی یواقیت للشعرانی ج ۱ ص ۱۰۷)

[3] قال العلامۃ التفتازانیؒ: وما قال بعض السلف من وقوع الرؤیۃ بالبصر لیلۃ المعراج فالجمھور علیٰ خلافہ وقد روی انہٗ سُئل ھل رأیت ربک فقال رأیت ربی بفوادی۔ (شرح المقاصد ج ۲ ص ۱۲۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ درود پڑھنے کو دم کہنا

سوال:- ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اسم گرامی کے ساتھ درود پڑھنے کو (دُم) لگانے سے تعبیر کیا کہ محمد کے ساتھ درود پڑھنا (دُم) لگانے کے مترادف ہے، از روئے شرع ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات میں سب سے افضل اور سب سے زیادہ پیارے امام الانبیاء والمرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کی عزت، عظمت اور اتباع اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا سبب ہے اور آپ کی عزت و عظمت اور احترام نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا آپ کی تعظیم و تکریم کے لیے مشروع ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۰ (سورۃ الاحزاب آیت ۵۶)

و قال العلامۃ ابن عابدینؒ: بانّ المقصود من الصلوٰۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم تعظیمہ۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۸۳) — اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتے ہیں کہ "میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود و سلام پڑھو"۔ اسی طرح درود نہ پڑھنے والے کے متعلق احادیث میں کثرت سے وعیدات وارد ہوئی ہیں، علامہ ابن عابدینؒ نے ردالمحتار میں وہ تمام احادیث نقل کی ہیں۔ مستدرک کی روایت ہے: عن کعب بن عُجرۃ ...... لمبی حدیث ہے، اس کا ایک جملہ یہ ہے: فلما رقیت الثانیۃ قال جبریل بعد ماذکرت فلم یُصَلِّ علیک فقلتُ آمین (الحدیث) کہ جس کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی لیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے اس کے لیے جبرئیلؑ نے بد دعا کی اور حضور انورؐ نے اس پر آمین کہی۔ دوسری روایت میں رغم انف رجلٌ ذکرت عندہٗ فلم یُصَلِّ علیک کے الفاظ ہیں۔ ایک اور روایت میں یوں فرمایا "شقی عبد ذکرت عندہٗ فلم یُصلِّ علیک"۔ علامہ سیوطیؒ نے "جامع صغیر" میں ایک روایت بایں الفاظ نقل کی ہے: "من الجفاء ان اذکر عند الرجل فلا یصلّی علی"۔ ان تمام احادیث اور قرآنی آیات کے پیش نظر رکھ کر فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ آپ پر درود پڑھنا فرض ہے، اور جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی لیا جائے تو مذہب صحیح کی رو سے آپ پڑھنا واجب ہے اور نماز میں پڑھنا سنت ہے۔

اور بھی جتنا زیادہ ممکن ہو پڑھنا مستحب ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : ورجحه فی البحر باحادیث الوعید کرغم وابعاد وشقاء وبخل وجفاء ثم تکون فرضاً فی العمر وواجباً کلما ذکر علی الصحیح وحراماً عند الفتح المتاع۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۱ ص۳۴۲)

ان تمام نصوص سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ درود شریف ایک امر مشروع ہے اور فقہاؒ نے لکھا ہے کہ شریعت کے کسی امر کی توہین اور استخفاف کرنا موجب کفر ہے، درود شریف بھی ایک امر مشروع ہے لہٰذا اس کا انکار کرنا یا اسے دین میں معتبر چیز نہ سمجھنا یا استخفاف کرنا موجب کفر ہے۔

لما فی الهندیة : سئالت صدر الاسلام جمال الدین عمن قرأ حدیثاً من احادیث النبی صلی الله علیه وسلم فقال رجل "دہمہ روز غلشہا خوانند" قال ان اضاف ذٰلك الی القاری لا الی النبی صلی الله علیه وسلم ینظر ان حدیثاً ان کان حدیثاً یتعلق بالدین واحکام الشرع یکفر وان کان حدیثاً لایتعلق به لا یکفر وتحمل مقالته علیٰ ان ارادته قرأة غیره اولیٰ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۲۹۶ الباب التاسع فی احکام المرتدین)

معراجِ نبوی سے انکار کرنا

سوال :۔ ایک شخص معراجِ نبوی کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج خواب میں ہوئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر بلانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر اور موجود ہوتا ہے، شرعاً ایسے شخص پر کیا حکم لگایا جا سکتا ہے؟

الجواب :۔ اہلِ سنت والجماعت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور معجزہ کے اور انتہائی زیادہ اعزاز واکرام

لہ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : واذا روی رجل حدیثاً عن النبی صلی الله علیه وسلم ورده آخر قال بعض مشائخنا انه یکفر ومن المتأخرین من قال ان کان متواتراً یکفر وکذٰلك لو قال بطریق الاستخفاف سمعنا کثیراً یکفر۔

(الفتاویٰ التاتارخانیة ج ۵ ص۴۸۱ کتاب احکام المرتدین)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۲۲۳ باب احکام المرتدین۔

سے نوازنے کے لیے اپنے دربارِ خاص میں بلاکر اپنے ساتھ ہمکلامی کا شرف بخشا تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیداری کی حالت میں اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ حضرت جبریلؑ کے ہمراہ براق پرسوار ہوکر سب سے پہلے مسجدِ اقصیٰ تشریف لے گئے، آپ وہاں پر براق سے اترے اور اسے دروازہ کے پاس حلقہ کے ساتھ باندھا اور پھر تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کی، پھر وہاں سے آپؐ کو پہلے آسمان، دوسرے، تیسرے حتیٰ کہ ساتوں آسمان، عرش وکرسی، جنت وجہنم کی سیر کرائی گئی، اسی کو معراج کہا جاتا ہے، اور برحق اور ثابت ہے کہ معراج کا کچھ حصہ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ قطعی اور یقینی ہے کیونکہ اس کا ثبوت قرآنِ پاک آیتِ کریمہ سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (سورۃ الاسراء آیت ۱) سے ہے اس کا منکر کافر اور مرتد ہے، اور پھر بیت المقدس سے اوپر آسمانوں تک کا ثبوت احادیث صحیحہ سے ہے لہٰذا اس کا منکر اگرچہ کافر تو نہیں مگر فاسق وفاجر اور ضال ومبتدع ضرور ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی عادتِ شریفہ ہے کہ اپنے برگزیدہ نبیوں کی حقانیت اور ان کے دشمنوں کو عاجز اور ذلیل ورسوا کرنے کے لیے اپنے ان نیک بندوں کے ہاتھوں ایسے فعال صادر فرماتا ہے کہ جن کے کرنے سے عام لوگ عاجز ہوتے ہیں اور اس کو کر نہیں سکتے، اس کو معجزہ کہتے ہیں۔ تو واقعہ معراج بھی من جملہ معجزات سے ہے، لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ جب اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر وناظر ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ بے جا، بے محل اور ناقابلِ التفات ہے، پھر تو نعوذ باللہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی کیوں بنایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء سابقین میں امتیازی شان کیوں بخشی؟ نعوذ بک من شر الوسواس الخناس۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: وفی الخلاصۃ من انکر المعراج ینظر ان انکر الاسراء من مکۃ الی بیت المقدس فهو کافر ولو انکر المعراج من بیت المقدس لا یکفر۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۴۴ بحث فی ان المعراج حق)[له]

[له] قال فی النبراس: فالاسراء وهو من المسجد الحرام الی بیت المقدس قطعی ای یقینی ثبت بالکتاب ای القرآن والسنۃ ویکفر منکرہ والمعراج من الارض الی السماء مشهور ای ثبت بالحدیث المشهورۃ فلا یکفر منکرہ بل تفسق ومن السماء الی الجنۃ او العرش او غیر ذلك احاد ای مروی غیر الآحاد یاثم منکرہ۔ (النبراس ص۲۲۴ سورۃ الاسراء)

وَمِثْلُهٗ فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص۲۴۵ تحت قوله والمعراج حق الی آخرہ۔

قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ختمِ نبوت کے منافی نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارہ میں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمانوں سے نزول فرمائیں گے تو بحیثیتِ پیغمبر نزول فرمائیں گے یا امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی کی حیثیت سے؟

الجواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمانوں پر اٹھایا جانا اور قیامت کے قریب ان کا نازل ہونا اور پھر متبع شریعتِ محمدی بن کر کچھ عرصہ اس دنیا میں رہنا اُمتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے۔ قرآنی آیات اور احادیثِ متواتر المعنیٰ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتی حیثیت یقیناً نبی اور پیغمبر کی ہوگی، انبیاء سابقین کی طرح آپ پر اللہ کی طرف سے وحی بھی ہوگی، اس کے باوجود آپ شریعتِ محمدی کے تابع ہوں گے البتہ یہ وحی شریعتِ محمدی کو بدلنے کے لیے نہیں ہوگی بلکہ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ضروری احکام ہوں گے۔ لہٰذا آپ نزول کے بعد دو صفات کے ساتھ متصف ہوں گے، ایک شانِ نبوت اور دوسرا شانِ امتِ محمدیہ، لیکن آپ کی یہ شانِ نبوت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے منافی نہیں ہوگی، اس لیے کہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو بھی منصبِ نبوت سے نہیں نوازا جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی بن کر آئے تھے۔

لما قال الامام فخر الدین الرازیؒ: تحت قولہ تعالیٰ: وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موته اى قبل موت عيسى المراد ان اهل الكتاب الذين يكونون موجودين فى زمان نزوله لابد ان يؤمنوا به قال بعض المتكلمين انه لا يمنع نزوله من السماء الى الدنيا الا انه انما ينزل عند ارتفاع التكاليف او بحيث لا يعرف اذ لو نزل مع بقاء التكاليف على وجه يعرف انه عيسى عليه السلام لكان اما ان يكون نبيًا ولا نبى بعد محمد صلى الله عليه وسلم او غير نبى وغير ذلك جائز على الانبياء وهذا اشكال عندى ضعيف لان انتهاء الانبياء الى مبعث محمد صلى الله عليه وسلم فعند مبعثه انتهت تلك المدة فلا يبعد ان يصير بعد نزوله تبعًا لمحمد صلى الله عليه وسلم۔ (تفسیر کبیر ج ۱۱-۱۲ ص ۱۰۴ سورۃ النساء آیت ۱۵۹) [1]

[1] قال العلامة ابن البزاز الكردرىؒ: واما الايمان بسيدنا عليه السلام فيجب بانه رسولنا فى الحال وخاتم الانبياء والرسل فاذا آمن بانه رسول ولم يؤمن بانه خاتم الرسل لا ينسخ دينه الى يوم القيامة لا يكون مؤمنًا وعيسى عليه السلام ينزل الى الناس ويدعوا الى شريعتهم وسائق لامته الى دينه۔ (فتاوى بزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۲۷ نوع فيما يتصل بها مما يجب اكفاره من اهل البدع۔ الثالث فى الانبياء) ـــ ومثله فى شرح الفقه الاكبر ص ۱۱۲

میت کا جسم ریزہ ریزہ ہوجانے کی صورت میں قبر کا عذاب وثواب

سوال :- بریم ہنود جو آدمی آگ میں جل کر راکھ ہوجائے یا پانی میں ڈوب کر ریزہ ریزہ ہوجائے یا اس کو کوئی درندہ کھاجائے تو کیا اس آدمی کو بھی قبر کا ثواب وعذاب ہوگا یا نہیں ؟ اور اس ثواب وعذاب کی کیا کیفیت ہوگی ؟

الجواب :- عالمِ برزخ کا عذاب وثواب مختلف آیات اور احادیث سے ثابت ہے جن اموات کے اجسام مذکورہ بالا طریقہ سے بالکل ختم ہوجاتے ہیں اور بظاہر آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں اُن کو بھی جزا وسزا ملتی ہے جس کی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں بہرحال جزا اور سزا روح اور جسم دونوں کو ملتی ہے اور یہی اصح قول ہے ۔ عالمِ برزخ میں رُوح کا جسم کے ساتھ ایک قسم کا تعلق اور ربط ہوتا ہے جس سے روح کو ملنے والی جزا وسزا سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے اور جو تکلیف یا راحت روح کو ملتی ہے باقاعدہ جسم بھی اُسے محسوس کرتا ہے خواہ جسم کے اجزاء ریزہ ریزہ ہو کر بظاہر بالکل ہی نیست ونابود کیوں نہ ہوجائیں۔

لما قال الامام ابوحنیفةؒ : وضغطة القبر حق وعذابه حق کائن للکفار کلھم ولبعض المسلمین
وقال ملا علی القاریؒ فی شرحه واعلم ان اھل الحق اتفقوا علیٰ ان الله تعالیٰ یخلق فی المیت نوع حیاة فی القبر قدر ما یتألم او یتلذذ ۔ الخ (شرح الفقه الاکبر ص۱۲۷ فی ان عذاب القبر حق) [1]

---

[1] وقال العلامة ابن ابی العز الحنفیؒ : وقد تواترت الاخبار عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ثبوت عذاب القبر ونعیمه لمن کان لذٰلك اھلاً وسوال الملکین فیجب اعتقاد ثبوت ذٰلك والایمان به ولا نتکلم فی کیفیته الخ ص۴۵۱ وکذٰلك عذاب القبر یکون للنفس والبدن جمیعًا باتفاق اھل السنة والجماعة تنعم النفس وتعذب مفردة عن البدن ومتصلة به واعلم ان عذاب القبر ھو عذاب البرزخ فکل من مات وھو مستحق للعذاب ناله نصیبه منه قبر او لم یقبر اکلته السباع او احترق حتیٰ صار رمادًا ونسف فی الھواء او صلب او غرق فی البحر وصل الیٰ روحه وبدنه من العذاب ما یصل الی المقبور ۔
(شرح العقیدة الطحاویة ص۴۵۰-۴۵۱ الایمان بعذاب القبر)
ومِثْلُهٗ فی شرح العقائد النسفی ص۹۸ عذاب القبر ۔

زیارتِ قبور کے موقع پر بعض غیر شرعی رسوم کا ذکر

سوال:۔ بعض مزارات پر کئی عجیب و غریب افعال دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً صاحبِ قبر سے مدد مانگنا، وہاں سے نمک لیکر کھانا اور چھوٹے چھوٹے گھیلے بنانا وغیرہ۔ شرعاً ان افعال کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب:۔ غیر اللہ کو اپنی حاجات میں غائبانہ پکارنا اور اس سے مافوق الاسباب امداد طلب کرنا حرام اور امورِ شرکیہ میں سے ہے جیسا کہ عام نصوصِ قرآنی اور احادیث سے ثابت ہے، اسی طرح صاحبِ مزارات کے نام پر نذر و نیاز دینا حرام اور شرک ہے اور اس عقیدہ کے تحت وہاں سے نمک لے کر کھانا اور چھوٹے چھوٹے گھیلے بنانا وغیرہ ناجائز اور حرام ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (سورۃ الاحقاف آیت ۶)

لما ورد فی الحدیث: وعن جابرؓ قال نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ وان یقعد علیہ۔ (المشکوٰۃ ص۱۴۸ باب دفن المیت)

وقال العلامة الحصکفیؒ: واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الدراهم والشمع والزیت ونحوها الی ضرائح الاولیاء الکرام تقرباً الیهم فهو بالاجماع باطل حرام مالم یقصد واصرفها لفقراء الانام وقد ابتلی الناس بذلک۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۴۳۹ کتاب الصوم) [1]

---

[1] قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (سورۃ یونس آیت ۱۰۶)

وَعَنْ ابی الهیاج قال قال لی علی الا ابعثک علی ما بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ لا تدع تمثالا الا طمسته ولا قبرا مشرفا الا سویته۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص۱۴۸ باب دفن المیت)

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سألت فاسأل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۴۵۳ باب التوکل والصبر)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۱ الباب السادس عشر فی زیارۃ القبور الخ

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے

سوال :- کیا اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے؟ اور کیا آپ کے دور کے تمام جدید مسائل کا حل اسلام میں موجود ہے ؟

الجواب :- مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دینِ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے، دینِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) عالمگیر بھی ہے اور احوال گیر بھی ہے، زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلام نے رہبری اور راہنمائی نہ فرمائی ہو۔ اسلامی نظام معاشرتی، معاشی اور اقتصادیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، اسلام میں صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں پوری انسانیت کے لیے فلاح اور بہبود کا پیغام ہے بلکہ تمام کے حقوق اور ان کی پاسداری کا لحاظ اسلام میں موجود ہے، نیز دین وشریعتِ محمدی کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے، البتہ ہم چونکہ ناقص العقل ہیں اس لیے بہت سی باتیں ہمیں ماوراء العقل نظر آتی ہیں اس میں خامی ہماری ناقص اور کمزور عقل کی ہے نہ کہ دینِ اسلام کی۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ : وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ٥ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ٥ (سورۃ الزمر ۲۷، ۲۸)

وقال ایضاً : اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدہ ۳)

وقال ایضاً، وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ٥ (سورۃ النحل آیت ۸۹) [1]

---

[1] لما ورد فی الحدیث : قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ : من اراد العلم فعلیہ بالقرآن فان فیہ خبر الاولین والآخرین۔ رواہ سعید بن منصور فی سننہ۔ وقال ایضاً : انزل فی ھٰذا القرآن کل علم وبین لنا فیہ کل شیء ولکن علمنا یقصر عما بین لنا فی القرآن۔ (رواہ ابن جریر وابن حاتم فی تفسیرھما) وقال : اذا حدثتکم بحدیث انبأتکم بتصدیقہ من کتاب۔ (رواہ ابن ابی حاتم) وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ستکون فتنۃ قیل وما المخرج منہا؟ قال کتاب اللہ فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۱۱۸ باب ما جاء فی فضل القرآن) ومثلہ فی نزول عیسیٰ بن مریم للامام جلال الدین سیوطی ص۴۱، ۴۲۔

قرآنِ پاک کے متعلق تبدیلی کا عقیدہ رکھنا

سوال:۔ جو قرآن مجید اس وقت مسلمانوں کے پاس موجود ہے کیا یہ وہی قرآن مجید ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصال کے وقت چھوڑ گئے تھے یا اس میں کوئی تبدیلی وغیرہ آچکی ہے؟

الجواب:۔ امتِ مسلمہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ جو قرآن مجید اس وقت ہمارے پاس موجود ہے یہ بعینہٖ وہی قرآن ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بواسطہ حضرتِ جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے ۲۳ سال میں اتارا گیا تھا اس میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور نہ قیامت تک آئے گی حتیٰ کہ لہجہ اور رسم الخط بھی اُسی طرح محفوظ ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں حفاظ کرام کے سینوں میں محفوظ چلا آرہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک ہر قسم کے تغیّر و تبدّل سے محفوظ رہے گا، اس لیے کہ قرآن مجید کا ہر حرف حدِ تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔ تمام فقہاء کرام اور متکلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص قرآن مجید میں تغیّر و تبدّل کا قائل ہو وہ بلا شک و شبہ کافر ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ (سورۃ الحجر آیت ۹)

وقال ایضًا: قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔ (سورۃ الزمر آیت ۲۸)

وقال العلامۃ عماد الدین ابن کثیرؒ: تحت قولہ تعالیٰ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ ای ثم قال تعالیٰ انہ ھو الذی انزل علیہ الذکر وھو القرآن وھو الحافظ لہ من التغییر والتبدیل۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۴۷ سورۃ الحجر پ ۱۴ آیت ۹) لہ

لہ لما قال العلامۃ ابو عبداللہ احمد القرطبیؒ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ یعنی القرآن وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ من ان یزاد فیہ اوینقص منہ قال قتادۃ وثابت البنانی حفظہ اللہ من ان تزید فیہ الشیاطین باطلاً اوتنقص منہ حقاً فتولی سبحانہ حفظہ فلم یزل محفوظاً۔

(الجامع لاحکام القرآن ج۱۰ ص۵ پ ۱۴ سورۃ الحجر آیت ۹)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص ۱۶۷ فصل فیما یتعلق بالقرآن۔

کفّار دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے

سوال:- اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ کفار بھی کفر و شرک کی سزا دوزخ میں بھگت کر جنت میں داخل ہوں گے، اس لیے کہ ایک شخص نے کفر و شرک ۶۰/۷۰ سال تک کیا اور اس پر عذاب دائمی ہونا ظلم ہے، سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیئے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- امتِ مسلمہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص اس دنیا سے کفر و شرک کی حالت میں مر گیا اور موت آنے تک اس کو اسلام کی دولت نصیب نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے کے لیے جہنم (دوزخ) میں رہے گا اور کبھی بھی اس کو وہاں سے چھٹکارا نہیں ملے گا، قرآن مجید کی بیشمار آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ صحیحہ سے صراحتاً اس عقیدے کا اثبات ہوتا ہے۔ اس ابدی عذاب کی وجہ اللہ تبارک و تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں، ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ۔ (سورۃ الانعام آیت ۲۸) "کہ اگر ان لوگوں کو دوبارہ لوٹا دیا جائے دُنیا میں تو یہ لوگ پھر کفر و شرک کی طرف لوٹ آئیں گے"۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ اگر اس شخص کو ابدی زندگی دے دی جائے تو یہ ابدی کفر و شرک سے باز نہیں آئے گا، پس اس کا کفر و شرک بھی ابدی ہے اور سزا بھی ابدی ہوگی۔ لہٰذا جو شخص ناقص عقلی دلائل کے بل بوتے پر اس عقیدے سے منحرف ہو جائے تو وہ دینِ محمدیؐ سے خارج ہے۔

قال اللہ تبارک و تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ (سورۃ النساء آیت ۵۶)

وقال اللہ تعالیٰ ایضاً: وَ یَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا ہُوَ بِمَیِّتٍ ؕ وَ مِنۡ وَّرَآئِہٖ عَذَابٌ غَلِیۡظٌ ۔ (سورۃ ابراھیم آیت ۱۶، ۱۷)

وفی موضع آخر: قال اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی ۔ (سورۃ طٰہٰ آیت ۷۴)

وَ قال اللہ تعالیٰ: قِیۡلَ ادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا۔ (سورۃ الزمر ۷۲)

وقال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۔ (سورۃ فاطر آیت ۳۶ / ۱)[1]

رمضان المبارک میں فوت ہونے والے گنہگار مسلمان کے لیے عذاب قبر میں تخفیف

سوال:۔ اگر کوئی گنہگار مسلمان رمضان المبارک میں فوت ہو جائے تو اس سے قیامت تک عذابِ قبر مرتفع ہوگا یا صرف رمضان المبارک میں ہی تخفیف ہوگی اور پھر غیر رمضان میں عذاب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "جب رمضان المبارک شروع ہو جائے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو گنہگار مسلمان رمضان شریف میں فوت ہو جائے وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہتا ہے۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے (رد المحتار ج آخر باب الجمعہ میں) لکھا ہے کہ اگر کوئی گنہگار مسلمان رمضان المبارک میں یا (غیر رمضان میں) جمعہ کے دن فوت ہو جائے تو وہ قیامت تک عذابِ قبر سے محفوظ و مامون رہے گا، البتہ کافر کا عذاب دائمی ہوگا صرف جمعہ کے دن اور رمضان شریف میں اس سے عذاب ہلکا ہوگا، البتہ بعض نے

---

[1] وقال العلامۃ تفتازانی رحمہ اللہ:۔ والجنۃ والنار حق وهما مخلوقتان موجودتان باقیتان لا تفنیان ولا یفنی اهلها ۔ ای دائمتان لا یطرء علیهما عدم مستمر لقوله تعالیٰ: فی حق الفریقین خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۔ واما ما قیل من انهما تهلکان ولو لحظة تحقیقاً ۔ لقوله تعالیٰ: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۔ فلا ینافی البقاء بهذا المعنیٰ لانك قد عرفت انه لا دلالة فی الآیة علی الفناء وذهبت الجهمیة الیٰ انهما تفنیان ویفنی اهلها وهو قول المخالف الکتاب والسنة والاجماع لیس علیه شبهة فضلاً عن حجة ۔ (شرح العقائد ص ۸۲ الجنۃ والنار الخ)

ومثله فی شرح الفقه الاکبر ص ۹۸، ۹۹ الجنة والنار مخلوقان ۔

وکذا فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص ۴۸۴ الجنة والنار ۔

اس قول کو کہ "عاصی تاقیامت عذابِ قبر سے مامون رہے گا" مرجوح قرار دیا ہے۔
لماورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل رمضان فتحت ابواب السماء وفی روایۃ ابواب الجنۃ وغلقت ابواب جھنم الخ۔
(مشکوٰۃ المصابیح ص۱۷۳ کتاب الصوم) لہ

کل شئ ھالك الا وجھه وکل نفس ذائقۃ الموت میں ہلاکت وموت کی تفصیل

سوال:۔ کیا کل شئ ھالك میں جنت، جہنم اور پلصراط داخل ہیں یا نہیں؟ اسی طرح کل نفس ذائقۃ الموت میں حاملینِ عرش اور مقرب فرشتے داخل ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآن مجید کی آیت مبارکہ کل شئ ھالك الا وجھه کی تفسیر میں متکلمین ومفسرین کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے الفاظ کے عموم اور ظاہر کو دیکھ کر سب پر فناء ہونے کا حکم لگایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا تمام موجودات پر ہلاکت طاری ہو گی حتیٰ کہ جنت، دوزخ وغیرہ بھی صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات باقی اور دائمی رہے گی، البتہ جنت جہنم کے لیے یہ ہلاکت تھوڑی دیر ہوگی دائمی فناء نہ ہوگا، اس لیے کہ ہلاکت دائمی فناء کو مستلزم نہیں اور یہ تھوڑی دیر کے لیے فناء ہوجانا قرآن مجید کی اس آیتِ کریمہ کل شئ ھالك الا وجھه کی تحقق کے لیے ہوگا، جیسا کہ جہنم کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَإِنْ مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا کے تحت مفسرین لکھتے ہیں کہ ہر نیک وبد کو اس پر سے گذرنا پڑے گا لیکن نیک آدمی کے لیے

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وضغطۃ القبر حق ان کان کافرًا فعذابہ یدوم الٰی یوم القیامۃ ویرفع عنہ یوم الجمعۃ وشھر رمضان .... والعاصی یعذب ویضغط لکن ینقطع عنہ العذاب یوم الجمعۃ ولیلتھا ثم لا یعود ومن مات یومھا ولیلتھا یکون العذاب ساعۃ واحدۃ وضغطۃ ثم لا یعود۔
(رد المحتار ج ۱ ص۸۱۱ باب الجمعۃ)
ومثلہ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۰۲ ضغطۃ القبر۔

صرف مرور ہوگا جہنم کی تپش اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکے گی۔ جبکہ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ چونکہ جنت اور جہنم پیدا ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں، نصوصِ قرآنیہ اس پر دال ہیں کہ ان پر عدم طاری نہیں ہوگا بلکہ باقی اور دائمی رہیں گے۔ کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ، وغیرہ ذلک (سورۃ آل عمران آیت ۱۳۳) لہٰذا ان نصوص کی بنا پر کل شئ اکثریت کے لیے ہے تمام اشیاء کو محیط نہ ہوگا اور جنت وجہنم اس حکم سے مستثنیٰ ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: واوتیت من کل شئ۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں ہلاکت سے مراد موت ہے اور عمومیت ہر ذی روح جو دنیا میں موجود ہے اس کے اعتبار سے ہے یعنی ہر ذی روح کو موت آئے گی اور وہ فناء ہوگی۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں نقل کی ہے: "کلّ حیّ میّت الّا وجھہ"۔

علامہ ابن ابی العزاء الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کل شئ ھالک سے تمام وہ موجودات مراد ہیں جن کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فناء اور ہلاکت کا فیصلہ فرمایا اور جنت، جہنم وعرش کو باقی رکھنے کے لیے پیدا فرمایا نہ کہ فناء ہونے کے لیے، جیسے کہ قرآنی نصوص عدمِ فناء کی طرف مشیر ہیں لہٰذا جنت، جہنم اور عرش وغیرہ اس حکم سے مستثنیٰ ہونگے۔

اسی طرح كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ میں تمام جاندار اشیاء داخل ہیں اور فرشتے بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہیں، سب پر ایک مرتبہ موت طاری ہوگی اور ازسرِنو ان کی بعث ہوگی جیسے دیگر جاندار اشیاء کی بعث ہوگی۔

لما قال العلامۃ تفتازانی رحمہ اللہ: وھما ای الجنّۃ والنّار مخلوقتان الّا ان موجودتان باقیتان لا تفنیان ویفنی اھلھا ای دائمنان لایطرء علیھا عدم مستمر لقولہٖ تعالےٰ: فِيْ حَقِّ الْفَرِيْقَيْنِ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۔ (سورۃ)

وَ اما ماقیل انھا تھلکان ولو لحظۃ تحقیقاً۔ لقولہٖ تعالےٰ: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وجھہ۔ فلاینافی البقاء بھذا المعنیٰ لانّک عرفت انہٗ لادلالۃ فی الآیۃ علی الفناء وذھبت الجھمیۃ الیٰ انھا تفنیان ویفنی اھلھا وھو قول مخالف

لکتاب والسنۃ والاجماع۔ (شرح العقائد ص۱۰۶)

وقال العلامۃ الآلوسی رحمہ اللہ: وقال غیر واحد المراد بالھلاک خروج الشیٔ عن الانتفاع بہ المقصود منہ اما بتفرق اجزائہ اونحوہ والمعنیٰ کل شیٔ سیھلک ویخرج عن الانتفاع بہ المقصود منہ الا ذاتہ عزوجل والظاھر انہ اُرید بالشیٔ الموجود المطلق لا الموجود وقت النزول فقط فیؤول المعنیٰ الیٰ قولنا کل موجود فی وقت من الاوقات سیھلک بعد وجودہ الا ذاتہ عزوجل فیدل ظاھر الآیۃ علیٰ ھلاک العرش والجنۃ والنار والذی دل علیہ الدلیل عدم ھلاک الآخرین وجاء فی الخبران الجنۃ سقفھا عرش الرحمٰن ولھٰذا اعترض بھٰذہ الآیۃ علی القائلین بوجود الجنّۃ والنّار الآن والمنکرین لہ القائلین بانھما سیوجدان یوم الجزاء ویستمر ان اَبَدَالآباد واختلفوا فی الجواب عن ذٰلک فمنھم من قال ان کلاً لیست للاحاطۃ بل للتکثیر کما فی قولک کل النّاس جاءَ الا زیداً اذا جاء اکثرھم دون زید واید بماروی عن الضحاک انہ قال فی الایۃ کل شیٔ ھالک الا اللہ عزوجل والعرش والجنۃ والنار ومنھم من قال ان المراد بالھلاک الموت والعموم باعتبار الاحیاء الموجودین فی الدنیا واید بماروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انہ قال فی تفسیر الایۃ کل حیٔ میت الا وجھہ۔ (تفسیر روح المعانی ج۲۰ ص۱۱۳ سورۃ القصص پارہ ۲۰ آیت ۸۸) [1]

---

[1] وقال الامام الرازی رحمہ اللہ (تحت ھٰذہ الآیۃ) استدلت المعتزلۃ بہ علیٰ ان الجنّۃ والنار غیر مخلوقتین قالوا ان الآیۃ تقتضی فناء الکل فلو کانتا مخلوقتین لفنیتا وھٰذا یناقض قولہ تعالیٰ فی صفۃ الجنّۃ ، اکلھا دائم، والجواب ھٰذا معارض بقولہٖ تعالیٰ فی صفۃ الجنۃ (اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ) وفی صفۃ النّار (وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ) ثمّ اما ان یحمل قولہ کل شیٔ ھالک علی الاکثر کقولہٖ (وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ) ویحمل قولہ اکلھا دائم علیٰ ان زمان فنائھما لما کان قلیلاً بالنسبۃ الیٰ زمان بقائھما لاجرم

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

رؤیتِ باری تعالیٰ | **سوال** :- قیامت کے دن مخلوق اپنے خالق کو دیکھ سکے گی یا نہیں؟ اور اگر دیکھ سکیں تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟

الجواب :- اہل السنۃ والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اہلِ جنت کو انکی ظاہری آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرایا جائے گا، یعنی دیدارِ خداوندی سے بڑھ کر ان کو کسی اور نعمت کے ملنے سے اتنی خوشی اور مسرت نہ ہوگی۔ اور اس عقیدے پر تمام صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے۔

لما قال العلامۃ ملاعلی القاری رحمہ اللہ: واللہ تعالیٰ یُریٰ (بصیغۃ المجهول) ای ینظر الیہ بعین البصر فی الآخرۃ ای یوم القیامۃ......... ویراہ المؤمنون وهم فی الجنۃ باعین رؤوسهم بلا تشبیہ ولا کیفیۃ ولا کمیۃ۔ الخ

(شرح الفقہ الاکبر ص۱۱۹ بحث فی انہ تعالیٰ یریٰ فی الآخرۃ بلا کیف) [۱]

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) اطلق لفظ الدوام علیہ۔

(تفسیر کبیر ج ۲۵، ۲۶ ص۲۲ سورۃ القصص آیت ۸۸ پارہ ۲۰)

وقال الامام عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ: تحت قول اللہ تعالیٰ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" یخبر اللہ تعالیٰ اخبارًا عامًا یعم جمیع الخلیقۃ بان کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ کقولہ تعالیٰ: "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" فهو تعالیٰ حیّ الذی لا یموتُ والجنّ والانس یموتون وکذلک الملائکۃ وحملۃ العرش وینفرد الواحد الاحد القهار بالدیمومۃ والبقاء فیکون آخرًا کما کان اولاً۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص۴۴۳ سورۃ آل عمران)

وَمِثْلُہٗ فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ مُفَصَّلاً ص۴۷۶ تا ۴۸۸)

[۱] وَقَالَ العلامۃ نجم الملۃ عمر النسفی رحمہ اللہ: ورؤیۃ اللہ تعالیٰ جائزۃ فی العقل واجبۃ فی النقل وقد ورد الدلیل السمعی بایجاب رؤیت المؤمنین اللہ تعالیٰ فی دار الآخرۃ۔

(شرح العقائد ص۱۴۷ رؤیۃ باری تعالیٰ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص۲۱۲ رؤیۃ اللہ تعالیٰ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے جنتی ہونے کا عقیدہ

سوال: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مشرف بہ اسلام تھے یا نہیں؟ مسلمانوں کو اس بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟

الجواب:۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے مسلمان ہونے اور نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس اختلاف کی اصل وجہ روایات میں اختلاف ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے دلائل سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین ماجدین دونوں مسلمان ہیں۔ یا تو بایں صورت کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز و اکرام کے لیے ان کو زندہ کیا گیا اور دونوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے اور دین محمدی کا اقرار کر لیا، یا یہ کہ ان کی وفات زمانۂ فترت میں ہوئی ہے، لہٰذا اشاعرہ کے اصول کے مطابق "من مات ولم تبلغه الدعوة يموت ناجيًا" یعنی جو اس حالت میں مرا کہ اس کو دینِ الٰہی کی دعوت نہیں پہنچی تو وہ ناجی ہوگا۔ اور ماتریدیہ کے نزدیک نجات کے لیے شرط یہ بھی ہے کہ کفر و شرک کا اعتقاد نہ ہو۔ اور جن روایات سے آپ کے والدین کا کفر پر مرنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے استفسار پر فرمایا" ابی وابوك فی النار" تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قبل از علم تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارہ میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مسلمان اور جنتی ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : الا ترى ان النبي صلى الله عليه وسلم قد اكرمه الله تعالى بحياة ابويه له حتى آمنا به كما في حديث صححه القرطبي وابن ناصر الدين حافظ الشام وغيرهما فانتفعا بالايمان بعد الموت على خلاف القاعدة اكراماً للنبي صلى الله عليه وسلم كما احيا قتيل بني اسرائيل ليخبر بقاتله..... وما قيل ان قوله تعالى : ولا تسئل

عن اصحاب الجحیم نزل فیہا لم یصح وخبر مسلم "ابی وابوک فی النار" کان قبل علم۔ (ردّ المحتار ج۴ ص۲۳۱ باب المرتد) لہ

عذابِ قبر کی کیفیت کیا ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل میں کہ عذابِ قبر کی کیفیت کیا ہے اور اس میں حساب و کتاب کیسا ہے اور گنہگار مسلمان کو کیسا عذاب دیا جائے گا؟

الجواب:۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ مرنے کے بعد عالمِ برزخ میں کفار، منافقین اور بعض گنہگار مسلمان کو عذاب دیا جاتا ہے، قرآن وحدیث اور تمام کتب کلام میں عذابِ قبر کا ثبوت صراحتاً ملتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص سے مرنے کے بعد قبر میں تین سوالات ہوں گے (۱) من ربّک (۲) من نبیک (۳) ما دینک، ہر ایک کو ان کا جواب دینا ہوگا، جواب نہ دینے یا غلط دینے کی صورت میں قبر میں عذاب ہوگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی عذابِ قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے اور صحابۂ کرام کو بھی اس کی تعلیم فرماتے تھے۔

باقی رہی یہ بات کہ کس کو کس قسم کا عذاب ہوگا؟ تو اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ کافر اور منافق کا عذاب سب سے زیادہ سخت ہوگا اور تا قیامت دائمی ہوگا۔ لقولہٖ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ الخ اور بعض گنہگار مؤمنین کا عذاب گناہوں کے لحاظ سے مختلف ہوگا، کیونکہ سزا جرم کی نوعیت کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے لیکن کافروں کے عذاب سے گنہگار مؤمنین کا

لہ لما قال العلامۃ محمد عبد العزیز الفرھاریؒ: تحت قولہ فانہٗ محمد بن عبد اللہ .... وروی باسانید ضعیفۃ ان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم دعا ربہ فاحیاہ وآمنتہ اُمّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وامنّا بہٖ واختار الامام الرازیؒ انہما ماتا علیٰ ملّۃ ابراہیم علیہ السلام والجمع ان الاحیاء کرامۃ لہما ایضاعف ثوابہما وقد الف الحافظ المحقق جلال الدین السیوطیؒ رسائل ستا فی اثبات ایمانہما وایمان جمیع آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ آدم علیہ السلام وتبعہ المحققون المتاخرون۔ (النبراس ص۳۱۹ نصب الامام ویکون من قریش)

عذاب بہر حال ہلکا اور آسان ہوگا۔

لما ورد فی الحدیث : فسألت عائشۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عذاب القبر فقال نعم عذاب القبر حق قالت عائشۃؓ فما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد صلی صلوٰۃ الا تعوذ باللہ من عذاب القبر۔ متفق علیہ

(مشکوٰۃ ص۲۵ باب اثبات عذاب القبور)

وقال ایضاً عن حدیث زید بن ثابتؓ : قال تعوذوا باللہ من عذاب القبر قالوا نعوذ باللہ من عذاب القبر۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص۲۵ باب اثبات عذاب القبور) [1]

عرضِ اعمال کی تحقیق

سوال :- کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر امت کے اعمال کا پیر اور جمعرات کے دن پیش ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں ؟

الجواب :- احادیثِ مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے بھی اپنی اپنی امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، عرضِ اعمال کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں بلکہ ہر روز صبح و شام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور ان کو سننے کے بعد امت کیلئے دعائے مغفرت بھی فرماتے ہیں، اس کے علاوہ بعض احادیث میں عزیز و اقارب پر بھی عرضِ اعمال کی تصریح ہے ۔

لما قال الحافظ واخرج ابن المبارك فی الزھد من طریق سعید بن المسیب قال لیس من یوم الا یعرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعمال امتہ غدوۃ وعشیۃ فیعرفھم بسیماھم واعمالھم فبذلك یشھد علیھم ۔ (فتح الباری ج۹ ص۸۶)

وفی المواهب مع شرحہ للعلامۃ الزرقانیؒ : (روی ابن مبارك) عبد اللہ الذی تستنزل

---

[1] قال ابن ابی العز الحنفیؒ ، وقد تواترت الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثبوت عذاب القبر ونعمتہ لمن کان لذلك اھلاً وسوال الملکین فیجب اعتقاد ثبوت ذلك والایمان بہ ولا نتکلم فی کیفیتہ الخ ۔ (شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص۴۵ الایمان بعذاب القبر)
ومثلہ فی شرح الفقہ الاکبر ص۱۰۱ ضغطۃ القبر۔

رحمۃ بذکرہٖ عن سعید بن المسیبؒ : (التابعی الجلیل ابن الصحابی) قال لیس من یوم الا و تعرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعمال امتہ غدوۃ وعشیًا فیعرفہم بسیماھم و اعمالہم یحمد اللہ ویستغفر لہم۔ (الزرقانی ج ۵ ص ۱۳) [1]

معجزہ اور کرامت کی حقیقت

سوال : عموماً کسی خارق العادت واقعہ کے ظہور کو لوگ معجزہ سے تعبیر کرتے ہیں، تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے کے بعد بھی کسی سے معجزہ کا ظہور ممکن ہے ؟

الجواب :۔ معجزہ شرعاً ہر اس خارق العادۃ واقعہ کے ظہور کو کہا جاتا ہے جو کسی سچے مدعی نبوت کے ہاتھوں سے ظاہر ہو، اور کسی غیر نبی بزرگ کے ہاتھوں خارق العادۃ امر کے ظہور کو کرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کسی بے دین کے ہاتھوں خارق العادۃ واقعہ کے ظہور کو استدراج کہا جاتا ہے، اس لیے ہر خرق عادت واقعہ کے ظہور کو معجزہ سے تعبیر کرنا نامناسب ہے، اور اگر اس سے اصطلاحی معجزہ مراد نہ ہو تو لا باس بہ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : فالحاصل ان الامر الخارق العادۃ بالنسبۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم معجزۃ سواء ظہر من قبلہ او من قبل احاد امتہ وبالنسبۃ الی الولی کرامۃ لخلوہ عن دعوی النبوۃ۔ (ردّ المحتار ج ۳ ص ۵۵۱ فصل فی ثبوت النسب۔ مطلب فی ثبوت کرامات الاولیاء) [2]

---

[1] وقال العلامۃ الآلوسیؒ : فی تفسیر قولہ تعالیٰ "وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ شَهِيْدًا" : فاعمال امتہ علیہ السلام تعرض علیہ بعد موتہ فقد روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال حیاتی خیر لکم تحدثون ویحدث لکم ومماتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما رأیت من خیر حمدت اللہ تعالیٰ وما رأیت من شر استغفرت اللہ تعالیٰ لکم بل جاء ان اعمال العبد تعرض علی اقاربہ الموتی وھکذا النقل عدۃ احادیث فی معناہ۔ (تفسیر روح المعانی ج ۴ ص ۱۹۴)

وَمِثْلُہٗ فی مشکوٰۃ ص ۶۹ باب المساجد۔ الفصل الثانی۔

[2] وقال العلامۃ الفرہاریؒ : وکرامتہ ظہور امر خارق العادۃ من قبلہ ای من جانبہ غیر قارن نعت لامر او حال منہ لدعوی النبوۃ فما لا یکون مقرونًا بالایمان والعمل الصالح یکون استدراجًا وما یکون مقرونًا بدعوی النبوۃ یکون معجزۃ۔ (النبراس ص ۲۹۵ کرامات الاولیاء حق)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص ۷۹۔ خوارق العادات۔

سوال:- کیا یہ درست ہے کہ امتِ محمدی کے صاحب | انبیاء کرام علیہم السلام تمام امتِ محمدیہ سے افضل ہیں

کرامت اولیاء کرام انبیاء سابقین سے افضل ہیں؟

الجواب:- امتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ کوئی ولی خواہ صاحبِ کرامت ہو یا نہ ہو کسی بھی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کو منصبِ نبوت سے نوازا ہے تو اس میں جملہ کمالاتِ اولیاء بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، لہٰذا کسی جزوی فضیلت کی بناء پر کسی ولی کو کسی بھی نبی سے افضل سمجھنا موجبِ کفر ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اجمعت الأمّة علی ان الانبیاء افضل الخلیقة وان نبینا علیه السلام افضلهم۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۲۷ مطلب فی عدد الانبیاء والرسل علیهم الصلوٰة والسلام)[1]

سوال:- ایک شخص صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ | صحابہ کرامؓ سے خطاء کا سرزد ہونا عدالت کے منافی نہیں

عقیدہ رکھتا ہے کہ ان سے جو خطائیں سرزد ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی ہیں اور ان کے ماسبق خطاؤں کا تذکرہ نہیں کیا، جبکہ ایک دوسرا شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے کہ صحابہؓ سے خطائیں ہوئی ہیں جن کی انہیں سزا بھی ملے گی۔ ان دونوں میں سے شرعاً کس شخص کا عقیدہ درست اور شرع کے موافق ہے؟

الجواب:- صحابہ کرام انسان اور بشر تھے فرشتے یا انبیاء نہ تھے کہ کسی قسم کی غلطی سے معصوم و مامون رہتے، بمقتضائے بشریت اجتہادی غلطی یا کوئی اور بھول چوک ہو جانا تقویٰ اور عدالت کے منافی نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کا مرتبہ

---

[1] وقال العلامة ابن ابی العز الحنفیؒ: تحت قوله ولا نفضل احداً من الاولیاء علی احد من الانبیاء علیهم السلام ونقول نبی واحد افضل من جمیع الاولیاء/ثم یشیر الشیخ الی الرد علی الاتحادیة وجهلة المتصوفة الخ (شرح العقیدة الطحاویة ص۵۵۵ تفضیل الانبیاء)

ومثله مفصلاً فی شرح الفقه الاکبر ص۱۲۱ تفضیل اولاد الصحابة۔

ہے، صحابۂ کرامؓ سے محبت رکھنا دین و ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بُغض و نفرت کفر و نفاق، فسوق و عصیان ہے۔ جس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل اور بہتر ہیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بھی باقی تمام اُمتوں سے افضل اور بہتر ہے۔ کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ۔ (سورۃ آل عمران ۱۱۰)
اور تمام امت میں افضل اور بہتر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہیں، لہٰذا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی عظیم ہستیوں کو محلِ نزاع بنانا فسق و ضلالت ہے، قرآنِ پاک میں مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے لیے جن نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان کا اوّلین مصداق صحابۂ کرام ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ : وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَھَاجَرُوۡا وَجَاھَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ۔ (سورۃ الانفال آیت ۷۴)

لما ورد فی الحدیث : وقال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم لا تَسُبُّوا اَصْحَابِیْ فلو ان احدکم انفق مثل احدٍ ذھبًا مابلغ مُدَّ احدھم ولا نصیفہ متفقٌ علیہ۔ (مشکوٰۃ ص ۵۵۳ مناقب الصحابۃ) [1]

مشاجراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین

سوال : سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی جو سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی اُس میں دونوں طرف سے صحابۂ کرام شریکِ جنگ تھے تو ان میں کون حق پر تھا اور کون غلطی پر؟ اور ہمیں ان کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟

الجواب : صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے باہم اختلافات و نزاعات پیش آئے

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاریؒ : الصحابۃ کلھم عدول مطلقًا لظواھر الکتاب والسنّۃ واجماع من یعتمد علیہ۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۵۵ مناقب الصحابۃ)
ومثلہ فی شرح الفقہ الاکبر ص ۷۱ الکبیرۃ لاتخرج المؤمن عن الایمان۔
وکذا فی اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۶۲۱ مناقب الصحابۃ۔

ہیں، جیسے جنگِ جمل اور جنگِ صفین وغیرہ، ان نزاعات کو نیک نیتی پر محمول کرنا چاہیئے اور خواہش پرستی، حبِ جاہ وحبِ مال سے دور سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ نفسِ امّارہ کی ذلیل خصلتیں ہیں اور ان حضرات کے نفوس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے خواہش پرستی، حرص وہوا، حبِ جاہ وحبِ مال کی آلائشوں سے آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے تمام امت کا اجماع ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ و بابرکت صحبت نصیب نہ ہوئی ہو وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ تاہم صحابۂ کرامؓ بشر اور انسان تھے اور ان سے بمقتضائے بشریت اجتہادی خطاء کا سرزد ہو جانا تقوع و ورع اور عدالت کے منافی نہیں، لہٰذا دونوں گروہ متقی و پرہیزگار تھے اور دونوں گروہ جنت میں جائیں گے، ان کی صلح بھی حق کے لیے تھی اور ان کی لڑائی بھی حق کے لیے تھی، ہر ایک گروہ نے اپنے اجتہاد کے موافق عمل کیا، پس جو مصیب ہے اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جو مخطی ہے اس کے لیے ایک اجر ہے، علماء نے لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور ان کے مخالف خطاء پر تھے لیکن یہ خطاء خطاءِ اجتہادی ہے جس پر لعن طعن کرنا بالکل جائز نہیں۔

اہلسنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ صحابہؓ کے باہمی نزاعات اور مشاجرات کے متعلق لب کشائی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ سکوت اور توقف اختیار کرنا چاہیئے، جہاں تک ممکن ہو زبان سے اس کا ذکر نہ کرے۔

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے باہمی نزاع کی کیا حقیقت تھی؟ آپؒ نے فرمایا کہ جب اس خون ریزی سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا تو ہم اپنے آپ کو اس میں کیوں ملوث کریں!

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ سے ان لڑائیوں کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۷۶) [1]

---

[1] وقال ابو محمد علی بن احمد الظاہریؒ: وذہب سعد بن ابی وقاص وعبداللہ بن عمر وجمہور الصحابۃ الی الوقوف فی علیؓ واہل الجمل واہل صفین وبہ یقول جمیع اہل السنۃ والجماعۃ۔ (الفصل فی الملل والاہواء والنحل ج۴ ص۱۵۳ الکلام فی حرب علی ومن حارب بہ من الصحابۃ)

مسیح موعود سے عیسیٰ ابن مریم ہی مراد ہیں | سوال، کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قیامت کے قریب نازل ہونے والے مسیح موعود سے عیسیٰ ابن مریم مراد ہیں یا کوئی اور عیسیٰ و مسیح؟ کیونکہ آجکل کئی مسیح موعود بنتے پھرتے ہیں، مخالفین کہتے ہیں کہ احادیث متعلقہ مہدی و عیسیٰ جو سنی حضرات بیان کرتے ہیں وہ سب موضوع اور ضعیف ہیں۔ ایسے عقیدہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ اہل سنت والجماعت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں اور قیامت سے قبل آسمانوں سے نزول فرمائیں گے، قرآن پاک کے کثیر نصوص قطعیہ سے یہ عقیدہ ثابت ہے، اس میں ذرہ بھر شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں کہ جن کو جمع کر کے علماء کرام نے کئی مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

حضرت علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام، اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ان حضرات نے اور اسی طرح دیگر علماء محققین نے حیات مسیح اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کو محققانہ انداز میں بیان فرمایا ہے کہ تمام روایات معنیً تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ رہا یہ کہ مسیح موعود سے مراد عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام ہیں یا کوئی اور عیسیٰ و مسیح مراد ہے؟ تو اس بارہ میں خود امام الانبیاءؐ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث نزول عیسیٰ میں صرف حضرت ابن مریمؑ کا تعین فرما دیا ہے کہ بعد میں آنے والا کوئی کذاب یہ دعوٰی نہ کر سکے کہ میں وہی مسیح موعود ہوں جس کی پیشین گوئی قرآن وحدیث میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ روایات میں عیسیٰ کا لفظ کا ذکر ہی نہیں تاکہ کل کو کوئی دجال اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائے بلکہ زیادہ تر روایات میں ابن مریم (مریم کے بیٹے) کی تصریح موجود ہے اور نزول ابن مریمؑ کے بارہ میں از اول تا آخر علامات بیان کی گئی ہیں، ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے اگر کوئی کذاب مسیح موعود ہونے کا دعوٰی کرے گا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ علامات سے ہٹ کر مہدی موعود یا نزول عیسیٰ یا دجال وغیرہ واقعات کے بارہ میں قیاس آرائیاں

کرے گا تو ایسے شخص کا عقیدہ قرآنی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے بلکہ قرآنی پاک کی نصوص قطعیہ سے متصادم ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔

(سورۃ النساء آیت ۱۵۸)

وقال الامام فخر الدین الرازیؒ: (تحت ھٰذہ الآیۃ) رفع عیسٰی علیہ السلام الی السماء ثابت بھٰذہ الآیۃ ونظیرھٰذہ الآیۃ. قولہ تعالیٰ فی آل عمران إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا۔

(تفسیر کبیر ج۱۱ ص۱۰۳ المسألۃ الثالثۃ۔ سورۃ النساء) [۱]

الوہیتِ علیؓ کا عقیدہ رکھنا شرک ہے

سوال:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو "الٰہ" ماننا اور اس کا عقیدہ رکھنے والے کا ازروئے شرع کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ٹھہراتا ہے تو وہ شخص کافر اور مشرک ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھنے کو فقہاء کرام نے بالخصوص شرک قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: لا شک فی تکفیر من قذف العائشۃ او انکر صحبۃ الصدیق او اعتقد الوھیۃ علیؓ... اونحو ذٰلک من الکفر الصریح۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۳۷ باب المرتد) [۲]

---

[۱] لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم، متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ ص۴۸۰ باب نزول عیسٰی علیہ السلام)

وقال ایضًا: ینزل عیسٰی ابن مریم الی الارض فیتزوج ویولد لہ ویمکث خمسًا واربعین سنۃ ثم یموت فیدفن معی فی قبری فاقوم انا وعیسٰی ابن مریم فی قبر واحد بین ابی بکر وعمر۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۴۸۰)

[۲] قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: وبعضھم قالوا انہ "الٰہ" وان صلوا الی القبلۃ لیسوا بمؤمنین۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۶۲ مطلب یجب معرفۃ المکفرات)

عیسائیوں کا ایمان کی تعریف پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال:- ایک عیسائی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر میں مولانا مفتی محمود صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لوں تو بریلویوں اور اہل حدیث کے نزدیک میں پھر بھی کافر ہی رہوں گا، کیونکہ اسلام کو عالمگیر مذہب ماننے والے لوگ مسلمان اور ایمان کی کوئی جامع تعریف نہیں کر سکے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ، ملائکہ، انبیاءؑ، کتب سماویہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مسلمان ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ شہادتین اور یوم آخرت پر جو شخص ایمان رکھتا ہو اور بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہو وہ مسلمان ہے، لہٰذا عرض یہ ہے کہ مسلمان کی متفقہ تعریف کیا ہے، اور اس (تعریف) میں اختلاف کیوں ہے؟

الجواب:- واضح رہے کہ ایمان کی تعریف میں کوئی معنوی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے وھوالتصدیق بجمیع ما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مما علم مجیئہ بہ بالضرورۃ۔ یعنی تمام ضروریاتِ دین اور واضحات یعنی اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب سماویہ خصوصاً قرآنِ مجید، رسل وغیرہ کو پیغمبر اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تشریحات کے مطابق ماننا، مسلمان کی اس تعریف میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے اور مومن، مسلمان ہونے کا صرف دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے کیونکہ ایمان اور اسلام ایک عملی عہد ہے۔ عیسائیوں کو چاہیئے کہ وہ عیسائیت کی ایسی تعریف پیش کریں جو ان کے تمام فرقوں کو قبول ہو، عیسائیت کی متفقہ تعریف پر عیسائیوں میں بہت بڑا اختلاف ہے، جب ان کے ہاں ابھی تک انجیل کے تعین پر اتفاق نہیں ہے تو اس کی تشریحات پر ان میں کس طرح اتفاق ہو سکے گا۔[1]

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: الایمان وھو تصدیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی جمیع ما جاء بہ عن اللہ تعالیٰ مما علم مجیئہ ضرورۃً۔ وقال ابن عابدینؒ: لما علم بالضرورۃ انہ من دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیث تعلمہ العامۃ من غیر افتقار الی نظر واستدلال کالوحدانیۃ والنبوۃ والبعث والجزاء ووجوب الصلوٰۃ والزکوٰۃ وحرمۃ الخمر ونحوھا۔ الخ
(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۳۱ باب المرتد)

کفّار کا جہنم میں داخل کیے جانے پر اعتراض کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ جہنم کے لیے فنا ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ جس آدمی نے تمام عمر مثلاً ۶۰ سال کفر کیا اس کو اللہ تعالیٰ کیونکر دائمی عذاب دیتا ہے، یہ تو ظلم ہے، جرم کے مطابق سزا ہونی چاہیئے، ایک عالمِ دین سے سُنا ہے کہ آخر میں کافر بھی جنت میں جائیں گے، تو کیا یہ عقائد اہلِ سنت والجماعت کے ہیں یا کسی اور کے؟

الجواب:- اہلِ سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ دوزخ ہمیشہ کے لیے رہے گا اور کفار بھی ہمیشہ کیلئے اس میں رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق خَالِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا[1] کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ کفار کے دوزخ میں ہمیشہ کیلئے رہنے پر عبارۃً دال ہے اور دوزخ دائمی ہونے پر اقتضاءً دال ہے، نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فِی الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ[2]۔ جو کہ دونوں مسائل پر مثلِ سابق کے دال ہے، اور یہ قولِ الٰہی كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ[3] اس مرام پر دال ہے کہ کفار نار سے عادی نہ ہوں گے بلکہ بیشمار سال عذاب بھگتنے کے بعد بھی ان کا حال دخولِ اول جیسا ہوگا۔ ویدل علیه ما اخرجه الطبرانی وجعل لهم الابد وما اخرجه ایضاً خلود بلاموت وما اخرج الشیخان یا اهل النار لا موت وکذا حدیث ذبح الموت۔ واما ما روی عن ابی هریرۃ رضی اللہ عنه وابن مسعود رضی اللہ عنه وغیرهما: "لیاتین علی جهنم زمان لیس فیها احد فقال البغوی ان ثبت فمعناه ان لا یبقی فیها احد من اهل الایمان کذا فی التفسیر المظهری ج ۵ ص ۵۵ سورۃ هود۔ پس یہ عقیدہ رکھنے والا عالمِ دین کہ آخر میں کفار بھی جنت میں جائینگے ضروریات کا منکر ہے، ایسے عالم کو اہلِ کفر اور زیغ کا امام ہونا چاہیئے۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت کریمہ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا[4]۔ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفر پر خاتمہ اُس شخص کا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے متعلق معلوم ہے کہ اگر یہ ابداً زندہ رہے تو ہمیشہ کافر رہے گا۔ پس کفر بھی ابدی ہے اور اس کی سزا بھی ابدی ہے، بالکل ایسے جس طرح حکومت کسی جرم پر کوئی سزا مقرر کرے تو اس جرم کا اقدام اسی سزا کا التزام ہے۔

۱؎ سورۃ البینۃ آیت ۸، پ ۳۰، ع ۱ ۔ ۲؎ سورۃ المائدۃ آیت ۸۰، پ ۶، ع ۱۴

۳؎ سورۃ النساء آیت ۵۶، پ ۵، ع ۵ ۔ ۴؎ سورۃ الانعام آیت ۲۸، پ ۷، ع ۹

"قرآن سے جماع کیا ہوگا" کہنے سے لزومِ کفر کا حکم | سوال :- ایک شخص نے لوگوں کے سامنے یہ کہا کہ "اگر میں نے فلاں برا کام کیا تو نعوذ باللہ قرآن کے ساتھ جماع کیا ہوگا" بعد میں وہ کام اس سے سرزد ہوگیا، اب وہ آدمی روتا ہے اور پشیمان ہے کہ میں نے یہ کفریہ الفاظ کہے ہیں، نہ معلوم اب مجھے کون سا عذاب دیا جائے گا۔ تو کیا یہ شخص واقعی کافر ہوگیا ہے یا نہیں، اور کفارہ دے گا یا نہیں؟

الجواب :- یہ معاملہ یمین کا ہے۔ مثل ان فعلت کذا فانا یہودی لکون جماع المصحف توھینًا وکفرًا۔ پس جب اس شخص نے وہ برا کام کیا تو حانث ہوا، اور اگر اس شخص کا عقیدہ یہ تھا کہ ایسی صورت میں یہ برا کام کرنے والا کافر ہو جاتا ہے تو یہ شخص کافر بھی ہوا ورنہ کافر نہ ہوگا۔ بہر حال یہ شخص توبہ و استغفار کرے، ایمان کی تجدید کرے اور احتیاطاً کفّارہ بھی ادا کرے۔[1]

داڑھی کی توہین کرنے والا کافر ہے | سوال :- داڑھی کی توہین اور بے عزتی کرنے والے کا شرعًا کیا حکم ہے؟ اور مسلمان کو گالی گلوچ کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب :- داڑھی سنت الانبیاء ہے اس لیے داڑھی کی توہین اور بے عزتی کرنے والا آدمی بلا شک و شبہ کافر ہے، نیز استقباحِ سنت کی وجہ سے آدمی کافر

---

[1] لما فی الهندیة : ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی او نصرانی او مجوسی او بریٔ من الاسلام او کافر او یعبد من دون الله او یعبد الصلیب او نحو ذٰلك مما یکون اعتقاده کفرًا فهو یمین استحسانًا کذا فی البدائع - حتی لو فعل ذٰلك الفعل یلزمه الکفّارة وهل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیه - قال شمس الائمة السرخسی رحمه الله والمختار للفتوٰی انه ان کان عنده انه یکفر متی اتی بهذا لشرط ومع هٰذا اتی یصیر کافرًا لرضاه بالکفر .... وان کان عنده انه اذا اتی بهذا الشرط لا یصیر کافرًا لا یکفر الخ - (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۵۴ الباب الثانی فیما یکون یمینًا وما لا یکون یمینًا)

ہو جاتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: او استقباحھا کمن استقبح من آخر۔۔۔الیٰ ان قال ان ما کان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد الاستخفاف۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۳۱۱ مطلب فی منکر الاجماع)

اور گالی گلوچ کرنے والا حدیث کی رو سے فاسق و فاجر ہے۔ ؎۱

اذان اور مؤذن کی توہین کرنے والے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں ایک آدمی مسجد میں اذان دے رہا تھا تو ایک عورت نے کہا کہ یہ تو بکرا بول رہا ہے، اس کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ اذان شعائرِ دین میں سے ہے اس سے استہزاء کفر ہے جبکہ غیر شعائر سے استہزاء کفر نہیں ہے، اور اگر آواز کی قباحت کا اظہار مقصود ہو تو یہ فسق ہے۔

یدل علی الاوّل ما فی رد المحتار ج ۳ ص ۳۱۱ باب المرتد قبیل مطلب فی منکر الاجماع۔ او استقباحھا کمن استقبح من آخر جعل بعض العمامۃ تحت حلقہ او احفاء شاربہ الخ

واما الثانی فلقولہ تعالیٰ: لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ۔ (سورۃ الحجرات آیت ۱۱) ؎۲

"تیرے سبق پر آسمانی بجلی گرے" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ زید کا دس سالہ بچہ قرآن مجید ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتا ہے، زید کی بیوی ہندہ نے کسی وجہ سے غصہ میں آکر بچے کو گالیاں دیں اور یہ بھی کہا کہ "ستا یہ سبق دے تندر پریوزی" یعنی تیرے سبق پر آسمانی بجلی گرے۔ تو کیا اس طرح کہنے سے زید کی بیوی کے نکاح پر کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں، اور اگر کچھ اثر پڑا ہے تو اس کا

؎۱ عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۴۱۱ باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم، الفصل الاوّل)

؎۲ لما فی الھندیۃ: فی التخییر مؤذن اذان فقال رجل "ایں بانگ غوغا است" یکفران قال علی وجہ الانکار۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۲۶۹ منھا ما یتعلق بالصلوٰۃ والصوم) ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۲ احکام المرتدین۔

کفارہ کیا ہے ؟

الجواب :- یہ جاہلانہ غصہ ہے اس میں کفریہ، شرکیہ یا قسمیہ الفاظ نہیں ہیں، لہٰذا اس سے نہ تو ہندہ کا نکاح متاثر ہوا ہے اور نہ کفارہ لازم ہے۔ [1]

فقہ اور اجتہاد کے منکر کا حکم

سوال :- فقہ اور اجتہاد کے منکر کو بعض حضرات مرتد، کافر اور بعض مسلمان کہتے ہیں، لہٰذا اس کے بارے میں شرعی حکم کی وضاحت کریں تاکہ لوگ اصل حقیقت سے واقف ہو سکیں ؟

الجواب :- منکرِ فقہ سے مراد اگر کوئی غیر مقلد ہو تو یہ انکار کفر نہیں ہے، البتہ ایسا شخص اہلِ تقلید کی امامت کا اہل نہیں ہے، اور اگر اس سے مراد منکرِ اجتہاد اور ائمہ کرام کی توہین کرنے والا ہو تو بظاہر اس کو مسلمان کہنا درست اور زیبا نہیں ہے [2]

جنات غیب کا علم نہیں جانتے

سوال :- ہمارے گاؤں میں ایک لڑکے پر جنات کا اثر ہے، یہ لڑکا گذشتہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات و واقعات بتا دیتا ہے، گم شدہ اشیاء کے بارے میں بھی بتا دیتا ہے، پوچھنے والوں کو ان کے ہر سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔ تو کیا واقعی جنات غیب کی خبریں جانتے ہیں ؟

الجواب :- جنات عالم الغیب نہیں ہیں البتہ تیز رفتار ہونے کی وجہ سے جلدی اطلاع دیدیتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر دروغگو ہوتے ہیں، اس لیے ان کے کلام کی تصدیق اور اس کے صدق پر جزم کرنا شرع اور عقل دونوں کے خلاف اور حرام ہے۔

لما ورد فی الحدیث : عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الملائکة تنزل فی العنان وھو السحاب نتذکر الامر قضی

---

[1] وفی الھندیة : وما کان خطأً من الالفاظ ولا یوجب الکفر فقائلہ مومن علی حالہ ولا یؤمر بتجدید النکاح والرجوع عن ذٰلک کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الھندیة ج۲ ص۲۸۳ قبیل الباب العاشر فی البغاة)

[2] وفی الھندیة : رجل قال قیاس ابی حنیفة رحمہ اللہ تعالیٰ حق نیست یکفر کذا فی التاتارخانیة ۔ (الفتاوی الھندیة ج ۲ ص۲۷۱ موجبات الکفر منہا ما یتعلق بالعلم والعلماء)

فی السّماء فتسترق الشیاطین السمع فتسمعه فتوحیه الی الکهان فیکذبون معها مائة کذبة من عند انفسهم۔ (رواہ البخاری)

(مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۳۹۳ باب الکهانة۔ الفصل الاوّل) [1]

حالتِ نزع میں ایمان لانے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ نزع کی حالت میں مسلمان کافر اور کافر مسلمان ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نزع کی حالت میں ایمان لانا عند اللہ مقبول نہیں ہے۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یقبل توبة العبد مالم یغرغر۔

(ابوداؤد ج ص)

اور ایسے وقت میں ایک مسلمان سے کفریہ کلمات کا زبان سے ادا کرنا غیر متصور ہے۔ لانه یشاهد ما کان یؤمن به بالغیب۔ اور ظاہراً ایسے کلمات اگر منہ سے نکل بھی جائیں تو غلبۂ حال کی وجہ سے معاف ہو جائیں گے۔ [2]

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: فان قال هٰذا لقائل انا اخبر باخبار الجن ایای بذٰلك قال هو ومن صدقه یكون كافرًا بالله لقوله علیه السلام من اتی كاهنًا فصدقه فیما قال فقد كفر بما انزل الله علیٰ محمد صلی الله علیه وسلم لایعلم الغیب الّا الله لا الجن والانس یقول الله فی الاخبار عن الجن فلمّا خرّ تبینت الجن ان لو كانوا یعلمون الغیب مالبثوا فی العذاب المهین۔ (فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص ۵۷۶ باب مایكون كفرًا من المسلم ومالا یكون)۔

وَمِثْلُهٗ ردالمحتار ج ۳ ص ۳۲۵ مطلب فی دعوٰی علم الغیب۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: واما ایمان الیاس فمذهب اهل الحق انهٗ لاینفع عند الغرغرة ولاعند معاینة عذاب الاستئصال لقوله تعالیٰ فلم یك ینفعهم ایمانهم لما راٴوا بأسنا ولذا اجمعوا علیٰ كفر فرعون الخ (ردالمحتار حاشیه علی الدرالمختار ج ۳ ص ۳۱۷ مطلب توبة الیاس وایمان الیاس)

ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کا تصوّر مضرِ عقیدہ نہیں

سوال:- مجھے نماز میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق مختلف خیالات کثرت سے آتے ہیں، بچپن میں کسی سے سُنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے اس لیے اکثر اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق نور کی بنی ہوئی لکیر جیسا تصور ذہن میں آتا ہے۔ چند ماہ قبل آسمان پر سبز، سرخ اور زرد رنگ کی بادل جیسی لکیریں دیکھی تھیں، اب یہ چیز نماز میں مجھے سامنے نظر آتی ہے، بعض اوقات کچھ تصاویر بھی ذہن میں آتی ہیں۔ براہ کرم اس بارے میں میری تشفی فرمائیں کہ کہیں کفر میں مُبتلا نہ ہو جاؤں۔

الجواب:- اس قسم کے خیالات کا آنا نہ تو شرک ہے اور نہ گناہ، بلکہ جس طرح ایک مادر زاد اندھا کسی شخص کے متعلق خیالات میں مبتلا ہو آپ کا معاملہ بھی اسی طرح ہے، بہرحال آپ کے ذہن میں ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کے متعلق جو خیالات، تصاویر اور انوار آتے ہیں اُن کے متعلق آپ دل میں یہ عقیدہ رکھیں کہ یہ خدا نہیں ہے ۔

وفی الهندیة: من خطر بقلبه ما یوجب الکفر ان تکلم به وهو کاره لذلك فذلك محض الایمان۔ (الفتاوی الهندیہ ج۲ ص۲۸۳ قبیل الباب العاشر فی البغاة) [۱]

تیری عبادت پر لعنت ہو

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرا بیٹا میرا سخت گستاخ، بے ادب اور نافرمان ہے، کوئی بات بھی کرتا ہوں تو جواب غلط دیتا ہے، اگر کوئی نصیحت کرتا ہوں تو اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ اُلٹا مجھے گالی گلوچ کرتا ہے، ایک دفعہ میں نے اُسے کہا کہ صبح سویرے اٹھا کرو لوگ تمہیں باہر بلانے کے لیے آتے ہیں اور میں اُس وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہوتا ہوں، تمہارے نہ جانے کی وجہ سے مجھے بار بار باہر جانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے میری عبادت میں خلل پڑتا ہے، اِس پر اُس نے کہا "تیری عبادت پر لعنت ہو" برائے مہربانی آپ یہ بتائیں کہ ایسے نافرمان بیٹے کی شرع میں کیا سزا ہے ؟

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: فلا تصح ردة مجنون ومعتوه وموسوس۔ قال ابن عابدینؒ: ولکن موسوس له ادا الیه ای تلقی الیه الوسوسة وقال اللیث الوسوسة حدیث النفس۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ مطلب ما یشك فی انه ردة لا یحکم بها)

الجواب:- یہ الفاظ بہت خطرناک ہیں، ایسے شخص کو فوراً توبہ کرنی چاہیئے اور والد کے نافرمان آخرت میں عذابِ جہنم ہے، اگر توبہ نہ کرے تو دنیا میں اس کو تعزیراً سزا دی جائے گی، مگر تعزیری سزا کا جاری کرنا قاضی یا حکومتِ وقت کا کام ہے عوام کا نہیں۔

مرتد کے دوبارہ مسلمان ہونے کے بعد اس کی سابقہ نیکیوں کا حکم

سوال:- جب کوئی شخص ارتداد کے بعد توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہو جائے تو اس کے سابقہ اعمال کا ثواب اسے دوبارہ واپس ملے گا یا نہیں؟

الجواب:- اسلام سے پھر جانا (مرتد ہونا) ایک سنگین جرم ہے جس کی وجہ سے اس (مرتد ہو جانے والے شخص) کی تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں لیکن اگر وہ شخص تائب ہو کر دوبارہ مسلمان ہو جائے تو اس کے سابقہ نیک اعمال کے اجر کے واپس لوٹنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ابوعلی، ابوہشام اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک اسکی سابقہ نیکیوں کا اجر واپس نہیں لوٹتا ہے اور یہ شخص دوبارہ اس اجر و ثواب کا مستحق نہیں رہتا اور ابوالقاسم الکعبی کے نزدیک اس کے نیک اعمال کا اجر و ثواب واپس لوٹتا ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری ؒ: قیل له: لو تاب أتعود حسناته؟ قال هٰذه المسئلة مختلفة فعند ابی علی وابی هشام واصحابنا انها لاتعود وعند ابی القاسم الکعبی انها تعود ونحن قلنا انهٗ لایعود ما بطل من ثوابه لکنه تعود طاعته المتقدمة مؤثرة فی الثواب من بعد۔

(الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۴۶۱ کتاب احکام المرتدین) [1]

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدین ؒ: فی التاتارخانیة معزیاً الی التتمة قیل لو تاب أتعود حسناته قال هٰذه المسئلة مختلفة فعند ابی علی وابی هشام واصحابنا انهٗ لایعود وعند ابی القاسم الکعبی انها تعود ونحن نقول انهٗ لایعود ما بطل من ثوابه لکنهٗ تعود طاعته المتقدمة مؤثرة فی الثواب۔

(رد المحتار ج۳ ص۳۳۱ باب المرتد، مطلب المعصیة تبقی بعد الردة)

ومثلهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۲۷ باب المرتد۔

نشے کی حالت میں ارتداد کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص نشے کی حالت میں ایسے الفاظ کہے کہ جن سے آدمی مرتد ہو جاتا ہے، تو کیا اس پر ارتداد کا حکم لگایا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- فقہاء کرام نے ارتداد کے لیے عقل کا صحیح ہونا شرط کے درجہ میں قرار دیا ہے، اس لئے اگر کسی آدمی کی عقل نشہ کی وجہ سے ختم ہو چکی ہو اور اسی حالت میں کفریہ الفاظ اس کے منہ سے نکل جائیں تو اس سے وہ مرتد نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے آدمی پر احکام مرتدین جاری کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: وکذلك السکران الذاهب العقل لاتصح ردته استحسانًا والقیاس ان تصح فی الاحکام۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۴ باب المرتد) ¹

ارتدادِ مکرہ کا حکم

سوال:- جب کسی مسلمان کو غیر مسلم کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کریں اور اس مجبوری کے تحت کفریہ کلمہ زبان سے نکال دیا لیکن دل سے کہنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا، تو کیا ایسی صورت میں بھی یہ شخص اسلام سے خارج ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- جبر و اکراہ کی صورت میں کوئی مسلمان دینِ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بشرطیکہ اس کا دل وحدانیتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مطمئن ہو۔ کقوله تعالیٰ: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ۔ (سورۃ النحل آیت ۱۰۶)

ولما قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها الطوع فلا تصح ردة المکره علی الردة استحسانًا اذا کان قلبه مطمئنًا بالایمان والقیاس ان تصح فی احکام الدین وسنذکره وجه القیاس والاستحسان فی کتاب الاکراه ان شاء الله تعالیٰ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۴ فصل فی احکام المرتدین) ²

---

¹ قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: وکذا لاتصح ردة السکران الذاهب العقل۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۱۹ باب المرتد)

ومثله فی ردالمحتار ج۳ ص۳۱۲ مطلب ما یشك فی انه ردة لایحکم بها۔

² قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: ومن شرائط صفة الردة الطوع فلا تصح ردة المکره علیها۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۱۹ باب المرتد)

ومثله فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد۔ مطلب ما یشك فی انه ردة لایحکم بها۔

عورت کے ارتداد کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی مسلمان عورت دینِ اسلام چھوڑ کر مرتد ہوجائے تو اس کو قتل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسلمان عورت جب مرتد ہوجائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے دوبارہ اسلام پر مجبور کیا جائے گا اور اسے قید کردیا جائے گا یہاں تک کہ اسلام لائے یا اسی جیل میں مرجائے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما المرءة فلا یباح دمها اذا ارتدت ولا تقتل عندنا ولکنها تجبر علی الاسلام واجبارها علی الاسلام ان تحبس وتخرج فی کل یوم فتستتاب ویعرض علیها الاسلام فان اسلمت والا حبست ثانیاً هٰکذا الٰی ان تسلم او تموت وذکر الکرخی وزاد علیه وتضرب اسواطاً فی کل مرة تعزیراً لها علیٰ ما فعلت۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۵ فصل احکام المرتدین)[1]

مرتد کو کب قتل کیا جائے گا

سوال:۔ اگر کوئی شخص دینِ اسلام چھوڑ کر دینِ کفر اختیار کرے تو اس کے قتل کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جب کوئی شخص دینِ اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرلے تو افضل طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کو اسلام کی دعوت دی جائے تو اگر وہ اسلام قبول کرلے تو فبہا اور اگر اسلام قبول نہ کرے اور مہلت طلب کرے تو حاکم اُسے تین دن کی دے گا، اگر تین دن میں مسلمان ہوگیا تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کیا جائے گا، اور اگر اسلام بھی قبول نہ کرے اور مہلت بھی نہ مانگے تو اُسی وقت قتل کیا جائے گا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: ومنها انهٗ یستحب ان یستتاب ویعرض علیه الاسلام لاحتمال ان یسلم لکن لا یجب لان الدعوة قد بلغته فان اسلم فمرحباً واهلاً بالاسلام وان ابیٰ نظر الامام فی ذٰلک فان طمع فی توبته

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: لا تقتل المرءة بل تحبس حتیٰ تسلم لنهیه صلی الله علیه وسلم عن قتل النساء۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۲۹ باب المرتد)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۵۴ الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

اوسأل هوالتاجيل اجّلهٗ ثلٰثۃ اَیّامٍ وان لم یطمع فی توبتہ ولم یسئال التاجیل قتلهٗ من ساعتہ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۴ فصل فی احکام المرتدین) [۱]

مُرتد کے مال کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ دینِ اسلام سے مُرتد ہو کر کفر اختیار کرے تو اس کے مال کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کے ورثاء پر مال تقسیم کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی شخص دینِ اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مُرتد ہو جانے سے اس کی مِلک اپنے اموال سے زائل (ختم) ہو جاتی ہے لیکن جب وہ دوبارہ اسلام قبول کرے تو اس کی دوبارہ برقرار ہو جاتی ہے۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک ارتداد اختیار کرنے کے بعد بھی اس کی ملکیت برقرار رہتی ہے اس لیے اس کا مال ورثاء آپس میں تقسیم نہیں کر سکتے، لہٰذا اگر وہ ارتداد کی حالت میں ہی مر گیا یا قتل کیا گیا تو امام صاحبؒ کے نزدیک حالتِ اسلام میں کسب شدہ مال اس کے ورثاء مسلمین کو ملے گا اور حالتِ ردت میں مال فئے کے حکم میں ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک دونوں حالتوں میں کسب شدہ سرمایہ ورثاء مسلمین کو ملے گا۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: قال ویزول ملک المرتد عن امواله بردته زوالاً مراعی فان اسلم عادت الیٰ حالها قالوا هٰذا عند ابی حنیفۃؒ وعندهما لا یزول ملکه لانه مکلّف محتاج فالیٰ ان یقتل یبقی ملکه.... وقال وان مات اوقتل علیٰ ردته انتقل ما اکتسبه فی اسلامه الیٰ ورثته المسلمین وکان ما اکتسبه فی حال ردته فیئاً وهٰذا عند ابی حنیفۃؒ وقالا کلاهما لورثته۔ (الهدایۃ ج ۲ ص ۵۶۶ باب المرتد) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: من ارتد عرض علیه الاسلام استحباباً وتکشف شبهته ویحبس ثلٰثۃ ایام ان استمهل والا قتلهٗ من ساعته۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۳ ص ۳۱۲ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۵ باب المرتد۔

[۲] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ویزول ملک المرتد عن ماله زوالاً موقوفاً فان اسلم عاد ملکه وان مات وقتل علیٰ ردته ورث کسب اسلامه وارثه المسلم بعد قضاء الدین الاسلام وکسب ردته فئ بعد قضاء دین ردته۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۳ ص ۳۲۹ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۶ فصل فی احکام المرتدین۔

سوال :- اگر کوئی شخص **اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے والے کا حکم** یہ عقیدہ رکھے یا یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں جگہ میں موجود ہے اور فلاں جگہ میں نہیں تو کیا یہ شخص اس سے کافر ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اللہ تعالیٰ کی ذات مخلوق کی طرح جسم سے وراء الوریٰ ہے جسے اس دنیا میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ اس میں دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کی طاقت ہے اور نہ کسی عقل میں اس ذات کے بارے میں سوچنے کی استعداد ہے ، یہی وجہ ہے کہ حدیث میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے بارے میں سوچنے سے منع کر دیا گیا ہے ، اس لیے انسانوں کی ذوات پر قیاس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں گفتگو کرنا ضلالت اور گمراہی کا سبب ہے ، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی کیفیت سے مکان ثابت کرنا جو کہ مخلوق کے لیے ثابت ہے تو اس طرح کا عقیدہ رکھنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے ، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے کا مطلب محض اخبار ہو جس طرح قرآن اور احادیث میں متعدد جگہ ثابت ہے تو ایسا کہنے یا عقیدہ رکھنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ : اذا قال: اللہ تعالیٰ فی السماء عالم ان اراد به المکان کفر وان اراد به الحکایة عما جاء فی ظاهر الاخبار لا یکفر وان لم تکن له نیة یکفر عند اکثرهم وفی التخییر وهو الاصح و علیه الفتوی ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۴۶۴ کتاب احکام المرتدین) [۱]

---

[۱] وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ : ویکفر بقوله یجوز ان یفعل اللہ تعالیٰ فعلاً لا حکمة فیه وباثبات المکان للہ تعالیٰ فان قال اللہ فی السماء فان قصد به حکایة ما جاء فی ظاهر الاخبار لا یکفر وان اراد المکان کفر وان لم یکن له نیة کفر عند الاکثر وهو الاصح وعلیه الفتوی ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۲۰ باب المرتد)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۵۹ الباب التاسع فی احکام المرتدین ۔

کفر اختیار کرنے کا مشورہ دینے والا خود کافر ہو جاتا ہے | **سوال**:۔ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو کلمۂ کفر کہنے کا مشورہ دیتے ہوئے اُسے کفر اختیار کرنے کا حکم دیا، تو کیا اس طرح کہنے والا خود کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح بذاتِ خود کفریہ الفاظ کہنے سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح کسی دوسرے کو کلمۂ کفر کی تلقین کرنے اور امر بالکفر کرنے والا بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الدهلویؒ: و فی غرر المعانی لاخلاف بین مشائخنا ان الامر بالکفر کفرٌ ۔ (التاتارخانیة ج ۵ ص۴۶۲ کتاب احکام المرتدین، فصل اجراء کلمة الکفر) [۱]

رضا بالکفر کفر ہے | **سوال**:۔ کسی شخص کا اپنے نفس کے کفر پر رضامندی کا اظہار کرنا کفر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص کے لیے اپنے نفس کے کفر پر اظہارِ رضا کرنا یقیناً اسلام سے خارج ہونے کا سبب ہے جس کی وجہ سے وہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے لہٰذا ایسے شخص کے کفر میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

لما فی الهندیة: ومن رضی بکفر نفسه فقد کفر۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۲۵۷ الباب التاسع فی احکام المرتدین) [۲]

رضا بکفر الغیر کفر ہے یا نہیں | **سوال**:۔ کیا کسی دوسرے کے کفر پر راضی ہونا کفر ہے یا نہیں؟

---

[۱] وقال العلامة ابن عابدینؒ: فی منحة الخالق وفی التاتارخانیة وفی غرر المعانی لاخلاف بین مشائخنا ان الامر بالکفر کفرٌ ۔ (منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج ۵ ص۱۲۴ باب المرتد)

[۲] وقال العلامة عالم بن العلاء الدهلویؒ: ومن رضی بکفر نفسه فقد کفر۔ (التاتارخانیة ج ۵ ص۴۶۲ کتاب احکام المرتدین، فصل فی اجراء کلمة الکفر)

الجواب:۔ کسی غیر کے کفر پر رضامندی کا اظہار کرنا تاکہ وہ عذابِ الٰہی کا مستحق بن جائے تو یہ کفر نہیں البتہ اس نیت سے رضا کا اظہار کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کی ذات وصفات میں نازیبا الفاظ کہے تو اس سے اس کے کفر میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ فی منحة الخالق: وفی النصاب الاصح انہ لا یکفر بالرضا بکفر الغیر وفی شرح السیر ان رضا بکفر الغیر انما یکون کفرًا اذا کان یستخف الکفر ویستحسنہ اما اذا احب الموت او القتل علی الکفر لمن کان شدیدًا موذیًا لطبعہ حتی ینتقم اللہ منہ فھذا لایکون کفرًا وقد عثرنا علی روایة ابی حنیفة رحمہ اللہ ان الرضا بکفر الغیر کفر من غیر تفصیل۔

(منحة الخالق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۴ باب المرتد)[1]

سوال: اللہ تعالیٰ کی طرف یہ نسبت — اللہ تعالیٰ کی طرف کسی کے کفر پر راضی ہونے کی نسبت کرنے کا حکم

کرنا یا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کفر پر راضی ہے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ جس طرح انسان کا خالق ہے اسی طرح اس کے تمام افعال کا بھی خالق ہے لیکن انسان کو اس کے افعال کے بارے میں مجبورِ محض پیدا نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی مرضی کے موافق اس کی قدرت کے مطابق افعال کے کسب کا پورا اختیار بھی دیا ہے افعالِ بد اور نیک افعال میں تمیز اور افعال پر مرتب ہونے والے نتائج کے بیان کرنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا انہوں نے ان تمام افعال کے نتائج سے

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الدھلوی رحمہ اللہ: ومن رضی بکفر غیرہ فقد اختلف المشائخ وفی النصاب الاصح انہ لا یکفر بالرضاء بکفر الغیر وفی غرر المعانی لاخلاف بین مشائخنا ان الامر بالکفر کفر وفی شرح السیر الکبیر مسئلة تدل علی ان الرضا بکفر الغیر لیس بکفر۔ (تاتارخانیة ج۵ ص۴۶۲ کتاب احکام المرتدین، فصل فی اجراء کلمة الکفر)

ومثلہ فی الھندیة ج۲ ص۲۵۷ الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

انسانیت کو خوب آگاہ کیا، اس کے باوجود اگر کوئی شخص افعالِ بد کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی مرضی سے اس فعل کو کرتا ہے اس لیے یہ اس کا ذاتی عمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جبراً کسی کو نہیں روکتا اگرچہ وہ انسان کے اس فعل سے راضی نہ ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف یہ نسبت کرنا یا یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ کسی کے کفر پر راضی ہے موجبِ کفر ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ویکفر ان اعتقد ان اللہ تعالیٰ یرضیٰ بالکفر۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۲۰ باب المرتد) [1]

اللہ تعالیٰ کی طرف عجز کی نسبت کرنے کا حکم

سوال:۔ اللہ تعالیٰ کی طرف عجز کی نسبت کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ جو کہ قادرِ مطلق ذات ہے، اس کا دستِ قدرت تمام مخلوق اور کائنات پر حاوی ہے اور جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرفات کرتا ہے، جس طرح تمام کائنات اور مخلوقات کی تخلیق اور عدم سے وجود لانے میں کسی سے کوئی مدد نہیں لی اسی طرح مخلوق اور کائنات کا نظام چلانے میں بھی کسی کی مدد کا محتاج نہیں، اس لیے کسی بھی فعل میں اس کی طرف عجز کی نسبت کرنا موجبِ کفر ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الدھلوی رحمہ اللہ: وفی خزانۃ الفقہ و لو قال للہ تعالیٰ شریک او ولد او زوجۃ او ھو جاھلٌ او عاجز او نقص بذاتہ او صفاتہ کفر۔ (تاتارخانیۃ ج۵ ص۴٦۳ کتاب احکام المرتدین) [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زنا کی نسبت کرنیوالے کا حکم

سوال:۔ جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ

---

[1] وفی الھندیۃ: ویکفر ان اعتقد ان اللہ تعالیٰ یرضیٰ بالکفر کذا فی البحر۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۵۸ الباب التاسع فی احکام المرتدین)

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: فیکفر اذا وصف اللہ بما لا یلیق بہ او سخر باسم من اسمائہ او بامر من اوامرہ او انکر وعدہ او وعیدہ او جعل لہ شریکاً او ولداً او زوجۃً او نسبہ الی الجھل او العجز او النقص۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۲۰ باب المرتد)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۵۸ الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

کی طرف زنا کی نسبت کرتے ہیں تو کیا وہ کافر ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جوکہ تمام مسلمانوں کی ماں ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہیں جن کی برأت پر قرآنِ پاک ناطق ہے جو آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کے عظیم ہونے کی واضح دلیل ہے اور ان کی برأتِ قطعی ہے، لہٰذا اُن کی طرف زنا کی نسبت کرنا نہ صرف یہ کہ قرآن کریم سے واضح انکار ہے بلکہ انسانی غیرت کے بھی خلاف ہے اس لیے ان کی طرف زنا کی نسبت کرنے والا نہ صرف کافر بلکہ انسانیت کے دائرہ سے بھی خارج ہے ۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ : و فی خزانۃ الفقہ لو قذف عائشۃ رضی اللہ عنہا کفر باللہ تعالیٰ ولو قذف سائر نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یکفر و یستحق اللعنۃ ۔ (التاتارخانیۃ ج ۵ ص۴۸۵ کتاب احکام المرتدین فصل فیما یعود الی الانبیاء) [1]

اللہ تعالیٰ کے بعض افعال میں حکمت سے انکار کرنے والے کا حکم

سوال:۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسے افعال بھی صادر ہوتے ہیں جن میں (نعوذ باللہ) کوئی حکمت نہیں ہوتی، تو ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ ایسی ذات ہے جو کہ خالقِ کائنات، قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہے کائنات کا کوئی ذرہ بھی اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں، بحیثیتِ انسان جو شخص بھی ادنیٰ درجہ کی عقل رکھتا ہو وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ سے کسی ایسے فعل کا صدور بھی ہو سکتا ہے جو کہ حکمت سے خالی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکیم ہونا ایک بدیہی امر ہے اس کا کوئی فعل بھی حکمت سے خالی نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کافی جگہ اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کا صراحتاً ذکر آیا ہے، فقہاء کرام کی تصریحات

---

[1] وفی الھندیۃ: ولو قذف عائشۃ رضی اللہ عنہا بالزنا کفر باللہ تعالیٰ ولو قذف سائر نسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یکفر و یستحق اللعنۃ ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۶۴ الباب التاسع فی احکام المرتدین)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۳ ص۳۲۱ باب المرتد ۔

کے مطابق جو شخص بھی یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے افعال بھی ثابت ہیں جو کہ حکمت سے خالی ہیں تو وہ شخص کافر ہے۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ : رجل قال یجوز ان یفعل اللہ تعالیٰ فعلاً لاحکمۃ فیہ یکفر لانہ وصف اللہ تعالیٰ بالسفہ وھو کفر۔
(تاتارخانیۃ ج۵ ص۴۶۳ کتاب احکام المرتدین) [1]

ارتداد سے نکاح فوراً ختم ہوجاتا ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص مرتد ہوجائے تو اس کے نکاح کا کیا حکم ہے، کیا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوجائے گی یا قضاء قاضی کی ضرورت ہوگی؟

الجواب:۔ ارتداد ایک ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے فوراً بلا قضاء قاضی کے نکاح ختم ہوجاتا ہے، مرتد کی بیوی پر لازم ہے کہ وہ بلا تاخیر شوہر سے جدا ہوجائے تاہم اگر مرد دوبارہ مسلمان ہوجائے تو تجدیدِ نکاح کرنا ضروری ہوگا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : وارتداد احدھما فسخ عاجل بلا قضاء۔ قال ابن عابدینؒ ای بلا توقف علیٰ قضاء القاضی وقضاء بلا توقف علی مضی عدۃ فی المدخول بھا کما فی البحر۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۲۵ باب نکاح الکافر) [2]

◇◇

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ : ویکفر بقولہ یجوز ان یفعل اللہ فعلاً لاحکمۃ فیہ۔
(البحرالرائق ج۵ ص۱۲۰ باب المرتد)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۵۸ الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ : ارتداد احدھما فسخ فی الحال یعنی فلایتوقف علیٰ مضی ثلاثۃ قروء فی المدخول بھا ولا علیٰ قضاء القاضی لان وجود المنافی یوجبہ کالمحرمیۃ بخلاف لانہ غیر مناف للعصمۃ۔
(البحرالرائق ج۳ ص۲۱۴ باب نکاح الکافر)

آسمان کے وجود سے انکار

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! بعض "تعلیمیافتہ" لوگوں سے سُنا ہے کہ آسمان کا اپنا کوئی وجود نہیں اور یہ جو نیلگوں چھت ہمیں دکھائی دیتا ہے یہ وہ خلاء ہے جو سیاہی اور سورج کی روشنی مخلوط ہو کر ایسا رنگ اختیار کر گیا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی آسمان کا اپنا کوئی وجود نہیں، اگر نہیں تو قرآن وسنت میں جس آسمان (السماء، السمٰوٰت) کا ذکر آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

الجواب:۔ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید اُس ذات کی کتاب ہے جس نے تمام عالم کو پیدا کیا اور کارخانۂ عالم کے تمام پُرزے اور ان میں جو خاصیت اور قوّت رکھی گئی ہے صرف اُس ذات کے علم میں ہے، تو ایسی ذات کے کلام کا ایسے امور پر مشتمل ہونا ناممکن ہے جو واقعات اور حقائق کے مخالف ہوں۔ اسی بناء پر یہ ناممکن ہے کہ قرآن اور سائنس کی صحیح تحقیقات میں تضاد اور مخالفت ہو، سائنس کی تحقیقات قرآن کے مخالف اور متضاد معلوم ہوں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مخلوق سے اس میں کوئی غلطی ہوتی ہے۔ خالق اور مالکِ حقیقی کی اپنے بنائے ہوئے کارخانہ کے بارہ میں بدگمانی ناممکن ہے۔ تو ایسی رسمی تحقیقات میں اگر لوگ نظرِثانی اور مکمل تحقیق کریں اور صرف تخمینہ اور اندازہ سے کام نہ لیں تو ضرور اپنے نظریہ کا غلط ہونا ان پر منکشف ہو جائے، ہر مسلمان کو یہ طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

موجودہ دور میں سائنسدانوں نے ایسے ایسے عجیب وغریب نظریات دُنیا کے سامنے پیش کیے ہیں کہ غیر مسلم تو درکنار بعض مسلمان بھی ان سے متاثر اور مرعوب نظر آتے ہیں جو آنکھیں بند کر کے سائنسدانوں کے ہر نظریہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں حالانکہ اندھی تقلید کرنا اور بلادلیل کسی سے مرعوب ہونا نہ عقل کا تقاضا ہے اور نہ شرع کا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عقول میں تفاوت پیدا کیا ہے، کسی کی عقل کمزور اور نارسیدہ ہے اور کسی کی قوی اور دُوررس، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ سائنسدانوں کے نظریات جُدا تھے اور موجودہ زمانہ کے سائنسدانوں کے نظریات الگ ہیں، ایک سائنسدان کا نظریہ الگ ہوتا ہے تو دوسرے کا الگ، بلکہ بسااوقات ایک شخص ایک وقت میں ایک نظریہ رکھتا ہے تو دوسرے وقت میں اپنی تحقیق اور نظریہ سے رجوع کر لیتا ہے۔ تو جب عقل کا یہ حال ہے تو کسی کے نظریات سے بلا دلیل مرعوب ہونا اور اس کی اندھی تقلید کرنا سراسر غلط اور خلافِ عقل ہے بلکہ اس کی دلیل پر غور کرنے کے بعد

کوئی رائے قائم کرنا ہی صحیح طریقہ کار ہے۔

وہ دلائل جن کے ذریعہ ہم کسی چیز کے متعلق یقین حاصل کرتے ہیں تین ہیں:۔

(۱) اوّل حواسِ خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، شامہ، لامسہ، ذائقہ ہیں جن کے ذریعہ ہم محسوسات پر علم اور یقین حاصل کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ حواس صحیح ہوں آفت رسیدہ نہ ہوں۔ تو احول (بھینگے شخص) کو ایک چیز کا دو محسوس ہونا اور صفراوی مزاج والے کو میٹھی چیز کا تلخ محسوس ہونا چونکہ خارجی آفت کی وجہ سے ہے تو یہ غلطی حواس کے ذرائع یقین ہونے میں ہرگز خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری دلیل عقل ہے جس کے ذریعے ہم ایک غیر محسوس چیز پر یقین کر سکتے ہیں اور جہاں حواس کا کام ختم ہو جاتا ہے وہاں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم دھواں دیکھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ ہمیں آگ نظر نہیں آ رہی ہوتی ہمارا سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ یہاں آگ موجود ہے، اور جب ہم خاک کا اُڑنا اور درختوں کے پتوں کا ہلنا دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہوا موجود ہے اور اس کا بھی کوئی وجود ہے، اسی طرح جب ہم چاند کا گھٹنا بڑھنا دیکھتے ہیں تو ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ چاند کی روشنی سورج سے حاصل ہے۔

(۳) تیسری دلیل کسی معتمد شخص کی اطلاع اور اخبار ہے جس کے ذریعے ہم ان چیزوں پر علم حاصل کرتے ہیں جن کی پہچان سے حواس اور عقل عاجز ہوں۔ مثلاً ایک شخص نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نہیں دیکھا لیکن ان شہروں کے وجود پر اس کو پورا یقین ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ صرف عقل نے اپنے پر کفایت کی ہے بلکہ ایسے معتمد اطلاعات کی وجہ سے یہ یقین اور علم حاصل ہوا ہے ـــــ اور ایک اندھا شخص جو کہ نہ تو کنواں اور سانپ دیکھ سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعے اُسے یہ معرفت حاصل ہو سکتی ہے، تو اس کے لیے ایک معتمد شخص کی اطلاع ہی واحد ذریعہ ہے جس سے وہ یقین حاصل کر سکتا ہے، اور اندھے کا یہ کہنا کہ جب تک میری سمجھ میں نہ آئے کہ یہ سانپ اور کنواں ہے تو میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں، یہ سراسر اس کی بیوقوفی ہوگی۔

بسا اوقات بعض لوگ کسی چیز کے وجود سے صرف اس وجہ سے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ چیز نہ ہم نے دیکھی ہے اور نہ ہماری سمجھ میں آتی ہے، مختصر یہ کہ ہمیں اس کے وجود پر کوئی دلیل معلوم نہیں لہٰذا یہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کسی چیز کے وجود کا انکار کرنا غلط ہے، کیونکہ کسی کی بے علمی سے یہ لازم نہیں آتا کہ اور لوگوں کو بھی اس چیز کے وجود کا علم اور خبر نہ ہو۔ مثلاً

ایک عامی اس سے انکار کرے کہ چاند اپنی روشنی سورج سے حاصل کرتا ہے اور یہ کہے کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تو چونکہ اوروں کو دلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ چاند اپنی روشنی سورج سے حاصل کرتا ہے لہٰذا پہلی بات قابلِ سماعت نہ ہوگی۔

موجودہ دور کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ نیلگوں چیز جو نظر آتی ہے یہ انسان کی حدِ نگاہ ہے ــــ مگر یہ سراسر غلط ہے کیونکہ قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آسمان کا ایک مضبوط رنگدار وجود ہے جس میں دروازے بھی ہیں۔ اور بعض آثار و روایات میں تو ہر ایک آسمان کا مادہ بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ آسمان زمین سے پانچسو سال کی مسافت پر دُور ہے، اور اگر تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی مسافت ہو تو ایک کروڑ اُنتیس لاکھ ساٹھ ہزار میل تقریباً بنتے ہیں ــــ اور رنگ کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نیلا ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ سُرخ ہے لیکن دُوری اور فاصلہ کی وجہ سے نیلا دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ رگ میں خون پردہ کی وجہ سے اور سُرخ پہاڑ دوری کی وجہ سے نیلگوں نظر آتا ہے، البتہ قیامت کے دن آسمان کا اصلی رنگ دکھائی دے گا، یا نظر کے تیز ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس دن تمام حقائق منکشف ہوں گے ــــ جس کا فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (سورۃ الرحمٰن آیت ۳۷) میں ارشاد کیا گیا ہے۔

قرآن و حدیث کے دلائلِ حقہ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے آسمان کو حدِ نگاہ خیال کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہے ــــ ایک اندھا آدمی جسے کوئی چیز نظر نہ آتی ہو اُسے کسی دُور پڑی ہوئی چیز کے وجود کے بارے میں ایک عام آدمی سنجیدگی سے بتا دے تو وہ فوراً یقین کر لیتا ہے حالانکہ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا ــــ اور ہمارے پاس آسمان کے وجود کے بارے میں ایک معتمد ذات (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطلاعات، اخبارات اور مشاہدات موجود ہوں اور پھر بھی، ہم آسمان کو حدِ نگاہ کہیں تو یہ کس قدر عجیب بات ہے ــــ اگر ایک سائنسدان کا مشاہدہ یا اطلاع تسلیم کی جا سکتی ہے تو کیا ایک مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی کوئی اطلاع قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی؟

واللہ اعلم بالصواب

قرآنِ کریم کی بے ادبی کرنے والے کا شرعی حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے اپنے گھر میں ساس کی موجودگی میں بیوی سے کسی بات پر جھگڑا کیا جبکہ اس وقت اسکی بیوی قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہی تھی اُس نے خاوند سے کہا کہ گھر آئے ہوئے کسی کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیئے، اتنی سی بات پر خاوند نے بیوی سے قرآنِ مجید چھین کر پھاڑ دیا اور پھر کپڑے میں باندھ کر پانی میں ڈال دیا۔ ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں بظاہر اس شخص نے قرآنِ مجید کی بے ادبی اور بحرمتی کی ہے لہٰذا اس شخص کے لیے تجدیدِ ایمان ونکاح ضروری ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد۳ ص۳۴۳ باب چہارم، احکام المرتد)

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی المسائرة وبالجملة فقد ضم الی التصدیق بالقلب اوبالقلب واللسان فی تحقیق الایمان امورٌ الاخلال بها اخلالٌ بالایمان اتفاقاً کترك السجود لصنم وقتل نبی والاستخفاف به وبالمصحف والکعبة الخ

(ردالمحتار ج۳ ص۳۱ باب المرتد) [1]

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور اسلامی نقطۂ نظر

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! "ڈیسنٹ آف مین فام" نامی کتاب میں "ڈارون کا نظریۂ ارتقاء" کے عنوان سے یوں مذکور ہے کہ ابتدائے دنیا کی تمام مخلوق اصل فطرت میں ایک تھی جس سے ترقی کر کے یہ مختلف نوعیں پیدا ہوئیں اور انسان اس فطری رفتار کا آخری مرحلہ ہے، یعنی انسان دفعتہً پیدا نہیں ہوا بلکہ چند مرحلوں سے گذر کر اپنی اس آخری منزل تک پہنچا ہے مثلاً جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوان اور پھر حیوان سے انسان بنا۔ آپ اسلامی نقطۂ نظر اور دلائل کی رُو سے اس نظریہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ ڈارون کا یہ نظریہ کہ انسان پہلے نباتات پھر حیوان (بندر) تھا پھر انسان بنا، سراسر غلط اور نصوصِ شرعیہ کے خلاف ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں

---

[1] وفی البزازیة: ادخال آیة القرآن فی المزاح والدعابة کفرلانه استخفاف به الخ

(الفتاویٰ البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۳۸ کتاب الفاظ تکون اسلاماً الخ)

یں اس نظریہ کی وضاحت کچھ اس طرح ہے :۔

قرآن مجید سے دلائل

(۱) قال اللّٰہ تعالیٰ : فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ ۔ (سورۃ الحجرات ۲۹)

(۲) وَخَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ (سورۃ الرحمٰن ۱۴)

(۳) قَالَ ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ (سورۃ بنی اسرائیل ۶۱)

(۴) وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ (سورۃ البقرۃ ۳۰)

(۵) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيْسَ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۔
(سورۃ البقرۃ ۳۴)

(۶) وَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا (سورۃ البقرۃ آیت ۳۵)

(۷) وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ ۝
(سورۃ البقرۃ ۳۶)

(۸) ان مثل عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خلقه مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝
(سورۃ آل عمران آیت ۵۹)

(۹) قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ۝ (سورۃ الاعراف آیت ۱۲)

(۱۰) قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ ۝
(سورۃ الاعراف آیت ۲۴)

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دلائل

(۱) عن ابی هریرة رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال خلق اللہ آدم و طوله ستون ذراعاً ثم قال اذهب فسلم علی اولئك من الملٰئکة ۔
(الصحیح البخاری ج ۱ ص ۴۶۸ پارہ ۱۳ کتاب بدء الخلق، باب قول اللہ تعالیٰ : و اذ قال ربك ۔ الآیۃ)

(۲) عن انس رضی اللہ عنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لما صور اللہ آدم فی الجنة ترکه ما شاء اللہ ان یترکه فجعل ابلیس یطیف به ینظر ما هو فلما رأٰه اجوف عرف انه خلق خلقاً لا یتمالك ۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۰۶ باب بدء الخلق ۔ الفصل الاول)

(۳) عن ابی هریرة رضی اللہ عنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال کان طول آدم

ستين ذراعًا في سبع اذرع عرضًا۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص۵۱۱ الفصل الثالث۔ باب بدء الخلق)

(۴) عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ مرفوعًا ان اللہ خلق آدم من قبضۃ قبضها من جمیع الارض فجاء بنو آدم علی قدر الارض منھم الاحمر والابیض الخ

(جلالین شریف ج ۱ ص۸ حاشیہ ع۱)

(۵) عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہ قال کان ابلیس من حیٍّ من احیاء الملٰئکۃ الی قولہ قال ثم امر بتربۃ آدم فرفعت فخلق اللہ آدم من طینٍ لازب واللازب اللازج الطیب من حمإٍ مسنونٍ منتن وانما کان حمإٍ مسنونًا بعد التراب فخلق منہ آدم بیدہٖ قال فمکث اربعین لیلۃ جسدًا ملقیً وکان ابلیس یاتیہ فیضربہ برجلہ فیصلصل فیصوت فھو قول اللہ تعالیٰ (من صلصالٍ کالفخار) یقول کالشئ المنفرج الذی لیس بمصمت قال ثم یدخل فی فیہ ویخرج من دبرہٖ ویدخل من دبرہ ویخرج من فیہ ثم یقول لست شیئًا لصلصلۃ ولشیءٍ ما خلقت ولئن سلطت علیک لاھلکنک ولئن سلطت علی لاعصینک قال فلما نفخ اللہ فیہ من روحہ اتت النفخۃ من قبل رأسہ فجعل لا یجری شئ منھا فی جسدہ الاصار لحمًا ودمًا فلما انتھت النفخۃ الی سرتہ نظر الی جسدہ فاعجبہ ما رأی من جسدہ فذھب لینھض فلم یقدر فھو قول اللہ تعالیٰ (وخلق الانسان عجولًا) قال ضجرًا لا صبر لہٗ علی سراء ولا ضراء قال فلما تمت النفخۃ فی جسدہ عطس فقال (الحمد للہ رب العلمین) بالھام اللہ فقال اللہ لہٗ (یرحمک اللہ یا آدم) قال ثم قال تعالیٰ للملٰئکۃ الذین کانوا مع ابلیس خاصۃ دون الملٰئکۃ الذین فی السمٰوٰت اسجدوا لآدم فسجدوا کلھم اجمعون الا ابلیس ابی واستکبر لما کان حدث نفسہ من الکبر والاغترار فقال لا اسجد لہٗ وانا خیر منہ واکبر سنًا واقوی خلقًا خلقتنی من نارٍ وخلقتہٗ من طینٍ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص۷۵)

مندرجہ بالا تمام دلائل سے معلوم ہوگیا کہ حضرت انسان ابتداء آفرینش سے کامل اور مکمل پیدا ہوا اور صاحب عقل بھی تھا کیونکہ اول روز ہی سے اللہ تعالیٰ نے اسے عالم و مکلف بالاحکام ٹھہرایا نہ کہ جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوان اور حیوان سے انسان بنایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تراب کے بعد کُن فیکون کے صیغے استعمال کیے ہیں جو کہ دفعۃً پر بغیر تدریج کے دلالت کرتے ہیں۔

زلیخا کو زانیہ وغیرہ کہنا

سوال :- اگر کوئی شخص زلیخا کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کرے کہ وہ زانیہ اور فاحشہ عورت تھی تو اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ مسلمان رہ سکتا ہے؟ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہے؟ اس کی شہادت اسلام میں قبول ہو سکتی ہے؟ اور کیا اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاسکتا ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :- چونکہ قرآن و حدیث میں امراۃ العزیز کے متعلق نہ تو یہ آیا ہے کہ اس کا نام زلیخا تھا اور نہ یہ کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آئی تھی - اس لیے محض اسرائیلیات کی وجہ سے ایسے شخص کو اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا خصوصاً جبکہ غلبہ حال کی وجہ سے حلت و حُرمت سے ذہن خالی ہو -

عبادت راته وغئ کلمۂ کفر نہیں

سوال :- ایک دیندار شخص مسجد میں اللہ کی عبادت کر کے فارغ ہو کر جب گھر آیا تو کسی بات پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا تو غصے کی حالت میں اس کی زبان سے پشتو کے یہ الفاظ نکل گئے "چه مونږ ه یه جماعت کښې څه عبادت ووکوچه کور ته راشو هغه هر څه تا سو راته وغئ" (مسجد میں عبادت کر کے جب گھر آتا ہوں تو سب کچھ تم بھول دیتی ہو) تو کیا اس شخص کا یہ کہنا کلمۂ کفر تو نہیں؟ اور اس سے یہ آدمی کافر بن جائے گا یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ ظاہری لحاظ سے مذکورہ الفاظ درست نہیں ہیں مگر پشتو زبان کے محاورہ میں کسی چیز کو برباد کرنے اور اس کو لغو کرنے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتے ہیں لیکن ان سے کسی چیز کی تحقیر و توہین مقصود نہیں ہوتی - اور ویسے بھی جن الفاظ کے مختلف مطالب اور معانی ہوں تو اصولِ افتاء کے مطابق ان کے اسلامی معانی اور مطلب کو ترجیح دی جائے گی تاکہ ایک مسلمان فتویٰ کفر سے بچ سکے - لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ دیندار شخص مسلمان ہے اس پر کفر کا کوئی شک و شبہ نہ کیا جائے - تاہم کسی بھی مسلمان کو اس قسم کے ذووجہین الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز ہی کرنی چاہیئے جس کی وجہ سے اسلام پر حرف آنے کا اندیشہ ہو -

هٰكذا فی عقود رسم المفتی ص۸۰ -

واللہ اعلم وعلمہ اتم

اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ "خدا" استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ جماعت المسلمین فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ "خدا" استعمال کرنے کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ "خدا" کا استعمال ناجائز و حرام ہے؟

الجواب:۔ "خدا" فارسی زبان کا لفظ ہے جو کہ لفظ اللہ کے قائم مقام ہے اور شرعاً اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بھی زبان کا ہر وہ لفظ استعمال کرنا جائز ہے جو واجب الوجود القدیم کے مترادف ہو۔

لما قال العلامۃ عبد العزیز فرھاروی: واذا اورد الشرع باطلاق اسم بلغۃ کلفظ اللہ فھواذن باطلاق ما یرادفہ من تلک اللغۃ کالواجب والقدیم او من لغۃ اخری کاسم خدا بالفارسیۃ۔ (النبراس ص۱۱۲ صفات اللہ تعالیٰ)

داڑھی کو بکری کی دم کہنے والے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک شخص نے ہمارے سامنے ایک داڑھی والے شخص سے کہا کہ تم نے کیا بکری کی دم کی طرح داڑھی رکھی ہوئی ہے اور ساتھ ہی خوب زور سے قہقہہ بھی لگایا، تو کیا اس طرح کہنے سے اس آدمی کا ایمان ختم ہوا یا نہیں؟ اور اس کے نکاح و دیگر اعمال کا کیا معاملہ ہوگا؟ ازراہ کرم تفصیل سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ ایک مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا سنتِ مؤکدہ بلکہ واجب ہے، اس کے ساتھ مذاق کرنا شعائر اللہ کے ساتھ مذاق کے مترادف ہے جو کہ شرعاً حرام و ناجائز ہے اور ایسا کرنے والے شخص کے ایمان سے نکلنے کا خطرہ ہے، لیکن پھر بھی اس کا نکاح ختم ہو جائے گا اور نیک اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے، ایسے شخص کیلئے تجدیدِ نکاح کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ووجھہ ان السنۃ احد الاحکام الشرعیۃ المتفق علی مشروعیتھا عند علماء الدین فاذا انکر ذلک ولم یرھا شیئاً ثابتاً و معتبراً فی الدین یکون قد استخف بھا واستھانھا وذلک کفر۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: اذا اراد ان یتکلم بکلمتہ مباحتہ فجری علی لسانہ کلمۃ الکفر خطأً بلا قصد لایصدقہ القاضی وان کان لا یکفر فیما بینہ وبین ربہ تعالیٰ..... ان ما یکون کفراً اتفاقاً یبطل العمل والنکاح وما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ وتجدید النکاح۔ (رد المحتار ج ۳ ص۳۱۶)

کسی بھی نبی کی اشارۃً یعنی فرضی کہانی سے توہین کرنا کفر ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ "میری نئی کتاب" برائے جماعت دوم پشتو ذریعہ تعلیم راہنمائے اساتذہ (این، ڈبلیو، ایف، پی ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور) میں صفحہ ۱۷۱ پر ایک کہانی بعنوان "ابوقاسم اور اس کے گدھے" تحریر ہے جس سے کسی شخص کی تذلیل وتحقیر ثابت ہوتی ہے۔ اس فرضی کہانی میں ابوقاسم اور موسیٰ کا نام استعمال ہوا ہے۔ تو کیا ابوقاسم نام کسی تذلیل آمیز کہانی میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(نوٹ) کہانی کی ایک عدد فوٹو کاپی لف ہذا ہے۔

الجواب:۔ ابوالقاسم یا ابوقاسم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت مبارکہ ہے۔ احادیث میں اس نام کی کنیت رکھنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: عن ابی ھریرۃؓ قال قال ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سموا باسمی ولا تکتنوا بکنیتی ۔ (عمدۃ القاری (۲۲/۷: ۲)۔ (ترجمہ) "حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے نام کی طرح نام رکھو لیکن میری کنیت کی طرح کنیت نہ رکھو"۔

اس لیے امام شافعی رحمہ اللہ نے مطلقاً ابوالقاسم کنیت رکھنے کو ناجائز کہا ہے۔

چنانچہ امام ابن حجر عسقلانیؒ امام نوویؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں: الاول المنع مطلقاً سواء کان اسمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ام لا ثبت ذلک عن الشافعیؒ۔ (فتح الباری ج۱۰ ص۴۷۲) (ترجمہ) "اول مذہب یہ ہے کہ اس طرح کی کنیت مطلقاً منع ہے چاہے کسی کا نام محمد ہو یا نہ ہو اور یہ امام شافعیؒ سے ثابت ہے"۔ اگرچہ اس کے جواز میں اور اقوال بھی پائے جاتے ہیں مگر یہ اقوال صرف نفس کنیت تک محدود ہیں۔ اور اگر اس کنیت کی تذلیل وتحقیر مقصود ہو یا اس میں تذلیل کا کوئی شبہ بھی ہو تو اس قسم کے اسماء یا الفاظ استعمال کرنا بنص قرآنی جائز نہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (سورۃ البقرہ آیت ۱۰۴) ۔ ترجمہ "اے ایمان والو! تم راعنا نہ کہو بلکہ انظرنا کہو اور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: فی ھذہ الآیۃ دلیلان: احدھما علیٰ تجنب الالفاظ المتحملۃ التی فیھا التعریض للتنقیص والغض۔ (تفسیر احکام القرآن للقرطبیؒ ج۲ ص۵۷)۔ (ترجمہ) "اس آیت میں دو دلیلیں ہیں:

ایک تو ایسے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے جو تنقیص کی طرف مشیر ہوں ؛"
اسی طرح علامہ ابو بکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : و ھٰذا یدل علیٰ ان کل لفظ احتمل الخیر والشر فغیر جائز اطلاقہ حتٰی یقید بما یفید الخیر۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص۷۲)۔ (ترجمہ) "یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ہر وہ لفظ جو خیر و شر دونوں کو متحمل ہو اس کا مطلقاً استعمال جائز نہیں؛ یہاں تک کہ اس کو خیر کے ساتھ مقید کیا جائے ۔"

چنانچہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں ایسے الفاظ کے استعمال سے منع فرما رہے ہیں جو تنقیصِ نبی کے متحمل ہوں متکلم کی مراد چاہے کچھ بھی ہو۔
چونکہ استفتاء کے ساتھ اصل کتاب کے لف شدہ صفحات کے مطالعہ سے خوب وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی لابی نے یہ فرضی کہانی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کے لیے بنائی ہے جس پر مندرجہ ذیل امور دلالت کرتے ہیں :

(۱) ابو قاسم کے نام کا استعمال جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ہے ۔

(۲) ان کے دوست موسیٰ کا ملنا ، چونکہ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر فوقیت حاصل ہے ، تو موسیٰ (جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام ہے) کو ابو قاسم (جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیتِ مبارکہ ہے) کے مقابلے میں لانا اس عقیدہ کی غمازی کرتا ہے ۔ اور پھر اس کہانی میں موسیٰ کو عقل و فراست میں ابو قاسم پر ترجیح دینا اور ابو قاسم کو موسیٰ کے مقابلے میں حقیر ثابت کرنا اس نظریہ کی واشگاف کرتی ہے ۔

(۳) اسی طرح ۹ کی تعداد بھی اس بات کی غماز ہے کہ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہیں ، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس وقت وصال ہوا تھا اُس وقت آپؐ کی ۹ بیبیاں حیات تھیں

(۴) پھر گدھوں کا تعین بھی اس بات کی طرف مشیر ہے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر گدھے پر سوار تھے ۔

(۵) پھر تصویر میں ابو قاسم کا پگڑی پہننا جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ ہے ، اس اس خلافِ شرع نظریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

(۶) پھر ترتیب اور نظرِ ثانی بھی ایک غیر مسلم مسٹر بمربنڈا ایین روز دایڈ وائنز مٹیریل ڈویلپمنٹ نے کی ہے۔

ورنہ وہ ان ناموں کے علاوہ اور نام بھی استعمال کرسکتے تھے لہٰذا اس کہانی میں ان ناموں یا ایسے ناموں کو جن کے ذریعہ کسی بھی پیغمبر کی ذات کی تذلیل وتحقیر مقصود ہو لکا استعمال جائز نہیں ۔ اب اگر ان ناموں کے استعمال سے متکلم کی مراد کسی رسول کی تذلیل مقصود ہو تو وہ شخص خارج عن الاسلام ہے، اور اگر تذلیل مقصود نہ بھی ہو مگر شبہ تذلیل مسمی ضرور ہے جس سے بچنا ہر مسلمان کا فریضۂ منصبی ہے۔ لہٰذا وزارتِ تعلیم کے اربابِ اختیار کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب سے ان ناموں کو نکال دے اور اُن جگہ کوئی اور نام تجویز کریں اور ساتھ تصویر سے عمامہ اور داڑھی کو بھی ختم کریں تاکہ اس سے شعائر اسلامی (پگڑی اور داڑھی) کی تذلیل وتحقیر نہ ہوسکے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

"نماز تو گدھے اور کتے پڑھتے ہیں"۔ کہنے کا حکم

سوال:۔ ایک صاحب نے نہ تو کبھی نماز پڑھی ہے اور نہ کبھی مسجد کا رُخ کیا ہے، ایک تبلیغی دوست نے اُسے نماز پڑھنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ "نماز تو گدھے اور کتے پڑھتے ہیں، جاؤ میں نماز نہیں پڑھتا"، تو کیا یہ شخص اسلام سے خارج ہے یا نہیں؟ اسکے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز شعائرِ اسلام میں سے ہے، اسکی توہین کرنا خروج عن الاسلام کا سبب ہے لہٰذا بظاہر اس شخص کے اِن الفاظ سے نماز کی توہین معلوم ہوتی ہے جس کی بناء پر موصوف اسلام سے خارج ہو چکا ہے، اس کے لیے تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح ضروری ہے، تاہم اگر اس شخص کے ان الفاظ سے نماز کی توہین مقصود نہ ہو بلکہ ناسمجھی یا کسی اور مقصد کی وجہ سے کہے تو اگرچہ اسلام سے تو خارج نہیں ہُوا البتہ ان الفاظ سے گنہگار ضرور ہُوا ہے۔

لما قال العلامۃ مفتی عبدالرحیم:۔ الفاظِ مذکورہ سے ظاہراً نماز اور نمازیوں کی توہین لازم آتی ہے لیکن اسکی تاویل ممکن ہے، بولنے والے کا مقصد یہ ہوگا کہ نماز اصل دین ہے لیکن عقیدہ کی درستگی مقدم ہے اگر عقیدہ فاسد ہو تو نماز نجات کیلئے کافی نہیں اس لیے اس کہنے والے کو اسلام سے خارج نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اگر یہ شخص نماز نہ پڑھتا ہو اور نماز پڑھنے کو ضروری نہ جانتا ہو اس لیے نماز کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے ہوں تو بے شک اسلام سے خارج ہو جائے گا اور توبہ، تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح ضروری ہوگا۔ (فتاوی رحیمیہ جلد ۱۰ ص۲۴ کتاب الایمان)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بھی نبی علیہ السلام کی توہین کرنے کی سزا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک پروفیسر ڈاکٹر یونس شیخ نے اپنی کلاس میں لیکچر کے دوران طلباء کے سامنے مندرجہ ذیل باتیں کی ہیں۔ (نقل کفر کفر نہ باشد)

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک غیر مسلم تھے۔ (معاذ اللہ، استغفروا اللہ ثم استغفروا اللہ)

(۲) چالیس سال کی عمر تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔

(۳) حضورؐ نے پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں کی اور چونکہ اس وقت وہ نہ نبی تھے اور نہ مسلمان اس لیے نکاح نہ ہوا۔

(۴) چالیس سال کی عمر تک آپؐ بغل کے بال اور زیر ناف بال نہیں کاٹتے تھے۔

(۵) آپؐ کے والدین غیر مسلم تھے۔

کیا یہ کلمات گستاخی رسول کے زمرہ میں آتے ہیں یا نہیں، اور اس شخص کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ اگر گستاخ رسول توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں؟ یہ جو پانچ کلمات اس نے کہے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن وحدیث سے اس کے لیے مدلل جوابات دیئے جائیں؟ نیز ان کلمات کے بارے میں مسلمانوں کا کیا عقیدہ ہونا چاہیئے؟ کیا کسی مسلمان کے لیے ایسے مجرم کی حمایت کرنا جائز ہے؟ کیا کوئی مسلمان وکیل عدالت میں اس کی وکالت کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر وکالت کرتا ہے تو اس کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ایسے مجرم کے رشتہ دار اس کی طرف سے وکیل کرسکتے ہیں اور وہ اس کی حمایت کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ اس کی حمایت کریں تو ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک دور میں کسی ایسے گستاخ کو معاف فرمایا تھا؟ اب ایسے گستاخ رسولؐ کو معاف کرنے کا کسی کو اختیار ہے یا نہیں؟ اگر کوئی عالم اس کی حمایت کرے تو اس کے لیے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ کیا گستاخ رسول اور مرتد کے احکامات اور سزاؤں میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات ترتیب وار درج ذیل ہیں:

س ۱: کیا معاذ اللہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک غیر مسلم تھے؟

ج: (۱) اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد جملہ صغائر اور کبائر گناہوں سے پاک اور منزہ ہیں، نہ ان سے قبل النبوت

کفر وشرک کے ارتکاب کا تصور تک ہوسکتا ہے اور نہ بعد النبوت، اس لیے کہ نبوت اور کفر وشرک دونوں اضداد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ابتداء ہی سے ایسی طبیعت اور نفس مرحمت فرمایا ہوتا ہے جو فطرتاً معصیت سے دور رہتا ہے اور نشۂ عبودیت سے چور ہوتا ہے، حتیٰ کہ حالت صغر میں بھی وہ عبدیت کا اعتراف کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بچپن ہی میں إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰه کا کلمہ زبان مبارک سے نکال کر اس بات کا اعلان کیا تھا۔ ہماری عقائد کی کتابوں میں بھی لکھا ہے،

چنانچہ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام كلهم منزهون عن الصغائر والكبائر والكفر والقبائح۔ (شرح فقہ اکبر ص۸۸،۸۹ بحث ان الانبیاء الخ)

علامہ النسفیؒ فرماتے ہیں: وفي عصمتهم عن سائر الذنوب تفصيل وهو انهم معصومون من الكفر قبل الوحي وبعده بالاجماع وكذا عن تعمد الكبائر عند الجمهور۔ (شرح عقائد النسفی ص۹۸)

علامہ ابن حزمؒ و امام ابواسحٰق اسفرائیؒ و ابن فورکؒ و ابن برہانؒ، نوویؒ، قاضی خانؒ وغیرہ تمام اہلسنت والجماعت کا مسلک بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: إِنَّهُمْ معصومون عن الصغائر والكبائر جميعًا قال انه الذي ندين به وَ هو الصحيح۔

(بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام ج۳ ص۲۴۷)

قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں: بزعم احقر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام از صغائر وکبائر قبل النبوۃ وبعد النبوۃ بہر طور کہ باشد معصوم اند۔ (ترجمان السنۃ جلد۳ ص۳۵۵)

علامہ ابومحمد عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: مگر کفر اور شرک سے بالاتفاق معصوم تھے کسی نبی سے قبل از نبوت بھی کفر اور شرک سرزد نہیں ہوا۔ (عقائد اسلام ص۳۸،۳۹)

علامہ مفتی عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں:۔

الجواب: حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ابتداء ہی سے موحد ہوتے ہیں، قبل از نبوت اور بعد از نبوت کفر وشرک بلکہ شائبہ کفر وشرک سے بھی بالکل پاک صاف اور منزہ ہوتے ہیں۔

(فتاویٰ رحیمیہ جلد۹ ص۲۹ کتاب العقائد)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے خصوصیت کے ساتھ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عالم ازل (عالم ارواح) میں اپنی عبادت اور توحید کا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت

دینے کا مضبوط عہد لیا تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا۔ (الاحزاب ۷)

تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے: (اذکر (اذ اخذنا من النبیین میثاقهم) حین اخرجوا من صلب آدم کالذر جمع ذرة وهی اصغر النمل (وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ) بان یعبد واالله و یدعوا لی عبادة وذکرالخمسة من عطف الخاص علی العام (وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا) شدیداً بالوفا بما حملوه وهوالیمین بالله تعالیٰ۔ (جلالین مع صاوی ج۳ ص۲۵۲)

ان جملہ عبارات سے وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام قبل النبوت بھی مسلمان ہوتے ہیں اور بعد النبوت بھی، ان پر کبھی بھی کفر و شرک کا زمانہ نہیں آیا ہے۔

(۲) خصوصاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تو قبل النبوت یا بعد النبوت گناہ اور کفریہ عقائد کے ارتکاب کا تصور بھی محال ہے کہ جن کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلم قرار پائیں اور ان کے نکاح کو ناجائز قرار دیا جائے۔

امام ابوحنیفہؒ سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تخصیص سے فرماتے ہیں: و محمد علیه الصلوٰة والسلام نبیه وعبده ورسوله ونبیه وصفیه ونقیه ولم یعبد الصنم ولم یشرك بالله تعالیٰ طرفة عین قط ولم یرتکب صغیرة ولا کبیرة قط۔ (شرح فقہ اکبر ص۹۴، ۹۶ بحث فی اثبات نبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

علامہ ملا علی قاریؒ اس عبارت کی شرح میں فرماتے ہیں: (ولم یعبد الصنم) ای ولا غیره لقوله (ولم یشرك بالله طرفة عین قط) ای لا قبل النبوة ولا بعدها فان الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام معصومون عن الکفر مطلقاً بالاجماع وان جوز بعضهم صدور الصغیرة بل الکبیرة قبل النبوة بل وبعدها ایضاً فی مقام النزاع واما هو صلی الله علیه وسلم فکما قال الامام الاعظم (ولم یرتکب صغیرة ولا کبیرة قط)۔ (شرح فقہ اکبر ص۹۶ بحث فی ان افضل الناس بعدہ الخ)

علامہ حافظ ابن کثیرؒ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

پاکدامنی نقل کرتے ہیں : عن جبیر بن مطعمؓ قال لقد رأیت رسول اللہ وھو علیٰ دین قومہ قال البیھقیؒ معنی قولہ علیٰ دین قومہ ما کان بقی من ارث ابراھیمؑ واسمٰعیلؑ ولم یشرك باللہ قط صلوات وسلامہ علیہ دائماً۔ (البدایۃ والنھایۃ ج۲ ص۲۶۸)

امام فخرالدین رازیؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت نقل کرتے ہیں : لم ازل لقل من اصلاب الطاھرین الیٰ ارحام الطاھرات ۔ (تفسیر کبیر ج۲۳ ص۱۷۲ سورۃ الشعراء آیت ۲۱۹)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی پاکدامن تھے اور آپ کے آباؤ اجداد بھی پاکدامن تھے ۔

اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی آپ کی حفاظت فرماتا تھا اور آپ میں اموِ صالحہ ودیعت کر رکھے تھے ۔

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے : وشب رسول اللہ مع ابی طالب یکلؤہ ویحفظہ ویحوطہ من امور الجاھلیۃ ومعائبھا........ وابعدھم من الفحش والاذی ما دوی ملاحیا ومماریا احد حتیٰ سماہ قومہ الامین لما جمع اللہ فیہ من الامور الصالحۃ ۔

(البدایۃ والنھایۃ ج۲ ص۲۶۵ فصل فی خروجہ علیہ الصلوٰۃ والسلام مع عمہ الخ)

(۳) آپ سے قبل النبوت اور بعد النبوت شرک سرزد نہ ہونے کی تصدیق خود آپ کے اس کلام سے ہوتی ہے جو بحیرہ نامی راہب کے طویل واقعہ میں درج ہے : قام الیہ بحیری وقال لہٗ یاغلام اسئلك بحق اللات والعزیٰ الا اخبرتنی عما اسئلك عنہ انما قال لہٗ بحیری ذلك لانہٗ سمع قومہ یحلفون بھما فزعموا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لہٗ لاتسئلنی باللات والعزیٰ شیئًا فواللہ ما ابغضت شیئًا قط فقال لہٗ بحیری فباللہ الا ما اخبرتنی عما اسئلك عنہ فقال لہٗ سلنی عما بدا لك الخ (البدایۃ والنھایۃ ج۲ ص۲۶۴ فصل فی خروجہ علیہ الصلوٰۃ والسلام....الخ)

(۴) اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی پیدائش کے بعد سے اللہ کے نبی اور رسول ہیں، تو جو شخص پیغمبری کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو تو اس سے کفر وشرک اور معاصی کا ارتکاب کیسے ممکن ہے ؟

علامہ سیوطیؒ نے "الخصائص الکبریٰ" میں کافی ساری روایات نقل کی ہیں جس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ آپؐ کی نبوت حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے بھی قبل تھی اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر میں تشریف لائے ہیں۔

لما اخرجه احمد والبخاری فی تاریخه والطبرانی والحاکم والبیهقی وابونعیم عن میسرة الفخر قال قلت یا رسول الله متی کتبت نبیا؟ قال وآدم بین الروح والجسد۔
(الخصائص الکبرٰی ج ۱ ص۱ باب خصوصیة النبیؐ)

واخرجه الحاکم والبیهقی وابونعیم عن ابی هریرة قیل للنبی صلی الله علیه وسلم متی وجبت لك النبوة؟ قال بین خلق آدم و نفخ الروح فیه۔ (الخصائص الکبرٰی ج ۱ ص۱)

اس قسم کی مزید روایات کے لیے "الخصائص الکبرٰی" کا مطالعہ کریں۔

ان جملہ روایات اور عبارات سے واضح ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء سے ایمان کی دولت سے مالا مال تھے، آپ پر کبھی بھی غیر مسلمی کا دور نہیں گذرا ہے اور نہ آپؐ سے کبھی کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ ہوا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گویا پیدا ہی پیغمبر ہوئے تھے۔

(۵) چونکہ آپؐ کی نئی شریعت ابھی تک نازل نہیں ہوئی تھی اس لیے آپ چالیس سال تک دینِ ابراہیمی کے مطابق عبادت ادا کرتے رہے۔

چنانچہ علامہ عینی، ابن حجر، علامہ کرمانی اور ابوالعباس القسطلانی رحمہم اللہ شارحین بخاری فرماتے ہیں: وفی روایة وکان یخلو ابغار حرا فیتحنث فیه وهو التعبد اللیالی الخ وسئل ابن الاعرابی عن قوله یتحنث فقال لا اعرفه وسئلت اباعمرو الشیبانی فقال لا اعرف یتحنث انما هو یتحنف من الحنفیة دین ابراهیم علیه السلام قلت قد روی فی سیرة ابن هشام یتحنف بالفاء۔ (عمدة القاری ج۱ ص۴۹ - ارشاد الساری ج ۱ ص۶۲ - کرمانی ج ۱ ص۳۲ کیف کان بدأ الوحی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم)

اسی طرح علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ وہی عبادت تھی جو آپؐ کے دادا (حضرت) ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے ادا کی تھی۔ (سیرت النبیؐ جلد ۱ ص۱۲۶ آفتاب رسالت کا طلوع)

لہٰذا اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے پیغمبر کے بارے میں یہ کلمات کہے کہ وہ نبوت ملنے سے قبل غیر مسلم تھے، ان کی شادی غیر مسلمی کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے ان کا نکاح نہیں ہوا تھا تو یہ کفریہ کلمات ہیں، اس لیے کہ ان سب باتوں میں انبیاء کرامؑ کی توہین ملحوظ ہے، لہٰذا ایسا شخص مرتد اور واجب القتل ہے۔

کما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اجمع المسلمون ان شاتمہ کافر وحکمہ القتل ۔
(رد المحتار ج۴ ص۲۲۳ باب المرتد)

وقال العلامۃ ابن تیمیۃؒ : ان من سبّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم من مُسلم او کافر فانہٗ یجب قتلہ ھٰذا مذھب علیہ عامۃ اھل العلم قال ابن المنذر اجمع عوام اھل العلم علیٰ ان حد من سبّ النبیّ القتل ۔
(الصارم المسلول ص۳ المسألۃ الاولیٰ)

علامہ ابن عابدینؒ نے کتاب الخراج کے حوالے سے قاضی ابو یوسفؒ کا قول لکھا ہے کہ

وایما رجل مسلم سبّ رسول اللہ اوکذبہ اوعابہ اوتنقصہ فقد کفر باللہ تعالیٰ وبانت منہ امرأتہ فان تاب والا قتل ۔
(ردالمحتار ج۴ ص۲۳۴ باب مھم فی حکم سابّ الانبیاء)

تاہم اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کرے صرف قانون سے بچنے کے لیے توبہ نہ ہو تو تنفیہ کے ہاں اس کی توبہ قبول ہوگی۔

لما قال ابوالحسین علی بن الحسین اسعدیؒ : من سبّ رسول اللہ فانہٗ مرتد ویفعل بہ ما یفعل المرتد ۔ (النتف فی الفتاویٰ ج۲ ص۲۴ کتاب المرتد الخ)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : وظاھر فی قبول توبتہ کما لا یخفیٰ ۔
(منحۃ الخالق علی البحرالرائق ج۵ ص۱۳۵ باب المرتد)

وقال ایضاً : ان مذھب ابی حنیفۃؒ والشافعیؒ ان حکمہ حکم المرتد وقد علم ان المرتد تقبل توبتہ ویؤید ما نقلہ ھنا عن النتف ۔
(رسائل ابن عابدینؒ ج۱ ص۳۳۳ تنبیہ الولاۃ والحکام)

لہٰذا توبہ و تجدیدِ ایمان کے بعد اس کو دوبارہ مسلمان سمجھا جائے گا۔

س۲ : کیا چالیس سال کی عمر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ نہیں ہوا تھا؟

ج : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کے بارے میں شریعتِ مقدسہ کی کتابوں میں تین قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں :۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ ملائکہ نے پہلی بار شقِ صدر کے وقت کیا تھا۔

(۳) اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ عربوں کی عام عادت کے مطابق آپ کے دادا جناب عبد المطلب نے ولادت کے ساتویں دن کرایا تھا اور لوگوں کی دعوت بھی کی تھی۔

لما قال العلامۃ شبیر احمد العثمانیؒ: قد اختلف فی ختانتہ علی ثلاثۃ اقوال احدھا انہ ولد مختونا مسرورا وروی فی ذلک حدیث لا یصح ذکرہ ابو الفرج ابن الجوزیؒ فی الموضوعات ولیس فیہ حدیث ثابت .... والقول الثانی انہ ختن صلعم یوم شق قلبہ الملٰئکۃ عند ظئرہ حلیمۃ والقول الثالث ان جدہ عبد المطلب ختنہ یوم سابعہ وصنع لہ مادبۃ وسمّاہ محمداً۔ (فتح الملھم ج۱ ص۲۱۸ باب تحریم بیع الرطب بالتمر الا فی العرایا)

ان تین اقوال کے علاوہ کوئی چوتھا قول کتب احادیث میں موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک غیر مختون تھے۔ اس بات کے غلط اور بے بنیاد ہونے کے لیے یہ ہی کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو دین ابراہیمیؑ کے شعائر پر عمل پیرا تھا اور یہ عمل (ختنہ) چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت مبارکہ میں سے تھا اور عرب بھی روز اول سے اپنے بیٹوں کا ختنہ کراتے چلے آرہے تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپؐ چالیس سال تک غیر مختون رہے۔ لہٰذا آپؐ کے بارے میں ایسا کہنا یا سمجھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و استخفاف ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ استخفاف بھی کفر ہے۔

لما فی خلاصۃ الفتاوی: ولو قال لشعر محمد شُعَیرًا یکفر۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۸۶)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: من سبّ رسول اللہ اوینقصہ وکان فیہ ردۃ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۸۶)

لہٰذا اس استخفاف اور توہین کی وجہ سے وہ قائل کافر اور خارج عن الاسلام ہے، حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شرعی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس (ڈاکٹر یونس شیخ) کو قرار واقعی سزا دے۔

س۳: کیا یہ درست ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں کی، اور چونکہ اُس وقت آپ نہ ہی نبی تھے اور نہ مسلمان، اس لیے نکاح نہ ہوا؟

ج: سوال اوّل کے جواب میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آپؐ روز اول سے مسلم اور

پاکباز تھے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح بالکل صحیح تھا، اس کی صحت پر کوئی شک وشبہ نہیں "نکاح نہیں ہوا" سے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ سال عمر کے بعد ۴۰ سال کی عمر تک (۱۵ سال) زنا میں مبتلا رہے۔ حالانکہ کائنات ارضی میں ایک پیغمبر کی ذات ایسی ہوتی ہے کہ جس سے زنا کا ارتکاب تو کجا اس کا تصور بھی محال ہے، حتیٰ کہ کسی نبی علیہ السلام کی اہلیہ کافرہ تو ہوسکتی ہے مگر زانیہ نہیں۔ لہٰذا کسی بھی نبی علیہ السلام کے بارے میں ایسے توہین آمیز کلمات کہنا یا الزام لگانا موجب کفر ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔

لما فی الهندیة: سئل عمن ینسب الی الانبیاء الفواحش کعزمهم علی الزنی و نحوه الذی یقوله الحشویة فی یوسف علیه السلام قال یکفر لانه شتم لهم واستخفاف بهم۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص۲۶۳ باب موجبات الکفر)

س۴۳: کیا واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس۴۰ سال کی عمر تک بغل اور زیرِ ناف بال کاٹے نہیں تھے؟

ج: زیرِ ناف اور بغل کے بال صاف کرنے کا رواج حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے چلا آرہا ہے اور آپؐ اور آپؐ کے آباؤ اجداد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے پیروکار تھے جبکہ زیرِ ناف بال وغیرہ صاف کرنا سنتِ ابراہیمی ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد اسی ابراہیمی سنت پر عمل کرتے ہوئے زیرِ ناف اور بغلوں کے بال صاف کیا کرتے تھے۔ اس بناء پر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس۴۰ سال تک زیرِ ناف اور بغلوں کے بال صاف نہ کیے ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ عمل فطرت الانبیاء ہے، حدیث شریف میں ہے: عن عائشة قلت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عشرة من الفطرة: قص الشارب و ایفا اللحیة والسواك والاستنشاق بالماء وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانة انتقاص الماء۔ (ابوداؤد علی صدر عون المعبود ج ۱ ص۵۳)

علامہ خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ حدیث بالا کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ای عشر خصال من سنن الانبیاء الذین امرنا ای نقتدی بهم کانا فطرنا علیها وکذا نقل عن اکثر العلماء السنة الابراهیمیة۔ (بذل المجهود ج ۱ ص۲۹)

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: هذه الطهارات منقولة عن ابراهیم متداولة فی طوائف الامم الحنفیة اشربت فی قلوبهم وودخلت فی صمیم

اعتقادہم علیہا محیاہم و علیہا مماتہم عصرًا بعد عصر ولذٰلك سمیت بالفطرۃ وھٰذہ اشعائر الملّۃ الحنفیۃ ولا بد لکل ملۃ من شعائر یعرفون بہا ویؤاخذون علیہا لیکون طاعتہما و عصیانہما امرًا محسوسًا۔ (فتح الملہم ج ا ص۴۱۸ باب تحریم بیع الرطب الخ)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیسے ممکن ہے کہ آپؐ نے دینِ ابراہیمی اور فطرۃ الانبیاء کی مخالفت کر کے چالیس سال تک بغل اور زیرِ ناف بال نہ کاٹے ہوں۔ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سخت عیب اور آپؐ پر افترا و باندھنا ہے اور آپؐ کی توہین و استخفاف کرنا ہے جبکہ کسی بھی پیغمبرؑ کے بارے میں ایسے توہین آمیز و معیوب کلمات کہنا سبب ارتداد ہے۔

لما فی التاتارخانیۃ: من لم یقر ببعض الانبیاء او عاب نبیًا بشئی او لم یرض بسنۃ من سنن المرسلین فقد کفر۔ (تاتارخانیہ ج ۵ ص۴۷۷)

اسی طرح صاحبِ تاتارخانیہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ولو عاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بشئی من العیوب یکفر۔ (تاتارخانیۃ ج ۵ ص۴۷۹)

علامہ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ محیط کے حوالے سے لکھتے ہیں: فی المحیط من شتم النبیؐ واھانہ او عابہ فی امور دینہ او فی شخصہ او فی وصف من اوصاف ذاتہ سواء کان الشاتم مثلًا عن امتہ او غیرھا سواء کان من اھل الکتاب وغیرہ ذمیًا کان او حربیًا سواء کان الشتم او الاھانۃ او العیب صادرًا عنہ عمدًا او سھوًا او غفلۃ او جدًا او ھزلًا قد کفر خلودًا۔

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۳۸۶ الفاظ الکفر)

س۵: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین غیر مسلم تھے؟

ج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارے میں اُمت کا اختلاف ہے کہ وہ اسلام لائے تھے یا نہیں؟ ان کی نجات ہوگی یا نہیں؟ یہاں تک تو یہ بات یقینی ہے کہ آپؐ کے والدین کا انتقال آپؐ کو رسالت ملنے سے پہلے ہو گیا تھا اور یہ بھی یقینی ہے کہ ان کا انتقال دورِ فترت میں ہوا تھا لہٰذا ان کا تعلق اہلِ فترت سے تھا۔

لما قال العلامۃ جلال الدین السیوطیؒ: ثم رأیت الشیخ عز الدین بن عبد السلام۔ قال فی امالیہ ما نصہ کل نبی ارسل الی قومہ الا نبینا صلی اللہ علیہ وسلم قال فعلی ھٰذا یکون ماعدا قوم کل نبی من اھل الفترۃ الا ذریۃ نبی سابق فانہ

مغاظبون ببعثة السابق الاان تدرس الشريعة السابقة فيصير الكل من اهل الفترة بلاشك لانهم ليسا من ذرية ولا من قومه۔ (الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۵۱)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس مسئلے کی وضاحت کے لیے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس مسئلے کی وضاحت کے لیے آپ نے تین مسالک ذکر کیے ہیں:۔

۱۔ چونکہ ان کا انتقال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہو چکا تھا اس لیے ان کو کوئی عذاب نہ ہوگا۔

۲۔ ان سے زمنِ فترۃ میں کوئی شرک ثابت نہیں بلکہ وہ دینِ ابراہیمؑ کے پیروکار تھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی برکت سے کرامتاً ان کو زندہ کیا اور وہ آپؐ پر ایمان لائے اور پھر فوت ہوگئے، یہ رائے اکثر محدثین و علمائے کرام وغیرہ کی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: ومنهم ابن شاهين الحافظ ابوبكر الخطيب البغدادی والسهيلی والقرطبی والمحب الطبری والعلامة ناصر الدين بن المنير وغيرهم۔ (الحاوی للفتاوی ج۱ ص۲۲۷، ۲۲۸ فصل فی المولد)

علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ ابن عابدین اور علامہ آلوسی (رحمہم اللہ) وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

قال العلامة عثمانی رحمہ اللہ: قال العلامة ابن حجر فی الزواجر ان نبينا صلی اللہ عليه وسلم قد اكرمه الله تعالىٰ بحيوٰة ابويه حتى آمنا به كما فی حديث صححه القرطبی وابن ناصر الدين حافظ الشام وغيرهما فانتفعا بالايمان بعد الموت على خلاف القاعدة اكرامًا لنبيه صلى الله عليه وسلم۔ (فتح الملهم ج۱ ص۳۷۳ باب بيان ان من مات على الكفر الخ)

قال العلامة ابن عابدينؒ: الا ترى ان نبينا صلى الله عليه وسلم قد اكرمه الله تعالىٰ بحياة ابويه له حتى آمنا به كما فی حديث صححه القرطبی وابن ناصر الدين حافظ الشام وغيرهما فانتفعا بالايمان بعد الموت على خلاف القاعدة اكرامًا لنبيه صلى الله عليه وسلم كما احى قتيل بنى اسرائيل ليخبر بقاتله الخ

(رد المحتار ج۴ ص۲۳۱ کتاب السیر، مطلب فی احیاء ابوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

قال العلامة الآلوسی رحمہ اللہ: واستدل بالآية (وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ) على ايمان

ابویه صلی اللہ علیہ وسلم کما ذهب الیہ کثیر من اجلۃ اهل السنۃ وانا اخشی الکفر علی من یقول فیهما رضی اللہ تعالیٰ عنهما ۔

(روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۳۸ سورۃ الشعراء)

وقال العلامۃ فخر الدین الرازی رحمہ اللہ: واعلم ان الرافضۃ ذهبوا إلیٰ اٰباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا مؤمنین وتمسکوا فی ذلك بهٰذه الاٰیۃ وبالخبر اما هٰذه الاٰیۃ فقالوا قوله تعالیٰ ﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ﴾ یحتمل الوجوه التی ذکرتم ویحتمل الوجوه التی ذکرتم ویحتمل ان یکون المراد ان اللہ نقل روحه من ساجد الیٰ ساجد کما نقوله نحن واذا احتمل کل هٰذا الوجوه وجب حمل الاٰیۃ علی الکل ضرورۃ أنّه لا لامنافاۃ ولا رجحان ۔ (تفسیر کبیر ج ۲۳ ص ۱۷۴ سورۃ الشعراء)

اس اختلاف کی وجہ سے بعض علماء کرام نے اس بارے میں توقف اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے، مگر علامہ جلال الدین السیوطیؒ اور علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ماجدین دونوں مسلمان ہیں اُن کو غیر مسلم کہنا صحیح نہیں ہے مگر اس طرح کہنے سے کوئی ایمان کی دولت سے محروم نہیں ہوتا ۔

۱۔ اس تفصیلی جواب کے بعد صورتِ مسئولہ کے مطابق فی الجملہ کلمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں توہین آمیز ہیں جو کہ موجبِ کفر وارتداد ہے اور مرتکب کی سزا قتل ہے ۔

۲۔ علمائے امت کو چاہیئے کہ اس قسم کے کلمات کے مرتکب شخص کو سمجھائیں ورنہ عدالت کے حوالے کر دیں ۔

۳۔ ایسے کلمات کے کہنے والے شخص کی کسی قسم کی حمایت (زبانی یا مالی) کرنا کسی بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے ۔

۴۔ اسی طرح اس کی وکالت (قانونی حمایت) کرنا بھی جائز نہیں ہے ۔

۵۔ اگر وکیل اس کے ان کفریہ کلمات پر راضی ہو تو رضا بالکفر کفر کی وجہ سے وکیل کے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا قوی خطرہ ہے ۔

۶۔ وکیل چاہے رشتہ دار ہو یا غیر سب کے لیے یہی حکم ہے ۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بھی پیغمبر کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنا موجب کفر ہے جس کی سزا شرعاً قتل ہے۔

۸۔ تاہم اگر کوئی مرتکب شخص صدقِ دل سے توبہ کرے تو حنفیہ کے ہاں اس کی معافی کی گنجائش موجود ہے۔

۹۔ گستاخِ رسول اور مُرتد میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی سزا قتل ہے اور توبہ اس کی مقبول ہے۔

۱۰۔ کسی مسلمان کے لیے چاہے وہ عالمِ دین ہو یا کوئی جاہل ہو کسی مرتد یا گستاخِ رسول کی کسی قسم کی (زبانی، مالی، قانونی) حمایت کرنا جائز نہیں، رضا کی صورت میں اس کے ایمان کے خروج کا بھی خطرہ ہے۔

آدھا کلمہ پڑھنے پر دم نکل جائے تو

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص دنیاوی زندگی میں بڑا پاکباز، نیکوکار اور نماز روزے کا پابند تھا، جب اس کی زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے تو اس کے رشتہ داروں نے بغرض تلقین اس کے سامنے باآوازِ بلند کلمہ طیبہ پڑھا جس پر اس کی زبان سے بھی کلمۂ شہادت جاری ہو گیا، ابھی وہ اشھد ان لا الٰہ ہی پڑھ سکا تھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی الا اللہ پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ تو اس شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس شخص کی موت کفر پر ہوئی یا اسلام پر؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مسلمان کا آخری وقت قریب ہو اور اس پر نزع کی حالت طاری ہو جائے تو پاس بیٹھنے والے درمیانی آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کریں تاکہ قریب المرگ آدمی بھی پڑھ سکے، لیکن نہ تو زیادہ زور سے پڑھیں اور نہ مرنے والے کو پڑھنے کا کہیں، صرف تلقین و تذکیر کے لیے پڑھیں۔ اگر وہ کلمۂ شہادت شروع کر کے درمیان میں ہی دم توڑ جائے یعنی آدھا کلمہ پڑھ کر فوت ہو جائے تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، اسلئے کہ کفر کا تعلق عمداً کلمہ کا انکار کرنے سے ہے۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص نے چونکہ عمداً الا اللہ یا محمد رسول اللہ سے انکار نہیں کیا اسلئے دنیا سے مسلمان گیا ہے، امید ہے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائیں گے۔

مسئلہ تقدیر کے بارے میں ایک استفسار

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ : اگر ایک شخص کافر گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور کفر کی حالت میں ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی تقدیر ہے، تو کیا اس کے کافر ہونے میں اس کا کوئی قصور ہے ؟ اگر کافر ہونا اس کی تقدیر ہے تو اسے خلافِ عقل کہہ دینا یا اسے قصور وار ٹھہرانا کیا صحیح ہے ؟

الجواب :- مسئلہ قضاء و قدر اور اس پر ایک لمحۂ فکریہ

مسئلہ قضاء و قدر بیشک بہت مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ جبر و قدر میں روایات سے زیادہ گفتگو کرنے کی ممانعت ثابت ہے، کیونکہ اس کے اسرار و رموز پورے کے پورے مشکل سے ہی عقل میں آتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک خالقِ کائنات کا وجود تسلیم کرنے کے بعد اس کا انکار کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جس نے بھی یہاں شریعت کی بیان کردہ راہِ اعتدال چھوڑی اس کو ہدایت کا انکار کرنا پڑا، یعنی یا تو بندہ کو پتھر کی طرح مجبورِ محض ماننا پڑا اور یا اس کو خالقیت میں خالق کے برابر تسلیم کرنا پڑا۔ ہم یہاں آپ کے غور و فکر کی دعوت کے لیے چند سطور پیش کرتے ہیں، ہو سکتا ہے ان سے مسئلہ حل نہ ہو مگر ممکن ہے کہ کسی حد تک مزید انکشاف کا باعث ہو جائے۔ وبہ نستعین

جملہ اسلامی فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سب کا اللہ تعالےٰ کو پہلے سے علم ہے، اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالےٰ علم ازل کے مطابق جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کچھ قیدِ کتابت میں بھی آچکا ہے، اور اب عالم کا ایک ذرہ بھی اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا، اس لیے بحث یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب انسانی افعال کی حقیقت کیا ٹھہری ؟ کیا اس کو ان میں مجبور سمجھ لیا جائے یا مختار کہا جائے ؟ اگر مختار کہا جاتا ہے تو لازمی طور سے اس میں قدرت اور اختیار کی صفت بھی تسلیم کرنی ہو گی۔ ادھر قدرت اور اختیار تسلیم کر لینے کے بعد پھر قضا و قدر کے سامنے اس کو مجبور کہنے کا مفہوم باطل ہو جاتا ہے اور اگر مجبور کہہ دیا جائے تو یہ ضروری ہو گا کہ اس میں قدرت و اختیار کی صفت کا بھی انکار کر دیا جائے اس لیے قضاء و قدر کی بحث میں اصل نقطۂ غور و فکر " افعالِ عباد " یعنی بندوں کے افعال (کام) بن جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے سے قبل جب آپ عالم پر ایک نظر ڈالیں گے تو آپ کے سامنے دو قسم کی

مخلوقات نظر آئیں گی۔ ایکؔ وہ جو اختیار و ارادہ کے بداہتہً مالک نہیں، وہ کھلے طور پر قدرتِ الٰہیہ کی مسخر بنی ہوئی ہے۔ مثلاً آفتاب حرکت کرتا نظر آتا ہے، یا زمین وآسمان میں جو بھی متحرک ہے یہ سب جانتے ہیں کہ یہ اپنے ارادہ سے متحرک نہیں بلکہ ارادہ و قدرتِ الٰہیہ سے متحرک ہیں۔ دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو بداہتہً ارادہ و اختیار کی مالک نظر آتی ہے، یہ تین قسم کی ہے، ایکؔ وہ جو صرف خیر ہی کا ارادہ کرتی ہے شر کا ارادہ کر ہی نہیں سکتی، یہ فرشتے کہلاتے ہیں، ان کی شان لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون ۵ (سورۃ) ہے، یعنی جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتے صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ یہاں نفی اور اثبات دونوں کو جمع کرنے سے اس مضمون کی تاکید مقصود ہے۔ دوسری مخلوق اس کے برعکس ہے وہ شر کے سوا خیر کا ارادہ کرتی ہی نہیں، یہ شیطان ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو ہر دو نوع کے ارادہ کی مالک ہے اور دونوں قسم کے ارادے کرتی بھی ہے، یہ حضرتِ انسان ہے۔ انسانوں کی بھی پھر تین قسمیں ہیں۔ ایکؔ وہ قسم جس کا ایمان اور جس کی عقل و معرفت اس کی خواہشاتِ نفسانی پر غالب ہوتی ہے یہ قسم تو ترقی کر کے فرشتوں سے جا ملتی ہے۔ دوسری اس کے برعکس ہے، یہ برادرِ شیطان بن جاتی ہے۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس کی عقل اس کی قوتِ شہوانیہ کی مفتوح ہو جاتی ہے، یہ بہائم اور حیوانات سے ملحق ہو جاتی ہے۔ جس طرح ان جملہ مخلوقات کا وجود محض جل و علا کی بخشش ہے اسی طرح ان کا ارادہ و اختیار بھی اس کا عطا کردہ ہے۔

اب ہم پہلے اصطلاحات اور مذاہب کی تفصیلات سے علیحدہ ہو کر سادہ طور پر اس مسئلہ پر نظر کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ بات ہم کو ماننا پڑتی ہے کہ بندہ میں اختیار و قدرت کی صفت یقینی ہے، اس کا انکار کرنا اپنے بدیہی وجدان کا انکار کرنا ہوگا۔ ایک بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اختیاری حرکات اور ایک رعشہ زدہ شخص کی حرکات کے مابین فرق کو بخوبی سمجھتا ہے اور ہرگز دونوں کو یکساں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی بدیہی ہے کہ جس طرح بندہ کا خود وجود اور اسی کے ساتھ اس کی دیگر صفات کمزور اور ضعیف ہے، اسی طرح اس کی یہ قدرت اور اختیار بھی ضعیف در ضعیف ہے۔ دیکھئے انسان سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے اس لیے اس کو شنوا اور بینا کہا جاتا ہے، مگر

چونکہ اس کی یہ صفات ضعیف ہیں اس لیے ان کی کچھ شرائط بھی ہیں، اگر وہ نہ ہوں تو وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے، پھر ان شرائط کے ساتھ جہاں وہ سنتا اور دیکھتا بھی ہے وہاں بھی کچھ دور چل کر اس کی شنوائی اور بینائی کی دونوں صفتیں معطل نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک خاص فاصلہ کے بعد نہ تو وہ کچھ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے، مگر کیا اُس کی اِس معذوری پر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں سمع وبصر کی صفت ہی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں دو رائیں پیدا نہیں ہو سکتیں، بالاتفاق یہی کہا جائے گا کہ ضرور ہیں مگر اتنی ضعیف ہیں کہ زیادہ دور چل کر کام نہیں دے سکتیں۔ اگر صفت اختیار بھی ایسی ہی ضعیف صفت ہو کہ جس کا کچھ دور تک تو اثر ظاہر ہوتا رہا ہے لیکن ذرا آگے چل کر اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو کیا اس ضعف کی وجہ سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دینا صحیح ہوگا؟ یا اگر اس کا اقرار کر لیا جائے تو کیا پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ آخر تک اس کا اثر تسلیم کیا جائے۔ پس اگر ہم اپنے اختیار کے اثرات کچھ دور چل کر مضمحل یا معدوم دیکھتے ہیں تو اس بناء پر ہم کو اپنے بدیہی وجدان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اسی طرح اگر ہم اپنے وجدان کی بناء پر اپنے نفس میں صفتِ اختیار تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے کہ پھر اس کے اثرات بھی آخر تک تسلیم کرتے چلے جائیں۔ اس لیے ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس بات کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم میں قدرت واختیار کی صفت موجود ہے، مگر ہاں خود اس صفتِ اختیار پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے، یعنی اس پر ہم قدرت نہیں رکھتے کہ اس اختیار کو جدھر چاہیں لگا دیں۔ بلکہ ہماری یہ صفت مشیتِ الٰہیہ کے تحت اسی طرح جبری حرکت کرتی ہے جس طرح ایک سنگ انداز کے ہاتھ کا پھینکا ہوا پتھر ہے کہ اس پتھر کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ اس سمت کو چھوڑ کر جدھر سنگ انداز نے اس کو پھینکا ہے کسی اور سمت چلا جائے، اسی طرح بندہ میں بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اُس جانب کے سوا جس جانب قدرت نے اس کے اختیار کو لگا دیا ہے کوئی ادنیٰ سی بھی حرکت کر سکے۔ لہٰذا بندہ جو کرتا ہے یقیناً اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے، مگر وہ اپنے اختیار سے کرتا وہی ہے جو مختارِ مطلق اُس سے کرانا چاہتا ہے۔ پس اس لحاظ سے کہ ہم جو کرتے ہیں اپنے اختیار سے ہی کرتے ہیں، مختار کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ اختیار وہی کر سکتے ہیں جو مشیتِ الٰہیہ ہوتی ہے، مجبور کہلاتے ہیں یا بمنزلۂ مجبور، مگر یہ ایسا جبر ہے جو

جبرِ مطلق سے ممتاز ہے، کیونکہ جبرِ مطلق میں مجبور کو اپنے ارادہ کے ساتھ مزاحمت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی مومن کو کلمۂ کفر کہنے کے لیے مجبور کر دیا جائے، تو اگرچہ وہ کلمۂ کفر زبان سے کہہ تو دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس خارجی جبر کی مزاحمت کا احساس بھی کرتا رہتا ہے، یا مثلاً ایک منافق زبان سے کلمۂ ایمان ادا تو کرتا ہے مگر یہاں بھی ظاہری خوف اس کے باطنی ارادہ کے لیے مزاحم رہتا ہے ــــ لیکن جو چیز یہاں ہے اس میں ارادۂ مجبور کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ہوتی۔ انسان جو افعال بھی کرتا ہے وہ اپنے احساس کے مطابق آزادانہ اور پوری خود اختیاری سے کرتا ہے، حتیٰ کہ اگر تقدیر کا جبر اس کو بتا بھی دیا جائے تو وہ اس کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے ــــ جس طرح یہاں بندہ کا جبر جبرِ مطلق سے ممتاز ہے اسی طرح اس کا اختیار بھی مطلق اختیار سے ممتاز ہے کیونکہ وہ جو چاہے اختیار نہیں کر سکتا بلکہ وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا اختیار قادرِ مطلق نے اس کو دے دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے مگر چاہتا وہی ہے جو اللہ تعالےٰ اس سے کرانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس اختیار کے ساتھ کوئی شخص اپنے نفس کو مجبور کہتا ہے تو کہے، مگر وہ ایسا مجبور ہوگا جو معذور نہیں ٹھہر سکتا۔ پروردگارِ عالم کی خالقیت کا یہ کرشمہ بھی عجیب ہے کہ اس نے ایک مجبورِ محض کو کس حکمت سے ایسا مختار بنا دیا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش میں اپنے احساس کے مطابق ادنیٰ سا جبر بھی محسوس نہیں کرتا ہے حالانکہ جبر کی گرفت اس پر اس درجہ سخت ہوتی ہے کہ وہ جنبش کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت اس لیے پیدا ہوئی ہے کیونکہ یہاں افعال پر جبر نہیں، افعال تو اپنے اختیار سے ہوتے ہیں مگر خود اس کا اختیار اللہ تعالےٰ کی مشیتِ کاملہ کے تحت ہوتا ہے اس لیے اس مختار کو اپنے جبر کا احساس نہیں ہوتا، اگر جبر افعال پر ہوتا تو ضرور اس کا احساس ہوتا، یہ صفت اب صرف قدیر کی ہے کہ وہ بندوں کے اختیار پر بھی حکومت کرتا ہے۔ قضاء و قدر کے رازہائے سربستہ سب اسی نقطہ میں پنہاں ہیں، بندہ مجبور رہ کر اپنے مختار ہونے کا مدعی بھی اس لیے رہتا ہے کہ اس کو اپنا اختیار ہی اختیار محسوس ہوتا ہے، اور چونکہ اس کو یہاں اپنے ارادہ کے ساتھ کوئی مزاحمت محسوس نہیں ہوتی اس لیے فوقانی جبر کا اس کو کوئی احساس نہیں ہوتا، اور جب جبر و اختیار اس طرح مدغم ہو جائیں تو پھر اپنے افعال پر مسئول ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے،

کیا ایسا مختار بھی مسئول نہ ہونا چاہیئے جو اپنے وجدان میں بھی خود مختار ہو۔ اس فوقانی جبر کا حال تو صرف انبیاء علیہم السلام نے بتایا ہے۔ حد درجہ حیرت ہے کہ یا تو انسان ایک طرف مختارِ مطلق بننا چاہتا ہے، ایسا مختار کہ تقدیر کے جبر کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا اور مسلمان ہو کر بھی اس کی تصدیق میں ہزار حجتیں نکالنے کو بیٹھ جاتا ہے اور دوسری طرف جب تقدیر کا جبر تسلیم کرنے پر آتا ہے تو یہاں بھی اس کا روش معاندانہ ہی نظر آتی ہے، یعنی پھر جزاء و سزا میں اُلجھنے لگتا ہے۔ ولقد صدق اللہ عز وجل:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ (سورۃ) "انسان فطرتاً ہے ہی جھگڑالو"

حالانکہ سوچنا تو یہ چاہیئے تھا کہ کیا محکومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکم کے زیرِ دست رہے۔ پھر یہاں تو رشتہ صرف محکومیت ہی کا نہیں بلکہ مخلوقیت کا بھی ہے۔ کیا یہ معقول نہیں کہ یہاں ہمارا غیر مستقل اختیار بھی مختارِ کل کی مشیت کا محکوم بنا رہے؟ جب یہ بات سامنے رکھی جاتی ہے تو دنیا شور بپا کر دیتی ہے کہ ہم کو مجبور بنا دیا، حالانکہ غور کی بات تو یہ تھی کہ جو سرے سے موجود ہی نہ تھا وہ مختار تھا کس دن؟ پھر جتنا کچھ مختار تھا تقدیر نے اس کو ختم کب کیا؟ بلکہ آئینی طور پر اور تسلیم کر لیا ہے۔ پس یہاں تو یہ احسان کہ ایک معدومِ محض کو شرفِ وجود بخشا، پھر اپنی حکمتِ کاملہ سے ایک جمادِ محض (یعنی نطفہ) کو سمیع و بصیر اور مختار بنا دیا، اِدھر احسان فراموشی کہ شکوہ یہ ہے کہ مختار کو مجبور بنا دیا ـــــ یہاں ایک مغالطہ یہ لگ گیا ہے کہ تقدیر اور بندہ کے اختیار کو علیحدہ علیحدہ سمجھ کر تقدیر کو بندہ کے اختیار پر حاکم مانا گیا ہے، حالانکہ ہمارا اختیار بھی خود تقدیر کے لیے دائرہ میں شامل ہوتا ہے ـــــ اسی قسم کا سوال ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تھا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) امراض میں دوا کا استعمال اور جنگ میں ڈھال استعمال کرنا کیا خدائی تقدیر کو ٹال سکتا ہے؟ یعنی جب نہیں ٹال سکتا تو پھر ان کے استعمال کا کیا فائدہ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب کتنا مختصر مگر کیسا تسلی بخش ارشاد فرمایا کہ "اے میرے صحابہؓ! تم ان اسباب کو تقدیر سے خارج سمجھتے ہی کیوں ہو، تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دوا کرو گے تو شفایاب ہو گے، ڈھال استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے" ـــــ پس ارتکابِ اسباب بھی احاطۂ تقدیر میں داخل ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ وبائے شام کے قصہ میں نقل فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ مقام کے پاس پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ شام میں تو وبا پھیل رہی ہے، یہ سنکر آپ نے اسلامی لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا، اس پر حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے تعجب سے فرمایا اچھا آپ تقدیر سے بھاگ رہے ہیں ؟ یعنی اگر موت مقدر ہو چکی ہے تو پھر اس واپسی کا کیا فائدہ ؟ حضرت عمرؓ نے حکیمانہ انداز میں اس کا جواب دیا، فرمایا "اے ابو عبیدہؓ! اگر دو وادیاں ہوں، ایک سرسبز اور دوسری خشک، بولو اپنے اونٹ کس میں چراؤ گے ؟ اگر سرسبز وادی میں چراؤ اور یقیناً اسی میں چراؤ گے تو کیا یہ تقدیر سے گریز ہوگا یا یہ بھی اسی تقدیر کے تحت ہوگا؟ اسی طرح میری واپسی کو احاطۂ تقدیر سے باہر کیوں سمجھتے ہو، اگر موت کی وادی سے بچ کر جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہوگا جب ہی تو واپس جا رہا ہوں۔" (مؤطا مالکؒ)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ تدبیر و تقدیر میں جنگ نہیں ہے اور جنگ تو اس وقت ہوتی جبکہ تدبیر تقدیر کے احاطے سے کہیں باہر ہوتی، اب تو تدبیر بھی تقدیر کا جزو بنی ہوئی ہے، تدبیر و تقدیر کے مراتب کو اس طرح محفوظ رکھنا یہ علوم نبوت کا فیض ہے۔ دیکھئے حضرت یعقوب علیہ السلام جب اپنے بیٹوں کو مصر روانہ کرتے ہیں تو نظر گذر کے خطرہ سے تحفظ کے لیے یہ بھی فرماتے ہیں: يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ۔ "اے میرے بیٹو! دیکھنا کہیں ایک ہی دروازہ سے سب کے سب مت داخل ہو جانا بلکہ متفرق دروازوں سے جانا (کہیں خاندانِ نبوت کو کسی کی نظر نہ کھا جائے)"۔ اِدھر شفقتِ پدری نظر گذر سے تحفظ کی یہ تدبیر بھی کرتی جاتی ہے اُدھر لسانِ نبوت رمز تقدیر سے بھی آگاہ کئے جاتی ہے اور فرماتی ہے کہ: وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ "یعنی میری یہ تدبیر عالم اسباب کی ایک تسلی ہے جو مقدر ہو چکا ہے کہیں میں اس کو ٹال سکتا ہوں"۔

یہاں اس پر بھی غور کیجئے کہ جس کو آپ تقدیر کا جبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ہے کیا؟ یہی کہ قدرت نے اپنے ہی دیئے ہوئے اختیار کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہے یا یہ کہ جو اختیار عطا فرمایا تھا اس کو سلب کر لیا ہے۔ پھر اس جبر کا اثر ہے تو کہاں ہے ؟

کیا اُن اشیاء میں ہے جہاں آپ کو تقدیر سے قبل اختیار حاصل تھا یا ان میں جہاں پہلے آپ
مجبور ہی تھے۔ اس لیے یوں نہ کہئے کہ تقدیر نے ہم مختاروں کو مجبور بنا دیا بلکہ یوں کہئے کہ
ہم مجبوروں کو ایک محدود پیمانہ پر مختار بنا دیا۔ ایسا مختار بھی ہماری حیثیت سے کہیں زیادہ
تھا۔ ایک مجبور ہی نہیں بلکہ معدومِ محض میں اختیار کا تصوّر کرنا ہی کب معقول ہے؟ یہ تو
مختارِ مطلق کا کرم تھا کہ اس نے محض اپنے کرشمۂ قدرت سے ایک جماد کو اختیار بخش دیا اور
اُس کے اس اختیار کے سامنے اپنا جبر ایسا پسِ پردہ کر دیا کہ اس عالم میں اس جبر کا ادراک
کرنا مشکل ہو گیا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا ۝ (سورۃ الدہر آیت ۲) ذرا اور دقتِ نظر سے کام لیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا
کہ ہمارا یہ ناتمام اختیار قائم ہی تب رہ سکتا ہے جبکہ قدرت کا اختیار اس کے ساتھ ساتھ لگا
رہے، اگر قدرت کا اختیار کہیں اس کی سرپرستی چھوڑ دے تو ہمارا اختیار خود بخود فنا ہو جائے
اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ بچہ جب ضد کرتا ہے کہ وہ چلے اور اپنے پیروں ہی
چلے، جبکہ اس کے والدین جانتے ہیں کہ اس غریب کے پیروں میں خود چلنے کا دم نہیں ہے
اس لیے اپنی طاقت سے اس کو چلاتے ہیں اور جس طرف وہ چلنا چاہتا ہے اُسی طرف
چلاتے ہیں، اس کا ناتمام اختیار جب اس طرح والدین کے اختیارِ مستقل کے سہارے
کام کرنے لگتا ہے تو اس بچہ کے ارمان تو یوں پورے ہو جاتے ہیں کہ جو اس کی ضد تھی
وہ پوری ہو گئی اور والدین یوں خوش ہو جاتے ہیں کہ اس طرح ان کا بچہ خوش ہو گیا اور
ان کا کچھ بگڑا بھی نہیں، اور اگر کہیں یہ بچہ اس بات کی ضد کر بیٹھے کہ والدین کی دستگیری کے
بغیر خود اپنی ہی طاقت سے چلے تو ظاہر ہے کہ جتنا فاصلہ اپنے اس ناتمام اختیار کے ساتھ
اس نے طے کر لیا تھا یہ بھی طے نہ ہو۔

یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ بچہ تو اپنی مشیت بھی رکھتا ہے اور کچھ طاقت
بھی، ادھر اس کے والدین گو طاقت اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں مگر اپنی مشیت اور
اپنی طاقت کو اس بچہ کے تابع بنائے رکھتے ہیں اور اُدھر ہی اس کو صرف کرتے ہیں جدھر
وہ بچہ ارادہ کرتا ہے۔ مگر خالق کے معاملہ میں بندہ کی مشیت کی ہستی ہی نہیں ہوتی، وہ اگر

کچھ قدم چل سکتی ہے تو خالق کی مشیّت کے سہارے سہارے ہی چل سکتی ہے۔ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ یعنی تم ارادہ ہی وہ کر سکتے ہو جو مشیّتِ الٰہیہ چاہتی ہے۔ تعجب ہے کہ اتنی محکومیت کے باوجود اگر سطحی نظر ڈالیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عالم میں مشیّتِ الٰہیہ ہمارے ارادے کے تابع بنی ہوئی ہے اور جو ہم کرنا چاہتے ہیں وہی وہ پورا کرتی رہتی ہے۔ یہ تمام کرشمہ اسی حکمت کا ہے کہ ہمارے افعال پر قدرت نے جبر نہیں فرمایا بلکہ خود ہمارے اختیار ہی کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے، لہٰذا مجبورِ محض ہونے کے باوجود ہمارا احساس یہی رہتا ہے کہ ہم مختارِ مطلق ہیں اور اس عالم کے لحاظ سے یہ غلطی بھی نہیں۔ جو جبر یہاں ہے وہ عالمِ غیب کے لحاظ سے ہے اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ اس معاملہ میں صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کیا جائے یہاں دلائل کے اگر انبار بھی لگا دیئے جائیں تو انسان اپنے ذاتی وجدان کے بالمقابل ان کو باور نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہاں اسلام نے صرف تسلیم و رضا کی ایک راہ بتا دی ہے، حقیقت سے بے خبر بھی نہیں رکھا، اور اس کو پورے طور پر حل کرنا چونکہ ہمارے بس سے بالاتر تھا اس لیے اس بارے میں بحث کرنے سے بھی روک دیا۔ فاتبعوہ ھٰذا صراط مستقیم۔

مسئلہ مجازات | جزاء اور سزا کے مسئلہ میں اُلجھنا بھی بیکار ہے۔ اوّل تو اس لیے کہ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ مالک اور خالق سے کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا بلکہ مالک کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو ہر قسم کا تصرّف کرنے کا مجاز ہو۔ آپ ایک چیز عاریۃً لیتے ہیں، کرایہ پر بھی لیتے ہیں، مگر یہاں اُلٹی اس کی حفاظت بھی آپ ہی کے سر پڑتی ہے، اور آپ صرف وقتِ مقررہ تک، وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہوتے ہیں، اس کو فروخت نہیں کر سکتے، ہبہ نہیں کر سکتے، اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کر سکتے، اس کو توڑنا اور خراب کرنا تو دور کی بات ہے، لیکن جس چیز کے آپ مالک کہلاتے ہیں اس میں آپ کو ان تمام تصرّفات کا حق حاصل ہوتا ہے، بلکہ کسی قیمتی چیز کے ضائع کر دینے پر بھی آپ مسئول نہیں ہو سکتے۔ جب ایک مجازی مِلک کے حقوق یہ ہیں تو حقیقی مِلک کے

حقوق کیا ہوں گے، پھر یہاں صرف علاقہ ایک مملوکیت کا ہی نہیں مخلوقیت کا بھی ہے۔ اور چونکہ اس نے بلا شرکتِ غیرے پیدا فرمایا ہے اس لیے مالکیتِ حقیقیہ کا حق بھی صرف اسی کا رہنا چاہیئے، اب ایسے مالک سے جو خالق بھی ہو جزاء و سزا کا سوال ہی کیا۔

دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مالکیت نہیں صرف ملوکیت عطا فرمائی تھی اور وہ بھی بہت محدود پیمانہ پر، لیکن اس ناتمام ملوکیت کے لیے بھی جو امتیازی شان عطا فرمائی وہ قرآنِ کریم کے ان الفاظ سے ظاہر ہے: ھٰذا عطاء نا فامنن او امسک بغیر حساب - یہ ہماری بخشش ہے، اب آپ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں آپ سے اس کا کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی مشہور زمانہ تصنیف "البدایہ والنہایہ" کی جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ نبوت کے ساتھ سلطنت بھی مرحمت فرمائی گئی تھی اس لیے یہ تنبیہ بھی کردی گئی کہ یہ بادشاہت ہے تو ہمارا عطیہ، مگر چونکہ بادشاہ سے کوئی بازپرس نہیں ہوا کرتی اس لیے جاؤ اس بارے میں تم سے بھی کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اسلام میں غلامی کے مسئلہ سے ذرا سی مالکیت کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ وہ صرف یہ جتلانے کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ جو مولائے حقیقی اور مالکِ حقیقی کی مالکیت پر راضی نہیں ہوتا اس کو پھر غلاموں کی مالکیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ مگر اس مالکیت کے بھی جتنے حقوق ہیں وہ اس سے ظاہر ہیں کہ جو ابھی ابھی غلامی سے قبل خود مالک بننے کی اہلیت رکھتا تھا محکومیت کا لفظ کسی بھی پہلو سے اس پر عائد نہیں ہوسکتا تھا، ہر تصرف اس کا نافذ اور ہر حکم اس کا ناطق تھا وہی غلامی کے بعد اس طرح مملوک بن جاتا ہے کہ مالکیت کی اس میں اہلیت ہی نہیں رہتی نہ اس کا کوئی تصرف درست ہوتا ہے نہ کوئی حکم نافذ ہونے کے قابل ہوتا ہوتا ہے۔ اور اس کے مالک کو اس کے بیچ ڈالنے کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ اس کو مار بھی ڈالے، جب بھی بعض ائمہ کے نزدیک گو اس کو گناہ کتنا ہی بڑا ہو مگر دنیا میں اس سے قصاص نہیں لیا جاتا۔

پس جبکہ مالکیت و خالقیت کی ادنیٰ سی مشابہتوں کے بعد سوال و جواب کا مرحلہ

ختم ہو جاتا ہو تو جہاں یہ دونوں باتیں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوں بھلا وہاں محاسبہ اور سوال کا حق کس کو ہو سکتا ہے؟ اس لیے فرمایا لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ ٥ (سورۃ آیت ـــ)

دوم آپ نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے کہ آخر اس عالم کی آفرینش ہوئی کیوں؟ یہاں صرف ذات جامع صفات کا ایک اقتضاء ہی تو تھا لہٰذا اب جس صورت سے بھی یہ اقتضاء پورا ہوگا وہی مناسب ہوگی۔ کمال یہ چاہتا ہے کہ مہر و قہر دونوں ہی کا ظہور ہو اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کے لیے اسباب بھی پیدا فرمائے جائیں، اور چونکہ جزاء و سزا کا عنوان یہ چاہتا ہے کہ جزاء میں عمل کی کچھ تاثیر بھی عیاں رہے تاکہ اچھے عمل پر اچھی جزاء اور بُرے عمل پر اس کی سزا دی جا سکے، اس لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ بندہ کو کچھ اختیار دے دیا جائے، اس تناسب کے لیے جتنا اختیار عقلاً ممکن تھا وہ عطا کر دیا گیا اور اسی پر جزاء و سزا کو دائر کر دیا گیا۔ اب جب کبھی بندہ اپنے اس عطا کردہ اختیار سے کوئی بُرا عمل کرتا ہے تو وہ دنیا میں بھی بُرا کہلاتا ہے، اور اگر بھلا (اچھا) عمل کرتا ہے بھلا کہلاتا ہے جب اس کے ان افعال پر دنیا میں تعریف و مذمت کرنا معقول ہو گئی تو آخرت میں معقول کیوں نہ سمجھی جائے؟ ؎

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پھنسنے کو کچھ اختیار لیتا جا

رہ گئی یہ بات کہ جب بُرے افعال کرنا بری بات ہے تو اس کا پیدا کرنا کمال کیوں کر سمجھا جائے؟ تو اس کو یوں سمجھئے کہ خلق اور کسب میں بڑا فرق ہے۔ انسان جب کوئی عمل کرتا ہے تو وہ عمل اس کے ساتھ اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کپڑے کے ساتھ سفیدی اور سیاہی، اب جب اس لحاظ سے کپڑے کو سفید اور سیاہ کہہ سکتے ہیں تو ان اعمال کے لحاظ سے بندہ کو بُرا اور بھلا بھی کہہ سکیں گے، مگر مخلوق خالق سے علیحدہ رہتی ہے وہ اس کے ساتھ قائم نہیں ہو جاتی، لہٰذا بری مخلوق خالق کی صفت نہیں ہو سکتی، البتہ اس کا پیدا کرنا اس کی صفت ہوتی ہے، صفتِ خلق بہرکیف کمال

ہے، اسی لیے ناقص نہ خیر پیدا کر سکتا ہے نہ شر، کیونکہ خلق مطلق ایک کمال ہے۔
اب رہا یہ سوال کہ خلقِ شر کمال کیوں ہے؟ تو یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب خلق کفر میں ظہورِ قہر کی مصلحت بھی ہو تو پھر اس کو بھی مقتضائے کمال کیوں نہ کہا جائے ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست
دوزخ کرا بسوزد گر بو لہب نہ باشد

شاعر یہاں یہی مضمون کہہ رہا ہے کہ عالمِ کفر کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ اگر ابولہب جیسا کافر نہ ہو تو پھر جہنم کی پیدائش کا کیا فائدہ؟
بادشاہی کا کمال دونوں قسم کی طاقتوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کافر کے حق میں کفر کتنا ہی قبیح کیوں نہ ہو لیکن خالق کے حق میں تو مظہرِ کمال ہوتا ہے۔
دیکھئے بیت الخلاء یعنی پاخانہ خود کتنی ہی کمتر چیز ہو لیکن ایک بڑی سے بڑی کوٹھی اس وقت تک ناقص ہی سمجھی جاتی ہے جب تک اس میں یہ ناقص در ناقص چیز موجود نہ ہو۔ جس طرح ایک کوٹھی کے لیے بیت الخلاء کا وجود ضروری ہے، اسی طرح عالم کے کمال کے لیے بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے مومنِ کامل کے بالمقابل ایک ابولہب جیسے کافر کی بھی ضرورت ہے۔ پھر جس طرح ایک کوٹھی میں یہ سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے کہ زمین کے اس ٹکڑے نے کیا قصور کیا تھا کہ اس پر بیت الخلاء بنا دیا اور اس ٹکڑے میں کیا کمال تھا کہ اس کو نشیمن بنا دیا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ابولہب نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو کافر بنا دیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں کیا کمال تھا کہ ان کو صدیقیت سے نواز دیا؟ یہ سب مالک الملک کے اپنے ارادہ اور پسند کی بات ہے، کسی کو اس میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے ؎

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فوائد قرآن کریم میں زیرِ تفسیر آیتِ کریمہ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝ (سورۃ الکہف آیت ۴۹) مسئلہ تقدیر کا

حل اس طرح تحریر فرمایا ہے:۔

"اب جو کرے ظلم نہیں سب اس کا مال ہے، ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا۔ بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا اور جو کوئی کہے (یعنی اعتراض کرے) کہ گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ سو یہ بات نہیں ہے اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے تو اپنے قصور سے دوڑتا ہے۔ اور جو کوئی (یہ) کہے (کہ) قصد بھی اس نے دیا، تو قصد دونوں طرف لگتا ہے اور جو کوئی کہے اُسی نے ایک طرف لگا دیا۔ سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے، بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اُس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسی کو۔ جو اس سے بدی کرے، یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کرا دیا"۔ اھ

ان سطور کو بار بار بغور پڑھئے تو مسئلہ تقدیر کا حل جتنا واضح اور جتنے سادگی سے آپ کو یہاں ملے گا۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی نہیں ملے گا، بلکہ سمجھنے کا ارادہ بھی ہو، اعتراض برائے اعتراض نہ ہو۔

فقط واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

نوٹ: "مسئلہ تقدیر اور مجازات" کے متعلق یہ تفصیل بندہ نے چند اہم کتابوں سے جمع کی ہے جس میں اکثر حصہ "ترجمان السنۃ" مؤلفہ حضرت مولانا الحاج محمد بدر عالم صاحب مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کا ہے۔ ان تفصیلات کا بغور مطالعہ کرنے سے ان شاء اللہ العزیز مسئلہ تقدیر اور مجازات سمجھ میں آجائے گا۔

ایمان میں کمی بیشی کا مسئلہ اور اس کی تحقیق

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں ایک غیر مقلد عالم دین نے برسرِ منبر یہ مسئلہ بیان کیا کہ اچھے اعمال کرنے سے ایمان بڑھتا ہے اور بُرے اعمال کے صدور سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور بطور دلیل اس پر قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کیں۔ اس کے بعد جب میں نے اپنے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے اس مسئلے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ایمان میں کمی اور زیادتی واقع نہیں ہوتی، غیر مقلد مولوی صاحب نے مسئلہ صحیح بیان نہیں کیا۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرماکر ہماری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب :۔ ایمان میں کمی اور زیادتی ہونے اور نہ ہونے کا مسئلہ زمانۂ قدیم سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف کی اصل وجہ ایمان کی تعریف میں اختلاف ہے۔

اور جمہور محققین کے ہاں ایمان صرف تصدیقِ قلبی سے عبارت ہے، اور اقرار باللسان وغیرہ اس کے شرائط ہیں ـــــ امام سرخسیؒ اور علامہ بزدویؒ وغیرہ کے نزدیک تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کا نام ایمان ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے الفقہ الاکبر میں الایمان ھو الاقرار والتصدیق کا مقولہ درج ہے۔ جبکہ محدثینِ عظام کے ہاں ایمان تصدیقِ قلبی، اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے عبارت ہے ـــــ اس لحاظ سے جن کے ہاں ایمان ان تین اشیاء سے عبارت ہے اُن کے ہاں تو ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے اور جن کے ہاں ایمان تصدیقِ قلبی سے عبارت ہے اُن کے نزدیک ایمان میں کمی و زیادتی پیدا نہیں ہوتی۔

لیکن اگر اس اختلاف پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اختلاف صرف لفظی نزاع ہے، اس لیے کہ ایمان کے تین معنی ہیں:۔

۱۔ نفس ایمان یعنی ھو التصدیق بما جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے جس میں گھٹاؤ اور بڑھاؤ دونوں نہیں آتے، البتہ شدت اور ضعف پیدا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کمی وزیادتی کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) حقیقی (۲) مجازی ـــ حقیقی میں اشیاء کی کمیت اور مقدار میں تفاوت ہوتا ہے۔ اور مجازی میں کیفیت کے اندر اشیا شدید اور ضعیف ہوتی ہیں۔ تو ایمان کی اس تعریف میں کمی وزیادتی سے کمیت اور مقدار کی نفی مراد ہے

کیفیت کی نہیں ۔

۲۔ ایمانِ دنیاوی : دنیاوی احکام اس شخص پر لازم ہوتے ہیں جو زبان سے کلمہ کا ورد کرے ۔ اس لیے بعض علماء کرام نے دنیاوی احکامات کے اجراء کے لیے اقرار باللسان کو لازم قرار دیا ہے ۔

۳۔ ایمانِ کامل ، جس ایمان پر اُخروی نجات بلاحساب وکتاب موقوف ہے ، ایمان کی اس قسم کے لیے اعمالِ صالحہ کی شدید ضرورت ہے ، اور اعمال ہی کی وجہ سے
تو علماء کرام نے ایمان کی اس قسم کے لیے اعمالِ صالحہ کو ایمان کا جُزء قرار دیا ہے ۔ مگر پھر بھی جو شخص اعمالِ صالحہ قصدًا وعمدًا ترک کرے اُن کے ہاں وہ کافر نہیں ہے ۔ اس سے معلوم ہؤا کہ اعمالِ صالحہ کامل ایمان کے لیے ضروری ہیں نفسِ ایمان کے لیے ۔ لہٰذا اس مسئلہ میں جو اختلاف ہے وہ صرف سطحی اور لفظی نزاع ہے حقیقت میں ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پنجگانہ کا تارک ہو یا کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو تو محدثین کے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ، صرف فاسق وفاجر شمار ہوگا اور آخرت میں اپنے اعمالِ بد کی سزا پانے کے بعد نجات حاصل کرے گا ۔ اگر محدثین حضرات کے ہاں اعمال نفسِ ایمان کا اجزاء ہوتے تو وہ ضرور اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج متصور کرتے اور اس پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے (جیسے خوارج نے کیا ہے) یا کم از کم اس کو ایمان وکفر کے درمیان رکھتے (جیساکہ معتزلہ کی رائے ہے) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محدثین کے ہاں بھی اعمال نفسِ ایمان کا جزء نہیں بلکہ ایمانِ کامل کا جُزء ہیں اس لئے کہ ایمان میں کمی بیشی اعمال ہی کی وجہ سے ہوتی ہے ۔

صورت مذکورہ کے مطابق ایمان کی زیادتی اور کمی کے بارے میں جو آیاتِ مبارکہ اور احادیث پیش کی ہیں وہ سب ایمانِ کامل کے بارے میں ہیں ورنہ تصدیقِ قلبی جو کہ نفس ایمان ہے اس کے لیے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کافی دلائل موجود ہیں ۔ مشہور مفسر قرآن علامہ قاضی بیضاوی رح نے سورۃ البقرہ کے شروع میں ہی ایمان کے بسیط ہونے کے کافی دلائل ذکر کیے ہیں ، مثلاً : اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (الآیۃ) ۔ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۔ (الآیۃ) ۔۔۔ اور بسیط میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی اور یہ نفسِ ایمان ہے ۔ اسی نفس ایمان ہی پر امام ابوحنیفہ رح کے اقوالِ ایمانی کا ایمانِ جبریل ! ۲۱

المؤمنون مستوون فی الایمان محمول ہیں، اس لیے نفسِ ایمان تمام مؤمنین کا ایمان، اور ہر انسان کا ایمان اور بڑے سے بڑے فرشتے کا ایمان یکساں ہے اور وہ کمی بیشی قبول نہیں کرتا کیونکہ تصدیق مقولہ کیف سے عبارت ہے مقولہ کم سے نہیں، اور کیف میں شدت وضعف تو آتا ہے مگر کمی وزیادتی نہیں آتی۔ لہٰذا اچھے اعمال کرنے سے کامل ایمان میں زیادتی اور بُرے اعمال کے ارتکاب سے کامل ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے، لیکن جس ایمان پر نجاتِ اُخروی کا مدار ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

ایمانی کایمانِ جبرئیل

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے ایک غیر مقلد ساتھی کا کہنا ہے کہ امام محمدؒ نے اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ کے قول ایمانی کایمان جبرئیل کو ناپسند فرمایا ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ آمنتُ بما آمن بہ جبرئیل۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مذکورہ قول کی مخالفت کی ہے؟ نیز یہ بھی فرمائیں کہ امام صاحبؒ کے قول ایمانی کایمان جبرئیل کا کیا مطلب ہے؟ کیا امام صاحبؒ کا ایمان حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ایمان کے برابر ہے؟

الجواب: امام محمدؒ کے حوالہ سے یہ کہنا کہ اکرہ ان یقول ایمانی کایمان جبرئیل کے بجائے آمنتُ بما آمن بہ جبرئیل کہنا چاہیے درست ہے، لیکن یہ بات غلط ہے کہ آپ نے اپنے استاد کی مخالفت کی ہے بلکہ آپ اپنے اس قول سے اس وہم کو دور کرنا چاہتے ہیں تاکہ کوئی جمیع وجوہ سے اپنے ایمان کو حضرت جبرئیل کے ایمان سے تشبیہ نہ دے اسلیے کہ کسی کا بھی ایمان انبیاء وملائکہ کے برابر نہیں ہے بلکہ دونوں کے ایمان میں فرق بیّن ہے، جیساکہ شارح فقہ اکبر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ومن ھنا قال الامام محمدؒ علی ما ذکرہ فی الخلاصۃ عنہ: اکرہ ان یقول ایمانی کایمان جبرئیل علیہ السلام ولکن یقول: آمنت بما آمن بہ جبرئیل علیہ السلام۔ انتھٰی۔ وذٰلک ان الاوّل یوھم ان ایمانہ کایمان جبرئیل علیہ السلام من جمیع الوجوہ ولیس الامر کذٰلک لما ھو الفرق البیّن بینھما ھنالک۔ (شرح فقہ اکبر ص۸۷، ۸۸ الایمان لایزید ولا ینقص) ـــــ جہاں تک امام صاحبؒ کے قول ایمانی کایمان جبرئیل علیہ السلام کا تعلق ہے تو اس کا مطلب بھی جمیع وجوہ سے تشبیہ دینا مقصود نہیں بلکہ نفس ایمان یعنی التصدیق بما جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مماثلت بیان کرنا ہے، ورنہ جمیع وجوہ میں کسی کا ایمان بھی انبیاءؑ وملائکہ کے مماثل وبرابر نہیں ہوسکتا، جس کے امام محمدؒ بھی قائل ہیں، وہ بھی بعض وجوہ میں دونوں کے ایمان میں مماثلت کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں ائمہؒ کے اقوال میں کوئی مخالفت نہیں ـــــ مزید تفصیل کیلئے ملا علی قاریؒ کی کتاب "شرح فقہ اکبر" اور حضرت شیخ الہندؒ کی کتابیں "ادلۃ کاملۃ" اور "ایضاح الادلۃ" کا مطالعہ ضروری ہے۔

ظہور امام مہدی اور نزول عیسیٰؑ کے بارے میں فتویٰ

سوال - جناب مفتی صاحب دوبارہ ظہور امام مہدی و نزول حضرت عیسیٰ، علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام حسب ذیل مسائل کے بارے میں اہل سنت والجماعۃ کے صحیح عقائد سے آگاہ فرمادیں۔

(۱) کیا امام مہدی آخر الزمان حضرت حسینؓ کی اولاد سے ہوں گے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں؛ احادیث نبویہ کی روشنی میں حضرت مہدی کے امام حسینؓ یا امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہونا بیان فرماویں۔

(۲) حضرت مہدی کب اور کہاں پیدا ہوں گے ان کا اسم مبارک اور ان کے والدین کے اسم مبارک ان کے بارہ میں آگاہ از غیب اور جامع حالات مہدی و حضرت عیسیٰ علیہ السلام تحریر فرماویں۔

(۳) نازل ہونے والے حضرت عیسیٰؑ سے عیسیٰؑ ابن مریم مراد ہیں یا کوئی اور عیسیٰ؛ کیوں کہ آجکل کئی مسیح موعود بنے پھرتے ہیں لامذہب حضرات یہ کہتے ہیں کہ احادیث متعلقہ مہدی و نزول عیسیٰؑ جو سنی حضرات بیان کرتے ہیں وہ موضوع اور ضعیف ہیں بلکہ اعلیٰ مہدی ابن حسن عسکری یا مرزا غلام احمد قادیانی ہے؛ جواب سے مطلع فرمادیں۔

الجواب: (۱) حضرت مہدی کا فاطمی اور خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہونا احادیث قویہ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے اکثر روایات میں حضرت مہدی کے بارہ میں رجل من اھل بیتی (یعنی میرے خاندان اہل بیت میں سے ہوگا) اور من عترتی (میری اولاد میں سے) کے الفاظ موجود ہیں ترمذی شریف ج ۲ و ۳ ص ۴۶ میں متعدد روایات ہیں جنہیں امام ترمذیؒ نے حدیث حسن صحیح کہا ہے نیز ابوداؤد کی روایت میں ہے - عن ام سلمۃؓ قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ یقول المھدی من عترتی من اولاد فاطمۃؓ (مشکوٰۃ جلد ۲ بروایت ابوداؤد شریف فرماتے ہیں کہ حضرت مہدی سید اور فاطمۃ الزہراؓ کے اولاد میں سے ہیں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرمایا کہ اس بارہ متعدد روایات وارد ہوئے ہیں وہ معنی حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں رہی یہ بات حضرت مہدی علیہ السلام والدہ اور والد باجد دونوں جانبوں سے نجیب الطرفین سید ہوں گے والدین ایک سلسلہ حضرت امام حسنؓ اور ایک حضرت حسین سے ہوگا جیسا کہ شیخ ابن حجر مکی ہیثمی نے بھی یہی تصریح فرمائی ہے۔

(جواب سوال (۲) حضرت مہدی کے اجمالی حالات) حضرت مہدی کے علامات ظہور ان کے حالات شکل و شباہت اور شمائل اور عادات احادیث نبویہ میں مفصلاً مذکور ہیں حضرت شاہ

رفیع الدین دہلویؒ "علامات قیامت" کے ضمن میں ان چیزوں کو بھی مفصل اور یکجا جمع کیا ہے اس رسالہ کی بنیاد آیات قرآنیہ اور مستند احادیث نبویہ پر ہے۔ یہاں ان کے رسالہ علامات قیامت سے اجمالاً مختصر حالات نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت امام مہدی کے ظہور کی علامت یہ ہوگی کہ اس سے قبل ماہ رمضان چاند اور سورج گرہن لگ چکے گا اور بیعت کے وقت آسمان سے ندا آئے گی ھذا خلیفۃ اللّٰہ مھدی فاستمعوا لہ واطیعوا یہ خدا کا خلیفہ مہدی ہے اس کا حکم سنو اور مانو اس آواز کو اس جگہ تمام خاص و عام سن لینگے حضرت امام سید اور اولاد فاطمہ کے ہونے کے آپ کا قد و قامت قدرے لمبا بدن چیرت رنگ کھلا ہوا اور چہرہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہہ ہوگا نیز آپ کے اخلاق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے ہونگے آپ کا اسم شریف محمد والدہ صاحبہ کا نام آمنہ ہوگا۔ زبان میں قدرے لکنت ہوگی جس کی وجہ سے تنگدل ہو کر کبھی کبھی ران پر ہاتھ مارتے ہوں گے آپ کا علم لدنی (خدا داد ہوگا) بیعت کے وقت عمر چالیس سال کی ہوگی خلافت کے مشہور ہونے پر مدینہ کی فوجیں آپ کے پاس مکہ معظمہ چلی آئے گی شام عراق اور یمن سے اولیاء کرام و ابدال عظام آپ کی مصاحبت میں اور ملک عرب کے بے انتہاء آدمی آپ کی افواج میں داخل ہو جائیں گے اور اس خزانہ کو جو کعبہ میں مدفون ہے جس کو تاج الکعبتہ کہتے ہیں نکال کر مسلمانوں پر تقسیم فرمائیں گے (آگے مفصل حالات ہیں یہاں تک کہ دجال کے دمشق پہنچنے سے قبل) حضرت امام مہدی علیہ السلام دمشق آ چکے ہوں گے اور جنگ کی پوری تیاری اور ترتیب فوج کر چکے ہوں گے اور اسباب حرب و ضرب تقسیم کر چکے ہوں گے کہ موذن عصر کی اذان دے گا لوگ نماز کی تیاری میں ہوں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو فرشتوں کے کاندھوں پر تکیہ کیے آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کی شرقی منارے جلوہ افروز ہو کر آواز دیں گے کہ سلم (سیڑھی لے آؤ) ہیں سیڑھی حاضر کی جائے گی آپ اس کے ذریعہ سے فروکش ہو کر حضرت امام مہدی سے ملاقات فرمادیں گے امام مہدی نہایت تواضع اور خوش خلقی کے ساتھ پیش آئیں گے (صحیح مسلم وغیرہ) اور فرمائیں گے یا نبی اللہ امامت کیجئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرمائیں گے کہ امامت تم ہی کرو کیوں کہ تمہارے بعض بعض کے لیے امام ہیں اور یہ عزت اسی امت کو خدا نے دی ہے پس امام مہدی نماز پڑھائیں گے حضرت عیسیٰ ابن مریم اقتدا کریں گے (اس کے بعد دونوں اکٹھے رہ کر دجال کا مقابلہ کفر و ضلالت استیصال کریں گے) تمام زمین امام مہدی کے عدل و انصاف کے چمکاروں سے منور و روشن ہو جائے گی ظلم بے انصافی کی بیخ کنی ہوگی آپ کی عمر ۴۹ سال ہوگی بعد ازاں حضرت امام مہدی کا وصال ہو جائے گا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کی جنازے

کی نماز پڑھاکر دفن فرمائیں گے اس کے بعد تمام چھوٹے بڑے انتظامات حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ آجائیں گے دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیام چالیس سال رہے گا۔ یہ تمام حالات صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے تفصیل کے لیے شاہ رفیع الدینؒ "کتاب علامات قیامت" دیکھئے واللہ اعلم!

جواب سوال ۳ - اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے قبل عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام آسمان سے نزول فرمائیں گے قرآن کے بے شمار نصوص قطعیہ سے یہ عقیدہ ثابت ہے اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں نزول عیسیٰ ابن مریم کے بارہ میں اس کثرت احادیث وارد ہوئی ہیں کہ علمائے اسے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

حضرت علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس موضوع پر عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح (مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) میں حیات مسیح و نزول عیسیٰ علیہ السلام کو محققانہ انداز سے ثابت کیا ہے کہ تمام روایات متعددہ اور احادیث معنی تواتر کے حد تک پہنچ گئی ہیں رہا یہ کہ عیسیٰ ابن مریمؑ ہی کیا کوئی اور عیسیٰ تو اس بارہ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث نزول عیسیٰ میں صرف ابن مریم کہہ کر ان دجالین اور کذابین کی جڑ کاٹ دی ہے عیسیٰ کا لفظ اکثر روایات میں ذکر ہی نہیں تاکہ کل کوئی دجال اس نام سے غلط فائدہ نہ لے سکے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور حدیث ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدی ابن لیوشکن ان ینزل ابن مریم حکماً عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ ویفیض المال حتی لا یقبل احد۔ (حدیث حسن صحیح مشکوٰۃ صفحہ ۴۷۹ بحوالہ مسلم ترمذی جلد ۲ ص ۴۶)

فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم رب کی قریب ہے کہ مریم کا بیٹا تم میں اتریں جو عادل و منصف فیصلہ کرنے والے ہیں صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کرکے کفار سے جزیہ نہ قبول کرنے کے احکام صادر کریں گے مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔

بخاری شریف مسلم شریف کی دوسری حدیث میں ہے۔

قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم۔

(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ شریف ص ۴۸۰)

اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور تمہارے امام (مہدی) تم ہی میں سے ہوں گے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے۔

قال فینزل عیسیٰ بن مریم (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم شریف)
فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ پھر عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔
حضرت عبداللہ بن عمر کے روایت ہے۔
قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل عیسیٰ بن مریمؑ الی الارض فیتزوج ویولد لہٗ ویمکث خمساً واربعین سنۃً ثم یموت فیدفن معی فی قبری فاقوم انا وعیسیٰ بن مریم فی قبرٍ واحدٍ بین ابی بکرؓ وعمرؓ (مشکوٰۃ باب نزول عیسیٰؑ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم زمین میں نازل ہوں گے شادی کریں گے اوران کی اولاد بھی پیدا ہوگی اور ۴۵ سال تک ٹھہریں گے پھر وفات پاکر میرے پہلو میں دفن ہوں گے پھر قیامت کے دن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکٹھے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے درمیان قبر سے اٹھیں گے۔

اس کے علاوہ کئی احادیث ہیں جن میں ابن مریم (مریم کے بیٹے) کی تصریح موجود ہے اور نزول عیسیٰ بن مریم کے بارہ از اوّل تا آخر علامات بیان کئے گئے ہیں ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے اگر کوئی مسیح موعود یا مہدی آخرالزمان ہونے کا دعویٰ کرے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ علامات سے ہٹ کر کوئی شخص مہدی موعود یا نزول مسیح موعودؑ یا دجّال وغیرہ واقعات کے بارہ میں قیاس آرائیاں کرے تو اسے مجنون کی بڑسے زیادہ وقعت نہیں دینی چاہیئے۔

یہ رہا امام بن حسن عسکری کا مہدی موعود ہونا اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں شیعوں نے ابتدائے خروج مہدی کے بارہ میں از خود ائمہ عظام اہل بیت کو منسوب کرا کر قیاس آرائیاں کی ہیں جو ہمیشہ غلط ثابت ہوئی ہیں شیعہ کتب میں مذکور ہے کہ

(۱) ائمہ نے ۷۰ھ میں خروج مہدی کا وعدہ کیا تھا مگر وہ پورا نہ ہوا (نصیحۃ الشیعۃ ج ۲ بحوالہ مافی شرح کافی
(۲) امام جعفر صادقؒ خود مہدی ہونے والے تھے مگر نہ ہوئے (نصیحۃ الشیعۃ ج ۲ ص ۲۳۸ بحوالہ کتاب الغیبت للطوسی)

(۳) امام موسیٰ کاظمؒ نے خروج مہدی کے لیے ۲۰۰ھ مقرر کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہوا (ج ۲ ص ۲۳۸)
یہ روایات اور یہ خروج مہدی کے اوقات ائمہ کے نام پر شیعوں کی ارتداد سے روکنے کے لیے گھڑے جاتے رہے کہ مہدی کا وقت مقرر ہے اور بہت جلد آنے والے ہیں چنانچہ حسب روایات کتب شیعہ خود امام باقرؒ نے ان کی تردید وتکذیب کی ہے اصول کافی کی روایت ہے۔

عن الفضل بن یسار عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت لھذا الامر وقت فقال کذب الوقاتون کذب الوقاتون کذب الوقاتون۔

(نصیحۃ الشیعۃ ج ۲ ص ۲۳۸ بحوالہ اصول کافی ص ۲۳۲)

فضل بن یسار امام باقرؒ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ کیا اس امر (خروج مہدی) کے لیے کوئی وقت مقرر ہے امامؑ نے تین مرتبہ فرمایا کہ جھوٹ بولا تھا وقت مقرر کرنے والوں نے۔

(فقط واللہ اعلم)

حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والے لوگ مسلمان تھے

سوال :- جناب مفتی صاحب! کیا حضرت ابراہیمؑ کو ماننے والے لوگ یا آپ کی امت اسلام پر تھی یا نہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ اس وقت یا آج سے چودہ سو سال پہلے کافروں کو جو تھوڑا بہت دنیاوی فائدہ دے رہا ہے وہ مسلمانوں کے وسیلہ سے دے رہا ہے؟ کیونکہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۵ میں ہے :-

(ترجمہ) "جب ابراہیمؑ نے کہا اے پروردگار! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں پھلوں کی روزیاں دے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ دوں گا پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا، یہ پہنچنے کی جگہ بُری ہے۔"

کیا مندرجہ بالا ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کافروں کو جو تھوڑا بہت فائدہ دے رہا ہے وہ مسلمانوں کے وسیلہ سے ہے؟ مفصل جواب سے نوازیں؟

الجواب :- جو لوگ جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے وہ مومن مسلمان تھے اور جو لوگ آپ پر ایمان نہیں لائے تھے وہ کافر تھے۔ ایک حدیث کا مضمون ہے کہ زمین پر جب تک اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا ایک انسان بھی موجود ہو گا قیامت نہ آئے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا کے آباد رہنے کا مدار مسلمان ہی ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

کیا قاتل ہمیشہ جہنم میں رہے گا؟

سوال: قرآن کریم کی آیت فجزاءہ جہنم خالدًا فیھا سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلِ مسلم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا، جبکہ احادیثِ شفاعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اس تعارض کو کس طرح دور کیا جائے گا؟ بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ مقتول کی موت اسی وقت مقدر تھی اس لیے قاتل پر مواخذہ نہیں ہوگا، جبکہ کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ بے گناہ قتل ہو جانے والا شہید ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مقتول کی موت اُسی وقت مقرر تھی تو وہ شہید کیسے ہوگیا اور قاتل کیونکر جہنم میں ڈالا جائے گا؟ اور اگر یہ قاتل پیش امام ہو تو اس کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ آدمی اگرچہ بہت سے کبیرہ گناہ کرکے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائے لیکن جب وہ مؤمن ہو تو ضرور اللہ عزّوجل کی مغفرت سے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے جہنم میں گناہوں کی سزا بھگتنے اور میعادِ سزا ختم ہو جانے کے بعد ضرور جنت میں داخل ہو جائے گا اور ایمان کی بدولت ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں جائے گا۔

اسی عقیدہ کے مطابق فجزاءہٗ جھنم خالدًا فیھا کی توجیہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ ہے کہ قاتل ایک مدتِ دراز تک جہنم میں پڑا رہے گا، پھر نکال کر جنت میں لایا جائے گا نہ یہ کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ اسی توجیہ کے مطابق خلود سے مراد مکث طویل (دیر تک رہنا) ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قتلِ مسلم حلال جان کر نہ کیا گیا ہو، اور اگر قاتل نے مقتول کو حلال جان کر قتل کیا ہو تو اس صورت میں قاتل بوجہ استحلال حرام قطعی کے کافر ہو کر ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ (اعاذنا اللہ منھا) اسی تقدیر کی بناء پر خلود سے دوام مراد ہوگا۔

علامہ حافظ جلال الدین السیوطیؒ، علامہ قاضیخانؒ، علامہ بیضاویؒ اور دیگر مفسرین اس کی تشریح فرما چکے ہیں، اب آیتِ کریمہ اور حدیثِ شفاعت میں مخالفت نہیں رہی ۔۔۔ باقی رہی یہ بات کہ علماء کہتے ہیں کہ مقتول کی موت اسی طرح مقدر تھی، تو یہ شہید کیسے ہوگیا اور قاتل جہنم میں جانے کا مستحق کیوں ہوگیا؟ تو اس کے جواب کو سمجھنے کے لیے چاہیئے کہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ فرمائی جائے:۔

(الف) ایک مسلمان اگر یہ چاہے کہ میں دنیا سے رخصت ہو کر خدا کے دربار میں ایسی حالت میں حاضر ہوں کہ میرے پاس ایمان کی دولت ہو تو اس کے لیے سب سے پہلے اس چیز کی ضرورت

ہے کہ وہ اپنے ایمان اور عقائد کی بنیاد صرف اور صرف اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کرام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور احکام پر رکھے ، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے جو حکم ملے تو بلا چون وچرا اسے اعتقاداً تسلیم کرے اور دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرے اور عملاً اس کا پابند رہنے کی کوشش کرے، رہی اسرار اور حکم کی تلاش ، تو یہ اگرچہ اچھا کام ہے مگر صرف مزید اطمینانِ قلبی کے لیے ہے نہ کہ اصل ایمان کے لیے ، تو اگر کسی حکم خداوندی کی رمز اور حکمت سمجھ میں نہ آئے تو اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ اس میں فی الواقع کوئی حکمت اور مصلحت ہے ہی نہیں بلکہ ہمارے عقل کی رسائی اس حکمت تک نہیں ہوئی ہے۔

(ب) دنیا میں جتنے بھی نظام پہلے گذر چکے ہیں یا اس وقت روئے زمین پر قائم ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نظام نہیں کہ اس کے لیے قوانین اور ان کی پابندی اور ان کی خلاف ورزی کرنے پر سزا اور جزاء دینے کے اصول نہ ہوں، بلکہ ہر نظام کی کامیابی کے لیے قوانین اور اصول ہوتے ہیں ، جو ان کی پابندی اور احترام کرتا ہے اسے اچھا بدلہ ملتا ہے اور جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

(ج) کسی نظام کو چلانے والے (اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو) قوانین کے مطابق سزا دیتے ہیں تو کوئی عقلمند انسان اُن کے اس فعل کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا ہے اور نہ اس بات میں تردد ظاہر کرتا ہے کہ کیوں اس طرح ہوا جبکہ جرم ثابت شدہ اور عیاں ہو چکا ہو — اگرچہ یہ سب کچھ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اب اصل جواب یہ ہے کہ دینِ اسلام اور شریعتِ محمدی ایک الٰہی نظام ہے، اس نظام کے اصولوں اور قواعد وضوابط کی پابندی بندوں پر اس لیے لازم کر دی گئی ہے کہ دنیا میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ بات ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور جاننے کی توفیق عطا فرمار کھی ہے، بھلائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت دی ہے ، انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا فرمائی ہے ، تصرف کے اختیارات بخشے ہیں، ہمیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ جس نے بھی اپنے اختیار اور ارادے سے نظامِ الٰہی کے اصولوں سے انحراف یا خلاف ورزی کی اُسے سزا ضرور ملے گی اور جس نے الٰہی نظام کے اصولوں کی پابندی کی اُسے انعام ملے گا —— قاتل نے چونکہ الٰہی احکام کی خلاف ورزی باختیارِ خود کی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس پر سزا کا بھی مستحق ہو، مقتول سے خلاف ورزی سرزد نہیں ہوتی ہے بلکہ

قانون کا پابند رہا، وہ جذبۂ انتقام کے انتہائی جوش کے وقت میں جبراختیار کرکے پامردی دکھائی اس لیے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ تعالٰے کے فضل وکرم سے شہادت کا درجہ نصیب ہو اور یہی عین عدل اور انصاف کا تقاضا بھی ہے، اسی طرف اشارہ ہے اس آیتِ کریمہ میں:
اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۔ (سورة ـــ)

باقی رہی یہ بات کہ اگر قاتل امام مسجد ہو تو اس کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں عرض ہے کہ اگر کوئی دوسرا صالح امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔

قیامت کے دن توبہ تائب شخص کا بھی حساب کتاب ہوگا

سوال:۔ ایک شخص صغائر وکبائر کا مرتکب ہوتا رہا کہ آخر میں اس نے توبہ کرلی، حقوق العباد جو اس کے ذمے لازم تھے ان کو ادا کیا یا معاف کرائے، حقوق اللہ کی اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی طلب کی اور خوب خلوص اور صدقِ دل سے گناہوں سے توبہ تائب ہوا، توبہ کے بعد موت تک اس سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد نہ ہوا، حالتِ نزع میں اس کی زبان پر کلمۂ شہادت بھی جاری ہوا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قیامت کے دن اس شخص کا بھی حساب وکتاب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۞ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۞ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۞ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۞ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۞ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۞ (سورة الانشقاق ۷ تا ۱۱)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سب کا حساب وکتاب ہوگا چاہے وہ ولی کامل ہو یا فاسق وفاجر کی، اس نے موت سے قبل توبہ واستغفار کیا ہو یا بغیر توبہ کے اس کی موت واقع ہوئی ہو، مگر ان کے حساب وکتاب میں فرق ہوگا، نیک لوگوں کا حساب وکتاب صرف بطور پیشی ہوگا، ان کا حساب آسان ہوگا، ان سے بازپرس محبت کی بناء پر ہوگی جبکہ فسّاق وفجّار اور کفّار کا محاسبہ بصورتِ مناقشہ ہوگا جو باعثِ کلفت وہلاکت ہے ـــ حدیث شریف میں ہے: فان من نوقش هلك (الحدیث) یعنے جس کا مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہوا ـــ لہٰذا توبہ وتائب شخص کا بھی حساب وکتاب ہوگا مگر برائے ہلاکت وکلفت نہیں بلکہ محبت کے طور پر ہوگا۔

آسمان اور چاند کی تحقیق

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل کے بارہ میں کہ:۔
(۱) آسمان ٹھوس جسامت رکھتا ہے یا صرف قدرتی طور پر پردے ہیں؟
(۲) یہ کہ چاند آسمان کے وسط میں واقع ہے یا اس سے باہر فضا میں معلق ہے؟
(۳) حدیث کی رو سے معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو دروازے کھولے گئے تھے وہ نورانی دروازے تھے یا ٹھوس مادہ کے بنے ہوئے تھے؟
(۴) یہ کہ قرآن وسنت کی رو سے کسی مادی چیز کا سائنسی آلات کے ذریعے چاند یا مریخ تک پہنچنا ممکن ہے یا نہیں؟
امید ہے کہ آپ اس بارہ میں ہمارے شکوک قرآن وسنت اور ائمہ فقہاء کی آراء کی روشنی میں رفع فرمائیں گے؟

الجواب:۔ آپ کے سوال کا ترتیب وار جواب حاضر ہے جو کہ امید ہے آپ کی تشفی کا باعث ہوگا:۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا "اور بنائے ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط" یعنی سات آسمان بہت مضبوط بنائے جن میں آج تک اس قدر مدت گذرنے کے باوجود کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا "یعنی قیامت کے دن آسمان پھٹ کر ایسا ہو جائے گا گویا دروازے ہی دروازے ہیں" يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ "اور جس دن پھٹ جائے آسمان بادل سے" إِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ "اور جب آسمان کا پوست اتار لیں" یعنی جیسے جانور کا بعد ذبح کے پوست اتار لیتے ہیں تو اس کے تمام اعضاء اور رگ وریشے ظاہر ہو جاتے ہیں، اسی طرح آسمان کے کھل جانے سے اس کے اندر کی چیزیں نظر آئیں گی۔ إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ "جب آسمان پھٹ جائے" إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ "جب آسمان چر جائے، پھٹ جائے" وغیر ذلک من الآیت مثل وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً ــــ یہ اور اس قسم کی دوسری آیات قرآنیہ کو جب مفسرین کی تحقیقات اور نصوص حدیثیہ کی تشریحات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹھوس جسامت رکھتا ہے اور صرف قدرتی پردے نہیں ہیں، کیونکہ جو صفات مذکورہ آیات میں آسمان کے متعلق بیان کی گئی ہیں مثلاً انشقاق، انفطار، فتح ابواب، شدت، سقف

محفوظ وغیرہ ایسی صفات ہیں جو ایک ٹھوس جسامت رکھنے والی چیز ہی میں ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت کی بناء پر معراج کی رات کو حدیث کی رُو سے جو دروازے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھولے گئے تھے وہ ٹھوس مادہ کے ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ نورانی دروازے۔

(۲) چاند اور سورج دو سیارے ہیں، کل ستارے فضاء میں شرعی نقطہ نظر سے معلق ہیں یعنی بین السماء والارض ہیں۔ آسمان میں ایک بھی ستارہ نہیں ہے، یہ سلف کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر روح المعانی ج ۳۰ ص۵۱ پر سورۃ التکویر کی تفسیر میں منقول ہے:

النجوم قنادیل معلقة بین السماء والارض بسلاسل من نور بایدی الملٰئکة۔

جدید فلاسفہ کا قول بھی اس کے نزدیک ہے وہ بھی یہی کہتے ہیں مگر وہ جذب کے قائل ہیں، نور کی زنجیروں کے قائل نہیں۔ ویقرب منہ قول الفلاسفة الجدیدة لکن بالجذب ــــ

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے استاذ عطاء ابن رباحؒ کا بھی یہی قول ہے ــــ علامہ آلوسیؒ نے سورۂ طلاق کی تفسیر میں ومن الارض مثلھن کے تحت میں لکھا ہے: ولم یقم دلیل علی ان شیئا من الکواکب مغروز فی شیء من السمٰوٰت کالفص فی الخاتم والمسمار فی اللوح ــ اس جگہ علامہ آلوسیؒ نے اسرائیلی روایات کی تردید بھی کی ہے اور فرمایا ہے۔ نعم اکثر الاخبار فی امر السمٰوٰت والارض لا یعول علیہا اشار الیہ النسفی فی بحر الکلام۔

باقی جن آیات سے ستاروں کا آسمان میں ہونا مترشح ہوتا ہے اسکی تردید "روح المعانی" کی جلد ۱۷، ۱۸، ۳۰ میں موجود ہے۔ علامہ آلوسیؒ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ○ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: قال اکثر المفسرین ھو موج مکفوف تحت السماء تجری فیہ الشمس والقمر وقال الضحاک ھو لیس بجسم بل مدار ھٰذہ النجوم۔ گویا اکثر مفسرین اسلام محلِ کواکب کو جس میں شمس و قمر گردش کرتے ہیں تحت السماء تسلیم کرتے ہیں نہ کہ فی السماء (آسمان کے نیچے نہ کہ آسمان میں)۔

(۳) روس و امریکہ کے خلائی تسخیر کے حالیہ کارناموں سے اسلامی تعلیمات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا، اس کا اگر کچھ اثر پڑے گا تو یونانی علم الفلک اور ہیئت بطلیموس پر یا پھر اسرائیلی روایاتِ مختلفہ پر پڑے گا۔ اب تک تو چاند، مریخ و زہرہ پر پہنچنے کی سعی جاری ہے لیکن اگر تمام کواکب تک رسائی ہو جو مستبعد ہے تو بھی اسلامی تحقیق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ــــ

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی (رحمہ اللہ) ڈاکٹر ٹنڈل کا قول جو اس نے "جغرافیہ عالم" میں لکھا ہے، نقل کرتے ہیں کہ خورد بینوں کے ذریعے جو ستارے نظر آسکتے ہیں ان کی تعداد سات ارب ہے، اور جو کسی صورت میں بھی نظر نہیں آتے اُن کی تعداد شمار سے باہر ہے، تاہم اگر ان سب ستاروں کی طرف رسائی ہو جائے تو بھی آسمان تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) سائنسی آلات کی بدولت چاند اور مریخ تک پہنچنے کی سعی جاری ہے مگر مستبعد ہے۔ (واللہ اعلم)

خلائی سفر کی شرعی حیثیت

سوال: جناب مفتی صاحب! قرآن وحدیث کی روشنی میں سورج اور چاند تک جانا ممکن ہے یا نہیں؟ اور ایک مسلمان کا اس کے بارے میں کیا عقیدہ ہونا چاہیئے؟

الجواب:۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ انسان کے لیے سورج اور چاند پر چڑھنا ممکن ہے اور اس سے قرآن وحدیث اور حکمتِ ایمانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ حکمتِ یونانی پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اس عقیدہ پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ اختصار کی وجہ سے یہاں صرف تین دلائل پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اہلِ اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے کہ وہ آسمان پر جسدِ عنصری کے ساتھ اٹھائے گئے ہیں اور یہ عقیدہ قرآن وحدیث اور اقوالِ سلف اور اجماعِ امت سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔ تو اگر خلائی سفر نا ممکن ہوتا تو عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف نہ اٹھایا جاتا۔

(۲) خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات کو جسدِ اطہر کے ساتھ آسمانوں کی طرف اٹھائے گئے اور سدرۃ المنتہیٰ بلکہ اس سے بھی بلند مقام تک پہنچائے گئے، قرآنِ کریم اور ذخیرۂ احادیث سے یہ امر بخوبی واضح ہے۔ تو معلوم ہوا کہ خلائی سفر انسان کے لیے اگرچہ خلافِ عادت ہے لیکن خلافِ شریعت نہیں ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وان كان كبر عليك اعراضهم فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نفقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ۔ (سورۃ الانعام ع ۔) "اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ کافر مسلمان ہو جائیں تو آپ خود اس کا انتظام کیجئے اور اسباب کو مہیا کر کے ان کے ذریعے سے زمین یا آسمان میں جا کر کوئی فرمائشی معجزہ لے آئیے اگر

آپ کو قدرت ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں معجزہ کے غیر اختیاری ہونے اور تسلی دینے کے ضمن میں زمین کے اندر جانے اور آسمان پر چڑھنے کے اسباب کے ممکن ہونے کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا یہ کوئی ناممکن چیز نہیں ہے بلکہ ممکن اور رشدنی امر ہے۔

قرآن و حدیث کی رُو سے مسلمان اور کافر میں یہ فرق موجود ہے کہ کافر کی رُوح خواہ جسم کے ساتھ ہو یا جسم کے بغیر، آسمان تک جا سکتی ہے لیکن آسمان پر چڑھ نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ۔ (الاعراف ع ۵) "جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور بوجہ تکبر اس سے اعراض کرتے ہیں ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر نہ چلا جائے"۔

اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: فیستفتح له فلا یفتح ثم قرء الآیة المذکورة ثم تطرح روحه۔ رواہ احمد (مشکوٰۃ ص ۱۵۶) "کافر کی روح کے لیے آسمان کے دروازے کھولنے کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کے لیے نہ کھولا جائے گا اور اسے پھینک دیا جائے گا"۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحیحین کی روایت میں آیا ہے کہ معراج کی رات پیغمبر اسلام نے آسمانِ اوّل میں حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کے وقت انہیں ایک عجیب حالت میں پایا وہ یہ کہ اُن کے دائیں بائیں کچھ لوگ نظر آتے تھے، تو جب حضرت آدم علیہ السلام دائیں طرف دیکھتے تو ہنستے اور جب بائیں طرف دیکھتے تو رو پڑتے، آپ کے استفسار پر حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے متعلق فرمایا کہ: "یہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، دائیں طرف جنتی ہیں اور بائیں طرف دوزخی ہیں"۔ تو سوال یہ ہے کہ دوزخی اور کافر کس طرح آسمان میں نظر آئے؟ حالانکہ کافروں کے ارواح اور اجسام آسمان پر نہیں چڑھ سکتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اُن ارواح کے آسمان میں نہ چڑھنے کا ذکر ہے جو کہ اجسام میں داخل ہو چکے ہیں، جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس وہ ارواح تھے جو کہ ابھی جسموں میں داخل نہیں کیے گئے تھے اور ابھی تک ان سے کفر کا ظہور نہ ہوا تھا۔ اور دوسرا

جواب یہ ہے کہ بعض ارواح اس وقت زمین پر اجسام میں تھے اور بعض ارواح سجین میں تھے اور بعض اس جگہ میں تھے جو کہ جسم کے ساتھ تعلق سے پہلے ان کا مستقر ہے لیکن حضرت آدم علیہ السلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کشف کی وجہ سے قریب اور آسمان میں دکھائے گئے۔

صعود شمس و قمر | قرآن و حدیث میں سورج اور چاند کے مقام کے متعلق سکوت ہے۔ اور کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ۵ (سورۃ یٰسٓ ع ــــ) سے یہ فہم نہ کیا جائے کہ یہ آسمان میں ہیں، کیونکہ فلک گول چیز کو کہتے ہیں، اور شمس و قمر کی حرکت چونکہ مستدیر ہے اس لیے اس کے مدار کو فلک فرمایا خواہ وہ آسمان ہو یا وہ فضا جو دو آسمانوں کے درمیان ہے، یا وہ فضا جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے، اور یا آسمان کی تحتی ہو، سلف صالحین سے تفسیر درمنثور وغیرہ میں مختلف تفسیریں منقول ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادیؒ آیت کریمہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ۵ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: وقال اکثر المفسرین ھو موج مکفوف تحت السماء تجری فیہ الشمس والقمر "اکثر مفسرین یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد آسمان تلے موج مکفوف ہے جس میں سورج اور چاند اپنی گردش کرتا ہے"۔

البتہ یونانی حکماء کہتے ہیں کہ چاند پہلے آسمان میں ہے اور سورج چوتھے آسمان میں ہے۔ اب اگر کوئی کافر انسان چاند یا سورج میں گیا ہے تو قرآن و حدیث کے تقاضے کے موافق ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ چاند اور سورج آسمان سے نیچے ہیں اور یونانی حکماء کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ چاند اور سورج آسمان میں ہیں ورنہ کافر اس تک نہ جا سکتے، بہر حال اس کا اثر حکمت ایمانی پر نہیں پڑے گا بلکہ حکمت یونانی پر پڑے گا۔

بعث ارباب عروج | سورج اور چاند میں پہنچنے کے بعد اگر کوئی وہاں مر جائے تو اس کے متعلق قرآن پاک کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بدن کے تمام اجزاء یا بعض زمین کو نفخ ثانی سے پہلے دنیا میں یا قیامت میں نفخ اول کے بعد پہنچیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی (سورۃ طٰہٰ ع ۳) ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹا دیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کے بارے میں ایک استفسار کا جواب

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ:۔

(۱) زید دورانِ تقریر کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان بت فروش اور بت پرست تھا، اس پر عمرو نے فوراً اعتراض کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان توحید پرست تھا۔ تو کیا زید حق پر ہے یا عمرو؟

(۲) عمرو کا بیان ہے کہ آذر لفظ لغت میں خدا پرست کو کہتے ہیں، کیا عمرو کا یہ بیان صحیح ہے؟

(۳) لابیہ آزر، اَب سے مراد چچا یا کوئی اور لواحق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۴) کیا قرآن کریم میں کہیں لفظ اَبْ بول کر اس سے مراد چچا لیا ہے یا نہیں؟ ان تمام مسائل کا تحقیقی جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ (۱) قرآنِ کریم اس کا شاہد ہے کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد مشرک اور بت پرست تھے اور ان کا سارا خاندان اس وقت بت پرست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بابل اور عراق چھوڑ کر شام کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ صرف حضرت لوط علیہ السلام جو ہاران کے بیٹے تھے اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہو کر ان کے ساتھ شام کی طرف ہجرت کی۔ اور پھر حضرت لوط علیہ السلام سدوم کے علاقے کی طرف مبعوث فرمائے گئے، قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: واذ قال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما الٰھۃ انی اراک وقومک فی ضلٰل مبین ہ (سورۃ مریم)

آیتِ کریمہ صاف دلالت کرتی ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا اور وہ اور اس کی قوم گمراہ تھی کیونکہ اس (قوم) نے حق کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی کا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ علماء انساب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام "تارخ" لکھا ہے، ممکن ہے "تارخ" نام اور "آزر" لقب ہو۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مجاہدؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ "آزر" ایک بت کا نام تھا، ہو سکتا ہے کہ اس بت کی خدمت میں زیادہ رہنے کی وجہ سے خود ان کا لقب بھی آزر پڑ گیا ہو۔ آزر کا معنیٰ خدا پرست ہم نے کسی لغت میں نہیں دیکھا اور اگر بالفرض آزر کا معنیٰ خدا پرست بھی ہو جائے، تو چونکہ وہ بھی (آزر اور اس کی قوم) اپنے آپ کو خدا پرست سمجھتے تھے، باطل معبودوں کو خدائی کا درجہ دے کر خدائی صفات اور اختیارات ان کے سپرد کر رکھے تھے، اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو خدا پرست کہتے تھے، لیکن

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ موحد بھی تھا جبکہ قرآنی نصوص اس کی بت پرستی اور شرک کو ظاہر کرتے ہیں۔ اِنّیْ اراك وقومك فی ضللٍ مبین ○

اس سے صریح اور صاف گواہی کیا ہوگی کہ اشرف المخلوقات انسان اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھروں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سربسجود ہو جائے اور ان سے مرادیں مانگنا شروع کر دے۔ میرے نزدیک تو اس مسئلہ میں زید حق پر ہے۔

(۲) سوال ۱ کے جواب میں اس کا جواب بھی ہو گیا کہ آزر کا معنیٰ لغت میں خدا پرست ہم نے نہیں دیکھا بلکہ آزر ایک بت کا نام تھا، اور بقول مجاھدؒ اگر اس کا معنیٰ خدا پرست ہو بھی جائے تو اس سے اُس کا توحید پرست ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

(۳) اَبْ کا اطلاق مجازاً چچا پر ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے قرینہ ہونا چاہیئے کہ یہاں اَبْ سے اپنا حقیقی معنیٰ مراد نہیں ہے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟ تو بیٹوں نے جواب میں کہا: نعبد الٰهك واله ابائك ابراهیم و اسمٰعیل و اسحٰق الٰهًا وَّاحِدًا۔ تو یہاں اسمٰعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے حالانکہ وہ یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے کیونکہ قرآنِ کریم سے یہ ثابت ہے کہ اسمٰعیلؑ اور اسحٰق علیہ السلام دونوں بھائی تھے اور یعقوبؑ اسحٰقؑ کے بیٹے تھے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام علماء انساب نے "تارخ" لکھا ہے اور جسے قرآنِ کریم نے آزر کے نام یا لقب سے یاد کیا ہے لیکن یہ کہیں تصریح نہیں کہ "تارخ" اور "آزر" کسی تیسرے شخص کے بیٹے تھے۔ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت کے بعد اب سورۃ توبہ پارہ ۹ کی آیت ملاحظہ فرمائیں: جو لوگ "آزر" کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی یہ تمام تر کوشش صرف اس لیے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ موحد تھے مشرک نہ تھے اور "آزر" کو قرآنِ کریم نے مشرک کہا ہے اس لیے وہ دُوسرے شخص تھے، مگر ان کی یہ کوشش ناکام ہے کیونکہ قرآنِ کریم خود تصریح کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ مشرک تھا۔ وما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها ایاه فلما تبین له انه عدو لله تبرأ منه۔ (الآیۃ)

سورۃ مریم میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے قبولِ حق سے اعراض کیا در ضد و عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قتل کی دھمکیاں دینے لگا تو آپؑ نے والدین کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ

بِیْ حَفِیًّا ہ یعنی میں خدا سے تیرے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ اس وعدہ کے موافق آپؑ برابر استغفار کرتے رہے، چنانچہ دوسری جگہ واغفر لابی فرمانے کی تصریح موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک حالتِ شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے، نہیں! بلکہ غرض یہ تھی کہ اللہ اس کو توفیق دے کہ حالتِ شرک سے نکل کر اسلام کی آغوش میں آ جائے اور قبولِ اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے۔ ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ ــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہؓ کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں۔ اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وعدہ کی بناء پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لیے استغفار کیا جب تک آپؑ پر یقینی طور سے یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر و شرک اور خدا کی دشمنی پر ہی مرنا ہے، کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ شاید توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے، پھر جب کفر و شرک پر خاتمہ ہونے سے معاملہ صاف کھل گیا کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے اور دعا و استغفار ترک کر دیا۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہ خداوندی میں عرض کریں گے کہ خداوندا تیرا وعدہ ہے کہ تو مجھے رسوا نہیں کرے گا مگر اس سے بڑی رسوائی کیا ہو گی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں پھینکا جائے! اسی وقت آپؑ کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع (کفتار) کی سی ہو جائے گی اور فرشتے گھسیٹ کر اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔

(تفسیر رفیع الشان)

فہم کامل اور عقلِ سلیم رکھنے والے حضرات خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ حشر ایک مشرک کا ہوتا ہے یا موحد کا؟ اتنا جواب شافی ہوگا۔ (فقط واللہ اعلم)

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بت خانوں میں جا کر تبلیغ کرنے کا حکم ہوا تھا؟

سوال: محترم المقام جناب مفتی صاحب! ایک شخص جو کہ امام مسجد ہے اور اپنے آپ کو قطب زمان، ولی اللہ اور بہت بڑا عالم دین بھی کہتا ہے۔ ایک دن مسجد میں ظہر کی سنت ادا کرنے کے بعد کہنے لگا کہ آجکل جو آدمی جدھر لگ گیا بس ادھر ہی لگا ہوا ہے، دوسری طرف دھیان ہی نہیں، جو نماز پڑھتا ہے وہ صرف نماز ہی میں مشغول ہے اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی روزے رکھے جا رہا ہے

اسے اور کسی چیز کا پتہ نہیں، کوئی نوکری کر رہا ہے اور وہ اپنے ہی حال میں مست ہے اُسے باقی باقی دنیا کی فکر نہیں۔ چاہیئے تو یہ کہ ہم مندروں، گردواروں اور گرجا گھروں میں جا کر ہر چیز کی تہہ کو تلاش کریں، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ آپ گردواروں، مندروں اور بُت خانوں میں جایا کریں۔ مسجد میں چند نمازی موجود تھے، ان میں سے ایک نے پوچھا کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم جو اس نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا قرآنِ حکیم ثابت کر سکتے ہیں؟ تو اس پر امام صاحب بڑے ناراض ہوئے دوسرے دن اپنی اس بات پر پردہ ڈالنے اور چھپانے کے لیے لوگوں کے سامنے کہنے لگے کہ یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں ہر ایک آدمی ان کو سمجھ سکتا، میری کل کی گفتگو کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بُت خانوں میں جا کر بتوں کو توڑنے کا حکم دیا تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بُت خانے میں جا کر بُت توڑے تھے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں بتوں کو نام لے لے کر توڑا تھا —— اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:-

(۱) کیا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُت خانوں میں جانے کا حکم دیا تھا؟

(۲) کیا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُت خانوں میں جا کر بُت توڑنے کا حکم دیا تھا؟ اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی دیا ہو تو قرآنِ کریم کی سورۃ، رکوع اور آیت کا حوالہ قلمبند کریں؟

(۳) کیا ایسے امام مفتری جو اللہ تعالیٰ (امام مذکور کو تو بہ واستغفار کے لیے بھی کہا گیا لیکن اس نے طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور نہ توبہ کی) اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء باندھے، کے پیچھے بغیر توبہ کیے نماز پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

مزید تشریح (۱) مذکورہ امام مسجد اور بھی کئی من گھڑت قصے کہانیاں مسجد میں بیٹھ کر سناتے ہیں، ایک دفعہ انہوں نے اپنا ایک ذاتی قصہ سنایا کہ ایک دفعہ میں ایک صاحبِ کشف کے پاس گیا اور کہا کہ میری تمنا ہے کہ میں بھی آپ جیسا ہو جاؤں، انہوں نے کہا کہ میاں اس میں بڑی مشکلات ہیں اور کئی چیزوں کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے، جواباً میں نے ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے اور قربانی دینے کا اقرار کیا، انہوں نے کہا کہ اچھا تو سب سے پہلے تمہیں داڑھی صاف کرنی اور نماز چھوڑنی پڑے گی، بادلِ نخواستہ میں نے

ہاں کر دی، نماز تو اُسی وقت چھوڑ دی اور ماتھے پر تلک بھی لگالیا اور حجام کو بلا کر داڑھی صاف کرانے کے لیے اس کے سامنے بیٹھ گیا، جونہی حجام نے اُسترا میرے منہ پر رکھا تو مجھے تمام باطنی چیزیں آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگیں۔ میں گھر سے بہت دُور اور گھر والوں سے چوری گیا تھا اور کسی کو میرا پتہ تک نہیں تھا کہ زندہ ہے یا مرگیا ہے اور گھر والے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرا بھائی اور ایک دوسرا آدمی مجھے تلاش کرتے کرتے تھک ہار کر ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے ہیں۔

(۲) ایک دوسرے موقع پر مسجد میں بیٹھے مولانا رومؒ کا ذکر کرنے لگے کہ مولانا رومؒ ایک دفعہ حضرت شاہ شمس تبریزؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ اے صاحب باکرامت مجھے آپ اپنے رنگ میں رنگ دیں، یعنی اپنے جیسا بنا دیں، حضرت شمس تبریزؒ نے کہا کہ میاں تیری منزل دُوری ہے، اسے چھوڑنا پڑے گا، مولانا رومؒ نے منظور کیا تو انہوں نے اور باتوں کے علاوہ نماز چھوڑنے کو بھی کہا۔ مولانا رُومؒ گھر آئے اور سوچنا شروع کیا کہ ایک طرف تو اللہ تعالے کا حکم ہے اور دوسری طرف پیرومُرشد کا حکم ہے، آخر یہ فیصلہ کیا کہ چلو فرض پڑھ لیتا ہوں جو خدا کا حکم ہے اور سُنتیں چھوڑ دیتا ہوں، اور ایسے ہی صرف فرض ادا کر کے سو گئے، خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور بہت سخت ناراض ہو کر فرمایا کہ تُو نے خدا کے فرض تو پڑھ لیے اور میری سنتیں چھوڑ دیں؟ صبح مولانا رومؒ اٹھے اور مُرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کیا، مُرشد نے پوچھا کہ اس سے پہلے بھی کبھی تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے؟ مولاناؒ نے جواب نفی میں دیا، اس پر مُرشد کہنے لگے کہ بے شک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم غصّے میں تھے لیکن زیارت تو ہو گئی، اگر تُو فرض بھی نہ پڑھتا تو خدا کا دیدار بھی ہو جاتا۔ اس کے بعد مذکورہ امام صاحب نے مولانا رُومؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

مولوی ہرگز نہ شُد مولائے رُوم
تا غلام شمس تبریزی نہ شُد

اس کے بعد امام کہنے لگے کہ نماز میں کیا رکھا ہے، خدا نماز پڑھنے سے نہیں ملتا، خدا کے ملنے کے اور طریقے ہیں۔ اس قسم کے اور بھی کئی قصّے اکثر سناتے رہتے ہیں جن میں سے دو بطور تمثیل پیش کر دیئے ہیں۔

(۳) علاوہ ازیں امام مذکورہ خود صبح کی نماز پڑھنے کبھی مسجد میں تشریف نہیں لاتے، گھر پر

پڑھ لیتے ہوں تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ صبح مسجد میں آکر نماز پڑھایا کریں تو کہتے ہیں کہ تم لوگوں کو کیا پتہ! اگر میں صبح کی نماز پڑھانے کے لیے سویرے اٹھوں تو نہ معلوم میرے اوپر کیا کیا آفت آتی ہے۔

(۴) مذکورہ امام صاحب بینجو (جو کہ ساز بجانے کا ایک آلہ ہے) بڑے شوق سے بجاتے ہیں اور جب اس کی دُھن میں مست ہو جاتے ہیں تو پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کچھ مانگنا ہے تو مانگ لے۔ راقم الحروف کی رائے میں گویا وہ صبح کی نماز کو نحوست اور یہاں (نعوذ باللہ) خدائی دعویٰ کر کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو منہ مانگی مرادیں دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا قصّے کہانیوں کی روشنی میں علمائے کرام اس امام کے بارے میں کیا فتویٰ دیتے ہیں؟ نیز ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور جو نمازیں اس کی اقتدا میں پڑھی گئی ہیں اُن کا لوٹانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جامعہ اشرفیہ لاہور کا جواب (۱) جو خود کہا کرتا ہے وہ ہوتا نہیں ہو ایسا ہوتا ہے وہ کبھی کہا نہیں کرتا بلکہ خود کو حقیر تر سمجھا کرتا ہے، کہنا ہی دلیل ہے کہ کچھ نہیں ہے غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

(۲) نہیں! نہ تلاش کرنے کا اس کو حکم ہو سکتا ہے، جس کو بتائی نہ گئی ہو۔

(۳) شریعت میں ہر گناہ و کفر کو مٹانے کا حکم ہے، اس میں بُت بھی ہیں، جس قدر قدرت ہو، وہاں جانے کا نہیں۔ مگر امام کی کم علمی پر اس قدر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں سمجھانے کی ضرورت ہے، یہ زیادہ مفید ہو گا۔

(۴) مندروں وغیرہ میں ہر چیز کی تہہ تلاش کرنا کئی وجہ سے ہو سکتا ہے، اس لیے یہ کلمۂ کفریہ بننے سے نکل سکتا ہے، اس سے ترغیب کفریہ باتوں کی ہوتی ہے، اس لیے گناہ ضروری اور آگے روز کی تاویل گو یا مثل رجوع کے ہے۔ مگر صاف لفظوں میں توبہ کرنی چاہیئے اس کو بار بار، ان سے کہا جائے ورنہ اس کو بھی کافی قرار دیں اگر اور باتیں ان میں نہ ہوں ــــ دوسرے کاغذ سے معلوم ہوا کہ خطرناک اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے ہیں، فاسق ہیں، ان کی امامت مکروہ ہے، ان کو فوراً امامت سے الگ کر دینا چاہیئے بشرطیکہ مذکورہ باتیں صحیح ہوں۔

کتبہٗ: جمیل احمد تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور، ۱۷/۱۲/۱۳۸۴ھ

مُہر: دار الافتاء ۱۳۶۶ھ جامعہ اشرفیہ لاہور

دارالعلوم کراچی کا جواب | جواب صحیح ۔ یہ شخص پرلے درجے کا فاسق مفتری کذاب ہے، جھوٹی روایات اور قصے بیان کرتا ہے جو لوگوں کو بد دین اور گمراہ کرنے والے ہیں، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس کو امام بنانا درست نہیں اور اس کے پیچھے نمازیں نہ پڑھیں، فوراً اس کو امامت سے علیحدہ کر کے اس کی بجائے کسی متقی صحیح العقیدہ، مسائل امامت و نماز کے واقف کار شخص کو امام مقرر کریں، اور جو نمازیں اس امام کے پیچھے پڑھ لیں ان کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ۔ واللہ اعلم

مہر

احقر العباد محمد صابر نائب مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴ ۱/۱/۱۳۸۵ھ

مورخہ ۱/۱/۸۵ھ
دارالافتاء
دارالعلوم کراچی ۱۴
اسلامی جمہوریہ پاکستان

الجواب صحیح

بندہ محمد تقی عثمانی دارالعلوم کراچی ۱۴ (۲/۱/۱۳۸۵ھ)

دارالعلوم حقانیہ کا جواب | الجواب صحیح ۔۔۔ واقعی یہ شخص انتہائی دروغ گو ہے اور اپنی دروغ گوئی سے لوگوں کو گمراہ اور بے دین کرنے والا ہے، ایسے قصے اور کہانیاں بیان کرتا ہے جس کا اثر سادہ لوح مسلمانوں پر زیادہ ہوتا ہے مگر حقیقت اس کی کچھ نہیں اور شرعی احکام کے سراسر خلاف ہیں ۔ ایسے مفتری کو ہرگز امام نہ بنایا جائے، اس کو معزول کر کے اس کی جگہ ایک صالح مرد عالم دین کو منصب امامت پر مقرر کیا جائے ۔

فقط واللہ اعلم

جدید سائنسی تحقیق انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل اردو، انگریزی اور دیگر مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل وجرائد میں کلوننگ کا مسئلہ بہت زور وشور سے آرہا ہے، اس مسئلہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنسدان ڈاکٹر ولمٹ نے کلوننگ کے ذریعے کئی بھیڑوں اور مختلف حیوانات کو پیدا کیا ہے اور اب وہ انسانی کلوننگ کا تجربہ کررہا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی جنس سے اس جیسی دوسری جنس پیدا کی جائے؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق میں مداخلت ہے یا نہیں؟ جبکہ خالقیت اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے کیا یہ صفت کسی انسان میں پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ براۓ مہربانی شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس بارے میں وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ سائنسی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق خلیہ (سیل) سے ہوتی ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی پیدائش کی ابتداء دو خلیوں سے ہوتی ہے، ان میں سے ایک خلیہ باپ کا ہوتا ہے اور دوسرا ماں کا ہوتا ہے، یہ دونوں خلیے یکجان ہوکر جراثیمی نظام کے ذریعے نشو ونما پاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ خود بخود ٹوٹ کر کئی خلیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں اور ایک سو بیس دنوں تک ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ۲ دو جنسوں کی تشکل اختیار کرلیتے ہیں۔

تو گویا انسان کی پیدائش بھی خلیوں سے ہوتی ہے اور ایک انسان لاتعداد خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں سے ہر خلیہ ایک مکمل فیکٹری کا کام کرتا ہے۔ مگر یہ بات حقیقت ہے کہ ان خلیوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی مخلوق ان خلیوں کو پیدا نہیں کرسکتا اور مُردہ خلیوں سے کسی حیوان کی پیدائش کا کام لیا جاسکتا ہے۔ سائنسدان تو کائنات کے ظاہری مشاہدات پر غور وفکر کرکے پھر اس پر عملی تجربہ کرتے ہیں جس میں کبھی تو وہ امیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکام ـــ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر سائنسدان کسی تجربہ ں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر جن اجزاء پر انہوں نے تجربہ کیا ہے وہ تو سائنس کی پیداوار نہیں وتے، ان کا خالق تو لامحالہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے کسی کامیاب تجربہ میں بھی سائنس وخالق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اس لیے کہ خالق حقیقی ایک تو اپنی تخلیق میں کبھی ناکام نہیں۔

ہوتا اور دوسری وہ معدوم چیز کے ہر مادہ کو خود پیدا کرتا ہے اور کسی دوسرے پیدا کردہ مادہ پر بنیاد قائم نہیں کرتا۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ھل من خالق غیر اللہ (الآیۃ) کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور خالق ہے؟ لن یخلقوا ذبابًا۔ (الآیۃ) وہ معبودانِ باطلہ تو ایک مکھی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوقات میں سے کوئی بھی صفتِ خالقیت سے متصف نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اسکاٹ لینڈ کے سائنسدان ڈاکٹر این ولمٹ اور اس کی جماعت نے جو بھیڑ اور بندر کو خلیوں سے پیدا کرنے کا تجربہ کیا ہے اس سے ان کے بارے میں خالقیت کا عقیدہ نہ رکھا جائے اور یہ تخلیق بھی نہیں بلکہ ایک کامیاب تجربہ ہے اس لیے کہ کسی چیز کا کلون اسکی ڈی این اے یا کروموسوم کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے جس میں قدرتی طور پر بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ولمٹ اور اس کی جماعت نے اس کی پرورش کی جس سے بھیڑ کے کلون یعنی ڈی این اے نے بھیڑ کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ڈاکٹر ولمٹ کا کہنا ہے کہ اس نے بھیڑ کے پستان کے ایک ڈی این اے کو ترقی دے کر اس ڈی این اے میں قدرت نے جو امکانات پوشیدہ رکھے تھے انہی کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ (ماہنامہ الحق جلد ۳۲ شمارہ ۶)

لہٰذا اس ڈی این کو ترقی دینے یا پرورش کرنے سے وہ (ڈاکٹر ولمٹ) اس بھیڑ کا خالق نہیں بنا، جیسا کہ کوئی دائی یا نرس کسی بچے کو پالنے اور اس کی پرورش کرنے سے اس کی ماں نہیں بن سکتی، بالکل اسی طرح سائنسی ایجادات سے کسی خلافِ فطرت کارنامے پر وہ سائنسدان خالق نہیں بن سکتا، اس لیے کہ ان اجزاء کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا اور ان میں یہ تمام تر خصوصیات اسی نے پیدا کی ہیں۔ البتہ اس قسم کے تجربوں سے کسی جانور کا پیدا ہونا یا کسی خلافِ فطرت امر کا سامنے آنا شرعًا ناممکن نہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو سائنسدانوں کے ان تجربات سے قدرتِ خداوندی کا ظہور اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت سامنے آتی ہے۔ مثلاً سائنس کی اس ایجاد سے حیاتِ ثانی کے اسلامی عقیدے کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مادہ پرست اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے منکرین سے لاشعوری میں یہ بات لوگوں پر عیاں کرادی کہ جب ایک مخلوق اپنے تجربہ سے کسی جانور کے ایک خلیہ سے ایک اور جانور کو بالکل اسی شکل وصورت، رنگ ڈھنگ اور دیگر عادات واطوار کے ساتھ پیدا کر سکتی ہے تو خالقِ کائنات، مالکِ ارض وسماء بدرجۂ اولیٰ انسان کو مرنے

کے بعد دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔

سائنس کی اس ایجاد سے حیات بعد الموت کے بارے میں وارد بعض احادیثِ مبارکہ کی بھی تائید ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ جب کوئی انسان اس دار فانی سے انتقال کر کے قبر میں چلا جاتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء خاک ہو جاتے ہیں علاوہ دُمچی کے (دُم کے سرے کی ایک ہڈی) اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسی سے انسان کو دنیا وی شکل وصورت میں اٹھائے گا۔ (بخاری و مسلم)

اور دُمچی کے بارے میں ایک روایت میں ہے کہ دُمچی رائی کے ایک دانے کی طرح ہے۔ (فتح الباری)

تو سائنس کی اس قسم کی ایجادات سے اسلامی تعلیمات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے، البتہ انسانی کلوننگ کا عمل شرعی نقطۂ نظر سے کئی وجوہات کی بناء پر ناجائز ہے:۔

(۱) اس تجربے کی کامیابی سے لاشعور اور لاعلم انسانوں کے دل و دماغ میں کسی سائنسدان کے خالق ہونے کا عقیدہ راسخ ہونے کا خطرہ ہے جو بنص قرآن کریم ناجائز و حرام ہے، اس لیے کہ صفتِ خالقیت اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ (الآیۃ) وَلَنْ يَخْلُقُوْا ذُبَابًا۔ (الآیۃ)

(۲) اس عمل میں تغیر لخلق اللہ کا عنصر نمایاں ہے جو کہ ایک شیطانی عمل ہے جس کا شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے انسانوں کو گمراہ کرنے کا چیلنج دیا تھا۔ ولامرنهم فليغيرن خلق الله۔ (الآیۃ) میں انسانوں کو اس بات کی تعلیم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی شکل وصورت میں تغیر پیدا کریں اور اس کو بگاڑ دیں ـــ کلوننگ میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی انسانی شکل و صورت تختۂ مشق بن جائے گی اور اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کرتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا ہے: لا تبديل لخلق الله۔ (الآیۃ)

(۳) اس عمل میں غیر فطری طریقہ سے انسان کی پیدائش ہوگی اور توالد و تناسل کا جو طریقہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے اس کی خلاف ورزی ہوگی۔

(۴) اس طریقہ عمل سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ ابتداء ہی سے مادر پدر آزاد ہوگا اور ماں باپ کے پیار و محبّت سے محروم ہوگا، جبکہ اولاد کی تعلیم و تربیت کیلئے ماں باپ

کا ہونا از حد ضروری ہے۔
(۵) کلوننگ کے اس عمل سے پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں جھگڑے پیدا ہونے کا قوی امکان ہے، اس لیے کہ کلوننگ میں ایک ہی اصل سے خلیہ لیا جاتا ہے اور اُسے کسی دوسری عورت کے رحم میں رکھا جاتا ہے، تو اب اس بچے پر اس عورت اور جس مرد سے خلیہ لیا گیا ہے کے مابین جھگڑا پیدا ہوگا جبکہ جنگ و جدال سے اسلام نے منع فرمایا ہے اور اس کے ذرائع کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔
(۶) کلوننگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کے ثبوتِ نسب کا بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوگا کہ اس بچے کا نسب خلیہ والے مرد سے ثابت کیا جائے یا جس عورت کے رحم میں یہ خلیہ رکھا گیا ہے اس سے نسب ثابت کیا جائے، جبکہ اسلام نے ثبوتِ نسب کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے اور حتی الامکان کسی بچے کے نسب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر ایک شادی شدہ عورت سے کسی نے زنا کیا اور اس زنا سے اُسے حمل ہو گیا تو بچے کا نسب عورت کے زوج سے ثابت ہوگا نہ کہ زانی سے۔ ارشادِ نبوی ہے: الولد للفراش وللعاھر الحجر۔ (الحدیث)
(۷) اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کو مختلف رنگوں اور صورتوں میں پیدا کیا ہے، حتیٰ کہ ہر انسان کے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی لکیریں بھی ایک دوسرے سے مختلف بنائی ہیں، ان کی آوازمیں باہمی اختلاف موجود ہے اور یہ اختلاف اس لیے ہے کہ ان کی پہچان میں آسانی ہو، اور اگر کسی سے جرم کا ارتکاب ہو جائے تو اس تک قانون کی رسائی ہو سکے۔ جبکہ کلوننگ میں ایسا نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والا انسان اپنے اصل کے ساتھ ہر ہر شے میں موافق ہوگا، دونوں میں کوئی امتیازی نشان نہیں ہوگا جس کی وجہ سے اصل اور نقل میں پہچان مشکل ہو جائے گی۔ اسی طرح ارتکابِ جُرم کی صورت میں مجرم تک قانون کی رسائی بھی محال ہو جائے گی جس سے لاقانونیت، بدامنی، جرائم کی کثرت اور دنیا میں فسادات کے زیادہ ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اور اگر کسی جرم میں اصل کی بجائے اس کے کلون کو اور کلون کی بجائے اس کے اصل کو سزا دی جائے تو یہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔
(۸) اولاد دینے میں اللہ تعالےٰ کا ایک نظام ہے جس کے تحت وہ کسی کو بیٹے عطا کرتا ہے

اور کسی کو بیٹیاں، جبکہ بعض کو دونوں اور کسی کو عقیم یعنی بے اولاد رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَّيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ه (الآیۃ)

کلوننگ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا مخالف و مقابل ہے، اس لیے کہ ہر انسان میں بارآور خلیہ جات لاتعداد مقدار میں موجود ہیں جس سے کلون کا پیدا ہونا لازمی امر ہے، تو اس عمل سے کوئی بھی عقیم (بے اولاد) کا مصداق نہ ہوگا اور لوگ صرف نرینہ اولاد کا ہی تقاضا کریں گے جس سے یَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا کا مصداق مفقود ہو جائے گا۔

(۹) بعض لوگ صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ ان کے ہاں بچے پیدا ہوں جب کہ بچے پیدا کرنا نہ فرض ہے نہ واجب اور نہ سنت، اور شادی کرنا فی ذاتہٖ سنتِ مؤکدہ ہے، اور شادی کے بعد بچوں کا پیدا ہونا کوئی ضروری نہیں، بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ چار چار شادیاں کرنے کے باوجود ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا حالانکہ طبی لحاظ سے وہ بالکل تندرست ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کلوننگ کے ذریعے بچے پیدا کرنے کو جائز قرار دیا گیا تو لوگ کلوننگ کے ذریعے بچے پیدا کریں گے اور امر مطلوب (شادی) کا سنت عمل ترک کر دیں گے جو شرعاً صحیح نہیں۔

(۱۰) کلوننگ کے اس عمل میں اجنبی عورت کے رحم میں خلیہ رکھا جاتا ہے، چنانچہ اس عمل کے لیے غیر محرم مرد کے سامنے اس عورت کا سترِ عورت کھل جاتا ہے جو کہ خلافِ شرع، خلافِ فطرت اور حیا سوز عمل ہے۔ اسلام نے ہم جنس یا غیر جنس کے سامنے بلا ضرورتِ شرعی کشفِ عورت کی اجازت نہیں دی ہے اور اپنے ستر کو چھپانا فرض قرار دیا ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر انسانی کلوننگ کا عمل ناجائز و حرام ہے۔

مسلم اور غیر مسلم محققین کی آراء اور تبصرے

ذیل میں انسانی کلوننگ کے اس غیر فطری مخرب اخلاق، حیا سوز اور غیر شرعی طریقۂ تولید کے مضرات، نقصانات اور توالد و تناسل کے شرعی طریقہ (نکاح) کی تائید میں مسلم اور غیر مسلم محققین، مذہبی و حکومتی زعماء کی آراء درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) انسانی کلوننگ کے بارے میں مصر کے مشہور مفتی جناب فرید واصل صاحب کا فتویٰ

یہ ہے کہ :۔

"ان الاجماع قائم من الناحیۃ العلمیۃ والطبیۃ علیٰ استنساخ البشر مرفوض وایضاً من الناحیۃ الاخلاقیۃ ومن الناحیۃ العقلیۃ ومن الناحیۃ الاجتماعیۃ"۔ المجتمع ۲۳-۲ ذوالقعدۃ ۱۴۱۸ھ

(بحوالہ ماہنامہ الحق شمارہ ۱۰ جلد ۳۲ جولائی ۱۹۹۷ء)

یعنی انسانی کلوننگ کے عدم جواز پر علمی، طبی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر اجماع قائم ہو چکا ہے۔

(۲) اسی طرح جامعہ الازہر الشریف کے استاذ پروفیسر عبدالمطیع نے بھی انسانی کلوننگ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسانی کلوننگ پر تحقیق فوراً بند کر دی جائے اس لیے کہ اس کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ (بحوالہ ماہنامہ الحق شمارہ ۶ جلد ۳۲ مارچ ۱۹۹۶ء)

(۳) اپنے تو کجا اغیار اور غیر مسلم حکومتی زعماء نے اس تحقیق کو بند کرنے کے اقدامات کیے ہیں، چنانچہ امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے ایسے تمام تحقیقی مراکز کے فنڈز روک لیے ہیں جہاں پر کلوننگ کے شعبے میں کام ہو رہا ہے اور جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہاں انسان کی فوٹو سٹیٹ کاپی تیار کی جا سکتی ہے، بل کلنٹن نے نجی شعبے میں کام کرنے والے تحقیقی مراکز سے بھی کہا ہے کہ وہ بھی اس سلسلہ میں سرکاری شعبے میں کام کرنے والے مراکز کی تقلید کریں۔ (ماہنامہ الحق جلد ۳۲ شمارہ ۷ اپریل ۱۹۹۷ء)

(۴) عیسائیت کے روحانی پیشوا پوپ جان پال نے ۱۹۹۷ء کو ویٹی کن سٹی میں ہزاروں افراد کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انسانی حیات کا احترام خطرناک تجربات کا نشانہ بنا ہوا ہے، اس لیے دنیا کے تمام ممالک انسانی کلوننگ کی بندش پر سخت اقدام کریں اور اس کے لیے سخت سے سخت قوانین کا اجراء کریں، اس لیے کہ غیر جنسی عمل کے ذریعے انسان کی تخلیق اخلاقیات کے منافی اور رشتہ ازدواج کے بندھن کے وقار کو پامال کرنے کے مترادف عمل ہے۔ (تلخیص از ماہنامہ الحق جلد ۳۲ شمارہ ۶ مارچ ۱۹۹۷ء)

(۵) بلکہ اس ایجاد کی ٹیم میں شریک کار سائنسدان ڈاکٹر ایلن کولین کا کہنا ہے کہ میں اپنی بیوی اور چودہ سالہ بیٹے کو اس کام کے بارے میں قائل نہ کر سکا، ان کا کہنا ہے کہ اخلاقیات کی رو سے یہ غیر معتبر کام ہے، یہ خوفزدہ کر دینے والی سائنس ہے۔ (ماہنامہ الحق ج ۳۲ شمارہ ۶ مارچ ۱۹۹۷ء)

(۶) اور خود اس جماعت کے سربراہ ڈاکٹر ایان ولمٹ نے بھی انسانی کلوننگ کو غیر انسانی فعل قرار دیا ہے، چنانچہ اس نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ کلوننگ کے عمل سے حیوان تیار کرنے کا عمل تو ٹھیک ہے لیکن انسان تیار کرنے کا عمل ایک غیر انسانی فعل ہے۔

(بحوالہ ماہنامہ الحق جلد ۳۲ شمارہ ۷ اپریل ۱۹۹۷ء)

خلاصۂ کلام | شریعتِ مقدسہ اور غیر مسلم محققین اور دانشوروں کی آراء کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کلوننگ کوئی غیر ممکنہ عمل نہیں اور نہ کوئی تخلیقی صفت ہے کہ جس سے کوئی سائنسدان صفتِ خالقیت سے متصف ہو جائے البتہ اس تجربہ کو انسانی کلون پر بروئے کار لانا تفصیل میں ذکر کی گئی وجوہات کی بناء پر ناجائز حرام اور غیر اخلاقی و غیر شرعی عمل ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی سطح پر اس عمل کو فوراً بند کر دینا انسانیت کی بقاء کے لیے از حد ضروری ہے۔ (ھٰذا ما ظھر لی واللہ اعلم)

چاند تک انسان کی رسائی اور اسلام

خلائی پرواز کا اسلامی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو حضرتِ انسان کے فائدے اور خدمت کے لیے پیدا کیا، اور اس کو یہ قوت دی ہے کہ وہ تمام کائنات کو مسخر کر سکے۔ اسی قوتِ تسخیر اور سائنسی ایجادات کے نتیجہ میں چاند اور زہرہ سیارہ تک انسان کی رسائی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے اور بعض ذہنوں میں یہ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں کہ سائنس کی یہ ترقی اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحبؒ اور حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے اپنے اپنے مضامین میں اس قسم کے توہمات اور شکوک و شبہات کا رد کرتے ہوئے شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ چاند اور دوسرے سیاروں تک انسان کی رسائی سے اسلامی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس قسم کی جدید سائنسی ایجادات و ترقیات اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں ـــــ یہاں "فتاویٰ حقانیہ" میں ان ہر دو مضامین کو افادۂ عام کے لیے پیش کیا جا رہا ہے ـــــــــــ (مرتب)

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط قال اللہ تعالیٰ : وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

کائنات پر انسان کی فضیلت

محترم بزرگو! خداوند کریم نے انسان کو کائنات پر صوری و معنوی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ جسم میں انسان بہت چھوٹا ہے مگر

صوری و ظاہری محاسن میں سارے عالم پر فائق ہے، اور عقل و ادراک علم اور دوسری معنوی خوبیوں میں بھی ساری مخلوقات پر اسے سبقت حاصل ہے، گویا کہ یہ پوری کائنات اس مختصر سے جسم میں سمٹ گئی ہے اور عالمِ اکبر اس عالمِ اصغر میں پنہاں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ پوری "آفاقی" آیات اس چھوٹے سے "نفس" میں موجود ہیں۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الآیۃ) خداوند کریم کا ارشاد ہے کہ، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۝ (ہم نے بنی آدم کو کرامت سے نوازا ہے اور اسے بر و بحر میں اٹھایا اور اسے بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔)

اِس فضیلت کی وجہ بارِ امانت کا اٹھانا ہے

اِس فضیلت کو ایک دوسری آیت میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ( )

(ہم نے آسمانوں اور زمینوں پر اپنی امانت (خلافت) کے اٹھانے کی پیشکش فرمائی تو انہوں نے اس بارِ امانت کو اٹھانے کی ذمہ داریوں سے معذرت کی، اور انسان پر جب اسے پیش کیا تو اس نے اس ذمہ داری کو اپنے ذمے لگا لیا۔)

یاد رہے کہ بارِ امانت کی یہ پیشکش جب مخلوقات پر ہوئی تو انہیں اختیار دیا گیا کہ اگر اس امانت کا بوجھ تم نے اٹھالیا اور اس کا حق ادا کیا اور اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھال لی تو تمہیں رضائے الٰہی، جنت اور دائمی عزت نصیب ہوگی، اور اگر ذمہ داری قبول کرنے کے بعد تم نے حقِ امانت پورا نہ کیا تو تمہیں دائمی عذاب اور جہنم میں داخل ہونا پڑے گا، اس لیے تمہیں اختیار ہے کہ اس امانت کے متحمل بنتے ہو یا نہیں، برداشت کرتے ہو یا نہیں، دونوں باتیں تمہاری مرضی پر ہیں مگر عدمِ تحمل کی صورت میں تمہیں اسی حالت میں رہنا ہوگا، جمادات کی طرح کہ نہ تو ترقی ہوگی نہ عروج، نہ عذاب کا خطرہ ہوگا نہ جنت کی امید ہوگی ـــــ تو زمین اور آسمانوں نے امانت نہ اٹھائے جانے کو ترجیح دی کہ کہیں کوتاہی کی صورت میں عذاب میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔

انسان کی فطرت میں محبت ہے

مگر انسان جو کہ بالطبع اللہ ربّ العزت کا عاشق ہے اور عشق کے جذبہ سے اس کی روح اور اس کا قلب سرشار رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قلب ہر وقت متحرک، مضطرب اور دھڑکتا رہتا ہے، گویا کہ محبوبِ حقیقی کی تلاش اور یاد میں اپنی ہر حرکت سے اللہ اللہ کی ضربیں لگاتا ہے، ایسے عاشق طبع کو تو

محبوب کا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ تو جب محبوب کی طرف سے پیشکش ہوئی اس کو فوراً جذبۂ عشق نے قبولِ امانت پر آمادہ کر دیا اور یہ پرواہ نہ کی کہ ذمہ داری میں کوتاہی کی صورت میں کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں گی؟ دیکھئے! فرہاد جو کہ مجازی عاشق تھا محبوب کے اشارۂ ابرو پر پہاڑ کھودنے لگا، تو انسان جو کہ عاشقِ حقیقی ہے محبوبِ حقیقی کے اشارے پر کیوں بارِ امانت اٹھانے سے جھجکتا۔ اور اس کا نتیجہ بھی نکلا کہ خداوند کریم نے اسے آسمانوں، زمینوں اور ساری مخلوقات پر فوقیت دی، یہ راعی اور وہ رعیت بنے، ساری کائنات اس کی مسخر ہوئی، اس کو بحر و بر اور آسمان و زمین کے درمیان ساری فضا پر چلنے اور ان میں تصرف کرنے کی اجازت ملی اور بنی نوع انسان کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا گیا اور عالم کی تمام اشیاء میں تصرف کرنے اور اس کی تحلیل و ترکیب کی اجازت ملی، اشیاء کے اسماء اور خاصیتیں اسے بتلا دی گئیں۔

کائنات میں تصرف کی راہنمائی انبیاءؑ نے فرمائی

اس تصرف اور استعمال کی راہنمائی اپنے رسولوں کے ذریعے فرمائی جو معصوم عن الخطاء اور معلّم من اللہ تھے تاکہ انسان نفس اور شیطان کے دھوکہ اور خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے اس امانت کو غلط طور پر استعمال نہ کرے اور تمام چیزوں کی ترکیب و تحلیل اپنے موقعہ پر اور نیک مقصد کے لیے کرے، اشیاء میں بے جا تصرف سے بذریعہ وحی منع کر دیا گیا اور دیگر فضیلتوں کے علاوہ اسے نعمتِ علم سے نوازا گیا جو انسان کی خصوصیت ہے، ان انبیاء کو دیئے گئے علوم میں رفتہ رفتہ ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ کی ذات پر علوم نبوت کی تکمیل کر دی گئی۔

علوم کا ظہور اور تکمیل حضورؐ کی ذات پر ہوئی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کو جو علوم دیئے گئے اس کی نظیر سابقہ ادوار اور گذشتہ امتوں میں نہیں ملتی ــــ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج میں جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ اوپر تشریف لے جارہے تھے تو بیت المقدس میں بطور مہمانی و ضیافت کے مختلف مشروبات خدمتِ عالیہ میں پیش کیے گئے۔ ایک گلاس پانی کا بھرا ہوا تھا، ایک میں شہد تھی اور ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب تھی۔ مگر یاد رہے کہ یہ جنت کی شراب تھی، یعنی شرابِ طہور جو تمام مسلمانوں کو جنت میں ملے گی اور طیّب و طاہر اور ہر قسم کی خرابیوں سے پاک صاف ہوگی، مگر پھر بھی شراب ہی اس کا نام تھا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ پانی پیا نہ شہد اور شراب بلکہ دودھ پی لیا۔ حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا الحمد للہ کہ آپ نے دودھ پی لیا یہ فطرت کے مطابق

ہے اور دُودھ عالمِ مثال میں علم کی شکل ہے۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ آپؐ کی اُمّت علم میں باکمال اور سارے عالم میں ممتاز رہے گی۔ اگر آپؐ شہد پی لیتے تو اُمّت لذّتوں میں پڑجاتی اور اگر شراب پی لیتے جو اگرچہ طیّب و طاہر تھی تو امت گمراہی میں مبتلا ہو جاتی، اگر پانی پی لیتے تو اُمّت بے کمال رہ جاتی، کیونکہ پانی صفات اور کمالات سے خالی ہے، نہ میٹھا نہ کڑوا، نہ سرخ نہ زرد، نہ خوشبودار اور نہ بدبودار، اس میں بالفعل کوئی کمال نہیں، شہد میں لذّت اور مٹھاس ہے، شرابِ دنیوی مزیلِ عقل ہے اور اخلاقِ رذیلہ برانگیختہ کرتی ہے، حضورِ اقدسؐ نے ان سب کو چھوڑ کر دُودھ پی لیا جو علم سے تعبیر ہے۔

تو اُمّت میں بھی علم سرایت کر گیا کیونکہ قاعدہ ہے کہ استاد کا رنگ شاگرد میں سرایت کرتا ہے اور باپ کے مخفی اثرات و کمالات اولاد میں پائے جاتے ہیں۔ حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے: الولد سرّ لابیہ (بچہ باپ کا راز ہے اس کی مخفیہ صفات اس میں منتقل ہوتی رہتی ہیں)۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: اوتیت علم الاوّلین والاٰخرین (مجھے پچھلے اور اگلے سب لوگوں کا علم دیا گیا) دوسری حدیث میں ہے: انا مدینۃ العلم (میں تو علم کا شہر ہوں)۔ تو حضورؐ کا اثر اوپر تو ساری اُمّت پر ہے کیے پوری اُمّت علم کی وارث ہے البتہ اتنا یاد رہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علم مادیات، جس میں صنعت و حرفت، زراعت، طب، سرجری اور سائنس، جغرافیہ وغیرہ شمار ہیں اور علم روحانیات جس میں تمام علومِ مذہبیہ دینیہ داخل ہیں۔

اُمّتِ دعوت و اُمّتِ اجابت

اسی طرح آپؐ کی اُمت کی بھی دو قسمیں ہیں: اُمتِ دعوت جنہیں حضورؐ کی دعوت متوجہ ہے کہ قولوا لا الٰہ الّا اللہ، یہ دعوت الی الاسلام کل دُنیا کے باشندوں کے لیے ہے اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (ہم نے نہیں بھیجا تمہیں مگر نوعِ انسانی کیلئے) بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا)۔ تو کل دنیا کے انسان یورپ کے ہوں یا ایشیا کے، مشرق کے ہوں یا مغرب کے، امریکہ کے ہوں یا افریقہ کے دور دراز علاقوں کے غیر متمدن وحشی ہوں، سب کے سب امتِ دعوت میں شامل ہیں، آج بھی حضورؐ کی دعوت انہیں مخاطب کر رہی ہے جیسا کہ چودہ سو برس پہلے تھا، مگر اس امت نے دعوت قبول نہیں کی اس لیے کافر ہے کہ اتنی بڑی نعمت کی ناشکری کرنے والی ہے، اور جنہوں نے حضورؐ کی دعوت قبول کی ہے وہ اُمتِ اجابت ہے کہ دعوت کی اجابت میں انہوں نے لا الٰہ الّا اللہ محمّد رّسول اللہ کہہ دیا ہے، ایسی امت کو امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے۔

اصل علوم علومِ نبوّت تھے جو مسلمانوں کو ملے | علم ساری امت کو حضورؐ کی آمد اور بعثت کے بعد آپؐ ہی کی برکت سے ملا مگر امتِ دعوت کو زیادہ حصّہ علومِ مادیہ کا ملا اور امتِ اجابت یعنی مسلمانوں کو وافر حصہ علومِ غیب، علومِ نبوت و آخرت کا ملا جو اشرف ترین علوم تھا۔ علومِ مذہبیہ میں امتِ مسلمہ کو جو مقام حاصل ہوا اور جو تحقیقات ہر ہر مسئلہ اور ہر ہر موضوع پر علماء امت نے پیش کیں، اس کی نظیر کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، جس کا کچھ حصہ لاکھوں کتابوں اور سینکڑوں علوم کی شکل میں آج بھی موجود ہے اس کا عشرِ عشیر بھی گذشتہ مسلمان اُمتوں میں نہیں ملتا۔

مادّی اور روحانی علوم کا پورا ظہور حضورؐ کے بعد ہوا | اسی طرح امتِ دعوت نے مادی علوم، تمدنی مسائل، سائنسی تحقیقات اور تکوینیات کے مخفی اسرار ظاہر کرنے میں جو ترقی کی اس کی مثال حضورؐ سے پہلے کی اُمتوں میں نہیں مل سکتی۔ الغرض ان تمام علمی کمالات کا ظہور امتِ محمدیہؐ میں اسی مخزنِ علم کے کمالات کا پرتو ہے جو سیدالرسل اور خاتم النبیین ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر ترقی کا یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوگا بلکہ دینی اور دنیوی علوم میں قیامت تک ترقی کرتی رہے گی۔ تو جس امت کا پیغمبرؐ سارے علوم اور کمالات کا سرچشمہ ہے اس کی امت کسی علمی انکشاف اور علمی ترقیات کی کب مخالفت کر سکتی ہے، یا علم کی کوئی صحیح اور نئی بات جامع العلوم والکمالات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی کب مخالف ہو سکتی ہے؟

خلائی پرواز اور اسلامی تعلیمات | آجکل چاند تک انسان کی رسائی اور پرواز نے ہر فرد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرادی ہے۔ سائنس کی اس ترقی نے بعض مسلمانوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ اس سے اسلامی تعلیمات پر زد پڑتی ہے، حالانکہ یہ تو محض ایک سائنسی اور تمدنی ترقی کا مسئلہ ہے۔ زندگی کے تمدنی مسائل میں ہر دور اور ہر زمانہ کے لوگوں میں پچھلوں کی بہ نسبت ترقی ہوتی آرہی ہے اور ہمارے اسلاف نے اس کو دیکھ کر کبھی یہ خیال ہی نہیں کیا کہ اس ترقی سے اسلامی اصول مجروح ہوتے ہیں۔ مثلاً پہلے زمانے میں سواری کا وسیلہ گھوڑا، خچر اور اونٹ تھا، پھر موٹر اور ریل ایجاد ہوئی، رفتہ رفتہ ہوائی جہاز ایجاد ہوئے، اب اس میں میزائلوں اور راکٹوں کا اضافہ ہوا ہے، اور اس کے بعد بہت ممکن ہے اور بھی تیز رفتار ذرائع سفر ایجاد ہو جائیں۔

قرآنِ کریم میں تیز رفتار سواریوں کی طرف اشارہ | اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

والخیل و البغال والحمیر لترکبوھا و زینۃ و یخلق مالا تعلمون ٥ (سورۃ آیت ع ۔)
(اور پیدا کیے اللہ نے گھوڑے، خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سواری کرو اور ان میں تمہارے لیے زینت بھی ہے اور پیدا کیا ان کے علاوہ ایسی چیزوں کو جنہیں تم نہیں جانتے) ویخلق مالا تعلمون مضارع کا صیغہ ہے اس میں قیامت تک وجود پذیر ہونے والی تمام تیز رفتار سواریاں آگئیں۔ اسی طرح سمندری سواری کا ذکر فرما کر بعد کی ایجادات کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ وَاٰیَۃٌ لَّھُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَھُمْ فِی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ ۝ وَخَلَقْنَا لَھُمْ مِّنْ مِّثْلِہٖ مَا یَرْکَبُوْنَ ۝ (یٰسٓ ع ۔)
(ان کے لیے قدرت کی نشانی ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا اور پیدا کیں ہم نے ان کیلئے کشتیوں کی مانند طرح طرح کی چیزیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں)

الغرض ان آیات میں تمام نئی اور بری اور فضائی ایجادات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اسی طرح پہلے بات پہنچانے کا ذریعہ آمنے سامنے بات چیت کا تھا، رفتہ رفتہ ترقی ہوئی، ٹیلیفون، تار، لاسلکی اور ریڈیائی لہروں سے کام لیا جانے لگا، اور بھی کئی ذرائع کلام پہنچانے کے پیدا ہوئے۔

خلائی تسخیر خالص تمدنی اور سائنسی مسئلہ ہے

خلائی تسخیر کا مسئلہ بھی خالص تمدنی ترقی اور سائنسی تحقیق کا ہے جس میں کامیابی یا ناکامی دونوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انسان ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت نہیں کر سکے گا اور نہ کبھی یہ کہا کہ خلا میں ذی روح اجسام کی پرواز ناممکن ہے، نہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ فضا میں کرۂ نار اور کرۂ زمہریر ہے جن سے ذی روح کا گذر محال ہے اور نہ یہ کہا کہ زمین کی کشش ثقل سے باہر نکلنا ناممکن ہے، یہ باتیں تو فلاسفۂ یونان کی مخترعات ہیں جن کا بطلان اور تردید اسلامی معتقدات ہی نے کر دی تھی۔

قرآن مجید اور لامحدود پرواز

قرآن مجید پلک جھپکنے میں ہزاروں میل مسافت طے کرنے کے نہ صرف امکان بلکہ وقوع کا قائل ہے۔ ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ (النمل ع ۔) اور کہا اس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب کا میں لا دیتا ہوں تیرے پاس اس تخت کو کہ پہلے اس کے کہ لوٹ آئے تیری طرف تیری نظر۔"

اور وہ طرفۃ العین میں تخت لے آئے، گویا کہ راکٹ کی سی تیز رفتاری سے اسلام کو انکار

نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حرکت اور سرعت ممکن ہے۔

خلائی پرواز مدارِ شرافت نہیں

باقی رہی ستاروں تک پرواز، تو یہ تو آپ کو تمہید سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر مدارِ شرافت اونچی پرواز کرنا نہیں ہے۔ آج خلاء میں بادل پھر رہے ہیں۔ چیل، گدھ، کوّے اور دیگر پرندے فضاء میں بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔ ایک دیوہیکل جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو تختِ سبا چند لمحات میں پہنچا دینے کی پیشکش کی۔ خود انسان ایک عرصہ سے کئی کئی میل اوپر ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا ہے، تو اب اگر اس پرواز کی حد ڈھائی لاکھ میل خلاء میں چاند تک پہنچ گئی یا آئندہ اس سے بھی بڑھ جائے تو اس میں کیا استحالہ اور تعجب ہے اور قرآن مجید کے کون سے دعوٰی کا مقابلہ ہوا جو باعثِ حیرت بن جائے۔

جِنّات کی آسمانوں تک رسائی

قرآن مجید سے تو جنّات کی آسمان تک پرواز ثابت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے سورۂ جن میں جنّات کی آپس میں گفتگو نقل فرمائی ہے:۔

وانا لمسنا السماء فوجدناها مُلِئَتْ حرسًا شديدًا وشهبًا وانا كنا نقعد منها مقاعدً للسمع فمن يستمع الآن يجد له شهابًا رصدًا۔ (سورۂ جن آیت ۸ـــ۹)

(ترجمہ) اور یہ کہ ہم نے ٹٹول کر دیکھا آسمان کو پھر پایا ہم نے اس کو کہ بھرا ہوا ہے سخت چوکیداروں سے اور انگاروں سے اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں سننے کے واسطے پھر اب جو کوئی سننا چاہے وہ پائے گا اپنے واسطے انگارہ گھات میں۔"

اس کی تفصیل بخاری شریف میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنّات اور شیاطین آسمانی دنیا تک پہنچ کر خفیہ ٹھکانوں پر بیٹھ جاتے تاکہ فرشتوں کی آپس میں گفتگو سنکر اسے کاہنوں اور نجومیوں تک پہنچا دیں۔ اس میں سُنی ہوئی کوئی بات تو درست ہوتی تھی اور سو باتیں جھوٹ اور من گھڑت ہوتی تھیں جس کا لوگوں میں مشہور ہو جانے پر اس وقت کے مذہب حق پر اثر پڑتا، اس کے بعد دوسرے نبی آجاتے اور وہ اس جھوٹ اور حق سے مخلوط باطل کو جدا کر دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کریم کے آخری نبی تھے، خداوند کریم کو دینِ اسلام قیامت تک کے لیے محفوظ رکھنا اور زائغین کی زیغ سے بچانا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جنّات کا آسمانوں تک پہنچنا روک دیا گیا اور اگر جنّات اوپر جانے کی کوشش

کرتے تو ان پر انگارے اور شہاب ثاقب پھینکے جاتے تا کہ آسمانی باتیں نہ سن سکیں اور دینِ اسلام غلط ملط نہ ہو۔ اور صعود بلکہ آسمانوں کو چھونے (لَمَسِ سماء) تک کا بھی ثبوت ملتا ہے، لیکن بعض روشن خیال اس کی بھی تاویل کرتے ہیں جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنات میں آسمانوں تک پرواز کی صلاحیت رکھی ہے اس لیے جنات وہاں تک پرواز کرتے تھے جہاں تک ان کی پرواز پر پابندیاں لگی ہوئی نہ تھیں۔ اب اگر انسان اپنے علم و تحقیق اور خدا کے دیئے ہوئے وسائل کی بناء پر اوپر چلا جائے تو اس میں کوئی استحالہ نہیں۔

اسلام میں ستاروں تک رسائی کے لیے آسمانوں سے گذرنے کا کہیں ذکر نہیں

یہ غلط ہے کہ ستاروں تک پہنچنے کے لیے آسمانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ چاند آسمانِ دُنیا اور سورج چوتھے آسمان پر ہے یا دیگر سیارے فلاں آسمان پر ہیں یا ثوابت سبعہ سیارہ ساتویں آسمان کے نیچے درجہ بدرجہ ہیں۔ یہ فلاسفۂ یونان کا عقیدہ اور بطلیموس کا مسلک ہے جس کا ذکر تصریح و شرح چغمنی میں پایا جاتا ہے نہ کہ فلاسفۂ اسلام کا۔

سائنس کے متضاد نظریات اور اسلام

ہم مسلمان نہ تو قدیم فلاسفہ کے معتقد ہیں اور نہ جدید فلاسفہ کے معتقد ہیں۔ ان فلاسفہ کا ابطال آپس میں خود (مثلاً فیثاغورث وغیرہ نے) کیا ہے۔ اور آج کے سائنسدان قدیم سائنس کو خود لغو اور باطل قرار دے رہے ہیں، پھر جدید سائنس دانوں کا آپس میں بھی شدید اختلاف ہے اور ان کے نظریات آپس میں متصادم ہیں تو ہم خواہ مخواہ اسلام کو کیوں ایک فریق بنائیں! البتہ اتنی بات واضح ہے کہ آسمانوں کے اندر داخل ہونے کے لیے اجازت لینی پڑتی ہے، آسمانوں کے دروازے ہیں جو کہ بند رہتے ہیں، اندر جانے والا بغیر اجازت رب العالمین کے نہیں جا سکتا۔ جیسا کہ حدیثِ معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمان کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی تو فرشتوں نے پوچھا کہ کون؟ انہوں نے فرمایا جبرائیل، پھر انہوں نے پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ من معك قال محمد صلى الله عليه وسلم قيل ارسل اليه قال نعم ففتح۔ (جبرائیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تب دروازہ کھول دیا گیا)

اس سے معلوم ہوا کہ افلاک (آسمانوں) میں داخلہ بغیر اجازتِ خداوندی کے نہ فرشتہ کو

ہے نہ کسی نبی مرسل کو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا داخلہ جو آسمانوں میں ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے اور دروازہ کھول دینے کے بعد ہوا۔

موجودہ نظریات کا اثر باطل مذاہب اور فلسفہ پر پڑتا ہے

اب اگر ستاروں کے بارہ میں اسلام نے کہا ہوتا کہ یہ آسمانوں کے اندر ہیں تب تو یہ اشکال درست ہوتا کہ راکٹ اور خلائی جہاز آسمان کے اندر بغیر اجازتِ خداوندی کے کب داخل ہوئے جو کبھی نہیں ہو سکتے۔ مگر جب ہم بطلیموسی اقوال کے پابند نہیں، ہم تو اسلام کے قائل ہیں، تو یہ اشکال ہمارے اوپر وارد ہی نہیں ہوتا، جن مذاہب نے یہ دعویٰ کیا ہے ان پر اس کی زد پڑتی ہے مسلمانوں پر نہیں۔

تمام ستارے آسمان کے نیچے ہیں

قرآن مجید کا تو اعلان ہے کہ: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ (سورۃ الملک ۵) "ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے مزین کر دیا اور ہم نے بنایا انہیں شیاطین کو مارنے کی چیز۔"

شیاطین تو آسمانوں تک جا کر باہر رہتے ہیں، آسمانوں میں تو داخل نہیں ہو سکتے، پھر ان ستاروں سے ان کا رجم تب ہی ہو سکتا ہے کہ ستارے بھی آسمانِ دنیا سے باہر ہوں اور دنیا کی زینت بھی ان ستاروں سے تب ہی ہو سکتی۔ اس لیے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ: النجوم قناديلُ معلقة بين السماء والارض بسلاسل من نورٍ بايدي الملٰئكة۔ (   ) "ستارے لٹکے ہوئے فانوس ہیں آسمان اور زمین کے درمیان نور کی زنجیروں کے ساتھ جنہیں فرشتے تھامے ہوئے ہیں۔"

علامہ آلوسیؒ تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں "جدید سائنسدانوں کا قول بھی اس کے قریب قریب ہے، مگر ان کے ہاں نور کی زنجیروں کی تعبیر کشش اور مرکزِ ثقل کے نام سے ہوتی ہے۔"

ويقربُ منه قول الفلاسفة الجديدة لكن بالجذب۔ (روح المعانی جلد ۳۰ ص۵)

سورۃ طلاق کی آیت وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ کے تحت تو صاف تصریح علامہ آلوسیؒ نے کی ہے کہ:

ولم يقم دليلٌ على ان شيئاً من الكواكب مغروزٌ في شيءٍ من السمٰوٰت كالفص في الخاتم والمسمار في اللوح۔ (روح المعانی جلد   ص   ) یعنی "اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کوئی ایک ستارہ بھی آسمان میں ایسا جڑا ہوا ہے جیسا انگوٹھی میں ہیرا یا تختی میں میخ۔"

امام ابوحنیفہؒ کے استاد عطاء بن ابی رباحؒ کا بھی ایسا ہی قول ہے۔
علامہ آلوسیؒ نے سورہ طلاق کی تفسیر میں اسرائیلی روایات کی بھی تردید کی ہے کہ اکثر ناقابلِ اعتماد ہیں۔ باقی جن آیات سے ستاروں کا آسمانوں میں ہونا مترشح ہوتا ہے اس کی تردید "روح المعانی" کے مختلف مقامات پر موجود ہے، اور عموماً ایسے مقامات میں ادنیٰ ملابسہ کے طور پر یا مجازاً نسبت کی گئی ہے۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ کی تفسیر

مثال کے طور پر قرآنِ کریم کی آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ سے بظاہر لوگوں نے یہ فہم لیا ہے کہ سب ستارے آسمان میں تیر رہے ہیں ۔۔۔ مگر علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس سے مراد اس موج کو لیا ہے جو روک دی گئی ہے آسمان کے نیچے جس میں چاند اور سورج گردش کرتے ہیں۔

قال اکثر المفسرین ھو موج مکفوف تحت السماء تجری فیہ الشمس و القمر

وقال الضحاك ھو لیس بجسم بل مدار ھٰذہ النجوم۔ (روح)

حضرت ضحاک کہتے ہیں کہ فلک سے مراد جسم نہیں بلکہ ان ستاروں کا مدار ہے ۔۔۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی ان احتمالات کو ذکر کرتے ہوئے آیت کو آسمان کے مفہوم میں مبہم قرار دیا ہے ۔۔۔ الغرض اکثر مفسرین محلِ کواکب کو جس میں وہ گردش کرتے ہیں تحت السماء تسلیم کرتے ہیں نہ کہ آسمان کے بیچ میں ۔۔۔ تو روس اور امریکہ کی خلائی پرواز اور چاند تک رسائی کا اگر اثر پڑتا ہے تو یونانی ہیئت اور بطلیموسی فلسفہ یا اسرائیلی روایات پر نہ کہ اسلام پر۔ چاند تو کیا اگر تمام کواکب تک بھی انسان کی رسائی ہو جائے تو بھی اسلامی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اسلام کی غیبی تائید سائنس سے ہو رہی ہے

اللہ تعالیٰ ان سائنسدانوں کے ہاتھ سے ہی اسلام کی غیبی تائید کروا رہا ہے اور ان پر اتمامِ حجت ہو رہی ہے، سائنسدانوں نے اربوں روپے خرچ کیے تب کہیں اوزار اور آلات کے ذریعہ چاند سے مشتِ خاک لائے۔ لیکن سید الرسل اور مسلمانوں کے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی کے ایک اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے جبکہ دونوں ٹکڑوں نے مکہ معظمہ کی پہاڑی کو بیچ میں لے لیا، پھر اسی طرح اللہ رب العزت نے چاند کے دونوں ٹکڑوں کو ملا دیا۔ اقتربت الساعة وانشق القمر و ان یروا ایۃً یقولوا سحرٌ مستمر۔ (طارق)
اتنا بڑا کارنامہ جب بلا راکٹ و اسباب اور بغیر کھربوں روپیہ ضائع کیے ظاہر ہوا تو یورپ کے

خرد ماغوں نے اس معجزہ کی اب تک ہنسی اڑائی، فلاسفہ نے مذاق اڑایا مگر آج انہیں خود قائل ہونا پڑا کہ تمام سیارے خرق والتیام (پھٹنا اور جڑنا) اور توڑ پھوڑ قبول کرتے ہیں۔ تو حقیقت تو یہ ہے کہ آج کی سائنسی تحقیقات سے اسلامی تعلیمات کی تائید ہو رہی ہے، اور بحمد اللہ تعالیٰ جو لوگ معجزات کے منکر تھے اور محال سمجھتے تھے ان دشمنانِ اسلام کی اپنی تحقیقات سے خدا نے ان کا منہ بند کر دیا ہے۔

قیامت اور معراج کی تائید قیامت جو ان سیارات اور عالم کے فناء اور نیست و نابود ہونے اور نئے سرے سے دوبارہ قائم ہونے کا نام ہے، آج تک فلاسفہ اس نظام کو ناقابلِ تغیر مان کر اس کی قدامت کے قائل تھے اور اس توڑ پھوڑ سے خود ہی حدوث عالم اور تغیر پذیر ہونے کے قائل ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے جب اعلان کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس جسدِ عنصری کے ساتھ خلاؤں سے اوپر تشریف لے گئے اور ایک رات میں واپس ہوئے تو ان لوگوں (فلاسفہ) نے انکار کیا کہ کروڑوں میل کی مسافت اتنی جلدی کیسے طے ہوئی اور بغیر آکسیجن کے کیسے زندہ رہے؟ آج کے خلانورد اس جسمِ خاکی کے ساتھ صرف چاند تک پہنچے اور بعض بلکہ انہوں نے ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے پرواز کی۔ تو مالک الملک جو زمین و آسمان کا خالق ہے اس کا اپنے رسولِ مکرم کو پہنچانے میں کیا استحالہ رہا؟ سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا۔ (بنی اسرائیل ۱) "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو راتوں رات لے گیا۔"

رفعِ مسیح کی تائید قرآن مجید نے اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے، بل رفعه الله اليه مگر جدید تعلیمیافتہ حضرات اسے ناممکن بتلا رہے ہیں کہ اس جسم کے ساتھ اوپر کیسے زندگی گذر سکتی ہے مگر آج تو خود چاند، مریخ اور زہرہ میں اپنے لیے الاٹمنٹ کروانا چاہتے ہیں گو ابھی یہ مرحلے بہت دور ہیں۔ ہنوز دلی دور است

آدم علیہ السلام کا نزول اسلام نے بتلایا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام اسی زمین سے پیدا ہوئے پھر انہیں جنت میں اٹھایا گیا، کچھ عرصہ جنت میں گذارنے کے بعد خلافتِ ارض کیلئے انہیں زمین پر اتارا گیا۔ اس کا بھی ڈارون کی اولاد نے انکار کیا، مگر اسلامی تعلیمات نے تو تخلیق انسان حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک انسانی عروج اور صعود و نزول اور خلاء سے گذرتے رہنے کا تصور پیش کیا اور بطور ظہورِ معجزہ و قدرتِ خداوندی کے اس کی کئی مثالیں پیش کیں۔

تمام مسلمان ساتویں آسمان سے بھی اوپر جائیں گے

اسی طرح جنّت کو لیجئے، اور ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام مومنین اور عبادِ مقربین جنّت میں جائیں گے، پھر یہ بھی ذکر ہے کہ قیامت کے دن تمام آسمان اور زمین فنا ہو جائیں گے، اس زمین اور آسمان کی جگہ جہنم لے لے گی، اور عرش الرحمٰن کے نیچے اور سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنّت ہو گی جو ساتویں آسمان سے اوپر ہے، تو گویا کل مسلمان سابقین و آخرین ان شاء اللہ جب جنّت میں داخل ہوں گے اور یہ دخلہ جسم اور روح دونوں کا ہو گا تو سب کی پرواز ساتویں آسمان اور اس سے اوپر ہو گی تب تو وہ جنّت میں داخل ہو گا۔ تو افسوس ہے کہ ایک ایسی اُمّت اعدائے اسلام کے لایعنی کارناموں سے مرعوب ہو یا اسے ناقابلِ تسلیم سمجھے، حالانکہ یہ توصعود اور پرواز کا ادنیٰ درجہ ہے جو بطورِ اتمامِ حُجت مادیت پرست قوموں کے ہاتھ پر ظاہر ہو رہا ہے۔

کون سا مسئلہ حل ہُوا؟

پھر اس "عظیم کارنامے" سے کون سا انسانی مسئلہ حل ہُوا؟ بھوک، افلاس، بیماری ختم ہو گئی؟ بُغض، عناد، کینہ اور خانہ جنگی ختم ہوئی؟ طبقاتی، لسانی اور رنگ و نسل کے جھگڑے ختم ہوئے؟ انسانیت کو کون سا فائدہ ہُوا؟ کچھ بھی نہیں! باہمی عداوت و منافرت اور بھی بڑھ گئی، ایکدوسرے پر فخر و غرور کیا جانے لگا، پھر نتیجہ میں کون سا خاص تحقیقی انکشاف ہُوا جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہو؟ یہی کہ چاند عناصر سے مرکب خاکستری یا سرمئی رنگ کی چیز ہے جو سورج سے روشنی لے کر دنیا کو منوّر کرتی ہے، جبکہ یہ تصوّر تو ظنّی طور پر فلاسفۂ قدیم نے بھی پیش کیا تھا۔ تصریح اور شرح چغمنی اٹھا کر دیکھیں، اس وقت سے انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ جرمِ قمر خاکستری ہے، اور عربی زبان کا یہ مقولہ تو زبان زدِ عام ہے کہ نور القمر مستفادٌ من نور الشمس (چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے حاصل کی گئی ہے)

سائنس سے باطل مذاہب ہی متاثر ہوں گے

ہماری نگاہ میں اس کارنامہ سے ایک ہی فائدہ حاصل ہُوا ہے اور وہ یہ کہ باطل مذاہب لرزہ براندام ہیں، یہودیت اور نصرانیت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا ہے۔ آج ہی کے اخبارات میں ہے کہ یہودیوں نے تو اپنی بعض عبادات میں ترمیم کر دی ہے اور کلیسا والے بھی واویلا کر رہے ہیں۔ فلاسفۂ یونان کی تغلیط ہو گئی، معجزات سے منکر شرمندہ ہوئے مگر اسلام کی تو سراسر تائید ہی تائید ہو گئی، کوئی مسئلہ اور کوئی عبادت اسلام کی متاثر نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک متاثر ہو سکے گی۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ، یہ تو دینِ قیّم ہے اور قیامت

تک زندہ رہنے والا دین ہے، خداوندِکریم نے اتمامِ حجت نہ صرف دلائل سے بلکہ اس زمانہ کی سائنس کی بدولت حواس اور مشاہدہ سے بھی کرادی۔

وحی اور اسلام کے دیگر دعوؤں کی تائید

جب اسلام نے اعلان کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں سے اوپر کی چیزیں نظر آتی تھیں اور وحیٔ الہام کے ذریعہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ رب العزت کی باتیں سن سکتے تھے، تو اس کا انکار کیا گیا اور آج ڈھائی لاکھ میل دُور خلائی جہاز والوں کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے، ٹیلیفون کیے جا رہے ہیں اور ایک انسانی ایجاد ٹیلیویژن کے ذریعے ڈھائی لاکھ میل دور کے حالات کا مشاہدہ ہو رہا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رُوحانی قوت کے ساتھ بغیر آلات و وسائل کے کیوں جبرائیلِ امین اور خداوندِکریم سے ہمکلام نہیں ہو سکتے تھے اور اگر انہیں آسمانوں کا مشاہدہ ہوتا تھا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

معجزہ امکان کی دلیل ہے

اتنی بات یاد رہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھوں ایسے امور کا ظہور بلا شبہ معجزہ کہلاتا تھا جو بغیر آلات و وسائل کے ہو جو کسی غیر نبی کے بس میں نہیں، مگر اس سے بہرحال یہ تو ثابت ہوا کہ ذی روح جسم کا رفع الی السماء ممکن ہے، اس لیے کہ معجزہ نام ہے اس کا کہ کسی امر کا ظہور بطور خرقِ عادت کے ہو جائے نہ کہ کسی محال کو ممکن بنا دے۔ اب اگر کوئی وسائل اور ذرائع کے ذریعہ سے ایسا کر دے تو یہ ممکن ہے مگر اسے معجزہ نہیں کہا جا سکتا، مثلاً ایک شخص بغیر و ذرائع کے کراچی پہنچ جائے تو یہ اس کی کرامت ہے اور اگر ریل، موٹر کار، ہوائی جہاز وغیرہ کے ذریعہ جائے تو اسبابِ عادیہ کا عمل خرقِ عادت نہیں تو اس کو کرامت نہیں کہا جا سکتا۔

قرآنِ کریم کا بنیادی مقصد

رہا یہ امر کہ موجودہ ترقیات کا ذکر قرآن مجید میں صراحتاً کیوں نہیں تو یاد رکھیں کہ قرآنِ کریم کا موضوع آخرت کی دائمی اور حقیقی زندگی کے حصول کے لیے دنیا کی چند روزہ زندگی کو استوار رکھنے کا طریقہ بتلاتا ہے اور اسی مقصد کے لیے زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی پیش آنے والی ضرورتوں کو تشنہ نہیں چھوڑتا، سعادتِ اُخروی کے طریقوں کو ترغیب و ترہیب سے بیان کرتا ہے اور تجارت، سیاست، ملازمت، زراعت سب شعبوں میں حلال و حرام کی راہنمائی کرتا ہے لیکن وہ طبیعات، نجوم اور جغرافیہ کی کتاب نہیں کہ ہر زمانہ کے عروج و ارتقاء کے سارے مراحل بتلائے، البتہ بطور آیاتِ آفاقی اور مبداء و معاد میں غور و فکر کرنے کے لیے

کہیں ضرورت پیش آئی تو ان اشیاء کا ذکر ایسے جامع کلمات سے کرتا ہے جس سے قیامت تک اہم فنی مسائل بھی مستنبط ہو سکیں، مگر یہ نہ تو ہر شخص کا کام ہے نہ اس کا فہم ایمان کے لیے ضروری ہے۔

قرآن کریم میں علوم کا لامتناہی ذخیرہ

اولوالابصار اور عقلمندوں کے لیے علوم کا لامتناہی ذخیرہ قرآن مجید میں موجود ہے اور ان کلیات سے قیامت تک جزئیات نکالی جا سکتی ہیں۔

محترم بھائیو! قرآن کریم کی کائنات بے حد و بے حساب ہے، اسکی وسعتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حدیث میں اس کی تعبیرات الفاظ میں کی گئی ہے کہ عرش معلی کے نیچے ایک ہزار قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں اور یہ ساتوں آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کچھ صرف ایک قندیل میں سمایا ہوا ہے باقی قنادیل میں کیا ہے؟ ان کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کس کو ہو سکتا ہے؟ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔

مختصراً یہی کچھ عرض ہوا، آئندہ کسی موقع پر خدا نے چاہا تو مزید تفصیل کی جائے گی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سائینسی کارنامے

پچھلے دنوں روسی سائنسدانوں کے اس اعلان نے علم و تحقیق کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا کہ روس کے محکمہ "خلائی تحقیقات" نے لونا ہیم" کو سطح چاند پر اتار دیا۔ اور وہاں سے معلوماتی اطلاعات فراہم کیں۔ پھر چند دن بعد زہرہ ستارہ پر بھی کمند ڈالنے کی خبروں نے دنیا کو مزید حیرت میں ڈال دیا۔ جبکہ چاند کی مسافت کا اندازہ سائنسدانوں کے نزدیک اڑھائی لاکھ میل کے قریب ہے۔ اور نظام شمسی کے اس دوسرے ستارہ زہرہ کی مسافت (بقول سائینسدانوں کے) اس وقت ہم سے ساڑھے سترہ کروڑ میل دور ہے۔

اکتشافات کا عہد موجودہ دور جو اپنے طبعی تحقیقات، علمی و فنی ایجادات اور اکتشافات کے لحاظ سے بجا طور پر تاریخ کا اہم ترین دور ہے اور مستحق ہے کہ اسے اکتشافات و ایجادات کے عہد سے یاد کیا جائے روس کے اس محیر العقول کارنامہ سے جو بلاشبہ سائنس اور اکتشافات کی دنیا میں ایک عظیم اور قابل فخر کارنامہ ہے جہاں علم اور سائنس کی دنیا میں ایک غلغلہ بلند ہوا ہے، وہاں بعض حلقوں میں اس پر حیرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا عمیق مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض سطحی اذہان شکوک و شبہات کے شکار ہوئے۔ کہ سائینس کے ان نت نئے اکتشافات اور محسوسات کے اس مشاہدہ اور تجربوں میں اسلام کہاں تک ساتھ دیتا ہے۔ اور کیا تسخیر کائنات کی یہ لامتناہی کامیابیاں اور یہ برق رفتار پیش قدمیاں اسلام کے کسی اصول سے ٹکراتی تو نہیں ؟ اور اس عالم کائنات و مادیات کے بارہ میں اسلام کا کوئی ایسا متوارث نظریہ یا عقیدہ تو نہیں جو انکشاف اور تسخیر کے کسی کارنامہ سے جوڑ نہ کھاتا ہو۔ ؟ — آج کی فرصت میں ہم اس نقطۂ نگاہ سے تسخیرِ

کائنات اور سائنس کے دیگر کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاکہ ایک طرف ان شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے جو اذہان کی ناپختگی کی وجہ سے اسلام کے بارہ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اس احساس کہتری کا ازالہ بھی ہو جن کے شکار بعض حضرات ان کارناموں کی پُرفریب ٹیپ ٹاپ کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اور بالآخر یہ احساس ان اسلامی اذہان و قلوب کو اپنے مذہب کے بارہ میں مایوسی اور افلاس، غیروں کی ذہنی غلامی، اور فکری مرعوبیت میں مبتلا کر کے رکھ دیتا ہے۔

مذہب اور سائنس کے حدود کار | جہاں تک مذہب اور سائنس کے باہمی ٹکراؤ اور تصادم کے خدشات اور وساوس کا تعلق ہے۔ عقل و فہم کی اس کج روی اور فہم و نظر کی اس گمراہی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان اذہان میں مذہب اور سائنس کے دائرۂ کار اور حدود و رفتار کا تعین نہیں ہو سکا۔ حالانکہ مذہب اور سائنس کی راہیں بنیادی طور پر جدا جدا اور دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ سائنس تحقیق اور علم و انکشافات کا سروکار اس عالم محسوسات و مادیات سے ہے۔ جو کسی طرح بھی ہمارے حواس و مشاہدات میں آسکتے ہیں۔ اور مذہب کی ساری جولانی غیب کی اس دنیا میں ہے جو ہمارے محسوسات سے وراء الوراء ہے، وہ ہمیں اس دنیا کی حقیقتوں کی خبر دیتا ہے جہاں تک ہمارے عقل و ادراک اور احساس و شعور کی رسائی قطعی ناممکن ہے۔

فطری تجسس | مذہب ہمارے ان سوالات اور گتھیوں کا حل پیش کرتا ہے جس کے سلجھانے سے سائنس اور فلسفہ، علم و شعور کی طاقتیں وامانده اور درمانده ہو جاتی ہیں عالم کی حقیقت کیا ہے۔؟ اس کارخانۂ ہست و بود کی یہ ہنگامہ آرائیاں کہاں جا کر ختم ہوں گی؟ اس عالم آب و گل کی تخلیق کیونکر اور کس مقصد کے لئے ہے۔؟ پھر اس کائنات کی وہ جوہری ہستی "جسے ہم" انسان کے نام سے پکارتے ہیں۔ جسم و مادہ کے اس کارخانہ اور قدرت کے ان لامتناہی خزانوں پر کیونکر قابض و حاوی ہے۔؟ اور بالآخر تسخیر و غلبہ کی یہ

قوت و طاقت جسم و خون سے بنے ہوئے اس "عالمِ اصغر" (چھوٹے عالم) انسان کے ہاتھوں میں کیوں اور کس مقصد کیلئے ودیعت کی گئی ہے۔؟ عقل و فکر ان سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہے۔

سائنس کی درماندگی اور سائنسدانوں کا اعتراف

سائنس و تحقیق کا عالم انسانی جبلت کے ان فطری مطالبات کا جواب نہیں دے سکتا۔ اسے خود اپنی عجز و درماندگی کا اعتراف ہے۔ اور اکتشاف و انکشاف کی اس دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی اور موجد، اسباب و مسببات کے معمے حل کرنے والا بڑے سے بڑا محقق بھی، بانگ دہل اپنے قصور اور لاعلمی کا اعلان کر رہا ہے کہ:

"کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لئے ہمارا دائرہ کار ان دونوں سے الگ الگ ہے۔" (فرانس کا مشہور ماہر سائنس پروفیسر لسنر)

اس دنیا کا ایک دوسرا شہسوار جے ڈبلیو این سلیون کتنی صفائی سے اقرار کرتا ہے کہ زندگی جو انسان کی سب سے زیادہ قریب حقیقت ہے، سائنس اسکی کیفیت و نوعیت اور ماہیت و آغاز کے ادراک سے قاصر ہے:

"اور انسان کے گہرے مسائل سائنس کی سرحد سے باہر واقع ہیں۔ سائنس تو محض ایک ابتدائی کوشش ہے، اور اسکی تمام "سچائیاں" مشروط ہیں" (برہان ۱/۲)

"بہت سے سائنسدانوں نے زندگی کے آغاز کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اب تک اس کے متعلق کوئی قطعی علم حاصل نہ ہو سکا"

تھامس ہنری ہکسلے مزید وضاحت سے عقل و سائنس کے اس بے دست و پا ہونے پر روشنی ڈالتا ہے۔:

"جب ہم پچھلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں زندگی کے آغاز کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہوتا اور ہم اس ظہور کی کیفیت پر قطعی رائے قائم

نہیں کر سکتے ۔"

انہی کے ہم نام جولین ہکسلے کو اقرار ہے کہ :

"ہم صرف مظاہر تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور جہاں تک سائنٹفک تحقیقات کا تعلق ہے ، ہمارا علم صرف مظاہر کی تشریح اور ترجمانی کرتا ہے ۔ سائنس کی حقیقت آزادانہ تحقیقات اور تجربات میں مضمر ہے ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے اصول و مبادی غیر متغیر ہیں ۔ اس میں حذف و اضافہ و ترمیم کا ہر وقت امکان ہے ۔ (برہان ص ۲۴ ج ۶ ش ۱)

ہکسلے کے اس قول کے خط کشیدہ الفاظ خاص طور سے اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ استدلال و فلسفہ کی بنیاد پر گھڑے گئے گئے اصول و مبادی کتنے کمزور اور بے تمکین ہوتے ہیں ، پھر زندگی کے فطری سوالات اور حقائق کی رہنمائی ان تغیر پذیر نظریات و مبادی سے کسطرح ممکن ہے ۔ ؟

کائنات کی حقیقت اور سائنسدانوں کا اعتراف عجز

سائنسی اصول و نظریات کی یہی بے ثباتی اور کمزوری ہے کہ جب بھی سائنس کی دنیا میں کائنات کی حقیقت اور ماہیت کے بارہ میں سوچا گیا تو اس کی بنیادوں میں تزلزل پیدا ہوا ، جہل اور لاعلمی کی آندھیاں اٹھنے لگیں اور اعلان کیا گیا کہ :

"ہمارے دماغ کی فطری ساخت ہی اشیاء کی ماہیت اور کیفیت کے ادراک سے عاجز ہے ہم صرف کمیت کا ادراک کر سکتے ہیں ۔ کیفیت کا نہیں (پروفیسر کنلکیہ برہان ج ۶ ش ۱)

پروفیسر ٹنڈل نے سمجھانے کے لئے گھڑی کی مثال دیکر سائنس کے حدود اختیارات کا تعین کیا اور کہا کہ :

"بعینہ یہی حال واقعات و حوادث فطری کا ہے ۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی

ایک مخفی مشین کارفرما ہے۔ اور ایک خزانۂ قوت ہے، جو اس مشین اور ذخیرۂ قوت سے پردہ ہٹاکر یہ بتاتا ہے کہ واقعات وحوادث انہی دنوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں۔ لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے۔؟ یہ کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوکا —— ؟ اور اسکی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔"

(از مولانا مناظر احسن گیلانی ص۲۸)

لاریب کہ عالمِ سائنس کے یہی شہباز آج خلاکو مسخر اور نظامِ شمسی کے بڑے سے بڑے اجرام کو زیر کر رہے ہیں، مگر زندگی کے وہ فطری حقائق جن کے سمجھنے اور پانے سے خدا و آخرت پر ایمان لانے والا کوئی شخص بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ نہ ہر وہ شخص جس کے سر میں انسانی دماغ ہے، گویا نہیں۔ اس کے تسلّی بخش حل سے مستغنی ہوسکتا ہے سائنس، اختراع اور ایجاد کی دنیا اس بارہ میں کوئی رہنمائی نہیں کرسکی۔ اور پکار پکار کر کہا جارہا ہے کہ:

"سائنس کسی چیز کی بھی کامل توجیہہ نہیں کرسکتی نہ اس کے اسباب اوّل تا آخر بتائے جاسکتے ہیں، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی تاویل وتوجیہہ میں آغاز اشیاء کی طرف چند قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔" (ہکسلے)

اسی ہکسلے نے عالمِ سائنس کے بنیادی اصول ومباحث، سلسلۂ علت ومعلول ازرجی الیکٹرون سالمات (اجزاء لاتتجزیٰ) وقت اور زمانہ کی گتھیاں سلجھانے میں ایک زندگی کھپا دی۔ مگر بالآخر اسباب ومسببات کے درمیان زمین وآسمان کے قلابے ملاتے اور عقلِ نارسا کے گھوڑے دوڑانے کے بعد اسے برملا اپنی کتاب "اصول ونتائج" میں اعتراف کرنا پڑا کہ:

"وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے۔ اس باب میں جتنی لایعنی ہرزہ سرائیاں پڑھنے کا موقعہ مجھے ملا ان میں سب سے

بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں۔ جو آغازِ عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں۔
مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرنا
چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔" (الدین القیم)

یہ صرف چند نمونے اور اقتباسات ہیں جن سے غیب اور غیر محسوس عالم کے بارہ میں سائنس کی درماندگی اور زندگی کے فطری تقاضوں اور سوالات سے اس کے فرار و گریز پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب اور سائنس کے دائرے قطعی جدا جدا ہیں، ان میں تعارض و تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا خوب فرمایا ایک بالغ نظر فلسفی اور صاحبِ دل عالم نے کہ: " اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے۔ تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔"

غرض آج جن لوگوں کو سائنسی کارناموں سے مذہب کی بنیادیں گرتی اور لرزتی معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ ان کی اپنی نظر کی کوتاہی اور عقل کے فتور کی دلیل ہے ؎

بہ چہرۂ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

اقلیم مذہب کی حدود اور وسعتیں | مشاہدات و محسوسات کی وہ آخری سرحد جہاں سائنس ہمیں بے یار و مددگار ظلمتٌ بعضها فوقَ بعض۔ (تہ بہ تہ اندھیرے) کے عالم جہل و بے خبری میں چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے۔ ٹھیک وہاں سے اقلیم مذہب کی حدود کا آغاز ہوتا ہے، جس کی پہنائیاں لامحدود ہیں، اور جس کی وسعتیں علم و ہدایت، فکر و فہم، عقل و خرد کے تمام خزانوں کو سمیٹی ہوتی ہیں، جہاں ظلم و جہل نام کی کوئی شئے موجود نہیں، نور ہی نور ہے۔ علم حقیقی کی ضیا پاشیاں اور قدرت و فطرت کے اٹل اصول اور لازوال مبادی کی فرمانروائیاں ہیں۔ فطرتَ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللّٰہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ جس سرحد پر محسوسات و مشاہدات کا علم ہمیں حیران و سرگردان

چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ وہاں سے مذہب آکر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور انسانی فطرت کے سوالات کے جوابات دیتا ہے۔ ہمیں تخلیقِ کائنات اور انسانی پیدائش کے مقاصد سے روشناس کراتا اور شکوک و شبہات کی تمام گتھیاں سلجھا کر انسانی قلوب و اذہان کو سکونِ اطمینان کی نعمت سے مالامال کر دیتا ہے۔

تسخیرِ کائنات میں مذہب کی رہنمائی | زندگی کی حقیقت اور عالم کے آغاز و انجام کے بارہ میں انسانی رہبری کے بعد مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ یہ زندگی کن خطوط پر بسر ہونی چاہیئے، اور قدرت نے تسخیر و غلبہ کی جو استعداد انسان کو دی ہے، اسے کن مقاصد میں لگانا چاہیئے۔؟ مذہب کہتا ہے کہ مشاہدات و محسوسات کی یہ ساری کائنات اُن اعلیٰ مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہے، جس کی بناء پر عالم کے اس جرمِ صغیر "انسان" کو پوری کائنات پر **سبقت دی گئی اسے اشرف المخلوقات یہاں تک کہ اسے** "خلافتِ ربانی" کے آخری مقام عروج پر فائز کیا گیا، مذہب کہتا ہے کہ اس "زندگی" کو جس کے ادراک سے تمہاری سائنس و عقل قاصر تھی، آخرت اور ایک ابدی زندگی کا ذریعہ بناؤ اور اس طرح بقائے دوام اور لافانی ہونے کی وہ فطری خواہشیں حقیقی معنوں میں پوری کر دو جس کا ولولہ اور تڑپ تمہارے خمیر میں شامل ہے۔ مذہب ہمیں ہرگز ان تسخیری قوتوں کو کام میں لانے سے نہیں روکتا جو ہماری سرشت میں قدرت کے دستِ فیاض نے رکھیں، وہ کہتا ہے کہ تم ستاروں کو گن سکتے ہو آفتاب و قمر کو زیر کر سکتے ہو۔ پہاڑوں کو چیر سکتے ہو۔ ہواؤں اور سمندروں کو مغلوب کر سکتے ہو زمین و آسمان کی وسعتیں سمیٹ کر اپنی مٹھی میں لا سکتے ہو۔ تیز رفتار اور دیو ہیکل بے جان اجسام کو خلائی سیارہ، جہاز، ریل اور بحری بیڑے کی شکل میں دوڑا سکتے ہو کائنات کے عناصرِ اربعہ کی حقیقتیں اور ماہیتیں بدل سکتے ہو۔ یہاں تک کہ ان کائنات سے ایٹمی توانائیوں کی صورت میں قوت اور طاقت کی لامحدود دولت حاصل کر سکتے ہو۔ تمہارے لئے آسان ہے کہ پہاڑوں کے جگر شق کر دو اور خلا کی پنہائیاں چیر ڈالو اور ممکن ہے کہ تم زمین کے

علاوہ زہرہ و ماہتاب اور نظامِ شمسی کے دیگر سیاروں کو بھی اپنا مسکن اور جولانگاہ بنا دو کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے پیدا کیا گیا ــــــ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دجالی تہذیب کے کامل ارتقاء و عروج کے زمانہ میں تمہاری یہ تخلیقی قوت اور اختراعی صفت درجۂ کمال تک پہنچ جائے تم بادل برساؤ اور مصنوعی صورتوں سے احیاء اموات پر بھی قادر ہو جاؤ۔

بہت سے دعووں کی تائید و توثیق | مذہب اس دن کے انتظار میں ہے۔ کہ تم یہ سب کچھ کر سکو کہ اس کے بہت سے دعووں کی مزید توثیق و تصدیق تمہارے ان سائنسی کارناموں پر موقوف ہے۔ اس طرح اخبارِ غیب اور رجالِ غیب کے وہ سارے دعوے اور حقیقتیں تم پر عیاں ہو سکتی ہیں، جسے تم اپنے ماؤف دل و دماغ اور مفلوج ذہن کی بنا پر ناممکن اور محال سمجھتے تھے۔ وہ حقیقتیں اور خوارقِ عادات جس کا مظاہرہ اس کائنات کے خالق نے غیبی اسرار کی مقدس شخصیتوں انبیاء و رسل کے ہاتھوں کرایا تھا تم آج سائنس اور صنعت،، راکٹ اور میزائل کے سہارے خلاؤں کے میدان میں اتر رہے ہو۔ ہم نے مان لیا کہ صدیوں کی کد و کاوش کے بعد آج تمہاری رسائی خلاء سے پار کی دنیا تک ہو رہی ہے۔

رسولِ کریمؐ اور عروج و پرواز کی منزلیں | مگر کیا آج سے چودہ سو سال قبل مخلوقات میں خلافتِ الٰہیہ کے سب سے عظیم مظہر انسان نے "محمدِ عربی فداہ ابی و امی" کی شکل میں عروج و پرواز کی یہ ساری منزلیں پلک جھپکنے میں طے نہیں کی تھیں۔؟ ولقد رایٰ من آیات ربہ الکبریٰ۔

وہ جو خود انسانی ارتقاء و عروج کا آخری نقطۂ معراج تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ جو چاند اور ستارے تو کیا آسمانوں اور ملکوتی کائنات کی ساری بلندیوں سے بھی پرے پہنچ گیا جہاں دنیا کی سب سے بڑی محرمِ راز اور طاقتور ہستی جبریلِ امین کی رسائی بھی ناممکن تھی۔ ملأ اعلیٰ کے اس اسراء و معراج میں نہ تو انہیں کسی جسمانی قوت و طاقت کی ضرورت پیش آئی۔ اور نہ اس عالمِ مادیات و مشاہدات کی کسی مادی قوت نے ان کی دستگیری کی۔ پھر یہ اسلام اور

مذہب ہی تو تھا جس نے انسانی عروج واستیلاء اور معراج وارتقاء کی ایسی جیتی جاگتی تصویر محمد عربی کے معراج کی شکل میں صدیوں قبل دنیا کے سامنے رکھ دی تسخیر کائنات کا اتنا قدیم تصوّر اور اس کے دائرۂ امکان میں ہونے کی تعلیم کسی دوسرے مذہب، نظریہ اور عقیدہ نے اس سے پہلے نہیں دی تھی۔ یہ غلامانِ تجربہ وسائنس اور ریندگانِ عقل تو اب تک اس کا مذاق اڑاتے رہے، اور زندگی کی تمام حقیقتوں اور آغاز وانجام کے خدائی تقاضوں اور حکمتوں کی طرح اسکی بھی تکذیب کی۔ بل کذبوا بمالم یحیطوا بعلمہ۔

تسخیر مخلوقات معرفت خالق کا ذریعہ | الغرض قدرت نے ہمیں پوری فیاضی سے اس کائنات سے فائدہ اٹھانے کا اختیار دیا کہ زندگی کے فطری سفر میں جو بھی رکاوٹ تمہارے سامنے آئے اسے زیر وزبر کر دو ــــ مگر ہاں! زندگی کے کسی لحظہ اور کسی ثانیہ میں اس حقیقت سے غافل مت ہو کہ تمہاری یہ تمام قوتیں اور توانائیاں کسی "غیر" کی کرم نوازیوں کا نتیجہ ہیں۔ ایک وراء الوراء ہستی ہے جس نے تمہیں عقل وخرد کی نعمت سے نوازا اور تسخیر وتصرف کے یہ راستے سجھائے اس نے اپنی بے مثال فضل وکرم سے تمہیں عقل کی دولت دی، استنباط واستخراج کی نعمت سے نوازا جس کے ذریعہ تم کائنات کو اپنی جولانی اور تصرف کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہو۔ عقل انسانی اور شعور وادراک کا یہ "جوہر" اُسی کا عطا کردہ ہے، جس کے ذریعہ تم عناصر اربعہ کی باہمی تحلیل وترکیب کر کے طاقت کے لازوال خزانوں پر قابض ہو گئے ہو۔ اگر اس کے فیض وکرم کی کرشمہ سازیاں نہ ہوتیں اور اس نے اس قیمتی جوہر "عقل وفہم" سے تمہیں نہ نوازا ہوتا تو تم اس کائنات کی سب سے حقیر وناتواں مخلوق ہوتے کہ اس کائنات میں عقل وخرد سے عاری مخلوق ہاتھی اور بیل وغیرہ جسم وضخامت کے لحاظ سے تم سے بدرجہا بڑھ کر ہیں پھر وہی رب ہی تو ہے جس نے عقل وخرد اور خلافت ربّانی کی نعمتوں سے تمہیں نواز کر اس کائنات کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔

ولقد کرّمنا بنی آدم وحملناھم | اور البتہ ہم نے بنی آدم کو فضیلت

فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبت وفضلنٰھم علی کثیر ممّن خلقنا تفضیلا۔

وہی اور خشکی و تری دونوں کی قوتیں اسکی تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں اسکی روزی کے لئے پیدا کر دیں نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں سے اکثر پر اس کو برتری دی۔

ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا۔

اللہ وہی ذات ہے جس نے زمین کے بیچ ہر چیز کو تمہارے لئے پیدا کیا۔

تسخیر واکتشاف اور قرآن | غیب کی راہیں سجھانے والا یہ آخری صحیفۂ غیب کہتا ہے ۔کہ یہ تو خدا ہی ہے جس نے انسان کو تمام مخلوقات کی حاکمیت عطا فرمائی اور سفلیات تو کیا عالم بالا کے شمس و قمر تک بھی تمہارے زیر کر دئے ۔

اللہ الذی خلق السمٰوت والارض وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم و سخر لکم الفلک تجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانھٰر وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار وآتاکم من کل ما سالتموہ وان تعدّوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا ان الانسان لظلوم کفّار۔

اللہ وہ ہے جس نے بنایا آسمان و زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے ۔ اور مسخر کیا تمہارے لئے کشتی کو کہ اس کے حکم سے دریا میں چلے اور کام میں لگایا تمہارے لئے ندیوں کو سورج کو اور چاند کو ایک خاص دستور و نظام کے مطابق اور کام میں لگا دیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی اور اگر گنو اللہ کے احسانات نہ پورے کر سکو بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکرا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں ساری مخلوقات سے زیادہ محتاج بنا کر بھی کائنات کی ہر چیز کو

خواہ سفلی ہو یا علوی تمہاری بیگار میں لگا دیا۔

الم تروا ان اللّٰہ سخر لکم ما	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں
فی السموٰت والارض واسبغ	میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب
علیکم نعمۃ ظاھرۃ وباطنۃ	کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام پر لگا
(پ ۲۱ آیت ۲۰)	رکھا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری اور

باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ (ترجمہ: مولانا احمد علی لاہوری)

والانعام خلقھا لکم فیھا دفء	اور اس نے تمہارے لئے چارپائے
ومنافع ومنھا تاکلون ولکم	پیدا کئے جن میں تمہارے لئے گرم
فیھا جمال حین تریحون و	کرنے والی پوشاک اور طرح طرح
حین تسرحون وتحمل	کے فائدے ہیں۔ اور ان میں سے
اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ	بعض کو تم کھاتے ہو اور ان میں تمہاری
الا بشق الانفس ان ربکم	نگاہوں کیلئے جمال و زینت بھی ہے
لرءوف رحیم (الی قولہ)	جب تم انہیں صبح و شام گھومنے
ویخلق مالا تعلمون ؏	پھرنے چھوڑتے ہو۔ اور یہی جانور

تمہارا بوجھ ایک شہر سے دوسرے تک لے جاتے ہیں کہ تمہارے بس میں وہاں

ؔ نیز ملاحظہ ہو — وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمّٰی پ ۲۳۔ وسخر الشمس والقمر لیقولن اللّٰہ پ ۲۱ آیت ۶۱۔ الم تر ان اللّٰہ سخر لکم ما فی الارض والفلک تجری بامرہ پ ۱۷ ع ۱۵ وسخر لکم الانھار۔ پ ۱۳۔ وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ان فی ذلک لآیٰت لقوم یعقلون پ ۱۴ آیۃ ۱۲۔ وھو الذی سخر البحر (الی قولہ) لعلکم تشکرون پ ۱۴ آیت ۱۴۔ وسخر الشمس والقمر کل یجری الی اجل مسمّٰی وان اللّٰہ بما تعملون خبیر۔ پ ۲۱۔

پہنچتا تھا، مگر بڑی مشقت کے ساتھ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا شفقت اور رحم والا ہے ۔ الخ پھر وہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جنکی تمہیں خبر نہیں ۔

کیا آیت بالا کا آخری ٹکڑا ویخلق مالا تعلمون ۔ اکتشافات حاضرہ اور موجودہ دور کی نت نئی اختراعات کیطرف اشارہ نہیں کرتا ۔ ؟

نعمت تسخیر کا حق اور تقاضا | ان آیات بینات سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہوتی ہے ۔ کہ انسان کے یہ تسخیری کارنامے منشاء قدرت کے خلاف نہیں ہیں ۔ اور نہ اسلام تمہیں اس سے روکتا ہے ۔ بلکہ جگہ جگہ تفکر اور تدبر و تفہم کی خاطر ہمیں اس کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر اور سیر فی الارض کی دعوت دیتا ہے ، اور چاہتا ہے کہ ہم اس عالم مشاہدات کے انفسی اور آفاقی آیات کو اس کے خالق کی پہچان اور ان قوتوں کو اسکی مرضیات کے حصول کا ذریعہ بنائیں ۔ تہاری یہ " خلانوردیاں " اسکی عظمت و قدرت کی پہچان کا ذریعہ بننی چاہئیں ۔ اور ہر نئے انکشاف و اختراع اور ایجاد و ادراک کے وقت تمہارا رُواں رُواں اسکی کبریائی میں ڈوب جانا چاہیئے ۔ کہ اس نے تمہارے آرام و آسائش کی خاطر نعمتوں کی ایک دنیا بسا دی اب تمہارا فرض ہے کہ اس کی حمد و ستائش کے گیت گاتے ہوئے اسکی نعمتوں کو ٹھکانے لگا دو ۔ یہ چاند اور سورج تو اس کے انعامات و اکرامات کا ایک ذرہ ہے ۔ اور اس طرح اس عالم کا ہر ذرہ انسانیت کے ابدی فلاح ، دائمی امن اور بقاء کا وسیلہ بننا چاہیئے نہ کہ تہاری یہ سائنس و تحقیق اس کی عظمتوں سے غفلت و انکار ، اور اسکی نافرمانی و سرتابی ، اس دنیا کی مخلوقات پر ظلم و تعدی کا ذریعہ بن جائے ، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایجادات تمہاری بہیمی و حیوانی جبلت کی وجہ سے عالم کی تباہی و بربادی اور مخلوق کی ویرانی اور بربادی کا سبب بن جائیں ـــــ بلکہ :

ثم تذکروا نعمة ربکم اذا	پھر جب اس پر تمہارا تسلط ہو جائے
استویتم علیه وتقولوا	تو اپنے رب کا احسان یاد کرو ۔ اور

سبحان الذی سخر لنا ھذا وماکنالہ مقرنین و انا الی ربنا لمنقلبون۔ | کہو کہ پاک ذات ہے وہ جس نے اس کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم ہرگز اسکو اپنے قابو میں نہ لا سکتے
تھے۔ (اگر اسکی رہنمائی و مددگیری نہ ہوتی۔) بالآخر ہم سب کو اسکی طرف لوٹنا ہے۔

کذلک سخرنا ھا لکم لعلکم تشکرون۔ | اللہ نے انہیں تمہارے لئے ایسا مسخر کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

کذلک سخرھا لکم لتکبروا علی ما ھداکم | اس طرح انہیں تمہارے تابع کر دیا تاکہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اس نے
تمہیں ہدایت کی ——— (ترجمہ: حضرت مولانا لاہوریؒ)

چاند تک رسائی اور اسلام کا موقف | الغرض سائنسی کارناموں یا چاند اور سورج کی تسخیر کے بارے میں اسلامی تعلیمات میں کوئی ایسی تصریح نہیں پائی جاتی جس سے ان چیزوں کی نفی ہوتی ہو۔ سورج اور چاند کا کسی خاص آسمان میں ہونا یا دیگر سیارات کیلئے آسمانوں سے اوپر یا پانچویں یا چھٹے آسمان کے تعین کے جو اقوال مشہور ہیں وہ فلسفۂ یونان یا بطلیموسی علم ہئیت، یا اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں۔ البتہ قرآن وسنت سے آسمانوں کا وجود ان کا ذی جرم ہونا ان میں دروازوں، گذرگاہوں کا پایا جانا، ان کا مختلف منازل و بروج پر تقسیم ہونا ثابت ہے۔ اکابرین اسلام میں حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کی روایات میں تصریح پائی جاتی ہے۔ کہ نظام فلکی کے تمام سیارے شمس وقمر سمیت قنادیل معلقہ (لٹکے ہوئے فانوسوں) کی مانند آسمانوں کے نیچے موجود ہیں[1]۔ اور آسمانوں کا مقام ان تمام سیاروں سے اوپر ہے۔

طبعیاتی علوم اور امام غزالیؒ کی اصولی بات | باقی ان علوم کے بارہ میں اصولی بات

---

[1] النجوم قنادیل معلقة بین السماء والارض بسلاسل من نور بایدی الملائکة۔ (روح المعانی ج ۳۰ ص ۵۱)

وہی ہے جو امام غزالیؒ نے اپنی خود نوشت واردات و تاثرات المنقذ من الضلال میں ارشاد فرمائی کہ ریاضیات، منطقیات، طبعیات وغیرہ کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ بھی تعلق نہیں۔ اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے۔ ان طبعیاتی علوم کے بارے میں (جس میں عالم سماوات و کواکب، عناصر اربعہ اور اجسام مرکبہ و مفردہ سے بحث ہوتی ہے۔) ہمیں یہ اصولی بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ خود مختار نہیں جو لوگ ان علوم کی باریکیوں سے مرعوب ہو کر یہ خیال کرتے ہیں کہ علوم غیب و حقائق میں بھی ان لوگوں کی مہارت کا یہی حال ہو گا وہ غلطی پر ہیں۔

امام غزالیؒ ایک طرف علماء طبعیات کے ان کارناموں سے مرعوب اذہان اور ان کی تقلید میں دین کے انکار اور استخفاف کرنے والوں پر سخت گرفت کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان سطحی اذہان پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ جو ہر نئی دریافت اور مادی اکتشاف کو اسلام سے متصادم سمجھ کر اس کے ماننے سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

الآفة الثانية نشأت من صديق	طبعیات سے مرعوب ہونے کی طرح یہ بھی
للاسلام جاهل ظن ان الدين	ایک بڑی آفت ہے کہ اسلام کے بعض
ينبغي ان ينصر بانكار كل علم	نادان دوست فلاسفہ اور علماء طبعیات
منسوب اليهم فانكر جميع علومهم	کی ہر نئی دریافت اور نظریہ اور ان کے
وادعى جهلهم فيها حتى انكر قولهم	ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت
في الكسوف والخسوف وزعم ان	سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ طبعیات کے سلسلہ
ما قالوا خلاف الشرع فلما قرع	میں سورج گرہن چاند گرہن تک کے بارے
ذلك لسمع من عرف ذلك	میں انکی باتوں کو خلاف شرع اور مذہب
بالبرهان القاطع لم يشك في	سے متصادم سمجھ کر ٹکرا دیتے ہیں اسکا ضرر

برهانه ولكن اعتقد ان الاسلام مبنى على الجهل وانكار البرهان القاطع فيزداد للفلسفة حبا و للاسلام بغضا ولقد عظم على الدين جناية من ظن ان الاسلام ينصر بانكار هذه العلوم وليس فى الشرع تعرض لهذه العلوم بالنفى والاثبات ولا فى هذه الامور تعرض للامور الدينية۔

پہلو یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان نظریات و انکشافات کی صداقت کے قائل ہوتے ہیں۔ اور مضبوط دلائل سے ان کے ہاں یہ چیزیں مسلّم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارہ میں متزلزل ہو جاتا ہے۔ (اور معاذ اللہ) وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد جہل اور مشاہدات سے انکار پر ہے۔ پھر بجائے طبیعات کے انکار کرنے کے اسلام سے ان کی بدگمانی بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں کی اسلام کے بارے میں یہ بڑی جسارت ہے جن کا گمان ہے کہ اسلام ان علوم کے انکار کی حوصلہ افزائی کرتا ہے حالانکہ شریعت کو نہ تو ان اشیاء کا ثبوت مطلوب ہے اور نہ انکار مقصود اور نہ ان علوم وتحقیقات میں دینی اصول کو تعرض ہو سکتا ہے۔ (المنقذ من الضلال للغزالیؒ ص۱۰)

حسن وقبح کا دارومدار مقاصد اور استعمال پر ہے۔ یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے بخوبی واضح ہوا کہ سائنس کے کسی بڑے سے بڑے کارنامے کا مذہب کے کسی پہلو پر زد نہیں پڑتی۔ پھر اسلام جیسا دینِ فطرت ——! جو اپنے بنیادی اصول وارکان روح اور مزاج اور مقاصد میں ذرّہ بھر ترمیم وتبدیلی کا روادار نہیں۔ اس کے مبادی اور اغراض لافانی اور اس کے احکام وقوانین اٹل ہیں۔ ناممکن ہے کہ یہی ملّتِ حنیفیہ سائنس وعلم اور نظریات کے کسی چیلنج کو قبول نہ کر سکے وہ ان مادی ترقیات کی مخالفت نہیں کرتا بشرطیکہ اس فانی کائنات میں تمہارا یہ تگ وتاز مقاصد ومبادی اور انجام سے بے فکری کا باعث نہ بنے اور تم وسائل وذرائع کو زندگی کا مقصد نہ ٹھہرالو۔ یہ چیزیں بذاتِ خود نہ خیر میں نہ شر۔ اگر تمہاری یہ تسخیری قوتیں عالم کی فلاح انسانیت

کی باہمی خیر خواہی و ہمدردی، حقیقتِ انسانی کی پہچان کا ذریعہ اور حصول آخرت کا وسیلہ بنتی ہیں تو ان کی خوبی کے کیا کہنے۔ اور اگر تمہارے یہ ایجادی و اختراعی کارنامے دنیا کے مختلف ممالک کی تباہی اور بربادی عالم کی تخریب کاری اور انسانیت کی پریشان حالی، ایک دوسرے کو مغلوب و مقہور کرنے اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کا باعث بنتے ہیں ــــــ اور جیسا کہ دو عالمی لڑائیوں سے لیکر اب تک ان اشیاء کے استعمال سے ثابت ہو رہا ہے۔ تو تمہاری یہ سائنس و تحقیق اور یہ شبانہ روز کوشش صرف اس جذبۂ حیوانیت اور درندگی کی تسکین اور اس وحشت و بربریت کا ظہور ہے جو خدا اور نوامیسِ فطرت سے غفلت و انکار مادیت کو منتہائے حیات بنانے کے بعد ان انسان نما جسموں کو وحشی درندوں اور چوپائیوں سے بھی ذلیل و خوار بنا دیتا ہے۔ اولئک کالانعام بل ھم اضلّ۔ اگر تمہارا مقصد ان خلائی فتوحات سے زمین کے رہے سہے چین و سکون کو تباہ کر کے اپنے سامراجی اور حیوانی ارادوں کو پورا کرنا ہے۔ تو کائنات کی ملکوتی طاقتیں تمہاری ان کامیابیوں پر لعنتیں بھیجتی ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی کہ بر آسماں باز و پرداختی

پھر خدا کے نزدیک اس خلائی اور ایٹمی دور کے روشن خیال اور آدم نما "درندہ" سے قرونِ اولیٰ کا وہ "غیر مہذب" انسان ہزار درجہ بہتر ہے جو غاروں میں رہتا۔ مگر اس کا دل انسانیت کے احترام و فلاح اور خدائی اقدار کی عظمت و تقدیس سے معمور تھا۔

ایجاد و اختراع اور بربادیٔ عالم | ہیروشیما کی دلدوز داستانیں کسے بھولی ہونگی صرف ایک دن (۶ ر اگست ۱۹۴۵ء) کو صرف ایک بم سے جاپان کا یہ عظیم الشان شہر ہیوند خاک ہوکر رہ گیا صدر میونسپلٹی کی رپورٹ کے مطابق اس ایک بم سے دو لاکھ چالیس ہزار افراد ہلاک ہوئے سینکڑوں میل تک فضا تابکاری ذرات سے زہر آلود ہوئی اور جس کی تاثیر سے بچے ہوئے لوگوں کا خون تحلیل ہوا۔ ان کے بال گرتے رہے اعضاء سکڑ گئے اور رفتہ رفتہ موت

کے گڑھے میں جاگرے (ترجمہ ماذا خسر العالم) پچھلے ہفتہ فرانس کے مشہور رسالے ـــ "پیرس مارچ" ـــ میں اس تباہی کی ہلاکت آفرینی کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی جس کا ترجمہ جنگ "نارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ۔ اس رپورٹ کا کہنا ہے کہ "دس لاکھ برسوں کی انسانی ترقی پر چند لمحوں میں پانی پھیر دیا گیا ۔"

یہی حال دوسرے شہر ناگاساکی کا ہوا ۔ یہ تو اس وقت کے ایٹم بم کا حال تھا ۔ آج کے بیس میگا ٹن کا ایک بم ان بموں سے ہزار گنا طاقتور ہے اور اگر یہ بم ایسے شہر پر گرایا جائے جس کا رقبہ بیس میل میں پھیلا ہو تو چشم زدن میں یہ ساری آبادی نیست و نابود ہو جائیگی ۔ برطانوی سائنسدانوں کے اندازے کے مطابق لندن یا نیویارک جیسی گنجان آبادی پر یہ ایک بم دو کروڑ انسانوں کو موت کی نیند سلا سکتا ہے ۔ امریکی حکام اپنی ایسی دور مار میزائلوں کا دعوی کر رہے ہیں ، جس سے براہ راست چین اور روس کو تباہ کیا جا سکتا ہے ۔ حکومت روس اعلان کر رہی ہے کہ اس کے پاس ایک سو میگا ٹن ہائیڈروجن بم تیار ہو چکا ہے جو روس سے ہزاروں میل دور دشمن کے علاقوں کے ہر صنعتی ، اقتصادی اور فوجی مرکز کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے ۔ اور اس کے مہلک تابکاری اثرات لاکھوں مربع میل کے ہر جاندار کو مفلوج کر کے رکھ دیں گے ۔

تہذیب جدید کی سائنسی فتنہ سامانیاں | تہذیب جدید کی ان سائنسی فتنہ سامانیوں کی تعبیر حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کی ہے ۔

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی   موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

یہ حال تو ان چیزوں کے اختیاری اور ارادی استعمال کا ہے ۔ غیر ارادی اور تکنیکی طور پر ان چیزوں کی ہلاکت آفرینی کا حال کیا ہے ۔ ؟ پچھلے ایک ماہ میں دنیا کی صرف ایک حکومت کے ایک دارالخلافہ ٹوکیو میں پے در پے ہوائی حادثوں سے تین سو افراد ہلاک ہوئے ، دنیا کے مختلف حصوں میں آٹھ دس ہوائی جہاز گر کر تباہ ہوئے ۔ امریکہ کا ایٹمی اسلحہ سے لیس ہوائی جہاز

بحیرہ سپین میں گرا اور ایک دنیا کو ہلاکت اور تباہی کے خطرے میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح اس درندگی دبہیّت کو بھی نگاہ میں رکھئے جس کا مظاہرہ ویٹ نام کی نہتی انسانیت پر کیا جا رہا ہے۔

ایسے ہولناک نتائج کو دیکھ کر ڈاکٹر الفریڈ ایون نے جنگ عظیم کے بعد کہا تھا کہ "جنگ عظیم کے بعد سائنسی انکشافات کے بارہ میں میری اچھی توقعات کا خاتمہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہی علوم و فنون اور انجنیری کی ساری حکمتیں جس سے انسان کی خدمت کی جا سکتی تھی الٹی اس کے حق میں دشمن بن گئیں اور اسکی وحشت و سنگدلی شقاوت اور بہیّت میں ان آلات سے بدرجہا اضافہ ہوگیا۔ تخریب و بربادی کے عظیم الشان انجن ہم جانوروں کے ہاتھ آگئے"۔ ان "ترقیات" کی نظر فریب حقیقت دوسرے سائنسدان پروفیسر جوڈ نے ان الفاظ میں ظاہر کی کہ "تم ہوائی جہاز کو فضائے انسانی پر اڑتے دیکھ کر اس کے موجد کے عزم و ہمت پر عش عش کرنے لگتے ہو مگر ذرا ان مقاصد کا جائزہ لو جن کے ماتحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ مقاصد کیا ہیں۔؟ فضائے آسمانی سے نہتے انسانوں پر بمباری انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا۔ زہریلی گیسوں کا پھینکنا یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں۔ یا شیطانوں کے۔

انما یرید اللّٰہ ان یعذبھم بھا فی الدنیا و تزھق انفسھم وھم کٰفرون۔ الآیۃ
ھل یجزون الا ما کانوا یعملون صدق اللّٰہ خالق الکل مولانا الکریم۔

چاند اور ستاروں کی تسخیر

سائنس کی دنیا میں پچھلے چند سالوں سے خلائی فتوحات کا غلغلہ ہے، امریکی خلائی جہاز اپالو دہم کے حالیہ تجربہ اور ۲۰ جولائی ۶۹ء کو چاند پر انسان اتارنے کے پروگرام سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس وسیع کائنات کا حسین ترین سیارہ چاند انسانی قدموں کے زیر ہوا چاہتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے دائرہ کار اور حدود سے لاعلمی طبعیاتی علوم میں ناپختگی اور مذہب سے دوری یا کم علمی کی وجہ سے ان خلائی کارناموں نے بہت سے مسلمانوں کو احساس کمتری، مرعوبیت اور شکوک و شبہات میں ڈال دیا ہے۔ آج کی فرصت میں اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر کچھ اصولی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

فطرت انسانی کے تجسس کا قابل تسلیم جواب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم اپنی تخلیق و بقا اور اپنا تسلسل قائم رکھنے میں کسی بے جان مادہ، انرجی، نامعلوم الیکٹرون یا سلسلۂ علت و معلول کا منت پذیر نہیں بلکہ یہ نہایت منظم اور پر حکمت کائنات ایک حی و قیوم اور حکیم و علیم صانع کی کرشمہ سازی ہے۔ انسانی فطرت کی اس بارہ میں جو تجسس اور بے چینی ہے۔ اس بے چینی کا یہی ایک سیدھا سادا اور قابل تسلیم جواب ہے۔ اس ازلی اور ابدی حقیقت کو چھوڑ کر عقلاء اور فلاسفۂ قدیم یا عصر حاضر کے ماہرین طبیعیات اور سائنسدانوں نے جو بھی راستہ اختیار کیا وہ ایک ایسی سرحد پر ختم ہو کر رہا جہاں انہیں حیرت و اضطراب، فکری انتشار، تضاد بیانی اور بالآخر عجز و درماندگی کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہ مل سکا۔

لامحدود کائنات اور سائنسی اعترافات پھر یہ کائنات صرف وہی نہیں جو اب تک ہمارے

علم وادراک اور مشاہدات کی گرفت میں آچکی ہے بلکہ خداوند قدوس کی خدائی کی کوئی انتہا ہی نہیں ۔ موجودہ سائنس کو اپنی تحقیق اور تجربات کی رو سے اعتراف ہے کہ علویات اور سفلیات کا جتنا حصہ ہمارے علم و مشاہدہ میں آچکا ہے ۔ وہ اس لامحدود کائنات کا کھرواں حصہ بھی نہیں جواب تک ہماری نگاہ درماندہ سے مستور ہے ۔ مذہب نے اپنے آخری ترجمان رسول اکرمؐ کی زبانی کائنات کی ان لامحدود وسعتوں کا اعلان کیا تو بندگان عقل اور غلامان مشاہدہ کو نزرد ہوا مگر آج کے سائنس دانوں نے خالق کائنات کی تخلیقی عظمتوں پر اپنے اس قسم کے اعترافات سے منکر سے منکر انسان کا بھی سر تسلیم خم کرادیا اور مذہب کی تائید و تصدیق کا یہی وہ کام ہے جو خداوند کریم آج سائنس سے لے رہا ہے ۔ اس کائنات کی وسعتوں کا کیا حال ہے ؟ اس کے جواب میں بطور مثال ہم صرف چند چیزیں پیش کرتے ہیں ۔ کائنات کی وسعت کے بارہ میں یہ بھی صرف چند قیاسی اور ظنی تخمینے ہیں ورنہ حقیقت اس سے بھی بڑھ کر ہے ۔ صرف ستاروں کو لیجئے جو اس وسیع کائنات کا صرف ایک جزاور ایک حصہ ہے ۔ ورلڈ اٹلیس کی تحقیق کے مطابق اگر رات کو مطلع صاف ہو تو ۵ ہزار تارے نظر آتے ہیں ۔ ہلکی دوربین سے کئی ہزار نوری دوربینوں سے کروڑوں اور امریکہ کے بڑے رصد گاہ ماؤنٹ پالومر سے اربوں نظر آتے ہیں ۔ ڈاکٹر منڈل نے جغرافیہ عالم میں خوردبینوں سے نظر آنے والے ان تاروں کی تعداد سات ارب بتلائی ہے مگر بعض علماء فلکیات کا خیال ہے کہ ان ستاروں کی تعداد دنیا بھر کے سمندروں کے کنارے ریت کے ذرات سے بھی بڑھ کر ہے ۔ پھر ان میں سے بعض تارے تو حجم میں اتنے بڑے ہیں کہ بعض میں لاکھوں اور بعض میں اربوں زمینیں سما سکتی ہیں ۔ پھر ان ستاروں کی درمیانی مسافت اور کرۂ ارض سے فاصلہ کا کیا عالم ہے ۔ انہی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ چاند ہماری زمین سے اڑھائی لاکھ میل سورج ساڑھے نو کروڑ اور زہرہ ساڑھے تیرہ کروڑ میل دور ہے ۔ ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے ۔ پھر یہ کائنات ستاروں کی لاتعداد کہکشاؤں کی صورت میں حرکت کررہی ہے اور ہمارے شمسی نظام کا قریب ترین کہکشاں اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے ایک دور بیس کروڑ سال میں پورا کرتی ہے ۔ پوری

کائنات کی پیمائش کے لئے بعض سائنسدانوں کے خیال میں ۸۶ ارب سال اور بعض کی رائے میں ایک ارب سال کا عرصہ درکار ہے جبکہ اس عرصہ میں ہماری تحقیق و انکشاف کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ رہے۔ اس پر بس نہیں بلکہ ہر لمحہ اس کائنات میں چاروں طرف اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پھیلنے کی رفتار آئن سٹائن کے خیال میں اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کروڑ سال بعد کائنات کی مقدار دگنی ہو جاتی ہے اور یہ جو روشنی ستاروں سے پھوٹ پھوٹ کر ہماری نگاہوں کو خیرہ کرتی رہتی ہے۔ وہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے آرہی ہے مگر بہت سے ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی اس تیزی اور سرعت کے باوجود ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک ہماری زمین تک پہنچ بھی نہیں سکی۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کائنات کی وسعت کی صحیح تعبیر اس کی بے حساب حکمتوں اور اس کے صحیح اندازہ کے بارہ میں انسان کو مجبور و بے بس بنا کر اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہے جسے خداوند کائنات نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا :-

ولو ان ما فی الارض من	اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ
شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ	سمندروں کے ساتھ سات اور ایسے سمندر بھی
من بعدہ سبعۃ ابحر	سیاہی بن جائیں جب بھی خدا کی تخلیقی
ما نفدت کلمات اللہ۔	کارفرمائیوں اور حکمتوں کی باتیں ختم نہ ہو سکیں گی۔

اور یہی وہ صداقت ہے جسے قرآن نے وما یعلم جنود ربک الا ھو (اور نہیں جانتا تیرے رب کے لشکروں کو مگر وہی) اور وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اور نہیں دیا گیا تمہیں مگر تھوڑا سا علم) سے اشارہ فرمایا ہے۔

عالم غیب | یہ حالت تو صرف اس عالم کی ہے جسے ہم مادیات اور عناصر و محسوسات کی دنیا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک اور عالم بھی ہے جو نگاہوں کی دسترس سے بالا اور عقل و خرد کی ترک تازیوں سے وراء الوراء ہے جسے "عالم غیب" سے موسوم کرتے ہیں اور جس کے لئے یہ ساری ظاہری کائنات ایک وسیلہ اور خادم ہے۔ اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کے سامنے تو یہ پوری مادی

کائنات بھی ایک ذرہ بے مقدار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے حصول اور جس کی تعمیر و آرائش کے لئے انبیاء کرام آتے رہے اور ان ابدی حقیقتوں کی تلقین کرتے رہے جن پر ہماری دائمی کامیابی اور حیات جاودانی کا دارو مدار ہے۔

تخلیق کائنات کا مقصد اور تسخیر کائنات کے خدائی تقاضے

دوسری اہم بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس پورے عالم آب و گل کو اس کے خالق نے بے مقصد اور سعی لاحاصل قرار نہیں دیا بلکہ زمین میں اپنے خلیفہ "حضرت انسان" کو اول روز سے علمی قوتوں سے مالا مال کیا۔ (وعلم آدم الاسماء کلھا) اور بار بار اس کائنات میں غور و فکر اور تدبر کرنے، اس کی حکمتوں کو سمجھنے، اس کے لامحدود خزانوں سے فائدہ اٹھا کر اسے عالم آخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی مسلسل دعوت دیتا چلا آرہا ہے اور بار بار اعلان کرتا ہے کہ عرش سے لے کر فرش تک سب کچھ تمہارے لئے پیدا کیا گیا کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کے ذرہ ذرہ کو خالق کائنات کی پہچان اور اس کی عظمتوں کے اعتراف کا ذریعہ بنا دو۔ اس کے چپہ چپہ میں تمہارے لئے عبرت و نصیحت کے دفتر پنہاں ہیں۔ اس کا ذرہ ذرہ تمہارے لئے راحت اور سامان تعیش کا ایک گنج گرانمایہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ یہ شمس و قمر یہ بحر و بر سب کچھ تمہارے لئے ہے اور یہ اس رب کریم کی نہایت کرم نوازی ہے کہ تمہارے اوپر ظاہری و باطنی نعمتوں کی اتنی بارش برساتا ہے جسے تم قیامت تک حساب بھی نہ کر سکو۔ یہی نہیں بلکہ خلق و قدر تخلیق اور ایجاد کے اس عمل میں ہر لحظہ ترقی، تسلسل اور اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے (یخلق مالا تعلمون) اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تم اس کی دی ہوئی نعمتوں سے خوب خوب فائدہ اٹھا کر اس کی عظمتوں میں ڈوب جاؤ۔ سراپا عبدیت اور بندگی بن جاؤ اور تمہارا رواں رواں اس کائنات میں تمہارے اشرف المخلوقات ہونے کی ایک واضح نشانی بن جائے۔

ثم تذکروا نعمۃ ربکم — پھر جب اس پر تمہارا تسلط ہو جائے

اذا استویتم علیہ وتقولوا	تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہدو
سبحان الذی سخر لنا ھذا	کہ پاک ذات ہے وہ جس نے اس کو
وما کنا لہٗ مقرنین وانآ الی	ہمارے بس میں کر دیا۔ بیشک ہمیں اپنے
ربنا لمنقلبون ۔	رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس مقصد کے لئے قرآن کریم مادیات کی تسخیر کے ساتھ ساتھ کہیں لعلکم تشکرون (تاکہ تم شکر کرو) کا اور کہیں لتکبروا اللہ علی ماھداکم۔ (تاکہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ان چیزوں کی ہدایت دی) جیسے کلمات ذکر کرتا ہے ۔

مذہب اور سائنس کے سرحدات اور سرچشمے :- اس وسیع کائنات کا صرف انسان کے لئے بنایا جانا اور اس میں تسخیر اور غلبہ کی لامحدود قوتیں ودلیعت فرمانا اور اوّل تا آخر غور و تدبر کی دعوت دینا خود بخود اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ موجودہ سائنس کا مقصد اگر عناصر اربعہ کے باہمی تحلیل وترکیب اور عناصر علوی وسفلی کے باہمی ربط وتعلق سے پردہ ہٹا کر انسان کے لئے اس سے استفادہ کرنے کی نئی نئی راہیں نکالنا ہے ـــ تو ایک سچے اور صحیح مذہب کے کسی گوشہ اور پہلو پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ مذہب کا براہ راست تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جو اس کائنات کے آغاز وانجام کی گتھیاں سلجھاتا اور ہدایت و اصلاح کے طریقے سمجھاتا ہے اور اس پوری کائنات کا مقصد تخلیق بتاتا ہے۔ مذہب کی حدود فرمانروائی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سائنس اور فلسفہ کی مملکت ختم اور اس کی قوت پرواز جواب دے دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سائنس اور طبیعات کا تعلق صرف عالم آب وگل اور کثیف عناصر سے ہے۔ خواہ اس کا ظہور کرۂ ارضی کی شکل میں ہو یا چاند اور سورج کی شکل میں، مگر مذہب کا دائرہ کار اور تعلق روحانیات اور الہیات ہیں۔ وہ ہمیں انسان کے گہرے مسائل، فطری حقائق نوامیس خداوندی، آخرت، حساب وکتاب اور قانون

مکافات عمل، زندگی کے انجام اور توحید و رسالت جیسے لطیف اور باقی و پائیدار امور سے واقف کراتا ہے۔ اول الذکر کے اصول و مبادی ہر وقت تغیر پذیر ہیں۔ اس کی تحقیق و انکشاف پر مبنی نتائج میں ہر لحظہ ترمیم و تبدیلی ہو سکتی ہے جبکہ مذہب کے اصول و مبادی اٹل اس کی سچائیاں ابدی اور اس کے علوم و نظریات کی صداقت لافانی اور ہر زمانہ اور ہر دور کے لئے ایک چیلنج ہوتی ہے۔ ایک کا سرچشمہ خدائے حی و قیوم کی دی ہوئی روشنی وحی و نبوت ہے۔ دوسرے کا مبلغ علم، عقل خام اور فہم ناقص ہے۔ فاین الثریا و این الثری۔

سائنس اور مذہب میں کوئی تصادم نہیں

پس زمین پر چلنے والے چوپایوں کا ہوا میں اڑنے والے پرندوں سے اور کسی ریل گاڑی کا سمندری جہاز سے تصادم اتنا تعجب خیز نہیں جتنی کہ یہ رائے قائم کر لینا کہ مذہب اور سائنس میں تصادم ہو سکتا ہے۔ اگر سائنس کی کوئی بات معاینۂ صحیح اور عقل سلیم پر مبنی ہے تو ناممکن ہے کہ مذہب کے کسی اصول سے اس کا ٹکراؤ ہو۔ اگر ایسی صورت حال کہیں پیدا ہو جائے تو وہ درحقیقت عقل کی ٹھوکر کا نتیجہ ہوگا۔ حقائق اشیاء کے ادراک میں ہمارے علم و فہم سے لغزش ہوئی ہوگی یا پھر ایک ایسی بات کا رشتہ ہم نے مذہب سے ملا دیا ہوگا جو نہ تو کسی صحیح سند اور مضبوط استدلال اور نقل صحیح پر مبنی ہوگا اور نہ اس کا رشتہ درحقیقت مذہب کی اوّلین تعلیمات سے ملا ہوگا —— اور یہ اس لئے کہ جس طرح ایک سچا مشاہدہ اور علمی دریافت قابل تسلیم ہے تو کسی قطعی اور متواتر دلیل پر مبنی مذہب کا کوئی اصول اس سے ہزار درجہ ناقابل تردید اور واجب التسلیم ہے۔ دونوں میں تعارض ناممکن ہے۔ دونوں کا دائرہ کار الگ الگ اور دونوں کی حدود اختیار جدا جدا ہیں۔

خدائی تعلیمات کا اصل موضوع

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت اور آسمانی تعلیمات وحی و رسالت

کا اوّلین مقصد صرف اور صرف انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی ہوتی ہے۔ نبی کی تعلیمات کا محور سچائی کی تلقین، بھلائی کی ہدایت، خلق کا خالق سے رشتہ ملانا، خدا کی دی ہوئی زندگی اور اس کائنات کا صحیح مصرف اور محل میں استعمال کرنا اور اس زندگی کو حیات جاودانی کا ذریعہ بنانا ہوتا ہے۔ وہ اگر آیات آفاقی و انفسی سے بحث کرتا ہے تو صرف اس لئے کہ اسے ذات وحدہٗ لاشریک کی پہچان کا ذریعہ بنایا جائے۔ وہ عالم آخرت و حیات بعد الموت کا ذکر چھیڑتا ہے تو سائنٹفک استدلال اور منطقی مقدمات سے اسے ثابت نہیں کرتا بلکہ روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے تکوینی امور و حقائق کی طرف توجہ دلا کر پوچھنا چاہتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ ممکن ہے تو مرنے کے بعد دوسری زندگی اور نبوت کی دیگر تعلیمات ماننے میں کیا استبعاد ہے؟ یا پھر صرف اس حد تک انہیں بیان کرتا ہے کہ کسی شرعی مسئلہ اور بندگی کے کسی طور طریقہ اور اس کے وقت اور مقدار سے اس کا تعلق ہو اصلاً یہ تعلیمات تعلیمات ہدایت ہو۔ حقائق اشیاء اور عناصر کی کنہ و ماہیت سے بحث کرنا اس کا موضوع نہیں ہوتا۔ چاند کے بارہ میں بار بار پوچھا گیا تو صرف یہی کہا گیا کہ قل ھی مواقیت للناس والحج کہ یہ تو حج اور دیگر امور کے اوقات کی نشاندہی کرتا ہے۔ آگے اس کی ماہیت اور حقیقت زمین سے اس کی مسافت اور اس کے قابل تسخیر ہونے یا نہ ہونے سے سکوت کیا گیا کہ وہ تو ہدایت کی کتاب تھی کیمیا نجوم، ہیئت اور ریاضی کی نہیں الغرض جن مسائل کا تعلق عالم غیب سے نہ تھا انہیں انسانی علم و فہم پر چھوڑ دیا گیا کہ یہ چیز بھی خدا کی دی ہوئی تھی اور یہ اس لئے کہ نہ تو ایسے مسائل پر مذہب کا اثبات موقوف تھا اور نہ مذہب ان مسائل سے انکار پر مجبور کرتا تھا۔

راہ اعتدال | پس اگر آج کوئی شخص علماء طبعیات کے کسی کارنامے سے مرعوب ہو کر دین سے انکار یا اس کا استخفاف کرتا ہے تو وہ اتنا ہی قابل مذمت ہے جتنا کہ وہ شخص جو ہر نئی دریافت اور مادی انکشاف کو اسلام سے متصادم سمجھ کر اس کے ماننے سے انکار کر بیٹھے۔ دونوں راہیں غلط اور عقلی بے مائیگی کی علامت ہیں۔

چاند کی تسخیر میں اسلام کا موقف

اس تفصیل کی روشنی میں چاند اور ستاروں کی تسخیر کا مسئلہ لیجئے۔ بلاشبہ قرآن و حدیث نے اس کے وقوع پذیر ہونے کی صاف، صریح اور محکم الفاظ میں نشاندہی نہیں کی کہ نہ تو یہ چیز اس کے موضوع میں داخل تھی اور نہ چودہ سو سال بعد تحقیق اور مشاہدہ پر مبنی کسی دریافت کی تمام تفصیلات اس وقت کے اذہان کے لئے قابل فہم تھیں۔ مگر کیا اسلام نے ان فتوحات کے متحقق اور وقوع ہونے کی نفی بھی کی ہے[1] اسلامی تعلیمات اور کتاب و سنت کی تصریحات میں، ہمیں کوئی بھی ایسی چیز نہیں مل سکتی جن سے ان چیزوں کی نفی ہوتی ہو یا اب تک کسی ثابت شدہ تحقیق سے اس کی تغلیط ہوتی ہو۔ چاند اور سورج یا دیگر سیاروں کا کسی خاص آسمان کی طرف نسبت یا آسمانوں میں اس کا جڑنا اور اس قسم کے کئی امور کے بارہ میں جو متضاد آراء اور مختلف نظریات مشہور ہیں۔ وہ سب کے سب فلسفہ یونان رومی علم الافلاک یا بطلیموسی علم ہیئت یا پھر اسرائیلی روایات بلکہ خود اب تک کے سائنسدانوں کے متضاد اقوال پر مبنی ہیں۔ صدیوں تک ان افکار و نظریات کا غلغلہ رہا اور مسلمانوں کے دو ایک مفسرین نے بھی اس سے متاثر ہو کر ان کا رشتہ تاویل کے طور پر کسی آیت سے جوڑ دیا تفسیر محکم کے طور پر ہرگز نہیں۔

نظام فلکی اور ائمہ سلف

پھر ان تفاسیر میں اگر بطلیموس اور فیثا غورث کی تحقیقات پر مبنی اقوال مل سکتے ہیں تو دوسری طرف عبداللہ بن عباس جیسے حبر الامت صحابی اور

---

[1] ۔ یہاں واضح اور غیر مبہم اخبار و اطلاع کی نفی ہے ورنہ علامات ساعۃ کے ضمن میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں تاویل کے درجہ میں عصری ایجادات کے لئے پیش گوئی قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس کی تعبیر میں اس وقت کی مخاطب دنیا کا محافظ رکھا گیا اور جو دن کے اجالے کی طرح ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے اس صادق و مصدوق کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں۔ "س"

عطاء بن ابی رباح جیسے ثقہ تابعی کے اقوال و روایات بھی موجود ہیں جن سے عصر حاضرہ کی موجودہ تحقیقات کی تائید ہو رہی ہے۔ ان حضرات کی روایات میں تصریح پائی جاتی ہے کہ نظام فلکی کے تمام سیارے شمس و قمر، زہرہ، عطارد سمیت آسمانوں کے نیچے لٹکے ہوئے فانوسوں کی مانند ہیں، یہاں تک کہ جن چیزوں کی تعبیر موجودہ اصطلاح میں مرکز ثقل کشش اور مدار میں گردش وغیرہ سے کی جاتی ہے۔ ان روایات میں انہیں نور کی زنجیروں، ڈھلکی ہوئی موج، جذب اور مدار وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو لوگ چاند اور ستاروں کو اسرائیلی روایات یا اپنی تاویلات کے بل بوتے پر آسمانوں کے اوپر یا ان کے بیچ میں انگوٹھی میں ہیرے اور تختی میں میخ کی مانند جڑا ہوا ثابت کرانا چاہتا ہے۔ محقق علماء اور مفسرین نے ان کی تردید کی ہے اور ان تاویلات کو بے دلیل اور ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ لا یعول علیھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو روح المعانی (ج ۷، ۱۸-۲۰) اور دیگر تفاسیر ــــــ قرآن کریم کی ظاہری عبارت اور سیاق و سباق بھی اس کی تائید کرتی ہے اور وہ آسمانوں کو ایک محفوظ چھت قرار دے کر اس چھت کو ستاروں سے روشن کرنے کا احسان جتلاتا ہے۔

آسمانوں کا وجود | رہا آسمانوں کا وجود تو بیشک قرآن و سنت بار بار اسے ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر ذکر کرتا ہے۔ ان کا وجود، ان کا تعدد، ان کا ذی جرم ہونا، ان میں دروازوں اور گزرگاہوں کا پایا جانا اور مختلف منازل اور برجوں پر ان کا تقسیم ہونا یہ سب کچھ صاف اور صریح الفاظ میں موجود ہے۔ مگر کائنات کی ان لامحدود وسعتوں کے ہوتے ہوئے جنہیں اجمالاً اشارہ کیا جا چکا ہے) کائنات کی ایک حقیر مقدار اور معمولی ذرہ کے برابر چاند اور سورج کی صورت میں کسی سیارہ تک رسائی ہو جانے سے یہ دعوے کرنا کہ آسمانوں کا وجود ہی نہیں علم و فہم اور عقل و خرد کی تضحیک اور رسوائی نہیں تو اور کیا ہے۔ کنویں کے مینڈک کی مثال شاید ایسے لوگوں سے بڑھ کر کسی اور پر کبھی صادق نہ آئی ہو۔ حال ہی میں ایک تازہ بیان کسی سائنسدان کا نظر سے گزرا تھا کہ دور دراز سیاروں سے آگے ایک لامحدود خلاء ہے جس کو پاٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ الغرض ایک چاند تو

کیا تمام سیارے بھی ہماری کمند میں آجائیں تو کسی اسلامی تحقیق اور آسمانوں کے وجود کے بارہ میں اسلام کے کسی دعویٰ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

اسلام نے کبھی بھی سائنسی اور مادی ترقیات سے نہیں روکا

کائنات کی ان لامحدود وسعتوں میں غیر اقوام کی ترک تازیوں کو دیکھ کر یورپ کی ذہنی غلامی میں مبتلا بہت سے لوگ اس میدان میں مسلمانوں کی پسماندگی کا الزام لے چارے اسلام کے سر تھوپنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ خود اس طبقہ کی ذہنی پستی اور فکری غلامی کا نتیجہ ہے جسے وہ بڑی عیاری اور چالاکی سے اب اس اسلام کا سر مونڈھنا چاہتے ہیں جس کے ساتھ وہ اپنا ذہنی وفکری اور عملی رشتہ صدیوں ہوئیں کاٹ چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام نے سائنسی اور مادی ترقی اور تسخیری کوششوں سے ہمیں کب روکا تھا؟ اسلام کی ترجمانی کرنے والے علماء اور راسخین نے کب آپ کا ہاتھ روکا ہے؟ اسلام ان بے مایہ ادیان اور مذاہب، عیسائیت اور پاپائیت جیسا نہ تھا کہ ان میں عصری تقاضوں اور سائنسی انقلاب کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی اور یورپی اقوام کو سائنسی انقلاب کے لئے اپنے مذاہب کے ہاتھوں آگ اور خون کے طوفانوں سے گزرنا پڑا بلکہ وہ ہر دور کے چیلنج کا مجسم جواب رہا اور قیامت تک رہے گا۔ پھر کیا ایک بھی مثال اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ سے پیش کی جا سکتی ہے کہ اس نے علم وتحقیق ایجاد واختراع اور مادی ترقی کو پابجولاں کر دیا ہو۔ یہ سیاہ تصویر اگر ہے تو یورپ کے کلیسائی نظام کی ہے اسلام کی نہیں۔

مسلمانوں کے تخلف کے اصل ذمہ دار

پس طبیعاتی علوم میں مسلمانوں کا تخلف اگر ہے تو اس کی ذمہ دار یورپ کی وہ اندھی تقلید ہے جو ہماری نظر انتخاب صرف وہاں کی فحاشی، عیاشی اور دیگر خرابیوں پر ہی ڈالتی ہے مگر علم وتحقیق اور سائنس کے میدان میں ہاتھ پاؤں توڑ کر اور کاسہ گدائی لے کر ہم صرف ان نوالوں کے چبا لینے اور اگلنے پر اکتفا کرتے ہیں جنہیں آقایان مغرب اگل کر ہمارے سامنے [illegible] ہیں۔ اگر [illegible] ہمیں ان ترقیات سے

روکتا ہے تو جن لوگوں نے صدیوں سے حاملین مذہب کو از کار رفتہ قرار دے کر مذہب کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے اور دو ڈھائی سو سال سے اپنی ساری فکری اور علمی قوتیں مغربی نظام تعلیم میں کھپا رہے ہیں۔ انہوں نے سائنس کے میدان میں کونسا تیر مارا ہے۔ اس میدان میں ان کی رسائی زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مغرب کے بنائے ہوئے اوزار اور ایجادات کا کچھ استعمال سیکھ سکیں تو درحقیقت ہماری پسماندگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے یورپ کے خراد پر اپنا مذہب، اپنا ورثہ اور اپنی فکری قوتیں بھی چڑھا دیں اور اس کے بدلے میں مغرب سے ایک ناقص اور جامد نظام تعلیم قبول کر لیا جس کے نتیجہ میں ہمیں سوائے ادنیٰ و اعلیٰ درجہ کے کلرکوں، مسترلوں اور اس کی تہذیب و معاشرت میں نقالی کرنے والے بہروپیوں کے اور کچھ نہ ملا۔ اس نظام تعلیم سے ہمیں ذہنی آوارگی یورپ کی مرعوبیت، مذہب سے گریز کی دولت تو مل گئی مگر ایجاد و اختراع، تحقیق اور دریافت کی کنجیاں انہوں نے اپنے پاس ہی رکھیں۔

تسخیری جدوجہد کے ہولناک نتائج

آخر میں اگر اعلیٰ انسانی اقدار کی روشنی میں امریکہ اور روس کے اس مقابلہ اور مسلسل جدوجہد کے محرکات و اسباب کا جائزہ لیں تو ہمیں اور بھی مایوسی ہو گی۔ ان تسخیری قوتوں سے انسان کی کونسی مشکلات ختم ہو جائیں گی اس کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا مگر اس سلسلہ میں اب تک جتنی ایجادات ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ان اقوام کی انسان دشمنی، حیوانیت اور درندگی کی وجہ سے ان میں سے اکثر انسان کی فلاح و بہبود کی بجائے اس کی ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ بنی ہیں۔ عالمی لڑائیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تسخیر قمر کی اس جدوجہد کی پشت پر بھی یقیناً یہی حیوانی جذبات کارفرما ہیں یہ لوگ ایک ایک تجربہ پر کئی کھرب روپے پھونک رہے ہیں مگر روئے زمین پر بسنے والے کروڑوں بھوکے ننگے سردی اور دھوپ میں جھلسنے والے اور جنگ کی بھٹیوں میں جلنے والے انسانوں کے امن و سکون اور بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لئے سائنس کے پاس وہ کونسا

تسخیر کیا ہے جسے اب ستاروں اور آسمانوں پر آزمایا جا رہا ہے۔ پھر اس دوڑ دھوپ کا مقصد ایک دوسرے
پر بالادستی اور برتری ہے تو اس وسیع اور لامحدود کائنات اور ریت کے ذرات کے برابر ستاروں
کے ہوتے ہوئے یہ مقابلہ اور ریس آخر کہاں جا کر ختم ہوگا؟ کوئی مانے یا نہ مانے مگر انسانیت کی
فلاح کامیابی اور امن و سکون کا حل صرف مذہب کے پاس تھا اور یورپ نے بڑی عیاری سے
اس کا رخ ایک نہ ختم ہونے والی مادی عیاشی کی طرف موڑ دیا ہے تا کہ جلد از جلد یہ عالم اپنے انجام
تک پہنچ جائے۔ گویا خدا کی دی ہوئی شہادت اب پوری ہوا ہی چاہتی ہے کہ اقتربت الساعۃ
والشق القمر اور قریب ہے کہ وقت موعود کسی بھی وقت انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔
لا یجلیہا لوقتہا الا ھو ثقلت فی السموات والارض لا تاتیکم الا بغتۃ۔
(جولائی ۱۹۶۹ء)

چاند تک انسان کی رسائی

چند شبہات کا ازالہ

چاند تک انسان کی رسائی کے بارہ میں دارالافتاء اور ماہنامہ الحق کے دفتر میں بیشمار خطوط موصول ہوئے، اس مسئلہ پر جولائی راگست ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں مفصل روشنی ڈالی گئی، بعض خطوط میں کچھ لوگوں نے اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے، دارالعلوم کے دارالافتاء نے اس مضمون میں ان شبہات کے ازالہ کی کوشش کی جسے ماہنامہ الحق نے شائع کیا تھا۔ اب یہاں بھی بغرض افادۂ عام شاملِ فتاوٰی کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

(الف) اولاً چند بنیادی باتیں عرض ہیں۔ واضح رہے کہ تمام اہلِ اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس سارے عالم کا بنانے والا صرف اللہ ہی ہے اور وہ اس عالم کے تمام ذرّات اور تمام ان قوتوں سے جو کہ عالم میں ودیعت کی گئی ہیں بخوبی عالم اور واقف ہے۔ پس جو حقائق اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بیان کیے ہیں ان میں غلطی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر سائنس اور وحی میں اگر تصادم محسوس ہو تو یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ سائنسدانوں نے پوری تحقیق نہیں کی ہے ورنہ ان کی صحیح تحقیقات وحی سے کبھی متصادم نہ ہوتیں کیونکہ وحی اور سائنس (جو واقعات پر مبنی ہو) میں مخالفت اور تصادم ناممکن ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے وحی اس مقصد کے لیے نازل کی ہے کہ انسان کو تعلق مع اللہ کے حصول کے طریقے معلوم ہوں اور مرضیاتِ الٰہی غیر مرضیات سے ممتاز ہوں، وحی الٰہی کا مقصد اسلحہ سازی اور کارخانہ سازی نہیں ہے اور نہ قرآنِ کریم تاریخ یا جغرافیہ کا صحیفہ ہے، ان مقاصد کی تحصیل کے لیے نعمتِ خداداد دیعتی عقل کا استعمال ضرورت کے وقت کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحی میں ایسے حقائق کی طرف کوئی تعرض نہیں کیا جاتا ہے جن کا نزولِ وحی کے مقصد کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

(ج) عقلیات اور اسرائیلیات کے ساتھ اسلامی رویہ یہی چلا آیا ہے کہ ان میں سے جو امور وحی سے مخالف ہوں ان کی تکذیب کی جائے گی، اور جو مخالف نہ ہوں تو وہ دو قسم ہیں، ایک یہ کہ مشاہدہ یا دلیل سے ان کا ثبوت ہوا ہو تو ان کی تصدیق کی جائے گی، دوسرا یہ کہ مشاہدہ یا دلیل سے ان کا ثبوت نہ ہوا ہو تو ان کی نہ تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب۔

(د) قرآن اور حدیث سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ کفار آسمان میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لاتفتح لہم ابواب السماء، مکذبین اور کفار کے لیے (ان کے اعمال اور ارواح اور اجساد کے لیے) آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے (سورۃ الاعراف ع ۵) لیکن آسمان تک جانے سے ممنوع نہیں ہیں، اور نہ آسمان تک جانا مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے (ومن ادعیٰ فعلیہ البیان) بلکہ شیاطین اور جنات کا آسمان تک چڑھنا اور آسمان کو چھونا نص قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا۔ (سورۃ جن) لہٰذا جو اشیاء آسمان سے نیچے ہیں کفار کے لیے ان پر چڑھنا ممنوع نہیں ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

(ھ) چاند کے متعلق حکماء یونان (سائنسدان) کا خیال اور عقیدہ تھا کہ چاند پہلے آسمان کے ثخن میں مرکوز ہے اور بہت سے اہل اسلام بھی ان سے موافقت کرتے تھے، اس بناء پر کہ یہ عقیدہ نصوص سے متعارض نہیں تھا، اس لیے کہ قرآن و حدیث میں چاند کے متعلق صاف طور پر نہیں کہا گیا تھا کہ چاند آسمان کے ثخن میں مرکوز ہے اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ جان آسمان و زمین کے درمیان فضاء میں ہے کیونکہ قرآن کے مقصد نزول کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، بیشک قرآن مجید میں چاند کے متعلق "فی" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا۔ وقال اللہ تعالیٰ، جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا۔ وقال اللہ تعالیٰ: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ، مگر کلمہ "فی" کا مدلول ظرفیت ہے نہ کہ مرکوزیت، یعنی "فی" کا مدلول یہ ہے کہ اس کا مدخول کسی چیز کے لیے زمان یا مکان ہوگا، اور یہ معنیٰ نہیں ہے کہ اس کے مدخول میں کوئی چیز مرکوز ہوگی۔ زید فی الدار، فی المسجد، فی السوق، فی الجنۃ سے یہ مراد نہیں ہے کہ زید ان اشیاء میں مرکوز ہے۔ (و ھذا مما لا یخفی علیٰ من تفکر فی الاستعمال) نہ یہ لغت کا تقاضا ہے نہ عرف کا۔ اور مزید برآں یہ کہ ظرفیت سے ہمیشہ کے لیے یہ مراد نہیں ہوتا ہے کہ کلمہ "فی" کا مدخول نفس الامر اور حقیقت میں ظرف ہوگا

بلکہ بسا اوقات اس سے مراد بادی اور ظاہری نظر میں ظرفیت ہوتی ہے، خصوصاً ایسے مقام میں جہاں عام اذہان کے لیے حقیقت کے سمجھنے میں مشکلات پیش ہونے کا خطرہ ہو۔ اور یہ معنی بھی فصیح اور بلیغ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وجدها تغرب فی عین حمئة. (ذوالقرنین نے سورج کو ایک گدلے تالاب میں ڈوبتے پایا) اس کا مقصد بھی یہی ظاہری نظر میں آنا ہے نہ کہ حقیقت میں ایسا تھا۔ تو اس تحقیق کی بناء پر یہ گنجائش بھی نکلی کہ چاند کا فی السماء ہونا بادی اور ظاہری نظر میں ہو۔

(و) یہاں یہ بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ فلک اور سماء بعض مفسرین کے نزدیک ایک ہی چیز کے نام ہیں، لیکن تحقیق یہ ہے کہ فلک مدار کو کہا جاتا ہے نہ کہ آسمان کو۔ (قال العلامة الآلوسیؒ فی تفسیرہ ج ۱۷ ص ۴۲) والفلک فی الاصل کل شئ دائر ومنه فلکة المغزل والمراد به هنا علی ما روی عن ابن عباس والسدی رضی اللہ تعالیٰ عنهم السماء وقال اکثر المفسرین هو موج مکفوف تحت السماء یجری فیه الشمس والقمر وقال الضحاک هو لیس بجسم وانما هو مدار هذه النجوم۔ انتهیٰ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ "بیان القرآن" میں فرماتے ہیں: فلک گول چیز کو کہتے ہیں، چونکہ شمس و قمر کی حرکت مستدیر ہے اس لیے اس کے مدار کو فلک فرما دیا، خواہ وہ آسمان ہو یا فضاء بین السمائین ہو یا فضاء بین الارض والسماء ہو یا ثخن سماء ہو، کوئی نص اس میں قطعی نہیں اور اور سلف سے تفسیریں مختلف منقول ہیں۔ کما فی الدر المنثور۔ اس لیے اس کو مبہم ہی رکھنا اقرب الی الاحتیاط ہے۔ (سورۃ الانبیاء ع ۳)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ فلک اور سماء الگ الگ چیزیں ہیں، نیز اس کی بھی تائید ہوئی کہ شمس و قمر آسمان کے ثخن میں یقینی طور پر مرکوز نہیں ہیں۔

(ز) نجوم (تاروں) کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت فرماتے ہیں: ان النجوم قنادیل معلقة بین السماء والارض بسلاسل من نور بایدی ملئکة من نور۔ (روح المعانی جلد ۳ ص ۵۰) یعنی ستارے آسمان اور زمین کے درمیان ہیں اور آسمان کے ثخن میں مرکوز نہیں ہیں ـــــ مزید فرماتے ہیں: لم یقم دلیل علی ان شیئاً من الکواکب مغروق فی شئ من السمٰوٰت کالفص فی الخاتم۔ (روح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۵)

حالانکہ ان کے متعلق اللہ فرماتا ہے: تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا۔ (سورۃ الفرقان ع ۶) اور بروج سے مراد نجوم اور تارے ہیں۔ (فی التحقیق وهو منقول عن السلف) اور فرماتے ہیں،

وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ۔ (سورۃ الملک ۵) توجس طرح نجوم کے متعلق کلمہ" فی" استعمال ہوا اور ان کو زینت سماء کہا گیا ہے، اور باوجود اس کے کہ یہ آسمان میں مرکوز نہیں بلکہ بادی اور ظاہری نظر پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔ اسی طرح چاند کے متعلق بھی کہا جائے گا بلکہ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ زمین اور آسمان دونوں گول ہیں تو اسی تقدیر پر چاند اور سورج بلکہ زمین تمام کے تمام پر یہ اطلاق بلا ریب صحیح ہے کہ یہ چیزیں آسمان اور آسمانوں میں ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مسلمانوں کے لیے چاند اور سورج بلکہ آسمان پر اترنا ممکن ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں کی طرف مافوق الاسباب چڑھنا اس امکان کی واضح دلیل ہے کیونکہ اس حکم کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ بیشک امریکہ وغیرہ کے کفار کے لیے ناممکن ہے کہ وہ آسمان میں داخل ہو جائیں لیکن جو چیزیں آسمان سے نیچے ہیں اُن پر اُترنا کفار کے لیے ناممکن اور ممنوع نہیں ہے۔ پس اگر چاند آسمان سے نیچے ہو جیسا کہ یہ اکثر مفسرین کی رائے ہے تو کفار کے لیے اس پر اُترنے میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ باقی رہا امریکہ کا یہ دعوٰی کہ:۔

(۱) اس نے چاند پر انسان اتارا ہے، تو اس کے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ ایسے دعوؤں کا وحی کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔

(۲) آلات اور رصد گاہوں کے ذریعہ سے اس کا مشاہدہ ہوا ہے۔

(۳) روس وغیرہ جو کہ امریکہ کے مخالف ہیں انہوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔

(۴) نیز شریعت میں کفار کے دنیوی اخبارات پر اعتماد کرنا جائز ہے بلکہ اس میں دینی مصالح بھی موجود ہیں خصوصاً رفع عیسٰیؑ اور واقعہ معراج کا ذہن نشین ہونا اور کفار پر اتمام حجت ہونا اور انکار کی صورت میں قرآن مجید کی تکذیب کا خطرہ ہے، خصوصاً جبکہ عام سروس شروع ہو جائے لہٰذا اس کو تسلیم کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ اس سے حکمتِ یونانی کو سخت صدمہ پہنچا کیونکہ اس کا یہ اعتقاد کہ چاند آسمان کے ثخن میں مرکوز ہے غلط ثابت ہوگیا۔

چند شبہات کا ازالہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے) اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان علویات پر نہیں اتر سکتا ہے ورنہ عیسٰی علیہ السلام وغیرہ کس طرح آسمان پر ٹھکانا رکھتے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ عام طور پر انسان زمین پر ٹھکانا رکھے گا کیونکہ دنیوی زندگی کی ضروریات کا یہاں انتظام ہوا ہے، لہٰذا یہ ممکن

ہے کہ بعض افراد (مافوق الاسباب یا ماتحت الاسباب) خلاف عادت علویات پر اتر جائیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ (اس زمین میں تم کو لوٹا دیں گے) اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ انسان خلائی پرواز نہیں کر سکتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی وقت ضرور زمین میں لوٹایا جائے، خواہ موت کے ساتھ متصل ہو یا حشر سے پہلے ہو۔

(۳) وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ (محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے) تو اس سے مراد لمس اور آسمان تک چڑھنے سے حفاظت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد آسمان کے حالات سے خبرداری سے حفاظت ہے یا آسمان کے باشندوں کے اختلاط سے۔

(صرح بہ الآلوسی فی تفسیر ج ۱۴ ص ۲۳)

(۴) شہاب ثاقب کا حملہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ شیاطین استماع کرنے لگتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَصَدًا۔ اور قرآن حکیم سے یہ معلوم نہیں کہ صرف چڑھنے سے یہ حملہ شروع ہوتا ہے، لہٰذا کفار کی آسمان تک رسائی میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

باب الفرق الاسلامیۃ وغیرھا

(اسلامی اور کفریہ فرقوں کے احکام ومسائل)

اہل السنۃ والجماعۃ کی تعریف

سوال:- جناب مفتی صاحب! اہل السنۃ والجماعۃ کا مصداق کون لوگ ہیں اوران کی کیا تعریف ہے؟

الجواب:- اہل السنۃ والجماعۃ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عقائد واحکام میں قرآن و سُنّت کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرامؓ کے مسلک کو اپنانے اوران کے اقوال پر عمل کرتے ہیں۔

لما قال العلامۃ ظفراحمد العثمانیؒ: اہلِ سنت وجماعت وہ مسلمان ہیں جو عقائد واحکام میں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک پر ہوں اور قرآن کے ساتھ سُنتِ نبویہ کو بھی حُجت مانتے اوراس پر عمل کرتے ہوں۔ قال فی شرح العقائد النسفیۃ: فبھت الجبائی وترک الاشعری مذھبہ فاشتغل ھو ومن تبعہ بابطال رأی المعتزلۃ واثبات ماورد بہ السنۃ ومضی علیہ الجماعۃ۔ (امداد الاحکام ج ۱ ص ۱۶۹ کتاب الایمان والعقائد)

ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی اوراس کی جماعت حزب اللہ کا شرعی حکم

سوال:- جناب مولانا صاحب! میں بسلسلہ روزگار کراچی میں مقیم ہوں، یہاں ایک نیا فرقہ "حزب اللہ" کے نام سے وجود میں آیا ہے جس کا بانی ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی نام کا کوئی شخص ہے، اس فرقہ کے لوگ بڑی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں، مثلاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو کافر کہتے ہیں، عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، توسل بالاعمال وبالذوات اور عذابِ قبر وغیرہ کے منکر ہیں، تقلید مذاہب اربعہ کو شرک کہتے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری باتیں وعقائد ان لوگوں کے ایسے ہیں جو ہم نے آج تک اپنے علماء سے نہیں سُنی ہیں۔ تو اس فرقہ کے بانی اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ نیز ان لوگوں کے ساتھ عقدِ مناکحت اور دیگر سماجی تعلقات رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی بانیٔ جماعت حزب اللہ سوال میں مذکور عقائد کے علاوہ بھی بہت سارے خلافِ شرع عقائد کا قائل اور داعی ہے، امتِ مسلمہ میں فتنہ اور فساد

پیدا کرنے والا شخص ہے، اس کے شائع شدہ رسائل میں امتِ مسلمہ کے متفقہ اور اجماعی عقائد سے فرار اور ایک نئے دین کی بنیاد رکھنا پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شخص مسلمانوں کی تکفیر میں بھی از حد جلد باز ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے مشائخ اور محدثین علماء کرام کو بھی معاف نہیں کرتا، اس لیے ڈاکٹر عثمانی اور اس کے متبعین ضال (گمراہ) اور مضل (گمراہ کرنے والے) ہیں، انکے ساتھ رشتہ ناطہ کے علاوہ بھی کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے اور ان لوگوں کی صحبت سے اجتناب کیا جائے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے متبعین کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! حضرات علماء دیوبند محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ لوگ کافر ہیں یا مسلمان؟

الجواب :- محمد بن عبدالوہاب النجدی ایک متشدد قسم کا مذہبی آدمی تھا اور اس کے پیروکار بھی اس کے نظریات کی روشنی میں لوگوں کی تکفیر میں بہت جلد بازی سے کام لیتے ہیں، حضرات علماء دیوبند اس کے عقائد اور نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے اور نہ اسکی اور اس کے پیروکاروں کی تکفیر کے قائل ہیں، عوام الناس کو اس کے عقائد و نظریات سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة انور شاہ الکشمیریؒ : اما محمد بن عبدالوھاب النجدی فانہ کان رجلاً بلیداً قلیل العلم فکان یتسارع الی الحکم بالکفر ولا ینبغی ان یقتحم فی ھٰذا الوادی الا من یکون مستیقظاً متقنا عارفا بوجوہ الکفر واسبابہ۔
(فیض الباری ج ا ص۱۷۱ کتاب العلم، باب من جعل الخ) [1]

---

[1] قال العلامۃ خلیل احمد السھارنفوریؒ : الحکم عندنا فیھم ما قال صاحب الدر المختار وخوارج ھم قوم لھم منعۃ خرجوا علیہ بتاویل یرون انہ علی باطل کفر او معصیۃ توجب قتالہ بتاویلھم یستحلون دماءنا و اموالنا ویسبون نساءنا الی ان قال وحکمھم حکم البغاۃ ثم قال وانما لم نکفرھم لکونہ عن تاویل وان کان باطلاً۔
{ المھند علی المفند ص۴۶
السوال الثانی عشر }

فرقۂ نیچریہ کا عقیدہ

سوال:۔ فرقۂ نیچریہ کے پیشوا سرسید احمد خان کو کافر کہنا درست ہے یا نہیں؟ نیز اس کے اور اس کے ہمنواؤں کے عقائد قرآن و حدیث اور اجماعِ اُمت کے موافق ہیں یا مخالف؟ عوام میں یہ بڑا قابلِ قدر تصور کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کی جدوجہد کی بدولت ملی ہے، اس بارہ میں علماء حق کی کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ ایک شخص کے عقائد و نظریات اس کی تحریر کردہ کتابوں اور دیگر لٹریچر سے معلوم ہو سکتے ہیں جن میں وہ اپنے عقیدہ اور نظریہ کا کھلے لفظوں میں ذکر کرتا ہے، فرقۂ نیچریہ کا رئیس سرسید احمد خان اور اس کے ہم خیال لوگوں کے عقائد و نظریات خود ان کی تحریر کردہ کتابوں میں مذکور ہیں، ان میں بعض تو صراحتًا قرآن و حدیث اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہیں اور بعض بدعت و ضلالت ہیں، بطورِ مثال چند وہ عقائد جو صراحتًا شریعتِ محمدیؐ کے متضاد ہیں ذکر کئے جاتے ہیں:۔ انکارِ حقیقتِ ملائکہ و شیاطین و شجرۃ الجنۃ، عذابِ قبر کا انکار، وجودِ جنت و جہنم کا انکار، قیامت، حشر و نشر اسی طرح عذاب و ثواب اور حور و غلمان کا انکار، معجزہ و کرامت کا انکار، خمر و خنزیر کا حلال سمجھنا وغیرہ ذالک۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے عقائد ہیں جو اجماعِ امت کے متصادم ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "امداد الفتاوٰی" میں اس فرقۂ مُحدثہ کے تمام اقوال و عقائد پر مفصل بحث کی ہے اور ان کے تمام عقائدِ باطلہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں مردود اور قرآن و حدیث کے خلاف قرار دیا ہے اور بہت سے علماء دین کے فتاوٰی جو اس کے کفر و ارتداد پر مبنی تھے نقل کیے لیکن خود بوجہ ادعاءِ اسلام کے کفر کا فتوٰی نہیں دیا البتہ یہ فرمایا کہ (سرسید) اعلیٰ درجہ کا ضال و مُضل اور مبتدع ضرور ہے لہٰذا ایسا شخص جس کے عقائد قرآن و حدیث کے مخالف ہوں ہرگز مسلمانوں کا خیر خواہ اور ان کی آزادی کا فکر مند نہیں بن سکتا ہے بلکہ یہ عوام کالانعام کی لاعلمی اور خوش عقیدتی ہے کہ اس کو اپنا خیر خواہ مانتے ہیں۔

قال اللہ تبارک و تعالیٰ: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۱۳۶)

وقال اللہ تعالیٰ ایضًا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۶)

وقال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث جبریل : وسوالہ للنبیّ صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان . فقال ان تؤمن باللہ و ملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاٰخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ ۔ (رواہ البخاری فی صحیحہ کتاب الایمان باب ۳۷)

[ومسلم فی صحیحہ کتاب الایمان . باب ۱-۲ ۔ وابوداؤد کتاب السنۃ باب ۱۵-۱۶ ۔ والنسائی کتاب الاشربۃ / باب ۴۸ ۔ وابن ماجۃ مقدمۃ / باب ۹ ۔]

فہٰذہ الاصول التی اتفقت علیہا الانبیاء والرسل صلوٰت اللہ علیہم ولم یؤمن بہا حقیقۃ الایمان الاتباع الرسل ۔[1]

---

[1] وقال اللہ تبارک وتعالیٰ : اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۔ (سورۃ المؤمن آیت ۴۶)

وقال وَحُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۔ (سورۃ الدھر آیت ۱۹) ۔ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِى الْخِيَامِ ۔ (سورۃ الرحمٰن آیت ۷۲)

وقال العلّامۃ مُلا علی القاری رحمہ اللہ : والجنّۃ والنار حق مخلوقتان الیوم لا تفنیان ابدًا ...... وفی شرحہ وفی نسخۃ ولا تموت الحور العین ابدًا ولا یفنی عتاب اللہ ولا ثوابہ سرمدًا ۔۔ وقال الامام الاعظم فی کتاب الوصیۃ ".....والجنۃ والنار حق وھما مخلوقتان ولا فناء لہما ولا اھلہما لقولہ تعالیٰ فی حق اھل الجنۃ : "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ" وفی حق اھل النار "اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ" خلقہما للثواب والعقاب ۔ وقال ایضًا : فی الوصیۃ واھل الجنۃ فی الجنۃ خالدون واھل النار فی النار خالدون ۔ لقولہ تعالیٰ فی حق المؤمنین اولٰئک اصحاب الجنۃ ھم فیہا خٰلدون و فی حق الکفار اولٰئک اصحاب النار ھم فیہا خالدون ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۲۳ بحث حوض النبی صلی اللہ علیہ وسلم حق والجنۃ والنار مخلوقتان الیوم) ۔

ومثلہ فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص۴۲۶ ان اللہ خلق للجنۃ اھلًا ۔

پرویزی فرقہ کے عقائد و نظریات

سوال:- ایک شخص پرویزی عقائد و نظریات کا معتقد ہے اور پرویزیت کی نشر و اشاعت کرتا ہے نیز اس مذہب کے اثبات اور حقانیت پر لوگوں کے ساتھ بحث مباحثہ کرتا ہے، ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس کی نماز جنازہ میں مسلمانوں کو شرکت کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- پرویزی اصل میں منکرین حدیث کہلاتا ہے، اس فرقہ کے پیروکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کو غیر معتبر کہتے ہیں، دراصل یہ فرقہ بظاہر اسلام کا نام لے کر اسلامی تعلیمات کی بیخ کنی میں مصروفِ عمل ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کا بیشتر حصہ احادیثِ نبوی پر مشتمل ہے اور احادیث مبارکہ قرآنِ پاک کے مطلب اور مراد کے لیے مظہر اور مبیّن ہے احادیثِ مبارکہ کی حُجیّت چونکہ قرآنِ پاک ہی سے ثابت ہے اس لیے احادیثِ نبویہ کا انکار کرنا قرآنِ پاک کے اِنکار کے مترادف ہے، لہٰذا اس قسم کا عقیدہ رکھنا دینِ محمدی کے خلاف ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کرنا، ان کے جنازہ وغیرہ میں شرکت کرنا جائز نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود ۱۱۳)

قال اللہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (سورۃ الجمعۃ آیت ۲)

قال ابوعبداللہ محمد بن یوسف فی تفسیر هذه الآیة: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ هو القرآن والمعنی انه یفهم ویلقی الیهم معانیه والحکمة الشریعة وبیان الاحکام وقال قتادة الحکمة السنة وبیان النبی الشرائع الیٰ غیر ذلك۔ (البحر المحیط ج ۸ ص ۲۹۳،۲۹۲ وبهامشه الحکمة وهی السنة التی لم تکن فی الکتب)۔

قال اللہ تعالیٰ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ۝ (سورۃ النجم ۳) [1]

---

[1] لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القرآن و مثله معه الا یوشك رجل شبعان علیٰ اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه و ما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ الخ (رواه ابو داؤد بحواله مشکوٰۃ ص ۲۹ باب الاعتصام الخ)

و مثله فی المرقاۃ شرح المشکوٰۃ مفصلاً ج ۱ ص ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

گستاخِ رسول سلمان رُشدی کی سزا کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل سلمان رُشدی کی مخالفت میں اس کی بدنام زمانہ کتاب "شیطانی آیات" کی وجہ سے عالم اسلام خصوصاً پاک و ہند اور ایران میں مظاہرے جاری ہیں، ان مظاہروں کے دوران ایک عالم دین نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ (سلمان رشدی) مُرتد ہے اور اس کی سزا قتل ہے، اور شاتم النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قتل چونکہ حداً ہے لہٰذا بعد از توبہ بھی قتل کیا جائے گا، اس بارہ میں وضاحت فرمادیں؟

الجواب:- جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالیہ میں گالی بکے تو بلاشک و شبہ وہ کافر و مرتد ہو جاتا ہے، اگر اپنے فعلِ شنیع پر مُصر رہے تو اس کی سزا قتل ہے البتہ اگر صدقِ دل سے توبہ کرے کہ آئندہ ایسی بکواس نہیں بکوں گا تو محققین علماء کے نزدیک اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے لیکن صاحب بزازیہ اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک ایسے شخص کو حداً قتل کیا جائے گا خواہ توبہ کرے یا نہ کرے، تاہم ایسا شخص جس کی خباثت پورے عالم اسلام میں پھیل رہی ہو اور اسے رہا کرنے کی صورت میں دوسروں کو بھی جرأت ملتی ہو تو ایسے گستاخ کے ناپاک وجود کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔

لما قال العلامة ابن بزاز الكردريؒ: الا اذا سب الرسول عليه السلام او واحداً من الانبياء عليهم السلام فانه يقتل حداً ولا توبة له اصلاً سواء بعد القدرة عليه والشهادة او جاء تائباً من قبل نفسه كالزنديق لانه حد وجب فلا يسقط بالتوبة كسائر حقوق الآدميين۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۲۱ الثالث فيما يتعلق بالانبياء) [1]

---

[1] وقال العلامة الحصكفيؒ: والكافر بسبب النبي من الانبياء فانه يقتل حداً ولا يقبل توبته مطلقاً، ولو سب الله تعالى قبلت لانه حق الله والاول حق عبد لا يزول بالتوبة ومن شك في عذابه وكفره كفر۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۲۳۱ باب المرتد)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۴-۳ ص ۳۸۶ كتاب الفاظ الكفر ويتصل بهذا۔

فرقۂ آغاخانی کے عقائد ونظریات

سوال:- فرقۂ اسماعیلیہ آغاخانی جو پرنس عبدالکریم آغاخان کو اپنا مقتدا اور پیشوا مانتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس فرقہ کے لوگ مؤمن ہیں یا کافر؟

الجواب:- فرقہ اسماعیلیہ آغاخانی کے تمام عقائد ونظریات قرآن وحدیث کے بالکل خلاف اور متصادم ہیں، اسی طرح اُن کے فروعی مسائل صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا طریقہ بھی اسلامی تعلیمات سے یکسر مخالف ہے، ان لوگوں نے اپنا مذہب خود ہی ایجاد کیا ہے، ان کا کوئی بھی مسئلہ (اصولی ہو یا فروعی) اسلامی تعلیمات کے ساتھ موافق نہیں ہے، یہ لوگ انتہائی گمراہ کن عقائد رکھتے ہیں، مثلاً آغاخانی امام کی تصویر کی پرستش، تسمیہ کے موقع پر بجائے بسم اللہ کے لفظ "ادم" ذکر کرنا، نماز، ذکر اذکار اور دعا کا طریقہ بھی بڑا عجیب ہے، ان کا سلام "یا علی مدد" اور سلام کا جواب مولا علی مدد، کلمہ شہادت اُشہد اَنّ علیّ اللہ ہے، وضو کو یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے کہتے ہیں کہ ہمارے دل کا وضو ہے اور روزہ کان، زبان اور آنکھ کا ہوتا ہے کھانے پینے سے نہیں ٹوٹتا، زکوٰۃ کی بجائے دو آنہ جماعت خانہ کو دیتے ہیں، حج ان کا اپنے حاضر امام کا دیدار کرنا ہے، یہ سب امور موجب کفر اور لغویات ہیں، اسلامی تعلیمات جو ہمیں ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم دیکر گئے اُن کے ساتھ ذرہ بھر بھی ان عقائد کا واسطہ نہیں ہے لہٰذا یہ فرقہ اسلام سے کوسوں دور کفر وارتداد کی شدید ظلمات میں گھرا ہوا ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: والكفر لغة الستر وشرعًا تكذيبه صلى الله عليه وسلم في شيء مما جاء به من الدين ضرورة والفاظه تعرف في الفتاوى۔
(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۲۲۳ باب المرتد) [1]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: قوله تكذيبه صلى الله عليه وسلم المراد بالتكذيب عدم التصديق الذي اى عدم الاذعان والقبول لما علم مجيئه به صلى الله عليه وسلم ضرورة اى علماً ضروريا لا يتوقف على نظر واستدلال وليس المراد التصريح بانه كاذب في كذا لان مجرد نسبة الكذب اليه صلى الله عليه وسلم كفر وظاهر كلامه تخصيص الكفر بجحد الضروري فقط مع ان الشرط عندنا ثبوته على وجه القطع وان لم يكن ضروريا۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۳ باب المرتد، قبيل مطلب في منكر الاجماع)
ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۱۱۹ باب احكام المرتدين۔

شیعہ کے کفر اور اسلام کی تحقیق

سوال:۔ کیا شیعہ عقائد ونظریات رکھنے والے لوگ مسلمان ہیں یا کافر؟ نیز ان کے ساتھ میل جول اور تعلقات قائم کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعہ کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ کے عقائد ونظریات ایک دوسرے سے جُدا ہیں، اسی وجہ سے ان کی تکفیر میں سلفاً خلفاً اختلاف چلا آرہا ہے، البتہ ان میں سے جو فرقہ ضروریاتِ دین کا منکر ہو اس کی تکفیر میں کسی کو اختلاف نہیں۔ مثلاً جو گروہ سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زنا کی تہمت کا قائل ہے یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت اور خلافت کا منکر ہے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہے اور ان کو نبی آخر الزمان تسلیم کرکے حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق وحی لانے میں غلطی کا معتقد ہے یا قرآن کریم میں تغیّر وتبدّل کا قائل ہے تو اس فرقے کے کفر میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اس سے تعلقات رکھنا، اٹھنا بیٹھنا، رشتہ ناطہ قائم کرنا، ان کے جنازہ وغیرہ میں شرکت کرنا ناجائز ہے۔ اور اس کے علاوہ عقیدہ رکھنے والے گروہ مبتدع ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: لا شك في تكفير من قذف السيدة عائشة رضي الله عنها او انكر صحبة الصديق رضي الله عنه او اعتقد الالوهية في علي رضي الله عنه او ان جبرئيل عليه السلام غلط في الوحي او نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقرآن۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۳۷ باب المرتد) [1]

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: واكفار الروافض في قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وبتنسخ الارواح وانتقال روح الاله الى الائمة وان الائمة الهة وفي قولهم بخروج امام ناطق بالحق وانقطاع الامر والنهي الى ان يخرج ويقولهم ان جبرئيل عليه السلام غلط في الوحي الى محمد صلى الله عليه وسلم دون علي رضي الله عنه واحكام هؤلاء احكام المرتدين ومن انكر خلافة ابي بكر رضي الله عنه فهو كافر في الصحيح ومنكر خلافة عمر رضي الله عنه فهو كافر في الاصح ويجب اكفار الخوارج في اكفارهم جميع الامة سواهم ويجب اكفارهم باكفار عثمان وعلي وطلحة والزبير وعائشة رضي الله عنهم۔ (البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۱۸ باب احكام المرتدين)

ومثله في الهندية ج۲ ص۲۶۴ الباب التاسع في احكام المرتدين۔

فرقۂ اثناء عشریہ کی ختم نبوت کے متعلق تاویل فاسدہ

سوال: شیعہ فرقہ اثناء عشریہ جو کہ بارہ اماموں کو مانتا ہے اوران کے بارہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ مامور من اللہ، مفترض الطاعۃ اور معصوم عن الخطاء ہوتے ہوتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک بنیادی عقیدہ اور اصولِ دین میں سے ہے۔ کیا یہ عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے منافی تو نہیں؟

الجواب: شیعوں کے مختلف فرقے ہیں، ان میں سے بعض صراحتاً ضروریاتِ دین کا انکار کرتے ہیں وہ تو کافر و مرتد ہیں، اور بعض اپنے کفر و ضلالت کو چھپانے کے لیے کسی امر اجماعی (ماثبت فی الدین بالضرورۃ) کی "تاویل بعید کرتے ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع امت کے خلاف ہوتی ہے، تو ایسے لوگ زندیق کہلاتے ہیں اور ان کا کفر زیادہ قریب الی الشر ہوتا ہے۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کی "تاویل بعید کرکے کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تو ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی کا نام نہیں دیا جائے گا اور نبوت بایں معنیٰ کہ کسی انسان کا مخلوق کی طرف مبعوث ہونا جس کی اطاعت مخلوق پر فرض ہو، معصوم من الذنوب ہو، یہ صفات تمام کی تمام ائمہ اثنا عشرہ میں موجود اور باقی ہیں، لہٰذا اس قسم کی تاویلات کرنے والا جو قرآن و حدیث اور اجماع امت کے مخالف ہو زندیق اور اس کا دم هدر ہے۔

لما قال الشاہ ولی اللہ بن عبد الرحیمؒ: اوقال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبوۃ ولکن معنیٰ ھذہ الکلام انہ لایجوز ان یسمی بعدہ احد بالنبی واما معنی النبوۃ وھو کون الانسان مبعوثاً من اللہ الی الخلق مفترض الطاعۃ معصوم من الذنوب ومن البقاء علی الخطاء فی مایریٰ فھو موجود فی الائمۃ بعدہ فذلک الزندیق وقد اتفق جماھیر الحنفیۃ والشافعیۃ علیٰ قتل من یجری ھذا المجریٰ۔

(مسویٰ علی المؤطا ج ۲ ص۱۰۹ مطبوعہ دھلی)[1]

---

[1] قال العلامۃ التفتازانیؒ: وان کان مع اعترافہ بنبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واظہار شرائع الاسلام یبطن عقائد ھی کفر بالاتفاق خص باسم الزندیق۔ (شرح المقاصد ج ۲ ص۲۶۸)
ومثلہ فی ردّ المحتار ج ۴ ص۲۴۱ باب المرتد۔

شیعہ کے بعض کفریہ عقائد

سوال: ۔اگر کوئی شخص حضرت علیؓ کی الوہیت، جبریل امین کا غلطی کرنا اور دیگر تمام امور کو امام مہدی کے ظہور تک معطل سمجھنے کا عقیدہ رکھے تو ازروئے شریعت اس شخص پر کیا حکم لگایا جاسکتا ہے ؟

الجواب: ۔ مندرجہ بالا عقائد مکمل طور پر صریح شرک اور کفر پر مبنی ہیں، جو شخص یا گروہ ان عقائد کا حامل ہو تو اجماعِ اُمت سے وہ دائرہ اسلام سے خارج اور مرتد ہے ان کے ساتھ مسلمانوں سا سلوک نہیں کرنا چاہیئے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: نعم لا شك فی تکفیر من قذف السیدة عائشةؓ او انکر الصحبة الصدیقؓ او اعتقد الوهیة فی علی او ان جبریل غلط فی الوحی۔

(ردالمحتار ج۳ ص۲۳۷ باب المرتد)[1]

بہائی مذہب اختیار کرنا کفر ہے

سوال: ۔ ایک شخص نے اسلام چھوڑ کر بہائی مذہب اختیار کر لیا ہے اور اس کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہے، دلائل سے وضاحت فرمائیں کہ دینِ اسلام چھوڑ کر بہائی مذہب اختیار کرنے سے آدمی مُرتد ہوجاتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔ فرقۂ بہائیہ چونکہ ضروریاتِ دین کا منکر ہے، مثلاً روزِ قیامت، دخولِ جنت و جہنم سے انکار، اللہ تعالیٰ کا کسی کے جسم میں حلول کرنے کا اعتقاد رکھنا، ختمِ نبوت سے انکار، میراث میں مرد و عورت کی مساوات، عدت سے انکار وغیرہ، یہ تمام عقائد ضروریاتِ دین میں ہیں اور پوری امتِ مسلمہ کا ان پر اجماع ہے لہٰذا ان میں سے کسی ایک سے انکار کرنا یا کسی کے جسم میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ رکھنا موجبِ کفر اور ارتداد ہے، اسلام میں داخل ہونے کے لیے کل ما ثبت بالضرورۃ کا یقین اور اقرار کرنا ضروری ہے، کسی ایک حقیقت کا انکار بھی موجبِ کفر بن سکتا ہے، اس لیے بہائی مذہب اختیار کرنے والا کافر مرتد ہے

---

[1] قال العلامة ملا علی القاریؒ: لو استحل السب والقتل فهو کافر لا محالة..... ففی شرح العقائد سب الصحابة والطعن فیهم ان کان مما یخالف الادلة القطعیة فکفر کقذف عائشة رضی الله عنها۔

(شرح الفقه الاکبر ص۴۲ الکبیرة لا تخرج المؤمن عن الایمان)

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۱۸ باب احکام المرتدین۔

خارج عن الاسلام ہے ۔

لما قال العلامة مُلا علی القاریؒ : فا لتحقیق ان الایمان هو تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالقلب فی جمیع ما علم بالضرورة مجیئہ بہ من عند اللّٰہ اجمالاً...... ثم المراد من المعلوم ضرورة کونہ من الدین بحیث یعلم العامة من غیر افتقار الی النظر والاستدلال کوحدة الصانع ووجوب الصلوٰة وحرمة الخمر ونحوھا وانما قید بھا لان منکر الاجتھادات لایکفر اجماعًا واما من یؤول النصوص الواردة فی حشر الاجساد وحدوث العالم وعلم الباری بالجزئیات فانہ یکفر لما علم قطعًا من الدین انھا علی ظواهرھا۔ الخ (شرح الفقہ الاکبر ص۸۶ الایمان هو الاقرار والتصدیق)

ختمِ نبوت کے وقت کے تعین کی تحقیق | **سوال :- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کس وقت سے تسلیم کرنا چاہیئے؟ ولادت کے بعد سے یا نبوت ملنے کے بعد سے یا بعد الوفات؟ مقصد یہ ہے کہ وحی کا دروازہ کس وقت سے بند تصور کیا جائے؟**

الجواب :- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائے امر سے ہی خاتم النبیین ہیں ، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس منصب مبارک کے لیے ازل سے ہی منتخب فرما دیا تھا۔ مشکوٰۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہؓ کرام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپؐ کو نبوت کب ملی ، ارشاد فرمایا" جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت بھی نہیں ہوئی تھی ۔" البتہ عالم اجساد میں آپ سب انبیاء کے بعد آئے اور جب عمر مبارک چالیس برس ہوئی تو نبوت ملی اور وحی کا نزول شروع ہوا، آپؐ کوئی شریعت

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ : المراد بالتکذیب عدم التصدیق الذی مرّ ای عدم الاذعان والقبول بما علم مجیئہ بہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورة ای علماً ضروریاً لایتوقف علی نظر واستدلال ولیس المراد التصریح بانہ کاذب فی کذا لان مجرد نسبة الکذب الیہ صلی اللہ علیہ وسلم کفر وظاھر کلامہ تخصیص الکفر بجحد الضروری فقط مع ان الشرط عند نا ثبوتہ علی وجہ القطع وان لم یکن ضروریاً۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۲۳ باب احکام المرتد)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۲۲۳ باب احکام المرتد۔

اور نئی کتاب ملی جو تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں کے لیے ناسخ بنا دی گئی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو آپ کی شریعت کو منسوخ کر دے، تاہم نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں اور قیامت کے نزول فرمائیں گے اور شریعتِ محمدی کا احیاء اور اس کی اتباع کریں گے، اور احادیثِ صحیحہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؑ پر وحی بھی آئے گی لیکن یہ وحی شریعتِ مصطفےٰ کو بدلنے کے لیے نہ ہوگی بلکہ اس وقت کے ضروری امور کے متعلق ہوگی، گویا انقطاعِ وحی سے مراد وہ وحی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کرے۔

لما ورد فی الحدیث : قال ابوھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ : قالوا یارسول اللّٰہ متٰی وجبت لک النبوۃ قال وآدم بین الروح والجسد۔ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ص۵۱۳ باب فضائل سید المرسلین صلی اللّٰہ علیہ وسلم، الفصل الثانی)

قال العلامۃ ملا علی القاری ؒ فی شرح ھٰذا الحدیث : وجبت لی النبوۃ والحال ان آدم بین الروح والجسد یعنی وانہ مطروح علی الارض بلا روح والمعنیٰ انہ قبل تعلق روحہ بجسدہ .... وروی ابونعیم فی الدلائل وغیرہ من حدیث ابی ھریرۃ ؓ مرفوعاً کنت اول النبیین فی الخلق وآخرھم فی البعث (مرقاۃ المصابیح ج ۱۱ ص۵۸)

وقال العلامۃ جلال الدین سیوطی رحمہ اللّٰہ : فبینما ھو کذٰلک اوحی اللّٰہ الی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام انی قد اخرجت عباداً لی لا یدان لاحد بقتالھم فحرز عبادی الی الطور ویبعث اللّٰہ یاجوج وماجوج (الحدیث) ..... فذٰلک صریح من انہ وحی حقیقی لا وحی الھام ان ماتوھمہ ھٰذا الزاعم من تعذر الوحی الحقیقی فاسد لان عیسیٰ علیہ السلام نبی فای مانع من نزول الوحی علیہ ؟ فان تخیل لقسہ ان عیسیٰ علیہ السلام قد ذھب عنہ وصف النبوۃ فھٰذا قول یقارب الکفر لان النبی لا یذھب عنہ وصف النبوۃ ابداً حتیٰ بعد موتہ وان تخیل اختصاص الوحی للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بزمن دون زمن فھو قول لا دلیل علیہ ویبطلہ ثبوت الدلیل علیٰ خلافہ۔ (نزول عیسیٰ بن مریم آخر الزمان ص۴۸-۵۲) [1]

---

[1] ومثلہٗ فی اشعۃ اللمعات ج ۴ ص۴۹۹ باب فضائل سید المرسلین صلی اللّٰہ علیہ وسلم

قادیانیوں کا کفر قرآن وحدیث کی روشنی میں

سوال :- قادیانی جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ احمدی سچا مذہب ہے باقی سب مذاہب باطل ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ واقعی احمدی سچا مذہب ہے اور قرآن وحدیث کے موافق ہے یا مخالف؟ بصورت دیگر ان کے ساتھ میل جول، رشتہ ناطہ کرنا کرانا کیسا ہے؟

الجواب :- تمام امت مسلمہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، نزول عیسیٰ ابن مریم سے انکار نہیں اسلیئے کہ ان کی نبوت اور پیغمبری آپ سے پہلے تھی لہٰذا اُن کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں نازل ہونا آپ کی ختم نبوت پر اثر انداز نہیں ہوگا، بہر حال ختم نبوت کا عقیدہ تمام امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، ایسے مسلّمہ عقائد سے انکار کرنے والا کافر ومرتد ہے، اسلام اور مسلمانوں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، اور مرزا غلام احمد قادیانی کے تمام دعوے نصوص قرآنیہ اور احادیث صحیحہ کی رُو سے بالکل جھوٹ اور بکواس پر مبنی ہیں لہٰذا اس کے ان جھوٹے دعووں کی بنیاد پر اس کے ماننے والے کافر اور مرتد ہیں۔ جب ایک مسلمان کو یہ معلوم ہوجائے کہ ایک شخص قادیانی ہے اور سمجھانے بجھانے پر بھی وہ باز نہیں آتا تو اس کے ساتھ اسلامی طریقہ پر علیک سلیک اور اٹھنا بیٹھنا جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (هود ۱۱۳) جمہور علماء اسلام جب قادیانی عقائد ونظریات پر مطلع ہوئے تو سب نے ان کے کفر وارتداد کے فتوے دیئے جن کی بناء پر وہ لوگ جو باوجود ان عقائد کے معلوم ہونے کے قادیانیوں کو مسلمان سمجھیں (خواہ وہ مرزا قادیانی کو نبی مانتے ہوں یا مسیح ظلّی یا بروزی) بہر حال کافر اور مرتد ہیں۔ مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو "تکفیر قادیانی" نامی رسالہ کا مطالعہ کریں جس میں سینکڑوں معتمد علیہ علماء کے دستخط ثبت ہیں۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ : مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ه (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰) [1]

[1] قال العلامة الحافظ ابن کثیرؒ تحت قوله وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ فهذه الآية نص فی انه لا نبی بعده واذا کان لا نبی بعده فلا رسول بعده بالطریق الاولیٰ والاخریٰ لان مقام الرسالة اخص من مقام النبوة۔ فان کل رسول نبی ولا ینعکس وبذلك وردت الاحادیث المتواترة عن رسول اللہ من حدیث جماعة من الصحابة۔ (تفسیر القرآن العظیم ج ۳ ص ۴۹۳)

ومثله فی الجامع لاحکام القرآن۔ جلد ۱۴ ص ۱۲۷ سورۃ الاحزاب۔

قادیانیوں کے دلائل اور ان کے جوابات

سوال :- ایک شخص حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے ثبوت اور حقانیت کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتا ہے :-

قادیانی کے دلائل : مَاكَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)

ہمارا عقیدہ :- واضح ہو کہ یہ قرآنِ پاک کی آیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کے کُل یا جُزء سے انکار کرنا ہمارے نزدیک موجبِ کفر ہے، پس ہم جماعتِ احمدیہ والے سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیّین تسلیم کرتے ہیں اور جو آپؐ کو خاتم النبیّین نہ مانے وہ ہمارے نزدیک مسلمان ہی نہیں ۔ لیکن لفظ خاتم کا حقیقی معنیٰ و مفہوم سمجھنا ضروری ہے، یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی بھی لُغت میں لفظ ختم مقامِ درج میں آکر خاتم کا معنیٰ بند کرنے والا یا روکنے والا نہیں ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کا محاورہ یا عرب کا مقولہ یا کسی عرب شاعر کا کوئی شعر تمام عربی لٹریچر میں موجود نہیں اور نہ ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی عربی کتاب میں خاتم کا لفظ بند کرنے اور روکنے کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا ہے، چنانچہ لُغات کی چند مشہور کتابیں ملاحظہ ہوں :-

لفظ	معنیٰ	نام کتاب لُغت
۱۔ خاتم	نگینہ، مُہر، جس پر نام وغیرہ کندہ کئے جاتے ہیں ۔	لسان العرب، تاج العروس، صحاح قاموس جوہری۔
۲۔ خاتم	انگشتری: مثل خاتم الذھب یعنی سونے کی انگوٹھی	” ، ” ، ”
۳۔ خاتم	گھوڑے کے جو تھوڑی سی سفیدی ہوتی ہے	قاموس ، تاج العروس ، منتہی الادب
۴۔ خاتم	گھوڑی کے تھنوں کے پاس کا حلقہ بھی خاتم کہلاتا ہے	” ، ” ، ”
۵۔ خاتم	گدی کے نیچے جو گڑھا ہوتا ہے اس کو بھی خاتم کہتے ہیں	” ، ” ، ”
۶۔ خاتم	مُہر کا نقش جو کاغذ پر اتر آتا ہے	لسان العرب وغیرہ
۷۔ خاتم النبین	نبیوں کی زینت اور رونق	مجمع البحرین جلد ۱

(۱) اسی طرح ملا علی قاریؒ "موضوعاتِ کبیر ص۴۹" میں خاتم النبیین کا معنی کرتے ہیں کہ آنحضرتﷺ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو آپؐ کے دین کو منسوخ کرے اور آپؐ کی اُمت سے نہ ہو۔

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبیوں کے ختم ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے شارع نبی بنا کر بھیجے۔

(۳) "مجمع البحار" مصنفہ شیخ محمد طاہرؒ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ یہ تو کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں لیکن یہ نہ کہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔

(۴) "تفسیر صافی" میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اے علیؓ! میں خاتم الانبیاء ہوں اور تُو خاتم الاولیاء ہے۔ تو کیا اس سے مراد یہ لیا جائے کہ حضرت علیؓ کے بعد کوئی ولی نہیں ہوگا؟

(۵) "دیلمیؒ" کی حدیث ہے کہ میں فقراء المؤمنین کے ساتھ سب سے پہلے جنت میں جاؤں گا اور میں اپنے سے پہلے اور بعد کے سب نبیوں کا سردار ہوں۔

(۶) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کو خاتم المہاجرین کہا ہے، تو کیا حضرت عباسؓ کے بعد کسی نے ہجرت نہیں کی؟

(۷) سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم بمعنی مُہر کے ہیں اور مُہر کا کام تصدیق کرنا ہے۔ ایک سرکاری ملازم اس لیے مہر لگاتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ رقم یا تنخواہ میں نے وصول کی ہے نہ کہ کسی اور نے۔

(۸) ایک عدالت کا حاکم اس لیے مہر لگاتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نوشتہ یا پروانہ میرے علم اور حکم سے جاری ہوا ہے۔

(۹) ایک بادشاہ اس لیے مہر لگاتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ فرمان یا تحریر میرے علم اور حکم سے لکھا یا جاری ہوا۔

(۱۰) ایک ڈاکخانہ خط پر اس لیے مہر لگاتا ہے کہ تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خط فلاں مقام سے فلاں تاریخ اور وقت پر روانہ ہوا یا پہنچا۔

(۱۱) ایک اپیل نویس اپنی مہر اس واسطے لگاتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ وثیقہ کی

عبارت میری تحریر کردہ ہے۔

(۱۲) کسی پارسل، لونل یا بند خط پر مہر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ یہ چیزیں میں نے بند کی ہیں اگر مہر سلامت نہ رہے تو اس کے اندر کی چیز کے سلامت ہونے کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔

(۱۳) کسی مہر کے واسطہ یہ ضروری ہے کہ وہ کسی تحریر کے لازماً آخر میں ہو، خواہ آغاز پر خواہ انجام پر، مراد اس سے مہر کنندہ کی تصدیق ہوتی ہے نہ کہ اس تحریر کا بند ہونا اور بند کرنا۔

یہ تو قادیانی کے دلائل تھے، آپ حضرات سے استدعا ہے کہ ان دلائل کے دندان شکن جوابات تحریر فرما کر اس نو پید فتنہ کا قلع قمع کرنے میں تعاون فرمائیں۔

الجواب:۔ تمام امتِ مسلمہ کا یہ اجماعی اور متفق علیہ عقیدہ ہے کہ حضور سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا سوائے حضرت عیسٰی ابن مریم علیہ السلام کے، وہ قربِ قیامت میں آسمانوں سے نزول فرمائیں گے اور دینِ محمدی کی احیاء اور تجدید کریں گے اور شریعتِ محمدی کے تابع ہوں گے۔ باقی قادیانی بدبخت اس اجماعی عقیدہ کو چھوڑ کر لفظِ خاتم کے غیر مرادی اور غیر معتبر معانی کے پیچھے لگ گئے اور خاتم النبیین کا جو اجماعی معنیٰ ہے جس پر تمام امت کا اتفاق ہے، جو آنحضرت ؐ نے خود سمجھایا اور صحابہؓ کرام نے سمجھا تھا اور امت کے تمام محققین، محدثین، مفسرین، ائمہ کرام اور علماء حق کا اسی پر اتفاق ہے، لیکن بدبخت قادیانیوں نے ان کا سمجھا ہوا معنیٰ جھٹلایا اور خود اپنے من گھڑت معنیٰ کو معتبر قرار دیا۔

قال اللہ تعالیٰ: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلَا اُمَّةَ بَعْدِيْ ـــــ یہ کئی احادیث کا مجموعہ ہے اور یہ مضمون کئی احادیث میں وارد ہوا ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم ج ۳ ص ۴۹۳) ـ لَا نفی جنس ہے، جب یہ اپنے مدخول پر آجاتا ہے تو اس کا بیخ نکال جاتا ہے، یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کا معنیٰ نبیوں کا خاتمہ کرنے کا لیا، اسی لیے فرمایا لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ الخ کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، نہ تشریعی نہ ظلی نہ بروزی ـــــ مگر قادیانی بدبختوں علیہم ما علیہم نے خاتم النبیین سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لیا ہوا معنیٰ چھوڑ کر اور خود بھی لغت کے تمام

معنوں کو چھوڑ کر صرف تصدیق اور مہر کا معنیٰ لیا جو تمام کے لیے ہوئے معنیٰ سے مخالف اور متضاد ہے۔

ملا علی قاریؒ نے جو "موضوعات کبیر" میں آیت خاتم النبیین کا معنیٰ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ایسا نہیں آئے گا جو آپؐ کے دین کو منسوخ کردے اور آپؐ کی امت سے نہ ہو۔ تو یہ حضرت عیسٰی بن مریمؑ کی طرف اشارہ ہے کہ آئیں گے مگر شرعی نبی نہیں بلکہ آنحضرتؐ کے دین کے حامی بن کر آئیں گے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا قول "تفہیمات الکبیر" میں بھی بالکل ٹھیک ہے قادیانی اس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ وہ بھرتے نبی کے آنے کے قائل ہیں۔

ضروری انتباہ:- قادیانیوں کی تحریرات میں سب دھوکہ ہے، سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ سے بے دینی کی طرف مائل کرتے ہیں، خاتم النبیین اور ختم نبوت کے اجماعی عقیدہ کے یہ لوگ منکر ہیں، لوگوں میں خود کو مسلمان ظاہر کرنے اور عوام الناس کو اپنے دام میں پھنسانے کے لیے اس قسم کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں تاکہ ان سادہ لوح لوگوں کو دھوکہ دے سکیں، ان کے پلید مذہب کی حقیقت خود ان کی اپنی تحریر کردہ کتابوں سے واضح ہوتی ہے، اگر آپ قادیانی مذہب کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنا چاہیں تو مندرجہ ذیل کتابیں منگوا کر مطالعہ کریں تاکہ ایمان بھی تازہ ہو اور دین و ایمان کے ڈاکوؤں کے فریب سے بھی نجات ملے۔ (۱) عشرۂ کاملہ (۲) ختم نبوت (۳) تحقیق الظفر والایمان بآیات القرآن (۴) دعاوی مرزا (۵) مسیح موعود کی پہچان (۶) قادیانیوں کے کفر پر علماء اسلام کا فتوٰی۔ یہ کتابیں طبع شدہ ہیں اور عام ملتی ہیں، کسی بھی مشہور کتب خانہ سے منگوا کر ضرور مطالعہ کریں۔

لفظ خاتم کی لغوی تحقیق :- خاتم کا معنیٰ لغت کی رُو سے: (۱) مراح ص۲۸۸ میں ہے "ختم کردن، مہر کردن، ختمت الشی فھو مختوم، ختم شدہ و تمام گردانیدن یقال خَتَمَ اللّٰہُ لَہٗ بِالْخَیْرِ، اتمام خواندن قرآن، اختتام بپایان بردن، نقیض الافتتاح، خاتم بفتح التاء و کسرہا، ختام با لتاء خاتام بالالف انگشتری جمع خواتیم، خاتم الشیٔ آخرہٗ، و محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء بالفتح صلوٰۃ اللہ علیہ و علیہم اجمعین: گلے و موم مہر کنندہ و قولہٗ تعالیٰ: خِتَامُہٗ مِسْکٌ" (۲) اور غیاث ص۱۵۳ پر: ختام بکسر موم و مک وغیرہ کہ بران مہر کنندہ (۳) المنجد ص۱۶۵ الختم ما یختم بہ الختام الطین او کل ما یختم بہ علی الشیٔ

جمع ختم الختم کل مایتختم بہ الخاتم جمع خواتیم، الخاتم مایتختم بہٖ وعاقبت کل شیٔ، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے۔ (۴) مفردات القرآن للامام راغب اصفہانی ص۱۴۲ پر ہے: وخاتم النبیین لانہٗ ختم النبوۃ ای تممہا بمجیئہٖ۔

مذکورہ بالاحوالہ جات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ خاتم ختم کرنے اور منتہی الشیٔ کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور خبیث قادیانی کے دھوکہ کو دیکھو کہ یہ لفظ کہیں بھی ختم کرنے اور انتہاء و اختتام الشیٔ کے معنیٰ میں نہیں لایا، خاص کر امام راغب اصفہانیؒ کی صرح کے الفاظ۔ المنجد کا مصنف تو عیسائی ہے مسلمان نہیں، اس عیسائی کے الفاظ دیکھیں کہتا ہے عاقبت کل الشیٔ، اور یہ معنیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے اگر بالفرض کسی لغت میں لفظ خاتم بمعنیٰ ختم کرنے والا نہ بھی ہو تب بھی ہمارے مُدعا اور اجماعی عقیدہ پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ہمارے نزدیک لُغات کی کتابیں معتبر ہی نہیں ہیں اور نہ ہم اپنے مدعا کے ثبوت کے لیے ان سے استدلال کرنے کے پابند ہیں، بلکہ ہمارا یہ دعویٰ قرآنِ پاک کے قطعی اور یقینی نصوص، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے، قرآن و حدیث کو چھوڑ کر لغات کی کتابوں سے استدلال کرنے والا حد درجہ کا زندیق اور ملحد ہے، اسلام سے کوسوں دور ارتداد کی شدید ظلمات میں پڑا ہوا ہے، اسلامی حکومت پر واجب کہ جو شخص قادیانی مذہب اختیار کرے تو عدم رجوع کی صورت میں اُسے سزائے موت دے۔

قال اللہ تعالیٰ: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۱)

قال الحافظ ابن کثیرؒ: تحت ہٰذہ الآیۃ فہٰذہ الآیۃ نص فی انہٗ لانبی بعدہٗ واذا کان لانبی بعدہ فلا رسول بعدہ بالطریق الاُولیٰ والاخریٰ لان مقام الرسالۃ اخص من مقام النبوۃ فان کل رسول نبی ولا ینعکس وبذٰلک وردہ الاحادیث المتواترۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدیث جماعۃ من الصحابۃ۔ (تفسیر القرآن العظیم ج۳ ص۴۸۳) [۱]

[۱] قال العلامۃ القرطبیؒ: قال ابن عطیۃ ہٰذہ الالفاظ عند جماعۃ علماء الامۃ خلفاً وسلفاً متلقاۃ علی العموم التام مقتضیۃ نصاً انہٗ لانبی بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(احکام القرآن ج۱۴ ص۱۹۶ سورۃ الاحزاب)

مرزائیوں کالاہوری فرقہ بھی کافر ہے

سوال :۔ مرزائیوں کا لاہوری فرقہ جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتا اور بظاہر اس کے نبی ہونے سے برأت کا اظہار کرتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا، اسی طرح یہ فرقہ حضرت عیسیٰؑ کے رفع الی السماء کا بھی منکر ہے۔ کیا یہ عقیدہ رکھنے والے لوگ مسلمان ہیں یا قادیانی مرزائیوں کی طرح کافر و مرتد ؟

الجواب :۔ مرزائیوں کا لاہوری فرقہ اگرچہ مرزا غلام احمد قادیانی کے نبی اور غیر نبی ہونے میں متردد ہے لیکن دیگر عقائد قطعیہ مثلاً حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا بغیر باپ پیدا ہونے سے انکار، اسی طرح ان کے رفع الی السماء سے بھی انکار (کمانا صرح بہ محمد علی لاہوری فی تفسیر بیان القرآن جلد ا ص۳۱۳) یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یوسف نجار کا بیٹا ماننا، اس قسم کا عقیدہ رکھنا قرآنی آیات، صحیح احادیث اور اجماع امت کے خلاف ہے لہٰذا مرزائیوں کا یہ (لاہوری) فرقہ بھی اپنی تاویلات فاسدہ کی وجہ سے مسلمان نہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

قال اللہ تعالیٰ حکایۃ عن مریم : قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (سورۃ مریم آیت ۱۸ تا ۲۱)

وقال اللہ تعالیٰ : وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ ۝ (سورۃ التحریم آیت ۱۲) [1]

---

[1] وقال ابو عبد اللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ فی تفسیرہ : وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ای بنکاح وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ ای زانیۃ وذکرت ھذا تاکیدًا لاقولھا لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ۔ یشمل الحلال والحرام...... وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً ای دلالۃ علیٰ عجیبۃ۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱۱ ص۹۱ سورۃ مریم)

وَمِثْلُهٗ فی التفسیر القرآن العظیم ج ۳ ص۱۸۷ سورۃ مریم۔

لاہوری مرزائی بھی کافر اور خارج اسلام ہیں

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ کل مؤرخہ ۸ ستمبر ۱۹ ء بوقت ۴/۱ ۲ بجے دن سابق امام مسجد ووکنگ مسجد محمد طفیل متعلقہ مرزائی لاہوری فرقہ کی ساس کا جنازہ مسجد ہذا میں لایا گیا اور یہاں کے سرکاری امام خواجہ قمر الدین جو کہ اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت ظاہر کرتے ہیں، مرزائی سابق امام محمد طفیل کی اقتداء میں نماز جنازہ ادا کی، جبکہ چند معززین نے ان کی اس حرکت کا محاسبہ کیا تو خواجہ قمر الدین سرکاری امام ووکنگ مسجد نے یہ دلیل پیش کی کہ میں نے اس لیے جنازہ میں شرکت کی ہے کیونکہ مرزا محمد طفیل بسا اوقات میرے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے ہیں، اور دوسری دلیل یہ پیش کی کہ میں لاہوری مرزائیوں کو کافر نہیں سمجھتا کیونکہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو صرف مجدد تسلیم کرتے ہیں اور ہم کو کافر نہیں سمجھتے، لہٰذا آپ مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسے شخص کے متعلق شرعی فتویٰ سے کماحقہ مطلع فرمائیں۔

عینی شاہدوں کے دستخط مندرجہ ذیل ہیں

الجواب :- مرزا غلام احمد قادیانی بوجہ اپنے دعاویٔ باطلہ کے قرآن وسنت کی واضح اور بدیہی نصوص اور اجماع امت کی بناء پر قطعی کافر اور مرتد ہے، انہی وجوہات کی وجہ سے مرزا کے ایسے معتقدات کو اپنانے والے یا اس کی اتباع کرنے والے یا اس کی تصدیق وتائید یا کسی طرح تاویل کرنے والے بھی قطعی کافر اور مرتد ہیں۔

متنبی کذاب مرزا قادیانی کے مرنے کے بعد ان کے متبعین کی ایک جماعت نے (جو لاہوری مرزائی جماعت کہلاتی ہے اور جس کی قیادت مولوی محمد علی لاہوری نے کی) مرزا کے واضح بدیہی اور غیر مبہم دعاوی کے باوجود اس کی تکفیر کرنے کی بجائے (جو ہر مسلمان کا لازمی عقیدہ ہونا چاہیے) ایسے تمام دعاوی اور اقوالِ کفریہ کی تاویل شروع کر دی جبکہ وہ خود اپنے دعوؤں میں پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں نبی ہوں تشریعی بھی اور غیر تشریعی بھی، سارے انبیاء بشمول حضور خاتم النبیین ؐ پر اپنی برتری کا دعویٰ کرتا رہا، اپنے منکر تمام مسلمانوں کو جہنمی اور کافر قرار دیتا رہا، مگر مولوی محمد علی لاہوری اور اس کی پارٹی نے مرزا صاحب کو کافر سمجھنے کی بجائے چودہویں صدی کا مجدد اعظم، مصلح اکبر اور اس سے بڑھ کر مسیح موعود تک مانا۔ (ملاحظہ ہو اس کی تفسیر بیان القرآن حصہ اول ص ۲۱۷، ریویو آف ریلیجز جلد ۵ ص ۱۷۱، جلد ۱۲ ص ۴۶۵ وغیرہ) اس نے اپنی تفسیر میں بیشمار مقامات پر تحریف معنوی اور ایسے تلاعب سے کام لیا جو کہ الحاد کا دروازہ کھولتا ہے، پھر نبوت مرزا سے

انکار اور مصلح و مجدد کہنے کا بھی راستہ جان بوجھ کر نفاق و تلبیس اور مسلمانوں کو فریب دینے کیلئے اختیار کیا گیا ورنہ درحقیقت لاہوری اور قادیانی ہر دو پارٹیوں کے معتقدات میں کوئی فرق نہیں۔ ملاحظہ ہو پیغام صلح ۷ ستمبر ۱۹۱۳ء جو کہ لاہوری پارٹی کا ترجمان ہے اس میں مرزا قادیانی کو رسول ماننے کا اعلان موجود ہے۔ اپنے رسالہ ریویو جلد ۳ صفحہ ۱۱، صفحہ ۲۱۱ میں مرزا کو نہ صرف رسول اللہ اور نبی بلکہ سارے رسولوں سے افضل کہا۔ بہرحال اگر حقیقت حال یہ ہوتی کہ وہ مرزا کو صرف مصلح و مجدد سمجھتے تب بھی ان کی تکفیر میں کوئی پس و پیش نہ ہوتی۔ برصغیر کے محقق علماء خصوصاً علامہ سید انور شاہ کشمیری نے اس فریب و نفاق کا پردہ بھی قطعی دلائل سے چاک کیا اور لاہوری گروپ کی تکفیر ہی کے ضمن میں "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس میں واضح فرمایا کہ قطعی یقینی اور متواتر عقائد اور ضروریات دین میں تاویل و تحریف وانکار قطعی کفر ہے اگرچہ ایسا کرنے والا خود اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اپنے کو اہل قبلہ میں سے سمجھے اور سارے ارکان اسلام عبادات وغیرہ بھی ادا کیوں نہ کرے۔

مسلمانوں کیلئے تو مرزائیوں کا لاہوری فرقہ قادیانی اور ربوائی جماعت سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے کہ عام مسلمان انہیں نمازوں وغیرہ میں شرکت کرتے دیکھ کر ان پر حسن ظن کر لیتے ہیں اور بالآخر ان کے مکائد اور خباثت کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانی مرزا قادیانی کے محامد اور محاسن سن کر اس کے بارہ میں بھی خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں جو ضیاع دین و ایمان بن کر رہ جاتا ہے۔

الحاصل لاہوری مرزائی بھی قادیانی مرزائیوں کی طرح قطعی کافر ہیں، نہ تو کسی مسلمان کے پیچھے ان کا نماز پڑھنا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل بن سکتا ہے نہ ان کا یہ کہنا کہ ہم تو مسلمانوں کو کافر نہیں سمجھتے! اور اب تو قادیانیوں کی ربوہ جماعت کے امام نے بھی از راہ تقیہ مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب دینے کی خاطر اپنے متبعین کو مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور معاشرتی و سماجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دیدی ہے، کیا ان کا اس طرح کرنے سے وہ مسلمان کہلا سکیں گے؟ اگر مرزائی ہم مسلمانوں کو کافر نہ بھی کہیں تو کیا وہ دائرہ کفر سے نکل سکیں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ جب تک وہ مرزا کے بارے میں اپنے کفریہ عقائد سے رجوع نہ کرلیں اسلام انہیں کافر، مرتد، واجب القتل اور جہنمی قرار دے گا۔ آپ نے اپنے سوال میں جس شخص (سرکاری امام خوا یہ قمر الدین) کا ذکر کیا ہے اگر اس نے غلط فہمی اور لاعلمی کی وجہ سے لاہوری مرزائی کی اقتداء کی یا اسے مسلمان سمجھتا رہا تو اسے نادم اور تائب ہو کر اپنے موقف سے رجوع کرنا چاہیئے، اور اگر اب بھی وہ لاہوری مرزائیوں کے بارہ میں اپنی رائے پر مصر ہے تو اسے منصب امامت سے ہٹانا اور معزول کرانا ضروری ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

شیعہ مذہب اختیار کرنے سے نکاح پر اثرات

سوال :- ایک لڑکے نے اپنے آپ کو سُنی ظاہر کر کے ایک سُنی المسلک خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی جبکہ حقیقت میں وہ شیعہ مذہب اور شیعیت کا ہمخیال ہے، اور اب بیوی کو بھی شیعہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن لڑکی شیعہ مذہب اختیار کرنے پر رضامند نہیں اور نہ وہ اس کے پاس آباد رہنے کے لیے تیار ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعتِ محمدی کی رو سے شیعہ مذہب اختیار کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں ؟ اور ایک سُنی المسلک خاتون کا کسی شیعہ مرد کے ساتھ نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکے نے شیعہ مذہب کے وہ عقائد اپنا رکھے ہیں جو ضروریاتِ دین کے مخالف اور متضاد ہیں، جیسے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زنا کی تہمت لگانا، سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صحابیت اور آپ کی خلافتِ حقہ کا انکار کرنا، اسی طرح قرآنِ پاک کے محرف ہونے کا عقیدہ رکھنا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا قائل ہونا یا آپ کو نبی آخر الزمان ماننا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وحی لانے میں غلطی کی اور حضرت علی رض کی بجائے جناب محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتاری وغیرہ وغیرہ، یہ تمام صورتیں موجبِ کفر و ارتداد ہیں۔ لہٰذا اگر مذکورہ شوہر اس قسم کے نظریات رکھتا ہے تو بلا شبہ وہ مُرتد اور کافر ہے، اور شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے شوہر کے مرتد ہو جانے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور عورت اگر مدخول بہا ہو تو وہ عدّت گذارنے کے بعد دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور پورے حق مہر کی حقدار ہے اور اگر غیر مدخول بہا ہے تو عدّت بھی واجب نہیں اور آدھا مہر ملے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصکفی رحمه الله : وارتداد احدهما ای الزوجين- فسخ ـ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۶۰۶ باب نکاح الکافر)

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : لا شك فی تکفير من قذف السيدة عائشة رضی الله تعالیٰ عنها او انکر الصحبة الصديق رضی الله تعالیٰ عنه او اعتقد الالوهية فی علی رضی الله عنه او ان جبرئيل عليه السلام

غلط فی الوحی او نحو ذلک من الکفر الصریح المخالف للقرآن ۔

(رد المحتار ج۴ ص۲۳۷ باب المرتد۔ مطلب مہم فی سب الشیخین)[1]

ذکری فرقے کے کفر کا حکم

سوال:۔ ذکری فرقہ جو ضلع تربت، مکران (بلوچستان) میں وقوع پذیر ہے، اس فرقہ کے تمام مذہبی طور طریقے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، ان کا کلمہ الگ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے انکار، خانہ کعبہ کو قبلہ ماننے سے انکار وغیرہ، اس کے باوجود اس فرقے کے پیروکار اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، تو کیا صرف اسلام کا دعویٰ کرنے سے آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ فرقہ محمد جونپوری یا محمد اٹکی کو اپنا رسول مانتا ہے، جیسا کہ اہلِ اسلام کے کلمہ کے برعکس اپنے ایجاد کردہ کلمہ سے وہ اپنے آپ کو رسول ظاہر کرتا ہے، اس فرقہ کا کلمہ لا الٰہ الّا اللہ نور پاک محمد مہدی رسول اللہ ہے۔ بایں وجہ یہ فرقہ ختمِ نبوت کے متفقہ و مسلّمہ عقیدہ کا بھی منکر ہے، دوسرا یہ فرقہ اسلام کے بنیادی ارکان نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جو قطعی الثبوت دلائل سے ثابت ہیں اور ان پر اسلام کی بنا رکھی گئی ہے کا منکر ہے، اسی طرح کعبۃ اللہ کے علاوہ کسی دوسری جہت کی طرف منہ کرنا یعنی اس کو قبلہ گاہ بنانا بھی موجبِ کفر ہے۔ لہٰذا جس شخص کے بھی یہ عقائد ہوں وہ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتا ہے چاہے اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے ہزار بار "میں مسلمان ہوں، میں مسلمان ہوں" کی رٹ

---

[1] قال العلامۃ ابن البزاز الکردری: واکفار الروافض فی قولھم برجعۃ الاموات الی الدنیا وبتناسخ الارواح وانتقال الروح الالٰہ الی الائمۃ وان الائمۃ اٰلھۃ وفی قولھم بخروج امام ناطق بالحق وانقطاع الامر والنھی الیٰ ان یخرج وبقولھم ان جبرئیل علیہ السلام غلط فی الوحی الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم دون علیٍّ رضی اللہ عنہ واحکام ھؤلاء احکام المرتدین ومن انکر خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ فھو کافر فی الاصح ویجب اکفار الخوارج فی اکفارھم جمیع الامۃ سواھم ویجب اکفارھم باکفار عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ وطلحۃ والزبیر وعائشۃ رضی اللہ عنھم ۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۱۸ باب احکام المرتد)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۲۲ باب احکام المرتدین ۔

لگا تا پھرے، اس لیے کہ فقہاء اور متکلمین نے لکھا ہے کہ مسلمان ہونے کی شرط یہ ہے کہ اُن تمام ضروریاتِ دین کا اقرار اور تصدیق کرے جن کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، اور دین کے کسی ضروری امر کا انکار نہ کرے، لہٰذا ذکری فرقہ اسلام کی اُن بنیادی ضروریات کے انکار کی بناء پر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحؒ: والایمان التصدیق بجمیع ما جاء به النبی صلی الله علیه وسلم عن الله تبارك وتعالیٰ مما علم مجیئه به ضرورة وهل هو فقط او هو مع الاقرار قولان فاکثر الحنفیة علی الثانی والمحققون علی الاول والاقرار شرط اجراء احکام الدنیا بعد الاتفاق علیٰ انه یعتقد متیٰ طولب به اتی به فان طولب به فلم یقرا فهو کفر عناد والکفر لغة الستر وشرعًا تکذیب محمدؐ فی شیٔ مما ثبت عنه ادعاه ضرورة۔ (البحرالرائق ج ۵ ص ۱۱۹ باب احکام المرتدین)[۱]

بریلوی فرقہ کا تذکرہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بریلوی فرقہ کا بانی کون تھا اور اس کے عقائد و نظریات کیا تھے؟ اُس کے اور اس کے پیروکاروں کا شرعًا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بریلوی فرقہ کا بانی احمد رضا خان تھا، اس نے اکابر علماء دیوبند اور دیگر علماء کرام کے بارے میں بہت کچھ غلط الفاظ استعمال کیے جن کو زبان و قلم پر لانا بھی مشکل ہے، اِس کے علاوہ اُس نے علماء دیوبند کی عبارات کو کاٹ چھانٹ کر علماء حرمین سے ان پر کفر کے فتوے حاصل کیے جن کی وجہ سے بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو علماء حق سے متنفر کیا اور ان میں مختلف قسم کی بدعات و رسومات کو رواج دیا، لیکن اس سب کے باوجود علماء حق نے اس فرقہ کے بانی اور اس کے پیروکاروں کی تکفیر نہیں کی، تاہم کسی بھی غیر اللہ کو ما فوق الاسباب حاجت روا ماننا اور اس کے لیے علمِ غیب کلی اور حاضر و ناظر کا عقیدہ رکھنا موجب کفر ضرور ہے۔

---

[۱] قال العلامة ملا علی القاریؒ: ورکن المخالفة ما اجمع علیه وانکاره بعد العلم به یعنی من امور الدین۔ (شرح الفقه الاکبر ص ۱۵۲ استحلال المعصیة کفر)
ومثله فی رد المحتار ج ۴ ص ۲۲۳ باب احکام المرتدین۔

لما قال اللہ تعالیٰ لحبیبہ : قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۔ (سورۃ الکہف آیت ۱۱۰)

وقال ایضًا : قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ (سورۃ الاسراء ۹۳)

لما فی الحدیث : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما انا بشر مثلکم اذا امرتکم بشئ من امر دینکم فخذوہ بہ واذا امرتکم بشئ من رائی فانما انا بشر ۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۸ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

قال العلامۃ ملا علی القاریؒ : فلیس لی اطلاع علی المغیبات انما ذلک شئ قلتہ بحسب الظن ۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۲ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)[له]

مولانا پنج پیر اور انکے پیروکاروں کو کافر کہنا صحیح نہیں

سوال :۔ مولانا پنج پیر اور ان کے متبعین کو انکے عقائد و نظریات سے اختلاف کی بناء پر کافر کہنا کیسا ہے ؟ نیز ان کے ساتھ مسلمانوں جیسے تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مولانا پنج پیر اور ان کے متبعین کا عقیدہ صحیح اور درست ہے اور وہ اہل السنۃ والجماعۃ میں داخل ہیں، اگرچہ بعض مسائل میں شدت سے کام لیتے ہیں جو کہ راہِ اعتدال سے تجاوز کر چکی ہے، اس سختی اور بے جا فتویٰ بازی کی وجہ سے علماءِ حقانیین نے ان کی جماعت میں شامل ہونے سے منع فرمایا ہے لیکن ان کو کافر اور مرتد کہنا صحیح نہیں، علماء کرام نے تکفیر کے فتویٰ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے اور مسلمان ہونے کے ناطے سے ان کے ساتھ مسلمانوں والے تعلقات قائم کرنا صحیح اور درست ہے، کسی بھی مسلمان کو

له قال العلامۃ ملا علی القاریؒ : ثم اعلم ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمهم اللہ تعالیٰ احیانًا وذکر الحنفیۃ تصریحًا بالتکفیر باعتقاد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضۃ قولہ تعالیٰ : قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (شرح الفقہ الاکبر ص ۱۵۱ حکم تصدیق الکاهن)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیۃ ج ۲ ص ۲۶۶ الباب التاسع فی احکام المرتدین ومنها ما یتعلق بالانبیاء علیهم الصلوٰۃ والسلام ۔

بلا وجہ کافر کہنا موجبِ تعزیر ہے ۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ : وقد ذکر ان المسئلۃ المتعلقۃ بالکفر اذا کان لہا تسعۃ وتسعون احتمال الکفر واحتمال واحد فی نفسہ فالاولیٰ للمفتی والقاضی ان یعمل بالاحتمال النافی لان الخطاءفی الف کافر اھون من الخطاء فی افناء مسلم واحد الخ (شرح الفقہ الاکبر ص۱۵۹ تکفیر اھل الکبائر) [1]

مودودی صاحب اور ان کے ہمخیالوں کے جدت پسند نظریات

سوال :- جناب مفتی صاحب ! بعض علماءِ دین کا کہنا ہے کہ عقائدِ مودودیہ گمراہ کن اور اجماعِ اُمت کے مخالف ہیں، مودودی صاحب خود ضال ومضل ہیں ، ان کی کتابوں کا مطالعہ بغیر عالمِ دین کے عوام الناس کے لیے ناجائز اور سخت مُضر ہے، اس جماعت کے ساتھ میل ملاپ اور اس کی حمایت کرنا ناجائز ہے ، اس بارہ میں آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں ؟

الجواب :- مودودی صاحب کے عقائد ونظریات پر اکابر علماء دیوبند نے کافی حد تک روشنی ڈالی ہے اور ان کے تمام یکطرفہ نظریات کو جمع کر کے قرآن وحدیث اور اجماعِ اُمت کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کر دیا ہے، تاہم مختصراً یہاں بھی عرض کیا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی تالیفات اور اُن کی جماعت کے بعض ذمہ دار حضرات کے مضامین وخیالات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب ایک آزاد خیال انسان ہیں جو اپنی تحقیق وریسرچ اور بزعمِ خود اجتہاد واستنباط کے شوق میں ائمہ اربعہ تو کیا بسا اوقات جمہور اہلِ سنت والجماعت کے مسلمہ مسلک اور حدود سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں ۔

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء انصاریؒ : یجب ان یعلم انہ اذا کان فی المسئلۃ وجوہ توجب الکفر ووجہ واحد یمنع التکفیر فعلی المفتی ان یمیل الی الذی یمنع التکفیر تحسیناً للظن بالمسلم ۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۵ ص۴۵۸ فی کتاب احکام المرتدین)

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ : اذا قذف مسلماً بغیر الزنا فقال یا فاسق او یا کافر او یا خبیث فوجب التعزیر ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۴۰ کتاب الحدود-فصل فی التعزیر) وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۴ ص۲۲۴ فی باب المرتد ۔

مودودی صاحب کی ان طبع آزمائیوں کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان سے متاثرہ افراد کے دلوں میں بھی سلف صالحین کی وقعت اور ان کی علمی اور فقہی تحقیقات اور کارناموں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ جمہور کے مسلک اور قطعی منصوص مسائل سے بے اعتنائی اور مخالفت کی چند مثالیں ہماری معلومات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں تاکہ مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کا تعارف سامنے آجائے۔

(۱) تنقید سے صحابۂ کرامؓ کو مستثنیٰ نہ کرنا اور نہ انہیں معیارِ حق سمجھنا۔ (دستور ص۱۴)
حالانکہ صحابۂ کرامؓ کا عادل ہونا اُن قطعی مسلمات میں سے ہے جن پر دین کی بنیاد قائم ہے اکتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی بے شمار نصوص ان کے معیارِ حق اور میزانِ عدل ہونے پر ناطق اور شاہد ہیں۔ اور بقول علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ "جو کوئی بھی صحابۂ کرامؓ کی تنقیص و تنقید کو جائز سمجھتا ہے وہ دراصل قرآن وحدیث کی ابطال و تنقیص کرتا ہے اور ایسا شخص زندیق ہے" (الاصابۃ)
اور بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ "اگر معاذ اللہ یہ اوّلین اساتذۂ اسلام غیر نا قابلِ اعتماد ہوں گے تو دین کی تمام عمارت گر جائے گی اور اس دروازۂ تنقید اور جرح کے کھلنے سے تمام دینی اصول و فروع ناقابلِ اعتماد ہو جاتے ہیں"
(مکتوبات ج ۲ ص۲۶۳)

(۲) ایسی ہی عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے متعلق ذاتی رائے اور انوکھا اجتہاد۔ (تفہیمات ۲/۴۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق (رسائل و مسائل ۱/۳۱) حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق (تفہیمات ۲/۴۲) اسی طرح دیگر انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام (تفہیم القرآن ۱/۵۵۸) حضرت یونس علیہ السلام (تفہیم القرآن ۲/حاشیہ ۳۱۲-۳۱۳) وغیرہ کے بارہ میں گستاخانہ الفاظ اور ان کی شانِ نبوت میں غفلت و بے پرواہی سے ایسے انداز میں ان پر تبصرے کیے کہ جن سے بے ادبی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ یا مثلاً حدودِ شرعیہ کے متعلق ظلم اور بے انصافی کا خیال ظاہر کرنا۔ (تفہیمات ص۲۸۱) یا مثلاً دجال وغیرہ کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کو قیاسات اور ظن و تخمین قرار دے کر انہیں افسانے کہنا ( ) یا مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی الی السماء کے مسلّمہ و متفقہ عقیدہ میں انکار و تردد کرنا (تفہیم القرآن) ـــــ اور اسی طرح کے دیگر خیالاتِ فاسدہ

جو کہ نصوصِ قطعیہ کے یکسر خلاف ہیں۔

اس کے علاوہ مودودی صاحب کی تحریرات میں مسلمانوں اور ملّتِ بیضاء کے مسلّمات مثلاً رُشد و ہدایت اور تصوّف کے طریقوں، مجددین و مصلحین کے خصوصی امتیازات اور تجدیدی کارناموں کی تضحیک و تحقیر کرنا موجود ہیں جس کی وجہ سے ان کے روشن خیال اور خالی الذہن متبعین کے دلوں میں ملت اسلامیہ کے صحیح راہنماؤں، فقہاء و ائمہ کرام، مشائخ عظام اور ان کے طریقۂ دعوت و عزیمت اور تجدیدِ دین کی مساعی اور کوششوں کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور عزت و احترام کے جذبات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کو تجدید و دعوتِ اجتہاد و امامت کے لیے ہمہ جہت اور جامع الصفات شخصیت صرف مودودی صاحب ہی نظر آتے ہیں ۔۔۔ اس قسم کی تحریرات کا نمونہ ان کی "تجدید اور احیاء دین" نامی کتاب میں موجود ہے جس کے صفحہ ۴۵، ۴۸، ۴۷ پر امام غزالی، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ وغیرہ پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آئے دن فقہی مسائل میں انوکھے اجتہادات سے مسلمانوں میں تشویش اور انتشار پیدا کرنے کے لیے تمام قوتیں بروئے کار لائی گئیں، اس کی چند مثالیں خود انکی تحریروں کی روشنی میں ملاحظہ ہوں:-

(۱) اضطراری حالت میں جوازِ متعہ کی فرضی صورت۔

(۲) مسنون داڑھی سے انکار اور لطیف حیلوں سے اس کی مقدار و عظمت کو گھٹانے کی کوشش۔ (ترجمان القرآن)

(۳) خلع اور اس کی عدت میں ذاتی رائے۔ (حقوق الزوجین)

(۴) بے وضو سجدۂ تلاوت کرنا۔ (تفہیم القرآن ۲/۶ ۱۱ سورۃ الاعراف)

(۵) روزہ دار کے لیے بعد از طلوعِ فجر کھانے پینے کا جواز۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۴۵ سورۃ البقرۃ) جس کے لیے کسی شاذ و نادر قولِ تابعی وغیرہ کا سہارا لے کر جمہور کے مسلک کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دین، اہلِ دین اور مسائل دین کے بارے میں بے ادبی اور بے احتیاطی اور اپنے مذعومہ نظریات اور آراء پر گھمنڈ ان کی آراء اور تحقیقات کا قدرِ مشترک ہے اور

اس طرح مودودی صاحب اپنی جدّت پسند طبیعت، جدید اور قدیم امتزاج سے ایک نئے مسلک اور دین کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ملّت بیضاء (مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ) سے جدا ہو کر دین کے بارے میں ایک ایسے شخص کو معتمد علیہ سمجھنا ہے جس میں اجتہاد، امامت اور تحقیق و استنباط کی شرائط اور لوازم کسی حال میں موجود نہیں اور جو اپنی تحقیق کے گھمنڈ میں اجماعیات تک سے چشم پوشی کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ مصلحت اور ضرورت سمجھے تو دین کے مسلّمہ عقائد اور اصول تک میں بھی حکمتِ عملی کے نام سے ترمیم و تبدیلی کر سکتا ہے۔

مذکورۃ الصدر بعض وہ اشارات ہیں جن پر اکابر علماء دیوبند نے تحقیق اور تفصیل سے انکے تفردات اور غلط و گمراہ کن نظریات پر روشنی ڈالی ہے اور الگ الگ مضامین و رسائل لکھے ہیں، اس بارہ میں اپنی تحقیق سے زیادہ ہمارا اعتماد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا اعزاز علی رحمہم اللہ تعالیٰ اور پاک و ہند کے دیگر علماء کرام اور ارباب فتویٰ کے فتاویٰ پر ہے جو پورے اخلاص و للّٰہیت اور جذبۂ دینی و خیرخواہی مسلمین اور بصیرتِ باطنی کی روشنی میں مودودی صاحب کو بحیثیت مجموعی ایک گمراہ اور ان کی جماعت کو ایک گمراہ کن جماعت سمجھتے ہیں، ان حضرات کی اتباع اور تقلید اور پھر اپنی ذاتی رائے کی بناء پر ہم بھی مودودی صاحب کو مسلمانوں کے حق میں ناپسندیدہ، مُضر اور ان کے نظریات و آراء سے اجتناب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مودودی صاحب کے نظریات و عقائد کی تردید اہلِ سنت والجماعت کی معتبر کتابوں سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح قرآنِ پاک میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کی گئی ہے اور قرآنِ پاک میں جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا اوّلین مصداق حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں، ان حضرات کو ہم اہل سنت والجماعت معصوم نہیں سمجھتے لیکن تمام اُمت میں بہترین اور افضل ترین سمجھتے ہیں، صحابۂ کرام رضؓ کو موضوعِ تنقید و تردید بنانا حد درجہ کی ضلالت و گمراہی ہے، اور یہ تمام اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کی نشر و اشاعت میں بالکل عدول ہیں اور اس میں انہوں نے کسی قسم کی کمی بیشی، کوتاہی یا غفلت اور ذاتیات کو شامل نہیں کیا اور من و عن سارا دین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اُمت تک پہنچایا ہے۔ اسی طرح تمام

انبیاء علیہم السلام بھی معصوم ہیں نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی، یہ بھی تمام اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ۔

(سورۃ الانفال آیت ۷۴)

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسبوا اصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذهبًا ما بلغ مُدّ احدهم ولا نصیفه۔ متفقٌ علیه

(مشکوٰۃ ص۵۵۳ فی باب مناقب الصحابۃ۔ فی الفصل الاوّل)

وقال العلامۃ ملا علی القاریؒ: الصحابۃ کلهم عدول مطلقاً لظواهر الکتاب والسنۃ واجماع من یعتمد علیه۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۱۰ ص۲۵۵)[1]

قادیانیوں کے ساتھ مسلمانوں جیسے تعلقات قائم کرنا ناجائز ہے

سوال: ہمارے علاقہ میں کچھ قادیانی رہتے ہیں، تو کن امور میں ہم مسلمانوں کو ان کے ساتھ تعلق رکھنا چاہیئے اور کن امور میں قطع تعلق کرنا چاہیئے؟

الجواب: ۔ قادیانیوں کے تمام دعوے جھوٹ اور لغویات پر مبنی ہیں، باجماعِ اُمت یہ لوگ کافر اور مرتد ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ مسلمانوں جیسے تعلقات (مناکحت، مواکلت، مشاربت وغیرہ) قائم کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

لما قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (سورۃ ھود آیت ۱۱۳)[2]

---

[1] وقال العلامۃ ملا علی القاریؒ وامام ابو حنیفۃؒ: والانبیاء کلهم منزهون عن الصغائر والکبائر والکفر والقبائح وقد کانت منهم زلات وخطیئات۔ (شرح الفقه الاکبر ص۸۹)

[2] قال الامام ابو عبداللہ محمد بن احمدؒ: تحت قوله تعالیٰ: الی الذین ظلموا قیل اهل الشرك وقیل عامة فیهم وفی العصاة..... وهذا هو الصحیح فی معنی الآیۃ وانها دالة علی هجران اهل الکفر والمعاصی من اهل البدع وغیرهم فان صحبتهم کفر او معصیة اذ الصحبة لا تکون الا عن مودة۔ (وقد قال حکیم) عن المرء لا تسأل وسل عن قرینه۔ فکل قرین بالمقارن یقتدی

(احکام القرآن ج ۹ ص۱۰۸ سورۃ الهود)

علامہ عنایت اللہ مشرقی کے بارے میں ایک استفسار کا جواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام علامہ مشرقی کے بارے میں کہ:

(۱) یہ کیسے آدمی تھے؟ کیونکہ ہم نے سُنا ہے کہ علامہ مشرقی دشمن اسلام اور قرآن و حدیث کے خلاف سخت مذہب رکھتا تھا، چنانچہ مؤرخہ ۲۰ ر جولائی ۱۹۳۹ء رکیم جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو علامہ ابوالحسنات قادری خطیب مسجد وزیر خان لاہور نے علامہ مشرقی کے متعلق چھپوا کر شائع کیا تھا اور اس پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ اور علماء پنجاب لاہور، علماء ہند دہلی نے بھی علامہ مشرقی کو اسلام سے خارج قرار دیا تھا۔ چنانچہ علامہ ابوالحسنات قادری نے اپنے رسالہ "خاکساری مذہب اور اسلام" میں لکھا ہے کہ علامہ مشرقی نے اپنے تذکرہ اور اشارات میں تحریر کیا ہے کہ مشرقی عقیدہ میں پنجوقتہ نماز فرض نہیں اور مشرقی عقیدہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک نہ تو کوئی سچا مذہب ہو سکا نہ خدا کا وجود کسی دلیل سے ثابت ہُوا۔ مشرقی عقیدہ کے مطابق مصلاؤں پر بیٹھ کر مثل اولیاء کرام اللہ اللہ کرنا کوئی عبادت نہیں بلکہ ریاکاری، مکاری اور شرک و کفر ہے۔ کیا یہ کفر آمیز مضامین علامہ مشرقی کے "تذکرۂ اشارات" میں لکھے ہوئے ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر لکھے ہوئے ہیں تو کیا علامہ مشرقی اپنی تحریرات اور کفریہ مضامین سے بعد میں تائب ہو گئے تھے یا حالتِ کفر پر ہی ان کا انتقال ہوا ہے؟

(۳) اگر علامہ مشرقی "تذکرہ" میں درج خرافات اور کفریات سے تائب نہیں ہوئے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اکثر لوگ مشرقی کو اچھا اور نیک آدمی جانتے ہیں اور بڑے بڑے عالم اس کے جنازہ میں شریک ہوئے اور نماز جنازہ بادشاہی مسجد لاہور میں ادا کی گئی۔

(۴) جو لوگ علامہ مشرقی کو اچھا اور نیک آدمی جانتے ہیں اور خاکساری مذہب رکھتے ہیں عند الشرع کافر ہیں یا فاسق؟

(۵) جن لوگوں نے علامہ مشرقی کا جنازہ پڑھا ہے ان کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۶) مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور مجبوری کی حالت میں بھی جائز

ہے یا نہیں؟ اور امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مسجد میں جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب:- آپ کے سوالوں کے نمبر وار جواب بتوفیقِ الٰہی حاضر ہیں:-

(۱) واقعی مشرقی کا "تذکرہ" ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے منصوص صحیح احکام کے صریح خلاف ہیں بلکہ قرآن کریم کے مضامین میں صریح تحریف بھی کی گئی ہے۔ یہی وہ خلافِ شرع مضامین ہیں جن کی وجہ سے تمام علماء اسلام کے حلقہ میں علامہ مشرقی کو دین اور مذہب و ملّت کے لیے انتہائی خطرناک آدمی سمجھا گیا اور علماء ربّانی نے کبھی بھی اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

(۲) ہمیں علامہ مشرقی کی یہ حالت معلوم نہیں ہے، اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے یا پھر مشرقی کو۔ (کہ وہ اپنے ان کفریہ عقائد و نظریات سے تائب ہوا تھا یا نہیں؟)

(۳) اس کی وجہ تو ان لوگوں سے پوچھنی چاہیئے جو علامہ مشرقی کو اچھا اور نیک آدمی جانتے ہیں اور اس کے جنازے میں شریک ہوئے یا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کا جنازہ پڑھا ہے، ہم سے یہ باتیں پوچھنا مناسب نہیں۔

(۴) ہم ایسے لوگوں کو کافر تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے عقائد کا ہمیں یقینی علم نہیں ہے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی عبارتوں میں تاویل کی گنجائش ہو، البتہ اسے (مشرقی کو) فاسق ضرور کہیں گے کیونکہ موجباتِ فسق امور اس کے عقائد و نظریات میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

(۵) جب ہم خود مشرقی پر کفر کا حکم نہیں لگا سکتے تو جن لوگوں نے اس کا جنازہ پڑھا ہے ان پر بھی ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔

(۶) ہمارے امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں مکروہ ہے جبکہ دوسرے ائمہؒ جواز بلا کراہت کے قائل ہیں۔

فقط واللہ اعلم

مودودی صاحب کے عقائد کے بارے میں استفسار کا جواب

سوال: یہاں پہ بعض علماء نے مندرجہ ذیل مضمون کا شائع کیا ہے "یہ امر مسلمہ ہے کہ عقائد مودودیہ گمراہ کن ہیں قرآن و حدیث سے مخالف ہیں۔ ائمہ اربعہ سے مخالف ہیں۔ مودودی ضال مضل ہے۔ مودودی عقائد والے مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا حرام ہے ان سے میل ملاپ حرام ہے ان کی کتابوں کا مطالعہ بغیر عالم دین عوام کے لیے حرام ہے اس جماعت کا حمایت کرنا حرام ہے"۔ کیا دار الافتاء کو مولانا مودودی صاحب کی عقائد اور ان کی کتابوں کے بارہ میں کچھ معلومات نہیں، کیا آپ اس فتویٰ سے اتفاق رکھتے نہیں۔ اگر واقعی مودودی گمراہ کن ہے تو برائے کرم ہماری رہنمائی فرمادیں۔ اگر نہیں تو بھی رہنمائی فرمادیں۔

الجواب: نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم :۔ اما بعد۔ اس وقت مودودی صاحب کے بارہ میں کچھ لکھنے کی فرصت نہیں مگر جو کچھ اپنے مطالعہ اور پھر اپنے اکثر علماء دیوبند خصوصاً سیدی وسندی شیخی ومرشدی مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی تحقیق اور مودودی جماعت کے بعض درون خانہ حضرات کے مضامین و خیالات سے معلوم ہوا تو یہی کہ مودودی صاحب ایک آزاد خیال انسان ہے جو اپنے تحقیق وریسرچ اور بزعم خود اجتہاد و استنباط کے شوق میں ائمہ اربعہؒ تو کیا بسا اوقات جمہور اہل سنت والجماعت کے مسلمہ مسلک اور حدود سے بھی باہر نکل جاتے ہیں مودودی صاحب کے ان طبع آزمائیوں کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ ان سے متاثر افراد کے دلوں سے بھی سلف کی وقعت اور سلف صالحین کے علمی و فقہی تحقیقات اور کارناموں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے جمہور کے مسلک اور قطعی اور منصوص مسائل سے بے اعتنائی اور مخالفت کی چند مثالیں ہمارے ان معلومات کے ثبوت و تائید کے لیے کافی ہیں۔ ۱؎ تنقید سے صحابہؓ کو بھی مستثنیٰ نہ کرنا اور نہ انہیں معیار حق سمجھنا (دستور ص ۱۴) حالاں کہ صحابہ کرام کا عدول ہونا ان قطعی مسلّمات میں سے ہے جن پر دین کا بنیاد قائم ہے کتاب و سنت کے بے شمار نصوص ان کے معیار حق اور میزان عدل ہونے پر ناطق و شاہد ہیں۔ اور بقول حافظ ابن حجر العسقلانیؒ جو کوئی بھی صحابہ کرام کی تنقیص و تنقید کو جائز سمجھے وہ "اہل قرآن و سنت کی ابطال و تنقیص کرتا ہے اور ایسا شخص زندیق ہے (الاصابہ) اور بقول شیخ الاسلام حضرت الاستاد مولانا مدنیؒ اگر معاذ اللہ یہ اولیں اساتذہ اسلام غیر قابل اعتماد ہوں گے تو تمام عمارت دین بالکل ڈھا جائے گی اور اس دروازہ (تنقید و جرم) کے کھلنے سے تمام دینی اصول و فروغ ملیامیٹ ہو جاتے ہیں (مکتوبات ج ۲ ص ۲۶۳) ۲؎ اسی طرح مسئلہ عصمت انبیاء کے بارہ میں ذاتی رائے اور انوکھا اجتہاد (تفہیمات ج ۲ ص ۴۳) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام (رسائل و مسائل

حصہ اول ص ۱۳۱) (ب) حضرت داؤد علیہ السلام (تفہیمات ج ۲ ص ۴۲) (ج) حضرت ابراہیم علیہ السلام (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۵۸) (د) حضرت یونس علیہ السلام (تفہیم القرآن ج ۲ حاشیہ ۳۱۲/۳۱۴) وغیرہ کے بارہ میں گستاخانہ ریمارک اور ان کے شانِ نبوت سے غفلت و بے پرواہی میں ایسے انداز سے ان پر تبصرے جن سے شانِ بے ادبی نمایاں ہے۔ ۳ یا مثلاً حدودِ شرعیہ کے قیام کے بارہ میں ظلم و بے انصافی کا خیال ظاہر کرنا (تفہیمات ص) ۴ یا مثلاً کانا دجال وغیرہ کے بارہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیشنگوئیوں کو قیاسات اور ظن و تخمین قرار دے کر انہیں افسانے کہنا ۵ یا مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع جسمانی الی السماء کے مسلمہ و متفقہ عقیدہ میں انکار و تردد (تفہیم القرآن) اور اس قسم کے دیگر مزعومات فاسدہ جو منصوصات قطعیہ کے یکسر خلاف ہیں، نیز مودودی صاحب کے تحریرات میں مسلمانوں اور ملت بیضا کے مسلمہ اقدار مثلاً رشد و ہدایت اور تصوف کے طریقوں مجددین و مصلحین کے خصوصی امتیازات اور تجدیدی کارناموں کی تضحیک و تحقیر کا پہلو موجود ہے جس کی وجہ سے ان کے روشن خیال خالی الذہن متبعین کے دلوں میں ملت کے صحیح رہنماؤں۔ فقہاء عظام مشائخ کرام اور ان کے طرقِ دعوت و عزیمت اور تجدیدِ دین کے مساعی اور کوششوں کی قیمت گھٹ جاتی اور احترام کے جذبات یکسر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو تجدیدِ دعوت اجتہاد و امامت کے لیے ہمہ جہت جامع الصفات شخصیت صرف مودودی صاحب ہی نظر آنے لگتا ہے۔ اس قسم کے تحریرات کا نمونہ ان کے کتاب تجدید و احیائے دین میں موجود ہے جس کے صفحات ص ۵۴ و ص ۸۴ ص ۷۴، ص ۷۴ وغیرہ پر امام غزالیؒ امام ابن تیمیہؒ مجدد الف ثانیؒ شاہ ولی اللہؒ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ پر کھڑی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن فقہی مسائل میں انوکھے اجتہادات سے مسلمانوں میں تشویش و انتشار پیدا کرنے کے لیے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۱ اضطراری حالت میں جوازِ متعہ کی فرضی صورت ۲ مسنون داڑھی سے انکار اور لطائف اطیل سے اس کی مقدار و عظمت کو گھٹانے کی کوشش (ترجمان القرآن) ۳ قلع اور اس کی عدت میں ذاتی رائے (حقوق الزوجین) بے وضو سجدۂ تلاوت (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۱۲۶) صائم کے لیے بعد از طلوعِ فجر کھانے پینے کی جواز (تفہیم ج ۱ ص ۱۴۵) جس کے لیے کسی شاذ اور نادر قول تابعیؒ وغیرہ کا سہارا لے کر جمہور کے مسلک کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین و اہلِ دین اور مسائلِ دین کے بارہ میں بے ادبی اور بے احتیاطی اور اپنے فرعومہ نظریات و آراء پر گھمنڈ ان کے آراء و تحقیقات کا قدر مشترک ہے اور اس طرح مودودی صاحب کی جدت پسند طبیعت جدید و قدیم امتزاج سے ایک نئے مسلک و دین کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ۔ سنت (بمصداق ما انا علیہ واصحابی) سے کٹ کر دین کے بارہ میں ایک ایسے شخص کو معتمد علیہ سمجھنا ہے، جس میں

اجتہاد و امامت، تحقیق و استنباط کے شرائط اور لوازم کسی حال میں موجود نہیں اور جو ایسے تحقیق کے گھمنڈ میں اجماعیات تک سے چشم پوشی کر جاتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے مصلحت اور ضرورت سمجھے تو دین کے مسلمہ عقائد اور اصول تک میں بھی حکمت عملی کے نام سے ترمیم و تبدیل کر سکتا ہے۔ مذکورۃ الصدر بعض اشارات ہیں۔ جن کی تفصیل و تشریح میں اکابر علماء نے تحقیق و تفصیل سے ان کے متفردات اور غلط و گمراہ کن نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور الگ الگ رسائل و مضامین لکھے ہیں۔ اس بارہ میں اپنی تحقیق سے زیادہ ہمارا اعتماد حضرت شیخ مدنی قدس سرہٗ۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ۔ حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ اور پاک و ہند کے دیگر اہل علم و ارباب فتویٰ کے فتوؤں پر ہے جو پورے اخلاص و للّٰہیت اور جذبۂ دینی و خیر خواہی مسلمین اور بصیرت باطنی کی روشنی میں مودودی صاحب کو بحیثیت مجموعی ایک گمراہ اور اس کی جماعت کو ایک گمراہ کن جماعت سمجھتی ہے۔ ان حضرات کے اتباع و تقلید اور پھر اپنی ذاتی رائے جو پورے دردمندی اور خلوص پر مبنی ہے کے بنا پر مودودی صاحب کو مسلمانوں کے حق میں ناپسندیدہ اور ضرر اور ان کے نظریات و افکار سے اجتناب ضروری سمجھتا ہوں۔ واللّٰہ اعلم وعلمہ اتم واحکم وبیدہ الباطن والا رابعہ ان اردنا الا الاصلاح ما استطعنا وما التوفیق الا باللّٰہ العلی العظیم۔

یہود کا ذکر قرآن میں

حضرت العلامہ مولانا عبدالحلیم زرولوی سابق صدر المدرسین جامعہ دارالعلوم حقانیہ

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کو مٹھی بھر یہودیوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس سے بعض اذہان میں اس شبہ کا ابھرنا ایک فطری امر تھا کہ یہود جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔ اور اسی طرح کئی دیگر مواقع اور مقامات پر کتاب اللہ نے ان کی ملعونیت اور مغضوبیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے تو ان کو تمام عالم عرب پر فتح کیسے حاصل ہو گئی؟ مندرجہ ذیل مقالہ میں حضرت العلامہ مولانا عبدالحلیم زرولوی نے اس شبہ کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں دیا ہے جس سے اس کے علاوہ دیگر شبہات کا بھی ازالہ ہوتا ہے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مؤقر جریدے ماہنامہ الحق نے اس پر مغز مضمون کو شائع کیا کتاب العقائد کے باب الفرق کے ساتھ مناسبت کی بناء پر فتاویٰ حقانیہ میں افادہ کے لئے شامل کیا گیا (مرتب)

مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر یہود کی طرف سے جو مصیبت عظمیٰ آپڑی ہے۔ اس سے غیر مسلم اقوام کو مسلمانوں کا مذاق اور تمسخر اڑانے کا موقع مل گیا۔ اور طعنہ دینے کا سامان بہم پہنچا ہے۔ کہ مٹھی بھر یہودیوں سے تیرہ کروڑ مسلمانوں کو شکست فاش دیدی حالانکہ یہ قوم دنیا بھر میں خصوصاً مسلمانوں کے نزدیک ذلیل ترین ہے۔ نہ تو مسلمانوں کو عظیم کثرت نے شکست سے بچایا اور نہ امداد غیبی ان کے شامل ہوئی جس کا مسلمان عموماً دعویٰ کرتے ہیں کہ نصرت خداوندی ہمیشہ ہماری شامل حال رہتی ہے۔ اسی طرح اس سے بعض اذہان میں وسوسہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ یہود کی حکومت اور غلبہ اور عزت قرآنی نصوص کے خلاف ہے مثلاً آیت ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ (البقرۃ) وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ (آل عمران) وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ (الاعراف)

تو یہود کی موجودہ عزت اور حکومت بلکہ مسلمانوں پر تسلط کیسے وقوع میں آیا اور نصرت خداوندی کا وعدہ (وکان حقا علینا نصر المؤمنین) کیوں وقوع پذیر نہ ہوا ؟ یہ تمام شبہات زیادہ تر قلت تدبر اور سوء فہم پر مبنی ہیں۔ یہاں اس کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ امداد غیبی کا وعدہ مشروط ہے ایمان و اطاعت اور عہد وفاداری پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے اور اشاعت دین کی جدوجہد کرنے پر ۔۔۔۔۔۔۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔۔۔ ولینصرن اللہ من ینصرہ ۔ وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ۔۔۔ وحقا علینا نصر المؤمنین۔

آیات مذکورہ بالا اور اسی قسم کے دوسرے بے شمار نصوص آیات اور احادیث امداد و نصرت خداوندی کی بنیادی شرائط پر واضح طور پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ بغاوت اور اطاعت سے انحراف اور عام بے عملی فسق و فجور کے ارتکاب شعائر اسلام کی بے حرمتی کی صورت میں عذاب اور تباہی کے مستحق بننے کی وعیدیں بھی وارد ہوتی ہیں مثلاً

۱ ۔ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ۔
اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر۔

۲ ۔ وما کان ربک لیھلک القریٰ واھلھا مصلحون ۔
تیرے پروردگار کی شان نہیں کہ بستیوں کو تباہ کر دے حالانکہ ان کے بسنے والے نیک کردار ہوں۔

۳ ۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم ۔
اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

۔ واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرناھا تدمیرا ۔
اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیجا اس کے عیش کرنیوالوں کو پھر انہوں نے نافرمانی کی اس میں تب ثابت ہو گئی ان پر بات۔ پھر اکھاڑ مارا ہم نے ان کو اٹھا کر۔

عصر حاضر کے مسلمانوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر عہد و پیمان توڑ کر عام بغاوت اور بے عملی کا ارتکاب شروع کر دیا ہے۔ کوئی عیب ایسا نہیں جو ان میں نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں کوئی حکومت مسلمانوں کی ایسی نہیں جس میں اسلامی احکام پورے طور پر نافذ ہوں۔ اکثریت پر مغربیت اور دہریت مسلط ہے اسلام کی سیاست مدنی، تدبیر منزل، تہذیب، اخلاق، معاملات، عبادات، معاشرات اور ایمانیات سے عام ناواقفی بلکہ اسلامی اصول حیات کو "ملائیت" اور "رجعت پسندی" کہہ کر حقارت دیکھنے

لگے تو نصرت خداوندی سے محروم ہوکر وعید الٰہی کو زبان حال دعوت دینے لگے۔ چنانچہ نتیجہ میں اپنے کردار کے عواقب برداشت کرنے لگے۔ اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئی فرمائی تھی۔ حرف بحرف واقع ہوکر رہی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

(۱) یوشك ان تداعی علیكم الامم كما تداعی الاكلة علی القصعة فقال قائل ومن قلة نحن یومئذ قال انتم یومئذ كثیر ولكنكم غثاء كغثاء السیل ولینزعن الله من صدور عدوكم المهابة ولیقذفن فی قلوبكم الوهن قال قائل یا رسول الله صلی الله علیه وسلم ما الوهن قال حب الدنیا وكراهیة الموت۔ (مشكوٰة)

عنقریب متعدد اقوام تمہارے کھانے اور ختم کرنے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دیں گے جس طرح کہ کھانے والوں کے کاسہ میں رکھے ہوئے طعام کے لئے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کسی نے کہا کہ ہم اس وقت قلت میں ہوں گے۔ فرمایا نہیں تم اس وقت بہت زیادہ ہوگے لیکن تمہاری حالت اس وقت مانند سیلاب کی جھاگ کی ہوگی اللہ تعالیٰ دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ضعف پیدا کردے گا یعنی دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری۔

(لفظ امم کے عموم میں یہود بھی شامل ہیں)

(۲) عن ابی سعید قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لتتبعن سنن من قبلكم شبرًا بشبرٍ ذراعًا بذراعٍ حتی لو دخلوا جحر ضب لتبعتموهم قیل یا رسول الله الیهود والنصاریٰ قال فمن؟ (مشكوٰة)

تم ضرور امم سابقہ کے طور طریقوں پر چلتے رہوگے بالشت بہ بالشت دست بدست (یعنی برابر کے برابر بلافرق) یہاں تک کہ اگر وہ داخل ہوئے ہوں سانڈے کے سوراخ میں تم بھی ان کا اتباع کروگے۔

(۳) عن المرداس قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یذهب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالة كحفالة الشعیر لا یبالیهم الله بالةً (مشكوٰة)

اچھے لوگ ختم ہوجاویں گے پیچھے بعد دیگرے اور رہ جاویں گے ایسے لوگ جن کی کوئی حیثیت نہ ہو بے قدر ہوں مانند جو کے بھوسے کے اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پرواہ نہ کرے گا یعنی جس طرح سے ان پر مصیبت پڑجائے کوئی امداد نہ فرمادے گا نہ فریاد کی شنوائی ہوگی۔

قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد مسلمانوں کے ہر دور کی تاریخ اور ان کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرکے ان آیات واحادیث وعد و وعید کے ساتھ مقابلہ کیا جاوے تو بے شبہ کبھی

پیدا نہیں ہوسکتا کہ امت مسلمہ کے ساتھ وعدہ و وعید میں کوئی فرق آیا ہے۔ یا ان کو ناکردہ گنا ہوں کی سزا ملی ہے۔ وما کان اللّٰہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ خدا کی شان یہ نہیں کہ ان پر ظلم کرے لیکن وہ اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں۔ یہود کی موجودہ دور میں عارضی حکومت اور وقتی تفوق جس کو قرآنی نصوص کے خلاف سمجھا جارہا ہے۔ تو اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے چند معروضات پیش کرنا ضروری ہے۔

(۱) عالم اسباب میں محدثات کا اجتماع اور حوادث کا تعاقب محض تحت واتفاق کی بناء پر نہیں۔ بلکہ خالق کائنات نے ان کے درمیان باہمی ارتباط اور تعلق پیدا کر کے بعض کو اسباب اور بعض کو مسببات قرار دیا ہے۔ اسباب مہیا اور موجود ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق مسببات ان پر مرتب ہو کر وجود میں آتے ہیں۔

(۲) تحقق اسباب کے بعد ترتیب مسببات لزوماً ہوتا ہے۔ اس کا تخلف نہیں ہوتا الاّ نادراً جس کو خرق عادت یا خلاف عادت الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورج کے طلوع کے بعد دن ضرور وجود میں آتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ سورج طلوع ہو کر رات قائم ہو جاتی ہے۔ مہلک مقدار میں زہر کھانے کے بعد موت طاری ہو جاتی ہے۔ چاہے حکیم کھائے چاہے جاہل، پانی پینے اور کھانا کھانے کے بعد پیاس بھوک کا ازالہ ہو جاتا ہے یہ ظاہر اور بدیہی امور ہیں۔

(۳) اقوام کے عروج و زوال اور آزادی و غلامی کے لئے بھی اسباب ہوتے ہیں۔ مانند دوسرے حوادث کے یہ اسباب دو قسم کے ہیں ۱۔ سماوی یعنی امداد غیبی اور ۲۔ مادی یعنی عادی اسباب۔ قسم اول کے متعلق پہلے عرض کیا گیا کہ وہ مشروط بالایمان والطاعۃ ہیں۔ ہاں کبھی قانون مجازات کے مطابق کافروں کو دوسرے کافروں یا مسلمانوں پر مسلط کر لیتا ہے کما قال تعالیٰ و نذیق بعضھم بأس بعض۔ اور ہم چکھاتے ہیں بعض کو دوسروں کی شدت جیسا کہ یہودیوں پر جالوت، بخت نصر، طیطوس رومی اور ہلاکو وغیرہ کو مسلط کرادیا۔ اور مسلمانوں پر سزائے جرم کی پاداش میں یا تنبیہ اور عبرت حاصل کرنے کیلئے مختلف ادوار میں نصاریٰ یا تاتاری وغیرہ کا تسلط ہوا۔

(۴) مادی اسباب عروج و آزادی کے عادی اسباب جب کوئی قوم پورے طور پر مہیا کرے (مثلاً اتفاق باہمی، مواسات، قربانی، راعی اور رعایا میں تعاون، طاعت اور اعتماد، مدافعت اور تسلط کے مطابق ہر زمانہ میں ہر نوع اسلحہ کی فراہمی، جفاکشی، ایثار، یعنی سیاست مدنی و ملکی کیلئے شریعت مصطفویہ نے بہ تفصیل تمام جو چیزیں بیان کی ہیں) تو حکومت اور غلبہ حاصل ہوگا۔ کفر اگر

کے لئے مانع ہوگا۔ آج کل امریکہ اور روس کو جو فوقیت حاصل ہے وہ انہی اسباب مادیہ کی بناء پر ہے نہ کہ وہ کلمہ گو ہیں۔

(۵) کسی قوم کو آزاد یا غلام حاکم یا محکوم کہنا کہ فلاں قوم آزاد یا حکمران ہے من حیث القوم باعتبار مجموعہ افراد یا اکثریت کے کہا جا سکتا ہے۔ اگر کسی قوم کے کروڑوں افراد میں سے صد ہزار یا لاکھ کسی گوشہ میں حاکمیت اور آزادی حاصل کریں۔ تو اس بناء پر قوم من حیث القوم کو آزاد یا حکمران اور باعزت نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) اسی طرح اگر ہزاروں سال کے اندر کسی قوم کو عارضی طور پر چند سال کے لئے حکومت ملے تو عارضی حکومت چند روزہ کالعدم قرار پاکر مجموعہ یا اکثر اجزائے زمانہ کے اعتبار سے ان کو ذلیل و غلام کہا جاوے گا۔ چنانچہ احادیث سے صراحۃً ثابت ہے کہ دجال یہودی کو عام دنیا پر سوائے حرمین شریفین کی پوری حکومت حاصل ہوگی، اس کے باوجود وہ ضربت علیہم الذلۃ کے مصداق ہیں

(۷) اگر کوئی قوم دینی آزادی اور حکمرانی غلبہ میں مستقل ہو۔ کسی دوسری قوم کی دست نگر نہ ہو تو ان کی طرف اقتدار اور حکومت کی نسبت حقیقۃً صحیح ہوگی، اور اگر کسی دوسری قوم کے لئے آلہ کار ہو۔ اور ان کی تمام طاقت دوسری قوم کے اغراض اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کیلئے ہو۔ تو اسی قوم کی طرف حکومت اور تسلیط کی نسبت حقیقۃً صحیح نہ ہوگی۔ بلکہ حاکمیت اور تسلط اس دوسری قوم کے لئے ہے۔ جس قوم کی یہ آلہ کار اور غلام ہے۔

اس تمہید کے بعد موجودہ دور میں ان سامراج کی ایجنسیوں یعنی یہود کی حکومت اور غلبہ اور اس کے وجود میں آنے کے عوامل و مبادی پر غور کرنا چاہیئے۔ تاکہ اس کی حقیقت اچھی طرح سے بے نقاب ہو کر کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اگرچہ سابقہ معروضات بھی ازالہ شبہ کیلئے اجمالاً کافی ہیں

۱۹۴۰ء کی جنگ عظیم میں جبکہ ان مغضوب علیھم پر قدرت کی طرف سے ہٹلر مجسم تازیانہ غضب بن کر مسلط ہوا۔ تو اس نے ممالک مفتوحہ میں حکم جاری کیا کہ جس یہودی کو جان بچانا منظور ہو وہ ان ملکوں سے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر نکل جائے ورنہ اس کی جان کی خیر نہ ہوگی۔ جرمنی کے سقوط سے پہلے جتنے یہود نکل گئے وہ جان بچانے میں کامیاب ہوئے، جو نہ نکل سکے ان سب کو قید کر کے زندہ جلا دیا اور کسی کو سمندر میں ڈبو دیا اور اکثر قتل کر دئے گئے۔ یہ داستان کسی پر مخفی نہیں کہ بچنے والے جو کثیر تعداد میں مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تھے۔ سامراجیوں نے ان کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آلہ کار بنا کر عرب کے قلب لینے کے لئے فلسطین میں لا کر بسایا۔ اور

فلسطینیوں کو جلا وطن کر دیا ۔ عرب ممالک اپنی کمزوری اور بے اتفاقی کی بناء پر دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے ۔ ابتداء میں تھوڑی مقدار میں آئے ۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی رہی ۔ اور سامراجیوں نے بیس سال کے اندر ان کو طاقتور بنانے اور سیاسی غلبہ حاصل کرنے کیلئے انہیں بھر امداد دی۔ مدافعت اور جارحیت کے لئے انہیں ہر قسم کے جدید اسلحہ سے پوری طرح مسلح کر دیا ۔ کامیاب اجتماعی زندگی کیلئے جن ذرائع اور وسائل کی ضرورت تھی ، سب کو پورا کر دیا ۔ یہود جو قریبی مدت میں انتہائی مظالم و مصائب برداشت کر چکے تھے ۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھانے لگے ۔ اور باہمی اتفاق مواساۃ ، قربانی ، جفاکشی ، تضییع مال سے گریز غرض معاشرہ اور نوعیت کی اصلاح اور کامیابی کے لئے جو اخلاقی اور مادی کارنامے درکار تھے ، ان کی تحصیل میں ہمہ تن لگ گئے ۔ اب قانون ربط اسباب بالمسببات کی رُو سے ان کو حکومت اور طاقت حاصل ہونا مطابق عادت تھا اور عرب حریف پر جو بے اتفاقی ، بیداری عیاشی ، عام بے عملی اور احکام خداوندی سے بغاوت کے شکار ہوئے تھے ۔ ان کا غالب ہونا غیر متوقع نہ تھا ۔ اور عجب نہیں کہ قدرت کو ان ذلیل ترین یہودیوں کے ہاتھ مطابق قانون مجازات کے عرب کو بالخصوص اور عام مسلمانوں کو بالعموم تنبیہ اور تازیانہ عبرت منظور ہو ۔ بلکہ ظاہر بھی ہے وما کان ربك لیھلك القریٰ واھلھا مصلحون تیرے پروردگار کی یہ شان نہیں کہ بستیوں کو تباہ کر دے اور اس کے بسنے والے نیک کردار ہوں ۔ آج امریکہ اور اس کی ہمنوا طاقتوں کے علاوہ ساری دنیا کہہ رہی ہے ۔ کہ یہ یہود سامراجیوں کے پروردہ کہتے ہیں ۔ اور انہوں نے انہیں اپنی سیاسی اغراض کے لئے عربوں پر مسلط کیا ہے ۔ ورنہ ان کی کوئی پوزیشن نہیں ۔ اس روشن حقیقت کے بعد کوئی عاقل اس حکومت اور طاقت کو ان کی طرف حقیقۃً منسوب نہیں کر سکتا ۔ بلکہ یہ ساری حکومت اور طاقت سامراجیوں کی ہے ۔ یہودی ان کے غلام بن کر حق غلامی ادا کر رہے ہیں ۔ یہود کی موجودہ حکومت کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل آیت سراپا صداقت کے معنی پر غور کر کے معلوم ہو جائے کہ یہ اس کی تصدیق ہے نہ کہ خلاف کجا کہ اس پر شبہ کیا جاوے ۔ ضربت علیھم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس ۔ (الآیۃ) ماری گئی ان پر ذلت جہاں دیکھے جاویں سوائے دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے قرآن کریم کی صداقت غیر متزلزل سے کسی شبہ کی اس میں گنجائش نہیں قصور ہمارے فہم کا ہے ۔

لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ۔ نہیں آسکتا اس کو

جھوٹ اور باطل سامنے نہ پیچھے سے نازل کی گئی ہے۔ حکمت والے اور ستائش کئے گئے قدرت کی طرف سے۔ اسی قسم کی آیت آل عمران کی آیت سے پہلے یہود کے تذکرہ میں سورۃ بقرہ میں بھی وارد ہوئی۔ وضربت علیهم الذلة والمسكنة وباءُوا بغضب من الله ذالك بانهم كانوا يكفرون بايٰت الله ويقتلون النبيّن بغير الحق ذٰلك بما عصوا وكانوا يعتدون ہ ترجمہ: جمادی گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے۔ غضب الٰہی کے یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے۔ احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور عقل و شرع کے دائرہ سے نکل جاتے تھے۔

۱۔ یہاں اینما ثقفوا کی قید نہیں اور نہ استثناء ہے لیکن القرآن یفسر بعضہ بعضاً کی بناء پر دونوں یہاں بھی مراد ہے۔ آل عمران کی آیت اگرچہ اہل کتاب کے تذکرہ میں آئی ہے۔ لیکن مراد اس سے خاص یہود ہیں بدلیل سابق۔

۲۔ ذلت خلاف عزت و قوت کو کہتے ہیں۔ جس میں جان و مال کا غیر معصوم ہونا اور محکومیت و غلامی شامل۔ مسکنت بمعنی ضعف و فقر اور پستی کے ہے اور الا بحبل استثناء ہے عموم احوال سے یعنی فی عامة الاحوال الّا معتصمين الا بحبل من الله و متلبسين بذمته۔ (بیضاوی)

۳۔ حبل متعدد معانی میں مستعمل ہے۔ کتاب اللہ، حدیث میں ہے كتاب الله حبلٌ ممدودٌ من السماء الى الارض۔ بحبل الله، ای كتابه۔ حبل بمعنی عہد و میثاق۔ حبل بمعنی ذمہ و امان کے بمعنی دین اور سبب کے (مجمع البحار) یہاں حبل اللہ سے ہر ایک معنی مراد لیا جاسکتا ہے اور حبل من الناس سے صرف ذمہ اور امان یعنی عہد و پیمان مراد ہیں یعنی ضربت عليهم الذلة اينما ثقفوا فى عامة الاحوال الا معتصمين او متلبسين بكتاب الله ودينه وذمته وعهده او بعهده او بعهد و ذمة و امان من الناس ترجمہ۔ جمادی گئی ہے ان پر ذلت جہاں بھی پائے جاویں ہر حال میں الا اعتصام بکتاب اللہ اور بدین اللہ کریں۔ اس کے ذمہ امان اور عہد میں داخل ہوجائیں۔ (جس کا حاصل اسلام میں داخل ہونا ہے) یا لوگوں کے ذمہ امان عہد میں داخل ہو جائیں۔ یعنی مسلمانوں کے ساتھ مصالحت ہو یا جزیہ قبول کر کے ذمی بن جاویں۔ یا کسی دوسری قوم کے عہد و ذمہ اور امان میں داخل ہوں یعنی نصاریٰ۔ یہاں لفظ ناس عام ہے۔ نصاریٰ کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ آیت وجاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا الى يوم القيٰمة۔ (آل عمران) میں وعدہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کہ تیرے متبعین کو قیامت تک یہود پر فوقیت حاصل ہوگی۔ اور اتباع سے مراد

اس کے ساتھ اعتقاد نبوت ہے ۔ اور اس میں مسلمان نصاریٰ دونوں شریک ہیں ۔ اور واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ یہود ہمیشہ کیلئے مسلمان یا نصاریٰ کے محکوم آئے ہیں ۔ اور اس وقت بھی یہی حال ہے کہ ساری دنیا میں یہود دوسری اقوام کے زیر اثر و حکومت ہیں ۔ قرآن کریم نے اس ذلت و پستی کی جو علت بیان کی ہے ۔ قتل انبیا علیہم السلا ، حدود شرع و عقل سے تجاوز نافرمانی ، انکار آیات ، دنائت طبع کی بنا پر نعمتوں کی ناشکری اور نفیس کو خسیس اشیاء سے استبدال ، انبیاء کی سرکردگی میں جہاد سے انکار وغیرہ ، قبائح انکا اثر لازم ذلت و ھوان ہے ہاں کبھی دنی اور شریر بالطبع مجازات و مکافات سے تنگ آکر عارضی اور وقتی طور پر راہ راست پر آجاتا ہے ۔ جیساکہ یہود نے بھی عمالقہ کے پے در پے قتل و غارتگری سے تنگ آکر اپنے نبیؑ سے بادشاہ کا مطالبہ کیا ۔ تاکہ اس کی سرکردگی میں جہاد کر کے شاید کامیاب ہو کر کچھ اطمینان کا سانس لیں ۔ اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللّٰہ ۔ مگر بادشاہ طالوت کے تقرر پر بھی شرارت سے باز نہ آئے ۔ اور پھر بھی کثیر تعداد میں قتال سے انکار کر بیٹھے ۔ الحاصل یہود کا موجودہ غلبہ بحبل من الناس کا مصداق ہے ۔ اس طرح سطحی اذہان میں آیت واذ تاذن ربك لیبعثن علیھم الی یوم القیٰمۃ من یسومھم سوء العذاب ۔ ترجمہ :۔ اور اس وقت کو یادکرو جب خبر دی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہوں گا ۔ یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو کہ دیا کرے ان کو بڑا عذاب ۔ ——— سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں یہود کی قیامت تک مقہوریت اور محکومیت کا اعلان کیا گیا ہے ۔ حالانکہ موجودہ وقت وہ قاہر و حاکم ہیں ۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے معروض ۵ کافی ہے ۔ لیکن مزید وضاحت کے لئے آیت کی تفسیر مناسب ہوگی ۔ یہ آیت سورۃ اعراف کی ہے ۔ جو یہود کے تذکرہ میں وارد ہے ۔ اس سے اوپر کی آیات میں یہود کے قبائح اور شرارتوں کا بیان ہوا ہے ۔ آگے اس آیت میں ان کے قبائح کا دنیا میں علاوہ سزائے آخرت کے انجام بد ذکر ہے ۔ یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ اگر یہود احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے ۔ تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتے رہے گا ۔ جو ان کو برے عذاب میں مبتلا رکھیں ۔ برا عذاب یہاں محکومانہ زندگی ، جان و مال کا غیر معصوم ہونا جزیہ دینا وغیرہ ہے ۔ چنانچہ قوم یہود سلیمان علیہ السلام کے بعد کبھی یونانی کبھی کلدانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہی ہے ۔ کبھی بخت نصر اور رومیوں سے شدائد کا تختہ مشق بنی ۔ آخر میں نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک مجوسیوں کی

باجگذار رہی۔ پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط کر دیا گیا۔ غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت اور آزادی کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ جہاں کہیں رہے اکثر ملوک وحکام کی طرف سے سخت ذلت اور خطرناک تکلیفیں اُٹھاتے رہے۔ ان کی مال و دولت وغیرہ کوئی چیز انہیں اس غلامی ومحکومیت کی لعنت سے نجات نہ دے سکی۔ ابھی مشرق وسطیٰ کی لڑائی میں جب یہود نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ تو ان کے وزیر اشکول نے مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر اس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے خود اعتراف کیا۔ کہ تین ہزار سال کے بعد ہم کو بیت المقدس میں داخلہ نصیب ہوا۔ اس عرصہ دراز میں ہماری قوم نے نہایت سخت مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ اور در بدر کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سورۃ ابراہیم میں بنی اسرائیل کے تذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کا خطاب اپنی قوم کو نقل فرمایا ہے۔ جو کہ مذکورہ بالا آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور موسیٰؑ نے اپنی قوم سے واذ تأذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم فرمایا کہ وہ وقت یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان فرمایا۔ کہ اگر احسان مانو گے اور زیادہ نعمتیں ملیں گی۔ ولئن کفرتم إن عذابی لشدید۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت۔ یعنی موجودہ نعمتیں تم سے سلب کر لی جائیں گی۔ اور ناشکری کی مزید سزا ملے گی۔ خدا کی ناشکری اس کی روحانی اور جسمانی نعمتوں کی بے قدری اور نازل کردہ احکام کی نافرمانی ہے۔

تو اسی آیت اور آیت مذکورہ بالا کی سیاق سے واضح ہے کہ محکومیت اور غلامی کی سزا ان کی نافرمانیوں اور ناشکری کی پاداش میں ہے۔ اور قرب قیامت کی قید اس لئے لگادی۔ کہ روایات صریحہ سے ثابت ہے کہ آخر زمانہ میں دجال یہودی چند روزہ حکومت کریگا۔ لیکن یہ چند روزہ حکومت کو عرصہ دراز کی غلامی کی بہ نسبت کالعدم قرار دیکر الی یوم القیامۃ کہا گیا۔ اسی طرح اس عرصہ دراز کے درمیان میں بھی ایسا معمولی وقفہ آیا ہے۔ ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم وامددنٰکم باموال وبنین وجعلنٰکم اکثر نفیرًا۔ پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری ان پر اور قوت دی تم کو مال سے اور بیٹوں سے اور اس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر۔ بابل کا گورنر بخت نصر نے یہود پر مسلط ہو کر ان کو تباہ و قتل کر دیا تھا۔ تقریبًا سو سال کے بہمن بن اسفندیار نے یہود پر رحم کھا کر ان کے قیدیوں کو آزاد کر کے ان پر دانیال کو بادشاہ مقرر کیا۔ اور چند روزہ آزادی ان کو حاصل ہوئی مگر تھوڑے عرصے بعد رومیوں کے ہاتھ سے ان کی تباہی ہوئی اور آزادی سلب ہو گئی۔ تو اس معمولی وقفہ آزادی کی نسبت تین ہزار سال بلکہ اس

سے بھی زائد زمانہ غلامی کی طرف کچھ بھی نہیں ۔ اسی کو استغراق اور استیعاب عرفی کہتے ہیں۔ خطابات اور محاورات میں یہی استیعاب اور استغراق مکمل ہے ۔ اس کی مثالیں حدیث لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق حتی یأتی امر اللّٰہ ۔ یعنی قیامت برپا نہ ہوگی ۔ یہاں تک کہ کوئی دنیا میں اللہ اللہ کہنے والا ہے لیکن یہ عرصہ چونکہ بہ نسبت زمانہ ظہورِ حق بہت کم ہے ۔ اس لئے اس کو کالعدم قرار دیکر حتی یأتی امر اللّٰہ ۔ یعنی قیامت تک کہہ دیا گیا ...... لہٰذا یہود کا یہ معمول وقفہ آزادی آیتِ بالا کے عموم پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔

✡

قومی اسمبلی کا تاریخی فیصلہ

سفارشات اور آئین میں ترمیم کا بل

تحریر...... مولانا سمیع الحق، مدیر ماہنامہ الحق

الحق اپنی نویں منزل کے اختتام پر یعنی ستمبر میں قادیانی مسئلہ کے آئینی حل کی شکل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کیساتھ فتح و شادمانی اور قرب و وصالِ حق کی ایک ایسی نعمت سے سرشار ہوا جس کا شکریہ کسی بھی ناتواں مخلوق کے بس میں نہیں اور نہ ہی اس نعمت کی حلاوت و مسرت کبھی زائل ہو سکتی ہے، انشاء اللہ العزیز اس راہ میں الحق کی ناچیز کوششیں بھی رائیگاں نہیں گئی ہوں گی۔ دسویں سال کے آغاز میں اس نعمت کے شکریہ کے طور پر ہم آقائے نامدار رحمۃ للعالمین خاتم النبیینؐ کی بارگاہِ اقدس میں تاج و تخت ختم نبوت اور ناموسِ ختم المرسلین کے آئینی تحفظ کی تقریب میں ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں اور وہ قادیانی مسئلہ پر مشاہیر علم و فضل اور زعماء ملک و ملت کے جذبات و تاثرات کا حسین گلدستہ ہے۔ اس امید پر کہ کیا عجب ان گلہائے عقیدت کو پیش کرنے والے اور اس کے مرتبین ادارۂ الحق اور تمام قارئین الحق کے لیے قیامت کے دن شافع محشر کی شفاعت و خوشنودی کا ذریعہ بن جائے اور یہی بضاعۃ مزجاۃ بارگاہِ ایزدی سے پروانۂ نجات نصیب ہونے کا وسیلہ بن جائے کہ یہی امید ہی زادِ راہ اور سرمایۂ آخرت ہے، بہرحال الحق کا یہ خصوصی حصہ بارگاہِ ختم المرسلینؐ میں اس التماس کے ساتھ پیش ہے کہ وجئنا ببضاعۃ مزجاۃ فاوف لنا الکیل وتصدق علینا ان اللہ یجزی المتصدقین۔

خراجِ عقیدت کے اس بابرکت ہدیہ میں کوئی بخل کیے بغیر ہم نے بلالحاظِ مشرب و مسلک، ملک و ملت اور علم و فضل سے تعلق رکھنے والے مختلف مکاتبِ فکر کے زعماء، علماء، اہلِ قلم اور اربابِ فکر کو اظہارِ خیال کی دعوت دی، نہ حزبِ اقتدار اور اختلاف میں تفریق کی نہ اپنوں اور غیروں میں کہ ہر ایک رحمتِ کائناتؐ کی رحمتِ کریمانہ کا امیدوار اور طلبگار ہے اور تقریباً سب نے ہی مسئلہ ختم نبوت میں حتی المقدور حصہ لیا۔ ہمیں خوشی ہے اور ہم خلوصِ دل سے ان تمام حضرات کے شکرگزار ہیں جنہوں نے گوناگوں مشاغل اور عوارض کے باوجود ہمیں اپنے احساسات اور تجاویز سے نوازا۔

قادیانی اقلیت کے آئینی فیصلہ پر اس مضمون میں صرف جذباتِ مسرت نہیں بلکہ اندیشے بھی ہیں، ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا گیا ہے، خطرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اور اس پہلو پر بھی مختلف حضرات نے سیر حاصل روشنی ڈالی ہے کہ آئینی فتح کے بعد ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوئے بلکہ اس مسئلے کے ذیلی تقاضے اور بڑھ گئے ہیں جو فوری طور پر حل طلب ہیں اس ضمن میں حکومت کی ذمہ داریوں، مسلمانوں، علماء بالخصوص مجلسِ عمل کے غور و فکر کیلئے اتنے مسائل کی نشاندہی ہو گئی ہے جس پر مزید کچھ اضافہ کیے بغیر ہم ملتِ مسلمہ کے تمام طبقات حکومت، عوام اور دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان نکات پر فوری غور و فکر کر کے انہیں عملی شکل دینے کیلئے کوئی لائحہ عمل تجویز کریں ورنہ کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ اس فتح مبین سے حاصل ہونے والے شاندار نتائج ہماری غفلتوں کی وجہ سے شکست سے زیادہ خطرناک صورت سے نہ بدل جائیں۔ (سمیع الحق ستمبر ۱۹۷۴ء م ۱۳۹۴ھ)

⊕ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہ ماننے والا یا نبوت کا دعویٰ کرنے والے یا مدعی نبوت کو نبی یا مصلح ماننے والا مسلمان نہیں۔

- قادیانیوں کے دونوں گروپوں (لاہوری وقادیانی) کو آئندہ انتخابی فہرستوں یا رجسٹریشن فارم میں غیر مسلم لکھا جائے گا۔
- کوئی شخص ختم نبوت کے عقیدے کے خلاف پرچار نہیں کرسکے گا، خلاف ورزی قابل تعزیر جرم ہوگی۔

---

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء ہماری تاریخ کا نہایت تابناک اور تاریخی دن تھا جب اسلامی جمہوریہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے اس دن اپنے الگ الگ اجلاسوں میں آئین میں ترمیم کا ایک تاریخی بل اتفاق رائے سے منظور کرلیا جس کے تحت پاکستان میں قادیانیوں کے دونوں گروپوں (لاہوری اور قادیانی) کو غیر مسلم آقلیت قرار دیدیا گیا ہے۔ آئین کی دفعات ۱۰۶ اور ۲۶۰ میں ترمیم کرکے یہ قرار دیا گیا ہے کہ ایسا کوئی شخص جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو یا خود کو کسی بھی صورت میں نبی یا مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہو یا ایسے کسی بھی کاذب کو نبی مانتا ہو تو وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ نیز یہ بھی قرار دیا گیا کہ قادیانی اور لاہوری احمدی فرقے کے تمام ارکان کو آئینی قانونی طور پر پاکستان میں بسنے والے دیگر غیر مسلموں کی مانند سمجھا جائے گا اور عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں، بودھوں، پارسیوں اور شیڈول کاسٹس کی طرح ان کے لیے بھی اسمبلیوں میں اضافی نشستیں ہوا کریں گی۔

آئین میں یہ ترمیم قومی اسمبلی کے پورے ایوان پر مشتمل کمیٹی کی سفارشات کو قبول کرتے ہوئے کی گئی۔ یہ سفارشات قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں منظور کیں، ان کے تحت امت مسلمہ کے نظریۂ ختم نبوت کو جو آئینی تحفظ دیا گیا ہے اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا بھی دی جاسکے گی۔ قانون سازی کے ذریعے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف کے بعد ۲۹۵ ب کا اضافہ کیا جائے گا۔ جس کے تحت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کے عقیدہ کے منافی کسی بھی قسم کا پرچار قابل تعزیر جرم ہوگا، سفارشات کے تحت آئندہ انتخابی فہرستوں میں قادیانیوں کا اندراج بھی غیر مسلموں کے زمرے میں ہوا کرے گا۔

آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات میں ترمیم کی صورت

قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کی روشنی میں آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات کی ترمیم کے بعد یہ صورت ہوگی۔

آرٹیکل نمبر ۲۶۰ | جو شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انداز میں نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا کسی ایسے مدعی نبوت یا مذہبی مصلح پر ایمان لاتا ہے وہ از روئے آئین و قانون مسلمان نہیں ہے۔

آرٹیکل نمبر ۱۰۶ کلاز نمبر ۳ | آرٹیکل ۱۰۶ کی کلاز نمبر ۳ میں مذکور طبقوں کے لفظ کے بعد قادیانی یا لاہوری گروپ کے اشخاص جو خود کو "احمدی" کہلاتے ہیں' کے جملے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اضافہ کے بعد کلاز نمبر ۳ کی صورت یہ ہوگی | صوبائی اسمبلیوں، بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کی کلاز نمبر ۱ میں دی گئی نشستوں کے علاوہ ان اسمبلیوں میں عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں، بدھوں، پارسیوں اور قادیانیوں یا شیڈول کاسٹس کے لیے اضافی نشستیں ہوں گی۔

آئین میں دوسری ترمیم کے بل کا متن | یہ قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے لہٰذا بذریعہ ہذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے۔

مختصر عنوان اور آغاز نفاذ | (۱) یہ ایکٹ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔

(۲) یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

آئین کی دفعہ نمبر ۱۰۶ میں ترمیم | اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا' دفعہ نمبر ۱۰۶ کی شق نمبر ۳ میں لفظ "اشخاص" کے بعد الفاظ اور قوسین اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) درج کیے جائیں گے۔

آئین کی دفعہ نمبر ۲۶۰ میں ترمیم | آئین کی دفعہ نمبر ۲۶۰ میں شق نمبر ۲ کے بعد حسب ذیل نئی شق درج کی جائے گی:-

(۳) جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' جو کہ آخری نبی ہیں' کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے' وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔

بیان و اغراض | جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارش کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے کہ اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اُسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔ (عبدالحفیظ پیرزادہ وزیر قانون)

تاریخی قرارداد کا متن

قومی اسمبلی کے پورے ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی نے متفقہ طور پر جو قرارداد طے کی ہے اور جس کی سفارشات کو قومی اسمبلی نے منظور کیا ہے وہ یہ ہے:۔

○ قومی اسمبلی کے کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی متفقہ طور پر طے کرتی ہے کہ حسب ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور اور منظوری کے لیے بھیجی جائیں۔

○ کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی اپنی راہنما کمیٹی اور ذیلی کمیٹی کی مدد سے اس کے سامنے پیش یا قومی اسمبلی کی طرف سے اس کو بھیجی گئی قرارداد وں پر غور کرنے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور گواہوں بشمول سربراہان انجمن احمدیہ ربوہ و انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی شہادتوں اور جرح پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات پیش کرتی ہے:۔

(الف) یہ کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے:

(اول) دفعہ ۱۰۶ (۳) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

(دوم) دفعہ ۱۰۶ میں ایک نئی شق کے ذریعے غیر مسلم کی تعریف درج کی جائے۔

مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لیے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مسودۂ قانون منسلک ہے۔

(ب) یہ کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں مندرجہ ذیل تشریح درج کی جائے۔

تشریح: کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق ۳ کی تشریحات کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔

(ج) یہ کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء منتخبہ قانونی اور ضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

(د) کہ پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں ، کی جان و مال ، آزادی ، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔

(۱) عبدالحفیظ پیرزادہ (۲) مولانا مفتی محمود

(۳) مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی (۴) پروفیسر غفور احمد

(۵) غلام فاروق (۶) چوہدری ظہور الٰہی

(۷) سردار مولا بخش سومرو۔

قادیانیوں کے بارہ میں صدارتی آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۴ء کا مُکمّل متن

سنہ ۱۹۷۴ء میں آئین میں ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے تقریباً دس سال بعد جنرل ضیاء الحق مرحوم نے مجلسِ شوریٰ میں شامل مولانا سمیع الحق صاحب اور دیگر ممبرانِ مجلس کی کوششوں سے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کی، ذیل میں اس آرڈیننس کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

قادیانی گروپ، لاہوری گروپ اور احمدیوں کو اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوّث ہونے سے روکنے کے لیے قانون میں ترمیم کرنے کے لیے آرڈیننس۔ چونکہ یہ ضروری ہے کہ قادیانی گروپ، لاہوری گروپ اور احمدیوں کو اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوّث ہونے سے روکنے کے لیے قانون میں ترمیم کی جائے۔ اور چونکہ صدر اس بات سے مطمئن ہیں کہ ایسے حالات موجود ہیں جن کے تحت فوری کاروائی کرنا ضروری ہے، اس لیے اب ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فرمان کے تحت اور اس سلسلے میں تمام اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے صدر مندرجہ ذیل آرڈیننس کا اجراء کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں:

حصہ ابتدائیہ

مختصر عنوان اور آغاز

(۱) اس آرڈیننس کو قادیانی گروپ، لاہوری گروپ اور احمدیوں (ممانعت اور سزا) کا آرڈیننس ۱۹۸۴ء کہا جائے گا۔

(۲) یہ فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔

(۳) آرڈیننس کو عدالتوں کے احکامات اور فیصلوں پر فوقیت ہوگی، اس آرڈیننس کی دفعات کسی بھی عدالت کے حکم یا فیصلے کے باوجود مؤثر ہوں گی۔

حصہ دوم (II) تعزیرات پاکستان (۱۸۶۰ء کا قانون) میں ترمیم

تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ ۲۹۸ ب اور ۲۹۸ ج کا اضافہ : تعزیراتِ پاکستان کے پندرہویں باب میں دفعہ ۲۹۸ الف کے بعد درج ذیل نئی دفعات شامل کی گئی ہیں :-

۲۹۸ ب : مقدس شخصیتوں اور مقامات کے لیے مخصوص اصطلاحات کا غلط استعمال۔

(۱) قادیانی گروپ یا لاہوری (جو اپنے آپ کو احمدی یا کوئی اور نام دیتے ہیں) کا کوئی شخص جو زبانی یا تحریری الفاظ یا ظاہری واضح طریقے کے ذریعے (الف) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خلیفہ یا صحابی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو "امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین، صحابی یا رضی اللہ عنہ" کہتا ہے یا اس نام سے مخاطب کرتا ہے۔ (ب) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے علاوہ کسی دوسری عورت کو "ام المؤمنین" کے نام سے مخاطب کرتا ہے یا کہتا ہے۔ (ج) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "اہلبیت" کے علاوہ کسی اور شخص کو اہلبیت کہتا ہے یا مخاطب کرتا ہے، یا (د) اپنی عبادت گاہ کو "مسجد" کا نام دیتا ہے۔

اُسے تین سال قید کی سزا دی جائے گی اور جرمانہ کا بھی مستوجب ہو گا۔

(۲) قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں یا کوئی بھی دوسرا نام دیتے ہیں) کا کوئی شخص لفظوں کے ذریعہ بول کر یا لکھ کر اپنے عقیدے میں اختیار کیے گئے عبادت کی خاطر بلانے کے طریقہ کار کو اذان کہے گا یا مسلمانوں کی طرح اذان دے گا تو اسے تین سال تک قید کی سزا دی جائے گی اور جرمانہ کا بھی مستوجب ہو گا۔

۲۹۸ سی : قادیانی گروپ وغیرہ کا شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو یا اپنے عقیدے کی تبلیغ یا تشہیر کرتا ہو : قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں یا کوئی بھی دوسرا نام دیتے ہیں) کا کوئی شخص جو اپنے آپ کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر مسلمان ظاہر کرے گا یا بولے گا یا اپنے عقیدے کی تبلیغ یا تشہیر کرے گا یا لفظوں کے ذریعہ بول کر یا لکھ کر یا کسی بھی دوسرے نمایاں طریقے سے دوسروں کو اپنا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو تو اسے تین سال تک قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔

(۳) آرڈیننس کے ذریعے مجموعہ ضابطہ فوجداری ۱۸۹۸ء کی دفعہ ۹۹ ۔ الف میں بھی ترمیم کی گئی ہے جس کے ذریعے صوبائی حکومتوں کو کسی ایسے اخبار، کتاب یا دیگر دستاویز کو ضبط کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جو مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں شامل کردہ نئی دفعات کی خلاف ورزی میں

چھاپی گئی ہو، آرڈی ننس کے ذریعے مغربی پاکستان پریس اور پبلی کیشنز آرڈی ننس ۱۹۶۳ء کی دفعہ ۲۴ میں کی ترمیم کے ذریعے صوبائی حکومت کو اختیار مل جائے گا کہ وہ مجموعہ تعزیرات پاکستان میں شامل کردہ نئی دفعات کی خلاف ورزی کرنے والی کسی کتاب یا دستاویز کی طباعت یا اشاعت کے لیے استعمال ہونے والے پریس کو بند کر دے، اُس اخبار کے ڈیکلریشن کو منسوخ کر دے جو ان دفعات کی خلاف ورزی کرے اور کسی ایسی کتاب یا دستاویز کو ضبط کرے جس میں ایسا مواد شامل ہو جس کی طباعت یا اشاعت مذکورہ دفعات کی رُو سے ممنوع قرار دی گئی ہے۔

◇

قادیانی مسئلہ میں مسلمانوں کی فتح مبین

علماء کرام کی جد وجہد اور مسلمانوں کے پُرزور مطالبہ سے مجبور ہو کر جب حکومت نے قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے ۱۲ ستمبر ۱۹۷۴ء کو خطبۂ جمعۃ المبارک میں طویل اور مفصل خطاب فرمایا تھا، جسے اب قادیانیت کی مناسبت سے فتاویٰ میں شامل کیا جا رہا ہے ــــــــــــ (مرتب)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۰
قال اللہ تبارک وتعالیٰ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۰

میرے محترم بھائیو! اللہ جل جلالہٗ کا پاکستان اور ساری دنیا کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے اور ایک فتح عظیم اللہ نے مسلمانوں کو دی ہے۔ ہمارے جسم کا ایک ایک رواں بھی اگر سربسجود ہو کر اُس احسان اور نعمت کا جو اللہ نے ہم پر فرمائی ہے، شکر ادا کرنا چاہے تو ادا نہیں کر سکے گا۔

قصرِ نبوتؐ کی حفاظت

بھائیو! ہم اور آپ اپنی جان، اپنے مال، اپنے بچوں کا انتظام کرتے ہیں، ہر شخص اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق ایک گھر بناتا ہے، چار دیواری کھینچتا ہے، دروازے لگاتا ہے صرف اسلئے کہ میرا گھر اور بال بچے چوروں، ڈاکوؤں اور دوسرے خطرات سے محفوظ رہیں، اور جب گھر کی ہر طرح حفاظت ہو جائے تو سب کی خوشی کا باعث ہوتا ہے ــــ دنیا میں ہر قوم اپنے ملک کی حفاظت کرتی ہے ــــ پاکستان ہمارا ملک ہے ہم اسکی سرحدات کی حفاظت کرتے ہیں، ملک میں کسی قسم کی خلفشار برداشت نہیں کرتے۔ ہر ملک کے حکمران اپنے بجٹ میں اربوں روپے رکھتے ہیں، پولیس داخلی خلفشار کو روکتی ہے، فوج بیرونی حملوں سے حفاظت کرتی ہے، ملکی سرحدات کی حفاظت کیلئے ہزاروں لاکھوں لوگ قربان ہو جاتے ہیں اور جب ملک محفوظ ہو جائے تو قوم فتح کی خوشی مناتی ہے۔

تو جیسا کہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو، ماں باپ اور اولاد کی حفاظت ہو جانے سے ہمیں خوشی ہوتی ہے، روح کو اطمینان ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے نزدیک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس

ان سب چیزوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ تو جب حضورؐ کی عزت و ناموس، ان کی شانِ رفیع، ان کے بلند مرتبہ و مقام کی حفاظت ایک چور اور ڈاکو سے ہو جائے تو کتنی خوشی ہو گی؟

بیوی بچوں اور ماں باپ کی حفاظت سے زیادہ اس پر خوشی ہوتی ہے۔ ملک کی حفاظت ہو جائے وہ بھی خوشی کی بات ہے، مگر اس سب سے بڑھ کر مسرت یہ ہے کہ دینِ اسلام محفوظ ہو، اور حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ناموس، عزت و مرتبت کو خداوند تعالیٰ محفوظ فرما دے۔

ختمِ نبوت میرے محترم بزرگو! اللہ جل مجدہٗ نے مسلمانانِ پاکستان اور عالمِ اسلام پر بہت بڑی مہربانی ۷ ستمبر کی تاریخ کو فرمائی۔ اس لیے کہ قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت جو اپنے کو احمدی کہلاتے ہیں، ان کا پیشوا ــــ مرزا غلام احمد قادیانی ــــ وہ نقب لگا رہا تھا خاتم النبوۃ کے قلعہ میں اور اس تاجِ عظیم میں دست اندازی کر رہا تھا جو ختمِ نبوت کی شکل میں اللہ جلّ مجدہٗ نے حضورؐ کے سر پہ رکھا تھا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ آپؐ کی ذات سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور دیکھئے ہر چیز کی دنیا میں ایک انتہا ہوتی ہے سوائے خدائے حی و قیوم کے کہ وہ سرمدی، ابدی، ازلی، دائمی ہیں، ان کے علاوہ ہر چیز کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک انتہاء، ایک آغاز ہوتا ہے اور ایک کمال، انسان ہی کو لیجئے پہلے بچہ ہوتا ہے پھر ترقی کرتے کرتے ۴۰ سال میں کمال کو پہنچتا ہے، پھر زوال پھر ختم ہوتا ہے اور قبر میں جاتا ہے۔

یہی حالت ہر چیز کی ہے، نبوت کا سلسلہ اللہ جلّ مجدہٗ نے حضرت آدمؑ سے شروع فرمایا اور نبئ کریمؐ کی ذاتِ بابرکات پر اسے کمال اور عروج تک پہنچا دیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ اس مقام و مرتبہ پر اللہ نے حضورِ اقدسؐ کو فائز فرمایا۔

متنبّی کذّاب اور توہینِ انبیاءؑ مرزا غلام احمد قادیانی نے ختمِ نبوت سے انکار کیا اور خود نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا، ایک شخص جب بے حیا ہو جائے تو اس کے لیے پھر کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ اذا لم تستحی فافعل ما شئت جیسے دنیا وی چور ہوتے ہیں پہلے چوری چھپے معمولی معمولی چیزیں چراتے ہیں پھر بڑھتے بڑھتے بالکل جری ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح مرزا قادیانی نے بھی پہلے یہ کہا کہ میں آدم ہوں، نوح ہوں، ابراہیم ہوں، موسیٰ اور عیسیٰ ہوں، پھر یہاں تک کہا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں بلکہ سب انبیاء سے بھی افضل ہوں ــــ ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ میری شکل میں آج آئے ــــ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ بھی کہا کہ حضورِ اقدسؐ پہلی رات کے چاند ہیں تو میں چودھویں صدی میں آیا ہوں تو میں بدر (چودھویں کا چاند) ہوں ــــ یہ مرزا کی وہ باتیں

ہیں جن کا اسمبلی میں بھی مرزا ناصر سے انکار نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنے آپ کو بدرِ کامل اور حضور افضل الانبیاء والمرسلین کو پہلی رات کا چاند کہا، اُس نے صرف ایک نبی کی توہین نہیں کی بلکہ سید الکائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی اور تمام انبیاء کی بھی توہین کی ہے۔ کہتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریمؑ کون ہے جو میرے منبر پر قدم بھی رکھ سکے؟

مسلمانوں کی تکفیر بھائیو! یہ ایک کذّاب اور بہت بڑا چالاک شخص تھا، اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کا امتحان کرانا تھا، اور مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضور اکرمؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد قیامت تک نیا نبی نہ مبعوث ہوگا نہ آسکتا ہے، نہ کوئی ظلّی نہ بروزی۔ اور مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نجات و فلاح دنیا کی ہو یا آخرت کی صرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے جنت بھی آپؐ کے اتباع سے ہی ملے گی۔ مگر مرزا قادیانی کہتا ہے کہ جس نے میری پیروی نہ کی اور مجھے نبی نہ مانا، خواہ اس نے میرا نام بھی نہ سُنا ہو، پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا ہو لیکن مجھ پر ایمان نہ لایا تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج اور پکا کافر ہے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا اور جنت ہمیں اُس نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سے دے گا جو حضور اقدسؐ نے ہمیں بتلائے لیکن مرزا کہتا ہے کہ نہیں جو میں کہوں گا حلال و حرام اس کی بھی پیروی کرنا ہوگی۔

نسخ جہاد ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ: الجنۃ تحت ظلال السیوف، جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ جو مسلمان اللہ کی رضا کے لیے، ملک و قوم اور اسلام کی حفاظت کے لیے جہاد کرتا ہے اُسے جنّت نصیب ہوگی۔ وہ انگریز سے، سکھ سے، ہندو سے جہاد کرتا ہے تو اگر اس پر تلوار کا سایہ بھی پڑ گیا تو بلا حساب کتاب کے جنت میں جائے گا۔ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ الجہاد ماضٍ الیٰ یوم القیٰمۃ، جہاد قیامت تک جاری رہے گا، منسوخ نہ ہُوا ہے نہ ہوگا۔ ہر دور میں جب کفر کا مقابلہ آیا ہم جہاد کریں گے، حتیٰ کہ حضور اقدسؐ فرماتے ہیں کہ تمہارا امیر اور تمہارا حاکم بدکردار اور بدعمل ہے اور تم اس سے ناراض بھی ہو مگر جب اس نے جہاد کا نعرہ بلند کیا تو اس کا ساتھ دینا پڑے گا۔

ایوب خان سے کون خوش تھا؟ مگر جب اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ کر جہاد کا نعرہ بلند کیا تو سب کو معلوم ہے کہ منبر و محراب سے آواز اٹھی کہ آگے بڑھو، یہ نہ دیکھا کہ ایوب خان سے لوگ خوش ہیں یا نہیں! یحییٰ خان شرابی زانی ہے یا نہیں؟ تو بھی ہے مگر اب وقت ہے جہاد کا ۔۔۔ تو جہاد کی اتنی اہمیت ہے، جہاد قیامت تک رہے گا، حقیقت یہ ہے کہ جس قوم سے جہاد اٹھ گیا تو وہ قوم بے عزت ہو کر رہ گئی، اصل زندگی جہاد ہی میں ہے۔ ارشادِ ربانی ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥

انگریز کی اطاعت

مرزا قادیانی کہتا ہے کہ اب جہاد حرام ہے، قطعی حرام ہے، اور جس مسلمان کے دل میں انگریز کی مخالفت کا خیال گذرے تو وہ بھی جہنمی ہے۔

مرزا قادیانی نے اپنی امت کو جو پانچ بنیادی اصول اپنی دعوت کے بتلائے اور وہ مرزائی مذہب کی پنج بنا ہے، جیساکہ ہم مسلمانوں کے پانچ اصول کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہیں ــــ تو مرزا قادیانی کے بنیادی اسباق میں یہ ہے کہ برطانیہ اور حکومتِ انگلشیہ کی وفاداری اور اطاعت وتابعداری کرنا ہوگی ــــ اور ہم نے یہ بھی اسمبلی میں مرزا ناصر احمد سے تسلیم کروالیا کہ یہ تو تمہارے مذہب کی پنج بنا ہے ــ ایک وقت آئے گا کہ یہ سب مباحث قوم کے سامنے بھی آجائیں گے۔ انشاء اللہ

جہاد کو مرزا نے بالکل حرام کہا، عراق جب انگریزوں نے فتح کیا تو ان لوگوں نے قادیان میں چراغاں کیا، لوگوں نے کہا کہ مسلمان تو رو رہے ہیں کہ انگریز نے ایک اسلامی ملک پر قبضہ کرلیا ہے اور تم چراغاں کرکے خوشیاں منارہے ہو؟ کہا ہاں ٹھیک ہے، اس لیے کہ یہ انگریز تو ہماری تلوار ہے اور یہ تلوار جہاں جہاں پہنچے گی وہاں مرزائیوں کی فوج بھی جائے گی۔ چنانچہ فرنگی نے عراق کا پہلا گورنر ایک قادیانی کو مقرر کیا، ترکوں سے لڑائی میں انگریزوں کو فتح ہوئی تو مرزائیوں نے انہیں مبارکباد دی کہ شکر ہے کہ خدا نے انگریز کو کامیاب کیا۔

ملک اور قوم سے غدّاری

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان لوگوں کا کردار کیا ہے اور عزائم اور محرکات کیا ہیں؟ پاکستان بننے کے بعد پہلے تو ان کا یہ ارادہ تھا کہ کشمیر کو قادیانی ریاست بنا دیا جائے، مگر جب مسلمان سمجھ گئے تو انہوں نے جیلیں بھر دیں اور ان کے عزائم ناکام بنا دیئے۔ اس کے بعد مرزا بشیر الدین نے اپنے لوگوں کو تلقین کی کہ بلوچستان کا رقبہ بہت وسیع ہے مگر مسلمانوں کی مردم شماری کم ہے اس لیے قلتِ تعداد کی بنا پر اس کو قادیانی ریاست بنانا بہت آسان ہے، اگرچہ وہ غیر آباد رقبہ ہے مگر جب اپنا ایک الگ صوبہ ہوگا تو ایک حیثیت ہوگی۔ یہ بات بھی اسمبلی کی بحث میں مرزا ناصر سے منوائی گئی، انکار کیسے ہوسکتا تھا کہ تحریرات، حوالے، کتابیں موجود تھیں یہ بھی ثابت کرا دیا کہ تقسیمِ ہند کے وقت تحصیل گورداسپور جہاں قادیان ہے، انہوں نے خود یہ درخواست دی ۲۸ برس پیشتر کہ ہم ایک الگ فرقہ ہیں۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کہا کہ ہمیں بھی دیگر اقلیتوں عیسائیوں وغیرہ کی طرح الگ نشستیں مقرر کرادی جائیں، اگر اُس وقت یہ درخواست نہ دی ہوتی تو یہ مسلمانوں میں شمار ہوجاتے اور شاید یہ علاقہ پاکستان کے ہاتھ میں ہوتا اور کشمیر بھی نہ نکلتا، یہ تقسیم آخر میں پاکستان کے ساتھ غداری تھی، تو گویا ۲۸ سال پہلے ان کی جو درخواست تھی وائسرائے ہند کے نام، وہ ۷ ستمبر کو اسمبلی کے ذریعے منظور ہوئی۔

اسمبلی میں اتمامِ حجت

یہ بھی یاد رہے کہ اسمبلی یا پاکستان نے انہیں کافر نہیں بنایا وہ خود تقریباً ۹۰ سال سے تمام مسلمانوں کو کافر اور پکے کافر کہہ رہے ہیں کہ پکے کافر ہیں کچے بھی نہیں۔

جب اسمبلی میں مرزا ناصر سے یہ پوچھا گیا کہ مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہو؟ تو نظر نیچی کر کے کہا کہ ہاں مسلمانوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ تو ہم نے مرزا غلام احمد اور مرزا بشیر الدین کی ایسی عبارتیں پیش کیں کہ وہ تو کافر کہتے ہیں۔ کہا کافر ہیں مگر کچی قسم کے کافر ہیں، معمولی قسم کے کافر ہیں۔ تو ہم نے کہا اچھا وہ تو اسی عبارت میں کہتا ہے کہ کافر ہیں اور پکے کافر ہیں، تو اب پکے کافر کچے کیسے ہو گئے؟ والد اور دادا تو ہم سب کو کافر کہتا ہے، سمجھتا ہے، تم کیسے مسلمان کہہ سکتے ہو؟ تو خاموش۔ پھر ہم نے دوسرا نکتہ یہ اٹھایا کہ اچھا مسلمانوں کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اور جب مسلمانوں کے قائدِ اعظم وفات پا گئے اور ان کے تو مرزائیوں اور ظفر اللہ پر بڑے احسانات تھے کہ ظفر اللہ کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا، اور یہ جو پھیلے ہیں تو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں پھیلے ہیں کہ وزارتِ خارجہ کے ذریعہ سفارتخانے قادیانیوں سے بھر دیئے گئے، جتنا بھی خرچ ہوتا رہا اس کی کوئی پوچھ گچھ نہ تھی، یہ کتنا بڑا احسان تھا قائدِ اعظم کا، جب ان کا انتقال ہوا تو ظفر اللہ نے اپنے بڑے محسن پر بھی نمازِ جنازہ نہ پڑھی۔ کیونکہ ان کا جنازہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھایا اور شاید قائدِ اعظمؒ کی وصیت بھی تھی کہ میرا جنازہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ پڑھائیں گے۔ الغرض انکی اقتداء میں نمازِ جنازہ نہ پڑھنا اگر عذر تھا تو ہمارے وکیل نے کہا کہ اچھا اس ملک میں تو قائدِ اعظم کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی گئی، وکیل نے کہا کہ میں ان دنوں لندن میں تھا وہاں بھی مسلمانوں کے اکثر فرقے جمع ہوئے اور قائدِ اعظم کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تو کیا کسی غائبانہ نمازِ جنازہ میں بھی کوئی قادیانی شریک ہوا تھا؟ کہا مجھے نہیں معلوم۔ وکیل نے کہا کہ ہر جگہ تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نہیں تھے؟ بلکہ وجہ خود ظفر اللہ نے بیان کر دی تھی کہ میں اپنے آپ کو کافر حکومت کا مسلمان ملازم سمجھتا ہوں یا مسلمان حکومت کا کافر ملازم، یعنی ملازم پر یہ ضروری نہیں کہ جنازے بھی پڑھے۔

انگریز کی مدح سرائیاں

الغرض مرزائیوں کو غیر مسلم سمجھنے کے ہزاروں شواہد اور دلائل ہمارے پاس موجود ہیں اور ان کی کتابیں ایسی تحریروں سے بھری پڑی ہیں۔

مرزا قادیانی نے انگریز کی مدح سرائی میں کہا کہ میں نے پچاس الماریاں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تلقین پر لکھی ہیں۔ انگریز لیفٹیننٹ گورنر کو مرزا نے لکھا کہ میں تو انگریز کا خود ساختہ پودا ہوں، اب اس خود ساختہ پودے کی آبیاری بھی تم کرو گے، اور مجھ پر اور میری جماعت پر خصوصی عنایت بھی کرنا ہو گی، ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں مستقل کتاب لکھی، تحفہ قیصریہ کے نام سے اسے منسوب کیا۔

الغرض انسان حیران رہ جاتا ہے مرزا کی خوشامد اور جی حضوری کو دیکھ کر۔ ہم تو اسمبلی میں دو چار مولوی ہیں، انگریزی خوان طبقہ بھی جو اسمبلی کے ارکان کا تھا وہ بھی انگریز کی اتنی حمد و ستائش سن کر حیران رہ گیا اور کہا کہ نبی تو کیا ایسا شخص تو کوئی شریف انسان بھی نہیں کہلا سکتا، نبی ہونا تو بڑی بات ہے، اتنی چاپلوسی کا تصور تو ہم انگریزی خوانوں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ملکہ وکٹوریہ کو دام اقبالہا کہنا، اور یہ کہ تیرا یہ تخت اقبال ہمیشہ باقی رہے، تو ظل اللہ ہے اور وہ مسلمان ملعون ہے، بدقسمت ہے جو تیری حکومت کے خلاف خیال کو بھی دل میں جگہ دے ۔ تو اتنی چاپلوسی تو کوئی بھنگی بھی نہیں کر سکتا، پھر ایک کافر حکومت کی، انگریز کی ۔

اور یہ حقیقت ہے کہ جب انگریز نے ہندوستان میں آکر قدم جمایا تو اس وقت انگریز کے خلاف شاہ عبدالعزیزؒ اور دیگر اکابر نے جہاد کا فتویٰ دیا، جہاد کی تحریک اٹھی، سینکڑوں مسلمان پھانسی ہوئے اور جہاد کا نعرہ بلند ہوا تو مسلمان جہاد کے لیے جان و مال قربان کرنے پر تیار ہو گئے، انگریز کو اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کو غلام رکھنے کا علاج سوائے اس کے نہیں کہ ان کے دلوں سے جہاد کا جذبہ نکال دیا جائے، اور اس کے لیے ایک فرضی نبی کھڑا کر دیا جائے اور وہ جہاد کو حرام قرار دے۔ یہی تو وہ خود کاشتہ پودا ہوتا تھا جس کا اقرار مرزا نے اپنی تحریروں میں کیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی میرے والد نے پچاس سوار گھوڑوں سمیت انگریز کو پیش کیے۔

بہرحال مرزائی ہم مسلمانوں کو ۹۰ سال سے کافر کہتے آرہے تھے اور جب یہی چیز اسمبلی میں پیش ہوئی تو اپنی مطلب برآری کے لیے اس کا انکار کرنے لگے، تو جب وہ عبارتیں پیش ہوئیں کہ تم نے تو مرزا کو نہ ماننے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج، کافر اور پکا کافر کہا ہے۔ تو کہا کافر تو ہیں مگر ملت میں داخل ہیں اور ملت کے تین دائرے ہیں، ایک اسلام، ایک اسلام سے نیچے اور ایک تیسرا درجہ ہے۔ راناحنیف صاحب مرکزی وزیر ہیں اسمبلی سے باہر ملے، بیمار پڑے ہوئے تھے میں نے کہا وزیر صاحب! کیا حال ہے؟ ہنس کر کہا مولانا! ابھی تک تو تیسرے دائرے میں پھر رہا ہوں، پتہ نہیں اس سے بھی کب نکالتے ہیں۔

معاشرتی تعلقات سے ممانعت

مرزا ناصر سے کہا گیا کہ مسلمانوں کے معصوم بچوں پر جنازہ کا کیا حکم ہے، آپ کے بڑوں نے تو کہا تھا کہ بالکل ناجائز ہے اور جس طرح تم ہندو، سکھ، عیسائی بچوں پر جنازہ نہیں پڑھ سکتے اسی طرح غیر مرزائی مسلمان بچوں کا حکم ہے اس لیے کہ کافر کا بچہ کافر کا تابع ہے، مسلمان کافر تو اس کا بچہ بھی کافر ہی ہو گا۔

نکاح کے بارہ میں کہا کہ کیا کوئی مسلمان عورت فرنگی یا ہندو یا سکھ سے نکاح کر سکتی ہے؟ اگر نہیں تو کسی مرزائی عورت کا بھی مسلمان مرد سے نکاح جائز نہیں البتہ مرزائی مسلمانوں کی لڑکیاں اپنے عقد میں لے سکتے ہیں جیسے کہ اہلِ کتاب کی ـــــ یہ تھا نکاح کے بارے میں ان کا عقیدہ۔

الغرض بھائیو! اسمبلی میں (قادیانیوں پر) جرح کے لیے سینکڑوں سوالات داخل کیے گئے جن میں سے چند کا انتخاب ہوا اور جرح و بحث کا محور زیادہ تر دو چار اصولی باتیں رہیں۔ الحمدللہ پاکستان کے آئین میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا ذکر پہلے بھی موجود تھا، صدر اور وزیر اعظم کے حلف کی عبارت میں تو ختم نبوت کا جھگڑا طے شدہ تھا کہ مسلمان صرف وہی ہوگا جو حضور اقدسؐ کو اللہ کا آخری نبی مانتا ہو، یہاں کمیٹی کی بحث میں یہ طے کرانا تھا کہ کیا مرزا نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں؟ اور کیا اس کے پیروکار اس کو نبی مانتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا ان کے نزدیک ان کے نہ ماننے والے غیر مرزائی مسلمان ہیں یا کافر؟ تو ربوہ والوں نے اور لاہوری مرزائیوں نے بھی یہ سب چیزیں مانی ہیں اور اقرار کیا کہ وہ الگ امت اور گروہ ہیں۔

لاہوری فرقہ کی منافقت

اور لاہوریوں کا ربوہ والوں سے جھگڑا تو محض خلافت اور گدی نشینی کا تھا لیکن وہ بھی منافقت سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے مسلمانوں کو مسلمان کہنے لگے، جرح کے دوران لاہوریوں نے بھی اقرار کیا کہ تم لوگ حقیقی مسلمان تو نہیں ہو البتہ مجازی مسلمان ہو۔ اور جب مرزائیوں سے اس دورنگی کردار کے بارے میں پوچھا گیا کہ مسلمانوں کو کافر بھی سمجھتے ہو اور ان کے لیے مسلمان کا نام بھی استعمال کرتے ہو؟ تو جواب دیا کہ حقیقی مسلمان تو نہیں ہو البتہ دنیا میں ایک قوم مسلمان کے نام سے معروف ہے اس لیے ہم بھی عرفاً تمہیں مسلمان کہتے ہیں ـــــ یہود وہ قوم تھی جو حضرت موسیٰ پر ایمان تو لائی مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر ان کا انکار کرنے کے بعد کافر ہو گئے مگر معروف ابھی تک یہودی نام سے ہیں، عیسائی حضور نبی کریمؐ کی آمد کے بعد آپؐ کی نبوت کا انکار کرنے سے کافر ہو گئے عیسائی نہ رہے مگر کہلاتے اب بھی عیسائی ہیں، اور جس طرح عبداللہ نامی شخص اللہ کی سرکشی اور نافرمانی کے باوجود عبداللہ کہلاتا ہے حقیقی نہیں صرف نام کی شہرت کی وجہ سے، اسی طرح ہم نے بھی کہیں کہیں مسلمانوں کو مسلمان کہا ہوگا۔

لاہوری مرزائیوں نے حدیثِ نبویؐ سینزل نبی اللہ عیسٰی بن مریم کے ضمن میں اعتراف کیا کہ مرزا نبی تھا۔

الغرض جب نوّے سال سے وہ خود ہمیں کافر کہتے رہے، سمجھتے رہے اور اپنے آپ کو الگ امت اور گروہ، مگر اب انہیں اپنے نہ ماننے والے "ان کافروں" میں شرکت پر اصرار محض مفاد حاصل کرنے اور در پردہ مارِ آستین

بنے رہنے کے لیے ہے۔ اس برِصغیر میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی بھتے مگر ہندو زیادہ بھتے اور مسلمان کم، تو اقلیت کو نقصان ہوتا ہے۔

اسلام کے نام پر اسلام دشمنی

اب مرزائیوں نے یہ چاہا کہ شامل تو مسلمانوں میں رہیں اور اسی نام سے اختیارات اور حقوق پر قابض ہوں اور کاروائی ان کے ساتھ غیر مسلموں جیسی ہو۔ حالانکہ کسی بھی مسلمان کی غیرت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ وہ ہندو، سکھ یا عیسائی اکثریت میں محسوب رہے، اور یہ مرزائی طبقہ انتہائے غیرت ہے کہ ہم مسلمان تو ان کے نزدیک ہندو اور سکھ سے بھی بڑھ کر کافر، مگر ان "کافروں" میں شرکت پر ان کا ہمیشہ اصرار رہا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا ہو جانے سے مفادات پر ضرب پڑے گی اور سازشیں نہیں کرسکیں گے۔

تقسیمِ ہند کے وقت تحصیل گورداسپور صرف ان کی وجہ سے بھارت میں شامل ہوئی کہ انہوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے پیش کرنا چاہا، اس وقت اپنے آپ کو غیر مسلموں میں شمار کر کے مسلم آبادی کی تعداد کم کرادی گئی۔ یہ بات بھی اسمبلی میں ثابت کر دی گئی اور یہی چیز کشمیر کے ہاتھ سے جانے کا بھی پیش خیمہ بنی۔

اسرائیل سے تعلقات

اسرائیل سارے عالم کا دشمن ہے، سارے مسلمانوں کے تعلقات اس سے نہیں، مگر مرزائی ہیں کہ ان کے مشن وہاں قائم ہیں[۱]، یہ مسلمانوں میں گھل مل کر اور ان کے اعتماد اور بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر سارے راز ایسے مشنوں کے ذریعہ دشمنوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ تو یہ لوگ مذہبی طور پر تو بھتے ہی دشمنِ اسلام مگر سیاسی طور پر بھی پاکستان اور عالمِ اسلام کی جڑیں کاٹتے رہے، یہ تو اللہ نے فضل کیا کہ ربوہ ریلوے اسٹیشن کا سانحہ ظاہر ہو گیا ورنہ اسی سال یا بہت جلد ان کے ہاتھوں ملک انقلاب اور خانہ جنگی کا نشانہ بن سکتا تھا، خداوند تعالیٰ کو اس ملک کی، اس حکومت کی، اس قوم کی مدد کرنی تھی، ورنہ یہ تو پاکستان کی سیاست پر، افواج پر، پاکستان کی اقتصادیات اور کلیدی عہدوں پر قابض ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اسمبلی کا متفقہ فیصلہ

اور مذہبی طور پر تو پہلے ہی روز سے بھتے ہی غیر مسلم اور کافر، مگر قومی اسمبلی نے بھی متفقہ طور پر آئین میں ان کی اس حیثیت کو شامل کر لیا، اسمبلی میں انگریزی خوانوں کی اکثریت تھی، تو یہ صرف علماء کا فیصلہ نہیں، نئی دنیا تو منبر و محراب سے اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنی کہ پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں سے، اور الحمدللہ کہ وہاں اسمبلی میں تمام ارکان نے، ہر پارٹی کے ارکان نے، سب نے سو فیصد متفق ہو کر فیصلہ دیدیا، سب ارکان مسئلہ کی گہرائیوں اور حقیقت کو سمجھ گئے ـــ وہاں طالب علموں کی طرح

---

[۱] ان تعلقات کی تفصیل جاننے کیلئے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی شائع کردہ کتاب "قادیان سے اسرائیل تک" کا مطالعہ ضروری ہے۔ (مرتب)

بحث و مباحثہ کا دور دورہ رہا، تو یقین و بصیرت کے ساتھ اور بڑی مسرتوں کے ساتھ سب کے سب ارکان نے آئین میں یہ ترمیمیں کریں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس شخص نے جس نوع سے بھی اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور جو اس پر ایمان لایا، اسے مذہبی مصلح سمجھا وہ غیر مسلم ہوگا اور مرزائی قادیانی، لاہوری جو خود کو احمدی کہلاتے ہیں غیر مسلم اقلیت ہیں۔ اب قیامت تک اس ملک میں ان شاء اللہ کوئی بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکے گا۔ اور جہاں تک اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ ہے تو ہمارے ہاں ہندو، سکھ، عیسائی سب ہیں مگر مسلمان ان سب کا تحفظ کرتے ہیں، قوانین موجود ہیں، اسلام کی تعلیمات ہیں، ہم ان (مرزائیوں) کا بھی تحفظ کریں گے۔ مسلمان دیہات میں ہندو، سکھ، عیسائی سے بھی سودا سلف خریدتے ہیں مگر وہ انہیں غیر مسلم جانتے ہیں، یہ خطرہ نہیں۔ یہی طور پر دھوکہ ہو سکے اور مار آستین بن جائیں، مگر اب ساری دنیا پر قادیانیوں کی حقیقت آشکارا ہو جانے کے بعد یہ خطرہ کم ہوگا کہ یہ سانپ ڈس لے گا۔ تو یہ پروردگار کا بڑے سے بڑا کرم اور انعام ہے کہ قوم کا، ملک کا، دین کا تحفظ ہو گیا۔ ہمارے دیگر مطالبات بھی اصولاً وزیر اعظم نے مان لیے ہیں۔ اب کلیدی عہدوں پر ان کو فائز رکھنا اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے۔ اب ہمارے سارے راز فاش کرنے اور ہر طرح دشمنی کرنے سے یہ لوگ کوئی دریغ نہیں کریں گے، نہ بھٹو سے نہ قوم سے بھلائی کریں گے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں جلد از جلد کلیدی عہدوں سے ہٹا دیا جائے، پاکستان کے اندر ربوہ کے نام سے قائم قادیانی ریاست ختم کر دی جائے، اسے مفتوح کر لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد

تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے دین کی حفاظت فرمائی، نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طالب علم بلا وجہ مرزائیوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے، ساری قوم اٹھی، ملازم، تجار، علماء، عوام، طلباء سب نے جرأت ایمانی کا ثبوت دیا، ابتدائی تین دن تک تحریک کی مرکزی قیادت نہ تھی تو کچھ گڑبڑ ہوئی، پھر مجلس عمل کی تشکیل ہو گئی اور ساری جماعتیں اس میں شامل ہو گئیں، سب نے حلف اٹھایا کہ اس مسئلہ میں سیاست بازی نہ ہوگی، صرف حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور اسلام کی خاطر اس تحریک کو چلائیں گے۔ بہت بڑے دو چار افسروں نے مجھے لاہور میں ایک میٹنگ کے بعد کہا کہ کیا کرنا ہے؟ ہم صرف ۷ ستمبر تک منتظر رہیں گے، میں نے پوچھا پھر کیا کرو گے؟ کہا پھر آپ سب کو اور ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اسلام آباد کے تمام ملازموں نے ایمان و عزیمت کے عجیب مظاہرے کیے، اللہ تعالیٰ نے ساری قوم کو متفق کر دیا، مجلس عمل نے تدبر سے کام لیکر مسلمانوں کی قیادت سنبھالی، پھر اسمبلی میں حزب اختلاف کے علماء اور جماعتوں نے مجلس عمل کی راہنمائی میں کام کیا۔ پھر پوری قومی اسمبلی، کیا حزب اقتدار اور کیا حزب اختلاف اس جہاد میں شریک ہو گئی

اور اس کو فتح نصیب ہوئی، اور اتنی آسانی اور اللہ کے کرم سے فتح ہوئی کہ ہم سے، تو حضور نبی کریمؐ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں ہزاروں صحابہؓ نے جان کی قربانی دی، ۲۸ ہزار کافر اور مرتد تہ تیغ کیے گئے اور یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ یہاں مسیلمہ پنجاب کے مقابلہ میں صرف چند مسلمان شہید ہوئے، ساری قوم کو ذرا سی محنت کرنی پڑی اور فتح عظیم حاصل ہو گئی۔ اگر اس راہ میں پوری مسلمان قوم شہید ہو جاتی اور ناموسِ ختمِ نبوت محفوظ ہو جاتی تو پھر بھی بہت بڑی فتح ہو جاتی۔

اب ماشاءاللہ، اللہ تعالیٰ اس ملک اور قوم کو اس مسئلہ کی بدولت اپنے فضل و کرم سے مالامال کر دے گا، اس مسئلہ کا کریڈٹ پوری مسلم قوم اور ساری اسمبلی کو پہنچتا ہے۔ ہم علماء کا تو کام ہی یہی ہے، موضوع ہی توحید و رسالت ہے۔ بلکہ بحث و تحقیق کے سلسلہ میں ہر رکنِ قومی اسمبلی تعاون کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کرتا رہا کہ کوئی شبہ نہ رہے۔ الحمدللہ آج پاکستان سمیت پوری مسلم امہ خوشی منا رہی ہے، پون صدی کے اکابر کی قربانیاں رنگ لائیں، ہر جگہ خوشی میں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، ایک دوسرے کو مبارکباد دی جا رہی ہے، آج نمازِ جمعہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دو رکعت شکرانہ کی پڑھی جائیں۔

البتہ ابھی غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے ان پر نظر رکھنی ہوگی، کیونکہ قادیانی انتہائی منظم ہیں، ان کی پشت پر امریکہ، برطانیہ اور صیہونی طاقتیں ہیں۔ اگر یہ لوگ ذمی بن کر پرامن ہو کر رہتے ہیں تو ان کی حیثیت دوسری ہوگی، اور اگر متحارب بنیں، ذمہ و عہد کا پاس نہ کریں، مسلمانوں اور عالمِ اسلام کے خلاف کام کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی مناسب طرزِ عمل اختیار کرنا پڑے گا، ان کا سیاسی احتساب کرنا ہوگا — اب اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں شامل رکھے اور شعائرِ اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شوکت قیامت تک بلند ہوتی رہے۔ آمین۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

◇ ◇ ◇

مسلمانوں کی فتح مبین

صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے قادیانیوں کے بارہ میں جاری کردہ صدارتی آرڈیننس پر مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ کا طویل اور پُرمغز تبصرہ ماہنامہ الحق سے پیشِ خدمت ہے ——— (مُرتّب)

قادیانیوں کے بارہ میں صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے جاری کردہ تازہ آرڈیننس کے ذریعہ مسیلمۂ پنجاب، متنبی کذاب مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں (قادیانی اور لاہوری دونوں گروپوں) کو ہر طرح کی خلافِ اسلام سرگرمیوں سے روک دیا گیا ہے۔ اور تعزیراتِ پاکستان میں ایک نئی دفعہ ۲۹۸ ب شامل کر دی گئی ہے جس کی رُو سے قادیانی اسلام اور مسلمانوں کی مخصوص اصطلاحات استعمال نہیں کر سکیں گے، نہ اذان دے سکیں گے، نہ اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہہ سکیں گے، نہ اپنے آپ کو بالواسطہ مسلمان ظاہر کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے مذہب کو اسلام کا نام دے کر اس کی تبلیغ و تشہیر کر سکیں گے، نہ کسی ایسی حرکت کے مجاز ہوں گے جس سے مسلمانوں کے احساسات و جذبات مجروح ہوں۔

یہ فیصلہ (آرڈیننس) کتنا اہم، نہایت ضروری، معقول اور قابلِ تحسین و تبریک ہے؟ اور کتنی گہرائی اور دور رس نتائج کا حامل ہے؟ اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکیں گے جن کی نظر مرزائیت کی تاریخ، پس منظر، محرکات و عزائم اور ملتِ مسلمہ کے خلاف اس جماعت کی ریشہ دوانیوں، گھناؤنی سازشوں اور اسلام دشمنی کے منظم اور مربوط و ہمہ گیر منصوبوں پر ہے۔ مسلمانوں کے جن حساس، عاقبت اندیش اور اسلامی درد سے سرشار قائدین اور زعماء کو اللہ تعالیٰ نے مرزائیت کے بارہ میں دلِ بینا اور دولتِ شرحِ صدر سے نوازا تھا انہوں نے اس صدی کے آغاز ہی سے علمی، فکری، سیاسی اور عوامی محاذ پر اور پورے تشدد و مد سے اس کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی خطرات سے مسلمانوں کو اور برصغیر کی حکومتوں کو آگاہ کرنا اپنا اوّلین فریضہ سمجھا۔ وہ نازک اور پُرخطر حالات میں بھی علمِ جہاد لہراتے رہے، انہیں للکارتے رہے اور مسلمانوں کو اس مارِ آستین سے بچنے کے لیے جھنجھوڑتے رہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، پیر صاحب گولڑہ شریفؒ، مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبالؒ، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کی پوری

جماعت مولانا ظفر علی خانؒ، شورش کاشمیریؒ، علامہ یوسف بنوریؒ اور ایسے ہزاروں علماء، مفکرین، زعماء اور مصنفین، مناظر، صحافی اور مبلغ تھے جن کی زندگی کا اہم ترین مشن ان غدارانِ خاتم النبیین اور سارقینِ تاج و تختِ ختمِ نبوت کا محاسبہ اور تعاقب رہا، جنہوں نے خواجۂ یثربؐ کی ناموسِ ختمِ نبوت کی حفاظت کی جدوجہد میں اپنی زندگیاں تج دیں، اور کتنے سعادتمند تھے جو اس راہ میں کٹ مر کر خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے اور شفاعت آقائے دوجہاں اور خوشنودئ نبی اوّلین و آخرینؐ کی ابدی سعادت سے مالامال ہوئے۔

ان تمام قربانیوں کے نتیجے میں اور ملتِ مسلمہ کے مومنانہ جہاد و جدوجہد اور اتحاد کے ثمرہ میں ۷ستمبر ۱۹۷۴ء میں عوامی دباؤ سے مجبور و بے بس ہو کر اس وقت کی بے دین حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور دستور میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا، یہ قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کی اوّلین فتح تھی مگر اُس وقت کی حکومت، علماء اور مسلمانوں کے مسلسل مطالبہ کے باوجود اس دستور کے عملی تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرتی رہی اور قادیانیوں کے بارہ میں کسی قسم کی قانون سازی سے گریز ہوتا رہا، یہاں تک کہ موجودہ حکومت کا دور آیا مگر بات وہاں کی وہاں ہی رہی، مسلمانوں کی یہ دستوری فتح عملی تقاضوں کی تکمیل نہ ہوسکنے کی وجہ سے کاغذی اور رسمی فتح رہی، نتیجتاً دشمن اپنی پوشیدہ اور اعلانیہ داخلی اور خارجی سرگرمیوں میں منہمک رہا۔ ادھر مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر دبتی رہیں، لاوا پکتا رہا، آگ اندر ہی اندر سُلگتی رہی، دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے ہی والی تھیں کہ خداوند قدوس نے مجلس تحفظِ ختمِ نبوت اور اس کی کل جماعتی مجلسِ عمل کے بروقت احساس اور خالص دینی و مذہبی غیر سیاسی تحریک کے نتیجہ میں موجودہ حکومت اور اس کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو توفیق دی کہ وہ اس شجرۂ خبیثہ پر اس آرڈیننس کی شکل میں کاری ضرب لگا دیں اور نفاق کے لبادہ میں ملبوس کفر و ارتداد کے اس بے لگام گھوڑے کو لگام لگ جائے۔

یہ فیصلہ ایک ایسا جرأتمندانہ اور مومنانہ فیصلہ ہے جس سے ہمارے اکابر کی پچھلی ایک صدی کی قربانیاں ٹھکانے لگ گئی ہیں اور جہد و عمل کا ایک طویل سفر منزل آشنا ہو گیا ہے۔ عالمِ اسلام کو صرف اور صرف ذہنی انتشار اور فکری اضطراب میں مبتلا کر دینے والے دشمنانِ اسلام منافقین قادیان کا پردۂ نفاق چاک کر دیا گیا، اور گویا ایک صدی سے مسلمانوں کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک ایسا روح پرور اور ایمان افزا فیصلہ ہے جس کے نور سے ساری کائنات منور اور جس کی خوشبو سے فضائے بسیط معطر ہے، ملاءِ اعلیٰ میں بہار آگئی ہے اور عالمِ علّیتین میں علامہ کشمیریؒ، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، علامہ اقبالؒ اور حضرتِ بنوریؒ کی ارواح کی آسودگیوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور دوسری طرف کفر بھتر آگیا ہے، نفاق کی مسجدِ ضرار زمین بوس ہو گئی اور دجالی قصرِ نبوت کے کنگرے پیوندِ خاک ہو گئے ہیں، باطل لرز اٹھا ہے اور جعلی نبوت کے ظلمت کدوں کی تاریکی اور بڑھ گئی ہے، شفیع المذنبینؐ کے نام لیوا اور شفاعتِ کبریٰ کے امیدوار اسے حرارتِ ایمانی اور حمیّتِ ناموسِ رسالت کی ترجمانی کرنے والا فیصلہ قرار دیتے ہیں، ایک ایسا فیصلہ جسے ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں ہمیشہ جلی اور سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

اس عظیم خوشی میں بد قسمتی سے اگر شریک نہیں ہیں تو چند ایسے طالع آزما سیاستدان ہیں جو "بغضِ معاویہ" میں اس حد تک مبتلا ہیں کہ جب تک وہ بیلائے مقصود حکومت و اقتدار سے ہمکنار نہ ہوں نہ اُن کی آنکھیں کھُل سکیں گی نہ دلوں پہ پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹ سکیں گے، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ جن کے قلب و ذہن میں ایمان اور مذہب کی کوئی کرن پڑتی ہی نہیں کہ وہ لبرل ازم، لادینیت اور سیکولرازم کی ظلمتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور کچھ وہ جو نام نہاد مغربی جمہوریت کے عشق و محبّت میں ہر دوسرا مسئلہ ثانوی اور ضمنی خیال کرتے ہیں خواہ وہ نفاذِ اسلام کا ہو یا تحفظِ ختمِ نبوت کا یا قوم کی فکری، اخلاقی تطہیر اور معاشی استحکام اور معاشرتی امن و سکون کا، انہیں اگر کوئی سروکار ہے تو جمہوریت اور الیکشنوں سے، خواہ اس کے نتیجے میں پوری قوم نئے سرے سے فکری انتشار، باہمی افتراق و اختلاف، خانہ جنگی، اباحیت اور طوائف الملوکی کا شکار کیوں نہ ہو جائے۔ اس لحاظ سے اس فیصلہ کا یہ پہلو خاص طور سے مسلمانوں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے کہ سیاست و جمہوریت کے علمبردار اکثر لیڈر بالخصوص وہ جو سیکولرازم کے داعی یا ان کے اتحادی ہیں وہ نہ صرف اس فیصلہ پر مُہر بہ لب رہے بلکہ بعض اخباری نمائندوں کی چھیڑ چھاڑ سے ان کے دلوں میں قادیانیوں کے لیے نرم گوشے سامنے آگئے اور کچھ نے تو بد قسمتی سے اس فیصلہ کو بلا وجہ بدگمانیوں کا نشانہ بنایا، اسے معمولی، بے اثر اور بے وقعت بنانے کی کوشش کی، اس میں مین میخ نکال نکال کر قادیانیوں کو خوش کرنے کی سعی بھی کی۔ بلاشبہ "بغضِ معاویہؓ" میں اندھے ہو جانے کی یہ عبرتناک مثالیں ہیں۔ خطرہ ہے کہ اس ردِعمل اور طرزِ عمل کے نتیجہ میں قادیانی فرقہ اب اپنے آپ کو ایسے سیاسی عناصر کی گود میں ڈالے گا اور لادینی سیاسی عناصر اور طالع آزما سیاستدانوں کا اتحاد آگے

پھل کر مرزائیوں کی سیاسی پناہ گاہ اور حصار بن سکے گا۔

بہرحال اب اس انقلابی اقدام کے کچھ لازمی اور منطقی تقاضے ہیں جو حکومت وقت نے فوری طور پر پورے کرنے ہیں جبکہ بدقسمتی سے اس کا انداز کار عام طور پر وقت کو ٹالنا اور مسائل کو ٹرخاتے رہنا ہے کہ گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی رہے اور کوئی ناراض نہ ہو۔ جس پالیسی کی وجہ سے اسلامی نظام کی گاڑی ایک ایسی بند گلی میں پھنس کر رہ گئی ہے کہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے، چاروں پہیئے چل تو رہے ہیں مگر سفر کٹھن اور منزل دور ہوتی جا رہی ہے، لیکن مرزائیوں کے بارہ میں یہ آرڈی ننس جاری کر کے اس نے ایک زہریلے سانپ کو مارا نہیں بلکہ صرف زخمی کیا ہے اور جب یہ سانپ بلبلا اٹھا ہے تو وہ کوئی بھی لمحہ ملت مسلمہ اور پاکستان کو ڈسنے کا ضائع نہیں کرے گا۔ وہ کوئی معمولی دشمن نہیں بلکہ وہ عالمی سامراجیت کا خود کاشتہ پودا اور صیہونیت اور برطانیہ کے بعد اب امریکی سامراج کا پروردہ ہے، وہ عالم اسلام کے تیقظ اور جہاد کے خلاف سامراجیوں کا خفیہ ہتھیار ہے، وہ اسرائیل کا گماشتہ ہے (جس کی پوری سیاسی سرگرمیاں اور محرکات اور منصوبوں کی تفصیلات ہماری شائع کردہ کتاب "قادیان سے اسرائیل تک" میں پڑھی جاسکتی ہیں) اور وہ ابتداء ہی سے اپنے درپردہ منصوبوں میں مثالی بیدار مغزی، نظم وضبط، ہمہ گیر اور گہرے طریق کار کا ثبوت دے رہا ہے۔ پاکستان تو تقسیم پنجاب اور پھر سقوط مشرقی پاکستان اور عالم عرب قیام اسرائیل کی شکل میں اس کا خمیازہ بھگت چکا ہے۔ عوامی ہمدردیاں حاصل کرنا، سیاسی لابیوں سے اپنے مفادات کا حصول، ملکی نظام کے لیے رجال کار کی تیاری اور کلیدی مناصب پر کنٹرول حاصل کرنا عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے مخصوص سامراجی ہتھکنڈے ہیں، وہ ہوشیاری سے ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ پوری قوم سیاسی اور معاشی سطح پر تلملا اٹھتی ہے مگر عیار و مکار دشمن پھر بھی نگاہوں سے غائب رہتا ہے۔ اب ایسے دشمن پر موجودہ آرڈیننس کی شکل میں کاری ضرب لگانے کے بعد اگر روایتی تساہل، درگذر، وسیع النظری اور رواداری سے کام لیا گیا تو یقیناً نہ تو یہ اس ملک کی بقاء واستحکام کے لیے مفید ہوگا اور نہ اس آرڈیننس کو جاری کرنے والے سربراہ مملکت کے لیے کہ وہ اب ان دونوں پر بھرپور وار کرے گا، اس لیے وقت کا اولین تقاضا ہے کہ فوری طور پر:۔

۱۔ تمام کلیدی بالخصوص فوج کے اہم مناصب سے قادیانیوں کو برطرف کیا جائے۔

۲۔ ملک کے اندر اس کی تنظیموں، سرگرمیوں، مراکز، دفاتر بالخصوص ہیڈ کوارٹر ربوہ پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

۳۔ اس کے تمام تحریری دستاویزات اور لٹریچر کی پڑتال کی جائے اور اس آرڈیننس کی زد میں آنے والی ہر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریر کو ضبط کر لیا جائے۔

۴۔ بیرونِ ملک پورے عالمِ اسلام کو اس اقدام کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے اور عالمِ اسلام سے ایسے ہی اقدامات اور تقاضوں کی تکمیل کی اپیل کی جائے۔

۵۔ ساری دنیا میں پاکستانی سفارتخانوں اور خارجہ امور سے وابستہ اداروں سے قادیانیوں کی مکمل تطہیر کی جائے۔

۶۔ اپنے سفارتخانوں اور علمی و دینی تنظیموں کے ذریعے غیر مسلم دنیا میں اس فرقہ کی سرگرمیوں اور منصوبوں اور ہر طرح کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

۷۔ اس فیصلے کے خلاف بیرونی دنیا کو گمراہ کرنے والے قادیانی اور مغربی پروپیگنڈہ کا مؤثر اور بھرپور جواب دینے کے انتظامات کیے جائیں۔

۸۔ مرزائیوں کی درپردہ نیم فوجی قسم کی تنظیموں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے۔

۹۔ قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں مذہب کی نشاندہی کے فوری انتظامات کئے جائیں تاکہ کوئی قادیانی "مسلمان" کے روپ میں عالمِ اسلام بالخصوص عالمِ عرب کو ملازمتوں کے سہارے قادیانی ریشہ دوانیوں کا مرکز نہ بنا سکے اور اگر کوئی قادیانی ہے تو قادیانی تشخص کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

۱۰۔ آئندہ کے لیے کفر وارتداد کے اس سلسلۂ خبیثہ کے تدارک کے لیے لازمی ہے کہ اسلام کی سزائے ارتداد نافذ کی جائے۔

۱۱۔ اس بات کے خود قادیانی لٹریچر سے تحریری شواہد موجود ہیں کہ قادیانی مرکز اسرائیل میں قائم ہے اور اس کے روابط ربوہ سے ہیں۔ قادیانی "مبلغین" اسرائیل جاتے ہیں، اگر براہِ راست نہیں تو یہاں سے برطانیہ، ماریشس، جزائر فجی، نائیجیریا اور دیگر افریقی ریاستوں اور یورپی ممالک کے نام پر اور وہاں سے اسرائیل چلے جاتے ہیں۔ ایسے نام نہاد "مبلغین" کے تبلیغی، دعوتی اسفار پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ یہ کتنے شرم اور افسوس کی بات ہے کہ ایک اسلامی جمہوری ملک کا زرمبادلہ لیکر وہ باہر جاکر اسلام اور نبوتِ محمدیہ کے خلاف بغاوت پھیلائیں اور اسلام دشمن عقائد کا پرچار کرکے بے تحاشا مسلمانوں کو اپنے دجل و فریب کے دامِ تزویر میں پھنساتے رہیں، اور پاکستانی زرمبادلہ سے وہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمِ عرب کے خلاف اسلام دشمنی کا دھندہ جاری رکھیں۔

۱۲۔ ربوہ کی مرزائی تحریک کی معاشی عمارت سادہ لوح اور خوش عقیدگی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے

پیرو کاروں کے مالی اور اقتصادی استحصال پر قائم ہے وہ ایسے جال میں پھنسے ہوئے ہیں کہ اپنے خون پسینہ کی کمائی لازماً مرزائی پاپائیت کی نذر کرنا پڑتی ہے، بسا اوقات اس استحصالی شکنجہ اور معاشی و سماجی ڈھانچہ سے رہائی ان مجبور و بے بس پیرو کاروں کے لیے ناممکن ہوتی ہے وہ مجبوراً اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اور بعد از مرگ ساری جائیداد کا دسواں حصہ صدر انجمن احمدیہ کے نام منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی بہت بڑی جائیداد مرزائی سربراہ کے نام ہے، اور یہاں کی معاشی افراتفری میں اس معاملے کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ یہ مرزائیوں کے استحصالی ہتھکنڈے ہیں جن پر از سرِ نو نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، اس سے نہ صرف مسلمان مطمئن ہوں گے بلکہ قادیانی استحصال کا شکار قادیانی فرقے کے لوگ بھی نجات پاکر اپنے مذہب اور عقیدہ کے بارہ میں از سرِ نو آزادانہ فیصلہ کر سکیں گے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

□ □ □

قادیانیت کے بارے میں قومی اسمبلی کا متفقہ فیصلہ اور اسکے ذیلی تقاضے

ایڈیٹر ماہنامہ الحق کا سوالنامہ اور مشاہیر علم و فضل، زعماء ملک و ملت کے جوابات

سوالنامہ

(۱) آئینی فیصلہ کے بارہ میں آپ کے تاثرات اور خدشات کیا ہیں؟
(۲) کیا اس فیصلہ کے بعد ہماری ذمہ داری ختم ہوگئی ہے؟
(۳) ملک و بیرونِ ملک قادیانی فتنہ کے سیاسی اور دینی اثرات کیا ہیں؟
(۴) ایسے مہلک اثرات کے تعاقب کا طریقۂ کار اور لائحۂ عمل کیا ہو سکتا ہے؟

(مولانا) سمیع الحق ایڈیٹر ماہنامہ الحق

الشیخ محمد صالح القزاز
سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

حضرة المكرم الفاضل الشيخ عبدالحق المحترم، پشاور، الباكستان

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تسلمت رسالتكم الكريمة رقم ۹۲۳۷ وتاريخ ۱۷ستمبر ۱۹۷۴م التى عبرتم فيها عن ابتهاجكم وابتهاج اخواننا المسلمين بما قررته الجمعية الوطنية بشأن الطائفة القاديانية واعتبارها اقلية غير الاسلامية۔

والواقع ان ذلك فضل من الله حيث جاء الحق وزهق الباطل لان هذه الفئة عاشت فى الارض فسادًا ونشرت رعايتها الضللة زهاءً تسعة وتسعين عاما وسيطرت على افكار كثير من المسلمين فى اوربا وافريقيا حيث وقعوا فى شراك ضلالها۔

وا سا نحمده الله تعالى على ما اصاب هذه الطائفة الضالة من خزى وقد افتضح امرها وما بثته من عوامل الفرقة بين المسلمين فى السياسة والمجتمع على السواء ونرجوا الله الا تقوم لها قائمة بعد الآن وان يتنبه اخواننا المسلمون الى دسائسها ونواياها السيئة

ومكايدها التي يرها منه المسلمين الحقيقيين۔
والسلام عليكم ورحمة الله وبركاتهٗ۔

الامين العام۔ محمد صالح القزاز (۱۳؍۹؍۱۳۹۴ھ)

(ترجمہ) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بارہ میں قومی اسمبلی کے شاندار فیصلے پر آپ کی اور تمام مسلمانوں کی مسرتوں کی غمازی کرنے والا گرامی نامہ موصول ہوا۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ حق غالب ہوا اور باطل مٹ گیا، اسلئے کہ اس فرقہ ضالہ نے زمین میں فساد برپا کر رکھا تھا، اور اس کی گمراہ کن جھوٹی دعوت تقریباً ۹۹ سال تک پھیلتی رہی جو یورپ اور افریقہ میں بہت سے مسلمانوں کی فکری گمراہی اور کجروی کا ذریعہ بنی، آج ہم اس فرقہ ضالہ کی رسوائی اور مسلمانوں میں اس کی سیاسی اور اجتماعی اور تفرقہ انگیزیوں اور ریشہ دوانیوں کی قلعی کھل جانے پر اللہ تعالیٰ کی حمد ادا کرتے ہیں اور اللہ سے امید کرتے ہیں کہ اس کے بعد اس فرقہ کے قدم کہیں نہ جم سکیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی ان لوگوں کی سازشوں، خفیہ مذموم منصوبوں اور ان فریب کاریوں پر گہری نظر رکھیں گے جو یہ لوگ سچے اور حقیقی مسلمانوں کے خلاف بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ (سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی محمد صالح القزاز ۱۳؍۹؍۱۳۹۴ھ)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قائد جمعیۃ علماء اسلام شیخ الحدیث قاسم العلوم ملتان

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ و من اعز جندہ۔

پاکستان کی پارلیمنٹ نے عقیدہ ختم نبوت کو دستوری تحفظ دے کر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا، یقیناً یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے، اس سلسلے میں پوری قوم اور پاکستانی ملت اور جملہ ارکان پارلیمنٹ مبارکباد کے مستحق ہیں، مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے اراکین خصوصیت سے مستحق تبریک ہیں جنہوں نے تین ماہ کی طویل جدوجہد میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر اور حکومت کے ہر تشدد کا نشانہ بن کر اس تحریک کو کامیاب بنایا، بہت سے مقامات پر پولیس نے وحشیانہ لاٹھی چارج کیا اور مساجد میں جوتوں سمیت داخل ہو کر بیگناہ نہتے مسلمانوں پر ناروا ظلم کیا، تھانوں میں فدائیان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بعض جگہ ایسی دلخراش حرکتیں روا رکھی گئی ہیں کہ جن کا ذکر بھی کسی شریف انسان کے لیے ممکن نہیں، بعض مقامات پر شہیدوں نے خون کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ بہرحال جن حضرات نے بھی اس سلسلہ میں کوئی خدمت، محنت اور قربانی حسن نیت اور خلوص سے پیش کی ہے میرا عقیدہ ہے کہ اس کی نجات اُخروی کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض سنجیدہ قسم کے لوگوں کے متعلق یہ سنکر سخت تعجب ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ ختم نبوت کے اس حل کا مہرا صرف ورصرف

وزیراعظم بھٹو کے سر باندھنے کی سعی نامشکور میں مصروف ہیں، مسٹر بھٹو نے عوامی جدوجہد کے سامنے مجبور ہو کر اس فیصلہ کی تصدیق کی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اسمبلی کے اندر اور باہر انہیں کن مشکلات کا سامنا ہوا، جس کے بعد انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہم جب پوری قوم کو مبارکباد دیتے ہیں تو ہم نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ پوری قوم کو انہیں اور ان کی قوم کو مستثنیٰ کیے بغیر ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے۔ نہ ہم نے اپنی جماعت کے لیے کریڈٹ لینے کی کوشش کی ہے نہ ہم اس خالص مذہبی مسئلے کو سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، ہم تو صرف یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس جدوجہد کو قبول فرما کر ہر ایک شریکِ کار کو اس کا ثمرہ دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے۔

برصغیر پاک و ہند کے لوگوں نے برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی کا مطالبہ کیا، جدوجہد کی، آخر جدوجہد کامیاب ہوئی اور برطانیہ لیبر پارٹی کی گورنمنٹ اور اس وقت کے وزیراعظم مسٹر اٹیلے نے بامرِ مجبوری ہمارا مطالبہ تسلیم کر کے ہمیں آزادی دی۔ تو کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسٹر اٹیلے اور لیبر پارٹی کی برطانوی گورنمنٹ کے نعرے لگائے جائیں یا مجاہدینِ تحریکِ آزادی کو زندہ باد کہا جائے؟

تازہ واقعہ ہے کہ الجزائر نے فرانس کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سات لاکھ سے دس لاکھ تک مجاہدین کا خون پیش کیا، آخر کار فرانس کی حکومت کو آزادی کا عوامی مطالبہ تسلیم کر کے الجزائر کو آزاد کرنا پڑا۔ تو کیا اب فرانس اور جنرل ڈیگال مبارکباد کے مستحق ہیں یا الجزائر کے شہداء و مجاہدین؟

انڈونیشی عوام نے سوئیکارنو کی زیرِ قیادت طویل جدوجہد کے بعد "ڈچ" قوم سے آزادی حاصل کی، ڈچ قوم نے مطالبہ مانا، اب کون مبارکباد کا مستحق ہے؟ ڈچ قوم یا انڈونیشی عوام؟

بہرحال ختمِ نبوت کی تحریک کے مجاہدین کے خلاف ظلم و تشدد، خونریزی اور بربریت کا جرم جس کے کھاتے میں بھی پڑتا ہے کم از کم تحریک کی کامیابی کا سہرا ایسے لوگوں کے سروں پر تو نہیں باندھا جاسکتا، پیپلز پارٹی ہی ایک ایسی پارٹی ہے جس کے ارکان نے انفرادی یا اجتماعی طور پر قوم کے اس عظیم مطالبے اور تحریک کا ساتھ نہیں دیا اور الگ تھلگ رہ کر عملاً ثابت کر دیا کہ ان کا اس مطالبہ اور تحریک سے کوئی تعلق نہیں، پھر پیپلز پارٹی یا اس کے چیئرمین ہی کو مدار المہام کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے؟ فیا للعجب!

الغرض مجموعی طور پر قوم اور اس کے نمائندوں نے ایک تاریخی فیصلہ صادر فرما کر دستوری طور پر مرزائیوں کے دونوں گروپوں کو خارج از اسلام قرار دیدیا اور انہیں پارسی، سکھ، ہندو، عیسائی

بدھسٹ، شیڈول کاسٹ (اچھوت، جو ہڑے چماروں) کی صف میں لا کھڑا کیا اور یہ طے کر لیا کہ :-

(۱) جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو کسی قسم کی نبوت کسی بھی شکل کسی خیال کے مطابق ملتی ہے وہ غیر مسلم ہے ۔

(۲) جو شخص ایسی کسی نبوت کا اپنے لیے دعویٰ کرتا ہے وہ غیر مسلم ہے ۔

(۳) جو ایسے مدعی نبوت کو نبی مانتا ہے وہ بھی غیر مسلم ہے ۔

(۴) جو شخص ایسے مدعی نبوت کو مذہبی مصلح مانتا ہے وہ غیر مسلم ہے، یہ بھی طے ہُوا کہ جو مرزائی منافق بن کر خود کو مسلمان کہلائے وہ ختمِ نبوت کے خلاف تبلیغ نہیں کر سکے گا، اگر کرے گا تو سزا کا مستوجب ہوگا جو دو سال قید بامشقت تک ہو سکتی ہے ۔

جو مرزائی اپنے کو کافر تسلیم کرے تو وہ دستور کے مطابق اپنے مذہب کی تبلیغ قانون اور امنِ عامہ کے دائرہ میں کرے گا۔ اگرچہ ایسے واضح غیر مسلم شخص کی تبلیغ کا کسی پر اثر پڑنے کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہے لیکن مسلمانوں کو ان فیصلوں سے خوش ہو کر غفلت نہیں برتنی چاہیئے ۔ ابھی اس مسئلہ سے متعلق بہت سے ذیلی مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کا حل بھی ضروری ہے ۔ عنقریب میں اس سلسلے میں حکومت کے نمائندوں سے مل کر ان چند مسائل کے حل کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا، اللہ توفیق دے ۔

بظاہر ذیلی مسائل یہ ہیں :-

(۱) مرزائیوں کے دونوں گروپوں کے اوقاف کو حکومت اپنی تحویل میں لے تاکہ اسلام کی اشاعت کے لیے لوگوں نے جو جائدادیں وقف کی ہیں ان کی آمدنی کسی غیر اسلامی مذہب کی اشاعت پر صرف نہ ہوں ۔

(۲) ربوہ میں واقع سفید زمین کو مسلمانوں میں فوراً تقسیم کر کے اسے کھلا شہر قرار دینے کی عملی صورت پیدا کی جائے ۔

(۳) مرزائیوں کے لاہوری گروہ نے ایک انجمن بنائی ہے جو کہ انجمن اشاعتِ اسلام کے نام سے موسوم ہے انہیں یہ نام قانوناً تبدیل کرنا ہوگا، اس لیے کہ اب وہ اسلام کی اشاعت کا کام نہیں کر رہی ۔

(۴) مرزائی اپنی تبلیغ اسلام کے نام سے نہیں کر سکیں گے، ان پر قانونی پابندی عائد کرنی ہوگی اسلئے کہ ان کا مذہب اب قانوناً اسلام نہیں رہا ۔

(۵) اسلام کی مخصوص اصطلاحات جو صرف اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مختص ہیں ان کے استعمال

سے انہیں قانوناً روکنا ہوگا، مثلاً مسجد، امیرالمؤمنین، خلیفہ، صحابی، ام المؤمنین وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس قسم کے دیگر امور ہمارے دستوری فیصلے کے لازمی نتائج ہیں جب تک ان نتائج کو بروئے کار نہیں لایا جاتا دستوری فیصلہ صرف کاغذی فیصلہ کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

اعاذنا اللہ وجمیع المسلمین فی بلادھم من ھذہ الفتنۃ الداھیۃ۔

حضرت العلامہ مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ، خلیفہ حضرت تھانویؒ
شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ٹنڈو اللہ یار سندھ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ! رمضان کی وجہ سے جواب میں دیر ہوئی، آج ۳۰ رمضان کو جواب دے رہا ہوں۔

(۱) قادیانی مسئلہ کا جو حل وزیرِ اعظم پاکستان اور ان کی کابینہ نے کیا ہے میں نے اس پر وزیرِ اعظم اور ان کی کابینہ کو دلی مبارکباد دی ہے کہ یہ فیصلہ شریعت کے مطابق اور عام اہلِ اسلام کے جذبات کے موافق ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزا۔

(۲) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بعد حکومت کا فرض ہے کہ ان کو کلیدی عہدوں سے الگ کریں اور افواجِ پاکستان سے تو بالکل الگ کرے کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے مذہب میں جہاد منسوخ ہو گیا ہے اسلئے اس کے ماننے والوں میں جذبۂ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو ان کے ساتھ اسلامی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں، جو خود قادیانی بنا ہے وہ مرتد ہے جس کو تین دن کی مہلت دے کر (اگر وہ ان تین دنوں میں قادیانیت سے توبہ نہیں کرتا تو) اسے قتل کر دینا حکومت کا فرض ہے، اور جو خود مرتد نہیں ہوا بلکہ مرتد کی اولاد ہے، وہ اگر دوسروں کو مرتد بناتا ہے تو اس کی بھی یہی سزا ہے اور جو مرتد نہ بناتا ہو اس سے اسلامی تعلقات نہ رکھے جائیں۔

(۳) اور جو قادیانی توبہ کرنا چاہے اس کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر مرتد مانے، اسی طرح جو اس کو نبی مانتے ہیں ان کو بھی کافر و مرتد مانے۔

والسلام: ظفر احمد عثمانی ۳۰ رمضان ۱۳۹۴ھ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیٔ اعظم پاکستان
بانی و صدر دارالعلوم کراچی

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد! قادیانی مسئلہ کے حل پر ہر مسلمان کے احساسات اور جذبات ایک ہی قسم کے ہیں، عرصہ دراز کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی سچی

مسرت نصیب کی ہے جس پہ عالم اسلام کا ہر گوشہ مسرور اور شاداں و فرحاں نظر آتا ہے۔ یہ اس طویل جدّو جہد کا ایک کامیاب مرحلہ ہے جو مسلمانوں اور علمائے اسلام نے انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں شروع کی تھی، میں اُس قافلے کا ایک ادنیٰ رفیق رہا ہوں جو امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی قیادت میں فتنۂ قادیانیت کے سدِّ باب کے لیے رواں ہوا تھا۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب استاذِ مکرم حضرت شاہ صاحبؒ اس گمراہی کے اثر و نفوذ سے ہر لحہ بے چین رہتے تھے اور ان کے دل کو کسی طرح قرار نہیں تھا، انگریز کی حکومت تھی جس کی مکمل سرپرستی قادیانیوں کو حاصل تھی اس لیے مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا تھا، اور مسلمانوں کی جدّو جہد کو قدم قدم پر حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب بہاولپور کے مقدّمے میں کام کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے ہم خدّام کو بہاولپور میں جمع کیا، اور جب اس چھوٹے سے مقدّمے میں مسلمانوں کو فتح مبین عطا ہوئی تو اس وقت شکستہ دل مسلمانوں کی مسرّت قابلِ دید تھی کیونکہ اس مقدمے میں پہلی بار عدالتی سطح پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔

آج اگر حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے کاروانِ حق کے دوسرے رُفقاء موجود ہوتے تو انکی مسرّت کا کیا عالم ہوتا؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ باطل کو کبھی نہ کبھی سرنگوں ضرور ہی ہونا پڑتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرسکتا کہ یہ وقت میری زندگی ہی میں آگیا اور اُس قافلے کے ایک ادنیٰ خادم کو یہ مسرت اپنی آنکھوں سے دیکھنی نصیب ہوگئی فللّٰہ الحمد کلّہ، ولہ الشکر کلّہ۔

اس مسرت کے ساتھ میں مملکتِ پاکستان کے وجود پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرسکتا کیونکہ اگر یہ ملک نہ بنا ہوتا تو یہ کام انجام نہیں پاسکتا تھا، اللہ تعالیٰ اس ملک کو قائم و دائم رکھے اور اسے دینِ حق کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس کامیابی کے بعد اہم ترین سوال یہ ہے کہ اب مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ جو لوگ اس کامیابی کے نشے میں اس اہم سوال کو پسِ پُشت ڈال دیں گے یا اس کے جواب میں سنجیدگی، ہوشمندی اور اخلاصِ عمل پر کاربند نہیں ہوں گے وہ اس کامیابی کے تمام اثرات پر پانی پھیر دینے کے مرتکب ہوں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ قادیانیت کے سلسلے میں اس کامیابی سے اس مہم کا صرف ایک منفی مرحلہ طے ہوا ہے، اس مرحلے کا مقصد یہ تھا کہ حق و باطل اور اسلام و کفر میں ایک واضح خطِ امتیاز قائم ہو جائے

اور دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ اس مذہب کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد اب مثبت کام سارا باقی ہے۔

اور وہ کام سب سے پہلے یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے راہِ حق سے بھٹک کر قادیانیت کے دامِ تزویر میں پھنسے ہوئے ہیں انہیں انتہائی حکمت، دردمندی، دل سوزی اور پیغمبرانہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے واپس لانے کی کوشش کی جائے۔

قادیانی مذہب کے بہت سے متبعین ایسے ہیں جنہیں یہ مذہب اپنے ماں باپ یا ماحول سے ورثے میں ملا ہے اور انہیں اس کی سنگین گمراہیوں سے آگاہ ہی نہیں ہونے دیا گیا اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس مذہب کو ایک فرقہ وارانہ مسلک سمجھ کر کسی دنیوی مفاد کی خاطر اس مذہب کے پیرو ہو گئے ہیں، ایسے لوگوں کو ہمدردی، ملاطفت اور مخلصانہ دعوت کے ذریعہ حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے اور خدا کا خوف دلانے کی ضرورت ہے، ان کے سامنے اس مذہب اور اس کے بانی کی وہ باتیں نرمی اور خیر خواہی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے جن سے قادیانیت کی اصلیت واضح ہوتی ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام اور اس کے علوم سے ناواقفیت کے سبب واقعۃً غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں انہیں بھی دلائل و براہین اور تبلیغ و دعوت کے ذریعے اس گمراہی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر حکمت، اخلاص اور سچے جذبۂ دعوت کے ساتھ یہ کام کیا گیا تو اللہ تعالےٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ قادیانیوں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہو سکے گی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی ایک شخص کو بھی ہماری اس دعوت کے ذریعے راہِ حق سے ہمکنار کر دے تو اس سے بڑھ کر ہماری سعادت کوئی نہیں۔

یہ کام یوں تو ہر مسلمان کے کرنے کا ہے، جو شخص جہاں ہے وہ اپنے ماحول میں ایسے لوگوں پر کام کرے لیکن خاص طور سے اہلِ علم حضرات، دینی جماعتوں اور اداروں کو اس غرض کیلئے اپنے اپنے حالات اور وسعت کے مطابق خصوصی طریقِ کار طے کرنا چاہیئے۔ قادیانیت کے موضوع پر لٹریچر کی کمی نہیں لیکن ان میں سے مختلف مدارج کے لٹریچر کا انتخاب کر کے اور مزید مختصر رسالے تیار کر کے انہیں منظم طور سے شائع کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے، جس مقام پر قادیانی زیادہ تعداد میں آباد ہیں وہاں اس موضوع پر عبور رکھنے والے حضرات تبلیغی وفود کی شکل میں ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور انہیں راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

دوسری طرف حکومت کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے اور ان کی وہ تمام رعائتیں ختم کرے جو ماضی میں انہوں نے ناجائز طور پر حاصل کی تھیں، ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھے، انہیں بحیثیت مسلمان تبلیغ کرنے سے روکے اور غیر ممالک میں سفارتخانوں کے ذریعے ایسا لٹریچر تقسیم کرائے جو پارلیمنٹ کے حالیہ بل کی تشریحات پر مشتمل ہو تاکہ بیرونی ممالک اس بل کے مضمرات سے آگاہ ہو سکیں اور قادیانیوں کی طرف سے اپنی نام نہاد مظلومیت کا جو پروپیگنڈا کیا جارہا ہے اس کا سدِ باب ہو سکے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ ہادی الصواب۔

حضرت العلامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی
سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند وجامعہ اسلامیہ بہاولپور

عزیز القدر الحاج مولانا مولوی سمیع الحق صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
آپ کا اخلاص نامہ دربارۂ تاثرات حلِ فیصلۂ قادیانی موصول ہوا۔ دورِ حاضر میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے جو فیصلہ حکومت نے کیا وہ انتہائی مسلمانہ وجرأتمندانہ اقدام ہے جس کی جرأت سابق پاکستانی حکمران نہ کرسکے، اس دور میں اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں تھا۔

لا الٰہ الا اللہ (۱) ــــ محمد رسول اللہ (۲) ــــ ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین (۳)

(۱) اسلام توحیدِ الٰہی کی صورت میں خدا شناسی کی اصلی روح ہے، رسالتِ محمدی کے ذریعہ اس کی حقیقی تشخیص وتشکیل ہوتی ہے، اس لحاظ سے حقیقی خدا شناسی کے لیے رسالت شناسی اپنی اصلی شکل میں لازمی ہے جو ختمِ نبوت ہے، اگر وصف ختمِ نبوت انکار کی زد میں آجائے تو رسالت کا حقیقی نقشہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ توحید، رسالتِ محمدی، ختمِ نبوت۔ یہ اسلام کی ایسی تین بنیادی کڑیاں ہیں جو یقین کے درجے میں ایسے مربوط ہیں کہ ثالث کے انکار سے ثانی اور ثانی کے انکار سے اول کا حقیقی یقین بھی ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) **تجویز ولائحہ کار برائے مستقبل** | دنیا میں سب بڑی طاقت آواز کی طاقت ہے، فرعون کے تاج وتخت اور جبروت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ختم کیا، قیصر وکسریٰ کی عظیم حکومتیں آوازِ محمدی کے ابلاغ سے پیوند زمین ہوگئیں، زارِ روس کے راج کو لینن کی آواز نے ختم کیا۔ اس اصول کے تحت مرزائی تنظیم اور اس کے اثرات کو صرف آواز ہی ختم کرسکتی ہے، یہ حکومت کے بس کی بات نہیں حکومت نے اپنا حق ادا کر دیا، اب آواز یعنی تحریری وتقریری تبلیغ کے ذریعہ ہر مسلمان ہر مرزائی کو اخلاص کے ساتھ تبلیغ کرنے کو اپنے اوپر لازم کرے، تاجر تاجر سے ملتا ہے، ملازم ملازم سے

تصنیفات اور ہزاروں تقریریں نہ انجام دے سکتیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام اور تبلیغ اسلام کے نام سے "احمدیت" کی تبلیغ کا جو کام کیا جاتا تھا وہ بے اثر اور بے بنیاد ہو گیا۔

(۲) اس فیصلہ کی اثرانگیزی اور انقلاب آفرینی کے باوجود علماء کی ذمہ داری کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے مسئلہ کا فیصلہ اگرچہ حکومتی اور انتظامی سطح پر ہو گیا ہے لیکن علمی اور فکری سطح پر بھی اس کو مختتم کرنے کیلئے ختم نبوت کے موضوع پر بلند پایہ اور یقین آفریں سنجیدہ اور محققانہ کتابوں اور مضامین کی ضرورت ہے۔ کم سے کم عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں اور بڑی قابل قدر اور فاضلانہ کتابوں کی موجودگی ہیں جو اس وقت تک تصنیف ہوئی ہیں، اب بھی اس کی ضرورت ہے۔

حضرت والد ماجد کی خدمت میں سلام کہئے اور دعا کی درخواست کیجئے۔ (۸ نومبر ۱۹۷۴ء)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند تقسیم ملک سے برسہابرس پہلے بالاتفاق علماء برصغیر ختم نبوت کے بنیادی اور قطعی اسلامی عقیدہ سے انکار پر قادیانی فرقہ کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دے چکا ہے۔ انگریز کے پیدا کردہ اس جھوٹے نبی اور اس کے ذریعہ مذہب حق اسلام کے برخلاف مذہبی رنگ کی اس ذلیل ترین اور خطرناک بین الاقوامی سازش کا آج بحمداللہ دنیائے اسلام نے طویل مہلتِ اصلاح دینے کے بعد پردہ چاک کر دیا ہے اور ممالکِ اسلامیہ کی ۳۲ اسلامی تنظیموں کے سربراہوں کی کانفرنس (منعقدہ اپریل ۱۹۷۴ء جدہ) نے بالاتفاق یہ صحیح ترین اور تاریخی اعلان کیا کہ قادیانی فرقہ غیر مشروط طریقہ پر خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ کی ختم نبوت کو نہ ماننے اور انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ عالمِ اسلام کے اس متفقہ اور تاریخی اعلانِ حق نے اہلِ حق کو نہ صرف قوت بخشی ہے بلکہ قادیانیوں کے مرتد ہونے کے بارے میں قرآن وحدیث پر مبنی اہلِ حق کے دینی مؤقف کو عظیم مضبوطی عطا کی ہے۔

عالمِ اسلام کے اس متفقہ فیصلے کے بعد پاکستان کے علماء حق اور عامۃ المسلمین مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے قادیانی فرقہ کے ارتداد کے بارے میں اپنے اور تمام مسلمانانِ عالم کے مؤقفِ حق کی حکومتی سطح پر تائید و توثیق حاصل کرنے میں پہل کی ہے۔ توقع ہے کہ دیگر ممالکِ اسلامیہ کے علماء اور عامۃ المسلمین بھی فتنۂ قادیانیت کے بالکلیہ انسداد کو اسلامی حمیت کے تحت ہر ممکن تقویت و تائید پہنچانے میں دریغ نہ کر کے عنداللہ ماجور اور عندالمسلمین مشکور ہوں گے۔

اور ہر ایک اپنے پاس والے ملازم کو نرم اور ہمدردانہ طور پر روزانہ جب موقع ملے تبلیغ شروع کرے اور تبلیغ کے لیے متعلقہ کتب اور علماء کرام سے امداد حاصل کرتے رہا کریں اور ان سے رابطہ جاری رکھیں۔ (۸ شوال ۱۳۹۴ھ)

یادگارِ سلف اسیرِ مالٹا وتلمیذِ خاص حضرت شیخ الہند
حضرت مولانا میاں عزیر گل صاحب دامت برکاتہم

برادرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زاد اللہ معالیکم۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اما بعد!

نوازش نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، حُسنِ ظن کا شکریہ، اگرچہ میں اس کا مستحق نہیں۔

(۱) مجلسِ عمل نے جو کام کیا قابلِ صد آفرین ہے۔

(۲) کام کی ابتداء ہوئی ختم نہیں ہوا۔ ایک کام حکومت کا ہے دوسرا رعایا کا۔ رعایا کا کام تعمیلِ حکم مجلسِ عمل ہے۔ بندہ کے پاس کوئی خاص تجویز نہیں، میں نے قصداً جواب دینے کی کوشش نہیں کی، مگر جناب کے دوبارہ نوازش نامہ نے مجبور کر دیا، یہ عریضہ اس قابل نہیں کہ مشتہر کیا جائے۔ والد صاحب کو سلامِ مسنونہ عرض ہے۔ (یکم نومبر ۱۹۷۴ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ
سربراہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

محبِ گرامی منزلت زید لطفہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ محررہ ۲۴ اکتوبر کل ۷ نومبر کو ملا عرصہ کے بعد آپ کا اسمِ گرامی اور رسالہ کا نام دیکھ کر مسرت ہوئی، آنکھیں ہمسایہ ملک کے دوستوں اور بزرگوں کے خطوط اور تحریروں کو ترس گئی تھیں اور کسی کسی وقت تو یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اب زندگی میں براہِ راست خط وکتابت نہ ہو سکے گی۔ نہایت عدیم الفرصتی میں یہ دو سطریں رفعِ انتظار کیلئے لکھوا رہا ہوں۔

(۱) دنیا کے مسلمانوں کو عموماً اور اس کے برِ اعظم کے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے اس فیصلہ سے جو مسرت ہوا اس کو بہتر طریقہ پر اس شعر کے ذریعہ ادا کیا جا سکتا ہے جو ایک شاعر نے بیت المقدس کی فتح پر اپنے اس قصیدہ میں کہا تھا جو اس نے صلاح الدین ایوبیؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا ؎

هٰذا الذی کانت الایام منتظر فلیوف للّٰه اقوام بما نذروا

(ترجمہ) یہ وہ مبارک موقع ہے جس کا زمانہ عرصۂ دراز سے منتظر تھا، ایسے لوگ اپنی وہ منتیں پوری کریں جو انہوں نے اس وقت کے لیے مان رکھی تھیں

اس ایک فیصلہ نے افہام وتفہیم اور اطمینانِ قلب کی وہ خدمت انجام دی جو علماء کی سینکڑوں

بلاشبہ عالمِ اسلام کا یہ فیصلہ اور اس کی تائید و توثیق قادیانی فرقہ کی تلبیس کاریوں سے مسلمانانِ عالم کو بچانے کا ایک اہم ترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ اس لیے عموماً تمام علماء اور مسلمانانِ ہند و پاک اور خصوصاً علماء دیوبند اسلام کے تحفظ کے اس بین الاقوامی فیصلہ کرنے والوں کو ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اس آخری (اور ابدی) دین کو زیادہ سے زیادہ غیبی نصرت و تائید مرحمت فرمائے آمین۔

اکابر اساتذۂ دارالعلوم دیوبند

مولانا فخرالحسن صاحب، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا انظر شاہ کشمیری، مولانا محمد شریف حسن، مولانا معراج الحق، مولانا نصیر احمد

محترم و مکرم مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

نامۂ کرم نے مشرف فرمایا۔ قادیانیت کے مسئلے کے حل کے لیے ماہنامہ مؤقرہ "الحق" کی اشاعتِ خاص کی اطلاع سے جہاں قلبی مسرت ہوئی وہیں یہ خبر اس لحاظ سے موجبِ تأسف بھی تھی کہ مرسلہ سوالات بعجلت جوابات ارسال کرنے کی ہدایت پر مشتمل مکتوبِ گرامی ایسے وقت میں موصول ہوا کہ جبکہ حضرت مکتوب الیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ جنوبی ہند کے طویل سفر پر تھے، اور واپس ہوئے تو ڈیڑھ تین روز میں اہم مصروفیات سے فارغ ہوکر فوراً ہی عازمِ حج بیت اللہ ہوگئے، سفر گو ہوائی جہاز سے ہوا ہے اس لیے واپسی ۲۰ جنوری تک متوقع بھی ہے، لیکن یہ وقفہ بھی مکتوبِ گرامی کی وسعت میں زیادہ ہی محسوس ہوا۔ مکتوبِ گرامی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی خدمت میں بعد واپسی پیش ضرور کیا جائے گا، لیکن ایماء تعجیل پر نظر کرتے ہوئے مناسب سمجھا گیا کہ یہ مکتوب حضرات اکابر دارالعلوم دیوبند کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ مکتوبِ گرامی کے استفسارات کے بارے میں منجانب اکابر دارالعلوم دیوبند مختصر جوابات مرسلِ خدمت ہیں:۔

صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو پیہم ذلّت ناک تاریخی شکستوں کے بعد بڑی حد تک عیسائیت کی عالمی زمامِ قیادت بخت و وقت نے انگریزوں کے ہاتھ میں دے دی، اس قیادتِ کبریٰ کا حق ادا کرنے کے لیے انگریز نے اپنی فطری اور عیارانہ صلاحیتوں کو ملّتِ اسلامیہ سے انتقام لینے کے محور پر مرکوز کر دیا، اور قومی شرافت اور انسانی اخلاقیت کی قربانی دے کر اس اعزازِ قیادت کو اس قوم نے کوئی مہنگا سودا نہیں سمجھا۔ چنانچہ طویل تکمہ و تدبّر کے بعد ملّتِ اسلامیہ

کے برخلاف انگریز نے اپنی انتقامی بساطِ سیاست کو بین الاقوامی سطح پر دو زہر آلود منصوبوں سے آراستہ کیا۔

(۱) پہلے منصوبہ کا محور مسلمانوں کی اجتماعی شوکت اور سیاسی وحدت کو تاخت و تاراج کرنا تھا جس کا سرچشمہ خلافتِ اسلامیہ تھی، اس کے لیے ترک و عرب میں انفرادی مفاد پر اجتماعی بہبود کو قربان کر دینے والے ہوس کار جعفر و صادق تلاش کر لیے گئے اور خلافت کے فطری ثمرے کے طور پر حاصل شدہ اسلامی وحدت کو دسیسہ کارانِ فرنگ نے وطنی کشر توں میں تبدیل کر کے ملّت کو اپنی عظمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

(۲) دوسرے منصوبہ کا مقصد ملّتِ اسلامیہ کی "دینی وحدت" کو پارہ پارہ کرنا تھا جس کا ناقابلِ اختلاف مرکزی نقطۂ اتحاد ہزاروں اختلافات کے باوجود "عقیدۂ ختمِ نبوت" ہے۔ اس قابلِ نفرت منصوبے کے ذریعہ ملّتِ اسلامیہ کے اس منصوص اور قطعی عقیدے کو اس طرح مجروح کرنا تھا کہ اگر وہ بالکلیہ ختم نہ بھی ہو تو تردّد و اختلاف کا نشانہ بن کر کم از کم نقطۂ اتحاد نہ رہے۔

اس کے لیے کذابِ ازلی مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کی خاندانی بے ضمیری اور ایمان فروشی کو بھانپ کر انگریز نے اسے نبی بنا کر عقیدۂ ختمِ نبوّت پر کاری وار کیا۔

پھر جس طرح مذہبی زندہ قدروں کو انسانیت و شرافت سوز سیاست کا ہدف بنانے پر تاریخ کا حرف حرف انگریزی دنائت پر گواہ رہے گا، ٹھیک اسی طرح اس ناقابلِ تردید حقیقت پر بھی تاریخ کا حرف حرف ہمیشہ شاہدِ عدل رہے گا کہ انگریز کی اس بدنہاد انتقامی سیاست کے دونوں منصوبوں کے اوّلین مرحلے پر ان کی گہرائیوں تک پہنچے اور ان دُور رس فتنوں سے ملّی تحفظ کی تدابیر کو بقدرِ بساط بروئے عمل لانے میں بتوفیقِ خداوندی حضرات علمائے کرام ہی نے پہل کی اور آج سے اسّی سال قبل کذّابِ قادیان اور اس کے متبعین کے بارے میں مرتد اور خارج از اسلام ہونے کا فیصلہ اکابر علمائے دیوبند نے اپنی بصیرتِ دینی اور فراستِ ایمانی سے فرمایا۔

ان مخلصین کی مساعی مشکور ہوئیں اور دُعائیں مستجاب کہ آج پورے عالمِ اسلام نے بیک زبان کذابِ اعظم مرزائے قادیان اور اس کے حاشیہ برداروں کے بارے میں الحمد للہ شرعی فیصلہ کو "اجتماعی فیصلہ" بنا دیا۔

اور اس "اجتماعی فیصلے" کو آئینی اور دستوری حیثیت دلانے کی اوّلیت کا شرف حاصل کر کے ارضِ پاک علمائے کرام اور عامۃ المسلمین اس دُعا کے ساتھ مستحقِ تہنیت و تبریک ہیں کہ اللّٰھم اعزّ الاسلام والمسلمین

وانصرهم على عدوك وعدوهم۔

چونکہ قادیانی کی یہ نبوت کا ذبہ انگریز کے انتقامی ذہن کی پیداوار تھی اس لیے اس کا آغاز ہی بین الاقوامی سطح پر کیا گیا تھا اس لیے اس کے اثرات کا بین الاقوامی سطح پر وسعت اختیار کر لینا تعجب خیز تو نہیں البتہ فکر انگیز ضرور ہے۔

دستوری کامیابی کے بعد بلاغ وابلاغ کی عظیم تر ذمہ داریوں کا مکمل شعور واحساس تقاضائے فراست و دیانت تو ہے ہی لیکن مدمقابل کے راسخ العداوت ہو جانے کی وجہ سے اس فرض کی ادائیگی تقاضائے ضرورت و سیاست بھی بن گئی ہے جس میں ان تمام وسائل و ذرائع کا متاثر بنیادی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے کہ جن کو فریق مخالف اپنی عصری تعلیمی برتری، ناجائز اقتصادی فارغ البالی، بین الاقوامی سطح پر عمومی تعارف، مؤثر و مفکر اور متقدر شخصیات کی تائید اور فکری جدت اور عددی قلت کی وجہ سے اجتماعی نظم وضبط کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرے گا۔

البتہ اس بارے میں داعیانِ باطل کے بالمقابل جہاں "اشداء" پر عملدرآمد ضروری معلوم ہوتا ہے سادہ لوحی کی وجہ سے مبتلائے ضلال ہو جانے والوں کے سامنے "رحماء" کی عملی تفسیر پیش کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری فریضۂ وقت محسوس ہوتا ہے۔ عہدِ رفتہ میں اربابِ علم و دین کا مؤقف دفاعی رہا، جو بذاتِ خود توسع اور ہمہ گیری کا طالب نہیں ہے لیکن فیصلے نے مؤقفِ اہلِ علم کو دفاع کے بجائے اقدام میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور اقدام وسعت و ہمہ گیری سے اگر عاری ہو تو وہ اقدام باقی نہیں رہتا ہے

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست ۔۔۔ مازندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم

لائحہ عمل کی ترتیب میں مقامی مؤثرات وعوامل کو ملحوظ رکھنا، اور خارجی مؤثرات وعوامل تک اپنی رسائی کا اندازہ کرنا منجملہ لوازم ہوتا ہے، اس لیے اس بارے میں اہلِ خبر سے اہلِ مشاہدہ کی بصیرت ہی زیادہ قابلِ اعتماد ہونی چاہیئے۔ والسلام

مولانا سید ازہر شاہ قیصر
مدیر ماھنامہ "دارالعلوم" دیوبند

گرامی محترم، سلام مسنون!
مجھے آپ کا پہلا خط نہیں ملا، دوسرا خط محررہ ۱۲ر دسمبر آج مؤرخہ ۲۴ر دسمبر کو ملا، پاکستانی ڈاک میں بے حد گڑبڑ ہے، کوئی بھی خط پندرہ دن سے پہلے نہیں پہنچتا۔

آپ کے رسالہ "الحق" کے تازہ شمارہ میں قادیانیت کے مسئلہ پر پاکستانی علماء اکابر کے

تاثرات بھی پڑھے۔ اس مسئلہ پر میرا تاثر یہ ہے کہ یہ صرف پاکستانی عوام کی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی بڑی کامیابی ہے کہ پاکستانی حکومت نے قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ قادیانی مارِ آستین بن کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتا ہے، اب پوری دنیا میں ان کو دینِ اسلام سے خارج قرار دینے میں سہولت ہوگئی، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے پاکستان میں ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی پوری حفاظت کی جائے، انہیں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کسی بھی اسلامی ملک میں ان کی عزت و آبرو اور شہری حقوق پائمال کیے جائیں۔

علمی میدان میں قادیانیت کے خلاف مثبت انداز میں کام کرنے کا دروازہ اب کھلا ہے، علماء کا فرض ہے کہ وہ ایسا تعمیری لٹریچر تیار کریں جس میں خود قادیانیوں کو ختم نبوت، نزولِ مسیح وغیرہ مسائل کی حقیقت سمجھائی جائے اور مرزا غلام احمد قادیانی کے متضاد، لغو اور غیر عقلمندانہ دعاوی کو واشگاف کیا جائے۔ یہ تبلیغ و تحریک جتنے مثبت انداز میں اور جتنے تعمیری رنگ میں ہوگی اتنی ہی کامیاب ہوگی، خود قادیانیوں میں بھی تبلیغ کی جائے اور مفکرانہ انداز میں اس حصار کو توڑ کر جو قادیانی لیڈروں نے اپنے فرقے کے اردگرد قائم کر رکھا ہے، نرمی اور ملاطفت کے ساتھ اس فرقۂ ضالہ کو اسلام کے قریب لایا جائے، خصوصیت سے ایک کوشش ضرور ہونی چاہیئے کہ قادیانی حضرات کو ملک کے کلیدی عہدوں سے ہٹا دیا جائے، انہوں نے پچھلے دنوں آپ کے ملک کو جو نقصان پہنچایا ہے اس سے آپ ناواقف نہیں ہوں گے۔ مگر ہٹائے جانے والے لوگوں کو بھی متبادل روزگار مہیا کرنا حکومت کا فرض ہوگا۔ کاش وقت میں گنجائش ہوتی اور میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات عرض کر سکتا۔ والسلام

حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری
صدر مجلسِ عمل

برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب زادکم اللہ توفیقاً اِلی الخیر، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نہ معلوم نامۂ کرم کب آیا اور کہاں ہے لیکن عزیزم محمد بنوری سلمہ سے یہ معلوم ہوا کہ جواب کا انتظار کر رہے ہیں اور اشاعت رکی ہوئی ہے، اس لیے چند حروف لکھ رہا ہوں، تفصیل کی نہ حاجت نہ فرصت نہ ہمت؛ اختصار بلکہ ایمان سے عرض ہے کہ آئینی فیصلہ نہایت صحیح اور باصواب ہے اگرچہ بعد از وقت ہے اور بعد از خرابی بسیار۔ وزیر اعظم صاحب نے خود اخبارات میں یہ اعتراف فرمایا ہے کہ "قادیانی مسئلہ کے حل ہونے سے

صاحب نے یہ اعلان فرمایا کہ "پاکستان آج صحیح معنوں میں پاکستان بنا" ان دونوں سیاستدانوں کے اس اعلان سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہ یہ کام کتنا عرصہ پہلے ہونا چاہیئے تھا؟ پاکستان کو سیاسی استحکام حاصل ہو گیا ہے" اور

یہاں ہماری ذمہ داری ختم نہیں ہوئی بلکہ ان آئینی نقوش کو جب تک عملی جامہ نہ پہنایا جائے اُس وقت تک مقصد ناتمام ہے "مسلمان درگور و مسلمانی در کتاب" والا معاملہ ہوگا۔ اندرون ملک قادیانیوں کا کچھ ردِ عمل ہے وہ تذبذب ہے، مایوسی ہے اور زیادہ سے زیادہ گیدڑ بھبکی ہے اور کچھ نہیں۔ باہر ملک میں حتیٰ کہ انگلستان میں بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، لیکن افریقہ کے ممالک میں اس آئینی فیصلہ کی اشاعت اور عام کرنے کی بڑی ضرورت باقی ہے، حکومت کو اپنا بین الاقوامی دامن بچانے کے لیے ضرورت ہے کہ عربی، انگریزی، فرانسیسی زبانوں میں اس فیصلہ کی اشاعت کو اپنے سفیروں کے ذریعے تمام عالم میں عام کرے۔

اس وقت حکومت کی جو کچھ پالیسی ہے اس میں تسامح، تغافل، تذبذب بلکہ ایک گونہ نفاق ہے اس نے عملی صورت میں کوئی اقدام نہیں کیا، نہ ان قیدیوں کو رہا کیا نہ ربوہ کو باقاعدہ تحصیل کی شکل دی ہے، ہو سکتا ہے کہ مرکز سے زیادہ پنجاب گورنمنٹ کی دوغلی پالیسی یا طرف دارانہ پالیسی کا نتیجہ ہو۔

بہر حال حالات اگر مایوس کن نہیں تو زیادہ امید افزا بھی نہیں ہیں، بس اس وقت زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں تفصیلات بہت کچھ ہیں۔ والسلام

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مدظلہ

برادرم مولانا سمیع الحق صاحب!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ موصول ہوا۔ مرزائیت کا اللہ تعالیٰ نے خاتمہ کر دیا ہے، اب ان کا معاملہ دوسرے کافروں کی طرح ہے۔ یہ سکھ، پارسی، عیسائی اور ہندو کی طرح ہو چکے ہیں، نکاح وغیرہ کے مسائل حل ہو گئے۔ ہمارے ٹکٹ پر یہ ممبر نہیں بن سکیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ باقی مسائل کے بارہ میں بھی ہم کو امید رکھنی چاہیئے کہ جلد حل ہو جائیں گے۔ میں اس بات کے سخت خلاف ہوں کہ بعض خود غرض اور اقتدار پسند افراد یہ کہتے پھرتے تھے کہ حکومت مرزائی ہو گئی ہے، مرزائی نواز ہے، ٹال رہی ہے۔ میرے بھائی! یہ کافی ہے، باقی میں سمجھتا ہوں کہ مرزائیت کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے، کم از کم اس مسئلے کو ہم اپنی وجاہت کا مسئلہ نہیں بنا سکتے، جیسے دینی ضرورت پیش آئے گی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے۔ فقط (۱۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
بانئ جماعتِ اسلامی پاکستان

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا عنایت نامہ ملا جس میں آپ نے قادیانی مسئلے سے متعلق چند سوالات دریافت کئے ہیں۔ آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ قادیانی مسئلے کے حل پر آپ کے احساسات کیا ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس مسئلے کے حل سے آپ کی مراد قومی اسمبلی کا حالیہ فیصلہ ہے۔ بلاشبہ اسمبلی اور حکومت کا یہ فیصلہ نہایت مستحسن اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے مسرت انگیز ہے، اور اس پر ہم جتنی بھی خوشی منائیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں بالکل بجا ہوگا، لیکن ہماری حکومت، نیشنل اسمبلی اور عامۃ المسلمین کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس سلسلے میں ان کی ذمہ داری اب ختم ہو گئی ہے اور اس فیصلے سے قادیانی مسئلہ پورے کا پورا حل ہو گیا ہے، اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف پہلا قدم ہے جو صحیح سمت میں اٹھایا گیا ہے اور ابھی تک بہت سے ضروری اقدامات ایسے باقی ہیں جن کے بغیر یہ قضیہ جوں کا توں رہے گا بلکہ خدشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدانخواستہ مزید پیچیدگیاں نہ پیدا ہو جائیں اور ہم اس اہم فیصلے کے فوائد سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپ کا ایک عنایت نامہ پہلے آ چکا تھا، اب یاددہانی اور تقاضے کا دوسرا خط آیا ہے جس میں آپ نے جلد جواب مانگا ہے، تو چند ضروری کرنے کے کام جو اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) ۷ ستمبر کو قومی اسمبلی نے آئینی ترمیم کے علاوہ ایک قرارداد یہ بھی منظور کی ہے کہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ الف کے بعد ب کا اضافہ کیا جائے جس میں یہ درج ہو کہ:۔

"ایک مسلمان جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے مفہوم مندرجہ آئینِ پاکستان دفعہ ۲۶۰ شق ۳ کے خلاف عقیدے کا اعلان یا اس کے خلاف عمل یا تبلیغ کرے وہ قابلِ سزا و تعزیر ہوگا۔"

یہ قرارداد غالباً عجلت میں مرتب اور پاس کی گئی ہے اور اس کی ابتداء میں "مسلمان" کا لفظ رکھنے کی وجہ سے اس میں ابہام اور اشتباہ پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس جرمِ شنیع کا مرتکب ہوگا اور مرتکب ہوتے کے بعد وہ مسلمان کہلانے کا مستحق رہ سکے گا؟ خود دستوری ترمیم ہی نے یہ طے کر دیا ہے کہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوگا خواہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ اس سزا کے اطلاق میں دشواری کا سامنا ہوگا۔ للٰہذا تعزیراتِ پاکستان میں اس مجوزہ ترمیم کو واضح اور غیر مبہم بنانے اور اس کے مقصد

تنفیذ کو آسان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا آغاز ایک مسلمان (MUSLIM) کی بجائے ایک مدعیٔ اسلام (A PERSON (PREACHER (To BE A MUSLIM) سے کیا جائے تاکہ کوئی فرد بیشتر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ختم نبوت کے مسلّمہ عقیدہ و مفہوم کے خلاف کسی قول و عمل کا اظہار نہ کر سکے۔

(۲) نیشنل اسمبلی کے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے کچھ مزید قانون سازی بھی بالکل ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر انتخابی قوانین میں ایسی ترمیم ہونی چاہیے جس کے مطابق ووٹروں کے فارم میں نام درج کراتے وقت ہر لاہوری اور ربوی مرزائی پر قانوناً یہ لازم کر دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو غیر مسلموں کے خانے میں مرزائی یا احمدی لکھوائے، اور ان دونوں گروہوں کا اپنے آپ کو مسلم لکھوانا جرم ہوگا جس کی کم سے کم سزا حق رائے دہی سے محرومی ہوگی۔ رجسٹریشن ایکٹ کے تحت شناختی کارڈ بن رہے ہیں ان میں بھی ترمیم ہونی چاہیئے جس کی رُو سے شناختی کارڈ میں بھی ایسی تصریح لازم اور غلط بیانی موجبِ سزا ہوگی۔

(۳) اسی طرح ہر ملازم حکومت پر بھی یہ لازم ہونا چاہیئے کہ اگر وہ قادیانیوں کے ان دو گروہوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اس کی باقاعدہ اطلاع اپنے محکمہ کے توسط سے حکومت کو دے اور جو ایسا نہ کرے یا غلط اطلاع دے تو اسے ملازمت کے لیے نااہل قرار دیا جائے، یا بعد میں بھی اسی قسم کا اندراج اور اس کی خلاف ورزی پر سزا از روئے قانون لازم ہونی چاہیئے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت کے بعض محکموں میں قادیانیوں کی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں لیکن ان میں بعض قادیانیوں کا نام درج نہیں ہو رہا یا اندراج ہو جانے کے بعد اسے حذف کرا دیا گیا ہے لیکن اس پر کسی قادیانی کے خلاف کوئی بازپرس یا تادیبی کارروائی نہیں ہو رہی کیونکہ قانون اور قواعد و ضوابط میں ایسی گنجائش موجود نہیں ہے۔

(۴) قادیانیوں نے جس طرح سول اور بالخصوص فوجی ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق پر غاصبانہ اور ناروا قبضہ کر رکھا ہے اس کا تدارک اور تلافی بھی ضروری ہے۔ جس طرح صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے لیے مسلمان ہونا لازمی شرط ہے اسی طرح بعض دوسرے کلیدی مناصب مثلاً آرمی چیف آف دی سٹاف، عدالت ہائے عالیہ کے چیف جسٹس، اسمبلیوں اسپیکر، سفراء، صوبوں کے گورنر، وزرائے اعلیٰ اور پبلک سروس کمیشن کے صدر کے لیے بھی مسلمان ہونا قانوناً لازم قرار دیا جائے۔ اسی طرح بعض حکومتی اور نیم حکومتی اداروں میں داخلے کے لیے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا کوٹہ الگ الگ

مقرر کیا جاتا ہے، وہاں بھی قادیانی امیدواروں کے لیے اپنے مذہب کا اعلان داخلے کے وقت لازم اور خلاف ورزی موجبِ سزا ہونی چاہیئے۔

(۵) قادیانی یہ بات علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ قومی اسمبلی کے فیصلے کے باوجود وہ مسلمان ہیں، وہ اسلام کے نام پر اپنے عقائد کو اسلامی عقائد کہہ کر ملک کے اندر اور باہر برابر ان کی تبلیغ وتلقین کر رہے ہیں، مرزا غلام احمد کو وہ اب تک نبی، مسیح موعود، مہدی معہود، اس کے ماننے والوں کو صحابۂ کرام اور اس کے خلیفہ کو خلیفۃ المسیح کہہ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں، یہ مسئلہ بڑا سنگین اور حکومت اور عامۃ المسلمین کے لیے صد درجہ غور طلب ہے۔ یہ دستور کی بھی خلاف ورزی ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے باعث دل آزاری واشتعال انگیزی بھی ہے۔ جس گروہ کو قانوناً اور شرعاً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا چکا ہو اُسے اسلامی اصطلاحات کرنے اور اسلام کا مدعی ومبلغ ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر یہ لوگ اسی طرح مسلمانوں کے سینے پر مونگ دلتے رہے تو ان کے اور مسلمانوں کے مابین کبھی صلح وآشتی کی فضا قائم نہیں رہ سکے گی اور حکمران ان کی حرکتوں سے کتنا ہی اغماض کیوں نہ برتیں جب تک عام مسلمانوں میں ایمان واسلام کی رمق بھی باقی ہے وہ ایسی سرگرمیوں کو کبھی بھی برداشت نہیں کریں گے۔

(۶) قادیانیوں کے بالمقابل مسلمانوں نے جس بےمثال اتفاق واتحاد وانفاق کا مظاہرہ کیا ہے اُسے دائماً قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے، جزوی اختلافات اگر ہوں تو انہیں مناسب حدود کے اندر رکھنا چاہیئے اور ان کے اظہار کا طریقہ علمی اور سنجیدہ ہونا چاہیئے، اختلاف کو مخالفت کا رنگ دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے اور ہر اختلاف کو حق وباطل اور کفر واسلام کا اختلاف نہیں بنا لینا چاہیئے ورنہ اس کا فائدہ قادیانیوں ہی کو پہنچے گا جیسا کہ پہلے پہنچتا رہا ہے۔

(۷) قادیانیوں کی دستوری تکفیر کے بعد ایک ضروری کام کرنے کا یہ بھی ہے کہ قادیانیوں کو حکمت اور موعظۂ حسنہ کے اسلوب وانداز میں قادیانیت سے تائب ہونے اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے، جن لوگوں کے ہاتھ میں قادیانیوں کی قیادت وسیادت ہے اور جن کے مفادات ان قائدین سے وابستہ ہیں ممکن ہے کہ وہ اسلام لانے میں تامل وتذبذب سے کام لیں اور پاکستان چھوڑ جانے کو ترجیح دیں، لیکن عام قادیانی جو قصرِ خلافت کے قریب نہیں بلکہ مسلمانوں کی عام آبادیوں میں مقیم ہیں اُن کے سامنے اگر اسلام کی اصل تعلیمات کو صحیح طریق پر پیش کیا جائے اور قادیانیت کے حقیقی خدوخال بھی ان پر اچھی طرح واضح کیے جائیں تو وہ ان شاء اللہ دائرۂ اسلام میں داخل

ہونے میں پس و پیش نہیں کریں گے۔ ان میں بہت سے لوگ ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے لڑکوں کی بہت سی تحریروں سے واقف ہی نہیں ہیں اور جب ان کے سامنے پہلی مرتبہ وہ تحریریں آئیں تو وہ حیران و ششدر اور دم بخود ہو کر رہ گئے اور قادیانیت سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔

(۸) اس سلسلے میں حکومت سے ہمارا ایک مطالبہ یہ بھی مسلسل ہونا چاہیئے کہ صمدانی رپورٹ کو من و عن شائع کیا جائے اور جو لوگ اس رپورٹ کی رو سے مجرم ہیں ان کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے نیز جو مزید سیاسی و انتظامی اقدامات اس رپورٹ کی روشنی میں ناگزیر ہوں ان کو فوراً عمل میں لایا جائے۔ اگر ہماری حکومت اور عوام الناس نے غفلت و تساہل سے کام لیا تو خدشہ ہے کہ اس سازشی گروہ کے ہاتھوں ہمیں مزید زخم نہ کھانے پڑ جائیں۔ کلاندہ اللہ۔

والسلام (۶ نومبر ۱۹۷۴ء)

حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی کراچی

مکرم و محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ ملفوفہ مجھے بعد از رمضان مل گیا تھا، آج کارڈ بھی موصول ہوا۔ جواب میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ میں علیل ہو گیا تھا اور اب بھی قلب کی تکلیف باقی ہے جس کی وجہ سے بہت سے کام ملتوی کرنے پڑے، آج سے تھوڑا تھوڑا کام شروع کر دیا ہے جوابات درج ذیل ہیں:۔

(۱) قادیانیوں کا کافر ہونا تو مسلمات میں سے ہے، حکومت تسلیم کرتی یا نہ کرتی اُمّتِ مُسلمہ انہیں کافر ہی سمجھتی، اس اعتبار سے حکومت کے اس رویئے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، تاہم اس کی خوشی ہے کہ حکومت نے حقیقت کا اعتراف کر لیا اور قادیانی سیاسی اعتبار سے بھی کافر سمجھے جانے لگے، مزید مسرت اس کی یہ ہے کہ اب تقریباً پوری دنیائے اسلام انہیں کافر سمجھنے پر متفق ہو گئی۔ اظہارِ مسرت کے بعد یہ بھی عرض کر دوں کہ میری خوشی محدود ہے یعنی میں اتنی مسرت محسوس نہیں کرتا جتنی عام طور پر لوگ محسوس کرتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں صرف اس اقدام کو مسئلہ قادیانیت کا حل نہیں سمجھتا۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ قادیانیت کی وجہ سے جو دینی و دنیاوی نقصانات امتِ مسلمہ کو پہنچ رہے ہیں ان سے حفاظت ہو۔ اس کی شکل یہی ہے کہ سیاسی اعتبار سے ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جو کسی غیر مسلم اقلیت کے ساتھ ہونا چاہیئے، انہیں ملازمتوں وغیرہ میں ان کی آبادی کے تناسب سے جگہ دی جائے اور کلیدی عہدوں پر ان کا تقرر نہ کیا جائے، باطل کی اشاعت اور ناواقف مسلمانوں کو

مبتلائے فریب کرنے سے انہیں روکا جائے، ربوہ کو مرکز بنا کر جو انہوں نے سلطنت در سلطنت قائم کر رکھی ہے اس صورتحال کو کلیتہً ختم کیا جائے اور ربوہ کو بھی اسی طرح کا شہر سمجھا جائے جیسے پاکستان کے دوسرے شہر ہیں۔ جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ قادیانیت حل ہو گیا ہے؟ اور ہمیں کامل مسرت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجلس عمل میں شیعوں کو شامل کرنا شدید غلطی تھی جس سے شدید دینی و سیاسی نقصانات پہنچے اور آئندہ بھی پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے، ان نقصانات پر نظر کرتے اور نفع و نقصان کا مقابلہ کرنے کے بعد خوشی کی مقدار اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

(۲) قادیانیت کے اثرات پوری دنیا میں پھیل تو نہیں سکے مگر تقریباً ساری دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ اثرات دو قسم کے ہیں، ایک تو خود کامل قادیانیت، اس کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے اگرچہ قادیانی اس کی وسعت کا پروپیگنڈہ بہت کرتے ہیں۔ اس کا دوسرا اثر ہے تشکیک اور دین و اہل دین پر بے اعتمادی کا پیدا ہو جانا۔ عقائد خصوصاً عقیدۂ نزول مسیح اور عقیدۂ ختم نبوت میں کمزوری اور ضعف پیدا ہو جانا۔ اس اثر کی طرف ہماری توجہ بہت کم ہے، حالانکہ اس فتنہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور پوری دنیا میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں یہ فتنہ نہ پہنچا ہو، اسے پھیلانے میں قادیانی اور شیعہ دونوں شریک و سہیم ہیں بلکہ شیعوں کا حصہ قادیانیوں سے زائد ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں کی سرپرستی کی وجہ سے فتنۂ قادیانیت کے سیاسی اثرات بھی نمایاں طور پر پھیل چکے ہیں خود ہمارا ملک اس کا ایک نمونہ ہے، افریقہ کی نوزائیدہ حکومتوں میں بھی ان کا خاص اثر ہے۔

(۳) جب تک فتنہ موجود ہے اس وقت تک ذمہ داری کیسے ختم ہو سکتی ہے؟ بلکہ اب تو اور زیادہ ہوشیاری اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے کہیں عامۃ المسلمین اپنی ذمہ داری ختم سمجھ کر غافل نہ ہو جائیں اور اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر قادیانی نئی نسل میں گمراہی نہ پھیلا دیں۔ قادیانی اقلیت کو تحفظ ضرور حاصل ہونا چاہیئے، ان کی جان و آبرو اور ان کا مال بالکل محفوظ رہنا چاہیئے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے کی آزادی یا اپنے جائز حقوق سے تجاوز کی اجازت دیدی جائے۔

(۴) جب تک یہ فتنہ دنیا میں موجود ہے اس وقت تک اس کا مقابلہ کرنا اور اس کے اثرات کو مٹانے کی کوشش جاری رکھنا لازم ہے۔

(۵) طریق کار ظاہر ہے کہ خود انہیں دین حق کی دعوت دی جائے، مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کر کے اس کے اثرات سے بچانے کی کوشش کی جائے، اس کے لیے ردِ قادیانیت اور استحکام

عقائد اہل سنت پر مناسب لٹریچر کے ساتھ مجالس وعظ و تذکیر کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔ بہت اہم، مؤثر اور ضروری چیز یہ ہے کہ عوام میں ایسے افراد تیار کیے جائیں جو ان میں کھل مل کر قادیانیت کا بطلان اور اسلام کی حقانیت ان کے ذہن نشین کر سکیں۔ یہی لوگ لٹریچر کے لیے بھی میدان پیدا کریں گے اور وعظ و تذکیر کے لیے بھی فضا تیار کریں گے، یہ وہ طریقہ کار ہے جس کی طرف عام طور پر ہمارے راہنما متوجہ نہیں ہیں، مزید یہ کہ ہمارا لٹریچر داعیانہ ہونا چاہیئے جس میں قوتِ استدلال کے ساتھ ساتھ دعوتی نفسیات سے بھی کام لیا جائے۔ والسلام (۱۰ ر شوال ۱۳۹۴ھ)

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب
صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج پشاور

الحمد للہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ۔ اما بعد!

محترمی و مکرمی زید مجدکم و جہادکم فی سبیل اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

قادیانی مسئلہ کے موجودہ حل کے بارے میں چند استفسارات پر مشتمل نامۂ سامی باعثِ سعادت و میمنت ہوا، گو فقیر اس کا اہل نہیں لیکن حضور انور فخر الانبیاء خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے تاجِ ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت کے بارے میں چند الفاظ نجات وسعادت کا ذریعہ بن سکیں تو زہے قسمت:۔

(۱) ختمِ نبوت ایک مُسلمہ اور متفقہ عقیدہ ہے کہ توحید کے بعد اسلام کی بنیاد ہی اس عقیدہ کی بے غل و غش واضح تعبیر پر مبنی ہے، حضورِ انور (روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے جملہ کمالات و مزایا کسی نہ کسی صورت میں "ختمِ نبوت" ہی کا ثمرہ ہیں۔ آپ کی رحمۃ للعالمین شان "عمومی بعثت" دائمی رسالت، آپ کی امت کی بعثت و خیر الامم ہونا، قرآنی احکام کے دوام وغیرہ سب "ختمِ نبوت" ہی کے نتائج و مظاہر ہیں، امتِ مسلمہ کا شیرازہ ختمِ نبوت کی رسی سے بندھا ہوا ہے۔ اُمتیں "نبی" سے بنتی ہیں، اور یہ قائم و جاوداں امت ختمِ نبوت ہی کی برکت سے زندہ، قائم اور استوار ہے۔ اس لیے ہر دور و ہر زمانے میں امت کے ہر طبقہ اور ہر مکتبۂ فکر نے اس عقیدہ کو اسلام کی روح و جان سمجھا اور ناموسِ ختمِ نبوت کے لیے اپنا سب کچھ نثار کرنے میں اپنی فوز و کامرانی جانی، اور اگر کسی روسیاہ و بدبخت نے حریمِ نبوت میں قدم رکھنے کی جسارت کی تو اسے فوراً ختم کر کے رکھ دیا گیا، اور اُمت نے کسی بھی دور میں ختمِ نبوت سے بغاوت اور اس ابلیسی سازش کو برداشت نہیں کیا۔ چنانچہ ہم سب کے آقا و مولیٰ سیدِ دو عالم حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے سے پیشتر ہی جب چند طالع آزماؤں نے مسیلمہ کذاب

اسود عنسی کی صورت میں اپنے خبثِ باطن کا اظہار کیا تو دریائے نبوت نے ان کے انجام کی خبر ایک پھونک سے ختم ہوتے ہوئے ارشاد فرمادی۔

دورِ صدیقیؓ میں امت اور صحابہؓ کا پہلا اجماع اور عملی اقدام ان متنبئین سے قتال پر تھا۔ اسی طرح جس دور میں بھی کسی کو یہ منحوس خبط سوار ہوا اُمت نے اسے ختم کرکے رکھ دیا۔ یہ اس دور کی کم نصیبی، ہماری شامتِ اعمال، انگریزی استعمار و سیاست کا انتہائی دجل وفریب تھا کہ مسیلمہ پنجاب آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی اُمت کو اسلامی معاشرے میں پنپنے اور باقی رہنے کی اتنی طویل مدت میسر آگئی۔ اُمت میں ابلیس کے مبعوثہ متنبئین میں جس طرح انگریزی استعمار کا یہ خود کاشتہ پودا پیدا ہوا اور پروان چڑھا اور اپنے لٹریچر و دعوت کو پھیلاتا رہا وہ تاریخ اسلامی کا ایک اندوہناک باب ہے۔ گو مرزا قادیانی کی منحوس نبوت کے دعویٰ کے پہلے دن ہی سے امت کے خواص وعوام اس "شجرۂ خبیثہ" کے مہلک اثرات کو بھانپ گئے تھے اور اس کے دفاع وقلع قمع کی کوشش شروع ہوگئی تھی لیکن مرزا قادیانی اور اس کی اُمت نے انگریز واستعماری طاقتوں کے زیرِ سایہ اور ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملّتِ اسلامیہ کے لیے ناسُورا ور آکاس بیل (PERASITE) کی صورت اختیار کرلی۔ برکوچک سے انگریز کے اخراج کے بعد ہمارے بعض راہنماؤں کی کم حوصلگی اور کوتاہ بینی نے پاکستان میں ان کے لیے ایسے مواقع فراہم کر دیئے تھے کہ قادیانیت جو ایک انتہائی قلیل وحقیر اقلیت ہے ہر سپید و سیاہ کی مالک بنی جارہی تھی اور اپنے کفر کا اعلان کھلم کھلا کرنے لگی تھی کہ یکا یک غیرتِ حق جوش میں آئی اور ربوہ ریلوے اسٹیشن کا سانحہ پیش آگیا۔ جو حقیقت میں قادیانی سیاست وسازش کا نہایت ہی سنگین واچھوتا اقدام تھا جو کنٹر کے جذبات وحالات معلوم کرنے کے لیے FEELKR کی حیثیت سے آزمایا گیا تھا لیکن "چاہ کن را چاہ درپیش" وہی ان کی سکرات کا سبب بنا۔ نفیرِ سوات میں (۲۸ مئی سے یکم جون ۱۹۷۴ء تک) حضرت الاستاذ علامہ سید محمد یوسف البنوری مدظلہ العالی کا ہمسفر تھا، غالباً ۳۰ مئی تھی کہ ہم منگورہ میں کار سے گزر رہے تھے کہ بندہ نے اخبار خریدا جس میں ربوہ کے خونچکاں سانحہ اور نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء پر قادیانیوں کے حملہ کا ذکر تھا۔ بندہ نے علامہ بنوری مدظلہ کو خبر پڑھ کر سنائی، حضرت موصوف گہری سوچ وفکر میں پڑ گئے، ردِ عمل پوچھا تو کچھ توقف کے بعد فرمایا ؏

"عدو شرے برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد

ہم متحد نہیں ہوسکے تھے ممکن ہے کہ یہ واقعہ ہمیں مسلمانوں کو متفق کردے اور اس فتنہ کا سدِ باب ہوسکے۔"

سچ ہے ؏ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ۳ ماہ ۱۰ دن کے بعد رحمتِ حق متوجہ ہوئی اور میرے قدیر رب کی قدرت نے اندرونی اور بیرونی قوتوں، قادیانیوں کے یقین اور پیشینگوئیوں کے علی الرغم اپنے محبوب اور پیارے رسول خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے لازوال تاج پر دشمنوں کی گردار انے کی نامسعود کوششوں کو ناکام بنا دیا، اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں اور زفر بانیوں کو شرفِ قبولیت سے نوازکر پاکستان کی قومی اسمبلی کو توفیق بخشی کہ وہ ایک مسئلہ سچائی اور حقیقتِ ثابتہ کو قانون کی صورت دے کر عنداللہ و عندالناس سرخرو ہو۔

مبارک ہیں وہ حضرات جنہوں نے یہ قرار داد پیش کی اور خوش بخت ہیں وہ ممبرانِ اسمبلی جنہوں نے اسے من و عن قبول کر کے اسے قانون کی صورت بخشی، قابلِ ستائش و صد آفریں ہیں وہ جملہ افراد و طبقات جنہوں نے اسمبلی سے باہر ہر قسم کی صعوبتیں اور مشکلات برداشت کر کے اس مسئلہ سے انکار کی گنجائش کو ختم کر دیا، اللہ تعالیٰ بیشمار اور لاتنا ہی رحمتیں بھیجے اُن شہداء کی روحوں پر جنہوں نے ناموسِ رسالت کے تحفظ میں حیاتِ جاودانی پائی، اور باری تعالیٰ اُن جملہ علماء و مشائخ اور مجاہدین کی قبروں کو اپنے نور سے منور کرے جو قادیانی فتنہ کی ابتداء سے اس لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بحمداللہ تعالیٰ اگر قادیانی مسئلہ کے اس قومی حل پر اس کے مضمرات و مقتضیات کی روشنی میں دیانتداری و اخلاص سے عمل کیا جائے اور اس کو عملاً روبکار لایا جائے تو یہ حل مسلمانوں کی توقعات کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ حل ہنوز ایک آئینی فیصلہ و تدبیر ہے، قانون کتنا ہی اچھا اور درست کیوں نہ ہو جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے اس کے ثمرات سے متمتع نہیں ہوا جا سکتا، اس لیے ضرورت ہے کہ موجودہ فیصلہ کو الفاظ و معنی اور اس کی آئینی روح کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے اور اس ضمن میں حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ کم از کم مندرجہ ذیل باتوں پر فوری عملدرآمد کیا جائے:-

(۱) پاکستان کی نظریاتی مسلم مملکت کے جملہ اہم عہدوں سے قادیانیوں کو فوراً برطرف کیا جائے۔

(۲) عام سرکاری ملازمتوں ان کا کوٹہ ان کی آبادی کے مطابق مقرر کیا جائے اور گذشتہ ۲۷ سالوں میں انہوں نے جس قدر ملازمتوں پر اپنے حصہ رسدی سے زیادہ مسلمانوں کے حق پر قبضہ کر رکھا ہے جب تک ان کے حصہ رسدی کے مطابق نہیں ہو جاتا اس وقت تک مزید بھرتی روک دی جائے۔

(۳) ربوہ کی مستقل حیثیت کو ختم کر کے اسے کھلا شہر عملاً بنا دیا جائے اور وہاں عام مسلمانوں کو آباد کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

(۴) فرقان رجمنٹ اور قادیانیوں کی دیگر فوجی و نیم فوجی تنظیموں کو فوراً ختم کیا جائے۔

(۵) ان کے لٹریچر کی جملہ کتابوں، رسائل اور عبارات کو ضبط کیا جائے اور ان کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے جن میں انبیاء علیہم السلام اور شعائر اسلام کی ہتک کی گئی ہے یا قرآن کے الفاظ و معنی میں تحریف یا ختم نبوت کی من مانی تشریح کی گئی ہو۔

(۶) نیشنل اسمبلی کی قادیانی مسئلہ پر کارروائی کو منضبط کر کے شائع کیا جائے خصوصاً اسمبلی کی قرارداد[۲] کا ضمیمہ "ملتِ اسلامیہ کا مؤقف" کتاب کو سرکاری طور پر عربی، انگریزی اور اردو میں شائع کر کے منیر رپورٹ کی طرح تمام دنیا میں پھیلایا جائے اور سفارتخانوں میں ان کی نقول بھیجی جائیں تاکہ فیصلہ کی حقانیت عالم پر ظاہر ہو۔

(۷) قادیانیوں کا اندراج مردم شماری، شناختی کارڈوں، پاسپورٹوں، ملازمت اور دیگر جملہ سرکاری کاغذات میں جہاں مذہب کا خانہ ہو، غیر مسلم کی حیثیت سے کیا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں وہ غلط بیانی سے کام لیں اور بعد از تحقیق اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو اسے قابلِ سزا جرم قرار دیا جائے جو پاسپورٹ کی دائمی ضبطی اور ملازمت سے اخراج وغیرہ کی صورت میں ہو۔

(۸) قادیانیوں کو مسلمانوں کی مسلمہ شرعی اور دینی اصطلاحات کے استعمال کرنے سے روک دیا جائے، ان کی عبادت گاہوں کو مسجد کی بجائے قادیانی معبد یا کسی اور نام سے پکارا جائے، اسی طرح ان کے ذبیحہ اور شادی بیاہ وغیرہ اور جملہ اسلامی احکام جو کفار کے بارے میں ہیں ان پر نافذ کیے جائیں۔ ذمیوں کی حیثیت سے اگر وہ اپنے کو غیر مسلم اور وفادار شہری کے طور پر رہنا چاہیں تو ان کے ان حقوق کی حفاظت کی جائے جو شریعتِ اسلامیہ میں ذمیوں اور غیر مسلموں کے لیے طے کیے گئے ہیں، اور اگر وہ اس حیثیت سے انکار کریں اور اپنے کو پہلے کی طرح مسلمان سمجھ کر مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں تو ان کا اقتصادی اور معاشرتی مقاطعہ کیا جائے۔

(۹) دنیا میں باطل عموماً ملک و مال کے سایہ میں یا زن، زر، زمین کے لالچ میں پھیلتا ہے یا غلط فہمی اور دجل و فریب سے سادہ لوح اشخاص کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لیتا ہے۔ "قادیانیت" بھی دجل و فریب کا مرقع، تحریف و تلبیس اور ابلہ فریبی اور دسیسہ کاری کا پلندہ ہے جو انگریزی استعمار اور دنیاوی حرص و آز میں پیدا ہوئی اور پھلی پھولی۔ ظاہر ہے کہ بہت سے دنیا پرست یا سادہ لوح دنیا کی محبت یا تحریف کے دھوکہ میں آکر اس لعنت کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری جگر سوزی اور توجہ سے ان لوگوں کو دینِ خالص اور اصل اسلام کی دعوت دی جائے اور پھر سے ان کو خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل کیا جائے تاکہ وہ اپنی گذشتہ

غلط زندگی سے تائب ہو کر تلافی مافات کر سکیں۔ اندرونِ ملک کے علاوہ غیر ممالک خصوصاً افریقہ و یورپ اور امریکہ کے ممالک میں جو سادہ لوح لوگ "قادیانیت" کو اسلام سمجھ کر گمراہ ہوئے ہیں انہیں صحیح اسلام سے روشناس کرانا اور اس فریب اور مغالطے سے انہیں بچانا ہم سب مسلمانوں کا فرض ہے اِس سلسلے میں وفود، لٹریچر، حکومتی اور عام سطح پر جملہ تدابیر کو بروئے کار لایا جائے۔ اس بارے میں سفارتخانوں سے قادیانی عملہ کی تبدیلی ایک خوش آئند عمل ہو گا۔

خیر یہ تو سادہ لوح، گم کردہ راہ قادیانیوں کی بات ہے لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ہٹ دھرم اور اپنے غلط عقائد پر رہتے ہوئے اپنے کو "مسلمان" سمجھنے اور سمجھانے پر مُصر ہے، اس نے قومی اسمبلی کے فیصلہ کو دل سے قبول نہیں کیا، وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح موقع کی تاک میں ہے اور ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے پاکستان خصوصاً اور مسلمان عموماً امن میں نہیں ہیں، ملّت کو ان سے وہی خطرات ہیں جو کسی زمانے میں حسن ابن صباح اور باطنیوں سے مسلمانوں کو تھے۔ گو اسمبلی اور مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلہ پر مرزا ناصر احمد اور اس کی اُمت منقارِ زیر پر ہے، اور ۱۴ اکتوبر کے خطبۂ جمعہ میں مرزا ناصر نے کہہ دیا ہے کہ "قادیانی مسئلہ پر قومی اسمبلی کے فیصلہ پر جنوری یا فروری سے پہلے کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔"[1] نہ معلوم مرزا صاحب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں، تاہم مرزا صاحب اور ان کی امت کی ذہنیت مرزا ناصر کے اس خطبۂ جمعہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے جو آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پر کرتے ہوئے انہوں نے ۱۳ مئی ۷۳ء مسجدِ اقصیٰ ربوہ[2] میں دیا تھا۔ قادیانی ذہنیت کی عکاسی کے لیے اس پمفلٹ کے بعض اہم و چیدہ اقتباسات کو نقل کرتا ہوں۔ آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد کا تذکرہ کرتے ہوئے مرزا ناصر احمد صاحب کہتے ہیں:۔

(۱) یعنی یہ کوئی ایسا بل پاس نہیں ہوا کہ اقلیت قرار دیا جاتا ہے، بلکہ یہ ایک سفارش ہے جو آزاد کشمیر کی حکومت سے کی گئی ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے اور ان کی مذہبی تبلیغ پر پابندی لگائی جائے اور احمدی غیر مسلم اقلیت کی صورت میں نام رجسٹرڈ کروائیں۔ چنانچہ میں نے آزاد کشمیر سے بعض ذمہ دار آدمیوں کو بلایا۔ اس وقت صحیح صورتحال سامنے

---

[1] نوائے وقت راولپنڈی ۱۶ اکتوبر ۷۴ء [2] یہ خطبہ الفضل ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا، پھر نظارتِ اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ نے "آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ از حضرت امام جماعتِ احمدیہ" کے عنوان سے علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

نہیں آئی تھی، اگلے دن وہ میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے کہا دیکھیں ایک بات میں آپ کو بنیادی ہدایت کے طور پر ابھی کہہ دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ قرارداد قانون کی صورت میں منظور بھی ہو جائے تو قانون یہ کہتا ہے کہ ہر وہ احمدی جو خود کو غیر مسلم سمجھتا ہے وہ اپنا نام رجسٹرڈ کروائے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ہر احمدی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور خدائے علیم و خبیر کی نگاہ میں بھی مسلمان ہے اس لیے یہ قانون لاگو نہیں ہوتا۔ ایک آدمی جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے وہ غیر مسلم کی حیثیت میں نام کیسے رجسٹرڈ کروائے گا، اگر وہ ایسا کرے گا تو گویا وہ جھوٹ بول رہا ہوگا اور اسلام نے جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دی۔" (پمفلٹ مذکورہ ص۳)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی ذہنیت باوجود اپنے صریح کفر اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلی بغاوت کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور کہلائے جانے پر باوجود قانون کے مُصر رہے گی۔

(۲) آگے چل کر دھمکی کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے:-

"پس اگر نو یا بارہ آدمیوں نے اس قسم کی قرارداد پاس کر دی تو خدا کی قائم کردہ جماعت پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے، اس کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ یہ نہیں کہ جماعتِ احمدیہ غیر مسلم بن جائے گی، جس جماعت کو اللہ تعالیٰ مسلمان کہے اُسے کوئی ناسمجھ انسان غیر مسلم قرار دے تو کیا فرق پڑتا ہے، اس لیے اس کا فکر نہیں، ہمیں فکر ہے تو اس بات کا کہ اگر یہ خرابی خدانخواستہ انتہا تک پہنچ گئی تو اس قسم کے فتنہ فساد کے نتیجہ میں پاکستان قائم نہیں رہے گا۔ اس لیے ہماری دعائیں ہیں، ہماری اور ہمارے اندر حُب الوطنی کا یہ جذبہ موجزن کہ کسی قسم کا کوئی بھی فتنہ نہ اٹھے کہ جس سے خود پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ آخر فتنہ فساد یہی ہے نا کہ کچھ سر کٹیں گے، کچھ زخمی ہوں گے، کون ہوں گے اور کیا ہوگا، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔" (ص۴، ۵)

مندرجہ بالا عبارت میں خصوصاً خط کشیدہ عبارات کے بین السطور میں جس قسم کی دھمکیاں عیاں ہیں وہ ہر سچے پاکستانی کے لیے لمحۂ فکریہ اور قادیانی سازشی ذہن کی عکاس ہیں جس سے ہر وقت چوکنا رہنا ضروری ہے، بلکہ آگے چل کر اس سے بھی واضح الفاظ میں تعلیل اور مقابلہ کی دعوت ہے ـــــ چنانچہ مرزا صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:-

(۳) "لیکن جہاں تک جماعتِ احمدیہ کا تعلق ہے تم گیدڑ اپنی کھوہ سے باہر نکل آئے ہو

اور سمجھتے ہو کر تمہارے چیخنے چلّانے سے جماعت احمدیہ کے افراد ڈر جائیں گے، نہیں ہرگز نہیں ڈریں گے۔" (صنا)

(۴) ...." آج ان لوگوں کو جو ۱۹۵۳ء کی آڑ میں فتنہ و فساد برپا کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں عاجزانہ طور پر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، جماعت احمدیہ کے وہ لاکھوں بالغ افراد جو پاکستان کے باشندے ہیں اُن کو خدا کی راہ میں موت سے ایسا ہی پیار ہے جیسا کہ ایک عاشق اپنے معشوق پر مستانہ وار قربان ہونے کو تیار کھڑا ہوتا ہے ..... پس جہاں ہمیں پیار سے لوگوں کے دل جیتنے کا حکم ہے وہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ (الحج ۴۰)۔ (صلا)

(۵) ....." ہ جو خدا کا ہے اُسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبہ زار و نزار

تم لومڑی کا لبادہ اوڑھ کر اور گیدڑ کا لباس پہن کر نکلتے ہو اور چیختے اور چنگھاڑتے ہو کہ ہم مرعوب ہو جائیں گے۔ ہمیں تو خدا تعالیٰ نے شیر کی جرأت سے بڑھ کر جرأت عطا فرمائی ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے شیر کے رعب سے زیادہ رعب عطا فرمایا ہے، شیر کی دھاڑ سے میلوں تک بزدل جانور کانپ اٹھتے ہیں، ہمیں تو یہ وعدہ دیا گیا۔ نصرت بالرعب میسر شہر۔" (ص۱۳)

(۶) ....." ہم تو ساری دنیا سے نہیں ڈرتے، جب انگریز سمجھتا تھا کہ اس کی دولت مشترکہ پر سورج غروب نہیں ہوتا، اس وقت اس نے احرار کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا (مرچہ دلاوری ڈرتے۔ ناقل) اُس وقت بھی ہم نہیں ڈرے نہ ہمیں کوئی نقصان پہنچا، اب جب کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے حالات بدل گئے ہیں اور احمدیت پر سورج غروب نہیں ہوتا، ہم نے خدا تعالیٰ کے عظیم الشان نشان دیکھ لیے، اب ہم اللہ کے سوا کسی اور سے بھلا کیوں ڈریں گے؟ ..... ہم انوار میں رہنے والے ظلمات میں چیخنے والے گیدڑوں (یعنی مسلمانوں۔ اشرف) سے بھلا کیسے ڈر سکتے ہیں؟" (ص۱۳)

(۷) ....." جماعت احمدیہ کو قربانیاں دینی پڑیں گی، بعض افراد کو شاید جان کی قربانی دینی پڑے، بعض کو مال کی قربانی دینی پڑے، یہ تو ضرور ہو گا، لیکن جس مقصد کیلئے جماعت کو پیدا کیا گیا ہے، اس مقصد میں انشاء اللہ ناکامی نہیں ہو گی۔" (ص)

مرزا ناصر احمد صاحب کی یہ پیشینگوئیاں مرزا غلام احمد صاحب کی محمدی بیگم کی پیشینگوئی کی طرح پوری ہوتی ہیں یا نہیں لیکن ان تحریروں سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا ناصر صاحب کھلے بندوں "ھل من یا دن" اور جنگ اور مقابلہ کی دعوت دے رہے ہیں، انہیں یہ ہرگز گوارا اور منظور نہیں کہ ان کے کفر کو کفر کہا جائے اور ان کے اسلام سے اخراج و بغاوت کا کھلے بندوں اظہار کیا جائے اور جن دنیاوی مصلحتوں، طالع آزما مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں، سازشوں اور غیر ملکی استعمار کا ایجنٹ بننے کیلئے انہوں نے منافقین کی طرح نام نہاد اسلام اور مسلمانی کا جامہ اوڑھ رکھا ہے اُس کی پردہ دری کی جائے اور ان کی جو اصل حقیقت ہے اس کو دنیا پہ آشکارا کیا جائے۔ غرض مرزا ناصر احمد اور اس کی ملت کبھی بھی خوشدلی سے قومی اسمبلی کے فیصلہ کو نہیں مانے گی۔ ان سے خطرات کھلے اور واضح ہیں یہاں تک کہ پاکستان کی سالمیت کے بارے میں بھی وہ دھمکیاں اور گیدڑ بھبکیاں دے رہے ہیں، اس لیے عام مسلمانوں اور حکومت کو پہلے سے زیادہ ان کی نگرانی اور ان کی نقل و حرکت کی نگہداشت کرنی چاہیئے، مبادا کہ وہ سرگودھا جیسے حالات پیدا کر کے پورے ملک کو آگ و خون میں نہ جھونک دیں۔

مندرجہ بالا سرسری گذارشات سے یہ بات ظاہر ہے کہ گو قومی اسمبلی کا فیصلہ ایک عمدہ اور اچھا عمل ہے لیکن ابھی یہ پہلا قدم ہے، ابھی ملتِ مسلمہ کو بے فکر ہو کر قادیانی فتنہ سے غافل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ملک و بیرون ملک دعوتی، دینی، سیاسی و معاشرتی غرض ہر میدان میں پورے حزم و احتیاط، ہوش و ضبط سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للّٰہ۔ کا امر الٰہی ظاہراً و باطناً پورا ہو جائے اور انگریزی استعمار کا یہ خود کاشتہ پودا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

آخر میں مجلس تحفظِ ختمِ نبوت اور اس کے امیر مخدومی الاستاذ علامہ سید محمد یوسف بنوری مدظلہٗ اور مجلس کے دوسرے راہنماؤں اور ان جملہ جماعتوں کو جنہوں نے اس دینی فریضہ اور فخرِ موجودات سید الکائنات خاتم النبیین حبیبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا، مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کا نظم و ضبط، اتحاد، صبر و ہوش اور فراست و ہمت اس فیصلہ پر پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ ہمارے لیے ۲۲ جماعتوں کا اتحاد ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ و فیض ہے۔ دشمن کھلے اور چھپے حربے استعمال کر کے اس اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ کاش! تمام فروعی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اسی طرح سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد رہ سکیں تاکہ اس جہد و جہاد کے جملہ مقاصد پورے اور اس کے ثمرات ظاہر ہو سکیں بلکہ مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کا کام اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

"خاتم الشرائع" کا من وعن نفاذ و اجراء پورے ملک بلکہ تمام دنیا میں نہیں کرا لیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگوں اور عام مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر اتحاد و تنظیم و ضبط، یقین و ہوش سے اپنی جملہ ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں اور حضور خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے فیض سے پورے عالم کو بقعہ نور بنا سکیں۔ آمین

مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مہتمم نجم المدارس کلاچی	مکرم و محترم وفقکم اللہ تعالیٰ لما یحبہ و یرضاہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوالنامہ اور پھر مکرر یاد دہانی موجب ممنونیت ہے۔ جواباً گذارش ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں اسلام کے بعد کسی چیز سے بھی شاید اتنی خوشی ہوئی ہو جتنی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے ایمانی، روحانی اور تاریخی فیصلہ کے اس اعلان سے ہوئی۔ فما فرحت بشی بعد الاسلام فرحی بهذا الاعلان، اس لیے کہ:-

(الف) اس میں مسلمانوں کی شاندار کامیابی اور ارتداد و مرزائیت کی ذلیل ترین شکست تھی۔

(ب) اس لیے کہ پاکستان کی تاریخ میں کسی ایمانی اور اسلامی مطالبہ میں ایسی صریح اور واضح کامیابی کی مثال موجود نہیں تھی۔

(ج) ماحول کو دیکھتے ہوئے اور خود اپنی اور قوم کے ما ظهر منها وما بطن معاصی، مظالم اور آثام کی تاریکیوں میں کبھی اپنے گناہ بھرے کانوں کو اور نہ ہی معاصی آلود آنکھوں کو اس قابل سمجھا کہ وہ عزت دین کی ایسی سامع نواز خبر سن سکیں گے یا اعزاز اسلام کا ایسا پُر لطف منظر دیکھ سکیں گے۔ سبحان الحی الکریم۔

(د) اور خاص طور پر اس لیے کہ اگر فیصلہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اس کے برعکس ہوتا تو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دین سے ناواقف لکھے پڑھے پاکستانیوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا، وہ قادیانیوں اور لاہوریوں کے کفر و ارتداد میں متردد ہوتے اور دنیوی مفاد حاصل کرنے یا دنیوی نقصانات سے بچنے کی خاطر حکومت کی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور دنیا بھر کے علماء و فضلاء کے اجماع کے خلاف مرزائیوں کو مسلمان کہنے کی ناروا جسارت کرتے اور اپنا ایمان کھو بیٹھتے، الحمد للہ ثم الحمد للہ اس فیصلہ سے سب کے ایمان بچ گئے۔

اللہ والوں کے روحانی تصرفات، مجاہد اور باریک بین علماء کی شب و روز کی تگ و دو اور مخلص مسلمانوں کی پرسوز آہوں اور مخلصانہ دعاؤں سے الحمد للہ کہ عام رجحان کے علی الرغم کایا

پلٹ گئی اور یکدم پلٹ گئی اور غیر متوقع طور پر مسلمانوں کی مدتوں کی آرزو پوری ہوگئی ؎
شکر اللہ ہر آں چیز کہ خاطر می خواست آخر آمد و پس از پردۂ تقدیر پدید
ونعوذ باللہ من الحور بعد الکور ؎
الٰہی چوں عزیزم کردی امروز مکن فردا بہ پیش خلق خوارم

دوسرا سوال: آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذمہ داری اس فیصلہ پر ختم ہوگئی ہے یا اس فتنہ کے مہلک اثرات کا تعاقب اور احتساب جاری رکھنا ہوگا؟

جواباً عرض ہے کہ یہ فیصلہ تو قبولِ اسلام کا اعلان ہے، اس پر اگر استقامت نہ ہوئی اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا گیا بلکہ اس میں تاخیر ہوئی تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو پاکستان بنا دینے کے بعد نظریۂ پاکستان سے تغافل کا ہوا کہ خود پاکستان کو دھکا لگا اور اُسے دو نیم ہونا پڑا، بہرحال اس غلطی کا اعادہ کیا گیا تو یہ فیصلہ بھی مسلمانوں کے حق میں مفید ہونے کی بجائے معاذ اللہ اُلٹا ارتداد کے لیے زیرِ زمین راہ ہموار کرنے کا باعث بنے گا۔ لا قدرھا اللہ۔

اس سلسلہ میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں:۔

تجویز ۱: فیصلہ کے تقاضوں کو بروئے کار لایا جائے | میری مراد اس فیصلہ کے تقاضوں سے یہ ہے کہ اب فوری طور سے حکومتی سطح پر:۔

(۱) ان نامسلموں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے۔
(۲) ان کے اوقاف حکومت کے قبضے میں لے لیے جائیں۔
(۳) ان کے اسلامی نام انجمن حمایتِ اسلام وغیرہ قانوناً ممنوع قرار دیئے جائیں۔ ایک غیر مسلم کا اسلام کی حمایت کے نام سے کام کرنا پرلے درجہ کا دجل نہیں تو اور کیا ہے؟
(۴) اسلامی شعائر از قسم اذان، مسجد وغیرہ کا استعمال یہ غیر مسلم ہرگز نہ کر سکیں۔
(۵) اور ان کی نیم فوجی تنظیمیں بلا کسی تاخیر کے قانوناً ممنوع قرار دی جائیں۔

ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کا وہی اتحاد برقرار رہنا از حد ضروری ہے۔ جو ۲۹ رمئی تا ۷ ستمبر رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی تقطیع کا کام شروع ہو چکا ہے، شیعہ نصاب الگ کرنے کے لیے شیعہ ایجی ٹیشن کی دھمکیاں اس کا بہت واضح قرینہ معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ نہ معلوم زیرِ زمین کیا کیا ہو رہا ہوگا، ۱۹۵۳ء کے بعد دیوبندی بریلوی اتحاد کو کس طرح پارہ پارہ کر کے قوم کو لڑایا گیا۔

تجویز ۲ مجلسِ عمل کے اجتماعات مسلسل ہوتے رہیں | میرے نزدیک اس کے لیے مجلسِ عمل کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر مسلسل اس کے اجتماعات ہوتے رہیں اور اکابرینِ مجلسِ عمل اپنی روحانی توجہات اور تصرفات میں کمی نہ آنے دیں اس کے بغیر جذباتی قوم میں اس اتحاد کو برقرار رکھنا ناممکن ہے ۔ والامر بید اللہ تعالیٰ ۔

تجویز ۳ پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد ہو | ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود بھی ان مرتدین کے سیاسی ناخدا ان کی پشت پناہی کرتے رہیں گے اور انہیں پاکستان اور پورے عالمِ اسلام کو خراب کرنے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان اور پورے عالمِ اسلام کی خارجہ پالیسی آزاد ہو اور حقیقتاً آزاد ہو۔ کیا آج اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ جو ممالک بھی مغربی ممالک کے تسلط سے آزاد ہیں، جو سلطنتیں امریکی بلاک کے زیرِ دست نہیں ہیں کیا ان میں بھی مرزائیت کوئی مسئلہ ہے؟ آزاد خارجہ پالیسی اپنانے سے ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا اور یہ فتنہ اپنی موت آپ مر جائے گا ۔

تجویز ۴ تبلیغی طور پر | مرزائے قادیانی کی ننگِ انسانیت زندگی کو خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں ننگا کیا جائے ۔

تجویز ۵ | عربی مدارس میں اور نہیں تو بلا کسی تاخیر کے القادیانی والقادیانیۃ قسم کی کتابوں کو داخلِ نصاب کیا جائے، کم از کم وفاق المدارس کے امتحان میں اس کا امتحان لازمی ہو، تقابلِ ادیان کے نام سے وفاق کے امتحان میں ایک پرچہ کا اضافہ ہو، اور جب تک کوئی مستقل کتاب اس عنوان پر شائع ہو کر شریکِ نصاب نہیں کر لی جاتی جس میں مرزائیت، سبائیت، اباحیت اور اسلام کے معاشی، اقتصادی اور سیاسی نظام کے منہ آنے والے نظاموں کی اصطلاحات کو منقح کیا گیا ہو، ان کے دلائل بیان کر کے عقل و نقل سے ان کے تار و پود نہ بکھیرے گئے ہوں، اس وقت تک صرف اسی کتاب (القادیانی والقادیانیۃ) کے امتحان پر اکتفا ہو۔ اصحابِ خیر سے اپیل کی جائے کہ اس کتاب کے حسبِ ضرورت نسخے وفاق المدارس سے منسلک درجہ علیا کے مدارس کو مفت مہیا کریں اور مدارس کے اربابِ اہتمام سے اپیل کریں کہ طلباء دورۂ حدیث شریف کو یہ کتاب یا اس کا خلاصہ پڑھا دیا جائے ۔

اس طرح تحفظ ختمِ نبوت اور تحفظِ اسلام و آئین و نظامہائے اسلام کا کام پورے ملک میں پھیل کر حفاظتِ عقائدِ حقہ کا ذریعہ بنے گا اور وقتی نہیں ان شاء اللہ صدقہ جاریہ اور دائمی ہوگا ۔ والامر بید اللہ ۔

(۱۸ شوال ۱۳۹۴ھ)

حضرت مولانا امین احسن اصلاحی
ایڈیٹر ماھنامہ "میثاق" لاھور

مکرمی زاد لطفہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
افسوس ہے کہ آپ کا سوالنامہ مجھے بڑی تاخیر سے موصول ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اب لاہور سے نقل مکان کر کے شیخوپورہ کے ایک دیہات میں آگیا ہوا اور آپ نے گرامی نامہ لاہور کے پتہ پر ارسال فرمایا، کل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ملنے آئے تو وہ سوالنامہ ساتھ لائے۔

قادیانی مسئلہ سے متعلق میری رائے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے رسالہ میثاق میں شائع کر دی ہے، میرے نزدیک قادیانی اقلیت کے حقوق کے سزاوار تو نہیں تھے۔ لیکن ہمارے ملک میں چونکہ شرعی توانین نافذ نہیں ہیں اس وجہ سے بالفعل مسئلہ کا ممکن حل یہی تھا، یہ نرم سے نرم سلوک ہے جو ان کے ساتھ کیا گیا ہے، اگر قادیانیوں نے اس کی قدر کی تو وہ اپنے لیے اس ملک میں امن کی زندگی کی گنجائش پیدا کر لیں گے اور اگر اس رعایت سے انہوں نے غلط فائدے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ قادیانی اس رعایت سے غلط فائدے اٹھانے کی کوشش کریں گے، اور خاصا اندیشہ اس امر کا بھی موجود ہے کہ بعض غلط اندیش لوگ اقلیت کے نام پران کی سرپرستی کریں۔ ان خطروں کے سدِباب کی واحد شکل یہی ہے کہ مسلمان برابر بیدار رہیں، اگر مسلمانوں نے اس معاملے میں غفلت اور سستی کی تو اب قادیانیوں کو جو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے اُس کی آڑ میں وہ ہمارے مذہب اور ملک دونوں کو پہلے کی نسبت زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ (۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء)

مولانا محمد طاسین صاحب
ناظم مجلسِ علمی کراچی

عزیز محترم وصدیق مکرم زاد کم اللہ لطفاً وعنایۃً۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
شکرِ الٰہی کے جذبہ سے معمور دل سے اس نمایاں اور خاطر خواہ کامیابی پر ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہوں جو قادیانی مسئلہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے علمائے حق کو عطا فرمائی ہے، آپ اس تبریک وتہنیت کے اس وجہ سے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ نے اس میدان میں ہر طریقہ سے غیر معمولی جدوجہد فرمائی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس مبارک مہم کے دورِ تازہ کا آغاز آپ کی ان جرأتمندانہ تحریروں سے ہوا ہے جو کچھ عرصہ پہلے ماہنامہ الحق میں منظرِ عام پر آئیں جبکہ ہر طرف عام طور پر سکوت تھا۔ بارک اللہ لکم وفیکم وشکر مساعیکم۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم کامیابی کو ہماری مستقبل کی بیشمار کامیابیوں کا ذریعہ بنائے اور ہمارا یہ ملک حقیقی اور عملی طور پر دارالاسلام بنے اور دنیا اس کی تقلید اور پیروی پر مجبور ہو۔

سوال ۱ کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ قادیانی مسئلہ میں جن حالات کے اندر جس طریقہ سے، جو کچھ بھی فیصلہ ہوا ہے میں سمجھتا ہوں یہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص اور عظیم فضل ہوا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اس فتنہ کے سر پر کاری ضرب لگی اور اس کے انقلابی عزائم ملیامیٹ ہو گئے جو آگے چل کر بہت بڑی تباہی و بربادی کا موجب بنتے اور دوسری طرف اس وقت مسلمان ایک بہت بڑے خون خرابے سے بچ گئے جس سے بے اندازہ جانی و مالی نقصان پہنچتا، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر بھی شکر کیا جائے کم ہو گا۔

سوال ۲ کے بارہ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قادیانی فتنہ کے جو اثرات پاکستان کے اندر اور باہر پھیلے ہوئے ہیں اُن کو مٹانے اور زائل کرنے کے لیے مختلف علمی و عملی طریقوں سے بڑے پیمانہ پر منظم اور مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے، اجتماعی صلاح و مشورہ سے ایسے طریقے سوچے اور معلوم کیے جائیں جو اس کے لیے مفید اور مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں اور جن کو اختیار کرنے سے مذکورہ اثرات کا ازالہ اور خاتمہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال کسی فتنے کے اثرات کو مٹانے اور ختم کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ فتنے کے وجود کے اسباب جو ہیں ان کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ان اسباب کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے ازالہ کے بغیر نہ فتنہ مٹ سکتا ہے اور نہ اس کے اثرات ختم ہو سکتے ہیں۔

سوال ۳ کے متعلق میری حتمی اور قطعی رائے یہ ہے کہ قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ کیا ہے، یہ فیصلہ چونکہ اصل مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد کا ایک ذریعہ ہے، لہٰذا جب تک اصل مقصد حاصل نہیں ہو جاتا مسلمانوں کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ اصل مقصد میں سمجھتا ہوں یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان میں کوئی ایسی آواز اور کوئی ایسی تحریر باقی نہ رہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص کسی بھی معنی میں نبی و رسول ہے پھر جب کہ اس کے لیے اسلام اور قرآن و حدیث کو بھی استعمال کیا جاتا ہو۔ اس کے بعد اگلی منزل یہ ہونی چاہیئے کہ مسلمانوں کے اندر سے شریعتِ محمدیہ کے سوا باقی سب غیر اسلامی قوانین ختم ہو جائیں اور ان پر صرف شریعتِ محمدیہ کی حکمرانی ہو جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی نے آخری طور پر پیش فرمائی ہے، کیونکہ عقیدۂ ختم نبوت کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ مسلمان صرف شریعتِ محمدیہ کو اپنی زندگی کا دستور حیات

اور لائحہ عمل بنائیں اور اس کے سوا باقی ہر قانون کو ٹھکرا دیں۔

سوال ۱۲ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا آئینی ذرائع اور کیا علمی و عملی طریقے اختیار کرنے چاہئیں؟ اس کا جواب کافی تفصیل طلب ہے اور خاصا مشکل بھی، لہٰذا میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی سوجھ بوجھ رکھنے والے کچھ حضرات ایک جگہ جمع ہوں اور تمام پہلوؤں پر سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد باہمی مشورہ سے یہ طے کریں کہ آج جن داخلی و خارجی اور اندرونی و بیرونی حالات سے ہم دوچار ہیں ان میں مذکورہ مقصد کے لیے کیا طریقِ کار زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہو سکتا ہے جس کو آج عملاً اختیار کیا جائے۔

بہرحال اس کے لیے جو بھی طریقِ کار طے کیا جائے اس میں اس ردِّ عمل کو ضرور ملحوظ رکھا جائے جو اس کے نتیجہ میں ظاہر ہو سکتا ہے، اندرونِ پاکستان بھی اور بیرونِ پاکستان بھی، تاکہ نقصان کم سے کم اور فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکے۔ اندھی جذباتیت اور انتہاء پسندی سے بچنا بہرحال مفید رہے گا، جہاں تک ہو سکے عقل و شعور اور اعتدال پسندی سے کام لیا جائے۔ اللّٰہم وفقنا لما تحب وترضیٰ۔

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب زرولوی
صدر المدرسین دارالعلوم حقانیہ

انگریزوں کے زمانے میں قادیانی مسئلہ کا حل نہایت مشکل تھا کیونکہ انگریزوں نے خود اس جماعت کو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا تھا، گذشتہ زمانہ میں بھی وہ ان کی سرپرستی کر رہے تھے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ تو انگریزی حکومت سے قادیانیوں کے خلاف اقلیت اور کفر کا فیصلہ ان کے مقاصد کے خلاف تھا، اگرچہ جزوی طور پر بعض عدالتوں میں ان کو ملتِ مسلمہ سے خارج قرار دیا گیا تھا اور ان کے بارہ میں فسخ نکاح کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

پھر جبکہ انگریز ملک چھوڑنے لگا اور پاکستان کا نظریہ ظہور میں آیا تو چونکہ یہ نظریہ دو قومیت پر مبنی تھا اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم کا دار و مدار بھی اکثریت اور اقلیت قرار دیا گیا تو کچھ لوگوں نے جن میں مسلم لیگ پیش پیش تھے، قادیانیوں کو شاید ملکی مفاد کی خاطر غیر مسلم (ہندو سکھ وغیرہ) کے مقابل شمار کیا، باوجود اس کے کہ سر ظفر اللہ نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ احمدی جماعت ان لوگوں کو کافر سمجھتی ہے، جو مرزا کی نبوت سے انکار کر رہے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ متعارف مسلمان نہیں ہیں، اور خود مرزائیوں نے ایک تیسری قوم کی حیثیت سے الگ ریاست حاصل کرنے کی سعی کی، اگرچہ

اس وقت بعض لیڈر اور اسلام کے بہی خواہ تنبیہ کر چکے تھے کہ احمدی جماعت اسلام سے خارج ہے ان کو مسلمانوں میں شامل کرنا ملک و ملت دونوں کے لیے سخت مُضر ہے لیکن افسوس کہ ان کی آواز کو نظر انداز کر دیا گیا، مگر واقعات نے ظاہر کر دیا کہ وہ لوگ حق بجانب تھے۔

اب بھی وہی لوگ تحریکِ ختمِ نبوّت کے خلاف رہے جنہوں نے ان کو مسلمانوں میں شامل کیا تھا اور اس مسئلہ کو سیاسی مسئلہ کہہ کر مسلمانوں کے خیالات کو بدلنا چاہا، یہ لوگ حتی الامکان اس تحریک کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے ۲۵ سال تک برسرِ اقتدار رہتے ہوئے انگریز کے اس خود کاشتہ پودے اور مارِ آستین کی پوری حفاظت کی۔ عام مسلمان چونکہ یہ دیکھتے ہیں کہ مرزائی جماعت والے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور مرزائی مذہب کے اصول و فروع میں قرآنی نصوص اور احادیث کے بعد التحریف استدلال کرتے ہیں مگر یہ تحریفات اور عقائد میں ردّ و بدل چونکہ عامیانہ فہم سے بالاتر ہے لہٰذا عوام ان کو ان کے ظاہری اعمال کی بناء پر امت میں شامل سمجھتے تھے اور ان کے خلاف تکفیر کا فتویٰ مولویانہ ضد یا احمقانہ سیاست جانتے تھے۔

الحمدللہ کہ قومی اسمبلی نے کافی غور و تامل کے بعد اس مسئلہ کا ایسا صحیح حل پیش کیا کہ ایک طرف تو دنیا کے مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہوئے اور ختمِ نبوت کے ساتھ صحیح شغف اور سرورِ کائنات کے ساتھ قلبی محبّت کا ثبوت دیا، اور دوسری طرف ان لوگوں کے خیالاتِ فاسدہ اور شبہاتِ باطلہ کو ختم کر دیا جو کہ اس تحریک کو احمقانہ سیاست اور مولویانہ ہٹ دھرمی یا کفر سازی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

لیکن مرزائی جماعت پہلے سے اسلام اور مسلمانوں کی بدترین دشمن تھی، وہ ایک زمانہ سے یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ کسی وقت وہ پاکستان پر قبضہ کر لیں گے اور جو مسلمان یا علماء ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور چلا رہے ہیں اُن کو بجبر یا لالچ دے کر مرزائی بنائیں گے یا ان کو قتل کریں گے۔ چنانچہ ان معاملات اور بیانات سے واضح ہو چکا ہے۔ اسی خاطر انہوں نے اعلیٰ فوجی عہدوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ برّی، بحری اور ہوائی فوج کے افسروں میں اکثریت ان کی ہے سول محکموں کے کلیدی مناصب ان کے ہاتھ میں ہیں، بیرونی ممالک میں حکومت کے وسائل سے اپنا مذہبی پرچار کر رہے ہیں، مسلمانوں کے خلاف جماعتی اور حکومتی ذرائع استعمال کر رہے ہیں، شخصی وسائل اور اثر و رسوخ سے کام لے رہے ہیں۔ ربوہ کا بند شہر ہونا، وہاں ہر قسم کا اسلحہ جمع کرنا، وہاں متوازی حکومت قائم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے امور ان کے ارادوں کی غمازی کر رہے ہیں اب جبکہ

ان کے خلاف قومی اسمبلی کا فیصلہ بھی صادر ہوا ہے تو ہر مسلمان کو بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا کہ ان کا جذبۂ انتقام اور مسلمانوں کی عداوت کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوا ہوگا، حالات حاضرہ اس کے شاہد ہیں پھر بہت سے نام کے مسلمان ان کے ہمدرد بھی ہیں جو کہ ان کی سرگرمیوں کو جائز سمجھتے ہیں۔

تو ایسی صورت میں عام مسلمانوں کا عموماً اور پاکستانی مسلمانوں کا خصوصاً فرض ہے کہ قوم و ملک اور دین کی حفاظت کے لیے پہلے سے زیادہ بیدار ہو جائیں اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ پر عمل کریں اور حکومت سے بھی مطالبہ کریں کہ وہ مسلمانوں کے دیرینہ مطالبات پر جلد از جلد عمل کرے اور قوم و ملک کو فتنہ سے بچانے کے لیے اپنا فرض ادا کرے۔ لینصرن اللہ من ینصرہٗ۔

حضرت مولانا محمد فرید صاحب
مفتی و مدرس دارالعلوم حقانیہ

(۱) قومی اسمبلی کے قادیانی فیصلہ سے اُن کا خارج از اسلام ہونا تمام عوام اور تعلیمیافتہ طبقہ پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا، اس سے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور مجبوراً وہ اب اپنے ارادوں میں ترمیم کریں گے، اس فیصلہ سے ان کی تبلیغ و اشاعت اور عوام کو پھسلانے کے ہتھکنڈے کافی حد تک بیکار اور ختم ہو جائیں گے۔

(۲) یہ مسئلہ اگرچہ کاغذی طور پر تو حل ہو گیا ہے لیکن عملی طور پر ابھی تک حل طلب ہے۔ کیونکہ قادیانیوں نے ابھی تک اسے تسلیم نہیں کیا۔ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ حکومت سے اس فیصلے کو عملاً نافذ کرائیں ورنہ دنیا اور آخرت میں انتقام کے خطرات درپیش ہیں۔

(۳) قادیانیوں کے اثرات ختم کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس فیصلہ کی ہر زبان اور ہر حکومت میں اشاعت کی جائے، اور ہر مسلمان حکومت ان کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دے اور اسلامی ممالک کے مشترکہ وفود غیر مسلم حکومتوں کو خبردار کریں اور انہیں مسلمانوں سے جدا گانہ حقوق دینے کا مطالبہ کریں۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ
هفت روزہ خدام الدین لاھور

مکرمی و محترمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ گرامی نامہ موصول ہوا لیکن افسوس کہ بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے آپ کی خواہش کے مطابق فوری جواب نہ دے سکا، امید ہے معذرت قبول فرمائیں گے۔ آپ کے سوالات کے جوابات کافی تفصیل طلب ہیں تاہم آپ کے اصرار اور تقاضے کے پیشِ نظر

فوری طور پر مختصر جوابات تحریر کر رہا ہوں :۔

آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ قادیانی مسئلہ کے اس حل پر آپ کے احساسات و جذبات اور تاثرات کیا ہیں ؟

(۱) ایک مسلمان کی حیثیت سے پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے اس فیصلے پر مجھے اسی طرح خوشی اور مسرت ہوئی ہے جس طرح تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کو ہوئی ہے۔ لیکن میں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تو ہمارے کام کی ابتداء ہوئی ہے اور عالم اسلام کے مسلمانوں کو عموماً اور پاکستان کے مسلمانوں کو خصوصاً اب بھی اسی اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے جس کا عملی مظاہرہ انہوں نے تحریکِ ختم نبوت کے دوران کیا ہے۔

میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ ہمیں جو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد، اجتماعی فکر، بے لوث اور پُرخلوص جد و جہد، سر آس پائیدار لگن اور مشترکہ پلیٹ فارم کی رہینِ منت ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی نظر انداز کر دیا تو ہمارا انتہائی خطرناک اور عیار دشمن اس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے عظیم اسلاف کی عظیم قربانیوں، ہماری بے مایہ کوششوں اور مجاہدینِ ختمِ نبوت کے خونِ شہادت کو بے نتیجہ بنانے کی کوشش کرے گا۔

(۲) میرا خیال ہے کہ قادیانی فتنہ کے "دینی" یا سیاسی اثرات عالمگیر نہیں، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری غفلت شعاری کی بدولت قادیانیوں نے بعض ممالک میں کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں، لیکن پاکستان کی قومی اسمبلی کے تاریخ ساز فیصلہ کے بعد اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ان کی کمر ٹوٹ گئی ہے، مگر ابھی ضربِ صدیقی کی شدید ضرورت ہے تاکہ ان کی رہی سہی قوت کو بھی توڑا جا سکے۔

(۳) مسلمانوں کی ذمہ داری کسی فتنہ کی عارضی اور وقتی بیخ کنی تک محدود نہیں، جب تک فتنہ مکمل طور پر ختم نہ ہو جائے اس وقت تک لگن و اتحاد، کوشش و سعی اور اتحادِ فکر و عمل کی انتہائی ضرورت ہے، ذمہ داری اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک فتنہ کا کچھ بھی نشان باقی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کے بعد بھی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی، کیونکہ مسلمان اسلام کا محافظ ہے اور محافظ کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے، خواہ امن ہو یا جنگ۔ دشمن اور ڈاکو کا پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کس وقت حملہ کر دے؟ اس لیے ذمہ داری کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) آپ کے چوتھے سوال کا جواب میرے مذکورہ جوابات کے ضمن میں آ گیا ہے۔
(۵) اب رہا یہ سوال کہ اس کا طریق کار اور لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ تو گذارش یہ ہے کہ:۔
نیشنل اسمبلی کے فیصلہ کے بعد ذمہ داریاں عوامی سطح سے بڑھ کر حکومتی سطح تک پھیل جاتی ہیں۔ عوام کا کام یہ ہے کہ وہ پُرامن رہتے ہوئے اس تحریک کو اپنے آخری اور منطقی نتائج تک پہنچانے کے لیے ہر قسم کی مالی، جانی اور زبانی قربانیوں کو جاری رکھیں، علماء و طلباء اور سیاسی زعماء سستانے کی بجائے کامیابی کے آخری مراحل تک پیشقدمی جاری رکھیں اور حصولِ مقصد کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دور کرنے کے لیے اجتماعی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، اور ان ممالک میں جہاں قادیانی زہر سرایت کر چکا ہے وہاں تبلیغی مشن بھیجے جائیں جو وہاں کے لوگوں کو قادیانی فتنہ کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور عالمِ اسلام کے متعلق خطرناک عزائم سے آگاہ کریں۔
حکومت کو چاہیے کہ وہ سفارتی سطح پر تمام دوست ممالک کو اس خطرناک تحریک کے نتائج و عواقب اور مضمرات سے باخبر کرے اور تمام اسلامی ممالک سے سفارش کرے کہ وہ قادیانیوں کو اپنے ملک میں غیر مسلم اقلیت قرار دیں اور ان کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھیں۔ اندرونِ ملک حکومت کی سب سے اہم اور پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کے نام پر قادیانیوں کی کافرانہ تبلیغ کا سدِباب کرے، ان کو شعائرِ اسلامی اور اصطلاحاتِ اسلامی کے استعمال سے روک دے اور ان کے زہریلے اور مہلک لٹریچر کو ضبط کر کے علماء کا ایک بورڈ بنائے جو قادیانیوں کے لٹریچر کے فاسدہ اثرات کو ختم کرنے کے لیے عوام کے لیے اسلامی تعلیمات کا حامل لٹریچر تیار کرے اور اس لٹریچر کو شائع کر کے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بھیجا جائے۔ اس کے علاوہ دستور میں جہاں یہ درج ہے کہ "ایک مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے مفہوم مندرجہ آئینِ پاکستان دفعہ ۲۶۰ شق ۳ کے خلاف عقیدے کا اعلان کرے یا اس کے خلاف تبلیغ کرے وہ قابلِ سزا و تعزیر ہو گا"۔ وہاں اس میں لفظ "ایک مسلمان" کی جگہ "جو شخص" کا لفظ درج کیا جائے، کیونکہ ایک مسلمان کے متعلق تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ ایسے لغو اور بیہودہ عقیدے کا اعلان یا پرچار کرے گا! "جو شخص" کا لفظ چونکہ عام ہے اس لیے اس کی موجودگی میں اگر کوئی مدعیٔ اسلام یا کوئی جدید مرشد ایسا کرے گا تو وہ مستوجبِ سزا و تعزیر ہو گا۔

حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی صاحب
ناظم ادارۂ دعوت وارشاد چنیوٹ

کافی دنوں سے گرامی نامہ موصول ہے اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے جلد تعمیلِ حکم نہ کر سکا جس کی وجہ سے معذرت خواہ ہوں۔

(۱) اس سوال کا تفصیلی جواب تو بڑا طویل ہے مختصراً میرے احساسات اور جذبات یہ ہیں کہ اس وقت راقم اپنی عمر کی تنتالیس (۴۳) منزلیں طے کر چکا ہے، اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی خوشیاں نصیب فرمائی ہیں، عیدیں بھی آئیں، شادی بھی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے بچے بھی دیئے، حرمین شریفین کی زیارت سے بھی بارہا مشرف فرمایا، قادیانیوں سے بارہا مناظرے ہوئے ان میں بھی اللہ تعالیٰ نے کامیابی نصیب فرمائی۔ مرزا بشیر الدین محمود کو جو مباہلہ کا چیلنج دیا تھا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے کامرانی اور سرخروئی نصیب فرمائی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی بھر کی تمام خوشیاں بھی اگر جمع کر دی جائیں تو وہ اس خوشی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو خوشی ۷ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کے متعلق قومی اسمبلی کے فیصلہ سے حاصل ہوئی ہے۔ راقم خوشی کے ان احساسات کو اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قادیانیوں کے متعلق یہ "تاریخی فیصلہ" اس صدی کا اہم فیصلہ اور عظیم کارنامہ شمار ہوگا۔

(۲) یہ بالکل بجا ہے کہ "قادیانی فتنہ" کے دینی اور سیاسی اثرات ملک اور بیرونِ ملک پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں لیکن اب یہ اثرات اللہ کے فضل سے کم ہونے شروع ہو چکے ہیں اب تو ان پر پے در پے ضربات لگ رہی ہیں، پہلی ضرب تو آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد سے لگی، دوسری سخت ضرب انہیں نیم بسمل کر دیا وہ ان کے خلاف رابطہ عالمِ اسلامی کی قراردادیں ہیں، اب جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے "تاریخی فیصلہ" نے نکال دی ہے۔

بیرونی دنیا کو جو وہ اسلام اور پاکستان کے نام سے دھوکہ دے رہے تھے الحمدللہ اب اس کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔

(۳) جب تک اس خطرناک اور مہلک فتنہ کا بالکلیہ خاتمہ نہیں ہو جاتا مسلمانوں کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی، لیکن اب آئین میں ترمیم ہو جانے کے بعد بہ نسبت عوام کے حکومت کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے کہ وہ آئین کے تقاضے پورے کر کے آئین کے احترام کو باقی رکھے۔ قوم نے تحریک کے دوران قادیانیوں سے بائیکاٹ اور آپس میں اتحاد کا جو بے نظیر مظاہرہ کیا ہے مجلسِ عمل کی سرپرستی میں

ان دو کامیاب "ہتھیاروں" کا استعمال اس وقت تک جاری رہنا چاہیئے جب تک آئینی ترمیم کے تقاضے مکمل طور پر پورے نہیں ہو جاتے۔

بیرونی ممالک میں ان کے تعاقب اور احتساب کے لیے ضروری ہے کہ مجلسِ عمل کی طرف سے ایک مؤثر وفد اس فیصلہ کے پس منظر اور تفصیلات کی وضاحت کرنے کے لیے فوری طور پر دورہ کرے کیونکہ سرظفر اللہ اور دیگر سربرآوردہ قادیانی بیرون ملک انتہائی خطرناک اور زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف ہیں اس کا تدارک از حد ضروری ہے۔

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ایم این اے کراچی

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کا ایک گرامی نامہ پہلے ملا تھا، دوسرا پرسوں ملا، جواب میں بوجوہ تاخیر ہوئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

جہاں تک قادیانی مسئلے کے حل کے متعلق میرے "تاثرات اور احتیاطی تدابیر و اقدامات" کے بارے میں تجاویز کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ جن اکابر نے ارباب اقتدار سے گفت و شنید اور مفاہمت کے نتیجے میں یہ فارمولا تیار کیا وہی اس بات کے زیادہ اہل ہیں کہ اس کے مالہٗ وما علیہ پر روشنی ڈالیں اور آئندہ کے لیے تدابیر و اقدامات بھی تجویز فرمائیں۔ فارمولے میں درج شدہ دفعات جس حد تک عملاً مؤثر ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ واضح ہو جائے گا میرا اس مرحلے پر کچھ عرض کرنا بے محل معلوم ہوتا ہے بلکہ سکوت ہی انسب نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا صاحب اکوڑہ خٹک میں تشریف رکھتے ہوں تو میرا سلام عرض کر دیجئے گا۔ (۳ر نومبر ۱۹۷۴ء)

شاعرِ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری، لاہور

کرم فرما مولانا سمیع الحق صاحب!
سلام مسنون قبول کریں۔ الحق کا شمارہ ستمبر ملا، مطالعہ میں آیا ہے، آپ کا مکتوب بھی ملا، جو کہ جواب طلب ہے اس لیے تعمیل کر رہا ہوں۔ آپ کے مکتوب میں چند اہم سوالات ہیں جن کا تعلق قادیانی مسئلہ کے اس حل کے بارے میں ہے جو ۷ ستمبر کی شام "اسلامی" پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں سے منتخبہ خاص کمیٹی کی سفارش پر متفقہ قرارداد کی صورت میں منظور کیا گیا اور اس کا اعلان موجودہ عوامی حکومت کے محترم وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے فرمایا۔

مولانا! اگر آپ کے نزدیک بھی یہ قادیانی مسئلہ کا ایسا حل ہے جس پر خوشیاں منانے اور

مطمئن ہوکر میں جی ہاں کہوں اور اس فتنہ باطنیہ کو دفن ہو چکنے والا سمجھ کر آپ سب کے ساتھ شامل ہو جاؤں تو مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا کرنے سے قطعاً معذور ہوں۔ میں ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ چاہے سمیع الحق ہی کیوں نہ ہوں وہ حق اُسی آواز کو قرار دیں گے جو خود ان کے فیصلے کی تائید میں ان کے گوش میں آئے۔ میں اس وجہ سے شاید خاموشی یعنی آپ کے سوالات کے جواب میں چُپ رہنا اختیار کر لیتا، لیکن جو احترام، احترام ہی نہیں ہم عقیدتی آپ سے اور مولانا عبدالحق صاحب سے ہے اس کی وجہ سے جواب نہ دینا بھی خلافِ آدابِ تعلقات ہے، اس لیے یہ سطور بہ تعجیل لکھ رہا ہوں۔

(۱) آپ کے اداریہ کا اوّلین کلمہ قومی اسمبلی کے فیصلے "تاریخی اسلامی فیصلہ بتاتا ہے" اس کو آپ نے عظیم اور مبارک فیصلہ قرار دیا ہے۔

میرے نزدیک یہ قادیانی مسئلے کا وہ حل نہیں ہے جو حل قرآنِ کریم و حکیم نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے، البتہ یہ ایک فیصلہ ہے جو اسلام کی قرآنی عدالت سے نہیں انگریز کی مسلط کردہ جمہوری عدالت نے دیا۔

یہ جمہوری عدالت قابلِ تحسین ہے، اس لیے کہ جو کچھ آپ علماء صاحبان نے طلب کیا وہی آپ کو مل گیا۔ اس لیے کہ جس طرح قادیانی فتنہ کے خلاف آپ نے کروڑوں عامۃ المسلمین کہلانے والے (ہم لوگوں) کو عملی آواز کے لیے اتحاد کی دعوت دی تھی، اسی طرح حکومتِ پاکستان کے اس فیصلے پر آپ نے خوش ہوکر جشن منانے کی صورت بھی پیدا کر دی ۔۔۔ یہ جشن حلِ مسئلہ کا جشن نہیں بلکہ علماء کے اس مطالبے کا جشن ہے جو انتہائی طور پر محدود بھی تھا اور غیر مآل اندیشانہ بھی۔ اور ایسا ہے کہ اب فتنۂ قادیان پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کرانے کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر جو چاہے گا کرے گا۔

سرزمینِ پاکستان کے سینے میں جھنڈا گاڑے ہوئے اطمینان سے رہتے سہتے یہودیت کے اصل ہراول دونوں گروہ لاہوری ہوں یا ربوا ہی کیا اپنے مقاصدِ ملعونہ سے باز آجائیں گے؟

آپ کے پاس اب کونسا حربہ ہے جو اُن کے حربوں کو زائل کرنے کیلئے آپ استعمال فرمائینگے؟ آپ مطمئن ہو گئے، ملّت کو آپ نے مطمئن بنا دیا، آپ کی نیت درست ہے، بجا ہے، لیکن ع

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

لہٰذا سوالات کے جوابات فی الحال بے فائدہ ہیں، ہاں میں نے یہ سطور انتہائی ادب سے

بھی ہیں۔ میں نے ان قادیانیوں کو پورے ستر برس سے جاننا شروع کیا تھا، ان کا مبلغِ اعظم ظفراللہ خان چوہدری میرے دیوار بہ دیوار برسوں پڑوسی رہ چکے، رات دن ان سے ان کے طریق تبلیغ الحاد کا ہدف رہا ہوں۔ اس لیے اب ایک مفصل کتاب ہی لکھوں گا، اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بطفیل سرکارِ دوجہاںؐ مدد کرے گا۔ (۱۵، اکتوبر ۱۹۷۴ء)

مولانا ماہرالقادری صاحب
مدیر ماہنامہ "فاران" کراچی

جنابِ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، یادآوری کا دلی شکریہ! آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ:

(۱) قادیانی مسئلہ کے اس حل پر آپ کے احساسات، جذبات اور تاثرات کیا ہیں؟

جواب:۔ اکتوبر کے "فاران" کا اداریہ (نقشِ اوّل) میرے احساسات کا آئینہ دار اور میرے جذبات و تاثرات کا ترجمان ہے۔ اس مسئلہ کے حل ہو جانے سے ملک بہت بڑے بحران CRisis سے محفوظ ہو گیا ورنہ ختمِ نبوت کے مسئلہ میں مسلمانوں کے جذبات آتشیں ہو گئے تھے اور وہ دستوری طور پر اس مسئلہ کے متعلق ہوتے سے تنگ آ چکے تھے۔ اربابِ اقتدار کا یہ حال ہے کہ وہ اس مسئلہ کا کریڈٹ بھی لینا چاہتے ہیں اور اس کا ذکر بھی انہیں زیادہ پسند نہیں ہے، تیر از کمان رفتہ والا معاملہ ہے۔

(۲) قادیانی فتنہ کے دینی اور سیاسی اثرات ملک و بیرونِ ملک پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں اقلیتوں کے تحفظ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا مسلمانوں کی ذمہ داری اس فیصلہ پر ختم ہو گئی یا اس فتنہ کے مہلک اثرات کا تعاقب و احتساب جاری رکھنا ہوگا؟

جواب: مسلمانوں کی ذمہ داری اور زیادہ بڑھ گئی ہے، قادیانیوں میں تبلیغ کرنے کا یہ بہترین موقعہ ہے، ان پر اخلاق و محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ کام کیا جائے اور خاص طور سے مرزا قادیانی کی تحریریں انہیں پڑھوائی جائیں کہ نبی تو کجا کیا کسی شریف آدمی کے یہاں بھی ایسی متضاد اور انمل بے جوڑ باتیں مل سکتی ہیں؟ اقلیت کے حقوق کا تحفظ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے مگر مولانا مودودی کے بقول حکومت نے سانپ کو لاٹھی سے مار کر اُسے چھوڑ دیا ہے اور چوٹ کھایا ہوا سانپ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ قادیانی سیدھے سادے طور پر غیر مسلم ذمّی کی حیثیت سے پاکستان میں امن و امان کے ساتھ رہ سکتے ہیں مگر پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کسی قسم کی سازش برداشت نہیں کی جا سکتی۔ یہ مسئلہ بھی بہت اہم اور خاص طور سے قابلِ غور

ہے کہ مسلمانوں کی حکومت اور مسلم معاشرے میں نبیٔ کاذب کی جھوٹی نبوت کی دعوت نہیں دی جاسکتی یہود ونصاریٰ اور ہندوؤں اور زرتشتیوں کے کفر اور کاذب نبی کی نبوت کا مؤقف ایک جیسا نہیں ہے، یہ وہ کفر ہے جس کی تبلیغ مسلمانوں میں قانوناً ممنوع ہونی چاہیئے۔ جس طرح مسیلمہ کذاب کے نام کے ساتھ حضرت اور علیہ السلام کے القاب گوارا نہیں کئے جاسکتے اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے نام کے ساتھ تکریم وتعظیم اور احترام کے القاب برداشت نہیں کیے جاسکتے۔ ابوجہل اور ابولہب کافر تھے، منکرِ نبوت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے حریف اور مدِمقابل نہیں تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ مدعیٔ نبوت ہے اس لیے اس کا مؤقف حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حریف کا مؤقف ہے۔

(استغفر واللہ) (۲۹ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ)

مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب
ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اسلام آباد

مولانا محترم ومکرم وفقکم اللہ بما ہو رضاہ
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ نشان ۱۲۳۲ مؤرخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۴ء وصول ہوا، آپ نے اس گرامی نامہ میں جو سوالات لکھے ہیں انکے سلسلہ میں حسب ذیل سطور پیش ہیں:

(۱) قادیانی مسئلہ کو جس طرح اسمبلی نے حل کیا ہے وہ ہر آئینہ قابلِ ستائش ہے، اللہ تعالیٰ اُن تمام حضرات کو جزائے خیر دے جنہوں نے اس کے لیے سعی فرمائی ہے۔ علمائے کرام اور دیندار مسلمان تو ابتدائے فتنۂ قادیانیت ہی سے ان لوگوں کو دین ودنیا دونوں کے لیے عظیم خطرہ قرار دے کر ان کو خارج از دائرۂ اسلام کہتے چلے آئے تھے۔ مقامِ شکر ہے کہ دیگر ارکانِ اسمبلی کو بھی اللہ تعالیٰ نے حق کی طرف راہنمائی فرمائی۔ میں نے اسمبلی کا فیصلہ سنکر سجدۂ شکر ادا کیا۔

(۲) قادیانیوں نے دشمنانِ اسلام کی حمایت اور اعانت سے ساری دنیا تو نہیں مگر بہت سے ملکوں میں اپنے اثرات کا زہر پھیلا دیا ہے، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھی اس زہر کا تریاق لیکر مختلف ملکوں میں پھیل جائیں اور ان کے دینی اور سیاسی زہر کا مقابلہ کریں، میرے خیال میں کرنے کا یہ ایک ضروری کام ہے، افریقہ کے دو ملکوں کو اس تریاق کی شدید ضرورت ہے، ایک نائیجیریا اور دوسرا مشرقی افریقہ۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیا کے دو ممالک ملیشیا کی طرف تو فوری توجہ کی شدید ضرورت ہے۔

(۳) اقلیتوں کی حفاظت اور ان کے عمرانی حقوق کی صیانت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم ان

لوگوں کو کھلی چھٹی دے دیں جو نہ تو وطن کے وفادار ہیں اور نہ دینِ حق کے مسلمانوں سے زیادہ اقلیتوں کے حق میں نرم اور وسیع الصدر دُنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں ہے، لیکن کسی اقلیت کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ فتنۂ اختلاف پیدا کرے اور مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کے خلاف دشمنانِ دین سے مل کر سازشیں کرتی رہے۔ اور نہ اسکی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ ملک کے کسی حصہ میں اپنی الگ آبادی بسا کر متوازی حکومت قائم کرے یا بعض دین سے ناواقف افسران کی ملی بھگت سے نظمِ حکومت و معیشت کو متاثر کرتی رہے۔

ہمارا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ ہم ان تمام بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کریں اور اس طرح سے اصلاح کریں کہ قادیانیوں کو مسلمان بن کر ریشہ دوانیوں سے باز رکھنے کی ہر مناسب تدبیر اختیار کریں، ان کے شناختی کارڈوں پر ان کا دین واضح طور پر لکھ دیا جائے اور ان کے پاسپورٹوں پر بھی ان کا دین ظاہر کر دیا جائے تاکہ تلبیس و التباس کا سدِ باب ہو جائے۔

(۴) مسلمانوں کو کسی پر بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے، ہر وقت چوکتا رہنا چاہیئے، پاکستان میں قادیانیوں کے اندر سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تبلیغِ دین کا وسیع انتظام کیا جائے۔ انشاءاللہ اس سے بہت سے قادیانی مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں گے۔ ان بیچاروں کو ہفواتِ مرزا کی خبر ہی نہیں ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پیری مریدی کے دیگر سلسلوں کی طرح یہ بھی ایک سلسلہ ہے۔ اور جب وہ یہ جان لیں گے کہ یہ اسلام نہیں بلکہ ایک بالکل علیٰحدہ دین و مذہب ہے تو امید ہے کہ بہت سے قادیانی تائب ہو کر ایمان لے آئیں گے، اور اس سے بہتر کیا ہو گا کہ کوئی بھٹکا ہوا انسان دینِ حق پر آجائے، اور یہی عمل دوسرے ممالک میں بھی جاری کیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ (۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۴ء)

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس (فرانس) | محترمی زاد مجدکم! السلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

یہاں دو ماہ سے ڈاک کی مکمل ہڑتال رہی اس لیے آپ کا ۱۰ نومبر کا خط اب جنوری میں آیا ہے، شکر گذار ہوں۔ مجھے قادیانیت سے کبھی اتنی بھی دلچسپی نہ ہوئی کہ اس کے متعلق کوئی مضمون یا کتاب ہی پڑھوں۔

چونکہ دیندار لوگوں نے اس کے خلاف تن من دھن سے کام کیا ہے اس لیے اچھا ہی ہو گا، خدا انہیں اجرِ عظیم دے۔

مگر عالمِ اسلامی میں دوسرے مسائل بھی ہیں جو اس سے کم اہم نہیں بلکہ شاید اہم تر ہی ہیں۔ ہتھیار کی جگہ مستعمل اور فرسودہ ہتھیار خرید نے پر ہم کب تک قانع رہیں گے؟ اشتراکیت اور الحاد کے مقابلہ سے کب تک سوتے رہیں گے؟

میں یہاں اپنی حقیر صلاحیت کے مطابق دوسری قسم کے علمی کاموں میں مصروف بلکہ غرق ہوں کاش احباب اس میں حارج نہ ہوں۔

آں محترم کا رسالہ آیا کرتا ہے، ممنون ہوں۔

جناب ڈاکٹر پروفیسر صغیر حسن معصومی، اسلام آباد

جناب مکرمی ایڈیٹر صاحب
ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

السلام علیکم! آپ کے استفسار کے جواب میں یہ چند سطریں مرسل ہیں:۔

(۱) قادیانی مسئلہ کے حل پر ہم حکومت کو مبارکباد دیتے ہیں کہ نہایت عمدہ اور مناسب حل عوام اور خصوصاً علماء کرام کے مطالبے کے مطابق اسمبلی سے پاس کرایا۔ اس حل سے اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو خاص طور پر اور عام مسلمانوں کو عام طور پر سرخروئی عطا کی۔ فرزندانِ توحید حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حکومت نے اس عقیدے کی حرمت کو قائم رکھنے میں سر توڑ کوشش کی ہے اور اس عقیدے کے مخالفین کو دشمنِ اسلام قرار دیا ہے۔

(۲) چونکہ قادیانی فتنہ چار دانگِ عالم میں پھیل چکا ہے اسلئے اس کے دینی اور سیاسی اثرات دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر احمدی یا قادیانی حکومت کے شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ڈومیسائل سرٹیفکیٹ پر قادیانی یا احمدی ہونے کا برملا اظہار کرے، اگر ایسی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو یہ لوگ نفاق اختیار کر کے اور حلفیہ اپنے کو مسلمان اور ختمِ نبوت کا معتقد قرار دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دینے کی کوشش کریں گے اور پھر اندرون و بیرونِ ملک میں ملتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانے سے کسی طرح باز نہ آئیں گے۔

(۳) غرض اس فتنہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومتِ پاکستان کوئی ایکٹ پاس کر کے ہر احمدی اور قادیانی کو اپنے عقیدے کا اظہار کرنے پر مجبور کرے۔ جب ان کو قانوناً غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے تو ان کی تعداد کی مناسبت سے ان کو حقوق دیئے جائیں اور ہر شعبے میں اسی مناسبت سے ان کے حقوق کی نگہداشت کی جائے۔

بنا بریں عقیدہ ختمِ نبوت کے راسخین اُس وقت حقیقی مسرت محسوس کر سکتے ہیں جبکہ حکومتِ پاکستان

اپنے عملی اقدام سے دنیا پر واضح کر دے کہ اہلِ نفاق احمدی وقادیانی اور صحیح العقیدہ مسلمانوں میں امتیاز و فرق نمایاں ہے، یا خود حکومت کے الفاظ میں بعض غیر مسلموں کو مسلمانوں کے حقوق و امتیازات نہیں دیئے جا رہے ہیں۔

اہلِ علم حضرات اسی وقت اطمینان کی سانس لے سکتے ہیں جبکہ اہلِ نفاق صحیح طور پر توبہ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں، ان میں گھل مل کر رہیں، ان کی مسجدوں میں آئیں اور میل و محبّت سے زندگی گذاریں۔ (۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

جناب محترم ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب

صدر شعبۂ دائرۂ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور)

قادیانیوں کے بارے میں اقلیتی فیصلہ ہو چکا ہے، اس طرح علماء کی وہ جدوجہد کامیاب ہوئی جس کے لیے وہ تقریباً ایک سو سال بھرپور لڑتے رہے ـــ اور مجھے یہ کہنے دیجیے کہ تنہا لڑتے رہے۔

میں جب یہ کہتا ہوں کہ یہ لڑائی تنہا علماء نے لڑی تو بالکل حقیقت بیان کر رہا ہوں، علماء کے علاوہ جو طبقے یہاں موجود ہیں ان کی بہت سی تحریریں بطور شہادت پیش کی جا سکتی ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر بالعموم علماء کے مؤقف کے خلاف اور قادیانیوں کے حق میں رہا ہے، اور اس میں بڑے بڑے اکابر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

تو مقصدِ گفتگو یہ ہے کہ یہ خالصتاً علماء کے مؤقف کی جیت ہے جس میں کسی سیاسی مفاد و مصلحت کو دخل نہیں، اور اب جبکہ علمائے عقیدہ کی اس جنگ میں کامیاب و بامراد اور سرخرو ہو کر باہر آ رہے ہیں تو یہ پھر علماء ہی کا فرض ہے کہ اس فیصلے کے بعد جو نتیجے نکل سکتے ہیں اُن کے بارے میں اپنے ذہن کو صاف کریں اور ایک تنظیم اور قوتِ مجتمعہ سے ان نئے فرائض کے لیے خود کو کمربستہ و مُستعد کریں جو اس سلسلے میں ان پر عائد ہو سکتے ہیں کیونکہ بالآخر دین کی خدمت علماء ہی کریں گے اور وہی کر سکتے ہیں کیونکہ دین کی خاطر (نہ کہ سیاست اور مفاداتِ دنیوی کی خاطر) کام کرنے کی اصولی صلاحیت علماء ہی کے پاس ہے۔

اقلیتی فیصلے سے علماء پر یہ روشن ہو جانا چاہیئے کہ اس ملک میں (بلکہ دنیا کے ہر ملک میں) دینِ اسلام کی برکت اسی صورت میں ہر کسی پر واضح ہو سکتی ہے کہ علمائے امت میں اصولیات میں اتحاد ہو۔

آج تک اسلام کے بارے میں بے رغبتی اور بے رونقی جتنی بھی موجود ہے اس کا ایک بڑا سبب علماء کا باہمی اختلاف ہے۔

ہم کہنے کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ پاکستان اور عالم اسلام میں اسلام کا قانون اور اسلامی طرزِ زندگی رائج ہو، لیکن ہمیشہ دیکھتے ہیں یہ آیا ہے کہ اسلامی قانون کی فروعات کو مدار بنا کر اختلاف کا بازار گرم ہوا اور عام مسلمان شہری کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ کس کے اسلام پر عمل کیا جائے بلکہ اس پریشان خیالی سے بچنے کے لیے عام لوگ اب یہ کہتے ہیں کہ بھائی ان لوگوں کے پاس جب کوئی متفقہ طریقِ کار اور دستور العمل ہی نہیں تو اس پریشانی میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

راقم الحروف دینِ اسلام میں گہرا اعتقاد رکھتا ہے اور علمائے کرام کا معتقد اور پیرو ہے لہٰذا ان باتوں کو تنقیص یا بے خیالی پر محمول نہ کیا جائے۔ یہ باتیں عام تعلیمیافتہ طبقے کے علاوہ بے علم، اَن پڑھ طبقے میں بھی پھیل چکی ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان پر ٹھنڈے دل سے غور ہو تاکہ لوگوں کی بے یقینی اور ان کا ضعفِ اعتقاد دُور ہو۔

یہ درست ہے کہ ہمارے قدیم دینی ادب میں اختلافِ فقہاء اپنی ایک مصلحت رکھتا تھا اور مصلحت یہ تھی کہ دینِ حق کی آخری جز تک یہ جستجو کی جائے کہ خدا اور خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا منشاء اس باب میں کیا تھا ـــــ یہ سچائی اور حق کی تلاش تھی اور مضائقہ اس میں اس لیے نہ تھا کہ اُمتِ مسلمہ پر اس کا بُرا اثر نہ پڑتا تھا اور کسی کے گمراہ ہونے کا اندیشہ نہ تھا، کوئی مسلم جو مسلک بھی اختیار کرے بہرحال دین سے اس کا تمسک غیر متزلزل تھا۔

مگر اب صورتحال بدل چکی ہے، اب طوفانِ مغرب عقائد کی عمارت کو ڈھا چکا ہے، دنیا داری غالب آ چکی ہے اور یورپ کی مادہ پرور سائنس نے شکوک و شبہات کے مینار کھڑے کر دیئے ہیں۔

ایسے میں ما بہ الاختلاف کی بجائے ما بہ الاشتراک پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ علماء کے سامنے اس ملک میں بہت سے اہم مسائل ہیں، ان کی خاطر علماء کا آپس میں اتحاد ـــــ اور بڑے مسئلے کے بارے میں کم و بیش متفقہ یا مفاہمتی دستور العمل تیار ہونا چاہیئے تاکہ عام لوگوں کو اس کے قبول کرنے یا اختیار کرنے میں پریشانی نہ ہو۔

علمائے کرام اچھی طرح باخبر ہیں کہ اس وقت اسلام کے سامنے دو عظیم خطرے ہیں، ایک ہے مغرب کے افکار اور طرزِ معاشرت کا خطرہ، اور دوسرا خطرہ ہے اشتراکیت (کمیونزم، سوشلزم وغیرہ) یہ دونوں فتنے قادیانی فتنے سے کچھ کم خطرناک نہیں۔

اب جبکہ علماء اپنی قوت سے باخبر ہو چکے ہیں اور یہ بھی جان چکے ہیں کہ ان کی اصل طاقت اتحاد میں ہے، ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں۔

ہمارے ملک کے بہت سے علماء ان مغربی فتنوں کی مضرت کو اس لیے کم اور معمولی سمجھتے ہیں کہ ان کے پیچیدہ نظامِ عقائد سے باخبر نہیں، اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ان مغربی عقیدوں کے ہر ہر پیچ میں کتنے کتنے خطرناک سومنات آباد ہیں تو انہیں خوب احساس ہو کہ ان کا مقابلہ کرنا صرف ضروری ہی نہیں بلکہ فرضِ عین ہے۔

لہٰذا علماء کرام پر واجب ہے کہ ان فتنوں کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچائیں اور پھر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں، بے خبری کی صورت میں ان خطرناک فلسفوں اور عقیدوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

قادیانی فیصلے کے بعد تعلیمیافتہ لوگوں میں تین چار قسم کے مغالطے بڑی کثرت اور شدت کے ساتھ پھیل رہے ہیں یا پھیلائے جا رہے ہیں، ایک خیال یہ پھیل رہا ہے کہ قادیانیوں کے بعد اب شیعہ اور دوسرے چھوٹے فرقوں کی باری آئے گی، دینی طور سے بھی اور سیاسی طور سے بھی، ایک مغالطہ یہ بھی پھیل رہا ہے کہ غیر اسلامی ملکوں میں تھوڑا بہت اسلام کا نام قادیانیوں کے ذریعے اور ان کے توسط سے چرچا ہو رہا تھا۔

اس فیصلے کے بعد جب تک ان ملکوں میں کوئی متبادل نظام (ہماری تبلیغ کے) موجود نہ ہوں گے اس وقت تک اس قسم کا چرچا اب نہ رہے گا ـــ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علماء اپنے موجودہ اکتسابات کے ساتھ ان ممالک میں تبلیغ کی اہلیت نہیں رکھتے ـــ اور غیر قادیانی تعلیمیافتہ طبقہ اتنا بےحس ہے کہ اسے دین کے معاملات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ـــ لہٰذا خیال یہ پھیلایا جا رہا ہے کہ اس سے آخرکار اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔

میری رائے میں یہ مغالطہ ہے لیکن علماء کے لیے بہر حال یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے اور فوری توجہ کے قابل ہے۔

ایک خیال یہ بھی پھیلایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کا حقیقی طرزِ معاشرت قادیانی گھرانوں میں ہے ورنہ عام تعلیمیافتہ مسلمان تو اس معاشرت سے بیزار ہی نظر آتے ہیں تعلیمیافتہ (غیر قادیانی) نوجوانوں میں پردہ داری، حیاداری، جمعہ اور جماعت کی پابندی بلکہ خود نماز کا التزام، قرآنِ مجید سے

تعلق (محض خواندگی وغیرہ کی حد تک بھی) اب بالکل مفقود ہے۔

سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرتی طریقوں کا پابند قادیانی، غیر پابند غیر قادیانی تعلیمیافتہ لوگوں پر غیر ممالک میں (بلکہ خود اپنے ملک میں بھی) کیا زیادہ بااثر نہ ہوگا، اسلام کے بنیادی مزاج سے مختلف ہے۔ جب مقصد اسلام ہے تو پھر اسلام ہی کا نام کیوں نہ لیا جائے، اسلام کے راستے سے اور اس کے ذریعے ہر مسئلہ کا حل ہو سکتا ہے۔ اس خیال کی تبلیغ کے لیے بردست تنظیم درکار ہے۔

دوسرا مسئلہ معاشی و معاشرتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ علماء کرام محض عقیدے پر اتنا زور دیتے ہیں کہ معاشی و معاشرتی حصہ غائب ہو جاتا ہے۔ آج کے معاشی ذہن کو مدِنظر رکھ کر معاشی عدل وانصاف کے حق میں اور معاشی برائیوں کے خلاف واضح پروگرام بنا کر پُرزور کام کرنا چاہیئے ورنہ مخالف یہ مغالطہ پیدا کر دیتے ہیں کہ علماء معاشی انصاف اور غرباء کے مفادات کے مخالف ہیں۔

معاشرتی طور پر فحاشی و عریانی اور مغربیت کے خلاف منظم کام کرنے کی ضرورت ہے، معاشرہ ہی سے کسی نظام یا مذہب کے خارجی فروغ وغلبہ کا پتہ چلتا ہے، سینما کے فحش اشتہارات سے اس کی ابتداء کی جا سکتی ہے۔

دینی تعلیم کے نصابات اور نصب العین پر دوبارہ غور ہونا چاہیئے، فی الحال وہ دینی لحاظ سے مکمل مگر تبلیغی لحاظ سے غیر مکمل ہیں، غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کے لیے علماء کو نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر کام کرنا چاہیئے۔

تطہیرِ نفس وتزکیۂ قلوب کے پرانے نظام کو از سر نو زندہ کرنا چاہیئے تاکہ افراد حرص وہوا سے پاک ہو سکیں۔

اقلیتی فیصلے کے بعد اس بات پر نظر رکھی جائے کہ کوئی فرقہ حکومت کی رواداری یا کمزوری سے فائدہ نہ اٹھا سکے، اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ علماء خود کو اس طرح آمادہ کریں کہ کسی سیاسی مفاد کے آلۂ کار نہ بن سکیں۔ والسلام

حضرت مولانا محمد شریف صاحب جالندھری
ناظم مرکزی دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت (ملتان)

اسلام دینِ فطرت ہے جس کی تکمیل فخرِ موجودات حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ہو گئی، مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں امتِ مسلمہ کے لیے اندرونی و بیرونی فتنوں کی نشاندہی فرمائی

وہاں جھوٹے مدعیانِ نبوت کے متعلق شرح وبسط کے ساتھ ارشاد فرمایا :

"فتن چاہے کتنے ہی ہمہ گیر ہوں ختم ہونے والی چیز ہیں اور باقی رہنے والا دینِ فطرت ہی ہے، طوفان چاہے کتنے ہی عظیم ہوں ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔

اما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

فتنہ مرزائیت امتِ مسلمہ کے لیے فتنۂ سوداء تھا اور ہے۔ مرزائیت نے دشمنِ اسلام قوتوں کا آلۂ کار بن کر عالمِ اسلام کے لیے مشکلات پیدا کیں اور اغیار کے لیے خوشی وانبساط کا سامان پیدا کیا۔ ۷ ستمبر کے فیصلہ نے اس فتنہ کی کمر توڑ دی۔ لیکن ابھی بہت کام باقی ہے جو تمام مسلمان فرقوں کے اتحاد واتفاق سے ہی انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ مجلسِ عمل کا قائم رہنا اور اس کی تنظیم کا مضبوط سے مضبوط تر ہونا نہ صرف مرزائیت کے سیاہ فتنہ کی سرکوبی کے لیے ضروری ہے بلکہ وطنِ عزیز میں اسلامی اقدار کے احیاء کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ اگر خدانخواستہ اراکینِ مجلسِ عمل اپنے اپنے فرقوں کی تنگنائوں میں چلے گئے، درخت کی جڑوں کو سیراب کرنے کی بجائے اس کے پتوں پر پانی کے چھڑکاؤ میں مصروف ہو گئے تو نہ صرف ۷ ستمبر کا فیصلہ محض کاغذی فیصلہ ہو گا بلکہ دشمن ملک وملت قوتیں اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیں گی۔ ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا۔

مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کا قیام ہی مسلمان فرقوں کے اتحاد اور تردیدِ مرزائیت کے لیے ہے۔ مجلس تمام مسلمان فرقوں کے راہنماؤں سے اپیل کرتی ہے کہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے فیصلہ کے اجراء، کلیدی آسامیوں سے مرزائیوں کی علیحدگی، ربوہ میں عملاً اہلِ اسلام کی سکونت کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کو ایک فعال جماعت کی حیثیت سے زندہ رکھیں۔ (۱۸ شوال ۱۳۹۴ھ)

حضرت مولانا احمد عبدالحلیم کانپوری (کراچی)

(۱) عام طور پر سب مسلمان اس سے واقف ہیں کہ مرزا غلام احمد نے اپنے اعلانِ نبوت یا بالفاظِ دیگر اپنے کفر وارتداد کے بعد ہی انگریزی حکومت سے اپنے اظہارِ عبودیت کے لیے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ میرے مذہب میں جہاد حرام ہے اور اس کے ساتھ ہی اس مرتدِ اعظم نے یہ بھی اعلان کیا کہ میں خونی نبی نہیں ہوں۔ (آتشِ بگورش) اس مردود نے "خونی" کا لفظ کہہ کر سید البشر خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر انتہائی رکیک اور کمینہ تعریض وتنقید کی ہے اور (معاذ اللہ) آپ کے دینِ مبارک کو قاتل وسفاک ٹھہرایا ہے، حالانکہ جہاد اسلام کا

پانچواں بنیادی اورضروری رکن ہے جس کے بغیر اسلام کی حفاظت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے اس کے بارہ میں ارشادِ عالی ہے کہ "الجهاد ماضٍ الى يوم القيامة" یعنی جہاد قیامت تک جاری رہے گا (اور کبھی منسوخ یا معطل نہ ہوگا) وہ جانتا تھا کہ انگریز نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شدید زک اور جانی و مالی نقصان اٹھانے کے بعد اس سے بمد لرزاں و ترساں ہے۔ اور اسی لیے اس نے تمام اسلحہ یہانتک کہ بڑے چاقو اور چھری تک پر پابندی لگادی تھی کہ یہ آلاتِ جہاد ہیں۔ اسی لیے مرزائے مرتد نے انگریز سے اپنی وفاداری اور عبودیت کو نعوذ نبی نہ ہونے کی جاہلانہ و کافرانہ تقی سے مستحکم کیا، اس لیے ہر مرزائی قادیانی جو اس کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی بھی برضا و رغبت جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا اور اگر ریاکاری دفریب دہی کے لیے شریک ہوگا بھی تو اس کے فرائض ادا نہ کرے گا۔ چونکہ ہماری فوج محض مجاہدین کی جماعت ہے اس لیے اس میں سے جلد از جلد انہیں خارج کر دینا چاہیئے۔

(۲) مرزائے مرتد نے قرآن مجید میں منجملہ دیگر تحریفات کے یہ تحریف بھی کی تھی کہ میری نبوت کی پیشینگوئی مسیح ابن مریم علیہما السلام سے بھی کرائی گئی تھی جس کا ذکر بحوالہ انجیل قرآن مجید میں اس طرح وارد ہے: "مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" یعنی مسیح ابن مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے احمد نام کے ایک رسول کے آنے کی بشارت دینے والا بنایا۔" مرزا کہتا تھا کہ وہ احمد میں ہوں۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسبِ تصریح قرآن محمد ہیں۔ حالانکہ کوئی پوچھتا کہ تم احمد کب ہو تم تو غلام احمد ہو؟ اور غلام بھی عیار و بے وفا۔ اسی مرزائی خرافات کی بناء پر اس کے متبعین اپنے کو احمدی کہتے ہیں مرزائی یا قادیانی نہیں کہتے، اس لیے ہمیں ان کی مشابہت اور ان کے کفر کی تائید سے بچنے کے لیے انہیں ہرگز احمدی نہیں کہنا چاہیئے بلکہ مرزائی یا قادیانی ہی کہنا چاہیئے۔ اسکی نظیر قرآن مجید میں بھی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا" یعنی اُے ایمان والو! (تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے کے لیے منافقین کی طرح) راعنا نہ کہا کرو۔ گو بظاہر یہ کلمہ مراعاۃ سے مشتق ہونے کی وجہ سے ادب و تعظیم کا کلمہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری بھی رعایت فرمائیے اور اس ضرورت کے لیے تم "انْظُرْنَا" کہا کرو جس کے معنی ہیں ہم پر بھی نظر فرمائیے۔ منافقین و یہود "رَاعِنَا" کے کسرہ کو اتنا کھینچتے تھے کہ وہ "راعینا" ہو جاتا تھا یعنی اے ہماری بکریوں کے چرواہے۔ نیز اگر وہ کسرہ کو کھینچتے نہ تھے تو اس کو راعن کا منادی بناتے تھے جو رعونت سے مشتق ہے، اور اس کے معنی تکبر اور اور اس کے روحانی مرض میں مبتلا کے ہیں یعنی

اے متکبر و مغرور۔ اور مومنین جب خطاب کے لیے ان کی تقلید میں داعتنا کتنے تھے تو وہ یہ سمجھ کر بہت خوش ہوتے تھے کہ ہم نے آپ کے جان نثاروں سے بھی آپ کو وہی گالی دلوا دی جو ہم دیتے ہیں۔

(۳) اسلام میں دنیاوی کاموں کی سرکاری ملازمت کفار اہلِ ذمہ کو دینا منع نہیں، ہاں وہ خدمات ان کو نہیں دی جائیں گی جن کا کسی نہ کسی طرح دین سے تعلق ہوگا، چونکہ فوجی نوکری جہاد کی نوکری ہے اس لیے کوئی غیر مسلم اس کا اہل نہیں۔

(۴) ربوہ جو اس وقت خالص کفرستان ہے، اسے بھی عام پاکستانی شہروں کی طرح ہر پاکستانی کی سکونت کے لیے عام ہونا چاہیئے بلکہ اسے ان کی (مرزائیوں کی) ملک سے نکال لینا چاہیئے۔ پہلی حکومت نے سر ظفر اللہ کے اثر سے یہ پورا خطہ اراضی کوڑیوں کے مول ان کے ہاتھ فروخت کر کے پاکستان میں ایک کفرستان بنوا دیا تھا۔ اس لیے یا تو اس خطہ کی سابقہ قیمت ان کو واپس کر کے اس پر قبضہ کر کے اسے پھر پاکستان میں شامل کر لینا چاہیئے یا اسی طرح بلا قیمت لے لینا چاہیئے جس طرح زمینداروں اور جاگیرداروں کی زائد زمینیں اور کارخانے مفت لے لیے گئے حالانکہ اسلام میں کسی کے سرمایہ یا جائیداد کی کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ خود خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کروڑپتی تھے اور بعض صحابہؓ اتنے مفلس تھے کہ انہیں جَو کی روٹی کی بھی وسعت نہ تھی اور وہ کھجور کے باغوں کی گری ہوئی کچی کسیلی کھجوروں پر گذر بسر کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مفلس و فقیر صحابیؓ کی ایک صاحبِ وسعت صحابیؓ نے کچھ خدمت کرنا چاہی تو انہوں نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ تم میری جنت کی نعمتیں کم کرانا چاہتے ہو ـــــ جب کسی کے مقدارِ سرمایہ و جائیداد پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی بشرطیکہ وہ شرعی اور جائز طریقے سے حاصل کی جائے تو اسلام کی دعویدار حکومت کو بھی اس پر پابندی نہیں لگانی چاہیئے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ، یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا مَا احل اللہ لَکُمْ۔ اے ایمان والو! ان چیزوں کو حرام نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دیا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ، واللہ المستعان۔

جناب محترم زبیدہ اے سیٹھی صاحب (لاہور)

مکرمی و محترمی جناب مولانا سمیع الحق صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

معاف فرمائیے، جواب میں تاخیر ہوگئی، آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور اسے علم کا خزینہ سمجھتا ہوں ـــــ میری شعوری زندگی اسی تمنا میں گذری کہ قادیانی مسئلے کے بارے میں مسلمان

اپنی منگیبن ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں۔ دراصل قادیانی ازم انگریزوں کی سنگینوں کی حفاظت میں پروان چڑھا، کسی آزاد مسلم معاشرے میں اس کا پنپنا ناممکن تھا، اس کا مقصد اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنا تھا، اور مغرب میں اس مذموم مقصد کے حصول کا ایک ہی ذریعہ قرار دیا گیا ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات کو گھٹایا جائے۔ چنانچہ وہاں صدیوں جتنا پراپیگنڈا اسلام کے خلاف ہوا ہے اس میں اسلامی عقائد کو اس قدر ہدفِ تنقید نہیں بنایا گیا جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو۔ مغربیوں نے اس بات کا صحیح اندازہ کر لیا کہ امتِ مسلمہ کا محور رسالت ہے۔ اگر مسلمانوں میں اس کا مرتبہ (نعوذ باللہ) گرا دیا جائے یا یورپیئوں کی نظروں میں اسے بڑھنے نہ دیا جائے تو اسلام سے نمٹا جا سکتا ہے۔ مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کا فوری مقصد تو ہندوستان میں وفادار مسلمانوں کا ایک ٹولہ پیدا کرنا تھا لیکن اس کا اصل مقصد ایسے اسلام کو ترویج دینا تھا جس کا دار و مدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نہ رہے اور جس میں حسبِ منشاء ہر قسم کا عقیدہ شامل کیا جا سکے۔ چنانچہ قادیانی ازم ہر غیر مسلم بلکہ اسلام دشمن حکومت کو بھی قبول ہو گا۔ جب تک انگریز کا راج رہا قادیانی مسئلے کا مؤثر حل مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھا۔ انگریزوں نے سکھوں کو تو بغیر مطالبے کے ہندوؤں سے الگ اقلیت قرار دیدیا لیکن قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے مطالبے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، لیکن آزادی اور تخلیقِ پاکستان کے بعد اس صورتحال کا کوئی جواز نہ رہا تھا کہ قادیانی بدستور مسلمانوں کے ایک جزوِ لاینفک کے درجے پر متمکن رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ؏

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اب زندگی میں ایک پاکیزگی محسوس ہوتی ہے اور درود شریف پڑھنے سے ایک گونا طمانیتِ قلب حاصل ہوتا ہے۔

ذیلی مسائل کئی باقی ہیں، لیکن میرے خیال میں سب سے اہم مسئلہ بیرونِ ملک تبلیغِ اسلام کا ہے، مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے فیصلے کا پوری دُنیا پر اثر ہو گا اور اسلام کے طالب اصل تعلیم کی طرف رجوع کریں گے۔ لیکن پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ ہم اس میدان کو قادیانیوں کیلئے کھلا نہ چھوڑیں، یورپ و افریقہ میں ان لوگوں نے کافی پاؤں جمائے ہوئے ہیں اور خلا میں ان کے جماعتی نظم و نسق کا کارگر ہونا دور از قیاس نہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کی تلاش میں ہو تو قادیانی مبلغ محض اپنے مشن کی موجودگی کی وجہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، خاص طور پر جب وہ خارجہ ممالک میں اسلام کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے مرزا قادیانی کی "نبوت" کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس سے ان کی غرض اپنی جماعت

کو مضبوط کرنا ہوتا ہے، لیکن جب آدمی ایک دفعہ ان کے سلسلے کے جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی کم علمی اور کم فہمی کی بناء پر ان کا ہم خیال ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ممالکِ غیر میں تبلیغ کی اشد ضرورت ہے، خصوصاً آجکل جبکہ مغربی افکار کے زوال اور روسی کمیونسٹ اقدار کے عملی انسانیت کش نتائج اظہر من الشمس ہونے کے بعد عالمی فضاء اسلام کے نفوذ کے لیے تیار ہو رہی ہے، اور دُنیا میں مسلمانوں کے لیے اعزاز حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا اور سبیل بھی کیا ہے کہ وہ اسے اسلام کا تحفہ پیش کریں ؟

میں اس کام (تبلیغ) کو اتنا اہم جانتا ہوں کہ میری تجویز تو یہ ہے کہ مسلم ممالک تبلیغِ اسلام کو اپنی خارجہ حکمتِ عملی کا ایک جزو قرار دیں اور اجتماعی طور پر اس فریضے کی ادائیگی میں حصّہ لیں۔ یاد رکھئے کہ کمیونزم کی کامیابی کا راستہ کمیونسٹ پراپیگنڈے نے ہموار کیا تھا۔ اذہان اور قلوب پر غلبہ حاصل کرنا سب سے بڑا محاذ اور جہاد ہے، اگر مسلمان اسلام کی فکری افضلیت واضح کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دنیا کی نعمتوں اور طاقتوں کے ماخذ خود بخود ان کے تصرّف میں آ جائیں گے۔

(۶۔ نومبر ۱۹۷۴ء)

✡

مطالبۂ اقلیّت کا ایک سرسری جائزہ

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

پاکستان کے نئے دستور میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی حیثیت خاتم النبیّین بطور آخری نبی کے ایک حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے۔ اس دستور کی تکمیل کے تین ہفتے بعد کشمیر کی وادیوں سے ایک روح پرور آواز اٹھی اور سارے فضائے بسیط میں پھیل گئی۔ پاکستان کی سرزمین اس آوازۂ حق سے گونج اٹھی، باطل کے در و دیوار لرزا اٹھے، کفر تھرا گیا اور جعلی نبوت کے ظلمتکدوں کی تاریکی اور بڑھ گئی۔ یہ آزاد کشمیر اسمبلی کی ایمان میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔ یہ حرارتِ ایمانی اور حمیّت ناموسِ رسالت کی ترجمانی کرنے والا فیصلہ تھا جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا اعلانِ حق کیا گیا تھا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی اسلامیانِ پاکستان میں خوشی و مسرّت کی لہر دوڑ گئی ——— اس جرأت مندانہ اور مومنانہ فیصلہ پر آزاد کشمیر اسمبلی اور صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان کو بے پناہ خراجِ تحسین پیش کیا گیا کہ ایسا کرنا ایمان کا تقاضا تھا۔ مگر جن کے دل اس روشنی سے محروم تھے اور جن کا باطن ناموسِ رسالت پر مر مٹنے کے جذبات سے عاری تھا اور جو آنکھوں کے نہیں مگر دلوں کے اندھے تھے۔ ان کے خرمنِ دجل و تلبیس پر یہ قرارداد ایک صاعقہ بن کر گری۔ ان کی سازشوں کا سلسلہ تیز سے تیز تر اور گہرا ہوتا چلا گیا ——— آزاد کشمیر کی حکومت اس "جرم" کی پاداش میں معزول کی جا چکی ہوتی اگر ملّتِ مسلمہ کا جذبۂ فدائیت اور ناموسِ رسالت پر مر مٹنے والے عزائم اس منصوبے کے آڑے نہ آتے۔

جن لوگوں کو یہ فیصلہ ناگوار گزرا ہے ان کی حقیقت سردار عبدالقیوم خان ہی کے ان الفاظ سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ جو انہوں نے مرکزی وزیرِ داخلہ خان عبدالقیوم خان کے

نام ایک تفصیلی مکتوب میں لکھے اور کہا کہ " دراصل بات میرے خلاف الزامات کی نہیں بلکہ آپ حضرات کو تکلیف اس امر کی ہے کہ میں یہاں آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ تیزی سے کیوں کر رہا ہوں۔ اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی توفیق کا مجھ سے مطالبہ ہو رہا ہے۔ غالباً قادیانیوں کی بھی آپ کو اتنی پریشانی نہیں جتنی اسلامی نظام کے نفاذ کی ہے۔"

بہر حال یہ مسئلہ صرف آزاد کشمیر کا نہیں صرف برصغیر کا نہیں نہ صرف عالمِ اسلام کا ہے، بلکہ روئے زمین پر بسنے والے محمد عربیؐ کے ہر نام لیوا امتی اور دربارِ رسالتؐ کی چوکھٹ سے نسبت رکھنے والے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ غلام کا ہے " قادیانی مسلم نزاع " جتنا بھی وقتی طور پر دبا دیا جائے گا۔ اتنا ہی شدت سے یہ امت کے اساسی تصورِ ایمان اور تصورِ رسالت کی وجہ سے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتا رہے گا۔ اسلام کے قطعی معتقدات قرآن و سنت کی متواتر تعلیمات، نبی کریمؐ سے عشق و محبت، رسولِ عربیؐ سے نسبتِ غلامی، اسلاف کے اجماعی فیصلے اور ملی اتحاد و یکجہتی کی حفاظت اور اس طرح کے ہزاروں ملی، دینی، سیاسی اور معاشرتی تقاضے ہمیں مجبور کریں گے کہ ہم ایک بار اٹھ کر اس " نبوت کا ذبہ " کے سارے نشانات ایک ایک کر کے مٹا دیں۔ اسلامی لبادہ اوڑھ کر دنیا میں پھیلنے والے اس دجالی کفر کو جب تک پوری طرح ٹھکانے نہ لگایا جائے گا قادیانیت پوری امت کے لئے ایک چیلنج بنی رہے گی، اور محمد عربیؐ کی پوری امت اپنے محبوب پیغمبر کے سامنے سرخرو نہیں ہو سکے گی۔ قرآن ہمیں ایسے معاملات میں وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ کا حکم دیتا ہے۔ جو لوگ اس بارہ میں رواداری اور وسیع النظری کا مطالبہ کرتے ہیں اور جو ایسی باتوں کو تنگ نظری اور فرقہ واریت سمجھتے ہیں وہ ایمان کی حقیقت سے کوسوں دور ہیں اور ہزار بار دعویٰ ایمان و اسلام کے باوجود خدا کی نگاہ میں ان کی وقعت سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قاتل وحشی کے پیشاب کے قطرے کے

برابر بھی نہیں جس نے نبی کریمؐ کی دلآزاری کا کفارہ اپنے وقت کے جھوٹے مدعی نبوّت مسیلمہ کذاب کو تہ تیغ کرنے کی شکل میں دیا اور جب تک اس ملعون کو جہنم رسید نہ کیا اس وقت تک خدا کی رحمت و مغفرت کے امیدوار نہ بن سکے ۔

—— تعجب ہے کہ بعض لوگ قادیانیوں کے بارہ میں مسلمانوں کے مطالبہ اقلیت پر بھی چین بجبین ہو جاتے ہیں ۔ حالانکہ یہاں مسئلہ کفر و اسلام کا نہیں اسلام اور ارتداد کا تھا اور پوری اسلامی تاریخ میں ایسے لوگوں کی سزا قتل سے کم ہرگز نہ تھی اسے مسلمانوں کی رواداری کہئے یا مجبوریاں کہ وہ قادیانیوں کے بارہ میں انہیں "اقلیت قرار دینے" کا کم تر درجہ مطالبہ کرتے ہیں ۔

تو آیئے ! ہم اس اقلیت کے مطالبہ کا ایک سرسری جائزہ لیں —— جہاں تک اقلیت کا مسئلہ ہے ۔

دین و دنیا کے ہر شعبے میں علیحدہ امت ہونے کا اعلان

قادیانیوں کا بحیثیت ایک ایک الگ اور متوازی امت ہونے کے یہ نہ صرف ایک بدیہی حقیقت ہے ۔ بلکہ خود مرزائیت اپنی تمام تر تعلیمات و اعمال میں نہ صرف ایک متوازی امت ہونے کا اعتراف کرتی ہے بلکہ اپنے پیروؤں کو عبادات، معاملات، معاشرت دین و دنیا ہر شعبۂ زندگی میں اس علیحدہ جداگانہ تشخص کی تلقین و تاکید کرتی چلی آرہی ہے ۔ اور اس دائرہ سے باہر تمام غیر مرزائی مسلمانوں کو ایک علیحدہ امت اور الگ گروہ کہنے اور سمجھنے کے ہزاروں شواہد ہمارے پاس موجود ہیں ۔ مرزا غلام احمد نے کہا ہے کہ "ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہ کیا، وہ مسلمان نہیں ہے" —— (تشحیذ الاذہان جلد ۶ ص ۱۳۵) اور کہا کہ میری بیعت میں توقف کرنے والا بھی کافر ہے (قادیانی قول و فعل الیاس برنی ص ۱۷)

ان کے خلیفہ نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہاں تک اعلان کیا کہ ـــــ مرزا کی دعوت قبول نہ کرنے والے خواہ انہوں نے مرزا کا نام تک بھی نہ سنا ہو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں (ص ۱۷) ان کا انکار موجب غضب الہٰی اور کفر ہے (ص ۱۵) ایسے لوگ خدا اور رسولؐ کے نافرمان اور جہنمی ہیں (ص ۱۶) اپنے نہ ماننے والوں کو مرزا کیسے "پاکیزہ" القاب سے نوازکر کہتا ہے: کل مؤمن یتقبلنی الا ذریۃ البغایا ـــــ میرے مخالف جنگلوں کے سؤر ہو گئے ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئیں (نجم الہدیٰ ص ۵۳) ہماری فتح کا قائل نہ ہونے والا ولد الزنا ہے، حلال زادہ نہیں ـــ

مرزا کے خلیفہ اور فرزند محمود احمد نے قادیانیت کے نمائندہ کی حیثیت سے گورداسپور کی عدالت میں کہا: کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے (اس لئے) غیر احمدی کافر ہیں (الفضل ۲۶ جون ۱۹۲۲ء) قادیانیت کے عالمی ترجمان ظفر اللہ خان کا محمد علی جناح صاحب کے نماز جنازہ کا انکار کس کو معلوم نہیں۔ اور جب پوچھا گیا تو ظفر اللہ نے کہا کہ مجھے کافر حکومت کا مسلمان ملازم سمجھئے یا مسلمان حکومت کا کافر ملازم ـــــ مسٹر جناح سے بہت پہلے اسی ظفر اللہ نے اپنے ایک اور محسن سر فضل حسین کے جنازہ سے بھی یہی سلوک کیا اور وہ دور ہندو سکھوں کے ساتھ الگ کھڑے رہے (قادیانی قول و فعل ص ۲۳) یہی نہیں بلکہ جب بھی مرزائیوں کے موقف کی ترجمانی کی ضرورت ہوئی، ظفر اللہ نے عدالت میں بھی اس مؤقف کی تائید کی کہ وہ غیر احمدیوں کو کافر کہتے ہیں۔ (ص ۱۹)

ابھی پچھلے سال ایم ایم احمد نے اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کے مقدمہ میں مرزائیوں کے اسی موقف کو بڑی ڈھٹائی سے دہرایا اور جنازہ کے مسئلہ میں ظفر اللہ کے موقف کی بھی تصویب کی ـــــ مسلمانوں کے بارہ میں مرزائیوں کا یہ موقف اتنا کھلا اور واضح ہے کہ ۱۹۵۳ء کی منیر انکوائری نے بھی ہزار بد دیانتی اور جانبدارانہ رویہ کے باوجود اپنی رپوٹ میں لکھا ہے

کہ ــــ ہم نے اس بارہ میں احمدیوں کے بے شمار اعلانات دیکھے ہیں اور ہمارے لئے اس کی کوئی تعبیر سوائے اس کے ممکن نہیں کہ مرزا کے نہ ماننے والے ان کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہیں (رپورٹ ص۲۱۲)

یہ تو مسلمانوں کے بارہ میں ان کا اصولی طرزِ عمل ہُوا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے ایک الگ اور جداگانہ امت سمجھنے لگے آگے اس اصولی موقف کو قائم رکھنے کے لئے دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں مرزائیوں نے مسلمانوں سے الگ تشخص قائم رکھنے کی تلقین نہ کی ہو۔

عبادات کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے دعائے مغفرت ممنوع ہے اس لئے کہ کفار کو دعائے مغفرت جائز نہیں (قادیانی قول و فعل ص۲۲) غیر احمدی کا جنازہ ہرگز جائز نہیں (ص۲۳) ایسے لوگوں کے معصوم بچوں کا جنازہ بھی جائز نہیں (ص۲۹) مرزا نے اپنے ایک بیٹے کا محض اس لئے جنازہ نہ پڑھا کہ وہ غیر احمدی (مسلمان) تھا (ص۲۳) کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنا تو کیا کسی احمدی نے ایسا کیا تو اس کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ (ص۲۴)

معاشرتی معاملات یہ تو عبادات کا حکم تھا، معاشرتی معاملات کو دیکھئے، مرزا کا قطعی حکم ہے کہ کوئی احمدی، کسی غیر احمدی کو لڑکی نہ دے (ص۲۶) البتہ ان کی لڑکیوں کو بیاہ سکتا ہے جس طرح یہودی اور عیسائی لڑکی کو (ص۲۷) خود خلیفہ مرزا کے الفاظ میں ــــ دینی تعلیمات نماز وغیرہ دنیوی تعلقات رشتہ ناطہ وغیرہ کے بعد اب کہ کیا گیا ہے کہ ہمارے لئے ان کے ساتھ قائم رکھنا جائز ہو۔ سلام کہنا بھی جائز نہیں (ص۲۸ بحوالہ کلمۃ الفصل) مرزا ساری عمر نہ غیر احمدیوں کی کسی انجمن کے ممبر ہوئے نہ ان کو اپنا ممبر بنایا نہ ان کو چندہ دیا (ص۲۸) مرزائیوں سے اختلاف کو فروعی اور جزئی قرار دینے والے بے حمیت "مسلمانوں" کے منہ پر

خود مرزائیوں نے اپنا غلیظ تھپڑ اس طرح مارا ہے کہ وہ برملا کہتے ہیں "یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ اللہ کی ذات، رسول کریمؐ قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے"۔ (خطبہ مرزا بشیر الدین۔ الفضل ۳ رجولائی ۱۹۳۱ء)

اسلامی اصطلاحات اور شعائر کا استعمال

مرزائی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر مرزا نے خود اس دعوے کی قلعی اس طرح کھول دی ہے کہ ان (مسلمانوں) کا اسلام اور ہے اور ہمارا اور ہے۔ (ایضاً ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء)

مسلمانوں سے دین اور معاشرت ہر لحاظ سے علیحدگی کی تلقین کے بعد اپنی جداگانہ تشخص کن کن طریقوں سے بحیثیت ایک الگ امت کے قائم کی گئی اس کی تفصیل دیکھئے۔

۱۔ اپنے پیروؤں کو "میری امت" سے تعبیر کیا گیا۔ ۲۔ رفقاء کو صحابہ کرام کا نام دیا۔ ۳۔ بیویوں کو امہات المومنین اور سیدۃ النساء کی اصطلاح سے نوازا۔ ۴۔ مرزا کے مدفن کو گنبد خضراء کے مماثل ٹھہرایا۔ ۵۔ قادیان کو مکہ اور مدینہ کے برابر ٹھہرایا۔ ۶۔ قادیان کے سفر کو ظلی حج کا لقب دیا۔ ۷۔ سنہ ہجری کے علاوہ نئی تقویم کی بنیاد ڈالی۔ الغرض کسی دین اور امت کے لوازمات اور مناسبات کو ایک ایک کر کے اختیار کرنے کی سعی کی گئی، اپنے مقابل امتِ محمدیہ کو سیاسی سطح پر جس طرح برصغیر اور پوری دنیا میں مٹانے کی کوششیں کی گئیں اور کی جارہی ہیں وہ آج کی فرصت کا موضوع نہیں کبھی آئندہ اس پر مفصل گفتگو ہوگی انشاء اللہ۔ اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے جب بھی مسلمانوں کی طرف سے آواز اٹھی کہ انہیں اقلیت قرار دیا جائے تو سارے مسلمانوں کو کافر اور جہنمی کہنے والوں کی "رگِ اسلامیت"

پھڑک اٹھتی ہے اور واویلا پر مچ جاتا ہے کہ اس طرح وہ اسلامی لبادہ میں مارِ آستین بن کر مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور سماجی مفادات سے محروم ہو جائیں گے اور بدقسمتی سے اس انگریز کی پیدا کردہ "امت" کو انگریز ہی کی دیسی ذریت کی شکل میں سرپرست بھی مل جاتے ہیں۔

مسلمان اور کلمہ گو ہونے کی حقیقت

اب کے مرزائیوں نے جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ اپنے ایمان اور اسلام اور مسلمان ہونے کا پروپیگنڈہ ہے۔ گھر گھر ایسے پمفلٹ اور رسائل پہنچائے جا رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ غیر احمدیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، حضورؐ کو خاتم النبیین جانتے ہیں، کلمہ گو ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ اس طرح بہت سی باتوں کے ذریعہ سادہ لوح مسلمانوں کو فریب دہی کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ہم ایسے دعووں کا بھی سرسری جائزہ ضروری سمجھتے ہیں۔

۱:۔ وہ حضورؐ کو ہزار بار خاتم النبیین کہیں مگر اس سے ان کی مراد امت کا متفقہ مفہوم آخری نبی نہیں ہوتا بلکہ ایسا نبی جس کی مہر (خاتم) امت کو نبی بنا دے مرزا محمود احمد دوسرے خلیفہ نے عدالت میں بیان دیا کہ لغت میں خاتم النبیین کے معنی آخری نبی کسی جگہ نہیں لکھے۔ (عدالت گورداسپور میں بیان۔ شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور ص۲۰)

۲:۔ مرزا کی اکثر ایسی عبارتیں ان کتابچوں میں پیش کی جا رہی ہیں جو اس کے دعویٰ نبوت ۱۹۰۱ء سے قبل لکھی گئی ہیں۔ جبکہ اس زمانہ میں خود مرزا نبوت کے دعویداروں کو کاذب، کافر، بدبخت، دشمنِ قرآن، بے شرم اور کیا کیا کچھ قرار دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو آسمانی فیصلہ ص۲۵ تبلیغ رسالت جلد ۲ ص۲ ص۲۳ وغیرہ) مگر جب "نبوت" کا دورہ پڑ گیا تو نہ صرف نبی بلکہ حقیقی نبی (حقیقت النبوۃ ص۱۷۴) رسول (دافع البلاء ص۱۰-۱۱)

مہدی اور محمد (الفضل ۲۶ رجنوری ۱۹۱۶ء) تمام انبیاء سے افضل (در ثمین) بن گئے۔

۳:- مرزائی اپنے آپ کو کلمہ گو کہتے ہیں کہ ہمارا کلمہ شہادت ایک ہی ہے۔ اس کی حقیقت بھی سنئے۔ مرزائیوں کے نزدیک اس کلمے سے مراد مرزا کی نبوت کی تصدیق اور مرزا کی ذات ہوتی ہے وہ اگر کلمہ گو ہیں تو مرزا ہی کے نہ کہ محمد عربی علیہ السلام کے۔ اس لئے کہ مرزا کہتا ہے کہ "محمد الرسول اللہ سے مراد میں ہوں اور محمد الرسول اللہ خدا نے مجھے کہا ہے (الفضل ۱۵ رجولائی ۱۹۱۵ء) احمد سے مراد مرزا ہیں۔ (الفضل ۱۹ راگست ۱۹۱۸ء) قرآن میں آپ ہی کی بشارت کا ذکر ہے ——— اب (خاکم بدہن) محمد الرسول اللہ کو بھی مرزا کے اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔ (پیغام صلح جلد ۲ ص ۳۴) اس وحی اللہ میں میرا نام محمد رکھا گیا ہے اور رسول بھی۔ (تبلیغ رسالت جلد ۲ ص ۱۴) اس لئے مرزائیوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ — ہمیں نئے کلمے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ مسیح موعود رسولِ کریمؐ سے الگ کوئی چیز نہیں وہ (مرزا) خود محمد الرسول اللہ ہے۔ اس لئے ہم کو نئے کلمہ کی ضرورت نہیں اگر محمد الرسول اللہ کی جگہ اور آتا تو ضرورت ہوتی۔ (کلمۃ الفصل رسالہ ریویو آف ریلیجنز جلد ۱۴ ص ۱۵۸)

۴:- وہ اپنی موجودہ تحریرات میں مسلمانوں کو مسلمان کہتے ہیں جبکہ مذکورہ بالا حوالوں سے آپ کو اس کے خلاف معلوم ہو چکا تو لیجئے اس تقیہ اور دجل وتلبیس کی حقیقت بھی خود مرزائیوں سے سنئے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے خود یہ الجھن دور کر دی ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان سے موسوم کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ وہ مسلمان کے نام سے پکارے جاتے ہیں اس لفظ کے بغیر پتہ نہیں چل سکتا مگر

خدا کے نزدیک مسلمان نہیں، انہیں نئے سرے سے مسلمان کرنا ہو گا۔
(مرزا بشیر احمد ص۲۱)

۵:۔ وہ اگر کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو مرزا کی اصطلاح میں "ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور":

۱۷:۔ امتیں انبیاء سے بنتی ہیں

اگر ایک شخص ہزار بار کلمہ گو کہلائے کلمۂ شہادت کو شبانہ روز ورد بنائے مگر دین کے کسی قطعی عقیدہ یا ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بات کا منکر ہو تو تمام امت کے نزدیک بالاجماع کافر ہو جاتا ہے۔ یہی طرزِ عمل مرزا محمود احمد نے غیر قادیانی یعنی مسلمانوں کے بارہ میں اختیار کیا ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ لوگ کلمہ گو نہیں کہ آپ انہیں کافر کہتے ہیں مرزا نے جواب دیا۔ بے شک وہ کلمہ گو ہیں مگر مسلم کے لئے توحید، تمام انبیاء، ملائکہ، کتب سماوی پر ایمان لانا ضروری ہے اور جو ان میں سے ایک کا منکر ہو جائے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح غیر احمدی مرزا کی نبوت سے منکر ہو کر کفار میں شامل ہوئے (الفضل جلد ۲ جون ۱۹۲۳ء) خود مرزا نے ایک دفعہ کھل کر جواب دیا کہ صوم وصلوٰۃ کا پابند شخص بھی اگر کسی ایک حکم کو نہ مانے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اگر زنا یا چوری کو جائز کہہ دے تو کافر ہو جاتا ہے۔ (البدر ۲۶ جون ۱۹۱۲ء)

پس ٹھیک یہی مؤقف مسلمانوں کا مرزائیوں کے بارہ میں ہے اگر کوئی شخص اسلام قرآن، حدیث، ارکانِ اسلام، شعائرِ اسلام، نبی کریمؐ کی مدح و توصیف سے دفتر کے دفتر بھر دے مگر وہ حضور خاتم النبیینؐ کے بعد کسی بھی شخص کو کسی قسم کا نبی تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے کافر اور ملعون نہیں سمجھتا تو وہ اسلام کے قطعی فیصلہ کی رو سے کافر اور بدتر ہو گا۔ اس لئے کہ

امتیں انبیاء سے بنتی ہیں۔ عیسائی حضرت موسیٰؑ کی نبوت تورات اور تمام احکام کو تسلیم کرتے ہوئے یہودیوں کے نزدیک اس لئے نئی امت ٹھہرے کہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت تسلیم کرلی۔ مسلمان حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ ان کی کتابوں ان کے دین اور ان کی سچی تعلیمات کی ہزار دل وجان سے تصدیق کرتے ہیں۔ مگر وہ عیسائی اور یہودی نہیں بلکہ محمدیؐ اسلئے کہلاتے ہیں کہ وہ حضورؐ کی نبوت پر ایمان لائے جنہوں نے تسلیم نہ کیا وہ عیسائی اور یہودی رہے اس طرح مرزائی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی تمام تعلیمات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی مرزا غلام احمد سے ادنیٰ رابطہ اور تعلق قائم رکھنے پر بھی اسلامی اور محمدی امت ہی سے خود بخود نکل جاتے ہیں۔

"پس اگر آج یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں سے ایک الگ اور جداگانہ اقلیت قرار دے دیا جائے تو یہ دونوں جماعتوں (مسلمانوں اور مرزائیوں) کے معتقدات کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر مرزائی مسلمانوں کے اندر رہ کر سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفادات کی خاطر نفاق کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں کہ اس طرح دینی پردے میں وہ ملتِ مسلمہ کے اتحاد پر ضربِ کاری بھی لگا سکیں گے اور مفادات بھی حاصل ہوتے رہیں گے۔"

مگر حالات جو بھی ہوں پورے پاکستان اور پورے عالمِ اسلام کے فدایانِ محمد عربی اور پوری امتِ اسلامی کا یہی مطالبہ رہے گا، جیسے آج سے کافی عرصہ قبل مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے انگریزی حکومت کو خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:۔

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ جب قادیانی مذہبی اور

معاشرتی معاملات میں علیٰحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔؟ ملّتِ اسلامیہ کو اس مطالبے کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیٰحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیٰحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ ابھی قادیانی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکیں ــــــــ"

(اسٹیٹسمین کے نام خط ۱۰ رجون ۱۹۳۵ء)

علّامہ اقبالؒ نے حکومتِ وقت کے طرزِ عمل کو جھنجھوڑتے ہوئے مزید فرمایا:-

"اگر حکومت کے لئے یہ گروہ مفید ہے، تو وہ اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ لیکن اس ملّت کے لئے اسے نظرانداز کرنا مشکل ہے جس کا اجتماعی وجود اس کے باعث خطرہ میں ہے ــــ"

الغرض آج بھی مسلمانوں کا یہی مطالبہ ہے کہ مرزا قادیان کے جملہ تبعین کو ہندو، سکھ عیسائیوں کی طرح غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ انہیں تمام کلیدی مناصب سے ہٹا دیا جائے ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے اور حضور علیہ السلام کے بعد کسی نوع کا دعوئے نبوّت اور کسی ایسے مدعی کی تصدیق و تائید کی سزا مرتد کی سزا سے ہرگز کم نہ ہو۔ (ج ۸ ش ۹ جمادی الاوّل ۱۳۹۳ھ جون ۱۹۷۳ء)

❋

قادیانیت اور مکہ معظمہ کی اجماعی قرارداد

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب

قادیانیت کے بارہ میں حال ہی میں مکہ معظمہ سے عالمی اسلامی تنظیموں کی متفقہ قرارداد کی شکل میں جو آواز اٹھی ہے۔ وہ قادیانیت کے بارہ میں گویا پورے عالم اسلام کے متفقہ اور تازہ اجماع کی حیثیت رکھتی ہے۔ مآخذ شریعت قرآن و سنت اور اجماع امت کی رو سے کبھی بھی قادیانیوں کا کافر مرتد اور خارج از اسلام ہونا کوئی متنازعہ بات نہیں رہی اور اس اجماع کا ظہور متفقہ قرارداد سے ہوتا ہے مگر حال ہی میں ۱۴ ربیع الاول سے لے کر ۵ دن تک مسلسل جاری رہنے والی تمام دنیا کی اسلامی تنظیموں کی کانفرنس کی متفقہ قرارداد سے اس فرقہ خبیثہ کے بارہ میں گویا پورے عالم اسلام کی اجتماعی طور پر بھی اجماع کی ایک صورت ظاہر ہو گئی۔

اس کانفرنس کی یہ قرارداد ملت مسلمہ کے لئے حقیقی اہم ہے بدقسمتی سے حالات کی وجہ سے ہمارے ملک میں اسے اتنا ہی نظر انداز کیا گیا تاکہ کعبۃ اللہ کی چوکھٹ سے وابستہ اسلامیان پاکستان اس خبر سے باخبر نہ ہو سکیں۔ ہمیں سعودی عرب کے پریس سے اس قرارداد اور کانفرنس کی تفصیلات کا علم ہوا ہم اس قرارداد کا اصل متن اور اس کا ترجمہ شائع کرتے ہوئے حکومت پاکستان اور عالم اسلام کے مسلمانوں اور حکومتوں سے گزارش کرتے ہیں کہ اس قرارداد کے مندرجات پر لبیک کہتے ہوئے ملت مسلمہ کو اور عالم اسلام کو فرقہ خبیثہ مرزائیت اور اس کی سازشوں سے بچانے کی اجتماعی تدابیر اختیار کیجائیں یہ آواز صفا کی چوٹیوں سے بلند ہوئی۔ اور ہم اس کے ایک ایک حرف سے متفق ہی نہیں بلکہ اسے اپنے دلوں کی دھڑکن سمجھتے ہیں۔ اور ناموس ختم نبوت کے پاسبان تمام مندوبین

رابطۂ عالمِ اسلام۔ شرکاءِ کانفرنس کو اور بالخصوص خادم الحرمین الشریفین ملک فیصل کو نہایت خلوص سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

ربیع الاول ۱۳۹۴ھ بمطابق ۸ اپریل ۱۹۷۴ء کی شام کو مکہ مکرمہ کی مقدس فضاؤں اور بیت اللہ الحرام کے سایہ میں دنیا بھر کے ایک سو چوالیس ۱۴۴ علمی اور اسلامی تنظیموں کی کانفرنس شروع ہوئی۔ یہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجتماع تھا جس میں اسلامی جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہوں، نمائندوں، علم و فضل کے لحاظ سے دنیائے اسلام کے مشاہیر علماء، ادباء، صحافی اور اہلِ قلم و اربابِ فکر نے متفقہ طور پر عالمِ اسلام کے دیگر مسائل کے علاوہ علمی اور دینی لحاظ سے الحاد و ارتداد کی تحریکوں اور فتنوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا۔ قادیانیت، صیہونیت، بہائیت، فری میسن اور اس کی ملحقہ تنظیمیں، عیسائی مشنریاں، کمیونزم، دہریت، مغربیت، اور الحاد وغیرہ کے انسداد پر غور ہوا۔ ان غیر اسلامی اور باطل فتنوں میں سرفہرست قادیانیت کا مسئلہ تھا، جو اب بحمد اللہ عربوں کے لئے بھی لمحۂ فکریہ بنتا جا رہا ہے اور سعودی عرب کے شاہ فیصل اور رابطۂ عالمِ اسلامی کے مساعی اس سلسلہ میں خاص طور سے قابلِ تحسین ہیں۔

باطل مذاہب کے بارہ میں قراردادیں مرتب کرنے والی کمیٹی کے چیئرمین علامہ محمود نے قرارداد پیش کرنے سے قبل قادیانی فتنہ کا مفصل تعارف کرایا۔ اس کے تاسیس سے سامراجی محرکات اور غیر اسلامی افکار و آراء اور عالم اسلام اور ملتِ مسلمہ کے خلاف مرزائیوں کے سیاسی کردار، سازشوں اور منصوبوں کو طشت از بام کیا۔ قادیانی ازم جو یقیناً ملتِ مسلمہ کے اتحاد کے لئے پوری دنیا میں ایک ضرب کاری بنی ہوئی ہے کا پس منظر بیان کرنے کے بعد قرارداد نہایت جوش و خروش سے منظور کی گئی۔ قرارداد میں اسلامی حکومتوں سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ کہ نہ صرف یہ کہ مرزائیوں سے ہر قسم کے عدم تعاون کا برتاؤ کیا جائے، بلکہ

انہیں کسی بھی اہم کلیدی منصب پر فائز ہونے کی اجازت نہ دی جائے ۔

دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمان مندوبین میں سے یہ تیرہ بختی اور شقاوت صرف پاکستان کے ایک مندوب، ڈی - ایچ ہاشمی کے حصہ میں آئی جس نے قرارداد کے اس حصہ سے غیر جانبداری اختیار کر کے حق و باطل کے اس معرکہ میں ایک عالمی سٹیج پر پاکستان کیلئے ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کیا ہم پاکستان کو رسوا کرنے والے اس شخص کی نہ صرف مذمت کرتے ہیں بلکہ اس کے اس شرمناک رویہ پر لعنت بھیجے بغیر نہیں رہ سکتے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کو کسی بین الاسلامی اجتماع کا مندوب منتخب کرنے پر ذمہ دارانِ حکومت سے احتجاج کرتے ہوئے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس طرح مٹھی بھر قادیانیوں اور یہودیوں کو خوش کر کے پورے عالمِ اسلام کے شبہات اور خدشات مول لینا اور دنیائے عرب کے اسلامی جذبات اخوت کو مجروح کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے ؟

بہر حال ڈی - ایچ ہاشمی قسم کے دینی حمیت سے عاری صرف ایک شخص کے غیر جانبدار رہنے سے قرارداد کی اہمیت اور اجماعی حیثیت اور بھی نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ علماء کی کتابوں، اہلِ قلم کے مضامین، خطباء کے خطبوں، اہلِ تحقیق کی تصانیف، مفتیوں کے فتووں، عدالت کے ججوں، اور بعض اسمبلیوں کی قراردادوں کے بعد اب مرکزِ اسلام ام القریٰ مکہ معظمہ میں ہونے والی اور دنیا بھر کے اسلامی فکر و نظر کی نمائندگی کرنے والی کانفرنس کی نگاہوں میں بھی قادیانیت قطعی کفر، دجل و تلبیس، اسلام اور عالمِ اسلام کے خلاف یہودیوں اور سامراجیوں کی کٹھ پتلی ایک اسلام دشمن تحریک ہے۔ دیکھئے اب اس اجماع کے بارہ میں مرزائیوں کے کذاب علیہم کیا کہتے ہیں ؟ مگر اس سے قطع نظر اسلامیانِ عالم اور اس کے ذمہ دار افراد کو بیت اللہ سے اٹھنے والی یہ آواز جھنجھوڑ رہی ہے کہ تاجدارِ مدینہؐ کی عصمتِ خلافتِ ختمِ نبوت کو تار تار کرنے کی سعیٔ ناکام کرنے والے ذلیل ہاتھ کب تک

دنیا ئے اسلام کی غیرت کو للکارتے رہیں گے۔

اس تاریخی قرارداد (جس کا عربی متن آگے آرہا ہے) میں قادیانیت کو عالمِ اسلام کے لئے سب سے مضر اور بدترین خطرہ قرار دیا گیا ہے اور جسے کانفرنس کے ایجنڈا میں پہلے نمبر پر جگہ دی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

قرارداد

قادیانیت ایک باطل فرقہ ہے۔ جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اغراضِ خبیثہ کی تکمیل میں مصروف ہے اسلام کے قطعی اصولوں سے اس کی مخالفت ان باتوں سے واضح ہے:۔

الف:۔ اس کے بانی کا دعوئ نبوت کرنا۔

ب:۔ قرآنی آیات میں تحریف

ج:۔ جہاد کے باطل ہونے کے فتوے دینا۔

قادیانیت کی داغ بیل برطانوی سامراج نے رکھی اور اس نے اسے پروان چڑھایا وہ سامراج کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے۔ قادیانی اسلام دشمن قوتوں کا ساتھ دے کر مسلمانوں کے مفادات سے غداری کرتے ہیں۔ اور ان طاقتوں کی مدد سے اسلام کے بنیادی عقائد میں تحریف و تبدیل اور بیخ کنی کے لئے کئی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں مثلاً۔

الف:۔ دنیا میں مساجد کے نام پر اسلام دشمن طاقتوں کی کفالت سے ارتداد کے اڈے قائم کرنا۔

ب:۔ مدارس، سکولوں، یتیم خانوں اور امدادی کیمپوں کے نام پر غیر مسلم قوتوں کی مدد سے ان کے مقاصد کی تکمیل۔

ج :۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے تحریف شدہ نسخوں کی اشاعت وغیرہ۔

ان خطرات کے پیشِ نظر کانفرنس میں متفقہ طور پر طے پایا گیا کہ :۔

(۱) دنیا بھر کی ہر اسلامی تنظیم اور جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ قادیانیت اور اس کی ہر قسم کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی ان کے معابد، مراکز، یتیم خانوں وغیرہ میں کڑی نگرانی کریں اور ان کے تمام درپردہ سیاسی سرگرمیوں کا محاسبہ کریں۔ اور اس کے بعد ان کے پھیلائے ہوئے جال، منصوبوں، سازشوں سے بچنے کے لئے عالمِ اسلام کے سامنے انہیں پوری طرح بے نقاب کیا جائے۔ نیز

(۲) اس گروہ کے کافر اور خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے اور یہ کہ اس وجہ سے انہیں مقاماتِ مقدسہ حرمین وغیرہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جاسکے گی۔

(۳) مسلمان ان لوگوں سے کسی قسم کا معاملہ نہیں کریں گے، اقتصادی، معاشرتی، اجتماعی، عائلی وغیرہ ہر میدان میں ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ ان سے شادی بیاہ کے ناطے نہیں کئے جائیں گے۔ نہ مسلمانوں کے مقبروں میں انہیں دفنایا جائے گا الغرض ہر طرح ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

(۴) کانفرنس تمام اسلامی ملکوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قادیانیوں کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں ان کے تمام وسائل اور ذرائع کو ضبط کیا جائے۔ اور کسی قادیانی کو کسی اسلامی ملک میں کسی قسم کا بھی ذمہ دارانہ عہدہ نہ دیا جائے۔

(۵) قرآن مجید میں قادیانیوں کی تحریفات سے لوگوں کو خبردار کیا جائے اور ان کے تمام تراجم قرآن کا شمار اور نشاندہی کر کے لوگوں کو ان سے متنبہ کیا جائے اور ان تراجم کی ترویج کا انسداد کیا جائے۔

ہم اس اہم قرارداد پر ایک بار پھر جلالۃ الملک فیصل المعظم، رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ اور

کانفرنس کے تمام شرکاء اور مندوبین کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور عالم اسلام بالخصوص اپنی حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس قرارداد کو یہاں کے چند" ملاؤں کی بڑ" قرار دینے کی بجائے اس کی اہمیت، دوررسی اور گہرائی پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہے۔ (۲۱مئی-ج ۹ ش ۲- ۷مئی ۱۹۷۴ء ۱۵ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ)

"رابطۂ عالم اسلامی کی قرارداد کا عربی متن"

"نداءٌ من مكة المكرمة تنادي المسلمين"

نحلة هدامة تجعل من اسم الإسلام شعاراً لستر أغراضها الخبيثة أبرز مخالفاتها للإسلام:-

(ا) ادعاء زعيمها النبوة۔
(ب) تحريف النصوص القرانية۔
(ج) إبطالهم للجهاد۔

القاديانية ربيبة الاستعمار البريطاني ولا تظهر إلا في ظل حمايته...
تخون القاديانية قضايا الامة الاسلامية وتقف موالية للاستعمار والصيهونية تتعاون القادنية مع القوى المناهضة للاسلام وتتخذها هذه القوى واجهة لتحطيم العقيدة الاسلامية وتحريفها وذلك بما ياتي۔

ا:- انشاء مساجد تحولها القوى المعادية ويتم فيها التبشير بالفكر القادياني المنحرف۔

ب:- فتح مدارس ومعاهد وملاجئ للايتام وفيها جميعا تمارس القاديانية نشاطها التخريبي لحساب القوى المعادية للاسلام۔

ج:- تقوم القاديانية بنشر ترجمات محرفه لمعاني القرآن الكريم بمختلف اللغات

العالمية والمحات المحلية بامكانية القوى المعادية ولا يقاف هذا النشاط التخريبي للاسلام يقترح مايأتي ـ

١ :ـ تقوم كل هيئة اسلامية بحصر النشاط القادياني في مساجدهم ومدارسهم وملاجئهم وكل الامكنه التي يمارسون فيها نشاطهم الهدام في منطقتها وكشف القاديانيين والتعريف بهم للعالم الاسلامي تماديا للوقوع في حبائلهم ـ

٢ :ـ اعلان كفر هذه الطائفة وخروجها على الاسلام وعلى هذا تمنع من دخول الاراضي المقدسة ـ

٣ :ـ عدم التعامل معهم ومقاطعتهم اقتصاديًا واجتماعيًا ونكاحيا وعدم التزوج منهم دفنهم في مقابر المسلمين ومعاملتهم ككفار ـ

٤ :ـ مطالبة الحكومات الاسلامية بمصادرة كل نشاط هذه الجماعات وتسليمة للمسلمين الحقيقيين وعدم توظيف اى قادياني او السماح له بمزاولة اى عمل ـ

٥ :ـ نشر مصورات لكل التحريفات القاديانية في القران الكريم مع حصر الترجمات القاديانيه لمعاني القران والتنبيه عليها ـ (الندوة مكة المكرمة ٨ـ اپريل ١٩٧٤ء)

✠

بہائیت

دنیا میں جو بھی فتنہ تخریب دین کے لیے پیدا ہوا ہے اس نے اپنے ساتھ کئی دوسرے فتنوں کو بھی جنم دیا ہے۔ فتنۂ رفض (شیعت) نے جب دنیا میں قدم رکھا تو اس کی کوکھ سے مزید کئی فتنے پیدا ہوئے جن میں ایک فتنہ بہائیت کا بھی ہے، اس سازشی گروہ نے مسلمانوں کے عقائد کو خراب کرنے اور ان کو نقصان پہنچانے میں کوئی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ذیل کی اس تحریر میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم نے اس فتنے کی اصلیت اور اس کے عزائم پر نہایت دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ "باب الفرق" کے ساتھ مناسبت کی بناء پر "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

قاہرہ سے عرب لیگ نے اسرائیل سے ہر شعبۂ زندگی میں بائیکاٹ کے اداروں ——— مکاتب المقاطعۃ العربیۃ لاسرائیل ——— کی طرف سے اپنی ایک نہایت اہم اور قابل توجہ قرارداد نشر کی ہے جو سارے اسلامی ممالک کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔

غیر اسلامی صیہونی فرقہ

قرارداد میں کہا گیا ہے کہ بہائی فرقہ کے بارے میں ایسے قطعی شواہد مل چکے ہیں کہ وہ در پردہ عالم عرب اور مسلمانوں کے خلاف اسرائیل اور صیہونیت کا آلہ کار ہے اور اسرائیل میں قائم کردہ اپنے مرکز کے ذریعے پورے عالم عرب میں سازشوں کا جال بچھا رہا ہے۔ یہ لوگ اسرائیل کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ قرارداد میں بہائیت کو قطعی غیر اسلامی صیہونی فرقہ قرار دیتے ہوئے بلیک لسٹ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اور عرب ممالک میں اس کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگانے کا کہا گیا ہے۔ عرب پریس اور علمی و سیاسی شخصیتوں نے اس قرارداد کا بجا طور پر زبردست خیر مقدم کیا ہے۔ سعودی عرب اور رابطہ عالم اسلامی نے اس بروقت تنبیہہ پر عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری اور بر سر پیکار عرب اداروں کو مبارکباد

دی ہے۔ اس سے قبل پچھلے سال مکہ مکرمہ میں دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں نے بھی اپنے اجلاس اپریل ۱۹۷۴ء میں بہائیت کے بارہ میں ایسی ہی واضح اور غیر مبہم قرارداد میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ بہائی تنظیم کے تمام مراکز، لٹریچر اور سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے۔ اس اجلاس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت اور ان سے کلی مقاطعہ کرنے کی وہ تاریخی قرارداد بھی پاس ہوئی تھی جو بعد میں قادیانی تحریک کے دوران مسلمانوں کے کاز کو تقویت پہنچانے کا باعث بنی۔ عرب پریس بہائیت کے بارہ میں اس قرارداد پر بحث کرتے ہوئے اس فرقہ کی بہت سی صیہونی اور اسلام دشمن سرگرمیوں سے پردہ اٹھا رہی ہے۔

مذہب سے زیادہ صیہونی سیاسی جماعت

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بہائی فرقہ ایک مذہب اور فرقہ ہے بھی نہیں بلکہ دراصل وہ اس پردہ میں اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صیہونی پروٹوکولات اور سامراجی و یہودی منصوبوں کی تکمیل ہی کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہی منصوبے ہیں جو ایک طرف تو عالمی تنظیم فری میسن روٹری کلب، لائنز کلب، غیر مسلم مشنری اداروں فحش جنسی لٹریچر اور استشراق و تحقیق کے نام نہاد اداروں کی شکل میں مسلمانوں میں انسانی اور اخلاقی قدروں کی تباہی، فکری انتشار و اختلاف، سیاسی ضعف و اضمحلال برپا کرنے میں مصروف ہیں تو دوسری طرف بہائیت، قادیانیت اور اس طرح کے کئی ایک فرقوں اور جماعتوں کے لبادہ میں ملت مسلمہ پر شب خون کا کام کرتے ہیں۔ بہائیت کے آغاز، محرکات، عقائد و اعمال اور سرگرمیوں میں گئے بغیر ایک سطحی نظر سے بھی اس کے اصل عزائم اور مقاصد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بہائیت کا سرچشمہ اور مقاصد

بہائیت نے شیعیت سے جنم لیا اور اس کے بانی مرزا علی محمد باب شیرازی (۱۸۲۰ء) نے شیعی غلو محبت اور اعتقاد کی آڑ لے کر اس مذہب کو فروغ دیا اور عقائد و اعمال، اوہام و خرافات کا ایک ایسا معجون مرکب تیار کر کے پیش کیا جسے اسلام سے تو کیا کسی بھی آسمانی مذہب کے دعویدار نظام ہدایت وارشاد سے دور کا بھی تعلق نہ رہا۔ چونکہ اس کی تاسیس ہی درحقیقت مذہب کی آڑ میں مسلمانوں کی

عداوت پر رکھی گئی تھی تو اس کے علمبرداروں نے بھی کسی اخلاقی مجد و شرف، انسانی اقدار، شرافت، عقل و فکر کی پختگی، عقیدہ و عمل کی اصابت کا لحاظ کئے بغیر اس ملغوبہ میں ہر وہ عنصر شامل کر دیا جو کسی نہ کسی طرح بھی اخلاقی و مذہبی اقدار سے باغی اباحیت زدہ انسانوں کے لئے باعث کشش بن سکے۔ اس سلسلہ میں حیا، شرافت، حلال و حرام، جائز و ناجائز، عقیدہ اور اوہام، عقل اور خرافات کا کوئی سوال نہ تھا۔ اباحیت کے مارے ہوئے یہود و نصاریٰ نے اسے اپنی تشنگی کا علاج اور صیہونیت و استعمار نے اسے مسلمانوں کے خلاف شرمناک مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا اور اس طرح وہ مغرب کے یہود و نصاریٰ کی، مشرق کی مجوسی اور مریض ذہنیتوں کا مرکز نظر بن گیا۔

اہل یورپ اس میں دھڑا دھڑ شامل ہونے لگے۔

مشہور مستشرق گولڈزیہر کا اعتراف ہے کہ:۔

امریکہ میں قائم ہونے والی علمی اور ادبی انجمنوں نے اس کے اصول وضوابط کے استحکام و فروغ میں نہایت بھرپور حصہ لیا۔ (انہی اصول وضوابط کے استحکام نے ہمارے ہاں روٹری کلب اور لائنز کلب جیسی انجمنوں کا روپ دھار لیا۔ راقم) طبعی طور پر بہائیت اپنے سرپرستوں کے دیس امریکہ کے دور افتادہ علاقوں تک پھیل گئی اور شکاگو کو مرکز بنا لیا گیا۔ (العقیدۃ الشرعیۃ صفحہ ۲۵)

استعماری مقاصد کا آلہ کار | پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی استعمار کو عالم اسلام کی بیداری سے خطرہ لاحق ہوا تو ٹھیک یہی زمانہ دنیا میں بہائیت کے فروغ اور ترویج کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ کافی عرصہ قبل جب حکومت مصر کے سامنے اس فرقہ کی غیر اسلامی، غیر انسانی اور صیہونی تصویر آگئی تو وہاں کے محکمۂ قضا یہاں تک کہ پارلیمنٹ اور وزارت داخلہ نے بھی اس فرقہ کو پر امن اور مسلمان شہریوں کے حقوق دینے سے انکار کر دیا۔

اسلامی حکومتوں کا فرض | اب جبکہ عالم عرب کی نہایت اہم کمان عرب لیگ نے اتنی ذمہ داری سے بہائیت سے عرب ممالک کو متنبہ کرایا ہے تو اس کے پاس قطعی اور کھلے شواہد ہوں گے۔ (گنجائش ہوتی تو ہم خود بھی اس کی نقاب کشائی میں تفصیل میں جاتے)

تو نہ صرف عالم عرب بلکہ تمام اسلامی حکومتوں کی غیرت ملی، حمیّت دینی اور قومی و سیاسی مقاصد کا تقاضا ہے کہ اس قرارداد پر لبیک کہتے ہوئے بہائیت کی تمام دعوتی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا جائے۔

فری میسن روٹری اور لائنز کلب

عرب پریس میں اس قرارداد کے ساتھ فری میسن، روٹری اور لائنز کلب کا بھی ذکر آرہا ہے اور قادیانیت کی ریشہ دوانیوں کا بھی۔ اوّل الذکر پر پاکستان میں رسمی اور قانونی پابندی لگ چکی ہے۔ گو اس کی سرگرمیاں اب تک جاری اور مشتبہ ہیں۔ روٹری اور لائنز کلب کا مسئلہ بھی ۵ جولائی ۱۹۷۳ء کو قومی اسمبلی میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب قرارداد کے ضمن میں زیر بحث آیا تو حکومت نے انہیں علمی اور ثقافتی ادارے قرار دیتے ہوئے ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے لاعلمی کا اظہار کیا، مگر اب جبکہ ان اداروں اور فرقوں کی سرگرمیاں پورے عالم اسلام کے لئے لمحہ فکریہ بن چکی ہیں تو حکومت کو بھی نہایت دانشمندی سے ان اداروں کے بارہ میں نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک ان تمام ملت کش عناصر کے لئے نہایت زرخیز ثابت ہو رہا ہے اور بہائی فرقہ بھی منظم شکل میں اپنی کوششوں میں مصروف ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے مراکز ہیں اور لٹریچر تقسیم ہو رہا ہے۔ کراچی، لاہور، لائلپور میں اس کی تبلیغی سرگرمیاں زوروں پر ہیں۔ اب حکومت اور تمام اسلامی ممالک کا فرض ہے کہ ایسے تمام عناصر کا قلع قمع کر دے جو مار آستین بن کر ملک و ملت کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔

◆

فتنۂ رفض و انکارِ صحابہؓ

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک جان نثار جماعت (صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا انتخاب کیا جو اپنی جان و مال کو اسلام کی خاطر لٹانے کے لیے ہمہ تن و ہمہ وقت تیار رہتی تھی، اس مقدس جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ اطہر کو کسی بھی حال میں نہیں چھوڑا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ کے ایمان کو دوسروں کے لیے نمونہ اور معیار قرار دیتے ہوئے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: "امنوا کما امن النّاس (الایۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشہور یہودی عبداللہ بن سبا نے اور اس کے بعد اس کی روحانی ذریت نے صحابۂ کرامؓ کے تقدس اور تعدیل کو پامال کرنے کی کوشش کی۔ علماء امت نے ہر زمانہ میں سبائی ٹولے کے ان ناپاک عزائم کا بھرپور تعاقب کرتے ہوئے حضرات صحابۂ کرامؓ کے ناموس کی جنگ لڑی۔ اسی سلسلہ کی ایک ۔۔۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کا ذیل کا یہ مضمون بھی ہے جو دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان "ماہنامہ الحق" میں شائع ہوا۔ "فتاویٰ حقانیہ" کے باب الفرق کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے برائے افادۂ عام شامل کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

تعدیلِ صحابہ مدارِ دین ہے | قدوسیوں کی اس جماعت صحابہؓ کی تقدیس اور تعدیل پر ہمارے افکار و نظریات ہمارے قرآن، ہمارے سنت اور ہمارے تمام اسلامی نظام کا مدار ہے۔ وہ دین اور شریعت کی اساس ہیں۔ وہ ہمارے قرآن کی صداقت اور ہمارے پیغمبر کی حقانیت کے گواہ ہیں غیر تو غیر "اپنوں" میں سے بھی اگر کوئی اٹھ کر ان ستونوں کو گراتا ہے، ان کی عدالت مجروح کرنے کی مذموم سعی کرتا ہے۔ ان کی عظمت اور تقدس کو داغدار کرنا چاہتا ہے تو ہم اسے ملی خودکشی اور اپنے دین اور اپنے پیغمبر اپنی شریعت سے دشمنی ہی سمجھیں گے اور پوری خیرخواہی، اخلاق اور خدا ترسی

سے اس ہاتھ، اس قلم اور اس زبان کو روکنے کی کوشش کریں گے کہ اگر دین کے یہ اولین محافظ (خاکم بدہن) منافق، سازشی، منافق، پالیٹکس، خودغرض یا اقربا پرور اور معاذ اللہ جابر و ظالم تھے تو جو دین اور شریعت اور جو کتاب وسنت ان کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس پر دین کی عمارت کھڑی ہوئی۔ یہ ساری عمارت اور سارا ڈھانچہ خود بخود دھڑام سے گر پڑے گا۔ صحابہ کرام کی تقدس ثقاہت اور تعدل کا مسئلہ صرف جذبات اور نری عقیدت کا مسئلہ نہیں اور نہ اسے تعصب اور بدخواہی پر محمول کرنا چاہیئے۔ یہ پوری شریعت اور پیغمبر اسلام کی صداقت اور حقانیت کا سوال ہے جن لوگوں کی جانفشانی، اخلاص، علو ہمت، ایثار و جہاد کی بدولت آج ہم مسلمان ہیں اگر ہم "علم وتحقیق" یا عناد و تعصب کا تیشہ ان ہی پر چلانے لگیں تو اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں بقول امام شعبیؒ (جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں نقل کیا) ہم یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ثابت ہوں گے اور یہود و نصاریٰ ہمارے مقابلہ میں زیادہ مرتبہ شناس اور قدردان کہ جب ان لوگوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں زیادہ بہتر کون لوگ ہیں۔؟ تو یہود نے کہا حضرت موسیٰ کے ساتھی اور عیسائیوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ کے حواری (صحابہؓ) اور ایک ہم ہیں کہ اپنے رسولؐ کے صحابہؓ کو بدترین امت ثابت کرنے لگے ـــــ" کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ اس طوفان نوحہ و ماتم میں ہمارا پورا گھر (دین و شریعت) تو نہیں ڈوب رہا۔؟ اور ہماری "تحقیق و اکتشاف" کی کلہاڑی سے قصر اسلام میں شگاف تو نہیں پڑ رہے۔؟ (لا فعل اللہ ذالک فاعتبروا یا اولی الابصار)

عظمتِ صحابہؓ اور شانِ عدالت پر حملے

صحابہ کرامؓ ہمارے دین کے سرکاری گواہ ہیں۔ جن کی عدالت اور صفائی خود خدا وند کریم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ قرآن وسنت اور دین و شریعت کے نام سے جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اسی قدسی صفات جماعت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ ان

کی بے لوث قربانی اور کوششوں کے نتیجہ میں ہمیں اور ہمارے اسلاف کو کفر و شرک اور ظلم و ضلالت کی ظلمتوں کی جگہ ایمان و یقین اور عدل و انصاف کی روشنی نصیب ہوئی۔

علم و تحقیق کے نام پر | پس یہ کیسی بدبختی اور شقاوت کی انتہا ہے کہ آج ہم میں سے ہی بعض ناعاقبت اندیش اور دولتِ خشیتہ خداوندی سے کورے ہاتھ انہی بنیادوں پر تیشہ چلا رہے ہیں اور وہی زبانیں جو" اقامتِ دین" اور اسلامی نظام کے احیاء کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے اپنی ساری قوتِ گویائی صحابہؓ کی تعدیل و تقدیس کو مجروح کرنے میں خرچ کر رہی ہیں۔ اور صحابہؓ جیسی بیش قیمت متاع دین و ایمان کی بولی اپنے جماعتی اخبارات اور رسالوں میں سربازار لگائی جا رہی ہے۔ اگر علم و تحقیق کے نام پر اسلام دشمنی اور اپنے اولین محسنوں کی ناقدری کا یہ شغل جاری رہا تو دردمندانِ اسلام اور علمائے حق کا اولین فریضہ ہوگا کہ وہ متفق ہو کر اس لبادۂ عیّاری کو تار تار کر دیں۔ بلاشبہ ایسی گستاخ زبانیں گنگ اور ایسے مکّار ہاتھ شل ہو جانے چاہئیں جس کی دست درازیوں سے عثمانؓ مظلوم اور معاویہؓ مرحوم کی قبائے عصمت و تقدیس اور صحابہؓ کی شانِ عدالت و تعدیل بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔ مگر جو قلم شہیدِ عثمانؓ کے اس خون سے رنگا جا رہا ہے۔ جس نے حضرت عثمانؓ کے بدن سے گرتے وقت قرآن کریم کی آیت فسیکفیکھم اللہ کی فولادی ضمانت میں پناہ لی تھی۔ کیا آج اللہ کی کفایت اس خون کے تقدس کی حفاظت و ضمانت سے مجبور و بے بس ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلا، ہرگز نہیں، یہ خون آج بھی تازہ ہے۔ عثمانؓ کی مظلومیت اور شہیدِ دار کی بیکسی تمام صحابہؓ کی عظمتوں کی قسم کھا کر زبانِ حال سے ان نام نہاد اربابِ تحقیق پر خندہ زن ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم۔

اظہارِ برأت | عظمتِ صحابہؓ کو مجروح کرنے کی جو وبا ہمارے ہاں "خلافت و ملوکیت" کے نام سے پھیلی اور پھیلائی گئی، افسوس کہ بعض ثقہ اور متدین ادارے بھی اس کی لپیٹ میں آ

گئے۔ دہلی کے معروف ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے آرگن برہان میں پچھلے ماہ کسی کیپٹن قطب الدین نے خلافتِ راشدہ کے ضمن میں حضرت امیر معاویہؓ کے بارہ میں نہایت ہرزہ سرائی کی بلکہ اصولی طور پر عدالتِ صحابہؓ پر بھی نہایت سخیف انداز میں طبع آزمائی کی۔ ندوۃ المصنفین ہمارا ہی ایک قابلِ فخر اشاعتی ادارہ ہے، پھر اس کے مدیر شہیر مولانا سعید احمد اکبر آبادی تو خود ایک ثقہ، متدین اور محقق صاحبِ قلم اور دیوبند سے وابستہ جید عالم ہیں۔ ایسے پرچہ میں اس قسم کا مضمون آنا نہایت تاسف اور حیرت کی بات تھی۔ چنانچہ مدیر برہان کو توجہ دلائی گئی جو ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے اسلامیات کے صدر اور وہاں مقیم ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ توقع کے مطابق مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنے جوابی گرامی نامہ میں اس مضمون سے اپنی اور ادارہ کی طرف سے برأت ظاہر فرمائی۔ اور برہان میں بہت جلد اس کی تلافی فرمانے کا بھی وعدہ کیا۔

دفاعِ صحابہؓ اور ہمارا فرض

قومی یک جہتی، استحکام، باہمی رواداری اور اتحاد و اتفاق کی ضرورت و اہمیت سے کس باشعور شخص کو انکار ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہے ان کی طرف سے بھی ملکی سالمیت کی خاطر قومی یک جہتی، باہمی اتحاد اور حسنِ معاشرت پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس ملک کی غالب اکثریت اہلِ سنت والجماعۃ کی ہے جس کے ریشہ ریشہ میں صحابہ کرامؓ کی عظمت و تقدیس کے ساتھ ساتھ اہلِ بیتؓ اور ائمہ اطہارؒ کی محبت بھی رچی بسی ہے۔

دفاعِ صحابہؓ بھی مسلمانوں کا فریضہ ہے

ایک ایسی اکثریت اگر اپنے اساسی نظریات دینی معتقدات و مسلمات کے تحفظ اور دفاع کے لیے کسی اقلیتی فرقہ کی ان سرگرمیوں میں قدغن کرتی ہے، جس کی زد دینی عظمت و تقدس اور دینی افکار و نظریات پر پڑ رہی ہے۔ یا جس سے ان کے مسلک و مذہب کے ان لوگوں کی عظمت مجروح ہوتی ہے۔ جن کا وجود دین میں اختیار ٹی اور اسوہ کا مقام رکھے ___ تو ایک اسلامی اور جمہوری ملک میں

اسے مرکز انتشار پسندی اور تفرقہ انگیزی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اس اخلاقی، سیاسی، جمہوری اور دینی استحقاق کے باوجود یہاں کی اکثریت نے (محض قومی یک جہتی اور ملکی استحکام کی خاطر (یا اپنی دینی اقدار و مسلمات سے غفلت اور بے حسی کی وجہ سے) اقلیتی طبقوں سے جس رواداری یا مساوات اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرتی ہے، چاہیئے تو یہ تھا کہ اس حسن معاشرت، اور فراخدلی کا خیر مقدم کیا جاتا۔ اپنے دل آزار معتقدات کو اپنے تک محدود رکھا جاتا، نہ یہ کہ پورے ملک کے سواد اعظم پر اپنے جارحانہ عزائم اور توسیعی ارادے نافذ کرانے کی سعی کی جاتی اور اس کے لئے روش اختیار کی جاتی جو نہ تو پاکستان کی سالمیت اور بنیادی اصول سے جوڑ کھائے اور نہ اکثریت کا مسلک و مذہب اسے گوارا کر سکے۔

اہل الحاد و فتن کی جیرہ زوریاں

مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کوئی فرقہ یا جماعت، تو کیا کوئی ایک فرد بھی اٹھ کر پورے ملک کے اعتقادات اور پاکستان کے اساسی نظریہ "اسلام" کو للکار سکتا ہے۔ اسے دین اور مذہب کے ایک ایک ستون گرانے اور اسلام کے پورے فکری نظام کو تہ و بالا کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ علم و مشیخت، مدرسہ و خانقاہ مسجد و مکتب، درس و تدریس، تصنیف و مطالعہ، ارشاد و تربیت، غرض اسلام کی ترجمانی کرنے والے تمام مظاہر، اداروں اور شخصیتوں کو حرف غلط کی طرح مٹانے کی تبلیغ کرتا ہے۔ چند افراد کا ایک گروہ جدّت اور روشن خیالی کے پندار میں پورے دین و شریعت، اسلام کو ملکی ترقی کے لئے "ربورس گیئر" سمجھتا ہے اور اسلام کی ترجمانی کرنے والے تمام علماء حق کو "ملائیت" کے نام پر پابند طوق و سلاسل کرنے کے مشورے دے رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو نظر و فکر۔ اگست ۱۹۶۷ء) ایک شخص (غلام احمد پرویز) اٹھ کر اسلام کے پورے "حدیثی ذخیرہ" اور پیغمبر کی تشریعی حیثیت پر لاتعداد حملے کرتا ہے مگر اس تمام جارحانہ غیر جمہوری، غیر اخلاقی اور لادینی تحریر و تقریر کو قومی یکجہتی کے خلاف اور اکثریت کی دل آزاری قرار نہیں دیا جاتا بلکہ اسلام کی تحقیق و ریسرچ کے نام پر اس اسلام دشمنی اور سیکولر نوازی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اگر اس ظلم و افراتفری کے خلاف اکثریت کوئی آواز اٹھاتی ہے تو

الٹا اسے انتشار پسند اور تفرقہ انگیز سمجھ لیا جاتا ہے۔

نبوت کاذبہ کا پرچار | جعلی نبوت کی علمبردار ایک جماعت (جسے پوری اسلامی دنیا روز اوّل سے کافر، مرتد اور خارج اسلام سمجھتی ہے) بلا روک ٹوک اپنی نبوت کاذبہ کا پرچار اور مسلمانوں کے بنیادی عقیدہ ختم نبوت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سالمیت کو چیلنج کرتی ہے۔ ملکی زرمبادلے سے تبلیغ کے نام پر دیس ودیس میں اس کی خلاف اسلام مساعی جاری ہیں۔ اس کا امیر پورے طمطراق اور شان بان سے اسلام کا "نمائندہ" مسلمانوں کا "خلیفہ" اور پاکستان کا "مذہبی راہنما" بن کر یورپ کے سرکاری اور عوامی محافل میں پیش ہو رہا ہے۔ عالم اسلام کے بدترین دشمن اسرائیل تک میں اس جماعت کے مشن قائم ہیں جس کا اعلان وہ بلا کسی جھجک کے اپنے گوشواروں میں کررہی ہے۔ مگر ارتداد کی اس مہم کو نہ تو قومی یکجہتی کے منافی سمجھا جاتا ہے اور نہ مسلمانوں کے عزیز ترین اعتقادات کے لئے چیلنج جبکہ اس ملک کی اکثریت کو اپنے دین اور پیغمبرؐ سے جذباتی اور فدائیانہ لگاؤ ہے۔

شیعہ معتقدات کا فروغ | اہل سنت والجماعۃ (دوسرے الفاظ میں پاکستان کی غالب اکثریت) کی "فراخ حوصلگی" سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش ہمارے شیعہ حضرات نے بھی کچھ عرصہ سے شروع کر رکھی ہے۔ ان کے ایک بڑے گروہ کی جانب سے

۱۔ شیعہ مسلمانوں کے لئے الگ نصاب تعلیم و تربیت بنانے۔

۲۔ عزاداری (دوسرے الفاظ میں تبرا اور صحابہؓ کے سب وشتم) کے جلوسوں کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد کرانے۔

۳۔ اور شیعوں کے لئے ایک الگ اوقاف بورڈ قائم کرنے کے مطالبات پیش کیے جارہے ہیں ان مطالبات کی خاطر "میدان کربلا" کی یاد تازہ کرنے تک کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ اب تک اکثریتی طبقہ کے علمی و فطری حلقوں نے ان انتشار انگیز باتوں کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا کہ ملکی استحکام اور بقاء کو غتر بود کرنے والی ان فتنہ انگیز باتوں پر غور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جس کی ہلاکت آفرینی کا شیعہ حضرات کے سمجھ دار اور سنجیدہ حلقوں کو بھی احساس ہو گا کہ الگ تھلگ رہنے کا یہ احساس اور علیحدگی کی یہ جد و جہد اگر ایک طرف ملک کی سالمیت پر ایک کاری ضرب ہے تو دوسری طرف عظیم اکثریت کے ردعمل کی شکل میں خود شیعوں کے لئے یہ انداز افتراق بے شمار مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ علیحدگی کے ان رجحانات کا ردعمل پھر تعلیم اور اوقاف تک محدود نہ رہے گا بلکہ کئی دیگر ایسے امور میں اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جس کا تصوّر بھی ملک و ملت کے بہی خواہ نہیں کر سکتے۔

سرکاری نصاب سے خلافت راشدہ کا اخراج | ان وجوہات سے اہل سنت ان مطالبات کو "دیوانوں کی بڑ" سمجھتے رہے مگر بدقسمتی سے اونچی سطح پر بعض ایسی باتیں ظاہر ہونے لگیں جس سے اہل سنت کی خوش فہمی اور حسن ظن غلط ثابت ہونے لگا۔ مثال کے طور پر یہ المناک خبر کہ سرکاری مدارس کے نصاب اسلامیات میں سے خلافت راشدہ کا عنوان حذف کر دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر سکولوں کو ایک سرکلر کے ذریعہ سیدنا ابوبکرؓ سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ جیسے معماران اسلام کے احوال و سوانح کی تعلیم سے روک دیا گیا ہے۔ (جن کی سوانح یورپ کی بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل اور ان کے لئے مشعل راہ ہے) جن کی پاکیزہ معیاری سیرت ملک اور معاشرہ کی تشکیل کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف جناب گورنر مغربی پاکستان کی طرف سے شیعہ مطالبات پر غور کے لئے بورڈ کی نامزدگی کی خبریں آئیں۔ ان امور نے بجا طور پر اہل سنت کو چونکا دیا ہے اور یہ خبریں پورے ملک کے لئے لمحہ فکریہ بن چکی ہیں۔ ایک ایسی تحریک جس کے نتیجہ میں ملک و ملت ہمیشہ کے لئے دو گروہوں میں بٹ جائے اور نہ ختم ہونے والے افتراق کا سلسلہ شروع ہو، کوئی معمولی سانحہ نہیں جس سے اہل سنت اور ملک کے دوسرے خیر خواہ صرف نظر کر سکیں۔

سنی کنونشن | اس سلسلہ میں پچھلے دنوں ملتان میں تنظیم اہل سنت کی طرف سے سنی کنونشن کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت اور ہر لحاظ سے موزوں اقدام ہے۔ اس کنونشن میں پورے

مغربی پاکستان کے مختلف دینی عناصر نے بھاری تعداد میں شمولیت کی اور مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر غور کے بعد چند قراردادیں پاس کیں جن میں ان امور کا سختی سے محاسبہ کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں باہمی عناد و فساد اور فرقہ وارانہ تلخی اور تصادم پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس ضمن میں اہل سنت کے مختلف مکاتیب فکر سے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق کی اپیل اور شیعوں کے دلآزار مساعی جلسے جلوسوں اور صحابہ کرام رض کی بے حرمتی اور گستاخی پر پابندی کا مطالبہ اور نصاب میں خلفاء راشدین کی سیرت نکالنے کی سازش وغیرہ امور پر شدید احتجاج کیا گیا ہے۔ یہاں ان تمام قراردادوں پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں —— یہ قراردادیں ملک کی خیر خواہی، دین کے تحفظ اور قومی سالمیت کی ترجمان ہیں اور ہر لحاظ سے تائید کی مستحق —— ظاہر ہے کہ نہ تو ایک مٹھی بھر جماعت کی خاطر ملک و ملت اس کشت و خون اور باہمی تقسیم کی متحمل ہے اور نہ اہل سنت اپنے ان بزرگوں اور مقدس اسلاف کی کھلم کھلا بے حرمتی، سب و شتم اور تبرا بازی یا معاندانہ سلوک کو گوارا کر سکتے ہیں جنہیں خلفاء راشدین یا صحابہ کرام رض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سنی سوادِ اعظم پر صریح زیادتی

تعجب ہے کہ ایک طرف تو ملک کی اکثریت سے لاء اینڈ آرڈر قسم کے پریس نوٹوں اور آرڈیننسوں کے ذریعہ دیگر فرقوں کا تحفظ کروایا جاتا ہے اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے دینی نظریات، اعتقادات اور قطعی مسلمات کی سرِ راہ توہین اور تحقیر برداشت کرتے جائیں، مگر کسی قسم کا حرفِ شکایت زبان یا قلم پر نہ لائیں کہ اس سے دیگر فرقوں کا تحفظ مجروح ہوگا۔ مگر دوسری طرف فراخ دلی اور رواداری کا عجیب مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اقلیتی فرقوں کو پورا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کے اساسی عقیدہ ختم نبوت پر کلہاڑی چلائیں۔ انبیاء اور صلحائے امت کے بارہ میں نہایت گستاخانہ الہامات اور مکاشفات کا پرچار کریں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو کنجریوں اور جنگلی سوروں کی اولاد سمجھیں۔ ملتِ محمدیہ کے تمام امتیازات اور خصوصیات کو ایک ایک کر کے مٹائیں

اسلامی اصطلاحات اور شعائر کا اپنی "ملت اور امت" کو مصداق قرار دیں۔ ان لوگوں کو آزادی
ہے کہ حضور اقدس ؐ کی احادیث سے انکار کی برملا دعوت دیں۔ حضورؐ کی تشریعی حیثیت کا (خاکم
بدہن) مذاق اڑائیں۔ اطاعت خدا اور رسول کو من مانی معنی پہنائیں۔ انہیں کھلی چھوٹ ہو کہ وحی، نبوت،
جبرئیل کی جو چاہیں تاویل کریں۔ معراج جسمانی اور عقیدہ رفع مسیح کو افسانہ سمجھیں۔ شراب، جوا، سود کو
حلال قرار دیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج جیسے ارکان اسلام کی مقداروں میں کمی بیشی کریں اور چاہیں تو
ڈنکے کی چوٹ اسلام کو کمیونزم یا سوشلزم کا لبادہ پہنائیں۔ انہیں تو بلا خوف احتساب یہ حق
حاصل ہو کہ مسلمانوں کے مسلمہ بزرگوں صحابہ کرامؓ اور خلافت راشدہ پر ہر قسم کی دست درازی
کریں، مگر نہ تو ان لوگوں سے کوئی باز پرس ہو اور نہ ایسی حرکات سے ملک وملت کو انتشار و
افتراق کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ملک کے اہل سنت والجماعت کی
عظیم اکثریت کے یا تو کوئی عقائد ہی نہیں اور اگر ہیں تو یہ عقائد نہ تو مجروح ہوتے ہیں اور نہ
ان پر مخالفین کی دست اندازیوں کی کوئی زد پڑتی ہے۔ پھر اگر ایسا نہیں تو کیا اس ملک کے
سواد اعظم کے دینی معتقدات اور مسلمات کسی تحفظ اور احترام کے لائق نہیں ہیں؟ اگر حالات و
واقعات نے یہ صورت اختیار کر لی ہے تو یہ اس ملک کے ان تمام مسلمانوں کے ساتھ ظلم
ہو گا جنہوں نے اپنے دین و شریعت اور اپنے محبوب معتقدات کی حفاظت و ترویج اور
باطل کی سرکوبی ہی کے لئے تاریخ کی لا مثال قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا۔ اگر ان کے
دین اور اعتقاد کو کسی غیر مسلم غالب اکثریت کے رحم و کرم پر رہنا تھا تو انہیں آگ اور خون
کے دریا عبور کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دین اور دینی اقدار کے خون ہونے کا یہ ہولناک
نظارہ وہ کسی سیکولر سٹیٹ میں بھی دیکھ سکتے تھے ——— پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے
اس کی اساس کتاب و سنت اور ان کی وہی تشریح و تعبیر ہے جو چودہ سو سال سے مسلمانوں
کے ہاں سند قبول و تسلیم پا چکی ہے۔ پس کیا ایک ایسا نظریہ جو کسی مملکت کے لئے ریڑھ
کی ہڈی اور مرکز ثقل کی حیثیت رکھتا ہو اس طرح محفوظ رہ سکتا ہے کہ اس کے ماننے والوں

کو توبے دست و پا بنا دیا جائے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے والوں کو کھلی چھٹی دی جائے بلکہ ان کے تحفظ اور مدافعت کا انتظام ہو۔ ایسی صورت حال سے کسی قوم یا کسی نظریاتی مملکت کا دوچار ہونا بصیرت اور تدبر کی موت، ناعاقبت اندیشی کا بین ثبوت اور فہم سلیم سے محرومی کی علامت ہے اور ہمارا حق ہے کہ ملک و ملت کی خیر خواہی، دینی ذمہ داری اور اور ہمارے اساسی نظریات سے وفاداری کی بنا پر اس المناک صورتحال کا جائزہ لیتے رہیں۔

اختلافی معتقدات پر مبنی کلمۂ اسلام

ملک میں شیعہ سنی نصاب کی علیحدگی کا مسئلہ اٹھا تو ہم نے بار بار اس فیصلہ کے قومی و ملی خطرناک عواقب پر ارباب اختیار کو متنبہ کیا، سنجیدہ طبقوں نے اضطراب اور تشویش ظاہر کی اسمبلی میں آواز اٹھائی گئی مگر یہ سب کچھ صدا بصحرا ثابت ہوا اور مشترکہ اور علیحدہ علیحدہ نصابوں کے ذریعہ قوم میں تفریق و انتشار کی نیو ڈالی گئی اور اب وہی کچھ سامنے آنے لگا جس کا خطرہ تھا، دینی نصاب کو متصادم خیالات اور نظریات کا ملغوبہ بنا دیا گیا اور ایک خاص گروہ کے معتقدات کو سواد اعظم کے سر منڈھنے کا آغاز ہو گیا۔ قومی ادارہ نصاب و درسی کتب وزارت تعلیم و صوبائی رابطہ اسلام آباد کی مطبوعہ کتاب رہنمائے اساتذہ اسلامیات جماعت نہم و دہم سکولوں میں آگئی، سنی مسلمانوں اور علماء کو بجا طور پر حیرت و تشویش ہوئی کہ جب انہوں نے کتاب کے حصہ سوم میں کلمہ اسلام تک کو نئے انداز میں پایا، شیعہ حضرات سے متعلق اس باب میں علیؓ ولی اللہ وصی رسول اللہ اور خلیفۃ بلافصل کے ذریعہ امامت و خلافت کے جھگڑوں کو کلمۂ اسلام کا جزو بنا دیا گیا، اور اسی پر اکتفاء نہیں بلکہ ایسے ہی کلمہ کو اسلام کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اور ان عقیدوں کو ذریعۂ ایمان و اسلام ملاحظہ ہو (ص ۳۵) مسلک و مشرب کے امتیاز کے لئے اگر یہ لکھ دیا جاتا کہ معیار اسلام کلمۂ طیبہ ہی ہے مگر شیعہ معتقدات میں امامت و خلافت بلافصل کا بھی اضافہ ہوتا ہے تب بھی کچھ بات ہوتی

مگر یہاں ان اختلافی معتقدات پر مبنی مسائل کو کلمۂ اسلام قرار دینا اور یہ کہ اس کے پڑھنے سے کافر مسلمان ہو جاتا ہے۔ نہ عقلاً اور نقلاً صحیح ہے نہ ملک کے سوادِ اعظم کو تحت السطور اور اشارات و تلمیحات میں کافر قرار دینا ملک و ملت کی خیر خواہی ہے ـــــ ان حضرات کو خود بھی معلوم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاں داخلۂ اسلام کی علامت صرف کلمۂ طیبہ رہا ہے۔ اور عہدِ صحابہؓ خیر القرون میں کلمۂ طیبہ ہی کلمۂ اسلام سمجھا جاتا رہا۔ خود شیعہ روایات بھی اس باب میں بے شمار ہیں۔ اس لئے ایک ایسی بات کو جو امتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت کے ہاں نزاعی اور نا قابلِ تسلیم ہے ایک ایسے نصاب میں شامل کر دینا جو اکثریتی طبقہ کے سامنے بھی بجبر و اکراہ رکھا جا رہا ہے۔ نہایت ناعاقبت اندیشی ہے، ملک میں جگہ جگہ اس مسئلہ پر بے چینی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ لاہور میں ایک عدالت کے سامنے بھی یہ مسئلہ رکھ دیا گیا ہے۔ چکوال میں تو کشیدگی کی حد ہو گئی ہے کہ مسجد کا تقدس مجروح کر کے پولیس نے داخل ہو کر نمازیوں پر ظلم کیا۔ ممتاز عالم قاضی مظہر حسین صاحب اور دیگر لوگ گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ قومی اسمبلی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب چکوال کے واقعہ کے ضمن میں اس مسئلہ کے محرکات پر تحریکِ التواء پیش کر چکے ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ نصاب دینیات کی شکل میں جو آگ سلگ اٹھی ہے خدا را ملک و ملت کی سالمیت کی خاطر اس کے خطرناک عواقب کو سوچے اور اس کے بھڑک جانے سے پہلے اسے بجھا دینے کے اقدامات کرے! (مارچ ۱۹۷۶ء)

⌘

متجددین اور منکرینِ حدیث کا جاہلانہ تصورِ نبوت

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب

اسلام میں قرآن کریم کے بعد دوسرا مقام سنت اور حدیثِ نبوی کا ہے۔

منصبِ رسالت قرآن کریم اول تا آخر سنتِ نبوی کی اس اہم ترین مرکزی اور بنیادی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ایک ایسے رسول کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو بیک وقت معلم اور مربی بھی ہیں، شارح کتاب اللہ بھی اور تمام امت کے لئے پیشوا اور نمونہ تقلید بھی۔ وہ رسول کی اتباع اور اطاعت کو محبتِ خداوندی اور یومِ آخرت کی امید داری کی علامت قرار دیتا ہے اور حضور کی زندگی اور آپ کے اقوال و افعال کو اپنا اسوہ حسنہ نہ بنانے والوں کو کافرین کے زمرہ میں شمار کراتا ہے۔ اس کی بے شمار آیتیں ناطق ہیں کہ رسول کا کام صرف "کتاب" پہنچانا نہیں بلکہ اس کی تشریح و تعبیر اور اس کی تفسیر و تبیین بھی آپ کے فریضہ نبوت میں شامل اور منصبِ رسالت کا تقاضا ہے کہ وہ جگہ جگہ رسول کو بحیثیت شارع پیش کر کے انہیں تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) دیتا ہے اور کبھی مختلف پیرایوں میں تصریح کرتا ہے کہ رسول کریم اللہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم، فرمانروا اور قاضی (جج) ہیں ــــ وہ ربِ رسول کی قسم کھا کر اعلان کرتا ہے کہ تیرے رب کی قسم جب تک یہ لوگ دل و جان سے تیرے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں یہ ہرگز ہرگز مومن نہیں ہو سکتے۔ تیری مرضی سے فیصلے سے انکار تو کیا، اگر انہیں اپنے دلوں میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہو جائے تو یہ چیز متاعِ ایمان کے ضیاع اور دین و اسلام کی بربادی کا سبب ہو گی۔ مومنین کا شیوہ تو یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کی کسی بات اور فیصلہ کی طرف بلائے جائیں تو وہ دوڑتے چلے آئیں اور کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا (النور ۵۱) رہے کافر اور منافقین تو ان کا حال یہ ہے کہ لوگ تیری طرف رسول سے کتنی کتراتے ہیں (النساء ـ ۶) وہی قرآن جس کی

آڑ لے کر آج دین اور ملتِ اسلامیہ پر شبخون کرنے والے یلغار کر رہے رہیں، اسی کتاب مبین کا اعلان ہے کہ رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت اور اس کے تشریعی منصب سے انکار خدا اور اس کی کتاب سے انکار ہے۔ وہی کتاب کہتی ہے کہ رسولؐ کی زبان خدا کی زبان۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ۔ اس کا قول خدا کی وحی، اس کا عمل خدا کا منشاء اور اس کا فیصلہ خدائے بزرگ و برتر کا اٹل قانون ہوتا ہے۔

پھر آہ! ان لوگوں کی نفسانی خباثتوں اور فطری کج فہمیوں کا ماتم کن الفاظ سے کیا جائے جو قرآن کا نام لے کر رسولؐ اولین و آخرین سے یہ سارے مناصب دھاکم بدہن) چھین لینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہے کتاب اللہ میں ہے، رسولؐ کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں، نہ اس کے ارشادات اور تشریحات قرآن کو شریعت کا حصّہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ انہیں مسلمانوں کے قانون کا ماخذ سمجھا جا سکتا ہے۔" حالانکہ سنّت کا دوسرا ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) ہونے پر صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ کا اجماع چلا آرہا ہے۔ مگر اسلام میں سنت کو جتنا اہم کردار اور اساسی حیثیت دی گئی ہے، اسلام اور رسولؐ اسلام کی ذاتِ اقدسؐ سے عناد رکھنے والے منافقین اور ملحدین نے سنت کی تشریعی حیثیت گھٹانے میں اتنا ہی زور لگایا ہے کہ جب رسولؐ کی تشریح اور تفسیر کو قرآنِ کریم کے احکام اور اصطلاحات سے الگ کر دیا جائے گا، تو اسلام اور قرآن کی من مانی تاویل بلکہ تحریف کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ قرامطہ، باطنیہ، معتزلہ، خوارج اور اس طرح کے بے شمار فرقِ باطلہ میں یہ چیز آپ کو قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی، خواہ یہ لوگ دعویٰ حدیث پر عمل کرنے کا کرتے رہے یا اعلانیہ انکار۔

سنتِ رسولؐ اور مستشرقین اور تجدد زدہ طبقہ | پچھلی دو صدیوں سے یورپ کے مستشرقین اور مسلمانوں کے تجدد زدہ طبقوں کے مساعی کا محور بھی زیادہ تر "سنتِ رسولؐ" ہی رہا کبھی کھلے

الفاظ میں اسے نشانۂ تحقیق بنایا گیا اور کبھی منافقانہ لبادہ اوڑھ کر سنت کی نئی نئی تعبیرات کرنے کی شکل میں؛ ہمارے ہاں کے تجدد زدہ حضرات جو نہ تو اپنی علمی و فکری قوتوں کو خدا اور رسولؐ کی مرضیات پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ اور نہ مجبوری اور مصلحتوں کی وجہ سے واضح طور پر اسلام اور ایمان سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کے مساعی کا تعلق بھی زیادہ تر سنتِ رسولؐ کی تشریعی حیثیت کو نقصان پہنچانے سے ہے۔ ایسے لوگ جن کی ساری علمی متاع اپنے پیشرو غیر مسلم مغربی اساتذہ کی تحقیق و ریسرچ ہے، ہمیشہ سنتِ نبویؐ کے مصداق اور اس کی اہمیت و استنادی حیثیت کو مجروح اور مشکوک کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے غلام احمد پرویز اور اس کی جماعت تو کھلے بندوں احادیثِ رسولؐ سے انکار کی دعوت دیتی ہے۔

سنت اور حدیث کے بارہ میں منافقانہ کردار | اور کچھ لوگ علانیہ انکار کئے بغیر سنت اور حدیث کو اپنی ملحدانہ اغراض کی بناء پر ایسے معانی پہنانا چاہتے ہیں جس سے سنت کی حقیقت تو مسخ ہو کر رہ جائے، مگر انکارِ حدیث کے الزام سے بھی ان کا دامن بچ جائے۔ اس "طرزِ تحقیق" کا سہرا رسوائے عالم یہودی مستشرق پروفیسر جوزف شاخت کے سر پر ہے۔ اور ہمارے ہاں اس نظریہ کے فروغ و اشاعت کا فریضہ ان کے وفاشعار شاگرد ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کی ہمنوا جماعت بجا لا رہی ہے۔ پہلی جماعت اپنی فاسد اغراض اور خواہشات کی راہ میں سنتِ رسولؐ کو سنگِ گراں سمجھ کر اسے راستہ ہی سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔

نظریۂ سنتِ جاریہ و غیر جاریہ | مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا نظریہ "سنتِ جاریہ و غیر جاریہ" وہ عیارانہ حربہ ہے جسے ہاتھ میں لے کر آپ ہر قسم کی رندی اور عیاری پر تقوے اور پارسائی کا غلاف چڑھا سکیں گے۔ اس نظریہ کا خلاصہ فضل الرحمٰن صاحب کے الفاظ ہی میں یہ ہے کہ "سنت درحقیقت ایک "تعاملی اصطلاح" ہے جس کی تشکیل "آزاد شخصی رائے" سے ہوتی ہے۔ اور "عوام الناس" یا "رائے عامہ" کے قبول کر لینے کے بعد وہی چیز "سنت"

بن جاتی ہے اور رائے عامہ کے اس قبول کر لینے کا نام ہی "اجماع" ہے۔ جس کو وہ "آزاد اجماع" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق ملّت مجموعی طور پر سنتِ نبوی کے مشمولات کی تخلیق کرنے کی مستحق ہے، ملّت الفاظ پر زور نہیں دیتی بلکہ اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے [1] اور اس "تعاملی اصطلاح" کو جاری رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف اس کا نام سنتِ جاریہ (زندہ سنت) رکھتے ہیں اور حضورؐ کی اصلی سنت کو سنتِ غیر جاریہ (مردہ سنت۔ معاذ اللہ) قرار دیتے ہیں جس کی تشریح مختصراً یہ ہے کہ کتاب وسنت اور تعلیماتِ شریعت میں اتنی "توسیع" کر دی جائے کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ تمام مسائل اور خرافات یہاں عامۃ الناس کی رائے اور تعامل کی وجہ سے حسبِ خواہش سنت اور شریعت میں سمائے جا سکیں۔

پرویزی نظریہ سے مہلک: تحریف وتلبیس اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کے لحاظ سے چودھویں صدی کی یہ تحقیق منکرینِ حدیث کے پہلے گروہ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے، تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح حضرات کی نظریں لاعلمی یا دینی بے حمیتی کی وجہ سے فضل الرحمٰن کی اس تکنیک پر نہیں جاتیں اور وہ "انکارِ حدیث" سے دوسری جماعت کی براءت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ فضل الرحمان یا اس کے ادارہ کی طرف سے اگر "پرویزی نظریہ" کے تعاقب میں کوئی مضمون آتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ انہیں پرویزی اندازِ فکر مسلمانوں کے دینی احساسات اور جذبات کی وجہ سے اسلام کے حق میں کم خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ یہ لوگ قصرِ اسلام کو عاکم بدہن جلد از جلد پیوندِ خاک دیکھنا چاہتے ہیں (ولا نعل اللہ کذلک) یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے چور اور منافق بن کر در پردہ حربوں سے اس قصر میں نقب زنی کو زیادہ مؤثر اور مفید سمجھتے ہیں۔ پرویز جیسا جارحانہ اور دو ٹوک طریقہ نہیں۔ اگر پرویزی جماعت کھلے ارتداد

---

[1] مذکورہ بالا نظریہ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر ونظر، جولائی، اگست ۱۹۶۳ء۔ مقالہ تصورِ سنت اور دیگر مضامین

اور کفرِ صریح کا راستہ چھوڑ کر ان کی طرح نفاق اور تلبیس کا راستہ اختیار کرے تو آج ہی یہ دونوں مکتبِ فکر گلے مل سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں مکاتبِ فکر میں میدان الحاد و تجدد کی سیادت و قیادت کا جذبہ بھی کارفرما ہے جو انہیں ایک دوسرے کا رقیب اور حریف بنانے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ورنہ فرقِ باطلہ کے نفسیاتی مطالعہ اور ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں اصل اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں سب ایک ہیں، طریقِ کار، اندازِ بیان اور تعبیرات میں فرق ہے۔

آزاد اجماع اور شخصی رائے | چودھویں صدی کے اباحیت زدہ لوگوں کو اسلامی اقدار سے فرار کے لئے مستشرقینِ یورپ، ہمارے ہاں کے اہلِ تجدد اور اسلام کے تعمیرِ نو (NEW CONSTRUCTION) کا نعرہ لگانے والوں اور اس کو حالات اور ظروف کا تابع بنانے والوں کی یہ تحقیق خوب بھائی ہے کہ ہوس زدہ عوام کی اکثریت اور دین سے عموماً بے خبر عامۃ الناس کی خواہشات اور فیصلوں کو دین میں سنتِ جاریہ، آزاد اجماع، شخصی اجتہاد وغیرہ کے نام سے حجت اور اتھارٹی کا مقام دے دو۔ پھر دیکھو کہ جو فواحش اور منکرات دین میں قطعی حرام تھے، کس طرح وہ یکایک عامۃ الناس کے اپنانے سے جائز اور حلال بلکہ قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

عوام کو فیصلہ کرنے کا حق؟ | اگر اس "آزاد اجماع" اور "شخصی رائے" کو احکامِ شرعیہ کا مأخذ اور "سنتِ جاریہ" مان لیا جائے تو پھر کون ہے جو سینما، بے پردگی، فحاشی، سود بنکنگ، جوا، الغرض یورپ کے تمام اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اسلام سے مخالف کہہ سکے۔ کل اگر آزاد شخصی رائے سے تشکیل پائی ہوئی "سنتِ جاریہ" سوشلزم کو پسند کرے، پرسوں کمیونزم یا کیپٹلزم کو اور کچھ عرصہ بعد دجال اور اس کی لائی ہوئی یورپی تہذیب کو گلے لگالے تو ان میں سے ہر چیز کو سنتِ نبوی کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ والعیاذ باللہ۔

ذرا اور گہرائی میں جائیے تو نتیجہ کے لحاظ سے "سنت اور حدیث" سے تلاعب اور تمسخر کرنے والی دونوں جماعتیں اس نکتہ پر اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ "اطاعتِ رسولؐ" اور شریعت کی بجائے ہر دور کے عوام کے فیصلوں کو وہی حیثیت دے دو جو رسولؐ اور اس کی سنت کو حاصل ہے۔ البتہ پرویزی مکتبِ فکر میں اس کی تعبیر "مرکزِ ملت" کے نام سے کی جاتی ہے اور متجددین کے ہاں "زندہ اور مردہ سنت" سے اور کبھی "آزاد اجماع اور اجتہاد" کی آڑ میں عوام یا ان کی منتخب کردہ پارلیمنٹ (مقننہ۔ اگر اسے اسلامی نقطۂ نظر سے مقننہ کہنا جائز بھی ہو) کو ہر قسم کے فیصلوں کا حق دیا جاتا ہے۔ خواہ ان فیصلوں کا مقصد کتاب و سنت اور اس کے منصوص احکام کو "ویٹو" کرنا ہی کیوں نہ ہو اور اس خود ساختہ اجماع سے امت کے پچھلے تمام اجماعی مسائل کا توڑ کیوں نہ ہو رہا ہو۔

صدر ایوب کے غلط خیالات اجماع وغیرہ کے بارہ میں

پھر اس غلط اور خطرناک تصورِ اجماع کا پروپیگنڈا جمہوریت کے نام پر اس زور شور سے کیا گیا ہے کہ بدقسمتی سے اور تو اور ہمارے قابلِ احترام صدرِ مملکت تک اس نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز"[1] کے گیارھویں باب "آئین اور نظریہ حیات" میں انہوں نے "اجماع" کے اسی مفہوم کو اپنا لائحہ عمل بنانا چاہا ہے۔ اور چونکہ ملکی آئین اور ضابطۂ حیات کی تشکیل میں صدرِ محترم کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ انہی خطوط پر وہ ملک کی قانون سازی کو پسندیدہ سمجھتے تھے جس کے اثرات سے مستقبل میں پورے ملک کے مسلمان اکثریت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اجماع کا وہ تصور جو اسلاف نے کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں دیا ظاہر ہے کہ اس کے لئے جو اہلیت اور صلاحیت ملحوظ رکھی گئی تھی، عوام تو کیا اس دور کے خواصِ امت تک میں اس کا پایا جانا مشکل ہے۔ صدرِ محترم کے

---

[1] وقت کے صدر محمد ایوب خاں کی تصنیف جس کا اردو ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

خیال میں ایسے اجماع سے جمہوری قدروں کی پامالی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قانون و شریعت پر علماء یا دینی علوم سے وابستہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ناجائز سمجھتے ہیں اور زمانۂ جدید میں اجماع کا مصداق قانون ساز اداروں کی رائے ہی کو قرار دیتے ہیں۔

ملائیت یا پاپائیت نہیں | حالانکہ ظاہر ہے کہ اسلام میں "علماء اور ملا" کسی خاص رنگ و نسل یا کسی مخصوص پیشہ یا کسی خاص قوم و نسب سے نسبت رکھنے والی جماعت کا نام نہیں، نہ اسلام میں اس پاپائیت اور برہمنیت کی گنجائش ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سے جو بھی چاہے بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و پیشہ، کتاب و سنت اور اسلامی علوم کا صحیح علم و فہم حاصل کر کے عالم بن کر منصب وراثت نبوت پر فائز ہو سکتا ہے۔ رنگ و نسل کا امتیاز تو کیا دین کی ترجمانی کا یہ منصب جلیل مسلمانوں کی عورتوں اور غلاموں تک کو نصیب ہو سکتا ہے۔ تو پھر اصل معاملہ "ملا" کی اجارہ داری کا کب رہ جاتا ہے۔؟ اس صورت میں اگر ہم "ملا" کا نام لے کر دین کی اجارہ داری اور تعبیر و ترجمانی میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہیں تو درحقیقت ہم تشریع اور قانون سازی کے لئے کتاب و سنت کی بالادستی اور اجارہ داری کے روادار نہیں ہوں گے۔

جمہور کی رائے اور جمہوریت کی کہاں تک اہمیت ہے | بیشک اسلام نے جمہور امت اور مسلمانوں کے عمومی پسند اور انتخاب کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اجماع، استحسان، عرف اور تعامل امت کے نام سے اسلامی قانون کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ جمہور کا کوئی فیصلہ نہ تو کتاب و سنت اور خدا اور رسول کی مرضی اور دین کے عمومی مزاج سے متصادم ہو اور نہ کسی چیز کو اپنانے میں خواہش پرستی، نفس پروری اور دین سے گریز کا داعیہ شامل ہو۔

اجارہ داری نہیں مگر اہلیت شرط ہے | جمہوریت کے نام سے دین اور شریعت میں عوام

کو اس طرح کی آزاد قانون سازی کا حق دینا بالکل ہی ایسا ہے کہ ہم ملک کی تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں میں کسی انجنیئر کی رائے اور قابلیت سے استفادہ کی بجائے عام لوگوں کو جنہیں انجنیئرنگ کی معمولی شد بد بھی نہ ہو سارا کام سپرد کر دیں۔ کسی قابلیت اور صلاحیت کے بغیر عوام کو تربیلہ اور منگلہ جیسے بھاری بھرکم منصوبوں کی تعمیر و تشکیل کا کام سپرد کر دینا جمہوریت پروری نہیں بلکہ جمہور اور جمہوری اقدار سے دشمنی ہوگی۔ اسی طرح ڈاکٹری اور میڈیکل کو لیجئے، لوگوں کی صحت، بیماری اور خصوصاً اجسامِ انسانی کی چیر پھاڑ جیسا نازک کام عوام کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ملک کے ہر شخص کو جاں بلب مریضوں کے اپریشن کا حق اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ اسے منع کرنا جمہوریت کی پائمالی ہوگی؟ نہیں! بلکہ سرجری کا نازک ترین کام وہی شخص انجام دے سکے گا جسے مطلوبہ قابلیت تعلیم، ڈگری اور تجربہ پورے طور پر حاصل ہو۔ اور کیا ملک کے ہر شہری کو خواہ وہ مروجہ عدالتی قوانین اور عدالتی نظام سے معمولی آگاہی بھی نہ رکھتا ہو یہ حق دیا جا سکے گا کہ وہ چیف جسٹس یا پورے عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج دے سکے، یا قتل جیسے مقدموں کا فیصلہ کرتا پھرے، یا اسے وکالت کا اختیار دیا جائے ـــــ پس ظاہر ہے کہ جب دنیاوی علوم میں اس قسم کی اجارہ داری کو ہم حق تلفی قرار نہیں دے سکتے تو دین، شریعت، اور زندگی پر لاگو ہونے والے قوانین کے لئے مخصوص شرائط، قیود ات اور خاص قسم کی قابلیت اور اہلیت کے التزام کو کیوں جمہوری اقدار کی خلاف ورزی سمجھا جائے؟

اجتہاد اور اجماع | پس بلاشبہ شریعت نے ہر کس و ناکس کو نہ تو اجتہاد کا حق دیا ہے نہ شخصی رائے پر اٹھائے گئے آزاد اجماع کو وہ دین کا اصل قرار دیتا ہے۔ بلکہ اجماع ایسے لوگوں کا ہی معتبر ہوگا جو خدا ترسی، تقویٰ، خشیت، فراستِ ایمانی، بصیرتِ دینی، جذبۂ خیر خواہی و حق گوئی جیسی صفات سے مالا مال ہوں، علمی اور فنی لحاظ سے ہر طرح کامل مکمل جامع اور

عنصری شخصیتیں ہوں۔ ان کا کوئی فیصلہ تعصب، تحزب عناد، جہل، خود غرضی اور خواہشات نفسانی پر مبنی نہ ہو اور پھر ان کے فیصلوں کے لئے اللہ، رسولؐ اور عہدِ صحابہؓ و تابعین سے کوئی قوی سند بھی موجود ہو۔۔۔ ایسے ہی لوگ اجتہاد و استنباط کے اہل ہوں گے اور ایسے ہی تمام بزرگوں کا اتفاق "اجماع" قرار پائے گا۔ ممکن تھا کہ آج بھی ان شرائط اور قابلیتوں کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ کھولا جا سکتا۔ مگر افسوس! کہ واقعاتی دنیا میں صدیاں ہوئیں وہ کنجی گم ہو چکی ہے جسے لے کر ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ، احمد بن حنبل اور مالک رحمہم اللہ تعالےٰ جیسے اساطینِ علم و فضل یہ دروازہ کھولا کرتے تھے۔ ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

خلاصۂ بحث | بہر تقدیر اسلام کی نظر میں اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ اور اصل مقام کتاب و سنت اور اس سے مستنبط احکام و اصول کا ہے۔ اگر امت کی اکثریت یا مسلمانوں کی منتخب کردہ کوئی پارلیمنٹ کسی غیر شرعی فیصلہ یا کسی گمراہی پر متفق ہو بھی جائے تب بھی امت میں ایک مضبوط جماعت ہمیشہ ایسی پائی جائے گی جو اس "اجماع ضلالت" کی نہ صرف مخالفت بلکہ حق کی اعلان و اشاعت کرتی رہے گی۔ مجموعی امت گمراہی پر حسبِ بشارتِ نبویؐ (لا تجتمع امتی علی الضلالۃ) ہرگز متفق نہیں ہو سکتی، بنا بریں نہ تو مرکزِ ملت یا قوتِ حاکمہ کو اطاعتِ رسولؐ سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہم یورپ کے اسلام دشمن یہود و نصاریٰ سے درآمد شدہ نظریات کو سنتِ جاریہ کہہ سکتے ہیں اور نہ زنا بالرضا جیسے صریح ناحشہ کو قانونی حیثیت دینے پر اتفاق کرنے والی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو "اجماع" قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ جس طرح دیگر دینی اصطلاحات، صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ قربانی وغیرہ کا ایک خاص شرعی مفہوم ہے۔ جسے نہ تو بدلا جا سکتا ہے۔ نہ ان میں "توسیع" اور ترمیم ہو سکتی ہے اور جس طرح "کتاب" سے مراد وہی قرآن ہوگا جسے امت اب تک متواتر آسمانی صحیفہ

مانتی چلی آ رہی ہے۔ اسی طرح سنت، اجماع، اور اجتہاد کے وہی معنی قابلِ قبول ہوں گے جو عہدِ صحابہؓ سے لے کر اب تک متواتر چلے آ رہے ہیں اور جس طرح کتاب، وحی، نبوت، رسالت وغیرہ الفاظ کے شرعی مفہومات قطعی اور اس میں تحریف و تبدیل اور ظلی بروزی کی تفریق الحاد، کفر اور زندقہ ہے، اسی طرح اسلام کے اصول اربعہ کتاب و سنت، اجماع و اجتہاد کو اپنے اصل معانی سے الگ کرنا اور اسے اپنے من مانی معانی پہنانا تحریف فی الدین اور دین سے تلاعب اور سنداق ہی سمجھا جائے گا، جسے امت کا عمومی دینی مزاج قیامت تک برداشت نہیں کرے گا۔

فتنۂ انکارِ حدیث

شریعتِ مقدسہ کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی عظمت و ہمہ گیر جامعیت کو کم کرنے کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ سر اٹھاتا رہتا ہے کوئی ختم نبوت پر ڈاکہ ڈال کر نبی بننے کی ناپاک کوشش کرتا ہے تو کوئی قرآن فہمی کی آڑ میں وحی غیر متلو حدیث وسنت کی حُجیت کا انکار کر بیٹھتا ہے، عصر حاضر کے اس فتنہ (انکارِ حدیث) کا سرخیل غلام احمد پرویز تھا، بعض دانشور اور اہلِ قلم بھی پرویز کی "قرآن فہمی" سے متاثر ہوئے۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ نے دینی فریضہ سمجھتے ہوئے دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ "الحق" میں اس فتنہ کا بھرپور تعاقب کیا۔ ذیل کی یہ تحریر بھی "الحق" میں کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی تھی جس کی اہمیت و جامعیت کے پیشِ نظر افادۂ عام کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جارہا ہے۔

(مُرتب)

منکرینِ حدیث کی بے جا وکالت

ملک کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی جناب شورش کاشمیری کو یکایک کیا سوجھی کہ ۱۳ر مئی کے چٹان میں انہوں نے اس ملک میں فتنۂ انکار حدیث کے سرغنہ جناب غلام احمد پرویز کی مدح سرائی اور وکالت کا بیڑا اٹھایا اور اس زور و شور سے کہ پرویز کو افکارِ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلہ کی آواز اور قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت قرار دیتے ہوئے انہیں بارگاہ رسالت کی سرخروئی اور فضلائے امت کی صف میں جگہ پانے کی "بشارتیں" بھی دیں مزید کہا کہ جو کام ساری امت کے علماء کے بس کا نہ تھا۔ پرویز نے وہ کر دکھایا اور اسلام کے دامن سے عجمی گرد جھاڑ دی۔ پرویز کی ایک کتاب کا صرف ایک باب پڑھ کر انہوں نے ان کے بارہ میں ایک "خوشگوار تبدیلی" محسوس

کی اور پھر اس کے نتیجہ میں امت کے تمام مکاتیب فکر کے ہزاروں علماء، مشائخ، اصحاب علم و تقویٰ اور ارباب تحقیق و فتویٰ کو مشورہ دیا کہ اب چونکہ اصل حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی اس لئے تمام علماء کو چاہیئے کہ وہ پرویز کے خلاف فتویٰ واپس لے لیں"۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ اسلام کے بارہ میں شورش صاحب پر یہ چودہ طبق کتاب کا صرف چودھواں باب پڑھ کر روشن ہو گئے معلوم نہیں ساری کتاب پڑھنے کے بعد معاملہ کہاں تک جا پہنچتا۔

جہاں تک شورش صاحب کا تعلق ہے ان سے بے شمار اختلافات اور آئے دن ان کے سیاسی اور غیر سیاسی مؤقف میں تبدیلیوں کے باوجود ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو شورش کی جرأت و ہمت اور بالخصوص قادیانیوں کے بارہ میں ان کے مومنانہ جہاد اور جرأت مندانہ کردار کی وجہ سے اپنے دل میں ان کے لئے محبت اور تحسین کے جذبات پاتے ہیں اور ملک کے لاکھوں اہل علم اور دینی حلقے اس جذبہ حمیت کی وجہ سے ان "سیئات" سے درگزر کئے ہوئے ان کے حسنات کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ یہ رائے شورش صاحب نے ایک ایسے شخص کی ایک کتاب کے کچھ حصے پڑھ کر قائم کی جو صرف مشتبہ و مشکوک نہیں بلکہ اساطین امت تمام اجلہ علماء کے ہاں کافر اور مرتد ہے اور ایسے لوگوں کے تمام نظریات اور مخصوص آراء سے صرف نظر کر کے کسی ایک کتاب کی اچھائی سے رائے تبدیل نہیں کی جاتی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی یا ایسی ہمہ دجل و تلبیس قرآن و سنت میں تحریفات نبوت سے بغاوت کے باوجود اس کی دو ایک ایسی کتابوں کو پڑھ کر کل کوئی تمام امت کو اس کے بارہ میں اپنا موقف بدلنے کا مشورہ دے اور ان کے چند ایسے قصائد اور اشعار یا مضامین اور کتابچوں کو پڑھ کر اسے اسلام اور خاتم النبیینؐ کا مجاہد و فادار قرار دے جس میں عشق رسولؐ اور محبت اسلام کا اظہار کیا گیا ہے، تو کیا شورش صاحب کسی کو ایسا کرنے کا حق دے سکیں گے۔

الغرض شورش صاحب کی خدمات اور جذبات کتنے ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں منکرین حدیث

کی اس زور و شور سے یہ ترجمانی ایک ایسی بات نہیں کہ اہل علم کیا کوئی مسلمان بھی اس سے صرف نظر کر سکے اس لئے کہ یہ بالواسطہ دین کے قطعی اور طے شدہ مسلمات میں دست اندازی اور خود اپنے ہاتھوں اس ناموس نبوت کو تار تار کرنے کی ظالمانہ جسارت ہے جس کی حفاظت اور اس کی خاطر شورش صاحب سر دھڑ کی بازی لگانے کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی اور "خوشگوار انقلاب" میں مسلمانوں کا نہیں خود آغا صاحب کا ضیاع دین و ایمان ہے۔ اس لئے ہم ان سے خیر خواہی جذبۂ نصیحت۔ اور دینی مسئولیت کی بنا پر یہ التجا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ دین ———— اور عقیدے کی دنیا میں خدا کی زبان میں اس بڑھیا جیسا نہ بنیں جو اپنے ہی ہاتھوں اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا۔

دین و عقیدہ کی راہ میں ہر اچھی بری وادی میں بھٹکتے رہنا ان شعراء کی تو جبلت ہے جنہیں اللہ نے ایمان اور عشق رسولؐ کی دولت سے محروم کیا ہوتا ہے مگر شورش صاحب تو ختم نبوت کے دفاع میں حسانی رنگ لئے ہوئے ہیں تو یہ کتنی بدقسمتی اور حسرت کی بات ہو گی کہ وہ یکایک والشعراء یتبعهم الغاوٗن الم تر انهم فی کل واد یهیمون ویقولون مالا یفعلون ——— کا مصداق بن جائیں۔

دینی مسئولیت اور معاملہ کی سنگینی کا احساس نہ ہوتا تو ہم اس معاملہ میں سکوت اختیار کرتے اس لئے کہ شورش صاحب کا قادیانیوں سے عین حالت جنگ میں، اپنے آپ سے ملک کے تمام دینی و علمی طبقوں اور ناموس رسالت سے سرشار مسلمانوں کو ناراض کرنا ان کے حق میں بھی مفید نہ تھا اور شماتت اعداد کا بھی ذریعہ تھا۔ مگر افسوس یہ سامان انہوں نے خود فراہم کیا اور قادیانیت سے برسرپیکار تلوار بہت سوں کی نظروں میں کند اور غیر موثر ہو گئی اور آج وہ الحق بھی بدقسمتی سے شورش کے اس نئے موقف پر ملامت کئے بغیر نہیں رہ سکتا جسے مرزائی تعاقب و استیصال کی وجہ سے قادیانی پریس چٹان کا ہم سفر قرار دے رہا ہے اور الحق قادیانی رسائل و مجلات کے سب و شتم برداشت کرنے میں چٹان کا برابر کا شریک ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث | لیکن اس تلخ فریضہ کی ادائیگی بہرحال ان تمام دینی وعلمی افراد کا دینی تقاضا ہے جو انکارِ حدیث اور اس فتنہ کے سربراہ غلام احمد پرویز کی حقیقت سمجھ کر اسے اتنا ہی ناموس رسالت اور اسلام کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں جتنا کہ یہ لوگ خود شورش صاحب ایک دوسرے غلام احمد کے قادیانی فتنہ کو اسلام کے لئے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں، اس لئے کہ نبوت کے مقام ومنصب سے بغاوت کے لحاظ سے انکارِ حدیث کی تاریخ محرکات دواعی اور عوامل پر نظر ڈالتے اور پاکستان میں اس فتنہ کے علمبردار پرویز کے پورے لٹریچر اور خیالات کو نگاہ میں رکھا ہوتا اور اسلام اور منصب نبوت، ورسالت کے تقاضوں اور حقیقت پر پرویزی فلسفہ فکر کو پرکھا ہوتا تو یہ حقیقت ان پر بھی منکشف ہوچکی ہوتی کہ یہ فتنہ اپنی فتنہ سامانیوں کے لحاظ سے اسلام کے لئے ان فتنوں سے کسی طرح کم نہیں جو تاریخ کے ہر دور میں اہل الحاد و زنادقہ نے اور پھر جھوٹے مدعیانِ نبوت نے منصبِ نبوت میں دجل وتلبیس کرکے اسلام کے خلاف کھڑے کئے۔

اور یہ ان تمام عجمی سازشوں سے بڑھ کر عجمی بلکہ یہودی سازش ہے جس کو اسلام کے رخِ زیبا سے بگاڑنے کا کریڈٹ، آج شورش صاحب پرویز کو دے رہے ہیں۔ برعکس نہند نام زنگی کافور عجمی سازشوں کی تاریخ اگر شورش کی نگاہ میں ہوتی تو انہیں اس تاریخ کے ہر صفحہ ہر سطر میں درپردہ انکارِ حدیث کی کافرانہ چالیں نظر آتیں۔ قرامطہ، باطنیہ، خوارج معتزلہ، مجسمہ، معطلہ، محرفینِ قرآن، منکرینِ صحابہؓ اور ایسے کتنے لوگ تھے جنہوں نے ہر دور میں سنت ہی کے خلاف شکوک وشبہات اٹھا کر اپنی اسلام دشمن سازشوں کے لئے زمین ہموار کی پھر اس زمین پر عقلیت اور عجمیت کفر والحاد، تشکیک اور زندقہ کا بیج بو دیا۔ یہ تو اسلامی لبادہ اوڑھ کر سنت اور حدیث کو نشانۂ تلبیس بنانے والوں کا حال تھا۔

فتنۂ استشراق | اسلام کے بدترین دشمن یہود ونصاریٰ جنہیں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد اپنے دینی عصبیت اور ملی حمیت اور اس سے بڑھ کر سیاسی استعماری اور سامراجی عزائم نے مجبور کردیا کہ وہ اسلام کے خلاف فیصلہ کن معرکہ کے لئے اپنی تدابیر اور منصوبے منظم کرلیں تو انہوں نے

مسلمانوں کے علمی وفکری محاذ پر سب سے اہم حربہ مستشرقین اور استشراق کے نام سے استعمال کیا جس کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام اور رسولؐ اسلام کے بارہ میں ہر اس چیز میں شک، بدظنی اور ریب وتذبذب پیدا کیا جائے جس کی نسبت کسی طرح بھی اسلام کی طرف ہو یا کسی درجہ میں بھی اسلام کی عزت وافتخار میں اضافہ کا ذریعہ ہو خواہ یہ چیز خود حضورؐ کی ذات اور ان کی سیرت تھی یا ان کی تعلیمات احادیث آثار واخبار اور مسلمانوں کے عملی واعتقادی نظام کے لئے سرچشمہ قانون وآئین تھا۔ خواہ وہ قرآن تھا یا حدیث، رسول اس مقصد کے لئے حضورؐ کی آئینی اور تشریعی حیثیت کو مجروح کرنا چاہا۔ سنت کے راویوں کی وہ مقدس جماعت جو طبقہ صحابہؓ میں کیوں شامل نہ تھی۔ انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا۔ راوی پر نکتہ چینی ہوئی۔ حدیث کے اوّلین مدوّنین کے کردار کو مشتبہ کیا گیا۔ چنانچہ مستشرقین کے سب سے بڑے گرو گولڈزیہر نے مستقل طور پر ابوہریرہؓ کی ذات اور حدیث کے مدون اوّل امام زہریؒ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی سعی نامشکور کی، اسلام کے قابل فخر مشاہیر کے خلاف پروپگنڈہ کا طوفان مستشرقین ہی نے اٹھایا۔ ایک پاکیزہ مثالی معاشرہ کی ایک بھیانک تصویر کھینچی۔

الغرض اسلام داعی اسلامؐ اور مسلمانوں سے جس چیز کو بھی کچھ نسبت تھی اسے مشق تحقیق بنا کر داغدار اور معیوب کرنا چاہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے بنیادی مصدر و مآخذ قانون وشریعت سنت اور حدیث کی تشریعی اور آئینی حیثیت کو خاص طور سے نشانہ بنایا۔ اسلام کے خلاف دسیسہ کاریوں اور اسلامی تحقیق کے پردے میں دجل وتلبیس کے اس میدان میں دشمنان اسلام کے ہاں — گولڈزیہر، مارگولیتھ، شاخت اور اس جیسے کئی آئمہ ضلال والحاد کے نام سنہری حروف میں لکھے گئے ہیں۔

منکرین حدیث کی ترجمانی کرتے والوں نے مستشرقین اور اعداء اسلام کے طویل المیعاد منظم علمی منصوبوں اور اس کے محرکات اور آراء وافکار کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح ان پر عیاں ہو جاتی کہ مرزائیت کی طرح فتنۂ انکار حدیث بھی سامراجی منصوبوں اور صیہونی سازشوں ہی کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ اپنے ہاں متجددین، روشن خیال، نام نہاد ترقی پسند اور منکرین حدیث کے انکار ونظریات کے سرچشموں کا صحیح کھوج لگاتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ اسلام کے

خلاف وہی قصے چاٹ چاٹ کر بھونکتے ہیں، جو سامراجی اور اشتراکی کتنے علمی تحقیق اور مشرق دوستی کے لبادہ میں پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں سے اگل رہے ہیں۔ یہ اپنے طور پر کچھ بھی نئی بات نہیں کرتے۔ یہ تو وہ سارنگی اور طنبورے ہیں جس کی ہر سُر کسی غیر کے ہاتھوں کی مرہون ہوتی ہے۔

انکارِ حدیث اور انکارِ ختمِ نبوّت میں باہمی مماثلث

حقیقت یہ ہے کہ انکارِ ختم نبوت ہو یا انکار حدیث، دونوں یکساں طور پر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے منصب و مقام نبوت اور ان کے لائے ہوئے دین و شریعت کے خلاف ایسی کھلی بغاوت ہیں کہ دونوں میں کسی طرح امتیاز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان وجوہ مماثلت پر ذرا بھی غور کیجیئے تو دونوں غلام احمد (پرویز اور مرزا ئے قادیان) ایک دوسرے کے ظل اور بروز معلوم ہوں گے ؎

وعدۂ وصل بجد لیست میان من و تو　　　که رقیب آمد و پرسید نشان من و تو

اور تناسخ والوں کی زبان میں ایسا معلوم ہوگا کہ قادیانی دجال کی بدبو دار روح پنجاب کے ویرانوں میں بھٹکی ہوئی اپنے ہی ایک ہم نام و ہموطن غلام احمد پرویز کے غلیظ قالب میں دوبارہ نمودار ہو گئی ــــــ آیئے ذرا دونوں کے درمیان ان وجوہ مشابہت کا کچھ جائزہ لیں۔

۱۔ مرزا غلام احمد نے حضورؐ اکرم کی نبوت اور اس کی تشریعی حیثیت کا زبانی اعتراف کرتے ہوئے بھی اپنے لئے تشریعی حیثیت کا دروازہ کھول دیا تو:-

غلام احمد پرویز نے حضورؐ کی تشریعی اور آئینی منصب پر تو ہاتھ صاف کر دیا مگر "مرکز ملت" اور مرکزی حکومت کے اطاعت کے نام سے ہر ایمی بری حکومت کو تشریع کا حق دے دیا اور یہ کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت، تابعداری اتباع، اقتداء اور تاسی۔ یہ تمام چیزیں رسول کی نہیں مرکز ملت کی اطاعت کا مطالبہ کرتی ہیں اور یہ کہ اولوا الامر سے افسران بالا مراد ہیں۔

۲۔ غلام احمد قادیانی نے ختم نبوت کو خود ساختہ عجیب و غریب معانی پہنائے اور ظلی اور

بروزی گورکھ دھندوں میں ایک قطعی واضح اور بدیہی حقیقت کو عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی طرح ایک معمہ بنا دیا۔ غلام احمد پرویز نے رسالت محمدیہ ماننے کا تو دعویٰ کیا، مگر حیثیت خاکش بدہن صرف ایک ڈاکیہ کی تسلیم کی اور ختم نبوت کا صاف الفاظ میں یہ مطلب لیا کہ اب انسانوں کو اپنے فیصلے آپ ہی کرنے ہوں گے اور یہ کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں تصورات اور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھوں میں ہوا کرے گی ۔۔۔ دیکھئے سلیم کے نام پرویز کا خط ۱۵، صفحہ ۲۵۰ (گویا یہ تصورات اشتراکی اور لادینی کیوں نہ ہوں اور نظام کارل مارکس اور لینن کا کیوں نہ ہو سب کچھ ختم نبوت کے کھاتے میں جائے گا۔

۳۔ غلام احمد مرزا اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جھوٹی نبوت کے اثبات کے لئے خود قرآن اور حضورؐ کی ذات کا سہارا لیا تو:۔

غلام احمد پرویز اور دیگر منکرین حدیث نے کتاب اللہ اور قرآن کی آڑ لے کر قرآن اور سنت اور خدا اور رسولؐ کا باہمی تعلق کاٹنے کی سعی کی اور قرآن ہی کو اس سلسلہ میں اپنا حربہ بنایا۔

۴۔ غلام احمد متنبی نے نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کر کے مسلمانوں کی ایک قطعی اجماعی عقیدہ میں رخنہ اندازی کی اور اسے ملت کا شیرازہ اتحاد بکھیرنے کا ذریعہ بنایا تو:۔

غلام احمد پرویز نے سنت کی آئینی حیثیت سے انکار کر کے ایک ایسے متفقہ صریح اجماعی مسئلہ میں دخل اندازی کرنا چاہی جو ختم نبوت کی طرح عہد صحابہ سے لے کر آج تک پوری امت کے ہاں طے شدہ مسلمات میں سے تھا۔

۵۔ غلام احمد قادیانی اور اس کا ٹولہ اپنے نبی کے لئے راستہ صاف کرنے کی خاطر انبیاء کی عیب جوئی اور طعن و تشنیع سے نہ چوکا۔ یہاں تک کہ رسول عربیؐ کی ذات میں نقص نکالنے سے بھی گریز نہ ہوا تو غلام احمد پرویز اور اس کے ہمنوا بھی اپنے نظام اجتماعی اور مرکز ملت کا راستہ

نکال لینے کی خاطر سنت رسول میں عیب جینی کرنے لگے۔

۶۔ غلام احمد قادیانی نے نئے امر ونہی پر مبنی شریعت کا علم اٹھایا اور پچھلے سارے دین پر خط نسخ کھینچنا چاہا یا خود کو اس میں ہر طرح تبدیلی کا مجاز ٹھہرایا تو :۔

غلام احمد پرویز نے کہا کہ قرآن کے تمام احکام وراثت فرضہ، لین دین، صدقات، زکوٰۃ وغیرہ سب عبوری دور سے متعلق ہیں۔ (نظام ربوبیت از پرویز صہ ۲۵، صہ ۱۶۷ وغیرہ) اور یہ کہ مرکز ملت کو اختیار ہے کہ وہ عبادات، نماز روزہ، معاملات اخلاق غرض جس چیز میں چاہے رد وبدل کر دے (مقام حدیث، ج ۱ ص ۱۹۳ ص ۹۲ ،۹۳) جبکہ عبادات پر اتنی ڈھٹائی سے ان کے پیش رو مرزا نے بھی چھرا نہیں چلایا تھا۔

۷۔ متنبی کذاب مرزا قادیانی نے شریعت کی تمام اصطلاحات کو تحریف کا نشانہ بنایا تو غلام احمد پرویز نے امت کے متفقہ ومسلمہ مصطلحات شریعت کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے من گھڑت مفہوم ومطالب پڑھائے اور ان کے ہاں آخرت سے مراد مستقبل ہے۔ (سلیم کے نام ج ۲ ص ۱۴۲) جنت ودوزخ مقامات نہیں انسانی کیفیات ہیں (لغات القرآن از پرویز ج ۱ ص ۴۴۹) فرشتے نفسانی محرکات ہیں اور ایمان بالملائکہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ قوتیں انسان کے آگے جھکی رہنی چاہییں۔ (ابلیس وآدم از پرویز صہ ۱۹۵ لغات القرآن ج ۱ صہ ۲۴۴)

جبرئیل انکشاف حقیقت کی روشنی کو کہتے ہیں۔ (ابلیس وآدم صہ ۳۸۲) آدم کسی وجود شخصی کا نہیں بنی نوع انسانی کا نام ہے۔ اور یہ کہ انسانی پیدائش ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق ہوئی ہے (لغات ج ۱ صہ ۲۱۳) نماز سے مراد نظام ربوبیت ہے (نظام ربوبیت صہ ۸۷) زکوٰۃ، صدقات واجبہ کا مطلب ٹیکس ہے۔ (قرآنی فیصلے صہ ۳۷، صہ ۱۲) ثواب اور وزن اعمال کا عقیدہ ایک افیون ہے۔ (قرآنی فیصلے صہ ۶۷)

تقدیر کا عقیدہ مجوسیوں کا داخل کیا ہوا ہے (صہ ۱۹) صدقہ فطر ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ حج بین الملی کانفرنس اور قربانی صرف اس کانفرنس کے لیے راشن مہیا کرنے کا انتظام ہے۔

تلاوت قرآن جادو منتر کے دور کی نشانی ہے ۔ (دیکھئے لغات القرآن رسالہ قربانی، قرآنی فیصلے وغیرہ)

۸۔ غلام احمد قادیانی نے اپنے متبعین کے علاوہ سارے مسلمانوں کی تکفیر کی۔

غلام احمد پرویز نے کہا کہ اس وقت دین کے ہر گوشے میں تحریف ہو چکی ہے ۔ (قرآنی فیصلے صلاح) اور اب قرآن کے رو سے سارے مسلمان کافر ہو چکے ہیں۔ (سلیم کے نام خط، ۳۲ ج ۳ ص ۱۹۸ تا ص ۱۹۹) موجودہ مسلمان تو یہ ہمو سماجی مسلمان ہیں۔ (سلیم کے نام خط ج ۲ ص ۱۸، ۱۵)

۹۔ غلام احمد قادیانی کی نئی شریعت میں حلال بھی ہے، حرام بھی یعنی یہ حق اسے حاصل ہے کہ جسے چاہے حلال کہہ دے جسے چاہے حرام ۔ غلام احمد پرویز کی نگاہ میں بھی حلال وحرام کی جو طولانی فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کے خود ساختہ ہیں اور پرویزی شریعت میں صرف چار چیزیں حرام ہیں۔ (طلوع اسلام مئی ۵۲ء ص ۶۹)

۱۰۔ غلام محمد کی وحی اور الہام — "بیں ولد بیں" قسم کے ہذیانات سے بھرپور ہے تو غلام احمد پرویز کے تفسیری نکات میں آپ کو ویٹلونک عن المحیض ۔ کا مطلب سرمایہ دارانہ معاشی نظام جیسے قرآن دانی جیسے شاہکار ملیں گے ۔ تلك عشرة كاملة ۔

اس وقت ہم صفحات کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ان چند مثالوں سے دونوں کی باہمی مماثلت ومشابہت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منکرین حدیث کی وکالت کرنے والوں بالخصوص شورش صاحب سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسا جذبہ ناموس رسالت اور حمیت دینی ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ایک غلام احمد کے بارے میں تو آپ کی رائے بالکل صحیح رخ اختیار کرتی ہے مگر دوسرے میں آپ کو حسین رضؓ کی مظلومیت اور فضلائے امت کی عبقریت نظر آنے لگتی ہے۔

جہاں تک کسی حدیث کا بظاہر قرآن سے مخالفت یا آئمہ حدیث امام بخاری و مسلم وغیرہ کا لاکھوں حدیث سے چند ہزار کا انتخاب اور اس جیسی دیگر باتوں کا تعلق ہے تو نہ صرف یہ بلکہ حدیث کی جمع تدوین کتابت وغیرہ اور اس سے متعلقہ تمام مباحث اس حد تک علماء

امت کے ذریعہ منقح ہو چکے ہیں کہ اس پر مزید اضافہ ممکن نہیں۔ علم و تحقیق کی یہ باتیں شورش صاحب نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہے اور اگر خواہ مخواہ شوق سخن ہے تو علما ءان سب کا نہایت بسط و تفصیل سے صدیوں قبل فیصلہ کر چکے ہیں۔ ایک نظر اس پر ڈال کر اس میں اتریں اسلامی لٹریچر میں اب حجیت حدیث ایک مستقل علم بن چکا ہے اور ہندی نژاد پرویز تو کیا یورپ کے مستشرقین تک کے چھکے چھڑا دیئے گئے ہیں۔

اصولی طور پر شورش صاحب پرویز کا نبی کریم کے مقام و منصب اور تشریعی حیثیت کے بارہ میں یہ لاگ لگی لپٹی کہے بغیر خیالات معلوم کر لیں اس کے بعد معاملہ صاف ہو جائے گا۔

رسول کا تشریعی منصب قرآن تو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بار بار رسول کی ان تمام حیثیتوں کو متعین کرا رہا ہے۔ یہاں ہم اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

- رسول بحیثیت معلم و مربی۔ (بقرہ آیت ۱۲۹۔۱۵۱ آل عمران ۱۶۴ وغیرہ)
- رسول کتاب اللہ کا شارح ہے۔ وہ قرآن کی تبیین پر مامور ہے (نحل آیت ۴۴)
- رسول پوری امت کے لئے پیشوا مقتدا نمونہ، اسوہ اور واجب الاتباع ہیں (آل عمران آیت ۳۱، ۱۳۲)
- رسول خدا کی طرح شارع (LEGISLATOR) ہیں۔ (اعراف آیت ۱۵۷، حشر آیت ۷)
- رسول قاضی اور فیصلہ کن اتھارٹی ہیں۔ (النساء ۱۰۵، الشوریٰ ۱۵، النور ۵۱، النساء ۶۵)
- رسول اکرم نبی ہی کی حیثیت سے اللہ کے مقرر شدہ حاکم اور فرمانروا ہیں۔ (النساء ۶۴، ۵۹، ۸۰ الفتح ۱۰، محمد ۳۰)

الغرض سنت اور اہل سنت کے بارے میں پرویز کا اصولی موقف کیا ہے جس کے مآخذ و مصدر قانون ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے اور جس کی اتباع و اطاعت ایمان کی اولین شرط ہے

اس بارہ میں امت کے واضح اور اجماعی طرز عمل قرآن کریم کی صریح ہدایات نبی کریم کے کھلے ارشادات کے ہوتے ہوئے کسی منکر حدیث کے بارے میں شورش صاحب کس منصب کے زعم میں یہ

حق رکھتے ہیں کہ ہر مکتب فکر کے اجماعی فتویٰ کو واپس لینے کا مشورہ دے سکیں جبکہ یہ حق امت کے کسی بڑے سے بڑے عالم اور رہنما کو بھی حاصل نہیں تو پھر کیا شورش صاحب اخلاص وخیر خواہی پر مبنی ان معروضات پر غور کرتے ہوئے اپنے نئے خوشگوار موقف پر نظر ثانی فرماویں گے۔ خدا کرے وہ اپنی جذباتی طبیعت پر مبنی اس موقف سے جلد ہی رجوع فرمالیں۔ (جمادی الاول ۹۴ھ)

✡

فتنۂ تجدّد والحاد

تجدّد و اصلاح کے نعروں کی اصل حقیقت

حکومتی سرپرستی میں جب بھی اسلامی تعلیمات میں دین کے عنوان سے رد و بدل کرنے کی کوشش کی گئی تو دین کا درد رکھنے والے اہل علم حضرات نے اُس فتنہ کا بھرپور تعاقب کیا اور اس کی اصلیت لوگوں پر واضح کی۔ ملکِ عزیز پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ایوب خان کی سرپرستی میں تجدد اور الحاد کا فتنہ تحقیق اور ریسرچ کے نام پر بڑے زور وشور سے شروع ہوا اور اسلام میں تحریف کرکے اسے "جدید اسلام" کے طور پر عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس موقعہ پر دیگر علماء حق کی طرح حضرت مولانا سمیع الحق صاحب نے بھی اس فتنے کے خلاف قلم اٹھایا اور اس کی حقیقت کو واضح کیا۔ تاریخ ہند کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل فرمانرواؤں میں سے اکبر بادشاہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب نے صدر ایوب خان کی کوکھ سے جنم لینے والے اس فتنہ کے تعاقب کے ساتھ ساتھ اکبر کے الٰہی دین کو بھی اپنے ایک مضمون میں وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جسے ماہنامہ الحق نے "اکبر دی گریٹ" کے عنوان سے شائع بھی کیا۔ اب اس مضمون کو افادۂ عام کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

اکبر دی گریٹ کا ماڈرن اسلام

اکبریت کا نیا روپ

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ قافلہ اسلام منزل بہ منزل کو بہ کو عہد سعادت نبوت سے لیکر اب تک رواں دواں ہے۔ اسلام کی وہ نعمت جو حضور سرور کائنات صلوات اللہ علیہ نے اپنی امت کے سپرد کی۔ اسلاف نے اس امانت کو جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر اسے سینے سے لگائے رکھا اور ہم تک پہنچایا۔ ہدایت و فلاح کا یہ کبریت احمر آج بھی اپنے اصلی خدوخال میں موجود ہے۔ اسلاف کی اس امانت کی حفاظت کے لئے کیا کچھ کرنا پڑا؟ یہ داستان کچھ عجیب وغریب ہے۔ ہماری تاریخ جو دعوت وعزیمت اور جہاد و قربانی کی ایک داستان مسلسل ہے، اس سے بھری پڑی ہے۔ ارباب اخلاص ووفا کو کبھی اس راہ میں آگ اور خون سے گزرنا پڑا تو کبھی صرصر وسموم کی تند و تیز لہروں کا سامنا کرنا پڑا، جو اللہ تعالیٰ کی اس روشنی کو بجھانے کے لئے اٹھتے رہے۔ بارہا الحاد و زندقہ کی تاریکیوں نے دین متین کے رخ زیبا کو چھپانے کی سعی کی۔ کفر اور گمراہی کے ظالم ہاتھوں نے خدا کی اس رسی کو کاٹنا چاہا۔ مگر یہ اسلام کی سخت جانی تھی اور وعدہ خداوندی حفاظت دین کا ظہور کہ ان ہی ظلمتوں سے روشنی کی کرن نمودار ہو جاتی۔ ظلمت اور اندھیرے چھٹ جاتے۔ اسلام کا آفتاب منیر آج بھی دمک رہا ہے۔ نجات کا راستہ اب بھی ایسا ہی صاف اور کھلا ہے جیسا کہ اولین عہد سعادت میں رہا۔ (المحجة البيضاء ليلها كنهارها)

دین کی عزت کا عبرتناک زمانہ

اس سرزمین (برصغیر پاک و ہند) میں اسلام اور مسلمانوں پر نازک سے نازک گھڑی دسویں صدی ہجری کے مغل تاجدار

سلطان جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ) کے عہد میں ہوئی۔ یہ پچاس سالہ "اکبر عہد" دین کی عزت اہل دین کی بے کسی اور شعائر اسلام کی تباہی اور بربادی کا عبرتناک زمانہ ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اگر عہد اکبری کی اس داستان سرائی میں دین اور دینی اقدار کو مٹانے والوں کے لئے کچھ سبق ہے تو رجال دین کے لئے نصیحت اور تسلی کا سامان بھی کہ رحمت خداوندی کا ظہور مایوسیوں کے حد کمال تک پہنچنے میں ہوتا ہے اور یہ کہ دین متین کو دبایا نہیں جا سکتا۔ نہ اس کی حفاظت توپ و تفنگ ہمہ گیر تحریکات منظم پروگرام اور جماعتوں کی رہین منت ہے ـــــ آج کی فرصت میں ہم اکبر کے "دین الہٰی" کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے اکبر کے خدوخال پر کچھ روشنی پڑ سکے

بے دینوں کے سب بے دین ترجمان | اور اسلام کے بارہ میں ان لوگوں کے عزائم باطنی کا بھی اندازہ لگایا جا سکے جو اس وقت مغل امپائر کے اس "طاغوت اکبر" کا نام بطور آئیڈیل پیش کرتے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ:

"اکبر بادشاہ اور اس کے عہد کے علماء کے درمیان مناقشات رونما ہونے کی بنیادی وجہ مذہبی جذبات کی بنا پر علماء کا اپنے آپ کو طاقتور بنانا تھا، جو مذہب کی آڑ سے کر ہر معاملے میں اس لئے دخل دینا چاہتے تھے کہ ان کا رسوخ بڑھ سکے۔ حکومت ان سے مرعوب ہو اور وہ حقیقی معنوں میں پشت پناہ تخت بن جائیں۔ علماء کے اس "ہوس اقتدار" کی تائید میں خود اکبر کا یہ قول بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ علماء می خواہند کہ فرمانروائی و کارگزاری شریک پادشاہی باشد (علماء چاہتے ہیں کہ فرمانروائی اور حکومت میں ہمارے شریک ہو جائیں ـــــ" (فکر و نظر ص ۴۶۴ ج ۴ اسلام آباد)

گویا کھلے بندوں اکبر کو حق بجانب قرار دے کر اہل حق کی ان سرفروشیوں اور قربانیوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، جس کا مظاہرہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقیؒ اور ان کے

ہمنوا علماء حق نے احیائے دین اور اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے لئے کیا ۔ عہد اکبری کی اس سیاہ تصویر سے ان لوگوں کے نظریات و عزائم کا بھانڈا بھی پھوٹ جائے گا کہ یہ لوگ کبھی اکبر اور کبھی مصطفے اکمال کا نام لے کر یہاں کس قسم کے اسلام کو زندہ کرنے کے آرزومند ہیں ۔ وہ کیا حالات تھے جس نے علماء حق اور اہل حق کو تڑپا کر انہیں اکبر اور اس کے لادینی نظریات کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا ۔ ؟ کیا دعوت و عزیمت تجدید و احیائے دین کے میدان میں ان کی سرفروشی اور جان نثاری اللہ تعالیٰ کی "سنت ماضیہ" اور "عادت جاریہ" کا ظہور تھا یا اقتدار کی ہوس عہد اکبری کے یہ سیاہ تصویر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے ۔ ہم نے اپنے مضمون میں عہد اکبری کے ایک نہایت ثقہ دیندار عالم بے لاگ اور مستند مورخ ملا عبد القادر بدایوانی (م ۱۰۱۰ھ) کی ان چشم دید معلومات کو بنیاد بنایا ہے ۔ جو انہوں نے "حلفیہ شہادت" کے بعد اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں جمع کر دیئے ہیں جسے ہمارے زمانہ کے ایک مایہ ناز محقق عالم مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے مذکورہ کتاب کے چار سو صفحات سے تلاش کر کے اپنے مقالہ "الف ثانی" کا تجدیدی کارنامہ" میں سمیٹ دیا ہے ۔ منتخب التواریخ کے حوالوں کے بارہ میں ہمارا اعتماد مولانا مرحوم کے مضمون پر ہے منتخب کے علاوہ عہد اکبری کے یہ سیاہ نقوش ، دبستان مذاہب اور خود اکبر کے فرزند جہانگیر کی تزک جہانگیری میں بھی پائے جاتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی جیسے معتمد ثقہ ، امین امام جلیل کے مکتوبات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے ۔

آئندہ تفصیل سے معلوم ہو گا کہ ایک سوچے سمجھے پروگرام اور تدریجی رفتار سے اکبری دین کو اس کے مقام ارتقا تک پہنچایا گیا اور اجتہاد ، امامت و تشریح اور قانون سازی کے مناصب سے گزرتے ہوئے بالآخر اکبر اس مقام تک پہنچا جہاں سے امامت و نبوت تو کیا معاذ اللہ الوہیت تک رسائی ہو جاتی ہے ۔

منصب اجتہاد | سب سے پہلے اکبر نے منصب اجتہاد" کو سرفرازی بخشی ۔ ملا مبارک ناگوری اور ان کے دونوں بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے ایک محضر نامہ مرتب کیا جس میں اکبر کو

اجتہاد اور دینی مسائل ہیں بتی آ ام کی معاشی اور دینوی پہلوؤں کے مدنظر کسی ایک پہلو کو ترجیح اور اور دوسرے کو ساقط کرنے کا حق دیا گیا اور یہ کہ عوام پر ان "فیصلوں" اور "احکام" کی پابندی لازمی اور اس کی مخالفت دنیوی اور دینی بربادی کا موجب ہوگی۔ اس محضر نامہ میں بادشاہ کو گویا "مرکز ملت" قرار دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ خدا کے نزدیک سلطان کا درجہ مجتہد کے درجہ سے زیادہ ہے۔ (ملاحظہ ہو پورا محضر نامہ۔ منتخب التواریخ ص ۲۷۲)

سلف کی بے حرمتی | اکبر کے منصب اجتہاد پر فائز ہونے کے بعد ائمہ سلف اور مجتہدین امت کی برسرعام توہین و تحقیر کی جانے لگی۔ ان "بڑ فقیہ کو" خشک ملا اور رفتار زمانہ سے آنکھیں بند کرنے والے علماء اور متعصب ہونے کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ دربار اکبری کا مایہ ناز "محقق" ابوالفضل فقہاء کرام اور مجتہدین امت کے فیصلے یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا کہ فلاں حلوائی کفش دوز اور فلاں چمڑہ فروش کی باتیں کیسے مانوں۔ (منتخب، ص ۲۰۰)

صحابہ کی بے وقعتی | سلف کی بے حرمتی اور گستاخیوں کی اس جرأت نے بڑھتے بڑھتے سب سے افضل اور مقدس ترین جماعت صحابہ کرام (جن پر سارے دین کی عمارت کھڑی ہے) کو بھی آگھیرا۔ ان کی عظمت و حرمت دلوں سے نکالی جانے لگی۔ خاص طور سے خلفاء ثلاثہ (ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) کی شان میں ایسی ایسی باتیں نکلنے لگیں جن کو زبان پر نہیں لایا جاسکتا (منتخب)

شان رسالت پر دست درازی | اب خاکم بدہن شان رسالت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات) کی باری تھی۔ حریم قدس نبوت پر دست اندازی سے پہلے ضروری تھا کہ حضور کے لائے ہوئے احکام و تعلیمات اور اسلام کے اساسی ارکان کو عبادات تک کو رفتار زمانہ سے بے جوڑ، نامناسب اور فرسودہ قرار دیا جائے اور اس طرح بالواسطہ "اسلامی تعلیمات و شعائر" سے کٹ کر امت مسلمہ کا جوڑ اس کے لانے والے پیغمبر سے بھی کٹ جائے۔

چنانچہ صحابہ کرام، آئمہ دین اور سلف صالحین کی اتباع اور تقلید کو روایت پرستی، شخصیت پروری

اور قدامت پسندی قرار دینے کے بعد اسلام کے سارے اثاثہ پر یہ کہہ کر ہاتھ صاف کرایا گیا کہ العیاذ باللہ ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث اور نامعقول ہے۔ اس کے بنانے والے چند مفلس بدو تھے جو معاذ اللہ سب کے سب مفسد، ڈاکو، لٹ مار تھے۔ ارکان اسلام کا یہ حال کہ روزہ، حج، زکوٰۃ، جبراً ساقط کئے گئے صـ۲۵۱۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اکبر کے دربار میں علانیہ نماز پڑھ سکے صـ۲۱۵

روشن خیالی کے نام پر دین سے مذاق | اس طرح دین اور دین کے تمام شعائر کو "تقلیدات" کہا جانے لگا صـ۲۱۶ یعنی غیر معقول باتیں "روایت پسندی" اور "دقیانوسیت" ایک شور برپا کیا گیا کہ مدار دین عقل پر ہے نہ کہ نقل پر صـ۲۱۱ اگر کسی مسئلہ میں اس کی دینی اور شرعی حیثیت پیش کر دی جاتی تو الف ثانی کا یہ "محرف اعظم" یہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ ـــــ یہ ملاؤں کی باتیں ہیں۔ مجھ سے تو ان چیزوں کا دریافت کرو جن کا تعلق عقل و حکمت سے ہو صـ۳۰۸

تمام دینی سرمایہ اور اسلامی اثاثہ کے بارہ میں مجموعی طور پر بداعتمادی اور بدظنی پیدا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے اسلام کے ان تمام اصول و فروع پر "تیشۂ تحقیق" چلایا جانے لگا جس پر خدائی دین "اسلام" کی ساری عمارت استوار تھی۔ بقول ملا عبدالقادر بدایونی ؒ ـــــ ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے مثلاً نبوت مسئلہ کلام، رویت باری تعالیٰ، انسان کا مکلف ہونا، تکوین عالم حشر و نشر وغیرہ کے تمسخر اور استہزاء ہونے لگا۔ صـ۳۰۷ ـــــ پورے دربار میں اسلامی معتقدات کو مشق سخن بنا کر ایک ایک مسئلہ اور شعار کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کئے جاتے۔ دوسرے مذاہب کا ہر وہ رکن جس سے اسلام کا توڑ ہوتا اسے نص قاطع، قطعی دلیل اور اسلام کی تمام باتوں کو مہمل نامعقول، نو پیدا عرب کے مفلسوں کی گھڑی چیزیں خیال کیا جاتا صـ۲۵۹

نبوت اور اخبار غیب سے انکار | مصدر شریعت اور سرچشمہ اسلام نبوت کبریٰ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عظمت اور وقار کو مجروح کرنے کی بہ مذموم کوششیں بڑھتی رہیں اور بالآخر اجتہاد و امامت کا یہ دعویدار صاحب نبوت کی غلامی اور اس کی تشریعی حیثیت ماننے سے بھی

منکر ہوا اور بادشاہ نے وحی کے محال ہونے پر اصرار شروع کیا۔ غیب اور عالم غیب کے بارے میں حضور رسالتمآب علیہ السلام کے اخبار کو جھٹلا کر جن، فرشتے، معجزات، تواتر، قرآن اور اس کے کلام خداوندی ہونے۔ بعث بعد الموت، حساب کتاب، ثواب وعذاب کا کھلے بندوں انکار کرنے لگا۔ ص ۲۶۲ ۔۔۔۔

معجزات سے استہزاء | معجزات نبوت سے نہ صرف انکار بلکہ بادشاہ کی جہالت اور شوریدہ سری کی انتہا تھی کہ بھرے دربار میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر معراج رسول کی ہنسی اڑانے لگا اور کہتا کہ جب میں دوسری ٹانگ اٹھا کر کھڑا نہیں ہو سکتا تو راتوں رات ایک شخص کیسے آسمانوں سے اوپر پہنچ گیا، خدا سے باتیں کیں اور جب واپس ہوا تب بھی اُن کا بستر گرم تھا ۔۔۔ ہنسی مذاق کا یہی حال شق القمر اور دیگر معجزات کے بارہ میں بھی تھا ص ۲۷۱

شان رسالت میں بے حمیتی | اس گستاخ نے اس پر اکتفا نہ کیا، بلکہ مسلمانوں کا تعلق ان کے مرکز حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توڑنے کی خاطر اس نے درباریوں کے وہ نام تک بدل ڈالے جس میں احمد اور مصطفیٰ شامل ہوتا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ یہ نام ان پر شاق گزرنے لگے تھے ص ۲۱۵ ج ۲ ۔۔۔ یہاں تک کہ غیرت وحمیت سے عاری اس "مغل اعظم" کے دربار میں عیسائی مشنری کے پادریوں نے سرعام شان رسالتؐ میں وہ بیہودہ کلمات استعمال کئے جن کے سننے پر جگر شق ہو جائے ۔ مگر اکبر نے ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی، اعزاز واکرام سے نوازا اور اپنے ایک شہزادہ کو حکم دیا کہ تبرکاً ان سے چند سبق پڑھ لو ص ۲۶۹

اکبر منصب رسالت پر (معاذ اللہ) | اپنے زعم باطل میں دین محمدی کی تخریب، شعائر اسلامی کے اضمحلال اور رسالت وعہد رسالت سے مسلمانوں کا تعلق کمزور کرنے کے بعد اکبر کے لئے ضروری تھا کہ تشریع اور قانون سازی کا منصب اب خود سنبھالے اور پڑانے دین کے اس ملبہ پر جو اس کے خیال میں اپنی عمر کے ہزار سال پورے کر چکا تھا ایک نئے دین، جدید ملت اور ترقی یافتہ نظام کی عمارت اٹھائے، کہ تخریب کے بعد تعمیر کے راستے کھلے تھے۔ امامت تو کیا نبوت اور الوہیت تک

(معاذ اللہ) اس کی رسائی ہو چکی تھی اور کون تھا جو اسے روک سکے۔ بقول مورخین اس خیال سے اس نے اپنے دین کو "الہٰی مذہب" کا نام دیا اور دعویٰ نبوت نہ کرتے ہوئے بھی منصب رسالت تشریع و تبدیل، نسخ احکام وغیرہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ــــ اب پورے طور پر وہ "دین الہٰی" کی تدوین اپنے خود ساختہ قوانین کی ترویج اور اسلامی احکام و شعائر کی بربادی و بیخ کنی میں لگ گیا۔ اعمال و فروع تو گیا عقائد و اصول تک نئے رائج کر دیئے اور اسطرح باقاعدہ ایک جدید ملت اور سائنٹیفک مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر دین الہٰی کی "تدوین و تنقیح" کا کام اکیلے اکبر کے بس میں کہاں تھا کہ وہ بیچارہ تھا۔ بہرحال ایک ان پڑھ اور جاہل دین کے مبادی تک سے بے خبر زمانہ کے روشن خیال "محققین" نے اسے بام پر چڑھایا اور اقتدار و نخوت کے پندار میں اکبر اس مقام "انا ولا غیری" پر براجمان ہوئے

اسلامی مشاورتی کونسل اور تحقیقاتی ادارے | عقائد و احکام فروع و اصول اور دین کے ہر ہر شعبہ میں نئے نئے اجتہادات و تحقیقات کے لئے باقاعدہ ادارے کھولے۔ تحقیقی مجالس قائم کیں اور بیسویں صدی کی اصطلاح اسلامی تحقیق، اسلام کا آزاد مطالعہ سائنٹیفک ریسرچ کے لئے قانون ساز اداروں کی تشکیل کی گئی۔ باہمی بحث و تمحیص کے لئے کونسلیں قائم ہوئیں۔ دیگر مذاہب کے ثقافتی لٹریچر کے ترجمہ کے لئے دفتر کھولا گیا۔ ملا مبارک اور اس کے شہرہ آفاق بیٹے ابوالفضل اور فیضی ان تحقیقاتی امور کے ڈائریکٹر اور خود "اکبر دی گریٹ" کی ذات اس تشریع و تجدید کی آخری اتھارٹی اور قوت نافذہ تھی ــ اکبری دربار کے اس ثقہ اور چشم دید راوی ملا عبدالقادر بدایونی نے تو اکبر کی اس "اسلامک ایڈوائزری کونسل" کے ارکان کی تعداد تک لکھ دی ہے۔

(بادشاہ) حکم کردند کہ از مقربان چہل کس
بعدد چہل تن بہ نشستید و ہر کس ہر چہ
داند بگوید و ہر چہ خواہد بپرسد ص ۳۰۸

بادشاہ نے حکم دیا کہ مقربین میں سے
چالیس آدمی یکجا بیٹھا کریں اور ہر شخص جو کچھ جانتا ہو
اسکا اظہار کرے اور ہر قسم کے سوالات کرنا چاہے کرے

اس کمیٹی میں اسلامی عقائد اور مسلمات کے متعلق عقل (سائنس) کی روشنی میں فیصلہ کیا جاتا۔ طرح طرح کے شبہات، ہنسی مذاق کی شکل میں کیا جاتا اور اگر کوئی ممبر اختلافی نوٹ پیش کرتا تو اسے روک دیا جاتا تھا۔ ۲۰

اس تحقیقاتی ٹکیسال میں ابوالفضل کے کئی شاگرد اور سکالر بھی تجدید دین کے کام میں شریک تھے اور بقول منتخب التواریخ صرف ایک شاگرد نے اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور مسخرگی کے پیرایہ میں کئی رسالے تصنیف کئے اور جس نے شاہی بارگاہ میں بڑی مقبولیت پائی ص۲۵۱

تاریخ کی تطہیر | ان روشن خیال اور آزاد ریسرچ کے شہسواروں کے ایک گروہ کو حکم دیا گیا کہ "تاریخ الفی" کے نام سے اسلام کے ہزار سالہ دور کی ایک تاریخ مرتب کی جائے جو دوسری تمام تواریخ کی ناسخ ہو اور جس میں سن ہجری کی بجائے سن رحلت کو آغاز بنایا گیا ہو ص۳۰۶

اس کا مقصد بظاہر آج کل کی اصطلاح میں یہ تھا کہ اسلامی تاریخ "پر عجمی اثرات" دینی تعصب و تصلّب اور فقہی جمود کے جو بادل چھا گئے ہیں۔ ان آمیزشوں سے اسلامی تاریخ صاف ہو جائے کہ صرف تاریخ پر کیا منحصر پورا اسلامی نظام اور دینی سرمایہ ان کے نزدیک تحریف و تلبیس کا شکار ہو کر ناقابل اعتماد ٹھہر گیا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کے والد ملّا مبارک ناگوری بادشاہ کے سامنے ہندوؤں کو کہتا پھرتا کہ تمہارے دین کی طرح ہمارے دین میں بھی تحریف ہوئی ص۲۱۱ گویا عجمی سازش قدامت، اور توہم پرستی نے اس پورے اثاثہ کو ناقابل عمل اور غیر معتمد بنا دیا ہے۔ اسلام کے مقابلہ میں دیگر مذاہب اور بے ہودہ رسوم روایات کی جن جن طریقوں سے حوصلہ افزائی کی گئی ان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ تمام رواداری اور وسیع الخیالی صرف ان نظریات، مذاہب اور خیالات سے تھی جن سے اسلام کے کسی حکم کا توڑ ہوتا۔ ص۲۵۶

اکبر کی رواداری کا نتیجہ | بخلاف اسلامی ملت کے کہ اکبر کے خیال میں اس "غریب دین" کی ساری باتیں مہمل، نامعقول، نو پیدا اور عرب مفلسوں کی گھڑی ہوئی تھیں۔ یہ "روادار اکبر" جس کو بھی اپنے اعتقاد اور معیار پر پورا نہ پاتا وہ واجب القتل اور راندہ درگاہ ہو جاتا اور اسے فقیہ (ملا) کا نام رکھ دیا جاتا ص۲۳۹۔ اسلام کے مقابلہ میں دیگر مذاہب سے "رواداری" (جو ہمیشہ سے الحاد اور گمراہی

لہ منکرین حدیث کے سرخیل غلام احمد پرویز اور نام نہاد دانشور اور تجدد زدہ طبقہ یہی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

کا مبداء اور سرچشمہ ہوتا ہے "مساوات ادیان اور آزادی رائے کا یہ ثمرہ نکلا کہ اکبر نے فرنگیوں کی عیسائی مشنریوں کو حکم دیا کہ بھرے دربار میں انجیل اور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث اور نصرانیت کو مدلائل بیان کریں اور ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ ان پادریوں کی مدد سے انجیل کا ترجمہ کر دیا جائے صد۳۰۹

فرنگی ثقافت اور کلچر | فرنگیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور بعض عقلی اعتقادات بادشاہ نے ان سے حاصل کئے صد۳۱۲ اور یہی عقل و دانش اور رواداری کے نام سے یورپ سے درآمد شدہ لعنت کی پہلی کھیپ جس کے نتیجہ میں مملکت کو صدیوں غلام رہنا پڑا۔ یہی "دانش افرنگ" ہے جو آج مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا اور نازک ترین مسئلہ بنا ہوا ہے ــــــ جشن نوروز میں فرنگی بھی شریک ہوتے جو پیانو اور ہارمونیم بجا بجا کر اپنے ثقافت اور کلچر کا مظاہرہ کرتے اور اکبری داد و ستد کے مستحق ہوتے۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ مجددؒ)

اس رواداری کے مظاہرے دنیا کے دیگر فرسودہ مذاہب سے بھی کیے گئے ــــ آتش پرستوں نے اکبر زردشتی دین کی حقیقت بیان کی صد۳۰۸ ــــ پھر کیا دیر لگتی اس وسیع الظرف روشن خیال بادشاہ نے ان کی دلجوئی کے لئے شاہی محلات میں دن رات آگ روشن رکھنے کا حکم دیا۔ صد۳۰۸

سیاست یا الحاد | ہندوؤں اور ان کے مذاہب اور غیر فطری رسم و رواج کے ساتھ اکبر نے جس رواداری کا معاملہ کیا وہ تو ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ آخر گردن سے اسلام کا "ربقہ" اتارنے کا یہ سارا ڈھونگ جب ان کی دلجوئی کی خاطر رچایا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ ہندومت کے ساتھ اکبر کی فراخ حوصلگیوں کا کیا عالم ہوگا ؟

ہندوؤں کے تہوار پر قشقہ لگانا، برہمنوں کے ہاتھ تبرک کا ڈوری بندھوانا، بھجن پڑھنا اور پڑھوانا، یہاں تک کہ اپنی والدہ کی وفات پر سارا سوگ ہندوؤں کی رسم "کریا" پر منایا گیا۔ سر، داڑھی مونچھیں منڈوا کر ماتمی لباس پہنا اور بادشاہ کی تقلید میں ہزاروں لوگ ان رسومات میں شریک ہوئے (شاندار ماضی صہ ۸۹ بحوالہ تزک جہانگیری۔ از مولانا محمد میاںؒ) غیروں سے یہ دریا دلی اکبر کے لئے ایک عام بات تھی، خواہ اسے آپ اکبر کی الحادی ذہنیت کا نتیجہ قرار دیں یا سیاست و مصلحت کا

خوشنما نام دیں۔

ملت جدیدہ یا ماڈرن اسلام | غرض اکبر کی یہ "رواداریاں" اور اسلام و دیگر مذاہب کا آزاد سائنٹیفک مطالعہ اور روشن خیالوں کی شبانہ روز بے رحم اور بے لاگ ریسرچ کے نتیجہ میں سرزمین ہند پہ ایک نئے ماڈرن اسلام اور "ملت جدیدہ" کا ظہور ہوا جس نے عقائد و اخلاق، سیاست و معاشرت، تہذیب و تمدن، احکام و مسائل غرض قدیم "اسلام" کے ایک ایک شعبہ جزئی سے جزئی مسئلہ اور حکم میں وہ وہ جدت طرازیاں کیں کہ الامان والحفیظ ہندوستان کے اس "فتنۂ کبریٰ" نے بزعم خود ملت مسلمہ کی چولیں ہلا ڈالیں اور جس کی ترویج کے لئے قوت و سطوت، دولت اور خزانوں کے تمام دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے تھے۔

حلف وفاداری | اس دین میں داخل ہوتے وقت جو کلمہ شہادت پڑھا جاتا مورخین کی زبانی وہ "لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" ہوتا اور نہ صرف مریدوں کو بلکہ عام رعایا کو بھی اس "ایمان و شہادۃ" کا مکلف ٹھہرایا جاتا ص۲۷۵۔ یہ نو مذہب ان الفاظ سے حلف وفاداری اٹھاتے "میں دلی شوق سے روایتی دین اور باپ دادوں کے تقلیدی مذہب کو چھوڑ کر اکبر شاہی دین میں داخل ہوتا ہوں ص۱۱

تمغے | اور اس طرح یہ روشن خیال یا ابن الوقت "فرسودہ روایات" کے خول کو توڑ آزاد فضا اور نئی روشنی میں آجاتے اور دین ملت کی متاع عزیز اکبر کے قدموں پر نثار کر کے دربار ہمایوں سے "شجرہ" کے نام سے ایک "تمغہ" حاصل کر لیتے ؎

دینے فروختند و چہ ارزاں فروختند

یہ تمغہ مقبولیت بھی بقول مولانا گیلانی حامیان تجدد کیلئے باعث رشک ہے۔ بادشاہ کی ایک تصویر ان وفا شعاروں کو دے دی جاتی جسے وہ ایک مرصع جواہر نگار غلاف میں رکھ کر اپنی دستاروں پر لگائے رکھتے ص۳۴۱ (کیا مغرب کی تصویر پرست تہذیب کو بیسویں صدی میں بھی یہ جدت سوجھی ہے۔ ابھی بات تصویر کی نقاب کشائی اور نمائشوں تک محدود ہے) ـــــ

بادشاہ سلامت ہر صبح ایک جھروکہ سے درشن کراتے۔ پردہ سے نکلتے ہی ہزاروں لوگ اپنے اس "معبود" اور "الہ اکبر" کے سامنے سربسجود ہوجاتے ص۲۲۶۔ اس تہذیب جدید میں باہمی ملاقات کے وقت "السلام علیکم" کی بجائے "اللہ اکبر" اور "جل جلالہ" کا تبادلہ ہوتا ص۲۶۵

اکبر کی افتادِ طبیعت اور اکبر کے "دین الٰہی" پر اس طائرانہ اور اصولی نگاہ ڈالنے کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ "دین اکبری" کے بعض معتقدات، معاشرتی اور اخلاقی میدان میں اس کی روشن خیالیوں اور شرعی احکام و فروع میں اس کی دست اندازیوں کی ایک ہلکی سی جھلک بھی پیش کردیں۔ شاید دین کے اضمحلال و اندراس کے اس آئینہ میں جھانک کر تاریخ سے عبرت لینے والے کچھ عبرت حاصل کرسکیں ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید کہ بیشک اس میں ایک نصیحت ہے۔ سننے اور سمجھنے والوں کے لئے ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اکبری عقائد و عبادات | اکبر کی نگاہ میں الوہیت اور نبوت کا جو مقام تھا اس کا اندازہ لوگ چکا وہ نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو خدائی منصب اور مقام نبوت پر فائز سمجھنے لگا بلکہ اپنی عبادات کرواتے کے ساتھ ساتھ تمام مظاہر فطرت آگ، پانی، درخت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجنے لگا ص۲۶۱۔ آفتاب کی عبادت لازمی طور پر دن میں چار مرتبہ کرتا ص۱۱ آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا وظیفہ پڑھتا ص۲۲۲ طلوع آفتاب کے وقت نقارہ بجایا جاتا ص۱۱ اور یہ فرمان جاری کیا کہ آفتاب کا ذکر آنے پر جلت قدرتہ (اس کی قدرت بہت بڑی ہے) کہا جائے۔ نہ صرف یہ کہ آفتاب کی عبادت ہونے لگی بلکہ کائنات کی ربوبیت میں بھی اسے شریک ٹھہرایا گیا ص۲۶۱ کواکب پرستی بھی کی جانے لگی اور یہاں تک کہ معاذ اللہ سورج کو خدا کا مظہر قرار دیا گیا کہ وہ اس میں حلول ہوچکا ہے ص۲۶۱ معاد، حشر نشر، بعث بعد الموت سے انکار کرکے ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ پر ایمان لایا ص۲۵۸ اپنے مقربین پر لازم قرار دیا کہ شمع اور چراغ روشن ہونے کے وقت کھڑے ہوکر تعظیم بجا لایا کریں۔ ص۲۱۲ آتش پرستی کے لئے ایک الگ آتش کدہ تازہ رہتا۔ آگ کو خدا کی نشانی اور نور قرار دیا ص۱۱

یہ اس مذہب کے اعتقادات اور اس تحقیقی علم الکلام والعقائد کے چند "شہ پارے" ہیں جنہیں "برعکس نہند نام زنگی کافور" توحید الٰہی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اجتہاد اور روشن خیالی کے اس کھیل سے اخلاق و کردار، معاشرہ اور تمدن کے میدان میں وہ گل کھلے کہ عقل و دانش اور دیانت و شرافت کی دنیا سر پیٹ کر رہ گئی۔ "مشتے نمونہ از خروارے" جس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

ریس کورس اور تعاونی سود کی حلت | سود اور جوا حلال قرار دیا گیا۔ شاہی خزانہ سے سودی قرضہ دیا جانے لگا۔ قمار کیلئے شاہی دربار میں ایک الگ جوا گھر (ریس کورس) قائم کیا گیا تھا۔[۲۴۶]

شراب حلال ہے | دربار اکبری سے فتویٰ جاری کیا گیا کہ طبّی طور پر بدن کی اصلاح و تقویت کے لئے شراب حلال ہے۔ البتہ بدکرداروں پر غل غپاڑہ کرنا اور دنگا فساد ممنوع ہے۔[۲۴۷]

محکمہ آبکاری | ایک عورت کی نگرانی میں شراب فروشی کی ایک دکان دربار کے سایہ میں قائم کی گئی۔ نرخ وغیرہ خود حکومت مقرر کرتی تھی۔

جام صحت | تقریبات اور مجالس میں جام پر جام لنڈھائے جاتے، شراب سے ایک دوسرے کے جام صحت تجویز ہوتے۔ دربار اکبری میں تجدد اور روشن خیالی کے ایک ممتاز لیڈر فیضی ایک جام "ملاؤں" کے تعصب اور جمود کے نام پر تجویز کرتے۔

شیو | اس ترقی یافتہ مذہب میں شراب کے بعد زیادہ زور داڑھی منڈھوانے پر دیا جاتا اور شیو کے بارہ میں عقلی و نقلی دلائل کا طومار باندھا جاتا۔

غسل جنابت منسوخ | دین جدید کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ جنابت واجب نہیں کہ منی سے نیک لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ہم بستری سے پہلے غسل کیا جائے (تذکرہ مجدد الف ثانی ص۲۰ مرتبہ مولانا منظور نعمانی)

عائلی قوانین کی اصلاح | نکاح و طلاق کے متعلق بھی مسلمانوں کے پرسنل لا میں ردوبدل کیا گیا۔ تب "عائلی قوانین" کی بعض دفعات یہ تھیں۔

ا۔ چچا زاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح حرام، کہ میل کم شود (یہ اجنبی تہذیب ہندوؤں کا اثر تھا کہ

بیگانوں کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔ ۲۔ سولہ سال سے پہلے لڑکوں اور چودہ سال سے پہلے لڑکیوں کا نکاح ممنوع قرار دیا گیا اور وجہ یہ تھی کہ فرزند ضعیف مے شود۔ گویا جو چیز بعد میں "سارداایکٹ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ وہ دراصل مغل اعظم ایکٹ کہلانے کی مستحق تھی۔ ۳۔ یہ کہہ کر "خدا یکے و زن یکے" ایک سے زائد شادیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ گویا اسلامی دنیا میں مسئلہ تعدد ازدواج کا جو غلغلہ ہے اس کا کریڈٹ بھی "اکبر اعظم" ہی کو حاصل ہے —— عائلی آرڈیننس کی مزید بعض دفعات یہ تھیں۔ ۴۔ آئسہ عورت (جس کی ماہواری بند ہو) نکاح نہیں کر سکے گی۔ ۵۔ مرد سے بارہ سال بڑی عورت سے ہم بستری ممنوع ہوگی۔ ۶۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کو گاؤں کے کوتوال کے سامنے پیش ہونا ضروری تھا کہ وہ عمر وغیرہ کی تصدیق کر کے باقاعدہ اجازت نامہ دے اور رجسٹریشن ہو سکے۔ ۷۔ کوئی ہندو عورت اگر مسلمان ہو کر کسی مسلمان سے شادی کرے تو اسے جبراً گھر والوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ (منتخب التواریخ)

آزادیٔ نسواں | پردہ ممنوع قرار دیا گیا۔ فرمان شاہی تھا کہ باہر نکلتے وقت عورتیں چہرہ کھلا رکھیں اور اگر برقعہ ہو تو چہرہ کھول دیا کریں ص۳۹۱

مخلوط کلب، زنا اور فحاشی کی ترویج | ایک طرف دوسری شادی پر پابندی عائد کی گئی دوسری طرف بغیر نکاح کے زنا کی کھلم کھلا اجازت دی گئی۔ "متعہ" رائج کر دیا گیا اور بقول منتخب التواریخ شہر سے باہر "شیطان پورہ" کے نام سے ایک مستقل آبادی بنائی گئی جہاں باقاعدہ محافظ، پولیس اور داروغہ ہوتا۔ جس کا جی چاہتا آ کر باہمی رضا و رغبت سے جو چاہتا کرتا اور جسے چاہتا ساتھ لے جاتا ص۲۹۱ گویا یہ زنا بالرضا کا ایک "مخلوط کلب" ہوتا جہاں سے داشتائیں دستیاب ہوتیں۔ گرل فرینڈز کی ایک دنیا آباد ہوتی —— نئی تہذیب کی تاریکیاں جنہیں اپنی جدت پر ناز ہے —— کیا صدیوں کی جمی ہوئی یہ تاریکی پھر بھی روشنی کہلانے کی مستحق ہے؟ تاریکی بہرحال تاریکی ہے۔ بیسویں صدی کی ہو یا عہد اکبری کی۔ ما أشبه الليلة بالبارحة

دیگر اصلاحات | میت کے گلے سے خام غلہ یا پکی اینٹیں بندھوا کر اسے پانی میں بہا دیا

بہانا یانی نہ ہوتا تو جلا دیا جاتا یا پھر کسی درخت سے لٹکا دیا جاتا ص۳۷۲ اگر تدفین ہوتی تو حکم تھا کہ قبر اس بنا پر بنائی جائے کہ مردہ کے پاؤں مغرب کی جانب اور سر مشرق کی جانب ہو ص۳۷۵ یہ دیدہ و دانستہ قبلہ کی توہین اور مسلمانوں کے دلوں سے کعبہ حجاز کی عظمت نکالنے کی ایک صورت تھی۔ چنانچہ اس نے خود اپنی خوابگاہ بھی اسی طرح بنائی تھی۔

ختنہ پر پابندی | بارہ سال سے پہلے ختنہ کرانے پر پابندی لگائی گئی ص۳۷۲ اور پختگی عمر کے بعد مشکل کوئی اس سنت پر عمل کرنے پر آمادہ ہو سکتا۔

سونا اور ریشم حلال | مردوں کے لئے سونے اور ریشم کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ تقریباً واجب قرار دیا گیا۔

سور اور کتوں سے دلچسپی | بزعم اسلام سور اور کتے کی نجاست کو منسوخ قرار دے کر اپنے محل میں ان کی سکونت کا انتظام کرایا۔ یہاں تک کہ صبح سویرے ان کا دیکھنا عبادت سمجھا جاتا ص۳۵۷ —— بادشاہ تو بادشاہ روشن خیال فیضی کا حال یہ تھا کہ سفر میں بھی چند کتے ساتھ رکھتا تھا اور ان ہی کتوں کے ساتھ کھانا کھاتا۔ بعض شاعر تو کتوں کی زبان تک اپنے منہ میں لے لیتے ص۳۵۷

سگ پرست تہذیب | آج مغربی تہذیب نے کتوں سے شیفتگی اور والہانہ محبت کو فیشن قرار دیا ہے۔ کتوں کے نام جائیدادیں وقف ہو رہی ہیں۔ گویا اس "سگ پرست" تہذیب کی داغ بیل بھی انگریزوں سے پہلے "دین الٰہی" کے ہاتھوں ڈالی گئی۔

ذبیحہ گائے پر پابندی | کتوں سے اختلاط اور تعلق کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر گائے، بیل، بھینس کا گوشت حرام قرار دیا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص قصائی کے ساتھ کھانا کھا لیتا خواہ اس کی بیوی کیوں نہ ہوتی، حکم تھا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

علماء حق اور مدارس دینیہ پر دست اندازی | یہ سب کچھ ان بلند بانگ دعووں کے باوجود کہ کسی مذہب کو دوسرے پر ترجیح نہ ہوگی نگران واقعات نے ثابت کیا کہ سارا ڈھونگ صرف عزیب اسلام کے لئے رچایا گیا تھا۔ ورنہ اکبر نے مسلمانوں کی تمام تہذیبی اقدار اور تمدنی اعضا

کو ایک ایک کرکے مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کی الحاد لپسند طبیعت نے صرف اس پر قناعت نہ
کی بلکہ ارادہ کیا کہ ہمیشہ کے لئے اسلام اور اسلامی ورثہ سے مسلمانوں کا رشتہ کاٹ دیا جائے ۔
اس مقصد کے لئے اکبر نے دین و رجال دین کو نشانہ بنایا۔ ان دینی معاہد اور اسلامی مدارس پر دست
اندازی کی جو قرآن و سنت اور تعلیمات ربانی کے سرچشمہ تھے۔ ان خانقاہوں پر ہاتھ ڈالا جہاں
سے مسلمانوں کی دینی تربیت اور تزکیہ کا کام وابستہ تھا۔ عربی زبان اسلامی علوم جو اسلام سے مسلمانوں
کی وابستگی کا ایک مضبوط ذریعہ تھا۔ اکبر نے رفتہ رفتہ ان سب چیزوں پر اپنی گرفت سخت کردی۔
عربی زبان اور عربی ثقافت کے ساتھ اس کا معاملہ بالکل ایسا تھا جیسا کہ پچھلے دنوں ترکی کے
مصطفیٰ کمال کا رہا ـــــ اکبری دور میں عربی زبان کے اضمحلال اسلامی علوم اور رجال دین کی بے قدری
اور بے کسی، دینی معاہد کی زبوں حالی اور شعائر اسلامی کی بربادی اور تباہی پر بھی ایک نگاہ حسرت و
عبرت ڈالنے چاہیے ـــــ قرآنی زبان کو ملک بدر کرنے کی خاطر عربی پڑھنا اور پڑھانا عیب قرار دیا گیا[صہ ۳۲]

عربی زبان سے دشمنی | دوسرا حکم یہ تھا کہ ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص تھے
مثلاً ث ، ح ، ع ، ص ، ض ، ط ، ظ ان کو مقامی بول چال سے بادشاہ نے باہر کردیا[صہ ۳۰۷]
عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی کہتا۔ عربی ناموں کی ترکیب ہندی سے بدل دی گئی
(تذکرہ مجددؒ مرتبہ مولانا منظور نعمانی)

اسلامی علوم کی کسمپرسی | اسلامیات اور دینیات سے سرکاری سرپرستی اٹھوائی گئی۔ فقہ و تفسیر اور
حدیث پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھہرائے گئے۔ صہ ۳۲ کہ شاید اکبر کے خیال میں ایسے لوگ
بے کار، قوم پر بار اور معاشی میدان اور مادی کارخانہ کے بے کار اعضائے تھے اور اکبر کی اصلاحات
اور تجدید آئی تحسین کرنے کی بجائے اسکی مخالفت کرتے رہتے اور آجکل کی زبان میں انکا کام مخالفت اور فساد و انتشار ہ گیا تھا یہ لوگ اکبر
کے "ترقیاتی پروگرام" میں روڑے اٹکاتے تھے اور رفتار زمانہ سے آنکھیں بند کرکے ہزار سال
پہلے کی باتیں کرتے تھے ـــــ اسلامی علوم کی جگہ مدارس میں اس وقت کے ترقی یافتہ علوم
اور سائنسی فنون، نجوم، طب، حکمت حساب شعر و تاریخ افسانہ رائج و معروض رائج کئے گئے۔

ایک شاہی سرکلر جاری کیا گیا کہ ہر قوم عربی علوم کو چھوڑ کر علوم نادرہ غریبہ نجوم حساب طب فلسفہ پڑھا کرے صد ۳۶۲ نصاب تعلیم کے اس تطہیر و اصلاح کے ساتھ ساتھ ایجابی کام یہ بھی کیا گیا کہ ہندی تہذیب و تمدن اور ہندؤں کے روحانی بزرگوں کے کتابی ذخائر فارسی میں ترجمہ کئے جانے لگے ان کتابوں کی اشاعت و ترویج کے لئے باقاعدہ دفتر قائم کئے گئے۔ صد ۳۲

دینی اداروں پر پابندیاں | علم دین اور اہل علم کو سرکاری عملداریوں سے نکال پھینکنے کے بعد اب ضروری تھا کہ ملک کے دیگر شعبوں کی بھی ان سے تطہیر ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا معاشی ناطقہ بھی ہر طرف سے بند کر دیا جائے۔

محکمہ قضا کا خاتمہ | بقول حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ اسلامی شعائر میں سے اسلامی آبادیوں کا قاضی مقرر کرنا ہے جو قرن اکبری میں مٹا دیا گیا۔ (مکتوبات صد ۱۹۵ ج ۱) قضا اور حکومت تو بڑی بات جمعہ، عیدین اور اسلامی تقریبات کا کام بھی اکبر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رویت ہلال کمیٹی | عید کے چاند میں اختلاف ہو رہا تھا۔ شرعی ثبوت سے پہلے اکبر عید کا اعلان کر کے لوگوں کے روزے تڑوا دیتا۔ (تذکرہ حضرت مجدد صد ۹۴) ایسے ہی ایک موقع پر ابوالفضل، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مجدد روزے سے تھے ابوالفضل نے روزہ نہ کھولنے کی وجہ پوچھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہندی نے فرمایا: بادشاہ بے دین ست اعتبارے ندارد"۔

اوقاف سرکاری تحویل میں | علماء و مشائخ آئمہ اور خطباء کے نام جو جاگیریں صدیوں سے وقف چلی آرہی تھیں ان کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ (تذکرہ صد ۸۲) اسلامی علوم اور اہل علم کے اس مقتل کا نتیجہ ملا عبد القادر بدایونی کے الفاظ میں یہی ظاہر ہوتا تھا کہ "مدارس اور مساجد ویران اور اکثر علماء جلا وطن کر دیئے گئے۔ (منتخب التواریخ صد ۲۷۴)

حضرت مجددؒ کی شکل میں رحمت حق کا ظہور | دین اور شعائر دین کی یہ عزت اور بے کسی تھی کہ یکایک رحمت حق جوش میں آئی۔ ان حالات نے سیدنا الامام ناصر سنت قامع

بدعت آیرو ئے مجدّدین دین اللہ کا روشن چراغ ، اللہ کے دشمنوں پر سیفِ مسلول امام عارف بدرالدین ابوالبرکات مجدّد الف ثانی رح ، شیخ احمد فاروقی سرہندی کی پاکیزہ اور حساس کو تڑپا دیا ۔ دعوت و عزیمت کے وہ جلیل القدر امام جن کی ساری زندگی درد و اضطراب ، سوز و ساز ، جہاد و ستیز ، تڑپ اور ولولہ ، دعوت و اصلاح کے روشن احوال اور کارناموں سے لبریز ہے ۔ یہ بظاہر فقیر بے نوا مگر اقلیم دعوت و عزیمت کا تاجدار اٹھا اور اس شان سے اٹھا کہ ؏

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اہل حق اور علماء ربانی کے مرید سرخیل دینِ ابراہیمی اور ملت محمدی کی اس بیکسی پر خون رو سکتے تھے ۔ روئے یہاں تک کہ ان کے جگر پاش نالہ و شیون سے زمین لرز اٹھی ، آسمان تھرا گئے خوابیدہ ضمیر جاگ اٹھے ۔

دین کی بیکسی کا ماتم مجددی جہاد و دعوت کے یہ تابناک نقوش ان کے مکتوبات کے ایک ایک صفحہ پر نقش ہیں وہ چیختے ہیں —— کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے نور کو بدعات کے اندھیروں نے چھپا دیا ہے اور ملتِ مصطفوی کی رونق کو ان نو ایجاد باتوں کی کدورتوں نے برباد کر دیا ہے ۔ (مکتوب ۱۸۱ دفتر اول ص ۲۰۳) اکبری دور میں دین کی بیکسی کا کتنا بھیانک نقشہ پیش فرماتے ہیں ۔

عزتِ اسلام نزدیک بہ یک قرن پنہجے
قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجرائے احکام
کفر برملا در بلاد اسلام راضی نمے شوند مے
خواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گروند و
اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نشود ، کار تابآں
سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانے از شعائر
اسلام اظہار نماید بہ قتل مے رسد ۔

ایک قرن میں اسلام کی عزت اس درجہ کو پہنچی کہ اہل کفر صرف اس پر راضی نہیں ہیں کہ محض کفر کے احکام کا اعلانیہ اسلامی بلاد میں اجرا ہو جائے ۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ مٹا دیئے جائیں اور اسلام و مسلمان کا کوئی اثر باقی نہ رہے ۔ بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار کرتا ہے تو اس کو قتل کے انجام تک پہنچایا جاتا ہے ۔

شاہ ولی اللہ کا تبصرہ | ملت اسلامیہ کے ایک دوسرے فرزند جلیل شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں "اکبر نے زندیقیت اختیار کی اور جہالت و گمراہی کے پھریرے اڑنے لگے۔ ہر طرف سے مختلف ملتوں اور باطل مذاہب کے لوگ دوڑ پڑے اور عظیم فتنے پیدا ہو گئے" (شرح رسالہ از فقہ از تذکرہ مجدد صفحہ ۳۰)

یہ تھا اس روشن خیال، صلح کل وسیع المشرب "رند باصفا" اور "ملت جدید" کے بانی دولت مغلیہ کے "تاجدار" "اکبر دی گریٹ" کے دین و مذہب کا ایک اجمالی خاکہ اور مادر پدر آزاد اکبری تہذیب کی حقیقت جس کے ڈھنڈورے الحاد اور اباحیت کے ایوانوں میں زور و شور سے پیٹے گئے کہ آسائش غیر تنا عی خلق دراں بود۔

اکبر کا آئیڈیل پیش کرنیوالے | اور آج بھی نام نہاد روشن خیال حلقے اکبر کا آئیڈیل پیش کر کے الحاد اور تحریف دین کی تحسین کر رہے ہیں ——

یہ ہے مغل ایمپائر کے ایک مطلق العنان حاکم اور عصر حاضر کے لادینی حلقوں کے مایہ ناز "ہیرو" کی ایک ہلکی سی تصویر جسے "روشن خیال اور ترقی پسند" سمجھ کر دین اور اہل دین کے استحصال اور بیخ کنی کے سلسلہ میں اس کے سارے کارناموں کی تائید و تصویب کی جارہی ہے اور اصلاح و خیر خواہی کرنے والے علماء حق کو خود غرض، حریص اقتدار، مجرم اور واجب القتل قرار دیا جارہا ہے قبل اس کے کہ ان باتوں کی حقیقت احکم الحاکمین کے دربار میں کھل جاتی۔ تاریخ نے یہاں بھی اپنا فیصلہ حق کے حق میں محفوظ رکھا۔ قدرت نے اکبر کے تخت پر جہانگیر اور پھر محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کو بٹھا دیا اور بہت جلد اکبر کی الحادی سلطنت پر حق و اہل حق کا پھریرا لہرانے لگا —— آج اکبر کے "الٰہی مذہب" کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے اور حق قائم و دائم ہے ——

والحق یعلوا ولا یعلیٰ ان فی ذلک لذکریٰ لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

تجدّد و اصلاح کے نعروں کی اصل حقیقت

• راولپنڈی کی اسلامی کانفرنس • ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن

◇◇

پچھلے ہفتہ راولپنڈی میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی بعض تقریبات دیکھنے کا راقم کو بھی اتفاق ہوا۔ مختلف اسلامی ممالک کے علماء اور دانشوروں کے علاوہ پاکستان کے دو چار علماءِ حق کو بھی اس میں شرکت کا موقع دیا گیا تھا۔ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں کے علماء اور قدیم و جدید طبقات کا باہمی تبادلۂ خیال اور عالمِ اسلام کو درپیش مسائل پر غور و فکر، مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اتفاق کی ضرورت کا احساس ایسے امور ہیں جن کے لحاظ سے اس کانفرنس کا اہتمام قابلِ تحسین قرار پاتا ہے مگر تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جسے ادارۂ تحقیقات اور اس کے کارپردازوں کی ذہنی ساخت نظریات اور تحقیقی "شاہکاروں" کے پس منظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں منتظمین نے اس کانفرنس کے انعقاد سے اپنی جن توقعات کے وابستہ ہونے کا اظہار کیا اس سے بھی یہ حقیقت ایک بار پھر کھل کر سامنے آگئی۔ جس کا اظہار دین کو نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنے اور حالات کے مطابق بنانے، وغیرہ الفاظ سے بار بار کیا جا رہا ہے۔

عالمِ اسلام میں قدیم و جدید کا معرکہ اس وقت تقریباً تمام مسلمان ممالک ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ جن کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی تہذیب و اقدار کے معرکہ کا نام دے سکتے ہیں۔ جو طبقہ تجدد اور مغربی افکار کا حامل ہے۔ اگر اس کی اس تمام غوغا آرائی اور کاوش کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ مغربی تہذیب کی اخلاقی اور روحانی خرابیوں سے پہلو

بچاتے ہوئے قرآن وسنت اور اسلامی اقدار کو مضبوطی سے تھام کر موجودہ عصری علوم، اور سائنسی ترقیات سے استفادہ کیا جائے۔ اور عصرِ حاضر کے درپیش مسائل کی شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں شرعی حیثیت واضح کی جائے۔ اگر وہ مسائل اور نظریات اسلام کی اساس سے متصادم نہ ہوں انہیں اپنالیا جائے۔

مغرب کے بارہ میں معتدلانہ راستہ | اور نئی تہذیب کی جو باتیں شریعتِ اسلامیہ سے میل نہ کھائیں انہیں بلاتامل یکسر خیر باد کہہ دیا جائے۔ تو اس مقصد کی خوبی میں کسی عالم اور متصلّب مسلمان کی دو رائے نہیں ہوسکتی تھیں۔ کیونکہ اسلام نے ہر دور اور ہر زمانہ کی اچھی باتوں کو اپنانے کا تمام مذاہب سے زیادہ اہتمام کیا ہے۔ وہ انسان کو اللہ کا خلیفہ اور بر و بحر کا مالک قرار دیتا ہے۔ اس نے انسان کو کائنات اور عناصر کی تمام جوہری قوتوں کی تسخیر کی دولت سے نوازا ہے۔ اسلام جائز حدود کے اندر انسان کی ضروریات کی تکمیل اور قومی، ملکی اور ملّی مفادات کی حفاظت و دفاع کے لئے ترقیاتِ زمانہ سے استفادہ اور حصولِ علوم و فنون کے لئے دوسری اقوام کے شانہ بشانہ چلنے سے ہرگز نہیں روکتا۔ جو طبقہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی اقدار کا علمبردار ہے اس کی طرف سے بارہا یہ چیلنج دیا جا چکا ہے۔ کہ اسلام کے اور نظریہ یا علماءِ حق کے کسی گروہ کی تعلیمات میں عصری اور تجرباتی علوم میں ترقی اور اضافہ سے منع کرنے کی کوئی مثال اگر موجود ہو تو اسے پیش کر دیا جائے۔

تجدد و اصلاح کے علمبرداروں کے اصل عزائم | الغرض تجدد و اصلاح مذہب کے نعرے بلند کرنے والوں کے عزائم اور مقاصد اگر صرف یہی ہوتے تو اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی۔ مگر اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کو نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں ان کی ذہنی ساخت تعلیم و تربیت، ذاتی و سیاسی مصالح مغربی تہذیب و تمدن میں سرتاپا استغراق اور جن سرچشموں سے ان کے نظریات کی آبیاری ہو رہی

ہے اور اسلام پر تحقیق و ریسرچ کے جو نت نئے نمونے مسلمانوں کے سامنے آرہے ہیں۔ ان سب چیزوں سے یہ حقیقت مسلّمہ کھل کر سامنے آچکی ہے۔ کہ در اصل ان لوگوں کا مقصد پورے اسلامی معاشرہ کو مغربی تہذیب و تمدن اور لادینی افکار و خیالات میں ڈھالنا اور اسلامی ممالک کو مغربی ممالک کے نقش قدم پر چلانا ہے۔ اس راہ میں جو بھی دینی تصورات اور ضوابط، قوانین اور دینی اقدار و روایات حائل ہو سکتے ہوں ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے یا اسے کھینچ تان کر اسلام کے دائرہ میں لایا جائے۔

آوازۂ تجدید یا تقلیدِ فرنگ | اور مختصراً یہ کہ اس طرح حقیقی خدوخال سے محروم ہو کر ملک و معاشرہ کو "مغربیت" کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے رکاوٹ نہ بنے۔ یہی وہ المناک صورتِ حال ہے جس سے تجدّد اور اصلاح کے خوشنما نام سے اسلام اور راسخ العقیدہ مسلمان دوچار ہیں۔ تجدید کے نام پر مغربی تہذیب و افکار کی یہی وہ اندھی تقلید ہے جس کا رونا علامہ اقبالؒ رو چکے ہیں ؎

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید — مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

علماء اور مسلمانوں کی تشویش | اور یہی وہ تشویشناک صورتِ حال ہے جس نے دینی اقدار و افکار پر مر مٹنے والے علماء اور غیور مسلمانوں کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور وہ کسی حال میں بھی اسلام کو یورپ کی اخلاقی اور روحانی اقدار سے عاری نظام کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اور اس راہ میں وہ بے خطر ہر میدان میں سنگِ گراں ثابت ہوجاتے ہیں۔ جس کا کچھ مظاہرہ راولپنڈی کانفرنس میں لادینی نظریات پیش ہونے پر حاضرین کے سوادِ اعظم کا شدید نفرت اور بیزاری ظاہر کرنے کی شکل میں ہُوا۔

اہلِ تجدّد اور مغرب زدہ طبقہ کے ہاں نئے تقاضوں اور حالات کا ساتھ اور مذہب کے ترقی پذیر ہونے کا مطلب کھلے الفاظ میں یہ ہے کہ مذہب کو حالات کا تابع بنا دیا

جائے نہ کہ حالات اور زمانہ کو مذہب کے مطابق بنایا جائے۔

عصرِ حاضر کے تقاضے اور اسلام | جہاں تک عہدِ جدید کا تعلق ہے ہم حیران ہیں کہ آخر وہ کون سے تقاضے ہیں جن کا مذہب کو سامنا کرنا پڑا ہے اور اسلام اپنی موجودہ شکل میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر انسان پیدل چلنے اور بیل گاڑی کے بجائے جیٹ طیارہ اور خلائی جہازوں میں اڑنے لگا۔ ہاتھ کا پنکھا چلانے کی بجائے ائیرکنڈیشنر استعمال کرنے لگا۔ دستکاری کی جگہ بھاری بھرکم مشینوں اور کارخانوں نے سنبھال لی۔ وہ دال روٹی کی بجائے کیک، ٹوسٹ، اور سینڈوچ کھانے لگا۔ برف اور ٹھنڈے پانی کی بجائے کولر، کولڈسٹوریج اور ریفریجریٹر کے مشروبات استعمال ہونے لگے۔ کچے مکانات کی بجائے فلک بوس عمارتوں میں رہائش ہونے لگی۔ لوگ سیڑھیوں کی بجائے لفٹ سے چڑھنے لگا۔ انسان تیروسنان کی بجائے توپ وتفنگ اور بندوق وریوالور کی بجائے ایٹم ومیزائل پر قادر ہوا۔ تو آخر مذہب کا وہ کون سا اصول ہے جو ان تبدیلیوں اور تغیرات سے جوڑ نہیں کھاتا؟ بیشک کھانے پینے، رہنے سہنے اور مال وجان کی حفاظت کی شکل میں انسان کو جو بنیادی ضروریات تھیں عصرِ حاضر نے ترقی یافتہ شکل میں انہیں پورا کر دیا جو امتدادِ زمانہ کا طبعی نتیجہ تھا۔ مذہب نے پہلے بھی چند ضابطوں اور تقاضوں سے مشروط کر کے ان ضروریات کی تحصیل وتکمیل کی اجازت دی۔ اور آج بھی مذہب مسلمانوں کو ان تقاضوں کے اندر رکھ کر ان مادی ضروریات کے حصول اور استفادہ کی پوری اجازت دیتا ہے۔

مغربی برائیوں کو عصرِ حاضر کا تقاضا نہیں کہا جا سکتا | ہاں اگر نئے تقاضوں اور عصری ضروریات سے صرف سائنسی ترتیبات اور تجرباتی علوم وفنون مراد نہیں بلکہ وہ پوری تہذیب ہے جس میں آج یورپ مبتلا ہے اور جو ایک زہریلے سرطان اور مہلک جذام کی شکل میں پوری انسانیت

کا جسم کھائے جا رہی ہے۔ اور آپ اسلام کا جوڑ اس مغربی طرزِ معاشرت سے لگانا چاہتے ہیں۔ جس کا مطلب جنسی بے راہ روی، اخلاقی انارکی، مرد اور عورت کا آزادانہ میل ملاپ، کلبوں کی زندگی، کاک ٹیل پارٹیاں، سود، شراب، جوا، نمائشِ حسن، سیول میرج، گرل اور بوائے فرینڈز، الغرض تمام اخلاقی اور دینی حدود و اصول سے بغاوت ہے۔

اسلام کا جمود و تصلب | تو یقین جانیئے کہ اسلام اس بارہ میں قطعی جامد اور متعصب ہے اس میں ہرگز عصرِ حاضر کے ان قبیح تقاضوں کے ساتھ چلنے کی سکت نہیں اور وہ ایک پل کے لئے ایسے "ترقی یافتہ" اور "مہذب" لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسلام کا یہ جمود اور تصلب خود تجدد پسندوں پر ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے اسلام کو اپنی خواہشات کے تابع بنانے اور اس کا صرف لیبل اپنے ساتھ ہر حال میں چپکائے رکھنے کی بجائے جرأت مندانہ بات تو یہ ہے کہ اسے خیر باد کہہ دیجئے۔ آپ بے شک ان نئے تقاضوں کو اپنائیے مگر اسلام بے چارے کو مشقِ ستم نہ بنائیے۔ یہ خدا کی آخری نعمت ہے۔ رہتی دنیا تک انسانیت کے حقیقی فلاح و بہبود کا اسی نسخہ شفا پر انحصار ہے۔ اگر عصرِ حاضر کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور اس کا مزاج اسلام سے جوڑ نہیں کھاتا۔ تو آنے والی نسلوں کو اس نسخۂ ہدایت سے کیوں محروم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اپنی نفس پرستی، شکم پروری اور خواہشات کی پرستش کے لئے اتنی بڑی نعمت کے ساتھ یہ تلاعب اور استہزاء اور یہ تعصب و عناد ایک ایسی بدترین ناشکری ہوگی جس کی نظیر انسانی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔

تحقیق و ریسرچ کا اصل ہدف | اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کی فوقیت ہر زمانہ پر رہے۔ اور آپ کا واقعی عقیدہ ہے کہ قرآن اور اسلام میں ہر زمانہ کے حوادث و نوازل کا حل موجود ہے۔ اور مغربی تہذیب نے جو ناجائز معاشرتی اور معاشی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسلام ان سب کا متبادل حل پیش کر سکتا ہے۔ تو آپ کی تحقیق اور ریسرچ کا ہدف

یہ نہ ہونا چاہیئے کہ یورپ کے حرام طور طریقوں کو جائز ثابت کرانے کے لئے اسلام کے محرمات کو حلال قرار دیں۔ بلکہ اپنی تحقیق کا محور یہ بنائیے کہ یورپ کی ان غلط اور حرام چیزوں کی بجائے کن جائز اور حلال صورتوں سے نئے زمانہ کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ بینکنگ نظام اور سود پر بحث کیجئے مگر اس کو حلال ثابت کرانے کے لئے نہیں بلکہ اس کے متبادل حلال صورتوں مضاربت و مشارکت وغیرہ کو زیرِ بحث لائیے، اور انہیں آزمائیے۔ شراب بے پردگی، اور مخلوط معاشرت کو کھینچ تان کر اسے اسلام میں داخل کرانے کی بجائے معاشرہ کو عصری ترقیات سے ہمکنار کرتے ہوئے ان خرابیوں سے بچنے کی تدابیر سوچیئے، معاشرتی حقوق کی پائمالی، حق تلفی اور ظلم و تعدی سے بچانے کے لئے اسلامی معاشرہ برپا کرنے اور ظلم کے اسباب کے تدارک پر غور کریں۔ نہ کہ آپ تعدادِ ازواج پر پابندی لگائیں یا دیگر معاشرتی مسائل طلاق، عدت وغیرہ میں توڑ موڑ شروع کردیں۔ معاشی تفاوت، غیر منصفانہ تقسیمِ دولت اور طبقاتی کشمکش ختم کرنے کے لئے آپ اسلام کے نظامِ اقتصاد و اعتدال کو سامنے لاکر آزمائیں نہ کہ اسلام کا رشتہ اور جوڑ سوشلزم، مارکسزم یا سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑ دیں۔ نئے حوادث اور مسائل کی قرآن و سنت اور آثارِ صحابہؓ اور فتوےٰ سلف کی روشنی میں مخصوص شرائط اور حدود میں رہتے ہوئے حل نکالئے نہ کہ آپ عقل کو شریعت پر ترجیح دے کر عقل کے کردار کو کھلی چھوٹ دے دیں کہ وہ پوری شریعت اور منصوصاتِ شریعت کو بھی "ویٹو" کرسکے۔ عقل کو شریعت کے دائرہ میں رہنے کا ذریعہ بنائیے نہ کہ شریعت سے فرار کا۔ آپ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے شک ترقی کریں۔ مادی آسائش کی راہیں تلاش کریں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا۔ کہ دیگر مادی اقوام کی طرح ان چیزوں کو ہی علم و حکمت سمجھ بیٹھیں۔ تسخیرِ کائنات یا بالفاظِ دیگر "شکم پروری کی تدبیروں" کو ہی قرآنی تعلیمات کا خلاصہ، پیغمبرؐ کی تعلیمات کا نچوڑ، تخلیقِ انسانی کا مقصد اور قرآن کے دعوتِ تفکر و تدبر کا محور سمجھ بیٹھیں۔ اور

تعلیماتِ قرآنی کے حقیقی مقصد عبدیتِ خداوندی، حصول و مرضیاتِ الٰہی اور فلاحِ آخرت کو ثانوی حیثیت دے دیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ اسلام کو محض ایک مادی نظام، اور شکم پرور مذہب کی شکل دینا چاہتے ہیں جس کا مقصد سرمایہ داری یا کمیونزم کی طرح صرف جسم اور پیٹ کی پرورش رہ جائے اور تمام اخلاقی اور روحانی قدریں پامال ہوجائیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس طرح آپ مذہب کا نام بھی لے سکیں گے۔ اور اس کے تمام مطالبات سے بھی بچ جائیں گے۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ میں مذہب کے ساتھ اس عیاری، تمسخر اور استہزاء کی مثال بمشکل مل سکے گی۔

ہمارے خدشات کی تائید ہم نے مذہب کے تجدد و اصلاح کی ان کوششوں کے بارہ میں جن خدشات کا اظہار کیا۔ اہلِ تجدد یقیناً اسے سوءِ ظن، ہماری تنگ نظری اور رجعت پسندی قرار دیں گے۔ جیسا کہ ان الزامات کو پچھلے دنوں ادارۂ تحقیقات اور اس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمان کے تعارف پر مشتمل بعض اخباری مضامین میں بار بار دہرایا گیا۔ ادارۂ تحقیقات اور اس کے فاضل ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا وجود اس ملک میں تحریک تجدد اور مغربیت کا سب سے واضح نشان ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے "تحقیقی شاہکار" بطور نمونہ اپنے قارئین کے سامنے رکھ کر فیصلہ انہی پر چھوڑتے کہ ہم ان خدشات اور بے چینی و اضطراب میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور نئے تقاضوں کے سانچہ میں ڈھال کر کون سا اسلام تصنیف کیا جا رہا ہے، یہ تمام "جواہر پارے" ادارۂ تحقیقات کے ترجمان مجلہ فکر و نظر میں ان کے مضامین یا پھر ان کی تازہ ترین تصنیف "اسلام" (مطبوعہ ویڈنفیلڈ اینڈ نکلسن لندن ۱۹۶۶) سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ :-

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بعض ملحدانہ خیالات

۱۔ قرآن کریم کے احکام ابدی نہیں بلکہ اس کے علل اور مقاصد ابدی ہیں (یعنی نماز روزہ، حج، زکوٰۃ بجائے خود لازمی نہیں بلکہ ان کے مقاصد ابدی ہیں خواہ وہ جس شکل میں بھی ظاہر ہوں) اب تک اس تحقیق کی دو مثالیں بھی سامنے آچکی ہیں۔ آگے نماز، روزہ حج میں بھی اسی اصول سے ترمیم و تبدیلی کی راہ کھلی ہے۔

الف۔ زکوٰۃ عبادت نہیں ٹیکس ہے۔ اور اگر مروجہ نصاب سے مقصد حاصل نہ ہوسکے تو حکومت اس میں کمی بیشی کر سکتی ہے۔

ب۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر تھی اسوقت عورتیں تعلیم یافتہ ہیں اور ایک عورت کی شہادت بھی مرد کے برابر ہے۔

۲۔ شریعت اسلامیہ غیر متبدل ہمہ گیر اور ابدی نہیں۔

۳۔ وہی وحی مقبول ہے جو عقل و بصیرت کے معیار پر پوری اترے۔

۴۔ وحی الٰہی اور رسولؐ دونوں حالات اور زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۵۔ قرآن کریم کے فیصلے اور حضورؐ کی احادیث قطعی قوانین نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک اسوۂ نمونہ اور مثال ہیں۔

۶۔ قرآن و سنت کے اکثر احکام خاص حالات سے وابستہ تھے۔ اور وقتی اور ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۔ اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اور قرآنی احکام بھی اجتہاد کے زیر اثر ہیں۔ جن میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ وحی ایک واردات قلبی اور نبیؐ کے شعور کی آواز ہے۔

۹۔ جبرائیل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود نہ تھا۔ یہ سب خیالات دوسری تیسری صدی کی پیداوار ہیں۔

۱۰۔ حضورؐ کی حیثیت صرف ایک اخلاقی مصلح کی تھی۔

۱۱۔ پیغمبر ایک عرب قوم کی تشکیل میں مصروف رہے اور قوانین بنانے کے لئے انہیں فرصت نہ مل سکی۔

۱۲۔ معراج ایک افسانہ ہے جو زمانہ مابعد میں تراشا اور عقیدہ رفع مسیح سے مستعار لیا گیا۔

۱۳۔ قرآنی قصص محض بے بنیاد کہانیاں ہیں۔

۱۴۔ حدیث کا بیشتر ذخیرہ خود ساختہ اور موضوعی ہے۔

۱۵۔ اسلامی قانون میں حدیث کو حجت نہیں بتایا جا سکتا۔

۱۶۔ حضورؐ نے پنجگانہ نمازوں اور ان کے احکام کی کوئی واضح تعلیم نہیں دی پنجوقتہ نماز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ تک رائج نہ تھی، اور بعد کی اختراع ہے۔

۱۷۔ سنت نبویؐ کا اکثر حصہ قبل از اسلام کی رسومات پر مشتمل ہے۔ اور فقہاء نے روم، ایران اور یہود کی روایات لے کر سنت میں داخل کر دی ہیں۔

(ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سنت ان تمام فقہی قوانین سے عبارت ہے جو ان کے زعم میں مذکورہ اقوام اور ان کے قوانین سے مستعار ہیں)

۱۸۔ عہد جاہلیت میں جو سود رائج تھا وہ حرام ہے مطلق سود حرام نہیں۔

۱۹۔ صرف انگور سے تیار کی گئی شراب حرام ہے اس کے علا بیئر وغیرہ تمام اقسام

حلال ہیں۔

۲۰۔ نزولِ عیسیٰ کا عقیدہ عیسائیوں سے مستعار ہے۔

۲۱۔ یہی حال شفاعت اور خروجِ مہدی کے عقیدہ کا ہے۔

۲۲۔ اسلام کا خلا مغرب کی رہنمائی ہی سے پُر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نظریات کے یہ چند نمونے ہیں جن کا تانا بانا مستشرقینِ یورپ کی تحقیقات سے تیار ہوتا ہے۔ اور پھر وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہ ہے وہ اسلام جس کا ہیولیٰ سر سید احمد خان کے نیچریت، سید امیر علی اور طٰہٰ حسین کے اظہارِ معذرت جوزف شاخت اور گولڈ تسہیر کی تشکیک و تلبیس اور ولفریڈ اسمتھ (یہودی) کے نقشے کے مطابق اسلام کی منصوبہ جیسے عناصر سے تشکیل پا کر مسلمانوں کے سامنے تجدد و اصلاح کے دعوؤں کے ساتھ پیش ہو رہا ہے۔ اور اگر اہلِ حق علماء کی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے۔ تو وہ تنگ نظر، انتشار پسند، متعصب اور گردن زدنی قرار پاتے ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون فیالاسلام ولخیبۃ المسلمین۔ اللّٰھم انا نسئلك الثبات والاستقامۃ والتوفیق والسداد والعافیۃ۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

کتاب الاجتهاد والتقلید

کتاب الاجتہاد و التّقلید

(اجتہاد اور تقلید کے احکام و مسائل)

تقلید کی شرعی حیثیّت

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقلید کرنا شرک ہے، جو ائمہ اربعہؒ کی تقلید کرتا ہے وہ مشرک ہے، دریافت مسئلہ یہ ہے کہ تقلیدِ ائمہ اربعہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا واقعی تقلید کرنے سے ایک مسلمان مشرک ہوجاتا ہے؟

الجواب: تقلید کسی ماہرِ شریعت کی راہنمائی میں شریعتِ مقدسہ کی اتباع کا نام ہے، قرآنی آیات، احادیثِ نبویؐ اور صحابۂ کرامؓ کے حالات میں بھی عامی شخص کو کسی ماہرِ شریعت کی پیروی کا حکم ملتا ہے، اس لیے عامی آدمی کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنا واجب ہے اس سے شرک لازم نہیں آتا۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ : ان الاجماع انعقد علی عدم العمل بمذھب مخالفٍ لِلْاَربعۃ لانضباط مذاھبھم وانتشارھا وکثرۃ اَتباعھم۔

(الاشباہ والنظائر ج ۱ ص ۳۳۳ القاعدۃ الاولیٰ: الاجتہاد لاینقض بالاجتہاد)[1]

مجتہد اور مقلّد کے دلائل میں فرق

سوال:۔ ادلۃ المجتہد اور ادلۃ المقلّد میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مجتہد کسی مسئلہ کے اثبات کے لیے ادلۂ اربعہ سے استدلال کرتا ہے اور مقلّد اپنے مسئلہ کے لیے مجتہد کا قول پیش کرتا ہے، مقلّد چونکہ کتاب وسنت سے ناواقف ہوتا ہے اس لیے وہ ثبوتِ مسئلہ کے لیے دلیل نہیں لاسکتا۔

لما قال العلامۃ صدر الشریعۃ : وقولنا یتوصل بھا الیہ الظاھر ان ھٰذا

---

[1] قال العلامۃ عبد العزیز الفرھاری: ثم من لم یکن مجتھداً وجب علیہ اتباعِ المجتھد۔ (نبراس شرح شرح عقائد ص ۲۷ تقلید المجتہد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۶۶ کتاب القضاء۔

يختص المجتهد فان المجوث عنه فی ھٰذا العلم قواعد یتوصل المجتھد بھا الی الفقہ لیس الّا المجتھد فان الفقہ ھو العلم بالاحکام من الادلّۃ التی لیس دلیل المقلّد منھا فلھٰذا لم یذکر مباحث التقلید والاستفتاء فی لیتنا ولا یبعد ان یقال انہ یعم المجتہد والمقلّد فالادلّۃ الاربعۃ انما یتوصل بھا المجتھد لا المقلّد فاما المقلّد فالدّلیل عندہ قول المجتھد فالمقلّد یقول ھٰذا الحکم واقع عندی لانہ ادی الیہ رأی ابی حنیفۃ وکل ما ادی الیہ رأیہ فھو واقع عندی۔

(توضیح وتلویح ص۵ مقدمۃ) [۱]

سوال:- مذاہب اربعہ کو حق جانتے ہوئے قرآن وحدیث پر عمل کرنا

ایک شخص مذاہب اربعہ کو حق جانتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ جو کچھ قرآن وحدیث میں ہے اسی پر عمل کرنا چاہیئے، تو ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:- ایسا شخص دو حال سے خالی نہیں ہوگا یا تو مقلد ہوگا یا پھر مجتہد ہوگا، اب اگر وہ مقلّد ہے تو مقلّد پر تقلید واجب ہے، اور اگر مجتہد ہے تو وہ قرآن وسنت سے استدلال کر سکتا ہے، لیکن عصرِ حاضر میں چونکہ کسی میں بھی اجتہادِ مطلقہ کی صلاحیت موجود نہیں ہے اسلیے اس شخص کا خیال غلط ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ. وقد ذکروا ان المجتھد المطلق قد فقد۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۱ ص۷۷ مطلب فی طبقات الفقھاء) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وظیفۃ العوام التمسک بقول الفقھاء واتباعھم فی اقوالھم وافعالھم دون التمسک بالکتاب والسنۃ۔

(الفتاوٰی تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۳۶۷ مسائل وفوائد شتّٰی من الحظر والاباحۃ)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۵ کتاب الطھارۃ۔

[۲] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وقد ذکروا ان المجتھد المطلق قد فقد۔ قال السید احمد الطحطاوی (قولہٗ فقد) وھو جائز الوجود لان فضل اللّٰہ تعالٰی لا یتقید بزمن دون زمن۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج۱ ص۵۱ مقدمۃ)

دو مذاہب پر عمل کرنے کا حکم

سوال:۔ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا مقلد دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خروج عن المذہب میں چونکہ اتباع ھوٰی ہی ہوتا ہے اس لیے اگر کوئی شخص مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب پر عمل کر رہا ہو تو وہ اوّل مذہب کے ہوتے ہوئے دوسرے مذہب پر عمل نہیں کرسکتا اس کو اصطلاح میں تلفیق کہتے ہیں اور یہ باطل ہے تاہم اشد ضرورت کے وقت اپنے مذہب میں رہتے ہوئے دوسرے مذہب پر اہلِ علم حضرات فتویٰ دے سکتے ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قول الحصکفیؒ: وان الحکم الملفق باطل بالاجماع) مثاله متوضئ سال من بدنه دم ولمس امرأة ثم صلی فان صحة هٰذه الصلوٰة ملفقة من مذهب الشافعی والحنفی والتلفیق باطل فصحته (رد المحتار ج ۱ ص۵۷ مطلب فی حکم التقلید والرجوع عنه) لہ

موضع ضرورت میں دوسرے مذہب پر عمل کرنا

سوال:۔ کیا موضع ضرورت میں دوسرے مذہب پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موضع ضرورت میں دوسرے مذاہب پر عمل کرنا جائز ہے مگر اس ضرورت کا تعین اکابر علماء کریں گے، جیسے زوجہ مفقود الخبر میں امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ عند الضرورت دینا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وقد کان لبعض اصحابنا یفتون بقول مالک فی هٰذه الحالة للضرورة۔ (رد المحتار ج ۳ ص۵۰۹ کتاب المفقود، مطلب فی الافتاء بمذهب مالک) ایضاً قال لو افتی مفتٍ لشیٔ من هٰذه الاقوال للضرورة طلباً للتیسیر کان حسناً۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۲ مطلب لا یجوز العمل بالضعیف الخ) لہ

لہ قال العلامة الطحطاویؒ: متوضئ سال من بدنه دم ولمس امرأة ثم صلی الخ۔ (طحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص۵)۔ ومثله فی خلاصة التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق عبد الغنی النابلسی ص۷۔

لہ لما قال العلامة عبد العزیز الفرهاروی رحمه الله: اذا اشتدت الحاجة فیجوز الرجوع الی قاضی مذهب آخر یفتی بحاجته وهٰذه الفوائد مما تحفظ۔ (النبراس ص۳۲ تقلید المجتهد)

اہل الظاہر کے فتویٰ پر عمل کرنا

سوال:۔ کیا ایک حنفی کے لیے اہل الظاہر کے فتویٰ پر عمل کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک حنفی کا اہلِ حدیث کے فتویٰ پر عمل کرنا درست نہیں، کیونکہ اہل الظاہر (اہل حدیث) اصحاب الفتویٰ میں سے نہیں ہیں۔

لما قال العلامة الکیرانوی: قال ابوبکر الرازی الجصاص فی اصوله لا یعد بخلاف من لا یعرف اصول الشریعة ولم یرتض بطریق المقاییس ووجوہ اجتهاد الرائی کداود الاصفهانی (امام اهل الظاهر) والکرابیسی اضرابهما۔

(مقدمہ اعلاء السنن ج ۲ ص۱۸۵ الفائدة الثانیة لا یعتد بخلاف الظاهریة) ؎۱

امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں

سوال:۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعی ہیں یا تبع تابعی اور آپؒ نے کس صحابی کو دیکھا ہے؟

الجواب:۔ امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، اس زمانہ میں کافی تعداد میں صحابہؓ حیات تھے اس لیے آپؒ نے کئی صحابہ کی زیارت کی ہے جن میں حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں اس لیے آپؒ تابعی ہیں؎۲ اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔

لما قال ملا علی القاریؒ: قد ثبت رؤیته بعض الصحابة واختلف فی روایته عنهم والمعتمد ثبوتها...... فهو من التابعین الاعلام۔ (مقدمہ اعلاء السنن ج ۳ ص۷ الفصل الاول)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات کی تعداد

سوال:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سترہ حدیثوں

؎۱ قال العلامة ابن عابدینؒ: وقد استقر رای الاصولیین علی ان المفتی هو المجتهد فاما غیر المجتهد ممن یحفظ اقوال المجتهد فلیس بمفت والواجب علیه اذا سئل ان یذکر قول المجتهد کالامام علی وجه الحکایة۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۹ مطلب رسم المفتی)

وَمِثْلُهٗ فی الطحطاوی علی در المختار ج۱ ص—

؎۲ قال العلامة ابن الجوزی رحمه الله: انما رأی انس بن مالك بعینه

(العلل المتناهیة ج۱ ص۱۲۸ باب الکفالة برزق التفقه)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۱ ص۶۲ مطلب فی اختلف فیما من روایة الامام عن الصحابةؓ۔

سے زیادہ نہیں جانتے تھے، جیسا کہ ابن خلدونؒ نے ذکر کیا ہے؟

الجواب:۔ جو کوئی بھی یہ کہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سترہ حدیثوں سے زیادہ نہیں جانتے تھے وہ غلط کہتا ہے اور اس کا یہ کہنا مندرجہ ذیل وجوہات سے **باطل** ہے:۔

(۱) امام ابوحنیفہؒ باتفاقِ اُمت مجتہد ہیں اور خود ابن خلدونؒ کا کہنا ہے کہ مجتہدین کا استنباط قرآن وسُنّت سے ہوتا ہے۔ تو اگر کوئی سترہ حدیثوں سے مجتہد بن سکتا تو آج ہر اہلِ حدیث مجتہد ہوتا۔

لما قال ابن خلدونؒ: ولاسبیل الی هٰذا لمتقد فی کبار الاسمه ملان الشریعة انما تؤخذ من الکتاب والسنة۔ (مقدمہ ابن خلدون ج ۱ ص ۳۷۱)

(۲) ابن خلدونؒ نے یہ قول یقال سے ذکر کیا ہے جو صیغہ تمریض ہے پھر خود ہی اس کا ردّ بھی کیا ہے۔

(۳) صرف امام یوسفؒ نے "کتاب الآثار" میں امام ابوحنیفہؒ کی روایات کی تعداد ۱۰۶۷ ذکر کی ہے۔

(۴) امام ابوحنیفہؒ کی اپنی مسند موجود ہے جس میں ہزاروں روایات درج ہیں۔

(۵) امام ذہبیؒ نے آپؒ کو حفاظ میں ذکر کیا ہے اور حافظ وہ ہوتا ہے جو ایک لاکھ حدیثیں جانتا ہو۔

(۶) وقال محمد بن سماعةؒ: ان الامام ذکر فی تصانیفه نیفا وسبعین الفاً حدیث وانتخب الآثار من اربعین الف حدیث۔

(مقدمات اعلاء السنن ج ۱ ص ۱۹۲ الفصل التاسع فی تراجم ائمتنا الثلاثة)

اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر اس قسم کا بے جا اعتراض کرنا بغض وحسد کی علامت ہے۔

صحاح ستہ میں امام ابوحنیفہؒ کی روایات

سوال:۔ صحاح ستہ خاص کر بخاری ومسلم میں امام ابوحنیفہؒ سے روایات کیوں منقول نہیں ہیں؟

الجواب:۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کام روایات سے مسائل کا استنباط تھا، نہ کہ محض روایات بیان کرنا۔ فقہی استنباطات میں شبانہ روز مشغولیت کی وجہ سے آپؒ سے

روایات کثرت موجود نہیں، نیز یہ بھی واضح ہو کہ بخاری و مسلم نے جس طرح امام ابو حنیفہؒ کی روایات کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس طرح امام شافعیؒ کی بھی کسی روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور امام الحدیث احمد بن حنبلؒ کی صرف دو روایات موجود ہیں وہ بھی ایک تعلیق اور دوسری نازل بواسطہ۔

لما قال العلامة الکوثریؒ: ومما یلتفت ان شیخین لم یخرجا فی الصحیح شیئاً من حدیث الامام ابی حنیفةؒ مع انہما ادرکا صغار اصحاب اصحابه واخذا عنہم ولم یخرجا ایضاً من حدیث الامام الشافعیؒ مع انہما لقیا بعض اصحابه ولا اخرج البخاریؒ من حدیث احمدؒ الا حدیثین احدہما تعلیقا والآخر بواسطة مع انه ادرکه الائمة۔ (التعلیق علی شروط الائمة الستة ص۸۱)

"میزان الاعتدال" کی عبارت کی تحقیق

سوال:- علامہ ذہبیؒ نے اپنی مشہور کتاب "میزان الاعتدال" میں امام ابو حنیفہؒ کو ضعفا میں شمار کیا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "میزان الاعتدال" میں امام ابو حنیفہؒ کو ضعیف کہا گیا ہے وہ غلطی پر ہیں، علماء احناف نے اس کے مندرجہ ذیل جوابات ذکر کیے ہیں:-

(۱) اول تو یہ کہ یہ عبارت علامہ ذہبیؒ کی نہیں ہے بلکہ کتاب میں بعد میں داخل کر دی گئی ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ (بعد تحقیق): فقد تصافرت الادلة علی ان ترجمة ابی حنیفةؒ فی المیزان انہا الحقت فی بعض النسخ بغیر قلم مؤلفه۔ (مقدمه اعلاء السنن ج ۱ ص۱۳۵ ثبوت العدالة بالاستفاضة

وان هذه العبارة لیست لها اثر فی بعض النسخ المعتبرة علی ما رأیتها بعین نقلا من الامام عبد الحی اللکهنویؒ ما تمس الیه الحاجة۔ (ص۲۷ مقدمة ابن ماجة)

(۲) اور خود علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہؒ اور امام ابو حنیفہؒ کو انکی جلالتِ شان کی وجہ سے میزان الاعتدال میں ذکر نہیں کیا ہے۔ کذلا اذکر فی کتابی من الائمة المتبوعین فی الفروع احدا لجلالتهم فی الاسلام وعظمتهم فی النفوس مثل ابی حنیفةؒ والشافعیؒ۔ (میزان الاعتدال ج ۱ ص۲)

(۳) یہ جرح مبہم ہے جو کہ قبول نہیں۔ انما الجرح فانه لایقبل الا مفسرا مبینا بسبب الجرح۔ (اعلاء السنن ج ۱ ص۱۰۱، تدریب الراوی ج ۱ ص۳۰۵

پاکستان میں دوسرے مذاہب کی تقلید کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا پاکستان میں علاوہ مذہب حنفی کے مذہب شافعی یا دوسرے مذاہب کی تقلید کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ یہاں ان پر عمل کرنے سے فتنہ و فساد کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے اور نہ ہی یہاں ان مذاہب کو کوئی جانتا ہے؟

الجواب:۔ مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کی حقانیت پر پوری امت کا اجماع ہے مگر یہاں جو مذہب رائج ہو اسی کی تقلید کی جائے گی دوسرے مذہب کی تقلید نہیں کی جائے گی، خصوصاً اس وقت جبکہ فتنہ و فساد کا خطرہ ہو کیونکہ دوسرے مذہب کی تقلید کرنا جائز نہیں۔

لما قال الشیخ شاہ ولی اللہ الدهلویؒ: فاذا کان جاهل فی بلاد الهند و بلاد ماوراء النهر ولیس هناک عالم شافعی ولا مالکی ولا حنبلی ولا کتاب من کتب هذه المذاهب وجب علیه ان یقلد لمذهب ابی حنیفة ویحرم علیه ان یخرج من مذهبه لانه حینئذ یخلع من عنقه ربقة الشریعة ویبقی سدی مهملاً۔

(الانصاف مع کشاف ص۷۰، ۷۱، ہندوستان میں جاہل پر تقلید ابوحنیفہؒ واجب ہے)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مقلد تھے

سوال:۔ ہم نے بعض علماء سے سنا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ مقلد نہیں تھے کیا واقعی حضرت شاہ صاحبؒ مقلد نہیں تھے؟

الجواب:۔ یہ کہنا درست نہیں کہ حضرت شاہ صاحب مقلد نہیں تھے، بلکہ شاہ صاحب رحمہ اللہ باوجود صلاحیت اجتہاد کے مقلد تھے بلکہ آپؒ کو تقلید سے خروج پر ممانعت کی گئی تھی، چنانچہ آپؒ خود فرماتے ہیں:۔

واستفدت منه صلی اللہ علیه وسلم ثلثة امور خلاف ما کان عندی وما کانت طبعی تمیل الیه اشد میل فصارت هذه الاستفادة من براهین الحق تعالیٰ علی ۔۔۔۔ وثانیها الوصاة بالتقلید بهذه المذاهب۔

(فیوض الحرمین ص۶۴، ۶۵)

مذہب حنفی موافق السنۃ ہے

سوال:۔ آجکل غیر مقلد حضرات عوام میں یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ مذہب حنفی خلاف سنت ہے کیونکہ

یہ لوگ نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے جبکہ رفع الیدین کرنا سنت ہے، اور یہ لوگ قرأۃ فاتحہ خلف الامام کے بھی قائل نہیں جبکہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام سنت ہے، اس کے علاوہ بھی بعض ایسے اقوال کہہ دیتے ہیں، تو کیا واقعی مذہبِ حنفی خلافِ سُنت ہے؟

الجواب:۔ مذہبِ حنفی کے بارے میں یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے، یہ مذہب دوسرے مذاہب سے سنت کی پیروی میں زیادہ قریب ہے۔ جہاں تک مذکورہ مسائل کا تعلق ہے تو اگرچہ رفع الیدین اور قرأۃ فاتحہ خلف الامام وغیرہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات منقول ہیں مگر ترکِ رفع الیدین وغیرہ کی روایات بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہیں اور یہ روایات بہ نسبت دوسری روایات کے زیادہ قوی ہیں اس لیے حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے بارے میں ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔

قال الشیخ الشاہ ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ: وعرفنی رسول اللہ علیہ وسلم انّ فی المذھب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنّۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری وأصحابہ۔ (فیوض الحرمین ص۴۸)

مذاہبِ اربعہ کی مخالفت کا حکم

سوال:۔ آجکل غیر مقلد اور دیگر جماعتوں کے لوگ مذاہبِ اربعہ اور ان کی تقلید کو شرک کہتے ہیں اور انکی مخالفت کرتے ہیں۔ تو کیا مذاہبِ اربعہ کی مخالفت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چاروں مذاہب پر علماء امت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے ان سے خروج کرنا اور ان کی مخالفت کرنا صحیح نہیں بلکہ موجبِ گناہ ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: وما خالف الائمۃ الاربعۃ فھو مخالف للاجماع۔
(الاشباہ والنظائر ص۱۳۱) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ احمد المعروف بملاجیون رحمہ اللہ: وقد وقع الاجماع علی ان الاتباع انما یجوز للاربع ------ وکذا لا یجوز الاتباع لمن حدث مجتھداً مخالفاً لھم۔
(التفسیرات الاحمدیۃ ص۳۴۶ سورۃ آل عمران)
وَمِثْلُہٗ فی التفسیر المظھری ج۲ ص۶۴ سورۃ آل عمران۔

مذاہب اربعہ کے علاوہ مذاہب کی تقلید کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! عصر حاضر میں مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی تیئے مذہب کی تقلید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- علماء کرام کی تصریحات کی روشنی میں زمانہ حال میں مذاہب اربعہ کے علاوہ دوسرے کسی مذہب پر عمل پیرا ہونا جائز نہیں، اس لیے کہ کوئی ایسا شرعی جزئیہ نہیں ہے جس کے بارے میں ان مذاہب نے تصریح نہ کی ہو۔

لما قال العلامة الشيخ احمد الطحطاوی رحمہ اللہ: فعليكم يا معشر المؤمنين باتباع الفرقة الناجية المسماة باهل السنة والجماعة فان نصرته فی موافقتهم و خذلانه وسخطه ومقته فی مخالفتهم وهذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم فی المذاهب الاربعة هم الحنفيون والمالكيون والشافعيون والحنبليون ومن كان خارجاً من هذه المذاهب الاربعة ذلك الزمان من اهل البدعة والنار۔ (الطحطاوی علی الدر المختار ج۴ ص۱۵۳ کتاب الذبائح) [1]

اجتہاد کا دروازہ کھلا ہونے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! کیا اس دور میں بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن و سنت سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب :- اجتہادِ مطلق کا سلسلہ ائمہ اربعہ پر ختم ہو چکا ہے، آجکل کسی میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اجتہادِ مطلق کے درجے تک پہنچ سکے، البتہ اجتہاد فی المسائل کی اب بھی اجازت ہے مگر جو شخص نئے مسائل میں اجتہاد کرتا ہو اُس میں

---

[1] قال العلامة ابن الهمام رحمہ اللہ: وعلى هذا ما ذكر بعض المتأخرين منع التقليد غير الاربعة لانضباط مذاهبهم وتقييد مسائلهم وتخصيص عمومها ولم يدر مثله فی غيرهم الآن لانقراض اتباعهم وهو صحيح۔ (التحرير فی اصول الفقه ص۵۵۲ بحواله فتاوی رحیمیه ج۱ ص۸۹ کتاب العلم)

ومثله فی فتاوی رحیمیه ج۱ ص۹۰ کتاب العلم۔

اجتہاد کی صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے بدون اس کے اجتہاد کی اجازت نہیں ۔

قال العلامة النووی ؒ : اما الاجتهاد مطلق فقالوا اختتم بالائمة الاربعة حتی اوجبوا تقليد واحد من هؤلاء على امته ونقل امام الحرمين الاجماع عليه۔ (روضة الطالبين بحواله فتاوی رحیمیة ج ۴ ص ۱۲۶ کتاب العلم) له

صحابہ کرام ؓ کے دور میں تقلید کا مسئلہ

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! جیسا کہ آجکل مذاہب اربعہ کی تقلید کی جاتی ہے اسی طرح صحابۂ کرام ؓ کے زمانے میں بھی تقلید ہوا کرتی تھی یا یہ کہ سب صحابہ ؓ اپنے اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے ؟

الجواب :۔ صحابۂ کرام میں بھی دو قسم کے لوگ تھے، بعض مجتہد اور بعض مقلد، توجس طرح اس زمانہ میں اجتہاد رائج تھا اسی طرح مجتہد صحابہ کرام ؓ کی تقلید بھی ہوا کرتی تھی، غیر مجتہد صحابۂ کرام ؓ دوسرے مجتہد صحابہ ؓ کی تقلید کر کے ان کے فتویٰ پر عمل کرتے تھے۔

عن سالم قال سئل ابن عمر عن رجل يكون له الدين على

له قال العلامة قاری محمد طیب ؒ : باقی میں عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط علل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لیے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے، ائمہ نے اس کو اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تحقیق و تلاش کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔۔۔ ۔۔۔۔ ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنسِ اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش، کتاب وسنت میں تدبر، ان کے لطائف وحقائق کا استخراج ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا، معاندین اسلام کے نئے نئے تشکیک و شبہات کی تردیدات، نصوص سے استنباط کرنا اصولِ اسلام کے اثبات وتحقیق کے لیے کتاب وسنت سے مؤیدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے، اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

{ اجتہاد اور تقلید ص ۵۹ تا ص ۶۴
اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے }

الرجل الیٰ اجل فیضع عنه صاحب الحق یعجله الآخر فکرہ ذٰلك عبد الله بن عمر ونھی عنه ۔ (موطا امام مالکؒ ص۲۷۲ کتاب البیوع ۔ باب ماجاء فی الربا فی الدین)

مجتہد کو خطاء پر بھی اجر ملتا ہے

سوال:۔ اگر مجتہد کسی مسئلہ میں اجتہاد کر کے اس میں خطا کر جائے تو کیا وہ عند اللہ ماخوذ ہو گا یا ماجور ؟

الجواب:۔ جب کوئی مجتہد کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور وہ مسئلہ صواب اور درست ہو جائے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا اور جب خطا کر جائے تو عند اللہ اُسے ایک نیکی ملے گی ۔

لما قال النبی صلی الله علیه وسلم : اذا حکم الحاکم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حکم فاجتهد ثم اخطاء فله اجر واحدؒ ۔

(الصحیح البخاری ج ۲ ص۱۰۹۲ باب اجر الحاکم)

مجتہدین کے اقوال پر فتویٰ دینے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جو عالم دین خود مجتہد نہ ہو یعنی قرآن وسنت سے بلا واسطہ استنباط نہ کر سکتا ہو تو فتویٰ دیتے وقت اس کو کیا کرنا چاہیئے ؟

الجواب:۔ جو عالم دین مفتی تو ہو لیکن درجہ اجتہاد کو نہیں پہنچا ہو تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے امام کی روایت اور اس کے مذہب کو نقل کر کے فتویٰ دے ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وان الخلاف خاص بالقاضی المجتهد واما المقلد

لہ قال الشیخ الشاہ ولی الله الدهلویؒ : لان الناس لم یزالوا من زمن الصحابة الیٰ ان ظهرت المذاهب الاربعة یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر من احد یعتبر انکارہ ولو کان ذٰلك باطلا لانکروہ ۔

(عقد الجید مع سلك مروارید ص۲۹ آخر باب دوم)

وَمِثْلُهٗ فی اجتهاد وتقلید ص۵۴ صحابہؓ میں بھی تقلید رائج تھی ۔

فلا ینفذ قضاؤہ بخلاف مذہبہ اصلاً کما فی القنیۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ صـ۵۲ مطلب فی حکم التقلید والرجوع عنہ) لہ

تقلید مذاہب اربعہ کا احادیث سے ثبوت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا ایک دوست بسلسلہ روزگار کئی سالوں سے کراچی میں مقیم ہے، جب وہ گاؤں سے کراچی جا رہا تھا تو صحیح سُنّی مسلمان تھا اب کراچی میں رہتے ہوئے اس کے نظریات بدل چکے ہیں، اب وہ یہ کہتا ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید کرنا شرک ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، آپ سے گذارش یہ ہے کہ کیا واقعی مذاہب اربعہ کی تقلید شرک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کوئی ثبوت نہیں؟

الجواب:۔ مذاہب اربعہ کی تقلید کو شرک کہنا لاعلمی اور جہل ہے، غیر مُقلّدین کے علاوہ کسی نے بھی اس کو شرک نہیں کہا ہے بلکہ اسی پر اُلٹا امت کا تعامل چلا آرہا ہے قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی کی کثیر تعداد تقلید کے اثبات کی تائید کرتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: اتبعوا السواد الاعظم۔ (الحدیث)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: ولما اندرست المذاہب الحقۃ الا ھٰذہ الاربعۃ کان اتباعھا اتباعاً للسواد الاعظم۔

(عقد الجید مع سلک مروارید صـ۳۳ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی الخ)

لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا غلط ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید شرک ہے اور یہ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

لہ قال ابو حفص قال لی ابو اسحاق لما جلستُ فی جامع المنصورؒ للفتیا ذکرتُ ھٰذہ المسئلۃ (ای مسئالۃ حفظ اربعمائۃ حدیث للفتیا) فقال لی رجلٌ! فانت ھو ذا لا تحفظ ھٰذا المقدار حتیٰ تفتی للناس؛ فقلت لہٗ عافاک اللہ ان کنتُ لا اَحفظ ھٰذا المقدار فانی ھوذا افتی الناس بقول من کان یحفظ ھٰذا المقدار واکثر منہ ھٰذا یرشدک الی انہ اذا لم یکن الرجل من اھل الفتوٰی والاجتھاد فعلیہ ان یفتی بقول المجتھد۔

(مقدمۃ اعلاء السنن صـ۹/۲۲ شرائط الافتاء، قواعد الفقہ)

شاہ اسماعیل شہیدؒ مقلد تھے

سوال :۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ غیر مقلد تھے، ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی بھی انہوں نے تقلید نہیں کی، تو کیا ان لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ بڑے بلند پایا عالم دین تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ صلاحیت عطا فرمائی تھی کہ وہ براہِ راست قرآن وسنت سے مسئلہ حل کرسکتے تھے مگر جہاں آپ کو صریح نص نہ ملتی تھی وہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل کرتے تھے، جیساکہ آپ کی تصانیف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اس لیے ان لوگوں کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مقلد نہ تھے۔

لما قال الشیخ رشید احمد گنگوہیؒ : بندہ نے جو کچھ سُنا ہے مولانا مرحوم کا حال وہ یہ ہے کہ جب تک حدیث صحیح غیر منسوخ ملی اس پر عمل کرتے اگر نہ ملتی تو امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے تھے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، تالیفاتِ رشیدیہ ص۲۰۹ تقلید واجتہاد کے مسائل)

اجماع وقیاس کی شرعی حیثیت

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! آجکل کے غیر مقلد حضرات اجماعِ اُمت اور قیاس کو حجتِ شرعی نہیں مانتے اور نہ ان سے ثابت شدہ مسائل مانتے ہیں۔ تو کیا واقعی اجماعِ امت اور قیاس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں؟

الجواب :۔ اسلامی احکامات کا استنباط ادلہ اربعہ سے ہوتا ہے جن میں اجماع اور قیاس بھی شامل ہے، نصوصِ قرآنیہ، احادیثِ صحیحہ اور آثارِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے یہی ثابت ہے، ان کو دلیلِ شرعی نہ ماننا جہلِ مرکب ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، تالیفاتِ رشیدیہ ص۲۰۵ تقلید واجتہاد کے مسائل)

مقلدین کو مشرک کہنے والے کے ایمان کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں جماعت المسلمین سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ہے جو سب مقلدین کو مشرک کہتا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام کا مقلد ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ مطلق تقلید قرآن وسنت سے ثابت ہے اور خیر القرون سے اس پر

تعامل چلا آرہا ہے جو شخص تقلید کو شرک کہتا ہے اور ائمہ اربعہ کے مقلدین کو مشرک اور دائرۂ اسلام سے خارج تصور کرتا ہے خود اس کے ایمان کی سلامتی مخدوش ہے اس کو ایسے الفاظ پر تلفظ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ المفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ:۔ جو شخص کہ تقلید کو شرک کہے وہ خود خاطی ہے اور اگر تمام مقلدین کو مشرک بنائے تو اس کے ایمان کی سلامتی مخدوش ہے، اسکے پیچھے نماز بھی نہیں ہوتی، کیونکہ مطلق تقلید کا ثبوت قرآن مجید اور احادیث صحیحہ اور اقوالِ صحابہؓ اور تعاملِ سلفؒ سے یقینی طور پر موجود ہے اور تقلیدِ شخصی کا جواز بھی قرآن و حدیث و اقوالِ صحابہؓ و تعاملِ سلفؒ سے ثابت ہے، پس اس کو شرک کہنا جہالت ہے۔

(کفایت المفتی ج ۱ ص۳۲۵ کتاب العقائد، تقلید واجتہاد)

مذاہب اربعہ قرآن وسنت کے موافق ہیں

سوال:۔ آجکل جو چار مذاہب مسلمانوں میں رائج ہیں، بعض لوگ حنفی، بعض شافعی اور بعض حنبلی اور بعض مالکی ہیں، ان میں سے کون سا مذہب قرآن وسنت کے موافق ہے؟ کیونکہ غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ مذاہبِ اربعہ قرآن وسنت کے موافق نہیں ہیں، ان کے اس قول کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب:۔ اصول اور مبادی دین میں سارے ائمہ اسلام متفق ہیں، اصول عقائد میں ان کا کوئی اختلاف نہیں، البتہ فروعی جزئیات میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر یہ اختلاف اصل اسلام میں نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں مختلف اعمال منقول ہوئے ہیں، ان کی مختلف مدارج کی ترتیب معلوم نہ ہوتے یا تسلیم نہ کرنے یا مختلف مواقع اور مقاصد پر محمول کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور اسی طرح بعض غیر منصوص مسائل کے حل میں دماغی تناسب اور رجحانات کے اختلاف کی وجہ سے بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ یا پھر عربی لغت کے کثیر المعانی لفظ کے تعین میں اختلاف کی بناء پر ائمہ اربعہ میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ اس قسم کے اختلافات سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شرائع میں بھی اس قسم کا اختلاف تھا، صحابہ کرامؓ میں بھی فروعی مسائل میں اختلاف تھا، اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کے بارہ میں فرمایا ہے کہ اختلاف الامتی رحمۃ کہ امت کے ائمہ کا اختلاف رحمت ہے۔ لہٰذا مذاہبِ اربعہ حق پر ہیں کوئی بھی باطل پر نہیں۔

كتاب البدعة والرسوم

کتاب البدعۃ والرّسوم

(بدعت اور رسومات کے احکام ومسائل)

بدعت کی تعریف

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بدعت کی جامع ومانع تعریف کیا ہے، آجکل بعض لوگ ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں؟

الجواب:۔ بدعت کا لغوی معنیٰ ہے الاحداث یعنی نئی چیز پیدا کرنا، شریعت کی اصطلاح میں اس کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں، ان تمام تعریفات میں جامع و مانع تعریف وہ ہے جو علامہ ابن رجبؒ اور دوسرے محققین نے بیان کی ہے کہ بدعت شرعاً وہ عمل ہے جس کی دینِ مقدس میں کوئی بنیاد نہ ہو، اس تعریف سے بہت سے وہ اعمال جن کو بعض حضرات بدعت کہتے ہیں خارج ہو جائیں گے۔

لما قال العلامۃ ابن رجب الحنبلیؒ: والمراد بالبدعۃ ما احدث مما لا اصل لہٗ فی الشریعۃ یدل علیہ واما ما کان لہٗ اصل من الشرع یدل فلیس ببدعۃ شرعاً وان کان بدعۃ لغۃ۔ (کتاب جامع العلوم والحکم ص۲۳۳ الحدیث الثامن والعشرون)

بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی تحقیق

سوال:۔ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ میں فرق کی وضاحت فرمائیں، بعض لوگ بدعت کی اس تقسیم (حسنہ وسیئہ) کو نہیں مانتے، جبکہ ہم نے اکثر علماء سے بدعت کی یہی تقسیم سنی ہے؟

الجواب:۔ بدعتِ اصطلاحی وشرعی ہر صورت میں قبیح و مذموم ہے، البتہ بدعتِ لغوی اپنی بعض اقسام کے اعتبار سے بدعت حقیقی (شرعی) نہیں رہتی بلکہ بدعتِ صوری بن

لہ قال العلامۃ القرطبی رحمہ اللہ: کل بدعۃ صدرت من مخلوق فلا یخلو ان یکون لہا اصل فی الشرع اولا فان کان لہا اصل کانت واقعۃ تحت ما ندب اللہ الیہ وحض رسولہ الیہ فہی فی حیز المدح وان لم یکن مثالہٗ الخ۔

(احکام القرآن للقرطبیؒ ج۱ ص۸۷ سورۃ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی صفوۃ التفاسیر ج۱ ص۹۲ سورۃ البقرۃ۔

جاتی ہے، اور بدعت کی یہ صورت مشابہ سنت ہونے کی وجہ سے بدعتِ حسنہ کہلاتی ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جو امر کلیاً یا جزئیاً دین میں نہ ہو اس کو کسی شبہ سے جزوِ دین علماً وعملاً بنا لینا بوجہ مزاحمت احکامِ شرعیہ کے بدعت ہے دلیل اس کی حدیثِ صحیح ہے من احدث فی امرنا ھٰذا مالیس منہ فھو ردٌّ۔ کلمہ من اور فی اس مدعا پر صاف صاف دلالت کر رہے ہیں اور حقیقی بدعت ہمیشہ سیئہ ہی ہو گی اور بدعتِ حسنہ صوری بدعت ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۵ ص۲۸۵ کتاب البدعات)[1]

بدعت للدّین کے جواز کا حکم

سوال:- بدعت فی الدین اور بدعت للدین میں کیا فرق ہے؟ نیز وہ کون سا اصول یا ضابطہ ہے کہ جس کے ذریعے ہر دو بدعت میں تفریق وتمیز ہو سکے؟

الجواب:- اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی سب ضروری باتیں قرآن وحدیث میں بندوں کو بتا دی ہیں، اب دین میں کوئی نئی بات نکالنا جو دینِ متین میں داخل نہیں ہے اور لوگ اس کو دین سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہوں تو ایسی نئی بات کو بدعت فی الدین اور احداث فی الدین کہا جاتا ہے اور اسی کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے، اور اس کے برعکس وہ امر جس کی اصل دینِ متین میں موجود ہو تو وہ بدعت للدین کے زمرے میں آتا ہے اور اس کو فقہاء کرام نے بعض شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: بدعت کی حقیقت تو یہ ہے کہ اس کو دین سمجھ کر اختیار کرے، اگر معالجہ سمجھ کر اختیار کرے تو بدعت کیسے ہو سکتا ہے، پس ایک احداث للدین ہے اور ایک احداث فی الدین ہے، احداث للدین معنیً سنت ہے اور احداث فی الدین بدعت ہے۔ (تحفۃ العلماء ج۲ ص۱۴۰ فقہ حنفی کے اصول وضوابط، الباب السادس سنت کی تعریف)

---

[1] قال العلامۃ ابن حجر العسقلانیؒ: والتحقیق انھا ان کانت مما تندرج تحت مستحسن فی الشرع فھی حسنۃ وان کانت من ما تندرج تحت مستقبح فی الشرع فھی مستقبحۃ والا فھی من قسم المباح وقد تنقسم الی الاحکام الخمسۃ۔ (فتح الباری ج۴ ص۲۱۹ کتاب صلوٰۃ التراویح)
وَمِثْلُہٗ فی المنہاج الواضح بحوالہ راہِ سنت ص۹۸)

قبر پر اذان دینے کا حکم | **سوال:۔** بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کو لحد میں رکھ کر اس پر پتھر رکھنے کے بعد اور مٹی ڈالنے سے پہلے اذان دی جاتی ہے، اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قبر پر اذان دینا اذان کے مواقع میں سے نہیں جبکہ اذان کے مواقع شرعاً معین ہیں، لہٰذا اس کا خلافِ شریعت اور بدعت ہونا ظاہر ہے، اس لیے اس سے اجتناب کیا جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت (دفن المیت) لایسن الاذان عند ادخال المیت فی قبرہ کما ھو المعتاد الآن۔ وقد صرح ابن الحجرؒ فی فتاویٰ بانہٗ بدعة وقال ومن ظن انہٗ سنت قیاساً علیٰ ندبہا للمولود الحاقاً لخاتمة الامر۔

(رد المحتار ج۱ ص۲۵۸ باب الاذان) [1]

میت کو غسل دینے سے پہلے تعزیت کرنے کا حکم | **سوال:۔** بعض علاقوں میں رواج ہے کہ میت کو غسل دینے اور تجہیز و تکفین سے پہلے کچھ لوگ میت کے پسماندگان سے تعزیت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: میت کے پسماندگان سے تعزیت کرنا اس وقت مسنون ہے جب وہ تعزیت کے لیے بیٹھ جائیں، خواہ وہ میت کو دفن کرنے سے پہلے بیٹھ جائیں یا بعد میں، البتہ تعزیت کے لیے بیٹھنے سے قبل میت کی تدفین کا کام مکمل کیا جائے اور یہی بہتر ہے، تاہم اگر دفن کرنے سے پہلے یا بعد میں تعزیت کرنے سے میت کے پسماندگان پریشان ہوتے ہوں تو پھر تعزیت کرنا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة: وھی بعد الدفن اولیٰ منها قبله۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۶۷ کتاب الجنائز، یتصل بذٰلک المسائل)

قال العلامة ابن عابدینؒ: وقال کثیر من متاخرین ائمتنا یکرہ الاجتماع

---

[1] قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: بہرحال بوجہ عدم ثبوت بالدلیل شرعی کے یہ عمل بدعت ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۵ ص۳۰۲ کتاب البدعات)

عند صاحب البیت ویکرہ له الجلوس فی بیته حتی یأتی الیه من یعزی بل اذا فرغ ورجع من الدفن فلیتفرقوا ویشتغل الناس با مورھم وصاحب البیت بأمرہ اھ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۶۰۳ کتاب الجنائز) ؎۱

تین دن کے بعد تعزیت کرنا

سوال:۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی کے ہاں میت ہو جانے کے بعد تین دن حجرے یا مسجد میں تعزیت کے لیے بیٹھتے ہیں، کیا شرعاً تین دن تک تعزیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور تین دن کے بعد تعزیت کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ مقیم لوگوں کے لیے تین دن تک میت کے پسماندگان سے تعزیت کرنا جائز ہے، البتہ غائب آدمی جس نے کسی قسم کی تعزیت نہ کی ہو واپسی کے وقت کر سکتا ہے اگرچہ کافی عرصہ کے بعد واپس آئے۔

لما فی الهندیة: وقتها حین یموت الی ثلاثة ایام ویکرہ بعدها الا ان یکون المعزی او المعزی الیه غائبًا فلا بأس بها۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۶۷ کتاب الجنائز، فصل فی التعزیة) ؎۲

روٹی کو چھری سے کاٹنے کی رسم کا حکم

سوال:۔ آجکل یہ رسم عام ہے کہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر لوگ روٹی اور گوشت وغیرہ کو چھری سے کاٹ کر کھاتے ہیں، اس رسم کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟

الجواب:۔ مناسب اور بہتر یہ ہے کہ حتی الامکان روٹی یا گوشت وغیرہ چاقو یا چھری

؎۱ قال العلامة وهبة الزحیلی: وهی بعد الدفن افضل منها قبله لان اهل المیت مشغولون بتجهیزہ وحشهم بعد الدفن لفراقه اکثر۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۵۴۳ المطلب الثالث التعزیة الخ)

؎۲ قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الاحکام عن خزانة الفتاوی الجلوس فی المصیبة ثلاثة ایام للرجال جاءت الرخصة فیه ولا تجلس النساء قطعًا۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۶۰۳ کتاب الجنائز)

سے کاٹ کر نہ کھایا جائے، ایک مسلمان کے لیے روٹی کا ادب و احترام کرنا ضروری ہے، لیکن شادی بیاہ یا دیگر تقریبات کے مواقع پر ایسا کرنا (یعنی چاقو، چھری سے روٹی وغیرہ کاٹ کر کھانا) مخصوص اور جائز ہے اور جو روایت منع کے بارے میں مشہور ہے وہ شرعاً صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابن الجوزی رحمہ اللہ: قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يقطع الخبز بالسكين وقال اكرموه فان الله عزوجل قد اكرمه۔ قال ابن الجوزیؒ قال دارقطنی تفرد به نوح وهو متروك وكذلك قال مسلم بن الحجاج و ابو حاتم الرازی هو متروك۔ وقال يحيى نوح لا يكتب حديثه ليس بشئ۔ وقال ابن حبان لا يجوز الاحتجاج به۔ (الموضوعات ج۲ ص۲۹۱ باب فصل الخبز)

تعزیت کیلئے مناسب جگہ بیٹھنا چاہیئے

سوال: بعض لوگ تعزیت کیلئے راستوں میں دریاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ حجروں اور مساجد کو استعمال کرتے ہیں، اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز تعزیت میں کیا الفاظ کہنے چاہئیں؟

الجواب: کسی مسلمان کی وفات پر اس کے پسماندگان سے تعزیت کرنا سُنت ہے اس کے لیے جو جگہ مناسب ہو استعمال کی جا سکتی ہے یعنی ایسی جگہ ہو جہاں تعزیت میں بیٹھنے والوں اور آنے والوں کو تکلیف نہ ہو، البتہ راستوں اور دروازوں میں بیٹھنا بُری بات ہے اور اس کو لازم سمجھنا بدعت ہے۔

لما فی الهندية: ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا فی البيت او فی مسجد ثلاثة ايام والناس يأتونهم ويعزونهم ويكره الجلوس على باب الدار وما يصنع فی بلاد العجم من فرش البسط والقيام على قوارع الطرق من اقبح القبائح، كذا فی الظهيرية۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۶۷ كتاب الجنائز فصل فی التعزية)[1]

تعزیت میں صبر کرنے، غم بھلانے اور حوصلہ سے کام لینے کے الفاظ استعمال کرنا مناسب ہے بہتر کلمات یہ ہیں: ان الله ما اخذ وله ما اعطى وكل شئ عنده باجل مسمّى۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۶۷ فصل فی التعزية)

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلی: وقال الحنفية لا بأس بالجلوس للتعزية فی غير المسجد ثلاثة ايام واولها افضلها۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۵۴۲ المطلب الثالث فی التعزية)

قل خوانی اور رسم چہلم کا شرعی حکم

سوال :۔ آجکل میت کے ایصالِ ثواب کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ جمعرات، تیجہ، دسواں اور چہلم کی رسم ادا کی جاتی ہے اور ایسا نہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع اور ملامت کی جاتی ہے، دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان رسومات کی شریعتِ مقدسہ میں کیا حیثیت ہے؟ بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں؟

الجواب :۔ وارثانِ میّت کا ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ کرنا ہر وقت جائز ہے مگر وقت کے تعین کی جو صورتیں عوام میں مروج ہیں، مثلاً شبِ جمعہ وجمعرات کے دن، تیجہ، دسواں، چہلم وغیرہ، اس تخصیص کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ تخصیص اور التزام کی وجہ سے کبھی کبھی مباح اور جائز افعال بھی ناجائز ہو جاتے ہیں۔

قال العلامة النووی رحمہ اللہ، والطعام فی الایام المخصوصة کالثالث والخامس والتاسع والعشرین والاربعین والشهر السادس والسنة بدعة ممنوعة۔
(شرح منهاج بحواله راه سُنت ص۲۶۵) [۱]

صفر المظفر میں چوری کی رسم کی شرعی حیثیت

سوال :۔ عوام میں مشہور ہے کہ صفر کے مہینے میں آسمان سے بلائیں نازل ہوتی ہیں، اور پھر اس ماہ کے آخری بدھ کو گھر وغیرہ صاف کر کے مٹھائی اور چوری وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے، کیا چوری کی یہ رسم شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ یہ سب خرافات اور جاہلیت کی باتیں ہیں، اس ماہ مبارک میں آسمان سے کوئی بلا نازل نہیں ہوتی، اور یہ مٹھائی وچوری وغیرہ کی تقسیم کا اہتمام والتزام کرنا بدعت ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنه قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول لا عدوٰی ولا صفر ولا غول۔ اخرجه مسلم۔ (ما ثبت بالسنة للشیخ عبدالحق محدث دهلوی ص۲۶۶)

---

[۱] قال العلامة ابن البزاز رحمه اللہ، ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع والاعیاد۔
(الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۸۱)
ومثلهٗ فی رد المحتار ج۱ ص۶۰۳ مطلب فی کراهة الضیافة من اهل المیت۔

بزرگوں کے ہاتھوں کو چومنا بدعت نہیں

سوال:۔ علماء، مشائخ اور نیک لوگوں کے ہاتھوں کو جھک کر چومنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کو بدعت کہنا صحیح ہے؟ جبکہ افغانستان اور بعض دیگر علاقوں میں اس کا عمومی رواج ہے؟

الجواب:۔ مشائخ کرام، علماء اور نیک لوگوں کے ہاتھوں کو چومنا جائز ہے البتہ اس موقع پر رکوع کی سی کیفیت اختیار کرکے جھک جانا ناجائز اور حرام ہے، اس لیے اگر بغیر جھکے چوما جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کو بدعت کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

لماقال العلامة ملاعلی قاری رحمہ اللہ: وقیل لایکرہ التقبیل لزھد وعلم وکبرسن قال النووی رح تقبیل ید الغیر ان کان لعلمہ وصیانتہ وزھدہ ودیانتہ ونحو ذلك من الامور الدینیة لم یکرہ بل یستحب وان کان لغناہ اوجاھہ فی دنیاہ کرہ۔

(مرقاة ج ۹ ص۷۶ باب المصافحة والمعانقة۔ الفصل الثانی) [1]

تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ کافی شدت اختیار کرچکا ہے کہ نماز میں التحیات پڑھتے وقت اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے موقع پر انگلی سے اشارہ کرنے کو بعض لوگ بدعت کہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اشخاص کی انگلیاں بھی توڑ دی گئی ہیں، تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اور اگر جائز ہے تو اس کو بدعت کہنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ التحیات میں اشھد ان لآ الٰہ الا اللہ کہتے وقت اُنگلی سے اشارہ کرنا احادیثِ نبویہ سے ثابت ہے جس کی مختلف ہیئتیں ہیں، مگر احناف کے نزدیک مختار طریقہ وہ ہے جو وائل ابن حجر کی روایت میں مذکور ہے کہ وسطیٰ وابہام سے حلقہ بنایا جائے اور خنصر وبنصر کو ہتھیلی سے ملاکر سبابہ سے اشارہ کیا جائے۔

کمافعل علیہ السلام: عن وائل ابن حجر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ولا بأس بتقبیل ید الرجل العالم والمتورع علیٰ سبیل التبرك...... الخ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۲۷۱ قبل فصل فی البیع، کتاب الخظر والاباحة)

قال ثم جلس فافترش رجله اليسرٰی ووضع يده اليسرٰی علیٰ فخذه اليسرٰی وحدّ مرفقه اليمنیٰ علیٰ فخذه اليمنیٰ وقبض ثنتين وحلق حلقةً ثم رفع اصبعهٗ فرأيتهٗ يحرّكها يدعوبها۔ (مشکوٰة ص۸۵ باب التشهد، الفصل الثانی)

ان جملہ طریقوں کو فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے لہٰذا اس کو بدعت کہنا علم سے دوری کی دلیل ہے۔ علامہ ملا علی قاریؒ نے ان جملہ طریقوں کو نقل کرکے مذکورہ طریقے کو راجح قرار دیا اور فرمایا ہے: والاخير هو المختار عندنا۔ (مرقاة ج۲ ص۳۲۸ باب التشهد۔ الفصل الثانی) [1]

عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنے پر دوام کا حکم

سوال:۔ بعض حضرات عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنے کو سُنت کہتے ہیں اور اسی پر دوام کرکے بغیر عمامہ کے نماز پڑھنے والوں پر لعن طعن کرتے ہیں، تو کیا عمامہ کے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عمامہ باندھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، افضل یہ ہے کہ عمامہ باندھ کر نماز پڑھی جائے، یہی عمل مستحب ہے مگر اس پر اس طرح دوام کرنا کہ بغیر عمامہ کے نماز پڑھنے والے پر لعن طعن کیا جائے غلو فی الدین کے مترادف ہے، جو شرعاً ممنوع ہے لہٰذا بغیر عمامہ کے بھی نماز پڑھنا بلاکراہت جائز ہے تاہم اگر کسی مستحب کو وجوب کا درجہ دیا جائے تو وہ واجب الترک ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: والمستحب ان يصلي الرجل

---

[1] اخرج الامام ابوداؤدؒ: عن وائل بن حجر قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قعد فى الصلوٰة جعل قدمه اليسرٰى تحت فخذه اليمنٰى وساقه وفرش قدمه اليمنٰى ووضع يده اليسرٰى على ركبته اليسرٰى ووضع يده اليمنٰى على فخذه اليمنٰى واشار باصبعه وارانا عبد الواحد واشار بالسبابة۔
(سنن ابی داؤد ج۱ ص۱۲۹ کتاب الصلوٰة۔ باب الاشارة فی التشهد)
وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۱ ص۴۴۱ کتاب الصلوٰة باب صفة الصلوٰة۔

فی ثلاثۃ اثواب قمیص وازار وعمامۃ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی مع مجموعۃ الفتاوٰی ج ا ص۴۳ الفصل السادس فی ستر العورۃ) ؎

میّت کے گھر سے پہلے تین دن کھانا کھانے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میت والے گھر سے پہلے تین دن تک کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میّت والے گھر سے پہلے تین روز کھانا کھانے کو فقہاؒ نے مکروہ کہا ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں: وقال ایضًا یکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اھل المیت لانہٗ شرع فی السرور لافی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ روی الامام احمد وابن ماجۃ باسناد صحیح عن جریر ابن عبد اللّٰہ قال کنّا نعد الاجتماع الیٰ اھل المیّت وصنعھم الطعام من النیاحۃ۔ (رد المحتار جلد ا ص۶۰۳ کتاب الجنائز، مطلب فی کراھۃ الضیافۃ من اھل المیت) البتہ یہ حکم اس کھانے کا ہے جو میت کے گھر میں بطور ضیافت کے تیار کیا جاتا ہے جیسا کہ بعض علاقوں میں اس کا رواج ہے۔ اور اگر میت کے گھر والوں کو دوسرے لوگ کھانا کھلائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایک مستحب امر ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے: قال فی الفتح ویستحب لجیران المیّت والاقرباء الاباعد تھیئۃ طعام لھم یشبعھم یومھم و لیلتھم لقولہ علیہ السلام اصنعوا لاٰل جعفر طعامًا فقد جاءھم مایشغلھم حسّنہٗ الترمذی وصححہ الحاکم ولانہٗ برٌّ ومعروف ویلح علیھم فی الاکل لان الحزن یمنعھم من ذٰلک فیضعفون۔ (رد المحتار ج ا ص۶۰۳ باب صلوٰۃ الجنائز تحت مطلب فی کراھۃ الضیافۃ من اھل المیّت) باقی رہی وہ صورت کہ جس میں

؎ قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ:۔ وفیہ لو صلّی فی ثوب واحد متوشحًا بہ جمیع بدنہ کما یفعلہٗ القصّار فی المقصرۃ جاز من غیر کراھۃ مع تیسر وجود الزائد ولکن فیہ ترک الاستحباب حینئذٍ۔ (کبیری شرح منیۃ ص۳۴۹ فصل فی مایکرہ فعلہ فی الصلوٰۃ ومالایکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ا ص۵۹ الباب الثالث فی شروط الصلوٰۃ، الفصل الاول فی الطھارۃ وستر العورۃ۔

ورثاء (اولیاءِ میت) میت کے گھر کھانا تیار کر کے پھر دوسروں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے کھلائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس میں کسی خاص دن اور وقت کا تعین ضروری نہیں، تخصیصِ ایام کی وجہ سے علماء نے اس کو بھی مکروہ کہا ہے ۔

قال العلامة ابن البزازؒ :- ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع واتخاذ الدعوۃ لقراءۃ القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم الخ۔ والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءۃ القرآن لاجل الاکل یکرہ ۔ اور معراج الدرایۃ میں ہے: وھذہ الافعال کلھا للسمعۃ والریاء فیتحرز عنھا لانھم لایریدون بھا وجہ اللہ تعالیٰ ۔ (الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۴ ص۸۱ کتاب الجنائز)

اور ایصالِ ثواب کے لیے میت کے گھر کھانا پکا کر خیرات کرنا تب جائز ہوگا جب اس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں :۔

(۱) خیرات کرنے میں رسم و رواج پورا کرنے کی نیت بالکل نہ ہو ۔

(۲) ریاء اور نمود و نمائش کے لیے بھی نہ ہو ۔

(۳) ترکہ کی تقسیم کے بعد ہو، اور اگر قبل از تقسیم ہو تو تمام مستحق ورثاء بالغ و عاقل ہوں اور سب کی طرف سے بطیبِ خاطر اس کی اجازت بھی ہو، ورنہ ناجائز ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی بڑے وارث نے دوسروں کی اجازت کے بغیر خرچ کر لیا تو اس کی ذمہ داری دوسرے ورثاء پر عائد نہ ہوگی بلکہ خرچ کرنے والا خود اس کا ذمہ دار ہوگا ۔

(۴) مالِ حلال سے ہو، سود وغیرہ حرام طریقوں سے حاصل کیا ہوا مال نہ ہو ورنہ پھر بھی ناجائز ہوگی ۔

(۵) اسی طرح وقت کی تخصیص و تعیین بھی اس میں نہ ہو ورنہ بدعت شمار ہوگی ۔

روٹی کو چومنا بدعت نہیں

سوال :- ایک آدمی سے روٹی غلطی سے گر گئی، دیکھنے والے آدمی نے اُسے کہا کہ اس کو اٹھا کر چومو اور ادب و احترام کرو کیونکہ ایسا نہ کرنے سے یہ بددعا دیتی ہے، اس پر پہلے آدمی نے کہا کہ نہیں یہ توہم پرستی اور بدعت ہے، تو کیا ایسا کرنا واقعی توہم پرستی اور بدعت ہے ؟

الجواب :- گری ہوئی روٹی اٹھا لینا اور اس کو ضائع ہونے سے بچانا واقعی

رزق کا ادب ہے اور اسراف سے بچنا ہے، تاہم گری ہوئی روٹی کو چومنا اور نہ چومنے والے کو گنہگار سمجھنا اور اس نہ چومنے کو بدفالی اور بدعت کہنا درست نہیں، چونکہ رزق اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اور اس انعام الٰہی کی قدر کرتے ہوئے چوم لینا بھی مباح اور جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واما تقبیل الخبز فحرر الشافعیة أنه بدعة مباحة وقیل حسنة۔۔۔۔الخ وقواعد نا لا تأباه۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۲ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء وغیره، قبیل فصل فی البیع)

بوقتِ ضرورت چھری کے ساتھ روٹی کاٹنا

سوال:۔ آجکل دوکاندار (بیکری والے) ڈبل روٹی کو لفافے میں ڈالنے کے لیے آسانی کی خاطر تیز چھری کے ساتھ اس کے ٹکڑے کرتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا روٹی کی بے ادبی اور ایک بُری رسم تو نہیں؟

الجواب:۔ ضرورت کے وقت روٹی یا دوسری اشیاء خوردنی کو چھری کے ساتھ کاٹنا جائز ہے اور یہ کوئی گناہ کا عمل یا بُری رسم نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وفی المجتبیٰ لا یکرہ قطع الخبز واللحم بالسکین۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۵ ص ۲۷۲ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء، قبیل فصل فی البیع)۔

جنازہ اٹھاتے وقت ذکر بالجہر کرنا مکروہ ہے

سوال:۔ آجکل اکثر جگہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جنازہ کو قبرستان یا جنازہ گاہ لے جاتے ہوئے اُسے کندھا دینے والا ہر نیا آدمی بلند آواز سے کہتا ہے "کلمۂ شہادت"۔ شریعتِ مقدسہ میں اس کا کیا حکم ہے؟ جبکہ کچھ لوگ اسے بدعت کہتے ہیں؟

الجواب:۔ جنازہ میں شریک لوگ اگر ذکر کرنا چاہیں تو اپنے دل میں ذکرِ الٰہی کریں، آواز بلند کرتے اور نعرے لگانے کو علماء نے مکروہ کہا ہے کیونکہ وہ عبرت و فکر کا مقام ہوتا ہے ایسے وقت خاموش رہنا بہتر ہے۔

قال العلامة عبد الحی اللکھنوی رحمہ اللہ: یکرہ رفع الصوت بالذکر والقرآن لحامل الجنازة

ومن معهم تحریمًا وقیل تنزیہًا وینبغی ان یطیلوا الصمت ولو ارادوا الذکر ذکروا فی انفسہم۔ کذا فی فتح القدیر وفی الجواھر النفیسۃ شرح الدرۃ المنیفۃ :لایرفع صوتہ بالذکر ای یکرہ رفع الصوت بالذکر والقراءۃ والتکبیر خلف الجنازۃ۔
(سیاحۃ الفکر فی الجھر بالذکر ص۵۵ الباب الثانی فی ذکر مواضع الجھر)[1]

میّت پر قرآنی کلمات سے منقّش چادر ڈالنے کا حکم

سوال:۔ اکثر علاقوں میں غسل اور کفن کے بعد دفنانے کے لیے لے جانے وقت میّت پر قرآنی آیات والی چادر ڈالی جاتی ہے، کچھ لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، شریعتِ مقدسہ میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق میّت پر قرآنی کلمات سے مکتوب چادر ڈالنا اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہے مگر توہین اور بے ادبی کے ڈر کی وجہ سے ڈالنا جائز نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: بساط او غیرہ کُتِبَ علیہ الملک للہ یکرہ بسطہ واستعمالہ لا تعلیقہ للزینۃ اھ ثم قال بعد اسطر قلتُ وظاھرہ انتفاء الکراھۃ بمجرد تعظیمہ وحفظہ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۱ ص۱۳۰ باب المیاہ، کتاب الطھارۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: اللغط ای رفع الصوت بذکر او قراءۃ والصیاح خلف الجنازۃ کقول استغفروا لہا ونحو لما روی البیھقی ان الصحابۃ کرھوا رفع الصوت عند الجنائز وعند القتال وعند الذکر..... والصواب ما کان علیہ السلف من السکوت فی حال السیر مع الجنازۃ والاشتغال بالتفکر فی الموت وما یتعلق بہ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص۵۱۲ مکروہات الجنازۃ)

[2] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: اقول فی فتح القدیر وتکرہ کتابۃ القرآن واسماء اللہ تعالیٰ علی الدراھم والمحاریب والجدران وما یفرش اھ۔ وقال ما ذاک الا لاحترامہ وخشیۃ وطئہ ونحوہ مما فیہ اھانۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۰۷ قبیل باب الشھید، کتاب الصلوۃ)

اپنے لیے پہلے سے قبر تیار کرنا بدعت نہیں

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے اپنے لیے پہلے سے قبر تیار کر رکھی ہے جس میں کبھی کبھی وہ سو جاتا ہے، بعض حضرات اس کو بدعت کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں بھائی یہ تو بہت بڑی دعوت ہے، اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ موت کو یاد رکھنا، آخرت کے مناظر کا تصور و یقین دل میں بٹھانا اور ہر وقت سامنے رکھنا کثیر آیاتِ قرآنیہ، احادیث اور حضرات صحابہ کرامؓ و مشائخ عظامؒ کے مسلسل واقعات سے قطعی طور پر ثابت ہے جس کی بناء پر اعمالِ صالحہ میں انہماک نہایت ہی ضروری ہے، تاہم حسّی طور پر قبر کے لیے جگہ خرید کر مخصوص کرنا بھی ایک اعتبار سے موت کیلئے تیاری ہے، اور موت کو یاد رکھنے کی مذکورہ صورت اور طریقۂ دعوت حضرات مبلغین کے ہاں رائج ہے نہ تھا، البتہ اگر کوئی انفرادی طور پر موت کو یاد رکھنے کی نیت سے پہلے سے قبر تیار کرائے تو یہ خلافِ شرع نہیں بلکہ ایسا کرنے والا اجر کا مستحق ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله (ویحفر قبراً لنفسه) ای ولا بأس به۔ والتتارخانیة لا بأس به ویؤجر علیه ھٰکذا عمل عمر بن عبدالعزیز والربیع بن حیثم وغیرھما۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۰۶ کتاب الجنائز، قبل الصفحة الواحدة من باب الشھید)۔

جمعہ و عیدین کی نماز کے بعد مروّجہ مصافحے کا حکم

سوال:۔ آجکل نمازِ جمعہ و عیدین کے بعد مساجد کے اندر جو مصافحہ مروج ہے اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ عیدین اور جمعہ کی نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے میں علماء کرام کا اختلاف ہے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور دیگر محققین علماء کرام نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، اور بعض دیگر حضرات نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، لہٰذا اگر مصافحہ کرنے میں التزام مالایلزم ہو تو ممنوع ہے ورنہ نہیں تاہم نہ کرنا بہتر ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط انه تکره المصافحة بعد اداء الصلوٰة بکل حال لان الصحابة رضی اللہ عنھم ما صافحوا بعد اداء الصلوٰة ولانھا من سنن الروافض ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعیة

انه بدعة مكروهة لا اصل لها فی الشرع وانه فاعلها اوّلاً ویعزر ثانیاً ثم قال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل انها من البدع وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاخیه لا فی ادبار الصلوٰة فحیث وضعها الشرع یضعها فینهیٰ عن ذٰلك ویزجر فاعلهٗ لما اتیٰ به خلاف السنة۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۵۲) وایضاً فی النسخة الاخریٰ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۳۷ کتاب الحظر والاباحة) [1]

بغیر عذر کے تابوت میں دفن کرنے کا حکم

سوال:- ہمارے ہاں بعض سجادہ نشین حضرات اپنے مُردوں کو بڑے اعزاز کے تابوتوں میں دفن کرتے ہیں، بعض لوگ اس کو بدعت اور بعض جائز کہتے ہیں، اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ نیز لوہے کا تابوت استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب:- بغیر کسی شدید عذر کے مرد میّت کو تابوت میں دفن کرنا مکروہ ہے، البتہ اگر میت عورت ہو تو پھر تابوت میں دفن کرنا افضل ہے بشرطیکہ تابوت لکڑی کا ہو، لوہے کا تابوت استعمال کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (ولا بأس باتخاذ تابوت ولو من حجر او حدید له عند الحاجة کرخاوة الارض) قوله لا بأس باتخاذ تابوت ای یرخص ذٰلك عند الحاجة والا کره قدمنا آنفا۔ قال فی الحلیة نقل عن غیر واحد عن الامام ابن الفضلؒ انه جوّزه فی اراضیهم لرخاوتها۔ وقال لکن ینبغی ان یفرش فیه التراب..... والسنة ان یفرش فی القبر التراب ثم لم یتعقبوا الرخصة فی اتخاذه من حدید بشیء ولا شك فی کراهته کما هو ظاهر الوجه۔ (قوله له) ومفهومه انه لا بأس به للمرأة مطلقاً وبه صرح فی شرح المنیة فقال وفی المحیط واستحسن مشائخنا اتخاذ التابوت للنساء یعنی ولو لم تکن الارض الرخوة فانه اقرب الستر والتحرز عن مسها عند الوضع فی القبر۔
(رد المحتار ج ۱ ص ۵۹۹ کتاب الجنائز)

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: ...... ما نقله عنه شارح المجمع من انها بعد الفجر والعصر لیس بشیء۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۳۷ کتاب الحظر والاباحة)
وَمِثْلُهٗ فی مائة مسائل ص ۶۸ سوال جہل وپنجم۔

دُعا بعد الجنازہ کا حکم سوال :- نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا مشروع ہے یا ممنوع، اگر مشروع ہو تو اس کا اذانِ عید سے کون سا فرق ہے کہ وہ ممنوع ہے اور یہ نہیں؟

الجواب :- نماز جنازہ کے بعد اسی حالت میں دعا کا التزام تو بدعت ہے لیکن اگر کسرِ الصفوف کے بعد ہو اور بلا التزام ہو تو ممنوع نہیں البتہ دعا قبل السلام پر اکتفا کرنا افضل اور قولِ منصوص ہے۔

دلیل :- کیونکہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس دعا کے کرنے اور نہ کرنے کے متعلق کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ کما لایخفی علی من راجع الی کتب الحدیث اور علامہ ابن الہمام وغیرہ محققین نے تصریح کی ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، ویؤیدھم ما رواہ ابوداؤد اِنَّ ماسکت عنہ فھو عفوٌ۔ لہٰذا دعا بعد الجنازہ جو کہ بذاتِ خود بڑی عبادت ہے مباح اور جائز ہو گی بخلاف اذانِ عید کے، کیونکہ اس کے متعلق نہ کرنے کی روایت ثابت ہے۔ وھو مارواہ ابوداؤد اِنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلّی العیدَ بلا اذان ولا اقامۃ وابا بکرٍ وعمرَ۔ (ابوداؤد ص۱۶۴ ج۱ باب ترک الاذان فی العید) یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے نمازِ عید کو بغیر اذان اور اقامت کے پڑھا، پس عدم الروایت اور روایت العدم اور عدم ذکر اور ذکر عدم میں فرق نہ کرنا غباوت یا جہالت ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب : اگر کوئی یہ کہے کہ دعا بعد الجنازہ کے متعلق حدیث وارد ہے وھو مارواہ ابوداؤد: اذا صلّیتم علی المیّتِ فاخلصوا لہ الدعاء (ص۲ ج۲ باب الدعاء للمیت الجنائز) (جب تم میت پر جنازہ پڑھتے ہو تو اس کے لیے دعا میں اخلاص کیا کرو) نیز امام کاسانی رحمہ اللہ نے بدائع الصنائع جلد اول ص۳۱۱ میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ نماز جنازہ فوت ہو گئی آپ نے دوبارہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا الصّلوٰۃُ علی الجنازۃ لا تُعادُ ولکن ادعُ للمیّت واستغفر لہٗ۔ (بدائع الصنائع ص۳۱۱ ج۱ کتاب الجنائز) یعنی نماز جنازہ دوبارہ نہ پڑھی جائے گی لیکن اس میت کے لیے دعا اور استغفار کرو۔ وروی عن ابن عباس وابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فاتتھما صلوٰۃٌ علی جنازۃٍ فلمّا حضرا مازادا علی الاستغفار لہٗ۔ و رُوِیَ عن عبد اللہ بن سلام انّہٗ فاتتہ الصلوٰۃُ علی جنازۃ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فلمّا جھزَ قال ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء لہٗ۔ انتہٰی (بدائع الصنائع ص۳۱۱ ج۱ فصل الکلام فی صلوٰۃ الجنازہ) ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک میت پر نمازِ جنازہ فوت

ہوگئی تو انہوں نے حاضری کے وقت اس میت کے لیے صرف استغفار پر اکتفاء کیا، اور عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نماز جنازہ ادا کرنا فوت ہوا تو لوگوں سے فرمایا کہ اگر آپ مجھ پر نماز جنازہ میں سبقت لے گئے تو مجھ پر دعا کرنے میں سبقت نہیں لے سکتے، یعنی مجھ سے دعا تو فوت نہیں کر سکتے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ حدیث مرفوع میں دعاء سے مراد دعا قبل السلام ہے، محدثین اور فقہاء نے یہی معنیٰ مراد لیا ہے۔ اور جن روایات کو صاحب بدائع الصنائع نے ذکر کیا ہے تو ان میں اس شخص کے دعا کرنے کا ذکر ہے جس سے نماز جنازہ فوت ہوا ہے اور یہ محل نزاع نہیں ہے۔

<u>سلفیہ کی دلیل کا جائزہ</u>: اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سلف صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نماز جنازہ کے بعد دعا نہیں کی ورنہ منقول اور مروی ہوتا، اور بظاہر بھی یہی معلوم ہوتا ہے، تو اس سے اس دعا کا بدعت اور مکروہ ہونا لازم نہیں آتا ورنہ فرائض کے بعد ہیئتِ اجتماعی سے دعا کرنا اور قرآن مجید کا پشتو اور اردو وغیرہ میں ترجمہ کرنا بھی بدعات ہوں گے حالانکہ یہ امور بدعات نہیں ہیں، بس اسی طرح دعا بعد الجنازہ بھی بدعت اور مکروہ نہ ہوگا۔ ہمارے جن مشائخ، فقہاء اور مفسرین نے اس دعا کو مکروہ کہا ہے تو کسی نے بھی اس کراہت کو اس سلفی دلیل پر بنا نہیں کیا ہے انہوں نے دیگر دلائل سے اس مدعیٰ کو مبرہن کیا ہے۔

<u>ایک توہم کا ازالہ</u>: بعض وہ لوگ جو کہ دیوبندیت اور حنفیت کے لباس میں نجدیت اور سلفیت کی اشاعت کرتے ہیں صاحب ہدایہ اور ملا علی قاریؒ کی بعض مختصر عبارات سے تمسک کرتے ہیں کہ جو کام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہ کیا ہو تو وہ بدعت ہوگا، یہ ان لوگوں کی خود غرضی اور مطلب پرستی ہے، کیونکہ حدیث صرف فعلِ رسول ﷺ کا نام نہیں ہے، حدیث پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول، فعل، تقریر تینوں کو کہا جاتا ہے، آپ کی عبارات، اشارات، دلالت، اقتضاء، اعتبار کوئی بھی بدعت نہ ہو۔ مزید تفصیل کے لیے التعلیق الممجد (ص ۱۴۴ باب قنوت فی الفجر) کو مراجعت کیا جائے۔

<u>فقہاء کرام کی آراء</u>: اکثر فقہاء کرام کی عبارات سے دعا بعد الجنازہ کا ممنوع ہونا معلوم ہوتا ہے البتہ امام فضلی بخاریؒ سے جواز مروی ہے۔ کمافی البحر (ج ۲ ص ۱۸۳ کتاب الجنائز) وعن الفضلی لا بأس بہ۔ انتہیٰ

نیز واضح رہے کہ ان مشائخ (مانعین) میں سے بعض نے دلیل کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اور بعض نے (ملا علی قاری رحمہ اللہ) زیادت علی الجنازہ کو مبنیٰ قرار دیا ہے، حیث قال فی المرقاۃ (ج ۴ ص ۴۲ کتاب الجنائز)

لِاَنَّهٗ یُشْبِہُ الزِیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ۔ اور بعض نے (صاحب ہدایہ نے) تکرارِ جنازہ کے مبنی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حیثُ قال لانّہٗ دعا مرّۃً لانَّ اکثرھا دعاءٌ۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۴ ص۹ کتاب الجنائز) یعنی نمازِ جنازہ میں مقصود دعا ہوتی ہے، تو گویا نمازِ جنازہ دعا سے عبارت ہے، پس دعا کرنے سے تکرارِ جنازہ کا توہم لازم ہوگا۔ اور اس عبارت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سلام سے قبل دعا کرنے کے باوجود اگر دعا بعد السلام کی جائے تو تکرارِ دعا لازم ہوگا کیونکہ تکرارِ دعا بذاتِ خود ممنوع نہیں ہے ورنہ اوقاتِ خمسہ میں سلام سے قبل دعا کرنے کی وجہ سے دعا بعد السلام کا ممنوع ہونا لازم ہوگا۔

پس بناء بر تحقیق یہ کراہت تشبیہ پر مبنی ہوگی کہ اس دعاء سے نمازِ جنازہ پر زیادت اور توہم تکرار لازم آتے ہیں، جیسا کہ فرائض کے بعد متصل اسی مکان میں سنت پڑھنا بھی اسی وجہ سے مکروہ ہے۔

اور یہ تشبیہ اس وقت لازم ہوتی ہے جب صفوف میں کھڑے ہوکر دعا کی جائے اور چونکہ کسر الصفوف کے بعد یہ تشبیہ موجود نہیں رہتی لہٰذا کراہیت بھی نہ ہوگی۔ ویشیر الیہ تعبیرھم بلا یقوم بالدعاء مع کون التعبیر بلا یَدْعُوْا اَخْصَرَ۔

__التزام بدعت ہے__: چونکہ یہ دعا نہ لازم اور واجب ہے اور نہ سنتِ مؤکدہ یا زائدہ ہے لہٰذا اس کا واجب اور سنت ماننا یا اس کے تارک پر انکار کرنا بدعت ہوگا جیسا کہ اس کے مطلق فاعل کو مبتدع قرار دینا منکر ہے۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مروّجہ قضاءِ عمری بدعت ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں لوگ ایک خاص طریقے سے رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں نماز باجماعت اس عقیدے کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ اس سے ساری عمر کی قضا نمازیں ادا ہو جاتی ہیں۔ عرفِ عام میں اس کو قضاءِ عمری کہا جاتا ہے اور اس کے اثبات میں لیلۃ التعریس اور خندق والی احادیث پیش کرتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قضاءِ عمری جو بعض علاقوں میں متعارف طریقہ سے ادا کی جاتی ہے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ نماز پڑھی ہے اور نہ اس کی ترغیب فرمائی ہے، اسی طرح یہ نماز آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے قول یا فعل سے بھی ثابت نہیں، ائمہ اربعہ کے مذہب کی معتبر کتابوں میں بھی اس کا کوئی ذکر اور نام ونشان نہیں۔ اس بناء پر یہ نماز یقینی طور بدعت ہے اور اس کا فاعل از روئے شریعت مبتدع ہے۔ کتب حنفیہ کی طرف اس کے جواز و طریقہ کو منسوب کرنا کذب بیانی اور ائمہ دین پر افتراء ہے، فقہ حنفی کی کتابوں میں قضاء نماز کے پڑھنے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ اور ہے اور مروجہ قضاء عمری اور چیز ہے، اس میں تو صرف پانچ نمازوں کو رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں اذان واقامت کے ساتھ با جماعت پڑھ کر پوری عمر یا ستر، اسی سال کی قضاء شدہ نمازوں کا قائم مقام اور ان کے لیے جبیرہ و کفارہ سمجھا جاتا ہے، اور کتب فقہ حنفی میں پوری عمر کی تمام نمازوں کو قضاً کے طور پر پڑھنے کا طریقہ مذکور ہے، یعنی اگر پوری عمر کی قضاء نمازوں کی تعداد ہزار ہو تو ہزار نمازیں پڑھی جائیں گی اور اگر لاکھ ہوں تو لاکھ، اور ان دونوں طریقوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ رہی وہ حدیث جس پر مروجہ قضاء عمری کی بناء ہے تو ائمہ جرح وتعدیل اور محدثین نے اس کو موضوع یعنی خود ساختہ قرار دیا ہے جس سے استدلال جائز نہیں۔

(۱) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: حدیث من قضی صلوٰۃ من الفرائض فی آخر جمعۃ من رمضان کان جابراً لکل صلوٰۃ فائتۃ فی عمرہ الی سبعین سنۃً باطل قطعاً لانہ مناقض للاجماع علی ان شیئاً من العبادات لایقوم مقام فائتۃ سنوات اھ۔ (الموضوعات الکبیر ص۲۴۲ رقم حدیث ۹۵۳ حرف المیم)

(۲) علامہ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں: حدیث من صلّٰی فی آخر جمعۃ من رمضان خمس صلوٰت من الفرائض فی الیوم واللیلۃ قضت عنہ ما أخلّ بہ من صلوٰۃ سنتہ اھ۔ ھذا موضوع لاشک فیہ ولم اجدہ فی شئ من الکتب التی جمع مصنفوھا فیہا الاحادیث الموضوعۃ ولکنہ اشتھر عند جماعۃ من المتفقھۃ بمدینۃ صنعاء فی عصرنا ھذا وصار کثیر منھم یفعلون ذلک ولا ادری من وضعہ لھم فقبح اللہ الکذابین۔ انتہی (الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ ص۵۴ النوع الثامن صلوٰۃ المفیدۃ بایام الشھور ولیالی منھا)

(۳) شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: الخامس ان یکون الحدیث مخالفاً لمقتضی العقل والنقل وتکذب بہ القواعد الشرعیۃ مثل حدیث

قضاء العمری ونحوہ ۔ انتہیٰ (الحجالۃ النافعۃ ص۳ فی بیان قرائن وضع الحدیث)

(۴) علامہ ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں: واقبح من ذلک ما اعتید فی بعض البلاد من الصلوٰۃ الخمس فی آخر جمعۃ من رمضان عقب صلوٰتہا زاعمین انہا تکفر صلوٰۃ العام او العمر المتروکۃ وذلک حرام بوجوہ لا تخفیٰ ۔ انتہیٰ

(تحفہ منہاج النووی ص)

کیا ان مذکورہ تصریحات سے اِس حدیث کا موضوع ہونا اظہر من الشمس ثابت نہیں ہُوا؟ اب اس کے باوجود بھی جو لوگ حدیث مذکور کو حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر قضاء عمری کے اثبات کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں اُن کا معاملہ خدا کے سپرد ہے کیونکہ معاند کا علاج ممکن نہیں۔

نیز یہ متعارف قضاء عمری چند مفاسد پر مشتمل ہے جن سے بچنا حد درجہ ضروری ہے وہ یہ کہ اس نماز کے متعلق عوام اور بعض کم علم خواص بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس سے عمر بھر یا ستر سال یا کم از کم ایک سال کی فوت شدہ نمازیں قضاء ہو کر ان سے ذمہ فارغ ہو جاتا ہے جیسا کہ اس نماز کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اس نماز کے لیے جس قدر اہتمام کرتے ہیں دوسرے فرائض و واجبات کے لیے اتنا اہتمام نہیں کرتے بلکہ ان سے نہایت بیباکانہ طریقہ سے ناغہ کر کے یہ خیال اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ قضاء عمری کی ایک نماز سے یہ سب کی سب ادا ہو جائیں گی، حالانکہ یہ اعتقاد بتصریح فقہاء اسلام موجبِ کفر ہے۔ فتاویٰ الہندیہ میں ہے "رَجُلٌ یُصَلِّیْ فِیْ رَمَضانَ لا غیر ویقول این خود بسیار است او یقول زیارت می آید لانّ کلّ صلوٰۃ فی رمضان تعدل سبعین صلوٰۃً یکفر۔ انتہیٰ ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۶۸ باب التاسع فی احکام المرتدین ومنہا ما یتعلق بالصلوٰۃ والصوم والزکوٰۃ) [1]

نیز فقہاء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ قضاء نماز اس طرح پڑھنا کہ دیکھنے والے کو یوں معلوم ہو کہ یہ قضاء نماز پڑھی جا رہی ہے مکروہ تحریمی ہے خواہ مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر ہو۔ قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویکرہ قضاءھا فی المسجد لان التاخیر معصیۃ فلا

---

[1] ومثلہٗ فی جامع الفصولین ج۲ ص۲۲۳

یظھرھا۔ وفی رد المحتار: ویظھر من تعلیلھا ان المکروہ قضاءھا مع الاطلاع علیھا ولو فی غیر المسجد۔ اھ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۹۵ قبیل باب السجود، باب قضاء الفوائت)

علامہ حصکفیؒ مزید فرماتے ہیں: وینبغی ان لا یطلع غیرہ علی قضاءہ لان التاخیر معصیۃ۔ اور علامہ ابن عابدینؒ اس عبارت کی شرح میں فرماتے ہیں: قلت والظاھر ان ھنا ینبغی ھھنا للوجوب وان الکراھۃ تحریمیۃ لان اظہار المعصیۃ معصیۃ لحدیث الصحیحین کل امتی معافی الا المجاھرین وان من الجھاران یعمل الرجل بالليل عملاً ثم یصبح وقد سترہ اللہ علیہ فیقول عملت البارحۃ کذا وکذا وقد بات یسترہ ربہ ویصبح یکشف ستر اللہ عنہ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۹۵ قبیل باب السجود، باب قضاء الفوائت)

چونکہ قضاء عمری کی اس مروجہ نماز میں بھی دوسروں کو اطلاع اور اعلان پایا جاتا ہے لہٰذا یہ بھی مکروہ تحریمی ہوگی۔

باقی غزوہ خندق اور لیلۃ التعریس کی احادیث سے بھی اس کا اثبات کرنا صحیح نہیں کیونکہ ان میں صرف یہی آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضۂ نوم یا جنگ میں مشغولیت کی وجہ سے ایک یا چند نمازیں قضاء ہوئی تھیں اور نیند سے اٹھنے اور جنگ سے فارغ ہونے کے بعد فوراً وہ تمام نمازیں پڑھ لی گئی تھیں۔ ان میں نہ تو رمضان کا ذکر ہے اور نہ آخری جمعے کا اور نہ یہ کہ وہ تمام عمر کی قضا نمازوں کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں۔

بہر حال شریعتِ مقدسہ قضاء نمازوں کے متعلق اپنا قطعی فیصلہ یہ دے چکی ہے کہ جتنی نمازیں قضاء ہوئی ہوں ان سب کا پورا پورا پڑھنا فرض ہے اس کے بغیر ان سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من نام عن صلوٰۃ او نسیھا فلیصلھا اذا ذکرھا لا کفارۃ لھا الا ذالک۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۸۴ باب من نسی صلوٰۃ فلیصل اذا ذکرھا لا یعید الا تلک الصلوٰۃ)

فقہاء کرام، ائمہ جرح و تعدیل، محدثینِ کرام کی ان تصریحات کی روشنی میں مروجہ قضاء عمری کو ہم بدعتِ قبیحہ اور مداخلت فی الدین سمجھتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

حیلۂ اسقاط کی شرعی حیثیت

سوال: آجکل اکثر علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کے ساتھ قرآن مجید قبرستان لے جاتے ہیں اور قرآن مجید پر کچھ نقد رقم رکھ کر چند آدمی آپس میں اس کو پھراتے ہیں اور اس طریقے کو اسقاط کہا جاتا ہے

اور اس کے جواز میں قرآن کریم کی آیت وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (الآیۃ) پیش کی جاتی ہے، ازراہ کرم اس مسئلہ کے جواز یا عدم جواز کے متعلق پوری وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ جس مکلف (عاقل، بالغ مسلمان) سے نماز روزہ عمداً یا غیر عمداً فوت ہوئے ہوں تو اس پر فرض ہے کہ ان کی باقاعدہ قضاء کرے اور قضاء نہ کرنے کی صورت میں یہ شخص مجرم ہوگا اور زندگی سے مایوسی کے وقت اس پر وصیت کرنا ضروری ہوگا، یعنی وہ وصیت کرے گا کہ اس کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کے ایک تہائی (۱/۳) سے ہر نماز اور روزہ کے بدلے میں دو دو سیر (انگریزی) گندم یا اس کی قیمت مساکین کو ادا کی جائے اور ایسی وصیت نہ کرنے کی صورت میں یہ شخص مجرم اور گنہگار مرے گا، البتہ اگر اس شخص کا مال نہ ہو یا مال کا ایک تہائی (۱/۳) فراغت ذمہ کے لیے ناکافی ہو یا اس نے جہل، فسق یا سستی کی وجہ سے فدیوں کے بارہ میں وصیت نہ کی ہو تو وارث وغیرہ اس میت کی طرف سے باقاعدہ حیلۂ اسقاط کر سکتے ہیں۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۹۱/۴۹۲ باب صلوٰۃ الجنائز، مطلب فی اسقاط الصلوٰۃ عن المیت)

حیلہ کی تشریح | حیلہ یا مخرج اس مباح کام اور گفتار کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے کسی مقصود کی طرف پوشیدہ طریقہ سے رسائی حاصل ہو۔ کما فی المفردات (ص ۱۳۸) اَلْحِيْلَةُ مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلٰى حَالَةٍ مَا خُفْيَةٍ۔ انتہیٰ۔ وفی فتح الباری (ج ۱۲ ص ۲۷۲) ھی ما یتوصل بہ الی مقصود بطریق خفی۔ انتہیٰ

حیلہ کی اقسام | حیلہ کی بہت سی اقسام ہیں، ان میں سے بعض یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

(الف) وہ حیلہ ہے جو کہ تحلیل حرام کے لیے ہو اور ابطالِ شریعت کے لیے ہو، جیسا کہ اصحاب السبت نے تحلیل صید کے لیے کیا تھا، اور بعض یہود نے تحلیل شحم (چربی) کے لیے کیا تھا (رواہ البخاری) یہ حیلہ بلاشک وشبہ حرام اور ناجائز ہے۔

(ب) وہ حیلہ ہے جو کہ حرام سے بچنے اور فراغت ذمہ اور اسقاط واجب کے لیے ہو، جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا تھا، اور جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مریض غیر شادی شدہ کے لیے کیا تھا۔ رواہ ابوداؤد ص ۶۱۴۔ قالوا ما رأينا باحد من الناس من الضر مثل الذي هو به لو حملنا اليك لتفسخت عظامه ما هو الا جلد على عظم فامر رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يأخذوا له مائة شمراخ فيضربوه بها ضربة واحدة۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۵۸ کتاب الحدود، باب فی اقامۃ الحد علی المریض)

خلاصہ یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس شخص (جس سے زنا صادر ہوا تھا اور وہ غیر شادی شدہ تھا) کے متعلق بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ اس جیسا کہ تکلیف میں بتلا ہم نے کسی اور کو نہیں دیکھا ہے، اگر ہم اس کو یہاں لائیں تو اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، اس کی ہڈیوں پر صرف چمڑا رہ گیا ہے۔ پس پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اس کو کھجور کے ایک گچھا سے (جس کی سو شاخیں ہوں) ایک دفعہ مارا جائے اور یہ حیلہ جائز ہے (نہ منسوخ ہے اور نہ مخصوص ہے۔ اور یہی مروی ہے عطاءؒ اور امام شعبیؒ، اور اس کو احناف، شوافع اور حنابلہ نے مختار کیا ہے بخلاف مالکیہ اور سلفیہ کے جن کے نزدیک یہ حیلہ مشروع نہیں ہے۔ فلیراجع الیٰ تفسیر القرطبی ج ۱ ص ۲۱۲ وشرح الاشباہ للحموی ص ۷۱۸ وفتح الباری ج ۱۲ ص ۲۷۵ کتاب الحیل)

فقہاءِ کرام کی آراء | حیلۂ اسقاط جس طرح باصلہا ثابت ہے تو اسی طرح فقہاءِ کرام (خصوصاً وہ فقہاء جن سے اکابر دیوبند فتاویٰ نقل کرتے ہیں) نے اس کی مشروعیت پر تصریح کی ہے۔ (فلیراجع الیٰ رد المحتار ج ۱ ص ۶۸۷ والطحاوی ص ۲۶۳ والشرح الکبیر ص ۲۹۷ وخلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۵۳ والبحر ج ۲ ص ۹۱ والاشباہ والنظائر ص ۴۱۸ وھٰکذا فی غیر واحد من الفتاویٰ) لہٰذا اس حیلہ کی مشروعیت میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔

شرائط | البتہ اس حیلہ کی مشروعیت کیلئے کچھ شرائط بھی ہیں جن کی رعایت نہایت ضروری ہے:-

(الف) یہ کہ عدمِ وصیت کی صورت میں ورثاء میں غائب اور نابالغ نہ ہوں کیونکہ ان کے اموال سے تبرع ناجائز ہے۔

(ب) یہ کہ دائرہ میں صرف مساکین بیٹھے ہوں، غنی کو دینے سے فراغتِ ذمہ حاصل نہیں ہوتی ہے۔

(ج) یہ کہ مسکین کو واقعی تملیک کیا جائے نہ کہ فرضی اور لسانی، ورنہ اس حیلہ سے مقصود حاصل نہ ہوگا۔ (کما فی منۃ الجلیل ج ۱ ص ۲۲۵، ویجب الاحتراز من ان یلاحظ الوصی عند دفع للفقیر الھزل والحیلۃ ان یدفعھا حقیقۃ لا تخییلاً ملاحظاً ان الفقیر اذا ابی عن الھبۃ الی الوصی کان لہ ذٰلک ولا یجبر علی الھبۃ۔ انتھٰی۔)

خلاصہ یہ کہ وصی وغیرہ پر ضروری ہے کہ مسکین کو تھیلی وغیرہ دیتے کے وقت ہزل یا حیلہ کا ارادہ نہ کرے گا بلکہ اس تھیلی وغیرہ کا مسکین کو واقعی اور حقیقی تملیک کرے گا۔ (حتیٰ کہ اگر یہ مال کافی

مقدار میں ہو اور حیلہ کرنے کے وقت حج کے لیے داخلہ کا اعلان ہوا ہو تو اس مسکین پر حج فرض ہو گا، دوسرے شخص کو ہبہ کرنے سے یہ فریضہ ساقط نہ ہوگا) اور یہ ملحوظ رکھے گا کہ اگر مسکین نے واپس دینے سے منع کیا تو یہ اس کے لیے درست ہوگا اور اس کو مجبور نہ کیا جائے گا۔

فقہاء کرام کے حیلۂ اسقاط اور مروّجہ اسقاط میں فرق (۱) فقہاء اپنے اسقاط کو حیلۂ اسقاط سے تعبیر کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ اسقاط نہ فرض ہے نہ واجب ہے نہ سنت نہ مستحب، کیونکہ حیلہ کی شرعی حیثیت اس طرح نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت اباحت کی ہو سکتی ہے، وہ بھی تب جبکہ اس میں محرماتِ شرعیہ کا ارتکاب نہ ہو، جبکہ مروّجہ اسقاط کی حیثیت عوام الناس میں فرض و واجب سے بھی بڑھ کر ہے بلکہ اس کو پورا کرتے میں قطعی فرائض چھوڑ دینے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

ونص علیہ فی تبیین المحارم فقال لا یجب علی الولی فعل الدور وان اوصٰی به المیت لانها وصیة بالمتبرع والواجب علی المیت ان یوصی بما یفی بما علیه ان لم یضق الثلث عنه۔ الخ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۴۹۲ باب الفوائت، تحت مطلب فی بطلان الوصیة بالختمات والتهالیل)

(۲) فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ فعل دور کا یہ حیلۂ اسقاط صرف ان اموات کے لیے ہے جو فقیر اور غریب ہوں یعنی ان کے ترکہ میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ اس میں شرعی طریقہ سے فوت شدہ نمازوں اور روزوں کا فدیہ فی نماز اور فی روزہ شرعی نصف صاع گندم یا پورا صاع جو پورا ہو سکے، امراء اور اغنیاء کے لیے یہ حیلہ اسقاط ایجاد نہیں کیا گیا ہے لیکن عوام میں اس حیلہ کا استعمال صرف فقراء اور غریب اموات کے لیے نہیں بلکہ امراء، اغنیاء اور سلاطین تک کے لیے یکساں طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جن اموات کے ترکہ میں سے پورا فدیہ ادا کیا جاسکتا ہو ان کے ترکہ سے فوت شدہ نمازوں اور روزوں کا پورا فدیہ نکالنا ضروری ہے بشرطیکہ میت نے اس کی وصیت بھی کی ہو اور ثلث ترکہ میں وہ پورا ہو سکتا ہو، نہ کہ ان کے لیے بھی مروجہ حیلۂ اسقاط پر عملدرآمد کیا جائے۔

(۳) یہ بھی فقہاء کی کتابوں میں بصراحت مذکور ہے کہ اگر میت مالدار ہو اور اس نے وصیت بھی نہ کی ہو تو میت کے اولیاء پر یہ حیلۂ اسقاط لازم نہیں ہے، نہ ان میں سے ایک وارث دیگر تمام ورثاء کی اجازت کے بغیر ترکہ میں سے کچھ بھی اس طرح کے حیلوں پر خرچ کر سکتا ہے کیونکہ وہ شرعاً ایسا

کرنے کا مجاز نہیں ہے، اور اگر کسی وارث نے دوسرے ورثاء کی اجازت کے بغیر ایسا کیا تو شرعاً دوسرے وارثوں کا یہ ضامن ہوگا، فتاویٰ بزازیہ میں اس کی تصریح موجود ہے، جبکہ مروجہ اسقاط میں اس کا خیال اصلاً نہیں کیا جاتا بلکہ ہر حالت میں اس کو لازم اور ضروری خیال کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر ورثاء میں کوئی نابالغ یا غیر حاضر ورثاء بھی موجود ہوں یا حاضر ورثاء ناراض ہوں تو اس وقت بھی ان میں سے جو بڑا وارث ہو وہ لازماً یہ اسقاط کر کے تمام ورثاء کا بے جا حق تلف کرے گا اور خرچ کیا ہوا مال تمام ورثاء کے ذمہ مشترک مشترک طور پر ڈالا جائے گا، حالانکہ یہ شریعت مقدسہ کے سراسر خلاف ہے۔

(۴) فقہاء نے مالِ اسقاط کا مصرف صرف فقراء اور مساکین کو قرار دیا ہے، کوئی خاص طبقہ اس کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا ہے نہ اس کے لیے کوئی خاص وقت مقرر کیا گیا ہے، مگر عوام کے اسقاط میں ایک طرف مخصوص طبقہ اس کے لیے مقرر ہے کہ اگر اس طبقہ کے علاوہ اسقاط کا مال شہر کے دوسرے فقراء و مساکین یا یتیموں اور بیواؤں وغیرہ پر تقسیم کیا جائے تو یہ اسقاط ان کے نزدیک جائز ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف اس کے لیے جنازہ کا خاص وقت مقرر کیا گیا ہے جو اس سے آگے پیچھے کیا ہی نہیں جاسکتا، نہ آگے پیچھے کرنے کو وہ جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ شریعت میں اس طرح کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔

(۵) فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ فعل دور سے قبل میت کی فوت شدہ نمازوں اور روزوں کا حساب کیا جائے گا، پھر جتنا مال برائے فدیہ یعنی اسقاط مقرر کیا گیا ہو اس کا اندازہ لگایا جائے گا کہ وہ کتنی نمازوں کے لیے فدیہ ہوسکتا ہے، تو اس حساب سے نمازوں کے لیے وہ فدیہ بن سکتا ہے فعلِ دور اس اندازے کے مطابق اُس وقت تک جاری رکھا جائے گا کہ پوری عمر کی فوت شدہ نمازوں کے لیے کفارہ ہوسکے یعنی فعل دور پوری نمازوں کے اندازے اور تعداد کے مطابق کیا جائے گا نہ کہ اس سے کم۔ جبکہ عوام کے اسقاط میں فعل دور صرف تین دفعہ کیا جاتا ہے اگرچہ یہ تین دفعہ کا دَور پوری نمازوں کے لیے کافی نہ ہو بلکہ اس سے کم ہو، نیز میت کی نمازوں کا حساب بھی نہیں کیا جاتا اور نہ ہی فدیہ کا اندازہ معلوم کیا جاتا ہے۔

(۶) فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس حلقہ میں مالِ اسقاط کا دور کیا جاتا ہو اس میں غنی اور مالدار آدمی ہرگز نہ ہو کیونکہ غنی اور مالدار کے لیے واجبی فدیہ کا مال لینا جائز نہیں بلکہ حرام ہے، لہٰذا دور کے حلقہ میں کوئی غنی اور مالدار ہرگز نہ ہوگا، لیکن عوام کے اسقاط میں جو لوگ دور میں شریک

ہوتے ہیں وہ اکثر مالدار اور غنی ہوتے ہیں جن کے لیے صدقاتِ واجبہ کا مال لینا قطعی طور پر حرام ہوتا ہے، لہٰذا یہ مروجہ اسقاط فقہاء کا اسقاط ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(۷) عوام کے اسقاط میں قرآن مجید کو جزء فدیہ بنایا جاتا ہے اور قرآن مجید کے بغیر کوئی اسقاط کیا ہی نہیں جاتا، حالانکہ معتبر کتبِ فقہ میں جہاں اسقاط کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے وہاں قرآن مجید کے متعلق اس بات کا نام ونشان نہیں ملتا کہ اس کو بھی مالِ اسقاط کا جزء بنا کر پھرایا جائے۔ اس موقعہ پر بعض ائمہ مساجد قرآن کریم کے ساتھ بیع کا ایک معاملہ کرتے ہیں جو نہایت غلط بھی ہے اور پر فریب بھی۔ چنانچہ میت کے وارث کا اگر اپنا کوئی قرآن نہ ہو تو یہ ائمہ حضرات اس پر دوسر شخص کا قرآن ہزار دو ہزار روپیہ پر ھزلاً فروخت کرتے ہیں، اس میں ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جب ہزار دو ہزار روپیہ پر قرآن مجید فروخت کر کے پھر اس کو مالِ فدیہ کے ساتھ جزء بنا دیا جائے تو فدیہ کی تعداد زیادہ ہو جائے گی کیونکہ فدیہ کے ساتھ دو ہزار روپیہ کا قرآن بھی شامل کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ بیع اوّلاً تو بیع ہی نہیں کیونکہ یہ بیع ھزلاً ہے جداً نہیں ہے، اور تمام علمائے فقہ و اصول لکھتے ہیں کہ ھزلاً بیع شرعی بیع نہیں ہے نہ اس سے بیع کسی کی ملکیت میں آتی ہے، تاوقتیکہ ہزل سے اعراض کر کے ثانیاً بطور جداً بیع نہ کی جائے۔ ثانیاً بالفرض اگر یہ بیع منعقد ہو بھی جائے تو فدیہ کے ساتھ قرآن مجید رکھنے سے فدیہ کی تعداد ہزار دو ہزار روپیہ تک کیسے بڑھ سکتی ہے جبکہ ہزار دو ہزار اس کی قیمت نہیں بلکہ ثمن بذمۂ مشتری مقرر کیا گیا ہے، اور فدیہ میں اگر شامل ہو سکتی ہے تو صرف قرآن مجید کی اصلی قیمت اور مالیت شامل ہو سکتی ہے جو ظاہر ہے کہ ہزار دو ہزار نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ روپے تک پہنچ سکتی ہے۔ فقہاء کرام کے اسقاط میں اس قسم کی پُر فریب چالوں کا اصلاً ذکر نہیں ہے یہ صرف مروجہ عوامی اسقاط ہی میں پائی جاتی ہیں۔

(۸) فقہاء کرامؒ کے نزدیک اسقاط صرف اس دور کو کہتے ہیں جو حلقہ کے اندر کیا جائے اس سے ان کے نزدیک اسقاط پورا ہو جاتا ہے، اس کے بعد مال کی تقسیم ورثاء کے ذمہ پر فرض یا واجب نہیں ہے نہ اس پر کسی درجہ میں اسقاط کا توقف ہے اور اپنی مرضی سے اگر صدقہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مگر اس میں بھی یہ ضروری نہیں کہ کل مال تصدّق کریں یا اُنہیں لوگوں پر تصدق کریں جو میت کی چارپائی کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے بیٹھے ہوں بلکہ اگر اس میں سے تھوڑا سا بھی خرچ کر دیا جائے اور حلقہ والوں کے علاوہ دوسرے فقراء و مساکین

کو دیا جائے تب بھی ثواب ملے گا اور اسقاط میں کوئی نقص نہیں آئے گا۔ اس کے برعکس مروجہ دور اسقاط کے بعد مال کی تقسیم بھی ضروری ہے اس کے بغیر اسقاط ہو ہی نہیں سکتا، یا کم سے کم مکمل نہیں ہو سکتا اور یہ تقسیم بھی ان لوگوں پر ضروری ہے جنہوں نے محنت کر کے دور کا عمل کیا ہے ان کے علاوہ دوسرے فقراء و مساکین پر اگر یہ مال تقسیم کیا جائے تو پھر اپنے اسقاط کا تماشا دیکھ لیں کہ اس کی کیا گت بنتی ہے۔

(۹) ان تمام چیزوں کے علاوہ ننانوے فیصد لوگ اس اسقاط کو ایک رسم اور رواج سمجھ کر ریا اور نمائش کے لیے کرتے ہیں یا اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی بدنامی نہ ہو اور لوگ ان کا مذاق نہ اڑائیں، ایسے لوگوں کی نیت اصلاً ثواب کی نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ریا و نمود و نمائش یا بدنامی سے بچنے کے لیے خواہ لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا جائے اس کا ذرہ برابر بھی ثواب نہیں ملتا۔ لہٰذا ایسے اسقاطوں میں میت کو بھی کوئی ثواب یا نفع نہیں پہنچتا ہے، البتہ اسقاط کرنے والوں کی لوگوں میں نیک نامی ضرور ہوتی ہے اور اُن لوگوں کو بھی دنیوی منفعت مل جاتی ہے جن کے ہاتھ اسقاط میں چند روپے آجاتے ہیں، میت بے چاری کو اس طرح کے اسقاطوں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

(۱۰) اس کے علاوہ عوام کے اسقاط میں مال کی تقسیم بھی بڑے غلط طریقہ سے کی جاتی ہے، یعنی جو لوگ عزت دار اور ذی وجاہت ہوتے ہیں اور کسی بڑی مسجد کے پیش امام ہوتے ہیں ان کو تو دُو دُو، تین تین بلکہ اس سے بھی زیادہ روپے دیتے ہیں اور غریب محتاج طالبعلم یا دیگر فقراء و مساکین جو کسی مسجد کے پیش امام نہیں ہوتے ہیں ان کو ایک یا دو آنے دیئے جاتے ہیں۔ اب انصاف سے کہیئے کہ یہ تمام چیزیں عوام کے مروجہ اسقاط میں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر پائی جاتی ہیں اور یقیناً پائی جاتی ہیں تو براہ کرم یہ بھی بتائیے کہ مروجہ اسقاط کو فقہاء کے اسقاط کے ساتھ کوئی مناسبت ہے یا نہیں؛ پھر کس طرح یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ فقہاء نے اپنی کتابوں میں اسقاط کا ذکر کیا ہے اس لیے عوام الناس میں جو اسقاط رائج ہے یہ بھی جائز ہوگا کیونکہ اس کا نام بھی اسقاط ہے۔ حاشا وکلاّ۔

اس بناء پر اسقاط کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اگر کہیں یہ اسقاط فقہاء کرام

کے تعلیم کردہ اسقاط کے موافق کیا جاتا ہو اور اس میں مندرجہ بالا مفاسد میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو وہ جائز اور کارِ ثواب ہوگا بشرطیکہ اس کو فرض یا واجب جان کر نہ کیا جائے اور اگر مندرجہ بالا مفاسد میں سے بعض مفاسد اس میں پائے جاتے ہوں تو وہ اسقاط ان مفاسد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا نہ کہ کارِ ثواب ۔ ایسے حضرات کو چاہیئے کہ پہلے قانونِ وراثت کی رُو سے میت کے ترکہ میں سے پہلے اس کا قرض ادا کریں اس کے بعد ورثاء کے مابین شرعی قانون کے مطابق باقیماندہ ترکہ تقسیم کرکے ہر ایک وارث کو اپنا اپنا حصہ دیدیویں، اس کے بعد ورثاء میں سے کوئی اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ میت کے ایصالِ ثواب کے لیے جتنا مال چاہے خرچ کرے، یہی صحیح اور شرعی طریقہ ہے جو کہ سلف صالحین سے منقول ہوتا چلا آیا ہے اور قرآن و حدیث کے احکامات کے ساتھ مطابقت بھی رکھتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دُعا بعد السنّة بھیئة اجتماعیه کی شرعی حیثیت

سوال:- محترم المقام جناب مفتی صاحب ایک مسئلہ ہمارے ہاں بڑے نزاع کا باعث بنا ہوا ہے ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دُعا بعد السنّة بھیئة اجتماعیه علی الاطلاق اور بعض کا کہنا ہے کہ دُعا بعد السنّة بھیئة اجتماعیه ضرور کرنی چاہیئے ۔ براہِ کرم صحیح مسئلہ کی طرف رہنمائی فرمائیں ۔ جزاکم اللہ ۔

الجواب:- دُعا بعد السنة بھیئة الاجتماعیة ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن چکا ہے بعض لوگ اس دعا کے ترک کرنے میں انتہا کر جاتے ہیں اور اتنا غلو کر جاتے ہیں کہ اس عمل کو مطلق بدعت قرار دیتے ہیں ۔ اور بعض غلو سے کام لے کر بالالتزام دعا بعد السنة کے مرتکب ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ راہِ اعتدال سے ہٹ کر مسئلہ بیان کرتے ہیں ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شریعتِ مقدسہ نے دعا کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دُعا بھیئة اجتماعیه اور انفراداً دونوں طرح ثابت ہے ۔ نیز احادیث مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دبر الصلوٰة دعا مانگنے کی ترغیب بھی وارد ہوئی ہے جبکہ دبر کا اطلاق جس طرح [illegible] متصل وقت پر ہوتا ہے اسی طرح منفصل وقت یعنی سنتوں کے بعد پر بھی ہوتا ہے لہٰذا اگر دعا بعد السنة بھیئة اجتماعیة بلا التزام مانگی جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ۔ مگر یاد رہے کہ اس مسئلہ کو فتنہ و فساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے ۔

کما قال العلامہ یوسف البنوری رحمۃ اللہ تعالیٰ الدعاء للامام والمأموم والمنفرد مستحب عقب کل صلوٰة بلا خلاف و یقول و یستحب أن یقبل علی الناس فیدعوا

معارف السنن ٣/١٢٣

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک (بال) موجود ہیں، لوگ ان کی زیارت کے لیے ثواب کی نیت سے جاتے ہیں اور وہاں نذرانے وغیرہ پیش کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی کسی جگہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک موجود ہیں اور ان کی زیارت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک (بال) موجود تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر احرام سے نکلنے کے لیے حلق فرمایا تو ان موئے مبارک کو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے صحابۂ کرامؓ میں تقسیم فرمایا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابۂ کرامؓ نے اپنی جانوں سے پیارا سمجھ کر ان کی حفاظت فرمائی۔

لما رواہ الامام ابوعیسٰی الترمذی رحمہ اللہ: عن انس بن مالکؓ قال: لما رمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجمرۃ نحر نسکہ ثمّ ناول الحالق شقہ الایمن فحلقہ فأعطاہ ابا طلحۃ ثمّ ناولہ شقہ الایسر فحلقہ فقال: اقسمہ بین النّاس

[الجامع الترمذی علیٰ صدٗ معارف السنن ج۶ ص۲۷۵
باب ماجاء بأی جانب الرأس یبدأ فی الحلق، کتاب الحج]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے جن کو وہ اپنے خود (حفاظتی ٹوپی) میں رکھا کرتے تھے خصوصاً جنگ کے موقع پر انہیں اپنے خود میں ضرور رکھتے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ آپ کو فتح عطا فرماتا۔

قال العلامۃ العینی رحمہ اللہ: وذکر غیر واحد ان خالد ابن الولیدؓ کان فی قلنسوتہ شعرات من شعرہ

صلی اللہ علیہ وسلم فلذٰلک کان لا یقدم علیٰ وجہ الا فتح لہٗ و یؤیدہ ما ذکرہ الملا فی السیرۃ ان خالد سأل اباطلحۃ حین فرق شعرہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الناس ان یعطیہ شعرۃ ناصیتہ فاعطاہ ایاہ فکان مقدام ناصیتہ مناسبًا لفتح کل ما اقدم علیہ۔

[عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۶۳ کتاب الحج
باب الحلق والتقصیر عند الاحلال]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے اہل و عیال کی وساطت سے دوسروں تک بھی پہنچے جو ان کے ہاں دنیا وما فیہا سے زیادہ محبوب تھے ۔ چونکہ صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد پوری دنیا میں پھیل گئے تھے، اس لیے ممکن ہے کہ آپ کے موئے مبارک صحابۂ کرامؓ کے واسطہ سے کشمیر اور افغانستان کے علاقوں میں کسی کے پاس ہوں۔

علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ نے صحیح بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے : عن ابن سیرین قال : قلت لعبیدۃ! عندنا من شعر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصبناہ من قبل انس او من اھل انس فقال لأن تکون عندی شعرۃ منہ احب الی من الدنیا و ما فیھا ۔ (معارف السنن ج ۶ ص ۲۷۸، ۲۷۹ کتاب الحج)

تو ان روایات اور اس قسم کی دوسری روایات سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک لوگوں کے ہاں محفوظ چلے آرہے ہیں، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دنیا کے کسی مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک موجود ہوں اور لوگ ان کی زیارت کے لیے سفر کریں ، تاہم اگر اس بارے میں کہیں شک پیدا ہو جائے تو خاموشی اختیار کرنے میں ہی بہتری ہے ۔ خواہ مخواہ تنازع کی صورت اختیار کرنے سے اجتناب کیا جائے ۔

فرض نمازوں کے بعد باآوازِ بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں فرض نمازوں کے بعد امام صاحب مع مقتدیوں کے تین مرتبہ بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھ کر درود شریف اور اللّٰھم انت السلام الخ کو بھی باآوازِ بلند پڑھتے ہیں حالانکہ نماز میں مسبوقین بھی موجود ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ خاص کر جب اس کے تارک پر طعن کی جاتی ہو؟

الجواب:۔ کلمہ طیبہ اور درود شریف کا جہر سے پڑھنا اجتماعاً وانفراداً دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو، اگر ایسا کرنے سے نمازیوں کی نمازوں میں خلل پڑتا ہو تو پھر یہ عمل درست نہیں۔

ایک دوسرے کو "عید مبارک" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آجکل عیدین کے موقع پر اکثر لوگ ایک دوسرے کو "عید مبارک" کے الفاظ کہتے ہیں، جبکہ بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عیدین کے موقع پر اسلام میں کئی افعال اور اعمال سنت ہیں جو ہر مسلمان کے لیے خوشی کے مواقع (عیدین وغیرہ) پر جائز قرار دیئے گئے ہیں جیسا کہ احادیث وآثارِ سلف صالحین میں وارد ہے البتہ رسوماتِ قبیحہ اور بدعاتِ مروجہ سے بچنا بھی نہایت ہی ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق عیدین کی خوشی پر اگر ایک مومن دوسرے مومن سے یہ کہہ دے کہ عید مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کے روزے، نمازیں اور تراویح قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کی قربانی قبول فرمائے، تو یہ ایک عبادت کے کرنے پر شاباش وترغیب ہے اور اعمالِ صالح کی عنداللہ قبولیت کے لیے دعا ہے۔ ایسا کہنے میں بظاہر کوئی حرج نہیں، البتہ اس طرح کے الفاظ کہنے کو لازم سمجھنا اور نہ کہنے والے سے ناراض ہونا یا اس کا اتنا اہتمام کرنا اور عید کی مبارکباد دینے کے لیے گلی گلی اور گھر گھر پھرنا یقیناً ایک مکروہ عمل ہے اور ثواب کی نیت وارادہ سے کرنا احداث فی الدین ہے۔

الدر المختار میں ہے: والتھنئۃ بتقبل اللہ منا ومنکم لاتنکر الخ اور رد المحتار میں ہے کہ: قولہ والتھنئۃ وانما قال ذلک لانہ لم یحفظ فیھا شیئ عن ابی حنیفۃ واصحابہ وذکر فی القنیۃ انہ لم ینقل عن اصحابنا کراھۃ وعن مالک انہ کرھھا وعن الاوزاعی

أنها بدعة وقال المحقق ابن امير الحاج بل الأشبه انها جائزة مستحبة فى الجملة ثم ساق آثارًا باسانيد صحيحة عن الصحابة فى فعل ذٰلك ثم ذٰلك والمتعامل فى البلاد الشامية والمصرية عيد مبارك عليك ونحوه وقال يمكن ان يلحق بذٰلك فى المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم فان قبلت طاعتهٗ فى زمان كان ذٰلك الزمان عليه مباركًا على انهٗ قد ورد الدعاء بالبركة بها هنا ايضًا اھ (رد المحتار على الدر المختار ج ۱ ص۵۵۶) [۱]

مساجد میں تعزیہ لانے کا حکم

سوال: ہمارے محلے میں بریلوی حضرات کی ایک مسجد ہے محرم الحرام میں یہ لوگ تعزیہ بنا کر مسجد میں لاتے ہیں اور وہاں حضرت امام حسینؓ کی یاد میں مرثیہ خوانی کرتے ہیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس منعقد کرتے ہیں اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں تعزیہ لانا اور مرثیہ خوانی وغیرہ کی مجالس قائم کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اوّلاً تو اسلام میں کسی میت کا تین دن سے زیادہ سوگ کرنا حرام اور ناجائز ہے، احادیث میں اس پر کافی وعیدیں آئی ہیں، البتہ عورت اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرسکتی ہے۔ ثانیاً اسلام میں تعزیہ سازی کا کوئی وجود نہیں چہ جائیکہ اسے مسجد میں لایا جائے، بلکہ ایسا کرنا خلافِ شرع اور بدعت ہے۔

لما قال العلامة مفتی عزیز الرحمٰنؒ: تعزیہ داری اور مجالسِ مرثیہ خوانی وغیرہ ہر جگہ اور ہر وقت حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور بالخصوص مساجد میں یہ کام سخت ظلم اور معصیت اور موجب

---

[۱] قال ابن الحاجؒ فى المدخل: قد اختلف علماءنا رحمة الله عليهم فى قول الرجل لاخيه يوم العيد تقبل الله منا ومنك وغفرلنا ولك على اربعة اقوال جائز لانه قول حسن، مكروه لانهٗ من فعل اليهود مندوب اليه لانهٗ دعاء ودعاء المؤمن لاخيه مستحب الرابع لايبتدئ به فان قال لهٗ احد ردّ عليه مثلهٗ واذا كان اختلافهم فى هٰذا الدعاء الحسن مع تقدم حدوثه فما بالك بقول القائل عيد مبارك مجردًا عن تلك الالفاظ مع انهٗ متاخر الحدوث فمن باب اولىٰ ان يكرهوه وهو مثل قولهم يوم مبارك وليلة مباركة وصبحك الله بالخير ومساك بالخير۔ (المدخل لابن الحاج المالكى ج۲ ص۲۸۲ فصل فى سلام العيد)

عتابِ الٰہی ہے، مسلمانوں کو ایسی حرکات سے توبہ کرنا چاہیئے، یہ امور حرام اور گناہ کبیرہ ہیں کفر نہیں ہیں، اصرار کرنے والا ان امور پر فاسق ہے اور تعزیر کا مستحق ہے۔

(عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص۱۰۳ کتاب السنۃ والبدعۃ)

ختنہ کی دعوت بدعت نہیں

سوال:- بچے کے ختنے کی خوشی میں لوگوں کو شرکت کی دعوت دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض حضرات اس کو بدعت کہتے ہیں؟

الجواب:- شادی بیاہ، ختنے اور دیگر خوشیوں کے مواقع پر کھانا تیار کر کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا جائے۔

قال العلامۃ عبد الحق الدھلویؒ: در مجمع البحار گفتہ کہ ضیافت بر ہشت نوع است ولیمہ برائے عرس وخرس بضم خای معجمہ برائے ولادت واعذار برائے ختان ووکیرہ برائے بنا ونقیعہ برائے قدوم مسافر... الخ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص۱۳۹ باب الولیمۃ) [1]

دُرود شریف کے لیے قیام کرنا

سوال:- بعض لوگ جلسوں اور وعظ ونصیحت کی مجالس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سنتے ہی کھڑے ہو کر با آوازِ بلند صلوٰۃ وسلام پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، شرعاً ایسے قیام کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنا اگرچہ موجبِ ثواب ہے مگر درود شریف پڑھنے کے لیے قیام کرنا سلف وخلف میں کسی سے ثابت نہیں، اس کے علاوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے لیے قیام کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سنکر درود شریف پڑھنے کے لیے کھڑے ہونا اور پھر اس پر التزام کرنا خلافِ شرع ہے۔

---

[1] قال العلامۃ قطب الدینؒ: (عرس اونحوہ) اس سے ختنہ اور عقیقہ وغیرہ کی دعوت مراد ہے۔ (مظاہرِ حق جلد ۳ ص۳۵۸ باب الولیمۃ)

وَمِثْلُہٗ حاشیۃ صحیح بخاری ج ۲ ص۷۷۷ باب الولیمۃ حق۔

لما ورد فی الحدیث : عن انس ؓ قال لم یکن شخص احبّ الیھم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہٖ لذٰلک۔ رواہ الترمذی۔ وقال حدیث حسن صحیح۔
(مشکوٰۃ المصابیح ص۴۰۳ باب القیام)

مصائب میں بخاری شریف کے ختم کا حکم

سوال :۔ جنابِ مفتی صاحب! بعض دینی مدارس میں مصیبت کے وقت بخاری شریف کا ختم کرایا جاتا ہے، شرعاً ایسے ختم کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ مصیبت میں بخاری شریف کا ختم کرنا قرون بالخیر میں نہیں تھا مگر متأخرین علماء نے اس کو جائز کہا ہے۔

لما قال العلامۃ رشید احمد گنگوھیؒ : قرونِ ثلاثہ میں بخاری شریف تالیف نہیں ہوئی تھی مگر اس کا ختم درست ہے کہ ذکرِ خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس کا اصل شرع سے ثابت ہے بدعت نہیں۔ (تالیفاتِ رشیدیہ ص۱۵۲ کتاب البدعات)

بڑے لوگوں کی برسیاں منانا

سوال :۔ آجکل عوام میں یہ ایک عام رواج بن چکا ہے کہ ہر سال قوم کے مقتداء اور بڑے لوگوں کی برسیاں منائی جاتی ہیں، جیسے کہ یومِ صدیقِ اکبرؓ، یوم فاروق اعظمؓ، یوم اقبالؒ اور یوم قائداعظم وغیرہ، شرعاً ان برسیوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ اسلام ایک کامل اور مکمل دین اور ضابطۂ حیات ہے جو کہ خدا پرستی کا داعی ہے اور شخصیت پرستی سے منع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیرالقرون میں اس قسم کے اعمال (برسی وغیرہ) کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کے دنیا سے جانے کے بعد خلفاءراشدین اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بعد میں آنے والے تابعین و تبع تابعین حتیٰ کہ کسی بھی امام یا محدث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برسی نہیں منائی اور نہ آپؐ کی یاد میں کوئی چھٹی کی، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں : لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تحد علیٰ میت فوق ثلثۃ ایام الا علیٰ زوجھا اربعۃ اشھر وعشرًا۔ (الھدایۃ ج۲ ص۴۰۷ باب العدۃ۔ فصل فی الحداد)

البتہ اگر اس کو ایصالِ ثواب کے لیے منایا جاتا ہو اور اس دن اموات کے ایصالِ ثواب

کے لیے ختمات القرآن وغیرہ ہوتے ہوں تو اس تخصیصِ ایام کی وجہ سے بھی یہ خلافِ شرع ہے اسلئے کہ شریعتِ مقدسہ نے ایصالِ ثواب کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں کیا بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ اس کی گنجائش ہے، اپنی طرف سے کوئی خاص دن مقرر کرنا دین میں زیادتی ہے جو اسلام کے کامل اور مکمل ہونے کی صفت کے خلاف ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان خرافات اور بیہودہ رسومات سے پرہیز کریں اور یہود و ہنود کا طریقہ ترک کر دیں۔

شادی کے موقع پر سہرا باندھنا

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! آجکل شادی بیاہ کے موقع پر دولہا کو سہرا باندھا جاتا ہے اور اس کو شادی کا لازمی حصہ تصوّر کیا جاتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ سہرا باندھنا ہندوؤں کی رسم ہے جو کہ عرصہ دراز تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں رواداری اور باہمی میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں سرایت کر چکی ہے، اس لیے یہ واجب الترک ہے اور اس پر التزام و اصرار کرنا موجبِ گناہ ہے۔

لما قال العلامۃ مفتی محمد کفایت اللہؒ: نکاح یا کسی اور تقریب کے موقع پر باجہ وغیرہ بجوانا، سہرا باندھنا، ناچ رنگ کرانا ناجائز ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۵ ص۱۴۱ چھٹا باب، مہر، چڑھاوا، جہیز وغیرہ)

سالگرہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آجکل خوشی منانے کی ایک عجیب رسم کا رواج ہے وہ یہ کہ جب کسی کی پیدائش کی تاریخ یا دن آجاتا ہے تو عزیز و اقارب کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے اور پھر بڑی دھوم دھام سے موم بتیاں جلا کر مخصوص قسم کا کیک کاٹا جاتا ہے، معاشرے میں اس کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے، لوگ اس خوشی میں ایک دوسرے کو گرانقدر تحفے تحائف دیتے ہیں، اور اس سب کچھ کو سالگرہ کہا جاتا ہے۔ تو کیا شرعاً اس کا کوئی ثبوت ہے، اور اس قسم کی دعوت میں شرکت کرنا، تحفہ وغیرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں اس قسم کے رسم و رواج کا کوئی ثبوت نہیں ہے، خیر القرون میں کسی صحابی، تابعی، تبع تابعین یا ائمہ اربعہ میں سے کسی سے مروجہ طریقہ پر سالگرہ منانا ثابت نہیں، یہ رسم بد انگریزوں کی ایجاد کردہ ہے ان کی دیکھا دیکھی کچھ مسلمانوں میں بھی یہ رسم سرایت کر چکی ہے۔ اس لیے اس رسم کو ضروری سمجھنا، ایسی دعوت میں شرکت کرنا

اور تحفے تحائف دینا فضول ہے، شریعتِ مقدسہ میں اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

عیسوی سال شروع ہونے پر خوشیاں منانا

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ملکِ عزیز پاکستان میں بھی یہ رواج ہے کہ جب نیا عیسوی سال شروع ہوتا ہے تو لوگ ایک دوسرے کو (نیو ایئر نائٹ کے عنوان سے) مبارکباد دیتے ہیں، ملک بھر میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ تو کیا عیسوی سال کے شروع میں اس طریقہ پر خوشیاں منانے کا شریعتِ مقدسہ میں کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمانوں کے لیے ہجری سال مقرر ہے اور اسی سے ہمارے اسلامی تشخص کا اظہار ہوتا ہے، عیسوی سال عیسائیوں کا ہے اور وہی اس کی آمد پر خوشیاں مناتے ہیں۔ بعض مسلمان جہالت اور ناسمجھی سے یہ خوشیاں مناتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لیے ہجری سال اپنائیں اور اپنے حساب وکتاب کا سارا دارومدار اسی کے مطابق رکھیں، اس لیے کہ اسلامی عبادات کا تعلق قمری سال سے ہے نہ کہ عیسوی سال سے۔

نیا کام شروع کرنے پر قرآن خوانی کا اہتمام کرنا

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! آجکل یہ ایک عام رواج بن چکا ہے کہ جب کوئی نیا کام شروع کرتے ہیں یا مکان وغیرہ بناتے ہیں تو اس میں خیر و برکت کی غرض سے چند لوگوں کو بلا کر ان سے قرآن مجید کا ختم کرایا جاتا ہے اور یہاں تک اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ اس وقت تک کوئی کام شروع ہی نہیں کرتے جب تک قرآن مجید کا ختم نہ کرالیں۔ شرعاً ایسے ختمِ قرآن کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم کی تلاوت فی نفسہٖ خیر و برکت کا ذریعہ ہے، اس کے پڑھنے یا پڑھوانے سے کاروبار، گھر اور دوکان وغیرہ میں برکت ہوتی ہے مگر اس کو دین کا جز نہیں سمجھنا چاہیئے، بغیر ختمِ قرآن کے بھی اللہ تعالیٰ سے خیر و برکت کی دعا مانگی جاسکتی ہے اور مانگنی چاہیئے۔ البتہ ختمِ قرآن کو ایک رسم کی شکل دے کر ضروری سمجھنا اور اس کا خوب اہتمام کرنا دین میں زیادتی کے مترادف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

★

جمعہ کی نماز کے بعد درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! کچھ عرصہ سے بعض مساجد میں نمازِ جمعہ کے بعد اجتماعی طور پر کھڑے ہو کر لاؤڈ سپیکر پر با آوازِ بلند صلوٰۃ و سلام پڑھنے کا رواج ہے اور ایسا نہ کرنے والوں پر لعن طعن کی جاتی ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام پڑھنا اعظم القربات میں سے ہے لیکن شریعتِ مقدسہ نے اس کے لیے کوئی خاص دن اور وقت مقرر نہیں کیا ہے بلکہ ایک مسلمان جب بھی اور جس وقت بھی چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام پڑھ سکتا ہے اور یہ عمل باعثِ خیر و برکت اور موجب اجر و ثواب ہے، مگر اس کے لیے از خود وقت اور دن متعین کرنا خلافِ شرع اور بدعت ہے، بریلوی حضرات کے اس نو ایجاد عمل کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، یہ ان حضرات کا ذاتی اور خود ساختہ عمل ہے جو کہ شرعاً واجب الترک ہے۔

کھانے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگنا

سوال:- بعض علاقوں میں یہ ایک عام رواج ہے کہ وہاں خواتین کھانا اور پانی کا گلاس سامنے رکھ کر اس پر ہاتھ رکھتی ہیں اور پھر فاتحہ پڑھتی ہیں، اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:- ایصالِ ثواب کے لیے کھانا وغیرہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرنا جائز ہے مگر اس پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگنا بے اصل اور خلافِ شرع ہے۔

لما قال المفتی کفایت اللہؒ: کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینے کی رسم بے اصل ہے کھانا اللہ کے واسطے کسی مسکین کو دیدیا جائے بس یہی کافی ہے اور جو کچھ کہ ثواب پہنچانا ہے وہ بغیر کھانا سامنے پڑھ کر ثواب پہنچا دیا جائے، آدھا کھانا دریا یا ندی میں ڈالنا ناجائز ہے اور اس کو ثواب سمجھنا غلط ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۱ ص۲۱۹ کتاب العقائد) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ: سوال: کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرامؓ، امام حسنؓ و حسینؓ، حضرات تابعینؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت غوثِ پاکؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کھانے کو سامنے رکھ کر اس پر فاتحہ پڑھ کر کسی کو بخشا تھا؟

جواب: یہ اکابر تو متبع شریعت اور پابند سنت تھے، یہ بے دلیل اور غلط طریقہ کو کیسے اختیار کر سکتے ہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ ج ۱۵ ص ۴۰۷، ۴۰۸ باب البدعات والرسوم)

اولیاء اللہ کی قبروں کا طواف کرنا | سوال:۔ آجکل کچھ لوگ خصوصاً خواتین اولیاء اللہ کے مزارات کے ارد گرد خانہ کعبہ کے طواف کی طرح چکر لگاتی ہیں اور اس کو کارِ ثواب سمجھتی ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اولیاء اللہ کے مزارات یا دیگر قبروں کا طواف کرنا نا جائز وحرام ہے اوراس کو کارِ خیر سمجھ کر کرنا موجب کفر ہے اس لیے اس گندے اور مشرکانہ طرزِ عمل سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامة ملا علی قاریؒ: ولا یطوف ای ولا یدور حول البقعة الشریفة لان الطواف من مختصات الکعبة المنیفة فیحرم حول قبور الانبیاء والاولیاء ولا اعتبار بما یفعله العامة الجهلة ولو کانوا فی صورة المشائخ والاولیاء۔

(ارشاد الساری ص۳۴۲ فصل وبلغتم ایام مقامہ)

قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا | سوال:۔ بعض لوگ اولیاء اللہ کی قبروں پر پھول وغیرہ ڈالتے ہیں، اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تازہ پھول اور سبز پتے یا شاخ وغیرہ اس نیت کے ساتھ قبروں پر رکھنا کہ اس سے عذابِ قبر میں تخفیف ہوا اور اس کی حمد و ثناء سے میت کو نفع ہوگا اگرچہ شرعاً جائز ہے، مگر شر و فساد اور فتنوں کے اس دور میں چونکہ نیتوں میں اکثر فتور پیدا ہو چکا ہے اس لیے علماءِ کرام نے اولیاء اللہ کی قبروں پر پھول یا پھولوں کی چادریں ڈالنے کو خلافِ شرع قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: کیا عوام الناس کی یہ نیت ہوتی ہے، اگر یہ نیت ہوتی تو فساق وعصاۃ کی قبور پر پھول چڑھاتے اولیاء کی قبور پہ نہ چڑھاتے، اور اگر کسی کی نیت ہو بھی تب بھی اس کا فعل عوام کے لیے موجبِ فساد

ؔ لما قال العلامة شاہ محمد اسحٰق الدھلویؒ: طواف کردن قبر سہ بار یا شد یا غیر سہ بار شرعاً غیر جائز وحرام است و مرتکب حرام کہ اصرار بران و فاسق میشود و اگر جائز و مستحب دانستہ طواف نمودہ باشد موجب کفر است۔ (مائة مسائل ص۵۹ سوال سی وچھارم)

ومثلہ فی تالیفاتِ رشیدیہ ص۱۳۵ کتاب البدعات۔

ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے بھی منہی عنہ ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۳۴۰ کتاب البدعات) [1]

والدین کی قبروں کو بوسہ دینے کے بارے میں شرعی حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک مولوی صاحب سے دورانِ وعظ یہ بات سننے میں آئی ہے کہ والدین کی قبروں کو بوسہ دینا جائز ہے جبکہ ہم علماء کرام سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ قبروں کو بوسہ دینا حرام اور قبر پرستی ہے، تو کیا والدین کی قبریں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، اور کیا یہ قبر پرستی نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں؟

الجواب:- قبر پرستی والدین کی ہو یا کسی اور کی، ناجائز وحرام ہے، اسلام میں اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے، مولوی صاحب نے جو بات وعظ میں کہی ہے کسی نادر الوقوع کتاب کے مصنف نے لکھی ہے مگر یہ قابلِ فتویٰ نہیں کیونکہ نادر الوقوع کتابوں پر فتویٰ دینا قواعد افتاء کے خلاف ہے اس لیے صحیح اور قابلِ فتویٰ قول یہ ہے کہ والدین کی قبروں کو بھی بوسہ دینا حرام وناجائز ہے۔

لما قال العلامة عبد الحیؒ: بوسہ دادن قبرِ والدین جائز است یا نہ؟ الجواب: حرام است کذا صرح علی القاری وغیرہ۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ج ۳ ص ۶۷ ما یتعلق بالقبور، کتاب الجنائز)

---

[1] قال العلامة محمد یوسف البنوریؒ: فتری العامة یلقون الزھو علی القبور وبالاخص علی قبور الصلحاء والاولیاء والجھلة منھم ازداد واصرارا علی ذلک وتغالوا فیه واوصت ذلک منشأ فی الجھلة لعقائد فاسدة تأبھا الشریعة النقیة وظنوا ذلک سببا للثواب والاجر الجزیل فالمصلحة التامة فی الشریعة تقتضی منع ذلک بتاتا استئصالا لشافة البدع وحسما لمادة المنکرات المحدثة وبالجملة ھذہ بدعة مشرقیة منکرة۔ (معارف السنن ج ا ص ۲۶۵ باب التشدید فی البول)

[2] قال العلامة عبد الحق الدھلویؒ: ایں قدر تعظیم قبر در شرع آمدہ کہ بر آں جلوس نکنند وپا نہند ونعل بر آں نہ دارند واز عائط وبول بر آں احتراز سازد وتعظیم قبر بوسہ دادن ودست مالیدن وسجدہ وطواف وتقبیل نمودن ومنحنی شدن در دیگاک مالیدن درست نیست چنانچہ روایات ایں امور در جوابات سابقہ گذشتہ واز آں جملہ در کتاب کشف الغطاء شیخ الاسلام مذکور است دست نہ نہند بر قبر ومسح نکنند وبوسہ ندہد ومنحنی نشود وبخاک نمالد اوکہ ایں عادت نصاریٰ است ومشائخ در منع ان تشدید بسیار دارند وآنچہ عوام مردم الآن کنند از بدعتہائے منکر است شرعاً وبالجملہ شک نیست۔ (مائۃ مسائل ص ۶۷ سوال چہل وچہارم)

بغیر نماز کے شبینہ کا حکم

سوال:- بعض علاقوں میں میت کے ایصالِ ثواب یا تقربِ الٰہی کے لیے چند حفاظ کرام شبینہ کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہر حافظ قرآن اپنی باری پر قرآن سامنے رکھ کر بغیر نماز کے لاؤڈ سپیکر پر تلاوت کرتا ہے، اسی طرح یہ سلسلہ ساری رات جاری رہتا ہے، اس سے لوگوں کی نیندیں بھی خراب ہوتی ہیں، بیماروں کو تکلیف ہوتی ہے جبکہ بعض خاص حالات میں قرآن سننا ویسے ہی بے ادبی ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس طریقہ پر قرآن مجید پڑھنے کی شریعت میں گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت اگرچہ اعظم القربات تقربِ الٰہی کے ذرائع میں سے ایک بڑا ذریعہ ہے مگر اس کے لیے وہ کیفیت وطریقہ اختیار کیا جائے جس کے آثار قرونِ ثلاثہ میں پائے جاتے ہوں، اپنی طرف سے کوئی ایسا طریقہ تلاوتِ قرآن کے لیے اختیار کرنا جو خیر القرون میں نہ ہوا اور پھر اس نوایجاد طریقہ سے لوگوں کو تکلیف بھی ہوتی ہو باعثِ گناہ وعذاب ہے اس لیے صورتِ مسئولہ کا شبینہ درست ہی نہیں بلکہ واجب الترک ہے۔

تیجے ورسم قل وغیرہ میں ختم قرآن کا حکم

سوال:- برصغیر پاک وہند کے اکثر علاقوں میں یہ رسم عام ہے کہ میت کے تیسرے دن محلہ کے امام مسجد اور حفاظ وغیرہ کو جمع کر کے میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن مجید کا ختم کرایا جاتا ہے اور اس رسم پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں پر انتہائی گھٹیا قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں، شرعاً اس طریقہ ایصالِ ثواب کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآنِ کریم کی تلاوت، نفل نمازیں اور دیگر نیک اعمال کرنا شرعاً مرخص ہے اور اس سے میت کو فائدہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے وقت اور ایام کی تخصیص شرع میں ثابت نہیں، اس لیے مذکورہ بالا طریقہ ایصالِ ثواب کو فقہاء کرام نے بدعت شمار کیا ہے۔

لما قال العلامة رشید احمد گنگوهیؒ: مقرر کردن روز سوم وغیرہ بالتخصیص واو را ضروری انگاشتن در شریعت محمدیہ ثابت نیست صاحب نصاب الاحتساب آں را مکروہ نوشتہ رسم ورا تخصیص بگذارند ہر روز یکہ خواہند بروح میت رسانند ومیت قریب مرگ خود زیادہ تر محتاج مدد میشود ہر قدر کہ ایصالِ ثواب بہر روز یکہ شود موجب خیر است۔

(تالیفاتِ رشیدیہ ص۱۴۲ کتاب البدعات)

نماز کے بعد التزاماً اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ الخ التزاماً پڑھنا

سوال :۔ بعض ائمہ مساجد فرض نمازوں کے بعد بالالتزام باآواز بلند آیتِ کریمہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ الخ پڑھ کر درود شریف پڑھتے ہیں اور نہ پڑھنے والوں پر وہابیت اور منکرِ درود کا فتویٰ لگاتے ہیں، تو کیا فرض نمازوں کے بعد درود شریف بلند آواز سے پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب :۔ درود شریف بلند آواز سے ہو یا آہستہ سے، دونوں طرح بلا التزام درست اور اجر و ثواب کا باعث ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں درج طریقہ قرون بالخیر میں اور نہ ہی ائمہ اربعہ میں کسی سے ثابت ہے، اس لیے یہ طریقہ چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں طرح خلافِ شرع اور بدعت ہے۔

لما قال العلامة ابن امیر الحاج المالکیؒ: الصلوٰة والتسليم على النبی صلی الله عليه وسلم لا یشك مسلم انها من اکبر العبادات واجلها وان کان ذکر الله تعالیٰ والصلوٰة والسلام على النبی حسنا سرًّا وعلانیاً لکن لیس لنا ان نفع العبادات الّا فی مواضعها التی وضعها التی وضعها الشارع فيها ومضی عليه سلف الائمة الا ترٰی الی قول عبد الله بن عمرؓ انّ الله قد بعث الینا محمّد صلی الله عليه وسلم ولا نعلم شيئًا وانما نفعل کما رأیناه یفعل ۔۔۔۔۔ والصّلوٰة والتسليم على النّبی صلی الله عليه وسلم احد ثوابها فی اربعة مواضع لم تکن تفعل فيها فی عهد من مضی والخير کله فی الاتباع لهم۔ (المدخل ج۲ ص۲۵، ۲۶)[1]

عرفہ کے دن حجاج سے مشابہت کیلئے شہر سے باہر نکلنا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! عرفہ کا دن بہت مبارک دن ہے، اس دن حاجی صاحبان عرفات کے میدان میں جمع ہوکر وہاں ظہر اور عصر کی نمازیں

---

[1] لما قال العلامة مفتی کفایت الله الدهلویؒ: سوال :۔ سنتوں کے بعد امام باجماعت فاتحہ خوانی اور درود بھیجنا کارِ ثواب ہے یا بدعت؟

الجواب :۔ سنتوں کے بعد اس عمل کا التزام کرنا سنت نہیں اور اس پر اصرار اور التزام کرنا بدعت ہے۔ (کفایت المفتی ج۱ ص۲۴۵ کتاب العقائد)

ادا کرتے ہیں، اب اگر ہم یہاں پاکستان میں گاؤں یا شہر سے باہر جا کر کسی پہاڑی وغیرہ کے دامن میں حجاج کے ساتھ مشابہت کے لیے وہاں ظہر و عصر کی نماز ادا کریں تو کیا ہمیں ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب: عرفہ کا دن اگرچہ بہت مبارک دن ہے لیکن حجاج کے ساتھ تشبّہ کے لیے میدانِ عرفات کے علاوہ اپنے اپنے علاقوں میں باہر کھلے میدان میں نکل کر ظہر و عصر کی نمازیں ادا کرنے کے بارے میں شریعتِ مقدسہ میں کوئی حکم وارد نہیں، اس لیے فقہاءِ کرام نے اس عمل کو بے اصل اور بدعت قرار دیا ہے اسی لیے اس عمل پر کسی قسم کے اجر و ثواب کی امید تو درکنار بلکہ الٹا عذاب کا خطرہ ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والحاصل ان الصحیح الکراھة کما فی الدرر بل فی البحر ان ظاھر ما فی غایة البیان انھا تحریمیة وفی شرح المنیة انما مفاتیح ھذہ الاشیاء البدع ----- ومالم یکن من امرھم فھو بدعة والبدعة اذا لم یستلزم سنة فھی ضلالة۔ (ردالمحتار)[1]

چندے کی رقم سے شیرینی تقسیم کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: آجکل کچھ مساجد میں رمضان المبارک میں تراویح کے اندر قرآن کریم کے ختم کے وقت چندہ جمع کر کے حاضرین میں شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا بدعت ہے۔ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے کہ واقعی ایسا کرنا بدعت ہے؟

الجواب: ختمِ قرآن کے موقع پر شیرینی تقسیم کرنا شرعاً جائز و مرخص ہے اس کو بدعت کہنا درست نہیں، البتہ چندہ کی رقم سے شیرینی خرید کر تقسیم کرنا صحیح نہیں، تاہم اگر کوئی شخص انفرادی طور پر بغیر چندہ کے تقسیم کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة رشید احمد گنگوہیؒ: چندہ کر کے اس طرح شیرینی تقسیم کرنا درست

---

[1] لما قال العلامة مفتی عزیز الرحمٰنؒ: بروز عرفہ جمع ہونا لوگوں کا تشبہاً بالواقفین اور نفل با جماعت کثیرہ پڑھنا بخیال حصول ثواب حج لاریب بے اصل اور بدعت و مکروہ ہے۔
(عزیز الفتاوٰی ج۱ ص۱۰۲ کتاب السنة والبدعة)

نہیں ہے علی الخصوص اس جگہ کہ اس شیرینی کا التزام کرلیویں اور اس کے تارک کو ملامت کرنا نادرست ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ ص۱۴۸ کتاب البدعات) لے

ختم القرآن کی تقریب میں مساجد کو روشن کرنا

سوال:۔ آجکل رمضان المبارک میں ختم القرآن کے موقع پر اکثر مساجد کو برقی قمقموں اور طرح طرح کی روشنیوں سے سجایا جاتا ہے، اسلام میں اس عمل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مساجد اور دیگر مقامات میں ضرورت سے زائد روشنی کرنا اسراف کے حکم میں داخل ہے اور پھر اس کو کارِ خیر جان کر اصرار کر کے ضروری سمجھنا اور کرنا بدعت کے حکم میں ہے، اس لیے رمضان یا غیر رمضان میں ان چیزوں کا اہتمام کرنا موجب گناہ ہے۔

لما قال العلامۃ رشید احمد گنگوھیؒ: ضرورت سے زائد روشنی کرنا اور پھر اس کے ساتھ اس کو ضروری سمجھنا اسراف اور بدعت ہے اور نادرست ہے۔

(تالیفاتِ رشیدیہ ص۱۵۲ کتاب البدعات) ۲ے

تعزیہ کے طور پر براق کی صورت بنانے کا حکم

سوال:۔ ماہ محرم الحرام میں بعض لوگ براق کی صورت بنا کر بطور تعزیہ پیش کرتے ہیں اور اس کو کارِ خیر اور موجب ثواب سمجھتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے ہر موڑ پر بت سازی کی نفی کی ہے اور لوگوں کو اس قبیح فعل سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ چونکہ براق بھی ایک جاندار مخلوق ہے اس لیے کسی بھی عنوان سے اس کی مورتی بنانا شرعاً ممنوع ہے، اور اسی طرح تعزیہ بنانا چاہے محرم میں ہو یا دوسرے مہینوں میں، حرام اور بدعت ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن سعید بن الحسن قال کنت عند ابن عباس اذ جاءہ رجل فقال یا ابن عباس انی رجل انما معیشتی من صنعۃ یدی وانی اصنع ھذہ

لے و ۲ے لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: الحمد ترکیب اور تمام قرآن کا حکم ان امور میں یکساں ہے یعنی فضول روشنی کرنا اسراف ہے اور بدعت ہے اور شیرینی کو لازمی سمجھ کر بانٹنا یہ بھی بدعت ہے۔۔۔ الخ (امداد الفتاویٰ ج ۵ ص۲۸۹ کتاب البدعات)۔

التصاویر فقال ابن عباسؓ الا احدثك ما سمعت من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سمعته یقول من صور صورۃ فان اللّٰہ معذبه حتی ینفخ فیه الروح ولیس بنافخ فیها ابداً فربا الرجل ربوۃ شدیداً واصفر وجهه فقال ویحك ان ابیت الا ان تصنع فعلیك بهذہ الشجرۃ وکل شیئ لیس فیه روح۔

(مشکوٰۃ ص۳۸۶ باب التصاویر، الفصل الثالث) [1]

تعزیہ کے جلوس میں شرکت کرنا حرام ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب ! ہر سال دس محرم الحرام کو اہل تشیع تعزیہ بناتے اور جلوس نکالتے ہیں جس میں بعض اہلسنت بھی بڑے جوش و جذبے کے ساتھ اجر و ثواب کی نیت سے شریک ہوتے ہیں۔ تو کیا اس قسم کے جلوسوں میں شرکت کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دس محرم کو تعزیہ بنانا اور اس کا جلوس نکالنا سب مخترعات اور بے اصل امور ہیں، اس قسم کے اعمال خلافِ شرع اور بدعت کے حکم میں ہیں، اس لیے اس قسم کے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرنا ناجائز و حرام ہے۔ [2]

لما قال العلامۃ شاہ عبد العزیزؒ: تعزیہ داری در عشرۂ محرم و ساختن ضرائح و صورت قبور وغیرہ درست نہیں۔ (فتاویٰ عزیزی جلد ۱ ص۶۸)

ایضاً قال: درا مجلس بہ نیت زیارت و گریہ و زاری حاضر شدن ہم جائز نیست زیرا کہ آنجا زیارت نیست کہ برائے او حاضر شود وایں چوبہا کہ ساختہ اوست قابل زیارت نیستند بلکہ قابل ازالہ اند۔ (فتاویٰ عزیزی جلد ۱ ص۶۹)

---

[1] وعن ابی طلحۃ قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تدخل الملٰئکۃ بیتاً فیه کلب ولا تصاویر۔ متفق علیه۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۸۸۱ باب من کرہ القعود علی الصور، کتاب اللباس)

ومثلهٗ فی امداد الفتاویٰ ج۵ ص۳۳۲ کتاب البدعات الفصل الحرام فی فصل المحرم۔

[2] لما قال المولوی احمد رضا خانؒ: علم، تعزیہ، بیرک، مہندی جس طرح رائج ہے بدعت ہے اور بدعت سے شوکتِ اسلام نہیں ہوتی، تعزیہ کو حاجت روا یعنی ذریعہ حاجت روائی سمجھنا جہالت پر جہالت ہے اور اس سے منت ماننا حماقت اور نہ کرنے والوں کو باعثِ نقصان خیال کرنا زنانہ وہم ہے مسلمانوں کو ایسی حرکت سے باز آنا چاہیئے۔ (رسالہ محرم و تعزیہ داری ص۵۹ بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ جلد ۱ ص۴۳۸ ردّ بدعات)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ رحیمیہ ج۱۰ ص۴۳۵ تا ص۴۴۲ ردّ بدعات۔

صفر المظفر کے آخری بدھ کو خوشی منانے کی شرعی حیثیت

سوال :- جناب مفتی صاحب ! بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کچھ لوگ ماہ صفر المظفر کے آخری بدھ کو خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض سے شفاء ہوئی تھی اور اسی دن بلائیں اوپر چلی جاتی ہیں، اس لیے اس دن میں خوشیاں مناتے ہوئے شیرینی تقسیم کرنی چاہیئے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ماہ صفر میں اس عمل کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب :- ماہ صفر المظفر کو منحوس سمجھنا خلافِ اسلام عقیدہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے، اس ماہ مبارک میں نہ تو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں اور نہ اس کے آخری بدھ کو اوپر جاتی ہیں اور نہ ہی امام الانبیاء جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن مرض سے شفایابی ہوئی تھی بلکہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ۲۸ صفر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تھے ۔

لما قال العلامۃ مفتی عبد الرحیم ؒ : مسلمانوں کے لیے آخری چہار شنبہ کے طور پر خوشی کا دن منانا جائز نہیں۔ "شمس التواریخ" وغیرہ میں ہے کہ ۲۶ صفر ۱۱ھ دوشنبہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو رومیوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا اور ۲۷ صفر سہ شنبہ کو اسامہ بن زیدؓ امیر لشکر مقرر کئے گئے ، ۲۸ صفر چہار شنبہ کو اگرچہ آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بیمار ہو چکے تھے لیکن اپنے ہاتھ سے نشان تیار کر کے اسامہؓ کو دیا، ابھی دلشکر کے) کوچ کی نوبت نہ آئی تھی کہ آخر روز چہارشنبہ اور پنجشنبہ میں آپ (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کی علالت خوفناک ہوگئی اور ایک تہلکہ سا مچ گیا، اسی دن عشاء سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو نماز پڑھانے پر مقرر فرمایا ۔ (شمس التواریخ جلد ۲ ص۱۰۰۸)

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۲۸ صفر کو چہارشنبہ (بدھ) کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں زیادتی ہوئی تھی اور یہ دن ماہ صفر کا آخری چہارشنبہ تھا، یہ دن مسلمانوں کے لیے خوشی کا تو ہے ہی نہیں البتہ یہود وغیرہ کے لیے شادمانی کا دن ہو سکتا ہے۔ اس روز کو تہوار کا دن ٹھہرانا ، خوشیاں منانا، مدارس وغیرہ

میں تعطیل رکھنا، یہ تمام باتیں خلافِ شرع اور ناجائز ہیں۔ (فتاوٰی رحیمیۃ ج ۱ ص ۱۱۹، ۱۲۰ کتاب العلم) [۱]

رمضان المبارک تیئسویں ۲۳ رات کو مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ رمضان المبارک کی تیئسویں ۲۳ رات کو نماز تراویح کے بعد امام مسجد یا کوئی حافظِ قرآن سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم کی تلاوت کر کے مٹھائی وغیرہ پر دم کرتا ہے اور وہ مٹھائی پھر حاضرین میں تقسیم کی جاتی ہے اور اس کو مستحب کہتے ہیں۔ کیا واقعی یہ طریقہ مستحب ہے؟

الجواب:۔ رمضان المبارک کی تیئسویں رات کو قرآنِ کریم کی بعض سورتوں (عنکبوت و روم) کو متعین کر کے پڑھنا اور پھر مٹھائی یا پیسوں پر دم کر کے حاضرین میں تقسیم کرنا بے اصل اور بدعت ہے، شریعتِ مقدسہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ قرآنِ کریم کا سننا اور سنانا موجبِ اجر و ثواب ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: لان ذکراللّٰه اذا قصد به التخصیص بوقت دون او شیٔ دون شیٔ لم یکن مشروعاً حیث لم یرد الشرع به لانه خلاف المشروع۔ (البحرالرائق ج ۲ ص ۱۵۹ باب العیدین) [۲]

---

[۱] قال المولوی احمد رضا خان البریلوی:۔ الجواب: آخری چہار شنبہ کی کوئی اصل نہیں نہ اس دن صحتیابی حضور سید عالم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا کوئی ثبوت ہے بلکہ مرضِ اقدس جس میں وفات مبارک ہوئی اس کی ابتداء اسی دن سے بتلائی جاتی ہے۔

(احکامِ شریعت جلد ۲ ص ۵ بحوالہ فتاوٰی رحیمیہ جلد ۱ ص ۱۲ کتاب العلم)

وَمِثْلُہٗ فی کفایت المفتی جلد ۱ ص ۲۲۷ کتاب العقائد۔

[۲] قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه: بان تخصیص الذکر بوقت لم یرد به الشرع غیر مشروع۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۷۰ باب العیدین، مطلب یطلق المستحب علی السنة و بالعکس)

فرض نماز کے بعد بلند آواز سے دعا کرنا بدعت نہیں

سوال :۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے مقتدیوں نے کہا کہ حضرت آپ فرض نماز کے بعد جب دعا کرتے ہیں تو اول و آخر میں کچھ کلمات با آواز بلند کہا کریں تاکہ ہمیں دعا کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا علم ہو سکے۔ اس پر امام صاحب نے کہا کہ فرض نماز کے بعد بلند آواز سے دعا کرنا بدعت ہے، اسلام نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، اگر کوئی ثابت کر دے تو میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے بازار میں گھسیٹا جائے۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ ہمیں اس مسئلے کا حل قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے جواب کے لیے چند مقدمات سمجھنا ضروری ہیں جو کہ ذیل میں تفصیل کے ساتھ نمبر وار درج کیے جاتے ہیں :۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نماز کے بعد دعا کرنا قولاً و عملاً دونوں طرح ثابت ہے۔ امام ابو عیسیٰ الترمذیؒ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے :۔

(ا) کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد ان ینصرف من صلاتہ استغفر ثلاث مراتٍ ثمّ قال وانت السّلام و منک السّلام تبارکت یا ذالجلال والاکرام۔ (ترمذی علی صدر معارف السنن ج ۳ ص ۱۲۱ باب مایقول اذا سلم)

(ب) امام ابن ابی شیبہؒ نقل فرماتے ہیں : حدثنی رجل من الانصار قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی دبر الصلوٰۃ اللّٰھم اغفرلی وتب علیّ انک انت التواب الرّحیم مائۃ مرّۃ۔

(ج) عن امّ سلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول اذا صلی الصبح حین یسلم اللّٰھم انی اسئلک علماً نافعًا ورزقاً طیّباً و عملاً متقبلاً۔

(رواھما مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۳۹ رقم ۱۴، ۱۵ کتاب الدعاء)

(د) علامہ ابن السنیؒ روایت کرتے ہیں : عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مامن عبد یبسط کفیہ فی دبر کل صلوٰۃ یقول اللّٰھم الٰھی و الٰہ ابراھیم و اسحاق و یعقوب ..... الاکان حقاً علی اللہ ان لا یرد یدیہ خائبتین۔

(عمل الیوم واللیلۃ بحوالہ معارف السنن ج ۳ ص ۱۲۳ باب مایقول اذا سلم)

ان کے علاوہ بھی بہت ساری روایات کتب حدیث میں مذکور ہیں جو دعا بعد الفرائض کو ثابت کرتی ہیں۔ اسی لیے علامہ محمد یوسف البنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

الدعا للامام والماموم والمنفرد مستحب عقب کل صلوٰۃ بلاخلاف ویقول ویستحب ان یقبل علی الناس فیدعوا۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۱۲۳ باب ما یقول اذا سلم)

(۲) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہیئتِ اجتماعیہ دعا کرنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

فهٰذه وما شاكلها من الروايات فى الباب تكفى حجة لما اعتاده الناس فى البلاد من الدعوات الاجتماعية دبر الصلوٰة ولذا ذكره فقهاءنا ايضاً كما فى نور الايضاح وشرحه مراقى الفلاح۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۱۲۳ باب مايقول اذا سلم)

(۳) ذکر اور دُعا کرنے کے بارے میں دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں، بعض روایات سے خفیہ طور پر ذکر اور دعا کرنا ثابت ہے، جبکہ بعض روایات سے جہر کے ساتھ یا آوازِ بلند دُعا کرنا ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اتباع میں فقہاء اور صلحاء و علماءِ امت باآوازِ بلند دعا کرتے آئے ہیں، چند دلائل بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :۔

(ا) علامہ بنوری رحمہ اللہ نے کنز العمال کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے : لا يجتمع ملاء فيدعوا بعضهم ويؤمن بعضهم الا اجابهم الله۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۱۲۲ باب ما يقول اذا سلم)

اس روایت سے باآوازِ بلند دعا کرنا صاف ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ دعا پر آمین تب کہی جاتی ہے جب دعا کرنے والا بلند آواز سے دعا کرے اور دوسرا شخص اس کو سنے۔

(ب) علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت نقل کی ہے :

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سلم من صلوٰته يقول بصوته الاعلى لآ اله الا الله وحده لاشريك له الخ۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۱ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

(ج) صحیح مسلم میں ہے : ان ابن عباس اخبره ان رفع الصوت بالذكر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان على عهد النبى صلى الله عليه وسلم وانه قال قال ابن عباس كنت اعلم اذا انصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(صحيح مسلم على صدر فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۱ باب الذكر بعد الصلوٰة)

یہ دونوں روایات بھی بلند آواز سے ذکر اور دعا کرنے کو ثابت کرتی ہیں اس لیے کہ ابن عباسؓ اس وقت حدیث السن تھے انہوں نے نماز سے فراغت کے بعد یہ ذکر یا تو آخر صف میں سنا ہوگا یا مسجد سے باہر۔

اس لیے علامہ عثمانیؒ اس روایت کے تحت لکھتے ہیں ، واستدل بحدیث الباب بعض السلف علی استحباب رفع الصوت بالتکبیر والذکر۔ (فتح الملہم ج۲ ص۱۷۱ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

اسی طرح علامہ نوویؒ نے بھی اس حدیث کے تحت لکھا ہے : ھٰذا الحدیث دلیل لما قاله بعض السلف انه یستحب رفع الصوت بالذکر عقیب المکتوبة ۔

(مجموعہ رسائل الکھنوی جلد ۳ ص۲۹ ، سباحۃ الفکر فی الجہر بالذکر ص۳۴ الباب الاول فی حکم الجہر)

(۴) اسی طرح علامہ لکھنویؒ نے عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے : قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اذکروا اللّٰہ ذکراً حتی یقول المنافقون انکم مراؤون۔

(مجمع الزوائد ج۴ ص۷۶ ، سباحۃ الفکر ص۲۹ الباب الاول فی حکم الجہر)

بلند آواز سے ذکر کرنے پر اس روایت اور دوسری روایات سے استدلال کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے : وجه الاستدلال بهٰذین الحدیثین انه انما یقال ذلك عند الجهر لا عند السر۔ (الحاوی للفتاوی ج۱ ص۳۹ نتیجۃ الفکر فی الجہر فی الذکر)

(۵) علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : اخرج البخاری عن ابی هریرة رضی اللّٰہ عنه قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول انا عند ظن عبدی وانا معه اذا ذکرنی فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منه والذکر فی الملاء لا یکون الا من الجهر۔ (الحاوی للفتاوی ج۱ ص۳۹۷ نتیجۃ الفکر فی الجہر فی الذکر)

(۶) عن جابر ان رجلا کان یرفع صوته بالذکر فقال رجل لو ان هٰذا خفض من صوته فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اترکه انه اواه۔

(رسائل عبدالحی الکھنوی ج۳ ص۲۸۷ ، سباحۃ الفکر فی الجہر بالذکر ص۳۱ الباب الاول)

(۷) عن شداد بن اوس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وقال ارفعوا ایدیکم فقولوا لا اله الا اللّٰہ ففعلنا فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اللّٰهم انك بعثتنی بهٰذه الکلمة وامرتنی بها ووعدتنی علیها انك لا تخلف المیعاد۔

(مستدرک حاکم جلد ۱ ص۵۰۱ کتاب الدعا، باب رفع الایدی عند لا اله الا اللّٰہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مذکورہ روایات سے خوب ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد باآوازِ بلند ذکر بھی کیا ہے اور دعا بھی فرمائی ہے اور ساتھ صحابہ کرامؓ کو اس کی ترغیب بھی دی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نماز کے بعد باآوازِ بلند ذکر اور دعا فرمایا کرتے تھے۔ چند آثار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں:-

(۱) کان عمر رضی اللّٰہ عنہ اذا انصرف من صلوٰتہ قال اللّٰھم استغفرك لذنبی واستھدیك لأرشد امری واتوب الیك فتب علی اللّٰھم انت ربی فاجعل رغبتی الیك واجعل غنائی فی صدری وبارك لی فیما رزقتنی وتقبل منی انك انت ربی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص۳۹ رقم ۷ کتاب الدعاء)

(۲) عن صلیۃ بن زفر قال سمعت ابن عمر یقول فی دبر الصّلوٰۃ اللّٰھم انت السّلام ومنك السّلام تبارکت یاذا الجلال والاکرام۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص۳۵ کتاب الدعاء)

(۳) عن ابی بکر بن ابی موسٰی عن ابی موسٰی انہٗ کان یقول اذا فرغ من صلوٰتہ اللّٰھم اغفر لی ذنبی ویسر لی امری وبارك فی رزقی۔

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۷ ص۳۶ کتاب الدعاء)

مصنف ابن ابی شیبہ، سباحۃ الفکر اور الحاوی للفتاوٰی وغیرہ کتب احادیث میں صحابہ کرامؓ کے آثار موجود ہیں جو ذکر بعد الصلوٰۃ اور دعا بعد الصلوٰۃ بلند آواز سے ادا کرنا ثابت کرتے ہیں۔

ان تینوں مقدمات سے خوب واضح ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد بلند آواز سے دعا کرنا یا ذکر و اذکار میں مشغول ہونا جائز ہے، علماء امت میں سے کسی نے بھی اس کو بدعت اصطلاحی میں شمار نہیں کیا، البتہ محققین علماء نے ریا کے خوف سے جہر کو خلافِ اولیٰ قرار دیا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ دعا اخفاء کے ساتھ کی جائے۔

چنانچہ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: والدعا بخصوصہ الافضل فیہ الاسرار لانہ اقرب الی الاجابۃ۔ (الحاص للفتاوٰی ج ۱ ص۳۹۴ نتیجۃ الفکر فی الجھر فی الذکر)

اور علامہ عثمانیؒ نے لکھا ہے: وقال ابن بطال اصحاب المذاھب المتبعۃ وغیرھم متفقون علی عدم استحباب رفع الصوت بالتکبیر والذکر عقیب المکتوبۃ۔
(فتح الملہم ج ۲ ص۱۷۱ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

چنانچہ مفتی عبدالرحیم صاحب سے جب اسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:
(الجواب) سری دعا افضل ہے، نمازیوں کا حرج نہ ہوتا ہو تو کبھی کبھی ذرا آواز سے دعا کرنا جائز ہے ہمیشہ جہری دعا کی عادت بنانا مکروہ ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۱ ص ۱۸۳ متفرق مسائل)
علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ نے لکھا ہے: وما ذکر من الآثار دلیل علیٰ ان اخفاء الدعاء افضل من اظہارہ لان الخفیۃ ھی السر۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۰۸ سورۃ الاعراف)
مگر یہ کراہت بھی تب ہے کہ مساجد یا دیگر مقامات میں بآواز بلند دعا کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو، ان کی نیند اور دیگر امور میں خلل واقع ہوتا ہو ورنہ بغیر اس کے بلند آواز سے دعا کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ اگرچہ علامہ شعرانیؒ نے بعض مواقع پر بلند آواز سے ذکر و دعا کو مستحب قرار دیا ہے۔
چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عن الامام الشعرانی اجمع العلماء سلفاً و خلفاً علیٰ استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد وغیرھا الا ان یشوش جھرھم علیٰ نائم او مصلی او قارئ۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۲ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)
اور جہاں تک اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً۔ (الآیہ) کا تعلق ہے تو یہ آیت مطلق دعا کو جہراً کرنے سے منع پر دال نہیں، اس منع سے مراد بے جا بلند آواز سے دعا کرنے پر محمول ہے، علماء امت نے اسی پر اس کو محمول کیا ہے۔
چنانچہ علامہ عبدالحی الکھنوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ان ھذہ الآیۃ تدل علیٰ اثبات الجھر الغیر المفرط لا علیٰ منعہ بناء علیٰ ما فسرہ الامام الرازیؒ فی تفسیرہ من ان قولہ: اُذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ معناہ ذکر خفیۃ وسراً ومعنیٰ قولہ: دُوْنَ الْجَھْرِ المفرط والمراد منہ ان یقع الذکر بحیث یکون بین المخافۃ والجھر کما قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۔ وعلیٰ ھذا تدل الآیۃ علیٰ جواز السر والجھر کلیھما وافضلیۃ السر للتضرع والخیفۃ۔ (سباحۃ الفکر ص ۱۶ الباب الاول فی حکم الجھر بالذکر)
اور حدیث لا تدعون اصم الخ بھی جہر مفرط پر محمول ہے۔
علامہ عثمانیؒ نے لکھا ہے: واما حدیث انکم لا تدعون اصم ولا غائباً فمحمول عندی علی الافراط فی رفع الصوت۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۱۷۲ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

اس تمام تفصیل سے واضح ہوا کہ بعد الفرائض بلند آواز سے دعا کرنا جائز ہے اگرچہ پست آواز سے کرنا افضل و بہتر ہے اس کو بدعت کہنا لاعلمی اور کتب حدیث و فقہ سے عدم ممارست کی دلیل ہے، بلا وجہ کسی ثابت شدہ چیز کو بدعت کہنا شرعاً گناہ عظیم ہے جس سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر تو مقتدیوں کا یہ مطالبہ ہو کہ امام صاحب بلا التزام دعا کرے اور آخر میں چند الفاظ بآواز کہیں تاکہ مقتدیوں کو دعا شروع ہونے اور ختم ہونے کا علم ہو سکے، اس کو سنت اور ضروری نہ سمجھتے ہوں تو ایسا کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

چنانچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الاخفاء افضل عند خوف الریاء او کان فی الجھر تشویش علیٰ نحو مصلی او نائم او قاری او مشغل بعلم شرعی وتقدیم الجھر علی الاخفاء فیما اذا خلاعن ذٰلک وکان فیہ قصد تعلیم الجاھل او نحو ازالۃ وحشۃ عن متوحش او طرد نحو نعاس او کسل علی الداعی نفسہ او ادخال سرور علیٰ قلب مؤمن الخ۔ (روح المعانی ج ۸ صـ۱۴۴ سورۃ الاعراف)

مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مولانا عبد الحی الکھنویؒ کا رسالہ سباحۃ الفکر، علامہ سیوطیؒ کی الحاوی للفتاویٰ، علامہ جصاص الرازیؒ کی احکام القرآن، معارف القرآن، السعایۃ فی حل شرح الوقایۃ کا مطالعہ کریں۔ (ھٰذا ما ظھرلی واللہ اعلم)

خطبہ جمعہ وعیدین میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال:- اگر خطیب جمعہ یا عیدین کے خطبۂ ثانیہ میں دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی بھی ہاتھ اٹھا کر آمین کہیں تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- عیدین و جمعہ کے خطبوں میں جو دعا کی جاتی ہے اس میں امام کا ہاتھ اٹھانا اور مقتدیوں کا آمین کہنا کہیں ثابت نہیں۔ عجب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بریلوی حضرات کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

لما قال العلامۃ مفتی عبد الرحیم، سوال: عیدین و جمعہ کے خطبۂ ثانی میں بعض خطیب دعا کرتے ہیں اس وقت حاضرین ہاتھ اٹھا کر آمین کہتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- اس وقت ہاتھ اٹھانا، آمین کہنا منع ہے اس میں دیوبندی، رضاخانی کا اختلاف نہیں ہے مولوی احمد رضا خان کی مصدقہ کتاب میں ہے کہ خطیب نے مسلمانوں کیلئے دعا کی تو سامعین کو ہاتھ اٹھانا یا آمین کہنا منع ہے ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ خطبہ میں درود شریف پڑھتے وقت خطیب کا داہنے بائیں منہ کرنا بدعت ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۲ صـ۳۰۲ باب رد بدعات)

عید میلاد النبیؐ کی تاریخی اور شرعی حیثیت

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان مذہب حنفیہ اس مسئلہ میں کہ آجکل میلاد شریف کے نام سے مجالس وعظ منعقد ہوتی ہیں اور ان میں علماء کرام کتاب اللہ اور سُنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ترغیب وترہیب کے مسائل پیش کرتے ہیں اور نعت خوان اور شعراء حضرات اپنے اپنے منظوم کلام میں توحید، رسالت، ختم نبوت، حُب علی الطاعت اور دیگر کئی قسم کے بہترین مضامین سناتے ہیں ۔کیا اس قسم کی تقریبات میں علماء کرام اور عوام الناس کی شرکت بدعت ہے یا نہیں ؟

(۲) زید اس بات کا قائل ہے کہ ایسی مجالس واجتماعات کا انعقاد بدعت وضلالت ہے ان میں شریک ہونا زنا، جوا بازی، شراب نوشی اور قتل وغارت سے بھی بڑھ کر گناہ ہے، کیونکہ خیر القرون میں اس قسم کے اجتماعات منعقد نہیں ہوتے تھے ۔ تو زید کا یہ عقیدہ درست ہے یا نہیں ؟ اگر درست نہیں تو اس کے لیے تعزیر شرعی تفصیلاً تحریر فرما کر اجر دارین حاصل کریں ؟

الجواب :۔ ہمارے نزدیک محققین علماء کی تصریحات کے پیش نظر عید میلاد کے نام سے جو مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور جن کو آجکل کے علماء اور جہلاء سب سے بہترین عبادت اور کار خیر جانتے ہیں، بد ترین قسم کی بدعت ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق ومحبت عین ایمان ہے، آپؐ کی ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے حالاتِ زندگی صحیح طریقہ سے ذکر کرنا عبادت اور کارِ ثواب ہے۔ سال کے ہر مہینہ اور مہینہ کے ہر ہفتہ اور ہفتہ کے ہر دن اور دن کے ہر گھنٹہ اور گھنٹہ کے ہر منٹ اور منٹ کے ہر سیکنڈ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر جائز ہے اس میں کسی بھی مسلمان کو نہ تو اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ ہی اس سے انکار کی مجال ہے مگر نزاع اور موضوعِ بحث وہ مجلسیں ہیں جن کو ثواب کی نیت سے خاص مہینوں (مثلاً ربیع الاول) میں منعقد کر کے میلاد منایا جاتا ہے، یہ اور چیز ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا ذکر اور شے ہے، اوّل بدعت ہے ثانی مندوب اور مستحب ہے۔ صحابۂ کرامؓ سے زیادہ حضور اکرم کا عاشق کوئی بھی نہ تھا، نہ ان سے بڑھ کر حضور صلعم کا احترام اور تعظیم کوئی کر سکتا ہے، حضور کی محبت ان میں کامل تھی تئیس ۲۳ سال تک حضور اکرم صحابہؓ میں نبوت کے ساتھ خود زندہ رہے، اور پھر تیس ۳۰ سال تک خلافت راشدہ کی حکومت رہی، تقریباً ۱۱۰ھ تک صحابۂ کرامؓ کا دور رہا، کم وبیش دو سو بیس ۲۲۰ برس تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ رہا لیکن قیامت تک کوئی اس بات کا ثبوت صحیح سند سے پیش نہ کر سکے گا کہ

اتنے ممتد زمانے اور طویل عرصے میں عشاقِ رسولؐ میں سے کسی عاشقِ صادق نے ایسی محفل کا انعقاد کیا ہے یا انعقاد کے لیے کسی سے صراحۃً یا اشارۃً کہا ہے، یا خود حضور اکرمؐ کے مبارک زمانے میں آپؐ کی اجازت سے ایسی مجالس منعقد ہوئی ہوں۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کارِ ثواب اور مبارک تقریب کا ان ہی زمانوں میں انعقاد کیوں نہ ہوا؟ اور اگر نہیں ہوا ہے تو بعد میں ہونے پر اس کو بدعت کیوں نہ کہیں گے؟ آپ اس کے متعلق ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر ترغیب وترہیب کی بناء پر مستحب قرار دینا چاہتے ہیں مگر ذرا یہ تو سوچیے کہ وہ کون سی شرعی بدعت ہے جس کی ظاہری شکل وصورت عبادت کی نہ ہو؟ خاص کر جب اس کے متعلق اکابرینِ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کے صریح فتاویٰ بھی حرمت اور ممانعت کے بارے میں موجود ہیں، تو دیوبندی ہو کر آپ کیوں اس کی طرف راغب معلوم ہوتے ہیں، میں نے خود اپنے شیخ حضرت العلامہ مفتی اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہٗ سے زبانی دورۂ حدیث پڑھتے وقت سنا تھا کہ "ایسی مجلسوں کا انعقاد بدعت ہے"۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ممنوع قرار دیا ہے، فتاویٰ رشیدیہ جلد ا ص۱۱ میں آپ فرماتے ہیں "نفس ذکر ولادتِ باسعادت فخر دو عالم صلعم کا مندوب ہے مگر بسبب انضمام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہوگئی"۔

مجالسِ عیدِ میلاد النبیؐ کا تاریخی پس منظر اس رسم وبدعت کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ اسلامی تاریخ کی ابتدائی چھ صدیوں میں اس بدعت کا کہیں بھی مسلمانوں میں رواج نہیں تھا، یہ نہ تو کسی صحابی کو سوجھی نہ کسی تابعی کو، نہ کسی محدث، فقیہ، بزرگ اور ولی اللہ کو، یہ بدعت اگر سوجھی تو ایک مسرف بادشاہ اور اس کے رفیق دنیا پرست مولوی کو۔ یہ بدعت ۶۰۴ھ میں موصل کے شہر میں مظفر الدین کوکری کے حکم سے ایجاد ہوئی جو ایک مسرف بادشاہ اور دین سے بے پرواہ شخص تھا۔ (ابن خلکان) اس کے متعلق امام احمد بن محمد بصری مالکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

كان ملكاً مسرفاً يأمر علماء زمانه ان يعملوا باستنباطهم واجتهادهم وان لا يتبعوا مذهب غيرهم حتى مالت اليه جماعة من العلماء وطائفة من الفضلاء ويحتفل مولد النبي صلعم في الربيع الاول وهو اول من احدث من الملوك هذا العمل (القول المعتمد في عمل المولد)

(ترجمہ) "وہ ایک مسرف بادشاہ تھا، علمائے زمانہ سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں غیروں کے مذہب پر عمل نہ کریں حتیٰ کہ (دنیا پرست) علماء اور فضلاء کی ایک جماعت اس کی طرف

مائل ہو گئی اور وہ ربیع الاوّل میں محفلِ میلاد منعقد کیا کرتا تھا، بادشاہوں میں یہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے"

اس محفلِ میلاد پر وہ کیا خرچ کرتا تھا؟ اس کے متعلق علامہ ذہبیؒ نقل فرماتے ہیں :-

کان ینفق کل سنۃ علیٰ مولد النبی صلعم نحو ثلاث مائۃ الف۔

(دول الاسلام ج ۲ ص ۱۰۳)

(ترجمہ) "وہ ہر سال میلاد النبیؐ پر تقریباً تین لاکھ روپے خرچ کیا کرتا تھا"

جس دنیا پرست مولوی نے اس کے جواز کے لیے مواد جمع کیا تھا اس کا نام عمر بن داحیہ ابوالخطاب تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

کان کثیر الوقیعۃ فی الائمۃ و فی السلف من العلماء خبیث اللسان احمق شدید الکبر قلیل النظر فی امور الدین متھاونًا۔ (لسان المیزان ج ۴ ص ۲۹۶)

(ترجمہ) "وہ ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت بڑا گستاخ تھا، گندی زبان کا مالک تھا، بڑا احمق اور بڑا متکبر تھا، دین کے کاموں میں بڑا بے پرواہ اور سست تھا"

ان دونوں مبتدعین نے مل کر یہ بدعت ایجاد کی، اور اس کے بعد علماء حق میں سے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ ج ۱ ص ۳۱۲ میں، امام نصیر الدین شافعیؒ نے ارشاد الاخیار ص ۲ میں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات ج ۵ ص ۲۲ میں اور علامہ ابن امیر الحاج مالکیؒ نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کی تردید کی ہے، چنانچہ علامہ موصوفؒ "مدخل ابن الحاج ج ۱ ص ۸۵" میں لکھتے ہیں :-

ومن جملۃ ما احدثوہ من البدع مع اعتقادھم ان ذٰلک من اکبر العبادات واظھار الشعائر مایفعلونہ فی شھر الربیع الاوّل من المولد وقد ذٰلک علیٰ بدع ومحرمات الیٰ ان قال وھٰذہ المفاسد مترتبۃ علیٰ فعل المولد اذا عمل با لسماع فان خلا منہ وعمل طعامًا فقط ونوی بہ المولد ودعیٰ الیہ الاخوان وسلم من کل ما تقدم ذکرہ فھو بدعۃ بنفس نیتہ فقط لان ذٰلک زیادۃ فی الدین ولیس من عمل السلف الماضیین وَ اتباع السلف اولیٰ۔ اھ (مدخل ابن الحاج مطبوعۃ مصر ج ۱ ص ۸۵)

(ترجمہ) "لوگوں کو ان بدعتوں میں سے جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو وہ شعائر اسلامیہ کا اظہار سمجھتے ہیں وہ مجلسِ میلاد ہے جس کو وہ ماہ ربیع الاوّل میں کیا کرتے ہیں، یہ مجلس

بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہوتی ہے (آخر میں فرماتے ہیں) اور اس مجلس میلاد پر یہ مفاسد اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جبکہ اس میں سماع ہو، پس اگر وہ سماع سے پاک ہو اور بہ نیت مولود کرانا تیار کر لیا ہو اور بھائیوں اور دوستوں کو اس کے لیے بلایا گیا ہو اور تمام مذکورہ بالا مفاسد سے محفوظ ہو تب بھی وہ نیت انعقاد مجلس میلاد کی وجہ سے بدعت ہے کہ یہ دین میں ایک جدید امر کا اضافہ ہے جو سلف نے اس پر عمل نہیں کیا ہے اور سلف کی پیروی زیادہ بہتر ہے"۔

علامہ عبدالرحمٰن اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:۔

ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم والخلفاء والائمة۔

(ترجمہ) "مجلس میلاد کا انعقاد بدعت ہے اس کو حضور اکرمؐ، خلفاء راشدینؓ یا ائمہ اربعہ میں سے کسی نے نہ تو خود کیا ہے نہ اس کی اجازت دی ہے"۔

علامہ احمد بن محمد مصری مالکیؒ لکھتے ہیں:۔

اتفق علماء المذاهب الاربعة بذم هذا العمل ۔اھ

(ترجمہ) "چاروں مذاہب کے علماء میلاد کی مذمت پر متفق ہیں"۔

نماز کے بعد مصافحہ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ نماز باجماعت پڑھنے کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں اور اس کو سنت کا درجہ دیتے ہیں، کیا شرعاً اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ پہلی بار ملیں (ملاقات کریں) تو مصافحہ کریں، حدیث شریف میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ما من مسلمين يلتقيان فيتصافحان الا غفر لهما قبل ان يتفرقا۔ (جامع الترمذی ج ۲ ص ۹۷)

مگر نماز کے بعد مصافحہ کرنا کسی صحیح حدیث یا سلف صالحین کے اقوال میں مذکور نہیں، اسلیے اس کو سنت سمجھ کر کرنا خلاف شرع اور بدعت ہے۔

لما قال العلامة ملا علی قاریؒ: فان محل المصافحة المشروعة اول الملاقات وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة ولهذا صرح بعض علمائنا بانها مكروهة حينئذٍ وانها من البدع المذمومة۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۵۷)

محرم الحرام میں شادی کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ محرم الحرام میں شادی بیاہ کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اس ماہ کو غم اور مصائب کا مہینہ کہتے ہیں، تو کیا محرم الحرام میں شادی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ محرم الحرام بھی سال کے دوسرے مہینوں کی طرح ایک مہینہ ہے جس طرح سال کے دوسرے مہینوں میں شادی بیاہ کرنا جائز ہے اسی طرح محرم میں بھی جائز ہے، کسی بھی دلیل شرعی سے حرمت و ممانعت ثابت نہیں۔ روافض اور شیعوں نے اس قبیح اور بے بنیاد مسئلہ کو لوگوں میں رائج کر رکھا ہے، مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس بدعت کو ترک کر دیں۔

مسجد میں ذکر بالجہر کا حکم

سوال:۔ ایک صاحب جو اپنے آپ کو چشتیہ خاندان کے بزرگوں سے منسوب کرتے ہیں وہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد ہی میں حلقہ باندھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ذکر بالجہر بھی کرتے ہیں اور بلند آواز سے کچھ اشعار بھی مجمع میں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں جن سے ان کے رفقاء پر شدید وجد طاری ہو کر گر پڑتے ہیں اور غشی کی سی حالت ان پر طاری ہو جاتی ہے، اس حالت میں وہ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں بھی مارتے ہیں اور چیخ و پکار کرتے اور مسجد میں الٹے سیدھے ہوتے رہتے ہیں۔ جب انہیں اس قسم کی حرکات سے منع کیا جاتا ہے تو نہیں رُکتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہیں، شرعاً اس کوئی ممانعت نہیں ہے، اس بارے میں جب انہیں علمائے شریعت سے فیصلہ کرانے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ صاحب کہتے ہیں کہ میں علمائے شریعتِ ظاہرہ سے فیصلہ کرانے کی بجائے باطنی علماء سے فیصلہ کرانا چاہتا ہوں۔ تو کیا اس شخص کی مندرجہ بالا حرکات اور طرزِ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب:۔ مسجد میں ذکر بالجہر کے بارے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، ایک جماعت کے نزدیک حرام ہے، دوسری ایک جماعت ہے جو اسے جائز قرار دیتی ہے دونوں کے لیے کتاب و سنت سے دلائل پیش کرنے کی گنجائش بھی ہے اور دلائل پیش کیے بھی گئے ہیں۔ فقہاء کی ایک تیسری جماعت ہے جس نے پہلے دو قولوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ ذکر بالجہر اگر نمازی آدمی یا سوئے ہوئے آدمی یا قاری کے لیے

موجب اذیت نہ ہو، اس طرح اس میں ریاکاری کا بھی خوف نہ ہو تو جائز ہے ورنہ حرام ہے۔ علامہ حصکفیؒ رفع الصوت بالذکر کو محرمات میں شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ویحرم رفع الصوت بالذکر فی المسجد اھ۔ بزازیہ میں ہے: الجهر بالذکر حرام۔ (اھ حموی) لیکن شامی نقل کرتے ہیں: اضطرب کلام البزازیة فی ذلك فتارة قال انه حرام وتارة قال انه جائز اھ فتاوٰی خیریہ سے بھی شامی نے جواز نقل کیا ہے۔ اخیر میں حمویؒ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی اجمع العلماء سلفاء وخلفاء علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها۔ الا ان یشوش جهرهم علی نائم او مصلی او قاری الخ یہی تطبیق فتاوٰی خیریہ میں بھی کی گئی ہے، چنانچہ علامہ خیرالدین الرملیؒ لکھتے ہیں: ولا یعارض ذلك حدیث خیر الذکر الخفی لانه حدیث خیف الریاء او تأذی المصلین او النیام فان خلا عن ذلك فقال البعض الجهر افضل۔ اھ۔

حاصل التطبیق

فقہاء کی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتوٰی ممانعت اور قول بالجواز دونوں میں مخالفت نہیں ہے، ممانعت اس وقت ہوگی جب دوسروں کو اس سے کسی قسم کی اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو، اور جب اس خطرے سے جہر بالذکر خالی ہو تو جائز ہوگا، یہ ہے حاصل تطبیق ـــ لیکن ہمارے نزدیک چند وجوہ کی بناء پر یہ تطبیق قابل قبول نہیں ہے:۔

(۱) اوّل یہ کہ یہ تطبیق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے اس فتوے کے صریح طور پر مخالف ہے جو آپؓ نے ایک ایسی جماعت کے بارے میں دیا تھا جو خاص وقت میں ہیئت مخصوصہ کے ساتھ ذکر بالجہر میں مشغول تھی، یہ واقعہ فقہ اور حدیث دونوں کی کتابوں میں مذکور ہے جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

عن ابن مسعود انه سمع قومًا اجتمعوا فی مسجد یهللون ویصلون علی النبی صلی الله علیه وسلم جهرا فراح الیهم وقال ماعهدنا ذلك علی عهده علیه الصلوٰة والسلام وما اراکم الا مبتدعین فما زال یذکر ذلك حتی اخرجهم من المسجد۔ اھ (حموی۔ بزازیہ، بحر شامی)

اس واقعہ میں قوم کے جس عمل پر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بدعت کا فتوٰی دے کر ممنوع قرار دیا تھا وہ ان کا بہ ہیئت اجتماعی خاص مسجد میں جہر سے ذکر

کرنا اور درود پڑھنا تھا، اور اس کو اس بناء پر ممنوع نہیں کہا تھا کہ وہاں کسی نائم (سوتے والے) یا نمازی یا تلاوت کرنے والے آدمی کو اذیت پہنچنے کا خطرہ تھا یا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ان کے دلوں کی صفتِ ریا کا علم ہو گیا تھا بلکہ ممانعت کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح ذکر کرنا معہود نہ تھا، تو بدعت فی الدین ہونے کی وجہ سے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اسی بناء پر فرما دیا گیا کہ ما اراکم الا مبتدعین۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس فتوے سے قائلین حرمت الجہر بالذکر نے حرمت پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے بصورتِ دعویٰ یہ ذکر کیا ہے: فی فتاویٰ قاضیخان الجھر بالذکر حرام۔ اھ۔ اس کے بعد دلیل کے طور پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ انہوں نے ذکر کیا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ مسجد میں ذکر بالجہر جن فقہاء کے نزدیک حرام ہے وہ خطرۂ اذیّت کی بناء پر نہیں بلکہ ابتداع اور احداث فی الدین کی وجہ سے حرام ہے۔ تو خطرۂ اذیّت ان کے قول بالحرمۃ کے لیے محل بنانا جیسا کہ مذکورہ تطبیق میں اختیار کیا گیا ہے توجیہ الکلام بما لا یرضیٰ بہ قائلہ اگر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

تطبیق کے قابل قبول نہ ہونے کی دوسری وجہ

(۲) دوّم یہ کہ کتاب وسنت کے ظواہر سے اگر ان میں بیجا تاویلات نہ کی جائیں، ممانعتِ جہر ظاہر ہے مطلقاً ادعوا ربکم تضرّعاً وّخفیۃً اِنّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ہ سے ظاہراً یہ مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے کہ اخفاء ضروری اور جہر حد اعتداء میں داخل ہے۔ البتہ دیگر نصوص کے پیشِ نظر جہاں جہر کی اجازت خود شارع علیہ السلام سے ثابت ہو وہاں جہر جائز ہو گا۔ اور جہاں جہر کی اجازت کا ثبوت نہ ملے وہاں اس آیتِ کریمہ کے عموم سے ممانعت ہی کا حکم دیا جائے گا نہ کہ جواز کا۔ اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: اربعوا علیٰ انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا۔ (الحدیث) اس سے بھی ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک اخفاء محبوب ہے نہ کہ جہر بلکہ یہ مکروہ ہے۔

الحاصل دلائل سے جو کچھ ظاہراً ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہر سوائے ان مواضع کے جہاں خود شارع علیہ السلام سے اس کی اجازت منقول ہو مثلاً اذان، تکبیراتِ تشریق یا تلبیہ فی الحج وغیرہ مکروہ ہو گا مطلقاً، اور اخفاء مندوب ہو گا مطلقاً۔

اس میں اذیت وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، یعنی ممانعت اذیت کی صورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

ترجیح یا صحیح تطبیق | فقہاء کرام کی مذکورہ تطبیق جب مندرجہ بالا دو وجوہ کی بناء پر صحیح ثابت نہ ہوئی تو اس کے بعد دو صورتیں رہ جاتی ہیں: اوّل یہ کہ ہم فقہاء کرام کے دو قولوں کے درمیان کسی صحیح طریقہ سے تطبیق دیں یا ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دیں۔ پہلی صورت اگر ہم اختیار کریں گے تو صحیح طریقہ سے تطبیق یوں ہوگی کہ جہر بالذکر اس وقت جائز ہوگا جبکہ اس میں نہ تو اذیت الی الغیر پائی جائے اور نہ اس میں بدعت کا شائبہ تک موجود ہو، محمل قول بالجواز کے لیے یہ ہی ہے، اور جب بھی اس میں اذیت الی الغیر پائی جائے یا وہ بدعت کی صورت اختیار کرے تو ممنوع اور ناجائز قرار پائے گا۔ پہلی صورت میں اس لیے کہ اس میں ضرار پایا گیا ہے جو شرعاً لا ضرار فی الاسلام کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔ اور دوسری صورت میں ممانعت اس بناء پر ہوگی کہ وہ بدعت میں داخل ہو گیا جو کہ مردود فعل ہے، اور یہی محمل ہے فقہاء کرام کے اس قول کے لیے کہ الجھر بالذکر حرام۔

ترجیح | لیکن اگر ہم ترجیح کا مسلک اختیار کریں گے تو پھر اصولِ ترجیح کے پیشِ نظر قول بالحرمۃ کو قول بالجواز پر ترجیح ہوگی۔ اس کے لیے ہم دو وجوہ پیش کریں گے:۔

اوّل یہ کہ فقہاء ہی نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ کسی مسئلہ میں جب دو روایتیں ائمہ مذہب سے مروی ہوں جو آپس میں مختلف ہوں تو ان میں ترجیح اس روایت کو ہوگی جس کو علامہ قاضی خان رحمۃ اللہ نے اختیار کیا ہو، کیونکہ وہ اہل الترجیح میں سے ہیں۔ اس کی تشریح علامہ شامیؒ نے ردالمحتار ج ۴ ص میں "بیع الوفاء" کی بحث میں کی ہے، اس مسئلہ میں بھی جیسا کہ حموی اور بزازیہ نے تصریح کی ہے۔ چونکہ علامہ قاضی خانؒ حرمتِ جہر کا قائل ہے اس بناء پر حرمت ہی کو جواز پر ترجیح دینی پڑے گی۔

دوم یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام علی الحلال۔ فقہاء کرامؒ نے اس ارشاد سے ترجیح کے لیے یہ اصول مستنبط کیا ہے کہ جب بھی محرّم اور مبیح میں تعارض واقع ہو تو ترجیح محرم کو ہوگی نہ کہ مبیح کو۔ اس بناء پر یہاں بھی حرمت و اباحت میں چونکہ فقہاء کے اقوال متعارض ہیں اسلیئے قاعدہ مذکورہ

کی رُو سے حرمت کو اباحت پر ترجیح دینی پڑے گی۔

بہر حال تحقیق مذکورہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذکر بالجہر اگر ذریعہ اذیت الی الغیر ہو یا وہ کسی ایسے طریقہ سے ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو جس کی وجہ سے وہ بدعت کی حد میں داخل ہو جاتا ہو تو ممنوع اور ناجائز ہو گا۔ چونکہ واقعہ مسئول عنہا میں بھی ذکر بالجہر غیر ثابت شدہ طریقہ سے ہے اس لیے لامحالہ بدعت کی حد میں داخل ہو کر ممنوع ہو گا۔ اس عمل کی حالت اُس قوم کے عمل کی حالت سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جس پر ابن مسعودؓ نے بلتدعین کا حکم لگایا تھا، اس بناء پر یہ بھی اس کی طرح بدعت ہو کر ممنوع قرار پائے گا۔

۳۔ وقت اور ہیئت کی تخصیص

سنن نبویہؐ اور علمائے شریعت کی تصریحات سے یہ چیز پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ جس عبادت کو شریعت نے مطلق رکھا ہو اُس کے لیے اپنی طرف سے مخصوص وقت یا کسی خاص ہیئت اور کیفیت کو اگر معین کر لیا جائے تو اس کی وجہ سے وہ عبادت بدعت ہو جاتی ہے۔ امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:۔

ومنها التزام الكيفيات والهيئات المعينة كالذكر بهيئة الاجتماع على صوتٍ واحد..... ومنها التزام العبادات المعينة في اوقاتٍ معينة لم يوجد لها ذلك التعيين في الشريعة اھ (اعتصام ج ۱ ص۳۴)

(ترجمہ) "اور انہی بدعات میں سے کیفیاتِ مخصوصہ اور ہیئاتِ معینہ کا التزام ہے جیسا کہ ہیئتِ اجتماعی سے ایک آواز پر ذکر کرنا، اسی طرح خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا التزام بھی بدعات میں سے ہے جن کے لیے شریعتِ مطہرہ نے وہ اوقات مقرر نہیں کیے ہیں۔"

صاحبِ "مجالس الابرار" ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی سابقہ روایت کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وهكذا يقال لكل من اتى فى العبادات البدنية المحضة بصفة لم تكن فى زمن الصحابة ۔ اھ (مجالس الابرار ص۱۳۲)

(ترجمہ) "ایسا ہی اُس شخص کے متعلق کہا جائے گا (کہ وہ بدعتی ہے) جو خالص بدنی عبادات میں کوئی صفت اور ہیئت ایسی پیدا کرے جو صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں نہ تھی۔"

حافظ ابن دقیق العید رحمہ اللہ کہتے ہیں:۔

ان ھٰذہ الخصوصیات بالوقت او بالحال والھیئۃ والفعل المخصوص یحتاج الیٰ دلیل خاص یقتضی استحبابہ بخصوصہ وھٰذا اقرب۔ اھ

(ترجمہ) "وقت اور حال یا ہیئت کے ساتھ یہ خصوصیات اور فعلِ مخصوص، دونوں خاص دلیل کے محتاج ہیں جو علی الخصوص ان کے استحباب پر دلالت کرے اور یہی اقرب الی الصواب ہے۔"

یہ بھی علماء نے اصولِ مسلّمہ کے طور پر مان لیا ہے کہ مطلق عبادت کے مشروع اور مرغوب ہونے سے یہ لازم نہیں کہ قیودات اور تخصیصات کے ساتھ وہ عبادت مفید اور مخصوص ہو کر بھی مشروع اور مرغوب ہو گی، بلکہ بسا اوقات تقیدات اور تخصیصات سے وہ بدعت اور قابلِ نفرت قرار پا جاتی ہے۔ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

فاذا ندب الشرع مثلاً الیٰ ذکر اللّٰہ فالتزم قوم الاجتماع علیٰ لسان واحد و بصوت واحد او فی وقت معلوم مخصوص عن سائر الاوقات لم یکن فی ندب الشرع ما یدل علیٰ ھٰذا التخصیص الملتزم بل فیہ ما یدل علیٰ خلافہ اھ (اعتصام ج ۱ ص ۳۲۵)

(ترجمہ) "شریعت نے جب کسی چیز کی ترغیب دے دی مثلاً ذکر اللہ، پس ایک قوم نے اجتماع کا التزام کر کے ایک آواز سے ایک زبان ہو کر ذکر کرنا شروع کر دیا، یا تمام اوقات میں سے کسی معین اور مخصوص وقت کو منتخب کر کے اس میں ذکر کرنے کا التزام کر دیا تو شریعت کی یہ مطلق ترغیب، تخصیص اور التزام کی دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اسکے خلاف پر وہ دلیل بن جائے گی۔"

اس مسلّمہ اصول کے پیشِ نظر جب ہم واقعہ مسئول عنہا پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی طرف سے بہت سی تخصیصات ایجاد کر کے ملائی گئی ہیں۔ ایک وقت کی تخصیص، دوسری ہیئت اور تیسری کیفیت کی تخصیص۔ ان تمام تخصیصات کی وجہ سے یہ اجتماع اور ذکر علماء کے پیش کردہ قانون کے بموجب دونوں بدعت قرار پائیں گے۔

(۴) مسجد میں اُلٹے سیدھے ہو کر چیخ و پکار کرنا

صحیح احادیثِ نبویہ میں مساجد کے جو احکام اور آداب بیان ہوئے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مساجد میں چیخنے چلّانے سے کُلی پرہیز اور مکمل اجتناب کیا جانا ضروری ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے : ایاکم وھیشات الاسواق فی المساجد۔ او کما قال علیہ السلام) (ترجمہ) "مسجدوں میں شور و غل اور چیخ و پکار سے جو عام طور پر بازاروں میں ہو رہا ہے پرہیز کرتے رہنا۔"

احادیث میں قربِ قیامت کے جو علامات بیان ہوئی ہیں اور بلائے عام کے نزول کے جو اسباب متعین کیے گئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مسجدوں میں بلند آواز سے چیخ و پکار شروع ہو جائے گی، وارتفاع الاصوات فی المساجد۔ (الحدیث) ان ارشاداتِ نبویہ سے صراحتاً معلوم ہوا کہ مسجدوں میں چیخ و پکار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ سوال مذکور میں اس کی تصریح موجود ہے کہ واقعہ مسئول عنہا میں یہ لوگ مسجد میں وجد کی حالت میں چیخ و پکار کرتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہے۔

(۵) وجد یا تواجد | یہ بھی اس واقعہ میں ذکر ہے کہ وہ لوگ اس مجلس میں اشعار وغیرہ پڑھنے اور سننے سے وجد یا تواجد میں اکثر مسجد میں الٹے سیدھے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ وجد یا تواجد کا مسئلہ صوفیاء اور مشائخ کے مابین بھی اختلافی ہے، اور فقہاء اور علمائے شریعت کے درمیان بھی سخت اختلافی ہے۔ محققین صوفیاء اور فقہاء دونوں نے اس بارے میں جو اپنا فیصلہ پیش کیا ہے اور جس کو شامیؒ وغیرہ فقہاء نے نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس سالک کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی اتباعِ سنت کا مکمل نمونہ ہو اور اس پر خوف و خشیتِ خداوندی غالب ہو اور جلالِ خداوندی کے آثار نمایاں ہوں، اس سے اگر ذکر کرنے کی حالت میں وجد یا تواجد کی حرکات سرزد ہوں تو اس کی عام زندگی کی حالت کے پیشِ نظر ایسی حرکات غیر اختیاری سمجھ کر قابلِ ملامت اور لائقِ سرزنش قرار نہیں دی جائیں گی، لیکن اگر وہ اپنی عام زندگی میں سنتِ نبویہ کا پابند نہیں ہے اور اس کے عام اعمال بھی شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہیں تو ایسی حرکات کو اختیاری اور ایک قسم کا تصنع و بناوٹ قرار دے کر ان سے اس کو منع کر دیا جائے گا اور ایسی حرکات کو قابلِ ملامت اور لائقِ سرزنش قرار دیا جائے گا ۔۔۔ فی زماننا چونکہ خلافِ شرع حرکات اور بدعات ترقی پذیر ہیں اور سنتِ نبویہ کا اتباع حد سے حد درجہ کم ہے، خصوصاً عصرِ حاضر کے صوفیوں میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی ایجاد کردہ سنتوں (بدعات) کے تو بڑی شدت سے پابند ہوتے ہیں لیکن اگر ان میں سے کسی سنت کی پابندی نہیں تو صرف سنتِ نبویہ کی نہیں، گو زبان سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کے دعاوی بلند بانگ ہوتے ہیں، اس بنا پر ایسے لوگوں کے حق میں ہماری رائے یہ ہے کہ ان کو اس قسم کی حرکات سے ضرور منع کر دیا جائے۔

اصل الجواب | (۱) مذکورہ بالا پانچ امور کے پیشِ اس اجتماع کے متعلق جو ان

خلافِ شرع امور پر مشتمل ہے ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ یہ ایک بدعت اور ناجائز فعل ہے اس میں شمولیت اعانت علی البدعۃ اور توقیر مبتدع ہے جو شرعاً مذموم اور ممنوع ہے ۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے : ومن وقر صاحب بدعۃ اعان علیٰ ھدم الاسلام (الحدیث) مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس سے پرہیز کریں اور علماء کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں کو حکمت کے طریقہ سے سمجھائیں ۔ ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ (الآیۃ) جھگڑوں اور فسادات سے مجتنب رہیں ۔ نیز اس شخص کا یہ کہنا کہ یہ تمام امور جائز ہیں سخت غلط ہے اور سابقہ دلائل سے اس کی غلطی واضح ہو چکی ہے ۔

(۲) شرعی فیصلہ کے مطالبہ کے جواب میں جو وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعتِ ظاہری کے علماء پر فیصلہ نہیں کرتا ہوں باطنی علمائے شریعت پر فیصلہ کرتا ہوں ، اگر تو اس کا یہ جواب اس خیال پر مبنی ہو کہ علماء چونکہ ظاہری شریعت پر فیصلہ کریں گے اور ظاہری شریعت کو یہ مقام حاصل نہیں ہے کہ اس پر فیصلہ کیا جائے تو یہ انکارِ شریعت ہے اور انکارِ شریعت صریح کفر ہے اور اگر وہ شریعتِ ظاہری کو فیصلہ کن قانون کی حیثیت سے تو مانتا ہے مگر فیصلہ ماننے سے گریز کرتا ہے تو یہ منافقوں کی روش ہے ، قرآنِ کریم اس کو منافقوں کی نشانی قرار دیتا ہے : واذا قیل لھم تعالوا الیٰ ما انزل اللہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدودا ۔ (الآیہ) اور اگر وہ یہ گریز اس خیال سے کر رہا ہے کہ علمائے شریعت فیصلہ حق کے مطابق نہیں کریں گے تو یہ وہ بے جا سوءِ ظن ہے جس سے قرآنِ عزیز اجتناب کا حکم دیتا ہے : یاایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ۔ (الآیہ) فقط واللہ اعلم

خواتین کا زیارتِ قبور کے لیے جانا

سوال : ۔ محترم مفتی صاحب ! چہ می فرمایند علماء دین دریں مسئلہ کہ رفتن مستورات برائے زیارتِ قبور جائز است یا ممنوع است ؟ اس مسئلہ کی مکمل تشریح بمعہ حوالہ جات درکار ہے ؟

الجواب : ۔ عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کا حکم مذہب مفتی بہ کے مطابق عدم جواز کا ہے ۔ دراصل اس مسئلہ میں دو حدیثیں ہمارے سامنے ہیں ، ایک وہ روایت ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے : قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات

القبور۔ (الحدیث) "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان عورتوں پر جو قبروں پر جاتی ہیں"۔ دوسری حدیث وہ ہے جو سنن ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث میں مذکور ہے جس سے عام رخصت ثابت ہوتی ہے، اور وہ حدیث یہ ہے: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا لانھا تذکرۃ الآخرۃ۔ (الحدیث) ۔ مجوزین حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عباسؓ سے جو لعن ثابت ہوتا ہے وہ اس وقت کا حکم ہے جبکہ زیارت القبور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہی فرمائی تھی اور جب نہی منسوخ ہوگئی تو خواتین کو رخصت مل گئی، جیسی کہ مردوں کو حاصل تھی ۔۔۔ اور مانعین حضرات فرماتے ہیں کہ خواتین کے حق میں نہی اب تک باقی ہے بوجہ ان سے قلت صبر اور کثرت جزع کے، اور یہی وجہ ہے کہ خاص کر حدیث میں ان کا ذکر ہوا۔ چنانچہ فتح الودود حاشیہ ابوداؤد میں ہے: قیل کان ذٰلک حین النھی ثم اذن لھن حین نسخ النھی وقیل لبقین تحت النھی لقلۃ صبرھن وکثرۃ جزعھن وھو الاقرب الی تخصیصھن بالذکر ۔۔۔ اور ملا علی قاریؒ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں: فی الشرح السنۃ قیل ھٰذا قبل الترخیص فلما رخص دخل فی الرخصۃ الرجال والنساء وقیل بل نھی النساء باق لقلۃ صبرھن وکثرۃ جزعھن۔ لیکن ظاہر حدیث کا مؤید اسی قول کا ہے کہ یہی ان کے حق میں باقی ہے ۔۔ مگر اس عموم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت جمہور علماء کے نزدیک مستثنیٰ ہے یعنی آں حضرتؐ کی قبر کی زیارت سب کو جائز ہے، خواہ مرد ہو خواہ عورت۔

حضرت مولانا شاہ اسحٰق رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ عورتوں کو زیارت قبور ساتھ قول صحیح تر کے مکروہ تحریمی ہے، چنانچہ کتاب "مستملی" میں لکھا ہے کہ "مستحب ہے زیارت القبور مردوں کو اور مکروہ ہے عورتوں کو اور کتاب مجالس واعظیہ سے"۔۔ مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ میں نقل کیا گیا ہے کہ عورتوں کو حلال نہیں کہ نکلیں طرف مقابر کے، کیونکہ روایت کی گئی ہے ابوہریرہؓ سے: انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لعن زوارات القبور ۔۔۔۔ اور "نصاب الاحتساب" میں آیا ہے کہ قاضی عیاضؒ سے پوچھا گیا نکلنے عورتوں کے طرف مقابر کے اور اس کی خرابی و قباحت کے متعلق، پس کہا انہوں نے کہ اے سائل مت پوچھ اس کے جواز و فساد سے بلکہ اس گناہ کی مقدار سے پوچھ۔ جو اس کو لاحق ہوتی ہے لعنت سے اور سمجھ لے کہ جب عورت ارادہ کرتی ہے نکلنے کا طرف مقابر کے تو ہوتی ہے بیچ لعنت کے اللہ تعالےٰ اور

ملائکہ کے اور ہر طرف اس کے شیاطین لگ جاتے ہیں اور جب آتی ہے قبر پر لعنت کرتی ہے اس پر روح میّت کی، اور جب پھرتی ہوتی ہے بیچ لعنت اللہ تعالےٰ کے یہاں تک کہ واپس پہنچ جاتی ہے ــــ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو عورت گھر میں بیٹھے مُردوں کے حق میں دُعا کرتی ہے تو اسے حج و عمرہ کا ثواب ملتا ہے ــ حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد سے نکلے اور آکر گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے اتنے میں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ تشریف لے آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیٹی! کہاں سے آرہی ہو؟ عرض کیا فلاں عورت فوت ہوگئی تھی اُن کے گھر گئی تھی، فرمایا حضورؐ نے کیا اس کی قبر پر بھی گئی تھی؟ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے کہا کہ معاذ اللہ! جبکہ ایک چیز کی ممانعت میں نے آپ سے سُنی پھر وہ کام کیسے کرسکتی ہوں؛ پس حضور اکرمؐ نے فرمایا اگر تو اس کی قبر پر جاتی تو نہ پاتی خوشبو جنّت کی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ مالا بد منہ میں لکھتے ہیں کہ زیارت قبور مردوں کو جائز ہے نہ عورتوں کو۔ انتہٰی

علماء کی ان تحقیقات اور روایات مشتمل بر وعیدات کے پیشِ نظر آجکل کے پُرفتن دور میں جہاں ہر طرف سے مستورات کی عصمت دری کے لیے شیطانی دروازے کھلے ہیں؛ اس بناء پر فتویٰ اس پر ہے کہ عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کے واسطے جانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم۔

ایصالِ ثواب اور تخصیصِ ایام کے بارے میں چند سوالات

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایصالِ ثواب کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کا جواب شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں عنایت فرمائیں؛ مہربانی ہوگی:

(۱) میت اور زندہ کے لیے قرآن شریف ختم کرنے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اور اس میں کھانے وغیرہ پکانے کو ضروری سمجھنے کا کیا حکم ہے؟

(۲) صدقہ اور نذر پر ختم قرآن شریف کرکے لوگوں کو کھلانے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ نیز بعض علماء نے قرآن پر اُجرت لینے کو جائز کہا ہے اور اس کو وہ اجرت کے مسئلہ پر محمول کرتے ہیں، اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

(۳) بارہ وفات (۱۲ ربیع الاول) کے دن اکثر لوگ ایک جگہ جمع ہوکر تبلیغ وغیرہ کرتے ہیں اور

اکثر لوگ ان دنوں میں صدقہ وخیرات کو ضروری اور بہتر سمجھ کر خاص کر بارہویں تاریخ کو نکال دیتے ہیں اور جہاں تبلیغ وغیرہ ہوتی ہوتی ہے اس میں بڑے بڑے علماء اور خواص و عام، غنی اور فقیر سب موجود ہوتے ہیں اُن میں صدقہ وخیرات کی وہ چیزیں تقسیم کر دیتے ہیں، شریعتِ مطہرہ میں ان افعال کی کیا حیثیت ہے ؟

(۴) ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ میں جو چُوری روزہ اور خیرات وغیرہ کرنے کا لوگ خصوصی اہتمام کرتے ہیں اس کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ مذکورہ بالاسوالات کے جوابات ترتیب وار حاضر ہیں۔

(۱،۲) میت اور زندہ کے لیے قرآن مجید کا ختم کرنے میں فرق ضرور ہے اور اس پر اجرت لینے میں بھی تفصیل ہے، چاہے نقدی کی صورت میں ہو یا کھانا وغیرہ کھانے کی صورت میں ہو کتب فقہ کی تصریحات سے واضح ہے، فقہاء کرام نے صاف لکھا ہے کہ قرآن مجید پڑھانے اور تعلیم کی اجرت جائز ہے۔ قدماء حنفیہ منع کرتے تھے مگر متاخرین نے جواز کا فتویٰ دیا ہے بسبب اندیشۂ تلفِ علم کے، علوم دین اور قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا اہل حدیث سے نکلتا ہے، اس میں تو بحث کی کوئی ضرورت نہیں، جبکہ میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن مجید پڑھنے پر اجرت لینا حرام ہے، کیونکہ یہ اجرت علی الطاعۃ ہے، تعلیم کی اجرت تو ضرورۃً جائز کی گئی ہے، ایصالِ ثواب میں نہ ضرورت ہے نہ کوئی حرج دین و دنیا کا مقصود ہے لہٰذا قرآن پڑھ کر ثواب پہنچانے کی اجرت کسی کے نزدیک بھی حلال نہیں، اگر سانپ یا بچھو کے کاٹے پر پڑھ کر یا کسی دوسرے مریض پر پھونکا جائے جس کو رقیہ کہتے ہیں تو یہ علاج ہے نہ کہ عبادت اور ایصالِ ثواب طاعت ہے مزید تفصیل شامی وغیرہ سے معلوم ہو سکتی ہے، نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رمضان شریف میں جو قرآن شریف تراویح اور نوافل میں سنایا جاتا ہے اُس کی اُجرت لینی دینی دونوں حرام ہیں۔ اور فتاویٰ رشیدیہ میں حضرت گنگوہیؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اگر حافظ کے دل میں لینے کا خیال نہ تھا اور پھر کسی کچھ دیا تو درست ہے اور جو حسب رواج وعرف دیتے ہیں، حافظ بھی لینے کے خیال سے پڑھتا ہے اگرچہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تو درست نہیں۔

(۳) اس میں شک وشبہ کی ادنیٰ سی بھی گنجائش نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق ومحبت اور عقیدت عین ایمان ہے اور آپ کی ولادتِ باسعادت سے لے کر وفات تک زندگی

کے ہر شعبے کے صحیح حالات اور واقعات اور آپ کے اقوال و افعال کو پیش کرنا باعث نزول رحمت خداوندی ہے، اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی حیات طیبہ کے حالات و واقعات معلوم کرے اور ان کو مشعل راہ بنائے۔ سال کے ہر مہینہ میں اور مہینہ کے ہر ہفتہ میں اور ہفتہ کے ہر دن میں اور دن کے ہر گھنٹہ اور ہر منٹ میں کوئی وقت ایسا نہیں کہ جس میں آپؐ کی زندگی کے حالات بیان کرنے اور سننے ممنوع ہوں، یہ بات محل نزاع نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاوّل کی بارہویں تاریخ کو متعین کر کے اس میں میلاد منانا، محافل و مجالس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اس دن کو مخصوص کر کے فقراء اور مساکین کو کھانا کھلانا وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو کسی کو اس میں پس و پیش کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں۔ کیونکہ جو کچھ انہوں نے فعلاً یا قولاً کیا وہی دین ہے اور اس کی مخالفت بے دینی ہے۔ تیئس ۲۳ سال آپؐ بعد از نبوت قوم میں زندہ رہے، اور پھر تیس ۳۰ سال خلافت راشدہ کے گذرے ہیں، اور پھر ۱۱۰ھ تک صحابہ کرامؓ کا دور رہا ہے، کم و بیش دو سو بیس ۲۲۰ برس تک اتباع تابعین کا دور اور زمانہ تھا عشق رسولؐ ان میں کامل تھا، محبت ان میں زیادہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام اور تعظیم ان سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ اگر کوئی ہمت کر کے ان سے مذکورہ بالا افعال کا کرنا ثابت کر دے تو "چشم ماروشن دل ماشاد"۔ کسی مسلمان کو اس سے سرمو اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی خیر القرون سے اس کا ثبوت پیش نہ کر سکے اور تاقیامت نہ کر سکے گا۔ تو سوال یہ ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے یہ مبارک اور کار ثواب عمل اس وقت کیوں نہ ہوا اور آج یہ کیسے مبارک اور کار ثواب ہوا؟ وہ تمام فوائد و برکات اور منافع اس وقت بھی تھے جن کو آج لوگ بیان کرتے ہیں ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ ہمہ اوست اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

محفل میلاد، مجلس میلاد اور چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس ذکر ولادت باسعادت اور چیز ہے، اول بدعت ہے اور ثانی مستحب اور مندوب ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں: "نفس ذکر ولادت مندوب ہے اس میں کراہت قیود کے سبب سے آتی ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص) حضرت گنگوہیؒ مزید لکھتے ہیں: "نفس ذکر ولادت فخر دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندوب ہے مگر بسبب انضمام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہو گی۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص) اسی طرح علامہ ابن امیر الحاج مالکیؒ نے مدخل میں پوری صراحت اور وضاحت سے اس کی

تردید کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلونه في الشهر الربيع الاول من المولد وقد احتوى ذلك على بدع ومحرمات الى ان قال وهذه المفاسد مرتبة على فعل المولد اذا عمل بالسماع فان خلا منه وعمل طعامًا فقط ونوى به المولد ودعا اليه الاخوان وسلم من كل ما تقدم ذكره فهو بدعة بنفس نيته فقط، لان ذلك زيادة في الدين وليس من عمل السلف الماضيين واتباع السلف اولى۔

اور امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ "حسن المقصد فی عمل المولد" میں لکھتے ہیں: ليس فيه نص ولكن فيه قياس۔

اسی طرح علامہ عبدالرحمٰن مغربیؒ اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں: ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعله رسول الله صلعم والخلفاء والائمة۔

یہ مختصر طور پر مروجہ میلاد کی حقیقت ہے جو آپ پر ظاہر کر دی گئی۔

(۴) آخری چہارشنبہ (ماہِ صفر) کی چوری اور خیرات کرنے کا جو لوگ خاص خیال رکھتے ہیں اس کا بھی کچھ ثبوت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "صفر کے آخری چہارشنبہ کو اکثر عوام خوشی وسرور اور اطعام الطعام کرتے ہیں، شرعًا اس باب میں کچھ ثبوت نہیں ہے، جہلاء کی باتیں ہیں۔" (فتاوی رشیدیہ ص ــ)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ "امداد المفتین" میں لکھتے ہیں: "یہ بات بالکل بے اصل ہے اور غلط ہے بلکہ حدیث میں ماہ صفر کا کوئی خاص اہتمام کرنے کی مخالفت وارد ہے۔ قال علیه السلام لا هامة ولا صفر (الحدیث) مسلمان کا بڑا کام اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے اور اتباع کرنے میں اس کو اچھی طرح علماء سے تحقیق کرنی چاہیئے کہ یہ فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں، سُنی سنائی باتوں سے اتباع کرنا گناہ ہے۔ (امداد المفتین ص ــ)

اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "فتاوی عزیزیہ" میں لکھا ہے کہ: "اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے اور یہ بدعت ہے۔"

فقط واللہ اعلم

اپریل فول منانے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک! کئی دنوں سے اپریل فول کے حوالے سے ایک سوال ذہن میں ابھر رہا ہے کہ ملکِ عزیز پاکستان میں ہر سال یکم اپریل کو لوگ بلا وجہ ایک دوسرے کے گھروں اور دوکانوں وغیرہ پر جھوٹی حادثاتی خبریں پہنچاتے ہیں جنہیں سُنکر بعض کمزور دل والوں کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے، اور بعض لوگوں کا مالی نقصان بھی ہوتا ہے، کئی لوگ بیمار بھی پڑ جاتے ہیں، اس فعل کو لوگ اپریل فول کہتے ہیں (یعنی لوگوں کو بلا وجہ مصیبت میں مبتلا کرکے خود خوش ہونا) اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعت میں اس مذموم فعل (اپریل فول) کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اس کو بنیاد بنا کر لوگوں کا جانی و مالی نقصان کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں دھوکا، فریب اور دُوسرے لوگوں کا بلا وجہ نقصان کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے اور نہ اسلامی تعلیمات میں کسی کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کا اپریل فول وغیرہ جیسی فضول رسم کا سہارا لیکر جانی و مالی نقصان کرکے خوش ہوتا پھرے جبکہ اسلامی نظام نے تو ہر ایک (مسلم اور غیر مسلم ذمی) کی جان و مال اور عزّت و آبرو کے تحفظ کا درس دیا ہے اور کسی کو بلا وجہ دُکھ اور تکلیف دینا حرام قرار دیا ہے، لاضرر ولاضرار فی الاسلام۔ (الحدیث)

اسلام نے دوسروں سے جھوٹ بولنے کو بھی حرام قرار دیا ہے بلکہ جھوٹ کو منافق کی نشانیوں میں سے شمار کیا ہے۔ اٰیۃ المنافق ثلاثۃ اذا حدث کذب اذا ائتمن خان واذا وعد اخلف (الحدیث) اور غیر کے جان و مال کے تحفظ کے لیے واضح قانون جاری فرمایا: من قال لا الٰہ الا اللہ عصم منی دمارہ واموالہ الا بحقہ (الحدیث)

خلاصہ یہ کہ لوگوں کے نفوس (جانوں) اور اموال کا جتنا تحفظ اسلامی قانون میں ہے دُنیا کے کسی اور قانون میں نہیں ــــ آجکل بلکہ زمانہ قدیم سے ہر سال یکم اپریل کو جو فول منایا جاتا ہے اس میں مذکورہ بالا تمام خرابیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے شرعاً اس (فول) کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان خرابیوں کے علاوہ اپریل فول میں صنم پرستی کا توہم بھی موجود ہے اور یہودیوں کے ساتھ توہینِ رسالت میں مشابہت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمسخر جیسے قبیح امور بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ تاریخ میں اس فول کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تین قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ فرانس میں سترھویں صدی عیسوی سے پہلے سال کا آغاز

یکم جنوری کے بجائے یکم اپریل سے ہوا کرتا تھا، اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس کی طرف منسوب کرکے مقدس سمجھا کرتے تھے۔ جس کا ترجمہ یونانی زبان میں APHRO DITE کیا جاتا تھا اور شاید اسی یونانی نام سے مشتق کرکے مہینے کا نام اپریل رکھ دیا گیا ہے۔

(برٹانیکا، پندرہواں ایڈیشن جلد ۸ ص۲۹۲ بحوالہ ذکر و فکر ص۶۷)

اس لحاظ سے صنم پرستی کا توہم اس (اپریل فول) میں پایا جاتا ہے اس لیے مسلمانوں کو ان توہمات سے بھی دور رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

بعض نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ۲۱ مارچ سے موسم میں تبدیلیاں آنی شروع ہوجاتی ہیں، ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ (معاذ اللہ) قدرت ہمارے ساتھ مذاق کرکے ہمیں بیوقوف بنا رہی ہے، لہٰذا لوگوں نے بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کو بیوقوف بنانا شروع کردیا۔ (برٹانیکا ج ا ص۴۹۶ بحوالہ ذکر و فکر ص۶۷)

تاریخ کے اس حوالہ سے (نعوذ باللہ) قدرت سے انتقام لینا مستفاد ہوتا ہے جو صریح کفر ہے۔

ایک وجہ یہ بھی لکھی گئی ہے کہ یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں یہودیوں اور رومیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنایا گیا، موجودہ نام نہاد اور محرف انجیلوں میں بھی اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، لوقا کی انجیل کے الفاظ یہ ہیں کہ:-

"اور جو آدمی اُسے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو) گرفتار کیے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے اور اس کی آنکھیں بند کرکے اس کے منہ پر طمانچے مارتے تھے اور اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے کہ نبوت (الہام) سے بتا کس نے تجھ کو مارا؟ اور طعنے مار مار کر بہت سی اور باتیں اس کے خلاف کہیں"۔ (لوقا ۲۲: ۶۳-۶۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی اس شرمناک اور توہینِ رسالت پر مبنی واقعہ کی یاد میں اپریل فول مناتے ہیں۔ اور بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس دن سپین سے اسلامی خلافت کا مکمل طور پر خاتمہ ہوا تھا جس کی خوشی میں عیسائی یہ دن مناتے ہیں اور اس دن ان کو مکمل آزادی ہوتی ہے۔

اسلئے مسلمانوں کو اس قسم کے بیہودہ اور اسلامی تعلیمات کے مخالف تہوار نہیں منانا چاہئیں اگر کسی نے اس قسم کا تہوار منا کر دوسروں کی جانی یا مالی نقصان کیا تو وہ عنداللہ اور عندالناس مجرم ہے اور اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے شخص کو سخت سزا دے۔ (واللہ اعلم)

بسنت کا تہوار منانا جائز نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب دار العلوم حقانیہ املکِ عزیز پاکستان کے اکثر شہروں اور دیہاتوں خصوصاً اہلیانِ لاہور موسمِ بہار کی آمد کے موقع پر ایک موسمی تہوار بسنت کے نام سے بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں، امسال تو سرکاری سطح پر اس تہوار کو منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کے تہوار منانا شریعت مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ خوشی کا کوئی بھی تہوار جس میں کسی غیر شرعی قباحت کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو اور نہ کسی غیر اسلامی مذہب کا جزء ہو تو صرف اظہارِ مسرت کی حد تک منانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں خود اسلام میں عیدین (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) کو تہوار کے طور پر منانے کا حکم موجود ہے مگر جس تہوار کا کسی غیر اسلامی مذہب سے تعلق ہو مسلمانوں کو ان تہواروں سے من تشبہ بقومٍ فهو منهم (الحدیث) کی بناء پر منع کیا گیا ہے۔ بسنت کا تہوار منانے میں دیگر محرمات کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ یہ علت بھی موجود ہے کہ ہندوؤں کا مذہبی تہوار ہے۔

مشہور محقق اور مسلم سائنسدان علامہ ابوریحان البیرونیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب الہند" میں بسنت کے بارے میں لکھا ہے کہ: "اسی مہینہ میں استواءِ ربیعی ہوتا ہے جس کا نام بسنت ہے، اس کے حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید عید کرتے ہیں اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں، دیوتاؤں کی نذر چڑھاتے ہیں۔

(کتاب الہند باب ۷۶ ص۳۶۷)

اس دن کو تہوار منانے کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوں کے سبزے کی دیوی کو کسی نے اغواء کیا تھا اور اغوا کار اس کو زیرِ زمین لے گیا تھا، اس دیوی کا عاشق اُسے تلاش کرتا رہا اور تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد دیوی کو رہا کرانے میں کامیاب ہوگیا، دیوی کے رہا ہونے کے بعد دوبارہ ہریالی شروع ہوگئی، اس لیے ہندو اس کی رہائی اور ہریالی دوبارہ شروع ہونے کی خوشی میں اس دن کو بسنت کے نام سے مناتے ہیں۔

اس کے برعکس پاکستان کے اکثر شہروں خصوصاً لاہور میں اس دن (بسنت) کو زیادہ زور و شور کے ساتھ منانے میں ایک اور علت بھی شامل ہے جس کی وجہ سے بھارت میں بسنت کی کہانی ہر سکول میں پڑھائی جاتی ہے، وہ کہانی کچھ یوں ہے کہ مُغل دورِ حکومت میں لاہور میں "حقیقت رائے" نامی ایک ہندو طالب علم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

شانِ اقدس میں دشنام طرازی کی، قاضی وقت نے اس کو پھانسی کی سزا سنائی، چنانچہ لاہور ہی کے علاقہ گھوڑے شاہ میں واقع سکھ نیشنل کالج کی گراؤنڈ میں "حقیقت رائے" کو پھانسی دیدی گئی۔ ہندوؤں نے اس کو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت دے کر خوشی کے طور پر بسنت کے نام سے منانا شروع کر دیا کہ ان کے ایک نوجوان نے اپنے مذہب کے لیے اتنی قربانی دی کہ پھانسی کی سزا سے بچنے کے لیے اسلام قبول کرنے کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

لہٰذا ان حقائق اور واقعات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بسنت کوئی موسمی تہوار نہیں بلکہ یہ ہندوؤں کا مذہبی تہوار ہے، مسلمانوں کے لیے اس تہوار کو منانا اور اس میں شرکت کرنا جائز اور صحیح نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ حکومت اس تہوار کو سرکاری طور پر منانے کا جو ارادہ رکھتی ہے شرعاً صحیح نہیں کر رہی، یہ نہ صرف غیرتِ ایمانی کا تقاضا ہے بلکہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ بسنت سمیت دیگر تمام غیر اسلامی تہواروں پر فوراً پابندی لگا دے تاکہ اس سے غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

کتاب العلم

قال الله تعالى يرفع الله الذين آمنوا
منكم والذين أوتوا العلم درجات

کتاب العلم
(علم کے احکام و مسائل)

لاؤڈ سپیکر پر درسِ قرآن دینے کا حکم

سوال:۔ لاؤڈ سپیکر پر تلاوتِ قرآن، نعت خوانی یا قرآن مجید کا درس دینا بعض اوقات مخلوقِ خدا کی ایذاءرسانی کا باعث بن جاتا ہے، کیا اس طرح لاؤڈ سپیکر کا استعمال شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ قرآنِ مجید کا درس دینا، تلاوت کرنا اور نعت خوانی وغیرہ خواہ لاؤڈ سپیکر سے ہو یا اس کے بغیر، کارِ خیر اور موجبِ اجر و ثواب ہے تاہم اگر اس سے خلقِ خدا کو ایذاء پہنچتی ہو اور قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہو تو ایسا کرنا مکروہ اور گناہ کا سبب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وعلیٰ هذا لو قرأ علی السطح فی اللیل جهراً والناس نیام یأثم ای فالاثم علی القاری۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۱۰۳ فصل فی القرأة)[1]

قرآنِ مجید کے بوسیدہ اوراق کی حفاظت کا طریقہ

سوال:۔ قرآنِ کریم اور دیگر اسلامی کتابوں کے بوسیدہ اوراق کو جلانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جلانا جائز نہیں تو ایسے اوراق کی حفاظت کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم اور دیگر دینی کتابوں کا ادب و احترام ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے، چونکہ ان کے بوسیدہ اوراق جلانے میں سوءِ ادب ہے اس لیے قرآنِ کریم اور دیگر دینی کتب کے بوسیدہ اوراق کو کسی محفوظ مقام پر دفن کر دیا جائے یا پھر دریا بُرد کر دیا جائے تو بہتر ہے، جلانا شرعاً مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: المصحف اذا صار خلقا وتعذر القرأة منه لا

---

[1] لما قال العلامة ابن الهمامؒ: وعلیٰ هذا لو قرأ علی السطح فی اللیل جهراً والناس نیام یأثم۔ (فتح القدیر ج۱ ص۲۹۸ کتاب الصلوٰة فصل فی صفة الصلوٰة)
ومثله فی البحر الرائق ج۱ ص۳۴۳ کتاب الصلوٰة۔ فصل فی صفة الصلوٰة۔

يحرق بالنار اليه اشار محمد وبه ناخذ ولا يكره دفنه وينبغي ان تلف بخرقة طاهرة ويلحد له۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۴۲۲ كتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی البیع) [۱]

کسبِ معاش کے لیے تدریس کو چھوڑنا

سوال:۔ اگر کسی شخص کا گذارہ تدریس کی تنخواہ پر مشکل ہو تو کیا ایک عالم دین تدریس کو چھوڑ کر دنیوی کاروبار شروع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تنخواہ پر گذارہ نہ ہونا ایک مبہم حقیقت ہے، ایسی صورت میں اپنی ضروریات پر نظر ثانی کر کے اخراجات کو محدود کرنا چاہیئے اور غیر ضروری اخراجات سے اجتناب کرنا بہتر ہے تاکہ تدریس جیسی مقدس عبادت سے تعلق منقطع نہ ہو، تاہم اگر اہل وعیال کا نان ونفقہ تدریس کی تنخواہ سے پورا ہونا مشکل ہو اور جزوی اوقات میں متبادل ذرائع آمدن کا اختیار کرنا ممکن نہ ہو تو پھر نفقہ کی تلاش میں تدریس کو چھوڑ دینا ناجائز نہیں ہے اس لیے کہ تدریس فرض کفایہ ہے اور اہل وعیال کے نفقہ کا بندوبست کرنا فرضِ عین ہے۔

لما قال الله تعالىٰ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (سورة التوبة آیت ۱۲۲) [۲]

لڑکیوں کے لیے عصری تعلیم کا حکم

سوال:۔ عصر حاضر میں لڑکیوں کے لیے سکول، کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مستورات کی تعلیم وتعلم کے بارے میں شریعتِ مقدسہ کی رائے مثبت

---

[۱] لما فی الهندية: والمصحف اذا صار خلقاً لا يقرأ منه ويخاف ان يضيع يجعل في خرقة ويدفن ودفنه أولىٰ من وضعه موضعاً يخاف ان يقع عليه النجاسة او نحو ذلك ويلحد له۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۲۲ الباب الخامس فی آداب المسجد والقبلة والمصحف)

[۲] لما قال العلامة جلال الدين السيوطيؒ: قوله تعالىٰ (وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً۔ الآية) فيها ان الجهاد فرض كفاية وان التفقه في الدين وتعليم الجهال كذلك۔ (الاكليل فی استنباط التنزيل ص۱۲۳ سورة التوبة)

ہے بشرطیکہ حدود اللہ کی رعایت ہو۔ تاہم عصرِ حاضر میں پردہ وغیرہ کے فقدان کی بناء پر خواتین کا سکول و کالج میں تعلیم حاصل کرنا بے شمار مفاسد کے لیے راہ ہموار کرنے کا ذریعہ ہے، البتہ اگر بچیوں کو مستقل طور پر مستورات ہی کے ذریعہ تعلیم دی جائے اور مفاسد کا انسداد ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ المحدث علی بن سلطان محمد القاریؒ : تحت قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم (الا تعلمین ھذہ رقیۃ النملۃ لما علمتیھا الکتابۃ) قال الخطابی فیہ دلیل علی ان تعلم النساء الکتابۃ غیر مکروہ قلت یحتمل ان یکون جائزا للسلف دون الخلف لفساد النسوان فی ھذا الزمان۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۸ ص۳۶۶ باب الرقی)[1]

کمسن بچے کو سزا دینا

سوال:۔ ایک بچے کی عمر دس سال ہے لیکن تعلیم و تہذیب سیکھنے میں تعلیم و تہذیب سکھانے کے لیے اس کا جی نہیں لگتا، وقت ضائع کرنے کا عادی ہے، کیا ایسے بچے کو مارنا زجراً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے اپنی اور اہل و عیال کو تعلیم و تہذیب سکھانے کی ترغیب دلائی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو! تم خود بھی جہنم کی آگ سے بچو اور اپنے اہل و عیال کو بھی بچاؤ" اور یہ تب ہو گا جب بچوں کو تعلیم و تہذیب اور ادب سکھایا جائے اور ظاہر ہے کہ تعلیم و تعلم کے لیے بعض اوقات بچوں پر سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر اس بچے کا تعلیم میں جی نہیں لگتا اور وقت ضائع کرتا ہے تو زجراً اس کو سزا دینا مرخص ہے بلکہ اس میں ثواب کی بھی امید ہے، تاہم سزا میں اتنا مبالغہ نہ ہو کہ جسمانی نقصان یا دل شکنی کا ذریعہ بن جائے۔

---

[1] رواہ الامام محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ: عن ابی سعید الخدریؓ قال قال النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبنا علیک الرجل فاجعل لنا یوماً من نفسک فوعدھن یوماً لقیھن فیہ فوعظھن وامرھن الخ۔ (الصحیح البخاری ج۱ ص۲۰ باب ھل یجعل للنساء یوماً علیحدۃ فی العلم)
ومثلہٗ فی سنن ابی داؤد ج۲ ص۱۸۶ باب فی الرقی۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ :۔ یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَاراً۔
(پارہ ۲۸ سورۃ التحریم آیت ۶) لہ

اُستاد کا شاگرد کو سزا دینا

سوال :۔ کیا استاد کے لیے تعلیم وادب کے واسطے اپنے شاگرد کو مارنا (سزا دینا) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ استاد کا اپنے شاگرد کو مارنے (سزا دینے) کا حق حاصل ہے کیونکہ اہلِ خانہ نے تعلیم وتادیب کے واسطے بچے کو استاد کے حوالہ کیا ہوتا ہے، لیکن اُستاد کو سزا دینے میں اتنا مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے کہ شاگرد کو جسمانی نقصان پہنچے یا اُستاد کی سختی کی وجہ سے بچہ تعلیمی میدان ہی چھوڑ دے بلکہ شاگرد کی اصلاح کے لیے استاد اُسے معمولی سزا دے سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولو امر غیرہ بضرب عبدہ حل للمامور ضربہ بخلاف الحر قال فھذا تنصیص علیٰ عدم جواز ضرب الولد بامرہ بخلاف المعلم لان المامور یضربہ نیابۃً عن الاب لمصلحتہ۔ (ردالمحتار ج۳ ص۱۹۳ باب التعزیر) لہ۲

دینی علوم کے طالبعلم کے نفقہ کا حکم

سوال :۔ ایک طالب علم دینی مدرسہ میں دینی علم حاصل کر رہا ہے اور اس کا باپ غنی ہے، ضعیف بھی نہیں، تو کیا والد پر اس بچے کی ضروریات پورا کرنا لازمی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ دین کا سیکھنا ہر مسلمان مرد و عورت کی ذمہ داری ہے تاکہ وہ اپنی ضروریاتِ دین سے واقف ہو کر صحیح طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے، جو انسان دینی علم کے حاصل کرنے کے لیے نکلا ہو اور صحیح معنوں میں علم حاصل کر رہا ہو اور

لہ قال العلامۃ الحصکفیؒ : وفی القنیۃ لہ اکراہ طفلہ علی تعلیم قرآن وادب وعلم لفریضۃ علی الوالدین۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۴ ص۸۷ باب التعزیر)
وَمِثْلُہٗ فی الاحکام الصغار علیٰ ھامش جامع الفصولین ج۱ ص۱۰ مطلب لیس للمعلم ان یضرب۔

لہ۲ قال العلامۃ محمد بن محمود الاستروشنیؒ : بلغ الصبی عشر سنین یضرب لاجل الصلوٰۃ (بحذف یسیر) وکذا المعلم لیس لہٗ ان یجوز الثلاث۔
(احکام الصغار علیٰ ھامش جامع الفصولین ج۱ ص۱۰ مطلب لیس للمعلم ان یضرب)

وقت ضائع نہیں کرتا ہو تو ایسے طالب علم کے والد پر اس کی جملہ ضروریات پوری کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وکذا طلبة العلم اذا کانوا عاجزین عن الکسب لایھتدون الیه لاتسقط نفقاتھم من آبائھم اذا کانوا مشتغلین بالعلوم الشرعیة۔ (تنقیح الفتاوی حامدیة ج۱ ص۴۲) ؎۱

علماءِ دین کی توہین کرنا

سوال:۔ ایک شخص جو کہ بڑا بدزبان اور بداخلاق ہے، بغیر کسی سبب وجرم کے علماءِ دین کی توہین کرتا ہے اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا اور گالیاں بھی دیتا ہے، تو اس شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں علماءِ دین کا بہت بڑا مقام ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۰ (سورۃ الزمر آیت ۹) یعنی عالم اور جاہل دونوں برابر نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماءِ کرام کو انبیاء علیہم السلام کا وارث قرار دیا ہے۔ قرآن اور حدیث سے عالم کا مقام نمایاں ہے اور ایک عالمِ دین سے بلاوجہ بغض وحسد رکھنا یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔ اگر کوئی بلا کسی دنیوی واُخروی سبب کے کسی عالم کی توہین کرتا ہو اور اُسے گالیاں دیتا ہو تو مُلّا علی قاریؒ اور دیگر علماءؒ کے نزدیک اس کی یہ حرکت موجبِ کفر ہے، اور اگر کسی دُنیوی وجوہات سے توہین کرتا ہو تو گنہگار اور فاسق ہے۔

قال العلامة ملا علی القاریؒ: من ابغض عالماً من غیر سبب ظاھر خیف علیه الکفر قلت الظاھر انه یکفر لانه اذا ابغض عالماً من غیر سبب دنیوی او اُخروی فیکون بغضه لعلم الشریعة ولا شك فی کفر من انکره فضلاً عمن ابغضه۔ (شرح الفقه الاکبر ص۱۷۳) ؎۲

؎۱ لمافی الھندیة: وکذا طلبة العلم اذا کانوا عاجزین عن الکسب لایھتدون الیه لاتسقط نفقتھم عن آبائھم اذا کانوا مشتغلین بالعلوم الشرعیة۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۵۶۳ الفصل الرابع فی نفقة الاولاد۔ کتاب الطلاق)

؎۲ قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: من ابغض عالماً من غیر سبب ظاھر خیف علیه الکفر۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۸۸ کتاب الفاظ الکفر)

ہر سال بلا وجہ مدرسہ تبدیل کرنا

سوال:۔ دینی مدارس کے بعض طالبعلموں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر سال بلکہ سال میں دو تین مدرسے بدلتے ہیں جبکہ پہلے والے مدرسے میں ان کو ہر قسم کا آرام وراحت ملتا ہے، آب وہوا وغیرہ بھی موافق ہوتی ہے، اسباق بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، اساتذہ بھی بڑے شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، اس سب کچھ کے باوجود مدارس کی تبدیلی کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس کی وجہ سے مدارس پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور ان کی ساکھ بھی متأثر ہوتی ہے، شریعتِ مطہرہ کا اس بارہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تمام تر سہولیات کے باوجود مدرسہ تبدیل کرنا نعمتِ خداوندی کی ناشکری ہے جو شرعاً جائز نہیں اس لیے بلا عذرِ شرعی اس سے اجتناب کیا جائے، جن طلباء کی یہ عادت ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے مدارسِ دینیہ متاثر ہوتے ہوں وہ عنداللہ مسئول ہوں گے۔

لقولہ تعالیٰ: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔ (سورۃ ابراہیم آیت ۷)

مالِ حرام کو صدقہ کرنا موجبِ ثواب ہے یا نہیں "تعارض کا حل"

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض کتابوں کے مطالعہ سے ایک اشکال ذہن میں آیا ہے کہ حرام مال کو صدقہ کرنا بھی حرام ہے اور ظاہر ہے کہ معصیت کے کاموں پر کوئی اجر وثواب نہیں ہوتا جبکہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حرام مال کو صدقہ کرنا موجبِ اجر وثواب ہے۔ تو اب اس تعارض کا کیا حل ہوگا؟

الجواب:۔ حرام مال کو ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا معصیت اور گناہ ہے جبکہ بلا نیتِ ثواب صدقہ کرنا امرِ شارع علیہ السلام کی تعمیل ہے جو موجبِ اجر وثواب ہے، لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں، جن کتابوں میں معصیت لکھا ہے تو تصدق مالِ حرام بہ نیتِ ثواب مراد ہے اور جن میں اجر وثواب کا قول پایا جاتا ہے اس سے مراد بلا نیتِ اجر وثواب حرام مال کو صدقہ کرنا ہے۔

لما قال العلامۃ انور شاہ الکشمیریؒ:۔ اقول فی دفع التعارض ان ھٰھنا شیئان احدھما ایتمار امر الشارع والثواب علیہ والثانی التصدق بمالٍ خبیث والرجاء من نفس المال بدون لحاظ رجاء الثواب من امتثال الشارع فالثواب انما یکون علی ایتمار الشارع واما رجاء الثواب من نفس المال فحرام۔
(عرف الشذی علی الجامع الترمذی ج ا ص۳ باب ما جاء فی فضل الطھور)

فیض الباری کی ایک عبارت پر اشکال کا ازالہ

سوال:۔ بخدمت محترم المقام حضرت مولٰنا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہٗ العالی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــــ جناب والا فیض الباری جلد۳ ص۳۹۵ کی اس عبارت کا مطلب آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں، امید ہے آپ ضرور راہنمائی فرمائیں گے۔

واعلم ان فی التحریف ثلاثۃ مذاھب ذھب جماعۃ ان التحریف فی الکتب السماویۃ قد وقع بکل نحو فی اللفظ والمعنی جمیعًا وھوالذی مال الیہ ابن حزمؒ وذھب جماعۃ الی ان ان التحریف قلیل ولعل الحافظ ابن تیمیۃؒ جنح الیہ وذھب جماعۃ الی انکار التحریف اللفظی رأسًا فالتحریف عندھم کلہ معنوی قلت یلزم علی ھذا المذھب ان یکون القراٰن ایضًا محرفًا فان التحریف المعنوی غیر قلیل فیہ ایضًا والذی تحقق عندی ان التحریف لفظی ایضًا اما انہٗ عن عمد منھم او لمغلطۃ فاللہ تعالی اعلم۔

مخطط (خط کشیدہ) عبارت پڑھ کر سر چکرا گیا ـــ ایک طرف محفوظیتِ قرآنِ کریم کا بنیادی اور قطعی یا ضروری عقیدہ وانا لہٗ لحافظون کے ماتحت قدیمًا وحدیثًا مفسرین کا ایک ایک حرف بلکہ زیر وزبر تک کی حفاظت کی تصریح ـــــ امام ابن حزمؒ کی "الملل والنحل جلد۲ ص۸۰" کا یہ ارشاد ـــــ ثم مات ابو بکرؓ وولی عمرؓ ..... ان لم یکن عند المسلمین اذمات عمرؓ مائۃ الف مصحف من مصر الی العراق الی الشام الی الیمن فما بین ذلک فلم یکن اقل ثم ولی عثمانؓ فزادت الفتوح فلو رام احد احصاء مصاحف اھل الاسلام ماقدر.....

واعلموا انہٗ لو رام احد ان یزید فی شعر النابغۃ اوشعر زھیر کلمۃ اوینقص اخری ماقدر لانہ کان یفتضح الوقت وتخالفہ النسخ المبثوثۃ فکیف القراٰن فی المصاحف وھی من آخر الاندلس وبلاد البربر وبلاد السودان الی آخر السند وکابل وخراسان والترک والصقالیۃ وبلاد الھند فما بین ذلک فظھر حمق الرافضۃ ومجاھراتھا بالکذب الخ وقبل ذلک فی ص۷۸ واما قولہم فی دعوی الروافض تبدیل القراٰت فان الروافض لیسوا من المسلمین۔

اور علامہ خفاجیؒ اور خود قاضی عیاضؒ کی "شفاء" اور "نسیم الریاض" کے اس فرمان (ج۴ ص۵۵۳ نسیم الریاض) وکذلک کما کفرنا ھذا انکفر من انکر القراٰن کلہ او انکر حرفًا منہ اوکلمۃ اوغیر شیئًا منہ بابدال اوزیادۃ اونقص فیہ کلامًا لیس منہ اور اس سے قبل والمثبت

فی ذٰلک المعلوم من الدین بالضرورۃ والمنکر بعد البحث وصحبۃ المسلمین کافر بالاتفاق ولا یعذر بقولہ لا ادری الخ

بہرحال یہ اور اس جیسی بیسیوں بلکہ اس سے بھی زیادہ تصریحات کے باوجود جو ہم سب طالب علموں کو معلوم ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ بالا مختلطہ کا مقصد کیا ہے؟ ــــ خدا کرے یہ میری ناسمجھی کا کرشمہ ہو، اور آپ کوئی ایسی تسلی بخش توجیہہ سے سرفراز فرماویں کہ اطمینانِ قلبی کی دولت حاصل ہو جائے ــــ نہ جانے میری فہم وعقل کو کیا ہو گیا کہ اس سے سخت پریشان ہوں اور بار بار رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا کی دعا کر رہا ہوں۔ دو چار شخصیتیں جن سے اُن کے روحانی اثرات کی اُمید بندھی ہوئی ہے، سے اپنا دُکھ عرض کر رہا ہوں جن میں سے آنجناب سے خصوصی طور پر پُر امید ہوں، اس وقت صرف آپ ہی کو عریضہ بھیج رہا ہوں اُمید ہے جلد تر دستگیری فرما کر ممنون فرمائیں گے ــــ مجھے خود حاضر ہو کر تشفی حاصل کر لینی چاہیئے تھی مگر دوری مجھی مانع ہے ــــ اگر ان الفاظ کے یہی ظاہری معنی مراد ہیں جو میں سمجھ رہا ہوں کہ قرآنِ پاک میں لفظی تحریف موجود ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ نہ تو فیہ کا مرجع کتبِ سماویہ سابقہ بن سکتی ہیں اور اسے قہداً کر کے کاتب کے سر ڈالا جائے، تو اما انہ عن محمد منہم او لمغلطۃ۔ اس سے مانع ہے کیونکہ ان کفّار کی تحریف تو یقیناً عن محمد تھی۔ لقولہٖ تعالیٰ: تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ـــ)

تو بہرحال کیا کسی مسلمان نے تحریف کا ارتکاب کیا ہے؟ (والعیاذ باللہ) اگر ایسا ہے تو بقول شفاء ان ھٰذا المنکر اذا جوز علیٰ جمیع الامۃ الوھم والغلط منا نقلوہ..... دخل الامۃ انہ فی جمیع الشریعۃ اذھم الناقلون لیا وللقرآن وانحلت عری الدین۔ (نسیم الریاض ص ــ)

اور اگر معاذ اللہ بات یہی ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھی جا رہی ہے تو حاسدین اور اعداء دیوبندیین نے آج تک ان اکابر کے خلاف ان الفاظ کو اچھالا کیوں نہیں؟

اللّٰھم فلا تکلنا الی انفسنا طرفۃ عینٍ ولا الیٰ احد من خلقک ولا اقل من ذٰلک واصلح لنا شاننا کلہ بجاہ نبیک المصطفیٰ وحبیبک المرتضیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ من الصلوٰۃ اکملہا ومن التسلیمات افضلہا۔

ناکارہ: عبد الکریم غفرلہ ولوالدیہ از نجم المدارس کراچی

۲۰ رجمادی الثانی ۱۴۱۲ھ / ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء

؎ دریں کتاب پریشاں چو بینی از ترتیب
عجب مدار کہ چوں حالِ من پریشان است

حضرت شاہ صاحبؒ کا تفرد اسے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قطعیات بالضروریات میں تفرد کے کیا معنی؟ اگر ان الفاظ کو کہا جائے تو اس کے خلاف حضرتؒ کی کوئی صریح عبارت موجود ہو تو اس کی نشاندہی فرما دیں تاکہ تسلی ہو جائے؟

جواب از حضرت العلامۃ مفتی محمد فرید صاحب مدظلہٗ

محترم المقام جناب قاضی صاحب دامت برکاتکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امابعد! پس جب آپ نے مجھ جیسے کم علم اور کم عمر پر اعتماد کیا ہے تو اس بناء پر اس اشکال کے ازالہ کے متعلق عرض ہے کہ میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ تحریر حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوریؒ سے سنا ہے کہ "فیض الباری" ہمارے شیخؒ کی امالی ہے اور باوجود سعی بلیغ کے اس میں بہت سی بیّن غلطیاں ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل الرفع سماء عمر کے متعلق اور قرض میں حوالہ کی عدم صحت کے متعلق وغیرہ۔ تو ان امالی کے تفردات میں غور سے کام لینا ضروری ہے۔

اس تحریف والی عبارت کے متعلق سال کے ابتداء میں ایک سوال آیا تھا، اس کا جواب یہ لکھا گیا تھا کہ شاہ صاحبؒ نے کتب سماویہ (سابقہ) کے متعلق دو مذہب ذکر کیے ہیں۔ اوّل یہ کہ ان میں تحریفِ لفظی اور معنوی دونوں قسم متحقق ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ ان میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی ہے ان میں صرف تحریفِ معنوی متحقق ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ اس دوسرے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن مجید بھی محرّف ہے کیونکہ اس میں بھی تحریفِ معنوی واقع ہوئی ہے حالانکہ قرآن مجید محفوظ ہے۔ اور اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ مذہب اوّل کو ترجیح دیتے ہیں کہ کتبِ سماویہ میں تحریفِ لفظی بھی واقع ہوئی ہے، صرف مترجم نے مؤنث کی جگہ مذکر کی ضمیر لایا ہے وحق العبارۃ: "والذی تحقق عندی ان التحریف فیھا لفظی ایضاً" الخ ھو الموفق (محمد فرید عفی عنہ)

جواب از حضرت مولانا مفتی سیف اللہ حقانی صاحب مدظلہ العالی

آپ نے فیض الباری کی جس عبارت کی نشاندہی فرمائی ہے اس کے علاوہ بھی بعض دیگر عبارتیں موردِ اعتراض ہیں، مثلاً:

ہے) واما رفعه فكان على ثمانين سنة - وصححه الحافظ فى الاصابة وهو الذى رجع اليه السيوطى فى مرقاة الصعود - (فيض البارى ج ۳ ص۲۶۳ كتاب البيوع . باب قتل الخنزير)

جبکہ خود الاصابة فى تمييز الصحابة کی عبارت ملاحظہ کیجئے : واختلف فى عمره منذ ولد الى ان رفع فقيل ثلاث وثمانون سنة وهذا اشهر وقيل اربع وثلاثون وفى مرسل سعيد بن المسيب انه عاش ثمانين ذكره من رواية على بن زيد عنه وهو ضعيف وفى مستدرك الحاكم عن فاطمة رضى الله تعالى عنها ان النبى صلى الله عليه وسلم اخبرها ان عيسى عاش مائة وعشرين سنة فى حديث ذكره - (الاصابة فى تمييز الصحابة ج ۳ ص۵۴ حرف العين ۶۱۴۹)

العلامة الشيخ سليمان الجملؒ فرماتے ہیں : ففى زاد المعاد ما يذكر ان عيسى رفع وهو ابن ثلاث وثلثين سنة لا يعرف به اثر متصل يجب المصير اليه قال الشامى وهو كما قال فان ذلك انما يروى عن النصارى والمصرح فى الاحاديث النبوية انه انما رفع وهو ابن مائة وعشرين سنة ثم قال اى الزرقانى مهمة - وقع للحافظ جلال الدين السيوطى فى تكملة تفسير المحلى وشرح النقاية وغيرهما من كتبه الجزم بان عيسى رفع وهو ابن ثلاث وثلاثين سنة ويمكث بعد نزوله سبع سنين وما زالت التعجب منه مع مزيد حفظه واتقانه وجمعه المعقول والمنقول حتى رايته فى مرقاة الصعود رجع عن ذلك -

(الفتوحات الالهية ج ۱ ص۲۸۰ سورة البقرة)

(۲) فيض البارى ج ۳ ص۲۸۳ كتاب الكفالة میں ہے : وكذا لا تصح الكفالة فى القرض لانه من باب الاعتماد الخ - حالانکہ فقہاءِ کرام کفالہ فى القرض کو صحیح بتاتے ہیں - شرح التنویر میں ہے : قلت ومن حيل تاجيل القرض كفالته مؤجلاً فيتاخر عن الاصيل لان الدين واحد - وفى رد المحتار (قوله لان الدين واحد) اى فاذا تاخر عن الكفيل لزم تاخيره عن الاصيل ايضاً اذ يثبت ضمنا ما يمتنع قصداً كبيع الشرب والطريق كما فى البحر عن تلخيص الجامع لكن فى النهر عن السراج قال ابويوسف اذا اقرض رجل رجلا مالا فكفل به رجل عنه الى وقت كان على الكفيل الى وقته وعلى المستقرض حالاً الى قوله وحاصله ان الجمهور على انه

یتاجل علی الکفیل دون الاصیل وبه افتی العلامة قاری الھدایة وغیرہ (ج۴ ص۱۹۰)
وفی رد المحتار ایضاً ونقل عبارتھا ویستثنیٰ ایضاً مالوکفل بالقرض مؤجلاً الیٰ
سنة مثلاً فھو علی الکفیل الی الاجل وعلی الاصیل حال الخ (ج۴ ص۳۰۵) وفی
شرح التنویر لوکفل الحال مؤجلاً ــ تاخر عن الاصیل ولوقرضاً لان الدین
واحد۔ الخ (ج۴ ص۳۱۶)

تو بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ قابلِ گرفت عبارتیں جامع کے توہم پر مبنی ہیں، اسلئے
اب یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس عبارت کی نشاندہی آپ نے فرمائی ہے یہ بھی جامع کے توہم
پر مبنی ہے ۔ اس کے علاوہ اس عبارت کی توجیہہ بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ حضرت الشیخ الانور
کی یہ عبارت والذی تحقق عندی ان التحریف فیہ لفظی ایضاً اما انہ عن عمد
منہم او لمغلطة فاللہ تعالیٰ اعلم بہ ۔ قرآن پاک کے بارے میں نہیں ہے بلکہ کتب
سماویہ کے بارے میں ہے ۔ الشیخ الانور رحمہ اللہ تعالیٰ اس عبارت سے یہ مضمون ادا فرما
رہے ہیں کہ میرے نزدیک متحقق یہ ہے کہ کتب سماویہ سابقہ میں صرف تحریفِ معنوی نہیں
ہوئی ہے بلکہ تحریفِ معنوی کے ساتھ ان میں لفظی تحریف بھی موجود ہے ۔ اور والذی تحقق
عندی ان التحریف فیہ میں فیہ کا ضمیر مجرور بتاویل مذکور کتب سماویہ کو راجع کیا
جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ جامع نے مونث کی جگہ مذکر کی ضمیر لائی ہے ۔ وحق العبارة
والذی تحقق عندی ان التحریف فیھا لفظی ایضاً الخ ۔ مگر اس توجیہہ سے جملہ
اما انہ عن عمد منھم الخ مساعدة اور موافقت نہیں کر رہا ہے ۔ اللّٰھم ان یقال
قیل ما قیل باعتبار بعض المحرفین الذین ما علم قصدھم وعدمہ
مگر وفیہ ما فیہ ۔ فلا سبیل ولا مخلص الا ان یتثبت بالتوھم
واللہ اعلم ۔

استبراءِ رحم کے لیے عدت نہ ہونے پر اشکال کا ازالہ

سوال: جناب مفتی صاحب! کئی دنوں سے ایک اشکال ذہن میں آرہا ہے کہ اسلام نے مطلقہ اور بیوہ کے لیے تو عدت مقرر کی ہے مگر استبراءِ رحم کے لیے کوئی میعاد مقرر نہیں کی، شرعاً اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ براہِ مہربانی میرے اس اشکال کو شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں رفع فرمائیں؟

الجواب: اسلام میں طلاق اور وفات کی عدت اس لیے مقرر ہے کہ مطلقہ یا بیوہ کسی دوسرے شخص کی کھیتی رہ چکی ہوتی ہے اور ایک شخص کی کھیتی کو دوسرا شخص پانی نہیں پلا سکتا بخلاف استبراءِ رحم کے کہ وہاں صرف حمل کا احتمال ہے اور وہ واطی بالشبہ یا مولی کی کھیتی نہیں اس لیے وہاں صرف استبراء کو لازم قرار دیا۔

لما قال علیہ السلام: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یسقین ماءہ زرع غیرہ ۔ (الجامع الترمذی ج۱ ص۲۱۴ باب الرجل یشتری الجاریۃ وھی حامل کتاب النکاح)

لفظ قیل کی وضاحت

سوال: جناب محترم مفتی صاحب! ہم جب فقہ یا شروحِ حدیث وتفسیر یا دیگر دینی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بعض اقوال لفظ قیل کے ساتھ ذکر ہوتے ہیں، ایسے اقوال کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب: جس دینی کتاب میں کوئی قول قیل کے ساتھ مذکور ہو تو وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ سارے اقوال قیل کے ساتھ ذکر ہیں یا کہ ایک قول قال یعنی صیغہ معروف کے ساتھ ذکر ہے، اگر ایک قول صیغہ معروف کے ساتھ مذکور ہو تو صاحبِ کتاب کے نزدیک وہ قول راجح ہے اور دیگر اقوال کے ضعف کی طرف ان کا قیل یعنی صیغۂ مجہول کے ساتھ اشارہ مقصود ہوتا ہے اور اگر سارے اقوال قیل کے ساتھ ذکر ہوں تو اس صورت میں کسی قول کو ترجیح مقصود نہیں ہوتی۔

متعدد شوہروں والی عورت جنّت میں کس کے پاس ہوگی

سوال: اگر کسی عورت نے یکے بعد دیگرے دو تین شادیاں کی ہوں تو وہ عورت جنت میں کس شوہر کو ملے گی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ جس عورت نے دنیا میں دو تین شادیاں کی ہوں وہ قیامت کے دن جنت میں کس شوہر کو ملے گی؟ تو اس بارے میں دو اقوال ہیں۔ (۱) پہلا قول یہ ہے کہ وہ جس شوہر کے پاس رہنا چاہے اس کو اختیار ہوگا۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ وہ عورت آخری شوہر کو ملے گی۔

حضرت علیؓ کو کرم اللہ وجہہ کہنے کی وجہ

سوال:۔ جناب محترم مفتی صاحب! جب ہم کسی صحابیؓ رسولؐ کا مبارک نام سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو ان کے اسم گرامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اور جب حضرت علیؓ کا نام سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں، اکثر علماء کرام سے بھی اسی طرح سنتے میں آیا ہے، شرعاً اس کی کیا وجہ ہے؟

الجواب:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے عموماً رضی کے بجائے صیغۂ تکریم یا تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ آپ نے کبھی بتوں کے سامنے اپنے سر کو نہیں جھکایا تھا کیونکہ آپ نے بلوغت سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یا پھر اس لیے کہ جنگِ صفین میں بعض لوگوں نے آپ کے بارے میں سود اللہ وجہہ کے الفاظ استعمال کیے تو ان کی تردید کے لیے علماء امت نے آپ کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کے الفاظ استعمال کرنا شروع کئے۔

ذبیح اللہ کون تھے؟ حضرت اسحٰق یا حضرت اسمٰعیل (علیہم السلام)؟

سوال:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے کس بیٹے کو ذبح کیا تھا؟ بعض حضرت اسحاق علیہ السلام بتاتے ہیں جبکہ ہم ابھی تک یہی سنتے آرہے ہیں کہ آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کیا تھا، مہربانی فرما کر راہنمائی فرمائیں کہ ذبیح اللہ کون تھے؟

الجواب:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے جس بیٹے کو ذبح کیا تھا اس کے تعین میں اختلاف ہے، بعض علماء نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ قرار دیا ہے جبکہ جمہور علماء نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ قرار دیا ہے اور یہی راجح اور مشہور ہے۔

قد انزادھار ہے، کا مطلب

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اللہ الصمد کا معنیٰ "قد انزادھار ہے" لکھا ہے۔ مہربانی فرما کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں لفظ "نزادھار" کی تشریح فرمائی جائے؟

الجواب: "نرادھار" سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنیٰ ہے "وہ ذات جو کسی کی محتاج نہ ہو اور دوسروں کا بغیر اس کے کام نہ چلتا ہو، دوسرے سب اس کے محتاج ہوں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ الصمد کا معنیٰ "اللہ بے نیاز ہے" والا ترجمہ اگرچہ درست ہے مگر آدھا ترجمہ ہے، اس لیے کہ بے نیاز اس ذات کو کہا جاتا ہے جو کسی کی محتاج نہ ہو۔

لما قال المفتی محمود حسن گنگوہیؒ: مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فرمایا کہ میں نے جیل میں ترجمۂ کلام اللہ کا مطالعہ کیا جو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا تھا۔ اس میں انہوں نے اللہ الصمد کا ترجمہ یہ کیا کہ "خدا نرادھار ہے"۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ایک پرانا سادھو تھا میں نے اس سے پوچھا کہ نرادھار کا کیا معنیٰ ہے؟ اس نے کہا کہ آپ نے یہ لفظ کہاں سے سنا؟ یہ تو سنسکرت کا لفظ ہے، مذہب کے اونچے لوگ اس کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سنا ہوگا کہیں سے، تم اس کے معنی بتلاؤ، کیا اس کے معنی بے نیاز کے ہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں، اس کے معنی ہیں جو کسی کا محتاج نہ ہو اور دوسروں کا بغیر اس کے کام نہ چلتا ہو، دوسرے سب اس کے محتاج ہوں، بے نیاز میں اس کے معنی آدھے آتے ہیں۔

(ملفوظات فقیہ الامت ج ۲ قسط ۷ ص ۵۴)

☐ ☐

کتاب التفسیر

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنٰهُ

أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ

کتاب تفسیر القرآن

(قرآن مجید کی تفسیر کا بیان)

قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے

سوال:۔ قرآن کریم میں لفظ بَاؤُ۔ فَاؤُ۔ جَاؤُ جمع کے قوانین کے مطابق ان کلمات میں الف کیوں نہیں لکھا گیا؟

الجواب:۔ قرآن کریم کے رسم الخط میں مصحفِ عثمانی کا اتباع کیا گیا ہے جو کہ اصل اور بنیاد ہے جس کو کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ایک خاص طریقے پر خلاف القیاس مرتب کیا گیا تھا اور یہ رسم الخط توقیفی ہے، اس لیے کسی قیاسی قانون کی وجہ سے اس میں تبدیلی جائز نہیں ہے، لہٰذا ان کلمات میں بھی مصحفِ عثمانی کا اتباع کیا گیا ہے نہ کہ قوانینِ عربیہ کا۔

لما قال احمد مصطفٰی المراغی رحمہ اللہ: امّا کتابۃ المصحف فھی تابعۃ للطریق التی کتب بھا فی عھد عثمان رضی اللہ عنہ الخلیفۃ الثالث علی ید جماعۃ من کبار الصحابۃ وتسمّی الرسم العثمانی وقد اتبع فیھا نھج خاص یخالف ما اتبع فیما بعد فی کثیر من المواضع ومن ثمّ قیل خطان لا یقاس علیھما خط العروض وخط المصحف العثمانی۔

(تفسیر مراغی ج ۱ ص۱۳ مقدمۃ، طریق کتابۃ القرآن الکریم)[1]

تعداد حروف قرآن کریم

سوال:۔ قرآنِ کریم کے حروف کی صحیح تعداد کیا ہے؟

الجواب:۔ جس طرح قرآنِ کریم کی آیات میں اختلاف ہے اسی طرح حروف کی تعداد میں بھی علماء کی آراء مختلف ہیں، چند مشہور اقوال تحریر کیے جاتے ہیں:۔

(۱) امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی مشہور تفسیر "احکام القرآن" میں سلام ابو محمد الحمّانی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ حجّاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں اس کے حکم سے قرآنِ کریم کے حروف کو

---

[1] قال عبد العظیم الزرقانی رحمہ اللہ: فی مسئلۃ رسم خط القرآن ثلاثۃ اقوال، الاوّل: انہ توقیفی لا تجوز مخالفتہ ذٰلک مذھب الجمھور الخ (مناھل العرفان ج ۱ ص۳۷۷ ھل رسم المصحف توقیفی؟)

شمار کیا گیا تو کل تعداد ۳۴۰۷۴۰ ہوئی۔ (احکام القرآن للقرطبی ج ۱ ص ۶۴ باب ماجاء فی ترتیب سورۃ القرآن وآیاتہ وشکلہ)

(۲) عطاء بن یسار سے منقول ہے کہ قرآن کریم کے حروف کی تعداد ۳۲۳۰۱۵ ہے۔ (البرھان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۴۹ فصل فی عدد سور القرآن وآیاتہ وکلماتہ وحروفہ)

(۳) علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ نے ابن الجوزیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حساب کے مطابق قرآن مجید کے تمام حروف ۳۲۲۶۷۱ ہیں۔

(علوم القرآن ص ۱۷۰ تعداد حروف)

تعداد آیات قرآن کریم

سوال:۔ قرآن کریم کی آیات کریمہ کی تعداد کتنی ہے؟

الجواب:۔ قرآن کریم کی آیات کریمہ کی ابتداء اور انتہاء میں اختلاف کی وجہ سے ان کی تعداد کے بارے میں بھی علماء کے درمیان اختلاف ہے تاہم اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی آیات چھ ہزار سے زائد ہیں۔ یہاں چند مشہور علماء کرام کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں:۔

(۱) علامہ شمس الحق افغانیؒ نے ابن جوزیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ بشمار اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آیات قرآن کریم کی کل تعداد ۶۶۶۶ ہے۔ (علوم القرآن ص ۱۷۰ تعداد آیات)

(۲) اہل مدینہ سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں، پہلے قول کے مطابق کل آیات مبارکہ ۶۲۱۷ ہیں جو حضرت نافعؒ کی طرف منسوب ہے، اور دوسرے قول کے مطابق ۶۲۱۴ ہیں۔

(۳) اہل مکہ کی رائے کے مطابق کل آیات ۶۲۲۰ ہیں جو کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

(۴) اہل کوفہ کے نزدیک کل آیات ۶۲۳۳ ہیں۔

(۵) اہل بصرہ سے دو قول منقول ہیں جن کے مطابق کل آیات ۶۲۰۵ یا ۶۲۱۹ ہیں۔

(۶) اہل شام سے ۶۲۲۵ اور ۶۲۲۶ کی روایات بھی مروی ہیں۔

{ البرھان فی علوم القرآن لبدر الدین زرکشیؒ ج ۱ ص ۲۴۹ فصل فی عدد سور القرآن وآیاتہ وکلماتہ وحروفہ
مناھل العرفان از محمد عبد العظیم زرقانیؒ ج ۱ ص ۳۳۶ تحت قولہ عدد آیات القرآن }

مکّی اور مدنی سورتوں میں فرق | **سوال** :۔ قرآنِ کریم کی بعض سورتوں کو مکی اور بعض کو مدنی کہا جاتا ہے، ان میں کیا فرق ہے؟

الجواب :۔ قرآنِ کریم کی سورتیں دو قسم کی ہیں، مکّی اور مدنی، لیکن ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ارشاد منقول نہیں، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کے زمانۂ اقدس میں صحابۂ کرامؓ وحی کے زمان و مکان وغیرہ کا مشاہدہ کرتے تھے لہٰذا ان کو مکّی اور مدنی کی پہچان کی ضرورت نہیں پڑی، لیکن جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال ہوا اور صحابۂ کرامؓ کو ناسخ و منسوخ کی معرفت کی ضرورت پڑی تو اس کے بعد صحابۂ کرامؓ کو مکی اور مدنی سورتوں کا جاننا ضروری ہوا تاکہ ناسخ و منسوخ کی معرفت میں آسانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان کے بارے میں صرف صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے اقوال دستیاب ہو سکتے ہیں۔

شیخ محمد عبد العظیم زرقانیؒ فرماتے ہیں: لاسبیل الی معرفة المکّی والمدنی الابما ورد عن الصحابةؓ والتابعینؒ فی ذٰلک لانّہ لم یرد عن النبیؐ بیان المکّی والمدنی وَذٰلِکَ لانّ المسلمین فی زمانہٖ لم یکونوا فی حاجة الی ھٰذا البیان کیف وھم یشاھدون الوحی والتنزیل ویشھدون مکانہٗ وزمانہ واسباب النزول عیاناً۔ الخ

(مناھل العرفان ج ۱ ص۱۸۹ الطریق الموصلة الی معرفة المکی والمدنی)

تاہم بعدازاں مفسّرین نے مضامین اور حالات و واقعات کی روشنی میں مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے جس میں ہر ایک سورۃ کی مختلف خصوصیات شمار کی گئی ہیں، بعض کے نزدیک جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں انہیں مکی کہا جاتا ہے اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں انہیں مدنی کہا جاتا ہے اس میں مکان کا اعتبار نہیں ہے چاہے جہاں بھی نازل ہوئی ہوں، یہ اصطلاح سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اصطلاح ۲ : جو سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں مکّی کہلاتی ہیں نزول چاہے ہجرت سے پہلے ہو یا بعد میں، اور جو سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں اس صورت میں مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان واسطہ ثابت ہوتا ہے اور وہ مکہ و مدینہ سے باہر والی سورتیں ہیں۔

اصطلاح ۳ : جن سورتوں میں خطاب اہل مکہ کے ساتھ ہوا ہو وہ مکّی ہیں اور جن میں خطاب مدینہ والوں سے ہو وہ مدنی ہیں۔ (البرہان فی علوم القرآن ج ۱ ص۱۸۷ تا ۱۹۰ النوع التاسع معرفة المکی والمدنی)

مکّی اور مدنی سُورتوں کی پہچان سوال:- مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان اور ان کی علامات کیا ہیں ؟

الجواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی روایت مروی نہیں تاہم بعد میں مفسرین حضرات نے اپنی اپنی علمی استطاعت کے مطابق علامات بتائی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

مکّی سُورتوں کی علامات

(۱) جن سورتوں میں لفظ کَلَّا کا ذکر ہو وہ مکّی ہوں گی۔

(۲) جس سورۃ میں آیت سجدہ ہو وہ مکّی ہوگی۔

(۳) جس سُورۃ میں انبیاء کرام، اُمم سابقہ کے قصّے اور واقعات کا ذکر ہو وہ مکّی ہوگی سوائے سورۃ البقرہ کے۔

(۴) جس سُورۃ میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعہ کا ذکر ہو وہ مکّی ہو گی سوائے سورۃ بقرہ کے۔

(۵) جس سورۃ میں یَاَیُّهَا النَّاسُ کے ساتھ خطاب ہو مکّی ہوگی۔

(۶) جس سورۃ کی ابتداء حروفِ تہجّی سے ہو مکی ہوگی سوائے سورۃ بقرہ و آلِ عمران کے۔

مَدنی سورتوں کی علامات

(۱) جس سورۃ میں حدود اور فرائض کا بیان ہو وہ مدنی کہلاتی ہے۔

(۲) جس سورۃ میں جہاد اور احکامِ جہاد کا ذکر ہو وہ مدنی کہلاتی ہے۔

(۳) جس سورۃ میں منافقین کا ذکر ہو وہ مدنی ہوگی سوائے سورۃ العنکبوت کے۔

(۴) جس سُورۃ میں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ خطاب ہو وہ مدنی کہلاتی ہے۔

[البرہان فی علوم القرآن (بدرالدین زرکشیؒ) ج ۱ ص ۱۸۸ تا ۱۹۱ النوع التاسع معرفۃ المکی والمدنی]
[مناھل العرفان (محمد عبدالعظیم الزرقانیؒ) ج ۱ ص ۱۹ الطریق الموصلۃ الی معرفۃ المکی والمدنی]

تعوّذ کا حکم سوال:- ابتدائے قرأت و تلاوتِ قرآن میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا فرض ہے یا سُنت یا واجب ؟

الجواب:- سورۃ نحل کی مندرجہ ذیل آیت فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہ میں تعوذ کے حکم کی وجہ سے جب بھی کوئی مسلمان تلاوت کرے تو اس کو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنا چاہیئے، تاہم اس آیتِ کریمہ میں امر اکثر مفسرین کے نزدیک

وجوب کے لیے نہیں صرف ندب کے لیے ہے۔

لما قال القاضی ثناء الله رحمه الله : قد صح عن النبی صلی الله علیه وسلم انهٗ کان یصلّی ای یتعوذ قبل القرأة وعلیه انعقد الاجماع من السّلف والخلف لکنهٗ سنّۃٌ عند الجمهور العلماء۔

(تفسیر مظہری ج۵ ص۳۷ سورۃ النحل، تحت تفسیر الآیۃ ۹۸) [1]

تعوّذ کی جزئیت کا حکم

سوال:۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ قرآنِ کریم کا جزء ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ان مخصوص الفاظ کے ساتھ قرآنِ کریم کا جزء نہیں ہے تاہم ایک دوسرے مقام پر تعوّذ کا حکم ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

لما قال القرطبیؒ : اَجْمَعَ العلماء علیٰ ان التعوّذ لیس من القراٰن ولا اٰیة منه وهو قول القاری اعوذ بالله من الشیطٰن الرّجیم۔ (احکام القراٰن ج۱ ص۸۶، القول فی الاستعاذة) [2]

تسمیہ کی جزئیت کا حکم

سوال:۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآنِ کریم کا جزء ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سورۃ النمل میں ہے اس پر تو سب علماء کا اتفاق ہے کہ یہ قرآنِ کریم کا جزء ہے، اس کے علاوہ باقی سورتوں کی ابتداء میں جو تسمیہ لکھی گئی ہے اس کی جزئیت میں اختلاف ہے، فقہاء احناف، قراءِ مدینہ، بصرہ اور شام کے نزدیک کسی بھی سورۃ کا جزء نہیں ہے۔

لما قال القرطبیؒ : قد اختلفت العلماء علیٰ هٰذا المعنیٰ علیٰ ثلاثه اقوال، الاوّل لیست بآیة من الفاتحة ولا من غیرها وهو قول مالك...... الصحیح من هٰذه الاقوال قول مالك

---

[1] وقال محمد بن احمد القرطبیؒ : هٰذا الامر علی الندب فی قول الجمهور فی کل قرأة فی غیر الصّلوٰة۔
(احکام القرآن ج۱ ص۸۶ القول فی الاستعاذة)
وَمِثْلُهٗ فی مختصر تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۳۴۶ سورۃ النحل آیت ۹۸۔

[2] قال الشیخ عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبیؒ : اجمع العلماء علیٰ ان قول القاری اعوذ بالله من الشیطٰن الرّجیم لیس بآیة من کتاب الله۔ (تفسیر الثعالبی ج۱ ص۱۹ سورۃ الفاتحة)

لان القرآن لایثبت باخبار الاحاد وانما بطریقۃ التواتر القطعی ۔ الخ

(احکام القرآن للقرطبی ج۱ ص۹۳ الکلام علی البسملۃ) ؎۱

تعداد آیات سورۂ فاتحہ

سوال:۔ سورۂ فاتحہ کی آیات کی تعداد کتنی ہے؟

الجواب:۔ سورۂ فاتحہ کے بارے میں علماء کا اتفاق صرف اس بات پر ہے کہ اس کی آیات کی تعداد سات ہے جس کی وجہ سے اس کو سبع من المثانی کہا گیا ہے، تاہم فقہاء کرام کے نزدیک آیات کے تعین میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ مستقل آیت نہ ہونے کی وجہ سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ آیت شمار ہے، جبکہ احناف کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ مستقل آیت ہو کر بِسْمِ اللّٰهِ کو جزء الفاتحہ شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔

قال العلامۃ ابوبکر الرازی الجصاصؒ: قال سعید بن جبیر سألتُ ابن عباس عن السبع المثانی فقال السبع المثانی هوام القرآن وانما اراد بالسبع انها سبع آیات۔

(احکام القرآن ج۱ ص۲۸ قبیل احکام سورۃ البقرۃ) ؎۲

فاتحۃ الکتاب کا جزءِ قرآن ہونا

سوال:۔ سورۂ فاتحہ جس طرح قرآنِ کریم کا جزء ہے اسی طرح تیس پاروں میں کسی پارے میں داخل ہے یا قرآنِ کریم کا مستقل حصہ ہے؟

الجواب:۔ قرآن مجید کے پاروں کی تقسیم حجاج بن یوسف کے دور میں ہوئی ہے،

؎۱ وقال عبد اللہ النسفیؒ: قراء المدینۃ والبصرۃ والشام وفقهاءها علی ان التسمیۃ لیست بآیۃ من الفاتحۃ ولا من غیرها من السور وانما کتبت للفصل والتبرک للابتداء بها وهو مذهب ابی حنیفۃ (رحمہ اللہ) ومن تابعہ الخ

(مدارک التنزیل ج۱ ص۳ فاتحۃ الکتاب)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر روح المعانی ج۱ ص۳۹ مباحث فی البسملہ ۔

؎۲ قال الامام ابن جریر الطبریؒ: واما تاویل اسمها انها سبع آیات فانها سبع آیات لاخلاف بین الجمیع من القراء والعلماء وذلک ۔ (تفسیر طبری ج۱ ص۴۸ القول فی تاویل اسماء فاتحۃ الکتاب)

صحابۂ کرامؓ کے دور میں قرآنِ کریم یوں تیس پاروں میں تقسیم نہیں تھا تاہم صحابۂ کرامؓ آپس میں اپنی اپنی سہولت کے لیے قرآنِ کریم کئی حصوں میں تقسیم کیے ہوئے تھے جن میں منزل وغیرہ کا ثبوت بڑی دلیل ہے، چونکہ پاروں کا تعین صحابہؓ کے دور میں نہیں تھا اس لیے سورۂ فاتحہ کو کسی پارے کا جزء قرار دینے کے لیے کسی روایت کا سہارا لینا بے سود ہے، تاہم قرآن کے تیس پاروں کے حساب سے پہلا پارہ الٓمّٓ سے مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۃ فاتحہ کسی ایک پارہ کا جزء قرار دینے کی بجائے پورے قرآن کا اجمالی خاکہ ہے۔

قال ابن جریر الطبریؒ: صح الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھی ام القرآن، ھی فاتحۃ الکتاب وھی السبع المثانی۔ فھٰذہ اسماء فاتحۃ الکتاب وسمیت فاتحۃ الکتاب لانھا یفتتح بکتابتھا المصاحف... فھی فواتح لما یتلوھا من سور القرآن فی الکتابۃ والقراءۃ۔ (تفسیر الطبری ج۱ بحکم القول فی تاویل اسماء فاتحۃ الکتاب)[1]

اسمائے سورۃ فاتحہ

سوال:۔ سورۃ فاتحہ کو کتنے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے؟

الجواب:۔ سورۃ فاتحہ کے متعدد اسماء ہیں جن کو مفسرین حضرات نے ذکر کیا ہے، ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) فاتحۃ الکتاب (۲) فاتحۃ القرآن (۳) ام الکتاب (۴) ام القرآن (۵) الکنز (۶) الوافیہ (۷) الکافیہ (۸) الاساس (۹) سورۃ الرقیۃ (۱۰) سورۃ الشفاء (۱۱) سورۃ الشافیہ (۱۲) سورۃ الحمد (۱۳) سورۃ الشکر (۱۴) سورۃ الدعاء (۱۵) سورۃ تعلیم المسئلہ (۱۶) سورۃ السؤل (۱۷) سورۃ المناجات (۱۸) سورۃ الصلوٰۃ (۱۹) سورۃ النور (۲۰) القرآن العظیم (۲۱) السبع المثانی۔ (روح المعانی ج۱ ص۳۴ تا ۳۸)[2]

کسی آیت کا ترجمہ شائع کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر قرآنِ کریم کی کسی آیت کا ترجمہ کسی بھی زبان میں اس طریقے سے شائع کیا جائے کہ عربی

---

[1] قال العلامۃ ابو عبد اللہ القرطبی رحمہ اللہ: اجمعت الامۃ ایضاً علی انھا من القرآن۔
(تفسیر قرطبی ج۱ ص۱۱۴ سورۃ الفاتحۃ)

[2] وذکر القرطبی اکثرھا۔ (احکام القرآن ج۱ ص۱۱۱ تا ۱۱۳ المسئلۃ الرابعۃ وفی اسماءھا وھی اثناء عشر اسماً) وذکر بعضھا ابن کثیر۔ (تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۸ سورۃ الفاتحہ)

کے الفاظ نہ لکھے گئے ہوں بلکہ آخر میں صرف آیت نمبر اور سورۃ کے نام پر اکتفاء کیا گیا ہو، کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پورے قرآن مجید یا کسی ایک سورۃ کا صرف ترجمہ شائع کرنا اگرچہ ناجائز ہے تاہم ایک یا دو آیات کا ترجمہ شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وتجوز کتابة آیة او آیتین بالفارسیة لا اکثر۔ قال ابن عابدینؒ: والظاهر ان الفارسیة غیر قید الخ۔ (الدر المختار علی رد المحتار ج۱ ص۳۲۶) ؎۱

شیطان کی ابتدائی ذمہ داریاں

سوال:۔ شیطان مردود اور مسخ ہونے سے پہلے فرشتوں کے ساتھ کن کن امور و مشاغل پر مامور تھا؟

الجواب:۔ شیطان کے بارے میں مفسرین نے مختلف معمولات کا ذکر کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلے سے تھا جن کو جن کہا جاتا ہے اور ان کو نار سموم سے پیدا کیا گیا تھا جبکہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے تھے، سریانی زبان میں شیطان کا نام عزازیل تھا اور عربی میں حارث، اور یہ جنت کے خزانچیوں میں سے تھا، آسمان دنیا کا رئیس تھا، آسمان دنیا اور زمین پر اس کی حکمرانی تھی، فرشتوں میں سب سے زیادہ اجتہاد و علم والا تھا جس کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو گیا اور کفر کر کے مردود ہوا۔

لما قال القرطبیؒ: عن ابن عباس رضی اللہ عنه ان ابلیس کان من حی من احیاء الملٰئکة یقال لهم الجن خلقوا من نار السموم وخلقت الملٰئکة من نور وکان اسمهٗ بالسریانیة عزازیل وبالعربیة الحارث ومن کان من خزان الجنة وکان رئیس ملٰئکة سماء الدنیا وکان له سلطانها وسلطان الارض وکان من اشد الملٰئکة اجتهادًا و اکثرهم علمًا وکان یسوس مابین السماء والارض الخ (احکام القرآن ج۱ ص۲۹۵ تحت قوله تعالیٰ الا ابلیس البقرة) ؎۲

؎۱ قال ابن الهمامؒ: او اراد ان یکتب مصحفًا بها یمنع وان فعل فی آیة او آیتین لا الخ (فتح القدیر ج۱ ص۲۴۸)

؎۲ اسی طرح حافظ ابن کثیرؒ نے بھی مختلف روایات نقل کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے: مثلاً کان من اشد الملٰئکة اجتهادًا واکثرهم علمًا۔ کان من اشرف الملٰئکة واکرمهم قبیلةً وکان خازنًا علی الجنان، کان لهٗ سلطان سماء الدنیا وکان لهٗ سلطان الارض وکان یسوس مابین السماء والارض فعصیٰ فمسخه اللہ تعالیٰ شیطانًا رجیمًا۔

(تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۷۷ سورۃ البقرة تحت قوله: واعلم ما تکتمون)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مثلِ آدمؑ ہونا

سوال:۔ سورۃ آل عمران آیت ۵۹ میں ارشادِ خداوندی ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَم، جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کا تمثیل اور مشبّہ بتایا گیا ہے لیکن آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے تھے اور عیسٰی علیہ السلام بغیر باپ کے تھے، تو پھر یہ تشبیہ کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟

الجواب:۔ چونکہ سیدنا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش عادتِ مستمرہ کے خلاف ہوئی تھی جو بغیر باپ کے تھی، اور یہ ایک عجیب واقعہ تھا لیکن اس سے زیادہ عجیب تر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش تھی جو ماں باپ دونوں کے بغیر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوئی تھی۔ تو یہاں عجیب واقعہ کی عجیب تر واقعہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور تشبیہ و تمثیل میں مشبّہ کا مشبّہ بہ کے ساتھ تمام وجوہات میں متحد اور یکساں ہونا لازم نہیں ہے بلکہ مشبّہ بہ کی بعض صفات کا مشبّہ میں پایا جانا تشبیہ اور تمثیل کے لیے کافی ہوتا ہے جیسے کسی انسان کی بہادری کی تشبیہ شیر کے ساتھ دی جاتی ہے اگرچہ من کل الوجوہ یکساں نہیں ہوتے۔

لما قال الشیخ علاؤالدین رحؒ علی تحت قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَم۔ قلت ہو مثلہ فی احد الطرفین فلا یمنع اختصاصہ دونہ بالطرف الاٰخر من تشبیہہ لان المماثلۃ مشارکۃ فی بعض الاوصاف ولانہ شبہ بہ فی ان لہٗ وجوداً خارجاً عن العادۃ المستمرۃ وھما فی ذٰلک نظیران لان الوجود من غیر اَبٍ وَاُمٍّ اغرب فی العادۃ من الوجود من غیر اَبٍ فشبہ الغریب بالاغرب لیکون اقطع للخصم واحسم لمادۃ شبہتہ۔

(تفسیر خازن ج ۱ ص ۳۰۱ سورۃ البقرۃ) [1]

---

[1] وقال القرطبی رحمہ اللہ، فیہ دلیل علیٰ صحۃ القیاس والتشبیہ واقع علیٰ ان عیسٰی خلق من غیر اَبٍ کآدم لا علیٰ انہ خلق من تراب والشیٔ قد یشبہ بالشیٔ وان کان بینہما فرق کبیر بعد ان یجتمعا فی وصف واحد فان اٰدم خلق من تراب ولم یخلق عیسٰی من تراب فکان بینہما فرق من ھٰذہ الجہۃ ولٰکن شبّہ ما بینہما انہما خلقًا من غیر اَبٍ۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۰۲ تحت ان مثل عیسٰی عند اللہ الخ، سورۃ البقرۃ)

ومثلہٗ فی تفسیرہ الشہیر بالصاوی ج ۱ ص ۱۵۹ سورۃ البقرۃ۔

قاتل کی توبہ کا قبول ہونا

سوال:۔ سورۂ نساء کی آیت ۹۳ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً قتل کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ جہنم میں رہے گا، جبکہ حدیثِ شفاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا، اس میں کس پر عمل کیا جائے؟ اور عمداً قتل کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عمداً قتل کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں، اور یہ شخص ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا یا نہیں، تاہم جمہور اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک یہ شخص اگر مومن ہو تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے جہنم میں گناہوں کی سزا پانے کے بعد جنّت میں جائے گا اور ایمان کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے جہنم میں نہیں رہے گا، لیکن یہ اُس وقت ہے کہ جب قاتل نے قتل کو حلال سمجھ کر یہ اقدام نہ کیا ہو ورنہ استحلالِ حرام کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اسی وجہ سے جمہور علماء اِس آیت میں خَالِدًا کا ترجمہ مکثِ طویل سے کرتے ہیں۔

لما قال الشیخ ابن کثیرؒ:۔ والذی علیه الجمهور من سلف الامة وخلفها ان القاتل لهٗ توبة فیما بینهٗ وبین الله عزّ وجل فان تاب واناب وخشع وخضع وعمل عملاً صالحًا یبدل الله سیئاته حسنات وعوض المقتول من ظلامته وارضاه عن طلابة....... ومعنٰی هٰذه الصیغة ان هٰذا جزاءهٗ ان جوزی علیه۔ وبنقص بردخول القاتل فی النار.... فلیس یخلد فیها ابداً بل الخلود المکث الطویل وتواترت الاحادیث عن رسول اللهؐ انهٗ یخرج من النار من کان فی قلبه ادنٰی مثقال ذرّة من ایمان الخ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۵۳۷ تحت من یقتل مؤمنًا متعمدًا)[1]

آدم علیہ السّلام کے بیٹوں میں نزاع کا سبب

سوال: حضرتِ آدم علیہ السّلام کے بیٹوں کے درمیان جھگڑے کا سبب کیا تھا اور ان میں بہن بھائی کا امتیاز کیا تھا؟

---

[1] وقال النسفیؒ: فجزاءهٗ ای ان جازاه قال علیه السّلام هی جزاءه ان جازاه والخلود قد یراد به طول القیام۔ (مدارک التنزیل ج۱ ص۲۴۴ تحت قوله تعالیٰ: فَجَزَاءُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا)

وَمِثْلُهٗ فی جامع البیان للطبریؒ ج۴ ص۲۲۱ تحت قوله تعالیٰ: من یقتل مؤمنًا متعمدًا۔

الجواب: اس نزاع اور جھگڑے کے سبب کے بارے میں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں جب بھی بچہ پیدا ہوتا تو ایک لڑکے اور ایک لڑکی کا جوڑا ہوتا، چونکہ آدم علیہ السلام دنیا میں پہلے انسان تھے اور اللہ تعالیٰ کو ان کی نسل باقی رکھنا منظور تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے ضابطہ یہ مقرر کیا تھا کہ ہر جوڑے کا آپس میں نکاح ناجائز ہوتا اور دوسرے جوڑے کے ساتھ جائز ہوتا تھا اور ان کیلئے ضرورت کی بناء پر افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے تھا۔ تو اسی طرح حضرت آدمؑ کے ایک بیٹے قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوتی اس کا نام اقلیما تھا اور وہ حسین بھی تھی اور ان کے بعد دوسرے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوا اس کا نام ہابیل اور اس کی بہن کا نام لبوداتھا۔ اب اصول کے مطابق جب نکاح کا وقت آیا اور اقلیما کا نکاح ہابیل سے ہونے لگا تو قابیل نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے ساتھ پیدا ہوئی لہٰذا میرا حق ہے اور یہ لبودا سے حسین بھی ہے اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا تو پھر آدم علیہ السلام نے قابیل اور ہابیل دونوں کو نذر کا حکم دیا کہ جس کی نذر قبول ہوگئی فیصلہ اس کے حق میں ہوگا، اب ہابیل کی نذر قبول ہوگئی جس پر قابیل کا غصہ مزید بڑھا اور آخر کار اس نے ہابیل کو قتل کر دیا۔

لما نقل الطبریؒ:۔ عن ابن عباسؓ وعن مرة وعن ابن مسعود وناس من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یولد لآدم مولود الا ولد معه جارية فكان يزوج غلام هذا البطن جارية هذا البطن الآخر ويزوج جاريته هذا البطن غلام هذا البطن الآخر حتى ولد له ابنان يقال لهما قابيل وهابيل وكان قابيل صاحب زرع وكان هابيل صاحب ضرع وكان قابيل اكبرهما وكان له اخت احسن من اخت هابيل وان هابيل طلب ان ينكح اخت قابيل فابى عليه قال هي اختي ولدت معي وهي احسن من اختك وانا احق ان اتزوجها فامره ابوه ان يزوجها هابيل فابى وانهما قربا قربانا الى الله ايهما احق بالجارية الخ۔ (طبری ج۴ ص۱۸۸ سورة المائدة) [1]

---

[1] وقال ابن کثیرؒ: قال السدی فیما ذکر عن ابن عباس وابن مسعود وناس من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه كان لا يولد لآدم مولود الا ولد معه جارية فكان يزوج غلام هذا البطن جارية هذا البطن الآخر ويزوج جارية هذا البطن غلام هذا البطن الآخر حتى ولد له ابنان يقال لهما هابيل وقابيل وكان قابيل صاحب زرع وكان هابيل صاحب ضرع وكان قابيل اكبرهما وكان له اخت احسن من اخت هابيل وان هابيل طلب ان ينكح اخت قابيل فابى عليه وقال هي اختي ولدت معي وهي احسن من اختك وانا احق ان اتزوج بها فامره ابوه ان يزوجها هابيل فابى وانهما قربا قربانا الى الله عز وجل ايهما احق بالجارية الخ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۴۱ سورة المائدة۔ تحت الآية: واتل عليهم نبأ ابني آدم ......) ـــ ومثله في التفسير المظهری للقاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ ج۳ ص۸۵ سورة المائدة۔

غیر ذوی العقول کے لیے ذوی العقول کے لفظ کا استعمال

سوال:۔ سورۂ اعراف آیت ۱۹۱ وَهُمْ يُخْلَقُونَ اور آیت ۱۹۳ پر وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ میں هُمْ ضمیر کا مرجع کیا ہے اور اگر بُت مراد ہیں تو ذوی العقول کی ضمیر غیر ذوی العقول میں کیسے استعمال ہوئی ہے؟

الجواب:۔ ان دونوں آیتوں میں هُم کی ضمیر بُتوں کی طرف راجع ہے جو پہلے آیت ۱۹۱ میں لفظ مَا کے ضمن میں مذکور ہے اور هُمْ ضمیر اگرچہ ذوی العقول کے لیے استعمال کی جاتی ہے لیکن چونکہ مشرکین نے بُتوں کو اپنا اِلٰہ بنایا تھا اور ان کو عقلمند سمجھتے تھے، اس لیے قرآنِ کریم کا اسلوب بھی بطورِ زجر و توبیخ اُن کے عقائد کے مطابق چلا۔

لما قال الشیخ محمود الآلوسیؒ: وایراد ضمیر العقلاء مع ان الاصنام مما لایعقل انما هو بحسب اعتقادهم فیها واجرائهم لها مجری العقلاء وتسمیتهم لها اٰلهة۔ (روح المعانی ج۹ ص۱۴۱)[۱]

مالا یخلق میں ما کا معنیٰ و مُراد

سوال:۔ سورۃ اعراف آیت ۱۹۱ میں ارشادِ ربانی ہے: أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝ یہاں لفظ مَا سے مراد کون ہیں؟ اور لفظ مَا ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے یا غیر ذوی العقول کے لیے؟

الجواب:۔ اس آیتِ کریمہ میں لفظ مَا سے مراد ابلیس اور بُت ہیں اور لفظ مَا اکثر غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے تاہم بعض اوقات ذوی العقول کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

لما قال البغویؒ: أَيُشْرِكُونَ مَا۔ ای ابلیس والاصنام۔ (معالم التنزیل ج۲ ص۲۲۲ سورۃ الاعراف)[۲]

لفظ عِبَادٌ کی تفسیر

سوال:۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۹۴ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ میں عِبَادٌ سے کیا مراد ہے؟

---

[۱] وقال القاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ: هُم ضمیر الاصنام جیئ به بناءً علیٰ ان تسمیتهم اٰلهة۔ (تفسیر مظهری ج۳ ص۴۴۳ تحت آیة: إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۔۔ الاعراف)

[۲] وقال البیضاویؒ: مَا ای الاصنام۔ (تفسیر بیضاوی ج۳ ص۳۸ سورۃ الاعراف)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر المظهری ج۳ ص۴۴۳ تحت الآیة: إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۔ (الاعراف)

الجواب: لفظ عِبَادٌ عبد کی جمع ہے جو بمعنیٰ مملوک ہے، اور مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کا رَدّ کرتے ہوئے مشرکینِ مکہ کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم نے اپنے لیے جو معبود بنا رکھے ہیں اُن میں اور تم میں کوئی فرق نہیں، جیسے تمہارا مالک اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ان کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور معبود ایسا ہونا چاہیئے جو عابد سے درجے میں برتر ہو۔

لما قال القاضی پانی پتیؒ: عبادٌ امثالکم ای مخلوقۃٌ مملوکۃٌ مذللۃٌ مسخرۃ لما ارید منھم۔ (التفسیر المظھری ج ۳ ص ۴۴۲ سورۃ الاعراف پارہ ۹) [1]

فرعون کی لاش کی تحقیق

سوال: مصر کے عجائب گھر میں فراعنہ کے دَور کی ایک لاش ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اُس فرعون کی لاش ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے مقابلہ ہُوا تھا، بعض لوگ اس کے ثبوت کے لیے سورۃ یونس کی آیت کریمہ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ کا سہارا لیتے ہیں، کیا اس آیت کا مقصد واقعی یہ ہے کہ فرعون کی لاش محفوظ رہے گی اور وہ آج تک مصری عجائب گھر میں محفوظ ہے؟

الجواب: مصریوں کو ۱۹۲۶ء میں کچھ لاشیں ملیں جن کو دیکھ کر آثارِ قدیمہ کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ فرعون کی لاش ہے لیکن یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچی کہ واقعی اُسی فرعون کی لاش ہے جس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہُوا تھا، اس لیے کہ اُس زمانے میں مصر کا ہر بادشاہ فرعون کے نام سے پکارا جاتا تھا، جہاں تک سورۂ یونس کی آیتِ کریمہ سے اس کے لیے سہارا لینے کی کوشش ہے تو یہ ایک بے سود کوشش ہے۔ قرآنِ کریم کی اِس آیتِ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ فرعون کی لاش قیامت تک محفوظ رہے گی ورنہ آج اس کی لاش نا قابلِ دید ہے اس صورت میں پھر قرآن کی تکذیب لازم آئے گی۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "سو بجائے نجاتِ مطلوبہ کے آج ہم تیری لاش کو پانی میں تہہ نشین ہونے سے نجات دیں گے تاکہ اُن کے لیے موجبِ عبرت ہو جو تیرے بعد موجود ہیں کہ تیری بدحالی اور تباہی دیکھ کر احکامِ الٰہیہ کی مخالفت سے ڈریں" (بیان القرآن ج ۳ ص ۵۸) [2]

---

[1] وقال البیضاویؒ: امثالکم من حیث انھا مملوکۃٌ مسخرۃ۔ (تفسیر بیضاوی ج ۳ ص ۳۹ سورۃ الاعراف آیت ۱۹۴)
وَمِثْلُہٗ فی معالم التنزیل للبغوی ج ۲ ص ۲۲۲ سورۃ الاعراف۔

[2] مفسرین کے ہاں ننجیک کا معنیٰ ای نُلقیك بنجوۃٍ من الارض الخ "یعنی تیری لاش کو کسی اونچی جگہ میں ڈال دیں گے" (مدارک التنزیل ج ۲ ص ۱۷۵) — وقال البیضاویؒ: نلقیك علی نجوۃٍ من الارض لیراك بنو اسرائیل۔ الخ (تفسیر بیضاوی ج ۳ ص ۱۰۰)
وَھٰکَذَا قال الزمخشری فی تفسیرہ الشھیر بالکشاف ج ۲ ص ۳۶۸ سورۃ الاعراف۔

لفظ لَاجَرَمَ کی تحقیق

سوال:۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر لفظ لَاجَرَمَ کا استعمال ہوا ہے مثلاً سورۃ النحل، سورۂ مومن وغیرہ، اس کا لفظی معنیٰ کیا ہے اور صرفی و نحوی قوانین کے مطابق اس کی ترکیب کیا ہے؟ اگر لَاجَرَمَ میں لام کے ساتھ الف کو کھڑا کر کے نہ پڑھا جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ لاجرم کو الف کے بغیر پڑھنے سے چونکہ معنیٰ متغیر ہو جاتا ہے اس لیے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور یہ احناف کے مشہور اقوال میں سے ہے۔ اس لفظ کی ترکیب صرفی و نحوی میں علماء نے متعدد توجیہات کی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) امام سیبویہ، خلیل اور جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ لاجرم خمسۃ عشر کی طرح مرکب بنائی ہے اور مجموعہ فعل ماضی کے معنیٰ میں ہے یعنی حَقَّ، اور اس کے بعد والا کلام کا مصدر بأنّ ہے جو کہ لاجرم کا فاعل ہوتا ہے۔

(۲) بعض دوسرے علماء کے نزدیک جَرَمَ فعل ماضی بمعنیٰ ثَبَتَ و وَجَبَ ہے اور بعد والا جملہ اس کا فاعل ہے اور لَا اس میں نافیہ ہے جو ماقبل کے مضمون کی نفی کرتا ہے۔

(۳) زجاج کا کہنا ہے کہ جَرَمَ بمعنیٰ کسب ہے اور اس میں ضمیر مستتر ہے اس کا فاعل ہے جو کلام سابق کے مناسب مضمون کی طرف راجع ہے اور مابعد والا کلام جَرَمَ کا مفعول ہوگا اور لَا نافیہ ہے۔

(۴) زجاج سے یہ بھی منقول ہے کہ لَاجَرَمَ اصل میں لَا یَدْخُلَنَّکُمْ فِی الْجَرَمَ کے معنیٰ میں ہے پھر کثرتِ استعمال کی وجہ سے لَا بُدَّ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

(۵) کسائیؒ سے منقول ہے کہ جَرَمَ میں لَا نافیہ ہے اور جَرَمَ اس کا اسم ہے مبنی بر فتحہ جیسے لَا رَجُلَ اور معنیٰ اس کا لَا صَدَّ وَلَا منع ہے۔

(تفسیر روح المعانی ج۲۲ ص۳۲۔ تفسیر قرطبی ج۵ ص۲۰)

حضرت یوسف علیہ السّلام اور زلیخا کے نکاح کی تحقیق

سوال: حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے درمیان عقد نکاح ہوا تھا یا نہیں؟

الجواب:۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب شاہِ مصر کے ہاں گئے تو عزیزِ مصر کی بیوی کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ کی صفائی کے بعد شاہِ مصر نے آپ کو اپنے خواص میں نمایاں جگہ دی اور پھر عزیزِ مصر کے انتقال کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے منصب پر فائز کیا

اور اس کی بیوی رحیل کا نام بعض مفسرین نے زُلیخا بتایا ہے ان کا نکاح حضرت یوسفؑ کے ساتھ کر دیا۔ چونکہ عزیزِ مصر نامرد تھا اس لیے زلیخا اس وقت تک باکرہ ہی رہی۔ پھر زُلیخا سے حضرت یوسف علیہ السّلام کے تین بچے پیدا ہوئے جن کے نام افرائم، میشا اور رحمت ہیں۔

قال البغویؒ: عن ابن اسحٰقؒ قالوا ثمّ ان قطفیرای عزیز مصر هلك فی تلك اللیالی فتزوج الملك لیوسف راعیل امرأة قطفیر فلمّا دخل علیها قال الیس هٰذا اخیراً ما کنت تریدین متی قالت ان العزیز کان لا یأتی النساء۔۔۔۔۔فقرب منها یوسف فوجدها عذراء۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص۴۳۳) لہ

حضرت یوسف علیہ السّلام کے حیلے کی حقیقت

سوال: سورۃ یوسف آیت ۷۰ میں ہے کہ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ۔ اس میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو چور ٹھہرایا گیا ہے جو دراصل بے گناہ تھے، اور سورۂ نساء آیت ۱۱۲ میں ارشادِ ربانی ہے: وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا۔ اس آیت سے بے گناہ پر الزام لگانا گناہ معلوم ہو رہا ہے، لہٰذا یوسف علیہ السلام نے کیوں ایسا کام کیا؟

الجواب: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ وحیِ الٰہی کے تابع تھا جس کی بعد میں اللہ تعالیٰ نے کَذٰلِكَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ کے ساتھ تعبیر کر کے تحسین بھی فرمائی، لہٰذا اس میں حضرت یوسف علیہ السّلام پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

لما قال احمد الصاویؒ: کذٰلِكَ کدنا لیوسف علمناه الاحتیال۔ای فما وقع من یوسف فی تلك الواقعة بوحی من الله تعالیٰ وحینئذٍ فلا یقال کیف تأذی علی اخوته بالسرقة واتهمهم بها مع انهم بریئون۔ (تفسیر صاوی ج ۲ ص۲۵۳ سورۃ یوسف) ۲ـہ

لہ قال القرطبیؒ: ثمّ مات قطفیرای عزیز مصر فوجد الولید بزوجة قطفیر راعیل فدخل بها یوسف فوجدها عذراء وولدت له والدین الخ۔ (احکام القرآن ج ۵ ص۲۱۸ سورۃ یوسف)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص۴۸۲ سورۃ یوسف۔

۲ـہ وقال الحافظ ابن کثیر وهٰذا من الکید المحبوب المراد الذی یحبه الله ویرضاه لما فیه من الحکمة والمصلحة المطلوبة الخ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص۴۸۵ سورۃ یوسف)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر جامع البیان للطبری ج ۸ ص۲۴ سورۃ یوسف۔

مسئلہ روح | **سوال:** جناب مفتی صاحب! روح کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان فرمایا جائے؟

الجواب: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں سوال ہوا تو وحی الٰہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے صرف اس پر اکتفاء کیا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ یعنی روح بھی میرے رب کے امرِ کُنْ ہی سے ہے اور اس کی مخلوق ہے۔

اس کے بعد ہر زمانے کے فلاسفۂ عقلاء اور سائنسدان، غرض ہر مذہب کے پیروکار آئے اور انہوں نے اپنی علمی بساط کے مطابق روح کے بارے میں اظہارِ خیال کیا حتیٰ کہ روح ایک مستقل موضوع بن گیا جس پر کئی کتابیں اور رسائل لکھے گئے۔

اسی طرح مفسرین حضرات میں بھی دو جماعتیں بن گئیں، بعض نے اس میں تفصیل اور گہرائی میں جانے سے گریز کیا ہے اور انہوں نے اُسی اجمال کو ترجیح دی ہے جسے کلام اللہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح کے بارے میں لوگوں نے جو اختلاف کیا ہے اس کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں اور انہوں نے جو تحقیقات و تفصیلات کی ہیں ان کو طِب اور فلسفہ سے اخذ کیا گیا ہے جس سے سلف نے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے پیشِ نظر سکوت کیا ہے۔ اس لیے کہ سلف صالحین نے جب یہ دیکھا کہ مشرکین نے سوال کیا اور اس وقت وحی نازل ہو رہی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے پھر بھی مشرکین کو تفصیلی جواب نہیں ملا تو اس مسئلے میں سکوت کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔

لما قال وقد اختلف الناس في ماهية الرُّوح ثمّ اختلفوا هل الروح النفس ام هما شيئان فلا يحتاج الى ذكر اختلافهم لانه لا برهان على شيءٍ من ذٰلك وانما هو شيءٌ اخذوه عن الطبّ والفلاسفة فاما السّلف فانّهم سكتوا عن ذٰلك لقوله تعالى: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ فلمّا رأوا ان القوم سألوا عن الروح فلم يجابوا والوحي ينزل والرّسول حيّ علموا ان سكوت عمّا لم يحفظ بحقيقة علمه اولى۔ (زاد المسير ج۵ ص۸۶ سورۃ الاسراء)

اسی طرح امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اُسی ابہام کو ترجیح دی ہے جسے قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کی وجہ سے بہتر اس میں ابہام ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان نہ کر کے مبہم اس لیے چھوڑا ہے تاکہ انسان اپنے وجود پر علم رکھنے کے باوجود اپنی حقیقت سے جاہل ہو کر اپنے عجز کا اعتراف کرے۔ اور جب انسان کی اپنے نفس

کے بارے میں یہ حالت ہو تو اللہ جل مجدہٗ کی حقیقت کے جاننے کے بارے میں ضرور عاجز ہوگا۔

لما قال الصحیح الابہام لقولہٖ تعالیٰ: قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ - ای ھو امر عظیم وشان کبیر من امر اللہ تعالیٰ مبھمًا وتارکًا تفصیلہ لیعرف الانسان علی القطع عجزہ عن علم حقیقۃ نفسہٖ مع العلم بوجودھا واذا کان الانسان فی معرفۃ نفسہٖ ھٰکذا کان بعجزہٖ عن ادراک حقیقۃ الحق اولیٰ۔ الخ (احکام القرآن للقرطبی ج ۱۰ ص۳۲۴)

ان کے مقابلے میں بعض مفسرین حضرات ایسے ہیں جو روح کے بارے میں تفصیل کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ آیتِ کریمہ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ میں اجمال کو اس لیے اختیار نہیں کیا گیا کہ اُمتِ مرحومہ اس کی حقیقت کو نہیں بھانپ سکتی بلکہ یہ اجمال اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اکثریت اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتی اگرچہ بعض افراد پر یہ حقیقت کھل سکتی ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ جس چیز سے شریعت نے سکوت کیا ہو اس کی معرفت ناممکن ہو بلکہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر سکوت کیا جاتا ہے جسے اکثر نہیں سمجھ سکتے۔

لما قال الامام ولی اللہ الدھلویؒ: ولیست الآیۃ نصًا فی انہ لایعلم احد من الامۃ المرحومۃ حقیقۃ الروح کما یظن ولیس کل ما سکت عنہ الشرع لایمکن معرفتہ البتۃ بل کثیرًا ما یسکت عنہ لاجل انہٗ معرفۃ دقیقۃ لایصلح لتعاطیھا جمھور الامۃ وان امکن لبعضھم۔ الخ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص۱۸ باب حقیقۃ الروح)

اس کے بعد روح کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:- جاننا چاہیئے کہ روح کے متعلق اوّلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان میں زندگی کا باعث ہوا کرتی ہے جب حیوان میں روح ڈال دی جاتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے اور جب نکال لی جاتی ہے تو وہ مر جاتا ہے، اس کے بعد غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدن میں ایک لطیف بھاپ ہے جو اخلاط کے خلاصہ سے پیدا ہوتا ہے..... پھر جب زیادہ غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روح روحِ حقیقی کا مرکب ہے اور روحِ حقیقی کے بدن سے متعلق ہونے کا مادہ ہے.... اور روحِ حقیقی ایک جداگانہ چیز ہے، وہ ایک نورانی نقطہ ہے، ان تمام متغیرات سے جن میں سے بعض جوہر ہیں اور بعض عرض، اس کا رنگ ڈھنگ نرالا ہے۔

لما فی الحجۃ اللہ البالغہ: واعلم ان الرُّوح اوّل ما یدرک من حقیقتھا انھا مبدء الحیاۃ فی الحیوان وانہٗ یکون حیًا ینفخ الرّوح فیہ ویکون میتًا بمفارقتھا منہ ثم اذا امعن

فی التامل ینجلی ان فی البدن بخاراً لطیفاً متولداً فی القلب من خلاصۃ الاخلاط۔۔۔۔۔
ثم اذا امعن فی النظر ایضاً انجلی ان ھذا الروح مطیۃ للروح الحقیقۃ ومادۃ لتعلقھا۔۔۔۔۔
بل الروح فی الحقیقۃ حقیقۃ فردانیۃ ونقطۃ نورانیۃ یحل طورھا عن طورھذہ الاطوار المتغیرۃ المتغائرۃ التی بعضھا جواھر وبعضھا اعراض۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج۱ ص۱۸ باب حقیقۃ الروح) [1]

اصحاب کہف کے کتے کا جنت میں جانا | **سوال:** کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائے گا یا نہیں؟

الجواب: قرآن کریم اس مسئلے میں ساکت ہے اور ذخیرہ احادیث میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا، تاہم مفسرین حضرات نے چند حیوانات ایسے بتلائے ہیں جو جنت میں جائیں گے اور اصحاب کہف کے کتے کو بھی ان کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

لما قال العلامۃ اسمٰعیل حقی البروسویؒ: وروی انہ یدخل الجنۃ مع المؤمنین علی ماقال مقاتل عشرۃ من الحیوانات تدخل الجنۃ ناقۃ صالحؑ وعجل ابراھیمؑ وکبش اسمٰعیلؑ وبقرۃ موسیٰؑ وحوت یونسؑ وحمار عزیرؑ ونملۃ سلیمانؑ وھدھد بلقیس وکلب اصحاب الکھف وناقۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فکلھم یصیرون علی صورت کبش و یدخلون الجنۃ۔ (روح البیان ج۵ ص۲۲۶ سورۃ الکھف) [2]

صاحبِ موسیٰؑ کا بشر ہونا | **سوال:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس شخص کے پاس جاکر استفادہ کرنے کا حکم ہوا تھا وہ انسان تھا یا کوئی

---

[1] وقال احمد مصطفیٰ المراغیؒ:۔ ان الروح جسم نورانی حی متحرک من العالم العلوی مخالف بطبعہ لھذا الجسم المحسوس سار فیہ سریان الماء فی الورد والدھن فی الزیتون والنار فی الفحم لایقبل التبدل والتفرق والتمزق یفید الجسم المحسوس الحیاۃ وتوابعھا مادام صالحاً لقبول الفیض وعدم حدوث مایمنع السریان والاحداث الموت۔ واختارہ الرازی وابن القیم۔ (تفسیر مراغی ج۱۵ ص۸۹ آراء العلماء فی الروح)

[2] وقال العلامۃ محمود الآلوسی رحمہ اللہ: وجاء فی شأن کلبھم انہ یدخل الجنۃ یوم القیامۃ فعن خالد بن معدان لیس فی الجنۃ من الدواب الاکلب اصحاب الکھف وحمار بلعم۔ (روح المعانی ج۱۵ ص۲۲۶ تحت وَکَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ۔ الکھف)
وَمِثْلُہٗ فی تفسیر جمل ج۳ ص۱۲ سورۃ الکھف۔

فرشتہ تھا؟

الجواب:۔ اس بارے میں ایک ضعیف قول یہ ہے کہ یہ شخص فرشتہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سے استفادہ کرنے کا حکم ہوا تھا، لیکن یہ قول بہت ہی کمزور اور غیر معتبر ہے اور جمہور علماء کے نزدیک یہ حضرت خضرؑ تھے جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور فرشتہ نہ تھے بلکہ انسان تھے۔

لما قال الشیخ آلوسی رحمہ اللہ: قولہ تعالیٰ: عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا۔ الجمھور علیٰ انہ الخضر بفتح الخاء۔ وقیل الیاس وقیل ملك من الملٰئکۃ وھو قول غریب باطل کما فی شرح مسلم والحق الذی تشھد لہ الاخبار الصحیحۃ ھو الاوّل الخ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۳۱۹) لہ

نبوتِ خضر علیہ السلام

سوال:۔ خضر علیہ السلام نبی تھے یا ویسے اللہ تعالیٰ کے کوئی نیک بندے تھے؟

الجواب: حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور ولایت میں اختلاف ہے بعض علماء کے نزدیک وہ اللہ تعالیٰ کے ولی اور نیک بندے تھے، اور بعض دیگر حضرات کا قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے جس پر وہ مختلف شواہد اور دلائل پیش کرتے ہیں۔

لما قال الحافظ ابن کثیرؒ: تحت قولہ تعالیٰ: وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي۔ وفیہ دلالۃٌ من قال بنبوۃ الخضر علیہ السلام وقال آخرون کان رسولاً وقیل بل کان ملکاً وذھب کثیرون الیٰ انہ لم یکن نبیاً بل کان ولیاً۔ فاللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۹۹ سورۃ الکھف آیت ۸۲)

وقال الرازی رحمہ اللہ: قال الاکثرون ان ذٰلك العبد کان نبیاً واحتجوا علیہ بوجوہ الخ۔ (تفسیر کبیر ج ۲۱ ص ۱۴۸ سورۃ الکھف آیت ۶۵) ٢ـہ

لہ وقال القرطبی رحمہ اللہ: ھو الخضر علیہ السلام فی قول الجمھور .... وقیل کان ملکاً امر اللہ موسیٰ ان یأخذ عنہ مما حملہ من علم الباطن والاوّل الصحیح۔ (تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۶ سورۃ الکھف آیت ۸۳)

٢ـہ وقال القرطبی رحمہ اللہ: والخضر نبی عند الجمھور وقیل ھو عبد صالح غیر نبی والآیۃ تشھد بنبوّتہ لان بواطن افعالہ لا تکون الا بوحی۔ (تفسیر احکام القرآن للقرطبی ج ۱۱ ص ۱۶ سورۃ الکھف آیت ۶۵)

وقال ابوحیان الأندلسی رحمہ اللہ: والجمھور علیٰ ان الخضر نبی وکان علمہ معرفتہ بواطن قد اوحیت الیہ الخ۔ (تفسیر البحر المحیط ج ۶ ص ۱۴۷ سورۃ الکھف آیت ۶۵)

حیاتِ خضر علیہ السلام کی تحقیق

سوال:- حضرتِ خضر علیہ السلام اب بھی زندہ ہیں یا فوت ہوچکے ہیں؟

الجواب:- حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کے بارے میں علماء دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، بعض محدثین کا قول یہ ہے کہ وہ فوت ہوچکے ہیں' اور وہ اس پر مختلف دلائل پیش کرتے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ حضرتِ خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں، اور یہی صوفیائے کرام کا قول ہے۔

لما قال العلامة آلوسیؒ: وذهب جمهور العلماء الى انه حيٌّ موجود بين اظهرنا وذلك متفقٌ عليه عند الصوفية۔

قال النوویؒ: وقال ابن صلاح هو حيٌّ اليوم عند جماهير العلماء والعامة معهم في ذلك وانما ذهب الى انكاره بعض المحدثين۔ الخ (روح المعانی ج ۵ ص۲۹۵ سورۂ کہف آیت ۶۵)

وقال الثعالبیؒ:- والخضر شرب من ماء الحياة فهو حيٌّ الى ان يخرج الدجال وانه الرجل الذى يقتله الدجال۔ (تفسیر ثعالبی ج ۲ ص۲۸۸ سورۃ الکہف آیت ۶۰)

وقال القرطبیؒ: الصحيح انه حيٌّ على ما نذكره من الدلائل۔ (تفسیر قرطبی ج ۱۱ ص۴۱ سورۃ الکہف آیت ۸۲)

تاہم چونکہ مسئلہ اختلافی ہے اور دونوں طرف محققین علماء موجود ہیں، اور اس سے کسی عقیدے کا تعلق بھی نہیں، اس لیے اس کے بارے میں وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جس کو قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں مجدد الف ثانی رحمہ اللہ سے نقل کرکے فریقین کے اشکالات کو رفع کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے عالمِ کشف میں خود خضر علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہم السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہوکر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں" یہ ایک ایسا حل ہے کہ اس سے جانبین کے استدلات اور شواہد کی رعایت ہوجاتی ہے۔

ولا يمكن حل هذا الاشكال الا بكلام المجدد للالف الثانیؒ فانه حين سئل عن حياة الخضرؑ ووفاته توجه الى الله سبحانه متعلماً من جنابه عن هذا الامر فرئ الخضرؑ حاضراً عنده فسئله عن حاله فقال انا والياس لسنا من الاحياء لكن الله سبحانه اعطى لارواحنا قوة نتجسد بها ونفعل بها افعال الاحياء من ارشاد الضال واغاثة الملهوف اذا شاء الله وتعليم اللدنی واعطاء النسبة لمن

شاء اللہ تعالیٰ۔ (تفسیر مظہری ج ۶ ص ۶۲ سورۃ الکہف آیت ۸۲)

ذوالقرنین کون تھا؟

سوال: قرآن کریم میں ذوالقرنین کا ذکر آیا ہے، یہ شخص کون تھا؟
الجواب: ذوالقرنین کے متعلق قرآن کریم میں جو وضاحت ہے وہ صرف اتنی ہے کہ وہ ایک نیک اور عادل بادشاہ تھا جس نے مشرق و مغرب میں پہنچکر ان ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کی، اس مہم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کا سامان اور ضروریات اس کو عطا کئے گئے تھے، اس نے فتوحات کرتے ہوئے مختلف اطراف کے اسفار کیے، جن میں مشرقِ اقصیٰ، مغربِ اقصیٰ اور شمالی کوہستان کے ممالک شامل ہیں، اس سفر کے دوران اُس نے دو پہاڑوں کے درمیانی دَرے کو آہنی دیوار سے بند کر دیا جہاں سے یاجوج ماجوج نکل کر وہاں کے باشندوں کو تکالیف پہنچاتے اور ہراساں کرتے تھے۔ چونکہ قرآن کریم کا نزول ضروریات کے مطابق ہوتا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس وقت جو سوال ہوا تھا اُس کے سائلین کی تشفی مذکورہ جواب سے ہوگئی تھی، اس لیے قرآنِ مجید میں ذوالقرنین کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی ذخیرۂ احادیث میں اس کے بارے میں کوئی خاص ذکر ملتا ہے، البتہ اس بارے میں تاریخی اور اسرائیلی روایات ملتی ہیں، لیکن چونکہ ذوالقرنین کی تعیین کے بارے میں تاریخی روایات مختلف ہیں اس لیے چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

(۱) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اسکندر مقدونی یونانی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے گذرا ہے، اور اسی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

لما قال: والاقرب عندی لالزام اھل الملل والنحل..... اختیار إنّہ الاسکندر بن فیلقوس غالب دار۔ الخ۔ (روح المعانی ج ۱۶ ص ۳۰ سورۂ کہف آیت ۸۴)

(۲) اسی طرح امام رازیؒ نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے اسی قول کو ذکر کر کے اس پر دلائل پیش کیے ہیں، اور اخیر میں کہتے ہیں، والقول الاول اظہر لما ذکرنا۔ الخ

(تفسیر کبیر ج ۲۱ ص ۱۶۵ سورۂ کہف آیت ۸۳)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ نے اس قول کی بڑی سختی سے تردید کی ہے کہ اسکندر مقدونی کافر و مشرک تھا اور حکیم ارسطو اس کا استاد تھا اور جس شخص کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا وہ اتفاقاً مومن تھا، بلکہ بعض کے نزدیک تو نبی تھا، لہٰذا اس کو اسکندر مقدونی کہنا غلط ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۹۷ خبر ذوالقرنین)

(۳) بعض مؤرخین اور مفسرین کے نزدیک ذوالقرنین سے مراد ابوکرب شمر بن عبیر حمیری تھا، اور وہ اس پر بنو حمیر کے شعراء کے قصائد سے استدلال کرتے ہیں جن میں ذوالقرنین کی تعریف کی گئی ہے، اسی قول کو ابوریحان بیرونی نے ترجیح دی ہے۔ (تفسیر کبیر، روح المعانی)

(۴) اور اکثر متقدمین کے نزدیک ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا، حج کے موسم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کی ملاقات ہوئی اور خضر علیہ السلام اس کے وزیر یا مشیر تھے۔

(۵) جدید دور کے محققین اور تاریخ القرآن کے ماہرین مثلاً مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ کا مؤقف یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین سے مراد فارس کا وہ بادشاہ ہے جسے یہود خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش، اور عرب کیخسرو کہتے ہیں۔ اس پر وہ قرآن کریم سے اور تاریخی شواہد اور اسرائیلی روایات سے دلائل قائم کرتے ہیں۔

(قصص القرآن ج ۳ ص ۱۱۷ تا ۱۸۹ ذوالقرنین)

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ کی تفسیر

سوال:۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے ؎
سگِ اصحابِ کہف روزے چند : پئے نیکاں گرفت مردم شد
جس میں اصحاب کہف کے کتے کا انسان بننا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے ذہن میں کچھ خدشات پیدا ہوتے ہیں کہ اصحاب کہف کا کتا کیسے انسان بنا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ" تو پھر اس کتے میں کیسے تبدیلی آئی کہ وہ انسان بن گیا؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم اور ذخیرۂ احادیث میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ اصحاب کہف کا کتا انسان بن گیا ہو، اور نہ ہی شیخ سعدیؒ کی یہ مراد ہے بلکہ شیخ سعدیؒ نیک بندوں کی صحبت کے اچھے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب کتے نے (جو کہ نجس حیوان ہے) نے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی صحبت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔ جب کتے کو نیکوں کی صحبت سے اتنا بلند رتبہ ملتا ہے تو مومن موحد جب ایسا کرے گا تو وہ ضرور اس رتبے کا مستحق بنے گا۔

لما قال محمد بن احمدؒ:۔ قلتُ اذا کان بعض الکلاب قد نال ھذہ الدرجۃ العلیا بصحبتہ ومخالطتہ الصلحاء والاولیاء حتی اخبر اللہ تعالیٰ بذلک فی کتابہ جل وعلا فما ظنک بالمؤمنین الخ۔ (قرطبی ج ۱۰ ص ۳۷۱ سورۃ الکہف آیت ۱۸)

اور مردم شُد کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ کُتا انسانوں کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا یہ نہیں کہ انسان بن گیا ع ای مردمان داخل جنت شد۔ (روح البیان ج ۵ ص ۲۲۶ سورۃ الکہف آیت ۱۸)

اور لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ میں خَلَق سے مراد دین اور فطرتِ سلیمہ ہے۔

لما قال اسماعیل ابن کثیرؒ:۔ قال بعضهم لا تبدلوا خلق الله فتغيروا الناس عن فطرتهم التي فطرهم الله عليها وهو معنى حسنٌ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۳۲ سورۃ الروم آیت ۳۰) [۱]

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کی تحقیق

سوال:۔ بعض لوگ حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف ایک خاص بیماری کی نسبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس بیماری کی وجہ سے اُن کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے، یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے؟ اور قرآن و حدیث کی رُو سے اس کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب:۔ اس بارے میں قرآنِ کریم میں صرف اتنی تصریح موجود ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک شدید بیماری لاحق ہوگئی تھی جس سے نجات کے لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفاء عطا فرمائی۔ لیکن اس بیماری کے تعین کے بارے میں قرآنِ کریم ساکت ہے، اسی طرح ذخیرۂ احادیث بھی اس کے تعین سے خاموش ہے، البتہ بعض آثار سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے ہر حصے پر پھوڑے نکل آئے تھے جن کی وجہ سے لوگ نفرت کا اظہار کرتے تھے، لیکن محققین مفسرین نے ان آثار کی صحت سے انکار کیا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بیماری تو آسکتی ہے لیکن اُنہیں کسی ایسی بیماری میں مبتلا نہیں کیا جاتا جو عوام کی نفرت کا سبب بنے۔ لہٰذا حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کوئی خاص بیماری نہ تھی بلکہ عام بیماری تھی، اور جن آثار میں ان کی طرف کیڑوں کی نسبت کی گئی ہے اُن پر روایۃً و درایۃً اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

لما قال محمود الآلوسیؒ: وکل هذه الاقوال عندی متضمنةٌ ما لا یلیق بمنصب الانبیاء علیهم السلام۔ (تفسیر روح المعانی ج ۲۳ ص ۲۰۶) [۲]

---

[۱] قال حافظ الدین النسفیؒ: لا تبدیل ای ما ینبغی ان تبدل تلک الفطرۃ او تغیر وقال الزجاج معناه لا تبدیل لدین الله ویدل علیه ما بعده۔ (مدارک التنزیل ج ۳ ص ۲۷۲ سورۃ الروم آیت ۳۰)

[۲] ولا شك ان هذا الحديث من اخبار الاحاد التي تصادم اساس الدين الصحيحة من ان الانبياء يجب ان لا يكون فيهم من الامراض ما ينفر الناس منهم۔ (تفسیر مراغی احمد مصطفیٰ ج ۲۳ ص ۱۲۵)

حضرت داؤد علیہ السلام اور اسرائیلی روایات

سوال:۔ قرآن کریم کی سورۃ صٓ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے متعلق تفسیر جلالین میں بمحبتہ تلک المرأۃ کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے توقف کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح تفسیر روح البیان میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کے بیان کرنے والے کے لیے حد مقرر کی تھی۔ اس واقعہ میں کہاں تک صداقت ہے؟

الجواب:۔ جلالین اگرچہ ایک بہترین تفسیر ہے لیکن بعض مقامات پر اس کی تفسیر قابلِ مواخذہ ہے جن میں سے ایک مذکورہ جگہ بھی ہے، انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی نسبت موجبِ تنقیص ہے جس سے انبیاء کرام محفوظ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ محققین مفسرین نے اس واقعہ سے انکار کیا ہے، چنانچہ حافظ اسماعیل بن کثیر رحمۃ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

قد ذکر المفسرون ھٰھنا قصۃً اکثرھا ماخوذٌ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہٗ...... فالاولیٰ ان یقتصر علیٰ مجرد تلاوۃ ھٰذہٖ الآیۃ وان یرد علمھا الی اللہ عزّ وجلّ۔ الخ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۵۷ سورہ صٓ)

اور علامہ احمد مصطفےٰ رحمہ اللہ اس بارے میں لکھتے ہیں :۔

انّما جاء من القصص عن ذکر السبب فی مجیٔ الملکین فما یخل بمنصب النبوّۃ وفیہ نسبۃ الکبائر الی الانبیاء فیجب علینا ان نطرحہٗ اذ یبطل الوثوق بالشرائع۔ الخ

(تفسیر مراغی ج ۲۳ ص ۱۱۱ سورۃ صٓ)

علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حد مقرر کرنے کی جو بات ہے یہ کسی روایت سے ثابت نہیں اور بصورتِ ثبوت اُن کے اجتہاد پر محمول ہے جس کی اتباع کرنا ضروری نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ اس موقعہ پر تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

قال علیٌّ علیٰ مَا فی بعض الکتب من حدّث بحدیث داوٗد علیہ السلام علیٰ ما یرویہ القصاص جلدتہٗ مائۃً وَستّین وذٰلک حد الفریۃ علی الانبیاء۔ وھٰذا اجتھاد منہ کرّم اللہ وجھہٗ الا ان الزین العراقی ذکر ان الخبر نفسہٗ لم یصح عن الامیر رضی اللہ عنہ۔ (تفسیر روح المعانی ج ۲۳ ص ۱۵۸ سورۃ صٓ)

لہٰذا اس آیت کی وہ تفسیر قابلِ قبول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر سے

معلوم ہوتی ہے۔

عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قال ما اصاب داؤد ما اصابہ بعد القدر الا من عجب بہ من نفسہ وذلک انہ قال یا رب ما من ساعۃ من اللیل ولا نہار الا وعابد من آل داؤد یعبدک یصلی لک ویسبح اویکبر وذکر اشیاء فکرہ اللہ وقال یا داؤد ان ذلک لم یکن الا بی فلولا عونی ما قویت علیہ وجلالی لأکلنک الی نفسک یوما قال یا رب فاخبرنی بہ فاصابتہ الفتنۃ ذلک الیوم۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک ج۲ ص۴۳۳)

جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض امور مثلاً حسنِ انتظام اور ہر وقت عبادت میں شغل سے ایک نوع اعجاب کی وجہ سے بطور عتاب یہ واقعہ پیش آیا۔

تعداد ازواج حضرت داؤد علیہ السلام

سوال: حضرت داؤد علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد کتنی تھی؟

الجواب: حضرت داؤد علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد مؤرخین اور مفسرین نے ایک سو [۱۰۰] بتائی ہے، لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اس لیے کہ اُن کی شریعت میں تعداد ازواج کے بارے میں کوئی خاص حد مقرر نہیں تھی کہ جس کی پابندی کی جاتی۔

لما قال الحافظ ابن کثیر رحمہ اللہ: وکانت لداؤد مائۃ امرأۃ منہم امرأۃ وریا ام سلیمان التی تزوجہا بعد الفتنۃ وقد ذکر الکلبی نحو ھذا۔ (البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص۱۵) [لہ]

اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ کی تفسیر

سوال: سورۂ صٓ کی آیت ۷۵ اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ۔ میں لفظ عالین سے بعض لوگ جماعت پنج تن پاک مراد لیتے ہیں اور ان لوگوں کے نزدیک پنج تن پاک سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں؛ اور ان کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ

[لہ] وقال القرطبیؒ: وفی التفسیر لہ تسع وتسعون امرأۃ۔ قال ابن العربیؒ: ان کان جمیع ھن احرارًا فذلک شرعہ وان کن اماءً فذلک شرعنا والظاہر ان شرع من تقدم قبلنا لم یکن محصورًا بعدد وانما الحصر فی شریعۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لضعف الابدان وقلۃ الاعمار۔ (احکام القرآن للقرطبی ج۱۵ ص۱۶۱ سورۃ صٓ)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر جلالین ج۲ ص۳۸۱ سورۃ صٓ۔

کرنے سے مُستثنیٰ کیا گیا تھا، کیا واقعۃً کوئی ایسی جماعت تھی جسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے مُستثنیٰ کیا گیا ہو؟

الجواب:۔ حضرت آدم علیہ السّلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا جس میں فرشتوں کے علاوہ کوئی اور داخل نہیں تھا، جبکہ پنج تن پاک کی جماعت اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کسی تفسیرِ قرآن یا حدیث میں یہ بات نہیں ملتی کہ یہاں عَالِیْن سے مراد پنج تن پاک ہوں جبکہ اس آیت کی جو تفسیر ہے وہ یوں ہے کہ جب ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السّلام کو سجدہ کرنے کے حکم سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس! تُو نے میری اس خاص مخلوق کو سجدہ کیوں نہ کیا جبکہ یہ میرا حکم تھا، تو نے اب تکبّر کیا یا تو پہلے سے متکبّر تھا۔

لما قال العلامۃ محمود الآلوسیؒ: استکبرت من غیر استحقاق اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ، اوکنت مستحقًا للعلو فائق فیہ۔ وقیل المعنیٰ احدث لک الاستکبار ام لم تزل منذ کنت من المستکبرین الخ۔ (روح المعانی ج ۲۳ ص۲۲۶ سورۃ صٓ)

لفظ اعداء اللہ کی تفسیر

سوال:۔ کیا سورۃ حٰمٓ السجدہ کی مندرجہ ذیل آیات وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ، حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ (آیت ۱۹، ۲۰) سے یہود و نصاریٰ، مشرکین، دہریہ وغیرہ ہی مراد ہیں یا جو لوگ کلمہ پڑھ کر حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں اور خدا و رسول کی نافرمانی کرتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں؟

الجواب:۔ کسی آیت کے مفہوم کے بارے میں قطعی طور پر یہ فیصلہ کرنا کہ اس سے یہی مراد ہے کوئی اور نہیں، یہ تب ہو سکتا ہے جب الفاظ کی دلالت کا اس پر قطعی یقین ہو دوسرا احتمال نہ ہو یا اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تصریح موجود، اِن دونوں صورتوں کے علاوہ قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم آیت کا سیاق و سباق، موقع و محل کی مناسبت اور قرآن کی دوسری شہادتیں ایسی چیزیں ہیں کہ جن سے عقلِ سلیم والا شخص کسی آیت کے مفہوم کے بارے میں بطورِ ظنِ غالب

لہ وقال ابن الجوزیؒ: استکبرت بنفسک حین ابیت السجود اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ۔ ای من قوم یتکبرون فتکبرت علی السجود لکونک من قوم یتکبرون۔ (زاد المسیر ج ۷ ص۱۵۷ سورۃ صٓ)

وَمِثْلُہٗ قال الصابونی فی صفوۃ التفاسیر ج ۳ ص۶۵ سورۃ صٓ۔

یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہاں یہی مراد ہے۔

اب زیرِ غور آیتِ کریمہ کے بارے میں مذکورہ بالا امور کو مدِ نظر رکھ کر جب سوچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعداء اللہ سے مراد کفار و مشرکین ہیں، مؤمنین عاصین مراد نہیں ہیں۔

(۱) سیاق و سباق: سورۃ کی ابتداء سے ہی کفار و مشرکینِ عرب کے ساتھ تین باتوں پر گفتگو چل رہی ہے۔ قرآنِ کریم کا منزل من اللہ ہونا، اثباتِ توحید، اثباتِ رسالت، اور مختلف دلائل و براہین سے ان مسائل کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کے بعد وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ کے ساتھ ان ہی کفار کے عقوبات کا ذکر ہو رہا ہے۔

(۲) مقامی قرائن یہاں پر یہ ہیں کہ یہاں پر اعداء اللہ کی تین نشانیاں بتلائی گئی ہیں جو کہ کفار کے ساتھ خاص ہیں، ایک یہ کہ وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ۔ دوسری اعضاء کی شہادت اور تیسری فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔

(۳) یہ کہ لفظ اعداء اللہ کا اطلاق قرآنِ کریم میں کفار ہی پر ہوتا ہے، چند مقامات ملاحظہ ہوں: ۱ ذٰلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارُ (حم السجدۃ آیت ۲۸) ۲ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ (بقرہ ۹۸) ۳ لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ (الممتحنہ ۱) ۴ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۔ (الفرقان ۳۱) ۵ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ ۔ (الانعام ۱۱۲)

اس کے برعکس قرآنِ کریم میں جب اللہ تعالیٰ مؤمنین سے مخاطب ہوتے ہیں تو اولیاء یا ولی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، مثلاً ۱ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا ۔ (البقرہ ۲۵۷) ۲ اللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران ۶۸) ۳ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ (المائدہ ۵۵) ۴ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (یونس ۶۲)

ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اعداء اللہ سے مراد کفار ہیں نہ کہ مؤمنین فاسقین۔

اب مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں:-

علامہ حافظ الدین نسفیؒ فرماتے ہیں: (ويوم يحشر اعداء الله) اى الكفار من الاولين والآخرين ۔ (تفسیر مدارک ج ۴ ص ۹۲ سورۃ حم السجدۃ آیت ۱۹) [1]

---

[1] علامہ ابوحیان اندلسیؒ فرماتے ہیں: واعداء الله هم الكفار من الاولين والآخرين۔ (البحر المحیط ج ۷ ص ۴۹۱ حم السجدۃ ۱۹)

وَمِثْلُهُ فی احکام القرآن ج ۵ ص ۳۵ سورۃ حم السجدۃ آیت ۱۹۔

منافقین کی لکڑی سے تشبیہ

سوال: سورۂ منافقون کی آیت ۴ کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ کا معنیٰ اور مطلب کیا ہے؟

الجواب: اس سے پہلے منافقین کی بحث چل رہی ہے، اس آیت میں اللہ کریم نے منافقین کے بے عقل اور بے ایمان ہونے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کتنی ہی موٹی کیوں نہ ہو لیکن بے جان ہوتی ہے یہی حالت منافقین کی ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر یہ جسیم وجیم نظر آتے ہیں لیکن اندر سے خالی ہوتے ہیں۔

لما قال الامام فخر الدین الرازیؒ: والخشب لا تعقل ولا تفھم فکذٰلک اھل النفاق کانھم فی ترک التفھم والاستبصار بمنزلۃ الخشب۔ (تفسیر کبیر ج ۳۵ ص ۱۵ سورۃ المنافقون آیت ۴) ؂۱

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کا عموم پر حمل کرنا

سوال: اگر کوئی شخص سورۃ الم نشرح کی آیت وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کے بارے میں یہ کہے کہ اس سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو زندگی کے تشکیلی دور میں محنت سے کام لے کر بلند مرتبہ حاصل کرے وہ بھی اس بلندی اور رفعت میں داخل ہے، کیا اس آیت سے یہ مفہوم مراد لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ ورفعنا لک ذکرک میں کاف واحد مخاطب کی ضمیر ہے اسلئے اس آیت میں خطاب خصوصی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے لہٰذا اس کو عام کرنا اور ہر شخص کو اس میں داخل کرنا صحیح نہیں۔ یہاں رفعتِ ذکر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی اذان، کلمہ تشہد وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذکر کرنا ہے جو کسی اور کے لیے حاصل نہیں ہو سکتا۔

لما قال محمد بن احمدؒ: تحت ھٰذہ الآیۃ روی عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال یقول لہٗ لا ذکرت الا ذکرت معی فی الاذان والاقامۃ والتشھد ویوم الجمعۃ علی المنابر الخ۔ (احکام القرآن للقرطبی ج ۲۰ ص ۱۰۶ سورۃ الانشراح ۴) ؂۲

؂۱ وقال القاضی البیضاوی رحمہ اللہ: ای مشبھین باخشاب منصوبۃ مسندۃ الی الحائط فی کونھم اشباحا خالیۃ عن العلم والنظر۔ (تفسیر بیضاوی ج ۵ ص ۳۳۳ سورۂ منافقون آیت ۴)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر معالم التنزیل للبغوی ج ۴ ص ۳۴۸ سورۂ منافقون آیت ۴۔

؂۲ وقال المحلی رحمہ اللہ: بان تذکر مع ذکری فی الاذان والاقامۃ والتشھد الخطبۃ وغیرھا۔ (تفسیر جلالین ج ۲ ص ۵۰۲ سورۃ الانشراح۔ آیت ۴)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر روح المعانی ج ۳۰ ص ۱۶۹ سورۃ الانشراح، آیت ۴۔

قرآنِ کریم کو چُومنا

سوال:۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ قرآنِ کریم اٹھاتے اور رکھتے وقت اسے چُومتے ہیں، کیا قرآنِ کریم کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سلف صالحین اور صحابۂ کرامؓ کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ قرآنِ کریم کو چُومتے تھے اور اس میں قرآنِ کریم کی تعظیم وتکریم مضمر ہے، لہٰذا ایسا کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: روی عن عمرؓ انہٗ کان یأخذ المصحف کل غداۃ ویقبلہ ویقول عہد ربی ومنشور ربی عزّوجل وکان عثمان رضی اللہ عنہ یقبل المصحف ویمسحہ علیٰ وجہہ۔ (الدر المختار علیٰ رد المحتار ج۵ ص۲۴۶ کتاب الحظر والاباحۃ ۔ باب الاستبراء وغیرہ)

ختمِ قرآن کے وقت سورۂ اخلاص کو تین مرتبہ پڑھنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض اساتذہ ناظرۂ قرآنِ مجید یا حفظ القرآن کی تکمیل کرنے والے طالب علم کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید ختم کرتے وقت سورۂ اخلاص کو تین بار پڑھے، کیا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض مشائخ کے ہاں ایسا کرنا مستحسن نہیں جبکہ اکثر مشائخ کے ہاں ایسا کرنا مستحسن ہے، البتہ اگر ختمِ قرآن فرض نماز میں ہو تو ایک بار سے زیادہ نہ پڑھے۔

قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: قرأۃ قل ھو اللہ احد ثلث مرات عند ختم القرآن لم یستحسنھا بعض المشائخ وقال الفقیہ ابو اللیثؒ ھذا شیٔ استحسنہ اھل القرآن وائمۃ الامصار فلا بأس بہ الّا ان یکون الختم فی المکتوبۃ فلا یزیدہٗ علیٰ مرّۃ۔

(کبیری ص۴۹۶ اما القرأۃ خارج الصلوٰۃ) لہ

لہ وفی الھندیۃ: قرأۃ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ثلاث مرّات عقیب الختم لم یستحسنھا بعض المشائخ واستحسنھا اکثر المشائخ لجبر نقصان دخل فی قرأۃ البعض الّا ان یکون ختم القرآن فی الصلوٰۃ المکتوبۃ فلا یزید علیٰ مرّۃ واحدۃ کذا فی الغرائب۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۱۷ الباب الرابع فی الصلوٰۃ والتسبیح وقرأۃ القرآن والذکر والدعاء ورفع الصوت عند قرأۃ القرآن)۔

قرأتِ سبعہ میں قرآن کریم پڑھنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! میں نے ایک مسجد میں ایک مولانا صاحب کی اقتداء میں نماز پڑھی جنہوں نے عام قرأت کے علاوہ قرأتِ سبعہ میں تلاوتِ قرآن پاک کر کے نماز پڑھائی، کیا اس صورت میں مقتدیوں کی نماز ہوگئی یا نہیں؟ نیز قرأتِ سبعہ تواتر سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو قرأت ہم تک پہنچی ہیں ان میں بعض متواتر ہیں، بعض مشہور اور بعض احاد اور شاذ کی حد تک پہنچ چکی ہیں، جہاں تک قرأتِ سبعہ کا تعلق ہے تو یہ قراءِ سبعہ سے ثابت ہے البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت جمہور کے نزدیک حدِ تواتر تک نہیں پہنچا ہے جبکہ بعض تواتر کے قائل ہیں، جہاں تک نماز کا تعلق ہے تو قرأت سبعہ میں ہو جاتی ہے۔

قال العلامۃ السیوطیؒ، قال قی اول کتابہ النشر کل قرأۃ وافقت العربیۃ ولو بوجہ ووافقت احد المصاحف العثمانیۃ ولو احتمالاً وصح سندھا فھی القراءۃ الصحیحۃ التی لایجوز ردھا ولا یحل انکارھا بل ھی من الاحرف السبعۃ التی نزل بھا القرآن ووجب علی الناس قبولھا سواء کانت عن الائمۃ السبعۃ ام عن العشرۃ ام عن غیرھم من الائمۃ المقبولین۔

(الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص۷۵ النوع الثانی ... معرفۃ التواتر والمشھور)[1]

قرأتِ عشرہ کا ثبوت

سوال :- جناب مفتی صاحب! قرأتِ سبعہ کا تو تواتر سے ثبوت ہے، اس کے علاوہ جو شخص عشرہ میں قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہو تو خاطی شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- قرأتِ عشرہ اگرچہ تواتر سے ثابت نہیں مگر اس کا ثبوت حدِ شہرت کو پہنچا ہوا ہے، اس میں قرآن پڑھنے والے کو خاطی کہنا درست نہیں اس لیے کہ اس کی زد میں کبار تابعینؒ وصحابۂ کرامؓ آتے ہیں۔

---

[1] قال صاحب مناھل العرفان : وجاء اقتصارہ علی ھؤلاء السبعۃ مصادفۃ واتفاقاً من غیر قصدٍ ولاعمدٍ ذلک انہ اخذ علی نفسہ الا یروی الا عن اشتھر بالضبط والامانۃ وطول العمر فی ملازمۃ القرأۃ واتفاق الاراء علی الاخذ عنہ والتلقی منہ ...... بل کل قرأۃ توافرت فیھا الارکان الثلاثۃ للضابط المشھور وجب قبولھا۔ (مناھل العرفان ج ۱ ص۴۱۱ اعداد القرأت)

قال صاحب مناهل العرفان : الاوّل المتواتر...... والثانی المشھور...... وھذان النوعان ھما اللہ ان یقرأ بھما مع وجوب اعتقادھما ولا یجوز انکار شئ منھما۔ (مناھل العرفان ج ۱ ص ۴۲۳ المبحث الحادی عشر فی القرآت والقراٰ والشبھات التی اثیرت فی ھذا المقام) [۱]

مقامِ محمود سے کیا مراد ہے

سوال :۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (سورۃ الاسراء آیت ۷۹ پ ۱۵) سے کیا مراد ہے؟ کیا مقامِ محمود جنت میں کوئی جگہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی یا کوئی اور خاص مقام ہے؟

الجواب :۔ جمہور علماءِ امت، صحابۂ کرام و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے اس مقام کی تفسیر یوں منقول ہے کہ اس سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ ہے، یہ بلند مرتبہ کسی بھی دوسرے نبی یا رسول کو حاصل نہ ہوگا، چنانچہ بعض روایات بھی اس قول کی تائید کرتی ہے۔

قال العلامۃ ابن الجوزیؒ : قولہ مقامًا محمودًا وھو الذی یحمدہ لاجلہ جمیع اھل الموقف وفیہ قولان احدھما انہ الشفاعۃ للناس یوم القیامۃ۔ قالہ ابن مسعود و حذیفۃ بن الیمان و ابن عمر و سلمان الفارسی و جابر بن عبد اللہ والحسن وھی روایۃ ابن ابی نجیح عن مجاھد والثانی یجلسہ علی العرش یوم القیامۃ روی ابو وائل عن عبد اللہ انہ قرأ ھذہ الایۃ وقال

---

[۱] قال العلامۃ جلال الدین السیوطیؒ : اعلم ان القاضی جلال الدین البلقینی قال القرأۃ تنقسم الی المتواتر واحادٍ وشاذٍ فالمتواتر القرأٰت السبعۃ المشھورۃ والاحاد قرأٰت الثلاثۃ التی ھی تمام العشر ویلحق بھا قرأۃ الصحابۃ والشاذ قرأۃ التابعین...... قال الدانی وائمۃ القراٰ لا تعمل فی شئ من حروف القراٰن علی الافشاء واللغۃ والاقیس فی العربیۃ بل علی الاثبت فی الاثر والاصح فی النقل واذا ثبت الروایۃ لم یردھا قیاس عربیۃ ولا فشو لغۃ لان القرأۃ سنۃ متبعۃ یلزم قبولھا والمصیر الیھا۔
(الاتقان فی علوم القراٰن ج ۱ ص ۷۵ النوع الثانی...... معرفۃ المتواتر والمشھور والاحاد...... الخ)

یقعدہ علی العرش وکذٰلک روی الضحاک عن ابن عباسٍ ولیث عن مجاھد۔
(تفسیر زاد المسیر ج ۵ ص۷۶ قول تعالیٰ: عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ) [۱]

دورانِ تلاوت حضورِ انور کا نام آنے پر درود پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر قرآن کریم کی تلاوت کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اسمِ گرامی آجائے تو کیا اُسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھنا ضروری ہے یا کہ تلاوت سے فارغ ہو کر پڑھا جائے؟

الجواب:۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سنتے ہی شرعاً درود و سلام پڑھنا واجب ہے مگر دورانِ تلاوتِ قرآن بہتر یہ ہے کہ تلاوت کو جاری رکھا جائے اور تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد درود پڑھا جائے تاہم اگر دورانِ تلاوت ہی درود پڑھ لیا جائے تب بھی جائز ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولو قرأ القراٰن فمر علیٰ اسم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقرأۃ القراٰن علی تالیفہ ونظمہ افضل من الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ذٰلک الوقت فان فرغ ففعل فھو افضل والا فلا شئ علیہ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۱۹ مطلب فی المواضع التی تکرہ فیھا الصلوٰۃ علی النبیؐ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ آلوسیؒ: مقاماً محموداً والمراد بذٰلک المقام مقام الشفاعۃ العظمیٰ فی فصل القضاء حیث لا احد الا وھو تحت لوائہ صلی اللہ علیہ وسلم فقد اخرج البخاری وغیرہ عن ابن عمرؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الشمس لتدنوا حتی یبلغ العرق نصف الاذن فبینما ھم کذٰلک استغاثوا بآدم فیقول لست بصاحب ذٰلک ثم موسیٰ فیقول کذٰلک ثم محمد فیشفع فیقضی اللہ تعالیٰ بین الخلق فیمشی حتیٰ یأخذ بحلقۃ باب الجنۃ فیومئذٍ یبعثہ اللہ تعالیٰ مقاماً محموداً یحمدہ اھل الجمع کلھم۔ (تفسیر روح المعانی ج ۵ ص۱۴۱ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ)

[۲] قال العلامۃ قاضیخانؒ: رجلٌ یقرأ القراٰن فسمع اسم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر الناطفیؒ انہٗ لا یجب علیہ الصلوٰۃ والتسلیم لان قرأۃ القراٰن علی النظم والتالیف افضل من الصلوٰۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا فرغ من القرأۃ ان صل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان حسناً وان لم یصل فلا شئ علیہ ....الخ (فتاویٰ قاضی خان ج۳ ص۳۷۷ کتاب الحظر والاباحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۱۶ کتاب الکراھیۃ الباب الرابع فی الصلوٰۃ والتسبیح ....الخ

اذان کے دوران قرآن کریم کی تلاوت کرنا

سوال:۔ زید ایک دن مسجد میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ اذان شروع ہوگئی تو ایک صاحب نے اس کو سختی سے منع کیا، تو کیا اذان کے دوران قرآن کریم کی تلاوت کرنا ممنوع ہے؟

الجواب:۔ اذان کے وقت اگرچہ تلاوتِ قرآن ممنوع نہیں "تاہم بہتر یہ ہے کہ اذان شروع ہوتے ہی تلاوت بند کر دی جائے اور اذان کو سنکر اس کا جواب دیا جائے۔

قال القاضی خانؒ: ولو سمع القاری الاذان فالافضل له ان یمسك عن القرأة ولیسمع الاذان۔ الخ۔ (فتاوی قاضیخان ج۴ ص۳۷۷ کتاب الحظر والاباحة) [۱]

قرآن کریم کی تلاوت کرنا افضل ہے یا درود شریف پڑھنا؟

سوال:۔ دو آدمیوں کی ایک جگہ اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی کہ تلاوتِ قرآن افضل ہے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجنا افضل ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا افضل ہے، دوسرے نے کہا کہ قرآن کریم کی تلاوت افضل ہے۔ لہٰذا کرم آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ مولانا عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ اوقاتِ مکروہہ یعنی جن اوقات میں نماز پڑھنا شرعاً مکروہ ہے ان اوقات میں تلاوتِ قرآن کے علاوہ دیگر تسبیحات واذکار اور درود شریف پڑھنا افضل ہے، اس کے علاوہ دیگر اوقات میں تلاوتِ قرآنِ پاک کرنا افضل ہے۔

لما قال الشیخ عبد الحی الکهنوی رحمه الله، القران افضل الاذکار لانه کلام الله تعالیٰ کما فی الحصن الحصین لکن فی الاوقات التی یکره الصلوٰة فیها کما بعد صلوٰة الصبح الی طلوع الشمس فالتسبیح والدعا والصلوٰة علی النبی

---

[۱] وفی الهندیة: ولا ینبغی ان یتکلم السامع فی خلال الاذان والاقامة ولا یشتغل بقرأة القران ولا بشیٔ من الاعمال سوی الاجابة ولو کان فی القرأة ینبغی ان یقطع ویشتغل بالاستماع والاجابة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۷ الباب الثانی فی الاذان، ومما یتصل بذلك اجابة المؤذن)

وَمِثْلُهٗ فی البدائع الصنائع ج۱ ص۱۵۵ فصل وَاَمَّا بیان ما یجب علی السامعین ۔۔۔ الخ۔

صلی اللہ علیہ وسلم فیہا افضل من قرأۃ القرآن وکان السلف یسبحون فی ذلک الوقت ولا یقرأن۔ (نفع المفتی والسائل ص۱۱۲ ما یتعلق بقرأۃ القرآن) [۱]

قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کو جلانا جائز نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب! زید اور بکر کے درمیان قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کے بارے میں بحث ہوئی، زید نے کہا کہ قرآنِ کریم کا وہ نسخہ جو بوسیدہ ہو چکا ہو تو اس کو جلانا جائز ہے اور دلیل میں حضرت عثمانؓ کا عمل پیش کیا، جبکہ بکر نے کہا کہ مطلقاً قرآنِ کریم کو جلانا جائز نہیں اگرچہ بوسیدہ ہو چکا ہو، از راہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح صورتحال سے ہمیں مطلع فرمائیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جب قرآنِ کریم کا کوئی نسخہ بوسیدہ ہو جائے اور تلاوت کے قابل نہ رہے تو اس کو جلایا نہ جائے بلکہ کسی محفوظ مقام میں دفن کر دیا جائے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بکر کا قول درست ہے۔ جہاں تک اس بارے میں حضرت عثمانؓ کے عمل کا تعلق ہے تو محدثین نے اس کے مختلف جوابات ذکر کیے ہیں، قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اولاً ان اوراق کو پانی سے دھویا پھر آگ سے جلایا، گویا کہ آپؓ نے مصحف کو نہیں بلکہ ان صاف اوراق کو جلایا تھا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی الذخیرۃ المصحف اذا صار خلقاً وتعذر القرأۃ منہ لا یحرق بالنار الیہ أشار محمد وبہ نأخذ۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۲۲ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی البیع) [۲]

---

[۱] قال العلامہ ابراھیم الحلبیؒ: وسئل البقالی عن قرأۃ القرآن فی الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیہا أھی افضل ام الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والذکر والتسبیح فقال الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والذکر والتسبیح افضل ۔۔۔ الخ (حلبی کبیری ص۴۹۶ تتمات فیما یکرہ من القرآن فی الصلوۃ ومالا یکرہ وفی القرأۃ خارج الصلوۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۱۶ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع فی الصلوۃ والتسبیح ۔۔۔ الخ

[۲] وَفِی الھندیۃ: المصحف اذا صار خلقاً وتعذرت القرأۃ منہ لا یحرق بالنار أشار الشیبانی (ای محمد) الی ھذا فی السیر الکبیر وبہ نأخذ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۳ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد والقبلۃ والمصحف۔ الخ)

نیکر پہننے والوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کرنا بے ادبی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں ایک فوجی خطیب ہوں، فوجی قانون یہ ہے کہ صبح سویرے فوجی جوان نیکر و بنیان پہن کر پریڈ کے لیے اسمبلی میں آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی رانیں ننگی ہوتی ہیں، اس حالت میں مجھے ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرنے کو کہا جاتا ہے، کیا اس حالت میں ان کے سامنے قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باتفاق علماءِ امت مرد کی ران عورت (ستر) ہے، اس کو بلا عذرِ شرعی ننگا رکھنا ناجائز و حرام ہے، جس جگہ لوگ ناجائز اور حرام امور میں مشغول ہوں تو وہاں قرآنِ مجید کی تلاوت کرنا یا اس کا درس دینا بے ادبی ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں فوجیوں کے سامنے قرآنِ مجید کی تلاوت سے اجتناب کیا جائے اور فوجیوں کو سترِ عورت کی تلقین کی جائے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: سلامك مكروه على من ستسمع ...... ومن بعد ما ابدى يسن و يشرع ودع كافرايضاً مكشوف عورة ...... ومن هو في حال التغوط اشنع۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۱۶ باب ما يفسد الصلوٰة وما يكره فيها۔ مطلب المواضع التي يكره فيها السلام)[1]

بوسیدہ قرآن مجید دفنانا جائز ہے

سوال:۔ جو مصاحفِ قرآنیہ بوسیدہ ہو جائیں اور تلاوت کرنے کے قابل نہ رہیں تو ان قرآنی نسخوں کا کیا کیا جائے؟ از روئے شرع اس کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جو قرآنی نسخہ اتنا بوسیدہ ہو کہ اس پر تلاوت کرنا ناممکن ہو جائے تو اس کو مسلمان میت کی طرح قابلِ احترام اور محفوظ مقام پر دفن کیا جائے تاکہ پاؤں تلے آنے سے بچ سکے، تاہم اگر کسی بوری وغیرہ میں ڈال کر اور ساتھ بھاری پتھر رکھ کر دریا برد کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ: المصحف اذا صار بحال لا يقرأ فيه يدفن كالمسلم، قال

---

[1] وفي الهندية: ولا يسلم على الذي يتغنى والذي يبول والذي يطير الحمام ولا يسلم في الحمام ولا على العاري اذا كان متزراً اولا يجب عليهم الرد ...... الخ (الفتاوى الهندية ج ۵ ص۳۲۶ كتاب الكراهية۔ الباب السابع في السلام وتشميت العاطس) و مثله في البحر الرائق ج ۸ ص۲۰۷ كتاب الكراهية۔

ابن عابدینؒ، (تحت قولہ یدفن) ای یجعل فی خرقۃ طاھرۃ ویدفن فی محل غیر ممتھن لایوطأ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۱۷۷ کتاب الطھارۃ۔ قبیل باب المیاہ فی ابحاث الغسل) [1]

جس کمرے میں قرآنِ مجید ہو اُس کی چھت پر چڑھنا

سوال:۔ تقریباً ہر مسلم گھرانے میں قرآنِ کریم کے نسخے ضرور ہوتے اور لوگ بوقتِ ضرورت مکان کی چھت پر چڑھتے بھی ہیں، تو کیا جس مکان میں قرآنِ مجید موجود ہو اُس کی چھت پر چڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام کی واضح عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مکان میں قرآنِ کریم کا نسخہ موجود ہو اُس کی چھت پر اگر پیشاب کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، جب قرآنِ مجید کی موجودگی میں مکان کی چھت پر پیشاب کرنا قبیح امر نہیں تو مکان کی چھت پر صرف چڑھنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ فھٰذا کما لو بال علیٰ سطح بیت فیہ مصحف وذٰلک لایکرہ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۵)

قیامت کے دن کی مقدار کے اختلاف میں تطبیق

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کئی دنوں سے ایک سوال ذہن میں آ رہا ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی مدت ایک آیت میں ایک ہزار سال فرمائی ہے اور ایک دوسری آیت میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے جبکہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ قیامت کا دن ایک ہی ہے تو پھر اس مختلف مدت کو بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟ از راہِ کرم میرے اس اشکال کو دور فرمائیں؟

الجواب:۔ اگرچہ ان دونوں آیات میں ظاہری تعارض ہے مگر حقیقی نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ مختلف مدت لوگوں کے جرائم کے تفاوت کی وجہ سے بیان کی ہے کہ لوگوں کو قیامت کے دن کی سختت سے سخت مدت میں بھی امتداد نظر آئے گی۔

---

[1] وفی الھندیۃ: المصحف اذا صار خلقاً لایقرأ منہ ویخاف ان یضیع یجعل فی خرقۃ طاھرۃ و یدفن ودفنہ اولیٰ من وضعہ موضعاً یخاف ان یقع علیہ النجاسۃ او نحوذٰلک۔۔۔۔الخ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۳ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد والقبلۃ والمصحف الخ)

قال الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ :- یہ دونوں آیتیں یوم قیامت کے بارے میں ہیں، اور تطبیق دونوں میں یہ ہے کہ مختلف لوگوں کو اشتداد کے تفاوت سے امتداد میں تفاوت محسوس ہوا کرتا ہے۔ (امداد الفتاوی ج ۵ ص۱۵ کتاب ما یتعلق بتفسیر القرآن) لہ

ابلیس بھی حکمِ سجدہ کا مکلّف تھا

سوال :- قرآن کریم کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ..... الخ میں حکم صرف فرشتوں کو تھا جبکہ ابلیس فرشتوں کی جنس سے نہ تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کو سجدہ نہ کرنے پر ملعون کیوں کر دیا؟

الجواب :- ظاہر آیت میں تو اگرچہ صرف فرشتوں کا ذکر ہے مگر یہ صرفاً تغلیباً ہے ورنہ حکم ابلیس کو بھی ہوا تھا جس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اور سوال وجواب قرینہ ہے، بسا اوقات قیامِ قرینہ سے کسی شخص پر آمر کا حکم لاگو ہو جاتا ہے۔

قال الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ :- یاں حکم اس کو بھی ہوا تھا اور جس امر پر قرینہ قائم ہوتا ہے اس کی تصریح کی حاجت نہیں ہوا کرتی، اور یہاں قرینہ قصہ میں موجود ہے وہ یہ کہ جب اس پر عتاب کی حکایت بیان فرمائی گئی، خود اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی مامور تھا، دوسرے سورۂ اعراف میں یہ آیت مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ اس میں امر کا ہونا مصرح ہے، پہلی دلیل عقلی دوسری دلیل نقلی۔ (امداد الفتاوی ج۵ ص۱۲ کتاب ما یتعلق بتفسیر القرآن) ۲ھ

مَعِيْشَةً ضَنْكًا کی تفسیر

سوال :- جناب مفتی صاحب! قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (سورۃ طٰهٰ آیت ۱۲۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ذکرِ خداوندی سے اعراض کرے

لہ قال ابن عباس رضی اللہ عنہ : هو يوم القيامة جعله الله على الكافرين مقدار خمسين الف سنة ثم يدخلون النار للاستقرار۔ (تفسير قرطبی ج ۱۸ ص۲۸۲ سورة المعارج)

وَمِثْلُهٗ فی بوادر النوادر ج ۲ ص۳۷۹ حصہ سوم نوادر، تیسرا نادرہ۔

۲ھ قال مولانا محمد ادریس الکاندھلوی : ابلیس اگرچہ ملائکہ میں سے نہیں کما قال اللہ تعالیٰ کان من الجن مگر خطاب سجود بتبعیت ملائکہ بالاولیٰ داخل تھا۔ (معارف القرآن ج ۱ ص۹۲ سورۃ البقرۃ)

وَمِثْلُهٗ فِی تفسیر ماجدی سورۃ البقرۃ ج ۱ ص۱۰۴

تو اس کی زندگی (معیشت) تنگ ہوگی، حالانکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کفار و فجار جو دینِ الٰہی کے دشمن ہیں اُن کی زندگی بہت آسودہ ہوتی ہے، اُن کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے، تو پھر اس آیت میں زندگی (معیشت) کی تنگی کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: اسلام دشمن اور خدا کے باغی اگرچہ ظاہری طور پر دنیا میں کافی آسودہ حال اور خوش و خرم نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں ان کے دل تنگ ہوتے ہیں اور ان کی یہ خوشی و مسرت ظاہری اور دکھاوے کی ہوتی ہے، اسی طرح آیتِ مذکورہ میں بھی باطنی تنگی مراد ہے نہ کہ ظاہری تنگی مراد ہے۔

قال الشیخ محمد ادریس کاندھلویؒ: دنیا میں تو اس طرح کہ تحقیق اس کی زندگی تنگ ہوگی، راحت اور سکون اور اطمینان سے خالی ہوگی۔ کافر کے دل پر حرص اور ترقی کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ دن رات ننانوے کے پھیر میں رہتا ہے اور دولت و عزت و وجاہت کے زوال کے خطرات ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں، بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ دولتمند جس کو دن رات میں دو تین گھنٹے سونا نصیب ہو جائے، جب راحت اور سکون ہی نصیب نہ ہوا تو دولت سے کیا فائدہ ہوا، ظاہر میں بیشمار دولت ہوتی ہے مگر قناعت کی دولت سے دل خالی ہوتا ہے اور حیرانی اور پریشانی سے لبریز ہوتا ہے ...... الخ

(معارف القرآن جلد ۴ ص ۵۹۸)[1]

اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً الخ کی تفسیر

سوال: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَایَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (سورۃ النور آیت ۳) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ کے ساتھ نیک مسلمان کا نکاح صحیح نہیں جبکہ فقہ کی کتابوں میں صراحتاً لکھا ہوا ہے کہ یصح نکاح الحبلیٰ من الزنا۔ اور اسی طرح بعض واقعات رونما بھی ہو چکے ہیں کہ کسی زانیہ سے ایک نیک، متقی و پرہیزگار شخص نے نکاح کیا ہے، کیا ایسا نکاح

---

[1] قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ:۔ ایں تنگی متعلق بقلب است ہرگز کسے را از اعداء خدا نہ دید کہ در دلش شگفتگی و فراخی باشد سراسر از پریشانی و تکدر پر می باشد۔ اھ
(امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۱۶ کتاب ما یتعلق بتفسیر القرآن)

صحیح نہیں، اگر صحیح ہے تو پھر آیتِ کریمہ کا کیا مطلب ہے ؟

الجواب:- اگرچہ اس آیتِ کریمہ کے بارے میں مفسرین عظام نے مختلف تاویلات اور اقوال بیان کیے ہیں لیکن جمع بین الروایات کے تحت یہ قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مقصود اخبار ہے نہ کہ حکم شرعی، یعنی زانیہ عورت عادتاً کسی صالح مرد سے نکاح کرنے میں رغبت نہیں رکھتی اور نہ کوئی صالح مرد کسی زانیہ سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتا ہے، اس لیے کہ پاکدامنی اور عفت سے محبت ایک طبعی امر ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زانیہ کا نکاح حکمِ شرعی کے تحت جائز اور صحیح ہے ۔

قال القاضی ثناء اللہ الپانی پتیؒ :- وعند الائمة الثلاثة نكاح الزانی والزانية صحيح ففی تفسير هٰذه الاية قال بعضهم معناه الاخبار كما هو ظاهر الصيغة والمعنى ان الزانی لاجل فسقه لا يرغب غالبًا فی نكاح الصالحات والزانية لا يرغب فيها الصلحاء فان المشاكلة علة الالفة والتضاد والمخالفة سبب للنفرة والافتراق وكان حق المقابلة ان يقال والزانية لا تنكح الا من زانٍ او مشرك لكن المراد بيان احوال الرجال فی الرغبة فيهن لما ذكرنا انها نزلت فی استيذان الرجال من المؤمنين ـ

(التفسير المظهری ج۶ ص۴۴۲ سورة النور)

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ سے مراد نماز ہے

سوال:- آجکل ذکری فرقہ کے لوگ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ، اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وغیرہ آیاتِ قرآنی سے نفسِ ذکر کے اثبات کے لیے استدلال کرتے ہیں، کیا واقعی ان کا یہ استدلال صحیح ہے؟ یا اس سے نماز ہی مراد ہے ؟

الجواب:- احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ امت اس بات کی توضیح کرتی ہیں کہ ان آیات سے مراد نمازِ معہود ہے، اس سے صرف ذکرِ الٰہی مراد لے کر نماز کی نفی کرنا تحریف فی القرآن کے مترادف ہے جس سے کفر لازم ہوجاتا ہے ۔

قال العلامة ابو البركات عبد الله بن محمد النسفی رحمه الله : (ويقيمون الصلوٰة) ای يؤدونها فعبر عن الاداء بالاقامة لان القيام بعض اركانها كما عبر عنه بالقنوت وهو القيام وبالركوع والسجود والتسبيح لوجودها

فیہا ۔۔۔۔۔۔۔الخ (تفسیر نسفی ج ۱ ص ۱۳ ویقیمون الصلوٰۃ) [1]

خارج نماز تلاوتِ قرآن سننا واجب نہیں

سوال:۔ خارج نماز جو تلاوتِ قرآن حکیم ہوتی ہے تو کیا اس کا سننا واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو رمضان المبارک میں جو قاری صاحبان اور حفاظ کرام لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت کرتے ہیں اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے تلاوتِ قرآن نہیں سن سکتے تو اس پر کون گنہگار ہوگا؟

الجواب:۔ اس بارے میں دو طرح کے اقوال موجود ہیں ایک وجوب کا ہے اور دوسرا عدم وجوب کا، متاخرین فقہاء کرام نے آسانی اور سہولت کے لیے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، لہٰذا خارج از نماز قرآن کریم کی تلاوت سننا واجب نہیں تاہم مستحب ضرور ہے۔

وحکی ابن المنذرؒ: الاجماع علی عدم وجوب الاستماع والانصات فی غیر الصلوٰۃ والخطبۃ وذلک ان یجابہما علی کل من یسمع احداً یقرأ فیہ حرج عظیم لانہ یقتضی ان یترک لہ المشتغل بالعلم علمہ والمشتغل بالحکم حکمہ والمتاعان مساومتہما وتعاقدھما وکل ذی شغل شغلہ۔ (تفسیر المنار ج ۹ ص ۵۵۲، ۵۵۳) [2]

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ الخ کا حکم منسوخ ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے محلے میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہے، نماز پنجگانہ کا پابند ہے لیکن رمضان کے مہینے میں روزے نہیں رکھتا بلکہ فدیہ دیکر

---

[1] قال ابن عباسؓ ویقیمون الصلوٰۃ ای یقیمون الصلوٰۃ بفروضہا۔ وقال الضحاکؒ عن ابن عباسؓ اقامۃ الصلوٰۃ اتمام الرکوع والسجود والتلاوۃ والخشوع والاقبال علیہا فیہا۔ وقال قتادۃؓ: اقامۃ الصلوٰۃ المحافظۃ علی مواقیتہا ووضوءھا ورکوعہا وسجودھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۲ سورۃ البقرۃ)

(اقیموا الصلوٰۃ) امرھم ان یصلوا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۴)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المنثور ج ۱ ص ۶۲ سورۃ البقرۃ۔

[2] قال الجصاصؒ فی تفسیر الآیۃ: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا....المؤمن فی سعۃ من الاستماع الیہ الا فی صلوٰۃ مفروضۃ۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۳۹)

جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ وہ توانا اور تندرست ہے اور اپنے اس عمل پر قرآن حکیم کی آیت مبارکہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (سورۃ البقرہ آیت ۔) سے استدلال کرتا ہے، تو کیا صحت اور تندرستی کے باوجود فدیہ دے کر روزہ چھوڑنا جائز ہے؟

الجواب:۔ حالتِ صحت میں فرض روزہ رکھنے کے علاوہ کوئی اور عمل چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں، جہاں تک آیت مذکورہ کا تعلق ہے تو یہ حکم ابتداءِ اسلام میں تھا لیکن بعد میں فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ سے منسوخ ہوگیا، لہٰذا موصوف کا مذکورہ آیتِ مبارکہ سے فدیہ کے جواز کا استدلال صحیح نہیں ہے۔

لما قال الحافظ ابن کثیر: (وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مسكين) فكان من شاء صام ومن شاء اطعم مسكينًا فاجزا ذلك عنه ثم ان الله عزّوجل انزل الآية الاخرى (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ) الى قوله (فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ) فاثبت صيامه على المقيم الصحيح ورخص فيه للمريض والمسافر وثبت الاطعام للكبير الذى لا يستطيع الصيام۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص۲۱۴ سورۃ البقرۃ) [1]

آیاتِ قرآنی کا صرف ترجمہ شائع کرنے کی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل اخبارات اور رسائل وجرائد میں بغیر

---

[1] حدثنا ابن حميد قال ثنا جرير عن منصور عن ابراهيم عن علقمة فى قوله (وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ) قال كان من شاء صام ومن شاء افطر واطعم نصف صاع مسكينًا فنسخها (شهر رمضان....) الى قوله (فمن شهد منكم الشهر فليصمه)

عن مغيرة عن ابراهيم بنحوه وزاد فيه قال فنسخها هذه الآية وصارت الآية الاولى للشيخ الذى لايستطيع الصوم يتصدق مكان كل يوم على مسكين نصف صاع۔

ثنا ابن ادريس قال سألت الاعمش عن قوله (وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين)

فحدثنا عن ابراهيم عن علقمة قال نسخها (فمن شهد منكم الشهر فليصمه)۔ (جامع البيان ج۲ ص۱۳۳ سورة البقرة)

وَمِثْلُهُ فى الدر المنثور ج ۱ ص۳۲۲ سورة البقرة۔

عربی متن کے قرآنی آیات کا اردو ترجمہ شائع کرتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس طرح کرنے میں قرآنِ کریم کی توہین بھی ہے؟

الجواب: ۔ علماء امت کا اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ بغیر عربی متن کے قرآنِ کریم کا ترجمہ شائع کرنا حرام و ناجائز ہے، اس قسم کے عمل سے اجتناب کیا جائے (اس موضوع پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ "جواہر الفقہ" شائع ہو چکا ہے، مزید تفصیل کے لیے وہاں مراجعت کریں)۔ البتہ ایک دو آیتوں کا صرف ترجمہ شائع کرنا اس میں داخل نہیں، ہاں اگر اس کے شائع کرنے سے قرآن مجید کی توہین مقصود ہو تو پھر تو یہ اور بھی ناجائز اور حرام ہے جس سے بچنا از حد ضروری ہے۔

قال الشيخ ابن الهمام رحمه الله: وفي الكافي إن اعتاد القرأة بالفارسية او اراد ان يكتب مصحفاً بها يمنع وإن فعل في آية او آيتين لا فان كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز۔ اھ

(فتح القدير ج۱ ص۲۴۸ باب صفة الصلوٰة) [1]

سب سورتوں کے نام توقیفی ہیں

سوال: ۔ جناب مفتی صاحب! قرآنِ کریم کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کے نام جو مشہور ہیں اس کا ثبوت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے یا کہ علماء کرام نے اپنی طرف سے یہ نام رکھے ہیں؟

الجواب: ۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحکمِ الٰہی خود ان کے نام رکھے ہیں، علماء کرام کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

قال الامام ولي الدين محمد بن عبد الله الخطيب العمري رحمه الله: ۔ عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تجعلوا بيوتكم مقابر ان الشيطن

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وتجوز كتابة آية او آيتين بالفارسية لا اكثر (قال الشامي) والظاهران الفارسية غير قيد الخ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۱ ص۴۵۳، مطلب في حكم القرأة بالفارسية او التوراة والانجيل)

ینفر من البیت الذی یقرأ فیہ سورۃ البقرۃ۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ مترجم اردو ج۱ ص۴۵۸ فضائل القرآن)[1]

قصۂ ہاروت وماروت کی تحقیق

سوال:۔ سورۂ بقرہ میں ہاروت وماروت کے ناموں سے جو قصہ مشہور ہے، بعض علماء اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں جبکہ بعض تفاسیر میں اس قصہ کا باسند تذکرہ ملتا ہے، اس قصہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟

الجواب:۔ ہاروت وماروت ایک اسرائیلی واقعہ ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس کو صحیح اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے مگر منتہیٰ کے اعتبار سے یہ اسرائیلی واقعہ ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ اسرائیلیات کی نہ تصدیق کریں اور نہ تکذیب، بلکہ اس بارے میں توقف سے کام لیں۔

قال الشیخ مفتی محمد شفیعؒ: **الجواب:** قصہ ہاروت وماروت کا تفسیر معالم التنزیل وغیرہ میں بہت مفصل لکھا ہے، مگر یہ سب اسرائیلی روایات سے لکھا گیا ہے، نیچے کی سندیں اگرچہ قوی بھی ہیں مگر منتہائے سند سب کا اسرائیلی روایات پر ہوتا ہے جن کا حکم یہ ہے کہ نہ ان کی تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اس قصہ کا ثبوت کسی روایت میں ہے نہیں اور اسرائیلی روایات میں سے ان کا اعتبار نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(امداد المفتین ج۲ ص۲۲۳ کتاب التفسیر)[2]

---

[1] قال الشیخ المفتی محمد شفیعؒ: **سوال:** زید کہتا ہے کہ سورۃ بقرہ نام خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں رکھا علماء نے خود یہ نام رکھ لیا ہے، یہ قول صحیح ہے یا نہ؟

الجواب: زید کا قول غلط ہے، متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نام سورتوں کے مروی ہیں، حدیث مسلم میں ہے: اقرؤا الزهراوین البقرۃ وسورۃ اٰل عمران۔ الحدیث (رواہ مسلم) مشکوٰۃ۔

ان الشیطٰن ینفر من البیت الذی یقرؤ فیہ سورۃ البقرۃ۔ الحدیث (رواہ مسلم مشکوٰۃ شریف) واللہ اعلم

(عزیز الفتاویٰ ج۱ ص۱۳۴ کتاب السنۃ والبدعۃ)

[2] قال العلامۃ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ: وهذه القصة من اخبار الآحاد بل من الروایات الضعیفة الشاذة ولا دلالة علیها فی القرآن لشیٔ..... وبعد اسطر: قال العاصی ان هذه الاخبار لم یرو منها شیٔ صحیح ولا سقیم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال وهذه الاخبار من کعب الیهود وافترائهم۔ الخ

(التفسیر المظهری ج۱ ص۱۰۹ سورۃ البقرۃ)

ومثلہٗ فی معارف القرآن للشیخ محمد ادریس کاندھلویؒ ج۱ ص۱۹۱۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذبیحہ کا گوشت کس نے کھایا تھا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے جس مینڈھے کو ذبح کیا تھا اُس کا گوشت کس نے کھایا تھا؟ لوگوں سے اس بارے میں بہت کچھ سننے کو ملتا ہے۔

الجواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذبیحہ کے گوشت کے بارے میں صاحب تفسیر صاوی نے لکھا ہے کہ یہ گوشت درندو پرند نے کھایا تھا اس لیے کہ اس کا پکانا مشکل بلکہ ناممکن تھا کیونکہ جنتی گوشت پر آگ اثر انداز نہیں ہوتی۔

قال العلامة الصاوی رحمه الله: وبقی قرناه معلقین علی الکعبة الی ان احترق البیت فی زمن ابن الزبیر ومابقی من الکبش اکلته السباع والطیور لان النار لاتؤثر فیها هو من الجنة۔ (حاشیة العلامة الصاوی علی الجلالین ج ۴ ص ۳۴۳ سورة الصافات) [1]

آیت کریمہ قَالُوْا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کی تحقیق وتشریح

سوال:- پاکستان میں اس وقت قرآن وسنت پر مبنی نظام نافذ نہیں ہے، معاشی نظام سودی اور رزق حرام ہے، ملک پر کفریہ انگریزی قانون نافذ ہے۔ قرآن مجید کے پ ۵ رکوع ۱۱ کی پہلی آیت کی تشریح میں علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "بعض مسلمان ایسے بھی ہیں کہ دل سے تو سچے مسلمان ہیں مگر کافروں کی حکومت میں ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے نہ حکم جہاد کی تکمیل کر سکتے ہیں، سو اُن پر فرض ہے کہ وہاں سے

---

[1] قال العلامة سلیمان بن عمر العجیلی الشافعی الشهیر بالجمل رحمه الله: وقد بقی قرناه معلقین علی الکعبة الی ان احترق البیت فی زمن .... ومن المعلوم المقرر ان کل ماهو من الجنة لاتؤثر فیه النار فلم یطبخ لحم الکبش بل اکلته السباع والطیور تامل۔ (التفسیر الجمل ج ۳ ص ۵۴۹ سورة الصافات)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الزهور فی وقائع الدهور ص ۸۰ قصة ذبح اسمٰعیل علیه السلام۔

ہجرت کریں الخ"۔ اور یہی مضمون شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تفسیر موضح القرآن میں بھی ہے، آپ فرماتے ہیں: "فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ جس ملک میں مسلمان کھلا نہ رہ سکیں وہاں سے ہجرت فرض ہے"۔ تو آیا پاکستان کے مسلمانوں پر اس آیت کی رُو سے اس کفری نظام کی وجہ سے ہجرت فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:- ہجرت دارالحرب اور دارالکفر سے کی جاتی ہے جبکہ پاکستان دارالمسلمین ہے جس میں مسلمانوں کو جملہ دینی امور اور تبلیغ وجہاد کو عملی طور پر ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں لیکن ایمانی کمزوری کی وجہ سے پاکستانی قوم اپنے فرائض کی ادائیگی میں روایتی غفلت کا شکار ہے اور آیت کریمہ کی تفسیر وتشریح وہی ہے جو ان اکابرین نے کی ہے۔ اور اسی مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کرسکتے نہ حکمِ جہاد کی تکمیل کرسکتے ہیں تو ہجرت ان لوگوں پر فرض ہے"۔ لہٰذا فرائض کی انجام دہی کی صورت میں مذکورہ آیتِ کریمہ کی رو سے پاکستان سے ہجرت فرض نہیں ہے بلکہ یہی لازمی ہے کہ اس نظام کو دور کرکے اس کی بجائے شرعی نظام کا نفاذ کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی ص۱۲۳ پ۵ سورۃ النساء ع ۱۱) [1]

قبل المسخ شیطان کا فرشتوں سے افضل ہونا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارگاہِ الٰہی سے نکالے جانے سے پہلے شیطان کا علم فرشتوں سے زیادہ تھا یا نہیں، نیز اُس وقت شیطان افضل تھا یا فرشتے؟

الجواب: شیطان کے بارے میں تفسیر ابن کثیر میں مختلف عبارات مذکورہ ہیں جس سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ شیطان قبل المسخ من اشراف الملائکۃ، خازن الجنۃ، سلطان

---

[1] قال العلامۃ قاضی ثناء اللہ الفانی فتیؒ: الم تکن ارض اللہ واسعۃً فتہاجروا فیہا۔ یعنی کنتم قادرین علی الخروج من مکۃ الی ارض لاتمنعون فیہا من اظہار الاسلام ومخالفۃ الکفار واعلاء کلمۃ اللہ کما فعل المہاجرون الی المدینۃ والحبشۃ ونصب فتہاجروا علی جواب الاستفہام۔ (التفسیر المظہری ج۲ ص۲۰۸ پ۵ سورۃ النساء)
وَمِثْلُہٗ فی تفسیر روح المعانی ج۲ ص۱۲۶ پ۵ سورۃ النساء۔

سماء الدنیا والارض اور علم واجتہاد میں فرشتوں سے بڑھ کر تھا۔

قال العلامة عماد الدین ابن کثیرؒ: کان من اشدهم ای اشد الملٰئکة اجتهادًا واکثرهم علمًا۔ کان من اشراف الملٰئکة من ذوالاجنحة الاربعة کان من اشرف الملٰئکة واکرمهم قبیلة وکان خازنًا علی الجنان، کان لهٗ سلطان السماء الدنیا وکان لهٗ سلطان الارض وکان یسوس ما بین السماء والارض فعصٰی فمسخه الله شیطانًا رجیما، کان ابلیس رئیس ملائکة سماء الدنیا۔

(تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۷۵ سجود الملٰئکة لآدم) [1]

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (الآیة) اور ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء

سوال: جناب مفتی صاحب!

ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روح ڈالے جانے سے پہلے بھی زندہ تھے مگر ان کی شکل وصورت حیوان کی تھی اور اس حیوانی شکل میں بھی وہ جمادات ونباتات کے مراحل سے گذر کر پہنچے تھے۔ اور اپنے اس عقیدہ پر استدلال کے لیے وہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتا ہے کہ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ (سورۃ نوح پ۲۹) اس آیت کے مطابق تو حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کا ان مراحل سے گذر کر حیوان کی شکل تک پہنچنے سے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کی تائید ثابت ہوتی ہے، شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس آیت سے اس عقیدہ کے لیے استدلال کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ سے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کو ثابت کرنا سراسر تحریف اور غلط ہے جبکہ تحریف فی القرآن شرعًا کفر ہے۔ علاوہ ازیں دیگر آیات حضرت آدمؑ

---

[1] قال العلامة بدرالدین محمد بن عبد الله الشبلی الحنفیؒ: قلت وقد ذکر الطبری فی تاریخه قول ابن عباسؓ قال قال ابن عباسؓ کان ابلیس من اشرف الملٰئکة واکرمهم قبیلة وکان خازنا علی الجنان وکان لهٗ سلطان السماء الدنیا وکان لهٗ سلطان الارض۔ (آکام المرجان فی احکام الجان ص۱۵۵ الباب فی بیان هل کان ابلیس من الملٰئکة)

وَمِثْلُهٗ فی حیاة الحیوان الکبرٰی للدمیریؒ ج۱ ص۲۹۸ سورة الجن)

کی تخلیق میں واضح ثبوت ہیں جس میں نظریۂ ارتقاء کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ اس آیتِ کریمہ میں غور و فکر کرنے سے اس نظریہ کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

قال العلامۃ جلال الدین سیوطیؒ: وَاللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ ای خلقکم مِنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا اذ خلق اٰباکم اٰدم منہا۔ (تفسیر جلالین، سورۃ نوح پ ۲۹ آیت ۱۷)

قال العلامۃ شبیر احمد العثمانیؒ: "یعنی زمین سے خوب اچھی طرح جماؤ کے ساتھ پیدا کیا۔ اول ہمارے باپ آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے، پھر نطفہ جس سے بنی آدم پیدا ہوتے ہیں، غذا کا خلاصہ ہے جو مٹی سے نکلتی ہے۔ (تفسیر عثمانی ص ۷۵۷ پ ۲۹ سورۃ نوح آیت ۱۷) ؎۱

مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ۔ کی تفسیر اور مصداق

سوال:۔ قرآن مجید کی بعض پشتو تفاسیر میں سورۃ والناس کی آیت مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۔ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "چہ پیریان او سری دی، پہ انسان کښې بد عتیان، مشرکان، پیران او مُلیان دی۔" کیا اس آیتِ کریمہ کی یہ تفسیر و ترجمہ اور مصداق صحیح ہے؟ کیا الناس کا ترجمہ سړی صحیح ہے؟

الجواب:۔ آیتِ کریمہ من الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۔ کا ترجمہ بزبانِ پشتو یہ ہے: "چہ دَ جنّاتو او دَ انسانانو نہ" تاکہ مرد و زن دونوں اس میں داخل ہوں، اور مرد و زن دونوں انسان اور حضرتِ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لیے ان دونوں کو آدمی منسوب ہوتے آدمؑ کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے، اس لیے آدمی میں مرد اور عورتیں دونوں داخل ہیں، اور "سړی" کے ساتھ ترجمہ میں عورتیں تغلیباً داخل ہوں گی، اس لیے "سړی" کے ساتھ ترجمہ کرنا بھی درست ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس آیت مبارکہ کا ترجمہ یوں کیا ہے: "جنّوں میں اور آدمیوں میں۔"

؎۱ قال العلامۃ قاضی ثناء اللہ الفانی فتی رحمہ اللہ: وَاللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ ..... ای انشأکم فاستعیر الانبات للانشاء لانہ ادل علی الحدوث، مِنَ الۡاَرۡضِ بان خلق اباکم اٰدم منہا او بانہ خلقکم من النطف والنطف من الغذاء المنبت من الارض نَبَاتًا ...... تقدیرہ واللہ انبتکم فنبتّم نباتًا فاقتصر اکتفاء بالدلالۃ الالتزامیۃ۔
(التفسیر المظہری ج ۱۰ ص ۷۶ سورۃ نوح)
وَمِثۡلُہٗ فی تفسیر البحر المحیط ج ۸ ص ۳۴۰ سورۃ نوح۔

اور انسانوں میں اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو وسوسے ڈالتے ہیں لوگوں کے دلوں میں، خواہ وہ ہر طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔

فوائد عثمانیہ میں لکھا ہے: "شیطان جنوں میں بھی ہے اور آدمیوں میں بھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا۔ (سورۃ انعام ع ۱۴:۱۱)"۔ (تفسیر عثمانی ص۸۰۔ سورۃ الناس) ؎۱

آیت کریمہ إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الخ کی تحقیق

سوال: قرآن مجید کے پشتو کے ایک ترجمہ میں آیتِ کریمہ إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "چه دا کاغذ د سلیمانؑ نه دے" "مطلب دا دے" چه امداد غواړئ صرف په نوم د اللّٰه چه بے حده مهربان او رحم د هغه خوئی دے"۔ تو کیا حضرت سلیمانؑ خود اس آیت سے ابتداء کر رہے ہیں یا ملکہ سباء کو حکم دے رہے ہیں کہ تم استعانت علیٰ اسم اللہ یعنی بسم اللہ پڑھو؟

الجواب: اس آیت میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم ملکہ سباء کو نہیں ہے بلکہ یہ حضرت سلیمانؑ کی طرف سے استعانت باسم اللہ تعالیٰ علی الغیر ہے جیسا کہ عام طور پر بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ہر نیک کام کے شروع میں پڑھی جاتی ہے جو کہ باعث خیر و برکت ہے۔

قال العلامة القرطبیؒ: لانهٗ بدأ فيه بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، وقد قال صلی اللہ علیہ وسلم كل كلام لا يبدأ فيه بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فَهُوَ اجذم۔ (تفسیر قرطبی ج۱۳ ص۱۹۱ سورۃ النمل) ؎۲

؎۱ قال العلامة مراد علی: "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" له پیریانو او سړو نه یعنی له شیطانانو د جن او انس نه۔ (تفسیر یسیر فوق الیسر ج۲ ص۱۰۵ سورۃ الناس)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر عثمانی کابلی پشتو ج۲ ص۱۷۸۲ سورۃ الناس۔

؎۲ قال العلامة الآلوسیؒ: وكتابة البسملة فی اوائل الكتب مما جرت به سُنّة نبينا صلی اللہ علیہ وسلم بعد نزول هٰذه الآية بلا خلاف..... عن الشعبیؒ قال كان اهل الجاهلية يكتبون باسمك اللهم فكتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ما كتب باسمك اللّٰهم حتی نزلت بسم اللّٰه مجرٖها ومرسٰها فكتب بسم اللّٰه ثم نزلت (ادعوا اللّٰه او ادعوا الرحمٰن) فكتب بسم اللّٰه الرحمٰن ثم نزلت آية النمل الخ۔ (تفسیر روح المعانی ج۷ ص۱۹۵ سورۃ النمل)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المنثور ج۶ ص۳۵۴ سورۃ النمل۔

لَعَمْرُكَ (سورۃ الحجر) جملہ قسمیہ ہے

سوال: قرآن مجید کے بعض پشتو تراجم میں سورۃ الحجر کی آیت ۷۲ میں لَعَمْرُكَ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "اللہ دے ژوندے ساتی تا (اے نبیؐ)" تو کیا یہ جملہ قسمیہ ہے یا دعائیہ؟

الجواب: لَعَمْرُكَ جملہ قسمیہ ہے، یہ مبتداء ہے جس کی خبر محذوف وجوباً ہے اور انّہم اور اس کی خبر جواب القسم ہے، تقدیر عبارت اسی طرح ہے لعمرك قسمی۔

قال المحشی لجلالین: قوله لعمرك آه لعمرك مبتدا محذوف الخبر وجوباً وانّهم ومافی حیزه جواب القسم تقدیره لعمرك قسمی اومعنی انّہم والعمر والعمرك بالفتح والضم هو البقاء الا انّهم التزموا الفتح فی القسم۔

(هامش الجلالین ص۲۱۴ سورۃ الحجرع ۵) [۱]

تفسیر جواہر القرآن کا پڑھنا پڑھانا

سوال: تفسیر جواہر القرآن (مؤلف شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ) کا مطالعہ کرنا یا مطالعہ کرکے پڑھانا کیسا ہے؟

الجواب: تفسیر جواہر القرآن کا پڑھنا پڑھانا تفسیر کشاف کے پڑھنے اور پڑھانے جیسا ہے۔ یہ تفسیر العالم العارف حضرت العلامہ مولانا حسین علی الفنجابی رحمہ اللہ کے تفسیری نکات و فوائد اور افادات کا مجموعہ ہے۔ حضرت الشیخ قدس سرہ العزیز کے فہم فی القرآن، تفسیری فوائد و نکات اور مسئلہ توحید میں استغراق کو علماء دین نے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی قدس سرہ العزیز اس تفسیر

---

[۱] قال العلامۃ القاضی ثناء اللہ الفانی فتی رح: لعمرك یا محمد وحیاتك قسمی وهو لغۃ فی العمر یختص به القسم لایثار الاخف فیه لانه کثیر الدور علی الالسنۃ۔ قال البغویؒ: روی عن ابی الجوزاء عن ابن عباس قال ماخلق اللہ نفساً اکرم علیه من محمد صلی اللہ علیه وسلم وما اقسم بحیٰوۃ احد الا بحیاته۔ (التفسیر المظہری ج۵ ص۳۱ سورۃ الحجر)
وَمِثْلُهٗ فی تفسیر القرطبی ج۵ ص۳۹ سورۃ الحجر۔

کی تقریظ میں رقمطراز ہیں : إنی نظرتُ فی هٰذا التفسیر وکررت النظر والمطالعة فوجدته بحمد الله ومنّه نافعًا مفیدًا للنّاس مبارکًا۔

(تقریظ مولانا نصیر الدین غورغشتوی علیٰ تفسیر جواہر القرآن ج ۱ ص۵) ۱؎

سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اور شیطان کی بادشاہت کا قصہ

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء تفسیر اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ درس قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی انگوٹھی اپنی بیوی کے ساتھ غسل کے وقت اتار کر رکھ لی تھی پھر شیطان نے حضرت سلیمانؑ کی شکل میں آکر انگوٹھی لی اور بادشاہ بن گیا، پھر سلیمانؑ ایک مچھیرے کے ہاں ملازم ہوگئے، پھر چالیس دن بعد شیطان نے تخت چھوڑ کر خاتم سلیمانی دریا میں پھینک دی اور سلیمانؑ اسے مچھلی کے پیٹ سے نکال کر پھر بادشاہ بن گئے اور شیطان کو دریا بُرد کر دیا، تو کیا یہ واقعہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اس واقعہ کی بنیاد ایک اسرائیلی روایت پر قائم ہے جو کہ جھوٹ اور سراسر غلط ہے، شیطان کسی بھی نبی علیہ السلام کی شکل میں ظاہر نہیں ہوسکتا اور نہ اپنی شکل کسی نبی علیہ السلام کی شکل جیسی بنا سکتا ہے۔

قال الامام محمد بن سیرین التابعیؒ : انّ الشّیطٰن یتمثّل فی الرّؤیا بکلّ شیءٍ الّا بالله تعالیٰ وملٰئکته ورسله ۔ (منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام علیٰ ہامش تعطیر الانام ج۲ ص۲۶۵) ۲؎

۱؎ قال العلامة محمد یوسف البنوریؒ : وفی اثناء ذٰلك تتابعت تراجم القرآن وفوائده التفسیریة بعضها صحیحة من اهل الحق کتقریرات ترجمة القرآن افادها العالم العارف مولانا الشیخ حسین علی الفنجابیؒ طال بقائه من تلامذة قطب العصر مولانا المحدث ابی مسعود رشید احمد کنگوهی الدیوبندیؒ ۔ (البیان لمشکلات القرآن ص۳۹)

وَمِثْلُهٗ فی مقدمة لامع الدراری لمحمد زکریا السهارنفوری ج ۱ ص۱۵۰

۲؎ قال العلامة شبیر احمد العثمانیؒ : اکثر مفسرین نے آیت کی تفسیر دوسری طرح کی ہے اور اس موقع پر بہت بے سروپا قصے سلیمان علیہ السلام کی انگشتری اور جنّوں کے نقل کئے ہیں۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں : وقد رویت هٰذه القصّة مطولة عن جماعة من السلف رضی الله عنهم وکلها متلقاة من قصص اهل الکتٰب ۔ (تفسیر عثمانی ص۶۰۱ سورۃ ص)

وَمِثْلُهٗ فی التفسیر المظهری ج ۸ ص۱۸۱ پ۲۳ سورۃ ص ۔

پشتو زبان میں قرآن کریم کی معتبر تفاسیر | سوال: پشتو زبان میں قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر لکھی گئی ہیں جن میں مختلف باتیں لکھی گئی ہیں مثلاً پیروں اور مقبروں پر جانا جائز نہیں، مُردے نہیں سنتے، دعا بعد السنت جائز نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، لہٰذا مطالعہ کے لیے پشتو زبان میں کون سی ایسی تفسیر ہے جس کا پڑھنا پڑھانا مفید ہو؟

الجواب: تفسیر معارف القرآن (از مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ) اور تفسیر عثمانی (از علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) کا پشتو زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے، یہ دونوں معتبر تفاسیر ہیں، ان کا پڑھنا پڑھانا مفید ہے۔[۱]

حضرت یوسفؑ کی برأت میں شیر خوار بچے کا گواہی دینا | سوال: حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف زلیخا نے جو بے بنیاد الزام تراشی کی تھی تو آپؑ کی برأت میں جس نے گواہی دی تھی اور جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے کہ وَشَاهِدٌ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا۔ (سورۃ یوسف آیت ۲۶) تو یہ شاہد کون تھا؟ کوئی بالغ آدمی تھا یا چھوٹا بچہ؟

الجواب: وہ گواہ نابالغ اور شیر خوار بچہ تھا۔ تفسیر بیان القرآن میں ہے: "اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے جو کہ شیر خوار بچہ تھا اور یوسفؑ کے معجزہ سے بول پڑا تھا، آپؑ کی برأت اور نزاہت پر شہادت دی"۔ (تفسیر بیان القرآن ج ۵ ص ۱۷ سورۃ یوسف)[۲]

---

[۱] اس کے علاوہ مندرجہ ذیل تفاسیر بھی معتبر اور مطالعہ کے لیے مفید ہیں:-

(۱) تفسیر حبیبی لمولانا الحاج حبیب الرحمٰن خلف الرشید شیخ المفسرین مولانا محمود حسنؒ۔

(۲) موضح القرآن، بیضاوی، فتح الرحمٰن، روح البیان، ابن کثیر، فتح البیان۔

(۳) تفسیر حسینی (پشتو) ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، پشتو ترجمہ مُلّا عبداللہ۔

[۲] وَشَاهِدٌ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ای ابن عمها وروی انه کان فی المهد وعلی هامش الجلالین قوله روی انه ای الشاهد کان فی المهد صبیا۔ وفی الحدیث لم یتکلم فی المهد الا اربعة وذکر منها شاهد یوسف۔ رواه احمد عن ابن عباس۔ (حاشیہ جلالین ج ۱ ص ۱۹۲ سورۃ یوسف پ ۱۲)

وَمِثْلُهُ فی تفسیر عثمانی ج ۱ ص ۳۱۶ فائدہ ۲،۴،۵ سورۃ یوسف پ ۱۲۔

سورۃ الحج کا سجدۂ ثانیہ عند الحنفیہ

سوال :- سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں ، پہلا سجدہ عند الحنفیہ کیا جاتا ہے اور دوسرا سجدہ نہیں کیا جاتا ، تو یہ دوسرا سجدہ کیوں نہیں کیا جاتا ، اور نماز کے باہر اور اندر اس سجدہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- امداد الفتاوی ج ۱ ص ۱۷۳ میں لکھا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک سجدۂ اولیٰ واجب ہے اور دوسرا سجدہ ثابت نہیں لیکن حنفیہ نے یہ کلیہ لکھا ہے کہ مسائل اختلافیہ میں اختلاف کی مراعات افضل ہے بشرطیکہ اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب لازم نہ آئے ، سو اس قاعدہ کی بناء پر نماز کے خارج کو تو دوسرے سجدہ کا کرلینا بہتر ہوگا ، البتہ نماز کے اندر چونکہ سجدۂ زائدہ بغیر سبب خلاف موضوع صلوٰۃ ہے اس لیے نماز کے اندر نہ کیا جاوے البتہ ایک خاص طریق سے کرلیا جاوے تو اس مکروہ کے ارتکاب سے بھی محفوظ رہے گا اور وہ طریق یہ ہے کہ سجدۂ ثانیہ کی آیت پڑھ کر فوراً رکوع میں چلا جائے تو سجدہ صلوٰۃ میں یہ سجدہ بھی ادا ہوجائے گا ۔" بہرحال دوسرا سجدہ عند الحنفیہ ثابت نہیں بلکہ وہ سجدۂ صلوٰۃ ہے ۔ (امداد الفتاوی)

قال العلامۃ الکاسانیؒ : ولنا ماروی عن ابی رضی اللہ عنہ انہ عد السجدات التی سمعہا من رسول اللہ ﷺ وعد فی الحج سجدۃ واحدۃ وقال عبد اللہ بن عباسؓ وعبد اللہ ابن عمرؓ سجدۃ التلاوۃ فی الحج ھی الاولیٰ والثانیۃ سجدۃ الصلاۃ وھو تاویل الحدیث وھذا لان السجدۃ متیٰ قرنت بالرکوع کانت عبارۃ عن سجدۃ الصلاۃ کما فی قولہ تعالیٰ : فَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۹۳ فصل واما بیان مواضع السجدۃ) [1]

وقیل من راق (الآیۃ) کا پشتو ترجمہ

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ سورۃ القیامۃ کی آیت نمبر ۲۷ وقیل من راق کا پشتو زبان میں کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ صحیح ہے یا نہیں ؟ " او اوبہ وئیلے شی چہ څوک غواړی

---

[1] قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ : منہا اولی الحج اما ثانیۃ فصلاتیۃ لاقترانہا بالرکوع ۔ وقال ابن عابدینؒ : لان السجدۃ متی قرنت بالرکوع کانت عبارۃ عن السجدۃ الصلاتیۃ کما فی قولہ تعالیٰ : وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ ۔ بدائع ۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۱ ص ۵۶۵ باب سجود التلاوۃ)

وَمِثْلُہٗ فی حاشیۃ الطحطاوی ج ۱ ص ۳۹۲ باب سجود التلاوۃ ۔

هغه به او وائی چه دمونږ غواړم د مریض خپلوان به تپوس اوکړی چه څوک غواړی نو هغه به او وائی چه دمونږ غواړم"۔

الجواب: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "اور لوگ کہیں کون ہے جھاڑنے والا"۔ علامہ عثمانیؒ فائدہ میں لکھتے ہیں: "ایسی مایوسی کے وقت طبیبوں اور ڈاکٹروں کی کچھ نہیں چلتی، جب لوگ ظاہری علاج و تدبیر سے عاجز آجاتے ہیں تو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کی سوجھتی ہے، کہتے ہیں کہ میاں کوئی ایسا شخص ہے جو جھاڑ پھونک کر کے اس کو مرنے سے بچالے۔ اور بعض سلف نے کہا کہ "من راق" فرشتوں کا کلام ہے۔ جو ملک الموت کے ساتھ روح قبض کرنے کے وقت آتے ہیں، وہ آپس پوچھتے ہیں کہ کون اس مردے کی روح کو لے جائے گا، رحمت کے فرشتے یا عذاب کے؟ اس تقدیر پر "راق" "رقی" سے مشتق ہوگا جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں"۔ رقیۃ سے نہ ہوگا جو فسوں کے معنی میں ہے۔ (تفسیر عثمانی ص۷۶۸ سورۃ القیٰمۃ پ ۲۹) لہ

حضرت سلیمانؑ کا اپنے گھوڑوں کو قتل کرنے کے واقعہ کی تحقیق

سوال: بعض مفسرین حضرات سلیمانؑ کا یہ واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ آپؑ اپنے گھوڑوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے کہ آپ سے عصر کی نماز قضاء ہوگئی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو قتل کرنا شروع کردیا جس پر اللہ تعالیٰ نے سورج کو روک دیا اور آپ نے نماز پڑھ لی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان گھوڑوں کا اس میں کیا قصور تھا، اور کیا واقعی سورج روک لیا گیا تھا؟

الجواب: گھوڑوں کے قتل کے بارے میں مفسرین کی دو رائے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جہاد کے لیے پرورش کئے گئے تیز و سبک رفتار

لہ قال العلامۃ ثناء اللہ الپانی پتی رحمہ اللہ: وقیل من یرقی ای قال حاضر والمحتضر من یرقیہ مما بہ من الترقیۃ کذا قال قتادۃ او قالت الملٰئکۃ الموت ایکم یرقی بروحہ ملٰئکۃ الرحمۃ او ملٰئکۃ العذاب من الرقی کذا قال سلیمان التیمی ومقاتل بن سلیمان۔ (التفسیر المظہری ج ۱۰ ص۱۴۵ سورۃ القیامۃ)

ومثلہ فی معالم التنزیل (تفسیر البغوی) ج۴ ص۴۲۴ سورۃ القیامۃ)

گھوڑے پیش کئے گئے، تو ان گھوڑوں کا معائنہ کرتے ہوئے عصر کی نماز میں تاخیر ہوگئی تو آپؑ نے کہا کہ کوئی مضائقہ نہیں، دونوں کا کرنا عبادت ہے، کیونکہ جہاد بھی تو ذکر اللہ میں داخل ہے۔ تو جہاد کے اسی جوش و جذبے سے سرشار ہوکر ان گھوڑوں کے واپس لانے کا کہا اور غایت محبت و اکرام سے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں پونچھنے اور صاف کرنے لگے۔ اور مفسرین کی دوسری رائے یہ ہے کہ مال کی محبت کی وجہ سے انہوں نے نماز میں غفلت محسوس کی تو شدتِ غیرت اور غلبۂ حُبِ الٰہی میں تلوار لے کر ان کو قتل کر دیا تاکہ یہ نماز میں تاخیر کا کفارہ ہو جائے۔ شاید اُن کی شریعت میں گھوڑوں کی قربانی جائز تھی اور اسی بنا پر آپ نے ان گھوڑوں کو قتل کر دیا۔ اور مشہور یہی ہے کہ سورج واپس ہٹا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز پڑھ لی تھی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ فرماتے ہیں: "اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے سامنے اصیل اور تیز و سبک رفتار گھوڑے جہاد کیلئے پرورش کئے گئے پیش کئے گئے تو ان کے معائنے میں عصر کی نماز میں دیر لگ گئی۔۔۔۔ لیکن پھر بھی سلیمانؑ یہ کہنے لگے اگر ایک طرف یادِ خدا سے بظاہر علیحدگی رہی تو دوسری جانب جہاد کے گھوڑوں کی محبت اور دیکھ بھال بھی تو اللہ ہی کی یاد سے وابستہ ہے، جب جہاد کا مقصد اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے تو اس کے معدات و مبادی کا تفقد کیسے ذکر اللہ کے تحت میں داخل نہ ہوگا، تو اسی جہاد کے جوش و افراط میں حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو پھر واپس لاؤ، چنانچہ واپس لائے گئے اور غایت محبت و اکرام سے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں پونچھنے اور صاف کرنے لگے۔ بعض مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ مال کی محبت نے مجھ کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیا، تو شدتِ غیرت اور غلبۂ حب الٰہی میں تلوار لیکر ان کی گردنیں اور پنڈلیاں کاٹنا شروع کر دیں تاکہ فی الجملہ کفارہ اس غفلت کا ہو جائے، شاید ان کی شریعت میں قربانی گھوڑے کی جائز ہوگی۔" (تفسیر عثمانی ص۶۰۶ پ۲۳ سورۃ صٓ) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ ثناء اللہ الپانی پتیؒ: "رُدّوها علیّ" بتقدیر القول عطف علیٰ قال انی احببت وقال ردّوها ای الصافنات علی فردّوها علیہ۔۔۔۔ مسحاً ای یمسح السیف مسحاً۔۔۔۔ عن ابی بن کعبؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قطع سوقها واعناقها بالسیف وکان ذلک باذن اللہ تعالیٰ توبۃً عما غفل من ذکرہ وتقرباً الیہ وطلباً لمرضاتہ۔۔۔۔ قال بعض المفسرین انہ ذبحها وتصدق بلحومها وکان لحوم الخیل حلالاً کما هو فی شریعتنا عند الجمهور خلافاً لابی حنیفۃ فانہ قال یکرہ۔۔۔۔ قال البغوی حکی عن علیّ کرم اللہ وجهہ فی قولہ ردّوها علیّ۔۔۔۔ ردّوها ای الشمس علی فردوها علیہ حتی صلی العصر فی وقتها۔۔۔۔ وقال الزهری وابن کیسان یمسح سوقها واعناقها بیدہٖ یکشف الغبار عنها حباً لها وشفقۃ علیها الخ (تفسیر مظہری ج۸ ص۱۷۶ سورۃ صٓ)

ومثلہٗ فی معالم التنزیل (تفسیر بغوی) ج۴ ص۳۸ سورۃ صٓ۔

سوال: کیا فرماتے ہیں | وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الآیۃ) کی تفسیر

علماء تفسیر اس آیت کے بارے میں کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا، اس میں مساجد سے کیا مراد ہے؟ عام مساجد یا عبادت مراد ہے؟

الجواب:۔ اس آیت میں مساجد سے مراد حال اور محل دونوں ہے، اس لیے بعض مفسرین نے محل یعنی مساجد اور بعض نے حال یعنی عبادت مراد لیا ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے دونوں ہی مراد ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "۔ اور ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہے۔۔ سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو۔" (تفسیر بیان القرآن جلد۲ صـ۴۹ پ۲۹ سورۃ الجن)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے"۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی یاد کے واسطے ہیں سو مت پکارو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو"۔ اور فوائد عثمانیہ میں یہ لکھا ہے"۔ یوں تو خدا کی ساری زمین اس امت کے لیے مسجد بنا دی گئی ہے لیکن خصوصیت سے وہ مکانات جو مسجدوں کے نام سے خاص عبادتِ الٰہی کے لیے بنائے جاتے ہیں اُن کو اور زیادہ امتیاز حاصل ہے، وہاں جاکر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو پکارنا ظلمِ عظیم اور شرک کی بدترین صورت ہے"۔ (تفسیر عثمانی صـ۷ پ۲۹ سورۃ الجن، آیت ۱۸) [1]

عوام الناس کیلئے تفہیم القرآن کا مطالعہ کرنا صحیح نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک مشکل اور دینی نوعیت کے مسئلہ کی وضاحت کیلئے گذارش ہے کہ میرے اکثر احباب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" کا

---

[1] قال العلامۃ قاضی ثناء اللہ الفانی فتی رحمہ اللہ: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ عطف علیٰ ان لو استقاموا علی الوحی به قیل المراد بالمساجد المواضع التی بنیت للصلوٰۃ۔۔۔ فامر اللہ المؤمنین ان یخلصوا للہ الدعوات اذا دخلوا المساجد الخ۔

(التفسیر المظهری ج۱۰ ص۹۲ پ۲۹ سورۃ الجن)

ومثلہ فی تفسیر مواهب الرحمٰن للسید امیر پ۲۹ ج۲۹ صـ۱۳۱۔

مطالعہ بڑے ذوق اور شوق سے کرتے ہیں اور "قرآن فہمی" کے لیے اسے حرفِ آخر سمجھتے ہیں،
اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ "تفہیم القرآن" کا مطالعہ کرنا کیسا ہے؟ کیا واقعی اس میں وہ باتیں ہیں
جن کی ہمارے علماء کرام نے نشاندہی کی ہے؟ برائے مہربانی مدلل جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب: سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک آزاد خیال شخص تھا اور اس نے "تفہیم القرآن" بھی اپنی اسی
آزاد خیالی پر مبنی خود ساختہ اصولوں کے تحت لکھی ہے۔ اس نے خود لکھا ہے کہ "اس کام میں میرے
پیشِ نظر علماء محققین کی ضروریات نہیں ہیں .... میں نے اس کتاب میں ترجمے کا عام طریقہ چھوڑ کر
آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے .... میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے
کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور
جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔"
(دیباچہ تفہیم القرآن ج ۱ ص۵ تا ص۱۰)

لہٰذا اس خود ساختہ ترجمانی کی بنا پر مودودی صاحب نے ترجمہ اور تفسیر میں کافی ٹھوکریں
کھائی ہیں جس کی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کے مرتکب بھی
ہوئے ہیں، بطور نمونہ چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(۱) الحمد للہ رب العلمین کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو
تمام کائنات کا رب ہے۔" (تفہیم القرآن ج ۱ ص۴۳) ——— مودودی صاحب نے آیتِ کریمہ کے ترجمہ میں
الحمد کے الف لام استغراقی اور جنسی کو نظر انداز کیا ہے جبکہ دیگر تمام مترجمین نے الف لام کا لحاظ رکھتے
ہوئے الحمد کا ترجمہ "سب تعریفیں الخ" کے ساتھ کیا ہے۔ آپ کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں
بعض الفاظ بے فائدہ ہیں، حالانکہ قرآن مجید کا کوئی لفظ بھی بے فائدہ نہیں ہے۔

(۲) اسی آزاد خیالی کی بناء پر انہوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی شانِ عالی میں توہین آمیز کلمات لکھے ہیں، مثلاً:-

(الف) حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے
ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔ (تفہیم القرآن ج ۴ ص۳۲۷)

(ب) حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں الخ (تفہیم القرآن ج ۲ ص۳۱۲)

(ج) حضرت نوح علیہ السلام اپنی بشری کمزوریوں سے مغلوب اور جاہلیت کے جذبہ کا شکار ہو گئے
تھے۔ (بحوالہ مودودی مذہب ص۲۶) ——— تو مودودی صاحب کے ان اعلام کی وجہ سے عوام الناس
کے لیے تفہیم القرآن کا مطالعہ کرنا صحیح نہیں بلکہ باعثِ گمراہی ہے۔

كتاب ما يتعلق بالحديث

کتاب مایتعلّق بالاحادیث

(احادیث مبارکہ کے بیان میں)

کتابت اور تدوینِ حدیث

سوال:- کتابت اور تدوینِ حدیث کا کام کب سے شروع ہوا ہے؟

الجواب:- جزوی طور پر تو صحابۂ کرامؓ کے دور میں بھی کتابتِ حدیث کا خیال رکھا جاتا تھا لیکن باضابطہ طور پر تدوینِ حدیث کے لیے دو چیزیں رکاوٹ بنتی تھیں۔ ایک تو قرآنِ حکیم کے ساتھ التباس کے خوف کی وجہ سے انہیں منع کیا گیا تھا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ حافظہ کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا جس کی وجہ سے انہیں تدوینِ حدیث کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن جب تابعینؒ کا دور آیا اور مختلف فرقے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر نمودار ہونے لگے جو دین میں اپنی طرف سے کچھ داخل کرنا اور مرضی کے خلاف کو دین سے نکالنا کوئی گناہ نہیں سمجھتے تھے، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ احادیثِ نبوی کی باضابطہ طور پر تدوین کی جائے تاکہ صحیح اور سقیم کا امتیاز ہو۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر ایک فرمان جاری کیا جس میں اہلِ علم کو یہ پیغام تھا کہ وہ احادیثِ نبوی کو جمع کریں، پھر اس فرمان کی روشنی میں علماءِ کرام نے احادیث کو جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ چونکہ ۱۰۱ھ میں وفات پا گئے تھے اسلئے معلوم ہوا کہ کتابت و تدوینِ حدیث کا کام باقاعدگی سے پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کی ابتداء میں شروع ہوا ہے۔

لما قال ابن حجرؒ: اعلم علمنی و ایاک ان آثار النبیؐ لم تکن فی عصر اصحابه وکبار تبعهم مدونة فی الجوامع ولا مرتبة لامرین احدهما انهم کانوا فی ابتداء الامر قد نهوا عن ذٰلك کما ثبت فی صحیح مسلم خشیة ان یختلط بعض ذٰلك بالقرآن العظیم وثانیهما لسعة حفظهم وسیلان اذهانهم ولان اکثرهم کانوا لا یعرفون الکتابة ثم حدث فی اواخر عصر التابعین تدوین الآثار وتبویب الاخبار لما انتشر العلماء فی الامصار وکثر الابتداع من الخوارج والروافض ومنکری الاقدار الخ (هدی الساری مقدمہ فتح الباری ج۱ ص۴ الفصل الاول)

اسی طرح ارشاد الساری شرح صحیح البخاری میں ہے :وکان اول من امر بتدوین الحدیث وجمعہ بالکتابۃ عمر بن عبد العزیز خوف اندراسہ اخرج ابو نعیم فی تاریخ اصبہان عن عمر بن عبد العزیز انہ کتب الی اھل الآفاق انظروا الی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ۔ (ارشاد الساری للعسقلانیؒ ج ۱ ص ۷ فی الفصل الثانی فی ذکر اول من دوّن الحدیث والسنن)

اقسام حدیث

سوال :- حدیث کی کل کتنی قسمیں ہیں؟

الجواب :- رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ہیں: متواتر[۱]، مشہور[۲]، عزیز[۳]، غریب[۴]۔

متواتر :- وہ حدیث ہے جسے ہر دور میں اتنے راویوں نے نقل کیا ہو کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا از روئے عقل محال ہو۔

مشہور :- وہ حدیث ہے جس کے راوی محدود ہوں جو تواتر کی حد تک نہ پہنچے اور ہر دور میں کم از کم تین راوی ہوں۔

عزیز :- وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر دور میں ۲ دو سے کم نہ ہوں۔

غریب :- وہ حدیث ہے جس کی سند میں کسی بھی دور میں ایک راوی آیا ہو۔

لما قال العلامہ ابن حجر العسقلانیؒ: الخبر ای الحدیث اما ان یکون لہ طرق بلا حصر عدد معین او مع حصر بما فوق الاثنین او بھما او بواحد فالاول المتواتر وھو المفید للعلم الیقینی بشروطہ والثانی المشھور والثالث العزیز والرابع الغریب۔ الخ (نخبۃ الفکر ص ۱ فی البحث اقسام باعتبار عدد رواۃ) لہ

لہ وقال العلامۃ شبیر احمد العثمانیؒ: الخبر اما ان یرویہ جماعۃ یبلغون فی الکثرۃ مبلغاً تحیل العادۃ تواطئھم علی الکذب فیہ اولاً فالاول المتواتر والثانی خبر الآحاد ---- وخبر الاحاد ان کانت رواتہ فی کل طبقۃ ثلاثۃ فاکثر یسمّٰی مشھوراً، وان کانت رواتہ فی بعض الطبقات اثنین ولم تنقص فی سائرھا عن ذٰلک یسمّٰی عزیزاً، وان انفرد فی بعض الطبقات اوکلھا راو واحد یسمّٰی غریباً۔ الخ (مقدمۃ فتح الملھم ج ۱ ص ۶ فی بیان اقسام الحدیث باعتبار عدد رواۃ)

حدیث کی اقسام باعتبارِ صفات

سوال :- حدیث مقبول کی باعتبارِ صفات کل کتنی قسمیں ہیں ؟

الجواب :- حدیث مقبول کی باعتبارِ صفات چار قسمیں ہیں۔ صحیح لذاتہٖ ، صحیح لغیرہٖ ، حسن لذاتہٖ ، حسن لغیرہٖ۔

(۱) **صحیح لذاتہٖ** : اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے تمام ناقلین تام الضبط ہوں، سند متصل ہو اور اس میں کسی قسم کی علّت یا شذوذ نہ پایا جاتا ہو۔

(۲) **صحیح لغیرہٖ** :- وہ حدیث ہے جس میں مذکورہ شرائط اعلیٰ درجے کی نہ ہوں، تاہم اس نقصان کا جبیرہ کثرتِ سند یا کسی اور صفت سے کر دیا گیا ہو۔

(۳) **حسن لذاتہٖ** :- وہ حدیث ہے جس میں مذکورہ بالا شرائط کا کوئی جبیرہ نہ کیا گیا ہو۔

(۴) **حسن لغیرہٖ** :- وہ حدیث ہے جس میں قبولیت اور مردودیت برابر ہوں لیکن کسی قرینہ کی وجہ سے جانبِ قبولیت کو ترجیح دی گئی ہو۔

لما قال الحافظ ابن حجر العسقلانیؒ : وخبر الاحاد بنقل عدل تام الضبط متصل السند غیر معلل ولا شاذ هو الصحیح لذاته لانه اما ان یشتمل من صفات القبول علی اعلاها اولا الاول الصحیح لذاته۔ والثانی ان وجد ما یجبر ذلك القصور ككثرة الطرق فهو الصحیح ایضاً لکن لا لذاته وحیث لا جبیرة فهو الحسن لذاته۔ وان قامت قرینة ترجح جانب قبول ما یتوقف فیه فهو الحسن ایضاً لکن لا لذاته۔ الخ (شرح نخبة الفکر ص۲۶) [1]

---

[1] وقال العلامة شبیر احمد العثمانیؒ :- والمقبول ینقسم الی اربعة اقسام : صحیح لذاته۔ صحیح لغیره۔ حسن لذاته۔ حسن لغیره۔ وذلك لان الحدیث ان اشتمل من صفات القبول علی اعلی مراتبها فهو الصحیح لذاته۔ وان لم یشتمل علی اعلی مراتبها فان وجد فیه ما یجبر ذلك القصور الواقع فیه فهو الصحیح لا لذاته بل لغیره۔ وان لم یوجد فیه ما یجبر ذلك القصور الواقع فیه فهو الحسن لذاته وان کان فی الحدیث ما یقتضی التوقف فیه لکن وجد ما یرجح جانب قبوله فهو الحسن لا لذاته بل لغیره۔ الخ (مقدمة فتح الملهم ج ۱ ص۹ فی بحث ان خبر الاحاد ینقسم الی قسمین المقبول والمردود) ومثله فی قواعد التحدیث للقاسمیؒ ص۸۲-۱۰۲ فی الباب الرابع فی معرفة انواع الحدیث۔ فی بیان اقسام الصحیح وبیان الحدیث الحسن۔

شاذ کی تعریف

سوال:۔ شاذ کس قسم کی روایت کو کہا جاتا ہے ؟

الجواب:۔ شاذ کے بارے میں محدثین کی مختلف عبارات منقول ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاذ کی تعریف اہلِ فن کے مابین مختلف فیہ ہے ، چنانچہ علماء حجاز کی ایک جماعت کے نزدیک شاذ اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس میں ثقہ راوی دوسرے ثقات کی مخالفت کرے ۔

اور حافظ ابو یعلیٰ خلیلی کے نزدیک شاذ اس روایت کو کہا جاتا ہے جس کی صرف ایک سند ہو اور ایک ہی راوی سے نقل کیا ہو چاہے وہ ثقہ ہو یا نہ ہو، لہٰذا اس تقدیر پر شذوذ صرف تفرد سے عبارت ہے ۔

اور حاکم کے نزدیک شاذ وہ روایت ہے جسے کوئی ثقہ راوی انفرادی طور پر نقل کرے، اور اس کا کوئی متابع نہ ہو ۔

تاہم محققین کے نزدیک شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ راوی راجح روایت سے مخالف نقل کرے ۔

لما قال العلامة شبیر احمد عثمانیؒ : بعد ما فصل الاقوال المذکورة ۔ والمعتمد فی حد الشاذ بحسب الاصطلاح انہ ما یرویہ الثقة مخالفاً لمن ھو ارجح منہ ۔ الخ
(مقدمة فتح الملھم ج ۱ ص۱۱ فی بیان الشاذ والمحفوظ والمنکر والمعروف)[1]

امام ابو حنیفہؒ تابعی تھے

سوال:۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کسی صحابی سے ملاقات اور اس سے روایت ثابت ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ سیر اور تاریخ کی کتابوں میں یہ بات واضح الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو کئی بار دیکھا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لائے تو اس زمانے میں امام اعظم رحمہ اللہ کی ان سے ملاقات ہوتی ہے اور کئی

---

[1] وقال الحافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ : وعرف من ھذا التقریر ان الشاذ ما رواہ المقبول مخالفاً لمن ھو اولیٰ منہ وھذا ھو المعتمد فی تعریف الشاذ بحسب الاصطلاح ۔ الخ
(نزھة النظر شرح نخبة الفکر ص۴۲ فی بحث الشاذ والمنکر)
ومثلہ فی قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث ج ۱ ص۱۳۰ فی ذکر انواع تختص بالضعیف ۔

صحابہ سے روایت بھی کی ہے۔

لما قال الحافظ الذهبی رحمه الله: فی ذکر الامام ابی حنیفه رحمه الله ولد سنة ثمانین فی حیاة صغار الصحابة و رأی انس رضی الله عنه لما قدم علیهم الکوفة۔

(سیرة اعلام النبلاء ج ۶ ص ۳۹۱ فی ذکر سوانح ابی حنیفة)

قال العلامة ابن حجرؒ: وفی فتاوی شیخ الاسلام ابن حجر انه ادرک جماعة من الصحابةؓ کانوا بالکوفة بعد مولده بها سنة ثمانین فهو من طبقة التابعین ولم یثبت ذلک لاحد من ائمة الامصار المعاصرین۔ (الخیرات الحسان ص ۲۸ الفصل السادس) [۱]

شیعوں سے روایت کرنے کا حکم

سوال:- صحاح ستہ میں شیعوں سے روایات کیوں لی گئی ہیں جبکہ ان پر دینی امور میں کوئی اعتبار نہیں؟

الجواب:- جو شخص متواترات اور ضروریاتِ دینیہ سے انکار نہ کرے اور نہ اپنی طرف سے دین میں ایسی باتیں داخل کرے جن کو ضروریاتِ دین کے برابر اہمیت حاصل ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ صاحبِ ضبط و تقوٰی بھی ہو تو اس کی روایت کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ شیعوں میں کئی فرقے ہیں اور ان کے عقائد میں بھی فرق ہے، اس لیے اگر کوئی شخص اہلِ تشیع میں سے ہو لیکن اس کے اندر مذکورہ باتیں نہ پائی جائیں تو اس سے روایت لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ روایت اس کے مخصوص عقائد و نظریات وغیرہ کی تائید میں نہ ہو۔

چونکہ سلف صالحین کے زمانے میں شیعہ برادری کے مختلف فرقے تھے جن میں بعض اگرچہ غالی قسم کے بھی تھے لیکن بعض معتدل بھی تھے جو صحابۂ کرامؓ پر طعن و تشنیع سے گریز کرتے تھے بلکہ وہ صرف حضرت علیؓ کی فضیلت کے قائل تھے جس کی وجہ سے وہ ثقاہت سے خارج

---

[۱] و ایضاً ذکر الذهبیؒ فی تذکرة الحفاظ: رأی انساً غیر مرة لما قدم علیهم الکوفة۔

(تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۸ فی ذکر ابوحنیفة الامام اعظمؒ)

قال الشیخ محمد عاشق الٰهی البرنیؒ: ذکر الاحادیث الثلاثة ابوالمؤید الخوارزمی فی جامع المسانید ج ۱ ص ۸۳ تا ۸۵ والموفق المکی فی المناقب ص ۲۸ تا ۳۱ والسیوطی فی تبییض الصحیفة ص ۲۷ والصالحی فی عقود الجمان ص ۵۴ ، ۵۵ وهی هذه ۱ طلب العلم فریضة علی کل مسلم ۲ الدال علی الخیر کفاعله ۳ ان الله یحب اغاثة اللهفان۔ (التعلیق علی الخیرات الحسان ص ۲۷ ، ۲۸ الفصل السادس)

نہیں تھے، اسی بناء پر محدثین نے ان کی روایات کو نقل کیا ہے۔

لما قال العلامة ابن حجر العسقلانیؒ: فالمعتمد ان الذی ترد روایته من انکر امرًا متواترًا من الشرع معلومًا من الدین بالضرورة وکذا من اعتقد عکسه فاما من لم یکن بهذه الصفة وانضم الی ذٰلک ضبطه لما یرویه مع ورعه وتقواه فلا مانع من قبوله۔ (نخبة الفکر ص۵۵) [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شعر سننے کا ثبوت

سوال:۔ عن عمرو بن شرید عن ابیه قال استنشدنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم هل تروی من شعر اُمیه بن ابی الصلت شیئًا۔ فانشدته مائة قافیة فجعلت کلما مررت علی بیتٍ قال هیه۔ الخ

اس روایت کا حدیث کی معتبر کتابوں سے حوالہ مطلوب ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ بالا روایت جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شعر سننا ثابت ہے کو ذیل کی کتابوں نے روایت کیا ہے: رواه الامام مسلم بن حجاج فی صحیحه، ولفظه هٰکذا۔

عن عمرو بن الشرید عن ابیه قال ردفت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یومًا فقال هل معک من شعر امیة بن ابی الصلت شیئًا، قلت نعم قال هیه فانشدته بیتًا فقال هیه ثم انشدته بیتًا فقال هیه حتی انشدته مائة بیتٍ۔ وفی روایة استنشدنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الخ

---

[1] قال العلامة شبیر احمد العثمانی رحمه اللہ: التشیع فی عرف المتقدمین هو اعتقاد تفضیل علی رضی اللہ عنه علی عثمان رضی اللہ عنه وان علیًا کان مصیبًا فی حروبه وان مخالفه مخطئ مع تقدیم الشیخین وتفضیلهما وربما اعتقد بعضهم ان علیًا رضی اللہ عنه افضل الخلق بعد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاذا کان معتقدًا ذٰلک ورعًا دینًا صادقًا مجتهدًا فلا ترد روایته لهٰذا لاسیما ان کان غیر داعیة۔ الخ (مقدمة فتح الملهم ص۱۵۲ روایات اهل البدع والاهواء)

وقال العلامة النووی رحمه اللہ: فی المبتدعین ومنهم من قال تقبل اذا لم یکن الداعیة ولا تقبل اذا کان داعیةً وهٰذا مذهب الاکثرین من العلماء وهو الاعدل الصحیح۔ الخ۔ (نووی شرح صحیح مسلم ج۱ ص۶ فی باب وجوب الروایات عن الثقات وترک کذابین والتحذیر من الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم)

وزادان کاد یُسلم ۔ الخ (الجامع الصحیح المسلم ج۲ ص۲۳۹ کتاب الشعر)

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ کا ثبوت

سوال:۔ حدیث "تم اپنے اوپر میرے طریقے کو لازم رکھنا اور خلفاء راشدین کے طریقے کو بھی، اور اس پر خوب مضبوطی سے ڈٹے رہنا اور دین میں نئی باتیں گھڑنے سے بچے رہنا اس لیے کہ دین میں نئی باتیں ایجاد کرنا بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" اس روایت کا ماخذ بتا کر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ یہ روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے، چنانچہ العلامہ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب نقل کرتے ہیں:۔

عن العرباض بن ساریۃ فی روایۃ طویلۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ ۔ الخ

(مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۳۰ فی باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۔ الفصل الثانی) [۱]

تلاوتِ قرآنِ مجید کی فضیلت

سوال:۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں مہاجرین کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا اور ان میں بعض اپنے ننگے جسموں کو دوسروں کے ذریعے چھپائے ہوئے تھے اور ایک قاری ان میں قرآن پڑھ رہا تھا، اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھڑے ہوئے اور فرمایا تم کیا کر رہے تھے؟ اس روایت کا حدیث کی معتبر کتابوں سے حوالہ مطلوب ہے؟

الجواب:۔ اس روایت کو امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے سُنن ابی داؤد میں نقل کیا

---

[۱] وذکر محمد بن عیسٰی الترمذی رحمہ اللہ: ایضًا عن العرباض بن ساریۃ انہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایاکم ومحدثات الامور فانها ضلالۃ فمن ادرک ذلک منکم فعلیہ بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین والمهدیین ۔ الخ

(جامع الترمذی ج۲ ص۹۶ فی باب الاخذ بالسنۃ واجتناب عن البدعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی سنن ابن ماجۃ ج ۱ ص۵ فی باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المهدیین ۔

ہے، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

عن ابی سعید ن الخدری رضی اللہ عنہ قال جلست فی عصابۃ من ضُعفاء المہاجرین وانّ بعضھم لیستتر ببعض من العریٰ وقاری یقرأ علینا اذجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقام علینا فلمّا قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکت القاری۔ فسلّم ثمّ قال ما کنتم تصنعون قلنا یا رسول اللہ انہٗ کان قاری لنا یقرء علینا فکنّا نستمع الیٰ کتاب اللہ تعالیٰ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الّذی جعل من اُمّتی من اُمرت ان اصبر نفسی معھم قال فجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسطنا لیعدل بنفسہٖ فینا ثم قال بیدہٖ ھٰکذا فتحلّقوا وبرزت وجوھھم لہ قال فما رائیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرف منھم احداً۔ غیری فقال رسول اللہؐ ابشروا یا معشر صعالیک المھاجرین بالنور التّام یوم القیٰمۃ تدخلون الجنّۃ قبل اغنیاء النّاس بنصف یوم وذٰلک خمس مائۃ سنۃ۔

(سُنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۶۱ کتاب العلم، فی باب القصص)

تسبیح فاطمی کا حدیث سے ثبوت

سوال:۔ آنحضرت صلی اللہ نے اُم الحسنینؓ سیّدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو جس تسبیح کی تلقین فرمائی تھی کیا وہ کتبِ احادیث سے ثابت ہے؟

الجواب:۔ تسبیح فاطمہ کو اکثر کتبِ حدیث میں نقل کیا گیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے درج ذیل الفاظ میں اس حدیث کو نقل کیا ہے:۔

لما قال محمد بن اسماعیل البخاریؒ: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبۃ عن الحکم عن ابن ابی لیلیٰ عن علیؓ ان فاطمۃ اشتکت ما تلقی فی یدھا من الرحی فاتت النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم تسئالہ خادماً فلم تجدہ فذکرت ذٰلک لعائشۃؓ فلما جاء اخبرتہٗ قال فجاءنا وقد اخذنا مضاجعنا فذھبت اقوم فقال مکانک فجلس بیننا حتّٰی وجدت برد قدمیہ علٰی صدری فقال الا ادلّکما علٰی ما ھُو خیر لکما من خادم اذا اویتما الی فراشکما او اخذتما مضاجعکما فکبرا ثلٰثاً وّ ثلٰثین وسبحا ثلٰثاً وّ ثلٰثین واحمدا ثلٰثاً وّ ثلٰثین فھٰذا خیر لکما من خادم وعن شعبۃؒ عن خالد عن ابن سیرینؒ

قال التسبیح اربع وثلثون۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۲ ص ۹۳۵ باب التسبیح والتکبیر عند المنام) [1]

سورۂ حشر کی فضیلت کے بارے میں روایت

سوال :- ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص فجر اور مغرب کے بعد سورۂ حشر کی آخری تین آیات کو تین بار پڑھے تو اس کے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔ یہ حدیث کونسی کتاب میں مذکور ہے اور اس کا راوی کون ہے؟

الجواب :- یہ روایت بعض کتب حدیث میں موجود ہے اور اس کے راوی حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ہیں، حدیث درج ذیل ہے :-

لما روی محمد بن عیسٰی الترمذیؒ : عن معقل بن یسار رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من قال حین یصبح ثلاث مرات اعوذ باللہ من السمیع العلیم من الشیطان الرجیم فقرأ ثلاث آیات من آخر سورۃ حشر وکل اللہ بہ سبعین الف ملک یصلون علیہ حتی یمسی وان مات فی ذلک الیوم مات شہیداً۔ ومن قالہا حین یمسی کان بتلک المنزلۃ۔ الخ (جامع سنن الترمذی ج ۲ ص ۱۲۰ ابواب فضائل القرآن) [2]

فضائل سورۂ الملک

سوال :- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض صحابہؓ نے لاعلمی کی وجہ سے ایک قبر پر خیمہ نصب کیا تو اس قبر سے سورۂ ملک کی تلاوت کی آواز آرہی تھی، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ کیا یہ واقعہ کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب :- یہ واقعہ حدیث سے ثابت ہے اور محدثین نے اسے نقل کیا ہے،

---

[1] قال الترمذیؒ : حدثنا ابو الخطاب زیاد بن یحیٰی البصری قال حدثنا ازهر السمان عن ابن عون عن ابن سیرین عن عبیدۃ عن علی قال شکت الی فاطمۃ مجل یدها من الطحین فقلت لو اتیت اباک فسألتہ خادماً فقال الا ادلکما علی ما هو خیر لکما من خادم اذا اخذتما مضاجعکما تقولان ثلاثاً وثلثین وثلاثاً وثلثین واربعاً وثلثین من تحمید وتسبیح وتکبیر۔ الخ (الجامع الترمذی ج ۲ ص ۱۷۸ باب ماجاء فی التسبیح والتکبیر والتحمید عند المنام)

وهکذا روی ابو داؤد عن حفص بن عمر ومسدد ج ۲ ص ۳۴۲ باب فی التسبیح عند النوم۔

[2] وهکذا رواه الشیخ ولی الدین العراقی فی مشکوۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۸۸ کتاب فضائل القرآن، الفصل الثانی۔

چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں :۔

حدثنا محمد عبد الملک بن ابی الشوارب قال حدثنا یحیی بن عمرو بن مالک النکری عن ابیه عن ابی الجوزاء عن ابن عباس رضی الله عنهما قال ضرب بعض اصحاب النبیؐ خبائه علی قبر وهو لا یحسب انه قبر فاذا فیه قبر انسان یقرأ سورة الملک حتی ختمها فاتی النبیؐ فقال یا رسول اللهؐ انی ضربت خبائی علی قبر وانا لا احسب انه قبر فاذا فیه انسان یقرأ سورة الملک حتی ختمها فقال النبیؐ هی المانعة هی المنجیة تنجیه من عذاب القبر۔ (سنن الترمذی ج ۲ ص۱۱۷ ابواب فضائل القرآن) [۱]

لاجمعۃ ولا تشریق کی تحقیق

سوال :۔ "لاجمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع" یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ ائمہ حدیث اور محققین کے ہاں اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب :۔ اس حدیث کو محدثین نے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے جن میں سے بعض طریقے اگرچہ ضعیف ہیں لیکن تمام طریقے ضعیف نہیں بعض صحیح بھی ہیں لہٰذا تمام طرق کو ضعیف قرار دینا درست نہیں، جیسے مصنف ابن ابی شیبہؒ کی سند: حدثنا جریر عن منصورؒ عن طلحة عن سعد بن عبیدة عن ابی عبد الرحمٰن انه قال علیؓ رضی الله عنه لاجمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے درایۃ میں تصریح کی ہے کہ: وَسَنَدُهٗ صَحِیْحٌ۔ (درایۃ ج ۱ ص۲۱۲ باب الجمعۃ) [۲]

اختلاف امتی رحمۃ کا ثبوت

سوال :۔ اختلاف امتی رحمۃ حدیث ہے یا نہیں؟ اگر حدیث ہے تو کس درجہ کی ہے؟

الجواب :۔ اس حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، بعض اس کو منقطع اور بلا اصل و بلا سند ٹھہراتے ہیں، تاہم بعض محدثین نے اس کی تصحیح بھی کی ہے چنانچہ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: زعم کثیر من الائمة انه لا اصل له

---

[۱] وهکذا رواه الشیخ ولی الدین العراقیؒ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص۱۸۷ کتاب فضائل القرآن الفصل الثانی)

[۲] قال حافظ بدر الدین عینیؒ: وسنده صحیح۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص۱۸۸ باب الجمعہ فی القری والمدن)
وَمِثْلُهٗ فی فیض الباری ج ۲ ص۳۳۱ باب الجمعة فی القری۔

لکن ذکرہ الخطابی فی غریب الحدیث مستطرداً واشعر بان لہٗ اصلاً و عندہٗ۔ وقال السیوطیؒ اخرجہ المقدسی فی الحجۃ والبیہقی فی الرسالۃ الاشعریۃ بغیر سند۔

وقال الزرکشیؒ: اخرجہ نصر المقدسی فی کتاب الحجۃ مرفوعاً والبیہقی فی المدخل عن القاسم بن محمد۔ (الموضوعات الکبریٰ ص۵۱ حدیث ۱۶۰) [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود کو گرانے کا عزم اور اس کی تحقیق

سوال:۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی روایت ثابت ہے جس کا مضمون یوں ہو کہ "میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دوں"۔ اگر یہ روایت آپؐ سے ثابت ہو تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ کب کیا تھا اور یہ کیسے ہوا؟ جبکہ خودکشی شریعت میں حرام ہے۔

الجواب:۔ یہ روایت بعض کتب حدیث میں موجود ہے، اور یہ واقعہ فترۃ الوحی کے زمانے میں پیش آیا تھا، اس روایت کو علامہ قسطلانیؒ نے امام زہریؒ سے یوں نقل کیا ہے:۔

وَفَتَرَ الوحی فترۃً حتّٰی حزن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاد فی التعبیر من طریق معمر عن الزہریؒ فیما بلغنا حزناً غدا منہ مراراً کی یتردّٰی من رؤس شواھق الجبال فکلما اوفی بذروۃ جبل لکی یلقی نفسہ تبدّٰی لہٗ جبریل فقال یا محمد انّک رسول اللہ حقّاً فیسکن لذٰلک جاشہ وتقر نفسہ فیرجع واما ارادتہ علیہ السلام القانفسہ من رؤس شواھق الجبال فحزناً علیٰ ما فاتہ من الامر الذی بشر بہ ورقۃ۔ (ارشاد الساری ج ۸ ص۴۲۷ سورۃ اقرأ باسم ربّک الذی خلق ۔ صحیح ابن حبّان ج ۱ ص۱۲۰ ۔ البدایۃ والنہایۃ ج۳ ص۴ باب کیف بدأ الوحی)

اور اس سے خودکشی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ تو عشق و محبت مع اللہ کا درجہ ہے، جیسے کہ ایک ایک شخص کے دل میں تڑپ ہو کہ اللہ کی راہ میں قربان ہو جائے اور پھر جہاد کو چلے اور کفار کے

---

[1] وقال علاؤ الدین علی الہندیؒ: رواہ نصر المقدسی فی الحجّۃ والبیہقی فی رسالۃ الاشعریۃ بغیر سند وادردہ الحلیمی والقاضی حسین وامام الحرمین وغیرھم ولعلّہٗ خرج بہٖ فی بعض کتب الحفاظ التی لم تصل الینا۔ قال المناوی فی الفیض (ج ۱ ص۲۶۹) لم اقف لہٗ علیٰ سند صحیح وقال الحافظ العراقی سندہٗ ضعیف۔ (کنز العمال ج ۱۰ ص۱۳۶ کتاب العلم)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار (ج ۱ ص۶۸) مطلب فی حدیث اختلاف اُمتی رحمۃ۔

ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے آخر شہید ہو جائے تو اس کو خودکشی نہیں کہا جاتا جو باعثِ عتاب ہو بلکہ یہ باعثِ اجر ہوتی ہے، یا یہ ابتدائی وقت تھا جب خودکشی سے ممانعت نہیں ہوئی تھی۔

اور قاضی عیاضؒ نے اس وقت پر حمل کیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت پیش کی تو کفار نے اسے جھٹلایا اور انکار کر بیٹھے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت غمگین ہوئے۔ چنانچہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (سورۃ الکہف آیت ۶) میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

لما قال القسطلانیؒ: وحمله القاضی عیاضؒ علیٰ انه لما اخرجه من تکذیب من بلغه کقوله تعالیٰ: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ.... الخ ولم یرد بعد شرع عن ذٰلک فیعترض به۔

(ارشاد الساری ج ۸ ص۲۷۱ سورۃ اقرأ باسم ربک الذی خلق)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز اور طلوعِ آفتاب کا ثبوت

سوال:۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سر مبارک رکھ کر آرام فرما رہے تھے کہ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عصر کی نماز فوت ہوگئی یعنی سورج غروب ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نماز کے بارے میں پوچھا کہ نماز ادا کی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا نہیں، اسکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی جس کی وجہ سے سورج دوبارہ طلوع ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز عصر ادا کی۔ کیا یہ روایت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس روایت کو امام طبرانیؒ نے المعجم الکبیر میں اسماء بنتِ عمیسؓ سے یوں روایت کیا ہے:۔

عن اسماء بنت عمیس ان رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی الظهر بالصهباء ثم ارسل علیاً رضی الله عنه فی حاجته فرجع وقد صلی النبی صلی الله علیه وسلم العصر فوضع النبیؐ رأسه فی حجر علیؓ رضی الله عنه فنام فلم یحرکه حتیٰ غابت الشمس فقال النبیؐ صلی الله علیه وسلم اللهم ان عبدك علیاً رضی اللہ عنہ احتبس بنفسه علی نبیه فرد علیه الشمس قالت فطلعت علیه الشمس حتیٰ رفعت علی الجبال وعلی الارض وقام علی فتوضاء وصلی العصر ثم غابت وذٰلك بالصهباء۔

(المعجم الکبیر للطبرانیؒ ج ۲۴ ص۱۴۵)

لیکن اس روایت کی صحت کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، چنانچہ علامہ

ابن الجوزی، امام ابن تیمیہ اور امام احمد رحمہما اللہ وغیرہ نے اس کو موضوعات اور بلا اصل روایات میں شمار کیا ہے۔ اور امام طحاویؒ، قاضی عیاضؒ وغیرہ نے صحت پر قول کیا ہے اور طبرانی کی مذکورہ بالا روایت کو بھی صحیح روایات میں شمار کیا گیا ہے۔

لما قال محمود الآلوسیؒ: وھٰذا الخبر فی صحته خلاف فقد ذکرہ ابن الجوزیؒ فی الموضوعات وقال انه موضوع بلاشك وقال الامام احمد لا اصل له واخرد ابن تیمیةؒ تضیفًا فی الرد علی الروافض وذکوا الحدیث بطوقه ورجاله وانه موضوع وصححه الطحاوی والقاضی عیاضؒ والطبرانیؒ۔ (روح المعانی ج۲۳ ص۱۹۴ مطلب فی تفسیر قوله تعالیٰ: فطفق مسحًا)

ابوالشیخ کے حالاتِ زندگی

سوال: حدیث من صلّی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی علیّ نائیًا ابلغته کی سند میں ابوالشیخ آیا ہے اس کا نام، اس کے والد کا نام، اساتذہ اور حالاتِ زندگی کو تحریر کیا جائے؟

الجواب: ابوالشیخ کا نام عبداللہ اور ان کے والد کا نام محمد بن جعفر ہے اور مشہور ابوالشیخ کے نام سے ہیں، ان کے اساتذہ بہت ہیں جن میں سے چند کے اسماء درج ذیل ہیں: الزاہد محمود بن الفرج، ابراہیم بن سعدان، محمد بن عبداللہ بن الحسن، محمد بن اسد المدنی، احمد بن محمد، ابوبکر ابن ابی عاصم، اسحٰق بن اسماعیل الرملی، ابوخلیفہ الجمحی، احمد بن الحسن الصوفی، ابویعلیٰ الموصلی، ابوعروبہ الحرانی۔

حافظ ابن مردویہؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ابوالشیخ ثقہ مامون تھے اور انہوں نے احکام و تفسیر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ابوبکر خطیبؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کان حافظاً ثبتاً متقناً۔

بعض علماء سے یوں منقول ہے کہ ہم جب بھی ابوالشیخ کے ہاں جاتے تو وہ نماز میں مشغول ہوتے تھے۔

ابونعیمؒ کا کہنا ہے کہ وہ بلند پایہ علماء میں سے تھے، انہوں نے احکام و تفسیر میں کئی کتابیں تصنیف کیں اور وہ اپنے شیوخ سے علم پھیلاتے تھے اور ساٹھ سال تک تصنیف کرتے رہے، وہ با اعتماد تھے۔

لما قال الذهبیؒ: ابوالشیخ حافظ اصبهان ومسند زمانه الامام ابومحمد عبد اللہ بن محمد بن جعفر الانصاری صاحب المصنفات السائرة ویعرف بابی الشیخ سمع من جده

لامہ الزاهد محمود بن الفرج، ابراهیم بن سعدان، محمد بن عبد الله بن الحسن، محمد بن اسد المدنی، احمد بن محمد، ابوبکر بن ابی عاصم، اسحاق بن اسماعیل الرملی، ابوخلیفة الجمحی، احمد بن الحسن الصوفی، ابویعلی الموصلی، ابوعروبة الحرانی ۔ قال ابن مردویة ثقة مامون صنف التفسیر والکتب الکثیر فی الاحکام وغیر ذلك ۔ وقال ابوبکر الخطیب کان حافظاً ثبتاً متقناً ۔ وروی بعض العلماء قال ما دخلنا علی ابی الشیخ الا وهو یصلی ۔ قال ابونعیمؒ هو احد الاعلام صنف الاحکام والتفسیر وکان یفید عن الشیوخ و یصنف لهم ستین سنة وکان ثقة ووقع لنا الکثیر من کتب ابی الشیخؒ ۔ الخ

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۴۵)

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ کی تحقیق

سوال: مشکوٰۃ المصابیح میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کسی شخص کو ایسی حالت میں موت آئے کہ وہ توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہو تو یہ شخص جنتی ہے۔ اگر صرف اس عقیدے کی بناء پر جنت میں جانا ہو سکتا ہے تو پھر دیگر اعمال کا کیا فائدہ؟

الجواب: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو دل سے معبودِ برحق مانتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچا رسول مانے اور زبان سے بھی اس عقیدے کا اظہار کرے تو ایسا شخص جنت میں جانے کا اہل بن جاتا ہے صرف زبانی کلمہ پڑھنا مراد نہیں ہے، اور دوسرے اعمال کا ذکر اس لیے نہیں ہوا کہ اس حدیث کا تعلق اس زمانے سے ہے جب دوسرے اعمال فرض نہیں ہوئے تھے جبکہ ایمان کا دارومدار صرف توحید و رسالت اور قیامت پر تھا، اسی وجہ سے دوسرے اعمال کا بے فائدہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اور دخولِ جنت سے مراد دخولِ اولیٰ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو یا بصورتِ کوتاہی کے توبہ کرلی ہو یا اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے معاف کیا ہو۔ یا دخول جنت سے مراد دخولِ اُخروی ہے جو اعمال میں کوتاہی کی سزا بھگتنے کے بعد ہوگا، یا دخل الجنة کا معنیٰ استحق دخول الجنة ہے۔

لما قال العلامة مُلا علی القاری الحنفی رحمه الله: دخل الجنة دخولاً اولياً ان لم يصدر عنه ذنب بعد الايمان او اذنب وتاب او عفا الله عنه او دخولاً اخروياً فان الله لا يضيع اجر من احسن عملاً اومعناه استحق

دخول الجنة ۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۱ ص۲۰۱ کتاب الایمان)

وقال النوویؒ : قلنا نحمله علیٰ انهٗ غفرله او اخرج من النار با لشفاعة ثم ادخل الجنة فیکون معنیٰ قوله دخل الجنة الیٰ دخلها بعد مجازاته بالعذاب وھٰذا لابد من تاویله لما جاء فی ظواھر کثیرۃ من عذاب بعض العصاۃ ۔ (شرح النووی علیٰ صحیح مسلم ج ۱ ص۴۱)

حدیث لولاک لما... کی تحقیق | حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کے بارے میں ملا علی القاری رحمہ اللہ نے موضوع ہونے کا قول کیا ہے، اور ان کے علاوہ بعض علماء نے اس کو بلا سند روایات میں شمار کیا ہے، جبکہ بعض حضرات نے دیلمیؒ کے حوالے سے مرفوع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لہٰذا اس کے بارے میں تسلی بخش جواب سے سرفراز فرمائیں ؟

الجواب:۔ اگرچہ اس حدیث کے الفاظ کے بارے میں محدثین حضرات نے کلام کیا ہے لیکن معنیٰ ومضمون کے اعتبار سے یہ ثابت ہے اور ایک حقیقت نفس الامری ہے جو کہ دوسری روایات سے ثابت ہے اور جن علماء سے انکار منقول ہے وہ بھی الفاظ ہی کے بارے میں ہے معنیٰ کے بارے میں نہیں ہے ۔ چنانچہ خود ملا علی قاری رحمہ اللہ اس کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اگرچہ علامہ صنعانیؒ نے اسے موضوع کہا ہے لیکن معنیٰ کے اعتبار سے ثابت ہے ۔

حدیث لولاک لما خلقت الافلاک قال الصغانی انه موضوع کذا فی الخلاصة لکن معناه صحیح فقد روی الدیلمیؒ عن ابن عباس رضی اللہ عنهما مرفوعًا اتانی جبریل فقال یا محمد لولاک ما خلقت الجنة ولولاک ما خلقت النار وفی روایة ابن عساکر لولاک ما خلقت الدنیا ۔ (موضوعاتِ کبیر ص۵۹ حرف اللام) [1]

---

[1] قال العلامة شهاب الدین قسطلانیؒ : قال اللہ تبارک وتعالیٰ لآدم یاآدم یا ایا محمدٌ ارفع رأسک فرفع رأسه فریٰ نور محمد فی سرادق العرش فقال یا ربّ ما ھٰذا النور قال ھٰذا نور نبیٌّ مِنْ ذُرّیتک اسمُهٗ فی السّمآء احمد وفی الارض محمّد لولاه ما خلقتک ولاخلقت سماءً ولا ارضًا ۔ (مواھب اللدنیة ج ۱ ص۸۳)

وروی فی حدیث طویل عن سلمان رضی اللہ عنه ولقد خلقت الدّنیا واھلها لأعرفهم کرامتک ومنزلتک عندی ولولاک ماخلقت الدّنیا ۔

(مواھب اللدنیه ج ۱ ص۸۳)

وَمثْلُهٗ فی سبل الھُدیٰ والرّشاد ج ۱ ص۷۵ ۔

مہاجرین و انصار میں عقدِ مواخات اور انصار کا مہاجرین کو بیوی کی پیشکش

سوال:۔ صحابہ کرامؓ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے درمیان عقدِ مواخات یعنی بھائی بندی اور بھائی چارہ قائم کیا تو جن انصار صحابہؓ کی دو بیویاں تھیں انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو ایک بیوی کی طلاق کے بعد پیشکش کی۔ کیا یہ روایت حدیث کی کتابوں سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہجرت فرمانے کے بعد مدینہ طیبہ جاکر مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات یعنی بھائی بندی اور بھائی چارے کا رشتہ قائم فرمایا اور اس پر انصار نے اپنے خلوص و جذبۂ ایمانی سے بھرپور طریقے پر عمل کیا جو حدیث کی کتابوں میں تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ اسی جذبۂ ایثار اور اخلاص ہی کی وجہ سے حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنے مہاجر بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنی نصف جائیداد اور ایک بیوی کی پیشکش کی جو کہ اُن کے انتہائی ایثار کا اظہار تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ظاہری طور پر خلافِ مروت سمجھتے ہوئے حضرت سعد بن ربیعؓ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کی۔

لما روی محمّد بن اسمٰعیل البخاریؒ: لمّا قدموا المدینۃ اٰخیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین عبدالرحمٰن بن عوف وسعد بن الربیع فقال لعبد الرحمٰن انی اکثر الانصار مالاً فاقسم مالی نصفین ولی امرأتان فانظر اعجبھما الیک فسمّھا الیّ اطلقھا فاذا انقضت عدتھا فتزوّجھا قال بارک اللہ لک فی اھلک ومالک۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۵۳۳ باب اِخاء النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم بین المھاجرین والانصار) [1]

اشعۃ اللمعات کی ایک عبارت کی تشریح

سوال:۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "اشعۃ اللمعات ج۲ ص۱۵۴" میں کتاب فضائل القرآن، باب آداب التلاوت" کے تحت ایک حدیث کی تشریح کی تشریح کی ہے جس کا

---

[1] روی الامام محمد بن عیسٰی الترمذیؒ: عن انسٍ رضی اللہ عنہ اٰخیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین عبد الرحمٰن بن عوف وسعد بن الربیع فقال ھلم اقاسمک مالی نصفین ولی امرأتان فاطلق احدٰھما فاذا انقضت عدتھا فتزوّجھا۔ الخ (جامع الترمذی ج۲ ص۱۵ باب المواسات۔ ابواب البر والصلۃ)

مطلب سمجھ میں نہیں آرہا، ازراہ کرم فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت کی وضاحت فرمائیں ۔
" ومقصود وی صلی اللہ علیہ وسلم رفع جرح ومشقت وتکلیف در استقصائے رعایت تجوید بمرتبۂ غایت است وتنبیہ بر تحری حسبۂ واخلاص در عمل لوجہ اللہ وتفکر در معانی وشدت اہتمام بآں اگرچہ در تحسین الفاظ وتجوید کلمات نہ باقصا الغایۃ کوشد زیرا کہ استقصاء واہتمام بثانی بامساہلہ وتقصیر دراول چنداں نفع نکند واعتناء بثانی بامساہلہ دراول ضرر نیارد " ؟

الجواب :- یہاں پر تلاوتِ قرآن کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی کلام پاک کے معانی ومطالب میں غور وفکر نہ کرے بلکہ صرف الفاظ کی تحسین اور کلمات کی تجوید میں کوشش کرے تو اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں ۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی کلام الٰہی کی تلاوت اخلاص کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرے اور اس کے معانی ومطالب پر غور وفکر کرے اگرچہ انتہائی طور پر قوانینِ تجوید اور تحسینِ الفاظ حاصل نہ ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔

اور حاصل اس کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت میں بنیادی چیز اخلاص وللّٰہیت اور تفکر وتدبر ہے جب یہ حاصل ہوں تو تلاوت کا ثواب مکمل طور پر حاصل ہوگا، اور جب اخلاص اور تفکر نہ ہو تو اگرچہ تحسین وتجوید سے پڑھا جائے اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں ۔

بشّروا ولا تنفّروا کی تحقیق

سوال :- اصولِ تبلیغ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی کوئی روایت منقول ہے کہ نفرت نہ دلانا محبت پیدا کرنا، پہلے توحید ورسالت کی دعوت دینا جب اس کو مان لیں تو پھر نماز پنجگانہ بتانا ؟

الجواب :- مذکورہ پورے الفاظ کسی ایک روایت میں نہیں ملتے تاہم متعدد روایات سے یہ باتیں ثابت ہیں ، ایک روایت میں یوں ہے :-

بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابا موسیٰ ومعاذًا رضی اللہ عنہما الی الیمن فقال یسّر ولا تعسّر وبشّر ولا تنفّر ۔ الخ (الجامع الصحیح للبخاری ج۲ ص۶۲۲ کتاب المغازی / صحیح مسلم ج۲ ص۸۲ کتاب الجہاد)

اور دوسری روایت میں یوں ہے :-

انّک ستأتی قومًا من اھل الکتاب فاذا جئتھم فادعھم الٰی ان یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وانّ محمدًا رسول اللہ فان ھم اطاعوا بذٰلک فاخبرھم انّ اللہ قد فرض علیکم خمس صلوٰۃ فی کل یوم ولیلۃ ۔ الخ (الجامع الصحیح للبخاری ج۲ ص۶۲۳ کتاب المغازی / صحیح مسلم ج۱ ص۳۶ کتاب الایمان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی سزا

سوال:۔ تیسیر الباری ترجمہ صحیح بخاری میں پارہ اوّل حدیث ۱۰۸ کے تحت لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جو تم سے بہت سی حدیثیں بیان نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور انور نے فرمایا جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔ متن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نا دانستہ ایسا ہو جائے تو بالاجماع وہ گنہگار نہ ہوگا۔ جوینیؒ نے کہا کہ جو کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عمداً جھوٹ باندھے وہ کافر ہو گیا، علیؒ نے کہا کہ کافر تو نہیں ہوا مگر سخت گنہگار ہوا، اس حدیث کے صحیح مطلب و مفہوم سے روشناس فرما کر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ اس حدیث کا مفہوم تو ظاہر ہے کہ جان بوجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے والے کی سزا جہنم ہے، باقی اگر کوئی غلطی سے یا بھول کر اس فعل کا ارتکاب کرے تو بالاجماع علماء یہ شخص گنہگار نہیں ہوگا، اسی وجہ سے حکم کے ساتھ بالعمد کی قید لگائی گئی ہے اور جو روایات مطلق ہیں وہ اس مقید پر محمول ہیں البتہ کذب عمداً کے مرتکب کے کفر کے بارے میں اختلاف ہے لیکن جمہور کے ہاں جب تک حلال نہ سمجھے کافر نہ ہوگا، اگرچہ گناہِ عظیم ہونے میں شک نہیں مگر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

لما قال النوویؒ: ان الاجماع والنصوص المشهورة فی الکتاب والسنة متوافقة ظاهرة علیٰ انّہٗ لا اثم علی النّاسِ والغالط فلو اطلق النّبی صلی اللہ علیہ وسلم لتوهم انهٗ یأثم النّاس ایضًا فقیّدهٗ واما الرّوایات المطلقة فمحمولة علی المقیّدة بالعمد ...... ثم قال ولکن لا یکفر بهذا الکذب الا ان یستحله هٰذا هوا لمشهور من مذاهب العلماء۔ الخ

(نووی شرح صحیح مسلم ج ۱ ص۸ باب النهی عن الحدیث)

مرتد عن الاستاد کی حدیث کی تحقیق

سوال:۔ مندرجہ ذیل حدیث "عن النّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انهٗ قال المرتد علیٰ نوعین مرتد عن الدّین و مرتد عن الاستاد اما المرتد عن الدین فهو یصلح بالتوبة واما المرتد عن الاستاد فهو لا یصلح اصلاً فهو کالبیضة المنتة" ایک قلمی نسخے میں نظر سے گذری، مگر اشتباہ اس میں یہ ہے کہ حقوق دو قسم کے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، حقوق اللہ تو توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں اور حقوق العباد بندوں کے راضی کرنے سے معاف

ہوجاتے ہیں اور توبہ کے ذریعے تو کافر و فاسق کی اصلاح ہوتی ہے۔ مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "وتوبۃ الکافر ومقبولۃ" لہٰذا اس حدیث کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ محدثین کے ہاں اس کی کیا حیثیت ہے، صحیح ہے یا موضوع؟

الجواب: اساتذہ کرام اور والدین کا احترام قرآن وحدیث سے ثابت ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ نافرمان شاگرد کی توبہ قبول نہ ہو، لقولہ تعالیٰ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (سورۃ زمر آیت ۵۳) اور اسی طرح غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ۔ (سورۃ المؤمن آیت ۳) لہٰذا توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

باقی چونکہ اس روایت کی سند مذکور نہیں اور نہ ہی کسی مخرج پر حوالہ دیا گیا ہے، لہٰذا صحت وضعف کے اعتبار سے تفصیل نہیں لکھی جاسکتی تاہم بظاہر وضع کے آثار اس میں نمایاں ہیں جن میں کتاب اللہ، سنتِ رسولؐ اور اجماعِ اُمت سے تعارض شامل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قبر میں نماز پڑھنا

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ معراج کی رات میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کیا یہ حدیث ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: اس حدیث کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے: حدثنا هدّاب بن خالد و شيبان بن فروخ قال اخبرنا حمّاد بن سلمة البناني وسليمان التيمي عن انس بن مالك رضى الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اتيت وفى رواية هدّاب مررت على موسى ليلة أسرى بى عند الكثيب الاحمر وهو قائم يصلّى فى القبر۔[1]

(الجامع الصحیح المسلم ج ۲ ص ۲۶۸ باب فضائل موسیٰ علیہ السلام)

نِسبت اِلَی الغیر پر وعید اور اس کی توجیہہ

سوال: اس حدیث کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں "حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے اپنے

[1] عن انس بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اتيت ليلة أسرى بى على موسى عليه السلام عند الكثيب الاحمر وهو قائمٌ يُصلّى فى قبره۔ (نسائی ج ۱ ص ۲۴۲ کتاب قيام الليل وتطوع النهار۔ ذکر صلوٰۃ نبی اللہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ..... الخ)

والد کے سوا کسی دوسرے شخص کو والد کہا اور وہ جانتا بھی ہو کہ یہ شخص اس کا باپ نہیں ہے تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے؟

الجواب:۔ یہ حدیث امام مسلم بن حجاج نے صحیح مسلم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے نقل کی ہے:۔

عن ابی بکر رضی اللہ عنہ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من ادّعیٰ الیٰ غیر ابیہ وھو یعلم انّہٗ غیر ابیہٖ فالجنّۃ علیہ حرامٌ ۔

ائمہ حدیث نے اس روایت کی مختلف توجیہات کی ہیں:۔

(۱) یہ کہ جو شخص اس کام کو حلال سمجھ کر کرے گا تو اس پر جنت حرام ہے۔

(۲) یہ کہ حرام بمعنے ممنوع ہے تو ایسے شخص پر جنت میں دخول اول ممنوع ہوگا جو فائزین اور سلامتی والوں کے لیے ہے اور سزا پانے کے بعد داخل ہوگا۔

لما قال النوویؒ: الاوّل انّہٗ حرام علیٰ من فعلہٗ مستحلاً لہٗ۔ والثّانی ان جزاءہ انھا محرمۃٌ علیہ اوّلاً عند دخول الفائزین الخ۔ (شرح النووی علیٰ صحیح مسلم ج۱ ص۵۷ باب بیان حال ایمان من رغب عن ابیہ وھو یعلم)[1]

نماز میں اشارۂ ممنوعہ کی حقیقت

سوال:۔ ابوداؤد شریف میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من اشار فی صلوتہٖ تفھم عنہ فلیعد لھا یعنی الصلوٰۃ (ج۱ ص۱۴۳)"۔ کیا یہ حدیث اشارہ بالسبابہ کی روایت سے معارض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ بالسبابہ کے لیے مستقل عنوان باب الاشارۃ فی التشھد کے تحت روایات کو جمع کیا ہے، اور مذکورہ روایت کو باب الاشارۃ فی الصّلوٰۃ میں نقل کیا ہے، لہٰذا اس اشارہ سے مراد وہ اشارہ ہوگا جو سلام کے جواب

---

[1] فالمراد من استحل ذٰلک مع علمہ بالتحریر وعلی الروایۃ المشھورۃ فالمراد کفرٌ لنعمۃ وظاھر اللفظ غیر مرادٍ وانّما ورد علی سبیل التغلیظ والزجر لفاعل ذٰلک او المراد باطلاق الکفران فاعلہ فعل فعلاً شبیھاً بفعل اھل الکفر۔ الخ (فتح الملھم بشرح صحیح مسلم ج۱ ص۲۳۶ باب بیان حال ایمان من رغب عن ابیہ وھو یعلم)

یاکسی دوسری ضرورت کے لیے کیا جائے ۔

لما قال الشیخ خلیل احمد السہارنفوری رحمہ اللہ: الاشارۃ المذکورۃ فی ھذا الحدیث محمولۃ علی الاشارہ فی الصلوٰۃ للحاجۃ کرد السلام وغیرہ ۔

(بذل المجہود شرح ابوداؤد ج ۲ ص۱۰۰ باب الاشارۃ فی الصلوٰۃ)

فقیہ اور عابد کے تقابلی موازنہ کی روایت

سوال:۔ فقیہٌ واحدٌ اشد علی الشیطٰن من الفِ عابد ۔ یہ حدیث ہے یا کوئی عربی مقولہ ہے؟ اگر حدیث ہے تو حدیث کی کس کتاب میں مذکور ہے؟

الجواب:۔ یہ عبارت ایک حدیث کے الفاظ ہیں اور اکثر کتب احادیث میں بروایت عبداللہ ابن عباسؓ ذکر کئے گئے ہیں :۔

روی محمد بن عیسٰی الترمذیؒ بسندہٖ ابن عباس رضی اللہ عنہما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیہٌ وَّاحدٌ اَشَدّ علی الشیطٰنِ من الفِ عابد ۔

(جامع الترمذی ج ۲ ص۹۳ باب ماجاء فی عالم المدینۃ) [1]

حضرت علیؓ اور قوّتِ حافظہ والی روایت

سوال :۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قوّتِ حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چند کلمات اور اسمائِ حُسنٰی بتلائے جن کے ورد سے حضرت علیؓ کی حافظہ کی کمزوری ختم ہوگئی، پھر بعد میں کسی صحابی کے پوچھنے پر حضرت علیؓ نے وہ کلمات بتائے ۔ اس روایت کا حوالہ بتائیں؟

الجواب :۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ روایت ان کلمات کے ساتھ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ضعفِ حافظہ کی دوری کے لیے فرمائے تھے) نقل کی ہے :۔

عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہ مختصرًا شکی علی رضی اللہ عنہ تفلّت القراٰن عن صدرہٖ

---

[1] وکذا ذکرہ ولی الدین محمد بن عبد اللہ عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقیہٌ واحدٌ اشدّ علی الشیطٰن من الفِ عابدٍ ۔

(مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۳۴ کتاب العلم ۔ الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی سنن ابن ماجۃ ج ۱ ص۲۰ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ۔

الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا ابا الحسن افلا اعلّمك کلماتٍ ینفعك اللہ بهن وینفع بهن من علّمتهٗ ویثبت ما تعلّمت فی صدرك قال اجل یا رسول اللہ فعلّمنی قال اذا کان لیلة الجمعة فان استطعت ان تقوم فی ثلث اللیل الاٰخر فانها ساعة مشهودة والدّعاء فیها مستجابٌ فان لم تستطع فقم فی وسطها فان لم تستطع فقم فی اوّلها ۔ فَصَلِّ رکعاتٍ تقرء فی الرکعة الاولیٰ فاتحة الکتاب وسورة یٰسٓ وفی الرکعة الثانیة فاتحة الکتاب وحٰمٓ الدخان وفی الرکعة الثالثة بفاتحة الکتاب والٓمّٓ تنزیل السجدة. وفی الرکعة الرابعة بفاتحة الکتاب وتبارك المفصّل، سورة الملك ۔ فاذا فرغت من التّشهّد فاحمد اللہ واحسن الثّناء علی اللہ و صَلِّ عَلَیَّ واحسن وعلیٰ سائر النّبیّین واستغفر للمؤمنین والمؤمنات ولاخوانك الّذین سبقوك بالایمان ثم قل فی اٰخر ذٰلك اللّٰهم ارحمنی بترك المعاصی ابدًا ما ابقیتنی وارحمنی ان اتکلّف مالا یعنینی وارزقنی حسن النظر فی ما یرضیك عنّی اللّٰهمّ بدیع السمٰوٰت والارض ذوا الجلال والاکرام والعزّة الّتی لا ترام اسئلك یا اللہ یا رحمٰن بجلالك ونور وجهك ان تلزم قلبی حفظ کتابك کما علّمتنی وارزقنی ان اتلوه علی النّحو الّذی یرضیك عنّی اللّٰهمّ بدیع السّمٰوٰت والارض ذوا الجلال والاکرام والعزّة الّتی لا ترام اسئلك یا اللہ یا رحمٰن بجلالك ونور وجهك ان تنوّر بکتابك بصری وان تطلق به لسانی وان تفرّج به عن قلبی وان تشرح به صدری وان تغسل به بدنی ۔ فانهٗ لا یُعیننی علی الحق غیرك ولا یؤتیه الّا انت ولا حول ولا قوّة الّا باللہ العلیّ العظیم ۔ یا یا الحسن تفعل ذٰلك ثلاث او خمسة او سبعًا تُجب باذن اللہ والّذی بعثنی بالحق ما اخطاء مؤمنًا ۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۹۶ باب دعاء الحفظ)

۴۹ انچاس کروڑ گنا ثواب کی حدیث

سوال :- بعض حضرات تبلیغ میں جانے والوں کے لیے جو فضائل بیان کرتے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے والوں کو ایک روپے کے خرچ کرنے پر اُنچاس کروڑ روپے کا اجر و ثواب ملے گا۔ کیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب :- یہ بات کسی مستقل روایت سے ثابت نہیں، تاہم چند روایات کے مجموعی مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلنے والے کے اعمال میں بہت زیادہ تضاعف ہوتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ایک روپے کے عوض ۴۹ کروڑ کا

ثواب ملتا ہے۔ اس بارے میں ابن ماجہ کی ایک روایت ہے جو آٹھ صحابہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من ارسل بنفقة فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ فلہ بکل درھم سبع مائة درھم ومن غزی بنفسہ فی سبیل اللہ وفی وجہ ذلک فلہ بکل درھم سبع مائة الف درھم۔ (ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۹۸ باب فضائل النفقة فی سبیل اللہ)

اور دوسری روایت کو امام ابوداؤدؒ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الصلوٰة والصیام والذکر یضاعف علی النفقة فی سبیل اللہ عزّ وجل بسبع مائة ضعف۔ (سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۳۴۵ باب تضعیف الذکر فی سبیل اللہ)

یہاں پہلی روایت میں یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکل کر خرچ کرے اس کو ایک روپے کے عوض سات لاکھ روپے کا ثواب ملے گا۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نماز، روزہ، ذکر اللہ کا ثواب انفاق فی سبیل اللہ کی نسبت سات (۷۰۰) سو گنا زیادہ ہے۔ اب پہلی حدیث کے سات لاکھ کو دوسری حدیث کے سات سو روپے سے ضرب دی جائے تو انچاس ۴۹ کروڑ ہی بنتا ہے۔

۷۰۰۰۰۰ × ۷۰۰ = ۴۹۰۰۰۰۰۰۰

تاہم یہ ثواب صرف تبلیغ میں نکلنے سے خاص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کے ہر مسافر کا یہ حکم ہے، البتہ تبلیغ بھی سبیل اللہ کا ایک شعبہ ہے۔

ولد الزنا لا یدخل الجنة کی تحقیق

سوال:۔ درج ذیل حدیث ولد الزنا لا یدخل الجنة کی محدثین کے ہاں صحت اور ضعف کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے؟ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟

الجواب:۔ اس حدیث کے متعلق اکثر حفاظِ حدیث کی رائے یہ ہے کہ اس کا شمار موضوع روایات میں ہوتا ہے اور حدیث کے ذخائر میں اس کی صحت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

لما قال عبد الرحمٰن الاثری الشافعیؒ: ولد الزنا لا یدخل الجنة یدور علی الالسنة ولم یثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بل قال القاضی مجد الدین شیرازی فی سفر السعادة ھو باطلؒ۔ (تمییز الطیب من الخبیث ص ۲۰۷)[1]

[1] وقال ایضاً: ذکر فی المصنوع فی احادیث الموضوع ولد الزنا لا یدخل الجنة لا اصل لہ۔ (تمییز الطیب من الخبیث ص ۳۹۱) ومثلہ فی موضوعاتِ کبریٰ للملا علی القاریؒ ص ۳۵۱ احادیث فی ولد الزنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجنبیہ سے غنا کی روایت

سوال: عن عائشۃ رضی اللہ عنہ قالت کانت عندی امرأۃ تسمعی فدخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی علی تلک الحال ثم دخل عمر ففرت فضحک رسول اللہ فقال عمر رضی اللہ عنہ ما یضحک یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محدثہ فقال واللہ لا اخرج حتی اسمع ماسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسمعتہ۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: اس روایت کو بعض محدثین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور اس کی سند میں ابوالفتح البغدادی ہے جو محدثین کے ہاں متکلم فیہ ہے، اور بعض نے اسے واھی الحدیث ساقط الروایۃ تک کہا ہے۔

لما قال ابن الجوزی رحمہ اللہ: قال الخطیب ابوالفتح البغدادیؒ واھی الحدیث ساقط الروایۃ واصل الحدیث باطل۔ (کتاب الموضوعات لابن الجوزیؒ ج۳ ص۱۱۶ باب فی اباحۃ الغناء)

گائے کے گوشت کی حلت وحرمت کی تحقیق

سوال: کیا یہ حدیث صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گائے کا دودھ پیو کیونکہ اس میں دوا ہے اور اس کے گھی میں شفاء ہے اور بچو اس کے گوشت سے اس لیے کہ اس میں بیماری ہے؟

الجواب: گائے کے دودھ میں شفاء ہونے کے بارے میں تو روایات موجود ہیں جن کو حافظ عبداللہ نیشاپوریؒ نے مستدرک میں نقل کیا ہے:۔

ان اللہ تعالی لم ینزل داءً الا انزل لہ شفاءً الا الحرام فعلیکم بالبان البقر فانھا ترم من کل شجر۔ (مستدرک حاکم ج۴ ص۱۹۷ کتاب الطب)

لیکن گائے کے گوشت سے ممانعت کی روایت نہیں مل سکی بلکہ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل مبارک سے اس کی حلت ثابت ہے، اور اگر منع کی روایت ثابت ہو جائے تو نہی طبع پر محمول ہوگی۔

لما روی الامام مسلم بن حجاجؒ فی صحیحہ: عن عائشۃ رضی اللہ عنہا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلحم بقر فقیل ھذا ما تصدق بہ علی بریرۃ

فقال هو لہا صدقۃٌ ولنا ھدیۃ ۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص۳۴۵ باب اباحۃ الہدیۃ للنبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ولبنی ھاشم وبنی المطّلب۔۔۔ الخ) ؎۱

منجیات ومُہلکات کی تشریح

سوال: ۔ ثلٰث مُنجیاتٌ وثلٰث مہلکاتٌ فامّا المنجیات فتقوی اللہ فی السّرّ والعلانیۃ والقول بالحق فی الرضا والسخط والقصد فی الغناء والفقر، وامّا المہلکات فہوًی متبع وشحٌ مطاعٌ واعجاب المرء بنفسہٖ وھو اشدھنّ ۔ اِس حدیث کا حوالہ اور تشریح ارسال کریں؟

الجواب: ۔ یہ حدیث صاحبِ مشکوٰۃ المصابیح نے جلد ۲ ص۴۳۴ پر شعب الایمان للبیہقی کے حوالے سے نقل کی ہے ۔

تشریح: ۔ اس روایت میں مقصود یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہلاکت سے بچنے اور نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ مومن میں تین صفات موجود ہوں ۔ (۱) خوفِ خدا: یعنی ہر حالت میں خوفِ خدا اس کے دل میں ہو ۔ (۲) قول بالحق: یعنی ہر حالت میں حق بات پر ڈٹا رہے خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض، دوست ہو یا دشمن، کسی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھے بغیر سچ بات کرے ۔ (۳) قصد: اعتدال اور میانہ روی خرچ کرنے میں چاہے فراخیٔ رزق ہو یا فقر و فاقہ، ہر حالت میں افراط و تفریط یعنی اسراف اور بخل دونوں سے بچے اور ان کے درمیانی حالت کو اختیار کرے ۔

مُہلکات: ۔ اسی طرح دُنیوی و اُخروی ہلاکتوں سے بچنے کے لیے بھی تین چیزیں ایسی ہیں جن سے بچنا چاہیئے ۔ (۱) ھوًی متبع یعنی نفس کی خواہشات کی پیروی، اسلئے کہ خواہشاتِ نفسانیہ کی مخالفت اکبرالمنجیات میں سے ہے جیسے کہ اتباعِ خواہشاتِ نفسانیہ اکبرالمہلکات میں سے ہے ۔ (۲) شح: یعنی بُخل کہ انسان کی طبیعت میں بُخل مل جائے

؎۱ وعن جابر رضی اللہ عنہ قال ذبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عائشۃؓ بقرۃ یوم النحر ۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص۴۲۴ باب جواز الاشتراک فی الھدی واجزاء البدنۃ والبقرۃ کل واحدۃ منھما عن سبعۃ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی سنن ابی داؤد ج ۱ ص۲۵۱ باب فی ھدی البقر ۔

پھر اسی کے مطابق چلتا رہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ بُخل ہے جو حرص کے ساتھ مقرون ہو۔

(۳) اعجاب المرء بنفسہ:۔ یعنی خود بینی پیدا ہو جائے تو اپنے اعمال، احوال، جمال یعنی ہر کمال پر گھمنڈ کرے اور یہ سب سے زیادہ مہلک خصلت ہے، اس کا وبال بھی سب سے زیادہ اور نقصانات بھی سب سے زیادہ ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۹ ص۳۱۸ باب الغضب والکبر الفصل الثالث)

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْن کی تحقیق

سوال:۔ حدیث اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْن کے بارے میں محدثین کی کیا رائے ہے؟ یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو کتاب کا حوالہ دے کر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ مندرجہ بالا حدیث کو امام احمد بن حسین بیہقیؒ نے "شعب الایمانؒ" میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے، اور امام بیہقیؒ کی تحقیق کے مطابق اس روایت کا متن تو مشہور ہے لیکن تمام اسناد ضعیف ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ھٰذا الحدیث شبه مشهور واسناده ضعیف وقد روی من اوجه کلها ضعیفة۔ (شعب الایمان للبیهقی ج۲ ص۲۵۴)

اور علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے بھی جامع بیان العلم وفضلہ ج ص۸ میں امام زہریؒ سے نقل کیا ہے۔

اسی طرح امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء علوم الدین میں نقل کیا ہے۔ (جلد ۱ ص۹)

تاہم ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوعات کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں: ھٰذا حدیث لا یصح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وقال ابن حبانؒ ھٰذا الحدیث باطل لا اصل لہٗ۔ (الموضوعات لابن الجوزی ج۱ ص۲۱۶ کتاب العلم۔ باب طلب العلم ولو بالصین)

امتِ محمدیہ کے تہتر (۷۳) فرقوں کا ثبوت

سوال:۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہوگی۔ کیا یہ کسی صحیح حدیث کا مفہوم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ ایک صحیح حدیث کا مفہوم ہے جسے محدثین نے مختلف سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود و نصاریٰ ۷۱ یا ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور میری اُمت

تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی ۔

لما روی الترمذیؒ : عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال تفرقت الیھود علی احدی و سبعین او اثنتین وسبعین فرقۃ والنصاری مثل ذلک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ ھذا حدیث حسن صحیح ۔ (جامع السنن للترمذی ج۲ ص۹۲)

وقال عبد القاھر بن محمد البغدادیؒ : قد رواہ عن النبی ﷺ جماعۃ من الصحابۃ کانس بن مالکؓ وابی ھریرۃؓ وابی درداءؓ وجابرؓ وابی سعید الخدریؓ وابی بن کعبؓ وعبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ وابی امامۃؓ وواثلۃ بن اسقعؓ وغیرھم ۔ (الفرق بین الفرق ص۵ الباب الاول فی بیان الحدیث الماثور) [1]

تفرق کی تحقیق

سوال:۔ مندرجہ ذیل حدیث تفترق امتی ثلاث وسبعین فرقۃ ... الخ میں افتراق سے کیا مراد ہے ؟

الجواب:۔ اس حدیث میں تفرق اور تقسیم سے مراد وہ تفرق ہے جو اصولِ دین میں واقع ہوا ہو اور فروعی اختلاف اس سے مراد نہیں، اس لیے کہ جن فرقوں کا فروع میں اختلاف ہو وہ سب اصول اور بنیادی عقائد میں متحد ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو کفر و گمراہی کی نسبت نہیں کرتے ، اور جو لوگ اصولِ دین میں متفرق ہوں وہ ایک دوسرے کو کافر و گمراہ کہتے ہیں ۔

لما قال الشیخ خلیل احمد السھارنفوریؒ : والمراد من ھذا التفرق ، التفرق المذموم الواقع فی اصول الدین واما اختلاف الامۃ فی فروعہ فلیس بمذموم بل من رحمۃ اللہ سبحانہ فانک تری ان الفرق المختلفۃ فی فروع الدین متحدون فی الاصول ولا یضللون بعضھم بعضاً ۔ واما المتفرقون فی الاصول فیکفر بعضھم بعضاً ویضللون ..... الخ (بذل المجھود شرح ابی داؤد ج ۱۸ ص۱۱ اول کتاب السنۃ ۔ باب شرح السنۃ)

---

[1] عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفرقت الیھود علی احدی وسبعین فرقۃ تفترق امتی علی ثلاث و سبعین فرقۃ ۔

(ابن ماجۃ ص۲۸۷ ابواب الفتن ۔ باب افتراق الامم)

لاتعلموهن الکتابۃ کی تحقیق

سوال:۔ لاتنزلوهن الغرف ولاتعلموهن الکتابۃ۔ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس روایت کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے "شعب الایمان" میں، اور حافظ ابوعبداللہ حاکم نے اپنی "مستدرک" میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے۔

عن عائشۃؓ قالت قال رسول اللہ لاتنزلوهن الغرف ولاتعلموهن الکتابۃ یعنی النساء وعلموهن المغزل وسورۃ النور۔ هٰذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ۔
(مستدرک حاکم ج۲ ص۳۹۶ تفسیر سورۃ النور، النهی عن تعلیم الکتابۃ للنساء)

تاہم بعض علماء نے اس کی عدم صحت پر قول کیا ہے۔

لما قال ابن الجوزیؒ: هٰذا الحدیث لایصح عن رسول اللہ۔ وقد ذکرہ ابوعبداللہ النیشابوریؒ فی صحیحہ والعجب کیف خفی علیہ امرہ۔

قال ابوحاتم ابن حبانؒ: کان محمد بن ابراهیم الشامی (راوی الحدیث) یضع الحدیث علی الشامیین لایحل الروایۃ عنہ الا عند الاعتبار روی احادیث لااصول لها من کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایحل الاحتجاج بہ۔
(کتاب الموضوعات لابن الجوزیؒ ج۲ ص۲۶۹ باب تعلیم النساء سورۃ النور ومنعهن من سکنی الغرف وتعلیم الکتابۃ)[1]

---

[1] قال الشیخ السعید بن سیونی زغلول تحت حدیث ابی هریرۃ لاتعلموا النساء الکتابۃ لاتسکنوهن الغرف۔۔۔الخ
ومن حدیث عائشۃؓ من طریق محمد بن ابراهیم الشامی عن شعیب بن اسحاق الدمشقی عن هشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ لاتسکنوهن الغرف ولاتعلموهن الکتابۃ وعلموهن المغزل وسورۃ النور۔

قال ابن الجوزی رحمہ اللہ: هٰذا حدیث لایصح وقد ذکرہ الحاکم فی صحیحہ۔ واعلہ ابن الجوزیؒ بمحمد بن ابراهیم الشامی۔ قال ابوحاتم بن حبان کان محمد بن ابراهیم الشامی یضع الحدیث علی الشامیین لایحل الروایۃ عنہ الا عند الاعتبار روی احادیث لااصول لها من کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایحل الاحتجاج بہ۔

(حاشیۃ مسند الفردوس الدیلمی ج۵ ص۱۹ رقم حدیث ۷۳۱۷)

امام مہدیؑ کے بارے میں روایات کی تحقیق

سوال:۔ کیا مہدی علیہ السلام کے آنے کے بارے میں جو باتیں زبان زدِ عام ہیں یہ صحیح روایات سے ثابت ہیں یا کوئی عام واقعہ ہے جس نے شہرت پائی ہے؟

الجواب:۔ امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں واقعات درست اور صحیح روایات سے ثابت ہیں اور احادیث کی اکثر کتابوں میں مستقل باب کے تحت روایات کو جمع کیا گیا ہے جن میں امام مہدی علیہ السلام کے حالات تفصیل کے ساتھ مذکور رہیں مثلاً جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، مستدرک حاکم، مسند احمد ابن علم، مسند ابویعلی، مسند ابن ابی شیبہ، طبقات، صحیح ابن حبان وغیرہ۔

اور مجموعی لحاظ سے امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں روایات تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہیں، چنانچہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے تواتر کو یوں نقل کیا ہے:۔

قال ابوالحسن الآمدی فی مناقب الشافعی تواترت الاخبار بان المهدی من هٰذه الأمّة وان عیسٰی علیه السلام یُصلّی خلفه۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۴۹۴ باب نزول عیسٰی ابن مریم علیهما السلام)[1]

اللہ طاق ہے، کی روایت کی تحقیق

سوال:۔ حدیث "اللہ تعالیٰ کی ذات طاق ہے اور طاق چیز کو پسند کرتی ہے لہٰذا اے اہلِ قرآن! تم طاق نماز یعنی وتر پڑھا کرو"۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ یہ روایت کتبِ حدیث کی کون سی کتاب میں مسطور ہے؟ ذرا وضاحت سے رُوشناس فرمائیں؟

الجواب:۔ یہ روایت حدیث کی اکثر کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے یوں منقول ہے:۔

قال الامام محمّد بن عیسٰی الترمذیؒ: بسندهٖ عن علیؓ قال الوتر لیس کصلٰوتکم المکتوبة

---

[1] ونقل عن الشوکانی: انّها متواترة بلاشكّ ولا شبهة بل یصدق وصف التواتر علی ما هو دونها علی جمیع الاصطلاحات المحررة فی الاصول۔ (الاذاعة ص ۱۱۳)

وَمِثْلُهٗ فی عقد الدرر فی اخبار المنتظر للعلّامه یوسف بن یحیٰی المقدّسی الشافعی ص ۱۵۔

ولکن سُنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انّ اللہ وترٌ یحبّ الوتر فا وتروا یا اھل القراٰن۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص۱۰۶ باب ماجاء ان الوتر لیس بحتم) [1]

شھرا عید لا ینقصان کی تحقیق

سوال: درج ذیل حدیث: شھرا عید لا ینقصان رمضان وذوا لحجّۃ کا مطلب اور مفہوم کیا ہے؟ ذرا وضاحت کے ساتھ اس کی تحقیق سے نوازیں؟

الجواب:۔ شھرا عید لا ینقصان کے بارے میں ائمہ حدیث سے مختلف توجیہات منقول ہیں لیکن مشہور اور قریب الی الفہم جو توجیہات ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان اور ذوالحجۃ ایک سال میں دونوں ۲۹ دن کے نہیں آتے، اگر ایک ۲۹ دن کا آئے تو دوسرا ضرور ۳۰ دن کا آئے گا۔

(۲) امام اسحٰق بن راہویہ اور امام بخاری رحمہم اللہ اس کا مطلب واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بظاہر عددِ ایّام کے اعتبار سے رمضان اور ذوالحجہ کے مہینے اگرچہ ۲۹ دن کے آئیں لیکن باعتبار اجر و ثواب ۳۰ دن کے برابر ہوں گے۔

(سنن ترمذی ج ۱ ص۸۵ باب ماجاء شھرا عید لا ینقصان) [2]

انا نبیّ و اٰدم بین الماء و الطّین کی تحقیق

سوال:۔ ایک واعظ سے میلاد شریف کے وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین و آخرین ہونے کے بارے میں یہ الفاظ سُنے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا نبیّ و اٰدم بین الماء و الطّین، کیا یہ روایت بایں الفاظ ثابت ہے؟ اور کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ونقل ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ فی سننہ بسندہٖ عن علیّ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اھل القراٰن اوتروا فانّ اللہ وترٌ یحبّ الوتر۔
(سنن ابی داؤد ج ۱ ص۲۰۷ باب تفریع ابواب الوتر۔ باب استحباب الوتر)
وَمِثْلُہٗ فی سُنن ابن ماجہ ج ۱ ص۸۳ باب ماجاء فی الوتر۔

[2] نقل ھٰذین التوجیھین ابو عیسٰی ترمذی رحمہ اللہ فی متن سنن ترمذی ج ۱ ص۱۴۸ باب ماجاء شھرا عید لا ینقصان)

اوّلین و آخرین نبی ہیں ؟

الجواب: نصوصِ صریحہ اور اجماعِ اُمت سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوّلین اور آخرین پیغمبر ہیں، لیکن جہاں تک مذکورہ الفاظ کا تعلق ہے تو بایں الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت ثابت نہیں، البتہ معنیٰ کے اعتبار سے روایت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عن ابی ھریرۃ قال قالوا یارسول اللہ متی وجبت لك النبوۃ قال وآدم بین الروح والجسد، رواہ الترمذی۔ (شرح طیبی ج۱۱ ص۳۵۳ باب فضائل سید المرسلین) [1]

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ الخ کی تحقیق

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے سکول کی دیوار پر ایک حدیث ان الفاظ کے ساتھ لکھی ہوئی ہے طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ کیا یہ حدیث کسی کتاب میں موجود ہے یا نہیں ؟

الجواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مسلم مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے اور اس حدیث کو صحیح اور مستند کتابوں نے ذکر کیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث میں مسلمۃ کا لفظ زائد ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلم وواضع العلم عند غیر اھلہ کمقلّد الخنازیر الجوھرۃ واللؤلوء والذھب۔ (ابن ماجۃ ص۲۰ باب فضل العلماء والحث علیٰ طلب العلم) [2]

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا کی تحقیق

سوال: جناب مفتی صاحب! میں نے ایک عالم دین سے وعظ میں سنا ہے کہ

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: ای وجبت لی النبوۃ والحال ان آدم بین الروح والجسد یعنی انہ مطروح علی الارض وصورۃ بلا روح والمعنی انہ قبل تعلق روحہ بجسدہ۔ (مرقات ج۱۱ ص۵۸ باب فضل سید المرسلینؐ۔ الفصل الثانی)

[2] عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کلّ مسلم واضع العلم عند غیر اھلہ کمقلّد الخنازیر الجوھر واللؤلو والذھب۔ (مشکوٰۃ ص۳۴ کتاب العلم۔ الفصل الثانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

الجواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب میں بہت ساری روایات مروی ہیں مگر مندرجہ بالا روایت کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، علماء حدیث نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ مُلّا علی القاریؒ: حدیث "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا" (الحدیث) رواہ الترمذی فی جامعۃ وقال انہ منکر، وکذا قال البخاری وقال انہ کذب لا اصل لہ وکذا قال ابوحاتم ویحیٰ وسعید۔ (موضوعات الکبریٰ ص۷۱ حدیث ۲۵۱) [1]

ابوحنیفۃ سراج اُمتی کی تحقیق

سوال: محترم مفتی صاحب! میں ایک دن الدر المختار کا مقدمہ مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق دیگر روایات کے علاوہ ایک یہ روایت بھی نظر سے گذری جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ابوحنیفۃ سراج اُمتی" (رواہ ابواللیث) کیا یہ روایت صحیح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

الجواب: امام ابوحنیفہ رحؒ کے بارے میں جو روایات ذکر کی جاتی ہیں اگرچہ ان میں سے بعض میں آپؒ کی منقبت اور فضیلت کی طرف اشارہ ملتا ہے مگر اکثر روایات موضوع اور غیر ثابت شدہ ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ روایت بھی ہے، مذہب حنفی کے مشہور و معروف محدّث اور فقیہ مُلّا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کو موضوع کہا ہے۔

قال العلامۃ مُلّا علی القاریؒ: حدیث: "ابوحنیفۃ سراج اُمتی"۔ موضوعٌ باتفاق المحدّثین۔ (موضوعات الکبریٰ ص۴۷ حرف الھمزۃ۔ رقم الحدیث ۱۴۳) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن الجوزیؒ: قال یحیٰی بن معین ھٰذا الحدیث کذب لیس لہٗ اصل، وقال ابن عدیؒ: ھٰذا الحدیث موضوع یعرف بابی الصلت (م (الموضوعات ج ا ص۳۵۴ باب فضائل علی علیہ السلام)

[2] قال العلامۃ ابن الجوزیؒ، حدیث: "یکون فی اُمتی رجل اسمہ النعمان وکُنیۃ ابوحنیفۃ ھو سراج اُمتی" قال الخطیب: ھٰذا حدیث موضوع تفرد بروایۃ البورقی۔ قال وحدثتُ عن ابی عبد اللہ الحاکم انہ قال، وضع ابوعبد اللہ البورقی من المناکیر عن الثقاۃ مالا یحصی وافحشہا ھٰذا الحدیث۔ (الموضوعات لابن الجوزیؒ ج ۲ ص۴۸ باب فضل ابی حنیفۃؒ)

مانقول فی ھٰذا الرجل کا مطلب

سوال:۔ قبر میں سوال وجواب کے بارے میں جو روایت مروی ہے اس میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں "ما تقول فی ھٰذا الرّجل"۔ ھٰذا اسم اشارہ ہے جس سے معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے ہوں گے جبکہ آپؐ تو مدینہ منورہ میں اپنے روضۂ اطہر میں آرام فرما ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے؟

الجواب:۔ محدثینِ عظام نے ان الفاظ کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک پیش کی جاتی ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ درمیان سے حجابات ہٹا دیئے جاتے ہیں، جبکہ علامہ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ بدون کشف حجاب اور بدون شبیہ کے سوال کیا جائے گا، اور یہ بصورتِ امتحان زیادہ قوی ہے۔

قال ابن حجرؒ: ولا یلزم من الاشارۃ ما قیل من رفع الحجب بین المیّت وبینہ صلی اللہ علیہ وسلم حتّٰی یراہ ... اقوی فی الامتحان ... الخ (مرقاۃ شرح المشکوٰۃ)

علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل کی تحقیق

سوال:۔ مندرجہ ذیل حدیث "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" کو واعظین حضرات بہت شدّومد سے بیان کرتے ہیں اور اس سے علماء کی فضیلت ثابت کرتے ہیں، کیا یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں اور اس کا درجہ کیا ہے؟

الجواب:۔ محدثین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے جبکہ بعض علماءؒ نے اس کو موضوع قرار دیا ہے تاہم صرف فضیلت العلم کے طور پر بیان کرنا ممنوع نہیں ؟

قال العلامۃ طاھر بن علی الھندی رحمہ اللہ: وعلماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل۔
قال شیخنا الزرکشی رحمہ اللہ لا اصل لہٗ ولا یعرف فی معتبر وروی بسند ضعیف۔
(تذکرۃ الموضوعات ص۲۰) [1]

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاری رحمہ اللہ: علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ قال الدمیریؒ والعسقلانیؒ لا اصل لہٗ۔ وکذا قال الزرکشیؒ وسکت عنہ السیوطی۔ (موضوعاتِ کبریٰ ص۱۵۹ رقم حدیث ۶۱۲)۔

رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ کی تحقیق

سوال:۔ بخاری شریف کی "کتاب العلم" میں ایک حدیث ہے کہ رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ۔ (الحدیث) اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟ میں نے بہت کوشش کی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟

الجواب:۔ علماءِ علم حدیث نے ان الفاظ کی مختلف تاویلات اور مقاصد بیان کئے ہیں' (۱) بہت سی عورتیں دنیا میں اعمال کے اعتبار سے خوب اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر اپنی دیگر بد اعمالیوں کی وجہ سے آخرت میں اعمال سے ننگی (خالی) ہوں گی (۲) مگر مناسب مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت ساری عورتیں اگرچہ بظاہر بدن پر کپڑے پہنے ہوتی ہیں جو اتنے باریک ہوتے ہیں کہ ان کا سارا بدن نظر آتا رہتا ہے، تو ایسی عورتوں کو ننگا ہونے کی آخرت میں سزا ہوگی۔

قال الشیخ محمد زکریا السہارنپوریؒ: اور حقیقی معنیٰ بھی مراد ہوسکتے ہیں کہ بہت سی عورتیں دنیا میں جو لباس پہنتی ہیں وہ شرعاً معتبر نہیں ہوتا مثلاً اندر سے بدن اس میں نظر آتا ہے، تو ایسی عورتوں کو ننگی ہونے کی سزا آخرت میں ملے گی۔ (تقریر بخاری ج۱ ص۱۹۳ باب العلم والعظۃ باللیل)

انا من نور اللہ والمؤمنون منی کی تحقیق

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے نور میں سے نور مانتے ہیں اور دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں: انا من نور اللہ والمؤمنون منّی۔ کیا یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ اقدس کے اعتبار سے بشر ہیں اور آپ میں بشریت کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں لہٰذا آپ کو باعتبارِ ذات نور کہنا صحیح نہیں۔ جہاں تک مذکورہ روایت کا تعلق ہے تو محدثینِ عظام نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔

قال العلامۃ طاہر بن علی الہندیؒ: وفی الذیل "کنتُ نبیًّا وآدم بین الماء والطین وکنت نبیًّا ولا آدم ولا ماء ولا طین"۔ قال ابن تیمیۃ موضوع وھو کما قال وکذلک حدیث "انا من نور اللہ والمؤمنون منّی الخیر فیّ وفی اُمّتی الیٰ یوم القیامۃ"۔ قال ابن حجر لا اعرفہ۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۸۶ فضل الرسول وخصالہ) [1]

---

[1] قال العلامۃ ملا علی قاریؒ: حدیث "انا من نور اللہ والمؤمنون منی"۔ قال العسقلانیؒ: انہ کذب مختلق۔ وقال الزرکشیؒ: لا یعرف۔ وقال ابن تیمیۃ موضوع۔

(الموضوعات الکبریٰ للملا علی قاریؒ ص۷۳)

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا ثبوت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک صاحب نے دوسرے سے کہا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے تو کیا تم مان لوگے؟ تو دوسرے آدمی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا، دونوں کا اس بات پر اختلاف ہے، آنجناب سے استدعا ہے کہ ان کے اس اختلاف کو دور فرمائیں؟

الجواب:۔ ابوداؤد اور دیگر کتب احادیث میں بالفاظ صریح ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر کی وجہ سے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے، لہٰذا اس سے انکار نہ کیا جائے، اور بلا عذر شرعی کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے اجتناب ضروری ہے۔

اخرج الامام ابوداؤد: عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سباطۃ قوم فبال قائماً ثمّ دعا بماء فمسح علیٰ خفیہ۔

(ابوداؤد ج ۱ ص باب البول قائماً) [۱]

سبحان من زین الرجال باللحی الخ کی تحقیق

سوال:۔ سبحان من زین الرجال باللحی وزین النساء بالذوائب (الحدیث) سنتے چلے آرہے ہیں، برائے مہربانی اس حدیث کا حوالہ درکار ہے؟

الجواب:۔ یہ حدیث کتب احادیث میں مختلف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے، مثلاً:۔

قال الامام السرخسیؒ: روی عن النبی انہ قال ان اللہ تعالیٰ ملٰئکۃ تسبیحھم سبحان من زین الرجال باللحی والنساء بالقرون والذوائب۔ (المبسوط ج ۲۶ ص ۷۲ کتاب الدیات) [۲]

---

[۱] اخرج الامام الزیلعیؒ: عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ قال: کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فانتھیٰ الیٰ سباطۃ قوم، فبال قائماً فتنحیت فقال اُدنہ فدنوت حتیٰ قمت عند عقبہ فتوضأ ومسح علیٰ خفیہ۔

(نصب الرایۃ بحوالہ مسلم ج ۱ ص ۱۶۳ کتاب الطہارت)

[۲] قال العلامۃ عبدالرؤف المناویؒ: سُبحان من زین الرجال باللحی والنساء بالذوائب۔

(کنوز الحقائق علیٰ ھامش الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۴۲)

وَمِثْلُہٗ فی مسند الفردوس للدیلمیؒ ج ۲ ص ۹۔

انبیاء کرامؑ کا اپنی قبروں میں نماز پڑھنا

سوال:۔ محترم مفتی صاحب! ایک عالم دین نے واقعۂ معراج بیان کرتے ہوئے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا۔ توکیا یہ روایت صحیح ہے؟ نیز کیا انبیاء کرام کے لیے بعد الوفات بھی نماز پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مرنے کے بعد انسان کسی کے اعمال کرنے کا مکلف نہیں رہتا یعنی نماز وغیرہ پڑھنا اس پر لازم نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ کے بعض نیک بندوں کا اس طرح کرنا ذوقی امور پر محمول ہے، جہاں تک مذکورہ حدیث کا تعلق ہے تو یہ بسند صحیح جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ امام مسلم بن قشیرؒ فرماتے ہیں:۔

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتیت وفی روایۃ مررتُ علی موسیٰ لیلۃ اسری بی عند الکثیب الاحمر وھو قائمٌ یصلی فی قبرہ۔ (الجامع الصحیح المسلم ج۲ ص۲۶۸ باب فضائل موسیٰ علیہ السلام)[1]

لاصلوٰۃ لجار المسجد الخ کا مطلب

سوال:۔ ہم نے علماء دین سے سنا ہے کہ نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے مگر حدیث شریف لاصلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد، سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل بھی مسجد ہی میں پڑھنے ضروری ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہیں تو پھر حدیث کا مطلب کیا ہے؟

الجواب:۔ علماء حدیث نے اس روایت کو فرائض پر محمول کیا ہے کہ فرائض مسجد ہی میں پڑھنا ضروری ہیں اور نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہیں۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد اھ

نقل الشیخ المفتی عزیز الرحمٰن عن السراج المنیر: ھٰذا محمول علی الفریضۃ و ما الحق بھا ففعلھا فی المسجد افضل وما عدا ذلک ففعلہ فی البیت افضل من فعلہ فی المسجد۔ (السراج المنیر بحوالہ عزیز الفتاوی ج۱ ص۱۳۷)[2]

---

[1] ۳۲۳۸۹۔ مررت لیلۃ اسری بی علی موسیٰ عند الکثیب الاحمر وھو قائمٌ یصلی فی قبرہ (کنز العمال ج۱۱ ص۵۱۱)

[2] قال العلامۃ المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: حدیث اول معمول بہا ہے اس طریقہ سے کہ حدیث کو محمول کریں گے فرائض پر اور جو اس کے حکم میں ہو اور نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ (عزیز الفتاوی ج۱ ص۱۴۷ کتاب مایتعلق بالحدیث)

من صلّ عليّ عند قبري الخ کی تحقیق

سوال :۔ بعض لوگ سماع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر کے قائل نہیں اور وہ اِس حدیث من صلّ علیّ عند قبری سمعتُہٗ ومن صلّ علی نائیًا اُبلغتہ کوضعیف کہتے ہیں، کیا واقعی یہ روایت ضعیف اور نا قابلِ حُجت ہے ؟

الجواب :۔ اس حدیث کے بارے میں اگرچہ بعض حضرات نے تضعیف کاقول کیا ہے مگر اکثر محدّثین نے اس کی توثیق کی ہے لہٰذا یہ روایت سماع النبیؐ فی القبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قابلِ حُجت ہے۔

کماذکرالعلامۃ ابوالطیب محمد شمس الدین العظیم آبادیؒ :تحت ذٰلک الحدیث۔ قال ابن القیمؒ وقد صحح اسناد ھٰذا الحدیث وسألت شیخنا ابن تیمیۃ عن سماع یزید بن عبد اللہ من ابی ھریرۃ فقال کا نہ ادرکہ وفی سماعہ منہ نظر انتہٰی کلامہ۔ وقال النوویؒ فی الاذکار ورياض الصالحین : اسنادہ صحیح۔ وقال ابن حجرؒ: رواتہ الثقات۔ اھ (عون المعبود ج۲ ص۲۲ کتاب المناسک) [1]

حدیث قال لایبیع بعضکم الخ کی وضاحت

سوال :۔ جنابِ مفتی صاحب! مَیں نے ایک کتاب میں ایک حدیث پڑھی ہے جو کہ کچھ اس طرح ہے : عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لایبیع بعضکم علی بیع بعض ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟

الجواب :۔ یہ روایت امام ترمذیؒ نے جامع الترمذی ،کتاب البیوع میں نقل کی اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :۔

(۱) عاقدین کے درمیان بیع تام ہوچکی ہو اور ایک دوسرا آدمی آکر بائع سے یہ کہے کہ میں تمہیں اِس چیز کی زیادہ قیمت دیتا ہوں تم اس آدمی سے بیع فسخ کرکے یہ چیز مجھے دے دو۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان بات چیت چل رہی ہے اور بائع مشتری پر چیز فروخت کرنے پر آمادہ بھی ہے کہ تیسرا آدمی آکر بائع سے یہ کہے کہ مجھ سے زیادہ رقم لے کر عقدِ بیع میرے ساتھ کر دو ــــ اس حدیث کی رُو سے یہ دونوں صورتیں ناجائز وحرام ہیں ۔

سوال: حدیث "قال جاء رسول اللہ ﷺ بیتنا وانا صبی" اور فقہی روایات میں تطبیق

عن عبد اللہ بن عمر بن ربیعۃ قال جاء رسول اللہ ﷺ بیتنا وانا صبی صغیر فذهبت العب فقال ای لی یا عبد اللہ تعال اعطیك فقال رسول اللہ ما زدت ان تعطیہ قالت اردت ان اعطیہ تمرًا قال اما انك لم تعطی لکتبت علیك كذبةً (در منثور ج ۳ ص ۲۹۱)

اور علامہ ابن عابدینؒ نے اس سے اپنے بچے کے ساتھ کذب کو مستثنیٰ کیا ہے: قال ابن عابدینؒ: قال رسول اللہ کل کذب مکتوب لا محالہ الا ثلاثۃ الرجل مع امرأتہ او ولدہ والرجل یصلح بین اثنین والحرب۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۲۷ قبیل احیاء الموات)

تو ان دونوں روایتوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

الجواب: اس تعارض بین الروایات کے حل میں تطبیق یہ ہے کہ حدیث اول میں کذب سے مراد کذب صحیح ہے اور حدیث ثانی میں کذب صوری مراد ہے جسے تعریض کہا جاتا ہے، کذب عینی اور حقیقی مراد نہیں ہے۔

قال العلامۃ الشامیؒ: قولہ قال ای صاحب المجتبیٰ وعبارتہ قال کل کذب مکتوب لا محالۃ الا ثلاثۃ الرجل مع امرأتہ اوولدہ والرجل یصلح بین اثنین والحرب فان الحرب خدعۃ قال الطحاوی وغیرہ ھو محمول علی المعاریض لان عین الکذب حرامٌ ...... فالاستثناء فی الحدیث لما فی الثلاثۃ من صورۃ الکذب وحیث ابیح التعریض لحاجۃ لا یباح لغیرھا لانہ یوھم الکذب وان لم یکن اللفظ کذبًا قال فی الاحیاء نعم المعاریض تباح بغرض حقیقی کتطیب قلب الغیر بالمزاح ...... جاز الکذب...... قال الشارح ابن الشحنۃ نقل فی البزازیۃ انہ اراد بہ المعاریض لا الکذب الخالص۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۵ ص ۲۷۵ قبیل احیاء الموات) [1]

---

[1] قال العلامۃ سید احمد الطحطاویؒ: والمراد التعریض عبارۃ المجتبی الطحاوی وغیرہ ھو ای الحدیث محمول علی المعاریض لان الکذب حرام اھ وظاھرہ ان التعریض لا یباح الا فی ھذہ الصور۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص ۲۱۱ قبیل احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی حاشیۃ کشف الاستار علی الدر المختار ج ۲ ص ۲۵۲ فصل فی البیع قبیل باب احیاء الموات۔

احادیث وحی غیر متلو ہیں

سوال :۔ احادیث کو وحی الٰہی قرار دیا جاتا ہے اور جسے علماء دین وحی غیر متلو کہتے ہیں حالانکہ احادیث تو رسول اللہؐ کا کلام ہے تو اُسے وحی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، اس کی دلیل کیا ہے ؟

الجواب :۔ احادیث بھی قرآن کریم کی طرح وحی ہیں جسے علماء کرام وحی غیر متلو کہتے ہیں، تو جب الفاظ اور معنیٰ دونوں منجانب اللہ منزل ہوں تو اُسے وحی متلو کہتے ہیں جو کہ قرآن مجید ہے اور جب معنیٰ اللہ تعالےٰ کی جانب سے اور الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں تو اسے وحی غیر متلو اور احادیث کہتے ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ :۔

(۱) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (سورۃ النجم آیت ۳ ۔ ۴)

(۲) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا ۝ (سورۃ الزمر آیت ۵۱) [۱]

کسی غیر کو باپ بنانے اور حدیث "فالجنۃ علیہ حرام" میں اس کی حرمت کی تحقیق

سوال :۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے غیر کو اپنا باپ بنایا اور وہ جانتا بھی ہو کہ یہ میرا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے، تو کیا حدیث میں لفظ حرام سے حرمتِ ابدی مراد ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اس حدیث میں جنت کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو اس گناہ کو حلال بھی سمجھے تو اس پر جنت ہمیشہ کے لیے حرام ہوگی اور جو حلال نہ سمجھے تو اس پر جنت کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر جنت کا دخولِ اولیٰ فائزین اور اہل السلامہ کے ساتھ حرام ہے، جہنم میں سزا کاٹنے کے بعد اُسے جنت میں داخل کیا جائے گا ۔

قال العلامۃ محی الدین النوویؒ : قولہ فالجنۃ علیہ حرام ...... احدھما انہٗ

---

[۱] قال العلامۃ مُلّا جیون المستدل لایخلوا ما ان یتمسّک بالوحی اوغیرہ والوحی امّا متلوٌّ و ھوالکتٰب اوغیرہ وھوالسنّۃ ۔ (نورالانوار ص۶ تقسیم اصول الشرع)
وَمِثْلُہٗ فی کشف الاسرار علی المنار ج ۱ ص۱ تقسیم اصول الشرع ۔

محمول علیٰ من فعله مستحلاً لهٗ والثانی ان جزاءه انها محرمة علیه اولاً عند دخول الفائزین واهل السلامة ثم انهٗ قد یجازی فیمنعها عند دخولهم ثم یدخلها بعد ذلک وقد لا یجازی بل یعفو اللہ سبحانہ وتعالیٰ عنہ۔

(نووی شرح مسلم ج ۱ ص۵۷ باب حال ایمان من رغب عن ابیہ وقد یعلم) [۱]

حدیث: "بعثنی بالحق لایقبل اللہ صدقة" میں قبول کی تحقیق

سوال: مندرجہ ذیل حدیث مبارک "والذی بعثنی بالحق لا یقبل اللہ صدقة من رجل وله قرابات محتاجون الیٰ صلته و یصرفها الیٰ غیرہ" میں عدم قبول سے کیا مراد ہے؟

الجواب: علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

عن ابی هریرة مرفوعاً الی النبیؐ انه قال یا امة محمد والذی بعثنی بالحق لایقبل اللہ صدقة من رجل وله قرابة محتاجون الیٰ صلته یصرفها الیٰ غیرهم والذی نفسی بیدہ لاینظر اللہ الیه یوم القیامة۔ اور پھر علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے عدم قبول سے مراد عدم ثواب لیا ہے، اگرچہ فرض کے ذمہ سے سبکدوش ہوجائے گا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللہ: والمراد بعدم القبول عدم الاثابة علیها وان سقط بها الفرض لان المقصود منها سد خلة المحتاج۔ الخ

(رد المحتار علیٰ هامش الدر المختار ج۲ ص۷۵ قبیل باب صدقة الفطر) [۲]

---

[۱] قال العلامة شبیر احمد العثمانی رحمه اللہ: قوله "فالجنة علیه حرام" الخ۔ اما محمول علیٰ من فعله مستحلاً او علیٰ ان جزاءه انها محرمة علیه اوّلاً عند دخول الفائزین واهل السّلامة ویمکن العفو عنه بفضل اللہ سبحانهٗ وتعالیٰ۔

(فتح الملهم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص۲۳۶ باب حال ایمان من رغب الخ)

وَمِثْلُهٗ فی ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للقسطلانیؒ ج ۹ ص۴۵۵ باب من ادعیٰ الیٰ غیر ابیه۔ کتاب الفرائض۔

[۲] قال الطحطاویؒ: قوله لاتقبل صدقة الرجل۔ ای لایثاب علیها وان سقط الفرض ومثل الرجل المرأة کذا فی کتابة الدر۔ (طحطاوی علی المراقی ص۳۹۴ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی البنایة فی شرح الهدایة ج۴ ص۲۱۴ قبیل باب صدقة الفطر۔

حدیث بئر بضاعۃ کی تحقیق اور احناف کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء حدیث اس حدیث کے بارے میں جو مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۲ الفصل الثانی، باب احکام المیاہ میں ذکر ہے کہ عن ابی سعید الخدریؓ قال قیل یا رسول اللہ انتوضأ من بئر بضاعۃ وھی بئر یلقی فیہ الحیض و لحوم الکلاب الخ۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی۔- کیا یہ حدیث احمد، ترمذی، ابو داؤد اور نسائی میں اسی عبارت کے ساتھ مذکور ہے اور پھر احناف کے ہاں اس حدیث کا کیا جواب ہے؟

الجواب:- حدیث بئر بضاعۃ مسند احمد میں ج ۳ ص ۱۵، ۱۶ پر بسند ابی سعید الخدریؓ اور سنن ترمذی کی ج ۱ ص ۶۲ باب ماجاء ان الماء لا ینجسہ شئ، اور ابو داؤد کی ج ۱ ص ۱۱ باب ماجاء فی بئر بضاعۃ اور سنن النسائی کی ج ۱ ص ۶۲ کتاب المیاہ باب ذکر بئر بضاعۃ میں ادنیٰ لفظی تغیر کے ساتھ مذکور ہے، اور احناف نے اس حدیث کے مختلف جوابات ذکر کیے ہیں کہ اس کنوئیں کا پانی باغات کو دیا جاتا تھا اس لیے اس کا حکم جاری پانی کا تھا یا پھر کنواں بڑا تھا اور یہ ناپاکی کنوئیں میں اثر پذیر نہیں تھی جس کی وجہ سے اس کے رنگ، طعم اور بو میں فرق آتا ہو۔

قال العلامۃ ابو جعفر الطحاویؒ: فقالوا اما ما ذکرتموہ من بئر بضاعۃ فلا حجۃ لکم فیہ لان بئر بضاعۃ قد اختلف فیھا ما کانت فقال قوم کانت طریقاً للماء الی البساتین فکان الماء لا یستقر فیھا فکان حکم مائھا کحکم ماء الانھار..... فلا ینجس ماؤہ الا ان یغلب علی طعمہ او لونہ او ریحہ او یعلم انھا فی الماء الذی یؤخذ منھا فان علم۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ج ۱ ص ۱۶ کتاب الطہارۃ، باب مایقع فیہ النجاسۃ) [۱]

---

[۱] قال الشیخ محمود حسن الدیوبندیؒ: قال اھل المعانی فی الاصول الاصل فی اللام ان یکون للعھد مالم تکن قرینۃ صارفۃ فاللام فی قولہؐ الماء اہ للعھد الخارجی والمعھود ھو الماء فی بئر بضاعۃ یعنی الماء الذی فی بئر بضاعۃ لا ینجس لا ان مطلق الماء لا ینجس وعدم تنجس مادہ لانہ کان جاریاً فی البساتین وحکم الجاری..... واجاب الطحاوی بان السوال عن حکم الماء کان بعد اخراج النجاسات من بئر بضاعۃ الخ۔ (التقریر للترمذی فی کتاب الترمذی ص ۵ باب ما جاء ان الماء لا ینجسہ شئ۔ کتاب الطہارۃ) ومثلہ فی اعلاء السنن ج ۱ ص ۱۷۷ حدیث بئر بضاعۃ، کتاب احکام المیاہ۔

حدیث لا تشدوا الرحال الخ کی تشریح

سوال:۔ لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجدی ھذا و مسجد الاقصیٰ و مسجد الحرام۔ یہ ایک حدیث ہے، اس کے مطابق ان تینوں مساجد کے علاوہ ثواب کی نیت سے دوسری جگہوں کے لیے سفر کرنا اور سامان باندھنا جائز نہیں ہے، کیا واقعی مسئلہ اسی طرح ہے یا اس حدیث کا کچھ اور مطلب ہے؟

الجواب:۔ حدیث کے الفاظ سے تو بظاہر یہی مطلب نکلتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ جگہوں کے علاوہ اعمال میں ثواب کی زیادتی کی نیت سے سفر کرنا ممنوع ہے۔ اور اس حدیث میں علت نیت تقرب اور ثواب سفر الیٰ ھذہ المساجد ہیں، دوسرے اماکن اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، لہٰذا اس حدیث میں زیارتِ قبور، تعلیم و تعلم اور تبلیغ دین وغیرہ کے لیے سفر کرنے میں کوئی ممانعت نہیں کیونکہ زیارتِ قبور اور تعلیم و تعلم وغیرہ کی نیت سے کیے جاتے ہیں نہ کہ خاص ثواب کی نیت سے، اور اس پر جو ثواب ملتا ہے وہ ان الگ وجوہات سے ملتا ہے۔

قال الحافظ ابن حجر العسقلانیؒ: ومنها ان المراد حکم المساجد فقط وانہ لا تشد الرحال الی مسجد من المساجد للصلوٰۃ فیہ غیر ھذہ الثلاثۃ واما قصد غیر المساجد لزیارۃ صالح او قریب او صاحب او طلب علم او تجارۃ او نزھۃ فلا یدخل فی النھی ویؤیدہ ما روی احمد۔ الخ

(فتح الباری شرح صحیح البخاری ج ۳ ص ۵۳ کتاب التھجد، باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ)[1]

---

[1] قال العلامۃ عینیؒ: وقال شیخنا زین الدین من احسن محامل ھذا الحدیث ان المراد منہ حکم المساجد فقط وانہ لا یشد الرحل الی مسجد من المساجد غیر ھذہ الثلاثۃ فاما قصد غیر المساجد من الرحلۃ فی طلب العلم وفی التجارۃ والتنزہ وزیارۃ الصالحین والمشاھد وزیارۃ الاخوان ونحو ذلک فلیس داخلاً فی النھی وقد ورد ذلک مصرحاً بہ فی بعض طرق الحدیث الخ۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۷ ص ۲۵۴ باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، کتاب التھجد)

ومثلہ فی فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۲ ص ۴۳۳ کتاب التھجد، باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ۔

حدیث المولود حتی یبلغ الحنث مایعمل من حسنة الخ اور فقہی روایت میں تطبیق

سوال:- واخرج ابن مردویۃ عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ المولود حتی یبلغ الحنث ما یعمل من حسنۃ اثبت لوالدہ او لوالدیہ وان عمل سیئۃً لم یکتب علیہ ولا علی والدیہ فاذا بلغ الحنث وجری علیہ القلم الخ (درمنثور (تفسیر معارف القرآن ج ۲ ص۲۲)

اور علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وقد قالوا حسنات الصبی لہ لا لابویہ بل لہما ثواب التعلیم۔ (رد المحتار حاشیۃ الدر المختار ج ۱ ص۴۲۶)

وفی خلاصۃ الفتاوی: الصبی اذا عمل من الحسنات قبل ان یجری علیہ القلم کان ثوابًا لہٗ لا لِاَبَوَیۡہِ ولو علم الوالد تلک الطاعۃ کان للوالد ثواب التعلیم۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۱) ثواب مذکورہ بالاحدیث اور ان فقہی روایات میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

الجواب:- یہاں دفع تعارض میں یہ کہنا ممکن ہے کہ حدیث میں ثواب سے مراد ثواب التسبب ہے اور فقہاء کی عبارات میں ثواب سے مراد ثواب العمل ہے، جیسا کہ مرقاۃ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

قال العلامۃ مُلا علی قاری رحمہ اللہ: (الا من صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولد صالح) ..... واما الثلاثۃ المذکورۃ فانہا اعمال تحدث بعد وفاتہ فلا تنقطع عنہ لانہ سبب تلک الاعمال وفی مقام آخر قال وفی معناہ کتب العلوم الشرعیۃ فیکون لہ ثواب السبب۔ (مرقاۃ المفاتیح علی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۲۶۹ کتاب العلم۔ الفصل الاوّل) [1]

---

[1] وقال العلامۃ رافعی رحمہ اللہ: ھٰذا قول عامۃ المشائخ وقال بعضہم ینتفع المرء بعلم ولدہ بعد موتہ ویکون لوالدہ اجر ذٰلک من غیر ان ینقص من اجر الولد شیئ اھ سندھی۔ (التقریرات للرافعی ج ۱ ص۱۱۹ کتاب الجنائز)

وَمِثۡلُہٗ فی شرح الطیبی علی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۳۶۱ کتاب العلم۔ الفصل الاول۔

یتبع المیت ثلاثۃ اھلہ الخ (الحدیث) کی تشریح

سوال:- ریاض الصالحین جلد ۱ ص۱۷۱، رقم حدیث ۴۶۱ میں جو حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ یتبع المیت ثلاثۃ اھلہ ومالہ وعملہ فیرجع اثنان ویبقی واحدٌ یرجع اھلہ ومالہ ویبقی عملہ۔ متفقٌ علیہ۔ **اس حدیث میں** عمل اور اہل تو واضح ہے لیکن مال سے کیا مراد ہے جو اس سے واپس آتا ہے؟

الجواب:- اس حدیث میں مالہ سے مراد غلام، کنیز، خیمے، زائد از کفن چادریں، چارپائی وغیرہ اور وہ سامان جو تدفین کے وقت قبرستان میں کام آتے ہیں اور پھر واپس کئے جاتے ہیں۔

قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: یتبعہ اھلہ ای اولادہ واقاربہ واھل صحبتہ ومعرفتہ ومالہ کالعبید والاماء والدابۃ والخیمۃ ونحوھا قال المظہر اراد بعض مالہ وھو ممالیکہ وقال الطیبیؒ اتباع الاھل علی الحقیقۃ واتباع المال علی الاتساع فان المال حینئذٍ لہ نوع تعلق بالمیت من التجہیز والتکفین ومؤنۃ الغسل والحمل والدفن فاذا دفن انقطع تعلقہ بالکلیۃ وعملہ فیرجع اھلہ ومالہ ویبقی عملہ۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج۹ ص۳۵۶ کتاب الرقاق الفصل الاول) [1]

مقدمہ صحیح مسلم میں ضمائر خطاب کا مرجع

سوال:- جناب مفتی صاحب! صحیح مسلم کے مقدمہ میں " جو عبارات خطاب کے ضمائر سے ذکر کئے ہیں، مثلاً یرحمک اللہ لما سھل الانتصاب لما سئلت وغیرھا۔

---

[1] قال العلامۃ ابن حجر العسقلانیؒ: قولہ یتبعہ اھلہ ومالہ وعملہ ھٰذا یقع فی الاغلب ورب میت لا یتبعہ الا عملہ فقط والمراد من یتبع جنازتہ من اھلہ ورفقتہ ودوابہ علیٰ ما جرت بہ عادۃ العرب واذا انقضیٰ امر الحزن علیہ رجعوا سواء اقاموا بعد الدفن ام لا...... قال الکرمانیؒ: التبعیۃ فی حدیث انسؓ بعضھا حقیقۃ وبعضھا مجازٌ فیستفاد منہ استعمال اللفظ الواحد فی حقیقۃ ومجازہ۔

(فتح الباری شرح صحیح البخاری ج ۱۱ ص۳۱۵ کتاب الرقاق الفصل الاول)

ومثلہٗ فی حاشیۃ مشکوٰۃ المصابیح للعلامۃ تبریزی ج۲ ص۴۴۳ کتاب الرقاق الفصل الاول)

تو ان ضمائر خطاب کا مرجع کون ہے، حل فرما کر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ مقدمہ مسلم شریف میں جتنے ضمائر خطاب کے آئے ہیں اُن کا مرجع یا تو امام مسلمؒ کا کوئی شاگرد ہے یا کوئی دوست معاصر! جیسا کہ مسلم شریف کے سبب تالیف اور ضرورت کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

قال الشیخ المفتی محمد فرید مد ظلہ العالی: ذکر فی بعض حواشی مسلم ان المخاطب لھذا اما بعض تلامذتہ واما معاصرہ المصاحب لہ۔

(فتح المنعم شرح مسلم ص۱۷) [1]

مُہرِ نبوت میں لکھائی کی تحقیق

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک کندھوں کے درمیان جو مہرِ نبوت تھی تو اس میں کوئی چیز لکھی ہوئی تھی یا نہیں؟

الجواب:۔ مہرِ نبوت میں کیا لکھا ہوا تھا، اور تھا بھی یا نہیں! علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن حبانؒ وغیرہ نے اس بات کی تصحیح کی ہے کہ اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، جبکہ بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سر فانت المنصور لکھا ہوا تھا، مگر بعض دوسرے اکابر کی رائے یہ ہے کہ یہ روایتیں ثبوت کے درجہ کو نہیں پہنچی ہیں اور مہرِ نبوت پر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔

قال العلامۃ ملا علی قاریؒ: وقال العسقلانیؒ وروایۃ کانت بضعۃ ناشزۃ او کرکبۃ عنز او کشامۃ خضراء او سوداء مکتوب فیہا محمد رسول اللہ او سر فانک المنصور لم یثبت منہا شیء وتصحیح ابن حبان۔ (جمع الوسائل فی شرح الشمائل ج۱ ص۶۲ باب ماجاء فی خاتم النبوۃ) [2]

---

[1] قال محمد طاہر رحیمی: اس کا مخاطب ابو اسحٰق ابراہیم راوی صحیح مسلم ہے اور یہ سبب تالیف کی طرف اشارہ ہے کہ تم لوگوں کا یہ مطالبہ ہوا کہ میں احادیث متداولہ بیں اسانید سمیت ایک ایسا مختصر سا مجموعہ مدون کروں۔ الخ

(عمدۃ المفہم فی حل مقدمہ مسلم ص۲۳)

[2] اخبرنا نصر بن الفتح بن سالم الربعی العابد بسمرقند: حدثنا رجاء ابن مرجی الحافظ حدثنا اسحاق بن ابراہیم القاضی بسمرقند حدثنا ابن جریج عن عطاء عن ابن عمر قال کان خاتم النبوۃ فی ظہر رسول اللہ مثل البندقۃ من لحم علیہ مکتوبٌ محمد رسول اللہ۔

(الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ج۸ ص۲۲ رقم حدیث: ۶۲۶۹ باب ذکر حقیقۃ الخاتم)

وَمِثْلُہٗ فی خصائل ترمذی شرح شمائل ترمذی ص۲۸ باب ماجاء فی خاتم النبوۃ۔

سوال:۔ بخاری شریف | حدیث فانها تذهب حتی تسجد تحت العرش الخ کی تشریح

کی ایک حدیث ہے : عن ابی ذرٍ قال کنت مع النبیؐ فی المسجد عند غروب الشمس فقال یا ابا ذر اتدری این تغرب الشمس قلت اللّٰہ ورسولہ اعلم قال فانها تذهب حتی تسجد تحت العرش فذلك قوله تعالیٰ: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ○ (سورۃ یٰسٓ) اب سوال یہ ہے کہ تمام ممالک کے اوقات جدا جدا ہیں۔ مثلاً یہاں پاکستان میں رات ہے تو کئی دوسرے ممالک میں دن ہوتا ہے۔ اب اگر ہم یہاں سے رات کے بارہ بجے یہ خبر نشر کریں کہ سورج عرش کے نیچے سجدے میں ہے تو اُس وقت دنیا کے کئی ممالک میں صبح کے آٹھ بجے ہوں گے وہاں کے لوگ کہیں گے کہ یہاں تو سورج چمکتا ہوا دکھائی دے رہا ہے لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ اس وقت سورج عرشِ الٰہی کے نیچے سجدے میں ہے۔ تو برائے مہربانی حدیث کی تشریح فرمائیں ؟

الجواب:۔ رفع اشکال کے لیے علماء امت نے اس حدیث کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ مثلاً علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورج کی روح اوپر جا کر سجدہ کرتی ہے جو کہ سورج کی حرکت کے ساتھ معارض نہیں ہے خصوصاً جبکہ یہ غروب بہ نسبت معظم معمورہ کے مراد ہے۔ اور بعض علماء نے یہ توجیہہ کی ہے کہ چونکہ عرش تمام کائنات کے اوپر ہے اور سورج اپنی رفتار کے وقت ضرور عرش کے نیچے سے گذرے گا اس لیے اس میں کوئی بات خلافِ عقل نہیں ہے البتہ ماوراء العقل ضرور ہے، چونکہ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے جس کا تعلق وحی سے ہے اس لیے ہم اس کے ادراک اور مشاہدہ کے مکلف نہیں ہیں بلکہ ہمیں اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قال العلامة بدر الدین العینی رحمه اللّٰه: الارضون السبع فی ضرب المثال کقطب الرحی والعرش العظیم ذاته کالرحی فاینما سجدت الشمس سجدت تحت العرش وذٰلك مستقرها۔۔۔۔۔۔ السمٰوٰت والارضون وغیرها من جمیع العالم تحت العرش فاذا سجدت الشمس فی ای موضع یصح ان یقال سجدت تحت العرش۔۔۔۔۔۔۔۔ لاینکران یکون لها استقرار تحت العرش من حیث لا ندرکه ولا نشاهده وانما اخبر

عن غیب فلا نکذبه ولا نکفره ان علمنا لا یحیط به۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۱۵ ص ۱۱۹ باب صفۃ الشمس والقمر بحسبان۔ کتاب بدء الخلق) ؎۱

حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ الخ کا مطلب

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! کئی دنوں سے ایک سوال ذہن میں کھٹک رہا ہے کہ حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے ساتھ مطلقاً مشابہت اختیار کرنا ممنوع ہے، حالانکہ آجکل بہت سارے امور میں مسلمان کفار کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟

الجواب : حدیث کے یہ الفاظ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، مگر اس میں کفار کے ساتھ مطلقاً مشابہت اختیار کرنا مراد نہیں بلکہ ان امور میں مشابہت اختیار کرنا مراد ہے جو ان کے مذہبی اور دینی شعار یا رسم ورواج ہوں، جیسے زنار وغیرہ پہننا۔

قال العلامۃ طیبی رحمہ اللہ : (قوله مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ) هذا عام فی الخلق والخلق والشعار واذا کان الشعار اظهر فی التشبیه ذکر فی هذا الباب۔ (شرح طیبی ج ۸ ص ۲۱۹ کتاب اللباس۔ الفصل الثانی) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ قسطلانی رحمہ اللہ : والجواب ان الارضین السبع فی ضرب المثال کقطب رحیٰ والعرش العظیم ذاته بمثابة الرحیٰ فاینما سجدت الشمس سجدت تحت العرش۔۔۔الخ (ارشاد الساری شرح صحیح البخاری ج ۵ ص ۲۵۸ باب صفۃ الشمس والقمر۔ کتاب بدء الخلق)

وَمِثْلُهٗ فی عون الباری لحل ادلۃ البخاری ج ۴ ص ۱۰۷ غروب الشمس سجودها تحت العرش۔

؎۲ قال العلامۃ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ : ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار یا دینی رسم اور قومی رواج ہے، جیسے زنار وغیرہ پہننا یا مجوس کی خاص ٹوپی جو ان کے مذہب کا شعار ہے اس میں تشبہ حرام بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔ (امداد الاحکام ج ۱ ص ۲۸۶ کتاب ما یتعلق بالحدیث والسنۃ)

وَمِثْلُهٗ فی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس۔ الفصل الثانی۔

تطبیق بین الاحادیث

سوال:۔ داڑھی کو خضاب کرنے کے بارے میں درج ذیل چند احادیث بندہ کے علم میں ہیں جن کی وجہ سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکتا، قبل ازیں حرمت کی وجہ یہ گردانتا تھا کہ چونکہ خضاب وسمہ حرام ہے کہ یہ جرم پکڑتا ہے جس کی وجہ سے وضو میں خلل پڑتا ہے، اب دورِ جدید کی کالی مہندی میں یہ علت نہیں پائی جاتی لہٰذا اس کا استعمال جائز ہوگا، لیکن احادیث میں ترجیح نہیں دے سکتا اور آپ سے رجوع کرنا ضروری سمجھتا ہوں لہٰذا آپ سے استدعا ہے کہ مدلل جواب سے مستفید فرما کر ممنون فرمائیں، احادیث درج ذیل ہیں:۔

(۱) عن ابی ذرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ان احسن ما غیّر بہ الشیب الحناء والکتم۔ (رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی)

(۲) عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال یکون فی آخر الزمان یخضبون بھٰذا السواد کحواصل الحمام لایجدون رائحۃ الجنۃ۔ (رواہ النسائی و ابوداؤد)

(۳) عن ابن عباسؓ قال مر علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رجل قد خضب بالحناء فقال ما احسن ھٰذا قال فمر آخر قد خضب بالحناء والکتم فقال صلی اللہ علیہ وسلم ھٰذا احسن من ھٰذا ثم مرّ آخر قد خضب بالصفرۃ فقال ھٰذا احسن من ھٰذا کلہ۔ (رواہ ابوداؤد)

(۴) عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم غیروا ولاتشبھوا بالیھود۔ (رواہ الترمذی)

الجواب:۔ احادیث میں کوئی تعارض نہیں، وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ممانعت محمول ہے خالص سیاہ خضاب پر اور احادیث الاجازۃ محمول ہے غیر خالص سیاہ خضاب پر۔
(ھٰذا مایفھم من معتبرات الفقۃ)

ثلاثٌ مُهلِکاتٌ کی تحقیق وتشریح

سوال :- جناب مفتی صاحب! مندرجہ ذیل حدیث کی صحتِ الفاظ اور تشریح فرماویں اور تکمیل بھی فرمادیں، حدیث شریف یہ ہے: "ثلاثٌ مھلکاتٌ۔ اوّل حصہ یاد نہیں دوسرا اور تیسرا حصہ غالباً یہ ہے: ھواءٌ متبع واعجاب المرء بنفسہ؟

الجواب :- مکمل حدیث یہ ہے: عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلٰثٌ منجیاتٌ وثلٰثٌ مھلکاتٌ۔ فاما المنجیات فتقوی اللہ فی السر والعلانیۃ والقول بالحق فی الرضاء والسخط، والقصد فی الغنی والفقر۔ واما المھلکات فھوی متبع وشح مطاع واعجاب المرء بنفسہ وھواشدھن۔ (بیھقی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ باب الغضب والکبر)

مختصر تشریح درج ذیل ہے: (منجیات) ۱ (خوف)

ارشاد نبویؐ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا وآخرت میں ہلاکت سے بچانے اور نجات دلانے کے لیے ضروری ہے کہ مومن میں تین صفات موجود ہوں، یہ تین صفات جس شخص میں بھی پائی جائیں گی وہ ہلاکت سے محفوظ اور کامیابی سے ہمکنار رہے گا۔

پہلی صفت یہ ہے کہ اعلانیہ اور تخلیہ دونوں حالتوں میں وہ اللہ سے ڈرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جس آدمی کے دل میں خوفِ خداوندی اس درجہ میں موجود ہو کہ وہ اعلانیہ اور تخلیہ دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ سے یکساں طور پر ڈرتا ہو وہ یقیناً دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تباہیوں سے محفوظ اس بنا پر رہے گا کہ اس سے نہ تو حقوق اللہ تلف ہوئے ہوں گے اور نہ حقوق العباد۔ وہ دونوں حالتوں میں حدود اللہ کا پابند رہے گا۔ اور ہلاکت وتباہی میں وہی لوگ مبتلاء ہوتے ہیں جو حدود اللہ کو بُری طرح پامال کرتے رہتے ہیں، اور کامیابی سے بھی اس بناء پر وہ ہمکنار رہے گا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی نے دنیا میں اچھی زندگی اور آخرت میں جنّت کا وعدہ فرمایا ہے: واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی الماوٰی۔ (الآیۃ) "جو لوگ کل قیامت کے دن خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈریں اور خواہشاتِ نفس کی ناجائز پیروی کو چھوڑ دیں، اُن کے ٹھکانے کی جگہ جنّت ہی ہے"۔ دنیا میں اچھی زندگی کا وعدہ اس آیتِ کریمہ میں موجود ہے: من عمل صالحاً مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ (الآیۃ) "جو شخص (خوفِ خداوندی کی وجہ سے) عملِ صالح کا پابند ہو خواہ مرد ہو یا عورت، اُسے ہم دُنیا میں اچھی زندگی دیں گے"۔

۲۔ (قول بالحق)

دوسری صفت جس پر نجات کا مدار ہے ہر حالت میں قول بالحق، حق بات کہنی ہے، خواہ کوئی سے خوش ہو یا ناراض، دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ، ارشادِ نبوی کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کے اصولوں کو کسی حالت میں بھی نہ چھوڑا جائے، نہ حق بات کہنے سے سرِ مو انحراف کیا جائے بلکہ حق گوئی کو ہر وقت اپنا شعار بنا یا جائے، خواہ دشمن قوم سے سابقہ کیوں نہ پڑے، یہ بھی ایک ایسی بہترین صفت اور انسانی کمال ہے کہ نہ صرف یہ کہ مومن اور مسلم کے لیے دنیا و آخرت میں ذریعۂ نجات اور کامیابی کی ایک کنجی ہے بلکہ بلا امتیاز مذہب اور قوم و نسل کے جس شخص یا قوم میں بھی یہ صفت پائی جائے گی وہ بین الاقوامی عزت کے مستحق اور عام و خواص، دوست و دشمن سب کے دلوں میں ایسے لوگ محبوب ہی ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے ماننے والوں کو عدل و انصاف پر قائم رہنے کا تاکیدی حکم دیتا ہے، اور اس سے کسی حالت میں بھی پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ۔ (الآیہ) "اے ایمان والو! خدا کی خاطر حق کے گواہ بن کر عدل و انصاف پر ہمیشہ قائم رہو۔" اور وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ (الآیہ) "کسی قوم کے ساتھ بغض و عناد تمہیں ظلم اور بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔" اور كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ (الآیہ) "تمہیں حکم ہے کہ سچے اور حق گو لوگوں کے ساتھ رہو۔"

(۳) **اعتدال**: تیسری وہ صفت جس پر انسانی نجات کا دار و مدار ہے اعتدال ہے، ارشادِ نبوی کا مقصد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان ہر حالت میں خواہ فراخیٔ رزق کی حالت ہو یا فقر و فاقہ اور تنگدستی کی حالت ہو اعتدال کو ملحوظ رکھے، نہ بے جا اسراف اور فضول خرچی کرے نہ بخل اور کنجوسی کو اپنا شعار بنائے کہ خرچ ہی نہ کرے۔ راہِ اعتدال کو اپنانے سے ایک طرف تو انسان کی اقتصادی حالت پر خراب اثر نہیں پڑے گا اور معاشی زندگی میں مشکلات سے دوچار نہ ہو گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: مَا افْتَقَرَ مَنِ اقْتَصَدَ۔ "صاحبِ اعتدال آدمی کبھی فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔" اور دوسری طرف وہ اُس مہلک بیماری سے بھی محفوظ رہتا ہے جو شح کے نام سے موسوم ہے، جس کا ذکر مہلکات کی فہرست میں آئے گا۔ یہی وہ صفت ہے جسے قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نشانی قرار دیا ہے، ارشادِ ربانی ہے: وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا۔ (الآیہ) "اللہ تعالیٰ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ مقدارِ مطلوب سے کمی کرتے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان راہِ اعتدال پر رہتے ہیں۔"

یہ تو منجیات کی مختصر تشریح ہوئی، اب ذیل میں مہلکات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے:۔

مُہلکات | **ہوائے نفس** : انسان کو دُنیوی و اُخروی دونوں قسم کی ہلاکتوں میں ڈالنے والی صفتیں بھی تین تین ہیں، ان سے اگر انسان اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھے تو خطرہ ہے کہ کسی نہ کسی ہلاکت میں مبتلا ہو جائے ــــ پہلی صفت ہوائے نفس کی ناجائز پیروی اور خواہشات کی اتباع ہے جس کو حدیث میں ھویً متبعٌ کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ "ہوائے نفس" ایسی مہلک اور خطرناک بیماری ہے کہ جب ایک دفعہ انسان اس میں مبتلا ہو جائے تو اس کی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے ہدایتِ الٰہی کے تمام دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں اور گمراہی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، بالآخر انسان کو ہلاکت کے کسی نہ کسی گڑھے میں گرنا ہی پڑتا ہے، دنیا میں گمراہی کا شکار ہوگا اور آخرت میں جہنم کے سوا کوئی بھی جائے پناہ اُسے نہیں ملے گی۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ۝ (سورة) "کیا تم بتلا سکتے ہو کہ جن لوگوں نے خواہش نفس کو اپنا خدا اور معبود بنایا ہے جس کے پیچھے وہ چل پڑے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اُنکے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور آنکھوں پر پردہ ڈال کر علم کے باوجود انہیں گمراہ بنایا ہے، تو خدا کے سوا کوئی دوسرا ہے جو انہیں راہِ حق دکھا سکے؟ تم اس پر غور کیوں نہیں کرتے ہو؟"

(۲) فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی (سورة) "جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے باغی ہو کر سرکشی کی روش اختیار کریں اور دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیں تو وہ یہاں سے پلٹ کر جہنم ہی میں جانے والے ہیں۔"

(۲) **شحِ مطاع** : دوسری مہلک اور تباہ کن صفت انسان کے لیے حرص اور بُخل کی اطاعت ہے، یہ خصلت بھی ایسی بُری خصلت ہے کہ جب یہ نفسِ انسانی میں راسخ ہو کر اُسے اپنا محکوم اور تابع بنا دے تو پھر اس سے آزادی غیر معمولی جہاد کے بغیر ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے تابع اور محکوم انسان تمام زندگی میں لازمی طور پر حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو بُری طرح پامال کرتا رہے گا، جس کا انجام اس کے حق میں ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ: وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (سورة) "وہی لوگ کامیاب ہوں گے جو بُخل اور حرص کی اطاعت سے محفوظ رہے۔"

اور جو لوگ حرص اور بُخل کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اُنہیں قرآنِ کریم نے یہ تنبیہ کی ہے کہ اگر یہاں امتحان کی چند روزہ زندگی میں اس کا ازالہ نہ کیا گیا تو آخرت میں تم سخت ہلاکت اور تباہی میں

میں مبتلا ہو کے رہو گے۔ ارشادِ ربانی ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (سورۃ ع)
"جو لوگ خدا کی دی ہوئی نعمتِ مال پر بخل کرتے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ بخل ان کے لیے مفید ثابت ہوگا، یہ بخل ان کے لیے انتہائی مضر ہے، قیامت کے روز بخل کیا گیا مال ایک اژدہا بن کر ان کے گلے میں بصورتِ طوق پڑا رہے گا"۔ بخل اور حرص کے مابین تلازم ہے، ایک ہوگا تو دوسرا بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ اور جو انجام ایک کا ہوگا دوسرے کا بھی وہی انجام ہوگا۔

(۳) اعجابِ نفس: تیسری وہ صفت جو نہ صرف انسان کے لیے مہلک ہے بلکہ مہلکات کی فہرست میں صدر کا مقام رکھتی ہے۔ اعجاب خود بینی اور تکبر کی صفت ہے۔ خود بینی اور تکبر کو تمام مہلکات سے بڑھ کر مہلک اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان میں بندگیٔ رب کا بالکل مفقود ہو جاتا ہے اور وہ اطاعتِ خداوندی کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ یہ صفت اُسے خود خدائی اور الوہیت و ربوبیت کے خواب دکھانے لگتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کر لیتا ہے۔ فرعون نے اسی کی وجہ سے أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ کا نعرہ بلند کیا تھا۔ نمرود بھی اسی کی بدولت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ کہہ گیا تھا، ابوجہل اسی کی "برکت" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ "غزوۂ حنین" میں اعجاب ہی کی بدولت مسلمانوں کو پہلی شکست مل گئی۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ (سورۃ ع) اعجاب اور تکبر ہی وہ صفت ہے جو بہت جلد انسان سے اپنی حقیقت کو بھلا دیتی ہے اور آہستہ آہستہ خدائی کے دعویٰ کے لیے تیار کر دیتی ہے۔

میرے ناقص علم میں اس وقت حدیث کی جو مختصر تشریح تھی وہ عرض کر دی گئی ہے، پوری تشریح کے لیے مزید وقت درکار ہے۔ بہرحال حدیث کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات میں سے ہے جو جوامع الکلم کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

کتاب السلوک

بسم الله الرحمن الرحيم

ثم جعلناك على شريعة من الأمر فاتبعها

کتاب السّلوک

(تصوّف کے احکام و مسائل)

شریعت اور طریقت کی حقیقت

سوال:۔ شریعت اور طریقت ایک ہی چیز ہے یا دونوں میں کوئی فرق ہے ؟

الجواب:۔ شریعت احکام تکلیفیہ کے مجموعہ کا نام ہے، چاہے اعمال ظاہری ہوں یا اعمالِ باطنی، اسی وجہ سے متقدمین علماء کی اصطلاح میں لفظ فقہ امر مجموع کے مترادف سمجھا گیا تھا چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے :

"ھو معرفۃ النفس ما لھا وما علیھا ہے"۔ (توضیح وتلویح ص۲۸ بحث تعریف فقہ)

البتہ متاخرین علماء نے اس میں ذرا سی تبدیلی کی ہے یعنی اعمالِ ظاہری کو شریعت اور اعمالِ باطنی کے طریقوں کو طریقت میں تقسیم کیا ہے لیکن حقیقت میں دونوں ایک ہی چیز ہیں اس لیے جو شخص طریقت کو شریعت سے جدا سمجھتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہے۔

لما قال مجدد الف ثانیؒ: ظاہر را بظاہر شریعت و باطن را بباطن شریعت کہ عبادت از حقیقت است متجلی و متشرین دارند چہ حقیقت و طریقت عبارت از حقیقت شریعت است، و طریقت آں حقیقت نہ آنکہ شریعت امری دیگر است و طریقت و حقیقت دیگر کہ الحاد و زندقہ است۔ (مکتوبات دفتر اول مکتوب ۵۷ جلد ۱ ص۲۳) لـہ

بیعت کی حقیقت

سوال:۔ بعض لوگ بیعت کو صرف جہاد سے مخصوص مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیری مریدی کے نام سے جو بیعت مروج ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ یہ ایک خود ساختہ رسم ہے، کیا واقعی یہ بات درست ہے ؟

الجواب:۔ مرتبہ احسان اور تزکیہ نفس ہر مسلمان پر لازم ہے، اس زمانے میں

لـہ قال الشاہ غلام علیؒ: در بیان آنکہ کمالاتِ الٰہیہ در ہر خاندان برنگ دیگر ظہور نمودہ اند لیکن معیار آنہا شریعت است۔ (مکتوبات شاہ غلام علی ص۹۳ مکتوب ہفتاد و پنجم)

وَمِثْلُہٗ فی المرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص۵۲۶ کتاب العلم۔ الفصل الثالث۔

مرتبہ احسان اور تزکیۂ نفس تصوف سے ہی حاصل ہوتا ہے اور اس بات پر اکثر مشائخ متفق ہیں، اور مرتبہ احسان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ اور بیعتِ مسنونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے ثابت ہے۔

لما قال خطیب ولی الدین التبریزیؒ: الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۱۱ کتاب الایمان، الفصل الاول)

وقال شاہ ولی اللّٰہ محدث الدھلویؒ: واستفاض عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الناس کانوا یبایعونہ تارۃً علی الھجرۃ والجھاد وتارۃً علی اقامۃ ارکان الاسلام۔ الخ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۱۵ پہلی فصل) [۱]

پابندِ شریعت شخص کی بیعت کا حکم

سوال:۔ کیا کسی کامل مرشد سے بیعت کرنا سنت ہے یا واجب؟ اس بارے میں راہنمائی فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی پابندِ شریعت مرشد مل جائے تو باطنی صفائی کے لیے اس کی بیعت کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب اور سنت ہے، اس لیے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرنا ضروری ہے۔

کما قال الشاہ ولی اللّٰہ الدھلویؒ: فاعلم ان البیعۃ سنۃ ولیس بواجبۃ۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۲۱ دوسری فصل) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ فقیر اللّٰہ الحنفیؒ: وھی سنۃ لیست بواجبۃ لان الناس بایعوا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وتقربوا بہا الی اللّٰہ تعالیٰ وما وجدنا الدلیل علی تاثم تارکہا ولم ینکر احد من الائمۃ المھدیین من الصحابۃ والتابعین علی تارکہا فکان الاجماع السکوتی علی انہا لیست بواجبۃ اھ
(قطب الارشاد ص۵۴۳ بحث تکرار البیعۃ ماثورہ)

[۲] قال العلامۃ فقیر اللّٰہ الجلال آبادیؒ: وھی سنۃ لیست بواجبۃ، لان الناس بایعوا النبیؐ الخ۔ (قطب الارشاد ص۵۴۳ بحث تکرار البیعۃ ماثورہ)
ومثلہٗ فی انوار القدسیۃ ص۵

مرشد کے لیے شرائط کا تذکرہ

سوال:- کسی کو بیعت کرنے والے مرشد میں کیا کیا شرائط ضروری ہیں یا ہر شخص کسی کو بیعت کر سکتا ہے؟

الجواب:- مرشد چونکہ فیض حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور وصول الی اللہ میں مدد دیتا ہے اس لیے علماء حق نے اس اہم منصب کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ذکر کی ہیں:-

(۱) وہ شخص عالم ہو (۲) متقی ہو (۳) زاہد فی الدنیا اور آخرت میں رغبت والا ہو (۴) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہو (۵) مشائخ کا صحبت یافتہ ہو۔ جس شخص میں یہ شرائط پائی جائیں تو اس سے بیعت ہونا یا اس کا کسی کو بیعت کرنا جائز ہے، ان شرائط کی عدم موجودگی میں کسی کو بھی بیعت لینے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال الشاہ ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ:- فشرط من یاخذ البیعۃ امور احدھا علم الکتٰب والسنۃ، والشرط الثانی العدالۃ والتقوٰی، والشرط الثالث ان یکون زاھداً فی الدنیا راغباً فی الاٰخرۃ، والشرط الرابع ان یکون امراً بالمعروف ناھیاً عن المنکر، والشرط الخامس ان یکون صحب المشائخ وتأدب بھم دھراً طویلاً واخذ منھم النور الباطن والسکینۃ۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۲۳تا۳۰ الفصل الاول حکمت بیعت)[1]

عورت کے لیے بیعت کا حکم

سوال:- کیا پیری مریدی میں زنانہ کے لیے بیعت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کی صورت کیا ہوگی خصوصاً جبکہ عورت غیر محرم ہو؟

الجواب:- آجکل مشائخ سے جو بیعت کی جاتی ہے وہ دراصل بیعتِ توبہ ہے لہٰذا جب کسی شیخ میں جملہ شرائط موجود ہوں اور پردہ کا بھی اہتمام ہو تو خواتین کا مرشد سے

---

[1] قال الشاہ غلام علی رحمہ اللہ: پیر کسے است کہ تبع سنت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم باشد ظاہراً و باطناً و تارک بدعت و برعقیدہ بزرگانِ سلف مانند حضرت غوث الثقلین رح و شیخ الاسلام گنج شکر رح مستقیم بود و از علم ضروری فقہ بہرہ داشتہ باشد الخ۔

(مکتوبات شاہ غلام علی رح ص۱۰۹ مکتوب ہشتاد و پنجم رسالۂ اول)

وَمِثلُہٗ فی مرصاد العباد للشیخ نجم الدین کبریٰ ص۱۵۸

سے بیعت ہونا جائز اور مرخص ہے۔

کقوله تعالیٰ: یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰهِ۔

(سورۃ الممتحنۃ آیت ۱۲)

لیکن یہ بیعت تو بہ ہوگی اور اس میں ہاتھوں کو مس نہیں کیا جائے گا اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت ان کے ہاتھوں کو مس نہیں کیا تھا۔

کما ذکر الامام البخاریؒ: انّ عائشۃؓ زوج النبیّ اخبرته انّ رسول اللّٰہ کان یمتحن من هاجر الیه من المؤمنات بهٰذه الآیت بقول اللّٰہ: یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَکَ الیٰ قوله غفور رحیم — قال عروۃ قالت عائشۃؓ فمن اقر بهٰذا الشرط من المؤمنات۔ قال لها رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قد بایعتک کلامًا ولا واللّٰہ ما مسّت یده ید امرأۃ قط فی المبایعۃ۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۲ ص ۷۲۶ سورۃ الممتحنۃ۔ باب اذا جاءکم المؤمنٰت)

باقی رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو کس طرح بیعت فرمایا کرتے تھے، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے برتن میں عورتوں کے ہاتھوں کو ڈال کر مس کیا ہے، جیسا کہ علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں ابن مردویہؒ سے نقل کیا ہے۔

(روح المعانی جلد ۲۸ ص ۸۱ پ ۲۸ آیت ۱۲ سورۃ الممتحنۃ)

مگر اس کی تصحیح میں تامل کیا ہے۔

مشائخ صوفیاء کرام کے ہاں عورتوں کو بیعت کرنے کا طریقہ مختلف چلا آرہا ہے بعض مشائخ پانی میں ہاتھ ڈال کر عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے، جیسا کہ شاہ کلیم اللہ جان آبادیؒ کے خلیفہ خاص شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے "نظام القلوب ص ۵" میں ذکر کیا ہے۔ مگر اس بات پر تمام مشائخ صوفیاء متفق ہیں کہ اگر نامحرم عورت بیعت ہونا چاہتی ہو تو پردہ میں بیٹھ کر بیعت لی جائے گی۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ: نوشتہ بودند بعضی عورت طلب مشغولی می نمایند اگر محارم اند چہ مانع است والا در پردہ بنشینند و طریقہ را اخذ نمایند۔ (مکتوبات جلد ۱ ص ۲۸۰ دفتر اول حصہ چہارم مکتوب ۲۵۶) [1]

[1] قال مجدد عبد اللّٰہ الحانی الخالدی النقشبندیؒ: وقال رضی اللّٰہ عنه مجیبًا لمن سأله عن طریق التعلیم للنساء ان کانت المرأۃ محرمۃ فای مانع والا فتجلس وراء الحجاب وتاخذ الطریقۃ۔ (البهجۃ السنیۃ فی آداب الطریقۃ النقشبندیۃ ص ۳۴ فصل فی بیان مایتعلق بالاخذ والشروع فی سلوک الطریقۃ العلیۃ)

بدعتی پیر کی بیعت کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا کسی بدعتی اور ناقص پیر سے بیعت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پیر و شیخ چونکہ وصول الی اللہ کا ذریعہ ہوتا ہے اس لیے اس کے انتخاب میں احتیاط کرنی چاہیئے، بدعتی اور ناقص پیر کی بیعت کرنا اپنے آپ کو تباہی کے دھلانے تک لے جانے کے مترادف ہے اس لیے ایسے کسی بھی پیر سے بیعت نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ شرائطِ ارشاد میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ شیخ کا عقیدہ و عمل بھی ٹھیک ہو اگر عمل و عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ و سنت کے مطابق نہ ہو تو وہ شخص شیخ یا پیر نہیں ہو سکتا۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ: وقوی ترین اسباب فتور در طلب انابت شیخ ناقص است کہ بسلوک و جذبہ کار را تمام ناکردہ بمسند شیخی خود را کشیدہ طالب را صحبت او سم قاتل است و انابت او مرض مہلک۔ (مکتوباتِ مجدد الف ثانی جلد ۱ ص۱۴۴ مکتوب ۶۱) [1]

بیعت توڑنے کا حکم

سوال:۔ میں نے ایک پیر سے بیعت کی تھی اب اس میں کچھ خلافِ سنت و شریعت امور پیدا ہو چکے ہیں تو کیا میں اس کی بیعت توڑ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ شیخ اور مرشد کے انتخاب میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور غیر متبع سنت شخص سے بیعت نہیں کرنا چاہیئے، جو شخص شریعت پر عمل نہیں کرتا وہ شیخ ناقص ہے اور اس کی بیعت توڑنے میں کوئی قباحت نہیں۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ: وقوی ترین اسبابِ فتور در طلب انابت شیخ ناقص است کہ بسلوک و جذبہ کار را تمام ناکردہ بمسند شیخی خود را کشیدہ طالب را صحبت او سم قاتل است و انابت او مرض مہلک۔ (مکتوباتِ مجدد الف ثانیؒ جلد ۱ ص۱۴۴ مکتوب ۶۱) [2]

---

[1] و [2] قال شاہ ولی اللہ محدث الدھلوی رحمہ اللہ: والشرط الثانی العدالۃ والتقوٰی فیجب ان یکون مجتنباً عن الکبائر غیر مصر علی الصغائر۔
(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۲۸ دوسری فصل، شروط دوم مرشد)
ومثلہ فی المرصاد العباد ص۱۵۸

فائدہ نہ ہونے کی صورت میں بیعت توڑنا سوال:- کسی مرشد سے بیعت کرنے کے بعد اس سے فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو تو بیعت توڑنا کیسا ہے اور اگر فائدہ ہوتا ہو تو پھر توڑنا کیسا ہے؟

الجواب:- کسی مرشد سے بیعت کرنے کے بعد اگر کوئی فیض حاصل نہ ہوتا ہو تو دوسرے کسی متبع سنت مرشد سے تجدید بیعت جائز ہے اور اگر فائدہ حاصل ہوتا ہو تو پھر بیعت توڑنا صحیح نہیں، اس سے آدمی میں بے برکتی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا شخص مشائخ کے فیض سے محروم ہو جاتا ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ: فاعلم ان تکرار البیعة من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماثور وکذلک عن الصوفیة اما من شخصین فان کان بظهور خلل فی من بایعه فلا بأس وکذلک بعد موته او غیبته المنقطعة واما بلاعذر فانه یشبه المتلاعب ویذهب البرکة ویصرف الشیوخ عن تعهده۔

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۳۵ حکمت تکرار بیعت) [1]

بدعتی پیر کی بیعت توڑنے کا حکم سوال:- میں نے ایک پیر سے بیعت کی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مشرکانہ و مبتدعانہ عقائد رکھتا ہے، اب اس کی بیعت توڑنا میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- ایک مسلمان کے لیے عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جو شیخ مشرکانہ و مبتدعانہ عقائد رکھتا ہو وہ شیخ ناقص ہے اور شیخ ناقص سے بیعت حرام ہے۔ لہٰذا اس قسم کے عقائد رکھنے والے شخص کی بیعت توڑنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ بیعت توڑنا ضروری ہے۔

لما قال مجدد الف ثانی رحمہ اللہ: وقوی ترین اسباب فتور در طلب انابت است شیخ ناقص کہ سلوک وجذبہ کار را تمام ناکردہ بمسند شیخی خود را کشیدہ طالب را صحبت او سم قاتل

---

[1] قال الشاہ غلام علیؒ: قال العلامة فقیر اللہؒ اما من الشخصین فان کان بظهور الخلل فیمن تبعه فلا بأس۔ (قطب الارشاد ص۵۴۲ بحث تکرار البیعة ماثور)

است وانابت اومرض مہلک۔ (مکتوبات مجدد الف ثانی جلد ا ص۱۴۴ مکتوب ع ۶۱) لہ

مرشد کی وفات کے بعد دوسرے مرشد کی بیعت کرنا

سوال:۔ اگر کسی کا مرشد فوت ہوجائے تو کیا وہ کسی دوسرے متبع شریعت مُرشد سے بیعت کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مرشد کی وفات کے بعد کسی متبع شریعت مرشد سے بیعت ہونا صحیح ہی نہیں بلکہ ضروری ہے تاکہ وصول الی اللہ کا مرتبہ حاصل ہوسکے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: وکذٰلک بعد موتہ وغیبتہ المنقطعۃ۔

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۳۵ حکمت تکرار بیعت) ۲لہ

ذکرِ حدادی کا طریقہ اوراس کی حقیقت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! صوفیاءؒ کے ہاں ذکرِ حدادی کی ایک اصطلاح مشہور ہے، اس کی شرعی حقیقت کیا ہے ؟

الجواب:۔ ذکرِ حدادی اسلاف سے منقول ہے کہ دوزانو بیٹھ کر کلمہ لَاإِلٰہ کو دل سے اداکرے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور لفظ إِلَّا اللہ کو تصوّر میں آسمان سے پکڑے اور دونوں ہاتھوں سے دل پر ضرب لگائے، ذکر کا یہ طریقہ ذکرِ حدادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کما قال الولی الکامل شیخ نظام الدینؒ: طریقِ ذکر حدادی دوزانو بنشیند چنانچہ ہر دو سرِپا برزمین باشد وکلمہ لَاإِلٰہ را از دل کشیدہ ہر دو دست درازکردہ بطرف آسمان بر و لفظ إِلَّا اللہ از آسمان گرفتہ ہر دو دست بستہ بر دل سخت ضرب کنند

لہ قال شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ: والشرط الثانی العدالۃ والتقوٰی۔

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۲۸ دوسری فصل، شروط دوم مُرشد)

وَمِثْلُہٗ فی المرصاد العباد ص۱۵۸

۲لہ قال العلامۃ الشاہ الشکارپوریؒ: وکذٰلک بعد موتہ والغیبۃ المنقطعۃ۔

(قطب الارشاد ص۵۴۳ تکرار البیعۃ ماثور)

وَمِثْلُہٗ فی مکتوباتِ مجدد الف ثانیؒ ج۲ ص۱۲۵ مکتوب ۶۳۔

فائدہ بسیار و تاثیر بے شمار است۔ (نظام القلوب ص۲۳)

صلوٰۃ معکوس کا حکم

سوال:۔ صلوٰۃ معکوس پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ صلوٰۃ معکوس اصل میں ایک مجاہدہ ہوتا ہے اور مجاہدہ میں نقل ضروری نہیں۔ اگرچہ مشائخ چشت میں اس کا ذکر تو پایا جاتا ہے مگر دوسرے ادلہ سے یہ ثابت نہیں، تاہم اس کو نماز مجازاً کہا جاتا ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: وللچشتیۃ صلوٰۃ تسمی صلوٰۃ المعکوس لم نجد من السنۃ ولا اقوال الفقہا ما تشدھا بہ فلذلک حذفناھا والعلم عند اللہ۔

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۸۶ صلوٰۃ المعکوس)

ذکر میں دل پر ضربیں لگانا

سوال:۔ بعض صوفیاء کرام ذکر میں دل پر ضربیں لگاتے ہیں کیا ذکر کرتے وقت ایسا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعی اعتبار سے ذکر میں ضرب برائے تصفیۂ باطن اور بطور علاج کیا جاتا ہے کوئی ضروری عمل نہیں مگر جائز ہے، علماء راسخین نے ضرب مع الذکر کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

کما قال شاہ ولی اللہؒ:۔ فمنہ اسم الذات اما بضربۃٍ واحدۃٍ وصفتہ ان یقول اللہ بالشد والمد والجہر بقوۃ القلب والحلق جمیعاً ثم یلبث حتی یعود الیہ نفسہ ثم یفعل ھکذا وھکذا۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۵۸ چوتھی فصل مشائخ جیلانیہ)[1]

ذاکرین پر وجد طاری ہونے کا حکم

سوال:۔ بعض ذاکرین پر دورانِ ذکر وجد طاری ہو جاتا ہے، کیا ذکر کرتے وقت انسان پر وجد کا طاری ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ذاکر پر وجد و جذب کا آنا حق ہے اور اس کے متعدد اسباب ہیں، اس لیے اگر وجد کی حالت میں مسجد کی بے حرمتی اور شور و غل نہ ہو تو جائز ہے لیکن یہ کسی کمال

---

[1] قال العلامۃ شکارپوریؒ: او بضربۃ بان یقول اللہ بالشد والمد والجہر بقوۃ القلب الخ (قطب الارشاد ص۵۴۹ الطرق الی اللہ تعالیٰ بعدد انفاس المخلوقات) ومثلہ فی نظام القلوب ص۱۵

کی دلیل نہیں بلکہ ضعف کی دلیل ہے۔ تاہم عصرِ حاضر میں ذاکرین پر وجد کا آنا ایک رسم بن چکا ہے جو کمال کی دلیل سمجھی جاتی ہے اس لیے علماء نے اس سے منع کیا ہے۔

کما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: التحقیق القاطع للنزاع فی امر الرقص والسماع یستدعی تفصیلاً ذکرہ فی العوارف المعارف واحیاء العلوم وخلاصۃ ما اجاب بہ العلامۃ النحریر ابن کمال پاشا بقولہ ؎

ما فی التواجد ان حققت من حرج ولا التمایل ان اخلصت من بأس
فقمت تسعی علی رجل وحق لمن مولاہ ان یسعی علی الرأس

الرخصۃ فیما ذکر من الاوضاع

(رد المحتار ج۴ ص۲۵۹ کتاب البیوع۔ باب المرتد)

ذکر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معانقہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ میں نے ذکر کے دوران اللہ تعالیٰ کے ساتھ معانقہ کیا ہے، کیا اس کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس دعویٰ سے ایمان پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟

الجواب: اگر اس سے مراد مراقبہ یا خواب میں اللہ تعالیٰ سے معانقہ کرنا مراد ہو تو جائز ہے اور اگر اس سے مراد حالتِ بیداری میں ہو تو یہ ناممکن ہے اس لیے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا محال ہے لہٰذا اس قسم کے دعویٰ سے ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: بعد بحثٍ طویل۔ والحاصل ان الامۃ قد اتفقت علی انہ تعالیٰ لا یراہ احد فی الدنیا بعینہ۔ (شرح فقہ الاکبر ص۱۲۳ رؤیۃ الباری جلّ شانہٗ فی الدنیا)[2]

---

[1] قال العلامۃ داماد افندی رحمہ اللہ: وفی التسهیل فی الوجد مراتب وبعضہ یسلب الاختیار فلا وجہ للانکار بلا تفصیل۔ (مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر ج۲ ص۵۵۲ فصل فی المتفرقات)

وَمِثْلُہٗ فی طحطاوی شرح مراقی الفلاح ص۱۷۴ کتاب الکراھیۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ان الامام رضی اللہ عنہ قال رأیت ربّ العزّۃ فی المنام تسعاً وتسعین مرّۃ۔

(رد المحتار ج۱ ص۵۱ مطلب یجوز تقلید المفضول مع وجود الافضل)

دلائل الخیرات کے وظیفہ کا حکم

سوال:- بعض صوفیاء دلائل الخیرات کا ورد کرتے اور سالکین کو بھی اس کی اجازت دیتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور اس سے کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں؟

الجواب:- دلائل الخیرات کا اکثر حصہ چونکہ درود شریف پر مشتمل ہے اس لیے اسے بطور وظیفہ پڑھنا جائز ہے بلکہ ثواب کا کام اور رحمتوں کے نزول کا ذریعہ ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنا باعث اجر و ثواب ہے۔

کما ذکر مسلم بن حجاجؒ: عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی علیّ واحدۃ صلی اللہ علیہ عشراً۔ (صحیح مسلم ج۱ ص۱۷۵ باب صلوٰۃ علی النبیؐ بعد التشہد)[۱]

عملیات میں اجازتِ شیخ کا حکم

سوال:- کیا اوراد و وظائف اور عملیات کیلئے شیخ کی اجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ تعویذات اور دیگر عملیات میں اجازتِ شیخ کو ضروری تصور کرتے ہیں؟

الجواب:- اوراد و وظائف کے صرف پڑھنے میں تو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں البتہ اگر شیخ کی اجازت ہو تو ان میں برکات اور فیض منتجاری ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ السیوطیؒ: الاجازۃ من الشیخ غیر شرط فی جواز التصدی للاقراء والافادۃ فمن علم من نفسہ الاھلیۃ جازلہ ذٰلک وان لم یجزہ احد۔ الخ (الاتقان فی علوم القرآن ج۱ ص۱۳۵ الفصل الثالث فی کیفیۃ الاخذ بافراد القرأۃ)[۲]

---

[۱] قال الخطیب ولی الدین تبریزیؒ: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیّ واحدۃ صلی اللہ علیہ عشراً۔
(مشکوٰۃ ج۱ ص۸۶ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفضلھا)
وَمِثْلُہٗ فی القول البدیع ص۱۰۹

[۲] قال العلامۃ جلال آبادی رحمہ اللہ: الاجازہ من الشیخ غیر شرط فی جواز التصدی للافادۃ والاقراء فمن علم من نفسہ الاھلیۃ جازلہٗ ذٰلک وان لم یجزہ احد، الخ۔ (قطب الارشاد ص۶۲۳ الخاتمۃ فی ذکر الاجازۃ)
وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوٰی ج۵ ص۲۵۳ کتاب السلوک۔

مشائخ کا مریدین پر توجہ دینا

سوال:۔ سلسلہ تصوف میں شیخ کا اپنے مریدین پر توجہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس کو کمال کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے، شرعاً مشائخ کا اپنے مریدین پر توجہ دینا کیسا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ مشائخ کا اپنے مریدین پر توجہ دینا جائز ہے جو کہ علماء ربانیین سے منقول ہے، اور اس کا طریقہ اپنے مرشد سے سیکھنا چاہیئے جیسا کہ بعض بزرگوں نے اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: اما هٰذہ التصرفات عند کبرائهم اصحاب الفناء فی اللہ والبقاء به فلها شان عظیم واما عند سائرهم فالتاثیر فی الطالب بتوجه الشیخ الیٰ نفسه الناطقة ویصادمها بالهمة التامة القویة ثم یستغرق فی نسبة بالجمعیة وهٰذا الخ۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۱۱۲ چھٹی فصل تصرفات نقشبندیہ)[1]

مہمان کے لیے اوراد و وظائف چھوڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کا اوراد و وظائف کا معمول ہو تو مہمان آنے کی صورت میں وہ اسے چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص کا کوئی مہمان آجائے تو وہ دو قسم کا ہوگا یا تو اکثر آتا رہتا ہوگا یا کبھی کبھار آتا ہوگا، اگر مہمان اکثر آتا رہتا ہو تو پھر یہ شخص اپنے نفلی معمولات کو قضاء نہ کرے اور اگر کبھی کبھار آتا ہو تو اپنے معمولات چھوڑ کر مہمان کے ساتھ بیٹھنا بہتر ہے۔

لما قال حافظ الدین محمد بن بزاز الکردریؒ: نزل به ضیف وله ورد من النفل فان کان ینزل کثیراً فالورد افضل والا فالاشتغال بالضیف افضل۔

(فتاویٰ بزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۴ ص۲۸ کتاب الصلوٰة۔ نوع فیما یکرہ)[2]

---

[1] قال فقیر اللہ جلال آبادیؒ: والتصرفات الموجبة للکمال عند کبر المشائخ وسائرهم تصرفات اصحاب الفنا فی اللہ والبقاء به ولها شان عظیم فالتاثیر فی باطن الطالب ان یتوجه الشیخ الیٰ نفسه الناطقة ویصادمها بالهمة التامة القویة الخ

(قطب الارشاد ج۲ ص۶۰۶ وللنقشبندیة تصرفات)

[2] قال عالم بن العلاء الانصاریؒ: رجل نزل به ضیف وله ورد من صلوٰة التطوع فان کان هٰذا الرجل کثیر الضیافة لا یترك وردہ۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ ج۱ ص۶۳۳ کتاب الصلوٰة۔ الفصل الثامن)

مجلسِ ذکر میں مشائخ کی ارواح کا آنا

سوال:۔ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ مجلسِ ذکر میں مشائخ کی ارواح آتی ہیں، اس سے تو تجسد الارواح صحیح معلوم ہوتا ہے، کیا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں یہ عقیدہ صحیح ہے؟

الجواب: انبیاء و اولیاء اللہ کی ارواح دنیا میں آسکتی ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تصانیف میں اس کا جواز لکھا ہے، لیکن اس کو عوامی عقیدہ نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ اس طرح کی حکایات بعض اوقات مفضی الی الشرک ہوسکتی ہیں۔

کما قال العلامۃ آلوسیؒ: فقد وقعت رؤیتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ لغیر واحد من الکاملین من ھٰذہ الامۃ۔ (روح المعانی ج۲۲ ص۳۵ سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)[1]

چالیس دن کے چلّہ کا حکم

سوال:۔ بعض صوفیاء کرام چالیس دن کے چلّہ کا اہتمام کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کو وضاحت سے بیان فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر تو اس چلّہ سے مقصود عبادتِ الٰہی ہو اور یہ چلّہ طیبات کی تحریم سے بھی خالی ہو تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں، اور چالیس دن کا تعین اس لیے کرتے ہیں کہ جو عبادت چالیس دن تک خلوصِ نیت سے کی جائے وہ راسخ ہوجاتی ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰىٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ ۝ (سورۃ البقرہ آیت ۵۱)

علّامہ ابو عبد اللہ القرطبیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: وبھٰذا استدل الصوفیۃ علی الوصال وان افضلہ اربعون یومًا۔ (تفسیر قرطبیؒ ج۱ ص۳۹۶ سورۃ البقرۃ)

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: عن انس بن مالکؓ قال

---

[1] قال العلامۃ جلال الدین السیوطیؒ: ولایمتنع رؤیۃ ذاتہ الشریفۃ بجسد وروحہ وذٰلک لانہ صلی اللہ علیہ وسلم وسائر الانبیاء احیاء ردت الیھم ارواحھم بعد ما قبضوا واذن ھم بالخروج من قبورھم والتصرف فی الملکوت العلوی والسفلی۔ (الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۶۳ القول بامکان رؤیۃ النبی فی الیقظۃ)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی للہ اربعین یوماً فی جماعۃ یدرک التکبیر الاولیٰ کتب لہ براٗتان براٗۃ من النار وبراٗۃ من النفاق۔ (الجامع الترمذی ج ۳ ص ۳۳ ابواب الصلوٰۃ) اس میں بھی چالیس دن کو خصوصیت حاصل ہے۔

مشائخ کرام سے اس کے جواز کی تصریحات اور شرائط بھی منقول ہیں، جیسے روزہ رکھنا، شب بیداری، کم بولنا اور کم کھانا وغیرہ۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: قال المشائخ من اراد الدخول فی الامر بعینیۃ یلزمہ مراعات امور دوام الصیام ودوام القیام وتقلیل الکلام والطعام والمنام والصحبۃ مع الانام والمواظبۃ فی الوضوء حالات الیقظۃ وعند المنام وربط القلب مع الشیخ علی الدوام وترک الغفلۃ رأساً۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص ۸۳ شرائط چلہ نشینی)

اولیاء اللہ کی پہچان

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! شریعت مطہرہ کی روشنی میں اولیاء اللہ کی پہچان کیا ہے؟

الجواب:۔ ہر وہ مسلمان جو شریعت کا پابند ہو، متقی پرہیزگار ہو، صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوستوں میں سے ہے۔

لما قال العلامۃ تفتازانیؒ: الولی ھو العارف باللہ تعالیٰ وصفاتہ حسب ما یمکن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانھماک فی اللذات والشھوات۔ (شرح العقائد ص ۱۰۵ تحت قول النسفی وکرامات الاولیاء حق) [1]

کافروں میں اولیاء کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کافروں میں بھی اولیاء ہوتے ہیں، یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب:۔ اگر ان لوگوں کی اولیاء سے مراد صاحبِ توجہ وتصرف ہو تو یہ کافروں میں بھی ہوتے ہیں جنھیں اولیاء الشیطان کا نام دیا جاسکتا ہے اور اگر اولیاء سے ان کی مراد

---

[1] قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: ھو العارف باللہ تعالیٰ وصفاتہ حسب ما یمکن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانھماک فی اللذات والشھوات۔ (کشاف اصطلاحات الفنون ج ۲ ص ۱۵۲۸ فی التحقیق لفظ مولی الموالاۃ۔ الولی) ومثلہٗ فی النبراس ص ۴۷۵ کرامات الاولیاء حق۔

عرفی و اصطلاحی اولیاء الرحمٰن ہوں تو یہ صرف مومنوں میں ہوتے ہیں کافروں میں نہیں ۔
کما قال اللہ تبارك وتعالیٰ : اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۔ (سورۃ یونس آیت ۶۲، ۶۳) [1]

اولیاء اللہ کا جمع ہونا

سوال :۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ جمع ہوتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے یا غلط ؟

الجواب :۔ صوفیاء کرام کے نزدیک اولیاء اللہ بعض اوقات جمع ہوتے ہیں لیکن یہ سب باتیں کشف اور مخفی امور ہیں فتویٰ اور قلم سے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا، البتہ صوفیاؒ کے نزدیک یہ باتیں موجود ہیں کہ غوث کی موجودگی میں زندہ اولیاء جمع ہوتے ہیں اور بعض وفات شدہ اولیاء کی ارواح بھی موجود ہوتی ہیں، لیکن ان سب باتوں کو عوامی جہالت سے بچانا چاہیئے ۔

اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے علامہ عبدالعزیز سلجماسی مالکی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :
حضرت نے فرمایا کہ دیوان اسی غارِ حرا میں لگتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے عبادت کیا کرتے تھے، غوث غار کے باہر اس طرح بیٹھتا ہے کہ مکہ اس کے دائیں شانہ کے پیچھے ہوتا ہے الخ (ابریز ص۵۱۹ چوتھا باب، دیوان صالحین)
حضرت نے فرمایا کہ گذشتہ لوگوں میں سے بعض کاملین بھی دیوان میں حاضر ہوتے ہیں ۔ (ابریز ص۵۲۱ چوتھا باب ۔ دیوان صالحین)
فرمایا کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں شرکت فرماتے ہیں ۔
(ابریز ص۵۲۲ چوتھا باب ۔ دیوان صالحین)

فوت شدہ اولیاء اللہ کی نسبت معلوم کرنا

سوال :۔ کیا کوئی شخص کسی فوت شدہ ولی اللہ کی نسبت معلوم

---

[1] قال العلامة التفتازانیؒ : الولی هو العارف بالله تعالیٰ وصفاته حسب ما یمكن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانهماك فی اللذات والشهوات ۔
(شرح العقائد ص۱۰۵ تحت قول النسفیؒ وکرامات الاولیاء حق)
وَمِثْلُهٗ فی شرح المقاصد ج ۵ ص۷۲ شمول قدرة الله تعالیٰ ۔

کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: کوئی سالک اور متقی و پرہیز گار شخص مراقبہ کے ذریعے فوت شدہ اولیاء اللہ کی نسبت معلوم کرسکتا ہے، اور مشائخ نقشبندیہ کو اس میں مہارت حاصل ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: اَمّا الاطلاع علیٰ نسبۃ اھل اللہ فطریقہ ان یجلس بین یدیہ ان کان حیًّا او قبرہ ان کان میتًا ویفرغ نفسہٗ عن کل نسبۃ ویقضی بروحہ الیٰ روح ھٰذا الشخص زمانًا الخ۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۱۱۶ طریقہ اطلاع نسبت اہل اللہ)[1]

ولایت کے لیے بیعت ہونے کا مسئلہ

سوال: کیا ولایت، طریقت و بیعت کے بغیر مل سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی متبع شریعت شیخ سے بیعت ہونا ایک مستحب امر ہے، حصولِ ولایت کے لیے جتنے ذرائع ہیں کسی سے بیعت ہونا ان میں ایک کامیاب ذریعہ ہے جو لوگ اس کو شرط قرار دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

ایک مرشد کی موجودگی میں دوسرے سے بیعت ہونا

سوال: اگر کوئی شخص پہلے مرشد کی موجودگی میں دوسرے مرشد سے بیعت کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مرشد کی وفات کے بعد بیعتِ ثانیہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: طریقت و بیعت چونکہ اخذِ فیض کے لیے کی جاتی ہے، تو اگر پہلی جگہ سے بیعت کے بعد فیض کے حصول کا یقین نہ ہو تو دوسری جگہ بیعت کرنا جائز ہے، لیکن اس کو عادت نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ اس سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور مرشد سے فیوض و برکات کا حصول مشکل ہوجاتا ہے۔

کما قال الشیخ التھانویؒ و شاہ ولی اللہؒ: اور جب شیخ کی موجودگی میں بیعتِ ثانیہ جائز ہے تو اس کی وفات کے بعد تو بطریقِ اولیٰ جائز ہوگی۔

لما قال شیخ الطائفۃ مجدد الف ثانیؒ: بدانکہ مقصود حق است و پیر وسیلہ است بوصول

---

[1] قال العلامۃ الشکارپوریؒ: واَمّا الاطلاع علی النسبۃ اھل اللہ فطریقہ ان یجلس بین یدیہ ان کان حیًّا وعند قبرہ ان کان میتًا۔ (قطب الارشاد ص۶۵۶)

جنابِ قدسی حق تعالیٰ اگر طالبے رُشد خود را پیش شیخ دیگر بیند و دل در صحبتِ او حق سبحانہ جمعہ یابد روا است کہ در حیات پیرے اذن پیر طالب پیش اذن شیخ بر ورود طلبِ رشد از و نماید اما باید کہ از پیرِ اوّل انکار نکند و جز بہ نیکی یاد نماید۔ (مکتوباتِ مجدد الف ثانیؒ ج ۲ ص۱۲۵ دفتر دوم حصہ ہفتم مکتوب ۱۳) [۱]

پیرِ کامل بننے کی شرط

سوال:۔ ایک شخص کہتا ہے کہ پیر و شیخِ کامل وہ ہے کہ مرید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرائے ورنہ ناقص ہے، کیا اس کا یہ قول صحیح ہے یا غلط؟

الجواب:۔ جو شخص بیعت کے لیے یہ شرط لگاتا ہے وہ غلطی پر ہے، نہ تو یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور نہ صوفیاء کرام نے شرائط مرشد میں اس کا ذکر کیا ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: شرط من یاخذ البیعۃ امور احدھا علم الکتاب والسنۃ الخ

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۲۳ دوسری فصل حکمتِ بیعت) [۲]

ایک پیر کے الفاظ کا حکم

سوال:۔ ایک پیر نے کسی شخص سے کہا کہ مقبولک مقبولی ومردودک مردودی، کیا اس طرح کہنے سے کوئی کام مقبول یا مردود ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر ان الفاظ سے اس کی مراد یہ ہے کہ جو تم کو پسند ہے وہ مجھ کو بھی پسند ہے اور جو کام تجھے ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے تو پھر تو یہ صحیح ہے اور اگر اس کی

---

[۱] قال شاہ ولی اللہؒ: فاعلم ان تکرار البیعۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماثور و کذٰلک عن الصوفیۃ اما من الشخصین وان کان بظهور خلل فی من بایعہ فلا بأس وکذٰلک بعد موتہ وغیبتہ المنقطعۃ واما بلا عذر فانہ یشبہ التلاعب۔

(شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۳۵ حکمت تکرار بیعت)

و مثلہ فی مکاتیبِ شریفۃ شاہ غلام علیؒ ص۲ مکتوب ثانی دہم۔

[۲] قال العلامۃ جلال آبادیؒ: اعلم ان للمشیخۃ واخذ البیعۃ شروط منها علم الکتاب والسنۃ الخ۔ (قطب الارشاد ص۵۲۶ بحث شروط المشیخۃ)

و مثلہ فی مرصاد العباد ص۱۸۵

مراد یہ ہو کہ میرے کہنے سے کوئی کام مقبول یا مردود ہوتا ہے تو یہ غلط ہے کسی کام کے مقبول یا مردود ہونے کا حکم شریعت کے ادلہ اربعہ کر سکتے ہیں کوئی اور شخص نہیں۔

کما قال الشیخ مُلّا جیون رحؒ: ان اصول الشرع ثلاثة...... الکتاب والسنة واجماع الامة...... واصل الرابع القیاس۔ (نور الانوار ص۶ تقسیم اصول الشرع) [1]

نماز روزہ کی معافی کا بے بنیاد دعویٰ

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک شخص اپنے آپ کو پیر ظاہر کرتے ہوئے آیا ہے جبکہ وہ داڑھی بھی منڈاتا ہے اور اعلانیہ کہتا ہے کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نماز روزہ معاف کر دیئے ہیں کیا واقعی کسی آدمی سے نماز روزہ معاف ہو سکتے ہیں؟

الجواب:۔ اگر تو اس شخص کے دماغ میں فرق ہو یا پاگل پن میں صریحاً مبتلا ہو تو پھر اس کے کلام کا کوئی اعتبار نہیں اور اگر مذکورہ شخص صحیح العقل ہو کر ایسی بات کہتا ہے تو وہ زندیق ہے اور اس سے اعتقاد و تعلق رکھنا حرام ہے بلکہ واجب القتل ہے۔

کما قال العلامة التفتازانیؒ: ولا یصل العبد ما دام عاقلاً بالغاً الی حیث لیقط عنه الامر والنهی لعموم الخطابات الواردة فی التکالیف واجماع المجتهدین علیٰ ذٰلك الخ۔ (شرح العقائد ص۱۱۹ ولا یصل العبد...... الخ) [2]

مرشد کو کعبہ اور پیغمبر کہنا

سوال:۔ ایک شخص اپنے مرشد کے متعلق کہتا ہے کہ میرا مرشد میرے لیے کعبہ و پیغمبر ہے، اس شخص کے ان الفاظ کا

---

[1] قال العلامة فخر الاسلام رحمه الله: واصول الفقه الکتٰب والسنّة والاجماع والقیاس۔
(توضیح والتلویح ص۳۳)
وَمِثْلُهٗ فی المولوی علی الحسامی ص۴

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: ونازعه فی نور العین بان ما ذکره من المعنی الوصفی هو معنا الوصفی اما العرفی الذی جری علیه اصطلاح الملاحدة والقلندریة فهو ان جمیع الاشیاء مباحة لك فالحق ان یکفر القائل ان کان من تلك الفئة۔
(رد المحتار ج۴ ص۲۵۹ مطلب فی معنی درویش درویشان)
وَمِثْلُهٗ فی النبراس ص۵۶۲ اختلفوا فی ان نبوة النبی افضل ام ولایته)

حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ مندرجہ بالا الفاظ شریعتِ مقدسہ سے متصادم ہیں، لہٰذا جو طریقت اور اس کے الفاظ شریعت سے متصادم ہوں وہ مردود اور نا قابلِ قبول ہیں۔

لما قال مجدد الف ثانیؒ: کل حقیقۃ ردتہ الشریعۃ فھو زندقۃ۔

(مکتوبات جلد ۱ ص ۱۱۴ دفتر اول، مکتوب ۴۳) [1]

پیر کے بارے میں مبالغہ آمیزی سے کام لینا

سوال:۔ ایک شخص اپنے پیر کے متعلق کہتا ہے کہ جب پیر کو تو نے قبول کیا تو اس میں خدا بھی ہے اور رسول بھی، اور پیر کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اور پیر خدا کا نائب ہے، ان الفاظ کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ الفاظ کسی عالم یا دیندار شخص سے صادر ہوئے ہوں تو ان کی تاویل کی جائے گی اور اگر کسی فاسق وفاجر سے صادر ہوں تو یہ مخالف الشریعت الفاظ ہیں اگرچہ طریقت میں استعمال ہوئے ہیں مگر مردود ہیں کیونکہ جو طریقت شریعت سے مخالف ہو وہ زندیقیت ہے۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ: کل حقیقۃ ردتہ الشریعۃ فھو زندقۃ۔

(مکتوبات جلد ۱ ص ۱۱۴ دفتر اول مکتوب ۴۳)

پیر سے پردہ کرنا

سوال:۔ بعض خواتین پیر سے پردہ نہیں کرتیں، کیا خواتین کا پیر سے پردہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پردہ کے متعلق جو نصوص آئی ہیں وہ عام ہیں، پیر اور دوسرے محارم سب کو

---

[1] قال شاہ غلام علی دھلویؒ: آنکہ کمالاتِ الٰہیہ در ہر خاندان برنگ دیگر ظہور نمودہ اند لیکن معیار اینہا شریعت است۔ (مکتوبات شاہ غلام علیؒ ص ۹۳ مکتوب ہفتاد و پنجم)

وَمِثْلُہٗ فی قطب الارشاد ص ۱۳ مقدمۃ۔

[2] قال شاہ غلام علی دھلویؒ: آنکہ کمالاتِ الٰہیہ در ہر خاندان برنگ دیگر ظہور نمودہ اند لیکن معیار آنہا شریعت است۔ (مکتوبات شاہ غلام علیؒ ص ۹۳ مکتوب ہفتاد و پنجم)

وَمِثْلُہٗ فی قطب الارشاد ص ۱۳ مقدمۃ

شامل ہیں، تو اس وجہ سے دوسرے لوگوں کی طرح پیر سے بھی خواتین کے لیے پردہ کرنا ضروری ہے جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ غلطی پر ہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: ولا ینظر من اشتہی الی وجہها الا الحاکم۔ والشاہد وینظر الطبیب الی موضع مرضہا۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۹۲ کتاب الکراہیۃ۔ فصل فی النظر) [1]

تصوف کے چار سلسلوں کا ثبوت

سوال:۔ بعض لوگ سلاسل اربعہ کا انکار کرتے ہیں کہ ان کی کوئی اصل نہیں، کیا واقعی ان سلاسل کا کوئی وجود ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سلاسل اربعہ (قادریہ، سہروردی، چشتیہ، نقشبندیہ) سے انکار بے معنی چیز ہے یہ تو حد تواتر تک پہنچا ہوا اور مشائخ کا معمول رہا ہے اور ان کا اپنی کتابوں میں باقاعدہ ذکر کیا ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ وبعد از زمان ایں خانوادہا خانوادہائے دیگر پیدا شدند چوں جامعیہ قادریہ، اکبریہ، سہروردیہ، کبرویہ، اولیسیہ وخانوادہ خواجگان خانوادہ معینیہ کہ احیائے طریقہ چشتیہ است ونقشبندیہ کہ آحیائے خانوادہ خواجگان است۔ (همعات ص۱۵) [2]

تصوف سے وابستہ نہ ہونے کی تشریح

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو تصوف سے وابستہ نہیں وہ فاسق ہے، حالانکہ بہت سے علماء تصوف سے وابستہ نہیں تو کیا وہ سب فاسق ہیں؟

الجواب:۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو تصوف سے وابستہ نہیں وہ فاسق ہے، تو اگر تصوف سے ان کی مراد نفس بیعتِ مروجہ ہو تو یہ قول غلط ہے کیونکہ بیعت کرنا واجب نہیں بلکہ سنت

---

[1] قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: ولا ینظر من اشتہی الی وجہها الا الحاکم والشاہد وینظر الطبیب الی موضع مرضہا۔ والاصل فیہ انہ لا یجوز ان ینظر الی وجہ امرأۃ اجنبیۃ مع الشہوۃ۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۱۷ کتاب الکراہیۃ۔ فصل فی النظر)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۶ ص۳۶۷ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی النظر۔

[2] قال العلامة الشکارپوریؒ: ان الطرق الی اللہ کثیرۃ کالشاذلیۃ والسہروردیۃ والقادریۃ الی غیر ذلک۔ (قطب الارشاد ص۵۴۴ الفصل ان العلماء من المتکلمین والفقہاء والمحدثین الخ)

وَمِثْلُہٗ فی شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل ص۴۰ حکمت تکرار بیعت۔

ہے، اور اگر تصوّف سے مراد تزکیہ باطن اور اجتناب عن المعاصی ہو تو پھر یہ قول صحیح ہے، جیسا کہ اکابر نے بھی یہی فرمایا ہے۔

کما قال العلامۃ ملا علی قاریؒ عن امام مالکؒ: من تفقه ولم يتصوّف فقد تفسق ومن تصوّف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما فقد تحقق۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص۵۲۶ کتاب العلم۔ الفصل الثالث)[۱]

سلاسلِ اربعہ حق پر ہیں

سوال:۔ سلاسلِ اربعہ حق پر ہیں یا نہیں اور یہ کون کون سے سلاسل ہیں؟

الجواب:۔ وصول الی اللہ کے متعدد طرق ہیں، ان میں سے بعض طرق وسلاسل آسان اور جلد انسان کو مقصود تک پہنچا دیتے ہیں، اسی آسانی کے لیے مشائخ سے یہ طرق وسلاسل منقول ہیں مگر ان میں چار طرق وسلاسل برصغیر پاک وہند میں زیادہ مشہور ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) الطریقۃ العالیۃ النقشبندیۃ : منسوب بہ خواجہ بہاؤ الدینؒ نقشبند۔
(۲) ״ ״ القادریۃ : ״ ״ شیخ عبد القادر جیلانیؒ۔
(۳) ״ ״ الچشتیۃ : ״ ״ خواجہ معین الدین چشتیؒ۔
(۴) ״ ״ السہروردیۃ : ״ ״ خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ۔

کما قال العلامۃ الشکارپوریؒ: قال الشیخ العارف باللہ ابو اسحٰق ابراہیم الی الطرق الی اللہ کثیرۃ کاشاذلیۃ والسہروردیۃ والقادریۃ الی غیر ذلک۔

(قطب الارشاد ص۵۴۴ الفصل ان العلماء من المتکلمین والفقہاء والمحدثین الخ)[۲]

---

[۱] قال الامام عبد الوہاب الشعرانیؒ: اجمع اہل الطریق علی وجوب اتخاذ الانسان له شیخاً یرشدہ الی زوال تلک الصفات الخ۔ (انوار القدسیۃ ص۵)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر المظہری ج۲ ص۱۰۴

[۲] قال الشاہ ولی اللہؒ: وبالجملہ خانوادہ بسیار بودند وبسیار خواہد بود وحصر آن نامعقول

ثم قال: وبعد از زمان ایں خانوادیا خانواد ہائے دیگر پیدا شدند چوں جامیہ، قادریہ، اکبریہ، سہروردیہ وسیرویہ خانوادہ خواجگان یتبعہ کہ احیائے چشتیہ است در بتیعہ ونقشبندیہ کہ احیائے خانوادہ خواجگان است۔ (ہمعات ص۱۳)

وَمِثْلُهٗ فی شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۱۲ حکمت تکرار بیعت۔

تصوف کے مراقبات اور اذکار کا حکم

سوال: سلسلہ نقشبندیہ میں جو لطائف سبعہ اور اذکار ہوتے ہیں ان کا وجود تو قرونِ ثلاثہ میں موجود نہ تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدعت ہیں، کیا نقشبندیہ سلسلہ کے لطائف سبعہ کا وجود ہے یا نہیں؟

الجواب: مرتبہ احسان حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہوتا ہے جس کا اشارہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث: ان تعبد اللہ کانک تراہ الخ میں ملتا ہے، اب یہ مرتبہ ذکرِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے، تو بعض مشائخ نے جو اذکار مرتبۂ احسان کے حصول کے لیے مقرر کیے ہیں وہ محض آلات ہیں جن سے یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور آلات و معالجات میں یہ ضروری نہیں کہ وہ منقول عن الشارع ہوں صرف یہ ضروری ہے کہ شریعت سے متصادم نہ ہوں اور لطائف سبعہ صرف آلات ہیں شریعت سے متصادم نہیں مشائخ کی کتابوں میں ان کا باقاعدہ تذکرہ موجود ہے۔

کما قال العلامۃ الشکارپوریؒ: اعلم ان اللہ تعالیٰ خلق فی الانسان ستۃ لطائف بل عشرۃ خمسۃ منها من عالم الامر وھی القلب والروح والسر والخفی والاخفی والخمسۃ من عالم الخلق الخ۔ (قطب الارشاد ص۵۶۳ بیان اللطائف الستۃ) [1]

ذکرِ سلطان الاذکار کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! سلطان الاذکار کون سا ذکر ہے۔

الجواب: لطیفہ قلبی کے ذکر کو جب سالک اپنے سارے جسم سے ذکر کرنے لگے نقشبندیہ سلسلہ کے مشائخ نے اسے سلطان الاذکار کہا ہے۔

کما قال العلامۃ الجلال آبادیؒ: ثم یلاحظ اسم الذات فی اللطیفۃ القالبیۃ وھی جمیع البدن واذا غلب الذکر واحاط البدن کلہ حتی صار کل خیر

---

[1] قال شاہ غلام علی دھلوی رحمہ اللہ: طریق مشغولی بذکر حق سبحانہٗ تعالیٰ باتوجہ بلطائفِ سبعہ تا دلال حرکت ذکر پیدا شود اینست الخ۔

(مکاتیب شریفہ شاہ غلام علیؒ ص۱۲ مکتوب دوئم)

ومثلہٗ فی تفہیمات الالٰہیۃ ج۱ ص۲۲۹ ما معنی لطائف السبعۃ۔

من البدن ذاكراً مثل القلب تسمّٰى هٰذہ الحالۃ سلطان الاذکار۔
(قطب الارشاد ص۵۶۷ فی بیان اللطائف الستۃ) لہ

غوث و قطب کے وجود کا حکم

سوال:۔ صوفیاء کرام کے کلام میں قطب، غوث اور ابدال کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں، کیا حدیث اور شریعت میں یہ مراتب موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو ان کی تفصیل بیان کرکے مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ اولیاء اللہ کا وجود قرآن و حدیث سے ثابت ہے، مندرجہ بالا مراتب میں سے صرف ابدال کا ذکر صراحتاً حدیث میں موجود ہے، صحاح ستہ میں سے صرف ابوداؤد کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں ابدال الشام کا ذکر ہے، جو کہ ام المؤمنین سیدہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے۔

عن نبیؐ قال یکون اختلاف عند موت خلیفۃ فیخرج رجلٌ من اھل المدینۃ ھارباً الیٰ مکۃ فیاتیہ ناسٌ من اھل مکۃ فیخرجونہ وھو کارہ فیبایعونہ بین الرکن والمقام ویبعث الیہ بعثٌ من الشام فیخسف بھم بالبیداء بین مکۃ ومدینۃ فاذا رأی الناس ذٰلک اتاہ ابدال الشام الخ
ابوداؤد جلد ۲ ص۲۳۳ کتاب السنن اوّل کتاب المھدی میں صراحتاً ابدال کا ذکر موجود ہے۔

امام ولی الدینؒ صاحب مشکوٰۃ کے مشکوٰۃ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مسند کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

عن شریح بن عبید قال ذکر اھل الشام عند علیؓ وقیل العنھم یا امیر المؤمنین قال لا انّی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول الابدال یکونون بالشام وھم اربعون رجلاً کلّما مات

لہ قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ الباقی رحمہ اللہ: فینتقل الیٰ لطیفۃ الجسد وھی ان یذکر بتجمع الجسد مستحضراً لھا فی نظر القلب بطریق المشاھدۃ فی الجمیع ان تعبد اللہ کانک تراہ ولا یزال علیٰ ذٰلک حتی تصیر جمیع اجزائہ تذکر بدنک ویحصل سلطان الذکر البھجۃ السنیۃ فی آداب الطریقۃ النقشبندیۃ ص۹۲

رجل ابدال اللہ منہ ثلاثون رجلاً یسقی بھم الغیث وینصر بھم الا عداء ویصرف عن اھل الشام بھم العذاب۔ رواہ احمد۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۶۰۲ باب ذکر الیمن والشام الفصل الثالث)

باقی مراتب کا ذکر حدیث میں صراحۃً موجود نہیں ہے البتہ اشارۃً معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ اور مُلّا علی قاریؒ نے ابن عساکرؒ سے نقل کئے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ عزوجل فی الخلق ثلاثمائۃ قلوبھم علیٰ قلب آدم و للّٰہ فی الخلق اربعون قلوبھم علیٰ قلب موسیٰؑ واللہ فی الخلق سبعۃ قلوبھم علیٰ ابراھیم وللّٰہ فی الخلق خمسۃ قلوبھم علیٰ قلب جبرائیل وللّٰہ فی الخلق ثلاثۃ قلوبھم علیٰ قلب میکائیل وللّٰہ فی الخلق واحد قلبہ علیٰ قلب اسرافیل۔ الخ اخرجہ ابن عساکر الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۴۷۔ وایضاً ذکرہ ملا علی قاریؒ فی مرقاۃ ج۹ ص۳۵۶ جو کہ قطب، غوث، نقبا کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور علمائے راسخین نے اس کو اسی طرح بیان کیا ہے لیکن یہ صرف عبدیت اور قرب کے مدارج ہیں نہ کہ عوام کے ربوبیت کے مدارج۔[1]

متصرّف کا حکم

سوال:۔ تصرّف کیا ہے، کیا کوئی ولی یا پیر متصرّف ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصرّف کے دو معنیٰ ہیں، ایک تو عوامی معنیٰ ہے کہ اولیاء اللہ کی قوت اور ان کا کام ہے، یہ معنیٰ غلط ہے۔ دوسرا معنیٰ شرعی اور اصطلاحی اور فن تصوّف کا معنیٰ ہے، ان میں تصرّف سے مراد قوتِ توجہ سے مختلف آثار پیدا کرنا ہے، تو اس سے تصرّف اور متصرّف دونوں صحیح ہیں۔

کما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: وحقیقۃ ھٰذا التائید افاضۃ کیفیات خاصۃ

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاریؒ:۔ قلتُ ھم الاقطاب فی الاقطار یاخذون الفیض من قطب الاقطاب المسمی بالغوث الاعظم فھم بمنزلۃ الوزراء تحت حکم الوزیر الاعظم۔
(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۹ ص۳۵۵ کتاب الفتن۔ الفصل الثانی)
ومثلہٗ فی السائل لابن عابدینؒ ج۲ ص۲۶۴

محمودة والقائها فی النفس آثار خاصة تتعدد حسب اختلاف المقاصد ویسمی هذا التاثیر فی عرف اهل التصوف تصرفًا و توجهًا وهمة وجمع الخواطر۔

(بوادر النوادر ص۸۰۲ رسالة التعرف فی تحقیق التصرف) [1]

اصحاب القبور کا تصرف | **سوال:-** جناب مفتی صاحب! اصحاب القبور کے تصرفات کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر اصحاب القبور کے تصرفات سے مراد ان کی دعا، توجہات اور فیوضات ہوں تو پھر تو ان کا یہ تصرف موجود اور صحیح ہے ورنہ تصرف اصطلاحی تسلط غیبی ثابت نہیں بلکہ یہ شرک کی ایک قسم ہے۔

کما قال شاہ ولی اللہؒ: درآنجا بوجہ اَتم قدم زدہ است حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ گفتہ اند کہ در ایشاں در قبر خود مثل احیا تصرف میکنند۔

(ہمعات ص۶۱)

لما قال محمد بن سلیمان الرصاویؒ: معنی البیت ان کرامات الاولیاء حال کونهم فی الدنیا لها وجود وثبوت وقوع ای حال حیاتهم وکذا بعد الموت بمعنی اکرامه فی قبره او حال حضرت فیه وتوسیعه لا بمعنیٰ تفرقة فی العالم کما یعتقد جهلة العوام۔

(نخبة اللآلی شرح بد الامالی ص۴۳) [2]

بعد الوفات اولیاء اللہ کے تصرفات کا حکم | **سوال:-** کیا بعد الوفات اولیاء اللہ کا تصرف ثابت ہے یا نہیں؟

---

[1] قال شاہ ولی اللہؒ (اجمالاً) وللنقشبندیة تصرفات عجیبة من جمع الهمة علیٰ مراد فیکون علیٰ وفق الهمة۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۱۱۱ چھٹی فصل، تصرفاتِ نقشبندیہ)

وَمِثْلُهٗ فی قطب الارشاد ص۶۰۵ ف: للنقشبندیة۔

[2] قال شاہ ولی اللہؒ: وذٰلك لان شیخ عبد القادرؒ له شعبة من السریان فی العالم وذٰلك انه لما مات صار بهیئة الملاء الاعلیٰ وتطیع فیه الوجود ساری فی العالم کله۔

(تفهیمات الالٰهیة ج۱ ص۱۱ تفهیم ۳۴)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج۵ ص۱ کتاب السلوک۔

الجواب :۔ اولیاء اللہ کے تصرف بعد الوفات سے مراد اگر تسلط غیبی و غائبانہ ندا ہو تو یہ صریح شرک ہے اور اگر اس سے مراد کوئی کرامت ہو تو بعد الوفات بھی اولیاء اللہ کی کرامات کے اثرات سے انکار بے معنیٰ ہے ۔

کما قال محمد بن سلیمان الحلبی الرصاویؒ : تحت قول الماتن ، کرامات الولی بدار دنیا لہا کون فہم اهل النوال ۔ وحاصل معنی البیت ان کرامات الاولیاء حال کونہم فی الدنیا لہا وجود وثبوت وقوع ای حال حیاتہم وکذا بعد الموت بمعنی اکرامہ فی قبرہ وحال حضرۃ فیہ وتوسیعۃ لا بمعنیٰ تفرقۃ فی العالم کما یعتقدہ جہلۃ العوام ۔

(نخبۃ اللآلی شرح بدء الامالی ص۴۳)[1]

کراماتِ اولیاء بعد الموت کا حکم

سوال :۔ بعض لوگ کراماتِ اولیاء بعد الموت کو شرک کہتے ہیں ، کیا واقعی اولیاء اللہ کے لیے کرامات بعد الموت ثابت ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ کراماتِ اولیاء بعد الموت اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں محقق اور ثابت شدہ ہیں اور ان کا فعلاً ثبوت بھی پایا گیا ہے ۔

لما قال محمد بن سلیمان الرصاویؒ : وحاصل معنی البیت ان کرامات الاولیاء حال کونہم فی الدنیا لہا وجود وثبوت وقوع ای حال حیاتہم وکذا بعد الموت بمعنی اکرامہ فی قبرہ ۔ (نخبۃ اللآلی شرح بدء الامالی ص۴۳)[2]

---

[1] قال العلامۃ عبد الغنی النابلسی رحمہ اللہ : (کرامات) ..... (الاولیاء) الاحیاء والاموات اذ الولی لا ینعزل عن ولایتہ بالموت الخ

(الحدیقۃ الندیۃ شرح الطریقۃ المحمدیۃ ج۱ ص۲۹۲)

ومثلہٗ فی روح المعانی ج۲۸ ص۱۰۸

[2] قال العلامۃ عبد الغنی النابلسی رحمہ اللہ : (وکرامات الاولیاء) الاحیاء والاموات اذ الولی لا ینعزل عن ولایتہ بالموت کالنبی لا ینعزل عن نبوتہ بالموت ۔

(الحدیقۃ الندیۃ شرح الطریقۃ المحمدیۃ ج۱ ص۲۹۲)

ومثلہٗ فی روح المعانی ج۲۸ ص۱۰۸

اولیاء اللہ کا مریدین کی مدد کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ یا مرشد نے مصیبت کے وقت اپنے فلاں مرید کی غائبانہ مدد کی، شریعت مقدسہ میں ایسے عقیدہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے بعض واقعات کا جزوی طور پر رونما ہونا ثابت ہے جیسا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ فضائل درود ص ۱۱۳ میں ذکر فرماتے ہیں، مگر اس کو عوامی عقیدہ نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ اس سے علمِ غیب کلی کا عقیدہ پیدا ہوجاتا ہے جو مفضی الی الشرک ہے۔

کما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: لو تزوج بشہادۃ اللّٰہ ورسولہ لاینعقد ویکفر للاعتقاد ان النبی یعلم الغیب۔ (البحرالرائق ج ۳ ص ۸۸ کتاب النکاح) [1]

کشف القبور کے علم کا حکم

سوال:۔ کشف القبور کیسا علم ہے، کیا قبروں کے اندرونی احوال کا کسی کو کشف ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو یہ علم سیکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی فرمائیے کہ کشفِ قبور علمِ غیب میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کبھی کبھی قبور کا کشف انسان کو ہوجاتا ہے، یہ کوئی باقاعدہ علم نہیں بلکہ غیر اختیاری کیفیت ہوتی ہے، اسی وجہ سے اس میں تعلیم وتعلم جاری نہیں ہوسکتا، اس کو علمِ غیب بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ کشف سے تعلق رکھتا ہے اور کشفِ ظن کا فائدہ دیتا ہے علمِ جازم کا نہیں، مشائخ کی کتابوں میں اس کا باقاعدہ تذکرہ موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قبور کا کشف ہوا تھا جیسا کہ مشکوٰۃ میں باب عذاب القبر، فصل اول میں نقل کیا گیا ہے، اسی کے تحت ملا علی قاریؒ مرقاۃ میں لکھتے ہیں:۔

وھٰذا الحدیث مثل قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لوعلمتم ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا۔ وفیہ ان الکشف بحسب الطاقۃ

---

[1] قال العلامۃ قاضی خانؒ: لو تزوج بشہادۃ اللّٰہ ورسولہ لاینعقد ویکفر للاعتقاد ان النبی یعلم الغیب۔ (فتاوٰی قاضی خان ج ۳ ص ۵۷۶ کتاب النکاح باب الشہادۃ) ومثلہٗ فی مجمع الانہر ج ۱ ص ۳۲۲ کتاب النکاح۔

ومن کوشف بمالا یسعہ یطیح و یہلک۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۱ ص۳۲۶ کتاب الایمان)[1]

دوزخ کے لیے فنا کا حکم

سوال:۔ بعض صوفیاء و اہلِ کشف کہتے ہیں کہ دوزخ آخر میں فنا ہوجائے گی، کیا واقعی یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ کشف کا معاملہ تو اہلِ کشف ہی بہتر سمجھتے ہیں مگر ظاہری نصوص سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کو فنا نہیں بلکہ کفار کی تعذیب کے لیے ہمیشہ کیلئے رہے گی۔

کما قال العلامۃ عبدالعزیز پرہارویؒ: ذھب شرذمۃ قلیلۃ من المسلمین الیٰ ان (وھم بعض الکشف ثم قال بعد الکلام الطویل) وعلیک بالکف عن طعنہ۔ (نبراس ص۳۶۱)[2]

صفتِ جلالی وجمالی کا فرق

سوال:۔ صفتِ جلالی اور جمالی کیا ہوتی ہے؟ اور ان کے مراقبہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ علماء صوفیاء نے صفتِ جلالی اور جمالی کی مختلف تعریفات کی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ جن صفات میں قہر وغضب ہو وہ صفات جلالی ہوتی ہیں اور جن صفات میں نرمی وشفقت کا ذکر ہو ان کو جمال کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ صفاتِ باطن کو جلالی اور باطن کو جلال کہتے ہیں اور ان صفات سے اخذِ فیض کو مراقبۂ جمال وجلال کہتے ہیں۔

کما قال قاضی محمد علی تھانویؒ: ودرکشف اللغات میگوید ونیز صفات باطن حق تعالیٰ را جلال گویند وظاہر را جلال۔ (کشاف اصطلاحات الفنون جلد۱ ص۲۴۴)[3]

---

[1] قال العلامۃ الشکارپوریؒ: وقالوا اذا دخل المقبرۃ قرأ بسورۃ انا فتحنا فی رکعتین ثم یجلس مستقبل المیت الخ۔ (قطب الارشاد ص۵۵۵ الشغل العاشر)
وَمِثْلُہٗ فی شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۸۵ پانچویں فصل کشف القبور۔

[2] قال العلامۃ ثناء اللّٰہ پانی پتیؒ: وبہ قال من الصوفیۃ محی الدین ابن العربی رحمہ اللّٰہ لٰکن ھٰذا قول مردود۔ (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۱۷)

[3] قال العلامۃ آلوسیؒ: والصفات اما جمالیۃ اوجلالیۃ والاولیٰ اسبق کما یشیر الیہ حدیث سبقت رحمتی غضبی (روح المعانی ج۱ ص۵۱ مبحث فی لفظ الاسم)
وَمِثْلُہٗ فی تفہیمات الالٰہیۃ ج۲ ص۲۲۲

کائنات سے اللہ تعالیٰ کی معیت کی حقیقت

سوال:۔ اللہ تعالیٰ کی معیت کائنات کے ساتھ کس طرح ماننا صحیح ہے؟ معیت ذاتی صحیح ہے یا معیت علمی؟

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کائنات کے ساتھ معیت ذاتی وعلمی ماننے میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ معیت علمی سے خود معیت ذاتی متحقق ہوجاتی ہے۔

کما قال ارشاد اللہ قاضی مبارک رحمہ اللہ: فالموجودات باثرھا من حیث الوجود الرابطی معلومة وصور العلمیة لہ تعالیٰ فعلمہ تعالیٰ الاجمالی تلك الاشیاء نفسہ ذاتہ تعالیٰ۔ (قاضی شرح السلم ص۱۵) ؎۱

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ

سوال:۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسائل شریعت سے متصادم ہیں یا نہیں اور ان دونوں میں کون سا صحیح ہے؟ بعض لوگ شرک کہتے ہیں۔

الجواب:۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کشفی مسائل ہیں، قلم اور فتویٰ سے ان کا اظہار مشکل ہے لیکن تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اور ان مسائل میں کوئی تصادم نہیں اور اقرب الصواب شہود معلوم ہوتا ہے۔ عند الشہودیة الصوفیة۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ: توحید دو قسم ہست شہودی و وجودی وآنچہ لابدست توحید شہودی ہست کہ فنا یان مربوط ہست و توحید شہودی باعقل وشرع مخالفت ندارد بخلاف وجودی۔

(مکتوبات مجدد الف ثانی جلد ا ص۱۱۱ مکتوب ۴۳ دفتر اول) ؎۲

؎۱ قال شاہ اسمٰعیل شہیدؒ: ومنہم من تفطن بعلاقیہ القیومتہ بینہ (ای لاھوت) و (ای الکثرات) علی نحو الا یلاع اکمل تفطن۔ (العبقات ص۲۰)

وَمِثْلُہٗ فی المکتوبات شاہ غلام علی دھلویؒ ص۵۱ مکتوب ۶۸)

؎۲ قال العلامة قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ: وعلیٰ ھٰذا التاویل ھٰذہ الاٰیة تدل علی التوحید الشہودی کما قال بہ المجدد رضی اللہ عنہ دون التوحید الوجودی۔

(التفسیر المظہری ج۱ ص۱۱۹ سورۃ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مکاتیب شریفہ شاہ غلام علی دھلویؒ ص۲۲ مکتوب ۔۔۔

اصطلاح حقیقت المحمدی
سوال :- بعض صوفیاء حقیقتِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، اس اصطلاح کا استعمال شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :- حقیقتِ محمدی علیہ السلام جس کو یقین ثانی اور مرتبہ واحدیت بھی کہتے ہیں یہ سب کشفی امور ہیں اور شریعت سے متصادم نہیں بلکہ امت کے اکابر اولیاء اللہ نے اس مقام کا ادراک کیا ہے اور اس پر گفتگو کی ہے۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ : درجواب گویم کہ حقیقتِ محمدی نہایت مقامات نزول محمد علیہ السلام است ازاوج تنزیہ وتقدیس وحقیقت کعبہ نہایت مقامات عروج کعبہ است۔ (مکتوبات مجدد الف ثانیؒ جلد ا ص۳۳۴ مکتوب ع۲۰۹) [1]

استاد اور پیر کے حقوق کا حکم
سوال :- ایک شخص کا استاذ بھی ہے اور مُرشد بھی موجود ہے تو اس پر پیر کا حق زیادہ ہے یا استاد کا؟

الجواب :- مُرشد اور استاذ دونوں علم وعمل اور رشد و ہدایت کے ذرائع ہیں اس لیے دونوں کا حق برابر ہے، لہٰذا اگر پیر اور استاذ میں اختلاف ہو جائے کہ آدمی ان کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے اور اگر مجبور ہو جائے تو پھر حق کی اتباع کرے تاہم بعض اکابرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا درجہ استاذ پر مقدم ہے۔

کما قال مجدد الف ثانیؒ : منہا شرافت علم باندازہ شرف ورتبہ معلوم است۔ معلوم ہرچند شریف تر علم آں عالی تر پس علم باطن کہ صوفیاء بآن ممتاز اند اشرف باشد از علم ظاہر کہ نصیب علمائے ظواہر است برقیاس شرافت علم ظاہر بر علم حجامت وحیاکت پس رعایت آداب پیر کہ علم باطن لاہ از واحد کنند باضعاف زیادہ باشد از رعایت

---

[1] قال العلامۃ فقیر اللہ جلال آبادیؒ : وثانیاً ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم سمّی باسمین محمد ولانہ ھذا الاسم ناشیۃ عن الاسم الالٰہی الذی ینا سب تربیۃ ھذا العالم السفلی وسمّی بالحقیقۃ المحمدیۃ - (قطب الارشاد ص۵۹۳ حقیقۃ الکعبۃ فوق حقیقۃ المحمدیۃ) وَمِثْلُہٗ فی روح المعانی ج ۱ ص۵۱ سورۃ البقرۃ -

آداب استاذ کہ علم ظاہر از استفادہ نمایند وہ عنیچین رعایت آداب است از علم ظاہر باضعاف زیادہ است از رعایت آداب استاذ حجام وحائک۔ (ابتداء ومعاد ص۱۱۶)

خواب میں خلافِ شریعت حکم دیکھنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے خلافِ شریعت کام کا حکم فرما رہے ہیں تو اس پر عمل کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں اگر ارشاد مبارک شریعت کے صریح مخالف ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور اگر شریعت کے مخالف نہ ہو تو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

لما قال مجدد الف ثانیؒ: ازیں قبیل است کہ بعضی در منامات حضرت پیغمبر علیہ السلام را می بینند و بعضی احکام را اخذ می کنند کہ فی الحقیقۃ خلاف آن احکام متحقق است دریں صورت القائے شیطانی متصور نیست کہ مختار علماء عدم تمثل شیطانی است بصورت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام بہر صورتیکہ باشد پس دریں صورت نیست الا التصرف متخیلہ کہ غیر واقع را نا پندہ است۔

(مکتوبات امام ربانی جلد ا ص۲۱۵ مکتوب ۱۰۷)[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں قربانی کرنے کا حکم دینا

سوال:۔ ایک عورت غریب ہے لیکن ذاکرہ اور شاغلہ ہے، اس کا کہنا ہے کہ مجھے مراقبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوتی ہے، آپؐ نے مجھے مراقبہ میں قربانی کا حکم فرمایا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس عورت پر اب قربانی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خواب اور مراقبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ممکن ہے اور جو حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمائیں اگر وہ خلافِ شریعت حکم ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور موافقِ شریعت ہو تو اس پر عمل کرنا مناسب ہے کیونکہ یہ کشف کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر یہ عورت اختیاری طور پر قربانی کرے تو اچھی بات ہے ورنہ اس پر قربانی واجب

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاری رحمہ اللہ: ولذا لم یعتبر احد من الفقہاء جواز العمل فی الفروع الفقہیۃ بما یظہر للصوفیۃ من الامور الکشفیۃ او حالات المنامیۃ۔ (مرقاۃ ج۹ ص۳۵۸ کتاب الفتن)

نہیں ہے۔

کما قال ملا علی قاریؒ: ولذا لم یعتبر احد من الفقہاء جواز العمل فی الفروع الفقیہ بما یظہر للصوفیۃ من الامور الکشفیۃ او من حالات المنامیۃ۔

(مرقاۃ ج۹ ص۳۵۸ کتاب الفتن)[1]

کشف پر عمل کرنے کا حکم

سوال:۔ کشف کی کتنی قسمیں ہیں، نیز کشف پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کشف کی دو قسمیں ہیں: (۱) مخالف الشریعۃ (۲) اور موافق الشریعۃ۔ پس موافق الشریعۃ کشف پر تو صاحبِ کشف عمل کر سکتا ہے اور مخالف الشریعۃ کشف مردود ہے اور اس پر عمل نہیں کیا جائے گا تاہم کسی غیر صاحبِ کشف کے لیے کشف دلیل نہیں بن سکتا۔

کما قال ملا علی قاریؒ: ولذا لم یعتبر احد من الفقہاء جواز العمل فی الفروع الفقیہ بما یظہر للصوفیۃ من الامور الکشفیۃ او من حالات المنامیۃ۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۹ ص۳۵۸ کتاب الفتن)[2]

تصورِ شیخ کا حکم

سوال:۔ سلسلۂ تصوف میں پہلا سبق تصورِ شیخ کا ہوتا ہے جبکہ بظاہر یہ خلافِ شریعت معلوم ہوتا ہے، تو کیا تصورِ شیخ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سلسلۂ تصوف میں تصورِ شیخ جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے بطور علاج و دوا کے اختیار کیا جائے نہ کہ بطور ثواب کے، اس لیے کہ اس سے ذاکر کی فکر مجتمع ہو جاتی ہے اور تصورِ شیخ کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت

---

[1] قال مجدد الف ثانیؒ: الہام مثبت حل و حرمت نہ بود و کشف اربابِ باطن اثبات فرض و سنت نماید۔ (مکتوباتِ امامِ ربانی ج۲ ص۱۵۶، ص۱۵۵ مکتوب ۵۵)

[2] قال مجدد الف ثانیؒ: الہام مثبت حل و حرمت نہ بود و کشف اربابِ باطن اثبات فرض و سنت نماید اربابِ ولایت خاصہ یا عامہ در تقلید مجتہدان برابر اند کشوف و الہامات ایشاں را مزیت نمی بخشند۔ (مکتوبات امام ربانی ج۳ ص۱۵۶، ۱۵۵ مکتوب ۵۵)

دل میں بیٹھ جاتی ہے جو تعلق مع اللہ کے بنیادی عوامل میں سے ہے۔

لما قال شاہ ولی اللہؒ: قالوا والرکن الاعظم ربطۃ القلب بالشیخ علی وصف المحبۃ والتعظیم وملاحظۃ صورتہ۔ (شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص۸۰ پانچویں فصل)[۱]

اولیاء اللہ کا اپنے مریدوں کی امداد کرنا

سوال:۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اولیاء کرام اپنے مریدوں کی مشکل وقت میں امداد کرتے ہیں اور عالم میں تصرف کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں شرع کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر ان لوگوں کا تصرفِ شیخ سے مراد صوفیاء کرام کا اصطلاحی تصرف ہے تو یہ درست ہے کیونکہ اس قسم کا تصرف اصل میں غائبانہ دُعا ہوتی ہے اور اگر تصرف سے مراد تسلطِ غیبی ہے تو اس کے لیے علمِ غیب کُلی کی ضرورت ہوگی اور یہ عقیدہ رکھنا شرک ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: لو تزوج بشہادۃ اللہ ورسولہ لا ینعقد ویکفر للاعتقاد ان النبی یعلم الغیب۔ (البحر الرائق ج۳ ص۸۸ کتاب النکاح)[۲]

شیخ کا مریدین کو بعض حلال چیزوں کے استعمال سے منع کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! بعض شیوخ (پیر) اپنے مریدین کو بعض ایسی چیزوں کے استعمال سے منع کرتے ہیں جو کہ شرعاً حلال ہوتی ہیں، تو کیا ان حضرات کا یہ عمل درست ہے؟ اور مریدین کے لیے ایسے حکم کی تعمیل ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیخ اپنے مرید کی اصلاحِ نفس کے لیے اس کے مزاج کے موافق جو چاہے تربیت کا حکم دیتا ہے مگر یہ حکم علاجاً ہوتا ہے شرعاً نہیں اس لیے بلا اعتقادِ حرام کے حلال

---

[۱] قال العلامۃ الشکارپوریؒ: واذا غاب الشیخ عنہ یخیل صورتہ فی خیالہ بوصف المحبۃ والتعظیم فانہ یفید فائدۃ صحبتہ۔ (قطب الارشاد ص۵۵۸ الشغل العاشر)
وَمثلہٗ فی الکتاب البھجۃ السنیۃ فی آداب الطریقۃ العالیۃ النقشبندیۃ ص۴۲

[۲] قال العلامۃ قاضی خانؒ: رجل تزوج امرأۃ بغیر شہود فقال الرجل والمرأۃ خدا ئرا وپیغامبر مرا گواہ کردیم قالوا یکون کفراً لانہ اعتقد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب۔ (فتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۷۶ باب ما یکون کفراً من المسلم)

حلال چیزیں مریدین کیلئے استعمال نہ کرنا درست ہے اس حکم کی تعمیل میں کوئی گناہ نہیں بلکہ مرید کے لیے اپنے شیخ کے اس حکم کی بطورِ علاج تعمیل کرنا ضروری ہے، جیسے طبیب حاذق بعض اوقات مریض کی حالت دیکھ کر کسی حلال چیز کا کھانا اس پر بند کر دیتا ہے جس کے کھانے کو اس کی طبیعت زیادہ متمنی ہوتی ہے، یہی حالت کسی شیخ کے ایسے حکم کی ہوتی ہے۔

حلاوتِ ذکر کا مسئلہ

سوال:۔ ایک مسئلہ قابلِ پرسش ہے وہ یہ کہ ذکر میں حلاوت حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے، مجھے ذکر کی حلاوت کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

الجواب:۔ ذکر اللہ میں حلاوت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فضیلتِ ذکر میں وارد آیات و احادیث کو سامنے مستحضر رکھ کر ذکر کیا جائے تو ان شاء اللہ حلاوت حاصل ہوگی۔

ترقی نہ ہونے کی صورت میں شیخ کی تبدیلی کا مسئلہ

سوال:۔ حضرت مفتی صاحب! بندہ ایک پیر صاحب سے بیعت ہے کئی سال ہو چکے ہیں لیکن کوئی ترقی نہیں ہوئی، فیض نہیں پہنچتا، باوجود اس کے کہ میں اپنے شیخ سے از حد محبت کرتا ہوں اور ان کے ساتھ عقیدت بھی بہت ہے، ان کی ہدایات پر عمل بھی کرتا ہوں۔ تو کیا میں روحانی ترقی اور فیضِ شیخ کے لیے اپنے شیخ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شیخ سے بیعت کر سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی آپ کو اپنے شیخ سے عقیدت اور کمال محبت ہے اور ان کی ہدایات پر عمل کرنے کے باوجود آپ کو روحانی ترقی اور فیض نصیب نہیں ہوا تو مناسب یہ ہے کہ شیخ خود آپ کو کسی دوسرے اللہ والے سے بیعت کا مشورہ دے ورنہ بصورتِ دیگر آپ خود بھی ان کو چھوڑ کر کسی متبع شریعت شیخ سے بیعت ہوسکتے ہیں، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: دوسرے شیخ سے رجوع اُس وقت کرے جب ایک معتد بہ مدت کے بعد بھی اپنے اندر اصلاح محسوس نہ کرے، اور اصلاح کے یہ معنی ہیں کہ دواعی معاصی کے مضمحل ہوجائے، لیکن شرط یہ ہے کہ شیخ اوّل کی مجوزہ تدابیر پر پوری طرح عمل کر چکا ہو اور پھر بھی کامیابی نہ ہوئی ہو ورنہ وہ تو اس طرح کا مصداق ہو جائے گا کہ نسخہ تو پیا نہیں اور حکیم صاحب کی شکایت کہ ان کے علاج سے نفع نہیں ہوا۔

(انفاسِ عیسیٰ ص۲۹ حصہ اوّل)

مجاز ہونے کے لیے بیعتِ شیخ ضروری نہیں

سوال:- اگر ایک متبع شریعت شیخ کسی دیندار شخص کو بیعت لینے کی اجازت دے مگر یہ شخص اس شیخ سے بیعت نہیں، تو کیا اس شیخ کا اس شخص کو اجازتِ بیعت دینا صحیح ہے اور وہ شخص دوسروں سے بیعت لے سکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ کسی شیخ کا مجاز ہونے کے لیے اس سے بیعت ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ عموماً کوئی مرشد اس شخص کو بیعت لینے کی اجازت دیتا ہے جو خود اس سے بیعت ہو، لیکن اگر کبھی کسی دیندار اور صالح شخص کو اجازتِ بیعت دیدے تو یہ اجازت صحیح ہے اور یہ شخص دوسروں سے بیعت لے سکتا ہے۔

ہمارے اکابرین میں سے حضرت تھانویؒ نے حضرت عبدالرحمٰن کاملپوریؒ کو بغیر بیعت کے مجاز فرمایا تھا، جب آپ کو حضرت تھانویؒ کا اجازت نامہ ملا تو تھانہ بھون جاکر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں تو آپ سے بیعت بھی نہیں ہوا ہوں پھر یہ اجازت نامہ کیسے؟ تو اس پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا اگر اجازت کے لیے بیعت شرط ہو تو آئیے اب بیعت کرلیتا ہوں۔ (ماخوذ از ملفوظات فقیہ الامت جلد ۲ ص۵۳ حصہ ۱۰)

مسجد کی فضیلت خانقاہ پر

سوال:- ایک مسجد کے قریب ہی خانقاہ بھی آباد ہے، پیر صاحب اور ان کے مریدین مسجد کی بجائے خانقاہ ہی میں نماز پڑھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ بہ نسبت مسجد کے خانقاہ میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ملتا ہے۔ کیا شرعاً ان کا یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ اور کیا واقعی مسجد کی بجائے خانقاہ میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے؟

الجواب:- مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت احادیث مبارکہ میں کثرت سے وارد ہے خانقاہ کے بارے میں اس قسم کی کوئی فضیلت وارد نہیں ہوئی اور نہ ہی خانقاہ مسجد کے حکم میں ہے اگرچہ وہاں اصلاح و تزکیۂ نفس کا سلسلہ جاری رہتا ہے مگر نماز مسجد ہی میں پڑھنا افضل ہے خانقاہ میں نہیں۔ اس لیے ان حضرات کا یہ اعتقاد فاسد ہے شریعتِ مطہرہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علیٰ صلوٰتہ فی بیتہ و فی سوقہ خمساً وعشرین ضعفاً

وذٰلك انهٗ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثمّ خرج الى المسجد لا يخرجه الّا الصلوٰة لم يخط خطوة الّا رفعت لهٗ بها درجة وحط عنه بها خطيئة الخ ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۶۸ باب المساجد، الفصل الاول)[1]

کیا کسی شیخ سے بیعت ہونا ضروری ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارا ایک دوست کسی پیر صاحب سے بیعت ہو چکا ہے اور وہ ہمیں بھی ہر وقت اس بات کی تلقین کرتا رہتا ہے کہ آپ لوگ بھی کسی پیر سے بیعت ہو جائیں۔ اور اسے اپنا پیر بنالیں ۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا کسی پیر کی بیعت کرنا شریعت میں ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ انسان کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ، ظاہر کی درستگی اور اس کے متعلق احکامِ شرعیہ کی تعبیر وتشریح جاننے کے لیے جس طرح ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنا اور ان کی راہنمائی میں اپنی عبادات کو درست کرنا ضروری ہے ۔ اسی طرح باطن کی اصلاح اور اس سے متعلق دیگر امور کی درستگی کے لیے کسی متبع شریعت شیخ یا پیر کی بیعت کرنا درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ بیعت کوئی شرعی ضرورت نہیں بلکہ علاجاً ہے ۔

لما فی امداد السلوک : پس اگر سالک عالم ہوگا تو وہ خود ہی ضروریاتِ دین سے آگاہ ہوگا ورنہ ایسا شیخ ڈھونڈنا چاہیئے جو اس کو اول توحید درست کرنے والے عقائد اور فقہی مسائل کی تعلیم کرے اور اس کے بعد مجاہدہ اور زہد و تقوٰی کا راستہ دکھائے ۔ مثل مشہور ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے ۔ سو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس کا کوئی راہنما نہ ہو یعنی نہ ذاتی علم رکھتا ہو کہ خود راستہ دیکھ سکے اور نہ مرشدِ کامل کی صحبت نصیب ہو کہ وہ راہِ حق دکھا دے تو ایسے شخص کو شیطان گمراہ بنا دیتا ہے ۔ (امداد السلوک ص۵۶ شیخ کی ضرورت)

کسی نیک آدمی سے دُعا کی درخواست کرنا

سوال:۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ بزرگانِ دین جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں نہ بھولنا یا یہ کہ ہمارے حق

---

[1] لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : وان صلّٰی فی مسجد حیہ منفرداً فحسن .... لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۵۵۵ باب الامامۃ)

میں دعا فرمائیں، تو کیا شرعاً دوسروں سے دعاء کی التجاء (درخواست) کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنے لیے خود دعا کرنا یا دوسروں سے دعا کی درخواست کرنا شرعاً درست ہے، خود جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ سے دعا کے لیے فرمایا کرتے تھے۔ اس میں شرعاً کوئی اشکال و قباحت نہیں اور نہ یہ اصولِ اسلام کے منافی ہے۔

لما قال شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد المدنیؒ: بہر حال جس قدر ہو انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں کی اصلاح اور ہدایت میں بلا طمع کوشاں رہیں، دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں، واقفین پرسانِ حال سے سلام مسنون عرض کر دیں۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام ج۲ ص۳۰۸ مکتوب ۶۶)

پیر کے نام کا وظیفہ کرنا

سوال:۔ بعض لوگ پیرانِ پیر شیخ عبد القادر جیلانیؒ یا معین الدین اجمیریؒ کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں، تو کیا کسی پیر یا بزرگ کے نام کا وظیفہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ورد اور وظیفہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ کافی ہیں، کسی پیر فقیر کے نام کو بطور وظیفہ لینا اور اس کو وظیفہ بنانا شرعاً جائز نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسے وظائف سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ: وظیفہ کے طور پر پیر صاحب کا نام لینا جائز نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ ج۵ ص۹۱ باب السلوک)

اعمالِ صالحہ میں دل نہ لگنے کا علاج

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! آج کل میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہو رہا ہے وہ یہ کہ پہلے میں صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا، ہر نماز مسجد میں باجماعت پڑھتا تھا، مگر اب ہفتہ دو ہفتہ سے اچانک نماز میں رغبت کم ہونا شروع ہو گئی ہے، جماعت کے ساتھ تو بہت کم نمازیں نصیب ہوتی ہیں، تو اس کیفیت کا کیا سبب اور علاج ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کا ایک سوال حضرت گنگوہیؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؒ نے فرمایا کہ "اعمال میں رغبت کی کمی کے تین اسباب ہیں (۱) ناجنس کی صحبت (۲) ناموافق غذا، (۳) معصیت کا صدور۔" اس لیے آپ بھی اپنے اوپر نگاہ ڈالیں کہ ان تینوں میں سے کونسا سبب آپ میں پایا جاتا ہے اس کو ترک کر دیں ان شاء اللہ اعمال میں رغبت پیدا ہو جائے گی۔

تصوّرِ فنا فی الشیخ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ اہلِ تصوّف کے ہاں ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ کوئی سالک اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کو فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل نہ ہو، تو گویا تصوّف میں فناء فی الشیخ کو ترقی کا بنیادی درجہ حاصل ہے، اس کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

الجواب:۔ متصوّفین کا یہ مسلّمہ قاعدہ کہ فناء فی الشیخ کو ترقی درجات کے لیے بنیادی حیثیت حاصل ہے صحیح اور درست ہے، صلحاء اُمّت نے اس کو جائز کہا ہے اور فرمایا ہے کہ بدون اس کے کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

لما قال شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ : الغرض فناء فی الشیخ ہونا سلوک میں ضروری اور اقوی ذریعۂ کامیابی ہے حضرت شیخ الہندؒ کے یہ الفاظ اور اس قسم کے دیگر جملے اسی فنائیت فی الشیخ کے مظاہر ہیں جو کہ حضرت شیخ الہندؒ کے سلوک میں کمال کو بتلاتے ہیں۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام ج ۳ ص۲۲۰ مکتوب ۸۸) [1]

آنکھیں بند کر کے ذکر کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب ! ہمارے علاقے میں ایک پیر صاحب ہیں جو اپنے مریدین اور متعلقین کو حکم دیتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے ذکر کیا کرو، تو کیا ذکر کرنے کا طریقہ شرعاً یہی ہے یا آنکھیں کھول کر ذکر کرنا درست ہے؟

الجواب:۔ ذکرِ الٰہی ہر حال میں کرنا جائز ہے چاہے آنکھیں بند کر کے کیا جائے یا کھول کر، البتہ تصوّف میں شیخ کے سامنے عامی (جاہل) شخص کو آنکھیں بند کر کے ذکر کرنا چاہیے اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے شیخ سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوتے دیکھے جو بدظنی کا سبب بنے، اس لیے مذکورہ پیر صاحب کی بات علاجاً درست ہے۔

---

[1] لما قال العلامۃ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ: سوال: فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسولؐ کیا ہوتا ہے اور کہاں سے ثابت ہے اور اس کی نسبت صوفیاء کرام کیا فرماتے ہیں؟
جواب: یہ دونوں لفظ اصطلاح مشائخ کے ہیں اتباع کرنا اور محبت کا غلبہ لوجہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اس کی اصل شرع سے ثابت ہے، فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (الآیۃ)
(فتاویٰ رشیدیہ (تالیفاتِ رشیدیہ) ص۱۹۸ کتاب السلوک)

رضاء بالقضاء اور دُعا کرنا

سوال:۔ ایک اشکال کئی دنوں سے ذہن میں آرہا ہے کہ انسان پر مصائب و آلام کا آنا تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور یہی اللہ کا حکم ہے تو چاہیئے کہ وہ ان مصائب پر صبر کرے اور اللہ تعالےٰ کی قضاء پر رضامندی کا اظہار کرے مگر دوسری طرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کے دفع کرنے کے لیے دُعائیں شروع کر دیتا ہے۔ تو کیا یہ دعائیں رضاء بالقضاء کے منافی تو نہیں؟

الجواب:۔ انسان پر مصائب و آلام کا آنا اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی کے امر و ارادہ سے ہے انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر راضی رہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کو برداشت کرنا چاہیئے، چونکہ انسان بہت کمزور اور ضعیف ہے جس کی وجہ سے مصائب و آلام کے وقت اس کا فتنہ میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے شریعتِ مقدسہ نے اس کو دفع مصیبت کے لیے دعاء کی تعلیم دی ہے کہ دعا اس طرح کرے کہ اے اللہ! مصائب کا آنا بھی تیری رحمت ہے اور ان کا دور کرنا بھی تیری رحمت ہے، ہم چونکہ بہت ناتواں اور کمزور ہیں ان مصائب کو برداشت کرنے کی طاقت ہم میں نہیں اس لیے اپنے فضل و کرم سے ان مصائب کو ہم سے دور فرما۔ اس قسم کی دعائیں کرنا رضاء بالقضاء کے خلاف نہیں البتہ جن دعاؤں میں جزع و فزع اور شکوہ و شکایت ہو تو وہ رضاء بالقضاء کے منافی ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔

لما قال الشیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ: دعاء کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے اللہ ہم آپ کی اجازت سے وہ چیز مانگتے ہیں جو ہمارے علم میں مصلحت و خیر ہو اگر آپ کے علم میں بھی وہ خیر ہے تو عطا کر دیجئے ورنہ نہ دیجئے، ہم دونوں حال سے راضی ہیں مگر اس رضا کی علامت یہ ہے کہ قبول نہ ہونے سے شاکی اور تنگدل نہ ہو، دعا کرتا رہے دعا کرنا خلافِ رضا نہیں۔

(انفاسِ عیسٰی حصہ اول ص ۲۳۴ رضاء بالقضاء)

اشارۃً وکنایۃً غیبت کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں دوسرے شخص کے سامنے طنزیہ انداز میں یہ کہے کہ ہاں میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں! جبکہ مخاطب اس غائب شخص کی تعریف کر رہا ہو، تو کیا ایسا جملہ کہنا غیبت کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے غیبت کی مختلف اقسام بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی شخص کی تعریف سنکر طنزاً جواب میں یہ الفاظ کہے جائیں کہ ہاں میں اس کو اچھی طرح

جانتا ہوں کہ وہ کیسا ہے، اس لیے اس قسم کے الفاظ سے اجتناب کیا جائے، ہاں اگر ایسے کلمات طنزاً نہ ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: بغمز العین والاشارة بالید وکل ما یفهم منه المقصود فهو داخل فی الغیبة وهو حرام۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۴۰۸ کتاب الکراہیۃ)

پسِ پشت حقائق بیان کرنا بھی غیبت ہے

سوال:۔ ایک آدمی چند لوگوں کے سامنے کسی ساتھی کی غیبت کر رہا تھا کہ حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے اس کو اس امر سے منع کیا تو اس نے جواباً کہا کہ میں تو حقائق بیان کر رہا ہوں یہ غیبت نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کسی کے پسِ پشت اس کے متعلق واقعی اور حقیقی امور کو بیان کرنا غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ بات جو کسی کے پسِ پشت بیان کی جائے اور وہ اس کو بُری لگے تو وہ غیبت میں داخل ہے اگرچہ وہ بات سچی ہی کیوں نہ ہو، اور کسی کے بارے میں اس کی عدم موجودگی میں جھوٹی بات بیان کرنا بہتان ہے جو ایک الگ کبیرہ گناہ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: الغیبة ان تصف اخاك حال کونه غائباً بوصف یکرهه اذا سمعه..... وعن ابی هریرةؓ قال قال علیه الصلوٰة والسلام أتدرون ما الغیبة؟ قالوا الله ورسوله اعلم، قال ذکرك اخاك بما یکره فقیل افرأیت ان کان فی اخی ما اقول؟ قال ان کان فیه ما تقول اغتبته وان لم یکن فیه فقد بهته۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۴۰۸ کتاب الکراہیۃ)[۱]

ربطِ قلب بالشیخ کی وضاحت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اہلِ تصوّف کے ہاں "ربطِ قلب بالشیخ" کی اصطلاح مستعمل ہے، اس کا معنیٰ اور مطلب کیا ہے؟ مہربانی فرما کر اس اصطلاح کی وضاحت فرمائیں تاکہ دل

---

[۱] عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قیل یا رسول الله ما الغیبة قال ذکرك اخاك بما یکره قال رأیت ان کان فیه ما اقول قال ان کان فیه ما تقول فقد اغتبته وان لم یکن فیه ما تقول فقد بهته۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۱۵ باب ماجاء فی الغیبة)
ومثلهٗ فی العرف الشذی علی الترمذی ج۲ ص۱۵ باب ماجاء فی الغیبة۔

کو تسلی ہو سکے؟

الجواب:۔ متصوفین کے ہاں ربط قلب بالشیخ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دل کو شیخ کی طرف اس طرح متوجہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فیضانِ رحمت شیخ (مرشد حقانی) کے قلب پر ہو رہا ہے وہ اس کی طرف بھی متوجہ ہو یعنی شیخ کی وجہ سے میرے دل پر بھی یہ فیضان نازل ہو جائے۔

قلندر اور مجذوب کا مطلب

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم اکثر یہ سنتے رہتے ہیں کہ اولیاء اللہ میں سے فلاں قلندر ہے، فلاں مجذوب ہے اور فلاں فلاں قلندروں کی جماعت سے ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں اصطلاحات کا کیا مطلب ہے؟

الجواب:۔ صوفیاء کی اصطلاح میں وہ جماعت قلندر کہلاتی ہے جن کے اعمالِ قلبیہ یعنی ظاہری اعمال تو کم ہوتے ہیں مگر اعمالِ قلبیہ ان کے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اعمالِ قلبیہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھا جائے، قلب کی نگہداشت کی جائے کہ وہ غیر حق کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے بلکہ اکثر اوقات قلب کو ذکر و شغل میں محفوظ رکھا جائے، نیز قلب میں کسی مسلمان کی طرف سے غل و حقد (کینہ و حسد) نہ ہو سب کے ساتھ خیر خواہی ہو، نیز حقوقِ وقت ادا کئے جائیں کہ کوئی وقت ذکر سے خالی نہ جاوے نیز غمی و خوشی کے حقوق ادا کیے جائیں، نعمت ملنے پر شکر ادا ہوتا رہے، حزن و غم میں دل خدا تعالیٰ سے راضی رہے، اس کے علاوہ اور بہت سے اعمالِ قلبیہ ہیں۔ (شریعت و طریقت ص۳۴۲)

قصہ مختصر قلندر وہ شخص ہوتا ہے جو ظاہری اعمال کی بجائے اعمالِ قلبیہ پر زیادہ توجہ دے۔

اور مجذوب وہ ہوتا ہے کہ جس کی عقل کسی وارد غیبی کے غلبہ سے زائل ہو جائے مگر کبھی کبھی احوال و واردات کے غلبہ سے اخلاط میں بھی تغیر ہو جاتا ہے اس لیے علت سے تو اس کی پہچان مشکل ہے (البتہ) مجذوب کے پاس بیٹھ کر قلب کو آخرت کی طرف کشش ہوتی ہے، علامت (اس کی) یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل بصیرت اس شخص پر نکیر نہ کرتے ہوں۔ (شریعت و طریقت ص۳۴۳)

الصّوفی لامذھب لہٗ کی وضاحت

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! الصوفی لامذھب لہٗ کا کیا مطلب ہے؟ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صوفی غیر مقلد اور لا مذہب ہوتا ہے، حالانکہ بہت سارے صوفیاء کرام شافعی المسلک ہوتے ہیں اور بہت سارے حنبلی ، مالکی اور حنفی ہوتے ہیں ؟

الجواب :۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ "انفاسِ عیسیٰ" میں مذکورہ مقولہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں "الصوفی لا مذھب لہٗ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صوفی لامذہب ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ محتاط ہوتا ہے اور ہر مسئلہ میں احتیاط کی جانب کو اختیار کرتا ہے، ورع وتقویٰ اسی کا نام ہے ۔ ہمارے فقہاء کرام نے بھی اس کی تصریح کی ہے رعایۃ الخلاف والخروج منہ اولیٰ مالم یرتکب مکروہ مذھبہ کہ اختلاف سے نکلنا مستحب ہے جب تک اپنے مذہب کے کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو" (انفاس عیسیٰ ص۲۸۳ ارشادات)

سیر الی اللہ وسیر فی اللہ کا مطلب

سوال :۔ جناب مفتی صاحب دارالعلوم حقانیہ ! بندہ کو تصوف سے متعلق ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ سیر الی اللہ وسیر فی اللہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا مہربانی فرماکر تصوف کی ان دونوں اصطلاحات کی وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ :۔
"تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں، ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے، ایک سیر فی اللہ یہ غیر محدود ہے ۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفاء ہوگئی اور ذکر وشغل سے تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا، یعنی تخلیہ وتحلیہ کے قواعد جان گئے ، موانع مرتفع کر دیئے ، معالجہ امراض سے واقف ہو گئے نفس کی اصلاح ہوگئی ، اخلاقِ رذیلہ زائل ہوگئے ، اخلاقِ حمیدہ اور انوارِ ذکر سے قلب آراستہ ہوگیا ، اعمالِ صالحہ کی رغبت طبیعت بن گئی ، اعمال وعبادت میں سہولت ہوگئی، نسبت وتعلق مع اللہ حاصل ہوگیا تو سیر الی اللہ ہوگئی ۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات وذات کا حسبِ استعداد انکشاف ہونے لگا، تعلق سابق میں ترقی ہوئی ، اسرار وحالات کا ورود ہونے لگے ، یہ غیر محدود ہے" (اور یہ سیر فی اللہ ہے)

(شریعت وطریقت ص۳۶)

استغفار نا یحتاج الیٰ استغفار کثیر کا مطلب

سوال:۔ جناب مفتی صاحب اعید میلاد النبیؐ کے موقع پر ایک واعظ صاحب سے کسی بزرگ کا ایک مقولہ سننے میں آیا کہ ہمارا استغفار بہت سارے استغفار کا محتاج ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، آپ مہربانی فرماکر مجھے اس مقولہ کا مطلب سمجھادیں؟

الجواب:۔ یہ مقولہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، آپؒ فرماتے ہیں کہ استغفارنا یحتاج الیٰ استغفار کثیر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو استغفار کرتے ہیں صرف رسم پوری کرنے کے لیے استغفار کے الفاظ استعمال کرتے ہیں دل سے اس گناہ کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ یا قصد نہیں ہوتا بلکہ اندر ہی اندر اس گناہ کو بار بار کرنے کا قصد ہوتا ہے اور یہ استہزاً کی صورت ہے جو خود ایک عظیم گناہ ہے۔ تو اس قسم کے استغفار کے بارے میں ہی آپ نے فرمایا کہ استغفارنا یحتاج الیٰ استغفار کثیر کہ ہمارا استغفار کثیر استغفار کا محتاج ہے۔

دل کو روشن کرنے کا طریقہ

سوال:۔ دل میں روشنی اور نور کیسے پیدا ہوسکتا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ عبادات کرنے اور محرمات و معاصی سے دور رہنے سے دل میں نورِ ایمانی پیدا ہوتا ہے اور منہیات کے کرنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے، لہٰذا دل کو نورِ ایمانی سے روشن کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ عبادتِ الٰہی کی طرف زیادہ توجہ دیں اور منکرات سے اپنے آپ کو بچائیں انشاء اللہ دل روشن ہوجائے گا۔

ریاکاری کے خوف سے نوافل وغیرہ کو ترک کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مجھے نوافل پڑھنے اور ذکر اذکار کا بہت شوق ہے مگر اس لیے ترک کردیتا ہوں کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنا شروع کردیں کہ بہت بڑا عبادت گذار ہے اور میرے اندر کہیں ریاکاری نہ پیدا ہوجائے۔ تو کیا میرا اس طرح کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عبادات میں ریاکاری اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے ایک مسلمان کو حتی المقدور اس سے بچنا چاہیئے، مگر ریاکاری کے خوف سے نیک عمل کو ترک کرنا بھی کوئی عقلمندی کا کام

نہیں۔ اس لیے جو نیک عمل (نفل و ذکر اذکار) آپ صرف اس وجہ سے ترک کرتے ہیں کہ کہیں اس میں ریاکاری نہ پیدا ہو جائے بالکل نامناسب اور خلافِ شرع عمل ہے، آپ کو جب بھی عبادت کا شوق پیدا ہو فوراً نوافل اور اذکار میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔

صرف سلام کر دینے سے بلا عذرِ شرعی کسی سے بات چیت نہ کرنے پر وارد وعید ختم ہو جاتی ہے

سوال:- ایک صاحب سے میرے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہیں کہ میں اس کے ساتھ کلام بھی نہیں کرنا چاہتا مگر حدیث شریف میں وارد وعید سے بھی ڈرتا ہوں، مجھے کوئی ایسی تدبیر بتائیں کہ میری اس کے ساتھ زیادہ گفت وشنید بھی نہ ہو اور اس وعید سے بھی بچ جاؤں؟

الجواب:- کسی مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ بلا عذرِ شرعی باتیں نہ کرنا جائز نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر کے طویل وقت تک گپ شپ لگائیں اور اس کے ساتھ آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا ہو بلکہ صرف سلام کرنے پر کلام کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اس شخص کے ساتھ کسی شرعی عذر کی بناء پر بات چیت کرنا نہیں چاہتے تو نہ کریں صرف سلام کرنا ہی کافی ہے اس سے بھی آپ کا ذمہ فارغ ہو جائے گا، طویل وقت تک گپ شپ لگانا اور گفت وشنید کرنا ضروری نہیں۔

خلافت اور سجادہ نشینی کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! آجکل خانقاہی نظام میں ایک عام دستور ہے کہ جب کوئی پیر عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو وہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کر کے اپنے مریدین اور احباب و اقارب کی موجودگی میں اس کی دستار بندی کرتا ہے اور اس سلسلے میں بڑی دھوم دھام سے ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ تو کیا اسلام میں کسی کو اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی اہل شخص کو اپنا جانشین مقرر کرنا اور اس کو خلافت سے نوازنا کوئی خلافِ شرع عمل نہیں، اسلامی تعلیمات میں اسکی گنجائش موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنی خلافت اور جانشینی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس کو جانشین یا خلیفہ مقرر کرنا مقصود ہو اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہوں جن کا ایک متبع سنّت مصلح یا پیر و مرشد میں پایا جانا ضروری ہے جس میں اہلیت نہ ہو اسلام نے اس کو خلافت دینے اور جانشین بنانے

کی اجازت نہیں دی ہے، آجکل اکثر نااہل لوگوں کو خلافت سے نوازا جاتا ہے جو کہ بے دینی اور فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: اکثر مشائخ کی عادت ہے کہ وہ ابقاء فیض اور اجراء سلسلہ کیلئے اپنے اتباع میں سے کسی کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کر دیتے ہیں، ایک کو یا متعدد کو، کبھی حیات میں اور کبھی بعید اپنی وفات کے، مگر مقصود ان سب سے ضرورتوں کا مشترک و متحد ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ شخص اہل ہو، حدیث شریف سے اس کی اصل ثابت ہوتی ہے کہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کسی امر میں گفتگو کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ پھر آنا، اس نے عرض کیا کہ اگر اس وقت آپ کو نہ پاؤں تو؟ مراد اس کی یہ تھی کہ اگر آپ کی وفات ہو جائے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو مجھ کو نہ پائے تو ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اب جو خلافت و سجادہ نشینی کا طریق متعارف ہو گیا ہے کہ کبھی شیخ کی حیات میں اور کبھی بعد وفات سلسلہ کے لوگ جمع ہو کر شیخ کے اقارب یا خدام میں سے جس کو زیادہ اختصاص دیکھا، گو وہ اختصاص دنیوی ہی ہوا اور گو اس میں اہلیت نہ ہو دستار بندی کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل طریقہ کا افساد اور طالبین کی راہزنی اور عوام کی اضاعتِ دنیا و دین ہے۔ امام مالکؒ نے روایت کیا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس عہدہ (خلافت) کو ایسے شخص کے حوالے نہیں کرتا جو اس کا اہل نہ ہو، البتہ ایسے شخص کے لیے تجویز کرتا ہوں جس کی رغبت اہل اسلام کی توقیر کی طرف ہو، سو یہ لوگ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ مستحق ہیں — اس حدیث سے نااہل کو خلیفہ بنانے کا ابطال ثابت ہوتا ہے۔

(شریعت و طریقت ص۴۲۳ باب پنجم متفرقات)

✪

کتاب السیاسة

کتاب السیاسۃ
(سیاست کے احکام و مسائل)

سیاست کی حقیقت اور اس کا حکم

سوال :- سیاست کسے کہتے ہیں؟ شرعاً سیاست میں حصہ لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی سیاست میں حصہ لیا تھا یا نہیں؟

الجواب :- سیاست کا معنیٰ اور مفہوم لغت کی کتابوں سے یوں معلوم ہوتا ہے :-
"پاس داشتن ملک وحکم راندن بر رعیت" (شمس اللغات ص۳۶۶)

"السیاسۃ" القیام علی الشئ بما یصلحہ۔ والسیاسۃ فعل السائس یقال ھو یسوس الدواب اذا قام علیھا وراضھا۔ والوالی یسوس رعیتہ۔ (لسان العرب ج۶ ص۴۲۹، ۴۳۰)

ان تعریفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے ملک اور قوم کی بہتری کے بارے میں سوچا جاتا ہے، اگرچہ موجودہ دور کے نام نہاد جمہوریت پسندوں کی دوغلی پالیسی اور دجل وتلبیس نے سیاست کا میدان ایسا بدنام کر رکھا ہے کہ جس کی وجہ سے کسی شریف اور باعزت شخص کے لیے اس میں قدم رکھنا موجبِ ملامت سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود شرعی نقطہ نظر سے اسلامی سیاست کا منشاء یہ ہے کہ ملک اور قوم کو ایسا منظم نظام مہیا ہو کہ جس پر چلنے سے انسان کامیابی سے ہمکنار ہو جائے اور اسی مقصد کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے متعدد انبیاء کرام بھیجے کہ وہ انسانوں کو ایسی تعلیمات دیں کہ جن پر عمل کر کے انسان دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

دین ومذہب انسان کے عقائد سے لے کر سیاسیات کے میدان تک اصلاح کا تقاضا کرتا ہے سیاست چونکہ دنیوی نظام ہائے حیات سے متعلق ہے اس لیے یہ شریعت کا مستقل موضوع ہے۔ شارح قانونِ اسلام علامہ ابوالحسن الماوردیؒ فرماتے ہیں :"الامامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا" (الاحکام السلطانیۃ ج۲ ص۵ الباب الاول فی عقد الامامۃ)[۱]

---

[۱] "السیاسۃ" استصلاح الخلق بارشادھم الی ما فیہ مصلحتھم۔ النھج المتبع فی تدبیر مرفق من مرافق الحیاۃ العامۃ ۔ تدبیر المعاش مع العموم علی طریق العدل۔ (لاروس ص۶۸۶)

یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی تعلیمات میں سیاست ایک مستقل شعبہ رہا ہے، حدیث میں ہے:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وستکون خلفاء فتکثرون قالوا فما تامرنا یارسول اللہ قال فوا ببیعۃ الاول فالاول واعطوھم حقھم فان اللہ سائلھم عما استرعاھم۔

وقال الامام النووی فی شرح المسلم تحت ھذا الحدیث: "قولہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی" ای یتولون امورھم کما یفعل الامراء والولاۃ بالرعیۃ" والسیاسۃ القیام علی الشیٔ بما یصلحہ۔

(النووی شرح المسلم ج۲ ص۱۲۶ کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلیفۃ)

سیاست ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ انسان منصب خلافت پر فائز ہوتا ہے اور یہ عمل خود سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔

مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ "وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا" (سورۃ الاسراء آیت ۸۰) کی تفسیر میں مفسرین حضرات یوں فرماتے ہیں:۔

قال الامام طبریؒ: واجعل لی ملکا ناصرا ینصرنی علی من ناوانی وعزا اقیم بہ دینک وادفع بہ عنہ من ارادہ بسوء۔ (جامع البیان ج۹ ص۱۵۰ سورۃ بنی اسرائیل)

وقال الامام شھاب الدین الآلوسی البغدادیؒ: "وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا"، بنی اسرائیل وعلم نبی اللہ انہ لا طاقۃ لہ بھذا الامر الا بسلطان فسال سلطانا نصیرا لکتاب اللہ تعالیٰ وحدودہ وفرائضہ فان السلطان عزۃ من اللہ عزوجل جعلھا بین اظھر عبادہ لولا ذلک لاغار بعضھم علی بعض واکل شدیدھم ضعیفھم۔ (روح المعانی ج۱۵ ص۱۴۴ سورۃ بنی اسرائیل)[1]

مروجہ سیاست میں الجھنا

سوال:۔ موجودہ دور کی سیاست میں حصہ لینا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا شرعاً کیسا ہے؟

---

[1] وقال الامام بیضاویؒ: وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم۔ (تفسیر بیضاوی شریف ص۶۳،۶۲ سورۃ بنی اسرائیل)

ومثلہ فی تفسیر ابن کثیر ج۳ ص۶۰ بنی اسرائیل وفی تفسیر مظہری ج۵ ص۸۲ سورۃ بنی اسرائیل۔

الجواب: موجودہ دور میں لوگ سیاست میں مختلف مقاصد کے حصول کے لیے حصہ لیتے ہیں، بعض لوگ تو اپنی سیاسی دوکان چمکانے کے لیے متحرک نظر آتے ہیں جبکہ بعض لوگ غیر شرعی نظامہائے زندگی مثلاً سوشلزم، نیشنلزم، کیپیٹلزم وغیرہ کے لیے محنت کرتے ہیں اور بعض لوگ علاقائی یا قومی تعصبات کی سیاست میں ہی اپنی بقاء سمجھتے ہیں، ان مقاصد کے حصول کے لیے سیاست میں حصہ لینا اور ان کے لیے جدوجہد کرنا یقیناً سعی لاحاصل کے مترادف ہے جبکہ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے کوشش کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس لیے اگر ایک شخص ایسے بے دینی نظام کی ترویج و اشاعت کے مقابلہ میں اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو یقیناً یہ مستحسن اقدام ہے بلکہ بے دینی کی یلغار کے مقابلہ کے لیے اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق اس میدان میں حصہ لینا علماء کرام کے فرائضِ منصبی کا حصہ ہو کر عظیم جہاد ہے۔

لما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: عن ابی سعید الخدریؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔

(ترمذی ج۲ ص۴۰ ابواب الفتن)[1]

البتہ جہاں کہیں علماء کرام بجائے کسی اصلاحی پہلو کے تو وکسی غیر شرعی سیاست کا شکار ہو کر اپنے دینی تشخص کو کھو بیٹھیں تو ایسی حالت میں اپنے دینی تشخص کا تحفظ کرنا علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدۃ آیت ۱۰۵)

---

[1] وقال العلامۃ ملا علی قاری رحمہ اللہ، تحت ھذا الحدیث: "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" وقال المظہر وانما کان افضل لان ظلم السلطان یسری فی جمیع من تحت سیاستہ وھو جم غفیر فاذا نہاہ عن الظلم فقد اوصل النفع الی خلق کثیر بخلاف قتل کافر۔ (مرقاۃ المفاتیح ج۷ ص۲۲۲ کتاب الامارۃ والقضاء۔ الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی ابی داؤد ج۲ ص۲۴۱ کتاب الملاحم۔ ب۔ الامر والنہی۔

امارتِ شرعی کے قیام کا حکم

سوال :- پاکستان میں مختلف پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتی ہیں جن میں ہر پارٹی کا نقطۂ نظر الگ ہوتا ہے، اور بعض پارٹیاں تو کامیاب ہونے کے بعد نظامہائے غیر شرعی کے نفاذ کی کوششیں کرتی ہیں جبکہ دینی جماعتیں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے انتخابات میں حصہ لیتی ہیں۔ تو اب اہلِ پاکستان خصوصاً مسلمانوں پر شرعی نقطۂ نظر سے کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ملک میں اسلامی خلافت یا جمہوری نظام کے قیام کی حامی پارٹیوں میں سے کس پارٹی کو کامیاب کریں؟

الجواب :- تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ کسی ایسی پارٹی کو برسرِ اقتدار لائے جو عملاً نظامِ اسلام کو ملک میں نافذ کر سکے۔ شرعی نظام میں خلیفہ کی بڑی ذمہ داریاں یہ ہیں، احکامِ الٰہی کا عملاً نفاذ کرنا، حدود اور قصاص کو جاری کرنا، جمعوں اور عیدین کی نمازوں کو قائم کرنا، ملکی سرحدات کی حفاظت کرنا، اسلامی لشکروں کو منظم کرنا، ڈاکوؤں اور قطاع الطریق کا قلع قمع کرنا، عوام کے جھگڑوں اور منازعات کو حل کرنا۔ شرعی نقطۂ نظر سے سب مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایسی خلافت کے قیام میں تعاون کریں ورنہ سب گنہگار ہوں گے۔

لما قال الامام سعد الدین تفتازانیؒ : ثم الاجماع علی ان نصب الامام واجب وانما الخلاف فی انہٗ یجب علی اللہ او علی الخلق بدلیل سمعی او عقلی والمذھب انہٗ یجب علی الخلق سمعاً لقولہٖ عم من مات ولم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃً جاھلیۃً۔

(شرح العقائد النسفی ص۱۱۰ الخلافۃ والامارۃ)

وقال الامام شاہ ولی اللہ محدث الدھلوی رحمہ اللہ : اعلم انہٗ یجب ان یکون فی جماعۃ المسلمین خلیفۃ لمصالح لا تتم الا بوجودہ وھی کثیرۃ جداً یجمعھا صنفان، احدھما ما یرجع الی سیاسۃ المدینۃ من ذب الجنود التی تغزوھم وتقھرھم وکف الظالم عن المظلوم وفصل القضایا وغیر ذٰلک .... وثانیھما ما یرجع الی الملۃ وذٰلک ان تنویہ دین الاسلام علی سائر الادیان لا یتصور الا بان یکون فی المسلمین خلیفۃ ینکر علی من خرج من الملۃ وارتکب ما نصت علی تحریمہ او ترک ما نصت علی افتراضہ اشد الانکار وبذل اھل سائر الادیان یأخذ منھم الجزیۃ عن ید وھم

صاغرون - رحجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص۱۴۸ ابواب سیاسۃ المدن) لہ

اسلام میں انتخابِ امیر کا طریقۂ کار

سوال :- اسلام میں انتخابِ امیر یعنی کسی شخص کو امیر اور خلیفہ مقرر کرنے کے لیے کون سا طریقہ اپنایا جاتا ہے ؟

الجواب :- اسلامی سیاست میں انتخابِ امیر کے لیے چار طریقے پائے جاتے ہیں،
(۱) بیعتِ اہلِ حل وعقد (۲) استخلاف (۳) شوریٰ (۴) استیلاء

۱ :- پہلی قسم کی مثال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت ہے کہ چند اہلِ حل و عقد نے جمع ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رض کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد عام لوگوں نے بیعت کرنا شروع کی تھی۔

لما قال الامام الماوردی رحمہ اللہ : ان بیعۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ انعقدت بخمسۃ اجتمعوا علیہا ثم تابعهم الناس فیہا وهم عمر بن الخطاب وابوعبیدۃ بن الجراح واسید بن حضیر وبشر بن سعد وسالم مولی ابی حذیفۃ رضی اللہ عنہم ۔
(الاحکام السلطانیۃ ص۷ الباب الاول فی عقد الامامۃ)

۲ :- استخلاف کی صورت یہ ہوتی ہے کہ خلیفۂ وقت چند اہلِ حل وعقد سے مشورہ کر کے کسی ایسے شخص کے بارے میں وصیت کرے کہ جس میں خلافت کی پوری شرائط پائی جاتی ہوں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے ۔

لما قال الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ : طریقِ دوم : استخلافِ خلیفہ است متجمع

لہ وقال الامام عمر النسفیؒ : والمسلمون لا بد لهم من امام یقوم بتنفیذ احکامهم واقامۃ حدودهم وسد ثغورهم وتجهیز جیوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبۃ والمتلصصۃ وقطاع الطریق واقامۃ الجمع والاعیاد وقطع المنازعات الواقعۃ بین العباد وقبول الشهادات القائمۃ علی الحقوق ۔
(شرح العقائد النسفی ص۱۱۰ الخلافۃ والامارۃ)
وَمِثْلُهٗ فی احکام السلطانیۃ لابی یعلی ص۱۹ فصول فی الامامۃ ۔

شروط را یعنی خلیفۂ عادل بمقتضائی تصحح مسلمین شخصی را از میان مستجمعین شروط خلافت اختیار کنند و جمع نماید مردمان را وتص کنند باستخلاف وی و وصیت نماید باتباع وی۔ پس این شخص میاں سائر مستجمعین خصوصیتی پیدا کند و قوم را لازم ست کہ ہماں شخص را خلیفہ سازند انعقاد خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں طریق بود۔

(ازالۃ الخفاء ص۵ مقصد اوّل)

۳۔ شوریٰ : شوریٰ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ وقت چند آدمیوں کی شوریٰ مقرر کرے کہ میری خلافت کے بعد یہ حضرات آپس میں مشورہ کر کے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کریں گے، جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چھ آدمیوں کی شوریٰ مقرر کی تھی اور اس شوریٰ والوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔

لما قال الامام ابوالحسن الماوردیؒ : والثانی ان عمر رضی اللہ عنہ جعل الشوریٰ فی ستۃ لیعقد لاحدھم برضاء الجنسۃ۔ (الاحکام السلطانیہ ص۶ الباب الاول فی عقد الامامۃ)

۴۔ استیلاء : استیلاء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مذکورہ تین طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقہ سے خلیفہ بن جائے، پھر یہ استیلاء بھی دو قسم پر ہے : (۱) ایک قسم وہ ہے کہ جو شخص طاقت اور غلبہ کے ساتھ اپنے آپ کو خلیفہ مقرر کرلے اور اس میں خلیفہ کی تمام شرائط موجود ہوں تو یہ قسم شرعاً جائز ہے۔ (۲) دوسری قسم یہ ہے کہ جو شخص طاقت کے زور سے خلافت کے منصب پر فائز ہوجائے اور اس میں خلیفہ کی شرائط بھی موجود نہ ہوں تو ایسی خلافت کو نظریہ ضرورت کے تحت تسلیم کیا جائے گا، شرعاً کسی مسلمان کو اس کے خلاف قدم اٹھانا صحیح نہیں۔ تاہم جب تک ایسے خلیفہ سے ضروریاتِ دین میں کمی نہیں آئی ہو تو مسلمان عوام پر اس کی اطاعت کرنا اور اس کے ساتھ جہاد وغیرہ کے لیے جانا لازم ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ایسی خلافت کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

ــــ طُریق چہارم : استیلاء ست، چوں خلیفہ بمیرد وشخصی متعدی خلافت گردد بغیر بیعت واستخلاف وہمہ را برخود جمع سازند باستلاف قلوب یا بقہر ونصب قتال خلیفہ شود ولازم گردد بر مردماں اتباع فرمانِ اُو درآں چہ موافق شرع باشد۔ وایں دو نوع است : یکے آنکہ مستولی مستجمع شروط باشد وصرف منازعین کند بصلح و تدبیر از غیر ارتکاب محرمی وایں قسم جائز است ورخصت وانعقاد خلافتِ معاویہ بن ابی سفیان بعد حضرت مرتضیٰ وبعد صلح امام

حسین رضی اللہ عنہم بہمیں نوع بود۔

دیگر آنکہ مستجمع شروط نباشد و صرف منازعین کند بقتال و ارتکاب محرم وان جائز نیست و فاعل آں عاصی ست لیکن واجب است قبول احکام او اُن چہ موافق شرع باشد و اگر عُمّالِ او اخذ زکوٰۃ کنند از ارباب اموال ساقط شود و چوں قاضی او حکم نماید نافذ گردد و حکم او ہمراہ او جہاد می تواں کرد۔ و ایں انعقاد بنا بر ضرورت ست زیراکہ در عزلِ او افنائے نفوس مسلمین و ظہور حرج و مرج شدید لازم می آید و بیقیں معلوم نیست کہ ایں شدائد مفضی شود بصلاح یانہ۔ یحتمل کہ دیگری بدتر از اوّل غالب شود پس ارتکاب فتن کہ قبح او متیقن ست چرا باید کرد برائے مصلحتے کہ موہوم ست و محتمل و انعقاد خلافت عبدالملک بن مروان و اوّل خلفائے بنی عباس بہمیں نوع بود۔" (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص مقصد اول)[۱]

---

[۱] وقال الامام شاہ ولی اللہ فی طرق انعقاد الخلافۃ: وتنعقد الخلافۃ بوجوہ (۱) بیعۃ اھل الحل والعقد من العلماء والرؤساء وامراء الاجناد ممن یکون لہٗ رائی ونصیحۃٌ للمسلمین کما انعقدت خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ۔ (۲) وبأن یوصی الخلیفہ الناس بہ کما انعقدت خلافۃ عمر رضی اللہ عنہ (۳) اویجعل شوریٰ بین قوم کما کان عند انعقاد خلافۃ عثمان بل عَلِیّ ایضًا رضی اللہ عنہما (۴) أو استیلاء رجل جامع للشروط علی الناس وتسلطہ علیھم کسائر الخلفاء بعد خلافۃ النبوۃ ثم ان استولی من لم یجمع الشروط لا ینبغی ان یبادر الی المخالفۃ لان خلعہ لایتصور غالبًا الا بحروب ومضایقات وفیھا من المفسدۃ اشد مما یرجیٰ من المصلحۃ۔ وسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنھم فقیل افلا ننا بذھم؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ وقال الا ان تروا کفرًا بواحًا عندکم من اللہ فیہ برھان وبالجملہ فاذا کفر الخلیفۃ بانکار ضروری من ضروریات الدین حل قتالہ بل وجب والا لا۔

[حجۃ اللہ البالغۃ ج۲ ص۱۴۹، ۱۵۰ ابواب السیاسۃ
المدن انعقاد الخلافۃ بوجوہ]

ومثلہٗ فی الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص۲۳ فصول فی الامامۃ۔

عورت کی حکمرانی شرعاً ناجائز ہے

سوال :- اسلامی نقطہ نظر سے کوئی عورت کسی ملک کی سربراہ بن سکتی ہے یا نہیں؟ اگر مروجہ جمہوری نظام میں کسی عورت کو اقتدار سونپ دیا جائے تو ایسی حالت میں شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب : قرآن وحدیث کی رُو سے سربراہ مملکت بننے کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ سربراہ کا مذکر ہونا اہم شرط ہے، اسلامی نظامِ خلافت میں یہ قطعاً گوارا نہیں کہ کسی عورت کو زمامِ اقتدار سونپا جائے۔

لما قال الامام سعد الدین التفتازانیؒ : (تحت قول النسفی) "ویشترط ان یکون من اهل الولایة المطلقة الکاملة" ای مسلماً حراً ذکراً عاقلاً بالغاً... والنساء ناقصات عقلٍ ودین۔ (شرح العقائد النسفی ص۱۱۳ الخلافة والامارة)

وقال العلامة ابن عابدینؒ : (تحت قول درمختار) "ویشترط کونه مسلماً حراً ذکراً" ولان النساء امرن بالقرار فی البیوت فکان مبنیٰ حالهن علی الستر والیه اشار النبی صلی الله علیه وسلم حیث قال کیف یفلح قوم تملکهم امراة۔

(رد المحتار ج ۱ ص۴۰۵ باب الامامة)

سربراہ بننے کے بعد اس کے فرائض منصبی کی احسن طریقہ سے ادائیگی کے لیے جن امور کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے وہ مردوں میں پیدا کئے ہیں، البتہ گھریلو اور خاندانی امور کے تکفل کی ذمہ داری عورت کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے، اس لیے عورت کو اس میدان میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے جن امور کی ضرورت تھی وہ اسے مکمل طریقہ سے دیئے گئے جبکہ مرد میں وہ صلاحیتیں مفقود ہیں۔

عورت کے لیے پردہ کی رعایت، اجانب سے بے جا اختلاط سے ممانعت اور دامن عصمت کا تحفظ ایسے امور ہیں جو میدانِ قیادت میں جانے سے منع کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق کسی قوم کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ جس نے اپنی حکمرانی عورت کے سپرد کر دی۔

لما ورد فی الحدیث : عن ابی بکرة رضی الله عنه قال نفعنی الله بکلمة سمعتها من رسول الله صلی الله علیه وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل

فاقاتل معهم قال لما بلغ رسول الله صلی الله علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۶۳۷ کتاب المغازی)

وقال الامام بغویؒ: (تحت ھذا الحدیث) اتفقوا علی ان المرأۃ لا تصلح ان تکون اماماً ولا قاضیاً لان الامام یحتاج الی الخروج لاقامۃ امر الجھاد والقیام بامور المسلمین...... ولان المرأۃ ناقصۃ والامامۃ والقضاء من کمال الولایات فلا یصلح لھا الا الکامل من الرجال۔ (شرح السنۃ ج۱۰ ص۷۷ کتاب الامارۃ والقضاء۔باب کراھیۃ تولیۃ النساء) [1]

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ایک کافر قوم کے بارے میں ہے اس لیے کسی بھی قوم کو اس سے مستثنیٰ کرنا جائز نہیں، خواہ مروجہ جمہوریت میں یا اسلامی طریقۂ خلافت میں کسی عورت کو یہ موقع دیا جائے ہر حالت میں عورت کی حکمرانی عذابِ خداوندی کے مترادف ہے۔

اولوالامر کی حقیقت

سوال:۔جمہوریت یا شہنشاہیت میں جو لوگ حاکمیت کے دعویدار ہیں کیا یہ لوگ "اولی الامر" کی حقیقت میں داخل ہیں یا نہیں؟ تاکہ ان کی تابعداری رعیت کے لیے لازم ہو کر ان کے خلاف آواز اٹھانا بغاوت کے مترادف ہو؟

الجواب:۔شریعت کی رُو سے" اولی الامر" کی حقیقت خلافت علیٰ منہج النبوۃ سے خاص نہیں بلکہ امراء اور سلاطین بھی اگر عوام کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری نبھاتے ہوں اور کسی خاص طریقۂ انتخاب سے ان کی تقرری ہوتی ہو اور جس کو عوام کی تائید بھی حاصل ہو خواہ جمہوریت میں ہو یا دوسرے نظامِ حکومت میں ہو تو یہ لوگ بھی" اولی الامر" میں شمار ہوں گے۔

لما قال الامام جصاصؒ: والصحیح عندی انھم الامراء والعلماء جمیعاً اما الامراء فلان اصل الامر منھم والحکم الیھم واما العلماء فلان سئوالھم واجب متعین علی الخلق وجوابھم لازم۔ (احکام القرآن ج۱ ص۱۸۹ سورۃ البقرۃ)

تاہم جہاں کہیں امراء اور سلاطین کسی خلافِ شرع نظام کو مسلمانوں پر نافذ کرنے کی کوشش کریں تو ان کے خلاف آواز اٹھانا صرف جائز ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی دینی اور

---

[1] قال العلامۃ الامام القرطبیؒ: واجمعوا علی ان المرأۃ لا یجوز ان تکون اماماً۔ (الجامع لاحکام القرآن ج۱ ص۲۷۰ سورۃ البقرۃ)

اخلاقی ذمہ داری ہے ۔

لما قال الامام قرطبیؒ : فی تفسیر "اولی الامر" روی عن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ انہٗ قال حق علی الامام ان یحکم بالعدل ویؤدی الامانۃ واذا فعل ذٰلک وجب علی المسلمین ان یطیعوہ لان اللہ تعالیٰ امر باداء الامانۃ والعدل ثم امر بطاعتہ ۔

(تفسیر الجامع لاحکام القرآن ج۵ ص۲۵۹ سورۃ النساء) [1]

خلافت یا ملوکیت

سوال : خلافت علیٰ منہج النبوۃ کا دور کتنا عرصہ رہا اور اس کے بعد نظامِ حکومت خلافت کی بجائے ملوکیت کو منتقل ہوا؟ نیز خلافت اور ملوکیت میں کیا فرق ہے ، اور ملوکیت کا دور کس وقت سے شروع ہوتا ہے ؟

الجواب : خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور تیس ۳۰ سال تک مسلسل رہا ، پھر اس کے بعد ملوکیت کا دور شروع ہوتا ہے البتہ درمیان میں بعض ایسے خلفاء آئے جن کے عدل و انصاف کی وجہ سے ان کا دورِ حکومت بھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ میں شمار کیا گیا تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تیس سال تک رہی ۔ اس کے بعد مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے خلافت ملوکیت کی طرف منتقل ہوئی ۔

لما ورد فی الحدیث : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلافۃ فی اُمتی ثلاثون سنۃ ثم ملک بعد ذٰلک ۔ ثم قال سفینۃ امسک خلافۃ ابی بکرؓ ثم قال وخلافۃ عمرؓ وخلافۃ عثمانؓ ثم قال امسک خلافۃ علیؓ فوجدنا ھا ثلاثین سنۃً قال سعید فقلت لہٗ ان بنی اُمیۃ یزعمون ان الخلافۃ فیھم قال کذبوا بنوا الزرقاء بل ھُم ملوک من شر الملوک ۔ (ترمذی ج۲ ص۴۶ کتاب الفتن)

بنو امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے تقویٰ ، خدا ترسی اور للّٰہیت کی وجہ سے اُن کا

---

[1] لما قال الامام الشوکانیؒ : "واولی الامر" ھم الائمۃ والسلاطین والقضاۃ وکل من کانت لہٗ ولایۃ الشرعیۃ لا ولایۃ طاغوتیۃ والمراد طاعتھم فیما یأمرون بہٖ وینھون عنہ مالم تکن معصیۃً فلا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ کما ثبت ذٰلک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ (فتح القدیر للشوکانی ج۱ ص۴۸۱ سورۃ النساء)

وَمِثْلُہٗ فی جامع البیان للطبری ج۴ ص۱۴۷ سورۃ النساء ۔

دورسنہری دور کہلایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بعض اسلاف نے آپ کے دورِ حکومت کو خلفاء راشدین کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

عن سفیانؒ یقول الخلفاء خمسة ابو بکر وعمر وعثمان وعلی وعمر ابن عبد العزیز رضی اللہ عنهم۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۲۸ کتاب الامارة) [1]

خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی کے اسباب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کی قوت اور ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پوری کوشش کی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ خلفاء راشدین خاص کر حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں انہیں موقع نہ مل سکا تاہم ان لوگوں نے زیر زمین اپنی سرگرمیاں زور وشور سے جاری رکھیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد دشمنانِ اسلام کھل کر میدان میں آگئے جس کی سب سے بڑی دلیل خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت ہے۔

قال العلامة ابن کثیر رحمه الله: فکان اول من دخل علیه رجل یقال له الموت الاسود فخنقه خنقاً شدیداً حتی غشی علیه وجعلت نفسه تتردد فی حلقه فترکه وهو یظن انه قد قتله...... ثم دخل علیه آخر ومعه سیف فضربه به فاتقاه بیده فقطعها..... فکان اول قطرة فیها سقطت علی هذه الآیة: "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" ثم جاء آخر شاهداً سیفه فاستقبلته نائلة بنت الفرافصة لتمنعه منه واخذت السیف فانتزعه منها فقطع اصابعها۔ (البدایة والنهایة ج ۷ ص۱۹۷)

جس کے بعد جمل وصفین اور دوسری جنگیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے خلافت علیٰ منہج النبوة کی جڑیں کھوکھلی کی گئیں جس سے رفتہ رفتہ خیر القرون کا دور ختم ہو کر خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔

خلافت اور ملوکیت میں نمایاں فرق یہ رہا کہ خلافت کے انتخاب کا جو طریقہ خلفاء راشدینؓ کے دور میں مروج تھا وہ ملوکیت میں نہ رہا، خلفاء راشدین کے دور میں رعایا کی رضامندی سے

---

[1] عن سفیانؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم یؤتی الله الملك من یشاء۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۲۸۲ کتاب الامارة)

بیعت لی جاتی تھی جبکہ ملوکیت میں اس کے برعکس دباؤ اور جبر سے بیعت لی جاتی تھی، اس کا اندازہ خود حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ طیبہ میں کی گئی تقریر سے ہوتا ہے، آپ نے فرمایا :-

اما بعد! فانی واللہ ما ولیت امرکم حین ولیتہ وانا اعلم انکم لا تسرون بولایتی ولا تحبونہا۔ وانی لعالم بما فی نفوسکم من ذلک ولکنی خالستکم بسیفی ھذا مخالسۃ۔
(البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۱۳۵)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملوکیت کے دور میں خلفاء راشدین کی سی سادہ زندگی کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سی شان و شوکت پیدا ہو گئی اور بادشاہ اور رعیت کے درمیان حاجب اور دربان حائل ہو گئے، رعیت کی خیر خواہی کی جگہ امراء خود انانیت کا شکار ہو گئے اور ان سے ایسے کام سرزد ہوتے جو اس منصب کو زیب نہیں دیتے۔

منصب خلافت کے انتخاب کا معیار

سوال :- اگر ایک شخص اعمال کے اعتبار سے دین کا پابند ہو، تقویٰ اور دینداری میں بڑی شہرت رکھتا ہو لیکن ملکی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر نہ ہونے کی وجہ سے امور مملکت چلانے سے نابلد ہو تو کیا منصب خلافت کے عہدہ کیلئے اس کو ترجیح دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :- کسی مسلمان کی دینداری اور تقویٰ بے شک ایک مستحسن چیز ہے جو کہ صرف اس کی اپنی ذات تک محدود ہے، منصب خلافت میں چونکہ ذاتی کردار سے ہٹ کر مخلوق خدا سے واسطہ پڑتا ہے اور اس میں معاشرہ کے خم و پیچ اور حالات کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے اس لیے اس میدان میں امور خلافت سے واقفیت رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ تاہم ایسے منصب کے انتخاب میں دجل و تلبیس اور ظلم و زیادتی سے بچنے کے لیے اُمیدوار کے ذاتی کردار و اخلاق کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ : تحت قول النسفیؒ

ولا یشترط فی الامام ان یکون معصوماً ولا ان یکون افضل من اھل زمانہ لان المساوی فی الفضیلۃ بل المفضول الاقل علماً وعملاً ربما کان اعرف بمصالح الامامۃ ومفاسدھا واقدر علی القیام بمواجبھا خصوصاً اذا کان نصب المفضول ادمع للشر وابعد عن اثارۃ الفتنۃ .... مع انہ لا یجوز نصب امامین فی زمان واحد قلنا غیرا لجائز

ھو نصب اما مین مستقلین۔ (شرح العقائد النسفی ص۱۱۳ الخلافۃ والامارۃ) [۱]

قومی یا علاقائی امیر کی شرعی حیثیت

سوال:۔ اگر ایک قوم متفقہ طور پر شریعت کے نام پر ایک عالمِ دین کو اپنا امیر منتخب کرے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے اور اس کے اختیارات کا دائرہ کار کیا ہے؟

الجواب:۔ امیر کی شرائط کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر کسی قوم نے اجتماعی طور پر یا اکثریت کی رائے سے کسی معتمد شخص کو اپنا امیر مقرر کر لیا تو ایسا اقدام شرعاً قابلِ تحسین ہے بلکہ شرعی نقطۂ نظر سے حضر کے علاوہ سفر میں بھی اس کی رعایت ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا خرج ثلاثۃ فی سفرٍ فلیؤمروا احدھم۔ (ابوداؤد ج۱ ص۳۵۱ کتاب الجھاد)

تاہم قوم پر لازم ہے کہ شرعی امور میں ایسے امیر کی اطاعت کرے البتہ غیر شرعی امور میں امیر کی اطاعت اور قول کو اعتبار نہیں دیا جائے گا۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ قال علی المرء المسلم السمع والطاعۃ فیما احب وکرہ الا ان یؤمر بمعصیۃ فان امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔ (صحیح مسلم ج۲ ص۱۲۵ کتاب الامارۃ)

ایسے امیر کو چونکہ کلی اختیارات حاصل نہیں ہوتے اس لیے حدود اور قصاص کی تنفیذ اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

لما قال الامام علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی رحمہ اللہ: واما شرائط جواز اقامتھا فمنھا ما یعم الحدود کلھا ومنھا ما یخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلھا فھو الامامۃ وھو ان یکون المقیم للحد ھو الامام او من ولاہ الامام وھذا عندنا...... لان للامام ولایۃ علی جمیع دار الاسلام ثابتۃ۔
(بدائع الصنائع ج۷ ص۵۷، ۵۸ کتاب القضاء)

---

[۱] وقال العلامۃ محمد عبد العزیز الفرھاروی رحمہ اللہ: لان اعظم مدار السلطنۃ ھو علی المھارۃ باموراالدنیا لا علی المھارۃ بالعلم الشرع وکثرۃ العبادۃ۔
(النبراس ص۱۱۳ الخلافۃ والامارۃ)
ومثلہٗ فی رد المحتار ج۱ ص۳۶۵ باب الامامۃ۔

وقال الامام الهمام نجم الملۃ والدین عمر النسفیؒ : ویشترط ان یکون من اهل الولایۃ المطلقۃ الکاملۃ سائسًا قادرًا علی تنفیذ الاحکام وحفظ حدود دار الاسلام وانصاف المظلوم من الظالم۔ (شرح العقائد النسفی ص۱۱۳، ۱۱۴ الخلافۃ والامامۃ) [1]

ووٹ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ مروجہ طریقہ انتخاب میں ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ عصر حاضر میں ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں:۔

(۱) اس کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے، ووٹر جس ممبر کو ووٹ دے رہا ہوتا ہے وہ اس بات کی گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ میں اس کو ملک وقوم کے لیے مفید اور خیرخواہ سمجھتا ہوں۔

(۲) اس کی حیثیت مشورہ کی سی ہے، ووٹر حکومت اور نظم ونسق کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ سیاسی امور میں کون زیادہ بہتر، ایماندار اور دیانتدار ہے۔

(۳) اس کی حیثیت سفارش کی ہے کہ ووٹر اس امیدوار کے لیے ایک اہم عہدہ سنبھالنے کے لیے سفارش کرتا ہے۔

(۴) اس کی حیثیت وکالت کی ہے، ووٹر اپنے لیے حکومت کے گھر میں وکیل نامزد کرتا ہے کہ یہ شخص (امیدوار) حکومت سے میرے مسائل حل کرائے گا۔

(۵) ووٹ کی حیثیت سیاسی بیعت کی ہے، ووٹر اپنے ووٹ کے ذریعے مقامی امیدوار کے واسطہ سے سربراہ مملکت کی بیعت کرتا ہے۔ اس بیعت میں یہ ضروری نہیں کہ براہ راست سربراہ مملکت یا خلیفۂ وقت کے ہاتھ پر بیعت کی جائے، بلکہ بیعت خط وکتابت کے ذریعہ بھی ہوسکتی ہے، اور اسی طرح سربراہ مملکت کی جانب سے مقرر شدہ نمائندہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا بھی خلیفہ کی بیعت شمار ہوتی ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ : هی صغری وکبری فالکبری استحقاق تصرف عام علی الأنام۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۱ ص۴۰۴ باب الامامۃ)

ومثلہ فی رد المحتار ج۱ ص۴۰۴ باب الامامۃ۔

سے فرمایا کہ لوگوں سے میرے لیے بیعت لے لو۔

عن عبادۃ بن الصامت رضؓ یقول قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن فی مجلس تبایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷ کتاب الاحکام)

وعن عبد اللہ بن دینار قال شھدت ابن عمرؓ حیث اجتمع الناس علی عبد الملک کتب انی اقر بالسمع والطاعۃ لعبد اللہ عبد الملک امیر المؤمنین علی سنۃ اللہ وسنۃ رسول اللہ ما استطعت وان بنیّ قد اقروا بمثل ذلک۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۶۹ کتاب الاحکام)

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے اپنے حق رائے دہی (ووٹ) کے استعمال کا معاملہ بڑا نازک اور اہم ہے۔ اگر کسی نے نااہل شخص کو ووٹ دے دیا تو یہ ووٹ شہادتِ زور، غلط سفارش اور غلط مشورے میں داخل ہوگا اور اس قسم کے غلط افعال کا ارتکاب قرآن اور حدیث کے صریح مخالف ہے۔

لما قولہ تعالیٰ: ؎ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ ۔ (الحج آیت ۳۰، ۳۱)

۳۔ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا ۔ (النساء آیت ۸۵)

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: المستشار مؤتمن۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۰۵)

وعن تمیم الداریؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدین النصیحۃ قلنا لمن قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳ کتاب الایمان۔ صحیح مسلم ج ۱ ص ۵۴ کتاب الایمان) ؎

ووٹ کا حق استعمال نہ کرنا

سوال: عصرِ حاضر میں انتخابات کے موقع پر ووٹنگ کے دوران بعض لوگ بالکل ووٹ کا استعمال نہیں

؎ ووٹ کی شرعی حیثیت کے لیے دیکھئے (۱) جواہر الفقہ ج ۲ ص ۲۹۶ تا ص ۳۰۱۔ (۲) جدید فقہی مسائل ج ۱ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶ متفرقات۔

وَمِثْلُہٗ فی النسائی ج ۲ ص ۱۶۴ کتاب الامارۃ۔

کرتے ہیں، کیا شریعتِ مقدسہ کی رُو سے ووٹ کا حق استعمال کرنا لازمی ہے یا نہیں؟
الجواب:۔ ووٹ کی حیثیت ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت میں یہ تفصیل ہے کہ شہادت کبھی واجب اور کبھی فرض کی حد تک پہنچتی ہے اور کبھی استحباب اور اباحت کے درجہ میں ہوتی ہے۔ جہاں کہیں شہادت کے ترک کرنے سے مدعی کا حق سلب ہوتا ہو تو وہاں شہادت دینا واجب ہو جاتا ہے، اور جہاں کہیں گواہوں کی تعداد زیادہ ہو وہاں گواہی دینا مستحب اور مباح ہے۔

لما قال الامام القرطبیؒ فی تفسیر هذه الآیة "وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا" فاذا كانت الفسحة لكثرة الشهود والامن من تعطل الحق فالمدعو مندوب وله ان يتخلف لادنى عذر وان تخلف لغير عذر فلا اثم عليه ولا ثواب له واذا كانت الضرورة وخيف تعطل الحق ادنى خوف قوى الندب وقرب من الوجوب - واذا علم ان الحق يذهب ويتلف بتأخر الشاهد عن الشهادة فواجب عليه القيام بها لاسيما ان كانت محصلة وكان الدعاء الى ادائها۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۳۹۸ سورۃ البقرۃ)

انتخابات میں ووٹنگ کے دوران ہر شخص کو یہ اندازہ لگانا چاہیئے کہ اگر میں نے فلاں عقدار شخص کو ووٹ نہ دیا تو اس کے مقابلے میں فاسق فاجر کامیاب ہو جائے گا، تو ایسی حالت میں اس کے لیے ووٹ کا حق استعمال کرنا ضروری ہے، اور اگر یہ خطرہ موجود نہ ہو تو اس کے لیے ووٹ کے عدم استعمال پر کوئی مواخذہ نہیں۔

اسی طرح اگر کسی انتخابی حلقہ میں حصہ لینے والے اُمیدوار فسّاق و فجّار ہو تو ووٹر کے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ ووٹ کا بالکل استعمال نہ کرے۔ حقیقت میں ووٹ کے استعمال کے دو پہلو ہوتے، اور یہ تو ووٹر کی اپنی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے کہ میرے لیے ووٹ استعمال کرنے میں کیا فائدہ ہے اور عدم استعمال میں کیا نقصان ہے، اپنے دینی اور دُنیوی فائدہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ووٹ کا استعمال کرے، اس لیے کہ ووٹ کی حیثیت ایک قسم سفارش کی ہے، اور سفارش اگر اچھی ہو تو ثواب ورنہ گناہ کا مستوجب ہوگا۔

قال الامام القرطبیؒ فی تفسیر هذه الآیة "مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ

نَصِیْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّکُنْ لَّهٗ کِفْلٌ مِّنْهَا۔ (النساء آیت ۸۵)

وَقال مجاهد والحسن وابن زیاد وغیرهم هی فی شفاعات الناس بینهم فی حوائجهم فمن یشفع لینفع فله نصیب ومن یشفع لیضر فله کفل۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۵ ص۲۹۵ سورۃ النساء)[1]

دین کے لیے ووٹ کے استعمال میں والدین کی نافرمانی میں گناہ نہیں

سوال:۔ ایک شخص دیندار ہے اور شرع کا پابند ہے، جب انتخابات کا وقت آتا ہے تو وہ ایک دینی جماعت کو ووٹ دیتا ہے جبکہ اس کا والد سیکولر ذہنیت رکھتا ہے اور اپنا ووٹ بھی غیر مذہبی پارٹی کو دیتا ہے اور اپنے دیندار بیٹے سے بھی کہتا ہے کہ میری پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دینا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع بیٹے کے لیے والد کی یہ بات ماننا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک سعادتمند بیٹے کے لیے والدین کی فرمانبرداری ضروری ہے لیکن ایسے امور میں نہیں کہ جس سے دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہو۔ صورتِ مسئولہ میں بیٹا عنداللہ اپنی مسئولیت کا احساس کرکے کوئی ایسا فیصلہ کرے کہ جس سے اللہ کے ہاں اس کی ذمہ داری فارغ ہو۔

لما قال علیه الصلوٰۃ والسلام: لا طاعة فی معصیة الله انما الطاعة فی المعروف۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۱۲۵ کتاب الامارۃ۔ نسائی ج ۲ ص۲۶۶ کتاب البیعة)

وعن ابن سیرین ان عمران بن حصین قال للحکم الغفاری اسمعت النبی صلی الله علیه وسلم

---

[1] وقال الامام ابن جریر الطبریؒ فی تفسیر هٰذه الاٰیة "وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا" یجب فرض ذٰلک علیٰ من دعی للاشهاد علی الحقوق اذا لم یوجد غیره فامّا اذا وجد غیره فهو فی الاجابة الیٰ ذٰلک مخیر ان شاء اجاب وان شاء لم یجب۔ (جامع البیان للطبری ج ۳ ص۱۲۷ سورۃ البقرۃ)

وقال الامام احمد مصطفیٰ المراغی رحمه الله: فی حق الشهادة۔ وَهو فرض کفایة لا یجب علیٰ من دعی الیه الا اذا لم یوجد غیر یقوم مقامه۔ (تفسیر المراغی ج ۳ ص۷۵ سورۃ البقرۃ)

یقول لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق قال نعم ۔(کنز العمال ج۵ ص۹۲ حدیث ۱۴۴۰۱) [1]

ووٹ دیتے وقت شخصیت یا پارٹی کو ترجیح دینا

سوال :۔ عصر حاضر میں انتخابات کے وقت اہل حلقہ کسی امیدوار مثلاً زید کو صالح، دیندار اور مدبر سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی اس کے مقابلہ میں ووٹ بکر کو دیتے ہیں جو کہ مرتبہ میں زید سے تھوڑا سا کم ہے، اہل حلقہ کا یہ اقدام شرعاً کیسا ہے؟

الجواب :۔ انتخابات میں ووٹ دیتے وقت اہل اور صالح ترین آدمی کو ترجیح دینا ضروری ہے تاہم اگر صالح آدمی کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ اسمبلی میں پہنچ کر صدارتی انتخابات یا وزارتِ عظمیٰ کے انتخاب میں کسی فاسق فاجر کو ووٹ دے گا تو اس صورت میں اُسے ترجیح نہیں دی جائے گی بلکہ جو شخص آگے کسی دیندار صدارتی امیدوار کو ووٹ دے گا اس کو صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات میں ترجیح دینی ضروری ہے۔

قال العلامۃ الحاکم نیسابوریؒ : عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من استعمل رجلاً من عصابۃ وفی تلک العصابۃ من ھو ارضیٰ للہ منہ فقد خان اللہ وخان رسولہ وخان المؤمنین ۔(المستدرک علی الصحیحین ج۴ ص۹۲) [2]

بیوی کو ووٹ ڈالنے سے منع کرنا

سوال :۔ ووٹنگ کے دوران ایک شخص اپنی بیوی کو ووٹ ڈالنے سے منع کرتا ہے اور بیوی اپنے

---

[1] عن ابن جریر کرش عن علیؓ قال لا طاعۃ لبشر فی معصیۃ اللہ ۔
(کنز العمال ج۶ ص۶۷ حدیث ۱۴۹۱۱)

وقال الامام شوکانی محمد بن علیؒ : وکل من کانت لہ ولایۃ شرعیۃ لا ولایۃ طاغوتیۃ والمراد طاعتہم فیما یأمرون بہ وینھون عنہ مالم تکن معصیۃ فلا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ ۔ (تفسیر فتح القدیر للشوکانی ج۱ ص۴۸۱ سورۃ البقرۃ)

[2] وعن حذیفۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل استعمل رجلاً علی عشرۃ انفس علم ان فی العشرۃ افضل ممن استعمل فقد غش اللہ وغش رسولہ وغش جماعۃ المؤمنین ۔ (کنز العمال ج۶ ص۱۹ حدیث ۱۴۶۵۳)

ومثلہٗ فی کنز العمال ج۶ ص۲۵ حدیث ۱۴۶۸۷ ۔

خاوند کے خوف کی وجہ سے ووٹ ڈالنے سے محروم ہوجاتی ہے، شریعت کی رُو سے بیوی کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ ووٹ ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی فرض کفایہ، موجودہ حالات میں ووٹنگ کا جو نظام ہے اس میں ووٹر زیادہ ہوتے ہیں اس لیے ووٹ ڈالنا زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کے حکم میں داخل ہوگا، اور فرض کفایہ میں یہ قاعدہ ہے کہ ضرورت کے تحت اگر چند لوگ ووٹ کا حق استعمال کریں تو اوروں کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے۔ اس لیے اگر خاوند بیوی کو ووٹ ڈالنے سے منع کرے تو شرعاً کسی پر مواخذہ نہیں، نہ خاوند پر اور نہ بیوی پر، بلکہ عورت کے لیے عزت اور حیاء اسی میں ہے کہ خاوند کی بات مان کر ووٹ ڈالنے سے احتراز کرے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ان الشهادة فرض کفایة اذا قام بها البعض سقط عن الباقین وتتعین اذا لم یکن الا شاهدان۔ (البحر الرائق ج۷ ص۵۵ کتاب الشهادة)[1]

رشتہ داری کی بنیاد پر ووٹ دینے کا حکم

سوال:۔ کسی امیدوار کو اچھے بُرے کی تمیز کیے بغیر محض برادری اور رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ووٹ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اہل اور حقدار کے بجائے صرف رشتہ داری اور برادری کی وجہ سے کسی امیدوار کو ووٹ دینا عصبیت اور جاہلیت کے مترادف ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصبیت کی دلدل میں پھنسنے والوں سے بے زاری کا اظہار فرمایا ہے۔

لما ورد فی الحدیث: وعن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات میتة جاهلیة......

---

[1] وقال الامام عبدالرحمٰن بن علی الجوزی القرشیؒ: انما یلزم الشاهد ان لا یأبی اذا دعی لاقامة الشهادة اذا لم یوجد من یشهد غیره۔ فاما ان کان قد تحملها جماعة لم تتعین علیه وکذلك فی حال تحملها لانه فرض علی الکفایة کالجهاد فلا یجوز لجمیع الناس الامتناع منه۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر ج۱ ص۳۳۹ سورة البقرة)

ومن قاتل تحت رأیۃ عمیۃ یدعوا الیٰ عصبیۃ او یغضب لعصبیۃ فقتل فقتلتہٗ جاھلیۃ ۔ (سنن النسائی ج ۲ ص۱۵۶ کتاب المحاربۃ، باب التغلیظ فیمن قاتل تحت رایۃ عمیۃ) [۱]

دیندار امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کی قسم توڑنا

سوال:۔ زید نے انتخابات کے موقع پر عمرو کے بارے قسم اٹھائی کہ میں اپنا ووٹ عمرو کو دوں گا، لیکن کچھ دن بعد عمرو کے مقابلہ میں بکر انتخابات کے لیے کھڑا ہوگیا اور تمام اہل محلہ کے نزدیک بکر، عمرو سے دینی اور دُنیوی دونوں اعتبار سے اچھے کردار کا مالک ہے، اب زید کہتا ہے کہ میں نے جو قسم اٹھائی ہے اسے بکر کے حق میں توڑ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ بکر چونکہ دیندار اور دیانتدار ہونے کی وجہ سے ووٹ کا صحیح حقدار ہے اس لیے زید کو چاہیئے کہ اپنی قسم توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کرے اور اپنا ووٹ بکر کے حق میں استعمال کرے تو شرعاً اس کا ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

لما روی امام نسائیؒ: عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیراً منھا فلیأت الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہ ۔ (سنن النسائی ج ۲ ص۱۴۱ کتاب الایمان والنذور، باب من حلف علیٰ یمین فرأی خیراً منہا) [۲]

مسلمانوں اور مرزائیوں کی متحدہ جماعت کو ووٹ دینے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایک مسلم پارٹی کا قادیانیوں سے انتخابی اتحاد ہوا ہے، ایسی متحدہ جماعت کو ووٹ دینا مسلمانوں

---

[۱] لما فی الحدیث: وعن فسیلۃ قالت سمعتُ ابی یقول سألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللہ امن العصبیۃ ان یحب الرجل قومہ قال لا ولکن من العصبیۃ ان یعین الرجل قومہ علی الظلم ۔ (سنن ابن ماجہ ص۲۸۳ باب العصبیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز العمال ج ۳ ص۵۱۰ رقم حدیث ۷۶۵۷

[۲] وقال الامام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: ومن حلف علیٰ معصیۃٍ ینبغی ان یحنث ویکفر ۔ (کنز الدقائق ص۱۵۵ کتاب الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی سنن النسائی ج ۲ ص۱۴۱ کتاب الایمان والنذور، باب من حلف علیٰ یمین فرأی خیراً منہا ۔

مسلمانوں کے لیے شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قادیانی چونکہ مرتد اور خارج من الاسلام ہیں، ان سے اتحاد کرنے سے اگرچہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر کچھ معمولی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے ارتداد اور کفر کی وجہ سے ان کے جو مذموم مقاصد ہیں اتحاد کی صورت میں وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس لیے قادیانیوں سے اتحاد کرنے میں فائدہ کم اور نقصان کا احتمال زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ یہودیوں سے اتحاد کیا تھا لیکن اس سے کوئی اسلامی شعائر متاثر نہیں ہوا تھا۔

تاہم صورت مسئولہ کے مطابق اگر مسلمان کسی نیک مقصد کی تکمیل کے لیے قادیانیوں سے اتحاد کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بنیادی طور پر کفار اور مشرکین سے اتحاد کرنا ممنوع ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ۝ (سورۃ آل عمران آیت ۲۸)

لیکن جہاں کہیں مسلمانوں کو کفار اور مشرکین سے دینی اور دنیوی فائدہ ہو تو ایسی صورت میں ان سے اتحاد کرنا مرخص ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ منورہ میں آنے کے بعد یہودیوں کے دو مشہور قبائل بنو نضیر اور بنو قریظہ سے اتحاد کیا تھا، اور صلح حدیبیہ بھی اسی قسم کے اتحاد اور معاہدہ کی ایک کڑی تھی۔ اسی طرح آج بھی حالات کو دیکھا جائے گا کہ اگر مسلمانوں اور اسلام کو کفار کے ساتھ اتحاد کرنے میں کوئی معقول فائدہ ہو تو ان سے اتحاد کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما قال الامام شمس الدین السرخسیؒ : ولان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صالح اهل مكة عام الحدیبیة علیٰ ان وضع الحرب بینه وبینهم عشر سنین فکان ذلك نظرًا للمسلمین لمواطئة کانت بین اهل مكة واهل خیبر وهی معروفة ولان الامام نصب ناظرًا ومن النظر حفظ قوة المسلمین اولاً فربما ذلك فی الموادعة إذا كانت للمشرکین شوکة۔ (المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۸۶ کتاب السیر)

وقال الامام ابوبکر جصاصؒ فی تفسیر هذه الآیة " وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا " قال

ابوبکر قد کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاھد حین قدم المدینۃ اصنافاً من المشرکین منھم النضیر و بنو قینقاع و قریظۃ وعاھد قبائل من المشرکین ۔

(احکام القرآن ج۳ ص۸۶ سورۃ الانفال) لہ

فاسق وفاجر کے حق میں ووٹ کا استعمال کرنا

سوال: کسی فاسق اور فاجر شخص کے حق میں ووٹ کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: ووٹ ایک امانت اور سفارش ہے یا ایک قسم کی شہادت ہے، اس اعتبار سے کسی فاسق یا فاجر شخص کو ووٹ نہیں دینا چاہیئے، ووٹ کسی دیانتدار، امانتدار اور دیندار یا ایسے شخص کو دینا چاہیئے جو قوم اور ملک کے لیے مفید ثابت ہو۔ تاہم جہاں کہیں پارٹی کی بنیاد پر الیکشن ہو تو اس میں شخصیت کے مقابلہ میں پارٹی کے منشور کو مدِنظر رکھنا زیادہ مناسب ہے ۔

قولہ تعالیٰ: ۱. اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا۔ (النساء آیت ۵۸)
۲. مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا۔ (النساء آیت ۸۵)

وَنقل الامام القرطبیؒ فی تفسیر ھذہ الآیۃ: ھی فی شفاعات الناس بینھم فی حوائجھم فمن یشفع لینفع فلہٗ نصیب ومن یشفع لیضر فلہٗ کفل۔ (الجامع لاحکام القرآن ج۵ ص۲۹۵ سورۃ النساء) ۳ہ

لہ قال فی الھندیۃ: واذا رأی الامام ان یصالح اھل الحرب او فریقاً منھم وکان ذٰلک مصلحۃ للمسلمین فلا بأس بہ وان رأی الامام موادعۃ اھل الحرب وان یأخذ علی ذٰلک مالاً فلا بأس بہ لکن ھٰذا اذا کان بالمسلمین حاجۃ اما اذا لم تکن فلا یجوز۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۹۶ الباب الثالث فی الموادعۃ والامان الخ)

ٹہ وقال الدکتور الزحیلیؒ: ثانیاً، العدالۃ - ای الدیانۃ والاخلاق الفاضلۃ وھی معتبرۃ فی کل الولایۃ وھی ان یکون صادق اللھجۃ ظاھر الامانۃ عفیفاً عن المحارم - متوقیاً المآثم - بعیداً من الریب - مأموناً فی الرضا والغضب - مستعملاً لمروءۃ مثلہٗ فی دینہ ودنیاہ ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۶ ص۶۹۴ الباب السادس نظام الحکم فی الاسلام، المبحث الرابع شروط الامام)

ووٹ لینے کی غرض سے لوگوں میں رقم تقسیم کرنا

سوال:- انتخابات کے موقع پر بعض امیدوار اپنے حلقہ کے لوگوں میں کچھ پیسے یا کھانے پینے کی بعض اشیاء اس غرض سے تقسیم کرتے ہیں کہ کل ووٹنگ کے وقت یہ لوگ اپنا ووٹ ان کے حق میں استعمال کریں، شرعاً ان تقسیم شدہ اشیاء کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب:- اگر امیدوار کا مقصد یہ ہو کہ میں پیسوں کے ذریعے لوگوں سے ووٹ خریدتا ہوں، تو اس غرض سے لوگوں کو پیسے دینا جائز نہیں، اس لیے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت یا تو شہادت (گواہی) کی ہے یا سفارش کی، اور فقہاء کے نزدیک شہادت پر پیسے لینا جائز نہیں۔

لما قال الامام ابن الهمام رحمه الله: بخلاف الشهادة فانها فرض يجب على الشهادة اداءها فلا يجوز فيها التعارض اصلاً۔ (فتح القدير ج۲ ص۲ کتاب الشهادة)

اور اگر امیدوار کی غرض خرید و فروخت کی نہ ہو بلکہ ویسے لالچ دینے کے لیے ہو کہ پیسے دیکھ کر لوگ مجھے ووٹ دیں گے تو اس صورت میں تقسیم شدہ اشیاء کی حیثیت رشوت کی ہے اور رشوت لینا اور دینا شرعاً حرام ہے، اس لیے ووٹ کے عوض میں کچھ لینا اور دینا دونوں ناجائز ہے۔

لقوله عليه السلام: لعن الله الراشي والمرتشي والرائش الذي يمشي بينهما۔
(کنز العمال ج۶ ص۱۱۴ حديث ۱۵۰۸۰) [1]

عورت کے لیے ووٹ کا حق استعمال کرنا

سوال:- صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات کے موقع پر عورت اپنا حق رائے دہی (ووٹ) کا استعمال کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- ووٹ درحقیقت ایک قسم کی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، ووٹ کے

---

[1] وعن ابي هريرة رضي الله عنه قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم۔ (ترمذی ج۱ ص۲۴۸ ابواب الاحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي)
ومثله في سنن ابي داؤد ج۲ ص۱۴۸ كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة۔

ذریعہ ووٹر امیدوار کی اہلیت کی گواہی دیتا ہے اور اسی طرح ووٹر اپنے حلقہ کے امیدوار کے حق میں رائے اور مشورہ دیتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ نے عورت کو اہل الرائے، اہلِ مشورہ اور اسی طرح اہلِ شہادت قرار دیا ہے۔

لقوله تعالیٰ: فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ۔ (البقرة ع ۲۸۲)

خلفاء راشدین کے روشن دورِ خلافت میں جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت ختم ہوئی تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے لوگوں سے مشورہ اور رائے طلب کی تو اس موقعہ پر آپؓ نے پاکدامن عورتوں سے بھی مشورہ اور رائے طلب کی تھی۔

لما قال الامام ابن کثیر رحمه الله: ثم نهض عبد الرحمٰن بن عوف رضی الله عنه يستشير الناس فيهما ويجمع رأى المسلمين برأى رؤس الناس واقيادهم جميعاً واشتاتاً مثنىٰ وفرادىٰ ومجتمعين سراً وجهراً حتى خلص الى النساء المخدرات فى حجابهن وحتى سأل الولدان فى المكاتب وحتى سأل من يرد من الركبان والاعراب الى المدينة فى مدة ثلاثة ايام بلياليها۔ (البداية والنهاية ج ۷ ص ۱۵۱)

تاہم ایک مسلمان عورت کے ووٹ ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پردہ اور دیگر امورِ شرعیہ کا خیال کرتے ہوئے اپنے ووٹ کا حق استعمال کرے ورنہ معصیت کے ارتکاب سے ووٹ کا ترک کرنا افضل ہے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا۔"

(کفایت المفتی ج ۹ ص ۳۷۱ کتاب السیاسة)

عورت کی شہادت (گواہی) کے بارے میں علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وما سوىٰ ذٰلك من المعاملات اى وكل ما سوىٰ ذٰلك يقبل فيه رجلان او رجل وامرأتان سواء كان الحق مالاً اولا كالنكاح والطلاق والوكالة والوصية ونحو ذٰلك

کالعتق والوجعیۃ والنسب ۔ (فتح القدیر ج۶ ص۴۵۰،۴۵۱ کتاب الشہادۃ)[1]

مروجہ مغربی طرز پر ہونے والے انتخابات میں علماء کا حصّہ لینا

سوال:۔ مروجہ انتخابات جو کہ مغربی طرزِ جمہوریت پر ہوا کرتے ہیں علماء کرام ان انتخابات میں حصہ کیوں لیتے ہیں ؟

الجواب :۔ علماء کرام کے لیے لازم ہے کہ اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی لائن پر منکرات کا سدِ باب کریں اور برسرِ اقتدار طبقہ کو خلافِ شرع امور کی نشاندہی کرتے ہوئے منکرات سے بچائیں ۔ اور اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انتخابات میں شرکت کیے بغیر صحیح طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے، اسی لیے علماء کرام ضرورت کے تحت مروجہ طریقہ انتخابات کے ذریعہ ایوانِ اقتدار میں پہنچ کر حق کی آواز بلند کرتے ہیں ۔

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے جسے علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں : من ابتلی ببلیتین وھما متساویان یأخذ بایتھما شاء وان اختلفا یختار اھونھما لان مباشرۃ الحرام لا تجوز الا لضرورۃ ولا ضرورۃ فی حق الزیادۃ ۔ (الاشباہ والنظائر مع شرح للحموی ج۱ ص۲۸۶ القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال)[2]

انتخابات میں مروجہ طریقہ کے تحت حصہ لینا ترکِ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے

---

[1] وقال العلامۃ ابن حجر العسقلانیؒ : عن مسروق ....کانت عائشۃؓ افقہ الناس واعلم الناس واحسن الناس رأیاً فی العامۃ ۔ (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ج۴ ص۳۶۰ ذکر عائشۃؓ)

وقال العلامۃ عمر کحالہ فی ترجمۃ شفاء بنت عبد اللہ : یقول الشفاء بنت عبد اللہ ......صحابیۃ جلیلۃ ذات عقل وفضل وجودۃ رأی کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یقدمھا فی الرأی ویرضاھا ویفضلھا وربما ولاھا شیئاً من امر السوق ۔

(اعلام النساء لعمر کحالۃ ج۲ ص۳۰۱)

[2] وقال الامام القرطبیؒ فی تفسیر ھذہ الآیۃ "مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ" ای سلطانہ.... ....عادتہ ای یظلم بلا حجۃ مجاھد فی حکمہ وھو استرقاق السراق ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو روکنے کے لیے ملکِ مصر کے قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر عمل فرمایا تھا ۔ (الجامع لاحکام القرآن ج۹ ص۲۳۸ سورۃ یوسف)

آهنگ ہے، اس وجہ سے بھی علماء کرام مغربی طرزِ جمہوریت کے مطابق منعقدہ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔

انتخابی مہم میں مخالف امیدوار پر نازیبا الفاظ استعمال کرنا

سوال: انتخابات کے دوران بعض امیدوار انتخابی جلسوں میں لاؤڈ سپیکر پر اعلانیہ ایک دوسرے (مخالف امیدوار) کو گالی گلوچ اور نازیبا الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں، ازروئے شرع کسی پر نازیبا الفاظ کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے کسی مسلمان کی بے جا تحقیر کرنے یا اس کے بارے میں نازیبا الفاظ زبان سے نکالنے کو ایک بری خصلت قرار دیا ہے، اسی طرح کسی مسلمان کو گالی گلوچ کرنا فسق و فجور کی علامت ہے، ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی زبان کو ہر وقت قابو میں رکھے اور کسی کی دل آزاری نہ کرے، جذبات کی رَو میں بہہ کر اپنی مسئولیت کو پسِ پشت نہیں ڈالنا چاہیئے، اسلامی اقدار کا ہر میدان میں خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

لما روی البخاریؒ: عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلیکرم ضیفه ومن کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلا یؤذ جاره ومن کان یؤمن بالله والیوم الآخر فلیقل او لیصمت۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۸۸۹ کتاب الادب باب لا تحقرن جارة لجارتها)

وایضاً: عن النبیؐ صلی الله علیه وسلم قال سباب المسلم فسوق وقتاله کفر۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۵۶ کتاب المحاربة)[1]

---

[1] لما فی الحدیث: عن ابی هریرة رضی الله عنه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان العبد یتکلم بالکلمة ما یتبین فیها یزل بها فی النار ابعد ما بین المشرق۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۹۵۹ کتاب الرقاق۔ باب حفظ اللسان ومن کان یؤمن بالله الخ)

ایضاً: عن عبد الله رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم سباب المسلم فسوق وقتاله کفر۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۸۹۳ کتاب الادب باب ما ینهی عن السباب واللعن)

انتخابات میں خود اُمیدوار بننا

سوال :- ایم این اے اور ایم پی اے کی مراعات اور اسے منافع بخش کاروبار سمجھتے ہوئے لوگ خود اس میدان میں اُتر آتے ہیں، جن میں سے اکثر کا نہ تو کوئی منشور ہوتا ہے اور نہ ہی ملک کی بہتری کا کوئی پروگرام ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ تو کیا ذاتی طور پر انتخابات میں امیدوار بننا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ اصولی طور پر کوئی بھی عہدہ طلب کرنے کے خلاف ہے، امارت یا وزارت وغیرہ کے عہدہ پر فائز ہونے کے لیے مناسب یہ ہے کہ عوام میں سے دانشور لوگ کسی کو منتخب کریں اور جو کوئی خود اپنے آپ کو امارت و وزارت کے لیے پیش کرتا ہو تو شریعت ایسے اقدام کی نفی کرتی ہے۔

لقوله عليه السلام: انا والله لا نولّى على هذا العمل احدًا سأله ولا احدًا حرص عليه ۔ (صحیح مسلم ج۲ ص۱۲۰ کتاب الامارۃ)

وایضاً: عن عبد الرحمٰن بن سمرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تسئل الامارة فانك ان اعطيتها عن مسئلة وكلت اليها وان اعطيتها عن غير مسئلة اعنت عليها ۔ (السنن النسائی ج۲ ص۲۵۹ کتاب الامارۃ) [1]

تاہم جہاں کہیں نا اہل نمائندوں کی وجہ سے عوام کے حقوق ضائع ہوتے ہوں یا بے دین اور فسّاق و فجّار کے ممبر منتخب ہونے سے معاشرہ میں بے دینی کی ترویج کا خطرہ ہو تو فواحش اور مظالم کے انسداد کے لیے انتخابی میدان میں آنا کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ امیدوار خود کسی خلافِ شرع امور میں ملوّث ہونے کا خطرہ محسوس نہیں کرتا ہو، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر سے فرمایا تھا: "اجعلني عَلىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ" (یوسف) ورنہ جہاں کہیں ایسے میدان میں خود آنا بے دینی کا ذریعہ بننا یقینی ہو تو بے دینی کے لیے سبب بننا خود جرم ہے۔

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قلت یا رسول الله الا تستعملنی قال فضرب بيده على منكبي ثم قال يا اباذر انك ضعيف وانها امانة وانها يوم القيامة خزی وندامة الا من اخذها بحقها وَ اَدَّى الَّذِیْ عَلَيْهِ فِيْهَا ۔

(صحیح مسلم ج۲ ص۱۲۱ کتاب الامارۃ)

اِنتخابی وعدوں کا شرعی حکم

سوال :۔ انتخابی مہم کے دوران ایک امیدوار نے لوگوں سے قسم قسم کے وعدے کیے اور لوگوں نے بھی اس سے عہد و پیمان لیا کہ کامیاب ہونے کے بعد آپ فلاں فلاں کام کریں گے، لیکن جب وہ کامیاب ہوگیا تو اُسے نہ وہ وعدے یاد رہے اور نہ ہی کوئی کام کیا بلکہ اپنی عیش وعشرت میں مصروف رہا، ایسے وعدے پورے نہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب :۔ شریعت میں کسی کے کام کرنے کے لیے دو قسم کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک کو کہتے ہیں وعدہ اور دوسرے کو کہتے ہیں مُعاھدہ۔ اب شریعتِ مطہرہ میں معاہدہ پورا کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے اور کبھی کبھی تو معاہدہ قسم کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے، اور اگر معاہدہ توڑ دیا جائے تو یمین یعنی قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔

لما قال الامام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فی تفسیر قولہ تعالیٰ: "وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا" العهد ينصرف على وجوه فمنها الامر۔ قال اللّٰه تعالىٰ: "وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ" وقال: "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ" والمراد الامر وقد يكون الْعَهْدَ يَمِيْنًا ودلالة الاية على ان المراد فى هٰذا الموضع اليمين ظاهر لانہ قال: "وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا" ولذٰلك قال اصحابنا ان من قال على عَهْدِ اللّٰهِ ان فعلت كذا انہ حالف وقد روى فى حديث حذيفة۔ حين اخذه المشركون واباه فاخذوا منه عهد اللّٰه ان لا يقاتلوا مع النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فلما قدما المدينة ذكرا ذٰلك للنبى صلى اللّٰه عليه وسلم فقال نفى لهم بعهدهم ونستعين اللّٰه عليهم۔

(احکام القرآن ج۳ ص۲۳۵ سورۃ النحل)

دوسری قسم وعدہ کی ہے، وعدہ وفا کرنے کو شریعتِ مطہرہ نے مکارمِ اخلاق سے شمار کیا ہے، اگر کوئی شخص کسی سے وعدہ کرے کہ میں انشاءاللہ آپ کے لیے فلاں کام کروں گا، اور وعدہ کرتے وقت وہ کام کرنے کا ارادہ بھی تھا تو بعد میں کسی وجہ سے کام نہ کرسکنے پر گنہگار نہ ہوگا، تاہم وعدہ کو بروقت پورا کرنا ایک مستحسن فعل ہے اور

اور انسانی مروت کا شیوہ بھی ہے ۔

لما روی ابو داؤد فی سننہ : عن زید بن ارقم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا وعد الرجل اخاہ ومن نیتہ ان یفی فلم یف ولم یجیٔ للمیعاد فلا اثم علیہ ۔
(سنن ابی داؤد ج ۲ ص۳۲۶ کتاب الادب باب فی العدۃ)

وقال العلامۃ فخر الحسن الجنجوھیؒ فی شرح ھذا الحدیث : "قولہ، فلا اثم علیہ" قیل فیہ دلیل علی ان الوفاء بالوعد لیس بواجب شرعی بل ھو من مکارم الاخلاق بعد ان کان نیتہ الوفاء ۔ (تعلیق المحمود علی ھامش ابی داؤد ج ۲ ص۳۲۶ کتاب الادب باب العدۃ)[1]

ان دونوں میں دیکھنا ہوگا کہ اُمیدوار کا وعدہ کس قسم سے تھا، اگر معاہدہ کی قسم سے ہو تو اُسے اپنا معاہدہ پورا کرنا ہوگا ورنہ گنہگار ہوگا، اور اگر وعدہ کی تک ہو تو پھر بھی انسانی اخلاق وشرافت کا تقاضا یہ ہے کہ وعدہ پورا کرے بصورتِ دیگر گنہگار نہ ہوگا، ہاں وعدہ کرتے وقت اسے پورا کرنے کی نیت کا ارادہ کرنا ضروری ہے ورنہ پھر نفاق کی علامت ہوگی ۔

کیا عورت پارلیمنٹ کی رکن بن سکتی ہے؟

سوال:۔ عصرِ حاضر میں انتخابات کے موقع پر مرد اور عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، کیا اسلام میں یہ جائز ہے کہ عورت کو قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ کی رکن منتخب کیا جائے؟

الجواب:۔ اس پُرفتن دور میں حالات کے پیشِ نظر عورت کو اسمبلی یا پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے اس لیے کہ موجودہ حالات میں انتخابات

---

[1] وقال الامام ابن حجر العسقلانیؒ : لان خلف الوعد لا یقدح الا اذا کان العزم علیہ مقارنًا للوعد۔ امّا لو کان عازمًا ثم عرض لہٗ مانع او بدا لہ رایٌ فھٰذا لہ توجد منہ صورۃ النفاق ۔ (فتح الباری ج ۱ ص۹۰ کتاب الایمان، باب علامات النفاق)

وروی ابوداؤدؒ ؛ عن ابن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان للغادر ینصب لہٗ لواء یوم القیٰمۃ فیقال ھٰذہ غدرۃ فلان بن فلان ۔
(سُنن ابی داؤد ج ۲ ص۲۳ فی الباب فی الوفاء بالعھد)

کے لیے مہم چلانے کے دوران عورت کے لیے پردہ برقرار رکھنا مشکل نظر آتا ہے، تاہم اگر عورت انتخابات میں اس طرح حصہ لے کہ شرعی پردے کا خاص خیال رہے اور کسی غیر شرعی امور کا ارتکاب نہ کرے تو اس صورت میں عورت کے لیے انتخاب لڑنا اور پارلیمنٹ میں اس کو رکنیت دینا شرعاً جواز کی گنجائش ہے۔

اس لیے کہ ارکانِ اسمبلی و پارلیمنٹ عوام اور قوم کی طرف سے ان کے وکلاء ہوتے ہیں اور عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ کسی فرد کی وکیل بنے، فقہ حنفی کی کتابوں میں وکیل کی شرائط میں کہیں بھی ذکورت کی شرط موجود نہیں، اور بدایۃ المجتہد کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک عورت کی وکالت صحیح ہے، صرف عقدِ نکاح میں امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عورت وکیل نہیں بن سکتی۔

لما قال الامام ابن رشد الحفیدؒ: وشروط الوکیل ان لا یکون ممنوعاً بالشرع من تصرفه فی الشئ الذی وکل فیه فلا یصح توکیل الصبی ولا المجنون ولا المرأة عند مالکؒ والشافعیؒ علی عقد النکاح۔ (بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج۲ ص۲۹۶ الباب الاول، کتاب الوکالۃ)

اسی طرح ارکانِ اسمبلی و پارلیمنٹ کی حیثیت اہلِ حل وعقد کی ہے، ان ہی کے ووٹوں سے پھر وزیر اعظم اور صدر مملکت کا انتخاب ہوتا ہے ــــ سیاست کے مشہور امام علامہ ماوردیؒ نے اہلِ حل وعقد کی شرائط میں ذکورت کا ذکر نہیں کیا ہے، آپؒ فرماتے ہیں:۔

فاما الاختیار فالشروط المعتبرة فیهم ثلاثة۔ احدها العدالة الجامعة لشروطها۔ والثانی: العلم الذی یتوصل به الی معرفة من یستحق الامامة علی الشروط المعتبرة فیها۔ والثالث: الرأی والحکمة المودیان الی اختیار من هو للامامة اصلح وبتدبیر المصالح اقوم واعرف۔ (الاحکام السلطانیة للماوردی ص۶ الباب الاول فی عقد الامامة)

لـہ قال العلامة ابویعلی الموصلی رحمه الله: أما اهل الاختیار فیعتبر فیهم ثلاث شروط احدها: العدالة والثانی: العلم الذی یتوصل به الی معرفة من یستحق الامامة والثالث: ان یکون من اهل الرأی والتدبیر المؤدیین الی اختیار من هو للامامة اصلح۔
(الاحکام السلطانیة ص۱۹ فصول فی الامامة)

اگر اسلامی تاریخ اور اسماء الرجال کی کتب پر نظر ڈالی جائے تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک صحابیہؓ کو بازار کے نظم و نسق پر مامور کیا تھا اور اس صحابیہ کو رائے اور مشورہ دینے میں ترجیح دیتے تھے، اس صحابیہ کا نام حضرت شفاء رضی اللہ عنہا ہے۔

علامہ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ اسی صحابیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: الشفاء بنت عبد اللہ بن عبد شمس بن خلف ۔۔۔۔۔۔۔ وکان عمرؓ یقدمها فی الرأی ویرعاها ویفضلها وربما ولاها شیئاً من امر السوق۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج۴ ص۳۴۱)[1]

اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ میں ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بڑا مقام تھا، صحابہ کرام کو جب بھی کسی مسئلہ میں کوئی مشکل پیش آتی تو آپؓ سے اس کے بارے میں ضرور پوچھا جاتا تھا اور آپؓ کی رائے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔

علامہ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ آپؓ کی شان میں یوں رقمطراز ہیں، وقال ابو الضحیٰ عن مسروق رأیت مشیخة اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاکابر یسألونہ عن الفرائض۔ وقال عطاء بن ابی رباح کانت عائشةؓ افقه الناس واعلم الناس واحسن الناس رأیاً فی العامة ۔۔۔۔۔۔۔ وقال ابو بردة بن ابی موسیٰ عن ابیه ما اشکل علینا امر فسألنا عنه عائشةؓ الا وجدنا عندها فیه علماً۔

(الاصابة فی تمیز الصحابة ج۴ ص۳۶۰ ترجمة عائشةؓ)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ عورت کو گھریلو معاملات کے علاوہ انتظام مملکت میں بھی کچھ کردار ادا کرنے کی اجازت ہے۔ احناف کے نزدیک حدود اور قصاص کے علاوہ دیگر مسائل میں عورت قاضیہ بن سکتی ہے[2]

اگر عورت امور شرعیہ کا خیال رکھتے ہوئے اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبر بن جائے تو شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن عصر حاضر میں پارلیمنٹ میں عورتوں کے کردار کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی اجازت دینا کسی دینی مقصد کے لیے فائدہ مند نہیں بلکہ

---

[2] لما قال الامام ابن الهمامؒ: واما الذکورة فلیست بشرط الا للقضاء فی الحدود والدماء فتقضی المرأة فی کل شیٔ الا فیهما۔ (فتح القدیر ج۶ ص۳۵۷ کتاب ادب القاضی)

عموماً پارلیمنٹ میں عورتیں احیاء حقوق نسواں کے نام سے بے دینی کے کام زیادہ کرتی ہیں اس لیے انہیں اسمبلیوں میں نہ بھیجنا زیادہ راجح ہے۔

تاہم دلائل مذکورہ سے یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ عورت سربراہِ مملکت بن سکتی ہے اس لیے عورت کی سربراہی کے بارے میں احادیث اور قرآن مجید میں واضح دلائل موجود ہیں، اس کے علاوہ جہاں بھی امامتِ کبریٰ کی شرائط بیان ہوتی ہیں وہاں ذکورت کی شرط لازمی ذکر ہوئی ہے۔

سیاہ وسفید رنگ کے جھنڈے کا ثبوت

سوال:۔ جمعیۃ علماء اسلام کا جماعتی جھنڈا جو کہ سیاہ وسفید رنگ پر مشتمل ہے، اس سے وابستہ علماء اس جھنڈے کو عَلَمِ نبوی کی شبیہ سمجھتے ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کا رنگ بھی ایسا ہی تھا، تاریخ یا غزوات کی روشنی میں یہ بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جنگوں میں مختلف رنگ کے جھنڈے استعمال کئے ہیں، کسی ایک رنگ کے جھنڈے کا مستقل استعمال کرنا آپؐ سے ثابت نہیں۔ تاہم بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "نمرۃ" کا جھنڈا استعمال کیا ہے جس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا، کیونکہ "نمرۃ" سفید اور سیاہ رنگ سے مرکب ہوتا ہے۔

لما قال ابن منظورؒ: والنمرۃ شملۃ فیہا خطوط بیض وسود۔ (لسان العرب ج۱۴ ص۲۹۰)

وعن یونس بن عبید مولیٰ محمد بن القاسمؒ: قال بعثنی محمد بن القاسم الی البراء بن عازب اسئالہ عن رأیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال کانت سودا مربّعۃ من نمرۃ۔ (ترمذی ج۱ ص۲۹۷ ابواب الجہاد، باب فی الرایات) [۱]

---

[۱] وعن یونس بن عبید مولیٰ محمد بن القاسمؒ: قال بعثنی محمد بن القاسم الی البراء بن عازب اسئالہ عن رأیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال کانت سودا مربّعۃ من نمرۃ۔ (سنن ابوداؤد ج۱ ص۳۴۹ کتاب الجہاد باب فی الرّایات والالویۃ)

جنگ کے علاوہ جھنڈے کے استعمال کا حکم

سوال :۔ آجکل لوگ گھروں اور بازاروں میں جھنڈے لگاتے ہیں کیا خیر القرون میں جھنڈے کا اس قسم کا استعمال ہوتا تھا یا نہیں ؟ اور شرعاً اس طرح جھنڈے استعمال کرنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنگ کے میدانوں میں جھنڈے کا استعمال کرتے تھے لیکن جنگ کے علاوہ صحابۂ کرام سے جھنڈے کا استعمال قولاً فعلاً ثابت نہیں ۔ تاہم آجکل جو لوگ گھروں، دوکانوں یا بازاروں میں جھنڈے لگاتے ہیں اگر بلا التزام ہو تو اباحت پر محمول ہوگا، اس لیے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے ۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : الاصل فی الاشیاء الاباحۃ ۔

(الاشباہ والنظائر مع شرحہ للحموی ج ۱ ص ۲۲۳) [1]

البتہ اگر کسی جگہ دیندار لوگوں کی کثرت ظاہر کرنے کے لیے جھنڈے کا استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔

بے دین لوگوں کی مشابہت اختیار کرنا

سوال :۔ ایک شخص خود نہ تو کمیونسٹ ہے اور نہ ہی مغربی جمہوریت کو پسند کرتا ہے لیکن وہ اپنے گھر اور دوکان وغیرہ پر کمیونسٹ، سوشلزم یا مغربی جمہوریت پسند پارٹیوں کے جھنڈے لگاتا ہے اور کسی دینی یا اسلامی پارٹی کا جھنڈا نہیں لگاتا ہے، تو شرعاً اس شخص کا یہ فعل کیسا ہے ؟

الجواب :۔ شریعتِ مطہرہ نے غیر مسلم لوگوں کے شعار اپنانے سے منع فرمایا اس لیے مذکورہ بالا شخص کو ایسے امور کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیئے جس سے غیر مسلم اقوام کی

---

[1] ونقل الشیخ احمد بن محمد الحمویؒ، عن قاسم بن قطلوبغا ان المختار ان الاصل الاباحۃ عند جمہور اصحابنا ۔ (غمز عیون البصائر ج ۱ ص ۲۲۳ قاعدۃ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۲۴ باب المرابحۃ والتولیۃ ۔

مشابہت ہوتی ہو، یا کسی بے دینی کو تقویت ملتی ہو۔

لما ورد فی الحدیث : عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم ۔ (سنن ابی داؤد ج۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس) [۱]

مرتد کا قتل کس کی ذمہ داری ہے

سوال :۔ اگر کسی ایسے علاقہ میں جہاں کوئی حکومت نہ ہو کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ اور اگر اس کو قتل کرنا ضروری ہو تو یہ کس کی ذمہ داری ہے ؟

الجواب :۔ مرتد کے بارے میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ حاکم وقت اگر مناسب سمجھے تو اُسے تین دن کی مہلت دیدے تاکہ دین اسلام کے متعلق اگر اس کے ذہن میں کچھ شبہات ہوں تو وہ ختم ہو جائیں اور وہ دوبارہ اسلام قبول کرکے راہ راست پر آجائے لیکن اگر تین دن تک جملہ کاروائی کے بعد بھی مسئلہ جوں کا توں رہے تو حاکم اس کے قتل کا حکم دے لیکن عوام میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اسے قتل کرے، یہ حکومت کی ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے ذاتی طور پر مُرتد کو قتل کر دیا تو اس سے بازپُرس کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : تحت قول کنز الدقائق " قولہ وکرہ قتلہ قبلہ " ای قبل عرض الاسلام لان اسلامہ مرجو۔ قال فی الھدایۃ ومعنی الکراھۃ ھنا ترک المستحب یعنی فھی کراھۃ تنزیۃ وھو مبنی علی القول باستحباب العرض واما من قال بوجوبہ فھی کراھۃ تحریم کما فی فتح القدیر اطلقہ فشمل قتل الامام وغیرہ ولکن ان قتلہ غیرہ او قطع عضواً منہ بغیر اذن الامام ادبہ الامام ۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۲۸ کتاب الجہاد) [۲]

---

[۱] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس منا من تشبہ بغیرنا لاتشبھوا بالیھود ولا بالنصاریٰ ۔ (ترمذی ج۲ ص۹۹ ابواب استئذان)

[۲] لما فی الھندیۃ : فان قتلہ قاتل قبل عرض الاسلام علیہ او قطع عضواً منہ کرہ ذلک کراھۃ تنزیۃ فلا ضمان علیہ لکنہ اذا فعل بغیر اذن الامام ادب علی ما صنع ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۲۵۴ کتاب السیر)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۳۱۳ کتاب السیر۔

حدود اور قصاص میں حاکمِ وقت کا دائرہ اختیار

سوال:۔ کسی شخص پر قصاص یا حدود کے ثبوت کے بعد حاکمِ وقت شرعاً اس میں کسی قسم کی ترمیم کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ جبکہ عام طور پر قصاص کے موقع پر سربراہ مملکت مروجہ قانون کی رُو سے رحم کی اپیل کرنے پر قصاص کی معافی کا اعلان کردیتا ہے؟

الجواب، حدود اور قصاص ایسی سزائیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خود مقرر اور متعین کیا ہے، عوام الناس میں سے کسی فرد یا جماعت کو ان سزاؤں پر عملدرآمد کا حق نہیں، اسی طرح سربراہ مملکت کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان سزاؤں میں کسی قسم کی کوئی ترمیم یا ردّ وبدل کرے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الکاسانی رحمہ اللہ: واما صفات الحدود فنقول وبا للہ التوفیق لاخلاف فی حد الزنا والشرب والسکر والسرقة انہ لایحتمل العفو والصلح والابراء بعد ما ثبت بالحجة لانہ حق للہ تعالیٰ خالصاً لاحق للعبد فیہ فلا یملک اسقاطہ۔

(البدائع الصنائع ج۷ ص۲۵۵ کتاب الحدود) [1]

البتہ قصاص میں مقتول کے اولیاء کو شریعت نے اختیار دیا ہے کہ وہ قاتل سے قصاص لیں یا دیت وصول کریں یا ویسے ہی قاتل کو معاف کردیں، اس کے علاوہ کسی اجنبی شخص کو یا حاکمِ وقت کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مقتول کے اولیاء کی رضامندی کے بغیر قاتل کو معاف کردے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیان ما یسقط القصاص

---

[1] وقال العلامة عبد القادر عودة: والحد ھو العقوبة المقررة حقاً للہ تعالیٰ .... یعنون بذلک انھا لا تقبل الاسقاط من الافراد ولا من الجماعة .... ولانھا عقوبات لازمة فلا یستطیع القاضی ان ینقص منھا او یزید فیھا کما انہ لا یستطیع ان یتبدل بھا غیرھا۔
(التشریع الجنائی الاسلامی ج۱ ص۶۳۵ الفصل الاول، العقوبات المقررة لجرائم الحدود)

بعد وجوبه فالسقط لهٗ انواع ......؛ ومنها العفو...... واما الشرائط فمنها ان یکون العفو من صاحب الحق لانهٗ اسقاط الحق واسقاط الحق ولاحق محال فلا یصح العفو من الاجنبی لعدم الحق۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۶۱ کتاب الحدود) [1]

اصلاحی کمیٹی کا دائرہ اختیار

سوال:۔ علاقائی سطح پہ اصلاح معاشرہ اور جرائم کے انسداد کے لیے اگر معززین علاقہ پر مشتمل کوئی ایسی اصلاحی کمیٹی قائم کی جائے جس کو حکومت کی طرف سے مکمل اختیار حاصل ہو تو کیا ایسی کمیٹی حدود و تعزیرات کے مقدمات کے فیصلے کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعی نقطۂ نظر سے حدود اور تعزیرات کے قیام کا حق صرف حکومت یا اس کے منتخب شدہ قاضی یا جج کو حاصل ہے، اس کے علاوہ شریعت رعایا میں سے کسی شخص یا ادارے کو یہ اجازت نہیں دیتی، اس لیے حدود و قصاص کے مقدمات کے فیصلے کرنا ایسی کمیٹی کے دائرہ اختیار سے خارج ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الکاسانی رحمه الله: واما شرائط جواز اقامتها فمنها ما یعم الحدود کلها ومنها ما یخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلها فهو الامامة وهو ان یکون المقیم للحد هو الامام أو من ولاه الامام وهذا عندنا۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

وقال الامام سید سابق رحمه الله: والتعزیر یتولاه الحاکم لان له الولایة العامة علی المسلمین۔ (فقه السنة ج۲ ص۵۰۰ کتاب الحدود) [2]

---

[1] وقال عبد القادر عودة: تجیز الشریعة للمجنی علیه او ولی دمه ان یعفو عن عقوبتی القصاص والدیة۔ (التشریع الجنائی الاسلامی ج۱ ص۷۷۵ الباب السادس سقوط العقوبة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة الآخرین ص۵۵۶ کتاب الجنایات۔

[2] وقال ابن الهمام: بخلاف الحدود فانها لم تثبت تولیتها الا للولاة وبخلاف التعزیر الذی یجب حقاً للعبد بالقذف ونحوه فانه لتوقفه علی الدعوی لا یقیمه الا الحاکم الا ان یحکما فیه۔ (فتح القدیر ج۵ ص۱۱۳ فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۱۹۸ باب التعزیر۔

جمعہ وعیدین میں شرطِ سلطان کی وضاحت

سوال :۔ نسوانی دورِ اقتدار میں نمازِ جمعہ وعیدین کے وجوب پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ فقہاء نے وجوبِ ادا کے لیے سلطان یا اس کے نائب کی شرط لکھی ہے جبکہ نسوانی دورِ اقتدار میں یہ شرط مفقود ہوتی ہے۔

الجواب :۔ جمعہ اور عیدین کی نماز کی صحت کے لیے سلطان کی شرط ہونا مقصود بالذات نہیں بلکہ ایسے مواقع پر اس اشتراط کا مقصد مسلمانوں کے باہمی معاملات کو سلجھانا ہے، عموماً ان حالات میں لوگوں کی کثرت کی وجہ سے باہمی طور پر نزاع پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے ایسے مواقع پر سلطان یا اس کے مقرر کردہ شخص کو اعتبار دیا ہے تاکہ کسی کو بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے لیے باہمی طور پر کہیں کسی کو خطیب مقرر کیا جائے تو پھر سلطان یا اس کا نائب نہ ہونے کے باوجود جمعہ وعیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے۔[1]

لما فی الہندیۃ : ولو تعذر الاستیذان من الامام فاجتمع الناس علیٰ رجلٍ یصلی بہم الجمعۃ جاز۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۴۶ باب الجمعۃ)

وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : والسلطان ھو الوالی الذی لا والی فوقہ وانما کان شرطاً للصحۃ لانہا تقام بجمع عظیم وقد تقع المنازعۃ فی التقدیم والتقدم وقد تقع فی غیرہ فلا بد منہ تتمیماً لامرہ ...... ولو لم یکن ثمہ قاض ولا خلیفۃ المیت فاجتمع العامۃ علیٰ تقدیم رجلٍ جاز للضرورۃ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۴۳ کتاب الجنائز)[2]

حکومت کے غیر شرعی اقدامات کی تردید کرنا

سوال :۔ بسا اوقات اربابِ اقتدار کچھ ایسے فیصلے کرتے ہیں جو قرآن وحدیث سے متصادم ہوتے ہیں، اس صورت میں رعیت میں سے کسی شخص کو اپنی

---

[1] لما فی الہندیۃ : بلاد علیہا ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین ویجب علیہم ان یلتمسوا والیاً مسلماً۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۴۶ باب الجمعۃ)

ذمہ داری کا احساس کہاں تک ہونا چاہیئے ؟

الجواب :۔ خلفاء راشدین کے دور خلافت میں جب کوئی کام اسلام کے خلاف ہوتا تو رعیت میں سے ہر شخص اور فرد کو باقاعدہ یہ حق حاصل تھا کہ حسبِ استطاعت اس غلط کام کا سدِ باب کرے، اگر بذاتِ خود خلیفہ سے بھی بے خبری میں کوئی خلافِ شریعت بات سرزد ہوجاتی تو رعایا میں سے کوئی نہ کوئی شخص ضرور اس کی نشاندہی کرتا اور خلفاء کی طرف سے اس شخص کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک تاریخی خطبہ میں رعیت کے عام افراد کو یہ حق دیتے ہوئے فرمایا "اما بعد! ایہا الناس! فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوموني..... اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ (البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۰۵، ۳۰۶ مناقب ابوبکرؓ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عورتوں کے حقِ مہر کے بارہ میں فرمایا کہ آئندہ حقِ مہر چار سو درہم سے زیادہ نہیں ہوگا، اس پہ ایک عورت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں "وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا" اور دے چکے ہو ایک کو بہت سامال۔ اس عورت کے اس طرح کہنے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی بات سے رجوع کر لیا اور اس عورت کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

قال عمرؓ لا تغالوا فی مهور النساء فقالت امرأۃ لیس ذلک یا عمرؓ! ان اللہ یقول "وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا" من ذهب..... فقال عمرؓ ان امرأۃ خاصمت عمرؓ مخصمتہ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۶۷ سورۃ النساء)

تاہم جہاں کہیں آدمی کو حق بات کہنے پہ اپنی جان کے ضیاع اور گالی گلوچ کا خطرہ ہو اور اس پر صبر کرنے کی طاقت بھی نہ ہو تو اس کے لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

لما فی الهندیۃ: ولو علم بأکبر رأیہ انہ لو امرهم بذلک قذفوہ وشتموہ فترکہ افضل وکذلک لو علم انہم یضربونہ ولا یصبر علیٰ ذلک ویقع بینہم عداوۃ و یهیج منہ القتال فترکہ افضل۔ (الفتاویٰ الهندیۃ ج ۵ ص ۳۵۳) [1]

---

[1] قال عمرؓ احب الناس الیّ من رفع الیّ عیوبی۔ (کنز العمال ج ۹ ص ۲۵۵۰۳)

جمہوری حکومت کے خلاف آواز بلند کرنا

سوال:- آجکل پاکستان میں زیادہ تر مغربی طرز کا جمہوری نظام نافذ العمل ہے، اگر عوام الناس میں سے کوئی جماعت یا کئی افراد جمہوری نظام کی بعض خامیوں کے خلاف جلسے جلوس نکالیں اور برسرِاقتدار طبقہ کے خلاف ہو جائیں تو کیا یہ لوگ حکومت کے باغی شمار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:- مغربی جمہوری نظام میں حکومت کے خلاف آواز اٹھانا جمہوریت کا تقاضا ہے بلکہ جمہوری حکومت اپنے خلاف کسی ردِّ عمل کو اپنی بقاء کا ذریعہ سمجھتی ہے، اس لیے اس میں جلسہ جلوس یا اورکسی مناسب طریقہ سے حکومت کے خلاف آواز اٹھانا جمہوری نظام کا حصہ ہے، ایسا کرنا نہ بغاوت ہے اور نہ مخالفین باغی شمار ہوں گے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الکاسانیؒ: فالبغاۃ هم الخوارج وهم قوم من رأیهم ان کل ذنب کفر کبیرة کانت او صغیرة یخرجون علی امام اهل العدل ویستحلون القتال والدماء والاموال بهذا التاویل ولهم منعة وقوة۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۴۰ کتاب السیر) [1]

غیر اسلامی نظام کے خلاف تحریک چلانا

سوال:- موجودہ دور میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف غیر اسلامی نظامہائے زندگی مثلاً سوشلزم، کمیونزم وغیرہ کے قوانین چلتے ہیں، اور بعض مسلمان حکمران بھی اس قسم کے قوانین سے متاثر ہو گئے ہیں، اگر مسلمانوں میں سے کوئی گروہ یا جماعت اس قسم کے قوانین کے خلاف تحریک چلائے اور لوگوں کو اس کی قباحتیں بتائے تو شرعاً اس قسم کی تحریک کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- سوشلزم، کمیونزم اور مغربی جمہوریت یہ تمام نظامہائے زندگی اسلام

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: البغی لغة الطلب ومنه ذٰلك مَا کنا نبغی وعرفاً طلب مالایحل من جور وظلم فتح وشرعاً هم الخارجون علی الامام الحق بغیر حق فلو بحق فلیسوا ببغاة۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۳ ص ۳۳۸ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی احکام السلطانیة للماوردی ص ۵۸ الباب الخامس فی الولایة حروب المصالح۔

کے اصولوں سے متصادم ہیں، ایسے کسی بھی نظام کے خلاف آواز اٹھانا، جدوجہد کرنا یا کوئی تحریک چلانا یہ سب امور موجب ثواب ہیں، اس لیے کہ یہ سب نظامہائے زندگی منکرات میں داخل ہیں، خاص کر جب ان نظامہائے زندگی میں دینی اقدار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ہوں اُس وقت مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ ان منکرات کا سدّباب کریں۔ اور اگر منکرات کو ختم کرنے کے لیے کوئی جماعت مقرر ہوجائے یا کوئی خاص تحریک چلائی جائے تو یہ ایک مستحسن اور قابلِ فخر عمل ہوگا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (سورۃ آل عمران آیت ۱۰۴)

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: من رأی منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہٖ وذٰلک اضعف الایمان۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص۵۱ کتاب الایمان) [۱]

وعن جریرؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من رجل یکون فی قوم یعمل فیھم بالمعاصی یقدرون علیٰ ان یغیروا علیہ فلا یغیروا الا اصابھم اللہ بعقاب من قبل ان یموتوا۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۲۴۰ کتاب الملاحم)

پھانسی کی سزا کا شرعی حکم

سوال:۔ پاکستان کے قانون میں قاتل کو پھانسی کی جو سزا دی جاتی ہے، شریعت کی رُو سے یہ قصاص شمار ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت نے قصاص لینے کی جو شرائط مقرر کی ہیں موجودہ قانون کے مطابق پھانسی کی سزا میں وہ مفقود ہیں، اس لیے پھانسی کی سزا کو شرعاً تعذیر تو کہا جا سکتا ہے اسے قصاص کہنا صحیح نہیں، قصاص میں بنیادی تین شرطیں ہیں:۔

(۱) قاتل سے قصاص لینا حقیقتاً مقتول کے ورثاء کے سپرد ہے، ورثاء چاہیں تو قصاص

---

[۱] وفی الھندیۃ: یقال الامر بالمعروف بالید علی الامراء و باللسان علی العلماء وبالقلب لعوام الناس۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۳ کتاب الکراھیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی جامع الترمذی ج ۲ ص۴۰ باب الفتن۔

بس چاہیں تو دیت قبول کریں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔
(۲) عین قصاص لینے کے وقت ورثاء کا حاضر ہونا لازمی ہے۔
(۳) احناف کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے کہ قصاص تلوار سے لیا جائے، جبکہ آجکل پھانسی کی صورت میں یہ تینوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الکاسانیؒ: فَوَلَایَۃُ استیفاء القصاص تثبت باسباب منها الوراثة وجملة الکلام فیه ان الوارث لا یخلو...... فان کان الکل کبارًا فلکل واحد منهم ولایة استیفاء القصاص حتی لو قتله احدهم صار القصاص متوفی...... الا ان حضور الکل شرط جواز الاستیفاء ولیس للبعض ولایة الاستیفاء مع غیبة البعض لان فیه احتمال استیفاء مالیس بحق له لاحتمال العفو من الغائب وفی فصل آخر۔ فالقصاص لایستوفی الا بالسیف عندنا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۳-۲۴۵ کتاب الجنایات)

تاہم قاتل کو پھانسی دینا اگر قصاص نہ بھی ہو تو پھر بھی اس کا اجراء ونفاذ ناجائز نہیں بلکہ قاتل کو سزا دینے کے لیے پھانسی کا اقدام ایک مستحسن فعل ہے۔

سرکاری اداروں میں افسران کو سلیوٹ (سلام) کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: سرکاری افسروں کو ماتحت عملہ کے لوگ سلیوٹ (سلام) کرتے ہیں اسی طرح سکولوں اور بعض دیگر سرکاری اداروں میں پرچم کشائی کے موقع پر لوگ کھڑے ہو کر پرچم کو بھی سلام کرتے ہیں، کیا اس قسم کا سلام شرعی سلام میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں سنت سلام کے لیے سلام کے الفاظ زبان سے

---

[1] وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله: "وللکبار القود": ای اذا قتل رجل له ولی کبیر وصغیر کان للکبیر ان یقتل قاتله...... لو کان الکل کبارًا لیس للبعض ان یقتص دون البعض ولا ان یوکل باستیفائه لان فی غیبة الموکل احتمال العفو فالقصاص لیحققه من یستحق ماله۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۸۳ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الهندیة ج۶ ص۷ کتاب الجنایات، الباب الثالث۔

ادا کرنا ضروری ہے تاہم جہاں کہیں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اگر کچھ فاصلے پر ہوجس میں ایک دوسرے کی آواز نہ سُنی جا سکتی ہو تو زبان سے سلام کے الفاظ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرنا بھی مرخص ہے۔

لما فی الھندیۃ : وفی النوازل رجل جالس مع قوم سلم علیھم رجل فقال السّلام علیک فردہ بعض القوم بثوب ذٰلک عن الذی سلم علیہ المسلّم ویسقط عنہ الجواب یرید بہٖ اذا اشار الیھم ولم یسم لان قصدہ التسلیم علی الکل ویجوز ان یشار الی الجماعۃ بخطاب الواحد ھٰذا اذا لم یسلم ذٰلک الرّجل فامّا اذا سمّاہ فقال السّلام علیک یا زید فاجابہ غیر زید لا یسقط الفرض عن زید وان لم یسم واشار الیٰ زید یسقط لان قصدہ التسلیم علی الکل۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع فی السلام)

سرکاری محکموں میں سلام کا جو طریقہ رائج ہے اس میں اصل دخل ہاتھ اور پاؤں کے اشارہ کو ہے چاہے سلام کرنے والے ایک دوسرے سے دور ہوں یا قریب، ہر حال میں سلام ہاتھ اور پاؤں کے اشارہ سے ہوگا، زبان سے سلام کے الفاظ کا ادا کرنا محض ضمناً ہوتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ نے صرف ہاتھ وغیرہ کے اشارہ سے سلام کرنے کو مکروہ اور یہود و نصاریٰ سے مشابہت قرار دیا ہے۔

کما فی الحدیث النبوی صلی اللہ علیہ وسلم : عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس منّا تشبہ بغیرنا لا تشبّھوا بالیھود ولا بالنصارٰی فان تسلیم الیھود الاشارۃ بالاصابع وتسلیم النصارٰی الاشارۃ بالاکف۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۹۹ ابواب الاستیذان والادب)[1]

رہی یہ بات کہ پرچم کشائی کے موقع پر لوگ کھڑے ہوکر ہاتھ کے اشارہ سے تعظیم کیلئے

---

[1] روی الامام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاویؒ :عن ابراھیم النخعی قال ترفع الایدی فی سبع مواطن فی افتتاح الصلوٰۃ وفی التکبیر للقنوت فی الوتر وفی العیدین وعند استلام الحجر وعلی الصفا والمروۃ وبجمع عرفات وعند المقامین عند الجمرتین۔ قال ابو یوسفؒ فامّا فی افتتاح الصّلوٰۃ وفی العیدین وفی الوتر وعند استلام الحجر فیجعل ظھر کفّیہ الی وجھہ وامّا فی الثلٰث الاُخر فیستقبل بباطن کفیہ۔

(شرح معانی الآثار ج۱ ص۴۱۶ باب رفع الیدین)

پرچم کو سلام کرتے ہیں تو یہ محض ایک رسم ہے شریعتِ مطہرہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ۔ خیر القرون میں بھی مجاہدینِ اسلام پرچم رکھتے تھے لیکن کسی سے پرچم کی اس طرح تعظیم کرنا ثابت نہیں، اس کے علاوہ شریعتِ مقدسہ میں جن مواقع پر ہاتھ اٹھا کر تعظیم کرنا ثابت ہے ان میں پرچم کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔

شرعی قوانین کے عدم نفاذ کی وجہ سے مجرم کی ذمہ داری

سوال :- جس ملک میں حدود و قصاص جیسی سزاؤں کا اجراء نہ ہو وہاں اگر کوئی شخص کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرے جو موجبِ حد ہو اور یہ شخص اپنے آپ کو حد کے لیے پیش بھی کرتا ہو لیکن حدود کے عدم اجراء کی بناء پر کیا یہ شخص صرف توبہ پر اکتفاء کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :حدود اور قصاص کے اجراء کی ذمہ داری حکام پر ہے ، اگر کسی ملک میں حکام حدود و قصاص وغیرہ شرعی سزاؤں کا اجرا عملاً نہ کرتے ہوں تو ایسے ملک میں مرتکبِ جرم کے صرف توبہ و استغفار پر اکتفاء کرنا صحیح ہے، اس لیے کہ مجرم کا کام عذاب سے بچنے کے لیے توبہ کرنا ہے اور حکام صاحبان اور قضاۃ حضرات کا کام جرم ثابت ہونے کے بعد حدود و قصاص کو عملاً نافذ کرنا ہے ۔

لما قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله ، والحاصل أن الواجب على العاصي في نفس الامر التوبة فيما بينه وبين الله تعالىٰ والانابة ثم اذا اتصل بالامام ثبت وجب اقامة الحد على الامام ولا يمتنع من اقامة بسبب التوبة ۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۳ كتاب الحدود) [1]

انگریزی قانون میں بیٹیوں کو وراثت سے محروم کرنے کا شرعی حکم

سوال :- انگریزی قانون کے مطابق باپ کی میراث

---

[1] وفي الهندية : وركنه اقامة الامام او نائبه في الاقامة..... والتطهر من الذنب ليست بحكم اصلي لاقامة الحد لانها تحصل بالتوبة لا باقامة الحد ولهذا يقام الحد على الكافر ولا طهرة له كذا في التبيين ۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۴۳ كتاب الحدود، الباب الاول)

ومثله في رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۴ كتاب الحدود ۔

میں سے بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا، تو کیا ایسے قانون کی آڑ لے کر بیٹیوں کو ان کے حقِ وراثت سے محروم کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانون میں باپ کی میراث سے بیٹی کو باقاعدہ حصہ ملتا ہے، اس لیے مروجہ انگریزی قانون کا سہارا لے کر بیٹیوں کو ان کے حق سے محروم کر دینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، ایک مسلمان کے لیے یہ لازمی اور ضروری ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کا سہارا لینے کی بجائے شریعتِ مقدسہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اگرچہ بظاہر اس کو نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱)[1]

کسی چیز پر مدت دراز تک قبضہ مفیدِ ملک نہیں

سوال:۔ ملک میں ایک ایسا قانون رائج ہے کہ اگر اجارہ کی صورت میں کوئی زمین وغیرہ ساٹھ سال تک مستاجر کے پاس رہ جائے تو وہ زمین مستاجر کی ملک شمار ہوتی ہے، اس قانون کو "زائد المیعاد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو کیا یہ قانون شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انگریزی دور سے رائج "زائد المیعاد" نام کے اس ظالمانہ قانون کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں، شریعتِ مطہرہ نے اجارہ میں مدت کا تعین نہیں کیا ہے بلکہ اگر اجیر نے کوئی زمین وغیرہ کسی کو اتنی زیادہ مدت کے لیے مستاجری پر دی ہو کہ جس میں اجیر اور مستاجر کا زندہ ہونا بھی محال ہو تو ایسا اجارہ صحیح ہے، لیکن اتنی زیادہ مدت گزرنے کے باوجود بھی وہ زمین شرعاً مستاجر کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

---

[1] وقال الامام سراج الدین محمد بن عبد الرشید السجاوندیؒ: واما لبنات الصلب فاحوال ثلث، النصف للواحدة والثلثان للاثنین فصاعدة ومع الابن للذکر مثل حظ الانثیین وھو یعصبھن۔ (السراجی ص۸ کتاب الفرائض)

ومثلہ فی شریفیۃ شرح سراجیۃ ص۲۱ الفرائض۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: (تحت قول مجلة الاحکام" للمالك ان يوجر ماله وملكه لغيره مدة معلومة قصيرة کانت کيوم او طويلة كسنين" او اکثر حتی لو اجرها الی مدة لا يعيش العاقد ان الی مثلها عادة جاز واختاره الخصاف ومنعه بعضهم وظاهر اطلاق المتون ترجيح الاول۔

(شرح المجلة ص۲۱۷ المادة ۴۸۴ کتاب الاجارات) [1]

تعزیر بالمال کا شرعی حکم

سوال :۔ اگر علاقائی سطح پر حکومت کی طرف سے قائم کردہ کمیٹیاں جرائم کے انسداد کے لیے مجرموں سے مالی جرمانے وصول کریں تو ایسی کمیٹیوں کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح تعلیمی اداروں میں بچوں سے غیر حاضری پر جرمانے وصول کیے جاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب :۔ مالی جرمانہ کا مسئلہ فقہاء کرام کے درمیان اختلافی رہا ہے، احناف کے اصل مذہب میں کسی پر مالی جرمانہ عائد کرنا صحیح نہیں، کیونکہ کسی بھی مسلمان کا مال بغیر اس کی رضامندی کے لینا جائز نہیں۔

لحديث النبي صلی الله عليه وسلم :لا يحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفس منه۔ (کنز العمال ج ۱ ص۳۹۷ ۔ الفردوس للديلمي ج ۵ ص۱۱۰ رقم ۷۶۳۵)

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله :تحت الدر المختار" لا باخذ مال فی المذهب" وعن ابی يوسف ؒ يجوز التعزير للسلطان باخذ المال وعندهما وباقي الائمة الثلاثة لا يجوز ...... واقاد فی البزازية ان معنی التعزير باخذ المال علی القول به امساك شیٔ من ماله عنه مدة اذ لا يجوز لاحد من المسلمين اخذ مال احد بغير سبب شرعي .... واری ان ياخذها فيمسكها فان أيس من توبته يصرفها الی ما یری - وفی شرح الآثار التعزير بالمال کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ

---

[1] لما فی الهندية :يصح العقد علی مدة معلومة ای مدة کانت قصرت المدة کاليوم ونحوه اوطالت کالسنين كذا فی المضمرات ويعتبر ابتداء المدة مما سمی وان لم يسم شيئاً فهو من الوقت الذی استاجرها۔ (الفتاوی الهندية ج ۴ ص۴۱۵ کتاب الاجارة۔ الباب الثالث) وَمِثْلُهُ فی البزازية علی هامش الهندية ج ۵ ص۱۸ کتاب الاجارة۔ تفريعات علی الاجارة الطويلة۔

والحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۹۵، ۱۹۶ فصل فی تعزیر بالمال۔کتاب الحدود)

تاہم جہاں کہیں مالی جرمانہ کے بغیر چارہ نہ ہو اور مالی جرمانہ سے جرائم ختم ہوتے ہوں تو ایسی حالت میں اگر نظریۂ ضرورت کے تحت **امام** ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ چونکہ تعزیر کا مسئلہ قضاء سے تعلق رکھتا ہے اور فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قضاء کے مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح دی جائے گی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وکل فرع بالقضاء تعلقا..... قول ابی یوسفؒ فیہ ینتقی........ الفتویٰ علیٰ قول ابی یوسفؒ فیما یتعلق بالقضاء لزیادة تجربتہ۔
(مجموعة رسائل ج ۱ ص ۳۴-۳۵)

وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: وسمعت من ثقة ان التعزیر باخذ المال ان رأی القاضی والوالی جاز ومن جملة ذلك رجل لا یحضر الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۴۴ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر)[۱]

اشیاءِ خورد و نوش کے نرخ مقرر کرنا

سوال:۔ روزمرہ استعمال کی اشیاءِ خورد و نوش کے نرخ مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو یہ کس کو حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں کمی یا زیادتی تجارتی منڈیوں میں اتار چڑھاؤ کی حالت پر مبنی ہے جس کا سبب ماہرینِ معاشیات ملکی حالات کو قرار دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں افراطِ زر پیدا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث میں اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اس لیے کسی حاکم یا والی کو روزمرہ استعمال کی اشیاءِ خورد و نوش کی قیمتیں مقرر

---

[۱] وقال الامام سید سابق رحمہ اللہ: ویجوز التعزیر باخذ المال وھو مذہب ابی یوسفؒ وبہ قال مالك۔ وایضاً نقل عن معین الحکام ومن قال ان العقوبة المالیة منسوخة فقد غلط علیٰ مذاہب الائمة نقلاً واستدلالاً ولیس یسهل دعویٰ نسخها۔
(فقه السنة ج ۲ ص ۴۹۹ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر)

کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے ۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق وانی لارجوا ان القی اللہ ولیس احد منکم یطالبنی بمظلمۃ فی دم ولا مال ۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۳۳ باب فی التسعیر)

تاہم جہاں کہیں تاجر عوام کی مجبوریوں سے غلط فائدہ اٹھاکر مصنوعی مہنگائی پیدا کرتے ہیں، ایسی صورت میں قاضی یا حاکم کے لیے اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں مقرر کرنا اور پھر اس کی نگرانی کرنا بھی ضروری ہے ۔

لما قال الامام علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ : ولا ینبغی للسلطان ان یسعر علی الناس فان کان ارباب الطعام یتحکمون ویتعدون عن القیمۃ تعدیًا فاحشًا وعجز القاضی عن صیانۃ حقوق المسلمین الا بالتسعیر فحینئذٍ لا بأس بہ بمشورۃ من من اھل الرائے والبصیرۃ ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۴۷۱-۴۷۲ کتاب الکراھیۃ ۔ فصل فی البیع) [1]

حکومت کی طرف سے لگائے گئے ٹیکسوں کی شرعی حیثیت

سوال :۔ آجکل ملک میں تقریباً ہر طرف ٹیکسیشن کا نظام رائج ہے، کہیں انکم ٹیکس، ٹریڈ ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی، سیلز ٹیکس ہے تو کہیں آبکاری ٹیکس کی شکل میں یہ عوام پر نافذ ہے، تو کیا شریعتِ مطہرہ حکومت کو زکوٰۃ اور صدقات کے علاوہ رعایا پر مزید ٹیکس لگانے کی اجازت دیتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ شریعتِ مطہرہ میں صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال خرچ کرنے کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ اغنیاء کے اموال میں فقراء اور مساکین کا حصہ

---

[1] وقال الامام سید سابق رحمہ اللہ : الترخیص فیہ عند الحاجۃ الیہ علی ان التجّار اذا ظلموا وتعدوا تعدیًا فاحشًا یضر بالسوق وجب علی الحاکم ان یتدخل ویحدد السعر صیانۃ لحقوق الناس ومنعًا للاحتکار ودفعًا للظلم الواقع علیھم من جشع التجّار ۔ (فقہ السنۃ ج ۳ ص۱۶۰، ۱۶۱ کتاب الکراھیۃ التسعیر)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص۲۸ کتاب الکراھیۃ ، فصل فی البیع ۔

موجود ہے۔

قولہ تعالیٰ : وَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (سورۃ الذّٰریٰت آیت ۱۹)

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے اور انہوں نے اس بات پر اُمت کا اجماع نقل فرمایا ہے، فرماتے ہیں :۔

فقال ابن عمر والحسن والشعبی ومجاهد هو حق سوی الزکوٰۃ واجب فی المال ...... قال ابوبکر هذه الاخبار کلها مستعملة وفی المال حق سوی الزکوٰۃ باتفاق المسلمین۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۵۰۵، ۵۰۶ سورۃ الذّٰریٰت)

اس کے علاوہ حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ اپنا دفاعی نظام مستحکم رکھے، اسی طرح رفاہِ عامہ کے کاموں مثلاً ہسپتال، مسافر خانوں اور سڑکوں وغیرہ کے لیے مخصوص فنڈ مقرر کرے، فقراء ومساکین اور یتیموں کا خصوصی خیال رکھے، اگر بیت المال خالی ہو تو دفاعی نظام کے اخراجات کے لیے حکومتِ وقت اغنیاء پر محدود انداز میں کچھ تھوڑا سا ٹیکس لگا سکتی ہے لیکن یہ ٹیکس اتنا زیادہ نہیں لگایا جائے گا کہ وہ ظلم کی حد تک پہنچ جائے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : امّا اذا دخلت الایدی من الاموال ولم یکن من مال المصالح ما یفی بخراجات العسکر ولو تفرق العسکر واشتغلوا بالکسب لخیف دخول الکفار بلاد الاسلام او خیف ثوران الفتنة من اهل العرامة فی بلاد الاسلام فیجوز للامام ان یوظف علی الاغنیاء مقدار کفایة الجند۔

(المستصفیٰ للامام غزالیؒ ج ۱ ص ۳۰۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکمِ وقت ضرورت کے تحت مالدار لوگوں پر ٹیکس لگا سکتا ہے، تاہم اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ موجودہ دور میں ٹیکسیشن کا سارا نظام صحیح ہے، اس لیے کہ آج کل ٹیکسوں کا جو نظام ہے اس میں بعض ٹیکس غیر شرعی ہیں اور اسی طرح عام طور پر ٹیکسوں کی شرح فیصدی اتنی زیادہ ہے کہ عام انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہے، شریعتِ مقدسہ نے ٹیکسوں کی شرح کو زکوٰۃ کی شرح مقدار سے زیادہ نہیں بڑھایا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ایک جگہ ٹیکس کی وصولی کے لیے بھیجا تو ان کو یہ حکم فرمایا کہ مسلمانوں سے چالیسواں حصہ اور ذمیوں

سے بیسواں حصّہ اور حربیوں سے دسواں حصّہ وصول کرلیا کرو۔

قال الامام ابویوسف رحمہ اللہ: فان عمر بن الخطابؓ وضع العشور فلا بأس باخذھا اذا لم یعتدفیھا علی النّاس ویوخذ باکثر مما یجب علیھم ...... قال وحدثنا ابوحنیفةؒ عن القاسم عن انس بن سیرین عن انس بن مالک قال بعثنی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ علی العشور وکتب لی عھدًا ان اخذ من المسلمین بما اختلفوا فیہ لتجاراتھم ربع العشر ومن اھل الذّمّة نصف العشر ومن اھل الحرب العشر۔ (کتاب الخراج ص۱۳۲ فصل فی العشور) [1]

آجکل ملک کے ہر کونہ میں چونگی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جسے ضلع ٹیکس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شریعتِ مطہرہ میں اس قسم کے ٹیکس کا کوئی جواز نہیں ہے بلکہ صراحتًا اس کا عدم جواز نقل کیا گیا ہے۔

قاضی ابویعلیٰ رحمہ اللہ اس قسم کے ٹیکس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایک ملک کے اندر ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو اشیاء منتقل کرنے پر جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے شریعت نے اس کو حلال قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس قسم کا ٹیکس حرام ہے اور عادلانہ سیاست کے بالکل منافی ہے اور اکثر یہ ٹیکس ظالموں کے بلاد میں ہوتا ہے۔

قال العلامة قاضی ابی یعلیٰؒ فاما اعشار المنتقلة فی دارالسلام من بلد الی بلد فمحرمة لایبیحھا شرع ولا یسوغھا اجتھاد ولا ھی من سیاسات العدل وقلما تکون الا فی بلاد الجائرة ولذٰلک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ید خل الجنّة صاحب مکس وفی لفظ اخوان صاحب المکس فی النّار یعنی العاشر وفی لفظ آخر اذا لقیتم عاشرًا فاقتلوہ۔ (الاحکام السلطانیة ص۲۲۶ فاما اعشار الاموال)

---

[1] قال الامام ابن حزم الظاھریؒ: قال ابومحمدؒ وفرض علی الاغنیاء من اھل کل بلد ان یقوموا بفقرائھم ویجبرھم السلطان علی ذٰلک ان لم تقم الزکوٰة بھم ولا فی سائر اموال المسلمین بھم فیقام لھم بما یاکلون من القوت الذی لا بد منہ ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذٰلک ...... برھان ذٰلک قولہ تعالیٰ "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمَسٰکِیْنَ۔ (المحلّٰی ج ۲ ص۴۵۲، ۴۵۳ رقم ۷۲۵ کتاب الزکوٰة قسم الصدقات)

تاہم ایک ملک سے دوسرے ملک میں مال اور اشیاء منتقل کرنے پر جو کسٹم ڈیوٹی عائد ہوتی ہے اس کے جواز کی گنجائش ہے، لیکن عصرِ حاضر میں بعض ممالک میں یہ کسٹم حد سے زیادہ وصول کیا جاتا ہے اس لیے اس کی مقدار میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے اور اس قسم کے ٹیکس کو ظلم کی حد تک نہیں بڑھانا چاہیئے۔

لما قال القاضی ابو یعلیٰؒ: ان کان البلد ثغراً یتاخم دار الحرب وکانت اموالہم اذا دخلت دار الاسلام معشورۃ عن صلح استقر معہم اثبت فی الدیوان عقد صلحہم وقدر المأخوذ منہم من عشر او خمس او زیادۃ علیہ او نقصان منہ وان کان یختلف باختلاف الامتعۃ والاموال فصلت فیہ وکان الدیوان موضوعاً لاخراج رسومہ والاستیفاء ما یرفع الیہ من مقادیر الامتعۃ المحمولۃ الیہ۔ (الاحکام السلطانیۃ ص۲۴۵ تقدیر العطاء۔ الفصل السادس)[1]

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی عبادت کا طریقۂ کار

سوال:۔ کیا اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کی اعلانیہ تبلیغ کریں یا کوئی نئی عبادتگاہ تعمیر کریں یا اپنے مذہب کے مطابق جملہ رسومات ادا کرتے رہیں۔

الجواب:۔ ایک اسلامی مملکت میں مسلمان حاکم پر لازم ہے کہ غیر مسلم اقلیت کی جان و مال کا تحفظ کرے، لیکن شریعت نے غیر مسلموں کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ بازاروں اور چوکوں اور دیگر پبلک مقامات میں اپنے مذہب کا پرچار کریں، غیر مسلموں کی عبادت اپنے گھروں اور اپنی قدیم عبادت گاہوں (مندروں، گرجا گھروں اور چرچوں) تک محدود رہے گی۔ اسی طرح غیر مسلم اپنے لیے کوئی نئی عبادت گاہ تعمیر نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی نیا قبرستان یا اپنے مُردوں کو جلانے کے لیے کوئی نئی جگہ تعمیر کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: ولا یجوز ان یحدث بیعۃ

---

[1] قال الامام قاضی ابویوسفؒ: اما العشور فرأیت ان تولیہا قوماً من اہل الصلاح والدین وتأمرہم ان لا یتعدوا علی الناس فیما یعاملونہم بہ فلا یظلموہم ولا یأخذوا منہم اکثر مما یجب علیہم۔ (کتاب الخراج ص۱۳۲ فصل فی العشور)

ولا كنيسة ولا صومعة ولا بيت نار ولا مقبرة ولا صنماً حاوى فى دارالاسلام ولو قرية فى المختار۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۶ کتاب السیر) لہ

تاہم جہاں کہیں غیر مسلموں کی کوئی عبادت گاہ یا قبرستان وغیرہ اُن کی کثرتِ آبادی اور مردم شماری کی زیادت کی وجہ سے ناکافی ہو جائے تو اس ضرورت کے تحت وہ نئی عبادت گاہ اور قبرستان وغیرہ صرف ایسے دیہاتوں میں تعمیر کر سکتے ہیں جہاں پر جمعہ اور عیدین کی نمازیں نہیں پڑھی جاتی ہوں۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الكاسانى رحمه الله: ولا يمكنون من اظهار صليبهم فى عيدهم لانه اظهار شعائر الكفر فلا يمكنون من ذلك فى امصار المسلمين ولو فعلوا ذلك فى كنائسهم لا يتعرض لهم وكذا لو ضربوا الناقوس فى جوف كنائسهم القديمة لم يتعرض كذلك لان اظهار التسعار لم يتحقق فان ضربوا به خارجاً منها لم يمكنوا منه لما فيه من اظهار الشعائر.......وانما الكنائس والبيع القديمة فلا يتعرض لها ولا يهدم شئ فيها واما احداث كنيسة اخرى

لہ وقال الامام قاضى ابو يعلىٰ رحمه الله: ويلزم الذمى ترك مافيه ضرر على المسلمين واحادهم فى مال اونفس وهى ثمانية اشياء۔ الاجتماع على قتال المسلمين۔ وان لا يزنى بمسلمة۔ ولا يصيبها باسم نكاح۔ ولا يفتن مسلماً عن دينه ولا يقطع عليه الطريق۔ ولا يودى للمشركين عيناً اعنى جاسوساً۔ ولا يعاونوا على المسلمين بدلالة اعنى لا يكاتب المشركين باخبار المسلمين۔ ولا يقتل مسلماً ولا مسلمة۔ وكذلك يلزم ترك ما فيه غضاضة ونقص على الاسلام ـ وهى ثلاثة ذكر الله تعالىٰ وكتابه ودينه ورسوله بما لا ينبغى ـ

(الاحكام السلطانية ص ۱۵۸ فصل فى وضع الخراج والجزية)

فیمنعون عنہ فیما صار مصراً مِنْ اَمْصَارِ المسلمین ۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۳، ۱۱۴ کتاب السیر) [1]

سوال: حکمران طبقہ میں سے بعض | حکومت کو زنا بالجبر اور بالرضاء کی تقسیم کا کوئی اختیار نہیں

افراد نے زنا کی دو قسمیں بنا رکھی ہیں، یعنی زنا بالجبر کو قابلِ حد اور زنا بالرضاء کو جائز قرار دے کر زانی اور مزنیہ سے حد کو ساقط تصوّر کرتے ہیں، کیا شرعاً ان افراد کا یہ اقدام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علماءِ اُمت اور فقہاءِ کرام نے قرآن اور احادیث کی روشنی میں جس زنا کو قابلِ حد قرار دیا ہے اس میں زنا بالرضاء یا زنا بالجبر کی کوئی قید نہیں لگائی، بلکہ فقہاء عبارات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو زنا رضامندی کے ساتھ کیا جائے وہ تو بطریقِ اَولیٰ

---

[1] وفی الهندیة: ولیس للنصرانی ان یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر المسلمین ولا ان یجمع فیه بهم اتماله ان یصلّی فیه ولا ان یخرجوا الصلیب او غیر ذلك من کنائسهم ولو رفعوا اصواتهم بقراءة الزبور والانجیل ان کان فیه اظهارا لشرك منعوا عن ذلك وان لم یقع بذلك اظهار الشرك لا یمنعون ویمنعون عن قراءة ذلك فی اسواق المسلمین ------ ولا بأس باخراج الصلیب وضرب الناقوس اذا جاوزوا افنیة المصر وفی کل قریة او موضع لیس من امصار المسلمین فانهم لا یمنعون عن ذلك وان کان فیها عدد من المسلمین یسکنون فیها ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۲۵۱ کتاب الجهاد، الباب الثامن فی الجزیة)
وقال الامام علاء الدین الکاسانی رحمه الله: لا یمنعون من اظهار شیٔ مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیرٌ من اهل الاسلام وانما یکره ذلك فی امصار المسلمین وهی التی یقام فیها الجمع والاعیاد والحدود ۔
(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۷ ص ۱۱۳ کتاب السیر)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۱۳ کتاب السیر ۔

حد کا مستحق ہے۔

چونکہ عورت اور مرد پر اپنی اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا حقوق اللہ میں سے ہے اسلئے کسی عورت یا مرد کو اپنی شرمگاہ شریعت کے مقرر کردہ طریقہ کے علاوہ دوسرے طریقہ سے استعمال کرنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے رضامندی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہی وجہ ہے کہ اس کی سزا جب حد مقرر ہو جائے تو کسی کو معاف کرنے کا اختیار حاصل نہیں اور نہ ہی حد کو ساقط کرنے کے لیے زنا میں بالجبر اور بالرضاء میں تقسیم کر سکتا ہے، موجب حدِ زنا کی جو تعریف کی گئی ہے وہ دونوں کو شامل ہے :

لما قال العلامة علاؤ الدين الكاساني رحمه الله : امّا الزنا فهو اسم للوطء الحرام في قُبُل المرأة الحيّة في حالة الاختيار في دار العدل ممن التزم احكام الاسلام العاری عن حقيقة الملك وعن شبهته وعن حق الملك وعن حقيقة النكاح وشبهته وعن شبهة الاشتباه في موضع الاشتباه في الملك والنكاح جميعاً - (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۳ کتاب الحدود)

تاہم جہاں کہیں زانی اور مزنیہ پر ایسی زبردستی کی گئی ہو جس سے انکار کی صورت میں جان کے چلے جانے کا خطرہ ہو تو ایسے اکراہ اور جبر میں زانی مکرَہ یا زانیہ مکرَہہ سے حد ساقط ہو سکتی ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: قال ومن اكرهه السلطان حتى زنى فلا حد عليه..... وان اكرهه غير السلطان حد عند ابي حنيفة ؒ وقالا لا يحد لان الاكراه عندهما قد يتحقق من غير السلطان - (الهداية ج ۲ ص۴۹۹ کتاب الحدود، باب حد الزنا) لہ

لہ وقال الامام علي ابن ابي بكر المرغيناني ؒ: الوطي الموجب للحد هو الزناء وانهُ في عرف الشرع واللسان وطي الرجل المرأة في القُبُل في غير الملك وشبهة الملك لانهٗ فعل محظور والحرمة على الاطلاق عند التعدي عن الملك وشبهة يؤيد ذلك قوله عليه السلام ادرءوا الحدود بالشبهات۔

(الهداية ج ۲ ص۴۹۹ کتاب الحدود - باب حد الزنا)

وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج ۵ ص۳۰ کتاب الحدود - باب حد الزنا۔

غربت کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان عدالتی کاروائی کا حکم

سوال:۔ فقہ حنفی کی تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ شوہر کی غربت اور افلاس کی وجہ سے قاضی یا حاکم خاوند اور بیوی کے درمیان نکاح فسخ نہیں کر سکتا ہے بلکہ خاوند کو مجبور کرے کہ کسی سے قرض لے کر بیوی کا نفقہ ادا کرے۔ آجکل چونکہ بہت سی عورتیں شوہروں کی غربت و افلاس کی وجہ سے کئی قسم کے گناہوں کی مرتکب ہوتی جا رہی ہیں، لہٰذا موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے آجکل کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے علماء نے حالات کے پیشِ نظر ضرورت کے تحت ائمہ ثلاثہ کے مذہب پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ مذکورہ مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کا مسلک اور طریقہ کیا ہے؟ ائمہ ثلاثہ کی کتب کے مطالعہ سے اس مسئلہ کا حل کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند اس قدر غریب اور نادار ہو کہ وہ اپنی بیوی کو عام معمولی سی خوراک اور کپڑے وغیرہ نہیں دے سکتا ہو تو عورت کو اختیار ہے کہ خاوند کے ساتھ اس مفلسی کی حالت میں رہے یا خاوند سے علیٰحدگی اختیار کرے[1] جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

فلمّا كان من حقها عليه ان يعولها ومن حقه ان يستمتع منها ويكون لكلّ على كل ما للزوج على المرأة وللمرأة على الزوج احتمل ان لا يكون للرجل ان يمسك المرأة يستمتع بها ويمنعها غيره تستغني به ويمنعها ان تضطرب

---

[1] قال الامام البيهقيؒ: عن ابی الزناد قال سألت سعيد بن المسيب عن الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته قال يفرق بينهما قال ابو الزناد قلت سنة قال سعيد سنة قال الشافعی والذی يشبه قول سعيد سنة ان تكون سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (السنن الكبرٰی ج ۷ ص ۴۶۹ كتاب النفقات، باب الرجل لا يجد نفقة امرأته)

فان امتنع الزوج عن الانفاق فالزوجة بالخيار ان شاءت بقيت على نكاحها وان شاءت طلبت التفريق۔ (موسوعة فقه عمر بن الخطابؓ ص ۶۴۱ نفقة)

فراقه فهی فرقة بلاطلاق لانهالیست شیئاً اوقعه الزوج ولا جعل الی احد ایقاعه ...... ان عمر بن الخطاب رضی الله عنہ کتب الی امراء الاجناد فی رجال غابوا عن نساءهم یأمرهم ان یأخذوهم ان ینفقوا او یطلقوا فان طلقوا بعثوا بنفقة ما حبسوا ۔ (کتاب الام للشافعی ج ۵ ص ۹۱ باب الرجل لا یجد ماینفق علی امرأته) لہ

وقال الامام احمد بن محمد بن احمد الدردیر المالکیؒ : فان اثبت الزوج عسرہ عند الحاکم تلوّم له ای امهل بالاجتهاد من الحاکم بحسب ما یراہ من حال الزوج لعلّه ان یّحصل النفقة فی ذٰلك الزمن والا یثبت عسرہ عند الحاکم امر الزوج ای امرہ الحاکم بها ای بالنفقة او بالطلاق بلا تلوّم بان یقول له اِمّا ان تنفق واِمّا ان تطلقها فان طلق اَوْ انفق فالامر ظاهرٌ والا طلق علیه بان یقول الحاکم فسخت نکاحه اُوطلقتك منه اَوْیأمرها بذٰلك ثم یحکم به ۔

(الشرح الصغیر ج ۲ ص ۷۴۵، ۷۴۶ باب وجوب النفقة علی الغیر)

تاہم تفریق کی صورت میں میاں بیوی شرعی عدالت سے رجوع کریں گے اور قاضی یا حاکمِ وقت عورت اور اس کے شوہر کے درمیان تفریق کرے گا۔ قاضی یا مسلمانوں کی بنائی ہوئی عدالت کے بغیر عورت اور خاوند کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی۔

لما قال الامام علاؤ الدین ابوالحسن علی بن سلیمان المرداوی الحنبلیؒ : ولا یجوز الفسخ فی ذٰلك الا بحکم حاکم ۔ (الانصاف ج ۹ ص ۳۹۱ کتاب النفقات)

لہ وقال الامام ابوالحسن المرداوی الحنبلی رحمه الله : قوله (وَإِنْ اعسر الزوج بنفقتها او ببعضها او بالکسوة) وکذا ببعضها خیرت بین فسخ النکاح والمقام وتکون النفقة دیناً فی ذمّته یعنی نفقة الفقیر ومحله اذا لم تمنع نفسها الصحیح من المذهب ان لها الفسخ بذٰلك مطلقاً وعلیه جماهیر الاصحاب ونقله الجماعة عن الامام احمد رحمه الله قال الزرکشی رحمه الله : هٰذا المشهور والمختار للاصحاب ۔

(الانصاف ج ۹ ص ۳۸۳ کتاب النفقات)

وَمِثْلُهٗ فی مختصر المزنی ص ۲۳۲ باب النفقة ۔

پاسپورٹ اور ویزہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔آجکل بین الاقوامی قانون کے مطابق جب کسی ملک میں کوئی غیر ملکی شخص داخل ہوگا تو وہ لازماً ویزہ اور پاسپورٹ کے ساتھ اجازت طلب کرکے اس ملک میں داخل ہوگا ورنہ وہ مجرم شمار ہوگا، تو اس اجازت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔عصرِ حاضر میں دنیا کی تقسیم جغرافیائی اعتبار سے ہو چکی ہے، ہر ملک کے لیے الگ حدود مقرر ہیں، اب اگر ہر شخص کا بغیر اجازت کے کسی ملک میں داخلہ شروع ہو جائے تو اس سے ممالک کے اندرونی معاملات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، ایک ملک والے دوسرے ملک میں گڑبڑ پیدا کریں گے اور اس طرح فتنہ وفساد کا ایک نہ بند ہونے والا دروازہ کھل جائے گا۔

اس لیے ملکی قوانین میں اگر کسی غیر ملکی کے داخلہ کے لیے خاص شرائط رکھی جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، ایسی کوئی بھی پابندی کسی شرعی اصول سے متصادم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ملک میں کسی غیر مسلم کا داخلہ وہاں کی انتظامیہ کی اجازت پر موقوف ہے، کیونکہ اس سے یعنی کسی غیر مسلم کا بلا اجازت کسی اسلامی ملک میں داخل ہونے سے وہاں فتنہ وفساد کا خطرہ ہے۔

شریعتِ مطہرہ میں ویزہ کی مثال متأمن کا دوسرے ملک میں داخل ہونے کے لئے ایک معین مدت تک امن طلب کرنے کی ہے، جس طرح ویزہ میں ایک معین مدت تک کسی دوسرے ملک میں رہنا پڑتا ہے اسی طرح متأمن کو بھی معین مدت تک دوسرے ملک میں رہنا ہوتا ہے۔

کما قال شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا دخل المسلم دار الحرب تاجرًا فلا یحل لہ ان یتعرض بشیءٍ من اموالھم ولا من دمائھم لانہ ضمن ان لا یتعرض لھم بالاستیمان فالتعرض بعد ذلک یکون غدرًا والغدر حرام---------- قال واذا دخل الحربی الینا مستأمنًا لم یمکن ان یقیم فی دارنا سنۃ ویقول لہ الامام ان اقمت تمام السنۃ وضعت علیک الجزیۃ والاصل ان الحربی لا یمکن من اقامۃ دائمۃ فی دارنا الا بالاسترقاق او الجزیۃ لانہ یصیر عینًا لھم وعونًا علینا فیلتحق المضرۃ بالمسلمین ویمکن من الاقامۃ الیسیرۃ لان فی منعھا

قطع السیر والجلب وسد باب التجارۃ ففصلنا بینھما سنۃ۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۵۵۵ کتاب السیر۔ فصل فی استئمان الکفار)[1]

سی آئی ڈی (جاسوسی) کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آجکل دنیا کے اکثر ممالک کے حکمران طبقہ کا یہ دستور ہے کہ اپنے آپ کو حکومت مخالف سرگرمیوں سے واقف اور باخبر رکھنے کے لیے ایک ادارہ قائم کرتا ہے جسے عرف میں سی۔ آئی۔ ڈی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایسے محکمے یا ادارے کا قائم کرنا شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: ملک کو انتظامی طور پر بہتر انداز میں چلانے کے لیے حکومتیں مختلف قسم کے ادارے بناتی ہیں، اسی طرح اگر حکومت کوئی ایسا ادارہ قائم کرے جو غیر ملکی جاسوسوں یا ملک کے اندر ایسے لوگوں کی خفیہ سرگرمیاں معلوم کرے جو کہ حکومت اور ملک کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہو، تو یہ ایک مستحسن اقدام ہے، حکومت کے قائم کردہ ایسے ادارے ملک کے استحکام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: واذا استخلف الوالی رجلاً لیعلمہ بکل داعرٍ دخل البلد فھٰذا علی حال ولایتہ خاصۃ لان المقصود منہ دفع شرہ اوشرِ غیرہٖ بزجرہ فلایفید فائدتہ بعد زوال سلطنتہ۔

(الھدایۃ ج۲ ص۵۰۶ کتاب السیر)

امیرالمؤمنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کو ملک کے اندرونی حالات وواقعات، عمال کی کارکردگی اور باغیوں کے خروج کا جس سرعت سے علم ہوتا تھا شاید دوسرے ممالک میں بہت کم ایسے ہوتا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر علاقے میں اس قسم کے خفیہ حالات فراہم کرنے کے لیے پرچہ نویس مقرر کئے ہوئے تھے

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ فی شرح ھٰذہ العبارۃ: "قولہ لانہ یصیر عیناً لھم"۔ قال الرملی ھٰذہ العلۃ تنادی بحرمۃ تمکینہ سنۃ بلا شرط وضع الجزیۃ۔

(منحۃ الخالق علی ھامش البحرالرائق ج۵ ص۱۰۱ کتاب السیر، فصل فی تاخیر استئمان الکافر)

ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۵ ص۱۰۱ تا ۱۰۲ کتاب السیر۔ فصل فی تاخیر استئمان الکافر۔

مملکتِ اسلامیہ کے جس حصہ میں بھی نخفیہ کام ہوتا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فوراً اس کی اطلاع پہنچ جاتی تھی۔

لما قال الامام طبری رحمہ اللہ : وکان عمرؓ لایخفیٰ علیہ شئ فی عملہ کتب الیہ من العراق بخروج من خرج ومن الشام بجائزۃ من اجیز فیھا۔
(تاریخ الامم والملوک للطبری ج ۴ ص ۶۷ ذکر خبر عزل خالد بن ولیدؓ)

اسی طرح نعمان بن عدی رضی اللہ عنہ میسان کے علاقہ کے گورنر تھے انہوں نے اپنی بیوی کو خط میں کچھ نازیبا اشعار لکھے جن میں سے بعض اشعار کا کسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوگیا، اشعار سنتے ہی فوراً نعمان بن عدیؓ کو خط لکھ کر گورنری سے معزول کر دیا۔

لما قال الامام دولابی رحمہ اللہ : وکان النعمان اول وارث فی الاسلام وکان ابوہ اول موروث فی قول واستعملہ عمر بن الخطابؓ علیٰ میسان ولم یستعمل من قومہ غیرہ واراد امرأتہ علی الخروج معہ الیٰ میسان فابت فکتب الیھا ابیات۔ شعر وھیَ ؎

فمن مبلغ الحسناء ان حلیلھا ... بمیسان یسقی فی زجاج وحنتم
لعل امیر المؤمنین یسوءہ ... تنادمنا بالجوسق المتھدم

فبلغ ذٰلک عمرؓ فکتب الیہ۔ امّا بعد فقد بلغنی قولک ؎

لعل امیر المؤمنین یسوءہ ... تنادمنا بالجوسق المتھدم

وایم اللہ لقد سائنی ثم عزلہ۔ (اسد الغابہ فی ذکر نعمان بن عدیؓ ج ۵ ص ۲۷ م ۵) [1]

---

[1] وقال الامام علامہ دولابی رحمہ اللہ : وحذیفۃ صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنافقین لم یعلمھم احد الا حذیفۃ اعلمہ بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسألہ عمرؓ أفی عمالی احد من المنافقین قال نعم واحد قال من قال لا اذکرہ قال حذیفۃ معزلہ کانّما دل علیہ وکان عمرؓ اذا مات میت یسأل عن حذیفۃ کان حضر الصلوٰۃ علیہ صلّی علیہ عمرؓ وان لم یحضر حذیفۃ الصلوٰۃ علیہ لم یحضر عمرؓ۔
(اسد الغابۃ۔ ذکر حذیفۃ بن الیمان ج ۱ ص ۳۹۱)

مُخبری کرنے والے پر ضمان کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص حکومت کی جانب سے سی آئی ڈی کے محکمہ میں ملازم نہ ہو بلکہ اپنی طرف سے لوگوں کے احوال اور اسمگلنگ کے اموال کے بارے میں حکومت کو معلومات اور شکایات فراہم کرتا ہوں، تو اگر ایسے شخص کی مخبری کی وجہ سے لوگوں کا کوئی نقصان ہو جائے تو آیا اس شخص پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو شخص حکومت کی طرف سے خفیہ معلومات کی حکومت کو فراہمی پر باقاعدہ مامور نہ ہو اور وہ شخص لوگوں کے اموال وغیرہ کی حکومت کو سی آئی ڈی کرتا ہو تو وہ شرعاً مجرم شمار ہوگا اور جو مال وغیرہ اس کی شکایت کی وجہ سے بحق سرکار ضبط ہو چکا ہو اُس کا ضمان اور تاوان اس شخص پر عائد ہوگا۔

لما قال العلامۃ سید محمد امین بن عمر بن عبد العزیزؒ: اقول حاصلہ انہ اذا شکاہ بغیر حق یضمن ما اتلفہ الوالی اَوْ اعوانہ من عضوٍ او من مال دون النفس .... افتی بہ المتاخرون علیٰ خلاف القیاس زجراً عن السعایۃ۔ (فتاوی تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۲۷۸ کتاب الجنایات)

تاہم اگر کسی نے خوف اور خود کو ضرر پہنچنے کی وجہ سے کسی کی شکایت کی ہو تو پھر شکایت کرنے والے پر ضمان نہیں۔

لما قال الامام حافظ الدین محمد بن شہاب البزازؒ: السعی الی السلطان علیٰ ثلاثۃ ان کان بحق بان کان یوذیہ ولا یمکنہ الدفع الا بالرفع او فاسقاً لایمتنع بالامر بالمعروف لایضمن الساعی۔ (فتاوی بزازیۃ علی هامش الهندیۃ ج۶ ص۴۱۳ کتاب الاستحسان الباب السادس فی السعایۃ) ؎

؎ قال العلامۃ احمد بن محمد الحموی المصریؒ: تحت قول الاشباہ والنظائر "الافتاء بتضمین الساعی" وھو قول المتاخرین لغلبۃ السعایۃ۔ "قیدہ قاری الهدایۃ بما اذا کان عادۃ ذٰلک الظالم ان من رفع الیہ ویقول عندہ ان یأخذ منہ مالاً مصادرۃً یضمن الساعی فی ھٰذہ الصورۃ ما اخذہ للظالم ھٰذا ھو المفتی بہ افتی بہ المتاخرون من علمائنا۔

(الاشباہ والنظائر مع شرحہ للحموی ج۱ ص۴۹۷ القاعدۃ التاسعۃ عشرۃ)

ومثلہ فی رد المحتار ج۳ ص۳۱۵ کتاب القضاء۔

قبائل میں سے ایک گروہ کا مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کو جہاد قرار دینا

سوال:۔ پاکستان کے قبائل میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو پاکستانیوں کے ساتھ لڑائی کو جہاد کہتے ہیں اور لڑائی میں مرنے والے اپنے ساتھیوں کو شہید اور زندہ رہ جانے والوں کو غازی تصوّر کرتے ہیں، اور پاکستانیوں سے اخذ شدہ مال کو مالِ غنیمت کہتے ہیں، اور اس گروہ کا امیر اس مال سے اپنے لیے خُمس (۵/۱) لیتا ہے، شرعاً اس گروہ کا یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب:۔ مسلمانوں کے ملک میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے مال و جان کو مباح قرار دینا اور ان کے ساتھ قتال کو جہاد کے مترادف قرار دینا، یہ باغیوں اور قطاع الطریق کا کام ہے۔ فقہاءِ کرام نے باغیوں اور قطاع الطریق کی جو تعریفات ذکر کی ہیں وہ اسی قسم کے گروہوں پر حرف بحرف صادق آتی ہیں۔

لما فی الهندیة: اهل البغی کل فرقة لهم منعة یتغلبون ویجتمعون ویقاتلون اهل العدل بتأویل ویقولون الحق معنا ویدعون الولایة۔ (الفتاویٰ الهندیہ ج۲ ص۲۸۳ کتاب السیر الباب العاشر فی البغاة)

شریعتِ مقدسہ کی رُو سے کسی مسلمان کا ناحق قتل کرنا اور اس کی رضامندی کے بغیر لینا دونوں حرام اور ناجائز ہے۔

لقوله علیه السّلام: لا یحل دم امرئٍ مسلم یشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله الا باحدیٰ ثلٰث، والنفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینه التارك الجماعة۔ (صحیح بخاری، دیات، ۲/۱۰۱۶۔ صحیح مسلم، قسامہ، ۲/۵۹۔ سنن النسائی ج۲ ص۱۶۰)

وایضاً قال علیه السلام: لا یحل مال امریٔ مسلم الا بطیب نفس منه۔ (کنز العمال ج۱ ص۳۹۷۔ فردوس للدیلمی ج۵ ص۱۱ رقم ۶۳۵) ؎

؎ وقال الامام فخر الدین الرازیؒ: (فی تفسیر هٰذه الاٰیة) ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا'' المحاربون المذکورون فی هٰذه الاٰیة هم القوم الذین یجتمعون ولهم منعة ممن ارادهم بسبب انهم یحمی بعضهم بعضاً ویقصدون المسلمین فی ارواحهم ودمائهم۔ (التفسیر الکبیر ج۱۱ ص۲۱۵،۲۱۴ سورة المائدة)

ومثله فی احکام السلطانیة لابی یعلیٰ ص۵۴ اما قتال اهل البغی۔

شریعت بل کا پس منظر

سوال :۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت میں شریعت بل کا شور وغوغا پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔۔۔ اس بل کی ابتداء، پس منظر اور بالآخر ایوانِ بالا (سینیٹ) سے منظوری کے باوجود اس کے تعطّل کا شکار ہونے کی وجوہات کیا ہیں ؟

الجواب :۔ شریعت بل اُن اسلامی دفعات کا مجموعہ ہے جس پر علماء کرام نے شب و روز محنت کی، علماء نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے حکومتی ایوانوں میں یہ بل پیش کیا لیکن بدقسمتی سے نام نہاد جمہوری اداروں سے اس کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۰ء کو سینٹ سے متفقہ طور پر پاس ہونے کے باوجود ابھی تک یہ بل آئین کا حصہ نہ بن سکا۔ اس بل کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ بل تمام قانونی مراحل سے پاس ہوجاتا تو ملک کے پورے نظام میں یکسر تبدیلی آجاتی۔ معاشی اور اقتصادی اور عدالتی امور میں اس سے انقلاب برپا ہوجاتا لیکن حکومتی ایوانوں پر قابض بے دین طبقہ نے علماء کی آواز کو دبا کر سرد خانہ میں ڈال دیا، یہی وجہ ہے کہ حالات جُوں کے تُوں ہی ہیں۔

شریعت بل کا خاکہ یہ تھا :۔

دفعہ ۱ : (الف) یہ قانون نفاذِ شریعت کے نام سے موسوم ہوگا۔

(ب) یہ قانون اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام علاقوں اور تمام باشندوں پر نافذ ہوگا، البتہ غیر مسلم باشندوں کے شخصی معاملات اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

دفعہ ۲ : شریعت کی قانونی تعریف !

(الف) شریعت سے مراد دین کا وہ خاص طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے۔

(ب) شرعی قوانین کا اصل ماخذ قرآنِ کریم اور سنتِ رسولؐ ہے۔

(ج) اجماعِ اُمت کو قرآن اور سنت نے حُجت قرار دیا ہے، اس لیے جو قانون اجماعِ اُمت سے ثابت اور ماخوذ ہو وہ بھی شریعت کا قانون ہے۔

(د) جو احکام اُمت کے معتمد اور مستند مجتہدین نے قرآن و سنت اور اجماع کے قواعد و ضوابطِ معینہ کے مطابق مستنبط کر کے مدوّن کرائے ہیں وہ بھی شریعت ہی کے قوانین

ہیں اس لیے کہ قیاس اور اجتہاد کو (بشرطیکہ وہ قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو) قرآن اور سنت نے حجت قرار دیا ہے۔

دفعہ ۳ : شریعت کی بالادستی۔

مقننہ کوئی ایسا قانون یا قرارداد منظور نہیں کرسکے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو، اگر ایسا کوئی قانون یا قرارداد منظور کر لی گئی تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی اور اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا اور چیلنج کرنے کے فوراً بعد عدالت کے آخری فیصلہ تک اس پر عملدرآمد ملتوی ہو جائے گا۔

دفعہ ۴ : ملک کی تمام عدالتوں میں ہر قسم کے مقدمات بشمول مالی وغیرہ کے شریعت کے مطابق نہ کئے گئے فیصلوں کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہو گی۔

دفعہ ۵ : وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ بلا کسی استثناء ہر قسم کے مقدمات پر حاوی ہو گا، اور عبوری دستوری حکم ۱۹۸۵ء کی دستوری ترامیم کے ذریعہ لگائی گئی پابندیاں فوراً ختم کر دی جائیں گی۔

دفعہ ۶ : انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدر مملکت اور وزیر اعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا اور اگر ایسا کوئی حکم دے دیا گیا ہو تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی اور اسے عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

دفعہ ۷ : حکومت کے تمام عمال بشمول صدر مملکت اور وزیر اعظم پر شرعی عدالت کا فیصلہ ملک کے تمام دوسرے باشندوں کی طرح یکساں طور پر نافذ ہو گا، اور کوئی بھی ملک کا باشندہ اسلامی قانونِ عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہو گا۔

دفعہ ۸ : مسلمہ اسلامی فرقوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق طے کئے جائیں گے۔

دفعہ ۹ : غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو اپنے بچوں کے لیے مذہبی تعلیم اور اپنے ہم مذہبوں کے سامنے اپنی مذہبی تبلیغ کی آزادی ہو گی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

دفعہ ۱۰ : تمام عدالتوں میں حسب ضرورت تجربہ کار، جید اور مستند علماء دین کا بحیثیت جج اور معاونینِ عدالت تقرر کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۱: علومِ شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور ججوں کی تربیّت کا ایسا مؤثر انتظام کیا جائے گا کہ مستقبل میں علومِ شرعیہ اور خصوصاً اسلامی قانون کے ماہر جج تیار ہوسکیں۔

دفعہ ۱۲: قرآن اور سنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو صحابۂ کرامؓ اور مستند مجتہدین کے تمام عام اصولِ تفسیر اور علم حدیث کے مسلّمہ قواعد اور ضوابط کے مطابق ہو۔

دفعہ ۱۳: انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے ہر فرد کے لیے فرائض شریعت کی پابندی اور محرماتِ شریعت سے اجتناب کرنا لازم ہوگا۔

دفعہ ۱۴: تمام ذرائع ابلاغ کو خلافِ شریعت پروگراموں، فواحش اور منکرات سے پاک کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۵: حرام طریقوں اور خلافِ شریعت کاروبار کے ذریعہ دولت کمانے پر پابندی ہوگی۔

دفعہ ۱۶: شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگانِ ملک کو دیئے ہیں اُن کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا، اگر ایسا کوئی حکم دیا گیا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے عدالت میں چیلنج کیا جاسکے گا۔

(شریعت بل کا معرکہ ص۲۵، ص۲۶)

اِسلام اور مغربی جمہوریت کا تقابلی جائزہ

سوال:۔ دُنیا کے اکثر ممالک میں جمہوری نظام رائج اور نافذ العمل ہے، کیا اسلام میں ایسی جمہوریت کی بقاء کے لیے کوئی جگہ ہے یا اسلام اور جمہوریت دونوں الگ الگ نظام ہیں؟

الجواب:۔ اسلام ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے مستقل تشخص کا مالک ہے، اس کا تعلّق جمہوریت یا سوشلزم سے جوڑنا اسلامی نظامِ حیات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں، عوام جس طرح چاہیں ملک کے قانون پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، ملک کے کسی بھی رائج الوقت قانون کو محض اکثریت کے بل بوتے پر ختم کرسکتے ہیں، اور اگر چاہیں تو بے دینی، فحاشی اور خلافِ انسانیت قانون کو راتوں رات پاس کرکے

ملک پر نافذ کر سکتے ہیں ۔ ایسے نظام میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہوتے ہیں جبکہ عوام کے نمائندے وزیر اعظم کو ملک کی قسمت سے کھیلنے کے لیے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے فرسودہ نظام میں صرف افراد گنے جاتے ہیں، باطنی معانی اور علم و دانش کی کوئی قدر نہیں ہوتی، معاشرہ کی قابلِ فخر شخصیت اور ادنیٰ فرد کی رائے ایک شمار ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی جمہوریت کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت بظاہر اپنے آپ کو عوام کا ترجمان شمار کرتی ہے لیکن عوام کے حقوق سب سے زیادہ اسی کے ذریعہ پامال ہوتے ہیں ۔ چنانچہ پاکستانی معاشرہ کے حوالہ سے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ جمہوری نظام ہی میں قوم نے تباہی و بربادی اور ہلاکت کے کون سے مواقع نہیں دیکھے ۔

جبکہ اس کے برعکس اسلام میں طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور خلیفہ صرف تنفیذِ احکامِ الٰہی کے لیے نیابت کی ذمہ داری نبھاتا ہے ۔

قولہ تعالیٰ: (۱) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (سورۃ الانعام آیت ۵۷، سورۃ یوسف آیت ۴۰/۶۷)
(۲) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۰) ۔ (۳) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (سورۃ الاعراف آیت ۵۴)

علاوہ ازیں جمہوری نظام میں طریقۂ انتخاب بھی اسلام کے طریقۂ انتخاب سے مختلف ہوتا ہے جس میں شوریٰ کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے خلاف کوئی فیصلہ کرے، شوریٰ کی تمام سرگرمیاں دین کے ماتحت رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب تک خلیفہ اللہ تعالیٰ کے قانون کا تابع ہو تو اس کی خلاف ورزی ناجائز بلکہ بغاوت تصوّر ہوگی ۔

قال الامام قاضی ابو یعلیٰؒ ۔ وھم الذین یخرجون علی الامام ویخالفون الجماعۃ وینفردون بمذھب ابتدعوہ ۔ (الاحکام السلطانیۃ ص ۵۴ اما قتال اھل البغی)

بہرحال اسلام ایک مستقل نظامِ حیات ہے جو مروجہ مغربی جمہوریت سے جدا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جمہوریت بعض امور میں اسلام کی خوشہ چین ہے، ووٹنگ کے مروجہ نظام کے مقابلہ میں اسلام میں شورائی اور استخلاف کا نظام موجود ہے ۔

قولہ تعالیٰ: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ ۔
(سورۃ آلِ عمران آیت ۱۵۹)

سیاستِ اسلامیہ کے نامور امام ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البغدادی الماوردیؒ نے

خلافتِ اسلامیہ کے انعقاد اور خلیفہ مقرر کرنے کا تفصیلی نقشہ یوں کھینچا ہے :۔

فصل: والامامة تنعقد من وجهين احدهما باختيار اهل العقد والحل ۔ والثانى بعهد الامام من قبل فاما انعقادها باختيار اهل الحل والعقد فقد اختلف العلماء فى عدد من تنعقد به الامامة منهم على مذاهب شتى فقالت طائفة لا تنعقد الا بجمهور اهل الحل والعقد من كل بلد ليكون الرضاء به عاماً والتسليم لامامته اجماعاً وهو مذهب مدفوع ببيعة ابى بكر رضى الله عنه على الخلافة باختيار من حضرها ولم ينتظر ببيعته قدوم غائب عنها ۔ وقالت طائفة اخرى اقل من تنعقد به منهم الامامة خمسة يجتمعون على عقدها أو يعقدها احدهم برضاء الاربعة استدلالاً بامرين احدهما ان بيعة ابى بكر رضى الله عنه انعقدت بخمسة اجتمعوا عليها ثم تابعهم الناس فيها وهم عمر بن الخطاب وابو عبيدة ابن الجراح واُسيد بن حُضير وبشر بن سعد وسالم مولى ابى حذيفة رضى الله عنهم ۔ والثانى ان عمر رضى الله عنه جعل الشورىٰ فى ستة ...... وقالت طائفة اخرىٰ تنعقد بواحد لان العباس قال لعلى رضوان الله عليهما امدد يدك ابايعك فيقول الناس عم رسول الله صلى الله عليه وسلم بايع ابن عمه فلا يختلف عليك اثنان ۔ ولانه حكم وحكم واحد نافذ ۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی الباب الاول فی عقد الامامة ص ۶،۷)[1]

سوشلزم اور اسلام کا موازنہ | سوال :۔ سوشلزم (اشتراکیت) کیا چیز ہے، اور کیا اسلام اور سوشلزم میں کوئی فرق ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ سوشلزم یا اشتراکیت یہ ایک کافرانہ نظام ہے اور اس کی تاریخ کا آغاز اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہوا، سب سے پہلے ہیگل نامی ایک شخص نے اس نظریہ کو ایک علمی نظریہ کی شکل میں پیش کیا اور اسے اقتصادی امور میں کامیابی کی بنیاد قرار دیا بعد میں اسے اقتصادی زندگی بخشنے بلکہ معاشرتی اصول بنانے اور تمدنی پروگرام میں ڈھالنے والا شخص "کارل مارکس" ہے، اور یہی نظریہ آجکل "کمیونزم" کی شکل میں روس پر حاوی ہے ۔

---

[1] و مثلہٗ فی الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۱ ص ۱۸۵، ۱۸۶ سورۃ البقرۃ ۔

اسی نظریئے کے بارے میں برصغیر کے مشہور مسلمان ماہر اقتصادیات حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

"کارل مارکس اور دوسرے اشتراکی راہنماؤں نے جس فلسفہ پر" مارکسزم" کی بنیاد قائم کی ہے اس میں خدا سے انکار اور الہٰیات کی نفی صفِ اوّل میں درجہ پاتے ہیں۔۔۔۔ لہٰذا اس کے فلسفہ لادینیت کے ساتھ اسلام کا کوئی رابطہ اور تعلق قائم نہیں ہوسکتا"۔

اس کے بعد مولانا سیوہاروی رحمہ اللہ اسلام اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کے فرق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلامی اقتصادی نظام کے اصول یہ ہیں :-

(۱) دولت و ذرائع دولت میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حدود قائم کردی جائیں۔

(۲) حقِ معیشت کی مساوات کے اعتراف کے ساتھ بلحاظِ معیشت اختلافِ مدارج تسلیم کرتے ہوئے احتکار کو روکا جائے۔

جبکہ اشتراکی اقتصادی نظام ان امور پر قائم ہے :-

(۱) دولت و ذرائع دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔

(۲) بلحاظِ معیشت اختلافِ درجات کا انکار کیا جائے اور معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کی جائے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۲۴۳،۲۴۴)

سوشلزم اور اسلام کا تقابلی جائزہ

سوال :- سوشلزم کے بارے میں کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں انسانی ضروریات کا تکفل ہے اور بغیر کسی معاوضہ کے حقوق دیئے جاتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اسلام میں سوشلزم کے مقابلے میں انسانی ضروریات کا خیال کیا جاتا ہے یا نہیں؟ کیا اسلام میں محنت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے یا صرف خیرات وصدقات پر بھروسہ کیا جاتا ہے؟

الجواب :- اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں انسان کی ضروریات کا حل اکمل طریقہ سے موجود ہے، سوشلزم میں تو صرف چند لوگوں کو مفت روٹی، کپڑا اور مکان ملتا ہے، باقی سب لوگوں سے مزدوری زیادہ لی جاتی ہے اور معاوضہ تھوڑا دیا جاتا ہے اس لیے کہ پوری رعایا صرف حکومت کے لیے کام کرتی ہے، کوئی چیز کسی فرد کی ذاتی

ملکیت نہیں ہوتی ، اس کے بالمقابل اسلام میں ضعفاء، فقراء اور مساکین کو زکوٰۃ، صدقات اور عام رعایا کو بھی بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں ملتی ہیں۔

خلفاء راشدین کے دورِ خلافت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ملازمین کے علاوہ عام مسلمانوں کے لیے بھی بیت المال سے وظائف مقرر کئے تھے۔

لما قال الامام حافظ ابن تیمیۃ رحمہ اللہ : کما فعل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لما کثر المال اعطاهم عامۃ المسلمین فکان لجمیع اصناف المسلمین فرض فی دیوان عمر بن الخطاب غنیهم وفقیرهم....... ومع هذا فالجواب تقدیم الفقراء علی الاغنیاء الذین لا منفعۃ فیهم فلا یعطی غنی شیئاً حتی یفضل عن الفقراء۔

(مجموعۃ الفتاوی ج ۲۸ ص ۵۶۷ السیاسۃ الشرعیۃ)

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی محنت مزدوری اور کسبِ معیشت کو ترک کر کے صرف حکومتی وظائف ہی کو اپنی بقاء کا ذریعہ سمجھے اور یہاں تک کہ دستِ سوال پھیلانے کی نوبت آجائے ، جو شخص بدن اور اعضاء کے اعتبار سے تندرست و توانا اور محنت مزدوری کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود صدقات و خیرات کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے، شریعت ایسے شخص کو کبھی بھی سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتی ۔

امام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی رحمہ اللہ محتسب کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

وان رأی رجلاً ان یتعرض لمسألۃ الناس فی طلب الصدقۃ وعلم انہ غنی امّا بمالٍ او عملٍ انکرہ علیہ وأدبہ فیہ وکان المحتسب بانکارہ اخص من عامل الصدقۃ فعل عمرؓ مثل ذلک بقوم من اهل الصدقۃ۔

(الاحکام السلطانیۃ للماوردی ص ۲۴۸ الباب العشرون فی احکام الحسبۃ)

قرآنِ کریم اور سنتِ نبوی کی تعلیمات قدم قدم پر انسان کو حلال روزی کمانے اور کسبِ معیشت کی ترغیب دیتی ہیں، مثلاً :-

قولہ تعالیٰ : فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔

(سورۃ الجمعۃ آیت ۱۰)

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔
(کنز العمال ج ۴ ص۴ رقم ۹۲۰۳ الفصل الاول فی فضائل الکسب الحلال)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ تنخواہوں کی تفصیل امام ابوالحسن الماوردی رحمہ اللہ نے کچھ یوں بیان فرمایا ہے:۔

فلما وضع الدیوان فضل بالسابقۃ ففرض لکل من شھد بدراً من المھاجرین الاولین خمسۃ آلاف درھم فی کل سنۃ منھم علی بن ابی طالب وعثمان بن عفان وطلحۃ بن عبید اللہ والزبیر بن العوام وعبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنھم۔ وفرض لنفسہ معھم خمسۃ آلاف درھم والحق بہ العباسؓ بن عبد المطلب والحسن والحسین رضوان اللہ علیھم لمکانھم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقیل بل فضل العباس وفرض لہ سبعۃ آلاف درھم وفرض لکل من شھد بدراً من الانصار اربعۃ آلاف درھم ولم یفضل علی اھل بدر احداً الا ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ فرض لکل واحدۃ منھن عشرۃ آلاف درھم ......الخ
(الاحکام السلطانیۃ للماوردی ص۲۰۱، ۲۰۲ الباب الثامن عشر فی وضع الدیوان الخ)

بائیکاٹ اور ہڑتال کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آجکل حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ کیا شریعتِ مقدسہ میں اس قسم کی ہڑتالوں کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ عصرِ حاضر میں احتجاجات اور ہڑتالوں نے مختلف شکلیں اختیار کر رکھی ہیں، بعض ہڑتالیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں لوٹ مار، سنگباری، توڑ پھوڑ اور چلتی گاڑیوں کو آگ لگانے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے جیسے غلط اور ناروا افعال کو اپنایا جاتا ہے جو کہ کسی بھی مہذب قوم کو زیب نہیں دیتا۔

ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ہڑتالیں کرنا اور جلسے جلوس نکالنا شرعاً ناجائز ہے۔ اسی طرح بعض تعلیمی اداروں میں طلباء ان اداروں کے نظم ونسق کے بارے میں ہڑتالیں کرتے ہیں اور اسباق میں حاضر نہیں ہوتے۔

اس قسم کی ہڑتالوں کے بارے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے عدمِ جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ”طلبۂ مدارس کی اسٹرائک منتظمین کے خلاف قواعدِ شرعیہ

کی رُو سے ناجائز ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ اسٹرائک کا مقصد منتظمین پر دباؤ ڈال کر ان کو اپنے مطالبات کے ماننے پر مجبور کرنا ہے۔ اور طلبہ کو کسی حالت میں اس قسم کے دباؤ ڈالنے کا حق نہیں ہے کیونکہ طلبہ محکوم ہیں اور منتظمین حاکم، اور محکوم پر حاکم کی اطاعت اس وقت تک لازم ہے جب تک کہ ان کو کسی خلافِ شرع امر کا حکم نہ دیا جائے۔ پس طلبہ کا منتظمین پر حکومت کرنا قلب موضوع اور شریعت کے حکم کو بدلنا ہے، لہٰذا اسٹرائک جائز نہیں ہو سکتی۔"

(امداد الفتاویٰ ج ۶ ص ۲۰۳ کتاب العقائد والکلام)

تاہم اگر مطالبات جائز ہوں اور ہڑتال، بائیکاٹ اور جلسے جلوس پُرامن ہوں، اور غیر شرعی امور کا ارتکاب نہ ہو تو ایسی حالت میں ہڑتال کرنے اور جلسے جلوس نکالنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ شرعی اور جائز مطالبات منوانے کے لیے ایسا اقدام کرنا مستحسن عمل ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسے وقت میں احتجاج کے طور پر جیل سے نکلنے سے انکار کیا تھا۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ۔ (سورۃ یوسف آیت ۵۰)

وقال الامام القرطبیؒ: فی تفسیر ہٰذہ الاٰیۃ "فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ" ای یامرہ بالخروج قال ارجع الیٰ ربّک فاسئلہ ما بال النسوۃ۔ ای حال النسوۃ التی قطّعن ایدیھن فابیٰ ان یخرج الّا ان تصح براءتہ عند الملک مما قذف بہ وانہ حبس بلا جرم۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۹ ص ۱۳۵ سورۃ یوسف)[۱]

---

[۱] قال الامام ابن جریر الطبریؒ: یقول فلمّا جاءہ الرسول الملک یدعوہ الی الملک "قال ارجع الیٰ ربّک" یقول قال یوسف ارجع الیٰ سیّدک "فاسئالہ ما بال النسوۃ التی قطّعن ایدیھنّ" وابیٰ ان یخرج مع الرسول واجابۃ الملک حتّٰی یعرف صحۃ امرہ عندھم ممّا کانوا قذفوہ بہ من شأن النساء فقال للرّسول سَل الملک ما شأن النسوۃ التی قطّعن ایدیھنّ والمرأۃ التی سجنت بسببھا۔

(جامع البیان للطبری ج ۷ ص ۲۳۴ سورۃ یوسف)

وقال الامام جلال الدینؒ فی تفسیرہ: اخرج ابن المنذر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فی قولہ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ قال اراد یوسف علیہ السلام العذر قبل ان یخرج من السّجن۔ (الدر المنثور فی التفسیر الماثور ج ۴ ص ۵۲۸ سورۃ یوسف)

بھوک ہڑتال کی شرعی حیثیت

سوال:۔ اپنے حقوق حاصل کرنے اور مطالبات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کا سہارا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ آجکل اکثر ملکوں میں جمہوری حکومتیں ہیں اور بھوک ہڑتال کے ذریعہ حکومتیں عوام کے مطالبات کو تسلیم کر لیتی ہیں، اس لیے جائز مطالبات اور حقوق کے حصول کے لیے بھوک ہڑتال پر امن طریقہ سے ہونی چاہیئے، کہیں یہ نہ ہو کہ اس کی وجہ سے جان خطرے میں پڑ جائے ایسی ہڑتال کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ تاہم اگر بھوک ہڑتال ایسی ہو کہ اس کی وجہ سے جان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا بھوک ہڑتال کو اتنا لمبا کر دیا جائے کہ بھوک کی وجہ سے کوئی مر جائے تو ایسی بھوک ہڑتال نہ صرف ناجائز اور ممنوع بلکہ خودکشی کے مترادف ہے۔

لما فی الهندية: فان ترك الاكل والشرب حتى هلك فقد عصى ...... ولا تجوز الرياضة بتقليل الاكل حتى يضعف عن اداء الفرائض فاما تجويع النفس على وجه لا يعجز عن اداء العبادات فهو مباح وفيه رياضة النفس۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۳۶ کتاب الكراهية الباب الحادی عشر فی الكراهية فی الاكل)[1]

عورتوں کا جلوس نکالنے کا حکم

سوال:۔ جمہوری حکومت میں اپنے حقوق کیلئے جلوس نکالنا جمہوری عمل کا ایک حصہ ہے، تو کیا مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنے حقوق کے لیے جلوس نکال سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ معاشرہ کی بقاء مردوزن کے باہمی اشتراک پر موقوف ہے، اس میں مردوں کی طرح عورتیں بھی حقوق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

(۱) لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔ (سورۃ النساء آیت ۳۲)

(۲) وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۸)

---

[1] وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فان ترك الاكل والشرب حتى هلك فقد عصى لان فيه القاء النفس الى التهلكة وانه منهي عنه في محكم التنزيل۔

(رد المحتار ج۵ ص۲۳۸ کتاب الحظر والاباحة)

وقال الله تعالى: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۵)

اپنے حقوق کے حصول کے لیے لڑنے یا اس کا مطالبہ کرنے پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے جس طرح مرد اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکتے ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے کوئی امر مانع نہیں، تاہم عورت کو اپنے حقوق کے احیاء کے لیے اپنی شخصیت کے تقدس کو پامال کرنا بددیانتی اور خیانت کے مترادف ہے۔ عورتوں کا جلوس نکالنے سے اگرچہ اپنے حقوق کا مطالبہ مقصود ہوتا ہے لیکن موجودہ حالات کی روشنی میں یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ اس میں عورتوں کا اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے نعرہ بازی کرنا یا اظہار نفرت کے لیے اپنے ایسے اعضاء کو ظاہر کرنا لازمی امر ہے جن کا بلا عذر شرعی کھولنا شریعت میں حرام ہے جو کہ عورت کے لیے جائز نہیں، اس لیے عورتوں کا جلسے جلوسوں یا دوسرے احتجاجی طریقوں میں مذکورہ امور کا ارتکاب ناجائز اور حرام ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال مثل الرافلة فی الزّینة فی غیر اھلھا کمثل ظلمة یوم القیٰمة لا نور لھا۔ (جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۳۹ ابواب الرضاع، باب ماجاء فی کراھیة خروج النساء فی الزّینة)

تاہم اگر عورتوں کے ایسے جلوس نکالنے سے کسی بے حیائی اور خلافِ شرع امور کا ارتکاب نہ ہوتا ہو بلکہ ایسے جلوسوں سے کسی دینی یا دنیوی حقوق کا احیاء مقصود ہو تو ان کے جواز کی گنجائش ہے۔

لما فی الحدیث: عن ایاس بن عبد اللہ بن ابی ذباب قال قال رسول اللہ علیہ وسلم لا تضربوا اماء اللہ فجاء عمرؓ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ذئرن النساء علی ازواجھن فرخص فی ضربھن فاطاف بآل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساء کثیر یشکون ازواجھن فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقد طاف بآل محمدؐ نساء کثیر یشکون ازواجھن لیس اولٰئک بخیارکم۔

(سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۲۹۲ کتاب النکاح)

عائلی قوانین کی شرعی حیثیت

سوال: فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں جو عائلی قوانین نافذ کئے تھے ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: ایوب خان مرحوم نے جن عائلی قوانین کا آرڈیننس جاری کیا تھا اس کی بعض

دفعات قرآن کریم اور احادیث سے مثلاً :۔

(۱) **دفعہ ۴** قابلِ توجہ ہے جس کی رُو سے اگر کسی شخص کے چند لڑکوں اور لڑکیوں میں سے کوئی ایک لڑکا یا لڑکی اس کی زندگی میں ہی فوت ہوجائے اور اس نے لڑکا یا لڑکی اولاد چھوڑی ہو تو اس دادا یا نانا کی وفات کے وقت شرعی قاعدہ کی رُو سے صلبی بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے اور نواسے کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا، جبکہ اس قانون نے ان کو حصہ دلانے کے لیے مرنے والے بیٹے یا بیٹی کو زندہ فرض کرکے ان کا حصہ ان کی اولاد کو حصہ دلوایا ہے۔ حالانکہ صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے "ولا یرث ولد الابن مع الابن" یعنی کسی بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث نہیں لے سکتا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۷ کتاب الفرائض)

(۲) **دفعہ ۶** : اس دفعہ میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے پر کڑی پابندی عائد کی گئی ہے، اس دفعہ کی رُو سے کوئی بھی شخص ثالثی کونسل کی تحریری اجازت کے بغیر نہ تو دوسری شادی کرسکے گا اور نہ ہی مذکورہ منظوری کے بغیر کسی شادی کو اس آرڈیننس کے تحت رجسٹرڈ کیا جائے گا۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا فیصلہ بہت واضح ہے۔

قولہ تعالیٰ : فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ۔ (النساء ع ۳)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر شخص کو بیک وقت چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۳) **دفعہ ۷** : اس دفعہ میں طلاق اور عدت کے متعلق چند قوانین بیان کئے گئے ہیں اس دفعہ کی ذیلی دفعہ ۱ کے تحت کوئی طلاق اُس وقت تک مؤثر نہ ہوگی جب تک کہ چیئرمین یونین کونسل کو دیئے گئے نوٹس کی تاریخ سے نوے ۹۰ دن نہ گذر گئے ہوں چاہے ایک طلاق ہو یا ایک سے زائد، چاہے مُطلقہ غیر مدخول بہا ہو یا مدخول بہا۔ حالانکہ کتاب اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ جب کسی غیر مدخول بہا عورت کو طلاق دی جائے تو فوراً شوہر کے نکاح سے نکل کر بغیر عدت گذارے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرسکتی ہے۔ قولہ تعالیٰ : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ۖ فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔ (الاحزاب ع ۴۹)

اور جب مدخول بہا عورت کو طلاق دی جائے تو اس صورت میں بھی طلاق کا اپنا اثر فوراً ظاہر ہوکر اس عورت کو مطلقہ کہا جاتا ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے عدت پوری کرے گی۔

قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ (الیٰ) وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۸)

(۴) دفعہ ۱۲: اس دفعہ کی منشاء یہ ہے کہ کسی لڑکی کا نکاح سولہ ۱۶ سال اور لڑکے کا نکاح اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے کرنا جرم ہوگا ــــــ حالانکہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح فرمایا تو اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر صرف چھ ۶ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت آپؓ کی عمر نو ۹ سال کی تھی۔

لما فی الحدیث: عن عائشۃؓ قالت تزوّجنی النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وانا بنت ست سنین وبنیٰ بی وانا بنت تسع۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۶) [1]

یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے اُس وقت اِس قانون کے خلاف آواز اٹھاکر اپنی ذمہ داریاں پوری کیں اگرچہ اُس وقت سے لے کر اب تک قائم ہونے والی ہر حکومت انہی قوانین پر عمل پیرا ہے۔

حضرت حسنؓ کی خلافت خلافتِ راشدہ میں داخل ہے

سوال: حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کا دورِ خلافت خلافتِ راشدہ میں داخل ہے یا نہیں؟ ورنہ بصورتِ دیگر حق چار یار کا نعرہ لگانے کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ خلافت میرے بعد تیس ۳۰ سال تک رہے گی، پھر اس کے بعد بادشاہت اور امارت ہوگی۔ فقہاء کرام اور متکلمین علماء نے خلفاء اربعہ (ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ) کا زمانہ خلافت اُنتیس ۲۹ سال اور چھ ۶ ماہ

---

[1] عن عروۃ تزوّج النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عائشۃؓ وھی ابنۃ ستّ وبنیٰ بہا وھی ابنۃ تسع ومکثت عندہٗ تسعًا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۷۵ باب من بنی بامرأۃ وھی بنت تسع سنین۔ کتاب النکاح)

بنا یا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلم اکثریت نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چھ ماہ کے بعد آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرتے ہوئے خلافت آپ کے سپرد کر دی۔ اس بناء پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت خلافتِ راشدہ میں مشہور یہا داخل ہے۔
حق چار یار کے نعرہ سے اہل سنت والجماعت کا مقصد دوسروں کا انکار نہیں بلکہ ان چاروں کی حقانیت کا اعلان ہے۔

لما قال العلامة ملاّ علی القاری رحمه الله: وخلافة النّبوّة ثلاثون سنة۔ منها خلافة الصدیق رضی سنتان وثلاثة اشهر وخلافة عمر رضی عشر سنین ونصف وخلافة عثمان رضی اثنتا عشرة سنة وخلافة علی رضی اربع سنین وتسعة اشهر وخلافة ابنه ستة اشهر واوّل ملوك المسلمین معاویة رضی وهو افضلهم لکنه انما صار اِماماً حقاً لما فوض الیه الحسن رضی بن علی رضی الخلافة فان الحسن رضی بایعه اهل العراق بعد موت ابیه ثم بعد ستة اشهر فوض الامر الی معاویة رضی والقصّة مشهورة وفی الکتب المبسوطة مسطورة۔ (شرح الفقه الاکبر ص۶۸، ۶۹) [۱]

---

[۱] وقال الامام ابوجعفر الطحاوی رحمه الله: "قال النبی صلی الله علیه وسلم خلافة النّبوّة ثلاثون سنة ثم یؤتی الله ملکه من یشاء" وکانت خلافة ابی بکر رضی سنتین و ثلاثة اشهر وخلافة عمر رضی عشر سنین نصفاً وخلافة عثمان اثنتی عشرة سنة وخلافة علی رضی اربع سنین وتسعة اشهر وخلافة الحسن رضی ستة اشهر واوّل ملوك المسلمین معاویة رضی وهو خیر ملوك المسلمین لکنه انما صار اِماماً حقاً لما فوض الیه الحسن رضی بن علی رضی الخلافة فان الحسن رضی بایعه اهل العراق بعد موت ابیه ثم بعد ستة اشهر فوض الامر الی معاویة رضی نظر صدق قول النبی ان ابنی هذا سیّد وسیصلح الله به بین فئتین عظیمتین من المسلمین والقصّة المشهورة فی موضعها۔
(شرح العقیدة الطحاویة ص۵۴۵ الخلافة والامارة)
ومثله فی شرح العقائد علی هامش خیالی ص۱۵۱ الخلافة والامارة۔

عورت کا سربراہ مملکت بننا

سوال :۔ کیا اسلام میں عورت ملک کی سربراہ بن سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ دلائل شرعیہ کی رُو سے عورت کو بادشاہ وسربراہ بنانا جائز نہیں ہے تفصیل درج ذیل ہے :۔

شریعتِ اسلامیہ کا ایک ادنیٰ طالب علم آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ شرعاً کسی چیز کا جواز یا عدم جواز اسلام کے چار مشہور اصول اور دلائل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے ان دلائل کے بغیر کسی چیز پر جواز یا عدم جواز کا حکم لگانا اور اسے شرعی حکم سمجھنا سراسر جہالت ہوگی، اسلئے ضروری ہے کہ عورت کی سربراہی کو ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تاکہ عورت کی سربراہی کے اصلی خدوخال اور اس کی شرعی حیثیت سامنے آجائے، اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون پیشِ خدمت ہے، امید ہے کہ اس سے صحیح صورتحال سامنے آسکے گی ۔

(۱) قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے : اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَہُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۔ (سورۃ النساء آیت ۳۴) اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے تحت ساتویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول اور معتمد مفسر علامہ ابن کثیرؒ اپنی مایۂ ناز تفسیر میں لکھتے ہیں ،۔

یقول تعالیٰ (الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ) ای الرجل قیم علی المرأۃ ای ھو رئیسھا وکبیرھا والحاکم علیھا ومؤدبھا اذا اعوجت (بما فضل اللہ بعضھم علی بعض) ای لان الرجل افضل من النساء والرجل خیر من المرأۃ ولھذا کانت النبوۃ مختصۃ بالرجال وکذلک الملک الاعظم لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم " لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ ۔ (رواہ البخاری من حدیث عبدالرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ) ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۹۱ سورۃ النساء)

(ترجمہ) "جنابِ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ مرد عورت کا حاکم و رئیس اور سردار ہے، اُسے درست اور ٹھیک ٹھاک رکھنے والا ہے اس لیئے کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں یہی وجہ ہے کہ نبوّت مردوں میں رہی اور اسی طرح شرعی طور پر خلیفہ بھی مرد ہی بن سکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ لوگ کبھی نجات نہیں پا سکتے جو اپنا والی کسی عورت کو بنائیں " (بخاری)

(۲) (الف) حدثنا عثمان بن الہیثم قال حدثنا عوف عن الحسن عن ابی بکرۃؓ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا

علیہم بنت کسرٰی قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃً ۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۷، ص ۱۰۵۲ کتاب النبیؐ الی کسرٰی وقیصر)

(ترجمہ) "ہم سے عثمان بن ہیثم نے بیان کیا کہا ہم سے عوف نے انہوں نے امام حسن بصریؒ سے انہوں نے ابی بکرہؓ سے انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے جنگِ جمل کے دن مجھ کو اس بات سے فائدہ دیا جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی ورنہ قریب تھا کہ میں جمل والوں کے ساتھ یعنی حضرت عائشہؓ کے لشکر میں شریک ہو کر (مسلمانوں سے) لڑتا، ابوبکرہؓ نے کہا وہ بات یہ تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسرٰی کی بیٹی (بوران بنت شیرویہ) کو تخت پر بٹھا دیا ہے تو فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے (ملک کے) امور کا حاکم والی کسی عورت کو بنایا ہو۔"

بخاری شریف کے حاشیہ میں حدیثِ ابوبکرہؓ پر قسطلانی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ عورت کی سربراہی جائز نہیں۔

اور اسی طرح محدثِ شہیر فقیہ نبیل ملا علی قاری رحمہ اللہ اپنی مشہور زمانہ تالیف "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

فی شرح السنۃ: لاتصلح المرءۃ ان تکون اماماً ولا قاضیاً لانھما محتاجان الی الخروج للقیام باموِر المسلمین والمرءۃ عورۃ لاتصلح لذلک۔ ولان المرءۃ ناقصۃ والقضاء من کمال الولایات فلایصلح لھا الا الکامل من الرجال ۔

(مرقاۃ المفاتیح ج ۷ ص ۳۱۵ کتاب الامارۃ والقضاء)

شرح السنۃ میں ہے کہ عورت کی سربراہی اور ریاستِ عامہ دو وجہوں سے جائز نہیں:۔

(۱) سربراہی قیام باموِر المسلمین کے لیے آزادانہ چلنے پھرنے کا تقاضا کرتی ہے اور عورت کو قرار فی البیت اور حجاب کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) عورت عقل کے لحاظ سے ناقص ہے اور ریاستِ عامہ کمال ولایت ہونے کی وجہ سے کمال عقل کو چاہتی ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے محدثین، مفسرین نے اس حدیث کو عام لیکر اس سے عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر استدلال فرمایا ہے، لہٰذا اس حدیث کو بنتِ کسرٰی کے ساتھ مخصوص جاننا سوائے خالی دعوے کے اور کچھ نہیں، خود راویٔ حدیث صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرہؓ کے اسلوب کلام

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اس حدیث کو عام لے رہے ہیں۔ (کما لا یخفیٰ علی المتامل)

(ب) ما رأیت من ناقصات عقل ودین اغلب لذی لب منکن قالت یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ما نقصان العقل والدین قال اما نقصان عقلها فشهادة امرتین تعدل شهادة رجل فهذا نقصان العقل وتمکث اللیالی لا تصلی وتفطر فی رمضان فهذا نقصان الدین۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۳۵ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ) میں نے نہیں دیکھا کہ باوجود عقل و دین کی کمی کے مردوں کی عقل مارنے والی تم سے زیادہ ہو، اس نے پھر پوچھا کہ حضورؐ! ہم میں دین کی اور عقل کی کمی کیسی ہے؟ فرمایا عقل کی کمی تو اس سے ظاہر ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور دین کی کمی یہ ہے کہ ایام حیض میں نہ نماز ہے نہ روزہ۔" (تفسیر ابن کثیر جلد ا ص ۳۳۵ سورۃ البقرۃ)

اس حدیث سے صاف معلوم ہُوا کہ عورت ناقص العقل ہے اور ریاستِ عامہ نام ہے کمال ولایت کا لہٰذا اس کے لیے کمال عقل کی ضرورت ہے اور یہ حدیث کی رُو سے عورت میں مفقود ہے اس لیے عورت کی سربراہی اور ریاستِ عامہ جائز نہیں۔

(۳) شرح عقائد کی مشہور شرح نبراس میں ہے:۔

قد اجمع الامۃ علی عدم نصبها حتی فی الامامۃ الصغریٰ۔

(النبراس شرح شرح العقائد ص ۳۲۱ نصب الامام۔ یشترط ان یکون الامام من اہل الولایۃ)

(ترجمہ) "امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ عورت کی ریاستِ عامہ (امامتِ کبریٰ) اور ریاستِ خاصہ (امامتِ صغریٰ) دونوں جائز نہیں۔

ذیل میں مشہور محدثین و فقہاء اور متکلمین ارشادات بھی ملاحظہ فرمالیجئے تاکہ مسئلہ کی مزید توضیح ہو جائے۔

(۱) علامہ علاؤالدین الحصکفیؒ فرماتے ہیں:۔

ویشترط کونہ مسلماً حراً ذکراً عاقلاً بالغاً قادراً۔ (الدر المختار علی ہامش رد المختار ج ۱ ص ۲۰۵ باب الامامۃ)

(ترجمہ) "یعنی ریاستِ عامہ کیلئے مرد ہونا شرط ہے لہٰذا عورت کی سربراہی جائز نہیں۔

(۲) علامہ ابن عابدینؒ عورت کی سربراہی کے عدم جواز کی تعلیل میں لکھتے ہیں:۔

لان النساء امرن بالقرار فی البیوت فکان مبنی حالهن علی الستر والیه اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث قال کیف یفلح قوم تملکهم امرأۃ۔ (رد المختار جلد ا ص ۲۰۵ باب الامامۃ)

(ترجمہ) "کیونکہ عورتوں کو قرار فی البیوت کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا ان پر حجاب اور ستر میں رہنا لازم ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی سربراہی کے عدم جواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہ پا سکے گی جس پر عورت حکومت کر رہی ہو۔"

(۳) علامہ تفتازانی رحمہ اللہ "شرح مقاصد" میں لکھتے ہیں: یشترط فی الامام ان یکون مکلفا حرًا ذکرا الی قولہ والنساء ناقصات عقل ودین ممنوعات عن الخروج الی مشاهد الحکم ومعارك الحرب۔ (شرح المقاصد ج ۲ ص ۲۷۷)

(ترجمہ) "عورت کی سربراہی دو وجہ سے جائز نہیں ۱ عورت عقل اور دین کے لحاظ سے ناقص ہے۔ ۲ اس کو پردہ میں رہنے کا حکم ہے۔"

(۴) علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ اپنی مشہور زمانہ تفسیر "روح المعانی" میں اس آیت انی وجدت امرأة تملکهم (الآیۃ) کے تحت رقمطراز ہیں:۔

ولیس فی الآیۃ ما یدل علی جواز ان تکون المرأة ملکۃ ولا حجۃ فی عمل قوم کفرۃ علی مثل هذا المطلب۔ وفی صحیح البخاری من حدیث ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما بلغہ ان اهل فارس قد ملکوا علیهم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرهم امرأة۔ (روح المعانی ص ۱۸۹ ج ۱۰، الجزء ۱۹ الکلام علی نکاح الانس والجن)

(ترجمہ) "یعنی عورت کی سربراہی جائز نہیں کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپؐ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔"

(۵) حضرت العلامہ مولانا آزادؒ الرجال قوامون الخ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے اور ایسی مزیت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے، مرد عورت کی ضروریات معیشت کے قیام کا ذریعہ ہے اس لیے سربراہی و کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انہی کیلئے ہو گیا ہے۔" (ترجمان القرآن ج ۱ ص ۳۱۱ سورۃ النساء)

(۶) مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی معروف ومقبول تفسیر "معارف القرآن" میں لکھتے ہیں: "کیا کسی عورت کا بادشاہ ہونا یا کسی قوم کا امیر و امام ہونا جائز ہے"؟

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے، تو آپؐ نے فرمایا:۔

لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔" اس لیے علماء اُمت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت وخلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کی جاسکتی بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامتِ کبریٰ بھی صرف مردوں کو سزاوار ہے۔ رہا بلقیس کا ملکہ سبا ہونا، تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح کیا اور پھر اس کو حکومت وسلطنت پر قائم رکھا، اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکام شرعیہ میں اعتماد کیا جاسکے۔

(معارف القرآن ج ۶ ص ۵۷۳ سورۃ النمل)

(۷) مشہور محدث حضرت مولانا عبدالحق دہلویؒ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں حدیث لن یفلح قوم الخ کی شرح میں فرماتے ہیں: "ازیں معلوم میشود کہ زن قابل ولایت وامارت نیست"۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۳۰۹ کتاب الامارۃ والقضاء)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کی ریاستِ عامہ اور سربراہی جائز نہیں ہے۔

(۸) علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلویؒ "مظاہر حق شرح مشکوٰۃ" میں اس عنوان: "عورت کو اپنا حاکم بنانے والی قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی" کے تحت حدیث لن یفلح قوم الخ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولایت وحکمرانی کا اہل مرد ہی ہوسکتا ہے، عورت حکمرانی وسربراہی کے منصب کی اہل نہیں"۔ (مظاہر حق ج ۳ ص ۶۷۲ کتاب الامارۃ والقضاء)

(۹) حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنی مشہور زمانہ تفسیر مظہری میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی بما فضل اللہ بعضھم علی بعض کے تحت لکھتے ہیں:

یعنی الرجال علی النساء فی اصل الخلقۃ بکمال العقل وحسن التدبیر وبسطۃ فی العلم والجسم ومزید القوۃ فی الاعمال وعلو الاستعداد ولذلک خصوا بالنبوۃ والامامۃ والولایۃ والقضاء والشہادۃ فی الحدود والقصاص وغیرھا ووجوب الجہاد والجمعۃ والعیدین والاذان والخطبۃ والجماعۃ وزیادۃ السہم فی الارث ومالکیۃ النکاح وتعدد المنکوحات والاستبداد بالطلاق وکمال الصوم والصلوٰۃ من غیر فتور وغیر ذلک وھذا امر وھبی۔

(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۹۸ سورۃ النساء)

(ترجمہ) "اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو یعنی مردوں کو بعض پر یعنی عورتوں پر (تخلیقی) برتری عطا فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ نے مرد کو کمال عقل، حسن تدبیر، وسعتِ علم، عظمتِ جسم، زیادتی قوت اور

صلاحیت واستعداد کی بیشی تخلیقی طور پر عطا کی ہے اتنی کہ عورت کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں اسی لیے مندرجہ ذیل خصوصیات واحکام مرد کے لیے ہیں عورتیں ان احکام وخصوصیات سے محروم ہیں۔ نبوت، امامت وحکومت، قضاء، تعزیری جرائم کی شہادت، وجوب جہاد، وجوب جمعہ، وجوب عیدین، اذان و خطبہ، نماز باجماعت، میراث میں حصہ کی زیادتی، نکاح کی مالکیت، تعدد ازدواج، اختیار طلاق، پورے رمضان کے روزوں کی اور ہر زمانہ میں پوری نمازوں کی فرضیت وغیرہ، اور یہ عطاء الٰہی ہے۔

(۱۰) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مشہور اور بے حد مقبول تفسیر "بیان القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے، اوّل تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں"۔

(بیان القرآن ج۲ ص۴۷۴)

(۱۱) تفسیر النسفی میں الامام الجلیل العلامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ رقمطراز ہیں:۔

یعنی انما کانوا مسیطرین علیهن لسبب تفضیل الله بعضهم وهم الرجال علی بعض وهم النساء بالعقل والعزم الی قوله والنبوة والخلافة والامامة۔ (المدارک ج۱ ص۲۲۳ سورۃ النساء)

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ نے بعض باتوں میں مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے عقل، عزم، حزم، رائے وقوت وجہاد وکمال، صلوٰۃ وصوم، نبوت وخلافت وامامت وغیرہ"۔

(۱۲) حضرت العلامہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، حدیث لن یفلح قوم الخ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

قوله ولوا امرهم امرأة فی شرح السنة لاتصلح المرأة ان تکون اماما ولاقاضیا لان الامام والقاضی محتاجان الی الخروج للقیام بامر المسلمین والمرأة عورة لاتصلح لذلک ولان المرأة ناقصة والقضاء من کمال الولایة فلا یصلح لها الا الکامل من الرجال۔ (التعلیق الصبیح ج۴ ص۲۰ کتاب الامارة والقضاء)

(ترجمہ) شرح السنۃ میں ہے کہ عورت کی سربراہی اور ریاست عامہ دو وجہ سے جائز نہیں ۱۔ سربراہی قیام بامور المسلمین کیلئے آزاد چلنے پھرنے کا تقاضا کرتی ہے اور عورت کو قرار فی البیت اور حجاب کا حکم دیا گیا ہے ۲۔ عورت عقل کے لحاظ سے ناقص ہے اور ریاست عامہ کمال ولایت ہونے کی وجہ سے کمال عقل کو چاہتی ہے۔

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمہ اللہ اپنی مقبول ترین تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں لکھتے ہیں :-

العاشرة - روی البخاری من حدیث ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما بلغہ ان اھل فارس قد ملکوا بنت کسرٰی قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ قال القاضی ابوبکر ابن العربی فی ھذا نص فی ان المرأۃ لا تکون خلیفۃ ولاخلاف فیہ ۔ (تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۱۸۳ سورۃ النساء)

(ترجمہ) "امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو تخت پر بٹھادیا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے ملک کے امور کا حاکم و والی کسی عورت کو بنایا ہو۔"

قاضی ابوبکر بن العربیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ عورت خلافت کی اہل نہیں ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے ۔

الشیخ الامام العلامہ بدرالدین ابن محمد محمود بن العینیؒ بخاری شریف کی شرح عمدۃ القاری میں حدیث لن یفلح قوم الخ کی شرح میں لکھتے ہیں :-

قال الخطابی فی الحدیث ان المرأۃ لا تلی الامارۃ ولا القضاء ۔ (عمدۃ القاری ج ۱۸ ص ۵۹ کتاب الامارۃ والقضاء)

(ترجمہ) "علامہ خطابیؒ نے ارشاد فرمایا کہ عورت حکومت اور قضاء کی اہل نہیں ہے۔"

ازالۂ شبہات

بعض حضرات کو حدیث لن یفلح کے متعلق خصوص کا شبہ ہوا ہے اس وجہ سے کہ بعض اقوام میں عورتیں ان کی سربراہ رہ چکی ہیں اور وہاں بجائے عدم فلاح کے فلاح دیکھا گیا ہے ۔ تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جن اقوام میں عورتیں سربراہ رہ چکی ہیں تو وہ ضرور کسی نہ کسی درجہ میں عدم فلاح کا شکار رہ چکی ہیں اور تاریخ اس کی شاہد ہے ۔ اور بعض ایسی اقوام تو بڑے عبرتناک زوال[1] اور عدم فلاح سے دوچار ہوئی ہیں ۔ چنانچہ برطانیہ کی مثال لیجئے کہ ایک زمانہ

---

[1] اور یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ بعض اقوام کا زوال بغیر عورت کی سربراہی کے بھی آیا ہے اسلئے کہ زوال کے اسباب مختلفہ ہوتے ہیں جس طرح کہ موت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں کوئی بخار سے مرتا ہے اور کوئی ہیضہ سے! اور اس کا یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ جائز ہے کہ ان بیگمات کی حیثیت واقعۃً صرف مشیر کی ہوتی ہو گو بظاہر و صورتاً وہ حکمران تھیں! اور اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ یہ بیگمات اگرچہ حکمران تھیں مگر التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی تھیں، اور یہ دو تاویلیں حدیث کے تحت داخل نہیں اول اسلئے کہ عورت اہل مشورہ ہے اور دوم اسلئے کہ علت عدم فلاح کا نقصان عقل ہے، اور جب مشورہ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منتفی ہو گئی، تو ان وجوہ کی بناء پر یہ بعض اقوام عدم فلاح کا شکار نہ ہوئیں ۔

میں برطانیہ کے قلمرو میں سورج نہ ڈوبتا تھا آج وہی عظیم برطانیہ دنیا کے ایک چھوٹے سے گوشے میں محصور رہ کر عظیم سے صغیر وحقیر برطانیہ بن گیا ہے۔ اور ان میں سے بعض اقوام میں بہ ظاہر جو فلاح نظر آتی ہے اس سے حدیثِ نبوی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ فلاح کلی مشکک ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں، تو بظاہر کسی ایک مرتبہ فلاح کے وجود سے تمام مراتب فلاح کا وجود لازم نہیں آتا حتیٰ کہ عدم فلاح متحقق نہ ہونے کی وجہ سے حدیثِ نبوی کے متاثر ہونے کا خدشہ لازم آجائے۔ اس کے علاوہ حدیث کے استقبالی صیغہ لن یفلح کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ اقوام کسی خاص زوال اور ناکامی میں مبتلا بھی ہو جائیں اور بتقدیر عدم ابتلاء کے جواب وہ ہے جو پہلے گذر چکا ہے۔ اس حدیث کو تمام اکابر امت سلفاء و خلفاء نے عموم کا درجہ دیتے ہوئے انشاء کے معنی میں لیا ہے،' اور دوسرے نصوص کے علاوہ اس حدیث سے بھی عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے۔

(۲) بعض کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے عورت کی ریاستِ عامہ اور سربراہی کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ حضرات یا تو مولانا تھانویؒ کے مقصد کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے یا پھر تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے "امداد الفتاویٰ" میں جو فتویٰ دیا ہے اس کی عبارت سے یہ واضح ہے کہ وہ دو صورتوں میں جواز کے قائل ہیں:۔

۱۔ عورت صرف صوری سربراہ ہو حقیقی نہ ہو بلکہ حقیقتاً صرف مشیرہ ہو اور حاکم اور حقیقی سربراہ پارلیمنٹ ہو،' اور وجہ جواز یہ ہے کہ عورت اہلِ مشورہ ہے،' لیکن ہمارے یہاں تو یہ صورت نہیں بلکہ یہاں حقیقی سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کی حیثیت صرف مشیر کی ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت حقیقتاً حکمران ہو مگر التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو،' اور اس صورت میں جواز میں راز یہ ہے کہ علت عدم جواز کا نقصان عقل ہے،' اور جب مشورۂ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی تو معلول یعنی عدم جواز و عدم فلاح بھی منتفی ہو گیا، مگر ہمارے ہاں یہ صورت بھی بلکہ یہاں وزیر اعظم مستبد بالرائے ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کو صرف اپنی رائے کا تابع بناتا ہے۔

اور جبکہ عورت حقیقتاً حکمران اور سربراہ مملکت ہو اور اپنی انفرادی رائے سے کام کرتی ہو تو اس صورت کو حضرت تھانویؒ بھی ناجائز اور داخل حدیث سمجھتے ہیں، لہٰذا حضرت تھانویؒ کے فتویٰ سے عورت کی مطلق سربراہی کا جواز نکالنا یقیناً حضرت تھانویؒ کے مقصد کو نہ جاننے یا تجاہل عارفانہ کا نتیجہ ہے۔

(تنبیہ) گذشتہ صفحات میں جو دو صورتیں جائز قرار دی گئی ہیں وہ بے حجابی سے اجتناب کے ساتھ مشروط ہیں، چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ کی تعلیل صراحت کے ساتھ اس پر دال ہے۔

(۳) بعض لوگ قرآن پاک میں مذکور ملکہ بلقیس کے قصہ سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں کہ ان سے انتزاع سلطنت کیا گیا ہو، بس بظاہر حکایت سلطنت اور عدم حکایت انتزاع سے اس سلطنت کا بحالہا باقی رہنا معلوم ہوتا ہے اور تاریخ صراحتہً اس کی مؤید ہے اور قاعدہ اصولیہ ہے اذا قص اللہ ورسولہ علینا امراً من غیر نکیر علیہ فھو حجۃ لنا لھٰذا قرآن پاک سے ثابت ہوا کہ عورت کی سربراہی جائز ہے۔ تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ملکہ بلقیس کی حکومت کی صورت ان دو صورتوں میں سے ایک تھی جن کو حضرت تھانویؒ نے جائز قرار دیا ہے اور اس کا قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عالی ہے: ماکنت قاطعۃ امراً حتّٰی تشھدون۔ بلقیس نے کہا "میں کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگ میرے پاس موجود نہ ہو۔"

اور اس قرینہ سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلمان ہونے کے بعد ملکہ بلقیس کی حکومت کی صورت وہ تیسری صورت تھی جس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے تو پھر گذشتہ قاعدہ اصولیہ کی رُو سے جواب یہ ہے کہ چونکہ اس صورت پر شریعت مقدسہ میں انکار آیا ہے لہٰذا یہ حجت نہیں بن سکتی۔

(۴) بعض صحافی حضرات نے حدیث لن یفلح قوم الخ کے متعلق ضعف کا دعویٰ کیا ہے جو سراسر جھوٹ اور بہتان عظیم ہے۔ امام ترمذیؒ نے اپنی مشہور کتاب سنن ترمذی میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

حدثنا محمد بن المثنیٰ ثنا خالد بن الحارث عن حمید الطویل عن الحسن عن ابی بکرۃؓ قال عصمنی اللہ بشیٔ سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما ھلک کسریٰ قال من استخلفوا قالوا ابنتہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ فلما قدمت عائشۃؓ یعنی البصرۃ ذکرت قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعصمنی اللہ بہ۔ قال الترمذیؒ ھٰذا حدیث صحیح۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص۵۲ ابواب الرؤیا)

(ترجمہ) حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (جنگ جمل کے دن) مجھ کو اس بات کی وجہ سے بچایا جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی، وہ بات یہ تھی کہ جب کسریٰ ہلاک ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایران والوں نے کس کو حکمران بنایا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کسریٰ کی بیٹی کو خلیفہ و حکمران بنایا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے

ملک کے امور کا حاکم و والی کسی عورت کو بنایا ہو۔ تو جب حضرت عائشہؓ بصرہ تشریف لے آئیں تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان لن یفلح قوم الخ یاد آیا اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بچا لیا اور میں جمل والوں کے ساتھ شریک نہ ہوا۔" امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

بعض لوگ جنگ جمل کے واقعات سے ناکام اور ناتمام استدلال کر رہے ہیں، اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے امامت وخلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی امامت وخلافت کا مطالبہ کیا بلکہ وہ اور ان کے ساتھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

دیکھئے یہ حضرات، حضرت قعقاعؓ کو کیا جواب دے رہے ہیں:-

—— "اگر حضرت علیؓ کے یہی خیالات ہیں جو آپ نے بیان کئے اور وہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر لڑائی اور مخالفت کی کوئی بات باقی نہیں رہتی ہم اب تک یہی سمجھتے رہے کہ ان کو قاتلین عثمانؓ سے ہمدردی ہے"—— (تاریخ اسلام جلد ا ص۳۹۶)

صحیح بخاری کا حاشیہ بھی ملاحظہ کیجئے:-

قوله ايام الجمل متعلق بقوله نفعني الله وايام الجمل وقعة وقعت بالبصرة بين علي وعائشة رضي الله عنهما سنة ست ثلثين وكانت عائشة يومئذ على الجمل فسميت به اصحاب الجمل يعني عسكره- قاله الكرماني ولم تكن عائشةؓ ولا غيرها طالبين الامارة والخلافة بل طلبوا دم عثمانؓ من قتلته وكان عليؓ الى قوله كذا في الفتح-

(صحیح بخاری جلد ۲ ص۶۳۷ کتاب النبیؐ الی کسریٰ وقیصر)

(ترجمہ) "جنگ جمل ۳۶ھ میں سیدنا حضرت علیؓ اور ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان لڑی گئی، اس دن ام المؤمنینؓ جمل (اونٹ) پر سوار تھیں اس لیے ان کے لشکر کا نام اصحاب الجمل پڑا، اور ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھی امارت یا خلافت کے طالب نہ تھے، یہ حضرات صرف اور صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔"

لہٰذا اس واقعہ سے عورت کی سربراہی کے جواز پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس واقعہ میں امامت یا خلافت کی کوئی بات نہیں تھی، البتہ اس واقعہ کی سرپرستی کرنے کی وجہ سے صورت خلافت وامامت ضرور آتی تھی جو جائز نہیں مگر حقیقت خلافت وامامت بالکلیہ موجود نہ تھی کیونکہ اس موقع پر نہ تو خود

ام المؤمنینؓ نے امامت کا دعویٰ فرمایا اور نہ آپ کے ساتھیوں نے آپ کو امام و خلیفہ بنایا بلکہ یہ حضرات مشترکہ طور پر حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے سعی و کوشش کر رہے تھے البتہ تحریک و سرپرستی حضرت ام المؤمنینؓ کی تھی، جیسے ایک گھر میں بچے ماں کی تحریک و سرپرستی میں کام کرتے ہیں، اس لیے اس واقعہ سے عورت کی سربراہی اور امامت و خلافت کا جواز پیش کرنا درست نہیں، مگر چونکہ اس سے صورتِ امامت تو آتی تھی اس لیے حدیث لن یفلح قوم الخ کے راوی حضرت ابوبکرہؓ جیسے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس حدیث لن یفلح قوم الخ ہی کی رو سے غایت تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی وجہ سے ام المؤمنینؓ کے لشکر میں شمولیت نہ فرمائی۔ اور خود ام المؤمنین حضرت عائشہؓ بھی اس حدیث کی صوری مخالفت اور اس فساد کی وجہ سے جو اس واقعۂ جمل میں واقع ہوا اتنی غمگین اور پریشان تھیں اور اکثر یہ فرمایا کرتی تھیں :-

"کاش میں اس واقعہ کے پیش آنے سے بیس۲۰ برس پہلے ہی مرجاتی ۔"

(۶) بعض لوگ یہ بے بنیاد اور بے سروپا الزام لگاتے ہیں کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کے مقابلہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر علماء نے فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی، اگر عورت کی سربراہی شرعاً ناجائز ہوتی تو شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، محدثِ کبیر حضرت مولانا عبدالحقؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ جیسے علماء فاطمہ جناح کی تائید و حمایت نہ کرتے۔

اس شبہ کا جواب صرف اور صرف یہ ہے: سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔

معترضین پر لازم ہے کہ وہ جل و فریب سے کام نہ لیں اور ماضی قریب کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور ایوبی دور کا سرکاری ریکارڈ ملاحظہ کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر فاطمہ جناح کی مخالفت کرتے رہے یا حمایت! حقیقت یہ ہے کہ اس موقعہ پر جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر نے ایوب خان اور فاطمہ جناح کی مخالفت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبیداللہ انور لاہوریؒ کو صدارتی امیدوار نامزد کیا تھا اور جمعیۃ کے اکابر فاطمہ جناح کی مخالفت اس لیے کر رہے تھے کہ عورت کی سربراہی شرعاً جائز نہیں۔

تنبیہ: شریعتِ مطہرہ نے عورت کو ریاستِ عامہ کی ذمہ داری سے مستثنیٰ کر کے اس پر عین شفقت اور مہربانی فرمائی ہے، کیونکہ عورت کے نازک اور ضعیف کندھوں پر ریاستِ عامہ کا عظیم بوجھ ڈالنا حکمت کا تقاضا ہے نہ عقل و دانش کا۔

امامتِ کبریٰ (خلافت) کے مستحق کا حکم

سوال:۔ مملکتِ اسلامیہ میں ایک شخص متقی پرہیز اور عالمِ دین ہے لیکن انتظامی امور میں تجربہ نہیں رکھتا جبکہ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص عالم اور متقی و پرہیز گار تو نہیں ہے لیکن مملکت کے انتظامی امور میں وسیع تجربہ رکھتا ہے، تو شرعاً ان دونوں میں سے کون خلافت کا زیادہ مستحق ہے؟

الجواب:۔ کتبِ کلام میں مذکور ہے کہ امام (خلیفہ) کا معصوم ہونا شرط نہیں اسی طرح اس کا اپنے ہمعصروں میں سب سے افضل ہونا بھی شرط نہیں، لہٰذا ایسا شخص جو کہ ماہر ہو اور مملکت کے انتظامی امور کا تجربہ رکھتا ہو اگرچہ غیر عالم اور غیر متقی ہی کیوں نہ ہو اس کو امام (خلیفہ) بنانا درست ہے، تاہم جو شخص حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرتا ہو اس کی امامت (خلافت) ناجائز ہے۔

لما قال العلامة التفتازانی رحمه الله : ولایشترط فی الامام ان یکون ولا ان یکون افضل من اهل زمانه لان المساوی فی الفضیلة بل المفضول الاقل علماً وعملاً ای کان اعرف بمصالح الامامة ومفاسدها واقدر علی القیام بمواجبها خصوصاً اذا کان المفضول ادفع للشر وابعد عن اثارة الفتنة۔

(شرح العقائد ص۱۵۶ الخلافة والامارة)

آئینِ پاکستان میں گستاخیٔ رسول ایکٹ میں ترمیم کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! پاکستانی آئین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے جس میں اب اربابِ اقتدار ترمیم کرکے اس سزا کو کم یا ختم کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا شرعاً اربابِ اقتدار کو یہ سزا کم یا ختم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور جو شخص کسی گستاخِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کفر میں شک کرے تو اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں نازیبا الفاظ کہنا ایک

لہ قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله : یجوز تقلید الفاسق وتنفذ قضایاه اذا لم یجاوز فیها حد الشرع۔ (شرح المجلة ص۱۱۶۴ المادة ۱۷۹۴ فصل فی القضایا)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۱ ص۴۰۵ باب الامامة۔

ناقابلِ معافی جرم ہے اس لیے علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مرتد اور واجب القتل ہے۔ فتاوٰی شامیہ میں ہے کہ اجمع المسلمون ان شاتمہ کافر (ج ۳ ص ۳۱۷ باب المرتد) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالی دینا بالاجماع کفر ہے۔ اور الدرالمختار میں ہے، صح فی آخر الشفاء بان حکمہ کالمرتد۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ کا حکم مرتد کا ہے اور اس پر مرتد کے احکام جاری کئے جائیں گے۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۳ ص ۳۱۸ باب المرتد)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال ابوبکر بن المنذر اجمع عوام اھل العلم علیٰ ان من سبّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقتل وممن قال ذٰلک مالک بن انس واللیث واحمد واسحاق ومذھب الشافعی وھو مقتضی قول ابی بکر رضی اللہ عنہ ولا تقبل توبتہ عند ھؤلاء وبمثلہ قال ابوحنیفۃ واصحابہ والثوری واھل الکوفۃ والاوزاعی فی المسلم لکنھم قالوا ھی ردۃ وروی مثلہ الولید بن مسلم عن مالک وروی الطبرانی مثلہ عن ابی حنیفۃ واصحابہ فیمن ینقصہ صلی اللہ علیہ وسلم او برئ منہ او کذبہ اھ۔ وحاصل انہ نقل الاجماع علی کفر ساب ثم نقل عن مالک ومن ذکر بعدہ انہ لا تقبل توبتہ فعلم ان المراد من نقل الاجماع علی قتلہ قبل التوبۃ ثم قال وبمثلہ قال ابوحنیفۃؒ واصحابہ الخ قال انہ یقتل یعین قبل التوبۃ لا مطلقا الخ۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۳۱۸ باب المرتد)

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گستاخ بالاجماع کافر، مرتد اور واجب القتل ہے ہاں اختلاف اس میں ہے کہ گستاخِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم توبہ سے قتل سے بچ جاتا ہے یا نہیں! نیز ردالمحتار میں ہے: اجمع المسلمون ان شاتمہ کافر وحکمہ القتل ومن شک فی عذابہ وکفرہ کفر۔ یعنی گستاخِ رسولؐ کافر ہے اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرتا ہو وہ بھی کافر ہے۔ اور فتاوٰی عالمگیری میں ہے کہ اہانت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالاجماع کفر اور ارتداد ہے۔ (ج ۲ ص ۲۶۳ باب المرتد)

ان حوالہ جات مذکورہ اور عبارت مسطوں سے واضح ہوا کہ گستاخِ رسول بالاجماع کافر اور مرتد ہے اس کے کفر میں شک کرنے والا بھی کافر اور خارج عن الاسلام ہے، اور مُرتد کی سزا قتل ہے لہٰذا گستاخِ رسولؐ کی سزا بھی قتل ہی ہے۔ حدیث میں ہے: من

بدل دینه فاقتلوه۔ (الدرالمختار ج ۳ ص ۳۱۳ باب المرتد ۔۔ بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۴)
نیز اصحابه العرب لما ارتدت بعد وفات النبی صلی اللہ علیه وسلم اجمعت
الصحابة علی قتلهم (ج ۷ ص ۱۳۴) اور رسائل ابن عابدین جلد ۱ ص ۳۱۸ میں ہے
اعلم ان المرتد یقتل بالاجماع کما سریبین اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ مرتد کی
سزا قتل ہی ہے۔
راقم الحروف کہہ رہا ہے کہ اس سے پہلے یہ گذر چکا ہے کہ امت کا اس پر بھی
اجماع ہے کہ گستاخ رسول کافر اور مرتد ہے۔ نیز العقود الدریة فی تنقیح الفتاوی
الحامدیة میں ہے: فمن سب النبی صلی اللہ علیه وسلم او احد من الانبیاء
صلوات اللہ علیهم وسلامه فانه یکفر ویجب قتله شاتم النبی صلی اللہ علیه
وسلم ونبی من الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام کافر اور مرتد ہے اور دونوں
واجب القتل ہیں۔ (ج ۱ ص ۱۰۲ باب المرتد)
وقال ابن نجیم: کل من ابغض رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بقلبه کان
مرتدا فالساب بطریق الاولی ثم یقتل حدا عندنا فلا تقبل توبته فی اسقاطه
القتل الخ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۵، ۱۲۶ باب المرتد) یعنی جو شخص پیغمبر اسلام
صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض رکھے یا آپ کو سب و شتم کرے تو وہ شخص کافر، مرتد اور
واجب القتل ہے۔ اور کفایت المفتی میں ہے کہ جناب رسالت مآب روحی فداہ صلی اللہ
علیہ وسلم یا ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان رفیع میں گستاخی کرنے
والا یا کسی گستاخی کرنے والے سے ناراض نہ ہونے والا کافر ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ تعالی
اجمعین اس پر متفق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والا
کافر ہے۔ الخ (جلد ۱ ص ۱۷ باب المرتد)۔ اور فتاوی محمودیہ میں ہے کہ جو شخص
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں (نعوذ باللہ، استغفر اللہ) گالی بکے وہ مرتد
اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کو چاہیئے کہ فوراً توبہ اور تجدید اسلام و تجدید
نکاح لازم ہے، اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے الخ (جلد ۱۲ ص ۱۶۲)
اور امداد الفتاوی میں ہے: "اہانت و گستاخی کردہ جناب انبیاء کفر است"۔ (جلد ۵ ص ۳۹۱
باب العقائد)۔ اور فتاوی دارالعلوم دیوبند جلد ۱۲ ص ۳۵۹ باب المرتد میں ہے کہ "سب النبی

کفر ہے"۔ اور الاشباہ والنظائر میں ہے: لاتصح ردة السکران الا الردة بسبب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فانہ یقتل ولا یعفی عنہ ۔ کذا فی البزازیۃ کل کافر تاب فتوبتہ مقبولۃ فی الدنیا والآخرۃ الا جماعۃ الکافر بسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و سائر الانبیاء یعین ۔ سب النبی کفر ہے اگرچہ حالت سکر میں ہو اور ساب النبی کی توبہ قبول نہیں (جلد ا صلـ۲۸۱) نیز فتاوی البزازیہ علیٰ ہامش الہندیۃ میں ہے کہ استخفاف النبی کفر ہے ۔ (جلد ۶ صـ۳۳۸) ۔ اور فتاوی قاضی خان علیٰ ہامش الہندیۃ میں ہے: اذا عاب الرجل النبی علیہ السلام فی شئ کان کافرا۔ الیٰ قولہ وذکر فی الاصل ان شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کفر۔ (ج ۳ صـ۵۷۳) یعنی استخفاف واہانت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا کفر وارتداد ہے ۔

سیاسی جلسوں میں نعرہ بازی کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل سیاسی جلسے اور جلوسوں میں نعرے بازی ہوتی ہے، مثلاً مسلم لیگ زندہ باد، پیپلز پارٹی زندہ باد، پختونستان زندہ باد، جئے سندھ وغیرہ کے نعرے بکثرت لگائے جاتے ہیں۔ تو کیا ایسی نعرہ بازی شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ نعرہ جس سے کسی خلافِ شرع امر کی تائید وتاکید ہوتی ہو تو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے اور جن نعروں میں اس قسم کی خرافات نہ ہوں تو ان میں شرعاً کوئی قباحت نہیں تاہم جو نعرے تعصب اور قوم پرستی کی ترغیب دیتے ہوں موجب اجتناب ہیں ۔

لما قال العلامۃ المفتی کفایت اللہ الدھلویؒ ۔ قومی نعرہ "ہندوستان زندہ باد، ہندوستان آزاد ہونا چاہیئے" لگانا جائز ہے

{کفایت المفتی ج ۹ صـ۲۹۱ کتاب السیاسیات
فصل چہارم: قومی ترانہ اور قومی نعرہ}

◎

مسلمان کی تعریف

مملکتِ خداداد پاکستان کی قومی اسمبلی میں جب عبوری آئین بنانے کے لیے کام ہو رہا تھا تو ایوان کے اندر اور باہر علماء کرام اور دینی جماعتوں کے قائدین نے حکومت سے پر زور مطالبہ کیا کہ آئین پاکستان میں جہاں صدر مملکت کے لیے مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے وہاں مسلمان کی تعریف بھی لازمی درج ہونی چاہیئے۔ لیکن حکمران طبقہ نے علماء کرام کے اس جائز مطالبہ کو مسترد کر دیا جس پر مرزائی، پرویزی اور دیگر لادین عناصر بہت خوش تھے، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور "آئینِ پاکستان میں مسلمان کی تعریف (مسلم و غیر مسلم کا تشخص کیوں ضروری ہے؟)" کے نام سے ایک مضمون ماہنامہ الحق میں شائع کیا مضمون کی اہمیت اور جامعیت کے پیشِ نظر "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

قومی اسمبلی میں عبوری آئین پر بحث کے دوران علماء کے مختلف مکاتبِ فکر نے متفق ہو کر پورے شد و مد کے ساتھ مطالبہ کیا کہ آئین میں جہاں ملک کی صدارت اور دیگر کلیدی آسامیوں کے لئے مسلمان کا ہونا لازمی قرار دیا جائے وہاں مسلم کی تعریف بھی ہونی چاہیئے کیونکہ کسی چیز کی ماہیت اس کی جامع اور مانع تعریف ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔ مسلمان قوم کی ایک مستقل تشخص ہے جو اسے دوسری اقوام اور ملل سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی انفرادی اور امتیازی تشخص ہی دو قومی نظریہ کی بنیاد تشکیلِ پاکستان کا ذریعہ بنا ہے۔ اور آج بھی کوئی اسلامی مملکت اور مسلم قوم اپنے وجود

کو صرف اس صورت میں برقرار رکھ سکتی ہے کہ وہ ایک واضح اور غیر مبہم مفہوم کے ذریعہ مار آستین، اسلام نما ملحدوں اور کافروں سے اپنی ملت کی حفاظت کر سکے۔ برصغیر پاک و ہند کی مختلف الاقوام حیثیت پھر موجودہ حالات میں پاکستان کی نزاکتیں اس مطالبہ کو ایک جائز اور معقول مطالبہ قرار دیتی ہیں۔ مگر حزب اقتدار نے جس زور شور سے اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا اس کی کوئی مناسب وجہ بجز "مرزائیت نوازی" اور الحاد پروری کے اور سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بالآخر وہی ہوا کہ چور کو داڑھی کا تنکا نظر آنے لگا۔ اور مرزائیوں نے اور کسی حد تک منکرین حدیث پرویزیوں نے حکومت کے اختیار کردہ موقف پر خوشی اور مسرت کا طوفان اٹھایا۔ آج ان لوگوں کے پریس پر سطحی نظر ڈال کر بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

لیکن اس مطالبہ پر مرزائی جتنے بھی سیخ پا ہوں گے اور پرویزی یا منکر خدا و رسول کمیونسٹ جتنی ناگواری ظاہر کریں گے اتنی ہی اس مطالبہ کی معقولیت اور گہرائی و دوررسی ظاہر ہوتی چلی جائے گی جس سے اسمبلی کے حزب اقتدار نے محترم وزیر اطلاعات کی قیادت میں علماء کے باہمی اختلاف کی آڑ میں فرار اختیار کرنا چاہا، مگر علماء کی متفقہ پیش کردہ تعریف نے آئینی کمیٹی کے لئے یہ راستہ بھی مسدود کر دیا ہے۔[۱]

تعجب تو مرزائی گروہ پر ہے جو ایسے مطالبات کو مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی سمجھ رہا

---

[۱] قومی اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں مولانا کوثر نیازی نے اختلاف علماء کی آڑ میں تعریف مسلم کے مطالبہ کو ٹالنا چاہا مگر علمائے کرام نے اپنے متفقہ موقف سے اس چیلنج کا جواب دے دیا اور اسی اجلاس میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے تمام علماء اراکین اسمبلی کی تائید و تصویب سے مسلمانوں کی متفقہ تعریف پیش کر دی جسے بعد میں آئین کا عنصر بنا لیا گیا اور جو قادیانیوں کے سلسلہ میں ان حضرات کی پہلی دستوری فتح تھی۔ "س"

ہے جب کہ اس گروہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے اسلام کے قلعۂ اتحاد ختم نبوت میں شگاف ڈالنے کی لگاتار سعی کی اور مسلمانوں میں اختلاف وانتشار اور نفاق کا بیج ڈالنے کے لئے ایک مستقل مذہب کھڑا کر دیا۔ اسلام اور کفر کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے پر یہ لوگ چلّا رہے ہیں۔ جبکہ ان کے پیر و مرشد متنبّی کذاب قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کو قطعی کافر، مستوجبِ جہنمی اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا، خواہ کسی نے اس کا نام تک بھی نہ سنا ہو مگر وہ اولئك هم الكافرون حقاً کا مصداق بنا ہوا ہے۔ نہ ماننے والے تمام عالمِ اسلام سے معاشرتی اور ازدواجی تعلقات قائم کرانا حرام سمجھتا ہو اور جو لوگ اس "جرم انکار" بانیٔ پاکستان مسٹر جناح کو بھی مستحقِ جنازہ و دعا نہ سمجھتے ہوں، جو گروہ اپنے دائرہ میں اپنے پیروؤں کے لئے ایک مستقل دین، مذہب اور انفرادی و امتیازی خصوصیات اور تشخصات کا طلبگار رہا ہو۔ (ملاحظہ ہو مرزا قادیانی اور ان کے خلفاء وغیرہ کی تصانیف رسائل الفضل، آئینۂ صداقت، کلمۃ الفصل وغیرہ مرزائی لٹریچر)

ستم بالائے ستم مرزائیوں کے لاہوری ٹولے پر ہے جو آج اس واویلا میں قادیانیوں کا ہمنوا ہے۔ اگر وہ صرف کلمہ کہنے کو اسلام کا سرٹیفکیٹ سمجھتا ہے تو پھر وہ کس بنیاد پر قادیانیوں کو کافر قرار دیتا ہے اور قادیانی انہیں کیوں دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

اس وقت مرزائیت کا فتنہ جس انداز میں مسلمانوں اور بقایا پاکستان کے لئے خطرہ کا الارم بنا ہوا ہے۔ اس شجرۂ خبیثہ کے ہاتھوں مستقبل میں جو خطرات پاکستان کو در پیش آ سکتے ہیں ہم اس پر بہت کچھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں بہت سے درونِ خانہ اسرار و رموز کا علم ہے۔ اگر خدا نے اس بے بس ملک پر خاص نگاہِ کرم نہ فرمائی تو سازشوں کے شکار ہونے کا خطرہ یقین سے بدل سکتا ہے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے ہم دن بدن ان لوگوں کے رہینِ منت

بنتے جا رہے ہیں جو عقیدتاً جہاد کو حرام سمجھتے اور اس ملک کے باشندوں کو قطعی کافر سمجھتے ہیں ۔ اقتصادیات میں ان کے عمل دخل کے نتیجہ میں ملک دو ٹکڑے ہوا۔ ایم ایم احمد ہی کی وجہ سے دونوں صوبوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی رہی۔ معاشی لحاظ سے ملک کا دیوالیہ ہوا۔

سیاسی عیاریوں کی یہ حالت کہ ایک طرف استعماری اور سامراجی اغراض کی خاطر ہمیں کاسۂ گدائی لے کر یورپ کی دریوزہ گری پر مجبور کر دیا گیا، ملک پر اربوں روپے کا بوجھ لدتا چلا گیا۔ دوسری طرف چینی سفیر بذاتِ خود ربوہ کی یاترا کرنے جا رہا ہے، روس کا فرسٹ سیکریٹری خفیہ طور پر ربوہ جا چکا ہے۔ خفیہ سے خفیہ مذاکرات ہو رہے ہیں۔ مگر پریس میں نہ تو اس بارہ میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے، نہ مرزائی اسے مصلحتاً ظاہر کرنے دیتے ہیں جبکہ چین آزادی اور حریت کا دعویدار ہے اور ربوہ سامراجی اور صیہونی سازشوں کا اڈہ۔ باخبر لوگ اس اجتماعِ ضدّین پر محوِ حیرت ہیں۔ کیا یہ سب کچھ زیرِ زمین کسی سازش کی غمازی نہیں کرتا؟ حکومت ان سب باتوں سے باخبر ہوگی مگر نوٹس تو کیا باہمی عہد و پیمان جیسا سلوک ہے۔ کہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے ارکان مرزائیت کو کفر سے بچانے کے لئے اسمبلی میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا چلے ہیں۔ ادھر مرزائی کن کن طریقوں سے اس احسان کا صلہ چکا ئیں گے ۔ ؟ اخبارات میں آ چکا ہے کہ لائل پور کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کے افضل رندھاوا کے حق میں " بوگس ووٹ " بھگتانے کے لئے ربوہ سے بھاری تعداد میں عورتیں آئی تھیں (جنگ یکم جون ۱۹۷۲ء) ان عورتوں کو ایک عورت کے مقابلہ میں پی پی پی کے نمائندہ سے دلچسپی تھی تو کیوں ؟ یہ سب باتیں قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں۔ اور ملّتِ مسلمہ کے شجرۂ طوبیٰ کے لئے یہ اکاس بیل دن بدن خطرۂ ہلاکت بنتا جا رہا ہے ایسے حالات میں اگر اسلام اور کفر کے درمیان

حدِ فاصل کھینچنے کے لئے آئین میں "مسلم" کی واضح حیثیت ظاہر کرانے پر زور دیا جائے تو آئینی کمیٹی اور پورے ایوان کو بجائے مخالفت کے اس ملک کے مفاد میں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے، مرزائیت اور اسلام کے الگ الگ تشخص آج کا مسئلہ نہیں ہمارے نقاد و بصیر مفکرؒ علامہ اقبالؒ نے اس وقت بھی ان خطرات کو محسوس کر کے واضح طور پر مسلمان کی تعریف پر زور دیا تھا جب کہ اس کی ہلاکت آفرینی اس حد تک نہیں پہنچی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:۔

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کی حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیاءؑ پر ایمان اور رسول کریمؐ کی ختم نبوت پر ایمان ——— دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔
(حرف اقبال ص ۱۳۶)

اس دجل وتلبیس اور ملت کو اضطرابی کیفیت اور ارتیاب ونفاق کے خطرات سے نکالنے کا علاج بھی علامہ اقبالؒ نے ہی بتلا دیا تھا کہ:۔

"میرے سامنے قادیانیوں کے لئے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا کہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔" (حرف اقبال ص ۱۳۷)

یہ مفادات اسی سے وابستہ ہیں کہ مرزائیت اسلام کے لئے دام ہمرنگِ زمین بن کر مارِ آستین

بنا رہے۔ پھر کیا وہ اپنے الگ تشخص اور کسی انفرادی امتیاز کو قبول کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہیں علامہ اقبالؒ نے کتنی حقیقت بینی کا ثبوت دیا کہ:۔

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویّہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانی تحریک نے ملّتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلّدین کو ملّتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار اپنی جماعت کا نیا نام مسلمانوں کے قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ تمام دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیٰحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے، کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں مگر وہ ہندوؤں کے مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔" (حرف اقبال ص۱۳۷)

اس علیٰحدگی اور مقاطعہ و متارکہ کے باوجود مرزائی ہم سے رواداری اور حسنِ ظن کی امید رکھتے ہیں۔ وہ تو ہمیں کافر سمجھیں مگر ادھر سے اسلام کی تعریف کا مطالبہ بھی تفرقہ انگیزی اور شر پسندی ہو، ان دو طرفہ مفادات کی آخر وہ ملّتِ مسلمہ سے کس بنیاد پر توقع رکھتی ہے؟ کیا اس وجہ سے کہ اس نے مسلمانوں کی آبروئے دنیا و دین متاعِ اوّلین و آخرین روحِ کائنات سرورِ عالمین خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے ردائے ختمِ نبوت اور خلعتِ ختم المرسلین پر ڈاکہ ڈالا اور ملّتِ مسلمہ کی غیرتِ ایمانی کو مجروح کیا۔ کیا کسی ملّت کے قلعہ وحدت کو پاش پاش کرنے کی جراٗت کا اتنی فراخدلی سے صلہ دیا جا سکتا ہے جس کی مرزائیت ہم سے طلبگار ہے اور کیا حصارِ اسلام میں پے در پے نقب لگانے کے بعد بھی مرزائیت مسلمانوں کی کسی حکومت کی اتنی کرم فرمائیوں کی مستحق ہو سکتی ہے۔ کہنے کو تو بہت کچھ

ہے مگر اپنے بعض کرم فرماؤں کی آزردہ دلی کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج کی یہ تقریب اقبال ؒ
ہی کے الفاظ پر ختم کر کے دوسری فرصت پر اٹھانا چاہتے ہیں۔
"میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل
نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ
قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ
کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب
کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں کہ چوتھی
جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا
سکے حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبے
کا انتظار نہ کیا اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبے کا کیوں انتظار
کر رہی ہے۔" (حرف اقبال ص ۱۳۸) (بجون ۲۰ء)

كتاب الكراهية والاباحة

"لباس التقوى ذلك خير"

باب الاکل والشرب

(کھانے پینے کے آداب و احکام)

کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونے میں کس کو مقدم کیا جائے؟

سوال: کم عمر اور عمر رسیدہ لوگ اکٹھے کھانا کھا رہے ہوں تو کھانا شروع کرنے سے قبل ہاتھ دھونے میں کس کو پہلے موقع دیا جائے گا؟

الجواب: کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونا مسنون طریقہ ہے، چونکہ احادیثِ نبوی میں بچوں اور اپنے سے چھوٹوں پر شفقت اور محبت سے پیش آنے کا حکم آیا ہے، علاوہ ازیں بچے اکثر کھانے پینے کے زیادہ حریص اور مشتاق ہوتے ہیں اس لیے کھانا کھانے سے قبل پہلے بچوں کو ہاتھ دھونے کا موقع دیا جائے اس کے بعد عمر رسیدہ بزرگوں کو موقع دیا جائے، اور کھانا کھانے کے بعد بزرگوں کا اکرام مدنظر رکھتے ہوئے پہلے انہیں موقع دیا جائے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وفی واقعات الناطفی الادب فی غسل الایدی قبل الطعام ان یبدأ بالشبان ثم بالشیوخ۔

(البحر الرائق ج۸ ص۱۸۳ کتاب الکراھیۃ) [1]

کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونا

سوال: بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونے کی بجائے صرف انگلیاں دھونے پر اکتفاء کرتے ہیں، تو کیا صرف انگلیاں دھونے سے سنت ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

---

[1] لما فی الہندیۃ: وآداب غسل الایدی قبل الطعام ان یبدأ بالشبان ثم بالشیوخ وبعد الطعام علی العکس۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۵ ص۳۳۷ الباب الحادی عشر فی الکراھیۃ فی الاکل)

ومثلہٗ فی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۴۰۵ کتاب الحظر والاباحۃ۔

الجواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھ دھویا کرتے تھے، اب اگر کوئی شخص کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونے کی بجائے صرف انگلیاں دھولے تو بلاشبہ اس سے صفائی تو حاصل ہو جائے گی لیکن سُنت ادا نہیں ہوگی، سُنت کی ادائیگی کے لیے پورے ہاتھوں کا دھونا ضروری ہے جبکہ انگلیاں دھونا ہاتھ دھونا نہیں ہے۔

لما فی الهندية: قال نجم الائمة البخاری وغیرہ غسل الید الواحدة او اصابع الیدین لا یکفی للسنة غسل الیدین قبل الطعام *۔ (الفتاوی الهندية ج۵ ص۳۳۷ الباب الحادی عشر فی الکراهية فی الاکل) [1]

* لان المذکور غسل الیدین وذلک الرسغ۔

دسترخوان پر روٹی رکھ کر سالن کا انتظار کرنا

سوال: اگر دسترخوان پر روٹی حاضر ہو لیکن تا حال سالن نہیں لایا گیا ہو تو روٹی کھانا شروع کی جائے یا سالن کا انتظار کیا جائے؟

الجواب: روٹی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے جس کا اکرام ضروری ہے، فقہاء نے تصریح کی ہے کہ روٹی حاضر ہونے کی صورت میں سالن کے انتظار میں نہ بیٹھے بلکہ روٹی کے اکرام کے پیش نظر روٹی کھانا شروع کی جائے جب سالن حاضر ہو تو وہ بھی استعمال کر لیا جائے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: و ینبغی ان لا ینتظر الادام اذا حضر الخبز ویاخذ فی الاکل قبل ان یأتی الادام۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۳ کتاب الکراهية) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ویستحب غسل الیدین قبل الطعام فان فیه برکة وفی البرهانية والسنة ان یغسل الایدی قبل الطعام وبعدہ۔
(البحر الرائق ج۸ ص۱۸۳ کتاب الکراهية. فصل فی الاکل والشرب)

[2] لما قال فی الهندية: ومن اکرام الخبز ان لا ینتظر الادام اذا حضر۔ کذا فی الاختیار فی شرح المختار۔ (الفتاوی الهندية ج۵ ص۳۳۷ الباب الحادی عشر فی الکراهية فی الاکل)
ومِثلُہٗ فی البزازية علی هامش الهندية ج۶ ص۳۶۵ کتاب الکراهية۔

کھڑے ہو کر کھانا پینا مکروہ ہے

سوال:۔ آجکل لوگوں میں کھڑے ہو کر کھانے پینے کا رواج عام ہو چکا ہے، خصوصاً شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بھی کھڑے ہو کر کھانا کھایا جاتا ہے، کیا کھڑے ہو کر کھانا پینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہمارا موجودہ معاشرہ چونکہ مغرب سے زیادہ متاثر ہے اس لیے مغرب ہی کے عادات و اطوار ہم نے اپنا رکھے ہیں، کھڑے ہو کر کھانا پینا مغربی اقوام کا طریقہ ہے جو کہ سنت اور ادب کے خلاف ہے، تاہم فقہاء نے کھڑے ہو کر کھانے کو مکروہ تنزیہی کے درجہ میں ذکر کیا ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن قتادة عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ نھی ان یشرب قائماً فقلنا الاکل فقال ذاك اشر و اخبث۔

(الصحیح المسلم ج۲ ص۱۷۳ باب فی الشرب قائماً)[1]

کھانا کھاتے وقت خاموشی کا حکم

سوال:۔ کھانا کھاتے وقت باتیں کرنا جائز ہے یا سکوت کرنا بہتر ہے؟ مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا افضل ہے یا اس کے خلاف کیا جائے؟

الجواب:۔ کھانا کھاتے وقت خاموش رہنے کو فقہاء کرام نے مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کی عادت ہے، اس لیے اچھی اور دینی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کھانا کھایا جائے۔ میزبان کے لیے مہمان کی مہمان نوازی اور عزت افزائی ضروری ہے، لہٰذا اگر مہمان ساتھ بیٹھ کر کھانے پر خوش ہوتا ہو تو ساتھ کھانا افضل ہے ورنہ مہمان کی ذاتی طور پر خدمت کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

لما فی الهندیة: یکرہ السکوت حالة الاکل لانہ تشبہ بالمجوس...... ولا یسکت

---

[1] قال الامام محی الدین یحیٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ: لیس فی ھٰذہٖ الاحادیث اشکال ولا فیھا بحمد اللہ ضعف بل کلھا صحیحة والصواب ان النھی محمول علی التنزیھة۔ (شرح المسلم للامام النووی ج۲ ص۱۷۳ باب فی الشرب قائماً) ومثلہٗ فی کبیری ص۳۶ آداب الوضوء۔

علی الطعام ولکن یتکلم بالمعروف وحکایات الصالحین ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۵ الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات) [1]

تکیہ لگا کر کھانا پینا

سوال:۔ بعض لوگ تکیہ لگا کر کھانے پینے کے عادی ہوتے ہیں، آیا تکیہ لگا کر کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کھانے پینے کے دوران اگر مسنون طریقہ مدنظر رکھا جائے تو ضرورت بھی پوری ہوگی اور ثواب بھی مل جائے گا۔ جہاں تک تکیہ لگا کر کھانے پینے کا تعلق ہے تو فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر تکبر کا خدشہ نہ ہو تو تکیہ لگا کر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم خلافِ ادب ہونے کی بناء پر اس طرح کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما فی الهندیة: لا بأس بالأکل متکئاً اذا لم یکن بالتکبر وفی الظهریة هو المختار۔
(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۳۷ الباب العاشر فی الکراهیة فی الاکل) [2]

تین انگلیوں سے کھانا

سوال:۔ بعض لوگ کھانا کھاتے وقت ہاتھ کی پانچوں انگلیاں استعمال کرتے ہیں، تو کیا اس طریقے سے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تین انگلیوں سے کھانے کی تھی لہٰذا تین انگلیوں سے کھانا مسنون طریقہ ہے، البتہ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ جہاں کہیں تین انگلیوں سے کھانے میں حرج ہو تکلیف کی وجہ سے یا سالن نرم ہونے کی وجہ سے، تو کھانے میں تین سے زائد انگلیاں استعمال کرنا بھی مرخص ہے۔

---

[1] لما فی الهندیة: وینبغی ان یخدم الضیف بنفسه اقتداءً بابراهیم علیٰ نبینا وعلیه السلام۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۵ الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات۔ کتاب الکراهیة)۔

[2] قال العلامة ابن عابدین: لا بأس بالاکل متکئاً او مکشوف الرأس وهو المختار۔
(رد المحتار ج ۶ ص ۳۴۰ کتاب الکراهیة۔ فصل فی البیع)
وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج ۲ ص ۴۰۵ کتاب الحظر والاباحة۔

لما ورد فی الحدیث : عن کعب بن مالک عن ابیہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأکل بثلاث اصابع ۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۱۷۵ باب لعق الاصابع والقصعۃ الخ)

ایک سے زیادہ گلاس پانی پینے کا مسنون طریقہ

سوال :- جناب مفتی صاحب! گرمی کے موسم میں پیاس کی شدت کے باعث انسان ایک ہی وقت میں کئی گلاس پانی پی جاتا ہے ، تو کیا ایسی صورت میں ہر گلاس کو تین سانسوں میں پینا ہوگا یا ہر گلاس کے بعد ایک مرتبہ سانس لینا کافی ہوگا اور اس سے سنت کی ادائیگی ہوجائے گی یا نہیں ؟

الجواب :- مسنون طریقہ یہ ہے کہ پانی کو تین سانسوں میں پیا جائے صورتِ مسئولہ میں چونکہ ہر گلاس مستقل پانی پینا ہے اس لیے ہر گلاس کو تین سانسوں میں پینے سے ہی سنت کی ادائیگی ہوگی ۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ : ہر گلاس کو تین سانس میں پیوے کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرا تیسرا گلاس کچھ فصل سے پیوے تو وہ مجموعی طور پر کئی بار کا پینا ہوگا اور سانس لینا ایک بار کے پینے میں ہے ۔ (امداد الفتاوی ج۴ ص۱۰۳ کتاب الحظر والاباحۃ ۔ کھانے پینے کی حلال وحرام الخ)

سود خور کی دعوت قبول کرنا

سوال :- ایک شخص گاڑیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا ہے اور سودی لین دین کے علاوہ بعض اوقات دیگر ناجائز ذرائع سے بھی مال حاصل کرتا ہے ، تو کیا ایسے شخص کی دعوت میں شرکت جائز ہے یا نہیں ؟

لہ قال الامام النووی رحمہ اللہ : واستحباب الاکل بثلاث اصابع ولا یضم الیہ الرابعۃ والخامسۃ الا لعذر بان یکون مرقًا وغیرہ فلا یمکن بثلاث وغیر ذلک من الاعذار ۔

{شرح صحیح المسلم للامام النووی ج۲ ص۱۷۵ باب لعق الاصابع والقصعۃ}

الجواب :۔ اگر یہ بات واضح اور یقینی ہو کہ اس شخص کا پورا مال حرام اور ناجائز ذرائع سے کمایا گیا ہے تو دعوت میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے، البتہ اگر یہ بات یقینی نہ ہو یا یہ معلوم ہو کہ اس شخص کا کچھ مال تو حرام ہے لیکن مال کا اکثر حصہ حلال ہے تو پھر شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ موجودہ دور میں اکثر لوگوں کے مال میں کچھ نہ کچھ ملاوٹ پائی جاتی ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: وان کان غالب المهدی من الحلال لا بأس بان یقبل الهدیة ویأکل مالم یتبین انه حرام لان اموال الناس لا یخلوا عن قلیل حرام فیعتبر الغالب۔
(الفتاوی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۰۲ کتاب الحظر والاباحة)[۱]

جس دعوت میں گانے بجانے اور لہو ولعب کا اہتمام ہو اس میں شرکت کا حکم

سوال :۔ بعض لوگ شادی بیاہ کے مواقع پر دعوتِ ولیمہ میں گانے بجانے اور لہو و لعب کا پورا اہتمام کرتے ہیں جس میں احباب و اقارب کو مدعو کیا جاتا ہے، تو کیا ایسی دعوتِ ولیمہ میں شرکت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ قبولِ دعوت کو علماء کرام نے ضروری قرار دیا ہے، لیکن آجکل چونکہ لادینیت اور فحاشی کا دور دورہ ہے لہٰذا اگر یہ بات یقینی ہو کہ وہاں گانے بجانے اور لہو ولعب کا پروگرام ہوگا تو ایسی دعوت میں نہیں جانا چاہیئے، البتہ اگر وہاں پہنچکر یہ بات معلوم ہو تو واپس نہ آنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یاد رہے کہ یہ حکم عوام الناس کے لیے ہے اور جہاں تک خواص کے واپس آجانے کا تعلق ہے تو ان کے واپس آنے میں مصلحت یہ ہے کہ الداعی پر ان کی ناراضگی واضح ہو کر وہ اپنے عملِ بد سے باز آجائیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: اذا کان هناك لعب وغنا قبل ان یحضر فلا یحضر

---

[۱] لما فی الهندیة: ولا یجوز قبول هدیة امراء الجور لان الغالب فی مالهم الحرمة الا اذا علم ان اکثر ماله حلال بان کان صاحب زرع او تجارة فلا بأس به لان اموال الناس لا تخلوا عن قلیل حرام فیعتبر الغالب وکذا اکل طعامهم۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۴۲ الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات۔ کتاب الکراهیة)

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۶۰ الباب الرابع فی الهدایا والمیراث۔

لانہ لایلزمہ الاجابۃ اذاکان ھناك منکر۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۸۸ کتاب الکراھیۃ) ؎۱

چونا کھانے کا حکم

سوال:۔ پان، نسوار وغیرہ میں چونا ملایا جاتا ہے، اس کے کھانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ چونا بمقدار ضرورت پان وغیرہ میں ملاکر کھانا مرخص ہے۔

لما قال العلامۃ محمد عبدالحی اللکھنویؒ: یباح اکل النورۃ مع الورق الماکول فی دیار الھند لانہ قلیل نافع فان الغرض المطلوب من الورق المذکور لا یحصل بدونھا۔ (نصاب الاحتساب بحوالہ مجموعۃ الفتاوی ج ۲ ص۳۰۸) ؎۲

افیون کھانے کا حکم

سوال:۔ افیون کھانا اور ادویات میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افیون مسکر اشیاء میں سے ہے جس کا بغیر عذر شدید کے کھانا حرام ہے تاہم اگر مباح وحلال اشیاء ادویات میں کوئی تداوی کے لیے مفید نہ ہو اور مسلمان طبیب نے بطور دوائی کے کھانے کا کہا ہو تو اس صورت میں کھانا مرخص ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: اتفق مشائخنا ومشائخ الشافعی علی تحریم الحشیش وافتوا باحراقہ وامروا بتادیب بائعہ والتشدید علی اکلہ فھو زندیق مبتدع۔ (الفتاوی الکاملیۃ ص۲۰۷)

وفی الھندیۃ: یجوز للتعلیل شرب الدم والبول واکل اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات) ؎۳

؎۱ لما فی الھندیۃ: ھذا اکلہ بعد الحضور واما اذا علم قبل الحضور فلا یحضر لانہ یلزمہ حق الدعوۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۴۳ الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)

ومثلہٗ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۳۶۴ کتاب الکراھیۃ۔

؎۲ قال العلامۃ عبدالحی اللکھنویؒ: نعم وفی نصاب الاحتساب یباح اکل النورۃ مع الورق الماکول فی دیار الھند لانہٗ قلیل نافع فان الغرض المطلوب من الورق المذکور لا یحصل بدونھا وھو الحمرۃ۔ (نفع المفتی والسائل ص۹۳ کتاب الکراھیۃ)

؎۳ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ والتتن الذی حدث) وھو صریح فی حرمۃ البنج والافیون لا للدواء۔ (رد المحتار ج ۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربۃ)

ومثلہٗ فی نصاب الاحتساب بحوالہ مجموعۃ الفتاوی ج ۲ ص۲۸۹ کتاب الکراھیۃ۔

پیاز وغیرہ کھاکر مسجد میں جانا | **سوال:** پیاز، لہسن اور دیگر بدبودار حلال اشیاء کھاکر مسجد میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: پیاز، لہسن وغیرہ اشیاء کا کھانا فی ذاتہ جائز اور مباح ہے تاہم مساجد اور ایسی مجالس جن میں خلقِ خدا کو ایذاء پہنچنے کا خدشہ ہو کھاکر جانا جائز نہیں۔

لما قال الشیخ فضل اللہ الشهیر بشبیر احمد العثمانیؒ: تحت قولہ صلی اللہ علیہ وسلم من اکل من هٰذہ الشجرة یعنی الثوم فلا یأتین المساجد، لیس فی هٰذا تقیید النهی بالمساجد فیعتدل بعمومه علی الحاق المجامع بالمساجد کمصلی العید والجنازة ومکان الولیمة وجمهور الامة علی اباحة اکلها۔ (فتح الملهم ج۲ ص۱۵۰،۱۵۱ باب نهی من اکل ثوماً)[1]

بھنگ کا استعمال کا حکم | **سوال:** بھنگ کا استعمال بطورِ نشہ اور تداوی کے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بھنگ کا شمار چونکہ مسکر اشیاء میں ہوتا ہے اس لیے اس کا استعمال شرعاً ممنوع ہے، تاہم بوقتِ ضرورت کسی مسلمان طبیب کے مشورہ سے بقدرِ ضرورت استعمال مرخص ہے بشرطیکہ حلال اشیاء میں معالجے کے لیے کوئی شے نہ ہو۔

لما قال شیخ الاسلام ابوبکر علی بن محمد الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذٰلک کلهٗ حرامٌ۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۷۵ کتاب الاشربة)[2]

---

[1] رواہ الامام مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن ابی سعید الخدریؓ قال لم نعد ان فتحت خیبر فوقعنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی تلک البقلة الثوم والناس جیاع فاکلنا منها اکلاً شدیداً ثم رحنا الی المسجد فوجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الریح من اکل من هٰذہ الشجرة الخبیثة شیئاً فلا یقربنا فی المسجد فقال الناس حرمت فبلغ ذٰلک النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ایها الناس انهٗ لیس بی تحریم ما احل اللہ لی ولکنها شجرة اکرہ ریحها۔

(الصحیح المسلم ج۱ ص۲۰۹ باب نهی من اکل ثوماً الخ)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مسلم للنوویؒ ج۱ ص۲۰۹ باب نهی من اکل ثوماً۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: وهو صریح فی حرمة البنج والافیون لا للدواء۔ (ردالمحتار ج۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربة)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۲۰۵ کتاب الاشربة۔

بغیر اجازت کسی کے مال سے نفع لینا

سوال: کسی مسلمان کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسلمان کا مال جان شرعاً معصوم ہے اور بغیر مالک کی اجازت کے لینا جائز نہیں اور نہ اس مال سے بغیر اجازت کے نفع اٹھانا جائز ہے۔

لما رواه الامام علی بن عمر الدارقطنیؒ: عن عمرو بن یثربی قال شهدت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی حجة الوداع بمنیٰ فسمعته یقول لایحل لامرءٍ من مال اخیه شئٌ الّا ماطابت به نفسه۔ (سنن دارقطنی ج۳ ص۲۵ کتاب البیوع۔ رقم حدیث ۸۹) [1]

کافر کے ساتھ کھانے کا حکم

سوال: کیا کسی غیر مسلم کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے کو معمول بنانا درست نہیں تاہم کبھی کبھار ایسا کر لینا مرخص ہے۔

لماقال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: والاکل والشرب فی اوانی المشرکین مکروه ولا بأس بطعام المجوس الّا ذبیحتهم وفی الاکل معهم وعن الحاکم عبدالرحمٰن لو ابتلی به المسلم مرة او مرتین لا بأس به اما الدوام علیه فمکروه۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة) [2]

---

[1] لما ذکره الشیخ ولی الدین ابوعبد الله محمد بن عبد الله الخطیبؒ: وعن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الا لاتظلموا الا لا یحل مال امرء الا بطیبِ نفس منه۔ (مشکوٰة المصابیح ج۱ ص۲۵۵ باب الغصب والعاریة، الفصل الاوّل)

وَمِثْلُهٗ فی نصب الرایة ج۴ ص۱۶۹ کتاب الغصب۔

[2] وفی الهندیة: الأکل مع المجوس ومع غیره من اهل الشرك انه هل یحل ام لا عن الحاکم عبدالرحمٰن الکاتب أنه ان ابتلی به المسلم مرّة او مرّتین فلا بأس به واما الدوام علیه فیکره۔ (الفتاوىٰ الهندیة ج۵ ص۳۴۷ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة.... الخ)۔

خلافِ شریعت دعوت میں شرکت کا حکم

سوال :۔ آجکل شادی بیاہ اور خوشی کی دیگر تقریبات میں اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور طور طریقوں کے خلاف کیا جاتا ہے جن میں غیر محرم مردوں اور عورتوں کا بے پردگی میں میل جول، ناچ گانا، ہندوؤں اور عیسائیوں کے مختلف طور طریقے قابلِ ذکر ہیں۔ اگر کسی کو ان خلافِ شرع کاموں سے روکا جائے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو خوشی کا موقع ہے اس کے بغیر تو خوشی کا اظہار ہی نہیں ہو سکتا۔ جبکہ بعض اہلِ علم اور دیندار طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اس قسم کی تقاریب میں شرکت کرتے دیکھا گیا ہے جس کی وجہ سے لوگ ان لغویات کو جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ کام ناجائز ہیں تو فلاں عالم یا دیندار شخص نے کیوں شرکت کی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کی تقاریب میں شرکت کرنا خصوصاً علماء اور دیندار طبقہ کا شرکت کرنا اور کھانا پینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اس طرح کی تقریبات میں شرکت کرنا ناجائز ہے اور جہاں احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی ہو رہی ہو اور منکرات موجود ہوں وہاں اکل و شرب یعنی کھانا پینا بھی ناجائز ہے۔ اسی طرح اس قسم کی تقریبات میں کسی عالم یا دیندار شخص کی شرکت کی بناء پر کوئی خلافِ شرع کام جائز نہیں ہو سکتا۔

قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ، دعی الی ولیمة وثمه لعب او غنا قعد واکل لو للمنکر فی المنزل فلو علی المائدة لاینبغی ان یقعد بل یخرج معرضًا الیٰ قوله فان قدر علی المنع فعل والا صبر ان لم یکن ممن یقتدیٰ به فان کان مقتدی و لم یقدر علی المنع خرج ولم یقعد لان فیه شین الدین الخ (الدر المختار ج۵ ص۲۲۵ کتاب الحظر والاباحة) [1]

---

[1] وفی الهندیة : ومن دعی الیٰ ولیمة فوجد ثمه لعبا او غناء..... ولو کان ذلك علی المائدة لاینبغی ان یقعد وان لم یکن مقتدیٰ به وهذا کله بعد الحضور واما اذا علم قبل الحضور فلا یحضر الخ

{الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۴۳ کتاب الکراهیة الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات}

باب التداوی

(علاج معالجہ کے احکام ومسائل)

انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا حکم

سوال :۔ دورِ حاضر میں انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا دور دورہ ہے، کئی لوگ وصیت کرجاتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کے کچھ اعضاء مثلاً آنکھیں، گُردے وغیرہ نکال کر کسی ضرورتمند کو لگا دیئے جائیں، تو کیا شریعتِ مقدسہ میں انسانی اعضاء کی پیوندکاری جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اپنے اعضاء کو معالجتاً استعمال کرنے کیلئے دوسرے انسان کیلئے وصیت کرنا اور ان اعضاء کی پیوندکاری کرنا شرعاً حرام ہے، اگرچہ یہ وباء آجکل کافی عروج پر ہے جس سے اجتناب لازمی ہے، تاہم متاخرین فقہاء نے حالتِ اضطرارِ شدیدہ کے وقت مرخص قرار دیا ہے۔

لما قال الامام محمد بن احمد السرخسیؒ :لایجوز الانتفاع به بحال ما والآدمی محترم بعد موته علیٰ ما کان علیه فی حیاته کما یحرم التداوی بشئ من الآدمی الحی اکراماً له کذٰلک لایجوز التداوی بعظم المیت۔ (شرح کتاب السیر الکبیر ج ۱ ص ۱۲۸ باب دواء الجراحة) [1]

انگریزی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال :۔ دورِ حاضر میں اکثر امراض میں انگریزی ادویات استعمال ہوتی ہیں جن میں الکحل بھی استعمال ہوتا ہے، شرعی نکتہ نگاہ سے ان ادویات کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ انگریزی ادویات کے بارے میں متاخرین علماء کرام کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ان میں شراب یا دیگر محرم اشیاء کا استعمال یقینی یا ظنِ غالب سے ثابت ہو تو بغیر

---

[1] قال العلامة علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو سقط سنه یکره أن یاخذ سن المیت فیشدها مکان الاولیٰ بالاجماع۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص ۱۳۲ کتاب الاستحسان)

ومثله فی الهندية ج ۵ ص ۳۵۴ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات الخ۔

شدید ضرورت کے استعمال کرنا درست نہیں ، ویسے انگریزی ادویات کا استعمال مرخص ہے ۔

لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ : وکرہ شرب دردی الخمر والامتشاط به لان فیه اجزاء الخمر فکان حراماً نجساً والانتفاع بمثله حرام۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۴۹ کتاب الاشربة) ۱؎

پوسٹ مارٹم کا حکم

سوال :۔ عصر حاضر میں اگر کوئی قتل ہو جائے یا کسی حادثہ میں ہلاک ہو جائے تو ہسپتال میں اس کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے جس میں اعضاء کی قطع برید ہوتی ہے ، تو شریعت مقدسہ میں اس عمل کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ جس طرح انسان کا احترام اس کی زندگی میں مسلّم ہے اسی طرح موت کے بعد بھی قابل احترام ہے ، جس طرح زندہ انسان کو ایذاء دینا موجب جرم وگناہ ہے اسی طرح مردہ انسان کو بھی ایذاء دینا موجب جرم وگناہ ہے اس لیے فقہاء کرام نے بعد الموت انسانی اعضاء کی قطع برید کو خلاف شرع قرار دے کر پوسٹ مارٹم کو ایک قبیح وناجائز عمل کہا ہے ۔

لما قال الباجیؒ : یرید ان له من الحرمة فی حال موته مثل ماله منها حال حیاته وان کسر عظامه حال موته یحرم کما یحرم کسرها حال حیاته (موطا امام مالک حاشیہ ۳ ص۲۲۰ ما جاء فی الاختفاء وهو النبش) ۲؎

۱؎ قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : (وکره شرب دردی الخمر) ای (والامتشاط) بالدردی لان فیه اجزاء الخمر وقلیله ککثیره کما مر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربة)

ومثله فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربة ۔

۲؎ رواه الامام ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ : عن عائشةؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال کسر عظم المیت ککسره حیاً ۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۰۱ باب الحفار یجد العظم هل یتنکب ذلك المکان)

ومثله فی سنن ابی ماجه مع حاشیة ج ۱ ص۱۱۶ باب ما جاء فیمن مات مریضاً ۔

خاندانی منصوبہ بندی اور مانع حمل ادویات کا حکم

سوال:۔ آجکل کے دور میں خاندانی منصوبہ بندی کی اشاعت بکثرت ہورہی ہے، شرعی لحاظ سے خاندانی منصوبہ بندی اور مانع حمل ادویات کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خاندانی منصوبہ بندی کے اہداف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں کہ یہ تمامتر پروگرام رزق کی تنگی کے خوف سے ہورہا ہے جو خالقِ کائنات جل مجدہٗ کی صفتِ خاصہ یعنی رزاقیت سے بغاوت کے مترادف ہے، اس لیے منصوبہ بندی کے بنیادی نظریہ (رزق کی تنگی کا خوف) کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس پر عمل کرنا شرعاً حرام ہے، تاہم کسی شرعی عذر کی بناء پر مانع حمل ادویات کا استعمال اور دیگر ذرائع اختیار کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلأ الانصاری رحمه الله: شرب الدواء لأجل إسقاط الحمل قبل ان يصير صورة يجوز عند الضرورة والكف عن هذا خير اولى۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۳ ص۲۱۶ كتاب النكاح الفصل السادس والعشرون)[1]

انجکشن کے ذریعے مادہ جانوروں کو حاملہ کرنے کا حکم

سوال:۔ افزائشِ نسل کے لیے گائے بھینس وغیرہ کو انجکشن لگوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ حیوانات میں نسب کا لحاظ رکھنا شرعی لحاظ سے ضروری نہیں اس لیے کہ ماں جانوروں میں اصل ہے اور بچہ بھی حِلّت وحرمت میں ماں کا

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدين: تحت قوله (ويكره أن تسقى لاسقاط الحمل) وجاز لعذر كالمرضعة اذا ظهر بها الحمل وانقطع لبنها وليس لابي الصبي ما يستأجر به الظئر ويخاف هلاك الولد قالوا يباح لها ان تعالج في استنزال الدم ما دام الحمل مضغة أو علقة ولم يخلق له عضو وقدروا تلك المدة بمائة وعشرين يوماً۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۲۹ كتاب الحظر والاباحة۔ فصل في البيع)
ومِثلُهٗ في الطحطاوي على الدر المختار ج۴ ص۲۱۲ كتاب الحظر والاباحة۔ فصل في البيع۔

تابع ہے، بنابریں جانوروں کو افزائش نسل کے لیے انجکشن لگوانا کوئی قبیح عمل نہیں۔

لما قال الامام الامام السید احمد بن محمد الحموی المصریؒ: والمولود بین الاھلی والوحشی یتبع الأم لان الاصل فی التبعیۃ الأم حتی ان نزی الذئب علی الشاۃ یضحی بالولد۔ (غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر ج ا ص۳۳۷) [1]

بیمار کو خون دینے کا حکم

سوال: بوقت ضرورت کسی بیمار کی جان بچانے کیلئے انسانی خون سے انتفاع کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: بوقتِ ضرورت (حادثہ یا شدید بیماری کی صورت میں) جان بچانے کے لیے انسانی خون سے استفادہ مرخص ہے۔

لما قال العلامۃ الشیخ محمد کامل بن مصطفی الطرابلسی الحنفیؒ: قال فی التھذیب یجوز لعلیل شرب البول والدم والمیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔ (الفتاوی الکاملیۃ ص۲۶۷ کتاب الکراھیۃ) [2]

تعویذ کا شرعی حکم

سوال: دفع ضرر وجلب منفعت کے لیے قرآنی آیات اور ادعیہ ماثورہ سے تعویذ کرکے پہننے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: غیر شرعی الفاظ کے علاوہ آیات قرآنی وادعیہ ماثورہ سے تعویذ کرنے یا کرانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں بلکہ یہ ایک مسنون طریقہ ہے اور پہننا بھی جائز ہے۔

لما قال الامام اللغوی ابوالفتح ناصر الدین المطرزیؒ: قال القتیبی وبعضھم یتوھم أن المعاذات ھی التمائم ولیس کذلک انما التمیمۃ الخرزۃ ولا بأس بالمعاذات

---

[1] لما قال الامام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص رحمہ اللہ: ولو ولدت حمارۃ وحشیۃ من حمار اھلی أکل ولدھا فکان الولد تابعاً لأمہ دون ابیہ۔
(احکام القرآن للجصاص ج۳ ص۵ سورۃ النحل)

[2] لما فی الھندیۃ: یجوز لعلیل شرب البول والدم وأکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۰۵ کتاب الکراھیۃ۔ فصل فی البیع۔

اذاکتب فیھا القرآن او اسماء اللہ تعالیٰ ۔ (المغرب فی ترتیب المعرب ج ا ص۱۰) [۱]

مردہ عورت کے پیٹ سے بچہ نکالنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی حاملہ عورت فوت ہو جائے اور طبی نقطۂ نظر سے اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ابھی زندہ ہے تو کیا اس کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے انتہائی مجبوری کے تحت مردہ عورت کے پیٹ کو چاک کر کے بچہ نکالنے کو مرخص کہا ہے مگر اس شرط پر کہ بچہ پیٹ میں حرکت کر رہا ہو یعنی اس کا زندہ ہونا یقینی ہو، چونکہ موجودہ دور میں سائنسی ترقی کی وجہ سے مذکورہ بالا صورت میں الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بچے کا زندہ ہونا معلوم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جب الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہو جائے کہ بچہ واقعی زندہ ہے تو مردہ عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ کو نکالنا شرعاً مرخص ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: حامل ماتت وولدھا یضطرب شق بطنھا ویخرج ولدھا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۳۸ باب الجنائز ،مطلب فی دفن المیت) [۲]

شوہر کو راغب کرنے کے لیے تعویذات کا سہارا لینا

سوال:۔ بیوی شوہر کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کسی تعویذ کا سہارا لے سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اصلاح بین الزوجین کے لیے عملیات یا دیگر تعویذات کا سہارا لینا شرعاً

---

[۱] لما اخرج ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانیؒ فی سُننه: عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان یعلمھم من الفزع کلمات اعوذ بکلمات اللہ التامة من غضبه وشر عباده ومن ھمزات الشیاطین وان یحضرون وکان عبد اللہ بن عمر یعلمھن من عقل من بنیه ومن لم یعقل کتبه فاعلقه علیه ۔ (سُنن ابی داؤد ج ۲ ص۵۴۳ باب کیف الرقی۔
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج ۶ ص۳۶۳ کتاب الخطر والاباحة ۔فصل فی اللبس ۔

[۲] قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: اس سے معلوم ہوا کہ پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لینا اُس وقت جائز ہے جب بچہ زندہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہو ورنہ اگر بچہ بھی مر گیا تو پیٹ چاک کرنا جائز نہیں ۔
(امداد الفتاویٰ ج ۴ ص۲۰۶ کتاب الخطر والاباحة)

قبیح نہیں بشرطیکہ شوہر کو اپنا غلام بنا نا مقصود نہ ہو بلکہ بے اختلافی سے بچنے کی نیت ہو، تاہم کتبِ فتاویٰ میں جو عدمِ جواز کا فتویٰ موجود ہے وہ غیر شرعی تعویذات وتسخیرات وغیرہ یا دیگر بدنیتی پر محمول ہے۔

لما قال العلامة ابوالفتح ناصرالدین المطرزیؒ: بعضهم يتوهم أن المعاذات هي التمائم وليس كذلك انما التميمة الخرزة ولا بأس بالمعاذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالى...... وأما ماكان من القرآن وشئ من الدعوات فلا بأس۔
(المغرب فی ترتیب المعرب ج ۱ ص ۱۰۷، ۱۰۸) [1]

تعویذات میں یا بدوح لکھنا

سوال: اکثر عاملین تعویذات میں یا بدوح لکھتے ہیں، اس بارے میں بعض علماء سے سُنا ہے کہ یا بُدوح لکھنا درست نہیں، کیا واقعی ایسا لکھنا ناجائز ہے؟

الجواب: بدوح عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور تعویذات میں اسماء اللہ لکھنا جائز ہے لہٰذا تعویذات میں یا بدوح لکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامة المفتی محمد شفیعؒ: احقر نے اپنے استاذِ محترم حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب الکشمیریؒ سے سُنا ہے کہ لفظ "بُدوح" بلا تشدیدِ دال عبرانی زبان میں اللہ کا نام ہے۔ (عزیز الفتاوی المعروف بہ فتاوی دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص ۱۲۹) [2]

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وبعضهم يتوهم أن المعاذات هي التمائم وليس كذلك إنما التميمة الخرزة ولا بأس بالمعاذات إذا كتب فيها القرآن أو اسماء الله تعالى۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۶۳ كتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی اللبس)

ومثله فی نيل الاوطار ج ۵ ص ۳۰۷ باب ماجاء فی الاجرة علی الضرب۔

[2] لما قال العلامة المفتی محمد شفیعؒ: بدوح یہ لفظ عام طور پر بضمِ باء وتشدیدِ دال مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں، صحیح لفظ بدوح بفتحِ باء وتخفیفِ دال ہے تحقیق یہ ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔
(امداد المفتیین المعروف بفتاوی دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۲۳۸ کتاب الکراھیۃ)

غیر شرعی الفاظ سے تعویذات لکھنا | سوال:۔ تعویذات میں غیر شرعی الفاظ مثلاً یا فرعون، یا ہامان وغیرہ لکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تعویذات میں قرآنی آیات وادعیہ ماثورہ کے علاوہ غیر شرعی الفاظ مثلاً جن، بھوت یا کسی بڑے کافر کا نام وغیرہ لکھنا شرعاً ناجائز ہے۔

لما رواه الامام مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن عوف بن مالک الاشجعی قال لنا نرقی فی الجاهلیة فقلنا یا رسول الله کیف تری فی ذلک فقال اعرضوا علیّ رقاکم لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک۔ (الصحیح لمسلم ج۲ ص۲۲۴ باب جواز اخذ الاجرة علی الرقیة) [1]

بیماری کا علاج کرنا سُنت ہے | سوال:۔ بیماری کا علاج کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور اگر کوئی بیمار علاج نہ کرنے پر ہلاک ہو جائے تو کیا وہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ علاج ایک ظاہری سبب ہے اور سُنت عمل ہے تاہم اگر کوئی بیمار اپنا علاج نہ کرنے کی وجہ سے مر جائے تو گنہگار نہیں ہوگا۔

لما قال الامام الفقیه ابو اللیث السمرقندیؒ: ولو مرض ولم یعالج حتی مات لم یأثم بخلاف الجائع اذا لم یأکل حتی مات بالجوع یأثم به۔
(فتاوی نوازل ص۲۰۰ کتاب الکراهیة) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: التمیمة المکروهة ما کان بغیر العربیة۔ وقال العلامة ابن عابدینؒ: (فی قوله التمیمة المکروهة) اقول الذی رأیته فی المجتبی التمیمة المکروهة ما کان بغیر القرآن۔
(رد المحتار ج۶ ص۳۶۳ کتاب الحظر والاباحة فصل فی اللبس)
ومثله فی حاشیة الجامع الترمذی للشیخ احمد علی السهارنفوریؒ ج۲ ص۲۵ باب ما جاء فی الاجرة علی التعویذ)

[2] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: امتنع عن الاکل حتی مات جوعاً اثم وان عن التداوی حتی تلف مرضاً لا لان عدم الهلاک بالاکل مقطوع والشفاء بالمعالجة مظنون۔
(الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۶۶ نوع فی التداوی۔ کتاب الکراهیة)
ومثله فی الاختیار لتعلیل المختار ج۴ ص۱۷۴ کتاب الکراهیة۔

خاندانی منصوبہ بندی کا شریعت مطہرہ کی روشنی میں جائزہ

سوال: مکرمی جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب سلام مسنون!

دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی ماہرینِ اقتصادیات وعمرانیات کے پیش نظر ایک ہولناک مسئلہ کی صورت میں جلوہ گر ہے، اگر اس مسئلے پر محض اقتصادی یا عمرانی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے تو تحدید النسل ناگزیر معلوم ہوتی ہے تاہم ایک مسلم معاشرے میں کسی تحریک کے آغاز سے پیشتر اس کی شرعی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔

میں ایک تحقیقی ادارے سے وابستہ ہوں اور "اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی" کے موضوع پر کام کر رہا ہوں، میرے پیشِ نظر کوئی سیاسی مصلحت نہیں، ہر قسم کے دباؤ سے بے نیاز محض دین کی خدمت کے جذبے کے تحت میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مجھے ہر وقت علماء کرام کی راہنمائی کی ضرورت ہے، اُمید ہے آپ اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحات نکال کر میری راہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے۔

الف۔ آپ کے خیال میں "خاندانی منصوبہ بندی" مذہبی نقطہ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟

ب۔ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں عزل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ج۔ فقہاء کرام نے کن صورتوں میں ایک شادی شدہ جوڑے کو عزل پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی ہے؟

د۔ آیا تحریک کی صورت میں ضبطِ تولید کے مختلف طریقوں کی ہمہ گیر اشاعت شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟

ہ۔ اگر نہیں تو اس سے کون سی خرابیوں کے پیدا ہونے کا احتمال ہے؟ نیز ان خرابیوں کے تدارک کے لیے آپ کی تجاویز؟

س۔ عزل کے علاوہ ضبطِ تولید کے دیگر جدید طریقوں پر عمل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آنجناب کا سوالنامہ ملا، خاندانی منصوبہ بندی کے بارہ میں ہماری رائے جو شرعی نصوص اور فقہاء اُمت کی آراء پر مبنی ہے، حسب ذیل ہے۔

دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے ہولناک نتائج کی بناء پر تحدید النسل کرنا جبکہ جبراً اور

حاکمانہ طور سے ہو یا تحریک کے طور سے ہو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہے، ایک موحد اور مسلم قوم کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں کہ املاک اور تنگدستی کے خطرہ کی بناء پر مشرکین عرب کی طرح (خفی) میں مبتلا ہو، نیز جب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین جن کی عاقبت اندیشی، ہمدردی اور شفقت علی الخلق میں کوئی شبہ نہیں ہے انہوں نے عرب جیسے ریگستان اور بے آب و گیاہ ملک میں تحدیدِ النسل کا حکم یا مشورہ نہ دیا حالانکہ وہاں قحط کا خطرہ بلکہ اس کا متحقق ہونا ان کو محسوس تھا بلکہ بجائے تحدید کے تکثیرِ نسل کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا: تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم۔ تو ایک مسلمان معاشرہ کے لیے یہ کب زیبا ہو سکتا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی اتباع چھوڑ کر ہر معاملہ میں مغرب کی اندھی تقلید کرے اور تقلید بھی اس درجہ کی کہ اگر آج ہی مغرب کی طرف سے تکثیرِ نسل کا اشارہ ہو جائے تو فوراً اس کے صواب اور حق ہونے پر مُصر ہوں گے۔

الغرض اس مسئلہ کا حل اقتصادی و عمرانی نقطۂ نظر سے تحدیدِ نسل نہیں جو اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقیت پر اعتماد اور توحید کے خلاف ہے، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین اور کائنات میں رزق و معاش کے جو بے انتہا اور بے حد و حساب خزانے ودیعت فرمائے ہیں خدا کی عطا کی ہوئی عقل و ادراک سے کام لے کر رزق بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار فراہم کرنے کے ذرائع اور طریقے اختیار کیے جائیں، بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنایا جائے، زمینداروں کی زرعی ترقی کے لیے جدید طریقوں سے راہنمائی کی جائے، زمین کی غیر ضروری پیداوار از قسم تمباکو، افیون وغیرہ کی تحدید یا ان کا خاتمہ کیا جائے جس پر انسان کی بنیادی ضروریات کا کوئی مدار نہیں۔

اس تمہیدی بحث کے بعد بالترتیب آپ کے سوالوں کے جوابات مختصراً عرض کئے جاتے ہیں:-

الف۔ حاکمانہ اور جبری طور سے، نیز ہمہ گیر اور اجتماعی تحریک کے طور سے ناجائز ہے۔ اور بلا جبر و اکراہ انفرادی طور سے کسی شدید ضرورت کی بناء پر جائز ہے۔

ب۔ جائز تو ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے لیکن یہ جواز بھی اس وقت ہے جبکہ یہ امر مفاسد پر مشتمل نہ ہو جو مباحات مفاسد کا ذریعہ بنیں وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ناجائز ہیں، اسی طرح کے

محرکات اور بواعث بھی از روئے شرع مذموم نہ ہوں۔

ج۔ ضرورت مند اور معذور اشخاص کے لیے عزل جائز ہے اور اہلِ مغرب کی تقلید کی وجہ سے یا اقتصادی نقطۂ نگاہ سے ناجائز ہے، جیسا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، اور جو لوگ اسے ایک تحریک کی شکل دے رہے ہیں ان کے نزدیک اس ایک معاشی مسئلہ کا حل ہونا ذہنی غلامی کا ثبوت ہے۔

د۔ ضرورتمند اور معذور کے لیے انفرادی طور پہ بلا جبر و اکراہ جائز ہیں جبکہ مفاسد پر مشتمل نہ ہوں، لیکن مفاسد پہ اشتمال یقینی ہے، اس لیے اسے تحریک کی شکل میں چلانا بہر حال ناجائز ہے۔

ر۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رزاقیت اور صفتِ تقدیر سے غفلت اور کثرتِ زنا کی لعنت اس کے اہم مفاسد ہیں جن کا تدارک اگرچہ زبانی طور سے تو ممکن ہے لیکن عملی طور سے ناممکن ہے۔

س۔ صاحب عذر اور ضرورت مند کے لیے دوسرے طرق بھی انفرادی طور پہ جائز ہیں البتہ جو طریقے مفاسد پر مشتمل ہوں، جیسے نس بندی کی صورت یا مستقل طور پہ فوتِ تولیدِ زوج یا زوجہ کا خاتمہ کرانا جو از قبیل تغییر خلق اللہ بھی ہے، اس کا ارتکاب ناجائز ہے اس قسم کے مفاسد پر اشتمال ضروری ہے، لہٰذا ہم اس تحریک کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتے ہیں۔ اور جو لوگ نصوصِ کتاب وسُنت اور فقہائے کرام کے اقوال و آراء کو کھینچ تان کر اپنی مطلب برآری کے لیے اس تحریک کا جواز ڈھونڈنا چاہتے ہیں ان کی تحقیقات کا (جو کہ دراصل تاویل و تحریف ہے) کوئی اعتبار نہیں۔

جند بیدستر کو ادویات میں استعمال کرنا

سوال:- جند بیدستر جو کہ ایک دریائی جانور کے خصیوں کی منجمد خشک شدہ رطوبت ہے اور طبی ماہرین اسے ادویات میں بکثرت استعمال کرتے ہیں، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ جبکہ بعض اوقات اس کا استعمال متبادل دوائی نہ ملنے کی وجہ سے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ امداد الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ جند بیدستر پاک نہیں بلکہ ناپاک است اگرچہ حرام ہے۔ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس بارے میں تفصیل درکار ہے؟

الجواب:- دریائی جانور سب پاک ہیں، چھوٹے ہوں یا بڑے، مذبوح ہوں یا غیر مذبوح، البتہ ان میں سے سوائے مچھلی کے کسی اور کا کھانا مذہب حنفی میں درست نہیں مگر ادویات میں تمام دریائی حیوانات کا یا ان کے کسی بھی اجزاء کا خارجی استعمال درست ہے الا آنکہ مینڈک کا مارنا کراہت سے خالی نہیں۔ لوورد النص فیہ۔ ہاں اگر مرا ہوا ہو تو خارجی استعمال میں کوئی حرج نہیں، یہ حکم صرف دریائی مینڈک کا ہے، جند بیدستر کا داخلی استعمال کسی کے نزدیک بھی درست نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک تو دو وجہ سے درست نہیں، ایک تو اس لیے کہ جند دریائی جانور ہے، دوسرے اس لیے کہ یہ خُصیہ ہے جس کی ممانعت حدیث میں منصوص ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک صرف اخیر وجہ سے اور بوجہ پاک ہونے کے خارجاً درست ہے، عطر میں ڈالنا جائز ہے۔ (اصلی طبی جوہر ص۱۰۴ از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

وفی الهندية: (واما حكمها) فطهارة المذبوح وحل اكله من الماكول و طهارة غير الماكول للانتفاع لابجهة الاكل۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۰۶ كتاب الذبائح۔ الباب الاول) [1]

---

[1] وفى الهندية: الحيوان فى الاصل نوعان نوع يعيش فى البحر ونوع يعيش فى البر اما الذى يعيش فى البحر فجميع ما فى البحر من الحيوان يحرم اكله الا السمك خاصة فانه يحل اكله الخ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۸۹ كتاب الذبائح۔ الباب الثانى فى بيان ما يوكل لحمه من الحيوان وما لا يوكل)

باب اللباس

(لباس کے احکام ومسائل)

سونے چاندی کی گھڑی پہننا

سوال:۔ سونے، چاندی یا لوہے اور تانبے کی بنی ہوئی گھڑی پہننا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گھڑی اگر خالص سونے یا چاندی کی بنی ہوئی ہو تو مردوں کے لیے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں لیکن اگر اندر سے سونا یا چاندی کی ہو اور باہر سے لوہا وغیرہ کی، ہو تو مرد و زن کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ لوہے وغیرہ کا استعمال صرف انگوٹھی میں ممنوع ہے۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: (ولا يتحلى) للرجل (بذهب وفضة) مطلقاً..... ولا يتختم الا بالفضة لحصول الاستغناء بها فيحرم (بغيرها كحجر) وذهب وحديد وصفر) ورصاص وغيرها لما مر فاذا ثبت كراهة لبسها للتختم۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۵۹ كتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی اللبس)[1]

عورتوں کے لیے سفید کپڑے پہننے کا حکم

سوال:۔ خواتین کے لیے رنگین کپڑوں کے علاوہ سفید کپڑے زیب تن کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامیہ میں عورتوں کے لیے کسی خاص رنگ کے کپڑے پہننے کی کوئی پابندی نہیں تاہم ان کے لیے ایسے لباس سے اجتناب ضروری ہے جس سے مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہو۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: وكره لبس المعصفر والمزعفر والاحمر والاصفر للرجال)

---

[1] قال العلامة ابو البركات النسفیؒ: ولا يتحلى الرجل بالذهب والفضة الا بالخاتم..... و حرم التختم بالحجر والحديد والصفر والذهب۔ (كنز الدقائق ص۲۲۱ كتاب الكراهية فصل فی اللبس۔

ومِثْلُهٗ فی الجوهرة النيرة ج۲ ص۳۸۳ كتاب الحظر والاباحة۔

مفادهٗ انهٗ لا یکرہ للنساء رو لا بأس بسائر الالوان ۔ الخ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۵۸ کتاب الحظر والاباحۃ ۔ فصل فی اللبس) ؎۱

خواتین کا باریک لباس پہننا

سوال:۔ زمانہ حال میں اکثر خواتین اتنا باریک لباس زیبِ تن کرتی ہیں جس میں ان کے جملہ اعضاء نمایاں نظر آتے ہیں اور بعض اوقات ان پر کسی غیر محرم کی نگاہ بھی پڑ جاتی ہے ۔ از روئے شرع ایسے لباس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اسلام نے خواتین کو پردے کا حکم دیا ہے اور ایسے ملبوسات کے استعمال سے منع فرمایا ہے جو بے حیائی کا موجب ہوں، لہٰذا خواتین کا ایسا لباس پہننا جس میں جسم کے پوشیدہ اعضاء کی وضاحت ہوتی ہو حرام و ناجائز ہے ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ اقول مفادہ ان رؤیۃ الثوب بحیث یصف حجم العضو ممنوعۃ ولو کثیفاً لا تری البشرۃ منہ ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۶۶ کتاب الحظر والاباحۃ ۔ فصل فی النظر واللمس) ؎۲

مردوں کے لیے تیلہ کے استعمال کا حکم

سوال:۔ خالص تیلہ جو سونے چاندی کا بنا ہو مردوں کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ خالص تیلہ جو سونا چاندی کا بنا ہو اس سے بنی ہوئی اشیاء کا استعمال کرنا مردوں کے لیے ناجائز ہے، تاہم مروجہ تیلہ جو سونا چاندی پر مشتمل نہ ہو کی بنی ہوئی

؎۱ قال العلامۃ السید احمد الطحطاویؒ : قولہ والمزعفر والمعصفر (والحمرۃ) یعنی ان المزعفر بقسمیہ مکروہ واما الاصفر من غیر الزعفران فلا کراھۃ فیہ ولا بأس بسائر الالوان من الابیض والازرق والاشقر ۔ الخ
(طحطاوی حاشیۃ الدر المختار ج ۴ ص ۱۸۰ کتاب الکراھیۃ ۔ فصل فی اللباس)

؎۲ رواہ الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ : عن ام سلمۃؓ قالت استیقظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ۔۔۔۔ فرب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ ۔
(الصحیح البخاری ج ۱ ص ۲۲ باب العلم والعظمۃ باللیل)
ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص ۱۷ کتاب الکراھیۃ ۔ فصل فی اللبس ۔

اشیاء کا استعمال مردوں کے لیے درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: یکرہ أن یلبس الذکور قلنسوۃ من الحریر او الذھب او الفضۃ او الکرباس۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۳۵۴ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی اللبس) لہ

دانت جوڑنے کے لیے سونا، چاندی استعمال کرنا

سوال: ۔ٹوٹے ہوئے دانت کو جوڑنے کے لیے سونا، چاندی کا استعمال ہوتا ہے، تو کیا اس طرح سونا، چاندی کا استعمال مردوں کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ٹوٹے ہوئے دانت کو جوڑنے کے لیے سونے کا استعمال ناجائز ہے اس لیے کہ سونا مردوں کے لیے حرام ہے، تاہم صرف چاندی کا خول چڑھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما قال الامام المجتہد محمد بن حسن الشیبانیؒ: ولا تشد الأسنان بالذھب وتشد بالفضۃ۔ (الجامع الصغیر ص۳۱۹ کتاب الکراھیۃ) ۲ہ

لوہے کی انگوٹھی پہننے کا حکم

سوال: ۔مرد وزن کو لوہے وغیرہ کی انگوٹھی پہننا جائز ہے یا نہیں؟ نیز سونے چاندی کی انگوٹھی کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: ۔لوہے کی انگوٹھی مرد وزن کو پہننا مکروہ ہے اور سونے کی انگوٹھی صرف مردوں کیلئے پہننا حرام ہے جبکہ چاندی کی انگوٹھی بمقدار ما ذون جائز ہے اور خواتین کے لیے مطلقاً جائز ہے تاہم محتاج الیہ کے علاوہ مردوں کو انگوٹھی پہننا مستحسن نہیں۔

لما قال الامام عبد اللہ بن محمود الموصلیؒ: ویجوز للنساء التحلی بالذھب والفضۃ

لہ لما فی الھندیۃ: یکرہ ان یلبس الذکور قلنسوۃ من الحریر والذھب والفضۃ والکرباس۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۳۲ الباب التاسع فی اللبس۔الخ)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی السراجیۃ ص۷۵ کتاب الکراھیۃ۔

۲ہ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ویشد الانسان بالفضۃ ولا یشد ھا بالذھب۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۷۷ کتاب الکراھیۃ۔الفصل السابع فی اللبس)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الکاملیۃ ص۲۶۱ کتاب الکراھیۃ۔

ولا یجوز للرجال الا الخاتم..... من الفضة (وقال فی شرح کتابه) ثم التختم سنة لمن یحتاج الیه کالسلطان والقاضی ومن فی معناهما ومن لا حاجة له الیه فترکه افضل ..... و یکره التختم بالحدید والصفر للرجال والنساء لانه حلیة اهل النار وقد نهی عنه۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۴ ص۱۵۹ کتاب الکراهیة۔ فصل فی اللباس)[1]

عورت کیلئے پازیب پہننے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل بڑے گھرانوں کی خواتین میں پازیب پہننے کا رواج ہے، عورت جب پازیب پہن کر راستے میں چلتی ہے تو اس کی چھن چھن کی آواز کانوں میں پڑتی ہے جس کی وجہ سے آوارہ قسم کے لڑکے ایسی عورتوں پہ آوازے کسنے لگتے ہیں جو کہ فساد کا ذریعہ ہے، کیا شرعاً عورت کے لیے پازیب کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے عورت کو حجاب (پردہ) کا حکم دیا ہے اور اُسے ہر اس عمل سے منع کیا ہے جو بے حیائی کا باعث بنتا ہو، چونکہ عورت کے پازیب پہننے میں ایک قسم کی بے حیائی ہے اور اس کی وجہ سے بعض اوقات بڑے بڑے فتنے و فساد پیدا ہو جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ پازیب حجاب شرعی کے بھی منافی ہے اس لیے اس کا استعمال ہر چھوٹی بڑی خاتون کے لیے ناجائز و حرام ہے۔

لما قال اللہ تعالیٰ: وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ۔
(سورة النور آیت ۳۱)[2]

---

[1] لما قال الامام ابو البرکات ابو عبد اللہ بن احمد النسفیؒ: ولا یتحلی الرجل بالذهب والفضة الا بالخاتم والمنطقة وحلیة السیف من الفضة ولا لغیر السلطان والقاضی ترک التختم بالحجر والحدید والصفر۔ (کنز الدقائق ص۴۲۳، ص۴۲۴ کتاب الکراهیة)

ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۵ الباب العاشر فی استعمال الذهب والفضة۔

[2] وعن بنانة مولاة عبد الرحمن بن حیانؓ الانصاری کانت عند عائشةؓ اذ دخلت علیها بجاریة وعلیها جلاجل یصوتن فقالت لا تدخلنها علیّ الا ان تقطعن جلاجلها سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تدخل الملائکة بیتاً فیه جرس۔ رواہ ابوداؤد (مشکوٰة ج۲ ص۳۷۹ کتاب اللباس۔ باب النعال)

ومثلهٗ فی امداد الفتاوی ج۴ ص۱۳۷ کتاب الخطر والاباحة۔

بدن پر خال یا نام لکھوانا جائز نہیں

سوال:۔ پیشانی یا جسم کے کسی عضو پر خالیں بنانا یا نام کھدوانے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بدن پر نام گدوانا یا پیشانی پر خالیں بنانا تخلیقِ خداوندی میں تغیر کے مترادف ہے جو کہ ناجائز عمل ہے اس لیے بدن پر نام کھدوانے یا خال بنانا حرام ہے لیکن اگر ایک دفعہ نام لکھا گیا ہو تو اس کو مٹانے کے لیے چمڑا کاٹنا بھی ضروری نہیں اور اس سے وضو اور غسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

لما رواہ الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عون بن ابی جحیفة عن ابیه ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نهی عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن آکل الربٰو ومؤکله والواشمة والمستوشمة والمصوّر۔

(الصحیح البخاری ج۲ ص۸۸۱ باب من لعن المصور)[1]

بالوں کو سیاہ خضاب لگانا

سوال:۔ سفید بالوں کو سیاہ خضاب لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سفید بالوں خصوصاً داڑھی کو سیاہ خضاب لگانے کے متعلق فقہاء کرام کی عام روایات سے ممانعت کا رجحان غالب معلوم ہوتا ہے، جبکہ صوفیاء کے نزدیک حرام ہے اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے، تاہم دشمن پر رعب ڈالنے کی خاطر مجاہدین کے لیے رخصت موجود ہے۔

لما قال العلامة علی بن سلطان محمد القاریؒ: ذهب اکثر العلماء الی کراهة الخضاب بالسواد وجنح النوویؒ الی انها کراهة تحریم وان من العلماء من رخص فیه فی الجهاد ولم یرخص فی غیرہ۔ (مرقاة المفاتیح ج۸ ص۳۳۴)[2]

---

[1] وروایة الامام ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لعن الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۲۰۴ باب تحریم فعل الواصلة الخ)

ومِثلُهٗ فی سنن النسائی ج۲ ص۲۸۰ وصل الشعر بالخرق۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله ویکرہ بالسواد) ای لغیر الحرب، قال فی الذخیرة أما الخضاب بالسواد للغزو ویکون اھیب فی عین العدو فهو محمود بالاتفاق۔

(رد المحتار ج۶ ص۴۲۲ کتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی البیع)

ومِثلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۹ الباب التاسع عشر فی الختان والخضاب۔

بچوں کے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالنا | **سوال:** بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ چھوٹے بچوں یعنی لڑکوں کے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنائی جاتی ہیں، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے لیے سونے اور ریشم کا استعمال ممنوع (حرام) قرار دیا ہے، البتہ عورتوں کے لیے یہ جائز ہے۔ اس لیے سونے کا استعمال جیسے بالغ مردوں کے لیے ممنوع (حرام) ہے اسی طرح نابالغ بچوں (لڑکوں) کے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالنا بھی ممنوع وحرام ہے اور اس کا وبال والدین یا سرپرست کے ذمہ ہوگا۔

لماورد فی الحدیث: عن ابی موسیٰ الاشعریؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال احل الذھب والحریر للاناث من امتی احرم علی ذکورھا۔

(رواہ مشکوٰۃ عن الترمذی ج۲ ص۳۷۵ کتاب اللباس الفصل الثانی) [1]

پگڑی کے شملے کی مقدار کا تعین | **سوال:** شریعتِ مطہرہ میں پگڑی کے شملے کی مقدار کیا ہے اور کہاں چھوڑنا چاہیئے؟ یعنی آگے کی طرف ہو یا پیچھے کی طرف ہو؟

الجواب: عمامہ (پگڑی) باندھنا سنتِ نبوی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامہ مبارک کا شملہ اکثر پیچھے کی طرف دونوں کندھوں کے درمیان ہوتا تھا، اور شملہ کی مقدار میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، بعض کی رائے ایک شبر ہے اور بعض کی رائے نصف الظہر ہے، اور بعض نے موضع الجلوس تک رکھنے کا قول فرمایا ہے۔

کمافی الھندیۃ: ندب لبس السواد وارسال ذنب العمامۃ بین الکتفین الی الی وسط الظھر، کذافی الکنز: واختلفوافی مقدار ماینبغی ذنب العمامۃ منھم

---

[1] قال العلامۃ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی رحمہ اللہ: ومنھا الذھب لان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم جمع بین الذھب والحریر فی التحریم علی الذکور۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۳۲ کتاب الاستحسان)

لماقال العلامۃ التمرتاشیؒ: وکرہ الباس الصبیّ ذھبًا اوحریرًا فان ماحرم لبسہ وشربہ حرم الباسہ واشرابہ۔ (تنویرالابصار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۳۶۲ کتاب الکراھیۃ)

من قدر شبراً ومنهم من قال الیٰ وسط الظهر ومنهم من قال الیٰ موضع الجلوس۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۳۰ الباب التاسع فی اللبس) [۱]

مسلمانوں کے لیے ٹائی باندھنا جائز نہیں

سوال:۔ بعض جدّت پسند مسلمان تعلیمی اداروں، سرکاری دفاتر یا عام معاشرہ میں ٹائی کا استعمال بڑے شوق سے کرتے ہیں، تو کیا ایک مسلمان کے لیے ٹائی باندھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ٹائی کا استعمال مسلمان کے قطعاً شایانِ شان نہیں، علماء کرام فرماتے ہیں کہ ٹائی صلیب کی نشانی ہے اور صلیب چونکہ نصاریٰ کا مذہبی شعار ہے، لہٰذا مسلمان کے لیے اس کا استعمال کفار سے مشابہت کے مترادف ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان قوم کے لیے غیر مسلموں سے مشابہت کو ممنوع قرار دیا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن آدمی اُسی قوم کے ساتھ اُٹھے گا دنیا میں جس کی مشابہت اختیار کی ہوگی، لہٰذا ٹائی کا استعمال جائز نہیں۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (سورۃ هود آیت ۱۱۳) [۲]

دانتوں کے اردگرد چاندی کا خول لگانا

سوال:۔ بعض لوگ اپنے دانتوں کو مضبوط اور خوبصورت بنانے کے لیے

---

[۱] لما قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: ویستحب ارسال ذنب العمامة بین کتفیه إلیٰ وسط الظهر وقیل الیٰ موضع الجلوس وقیل مقدار شبرٍ۔
(البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۶۸ کتاب الکراهیة۔ النوع السابع فی اللبس)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراهیة، فصل فی اللّبس۔

[۲] لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمرؓ قال قال النبی صلی اللہ علیه وسلم من تشبّه بقومٍ فهو منهم۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس)
وایضاً: عن عائشةؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان لا یترك فی بیته شیئاً فیه تصلیب الا قضبه۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۱۶ باب فی الصلیب فی الثوب)

ان کے اردگرد سونے چاندی کا خول لگاتے ہیں اور وہ خول اس طریقہ پر لگایا جاتا ہے کہ اسے دوبارہ دور نہیں کیا جا سکتا، تو کیا اس طرح چاندی کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں مردوں کے لیے سونے کا استعمال خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو ممنوع قرار دیا ہے، اور جہاں تک چاندی کا تعلق ہے تو شریعت نے مردوں کے لیے اس کا استعمال جائز قرار دیا ہے، لہٰذا دانتوں کی مضبوطی کے لیے چاندی کا استعمال شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامة ابی بکر الکاسانیؒ: اما شد السن المتحرك بالذهب لا یجوز..... ولو شدها بالفضة یجوز بالاجماع۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۳۲ کتاب الاستحسان)[1]

داڑھی پر مہندی لگانا

سوال:۔ بعض لوگ سفید داڑھی پر مہندی لگاتے ہیں، تو کیا داڑھی پر مہندی لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سر یا داڑھی کے سفید بالوں پر مہندی یا سرخ خضاب لگانا شرعاً مرخص ہے بلکہ فقہاء نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔

لما فی الهندیة: وعن الامام ان الخضاب حسن لکن فی الحناء والکتم والوسمة واراد به اللحیة وشعر الرأس۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۹ الباب التاسع عشر فی الختان والخضاء)[2]

شلوار یا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا

سوال:۔ بعض لوگ شلوار یا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کے عادی ہوتے ہیں البتہ

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ولا یشد الاسنان بالذهب ولو جدع انفه لا یتخذ انفاً من الذهب ویتخذ ها من الفضة۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۶ کتاب الکراهیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۶ الباب التاسع فی اللبس ...الخ

[2] قال العلامة قاضی خانؒ: والخضاب بالحناء والوسمة حسن۔

(فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۱۲ کتاب الکراهیة)

وَمِثْلُهٗ ورد فی الحدیث: عن عبد الله بن موهب قال دخلت علی ام سلمةؓ فاخرجت الینا شعراً من شعر النبی صلی الله علیه وسلم مخضوباً۔ (الصحیح البخاری ج۲ ص۸۷۵ باب ما یذکر فی الشیب)

نماز کے دوران اوپر اٹھا لیتے ہیں، تو کیا شلوار یا پائجامہ کا اٹھانا صرف نماز تک خاص ہے یا ہر وقت ٹخنوں سے اوپر رکھنا ضروری ہے؟

الجواب: تکبر چونکہ باری تعالیٰ کا خاصہ ہے لہٰذا بندوں کے لیے متکبرانہ چال چلن اور لباس کا استعمال مناسب نہیں، شلوار، پائجامہ یا چادر وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا عام طور پر تکبر اور غرور کی نشانی ہوتی ہے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، شلوار اور پائجامہ وغیرہ جس طرح نماز میں ٹخنوں سے نیچے رکھنا حرام اور ممنوع ہے ویسا ہی نماز کے باہر بھی حرام اور ممنوع ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۳۹۵ کتاب اللباس) [۱]

ریشمی لنگی استعمال کرنے کا حکم

سوال: بعض علاقوں میں ریشمی لنگیاں (بطور پگڑی) استعمال کی جاتی ہیں، تو مردوں کے لیے ریشمی لنگیاں استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم اور سونا اپنی امت کے مردوں پر حرام فرمایا ہے اس لیے ریشم کا استعمال خواہ کپڑوں کی شکل میں ہو یا لنگی کی شکل میں ہو حرمت میں یکساں ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابی موسیٰ الاشعریؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال احل الذھب والحریر للاناث من امتی وحرم علیٰ ذکورھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۳۷۵ کتاب اللباس۔ الفصل الثانی) [۲]

---

[۱] لما فی الھندیۃ: ینبغی ان یکون الازار فوق الکعبین الیٰ نصف الساق وھٰذا فی حق الرجال واما النساء فیرخین ازارھن اسفل من کعب لیستر ظھر قدمھن۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۳۳ الباب التاسع فی اللبس)
وَمِثْلُہٗ فی الصحیح البخاری ج ۲ ص ۸۶۱ کتاب اللباس باب من جر ازارہ من غیر خیلاء۔

[۲] قال ابن نجیم المصریؒ: حرم للرجل لا للمرءۃ لبس الحریر الا قدر اربع اصابع۔
(البحر الرائق ج ۸ ص ۱۸۹ کتاب الکراھیۃ، فصل فی اللبس)
وَمِثْلُہٗ فی تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۵۱ کتاب الکراھیۃ۔ فصل فی اللبس۔

سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا

سوال:۔ آجکل بعض لوگ کھانے پینے کے لیے ایسے برتن استعمال کرتے ہیں جو کہ چاندی یا سونے کے بنے ہوتے ہیں، کیا ازروئے شریعت ایک مسلمان کے لیے ایسے برتنوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سادگی اور بے تکلفی کا مظہر ہیں، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا تکلف اور تکبر کا ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے لہٰذا ایسے برتنوں کا استعمال جائز نہیں۔

عن حذیفۃؓ قال نہانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تشرب فی آنیۃ الذھب والفضۃ وان ناکل فیھا وعن لبس الحریر والدیباج وان نجلس علیہ۔
[الصحیح البخاری ج۲ ص۸۶۸ کتاب اللباس
باب مس الحریر من غیر لبس]

عورتوں کے لیے لوہے کی انگوٹھی کا استعمال جائز نہیں

سوال:۔ بعض عورتیں سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ لوہے یا دیگر دھاتوں کے زیورات مثل انگوٹھی وغیرہ بھی استعمال کرتی ہیں، کیا عورتوں کیلئے لوہے وغیرہ کی انگوٹھی استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں خواتین کے لیے سونے چاندی کے زیورات کا استعمال اگرچہ مشروع ہے لیکن اس کے علاوہ لوہے، پیتل وغیرہ دھاتوں کی انگوٹھی اور دیگر زیورات کا استعمال کرنا جائز نہیں؟

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولا یتختم بغیرھا کحجرٍ وذھبٍ وحدیدٍ وصفرٍ ورصاصٍ وزجاجٍ وغیرھا لما مر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۶۰ کتاب الکراھیۃ۔ فصل فی اللبس)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وکرہ الاکل والشرب والادھان والتسطیب فی اناء ذھب وفضۃ للرجال والنساء۔ (البحرالرائق ج۸ ص۱۸۵ کتاب الکراھیۃ) ـــ ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۳۰ کتاب الاستحسان۔

[۲] قال فی الھندیۃ: والتختم بالحدید والصفر والنحاس مکروہ للرجال والنساء فافھم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۳۵ الباب العاشر فی استعمال الذھب والفضۃ) ـــ ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۸ ص۱۹۱ کتاب الکراھیۃ۔ فصل فی اللبس۔

کپڑوں میں سونے کے بٹن استعمال کرنا

سوال:- کپڑوں میں اگر عام بٹن کی بجائے سونے کے بٹن استعمال کیے جائیں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اسلام میں مردوں کے لیے سونے اور ریشم کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے مردوں پر ان دونوں (ریشم اور سونے) کا استعمال حرام قرار دیا ہے، لیکن فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ مرد اگر حریر یعنی ریشم یا سونے کے بٹن کپڑوں میں استعمال کرے تو اگرچہ یہ اسراف ہے لیکن حرام نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وفی التاتارخانیة عن السیر الکبیر لابأس بازرار الدیباج والذهب۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۲۵ کتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی اللبس)[1]

مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا

سوال:- بعض علاقوں میں مرد بھی سونے کی انگوٹھی استعمال کرتے ہیں خصوصاً شادی کے موقع سسرال والوں کی طرف سے لڑکے کو بطور تحفہ سونے کی انگوٹھی دی جاتی ہے تو کیا مردوں کے لیے ایسی انگوٹھی کا استعمال مشروع ہے یا نہیں؟

الجواب:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کو اپنی اُمت کے مردوں پر حرام قرار دیا ہے، سونا خواہ انگوٹھی کی شکل میں ہو یا دیگر زیورات کی شکل میں ہو مردوں کے لیے حرام ہے، لہٰذا اسلام میں مردوں کے لیے سونے کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لما قال فی الهندیة: التختم بالذهب حرام فی الصحیح کذا فی الوجیز للکردری۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۵ الباب العاشر فی استعمال الذهب والفضة)[2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: ولا بأس بمسمار الذهب یجعل فی حجر الفص ای فی ثقبه لانه تابع کالعلم فی الثوب فلا یعد لابساً له۔ (الهدایة ج۴ ص۴۵۵ کتاب الکراهیة۔ فصل فی اللبس)

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: التختم بالذهب حرام۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۹۰ کتاب الکراهیة، فصل فی اللبس) وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۶۸ کتاب الکراهیة فصل السابع فی اللبس۔

چاندی کی انگوٹھی کا بلاضرورت استعمال مناسب نہیں

سوال:۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ چاندی کی انگوٹھی کی اجازت صرف قاضی یا حاکم ہے ہر شخص کے لیے اس کی اجازت نہیں، کیا واقعی چاندی کی انگوٹھی صرف حاکم اور قاضی کے لیے مشروع ہے یا ہر شخص اس کو استعمال کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ حاکم اور قاضی کو چونکہ دستاویزات وغیرہ پر مہر لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور پہلے زمانے میں یہ مہریں انگوٹھی میں ہوا کرتی تھیں اسلئے وہ ایسی انگوٹھی استعمال کرتے تھے لیکن فقہاء نے فرمایا ہے کہ قاضی اور حاکم کے علاوہ دوسرے لوگ بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ بلاضرورت استعمال نہ کیا جائے اور استعمال کی صورت میں زینت اور تکبر کی نیت سے بھی احتراز کیا جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وان تختم بالفضة قالوا ان قصد به التجبر یکرہ وان قصد به الختم ونحوہ لا یکرہ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۵۹ کتاب الکراھیة فصل فی اللبس)[۱]

سٹیل اور لوہا وغیرہ کے زیورات کا استعمال کرنا

سوال:۔ آجکل بعض لوگ سونے چاندی کے علاوہ سٹیل، لوہے اور جست وغیرہ کے زیورات استعمال کرتے ہیں، کیا اس قسم کے زیورات کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ میں عورتوں کے لیے سونے اور چاندی کے ہر قسم کے زیورات استعمال کرنا جائز ہے جبکہ مردوں کے لیے صرف چاندی کا استعمال مشروع قرار دیا گیا ہے اور سونا چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کے زیورات کا استعمال مکروہ ہے لہٰذا ایسے زیورات استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔

لما قال فی الهندیة: والتختم بالحدید والصفر والنحاس مکروہ للرجال والنساء فافهم۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۵ الباب العاشر فی استعمال الذهب والفضة)[۲]

---

[۱] لما فی الهندیة: یجوز التختم بالفضة اذا کان علی هیئة الرجال اما اذا کان علی هیئة النساء یکرہ...... ویکرہ للرجل بما سوی الفضة۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۵ الباب العاشر فی استعمال الذهب والفضة)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۶۸ کتاب الکراھیة السابع فی اللبس۔

[۲] لما قال العلامة التمرتاشیؒ: ولا یتختم بغیرها کحجر وذهب وحدید وصفر ورصاص وزجاج وغیرها بما مر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۶۰ کتاب الکراھیة فصل فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۹۱ کتاب الکراھیة۔ فصل فی اللبس۔

عورتوں کا مردوں جیسے بال بنانا

سوال:۔ آجکل بعض خواتین مردوں جیسے بال بنواتی ہیں اور اسے ایک فیشن سمجھا جاتا ہے تو کیا عورتوں کے لیے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ اور عورتوں کو مردوں کے ساتھ مشابہت سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، اس لیے خواتین کا ایسی ہیئت بنانا جس میں مردوں کے ساتھ مشابہت ہو ناجائز و حرام ہے۔ اسی طرح خواتین کا ایسے بال بنانا بھی حرام اور موجبِ لعنت ہے جس میں مردوں کے ساتھ مشابہت ہو۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ المتشبھین من الرجال بالنساء والمتشبھات من النساء بالرجال۔
(مشکوٰۃ المصابیح ص۳۸۰ کتاب النکاح۔ باب الترجل) [1]

بڑے بڑے ناخن رکھنا

سوال:۔ آجکل بڑے بڑے ناخن رکھنے کا رواج ہے خصوصاً خواتین فیشن کے طور پر بڑے بڑے لمبے ناخن رکھتی ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے ناخن وغیرہ کٹوانے کو امورِ فطرت میں شمار کیا ہے اور اس کے لیے دن بھی مقرر کیے ہیں، یعنی ہفتہ میں ایک بار کٹوانا مستحب اور پندرہ دنوں کے بعد جائز جبکہ چالیس دن سے زیادہ تاخیر کرنا مکروہ ہے، جس کی وجہ سے انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے خواتین اور مردوں کے لیے فیشن کے طور پر لمبے ناخن رکھنا مکروہ ہے۔

قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: (ویستحب قلم اظافیرہ یوم الجمعۃ) وکونہ بعد الصلوٰۃ افضل الا اذا اخرہ الیہ تاخیراً فاحشاً فیکرہ لان من

---

[1] وفی صحیح البخاری: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المتشبھین من الرجال بالنساء والمتشبھات من النساء بالرجال۔
(صحیح البخاری ج۲ ص۸۷۴ کتاب اللباس۔ باب المتشبھین بالنساء والمتشبھات بالرجال)
وَمِثْلُہٗ فی سنن ابی داؤد ج۲ ص۲۱۱ کتاب اللباس۔ باب فی لباس النساء۔

کان ظفره طویلاً کان رزقه ضیقاً الخ ۔ (تنویر الابصار مع شرحہ الدر المختار ج ۵ ص۳۸۷ کتاب الخطر والاباحة ۔ فصل فی النظر والمس) [۱]

غیرضروری بالوں کی صفائی کے بال صفا پاؤڈر استعمال کرنا

سوال:۔ کیا مردوں کے لیے غیرضروری بال اُسترے سے صاف کرنا ضروری ہے یا بال صفا پاؤڈر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مردوں کے لیے غیرضروری بال اُسترے سے صاف کرنا لازمی ہے اور یہی مسنون طریقہ ہے، اس مقصد کے لیے ایسے کیمیکل پاؤڈر استعمال کرنا (جن سے بال صاف ہوجائیں) اگرچہ مرخص ہے مگر کراہت سے خالی نہیں، تاہم خواتین کو استعمال کرنے کی اجازت ہے ۔

قال العلامة عبدالحی اللکھنویؒ: هل یجوز قطع شعر العانة بالمقراض؟ الاستبشار هو خلاف السنة ۔ قال المُلّا علی القاریؒ فی المرقاة: قال ابن الملك لو ازال شعرها بغیر الحلق لا یکون علی وجه السنة وفیه ان ازالته قد یکون بالنورة وقد ثبت انه علیه الصلوٰة والسلام استعمل النورة علی ما ذکره السیوطیؒ فی رسالته نعم لو ازالها بالمقراضة لا یکون آتیاً للسنة علی وجه الکمال ۔ والله اعلم

(نفع المفتی والسائل ص۱۳۰،۱۳۱ کتاب الخطر والاباحة ۔ مایتعلق بالنوم والقیام ۔۔۔ الخ) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: الافضل ان یقلم اظفاره ویخفی شاربه ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة فان لم یفعل ففی کل خمسة عشر یوماً ولا یعذر فی ترکه وراء الاربعین فالاسبوع هو الافضل الخ ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۷ کتاب الکراهیة ۔ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء الخ)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۱۱ کتاب الخطر والاباحة فصل فی الختان ۔

[۲] الافضل ان یقلم اظفاره ویخفی شاربه ویحلق عانته ۔۔۔۔۔ وبعد اسطر قال ویبتدئ فی حلق العانة من تحت السرة ولو عالج بالنورة فی العانة یجوز ۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۷، ۳۵۸ کتاب الکراهیة ۔ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار ورد المحتار ج۵ ص۲۸۸ کتاب الخطر والاباحة ۔ فصل فی البیع ۔

مصنوعی بھنویں (ابروء) بنانے کا حکم

سوال :۔ آجکل بعض خواتین زیبائش کے لیے مصنوعی طریقہ سے بھنویں (ابروء) بناتی ہیں جس میں چھوٹے بلکہ بعض بڑے بالوں کو کسی طریقہ سے نکال دیتی ہیں، کیا ان کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت پر لعنت فرمائی ہے جو اپنے بدن کو گوندتی ہے یا اپنے بالوں کے ساتھ دوسرے بال لگاتی ہے، چونکہ زیب و زینت کے لیے بھنویں بنانے میں بھی ان امور کا ارتکاب ہوتا ہے اس لیے خواتین کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

لما ورد فی الحدیث : عن ابن عمرؓ قال لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة ۔ (الصحیح البخاری ج۲ ص۸۷۹ کتاب اللباس) [1]

عورتوں کے چہرے پر سیاہ بال نکل آنے کا حکم

سوال :۔ اگر کسی عورت کے چہرے پر مردوں کی طرح سیاہ بال نکل آئیں تو کیا وہ ان کو صاف کر سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر کسی عورت کے چہرے پر غیر معتاد بال نکل آئیں جس کی وجہ سے اس کا حسن و جمال متاثر ہوتا ہو تو فقہاء کرام نے اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے چہرے سے غیر معتاد سیاہ بال صاف کر سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : تحت قوله (النامصة التی تنتف الشعر من الوجه) ولعله محمول علی ما اذا فعلته للتزین للاجانب والا فلو کان فی وجهها شعر ینفر زوجها عنها بسببه ففی تحریم ازالته بعد لان الزینة للنساء مطلوبة للتحسین الا ان یحمل علی ما لا ضرورة الیه لما فی نتفه بالمنماص من الایذاء وفی تبیین المحارم ازالة الشعر من الوجه حرام الا اذا نبت للمرأة لحیة او شوارب فلا تحرم ازالته بل تستحب الخ (رد المحتار ج۵ ص۲۶۴ کتاب الحظر والاباحة فصل فی النظر والمس) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ : ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواء کان شعرها او شعر غیرها لقوله صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة والواشرة والمستوشرة والنامصة والمتنمصة الخ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۶۳، ۲۶۴ کتاب الحظر والاباحة ۔ فصل فی النظر والمس) ومثله فی الهندیة ج۵ ص۳۵۸ کتاب الکراهیة ۔ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء وقلم الاظفار الخ

[2] قال العلامة عبد الحی اللکھنویؒ : الاستفسار : لو نبتت للمرأة لحیة ماذا تفعل؟ الاستبشار : یستحب نتفها وحلقها الخ ۔ (نفع المفتی والسائل ص۱۰۶ کتاب الحظر والاباحة ۔ ما یتعلق بالنساء من الحیض والنفاس)

وسمہ استعمال کرنے کا حکم

سوال، جناب مفتی صاحب (۱) میں بائیوٹر سکاؤٹس خار مالاکنڈ ایجنسی کے شعبہ تعلیمات سے وابستہ ہوں، ۱۱ جون ۱۹۶۵ء کو جمعہ کی نماز کے مسائل بیان کرتے ہوئے ایک عالمِ دین نے خضاب (وسمہ) کی ممانعت شرعی کے بارہ میں بھی فرمایا، بعد میں ایک آدمی نے اس کی دلیلِ قطعی اور حوالہ کتاب کے بارے میں پوچھا ہم نے اپنی معلومات کے مطابق جلالین شریف کے حاشیہ سے کسی حد تک ثابت کیا (پارہ ۵ رکوع ۱۸) مگر قطعی جواب کے لیے آنجناب سے رجوع کر رہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ آنجناب اس بارے میں شرعی فیصلہ (حکم) سے آگاہ فرمائیں گے۔

(۲) انگریزی طرز کے بال کٹوانے، داڑھی منڈانے یا کتروانے کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب (۱) علماء محققین کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ خضاب کرنا سرخ یا زرد یا اور کسی رنگ کا سوائے سیاہی خالص کے مستحب ہے، اور خضاب نہ کرنا اور سفیدی قائم رکھنا بھی جائز ہے اور سیاہ خضاب ممنوع اور گناہ ہے۔ فتاوٰی قاضیخان میں ہے۔ الخضاب بالحناء حسن۔ انتہٰی۔ اور صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ غیروا ھذا الشیب واجتنبوا السواد۔ یعنی تغیر کرو سفیدی کو اور اجتناب کرو سیاہی سے۔ اور سنن ابی داؤد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: یکون فی آخر الزمان قوم یخضبون بالسواد کحواصل الحمام لا یجدون رائحۃ الجنۃ۔ یعنی آخر زمانہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب کریں گے مثل رنگ کبوتر کے سینہ کے، وہ لوگ جنت کی خوشبو کو بھی نہ پائیں گے ــــ اور معجم الطبرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: من خضب بالسواد سود اللہ وجھہ یوم القیمۃ انتہٰی۔ یعنی جو شخص سیاہ خضاب کرے گا قیامت کے روز وہ روسیاہ محشور ہوگا ــــ اور شیخ محدث دہلوی شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: خضاب بحنا بالاتفاق جائز است و مختار در سواد حرمت است۔ انتہٰی ــــ اور مؤطا امام محمد میں ہے: لا نری بالخضاب بالوسمۃ والحناء والصفرۃ بأساً و ان ترکہ ابیض فلا بأس بذلک کل ذلک حسن۔ انتہٰی

(۲) داڑھی کی مقدار کے بارہ میں بعض قوی اور مشہور روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ

داڑھی کو اپنی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ حدیث شریف میں ہے: عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اعفوا اللحیٰ واحفوا الشوارب۔ (ترمذی ج۲ ص۱۰۰)
یعنی داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹواؤ۔ **اس کے علاوہ ابن عمرؓ کی دوسری روایت** میں ہے۔ عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر باحفاء الشوارب واعفاء اللحیٰ۔ امام ترمذیؒ نے دونوں روایات کو حسن اور صحیح کہا ہے اور ان کے رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ احادیث داڑھی کی مقدار کے بارہ میں مطلق ہیں، اور مطلق اعفاء (بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے) جس سے داڑھی لمبی کرنے کا مسنون اور مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں امام ترمذیؒ نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے: ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یاخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا۔ (الحدیث)
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کو طول وعرض سے کٹواتے تھے۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے حدیث غریب کہہ کر اس کی سند پر جرح بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ خود ابن عمرؓ اور ابوہریرہؓ کے بارہ میں بھی منقول ہے کہ وہ مٹھی سے زیادہ کٹواتے تھے۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ابی شیبہ)

بہر حال ان تمام روایات واقوال کو سامنے رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی داڑھی کو کٹوانا بھی چاہے تو مٹھی بھر سے زیادہ کو کٹوا سکتا ہے اور مٹھی بھر سے کم کرنا بالاتفاق حرام ہے۔ اور اگر کوئی حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایات پر عمل کرنا پسند کرے تو مٹھی سے بڑھا بھی سکتا ہے، دونوں صورتیں سنت کے خلاف نہیں ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لمعات شرح مشکوٰۃ میں مٹھی بھر سے زیادہ بال کٹوانے کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص داڑھی کو مٹھی سے زیادہ کاٹ دے تو جائز ہے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ سے ایسا کرنا ثابت ہے۔

امام شعبیؒ اور امام ابن سیرینؒ بھی اس کو پسند کرتے تھے جس سے مٹھی سے زیادہ کا کٹوانا جائز معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعض سلف داڑھی بڑھانے اور لمبا کرنے کو پسند کرتے تھے۔ جیسے حضرت حسن بصریؒ، حضرت قتادہؓ، حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے بارہ میں بھی یہی منقول ہے۔ یہاں تک کہ امام غزالیؒ نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تصریح کی ہے: وکان یعفی لحیتہ ویاخذ شاربہ، کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی مبارک بڑھاتے تھے۔

اور مونچھ مبارک کٹوا تے تھے۔ (احیاء العلوم جلد ۲ ص ۳۸۳)
شیخ ابوبکر مالکیؒ شرح ترمذی میں فرماتے ہیں، ان ترك لحيته فلاحرج عليه۔
(شرح ابی بکر مالکیؒ ج ۱۰ ص ۲۱۹)

ملا علی قاریؒ جو احناف کے بلند پایہ امام ہیں نے ابن الملک کی ایک روایت میں داڑھی بڑھانے کو مختار اور بہتر کہا ہے: قال ابن الملك اما الاخذ من اطراف اللحية من طولها و عرضها لتناسب محسن لكن المختار ان لا يأخذ منها شيئاً۔ (نقع قوت المغتذی حاشیہ ترمذی ج ۲ ص ۱۰)

اسی طرح شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بارہ میں بھی حاشیۂ مذکور میں ہے:
قال عندی اخذ اللحية ما فوق القبضة جائز لكن الاولى تركها۔

خلاصہ یہ کہ ان روایات اور اقوال سے داڑھی کا بڑھانا اور لمبا کرنا ہی افضل اور بہتر و مسنون معلوم ہوتا ہے۔ اور جن روایات سے مٹھی سے زائد کا کٹوانا معلوم ہوتا ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہیں، روایات میں تعارض نہیں ہے۔ حضرت الاستاذ شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز اعفاء اللحیۃ کو اطلاق پر حمل کر کے اس کو بڑھانا ہی افضل اور بہتر سمجھتے تھے اور مٹھی بھر سے زیادہ نہیں کٹواتے تھے۔ کئی صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور مشائخؒ کا نمونہ ان کے سامنے موجود تھا۔ جس کی وجہ سے بعض علماء کرام نے مٹھی بھر ہی کو قدرِ مسنون کہہ کر اسے افضل قرار دیا ہے مگر انہوں نے بھی بڑھانے کو ناجائز نہیں کہا۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ من تشبه بقوم فهو منه۔ آپؐ کے اس فرمان کے مطابق انگریزی بال رکھنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں غیر مسلم قوم کے ساتھ تشبہ ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

پی ٹی (P.T) میں نیکر پہننے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! بندہ پی اے ایف (PAF) رسالپور میں ملازم ہے جہاں تمام ملازمین نیکر پہن کر پی ٹی (فوجی مشقیں) کرتے ہیں جس سے ران وغیرہ ننگے ہوتے ہیں۔ میں نے افسرانِ بالا کو درخواست دی کہ چونکہ نیکر میں پردہ نہیں رہتا اور اسلام کا حکم یہ ہے کہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک مخفی ہونا چاہئے، اس لیے مجھے پی ٹی (PT) کے موقعہ پر پتلون پہننے کی اجازت دی جائے۔ جواب میں مجھے یہ کہا گیا کہ اس کے لیے قرآن مجید یا حدیث شریف سے حوالہ پیش کروں۔ آپ سے

استدعا ہے کہ جلد از جلد قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں اور اگر مناسب سمجھیں تو ایک سے زائد احادیث کا حوالہ بھی دے دیں۔ واضح ہو کہ نیکر ہم اپنی خوشی سے نہیں پہنتے بلکہ کھیل کود یا بعض دیگر فوجی مشقوں میں نیکر پہننا گورنمنٹ نے لازمی قرار دے رکھا ہے۔ امید ہے اس اہم شرعی مسئلہ میں آپ ضرور راہنمائی فرمائیں گے۔

الجواب:۔ مسلمان کے لیے ستر عورت کا چھپانا ہر حالت میں فرض ہے اور بلا عذر شرعی اس کے خلاف کرنا قانونِ اسلامی کی رُو سے سخت گناہ ہے۔ قرآن وحدیث کی نصوص اس پر شاہد ہیں۔ منجملہ ان نصوص کے خداوند قدوس کا ارشاد گرامی ہے: خذوا زینتکم (الآیۃ) ای مایواری عورتکم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔ عن عبد الرحمن بن ابی سعید الخدری عن ابیہ ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا المرأۃ الی عورۃ المرأۃ ولا یفضی الرجل الی الرجل فی ثوب واحدٍ ولا تفضی المرأۃ الی المرأۃ فی الثوب الواحد۔ (مسلم ج ۱ ص ۱۵۴)

مسلم شریف کے سترِ عورت کے باب میں جتنی احادیثِ رسولؐ مذکور ہیں اس کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس باب میں جتنی احادیثِ رسولؐ ہیں ان سے یہ حکم ثابت ہوا: ففیہ تحریم نظر الرجل الی عورۃ الرجل والمرأۃ الی عورۃ المرأۃ وھذا لاخلاف فیہ وکذلک نظر الرجل الی عورۃ المرأۃ والمرأۃ الی عورۃ الرجل حرام بالاجماع۔ آدمی کا آدمی کے عورت (ستر) کو دیکھنا اور عورت کا عورت کے عورت (ستر) کو دیکھنا حرام ہے اور اس میں کچھ خلاف نہیں ہے، اسی طرح آدمی کا عورت کے عورت (ستر) کو دیکھنا اور عورت کا آدمی کے عورت (ستر) کو دیکھنا بالاجماع حرام ہے۔

اب آدمی کے عورت کی تحدید کیا ہے، یعنی اس کے بدن کا کتنا حصہ عام حالات میں عورۃ ہے جس کا چھپانا اس پر فرض ہے؟ تو یہ احادیث سے بھی ثابت ہے اور فقہاءِ اسلام نے بھی اس کی تحدید کی ہے۔ قال علیہ السلام: عورۃ الرجل بین سرتہ الی رکبتہ۔ (الحدیث) (اخرجہ الحاکم فی المستدرک) ــــ نیز امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: واما ضبط العورۃ فعورۃ الرجل مع الرجل ما بین السرۃ والرکبۃ ــــ اور الدر المختار میں ہے: ووجوبہ عام ولو فی الخلوۃ علی الصحیح الی قولہ وھی للرجل ما تحت رکبتہ ــــ علامہ شامی رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ رکبتہ (گھٹنہ) بھی عورت

(پردہ) ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: فالرکبۃ من العورۃ لروایۃ الدارقطنی ماتحت السرۃ الی الرکبۃ من العورۃ ولحدیث علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الرکبۃ من العورۃ۔

ان نصوص اور فقہاء کرام کی عبارات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو ستر عورت کا چھپانا فرض ہے اور کسی حالت میں بھی اس کو ظاہر نہیں کرنا چاہیئے۔ فقط واللہ اعلم

مردوں کے لیے زرد رنگ کے لباس کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل بعض نوجوان زرد رنگ کا لباس پہنتے ہیں، اسلامی نقطہ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ وضاحت کے ساتھ جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ بعض الوان (رنگ) ایسے ہیں کہ اسلام نے ان کے استعمال سے مسلمان مردوں کو منع فرمایا ہے، ان میں سے ایک زرد رنگ بھی ہے۔ احادیثِ نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اس رنگ کے استعمال کی ممانعت آئی ہے، اس لیے فقہاء اسلام نے مردوں کے لیے زرد رنگ کے کپڑے استعمال کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وکرہ لبس المعصفر والمزعفر الاحمر والاصفر للرجال۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۵۸ کتاب الکراھیۃ، باب اللبس) [۱]

---

[۱] لما نقل العلامۃ المفتی عبدالقادر الرافعی: عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیّ ثوبین معصفرین فقال ان ھٰذہٖ من ثیاب الکفار فلا تلبسھا۔ الخ

وفی روایۃ المسلم رأی علیّ ثوبین معصفرین فقال أأمّك أمرتك بھٰذا قلتُ اغسلھا قال بل احرقھا۔ الخ

(التقریرات للرافعی ج ۲ ص ۳۰۶ فصل فی اللبس)

باب التصاویر
(تصویر کے احکام ومسائل)

خواتین کی تصاویر کو دیکھنا اور رکھنا حرام ہے

سوال:۔ آجکل بازاروں، دکانوں اور مجروں میں خواتین کی تصاویر لگی ہوتی ہیں، تو کیا ان تصاویر کو دیکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ذی روح اشیاء کی تصاویر اتارنا اور ان کو دیکھ کر لطف اندوز ہونا حرام ہے تو پھر اجنبی عورتوں کی تصاویر کو دیکھ کر لطف اندوز ہونا تو بعینہٖ اس خاتون کو دیکھنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز اور حرام ہے۔

لما رواہ الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تباشر المرأۃُ المرأۃَ فتنعتها لزوجها کانہ ینظر الیها۔ (الصحیح البخاری ج ۲ ص۷۸۸ باب لا تباشر المرأۃ المرأۃ) [1]

کسی جاندار کی تصویر کا حکم

سوال:۔ کسی جاندار کی تصویر بنانا اور کھینچوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ذی روح اشیاء کی فوٹوگرافی کرنا یا شبیہ بنانا تخلیقِ خداوندی کا مقابلہ کرنے کے مترادف ہے جو کہ گناہِ کبیرہ ہے، اس لیے جاندار اشیاء کی تصاویر بنانا شرعاً حرام و ناجائز ہے۔

لما رواہ الامام محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ: عن عائشۃؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اصحاب هٰذہ الصور

---

[1] لما رواہ الامام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ: عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تباشر المرأۃُ المرأۃَ لتنعتها لزوجها کانما ینظر الیها۔ (سنن ابی داؤد ج ۱ ص۲۹۲ باب ما یؤمر بہ من غض البصر)

ومثلہٗ فی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۲۶۸ کتاب النکاح، الفصل الاوّل۔

یعذبون یوم القیامة ویقال احیوا ما خلقتم وقال ان البیت الذی فیه الصور لا تدخله الملٰئکة۔ (الصحیح البخاری ج ۲ ص ۸۸۱ باب من یدخل بیتاً فیه صورة) [۱]

بٹوہ میں رکھی ہوئی تصویر کے ساتھ نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص کے پاس اپنی تصویر ہے جو کہ پوری نہیں بلکہ آدھی ہے اور بٹوہ میں بند کر کے جیب میں رکھی ہوتی ہے، تو کیا جیب میں رکھی ہوئی تصویر کے ساتھ نماز ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر کشی سے ہر حال میں منع فرمایا ہے جہاں کہیں دیواروں پر جاندار اشیاء کی تصاویر لٹکائی گئی ہوں وہاں نماز پڑھنا مکروہ ہوگی، لیکن جب تصویر چھوٹی ہو اور بٹوہ وغیرہ میں بند کر کے جیب میں رکھی گئی ہو تو اس سے نماز کی صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

لما قال شیخ الاسلام علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا یکرہ لو کانت تحت قدمیه او فی یده او فی بدنه لانها مستورة بثیابه او علیٰ خاتمه بنقش غیر مستبین۔ [۲]
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۰۷ مکروھات الصلوٰۃ)

کسی پیر یا بزرگ کی تصویر تبرکاً لٹکانا

سوال:- ایک شخص نے اپنی دوکان میں حصولِ برکت وعافیت کے لیے اپنے مرشد کی تصویر لگا رکھی ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[۱] لما رواہ الامام مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن نافع ان ابن عمرؓ اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الذین یصنعون الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم۔ (الصحیح المسلم ج ۲ ص ۲۰۱ باب تحریم تصویر صورة الحیوان)
ومثلہٗ فی مشکوٰة المصابیح ج ۲ ص ۳۸۵ باب التصاویر۔ الفصل الاول۔

[۲] قال ابراهیم الحلبیؒ: اما اذا کانت مقطوعة الرأس یعنی به اذا لم یکن لهٗ رأس او کان محاہ بخیط او کانت صغیرة لا تبدو للناظر اذا کان قائماً وهی علی الارض ای لا تتبین تفاصیل اعضائها فلا یکرہ حینئذٍ۔ (کبیری ص ۳۵۹ مکروھات الصلوٰۃ)
ومثلہٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۰۶ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ۔

الجواب:۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بزرگ کی تصویر لگانے میں کسی قسم کی خیر وبرکت نہیں بلکہ معصیت میں عام آدمی کی تصویر کے ساتھ برابر ہے۔حدیث میں ہے کہ جس گھر یا دوکان میں (عام آدمی یا کسی بزرگ کی) تصویر ہو اس گھر میں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا مذکورہ بالامقصد کے لیے کسی بزرگ کی تصویر لگانے سے اجتناب ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عائشةؓ قالت دخل علیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا مستترة بقرام فیہ صورة فتلوّن وجہہ ثم تناول الستر فھتکہ ثم قال ان اشد الناس عذابًا یوم القیامة الذین یشبھون بخلق اللہ۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۲۰۰ باب تحریم صورة الحیوان) [1]

آرائش کے لیے گھر میں نصف فوٹو لگانا

سوال:۔ضرورت کے تحت اگر نصف تصویر بنائی جائے اور پھر اس قسم کی دوسری تصویروں کو گھر کی سجاوٹ کے لیے دیواروں پر لگایا جائے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔متاخرین فقہاء کرام نے ضرورت کے تحت نصف تصویر بنانے کی اجازت دی ہے لیکن ضرورت کے لیے بنائی گئی تصویر کو اسی ضرورت میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے، ایسی تصویروں کو گھر کی دیواروں پر بغرضِ زیب وزینت لگانا جائز نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابی طلحة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتدخل الملٰئکة بیتًا فیہ کلبٌ ولاصورة۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۲۰۰ باب تحریم التصویر صورة الحیوان) [2]

---

[1] لما ورد فی الحدیث:۔عن ابی ھریرةؓ قال استاذن جبریل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ادخل فقال کیف ادخل وفی بیتك ستر فیہ تصاویر فاما ان تقطع رؤسھا او تجعل بساطاً یوطأ فانا معشر الملٰئکة لا ندخل بیتًا فیہ تصاویر۔ (سنن النسائی ج۲ ص۳۰۱ ذکر اشدّ الناس عذابًا)

وَمِثْلُہٗ فی فتح الباری ج۱۰ ص۳۲۲ باب لاتدخل الملٰئکة بیتًا فیہ صورة۔

[2] قال الامام النوویؒ: قال العلماء سبب امتناعھم من بیتٍ فیہ صورةٌ کونھا معصیة فاحشة وفیھا مضاھاة لخلق اللہ۔ (شرح المسلم للامام النووی ج۲ ص۲۰۰ باب تحریم تصویر)

وَمِثْلُہٗ فی سُنن النسائی ج۲ ص۳۰۱ ذکر اشد الناس عذابًا۔

شادی کی تقریبات کی تصاویر بنانا

سوال: بعض لوگ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں فوٹو گرافی کرتے ہیں، تو کیا ایسے مواقع پر تصاویر بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جاندار کی تصویر بنانے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے خواہ شادی بیاہ کے موقع پر ہو یا دیگر تقریبات کے مواقع پر، اس میں ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہوتی ہے اور دوسرے بلاضرورت مال ضائع ہوتا ہے جس سے منع فرمایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروزِ قیامت مصورین کے لیے سخت ترین سزا کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت دخل علیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا مستترۃ بقرام فیہ صورۃ فتلون وجھہ ثم تناول الستر........ ثم قال ان اشدّ الناس عذابًا یوم القیامۃ الذین یشبھون بخلق اللہ۔

(الصحیح المسلم ج۲ ص۲۰۰ باب تحریم تصویر الخ)[1]

خانہ کعبہ کی تصاویر میں چھوٹی چھوٹی انسانی تصاویر کا حکم

سوال:۔ بعض مساجد میں خانہ کعبہ کی تصاویر آویزاں ہوتی ہیں، ان میں حاجیوں کی انتہائی چھوٹی چھوٹی تصویریں بھی ہوتی ہیں جو کہ قریب سے دیکھے بغیر انسانی تصویریں معلوم نہیں ہوتیں، کیا اس قسم کی تصویروں والے کتبے مساجد میں آویزاں کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو انسانی تصاویر اتنی چھوٹی اور باریک ہوں کہ انتہائی قریب سے دیکھے بغیر پہچانی نہ جاسکتی ہوں، اور قریب سے دیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ تصویر کے اعضاء واضح طور پر نظر نہ آئیں، تو اس قسم کی تصویروں کا حکم عام تصویروں کی طرح نہیں

---

[1] کما ذکر فی الحدیث: عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الذین یصنعون ھذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم۔ (فتح الباری ج۱۰ ص۳۱۶ باب نقض الصور)

ومثلہٗ فی شرح المسلم للنووی ج۲ ص۲۰۰ باب تحریم تصویر۔

جس کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں، لہٰذا اس قسم کے کتبے مساجد اور گھروں میں آویزاں کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی اس سے نماز کی صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یکرہ لو کانت تحت قدمیہ او فی یدہ او فی بدنہ لانہا مستورۃ بثیابہ او علی خاتمہ بنقش غیر مستبین۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۰۱ مکروھات الصلوٰۃ) [۱]

جدید آلات (ٹی وی، وی سی آر) کا حکم

سوال:- آلاتِ جدیدہ یعنی ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر وغیرہ سننا اور دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- آلاتِ جدیدہ کا استعمال بذاتِ خود مرخص ہے لیکن ٹی وی اور وی سی آر میں چونکہ تصویر بینی کے علاوہ بعض فحش پروگراموں کی نمائش بھی ہوتی ہے جن کا دیکھنا ایک شریف آدمی کے لیے بہت مشکل ہے، لہٰذا ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ کے دیکھنے سے اجتناب ہی لازم ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ کرہ کل لہو) أی کل لعب وعبث فالثلاثۃ بمعنی واحد کما فی شرح التاویلات والأطلاق شامل لنفس الفعل واستماعہ کالرقص والسخریۃ والتصفیق وضرب الاوتار من الطنبور والبربط والرباب والقانون والمزمار والصنج والبوق فانہا کلہا مکروھۃ لأنہا زی الکفار واستماع ضرب دف والمزمار وغیرہ ذلک حرامٌ۔ (ردّ المحتار ج ۶ ص ۳۹۵ کتاب الحظر والاباحۃ - فصل فی البیع) [۲]

---

[۱] قال الشیخ ابراھیم الحلبیؒ: اما اذا کانت مقطوعۃ الرّأس یعنی بہ اذا لم یکن لہٗ رأس او کان فمحاہ بخیط او کانت صغیرۃً لا تبدو للناظر اذا کان قائماً وھی علی الارض ای لا تتبین تفاصیل اعضائہا فلا یکرہ حینئذٍ۔ (حلبی کبیر ص ۳۵۹ مکروھات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۰۷ مکروھات الصلوٰۃ۔

[۲] رواہ الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اِنَّ اشدّ النّاسِ عذاباً عند اللّٰہِ المصوّرون۔ (الصحیح البخاری ج ۲ ص ۸۸۰ باب عذاب المصوّرین یوم القیامۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۲۰۷ کتاب الکراھیۃ - فصل فی البیع۔

تصویر والی گھڑی کے ساتھ نماز پڑھنا

سوال :۔ اگر کسی شخص کی گھڑی یا انگوٹھی میں اتنی چھوٹی تصویر ہو جو کہ انتہائی غور سے دیکھے بغیر نظر نہیں آتی ہو تو کیا اس قسم کی گھڑی یا تصویر کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اسلام میں تصاویر رکھنا، دیکھنا اور بنانا سب ممنوع ہے اسلئے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، لیکن اس سے مراد وہ تصاویر ہیں جو ظاہر اور مستبین ہوں، صورتِ مسئولہ میں یہ تصویر صاف طور پر دکھائی نہیں دیتی لہٰذا اس سے اگرچہ نماز متاثر نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ایسی گھڑی رکھنا مناسب نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: ولا يكره لو كانت تحت قدميه او في يده او في يده لانها مستورة بثيابه او على خاتمه بنقش غير مستبين۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۰۷ فصل فی مکروهات الصلوٰة)[1]

بچھڑے کی کھال سے تصویر بنانا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! گائے بھینس رکھنے والوں میں یہ رواج ہے کہ جب ان کی گائے یا بھینس کا بچہ مر جائے تو اس کی کھال اتار کر اس میں بھوسہ بھر لیتے ہیں جسے گائے یا بھینس اپنا بچہ تصور کر کے دودھ آسانی سے دیدیتی ہے، تو کیا شرعاً یہ تصویر کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں بچھڑے کی کھال پر تصویر کی تعریف صادق نہیں آتی اور نہ یہ تصویر کے حکم میں ہے بلکہ ضرورت کی وجہ سے قدرتی پیدا کردہ جسم کو ایک گونہ محفوظ رکھا جاتا ہے، اس لیے یہ تصویر کے حکم میں داخل نہیں ہے بلکہ بوقتِ ضرورت ایسا کرنا مرخص ہے۔

---

[1] قال الشيخ ابراهيم الحلبيؒ: اما اذا كانت مقطوعة الرأس يعني به اذا لم يكن له رأس او كان محاه بخيط او كانت صغيرة لا تبدو للناظر اذا كان قائما وهي على الارض اي لا تتبين تفاصيل اعضائها فلا يكره حينئذٍ۔ (حلبی کبیر ص۳۵۹ مکروهات الصلوٰة)

ومثله في الهندية ج۱ ص۱۰۶ الفصل الثاني فيما يكره في الصلوٰة۔

باب الملاهی

(کھیل کود کے مسائل و احکام)

خوشی کی تقریبات میں ناچ گانے کا حکم | **سوال**:۔ شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات میں ناچ گانا اور ڈھول وسرور کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خوشی کی تقریبات ہوں یا عام تقریبات، ان تمام مواقع پر ناچ گانا اور ڈھول وغیرہ بجانا شرعاً حرام ہے تاہم شادی بیاہ کے موقع پر صرف دف بجانا (جو بغیر غناء کے ہو) مرخص ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الكردري: استماع صوت الملاهي كالضرب بالقضيب ونحوه حرام لقوله عليه السلام استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفراي بالنعمة۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۵۹ الباب الثالث فيما يتعلق بالمناهي) [1]

کیرم بورڈ کھیلنا | **سوال**:۔ آجکل بعض نوجوان جمع ہو کر کیرم بورڈ نامی کھیل بڑے شوق سے کھیلتے ہیں، کیا ایسا کھیل کھیلنا جائز ہے؟

الجواب:۔ وہ امور جن میں نہ دنیا کا فائدہ ہو اور نہ آخرت کا بلکہ وقت اور دولت کا ضیاع ہو، جیسا کہ کیرم بورڈ وغیرہ، کہ اس میں نہ تو صحت کا فائدہ ہے اور نہ دنیا و آخرت کا تو ایسے بے معنیٰ اور بلا ضرورت کاموں پہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا کوئی دانشمندی کا کام نہیں، اور شریعتِ مقدسہ نے بھی ایسے لہو و لعب سے منع فرمایا ہے۔

قال العلامة ابن نجيم: ويكره اللعب بالشطرنج والنرد والاربعة عشر لقوله

---

[1] رواه الامام محمد بن اسماعيل البخاري، عن ابن عباس: (ومن الناس من يشتري لهو الحديث (سورة لقمان ۶) قال الغناء واشباهه۔ (ادب المفرد ص۲۰۴ باب الغناء واللهو)
ومثله في الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۴۹ كتاب الحظر والاباحة۔

علیہ السلام کل لعب حرام الّا ملاعبۃ الرجل مع زوجتہ وقوسہ وفرسہ لانہٗ یصد عن الجمع والجماعات وسبب لوقوع فی فواحش الکلام۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۸۹ کتاب الکراھیۃ) [1]

شطرنج کھیلنا

سوال:۔ بعض لوگ شطرنج کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں، تو کیا شطرنج کھیلنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس کام میں دین اور دنیا کا فائدہ نہ ہو بلکہ قیمتی وقت ضائع ہوتا ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کاموں سے مسلمانوں کو منع فرمایا ہے، شطرنج چونکہ ایسا ہی ایک کھیل ہے جس میں سوائے تضیع اوقات اور خواہش پرستی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا لہٰذا اس قسم کے کھیل سے بچنا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ویکرہ اللعب بالشطرنج والنرد والاربعۃ عشر لقولہ علیہ السلام کل لعب حرام الّا ملاعبۃ الرجل مع زوجتہ وقوسہ وفرسہ لانہ یصد عن الجمع والجماعات وسبب لوقوع فی فواحش الکلام۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۸۹ کتاب الکراھیۃ) [2]

جوڈو کراٹے کھیلنا

سوال:۔ آجکل بعض مقامات میں جوڈو کراٹے سیکھنے کے مراکز کھلے ہوئے ہیں، اس کے سیکھنے سے بدن کو قوت اور مضبوطی ملتی ہے اس کھیل میں اگر آدمی اس غرض سے حصہ لے کہ صحت اور جسم کو مضبوط بنا کر جہاد میں حصہ لے سکوں تو کیا اس کا کھیلنا جائز ہوگا؟

الجواب:۔ انسان پر دیگر حقوق کے علاوہ اپنی صحت کا بھی حق ہے، اگر انسان کی صحت ہی خراب ہو تو باطل قوتوں کا مقابلہ تو درکنار عبادات بھی بطریق احسن ادا نہیں کر سکے گا،

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: وکرہ کل لھو لقولہ علیہ السلام کل لھو حرام الّا ثلاثۃ۔ الخ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۹۵ کتاب الکراھیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البدائع الصنائع ج ۵ ص۱۲۸ کتاب الاستحسان۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: والشطرنج وانما کرہ لان من اشتغل بہ ذھب عناؤہ الدنیوی وجاءہ الغناء الاخروی فھو حرام وکبیرۃ عندنا۔

(رد المحتار ج ۶ ص۳۹۴ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۲۸ کتاب الاستحسان۔

جوڈو کراٹے میں چونکہ صحت کا فائدہ ہے، لہٰذا اگر پردہ اور شرعی حدود و قیود کا اہتمام کرتے ہوئے اس میں حصہ لیا جائے تو جائز ہے بلکہ ثواب کی بھی امید ہے کیونکہ باطل قوتوں اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں تیاری پر مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) [1]

کھیل کود میں رانوں کو کھلا رکھنے کا حکم

سوال: بعض کھیلوں مثلاً پی ٹی اور کبڈی وغیرہ میں عورتِ غلیظہ کے علاوہ رانوں کو ننگا رکھنا پڑتا ہے جس پر لوگوں کی نظریں پڑتی ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مرد کے لیے ناف سے گھٹنوں تک عورت (پردہ) ہے جس کا چھپانا شرعاً لازمی ہے، ان حدود کو کھلا رکھنا اور لوگوں کو دکھانا معصیت ہے اس لیے کھیل کود کے وقت اس کے چھپانے کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ شیخ الاسلام ابو بکر بن علی الحداد الیمنیؒ: قوله ینظر الرجل من الرجل الی جمیع البدن الا ما بین سرته الی رکبته) لقوله علیه السلام لعلیؓ لاتنظر الی فخذ حی ولا میت۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۳۸۵ باب الحظر والاباحة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ویکره اللعب بالشطرنج والنرد والاربعة عشر لقوله علیه السلام کل لعب حرام الا ملاعبة الرجل مع زوجته وقوسه وفرسه لانه یصد عن الجمع والجماعات وسبب لوقوع فی فواحش الکلام۔
(البحر الرائق ج ۸ ص ۱۸۹ کتاب الکراهیة)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۲۸ کتاب الاستحسان۔

[2] قال العلامة علی بن سلطان محمد القاریؒ: تحت قول النبی صلی اللہ علیه وسلم لاینظر الرجل الی عورة الرجل ولا المرأة الی عورة المرأة الخ فیه بیان تحریم النظر الی مالا یجوز وعورة الرجل ما بین سرته ورکبته۔ (مرقاة شرح مشکوٰة ج ۶ ص ۱۹۵ باب النظر الی المخطوبة وبیان العورات)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۶۴ تا ۳۶۶ کتاب الکراهیة فصل فی البیع

ورزش کرنا

سوال:۔ ورزش کی نیت سے کھیل کود کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جس کھیل کود میں دینی یا دنیوی منفعت ہو تو اس کھیل میں شرعاً کوئی قباحت نہیں لیکن اگر نیت جہاد کی تیاری ہو تو موجب اجر وثواب ہے۔ تاہم ایسے کھیل سے اجتناب ضروری ہے جس میں کشفِ عورت (بے پردگی) یا کسی دوسرے حرام کا ارتکاب ہو۔

لما روی الامام مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن عائشةؓ قالت رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسترنی بردائه وانا انظر الی الحبشة وهم یلعبون۔ (الجامع الصحیح المسلم ج۱ ص۲۹۱ کتاب صلوٰة العیدین) [1]

تاش کھیلنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل ڈیروں اور پبلک مقامات میں لوگ تاش کھیلتے ہیں جسے وہ ٹرپ کہتے ہیں، اگرچہ یہ کھیلنا صرف تفریح کے لیے ہوتا ہے اور اس پر عموماً کوئی خاص شرط وغیرہ بھی نہیں لگائی جاتی لیکن لیسا اوقات اس میں چائے، حلوا وغیرہ کی شرط لگائی جاتی ہے جو کہ بازی ہارجانے والے کے ذمہ ہوتا ہے، کیا شرعاً ایسا کھیل جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر ذہنی ورزش یا تفریح کیلئے تاش کھیلا جاتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ ہار جیت پر شرط لگانا صحیح نہیں، اس صورت میں یہ کھیل قمار کے حکم میں داخل ہو جاتا ہے جو کہ شرعاً حرام ہے۔

لماقال العلامة مولانا اشرف علی التھانویؒ: اگر ہار جیت (پر شرط) نہ ہو تو جائز ہے۔

{(امداد الفتاوی ج۴ ص۲۵۲ کتاب الخطر والاباحة غناء، مزامیر اور لہو ولعب کے احکام}

○

---

[1] لما رواہ الامام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ: عن عائشة انها كانت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر قالت فسابقته فسبقته علی رجلی فلما حملت اللحم سابقته فسبقنی فقال هذہ بتلك السبقة۔ (سنن ابی داؤد ج۱ ص۳۴۸ باب فی السبق علی الرجل)

ومثله فی رد المحتار ج۶ ص۴۰۳ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع۔

بَابُ الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیِ عَنِ الْمُنْکَر

(امر بالمعروف والنہی عن المنکر کا بیان)

تبلیغِ دین فرضِ کفایہ ہے

سوال:- کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

الجواب:- خلقِ خدا کو اوامر کی دعوت دینا اور نواہی سے منع کرنا شرعاً فرضِ کفایہ ہے جو کہ بعض کے انجام دینے سے کل کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، فرضِ عین کی رائے رکھنا خطاء پر محمول ہے، تاہم اپنے آپ کو رذائل سے پاک کرنا فرضِ عین ہے۔

لما قال حجۃ الاسلام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاصؒ: قال ابوبکر قد حوت هٰذه الآیۃ معنیین احدهما وجوب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر والآخر انه فرض علی الکفایۃ لیس بفرض علی کل احد فی نفسه اذا قام به غیره لقوله تعالیٰ (ولتکن منکم امۃ) وحقیقته تقتضی البعض دون البعض فدل علیٰ انه فرض علی الکفایۃ اذا قام به بعضهم سقط عن الباقین۔ (احکام القرآن ج۲ ص۳۱۵ باب فرض الامر بالمعروف)[1]

مستورات کی تبلیغی جماعات کا حکم

سوال:- دورِ حاضر میں تبلیغی جماعت والے مستورات کی اصلاح اور تبلیغِ دین کے لیے خواتین کی جماعتیں نکالتے ہیں جبکہ خواتین کے ساتھ ان کے اپنے محارم اور دیگر حدود شرعیہ و پردے کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، کیا ان شرعی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے مستورات کا تبلیغِ دین کے لیے نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مروجہ تبلیغ کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور تعلیم و تعلم ہے جس کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت کی شرعی ذمہ داری ہے اور دونوں کو تبلیغِ دین کا حق حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ

---

[1] قال العلامۃ شهاب الدین الآلوسیؒ: منشاء الخلاف فی ذٰلک ان العلماء اتفقوا علی ان الامر بالمعروف والنهی عن المنکر من فروض الکفایات۔ (روح المعانی ج۴ ص۲۱ سورۃ آل عمران) وَمِثْلُهٗ فی الاکلیل فی استنباط التنزیل ص۵۶ سورۃ آل عمران۔

بیشمار نیک خواتین قرآن وحدیث کے علوم کی ماہرات گذری ہیں، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں خواتینِ اسلام کا جہاد میں شریک ہونا بھی ثابت ہے، اس لحاظ سے خواتین کی جہاد میں شرکت کی بناء پر تبلیغی جماعات میں خواتین کی شرکت جائز معلوم ہوتی ہے۔ تاہم پردہ، محارم اور دیگر حدودِ شرعی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

لما رواہ الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن انس قال لما کان یوم اُحد انہزم الناس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولقد رأیتُ عائشۃ بنت ابی بکر واُم سلیم وانہما مشمرتان اریٰ خدمَ سوقہما تنقزان القرب وقال غیرہ تنقلان القرب علیٰ متونہما ثمّ تفرغانہ فی افواہ القوم ثم ترجعان فتملآنہا ثم تجیئان فتفرغانہ فی افواہ القوم۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص۴۰۳ باب غزوۃ النساء وقتالہن مع الرجال)[1]

سالانہ چلّہ لگانے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص اپنی اصلاح وتحصیلِ علم کے لیے تبلیغ میں سالانہ چلّہ لگاتا ہے تو کیا تحصیلِ علم واصلاح کے لیے مزدوری چھوڑ کر چلّے کے لیے نکلنا بہتر ہے یا نہیں؟

الجواب:- چوبیس گھنٹے زندگی کو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق گذارنے کے لیے ضروری احکامات کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وزن پر فرض ہے، اس کے علاوہ دیگر علوم کی تحصیل نفلی عبادات سے افضل ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ضروری علوم کے علاوہ مزید علم کی تحصیل اور اصلاحِ نفس کے لیے سالانہ چلّہ لگانا چاہے اور اس سے اہل وعیال کا نان نفقہ متاثر نہ ہوتا ہو تو اس کے لیے تبلیغ میں سالانہ چلّے پر جانا بہتر ہے۔

لما قال العلامۃ ابن البزاز الکردریؒ: طلب العلم والفقہ اذا صحت النیۃ افضل اعمال البر وکذا الاشتغال بزیادۃ العلم اذا صحت النیۃ لأنہ اعم نفعاً لکن بشرط أن لا یدخل النقصان فی فرائضہ۔ (الفتاویٰ البزازیۃ علیٰ هامش الهندیۃ ج ۶ ص۳۷۸ کتاب الکراهیۃ)[2]

---

[1] لما ورد فی الحدیث:- وعن انسؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغزو بامّ سلیم ونسوۃ من الانصار معہٗ اذا غزا فیسقین الماء ویداوین الجرحیٰ۔ (الصحیح المسلم ج ۲ ص۱۱۶ باب غزوۃ النساء مع الرجال)
وَمِثْلُہٗ فی شرح کتاب السیر الکبیر ج ۱ ص۱۸۵ باب قتال النساء مع الرجال۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: طلب العلم والفقہ اذا صحت النیۃ افضل من جمیع اعمال البر وکذا الاشتغال بزیادۃ العلم اذا صحت النیۃ لأنہ اعم نفعاً لکن بشرط أن لا یدخل النقصان فی فرائضہ۔ (رد المحتار ج ۶ ص۴۰۷ کتاب الحظر والاباحۃ۔ فصل فی البیع)

مروجہ طریقہ تبلیغ میں انچاس کروڑ کا ثواب | **سوال**: تبلیغی جماعت وقت لگانے پر ایک نیکی پر انچاس کروڑ نیکیوں کا ثواب ملنے کا بتایا جاتا ہے، شرعاً اس کا ثبوت کیا ہے؟

الجواب:۔ تبلیغ کے لیے وقت لگانے پر انچاس کروڑ تک تضاعفِ اعمال کا مسئلہ دو احادیث کے ضرب دینے سے ثابت ہے لیکن یہ زیادت مطلقاً فی سبیل اللہ نکلنے سے وابستہ ہے اس کو محض تبلیغی جماعت میں وقت لگانے کے ساتھ خاص کرنا مناسب نہیں۔

لما رواہ الامام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ فی سننہ، عن سہل بن معاذ عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الصّلوٰۃ والصّیام والذکر تضاعف علی النفقۃ فی سبیل اللہ عزوجل بسبعمائۃ ضعف۔ (سنن ابی داؤد ج۲ ص۳۳۸)

ورواہ ابوعبد اللہ محمّد بن یزید بن ماجۃؒ فی سُننہ:۔ عن علیؓ ابن ابی طالب وابی الدرداءؓ وابی ھریرۃؓ وابی اُمامۃ الباھلیؓ وعبد اللہ بن عمرؓ وجابر بن عبد اللہؓ وعمران بن الحصینؓ کلھم یحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ قال من ارسل بنفقۃ فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ فلہٗ بکل درھم سبع مائۃ درھم ومن غزیٰ بنفسہٖ فی سبیل اللہ وانفق فی وجہ ذٰلک فلہٗ بکل درھم سبع مائۃ الف درھم ثمّ تلا ھٰذہ الاٰیۃ واللہ یضاعف لمن یشاء۔ (سنن ابن ماجۃ ص۱۹۸ باب من جھز غازیًا)[1]

---

[1] وقد ذکرہ الشیخ العلامۃ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ:۔ عن عمران بن الحصین عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من ارسل بنفقۃ فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ فلہ بکل درھم سبعمائۃ درھم ومن غزیٰ بنفسہٖ فی سبیل اللہ وانفق فی وجھہ ذٰلک فلہٗ بکل درھم یوم القیامۃ سبعمائۃ الف درھم ثمّ تلا ھٰذہ الاٰیۃ واللہ یضاعف لمن یشاء۔

وعن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم النفقۃ فی سبیل اللہ تضاعف سبعمائۃ ضعف۔ (الدُّر المنثور ج۲ ص۳۳۶ سورۃ آل عمران)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر القرآن لابن کثیرؒ ج۱ ص۳۱۷ سورۃ آل عمران۔

تبلیغی جماعت کو فرقہ جبریہ سے تعبیر کرنا درست نہیں

سوال:۔ تبلیغی جماعت کو کفریہ، جبریہ فرقوں سے تعبیر کرنا کیسا ہے، اور کہنے والے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تبلیغی جماعت فی زمانہ ایک فعال دینی جماعت ہے، اس کی ہر کوشش خلقِ خدا کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہے، اس کو فرقہ جبریہ و کفریہ وغیرہ سے تعبیر کرنا ضلالت اور گمراہی ہے اور ایسا کہنے والے پر کفر کا خطرہ ہے جو موجبِ تعزیر ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: اذا قذف مسلماً بغير الزنا فقال يا فاسق او يا كافر او يا خبيث او يا سارق لانه اذاه والحق الشين به ولا مدخل مقياس في الحدود فوجب التعزير۔ (الهداية ج۲ ص۱۸۳ كتاب الحدود) [1]

تبلیغی چلّے کی حقیقت

سوال: آجکل تبلیغی جماعت والے تبلیغ میں چلّہ لگانے پر بہت زور دیتے ہیں، کیا تبلیغ کے لیے دنوں کی یہ تعداد قرآن و سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ روحانی امراض سے شفاء کیلئے ضروری ہے کہ طبیعت میں تبدیلی پیدا ہوجائے، چونکہ تبلیغ میں چلّہ یعنی چالیس دن لگانے والے میں کافی تبدیلی آجاتی ہے اسلئے تبلیغ والے چلّہ لگانے پر زور دیتے ہیں، یہ کوئی واجب، سنت یا فرض نہیں بلکہ صرف روحانی علاج کیلئے چلّہ مقرر کیا گیا ہے، جس طرح چالیس دن تک تکبیرِ اُولیٰ سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے تبدیلی رونما ہوتی ہے اسی طرح تبلیغ میں چلّہ لگانے سے بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

لما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلّى لله اربعين يوماً في جماعة يدرك التكبيرة الاولىٰ كتب له برأتان براءة من النار وبراءة من النفاق۔ (مشكوٰة ج۱ ص۱۰۲ باب ما على الماموم من المتابعة وحكم المسبوق۔ الفصل الثاني)

---

[1] قال العلامة سراج الدين علي بن عثمانؒ: اما اذا قال لآخر يا فاسق او يا بليد او يا اكل الربوٰا...... او يا كافر او يا خبيث او يا فاجر يعزر وخيار التعيين الى الامام۔ (الفتاوىٰ السراجية ص۶۱ كتاب الحدود)

ومثله في الجوهرة النيرة ج۲ ص۲۵۳ كتاب الحدود۔ فصل في التعزير۔

تبلیغی جماعت کا طریقہ بدعت نہیں

سوال ۔ (۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین موجودہ طریقہ تبلیغ کے بارے میں کہ کیا اس طریقہ سے تبلیغ بدعت سیئہ ہے ۔ یا نا جائز ہے ہمارے علاقے میں ایک مولوی ہے جو موجودہ طریقۂ تبلیغ کو بدعت سیئہ کہتا ہے ۔ اور لوگوں کو اس سے منع کرتا ہے ۔ اور تبلیغ والوں کو مسجد سے نکالتا ہے ۔ اس مولوی کا یہ عمل اور قول خلاف شرع ہے یا موافق شریعت ہے ۔ اگر خلاف شریعت ہو ۔ تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں ؟

(۲) کیا تبلیغی جماعت اہل سنت والجماعت میں نہیں ہے کیا تبلیغی جماعت ضال اور مضل ہے اور گمراہ فرقہ ہے ۔ ہمارے علاقے میں عالم موصوف تبلیغی جماعت کو اہل سنت والجماعت میں شمار نہیں کرتا ہے ۔ اور تبلیغی جماعت کو فرقہ گمراہ کہتا ہے اور ضال اور مضل تصور کرتا ہے ۔ کیا اس عالم کا یہ کہنا شریعت کی رو سے صحیح ہے یا غلط ؟ اس کے مقابلے میں دیگر علماء تبلیغ والوں کے احترام کرتے ہیں ۔ اور اس طریقہ سے تبلیغ کو جائز کہتے ہیں اور تبلیغی جماعت کو اہلسنت والجماعت میں شمار کرتے ہیں ؟

الجواب : دین کی اشاعت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے سعی اور کوشش کرنا امر خداوندی ہے اس کی تعمیل لوگوں کے ذمے لازمی ہے ، اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر کئی مقامات پر اس ذمہ داری کا مسلمانوں کو احساس دلایا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

(۱) ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئك ھوالمفلحون (الآیۃ)

(۲) دوسری جگہ ارشاد ہے :

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (الآیۃ)

(۳) اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے ۔

ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً (الآیۃ)

ان آیات کے علاوہ اور بھی آیات موجود ہیں جن سے اس امر کی ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے ، اس لیے حضرات مفسرین نے وضاحت کے ساتھ اس کو فرض کفایہ لکھا ہے ، کما قال العلامۃ محمود الآلوسیؒ : ان العلماء اتفقوا علی ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر من فروض الکفایات ولم یخالف وذلك الا النزر روح المعانی ۴/۲۰

اور علامہ ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں۔

فی ھذہ الآیۃ وفی التی بعدھا وھی قولہ تعالیٰ (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) دلیل علی ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فرض علی الکفایۃ۔ (احکام القرآن ۲/۴۹)

اسی طرح علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ لکھتے ہیں۔

قال ابوبکر قد حوت ھذہ الآیۃ معنیین احدھما وجوب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر والآخر انہ فرض علی الکفایۃ (احکام القرآن ۲/۳۱۵)

اور یہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر سب کے لیے ہے چاہیئے کفار ہو یا مسلمان یہی حکم اکابر مفسرین کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے، چنانچہ علامہ سید محمود الالوسیؒ فرماتے ہیں۔

یدعون الی الخیر: المراد من الدعاء الی الخیر الدعاء الی ما فیہ صلاح دینی او دنیوی: روح المعانی ۴/۲۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

دعا الی اللہ ای الی توحیدہ تعالیٰ وطاعتہ والظاھر العموم فی کل داع الیہ تعالیٰ روح المعانی ۱۲/ ۱۸۸-

اسی طرح علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں۔

یدعون الی الخیر ای خیر العقائد والاخلاق والاعمال التی فیھا صلاح الدین والدنیا؛ تفسیر مظھری ۲/۱۱۴-

اور بندہ سبیلی کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

الدعوۃ الی التوحید والاعداد للمعاد؛ تفسیر مظھری ۵/۲۰۶

اسی طرح دعا الی اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومال الی اللہ ای الی عبادۃ اللہ وتوحیدہ۔ (تفسیر مظھری ۸/۲۹۴)

ان کے علاوہ تفسیر بیان القرآن تفسیر عثمانی، اور تفسیر معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ وغیرہ تفاسیر میں بھی اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ دعوت الی اللہ مسلمان اور کافر دونوں کے لیے ہے، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں۔

پھر دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت

دنیا ہے ، مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دنیا کے تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے ..... دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعت خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے اور فریضہ الی الخیر انجام دے ۔

(معارف القرآن ۲ / ۱۴۰ ، ۱۴۱)

اور نہ ہی طریقہ کار کوئی انوکھا ہے بلکہ سلف صالحین اور دور صحابہ میں اس طرز عمل کی مثالیں موجود ہیں ، چنانچہ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے لکھا ہے تبلیغی جماعت جس طرز پہ دعوت الی اللہ کا کام کر رہی ہے یہ سنّت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور طریقہ سلف صالحین کے عین مطابق ہے ۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۹ / ۲۶۳)

مفتی دار العلوم دیوبند مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے جواب سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے چنانچہ جب آپؒ سے تبلیغ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا ۔

الجواب : حامداً و مصلیاً تبلیغ دین ہر زمانے میں فرض ہے ، اس زمانہ میں بھی فرض ہے لیکن فرض علی الکفایۃ ہے ، جہاں جتنی ضرورت ہو اسی قدر اس کی اہمیت ہوگی اور جس جس میں جیسی اہلیت ہو اس کے حق اسی قدر ذمہ داری ہوگی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صراحت قرآن کریم میں ہے ، سب سے بڑا معروف ایمان اور سب سے بڑا منکر کفر ہے ، ہر مومن اپنی اپنی حیثیت کے موافق مکلف ہے کہ خدا سے پاک کے نازل فرمائے ہوئے دین کو حضرت رسول مقبول کی ہدایت کے موافق پہنچایا ہے ۔ (فتاوی محمودیہ ۱۲ / ۲۴۶)

اسی بناء پر اکابر علماء دیوبند نے اس کام کی تعریف کی اور اس کو ضروری قرار دیا ہے ۔

مفتی ہند مفتی کفایت اللہ صاحب نے لکھا ہے ۔

کہ یہ تحریک (تبلیغی جماعت) اصل حقیقت کے اعتبار سے تو اسلام کی بنیادی چیز ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں کو پہنچایا اور ان کے گھروں پر جاکر خود پہنچانا اصل تبلیغ ہے (کفایت المفتی ۲ / ۹)

حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کے اس تحریک کو ان الفاظ سے سراہا ہے ۔

کہ مولانا الیاسؒ نے یاس کو آس سے بدل دیا ہے ۔

(مولانا الیاس اور ان کی دعوت ۱۱۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میرے محترم بزرگ یہ جماعت تبلیغیہ نہ صرف ایک ضروری اور اہم فریضہ کی حسب استطاعت انجام دہی کر رہی ہے بلکہ اس کی بھی سخت محتاج ہے کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے اوران کو خود بھی مسلمانوں سے رابطہ قوی پیدا ہو اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کا قوی جذبہ پیدا اوران کو مذہبی احساسات کی سر گرمی کی طرف چلایا جائے جس سے مستقبل میں نہایت اعلیٰ درجے کے نتائج اور ثمرات کی قوی امیدیں پیدا ہوتی ہیں۔ بنابریں میں امیدوار ہوں کہ آئندہ اس میں پوری جدوجہد کو کام میں لایا جاوے اوران کی ہمت افزائی کی صورتیں عمل میں لائی جاویں والسلام حسین احمد غفرلہ ۱۶ صفر ۱۳۶۱ھ

(تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات ص۴۴)

ایک اور مکتوب میں (جو آپؒ نے پہلی بار تبلیغی جماعت کو جو افغانستان جا رہی تھی اپنے تلامذہ کے نام دیا تھا) فرماتے ہیں

عرض ان کہ حاملین عریضہ ہمارے چند احباب خدمات عالیہ میں حاضر ہو رہے ہیں ان کا مقصد کوئی سیاسی اور ملکی نہیں ہے فقط خدمات دینیہ اور فرائض تبلیغیہ ادا کرنا ہے اور مسلمانان افغانستان کو وہ مقصد یاد دلانا جس کو عام مسلمانوں نے بھلا دیا ہے مقصود ہے، امید کہ آپ حضرات ان کی امداد و اعانت میں کوتاہی روا نہ رکھیں گے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ممکن تسہیلات سے دریغ نہ فرمائیں گے والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ (تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات ص ۴۵)

ان کے علاوہ شاہ عبدالقادر رائیپوری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور احمد نعمانی مولانا مفتی محمد شفیعؒ مولانا محمد ذکریا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ وغیرہ نے بھی اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے اور اس کو اشاعت دین کا اہم ذریعہ قرار دیا ہے ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے اور اس میں بیانات کیے، لوگوں کو اس جماعت میں شامل ہونے کی تلقین فرمائی، تو اس کے باوجود بھی اس کو بدعت سیئہ لکھنا جہالت اور ناسمجھی کی دلیل ہے، بدعت سیئہ پر تو ایجاد امر کو نہیں کہا جاتا بلکہ بدعت سیئہ یہ وہ امر ہوتا ہے جس کے لیے شریعت مقدسہ میں کوئی اصل و بنیاد نہ ہو، اکابرین امت نے بدعت کی یہ تعریف کی ہے اور یہ تعریف چاروں مذاہب کا متفقہ تعریف ہے۔

چنانچہ علامہ ابن حجرؒ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والبدعة اصلها ما احدث على غير مثال سابق وتطلق في الشرع في مقابل

السنة فتكون مذمومة (فتح الباری ۴/ ۲۱۹)

اور علامہ زبیدی حنفی فرماتے ہیں۔

کل محدثۃ بدعۃ انما یرید ما خالف اصول الشریعۃ ولم یوافق السنۃ۔
(تاج العروس ۵/ ۲۷۱)

علامہ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں۔

المراد بالبدعۃ ما احدث مما لا اصل لہ فی الشریعۃ یدل علیہ واما ما کان لہ اصل من الشرع یدل علیہ فلیس ببدعۃ شرعاً وان کان بدعۃ لغۃ (جامع العلوم والحکم ص ۱۹۳)

اسی طرح علامہ قرطبی اور شیخ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں۔

کل بدعۃ صدرت من مخلوق فلا یخلو ان یکون لہا اصل فی الشرع ام لا فان کان لہا اصل فہی فی خیز المدح ویعضدہ قول عمر نعمت البدعۃ ہذہ والا فہی فی خیز الذم والانکار۔ (تفسیر قرطبی ۲/ ۸۷ و تفسیر صابونی ۱/ ۹۲)

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ تبلیغ کرنا مسلمانوں کو دین کی دعوت دینا ان کو نمازی، حاجی اور پابند صوم و زکاۃ بنانا اور اس کے لیے کوشش کرنا فرض کفایہ اور دینی ضروریات میں سے ہے، سلف صالحین اور صحابہ کرام سے ایسا کرنا ثابت ہے اس لیے اس کو بدعت سیئہ کہنا ضرور عناد یا جاہلیت و ناسمجھی کے سوا کچھ نہیں یہ کام نہ بدعت ہے اور نہ اس میں بدعت ہونے کا کوئی شبہ ہے ورنہ کبھی بھی اکابر علماء اس کو سرانجام نہ دیتے، لہذا ان لوگوں کو مساجد سے روکنا اور ان کو منع کرنا ان کو مسجد سے نکالنا وغیرہ گناہ ہے اور مانع عن الخیر کی قبیح صفت سے موصوف ہونے کے مترادف ہے، اس امر کا مرتکب شخص فاسق و فاجر ہے اس لیے اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں۔

(۲) گذشتہ تفصیل سے خوب واضح ہوا ہے کہ یہ جماعت اہل السنۃ والجماعۃ میں داخل جماعت ہے اس کو ضال اور مضل کہنا جاہلیت کی دلیل ہے یہ ایک حق جماعت ہے جو دین کی اشاعت کے لیے مصروف عمل ہے، ان کا احترام کرنا چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی ہر مسلمان کا فریضہ مذہبی ہے،

واللہ اعلم وعلمہ

باب مسائل المتفرقة
(متفرق مسائل کے بیان میں)

والدین کو گالی دینے والے کا حکم | سوال:- والدین کو گالی دینے والے کا کیا حکم ہے؟
الجواب:- اسلام میں جب کسی عام مسلمان کو گالی دینا موجبِ فسق ہے تو والدین کو گالی دینا تو بدرجۂ اولیٰ عظیم گناہ ہے، اس فعلِ بد کا ارتکاب قرآن مجید کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا.... وَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا۔ (سورۃ الاسراء آیت ۲۱) [1]

گالی گلوچ کرنے والے کا حکم | سوال:- کسی مسلمان کو گالی دینے والے کا کیا حکم ہے؟
الجواب:- کسی مسلمان کو بے عزت اور سب وشتم کرنا موجبِ فسق وگناہِ کبیرہ ہے اور گالی دینے والا فاسق وگنہگار ہو جاتا ہے۔

لما رواہ الامام ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذیؒ: عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوقٌ وقتالہ کفر۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۱۹ باب ماجاء فی الشتم) [2]

---

[1] لما رواہ الامام ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذیؒ: عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الکبائر ان یشتم الرجل والدیہ قالوا یارسول اللہ وھل یشتم الرجل والدیہ قال نعم یسبُّ ابا الرجل فیسب اباہ ویشتم امہ فیشتم اُمہ۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۱۲ باب ما جاء فی عقوق الوالدین)
وَمِثْلُہٗ فی مشکوٰۃ المصابیح ج۲ ص۴۱۹ باب البر والصلۃ، الفصل الاوّل۔

[2] رواہ الامام محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ: عن عیاض بن حماد قال قلتُ یا رسول اللہ الرجل یسبنی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المستبان شیطانان یتہاتران ویتکاذبان۔ (ادب المفرد ص۱۱۵ باب سباب المسلم)
وَمِثْلُہٗ فی شرح المسلم للنووی ج۲ ص۳۲۱ باب النھی عن السباب۔

والدین میں سے کسی ایک کے حکم سے دوسرے سے حسن سلوک نہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص کے ماں باپ کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ناراض ہیں، باپ بیٹے کو ماں سے حسن سلوک بند کرنے پر مجبور کرتا ہے جبکہ درمیان میں کوئی شرعی مقاطعہ بھی نہیں، تو کیا بیٹے کے لیے باپ کے حکم سے ماں کے ساتھ حسن سلوک بند کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت نے اولاد کے لیے والدین کو حسن سلوک اور تعاون میں برابر کے شریک قرار دیئے ہیں جبکہ بعض احادیث کی روشنی میں والدہ زیادہ حسن سلوک کی مستحق ہے، لہٰذا والد کے کہنے سے بیٹے کے لیے والدہ سے حسن سلوک سے پیش نہ آنا نامناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مختلف مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں کسی ایک کی تخصیص نہیں فرمائی ہے لہٰذا دونوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور فرمانبرداری کرنا ضروری ہے۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۱) [1]

بلا کسی شرعی عذر کے والدین کے حکم سے بیوی کو طلاق دینا

سوال:۔ ایک شخص کے والدین اس سے اپنی بیوی کی طلاق کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کی بیوی رہائش کے لیے علیحدہ مکان چاہتی ہے اور اپنے شوہر کے والدین سے جُدا ہونا چاہتی ہے، تو کیا یہ شخص اپنی بیوی کی بات مان کر والدین سے جُدا ہو جائے یا والدین کی بات مان کر بیوی کو طلاق دے دے؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ ہر انسان پر والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے اور حتی الامکان اپنے والدین کی فرمانبرداری کرنا ضروری ہے، لیکن بعض اوقات اگر والدین خواہ مخواہ سخت مزاجی سے پیش آئیں اور

---

[1] قال اللہ تبارك وتعالیٰ: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۱)

بغیر کسی شرعی عذر کے بیٹے کو مجبور کریں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو والدین کی یہ بات نہ ماننے میں شرعاً کوئی مواخذہ نہیں اور جہاں تک مذکورہ معاملہ میں والدین کے مطالبہ پہ بیوی کو طلاق دینے کا تعلق ہے تو شریعت نے عورت کو علیحدہ رہائش اور نفقہ کے مطالبہ کا حق دیا ہے اور اس کی حق تلفی کرنا گناہ ہے، لہٰذا بیوی کے حقوق پورا نہ کرتے ہیں والدین کی بات نا ننا گناہ ہے اور معصیتِ خالق (نافرمانی) میں اطاعتِ مخلوق کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا شخص مذکور کے لیے بیوی کے حقوق پورے کرنا لازمی ہے اور اس کے والدین کو بھی نرمی کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

لما فی الهندیة: تجب السکنیٰ لها علیه فی بیتٍ خالٍ عن اهله واهلها الّا ان تختار ذٰلك ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۵۵۶ البابُ السابع عشر فی النفقات الفصل الثانی فی السکنیٰ) [1]

والدین کی نافرمانی بدترین جرم ہے

سوال:۔ ایک آدمی اپنے بوڑھے اور ضعیف والدین کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ ان کی نافرمانی، توہین اور سب وشتم بھی کرتا ہے، تو ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ والدین کی نافرمانی اور ان کی گستاخی کرنا شریعت میں بدترین جُرم اور دُنیوی و اُخروی تباہی و بربادی کا باعث ہے اور ان کی خوشنودی اور تابعداری جنت میں داخلے کا ذریعہ و سبب ہے، بلکہ حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنّت کو تحت اقدام الاُمّہات قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی باپ کی خوشنودی سے جوڑ رکھی ہے۔ تو والدین کا نافرمان یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا مجرم ہے اور ایسا شخص سزا کے قابل ہے، البتہ دُنیا میں زجر و سزا رائے الامام کے حوالے ہے وہ جتنا اور جیسا مناسب سمجھے وہ ہی بہتر ہو گا۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: تجب السکنیٰ لها علیه فی بیتٍ خالٍ عن اهله و اهلها الا ان تختار ذٰلك ۔ (خلاصة الفتاوی ج ۲ ص۵۲ کتاب النکاح الفصل الخامس عشر فی الحظر والاباحة)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج ۱ ص۴۲۴ باب النفقة ۔

لما قال اللہ تعالیٰ : وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۱) [1]

علمِ دین کے حصول کے لیے والدین کی اجازت کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کو علومِ دینیہ حاصل کرنے کا بڑا شوق ہے، جبکہ اس کا کچھ نہ کچھ کاروبار بھی ہے اور کاروبار کے علاوہ بھی اُسکی مالی حالت اچھی ہے، تو کیا یہ شخص بلا اجازتِ والدین حصولِ علم کے لیے جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور نکلنے سے والدین کی نافرمانی تو نہیں ہوگی؟

الجواب :۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق علمِ دین کا حصول ہر مسلمان مرد وعورت کی ذمہ داری ہے، کم از کم اتنا علم ہو کہ دین کی بنیادی ضرورتوں سے آگاہ ہو سکے اور اس کے لیے والدین کا منع کرنا کوئی شرعی عذر نہیں بلا اجازتِ والدین بھی بالغ بیٹا حصولِ علم کے لیے سفر کرسکتا ہے اور صورتِ مذکورہ میں والدین کے ضعف اور محتاج نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیٹا عاق اور نافرمان بھی نہ ہوگا

لمافی الھندیۃ :رجل خرج فی طلب العلم بغیر اذن والدیہ فلا بأس بہ ولم یکن ھٰذا عقوقاً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۶۶ الباب السادس والعشرون فی الرجل یخرج الی السفر... الخ) [2]

---

[1] لما ورد فی الحدیث : عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل الذنوب یغفر اللہ منھا ماشاء الا عقوق الوالدین فانہ یعجل لصاحبہ فی الحیٰوۃ قبل الممات۔

(مشکوٰۃ المصابیح ج۲ ص۴۲۱ باب البر والصلۃ)

وَمِثْلُہٗ رواہ انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۲ ص۴۲۱ باب البر والصلۃ)

[2] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : ولو خرج لطلب العلم بلا اذن ابویہ لایصیر عاقاً کماذکرنا فی الخزانۃ ۔(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۲۷ کتاب الکراھیۃ)

وَمِثْلُہٗ قال العلامۃ شبیر احمد العثمانیؒ فی الفتح الملھم ج۱ ص۲۵۲ باب الکبائر واکبرھا۔

کسی مسلمان کو بُرے القابات سے پکارنا

سوال :۔ اگر کوئی شخص بلا کسی شرعی وجہ کے دوسرے مسلمان کو فاسق اور فاجر کے القاب سے متہم کرے تو ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت اور آبرو کی حفاظت لازمی ہے اور ایسے بُرے القاب اور بیہودہ کلمات جن سے مسلمان کی عزت پر حرف آتا ہو، اس سے بھی پرہیز از حد ضروری ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسے فسق وفجور والے القابات سے کسی کو متہم کرنے سے منع فرمایا ہے، کسی مسلمان کو فاسق اور فاجر کہنے والا شخص قابلِ تعزیر ہے، اس بارے میں فقہاء نے فرمایا ہے کہ یہ سزا حاکم کی صوابدید پر مبنی ہے وہ جیسا مناسب سمجھے سزا دے سکتا ہے البتہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں، اور اگر واقعی یہ فاسق اور فاجر ہو تو یہ بہت بُرا کام ہے لیکن ایسا کہنے والے پر تعزیر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ : وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۔ (سورۃ الحجرات آیت ۱۱) [۱]

مسلمان کی توہین اور استہزاء کرنا

سوال :۔ ایک شخص بلا کسی وجہ کے مسلمان کا مذاق اڑاتا ہے، ان کی عدم موجودگی میں ان کا تمسخر اڑاتا ہے، ایسے شخص کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ قرآن وحدیث کی رُو سے ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کا استہزاء اور تمسخر کرنا سخت گناہ ہے، خواہ عالم ہو یا جاہل ہو، گناہ گار ہو یا پرہیزگار، اس کا مذاق اڑانا شرعاً ممنوع ہے۔ سورۃ الحجرات میں جو اخلاقی تعلیمات بیان

---

[۱] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ : لو قال لآخر یا دیوث یا فاسق یا فاجر لا یجب الحد لکن یعزر ہٰذا اذا قال للصالح اما اذا قال للفاسق یا فاسق حذف یسیر لا یجب شئ واختیار التعزیر الی رأی الامام من واحد الی تسع وثلاثین ۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۴۳ کتاب الحدود)
ومثلہٗ فی بدائع والصنائع ج ۷ ص ۶۴ کتاب الحدود۔

کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دے کر اس کے تمسخر اور مذاق سے منع فرمایا ہے، ایسے شخص کے لیے بروز قیامت سخت سزا ہو گی۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ۔

(سورۃ الحجرات آیت ۱۱) [1]

اِستمناء بالید کا حکم

سوال:۔ استمناء بالید (ہاتھ سے جنسی تسکین حاصل کرنا) کے مرتکب کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق استمناء بالید بدون عذرِ شدید کے حرام وناجائز ہے اور ایسا کرنے والا مستحقِ تعزیر ہے، تاہم اگر کسی فتنے میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اھون البلیتین کی رُو سے رخصت کا امکان ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: الاستمناء حرام وفیہ التعزیر۔ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: وتحت قولہ (الاستمناء حرام) ای بالکف اذا کان الاستجلاب الشھوۃ اما اذا غلبتہ الشھوۃ ولیس لہٗ زوجۃ ولا اَمۃ ففعل ذٰلک لتسکینھا فالرجاء انہٗ لاوبال علیہ۔

(رد المحتار ج۴ ص۲۷ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر) [2]

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتحاسدوا ولاتناجشوا ولاتباغضوا ولاتدابروا ولایبع بعضکم علیٰ بعضٍ وکونوا عباد اللہ اخوانا المسلم اخ المسلم لایظلمہ وَلایخذلہ ولایحقرہ التقوٰی ھٰھُنَا ویشیر الیٰ صدرہ ثلاث مرار بحسب امرءٍ من الشّرّ اَن یحقر اخاہ المسلم کُلّ المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ۔

(الصحیح المسلم ج۲ ص۳۱۷ باب تحریم ظلم المسلم)

[2] قال العلامۃ السید محمود الآلوسیؒ: وکذا اختلف فی استمناء الرجل بیدہٖ ویسمیٰ الخضخضۃ وجلد عمیرۃ فجمھور الائمۃ علیٰ تحریمہ وھو عندھم داخل فیما وراء ذٰلک قال ابن الھمامؒ: یحرم فان غلبتہ الشھوۃ ففعل ارادۃ تسکینھا بہٖ فالرجاء اَلایعاقب۔ (روح المعانی ج۸ ص۱ سورۃ المؤمنون)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر المظھری ج۶ ص۳۶۵ سورۃ المؤمنون۔

ہاتھ پاؤں چومنے کا حکم

سوال:۔ کسی قابلِ تعظیم شخص کے ہاتھ پاؤں چومنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قابلِ تعظیم شخصیات کی دست بوسی میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ بوسہ دیتے وقت رکوع یا سجدہ کی کیفیت پیش نہ آئے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: (ولا بأس بتقبیل ید) الرجل (العالم) المتورع علی سبیل التبرک۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۸۳ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی الاستبراء وغیرہ) لـه

کفار سے مصافحہ کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل مسلمان حکمران غیر ملکی دورے کے دوران وہاں کے کفار سے مصافحہ کرتے ہیں، تو کیا اسلام میں کفار سے مصافحہ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کی عزت وتکریم کی نیت سے ان سے مصافحہ کرنا ایمانی غیرت کے منافی ہے، تاہم اگر مواسات کے درجہ میں ہو یا کفار کی اسلام میں رغبت کے لیے ہو تو ان سے ہاتھ ملانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ہاتھ ملاتے وقت السلام علیکم نہ کہا جائے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ویکرہ مصافحة اهل الذمة۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۳۴ کتاب الکراهیة، نوع منه فی السلام) لـه

مرشد کے قدموں پر گرنے کا حکم

سوال:۔ بعض مریدین اور چھوٹے اپنے بڑوں یا مرشد سے ملاقات کرتے وقت اُن کے قدموں پر گر جاتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

لـه لما رواه الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن صهیب قال رأیت علیاً یقبل ید العباس ورجلیه۔ (ادب المفرد ص ۲۵۴ باب تقبیل الید والرجل۔

ومِثْلُهُ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۹۸ کتاب الحظر والاباحة۔

لـه قال العلامة الحصکفیؒ: کما کرہ للمسلم مصافحة الذمی۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۱۲ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع)

ومِثْلُهُ فی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۸ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة الخ۔

الجواب :- ماسوی اللہ کے کسی کی ایسی تعظیم کرنا جس میں رکوع کی طرح جھکنا سجدہ لغیر اللہ کے مترادف ہے جو شرعاً ممنوع و ناجائز ہے ، اس لیے فقہاء کرام نے اس قسم کی تعظیم کو مکروہ لکھا ہے ۔

لما فی الھندیۃ : ویکرہ الانحناء عند التحیۃ و بہ ورد النھی ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۶۹ الباب الثامن والعشرون فی ملاقات الملوک) [1]

حشرات الارض کو جلانے کا حکم

سوال :- حشرات الارض یعنی کھٹمل ، پسو وغیرہ کو جلانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- ذی روح اشیاء کو آگ سے جلانا یا ان پر گرم پانی ڈالنا ایک مکروہ عمل ہے اس لیے کہ تعذیب بالنار خالق حقیقی (اللہ تبارک و تعالیٰ) کا خاصہ ہے اس لیے اس عمل سے اجتناب ہی بہتر ہے ۔

لما قال العلامۃ علی بن سلطان محمد القاریؒ : واما فی شرعنا فلا یجوز احراق الحیوان بالنار الا بالاقتصاص وسواء فی منع الاحراق بالنار القمل وغیرہ للحدیث المشھور لا یعذب بالنار الا اللہ تعالیٰ ۔ (مرقاۃ المفاتیح ج۸ ص۱۳۹ باب ما یحل اکلہ و ما یحرم) [2]

مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرنا

سوال :- مساجد میں گم شدہ اشیاء کا اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں ، عبادتِ الٰہی کے علاوہ دوسرا کوئی بھی دنیاوی عمل کرنا سوءِ ادب ہے اور خصوصاً کسی گم شدہ چیز کے اعلان کے بارے میں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے ، تاہم اگر کوئی چیز مسجد ہی میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان کرنا مرخص ہے لیکن

---

[1] قال العلامۃ عبد الرحمٰن بن شیخ محمد المدعو بشیخ زادہؒ : ویکرہ الانحناء لانہ یشبہ فعل المجوس ۔ (مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر ج ۲ ص۵۴۲ کتاب الکراھیۃ فصل فی البیع)

[2] لما فی الھندیۃ : واحراق القمل والعقرب بالنار مکروہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۶۱ الباب الحادی والعشرون فیما یسع من جراحات الخ)

پھر بھی پسندیدہ عمل نہیں ہے ۔

لما رواہ الامام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ : عن شداد بن الھاد انہ سمع اباھویرۃ یقول قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من سمع رَجُلاً ینشد ضالۃ فی المسجد فَلْیَقُلْ لا ردھا اللّٰہ علیك فان المساجد لم تبن لھٰذا ۔

(الصحیح المسلم ج۱ ص۲۱۰ باب نشد الضالۃ فی المسجد) [۱]

مسجد میں سوال کرنے کا حکم | سوال :۔ مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو کچھ دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مساجد کی تاسیس اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کی گئی ہے ، اس لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے علاوہ دیگر اعمال کرنا مناسب نہیں ، تاہم سائل کو بدون ایذاء کے دینے میں کوئی حرج نہیں ، البتہ مسجد کی ضروریات ، مدرسہ اور جہاد وغیرہ کے لیے چندہ کرنا بھی مرخص ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کاموں کے لیے چندہ کرنا ثابت ہے ۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ : ویحرم فیہ السوال ۔ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : یکرہ اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخطّ رقاب الناس فی المختار ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ مکروھات الصلوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ محمد یوسف البنوریؒ : وأما انشاد الضالۃ فلہ صورتان احدھما وھی اقبح واشنع بأن یضل شئ خارج المسجد ثم ینشدہ فی المسجد لأجل اجتماع الناس فیہ والثانیۃ أن یضل فی المسجد لنفسہ فینشدہ فیہ وھٰذا یجوز اذا کان من غیر لغط و شغب ۔ (معارف السنن ج۳ ص۳۱۳ باب ما جاء فی کراھیۃ البیع والشراء وانشاد الضالۃ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی سنن ابی داؤد ج۱ ص۶۸ باب فی کراھیۃ انشاد الضالۃ فی المسجد ۔

[۲] قال العلامۃ علی بن سلطان محمد القاریؒ : ویدخل فی ھٰذا کل أمر لم یبن لہ المسجد من البیع والشراء ونحو ذٰلك وکان بعض السلف لا یریٰ ان یتصدق علی السائل المعترض فی المسجد ۔ (مرقاۃ المفاتیح ج۲ ص۱۹۹ باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ ۔

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۴ ص۱۲۶ کتاب الکراھیۃ ۔ فصل الکسب ۔

مسجد میں سونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مسجد میں بلاعذر شرعی سونا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مساجد کی تاسیس عبادت اور ذکر اللہ کے لیے کی جاتی ہے لہٰذا ان میں علاوہ عبادت اور ذکر اللہ کے اور کام مثلاً نوم (نیند) وغیرہ بلا عذر شرعی کے کرنا فقہاء کرام کے ہاں مکروہ ہے، تاہم اگر کسی شرعی عذر کی بناء پر مسجد میں سوگیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں، البتہ مسافر، معتکف اور طلباء علوم دینیہ کے لیے مسجد میں سونا جائز ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ویکرہ) وأکل ونوم إلّا لمعتکف وغریب۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۶۱ مکروہات الصلوٰۃ)

لما ورد فی الحدیث: وعن ابن عمرؓ قال کنا ننام فی المسجد علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ابن ماجۃ ص۵۴ باب تنشید المساجد) [۲]

بار بار چھینک آنا

سوال:۔ ایک شخص کو زکام لگا ہوا ہے اور بار بار اس کو چھینک آتی ہے، تو ایک دفعہ چھینک آنے پر اس کا جواب دینا تو سننے والے مسلمان کا حق ہے، لیکن اگر بار بار چھینک آئے تو کیا پھر بھی جواب میں یرحمك اللہ کہنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامیہ میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کئی حقوق مقرر کیے گئے ہیں، ان حقوق میں سے ایک چھینکنے والے کو الحمد للہ کے جواب میں یرحمك اللہ کہنا بھی ہے، لیکن اگر اس کو بار بار چھینکیں آتی ہوں تو تین دفعہ سے زائد پر جواب نہ دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، کیونکہ بار بار جواب دینے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

---

[۱] قال الشیخ عبد الغنی المجددی الدهلویؒ: (تحت قوله کنا ننام) وهذه رخصة لابن السبیل والمسافر فان ابن عمرؓ ما کان له حینئذٍ اهل واما لغیره فیکره الاعتیاد بالنوم فیه
(حاشیة ابن ماجة ج۱ ص۵۴ باب تنشید المساجد)
ومثله فی مرقاة المفاتیح ج۲ ص۱۹۷، ۱۹۸ باب المساجد ومواضع الصلوٰة۔

لمافی الھندیۃ : فان عطس اکثر من ثلاث مرات فا لعاطس یحمد اللّٰہ کل مرۃ فمن کان بحضرتہ ان شمتہ فی کل مرۃ فحسن وان لم یشمت بعد الثلاث تحسن ایضًا ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۶ الباب السابع فی السّلام وتشمیت العاطس) ؎۱

زانی کا سوشل بائیکاٹ کرنا اور نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال :۔ ایک شخص اعلانیہ طور پر کسی اجنبی عورت کو بغیر نکاح کے اپنے پاس رکھتا ہے جبکہ پورے معاشرے پر اس کی یہ قبیح حرکت واضح ہے جبکہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے اجراءِ حد مشکل ہے، تو ایسے حالات میں اس شخص کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے یا لین دین کرنے اور نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ بشرطِ صحتِ سوال اگر یہ شخص واقعی زانی ہو اور محصن بھی ہو تو شرعی شہادت کے ثابت ہونے کے بعد قابلِ رجم ہے لیکن یہ رجم کرنا قاضی اور حکومتِ اسلامیہ کی ذمہ داری ہے عوام الناس کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اس سے مالی جرمانہ لینے کی عوام کو اجازت ہے، البتہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسا اوقات مالی تعزیر (جرمانہ) کے بغیر کسی کی اصلاح ممکن نہ ہو اور قاضی مناسب سمجھے تو مالی تعزیر بھی دے سکتا ہے لیکن عوام کے لیے ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے، عوام الناس کو چاہیئے کہ ایسے شخص کا بائیکاٹ کر کے اس سے تمام تر تعلقات اور لین دین بند کر دیں اور اس کے غم وخوشی میں بھی شریک نہ ہوں تاکہ وہ اپنے اس خلافِ شریعت فعل کے ارتکاب سے باز آنے پر مجبور ہو، اور جہاں تک نمازِ جنازہ کا تعلق ہے تو علماء اہلِ سنت کے نزدیک ایک مسلمان گناہوں کا ارتکاب کرنے سے ایمان سے

؎۱ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی العطاس فوق الثلاث ان شمتوہ فحسن وان لم یفعلوا فلا بأس بہ والعاطس یحمد اللّٰہ ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۳۳۴ کتاب الکراھیۃ، نوع منہ فی اسلام)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۴۲۴ کتاب الکراھیۃ فصل فی التسبیح والتسلیم الخ۔

خارج نہیں ہوتا خواہ کبیرہ گناہ ہوں یا صغیرہ! البتہ گنہگار اور قابلِ سزا ہے، مذکورہ صورت میں جنازہ بھی پڑھایا جائے گا اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: التعزیر هو التادیب دون الحد.... لا بأخذ مال فی المذهب۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص ۶۱ باب التعزیر)[1]

کسی کو ظلم وستم سے بچانے کیلئے جھوٹ بولنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی پر ظلم وستم کا اندیشہ ہو جبکہ کذب بیانی کے بغیر اس کا دفع ہونا ناممکن ہو تو اس کو ظلم وستم سے بچانے کے لیے کذب بیانی کی شریعت میں اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جھوٹ اور کذب بیانی ایک ایسی عادت ہے جو کہ ہر وقت ناجائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سختی کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے اور احادیث نبوی میں بھی اس کے بارے میں وعیدیں وارد ہیں۔ لیکن بسا اوقات اگر کسی انسان پر ظلم وستم کا ایسا اندیشہ ہو کہ کذب بیانی کے علاوہ اس کی تلافی ناممکن ہو تو ایسے حالات میں توریہ کرنا مباح ہے جو کہ حقیقتاً جھوٹ نہیں اگرچہ بظاہر جھوٹ ہی لگتا ہو یا دین پر چوٹ لگنے کا خطرہ ہو جبکہ ظاہری کذب بیانی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ہو تو ایسی صورت میں جھوٹ بولنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: الکذب مباح لاحیاء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعریض لان عین الکذب حرام۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۲۷ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع)[2]

---

[1] قال العلامة ملا علی القاری رحمه الله: ولا نکفر مسلماً بذنب من الذنوب وان کانت کبیرة اذا لم یستحلها۔ (شرح الفقه الاکبر ص ۱۰۲ الکبیرة لا تخرج المؤمن عن الایمان)

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: جوز الکذب فی ثلاثة مواضع فی الصلح بین الناس و فی الحرب ومع امرأته۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۳۴۶ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی، کتاب الکراهیة)۔

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۳۹۵ الباب الثالث فیما یتعلق بالمناهی۔

زلزلہ کے وقت گھروں سے باہر نکلنا

سوال:۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ زلزلہ کے وقت کمروں اور گھروں سے فوراً باہر نکل آتے ہیں، کیا شریعتِ مقدسہ میں بوقتِ زلزلہ ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ زلزلہ کے دوران چونکہ عمارتوں کے گرنے یا اور کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اپنی جان کی حفاظت کرنا بھی انسان پر لازم ہے اس لیے اس لیے ایسے اوقات میں گھروں سے باہر نکلنا نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہے کیونکہ نہ نکلنے کی صورت میں اپنی جان کو ہلاکت اور خطرہ میں ڈالنے کے مترادف ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ o (البقرۃ آیت ۱۹۵) [1]

گانے بجانے کو ذریعۂ معاش بنانا

سوال:۔ فحاشی اور بے دینی کے اس دور میں بعض لوگوں نے گانے بجانے کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا ہوا ہے یعنی فلموں اور ریڈیو وغیرہ کے لیے گانے لکھ کر اور گا بجا کر رقم حاصل کرتے ہیں، تو کیا گانے بجانے کو ذریعۂ معاش بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گانے بجانے کے ذریعے کمائی کرنا اور اس کو ذریعۂ معاش بنانا جائز نہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اس لیے کہ گانے بجانے سے دل میں سختی اور دین سے دوری پیدا ہوتی ہے لہٰذا اس کے ذریعہ کمایا ہوا مال حرام ہوگا۔

لما قال العلامۃ ابن الهمام رحمہ اللہ: ویکرہ کسب المغنیۃ والنائحۃ کذا

---

[1] لما قال العلامۃ ابن البزاز الکردری رحمہ اللہ: واذا تزلزلت الارض وھو فی بیتہ لہ الفرار الی الصحراء۔ (الفتاویٰ البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۷۱ الباب التاسع فی المتفرقات)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۶۱ کتاب الکراھیۃ۔

فی الجوامع الفقه علیٰ ان التغنی للھو اوجمع المال حرام ۔ (فتح القدیر ج۷ صفحہ ۵۸ کتاب الکراہیۃ) [1]

بغیرِ طہارت کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا

سوال:۔ ایک شخص نجاستِ حکمی سے پاک ہے لیکن باوضو نہیں جیسا کہ نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے، تو کیا اس شخص کے لیے قرآنِ پاک کو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآنِ پاک چونکہ کلامِ الٰہی ہے اس لیے اس کا مقام ومرتبہ بھی بلند و بالا ہے، اس کو ہاتھ لگانے کے لیے ظاہری اور باطنی ناپاکی دور کرنا ضروری ہے کیونکہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ناپاک آدمی قرآنِ پاک کو مس نہیں کر سکتا اس لیے بے وضو انسان کے لیے قرآنِ پاک کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے، البتہ غلاف کی موجودگی میں چھونے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ مصحف سے لگا ہوا غلاف مراد نہیں بلکہ وقایہ سے غیر محیط کپڑا مراد ہے۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (سورۃ الواقعۃ آیت ۷۹، ۸۰) [2]

قاری یا سامعینِ تلاوت پر سلام کرنا

سوال:۔ ایک قاری قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہو اور لوگ اُسکے اردگرد بیٹھ کر قرآنِ پاک سن رہے ہوں تو کیا اُن کو سلام کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اور حاضرینِ مجلس (سامعین) پر اس سلام کا جواب دینا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مقامات میں افشاء السلام کی

---

[1] لما فی الھندیۃ: امرأۃ نائحۃ اوصاحب طبلٍ او مزمار اکتسب مالاً .... باذاء النیاحۃ ..... او باذاء الغناء فکان الاخذ معصیۃ والسبیل فی المعاصی ردھا۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۴۹ الباب الخامس عشر فی الکسب)
ومثلہٗ فی مجموعۃ الفتاویٰ ج۲ ص۲۹ کتاب الحظر والاباحۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ومسہ ای مس القرآن ولوح اودرھم اوحائط ...... الا بغلافہ۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۱۲ باب الحیض)
ومثلہٗ فی الفوائد العثمانیۃ ص۷۱۲ للعلامۃ شبیر احمد عثمانیؒ۔

تاکید فرمائی ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہیں کہ ان میں سلام کرنا مکروہ ہے، ان مقامات میں ایک مجلس تلاوتِ قرآنِ پاک بھی ہے، قرآنِ پاک کی عظمت کا خیال رکھتے ہوئے تلاوت کے وقت سلام نہیں کرنا چاہیئے، اور فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ ایسی محفل پر سلام کرنے سے جواب لازم نہیں آتا۔

لما فی الهندیة: ویکره السّلام عند قرأة القرآن جهراً وکذا عند مذاکرة العلم وعند الاذان والاقامة والصحیح انه لا یرد فی هٰذه المواضع۔
(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۲۵ الباب السابع فی السلام)[1]

غائب کو سلام پہنچانے کا حکم

سوال:۔ بسا اوقات کسی آدمی کے ذریعے غائب کو سلام بھیجا جاتا ہے، تو کیا اس آدمی پر غائب کو سلام پہنچانا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی کو سلام کہنا مسنون عمل ہے لیکن اس کا جواب دینا واجب اور ضروری ہے اور کسی کو اگر کسی غائب کو سلام پہنچانے کی ذمہ داری سونپی جائے تو اس پر سلام پہنچانا واجب ہے اور جس کو سلام پہنچایا جائے اس کو چاہیئے کہ پہلے مبلغ سلام کو جواب دے اور پھر سلام بھیجنے والے کو سلام کا جواب دے یعنی جواب میں وعلیک وعلیہ السلام کہنا چاہیئے۔

لما ورد فی الحدیث: عن اسماعیل عن غالب قال انّا لجلوس بباب الحسن اذ جاء رجل فقال حدثنی ابی عن جدی قال بعثنی ابی الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال ائته فاقرأه السّلام قال فاتیته فقلت ان ابی یقرئک السّلام فقال علیک وعلی

---

[1] قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمه اللّٰه: ویکره علیٰ عاجزٍ عن الرّد حقیقةً کاکلٍ اوشرعاً کمصلٍّ وقارئٍ ولوسلم لا یستحق الجواب وهوالصحیح۔
(الدرالمختار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۵ ص۴۱۵ کتاب الحظر والاباحة)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۴۲۲ کتاب الکراهیة۔ فصل فی التسبیح والتسلیم۔

ابیك السلام ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۳۶۳ باب فی الرجل یقول فلان یقرئك السلام) [1]

ننگے سر نماز پڑھنا

سوال:۔ بعض لوگ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھتے اور یہ ان کی عادت ہوتی ہے، کیا ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص محض سستی اور غفلت کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھتا ہو اور ٹوپی یا پگڑی استعمال کرنے اور سر ڈھانپنے کا خیال نہیں رکھتا تو مکروہ ہے البتہ اگر عاجزی اور تذلل کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھتا ہے تو اس میں کوئی کراہت نہیں اور اگر اس کام کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھے تو اس کے کفر کا خطرہ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویکرہ صلاته حاسراً ای کاشفاً راٴسه للتکاسل ولا باٴس به للتذلل اما الاهانة بها فکفر ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۷۴ مکروهات الصلوٰة) [2]

مونچھیں کاٹنے کا حکم

سوال:۔ کیا مونچھوں کا حلق اولیٰ ہے یا انہیں کاٹ کر کم کرنا اولیٰ ہے؟ بعض لوگ بلیڈ کے ذریعے کاٹنا مناسب نہیں سمجھتے، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ مونچھوں کے بارے میں علماء کرام نے قصر اور حلق دونوں پر قول کیا ہے حلق کرنے میں یا قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اکثر علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ کاٹنے میں اتنا مبالغہ کیا جائے کہ گویا حلق نظر آئے، تو اس طرح کرنے سے حلق اور قصر دونوں پر

---

[1] لما فی الهندیة: واذا امر رجلاً ان یقرء سلامه علی فلان یجب علیه ذلك۔
(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۲۶ الباب السابع فی السلام الخ)
ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۱۵ باب الحظر والاباحة۔

[2] قال الشیخ ابراهیم الحلبیؒ: یکرہ ان یصلی حاسراً ای حال کونه کاشفاً راٴسه تکاسلاً ای لاجل الکسل وبسببه ان استثقل تغطیته ولم یرها امراً مهماً فی الصلوٰة ولا باٴس به اذا فعل به تذللاً وخشوعاً۔ (حلبی کبیر ص۳۴۸ مکروهات الصلوٰة)
ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج ۱ ص۱۳۵ کتاب الصلوٰة فصل فی مکروهات الصلوٰة۔

عمل ہو جائے گا۔

لما قال العلامة الشیخ احمد الطحطاوی ؒ: ویستحب احفاء الشوارب ونراہ افضل من قصها وفی شرح شرعة الاسلام - قال الامام الاحفاء قریبٌ من الحلق۔ (الطحطاوی ص۲۸۷ باب الجمعة) [1]

عورتوں کا سر کے بال کٹوانا

سوال:۔ آجکل بعض فیشن ایبل عورتیں سر کے بال کٹواتی ہیں، تو کیا عورتوں کے لیے سر کے بال کٹوانا یا کم کروانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عورتوں کے لیے حضور نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مردوں سے مشابہت ممنوع قرار دی ہے، چونکہ سر کے بال کم کرنے یا کٹوانے کا معمول مردوں کا ہوتا ہے اس لیے عورتوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا مردوں سے مشابہت کی وجہ سے حرام ہے، البتہ کسی بیماری یا عذر ہونے کی صورت میں عورتوں کے لیے بھی بال کاٹنے یا کم کروانے کی شرعاً اجازت ہے، حج اور عمرہ میں عورتوں کے لیے بھی قصر کی اجازت ہے۔

قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: واذا حلقت المرأة شعر رأسها فان كان لوجع اصابها فلا بأس به وان حلقت تشبيهاً بالرجال فهو مكروه۔
(البحر الرائق ج ۸ ص۲۰۵ كتاب الكراهية، فصل فی البیع) [1]

---

[1] لما فی الهندیة: ویأخذ من شاربه حتی یصیر مثل الحاجب۔۔۔ قص الشارب حسن۔۔۔۔ وتقصیران یأخذ حتی تنقص من الاطار۔
(الفتاوى الهندية ج ۵ ص۳۵۸ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۰۵ كتاب الكراهية، فصل فی البیع)

[1] لما فی الهندیة: ولو حلقت المرأة رأسها فان فعلت لوجع اصابها لا بأس به وان فعلت ذلك تشبيهاً بالرجل فهو مكروه۔
(الفتاوى الهندية ج ۵ ص۳۵۸ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۰۷ كتاب الحظر والاباحة۔

مغربی فیشن کے مطابق سر کے بال کٹوانا

سوال:۔ اگر کوئی مسلمان اپنے سر کے بالوں کا بعض حصہ زیادہ کٹوائے اور بعض حصہ کم کٹوائے یا دیگر مغربی فیشن کے مطابق سر کے بال کٹوائے، تو کیا اس طریقے سے سر کے بال کٹوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو سر کا حلق کیا ہے اور یا تین طریقوں سے (یعنی وفرہ، لمہ اور جمہ) سر کے بال رکھے ہیں۔ لہٰذا اگر سر کے بعض بال زیادہ کاٹ دیئے جائیں اور بعض رکھے جائیں تو یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے ہٹ کر غیر مسلم اقوام کی مشابہت ہے اس لیے ان غیر مسلم اقوام کی وجہ سے اس قسم کے بال بنانے سے اجتناب ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس)[۱]

غیر ضروری بالوں کی صفائی کا حکم

سوال:۔ زیرِ ناف بالوں کے ازالہ کے لیے مستحسن طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ مرد و زن کے لیے کسی بھی طریقے سے اپنے بدن کے غیر ضروری بالوں کا ازالہ ضروری ہے، ان کے ازالہ کے لیے کسی دوائی یا آلہ کا سہارا لینا جائز ہے تاہم خواتین کے لیے انگلیوں سے نکالنا مستحسن ہے۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ: قالوا الاولیٰ للمرأۃ النتف لانہ انظف وابعد لتفوۃ الحلیل من بقایا اثر الحلق ولان شہوۃ المرأۃ اضعاف شہوۃ الرجل اذ جاء ان لہا تسعاً وتسعین جزءً منہا وللرجل جزء والنتف یضعفہا والحلق یقویہا فأمر کل منہا بما ھو انسب بہ۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۲ ص۵)[۲]

---

[۱] لما فی الہندیۃ: ان السنۃ فی شعر الرأس اما الفرق واما الحلق وذکر الطحاوی ان الحلق سنۃ۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج۵ ص۳۵۷ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء)

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ ویستحب حلق عانتہ) قال فی الہندیۃ ویبتدی من تحت السرۃ ولو عالج بالنورۃ یجوز، کذا فی الغرائب وفی الاشباہ والسنۃ فی عانۃ المرأۃ النتف۔
(رد المحتار ج۶ ص۴۰۶ کتاب الخظر والاباحۃ، فصل فی البیع)

زیرِ ناف بالوں کی صفائی کی حد | **سوال**:۔ از روئے شریعت زیرِ ناف بالوں کی کہاں سے کہاں تک صفائی کرنا ضروری ہے ؟

الجواب: عام شراحِ حدیث وفقہاء کے بقول شرمگاہ کے ارد گرد بالوں کا صاف کرنا ضروری ہے ناف تک صاف کرنا لازمی نہیں ہے ۔

لما قال الامام محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ: المراد بالعانة الشعر الذی فوق ذکر الرجل وحوالیه وکذالك الشعر الذی حوالی فرج المرأة ۔
(شرح صحیح المسلم للنووی ج ۱ ص۱۲۸ باب خصال الفطرة) [۱]

زیرِ ناف بالوں کی صفائی کا مستحب وقت | **سوال**:۔ زیرِ ناف بالوں کی صفائی کا مستحب وقت کیا ہے ؟

الجواب:۔ زیرِ ناف بال ہفتے میں ایک بار صاف کرنا مستحب ہے اور چالیس دن تک تاخیر کرنا مکروہ ہے ۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ویستحب) حلق عانة وتنظیف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة) والافضل یوم الجمعة وجاز فی کل خمسة عشر وکره ترکه وراء الاربعین ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص۴۰۶ کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع) [۲]

---

[۱] قال الشیخ القاضی محمد بن علی الشوکانی رحمه الله : والمراد بالعانة الشعر فوق ذکر الرجل وحوالیه وکذلك الشعر الذی حول فرج المرأة ۔
(نیل الاوطار ج ۱ ص۱۲۳ باب الختان)
وَمِثْلُهٗ فی فتح الملهم ج ۱ ص۴۱۹ باب خصال الفطرة ۔

[۲] وفی الهندیة : والافضل أن یقلم اظفاره ویحفی شاربه ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل السبوع مرة فان لم یفعل ففی کل خمسة عشر یومًا لایعذر فی ترکه وراء الاربعین فالاسبوع هو الافضل والخمسة عشر الاوسط والاربعون الابعد ولا عذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید ۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۵۷ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء الخ)
ومثلهٗ فی مجمع الانهر فی شرح ملتقی الابحر ج۲ ص۵۵۶ کتاب الکراهیة ۔

پیدائشی طور پر مختون بچے کے ختنہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی بچہ مختون پیدا ہو یعنی اس کا حشفہ پوست سے باہر نظر آتا ہو اگرچہ مکمل طور پر باہر نہ ہو، تو کیا اس کا دوبارہ ختنہ کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مختون بچے کے بارے میں اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے، اگر اس کا مختون ہونا یقینی ہو تو دوبارہ ختنہ کرنا ضروری نہیں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: الصبی اذا کانت حشفته ظاهرة ولا یمکن ان یمد جلد ذکره الا بتشدید وظهور حشفته بحاله لو رآها انسان یریٰها کانه اختتن لا یتشدد علیه ویترک ولا یتعرض۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۳۴۲ کتاب الکراهیة، جنس آخر) لہ

بعد البلوغ ختنہ میں شرمگاہ پر نگاہ پڑنے کا حکم

سوال:۔ بالغ ہونے کے بعد ختنہ کرنے کی صورت میں نگاہ شرمگاہ پڑنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ختنہ شعائرِ اسلام میں شمار ہوتا ہے جو شرعاً ہر مسلمان کے ذمے لازمی ہے، اس لیے ضرورت کے تحت ڈاکٹر یا حجام کی نگاہ کا عورتِ غلیظہ پر پڑنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فلا بأس ان ینظر الرجل من الرجل الیٰ موضع الختان لیختنه او یداویه بعد الختن۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۱۲۳ کتاب الاستحسان) ؎۲

لہ وفی الهندیة: الصبی اذا لم یختتن ولا یمکن ان یمد جلدته لتقطع الا بتشدید وحشفته ظاهرة اذا رآه الانسان یراه کانه ختن ینظر الیه الثقات واهل البصر من الحجامین فان قالوا هو علیٰ خلاف ما یمکن الاختتان فانه لا یشدد علیه ویترک۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۵۷ الباب التاسع عشر فی الختان والخصاء)

؎۲ قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: یجوز النظر الیٰ فرج الرجل للختن۔ (الفتاویٰ البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۷۲ کتاب الکراهیة الباب التاسع فی المتفرقات)

ومثله فی رد المحتار ج۶ ص۳۷۰ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی النظر والمس۔

چہرے کے زائد بال دُور کرنے کا حکم

سوال: چہرے سے داڑھی کے علاوہ زائد بالوں کا دور کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ داڑھی کی حدود کے علاوہ چہرے کے زائد بالوں کے دور کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے تاہم اس میں اتنا مبالغہ نہ کیا جائے کہ مخنث سے مشابہت ہو جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ولا بأس بأخذ الحاجبين وشعر وجهه مالم يشبه المخنث ۔ (رد المختار ج ۶ ص ۴۰۷ کتاب الحظر والاباحة ،فصل فی البیع)[1]

داڑھی کی شرعی حد

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! شریعتِ مقدسہ میں داڑھی رکھنے کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ داڑھی انبیاء علیہم السلام کی سنتِ قدیمہ ہے اور شعائرِ اسلام میں اس کا شمار ہوتا ہے، فقہاء کرام کی تحقیقات کی روشنی میں داڑھی کا رکھنا واجب ہے جس کی مقدار ایک مشت ہے اس سے کم داڑھی رکھنا خلافِ سُنّت ہے۔

لما رواہ امام ابویوسفؒ یعقوب بن ابراھیم الانصاری : عن ابن عمرؓ أنه كان يقبض على لحيته فيأخذ منها ما جاوز القبضة ۔ (کتاب الآثار للامام ابو یوسف ص ۲۳۴ فی الخضاب والاخذ من اللحية ،رقم حدیث ۱۰۳۹)[2]

---

[1] قال العلامة الاستاذ محمد الشهير بالطوری فی تکملة البحر : ولا بأس بان يأخذ الحاجبين وشعر وجهه مالم يشبه المخنث ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۰۴ کتاب الکراهية ،فصل فی البیع)

[2] قال العلامة علی بن سلطان محمد القاریؒ : وفی الاحياء قد اختلفوا فيما طال من اللحية ان قبض الرجل على لحيته وأخذ ما تحت القبضة فلا بأس به وقد فعله ابن عمرؓ من التابعين واستحسنه الشعبی وابن سیرین ۔

(مرقاة المفاتيح ج ۸ ص ۲۹۸ باب الترجل ،الفصل الاوّل)

وَمِثْلُهٗ فی کتاب الآثار للمحمد ص ۱۹۸ باب حف الشعر من الوجه ۔

مصافحہ کے بعد ہاتھوں کو چومنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کسی سے ملتے ہیں تو مصافحہ کے بعد اپنے ہاتھ چومتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھ چومنا مکروہ ہے، شریعت مقدسہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وکذا ما یفعله الجهال تقبیل ید نفسها اذا لقی غیره فهو مکروه فلا رخصة فیه۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۲۴۶ کتاب الکراهیة)

بے دین خواتین سے پردہ کرنے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! بعض خواتین گندے اخلاق اور کردار والی ہوتی ہیں شرفاء اور دیندار گھرانوں میں اُن کے آنے جانے سے فتنہ اور فساد کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ تو کیا شرعاً اس بات کی اجازت ہے کہ دیندار گھرانوں کی باپردہ خواتین ان سے پردہ کریں ؟

الجواب :- اسلام انسان کی عفت وعصمت اور عزت وآبرو کا خیال رکھتا ہے، اور جن عوامل سے اس کی عفت وعصمت پامال ہوتی ہو وہاں سے منع کرتا ہے، جیسا کہ دیندار اور باپردہ گھروں میں برے اور گندے اخلاق والی خواتین کے آنے جانے سے معصوم بچوں خصوصاً عفت مآب خواتین کے متاثر ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ لہٰذا فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے بے دین اور بُرے اخلاق والی عورتوں سے عفیف اور دیندار خواتین کو پردہ کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ولا ینبغی للمرأة الصالحة ان تنظر الیها المرأة الفاجرة لانها تصفها عند الرجال فلا تضع جلبابها ولا خمارها۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۲۳۸ کتاب الحظر والاباحة۔ فصل فی البیع)۔

ٹیلیویژن کے بُرے اثرات اور مسلمانوں کی ذمّہ داری

سوال: مخدومی حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہٗ!

یہاں کلیرنس سٹریٹ بولٹن یو کے میں گھر گھر دل بہلانے کے لیے ٹیلیویژن نصب ہیں جس کے پروگرام عموماً یہ ہیں کہ برہنہ یا نیم برہنہ لڑکیاں رقص و سرود کرتی ہیں۔ گانا بجانا، بوس و کنار، دھینگا مشتی اور فحاشی کی اشاعت ہوتی ہے، عیسائیت کا پرچار اور عالمی حسیناؤں کے انتخاب کے دلخراش مناظر اور مختلف فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ غیر محرم مرد و عورتیں اور خاندان کے افراد ماں بیٹا، بہن بھائی، باپ بیٹی اکٹھے بیٹھ کر ان فلموں کے حیاء سوز مناظر کو دیکھتے ہیں، تعلیم اور دنیاوی کاروبار سب کاموں میں اس سے رکاوٹ اور پیداوار میں کمی واقع ہو رہی۔ رنگون کے ایک مفتی صاحب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ آنجناب ہمیں اسکی شرعی حیثیت سے مطلع فرمائیں ہم آپ کی تحریر کی کاپیاں سائیکلوسٹائل کر کے انگلینڈ میں آباد تمام مساجد میں فریم کرا کے رکھ دیں گے تاکہ مسلمانوں کو انتباہ ہو سکے اور وہ اس کے بُرے اثرات اور تباہ کاریوں سے بچ سکیں؟

الجواب:۔ ٹیلیویژن کے بارہ میں آپ کے خیالات بالکل صحیح ہے۔ تصویر پرستی اور تصویر کشی اسلام میں حرام ہے، پھر جبکہ ٹیلیویژن پر فحاشی اور عریانی کا غلبہ ہو تو اس کا نتیجہ سوائے اخلاقی بے راہروی، مادہ پرستی، خدا فراموشی، بیحیائی اور وقت ضائع کرنے کے اور کچھ ظاہر نہیں ہو سکتا، خاص کر یورپی ممالک میں تو ایسی چیزوں کی ہلاکت آفرینی اور بھی زیادہ ہے۔ تصویر کشی غلط تاویلات سے جائز نہیں ہو سکتی اور نہ مرد و عورت کا نامحرموں کی طرف دیکھنا خواہ آئینہ یا تصویر کی شکل میں ہو جائز ہو سکتا ہے۔ **الغرض** اس کے مفاسد اور قبائح یقینی ہیں، اس لیے تمام مسلمانوں کو اس لعنت سے احتراز کرنا ضروری ہے خصوصاً یورپ میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داری تو بہت نازک ہے، ان میں سے ہر ایک کو اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ اور مبلّغ بننا چاہیے نہ کہ خود یورپی تہذیب میں ضم ہو کر اپنی اسلامی حیثیت ہی ختم کر دی جائے افسوس کہ یہ برائی اب ہمارے ملک میں بھی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ افراد خانہ اور بیوی بچوں کے اخلاق اور نفسیات پر اس کے جو قبیح اثرات پڑ رہے ہیں پوری عالم قوم اس سے غافل ہے۔ نتیجہ عام خرابی اور وسیع بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگا مگر اس وقت تدارک انتہائی مشکل ہوگا۔

ٹیلیویژن اور وی سی آر کا
شرعی حکم

سوال: کیا ٹیلیویژن اور وی سی آر پر غیر محرم مرد و زن کو دیکھنا اور غیر محرم عورت کا نغمہ اور ترنم سننا اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ سے سرود سننا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: ٹی وی اور وی سی آر پر غیر محرم مرد و زن کو شہوت کے طور سے دیکھنا اور غیر محرم عورت کا نغمہ اور ترنم سننا اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ سے سرود سننا ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ جو شیطانی لذت اصل کو دیکھنے اور سننے سے حاصل ہوتی ہے تو اس جیسی لذت اس کے عکس اور صوت سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تصویر اور عکس میں فرق ہے، وہ یہ کہ جو شکل دھات، تار، رنگ، پلاسٹک وغیرہ ذی جرم اشیاء سے بنائی جائے اس کو تصویر اور صورت کہا جاتا ہے اور وہ قدرتی طور سے بقاء اور ثبات رکھتی ہے، اور جو شکل آئینہ وغیرہ سے تقابل کے وقت دکھائی دے اس کو عکس کہا جاتا ہے، یہ عکس صرف انتقاش ہوتا ہے ذی جرم اور ذی جسد نہیں ہوتا اور طبعی طور سے بقا اور ثبات نہیں رکھتا بلکہ تقابل کے زوال سے وہ بھی زائل ہوجاتا ہے البتہ اس کو مصنوعی طور سے باقی اور برقرار رکھا جاتا ہے اور تصویر جیسا دکھائی دیتا ہے بلکہ عرفِ عام میں اس کو بھی تصویر کہا جاتا ہے، جیسا کہ عرفِ عام میں اصل آواز کے عکس اور آوازِ بازگشت کو مصنوعی طور سے باقی رکھنے کے بعد اصل آواز کہا جاتا ہے، اور شرعی اصول کی بناء پر صورت اور عکس میں دیگر فرق بھی موجود ہے وہ یہ کہ زندہ اور جاندار اشیاء کی تصویر کشی شرعاً ناجائز ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

من صوّر صورة فی الدنیا کلف یوم القیٰمة ان ینفخ فیها الروح ولیس بنافخ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۸۱ باب من لعن المصوّر)

جس نے کسی زندہ چیز کی صورت بنائی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو مکلف اور مجبور کرے گا کہ وہ اس میں روح ڈالے اور وہ اس میں روح نہیں ڈال سکے گا۔

اور آئینہ وغیرہ کو دیکھنے سے عکس بنانا ناجائز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آئینہ دیکھتے تھے۔
فیض القدیر میں بحوالہ سنن ابن ماجہ، طبرانی اوسط، بیہقی مسطور ہے:-

كان اذا نظر في المرآة قال الحمد لله۔

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب آئینہ دیکھتے تو اللہ کی حمد بیان کرتے۔

واضح رہے کہ عکس کی طرح بت اور تصویر کو دیکھنا بذاتِ خود ناجائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُوْنَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (الاعراف ۔۔۔)

اور تو دیکھے کہ تکتے ہیں تیری طرف اور حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:-

انها اشترت نمرقة فيها تصاوير فلما رآها رسول الله صلى الله عليه وسلم قام على الباب فلم يدخل۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۸۸۱ باب من لم يدخل بيتا فيه صورة)

یعنی عائشہ صدیقہؓ نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصاویر تھیں، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور اندر تشریف نہ لائے۔

تو ان دلائل کی رُو سے عکس، تصویر، بت کو دیکھنا ممنوع نہیں ہے البتہ اگر ان کو دیکھنے میں مفسدہ موجود ہو، مثلاً یہ دیکھنا شیطانی تفریح اور شیطانی لذت حاصل کرنے کیلئے ہو تو ممنوع ہوگا، بخاری شریف کی ایک حدیث میں وارد ہے کہ:-

لا تباشر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها كأنه ينظر اليها۔
[صحیح بخاری ج۲ ص۷۸۸
باب لا تباشر المرأة فتنعتها لزوجها]

یعنی کوئی عورت کسی عورت کے ساتھ نہ لیٹے حتیٰ کہ اس کے بعد یہ عورت اپنے خاوند کو اس دوسری عورت کے اعضاء کی ترجمانی کرے گویا کہ یہ خاوند اس کو دیکھ رہا ہو۔

اس حدیث شریف کی روشنی میں جب بیوی کی ترجمانی سے اس کے خاوند کے دماغ میں اس اجنبی عورت کی خیالی تصویر سے لذت حاصل کرنا شنیع اور منکر ہوا تو آنکھوں سے دکھائی دینے والے عکس اور تصویر سے یہ لذت حاصل کرنا بطریق اولیٰ شنیع اور منکر ہوگا، کیونکہ اس میں اس مفسدہ کا خطرہ زیادہ ہے۔

اور جب اجنبی عورت کا نغمہ اور ترنم سننا حرام ہے کیونکہ اس سے غیر محرم عورت کا

میلان پیدا ہوتا ہے تو اس کے نغمہ اور ترنم کا عکس سننا بھی حرام ہوگا کیونکہ یہ مقسدہ اور جاذبیت اس میں بھی موجود ہے اور یہی حکم ٹیپ ریکارڈ وغیرہ سے سرود کے عکس کے سننے کا ہے۔
تو اس تفصیل کی بناء پر واضح ہوا کہ اگرچہ ٹی وی اور وی سی آر پہ اصل شے نظر نہیں آتی بلکہ ان پر عکس دیکھا جاتا ہے جو کہ جدید صناعت کی وجہ سے قائم اور ثابت ہوتا ہے لیکن یہ عکس اصل کے اعضاء اور محاسن کی بلا خیانت ترجمانی کرتا ہے، اور اس عکس کے دیکھنے سے اصل کے دیکھنے کی طرح شیطانی لذت اور خواہش پوری کی جاتی ہے تو لازمی طور پر ان آلات پر صنف مخالف کے عکس کو دیکھنا ناجائز اور حرام ہوگا، اسی طرح غیر محرم عورت کے ترنم اور نغمہ کے عکس کا سننا اور سرود کے عکس کا سننا بھی حرام ہوں گے۔

داڑھی کی مسنون مقدار

سوال : داڑھی کی مقدار مسنون اور اس کے بڑھانے کے بارہ میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب - داڑھی کے مقدار کے بارہ میں بعض قوی اور مشہور روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ داڑھی اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے عن ابن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال احفو الشوارب واعفو اللحی۔ یعنی مونچھوں کو کٹواؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ ترمذی شریف ج ۲ ص ۱۰۰ اس کے علاوہ ابن عمرؓ کی دوسری روایت میں ہے عن ابن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر باحفاء الشوارب واعفاء اللحی امام ترمذی نے دونوں روایات کو حسن وصحیح کہا ہے اور ان کے رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے احادیث داڑھی کے مقدار کے بارہ میں مطلق ہیں اور مطلق اعفاء بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے جس سے داڑھی لمبا کرنے کا مسنون اور یہ ہونا معلوم ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں امام ترمذی نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یاخذ من لحیتہ من عرضا وطولہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی مبارک کو طول وعرض سے کٹواتے تھے کہ اس روایت کو امام ترمذی نے حدیث "غریب" کہہ کر اس کی سند پر جرح بھی کی ہے اس کے علاوہ خود ابن عمرؓ اور ابی ہریرہ کے بارہ میں بھی منقول ہے کہ وہ مٹھی سے زیادہ کٹواتے تھے (ابوداؤد ونسائی) (ابن ابی شیبہ) بہرحال ان تمام روایات واقوال کو سامنے رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگر داڑھی کٹوانا چاہے تو مٹھی بھر سے زیادہ بال کٹوا سکتا ہے مٹھی سے کم کٹوانا بالاتفاق حرام ہے اور اگر مذکورہ بالا ابن عمرؓ کے روایات پر عمل کرنا پسند کرے تو مٹھی سے زیادہ بڑھا سکتا ہے دونوں صورتیں سنت کے خلاف نہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لمعات شرح مشکوٰۃ میں مٹھی بھر سے زیادہ کٹوانے کے بارہ میں

فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص داڑھی کو مٹھی سے زیادہ کاٹ دے تو جائز ہے کیوں کہ ابن عمرؓ سے ایسا ثابت ہے امام شعبی ابن سیرین بھی اس کو پسند کرتے تھے جس سے جائز ہونا معلوم ہوتا ہے دوسری طرف بعض سلف داڑھی بڑھانے اور لمبا کرنے کو پسند کرتے تھے جیسے حسن بصریؒ اور حضرت قتادہ نیز صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی حضرت عثمان یہی منقول ہے یہاں تک کہ امام غزالیؒ نے خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تصریح کی ہے کہ وکان یعنی لحیتہ ویأخذ شاربہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی مبارک بڑھاتے تھے اور مونچھ مبارک کٹواتے تھے (احیاء العلوم ج ۲ ص ۳۸۳)

شیخ ابوبکر مالکیؒ شرح ترمذی میں فرماتے ہیں ان ترک لحیتہ فلاحرج علیہ۔

(شرح ابوبکر مالکیؒ ج ۱۰ ص ۲۱۹)

حضرت ملا علی قاری نے ابن الملک کی ایک روایت میں داڑھی بڑھانے کو مختار اور بہتر کہا ہے۔

قال ابن الملک اما لاخذ من اطراف اللحیۃ من طولہا وعرضہا للتناسب فحسن لکن المختار ان لا یاخذ منہا شیئاً ان نفع قوت المعتدی حاشیہ ترمذی ج ۲ ص ۱۰) اسی طرح شاہ محمد اسحاق المحدث دہلویؒ کے بارہ میں حاشیہ مذکور میں ہے قال عندی اخذ اللحیۃ مافوق القبضۃ جائز لکن الاولیٰ رحوالہ تر کہا۔ خلاصہ یہ کہ ان روایات واقوال سے داڑھی کا بڑھانا اور لمبا کرنا ہی افضل اور بہتر و مسنون معلوم ہوتا ہے اور جن روایات سے مٹھی سے زائد کٹوانا معلوم ہوتا ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہیں روایات میں تعارض نہیں ہمارے حضرت الاستاذ شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز اعفاء اللحیۃ کو اطلاق پر حمل کر کے اس کو بڑھانا ہی افضل اور بہتر سمجھتے تھے اور مٹھی بھر سے زیادہ نہیں کٹواتے تھے کئی صحابہؓ و تابعین اور مشائخ کا نمونہ ان کے سامنے موجود تھا۔ جس وجہ سے بعض علماء نے مٹھی بھر ہی کو قدر مسنون کہہ کر اسے افضل قرار دیا مگر انہوں نے مٹھی بھر بڑھانے کو ناجائز نہیں کہا۔ والسلام

عورتوں کے حقوق

اسلام کامل اور مکمل نظام حیات ہے اس میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے چاہے مرد ہو یا عورت، اور خصوصاً عورت کو تو اسلام نے وہ مقام دیا ہے جو اسے پہلے حاصل نہ تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ فتنہ وفساد اور بے حیائی کی روک تھام کے لیے ان کو پردے اور حجاب کا حکم دیا جو کہ موافق فطرت ہے۔ لیکن عصر حاضر میں یورپ جس طرح دوسرے امور میں خلاف فطرت کام کرتا ہے اسی طرح عورتوں کے حقوق کی آڑ میں عورتوں کی غیر فطری آزادی اور بے حیائی کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے جبکہ بعض نام نہاد مسلمان بھی یورپ کی ذہنی غلامی سے مرعوب ہو کر اس نظریہ کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے "عورتوں کے حقوق، آزادی اور بے حیائی کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک وقیع مضمون لکھا جو ماہنامہ الحق کی زینت بنا۔ مضمون کی افادیت کے پیش نظر "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

یورپ کی غلامی میں آ کر جب عالم اسلام کے ذہن و فکر اور تہذیب و اخلاق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جن دینی علمی اور اخلاقی فتنوں نے اسلامی تہذیب و معاشرت پر یلغار کی۔

مساوات مرد و زن۔ تہذیب مغرب کا اہم فتنہ | اس میں سرفہرست ایک اہم فتنہ تحریک آزادی نسواں اور مساوات مرد و زن ثابت ہوا، اسلام کے نظام ستر و حجاب اور عورتوں کے مقدس اور محترم مقام و منزلت اور اس پر مبنی ایک پاکیزہ خاندانی نظام کو تہ و بالا کرنے کیلئے مستشرقین یورپ، غیر مسلم مصنفین اور ہمارے ہاں کی یورپی کو معیار حق و انصاف سمجھنے والے نام نہاد

مصلحین اور ترقی پسندوں نے اس نظام کو نشانۂ تضحیک بنایا، مسلمانوں میں مغرب سے مرعوب اذہان نے مغرب کی لے میں لے ملائی کبھی تعددِ ازدواج کی ہنسی اڑائی گئی، پردہ کو مشقِ تحقیق بنایا گیا اور کبھی مسلمان عورتوں کی مظلومیت اور قید و بند کا ماتم شروع کیا۔ اس طرح مسلمان عورت کی ایک نہایت بھیانک قابلِ رحم تصویر بنادی گئی، برِصغیر کے عہدِ غلامی سے طرح طرح کی آوازیں اٹھتی رہیں۔

بے حیائی کا عروج | قیامِ پاکستان کے بعد عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی میں زیادتی اضافہ ہوا، عورت کو اس کے مقامِ حیا و عفت سے ہٹانے کی مساعی ہوتی رہی۔ مگر ایک دعوت اور تحریک کی شکل میں یہ کام بھی پچھلے دو ایک سال سے بڑی تیزی سے بڑھنے لگا پچھلے سال کو خواتین کا عالمی سال کہا گیا۔ پاکستان بھی اس مہم میں یورپی اقوام سے پیچھے نہ رہا یہاں تک کہ پاکستان کی اعلیٰ خواتین کے ایک وفد نے میکسیکو کی ایک تقریبِ خواتین میں شرکت کی جس میں پیشہ ور عورتوں نے پیشہ کو قانونی حق دینے اور ایک عورت کو کئی مردوں سے شادی رچانے جیسے مطالبے بھی کئے گئے۔ قومی اسمبلی میں خواتین کے عالمی سال کے متعلق ایک قرارداد پیش کی گئی اور سال بھر آزادئ نسواں اور حقوقِ نسواں کی تائید میں تقریریں ہوتی رہیں۔

وزیرِ اعظم بھٹو کی دعوتِ بے حجابی | مگر اس مسئلہ کا نقطۂ عروج وہ تھا جب پاکستان کے محترم وزیرِ اعظم نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرتِ مقدسہ سے متعلق کانگریس کی آخری تقریب کراچی کے استقبالیہ میں دنیا بھر کے مفکرین کے سامنے پردہ کے بارہ میں اظہارِ خیال فرمایا اور یہ ہماری رائے میں اس کانگریس کا خاتمہ نہیں سوءِ خاتمہ تھا۔ جب آپ نے فرمایا کہ ہمیں اقتصادی مشکلات کی وجہ سے پردہ جیسے فرسودہ خیالات پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی۔ پھر جناب وزیرِ اعظم نے ایک اور عملی قدم اٹھاتے ہوئے بلوچستان کی ایک تقریب میں عورتوں کو پردے سے باہر آجانے کی دعوت دی اور فرمایا کہ یہ مساوات نہیں کہ عورتیں گھروں کی قید و قفس میں محصور رہیں، انہیں سیاسی اور اجتماعی میدانوں

میں سامنے آنا چاہیئے اور یہ فرسودہ روایات ہیں۔ یہ صرف ایک رائے اور اظہارِ خیال نہ تھا، بلکہ ایک مسلم اور باشعور جسور قوم کو عملی دعوت تھی، اور یہ سطور لکھتے وقت اسلام آباد میں عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں آر۔سی۔ڈی کے سیمنار میں صدرِ مملکت سمیت کئی اعیانِ سلطنت کے ایسے ہی خیالات اور پیغامات سامنے آ رہے ہیں۔ پس جب قوم کھلے دل سے ایک اہم مسئلہ پر اپنے عمائدین کے ایسے خیالات سن رہی ہے تو اسی طرح خدا اور رسولؐ کی مسئولیت اور ذمہ داریوں کے پیشِ نظر ہمیں کچھ گذارشات پیش کرنے کا بھی حق ہے اور جب مسئلہ زیرِ بحث کا تعلق سیاسی نظریات اور سیاست سے نہیں، ملک کی اخلاقی، معاشرتی قدروں اور اسلام کے ایک مستقل نظامِ عصمت و عفت سے ہے تو ہر دردمند مسلمان کو قرآن و سنت کی روشنی میں اظہارِ خیال کا حق ملنا چاہیئے اور کھلے دل سے اسے سننا چاہیئے۔

اسلام میں عورت کی حیثیت اور حقوق | اصولی طور پر پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی اسلام میں عورت کی حیثیت اور حقوق کے تعین کا مسئلہ مبہم چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور کیا واقعی اسلام نے عورت کو اس کا جائز مقام نہیں دیا اور یہ کہ اس بارہ میں دشمنانِ اسلام کا پروپیگنڈہ واقعی صحیح ہے؟ اس بارہ میں ہمیں تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنی ہوگی۔ اس بارہ میں کیا عرب اور کیا عجم اقوام و ادیانِ عالم کی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب العلم بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اسلام ہی وہ دینِ فطرت اور دینِ رحمت تھا جس نے عورت کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا۔

ظہورِ اسلام سے قبل عورت کا مقام | ظہورِ اسلام سے قبل دنیا بھر کے اقوام و ملل اور انسانی رسوم و رواج میں عورت جس ظلم و ستم اور ابتذال و تحقیر کی حالت میں مبتلا تھی اسے قرآن نے ایک اعجازی لفظ جاہلیتِ اولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ جاہلیت کیا تھی تاریخ شاہد ہے کہ اسے ایک مبتذل چیز سمجھا جاتا تھا جانوروں کی طرح اس کی خرید و فروخت عام بات تھی وہ کسی چیز کی مالک نہ سمجھی جاتی نہ وہ اپنے مال و متاع میں مردوں کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف کر سکتی تھی نہ وہ کسی کی

وراثت کی حقدار تھی نہ اسے کسی قسم کی وصیت کرنے کا حق تھا۔ اس کے قتل ہو جانے کی
صورت میں دیت اور قصاص میں وہ مردوں کے برابر نہ تھی۔ نکاح میں اس کی مرضی تو بڑی بات
ہے مرد جب چاہتا اسے پیشہ کرانے پر بھی مجبور کر سکتا تھا۔

عورت اور جاہل اقوام کے نظریات | عورت کے بارہ میں جاہل اقوام کے عجیب روح فرسا
نظریات تھے، روم جیسے متمدن اقوام میں ایک عرصہ تک سرے سے یہ مسئلہ بھی محلِ نظر رہا کہ
عورت انسان بھی ہے یا جانوروں کی طرح کوئی اور مخلوق۔ رومی ادوار میں اسے ایک نجس جانور
قرار دے کر فیصلہ کیا گیا کہ اسے بات چیت کرنے کا بھی حق نہیں، باؤلے کتے یا اونٹ کی طرح
اس کے منہ پر غلاف باندھا جائے گا۔ مغربی اقوام میں ایک رائے یہ بھی تھی کہ عورت ذی روح
ہی نہیں اس بارہ میں یہ بھی اختلاف تھا کہ عورت عبادت اور بندگی کی اہلیت بھی رکھتی ہے یا نہیں
بعض اقوام میں شودروں کی طرح عورتوں کے پورے طبقہ کو مقدس مذہبی کتابوں کے پڑھنے
پڑھانے کی قانونی ممانعت تھی۔ اس طرح ادائیگی عبادات کی بھی، کئی قبائل اور اقوام بلکہ خود ساختہ ادیان
میں والد کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی بیٹیاں بیچ سکتا ہے یہاں تک کہ بعض عرب قبائل میں اسے
بیٹی کو زندہ درگور کر دینے کا "سماجی حق" حاصل تھا۔ اور یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی۔

دوسری طرف اس جاہلی دور میں جسے جاہلیتِ اولیٰ اور تبرّج جاہلیت میں اشارہ کیا گیا ہے،
عورت کو محض ایک آلۂ تعیش اور ذریعۂ استلذاذ بنا کر رکھ دیا گیا تھا اس کی حیثیت مردوں کی ایک
شاملات ایک وقف اور ایک مشترکہ قومی ملکیت کی تھی کہ وہ مردوں کے مفادِ عامہ کی ایک مخلوق
اور تفریحِ طبع کا ایک سامان ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ غلاموں کی مانند مردوں کے آرام و راحت
میں لگی رہے، اور نت نئی اداؤں، عشوہ طرازیوں اور نمود و نمائش کے نئے نئے طریقوں سے
مردوں کو سامانِ تسکین فراہم کرتی رہے، کئی جاہلانہ رسومات میں عورت کئی مردوں کی مشترکہ متاعِ نشاط
بن سکتی تھی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے اس کا عاشق بھی برابر کا حقدار سمجھا جاتا اور ایک مرد بلا لحاظ عدل و

انصاف اور بلالحاظ تعداد جتنی بھی چاہے عورتوں کو نکاح یا تمتع میں رکھ سکتا تھا۔

عورت پر اسلام کے احسانات | اب اسلام نے آکر ایک طرف تو اس ضعیف و ناتواں جسم سے ظلم و استبداد کی ساری بیڑیاں توڑ ڈالیں، اسے مقام انسانیت میں مردوں کے ہمسر قرار دیا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: یاایہا النّاس انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثیٰ۔ حضورؐ نے فرمایا عورتیں مردوں کا جزو اں نصف ہیں۔ پھر اسے نہ صرف خطابات خداوندی کا مکلف اور مخاطب بنایا بلکہ یہ بھی کہ وہ عبادات کی اہلیت رکھتی ہے اور احکام دین کی تعمیل و امتثال میں اجر و ثواب اور قدر و منزلت کے اعتبار سے مردوں سے بھی سبقت لے جاسکتی ہے۔ و لیس الذکر کالانثیٰ۔ قرآن کریم نے عبدیت و عبادات میں بلا تفریق اگر مردوں کو مسلمین، مؤمنین قانتین، صادقین، صابرین، خاشعین، متصدقین، صائمین، حافظین، ذاکرین کے خطابات دیئے تو اسی کے ساتھ عورتوں کو بھی مسلمات، مؤمنات، قانتات، صادقات، صابرات، خاشعات، متصدقات، صائمات، حافظات اور ذاکرات کے تمغوں سے نوازا اور بلا امتیاز ایسے دونوں طبقوں کو مغفرت اور اجر عظیم کی بشارت دی۔ فوز عظیم جنات خلد اور رضوان و خوشنودی کی بشارت دیتے ہوئے دونوں فریقوں کو کہا گیا: وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنّٰتٍ (الیٰ قولہٖ) ذٰلک ھو الفوز العظیم۔

دینی، دنیوی، انفرادی، اجتماعی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ | اسلام نے نہ صرف اس کا حق ملکیت تسلیم کیا بلکہ اپنے مال و دولت میں ہر طرح جائز عقد و تصرف، بیع شراء، عاریت، صدقہ اور ہبہ وغیرہ تصرفات کا اختیار دیا گیا اسے وصیت کرنے کا حق دیا میراث کا اسے مستحق قرار دیا۔ فرمایا: وللنساء نصیبٌ مّمّا ترک الوالدان والاقربون۔ عورتوں کا والدین اور رشتہ داروں کی وراثت میں حصہ ہے۔۔۔ دیت اور قصاص میں وہ مردوں کے برابر ہے۔ انہیں قتل کرنا تو بڑی بات مارنا پیٹنا بھی ممنوع ہے۔ ان کی پاکدامنی اور عفت پر غلط انگلی اٹھانے والے اور تہمت لگانے

والے دنیا اور آخرت میں لعنت کے سزاوار ہیں اور انہیں عذابِ عظیم کی وعید ہے۔
ان الذین یرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والآخرۃ ولھم عذابٌ عظیم ۔۔۔ (الآیۃ) اگر چاہے تو اپنے شوہر کے غلط بہتان پر اس سے لعان کر سکتی ہے اور اس سے الگ ہو سکتی ہے شریعت نے پاک دامن خواتین کی بہتان تراشی کی سخت سزا حد قذف مقرر کر دی ہے۔ الغرض وہ ہر طرح اپنے جائز حقوق کا دفاع کر سکتی ہے۔ اسلام نے اس کی انفرادی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی ہر ناجائز بندش توڑ دی ہے۔ نکاح میں اسے اپنی مرضی اور اختیار کا حق دیا گیا کہ جسے چاہے قبول کرے، چاہے مسترد کر دے۔ پھر اسلام نے نکاح کی حدود بھی متعین کر دیں کہ وہ مالکیت اور مملوکیت کا رشتہ نہیں زوجین کے باہمی تعلق اور ربط کا نام ہے اس عقد سے وہ مرد کی غلام نہیں بن جاتی، بلکہ یہ ایک ایسی تمدنی اور معاشرتی ضرورت ہے جس کے مرد اور عورت دونوں محتاج ہیں۔ اور یہ دونوں کے فطری تقاضوں کی تکمیل ہے۔ البتہ فریقین کی خلقی اور فطری ضرورتوں سے شوہر کو اس پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔ وللرجال علیھن درجۃ ۔۔۔ اور ۔۔۔ الرجال قوامون علی النساء کہ اس میں عورت ہی کا تحفظ اور بھلائی ہے۔ اور اس ادنیٰ برتری کے صلہ میں بھی مرد کو مہر کا پابند بنا دیا گیا ہے، نہ صرف یہ بلکہ اس کی تمام ضروریاتِ زندگی نان ونفقہ اور لباس وسکونت کا بھی ذمہ دار مرد ہی ہے خواہ عورت کتنی بڑی مالدار اور ذی استطاعت کیوں نہ ہو مرد طرح طرح کی مشقتیں اٹھا کر اس کی اور اس کی اولاد کی ضروریات کی کفالت کا پابند ہے۔ اس کے علاوہ بھی مرد کو ہر قسم کے حسنِ سلوک کی تلقین کی گئی۔ فرمایا وعاشروھن بالمعروف۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی سے بہتر ہے۔

حقوق والدین کی وصیت کی گئی تو بار بار ماں کے بارہ میں زیادہ تاکید کی گئی فرمایا جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، فرمایا جو شخص لڑکیوں کی کفالت کرے گا دوزخ کی آگ اس پر

حرام ہوگی۔ فرمایا جو شخص دو بیٹیوں کی بلوغت تک نگہداشت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ اتنا قریب ہوگا جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں قریب ہوتی ہیں۔ فرمایا ما اکرم النساء الا کریمٌ ولا اھانھن الا لئیمٌ۔ عورتوں کی عزت و تکریم شرفاء کا اور ان کی اہانت و تحقیر رذیلوں کا شیوہ ہے۔

اسی طرح تعددِ ازدواج میں جاہلیت کی غیر محدود تعداد اور مردوں کی کھلی چھٹی کو چار تک محدود کر دیا گیا اور یہ بھی اس شرط سے کہ جب عدل کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ اب مرد استطاعتِ مالی کے باوجود بھی چاہے تو چار سے زیادہ شادیاں نہیں کر سکے گا۔ اس طرح طلاق میں بے تحاشا اسراف اور دھاندلی کا سلسلہ تھا۔ اس اسراف اور ابتذال کو روکنے کے لئے مرد پر طرح طرح کے قدغن لگائے گئے۔ فرمایا: فان کرھتموھن فعسٰی ان تکرھوا شیئاً و یجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً۔ ان کے ساتھ نیکی کی معاشرت کرو۔ اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تب بھی، تم کسی چیز کو ناپسند کرو گے اور خدا اس میں بہت بھلائی رکھ دے گا۔ پھر رجوع کی شکل میں اس مبغوض الی اللہ عمل کی تلافی کا موقعہ بھی مردوں کو دیا گیا۔ اسلام سے قبل بیواؤں کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی اسلام نے نہ صرف عقدِ بیوگان کو جائز قرار دیا بلکہ حضور اقدس صلعم نے اپنے پہلے نکاح میں عملی نمونہ پیش فرمایا اور بیواؤں کی مشکل حل کر دی گئی۔ عورت کو یہ حق بھی اسلام نے بخش دیا کہ وہ نکاح کی شکل میں اس باہمی معاہدہ کو بامر مجبوری اور نامساعد حالات میں فریقین کی مرضی سے فسخ اور منسوخ بھی کر سکتی ہے۔ الغرض دنیا کا کوئی دستور و نظام اور رسم و رواج ایسا نہیں جس نے عورت کو وہ مقام دیا ہو جو اسلام نے دیا۔

عورت کی عصمت و آبرو کا احترام | اسی طرح عورت کی اُس بے کسی کا معاملہ ہے جسے قرآن نے جاہلیتِ اولیٰ سے تعبیر کیا ہے جس میں عورت ایک بازیچۂ اطفال اور کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ اور اس وجہ سے یہ صورتحال عائلی اور تمدنی زندگی کے درہم برہم ہو جانے اور معاشرہ کی تباہی کا باعث بن رہی

تھی۔ اسلام نے ان حالات کو اس طرح ختم کردیا کہ مرد کی دست درازیوں اور شیطان صفت انسان نما درندوں سے اس کی حفاظت کے تمام وہ طریقے اختیار فرمالئے جو عورت کو اس کی حیثیت اور مقام سے ہٹانے والے تھے خواہ وہ عملی وجوہات تھے یا نظریاتی یا پھر تصوراتی ہی کیوں نہ تھے۔ اسلام نے اسے حفاظت کے قابل ایک بیش بہا خزانہ ایک قیمتی اور انمول موتی اور ایک نازک آبگینہ قرار دیا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: ان المرءة عورة مستورة (فی روایة خدرة مخدرة) فاذ اخرجت استشرفها الشیطان ۔"بلاشبہ عورت ایک چھپی ہوئی چیز ہے جب وہ باہر نکل جاتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے کہ اب کسی کو دام میں پھنساؤں گا۔"

مردوں کو انہیں بُری نگاہ اٹھانے سے بھی روکتے ہوئے غض بصر کا حکم دیا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: زنا العین النظر۔ نگاہ بازی آنکھ کا زنا ہے کہ جیسی نگاہ ہو ویسے اس کے اثرات ہوتے ہیں۔

آزادئ نسواں تبرج جاہلیت کا دوسرا نام | مگر آج کا یہ دور آزادئ نسواں اور حقوق اور مساوات کے نام سے اس مقدس اور محترم صنفِ نازک کو دوبارہ اسی جاہلیتِ اولیٰ کی طرف لوٹانے کی سعئ مذموم کر رہا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شرافت مآب دولت اور قیمتی خزانہ پھر ایک بار گھر کی دہلیز سے نکل کر سربازار تماشائے عالم بن جائے۔ رونقِ خانہ بننے کی بجائے شمعِ محفل ہو، آلات وصنائع اور حقیر سے حقیر مصنوعات کی تشہیر کا ذریعہ بن جائے۔ وہ سیرگاہوں، پارکوں، ہوٹلوں، کلبوں، جلسوں، جلوسوں، اسمبلیوں اور عدالتوں، کارخانوں اور فیکٹریوں، تھیٹروں اور سینماؤں، سرکسوں اور میلوں میں اور سیاست کی اسٹیج پر بھٹکتی ہوئی، رسوا ہوتی ہوئی مشقتیں اور مصیبتیں اٹھاتی ہوئی مردوں کی نشاطِ طبع کا سامان بن جائے اور یہ وہی فاسقانہ تبرج، جاہلیتِ اولیٰ (جاہلیت کی نمود ونمائش

ہے جو اس آبگینۂ عصمت، و حیاکو سر بازار پاش پاش کرنا چاہتی ہے۔

آزادی نہیں غلامی کی دعوت | یہ دعوت و تحریک اسے مرد کا کھلونا اور لعبۃ لاعبین بنانے کی دعوت ہے۔ یہ دعوت درحقیقت عورت کی آزادی کی نہیں اسے پھر سے غلام اور بے بس بنا دینے کی دعوت ہے۔ اور جاہلیت کی وہی شکل ہے جسے اسلام نے تہ و بالا کرکے رکھ دیا تھا۔ اس صورتِ حال کا جاہلیتِ ماضی سے موازنہ کیجئے تب حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کی قدر و قیمت معلوم ہو سکے گی، فرمایا اس عظیم مصلح اور مفکر اور سیاستدانِ اسلام نے:

انما تنقض عُرَی الاسلام عروۃً عروۃً اذ نشأ فی الاسلام من لم یعرف الجاھلیۃ

جو شخص اسلام میں رہتے ہوئے جاہلیت کے طور طریقوں سے ناواقف ہے۔ اُس سے خطرہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ایک کڑی کرکے توڑ بیٹھے۔

اسلام کا نظام عفت و عصمت | اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کیسے اس جاہلیتِ اولیٰ کی ظلمتوں سے نکال کر نور کے اجالا میں کھڑا کر دیا اسلام نے عورتوں کے حقوق کی رعایت و نگہداشت، عصمت و عفت کی حفاظت، تہذیب و تربیت کا ایک ایسا مستقل نظام پیش فرمایا جو اصول و جزئیات، جلی اور خفی، علمی اور نظری، عملی اور خیالی، تمام گوشوں پر ایسا حاوی ہے کہ اس نظامِ عصمت پر فحشاء اور فواحش کا سایہ تک بھی نہیں پڑ سکتا۔ دواعی اور اسبابِ فحاشی کو بھی فواحش کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خیال اور تصور کی لامحدود وسعتوں کو بھی عصمت و عفت کے دوائر میں محدود و محصور کر دیا گیا ہے۔ اس نظام میں حالات و مصالح، علل و بواعث اور جبلی اور فطری تقاضوں کی ہر طرح رعایت رکھی گئی ہے جس کے بغیر نہ سیاستِ مدنیہ درست ہو سکتی ہے نہ تہذیبِ اخلاق ممکن ہے نہ تدبیرِ منزل کارگر ہو سکتی ہے۔ اور جس کے بغیر ایک پاکیزہ معاشرہ کی تعمیر، اخلاقی قدروں کی حفاظت، خاندانی نظام کا قیام و استحکام اور تہذیب و تمدن کا کوئی مثالی نمونہ قائم کرنا قطعی ناممکن ہے۔ آئیے ہم اس سلسلہ میں

قرآن وسنت پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ مرد وزن کا خالقِ حکیم خدا وند کریم اور بنی نوع انسان کے رحمتِ مجسّم نبی الرحمۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہماری رہنمائی کس طرح فرمائی ہے۔ اس کے بعد ایک انصاف پسند اور جویائے حق طبیعت خود فیصلہ کرسکتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کا منشاء کیا ہے؟

پردہ کے احکام | ارشادِ ربانی ہے:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرّج الجاهلیّة الاولی۔	اور گھروں میں ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کی زینت اور نمائش ترک کردو۔

چلنے پھرتے پابندی عائد کی کہ وہ ایسے لباس میں رہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ اور عضو نہ کھلے اور نہ مخفی محاسن کی نمائش ہو۔ فرمایا۔

ولیضربن بخمرهن علی جیوبهنّ	اپنے سینوں اور گریبانوں پر دوپٹوں کا آنچل مارلیں۔

دوسری جگہ ازواج مطہرات، بناتِ اطہار اور تمام مسلمان خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

یدنین علیهن من جلابیبهنّ	وہ لمبی لمبی چادریں اپنے اوپر ڈھانک لیں۔

جلباب | مفسرین نے جلباب کی تفسیر میں لکھا ہے :۔

هو الرداء فوق الخمار۔ جلباب دوپٹہ کے اوپر اوڑھنے والی لمبی چادر کا نام ہے۔ حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: تغطی ثغرۃ نحرها بجلبابها تدنیه علیها۔ وہ اپنے سینہ کو اوپر تک ڈھانپ لیتی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: الذی یستر من فوق الی اسفل۔ وہ کپڑا جو اوپر سے نیچے تک ڈھانپ لے۔

اس آیت کا مفہوم صحابیاتؓ نے یہی سمجھ لیا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں انصاری عورتوں پر خدا رحم کرے کہ انہوں نے حکمِ حجاب سنا تو بڑی چادروں کو پھاڑ کر اپنے اوپر لپیٹ لیا۔

شققن مـــ وطهن نا عتجـن ن منها اب اگر دینی اور دنیوی ضرورت کی وجہ سے انہیں باہر نکلنا بھی پڑجاتا تو بقول حافظ ابن حجرؒ ۔ فقد کن یحجن ویطفن وھن مستترات الابدان حضورؐ کے وصال کے بعد ازواج مطہرات حج اور طواف بھی کرتیں تو اپنے جسموں کو ڈھانپے ہوئے ہوتیں۔ ایک اور موقعہ پر جسم کی عام زینتوں کو چھپائے رکھنے کے لئے مزید تاکیدی حکم دیا گیا۔ فرمایا۔

قل للمؤمنات یغضضن من	مومنات کو حکم دو کہ نگاہیں نیچی رکھیں
ابصارھن ویحفظن فروجھن	شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اپنے
ولایبدین زینتھن الا ما ظھر	بناؤ سنگھار کو نہ کھولیں مگر یہ کہ
منھا ۔ (الآیۃ)	مجبوری اور اور بلا قصد خود ظاہر ہو

جائے۔ اس پردہ اس میں گرفت نہیں۔

اس پردہ اور حجاب کا مزید واضح اور غیر مبہم حکم ان الفاظ میں دیا گیا۔

آیت حجاب | واذا سألتموھن متاعاً فسئلوھن من وراء حجاب۔ بغیر ضرورت کے پردہ کے پاس بھی مت آؤ۔ اگر مجبوری کوئی ضرورت پڑجائے تو گھر میں جھانکنے اور داخل ہونے کی بجائے پس پردہ مانگ لیا کرو۔ گویا گفتگو بھی ہیں پردہ ہوگی اور ضرورت بھی بڑے بڑے معاملات تجارتی لین دین کی نہیں، دکانوں اور سٹوروں میں ماڈل گرل بن کر تجارت کے سودے چکانے کی نہیں فٹ پاتھوں پر اور سڑکوں سے باہر ڈگڈگی بجا بجا کر لوگوں کو کھینچنے کی نہیں بلکہ صرف کوئی معمولی چھوٹی موٹی چیز جیسے لفظ متاعاً میں اشارہ کر دیا۔

حامیان بے پردگی کی مغالطہ انگیزی | اس آیت حجاب کا مقصد واضح ہے کہ اجنبیوں کیلئے نہ صرف عورت کا عام جسم بلکہ اس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں بھی حجاب کے حکم میں شامل ہیں۔ بعض روایات میں آیت بالا کے استثناء الا ما ظھر منھا ۔ کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اس جملہ سے چہرہ، ہاتھ

اور پاؤں مستثنیٰ کر دیئے گئے کہ عورت ان اعضاء کے چھپانے کی پابند نہیں، ایسی روایات کو مخالفین پردہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں بے پردگی کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے، حالانکہ یہ نا سمجھی ہے یا جان بوجھ کر دجل وتلبیس سے کام لیتے ہوئے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ان تمام روایات ونصوص کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں اور چہرہ کے ڈھلنپنے کا صریح حکم دیا گیا ہے۔

ستر اور حجاب میں فرق | حالانکہ درحقیقت دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں دونوں اپنے اپنے دائرہ میں واجب العمل ہیں۔ ایک کا دائرہ ستر اور دوسرے کا حجاب ہے۔ ایک ہے ستر عورت اور ایک ہے حجاب یعنی مردوں سے پردہ کرنا۔ ستر عورت مرد اور عورت دونوں پر یکساں فرض ہے۔ مرد کے جسم کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ یعنی وہ یہ حصہ جسم کا کسی کے سامنے نہیں کھولے گا۔ جسم کا اس کے علاوہ حصہ ستر سے خارج ہے۔ اور عورت کے جسم کا ستر والا حصہ اتنا نہیں بلکہ گردن سے لے کر سینہ، پیٹ، پیٹھ، رانیں، ٹانگیں بمعہ ٹخنوں اور گٹہ تک چھپائے رکھنا فرض ہے۔ جس طرح مرد جسم کا حصۂ ستر، نہ گھر میں کسی کے سامنے کھولے گا نہ باہر، خواہ اس کا والد بھائی، بیٹا کیوں نہ ہوں، اسی طرح عورت اپنے جسم کا مذکورہ سارا حصہ اپنے گھر میں محارم سے بھی چھپائے رکھے گی، البتہ چہرہ ہاتھ اور پاؤں کا چھپانا باپ بھائی بیٹے اور محارم سے چھپانا ضروری نہیں، اگر ان تین اعضاء کے علاوہ اکیلے میں بھی نماز کے دوران چوتھائی حصہ جسم کا کھل گیا یا مرد کے حصہ ستر کا ایک چوتھائی بھی کھل گیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ یہ وہ حقیقی ستر ہے جو بذاتہٖ مردوں عورتوں پر یکساں لازم ہے، فرق ہے تو جسم کی حدود میں۔ اور جس طرح مرد اپنے ہم جنس مردوں سے بھی حصہ ستر چھپانے کا پابند ہے اسی طرح عورت اپنی ہی ہم صنف عورتوں سے بھی سوائے چہرہ اور ہاتھ پاؤں کے باقی سارا جسم چھپائے رکھے گی، یہاں تک کہ بلاضرورت تنہائی میں بھی مرد یا عورت کو ستر کے حصے کھولنا مکروہ ہے۔ اور ایک ہے حجاب یعنی تمام اجنبی مردوں سے

پردہ جو صرف عورتوں پر لازم ہے، مردوں پر نہیں۔ اس میں سر سے پاؤں تک بشمول چہرہ سارا حصہ ڈھانپنا ضروری ہے، حجاب اور ستر کے مختلف دائروں کو خلط ملط کر کے بے پردگی کا جواز نکالنے والے عموماً دھوکہ دیتے ہیں، اگر چہرہ اور ہاتھ پاؤں ستر نہ ہوتے تو پس پردہ گفتگو یعنی من وراء حجاب کے قید لگانے کی ضرورت نہ ہوتی نہ ادناء جلابیب یعنی سر سے پاؤں تک لمبی چادر اوڑھنے کی۔ پس اگر بعض روایات میں کچھ مستثنیات ہیں تو ستر کے متعلق ہیں نہ کہ حجاب ہیں، جیسے ہمارے ہاں عرفِ عام میں پردہ کہا جاتا ہے [۱]

<u>بات چیت میں احتیاطی تدبیر</u> اسی طرح آیت استیذان میں مردوں پر لازم کیا گیا کہ کسی بھی گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہوں۔ اور اگر پسِ پردہ کبھی مجبوراً کسی نامحرم سے گفتگو کی نوبت آبھی جائے تو ہدایت کی گئی کہ سریلی آواز اور نرم و نازک لہجہ میں عورت گفتگو نہ کرے۔ بلکہ شائستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے روکھے پھیکے طرز میں جواب دے دے: تاکہ کسی بدنیت اور خبیث الطبع شخص کے دل میں فتور نہ آجائے۔ فلا تخضعن بالقول فیطمع الّذی فی قلبہ مرضٌ وقلن قولاً معروفا۔ (الآیۃ)

<u>خاص حالت میں باہر نکلنے کی اجازت</u> واویلا ہے کہ اس طرح تو عورت ایک قیدی کی طرح قفس میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ اس کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنا بھی جرم ہے، حالانکہ آیات و نصوص اور روایاتِ ممانعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کسی دینی یا دنیوی ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے بھی باہر نہیں نکل سکتی۔ وہ بلا شبہ دینی و دنیوی ضروریات کے لئے باہر نکل سکتی ہے۔ حج و زیارت کے لئے، عبادات کے لئے، تعزیت اور تیمارداری کیلئے

---

[۱] مضمون کے بعض فقہی اور حدیثی حصوں میں علامہ سید رشید رضا مصریؒ اور قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے موضوع سے متعلق مضامین کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

والدین اور قرابت داروں سے ملاقات کے لئے، علاج معالجہ کے لئے جا سکتی ہے۔ مگر اس کا یہ جانا کئی شرائط اور تقیدات کے ساتھ ہوگا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت بلا ضرورت باہر نہ نکلے اور اس لئے طرح طرح سے خروج کی حوصلہ شکنی کی گئی کہ یہ نقل و حرکت کم سے کم رہ جائے اور جب خروج کی نوبت آ ہی جائے تو یہ چیز عریانی، بے پردگی، محاسن و نمائش کی تشہیر اور جذبات بھڑکانے کا ذریعہ نہ بنے اور اس کی چال میں، ڈھال میں، لباس اور گفتار میں فحاشی کا کوئی داعیہ اور عنصر شامل نہ ہو۔

خروج کے شرائط اور قیود ات یہ خروج شرائط کے ایک دائرہ میں محصور ہے۔ مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی غض بصر کا حکم دیا گیا۔ اسے سفر کی ضرورت پڑے تو خواہ یہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو جس کی ادائیگی ایک فریضہ ہے۔ وہ باپ، بیٹے، بھائی، شوہر اور محارم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ جب عبادت کے سفر کا یہ حال ہے تو کیا عادت اور سیاحت کے اسفار میں اکیلے جانا جائز ہوگا؟ جو لوگ عورتوں کی قید کا رونا رو کر عورتوں کو دیس دیس کی سیاحت اور تنہا گھومنے پھرنے کا راستہ کھولنا چاہتے ہیں ان پر ایک اخبار کے مراسلاتی کالم میں ایک گمنام خاتون نے بہت سادہ الفاظ میں اس طرح طنز کی ہے کہ خدارا ہمیں ان فقیرنیوں کی طرح نہ بنائیں جو ننگے سر، ننگے پاؤں ننگے جسم کے ساتھ سامانِ سفر کا تھیلا پیٹھ پر لادے ہوئے، بھیک مانگتے ہوئے فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر گھوم پھر رہی ہیں۔

یہی خروج، تبرج جاہلیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ٹیڈی باریک اور چست لباس پہن کر یا منی سکرٹ پہن کر سڑکوں پر آوارہ گردی کرنا، اس خروج کی اجازت اگر اسلام سے مطلوب ہے تو اسلام ایسی کاسیات عاریات (برائے نام لباس والی مگر درحقیقت ننگی) پر لعنت بھیجتا ہے اور انہیں عذابِ جہنم کی وعید سناتا ہے۔

یہی حال حج کے علاوہ نماز باجماعت کا ہے جو افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ صحابیاتؓ

کی خواہش ہوتی کہ جماعت میں شریک ہوں۔ مسجدِ نبوی کی نماز اور حضور اقدس کی اقتداء میں باجماعت نماز، کہ ساری متاع کائنات اس کے سامنے ہیچ، اس سے بڑھ کر سعادت کیا ہو سکتی ہے ــــــ نفسی اجازت تو دی گئی مگر یہاں بھی قیودات کے ساتھ کہ ماحول اور زمانہ فساد کا نہ ہو عورت کی عزت اور عصمت خطرہ میں نہ ہو۔ اور خواتین سر سے پاؤں تک ڈھکی چھپی ہوں۔ جس کی طرف "متلفعات بمروطھن" میں بھی اشارہ ہے۔ اور صفوں میں بھی ان کی صف سب سے آخر میں ہوں۔ کہ سب سے آخر میں آکر سب سے پہلے چلی جائیں، اس طرح مردوں اور عورتوں کی نگاہوں کے تصادم کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور بعض فقہا و آئمہ نے تو جماعت میں مرد و زن کے محاذات کو مفسد نماز قرار دیا۔ غرض طرح طرح کی رکاوٹیں اس معاملہ میں بھی ملحوظ رکھی گئیں۔

ایک صحابیہؓ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا گھر کی کوٹھڑی میں تمہارا نماز ادا کرنا اس نماز سے افضل ہے جو تم گھر کے دالان میں پڑھو۔ اور گھر کے برآمدہ میں نماز اس نماز سے افضل ہے جو تو گھر کے صحن میں ادا کرے۔ اور گھر کے صحن میں جو نماز پڑھے وہ مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ اور گھر کی اس نماز کی یہ افضلیت اس مسجد کی نماز پر دی گئی جہاں کی ایک نماز دیگر مساجد کی نماز پر ہزار گنا فضیلت رکھتی ہے۔ اور پھر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقتداء میں نماز کہ دنیا و آخرت کی ساری دولتیں اس کے سامنے بے وقعت ہیں۔ اور وہ اس عہدِ سعادت میں جب کہ عفت و تقویٰ کا چار سو دور دورہ تھا۔ اور تسلیم و انقیاد کی کیفیت خود عورتوں میں بھی ایسی تھی کہ آیتِ حجاب کے نازل ہونے پر جس خاتون نے راہ چلتے ہوئے اعلانِ حجاب سنا، اس کے وہیں قدم جم گئے۔ جو جہاں تھیں وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں اور دوسرا قدم تب اٹھایا کہ اپنے آپ کو چادروں میں چھپا لیا تھا۔ مسجد جانے کے ضمن میں اجازت بھی دی گئی تو ایک آیت

میں اسے رات کی تاریکی سے مقید کر دیا گیا کہ جانا ہی چاہیں تو تاریکیٔ شب میں جانا بہتر ہے۔ اور ایک روایت میں فرمایا کہ جب مسجد جانے کا قصد کرے تو خوشبو نہ لگائے بلکہ ممانعت بھی وارد ہوئی کہ جو عورت خوشبو لگائے وہ ہمارے ساتھ نمازِ عشاء میں شرکت نہ کرے۔ خوشبو کے علاوہ ایسا بناؤ سنگھار بھی منع ہے جو مسجد میں نمازیوں کے لئے فتنہ سامانی کا باعث بن جائے۔ فرمایا ولیخرجن تفلات۔ مسجد جانے کے لئے میلی کچیلی ہو کر نکلیں یعنی بناؤ سنگھار اور میک اپ کرکے نہ نکلیں پھر خوشبو کی یہ ممانعت مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جہاں بھی گھر سے باہر نکلے ایسی کوئی خوشبو لگانے سے احتراز کرے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بنے، ایسی عورت کو جو خوشبو لگا کر لوگوں کے پاس سے گزرتی ہے زانیہ کہا گیا ہے۔ فھی کذا وکذا۔

باہر نکلنے کے دوران یہ قید بھی لگائی گئی ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن لمبی چادریں اپنے سینوں پر ڈھانپ دیں۔ عورت اگر بجنے والا زیور پہنے ہوئے ہے تو چلتے ہوئے اسے بچا بچا کر نہ چلے کہ لوگوں کو مخفی زیور کا علم ہو سکے یا اس کے بجنے کی آواز سے لوگوں کو اس طرف رغبت ہو۔ ولا یضربن بارجلھن۔ الآیۃ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عورتوں کو اجنبیوں پر سلام کرنا نہیں نہ اس پر اجنبی مردوں کے سلام کا جواب دینا ہے۔ تمدن و تہذیب کے نام سے عورتوں کو کلبوں اور مخلوط مجالس میں کھینچ کر لانے والوں کو اس میں سبق ہے کہ حضور علیہ السلام نے عورتوں کو حمام میں جانے سے روکا کہ وہ مردوزن کے اختلاط کے مقامات میں سے ہے۔ اور ایسی تمدنی معاشرت اور سہولت صاحبِ شریعت کو گوارا نہ تھی۔ عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔

صرف عملی، علمی نہیں بلکہ خیالی اور تصوراتی تحدیدات | اسی طرح عورت کی ایسے مناصب اور اسامیوں پر تقرری ممنوع کر دی گئی جن میں مردوں سے اختلاط اور رُو برُو ہونا یا خلوت کے مواقع کی فراہمی

ناگوزیر ہے۔ حکومت وریاست ولایتِ عامہ قضاء اور عدالتوں کے کاموں سے انہیں روک دیا گیا۔ یہ تحدیدات صرف تمدنی، معاشرتی عملی اور علمی حد تک نہ تھیں بلکہ خیالات اور تصورات تک میں حیاء وعفت کی نگہداشت کی گئی۔ مرد کا عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرنے کو کسی نے ناجائز اور کسی نے مکروہ تنزیہی کہا کہ کہیں خیالات کا سلسلہ وضوء سے گناہ تک نہ پہنچ جائے اور جو عمل تطہیرِ ذنوب وآثام کا ذریعہ تھا موجبِ آثام نہ بننے پائے۔ جنازہ میں امام عورت کے سینہ سے قدرے ہٹ کر کھڑا ہوگا گو اس پر ڈولی اور پردہ ہی کیوں نہ ہو کہ تصورِ محاسن مرأۃ کی طرف منتقل نہ ہونے پائے، امام جماعت مقتدیوں کے اقتداء کی نیت کرے گا۔ مگر خاص طور پر عورتوں کی نیت نہیں کرے۔ اسی طرح سلام پھیرتے وقت عورتوں کی نیت نہیں کی جائے گی۔ کہ آغاز یا انجامِ نماز تصوراتِ بد کا ذریعہ اور ناجائز حظِ نفس کا موجب نہ بن جائے۔

کیا پردہ حبسِ بے جا ہے؟ آج کہا جارہا ہے کہ عورتوں کا گھر میں بند رہنا گویا انہیں قفس میں قید رکھنا ہے۔ اور یہ حبس بے جا "مساواتی دور" میں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس طرح گھروں میں بیٹھے رہنے سے عورتوں کی صحت خراب ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ عورت کا اپنی مرضی اور طبعی وفطری تقاضوں سے گھروں میں بیٹھنا جبکہ وہ دینی و دنیوی ضروریات کے لئے شرائط اور قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمائشِ زینت اور ذریعۂ فواحش بننے سے محترز رہتے ہوئے گھر سے باہر آجاسکتی ہے۔ اور گھر کی چاردیواری اس کے لئے ہزارہا خطرات اور مصائب سے تحفظ کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ ہرگز قید یا اذیت نہیں بلکہ عین راحت اور نعمت ہے۔ اگر گھر میں اپنی مرضی سے بیٹھے رہنا قید ہے تو پھر تو مردوں کا بھی زیادہ تر وقت گھروں میں رہنا ہے۔ انہیں بھی جبراً نکال دیا جائے۔ پھر بلاضرورت آوارہ گردی کرنا تو مردوں کے لئے بھی معیوب ہے۔

مرد اور عورت کا دائرہ کار | تو اصل معاملہ خلقی اور جبلتی تقاضوں کی وجہ سے تقسیم کار ہے۔ مرد باہر نکلتا ہے تو عورت اور اس کے بچوں کی خاطر ہزاروں پریشانیوں اور مصیبتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے رہے، ورکشاپوں میں، فیکٹری اور کانوں میں پسینہ سے شرابور اپنا خون جلا رہا ہے۔ کہیں مزدوری اور کاشتکاری میں مقید و محصور ہے، کہیں دفتر کے ایک چھوٹے سے کونے میں صبح سے شام تک ساری زندگی ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح عورت کے ذمہ امور خانہ داری کی انجام دہی، بچوں کی تربیت و حفاظت، گھر کی نگہداشت کرنا ہے، وہ گھر کی اسیر نہیں، رونق خانہ اور نور منزل ہے۔ نئی تہذیب ظلم اور قید کے نام پر بظاہر جذبات ترحم ابھار کر اسے باہر کی ناقابل برداشت ذمہ داریوں اور صعوبتوں کی خارزار زندگی میں کھینچ کر اپنی فطری ذمہ داریوں کو اس کے سر منڈھنا چاہتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گلیوں، کوچوں میں بازاروں اور فیکٹریوں میں اپنے لئے ذریعۂ معیشت پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو قید کا یہ استدلال اور دوسری طرف اسی سانس میں کہہ دیا جاتا ہے کہ پاکستان کی زیادہ تر آبادی دیہات میں پردے کی پابند نہیں اور اپنے خود ساختہ استدلال کی نفی کر دی جاتی ہے۔

گھر میں بیٹھنا قید نہیں راحت و نعمت ہے | اگر آرام و راحت اور جان و آبرو کے ایک گوشۂ راحت میں زندگی بسر کرنا قید ہے تو شہروں کے ان لاکھوں کروڑوں عوام کی زندگی کیا ہے جو ہزاروں مسائل کی چکی میں پستے ہوئے ایک ہی شہر میں حیات مستعار ختم کر دیتے ہیں۔ ہر قسم کی آسائشوں سے محروم پانی کی قلت، خوراک کا فقدان، اور اب شہری فضاؤں کی آلودگی کی وجہ سے ہوا جیسی عام نعمت کو بھی ترسنے لگے ہیں۔ اگر یہ سب قید ہے اور قید سے بھی بدتر، تو پھر تو ساری شہری آبادی کو جنگلوں کی طرف دھکیل دیا جائے کہ وہ آزاد فضاؤں اور جنگلوں میں آزاد ہو کر گھومتی پھرے۔ اور اگر یہ سب کچھ قید و حبس نہیں تو عورتوں کو

اپنی اختیار اور رغبت اور فطرت کی بنا پر گھروں میں رہنا بھی مفید نہیں۔

پردہ نہیں بے پردگی خرابیٔ صحت کی باعث ہے | پھر عورتوں کی خرابیٔ صحت کا رونا رویا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں خرابیٔ صحت کی شرح میں اضافہ کے اسباب وہی ہیں جو صرف عورتوں کے نہیں مردوں، بڑوں بوڑھوں اور بچوں سب کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی سے اکثریت استحصالی ہتھکنڈوں کی وجہ سے محروم رہتی ہے۔ کوئی غذا خالص نہیں ملتی۔ نہ سر چھپانے کے لئے موزوں مکان، نہ سردی و گرمی سے بچنے کے لئے مناسب لباس، پانی اور ہوا تک جب خالص میسر نہ ہو سکے تو صحت کی شرح کیسے بہتر ہو سکتی ہے، چاہیئے یہ کہ حفظانِ صحت کے اصل اسباب تلاش کئے جائیں، اور لوٹ کھسوٹ کے اس کاروبار میں کمی کی جائے جس کی وجہ سے عوام مصائب اور فاقہ کشی کی دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں طبی سہولتوں بالخصوص عورتوں کے علاج معالجہ کی طرف توجہ دی جائے اگر عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا بربادیٔ صحت کا ذریعہ ہے۔ تو آئیے ان مخلوط اور بے حیا اور بے حجاب ملکوں کا حال بھی دیکھتے چلیں جہاں عورت اتنی آزاد ہے کہ ہفتوں اسے گھر کی دہلیز دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ وہاں جب عورت باہر قدم رکھتی ہے تو ہزاروں پریشانیوں، اور خطرات سے جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں اور الجھنوں میں مبتلا ہو جاتی ہے، یورپ کے آئے دن کے ہزاروں نوع بنوع جنسی، اعصابی، نفسیاتی اور ذہنی و دماغی امراض اور اموات کی شرح میں اضافہ کی رپورٹیں پڑھیئے۔ تفریح گاہوں اور کلبوں کی زندگی نے یورپی اقوام کی صحت کو سرطان لگا دیا ہے۔ ایسے جنسی امراض کا دور دورہ ہے جس کا نام و نشان بھی اس سے پہلے نہ تھا۔ ہزاروں لاکھوں عورتیں اسقاطِ حمل اور متعلقاتِ حمل کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ فیکٹری اور دفتر کی ملازمت نے اس کی صحت گرا دی ہے۔ وہ بچوں کی پرورش کے قابل نہیں رہی وہ والدین اور شوہر کی خدمت نہیں کر سکتی۔ اس

پرہسٹیریا کے دورے پڑتے ہیں، وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوتی جارہی ہے۔

نظر بازی، ذہنی انتشار اور فسادِ معاشرہ کا ذریعہ | پھر عورت کا گھر سے یہ بے تحاشا صرف اس کی صحت کی تباہی کا موجب نہیں بنتا۔ بلکہ پورے معاشرہ کے سقم اور بیماری کا ذریعہ بنتا جارہا ہے۔ وہ جدھر سے گزرتی ہے بے شمار نگاہوں کا نشانہ بنتی ہے، ایک مرد راستہ میں چلتے ہوئے ایک سے ایک جاذبِ نظر چہرہ دیکھتا ہے۔ اسے دفتر میں کارخانوں میں بے حجابانہ اختلاط اور بات چیت کے مواقع ملتے ہیں، اور یہ نظر بازی اس کے اپنے گھریلو نظام کو ہلا دیتی ہے، ذہنی انتشار، فاسد خیالات کا ہیجان جنسی اور جذباتی تلاطم، محبت و عشق کی آفتیں۔ الغرض یہ سب کچھ اس کے ذہنی اختلال، قلبی پریشانی اور اعصاب کے کھچاؤ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پھر دل کی بیماری جنسی اور اخلاقی بیماریوں، ضعفِ بصارت، دماغی عدم توازن، بلڈ پریشر اور اعصابی امراض کی شرح کا کسی پردہ دار معاشرہ سے موازنہ کرکے خود فیصلہ کر لیجئے۔

تعلیم کے لئے بے پردگی | پھر کہا جاتا ہے کہ عورت کو تعلیم کی ضرورت ہے، اور اقتصادی حالات جداگانہ تعلیم کے متحمل نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی تعلیم تھی جسے عورت کے لئے بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔ عورت کے لئے اسلام کا تصورِ تعلیم قطعی وہ نہیں جو یورپ کی پیداوار ہے۔ وہ اس سے دفتر، کارخانہ اور فیکٹریوں کے فرائض نہیں وابستہ کرتا کہ اس کے لئے وہ عورت کو کلرک، انجنیئر یا مزدور بنائے اسلام کی تعلیم عورت کو ایک باسلیقہ، وفاشعار، مہذب اور باحیا ذات بنانے کے لئے ہے۔ وہ اس تعلیم کو اہمیت دیتا ہے جو عورت کو خدا و رسولؐ، شوہر اور خاندان کے حقوق اولاد کے حسن تربیت سے باخبر کردے اور اس کی گود بچوں کی اوّلین تربیت گاہ ثابت ہوسکے۔ اس تعلیم کے لئے یہ ہرگز لازم نہیں کہ وہ مخلوط درس گاہوں اور بے حجابانہ

ہاسٹلوں میں گوہر حیا کی نیلامی کرتی پھرے۔

الغرض وہ تعلیم جو بے پردگی کا باعث ہو، شریعت اور اسلام اس کا حکم نہیں دیتا۔ بے پردگی اگر اخلاق و معاشرت، صحتِ جسمانی و روحانی اور حسنِ سیرت کے لئے تباہ کن ہے۔ تو جس تعلیم کے ذریعہ بے پردگی پھیلے گی شریعت ہرگز اس کی روادار نہ ہوگی، پھر تعلیمِ نسواں کی تاریخ دیکھئے، جب ظہورِ اسلام کے بعد حجاب اور عفت و عصمت کا دور دورہ ہوا اور عورت پردہ نشین ہوگئی تو اسلامی تاریخ میں تعلیمِ دین اور علوم و فنون سے آراستہ وہ خواتین نکلیں جن کے علوم سے خانہ نشینی کے باوجود ایک دُنیا مستفید ہوتی رہی۔ پس اگر مفاسد اور موجباتِ فحشاء کے بغیر شرعی حدود پردہ میں رہ کر مسلمان خواتین علم و فضل میں ایک نمونہ پیش کر سکتی ہیں تو مغرب کے بے حیاء عہدِ جاہلیت میں جو عورتیں باہر نکل بھی آئیں تو اسلامی علوم و فنون اور تعلیم اخلاق و تربیت معاشرہ میں کوئی ایک نمونہ بھی اس عہدِ جاہلیت نے پیش کیا، علم حیاء سے حاصل ہوتا ہے۔ بے پردگی سے جب آنکھوں کا پانی اتر گیا تو علمِ حقیقی اور علمی ذہنیت بھی فنا ہوگئی، نئے دور کے علم نے مردوں کو کیا دیا، سوائے چند انگریزی نظام کے پرزوں کے۔ ہم اس تعلیمِ جدید کے لئے خواتین کی عظمت و حرمت بھی قربان کر دیں۔

الغرض پردہ کا حکم نہ فرسودہ روایات (معاذ اللہ) میں سے ہے نہ کسی رسم و رواج کی پیداوار، اسلام عصمت و عفت کا محافظ ہے، وہ فحشاء اور منکرات کا ہرگز روادار نہیں۔ جہاں بھی فحشاء اور فواحش کے احتمالات زیادہ ہوں گے۔ پردہ کے احکام میں اتنی ہی شدت پیدا ہوگی۔ اور جہاں فحشاء کا احتمال نہ ہوگا عصمت و عفت کے پہرے سخت ہوں گے۔ وہاں اس میں نرمی اور وسعت پیدا ہوگی۔

ماڈرن بننے کے شوقین | پس جو لوگ مصلح اور ماڈرن ریفارمر بننے کے شوق میں اسلام کے

ایک مضبوط نظام کو نشانہ بنانا چاہیں وہ ایسی "اصلاحات" کا انجام یورپی اقوام میں دیکھ لیں کہ وہ بے پردگی اور فحاشی کے ہاتھوں کس قعرِ مذلت میں پہنچ چکا ہے — پھر انہیں عالمِ اسلام کے اس قسم کے نام نہاد مصلحین سے سبق لینا چاہیئے جنہوں نے ترکی وغیرہ میں تقلیدِ یہود و نصاریٰ کی خاطر اسلام کے ایک مستحکم نظام کو متزلزل کرنا چاہا، اور ان کا یہ اقدام ایک طرف قوم کی معاشرتی، اخلاقی قدروں کی بربادی اور دوسری طرف "مصلحین" ابدی ذلت اور مسلمانوں کے قلوب کی نفرت و ملامت کے مستحق بنے۔ (مئی ۱۹۷۶ء)

كتاب
الطهارة

باب الوضوء

وضو کے مسائل

★

وضو کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ وضو شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر ایک شخص وضو کی ابتداء میں قصداً یا سہواً بسم اللہ نہ پڑھے تو وضو پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وضو شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا سنت ہے اگر کسی سے بسم اللہ عمداً یا سہواً رہ جائے تو وضو پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا تاہم بار بار جان بوجھ کر ترک کرنا موجبِ ملامت ہے۔

قال الحصکفیؒ فی باب سنن الوضوء والبدءة بالتسمیة ای من سنن الوضوء (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۱۰۸) وایضاً قال وترک السنة لا یوجب فساداً ولا سهواً بل اساءة لو عامداً غیر مستخف وقالوا الاساءة ادون من الکراهة[1] (الدر المختار ج ۱ ص۴۷۳)

برش مسواک کی سنت کا متبادل نہیں

سوال:۔ مسواک سے عموماً دانتوں کی صفائی مقصود ہوتی ہے موجودہ دور میں برش سے یہ فائدہ اچھے طریقہ سے حاصل ہوتا ہے کیا یہ مسواک کا نعم البدل ہو سکتا ہے؟ یعنی برش کے استعمال سے سنت ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ دانتوں کی صفائی بلاشک مسواک کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ہے لیکن مسواک کا استعمال صرف دانتوں کی صفائی کے لیے نہیں، بنیادی عنصر اس میں سنتِ رسولؐ کا اتباع ہے، برش میں وہ خصوصیات اور صفات نہیں پائی جاتیں جو مسواک میں موجود ہوتی ہیں اسلیئے اس سے سنت ادا نہ ہوگی، تاہم برش کا نفسِ استعمال جائز ہے۔

---

[1] قال ابن نجیمؒ: فی سنن الوضوء (قوله کالتسمیة) ای کما ان التسمیة سنة فی الابتداء مطلقاً۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۱۸) ومثله فی الهندیة ج ۱ ص۶ الفصل الثانی فی سنن الوضوء۔

قال ابراھیم الحلبیؒ: ثم المستحب ان یکون المسواک من شجرۃ مرّۃ لزیادۃ ازالۃ تغیر الفم قالوا ویستاک بکل عود الا الرمان والقصب وافضلہ الاراک ثم الزیتون وان یکون طولہ شبرًا فی غلظ الخنصر[1] (کبیری۔ آداب الوضوء ص۳۷)

مسواک نہ ہونے کی صورت میں کیا انگلی قائم مقام ہوسکتی ہے؟

سوال:۔ اگر کسی شخص کے پاس مسواک نہ ہو یا مسواک کے استعمال سے تکلیف ہوتی ہو تو ایسی صورت میں انگلی مسواک کا قائم مقام ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مسواک میسر نہ ہو یا منہ میں دانت نہ ہوں یا اس کے استعمال سے کسی تکلیف اور ضرر کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں انگلی مسواک کا قائم مقام بن سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی الحلیۃ ثم بای اصبع استاک لا باس بہ والافضل ان یستاک بالسبابتین یبدأ بالسبابۃ الیسریٰ ثم بالیمنی وان شاء استاک بابہامہ الیمنی والسبابۃ الیمنی یبدأ بالابہام من الجانب الایمن فوق وتحت ثم بالسبابۃ من الایسر کذٰلک[2] (رد المحتار علی الدر المختار۔ سُنن الوضوء ج۱ ص۱۱۵)

مسواک چبانے کا حکم

سوال:۔ مسواک استعمال کرتے وقت اگر مسواک کو نرم کرنے کے لیے دانتوں سے چبایا جائے تو کیا از روئے شرع یہ عمل جائز ہے؟

الجواب:۔ مسواک کو دانتوں سے باریک کرنے میں شرعًا کوئی قباحت نہیں اور سُنّت کی ادائیگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ طبّی لحاظ سے مسواک کے چوسنے سے قوتِ بینائی متاثر ہوسکتی ہے اس لیے مسواک کا چوسنا مناسب نہیں۔

کما اخرجہ البخاری: عن عائشۃ ..... فاخذتُ السواکَ فقضمتہٗ ونفضتہٗ وطیّبتہٗ ثم دفعتہ الی النبیؐ۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۶۳۸ باب وفات النبیؐ) قال الحصکفیؒ

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (قولہ والسواک) بالکسر بمعنی العود الذی یستاک بہ۔ (رد المحتار ج۱ ص۱۱۳، ۱۱۵ سنن الوضوء)
وفی ایضًا، ویستاک بکل عود الا الرمان والقصب وافضلہ الاراک ثم الزیتون۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وتقوم الاصبع او الخرقۃ الخشنۃ مقامہ عند فقدہٖ او عدم اسنانہ فی تحصیل الثواب لا عند وجودہٖ۔ (البحر الرائق، سنن الوضوء ج۱ ص۲۱) ومثلہ فی الزیلعی، سُنن الوضوء ج۱ ص۴

ولا يمصه فانه يورث العمى۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار۔ سنن الوضوء ج ۱ ص ۱۱۴)[1]

ناخن پالش کی موجودگی میں وضو کا حکم

سوال:۔ آجکل عام عورتیں ناخن پالش لگاتی ہیں کیا ناخن پالش کی موجودگی میں وضو اور غسل پر کوئی اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ ناخن پالش جدید دور کا مسئلہ ہے اس کیلئے مستقل جزئیہ کسی قدیم کتاب میں نہیں ملتا ہے، موجودہ دور کے نامور علماء ناخن پالش کے عدم جواز کے قائل ہیں، کیونکہ ناخن پالش سے ناخن کا جسم مستور ہوکر وضو اور غسل میں اس کو پانی پہنچنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے گوندھے ہوئے آٹے کی طرح مانع وضو اور غسل ہے۔

لیکن بعض دوسرے علماء کے نزدیک ناخن پالش اگر عورت کی زینت مان لی جائے تو پھر ایسی صورت میں اگر ازالہ میں دشواری نہ ہو تو وضو اور غسل کے لیے ازالہ ضروری ہوگا اور اگر ازالہ میں حرج ہو لیکن اس کی تہہ نہ بنی ہو تو پھر اس کا حکم مہندی کی طرح ہوگا اور تہہ بن جانے کی صورت میں اس کے ازالہ میں حرج ہو تو موجب حرج ہونے کی وجہ سے پانی کا ایصال ضروری نہیں۔

قال الحصکفیؒ: ویجب ای یفرض غسل کل ما یمکن من البدن بلا حرج مرۃً (وبعد اسطر) ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین اسنانه اوفی سنه المجوف به یفتی وقیل ان صلبًا منع وهو الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار، ابحاث الغسل ج ۱ ص ۱۵۲-۱۵۳)

تاہم موجودہ وقت میں یہ مغربی ثقافت کا ایک جزء سمجھا جاتا ہے اس لیے معزز گھرانوں کی خواتین کے لیے اس سے اجتناب ضروری ہے لہٰذا محققین علماء کے نزدیک ناخن پالش، وضو اور غسل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

وضو میں گردن کا مسح

سوال:۔ وضو میں گردن کا مسح کسی روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟ بصورت ثبوت فقہاء کے نزدیک اس کا کیا درجہ ہے؟

---

[1] اخرجه الزیلعیؒ عن عائشة قالت ...... فاخذت السواك فقضمته وطیبته ثم دفعته الی رسول اللهؐ۔ (نصب الرایة ج ۱ ص ۸ احادیث السواك) قال الشیخ عبد الحی الکھنویؒ: لا یمص السواك فانه یورث العمی۔ (السعایة ج ۱ ص ۱۱۹ باب سنن الوضوء) ومثله فی مرقاة شرح مشکوٰة ج ۱۱ ص ۲۳۸ باب وفات النبی الفصل الاول۔

الجواب:۔ گردن کے مسح کے بارے میں متعدد روایات آئی ہیں جن میں موقوف روایات کے علاوہ مرفوع روایات بھی ہیں۔

لما ذکر العلامة العینیؒ عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من توضأ ومسح عنقه لم یغل بالاغلال یوم القیٰمة ۔ (البنایة شرح الهدایة ج۱ ص۱۰۸ باب الوضوء)

البتہ فقہاء کے نزدیک تعیینِ حکم میں اختلاف ہے، بعض علماء اس کی سُنّیت کے قائل ہیں لیکن صاحب الخلاصہ نے استحباب کو ترجیح دی ہے اور صاحب کنز نے بھی اس کو مستحباتِ وضوء میں ذکر کیا ہے۔

قال ابن نجیمؒ: وقیل سنة وهو قول الفقیه ابی جعفر وبه اخذ کثیر من العلماء کذا فی شرح مسکین وفی الخلاصة الصحیح انه ادب وهو بمعنی المستحب۔ (البحر الرائق مستحبات الوضوء ج۱ ص۲۸)[1]

سُر پر مسح کرنے کا مسنون طریقہ

سوال: سَر پر مسح کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ سَر پر مسح کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سر کے ابتدائی حصہ پر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور انگلیاں رکھ کر گردن تک ایسے طریقے سے لے جائے کہ اس سے تمام سر کا احاطہ ہو۔

قال العلامة محمد امینؒ: والاظهر ان یضع کفیه واصابعه علی مقدم راسه ویمدهما الی القفا علی وجه یستوعب جمیع الرأس۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ سنن الوضوء ج۱ ص۱۲۱)[2]

---

[1] عن وائل بن حجرؓ قال شهدت النبیؐ واُتِیَ باناء فاکفا علی یمینه ثلاثاً ثم غمس یمینه فی الماءِ فغسل بها ذراعه الیمنی حتی جاوز المرفق ثلاثاً ثم غسل یساره ثلاثاً حتی جاوز المرفق ثلاثاً ثم مسح علی راسه ثلاثاً وظاهر اُذُنَیْهِ وظاهر رقبته۔ (نصب الرایة ج۱ ص۱۳)

وقال صاحب التنویرؒ فی مستحبات الوضوء ومسح الرقبة۔ وقال ابن عابدینؒ (تحت قوله ومسح الرقبة) هو الصحیح وقیل انه سنة۔ (رد المحتار علی الدر المختار مستحبات الوضوء ج۱ ص۱۲۴) ومثله فی السعایة ج۱ ص۱۲۸ باب مسح الرقبة۔

[2] قال ابن نجیمؒ: قال الزیلعی تکلموا فی کیفیة المسح والاظهر ان یضع کفیه واصابعه...الخ (البحر الرائق، سنن الوضوء ج۱ ص۲۶) ومثله فی الهندیة ج۱ ص۷ الفصل الثانی فی سنن الوضوء

وضو کرتے وقت داڑھی تر کرنے کا حکم

سوال:۔ وضو کرتے وقت چہرہ دھونے کی حالت میں داڑھی کا کیا حکم ہے؟ کیا پوری داڑھی دھونا ضروری ہے یا بعض حصہ پر اکتفاء درست ہے، نیز گھنی اور ہلکی داڑھی کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح ہو کہ داڑھی کی دو قسمیں ہیں، گھنی اور ہلکی، اگر بالوں سے چہرے کی کھال نظر آتی ہو تو ایسی داڑھی ہلکی شمار ہوتی ہے اور جس داڑھی میں چہرے کی کھال مستور ہو تو اس کو گھنی داڑھی کہا جاتا ہے۔ اوّل الذکر یعنی ہلکی داڑھی کا دھونا فرض ہے یہاں تک کہ جو کھال نظر آتی ہو اس کا دھونا بھی فرض ہے اور گھنی داڑھی میں چہرے کی حدود میں جو داڑھی واقع ہو اُس کا دھونا فرض ہے اور جو داڑھی لٹکی رہے اس کا دھونا نہیں بلکہ صرف مسح ضروری ہے۔

قال الحصکفیؒ: ثم لا خلاف ان المسترسل لا یجب غسله ولا مسحه بل یسن، وان الخفیفة التی تری بشرتها یجب غسل ما تحتها ــ وقال ابن عابدینؒ: (تحت قوله المسترسل) ای الخارج عن دائرة الوجه، وفسره ابن حجر فی شرح المنهاج بما لو مد من جهة نزوله لخرج عن دائرة الوجه. (رد المحتار علی الدر المختار فرائض الوضوج ا صـ۱ـ) [1]

خضاب والی داڑھی پر وضو کا حکم

سوال:۔ بالوں پر خضاب لگانے سے حقیقت میں بالوں کی اپنی حقیقت غائب ہو کر اُن پر باریک سا پردہ آجاتا ہے، کیا اس سے وضو پر اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ بالوں پر خضاب لگانے سے کوئی تہہ نہیں بنتی اس لیے ایسے رنگ کی موجودگی میں وضو اور غسل پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ رنگریز کے ہاتھوں پر کپڑے کو رنگ دیتے وقت رنگ کا لگ جانا مانع وضو اور غسل نہیں۔ البتہ اگر بدن کے کسی ایسے حصہ پر جس کا دھونا ضروری

---

[1] قال فی الهندیة: وروی عن ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ انه یجب امرار الماء علیٰ ظاهر اللحیة هو الاصح کذا فی التبیین وهو الصحیح هکذا فی الزاهدی والشعر المسترسل من الذقن لا یجب غسله کذا فی المحیطین۔ (الهندیة ج ۱ صـ۴ کتاب الطهارة۔ الباب الاول) ــ ومثله فی البحر الرائق ج ۱ صـ۱۶ فرائض الوضوء۔

ہو جیسے لکڑی والا رنگ (پینٹ) لگ گیا ہو تو اس سے تہہ بن جانے کی وجہ سے پانی کا پہنچنا ممکن نہیں اس لیے اس کا ہٹانا ضروری ہے اور اس کی موجودگی میں وضو بھی درست نہیں۔

قال الحصکفیؒ: ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین اسنانہ او فی سنہ المجوف بہ یفتی وھو الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۱ ص ۱۵۴ ابحاث الغسل) [1]

وضو کے بعد آسمان کی طرف دیکھنا

سوال:۔ وضو مکمل کرنے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ وضو مکمل کرنے کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا مقصود بالذات نہیں بلکہ مسنون دعائیں پڑھتے وقت ادب یہ ہے کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی جائے۔

قال ابن عابدینؒ: وان یقول بعد فراغہ سبحانک اللّٰھمّ وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک واشھد ان محمداً عبدک ورسولک ناظراً الی السماء۔ (رد المحتار علی الدر المختار مندوبات الوضوء ج ۱ ص ۱۲۸) [2]

عبادت کیے بغیر وضو علی الوضو کا حکم

سوال:۔ ایسا وضو جس سے کوئی عبادت نہ ہوئی ہو تو ایسی حالت میں دوبارہ وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وضو علی الوضو بالاتفاق جائز ہے، البتہ اگر ایک دفعہ کیے ہوئے وضو سے کوئی ایسی عبادت ادا نہ کی جائے جس کے لیے وضو شرط ہو تو ایسی صورت میں وضو علی الوضو کراہت سے خالی نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: وفی شرح المُنیۃ فاذا لم یؤد بہ عمل مما ھو المقصود من شرعیتہ کالصلوٰۃ وسجدۃ التلاوۃ ومس المصحف ینبغی ان لا یشرع تکرارہ قربۃ لکونہ غیر مقصود لذاتہ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۱۱۹ مطلب فی الوضوء علی الوضوء) [3]

---

[1] قال العلامۃ الشرنبلالیؒ: ولا ما علی ظفر الصباغ من صبغ للضرورۃ وعلیہ الفتوٰی (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۵۰ فصل فی تمام اقسام الوضوء) ومثلہ فی مُنیۃ المصلی ص ۲۳

[2] قال العلامۃ الکاشغریؒ: بعد ما ذکر الادعیۃ الماثورۃ ناظراً الی السماء۔ (مُنیۃ المصلی ص ۱۴ سنن الوضوء)

[3] قال ابراھیم الحلبیؒ فاذا لم یؤد بہ عمل مما ھو المقصود من شرعیتہ کالصلوٰۃ وسجدۃ التلاوۃ ومس المصحف ینبغی ان لا یشرع تکرارہ قربۃ..... الخ (کبیری، سنن الوضوء ص ۲۶)

وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ وضوء کرتے وقت چہرے کو ایک ہاتھ سے دھوتے ہیں، جس میں پانی کا ضیاع اور بسا اوقات استیعاب میں بھی خلل آجاتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ وضوء میں مغسولہ اور ممسوحہ اعضاء کا استیعاب مسنون ہے، اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ دھویا ہے لہٰذا ایک ہاتھ سے چہرہ دھونا خلافِ سنت ہے۔

لما قال الامام محمد اسماعیل البخاریؒ: باب غسل الوجه باليدين من غرفة واحدة: عن ابن عباس انه توضأ وجهه اخذ غرفة من ماء فتمضمض بها واستنشق ثم اخذ غرفة من ماء فجعل بها هكذا اضافها الى يده الاخرى فغسل بها وجهه الخ۔ (الجامع الصحیح البخاری ج۱ ص۲۶ باب غسل الوجه باليدين من غرفة واحدة)[۱]

گلے کے مسح کا حکم

سوال:۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ گردن کے مسح کے ساتھ ساتھ گلے کا مسح بھی کرجاتے ہیں، کیا گلے کا مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آدابِ وضوء میں گردن کا مسح شامل ہے، حلقوم (گلے) کا مسح اسلاف میں سے کسی سے ثابت نہیں، اس لیے گلے کا مسح کرنا بدعت ہے۔

لما قال ابن نجیمؒ: والثانی مسح الرقبة وهو بظهر اليدين واما مسح الحلقوم فبدعة۔ (البحر الرائق ج۱ ص۲۹ کتاب الطهارت)[۲]

وضو میں ہاتھ دھونے کی ابتداء انگلیوں کی طرف سے کرنا سنت ہے

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں لوگ وضو کے دوران ہاتھوں پر انگلیوں کی طرف سے پانی بہاتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

---

[۱] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی: چہرہ ایک ہاتھ سے دھونا اور سر کا مسح ایک ہاتھ سے کرنا خلافِ سنت ہے۔ (امداد الاحکام ج۱ ص۳۴۷ فصل فی سنن الوضوء وآدابه ومکروهاته)

[۲] قال الحصکفیؒ: ومسح الرقبة بظهر يديه لا الحلقوم لانه بدعة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۱۲۴ مستحبات الوضوء)
ومثله فی الهندية ج۱ ص۸ الفصل الثالث فی المستحبات۔

الجواب:۔ وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت ایک مرتبہ دھونا فرض ہے اور تین مرتبہ دھونا سنت ہے، اسی طرح دھونے کی ابتداء انگلیوں کی طرف سے کرنا بھی سنت ہے۔

لما فی الهندية : ومن السنن البداية من رؤس الاصابع فی اليدين والرجلين ۔

(الهندية ج ۱ ص۸ الفصل الثالث فی المستحبات) [۱]

وضو کرنے کا افضل طریقہ

سوال:۔ وضو کھڑے ہو کر کرنا چاہیئے یا بیٹھ کر؟

الجواب:۔ وضو بیٹھ کر کرنا چاہیئے، اس لیے کہ وضو کے آداب میں یہ بات ہے کہ وضو بیٹھ کر کیا جائے۔

ومن الاداب ان يجلس المتوضی مستقبل القبلة عند غسل سائر الاعضاء ومن الاداب ان يكون جلوسه علىٰ مكان مرتفع ۔

(حلبی کبیر ج ۱ ص۳۱ باب الوضوء) [۲]

سردی کے موسم میں اعضاء وضو دھونے کا طریقہ

سوال:۔ سردی کے مہینوں میں اعضاء وضو اتنے خشک ہو جاتے ہیں کہ اگر ان پر پانی بہایا جائے تو اس سے اندام تر نہیں ہوتا بلکہ خشک رہ جاتا ہے، اس صورت میں وضو کیسے کیا جائے؟

الجواب:۔ سردی کے موسم میں خشکی بہت ہو جاتی ہے اور پانی اعضاء وضو کو گیلا نہیں کرتا، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ دھونے سے قبل مغسولہ اندام کو تر کیا جائے پھر پانی بہایا جائے تاکہ اندام اچھی طرح دھویا جا سکے۔

لما قال العلامة الكاسانیؒ : عن خلف بن ايوب انهٗ قال ينبغی للمتوضی فی الشتاء ان يبل اعضاءه شبه الدهن ثمّ يسيل الماء عليها لان الماء يتجافی

---

[۱] لما قال ابن الهمامؒ : ومن السنن الترتيب بين المضمضة والاستنشاق والبداءة من مقدم الرأس ومن رؤس الاصابع فی اليدين والرجلين ۔ (فتح القدير ج ۱ ص۳۱ كتاب الطهارة)

[۲] قال الحصكفیؒ : والجلوس فی مكان مرتفع تحرزا عن الماء المستعمل وعبارة الكمال : وحفظ ثيابه من التقاطر، وهی اشمل ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۱ ص۱۲۷ آداب الوضوء)
وَمِثْلُهٗ فی السعاية ج ۱ ص۱۸۰ آداب الوضوء ۔

عن الاعضاء فی الشتاء۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳ کتاب الطھارۃ) لہ

وضو میں دوسرے سے مدد لینے کا حکم

سوال:۔ فقہ کی عام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ استعانت بالغیر مکروہ ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے لیے اور ملازم اپنے مالک کے لیے وضو کا پانی تیار کرکے اس کو وضو کراتا ہے، کیا یہ استعانت مکروہ نہیں اور اس سے وضو پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ اس مسئلہ کے بارے میں اگرچہ فقہی ذخائر میں مطلقاً استعانت بالغیر پر کراہت کا قول کیا گیا ہے مگر محققین کے ہاں یہ مطلقاً نہیں بلکہ اس کے لیے دو حالتیں ہیں، (۱) استعانت تیاری آلات غسل (۲) استعانت بالغسل والمسح۔ اول الذکر استعانت بلا کراہت جائز ہے، اس قسم کی استعانت حضورؐ کے لیے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے جس پر آپؐ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی، البتہ ثانی الذکر استعانت بلاعذرِ شرعی مکروہ ہے۔

لما قال ابن عابدینؒ: وحاصلہ ان الاستعانۃ فی الوضوء ان کانت بصب الماء او استقائہ او احضارہ فلا کراھۃ بھا اصلاً ولو بطلبہ وان کانت بالغسل والمسح فتکرہ بلاعذر۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۲۷ آداب الوضوء مطلب فی مباحث الاستعانۃ فی الوضوء بالغیر) ۲ہ

بیماری کی وجہ سے وضو میں کلی نہ کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ بعض لوگوں کو یہ بیماری ہوتی ہے کہ اگر وہ کلی کرتے ہیں تو دانتوں سے خون آنا

لہ وفی الھندیۃ: عن خلف بن ایوب انہ قال ینبغی للمتوضی فی الشتاء ان یبل اعضاءہ بالماء شبہ الدھن ثم یسیل الماء علیھا لان الماء یتجافی عن الاعضاء فی الشتاء۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۹ الفصل الثالث فی المستحبات)

۲ہ قال العالم بن العلاء الانصاریؒ: ومن الاداب ان یقوم بامر الوضوء بنفسہ لحدیث عمر رضی اللہ عنہ قال انا لا نستعین علی وضوئنا ومع ھذا لو استعان بغیرہ جاز ان لا یکون الغاسل غیرہ بل یغسل بنفسہ وقد صح ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعان بالمغیرۃؓ وکان المغیرۃؓ یفیض الماء ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یغسل۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۱ ص۱۱۲ آداب الوضوء)

شروع ہوجاتا ہے، اب اگر بیمار بوجہ عذر کے کلی نہ کرے تو اس سے وضو پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا سنن وضو میں داخل ہے، اگر کوئی شخص اس کو بدون عذر ترک کرے تو گنہگار ہوگا، تاہم عذر کی وجہ سے کلی ترک کرنے پر وضو متاثر نہ ہوگا اور نہ گناہ لازم آئے گا۔

قال الحصکفیؒ: وغسل الفم الخ بمیاہ ثلثة والانف بمیاہٍ وھما سنتان مؤکدتان۔ فلو ترکھما اثم علی الصحیح سراج قال فی الحلیة لعله محمول علی ما اذا جعل الترک عادة له من غیر عذرٍ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۱۶ سنن الوضوء)[1]

بیسن میں وضو کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل کے نئے دور میں منہ ہاتھ دھونے کیلئے بیسن بنائے گئے ہیں جن میں کھڑے ہوکر منہ ہاتھ دھویا جاتا ہے، کیا ان میں وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وضو کرنا جائز ہے لیکن خلاف الادب ہے۔

ومن الاداب ان یجلس المتوضی مستقبل القبلة عند غسل سائر الاعضاء ومن الاداب ان یکون جلوسه علی مکان مرتفع۔ (حلبی کبیر ج ۱ ص۳۱ آداب الوضوء)[2]

وضو کے دوران باتیں کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل عموماً دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وضو کے دوران دنیاوی باتیں کرتے رہتے ہیں، کیا وضو کے دوران دنیاوی باتیں کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وضو کے دوران ادعیہ ماثورہ پڑھنا مسنون عمل ہے، دنیاوی باتوں

---

[1] وفی الھندیة: والسنة ان یتمضمض ثلاثاً، اولاً ثم یستنشق ثلاثاً ویأخذ لکل واحدٍ منھما ماءً جدیداً فی کل مرة..... ان ترک المضمضة والاستنشاق اُثم علی الصحیح لانھما من سنن الھدٰی وترکھا یوجب الاساءة الخ

(الھندیة ج ۱ ص۶ الفصل الثانی فی سنن الوضوء)

[2] قال الحصکفیؒ: والجلوس فی مکان مرتفع تحرزاً عن الماء المستعمل وعبارة الکمال: وحفظ ثیابه من التقاطر، وھی اشمل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۱۲۷ آداب الوضوء)

ومِثْلُهٗ فی السعایة ج ۱ ص۱۸ آداب الوضوء۔

کی وجہ سے چونکہ اس میں خلل آتا ہے اس لیے فقہاءِ کرام نے اس کو مکروہ کہا ہے، البتہ کسی ضروری سوال کا جواب یا کسی کو پیغام وغیرہ دینا بلاکراہت جائز ہے۔

لما قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ التکلم بکلام الناس لانہ یشتغلہ عن الادعیۃ۔ قال الطحاویؒ: مالم یکن لحاجۃ تفوتہ بترکہ۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۶۲ فصل مکروھات الوضوء) [1]

بواسیر کے مریض کے وضو کا حکم

سوال:۔ بعض حضرات بواسیر کے مرض کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اُن سے ہر وقت ریح (ہوا) یا خون وغیرہ کا خروج رہتا ہے، ان کے وضوء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بواسیر کے مریض کا مرض اگر اتنا شدید ہو کہ ہر وقت ریح یا خون کی آمد رہتی ہو تو ایسا مریض معذورین کے حکم میں ہے، وہ ہر نماز کے وقت کے لیے وضو کرے گا اور اس وضو سے وقت کے اندر جتنی چاہے نمازیں پڑھے۔ اور اگر معذورین کی حد تک مرض نہ پہنچا ہو تو پھر بواسیر کی وجہ سے نکلنے والی ریح اور خون دونوں ناقضِ وضو ہیں۔

لما قال الحصکفیؒ: وصاحب عذر من بہ سلس بول لایمکنہ امساکہ او استطلاق بطن او انفلات ریح..... ان استوعب عذرہ تمام وقت صلوٰۃ مفروضۃ بان لایجد فی جمیع وقتھا زمنا یتوضأ ویصلی فیہ خالیا عن الحدث ولو حکما..... حکمہ الوضوء لکل فرض اللام للوقت ثم یصلی بہ فیہ فرضا ونفلا فاذا خرج الوقت بطل۔ اھ

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۰۵، ۳۰۶ باب الحیض) [2]

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ومن ادابہ ...... وعدم التکلم بکلام الناس الا لحاجۃ تفوتہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۱۲۶ آداب الوضوء مطلب فی مباحث الاستعانۃ فی الوضوء بالغیر)

[2] قال المرغینانیؒ: ومن بہ سلسل البول والرعاف الدائم والجرح الذی لایرقأ یتوضئون لوقت کل صلوٰۃ فیصلون بذلک الوضوء فی الوقت ماشاء۔

(الھدایۃ ج۱ ص۵۰ باب الحیض)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۱ ص۳۰۵ باب الحیض مطلب فی احکام المعذور۔

وضو میں واجبات نہیں

سوال:۔ کیا وضو میں واجبات ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو اور غسل دونوں میں واجبات نہیں۔

لما قال الحصکفیؒ: وسننه افاد أنه لا واجب للوضوء ولا للغسل والا لقدمه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۱۰۲،۱۰۳۔ سنن الوضوء)[1]

اخبارات اور دینی رسائل کو بلا وضو مس کرنے کا حکم

سوال:۔ اس دور میں اخبارات، جرائد اور رسائل میں قرآنِ کریم کے الفاظ مع ترجمہ و تفسیر درج ہوتے ہیں، اسی طرح تفاسیر میں اکثر حصہ صرف تفسیر کا ہوتا ہے، کیا الفاظِ قرآنی کے علاوہ تفسیری اوراق کو بلا وضو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم کو بلا وضو مس کرنا جائز نہیں، البتہ تفسیر یا دیگر سفید کاغذات کو چھونے یا پکڑنے کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ سے مختلف روایات منقول ہیں جن میں بعض سے کراہت معلوم ہوتی ہے اور بعض سے عدمِ کراہت ــــ علامہ ابراہیم الحلبیؒ نے عدمِ کراہت کو ترجیح دی ہے اور اس پر عمل کرنے میں سہولت بھی ہے تاہم خلافِ اولیٰ ضرور ہے۔

قال الشیخ ابراهیم الحلبیؒ: ویکره ایضاً للمحدث ونحوه مس تفسیر القرآن و کتب الفقه وکذا کتب السنن ولانها لا یخلو عن آیات وهذا التعلیل یمنع مس شروح النحو ایضاً ...... والاصح انه لا یکره عند ابی حنیفةؒ۔ (کبیری ص ۵۶ فی آخر باب الغسل)[2]

کان اور رخسار کے درمیانی حصہ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ جلدی میں وضو کرتے ہوئے کان اور رخسار کے درمیان والے حصے کو خشک چھوڑ دیتے ہیں

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ذکر فی النهایة انه یجوز ان یکون الفرض فی مقدار المسح بمعنی لزم لا لتقائهما فی معنی اللزوم وتعقب بانه مخالف لما اتفق علیه الاصحاب اذ لا واجب فی الوضوء۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۱۱ کتاب الطهارة)

[2] قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ: اس سے معلوم ہوا کہ جب غیر قرآن کی عبارت غالب ہو اس کا مس مطلقاً کما ہو الظاہر امام صاحبؒ کے نزدیک درست ہے۔ وفی الاخذ به سهولة۔

(امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۹۳ مسائل منثورہ کتاب الطہارۃ)

کیا اس سے وضو پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی تصریحات کی رُو سے کان اور رخسار کے درمیان والا حصہ چہرے کے حکم میں داخل ہے، وضو میں جس طرح چہرے کا دھونا فرض ہے اسی طرح اس جگہ کا دھونا بھی فرض ہے۔

قال العلامة الحصكفیؒ : وما بين العذار والاُذن لدخوله فی الحد وبه يفتی۔ قال ابن عابدینؒ : قوله وما بين العذار والاُذن ای ما بينهما من البياض قوله وبه يفتی وهو ظاهر المذهب وهو الصحيح وعليه اكثر المشائخ۔ (رد المحتار ج۱ ص۹۷ کتاب الطهارة) [1]

سرخی، پاؤڈر، کریم کی موجودگی میں وضو کا حکم

سوال:۔ لپ سٹک، کریم اور پاؤڈر کے ہوتے ہوئے وضو کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ مروجہ سرخی، کریم وغیرہ تیل کے مانند ہے اور پاؤڈر گرد وغبار کے مانند، جس کی وجہ سے اعضاء پر تہہ نہیں بنتی، اس لیے ان کے ہوتے ہوئے بھی وضو درست ہے لیکن وضو کرتے وقت اولاً ان کو گیلا کرے پھر دھوئے، البتہ اگر سرخی یا کریم ایسی ہو جس سے ناخن پالش کی طرح تہہ جمتی ہو تو پھر وضو یا غسل جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابو بكر الكاسانیؒ : عن خلف بن ايوب انهٗ قال ينبغی للمتوضئ فی الشتاء ان يبل اعضاءه شبه الدهن ثم يسيل الماء عليها لان الماء يتجافی عن الاعضاء فی الشتاء۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳ کتاب الطهارة) [2]

جماعت کے فوت ہونے کے ڈر کے باوجود کامل وضو کرنا ضروری ہے

سوال:۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بسا اوقات جلدی میں ہوتے ہیں اور جماعت کے فوت ہونے کے ڈر سے وضو میں سُنن وغیرہ پورے نہیں کرتے، تو کیا وضو کی سنن کو چھوڑ کر جماعت میں شامل ہونا چاہیئے یا سُنن کو پورا کیا جائے

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : واما البياض الذی بين العذار وبين شحمة الاذن قد ذكر شمس الائمة الحلوانی انهٗ ظاهر المذهب۔ (الفتاویٰ التاتارخانية ج۱ ص۸۹ کتاب الطهارة)

[2] وفی الهندية : عن خلف بن ايوب انهٗ قال ينبغی للمتوضئ فی الشتاء ان يبل اعضاءه بالماء شبه الدهن ثم يسيل الماء عليها لان الماء يتجافی عن الاعضاء فی الشتاء۔ (الفتاویٰ الهندية ج۱ ص۹ باب الوضوء الفصل الثالث فی المستحبات)

اگرچہ جماعت فوت ہو جانے کا خطرہ ہو؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں اسباغِ وضو کا حکم ہے یعنی وضو کے جملہ فرائض، سنن اور آداب کو پورا کرنے کا حکم ہے، اس لیے جماعت کے فوت ہونے کے خوف سے سننِ وضو ترک نہ کی جائیں اگرچہ جماعت فوت ہو جائے۔

قال الشیخ مُلا علی القاریؒ: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسبغوا لوضوء۔ رواہ مسلم ای اتموہ باتیان جمیع فرائضہ وسننہ واکملوا واجباتہ۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱) [1]

آبِ زمزم سے وضو و غسل کا حکم

سوال:۔ کیا آبِ زمزم سے وضو یا غسل کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ زمزم کا پانی ایک متبرک پانی ہے، اس کے آداب و احترام کا خیال رکھنا شرعی ذمہ داری ہے، اسلئے بے وضو شخص کا اس سے وضو کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ دوسرا متبادل پانی مہیا ہو ورنہ بلا کراہت جائز ہے لیکن غسلِ جنابت ہر حال میں کراہت سے خالی نہیں اور نہ اس سے استنجا کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ تاہم اگر باوضو آدمی اس سے تبرک کے طور پر وضو کرے یا پاک بدن والا شخص اس سے غسل کرے تو بلا کراہت جائز ہے۔

لما قال السید احمد الطحطاویؒ: یجوز الاغتسال والتوضوء بماء زمزم ان کان علی طهارۃ للتبرك فلا ینبغی ان یغتسل به جنب ولا محدث ولا فی مکان نجس ولا یستنجی به ولا یزال به نجاسة حقیقیة من بعض العلماء تحریم ذٰلك وقیل ان بعض الناس استنجی به فحصل له باسور۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۷ کتاب الطهارة۔ اقسام المیاہ) [2]

---

[1] عن عبد اللہ بن عمر قال رجعنا مع رسول اللہ من مکة الی المدینة حتی اذا کنا بماء بالطریق تعجل قوم عند العصر فتوضأ وا وهم عجال فانتهینا الیهم واعقابهم تلوح لم یمسها الماء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویل للاعقاب من النار اسبغوا الوضوء۔
(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۶ باب سنن الوضوء)

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: یکرہ الاستنجاء بماء زمزم۔ قال ابن عابدینؒ: تحته وکذا ازالة النجاسة الحقیقیة من ثوبه او بدنه حتی ذکر بعض العلماء تحریم ذٰلك۔
[ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۲۵ کتاب الحج، مطلب فی کراهیة الاستنجاء بماء زمزم]

نشہ آور اشیاء کے استعمال سے وضو کا حکم

سوال:۔ کیا شراب، ہیروئن، چرس وغیرہ پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چرس، افیون، شراب، ہیروئن پینا بذاتِ خود ناقضِ وضو نہیں، البتہ پینے کے بعد جب نشہ غالب آجائے تو وضو متاثر ہو کر ٹوٹ جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (ینقضه اغماء) ومنه الغشی وجنون وسکر بان یدخل فی مشیه تمایل ولو باکل الحشیشة اھ۔ قال ابن عابدینؒ: (قوله سکر) هو حالة تعرض للانسان من امتلاء دماغه من الابخرة المتصاعدة من الخمر ونحوه فیتعطل معه العقل الممیز بین الامور الحسنة والقبیحة اسمٰعیل عن البرجندی۔ (رد المحتار ج۱ ص۱۴۴ باب نواقض الوضوء)[۱]

نشہ آور دوائیوں کے استعمال کی صورت میں وضو کا حکم

سوال:۔ آجکل بعض دوائیاں ایسی ہیں جن میں نشہ ہوتا ہے، کیا ان کے استعمال سے وضو متاثر ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دوائی اگرچہ بذاتِ خود ناقضِ وضو نہیں مگر جب اس کے نشہ کی وجہ سے انسان پر غشی طاری ہو جائے تو وضو باقی نہیں رہے گا ورنہ بغیر نشہ کے وضو متاثر نہ ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وینقضه اغماء ومنه الغشی وجنون وسکر بان یدخل فی مشیه تمایل ولو باکل الحشیشة۔ وقال ابن عابدینؒ: (قوله سکر) هو حالة تعرض للانسان من امتلاء دماغه من الابخرة المتصاعدة من الخمر ونحوه فیتعطل معه العقل الممیز بین الامور الحسنة والقبیحة۔ (رد المحتار ج۱ ص۱۴۴ باب نواقض الوضوء)[۲]

---

[۱] وکذا فی الهندیة: والغشی والسکر) قال وحد السکر فی هٰذا الباب أن لا یعرف الرجل من المرأة وهو اختیار بعض المشائخ۔ وصدر الشهید والصحیح ما نقل عن شمس الائمة الحلوانی انهٗ اذا دخل فی بعض مشیته تحرك كذا فی المذخیرة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۲ الفصل الخامس فی نواقض الوضوء)

[۲] وفی الهندیة: والغشی والسکر) قال وحد السکر فی هٰذا الباب ان لا یعرف الرجل من المرأة وهو اختیار بعض المشائخ۔ والصحیح ما نقل عن شمس الائمة الحلوانی أنّهٗ اذا دخل فی بعض مشیته تحرك۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۲ الفصل الخامس فی نواقض الوضوء)

انجکشن (ٹیکہ) لگانے سے وضو کا حکم

سوال:۔ ڈاکٹر حضرات بیمار کو دو طرح کے انجکشن لگاتے ہیں، ایک عام کسی نرم جگہ (گوشت) میں، اور ایک رگ میں، جس کو وریدی انجکشن کہا جاتا ہے۔ کیا ان انجکشنوں سے وضو پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر نجس چیز جب بدن کے کسی بھی حصے سے نکل جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ ان دونوں قسم کے انجکشنوں میں وریدی انجکشن تب یقینی ہوتا ہے جب پچکاری میں خون آجائے ورنہ یقینی نہیں ہوتا، چونکہ اس انجکشن سے نجس شئے یعنی خون کا اخراج ہوجاتا ہے اس لیے صرف وریدی انجکشن سے وضو متاثر ہوکر ٹوٹ جائے گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وینقضہ خروج کل خارج نجس منہ ای من المتوضی الحی معتادا اولا من السبیلین اولا الیٰ ما یطھر ای یلحقہ حکم التطھیر۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۱۳۴ مطلب نواقض الوضوء) [۱]

فلم بینی سے وضو متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ ٹی وی، وی سی آر اور فلم بینی وغیرہ سے وضو پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: ٹی وی، وی سی آر یا فلم وغیرہ دیکھنا امور فسقیہ ہیں، اس عمل سے انسان گناہ کا مرتکب ہوجاتا ہے لیکن اس سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ مستحب یہ ہے کہ گناہ کے ان کاموں کے ارتکاب کے بعد وضو کرلیا جائے۔

لما قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ومندوب للنوم علیٰ طھارۃ واذا استیقظ منہ .... وبعد غیبۃ وکذب ونمیمۃ وکل خطیئۃ الخ

(نور الایضاح ص۳۴ فصل الوضوء علیٰ ثلاثۃ اقسام) [۲]

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وینقضہ خروج نجس منہ ای وینقض الوضوء خروج نجس من المتوضی الخ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۲۹ کتاب الطھارۃ)

[۲] قال قاضیخانؒ: ومندوب...... ومنھا الوضوء بعد الغیبۃ وبعد انشاد الشعر۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۳۲ باب الوضوء والغسل فیہ سبعۃ فصول)

ومِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۹ الفصل الثالث فی المستحبات۔

گرم پانی سے وضو جائز ہے

سوال:۔ گرم پانی سے وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ہر وہ پانی جو پاک ہو اُس سے مطلقاً وضو کرنا جائز ہے چاہے پانی گرم ہو یا ٹھنڈا،[1] تاہم دھوپ سے گرم شدہ پانی کا استعمال طبّی لحاظ سے مکروہ ہے۔

ان عمرؓ: کان یسخن لہٗ ماءٌ فی قمقمۃ ویغتسل بہ۔اھ

ان عمرؓ: قال لاتغتسلوا بالماء المتشمس فانہ یورث البرص۔اھ (دار قطنی ج۱ ص۳۹،۳۸، باب الماء المسخن)[1]

کشفِ عورت ناقضِ وضو نہیں

سوال:۔ کیا کشفِ عورت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب:۔ کشفِ عورت مفسدِ صلوٰۃ ہے لیکن ناقض الوضو نہیں، لہٰذا مرد یا عورت کا ستر ظاہر ہونے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ اگر کشفِ عورت کا ارتکاب بلا ضرورت ہو تو حرام ہے۔

لما قال ابراھیم الحلبیؒ: ومن الآداب ان یستر عورتہ حین فرغ ای من الاستنجاء والتجفیف لان انکشف کان لضرورۃ لقولہ اللہ احق ان یستحی منہ۔ (کبیری ص۳۱ آداب الوضوء)[2]

وضو کے بعد شک غیر مؤثر ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کو وضو یا غسل کرنے کے بعد پیشاب نکلنے کا شک ہوا لیکن غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کوئی چیز نہیں نکلی ہے، یا بسا اوقات ریح نکلنے کا شبہ ہوتا ہے، کیا ایسی صورت میں وضو متاثر ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب تک پیشاب کے قطرے یا ریح نکلنے کا یقین نہ ہو محض شک کی بناء پر

---

[1] عن الاسلع بن شریکؓ:...... فقلتُ اصابتنی جنابۃٌ فخشیتُ البرد علی نفسی فأمرتُہٗ ان یرحلہا ووضعتُ احجاراً فاسخنتُ ماءً فاغتسلتُ بہ۔ اھ وعن عائشۃؓ قالت نہی رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتوضاء بالماء المتشمس

(نصب الرایۃ ج۱ ص۱۰۲،۱۰۳ باب الماء الذی یجوز بہ الطھارۃ)

وَمثلُہٗ فی السعایۃ ج۱ ص۳۳۶،۳۳۷ باب الکراھیۃ فی الماء المتشمس الخ۔

[2] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری ومن الاداب ان لا یترک عورتہٗ مکشوفۃ یعنی بعد الاستنجاء۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۱ ص۱۱۲ آداب الوضوء)

وضو متاثر نہیں ہوتا لہٰذا وضو کا اعادہ ضروری نہیں۔

قال طاھر بن عبدالرشیدؒ: ومن شك فی الحدث فھو علیٰ وضوئه ولو کان محدثاً فشك فی الطھارۃ فھو علیٰ حدثه۔ (خلاصة الفتاوٰی۔ الفصل الثالث فی الوضوء ج۱ ص۱۹) لہ

وضو کے بعد ہاتھ پاؤں پر صابن لگانے کا حکم

سرد علاقوں میں ہاتھ پاؤں کو پھٹنے سے بچانے کے لیے وضو مکمل کرنے کے بعد ہاتھ پاؤں پر مختلف قسم کا صابن لگایا جاتا ہے، کیا اس سے وضو متاثر ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صابن بذاتِ خود پاک چیز ہے اور نظافت کے لیے اس کا استعمال جائز ہے اسلیئے مذکورہ صورت میں صابن لگاکر باقی رکھنا اور پھر اس کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے۔

قال القدوریؒ: ویجوز الطھارۃ بماءٍ خالطه شیء طاھر فغیر احد اوصافه کماء المد والماء الذی اختلط به الزعفران والصابون .....الخ

(مختصر القدوری ص۹ کتاب الطھارۃ) ۲ہ

کیا سگریٹ اور نسوار سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال: کیا سگریٹ اور نسوار کے استعمال سے وضو پر کوئی اثر پڑتا ہے؟

الجواب: دیگر نواقض کے علاوہ وضو ہر اُس چیز سے بھی ٹوٹ جاتا ہے جس میں نشہ ہو اور چونکہ نسوار اور سگریٹ میں نشہ کی وہ کیفیت نہیں جس کا اعتبار فقہاء نے کیا ہے لہٰذا ان دونوں سے وضو نہیں ٹوٹتا، البتہ بدبو کے ازالہ کے لیے منہ ضرور دھونا چاہیئے (یعنی کُلی وغیرہ کرلینی چاہیئے)۔

لہ قال الحصکفیؒ: ولو ایقن بالطھارۃ وشك بالحدث او بالعکس اخذ بالیقین (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار، نواقض الوضوء ج۱ ص۱۵۱) وقال فی الھندیة ومثله فی الفتاوٰی الھندیة ج۱ ص۱۱۳ نواقض الوضوء۔

۲ہ قال ابراھیم الحلبیؒ: وتجوز الطھارۃ بماءٍ خالطه شیءٌ طاھر فغیر احد اوصافه کماء المد والماء الذی یختلط به الاشنان والصابون والزعفران .....الخ۔ (کبیری، باب ما یجوز به الطھارۃ ص۹۰)

قال العلامة ابن عابدینؒ: فانه لم یثبت اسکاره ولا تفتیره ولا اضراره بل ثبت له منافع....الخ (ردّ المحتار علی الدر المختار کتاب الاشربة ج ۶ ص۴۵۹) [1]

جب تک احلیل سے قطرہ خارج نہ ہو وضو نہیں ٹوٹتا

سوال:۔ اگر ایک شخص سے پیشاب یا مذی کے قطرے وقتاً فوقتاً نکلتے ہوں جس کی وجہ سے باقاعدہ ہر نماز کے لیے اس کو وضو کرنا پڑے، لیکن بعض اوقات ایک نماز سے دوسری نماز تک کوئی قطرہ نہیں نکلتا البتہ احلیل کے اندر قطرے موجود ہوں تو کیا ایسی صورت میں دوبارہ وضو کرنا لازمی ہے یا وہ پہلا وضو ہی کافی ہوگا؟

الجواب:۔ صاحب عذر ہو تو ہر نماز کے لیے وضو کرنا لازمی ہے البتہ غیر معذور کے وضو ٹوٹنے کا دارومدار سبب نقض کی قطعی اور یقینی موجودگی پر ہے، صورت مذکورہ میں جب پیشاب کے قطرے نکلنے کا یقین ہو تو وضو کرے گا اور اگر یقین نہ ہو تو دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں اگرچہ پیشاب کے قطرے احلیل میں موجود ہوں۔

قال الحصکفیؒ: (وینقضه خروج) کل خارج نجس (منه) ای من المتوضیٔ الحی معتاداً اولا من السبیلین اولا (الی مایطهر) ثم المراد بالخروج من السبیلین مجرد الظهور۔

وقال ابن عابدینؒ: (تحت قوله مجرد الظهور) ای الظهور المجرد عن السیلان فلو نزل البول الی قصبة الذکر لا ینقض لعدم ظهوره۔ (رد المحتار علی الدر المختار نواقض الوضوء ج ۱ ص۱۳۴، ۱۳۵) [2]

بدن سے خالص پانی نکلنے پر وضو کا حکم

سوال:۔ اگر بدن کے کسی حصہ سے خالص پانی نکل آئے جو خون یا پیپ سے مخلوط نہ ہو تو کیا اس سے وضو ٹوٹتا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ نکلا ہوا مواد یقیناً خالص پانی ہو جو پیپ یا خون سے مخلوط نہ ہو

---

[1] قال المفتی کفایت اللہ: "تمباکو نوشی اور نسوار کشی سے وضو نہیں ٹوٹتا"۔ (کفایت المفتی ج ۲ ص۲۶۲ باب الطہارۃ فصل چہارم) [2] وقال ابن نجیمؒ: (تحت قول النسفیؒ وینقضه خروج نجس منه) افاد بقوله خروج نجس ان الناقض خروجه لا عینه (البحر الرائق، نواقض الوضوء ج ۱ ص۲۹) ومثله فی تبیین الحقائق ج ۱ ص۷ نواقض الوضوء۔

تو اسکے نکلنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا (وضو درست رہے گا)۔

قال الحسن بن عمار: وعن الحسن ان ماء النفطة لا ینقض۔
(مراقی الفلاح ص۴۸ فصل فی نواقض الوضوء) [1]

خون پھیل جانے سے وضو کا حکم

سوال:۔ اگر خون یا پیپ نکل کر بہنے کی صورت اختیار نہ کرے اور یوں ہی بدن پر پھیل جائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب:۔ جب خون یا پیپ زخم کے منہ سے خارج ہو کر پھیل جائے تو اس سے وضو کا ٹوٹنا بہنے پر موقوف نہیں۔

قال الحصکفی: وینقضہ خروج کل خارج نجس منہ الی ما یطھر ای یلحقہ حکم التطھیر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ نواقض الوضوء ج۱ ص۱۳۴-۱۳۵) [2]

پاؤں کے شگاف میں دوائی لگانے کے بعد وضو کا حکم

سوال:۔ سردی کے موسم میں ہاتھ پاؤں کے اندر شگاف پڑ جاتے ہیں ایسی حالت میں اگر شقوق دوائی سے بھر دیئے جائیں اور وضو کرتے وقت پانی اس میں دخل انداز نہ ہو تو اس صورت میں وضو درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر زخموں کے اندر پانی پہنچنے سے نقصان کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں ہاتھ پاؤں کی جلد پر صرف پانی بہانا ہی کافی رہے گا، شقوق کے اندر پانی پہنچانا لازمی نہیں۔

قال ابن عابدین: تحت قول الحصکفی: (فی اعضائہ شقاق غسلہ ان قدر والا مسحہ) ولو کان فی رجلہ فجعل فیہ الدواء یکفیہ

---

[1] قال ابن نجیم: وعن الحسن ان ماء النفطة لا ینقض (البحر الرائق بحث الوضوء ج۱ ص۳۲)

[2] قال ابراھیم الحلبی: اذا خرج وتجاوز مکان خروجہ الی موضع یلحقہ ای یلحق ذلک الموضع حکم التطھیر ای یجب تطھیرہ فی الجملة۔ (کبیری۔ نواقض الوضوء ص۱۳۱) ومثلہ فی الھندیة ج۱ ص۱۰ الفصل الخامس فی نواقض الوضوء۔

امرار الماء فوقه لا بكيفية المسح. (رد المحتار على الدر المختار، فرائض الوضوء ج۱ ص۱۰۲) ؎۱

انجکشن کے ذریعہ خون کا نکالنا ناقض وضو ہے

سوال:- اگر کوئی شخص انجکشن کے ذریعہ بدن سے خون نکالے تو اس سے وضو پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ خون سوئی کے ذریعہ نکالا جاتا ہے اور بدن کے کسی حصہ پر یہ خون نہیں لگتا، جو الیٰ موضع یلحقه حکم التطهیر نہ ہونے کی وجہ سے بظاہر ناقض وضو نہ ہونے کا شبہ ہے، کیا یہ درست ہے؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں خون کا بدن کے کسی حصہ پر نہ لگنے کے باوجود ناقضِ وضو ہے کیونکہ اگر یہ خون تھیلے میں نہ جاتا تو اس کا جسم پر بہہ جانا لازمی امر تھا۔ تھیلا کا وجود ایک خارجی مانع ہے اس سے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فالاحسن ما فی النهر عن بعض المتاخرین من ان المراد السیلان ولو بالقوة: ای فان دم الفصد ونحوه سائل الیٰ ما یلحقه حکم التطهیر حکماً تامل۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ نواقض الوضوء ج۱ ص۱۳۴) ؎۲

صاحب عذر کے وضو اور کپڑوں کا حکم

سوال:- صاحب عذر کے وضو کا اعتبار نہیں رہتا ہے، ایسے شخص کے لیے وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز بسا اوقات اس عذر کی موجودگی میں کپڑوں کا پاک رکھنا ناممکن رہتا ہے، تو معذور کے کپڑوں کی تطہیر کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- کسی شخص سے خون نکلنے یا سلسلِ بول یا خروجِ ریح کی بیماری ایسی صورت

؎۱ قال ابراهیم الحلبیؒ: اذا کان برجله شقاق فجعل فیه الشحم او المرهم ان کان یضره ایصال الماء لا یجوز غسله ووضوءه وان کان لا یضره یجوز اذا مر الماء علی ظاهره ذلك۔ (کبیری ص۵۵، الطهارة الکبریٰ فرائض الغسل) ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۲۳۔

؎۲ قال فی الهندیة: القراد اذا مص عضو انسان فامتلأ دماً ان کان صغیراً لا ینقض وضوءه کما لو مصت الذباب او البعوض وان کان کبیراً ینقض وکذا العلقة اذا مصت عضو انسان حتی امتلأت من دمه انتقض وضوءه کذا فی محیط السرخسی۔ (الهندیة۔ نواقض الوضوء ج۱ ص۱۱) ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۱۷ الفصل الثالث نواقض الوضوء۔

اختیار کرے کہ نماز کا وقت اُس معذور شخص پر بغیر اس بیماری کے نہ گذرتا ہو تو یہ شخص معذورِ شرعی متصور ہوگا۔ اور معذور کے لیے لازمی ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے جس سے وہ اُس وقت کے اندر تمام عبادات ادا کر سکتا ہے البتہ نماز کا وقت گذرنے سے اس کا وضو ٹوٹ جائیگا دوسرے وقت کی نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا لازمی ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر کپڑوں کی صفائی ممکن ہو یعنی کپڑے دھونے سے نماز کے دوران یہ کپڑے پاک رہ سکتے ہوں تو پھر نماز کی ابتداء میں کپڑے صاف رکھنا ضروری ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کپڑوں سے ملحقہ نجاست سے صفائی ضروری نہیں اور اس شخص پر کپڑے دھونا لازمی نہیں۔

قال الحصکفیؒ: وصاحب عذرمن به سلسل بول او استطلاق بطن او انفلات ریح او استحاضة ان استوعب عذره تمام وقت صلوٰة مفروضة بان لا یجد فی جمیع وقتها زمناً یتوضأ ویُصلّی فیه خالیًا عن الحدث (الی ان) وحکمه الوضوء لا غسل ثوبه ونحوه لکل فرض۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ مطلب فی احکام المعذور ج ۱ ص۳۰۵)[1]

پاخانہ کے مقام سے کیڑا نکلنے پر وضو کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کو بیماری کی وجہ سے یا ویسے پاخانہ کی جگہ سے کیڑا نکل آئے تو اس سے وضو پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ پاخانہ کی جگہ سے کیڑا نکلنا موجبِ نقضِ وضو ہے اس سے وضو باقی نہیں رہتا، اس میں معذور اور غیر معذور دونوں برابر ہیں۔

قال الحصکفیؒ: وخروج غیر نجس مثل ریح او دُودة او حصاة من دُبرٍ۔ (ص۱۳۵)
وقال ابن عابدینؒ: قوله من دُبُرٍ وکذا من ذکرٍ او فرجٍ فی الدُّودة

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ویتوضأ صاحب الجرح السائل لوقت کل صلوٰة ویصلّی بذلک ما شاء من الفرائض والنوافل ما دام فی الوقت فان خرج الوقت ینتقض طهارته (وبعد اسطر) فان اصاب ثوبه من ذلک الدم فعلیه ان یغسل ان کان مفیدًا اما اذا لم یکن مفیدًا بان کان مصیبه مرّة اخری۔ ثانیًا وثالثًا حینئذٍ لا یفترض علیه غسله۔ (خلاصة الفتاوٰی۔ الفصل الثالث ج ۱ ص۱۶)

والحصاة بالاجماع۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ مطلب نواقض الوضوء ج ۱ ص۱۳۶) لـہ

باب الغسل

(غسل کے مسائل)

غسل میں غرغرہ کا حکم

سوال:۔ اگر غسل کرتے وقت غرغرہ رہ جائے تو کیا غسل درست رہے گا؟

الجواب:۔ جنابت کے غسل میں مضمضہ فرائض غسل میں شامل ہے، اس میں منہ دھونا (کُلّی کرنا) کافی ہے، یہاں تک کہ پانی پینے سے بھی یہ فرض ادا ہوجاتا ہے، اگر مطلقاً منہ دھونا رہ جائے تو غسل ناقص رہے گا جبکہ دھونے میں مبالغہ رہ جانے کی صورت میں غسل کامل متصور ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: وفرض الغسل غسل کل فمہ ویکفی الشرب عباً لان المج لیس بشرط فی الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار، ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۵۱) ۲ـہ

غسل کرتے وقت ناک دھونے کا حکم

سوال:۔ غسل کرتے وقت ناک میں پانی ڈالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا پانی ناک میں ڈال کر انگلی مارنا کافی ہے یا پانی کھینچ کر اقصیٰ ناک تک پہنچانا ضروری ہے؟ جبکہ کھینچتے وقت دماغ تک پانی پہنچنے کی صورت میں تکلیف کا اٹھانا لازم ہوتا ہے۔

الجواب:۔ دورانِ غسل ناک کا دھونا فرض ہے اور ناک کی مقدار ناک کی نرمی تک ہے،

لـہ قال فی الهندیة: منها ما یخرج من السبیلین من البول والغائط والریح الخارجة من الدبر والودی والمذی والمنی والدودة والحصاة۔ (الهندیة۔ الفصل الخامس فی نواقض الوضوء ج ۱ ص۹) ومثله فی خلاصة الفتاوی۔ الفصل الثالث فی نواقض الوضوء ج ۱ ص۱۷

۲ـہ قال ابراهیم الحلبیؒ: وشرب الماء یقوم مقام المضمضة اذا کان لا علی وجه السنة اذا بلغ الماء الفم کله والا فلا۔ (کبیری۔ فرائض الغسل ص۵۰)

ایسی صورت میں اپنی سہولت کو مدِ نظر رکھ کر جو مناسب نظر آئے وہی طریقہ اختیار کریں۔

قال الحصکفیؒ: وفرض الغسل غسل کل فمه ویکفی الشرب عباً لان المج لیس بشرط فی الاصح وانفه حتی ما تحت الدرن۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار، ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۵۱) [1]

مصنوعی دانت کے باوجود غسل کا حکم | **سوال:**۔ دانت گر جانے کے بعد مصنوعی دانت لگانے کی صورت میں کیا غسل کے لیے اس کا نکالنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ چونکہ مصنوعی دانت کا ہر وقت نکالنا موجب حرج نہیں اس لیے غسل کے وقت اس کا نکالنا ضروری ہے، لہٰذا آسانی سے نکال لینے کے باوجود اگر کوئی اس کو نہیں نکالتا اور پانی کا وصول بھی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں غسل کی ادائیگی جائز نہ ہوگی تاہم اگر دانت مستقل طور پر لگایا ہوا اور نکالنے میں تکلیف ہوتی ہو تو نکالے بغیر غسل درست ہے۔

قال الحصکفیؒ: بخلاف نحو عجین۔ ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین اسنانه او فی سنه المجوف به یفتی وقیل ان صلباً منع، وهو الاصح۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله بخلاف نحو عجین) ای کعلك وشمع وقشر سمك وخبز ممضوغ متلبد جوهرة...... نعم ذکر الخلاف فی شرح المُنیة فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء (قوله وهو الاصح) صرح به فی شرح المنیة وقال لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج اهـ۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۵۴) [2]

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: وانما یجوز اذا تمضمض واستنشق بناء علی ان المضمضة والاستنشاق فرض فی الغسل عندنا۔ (خلاصة الفتاوی، الفصل الثانی فی الغسل ج ۱ ص۱۲) ومثله فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۸۱ فصل فی فرائض الغسل)

[2] قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: قال بعضهم وان کان صلباً ممضوغاً متاکداً لا یجوز غسله قل او کثر وهو الاصح لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج۔ (کبیری ص۴۹۔ الطهارة الکبری، فرائض الغسل) ومثله فی السعایة ج ۱ ص۲۸۱ فرض الغسل۔

دانتوں پر سونے کے خول چڑھانے سے غسل کا حکم

سوال:۔ بسا اوقات لوگ دانت کے جل جانے یا کسی بیماری کی وجہ سے اس پر سونے کا خول چڑھاتے ہیں، سونے کے خول سے دانت مستور ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے مضمضہ کرتے وقت دانت کو پانی نہیں پہنچتا، کیا ایسی صورت میں جنابت کے غسل پر کوئی اثر پڑے گا؟ علاوہ ازیں کبھی یہ خول ویسے حسن اور زینت کیلئے چڑھایا جاتا ہے تو اس حکم میں ضرورت اور عدم ضرورت مساوی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دانت پر ضرورت کے وقت سونے کا خول چڑھانا از روئے شرع جائز ہے، غسل کے لیے اس خول کا ہٹانا حرج و تکلیف سے خالی نہیں بلکہ بسا اوقات منہ کے زخمی ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے بوقتِ غسل اصلی دانت تک پانی پہنچانا معاف ہے اور اس خول کے ہوتے ہوئے نماز بھی ہوجاتی ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یمنع الطهارة ونیم ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل الماء تحته وحناء ولو جرمه به یفتی۔ قال ابن عابدینؒ: (قوله به یفتی) صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسئلة الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورة (وبعد اسطر) فالأظهر التعلیل بالضرورة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۵۴) [1]

بلا ضرورت سونے کا استعمال جائز نہیں، ایسے وقت میں اگر خول کے ہٹانے سے دانت سے محرومی ہوتی ہو تو موجبِ حرج ہوتے ہوئے غسل جائز ہے، لیکن ہٹانے میں اگر حرج نہ ہو تو پھر یہ بلا ضرورت کے چڑھایا ہوا خول ہٹایا جائے گا۔

دانت بھروانے سے غسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا

سوال:۔ دانتوں میں سوراخ ہوجانے کی وجہ سے مصالحہ بھرنے کی ضرورت پڑتی ہے، کیا دانت بھر جانے کی وجہ سے غسل پر کوئی اثر پڑتا ہے؟ کیونکہ اس وقت دانت کے سوراخ میں پانی نہیں پہنچتا؟

---

[1] قال ابراهیم الحلبیؒ: ان کان بین اسنانه طعام ولم یصل الماء تحته فی الغسل من الجنابة جاز لان الماء شیٔ لطیف یصل تحته غالباً قال صاحب الخلاصة وبه یفتی (وبعد اسطر) والطین والدرن اذا بقیا علی البدن یجوز وضوءهم للضرورة۔ (کبیری باب الغسل ص۴۹)

الجواب :- دانت میں سوراخ ہوجانے سے عموماً کھانے پینے میں تکلیف ہوتی ہے اسلئے ایسے وقت میں پاک مصالحہ سے دانت بھرنا جائز معالجہ ہے، دانت بھرنے کے بعد ہر غسل کے لیے خالی کرنا موجب حرج ہے اس لیے اس کا خالی کرنا ضروری نہیں اور اس سے غسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال الحصکفیؒ: ولا یمنع الطہارۃ ونیم ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل الماء تحتہ وحناء ولو جرمہ، بہ یفتی۔ قال ابن عابدینؒ: (قولہ وبہ یفتی) صرح بہ فی المنیۃ عن الذخیرۃ فی مسئلۃ الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورۃ (وبعد اسطر) فالاظہر التعلیل بالضرورۃ۔ (رد المحتار علی الدر المختار-ابحاث الغسل ج۱ ص۱۵۴) ؎۱

سوال :- کیا عورت کو غسل کرتے وقت سر کے بال (مینڈھیاں) کھولنا ضروری ہے؟

جنابت کے غسل میں عورت کو مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں

الجواب :- اگر عورت کے سر کے بال گندھے ہوئے ہوں تو بالوں کے اصول (جڑوں) تک پانی پہنچانا ضروری ہے مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں۔

البتہ اگر عورت کے بال کھلے ہوئے ہوں تو پورے بالوں کا دھونا ضروری ہے اگر کچھ حصہ خشک رہ جائے تو غسل درست نہیں ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: وکفی بل اصل ضفیرتہا ای شعر المرأۃ المضفور للحرج اما المنقوض فیفرض غسل کلہ اتفاقاً ولو لم یبتل اصلہا یجب نقضہا مطلقاً ہو الصحیح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار-ابحاث الغسل ج۱ ص۱۵۳) ؎۲

؎۱ قال ابراہیم الحلبیؒ: والطین والدرن اذا بقیا علی البدن یجزئی وضوءہم للضرورۃ۔ (کبیری-باب الغسل ص۴۹) مثلہ فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۵۰ فصل فی تمام احکام الوضوء۔

؎۲ قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولا تنقض ضفیرۃ ان بل اصلہا) ای ولا یجب علی المرأۃ ان تنقض ضفیرتہا ان بلت فی الاغتسال اصل شعرہا (وبعد اسطر) ویجب علیہا الایصال الی اثناء شعرہا اذا کان منقوضاً لعدم الحرج۔ (البحر الرائق-کتاب الطہارۃ ج۱ ص۵۲) ومثلہ فی الہندیۃ-الباب الثانی فی الغسل ج۱ ص۱۳۔

جنابت کی حالت میں کھانے پینے کا حکم

سوال: جنابت کی حالت میں کھانے پینے اور چلنے پھرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز لیبا اوقات ایسی حالت میں کسی سے باتیں کرنے اور سلام کا جواب دینے کا موقع بھی پیش آتا ہے، ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: جنابت کی حالت میں کھانا پینا، چلنا پھرنا، سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا تمام امور جائز ہیں۔ البتہ کھانے پینے کے وقت کلی کرنا اور ہاتھوں کو دھولینا چاہیئے بغیر کلی کے کھانا پینا مکروہ ہے۔

قال الحصكفيؒ: لاقرأت قنوت راى لاتكره) ولا اكله وشربه بعد غسل يد وفم ولامعاودة اهله قبل اغتساله۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار: ابحاث الغسل ج۱ ص۱۲۹) [1]

حالتِ جنابت میں ناخن اور بال کاٹنے کا حکم

سوال: جنابت کی حالت میں ناخن تراشنا اور بال کٹوانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جنابت کی حالت میں پورا جسم ظاہری طور پر نجاست کا شکار رہتا ہے اسلیئے پورے جسم کا دھونا فرض ہے، ایسی حالت میں ناخن اور بال کٹوانا مکروہ ہے۔ فقہاء کرام نے کراہت مطلقاً ذکر کیا ہے لیکن قرائن کے اعتبار سے کراہت تنزیہی معلوم ہوتی ہے۔

وفى الهندية: حلق الشعر حالة الجنابة مكروه وكذا قص الاظافير۔ كذا فى الغرائب۔ (الهندية۔ الباب التاسع عشر فى الختان والخصاء وقلم الاظفار وقص الشارب ج۵ ص۳۵۸) [2]

دورانِ غسل باتیں کرنے کا حکم

سوال: غسل کرتے وقت باتیں کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز اس دوران ادعیہ مسنونہ پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا عریانی

---

[1] قال سديد الدين الكاشغريؒ: واذا اراد الجنب الاكل والشرب ينبغي له ان يغسل يده وفيه ثم يأكل ويشرب۔ (منية المصلى۔ بحث الطهارة الكبرى ص۲۹) ومثله فى الهندية۔ الفصل الثالث فى المعانى الموجبة للغسل ج۱ ص۱۶۔

[2] قال الشيخ العلامة اشرف على تھانویؒ: "درمطالب المؤمنين مى آرد ستردن وتراشيدن موئے وگرفتن ناخنها درحالتِ جنابت کراہت است"۔ (امداد الفتاوى ج۱ ص۲۸ فصل فى الغسل)

کی حالت میں باتیں کرنا جائز ہے ؟

الجواب :- دورانِ غسل خاموش رہنا بہتر ہے ، عریانی کی حالت میں فقہاء نے باتیں کرنے کو مکروہ لکھا ہے ، اور ادعیہ مسنونہ پڑھنے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ، کیونکہ نجس مکان میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا بے ادبی کے مترادف ہے ۔

قال ابن عابدینؒ : ویستحب ان لا یتکلم بکلام مطلقاً ، اما کلام الناس فلکراھتہ حال الکشف واما الدعاء فلانہ فی مصب المستعمل ومحل الاقذار والاوحال الخ

(رد المحتار علی الدر المختار مطلب سنن الغسل ج ۱ ص۱۵۶) [1]

غسل کرتے وقت بغیر لباس وضو کا حکم

سوال :- کپڑے اتار کر ننگے ہونے کی حالت میں وضو کرنے کا کیا حکم ہے ؟ عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ عریانی کی حالت میں وضو نہیں ہوتا ۔

الجواب :- کشفِ عورت نواقضِ وضو میں سے نہیں ہے لہٰذا یہ بات عوام میں غلط مشہور ہے کہ عریانی کی حالت میں وضو جائز نہیں ، غسل خانہ میں کپڑے اتار کر وضو کرنا جائز اور مشروع ہے ، البتہ حیاء کا تقاضا یہ ہے کہ خلوت میں بھی ستر کی رعایت ہو ۔

لما قال العلامۃ ملا علی القاریؒ : حاصل حکم من اغتسل عاریاً انہ ان کان بمحل خال لا یراہ احد یحرم علیہ نظر عورتہ حل لہ ذلک لکن الافضل التستر حیاء من اللہ تعالیٰ ۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص۳۹ باب الغسل الفصل الثانی) [2]

سوال :- غسل کرتے وقت کون سی کیفیت بہتر ہے ؟ کیا بیٹھ کر غسل کرنا چاہیئے یا **کھڑے ہو کر غسل کرنا افضل ہے یا بیٹھ کر ؟**

---

[1] قال الحسن بن عمارؒ : ویستحب ان لا یتکلم بکلام معہ ولو دعاء لانہ فی مصب الاقذار ویکرہ مع کشف العورۃ (وبعد اسطر) ویزاد فیہ کراھۃ الدعاء ۔ (مراقی الفلاح ، آداب الاغتسال ص۵۷) ومثلہ فی الھندیۃ ۔ الفصل الثانی سنن الغسل ج ۱ ص۱۴ ۔

[2] عن ام ھانیؓ بنت ابی طالب : تقول ذھبت الی رسول اللہ عام الفتح فوجدتہ یغتسل وفاطمۃ تسترہ ۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۱ ص۴۱ باب [illegible] عریاناً وحدہ فی الخلوۃ) ومثلہ عن میمونۃؓ فی الصحیح المسلم ج ۱ ص۱۵۴ باب تستر المغتسل بثوب ونحوہ ۔

کھڑے ہوکر بھی غسل کرنا افضل ہے؟

الجواب:۔ غسل کرتے وقت کسی خاص کیفیت کی پابندی ضروری نہیں، حالت اور موقع کو مدِنظر رکھ کر ایسی کیفیت اختیار کی جائے گی جو انسانی بدن کے لیے استر ہو، عموماً بیٹھ کر غسل کرنے سے پردہ قوی رہتا ہے اس لیے بیٹھ کر غسل کرنا بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے بارے میں روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بیٹھ کر غسل فرمایا ہے۔

لما اخرجه الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن اُمّ ھانیؓ تقول ذھبتُ الی رسول الله عام الفتح فوجدته یغتسل وفاطمة تسترہ فقال من ھٰذہ فقلتُ انا اُمّ ھانی۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص۴۲ باب التستر فی الغسل عند الناس)[1]

دورانِ غسل سر پر مسح کرنا کافی نہیں

سوال:۔ کیا غسل کرتے وقت عورت کے لیے پورے بدن کا دھونا فرض ہے؟ بعض عورتیں بدن پر پانی ڈال کر سر پر مسح کرنا کافی سمجھتی ہیں، کیا ایسی صورت میں غسل ہو جاتا ہے؟

الجواب:۔ احکامِ غسل میں مرد اور عورت یکساں ہیں، جیسا مرد کے لیے پورے بدن کا دھونا فرض ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی پورے بدن کا دھونا ضروری ہے، سر کے بالوں پر مسح کر لینا کافی نہیں، بال بھی دھونا ضروری ہیں، اگر غسل کرتے وقت بالوں پر مسح کر کے دھونا چھوڑ دیا جائے تو اس سے غسل ادا نہیں ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: وفرض الغسل غسل کل فمه وانفه حتّٰی ما تحت الدرن وباقی بدنه لکن فی المغرب وغیرہ البدن من المنکب الی الالیة، وحینئذٍ فالرأس والعنق والید والرجل خارجةٌ لغةً داخلة تبعًا شرعًا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار۔ ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۵۲)[2]

---

[1] واخرجه الامام مسلم فی صحیحة عن معاذة قالت قالت عائشةؓ کنتُ اغتسل انا ورسول الله من اناء واحد بینی وبینه فیبادرنی حتّٰی اقول دع لی دع لی قالت ھما جنبان۔ (مسلم ج ۱ ص۱۴۸ باب غسل الرجل والمرأة من اناء واحد)۔

[2] وفی الھندیة: الفصل الاول فی فرائضه وھی ثلاثة المضمضة والاستنشاق وغسل جمیع البدن علیٰ ما فی المتون۔ (الھندیه۔ الباب الثانی فی الغسل ج ۱ ص۱۳) ومثله فی البحر الرائق، کتاب الطھارة ج ۱ ص۴۵)

غسل کے لیے کشفِ عورت کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں لوگ بڑے بڑے تالابوں اور حوضوں میں اجتماعی طور پر غسل کرتے ہیں، اس میں ظاہر ہے کہ عضوِ مخصوصہ کے کشف پر جس کو لوگ دیکھ سکیں ضمیر ملامت کرتا ہے، لیکن اگر ایک شخص عضوِ مخصوصہ پر ایک کپڑا باندھ کر ایسی حالت میں غسل کرے کہ ناف کے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر کا کچھ حصہ عام لوگوں کو نظر آئے، اس کا از روئے شرع کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ واضح ہو کہ اگر انسان ایسی جگہ میں غسل کرے جہاں پر اکیلا ہو تو ایسی حالت میں بھی بلا ضرورت کشفِ عورت سے احتراز کرے گا ضرورت کی حد تک اس کے لیے کشفِ عورت کی رخصت ہے۔ لیکن جہاں آس پاس لوگ موجود ہوں تو ایسی حالت میں گھٹنوں سے لے کر ناف تک کا حصہ مرد کے لیے چھپانا فرض ہے جس کا کشف حرام ہے، ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ پردہ کر کے غسل کرے تاہم اگر ایک شخص نے اس طریقہ سے غسل کر لیا تو ارتکابِ حرام کے باوجود جب فرائضِ غسل ادا ہوئے ہوں تو فریضۂ غسل ادا ہو جاتا ہے۔

قال ابراھیم الحلبیؒ: وان یغتسل فی موضع لا یراہ احد لاحتمال بدو العورۃ حال الاغتسال او اللبس والحدیث یعلی بن امیۃ ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ حیّ ستیر یحب الحیاء والتستر فاذا اغتسل احدکم فلیستتر۔

(رواہ ابوداؤد)۔ (کبیری۔ فرائض الغسل ص۵۱) [۱]

کشفِ عورت کی صورت میں تیمم کی رخصت

سوال:۔ اگر کسی شخص کو ایسی جگہ میں غسل کی ضرورت پڑے جہاں غسل کرنے کا باپردہ انتظام نہ ہو اور اگر غسل کرتا ہے تو کشفِ عورت کا قوی امکان ہے تو ایسی صورت میں غسل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جب دیگر آدمیوں کے سامنے کشفِ عورت کے بغیر غسل ممکن نہ ہو تو اس شخص کے لیے تیمم کرنا جائز ہے یعنی کشفِ عورت سے بچنے کیلئے تیمم پر اکتفاء کرے اور

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: قال فی شرح المنیۃ: وھو غیر مسلم لان ترک المنھی مقدم علی فعل المامور وللغسل خلف وھو التیمم فلا یجوز کشف العورۃ لاجلہ عند من لا یجوز نظرہ الیھا۔ (رد المحتار علی الدر المختار: ابحاث الغسل ج۱ ص۱۵۶)

جب موقع ملے تو پھر غسل کرلے۔

قال ابراهيم الحلبيؒ: وللغسل خلف وهو التيمم ولا يجوز كشف العورة عند من لا يجوز نظره اليها لاجله۔ (كبيری۔ فرائض الغسل ص۵۱) ؎

غسل کا حکم شہوت کے باوجود منی بند کرنے سے

سوال:۔ اگر کسی نے رأس الذکر پکڑ کر منی روک کر شہوت ختم ہونے کے بعد منی چھوڑ دی تو ایسی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ طرفین کے نزدیک ایسی صورت میں غسل واجب رہے گا جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک خروجِ منی کے وقت شہوت کی موجودگی ضروری ہے۔ صورتِ مذکورہ میں خروجِ منی کے وقت شہوت نہ ہونے کی وجہ سے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غسل واجب نہیں ہوتا لیکن مفتیٰ بہ قول طرفین کا ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص کہیں مہمان ہو اور احتلام کی صورت میں میزبان کی طرف سے شک پیدا ہونے کا امکان ہو تو پھر احتلام کے وقت اسی طریقہ کو اختیار کرنے پر امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنا جائز ہے، البتہ فتویٰ اس پر نہیں دیا جاسکتا۔

قال الحصكفيؒ: وشرطه ابويوسفؒ وبقوله يفتى فى ضيفٍ خاف ريبةً او استحى كما فى المستصفى وفى القهستانى والتاتارخانية معزيًا للنوازل: وبقول ابى يوسفؒ ناخذ لانه أيسر على المسلمين قلت ولاسيما فى الشتاء والسفر۔ وقال ابن عابدينؒ قوله وشرطه ابويوسفؒ اى شرط الدفق، واثر الخلاف يظهر فيما لو احتلم او نظر بشهوة فامسك ذكره حتى سكنت شهوته ثم ارسله فانزل وجب عندهما لا عنده (وبعد اسطر) (قوله قلت) ظاهره الميل الى اختيار ما فى النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولاسيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الأحوط فينبغى الافتاء

؎ قال ابن عابدينؒ: ولا يخفى ان تاخير الغسل لا يقتضى عدم التيمم فان المبيح له وهو العجز عن الماء قد وجد فافهم۔
(ردّ المحتار على الدر المختار۔ ابحاث الغسل ج۱ ص۱۵۵)

بقوله فی مواضع الضرورۃ۔ فقط (ردّ المحتار علی الدرّ المختار۔ ابحاث الغسل ج ۱ ص ۱۶۰) لہ

غسل کرنے وقت جہاں پانی پہنچانا مشکل ہو تو اس کا حکم

سوال:۔ ختنے کے وقت بعض اوقات حشفہ کے ارد گرد چمڑہ رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے غسل کے وقت حشفہ تک پانی پہنچانا مشکل ہوجاتا ہے بلکہ بغیر کسی تکلف اور سخت کوشش کے پانی داخل نہیں ہوتا، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ جس جگہ میں پانی داخل کرنا شاق ہو تو وہاں کانوں کے سوراخ کی طرح ظاہر پہ پانی ڈالنے سے غسل صحیح ہوتا ہے، ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں جو موجبِ حرج ہوں۔

قال الحصکفیؒ: ولو کان خاتمہ ضیقًا نزعہ او حرکہ وجوبًا کقرط ولو لم یکن بثقب اذنہ قرط فدخل الماء فیہ ای الثقب عند مرورہ علی اذنہ اجزاہ کسرۃ واذن ودخلھما الماء (والا) یدخل أدخلہ ولو باصبعہ ولا یتکلف بخشب ونحوہ والمعتبر غلبۃ ظنہ بالوصول۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ابحاث الغسل ج ۱ ص ۱۵۵) ۲ہ

غسل کے بعد دوبارہ وضو کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا غسل کرنے کے بعد دوبارہ وضو ضروری ہے یا غسل کے ضمن میں کیے گئے وضو پر اکتفاء

لہ قال ابن نجیمؒ: ثم اتفق اصحاب المذھب انہ لا یجب الغسل اذا انفصل عن مقرہ من الصلب بشھوۃ الا اذا خرج علی رأس الذکر وانما الخلاف فی انہ ھل یشترط مقارنۃ الشھوۃ الخروج فعند ابی یوسفؒ نعم وعندھما لا وقد اشار الی اختیار قولھما بقولہ عند انفصالہ ای فرض الغسل عند خروج منی موصوف بالدفق والشھوۃ عند الانفصال عن محلہ عندھما۔ (البحر الرائق۔ مبحث الغسل ج ۱ ص ۵۵)

۲ہ قال ابراھیم الحلبیؒ: امرأۃ اغتسلت ھل تتکلف فی ایصال الماء الی ثقب القرط ام لا قال ای محمد تتکلف فیہ ای فی ایصال الماء الی ثقب القرط کما تتکلف فی تحریک الخاتم ان کان ضیقًا والمعتبر فیہ غلبۃ الظن بالوصول (وبعد اسطر) ولا تتکلف لغیر الامرار من ادخال عود ونحوہ فان الحرج مدفوع۔ (کبیری۔ فرائض الغسل ج ص ۴۸)

ومثلہ فی الھندیۃ الفصل الاول فی فرائض الغسل ج ۱ ص ۱۴۔

کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ غسل کرنے سے قبل وضو کر لیا جائے البتہ اگر غسل سے قبل وضو نہ کیا گیا ہو تو غسل میں ضمناً وضو پر اکتفاء ہو سکتا ہے، ایسی حالت میں غسل کے بعد دوبارہ وضو ضروری نہیں، البتہ اگر غسل کرنے کے بعد کسی دوسری مجلس میں وضو کرے تو جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واتفق العلماء علی عدم وجوب الوضوء فی الغسل الا داؤد الظاهری فقال بالوجوب فی غسل الجنابة واذ توضأ اولاً لا یاتی به ثانیاً بعد الغسل فقد اتفق العلماء علی انه لا یستحب وضوءان للغسل اما اذا توضأ بعد الغسل واختلف المجلس علی مذهبنا او فصل بینهما بصلوٰة کما هو مذهب الشافعی فیستحب۔ (البحر الرائق سنن الغسل ج ۱ ص۵۰) ؎۱

خواب سے بیداری کے بعد محض تری کے احساس سے غسل کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص صبح نیند سے بیدار ہوتے وقت احلیل میں بغیر کسی شہوت اور دفق کے تری محسوس کرے تو کیا اس پر غسل واجب ہے؟ جبکہ احتلام بھی یاد نہ ہو اور نہ تری کے بارے میں منی ہونے کا یقین ہو؟

الجواب:۔ خواب میں احتلام یاد نہ ہونے کے باوجود نفسِ تری کے احساس کی صورت میں غسل احتیاطاً واجب ہے، البتہ اگر مذی ہونے کا یقین ہو تو پھر غسل واجب نہیں۔

قال ابراهیم الحلبیؒ: واما اذا لم یتذکر الاحتلام وتیقن انه منی او شك هل هو منی او مذی فکذلك یجب علیه الغسل فی هاتین الحالتین ایضاً اجماعاً للاحتیاط۔ وان تیقن انه مذی فلا غسل علیه۔ (کبیری۔ اما الطهارة الکبریٰ تهی الاغتسال ص۴۲) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ: لو توضأ اولاً لا یأتی به ثانیاً لانه لا یستحب وضوءان للغسل اتفاقاً اما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس علی مذهبنا او فصل بینهما بصلوٰة کقول الشافعیة فیستحب۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۱ ص۱۵۸ سنن الغسل)

؎۲ قال طاهر بن عبد الرشید:۔ والثالث اذ رئ البلل علی فراشه ولم یتذکر الاحتلام عندهما یجب علیه الغسل وعند ابی یوسفؒ لا غسل علیه۔ (خلاصة الفتاوی۔ الفصل الثانی فی الغسل ج۱ ص۱۳) ومثله فی الهندیة۔ الفصل الثالث فی المعانی الموجبة للغسل ج ۱ ص۱۵۔

احتلام بھول جانے کی صورت میں پڑھی گئی نمازوں کا حکم

سوال:۔ کسی شخص سے احتلام بھول گیا تھا مگر چند دن بعد یاد آیا کہ چند روز قبل اس کو احتلام ہوا تھا، تو اس دوران پڑھی گئی نمازوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کسی کو چند روز کے بعد احتلام کا علم ہوا کہ فلاں دن کو مجھے احتلام ہوا تھا تو اسی روز سے نمازوں کی قضاء کرے گا اور اگر متعین دن کا علم نہ ہو تو آخری نوم (نیند) سے جُنبی شمار ہوگا، اس کے بعد جتنی نمازیں پڑھی گئی ہوں اُن کی قضاء لازم ہو گی۔

لما قال الشیخ عبد الحیؒ :۔ اگر دانست کہ احتلام فلاں روز ست حکم جنابت از آں روز جاری خواہد شُد و اگر تعین روز معلوم نہ شُد حکم احتلام از آخر نوم کہ بعد آں نخسپیدہ است داد خواہد شُد۔ (مجموعۃ الفتاویٰ (فارسی) ج ۳ ص ۲۶ باب الغسل)

کنڈوم (ساتھی) کے ساتھ ایلاج موجب غسل ہے

سوال:۔ کنڈوم (ساتھی) کو استعمال کرنے کی صورت میں جماع بدون انزال کے موجب غسل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نفس التقاء ختانین (دونوں شرمگاہوں کا مل جانا) جب سپاری غائب ہو جائے تو بغیر انزال کے موجب غسل ہے بشرطیکہ دونوں کو ایک دوسرے کی حرارت محسوس ہو اس لیے فقہاء نے اُس ایلاج (دخول) کو موجب غسل قرار نہیں دیا جو موٹے کپڑے کے ساتھ ہو اور اُس میں فرج داخل کی حرارت محسوس نہ ہو لیکن کنڈوم (ساتھی) میں اگرچہ ذکر ملفوف ہوتا ہے مگر یہ غلاف اتنا باریک ہوتا ہے کہ اس کی موجودگی میں بھی تمام تر لذت کا احساس ہوتا ہے اور طرفین ایک دوسرے سے لذت یاب ہوتے ہیں، اس لیے کنڈوم کے ساتھ ادخال بدون انزال بھی موجب غسل ہے۔

لما قال حسن بن عمار: ومنها ایلاج بخرقة مانعة من وجود اللذة علی الاصح۔ قال الشیخ احمد الطحطاوی (قوله مانعة من وجود اللذة) اقتصر علی ذکر اللذة هنا و زاد فیما تقدم وجود الحرارة ولعلهما متلازمان۔

(الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۸ فصل عشرة اشیاء لا یغتسل منها)

ایضاً قال ولو لف ذکره بخرقة واولجه ولم ینزل فالاصح انه ان وجد حرارة الفرج واللذة وجب الغسل والا فلا۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۴۷ موجبات الغسل)[1]

---

[1] قال الحصکفیؒ: اولج حشفته او قدرها ملفوفة بخرقة ان وجد لذة الجماع وجب الغسل والا لا علی الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۱۶۴، ۱۶۵ باب الغسل)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے وجوبِ غسل کا مسئلہ

سوال:۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعے جو مادہ منویہ عورت کے رحم میں رکھا جاتا ہے، کیا اس عمل سے عورت پر غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وجوبِ غسل کا سبب نفسِ خروجِ منی یا دخولِ منی نہیں بلکہ اصل علّت اس میں لذت اور تسکینِ قلب ہوتی ہے جو شہوت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، ٹیسٹ ٹیوب میں لذت اور تسکین کی علت مفقود ہوتی ہے اور اس میں صرف مادہ منویہ عورت کے رحم میں بذریعہ مشین پہنچایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے وہ لذت و تسکین نہیں جو مرد کے جماع کرنے سے عورت کو حاصل ہوتی ہے۔

اس کی مثال عورت کا اپنی شرمگاہ میں انگلی داخل کرنے یا غیر آدمی کے ذکر وغیرہ کو داخل کرنے کی ہے جو موجبِ غسل نہیں۔۔۔ البتہ اگر ٹیسٹ ٹیوب کے عمل کے وقت عورت کو انزال ہو جائے تو تب غسل واجب ہوگا اگرچہ بدونِ انزال کے غسل کرنا زیادہ احوط ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وفرض الغسل عند خروج منی من العضو۔۔۔ منفصل عن مقرہ ھو صلب الرجل وترائب المرأۃ۔۔۔ بشھوۃ ای لذۃٍ ولو حکماً کمُحتلم ولم یذکر الدفق یشمل منی المرأۃ، لان الدفق فیہ غیر ظاھرٍ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۱۵۹، ۱۶۰ باب الغسل)

وایضاً قال: ولا عند ادخال اصبع ونحوہ کذکر غیر آدمی وذکر خنثیٰ ومیّت وصبیّ لا یشتھی وما یصنع من نحو خشب فی الدبر او القبل علی المختار۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۱۶۶ باب الغسل)[1]

جانور سے وطی کرنے کی صورت میں غسل کا مسئلہ

سوال:۔ اگر ایک آدمی کسی جانور سے وطی کرے لیکن انزال

---

[1] قال حسن بن عمار: اولھا خروج المنی وھو ماء الیٰ ظاھر الجسد لانہ ما لم یظھر لاحکم لہ اذا انفصل عن مقرہ بشھوۃٍ من غیر جماعٍ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص ۷۲ فصل موجبات الغسل)

وایضاً ومنھا ادخال اصبع ونحوہ کشبہ ذکر مصنوع من نحو الجلد فی احد السبلین علی المختار مقصوراً لشھوۃ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص ۸۱ فصل عشرۃ اشیاء لا یغتسل منھا)

انزال نہ ہو تو غسل واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ نفسِ ایلاج موجبِ غسل نہیں بلکہ ایلاج (التقاءِ ختانین) کے لیے محلِ مشتہاۃ کا ہونا ضروری ہے ۔ چونکہ بہیمہ (جانور) یا میتۃ (مردہ) محلِ مشتہات نہیں اس لیے نفسِ وطی بدون انزال کے غسل واجب نہیں ۔

لما قال الحصکفیؒ: ولا عند وطی بہیمۃ او میتۃ او صغیرۃ غیر مشتہاۃ بان تصیر مفضاۃ بالوطء وان غابت الحشفۃ .... بلا انزال لقصور الشہوۃ ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۱۶۶ ابحاث الغسل، سنن الغسل)[1]

التقاءِ ختانین کی صورت میں غسل کا حکم

سوال:۔ مرد وعورت کی شرمگاہیں جب آپس میں مل جائیں تو کیا دونوں پر غسل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ احادیثِ مقدسہ کے صریح اور واضح الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ التقاءِ ختانین موجبِ غسل ہے بشرطیکہ حشفہ (سپاری) فرج میں غائب ہو جائے ۔

لما اخرج الامام ابو عیسٰی الترمذیؒ: عن عائشۃؓ قالت اذا جاوز الختانُ الختانَ وجب الغسل فعلتُہ انا و رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاغتسلنا ۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۳۰ باب ما جاء اذا التقی الختان وجب الغسل)[2]

غسل کے بعد منی نکلنے پر غسل کا حکم

سوال:۔ کبھی کبھی جلدی کی وجہ سے جماع یا احتلام کے بعد غسل کیا جاتا ہے اور غسل کے بعد منی کے قطرے خارج ہو جاتے ہیں تو کیا دوبارہ غسل کرنا واجب ہے یا پہلا غسل ہی کافی ہوگا ؟

---

[1] وفی الھندیۃ: والایلاج فی البہیمۃ والمیتۃ والصغیرۃ التی لا یجامع مثلھا لا یوجب الغسل بدون الانزال ۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۵ الفصل الثالث فی المعانی الموجبۃ الغسل)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۱۳ الفصل الثانی فی الغسل ۔

[2] قال الحصکفیؒ: وعند ایلاج حشفۃ ھی ما فوق الختان آدمی احتراز عن الجنی یعنی اذا لم تنزل ..... او ایلاج قدرھا من مقطوعھا ولو لم یبق منہ قدرھا ..... فی احد سبیلی آدمی حی یجامع مِثْلُہٗ علیھما ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۱۶۱،۱۶۲ سنن الغسل)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۵ الفصل الثالث فی المعانی الموجبۃ ۔

الجواب: - غسل کرنے کے بعد منی کے جو قطرات خارج ہوتے ہیں اس میں قدرے تفصیل ہے، اگر منی کے قطرات کثرتِ مشی (زیادہ چلنے) سونے یا پیشاب کے بعد نکلے ہوں تو چونکہ بسا اوقات ان حالات میں بغیر شہوت و دفق کے منی خارج ہو جاتی ہے اسلئے عدم شہوت کیوجہ سے پہلا غسل ہی کافی ہے دوبارہ غسل واجب نہیں اور اگر ان عوارض سے قبل منی کے قطرات خارج ہو جائیں تو دوبارہ غسل واجب ہوگا ۔

لما فی الهندیة : لواغتسل من الجنابة قبل ان یبول او ینام وصلی ثم خرج بقیة المنی فعلیه ان یغتسل عندهما خلافا لابی یوسفؒ ولکن لایعید تلك الصلوٰة فی قولهم جمیعاً کذا فی الذخیرة ولو خرج بعد مابال او نام او مشی لایجب علیه الغسل اتفاقاً کذا فی التبیین ۔

(الهندیة ج ۱ ص۱۴ الفصل الثالث فی المعانی الموجبة للغسل) [۱]

سوئمنگ پول میں غسل کرنے کا حکم

سوال: - آجکل غسل کے لیے بعض مقامات پر سوئمنگ پول بنا دیئے گئے ہیں جو دَہ در دَہ حوض (ایک سو مربع) سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں، اُن میں غسل کرنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب: - جو حوض دَہ در دَہ ہو تو مفتی بہ قول کے اعتبار سے اس کا پانی ماءِ جاری کے حکم میں ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سوئمنگ پول اگر دَہ در دَہ ذراع یا اس سے زیادہ ہو تو وہ ماءِ جاری کے حکم میں ہے اس لیے اس میں غسل کرنا جائز ہے ۔ البتہ چونکہ سوئمنگ پول میں غسل کرنا کفار اور فساق کا وطیرہ ہے اس لیے ایسی جگہوں میں غسل کرنے سے اجتناب کیا جائے ۔

لما قال طاهر بن عبد الرشیدؒ : الحوض الکبیر مقدار بعشرة اذرع فی عشرة اذرع ..... وعلیه الفتویٰ - (خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۳ کتاب الطهارة) [۲]

---

[۱] قال ابن عابدینؒ : وکذا لو خرج منه بقیة المنی بعد الغسل قبل النوم او البول او المشی الکثیر نهر ای لابعده لان النوم والبول والمشی یقطع مادة الزائل عن مکانه بشهوة فیکون الثانی زائلاً عن مکانه بلاشهوة فلا یجب الغسل اتفاقاً ۔

(رد المحتار ج ۱ ص۱۶۰ مواجبات الغسل)

[۲] التقدیر بعشر فی عشر هو المفتی به قال السید احمد الطحطاوی (قوله هو المفتی به) هو قول عامة المشائخ خانیة وهو قول الاکثر وبه ناخذ نوازل وعلیه الفتوٰی کما فی شرح الطحاوی - (طحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۲۱ کتاب الطهارة بحث اقسام المیاه)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۸ الباب الثالث فی المیاه ۔

جنابت کا غسل فوراً کرنا ضروری نہیں

سوال:۔ عوام میں یہ بات بہت زیادہ مشہور ہے کہ بیوی سے جماع کے فوراً بعد غسل کرنا ضروری ہے ورنہ گناہ ہوتا ہے، کیا واقعی یہ بات درست ہے؟

الجواب:۔ جماع کرنے کے بعد اگرچہ غسل کرنا واجب ہو جاتا ہے مگر یہ وجوب علی الفور نہیں بلکہ جب موقع ملے تو غسلِ جنابت کر لیا جائے، اگرچہ اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ فوراً غسل کر لیا جائے۔

عن ابن عمرؓ قال ذکر عمر بن الخطاب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انہ تصیبہ الجنابۃ من اللیل فقال لہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ واغسل ذکرک ثم نم۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۴۹ باب مخالطۃ الجنب) لہ

مصنوعی بالوں کا وضوء غسل میں حکم

سوال:۔ موجودہ دور میں خواتین اپنے بالوں کو لمبا اور گھنا ظاہر کرنے کے لیے مصنوعی بال لگاتی ہیں غسل یا وضو میں ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگرچہ یہ عمل شرعاً ممنوع ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے عمل کو موجبِ لعنت قرار دیا ہے لیکن اگر یہ عمل کر بھی لیا جائے تو غسل میں چونکہ عورتوں پر صرف بالوں کی جڑوں میں پانی پہنچانا ضروری ہوتا ہے اس لیے وضو اور غسل میں ان خارجی بالوں کا ہٹانا ضروری نہیں بشرطیکہ وضو میں چوتھائی سر کا مسح اصلی بالوں پر ہو، ہاں اگر مصنوعی بالوں پر مسح کیا جائے تو وضو جائز نہ ہوگا۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: لیس علی المرأۃ ان تنقض ضفائرھا فی الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۲ فصل فی الغسل) ؎

لہ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان جنبًا فاراد ان یأکل او ینام توضأ وضوءہ للصلوٰۃ۔ (متفق علیہ)
(مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۴۹ باب مخالطۃ الجنب وما یباح لہٗ)

ومثلہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۱ ص۳۸۲ المطلب الخامس مکروھات الغسل۔

؎ قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: لا یفترض نقض المضفور من شعر المرأۃ ان سری الماء فی اصولہ اتفاقاً الخ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۸۲ فصل فرائض الغسل)

ومثلہٗ فی کبیری ص۴۷ فرائض الغسل۔

صرف تری محسوس کرنا موجب غسل نہیں

سوال:۔ اگر ایک شخص بیداری کی حالت میں بلاشہوت و دفق احلیل میں منی یا مذی کی کچھ تری محسوس کرے اور وہ قلیل المقدار ہونے کی وجہ سے اس کے اندر ہی رک جائے اور باہر خارج نہ ہو تو اس صورت میں غسل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں غسل واجب نہیں کیونکہ وجوبِ غسل کے لیے خروجِ منی علیٰ وجہ الدفق والشہوت ضروری ہے جو کہ صورتِ مسئولہ میں مفقود ہے، البتہ اس تری کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اگر قطرات صرف احلیل کے اندر ہوں، خارج نہ ہوئے ہوں تو وضو پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

وفی الهندية: منها الجنابة وهی تثبت بسببين احدهما خروج المنى على وجه الدفق والشهوة۔ (الهندية الفصل الثالث فی المعانی الموجبة للغسل ج۱ ص۱۴) [1]

متعدد بار جماع کیلئے ایک غسل کافی ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی منکوحہ سے متعدد بار یا دو تین بیویوں سے جماع کر کے آخر میں ایک دفعہ غسل کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں یا ہر بار جماع کے لیے مستقل غسل کرنا ہوگا؟

الجواب:۔ ایک بیوی سے یا متعدد بیویوں سے کئی بار جماع کرنے کیلئے ایک غسل کرنا کافی ہے، ہر دفعہ جماع کے لیے الگ غسل کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ان رسول الله صلی الله علیه وسلم طاف ذات يوم على نسائه فی غسل واحد۔ (ترمذی ج۱ ص۳۶ باب ماجاء فی الرجل يطوف على نسائه بغسل واحد)

وقال الحصكفیؒ: ولا معاودة اهله قبل اغتساله الا اذا احتلم لم يأت اهله۔ قال الحلبیؒ ظاهر الاحاديث انما يفيد الندب لا نفی الجواز

---

[1] قال برهان الدينؒ: المعانی الموجبة للغسل انزال المنی على وجه الدفق والشهوة من الرجل والمرأة حالة النوم واليقظة (الهداية۔ فصل فی الغسل ج۱ ص۳۱) ومثله فی خلاصة الفتاوىٰ الفصل الثانی فی الغسل ج۱ ص۱۲۔

المفاد من کلامہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ ابحاث الغسل ج ۱ ص۱۲۵، ۱۲۶) [۱]

جنابت کی حالت میں بوقتِ ضرورت مسجد میں جانا

سوال:۔ اگر مسجد کے باہر گرم پانی میسر نہ ہو اور ٹھنڈے پانی سے غسل میں تکلیف ہوتی ہو تو گرم پانی کے لیے مسجد میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ایسا ہی بسا اوقات پانی کے پمپ کا بٹن مسجد کے اندر ہوتا ہے، تو کیا جُنب شخص پانی کی مشین چلانے کے لیے مسجد میں داخل ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد سے باہر غسل کا انتظام نہ ہو اور ضرورت کے تحت مسجد میں داخل ہونا ضروری ہو تو تیمّم کرکے مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: لکن لقائل ان یقول ان مراد المبتغی ان الجنب اذا وجد ماء فی المسجد و اراد دخوله للاغتسال تیمّم و یدخل۔

(رد المحتار علی الدر المختار۔ باب التیمّم ج ۱ ص۲۴۳) [۲]

جنابت کی صورت میں پورے بدن کے غسل کا فلسفہ

سوال:۔ جنابت کی حالت میں پورے جسم کا غسل کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے، حالانکہ نجاست تو عضوِ مخصوص سے نکلتی ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ صرف عضوِ مخصوص ہی دھویا جائے۔ آخر کار جنابت کا پورے جسم پر کیا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے غسل میں ہر بال تک پانی پہنچانا ضروری قرار دیا گیا ہے؟

الجواب:۔ احکاماتِ شرعیہ میں حکمتیں تلاش کرنا ضعفِ ایمان کی دلیل ہے، مسلمان کے لیے بغیر کسی چون و چرا کے احکامِ شرعیہ پر عمل ضروری ہے، احکامِ شرعیہ میں حکمتیں تلاش کرنا ایمان کا تقاضا نہیں، کیونکہ ایمان اور اسلام فرمانبرداری اور اطاعت کا نام ہے اس کا

---

[۱] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولا بأس للجنب ان ینام و یعاود اهله قبل ان یغتسل او یتوضأ۔ (خلاصة الفتاویٰ الفصل الثانی فی الغسل ج ۱ ص۱۴) ومثله فی مشکوٰة ج ۱ ص۴۹ باب مخالطة الجنب و یباح له الفصل الاوّل۔

[۲] قال ابراهیم الحلبیؒ: جنب وجد الماء فی المسجد ولم یجده فی غیره ولیس معه احد یاتیه به تیمّم لاجل الدخول۔ (کبیری باب التیمّم ص۷۲)

یہ مطلب نہیں کہ احکام شرعیہ عقل سے متصادم ہیں بلکہ ہماری عقل ناقص ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات ان حکمتوں اور فلسفوں کے ادراک سے ہم قاصر رہ جاتے ہیں۔

تاہم جنابت کی حالت میں پورے بدن کے دھونے کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ جنابت سے جسم میں گرانی و کاہلی اور کمزوری و غفلت پیدا ہوجاتی ہے اور غسل سے دل میں قوت و نشاط و سرور اور بدن میں سبکساری پیدا ہوتی ہے۔ جنابت سے انسان کو ارواح طیبہ یعنی فرشتوں سے بُعد و دوری پیدا ہوتی ہے اور جب غسل کرتا ہے تو وہ بُعد اور دُوری ختم ہوجاتی ہے۔ جب انسان مجامعت سے فارغ ہوجاتا ہے تو حالتِ جنابت میں ہونے کی وجہ سے اس کا دل انقباض اور تنگی کی حالت میں ہوتا ہے اور اس پر بوجھ سا طاری ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو نہایت تنگی اور گھٹن میں پاتا ہے، اور جب دونوں قسم کی نجاستیں دُور ہوجاتی ہیں اور انسان اپنے بدن کو مَلتا اور غسل کرتا ہے تب اس کی گھٹن اور سستی دور ہوجاتی ہے۔

حاذق طبیبوں نے لکھا ہے کہ جماع کے بعد غسل کرنا بدن کی تحلیل شدہ قوتوں اور کمزوریوں کو لوٹا دیتا ہے اور بدن اور رُوح کے لیے نہایت نافع اور مفید ہے،؎ اور جنابت میں رہنا اور غسل نہ کرنا بدن و رُوح کے لیے سخت مُضر ہے۔ اس امر کی خوبی پر عقل و فطرتِ سلیمہ کافی گواہ ہے۔

؎ والیہ اشار الشیخ ابن القیّم الجوزیہ: حیث قال فان الاغتسال من خروج المنی من انفع شیٔ للبدن والقلب والرّوح بل جمیع الارواح القائمۃ بالبدن فانہا تقویٰ بالاغتسال۔ والغسل یخلف علیہ ما تحلل منہ بخروج المنی وایضًا فانّ الجنابۃ توجب ثقلاً وکسلاً والغسل یحدث لہ نشاطاً وخفّۃً (وبعد اسطر) وقد صرح افاضل الاطبّاء بان الاغتسال بعد الجماع یعید الی البدن ویخلف علیہ ما تحلل منہ وانہ انفع شیٔ للبدن والروح وترکہ مضر۔ (اعلام الموقعین۔ جواب ابن القیم المفصّل عن الباب الغسل من المنی ج ۲ ص۲۴)

باب البئر
(کنوئیں کے مسائل و احکام)

مینڈک مرنے کی صورت میں پانی کا حکم

سوال:۔ اگر کنوئیں میں یا حوض کے پانی میں مینڈک گر کر مرجائے تو ایسے پانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مینڈک کی دو قسمیں ہیں، ایک بحری دوسری برّی۔ اگر بحری مینڈک جس کا رہن سہن پانی میں ہو تو مائی المولد کے حکم میں ہو کر اس کے مرنے سے پانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور برّی مینڈک کے بدن میں اگر خون نہ ہو تو اس سے بھی پانی نجس نہیں ہوتا البتہ اگر اسکے بدن میں خون ہو تو پھر اس کے مرنے سے پانی نجس ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: ومائی مولد کسمک وسرطان وضفدع الا بریا له دم سائل وهو ما لاسترة له بین اصابعه فیفسد فی الاصح کحیة بریة ان لها دم والا لا۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله فیفسد فی الاصح) وعلیه فما جزم به فی الهدایة من عدم الانساد بالضفدع البری وصححه فی السراج محمول علیٰ ما لا دم له سائل کما فی البحر۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ باب المیاہ ج ۱ ص ۱۸۵)[1]

انسان گرنے سے کنوئیں کے پانی کا حکم

سوال:۔ اگر کنوئیں میں انسان گر کر مرجائے تو اس کنوئیں کے پانی کا کیا حکم ہے؟ اور اگر گرنے کے بعد زندہ نکل آئے تو پانی کی طہارت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر جنب انسان کا بدن پاک ہے، اگر انسان کنوئیں میں گر جائے اور اسے زندہ نکال لیا جائے تو پانی پاک ہے، البتہ اگر مرگیا ہو تو پانی نجس ہوگا اور اس صورت میں کنوئیں سے

---

[1] قال قاضی خان: موت ما لا دم له کالسمك والسرطان والحیة وکل ما یعیش فی الماء لا یفسد الماء الا وانی وکذا الضفدع بریة کانت او بحریة فان کانت الحیة او الضفدع عظیمة لها دم سائل یفسد الماء وکذا الوزغة الکبیرة۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة فصل فیما یقع فی البئر ج ۱ ص ۱)

تمام پانی نکالا جائے گا۔ اور اگر تمام پانی نکالنا ممکن نہ ہو تو پھر دو سو سے لے کر تین سو ڈول تک نکالنے سے کنواں پاک ہوگا۔ تاہم اگر گرا ہوا آدمی مُحْدِث یا جُنب ہو تو چالیس ڈول پانی نکالا جائے گا۔

قال ابراھیم الحلبیؒ: وان ماتت فیھا شاۃ اوکلب او ادمی نزح جمیع الماء...... وکذا ینزح جمیع الماء اذا استخرج الکلب او الخنزیر حیًا۔ (کبیری فصل فی البیر ص۱۵۷)[1]

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ان کان محدثًا ینزح اربعون دلوًا۔ (تاتارخانیۃ ج۱ ص۱۸۲ مسائل البئر)

پانی کے کنوئیں اور بیت الخلاء کے درمیان فاصلہ

سوال:۔ گھروں میں بیت الخلاء کیلئے گٹر کھودا جاتا ہے جس میں بول و براز بیت الخلاء سے نکل کر جمع ہوتے ہیں، چھوٹے گھروں میں اس کے قرب وجوار میں پانی کا کنواں بھی بنایا جاتا ہے، کیا اس سے پانی کے کنوئیں پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں اور ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیئے؟

الجواب:۔ پانی کی طہارت ونجاست کا حکم گٹر اور کنوئیں کے درمیان گندگی کے وصول پر مبنی ہے اور یہ وصول زمین کی نرمی اور سختی کی وجہ سے متفاوت ہے کوئی خاص فاصلہ اسکے بارے میں متعین نہیں۔ تاہم یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک لون طعم ریح (بو) متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اتنا فاصلہ رکھ کر بیت الخلاء کا گٹر بنایا جائے جس سے کنوئیں کا پانی متاثر نہ ہو۔

قال فی الھندیۃ: بئر الماء اذا کانت بقرب البئر النجسۃ فھی طاھرۃ مالم یتغیر طعمہ اَوْلَوْنُہٗ اوریحہ کذا فی الظھیریۃ ولا یقدر ھذا بالذرعان حتی اذا کان بینھما عشرۃ اذرع وکان یوجد فی البئر اثر البالوعۃ فماء البئر نجس وان کان بینھما ذراع واحد ولا یوجد اثر البالوعۃ فماء البئر

---

[1] قال الحصکفیؒ: فان اخرج الحیوان غیر منتفخ ولا متفسخ ولا متمعط فان کان کادمی وکذا سقط وسخلۃ وجدی واوز کبیر نزح کلہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ فصل البئر ج۱ ص۲۱۵) ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۹ الباب الثالث فی المیاہ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ۔ تحت قولہ کادمی محدث) ای انہ ینزح فیہ اربعون۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۱۳ باب البئر)

طاهر۔ کذا فی المحیط وھو الصحیح۔ (الھندیۃ۔ الباب الثالث فی المیاہ ج ۱ ص۲۰) [۱]

کنوئیں میں گندی چیز مثلاً چپل یا لکڑی گر جانے کا حکم

سوال:۔ کنوئیں میں گندی چیز مثلاً چپل، لکڑی یا نجس کپڑا گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر اس گری ہوئی گندی چیز کا نکالنا ممکن ہو تو نکالنا لازمی ہے اور اگر نکالنا ممکن نہ ہو تو پھر اگر کنوئیں سے سارا پانی نکالنا مشکل نہ ہو تو سارا پانی نکالا جائے ورنہ تین سو ڈول نکالنے سے کنواں پاک متصور ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: ینزح کل مائھا بعد اخراجہ الا اذا تعذر کخشبۃ او خرقۃ مُتَنَجِّسَۃ فینزح الماء الی حد لا یملأ نصف الدلو یطھر الکل تبعاً۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ فصل فی البئر ج ۱ ص۲۱۲) [۲]

اس کنوئیں کا حکم جس سے مرا ہوا جانور نکالنا مشکل ہو

سوال:۔ اگر کنوئیں میں مرغی کا بچہ گر کر مر جائے اور کنوئیں سے اس کا نکالنا ممکن نہ ہو اور نہ تمام پانی کا نکالنا ممکن ہو تو تین سو ڈول نکالنے کے باوجود بھی کنوئیں میں نجاست کی موجودگی میں پانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں جبکہ تمام پانی کا نکالنا ممکن نہ رہے اور نجاست کا نکالنا بھی انسان کے بس میں نہ ہو تو کنوئیں سے اتنی مدت تک پانی استعمال نہیں کیا جائے گا جب تک وہ بچہ مٹی نہ ہو جائے، البعض نے چھ مہینے تک کی تحدید کی ہے۔

قال ابن عابدینؒ۔ قلت فلو تعذر ایضاً ففی القھستانی عن الجواھر: لو وقع

---

[۱] قال طاھر بن عبد الرشیدؒ: وادنیٰ ماینبغی ان یکون بین بئر الماء والبالوعۃ سبعۃ اذرع والتعویل علیٰ نفوذ الرائحۃ ان تغیر لونہ او طعمہ او ریحہ نجسۃ والا فلا۔ (خلاصۃ الفتاوی الجنس الثالث فی الآبار والابار ج ۱ ص۱۳)۔ ومثلہ فی رد المحتار علی الدر المختار فصل فی البئر ج ۱ ص۹۲

[۲] قال فی الھندیۃ۔ ولو وقعت فی البئر خشبۃ نجسۃ او قطعۃ ثوب نجس وتعذر اخراجھا وتغیبت فیھا طھرت الخشبۃ والثوب تبعا بطھارۃ البئر کذا فی الظھیریۃ۔ (الھندیۃ۔ الباب الثالث فی المیاہ ج ۱ ص۲۰) ومثلہ فی السعایۃ ج ۱ ص۴۲۶

عصفور فیها فعجز واعن اخراجه فمادام فیها فنجسة فتترك مدة يعلم انه استحال وصار حمأة وقيل مدة ستة اشهر۔

(ردّ المحتار على الدر المختار، فصل في البئر ج ۱ ص۲۱۲) [1]

کُتا گرنے سے پانی کا حکم

سوال:۔ اگر ایک کنوئیں میں کتا گر کر مر جائے تو اس سے پانی پر کیا اثر پڑے گا؟ ناپاکی کی صورت میں کنوئیں کے کیچڑ، ڈول اور رسّی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کُتا گرنے سے پانی نجس ہو جاتا ہے، کُتے کا جسم نکالنے کے بعد سارا پانی نکالنا اگر ممکن ہو تو ضروری ہے ورنہ دو سو سے لے کر تین سو ڈول تک پانی نکالا جائے گا۔ کیچڑ نکالنا، ڈول اور رسی دھونا ضروری نہیں۔ ایسا ہی کنوئیں کی دیواروں میں تری رہ جانے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال في الهندية: اذا وقعت في البئر نجاسة نزحت وكان نزح ما فيها من الماء طهارة لها باجماع السلف كذا في الهداية۔ (الهندية۔ الباب الثالث في المياه ج۱ ص۱۹) [2]

ناپاک پانی سے پکی ہوئی چیز کے کھانے اور وضو کی صورت میں اس سے ادا شدہ نماز کا حکم

سوال:۔ کنوئیں سے مردہ جانور خواہ گلا سڑا ہُوا ہو یا نہ نکالا جائے تو گرنے کے وقت سے لاعلمی کی بناء پر وہ پانی وضو یا غسل کے لیے استعمال ہُوا ہے اور اس سے جو کپڑے اور برتن وغیرہ دھوئے گئے ہوں یا آٹا گوندا گیا ہو، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

---

[1] قال محمد عبد الحيؒ۔ وذكر القهستاني في جامع الرموز نقلاً عن الجواهر لو وقع فيها عصفور فعجز واعن اخراجه فمادام فيها فنجسة فيترك مدة يعلم انه استحال وصار حمأة وقيل مدة ستة اشهر انتهى وهذا ايضاً يفيد انه لابد من اخراج عين النجس فاذا تعذر فيترك الى ان يستحيل۔ (السعاية ج ۱ ص۴۲۶ فصل في البئر)

[2] قال ابن عابدينؒ: (قوله ينزح كل مائها) اى دون الطين لورود الآثار بنزح الماء (وبعد اسطر) (يطهر الكل) اى من الدلو والرشاء والبكرة۔ (ردّ المحتار على الدر المختار، فصل في البئر ج ۱ ص۲۱۲) ومثله في مراقي الفلاح فصل في مسائل البئر ص۲۲۔

الجواب: کنوئیں میں نجاست مل جائے اور اس کا وقتِ وقوع معلوم نہ ہو تو علمِ وقوع سے قبل اگر اس کنوئیں کے پانی سے وضو کیا گیا ہو یا پاک کپڑے دھوئے گئے ہوں تو بالاجماع کسی چیز کا کا اعادہ نہیں، اور اگر حالتِ حدث میں وضو یا غسل کیا گیا ہو یا نجس کپڑے دھوئے گئے ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اگر حیوان (نجاست) گلا سڑا ہو تو تین دن ورات کی جملہ نمازوں کا اعادہ ضروری ہے، اِسی طرح ان دنوں کے دوران جو کپڑے یا برتن دھوئے گئے ہوں تو ان کا دوبارہ دھونا لازمی ہے اور جو آٹا گوندھا گیا ہو اگر وہ موجود ہو تو کسی حیوان کو کھلا دیں۔ اور صاحبین کے ہاں کسی چیز کا اعادہ نہیں بلکہ جس وقت اس کا علم ہوا اُسی وقت سے اس کی نجاست کا اعتبار ہوگا۔ بعض علماً نے صاحبین کے قول کو راجح کر کے اُسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن اکثریت نے امام صاحبؒ کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے، تاہم اگر صحراء وغیرہ ہو اور اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہو تو پھر صاحبینؒ کی رائے کو اپنانا بھی درست ہے۔

لما قال شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحداد: اذا وجد فی البئر فارۃ میتۃ اوغیرھا .... ولا یدرون متی وقعت ولم تنتفخ ولم تتفسخ اعادوا صلوۃ یوم ولیلۃ وان کانت قد انتفخت او تفسخت اعادوا صلوۃ ثلٰثۃ ایام ولیالیھا فی قول ابی حنیفۃؒ (اذا کانوا توضؤا منھا) ای وھو محدثون وغسلوا کل شیئ اصابہ ماؤھا ای غسلوا ثیابھم من نجاسۃ اما ان توضؤا منھا وھو متوضئون او غسلوا ثیابھم من غیر نجاسۃ فانھم لا یعیدون اجماعًا..... وقال ابویوسفؒ ومحمدؒ لیس علیھم شیئ حتی یتحققوا متی وقعت۔
(الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۲۰ فصل فی البئر)

قال ابن عابدینؒ: (قولہ قیل وبہ یفتی) قائلہ صاحب الجوھرۃ وقال العلامۃ قاسم فی تصحیح القدوری، قال فی فتاوی العتابی قولھما ھو المختار قلت: لم یوافق علی ذلک، فقد اعتمد قول الامام البرھانی والنسفی والموصلی وصدر الشریعۃ، ورجح دلیلہ فی جمیع المصنفات۔
(رد المختار ج ۱ ص۲۱۹ مطلب مھم فی تعریف الاستحسان) [1]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: اعلم ان البئر تنجس من وقت وقوع الحیوان الذی وجد میتًا فیھا
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

باب الحوض

(حوض کے مسائل و احکام)

دَہ در دَہ سے کم تالاب کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں چھوٹے چھوٹے حوض بنائے جاتے ہیں، پانی کی روانگی کے وقت تو کوئی مسئلہ نہیں رہتا لیکن جب پانی جاری نہ ہو تو ایسے حوض (تالاب) سے وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟ خاص کر اس وقت جبکہ حوض کے ایک جانب کتوں یا دوسرے حیوانات کی نجاست پڑی ہو۔

الجواب:۔ جو حوض دَہ در دَہ سے کم مقدار کا ہو تو صرف نجاست گرنے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے، اور جو حوض دَہ در دَہ یا اس سے زیادہ مقدار کا ہو تو جب تک پانی کے اوصاف تبدیل نہ ہوئے ہوں نفسِ نجاست گرنا ناپاکی کا سبب نہیں بنتا۔ لہٰذا مسئولہ حوض اگر دَہ در دَہ سے کم ہو اور اس میں نجاست پڑی ہوئی ہو تو پانی کے نجس ہونے کی بناء پر اس سے وضو کرنا جائز

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

ان علم ذٰلك الوقت وان لم يعلم فقد صار الماء مشكوكًا فى طهارته ونجاسته فاذا توضؤا منها وهم متوضؤن اوغسلوا ثيابهم من غير نجاسة فانهم لا يعيدون اجماعًا لان الطهارة لا تبطل بالشك وان توضؤا منها وهم محدثون او اغتسلوا من جنابة اوغسلوا ثيابهم عن نجاسة...... فى الاول والثانى خلاف فعند ابى حنيفة التفصيل المذكور فى الكتاب وقالا يحكم بنجاسته وقت العلم بها ولا يلزمهم اعادة شئ من الصلوٰة ولا غسل ما اصابه ماؤها قبل العلم وهو القياس لان اليقين لا يزول بالشك۔ (البحر الرائق۔ كتاب الطهارة ج ۱ ص۱۲۳)

وقال (بعد اسطر) فى تصحيح الشيخ القاسم وفى فتاوٰى العتابى المختار قولهما قلت هو المخالف لعامة الكتب فقد رجح دليله فى كثير من الكتب وقالوا انه الاحتياط فكان العمل عليه وذكر الاسبيجابى ان ما عجن به قال بعضهم يلقى الى الكلاب وقال بعضهم يعلف المواشى۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۱۲۵ كتاب الطهارة)

ومثله فى السعاية ج ۱ ص۴۳۸، ۴۳۹ كتاب الطهارة فى احكام الآسار۔

نہیں، البتہ جاری ہونے کی صورت میں دَہ دردَہ سے کم حوض بھی نجس نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة عبد الله بن محمود الموودود والماء الراكد اذا وقعت فيه نجاسة لا يجوز به الوضوء الا ان يكون عشرة اذرع فى عشرة ۔
(الاختيار لتعليل المختار ج ا ص۱۴ حكم الماء الراكد ان وقعت فيه نجاسة) [1]

گول حوض کا حکم

سوال:۔ طول وعرض کی مقدار بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوض کا مستطیل یا مربع ہونا ضروری ہے، لیکن بسا اوقات حوض گول ہوتا ہے تو کیا چالیس گز گولائی والے حوض کو حوضِ کبیر کہا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ حوض کا مستطیل یا مربع ہونا ضروری نہیں، طہارت کا دار ومدار پانی کی کثرت پر ہے لہٰذا گول حوض ہونے کے باوجود جب دَہ در دَہ جتنا رقبہ بنتا ہو تو یہ ماءِ جاری کے حکم میں ہوگا۔

قال ابن عابدينؒ: (قوله اى فى المربع) اشار الى ان المراد من اعتبار العشر فى العشر ما يكون وجهه مائة ذراع سواء كان مربعاً وهو ما يكون كل جانب من جوانبه عشرة وحول الماء اربعون ووجهه مائة او كان مدوراً او مثلثاً۔
(رد المحتار على الدر المختار۔ باب المياه ج ا ص۱۴۲) [2]

متفاوت کناروں والے حوض کا حکم

سوال:۔ اگر حوض کی لمبائی اور چوڑائی متفاوت ہو، پھر بھی اوسط رقبہ دَہ در دَہ سے زیادہ ہو تو

---

[1] قال العلامة ابراهيم الحلبىؒ: والماء الراكد الاصل عندنا ان الماء القليل ما لم يكن عشراً فى عشر ينجس بوقوع النجاسة فيه وان لم يظهر فيه اثرها من لون ونحوه۔ (كبيرى ص۹۴، فصل فى احكام الحياض) ومثله فى خلاصة الفتاوىٰ ج ا ص۴ احكام الحياض۔

[2] قال ابن نجيمؒ: فان كان الحوض مدوراً ففى الظهيرية يعتبر ستة وثلاثون وهو الصحيح وهو مبرهن عند الحساب ... وفى الخلاصة وصورة الحوض الكبير المقدر بعشرة فى عشرة ان يكون من كل جانب من جوانب الحوض عشرة وحول الماء اربعون ذراعاً۔ (البحر الرائق۔ كتاب الطهارة ج ا ص۷۷)

کیا اس کو حوضِ کبیر کے حکم میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ حوضِ کبیر کے ماءِ جاری کے حکم میں ہونے کا دار و مدار تناسبِ اطراف پر نہیں بلکہ پانی کی کثرت پر ہے، اگر اوسط رقبہ دَہ در دَہ سے زیادہ بنتا ہو اور مبتلیٰ بہ کی رائے میں پانی زیادہ ہو تو پھر طول اور عرض متفاوت ہونے کے باوجود یہ حوض دَہ در دَہ کے حکم میں ہو کر ماءِ جاری کے حکم میں رہ جائے گا۔

قال الحصکفیؒ: ولو لہ طول لاعرض لکنہ یبلغ عشراً فی عشرٍ جاز تیسراً۔ قال ابن عابدینؒ: (قولہ تیسراً) ای جاز الوضوء منہ بناءً علیٰ نجاسۃ الماء المستعمل اَوِ المراد جاز وان وقعت فیہ نجاسۃ، وھذا احد قولین، وھو المختار۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار۔ باب المیاہ ج ۱ ص۱۹۳) لہ

بڑے حوض سے وضو کا حکم

سوال:۔ ایک بڑا حوض ہونے کی صورت میں اگر وضو کرتے وقت ماءِ مستعمل کے کچھ قطرے گرتے رہیں اور پانی نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہ ہو تو کیا اس حوض سے وضو کرنا درست ہے؟

الجواب:۔ بڑے حوض میں جب تک پانی کے اوصاف یعنی رنگ، ذائقہ اور بُو متغیر نہ ہو تو ماءِ مستعمل کے قطرے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا، از روئے شرع ایسا پانی پاک ہے اس سے وضو اور غسل دونوں جائز ہیں۔

قال الحصکفیؒ: وکذا یجوز براکد کثیر کذلک ای وقع فیہ نجس لم یر اثرہ ولو فی موضع وقوع المرئیۃ، بہ یفتٰی بحر۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمختار باب المیاہ ج ۱ ص۱۹۰،۱۹۱) لہ

لہ قال ابن نجیمؒ: فان کان الحوض مدوراً ففی الظہیریۃ یعتبر ستۃ وثلاثون وھو الصحیح وھو مبرھن عند الحساب وفی الخلاصۃ وصورۃ الحوض الکبیر المقدر بعشرۃ فی عشرۃ ان یکون من کل جانب من جوانب الحوض عشرۃ وحولہ اربعون ذراعًا۔ (البحرالرائق۔ کتاب الطہارۃ ج ۱ ص۷۶)

لہ قال ابن نجیمؒ: (قولہ والا فھو کالجاری) ای وان یکن عشراً فی عشر فھو کالجاری فلا یتنجس الا اذا تغیر احد اوصافہ ثم فی قولہ کالجاری اشارۃ الی انہ لا یتنجس موضع الوقوع۔ (البحرالرائق کتاب الطہارۃ ج ۱ ص۸۲) ومثلہ فی الھندیۃ۔ الباب الثالث فی المیاہ ج ۱ ص۱۸۔

زیادہ پانی تغیرِ اوصاف کے بغیر پاک ہے

سوال:۔ اگر بڑا حوض جس کی مقدار عَشْرٌ فِیْ عَشْرٍ سے زیادہ ہو، گوبر یا بول و براز واقع ہونے سے اس کے پانی پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ واضح ہو کہ پانی خواہ حقیقتاً جاری ہو یا حکماً، اس میں نجاست واقع ہونے کی صورت میں تغیرِ اوصاف کے بغیر پانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن یہ بھی واضح ہو کہ دَہ دَر دَہ کو حوض ماء جاری کے حکم میں ہونا احناف کے مذہب میں ایک روایت ہے جو امام ابوحنیفہؒ سے منقول نہیں، لیکن زمانہ حال میں جہل کی بناء پر فقہاء کرام دَہ در دَہ پر فتویٰ دیتے ہیں۔

قال العلامہ طاهر بن عبد الرشیدؒ: النجاسة إذا وقعت فی حوض ان کان کبیراً فهو بمنزلة البحر لا یتنجس الا ان یتغیر طعمه او لونه او ریحه.... قال (بعد اسطر) الحوض الکبیر مقدر بعشرة اذرع فی عشرة اذرع وعلیه الفتوی۔

(خلاصة الفتاوی۔ کتاب الطهارة ج۱ ص۳) [1]

نہر میں گندگی ڈالنے کی صورت میں پانی کا حکم

سوال:۔ بڑی بڑی نہریں آبادیوں کے قریب سے گذرتی ہیں تو لوگ عموماً اس میں نجاست اور گندگی پھینکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ گاؤں سے بیت الخلاء کا پانی بھی انہی نہروں میں شامل ہوتا ہے، بسا اوقات نجاسات کے ڈھیر تک پانی میں نظر آتے ہیں تو ایسی نہروں کے پانی سے وضو اور غسل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نہروں کا پانی جاری ہے اور جاری پانی میں جب تک اوصاف متغیر نہ ہوں یعنی رنگ، ذائقہ اور بو میں فرق نہ آیا ہو تو نجاست کے وقوع سے پانی ناپاک نہیں ہوتا، ایسی بڑی نہروں میں عموماً نجاست مغلوب ہوجاتی ہے اور پانی میں اس کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا، اس لیے نہروں کا پانی پاک ہے اس سے وضو اور غسل جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویجوز بجار وقعت فیه نجاسة والجاری هو ما یعد جاریاً عرفاً....

---

[1] والتقدیر بعشر فی عشر هو المفتی به وذکر السید احمد الطحطاوی فی تحت (قوله هو المفتی به) هو قول عامة المشائخ خانیة وهو قول الاکثر وبه نأخذ نوازل وعلیه الفتوی۔

(الطحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۲۱ بحث اقسام المیاه) ومثله فی الهندیة۔ الباب الثالث فی المیاه ج۱ ص۱۸

ان لم یرای یعلم اثرہ فلوفیہ جیفۃ او بال فیہ رجال فتوضأ اٰخر من اسفلہ جاز مالم یرفی الجریۃ اثرہ وھو اما طعم اولون اوریح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار باب المیاہ ج ۱ ص ۱۸۷) [1]

باب التیمّم

(تیمّم کے احکام ومسائل)

تیمّم کی نیّت

سوال: تیمّم کی نیت کیسے کرنی چاہیئے؟ اگر عربی کی نیّت انسان کو یاد نہ ہو مادری زبان میں نیّت کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز عربی میں نیّت کے الفاظ کیا ہیں؟

الجواب: تیمّم کی نیّت دل کے ارادہ سے عبارت ہے، اگر دل میں ارادہ ہو تو یہ نیّت صحتِ تیمّم کے لیے کافی ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ زبان سے بھی نیّت کی جائے، اگر عربی میں نیّت یاد نہ ہو تو اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کرے، البتّہ عربی میں نیّت یوں ہے "نویت ان أتیمم لرفع الحدث ولاستباحۃ الصّلوٰۃ" لیکن نیّت پر تلفّظ کرتے وقت متعلقہ فعل کا دل سے ارادہ کرنا ہوگا تاکہ زبان اور دل کے ارادہ میں یکسانیت رہے۔

قال الحسن بن عمارؒ: وھو لغۃً القصد وشرعًا مسح الوجہ والیدین عن صعید مطھر والقصد شرط لہ۔ (وبعد اسطر) یشترط لصحۃ نیۃ التیمم للصلوٰۃ بہ احد ثلاثۃ اشیاء امانیۃ الطھارۃ من الحدث القائم بہ اونیۃ استباحۃ الصّلوٰۃ اونیۃ عبادۃ مقصودۃ لاتصح بدون طھارۃ۔ (مراقی الفلاح باب التیمم ص ۶۰) [2]

---

[1] قال فی الھندیۃ: وفی النصاب والفتوٰی فی الماء الجاری انہٗ لایتنجس مالم یتغیر طعمہ اولونہ اوریحہ من النجاسۃ کذا فی المضمرات۔ (الھندیۃ۔ الباب الثالث فی المیاہ ج ۱ ص ۱۷) ومثلہ فی البحر الرائق۔ کتاب الطھارت ج ۱ ص ۸۳۔

[2] وفی الھندیۃ: منھا النّیۃ وکیفیتھا ان ینوی عبادۃ مقصودۃ لاتصح الا بالطھارۃ اونیۃ الطھارۃ اواستباحۃ الصّلوٰۃ تقوم مقام ارادۃ الصلوٰۃ۔۔۔الخ (الھندیۃ ج ۱ ص ۲۵، ۲۶ باب التیمّم) ومثلہ فی تبیین الحقائق ج ۱ ص ۳۹، ۴۰، باب التیمم۔

مسجد کی مٹی پر تیمم کا حکم | **سوال**:۔ تیمم کی ضرورت پڑتے پر مسجد کی دیواروں سے تیمم کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد کی دیوار یا فرش پر تیمم کرنا مکروہ ہے کیونکہ تیمم کی صورت میں یہ مٹی حدث کے لیے مزیل ہے، جو مٹی یا پتھر مسجد میں نصب اور قائم ہو وہ واجب التعظیم ہونے کی وجہ سے اس کی طرف ازالۂ حدث کی نسبت بے ادبی کے مترادف ہے، البتہ اگر دیوار یا فرش کی مٹی کسی نے جمع کر کے مسجد کے ایک کونے میں رکھی ہو تو پھر اس پر تیمم جائز ہے کیونکہ مٹی کو اکٹھا کر کے کسی کونے میں رکھنا مسجد سے خارج ہوتے کے معنی میں ہے اور مسجد کی مٹی جب مسجد سے باہر نکالی جائے تو اس کا تقدس اور حرمت باقی نہیں رہتی ۔

قال قاضی خانؒ: ویکرہ مسح الرجل من طین والردغة باُسطوانة المسجد او حائطه وان مسح بتراب فی المسجد ان کان ذٰلك التراب مجموعاً فی ناحیة غیر منبسط لا بأس به وان کان منبسطاً مفروشاً یکره لانه بمنزلة ارض المسجد ۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ۔ فصل فی المسجد ج۱ ص۶۵) [1]

تیمم میں تخلیلِ لحیہ کا حکم | **سوال**:۔ وضو کے وقت داڑھی کا خلال تو ہوتا رہتا ہے لیکن تیمم کے وقت داڑھی کے خلال کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تیمم میں داڑھی کا خلال مسنون ہے تاہم اس کے لیے مستقل ضربہ کی ضرورت نہیں ہے ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الفیض: ویخلل لحیته واصابعه ویحرك الخاتم والقرط کالوضوء والغسل اھ قلت لکن فی الخانیة ان تخلیل الاصابع لا بد منه لیتم الاستیعاب وقال فی البحر لکن نزع الخاتم او تحریکه ام فبقی تخلیل اللحیة من السنن ۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ۔ باب التیمم ج۱ ص۲۳۳)

---

[1] قال العلامة اشرف علی تھانویؒ: "اس وقت روایت نہیں ملی مگر کہیں دیکھا ہے کہ مکروہ ہے"۔ (امداد الفتاوی ج۱ ص۳۹ فصل فی التیمم)

ومثله فی امداد الاحکام ج۱ ص۳۴۳ ۔ آداب المساجد ۔

نمازِ جنازہ کے لیے تیمم | **سوال:**۔ پانی کی موجودگی میں اگر جنازہ فوت ہونے کا خطرہ ہو تو تیمم جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ نماز جس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی تلافی بصورتِ قضاء ممکن نہ ہو اور اس کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کی وجہ سے اس کی ادائیگی کے لیے تیمم کرنا مرخص ہے، لہٰذا نمازِ جنازہ فوت ہونے کے خدشہ کی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے تاہم ولیِ میت اس حکم سے مستثنیٰ ہے اور اس کے لیے وضو کرنا ضروری ہے۔

قال الحصکفیؒ۔ وجاز لخوف فوت صلوٰۃ جنازۃ ای کل تکبیراتھا ولو جنباً۔ او فوت عید بفراغ إمام اوزوال شمس۔

قال ابن عابدینؒ (قوله وجاز لخوف فوت صلوٰۃ جنازۃ) ای لو کان الماء قریباً (قوله کل تکبیراتھا) فان کان یرجوان یدرک البعض لا یتیمم لانه یمکنه اداء الباقی وحده۔ بحر عن البدائع والقنیة۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار باب التیمم ج۱ ص۲۴۱) [1]

تلاوتِ قرآن کیلئے تیمم جائز ہے | **سوال:**۔ کیا تلاوتِ قرآن مجید کے لیے بلا عذر تیمم جائز ہے؟

الجواب:۔ تلاوت کے لیے طہارت شرط نہیں، ہر وہ عبادت جس کے لیے طہارت شرط نہ ہو تو اس کی ادائیگی بلا وضو بھی جائز ہے تاہم اس کے لیے تیمم کرنا مستحب ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صرف سلام کے جواب کے لیے تیمم فرمایا تھا۔

قال محمد عبدالحیؒ: ویتیمم لذکراللہ ولکل خیر ولو السلام قال ابن عمرؓ مر رجل من المهاجرین علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وهو یبول فسلم علیه ولم یرد علیه حتی کاد الرجل یتواری عنه ثم تیمم فرد السلام وقال لم یمنعنی ان ارد علیک السلام الا انی لم اکن علی طهر ففی هذا الحدیث دلالة علی کراهة الکلام وعدم استحباب السلام ورده فی هذا المقام وعلی انه یستحب ان یکون

---

[1] قال فی الهندیة ویجوز التیمم اذا حضرته جنازۃ الولی غیرہ فخاف ان اشتغل بالطهارۃ ان تفوته الصلوٰۃ ولا یجوز للولی وهو الصحیح هکذا فی الهدایة۔ (الهندیة الفصل الثالث فی المتفرقات ج۱ ص۳۱) ومثله فی مختصر القدوری ص۱۵ باب التیمم۔

ذکر اللہ علی الوضوء او التیمم لان السلام اسم من اسماء اللہ تعالیٰ کذا فی المصابیح ونحوہ ای یتیمم ایضاً لمثل ذلک المذکور کمس المصحف وقراءۃ القرآن عنہ او عن ظہر القلب۔ وزیارۃ القبور ودفن المیت والاذان والاقامۃ والدخول فی المسجد اوخروجہ ولو عند وجود الماء صرح بہ فی شرح النقایۃ نقلاً من المبسوط۔ (السعایۃ باب التیمم ج ۱ ص۵۳۲) [1]

صاحب عذر کیلئے خادم نہ ہونے کی صورت میں تیمم کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ پاؤں پر ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے یہ شخص خود وضو کرنے پر قادر نہ ہو تو کیا یہ شخص خدمت کے لئے خادم رکھے گا یا تیمم کرے گا؟

الجواب:۔ اس پر خادم رکھنا ضروری نہیں، جب خادم یا معاون کی کوئی ممکن صورت میسّر ہو تو وضو کرے ورنہ تیمم کر کے نماز پڑھے۔

قال ابن نجیمؒ: او کان لا یجد من یوضئہ ولا یقدر بنفسہ اتفاقاً وان وجد خادماً کعبدہ وولدہ واجیرہ لا یجزیہ التیمم اتفاقاً۔ (البحر الرائق باب التیمم ج ۱ ص۱۴۷) [2]

جنابت کے تیمم پر وضو ٹوٹ جانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا

سوال:۔ جنب اگر کسی عذر کی وجہ سے تیمم کرے اور اسکے بعد وضو ٹوٹ جائے لیکن تا ہنوز غسل پر قادر نہیں تو کیا وضو کے ساتھ ساتھ جنابت کے لیے دوبارہ تیمم کی ضرورت ہوگی یا وہ ایک تیمم کافی ہے؟

الجواب:۔ جب تک عذر باقی ہو تو جنابت کے لیے یہ ایک تیمم کافی ہے، موجب غسل اگر دوبارہ متحقق نہ ہو تو قدرت علی الماء تک جنابت کے لیے دوبارہ تیمم کی ضرورت نہیں، البتہ نواقض وضو کی موجودگی میں وضو باقاعدہ کرنا پڑے گا، تاہم اگر دوبارہ احتلام ہو جائے یا جماع

---

[1] قال العلامۃ محمد یوسف البنوریؒ: ویجوز التیمم مع وجود الماء لما لیس الطہور شرطاً فی فعلہ وحلہ کدخول المسجد للمحدث وکذا النوم او قراءۃ القرآن علی ظہر القلب۔۔۔ الخ (معارف السنن ج ۱ ص۴۹۷ بیان مسئلۃ جواز التیمم مع وجود الماء لما لم یکن الطہور شرطاً۔

[2] قال الحصکفیؒ: او لم یجد ضئہ فان وجد ولو باجرۃ مثل ولہ ذلک لا یتیمم فی ظاہر المذہب۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار باب التیمم ج ۱ ص۲۳۳) ومثلہ فی الھندیۃ باب التیمم ج ۱ ص۲۸۔

کرے تو پھر دوبارہ تیمم ضروری ہوگا۔

قال ابراهيم الحلبيؒ: وان كان الماء يكفى للوضوء ولا يكفى للمعة يتوضأ به ولا ينتقض تيمم الجنابة لان الماء فى حق اللمعة كالمعدوم لعدم كفايته لها۔
(كبيرى۔ باب التيمم ص۸۶) [1]

باب المسح على الخفين

(موزوں پر مسح کے مسائل)

ٹخنوں تک موزوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر موزے مضبوط قسم کے چمڑے سے اس طرح بنائے جائیں کہ ان میں ٹخنے چھپ جائیں تو کیا ایسے موزوں پر مسح جائز ہے؟

الجواب:۔ موزوں پر مسح کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان میں ٹخنے چھپے ہوں بلکہ اگر پنڈلی کا کچھ حصہ بھی چھپ جائے تو بھی مسح کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قال فى الهندية: منها ان يكون الخف مما يمكن قطع السفر به وتتابع المشى عليه ويستر الكعبين وسترما فوقهما ليس بشرط هكذا فى المحيط حتى لولبس خفا لا ساق له يجوز المسح ان كان الكعب مستورا۔
(الفتاوى الهندية الباب الخامس فى المسح على الخفين ج۱ ص۳۲) [2]

جرابوں کے ہوتے ہوئے موزوں پر مسح کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص پہلے سوتی جراب پہن کر اس کے اوپر موزے پہن لے تو کیا ایسی

---

[1] قال فى الهندية: لوكان مع الجنب ما يكفى للوضوء يتيمم ولا يجب التوضوء به الا اذا كان مع الجنابة حدث يوجب الوضوء۔ (الهندية الفصل الثالث فى المتفرقات ج۱ ص۳۰)

[2] قال الحصكفيؒ: شرط مسحه ثلاثة امور الاول كونه ساترا محل فرض غسل القدم مع الكعب۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار باب المسح على الخفين ج۱ ص۲۶۱)

صورت میں ان موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مسح حقیقتاً موزوں پر ہی رہتا ہے، موزوں کے نیچے جراب پہننا کوئی مانع مسح عمل نہیں لہٰذا جرابوں کے ہوتے ہوئے بھی موزوں پر مسح شرعاً مقبول ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت قوله او جرموقیه ولو فوق خفٍّ او لفافة ای سواء کانت ملفوفة علی الرجل تحت الخف او کان مخیطة ملبوسة تحته کما افاده فی شرح المنیة ۔ (ردّ المحتار علی الدر المختار۔ باب المسح علی الخفین ج۱ ص۲۶۸، ۲۶۹) [1]

جرابوں پر مسح کی شرائط

سوال:۔ جرابوں پر مسح کرنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نیلون کی بنی ہوئی جرابوں پر مسح کرتے ہیں، از روئے شرع ایسی صورت میں وضو ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ متواترہ سے موزوں پر مسح کرنا ثابت ہے، موزے عموماً چمڑے کے بنے ہوتے ہیں اس لیے مطلق جراب پر مسح جائز نہیں، البتہ علماء نے جرابوں پر مسح کرنے کیلئے چار شرائط ذکر کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ایسی گاڑھی اور موٹی ہوں جن میں تین میل (بارہ ہزار قدم) بغیر جوتے کے چلنا ممکن ہو۔

(۲) پہننے کے بعد پنڈلیوں پر خود چپکی رہیں اور نیچے نہ گریں۔

(۳) پانی نیچے سے جذب نہ کریں۔

(۴) جرابوں میں دیکھنے سے اندر پاؤں کا کوئی حصہ نظر نہ آئے۔

چونکہ موجودہ نائیلون کی جرابوں میں یہ شرائط نہیں پائی جاتیں اس لیے ان پر مسح کرنا جائز نہیں، ایسی صورت میں وضو ناقص رہے گا۔

قال الحصکفیؒ: او جوربیه ولو من غزل او شعر الثخینین بحیث یمشی فرسخاً

---

[1] قال ابراهیم الحلبیؒ: یعلم منه جواز المسح علی خفٍّ لبس فوق خفٍّ مخیط من کرباس او جوخ او نحوهما مما لا یجوز علیه المسح لان الجرموق اذا کان بدلاً عن الرجل وجعل الخف مع جواز المسح علیه فی حکم العدم فلان یکون الخف بدلاً عن الرجل ویجعل ما لا یجوز المسح علیه فی حکم العدم اولیٰ کما فی اللفافة ۔ (کبیری۔ فصل فی المسح علی الخفین ص۱۱۲) ومثله فی البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج۱ ص۱۸۱)

ویثبت علی الساق بنفسه ولا یریٰ ماتحته ولا یشف الا ان ینفذ الی الخف قدر الفرض۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار۔ باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۲۶۹) ـلـه

بوٹ پر مسح کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایسے بوٹ پہنے ہو کہ جن میں ٹخنے چھپ جائیں اور مضبوطی بھی اس درجہ کی ہو کہ ان میں پھٹن نہ ہو تو کیا ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ واضح رہے کہ ان میں پیدل چلنا بھی تین میل سے زائد ہوسکتا ہو؟

الجواب:۔ ایسے بوٹوں میں جوازِ مسح کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں لہٰذا ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: شرط مسحه ثلاثة امور الاول کونه ساتراً لقدم مع الکعب اویکون نقصانه اقل من الخرق المانع فیجوز علی الزربول لو مشدوداً۔ والثانی کونه مشغولاً بالرجل لیمنع سرایة الحدث۔ الثالث کونه مما یمکن متابعة المشیٔ المعتاد فیه فرسخاً فاکثر ــ قال ابن عابدینؒ: (قوله لو مشدوداً) لان شدة بمنزلة الخیاطة وهو مستمسك بنفسه بعد الشد کالخف المخیط بعضه ببعض فافهم۔ وفی البحر عن المعراج: ویجوز علی الجاروق المشقوق علی ظهر القدم وله ازرار یشدها علیه تسده لانه کغیر المشقوق ...الخ

(ردّ المحتار علی الدر المختار۔ باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۲۶۱ تا ۲۶۳) ـلـه

انگلیوں میں ورم پیدا ہونے سے پاؤں پر مسح

سوال:۔ سردی کے موسم میں بسا اوقات پاؤں میں سوجن پیدا ہوکر انگلیاں متورم ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے پانی کے استعمال سے تکلیف ہوتی ہے، کیا ایسے پاؤں پر مسح

ـلـه قال ابن نجیمؒ: (قوله والجورب المجلد والمنعل والثخین) ای یجوز المسح علی الجورب اذا کان مجلداً او منعلاً اوثخیناً (وبعد اسطر) والثخین ان یقوم علی الساق من غیر شد ولا یسقط ولا یشف وفی التبیین ولا یریٰ ماتحته۔ (البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۱۸۲) ومثله فی خلاصة الفتاوی باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۲۸۔

ـلـه قال ابن نجیمؒ: ویجوز علی الجاروق المشقوق علی ظهر القدم وله ازرار یشده علیه یسده لانه کغیر المشقوق وان ظهر من ظهر القدم شیٔ فهو کخروق الخف۔ (البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۱۸۳) ومثله فی خلاصة الفتاوی۔ باب المسح علی الخفین ج ۱ ص۲۸)

کرنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں اگر ٹھنڈے پانی کے استعمال سے تکلیف ہوتی ہے تو گرم پانی استعمال کرے اور اگر گرم پانی دستیاب نہ ہو یا گرم پانی کا استعمال بھی باعثِ تکلیف ہو تو پھر اس پر مسح کافی ہے گا ۔ تاہم اگر جبیرہ کے نیچے مسح کرنے سے تکلیف نہ ہو تو جلد پر مسح کرے گا، اور اگر جلد پر مسح کرنے سے تکلیف ہوتی ہو یا بیماری بڑھ جانے کا خطرہ ہو تو جبیرہ کے مسح پر اکتفاء ہو سکتا ہے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی شرح الجامع الصغیر لقاضیخان والمسح علی الجبائر علی وجوہ ان کان لا یضرہ غسل ما تحتہ یلزمہ الغسل وان کان یضرہ الغسل بالماء البارد ولا یضرہ الغسل بالماء الحار یلزمہ الغسل بالماء الحار وان کان یضرہ الغسل ولا یضرہ المسح یمسح ما تحت الجبیرۃ ولا یمسح فوقھا۔ (البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج ۱ ص ۱۸۷) [1]

باب الحیض

(حیض کے مسائل واحکام)

حالتِ حیض میں تسبیح پڑھنے کا حکم

سوال:۔ دورانِ حیض ونفاس عورت قرآنِ کریم کی تلاوت تو نہیں کر سکتی، لیکن کیا تسبیحات اور قرآنی دعائیں پڑھ سکتی ہے ؟

الجواب:۔ حالتِ حیض ونفاس میں عورت کے لیے تسبیحات یا دعائیں پڑھنا جائز ہے، البتہ قرآنی ادعیہ بہ نیتِ تلاوت پڑھنا حرام ہے جبکہ دعا کی نیت سے جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یکرہ النظر الیہ ای القرآن لجنب وحائض ونفساء لان الجنابۃ لا تحل العین کما لا تکرہ ادعیۃ ای تحریماً، والا فالوضوء لمطلق الذکر مندوب

---

[1] قال ابراھیم الحلبیؒ: والمسح علی الجبیرۃ علی وجوہ ان کان لا یضرہ غسل ما تحتہ یلزمہ الغسل بالاجماع وان کان یضرہ الغسل ما تحتہ بالماء البارد ولا یضرہ بالماء الحار یلزمہ الغسل بالماء الحار وان کان یضرہ الغسل ولا یضرہ المسح یمسح ما تحت الجبیرۃ ولا یمسح ما فوق الجبیرۃ۔ (صغیری۔ باب المسح ص ۶۵) ومثلہ فی الھندیۃ باب المسح ج ۱ ص ۳۵۔

وترکہ خلاف الاولیٰ وھو مرجع کراھۃ التنزیۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار مطلب یطلق الدعاء علیٰ ما یشمل الثناء ج ۱ ص۱۲۴) ؎۱

حالتِ حیض میں جماع کرنے کا حکم

سوال:۔ ایامِ حیض میں بیوی کے ساتھ جماع کرنے کا کیا حکم ہے؟ جماع کے علاوہ لمس وتقبیل (چومنا) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حائضہ عورت کے ساتھ بنصِ قرآنی جماع حرام اور ناجائز ہے ایسی حالت میں جماع سے احتراز اور اجتناب لازمی ہے۔

لقولہ تعالیٰ: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔

البتہ جماع کے علاوہ لمس وتقبیل یا بوقتِ ضرورت ما فوق الازار استفادہ جائز اور مرخص ہے۔

قال الحصکفیؒ: وقربان ما تحت ازار یعنی ما بین سرۃ ورکبۃ ولو بلا شھوۃ وحل ما عداہ۔

وقال ابن عابدینؒ: تحت قولہ (یعنی ما بین سرۃ ورکبۃ) فیجوز الاستمتاع بالسرۃ وما فوقھا والرکبۃ وتحتھا ولو بلا حائل وکذا بما بینھما بحائل بغیر الوطئ۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ باب الحیض ج ۱ ص۲۹۲) ؎۲

ناقص الخلقت بچے کی ولادت پر نفاس کا حکم

سوال:۔ اگر کسی عورت کا بچہ تام الخلقت نہ ہو، بعض اعضاء بنے ہوں یا اعضاء بالکل نہ ہوں بلکہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہو تو اس ناقص الخلقت یا علقہ کے خروج کے بعد عورت سے جو خون نکلتا ہے اس پر نفاس کا حکم جاری ہو سکتا ہے یا نہیں؟

؎۱ وفی الھندیۃ: ولا یکرہ قرأت القنوت فی ظاھر الروایۃ کذا فی التبیین وعلیہ الفتویٰ کذا فی التجنیس والظھیریۃ ویجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الاذان ونحو ذلک کذا فی السراجیۃ۔ (الھندیۃ۔ الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس ج ۱ ص۳۸)

؎۲ قال العلامۃ ابوبکر بن علی الحدادؒ: حرمۃ الجماع ولہ ان یقبلھا ویضاجعھا ویستمتع بجمیع بدنھا ما خلا ما بین السرۃ والرکبۃ۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۳۵ باب الانجاس)

ومثلہ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۳۹ الفصل الرابع فی احکام الحیض۔

الجواب: اگر حمل گوشت کا ایک ٹکڑا ہو یعنی اعضاء بالکل نہ بنے ہوں اور وہ کسی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اس کے بعد نکلنے والا خون حیض کے حکم میں شمار ہوگا بشرطیکہ مدتِ حیض تک خون جاری رہا ہو، اس سے زائد وقت میں خونِ استحاضہ میں سے شمار ہوگا البتہ اگر اعضاء بنے ہوں تو اس کی پیدائش کے بعد نکلنے والے خون کا حکم نفاس کا ہوگا۔

قال فی الهندية: والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع او ظفر او شعر ولد فتصير به نفساء هكذا فی التبيين وان لم يظهر شئ من خلقه فلا نفاس لها فان امكن جعل المرئی حيضًا يجعل حيضًا والا فهو استحاضة ۔ (الهندية الفصل الثانی فی النفاس ج ۱ ص ۳۷) [1]

ایامِ حیض میں استعمال ہونیوالے کپڑوں کا حکم

سوال: بعض خواتین ایامِ حیض میں استعمال شدہ کرسف (کپڑا) باہر گلی کوچوں میں پھینک دیتی ہیں جس سے انسانی ذہن میں عجیب وغریب قسم کے گندے خیالات پیدا ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسے کپڑے کے بارے میں شریعتِ اسلامی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: غیرت اور حیاء کا یہ تقاضا ہے کہ ایامِ حیض میں استعمال ہونے والا کرسف (کپڑا) دوبارہ استعمال نہ ہوسکتا ہو تو اسے جلا دیا جائے، ایسے کپڑے کو گلی کوچوں میں پھینکنا مناسب نہیں۔

قال العلامة الحصكفی: كل عضو لا يجوز النظر اليه قبل الانفصال لا يجوز بعده كشعر عانته وشعر رأسها وعظم ذراع حرة ميتة وساقها وقلامة ظفر رجلها دون يدها وان النظر الى ملاءة الاجنبية بشهوة حرام ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۷۱ کتاب الکراہیۃ فصل فی النظر) [2]

---

[1] قال الحصكفی: وسقط ظهر بعض خلقه كيد او رجل او اصبع او ظفر او شعر ولد حكمًا فتصير المرأة به نفساء والامة ام ولد فان لم يظهر له شئ فليس بشئ والمرئی حيض ان دام ثلاثًا وتقدمه طهر تام والا استحاضة ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار مطلب احوال السقط ج ۱ ص ۳۰۲) ومثله فی البحر الرائق ۔ باب الحيض ج ۱ ص ۲۱۸

[2] وفی خیر الفتاوی: اگر دھونے کے بعد دوبارہ استعمال نہ ہوسکیں تو جلا دیا جائے۔
(خیر الفتاوی ج ۲ ص ۱۳۹ باب الحیض)

حیض کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی

سوال: حضرت مفتی صاحب! ایک مسئلہ درپیش ہے کہ حیض کی ابتداء کب، کیسے اور کس سے ہوئی جو آج تک جاری و ساری ہے، ازراہِ کرم اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر تفصیلاً روشنی ڈالیں۔

الجواب: حیض ایک مرض ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بناتِ آدمؑ کو مبتلا کیا ہوا ہے، حضرت حواؑ نے گندم یا کسی اور شئے کو جو اُن کے لیے ممنوع تھی کھالیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ حواؑ کو اسی وجہ سے اس مرض میں مبتلاء فرمایا اور آج تک ان کی اولاد میں یہ بیماری چلی آرہی ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وسببه ابتداء ابتلاء الله لحواء لما اکل الشجرة وفی الشامی ای وبقی فی بناتها الی یوم القیامة وما قیل انه اول ما ارسل الحیض علی بنی اسرائیل فقد رده البخاری بقوله وحدیث النبی صلی الله علیه وسلم اکبر وهو ما رواه عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها قالت قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم فی الحیض هذا شیٔ کتبه الله علی بناتِ ادم قال النووی ای انه عام فی جمیع بنات ادم۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۲۸۳ باب الحیض) [1]

دورانِ حیض ہر رنگ کا پانی حیض ہے

سوال: ایامِ حیض میں عورت کو مختلف رنگ کا پانی آتا ہے، کیا یہ سب رنگ حیض ہے یا صرف سرخ رنگ والا خون؟

الجواب: ایامِ حیض میں ہر قسم کا رنگ حیض شمار ہوگا علاوہ سفیدی کے، کیونکہ یہ حیض نہیں بلکہ طہر کی علامت ہے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں مسلمان خواتین اپنے کرسف (وہ کپڑا جو خون کو روکنے کے لیے عورتیں استعمال کرتی ہیں) بھیجا کرتی تھیں، آپ فرماتی تھیں کہ ابھی انتظار کرو حتیٰ کہ سفیدی آجائے۔

لما قال المرغینانیؒ: وما تراه المرأة من الحمرة والصفرة والکدرة حیض حتی تری البیاض خالصاً۔ (الهدایة ج ۱ ص۶۴ باب الحیض) [2]

---

[1] قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: قوله وسببه ابتداء ای السبب فی حصوله اولاً (قوله ابتلاء الله لحواء) فیه رد علی من قال انه اول ما ارسل علی بنی اسرائیل فان الحدیث دال علی عمومه لجمیع بناتِ ادم والحدیث اقوی وهو ما روی عن عائشةؓ قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الحیض هذا شیٔ کتبه الله تعالیٰ علی بناتِ ادم۔ (الطحطاوی حاشیة الدر المختار ج ۱ ص۱۳۶ باب الحیض)

[2] قال الحصکفیؒ: وما تراه من لون ککدرة وتربیة فی مدته المعتادة سوی بیاض خالص۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۲۸۹ باب الحیض)

حائضہ عورتیں اوقاتِ نماز میں ذکر و اذکار کو معمول بنائیں

سوال: حالتِ حیض میں عورت کو نماز پڑھنا تو جائز نہیں کیا ایسی عورت اپنے معمول پر دوام کے لیے اوقاتِ نماز میں مُصلّٰی پر بیٹھ کر تسبیح و تہلیل، ذکر و اذکار کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حائضہ عورت کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ نماز کے اوقات میں وضو کر کے اپنے مصلّٰی پر آ کر بیٹھ جائے اور اتنی دیر تک تسبیح وتحمید، ذکر و اذکار میں مشغول رہے جتنے وقت میں یہ عورت نماز پڑھتی تھی تاکہ معمول میں کوئی فرق نہ آئے۔

قال ابن عابدینؒ: ویستحبّ لها ان تتوضأ لوقت کل صلوٰۃ وتقعد علیٰ مُصلّاها وتسبح وتهلل وتکبر بقدر ادائها کی لا تنسیٰ عادتها وفی روایۃ یکتب لها احسن صلوٰۃ کانت تصلی۔ (ردالمحتار ج۱ ص۲۹۰ باب الحیض)[۱]

حیض کی حالت میں جماع کرنا

سوال: بعض لوگ شرعی احکام سے ناواقف ہوتے ہیں، اُن کو حیض و نفاس کے مسائل معلوم نہیں ہوتے، اس لیے وہ دورانِ حیض اپنی بیویوں سے ہمبستری کر جاتے ہیں، کیا از روئے شرع ان کا یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو شریعت میں اس کی کیا سزا ہے؟

الجواب: حیض کے دوران بیوی سے جماع کرنا بنصِ قرآنی اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کی روشنی میں حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے، اس دوران اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ اگر کوئی شخص غلطی یا عدمِ علم کی وجہ ابتدائی ایام میں ہمبستری کرے تو ایک دینار اور اگر آخری ایام میں ہو تو نصف دینار صدقہ کرنا افضل ہے اور توبہ و استغفار واجب ہے۔

لما قال العلامۃ حسن بن عمارؒ: ویحرم بالحیض والنفاس الجماع والاستمتاع بما

---

[۱] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ویستحب للمرأۃ الحائض اذا دخل علیها وقت الصلوٰۃ ان توضأ وتجلس عند مسجد بیتها۔ وفی السراجیۃ مقدار ما یمکن اداء الصلوٰۃ لو کانت طاهرۃ وتسبح وتهلل کیلا تزول عنها عادۃ العبادۃ۔

(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۱ ص۳۳۲ باب الحیض، نوع فی الاحکام التی تتعلق بالحیض)

ومثلہ فی الهندیۃ ج۱ ص۳۸ الباب السادس فی الدماء المختصۃ بالنساء۔ الفصل الرابع فی احکام الحیض۔

تحت السرة الیٰ تحت الرکبۃ لقولہٖ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ..... وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "لك ما فوق الازار" فان وطئها غیر مستحل له یستحب ان یتصدق بدینار و نصف ویتوب ولا یعود وجزاء فی المبسوط وغیرہ بکفر مستحلہ۔

(مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۱۱۶ باب الحیض) لہ

حالتِ حیض میں تعلیمِ قرآن کا حکم

سوال: آجکل بنات (لڑکیوں) کے مدارس میں مستورات استاذ ہوتی ہیں، تو کیا ان کے لیے حالتِ حیض میں بچیوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ تعلیم ناگزیر ہے!

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں حائضہ کو قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا جائز نہیں لیکن جہاں تلاوت ناگزیر ہو تو وہاں مفتیٰ بہ قول کے اعتبار سے بہ نیتِ تعلیم ہجی سے پڑھنا جائز ہے، اگرچہ امام طحاوی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق نصف آیت بھی پڑھ سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله وقراءة القرآن) ای ولو دون آیة من المرکبات لا المفردات لانه جوز للحائض المعلمة تعلیمه کلمة کلمة کما قدمناه انتهى۔ (رد المحتار جلد ۱ ص۲۹۳) ۲ لہ

حائضہ عورت کیلئے دینی کتابوں کا مطالعہ جائز ہے

سوال: حالتِ حیض میں خواتین دینی کتابوں کا مطالعہ کرسکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب: حالتِ حیض میں قرآنِ کریم کے علاوہ دیگر دینی کتابوں کا مطالعہ شرعاً ممنوع نہیں البتہ

لہ وفی الهندیة: فان جامعها وهو عالم بالتحریم فلیس علیه الا التوبة والاستغفار ویستحب ان یتصدق بدینار او نصف دینار۔ (الهندیة ج۱ ص۳۹ الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۲۹۷ باب الحیض)

۲ لہ قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: قوله وقراءة القرآن) ای یمنع الحیض ومثله الجنابة قراءة قرآن و شمل اطلاقه الآیة وما دونها وهو قول الکرخی وصححه صاحب الهدایة فی التجنیس وقاضیخان فی شرح الجامع الصغیر والولوالجی فی فتواه ومشی علیه المصنف فی المستصفی وقواه فی الکافی ونسبه صاحب البدائع الیٰ عامة المشائخ۔

(طحطاوی حاشیه الدر المختار ج۱ ص۱۵۰ باب الحیض)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج۱ ص۳۳۳ باب الحیض نوع فی الاحکام التی تتعلق بالحیض)

مطالعہ کے لیے بغیر غلاف کے اٹھانا اور اس کی ورق گردانی کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال ابن الهمامؒ: قالوا یکرہ مس کتب التفسیر والفقه والسنن لانها لا تخلوا عن آیات القرآن وهٰذا التعلیل یمنع شروح النحوایضًا۔ (فتح القدیر ج ۱ ص۱۵۰ باب الحیض) لہ

حالتِ حیض میں آیۃ الکرسی پڑھنا

سوال: میں رات کو اکثر خواب میں ڈر جاتی ہوں، ایک صاحب نے مجھے آیۃ الکرسی پڑھنے کو کہا ہے، کیا حالتِ حیض میں مجھے آیۃ الکرسی پڑھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ویسے تو شرعاً حائضہ اور جنب کو قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی آیاتِ قرآنی دعا کی نیت سے پڑھے تو بلا کراہت جائز ہے البتہ تلاوت کی نیت سے نہ پڑھے۔

لما قال ابن عابدینؒ: (وقراءة القرآن بقصده) ای فلو قرأت الفاتحة علی وجه الدعاء او شیئًا من الآیات التی فیها معنی الدعاء ولم ترد القراءة لا بأس به الخ

(رد المحتار ج ۱ ص۲۹۳ باب الحیض) لہ٢

حائضہ عورت کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کا حکم

سوال:۔ حائضہ عورت ایامِ مخصوص میں کھانا وغیرہ پکاتی ہے اور بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے، تو اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کیسا ہے؟ نیز حالتِ حیض میں بچے کو دودھ پلا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام دینِ فطرت ہے، اس میں نہ تو یہودیوں کی طرح اس حالت میں عورتوں کو ایک گندی شے سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے نہ نصاریٰ کی طرح پاک اور سابقہ حالت کے مطابق جان کر استعمال کرنے کا حکم دیا ہے بلکہ جہاں جہاں پرہیز ممکن ہو وہاں منع فرمایا اور جہاں سے لابدی ہو

لہ قال ابن نجیمؒ: قالوا یکرہ مس التفسیر والفقه والسنن لانها لا تخلوا عن آیات القرآن وهٰذا التعلیل یمنع مس شروح النحوایضًا۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۲۰۱ باب الحیض)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج ۱ ص۳۳۳ باب الحیض نوع فی الاحکام التی تتعلق بالحیض۔

٢ لہ قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: (قوله بقصده) اما اذا قرأ علی قصد الثناء او افتتاح امرلا یمنع فی اصح الروایات والتسمیة لا تمنع اتفاقًا اذا کانت علی قصد الثناء او افتتاح امر خلاصة: وفی العیون لابی اللیث ولو قرأ الفاتحة علی سبیل الدعاء او شیئًا من الآیات التی فیها معنی الدعاء ولم یرد به القراءة فلا بأس به۔ (طحطاوی حاشیه الدر المختار ج ۱ ص۱۵۰ باب الحیض)

وہاں کرنے کا حکم دیا ہے، اسلیئے حائضہ کے ہاتھ کی پکی ہوئی اشیاء کے کھانے یا بچے کو دودھ پلانے سے کوئی اور چارہ نہیں، اسلیئے حائضہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یا اس کو اسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا جائز ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد یہ کام کاج کرے۔

لما قال الشیخ السید احمد الطحطاوی رحمہ اللہ: ولہ ان یقبلها ویضاجعها ولا یکرہ طبخها ولا استعمال ما مسته من عجین او ماء او غیرهما۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۱۶ باب الحیض)[1]

آپریشن سے ولادت کے بعد نکلنے والے خون کا حکم

سوال:۔ آجکل بسا اوقات بچے کی ولادت آپریشن کے ذریعے ہوتی ہے، اس کے بعد جو خون آتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ آیا وہ خون نفاس میں شامل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نفاس ہر اُس خون کو کہا جاتا ہے جو بچے کی ولادت کے بعد رحم سے آئے چاہے بچہ معتاد ذریعہ (فطری طریقہ) سے پیدا ہو یا آپریشن کے ذریعے سے۔ اب اگر آنے والا خون رحم سے ہو تو نفاس میں شمار ہوگا اور اگر آپریشن کی جگہ سے خون آتا ہو تو وہ نفاس نہیں، اس میں عورت پر روزہ نماز لازم ہوں گے۔

لما قال الحصکفی رحمہ اللہ: والنفاس لغة ولادة المرأة وشرعًا دم ویخرج من رحم فلو ولدته من سرتها ان سال الدم من الرحم فنفساء والا فذات جرح وان ثبت له احکام الولد عقب ولد او اکثر ولو منقطعًا عضوا عضوا لا اقله۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۲۹۹ باب الحیض)[2]

---

[1] قال الشیخ السید احمد الطحطاوی رحمہ اللہ: ولا یکرہ طبخها ولا استعمال ما مسته من عجین او ماء او غیرهما الا اذا توضأت بقصد القربة كما هو المستحب الخ۔ (طحطاوی حاشیہ الدر المختار ج۱ ص۱۴۹ باب الحیض)

[2] قال الشیخ السید احمد الطحطاوی رحمہ اللہ: قوله فلو ولدته من سرتها) بان كان بها جرح فانشقت وخرج الولد منها (قوله فنفساء) لانه وجد خروج الدم من الرحم عقب الولادة (قوله والا فذات جرح) یعنی لا تعطی حکم النفساء (قوله وان ثبت له احکام الولد) من انقضاء العدة وصیرورة الامة به ام الولد ولو علق الطلاق بولادتها وقع لوجود الشرط۔ (طحطاوی حاشیہ الدر المختار ج۱ ص۱۵۳ باب الحیض)

ومثله فی الهندیة ج۱ ص۳۷ الباب السادس فی الدماء المختصة بالنساء، الفصل الثانی فی النفاس۔

ولادت سے قبل آنے والے خون کا حکم

سوال:- کبھی کبھی کسی عورت کو ولادت سے پہلے خون آنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس خون کا کیا حکم ہے؟ اوراس دوران اس عورت کو نماز وغیرہ احکامات کا بجالانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- نفاس ہر اس خون کو کہا جاتا ہے جو بچہ پیدا ہونے کے بعد آتا ہو اور حیض اس خون کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سبب کے رحم سے آئے، صورتِ مسئولہ میں اس خون پر نہ نفاس کی تعریف صادق آتی ہے اس لیے کہ بچے کی ولادت سے قبل ہے، اور نہ حیض کی، اس لیے کہ رحم کا منہ بچے کی وجہ سے بند ہے، اس لیے یہ خون استحاضہ کا خون ہے، اس دوران ہر قسم کی عبادت جائز ہے۔

قال برهان الدين المرغيناني: والدم الذی تراه الحامل ابتداء او حال ولادتها قبل الولد استحاضة (الهداية ج۱ ص۵۲ کتاب الحيض) [1]

حائضہ عورت سے انتفاع جائز ہے

سوال:- حائضہ عورت کے ساتھ جماع کرنا تو بنصِ قرآن حرام ہے لیکن کیا اس سے مطلقاً انتفاع ناجائز ہے یا کچھ گنجائش ہے؟

الجواب:- اسلام نے حائضہ سے صرف جماع کرنے کو حرام قرار دیا ہے اس کے علاوہ دیگر استمتاع میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ آدمی کے لیے حائضہ سے استمتاع ما فوق السرۃ اور ما تحت الرکبۃ بلا حائل جائز ہے اوراس کے علاوہ سے مع حائل کے جائز ہے۔

لما قال ابن العابدين: تحت قوله يعني ما بين سرة و ركبة) فيجوز الاستمتاع بالسرة وما فوقها والركبة وما تحتها ولو بلا حائل وكذا بما بينهما بحائل بغير الوطء ولو تلطخ دماً. (رد المحتار جلد۱ ص۲۹۲ باب الحيض) [2]

---

[1] وفی الهندية: وكذا ما تراه الحامل ابتداء او حال ولادتها قبل خروج الولد۔ (الهندية ج۱ ص۳۸ الباب السادس فی الدماء المختصة الخ الفصل الثالث فی الاستحاضة۔
وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۱ ص۴۶۵ المبحث الثانی تعريف النفاس ومدته۔

[2] وفی الهندية: وله ان يقبلها ويضاجعها ويستمتع بجميع بدنها ما خلا بين السرة والركبة عند ابی حنيفة وابی يوسف۔ (الهندية ج۱ ص۳۹ الباب السادس۔ الفصل الرابع فی احکام الحيض والنفاس)

انجکشن سے حیض بند کرنے کا حکم

سوال: آجکل ایسے انجکشن ملتے ہیں جن کے لگانے سے خواتین کو حیض آنا بند ہو جاتا ہے خصوصاً حج کے ایام میں خواتین وہ انجکشن لگواتی ہیں، اگر ایک عورت کو حیض آنے کی میعاد مقرر ہو کہ ہر ماہ اس کو حیض آتا ہو اور اس انجکشن کے ذریعے اُس ماہ اُسے خون نہ آئے تو کیا یہ عورت اپنی میعادِ حیض میں جبکہ انجکشن کی وجہ سے خون بند ہے نماز روزہ وغیرہ عبادات کرسکتی ہے نہیں؟

الجواب: حیض کا تعلق اُس خون کو دیکھنے سے ہے جو بلا کسی سبب کے رحم سے آئے، گویا کہ حیض نام ہے خون آنے کا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ خون بذریعہ انجکشن بند ہے اس لیے صرف ایام کو حیض نہیں کہا جائے گا اور نہ اس پر حیض کے احکام جاری ہوں گے، بلکہ اس قسم کی خاتون کو نماز، روزہ، طواف وغیرہ سب کچھ جائز اور لازمی ہے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: یجب ان یعلم بان حکم الحیض والنفاس والاستحاضة لایثبت الا بخروج الدم وظهوره وهذا هو ظاهر مذهب اصحابنا وعلیه عامة المشائخ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۱ ص۳۳ کتاب الحیض، نوع فی بیان انه متی یثبت حکم الحیض) [۱]

پندرہ دن طہر گذرنے سے قبل خون آنے کا حکم

سوال: اگر کسی عورت کو ایک حیض گذر جانے کے دس بارہ دن بعد دوبارہ خون آئے تو کیا یہ خون حیض شمار ہوگا یا نہیں؟ نیز اقل مدتِ طہر کتنے دن ہیں؟

الجواب: فقہ حنفی کی تصریحات کے مطابق اقل مدتِ طہر پندرہ ۱۵ دن ہے، اگر خون پندرہ ۱۵ دن گذر جانے سے قبل شروع ہو جائے اور اس عورت کی کوئی عادت مقرر نہیں تو یہ خون جو پندرہ ۱۵ دن سے قبل آیا ہے پندرہ ۱۵ دن تک استحاضہ شمار ہوگا اور باقی حیض شمار ہوگا۔

لما قال الحصکفیؒ: واقل الطهر بین الحیضتین او النفاس والحیض خمسة عشر یوماً ولیالیها اجماعاً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۲۸۵ باب الحیض) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: اذا رأت المرأة الدم تترك الصلوٰة من اول ما رأت قال الفقیه وبه نأخذ۔ (الهندیة ج۱ ص۳۸ الباب السادس، الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس)

[۲] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ومن جملة ذلك الدم المتخلل فی اقل مدة الطهر ولا یمکن معرفة ذلك الا بعد معرفة اقل الطهر واقله خمسة عشر یوماً عندنا۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۱ ص۳۲۲ کتاب الحیض)

حالتِ جنابت میں کمپیوٹر سے قرآن لکھنے کا حکم

سوال:۔ جنابت کی حالت میں قرآنی آیات کی کتابت بذریعہ ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں قرآنِ کریم کا احترام اصلاً مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ جُنب آدمی کے لیے قرأتِ قرآن (تلاوت کرنا) درست نہیں، اسی طرح فقہاء کرام نے جُنب کے لیے قرآنِ کریم کا لکھنا بھی منع فرمایا ہے۔ چونکہ ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر کے ذریعے حالتِ جنابت میں قرآن لکھنا ہوتا ہے اسلئے درست نہیں، البتہ بے وضو ان جدید ذرائع سے کتابتِ قرآن کی جاسکتی ہے بشرطیکہ قرآنی آیات کو ہاتھ نہ لگے۔

لما فی الهندية: والجنب لا يكتب القرآن وان كانت الصحيفة على الارض ولا يضع يده عليها وان كان ما دون الآية۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۳۹ الفصل الرابع فی احكام الحيض الخ)[۱]

حائضہ عورت پر دم کرنے کا حکم

سوال:۔ حائضہ، نفاس والی عورت یا جُنب آدمی بیمار ہو جائے تو قرآنی آیات پڑھ کر اس کو دم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وظائف یا اوراد کے لیے طہارت شرط نہیں بغیر طہارت کے بھی دم کیا جاسکتا ہے جب دم کرنے والے کا طاہر ہونا ضروری نہیں تو جس پر دم کیا جاتا ہو اس کا طاہر ہونا بدرجہ اولیٰ ضروری نہ ہوگا، لہٰذا حیض ونفاس والی عورت اگرچہ خود پاک نہیں مگر اس پر دم کرنا جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ:۔ ولا بأس لحائض وجنب بقرأة ادعية ومسها وحملها وذكر الله تعالىٰ وتسبيح وزيارة قبور ودخول مصلى عيد۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار جلد ۱ ص۲۹۳ باب الحيض)[۲]

---

[۱] قال السيد احمد الطحطاویؒ: واما كتابت القرآن فلا بأس بها اذا كانت الصحيفة على الارض عند ابی یوسف لانه ليس بحامل للصحيفة وكره ذلك محمدؒ وبه اخذ امشائخ بخاری۔
(الطحطاوی على مراقی الفلاح ص۱۱۵ باب الحيض)

[۲] قال السيد احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله ويحرم قرأة آية من القرآن الا بقصد الذكر) أی أو الثناء أو الدعاء ان اشتملت عليه فلا بأس به فی اصح الروايات قال فی العيون ولو انه قرأ الفاتحة على سبيل الدعاء اوشيئاً من الآيات التی فيها معنى الدعاء ولم يرد به القرآن فلا بأس به۔ (الطحطاوی حاشيه مراقی الفلاح ص۱۱۴ باب الحيض)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۱۹۹ باب الحيض۔

مستحاضہ کا حکم

سوال:۔ بسا اوقات ایک عورت کو مدتِ حیض ونفاس میں زیادہ یا کم خون آتا ہے، اس دوران اس عورت کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ حیض ونفاس کی مدتِ شرعی سے زیادہ یا کم خون آنے کو استحاضہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی عورت پر یہ لازمی ہے کہ مدتِ حیض ونفاس کو پورا کرنے کے بعد غسل کرے اور پھر ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرکے نماز پڑھے، بلکہ اس قسم کی عورت کو ہر وہ کام (مثلاً نماز روزہ وغیرہ) جو حالتِ حیض میں ہونے کی وجہ سے ممنوع ہو چکے تھے کرنے کی اجازت ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: ودم الاستحاضة حکمه کرعاف دائم وقتًا کاملاً لا یمنع صومًا وصلوٰة ولو نفلاً وجماعًا لحدیث توضئ وصلی ان قطر الدم علی الحصیر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۲۹۹ باب الحیض)

وفیه: حکمه الوضوء لا غسل ثوبه ونحوه لکل فرض اللام للوقت..... ثم یصلی به فرضًا ونفلاً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۰۶ باب الحیض) [1]

معذور کی شرعی تعریف

سوال:۔ شریعت میں معذور کی تعریف کیا ہے؟

الجواب:۔ جب کسی مریض کو تمام وقت نماز میں کوئی ایسا وقت نہ ملے جس میں وہ مرض لاحق نہ ہو، ایسا شخص معذور کہلائے گا۔

قال الحصکفیؒ: بان لا یجد فی جمیع وقتها زمنًا یتوضأ و یصلی فیه خالیًا عن الحدث۔ الخ وهذا اشرط العذر فی حق الابتداء وفی حق البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت

---

[1] قال المرغینانیؒ: والمستحاضة ومن به سلس البول والرعاف الدائم والجرح الذی لا یرقا یتوضئون لوقت کل صلوٰة فیصلون بذلك الوضوء فی الوقت ماشاؤ من الفرائض والنوافل۔ (الهدایة علی صدر البنایة ج ۱ ص۶۴۹ باب الحیض)
ومثله فی الهندیة ج ۱ ص۳۹ الباب السادس فی الدماء المختصة بالنساء، الفصل الرابع فی احکام الحیض۔

ولو مرة الخ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۰۵ مطلب فی احکام المعذور) لے

ایسے معذور شخص کا حکم جس کا روئی رکھنے سے پیشاب رک جائے

سوال:۔ اگر ضعفِ مثانہ کی وجہ سے انسان کو قطرے آتے ہوں اور اس کی روک تھام کے لیے روئی رکھی جائے تو کیا اس حالت میں بھی وقت گذر جانے سے وضوء ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ وضو ٹوٹنے کا دارومدار پیشاب کے احلیل تک نکلنے پر ہے، لہٰذا اگر کسی وجہ سے پیشاب کے قطرات کو روکا جائے تو جب تک قطرات احلیل تک نہ پہنچیں تو وضو برقرار رہے گا البتہ جب روئی نکالی جائے اور کرسف تر ہو تو اُسی وقت وضو ٹوٹ جائے گا۔

لما قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: وفی المضمرات عن النصاب به سلس بول فجعل القطنة فی ذکره ومنعه من الخروج وهو یعلم انه لو لم یحش ظهر البول فاخرج القطنة وعلیها بلة فهو محدث ساعة اخراج القطنة فقط وعلیه الفتوی۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۱۹ باب الحیض) ۲ے

لے قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ولا یصیر من ابتلی بناقض معذوراً حتی یستوعبه العذر وقتاً کاملاً لیس فیه انقطاع لعذره بقدر الوضوء والصلوٰة اذ لو وجد لا یکون معذوراً۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۱۹ باب الحیض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۴۱ الباب السادس؛ الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس)

۲ے قال الشیخ عبد الحی الکھنویؒ: اذا خاف الرجل خروج البول فحشی احلیله بقطنة ولولاه یخرج البول فلا بأس به ولا ینتقض وضوءه حتی یظهر البول علی القطنة وان ابتل الطرف الداخل کذلك ما لم یبتل الظاهر منه۔ (السعایة ج۱ ص۲۰۱ باب الحیض)

باب الانجاس

(پلیدیوں اور ناپاکیوں کے بیان میں)

نیند کی حالت میں منہ سے نکلنے والے پانی کا حکم

سوال: میرے منہ سے حالتِ نیند میں بہت پانی نکلتا ہے اور ایسا اوقات وہ پانی میرے کپڑوں پر بھی لگ جاتا ہے، کیا اس سے کپڑے پلید (ناپاک) ہوجائیں گے یا نہیں؟

الجواب: زندہ آدمی کے منہ سے نکلنے والا پانی پاک ہے اگرچہ حالتِ نیند میں پیٹ سے ہی کیوں نہ نکلے، البتہ مردہ شخص کے منہ کا پانی نجس ہے۔ اس لیے خواب میں یا بیداری میں اگر لعابِ دہن یا منہ سے نکلنے والا پانی کپڑوں پر لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہ ہوں گے۔

لما فی الهندیة: لعاب النائم طاهر سواء کان من الفم او متبعثا من الجوف عند ابی حنیفة رحمه الله و محمد رحمه الله وعلیه الفتوی واما لعاب المیّت فقد قیل انه نجس۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۴۶ باب الانجاس)[1]

غسل کرتے وقت پانی کے برتن میں چھینٹے پڑنے سے پانی کا حکم

سوال: غسل کرتے وقت اگر بے احتیاطی سے یا احتیاط کے باوجود ماءِ مستعمل کے کچھ قطرے پانی کے برتن میں پڑ جائیں تو اس سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر پانی کے ان قطرات میں ظاہری نجاست نہ ہو یعنی اس سے نجاستِ ظاہری کا ازالہ نہ ہوا ہو تو تھوڑے تھوڑے قطرے پڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا کیونکہ اس سے بچنا انسان کے بس میں نہیں، تاہم ممکن حد تک احتیاط برتنا چاہیئے۔

قال الحصکفی رحمه الله: وانتضاح غسالة لاتظهر مواقع قطرها فی الاناء عفو۔
وقال ابن عابدین رحمه الله: وفی الفتح وما ترشش علی الغاسل من غسالة المیّت

---

[1] قال الشیخ الدکتور وهبة الزحیلی: عرفنا فی انواع المطهرات فی الآدمی المیت تولین قول الحنفیة انه نجس عملاً بفتوی بعض الصحابة (ابن عباس رضی الله عنه وابن الزبیر رضی الله عنه) کسائر المیتات......
واما الماء السائل من فم النائم وقت النوم فهو طاهر کما صرح الشافعیة والحنابلة۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج ۱ ص ۱۶۶ الآدمی میت ومایسیل من فم النائم)

مما لا یمکنه الامتناع عنه مادام فی علاجه لا ینجسه لعموم البلوی۔
(رد المحتار علی الدر المختار۔ باب الانجاس ج ۱ ص۳۲۵) [1]

پلاسٹک کے برتن پاک کرنے کا طریقہ

سوال:۔ پلاسٹک کے برتن پر اگر گندگی لگ جائے تو اسے پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ از روئے شرع جو برتن جاذب نہ ہو یعنی نجاست جذب نہ کرتا ہو تو اس قسم کے برتن کے ساتھ اگر نجاست لگ جائے تو تین دفعہ پانی ڈال کر دھونے سے برتن پاک ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تثلیثِ غسل کے لیے برتن کا خشک ہونا ضروری نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: ای ما لا یتشرّب النجاسة مما لا ینعصر یطّهر بالغسل ثلاثاً ولو دفعة بلا تجفیف کالخزف والآجر المستعملین کما مرّ وکالسیف والمرآة ومثله ما یتشرب فیه شئ قلیل کالبدن والنعل۔
(رد المحتار علی الدر المختار۔ مطلب فی حکم الوشم ج ۱ ص۳۳۲) [2]

جُنب کے پسینے کا حکم

سوال:۔ اگر جنابت کی حالت میں کچھ وقت گذر جائے اور گرمی کی وجہ سے بدن سے پسینہ نکلے تو اس پسینہ کا کیا حکم ہے؟ کیا اس پسینہ سے کپڑے ناپاک ہوتے ہیں؟

الجواب:۔ انسان کا پسینہ ہر حالت میں پاک ہے، خواہ جُنب ہو یا پاک، اور اس کی تخصیص اسلام کے ساتھ ہے، فقہاء نے جھوٹے (سؤر) اور پسینے کا حکم ایک قرار دیا ہے۔

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ما ترشش علی الغاسل من غسالة المیّت مما لا یمکنه الامتناع عنه ما دام فی علاجه لا ینجسه لعموم البلوی۔ (البحر الرائق۔ باب الانجاس ج ۱ ص۲۳۶) ومثله فی مراقی الفلاح۔ باب الانجاس ص۸۵۔

[2] قال فی الهندیة۔ وما لا ینعصر یطهر بالغسل ثلاث مرّاتٍ والتجفیف فی کل مرة لان للتجفیف اثراً فی استخراج النجاسة وحد التجفیف ان یخلیه حتیٰ ینقطع التقاطر ولا یشترط فیه الیبس هذا اذا تشربت النجاسة کثیراً وان لم یتشرب فیه او تشربت قلیلاً یطهر بالغسل ثلاثاً هکذا فی المحیط۔
(الهندیة۔ الباب السابع فی النجاسة ج ۱ ص۴۲)

البتہ اگر کسی عضو پر ظاہری نجاست ہو اور پسینہ نکلنے سے وہ نجاست کپڑے پر لگ جائے تو اس سے کپڑا ناپاک ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: فسئور ادمی مطلقاً ولو جنباً او کافراً او امرأۃً وماکول اللحم طاھر الفم (طاھر) طھور بلا کراھۃ (ویعد اسطر) وحکم عرق کسئور۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار مطلب فی السئور ج ۱ صـ۲۲۲، صـ۲۲۸) ـلـہ

کپڑے کو منی سے پاک کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر منی کپڑے کے ساتھ لگ جائے تو کیا صرف رگڑنے سے پاک ہوگا یا دھونا بھی ضروری ہے نیز رقیق اور سخت قسم کی منی کے حکم میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا حکم یکساں ہے؟

الجواب:۔ منی سے طہارت کے دو طریقے ہیں، اگر نرم ہو تو دھونے کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں، البتہ اگر سخت اور خشک ہو تو پھر سوکھ جانے کے بعد رگڑ کر اثرات زائل ہونے سے کپڑا پاک ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق کے مطابق یہ حکم غلیظ منی سے خاص ہے اور اگر منی کسی بیماری کی وجہ سے رقیق (پتلی) ہوگئی ہو تو دھونا ضروری ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویطھر منیّ ای محلہ یابس بفرك ولا یضر بقاء اثرہ إن طھر رأس حشفۃ کأن کان مستنجیا بماء وفی المجتبیٰ اولج فنزع فانزل لم یطھر الا بغسلہ لتلوّثہ بالنجس انتھی ای برطوبۃ الفرج فیکون مفرعاً علی قولھما بنجاستھا اما عندہ فھی طاھرۃ کسائر رطوبات البدن جوھرۃ۔ والا یکن یابساً اولا رأسہا طاھر فیغسل کسائر النجاسات ولو دماً عبیطاً علی المشھور بلا فرق بین منیہ ولو رقیقاً لمرض بہ ومنیھا۔ قال ابن عابدینؒ (قولہ ومنیھا) ای منی المرأۃ کما صححہ فی الخانیۃ وھو ظاھر الروایۃ عندنا کما فی مختارات النوازل وجزم فی السراج وغیرہ بخلافہ ورجحہ فی الحلیۃ بما حاصلہ ان کلامھم متظافر علی ان الاکتفاء بالفرك فی المنی استحسان بالاثر علی خلاف القیاس، فلا یلحق بہ الا ما

ـلـہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وعرق کل شیٔ معتبر بسئورہ طھارۃ ونجاسۃ وکراھیۃ۔ (البحر الرائق ج ۱ صـ۱۲۶ باب الانجاس) ومثلہ تبیین الحقائق ج ۱ صـ۳۱ باب الانجاس۔

فی معناہ من کل وجه والنص ورد فی منی الرجل ومنی المرأة یبس مثله لرقته وغلظ منی الرجل والفرك انما یؤثر زوال المفروك او تقلیله وذلك فیما له جرم والرقیق المائع لا یحصل من فرکه هذا الغرض فیدخل منی المرأة اذا کان غلیظاً ویخرج منی الرجل اذا کان رقیقاً لعارض۔ (رد المحتار علی الدر المختار باب الانجاس ج ۱ ص ۳۱۳،۳۱۲) [۱]

منی، مذی اور ودی سے طہارت کا حکم

سوال:۔ کیا منی، مذی اور ودی سے کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے کہ اس کو پانی سے دھویا جائے یا اس میں کوئی فرق بھی ہے؟

الجواب:۔ ودی اور مذی سے طہارۃ صرف پانی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے البتہ منی کے طریقہ طہارت میں یہ بھی ہے کہ خشک ہونے پر رگڑنے سے بھی کپڑا پاک ہو سکتا ہے بشرطیکہ منی رقیق نہ ہو ورنہ پانی سے دھونا ضروری ہے۔

قال طاهر بن عبد الرشیدؒ۔ اذا احت النجاسة لم یجز الا فی المنی الیابس فان کان رطباً لا یطهر الا بالغسل وهو نجس عندنا (وبعد اسطر) ولکن هذا اذا لم یخرج المذی قبل خروج المنی اما اذا خرج المذی ثم خرج المنی لا یطهر الثوب بالفرك۔

(خلاصة الفتاوی۔ الفصل السادس فی غسل الثوب والدهن ج ۱ ص ۴۱) [۲]

دجاجۂ مخلّاة کا جھوٹا

سوال:۔ گلیوں اور غلاظتوں میں گھومنے پھرنے والی مرغی اگر پانی سے بھرے ہوئے برتن میں چونچ ڈال دے تو اس پانی کا کیا حکم ہے؟ کیا پالتو مرغی جو کہ پنجرہ اور ڈربہ میں بند ہو اور باہر پھرنے والی مرغی کا حکم ایک ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

---

[۱] وفی الهندیة: (ومنها) الفرك فی المنی اذا اصاب الثوب فان کان رطباً یجب غسله وان جف علی الثوب اجزأ فیه الفرك استحساناً۔ (الهندیة۔ الباب السابع فی النجاسة ج ۱ ص ۴۴)

[۲] قال ابراهیم الحلبیؒ۔ واما الفرك فیزیل النجاسة فی المنی فیطهر الثوب من المنی به ای بالفرك اذا یبس المنی علی الثوب۔ (کبیری۔ فصل فی الاسار ص ۱۸۰)

الجواب:۔ سئور یعنی جھوٹا ہمیشہ کے لیے گوشت کا تابع رہتا ہے، جس جیوان کا گوشت حلال ہو تو اس کے لعاب کا پانی سے ملنے کی صورت میں پانی پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا اگر پالتو مرغی کی چونچ غلاظت سے پاک ہو اور جس برتن میں مرغی منہ ڈال دے یہ پانی پاک ہے البتہ گلی میں پھرنے والی مرغی کا منہ عموماً نجاست سے خالی نہیں ہوتا اس لیے ایسی مرغی کا جھوٹا مشکوک ہے لیکن نجاست پہ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

قال حسن بن عمارؒ: وسئورا لدجاجة المخلاة التی تجول فی القاذورات ولم یعلم طہارة منقارها من نجاسة فکره سئورها للشك فان لم یکن کذلك فلا کراهة فیه۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۲ فصل فی احکام السئور) لـه

کُتے کی کھال قابلِ دباغت ہے

سوال:۔ کیا کُتے کا چمڑا دباغت سے پاک ہو جائے گا یا نہیں؟ جبکہ فقہ کی عام کتابوں میں چمڑوں کی طہارت کا طریقہ دباغت لکھا ہے؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک کُتا نجس العین نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے، البتہ حشرات الارض سانپ، بچھو، خنزیر کا چمڑا قابلِ دباغت نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: وکل اهاب دبغ ولو بشمس وهو یحتملها طهر فیصلی به ویتوضأ منه وما لا یحتملها (فلا وعلیه) فلا یطهر جلد حیة وفارة خلا جلد خنزیر فلا یطهر (و بعد اسطر) وافاد کلامه طهارة جلد کلب وقیل وهو المعتمد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار۔ مطلب فی احکام الدباغة ج۱ ص۲۰۴) ـ۲ـه

لـه قال ابن عابدینؒ: واما المخلاة فلعابها طاهر فسئورها کذلك، لکن لما کانت تأکل العذرة کره سئورها ولم یحکم بنجاسة للشك حتی لو علمت النجاسة فی فمها تنجس ولو علمت الطهارة انتفت الکراهة۔

(رد المحتار علی الدر المختار۔ باب المیاه ج۱ ص۲۲۳) ومثله فی البحر الرائق۔ مسئلة السئور ج۱ ص۱۳۲۔

ـ۲ـه قال حسن بن عمارؒ: ویطهر جلد الکلب لانه لیس نجس العین فی الصحیح بالدباغة۔ (مراقی الفلاح۔ فصل یطهر جلد المیتة ص۹۰) وَمِثْلُهٗ فی کبیری۔ فصل فی النجاسة الحقیقیة ص۱۷۷

کُتے کے جُھوٹے (سُور) برتن میں کھانے اور اسکے پاک کرنے کا طریقہ

سوال:۔ بعض لوگ گھروں میں عمُوماً کُتے پالتے ہیں، کبھی کبھی کُتے اچانک کھانے پینے کے کسی برتن میں منہ ڈال دیتے ہیں، ایسے برتن میں کھانے پینے کا کیا حکم ہے اور اس کے پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ کُتے کا جھوٹا نجاستِ غلیظہ کے حکم میں ہے لہٰذا جس برتن میں کتا منہ ڈالے تو یہ برتن اگر جاذب نہ ہو تو تین دفعہ دھونے سے پاک ہوگا اور اگر جاذب ہو تو پھر ہر دفعہ کے لیے خشک کرنا (یعنی اتنا انتظار کرنا کہ پانی ٹپکنا بند ہوجائے) ضروری ہے۔

قال حسن بن عمارؒ: والقسم الثانی سؤر نجس نجاسة غلیظة وقیل خفیفة لایجوز استعماله ای لا یصح التطهیر به بحال ولا یشربه الا مضطر کالمیتة وهوای السؤر النجس ما شرب منه الکلب سواء فیه کلب صید اوماشیة وغیره لما روی الدار قطنی عن ابی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الکلب ولغ فی الاناء انه یغسل ثلاثا اوخمسا او سبعا۔

قال الشیخ احمدؒ: انه یغسل ثلاثا۔۔۔الخ وماذاك الا لنجاسته ویندب عندنا التسبیع وکون احداهن بالتراب۔ (طحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۲۳ فصل فی بیان احکام السؤر)[1]

نجس کپڑا دھونے کے بعد نچوڑنے کا حکم

سوال:۔ نجس کپڑا دھونے کے بعد کتنی بار نچوڑنا ضروری ہے؟ کیا طہارت کا دارومدار نچوڑنے پر ہے؟

الجواب:۔ کپڑے کے ساتھ اگر نجاستِ مرئیہ لگ جائے تو عین نجاست زائل ہونے سے کپڑا پاک ہوگا اس کو نچوڑنا ضروری نہیں، البتہ اگر نجاست غیر مرئیہ ہو تو طہارت کا دارومدار غلبۂ ظن پر ہے، تین بار نچوڑنے سے عموماً طہارت کا یقین ہوجاتا ہے اس لیے تین دفعہ نچوڑنے کے بعد کپڑا پاک متصور ہوگا، تاہم واضح ہو کہ آخری بار نچوڑنا مضبوط طریقہ سے ہو

---

[1] قال محمد عبد الحیؒ: وقول خامس ذهب الیه اصحابنا الحنفیة من عدم وجوب التسبیع والتثمان مع نجاسة السؤر وکفایة الثلاث کسائر النجاسات۔ (السعایة۔ سؤر الکلب ج۱ ص۴۲۹) ومثله فی الهندیة الفصل الثانی فیما لا یجوز به التوضوء ج۱ ص۲۴۔

قال ابراهیم الحلبیؒ: اما اذا اصابت الثوب نجاسة هذا شروع فی کیفیة تطهیر النجاسة بالغسل فان النجاسة اما ان تکون مرئیة او غیر مرئیة فان کانت مرئیة فطهارته زوال عینها الا ما یشق زوالہ بعد السعی وان لم تکن النجاسة مرئیة یغسلها حتی یغلب علی ظنه انه قد طهر وهذا اذا لم یکن لها ریح فان کان یجب الغسل الی زواله الا ما یشق وقیل اذا غسل الثوب من غیره مرةً وعصر بالمبالغة یطهر وقیل انه لا یطهر ما لم یغسل ثلاث مرات یعصر فی کل مرة والفتوی علی الاول۔ (کبیری۔ فصل فی الاسآر ص۲۱۱،۲۱۲) [1]

غیر ملکی کپڑوں سے (بغیر دھوئے) نماز پڑھنا

سوال:۔ آجکل بازاروں میں غیر ملکی مستعمل کپڑے مثلاً سویٹر، کوٹ وغیرہ فروخت ہوتے ہیں، بظاہر ان پر کوئی نجاست نظر نہیں آتی لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ پاک ہوں گے یا نہیں؟ کیا ایسے کپڑوں کا بغیر دھوئے نماز کے لیے استعمال جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر بظاہر نجاست نہ ہو اور غلبۂ ظن یہ ہو کہ اس میں نجاست نہیں تو یہ کپڑے پاک ہیں اور انہیں پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ دھونا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ومن هٰنا قالوا لا بأس بلبس ثیاب اهل الذمة والصلوٰة فیها الا الازار والسراویل فإنه تکره الصلوٰة فیها لقربها من موضع الحدث ونحوه، لان الاصل الطهارة، وللتوارث بین المسلمین فی الصلوٰة بثیاب الغنائم قبل الغسل، وتمامه فی الحلیة۔ (ردّ المحتار علی الدّر المختار۔ احکام الدباغة ج۱ ص۲۰۵،۲۰۶) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: وکذا یطهر محل نجاسة مرئیة بقلعها ای بزوال عینها واثرها ولو بمرة او بما فوق ثلاث فی الاصح ولا یضر بقاء اثر۔ ویطهر محل غیرها ای غیر المرئیة بغلبة ظن غاسل طهارة محلها بلا عدد وبه یفتی وقدر ذلک لموسوس بغسل وعصر ثلاثا۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار۔ مطلب فی حکم الوشم ج۱ ص۳۲۸،۳۳۱) وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی۔ الفصل السّادس فی غسل الثوب والدهن ج۱ ص۴۰۔

[2] قال الحصکفیؒ: ثیاب الفسقة واهل الذمة طاهرة۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار۔ فصل فی الاستنجاء ج۱ ص۳۵۰)

موٹے کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ | **سوال**:۔ موٹے کپڑے کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ خاص کر جب نچوڑنا ممکن نہ ہو؟

الجواب:۔ ایسے کپڑے پر اگر نجاست دکھائی دے تو نجاست کے ازالہ سے کپڑا پاک ہوگا اور اگر نجاست غیر مرئی ہو تو کپڑے کی طہارت دھونے والے کے غلبۂ ظن پر مبنی ہے، اور اگر کوئی شخص غلبۂ ظن کا ادراک نہیں کر سکتا تو تین بار دھوئے اور ہر دفعہ دھونے میں اتنی تاخیر کرے کہ پانی کے قطرات بند ہوجائیں تب کپڑا پاک ہوگا۔ علاوہ ازیں کسی بڑے حوض یا جاری پانی میں ڈبو کر کچھ وقت گذرنے کے بعد پانی سے نکالنے پر بھی پاک متصور ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: ویطھر محل غیرھا ای غیر مرئیۃ بغلبۃ ظن غاسل لو مکلفاً والا فمستعمل طھارۃ محلھا بلاعدد بہ یفتی وقدر ذٰلک لموسوس بغسل وعصر ثلاثاً اوسبعاً فیما ینعصر مبالغاً بحیث لایقطر ولو کان لو عصرہ غیرہ قطر طھر بالنسبۃ الیہ دون ذٰلک الغیر ولو لم یبالغ لرقتہ ھل یطھر الاظھر نعم للضرورۃ وقدر بتثلیث جفاف ای انقطاع تقاطر فی غیرہ ای غیر منعصر مما یتشرب النجاسۃ والا فبقلعھا کما مر وھٰذا کلہ اذا غسل فی اجانۃ اما لو غسل فی غدیر او صب علیہ ماء کثیرا وجری علیہ الماء طھر مطلقاً بلا شرط عصر وتجفیف وتکرار غمس ھو المختار۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار باب الانجاس ج ا ص۳۳۱ تا ۳۳۳)[1]

ڈرائی کلینر سے کپڑے پاک ہونے کا حکم | **سوال**:۔ ڈرائی کلینر کے ذریعے کپڑے پٹرول سے پاک کیے جاتے ہیں لیکن اس میں کپڑا نچوڑنا نہیں ہوتا بلکہ حرارت سے کپڑا سوکھ جاتا ہے، کیا اس طریقہ سے دھوئے ہوئے کپڑے سے نماز جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر کپڑا پاک ہو صرف میل کچیل ڈرائی کلینر کے ذریعہ دور کی گئی ہو تو اس سے کپڑے کی طہارت متاثر نہیں ہوتی تاہم یہ ضروری ہے کہ مائع چیزیں اس کے ساتھ ناپاک کپڑا

---

[1] قال ابراھیم الحلبیؒ: وفی فتاوٰی ابی اللیث خف بطانۃ ساقہ من الکرباس فدخل فی جوفہ ماء نجس فغسل الخف ودلکہ بالید ثم ملاء الماء الخف ثلاثاً واھرقہ الا انہ لم یتھیأ لہ عصر الکرباس نقد طھر الخف ای بمجرد جریان الماء ظاھراً وباطناً ولم یشترط فیہ عصر الخف ولا الکرباس لتعسرہ قیاساً علیٰ مسئلۃ البساط۔ (کبیری فصل فی الاسار ص۱۸۴)

نہ ملایا گیا ہو، اور اگر کپڑا ناپاک ہو تو پھر اگر اس پر اتنا پٹرول ڈالا جائے کہ اس سے کپڑے کو نچوڑا جاسکے تو ایسی صورت میں بھی کپڑا پاک ہوگا، کیونکہ کپڑے کی نجاست ہر مائع مزیل سے پاک ہوجاتی ہے۔ البتہ اگر میل کچیل حرارت کے ذریعہ سوکھ جاتا ہو اور کپڑا ناپاک ہو تو پھر میل کے چلے جانے کے بعد بھی کپڑا ناپاک ہی رہے گا، دوبارہ پانی سے دھونا ضروری ہے۔

قال الحصکفیؒ: یجوز رفع نجاسۃ حقیقیۃ عن محلھا ولو اناء او ماکولا علم محلھا اولا بماء ولو مستعملاً بہ یفتی وبکل مائع طاھر قالع للنجاسۃ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ باب الانجاس ج۱ ص۳۰۹) [1]

دودھ میں مینگنی یا گوبر گر جانے پر دودھ کا حکم

سوال: بکری، گائے یا بھینس سے دودھ لیتے وقت دودھ میں مینگنی یا گوبر گر جائے تو اس سے دودھ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: اگر یہ نجاست دودھ میں حل نہیں ہوئی بلکہ گرنے کے ساتھ ہی نکال لی جائے تو اس سے دودھ کی طہارت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ حل ہونے کی صورت میں دودھ ناپاک ہوکر قابلِ استفادہ نہیں، تاہم واضح ہو کہ یہ حکم دودھ نکالنے کے وقت سے خاص ہے اگر ایسے وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں گوبر یا مینگنی دودھ میں گر جائے تو دودھ علی الفور ناپاک ہوجائے گا۔

قال الحصکفیؒ: ویعرتی ابل وغنم کما یعفی لو وقعتا فی محلب وقت الحلب فرمیتا فوراً قبل تفتت وتلون۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی الفیض فلا ینجس الا اذا کان کثیراً سواء کان رطباً او یابساً صحیحاً او منکسراً ولا فرق بین ان یکون للبئر حاجز اولا ھو الصحیح وفی التاتارخانیۃ ولم یذکر محمد فی الاصل روث الحمار والخثی واختلفوا فیہ فقیل ینجس ولو قلیلاً او یابساً وقیل لو یابساً فلا واکثرھم علی انہ لو فیہ ضرورۃ وبلوی لا ینجس والا نجس (قولہ وقت الحلب) فلو وقعت فی غیر زمان الحلب فھو

---

[1] لما قال العلامۃ ابوالبرکات النسفیؒ: یطھر البدن والثوب بالماء وبمائع مزیل کالخل وماء الورد۔ (کنزالدقائق۔ باب الانجاس ج۱ ص۱۵) وَمِثْلُہٗ فی الاختیار ج۱ ص۳۵ باب الانجاس

کوقوعها فی سائرالاوانی فتنجس فی الاصح (قوله والتعبیر بالبعرتین) ای فی مسئلتی البئر والحلب - (رد المحتار علی الدر المختار - فصل فی البئر ج ۱ ص ۲۲۱) له

ناپاک شربت کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کسی برتن میں گنے کا رس پڑا ہو، کتے نے اس برتن میں منہ ڈال کر اس سے کچھ چاٹا، تو کیا باقی ماندہ شربت کو بہا دیا جائے یا گڑ بنانے میں استعمال کیا جائے؟ از روئے شرع اس کی طہارت کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی مائع چیز کتے کے منہ ڈالنے سے ناپاک ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں اس سے گڑ بنانا یا پینا ناجائز ہے، البتہ فقہاء کے کلام سے اس کی طہارت کا ایک طریقہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ شربت کی مقدار سے تین گنا پانی اس میں ڈالا جائے اور پھر آگ سے اس کو اتنا جوش دیا یعنی اُبالا جائے کہ یہ زائد مقدار پانی آگ کے ذریعے ختم ہو جائے تو باقیماندہ حصہ پھر پاک ہوتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله ویطهر دهن وعسل) قال فی الدرر ولو تنجس العسل فتطهیره ان یصب فیه ماء بقدره فیغلی حتی یعود الی مکانه والدهن یصب علیه الماء فیغلی فیعلوا الدهن الماء فیرفع بشئ هکذا ثلاث مرات - اھ (رد المحتار علی الدر المختار - مطلب فی تطهیر الدهن والغسل ج ۱ ص ۳۲۴) ۲ه

له قال ابراهیم الحلبیؒ: وان وقعت ای البعرة والبعرتان فی اللبن وقت الحلب فاخرجت حین وقعت ولم یبق لها لون لم یتنجس اللبن (وبعد اسطر) وفی الکافی قال لا فرق بین الرطب والیابس والصحیح والمنکسر والروث والخثی والبعرة لان الضرورة تشمل الکل والروث اذا کان صلبًا فهو بمنزلة البعرة فی الحکم - (کبیری فصل فی البئر ص ۱۶۱، ۱۶۲) ومثله فی الهندیة - الباب الثالث فی المیاه ج ۱ ص ۱۹)

۲ه قال ابراهیم الحلبیؒ: الا یری الی ما روی عن ابی یوسفؒ فی تطهیر الدهن النجس انه اذا جعل الدهن فی اناء فصب علیه الماء فیعلوا الدهن علی وجه الماء فیرفع بشئ ویراق الماء ثم یفعل هکذا حتی اذا فعل کذلک ثلاث مرات یحکم بطهارة الدهن - (کبیری - فصل فی الاسآر ص ۱۷۳)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة - الباب السابع فی النجاسة ج ۱ ص ۴۲)

انقلابِ حقیقت سے حکم بدل جاتا ہے

سوال:۔ اگر نمک کی کان میں ناپاک پانی جمع ہوکر نمک بن جائے تو کیا یہ نمک کھانا جائز ہے؟

الجواب:۔ از روئے شرع حقیقتِ اشیاء کی تبدیلی سے اس کا سابقہ حکم باقی نہیں رہتا، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں جب ناپاک پانی یا دوسری نجس چیزیں نمک کی کان میں نمک بن جانے کی وجہ سے پاک ہوکر اس نمک کا کھانا حلال ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا ملح کان حمارًا أو خنزیرًا ولا قذر وقع فی بئر فصار حمأۃ لانقلاب العین، بہ یفتی

قال ابن عابدینؒ: مقتضٰی ما مر ثبوت انقلاب الشئ عن حقیقتہ کالنحاس الی الذھب وقیل انہ غیر ثابت لان قلب الحقائق محال والقدرۃ لاتتعلق بالمحال والحق الاول۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ باب الانجاس ج۱ ص۳۲۶)[۱]

نجس چیز سے بنے ہوئے صابن کا حکم

سوال:۔ اگر نجس چیز سے صابن بنایا جائے تو اس صابن کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ صابن پاک ہے اور اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ صابن بنانے سے نجس چیز کی حقیقت بدل جاتی ہے اور انقلابِ حقیقت کی صورت میں سابقہ حکم بحال نہیں رہتا لہٰذا یہ چیز نجاست سے بدل کر طہارت کے حکم میں داخل ہوئی۔

قال الحصکفیؒ: ویطھر زیت تنجس بجعلہ صابونًا بہ یفتی للبلوٰی کتنور رش بماء نجس لا بأس بالخبز فیہ کطین تنجس فجعل منہ کوز بعد جعلہ علی النار یطھر ان لم یظھر فیہ اثر النجس بعد الطبخ ذکرہ الحلبی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔ باب الانجاس ج۱ ص۳۱۵، ۳۱۶)[۲]

---

[۱] قال ابراھیم الحلبیؒ: ولو احرقت العذرۃ او الروث فصار کل منھما رمادًا او مات الحمار فی مملحۃ فصار ملحًا او وقع والروث ونحوہ فی البئر فصار حمأۃ زالت نجاستہ وطھر عند محمدؒ حتی لو اکل الملح وصلی علی ذلک الرماد جاز۔ (کبیری فصل فی البئر ص۱۸۸)

[۲] قال ابراھیم الحلبیؒ: واکثر المشائخ اختاروا قول محمدؒ وعلیہ الفتوٰی لان الشرع رتب وصف النجاسۃ علی تلک الحقیقۃ وقد زالت بالکلیۃ فان الملح غیر العظم واللحم فاذا صارت الحقیقۃ ملحًا ترتب علیہ حکم الملح (والبعد اسطر) وعلی قول محمدؒ فرعوا طھارۃ صابون صنع من دھن نجس وعلیہ یتفرع مالو وقع انسان او کلب فی قدر الصابون فصار صابونًا یکون طاھرًا لتبدل الحقیقۃ۔ (کبیری۔ فصل فی الاسار ص۱۸۹) ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوٰی۔ الفصل السادس فی غسل الثوب والدھن ج۱ ص۴۳۔

حلال جانور کے پیشاب اور بول و براز کا حکم | **سوال**:۔ حلال جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہو ان کا پیشاب اور بول و براز نجاستِ خفیفہ ہے یا نجاستِ غلیظہ؟ اور اگر یہ نجاست کپڑے کے ساتھ لگ جائے تو نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے تو ان کا پیشاب نجاستِ خفیفہ کے حکم میں ہے، البتہ گوبر نجاستِ غلیظہ ہے، نجاستِ خفیفہ کا حکم یہ ہے کہ کپڑے (مثلاً آستین) کے ربع کے مقدار سے کم میں لگا ہو تو یہ مانع صلوٰۃ نہیں اس سے زیادہ مانع صلوٰۃ ہے جبکہ نجاستِ غلیظہ ایک درہم سے زائد مانع صلوٰۃ ہے۔

قال الحصکفیؒ: وعفا الشارع عن قدر درهم وهو مثقال فی نجس کثیف له جرم وعرض مقعر الکف فی رقیق من مغلظة کعذرة ودم وخمر وخرء کل طیر لا یذرق فی الهواء کبط أهلی ودجاج وروث وخثی افاد بهما نجاسة خرء کل حیوان غیر الطیور وعفی دون ربع جمیع بدن وثوب ولو کبیرا من نجاسة مخففة کبول مأکول

قال ابن عابدینؒ: قوله (ولو کبیرا الخ) اعلم انهم اختلفوا فی کیفیة اعتبار الربع علی ثلاثة اقوال فقیل ربع طرف اصابته النجاسة، کالذیل والکم والدخریص ان کان المصاب ثوبا وربع العضو المصاب کالید والرجل ان کان بدنا وصححه فی التحفة والمحیط والمجتبیٰ والسراج وفی الحقائق وعلیه الفتوی۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ باب الانجاس ج ۱ ص۳۱۶ تا ۳۲۲) [له]

کتے کے پیشاب کا حکم | **سوال**:۔ اگر کتا کسی برتن یا کنوئیں میں پیشاب کر دے تو اس برتن اور کنوئیں کے پانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کتے کا پیشاب چونکہ نجاستِ غلیظہ ہے لہٰذا اگر پیشاب کا ایک قطرہ

[له] وفی الهندیة: وکذلك الخمر والدم المسفوح ولحم المیتة وبول مالا یؤکل والروث واخثاء البقر والعذرة ونجو الکلب وخرء الدجاج والبط والاوز نجس نجاسة غلیظة هکذا فی فتاوی قاضیخان۔ (الهندیة۔ الفصل الثانی فی الاعیان النجسة ج ۱ ص۴۶) ومثله فی فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة فصل فی النجاسة التی تصیب الثوب ج ۱ ص۱۸۔

بھی کنوئیں یا برتن میں گرجائے تو شرعاً کنوئیں اور برتن دونوں کا پاک کرنا ضروری ہے۔

قال ابن نجیمؒ: وانما ینجس ماء البئر کله بقلیل النجاسة لان البئر عندنا بمنزلة الحوض الصغیر الا ان یکون عشراً فی عشر کذا فی فتاوی قاضیخان۔ (البحر الرائق۔کتاب الطهارة ج ۱ ص۱۱۱) ؎۱

پاک اور ناپاک کے اختلاط کا حکم

سوال:۔ ناپاک پانی پاک مٹی میں ڈالنے سے جو گارا بنتا ہے تو اس گارے کا کیا حکم ہے؟ کیا پانی کی ناپاکی کی وجہ سے یہ گارا ناپاک متصور ہوگا یا پاک مٹی کی وجہ سے پاک جانا جائے گا؟

الجواب:۔ جب پانی اور مٹی دونوں ملائے جائیں خواہ پانی پاک ہو اور مٹی ناپاک یا اس کا عکس ہو تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، بعض نے طہارت اور بعض نے نجاست کو ترجیح دی ہے، قاضی خانؒ اور ابراہیم حلبیؒ نے نجاست کا قول مفتی بہ قرار دیا ہے، لہٰذا ایسا گارا ناپاک متصور ہوگا۔

قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: الماء الطاهر اذا اختلط به التراب النجس وصار طیناً اوکان الماء نجساً والتراب طاهر فالعبرة للنجس ایهما کان نجساً فالطین نجس وبه اخذ الفقیه ابو اللیث وهکذا روی عن ابی یوسفؒ ۔ (خلاصة الفتاوی۔الفصل الثامن فی النجاسة ج ۱ ص۴۶) ؎۲

؎۱ قال الحصکفیؒ: اذا وقعت نجاسة لیست بحیوان ولو مخففة اوقطرة بول أودم أو ذنب فارة (وبعد اسطر) ینزح کل مائها الذی کان فیها وقت الوقوع۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار۔فصل فی البئر ج ۱ ص۲۱۱،۲۱۲) وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی۔مسائل البئر ج ۱ ص۱۔

؎۲ قال ابراهیم الحلبیؒ: الماء والتراب اذا اختلطا وکان احدهما نجساً فالطین الحاصل منهما نجس لان اختلاط النجس بالطاهر ینجسه هذا هو الصحیح کما ذکره قاضیخان وهو اختیار الفقیه ابی اللیث (وبعد اسطر) فلله در الفقیه ابی اللیث ولله در قاضیخان حیث جعل قوله هو الصحیح مشیراً الی ان سائر الاقوال لاصحة لها بل هی فاسدة لان النتیجة تابعة لاخس المقدمتین دائماً۔ (کبیری۔فصل الاسار ص۱۸۸) وَمِثْلُهٗ فی الهندیة الفصل الثانی فی الاعیان النجسة ج ۱ ص۴۷۔

واشنگ مشین سے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال:۔ واشنگ مشین میں کپڑے کچھ اس انداز سے دھوئے جاتے ہیں کہ ایک ہی بار صابن یا سرف ڈال کر اس میں نجس اور پاک کپڑے ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے دھوئے جاتے ہیں، ان کپڑوں کی پاکیزگی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگرچہ پہلے نجس پانی سے جملہ کپڑے نجس ہوجاتے ہیں مگر اس دُھلائی کے بعد اس نجس صابن کو نکالنے کے لیے مشین میں ہی یا باہر پانی میں کئی بار دھو کر اُن سے یہ نجس صابن نکال دیا جاتا ہے جس کے بعد کپڑوں میں نجس پانی باقی نہیں رہتا اس لیے ازالۂ نجس کے بعد کپڑے پاک ہوجاتے ہیں، لہٰذا واشنگ مشین سے دُھلے ہوئے کپڑے پاک ہیں۔

قال العلامة فخر الدين الزيلعيؒ: والنجس المرئى يطهر بزوال عينه لان كنجس المحل باعتبار العين فيزول بزوالها ولو بمرة..... وغيره بالغسل ثلاثا والعصر كل مرة اى غير المرئى من النجاسة يطهر بثلاث غسلات وبالعصر فى كل مرة والمعتبر فيه غلبة الظن۔ (تبيين الحقائق ج۱ ص۷۵ فصل فى الانجاس) [1]

شراب کی خالی بوتل کا استعمال

سوال:۔ شراب کی خالی بوتل کا تیل وغیرہ کے لیے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ شراب بذاتِ خود نجس ہے، جس برتن میں شراب موجود ہو اُس کا استعمال بھی جائز نہیں مگر خوب صاف کرنے کے بعد جب یہ یقین ہوجائے کہ شراب کے آثار

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصارى: ويجب ان يعلم ان ازالة النجاسة واجبة وازالتها ان كانت مرئية بازالة عينها واثرها ان كانت شيئا يزول اثرها ولا يعتبر فيه العدد وان كان شيئا لا يزول اثرها فازالتها بازالة عينها ويكون ما بقى من الاثر عفوا وان كان كثيرا...... هٰذا اذا كانت النجاسة مرئية وان كانت غير مرئية كالبول والخمر ذكر فى الاصل وقال يغسلها ثلاث مرات ويعصر فى كل مرة فقد شرط الغسل ثلاث مرات وشرط العصر فى كل مرة۔ (الفتاوىٰ التاتارخانية ج۱ ص۳۰۶، كتاب الطهارة، الفصل الثامن فى تطهير النجاسات)

ومِثْلُهٗ فى الفقه الاسلامى وادلته ج۱ ص۱۶۷ التقسيم الثالث تقسيم النجاسة الى مرتبة الخ.

باقی نہیں رہے تو اُس بوتل یا برتن وغیرہ کو استعمال کرنا جائز ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: نهيتكم عن النبيذ إلا في سقاء فاشربوا في الأسقية كلها ولا تشربوا مسكرًا۔ (شرح طیبی ج۱ ص۱۳۸ کتاب الایمان، الفصل الاول)[1]

شیرخوار بچے کے پیشاب کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر شیرخوار بچہ کپڑوں پر پیشاب کر دے تو کپڑوں کا دھونا ضروری ہے یا کہ شیرخوار بچے کا پیشاب پاک ہے؟

الجواب:۔ شیرخوار بچے کا پیشاب بھی بڑوں کی طرح نجس ہے، اس کی وجہ سے کپڑوں کو دھونا چاہیئے، البتہ فرق اتنا ہے کہ شیرخوار بچے کے پیشاب سے بچنا مشکل ہوتا ہے اسلئے اس صورت میں پورے کپڑے کا دھونا ضروری نہیں صرف پیشاب کی جگہ پر اتنا پانی بہادے کہ اس پانی سے یہ کپڑا تین مرتبہ بھیگ سکے، تو کافی ہے۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالی: وبول ما لا يؤكل لحمه كالآدمي ولو رضيعا۔ قال الشيخ السيد احمد الطحطاوی: (قوله ولو رضيعا) لم يطعم سواء كان ذكرًا أو أنثى۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۲۳ باب الانجاس)[2]

چمگادڑ کے پیشاب کا حکم

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقہ میں چمگادڑ بہت ہیں، کبھی کبھی وہ پیشاب ہمارے کپڑوں پر کر جاتے ہیں لیکن ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیتے ہیں، تو ایسے کپڑوں میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگرچہ قاعدہ کی رُو سے غیر ماکول اللحم کا پیشاب وغیرہ نجاست غلیظہ ہے مگر چمگادڑ بوجہ مجبوری کے اس حکم سے مستثنیٰ ہے اس لئے کہ ان سے احتراز (بچنا) ممکن نہیں لہٰذا چمگادڑ کا پیشاب و بیٹ پاک ہے اور اُن کپڑوں کے ساتھ (جن پر چمگادڑ کا پیشاب وغیرہ لگا ہو)

---

[1] قال العلامة مُلّا علی قاری: فلما مضت مدة اباح النبی صلی اللہ علیہ وسلم استعمال هذه الظروف فان اثر الخمر زال عنها۔ (مرقاة شرح مشكوٰة المصابيح ج۱ ص۹۱ کتاب الایمان، الفصل الاول)
ومثله فی حاشیة مشكوٰة ج۱ ص۱۳ کتاب الایمان الفصل الاول)

[2] قال العلامة الحصکفی: وبول غير مأكول ولو من صغير لم يطعم۔ قال ابن عابدين: (تحت قوله لم يطعم) اى لم يأكل فلا بد من غسله۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۱۸ باب الانجاس مطلب فی طهارة بوله)

پڑھی گئی نماز بھی درست ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وبول غیر ماکول ولو من صغیر لم یطعم الا بول الخفاش وخرأہ۔
قال ابن عابدینؒ : تحته ..... فی البدائع وغیرہ : بول الخفافیش وخرؤھا لیس بنجس لتعذر صیانة الثوب والاوانی عنها لأنها تبول من الھواء وھی فارة طیارة فلھذا تبول اھ۔ ومقتضاہ ان سقوط النجاسة للضرورة۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۱۹ باب الانجاس) [۱]

کنوئیں میں رہنے والے مینڈک کے پیشاب کا حکم

سوال:۔ گرامی قدر مفتی صاحب! ہمارے گھر کنوئیں میں مینڈک بہت ہیں، اگر وہ پانی میں پیشاب کردیں تو اس کنوئیں کے پانی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہی اصول اور قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ مینڈک کا پیشاب ناپاک ہے اسلئے کہ بول غیر ماکول اللحم نجاست غلیظہ ہے، صورت مسئولہ میں مینڈک چونکہ پانی ہی میں رہتا ہے تو عدم احتراز کی وجہ سے بوجہ ضرورت نجس نہیں یعنی کنوئیں کا پانی ناپاک نہ ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وبول غیر ماکول ولو من صغیر لم یطعم الا بول الخفاش وخرأہ فطاھر وکذا بول الفارة لتعذر التحرز عنه وعلیه الفتوٰی۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۳۱۸ باب الانجاس) [۲]

نجس مٹی سے بنے ہوئے برتن کے استعمال کا حکم

سوال:۔ اگر کمہار برتن بنانے کےلیے مٹی کو نجس پانی سے گوندھے تو کیا پلید مٹی سے بنے ہوئے پختہ برتن کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی نجس (پلید) شے کی تطہیر کے مختلف طریقے ہیں، ان طریقوں میں آگ بھی ہے، صورت مسئولہ میں چونکہ نجس مٹی آگ میں پک چکی ہے اس لیے آگ کے ذریعے نجاست کا

---

[۱] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ : وبول الخفافیش وخرؤھا لیس بنجس لتعذر صیانة الثیاب والاوانی عنه لانها تبول فی الھواء وھی فأرة طیارة فلھذا تبول۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۶۲ فصل واما الطھارة الحقیقیة)

[۲] قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ : بول الفأرة طاھر لتعذر التحرز عنه وعلیه الفتوٰی یحمل علی العفو۔ (طحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۱۲۳ فصل فی الانجاس)

ازالہ ہوچکا ہے اور برتن پاک ہوچکا ہے، اس لیے ایسے برتن کا استعمال جائز ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ : فی الفتاوی اذا احترقت الارض بالنار فتیمم بذلک التراب قیل یجوز التیمم وقیل لایجوز والاصح الجواز۔ (البحرالرائق ج۱ ص۲۲۸،۲۲۶ باب الانجاس) [1]

مردار جانور کی کھال کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا جانور مردار ہوجائے تو اس کی کھال اتارنے کے بعد اس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ حدیث شریف کی رُو سے مطلقاً کسی بھی جانور کی کھال اتار کر سکھائی جائے یا کسی اور ذریعے سے اس کو رنگا جائے یا دباغت دی جائے تو وہ کھال پاک ہوجاتی ہے، اس لیے مردار جانور کی کھال کو دباغت دینے کے بعد استعمال کرنا جائز ہے۔

لما اخرجہ الامام ابوعیسیٰ الترمذیؒ : عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما اھاب دبغ فقد طھر۔ (الجامع للترمذی ج۱ ص۳۰۳ باب ما جاء فی جلود المیتۃ اذا دبغت) [2]

خنزیر کے بالوں سے بنائے گئے برش کے استعمال کا حکم

سوال:۔ آجکل دانتوں کی صفائی کے لیے جو برش استعمال کیا جاتا ہے بعض میں خنزیر کے بال استعمال ہوتے ہیں، کیا ایسے برش سے دانتوں کی صفائی کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ دانتوں کی صفائی کے لیے جو برش استعمال کیا جاتا ہے اگر اس میں خنزیر کے بال استعمال ہوتے ہوں تو اس کا استعمال جائز نہیں۔

لما قال الحصکفیؒ : وشعر المیتۃ غیر الخنزیر علی المذھب۔ قال ابن عابدینؒ تحت (قولہ علی المذھب) ای علیٰ قول ابی یوسفؒ الذی ھو ظاھر الروایۃ أن شعرہ نجس وصححہ

---

[1] وفی الھندیۃ : ومنھا الاحراق .... الطین النجس اذا جعل منہ الکوز او القدر فطبخ یکون طاھراً کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۴۴ الباب السابع فی الانجاس، الفصل الاول فی تطھیر الانجاس)

[2] عن ابن عباسؓ قال تصدق علیٰ مولاۃ لمیمونۃؓ بشاۃ فماتت فمر بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ھلا اخذتم اھابھا فدبغتموہ فانتفعتم بہ فقالوا انھا میتۃ قال انما حرم اکلھا۔ (الصحیح البخاری ج۱ ص۸۳۰ باب جلود المیتۃ)

ومثلہٗ فی کبیری ص۱۵۳ فصل فی الانجاس)

فی البدائع ورجحہ فی الاختیار...... وعن محمد طاھر: لضرورۃ استعمالہ ای للحرازین۔ قال العلامۃ المقدسی: وفی زماننا استغنوا عنہ ای فلا یجوز استعمالہ لزوال الضرورۃ الباعثۃ للحکم بالطھارۃ۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۰۶ باب الانجاس) [1]

لعابِ دہن سے قرآنِ مجید کی ورق گردانی کرنا

سوال:۔ قرآنِ کریم کی ورق گردانی کے وقت انگلیوں پر منہ کا لعاب لگا کر ورقہ الٹایا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ قرآنِ کریم کی ورق گردانی کے لیے لعابِ دہن لگانے کی صورت مسئلہ طہارۃِ سؤر وعدم طہارۃ پر مبنی ہے، چونکہ انسان کا سؤر (جھوٹا) پاک ہے اس لیے ورق گردانی کیلئے انگلیوں کے ساتھ لعابِ دہن لگانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔

قال الحصکفیؒ: فسؤر آدمی مطلقاً ولو جنباً او کافراً او امرأۃ...... (طاھر) طھور بلا کراھۃ۔ قال ابن عابدینؒ (قولہ طاھر) ای فی ذاتہ طھور: ای مطھر لغیرہ من الاحداث والاخباث۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۲۲۲ مطلب فی السؤر) [2]

جانور کو ناپاک چیز کھلانے کا حکم

سوال:۔ عموماً لوگ ناپاک چیز جانوروں کو کھلا دیتے ہیں، کیا ناپاک چیز جانوروں کو کھلانا یا پلانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ناپاک چیز کا وصفِ نجاست کی وجہ سے تبدیل ہو چکا ہو تو اس کا انتفاع ہر حال میں ناجائز ہے اور اگر صفت تبدیل نہ ہوئی ہو تو جانوروں وغیرہ کو کھلانا یا پلانا جائز ہے، البتہ متغیر الوصف ناپاک چیز کو جانور خود کھائے تو کوئی حرج نہیں۔

---

[1] قال ابوبکر الکاسانیؒ: واما الخنزیر فقد روی عن ابی حنیفۃؒ انہ نجس العین لان اللہ تعالیٰ وصفہ بکونہ رجساً فیحرم استعمال شعرہ وسائر اجزائہ الا انہ رخص فی شعرہ للخرازین للضرورۃ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۶۳ فصل فی الطھارۃ الحقیقیۃ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۱ ص۱۰۱ باب الانجاس۔

[2] قال مولانا اشرف علی تھانویؒ: مسئلہ فقہیہ سؤر الآدمی طاہر سے لعابِ دہن کی طہارت ظاہر ہے اور تقبیل حجرِ اسود کی مسنونیت سے اس لعاب کے لگنے کا خلافِ ادب نہ ہونا بھی ظاہر ہے جو کہ تقبیل میں محتمل ہے اس سے اس طرح ورق گردانی مصحف کا جواز یقینی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۱ ص۳۹ فصل فی الآسار)

قال ابن عابدینؒ : الماء اذا وقعت فیه نجاسة فان تغیر وصفه لم یجز الانتفاع به بحال ولا جاز کبل الطین وسقی الدواب۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص۱۲۸)

کُتے کا منہ اگر کپڑے کو لگ جائے تو۔۔۔؟

سوال :۔ بعض لوگ کُتوں کو شوقیہ طور پر پالتے ہیں اور اُن سے کھیلتے ہیں اسی دوران کُتا قمیض، شلوار یا چادر کو منہ میں پکڑ لیتا ہے، تو اب اس قمیض، شلوار اور چادر وغیرہ کی طہارت کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ کُتے کا لعاب ناپاک ہے، اگر قمیض وغیرہ پر لعاب کی تری ظاہراً محسوس ہوتی ہو تو کپڑا ناپاک ہے ورنہ نہیں۔

لما فی الهندیة : الکلب اذا اخذ عضو انسان او ثوبه لاینجس ما لم یظهر فیه اثر البلل راضیا کان او غضبان۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۴۸ الباب السابع فی الانجاس، الفصل الثانی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال :۔ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات پاک ہیں یا نہیں؟

الجواب :۔ علماء کرام کی تحقیقات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رطوبات طاہر ہیں اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شاربین پر نکیر نہیں فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکیر نہ فرمانا حدیثِ تقریری ہے جو بالاجماع حُجّتِ شرعی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : صحح بعض ائمة الشافعیة طهارة بوله صلی الله علیه وسلم وسائر فضلاته۔ وبه قال ابوحنیفةؒ کما نقله فی المواهب اللدنیة عن شرح البخاری للعینی وصرح به البیری فی شرح الاشباه م قال الحافظ ابن حجر تظافرت الأدلة علی ذلک وعدا الائمة ذلک من خصائصه صلی الله علیه وسلم ونقل بعضهم عن شرح المشکوٰة لملا علی القاری أنه قال اختاره کثیر من اصحابنا۔ (رد المحتار ج ۱ ص۳۱۸ باب الانجاس مطلب فی طهارة بوله صلی الله علیه وسلم) [1]

---

[1] قال الملا علی القاریؒ فی جمع الوسائل : قال ابن حجر : وبهذا استدل جمع من ائمتنا المتقدمین وغیرهم علی طهارة فضلاته صلی الله علیه وسلم وهو المختار وفاقاً لجمع من المتاخرین فقد تکاثرت الادلة علیه وعده الائمة من خصائصه۔ (جمع الوسائل شرح الشمائل ج ۲ ص۳ باب ماجاء فی تعطر رسول الله صلی الله علیه وسلم)

گوبر کے اُپلے استعمال کرنے اور بیچنے کا حکم

سوال:- اکثر دیہاتوں میں گوبر کے اُپلے جلاکر کھانا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے اور بعض لوگ ان کو فروخت بھی کرتے ہیں، تو کیا گوبر کے اُپلوں کو جلانا اور فروخت کرنا جائز ہے؟

الجواب:- فقہاء کرام کی وضاحت اور صریح عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ گوبر کے اُپلوں کو کھانا وغیرہ پکانے کے لیے جلانے اور فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین: (تحت قوله کسرقین وبعر) والمراد انه یجوز بیعهما ولو خالصین۔ وفی البحر عن السراج ویجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع به والوقود به۔ (رد المحتار ج ۵ ص۵۸ باب فی البیع الفاسد۔ قبل مطلب الآدمی مکرم) [1]

زندہ سانپ کے جامے کا حکم

سوال:- بعض حکیم لوگ زخمی شخص کو سانپ کا جامہ (وہ چھلکا جو سانپ خود اتارتا ہے) بطور علاج استعمال کراتے ہیں، شرعاً اس کا استعمال کیسا ہے؟ اور کیا اس کے ساتھ نماز ہو جائے گی؟

الجواب:- مسلمان طبیب حاذق مریض کے لیے جو بھی دوا تجویز کرے اُس کا استعمال جائز ہے، جہاں تک صورتِ مسئولہ میں سانپ کے جامے کے استعمال کا مسئلہ ہے تو فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق سانپ جب اپنا جامہ حالتِ حیات میں خود اتارے، پاک ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: قمیص الحیة الصحیح انه طاهر کذا فی الخلاصة۔
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۴۶ باب الانجاس) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: یجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع به والوقود کذا فی السراج الوهاج۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۷۰ کتاب البیوع۔ باب البیع الفاسد)

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی نسخة القاضی الامام وقمیص الحیة الصحیح انه طاهر۔
(خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۴۴ الفصل السابع فیما یکون نجسا الخ)

باب الاستنجاء

(استنجاء کے احکام ومسائل)

کشفِ عورت کی صورت میں استنجاء کا حکم

سوال: جب استنجأ کے لیے باپردہ جگہ نہ ہو تو کیا ایسی جگہ پر بیٹھ کر استنجأ کرنا جائز ہے جہاں کشفِ عورت کا امکان ہو؟

الجواب: استنجاء کرنے میں جب کشفِ عورت کا خطرہ ہو تو استنجاء چھوڑ کر وضو کرنا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: بلاکشفِ عورة عند احد ما معه فیترکه کما مر فلوکشف له صار فاسقًا۔ قال ابن عابدینؒ: قوله فلوکشف له صار فاسقًا ای للاستنجاء بالماء قال نوح أفندی لان کشف العورة حرام ومرتکب الحرام فاسق سواء تجاوز النجس المخرج اولا وسواء کان المجاوز اکثر من الدرهم او اقل۔

(رد المحتار علی الدر المختار فصل فی الاستنجاء ج۱ ص۳۳۸) [1]

قدرِ درہم سے زیادہ نجاست معاف نہیں

سوال: پیشاب کرنے کے بعد جب ڈھیلے استعمال کر لیے جائیں تو کیا پھر پانی سے استنجا کرنا ضروری ہے؟ اگر کسی جگہ پانی سے استنجاء کرنے کی فرصت نہ ہو تو کیا صرف ڈھیلوں سے استنجا پر اکتفاء کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: اگر نجاست درہم کے اندازہ سے تجاوز کر گئی ہو تو دوبارہ پانی سے استنجأ کرنا ضروری ہے، البتہ اگر درہم کے اندازہ سے نجاست کم ہو یا بالکل نہ ہو تو پھر ڈھیلوں کے استعمال پر اکتفاء جائز ہے، تاہم ایسی صورت میں بھی پانی سے استنجاء کرنا بہتر اور افضل ہے۔

---

[1] وفی الهندیة: والاستنجاء بالماء افضل ان امکنه ذٰلك من غیر کشف العورة وان احتاج الی کشف العورة یستنجی بالحجر ولا یستنجی بالماء۔
(الهندیة الفصل الثالث فی الاستنجاء ج۱ ص۴۸) ومِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی الاستنجاء ج۱ ص۳۵

قال ابراهيم الحلبيؒ: اما ان زادت النجاسة المتجاوزة عن المخرج على قدر الدرهم فغسلهٗ ای النجس او المخرج فرض اجماعًا۔ (کبیری۔ آداب الوضوء ص۲۹)

وقال ابن عابدینؒ: ثم اعلم ان الجمع بین الماء والحجر افضل ویلیه فی الفضل الاقتصار علی الماء ویلیه الاقتصار علی الحجر وتحصل السنة بالکل وان تفاوت الفضل کما افاده فی الامداد۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ فصل الاستنجاء ج۱ ص۳۳۸) [۱]

ٹائلٹ پیپر سے استنجاء کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل خاص قسم کا کاغذ ملتا ہے جو لکھنے کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا، صرف استنجاء کیلئے بنایا گیا ہے، کیا اس پر کاغذ کے نام کی وجہ سے استنجاء جائز ہے؟

الجواب:۔ کاغذ سے استنجاء کے عدم جواز کی علت، عظمت اور تقدس ہے کیونکہ کاغذ عمومًا لکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ٹائلٹ پیپر چونکہ خصوصی طور پر استنجاء کیلئے تیار کیا گیا ہے اس لیے مروجہ ٹائلٹ پیپر میں کاغذ کی خصوصیات نہ ہونے کی وجہ سے اس سے استنجاء جائز اور مشروع ہے۔

قال ابن عابدینؒ: واذا کانت العلة فی الابیض کونه آلة للکتابة کما ذکرناه یؤخذ منها عدم الکراهة فیما لا یصلح لها اذا کان قالعًا للنجاسة غیر متقوم کما قدمناه من جوازه بالخرق البوالی وهل اذا کان متقومًا ثم قطع منه قطعة لا قیمة لها بعد القطع یکره الاستنجاء بها ام لا الظاهر الثانی۔

(رد المحتار علی الدر المختار فصل الاستنجاء ج۱ ص۳۴۰) [۲]

استنجاء کے وقت سلام کا حکم

سوال:۔ استنجاء کرتے وقت سلام کرنے یا سلام کا جواب دینے کا کیا حکم ہے؟

---

[۱] وفی الهندیة: والثانی اذا تجاوزت مخرجها یجب عند محمد رحمه الله قل او کثر وهو الاحوط۔ (الهندیة۔ الفصل الثالث فی الاستنجاء ج۱ ص۵۰) ومثلهٗ فی الهدایة فصل فی الاستنجاء ج۱ ص۷۶

[۲] قال العلامة محمد یوسف البنوریؒ: لان المراد من الحجر فی الحدیث کل شئ طاهر غیر محترم قالع للنجاسة سواء کان حجرًا او مدرًا او غیرهما۔ (معارف السنن ج۱ ص۱۱۰ باب الاستنجاء بالحجارة)۔

الجواب: فقہاء نے پیشاب کرتے وقت سلام کرنے کو مکروہ لکھا ہے، استنجاء کرتے وقت اگر تقاطرِ بول یعنی پیشاب کے قطرے گرتے ہوں تو اس حکم کی رُو سے اس وقت بھی سلام مکروہ ہے اور اگر تقاطرِ بول نہ ہو تو پھر بھی بے ادبی سے خالی نہیں، اس لیے ایسے مواقع پر سلام کرنے سے اجتناب کیا جائے اور اگر کوئی شخص سلام کرے تو استنجاء کے بعد جواب دے دے، کیونکہ سلام کے جواب میں تاخیر جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: عبارۃ الغزنویۃ ولا یتکلم فیہ: ای فی الخلاء، وفی الضیاء عن بستان ابی اللیث یکرہ الکلام فی الخلاء وظاھرہ انہ لا یختص بحال قضاء الحاجۃ۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ فصل فی الاستنجاء ج ۱ ص ۳۴۴) [1]

پانی سے استنجاء کا حکم

سوال: اگر پیشاب کرنے کے بعد ایک شخص صرف پانی کے استعمال پر اکتفاء کرے یعنی ڈھیلا استعمال نہ کرے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: ڈھیلے سے صفائی کے بعد پانی سے استنجا کرنا مستحب ہے اور صفائی نہ ہونے کی صورت میں جب نجاست قدر الدرہم سے زیادہ ہو تو پانی سے استنجا واجب ہے البتہ صرف پانی سے اکتفاء بھی جائز ہے، لیکن اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ پانی کے استعمال سے قبل تقاطرِ بول بند ہو ورنہ اس کے بغیر کپڑوں کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویعتبر القدر المانع لصلوٰۃ فیما وراء موضع الاستنجاء لان ما علی المخرج ساقط شرعاً۔ قال ابن عابدینؒ (قولہ ویعتبر... الخ) ای خلافاً لمحمدؒ والحاصل ان ما جاوز المخرج ان زاد علی الدرھم فی نفسہ یفترض غسلہ اتفاقاً وان زاد بضم ما علی المخرج الیہ لا یفترض عندھما وعند محمدؒ یفرض غسلہ بناء علی ان ما علی المخرج فی حکم الظاھر عندہ فلا یسقط اعتبارہ وبضم (وبعد اسطر) وقدمنا عن الاختیار انہ الاحوط۔ (رد المحتار علی الدر المختار۔ فصل فی الاستنجاء ج ۱ ص ۳۳۹) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: ولا یتکلم ولا یذکر اللہ تعالیٰ ولا یشمت عاطساً ولا یرد السلام ولا یجیب المؤذن۔ (الھندیۃ۔ الفصل الثالث فی الاستنجاء ج ۱ ص ۵) ومثلہ فی البحر الرائق باب الانجاس ج ۱ ص ۲۴۳۔

[2] قال ابراھیم الحلبیؒ: ومن الآداب ان یغسل مخرج النجاسۃ بعد الاحجار اذا لم یتجاوز النجاسۃ مخرجھا اما اذا جاوزت مخرجھا والحال انھا لم تکن قدر الدرھم فغسلہ سنۃ وان کان قدر الدرھم فغسلہ واجب۔ (کبیری۔ آداب الوضوء ج ۱ ص ۲۸، ۲۹) ومثلہ فی الھندیۃ الفصل الثالث فی الاستنجاء ج ۱ ص ۵۔

دائیں ہاتھ سے استنجاء کا حکم

سوال:۔ دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دائیں ہاتھ کی شرافت کی وجہ سے استنجاء یا پاکی جیسے امور میں اس کا استعمال مکروہ ہے، البتہ بوجہ عذر مجبوری کی حالت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة شرنبلالی: یکرہ الاستنجاء بالید الیمنی الا من عذر ــــ قال احمد الطحطاویؒ تحته: فإنه یفید عدم الکراھة بالیمین حال العذر وھو کذلك۔

(الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۳۹ فصل فیما یجوز به الاستنجاء ومایکرہ) [1]

استنجاء کے لیے پانی کی مقدار

سوال:۔ استنجاء کے لیے پانی کی کوئی خاص مقدار مقرر ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص زیادہ پانی استعمال کرے تو اسراف کے حکم میں داخل ہوکر وہ شخص گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے استعمال میں اعتدال اور میانہ روی کی ترغیب دی ہے، لیکن استنجاء کی حالت میں خاص مقدار کی تعیین نہیں، یہ نجاست کی کمی اور زیادتی یا اشخاص کے اعتبار سے متفاوت ہے، جبتک ازالۂ نجاست کے بارے میں غالب ظن نہ ہو تو پانی کا استعمال جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: والغسل بالماء الی ان یقع فی قلبه انه طھر مالم یکن موسوسًا فیقدر بثلاث۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله فیقدر بثلاث) وقیل بسبع للحدیث الوارد فی ولوغ الکلب معراج عن المبسوط۔

(رد المحتار علی الدر المختار فصل فی الاستنجاء ج۱ ص۳۳۷، ۳۳۸) [2]

---

[1] وفی الھندیة: ویکرہ الاستنجاء بالعظم والروث والرجیع والطعام واللحم والزجاج وکذا بالیمین ھکذا فی التبیین ــ واذا کان بالیسری عذر یمنع الاستنجاء بھا جاز ان یستنجی بیمینه من غیر کراھة۔ (الھندیة۔ الفصل الثالث فی الاستنجاء ج۱ ص۵۰)

[2] قال برھان الدینؒ: ویستعمل الماء الی ان یقع فی غالب ظنه انه قد طھر ولا یقدر بالمرات الا اذا کان موسوسًا فیقدر بالثلاث فی حقه وقیل السبع۔
(الھدایة۔ فصل فی الاستنجاء ج۱ ص۷۵) ومثله فی مراقی الفلاح فصل فی الاستنجاء ص۲۷۔

مغربی طرز کے بیت الخلاء میں پیشاب کرنا

سوال :۔ آجکل بعض مقامات پر مغربی طرز کے بیت الخلاء بنائے جاتے ہیں جن میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑتا ہے، کیا اس قسم کے بیت الخلاء میں پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اگرچہ بوقتِ ضرورت جائز ہے لیکن بلاضرورت کھڑے ہو کر پیشاب کرنا خلافِ سنت ہے ۔ البتہ آجکل مغربی تہذیب کے مطابق بنائے گئے بیت الخلاء کے استعمال میں ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہے اور دوسرے کفار کے ساتھ تشبہ کا لزوم ، اس لیے مغربی طرز کے مطابق بنائے گئے بیت الخلاء میں اسی تہذیب کے مطابق کھڑے ہو کر پیشاب وغیرہ کرنا مناسب نہیں ۔

لما قال الحصکفیؒ : وکرہ تحریمًا استقبال قبلۃ واستدبارھا......وان یبول قائمًا اومضطجعًا او مجردًا من ثوبہ بلا عذر ۔ (الدرالمختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۴۱،۳۴۴ فصل فی الاستنجاء)[۱]

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا حکم

سوال :۔ جہادِ افغانستان میں بعض اشخاص کے پاؤں کٹ چکے ہیں اور بعض کو کمر میں شدید درد کی وجہ سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اسلام نے نجاست سے بچنے کا حکم دیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی ہے کہ پیشاب کے چھینٹوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں کہ اکثر عذابِ قبر اسی وجہ سے ہوتا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے تاہم اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پیشاب کرنا ممکن نہ ہو تو کھڑے ہو کر کرنا بھی جائز ہے ۔

لما قال حسن بن عمارؒ : ویکرہ البول قائمًا لتنجسہ غالبًا الا من عذر کوجع بصلبہ الخ (مراقی الفلاح علی صدر حاشیۃ طحطاوی ص۲۲ فصل فیما یجوز بہ الاستنجاء ومایکرہ بہ الخ)[۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ : یکرہ ان یبول قائمًا اومضطجعًا ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۵۰/۵۱ باب الاستنجاء)

[۲] قال السید یوسف البنوریؒ : ان البول قائمًا وان کانت فیہ رخصۃ والمنع للتادیب لا للتحریم کما قالہ الترمذی ولکن الیوم الفتوٰی علی تحریمہ اولٰی حیث اصبح شعارًا لغیر المسلمین من الکفار واھل الادیان الباطلۃ ۔
(معارف السنن ج ۱ ص۱۰۶ باب النھی عن البول قائمًا)

استنجاء کرتے وقت شمال کی طرف منہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں یہ مشہور ہے کہ شمال کی طرف چھوٹا قبلہ ہے اور مغرب کی طرف بڑا قبلہ، تو کیا جس طرح پیشاب و پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنا جائز نہیں شمال کی طرف بھی ایسا ہی حکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ مبارکہ میں قبلہ (کعبہ) کی طرف استنجاء کے وقت منہ یا پشت کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے متبادل بقیہ دونوں طرف منہ یا پشت کرنے کا حکم ہوا ہے، اب یہ دونوں اطراف کے علاقے جغرافیائی نظام کے مطابق ہوں گے، یعنی جہاں کعبہ مغرب یا مشرق کے جانب ہو تو اس کے دونوں اطراف شمال و جنوب ہے اور جہاں کعبہ شمال یا جنوب کی طرف ہو تو وہاں کے رہنے والوں کو مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے۔

عن ابی ایوب الانصاریؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتیتم الغائط لا تستقبلوا القبلۃ ولا تستدبروھا لکن شرّقوا او غرّبوا۔[1] (الجامع الترمذی ج۱ ص۸ باب فی النہی عن استقبال القبلۃ بغائط الخ)

گھاس وغیرہ سے استنجاء کرنے کا حکم

سوال:۔ گھاس اور درخت کے پتوں یا ہڈی سے استنجاء کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ ہر ذی شرف یا حیوان یا جن یا انسان کے ماکولات سے شریعتِ مقدسہ نے استنجاء کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چونکہ گھاس اور درختوں کے پتے مویشیوں کی خوراک ہے اور ہڈی میں جنات کے لیے خوراک ہے، اس لیے ان کے ساتھ استنجاء کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وکرہ تحریماً بعظم وطعام وروث یابس کعذرۃ یابسۃ.....و فحم وعلف حیوان۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۳۳۹،۳۴۰ باب الانجاس، فصل فی الاستنجاء)[2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: کما کرہ تحریماً استقبال قبلۃ واستدبارھا لاجل بول او غائط.....ولو فی بنسیان لاطلاق النہی۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۳۴۱ فصل فی الاستنجاء)
وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۸ فصل فی الاستنجاء۔

[2] وفی الھندیۃ: ویکرہ الاستنجاء بالعظم والروث والرجیع والطعام واللحم والزجاج والخزف وورق الشجر والشعر۔ (الھندیۃ ج۱ ص۵۰ الفصل الثالث فی الاستنجاء)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۴۲،۲۴۳ فصل فی الاستنجاء۔

استنجا کرکے ہاتھ دھونے کے باوجود بدبو محسوس ہونے کا حکم

سوال:۔ پانی سے استنجا کرنے کے بعد ہاتھوں پر کبھی کبھی بدبو محسوس ہوتی ہے جبکہ ہاتھوں پر نجاست کا کوئی وجود بھی نہیں ہوتا، کیا اس طرح بدبو کی موجودگی میں ہاتھ پاک ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ پانی سے استنجا کرنے کے بعد ہاتھوں پر بدبو رہ جائے تو بدبو کی موجودگی میں ہاتھ پاک ہیں جیسا کہ ہندیہ میں ہے: وتطھر الید مع طھارۃ موضع الاستنجاء۔ (الھندیۃ ج۱ ص۴۹) لیکن بہتر یہ ہے کہ استنجاء کے بعد دوبارہ بھی ہاتھوں کو دھویا جائے تاکہ خوب تنقیہ و نظافت حاصل ہوجائے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے: ویغسل یدہ کما یکون یغسلھا قبلہ لیکون أتقی وانظف وقد روی ان النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) غسل یدہ بعد الاستنجاء ودلک یدہ علی الحائط، کذا فی التجنیس۔ (الھندیۃ ج۱ ص۴۹ الفصل الثالث فی الاستنجاء)

عورتوں کے لیے بھی ڈھیلے کا استعمال ضروری ہے

سوال:۔ مرد کے لیے تو پیشاب و پاخانہ کے بعد ڈھیلے سے استنجاء ضروری ہے تو کیا عورتوں کے لیے بھی یہی حکم ہے؟

الجواب:۔ ڈھیلے کے ساتھ استنجاء کرنا جس طرح مردوں کے لیے مستحب ہے[۱] اسی طرح عورتوں کے لیے بھی مستحب ہے، ڈھیلے سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے مزید پاکی حاصل کرنا زیادہ اولیٰ ہے البتہ مردوں پر استبراء ضروری ہے عورتوں پر نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قلتُ بل صرح فی الغزنویۃ بانھا تفعل کما یفعل الرجل الا فی الاستبراء فانھا لا استبراء علیھا بل کما فرغت من البول والغائط تصبر ساعۃ لطیفۃ ثم تمسح قبلھا ودبرھا بالاحجار ثم تستنجی بالماء۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۳۷ فصل فی الاستنجاء)[۲]

---

[۱] قال الشیخ عبد الحی الکھنویؒ: بزوال عین نجاست وجرمش طہارت بدن میشود واما اثر نجاست یعنی رنگ و بوئی، پس باید کہ بآب شستہ ایں را زائل نماید و از ہمیں جاست کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک خود را بعد استنجاء میشوئید و بر دیوار مے مالید تا اثر باقی نماند و اگر ازالہ آں دشوار بود یعنی محتاج صابون وغیرہ باشد بقاء آں لاباس بہ است الخ۔ (مجموعۃ الفتاوی (فارسی) ج۳ ص۳۳،۳۴ فصل فی الاستنجاء)

[۲] وفی الھندیۃ: والمرأۃ تفعل فی جمیع الاوقات مثل ما یفعل الرجل فی الشتاء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۴۸ الفصل الثالث فی الاستنجاء)

صرف ڈھیلے سے استنجا پر اکتفاء کرنا

سوال:- اگر کوئی شخص ڈھیلے سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے استنجا کرنا بھول جائے اور فوراً وضوء کر کے نماز شروع کرے تو کیا اس شخص کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ بہتر اور افضل یہی ہے کہ پانی اور ڈھیلے دونوں سے استنجا کیا جائے ورنہ ایک پر اکتفاء بھی جائز ہے، اس لیے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ڈھیلے سے کیے ہوئے استنجاء پر اکتفاء کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز درست ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اعلم ان الجمع بین الماء والحجر افضل ویلیہ فی الفضل الاقتصار علی الماء ویلیہ الاقتصار علی الحجر وتحصل السنۃ بالکل وان تفاوت الفضل کما افادہ فی الامداد وغیرہ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۳۸ فصل فی الاستنجاء)[1]

پیشاب کرتے وقت سورج یا چاند کی طرف منہ کرنا

سوال:- کیا چاند و سورج کی طرف منہ کر کے پیشاب، پاخانہ کرنا جائز ہے؟ اور اگر جائز نہیں تو سورج یا چاند بادلوں میں مستور ہوں تو بھی یہی حکم ہے یا نہیں؟

الجواب:- فقہی ذخائر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب، پاخانہ کرتے وقت سورج، چاند یا تیز ہوا کی طرف منہ کرنا مکروہ ہے، البتہ اگر سورج یا چاند بادلوں میں چھپے ہوئے ہوں تو اس صورت میں پیشاب کرتے وقت ان چیزوں کی طرف منہ کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والذی یظھر ان المراد استقبال عینھما مطلقاً لا جھتھما ولا ضوءھما وانہ لو کان ساتر یمنع عن العین ولو سحاباً فلا کراھۃ وان الکراھۃ اذا لم یکونا فی کبد السماء۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۴۲ باب الاستنجاء)[2]

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: والافضل فی کل زمان الجمع بین استعمال الماء والحجر مرتبا فیمسح الخارج ثم یغسل المخرج۔۔۔ ویجوز ای یصح ان یقتصر علی الماء فقط وھو یلی الجمع بین الماء والحجر فی الفضل او الحجر وھو دونھما فی الفضل۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۳۶ فصل فی الاستنجاء)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۴۸ الفصل الثالث فی الاستنجاء۔

[2] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ استقبال عین الشمس والقمر لانھما آیتان عظیمتان اھ قال السید احمد الطحطاوی تحت قولہ یکرہ استقبال الخ اطلاق الکراھۃ یقتضی التحریم وقید بالعین اشارۃ الی انہ لو کان فی مکان مستور ولم تکن عینھا بمرأی منہ لا یکرہ بخلاف القبلۃ الخ (طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۲۱ فصل فی الاستنجاء)

استنجاء سے عاجز شخص کیلئے استنجاء کا حکم

سوال: میرے ایک رشتہ دار کے دونوں ہاتھ روس کے ساتھ جہاد میں کٹ گئے ہیں اور وہ غیر شادی شدہ ہے تو کیا اس کو استنجاء کروانا ضروری ہے؟

الجواب: جو شخص بذاتِ خود استنجاء سے عاجز ہو، چاہے بیماری کی وجہ سے ہو یا ہاتھ کٹ گئے ہوں اور اس کی بیوی یا باندی بھی نہ ہو اور خود کسی بھی صورت میں استنجاء کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے استنجاء کرنا معاف ہے، البتہ اگر صرف ایک ہاتھ سے عاجز ہو تو جہاں تک ہو سکے استنجاء کرے ورنہ بصورتِ مجبوری معاف ہے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: الرجل المریض اذا لم یکن له امرأة ولا امة وله ابن او اخ وهو لا یقدر علی الوضوء قال یتوضئه ابنه او اخوه غیر الاستنجاء فانه لا یمس فرجه ویسقط عنه والمرأة المریضة اذا لم یکن لها زوج وهی لا تقدر علی الوضوء ولها بنت او اخت توضئها ویسقط عنها الاستنجاء اھ ولا یخفی ان هذا التفصیل یجری فیمن شلت یداه لانه فی حکم المریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۱ ص۱۰۲ کتاب الطہارۃ) [۱]

مرد اور عورت کے استنجاء میں فرق

سوال: مرد اور عورت کے استنجاء میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

الجواب: مرد اور عورت کے استنجاء میں کوئی فرق نہیں، یعنی جس طرح پانی اور ڈھیلے دونوں مرد استعمال کر سکتا ہے عورت کیلئے بھی جائز ہے، البتہ مرد کیلئے استبراء (یعنی پیشاب کے بعد اتنی دیر تک انتظار کرنا کہ پیشاب کے قطرات بند ہو جائیں) ضروری ہے عورت پر اس قسم کا استبراء لازم نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: قلت بل صرح فی الغزنویة بانها تفعل کما یفعل الرجال الا فی الاستبراء فانها لا استبراء علیها بل کما فرغت من البول والغائط تصبر ساعة لطیفة ثم تمسح قبلها ودبرها بالاحجار ثم تستنجی بالماء۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۳۴۸ فصل فی الاستنجاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله سقط اصلا کمریض) وفی التاتارخانیة والرجل المریض اذا لم یکن له امرأة ولا امة وله ابن او اخ وهو لا یقدر علی الوضوء قال یتوضئه ابنه او اخوه غیر الاستنجاء فانه لا یمس فرجه ویسقط عنه والمرأة المریضة اذا لم یکن لها زوج وهی لا تقدر علی الوضوء ولها بنت او اخت توضئها ویسقط عنها الاستنجاء ولا یخفی ان هذا التفصیل یجری فیمن شلت یداه لانه فی حکم المریض۔
(رد المحتار ج۱ ص۳۴۳ فصل فی الاستنجاء)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۴۹، ۵۰ فصل فی الاستنجاء۔

[۲] قال حسن بن عمارؒ: یلزم الرجل الاستبراء والمراد طلب براءة المخرج عن اثر الرشح حتی یزول اثر البول ولا یحتاج المرأة الی ذلك بل تصبر قلیلا ثم تستنجی۔ (مراقی الفلاح ص۲۴ فصل فی الاستنجاء)
ومثله فی البحر الرائق ج۱ ص۲۴۲ باب الانجاس۔

بوجہ مجبوری دُوسرے سے استنجاء کرنا

سوال:۔ ایک شخص اتنا بیمار ہے کہ خود استنجاء کرنے سے قاصر ہے، کیا وہ کسی اور سے استنجاء کرا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص بیماری یا بیماری کے بعد کمزوری کی وجہ سے خود استنجاء کرنے پر قادر نہیں تو اس کے لیے کسی دُوسرے سے استنجاء کروانا جائز ہے بشرطیکہ اس کی بیوی یا باندی اُسے استنجاء کرائے، ان کے علاوہ کسی اور سے استنجاء کرانا درست نہیں، ایسی صورت میں اُس کے لیے استنجاء معاف ہے۔

لما فی الہندیۃ:۔ الرجل المریض اذا لم یکن لہٗ امرأۃ ولا أمۃ ولہ ابن او أخ وھو لا یقدر علی الوضوء فانہٗ یوضیہ ابنہ او اخوہ غیر الاستنجاء فانہ لا یمس فرجہ و سقط عنہ الاستنجاء کذا فی المحیط: والمرأۃ المریضۃ اذا لم یکن لھا زوج وعجزت عن الوضوء ولھا ابنۃ او اخت توضیھا و سقط عنھا الاستنجاء۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۵۰ الفصل الثالث فی الاستنجاء) [۱]

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ پتلون پہننے کی صورت میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنا پڑتا ہے، کیا کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ مجبوری عُذر کی وجہ سے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے ورنہ عمومی حالات میں آپ نے بیٹھ کر پیشاب فرمایا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے بیٹھ کر پیشاب کرنے کا حکم دیا ہے اور کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص پتلون پہنے ہوا ور بیٹھ کر پیشاب کرسکتا ہو تو اس کے لیے کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مکروہ ہے ورنہ بامرِ مجبوری کھڑے ہوکر کرنا جائز ہے لیکن پیشاب کے چھینٹوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

لما قال الحصکفیؒ:۔ وکذا یکرہ...... ان یبول قائماً او مضطجعاً او مجرداً من ثوبہ

---

[۱] قال العلامۃ فخر الدین قاضی خانؒ:۔ وکذا قالوا فی المریض اذا لم یکن لہٗ امرأۃ وعجز عن الوضوء ولہٗ ابنٌ او اخٌ فانہٗ یوضیہ الا انّہٗ لا یمس فرجہ الا من یحل لہ وطؤھا والمرأۃ المریضۃ ان لم یکن لھا زوج وعجزت عن الوضوء ولھا بنتٌ او اختٌ توضیھا ویسقط عنھا الاستنجاء۔ (الفتاوی قاضی خان علی ھامش الہندیۃ ج۱ ص۳۳ فصل فی صفۃ الوضوء)

بلا عذرٍ اھ۔ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قول ان یبول قائماً) لما ورد من النھی عنہ لقولہ عائشۃ رضی اللہ عنہا من حدثکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یبول قائماً فلا تصدقوہ ما کان یبول الا قاعداً...... فلذا قال العلماء یکرہ الا لعذر وھی کراھۃ تنزیھۃ لا تحریم۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۴۴ باب الاستنجاء) ؎۱

پیشاب کراتے وقت بچے کو قبلہ رُخ کر کے پکڑنا

سوال:۔ خواتین میں یہ عادت ہوتی ہے کہ کبھی کبھی وہ بچے کو پیشاب یا پاخانہ کے لیے قبلہ رُخ کر کے پکڑتی ہیں، اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قبلہ کی طرف استدبار و استقبال دونوں مکروہ ہے، فقہی ذخائر میں عورتوں کے اس عمل کو مکروہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ بچوں کو پیشاب یا پاخانے کے لیے قبلہ رُخ کر کے پکڑیں، اس لیے ایسے عمل سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

کما قال الحصکفیؒ:۔ وکذا یکرہ ھذہ تعم التحریمیۃ والتنزیھیۃ للمرأۃ امساک صغیر لبول او غائط نحو القبلۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۳۴۲ باب الاستنجاء) ؎۲

بیت الخلاء میں داخل ہونے کا طریقہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں نے ایک شخص سے سُنا ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بائیں پاؤں کو داخل کرنا چاہیے اور نکلتے وقت پہلے دایاں پاؤں باہر کرنا چاہیے، کیا یہ درست ہے؟

الجواب:۔ معاشرہ میں دو قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک وہ اعمال جو عظمت اور کرامت

؎۱ قال العلامۃ یوسف البنوریؒ: ان البول قائماً وان کانت فیہ رخصۃ والمنع للتادیب لا للتحریم کما قال الترمذی ولکن الیوم الفتویٰ علی تحریمہ اولیٰ حیث اصبح شعاراً لغیر المسلمین من الکفار۔ (معارف السنن ج۱ ص۱۰۷ باب ما جاء من الرخصۃ فی ذالک)

؎۲ قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ امساک الصبی نحو القبلۃ للبول۔ قال السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قول یکرہ امساک الصبی) ...... ویکرہ امساکہ حال قضاء حاجتہ نحو القبلۃ وعین القمرین ونحو ذالک۔ (الطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۴۱ باب الاستنجاء)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۴۳ فصل فی الاستنجاء۔

والے ہوتے ہیں اور دوسرے خسیس اور بے عظمت وحرمت والے اعمال، شریعتِ مقدسہ میں ہر عظمت والے عمل کو دائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم ہے اور ہر خسیس عمل کو بائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم ہے۔ چونکہ بیت الخلاء خسیس اور غیر ذی شان والے اعمال سے تعلق رکھتا ہے اس لیے بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بائیں پاؤں سے داخل ہونا چاہیئے اور نکلتے وقت دائیں پاؤں کو پہلے نکالنا چاہیئے اور یہی آداب بیت الخلاء سے ہے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی :۔ یدخل الخلاء برجلہ الیسریٰ ویخرج برجلہ الیمنیٰ لان کل ما کان من التکریم یبدا فیہ بالیمین وخلافہ بالیسار لمناسبۃ الیمین للمکرم والیسار للمستقذر۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۱ ص۲۰۳ خامساً آداب قضاء الحاجۃ)[۱]

دورانِ قضاءحاجت اگر چھینک آ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:۔ اگر قضاءحاجت کے دوران کسی کو چھینک آجائے تو کیا وہ الحمد للہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء حاجت کے دوران باتیں کرنا یا ذکر کرنا وغیرہ مکروہ ہے، البتہ اگر کسی کو دورانِ قضاء حاجت چھینک آجائے تو اس کو دل میں الحمد للہ پڑھ لینا چاہیئے، زبان سے اس کا وِرد نہ کرے۔

لما فی الھندیۃ : فان عطس حمد اللہ بقلبہ ولا یحرک لسانہ الخ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۵۰ فصل فی الاستنجاء)[۲]

قضاءحاجت کو بیٹھنے کے لیے کس وقت کپڑا اٹھائے؟

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جب کوئی شخص قضاءحاجت کیلئے

---

[۱] وفی الھندیۃ : ویستحب لہٗ عند الدخول فی الخلاء ان یقول اللّٰھمّ انّی اعوذ بک من الخُبثِ والخبائث ویقدم رجلہ الیسریٰ وعند الخروج یقدم الیمنیٰ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۵۰ فصل فی الاستنجاء)

وَمِثْلُہٗ فی معارف السنن ج۱ ص۱۲ باب مایقول اذا دخل الخلاء۔

[۲] لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : واذا عطس حمد اللہ بقلبہ ویقول بعد الاستنجاء اللّٰھمّ طھر قلبی من النفاق ۔الخ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۱ ص۲۰۶ خامساً آداب قضاء الحاجۃ)

بیت الخلاء جائے تو وہ کس وقت اپنے کپڑے کو اٹھائے ؟

الجواب:۔ قضاء حاجت کے لیے بیٹھتے وقت اپنے کپڑے کو تب اٹھائے جب وہ زمین کے قریب ہو جائے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی :۔ یستحب الا یرفع ثوبہ حتی یدنو من الارض لان ذٰلک استر لہ ولما روی ابوداؤد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا اراد الحاجۃ لایرفع ثوبہ حتی یدنو من الارض ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۱ ص ۲۰۴ خامساً آداب قضاء الحاجۃ) [۱]

بیت الخلاء میں قرآنی آیات یا احادیث کے اوراق سمیت جانا

سوال:۔ کیا قضاء حاجت کے لیے بیت الخلاء میں جاتے وقت جیب میں آیاتِ قرآنی یا احادیث کے اوراق ہوں تو ایسی حالت میں بیت الخلاء میں جانا اور قضاء حاجت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں ہر معظم شے کی تعظیم واحترام کا حکم ہے ،چونکہ آیاتِ قرآنی اور احادیث وغیرہ کے اوراق انتہائی معظم ومکرم ہیں اور بیت الخلاء میں ساتھ لے جانے سے اُن کی تحقیر ہوتی ہے اس لیے قصداً ایسا کرنے سے اجتناب کیا جائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود بیت الخلاء جاتے وقت اپنی انگوٹھی اتار لیتے تھے جس میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا البتہ اگر ایسے کاغذات جیب سے باہر رکھنے پر ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر ساتھ لے جانے میں کوئی قباحت نہیں ۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: لا یحمل مکتوباً ذکر اسم اللہ علیہ او کل اسم معظم کالملٰئکۃ والعزیز والکریم ومحمد واحمد ۔ لما روی انس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا دخل الخلاء وضع خاتمہ وکان فیہ

---

[۱] عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد حاجۃ لایرفع ثوبہ حتی یدنو من الارض ـــ قال الشیخ خلیل احمد السہارنفوری رحمہ اللہ تحت ھٰذا الحدیث وھٰذا لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن التعری فی الخلوت ۔ ایضاً وقال فاللہ احق ان یستحی منہ من الناس وھٰذا یدل علی ان جواز التعری فی الخلوت للضرورۃ فلا ینبغی ان یرفع ثوبہ قبل الضرورۃ ۔ (بذل المجھود ج ۱ ص ۱۰ باب کیف التکشف عند الحاجۃ)

محمد رسول اللہ فان احتفظ بہ واحترز علیہ من السقوط فلا بأس۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۱ ص۲۰۳ آداب قضاء الحاجۃ) ؎۱

قضاء حاجت کے دوران برش یا مسواک کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ ایک شخص قضاء حاجت کیلئے بیت الخلاء میں بیٹھا ہوا ہے مگر اسی دوران وہ مسواک بھی کر رہا ہے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء حاجت کے مستحبات میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص قضاء حاجت کے دوران قضاء حاجت کے علاوہ اور کوئی عمل نہ کرے، نہ آسمان کو دیکھے اور نہ اپنی شرمگاہ پر نظر رکھے اور نہ دائیں بائیں طرف دیکھے، اسی طرح اس دوران مسواک یا برش کرنے سے بھی اجتناب کرے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی:۔ یستحب الا ینظر الی السماء ولا الی فرجہ ولا الی ما یخرج منہ ولا یعبث بیدہ ولا یلتفت یمیناً ولا شمالاً ولا یستاک لان ذٰلک کلہ لا یلیق بحالہ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۱ ص۲۰۶ آداب قضاء الحاجۃ) ؎۲

بیت الخلاء میں بغیر جوتوں کے جانے کا حکم

سوال:۔ بعض مساجد کے استنجا خانے مسجد میں ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں جوتوں سمیت جانا صحیح نہیں، اس لیے کہ مسجد کے صحن سے گزرنا پڑتا ہے، تو کیا ایسے استنجا خانوں یا بیت الخلاء میں بغیر جوتوں کے جانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ویسے تو جوتے پہن کر بیت الخلاء وغیرہ میں جانا آداب قضاء حاجت سے ہے اور مستحب ہے، لیکن صورت مسئولہ میں مسجد کی عظمت اور حرمت کے پیش نظر جوتوں کے بغیر

؎۱ قال الشیخ خلیل احمد السہارنفوریؒ: (تحت قول النبیؐ) عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا دخل الخلاء وضع خاتمہ یعنی ینزع خاتمہ من الاصبع ثم یضعہ خارج الخلاء ولا یدخل الخلاء مع الخاتم وھذا العظیم اسم اللہ عز وجل و یدخل فیہ کلما کان فیہ اسم اللہ من القرطاس والدراھم۔ الخ (بذل المجہود ج ۱ ص۱۳ باب الخاتم یکون فیہ ذکر اللہ تعالیٰ یدخل بہ الخلاء)

؎۲ لما فی الھندیۃ: ولا ینظر لعورتہ الا لحاجۃ ولا ینظر الی ما یخرج منہ ولا یبزق ولا یمتخط ولا یتنحنح ولا یکثر الالتفات ولا یعبث ببدنہ ولا یرفع بصرہ الی السماء۔ الخ
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۵۰ فصل فی الاستنجاء)

جانے میں کوئی قباحت نہیں، تاہم مناسب یہ ہے کہ مساجد کے استنجا خانے کسی ایسی جگہ بنائے جائیں جہاں جوتوں سمیت جانا ممکن ہو۔

لما قال الشیخ وھبة الزحیلی: ان یلبس نعلیه ویستر رأسه و یأخذ احجارا لاستنجاء او یھیئ ویعد المزیل للنجاسة من ماء ونحوه۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج۱ ص۲۰۳ باب خامساً آداب قضاء الحاجة)

استعمال شدہ ڈھیلوں کے دوبارہ استعمال کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ استعمال شدہ ڈھیلے سے دوبارہ استنجاء کرتے ہیں، ازروئے شرع ڈھیلوں کے سوکھ جانے کے بعد ان سے دوبارہ استنجاء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ استنجاء بالاحجار کے لیے ضروری ہے کہ ڈھیلے وغیرہ پاک ہوں۔ اسی بناء پر فقہاء نے مستعمل ڈھیلے سے استنجاء کو ناجائز قرار دیا ہے۔ تاہم اگر ڈھیلہ بڑا ہونے کے ساتھ اس کے کئی کونے بھی ہوں تو متعدد ڈھیلوں کے حکم میں ہو کر ہر ایک کونے سے مستقل طور پر استنجاء کرنا بلاکراہت درست ہے۔

قال العلامة ابن همامؒ: ولا یجزئه الاستنجاء بحجر استنجی به مرة الا ان یکون له حرف آخر لم یستنج به۔ (فتح القدیر ج۱ ص۱۹۱ فصل فی الاستنجاء) ؎۱

؎۱ قال فی الهندیة: وکذا لا یستنجی بحجر استنجی به مرة هو او غیره الا اذا کان حجرا له احرف له ان یستنجی کل مرة بطرف لم یستنج به فیجوز من غیر کراهة کذا فی المحیط۔ (الهندیة الفصل الثالث فی الاستنجاء ج۱ ص۴۸)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی۔ باب الاستنجاء ج۱ ص۲۴۔

مسائلِ شتّٰی

(غسل اور وضو کے متفرق مسائل)

غسل اور وضو کے لیے پانی کی مقدار

سوال :۔ وضو یا غسل کے لیے کتنا پانی ہونا چاہیئے، شرعاً اس کے لیے پانی کی کوئی مقدار مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ شریعت میں وضو یا غسل کے لیے پانی کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں کہ اس سے کم و بیش پانی کے ساتھ وضو یا غسل کرنا جائز نہ ہو۔ البتہ احادیث مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو اور غسل کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع پانی سے غسل اور ایک مد پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے۔ صاع کی مقدار موجودہ حساب سے ۲۷۰ تولہ اور مد ۶۸ تولہ اور چند ماشے بنتا ہے۔

لما قال العلامة السید احمد الطحطاویؒ : واعلم انه نقل غیر واحد الاجماع علی عدم التقدیر فی ماء الوضوء والغسل بل ھو بقدر الکفایة لاختلاف طباع الناس ۔ وعن عائشة رضی اللہ عنھا جرت السنة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الغسل من الجنابة صاع ثمانیة ارطال وفی الوضوء رطلان ھما مد فالمد ربع صاع ۔ (طحطاوی ص۶۳ کتاب الطہارۃ، فصل فی المکروہات) لہ

گنجے سر والے آدمی کے چہرے کی حدود کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! فقہ کی بعض کتابوں میں چہرے کی حد سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے اور ایک کان سے دوسرے کان تک

لہ قال العلامة الکاسانیؒ : مقدار الماء الذی یغتسل به فقد ذکر فی ظاهر الروایة وقال ادنی ما یکفی فی الغسل من الماء صاع وفی الوضوء مد..... ثم هذا التقدیر الذی ذکره محمدؒ من الصاع والمد فی الغسل والوضوء لیس بتقدیر لازم بحیث لا یجوز النقصان عنه او الزیادة علیه بل هو بیان مقدار ادنی الکفایة عادة حتی من اسبغ الوضوء والغسل بدون ذلك اجزاه وان لم یکفه زاد علیه لان طباع الناس واحوالهم تختلف ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۵ مطلب اداب الوضوء)

مذکور ہے، اب اگر کسی شخص کے سر کے نصف سے بال شروع ہوتے ہوں تو اس بارے میں اس کو کیا کرنا چاہیئے ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام کی عبارات میں جو یہ مذکور ہے کہ چہرے کی حد سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ عام طور پر جہاں سے سر کے بال اُگنے شروع ہوتے ہیں یعنی عرف میں بال اُگنے کی جو حد ہو اس کا اعتبار ہے، اس لیے جو آدمی بالکل گنجا ہو یا اس کے بال سر کے نصف سے شروع ہوتے ہوں تو اُسے عرف کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : وَحَدّہ ای جملۃ الوجہ طولاً من مبداء سطح الجبہۃ سواء کان بہ شَعْر ام لا ۔ قال السید احمد الطحطاویؒ : (قولہ سواء کان بہ شعر ام لا) اشار بہ الیٰ ان الأغم والاصلع والاقرع والانزع فرض غسل الوجہ منہم ماذکر۔ (طحطاوی و مراقی الفلاح ص۵۲ احکام الوضوء)[۱]

نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسواک کرنے کا حکم

سوال :۔ کیا رات کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسواک کرنا مسنون ہے یا ہر نیند (چاہے دوپہر کا قیلولہ ہو یا رات کی نیند) سے اٹھنے کے بعد مسواک کرنا مسنون ہے ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے مطلقاً نیند سے جاگنے کے بعد مسواک کرنے کو مستحب لکھا ہے چاہے رات کی نیند ہو یا دوپہر کا قیلولہ، اس لیے ہر نیند سے جاگنے کے بعد بعد مسواک کرنا مستحب ہے ۔

قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللّٰہ : ویستحبّ لتغیر الفم

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ : من مبداء سطح جبہتہ ای المتوضئ بقرینۃ المقام الیٰ اسفل ذقنہ ای منبت اسنانہ السفلیٰ طولاً کان علیہ شَعْر اولا عدل عن قولہم من قصاص شَعْرہ الجاری علی الغالب الی المطرد لیعم الاغم والاصلع والانزع ۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۹۷ کتاب الطہارۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۳ کتاب الطہارۃ ۔

والقیام من النوم۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۳۷ فصل سنن الوضوء) [1]

مریض کو تیمم کرانے کے لیے نیت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میری دادی بیمار اور بہت کمزور ہے، ڈاکٹروں نے اُن پر وضو وغیرہ کے لیے پانی استعمال کرنا منع کر دیا ہے، اس وجہ سے میں ان کو تیمم کراتی ہوں، تو کیا تیمم کی نیت کرنا میرے لیے لازم ہے یا میری دادی کے لیے؟

الجواب:۔ تیمم میں نیت کا وجوب ہر اُس شخص پر لازم ہے جو پاکی (طہارت) حاصل کرنا چاہتا ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں پاکی آپ کی دادی حاصل کرتی ہیں اس لیے تیمم کی نیت کرنا ان کے لیے لازمی ہے آپ کے لیے نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : مریض تیممه غیره فالنیة علی المریض دون المتیمم۔ انتهٰی۔ (الاشباہ والنظائر ج۱ ص۱۸۰ القاعدة الثانیة ۳۳۴) [2]

غسل کے چھینٹوں سے پانی نجس نہیں ہوتا

سوال: جنابت کے غسل کے دوران اگر استعمال شدہ پانی کے چھینٹے پانی کے برتن میں گر جائیں تو کیا اس باقی پانی ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ اگر جنبی آدمی کے بدن سے غسل کے دوران گرنے والے پانی کے چھینٹے صاف پانی میں گر جائیں تو اس سے صاف پانی ناپاک نہیں ہوتا، اس سے غسل کرنا جائز ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ویستحب فی خمسة مواضع اصفرار السن وتغیر الرائحة والقیام من النوم والقیام الی الصلوٰة وعند الوضوء۔

(رد المحتار ج۱ ص۱۱۳ سنن الوضوء، مطلب فی دلالة المفهوم)

وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۰ سنن الوضوء۔

[2] قال الشیخ المفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمه الله : مذکورہ لاچاری اور مجبوری کی صورتوں میں دوسرا شخص تیمم کرا دے تو تیمم ہو جائے گا مگر نیت معذور کو ہی کرنا ہو گی، تیمم کرانے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہو گا۔

(فتاویٰ رحیمیہ ج۸ ص۹۱ کتاب الطہارۃ)

لما فی الهندیۃ : جنب اغتسل فانتضح من غسلہ شئ فی انائہ لم یفسد علیہ الماء ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۲۳ الفصل الثانی فیما لا یجوز بہ التوضوء)[1]

نجس اشیاء کے دھوئیں کا حکم

سوال :۔ بسا اوقات کوڑ اکرکٹ کی جگہ دھواں سا اٹھتا ہے اگر وہ انسان کے کپڑوں پر یا اس کے بدن پر لگ جائے تو کیا اس سے بدن اور کپڑے ناپاک ہو جائیں گے یا نہیں؟

الجواب :۔ نجاست سے اٹھنے والا بھاپ نما دھواں اگر کپڑوں یا بدن پر لگ جائے تو اس سے کپڑے اور بدن نجس (ناپاک) نہیں ہوتے، اگرچہ بعض اقوال ناپاک ہونے کے بھی مروی ہیں مگر راجح قول یہ ہے کہ اس سے کپڑے یا بدن ناپاک نہیں ہوتے ۔

لما فی الهندیۃ : دخان النجاسۃ اذا اصاب الثوب او البدن الصحیح انہ لا ینجسہ۔
(الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۴۷ الفصل الثانی فی الاعیان النجسۃ)[2]

شیر خوار بچے کی قئے کا حکم

سوال :۔ اگر چھوٹا شیر خوار بچہ کسی پر قئے کر دے تو کیا اس کی قئے پاک ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قئے جب منہ بھر کے آئے تو مطلقاً نجس ہے چاہے بڑے آدمی کے معدے سے آئے یا شیر خوار بچے کے منہ سے، تاہم اگر قئے منہ بھر کے نہ آئے تو ناپاک نہیں ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ینقضہ قئ ملأفاہ من مرۃ او علق او طعام او ماء اذا وصل الی معدتہ وان لم یستقر وهو نجس مغلظ ولو من صبی ساعۃ ارتضاعہ وهو الصحیح۔ لمخالطۃ النجاسۃ ذکرہ الحلبی ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۱۳۷ مطلب نواقض الوضوء)

---

[1] قال العلامۃ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : جنب اغتسل فانتضح من غسلہ شئ فی انائہ لم یفسد علیہ الماء ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۸ کتاب الطهارت ، الفصل الاول)

[2] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ : وبخار الکنیف والاصطبل والحمام اذا قطر لا یکون نجسا استحسانا ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۳۲ قبل الفصل یطهر جلد المیتۃ)

چھوٹے بچے کا پانی میں ہاتھ ڈالنا

سوال:- اگر کوئی چھوٹا بچہ پانی کے مٹکے میں ہاتھ ڈال دے تو اس پانی کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں پانی کی طہارت اور ناپاکی بچے کے ہاتھوں کی طہارت اور ناپاکی پر منحصر ہے، اگر بچے کے ہاتھ یقینی طور پر پاک وصاف ہوں تو بلاشبہ پانی بھی پاک ہے اور اگر بچے کے ہاتھ نجس ہوں تو پانی بھی ناپاک ہے تاہم اگر شک کی سی صورت پیدا ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس پانی کو استعمال نہ کیا جائے اور اگر استعمال کر بھی لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قال العلامة فخرالدين قاضي خانؒ: وكذا الصبي اذا ادخل يده في البئر او في الاناء لايتوضأ منه استحسانًا مالم يتنزح وان لم ينزح وتوضاء جاز۔
(فتاوىٰ قاضي خان على هامش الهندية ج۱ ص۹ فصل في البئر)۔

وضو کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص وضو کر رہا ہو اور اسی اذان شروع ہو جائے تو کیا یہ شخص وضوء کی دعائیں پڑھے یا اذان کا جواب دے، شرعًا کون سا عمل افضل ہے؟

الجواب:- وضو کرتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا اور اذان کا جواب دینا دونوں سنت ہیں، لہٰذا دونوں میں سے جو بھی چاہے پڑھ سکتا ہے، تاہم اذان کا جواب دینا زیادہ بہتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان سننے والے کو سلام کا جواب دینا بھی مناسب نہیں، حالانکہ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

قال العلامة الكاسانيؒ: ولا ينبغي ان يتكلم السامع في حال الاذان والاقامة ولا يشتغل بقراءة القرآن ولا بشئ من الاعمال سوى الاجابة ولو كان في القرأة ينبغي ان يقطع ويشتغل بالاستماع والاجابة۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۱۵۵ فصل ما يجب على السامعين عند الاذان) [1]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: وينبغي للسامع ان لا يتكلم ولا يشتغل بشئ في حالة الاذان والاقامة ولا يرد السلام ايضًا لان الكل يخل بالنظم۔
(ردّ المحتار ج۱ ص۳۹۹ باب الاذان۔ مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد)

تیمم کے جواز کے لیے مسافت کی تحدید | **سوال** :- پانی کتنی مسافت کی دوری پر ہو تو تیمم کرنا جائز ہوتا ہے؟

الجواب :- جب آدمی سے پانی ایک میل کے فاصلے پر ہو تو تیمم جائز ہے، اور میل سے مراد چار ہزار ذراع ہے یعنی جب آدمی سے چاروں طرف ایک ایک میل کا فاصلہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ومن عجز عن استعمال الماء الخ لبعده و لو مقیماً فی المصر میلاً اربعة آلاف ذراع وهو اربع عشرون اصبعاً وهی ست شعیرات ظهر لبطن و ست شعرات بغل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۲۳۳ باب التیمم) [1]

کوئلہ سے تیمم کرنا | **سوال** :- کوئلہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) جبلی (پہاڑی) کوئلہ جو کہ کان سے نکالا جاتا ہے، اور ایک وہ جو لکڑی کو جلا کر اس سے کوئلہ بنایا جاتا ہے کیا جبلی (پہاڑی) کوئلہ اور اس کی بنی ہوئی راکھ پر تیمم کرنا جائز ہے؟

الجواب :- جبلی کوئلہ چونکہ حکماً پتھر ہے اس لیے یہ جنس الارض سے شمار ہوگا جس پر تیمم صحیح اور درست ہے، اسی طرح اس کی راکھ پر بھی تیمم صحیح ہے۔

قال الحصکفیؒ: ومترمد بالاحتراق الا رماد الحجر فیجوز کحجر مدقوق اومغسول۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۲۴۰ باب التیمم) [2]

راکھ پر تیمم کرنے کا حکم | **سوال** :- راکھ پر تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- تیمم کے لیے جنس الارض ہونا ضروری ہے، فقہاء کرام نے جنس الارض کی پہچان کے بارے میں فرمایا ہے کہ جنس الارض ہر وہ شے ہے جو جلانے سے

---

[1] وفی الهندیة: یجوز التیمم لمن کان یعیداً من الماء میلاً هو المختار فی المقدار سواء کان خارج المصر اوفیه وهو الصحیح وسواء کان مسافراً اومقیماً..... ان المیل هو ثلث الفرسخ اربعة آلاف ذراع طول کل ذراع اربع وعشرون اصبعاً وعرض کل اصبع ست حبات شعیر ملحقة ظهر البطن۔ (الهندیة ج ۱ ص ۲۷ الباب الرابع فی التیمم)

[2] قال الشیخ خلیل احمد: بندہ کے نزدیک جبلی کوئلہ اور اس کی راکھ پر تیمم کرنا جائز ہے کیونکہ ان کا حکم حجر کا ہوگا۔ (فتاوی خلیلیہ جلد ۱ ص ۷۵ کتاب الطهارة، باب التیمم)

نہ راکھ بنے اور نہ پگھل جائے۔ چونکہ راکھ اُس شے سے بنتی ہے جو جل کر راکھ بن جاتی ہے جس پر جنس الارض کی تعریف صادق نہیں آتی، اس لیے طہارت کے باوجود اس سے تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: جنس الارض فکل ما یحترق بالنار فیصیر رماداً کالحطب والحشیش ونحوھما او ما ینطبع ویلین کالحدید والصفر والنحاس والزجاج وعین الذھب والفضۃ ونحوھا فلیس من الارض وما کان بخلاف ذٰلک فھو من جنسھا۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۵۳ فصل فی بیان ما یتیمم بہ)[۱]

گدا یا تکیہ پر تیمم کا حکم

سوال:۔ ایک شخص صاحبِ فراش ہے اور ڈاکٹروں نے اس کو پانی کے استعمال سے منع کیا ہوا ہے، کیا وہ گدا یا تکیہ پر تیمم کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا صاحبِ فراش جس کو ڈاکٹروں نے پانی کے استعمال سے منع کیا ہو اس کیلئے گدا اور تکیہ پر تیمم کرنا جائز ہے جبکہ اس پر غبار ہو جیسا کہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:۔

والصحیح قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ: وصورۃ التیمم بالغبار ان یضرب بیدہٖ ثوباً او لبداً او وسادۃً او ما اشبھھا من الاعیان الطاھرۃ التی علیھا غبار فاذا وقع الغبار علیٰ یدہ تیمم۔ اھ (تاتارخانیۃ ج۱ ص۲۴۰ باب التیمم)[۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: ما یحترق بالنار فیصیر رماداً کالحطب والحشیش ونحوھما او ما ینطبع ویلین کالحدید والصفر والزجاج وعین الذھب والفضۃ ونحوھا فلیس من جنس الارض وما کان بخلاف ذٰلک فھو من جنسھا۔

(الھندیۃ ج۱ ص۲۶ الباب الرابع فی التیمم، الفصل الاول)

[۲] قال ابراھیم الحلبیؒ: ولا یجوز عندنا بما لیس من جنس الارض وھو ما یلین بالنار او یترمد کالذھب والفضۃ والحدید والرصاص والصفر والنحاس ونحوھا مما ینطبع ویلین بالنار وکالحنطۃ وسائر الحبوب والاطعمۃ من الفواکۃ وغیرھا وانواع النباتات مما یترمد بالنار اذا لم یکن علیھا غبار وان کان علیٰ ھذہ الاشیاء المذکورۃ غبار یجوز التیمم بغبارھا عند ابی حنیفۃ۔ الخ (کبیری ص۷۰ باب التیمم)

ومثلہٗ فی مجموعۃ الفتاویٰ ج۱ ص۱۲۸ کتاب الطھارۃ۔

ایک ہی جگہ پر متعدد بار تیمم کرنا

سوال:۔ ایک ہی جگہ پر بار بار تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک ہی ڈھیلے یا جگہ پر بار بار تیمم کرنا فقہاء کرام کی تصریحات سے جواز معلوم ہوتا ہے، اس لیے ایک جگہ پر بار بار تیمم کرنا جائز ہے۔

لما قال العالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا تیمم مراراً من موضع واحد جاز۔

(التاتارخانیۃ ج ۱ ص۲۴۲ قبل نوع من یجوز لہ التیمم ولا یجوز لہ)[1]

تلاوت قرآن کیلئے کئے گئے تیمم سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ جو تیمم تلاوت یا دیگر اذکار کیلئے کیا جائے اُس سے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ جس کیلئے طہارت شرط ہے، مثلاً نماز، سجدۂ تلاوت وغیرہ۔ (۲) وہ جس کے لیے طہارت شرط نہیں، مثلاً تلاوتِ قرآن، دخولِ مسجد، تعلیمِ دین وغیرہ۔

اب اگر تیمم ان عبادات کے لیے کیا جائے جن کے لیے طہارت شرط ہے تو اس تیمم سے جملہ عبادات ادا کرنا جائز ہے اور اگر تیمم اُس عبادت کے لیے کیا گیا ہو جن کے لیے طہارت شرط نہیں تو اس سے وہ عبادات جن کے لیے طہارت شرط ہے، ادا کرنا صحیح نہیں۔ لہٰذا تلاوتِ قرآن یا دیگر اذکار کے لیے چونکہ طہارت شرط نہیں اس لیے اس تیمم سے نماز پڑھنا بھی درست نہیں۔

لما قال الحصکفیؒ: لو تیمم لدخول مسجد اولقرأۃ ولو من مصحفہ.... لم تجز الصلوٰۃ بہ عند عامتہ ــــ قال ابن عابدینؒ: (قولہ لم تجز الصلوٰۃ بہ) ای لفقد الشرط، وھو امران: کون المنوی عبادۃ مقصودۃ وکونہا لا تحل الا بالطھارۃ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۲۴۵ باب التیمم)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: واذا تیمم مراراً من موضع واحد جاز کذا فی التاتارخانیۃ۔

(الھندیۃ ج ۱ ص۳۱ الباب الرابع التیمم، الفصل الثالث فی المتفرقات)

[2] قال ابن نجیمؒ: وصرحوا بانہ لو تیمم لدخول المسجد والقرأۃ ولو من المصحف او مسہ او زیارۃ القبور.... لا تجوز الصلوٰۃ بذلک التیمم عند عامۃ المشائخ لان بعضہا لیست بعبادۃ مقصودۃ وان کان عبادۃ مقصودۃ لکن یصح بدون الطھارۃ۔ (البحرالرائق ج ۱ ص۱۵ باب التیمم)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۲۶ الباب الرابع فی التیمم، الفصل الاول۔

تنگیٔ وقت کی وجہ سے تیمم کرنا درست نہیں

سوال:۔ اگر کسی کو ایسا واقعہ پیش آئے کہ غسل کی بھی ضرورت ہے اور نماز کا وقت بھی کم ہے، کیا تنگیٔ وقت کی وجہ سے تیمم کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ وقت کی تنگی کوئی ایسا عذر شرعی نہیں کہ جس کی وجہ سے غسل کو چھوڑ کر تیمم پر اکتفاء کیا جائے بلکہ ہر حال میں غسل کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ :لایتیمم لفوت جمعۃ ووقت ولو وتراً لفواتہا الی بدلٍ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۲۴۶ باب التیمم) [1]

جیل خانہ میں پانی نہ ملنے پر تیمم کا حکم

سوال:۔ افغانستان اور کشمیر کے جہاد میں جو لوگ کفار کی جیلوں میں محبوس ہیں اگر دشمن باوجود پانی کی موجودگی کے ان کو وضو یا غسل کے لیے نہ چھوڑیں تو کیا یہ لوگ تیمم کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ تیمم کے جواز کے لیے پانی پر عدم قدرت ضروری ہے اور یہ عدم قدرت چاہیے مسافت کی وجہ سے ہو یا مرض کی وجہ سے یا دشمن کی وجہ سے ہو تو ان تمام صورتوں میں تیمم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے، لہٰذا اگر قیدی تیمم کر کے نماز ادا کریں تو جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : من عجز عن استعمال الماء.....لبعدہٖ ولو مقیماً فی المصر میلاً.....اولمرضٍ یشتد اَویمتد بغلبۃ ظن اوقول حاذق مُسلم.......او برد یہلك الجنب اوبمرضہ.....اوخوف عدوٍّ کحیۃ او نار علیٰ نفسہ ولو من فاسق اوحبس غریم اومالہ......اوعطش ولو لکلبہ اورفیق القافلۃ حالاً اوماٰلاً۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۲۳۲تا۲۳۵ باب التیمم) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابراہیم الحلبیؒ : ولوخاف خروج الوقت لواشتغل بالوضوء فی سائر الصلٰوۃ ماعدا صلوٰۃ الجنازۃ والعید لایتیمم عندنا۔ (کبیری ص۸۳ فصل فی التیمم)

[2] قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ : (ومنہ خوف عدوٍّ) آدمی اوغیرہ سواء خافہ علی نفسہ اَومالہ اَو امانتہ اوخافت فاسقاً عند الماء اوخاف المدیون المفلس الحبس ولا اعادۃ علیہم ولا علیٰ من حبس فی السفر بخلاف المکرہ علیٰ ترك الوضوء فتیمم فانہٗ یعید الصلوٰۃ۔

(مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۹۲ باب التیمم)

زخمی تیمم کرسکتا ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص اتنا زخمی ہو کہ اس کے لیے غسل کرنا ممکن نہ ہو تو اس کے غسل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص کے نصف بدن یا اس سے زیادہ پر زخم ہوں تو وہ شخص تیمم کرسکتا ہے البتہ اگر بدن کے زخم کم ہوں اور غسل کرنا ممکن ہو تو وہ شخص غسل کرے گا اور زخم کی جگہوں پر مسح کرے گا، اور اگر زخم کم ہوں لیکن پانی کے اثر سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو پھر بھی تیمم جائز ہے۔

ویجوز التیمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان یقتله البرد او یمرضه :۔ وان کان به جراحات یعتبر الاکثر محدثاً کان اوجنباً ففی الجنابة یعتبر اکثر البدن وفی الحدث یعتبر اکثر اعضاء الوضوء فان کان الاکثر صحیحاً والاقل جریحاً یغسل الصحیح ویمسح علی الجریح ان امکنه وان لم یمکنه المسح یمسح علی الجبائر اوفوق الخرقة ولایجمع بین الغسل والتیمم۔ (الهندیة ج ۱ ص ۲۸) [1]

سرد علاقوں میں تیمم کا حکم

سوال:۔ کیا جنب آدمی سخت سرد علاقوں مثلاً سوات، سیاچین وغیرہ میں سردی کی وجہ سے نماز اور دوسری عبادات کے لیے تیمم کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تیمم کی مشروعیت پانی نہ ملنے یا قدرت نہ رکھنے کی صورت میں ہے بلا عذر شرعی تیمم سے طہارت حاصل نہیں ہوتی، سخت سردی بھی تیمم کے لیے عذر شرعی ہے لیکن تب جب پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو اور ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کی صورت میں بیماری بڑھنے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ ہو، البتہ صرف وضو ٹھنڈے پانی سے کیا جائے گا اس لیے کہ وضو میں نقصان کا خوف زیادہ نہیں ہوتا۔

لما قال الحصکفیؒ :او برد یهلك الجنب او یمرضه ولوفی المصر اذا لم تکن له اجرة الحمام ولا ما یدفئه۔ قال العلامة ابن عابدینؒ : قید بالجنب لان المحدث لایجوز له التیمم للبرد فی الصحیح۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۳۳ باب التیمم)

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ : او المرض یشتد او یمتد بغلبة ظن اوقول حاذق مسلم ولو بتحرك۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص ۲۳۳ باب التیمم)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۱ ص ۴۱۸ باب التیمم، المرض او بطء البرء۔

نمک پر تیمم کرنے کا حکم | **سوال**:۔ جناب محترم مفتی صاحب! ایک آدمی نمک کی کان میں کام کرتا ہے، اگر وہاں اس کو تیمم کی ضرورت پڑ جائے اور گرد و نواح میں مٹی بھی موجود نہ ہو تو کیا یہ شخص نمک پر تیمم کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پہاڑی نمک چونکہ زمین ہی کے اجزاء میں سے ہے اس لیے اس پر تیمم کرنا شرعاً جائز ہے، تاہم جو نمک سمندر کے پانی سے بنا ہوا ہو اس پر تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

کما قال العلامة ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: ولو تیمم بالملح نظر ان کان مائیا ای کان ماء فجمد لا یجوز لانہ لیس من اجزاء الارض وان کان جبلیا ای معدنیا وھو ما استحال ملحا من اجزاء الارض یجوز بہ التیمم لانہ جنس الارض۔

(کبیری ص۷۶ باب التیمم)[1]

ایک ہی ڈھیلے پر بار بار تیمم کرنے کا حکم | **سوال**:۔ جناب مفتی صاحب! ایک شخص اتنا بیمار ہے کہ وہ چارپائی سے نیچے نہیں اتر سکتا، اس نے تیمم کرنے کے لیے اپنے پاس مٹی کا ایک ڈھیلا رکھا ہوا ہے اور وہ اس پر بار بار (ہر نماز کے لیے) تیمم کرتا ہے، تو کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟ یا یہ کہ ہر تیمم کے لیے مٹی کا نیا ڈھیلا لینا پڑے گا؟

الجواب:۔ جو شخص بیمار ہو اور طبیب کے نزدیک پانی کا استعمال اس کے لیے مضر ہو تو شرعاً اس کے لیے تیمم کرنا جائز ہے۔ اب چاہے تو بیمار مٹی کے ایک ہی ڈھیلے یا جگہ پر بار بار تیمم کرے یا ہر بار تیمم کے لیے نئی جگہ یا ڈھیلا استعمال کر سکتا ہے، شرعاً اس بارے میں گنجائش ہے۔

لما فی الھندیة: اذا تیمم مراراً من موضع واحد جاز کذا فی التاتارخانیة۔

(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۲۶ باب التیمم)

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: اختلفوا فی الجبلی والصحیح ھو الجواز۔
(فتاوی قاضی خان ج۱ ص۶۲ فصل فیما یجوز بہ التیمم)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۱ ص۱۴۷ باب التیمم۔

نائلون کی جرابوں پر مسح کرنے کا حکم

نائلون کی موٹی جرابوں پر مسح کے بارہ میں حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ اور مولانا محمد فرید صاحب مفتی دارالعلوم حقانیہ کا یہ تحقیقی فتویٰ دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا تھا، فتویٰ کی اہمیت کے پیش نظر اب اسے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

فی الدر المختار او جوربیہ ولو من غزل او شعر الثخینین بحیث یمشی فرسخا ویثبت علی الساق بنفسہ ولا یری ما تحتہ ولا یشف الخ۔ (حلبی کبیر ص۱۲۱)
وحد الجورب الثخینین ان یستمسک ای یثبت ولا ینسدل علی الساق من غیر ان یشد بشی ھکذا فسروہ کلھم وینبغی ان یقید بما اذا لم یکن ضیقا فانا نشاھد مایکون فیہ ضیق یستمسک علی الساق من غیر شد ولو کان من الکرباس۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ جرابوں پر مسح کرنا مشروط ہے چند شرائط کے ساتھ۔ اوّل یہ کہ گاڑھی اور اتنی موٹی ہوں کہ اگر صرف جرابیں پہن کر کم از کم تین میل ان میں چلا جائے، اُسے باندھا بھی نہ ہو اور وہ پنڈلی پر سے نہ اُتریں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے فوری طور پر پانی نہ چھنے۔ کما صرح بھذا القید فی الشرح الکبیر ص۱۰۹۔ تیسرے یہ کہ ان کے اندر سے کوئی چیز نظر نہ آئے، یعنی اگر آنکھ لگا کر اس میں سے دیکھیں تو کچھ دکھائی نہ دے۔ چوتھے یہ کہ پنڈلی سے نہ گرنا تنگی کی وجہ سے نہ ہو۔

پس نائلون کی جرابیں جتنی ہمارے مشاہدہ میں آئی ہیں اُن میں یہ شرائط موجود نہیں ہیں، کیونکہ نائلون میں ربڑ کی طرح پھیلنے اور سکڑنے کی خاصیت موجود ہے تو پہننے کے بعد اُن کا نہ گرنا انقباض اور تنگی کی وجہ سے ہے، پھر بسا اوقات تھوڑی سی مسافت طے کرنے کے بعد وہ پنڈلی سے گر جاتی ہیں کما لا یخفی علی من جرب۔ اور جب ان جرابوں میں سے اتنا کھینچ کر

دیکھا جائے جتنا ان کے پہننے کے وقت کھینچا جاتا ہے تو ان سے ہر چیز دکھائی دیتی ہے، پھر فوری طور پر ان میں سے پانی بھی چھنتا ہے بخلاف ٹاٹ کی جرابوں کے۔ تو اس بنا پر ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر نائلون کی ایسی جرابیں موجود ہوں جن میں یہ تمام شرائط موجود ہوں تو پھر مفتیٰ بہ قول کے مطابق ان پر مسح کرنا جائز ہوگا۔ ھٰذا ما عندی و لعل عند غیری احسن من ھٰذا۔ (مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہٗ)

اس مسئلہ کے متعلق مزید وضاحت کیلئے حضرت العلامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی رحمہ اللہ سے بھی استفسار کیا گیا تھا، حضرت افغانیؒ کی تحقیق حسب ذیل ہے:۔

تخینین کے بارہ میں کتب فقہ میں سے رد المحتار جلد ۱ ص ۱۸۸ کی عبارت ذیل تخینین کے تحت ملاحظہ ہو:۔

بحیث یمشی فرسخاً و یثبت علی الساق بنفسہ و لا یری ما تحتہ و لا ینشف (الدر) وفی الدر و فی بعض الکتب ینشف وفسر فی الخانیۃ الاول بان لا ینشف الجورب الماء الی نفسہ کالادیم والصرم وفسر الثانی بان لا یجاوز الماء الی القدم وقال تحت بنفسہ ای من غیر شد اھ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جواز مسح علی التخینین کے لیئے ثخانۃ کا وجود ضروری ہے جو کہ امور ثلاثہ سے متحقق ہوتا ہے۔ (۱) شرعی تین میل یا اس سے زیادہ بغیر جوتے کے آدمی اس میں چل سکے (۲) باندھنے کے بغیر پنڈلی سے پیوست رہے (۳) پانی اگر اس پر ڈالا جائے تو اندر نہ جا سکے ۔۔ ان تین امور کا مجموعہ بالخصوص امر سوئم نائلون کی جراب میں متحقق نہیں لہٰذا مسح درست نہیں۔ اس میں احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ قرآن پاک میں غسل الرجلین مذکور ہے جو قطعی ہے اور احادیث مسح علی الخفین متواتر یا مشہور ہیں، اس لیئے تخصیص کے لیے کافی ہیں۔ مسح علی الجوربین فقط میں میرے نزدیک ایسی صحیح السند، صریح الدلالۃ احادیث شہرت کے درجہ میں موجود نہیں اور قیاس علی الخفین کے لیے ان سے مشاکلہ اور مشابہت قویہ کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم۔

(احقر شمس الحق افغانی بہاولپور)

مجلدین و منعلین جرابوں کا کیا حکم ہے

سوال:۔ فقہی ذخائر میں پڑھا ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز نہیں مگر مجلدین یا منعلین جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے، تو مجلدین، منعلین کا کیا مطلب ہے؟

الجواب:۔ مجلد یا منعل جراب کا مطلب یہ ہے کہ منعل اُس جراب کو کہا جاتا ہے جس کے نیچے چمڑا لگا ہوا ہو اور مجلد وہ ہے کہ تمام جراب پر چمڑا چڑھا ہوا ہو۔

قال الحصکفیؒ: بسکون النون ما جعل علیٰ اسفله جلدة۔ وقال ابن عابدینؒ (قوله ما جعل علیٰ اسفله جلدة) ای کالنعل للقدم وھٰذا ظاھر الروایة وفی روایة الحسن مایکون الی الکعب ابن کمال (قوله والمجلدین ما جعل الجلد علیٰ اعلاہ واسفله اھ)

(ردالمحتار ج۱ ص۲۶۹ باب المسح علی الخفین)[1]

سوتی جراب پر پہنے ہوئے بوٹ پر مسح کا حکم

سوال:۔ سوتی جراب پر تو مسح جائز نہیں البتہ اگر سردی کی وجہ سے اس جراب کے اوپر ایسے بوٹ پہن لیے جائیں جو ٹخنوں کو ڈھانپ کر رکھے۔ کیا ایسے بوٹوں پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سوتی موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں اس لیے کہ اُن پر موزے کی تعریف صادق نہیں آتی، چونکہ یہاں صورتِ مسئولہ میں بڑے بوٹ موزے کے حکم میں ہیں اس لیے ایسی صورت میں بوٹوں پر مسح کرنا درست ہے بشرطیکہ بوٹ کے نیچے کا حصہ پاک ہو۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: والخف الساتر لکعبین مأخوذ من الخفة لان الحکم به خف من الغسل الی المسح ...... صح ای جاز المسح علی الخفین فی الطھارة من الحدث الاصغر الخ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۱۰۱، ۱۰۲ باب المسح علی الخفین)[2]

---

[1] قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: جورب منعل بوضع الجلد اسفله کالنعل للقدم واذا جعل اعلاہ واسفله یقال له مجلد۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۱۰۳ باب المسح علی الخفین)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۱ ص۳۴۳ سابعًا المسح علی الجوارب۔

[2] قال الحصکفیؒ: والخف شرعًا: الساتر لکعبین فاکثر من جلد ونحوہ شرط مسحه ثلاثة امور الاوّل کونه ساتر محل فرض الغسل للقدم مع الکعب، والثانی کونه مشغولا بالرجل یمنع سرایة الحدث والثالث کونه مما یمکن متابعة المشی ..... وھو جائز ..... بسنة مشهورة۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار، باب المسح علی الخفین ص۲۶۱ تا ۲۶۵)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۱ ص۳۳۲ خلاصة الشروط فی المذھب۔

عمامہ یا ٹوپی وغیرہ پر مسح کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا متوضی عمامہ یا ٹوپی وغیرہ پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسح کا ثبوت خلاف القیاس ثابت ہے اس لیے صرف موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اس کے علاوہ عمامہ، ٹوپی اور برقع پر مسح کرنا جائز نہیں۔

لما قال الشیخ الدکتور وهبه الزهیلی: قال الحنفیة لا یصح المسح علی عمامة وقلنسوة و برقع وقفازین لان المسح ثبت بخلاف القیاس فلا یلحق به غیره۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۱ ص ۳۲۱ باب المسح، سادسا المسح علی العمامة) [۱]

پٹی پر مسح کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ پٹی پر مسح کب تک باقی رہتا ہے، کن کن حالات میں مسح ختم ہو جاتا ہے؟

الجواب:۔ پٹی پر مسح دو حالتوں میں ٹوٹ جاتا ہے: (۱) اتارنے یا اترنے کی حالت میں جب زخم مندمل ہو جائے، اس لیے کہ جس علت کی وجہ سے مسح شروع ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ (۲) حدث کی وجہ سے یعنی وضو ٹوٹنے کی حالت میں جبیرہ کا مسح بھی ختم ہو جاتا ہے۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: یبطل المسح علی الجبیرة فی حالتین هما (۱) نزعها وسقوطها قال الحنفیة یبطل المسح علی الجبیرة ان سقطت عن برء لزوال العذر.... (۲) الحدث: یبطل المسح علی الجبیرة بالاتفاق بالحدث۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۱ ص ۳۵۶ نواقض المسح علی الجبیرة) [۲]

زخم پر مسح کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ اگر زخم پر مسح کرنے سے تکلیف ہوتی ہو تو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اگر ظاہر زخم پر مسح کرنے سے تکلیف ہو تو پٹی وغیرہ کے اوپر مسح کرے اور اگر اس سے بھی شدید تکلیف کا احساس ہو تو پھر بوجہ مجبوری اس کا ترک کرنا

---

[۱] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ولا یجوز ای لا یصح المسح علی عمامة وقلنسوة و برقع وقفازین لان المسح ثبت بخلاف القیاس فلا یلحق به غیره۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۷۰ فصل المسح علی الخفین)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۲۷۲ باب المسح علی الخفین۔

[۲] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فسقوط الجبائر عن برء ینقض المسح۔

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۱ ص ۱۴ مطلب نواقض المسح علی الجبیرة)

جائز ہے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی، واذا رمد وامرہ طبیب مسلم حاذق الا یغسل عینہ او انکسر ظفرہ او حصل بہ داء وجعل علیہ دواء، جاز لہ المسح للضرورۃ وان ضرہ المسح ترکہ لان الضرورۃ تقدر بقدرھا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۱ ص۳۵۵ نواقض المسح علی الجبیرۃ) [1]

پلستر پر مسح کرنے کا حکم

سوال:۔ ہاتھ پاؤں یا دوسرے اعضاء کے ٹوٹ جانے کی صورت میں ڈاکٹر حضرات اُس عضو کو جوڑنے کے لیے پلستر لگاتے ہیں، کیا اس پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پلستر کا استعمال ٹوٹے ہوئے اعضاء کو جوڑنے کے لیے ہوتا ہے اور ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر اس کا کھولنا عموماً مُضر ثابت ہوتا ہے اور اگر مُضر نہ بھی ہو لیکن بار بار اس کو کھول کر باندھنا مالی اعتبار سے بھی نقصان کا باعث ہوتا ہے، اس لیے جبیرہ کی طرح پلستر کے اندر ملفوف اعضاء کا دھونا ضروری نہیں بلکہ مسح کافی ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: ویمسح نحو (مفتصد وجریح علی کل عصابۃ مع فرجتھا فی الاصح۔ قال ابن عابدینؒ: (قولہ علی کل عصابۃ) ای علی کل فرد من افرادھا سواء کانت عصابۃ تحتھا جراحۃ وھی بقدرھا او زائدۃ علیھا کعصابۃ المفتصد، اولم یکن تحتھا جراحۃ اصلاً بل کسر اوکیٌ وھذا معنی قول الکنز: کان تحتھا جراحۃ اولا، لکن اذا کانت زائدۃ علی قدر الجراحۃ فان ضرہ الحل والغسل مسح الکل تبعاً والا فلا۔ (ردالمحتار ج۱ ص۲۸۰ باب التیمم، مطلب فی لفظ کل اذا دخلت علی منکر او معروف) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: انکسر ظفرہ فجعل علیہ دواء اووضعہ علی شقوق رجلہ اجری الماء علیہ وان قدر والا مسحہ والا ترکہ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۱ ص۲۸۱ باب المسح علی الخفین)

وَمِثْلُہٗ مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۰۹ فصل فی مسح الجبیرۃ۔

[2] قال ابراھیم الحلبی الجبیرۃ ماتحتہ جراحۃ وما لیس تحتہ تبعاً لوصح الجراحۃ لان الجبیرۃ والعصابۃ لا توضع علی وجہ تاتی علی موضع الجراحۃ فحسب بل تکون علی ما حول الجراحۃ ایضاً فتحققت الضرورۃ الی جواز المسح علی الزائد علی الجراحۃ الخ۔ (کبیری ص۱۱۷ باب المسح علی الخفین)

ومثلہ فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۰۷ فصل فی الجبیرۃ ونحوھا۔

سانپ کنوئیں میں گر کر مرجائے تو اس کا حکم

سوال:۔ سانپ کنوئیں یا حوض میں گر کر مرجائے تو اس کنوئیں یا حوض کے پانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ سانپ عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ سانپ جو صحرا میں ہوتے ہیں، اگر ان میں خون شامل ہو اور ایسے سانپ کنوئیں یا حوض میں گر کر مرجائیں تو اس سے کنواں ناپاک ہوجائے گا اور اگر اس میں خون نہ ہو تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ دوسری قسم کے سانپ وہ ہیں جو پانی میں ہی رہتے ہیں اگر وہ پانی میں مرجائیں تو پانی مطلقاً ناپاک نہیں ہوتا۔

لما قال الحصکفیؒ: ومائی مولد ولو کلب الماء وخنزیرہ (کسمک وسرطان) وضفدع الابریا له دم سائل فیفسد فی الاصح کحیة بریة ان لها دم والا لا۔ قال ابن عابدینؒ: (قوله کحیة بریة) أما المائیة فلا تفسد مطلقاً کما علم مما مر وکالحیة البریة والوزغة لو کبیرة لها دم سائل منیة (قوله والا لا) أی ان لم یکن للضفدع البریة والحیة البریة دم سائل فلا یفسد اھ۔ (رد المحتار ج ا ص ۱۸۵ باب المیاہ مطلب فی مسائله الوضوء من الفساقی) [1]

کسی حیوان کا اندام (کوئی عضو) اگر کنوئیں میں گرجائے تو کیا حکم ہے

سوال:۔ ہمارے گھر کے کنوئیں سے چڑیا کا پر نکل آیا ہے، اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا اس میں ۲۰ سے ۳۰ ڈول پانی نکالنا کافی ہے؟

الجواب:۔ اگرچہ چڑیا کے مقدار جانور کے گرنے سے کنواں ناپاک ہوجاتا ہے اور وہ ۲۰ سے ۳۰ ڈول تک پانی نکالنے سے پاک ہوجاتا ہے مگر حیوان کے اندام میں یہ حکم نہیں بلکہ اس میں چھوٹے اور بڑے جانور سب برابر ہیں، اور یہ عضو ایک بڑے حیوان کے مساوی ہے، لہٰذا اس صورت میں کنوئیں یا حوض کا پورا پانی نکالا جائے گا یا ۲۰۰ سے ۳۰۰ ڈول تک پانی نکالنے سے کنواں پاک ہوجائے گا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله حیوان دموی وانتفخ) لو وقع ذنب فارة ینزح لماء

---

[1] قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: اگر خشکی کا سانپ ہو پس اندازہ کرکے دیکھا جاوے کہ اس میں کتنے سو ڈول پانی ہے اتنا نکال دیا جاوے اگرچہ ٹوٹے نہیں پاک ہوجاوے گا، البتہ اگر تجربہ سے یہ تحقیق ہوجاوے کہ ایسے سانپ میں بہنے والا خون نہیں ہوتا تو اس سے کنواں ناپاک نہ ہوگا..... اسی طرح اگر وہ سانپ پانی کا ہو تب بھی کنواں ناپاک نہ ہوگا۔ (امداد الفتاوی جلد ا ص ۴۲ فصل فی البئر)

کلہ یجزویہ ظھرانہ لوجرح الحیوان بلا تفسخ ونحوہ ینزح الجمیع کما فی الفتح وان قطعۃ منہ کتفسخہ ولہذا قال فی الخانیۃ قطعۃ من لحم المیتۃ تفسدہ۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۲۱۳ فصل فی البئر) [1]

چھپکلی گرنے سے پانی کا حکم

سوال:۔ ہمارے گھر میں چھپکلیاں بہت ہیں اور کبھی کبھی وہ پانی میں گر کر مر جاتی ہیں، کیا اس سے پانی ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عام چھپکلیوں میں بہنے والا خون نہیں ہوتا اس لیے اگر چھپکلی پانی میں گر کر مر جائے تو پانی ناپاک نہ ہوگا اور اس سے وضوء غسل وغیرہ جائز ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: اما الذی لیس لہ دم سائل فالذباب والعقرب والزنبور والسرطان ونحوھا وانہ لیس ینجس عندنا۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۲ فصل اما الطھارۃ الحقیقۃ) [2]

پرندوں کی بیٹ گرنے سے پانی نجس نہیں ہوتا

سوال:۔ ہمارے گھر کے کنوئیں کے پاس ایک درخت ہے جس پر کافی تعداد میں پرندے ہوتے ہیں، کبھی کبھی ان پرندوں کی بیٹ اُس کنوئیں میں گر جاتی ہے، شریعتِ مطہرہ میں اس کنوئیں کے پانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں پرندوں کی بیٹ سے بچنا انتہائی مشکل اور متعذر ہے، اسلئے شریعتِ مقدسہ میں اس کے گرنے سے پانی پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور نہ پانی کا استعمال ممنوع ہے بلکہ یہ پانی پاک اور قابلِ استعمال ہے۔

---

[1] قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰن الدیوبندیؒ: درصورتِ مسئولہ کشیدن مقدار جملہ آں چاہ لازم است وتا وقتیکہ مقدار مذکورہ کشیدہ نشود نوشیدن ازاں آب وطعام باآں پختہ خوردن ناجائز وحرام است۔ قال مولانا السید ابوالسعود فی حاشیۃ المسکین معزیا الی الحموی وقطعۃ الحیوان فی الحکم کالحیوان المتفسخ۔

(فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص ۱۵۲ فصل فی البئر، مرتبہ: مولانا ظفر الدینؒ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۰ الباب الثالث فی المیاہ۔

[2] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ولا ینجس الماء ولا المائعات علی الاصح بموت مابمعنی حیوان لادم لہ سواء البری والبحری فیہ ای الماء والمائع۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۳۱ فصل فی الآبار)

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا نزح فی بول فارۃ فی الاصح ولا بخرء حمام و عصفور وکذا سباع طیر فی الاصح لتعذر صونها عنه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۲۲ فصل فی البئر) [۱]

چشمہ دار کنوئیں کی پاکیزگی میں امام محمدؒ کا قول مفتی بہ ہے

سوال:۔ چشمہ دار کنوئیں کی تطہیر میں علماء احناف کے مختلف اقوال ہیں، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے ہاں رائے مبتلی بہ یا دو عادلین اشخاص کی رائے کا اعتبار ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کنوئیں میں جس قدر پانی ہے اتنی ہی مقدار میں نکالنا چاہیئے جبکہ امام محمدؒ سے ۲۰۰ سے ۳۰۰ ڈول تک کا قول مروی ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ ان اقوال میں کون سا قول مفتی بہ ہے۔

الجواب:۔ علماء احناف کے ہاں اگرچہ اس مسئلہ میں مختلف آراء ہیں مگر متاخرین فقہاء کرام نے آسانی کے لیے امام محمدؒ کے قول (۲۰۰ سے ۳۰۰ تک ڈول پانی نکالنا) کو مفتی بہ قرار دیا ہے، اگرچہ بعض نے امام صاحبؒ کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وقیل یفتی بمأتین الی ثلثمائۃ وهذا أیسر۔ قال ابن عابدینؒ: وجزم به فی الکنز والملتقی وهو مروی عن محمدؒ وعلیه الفتوی خلاصۃ وتاتارخانیۃ عن النصاب وهو المختار معراج عن العتابیۃ وجعله فی العنایۃ روایۃ عن الامام وهو المختار والایسر کما فی الاختیار۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۱۵ فصل فی البئر) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ولا یفسد ای لا ینجس الماء بخرء حمام ..... ولا ینجس بخرء عصفور ونحوها مما یوکل من الطیور غیر الدجاج والاوز والحکم بطهارته استحسان الخ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۳۰ فصل فی مسائل الآبار)

[۲] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ان الفتوی علی انه ینزح ثلثمائۃ وکذا فی معراج الدرایۃ معزیا الی فتاوی العتابی ان المختار ما عن محمدؒ .... والا فتاء بما عن محمد اسهل علی الناس۔ (البحر الرائق ج۱ ص۱۲۳ کتاب الطهارۃ)

فرج سے نکلی ہوئی ہوا ناقض الوضو نہیں

سوال :۔ نماز کے دوران اگر کسی عورت کی اگلی شرمگاہ سے ہوا خارج ہوجائے تو کیا وہ عورت نماز توڑ کر دوبارہ وضو کرے گی یا وہی وضو کافی ہوگا؟

الجواب: جو ہوا دُبر سے نکلے وہ ناقض الوضو ہوتی ہے اور جو ہوا عورت کی فرج یا مرد کے ذکر سے خارج ہو وہ ناقض الوضو نہیں ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مبتلی بہ عورت کا وضو نہیں ٹوٹا اور وہ اسی وضو سے ہی نماز کو پورا کرے گی ۔

لما قال العلامة ابوبکر بن علی بن الحدادؒ: والریح الخارجة من الذکر و فرج المرأة لا تنقض الوضوء علی الصحیح الا ان تکون المرأة مفضاة فانه یستحب لها الوضوء ۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۸ کتاب الطهارة۔ نواقض الوضوء) لـه

عادت سے پہلے دمِ نفاس بند ہوجانے کی صورت میں جماع کا حکم

سوال :۔ اگر کسی عورت کا دمِ نفاس عادت سے پانچ چھ دن قبل بند ہوجائے تو کیا اس کا شوہر اس سے قربان (ہمبستری) کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جس عورت کا خونِ نفاس عادت سے قبل بند ہوجائے تو جب تک اس کی عادت پوری نہ ہوجائے اس وقت تک شوہر کے لیے بیوی سے قربان (ہمبستری) ممنوع ہے، البتہ اگر خون بند ہونے کے بعد ایک نماز کا وقت گذر جائے تو وہ نماز اور روزہ ادا کرسکتی ہے ۔

لما قال العلامة الزیلعیؒ: ولو انقطع دمها دون عادتها یکره قربانها حتی یمضی عادتها وعلیها ان تصلی وتصوم ۔ (تبیین الحقائق ج۱ ص۳۹ کتاب الحیض) ؎۲

لـه لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولاخروج ریح من قُبل غیر مفضاة اما هی فیندب لها الوضوء وقیل یجب وقیل لو منتنة الخ ۔ (الدرالمختار علی هامش رد المحتار ج۱ ص۱۳۶ باب نواقض الوضوء)

ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۱ ص۹ باب نواقض الوضوء ۔

؎۲ لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: اذا انقطع ما دون العشرة دون عادتها لا یقربها وان اغتسلت مالم تمض عادتها ۔

(البحر الرائق ج۱ ص۲۰۳ کتاب الحیض)

پکی اینٹ پر تیمّم کرنا

سوال:۔ ایک شخص جو کہ بیمار ہے اور پانی سے وضو کرنے پر قادر نہیں، اس لیے وہ پکی اینٹ پر تیمم کرکے نماز پڑھ لیتا ہے، تو اس شخص کے تیمم اور اس سے پڑھی گئی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو چیز زمین کے اجزاء سے ہو اس پر تیمم کرنا جائز ہے، پکی اینٹ کا تعلق بھی چونکہ جنس الارض ہی سے ہے، اس لیے پکی اینٹ پر تیمم کرنا جائز ہے چاہے سالم ہو یا مدقوق۔

لما قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: واما التیمم بالاٰجر فعند ابی حنیفۃؒ یجوز مطلقاً دق اولا لانہ من اجزاء الارض وان شوی وتصلب بمنزلۃ النورۃ۔
(کبیری ص۷۵ باب التیمم) [1]

استنجاء کرنے کے بعد ہوا خارج ہو جانے پر استنجاء کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے استنجاء کرنے کے بعد ہوا خارج ہو جائے تو کیا طہارت کے لیے اسے دوبارہ استنجاء کرنا پڑے گا یا نہیں؟ جبکہ اس کی مقعد ابھی تک گیلی ہے؟

الجواب:۔ ہوا خارج ہونے سے اگرچہ وضو ٹوٹ جاتا ہے اور دوبارہ کرنا پڑتا ہے لیکن استنجاء کرنا لازمی نہیں ہوتا چاہے مقعد گیلی ہو یا خشک۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی اس شخص پر دوبارہ استنجاء کرنا لازمی نہیں صرف وضو کرنے سے طہارت حاصل ہو جائے گی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (فلا یسن من ریح) لان عینھا طاھرۃ وانّما نقضت لانبعاثھا عن مواضع النجاسۃ اھ لان بخروج الریح لا یکون علی السبیل شیئ فلا یسن منہ بل ھو بدعۃ۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۴۶ فصل فی الاستنجاء) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ویجوز بالاجری وھوالصحیح لانہ طین مستحجر۔
(البحرالرائق ج۱ ص۱۴۸ باب التیمم) ۔۔۔ ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۷ باب التیمم، الفصل الاول۔

[2] لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وقد علم من تعریفہ ان الاستنجاء لا یسن الا من حدث خارج من احد السبیلین غیر الریح لان بخروج الریح لا یکون علی السبیل شیئ فلا یسن منہ بل ھو بدعۃ۔ (البحرالرائق ج۱ ص۲۴۰ باب الانجاس)

ہوا خارج ہونے کا شک ہونے پر وضو کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کو وضو کرنے کے بعد اس بات کا وہم ہو جائے کہ اس کی ہوا خارج ہوگئی ہے مگر حقیقت میں اس سے کوئی ہوا وغیرہ خارج نہیں ہوئی ہوتی، تو کیا صرف شک کی بناء پر وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب تک ہوا خارج ہونے کا کامل یقین نہ ہو تو صرف شک کی بناء پر وضو نہیں ٹوٹتا۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: الیقین لا یزول بالشك۔

(الاشباہ والنظائر ج۱ ص۱۸۳) لہ

جگالی کے دوران جانور کے منہ سے نکلنے والا مواد ناپاک ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! جگالی کرتے وقت اگر کوئی چیز جانور کے منہ سے نکل کر پانی میں گر جائے تو اس سے پانی ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟ جبکہ یہ مواد معدہ سے واپس منہ میں آتا ہے اور جانور اس پر جگالی کرتے ہیں؟

الجواب:۔ جگالی کے دوران جو چیز جانور کے منہ سے نکل کر منہ میں واپس آتی ہے وہ حکماً پاخانہ کی طرح ہوتی ہے، اس لیے اگر وہ کسی پاکیزہ پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔

لما قال مولانا محمد رشیدؒ، مسئلہ: ہر جانور کا پتہ اس کے پیشاب کے برابر ناپاک ہے اور جگالی میں جو کچھ نکلتا ہے وہ اس کے پاخانہ کے برابر ناپاک ہے۔ (بہشتی زیور ص۸۲۳)

پنج سورہ وغیرہ کے ساتھ بیت الخلا جانا

سوال:۔ اگر کسی شخص کی جیب میں پنج سورہ یا سورۂ یٰسین وغیرہ ہو اور اُسے بیت الخلا جانے کی حاجت ہو اور یہ چیزیں وہاں رکھنے کی جگہ بھی نہ ہو تو کیا شرعاً آدمی ان کے ساتھ بیت الخلا جا سکتا ہے یا نہیں؟

لہ لما قال العلامۃ مفتی عبد الرحیم لاجپوری: جب ہوا نکلنے کا یقین نہیں ہے تو صرف وہم ہوتے رہنے سے وضوء نہیں ٹوٹے گا اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

(فتاوی رحیمیہ جلد ۱۰ ص۱۱۱ کتاب الطہارۃ)

الجواب:۔ متبرک اشیاء اور قرآنی آیات کا بیت الخلاء یا کسی ایسی جگہ جہاں گندگی پڑی ہو۔ لے جانا صحیح نہیں البتہ اگر جیب میں رکھ لی جائیں تو جائز ہے مگر پھر بھی خلافِ اولیٰ ہے کوشش کرکے ایسی چیزیں بیت الخلاء سے باہر کسی محفوظ اور پاکیزہ جگہ پر رکھ دی جائیں ورنہ بصورتِ مجبوری بلاکراہت مرخص ہے۔

لما قال العلامة کاشغریؒ: ویکرہ دخول المخرج لمن فی اصبعه خاتم فیه شئ من القرآن اومن اسماء الله تعالیٰ لما فیه من ترک التعظیم۔

وقال العلامة ابراهیم الحلبیؒ فی شرح المنیة: وقیل لا یکرہ ان جعل فصه الیٰ باطن الکف ولوکان ما فیه شئ من القرآن اومن اسماء الله تعالیٰ فی جیبه لابأس به وکذا ولوکان ملفوفاً وشئ والتحرز اولیٰ۔ (کبیری ص۵۸)[1]

نفاس والی عورت کے ہاتھوں کھانے پینے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد عورت جب تک ناپاکی کی حالت میں ہو تو اتنے دنوں (چالیس دن) تک اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا جائز نہیں، اس کا شرعی حل مطلوب ہے؟

الجواب:۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس میں افراط وتفریط اور یہود وہنود کے مفروضہ نظریات وخیالات کی کوئی گنجائش نہیں، جہاں تک مذکورہ بالا سوال کا تعلق ہے تو یہ یہودیوں کا عمل ونظریہ ہے، یہ لوگ ان مخصوص ایام میں عورتوں کو بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں، نہ تو ان کے ہاتھوں کا کھانا کھاتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ دیگر سماجی ومعاشرتی تعلقات رکھتے ہیں۔ اسلام نے حیض ونفاس کی حالت میں صرف جماع کرنے سے منع فرمایا ہے اور باقی سب امور کو جائز قرار دیا ہے، لہٰذا نفاس والی عورت کے ہاتھوں کھانا پینا شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولا یکرہ طبخها ولا استعمال مامسته من عجین اوماء اونحوهما۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۹۲ باب الحیض)

---

[1] لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: ایسی چیز جس پر خدا یا کسی نبی یا کسی فرشتے یا کسی معظم کا نام یا کوئی آیت یا حدیث یا دعا لکھی ہوئی ہو اپنے ساتھ رکھنا ... البتہ اگر ایسی چیز جیب میں ہو یا تعویذ کپڑے وغیرہ میں لپٹا ہوا ہو تو کراہت نہیں۔ (بہشتی زیور ص۸۳۹ کتاب الطہارۃ)

سوال :- جناب مفتی صاحب !
پیشاب اور پاخانہ کے وقت کن امور سے بچنا چاہیئے؟ ایک مسئلہ کے حل کی تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہوں، مسئلہ یہ ہے کہ قضائے حاجت (پیشاب اور پاخانہ) کے وقت کن امور سے بچنا ضروری ہے؟

الجواب :- اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس نے ہر عمل کے لیے کچھ آداب اور کچھ امور سے بچنے کو بیان کیا ہے، یہاں تک کہ پیشاب اور پاخانہ کرنے وقت بعض امور سے بچنے کی تعلیم دی ہے، مثلاً بلاضرورت باتیں کرنا، کھانسنا، قرآن کریم کی کوئی آیت، حدیث یا کوئی دوسرے متبرک کلمات پڑھنا، کوئی ایسی چیز جس پر خدا، رسول یا فرشتے کا نام ہو، کوئی آیت یا حدیث لکھی ہوئی ہو یا کوئی دعا تحریر ہو ساتھ لے جانا، بلا عذر شرعی کھڑے ہوکر یا لیٹ کر پیشاب اور پاخانہ کرنا، تمام کپڑے اتار کر بالکل برہنہ ہوکر قضاء حاجت کرنا، قبلہ رخ بیٹھنا، دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا، کھانے پینے کی اشیاء سے استنجاء کرنا، جانوروں کے چارے سے استنجاء کرنا وغیرہ، ان امور سے دوران قضاء حاجت بچنا چاہیئے ۔

لهكذا في كبيري ص۳۹ و بہشتی زیور حصہ ۱۱ ص۱۱

بواسیر کی رطوبت سے وضو کا حکم

سوال :- ایک شخص بواسیر کا مریض ہے، اٹھتے بیٹھتے بواسیر کی رطوبت اس کے کپڑوں پر لگ جاتی ہے ۔ تو کیا اس رطوبت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ جبکہ یہ رطوبت عام پانی کی طرح بہنے والا نہیں، نیز یہ بھی بتائیں کہ اس رطوبت سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ وضو ہر اس نجس چیز کے نکلنے سے ٹوٹ جاتا ہے جو انسان کے بدن سے نکل کر پانی کی طرح بہہ جائے، اگر بہے نہیں تو پھر وہ چیز ناقض وضو نہیں ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر رطوبت بواسیر کے زخم سے نکل کر بہتی نہ ہو تو اس سے وضو ختم نہیں ہوتا اور نہ کپڑے ناپاک ہونگے، کیونکہ فقہاء کرام کا قاعدہ کلیہ ہے : مالیس بحدث لیس بنجس ، کہ جو چیز محدث نہ ہو وہ نجس نہیں ۔

لما قال العلامة المفتي عزيز الرحمنؒ : (الجواب) جو رطوبت زخم سے باہر نہ بہے اور اور سائل نہ ہو اُس سے وضو نہیں ٹوٹتا ۔ کذا فی کتب الفقہ ۔ اور کپڑا بھی ناپاک نہیں ہوتا کیونکہ فقہاء قاعدہ کلیہ لکھتے ہیں ، ما لیس بحدث لیس بنجس ۔ پس جو صورت آپ نے تحریر

فرمائی ہے اس میں نہ وضوء ٹوٹتا ہے نہ کپڑا ناپاک ہوتا ہے ۔
(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص۱۲۶ ترتیب مفتی ظفیرالدین صاحب، کتاب الطہارۃ)

معذور کا قبل از وقت وضو کر کے اس سے نماز پڑھنا

سوال:۔ ایک شخص معذور ہے یعنی اس کو سلسل البول کی بیماری ہے، وہ ہر نماز کے لیے الگ وضوء کرتا ہے، اگر کسی نماز کا وقت داخل ہونے سے قبل اس نے وضو کیا ہو تو کیا وہ اس وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ معذور شخص کے لیے ضروری ہے کہ نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد وضو کرے، اگر اس نے وقت داخل ہونے سے قبل وضو کر لیا تو وہ وضوء درست نہیں اور وہ اس قبل از وقت کئے گئے وضو سے کوئی نماز نہیں پڑھ سکتا ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: حکمه الوضوء لکل فرض اللام للوقت ثم یصلی به فیه فرضاً ونفلاً فاذا خرج الوقت بطل ۔ (الدر المختار علی ہامش ردالمحتار ج ۱ ص۲۸۰ احکام المعذور) [1]

عورت کے رحم سے نکلنے والی سفید رطوبت سے وضوء کا حکم

سوال:۔ ایک عورت کے رحم سے ہر وقت سفید رطوبت نکلتی رہتی ہے، تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں ؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو کیا یہ عورت معذور سمجھی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر کسی عورت کے رحم سے سفید رطوبت ہر وقت بہتی رہتی ہو تو وہ ناقض الوضو ہے یعنی وضو ختم ہو جاتا ہے، البتہ جو رطوبت فرج خارج سے آتی ہو تو وہ پسینہ ہے اس سے وضو ختم نہیں ہوتا، صورت مذکورہ میں چونکہ ہر وقت اس عورت کے رحم سے رطوبت نکلتی ہے اس لیے وہ معذور سمجھی جائے گی ۔ ھکذا فی امداد الفتاویٰ ج ۱ ص۶۶)

---

[1] لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰنؒ : (الجواب) جبکہ وہ شخص معذور ہے تو اس کو قبل از وقت وضوء کرنا درست نہیں ہے، بس وقت کے بعد ہی وضو کرے اگرچہ جماعت فوت ہو جائے ۔
[فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص۲۶۶ ترتیب مفتی ظفیرالدین صاحب کتاب الطہارۃ ، فصل رابع ، معذور سے متعلق احکام]

كتاب

الصلوة

۱۴۰۵ھ

باب المواقیت

(نمازوں کے اوقات)

نماز کو مقررہ وقت سے مؤخر کرنا

سوال:۔ ہمارے علاقہ کی مساجد میں جماعت کے اوقات مقرر ہیں، لیکن بعض اوقات امام صاحب وقتِ مقررہ سے تاخیر کر کے آتے ہیں جس کی وجہ سے بعض لوگ دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ کیا نمازوں کو مقررہ وقت سے تاخیر کر کے پڑھنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ نمازوں کے لیے مقرر شدہ اوقات حتمی نہیں بلکہ نمازیوں کی سہولت کو مدِنظر رکھ کر مقرر کیے جاتے ہیں، اگر ان اوقات میں کچھ تقدیم و تاخیر ہو جائے (بشرطیکہ مکروہ وقت داخل نہ ہو) تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر امام تنخواہ دار ہو تو دیگر دلائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے مقررہ وقت سے تاخیر کرنا کراہت سے خالی نہیں، اگرچہ بہتر یہی ہے کہ نماز مستحب وقت میں پڑھی جائے۔

قال الحصکفیؒ: (ویجلس بینہما) بقدر ما یحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب۔ (الا فی المغرب)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۸۹ باب الاذان) [لہ]

فجر کی نماز کا وقت

سوال:۔ فجر کی نماز کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟ اور طلوعِ فجر اور طلوعِ آفتاب کے درمیان کتنا وقفہ ہوتا ہے؟

الجواب:۔ نمازِ فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہوتا ہے جس کی مقدار تقریباً سوا گھنٹہ ہے تاہم کمی و زیادتی بھی ممکن ہے۔ اور صبح صادق کی علامت یہ ہے کہ اُس وقت آسمان کے اُفق پر سفیدی سی نمودار ہوتی ہے جو آسمان کے اُفق میں پھیلی ہوتی ہے۔

[لہ] وفی الھندیۃ: وینتظر المؤذن الناس ویقیم للضعیف المستعجل ولا ینتظر رئیس المحلۃ و کبیرھا کذا فی معراج الدرایۃ۔ ینبغی ان یؤذن فی اول الوقت ویقیم فی وسطہ حتی یفرغ المتوضی من وضوئہ والمصلی من صلوتہ والمعتصر من قضاء حاجتہ کذا فی التاتارخانیۃ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص ۵۷ باب الاذان) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۵ باب الاذان۔

قال الحصکفیؒ: وقت صلاۃ (الفجر) ۔۔۔۔ (من) اول (طلوع الفجر الثانی) وھو البیاض المنتشر المستطیر لا المستطیل (الی) قبیل (طلوع ذکاء) بالضم غیر منصرف اسم الشمس۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۶۳ کتاب الصلوٰۃ) [1]

رمضان میں صبح کی نماز تاریکی میں پڑھنا

سوال: ہمارے علاقوں میں رمضان کے مہینے میں صبح کی نماز عموماً غلس (تاریکی) میں پڑھی جاتی ہے جس سے جماعت میں کثرت رہتی ہے، کیا فقہ حنفی کی رُو سے یہ درست ہے؟

الجواب: جواز سے کسی کو انکار نہیں، لیکن فقہ حنفی میں اسفار کے استحباب میں رمضان کا استثناء کہیں نہیں لکھا ہے، اس لیے شاید وقتی مصلحت کی رُو سے بہتر ہو لیکن یقینی اعتبار سے اسفار مستحب ہے۔

لما قال شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الیمنی: ویستحب الاسفار بالفجر۔۔۔۔۔ قیل ھو ان یصلی فی وقت لو صلی بقرأۃ مسنونۃ مرۃ فاذا فرغ ظھر لہ فساد فی طھارتہ امکنہ الوضوء والاعادۃ قبل طلوع الشمس وھذا کلہ فی السفر والحضر فی الازمنۃ کلھا الا یوم النحر بالمزدلفۃ للحاج۔
(الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۵۰ کتاب الصلوٰۃ) [2]

نماز کے لیے مستحب وقت کیا ہے؟

سوال: جواز سے قطع نظر نمازوں کے اوقات مستحبہ کی حقیقت کیا ہے؟ تعجیل افضل ہے یا تاخیر؟

---

[1] وفی الھندیۃ: وقت الفجر من الصبح الصادق وھو البیاض المنتشر فی الافق الی طلوع الشمس ولا عبرۃ بالکاذب وھو البیاض الذی یبدو طولاً ثم یعقبہ الظلام فبالکاذب لا یدخل وقت الصلاۃ ولا یحرم الاکل علی الصائم ھکذا فی الکافی۔
(الھندیۃ ج۱ ص۵۱ الباب الاول فی المواقیت) ومثلہ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۴۴ کتاب الصلوٰۃ

[2] قال الحصکفیؒ: والمستحب للرجل الابتداء فی الفجر باسفار والختم بہ ھو المختار بحیث یرتل اربعین اٰیۃ ثم یعیدہ بطھارۃ لو فسد وقیل یؤخر جداً لان الفساد موھوم الا لحاج بمزدلفۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۲۶۹ کتاب الصلوٰۃ)
ومثلہ فی شرح الوقایۃ ج۱ ص۱۲۸ کتاب الصلوٰۃ۔

الجواب:۔ مطلقاً تعجیل یا تاخیر مستحب نہیں بلکہ فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فجر کا مستحب وقت اسفار ہے، اور گرمیوں میں ظہر کو مؤخر اور سردیوں میں مقدم کرکے پڑھنا افضل ہے، عصر کو گرمی و سردی دونوں میں مؤخر کرنا افضل ہے بشرطیکہ سورج متغیر نہ ہو، اور عشاء کو ثلث لیل تک مؤخر کرنا افضل ہے، تاہم اگر آسمان ابر آلود ہو تو عصر و عشاء کو مقدم کرکے اور باقی کو مؤخر کرکے پڑھنا مستحب ہے۔

قال الحصکفیؒ: والمستحب للرجل (الابتداء) فی الفجر (باسفار والختم به) هو المختار بحیث یرتل اربعین اٰیة۔ ثم یعیده بطهارة لو فسد وقیل یؤخر جدا لان الفساد موهوم (الا الحاج بمزدلفة) فالتغلیس افضل کمرأة مطلقاً وفی غیر الفجر الافضل لها انتظار فراغ الجماعة (وتاخیر ظهر الصیف) بحیث یمشی فی الظل (مطلقاً)۔۔۔۔ وتاخیر (عصر) صیفاً وشتاءً توسعة للنوافل (ما لم یتغیر ذکاء) بان لا تحار العین فیها فی الاصح (و) تاخیر عشاء الی ثلث اللیل الی اخره۔

والمستحب تعجیل ظهر الشتاء یلحق به الربیع وبالصیف الخریف وتعجیل عصر وعشاء یوم غیم۔۔۔۔ وتاخیر غیرهما فیه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۶۶ تا ص۳۶۹ کتاب الصلوٰة)[1]

نمازِ عصر میں تاخیر کی مقدار

سوال:۔ نمازِ عصر میں فقہاء نے تاخیر کرنے کو مستحب لکھا ہے، لیکن تاخیر کی مقدار کیا ہے؟ اس کے بارے

---

[1] وفی الهندیة: یستحب تاخیر الفجر ولا یؤخرها بحیث یقع الشك فی طلوع الشمس بل یسفر بها۔۔۔۔ ویستحب تاخیر الظهر فی الصیف وتعجیله فی الشتاء۔۔۔۔ ویستحب تاخیر العصر فی کل زمان ما لم تتغیر الشمس۔۔۔۔ ویستحب تعجیل المغرب فی کل زمان کذا فی الکافی۔۔۔۔ وکذا تاخیر العشاء الی ثلث اللیل والوتر الی اٰخر اللیل لمن یثق بالانتباه۔۔۔۔ وفی یوم الغیم ینوّر الفجر کما فی حال الصحو ویؤخر الظهر لئلا یقع قبل الزوال ویعجل العصر خوفاً من ان یقع فی الوقت المکروه ویؤخر المغرب حذراً عن الوقوع قبل الغروب ویعجل العشاء کیلا یمنع مطر او ثلج عن الجماعة۔
(الهندیة ج ۱ ص۵۱ تا ۵۲ کتاب مواقیت الصلوٰة) ومثله فی شرح الوقایة ج ۱ ص۱۴۸ کتاب الصلوٰة

بارے میں معلومات فراہم فرماویں؟

الجواب:۔ عصر کی نماز میں بلاشک وشبہ تاخیر مستحب ہے لیکن اتنی تاخیر کرنا جو اصفرار الشمس تک مفضی ہو مکروہ تحریمی ہے، سورج پر زردی کے آثار ظاہر ہوتے سے قبل ہی نماز عصر سے فارغ ہونا چاہیئے۔

قال الحصکفیؒ (و) اخر (العصر الی اصفرار ذکاء) فلو شرع فیہ قبل التغیر فمدہ الیہ لا یکرہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۶۸ کتاب الصلوٰۃ) [1]

ظہر کی نماز کا وقت

سوال:۔ مثلِ ثانی میں ظہر کی نماز پڑھنا اداء ہے یا قضاء؟ جبکہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ امام صاحبؒ نے مثلِ ثانی کے قول سے رجوع کرلیا تھا لہٰذا مثل ثانی میں پڑھی گئی نماز ادا نہیں بلکہ قضاء ہے، حقیقت واضح فرماویں؟

الجواب:۔ محققین احناف کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ مثلِ ثانی میں ظہر کی نماز پڑھنا ادا ہے قضا نہیں، اور یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ امام صاحبؒ نے اپنے قول سے رجوع کرلیا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ ایک افتراء ہے البتہ احتیاط یہ ہے کہ مثلِ ثانی سے قبل ادا کی جائے۔

قال ابن عابدینؒ: (قولہ الی بلوغ الظل مثلیہ) ھذا ظاھر الروایۃ عن الامام نہایۃ وھو الصحیح بدائع ومحیط وینابیع وھو المختار وغیاثیۃ واختارہ الامام المحبوبی وعول علیہ النسفی وصدر الشریعۃ تصحیح قاسم واختار اصحاب المتون وارتضاہ الشارحون فقول الطحاوی وبقولھما نأخذ لا یدل علی انہ المذھب وما فی الفیض من أنہ یفتی بقولھما فی العصر والعشاء مسلم فی العشاء فقط علی

---

[1] قال ابن نجیمؒ: (قولہ والعصر مالم تتغیر) اطلقہ فشمل الصیف والشتاء لما فی ذلک من تکثیر النوافل لکراھتھا بعد العصر والمراد بالتغیر ان تکون الشمس بحال لا تحار فیھا العیون علی الصحیح فان تاخیرھا الیہ مکروہ لا الفعل لانہ ماموربہا منھی عن ترکھا فلا یکون الفعل مکروھا کذا فی السراج۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۴۷ مواقیت الصلوٰۃ)
ومثلہ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۵۲ مواقیت الصلوٰۃ

ما فیہ وتمامہ فی البحر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۵۹ کتاب الصلوٰۃ) [1]

سورج غروب نہ ہونے کی حالت میں نماز کا حکم

سوال :۔ بعض اوقات مغرب کی جانب سفر کرتے وقت سورج غروب ہوتا نظر نہیں آتا، ایسی حالت یا ایسے ممالک میں جہاں پر سورج غروب نہیں ہوتا، نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ جہاں پر سورج کے غروب نہ ہونے کی وجہ سے رات و دن کا امتیاز ناممکن ہو تو قریبی ممالک کے اوقات کو اعتبار دے کر چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے، تاہم اگر کہیں سفر کی حالت میں وقت ممتد نہ ہو لیکن سورج کا غروب ممکن ہو تو پھر سورج کے غروب میں تاخیر سے نماز کے اوقات پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال الحصکفیؒ: (وفاقد وقتهما) كبلغار فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق فی اربعينية الشتاء۔ مكلف بهما فيقدر لهما ولا ينوي القضاء لفقد وقت الاداء به افتى البرهان الكبير، واختاره الكمال وتبعه ابن الشحنة فی ألغازه فصححه فزعم المصنف انه المذهب۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۶۲ کتاب الصلوٰۃ) [2]

---

[1] قال ابن نجيمؒ (قوله والظهر من الزوال الى بلوغ الظل مثليه سوى الفئ) اى وقت الظهر ..... والاولى قول ابی حنيفة قال فی البدائع انها المذكورة فی الاصل وهو الصحيح وفی النهاية انها ظاهر الرواية عن ابی حنيفة وفی غاية البيان وبها اخذ ابوحنيفة وهو المشهور عنه وفی المحيط والصحيح قول ابی حنيفة وفی الينابيع وهو الصحيح عن ابی حنيفة وفی تصحيح القدوری للعلامة قاسم ان برهان الشريعة المحبوبی اختاره وعول عليه النسفی۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۴۵ كتاب الصلوٰة)

[2] لما اخرجه الامام مسلم بن حجاج القشيری۔ عن النواس بن سمعان حديثاً طويلاً ... ما لبثه فی الارض قال اربعون يوماً۔ يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر ايامه كايامكم قلنا يا رسول الله فذلك اليوم الذی كسنة اتكفينا فيه صلوٰة يوم قال لا اقدروا له قدره ... الخ۔ (الصحيح المسلم ج ۲ ص ۴۰۱ باب ذكر الدجال)

زوال کا وقت

سوال: میں ایک طالب علم ہوں اور تعلیم کی غرض سے ایک شہر میں آیا ہوں، یہاں ایک بات بہت مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ نماز ظہر کا وقت ۵۵/۱۱ سے شروع ہوتا ہے جبکہ ہم نماز ۱/۲/۱۲ بجے پڑھتے ہیں، کیا ہم اس مولوی صاحب کی بات کا اعتبار کر کے ۱/۲/۱۲ بجے سے پہلے نماز پڑھ سکتے ہیں؟

الجواب: زوال کا وقت موسم کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے اور اختلافِ مکان کی وجہ سے زوال کے اوقات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، تحقیق کر کے معلوم کیا جائے کہ زوال کا وقت اس وقت ہمارے بلاد میں کیا ہے؟

ہمارے بلاد میں جو نمازِ ظہر پڑھی جاتی ہے یہ مستحب وقت میں پڑھی جاتی ہے اگر کوئی اس سے قبل بھی پڑھنا چاہے تو وقتِ زوال معلوم کر کے پڑھ سکتا ہے البتہ زوال کے وقت پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

و الزوال ظهور زيادة الظل لكل شخص فى جانب المشرق كذا فى الكافى وطريق معرفة زوال الشمس و فئ الزوال ان تغرز خشبة مستوية فى ارض مستوية فما دام الظل فى الانتقاص فالشمس فى حد الارتفاع واذا اخذ الظل فى الازدياد علم ان الشمس قد زالت فاجعل على رأس الظل علامة فمن موضع العلامة الى الخشبة يكون فئ الزوال۔

(الهندية ج ۱ ص ۵۱ الفصل الاول فى اوقات الصلاة)

ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبات...... وعند الانتصاف الى ان تزول۔ (الهندية ج ۱ ص ۵۲ الفصل الثالث فى بيان الاوقات التى لا تجوز فيها الصلوة وتكره فيها) [1]

---

[1] قال ابن نجيمؒ: و فى معرفة الزوال روايات اصحها ان يغرز خشبة مستوية فى ارض مستوية ويجعل عند منتهى ظلها علامة فان كان الظل ينقص عن العلامة فالشمس لم تزل وان كان الظل يطول ويجاوز الخط علم انها زالت وان امتنع الظل من القصر والطول فهو وقت الزوال كذا فى الظهيرة۔ (بحر الرائق ج ۱ ص ۲۴۵ باب كتاب الصلوٰة)
ومنع عن الصلوٰة وسجدة التلاوة الجنازة عند الطلوع والاستواء۔ (جلد ۱ ص ۲۴۹ باب الاوقات)

مکروہ اوقات کی مقدار کا حکم

سوال:۔ طلوع اور غروبِ آفتاب کے دوران مکروہ وقت کی مقدار کتنی ہے؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام نے ان اوقات میں مکروہ وقت کی پہچان کی علامت یہ لکھی ہے کہ طلوع یا غروبِ آفتاب کے وقت جب کوئی سورج کو دیکھے تو دیر تک دیکھ سکے اور اس کی آنکھوں کو کسی قسم کی دشواری محسوس نہ ہو بشرطیکہ آسمان بالکل صاف ہو، بادل وغیرہ نہ ہوں تو یہ وقت مکروہ ہے۔ تخمینی مقدار یہ ہے کہ جب سورج ایک رمح (نیزہ جو کہ بارہ بالشت کا ہوتا ہے) کے برابر اونچا ہو جائے تو اس کے بعد نماز پڑھنا جائز ہے اس سے قبل کا وقت مکروہ ہے اور غروب کے وقت جب سورج ایک رمح سے کم ہو جائے تو مکروہ وقت شروع ہو جاتا ہے، اس وقت صرف اُسی دن کی نمازِ عصر پڑھنی جائز ہے باقی نمازیں جائز نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتاخیر عصر صیفا وشتاء توسعۃ للنوافل مالم یتغیرذکاء بان لاتحار العین فیہا فی الاصح۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ فی الاصح) صححہ فی الہدایۃ وفی الظہیریۃ ان امکنہ الحالۃ النظر فقد تغیرت وعلیہ الفتویٰ وفی النصاب وغیرہ وبہ ناخذ وھو قول ائمتنا الثلاثۃ ومشائخ بلخ وغیرھم..... وقیل حد التغیر ان یبقی للغروب اقل من رمح۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۶۷ کتاب الصلوٰۃ، اوقات الصلوٰۃ)

قال ابن عابدینؒ ایضاً (تحت قولہ مع شروق) ما دامت العین لاتحار فیہا فہی فی حکم الشروق کما تقدم فی الغروب انہ الاصح کما فی البحر.... اقول ینبغی تصحیح مانقلوہ عن الاصل للامام محمد من انہ مالم ترتفع الشمس قدر رمح فہی فی حکم الطلوع لان اصحاب المتون مشوا علیہ فی صلوٰۃ العید حیث جعلوا اول وقتہا من الارتفاع ولذا جزم بہ فی الفیض ونور الایضاح۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۱ کتاب الصلوٰۃ اوقات الصلوٰۃ)[۱]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وذکر فی الاصل مالم ترتفع الشمس قدر رمح فہی فی حکم الطلوع واختار الفضلی ان الانسان مادام یقدر علی النظر الی قرص الشمس فی الطلوع فلا تحل الصلوٰۃ فاذا عجز عن النظر حلت۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۰ کتاب الصلوٰۃ، باب المواقیت)

وفی الہندیۃ: وعند احمرارہا الی ان تغیب الا عصر یومہ ذلک فانہ یجوز اداؤہ عند الغروب۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص ۵۲ الفصل الثالث فی بیان الاوقات التی لاتجوز فیہا الصلوٰۃ)

استوائے شمس کے وقت مکروہ وقت کی مقدار

سوال:۔ استوائے شمس کے وقت مکروہ وقت کی مقدار کے بارے میں لوگوں کی مختلف آراء ہیں، بعض لوگ دو تین منٹ اور بعض بیس پچیس منٹ کا دورانیہ بتلاتے ہیں، اس دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں، اندریں صورت مکروہ وقت کی صحیح مقدار ازروئے شرع بیان فرمائیں؟

الجواب:۔ زوال میں زیادہ وقت نہیں لگتا اور نہ اس کے لیے کوئی متعین وقت مقرر ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ نصف النہار سے چند منٹ قبل اور چند منٹ بعد نماز پڑھنے سے توقف کرنا چاہیئے۔

هٰكذا فى فتاوىٰ محمودیه جلد ۲ صـ۲۳۷ [۱]

مکروہ اوقات میں نماز جنازہ وسجدۂ تلاوت کا حکم

سوال:۔ مکروہ اوقات یعنی غروب آفتاب، طلوع آفتاب اور استوائے شمس کے وقت نماز جنازہ پڑھنا یا سجدۂ تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مکروہ اوقات ہی میں اگر جنازہ تیار ہو جائے یا سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے تو ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھنا اور سجدۂ تلاوت کرنا بلا کراہت جائز ہے البتہ اگر جنازہ پہلے سے تیار ہو یا سجدۂ تلاوت پہلے سے واجب ہو چکا ہو تو پھر ان اوقاتِ مکروہہ میں نماز جنازہ پڑھنا اور سجدۂ تلاوت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال العلامة الحصكفیؒ: وكره صلوٰة مطلقاً ولو قضاءً او واجبةً او نفلاً او على جنازة وسجدة تلاوت وسهو لا شكر قنية مع شروق واستواء وغروب الاعصر يومه...... و سجدة تلاوة وصلوٰة جنازة تليت فى كامل وحضرت الجنازة قبل لوجوبه كاملاً فلا يتأدى ناقصًا فلو وجبتا فيها لم يكره فعلهما اى تحريمًا وفى التحفة الافضل ان لا تؤخر الجنازة۔ قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله فى التحفة الخ) فثبتت كواهة التنزيه

---

[۱] قال الشيخ المحقق محمد یوسف الدھیانوی:۔ زوال میں نو سے زیادہ منٹ نہیں لگتے لیکن احتیاطاً نصف النہار سے پانچ منٹ قبل اور پانچ منٹ بعد نماز میں توقف کرنا چاہیئے۔
(آپ کے مسائل اور ان کا حل ج ۲ صـ۱۰۵ اوقاتِ نماز)

فی سجدۃ التلاوۃ دون صلوٰۃ الجنازۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۲ تا ۳۷۴ کتاب الصلوٰۃ الاوقات) ؎۱

فجر اور عصر کے بعد قضاء نمازوں کا حکم

سوال:۔ کیا طلوعِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی نماز کے بعد غروبِ آفتاب تک قضاء نمازیں پڑھنا جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ طلوعِ فجر کے بعد نمازِ فجر سے پہلے صرف دو رکعت سُنتیں ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نفلی نماز جائز نہیں بلکہ مکروہ تحریمی ہے، اور نہ عصر کی نماز کے بعد نوافل جائز ہیں، البتہ قضاء نمازیں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکرہ نفل قصدًا ولو تحیۃ مسجد ولو سنۃ الفجر بعد صلوٰۃ فجر وصلوٰۃ عصر ولو المجموعۃ بعرفۃ ولا یکرہ قضاء فائتۃ ولو وترًا۔ الخ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ وکرہ نفل) والکراھیۃ ھٰھنا تحریمیۃ ایضًا کما صرح بہ فی الحلیۃ۔ ولذا عبر فی الخانیۃ والخلاصۃ: بعدم الجواز والمراد عدم الحل لاعدم الصحۃ کما لا یخفی۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۴ کتاب الصلوٰۃ۔ اوقات الصلوٰۃ) ؎۲

حرمین شریفین میں مثلین سے قبل نمازِ عصر پڑھنے کا حکم

سوال:۔ لوگ جب حج یا عمرہ کے لیے حرمین شریفین جاتے ہیں تو وہاں

؎۱ وفی الھندیۃ: ثلاث ساعات لاتجوز فیھا المکتوبۃ ولا صلوٰۃ الجنازۃ ولا سجدۃ التلاوۃ ...۔ ھٰذا اذا وجبت صلوٰۃ الجنازۃ وسجدۃ التلاوۃ فی وقت مباح واخرتا الی ھٰذا الوقت فانہ لایجوز قطعًا اما لو وجبتا فی ھٰذا الوقت وادیتا فیہ جاز لانھا ادیت ناقصۃ کما وجبت ..... لکن الافضل فی سجدۃ التلاوۃ تاخیرھا وفی صلوٰۃ الجنازۃ التاخیر مکروہ۔ (الفتاویٰ الھندیہ ج ۱ ص ۵۲ الفصل الثالث فی بیان الاوقات التی لاتجوز فیھا الصلوٰۃ وتکرہ فیھا)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۴۹ مواقیت الصلوٰۃ۔

؎۲ قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: واما الوقتان الاٰخران ..... فانہ یکرہ فیھما التطوع فقط ولا یکرہ فیھما الفرض ...... وھما ای الوقتان المذکوران ما بعد طلوع الفجر الی ان ترتفع الشمس فانہ یکرہ فی ھٰذا الوقت النوافل کلھا الا سنۃ الفجر ..... وما بعد صلوٰۃ العصر الی غروب الشمس لحدیث ابن عباسؓ۔ (کبیری ص ۲۳۸ کتاب الصلوٰۃ، الشرط الخامس)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۱ اوقات الصلوٰۃ۔

عصر کی نماز مثلین سے قبل ہوتی ہے، تو کیا ہم لوگ جماعت میں شامل ہو کر عصر کی نماز ادا کر سکتے ہیں یا مثلین تک تاخیر کریں؟

الجواب: عصر کی نماز مثلین کے بعد پڑھنا افضل ہے اگرچہ اس میں جماعت فوت ہو جانے کا خدشہ ہو، مگر یہ حکم دیگر عام مقامات کے لیے ہے، حرمین شریفین کی حرمت اور فضیلت کی وجہ سے جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے اور مثلین تک تاخیر کرنا ضروری نہیں، بلکہ حرمین شریفین میں باجماعت نماز پڑھنا افضل ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (وعلیہ عمل الناس الیوم) وانظر هل اذا لزم من تاخیرہ العصر الی المثلین فوت الجماعۃ یکون الاولیٰ التاخیر ام لا؟ والظاهر الاول بل یلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۳۵۹ کتاب الصلوٰۃ، اوقات الصلوٰۃ)

افطاری کی وجہ سے نمازِ مغرب میں تاخیر کرنا

سوال: رمضان المبارک میں افطاری کی وجہ سے لوگ مغرب کی نماز میں تاخیر کر دیتے ہیں، کیا افطاری کی وجہ سے نمازِ مغرب میں تاخیر کرنا جائز ہے؟

الجواب: مغرب کی نماز میں دو رکعت نماز کی مقدار تاخیر کرنا تو بالاتفاق جائز ہے اس سے زیادہ تاخیر کرنا مکروہ تنزیہی ہے، البتہ رمضان المبارک میں جب بھوک زیادہ ہو تو چند منٹ کی تاخیر جائز ہے بشرطیکہ یہ تاخیر ستاروں کے کثرتِ تعداد میں چمکنے تک نہ پہنچے، اس لیے کہ بھوک کی حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: کرہ ای التاخیر لا الفعل لانہ مأمور بہ تحریماً الا بعذر کسفر وکونہ علی اکل۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ الا بعذر) وعبارتہ الا من عذر کسفر ومرض وحضور مائدۃ او غیم۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۶۹ کتاب الصلوٰۃ۔ اوقات الصلوٰۃ)[1]

مغرب اور عشاء کے درمیانی وقت کے تعین کا حکم

سوال: آجکل مساجد میں نماز کے لیے دائمی کیلنڈر ہوتے ہیں اور

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: واما المغرب فیکرہ تاخیرها اذا غربت الشمس وفی السراجیۃ الا بعذر السفر او بأن کان علی المائدۃ۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۱ ص ۴۰۶ کتاب الصلوٰۃ المواقیت)

لوگ اس کے مطابق نماز کے اوقات تبدیل کرتے ہیں، ان میں سے بعض کیلنڈروں میں مغرب و عشاء کا درمیانی وقت پونے دو گھنٹے اور بعض میں ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت درج ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ مغرب اور عشاء کے درمیان صحیح وقت کتنا ہے؟

الجواب: مغرب اور عشاء کے درمیان کوئی متعین وقت مقرر نہیں، البتہ مفتی بہ قول کی رُو سے شفقِ احمر کے غروب کے بعد عشاء کا وقت داخل ہو جاتا ہے، جبکہ خطِ استواء کے درمیانی مقام پر معتدل ایام میں ۴۵ منٹ کے بعد شفقِ احمر غروب ہوتا ہے اور ۷۵ منٹ کے بعد سفیدی غروب ہوتی ہے، دیگر مقامات میں اس سے زیادہ وقت بھی ہو سکتا ہے اور اس زیادتی کی کوئی تحدید نہیں، البتہ مغرب کی اذان کے سوا گھنٹہ بعد عشاء کی اذان دینی چاہیئے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ووقت المغرب منه الی غروب الشفق وهو الحمرة عندهما وبه قالت الثلاثة و الیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها فکان هو المذهب۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله الیه رجع الامام) ای الی قولهما الذی هو روایة عنه ایضًا وصرح فی المجمع بان علیها الفتوٰی۔

(رد المحتار ج۱ ص۳۶۱ اوقات الصلوٰة۔ مطلب فی الصلوٰة الوسطیٰ)[1]

نصف شب کے بعد عشاء کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال: ہم نے عام کتابوں میں پڑھا ہے کہ نمازِ عشاء کا وقت غروبِ شفق سے لے کر طلوعِ فجر تک ہے یعنی اس دوران نمازِ عشاء پڑھنا جائز ہے لیکن "مجموعۃ الفتاوٰی اردو جلد ا ص۲۰۱ (ایچ ایم سعید کراچی)" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز نصف شب کے بعد پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور صبح کے وقت نماز کا اعادہ واجب ہے، گویا کہ نصف شب کے بعد نماز نہیں ہوتی حالانکہ یہ وقت نماز ہی کا ہے۔

الجواب: عشاء کی نماز کو نصف شب تک مؤخر کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک نصف شب تک مؤخر کرنا مکروہ تحریمی ہے اور جو بھی نماز کراہتِ تحریمی کے ساتھ

---

[1] وفی الهندیة: ووقت المغرب منه الی غیبوبة الشفق وهو الحمرة عندهما وبه یفتی۔
(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۵۱ الباب الاول فی المواقیت، الفصل الاول فی اوقات الصلوٰة)
و مِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۴۶ مواقیت الصلوٰة۔

ادا کی جائے واجب الاعادہ ہوتی ہے، اور بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے۔ اس کی علت تقلیل جماعت ہے، کراہت تنزیہی کا معاد خلافِ اولیٰ ہے اور یہی رائے راجح اور مفتیٰ بہ ہے اس لیے نصف شب کے بعد بھی عشاء کی نماز پڑھی جا سکتی ہے اور اس کا اعادہ بھی واجب نہیں صرف خلافِ اولیٰ ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: فان اخرها مازاد علی النصف کرہ لتقلیل الجماعۃ ۔۔۔۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ کرہ) ای تحریمًا کما یأتی تقییدہ فی المتن او تنزیهًا وهو الاظهر کما نذکرہ عن الحلیۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۳۶۸ کتاب الصلوٰۃ، اوقات الصلوٰۃ)

ایضًا وقال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ الآتی ای تحریمًا) کذا فی البحر عن القنیۃ لکن فی الحلیۃ ان کلام الطحاوی یشیر الی ان الکراهۃ فی تاخیر العشاء تنزیهیۃ وهو الاظهر۔ (رد المحتار ج ۱ ص۳۶۹ کتاب الصلوٰۃ، اوقات الصلوٰۃ) [۱]

تہجد کا وقت کب شروع ہوتا ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مجھے تہجد پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن نیند کے غلبہ کی وجہ سے صبح صادق سے پہلے اٹھنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے، اگر میں آدھی رات کے بعد تہجد پڑھ کر سو جاؤں تو کیا میری تہجد کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ تہجد کے وقت کے بارے میں اگرچہ مختلف روایات مروی ہیں مگر راجح یہ ہے کہ نصف شب کے بعد تہجد کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اگر کوئی نصف شب کے بعد دو چار رکعت پڑھ لے تو تہجد ادا ہو جائے گی چاہے وہ سویا ہو یا نہ، تاہم سو کر اٹھنے کے بعد تہجد پڑھنا افضل ہے۔

لما قال العلامۃ شاہ عبد العزیز الدهلویؒ: اول وقت آں بعد از نصف شب است سواء سبقہ النوم ام لا۔ (فتاویٰ عزیزی ص۵ کتاب الصلوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ، وفی الغیاثیۃ الّا اذا کان فیہ تفرق الجماعۃ وبعدہ الی نصف اللیل مباح غیر مکروہ۔ قال الطحاویؒ: وبعد نصف اللیل الی طلوع الفجر مکروہ اذا کان التاخیر بغیر عذر۔
(الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج ۱ ص۴۰۶ کتاب الصلوٰۃ۔ المواقیت)

[۲] لما قال المفتی عبد الرحیم لاجپوری: مختار مذہب یہ ہے کہ تہجد کا وقت نصف شب کے بعد شروع ہوتا ہے خواہ اس سے پہلے سویا ہو یا نہ سویا ہو، ہاں سونے کے بعد اٹھ کر پڑھنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۴ ص۲۸۳ باب اوقات الصلوٰۃ)

مغرب کے وقت کی مقدار

سوال:۔ نمازِ مغرب میں تعجیل کی افضلیت کو دیکھ کر بعض لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ مغرب کا وقت نہایت مختصر ہے اس کی مقدار عموماً کیا ہونی چاہیئے ؟

الجواب:۔ مغرب کا وقت فقہ حنفی کے مطابق غروب الشمس سے شروع ہو کر شفقِ احمر کے غروب تک رہتا ہے اور امام صاحبؒ کے نزدیک شفقِ ابیض تک رہتا ہے۔

مغرب کا وقت موسم اور علاقہ جات کے قرب و بُعد میں متاثر ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ بعض علاقوں میں گھنٹہ اور بعض علاقوں میں ایک گھنٹہ تین منٹ اور بعض میں ایک گھنٹہ پندرہ منٹ اور بعض میں ایک گھنٹہ بیس منٹ وقت ہوتا ہے، عموماً مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹہ کا وقفہ ہونا چاہیئے۔

تاہم مغرب کی نماز شفقِ احمر سے پہلے پڑھنی چاہیئے تاکہ اختلاف سے محفوظ رہے، البتہ مسافر یا دوسرے صاحبِ عذر کے لیے شفقِ ابیض میں پڑھنا مرخص ہے۔

قال الحصکفیؒ: (و) وقت (المغرب منه الی) غروب (الشفق وهو الحمرة) عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها فکان هو المذهب (و) وقت (العشاء والوتر منه الی الصبح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۶۱ کتاب الصلوٰۃ) [1]

XXXXX

---

[1] ووقت المغرب منه الی غیبوبة الشفق وهو الحمرة عندهما وبه یفتی هکذا فی شرح الوقایة وعند ابی حنیفة الشفق هو البیاض الذی یلی الحمرة هکذا فی القدوری وقولهما اوسع للناس وقول ابی حنیفة احوط لان الاصل فی باب الصلوٰة ان لا یثبت فیها رکن ولا شرط الا بما فیه یقین کذا فی النهایة ناقلاً عن الاسرار ومبسوط شیخ الاسلام ووقت العشاء والوتر من غروب الشفق الی الصبح کذا فی الکافی۔

(الهندیة ج ۱ ص۵۱ الباب الاول فی المواقیت)

باب الاذان والاقامة

(اذان اور اقامت کے بیان میں)

اذان کا شرعی حکم | **سوال**:- اذان کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور کن کن نمازوں کے لیے اذان دینی چاہیئے؟

الجواب:- اذان پانچ وقتہ نمازوں اور جمعہ کی نماز کے لیے دینا سنتِ مؤکدہ ہے، فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر پوری قوم بالاتفاق اذان ترک کردے تو اس کے ساتھ قتال کیا جائے، البتہ پانچ وقتہ نماز اور جمعہ کی نماز کے علاوہ دیگر نمازوں مثلاً صلوٰۃ کسوف وخسوف، تراویح یا جنازہ وغیرہ کے لیے اذان نہیں دی جائے گی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وھو سنة للرجال فی مکان عال مؤکدة ھی کالواجب فی لحوق الاثم للفرائض الخمس فی وقتها ولو قضاء لانه سنة للصلوٰة حتی یبرد به لا للوقت لا یسن لغیرها کعید۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله کعید) ای وتر وجنازة وکسوف واستسقاء وتراویح، الخ

{ رد المحتار ج۱ صـ۳۸۴ باب الاذان
مطلب فی المواضع التی یندب لها الاذان } لـه

یک وقت تعدد اذان | **سوال**:- ہمارے شہر میں ایک مسجد ایسی ہے جس میں عشاء کی اذان کے بعد اقامت سے پہلے تمام نمازی بمع امام صاحب

لـه قال العلامة صدر الشریعة: وھو سنة للفرائض الخمس والجمعة ولیس بسنة فی النوافل۔ قال العلامة عبد الحی اللکھنویؒ: (تحت قوله ولیس بسنة فی النوافل) اراد بالنوافل ما سوی الفرائض فان کل ما وراء الفرائض نافلة ای زائدة علیها۔ (السعایة ج۲ صـ۹ باب الاذان)

ومثله فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی صـ۱۵۶ باب الاذان۔

پہلی صف میں اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوکر اذان دیتے ہیں اور مسجد کے چاروں کونوں میں پھونک مارتے ہیں، اس کے بعد اقامت ہوتی ہے اور نماز شروع کرتے ہیں۔ کیا عندالشرع ایسا کرنا جائز ہے اور اس کا کوئی ثبوت ہے اور ایسا کرنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ عشاء کی اذان اور اقامت کے درمیان متعدد بار اذان کہنا عندالشرع اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ اپنی جانب سے اختراع اور بدعت ہے، اذان صرف فرض نماز کے لیے مشروع ہے اس کے علاوہ اذان کی سُنّیت ثابت نہیں۔

قال الحصکفیؒ: لانہ سنۃ للصلوٰۃ حتی یبرد بہ لا للوقت (لا) یسن (لغیرھا) کعید۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۲۸۳ باب الاذان، کتاب الصلوٰۃ) [۱]

ظالم کی اذان کا حکم

سوال:۔ ایک شخص جو خود بھی ظالم ہے اور اس کے بیٹے بھی ایک جرم کی پاداش میں گرفتار ہوگئے ہیں، ان کی رہائی کے لیے اس نے رشوت دی اور ان کو رہا کروایا۔ یہ شخص مستقل طور پر ایک مسجد کا مؤذن بھی ہے، کسی کو اذان کہنے نہیں دیتا، کیا اس شخص کی یہ اذان صحیح ہے ؟

الجواب:۔ ظلم کرنا اور رشوت دینا امورِ فسقیہ میں سے ہے ایسے شخص کی اذان مکروہ تحریمی ہے، البتہ ایسی اذان پر نماز میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ واجب الاعادہ ہے جبکہ ایسی اذان پر نماز باجماعت بھی پڑھی جاسکتی ہے تاہم اذان کا دوبارہ پڑھنا مستحب ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویکرہ اذان جنب واقامتہ واقامۃ محدث لا اذانہ علی المذھب (و) اذان (امرأۃ) وخنثی (وفاسق) ولو عالماً لکنہ اولی بامامتہ واذان من جاھل تقی...... ویعاد اذان الجنب ندباً۔ قال ابن عابدین (یعاد اذان جنب) زاد القھستانی والفاجر والراکب والقاعد... الخ (رد المحتار باب الاذان ج ۱ ص۳۹۲، ۳۹۳) [۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: الاذان سنۃ لاداء المکتوبات بالجماعۃ کذا فی فتاویٰ قاضی خان ولیس لغیر الصلوٰۃ الخمس والجمعۃ نحو السنن والوتر الیٰ آخرہ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۵۳ باب الاذان)

[۲] قال ابن نجیمؒ تحت ھذا القول (وکرہ اذان... والفاسق) اما الفاسق فلان قولہ لا یوثق بہ ولا یقبل فی الامور الدینیۃ ولا یلزم احداً فلم یوجد الاعلام ـــــ صرح بکراھۃ اذان الفاسق ولا یعادہ فالاعادۃ فیہ لیقع علی وجہ السنۃ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۲۶۳ باب الاذان) ومثلہ فی فتح القدیر ج ۱ ص۳۲ باب الاذان۔

اذان کے جواب میں درود شریف پڑھنا

سوال:۔ بعض لوگ اذان کے جواب میں درود شریف پڑھتے ہیں، کیا اس کا پڑھنا سنت ہے؟

الجواب:۔ درود شریف کا پڑھنا ایک امر مستحسن ہے لیکن اذان کے جواب میں اس کے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ اذان کے جواب میں اجابت مسنون ہے، یعنی جو کلمہ مؤذن سے سُنے وہ سامع کہے البتہ چند کلموں میں اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اذان کا جواب دیا جائے، البتہ اگر کسی نے درود شریف پڑھ لیا تو کوئی حرج نہیں تاہم اذان کے بعد دعا سے قبل درود شریف پڑھنا مسنون ہے۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ثم صلّوا عَلَیَّ فانہ من صلی علی صلوٰۃ صلی اللہ علیہ بہا عشرًا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص۱۶۶)

وفی الھندیۃ: یجب علی السامعین عند الاذان الاجابۃ وھی ان یقول مثل ما قال المؤذن الا فی قولہ حیّ علی الصلوٰۃ حیّ علی الفلاح فانہٗ یقول مکان حیّ علی الصلوٰۃ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ الی اٰخرہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۵۷ الفصل الثانی فی کلمات الاذان) [1]

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے آخر میں ہا ہا کہنا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں جب اذان دی جاتی ہے تو بعض لوگ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے آخر میں ہا ہا وغیرہ کہتے ہیں تو اس پڑھنے کا حکم عند الشرع کیا ہے؟

الجواب:۔ اگر کسی لفظ کی زیادتی یا کمی سے معنیٰ میں تغیرِ فاحش لازم آئے تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، اگر تغیرِ معنیٰ نہ آئے تو یہ جائز ہے۔ مذکورہ غلطی سے فسادِ معنیٰ اگرچہ نہیں آتا لیکن بچنا لازمی ہے۔

قال الحصکفیؒ: ومنھا القرأۃ بالالحان إن غیر المعنی والا لا الا فی حرف مد ولین فلو فی اعراب او تخفیف مشدد وعکسہ بزیادۃ

---

[1] (و) صفۃ الاجابۃ ان یقول کما قال ای مثل الفاظ المؤذن (و) لکن (حوقل) ای قال لاحول ولا قوۃ الا باللہ ای لاحول لنا عن معصیۃ ولا قوۃ لنا علی طاعۃ الا بفضل اللہ (فی سماعہ الحیعلتین)۔ (مراقی الفلاح علی الطحطاوی ص۱۱۰)
ومثلہٗ فی ردّ المختار ج ۱ ص۳۹۸ باب الاذان)

حرف فاکثر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۳۰ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [1]

اذان میں بھول جانا

سوال:۔ اگر اذان میں کوئی کلمہ بھول جائے اور بعد میں یاد آئے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی کلمہ بھول جائے یا تقدیم و تاخیر کرے تو اختتام سے قبل اس کا ازالہ کر کے آگے ترتیب سے اذان کہنا شروع کرے، البتہ اگر غلطی کا احساس اذان کے بعد ہوا اور باتوں کی وجہ سے تدارک ممکن نہ ہو تو اعادہ کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ: ولو قدم فیهما مؤخراً اعاد ما قدم فقط (ولا یتکلم فیهما) اصلاً ولو رد السلام فان تکلم استانفه۔ (در مختار ج ۱ ص ۳۸۶ باب الاذان) [2]

اذان و اقامت کیلئے دائیں جانب کا تعین

سوال:۔ اذان و اقامت میں عموماً دائیں جانب کی رعایت کی جاتی ہے، بسا اوقات بائیں طرف اقامت کہنے یا اذان دینے پر ڈانٹا بھی جاتا ہے، از روئے شرع کیا یہ تعین درست ہے؟

الجواب:۔ اذان و اقامت کے لیے کسی خاص جانب کا تعین ضروری نہیں، البتہ افضل یہ ہے کہ اذان ایسی جگہ پر دی جائے جہاں سے کامل طور پر سب لوگ اذان سن سکیں، چاہے مسجد کی دائیں جانب ہو یا بائیں جانب۔

---

[1] اما ان قرأ حرفاً مکان حرف او زاد حرفاً او نقص او قدم المؤخر او اخر المقدم واما ان کان کلمة او زاد کلمة او نقص او قدم او اخر واما ان قرأ اٰیة مکان اٰیة او نقص او زاد و قدم المؤخر او اخر المقدم اما اذا قرأ حرفاً مکان حرف ولم یغیر المعنیٰ بان قراء انّ المسلمین ان المسلمون لا یفسد۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۰۶ الفصل الثانی عشر فی زلة القاری)

[2] اذا قدم فی اذانه واقامته شیئاً بان قال اوّلاً اشهد انّ محمداً رسول الله ثم قال اشهد ان لا اله الّا الله فعلیه ان یقول بعد کلمة الشهادة اشهد انّ محمداً رسول الله واذا اذن ومکث ساعة ثم اخذ فی الاقامة فظن انها اذان وصنع فیها ما صنع فی الاذان فقیل له هٰذه اقامة فانه یستقبل الاقامة من اولها۔
(خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۴۹ الفصل الاول فی الاذان)۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله ویستدیر فی المنارة) یعنی ان لم یتم الاعلام بتحویل وجهه مع ثبات قدمیه ولم تکن فی زمنه صلی الله علیه وسلم مئذنة (بحر ج۱) قلت وفی شرح الشیخ اسماعیل عن الاوائل للسیوطیؒ ان اول من رقی منارة مصر للاذان شرحبیل بن عامر المرادی وبنی سلمة المنایر للاذان بامر معاویة ولم تکن قبل ذلک۔ وقال ابن ابن سعد بالسند الی ام زید بن ثابتؓ کان بیتی اطول بیت حول المسجد فکان بلال یؤذن فوقه من اول ما اذن الی ان بنی رسول الله صلی الله علیه وسلم مسجده فکان یؤذن بعد علی ظهر المسجد وقد رفع له شئ فوق ظهره۔

(رد المختار علی در المختار ج ۱ ص ۳۸۵ باب الاذان) ۔ [1]

اذان اور اقامت کی اہمیت

سوال :۔ از روئے شرع اذان اور اقامت کی اہمیت کیا ہے؟ اگر سنت کے حوالہ سے کہیں چھوڑ دی جائے تو اس کا نتیجہ کیا رہے گا؟

الجواب :۔ اذان اور اقامت دین کے اہم امور میں سے ہیں، بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ ہیں اور بعض کے نزدیک واجب ہیں، اگر کسی محلہ والے دائمی اذان واقامت چھوڑ دیں تو ان سے قتال کرنے کا بھی حکم ہے ۔

قال ابن عابدینؒ: (ھی کالواجب) بل اطلق بعضھم اسم الواجب علیه لقول محمد لو اجتمع اھل بلدة علی ترکه قاتلھم علیه ولو ترکه واحد ضربته وحبسته و عامة المشائخ علی الاول والقتال علیه لما انه من اعلام الدین وفی ترکه استخفاف ظاھر به۔ (رد المختار ج ۱ ص ۳۸۴ باب الاذان) ۔ [2]

---

[1] وفی الھندیة والسنة ان یؤذن فی موضع عالٍ یکون اسمع لجیرانه ویرفع صوته ولا یجھد نفسه ..... ویقیم علی الارض ھکذا فی القنیة وفی المسجد ھکذا فی البحر الرائق ۔ (الھندیة ج ۱ ص ۵۵ باب الاذان) وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۵ باب الاذان ۔

[2] قال ابن نجیم (قوله سن للفرائض) ای سن الاذان للصلوٰة الخمس والجمعة سنة مؤکدة قویة قریبة من الواجب حتی اطلق بعضھم علیه الوجوب ولھذا قال محمد لو اجتمع اھل بلدٍ علی ترکه قاتلناھم علیه وعند ابی یوسف یحبسون ویضربون وھو یدل علی تاکده لا علی وجوبه لان المقاتلة لما یلزم من الاجتماع علی ترکه من استخفافھم بالدین بخفض اعلامه لان الاذان من اعلام الدین ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۵ باب الاذان) ومثله فی خلاصة ج ۱ ص ۴۸ باب الاذان ۔

وقت سے قبل اذان دینا

سوال:۔ بعض مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں صبح کی اذان طلوعِ فجر سے پہلے دی جاتی ہے، ایسی اذان کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اذان قبل از وقت باتفاقِ علماء مشروع نہیں، اس کا اعادہ ضروری ہے البتہ اگر نماز اپنے وقت میں پڑھی جائے تو اس میں کوئی فساد نہیں آتا۔

قال الحصکفیؒ: فیعاد اذان وقع بعضہ (قبلہ) کالاقامۃ خلافاً للثانی فی الفجر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۸۵ باب الاذان) [1]

اذان میں روانگی سُنّت ہے

سوال:۔ بعض جگہ مؤذن اذان کے ہر کلمہ کو جدا جدا کر کے کہتا ہے جبکہ مشہور یہ ہے کہ اذان میں تکبیر دو دو کلمے ملا کر کہنا چاہیئے اگر کوئی شخص کلماتِ اذان اس طرح جدا جدا پڑھتا ہے تو اس سے صحتِ اذان پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اذان میں ترسیل سُنّت ہے یعنی تکبیر دو دو کلمے ملا کر کہے، البتہ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا بلکہ جدا جدا کلمے کہے تب بھی جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اذان کا اعادہ کیا جائے تاکہ سنت کے مطابق اذان ادا ہو جائے۔

قال الحصکفیؒ: (ویترسل فیہ) بسکتۃ بین کل کلمتین ویکرہ ترکہ وتندب اعادتہ ــــ قال ابن عابدینؒ: (قولہ بسکتۃ) أی تسع الاجابۃ مدنی عن مُلا علی قاریؒ وھذہ السکتۃ بعد کل تکبیرتین لابینھما کما افادہ فی الامداد اخذاً من الحدیث وبہ صرح فی التتارخانیہ (قولہ وتندب اعادتہ) ای لو ترک الترسل۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۳۸۷ باب الاذان) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: تقدیم الاذان علی الوقت فی غیر الصبح لایجوز اتفاقاً وکذا فی الصبح عند ابی حنیفۃ ومحمد رحمھما اللہ تعالیٰ وان قدم یعاد فی الوقت ھکذا فی شرح مجمع البحرین لابن الملک وعلیہ الفتوی ھکذا فی التتارخانیہ ناقلاً عن الحجۃ (الھندیۃ ج ۱ ص۵۳ باب الاذان) ومثلہ فی بحر الرائق ج ۱ ص۲۵۵ باب الاذان)

[2] قال ابن نجیم (قولہ ویترسل فیہ ویحدر فیھا) ای یتمھل فی الاذان ویسرع فی الاقامۃ وحدہ ان یفصل بین کلمتی الاذان بسکتۃ بخلاف الاقامۃ للتوارث...... ولو جعل الاذان اقامۃ یعید الاذان ولو جعل الاقامۃ الاذان اذانا یعید لان تکرار الاذان مشروع دون الاقامۃ ــــ قال ابن عابدین فی حاشیتہ ثم الاعادۃ انما ھی افضل۔ (بحر الرائق مع منحۃ الخالق ج ۱ ص۲۵۷-۲۵۸ باب الاذان) ومثلہ فی طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۶۱ باب الاذان۔

نشہ کی حالت میں اذان کا حکم

سوال :۔ ہماری مسجد کا ایک مؤذن ہے جو اعمال کے لحاظ سے کمزور ہے، مثلاً افیون و چرس وغیرہ کا استعمال ہمیشہ کرتا ہے، اسی حالت میں اذان بھی دیتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے اور نشہ ہی کی حالت میں وہ مسجد میں سوتا بھی ہے، تو کیا عند الشرع ایسے مؤذن کی اذان درست ہے؟ نیز مؤذن کے شرائط بھی تحریر فرماویں۔

الجواب :۔ فقہاء کرام نے مؤذن کے لیے جو شرائط لکھی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ مؤذن عاقل، صالح، متقی اور عالم بالسنۃ ہو، سنجیدہ اور لوگوں کے احوال کو بھی جانتا ہو اور جماعت سے متخلفین پہ زجر بھی کر سکتا ہو اور خود بھی اذان پہ مواظبت رکھتا ہو اور بہتر یہ ہے کہ مؤذن اسی شہر کا رہنے والا ہو

وفی الهندية: وينبغی ان يكون المؤذن رجلاً عاقلاً صالحاً تقياً عالماً بالسنة كذا فی النهاية وينبغی ان يكون مهيباً ويتفقد احوال الناس ويزجر المتخلفين عن الجماعات كذا فی القنية ...وان يكون مواظباً على الاذان هكذا فی البدائع والتتارخانيه وان يكون محتسباً فی اذانه كذا فی النهر الفائق والاحسن ان يكون اماماً فی الصلاة كذا فی معراج الدراية والافضل ان يكون المؤذن هو المقيم كذا فی الكافی۔

(الهنديه ج ۱ ص۵۳ باب الاذان)

لہٰذا جو شخص چرسی، افیمی ہو تو بحکم فسق کے اس کی اذان مکروہ تحریمی ہے اس سے نماز میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ واجب الاعادہ ہے، تاہم اذان کا دوبارہ کہنا مستحب ہے۔

قال الحصكفیؒ...ويكره اذان جنب واقامته واقامة محدث لا اذانه على المذهب (و) اذان (امرأة) و(خنثى) (فاسق) ولو عالماً لكنه اولى بامامة واذان من جاهل تقی، ويعاد اذان جنب ندباً. قال ابن عابدينؒ تحت (قوله يعاد اذان الجنب) زاد القهستانی والفاجر۔ (رد المختار ج ۱ ص۳۹۲،۳۹۳ باب الاذان) [1]

---

[1] قال ابن نجيمؒ تحت هذا القول وكره اذان .... والفاسق (اما الفاسق فلان قوله لا يوثق به ولا يقبل فی الامور الدينية ولا يلزم احداً فلم يوجد الاعلام۔ (بحر الرائق ج ۱ ص۲۶۳ باب الاذان)

تہجد کے لیے اذان کا حکم

سوال:۔ تہجد کے لیے اذان دینا کیا حیثیت رکھتی ہے؟ بعض مساجد میں اس کا اہتمام حرمین میں دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

الجواب:۔ ابتداء اسلام میں تہجد کے لیے اذان دی جاتی تھی لیکن بعد میں صحابۂ کرامؓ نے چھوڑ دی، اس لیے احناف کے ہاں تہجد کی اذان منسوخ ہے اور دینا خلافِ سنت ہے۔

اخرج الامام الطحاوی عن ابراھیم قال شَیَّعْنَا علقمۃ الی مکۃ فخرج بلیل فسمع مُؤَذِّنًا یُؤَذِّنُ بلیل فقال اَمَّا ھٰذا فقد خالف سنۃ اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لوکان نائمًا کان خیرًا لہٗ فاذا طلع الفجر اذّن فاخبر علقمہ ان التاذین قبل طلوع الفجر خلاف لسنۃ اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔[۱]

[۱] (شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۰۶ باب التاذین للفجر ای وقت ھو بعد طلوع الفجر او قبل ذٰلک)

تثویب کا حکم

سوال:۔ تثویب (یعنی مسنون اذان کے بعد دوبارہ نماز کے لیے بلانے) کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں۔

الجواب:۔ تثویب ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے البتہ فقہاء کرام نے عوام الناس کی سستی کو دیکھ کر اس کو جائز کہا ہے، لہٰذا اس دور میں اگر تثویب کی جائے تو اس پر بدعت کا اطلاق کرنا مناسب نہیں البتہ اس کو عادت بنانا بھی مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (ویثوب بین الاذان والاقامۃ فی الکل للکل بما تعارفوہ) ای کل الصلوٰۃ لظھور التوانی فی الامور الدینیۃ قال فی العنایۃ احدث المتاخرون التثویب بین الاذان والاقامۃ علی حسب ما تعارفوہ فی جمیع الصلوٰۃ سوی المغرب مع ابقاء الاول یعنی الاصل وھو تثویب الفجر وما راہ المسلمون حسنًا فھو

---

[۱] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ ھو سنۃ مؤکدۃ للفرائض الخمس فی وقتھا ولو قضاء لانہ سنۃ للصلوٰۃ حتی یبرد بہ لا للوقت ولا یسن لغیرھا کعید فیعاد اذان وقع قبلہ قال العلامۃ السید احمد الطحطاوی (قولہ کعید) ادخلت الکاف الوتر والجنازۃ والکسوف والاستسقاء والتراویح والسنن الرواتب۔ (حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۱۸۵ باب الاذان) ومثلہٗ فی منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵۵ باب الاذان۔

عند اللہ حسنًا۔ (رد المحتار علی در المختار ج ۱ ص۳۸۹ باب الاذان) لہ

اذان سے قبل تعوذ اور تسمیہ کا حکم

سوال:۔ اذان سے قبل اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ جیسا کہ آجکل اکثر مساجد میں ایسا ہوتا ہے، آیا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے؟

الجواب:۔ اذان سے قبل اعوذ باللہ اور بسم اللہ جہرًا پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں یہ زیادۃ علی الشرع کے مترادف ہے لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے، تاہم خفیہ طور پر پڑھنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

قال الحصکفیؒ (هو) لغة الاعلام وشرعًا (اعلام مخصوص) لم یقل بدخول الوقت لیعم الفائتة وبین یدی الخطیب (علی وجه مخصوص بالفاظ کذٰلك) ای مخصوصة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۸۳ باب الاذان) ۲ہ

اذان دینے کیلئے بہتر جگہ کونسی ہے

سوال:۔ اذان کے لیے کونسی جگہ موزوں ہے؟ اگر کسی اونچی جگہ سے اذان دینے میں قرب وجوار میں سے بے پردگی کا احتمال ہو تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اذان کے لیے بہتر یہی ہے کہ مسجد کے باہر اور بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دی جائے البتہ اگر ایسا کرنے سے بے پردگی کا احتمال ہو تو احتیاط بہتر ہے۔

لما قال العلامة قاضی خان وینبغی ان یؤذن علی المئذنة او خارج المسجد ولا یؤذن فی المسجد۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۱ ص۷۸) ۳ہ

لہ وفی الهندیة: والتثویب حسن عند المتاخرین فی کل صلوٰة الا فی المغرب هٰکذا فی شرح النقایة للشیخ ابی المکارم وهو رجوع المؤذن الی الاعلام بالصلوٰة بین الاذان والاقامة۔ (الهندیة ج ۱ ص۵۶ باب الاذان) ومثله فی بحر الرائق ج ۱ ص۲۶۰ باب الاذان۔

۲ہ وفی الهندیة اذان خمس عشرة کلمة وآخره عندنا لا اله الا الله کذا فی فتاوی قاضی خان۔ (ج ۱ ص۵۵ باب الاذان) ومثله فی قاضی خان علی هامش فتاوی هندیه ج ۱ ص۷۸)

۳ہ قال ابن نجیمؒ: وینبغی للمؤذن ان یؤذن فی موضع یکون اسمع للجیران ویرفع صوته ولا یجهد نفسه لانه یتضرر بذلك وفی الخلاصة ولا یؤذن فی المسجد۔ (بحر الرائق ج ۱ ص۲۵۵ باب الاذان) ومثله فی الهندیة ج ۱ ص۵۵ باب الاذان۔

وضو کے بغیر اذان دینا

سوال:- وضو کے بغیر اذان دینے کا کیا حکم ہے؟ کیا ایسی صورت میں اذان کا اعادہ ضروری ہے؟

الجواب:- اذان کے لیے بذاتِ خود طہارت شرط نہیں اسلئے بلا وضو اذان دینے میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی واجب الاعادہ ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ بلا وضو اذان دینے کو عادت نہ بنایا جائے۔

قال الحصکفیؒ: ویکرہ اذان جنب واقامتہ واقامۃ محدث لا اذانہ۔

(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۳ ص۳۹۲ باب الاذان) [۱]

نابالغ کی اذان کا حکم

سوال:- نابالغ کی اذان عندالشرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر صبی (بچہ) قریب البلوغ ہو اور عاقل ہو تو اس کی اذان جائز ہے اور اگر صبی غیر عاقل ہو تو اس کی اذان جائز نہیں بلکہ واجب الاعادہ ہے۔

لما قال العلامہ التمرتاشی یجوز اذان صبی مراھق وعبد واعمیٰ وولد الزنا واعرابی.... ویعاد اذان جنب لا اقامتہ وکذا اذان امرأۃ وسکران وصبی لا یعقل۔

(تنویر الابصار یعنی ردالمحتار ج ۱ ص۳۹۲ باب الاذان) [۲]

حیّ علی الفلاح پڑھتے کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم

سوال:- ہمارے علاقہ کی بعض مساجد میں لوگ اقامت کے وقت صفوف میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور جب مؤذن حیَّ علی الفلاح پر پہنچتا ہے تو اس وقت کھڑے ہوتے ہیں، اس عمل کے ثبوت کے لیے بہت سی کتب مثلاً عالمگیری، شرح وقایہ، بحرالرائق کا حوالہ دیتے ہیں اور اس بیٹھنے کو ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ مسجد میں بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں اور اس کے عامل کو مبتدعین میں شمار کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا حیَّ علی الفلاح کے وقت یا اس سے قبل اُٹھنا سنت ہے؟

---

[۱] وفی الھندیۃ: ولا یکرہ اذان المحدث فی ظاھر الروایۃ ھٰکذا فی الکافی۔ (ھندیہ ج ۱ ص۵۴ باب الاذان) وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۱ ص۲۶۳ باب الاذان۔

[۲] واذان الصبیّ العاقل صحیح من غیر کراھۃ فی ظاھر الروایۃ ولٰکن اذان البالغ افضل واذان الصبیّ الذی لا یعقل لا یجوز ویعاد۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۵۴ باب الاذان) ومثلہٗ فی البحرالرائق ج ۱ ص۲۶۴ باب الاذان۔

الجواب: حیّ علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا شرعاً مندوب ہے البتہ اس کو سُنّت مؤکدہ سمجھنا یا اس کو لازمی سمجھنا بدعت ہے۔

کتبِ فقہ میں قیام الی الصلوٰۃ کے لیے مختلف قسم کی روایات منقول ہیں عند الاقامۃ، وسط الاقامۃ اور عند الفراغ عن الاقامت، جس وقت بھی تسویہ صفوف ہو جائے نماز کو شروع کر دینا بہتر ہے البتہ اگر کوئی حَیَّ عَلَی الفلاح سے قبل کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی کراہت نہیں اور نہ ہی یہ واجب العتاب ہے بلکہ حَیَّ عَلَی الفلاح کے وقت کھڑے ہونے والے کو بدعتی کہنا صحیح نہیں جبکہ وہ اس کو سُنّت یا واجب قرار نہ دیتا ہو۔

قال الحصکفیؒ: (لہا اداب) ترکہ لا یوجب اساءۃ ولا عتاباً کترک سنۃ الزوائد لکن فعلہ افضل... (والقیام) لامام ومؤتم (حین قیل حیّ علی الفلاح خلافاً لزفر فعندہ عند حیّ علی الصلوٰۃ ... (وشروع الامام) فی الصلوٰۃ (مذ قیل قد قامت الصلوٰۃ) ولو اخر حتی اتمہا لا بأس بہ اجماعاً وھو قول الثانی والثلاثۃ وھو اعدل المذاھب کما فی شرح المجمع لمصنفہ وفی القہستانی معزیا للخلاصۃ انہ الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۷۷) [1]

مؤذن کی اجازت کے بغیر اقامت کرنا

سوال: اقامت کے لیے مؤذن کا ہونا ضروری ہے یا کوئی اور بھی اقامت کہہ سکتا ہے؟ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ غیر مؤذن کی اقامت کو لوگ اقامت ہی تصور نہیں کرتے، ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بہتر یہی ہے کہ مؤذن اقامت کہے، اگر مؤذن موجود نہ ہو تو غیر مؤذن کی اقامت بلا کراہیت درست ہے۔ اگر مؤذن موجود ہو اور کسی دوسرے کی اقامت کو بُرا محسوس نہیں کرتا تو اقامت بلا کراہیت درست ہے اگر بُرا محسوس کرتا ہے تو مع الکراہیۃ التنزیہیۃ

---

[1] من الادب (شروع الامام) الی احرامہ (مذ قیل) ای عند قول المقیم (قد قامت الصلوٰۃ) عندھما وقال ابو یوسف یشرع اذا فرغ من الاقامۃ فلو اخر حتی یفرغ من الاقامۃ لا بأس بہ فی قولھم جمیعاً۔ (مراقی الفلاح علی حاشیۃ الطحطاوی ص۱۵۱ اداب الصلوٰۃ) ومثلہٗ فی الفتاویٰ التاتارخانیہ ج ۱ ص۵۳ کتاب الصلوٰۃ اداب۔

درست ہے، البتہ اس سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال الحصکفیؒ: فلا بأس بذٰلک جوھرۃ (اقام غیر من اذن بغیبتہ) ای المؤذن (لا یکرہ مطلقاً) وان بحضورہ کرہ ان لحقہ وحشۃ کما کرہ مشیہ فی اقامتہ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۹۵ باب الاذان) لہ

جماعتِ ثانیہ کے لیے اقامت | **سوال**:۔ جماعتِ ثانیہ کے لیے اذان واقامت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر جماعتِ ثانیہ کسی ایسی مسجد میں ہو جہاں پر قوم نے باقاعدہ اپنی نماز اقامت اور اذان سے پڑھی ہو تو شرائطِ رخصت کی رعایت کرتے ہوئے دوبارہ جماعت کیلئے اذان واقامت مکروہ ہے، البتہ مسجد سے باہر یا راستہ کی ایسی مسجد جہاں قوم وامام دونوں نہ ہوں تو وہاں جماعتِ ثانیہ کے لیے اذان و اقامت مسنون ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: بل یکرہ فعلھما وتکرار الجماعۃ الا فی مسجد علیٰ طریق فلا بأس بذٰلک۔ قال ابن عابدین تحت قولہ (الا فی مسجد علیٰ طریق) ھو ما لیس لہ امام ومؤذن راتب فلا یکرہ التکرار فیہ باذان واقامۃ بل ھو الافضل۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۹۵، مطلب کراھیۃ تکرار الجماعۃ) لہ

امام کا اقامت کہنا | **سوال**:۔ کیا اقامت سے جاہل مقتدیوں کی موجودگی میں امام خود اقامت کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ ویسے تو بہتر یہ ہے کہ اذان اور اقامت ایک شخص کہے اور امامت کوئی

لہ والافضل ان یکون المؤذن ھو المقیم کذا فی الکافی وان اذن رجل واقام آخر ان غاب الاول جاز من غیر کراھۃ وان کان حاضراً یلحقہ الوحشۃ باقامۃ غیرہ یکرہ وان رضی بہ لا یکرہ عندنا کذا فی المحیط۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۵۳)۔ ومثلہ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص۵۰۔

لہ قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ۔ واذا لم یکن للمسجد امام ومؤذن راتب فلا یکرہ تکرار الجماعۃ فیہ باذان واقامۃ بل ھو الافضل ذکرہ قاضی خان اما لو کان لہ امام ومؤذن معلوم فیکرہ تکرار الجماعۃ فیہ باذان واقامۃ۔ (کبیری ص۶۱۴)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۶۶ باب الامامۃ۔

دوسرا کرائے لیکن بوقتِ ضرورت جب مقتدی اقامت سے جاہل ہوں تو امام کے لیے اقامت کہنے میں کوئی قباحت نہیں، فقہی ذخائر میں اس کے نظائر موجود ہیں جیسا کہ ایک آدمی خود اذان اور اقامت دے کر نماز پڑھے۔

قال ابن عابدینؒ: فی الخانیۃ لو لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن فانہ یذھب الیہ ویؤذن فیہ ویصلی ولو کان وحدہ لان لہ حقا علیہ فیؤدیہ۔

(رد المختار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۹ احکام المساجد) [1]

قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ پر وقف کرنا

سوال: قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ پڑھنے کی کیا کیفیت ہے؟ ہر کلمہ پر وقف ضروری ہے یا پہلے کلمہ کا وصل کرکے دوسرے پر وقف کیا جائے؟

الجواب: اذان اور اقامت پڑھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہر کلمہ کو ساکن کرکے پڑھے اذان میں حقیقتاً وقف کیا جائے اور اقامت میں بہ نسبت وقف ساکن پڑھا جائے، اسی طرح قد قامت الصلوٰۃ کو بھی دونوں مرتبہ بہ نیت وقف ساکن کرکے پڑھا جائے، البتہ اذان واقامت کے تکبیرات میں ہر دو تکبیر ایک کلمہ شمار ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ عالم بن علاء الانصاری یترسل فی الاذان ویحدر فی الاقامۃ ..... الترسل ان یقول اللہ اکبر اللہ اکبر و یقف ثم یقول مرۃ اخری مثلہ وکذلک یقف بین کلمتین الی اخر الاذان والحدر الوصل والسرعۃ۔

(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۱ ص۵۱۸ باب الاذان) [2]

---

[1] و فی الخلاصۃ: وان لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن فانہ یؤذن ویصلی وان کان ھنالک واحد فان کان لایحضر احد کیف یصنع المؤذن قال یؤذن ویقیم ویصلی وحدہ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۲۲۸)

[2] قال العلامۃ الشرنبلالیؒ: (ویتمھل) یترسل فی الاذان بالفصل بسکتۃ بین کل کلمتین (ویسرع) ای یحدر فی الاقامۃ للامر بھما فی السنۃ قال السید احمد الطحطاوی (تحت قولہ بین کلمتین) ای جملتین الا فی التکبیر الاول فان السکتۃ تکون بعد تکبیرتین۔ (الطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۵۷، ۱۵۸ باب الاذان) ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۵۶۔

اذان کے دوران انگلیوں کا کانوں کے سوراخ میں رکھنے کا حکم

سوال:- اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں داخل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- اذان دیتے وقت کانوں میں انگلیاں رکھنا سنت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اذان کی آواز میں تیزی اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ آجکل کے دور میں لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے اب یہ علت وسبب اختیار کرنے کی وجہ مفقود ہے اس لیے کہ بدون اس کے آواز بلند ہوتی ہے مگر تواتر کی وجہ سے آج بھی یہی عمل سنت ہے۔

لما قال العلامہ ابن نجیم المصریؒ: ولما کان ذٰلك ابلغ فی الاعلام لان الصوت یبدأ من مخارج النفس فاذا سد اذنیہ اجتمع النفس فی الفم فخرج الصوت عالیا من غیر ضرورۃ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۲۶۰ باب الاذان) [۱]

ریڈیو وغیرہ سے اذان کا حکم

سوال:- آجکل ریڈیو میں پانچ وقت اذان دی جاتی ہے کیا اس اذان پر اکتفاء کر کے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں، اسی طرح ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی کیسٹوں کے ذریعے دی گئی اذان کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ میں اذان دینے والے کا عاقل ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ صبی لایعقل کی اذان کالمعدوم ہے۔ چونکہ ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی میں یہ شرائط موجود نہیں اس لیے ٹیپ ریکارڈ یا ریڈیو وغیرہ کی اذان اذان نہیں، اس سے اذان کی سنیت ادا نہ ہوگی۔

قال العلامہ ابوبکر الکاسانیؒ: واما اذان الصبی الذی لایعقل فلا یجزئ ویعاد لان ما یصدر لاعن عقل لا یعتد بہ کصوت الطیور۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۵۰ فصل بیان سنن الاذان) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ویجعل اصبعیہ) لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لبلال رضی اللہ عنہ اجعل اصبعیك فی اُذُنیك فانہ ارفع لصوتك وان جعل یدیہ علی اُذُنیہ فحسن۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۸۵ باب الاذان)

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان اذان الصبی الذی لایعقل لایجزی ویعاد لان ما یصدر لاعن عقل لایعتد بہ کصوت الطیور۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۹۰ باب الاذان)

مسجد کے اندر اذان دینے کا حکم **سوال**:۔ یہاں دیہات میں مساجد کے اندر اذانیں دی جاتی ہیں، کیا مساجد کے اندر اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ مسجد سے باہر اذان دینے پر اصرار کرتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں اذان دینا بالاتفاق جائز ہے البتہ اس کی کراہت اور عدم کراہت میں علماء کا قدرے اختلاف ہے، بعض بلاکراہت جواز کے قائل ہیں لیکن راجح یہ ہے کہ مسجد میں اذان دینا تو جائز ہے مگر کراہت تنزیہی کے ساتھ۔

لما قال فخر الدین القاضی خانؒ: و ینبغی ان یؤذن علی المئذنة او خارج المسجد ولا یؤذن فی المسجد۔ (الفتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۷۸ باب الاذان ومسائل الاذان) [۱]

قد قامت الصلوٰۃ کے جواب کا حکم **سوال**:۔ اذان کے جواب میں وہی کلمات دہرائے جاتے ہیں تو اقامت کے دوران قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں کیا کہنا چاہیئے؟

الجواب:۔ احادیث مبارکہ میں مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں اقامها اللہ وادامها فرماتے تھے، اس لیے اقامت میں قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں اقامها اللہ وادامها کہنا چاہیئے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویجیب الاقامة ندبا اجماعا کالاذان ویقول عند قد قامت الصلوٰۃ اقامها اللہ وادامها۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله ویقول الخ) ای کما رواه ابوداود وزیادة ما دامت السمٰوٰت والارض وجعلنی من صالحی اهلها۔ (رد المحتار ج۱ ص۲۴۰ باب الاذان) [۲]

---

[۱] لما فی الهندیة: وینبغی ان یؤذن علی المأذنة او خارج المسجد ولا یؤذن فی المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۵ الفصل الثانی فی کلمات الاذان والاقامة)
ومثله فی کتاب الاصل ج۱ ص۱۳۱ باب الاذان۔

[۲] لما فی الهندیة: والاجابة الاقامة مستحبة هکذا فی فتح القدیر: واذا بلغ قوله قد قامت الصلوٰۃ یقول السامع اقامها اللہ وادامها ما دامت السمٰوٰت والارض وفی سائر الکلمات یجیب کما یجیب فی الاذان۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۷ الفصل الثانی فی کلمات الاذان والاقامة)

دعا بعد الاذان میں والدرجة الرفیعة کے الفاظ کا ثبوت

سوال:۔ اکثر مؤذنین سے سنا گیا ہے کہ وہ اذان کے بعد دعا میں والدرجة الرفیعة۔۔۔ وارزقنا شفاعته یوم القیامة انك لاتخلف المیعاد کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں، کیا یہ الفاظ احادیث مبارکہ میں مذکور ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ مستند اور معتبر کتب حدیث میں اذان کے بعد کی دعا ان الفاظ سے مروی ہے:
اللّٰھم ربّ ھٰذہ الدّعوۃ التّامة والصلوٰۃ القائمة اٰتِ محمدن الوسیلة والفضیلة وابعثه مقامًا محمودن الّذی وعدته۔ امام بیہقیؒ نے انّك لا تخلف المیعاد کی زیادتی نقل فرمائی ہے، اس کے علاوہ اس دعا میں دیگر الفاظ کی زیادتی بے اصل ہے ان کو نہیں پڑھنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وروی البخاری وغیرہ من قال حین یسمع النداء اللّٰھم ربّ ھٰذہ الدعوۃ التامة والصلوٰۃ القائمة اٰت محمدنِ الوسیلة والفضیلة وابعثه مقامًا محمودن الّذی وعدته حلت لهٗ شفاعتی یوم القیٰمة۔ وزاد البیہقی اِنّك لا تخلف المیعاد وتمامه فی الامداد والفتح وقال ابن حجر فی شرح المنهاج وزیادۃ والدرجة الرفیعة وختمه بیا ارحم الراحمین لا اصل لهما۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۹۸ باب الاذان)[1]

نومولود بچے کے کانوں میں اذان دینے کا طریقہ

سوال:۔ نومولود بچے کے کانوں میں اذان دینے کا کیا حکم ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ نومولود بچے کے کانوں میں اذان اور اقامت کہنا سنت ہے، طریقہ یہ ہے کہ بچے کو ہاتھوں پر اٹھاکر قبلہ رُخ کھڑے ہوکر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے اور حسب معمول حیّ الصّلوٰۃ کہتے وقت دائیں طرف اور حیّ علی الفلاح کہتے وقت بائیں طرف منہ پھیرا جائے۔

لما قال العلامة السندی: فیرفع المولود عند الولادۃ علیٰ یدیه مستقبل القبلة

---

[1] قال الشیخ خلیل احمد السہارنفوریؒ: واما زیادۃ والدرجة الرفیعة المشتهرۃ علی الالسنة فقال السخاویؒ لم اراہ فی شیءٍ من الروایات وزاد البیهقی فی روایة انك لاتخلف المیعاد واما زیادۃ ارحم الراحمین فلاوجود لها فی کتب الحدیث۔ (بذل المجهود ج۱ ص۳۰۲ باب ما جاء فی الدعاء عند الاذان)
وَمِثْلُهٗ فی اعلاء السنن ج۲ ص۱۲۵ باب الدعاء للنبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بعد الاذان۔

ویؤذن فی اُذنہ الیمنی ویقیم فی الیسریٰ و یلتفت فیھما بالصلوٰۃ لجھۃ الیمین وبالفلاح لجھۃ الیسار وفائدۃ الاذان فی اُذنہ انہ یدفع ام الصبیان عنہ ۔

(تقریرات الرافعی ج۱ ص۴۵ باب الاذان)

اذان میں انگوٹھے چومنے کا مسئلہ

سوال:۔ اذان کے دوران جب مؤذن اشھد ان محمد رسول اللہ پڑھے تو سننے والوں کے لیے اُس وقت انگوٹھے چومنا کیسا ہے ؟

الجواب:۔ صرف اذان کے وقت جب اذان ہو رہی ہو تو اشھد ان محمد رسول اللہ کے سننے پر شفاءِ عینین کے حصول کے لیے بغیر نیتِ ثواب اور سنت، واجب سمجھنے کے انگوٹھے چومنا جائز ہے، اگرچہ بعض نے مستحب لکھا ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ عمل صرف اذان کے ساتھ خاص ہے دیگر مقامات میں نہیں ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : (تحت قولہ لولم یجبہ حتیٰ فرغ لم ارہ) یستحب اَن یقال عند سماع الاولی من الشھادۃ : صلی اللہ علیك یارسول اللہ ۔ وعندالثانیۃ منھا : قرت عینی بك یارسول اللہ ۔ ثم یقول اللھم متعنی بالسمع والبصر بعد وضع ظفری الابھامین علی العینین فانہ علیہ السلام یکون قائدالہ الی الجنۃ ۔

(ردالمحتار جلد ۱ ص۳۹۸ باب الاذان) [1]

لاؤڈ سپیکر پر اذان دینے کا حکم

سوال:۔ آجکل لاؤڈ سپیکر کو اذان کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ آواز دُور تک پہنچ سکے، شرعاً اس میں کوئی قباحت ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اذان کی مشروعیت کا مقصد نماز کیلئے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نماز کی اطلاع دی جائے، اسلئے فقہاء کرام نے مسجد کے مینارہ پر چڑھ کر اذان کہنے کی ترغیب دی ہے

---

[1] قال العلامۃ الشیخ السید احمد الطحطاویؒ : یستحب ان یقول عند سماع الاولی من الشھادتین للنبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیك یارسول اللہ وعند سماع الثانیۃ قرتُ عینی بك یارسول اللہ اللھم متعنی بالسمع والبصر بعد وضع ابھامیہ علی عینیہ ۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۶۵ باب الاذان)

وَمِثْلُہٗ فی السعایۃ ج۲ ص۱۱۱ باب الاذان ۔

اور حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہتے وقت دائیں بائیں منہ موڑنے کو سنت قرار دیا ہے چونکہ موجودہ آلہ (لاؤڈ سپیکر) سے یہ مقصد بطریقِ احسن حاصل ہو سکتا ہے اسلئے لاؤڈ سپیکر پر اذان دینا جائز ہے۔

قال العلامۃ برهان الدین المرغینانیؒ: ویحول وجهه للصلوٰۃ والفلاح یمنۃ ویسرۃ لانه خطاب للقوم فیواجههم وان استدار فی صومعته فحسن ومراده اذا لم یستطع تحویل الوجه یمیناً وشمالاً مع ثبات قدمیه مکانهما کما هو السنۃ بان کانت الصومعۃ متسعۃ فاما من غیر حاجۃ فلا والافضل للمؤذن ان یجعل اصبعیه فی اذنیه بذلك امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلالاً ولانه ابلغ فی الاعلام۔ (الهدایۃ ج۱ ص۷۲ باب الاذان)[1]

دفع وبا کیلئے اذان دینے کا حکم

سوال: وبائی امراض کے رفع کیلئے بطور علاج اذان دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: نماز کے علاوہ بعض مواقع ایسے ہیں جن میں سلف صالحین سے اذان دینا عملاً چلا آرہا ہے۔ مثلاً جہاد کے دوران، غم اور انتہائی پریشانی کے وقت، غضب کے وقت، جب مسافر راہ بھول جائے، مرگی آجائے، جانور یا انسان کی بدخلقی ظاہر ہو جائے اسی طرح وبائی امراض کے پھیلاؤ کے وقت اذان دینا بھی منقول ہے اسلئے ان مواقع میں فی ذاتہٖ اذان دینا مباح ہے۔

لما قال ابن عابدینؒ: وفی حاشیۃ البحر للخیر الرملی: رأیت فی کتب الشافعیۃ انه قد یسن الاذان لغیر الصلوٰۃ کما فی اذن المولود والمهموم والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان او بهیمۃ وعند مزدحم الجیش وعند الحریق .... عند تغول الغیلان ای عند تمرد الجن لخبر صحیح فیه اقول: ولا بعد فیه عندنا۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۸۵ باب الاذان، مطلب فی المواضع التی یندب لها الاذان)[2]

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویستحب ان یجعل اصبعیه فی اذنیه لقوله صلی اللہ علیه وسلم لبلالؓ اجعل اصبعیك فی اذنیك فانه ارفع لصوتك۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۰۶ باب الاذان)

[2] قال العلامۃ الشیخ اشرف علی التھانویؒ: ان مواقع میں اذان سنت ہے: فرض نماز، بچہ کے کان میں بوقت ولادت، آگ لگنے کے وقت، جنگِ کفار کے وقت، مسافر کے پیچھے، جب شیاطین ظاہر ہو کر ڈرائیں، غم کے وقت، غضب کے وقت، جب مسافر راہ بھول جائے، جب کسی کو مرگی آوے، جب کسی آدمی یا جانور کی بدخلقی ظاہر ہو۔ اس کو صاحبِ ردالمحتار نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، اور بعض بزرگوں کا عمل وقت عموم امراض وخوف غرق کے بھی دیکھا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۱ ص۱۰۷ باب الاذان)

ومثلہٗ فی کفایت المفتی ج۳ ص۱۱ باب الاذان۔

کلماتِ اذان میں وقفہ کی مقدار

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مؤذن اذان دیتے وقت کلماتِ اذان میں کتنی دیر وقفہ کرے؟ یا بلا وقفہ کے مسلسل اذان دینا رہے؟ شریعتِ مقدسہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ اذان کے آداب میں سے ہے کہ مؤذن کلماتِ اذان کے درمیان اتنی دیر وقفہ کرے کہ جواب دینے والا پڑھے گئے کلمات کا جواب آسانی سے دے سکے۔

قال العلامة عبدالحی الکھنوی رحمہ اللہ: ویترسل فیہ ای فی الاذان بان یفصل بین کل الکلمتین و لا یجمع بینھما فانہ سنۃ۔ (السعایۃ ج۲ ص۱۳ باب الاذان) [1]

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا کیا جواب ہے

سوال:۔ جوابِ اذان میں حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ وحَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے مقابلے میں تو لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ پڑھا جائے گا لیکن فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کے جواب میں کیا پڑھا جائے گا؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جب مؤذن اذانِ فجر میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کہے تو جواب دینے والا جواباً صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ کے الفاظ یا مَاشَآءَ اللّٰہ کے الفاظ کہے۔

قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ: فی اذان الفجر قال المجیب صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ بفتح الراء الاولیٰ وکسرھا او یقول مَاشَآءَ اللّٰہ عند قول المؤذن فی اذان الفجر اَلصَّلٰوۃُ

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ: (ویتمھل) یترسل فی الاذان بالفصل بسکتۃ بین کل کلمتین۔ قال الشیخ السید احمد الطحطاوی رحمہ اللہ: (تحت قولہ بین کلمتین) ای جملتین الا فی التکبیر الاول فان السکتۃ تکون بعد تکبیرتین۔

(طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۱۵۸ باب الاذان)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۱ ص۵۱۸ باب الاذان۔

خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ (مراقی الفلاح علیٰ هامش طحطاوی ص۱۱۰ باب الاذان) ؎۱

اذان قبلہ رُخ ہوکر پڑھنے کا حکم

سوال:۔ کیا اذان دیتے وقت قبلہ رُخ کھڑے ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مؤذن کو چاہیئے کہ وہ قبلہ رخ کھڑے ہوکر اذان دے، شریعتِ اسلامی میں یہی طریقہ متوارث چلا آرہا ہے اس کے خلاف اذان نہ دی جائے۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویستحب ان یکون المؤذن صالحاً ای متقیاً لانہ امین فی الدین۔۔۔۔۔۔ مستقبل القبلة کما فعله الملك النازل۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص۱۵۸ باب الاذان) ؎۲

اذان میں لفظ اللہ اور اکبر کے ہمزہ کو لمبا کرکے پڑھنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض مؤذنین اذان میں لفظ اللہ اور اکبر کے الف کو لمبا کرکے پڑھتے ہیں، تو کیا لفظ اللہ اور اکبر کے الف کو لمبا کرکے پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اذان میں لفظ اللہ کے الف کو لمبا کرکے پڑھنے سے ہمزہ استفہام پیدا ہونے کا خوف ہوتا ہے جو کہ تغیرِ معنیٰ کا سبب ہے اسلئے فقہاءِ کرام نے لفظ اللہ اور اکبر کے الف کو لمبا کرکے پڑھنے سے منع کیا ہے

؎۱ وفی الهندیة: وکذا قول المؤذن اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ لا یقول السامع مثله ولکن یقول صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ کذا فی المحیط۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۷ الباب الثانی الاذان)
وَمِثْلُهٗ فی السعایة ج۲ ص۵۱ باب الاذان۔

؎۲ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: والمستحب للمؤذن ان یستقبل القبلة استقبالاً هکذا روی عبد الله بن زید رضی الله عنه عن النازل من السماء۔ وفی شرح الطحاوی ولو ترك استقبال القبلة اجزاه ویکره۔
(الفتاوی التاتارخانیة ج۱ ص۵۱۵ باب الاذان)

لہٰذا ان دونوں جگہ الف پر مَدّ نہ کیا جائے ۔

قال العلامۃ عبد الحی الکھنوی رحمہ اللہ: لا یقول المؤذن آللہ اکبر بمد الالف فانہ استفہام وانہ لحن شرعی الخ (السعایۃ ج ۲ ص ۱۵ باب الاذان) [1]

مؤذن کے کلماتِ اذان کی تکمیل سے قبل جواب دینے کا حکم

سوال: اذان کے کلمات کا جواب کب دیا جائے؟ یعنی اگر کوئی شخص مؤذن کے کلماتِ اذان مکمل طور پر پڑھنے سے قبل جوابی کلمات پڑھے تو کیا اس سے اذان کا جواب ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب: اذان کا جواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مؤذن کے کلماتِ اذان ختم کرنے کے بعد ان کا جواب دیا جائے، اور اگر کوئی شخص مؤذن کے کلماتِ اذان مکمل پڑھنے سے قبل ان کا جواب دیدے تو یہ فلسفہ جوابِ اذان کے خلاف ہے ۔

قال الشیخ الدکتور وھبۃ الزحیلی: ان یقول مثلما یقول مثنیٰ مثنیٰ عقب کل جملۃ الا فی الحیعلتین فیحوقل الخ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۱ ص ۵۵۳ باب الاذان) [2]

نومولود کے کانوں میں اذان دیتے وقت دائیں بائیں منہ پھیرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی نومولود کے کانوں میں اذان دینے والے کے لیے حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہتے وقت دائیں بائیں منہ پھیرنا ضروری ہے یا کہ منہ پھیرے بغیر بھی یہ سنت ادا ہو جائے گی؟

الجواب: کسی نومولود کے دائیں کان میں اذان دینا اور بائیں کان میں اقامت کہنا

---

[1] وفی الھندیۃ: والمد فی اول التکبیر کفر وفی آخرہ خطأ فاحش ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۵۶ الفصل الثانی فی الاذان)

[2] فی الھندیۃ: یجب علی السامعین عند الاذان الاجابۃ وھی ان یقول مثل ما قال المؤذن الا فی قولہ حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح فانہ یقول مکان حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۵۷ الباب الثانی فی الاذان الفصل الثانی)

سنت ہے، البتہ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہتے وقت دائیں بائیں منہ پھیرنا ضروری نہیں بغیر منہ پھیرے ہی سنت ادا ہو جائے گی۔

قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: قال جماعۃ من اصحابنا یستحب ان یؤذن فی اذنہ الیمنی ویقیم الصلوٰۃ فی اذنہ الیسریٰ وقد روینا فی کتاب ابن السنی عن الحسین بن علی رضی اللہ عنہما مرفوعاً من ولد لہ مولود فاذن فی اذنہ الیمنی واقام فی اذنہ الیسری لم تضرہ ام الصبیان۔ قال المصنفؒ: تحتہٗ وما ذکرہ بعض الفقہاء من تحویل الوجہ فی ھٰذا الاذان یمیناً وشمالاً لم اجد لہٗ اصلاً ولا یصح قیاسہ علی التحویل فی الاذان للصلوٰۃ لانہٗ للاعلام ولا حاجۃ الیٰ مثل ھٰذا الاعلام ھٰھنا۔ (اعلاء السنن ج ۱۷ ص ۱۲۳ باب فضیلۃ ذبح الشاۃ فی العقیقۃ)

خواتین کو اذان کا جواب دینا چاہیئے

سوال:۔ جس طرح مرد اذان کا جواب دیتے ہیں تو خواتین کے لیے بھی اسی طرح اذان کا جواب دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اذان کا جواب جس طرح مرد دیتے ہیں اسی طرح خواتین بھی اذان کا جواب دے سکتی ہیں بلکہ ان کی بھی یہ دینی ذمہ داری بنتی ہے کہ اذان کا جواب دیا کریں۔

عن میمونۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام بین صف الرجال والنساء فقال یامعشر النساء اذا سمعتن اذان ھٰذا الحبشی واقامتہ فقلن کما یقول فان لکن بکل حرف الف الف درجۃ قال عمرؓ فھٰذا للنساء یارسول اللہ فما للرجال قال ضعفان یا عمرؓ۔ (الترغیب والترھیب ج ۱ ص ۱۱۵ الترغیب فی اجابۃ المؤذن) لہ

حائضہ عورت اذان کا جواب نہ دے

سوال:۔ کیا خواتین حالت حیض میں اذان کا جواب دے سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ حائضہ اور نفاس والی خواتین کو اذان

لہ قال العلامۃ عبدالحی اللکھنویؒ: قلتُ یستنبط منہ ان الاجابۃ باللسان واجبۃ علی النساء الطاھرات ایضاً وھو ظاھر عبارات فقھائنا۔
(السعایۃ ج ۲ ص ۵۱ باب الاذان)

کا جواب دینا صحیح نہیں ۔

لما قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: لا یجیب الجنب ولا الحائض لعجزهما عن الاجابة بالفعل۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص۱۶۳ باب الاذان) [۱]

قد قامت الصلوٰۃ میں الصلوٰۃ کے تاء پر ضمہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اقامت کہتے وقت اکثر مقیمین (اقامت کہنے والے) قد قامت الصلوٰۃ کے تاء پر پیش اور دوسرے جملہ قد قامت الصلوٰۃ کے تاء پر سکون (جزم) پڑھتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ اقامت کہتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہر کلمہ کے آخر میں پیش کی جگہ جزم (سکون) پڑھی جائے چاہے وہ اللہ اکبر کی راء ہو یا قد قامت الصلوٰۃ کی تاء، اس لیے الصلوٰۃ کی تاء پر پیش پڑھنا صحیح نہیں بلکہ جزم پڑھی جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وروی ذلک عن النخعی موقوفاً علیه ومرفوعاً الی النبی صلی اللہ علیه وسلم قال الاذان جزم والاقامة جزم والتکبیر جزم وفیه: وفی الامداد ویجزم الراء ای یسکنها فی التکبیر الخ

(رد المحتار ج ۱ ص۳۸۶ باب الاذان، مطلب فی الکلام علیٰ حدیث الاذان جزم) [۲]

بعد الاذان دعا میں ہاتھ اٹھانا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ اذان کے بعد دعا وسیلہ کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں، شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ اذان کے بعد دعاء وسیلہ (مسنون دعا) کرتے وقت ہاتھ نہ اٹھائے جائیں

---

[۱] قال العلامة عبد الحی اللکهنویؒ: لا یجیب الحائض والنفساء لعجزهما عن الاجابة بالفعل فکذا بالقول۔ (السعایة ج۲ ص۵۰ باب الاذان)

[۲] قال العلامة ابن نجیمؒ: (تحت قوله یترسل فیه ویحذر فیها) یسکن کلمات الاذان والاقامة لکن فی الاذان ینوی الحقیقة وفی الاقامة ینوی الوقف ذکره الشارح وفی المبتغی والتکبیر جزم۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۲۵۸ باب الاذان)

ومثله فی السعایة ج۲ ص۲۰ باب الاذان۔

بلکہ بغیر ہاتھ اٹھائے دُعا مانگی جائے تاہم اگر کوئی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی سنت کے خلاف ہے۔

قال الشیخ مولانا محمد اشرف علی التھانویؒ: بالتخصیص دعائے اذان میں ہاتھ اٹھانا تو نہیں دیکھا گیا مگر مطلقاً دعا میں ہاتھ اٹھانا احادیث قولیہ و فعلیہ مرفوعہ و موقوفہ کثیرہ شہیرہ سے ثابت ہے من غیر تخصیص بدعاء دون دُعاء، پس دعائے اذان میں بھی ہاتھ اٹھانا سنت ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۰۵ باب الاذان)

کیا حضرت بلالؓ اذان میں شین کو سین پڑھتے تھے؟

سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک صاحب سے سُنا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے وقت اَشْہَدُ کی بجائے اَسْہَدُ یعنی شین کی جگہ سین پڑھتے تھے، یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب:- اگرچہ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان میں شین کی جگہ سین پڑھتے تھے لیکن علماءِ محققین نے اس کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ فصیح اللسان اور تیز و تُند آواز والی شخصیت تھے، اور جو بات ان کے بارے میں مشہور ہو چکی ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔

قال العلامۃ عبدالحی الکھنویؒ: اشتھر علی السنۃ العوام ان بلالاً کان یبدل الشین المعجمۃ سیناً مھملۃ ولیس کذٰلک قال المزنی علیٰ ما نقلہ عنہ البرھان السفاقسی انہٗ قد اشتھر علی الالسنۃ ولم نرہ فی شیٔ من الکتب۔ وقال ابن کثیر لا اصل لہٗ ولا یصح۔ (السعایۃ ج ۲ ص ۷ باب الاذان)

باب شروط الصّلوٰۃ وارکانہا

(نماز کے شرائط و ارکان کا بیان)

زبان سے نیّت کرنے کا حکم

سوال:۔ نماز کی نیت اگر صرف زبان سے کی جائے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز کے لیے دل سے نیت کرنا فرض ہے البتہ متاخرین فقہاءکرام نے زبان سے نیت کو مستحسن قرار دیا ہے تاکہ دل و دماغ دونوں حاضر ہوجائیں، البتہ اگر صرف زبان سے نیّت کرے مگر دل کی نیت نہ ہو تو یہ نیّت لغو اور بے کار ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: والتلفظ عند الارادۃ بہا مستحب ھو المختار۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۰۶ شروط الصلوٰۃ۔ بحث النیۃ) [1]

زبان سے نیت کے الفاظ میں غلطی کا حکم

سوال:۔ ہمارے ساتھ اکثر یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ہم جلدی میں ایک وقت کی نماز میں شامل ہوتے ہیں مگر زبان پر غلطی سے کسی دوسرے وقت کی نماز کے الفاظ کا اجراء ہوجاتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے، نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ نیّت دل کا عمل ہے، اگر دل میں اسی وقت کی نماز کا ارادہ ہو تو نماز ہوجائے گی اگرچہ زبان پر غلطی سے دوسرے وقت کی نماز کا اجراء ہوجائے ایسی غلطی کا کوئی اعتبار نہیں۔

لما قال الحصکفیؒ: والخامس النیۃ بالاجماع وھی الارادۃ المرجحۃ ..... لا مطلق العلم فی الاصح ..... والمعتبر فیہا عمل القلب اللازم للارادۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۰۵ باب شروط الصلوٰۃ، مطلب بحث النیّۃ) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: ولا عبرۃ للذکر باللسان فان فعلہ لتجتمع عزیمۃ قلبہ فھو حسن۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۶۵ الفصل الرابع فی النیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی السعایۃ فی حل شرح الوقایۃ ج ۲ ص ۹۹ باب شروط الصلوٰۃ۔

[2] وفی الھندیۃ: النیۃ ارادۃ الدخول فی الصلوٰۃ والشرط ان یعلم بقلبہ ای صلوٰۃ یصلی وادناھا ما لو سُئل لامکنہ ان یجیب علی البدیھۃ ..... ولا عبرۃ للذکر باللسان۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۶۵ الفصل الرابع فی النیۃ)

وفیہ ایضاً عزم علی الظھر وجری علیٰ لسانہ العصر یجزیہ (الفتاویٰ الھندیہ ج ۱ ص ۶۶ الفصل الرابع فی النیۃ)

امام کی اقتداء کی نیت کا مسئلہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو مگر اس نے امام کی اقتداء کی نیت نہ کی تو کیا اس شخص کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ امام کی اقتداء کی نیت صحتِ صلوٰۃ کے لیے شرط نہیں بلکہ تحصیلِ ثواب کے لیے شرط ہے۔ اگر کسی نے امام کی اقتداء کی نیت نہیں کی صرف نماز کی نیت کر کے امام کی اقتداء میں نماز پڑھی تو نماز تو ہو جائے گی مگر امام کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ملے گا۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ولا يشترط لصحة الاقتداء نية امامة المقتدى بل لنيل الثواب عند اقتداء احد به قبله۔ قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله لنيل الثواب) معطوف على قوله لصحة الاقتداء اى بل يشترط نية امامة المقتدى لنيل الامام ثواب الجماعة۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۲۴ شروط الصلوٰۃ مطلب بحث النية) [1]

تعداد رکعات کی نیت ضروری نہیں

سوال:۔ کیا نماز میں تعداد رکعات کی تعیین کر کے نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فرض نمازوں کی ادائیگی میں وقت کا تعین کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ رکعات کی گنتی ضروری نہیں بغیر نیت تعداد رکعات کے بھی نماز ہو جائے گی۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ولا بد من التعيين عند النية ------- لفرض ------ ولو قضاء لكنه يعين ظهر يوم كذا على المعتمد ---- وواجب انه وتر او نذر او سجود تلاوة وكذا شكر بخلاف سهو دون تعيين عدد ركعاته لحصولها ضمنا فلا يضر الخطأ فى عددها۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۱ ص۴۱۸ باب شروط الصلوٰۃ) [2]

---

[1] قال العلامة الشيخ اشرف علی التھانویؒ: اگر امامت کی نیت نہ کرے گا تو امامت کا ثواب نہ ملے گا، پس حصول ثوابِ امامت کے لیے تو امامت کی نیت ضروری ہے۔
(امداد الفتاویٰ ج۱ ص۱۳۳ باب شروط الصلوٰۃ)

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: لان نية عدد الركعات ليست بشرط فى الفرض والواجب لان قصد التعيين مغن عنه ولو نوى الظهر ثلاثا والفجر اربعا جاز۔ (البحر الرائق ج۱ ص۲۸۳)

رکوع وسجدہ میں ترتیب کا وجوب

سوال:۔ اگر کوئی شخص رکوع کیے بغیر سجدہ میں چلا گیا تو دوبارہ رکوع کی ادائیگی پر سجدہ کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رکوع وسجدہ میں ترتیب چونکہ واجب ہے اس لیے اگر کوئی شخص رکوع سے پہلے سجدہ کرے تو یہ سجدہ ادا نہیں ہوگا، بلکہ دوبارہ رکوع کی طرف لوٹ کر رکوع ادا کرنے کے بعد از سرِ نو سجدہ کرے گا۔

قال ابن عابدینؒ: الترتیب بین الرکوع والسجود مثلاً فانه فرض حتی لو سجد قبل الرکوع لم یصح سجود هٰذه الرکعة لان اصل السجود یشترط ترتیبه علی الرکوع فی کلّ رکعة کترتب الرکوع علی القیام۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۴۶۳ واجبات الصلوٰۃ) ^ل^

جیب میں نسوار کے ساتھ نماز پڑھنا

سوال:۔ جیب میں نسوار یا سگریٹ رکھ کر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کے لیے مکان (جگہ) بدن اور کپڑوں کی پاکیزگی شرط ہے، اور نسوار فی ذاتہٖ ایک پاک چیز ہے اس میں نجاست کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اگر کسی کی جیب میں نسوار وغیرہ ہو تو اس سے نماز میں کوئی فساد لازم نہیں آتا۔

تطهیرا لنجاسة من بدن المصلی وثوبه والمکان الذی یصلّی علیه واجب۔ هٰکذا فی الزاهدی فی باب الانجاس۔ (الهندیه ج۱ ص۵۸ الفصل الاوّل فی الطّهارة) ^۲^

تکبیرِ تحریمہ کی فرضیّت

سوال:۔ نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ شرط ہے یا سُنّت یا مستحب، اگر کوئی تکبیر نہ کہے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

---

^ل^ فالترتیب فیها فرض حتی لو رکع قبل القیام او سجد قبل الرکوع لایجوز۔
(الهندیة ج ۱ ص۷۱ واجبات الصلوٰة) ــ ومِثلُهٗ فی البحرالرائق ج ۱ ص۲۹۶ واجبات الصلوٰۃ۔

^۲^ قال الحصکفیؒ: (طهارة بدنه) ای جسده لدخول الاطراف فی الجسد دون البدن فلیحفظ (من حدث) بنوعیه وَقَدَّمه لانه اغلظ و خبث مانع کذلك وثوبه۔
(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۴۰۲ باب شروط الصلوٰة)
وَمِثلُهٗ فی الاختیار ج ۱ ص۴۵ باب مایفعل قبل الصلوٰة۔

الجواب:۔ تکبیرِ تحریمہ نماز کے فرائض میں سے ہے، بغیر تکبیر تحریمہ کے نماز نہیں ہوتی۔
قال الحصکفیؒ: من فرائضها التی لاتصح بدونها التحریمة قائماً وھی شرط فی غیر جنازة علی القادر بہ یفتی۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ علی القادر) متعلق بشرط لتضمنہ معنی الفرض ای وھی شرط مفترض علیہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۴۲ باب صفة الصلوٰة) [1]

نماز کی نیت کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں چونکہ پشتو زبان بولی جاتی ہے اور اکثر نمازی پشتو میں ہی نیت کے الفاظ کہہ لیتے ہیں، اور ایسے ہی بعض لوگ دل میں نیت کر لیتے ہیں، کیا شرعاً دل میں نیت کرنا کافی ہے یا زبان سے بھی نیت کرنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ نیت نماز کے فرائض میں سے ہے لیکن نیت کا دائرہ بنیادی طور پر دل تک محدود ہے، تاہم عوام الناس اس سے غافل رہتے ہیں لہٰذا ان کے لیے دل کی نیت کے ساتھ زبان سے بھی نیت کے الفاظ ادا کرنا بہتر ہے تاکہ زبان پر بولنے سے دل کے ارادے کا اظہار ہو سکے۔

ولاعبرة للذکر باللسان فان فعلہ لتجتمع عزیمة قلبہ فھو حسن کذا فی الکافی ومن عجز عن احضار القلب یکفیہ اللسان کذا فی الزاھدی۔
(الفتاوٰی الھندیة ج ۱ ص۶۵ باب شروط الصلوٰة) [2]

---

[1] منھا التحریمة .... وھی شرط عندنا حتی ان من یحرم للفرائض کان لہ ان یؤدی بھا التطوع ھکذا فی الھدایة۔
(الفتاوٰی الھندیة ج ۱ ص۶۸ باب صفة الصلوٰة الفصل الاول)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۲۹۰ باب صفة الصّلوٰة۔

[2] قال الحصکفیؒ: والمعتبر فیھا عمل القلب اللازم للارادة فلا عبرة للذکر باللسان ان خالف القلب لانہ کلام لانیة الا اذا عجز عن احضارہ لھموم اصابتہ فیکفیہ اللسان۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۱۵ شروط الصلوٰة)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۲۷۷ باب شروط الصّلوٰة۔

ہسپتال کی یونیفارم میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص ہسپتال میں ملازم ہے وہ ہر وقت زخمیوں کو اٹھاتا ہے اور ان کو دوائیاں وغیرہ دیتا ہے، ان زخمیوں کی وجہ سے اس کے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں۔ کیا اس شخص کے لیے ان کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:- نماز پڑھنے کے لیے چند شرائط ہیں جن میں کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے اس لیے اگر ہسپتال کے ملازم کے کپڑے زخمیوں کے خون یا پیپ کے ذریعے ناپاک ہوئے ہوں تو یہ کپڑے تبدیل کرکے دوسرے کپڑوں میں نماز پڑھے، البتہ اگر دوسرے پاک کپڑے مہیا نہ ہوسکتے ہوں تو بوجۂ مجبوری انہی کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: الشرط شرعًا ما يتوقف عليه الشئ ولا يدخل فيه هي ستة طهارة بدنه .... وكذا ما يتحرك بحركته او يعد حاملاً له كصبي عليه نجس.... الخ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۰۲ باب شروط الصلوٰة) [۱]

دوکان میں نماز پڑھنا جائز ہے

سوال:- میری دوکان کے اوپر دوسری منزل میں ایک میوزک سنٹر ہے، کیا میں اپنی دوکان میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ جبکہ بعض لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تمہاری نماز نہیں ہوتی اس لیے کہ دوکان میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔

الجواب:- نماز کے لیے طہارتِ مکان ضروری ہے خواہ وہ کوئی بھی جگہ ہو۔ چاہے دوکان ہو یا گھر، مسجد ہو یا حجرہ، بشرطیکہ پاک ہو، اس لیے دوکان میں نماز پڑھنا درست ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ نماز مسجد میں پڑھی جائے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: الشرط.... شرعا ما يتوقف عليه الشئ ولا يدخل فيه هي ستة طهارة بدنه اي جسده لدخول الاطراف في الجسد دون البدن من حدث بنوعيه وقدمه لانه اغلظ وخبث مانع كذلك ثوبه ..... مكانه اي موضع قدميه اواحدهما ان رفع الاخرى و موضع سجوده اتفاقاً في الاصح۔ الخ

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۰۲ باب شروط الصلوٰة) [۲]

---

[۱] وفي الهندية: تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۵۸ الباب الثالث في شروط الصلوٰة، الفصل الاول في الطهارة)

[۲] وفي الهندية: تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۵۸ الباب الثالث في شروط الصلوٰة، الفصل الاول في الطهارة)

جیل خانہ کی جائے نماز پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: مجھے پشاور سنٹرل جیل سے ایک دوست نے ایک جائے نماز بھیجی ہے، کیا میں اُس پر نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ وہاں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں؟

الجواب: نماز پڑھنے کے لیے جائے نماز کا پاک ہونا ضروری ہے، چونکہ یہ پاکی یقینی ہوتی ہے جو شک سے زائل نہیں ہوتی، اس لیے جیل سے آیا ہوا جائے نماز پاک ہے اور اس پر نماز پڑھنا درست ہے۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: لوشك في نجاسة ماء اوثوب او طلاق او عتق لم يعتبر۔ قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله ولوشك) في التاتارخانية من شاك في انائه اوثوبه او بدنه اصابته نجاسة اولا فهو طاهر ما لم يستيقن الخ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۱۵۱ قبيل اذ مطلب في ابحاث الغسل) [1]

مسجد کی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا

سوال: آجکل لوگوں کا ایک دستور بن چکا ہے کہ وہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اپنی ٹوپیاں یا رومال وغیرہ ساتھ نہیں لاتے بلکہ مسجد میں پڑی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز پڑھ لیتے ہیں، جبکہ بازار یا دیگر مقامات میں ان ٹوپیوں کے ساتھ آنے جانے کو عار سمجھتے ہیں، تو کیا مساجد میں پڑی ہوئی ٹوپیاں پہن کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: نماز ایسی اہم عبادت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ہوتی ہے اس لیے نماز پڑھنے کے لیے عمدہ اور بہترین لباس پہننا افضل ہے ورنہ کم از کم ایسا لباس پہننا چاہیئے کہ جس کے ساتھ دیگر مقامات میں جانے کو عار نہ سمجھا جائے، اسلئے فقہاء کرام نے ثیاب بذلہ یعنی گندے لباس کے ساتھ نماز پڑھنے کو مکروہ کہا ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر نمازی اپنی ٹوپی ساتھ لائے ورنہ بصورتِ دیگر مساجد کی ٹوپیاں استعمال کرنا کراہت سے خالی نہیں تاہم نماز ہو جائے گی۔

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: من شك في انائه اوثوبه اوبدنه اصابته نجاسة ام لا فهو طاهر مالم يستيقن۔
(الفتاوى التاتارخانية ج ۱ ص ۱۲۶ كتاب الطهارة الوضوء ما نوع مسائل الشك)

تکبیرِ تحریمہ میں ہاتھوں کو کہاں تک اُٹھایا جائے

سوال: تکبیرِ تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ تفصیلاً ارشاد فرمائیں۔

الجواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مختلف روایات مروی ہیں، فقہ حنفی کی تحقیق کے مطابق کانوں کی لَو تک ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔

بعض علماءِ کرام نے یہ کہا ہے کہ انگلیوں کے سروں کو کانوں کی لَو کے برابر کیا جائے جبکہ انگوٹھوں کو کندھوں کے مقابل کیا جائے تو دونوں روایات پر عمل ہو جائے گا۔

روا ہ ابو داؤد السجستانیؒ: عن وائل بن حجر قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع ابہامیہ فی الصلوٰۃ الیٰ شحمۃ اُذنیہ۔ (بذل المجہود شرح ابی داؤد ج۲ ص۱۸ باب افتتاح الصلوٰۃ)[1]

تکبیرِ تحریمہ کے بعد ہاتھوں کا ارسال یا سیدھا باندھنا

سوال: بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بعد ہاتھوں کو لٹکا کر پھر باندھتے ہیں، کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب: تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بعد ہاتھوں کو لٹکا کر باندھا جائے یا بغیر لٹکائے باندھا جائے دونوں طرح درست ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تکبیرِ تحریمہ کے بعد فوراً ہاتھوں کو ناف سے نیچے باندھا جائے لٹکانا نہیں چاہیئے، یہی افضل ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ووضع الرجل یمینہ علیٰ یسارہ تحت سرتہ اخذاً رسغہا بخنصرہ وابہامہ ھو المختار تضع المرأۃ والخنثیٰ الکف علی الکف تحت ثدیہا کما فرغ من التکبیر بلا ارسال[2] فی الاصح۔ قال ابن عابدینؒ (تحت قولہ بلا ارسال) ھو ظاھر الروایۃ۔

(رد المحتار ج۱ ص۴۸۶ ارکان الصلوٰۃ، مطلب فی بیان المتواتر والشاذ)

---

[1] عن مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا کبر رفع یدیہ حتیٰ یحاذی بہما اُذنیہ وفی روایۃ حتیٰ یحاذی بہما فروع اُذنیہ۔

(اعلاء السنن ج۱ ص۱۰۸ باب افتراض التحریمۃ وسننہا)

وَمِثْلُہٗ صحیح مسلم ج۱ ص۱۶۸ باب استحباب رفع الیدین حذو المنکبین۔

[2] قال الشیخ عبد الحی اللکھنویؒ: (تحت قولہ تحت سرتہ) وعند ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ یضع کما فرغ من التکبیر ولا یرسل وبہ جزم قاضیخان فی فتاواہ ولم یذکر خلافاً الخ۔ (السعایۃ ج۲ ص۱۵۶ باب صفۃ الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الاحکام ج۱ ص۴۷۰ باب صفۃ الصلوٰۃ)

مکی کیلئے نماز پڑھتے وقت عین کعبہ یا جہتِ کعبہ کا حکم

سوال:۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مکی کے لیے عینِ کعبہ اور آفاقی کیلئے جہتِ کعبہ ضروری ہے، لیکن آجکل شہر مکہ میں بڑی بڑی عمارتیں مسجد حرام اور مصلی کے درمیان حائل ہیں، اس صورت میں سمتِ قبلہ کی تعیین کس طرح کی جائے؟

الجواب:۔ یہ حکم اُس مکی کے لیے ہے جس کو کعبۃ اللہ دکھائی دیتا ہو تو اس پر لازمی ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور جس کو کعبہ دکھائی نہ دیتا ہو تو اس کے لیے بھی آفاقی کی طرح جہتِ کعبہ کافی ہے اگرچہ وہ مکہ مکرمہ میں ہی رہتا ہو۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فللمکی اصابۃ عینھا بیعم المعاین وغیرہ لکن فی البحر انہ ضعیف والاصح ان مابینہ و بینھا حائل کالغائب۔[1]

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۴۲۷، ۴۲۸ باب شروط الصلوٰۃ)

حطیم کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا مسئلہ

سوال:۔ ہم نے کتابوں میں دیکھا ہے کہ حطیم بیت اللہ کا حصہ ہے، لہٰذا اگر کوئی آدمی حطیم کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ خبر احاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حطیم کعبۃ اللہ کا حصہ ہے لیکن یہ امر ظنی ہے اور استقبالِ قبلہ قطعی الثبوت دلیل سے ثابت ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی حطیم کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے تو نماز نہیں ہوگی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ کاستقبالہ احتیاطاً) فانہ اذا استقبلہ المصلی لم تصح صلوٰتہ لان فرضیۃ استقبال القبلۃ ثبتت بالنص القطعی وکون الحطیم من الکعبۃ ثبتت بالاحاد فصار کانہ من الکعبۃ من وجہ دون وجہ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۴۹۶ بحث الطواف)[2]

سمتِ قبلہ کی تعیین کے لیے قبلہ نما کے استعمال کا حکم

سوال:۔ دورِ حاضر میں لوگ قبلہ کی تعیین کے لیے قبلہ نما استعمال کرتے ہیں، اس کی

---

[1] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: وفی الدرایۃ من کان بینہ و بین الکعبۃ حائل الاصح انہ کالغائب۔ (کبیری ص ۲۱۷ الشرط الرابع)

[2] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: الکعبۃ اسم للعرصۃ.....ولو صلی الی الحطیم وحدہ لایجوز۔ (کبیری ص ۲۲۵ الشرط الرابع فروع فی شرح الطحاوی)

شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ نماز پڑھنے کے لیے ایک اہم رُکن شہروں اور دیہاتوں میں استقبالِ قبلہ ہے یا جہتِ قبلہ ہے۔ فقہاء کرام نے اس کی پہچان کے لیے پہلے زمانے کی مساجد اور ان کے محرابوں کو دلیل ٹھہرایا ہے اور صحراؤں میں ستاروں کو دلیل قرار دیا ہے جس سے غالب گمان ہوتا ہے کہ قبلہ اس طرف ہے۔ چونکہ موجودہ دور کا یہ آلہ (قبلہ نما) ظنِ غالب کی تحصیل کے لیے زیادہ کارآمد ہے اس لیے قبلہ کی تعیین کے لیے اس کا استعمال شرعاً درست ہے اور اس سے قبلہ کا صحیح رُخ متعین ہو جاتا ہے۔

لما قال فی الهندیة: وجهة الکعبة تعرف بالدلیل والدلیل فی الامصار والقریٰ المحاریب التی نصبها الصحابة والتابعون فعلینا اتباعهم فان لم تکن فالسؤال من اهل ذلك الموضع واما فی البحار والمفاوز فدلیل القبلة النجوم۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۶۳ الفصل الثالث فی استقبال القبلة)[له]

ریل گاڑی میں دورانِ نماز استقبالِ قبلہ ضروری ہے

سوال:۔ ریل گاڑی میں سفر کے دوران نماز کا وقت بھی آتا ہے لیکن اس میں قبلہ کا بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ قبلہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا اور اگر چل بھی جائے تو ریل گاڑی کا کبھی کبھی عین نماز کے دوران قبلہ کی طرف سے رُخ مڑ جاتا ہے تو اس حالت میں نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بعض ٹرینوں کی وضع اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ مسلمان کے لیے ان میں قبلہ رُخ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہوتا ہے لہٰذا شروع نماز سے اختتام تک قبلہ رُخ ہو کر نماز پڑھے۔ اگر ابتداء میں قبلہ رُخ ہو کر نماز شروع کی اور درمیان میں ریل گاڑی قبلہ رُخ سے ہٹ گئی تو نمازی دورانِ نماز اپنا رُخ قبلہ کی طرف پھیرے، تاہم اگر ریل گاڑی میں ہجوم اتنا زیادہ ہو کہ رُخ پھیرنا ممکن نہ ہو تو بصورتِ مجبوری نماز ہو جائے گی، اس کی مثال فقہی ذخائر میں لنگر انداز کشتی جیسی ہے۔

له وتعرف بالدلیل وهو فی القریٰ والامصار محاریب الصحابة والتابعین وفی المفاوز والبحار النجوم کالقطب: قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله کالقطب)......وعلیٰ ما وضعوه لها من الآلات کالربع والاسطرلاب فانها لم تفد الیقین تفد غلبة الظن للعالم بها وغلبة الظن کافیة فی ذلك۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۴۳۰ کتاب الصلوٰة، ارکان الفرائض)

قال العلامة الحصکفیؒ :........ والمربوطة بلجة البحر ان کان الریح یحرکها شدیدًا فکالسائرة والا فکالواقفة ویلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وکلما دارت۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۰۱ باب صلوٰة المریض)[1]

ریل گاڑی میں بھی نماز کیلئے قیام فرض ہے

سوال:۔ ہم پشاور سے کراچی تک کا سفر ریل گاڑی سے کرتے ہیں، ریل گاڑی میں کثرتِ ازدہام کی وجہ سے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں ہم بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں قیام فرض ہے بغیر شرعی عذر کے اس کا ترک کرنا درست نہیں، اسلئے پہلے تو اپنے ہمسفر لوگوں سے درخواست کرکے نماز کے لیے جگہ مانگی جائے، اگر وہ جگہ نہ دیں تو پھر بیٹھ کر نماز ادا کرلی جائے مگر اس کا اعادہ لازم ہے، البتہ اگر سر چکرانے یا گرجانے کا خطرہ ہو تو پھر بلا اعادہ جائز ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ : الاسیر فی ید العدو اذا منعه الکافر عن الوضوء والصلوٰة یتیمم ویصلی بالایماء ثم یعید اذا خرج ... کالمحبوس لان الطهارة التیمم تظهر فی منع وجوب الاعادة ثم قال فعلم منه ان العذر ان کان من قبل الله تعالیٰ لاتجب الاعادة وان کان من قبل العبد وجب الاعادة۔ (البحر الرائق ج۱ ص۱۴۹ باب التیمم)

---

[1] وقال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰنؒ : اگر کسے در ریل نماز فرض خواند پس استقبالِ قبلہ وقیام ورکوع وسجود وغیرہ جملہ ارکانِ صلوٰۃ ادا کردن ضروری است ومحض از سواری ریل استقبال ساقط نمی شود چراکہ باوجود تحویل الواح بہ قدرے وقت وتکلف استقبال ممکن است، اگر بلا مجبوری ترکِ استقبال کرد نماز جائز ادا نمی شود واگر مستقبل قبلہ بودہ نماز شروع کرد ودر حالتِ صلوٰۃ سمتِ قبلہ مبدل گردد پس مصلی را ضروری است کہ آں ہم متوجہ قبلہ بودہ نماز تمام کند کہ جملہ ارکانِ صلوٰۃ ادا شوند ومصلی ریل را در نماز فرض قعود قطعاً جائز نیست ودر صلوٰۃِ نفل جائز است، البتہ اگر فی الحقیقت ہجوم ایں قدر باشد کہ حرکت رکوع وسجود ممکن نیست ونیز بر صلوٰۃ از خارج ریل قادر نیست بلا استقبال وبلا قیام ادا کند وایں صورت نادر است۔

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۲ ص۱۴۶ ارکان الصلوٰۃ فصل ثالث استقبالِ قبلہ)

دورانِ نمازِ قیام میں دونوں پاؤں کے درمیانی فاصلہ کا حکم

سوال:۔ حالتِ قیام میں نمازی کو دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھنا چاہیئے؟ بعض لوگ دونوں پاؤں کے درمیان ایک بالشت تک فاصلہ رکھتے ہیں، ان کا ایسا کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ یہ نماز کے آداب میں سے ہے کہ نمازی دونوں پاؤں کے درمیان ہاتھ کی چار انگلیوں کے برابر فاصلہ رکھے، اتنا فاصلہ نہ رکھے جس سے توازن بگڑ جائے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ (تحت قولہ منھا القیام) وینبغی ان یکون بینھما مقدار اربع اصابع الید لانہ اقرب الی الخشوع۔ (ردّ المحتار ج۱ ص۴۴۴ فرائض الصلوٰۃ)[۱]

بلاعذر ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر نماز پڑھنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! نماز میں ایک پاؤں پر بلاعذر شرعی کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں دونوں پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے، فقہاء کرام نے ایک پاؤں پر بلاعذر کھڑے ہونے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں سستی اور کاہلی ظاہر ہوتی ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ومنھا القیام) ویکرہ القیام علی احد القدمین فی الصلوٰۃ بلا عذر۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۴۴ فرائض الصلوٰۃ)[۲]

نماز میں قرأت کا حکم

سوال:۔ نماز میں قرأتِ قرآن کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز میں قرآنِ کریم کی قرأت لا علی التعیین فرض ہے جس کی مقدار ایک آیت ہے، اس مقدار کی قرأت نفل، وتر اور سنن کے جمیع رکعات میں فرض ہے اور فرائض کی دو رکعات میں البتہ تین آیات یا سورت اور فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں واجب ہے۔

---

[۱] قال العلامۃ عبدالحی اللکھنویؒ: ویستحب ان یکون بین الرجلین عند القیام مقدار اربعۃ اصابع کما فی البزازیۃ وغیرھا لکونہ اقرب الی الخشوع۔ (السعایۃ ج۲ ص۱۱۱ باب صفۃ الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۱۵۳ فصل اول، باب صفۃ الصلوٰۃ)

[۲] وفی الھندیۃ: ویکرہ القیام علی احد القدمین من غیر عذر وتجوز الصلوٰۃ وللعذر لا یکرہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۶۹ الباب الرابع فی صفۃ الصلوٰۃ، الفصل الاوّل)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرہ ج۱ ص۵۸ باب صفۃ الصلوٰۃ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله منها القرأة) ای قرأة آیة من القرآن وھی فرض عملی فی جمیع رکعات النفل والوتر وفی رکعتین من الفرض کما سیأتی متنًا فی باب الوتر والنوافل واما تعیین القرأة فی الاولیین من الفرض فھو واجب وقیل سنة لا فرض کماحققه فی الواجبات واما قرأة الفاتحة والسورة او ثلاث آیات فھی واجبة ایضًا۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۴۶ فرائض الصلوٰة) [1]

سجدہ کو جاتے وقت زمین پر اوّلاً ہاتھ رکھنے کا حکم

سوال: بعض لوگ سجدہ کو جاتے وقت زمین پر اوّلاً ہاتھ رکھتے ہیں اور پھر گھٹنے حالانکہ ہم نے علماء کرام سے سُنا ہے کہ سجدہ کو جاتے وقت پہلے گھٹنے رکھنے چاہئیں پھر ہاتھ، تو کیا مذکورہ صورت جائز ہے اور اس طرح سے نماز ہوجائے گی؟

الجواب: احادیثِ مبارکہ میں دونوں طرح کی صورتیں مروی ہیں۔ حضرت وائل بن حجرؓ کی روایت میں وضع الرکبتین قبل الیدین (گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے) کے الفاظ ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں وضع الیدین قبل الرکبتین کا ذکر ہے۔ مگر علماء احناف نے حضرت وائل بن حجرؓ کی روایت کو دیگر مؤیدات کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے اسلئے سُنت یہ ہے کہ پہلے زمین پر گھٹنے رکھے جائیں اور پھر ہاتھ، البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پہلے ہاتھ رکھے جاسکتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویسجد واضعا رکبتیه اولاً لقربھما من الارض ثم یدیه الا لعذر۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۴۹۷ فصل اذا اراد الشروع) [2]

حالتِ سجدہ میں پاؤں کا اٹھانا

سوال: نماز میں سجدہ کے دوران بعض لوگ دونوں پاؤں اوپر اٹھا لیتے ہیں، اس طرح کرنے سے نماز پر کوئی اثر پڑے

---

[1] قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: وفرض القرأة آیة۔ (کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج۱ ص۳۳۸ باب صفة الصلوٰة)

[2] قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: ثم کبر ووضع رکبتیه ثم یدیه ثم وجھه بین کفیه قال ابن نجیم المصریؒ: (تحت قوله ثم کبر ووضع الخ) لما کان یفعله علیه السلام۔۔۔۔۔انه اذا اراد السجود یضع اولًا ما کان اقرب الی الارض فیضع رکبتیه اولًا ثم یدیه۔۔۔الخ (البحر الرائق ج۱ ص۳۱۷ باب صفة الصلوٰة)

لگایا نہیں؟

الجواب:۔ سجدہ میں قدمین کا کوئی بھی حصہ زمین پر رکھنا ضروری ہے اگرچہ ایک انگلی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر قدمین میں سے کوئی بھی حصہ زمین پر نہ رکھا گیا تو سجدہ صحیح نہ ہوگا جس کی وجہ سے نماز فاسد ہوجائے گی۔

قال الحصکفیؒ: ومنھا السجود بجبھتہ وقدمیہ ووضع اصبع واحدۃ منھما شرط۔
قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ وقدمیہ) یجب اسقاطہ لان وضع اصبع واحدۃ منھما یکفی کما ذکرہ بعد وافاد انہ لولم یضع شیئاً من القدمین لم یصح السجود وھو مقتضی ما قدمناہ آنفا۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۴۷ بحث الرکوع والسجود) [1]

کور عمامہ (پگڑی کے بل) پر سجدہ کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ جو عمامہ پہنتے ہیں وہ عمامہ کے کور پر ہی نماز میں سجدہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے نہ ناک زمین پر لگتی ہے اور نہ پیشانی، تو اس طرح سجدہ کرنے سے نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عمامہ کا کور پیشانی پر ہو تو اسی حالت میں عمامہ کے کور پر سجدہ کرنا مکروہ ہے اور اگر کور عمامہ پیشانی سے اوپر ہو اور سجدہ کور عمامہ پر کیا جائے تو اس صورت میں سجدہ ادا نہیں ہوا اس لیے کہ پیشانی یا ناک زمین پر نہیں رکھی گئی لہٰذا اس صورت میں نماز پڑھنا درست نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: کما یکرہ تنزیھا بکور عمامتہ الا بعذر وان صح عندنا بشرط کونہ علی جبھتہ کلھا او بعضھا کما مر اما اذا کان الکور علی راسہ فقط وسجد علیہ مقتصراً ای ولم تصب الارض جبھتہ ولا انفہ علی القول بہ لایصح لعدم السجود علی محلہ الخ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۵۰۰ فصل اذا اراد الشروع) [2]

[1] وفی الھندیۃ: ولو سجد ولم یضع قدمیہ علی الارض لایجوز ولو وضع احداھما دون الاخری جاز مع الکراھۃ ان کان بغیر عذر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۷۰ الباب الرابع فی صفۃ الصلوٰۃ۔ الفصل الاول)
ومثلہ فی کبیری ص۲۸۴ الخامس السجدۃ۔

[2] قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: وکرہ باحدھما او بکور عمامتہ اھ قال ابن نجیمؒ: تحت قولہ وکرہ باحدھما الخ) ان صحۃ السجود علی الکور اذا کان الکور علی الجبھۃ او بعضھا اما اذا کان علی الراس فقط وسجد علیہ ولم تصب جبھتہ الارض علی القول بتعینھا ولا انفہ علی القول بعدم تعینھا فان الصلوٰۃ لاتصح لعدم السجود علی محلہ وکثیر من العوام یتساھل فی ذٰلک۔ (البحر الرائق ج۱ ص۳۱۹ باب صفۃ الصلوٰۃ)
ومثلہ فی الطحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۱۱۴ فصل شروط الصلوٰۃ وارکانھا۔

تختہ پوش پر نماز پڑھنے کا مسئلہ

سوال:۔ آجکل لڑکیوں کے والدین شادی کے وقت جہیز میں یا لڑکے والے اس کے لیے فرنیچر میں نماز پڑھنے کے لیے ایک تخت بنوانتے ہیں جس کو پشتو میں "تختہ پوش" کہا جاتا ہے، شرعاً اس پر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ ایسے تخت لکڑی سے بنائے جاتے ہیں جو کہ سخت ہوتی ہے، حالتِ سجدہ یا رکوع یا قیام پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، اس لیے ایسے "تختہ پوش" پر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ زمین پر رکھا ہوا ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لا یصح لعدم السجود علی محله وبشرط طهارة المکان وان یجد حجم الارض ۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله ان یجد حجم الارض) تفسیره ان الساجد لو بالغ لا یتسفل رأسه ابلغ من ذالک فصح علی طنفسة وحصیر وحنطة وشعیر وسریر وعجلة ان کانت علی الارض لا علی ظهر حیوان کبساط مشدود بین اشجار۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۳۵ فصل اذا اراد الشروع) [1]

قالین اور فوم کے گدّول پر نماز کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد میں ایک صاحبِ خیر نے نمازیوں کے لیے قالین بچھایا ہے جو بہت نرم ہے، کیا اس قالین پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں زمین پر سجدہ کرنا ضروری ہے یعنی زمین کی صلابت اور سختی کا ادراک ضروری ہے۔ لہٰذا اگر قالین پر سجدہ کے دوران نیچے کی زمین کی سختی کا ادراک ہو سکتا ہو تو نماز جائز ہے ورنہ نہیں، چونکہ آجکل کے قالینوں میں زمین کی سختی کا ادراک ہوتا ہے اس لیے قالین کارپٹ، دری وغیرہ پر نماز پڑھنا جائز ہے البتہ موٹے اور لچکدار فوم پر نماز جائز نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لا یصح لعدم السجود علی محله وبشرط طهارة المکان وان یجد حجم الارض ۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله ان یجد حجم الارض)...... والحشیش إلّا ان وجد حجمه

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: والاصل کما انه یجوز السجود علی الارض یجوز علی ما هو بمعنی الارض مما تجد جبهته حجمه وتستقر علیه وتفسیر وجدان الحجم أن الساجد لو بالغ لا یتسفل رأسه أبلغ من ذالک فیصح السجود علی الطنفسة والحصیر والحنطة والشعیر والسریر والعجلة ان کانت علی الارض لانه یجد حجم الارض ۔ (البحر الرائق ج۱ ص۳۱۹ باب صفة الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج۲ ص۱۵۲ فصل اول صفة الصلوٰة ۔

ومن هنا يعلم الجواز على لطواحة القطن فان وجد الحجم جاز والا فلا ۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۵۰۱ فصل اذا اراد الشروع) ؎۱

قعدۂ اخیرہ کا حکم

سوال:۔ نماز میں قعدۂ اخیرہ کا کیا حکم ہے؟ یعنی فرض ہے یا واجب؟

الجواب:۔ قعدۂ اخیرہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، بعض اس کو واجب قرار دیتے ہیں اور بعض فرض کہتے ہیں، بعض کی رائے رکنیت کی ہے جبکہ بعض اس کو شرط قرار دیتے ہیں، راجح یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ فرض اور شرط ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ومنها القعود الاخیر والذی یظهر انه شرط لانه شرع للخروج کالتحریمة للشروع ۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله والذی یظهر) اختلف فی القعدة الاخیرة قال بعضهم هی رکن اصلی ۔ وفی کشف للبزدوی: انها واجبة لا فرض لکن الواجب هنا فی قوة الفرض فی العمل کالوتر وفی خزانة الروایات انها فرض ولیست برکن اصلی بل هی شرط للتحلیل وجزم انها فرض فی الفتح والتبیین ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۴۴۸ فرائض الصلوٰة فی بحث القعود الاخیر) ؎۲

قعدۂ اخیرہ کی فرضیت کا منکر کافر نہیں

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد میں دو آدمیوں کے درمیان بحث ہو رہی تھی، ایک نے کہا کہ جو شخص نماز میں قعدۂ اخیرہ کی فرضیت کا منکر ہو تو وہ کافر نہیں اور دوسرا اس کو کافر کہہ رہا تھا، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں کس کی بات صحیح ہے اور کون حق پر ہے؟

الجواب:۔ قعدۂ اخیرہ کے بارے میں مختلف روایات فقہاء کرام سے مروی ہیں

؎۱ قال العلامة ابن نجیمؒ: والاصل کما انه یجوز السجود علی الارض یجوز علی ما هو بمعنی الارض مما تجد جبهته حجمه وتستقر علیه وتفسیر وجدان الحجم ان الساجد لو بالغ لا یتسفل رأسه ابلغ من ذلك ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۳۱۹ باب صفة الصلوٰة)

؎۲ قال العلامة بدر الدین العینی: وذکر فی الایضاح اما القعدة الاخیرة فمن جملة الفروض ولیست من الارکان لان الشئ مایقسم به ذلك الشئ وتفسیر الصلوٰة لایقع بالقعدة وانما یقع بالقیام والقرأة والرکوع والسجود وانما انعدمت الرکنیة فی القعدة لانها اعتدت نعیرها لا لعینها لان الصلوٰة لتعظیم وهو بالقیام وذاك بالرکوع ویتناهی بالسجود والقعدة للخروج ۔ (البنایة ج ۲ ص ۱۶۸ باب صفة الصلوٰة)

ومثله فی الطحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص ۱۳۸ باب شروط الصلوٰة وارکانها ۔

کشف الاسرار للبزدوی میں ہے کہ قعدۂ اخیرہ واجب ہے فرض نہیں لیکن یہ وجوب فرضیت کے حکم میں ہے۔ اور صاحب خزانۃ الروایات فرماتے ہیں کہ فرض ہے اور اسی کو ابن الہمامؒ اور فخر الدین الزیلعیؒ نے راجح قرار دیا ہے۔

بناء برایں اختلاف اگر کوئی نماز میں قعدۂ اخیرہ کی فرضیت کا منکر ہو تو کافر نہیں البتہ مشروعیت کا منکر کافر ہے، اس لیے اول شخص کی بات صحیح ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ لا یکفر منکرہ) الظاہر ان المراد منکر فرضیتہ لانہ قیل بوجوبہ کما فی القہستانی واما منکر اصل مشروعیتہ فینبغی ان یکفر لثبوتہ بالاجماع بل معلوم من الدین بالضرورۃ افادہ ویؤیدہ ما قالوا فی السنن الرواتب من لم یرھا حقاً کفر۔ (رد المحتار ج ا ص۴۴۸ فرائض الصلوٰۃ فی بحث القعود الاخیر)[1]

سوال:۔ ایک شخص کو دوران نماز سجدہ کرنے وقت ہوا خارج ہونے | ہوا خارج ہونے کی صورت میں سجدہ کرنے کا حکم

کی بیماری ہے لیکن قیام اور رکوع کی حالت میں درست اور صحیح رہتا ہے، تو کیا اس شخص کے لیے نماز میں سجدہ کرنا ضروری ہے یا صرف اشارے سے سجدہ کرے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ عذر شرعی کی کیفیت ہے اس لیے یہ شخص نماز میں قیام اور رکوع کے بعد اشارے سے سجدہ کرے، اگر کھڑے ہو کر اشارے سے سجدہ کرنا آسان ہو تو کھڑے ہو کر اشارے سے سجدہ کرے ورنہ بیٹھ کر سجدہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

لما قال العلامۃ الشرنبلالیؒ: وان تعذر الرکوع والسجود وقدر علی القعود ولو مستنداً صلی قاعداً بالایماء للرکوع والسجود برأسہ ولا یجزیہ مضطجعاً وجعل ایماءہ برأسہ للسجود اخفض من ایماءہ برأسہ للرکوع۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۳۵ باب صلوٰۃ المریض)

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وحکم الواجب استحقاق العقاب بترکہ عمداً وعدم اکفار جاحدہ والثواب بفعلہ ولزوم سجود السہو لنقص الصلوٰۃ بترکہ سہواً۔ اھ

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۱۹۹/۲۰۰ فصل فی واجبات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ا ص۶۲۸ الفصل الخامس ارکان الصلوٰۃ۔

باب واجبات الصّلوٰۃ
(نماز کے واجبات کے بیان میں)

جماعت میں امام کا تنہا رہ جانا

سوال:۔ اگر کہیں امام کے مقتدی دوران جماعت امام کو اکیلے چھوڑ کر بھاگ جائیں تو امام تکبیرات میں جہر کرے گا یا اخفاء؟

الجواب:۔ مقتدیوں کے بھاگ جانے سے امام کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ اس صورت میں امام کی حالت ایک منفرد کی ہوجائیگی، لہٰذا سری نمازوں میں اخفاء کرے اور جہری نمازیں میں جہر بھی جائز ہے۔

وان کان منفرداً ان کانت صلوٰۃ یخافت فیھا یخافت حتما ھو الصحیح وان کانت صلوٰۃ یجھر فیھا فھو بالخیار والجھر افضل ولکن لا یبالغ مثل الامام لانہ لا یسمع غیرہ کذا فی التبیین ولا یجھر کالامام نفسہ بالجھر کذا فی البحر الرائق۔

(الفتاویٰ الہندیہ ج۱ ص۷۲ واجبات الصلوٰۃ۔ الفصل الثانی)[1]

قعدۂ اولیٰ واجب ہے

سوال:۔ تین یا چار رکعت فرض نماز میں تو قعدۂ اولیٰ واجب ہے کیا نفل نماز (صلوٰۃ التسبیح وغیرہ) میں بھی قعدۂ اولیٰ واجب ہے؟

الجواب:۔ قعدۂ اولیٰ جس طرح تین یا چار رکعت فرض نماز میں واجب ہے اسی طرح نوافل، سُنن اور وتر میں بھی واجب ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولھا واجبات..... والقعود الاوّل ولو فی نفل فی الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۴۶۵ باب صفۃ الصلوٰۃ مطلب واجبات الصلوٰۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والاسرار یجب علی الامام والمنفرد فیما یسر فیہ وھو فی صلوٰۃ الظھر والعصر۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۶۹ واجبات الصلوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۰۲ واجبات الصّلوٰۃ۔

[2] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: ومن الواجبات القعدۃ الاولیٰ لما مر مراراً (کبیری ص۲۹۶ واجبات الصّلوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۰۰ واجبات الصلوٰۃ باب صفۃ الصّلوٰۃ۔

تعدیلِ ارکان واجب ہے

سوال: بعض لوگ نماز کو اس طرح پڑھتے ہیں جیساکہ مُرغ دانوں پر ٹھونگے مارتا ہے، اس قسم کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کا تعلق واجباتِ صلوٰۃ سے ہے۔ نماز میں ارکانِ نماز کو اطمینان اور تعدیل سے اداکرنا واجب ہے، جو نماز تعدیلِ ارکان کے ساتھ ادا نہ کی جائے تو وہ واجب الاعادہ ہے، البتہ اگر سہواً متروک ہوجائے تو سجدہ سہو سے نماز درست ہوجائے گی۔

قال الحصکفیؒ: لها واجبات لا تفسد بترکها وتعاد وجوبًا فی العمد والسهو ان لم یسجد له وان لم یعدها یکون فاسقًا اٰثمًا...... وهی قرأة الفاتحة الکتٰب.. وتعدیل الارکان۔[1]
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۴۵۶ و۴۶۴ مطلب واجبات الصلوٰۃ)

نماز میں قومہ اور جلسہ واجب ہے

سوال: بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نماز میں رکوع سے سیدھے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ براہِ راست رکوع سے ہی سجدہ میں چلے جاتے ہیں، اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان بھی پوری طرح نہیں بیٹھتے بلکہ ایک سجدہ سے پوری طرح سر نہیں اٹھایا کہ فوراً دوسرے سجدے میں چلے گئے، کیا نماز کو اس طرح اداکرنا جائز ہے؟

الجواب: قومہ (یعنی رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونا) اور جلسہ (یعنی دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا) دونوں واجب ہیں، اگر سہواً رہ جائیں تو سجدہ سہو کفایت کرجاتا ہے اور عمداً ترک کیا جائے تو نماز واجب الاعادہ ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولها واجبات..... وهی قرأة فاتحة الکتاب..... تعدیل الارکان ای تسکین الجوارح قدر تسبیحة فی الرکوع والسجود وکذا فی الرفع منهما علی ما اختاره الکمال۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله وکذا الرفع) ای یجب التعدیل ایضًا فی القومة من الرکوع والجلسة بین السجدتین وتضمن کلامه وجوب نفس القومة والجلسة ایضًا الخ..... حتی لو ترکها او شیئًا منها ساهیًا یلزمه السهو ولو عمدًا یکره اشد الکراهة ویلزمه ان یعید الصلوٰۃ۔[2] (رد المحتار جلد ۱ ص۴۶۴ باب صفة الصلوٰۃ مطلب واجبات الصلوٰۃ)

---

[1] قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ، وعندهما تعدیل الارکان من الواجبات لا من الفرائض۔ (کبیری ص۲۹۴ باب صفة الصلوٰۃ)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۲۹۹ باب صفة الصلوٰۃ۔

[2] قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: قال الشیخ کمال الدین بن الهمامؒ وینبغی ان تکون القومة والجلسة واجبتین للمواظبة۔ (کبیری ص۲۹۴ باب الثامن تعدیل ارکان)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۰۰ باب صفة الصلوٰۃ۔

نماز میں التحیات پڑھنے کا حکم

سوال:۔ نماز میں تشہد پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کے ہر قعدہ میں تشہد پڑھنا واجب ہے سہواً چھوٹ جانے کی صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوجاتا ہے، عمداً ترک کرنے سے نماز کا اعادہ ضروری ہے۔

قال العلامۃ ابراهیم الحلبیؒ : ومنها قراءۃ التشهد فانها واجبۃ فی القعدتین الاولی والاخیرۃ۔۔۔۔۔ فاوجب السجود بترک التشهد فی القعدۃ الاولی کما فی القعدۃ الاخیرۃ وهو ظاهر الروایۃ ۔ (کبیری ص۲۹۶ واجبات الصلوٰۃ) [۱]

وتر نماز میں دعاء قنوت کا حکم

سوال:۔ وتر میں دعاء قنوت کا کیا حکم ہے؟ اگر سہواً رہ جائے تو پھر کیا حکم ہوگا؟

الجواب:۔ وتر میں دعاء قنوت پڑھنا واجب ہے اگر سہواً رہ جائے تو سجدۂ سہو لازم ہوجائے گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : وقراءۃ قنوت الوتر وهو مطلق الدعاء۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۶۸ باب صفۃ الصلوٰۃ ۔مطلب واجبات الصلوٰۃ) [۲]

تکبیراتِ زوائد کا حکم

سوال:۔ عیدین میں تکبیراتِ زوائد کتنی ہیں؟ اور یہ سنت ہیں یا واجب اور فرض؟

الجواب:۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں تکبیراتِ زوائد چھ ہیں اور یہ واجباتِ صلوٰۃ میں داخل ہیں، اگر سہواً یہ تکبیرات چھوٹ جائیں تو سجدہ سہو واجب ہوجاتا ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : وتکبیرات العیدین وکذا احدها وتکبیرۃ رکوع رکعۃ الثانیۃ کلفظ التکبیر فی افتتاحه لکن الاشبه وجوبه فی کل صلوٰۃ ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۶۹ مطلب واجبات الصلوٰۃ) [۳]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : تحت قوله ولها واجبات۔۔۔۔ (والتشهدان) ای تشهد القعدۃ الاولی وتشهد الاخیر۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۶۶ مطلب واجبات الصلوٰۃ)

[۲] قال العلامۃ ابراهیم الحلبیؒ : ومنها قراءۃ القنوت فی الوتر۔ (کبیری ص۲۹۶ واجبات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۰۱ واجبات الصلوٰۃ باب صفۃ الصلوٰۃ۔

[۳] قال العلامۃ ابراهیم الحلبیؒ :۔ ومنها تکبیرات العیدین للمواظبۃ علیها من غیر ترک والمراد التکبیرات الزوائد لاجمیع ۔ (کبیری ص۲۹۶ واجبات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۰۱ واجبات الصلوٰۃ ، باب صفۃ الصلوٰۃ۔

باب سنن الصّلوٰۃ

(نماز کی سُنتوں کے بیان میں)

تشہّد میں انگلی سے اشارہ کرنا سُنّت ہے

سوال:۔ تشہد کی حالت میں سبابہ سے اشارہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعض لوگ اس کی حرمت کے قائل ہیں جبکہ روایات اس کے ثبوت اور استحباب و سُنّت پر دال ہیں؟

الجواب:۔ تشہد میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے وقت سبابہ (سواکی انگلی) سے اشارہ کرنا احادیث اور فقہی ذخائر سے ثابت ہے اس لیے نماز میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے وقت انگلی سے اشارہ کرنا مسنون ہے۔ جو حضرات اس کو بدعت کہتے ہیں اُن کی رائے احادیثِ صریحہ کے مخالف ہے۔

عن عبداللہ بن الزبیر عن ابیه قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا قعد یدعو وضع یده الیمنٰی علی فخذه الیمنٰی و یده الیسرٰی علی فخذه الیسرٰی و اشار باصبعه السبابة ووضع ابهامه علی اصبعه الوسطٰی ویلقم کفه الیسرٰی رکبته۔[1]
(الصحیح المسلم ج۱ ص۲۱۶ باب صفة الجلوس فی الصلوٰۃ)

تحقیق رفع الیدین

سوال:۔ دورانِ نماز رفع الیدین یا ترکِ رفع الیدین میں سے کون سا عمل روایاتِ صحیحہ کے موافق ہے؟

الجواب:۔ احادیث میں رفع الیدین اور ترک رفع الیدین دونوں کے متعلق روایات موجود ہیں، لیکن احناف کی تحقیق کے مطابق ترکِ رفع الیدین اولیٰ و افضل ہے۔

---

[1] عن وائل بن حجر قال قلتُ لانظرن الی صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ...... وحلق بشر الابهام والوسطٰی واشار بالسبابة۔
(سنن ابی داؤد ج۱ ص۱۰۵ باب رفع الیدین)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۵۰۸ آداب الصلوٰۃ۔

عن براءبن عازب قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ الی قریب من اُذنیہ ثم لا یعود۔ (ابی داؤد ج ۱ ص۱۰۹)

عن علقمۃ قال قال لنا ابن مسعود الا اُصلّی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلّی ولم یرفع یدیہ الا مرّۃ واحدۃ مع تکبیر الافتتاح۔ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۷۷ باب صفۃ الصلوٰۃ) [1]

تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا

سوال: تکبیرِ تحریمہ میں ہاتھ اٹھانے کا مسنون وقت کون سا ہے؟

الجواب: تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اگر تکبیر کہنے سے پہلے یا اس کے بعد اور یا تکبیر کے ساتھ اٹھا دیئے جائیں تو اس سے رفع یدین کی سنت ادا ہوجاتی ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ پہلے ہاتھ اٹھائے اور بعد میں تکبیر کہے۔

قال الحصکفیؒ: (ورفع یدیہ) قبل التکبیر وقیل معہ قال ابن عابدینؒ (قولہ رفع الیدین) للتحریمۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۷۳ سنن الصلوٰۃ) [2]

---

[1] عن عبد اللہ بن عمر قال: رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ حذو منکبیہ واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع رأسہ من الرکوع فلا یرفع ولا بین السجدتین۔ (مسند حمیدی ج ۲ ص۲۷۷ رقم حدیث ۶۱۴، احادیث عبد اللہ بن عمر بن الخطاب)

وَمِثْلُہٗ فی الجامع الترمذی ج ۱ ص۵۹ باب رفع الیدین عند الرکوع۔

[2] قال المرغینانیؒ: یرفع یدیہ مع التکبیر وھو سنۃ لان النبی علیہ السلام واظب علیہ وھذا اللفظ یشیر الی اشتراط المقارنۃ وھو المروی عن ابی یوسفؒ والمحکی عن الطحاوی والاصح انہ یرفع یدیہ اولاً ثم یکبر لان فعلہ نفی الکبریاء عن غیر اللہ تعالیٰ والنفی مقدم ویرفع یدیہ۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۰۱ صفۃ الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۷۲ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰۃ۔

بسم اللہ ترک کرنے سے نماز کا اعادہ لازم نہیں

سوال:۔ نماز کی ہر رکعت میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے یا سنت؟ اور اگر کسی سے پڑھنا رہ جائے تو کیا اس پر سجدہ سہو لازم ہے یا نہیں اور اگر کوئی قصداً وعمداً بسم اللہ پڑھنا ترک کردے تو کیا نماز کا اعادہ کرنا ہوگا؟

الجواب:۔ ہر رکعت میں بسم اللہ پڑھنا ایک مسنون عمل ہے اور مسنون عمل کے ترک کرنے سے نہ فساد لازم آتا ہے اور نہ قضا و اعادہ۔ اسلئے اگر کسی سے بسم اللہ سہواً یا عمداً چھوٹ جائے تو نماز دوبارہ پڑھنا لازم نہیں تاہم قصداً وعمداً ترک کرنا مناسب نہیں۔

لما قال الحصکفی وسمّی غیر المؤتم بلفظ البسملة سرًّا فی اول کل رکعة ولو جهرية

بحذف یسیر۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار۔ ۱۔۳۶۳)

وقال ایضاً (وسننها) ترک السنة (لا یوجب فساداً) ولا سهواً بل اساءة لو عامداً غیر مستخف

وقال الاساءة ادون من الکراهة (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۱۔۳۵۰ مطلب سنن الصلوٰۃ)

نماز میں تسبیح کی مقدار

سوال:۔ ہمارے محلہ کی مسجد کے پیش امام رکوع وسجود میں تسبیح پانچ مرتبہ پڑھتے ہیں جبکہ بعض مقتدی اس بات پر مُصر ہیں کہ تین مرتبہ پڑھنی چاہیئے، پانچ مرتبہ پڑھنے سے بہت دیر ہوجاتی ہے۔ کیا شرعاً تین مرتبہ پڑھنے سے نماز ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص رکوع وسجود میں تین مرتبہ تسبیح پڑھ لے تو اس سے سُنت ادا ہوجاتی ہے اور اس سے زائد پڑھنا استحباب کا درجہ رکھتا ہے۔

• تکبیر الرکوع وتسبیحه ثلاثاً۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص۷۲ سنن الصلوٰۃ)

البتہ امام صاحب کو چاہیئے کہ وہ مقتدیوں کا لحاظ رکھ کر نماز ادا کریں اور نماز میں تین مرتبہ ہی تسبیح پر اکتفاء کرے۔

عن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا صلی احدکم للناس

لما قال العلامة حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی:۔ والتسمية اول کل رکعة قبل الفاتحة لانه صلی الله علیه وسلم کان یفتتح صلاته بسم الله الرحمن الرحیم

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ۱/۳۵۳۔ فصل فی بیان سننها)

ومثله فی الهندیه ۱/۷۲ الفصل الثالث سنن الصلوٰۃ

فلیخفف فان فیھم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ماشاء۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۰۱ باب ماعلی الامام) [1]

سجدہ کی حالت میں عورتوں کی مسنون کیفیت کیا ہے؟

سوال:۔ سجدہ میں عورتوں کو کیا کیفیت اختیار کرنی چاہیئے؟ کیا عورتیں بھی مردوں کی ہیئت کی طرح سجدہ کریں گی یا عورتوں کے لیے سجدہ کی کوئی خاص ہیئت ہے؟ خاص کر قدمین میں ان کی ہیئت کیا ہونی چاہیئے؟

الجواب:۔ سجدہ میں عورتوں کی کیفیت مردوں سے الگ ہے، بہتر یہ ہے کہ عورتیں سجدہ کرتے وقت قدمین کو نہ اٹھائیں، پیٹ کو رانوں کے ساتھ ملاکر سجدہ کریں جبکہ بازوؤں کو جسم کے ساتھ ملاکر زمین پر رکھیں یعنی جو کیفیت زیادہ استر ہو اختیار کریں۔

قال الحصکفیؒ: (والمرأۃ تنخفض) فلا تبدی عضدیھا (وتلصق بطنھا بفخذیھا) لانہ استر وحررناقی الخزائن انھا تخالف الرجل فی خمسۃ وعشرین۔ ذکر فی البحر: انھا لا تنصب اصابع القدمین کما ذکرہ فی المجتبیٰ۔

(رد المحتار ج۱ ص۵۰۴ باب صفۃ الصلوٰۃ) [2]

نماز میں بحالتِ قیام ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال:۔ نماز میں بحالتِ قیام ہاتھ باندھنے کا طریقہ کیا ہے؟ بعض اوقات

---

[1] وفی المسلم: عن ابی ھریرۃ یقول: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی احدکم للناس فلیخفف فان فی الناس الضعیف والسقیم وذا الحاجۃ۔ (مسلم ج ۱ ص۱۸۸)

قال القدوری: یقول فی رکوعہ سبحان ربی العظیم ثلثا ذٰلک ادناہ۔

(مختصر القدوری ص۳۳ باب صفۃ الصلوٰۃ)

ومثلہ فی البخاری ج۱ ص۹۷ باب اذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء۔ الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۶۲ باب صفۃ الصلوٰۃ

[2] والمرأۃ لا تجافی فی رکوعھا وسجودھا وتقعد علی رجلیھا وفی السجدۃ تفترش بطنھا علی فخذیھا کذا فی الخلاصۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۷۵ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰۃ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۲۱ باب صفۃ الصلوٰۃ۔

ہاتھ باندھتے وقت دُوسرے ہاتھ کی کلائی پر گھڑی ہوتی ہے، اس سے نماز میں کوئی کراہیت تو لازم نہیں آتی؟

الجواب:۔ نماز میں ہاتھ باندھنے کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ کے باطن کو بائیں ہاتھ کے ظاہر پر رکھے اور دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھے سے اس کی کلائی کو پکڑے اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھے۔

البتہ گھڑی کوئی مقصود بالذات نہیں اور نہ ہی اس کے باندھنے سے کسی قسم کی رکاوٹ ہوتی ہے لہٰذا اس سے کوئی کراہیت نہیں آتی۔

قال الحصکفیؒ: (و وضع) الرجل (یمینه علی یسارہ تحت السرۃ آخذ رسغها بخنصرہ وابهامه) هو المختار۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۸۶ صفۃ الصلوٰۃ) لہ

نماز میں آمین بالجہر کی کیفیت

سوال:۔ نماز باجماعت میں آمین کہتے وقت کون سی کیفیت اختیار کرنی چاہیئے؟ حنفی مسلک والوں کے لیے باآوازِ بلند آمین کہنے سے نماز پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ آمین کے متعلق دونوں قسم کی روایات وارد ہیں، احناف کی تحقیق کے مطابق آمین میں اخفاء سُنت ہے، البتہ اگر کوئی حنفی المسلک شخص آمین بالجہر کہہ دے تو بھی جائز ہے، اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

قال الحصکفیؒ: (وامّن الامام سرًا کماموم ومنفرد) ولو فی السریۃ اذا سمعه ولو من مثله فی نحو جمعة وعید لما حدیث اذا امّن الامام فامنوا فمن التعلیق بمعلوم الوجود فلا یتوقف علی سماعه منه بل یحصل بتمام الفاتحة بدلیل اذا قال الامام ولا الضالین فقولوا آمین۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۹۲ آداب الصلوٰۃ) ۲ہ

لہ ذٰلك بان یضع باطن کفه الیمنی علی ظاهر کفه الیسریٰ ویاخذ الرسغ بالخنصر والابهام ویرسل الباقی علی الذراع۔ (الهندیة ج ۱ ص۷۳ سنن الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۰۸ باب صفۃ الصلوٰۃ۔

۲ہ اذا فرغ من الفاتحة قال آمین والسنۃ فیه الاخفاء کذا فی المحیط المنفرد والامام سواء وکذا المأموم اذا سمع هٰکذا فی الزاهدی۔ (الهندیة ج ۱ ص۷۴ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۱۳ باب صفۃ الصلوٰۃ۔

نماز میں تسویۃ الصفوف کا حکم

سوال:۔ نماز میں صفوں کا سیدھا کرنا کیسا ہے، یعنی اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز باجماعت میں صفوں کا سیدھا کرنا سنت مؤکدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا ہے، ٹیڑھی اور غیر متوازن صفوں پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

عن النعمان بن بشیر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُسَوِّی صفوفنا حتّٰی کانّما یسوّی بھا القداح حتّٰی رأی انا قد عقلنا عنہ ثمّ خرج یومًا فقام حتّٰی کاد ان یکبر فرأی رجلًا بادیًا صدرہ من الصف فقال عباد اللہ لتسوُّنَّ صفوفکم اولیخالفنّ اللہ بین وجوھکم ۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۹۷ باب تسویۃ الصُّفُوف) [1]

تکبیر تحریمہ کے وقت ہتھیلیوں کا رُخ کس طرف کیا جائے

سوال:۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی ہتھیلیوں کا رُخ اپنے چہرے کی طرف کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

الجواب:۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہتھیلیوں کا رُخ قبلہ کی طرف کرنا بھی جائز ہے اور اپنے چہرے کی طرف بھی، البتہ قبلہ کی طرف کرنا زیادہ بہتر ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویستقبل بکفیہ القبلۃ وقیل خدیہ۔ [2]

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۸۲ باب صفۃ الصلوٰۃ قبل مطلب الفارسیۃ)

---

[1] قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: وفی حاشیۃ البخاری عن العینی وھی رأی تسویۃ الصفوف سنۃ الصلوٰۃ عند ابی حنیفۃ والشافعی ومالک (جلد ۱ ص۱۰۰) قلتُ: والظاھر من کلام اصحابنا انھا سنۃ مؤکدۃ لاطلاقھم الکراھۃ علیٰ ضدھا والکراھۃ المطلقۃ ھی التحریمیۃ۔ الخ

(اعلاء السنن ج ۴ ص۳۱۳ باب سنیۃ تسویۃ الصف الخ)

وَمِثْلُہٗ فی معارف السنن ج ۲ ص۲۹۷ باب ما جاء فی اقامۃ الصفوف۔

[2] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: ویوجہ حالۃ الرفع بطن کفیہ نحو القبلۃ کما لا علیھا۔ وفی الحاوی: وقال یجعل بطن کل کف الی الکف الاخریٰ۔ (کبیری ص۳۰۰ صفۃ الصلوٰۃ)

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت ہے

سوال: تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ بعض حضرات سینہ پر ہاتھ باندھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

الجواب: علماء احناف کی تحقیق کے مطابق مرد حضرات تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ ناف کے نیچے باندھیں کیونکہ یہی سنت ہے، البتہ عورتیں اور خنثیٰ مشکل سینے کے نیچے ہاتھ باندھیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ووضع الرجل یمینه علی یساره تحت سرته اخذ ارسغها یخنصره وابهامه هو المختار نضع المرأة والخنثیٰ الکف علی الکف تحت ثدیها۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۴۸۶ باب صفة الصلوٰة مطلب فی بیان المتواتر والشاذ) [۱]

ثناء سے قبل اور تکبیر تحریمہ کے بعد ادعیہ کا مسئلہ

سوال: احادیث کی کتابوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے تکبیر تحریمہ کے بعد بعض دعائیں مروی ہیں، کیا یہ دعائیں فرائض و سنن سب میں پڑھی جاسکتی ہیں یا کہ صرف نوافل میں؟

الجواب: اگرچہ احادیث مبارکہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں مختلف مقامات پر مختلف ادعیہ منقول ہیں لیکن علماء احناف نے یہ روایات نوافل میں پڑھنے پر محمول کی ہیں اور یہ دعائیں نفلی نماز میں پڑھی جائیں گی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وقرأ کما کبر سبحانك اللّٰهم تارکاً وجل ثناءك الا فی الجنازة مقتصراً علیه فلا یضم وجهت وجهی الا فی النافلة۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله الا فی النافلة) لحمل ماورد فی الاخبار علیها...... وفی الخزائن: وماورد محمول علی النافلة بعد الثناء فی الاصح وقال فی هامشه صححه فی الزاهدی وغیره۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۴۸۸ باب صفة الصلوٰة۔ مطلب بیان المتواتر والشاذ) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: ویضع یده الیمنی علی الیسریٰ تحت السرة کما فرغ من التکبیر والمرأة تضعهما تحت ثدیها۔ (الفتاویٰ الهندیه ج ۱ ص ۷۳ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی کبیری ص ۳۰۱ صفة الصلوٰة۔

[۲] قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰنؒ: حنفیہ نے ان ادعیہ کو نوافل پر محمول کیا ہے لہٰذا نوافل میں ہی ان کو پڑھے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۱۴۲ فصل سنن الصلوٰۃ)

الحاقِ کعبین (ٹخنوں کے ملانے) کا مسئلہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں نے الدر المختار میں دیکھا ہے کہ و ان یلحق کعبیہ کہ رکوع میں کعبین کا الحاق یعنی ملانا مسنون ہے، کیا واقعی رکوع میں کعبین کا ملانا مسنون ہے؟ جبکہ شامی میں ہے کہ حالتِ قیام میں دونوں پاؤں کے درمیان چار انگشت کے برابر فاصلہ ہونا چاہیئے، جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں!

الجواب:۔ الحاق کعبین کا مسئلہ اگرچہ متاخرین کی کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر متقدمین سے اس بارے میں کوئی ثبوت نہیں، اس لیے متاخرین کی اس تصریح کا محل اور مقام یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے وقت ایک دوسرے کے کعب (ٹخنہ) کے ساتھ اپنا ٹخنہ ملایا جائے تاکہ صفیں سیدھی ہو جائیں، جیسا کہ حدیث شریف میں سووا صفوفکم وتواصوا وسدوا الخلل۔ (مشکوٰۃ ج ص باب تسویۃ الصفوف) کا حکم وارد ہے، لہٰذا حالتِ رکوع میں دوسرے کے ٹخنے کے ساتھ اپنا ٹخنہ ملانا مسنون نہیں البتہ اگر کوئی ایسا کرے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔

لما قال الشیخ المحقق عبد الحی الکھنویؒ: ومنھا الصاق الکعبین ذکرہ جمع من المتاخرین وجمھور الفقھاء لم یذکروہ ولا اثر لہٗ فی الکتب المعتبرۃ کالھدایۃ وشروحھا النھایۃ والعنایۃ والبنایۃ والکفایۃ وفتح القدیر وغیرھا والکنز وشرحہ العینی وشرح النقایۃ لالیاس زادہ والبرجندی والشمنی وفتاوی قاضی خان والبزازیۃ وغیرھا وامام الدین اوردہ فی ذکرہ الزاھدی حیث قال فی المجتبیٰ برمز بط یسن فی الرکوع الصاق الکعبین واستقبال الاصابع القبلۃ ...... قال خیر المتاخرین شیخ مشائخنا محمد عابد السندی المدنیؒ فی طوالع الانوار شرح الدر المختار قولہ والصاق کعبیہ ای حالۃ الرکوع۔ قال الشیخ الرحمتی مع بقاء تفریج ما بین القدمین قلتُ لعلہ اراد من الصاق المحاذاۃ وذٰلک بان یحاذی کل من کعبیہ لاٰخر فلا یتقدم

احدهما علی الآخر۔ (السعایة ج ۲ ص۱۸۰ باب صفة الصلوٰة) [1]

اگر تکبیراتِ انتقالات چھوٹ جائیں تو اس کا حکم

سوال: تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسری تکبیرات کا کیا حکم ہے؟ اگر کسی وجہ سے کوئی تکبیر چھوٹ جائے تو نماز پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

الجواب: تکبیر تحریمہ فرض ہے اور باقی تکبیرات انتقالاتِ سنت، لہٰذا اگر کسی عذر کی وجہ سے رہ جائیں تو نماز متاثر نہیں ہوگی۔

لما قال العلامة محمد یوسف البنوریؒ: تکبیرات الانتقالات سنة عند الجمهور قال ابن المنذرؒ: وبه قال ابوبکر الصدیقؓ وعمرؓ وجابرؓ وقیس بن عبادةؓ والشعبیؒ والاوزاعیؒ وسعید بن عبدالعزیزؒ ومالکؒ والشافعیؒ وابوحنیفةؒ الخ

(معارف السنن ج ۲ ص۴۲۶ باب ماجاء فی التکبیر عند الرکوع والسجود) [2]

رفع سبابہ (انگلی اٹھانا) بدعت نہیں

سوال: نمازی جب التحیات میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه تک پہنچ جائے تو کیا اس کو انگلی اٹھانا چاہیئے؟ جبکہ بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں۔

---

[1] قال العلامة عبدالقادر الرافعی الفاروقی الحنفیؒ علیٰ قول الحصکفیؒ قول الشارح ویسن ان یلصق کعبیه قال الشیخ ابوالحسن السندی الصغیر فی تعلیقته الدر هذه السنة انما ذکرها من ذکرها من المتاخرین تبعاً للمجتبی ولیس لها ذکر فی الکتب المتقدمة کالهدایة وشروحها وکأن بعض مشائخنا یرٰی انها من اوهام صاحب المجتبی ولم ترد فی السنة علیٰ ما وقفنا علیه وکأنهم توهموا ذلك مما ورد ان الصحابة کانوا یهتمون سد الخلل فی الصفوف حتی یضموا الکعاب والمناکب ولایخفیٰ ان المراد هنا الحاق کعبه بکعب صاحبه لا کعبه مع کعبه الآخر (تقریرات الرافعی ج ۱ ص۶۱ باب صفة الصلوٰة فصل)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص۲۰۳ فصل سنن الصلوٰة)

[2] قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ، باب کون التکبیر سنة عند کل رفع وخفض۔ عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یکبر فی کل خفض ورفع وقیام وقعود .... (ای التکبیر) عام فی جمیع الانتقالات فی الصلوٰة۔

(اعلاء السنن ج ۳ ص۳ باب کون التکبیر سنة عند کل رفع وخفض)

الجواب:۔ تشہد میں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله کہتے وقت انگشت شہادت سے اشارہ کرنا سُنّت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنا ثابت ہے، جو لوگ اِس کو بدعت کہتے ہیں ان کا قول روایت و درایت کے خلاف ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: وفي الشرنبلالية عن البرهان الصحيح أنّهٗ يشير بمسبحته وحدها يرفعها عند النفي ويضعها عند الاثبات واحترز بالصحيح عما قيل لايشير لانه خلاف الدراية والرواية۔ الخ (الدر المختار علىٰ صدر رد المختار ج۱ ص۵۰۹، باب صفة الصلوٰة۔ قبيل مطلب مهم في عقد الاصابع عند التشهد) ؎۱

التحيات میں دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھائی جائے

سوال:۔ التحیات (قعدہ) میں اشهد ان لا اله الا الله کہتے وقت کس ہاتھ کی اُنگلی اٹھانی چاہیئے؟ ایک شخص کو میں نے دیکھا کر وہ بائیں ہاتھ کی اُنگلی اٹھا رہا تھا۔

الجواب:۔ التحیات میں اشهد ان لا اله الّا الله کہتے وقت دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت اٹھانا سُنت ہے بائیں ہاتھ کی اُنگلی اٹھانا صحیح نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قوله بل في متن درر البحار الخ) ...... وصفتها ان يحلق من يده اليمنىٰ عند الشهادة الابهام والوسطىٰ ويقبض البنصر والخنصر ويشير بالمسبحة الخ (رد المحتار ج۱ ص۹۰۸ باب صفة الصلوٰة۔ قبيل مطلب مهم في عقد الاصابع عند التشهد) ؎۲

؎۱ قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلاليؒ: وتسن الاشارة في الصحيح لانهٗ صلى الله عليه وسلم رفع اصبعه السبابة وقد احناها ومن قال انهٗ لايشير اصلاً فهو خلاف الرواية والدراية۔

(مراقي الفلاح علىٰ صدر الطحطاوي ص۲۱۸ فصل في سنن الصلوٰة)

وَمِثْلُهٗ في كبيري ص۳۲۹ باب صفة الصلوٰة۔

؎۲ قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلاليؒ: وتسن الاشارة في الصحيح لانهٗ صلى الله عليه وسلم رفع اصبعه السبابة وقد احناها شيئاً ومن قال انهٗ لايشيرا صلاً فهو خلاف الرواية والدراية وتكون بالمسبحة اي السبابة من اليمنى فقط يشير بها ...... يرفعها اي المسبحة عند النفي ...... ويضعها عند الاثبات۔

(مراقي الفلاح علىٰ صدر الطحطاوي ص۲۱۸ فصل في سنن الصلوٰة)

تشہد میں وحدہٗ لاشریک لہٗ کے الفاظ پڑھنا

سوال:۔ اگر کوئی تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے بعد وحدہٗ لاشریک لہٗ کا اضافہ کرے تو نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشہد مختلف طرق سے ثابت ہے، بعض روایات میں وحدہٗ لاشریک لہٗ الخ کا پڑھنا بھی ثابت ہے مگر حنفیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تشہد کو اختیار کیا ہے اور مذکورہ الفاظ اس میں نہیں ہیں اسلئے ان کا پڑھنا مناسب نہیں تاہم اگر کوئی ان الفاظ کو پڑھتا ہے تو اس کی نماز متاثر نہیں ہوگی۔

لما اخرجه ابوداؤد: عن حطان بن عبد اللّٰه الرقاشی بهٰذا الحديث زاد فاذا قرأ وانصتوا قال فی التشهد بعد اشهد ان لا اله الا اللّٰه زاد وحدهٗ لا شريك لهٗ ۔

(ابوداؤد شریف ج۱ ص۱۴۰ باب التشہد)[1]

قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:۔ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی درود شریف پڑھنا چھوڑ دے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کے قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا سنت ہے اگر کسی سے بوجہ مجبوری درود شریف پڑھنا رہ جائے تو نماز بلا کراہت ہو جائے گی، جبکہ قصداً ترک کرنے کی صورت میں نماز کراہت سے خالی نہیں جس کا اعادہ مستحب ہے۔

قال العلامة الحصكفیؒ: وسننها......... والصلوٰة علی النبیؐ فی القعدة الاخيرة ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۴۷۷ باب صفة الصلوٰة)

وقال ايضًا: ترك السنة لا يوجب فسادًا ولا سهوًا بل اساءة لو عامدًا غير مستخف وقالوا الاساءة ادون من

---

[1] عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم فی التشهد............ اشهد ان لا اله الا اللّٰه قال ابن عمر زدت فيها وحده لا شريك لهٗ واشهد ان محمدًا عبدهٗ ورسوله ۔

(التلخيص الحبير ج۱ ص۲۶۶ باب صفة الصلوٰة)

ومثلهٗ فی دار القطنی ج۱ ص۳۵۲ باب صفة التشهد ووجوبه واختلاف الروايات فيه ۔

الکراھۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۷۷ باب صفۃ الصلوٰۃ مطلب فی قولہم الاساءۃ ادون) [۱]

درود شریف میں لفظ سیّدنا کے اضافہ کا حکم

سوال:۔ نماز میں جو درود شریف پڑھا جاتا ہے اگر کوئی اس میں سیدنا کے لفظ کا اضافہ کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ درود شریف میں لفظ سیدنا کا اضافہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں البتہ تشہد میں بلا لفظ سیدنا کے پڑھنا بہتر ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وندب السیادۃ لان زیادۃ الاخبار بالواقع عین سلوک الادب فہو افضل من ترکہ ذکرہ الرملی الشافعی وغیرہ۔ قال العلامہ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ذکرہ الرملی الشافعی) ای فی شرحہ علی منہاج النووی ونصہ والافضل الاتیان بلفظ السیادۃ۔ کما قالہ ابن ظہیرۃ وصرح بہ جمع وبہ افتی الشارح لان فیہ الاتیان بما امرنا بہ وزیادۃ الاخبار بالواقع الذی ہو ادب فہو افضل من ترکہ وان تردد فی افضلیۃ الاسنوی واما حدیث لا تسیدونی فی الصلوٰۃ فباطل لا اصل لہٗ کما قال بعض متاخری الحفاظ الخ (رد المحتار ج ۱ ص۵۱۲، ص۵۱۳ باب صفۃ الصلوٰۃ مطلب فی جواز الترحم علی النبی ابتداء) [۲]

قعدۂ اخیرہ میں دعا ترک ہو جائے تو اس کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب نماز میں التحیات اَنتی

---

[۱] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وتسن الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الجلوس الاخیر الخ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۱۹ فصل فی بیان سننہا)

قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: ترک السنۃ لا یوجب فساداً ولا سہواً بل اساءۃ لو عامداً غیر مستخف وقالوا الاساءۃ ادون من الکراھۃ۔

(طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۲۰۷ فصل فی بیان سننہا)

[۲] قال العلامۃ الشیخ المفتی عزیز الرحمنؒ: اضافۃ لفظ سیّدنا میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن تشہد نماز میں جیسا کہ وارد ہوا بلا لفظ سیّدنا ویسا ہی بہتر ہے۔

(فتاویٰ دار العلوم دیو بند ج ۲ ص۱۶۹ فصل فی سنن الصلوٰۃ)

جلدی پڑھتے ہیں کہ ہم (مقتدی) ابھی درود شریف سے فارغ نہیں ہوتے کہ امام صاحب سلام پھیر دیتے ہیں، تو کیا ہم امام کی اتباع میں سلام پھیر لیں یا درود شریف مکمل کرنے کے بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ پڑھیں۔

الجواب:۔ قعدۂ اخیرہ میں دُعا پڑھنا سُنت ہے اور امام کی اتباع واجب ہے، لہٰذا جب امام مقتدیوں کے دعا ختم کرنے سے قبل سلام پھیر دے تو امام کی اتباع میں سلام پھیرا جائے اگرچہ دعا متروک ہوجائے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو سلم الامام والمؤتم فی ادعیۃ التشھد تابعہ لانھا سنۃ والناس عنہ غافلون۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ فی ادعیۃ التشھد) یشمل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ردالمحتار ج۱ ص۴۹۶ باب صفۃ الصلوٰۃ فصل اذا اراد الشروع)[۱]

امام کی متابعت کی وجہ سے تسبیحات پوری نہ پڑھ سکنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب رکوع اور سجدہ اتنی جلدی کرتے ہیں کہ مقتدی تین بار تسبیح بھی پوری نہیں کرسکتے، تو کیا مقتدی تین بار تسبیح پوری کریں یا امام کی اقتداء کریں؟

الجواب:۔ اوّلاً تو امام صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ رکوع وسجدہ میں اتنی مقدار ٹھہرے کہ مقتدی تین بار تسبیحات پڑھنا پوری کرسکیں لیکن اگر مقتدی امام کی اقتداء کرکے تین بار تسبیح نہ پڑھ سکیں تو ان کی نماز جائز اور صحیح ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: لو رفع الامام رأسہ من الرکوع اوالسجود قبل ان یتم الماموم التسبیحات الثلاث وجب متابعتہ اھ۔ قال علامہ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ واعلم) یسبح فیہ ثلاثًا فانہ سنۃ علی المعتمد المشھور فی المذھب

---

[۱] قال العلامہ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: لو سلّم الامام اوتکلم قبل فراغ المقتدی من قرأۃ التشھد یتمہ لانہ من الواجبات ثم یسلم لبقاء حرمۃ الصلوٰۃ واُمکن الجمع بالاتیان بھما وان بقیت الصلوٰۃ والدعوات یترکھا ویسلم مع الامام لان ترک السنۃ دون ترک الواجب۔
(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۵ فصل فیما یفعلہ المقتدی بعد الخ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۱۶۵ فصل فی سنن الصلوٰۃ۔

لافرض ولاواجب کما مرفلا یترك المتابعة الواجبة لاجلها۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۴۶۳ و ۴۹۵ باب صفة الصلوٰة، فصل اذا اراد الشروع) [۱]

خواتین سجدہ کیسے ادا کریں

سوال:۔ اگر کوئی خاتون مردوں کی طرح سجدہ کرتی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خواتین کے لیے ضروری ہے کہ اپنے بدن اور اس کے اعضاء کو سجدہ کے دوران خوب ملا کر سجدہ کریں، مردوں کی طرح بدن کو کھول سجدہ نہ کریں، ایسا کرنا خواتین کے لیے کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر کسی عورت کو عذر شرعی ہو تو بلاکراہت درست ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: تنخفض فلا تبدی عضدیها وتلصق بطنها بفخذیها لانه استر۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله وحررنا فی الخزائن)....... وتضع یدیها علی رکبتیها ولا تحنی رکبتیها وتنضم فی رکوعها وسجودها وتفترش ذراعیها۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۵۰۴ باب صفة الصلوٰة فصل اذا اراد الشروع) [۲]

فرض نماز کے بعد سر پہ ہاتھ رکھنا

سوال:۔ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ فرض نماز کے بعد اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں، اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ جب نماز سے فارغ ہو جاتے تو اپنا دایاں ہاتھ سر مبارک پر رکھ کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے: بسم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم، اللّٰھم اذھب عنی الھم والحزن۔ اس لیے بہتر بلکہ سنت یہ ہے کہ نماز کے بعد فرائض ہوں یا نوافل اور سنن وغیرہ، دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر مذکورہ

---

[۱] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویسن تسبیحه ای الرکوع ثلاثاً لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا رکع احدکم فلیقل ثلاث مرات..... والامر للاستحباب فیکرہ ان ینقص عنها ولو رفع الامام قبل اتمام المقتدی فالصحیح انه یتابعه۔اھ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۱۵ فصل فی سنن الصلوٰة)

[۲] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: والمرأة تخفض فتضم عضدیها علی فخذیها وتلزق بطنها بفخذیها لانه استرلها۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۲۹ فصل فی کیفیة ترکیب افعال الصلوٰة)

ومثله فی الهدایة ج۱ ص۱۰۱ باب صفة الصلوٰة۔

دعا پڑھنی چاہیئے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا صلّى وفرغ من صلوته يمسح بيمينه على رأسه وقال بسم الله الذى لا اله الّا هو الرحمٰن الرحيم اللّٰهمّ اذهب عنى الهمّ والحزن۔ (حصن حصين ص) [1]

نیّت کرنے سے قبل اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ الخ کے پڑھنے کا حکم

سوال:۔ ہم لوگ نیّت سے قبل جب امام نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الخ پڑھتے ہیں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے، از راہ کرم اس مسئلہ کی توضیح عنایت فرمائیں۔

الجواب:۔ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ الخ کے کلمات پڑھنے کے بارے میں علماء احناف کی مفتی بہ رائے یہ ہے کہ ان کلمات کو نیّت اور تکبیر تحریمہ کے درمیان نہ پڑھنا چاہیئے، اگرچہ قاضی ابویوسفؒ سے ایک روایت سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ کے بعد پڑھنے کی مروی ہے، اور فقیہ ابواللیثؒ تکبیر سے پہلے پڑھنے کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس موقع میں یہ کلمات نہ پڑھے جائیں البتہ اگر نیّت سے قبل پڑھے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: والاولى ان لا يأتى بالتوجه قبل التكبير ليتصل النية به هو الصحيح۔ (الهداية ج۱ ص۸۶ باب صفة الصلوٰة) [2]

---

[1] لما قال الشيخ المفتى عزيز الرحمٰنؒ: فرائض کے بعد سر پہ ہاتھ رکھ کر یہ دُعا پڑھنا بسم الله لا اله الّا هو الرحمٰن الرحيم اذهب عنّى الهمّ والحزن۔
(فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۲ ص۲۱۱ فصل سنن الصلوٰة)

[2] قال العلامة صدر الشريعةؒ: ولا يوجه اراد بالثناء سبحانك اللّٰهمّ وبحمدك الخ وبالتوجه قرأة انى وجهت وجهى بعد التحريمة۔ قال الشيخ عبد الحئ الكهنویؒ: مختار المتأخرين اولوية قرأته قبله۔ قال فى الهداية الاولى ان لا يأتى بالتوجيه قبل التكبير لتتصل النية بالتكبير هو الصحيح۔ (السعاية فى حل شرح الوقاية ج۲ ص۱۶۵ باب صفة الصلوٰة)

وَ مِثْلُهٗ فى فتاوٰى دار العلوم ديوبند ج۲ ص۲۰۹ فصل سنن الصلوٰة۔

بائیں طرف سلام پھیرتے وقت آواز میں آہستگی اختیار کرنا

سوال:۔ سلام پھیرتے وقت دونوں طرف آواز یکساں ہونی چاہیئے یا اس میں کچھ فرق ہے؟

الجواب:۔ سنت اور افضل یہی ہے کہ دوسرے سلام میں پہلے سلام کی بہ نسبت آہستگی اور پستی اختیار کرے۔ اگر کوئی شخص بلند آواز سے کہہ دے تو اس سے نماز میں کوئی کراہیت لازم نہیں آتی۔

قال الحصکفیؒ: وسن جعل الثانی اخفض من الاول) خصه فی المنیة بالامام واقره المصنف۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۱ ص۵۲۶ باب صفة الصلوٰة) [1]

✵ ✵

---

[1] والسنة فی السلام ان تکون التسلیمة الثانیة اخفض من الاول کذا فی المحیط وهو الاحسن کذا فی التبیین۔ (الهندیة ج ۱ ص۷۶ سنن الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۵۳ باب صفة الصلوٰة۔

باب آداب الصلوٰۃ

(نماز کے آداب کے مسائل)

قیام کی حالت میں نگاہ کہاں ہونی چاہیئے

سوال:۔ دوران نماز قیام کی حالت میں نگاہ کہاں رکھنی چاہیئے؟ اگر کوئی شخص سجدہ کی جگہ نگاہ نہ رکھے تو اس سے نماز میں کوئی فساد یا کراہت تو لازم نہیں آتی؟

الجواب:۔ حالتِ قیام میں نگاہ کو سجدہ گاہ پر مرکوز رکھنا مستحب ہے، البتہ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرسکے تو اس سے نماز میں کوئی فساد لازم نہیں آتا۔

قال الحصکفیؒ: نظرہ الی موضع سجودہ حال قیامہ. (الدر المختار علی صدر رد المحتار جلد ۱ ص۴۷۷ آداب الصلوٰۃ) [۱]

نماز میں جمائی آنے پر منہ کو چھپانے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کو نماز کے دوران جمائی آجائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اگر کسی کو دورانِ نماز جمائی آجائے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ جمائی کو حتی الامکان روکے اور اگر روکنے پر قادر نہ ہو تو پھر دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے منہ کو چھپائے، اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ حالتِ قیام میں دائیں ہاتھ سے کام لے اور باقی ارکان میں بائیں ہاتھ سے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وامساك فمه عند التثاؤب فائدۃ لدفع التثاؤب مجربۃ ولو بأخذ شفتيه بسنه فان لم يقدر غطاہ بظهر يدہ اليسریٰ وقيل باليمنی لو قائما والا فيسراہ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۴۷۸ باب صفۃ الصلوٰۃ) [۲]

---

[۱] ومنها (نظر المصلی) سواء كان رجلاً او امرأۃ (الی موضع سجودہ قائماً) حفظاً له عن النظر الی مايشغله عن الخشوع۔ (مراقی الفلاح علی هامش طحطاوی ص۱۵۱ فصل من آدابها)

وَمِثْلُهٗ فی الهنديۃ ج۱ ص۷۲ سنن الصلوٰۃ وآدابها۔

[۲] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ومن الادب كظم فمه عند التثاؤب فان لم يقدر غطاہ بيدہ اوكمه لقوله صلی الله عليه وسلم التثاؤب فی الصلوٰۃ من الشيطان فاذا تثاؤب احدكم فليكظم ما استطاع۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۲۴ فصل آداب الصلوٰۃ۔

آداب صلوٰۃ ترک ہو جانے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی سے آداب یعنی مستحبات نماز رہ جائیں تو اس سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟ نماز کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کے اندر آداب کا لحاظ رکھنا افضل اور بہتر ہے، البتہ اگر کسی وجہ سے کبھی رہ جائیں تو نماز بلاکراہت صحیح اور درست ہے، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولھا آداب ترکہ لا یوجب اساءۃ ولا عتابا کترک السنۃ الزوائد لکن فعلہ افضل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۷۷ باب صفۃ الصلوٰۃ)[1]

امام اور مقتدی کس وقت نماز کے لیے کھڑے ہوں؟

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام اور مقتدیوں کو کس وقت نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہیئے؟

الجواب:۔ امام اور مقتدی دونوں کے لیے مستحب یہ ہے کہ مؤذن جس وقت حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کہے تو نماز کے لیے کھڑے ہو جائیں، اگرچہ بعض نے حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ کے وقت قیام کو مستحب قرار دیا ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: والقیام لامام ومؤتم حین قیل حَیَّ عَلَی الْفَلَاح خلافا لزفر فعندہ عند حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۷۹ باب صفۃ الصلوٰۃ)[2]

امام نماز کس وقت شروع کرے

سوال:۔ امام کو نماز کس وقت شروع کرنی چاہیئے؟

الجواب:۔ مستحب یہ ہے کہ امام نماز قد قامت الصلوٰۃ کے وقت شروع کرے، اگرچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مقیم (اقامت کہنے والے) کی فراغت

---

[1] قال العلامۃ السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قولہ الادب ما فعلہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ او مرتین ولم یواظب علیہ) وترکہ لا یوجب اساءۃ ولا عتابا لکن فعلہ افضل. اھ
(طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۲۲۴ فصل آدابھا)

[2] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: من الاداب القیام ای قیام القوم والامام ان کان حاضرا بقرب المحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حی علی الفلاح۔ قال السید احمد الطحطاوی (تحت قولہ حی علی الفلاح) قال الحسن وزفر عند حی علی الصلوٰۃ۔ (طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۲۲۵ فصل آدابھا)

تک انتظار کرے، لیکن یہ اختلاف نفسِ استحباب میں ہے۔

قال العلامة حسن بن العمار الشرنبلالیؒ: ومن الآداب شروع الامام الی احرامه منقیل ای عند قول المقیم قد قامت الصلوٰۃ عندهما۔ وقال ابو یوسفؒ: یشرع اذا فرغ من الاقامة فلو اُخر حتی یفرغ من الاقامة لابأس به فی قولهم جمیعا۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۲۵ فصل آداب الصلوٰۃ) [1]

مقتدی کس وقت سلام پھیرے

سوال: مقتدی کو کس وقت سلام پھیرنا چاہیئے؟

الجواب: مقتدی کیلئے بہتر یہ ہے کہ امام جب دائیں طرف سلام پھیرے تو مقتدی بھی دائیں طرف سلام پھیرے اور جب امام دائیں طرف سے فارغ ہو کر بائیں طرف سلام پھیرے تو مقتدی امام کے بعد بائیں طرف سلام پھیرے یعنی امام سے متقدم نہ ہو۔

لما قال فخر الدینؒ قاضی خان: قال الفقیه ابو جعفرؒ المختار ان ینتظر اذا سلم الامام عن یمینه فیسلم المقتدی عن یمینه واذا فرغ الامام عن یساره یسلم المقتدی عن یساره۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۸۸ فصل فیمن یصح الاقتداء به فیمن لا یصلح) [2]

سلام کے دوران امام اور ملائکہ کی نیّت کرنا

سوال: نمازی کو سلام کے دوران کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: نمازیوں کی تین قسمیں ہیں (۱) امام (۲) مقتدی (۳) منفرد۔ اگر نمازی مقتدی ہو تو سلام کے دوران اگر امام دائیں طرف ہو تو دائیں طرف سلام پھیرتے وقت ملائکہ

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وشروع الامام فی الصلوٰۃ مذ قیل قد قامت الصلوٰۃ ولو اخر حتی اتمها لا بأس به اجماعًا وهو قول الثانی والثلاثة وهو اعدل المذاهب کما فی شرح المجمع لمصنفه وفی القهستانی معزیا للخلاصة انه الاصح۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۱ ص۴۷۹ قبل فصل اذا اراد الشروع)

[2] قال الفقیه ابو جعفر رحمه اللہ: ان ینتظر اذا سلم الامام عن یمینه یسلم المقتدی عن یمینه واذا فرغ عن یساره یسلم المقتدی عن یساره ام (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۷۷ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰۃ وآدابها الخ)

اُس طرف کے مقتدیوں اور امام کی نیت کرنی چاہیئے اور اگر امام بائیں طرف ہو تو مقتدی کے لیے ملائکہ وغیرہ کے علاوہ امام کی بھی نیت کرنی چاہیئے اور اگر مقتدی صف کے وسط میں امام کے پیچھے کھڑا ہو تو دونوں طرف سلام میں امام کی نیت کرے۔ اور اگر نمازی امام ہو تو امام کو دونوں طرف کے مقتدیوں کی نیت کرنی چاہیئے۔ اور اگر نمازی منفرد ہو تو منفرد سلام میں ملائکہ (حفظۃ) کی نیت کرنی چاہیئے۔

لما فی الهندیة : وینوی من عنده من الحفظة والمسلمین فی جانبیه ..... والمقتدی یحتاج الیٰ نیة الامام مع نیت من ذکرنا فان کان الامام فی الجانب الایمن نواه فیهم وان کان فی الجانب الایسر نواه فیهم وان کان یحذائه نواه فی الجانب الایمن عند ابی یوسفؒ وعند محمدؒ ینویه فیهما وهو روایة عن ابی حنیفةؒ وفی الفتاوٰی هو الصحیح والمنفرد ینوی الحفظة لاغیر ولاینوی فی الملٰئکة عدداً محصوراً۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۷۶ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰة وآدابها) لـه

فرض نماز کے بعد امام کے لیے جلد اٹھنے کا حکم

سوال:۔ جن نمازوں کے بعد سُنتیں ہیں تو امام کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ پنج وقتہ نمازوں میں سے بعض نمازوں کے بعد سُنتیں ہیں اُن میں فرائض سے فراغت کے بعد امام کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ فوراً کھڑے ہو کر کچھ تقدیم وتاخیر کرکے باقی سُنتیں ادا کرے، طویل ادعیہ میں مشغول ہونا خلافِ اولیٰ ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاءؒ: وفی الحجة الامام اذا فرغ من الظهر والمغرب والعشاء یشرع فی السنة ولایشتغل بادعیة طویلة۔ (الفتاوٰی التاتارخانیة ج۱ ص۵۵۵ الفصل الثالث فی بیان مایفعله المصلی فی صلاته بعد الافتتاح) ـه

لـه قال العلامة عبد الرحمٰن الجزائریؒ: یسن ان ینوی المصلی بسلامه الاوّل من علیٰ یمینه وبسلامه الثانی من علیٰ یساره۔ (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج۱ ص۲۶۶)
ومِثْلُهٗ فی طحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۲۲۲ فصل سُنتها نیة المصلی من علیٰ یمینه ویساره بالسلام۔

ـه وفی الهندیة: وفی الحجة الامام اذا فرغ من الظهر والمغرب والعشاء یشرع فی السنة ولایشتغل بادعیة طویلة۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۷۷ الفصل الثالث فی سنن الصلوٰة الخ)

نماز میں ثناء سے پہلے تسمیہ نہ پڑھنے کی وجہ

سوال:۔ نماز میں ثناء سے پہلے تسمیہ کیوں نہیں پڑھا جاتا؟ کیا یہ کل امر ذی بال لم یبدا ء ببسم اللہ الخ کے خلاف تو نہیں؟ دلائل سے ثابت کریں؟

الجواب:۔ نماز میں ثناء (یعنی سُبحَانَكَ اللّٰھُمَّ) سے پہلے تسمیہ (بِسْمِ اللہ) پڑھنا ثابت نہیں ہے بلکہ تکبیرِ افتتاح کے بعد ہاتھ باندھ کر سبحانك اللّٰھم کے بعد بسم اللہ پڑھنا احادیث میں منقول اور تمام کتبِ فقہ میں محفوظ ہے۔

لما ورد فی الحدیث: (۱) عن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت کان النبی صلّی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصلٰوۃ قال سبحانك اللّٰھمّ و بحمدك وتبارك اسمُكَ وتعالیٰ جدّك ولا الٰہ غیرك الخ (جامع ترمذی ج۱ ص۵۷ ابواب الصلٰوۃ، باب مایقول عند افتتاح الصلٰوۃ) [۱]

نماز میں نگاہ کہاں ہونی چاہیئے

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! ایک نمازی جب نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو نماز کے اندر نگاہ کہاں رکھنی چاہیئے؟

الجواب:۔ نماز کے مختلف حالات میں مختلف مواضع پر نگاہ رکھنا مستحب ہے۔ حالتِ قیام میں سجدہ کی جگہ، رکوع میں پاؤں کے پنجوں پر، سجدے میں ناک کے سرے پر، قعدہ میں اپنی جھولی میں، اسی طرح سلام پھیرتے وقت اوّل سلام میں دائیں کندھے پر اور دوسرے میں بائیں کندھے پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: نظرہ الیٰ موضع سجودہ حال قیامہ والی ظھر قدمیہ حال رکوعہ والی ارنبۃ انفہ حال سجودہ والیٰ حجرہ حال قعودہ والی منکبہ الایمن والایسر عند التسلیمۃ الاولیٰ والثانیۃ تحصیل الخشوع۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۴۷۷/۴۷۸ ادب الصلٰوۃ)

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ووضع یمینہ علیٰ یسارہ تحت سرتہٖ مستفتحًا (قولہٗ مستفتحًا) ھو حال من الوضع ای یضع قائلاً سُبحانَكَ اللّٰھمّ وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدُّك ولا الٰہ غیرك وقد تقدم انہ سنۃ لروایۃ الجماعۃ انہ کان صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا افتتح الصلٰوۃ۔ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۱ ص۳۰۹)

تشہد میں اشارہ کرنا مسنون ہے

سوال:۔ بعض لوگ اشارہ فی التشہد کو حرام سمجھتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو حرام کا مرتکب سمجھتے ہیں، اس مسئلہ کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اقوال کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب:۔ سبابہ سے اشارہ کرنا تشہد میں ایک مسنون فعل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث اس بارہ میں منقول ہیں، ائمہ مذاہبِ اربعہ سب اس پر متفق ہیں۔ احادیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ سے تین طریقوں سے اشارہ کرنا ثابت ہے:۔

(۱) یہ کہ خنصر و بنصر اور وسطیٰ سب کا عقد کر کے ابہامہ کو سبابہ مُرسلہ کے اصل (بیخ) کے ساتھ ضم کر کے سبابہ کے ساتھ اشارہ کیا جائے، اس عقد کو عرب کی اصطلاح میں ترپن ۵۳ کا عقد کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں یہی طریقہ مذکور ہے: عن ابن عمرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قعد فی التشہد وضع یدہ الیسریٰ علیٰ رکبتہ الیسریٰ ووضع یدہ الیمنیٰ علیٰ رکبتہ الیمنیٰ وعقد ثلثۃ وخمسین واشار بالسبابۃ۔ (مشکوٰۃ علیٰ صدر مرقاۃ ج ۲ ص ۶۲۳ باب التشہد)

ملا علی قاری حنفیؒ عقد ثلثۃ وخمسین کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ھو ان یعقد الخنصر والبنصر والوسطیٰ ویرسل المسبحۃ ویضم الابہام الیٰ اصل المسبحۃ۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۶۲۳ باب التشہد)

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سبابہ کے ماسوا تینوں انگلیوں کا عقد کر کے ابہامہ کو وسطیٰ مقبوضہ کے اوپر رکھا جائے، اس عقد کو عقد ثلاثۃ وعشرین ۲۳ کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت میں منقول ہے: عن عبداللہ بن الزبیرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قعد یدعوا وضع یدہ الیمنیٰ علیٰ فخذہ الیمنیٰ ویدہ الیسریٰ علیٰ فخذہ الیسریٰ واشار باصبعہ السبابۃ ووضع ابہامہ علیٰ اصبعہ الوسطیٰ۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص ۹۱)

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ خنصر و بنصر سے عقد کر کے وسطیٰ اور ابہامہ سے حلقہ بنائے۔ یہی طریقہ منقول ہے وائل ابن حجرؓ کی روایت ہے۔ عن وائل بن حجر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثم جلس فافترش رجلہ الیسریٰ ووضع یدہ الیسریٰ علیٰ فخذہ الیسریٰ ومد مرفقہ الیمنیٰ علیٰ فخذہ الیمنیٰ وقبض ثنتین وحلق حلقۃً ثم رفع اصبعہٗ یدعوا بہا۔ رواہ ابوداؤد۔ (مشکوٰۃ ص ۹۱ باب التشہد)

مذکورہ بالا تین طریقوں کو فقہاء کرام نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور تینوں طریقوں سے اشارے کو جائز اور سُنت قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک مختار تیسرا طریقہ ہے۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں: قال الطیبیؒ وللفقہاء فی کیفیۃ عقدھا وجوہ احدھا ماذکرناہ فی الطریق الاولیٰ وھو عقد ثلٰثۃ و خمسین۔ والثانی ان یضم الابھام الی الوسطی المقبوضۃ کالقابض ثلٰثًا و عشرین فان ابن زبیر رواہ کذلک والثالث ان یقبض الخنصر والبنصر ویرسل المسبحۃ ویحلق الوسطی والابھام کما رواہ وائل بن حجر والاخیر ھو المختار عندنا قال الرافعیؒ الاخبار وردت بھا جمیعًا وکانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصنع مرۃ ھٰکذا ومرۃ ھٰکذا۔ اھ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

رہا یہ کہ اشارہ کرنے میں اُنگلی کو شہادۃ ختم کرنے پر رکھا جائے گا یا اٹھائے رکھے گا تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ قریب قریب سب فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اشہد ان لآ الٰہ میں نفی پر اٹھائے گا اور الا اللہ پر رکھے گا۔ لیوافق الرفع النفی والوضع الاثبات۔ البتہ بعض فقہاء نے ترمذی شریف کی ایک حدیث کے پیش نظر اٹھائے رکھنے کا حکم دیا ہے، اور مولانا گنگوہیؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں یہ لکھا ہے کہ انہٗ اذا رفعھا یستمر علی الرفع والعقد الیٰ اٰخر الصلوٰۃ۔

اب آپ جس طرح چاہیں اشارہ کر سکتے ہیں، مذکورہ بالا تمام طریقوں سے اشارہ کرنا مسنون ہے اور جس کیفیت میں بھی کیا جائے، جو احادیث میں منقول ہو تو جائز ہے۔

امام محمد بن حسنؒ "موطا" میں اشارہ کی روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں:۔ ویصنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نا خذ وھو قول ابی حنیفۃؒ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۸۵)

فقط واللہ اعلم

❋ ❋ ❋

تکبیرِ تحریمہ کے بعد ثناء سے قبل تسمیہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال:۔ نماز میں ثنا سے پہلے تسمیہ پڑھنا کسی حدیث یا فقہاء کے اقوال سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیا ثنا سے پہلے تسمیہ پڑھنے کے لیے دلیل کے طور پر حدیث کُلُّ اَمرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰہ الخ پیش کرنا درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ عام درسی کتب میں یہی لکھا ہے کہ ثناء کے بعد تعوّذ و تسمیہ پڑھا جاتا ہے۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، اقوال صحابہ کرامؓ وفقہاء کرام اس مسئلہ میں کیا کہتے ہیں؟ براہِ مہربانی مسئلے کا تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں ثناء (یعنی سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ) سے پہلے تسمیہ پڑھنا ثابت نہیں ہے بلکہ تکبیرِ افتتاح کے بعد ہاتھ باندھ کر سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھنا احادیث میں منقول اور تمام کتبِ فقہ میں محفوظ ہے۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصّلوٰۃ قال سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ الخ

(جامع الترمذی ج۱ ص۵۷ باب مایقول عند افتتاح الصلوٰۃ)

عن انس رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصّلوٰۃ کبّر ثُمّ رفع یدیہ حتٰی یحاذی بإبھامیہ أذنیہ ثُمّ یقول سبحانک اللّٰھم الخ

(الدارقطنی ص۸۸، ۸۹ کتاب الصلوٰۃ۔ باب دعاء الاستفتاح بعد التکبیر)[1]

---

[1] لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ووضع یمینہ علی یسارہ تحت سرّتہ مستفتحا قولہ مستفتحا ہو حال من الموضع أی یضع قائلا سبحانک اللّٰھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالٰی جدُّک ولآ الٰہ غیرک وقدم أنہ سنّۃ لروایۃ الجماعۃ أنہ کان صلی اللہ علیہ وسلم یقول إذا افتتح الصّلوٰۃ۔ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۱ ص۳۰۹ باب صفۃ الصلوٰۃ)

نماز کے آداب اور خاصیتیں

حضرت العلامہ مولانا عبدالحلیم صاحبؒ زرّوبوی صدر مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔

پیش نظر مقالہ حضرت مرحوم نے ایک سوالنامہ کے جواب میں تحریر فرمایا، سوال یہ تھا کہ نماز پڑھنے کے باوجود اس کے اثرات اور خاصیتیں ظاہر نہیں ہو رہے ہیں؟ جس کے جواب میں حضرت علامہ مرحوم نے یہ بیش قیمت مضمون تحریر فرمایا تھا۔ جو کہ ماہنامہ الحق کی زینت بنا۔ فتاویٰ کی کتاب الصلوٰۃ کے ساتھ مناسبت سے عمومی فائدہ کیلئے فتاوی حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

قال اللہ تعالیٰ: إنّ الصّلوۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ (الآیۃ)

بیشک نماز روکتی ہے۔ بے حیائی اور بُری بات سے۔

۱۔ نماز ایک حقیقتِ شرعی ہے جو کہ ہر عاقل بالغ سے مرد ہو یا عورت ہر حالت میں مطلوب ہے چاہے حالت صحت ہو یا بیماری حالت حضر یا سفر، جنگ ہو یا امن، سرکاری ملازم ہو یا قومی، اور شخصی مزدور زراعت میں مصروف ہو یا تجارت و حرفت میں۔ غرض یہ کہ جب تک انسان کے ہوش و حواس ٹھیک ہوں۔ پنجگانہ نماز کی پابندی اس پر فرض عین ہے۔ کسی حالت میں ساقط نہیں ہو سکتی البتہ ہر شخص پر اس کی حالت اور استطاعت کے موافق فرض ہے۔ اس لئے حضر اور سفر کی نماز میں فرق ہے صحت اور مرض کی نماز میں فرق ہے۔ اسی طرح حالتِ جنگ اور امن کی نماز میں فرق ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نماز کی پابندی نمازی کو بےحیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ نماز چند مرتبہ اُٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک شرعی حقیقت ہے جس کے اجزاء ترکیبی ہیں جن کو ارکان و فرائض کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شرائط صحت میں ان دونوں کے بغیر حقیقت نماز تو در کنار صورتِ نماز بھی متصور نہیں ہو سکتی۔ ان ارکان اور شرائط میں سے ایک بھی چھوٹ جائے تو وہ نماز از سرنو پڑھنا پڑے گی۔ اس کے علاوہ واجبات

سنن اور آداب ہیں، واجبات کے چھوٹنے سے اعادہ یعنی دوبارہ پڑھنا واجب ہوتا ہے۔ اور سنن کے ترک سے اعادہ سنت ہے۔ مستحبات وآداب کے ترک سے اعادہ مستحب ہے۔ خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ ایک بدری صحابی ہیں۔ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ صحابی مذکور نماز سے فارغ ہو کر سلام کی غرض سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیکر فرمایا ارجع فصل فانك لم تصل" (الحدیث) واپس جا پھر نماز پڑھ کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس طرح حضورؐ نے انہیں تین مرتبہ واپس کرکے ازسرنو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ ایک بدری صحابی کی شان سے یہ مستبعد ہے کہ اس نے شروط صحت یا ارکان صلوٰۃ یا واجبات صلوٰۃ ترک کئے ہوں گے۔ غالب ظن یہ ہے کہ اس نے بعض سنن ہیں کوتاہی کی ہوگی - اس پر اس کو اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی تکمیل بغیر سنن ومستحبات کی ادائیگی کے نہیں ہو سکتی۔

"شرائط صحت، فرائض صلوٰۃ واجبات وسنن ومستحبات صلوٰۃ سے صورۃ صلوٰۃ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ مگر نماز کے مقبول ہونے کی شروط ہیں۔ یعنی استحضار قلب وخشوع وخضوع وانابت اظہار عبودیت اس طور کہ تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک ہر ادا یعنی قرات، تکبیر، تسبیح، تشہد، قیام، قعود، رکوع، سجود حضور قلب سے ہو قلب غافل ولاہی سے نہ ہو۔ ظاہراً اور باطنی عجز ونیاز اور اظہار بندگی کے ساتھ ہو۔ یہ حضور قلب اور ظاہری و باطنی انقیاد بمنزلہ روح صلوٰۃ کے ہیں۔ اس کے بغیر حقیقت صلوٰۃ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ آیت مذکورہ بالا میں نہی عن الفحشا والمنکر اسی حقیقت کی پابندی کے ساتھ ادائیگی پر مرتب ہے۔ روح کے بغیر صورت کامل یا ناقص پر آثار ونتائج کا ترتب نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی گھوڑے کے نقش اور تصویر (جو کاغذ یا دیوار پر ہو) سے سواری، باربرداری کی توقع رکھے جو کہ اس حقیقت کے احکام ہیں یا قالب بے جان سے جاندار کے آثار کا تقاضا کرے"

اس مختصر گذارش وتمہید کے بعد ذرا غور فرماویں کہ آجکل کے مسلمان کی نمازیں اس معیار کے مطابق ہیں۔ وہ حقیقت صلوٰۃ جس کی ادائیگی پنجگانہ مطلوب ہے۔ خارج میں اس کا وقوع ہے اگر ہو تو لامحالا اس کی مواظبت سے ادائیگی پر یہ آثار مرتب ہوں گے۔ اور اگر نہیں تو محض ناقص صورت سے آثار واحکام کی توقع فضول ہے۔

عصرِ حاضر میں اکثر مسلمان نمازی نہ تو شرائطِ صحت سے واقف ہیں نہ شرائطِ مقبولیت سے نہ ارکان اور واجبات وسنن وغیرہ سے باخبر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی نمازوں کی صورت اگر حقیقی نماز کی صورت کے ساتھ موافق ہو۔ تو اتفاقی حادثہ ہوگا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شخص کسی شے کے اجزاء ترکیبی اور اجزاء تکمیلی وتحسینی اور ان کی ترتیب سے واقف نہ ہو۔ پھر اس شے کی صحیح ترکیب وترتیب واقع کر سکے۔ الاّ یہ کہ اتفاقاً ایسا ہو جائے۔

آجکل کے مسلمان غیر تعلیم یافتہ تو درکنار اکثر سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ جو اسلامی تعلیم سے بے خبر ہوں۔ بسم اللہ اور اعوذ باللہ اور کلمہ توحید اور شہادت کے صحیح تلفظ پر قادر نہیں تو اس کے صحیح معنی سے کیسے واقف ہوں گے؟

۲- دوسرا جواب یہ کہ نماز کے بے حیائی اور برائی سے روکنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ نماز میں ——— اللہ تعالیٰ نے اس میں روکنے کی خاصیت رکھی ہے ——— جیسے بعض ادویہ میں بعض امراض کے دفع کرنے کی خاصیت رکھی گئی ہے۔ لیکن جس طرح کہ ادویہ ہر حال میں امراض کے دافع نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کی تاثیر بعض امور کے ساتھ مشروط ہے کہ خاص ترکیب ہو۔ خاص طریق استعمال ہو۔ خاص مقدار ہو۔ ایک مدّت مخصوص تک مواظبت و دوام ہو۔ درمیان میں فصل نہ ہو دوا کی تاثیر کے منافی اشیاء سے پرہیز ہو۔ ان شروط کے تحقق اور موانع کے رفع کے بعد ادویہ امراض کے ازالہ میں مؤثر ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح نماز مؤثر بالخاصہ جبکہ شروط تاثیر موجود ہوں اور موانع مرتفع ہوں۔

دوسرے معنی یہ کہ نماز کا برائیوں سے روکنا بطریق تقاضا اور مطالبہ کے ہو۔ یعنی نمازی جبکہ نماز میں خضوع اور خشوع کے ساتھ اقرار الوہیت اللہ تعالیٰ کرے۔ اور اظہار خالقیت وربوبیت اس کی کرے اور نہایت عجز و نیاز کے ساتھ اپنی بندگی اور اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور معبودیت کا اعتراف کرے۔ تو نماز کی یہ مخصوص ہیئت اور اس کی ہر ادا اور ہر ذکر اس سے مطالبہ کرتی ہے زبان حال سے کہ اے غلامی اور بندگی کا دعویٰ کرنے والے! اس مولیٰ کی جس کی ربوبیت خالقیت اور معبودیت کا بھی اقرار کر چکا ہے۔ اس کی مخالفت سے باز رہ اور فواحش اور منکرات سے رک جا۔ اور بدعہدی نہ کر۔ اب کوئی باز آئے یا نہ آئے۔ مگر نماز کے اس اقتضاء اور مطالبہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ روکتا اور منع فرماتا ہے۔ ان اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربٰی وینھٰی عن الفحشآء والمنکر (الایۃ) پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے

روکنے پر برائی سے نہیں رکتا ۔ تو نماز کے روکنے پر اس کا نہ رکنا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

۲ - نماز سے غفلت کے اسباب مندرجہ سوال کے علاوہ حسب ذیل ہیں ۔

۱ - جب تک کہ انسان اپنے آپ کو کسی عمل کے متعلق ایک حاکم اعلیٰ (جو کہ عقاب دینے پر قادر ہو) کے سامنے جوابدہ نہ سمجھے تو اس سے غفلت برتتا ہے ۔

۲ - جب تک کہ انسان کسی کام کو اپنی دنیوی یا اُخروی زندگی کی کامیابی کیلئے ضروری نہ سمجھے ۔ تو اس عمل کے کرنے کی پرواہ نہیں رکھتا ۔

۳ - جب تک کہ انسان کسی عمل کے روحانی یا جسمانی فوائد شخصی انفرادی یا قومی اجتماعی منافع دنیوی یا اُخروی مصالح سے ناواقف ہو ۔ تو ایسے عمل کے کرنے کا سوال اُس کے نزدیک عبث ہے بلکہ بسا اوقات اس عمل کو کراہت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔

۴ - جب تک کہ انسان کسی عمل کے ترک کے بُرے عواقب سے بے خبر ہو ۔ انفرادی اور اجتماعی نقصانات سے ناواقف ہو ۔ دنیوی اور اُخروی عقاب سے جاہل ہو ۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کام کی طرف توجہ دے ۔

۵ - جب تک انسان کی روحانیت پر بہیمیت ، سُبعیت ، شیطنت غالب ہو جائے ۔ تو انسانیت اور روحانیت مفلوج ہو کر اس کے تقاضے ناقابل اعتبار اور ناقابل فہم ہو جاتے ہیں ۔ نماز اور دیگر فرائض ایمانی تقاضے ہیں ۔ اور خود ایمان فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے ۔

۶ - بہت سے تارکین صلوٰۃ شیطان کے بہکانے سے اس اُمید پر ترک صلوٰۃ کے مرتکب ہیں ۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں ان کے لئے شفاعت کر کے عقاب سے نجات پائیں گے ۔
شفاعتی لاھل الکبائر (الحدیث)

۷ - اکثر عوام جو ترک صلوٰۃ اور دیگر کبائر میں مبتلا ہیں ۔ نفس نے ان کو اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت اور ناپیدا کنار مغفرت کا سبز باغ دکھا کر دھوکہ دیا ہے کہ اس رحمت واسعہ اور مغفرت کاملہ کے سامنے تمہارے معصیات ہیچ ہیں اور یہ رحمت اور مغفرت ضرور تمام مسلمانوں کو شامل حال ہوگی ۔

۸ - کسی سے سنا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ ۔ (الحدیث) لہٰذا کلمہ پڑھنے والا ضرور جنت میں داخل ہوگا ۔ چاہے عمل کرے نہ کرے ۔

۹ - اہم سبب دین کی حقیقت سے بے خبری ۔ اسلام کے فروع و اصول سے ناواقفی اسلامی تعلیمات سے بیزاری ہے ۔ عصر حاضر میں جہل یہاں تک پہنچ چکا ہے ۔ کہ علومِ دینیہ کے عالم کو تعلیم یافتہ نہیں کہا جاتا ، سکولوں اور کالجوں میں پڑھنا پڑھانا تحصیل علم اور تعلیم سمجھتے ہیں ۔ اور اس میں

پڑھنے پڑھانے والوں کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں ۔ حالانکہ شرعی اصطلاح میں قرآن کریم احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور احکام دینیہ کے علوم کے علاوہ تمام فنون کو کسب ، صنعت وحرفت اور فن کہا جاتا ہے ۔ فن انجینئری ، فن ڈاکٹری ، فن طب ، فن زراعت وغیرہ وہاں لغت کے اعتبار سے علم کہنا صحیح ہے ۔کیونکہ لغت میں علم بمعنی دانستن یا سیکھنے کے ہیں ۔قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العلم ثلاثۃ ایات محکمۃ وسنۃ قائمۃ وفریضۃ عادلۃ ۔(الحدیث) علم تین ہیں ، علم القرآن ، علم سنت ثابتہ ، علم الفرائض یا احکام اجتہادیہ ۔

۴ ۔ امور مذکورہ فی السوال میں ترک صلوٰۃ کو کافی دخل ہے ۔ان کے علاوہ ترک صلوٰۃ میں بہت سی خرابیاں ہیں ۔جن کا بالتفصیل استقصا مشکل ہے مختصراً چند خرابیاں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں ۔

۱ ۔ روحانی خرابیاں ۔ صلوٰۃ درحقیقت ہیئات مخصوصہ میں اذکار خاصہ کا نام ہے ۔یعنی اللہ کی حمد وثنا ، تلاوت قرآن ، تکبیرات ، تسبیحات ، تشہد ، درود ، مناجات ، خضوع وخشوع کے ساتھ ، اور روح انسانی چونکہ ملکی ہے ۔اس کی غذا بھی ذکر ہے ۔انہی اس کے استکمال اور ترقی اور حیات کا مدار ہے ۔تارک الصلوٰۃ نے اپنی روح کو اپنی غذا سے محروم کرکے حیات جاودانی اور کمال انسانی سے بے بہرہ کردیا ۔

۲ ۔ روح کو جو تقرب عند اللہ فرائض ونوافل سے حاصل ہوسکتا تھا ۔ اور اس پر جو عنایات اور الطاف ربانی مرتب ہوسکتے تھے ، ان سے محروم کردیا ۔

۳ ۔ حدیث میں وارد ہے ۔ الصلوٰۃ نور ۔ یعنی صلوٰۃ دنیا میں روح انسانی کے لئے مانند نور کے حق وصواب کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ سبب کشف معارف الہیہ ہے ۔ قبر کی تاریکی کا ازالہ کرکے روح کیلئے باعث انشراح اور سرور ہے ۔ظلمت قیامت میں سامان کشف واشراق ہے ۔تارک صلوٰۃ نے ان تمام انواع انوار سے اپنی روح روک کردیا اور برزخ اور قیامت کی تاریکیوں میں پریشان وناکارہ کردیا ۔

۴ ۔ حدیث سے ثابت ہے کہ صلوٰۃ خمسہ پنجگانہ نماز گناہوں اور خطاؤں سے پاک کرنے کے لئے ایسے ہیں ۔جیسے نہر کا پانی ازالہ نجاست کے لئے بے نمازی نے نماز ترک کرکے گناہوں سے روحانی طہارت حاصل نہ کرسکا ۔

جسمانی اور مادی نقائص ۱ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود (الایۃ) چہروں کی نورانیت جو نماز پڑھنے کا اثر ہے ۔بے نماز کو یہ نور او راثر سجود حاصل نہیں ہوتا ۔

۲ - جسم کو نجاست اور احداث سے پاک کرنا نمازی کے لئے استنجاء، وضو، غسل کے ذریعہ ضروری ہے بے نمازی کو جبکہ نماز پڑھنے کی پرواہ نہیں۔ تو طہارت کا کیا خیال رکھے گا۔ لہٰذا اس کا جسم نجاسات کے تلوّث سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۳ - نمازی پنجگانہ نماز کے لئے پنجوقتہ وضو کرتا ہے۔ جس سے اس کے اعضاء ظاہرہ پر میل کچیل گردوغبار نہیں رہتا۔ بے نمازی اس جسمانی صفائی سے بے بہرہ ہوتا ہے۔

۴ - کسب اور کمائی میں برکت نہیں رہتی۔ بلکہ وہ مال جو نماز کے وقت میں نماز چھوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ مال خبیث ہے۔ دوسرے پاک اموال میں اس کے ملانے سے خبث پیدا کر دیتا ہے۔

۵ - طبعی نشاطِ جسمانی چستی جو بدنی عبادت کے حرکات مختلفہ سے حاصل ہوتی ہے۔ بے نمازی حق بندگی چھوڑ کر اس سے محفوظ نہ ہوسکا، ہر ذہنی پریشانی کا روحانی علاج اشتغال بالصلوٰۃ ہے جیساکہ استعینوا بالصبر والصلوٰۃ اور کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا فزعہ امر فزع الی الصلوٰۃ۔ یعنی شاق اور مشکل امور میں صبر وصلوٰۃ سے مدد لو۔ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کسی امر سے پریشان ہوجاتے۔ جلدی سے نماز کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ اس میں حکمت یہ ہے۔ کہ نماز میں مشغول ہوکر ہر غم واندوہ سے بلکہ ماسوی اللّٰہ سے توجہ ہٹ کر صرف معبود حقیقی ملحوظ ہوتا ہے۔ اس طرح ہر پریشانی اور فکر سے ذہن فارغ ہوجاتا ہے۔ نیز مصلّی اپنی نیازمندانہ مناجات ثناء ودعا تسبیح وتکبیر، قرأت وتہلیل، عاجزانہ رکوع وسجود کے ذریعہ معبود کریم کی رحمت اپنی طرف جذب کرلیتا ہے۔ جس پر مشکل حل ہوکر پریشانی ختم ہوجاتی ہے۔ یہ دولت صرف نمازی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ نماز کی برکت سے سب سے بڑھ کر ہلاکت خیز خرابی جو قصداً ترک نماز سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض ائمہ کے نزدیک اگر یہ شخص توبہ نہ کرے تو حدود اسلام سے خارج ہوکر مرتد ہوا۔ لہٰذا اس کی پاداش میں وہ ارتداداً قتل ہوگا۔ کیونکہ اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین۔ پابندی سے نماز ادا کرو۔ اور مشرکین میں نہ ہوا کرو۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہے۔ کہ نماز قصداً نہ پڑھنا مشرکین میں شامل ہونا ہے۔ نیز حدیث شریف میں وارد ہے۔ ان بین العبد والکفر والشرک ترک الصلوٰۃ (رواہ مسلم) بے شک بندہ اور کفر وشرک کے درمیان رابطہ ترک الصلوٰۃ ہے۔ یعنی بندہ اور کفر کے درمیان نماز مانع وحائل تھا۔ جب نماز چھوڑ دی۔ تو اب بندہ اور کفر وشرک کے درمیان کوئی حجاب نہ رہا۔ نیز وارد ہے۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم العھد الذی بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر (مشکوٰۃ شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔کہ ہمارے اور ان کے یعنی کفار کے درمیان عہد نماز ہے تو جس نے نماز چھوڑی ۔ اس نے کفر کیا ۔ اسی مضمون کی بہت احادیث وارد ہیں جس کی وجہ سے امام احمد صاحبؒ نے قصداً تارک الصلوۃ کو کفر کی حدود میں داخل سمجھ کر مرتد کا حکم لگایا ۔ یعنی دوسرے ائمہ اگرچہ فوری طور پر اس کو کافر نہیں کہتے ۔لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ کفر کے قریب پہنچا ۔ اگر توبہ نہ کی ۔تو انجام کار ایمان کی حدود سے نکل جائے گا ۔ جیسا کہ کوئی شخص خشک بیابان میں سفر کرتا ہو اور اس کے پاس پینے کے لئے پانی ختم ہو جائے اس کے متعلق کہا جائے کہ فلاں ہلاک ہوا ۔اگرچہ وہ بالفعل ہلاک نہیں ۔لیکن اسباب ہلاکت چونکہ پیدا ہوئے ہیں ۔تو آخر کار ہلاک ہوگا۔

باب تسویۃ الصفوف

(صفوں کو سیدھا کرنے کے مسائل)

بوقتِ ضرورت پہلی صف خالی چھوڑنا

سوال:۔ ہمارے محلہ کی مسجد کے قبلہ کی جانب شمال و مشرق کی طرف ایک دیوار ہے جبکہ جنوب کی طرف کا حصہ خالی ہے لیکن جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو بعض لوگ شدتِ گرمی کی وجہ سے جنوب کے حصے کی جانب نہیں کھڑے ہوتے اور مسجد کے امام صاحب لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ پہلے اس صف کو پورا کیا جائے کیونکہ اس کا ثواب زیادہ ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ پہلی صف جو باہر کے حصے میں ہے اور مسجد کے اندر جو دوسری یا تیسری صف ہے کیا یہ ثواب میں برابر ہیں یا ان کے درمیان فرق ہے؟

الجواب:۔ پہلی صف دوسری صفوف سے افضل ہے چاہے یہ دوسری صفوف مسجد کے ہال میں ہوں یا باہر ہوں، چونکہ شرعاً سخت دھوپ کی وجہ سے جماعت کا ترک کرنا مرخص ہے تو پہلی صف کا ترک کرنا بطریقِ اولیٰ جائز ہوگا "تاہم پہلی صف کی دوسری صفوف کے مقابلہ میں افضلیت احادیث میں ثابت ضرور ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر صفوف الرجال اولھا وشرھا آخرھا وخیر صفوف النساء اٰخرھا وشرھا اولھا۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص۱۸۲ باب تسویۃ الصفوف) [۱]

صف میں کھڑا ہونے کا طریقہ

سوال:۔ نماز کے لیے صفیں باندھتے وقت صف کہاں سے شروع کی جائے؟ بعض کہتے ہیں کہ دائیں طرف سے جبکہ بعض کہتے ہیں درمیان سے، اگر کوئی بائیں طرف سے صف باندھے تو اس کا کیا

---

[۱] وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر صفوف الرجال اولھا وشرھا اٰخرھا وخیر صفوف النساء اٰخرھا وشرھا اولھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۱۰۵ باب تسویۃ الصفوف) ومثلہٗ فی معارف السنن ج ۲ ص۲۹۲ باب ماجاء فی فضل الصف الاوّل۔

حکم ہے ؟

الجواب:۔ اگر امام اور مقتدی ایک ہو تو بہتر یہ ہے کہ مقتدی امام کے دائیں طرف کھڑا ہو بائیں طرف کھڑا ہونا خلافِ اولیٰ ہے، البتہ اگر مقتدی زیادہ ہوں تو پھر درمیان سے صف کا انعقاد کیا جائے، دائیں بائیں جانب سے بھی صف باندھنا جائز ہے اگرچہ خلافِ اولیٰ ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ویقف الواحد) ولو صبیًا اما الواحدة فتتأخر (محاذیا) ای مساویًا (لیمین امامه) علی المذهب ولاعبرة بالرأس بل بالقدم ... (والزائد) یقف (خلفه)

قال ابن عابدینؒ: (والزائد خلفه) عدل تبعًا للوقایة عن قول الکنز والاثنان خلفه لانه غیر خاص بالاثنین بل المراد مازاد علی الواحد اثنان فاکثر نعم یفهم حکم الاکثر بالاولیٰ وفی القهستانی وکیفیته ان یقف احدهما بحذائه والآخر بیمینه اذا کان الزائد اثنین، ولو جاء ثالث وقف عن یسار الاول والرابع عن یمین الثانی والخامس عن یسار الثالث وهکذا۔ (رد المحتار علی در المختار ج ۱ ص۵۶۶ باب الامامة)[1]

نابالغ کا بڑوں کی صف میں کھڑا ہونا

سوال:۔ سات یا آٹھ سال کا بچہ اگر بالغین کی صف میں کھڑا ہو جائے تو اس سے نماز فاسد ہو گی یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچہ ایک ہی ہوتا ہے اور پہلی صف میں جگہ کافی ہوتی ہے اور یہ بچہ پیچھے دوسری صف میں اکیلا کھڑا ہونے کے بجائے صفِ اول میں شامل ہو جاتا ہے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ بچے بالغین کی صف میں کھڑا ہونے کے بجائے اپنے لیے مستقل صف باندھیں، البتہ اگر بچہ ایک ہو یا زیادہ ہوں لیکن ان میں سے کوئی پہلی صف میں کھڑا ہو جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی مگر ایسا کرنا بہتر نہیں۔

---

[1] وفی الهندیة: اذا کان مع الامام رجل واحد او صبی یعقل الصلوٰة قام عن یمینه وهو المختار ولا یتاخر عن الامام فی ظاهر الروایة هکذا فی المحیط ولو وقف علی یساره جاز وقد اساء کذا فی محیط السرخسی ... وافضل مکان الماموم حیث یکون اقرب الی الامام فان تساوت المواضع ففی یمین الامام وهو الاحسن هکذا فی المحیط۔ (الهندیة ج ۱ ص۸۸،۸۹ باب الامامة) ومثله فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۵۳ باب الامامة۔

قال الحصکفیؒ: (ثم الصبیان) ظاهرہ تعددھم فلو واحداً دخل الصف۔
قال ابن عابدینؒ: (قولہ فلو واحد دخل الصف) ذکرہ فی البحر بحثاً قال وکذا لو کان المقتدی رجلاً وصبیاً یصفھما خلفہ لحدیث انس فصففت انا والیتیم وراءہ والعجوز من ورائنا وھذا بخلاف المرأۃ الواحدۃ فانہا تتاخر مطلقاً کالمتعددات للحدیث المذکور۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۷۱ باب الامامۃ) [1]

امام سے بلاضرورت دُور کھڑا ہونا

سوال:۔ ایک شخص مسجد میں آکر امام کی اقتداء میں نیّت باندھ لیتا ہے لیکن صف میں کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات امام کمرہ میں ہوتا ہے اور مقتدی برآمدہ میں کھڑے ہوکر امام کی اقتداء میں نماز پڑھتا ہے، ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص صفوں کو چھوڑکر اکیلا امام کی اقتداء کرتا ہے تو اس کی نماز جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔

وفی الھندیۃ.... ولو اقتدی بالامام فی اقصی المسجد والامام فی المحراب فانہ یجوز کذا فی شرح الطحاوی۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۸۸ باب الامامۃ) [2]

نماز میں ٹخنوں اور کندھوں کے ملانے کا حکم

سوال:۔ نماز میں ٹخنے اور کندھے ملا کر کھڑا ہونا چاہیئے یا بغیر کندھے ملائے ہوئے صف بندی کی جائے؟

الجواب:۔ نماز میں اصل چیز صف کا سیدھا رکھنا مطلوب ہوتا ہے اور جن بعض روایات

---

[1] وفی الھندیۃ: اذا کان مع الامام رجل واحد او صبی یعقل الصلوٰۃ قام عن یمینہ وھو المختار.... واذا کان معہ اثنان قاما خلفہ وکذلک اذا کان احدھما صبیاً.... ولو اجتمع الرجال والصبیان والخناثی والاناث والصبیات المراھقات یقوم الرجال اقصی مایلی الامام ثم الصبیان الخ (الھندیۃ ج ۱ ص۸۸-۸۹ باب الامامۃ) ومثلہ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۵۳ باب الامامۃ۔

[2] قال ابن عابدینؒ: فان المسجد مکان واحد ولذا لم یعتبر فیہ الفصل بالخلاء الا اذا کان المسجد کبیراً جداً۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۸۶ باب الامامۃ) ومثلہ فی فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش فتاویٰ ھندیۃ ج ۱ ص۹۲۔

میں کعب کو کعب سے ملانے کا حکم وارد ہے تو اس سے مراد محاذات ہے حقیقی معنی اس سے مراد نہیں کیونکہ بیک وقت ٹخنوں اور کندھوں کو ملانا مشکل ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ینبغی ان یأمرهم بان یتراصوا ویسدوا الخلل ویسووا مناکبهم ویقف وسطاً۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۱ ص۵۶۸ باب الامامة)[1]

صف میں اکیلے کھڑا ہونا

سوال:- بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم نماز کی غرض سے مسجد میں آتے ہیں تو جماعت کھڑی ہو چکی ہوتی ہے اور پہلی صف میں جگہ بھی نہیں ہوتی تو اب بعد میں آنے والا شخص کیا اکیلا ہی دوسری صف میں اقتداء کی نیت کرے یا کسی شخص کو صفِ اول سے کھینچ کر اپنے ساتھ دوسری صف میں ملا کر جماعت میں شامل ہو جائے جبکہ ایسا کرنا اس دور میں بہت مشکل ہے، تو کیا ایسی صورت میں اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:- بہتر تو یہ ہے کہ اکیلے نماز نہ پڑھے بلکہ صفِ اول سے کسی کو اپنے ساتھ ملائے اور جماعت میں شامل ہو جائے، چونکہ دورِ حاضر میں دین سے بے رغبتی عام ہے اور جہل کی وجہ سے نماز کے فاسد ہونے کا احتمال قوی ہے اس لیے اکیلے کھڑے ہو کر اقتداء کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

قال الحصکفیؒ: وقد منا کراهة القیام فی صف خلف صف فیه فرجة للنهی وکذا القیام منفرداً وان لم یجد فرجة بل یجذب احدا من الصف ذکره ابن الکمال لکن قالوا فی زماننا ترکه اولیٰ فلذا قال فی البحر یکره وحده الا اذا لم یجد فرجة۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۱ ص۶۴۶ باب مکروهات الصلوٰة)[2]

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: وینبغی للقوم اذا قاموا الی الصلوٰة ان یتراصوا ویسدوا الخلل ویسووا بین مناکبهم فی الصفوف ولا بأس ان یامرهم الامام بذلك۔ (البحر الرائق ج۱ ص۳۵۳ باب الامامة)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۱ ص۸۹ باب الامامة۔

[2] وفی الهندیة: وکره للمقتدی ان یقوم خلف الصفوف وحده اذا وجد فرجة فی الصفوف وان لم یجد فرجة فی الصفوف روی محمد بن شجاع وحسن بن زیاد عن ابی حنیفةؒ انه لا یکره فان جرّ احدا من الصف الی نفسه وقام معه فذلك اولیٰ کذا فی المحیط۔ وینبغی ان یکون عالماً حتی لا تفسد الصلوٰة علی نفسه کذا فی خزانة الفتاویٰ۔ (الهندیة ج۱ ص۱۰۷ مکروهات الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی مراقی الفلاح علی حاشیة الطحطاوی ص۱۹۶ فصل فی المکروهات۔

پہلی صف میں کھڑے ہونا کس کا حق ہے

سوال:۔ بوڑھوں کی موجودگی میں نوجوان پہلی صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز باجماعت کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہونا افضل ہے، عمر کے تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ امام کے پیچھے ایسے شخص کو کھڑا ہونا چاہیئے جو خود بھی امامت کی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ بوقتِ ضرورت اس کو خلیفہ بنایا جاسکے، ایسی حالت میں بے علم بوڑھوں کی جگہ ایسے نوجوان کا امام کے قریب ہونا بہتر ہے جو نماز پڑھا سکتا ہو۔

وکل من یصلح اماماً للامام الذی سبقہ الحدث فی الابتداء یصلح خلیفة له ومن لا یصلح اماماً له فی الابتداء لا یصلح خلیفة لهٗ کذا فی المحیط۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۹۵ فصل فی الاستخلاف) [۱]

پہلی صف میں جگہ ہونے کے باوجود دوسری صف میں کھڑا ہونا

سوال:۔ ہماری مسجد میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی صف میں جگہ ہوتی ہے، بعض لوگ باوجود جگہ ہونے کے دوسری صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا مکروہ ہے؟

الجواب:۔ صفوں کو پُر کرنا جماعت کے آداب میں سے ہے، اگر کوئی شخص ایسا عمل کرتا ہے کہ پہلی صف میں جگہ ہونے کے باوجود دوسری صف میں کھڑا ہوجاتا ہے تو بوجہ مخالفت حدیث کے مکروہ ہے۔

عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم اتموا الصف المقدم ثم الذی یلیه فما کان من نقص فلیکن فی الصف المؤخر۔ رواہ ابوداؤد۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۱۰۵ باب تسویة الصفوف) [۲]

ولما قال ابن عابدینؒ، وعلیه فلو وقف فی الصف الثانی داخلها قبل استکمال الصف الاوّل من خارجها یکون مکروهاً۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۶۹ مطلب فی جواز الایثار بالقُرب)

---

[۱] عن عبد اللّٰہ بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنهیٰ ثم الذین یلونهم ثلثا وایاکم وهیشات الاسواق۔ (المسلم ج ۱ ص۱۸۱ باب تسویة الصفوف) ومثلهٗ فی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۹۸ باب تسویة الصفوف۔

[۲] عن ابی سعید الخدری قال رأی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم فی اصحابه تاخرا فقال لهم تقدموا فأتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم لا یزال قوم یتاخرون حتی یؤخرهم اللّٰہ (رواہ مسلم ج ۱ ص۱۸۲)

باب الجماعۃ

(نماز باجماعت کے مسائل)

عذر کی وجہ سے جماعت کا ترک کرنا

سوال:۔ ہم سعودی عرب میں ایک کمپنی کے ملازم ہیں لیکن جب اذان ہوتی ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ کام کو چھوڑ کر مسجد میں جائیں اور جماعت سے نماز پڑھیں، اگر ایسا کرتے ہیں تو کمپنی کا مالک ناراض ہوتا ہے، ایسے ہی بعض اوقات ایسا کام بھی کرنا پڑتا ہے کہ اگر اُسے چھوڑ دیا جائے تو کام رُک جاتا ہے جس سے مالک کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور ہمیں مارنے پر تیار ہو جاتا ہے، اندریں حالات کیا ہم اسی جگہ نماز پڑھ لیا کریں یا مسجد میں جانا ضروری ہے؟

الجواب:۔ جہاں مال کے ضیاع اور ہلاکت کا خطرہ ہو اور ایسا ہی مالک کی جانب سے اپنی جان کو خطرہ ہو تو بوجہ ظلم کے آپ جماعت کو ترک کر سکتے ہیں لیکن جہاں کہیں موقع ملے انفراداً یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں۔

لما قال الحصکفیؒ: ولا علی حال بینہ وبینھا مطر وطین ..... وظلمۃ۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذا القول ولا علی ... ظلمۃ) یخافہ علی نفسہ او مالہ۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج۱ ص۵۵۵ باب الامامۃ)[1]

جماعۃ الثانیہ کا حکم

سوال:۔ کسی محلہ کی مسجد میں جب ایک مرتبہ لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ کر چلے جائیں تو بعض محلے والے دوسری مرتبہ بعض لوگوں کو جمع کر کے نماز باجماعت پڑھتے ہیں، تو کیا شرعاً جماعتِ ثانیہ کا محلہ کی مسجد میں کوئی جواز ہے؟

الجواب:۔ فقہاء احناف کے نزدیک محلہ کی مسجد میں جس کا امام اور مؤذن مقرر ہو جماعت ثانیہ مکروہ ہے، البتہ ایسی مسجد جس میں امام یا مؤذن مقرر نہ ہو یا راستے کی مسجد ہو تو اُس میں

---

[1] وفی الھندیۃ: تسقط الجماعۃ بالاعذار ..... او کان اذا خرج یخاف ان یحبسہ غریمہ فی الدین ..... او یخاف ضیاع مالہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۸۳ باب الامامۃ)۔
ومثلہ فی البحرالرائق ج۱ ص۳۶۷ باب الامامۃ۔

جماعتِ ثانیہ جائز ہے، البتہ اگر مسجد کے ساتھ ملحقہ کوئی حجرہ یا مدرسہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس میں جماعتِ ثانیہ کرلی جائے۔

قال ابن عابدینؒ: یکرہ تکرار الجماعۃ فی مسجد محلۃ باذان واقامۃ الا اذا صلی بھما فیہ اولاً غیر اھلہ او اھلہ لکن بمخافتۃ الاذان ولو کرر اھلہ بدونھما او کان مسجد طریق جاز اجماعاً کما فی مسجد لیس لہ امام ولا مؤذن ویصلی الناس فیہ فوجاً فوجاً فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامۃ علی حدۃ کما فی امالی قاضی خان۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۵۲ باب الامامۃ، مطلب فی تکرار الجماعۃ فی المسجد) [۱]

امام کا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ پڑھنا

سوال: امام تسبیح کے بعد رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ پڑھے گا نہیں؟ اگر پڑھ لے تو نماز میں کوئی حرج تو نہیں آتا؟

الجواب: یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس میں توسع ہے، اگر پڑھ لے تو نماز میں کوئی زیادتی نہیں آتی، اور بہت سے علماء کا یہی مسلک ہے، اگر نہ پڑھے تو اس سے نماز میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ پڑھنا بہتر ہے۔

قال الحصکفیؒ: ثم یرفع رأسہ من رکوعہ مسمعًا) فی الولوالجیۃ لو ابدل النون لاما نفسد وھل یقف بجزم او تحریک قولان ویکتفی بہ الامام) وقالا یضم التحمید سرًّا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۹۷ باب صفۃ الصلوۃ) [۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: المسجد اذا کان لہ امام معلوم وجماعۃ معلومۃ فی محلۃ فصلی اھلہ فیہ بالجماعۃ لایباح تکرارھا فیہ باذان ثانٍ اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعًا وکذا فی مسجد قارعۃ الطریق کذا فی شرح المجمع للمصنف۔ (فتاوی ھندیہ ج ۱ ص۸۳ باب الامامۃ) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۶ باب الامامۃ)

[۲] وفی الھندیۃ: فان کان اماماً یقول سمع اللہ لمن حمدہ بالاجماع وان کان مقتدیًا یاتی بالتحمید ولا یاتی بالتسمیع بلا خلافٍ وان کان منفردًا الاصح انہ یاتی بھما کذا فی المحیط وعلیہ الاعتماد کذا فی التتارخانیہ وھو الاصح ھٰکذا فی الھدایۃ ثم فی الروایۃ التی تجمع یاتی بالتسمیع حال الارتفاع واذا استوی قائمًا قال ربنا لک الحمد کذا فی الزاھدی وھو الصحیح کذا فی القنیۃ۔ (فتاوی ھندیۃ ج ۱ ص۷۴ سنن الصلوۃ وادابھا)

گھر کی حفاظت کے لیے جماعت ترک کرنا

سوال:۔ کیا گھر کی حفاظت کے لیے جماعت چھوڑنا جائز ہے؟

الجواب:۔ محض تردد اور شک کی وجہ سے جماعت کا ترک کرنا جائز نہیں، البتہ اگر یقین ہو کہ عدم موجودگی میں کسی ظالم سے ایذا پہنچے گی اور گھر کی بے پردگی ہوگی یا مریض کی بیماری بڑھ جائے گی، تو ان صورتوں میں ترکِ جماعت کی گنجائش ہے۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هٰذا القول ولاعلیٰ ...... وخوف علیٰ ماله او من غریم او ظالم، یخاف علیٰ نفسه او ماله (قیامه بمریض) ای یحصل بغیبته المشقة والوحشة كذا فی الامداد۔ (ردالمحتار ج۱ ص۵۵۶ باب الامامة) ؎۱

بغیرِ عذرِ شرعی جماعت ترک کرنا

سوال:۔ ایک شخص اپنے آپ کو صاحبِ نسبت ظاہر کرے اور اس کا حلقۂ ارادت بھی بہت وسیع ہو، ذکر و اذکار اور نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہو، لیکن اس کے باوجود نماز باجماعت کا اہتمام نہیں کرتا اکثر اس کی جماعت رہ جاتی ہے۔ تو کیا بغیر شرعی عذر کے جماعت کو ترک کرنا شرعاً جائز ہے؟ نیز ایسے شخص سے بیعت کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص بغیر کسی شرعی عذر کے جماعت کو ترک کردے اور جماعت سے نماز پڑھنے کو اچھا نہ سمجھے تو ایسا شخص فاسق شمار ہوگا، اس لیے بوجہِ فسق ایسے شخص سے بیعت کرنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس سے منصبِ بیعت کی توہین ہوتی ہے۔

قال الحصکفیؒ: قال فی البحر هو الراجح عند اهل المذهب (فتسن او تجب ثمرته تظهر فی الاثم بتركها مرة (علی الرجال العقلاء البالغین الاحرار القادرین علی الصّلوٰة بالجماعة من غیر حرج)

قال ابن عابدینؒ: تحت (قوله قال فی البحر) قال فی النهر هو اعدل الاقوال و اقواها ولذا قال فی الاجناس لا تقبل شهادته اذا تركها استخفافاً

؎۱ وفی الهندیة: تسقط الجماعة بالاعذار ..... اوكان فیها لمریض او یخاف ضیاع ماله۔ (الفتاوىٰ الهندیة ج۱ ص۸۳ باب الامامة)
ومثله فی البحر الرائق ج۱ ص۳۶۷ باب الامامة۔

ومجانة۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۵۴ باب الامامۃ) ؎۱

تکبیر اولیٰ کا وقت کیا ہے؟

سوال: تکبیر اولیٰ کا وقت کیا ہے؟ اور کب تک مقتدی امام کی اقتداء کرے تو تکبیر اولیٰ کا ثواب مل جائے گا؟

الجواب: تکبیر اولیٰ کی کئی صورتیں ہیں (۱) امام کے ساتھ متصل نیت باندھ کر اقتداء کرے تو سب کے نزدیک تکبیر اولیٰ کا ثواب مل جائے گا (۲) البتہ ثناء کے بعد یا سورۃ فاتحہ کے بعد رکوع سے قبل اقتداء کرے تو یہ صورتیں اختلافی ہیں۔ اوسع اور صحیح یہی ہے کہ پہلی رکعت کے پا لینے سے تکبیر اولیٰ کا ثواب مل جاتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: تظهر فائدة الخلاف فی وقت ادراك فضيلة تكبيرة الافتتاح فعنده بالمقارنة وعندهما اذ كبر فی وقت الثناء وقيل بالشروع قبل قرأة ثلاث آيات لو كان المقتدی حاضرًا وقيل سبع لو غائبًا وقيل بادراك الركعة وهذا اوسع وهو الصحيح۔ وقيل بادراك الفاتحة وهو المختار۔

(ردّ المحتار ج ۱ ص۵۲۶ باب صفة الصلوٰة، مطلب فی وقت ادراك فضيلة الافتتاح) ؎۲

امام کا مقتدی کی تشہد مکمل کرنے سے پہلے سلام پھیرنا

سوال: بعض مساجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ابھی مقتدی تشہد میں درود یا دعا پڑھ رہا تھا کہ امام صاحب نے سلام پھیر دیا۔ اب مقتدی کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ امام صاحب کے ساتھ ہی سلام پھیر دے یا اپنی تشہد

؎۱ قال ابن نجیمؒ: وذكر فی غاية البيان معزيًا الی الاجناس ان تارك الجماعة يستوجب اساءة ولا تقبل شهادته اذا تركها استخفافًا بذلك ومجانة اما اذا تركها سهوًا او تركها بتاويل بان يكون الامام من اهل الاهواء او مخالفًا لمذهب المقتدی لايراعی مذهبه فلا يستوجب الاساءة وتقبل شهادته۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۵ باب الامامة)

ومثله فی الهندية ج ۱ ص۸۳ باب الامامة)

؎۲ فضيلة تكبيرة الافتتاح تكلموا فی وقت ادراكها والصحيح ان من ادرك الركعة الاولی فقد ادرك فضيلة تكبيرة الافتتاح كذا فی الحصر فی باب ابی يوسفؒ۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص۶۹ الباب الرابع فی صفة الصلوٰة)

مکمل کر کے سلام پھیرے؟

الجواب:۔ اگر امام مقتدی کی تشہد کے پورا کرنے کے بعد سلام پھیر دے تو مقتدی کو چاہیئے کہ وہ بھی سلام پھیر دے کیونکہ امام کی متابعت ضروری ہے، البتہ اگر مقتدی نے تشہد پوری نہ کی ہو تو پھر تشہد پوری کر کے سلام پھیر دے۔

لما قال العلامة فخر الدین الشهیر قاضی خان ولو سلم الامام قبل ان یفرغ المقتدی من التشهد فانه یتم التشهد۔ (الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیة ج ۱ صلا۹ فصل فیمن یصح الاقتداء به وفیمن لا یصح۔)

مسجد کے ہوتے ہوئے دوسری جگہ نماز باجماعت پڑھنا

سوال:۔ ہمارے سکول کے طلبہ کی تعداد ۲۰۷ ہے جو سکول کے قریب شہر کی تین مساجد میں نماز ظہر، بعض مساجد میں یہ طلباء قبل از اذانِ ظہر نماز پڑھ کر سکول آجاتے ہیں چونکہ سکول کی مسجد بہت چھوٹی ہے البتہ سکول کا صحن بہت وسیع ہے۔ تو کیا عند الشرع بامرِ مجبوری سکول کے صحن میں نماز باجماعت پڑھنا صحیح ہے؟ اور جن طلبہ نے قبل از اذان نماز پڑھی ہے ان کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ (۱) ظہر کی اذان ہمارے شہروں میں مستحب وقت میں ہوتی ہے اور ظہر کی نماز کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اذان سے قبل اور بعد زوال ظہر کی نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی۔

(۲) جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجدِ شرعی کا ہونا زیادہ مناسب و بہتر ہے البتہ اگر بنا بر مجبوری سکول کے صحن میں یا کسی دوسری جگہ جماعت کی جائے تو شرعاً اس میں کوئی

لہ وفی الهندیة: ولو سلم الامام قبل ان یفرغ المقتدی من الدعا الذی یکون بعد التشهد اوقبل ان یصلی علی النبی صلی الله علیه وسلم فانه یسلم مع الامام۔ فی الهندیة اذا ادرک الامام فی التشهد وقام الامام قبل ان یتم المقتدی اوسلم الامام فی آخر الصلوٰة قبل ان یتم المقتدی من التشهد فالمختار ان یتم التشهد۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۹۰ باب الامامة۔ الفصل السادس فیما یتابع الامام وفیما لا یتابعه)

وَمِثْلُهٗ فی کبیری شرح منیة المصلی ص۵۲۷ باب الامامة السابع فی الاقتداء۔

قباحت نہیں ۔

کما فی الحدیث عن ابی ذر جعلت لی الارض طھوراً و مسجداً (رواہ ابو داؤد ج ۱ ص۵ک)

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الارض کلھا مسجد الا المقبرۃ والحمام ۔ (رواہ ابو داؤد والترمذی والدارمی[1]) (مشکوٰۃ ج ۱ ص ک باب المسجد)

معمولی لنگڑے کا جماعت ترک کرنا

سوال :۔ اگر کوئی شخص معمولی لنگڑا ہو تو کیا اس کا نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آنا ضروری ہے ؟

الجواب :۔ اگر لنگڑا آسانی سے مسجد میں آسکے تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مسجد میں آئے ، البتہ اگر زیادہ معذور ہو اور مسجد میں آنے سے اس کو تکلیف ہوتی ہو تو اس پر مسجد میں آنا واجب نہیں ۔

قال ابن عابدینؒ: الاعرج الذی لا یستطیع المشی ۔ (ردالمحتار جلد ۱ ص۵۵۴ باب الامامت[2])

نماز میں رئیس محلہ کا انتظار کرنا

سوال :۔ ہمارے محلہ میں ایک رئیس رہتا ہے ، جب تک وہ مسجد میں نہ آئے اس وقت تک امام صاحب نماز نہیں پڑھاتے بلکہ اس کا انتظار کرتے رہتے ہیں ، عموماً اس کے آنے کا مکمل یقین بھی نہیں ہوتا ۔ تو کیا شریعت میں نماز باجماعت کے لیے کسی کا انتظار کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر کوئی ضعیف و کمزور ہو اور مسجد میں ہمیشہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہو تو اُس کے لیے انتظار کیا جاسکتا ہے لیکن کسی رئیسِ محلہ کے لیے انتظار کی گنجائش نہیں ، البتہ اگر اُس سے شر کا خطرہ ہو تو وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے انتظار کیا جاسکتا ہے ۔

قال الحصکفیؒ : رئیس المحلۃ لاینتظر ما لم یکن شریراً والوقت متسع ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۲ باب الاذان[3])

---

[1] اخرج الامام ابوعیسیٰ الترمذی عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الارض کلھا مسجد الا المقبرۃ والحمام ۔ (رواہ الترمذی ج ۱ ص۴۳)

وَمِثْلُہٗ فی ابی داؤد ج ۱ ص ک باب فی المواضع التی لا تجوز فیھا الصلوٰۃ ۔

[2] وتسقط الجماعۃ بالاعذار ۔۔۔ والمفلوج الذی لا یستطیع المشی ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۸۳ الفصل الاول فی الجماعۃ)

[3] ینتظر المؤذن الناس ویقیم للضعیف المستعجل ولا ینتظر رئیس المحلۃ وکبیرھا کذا فی معراج الدرایۃ ۔ (فتاوٰی ہندیہ جلد ۱ ص۵ک باب الاذان) وَمِثْلُہٗ فی طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص۱ باب الاذان ۔

شیعہ امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ شیعہ عقائد رکھنے والے امام کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟ اگر دائمی امام موجود نہ ہو تو کیا بوقتِ ضرورت اُس کی اقتداء جائز ہے؟

الجواب:۔ ہمارے ملک کے اکثر شیعہ وہ عقائد رکھتے ہیں جو غالی شیعوں کے عقائد ہیں جن میں حضرت علیؓ کی الوہیت، سبِّ الشیخین، تحریف القرآن اور سبِّ عائشہ صدیقہؓ جیسے عقائد شامل ہیں، لہٰذا ایسے عقائد رکھنے والے کی اقتداء بوجہ مسلمان نہ ہونے کے کسی صورت میں جائز نہیں، تاہم جو شیعہ غالی نہ ہو وہ مبتدع کے حکم میں ہو کر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فی کتب الفتاوٰی نعم لا شك فی تکفیر من قذف السیدة عائشة رضی الله تعالیٰ عنها او انکر صحبة الصدیقؓ او اعتقد الالوهیة فی علیؓ او ان جبریل غلط فی الوحی او نحو ذٰلك من الکفر الصریح المخالف للقرآن ولکن لو تاب تقبل توبة هٰذا خلاصة ما حررناه فی کتابنا الولاة والحکام۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۲۹۴ کتاب الجهاد)

قال العلامة الحصکفیؒ: (ومبتدع) ای صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لا بمعاندة بل بنوع شبهة وکل من کان من قبلتنا ...... الخ

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۵۶۰ باب الامامة)[1]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: تحت هٰذا القول (ولما المبتدع) و عرفها الشمنی بانها ما احدث علی خلاف الحق المتلقی، عن رسول الله صلی الله علیه وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبهة و استحسان وجعل دینًا قویمًا وصراطًا مستقیمًا. اھ

(البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۹ باب الامامة)

ولما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: الرافضی ان کان یسبّ الشیخینؓ ویلعنهما فهو کافر وان کان یفضل علیًا علی ابی بکر وعمر رضی الله عنهم لا یکون کافرًا لکنه مبتدعٌ۔

(خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص ۳۸۱ کتاب الفاظ الکفر)

مُبتدع کی اقتداء کا حکم

سوال: ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے لیکن وہ ایسے اعمال کا مرتکب ہے جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، اور ایسے اعمال وہ ثواب سمجھ کر کر رہا ہے، کیا اس قسم کی بدعات کے مرتکب شخص کی اقتداء جائز ہے؟

الجواب: اگر کوئی امام ایسے امور کا مرتکب ہو جو عندالشرع ثابت نہیں لیکن یہ شخص ان امور کو دین سمجھ کر کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتا ہو تو بوجہ مبتدع ہوتے اس کی اقتداء مکروہ ہے۔

لیکن واضح رہے کہ کسی شخص پر بغیر کسی تحقیق کے مبتدع کا فتوٰی لگانا دانشمندی نہیں اور نہ ہر کام کو بدعت کہنا صحیح ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ (ویکره) مبتدع ای صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لابمعاندة بل بنوع شبهة وکل من کان من قبلتنا۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامة) [1]

جادوکرنے والے شخص کی اقتداء

سوال: ایک شخص جادو اور منتر کے ذریعے مال جمع کر رہا ہے، بسا اوقات اس عمل کے دوران وہ غیراللہ سے استعانت جیسے قبیح فعل کا بھی مرتکب ہوتا ہے، کیا ایسے شخص کی اقتداء جائز ہے، جبکہ کبھی کبھی موصوف اپنی غیب دانی کا بھی دعوٰی کرتا ہے؟

الجواب: نفسِ تعویذ کرنا از روئے شرع ممنوع نہیں، البتہ جادو کرنا اور استعانت میں غیراللہ کے مشرکانہ الفاظ سے تعویذ کرنا، منتر پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدین: قال فی الخانیة امرأة تضع ایات التعویذ لیحبها زوجها بعد ماکان یبغضها ذکر فی الجامع الصغیران ذٰلك حرام ولایحل اھ وذکرابن وصبان فی توجیهه أنه ضرب من السحر والسحر حرام اھ ومقتضاه انه لیس مجرد کتابة ایات بل فیه شئ زائد۔ قال الزیلعی وعن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه انه قال

---

[1] قال ابن نجیمؒ: تحت هٰذا القول (والمبتدع) وعرفها الشمنی بانها ما احدث علی خلاف الحق المتلقی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبهة واستحسان وجعل دیناً قویماً وصراطاً مستقیماً۔ (البحرالرائق ج ۱ ص۳۴۹ باب الامامة)

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الرقی والتمائم والتولۃ شرک۔
رواہ ابوداؤد وابن ماجہ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۵ ص۲۷۵ کتاب الحظر والاباحۃ)

نیز غیب کی باتوں کے علم کا دعویٰ کرنا بے بنیاد اور باطل عقیدہ ہے، ایسے عقائد ونظریات رکھنے والے شخص کی اقتداء نہ کی جائے، کیونکہ ایسی باتیں عقیدہ نہ بنانے کے باوجود بھی حرام اور ناجائز ہیں۔

قال الحصکفیؒ: تحت ھذا القول ویکرہ امامۃ..... مبتدع ای صاحب بدعۃ وھی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لا بمعاندۃ بل بنوع شبھۃ وکل من کان من قبلتنا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامۃ) [1]

خنثیٰ مشکل کی امامت کا حکم

سوال: ایک شخص علم وفضل وکمال میں سب سے اعلیٰ ہے لیکن جنس کے لحاظ سے وہ خنثیٰ مشکل ہے، کیا اس کی اقتداء درست ہے؟

الجواب: اگر کوئی شخص علم وفضل وکمال کے لحاظ سے سب سے بہتر ہی کیوں نہ ہو لیکن جنس کے لحاظ سے خنثیٰ مشکل ہو تو اس کی اقتداء ناجائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ولا یصح اقتداء رجل بامرأۃ) وخنثیٰ (وصبی مطلقاً)
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۵۷۶ باب الامامۃ) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: قال المرغینانی تجوز الصلوٰۃ خلف صاحب ھوی وبدعۃ وفیہ وحاصلہ ان کان ھوی لا یکفر بہ صاحبہ تجوز الصلوٰۃ خلفہ مع الکراھۃ والا فلا ھکذا فی التبیین والخلاصۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۸۴ باب الامامۃ)

قال ابن نجیمؒ: ھذا القول (والمبتدع) وعرفھا الشمنی بانھا ما احدث علی خلاف الحق المتلقی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبھۃ واستحسان وجعل دینا قویماً وصراطاً مستقیماً۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۹ باب الامامۃ)

[2] وفی الھندیۃ: وامامۃ الخنثیٰ المشکل للنساء جائزۃ ان تقدمھن وان قام وسطھن فسدت صلوٰتہ لوجود المحاذات ان کان الامام رجلاً کذا فی محیط السرخسی وللرجال والخنثیٰ مثلہ لا یجوز۔ (ھندیۃ ج ۱ ص۸۵ باب الامامۃ) ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص۱۴۷ باب الامامۃ۔

حنفی المسلک کے لیے غیر حنفی امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص حنفی المسلک ہے لیکن وہ ایک ایسے ملک میں مقیم ہے جہاں پر امام، امام شافعیؒ یا امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ کے مقلد یا غیر مقلد ہوں تو ایسی صورت میں حنفی المسلک مقتدی کا غیر حنفی امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ غیر حنفی امام اختلافی مسائل کی رعایت کرنے میں مشہور ہو یا مقتدی کا اس کے متعلق اختلافی مسائل میں رعایت کرنے کے بارے میں ظن غالب ہو، مثلاً خون بہنے اور قے میں وضو کرنے کا اہتمام کرتا ہو تو پھر اس کی اقتداء جائز ہے ورنہ نہیں۔

وفی الهندية: والاقتداء بشافعي المذهب انما يصح اذا كان الامام يتحامى مواضع الخلاف بان يتوضأ من الخارج النجس من غير السبيلين كالفصد وان لا ينحرف عن القبلة انحرافاً فاحشاً هكذا فى النهاية والكفاية فى باب الوتر۔

(الهندية ج۱ ص۸۴ باب الامامة) [1]

منصب امامت میں ارث اور وصیت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص جو کسی مسجد کا باقاعدہ امام ہے وفات کے بعد وہ اپنی جگہ منصب امامت کے لیے اپنے ورثاء میں سے کسی ایک شخص کو مقرر کر سکتا ہے یا نہیں؟ ایسی صورت میں اگر اس نے کسی خاص شخص کے بارے میں وصیت کی ہو تو اس کی رعایت کہاں تک کی جائے گی، اور بغیر وصیت کے بھی اگر کوئی شخص اس میں ارث کا دعویٰ کرے تو کیا یہ درست ہے؟

الجواب:۔ منصب امامت کوئی جائیداد اور مال نہیں کہ جس میں وراثت جاری ہو سکے یا مورث کی وصیت کی رعایت کی جائے۔ منصب امامت کی تقرری امام کی اہلیت، ذاتی کردار اور علم و عمل کے علاوہ اہل محلہ کی رضامندی پر ہے، امام کے مرنے کے بعد اہلِ محلہ جس کو بھی امامت تفویض کریں وہی محلہ کی مسجد کا امام متصور ہوگا۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: اما للاقتداء بالمخالف فى الفروع كالشافعى فيجوز ما لم يعلم منه مايفسد الصلوة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع انما الاختلاف فى الكراهة۔
(رد المحتار على الدر المختار (المعروف بشامى) ج۱ ص۵۶۳ باب الامامة)۔
ومثلهٗ فى فتاوى غياثية ص۳۱ باب الامامة والاقتداء۔

قال الحصکفیؒ: (والاحق بالامامة) تقدیمًا بل نصبًا مجمع الانہر (الاعلم باحکام الصلوٰة) فقط صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض وقیل واجب وقیل سنة ثم الاحسن تلاوة للقرأة ثم الاورع ثم الاسن ثم الاحسن خلقًا ثم الاحسن وجهًا ثم الاشرف نسبًا۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۱ ص۵۵۷ کتاب الامامة) [1]

بدکردار اور مفعول کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے لیکن وہ اپنے کردار کے لحاظ سے بدنام ہے، مثلاً مفعولیت میں مشہور ہے، تو ایسے شخص کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ موصوف کی بدنامی اگر امامت سے قبل کی ہو اور بعد میں اس نے توبہ کرلی ہو تو اس کی اقتداء جائز ہے۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے کے بعد اس کی حیثیت مجروح نہیں رہتی، لیکن اگر یہ بدنامی کسی ایسے فعل کی وجہ سے ہو جس میں فی الحال یہ شخص مبتلا ہو تو بوجہ فسق اس کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول (ویکره امامة عبد واعرابی وفاسق) ای من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی وآکل الربا ونحو ذلك۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامة) [2]

منکوحہ کے نکاح پڑھوانے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص اپنی منکوحہ

---

[1] وفی الهندیة: اولی بالامامة اعلمهم باحکام الصلوٰة هکذا فی المضمرات وهو الظاهر هکذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القرأة قدر ما تقوم به سنة القرأة هکذا فی التبیین ولم یطعن فی دینه کذا فی الکفایة وهکذا فی النهایة ویجتنب الفواحش الظاهرة وان کان غیره اورع منه کذا فی المحیط وهکذا فی الزاهدی وان کان متبحرًا فی علم الصلوٰة لکن لم یکن له حظ فی غیره من العلوم فهو اولی کذا فی الخلاصة۔ (فتاوی ہندیة ج ۱ ص۸۳ باب الامامة الفصل الثانی) ومثله فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۶۷۔

[2] وفی الهندیة: تجوز امامة الاعرابی والاعمی والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصة الا انها تکره هکذا فی المتون۔ (الهندیة ج ۱ ص۸۵ باب الامامة) ومثله فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۸ باب الامامة۔

لڑکی خاوند کے سپرد کرنے کے بجائے اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر دے جبکہ یہ فعل معاشرے میں بھی قبیح سمجھا جاتا ہے تو ایسے شخص کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب: منکوحہ کا نکاح پڑھوانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، نکاح علی النکاح کالعدم ہو کر اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، اگر امام مذکور نے عمداً یہ کام کیا ہو تو بوجہ فاسق ہونے کے اس کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ولو ام قوماً وھم له کارھون، ان) الکراھة (لفساد فیه او لانھم احق بالامامة منه کره) له ذلك تحریماً لحدیث ابی داؤد لا یقبل الله صلوٰة من تقدم قوماً وھم له کارھون۔ (رد المحتار علی الدر المختار المعروف بشامی ج۱ ص۵۵۹ باب الامامة)[1]

عمامہ نہ پہننے والے کی اقتداء کا حکم

سوال: کیا پگڑی نہ پہننے والے شخص کی اقتداء جائز ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ عمامہ کے بارے میں انتہائی متشدد ہیں، یہاں تک کہ جس کے سر پر عمامہ (پگڑی) نہ ہو تو اس کی اقتداء ناجائز سمجھتے ہیں، اور ترکِ عمامہ مفسدِ صلوٰۃ تصور کرتے ہیں۔ کیا قرآن و حدیث اور اقوالِ فقہاء کی رُو سے یہ زعم درست ہے؟

الجواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ عمامہ (پگڑی) پہننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، لیکن یہ سُننِ عادتیہ میں سے ہے، یعنی پگڑی وہ عمدہ لباس ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے استعمال کر کے پسند فرمایا ہے۔

قال صدر الشھیدؒ: فسنن الھدیٰ وان کانت علی سبیل العادة فسنن الزوائد کلبس الثیاب والاکل بالیمین وتقدیم الرجل الیسریٰ فی الدخول ونحو ذلك کلامنا فی الاوّل الیٰ اٰخرہ۔ (شرح الوقایة ج۱ ص۶۹ کتاب الطھارت)

جیسا کہ دھوتی اور سفید رنگ کے کپڑے پہننے کی فضیلت نماز سے خاص نہیں، ایسا ہی عمامہ کا پہننا بھی نماز سے خاص نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس عزت کا لباس سمجھا جاتا ہے،

---

[1] رجلٌ ام قوماً وھم له کارھون فان کانت الکراھة لفساد فیه او لانھم احق بالامامة منه کره له ذلك وان کان ھو احق بالامامة لا یکره لان الجاھل والفاسق یکره العالم والصالح۔ (الفتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیة ج۱ ص۹۲ باب ما یصح للاقتداء فی ما لا یصح)۔
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۱ ص۸۷ باب الامامة۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں جاتے وقت عزت کے لباس کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔ بناء بریں فقہاء عمامے کے ساتھ نماز پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں تاہم اگر کسی شخص کو عمامہ میسر نہ ہو تو پھر بغیر عمامہ کے بھی نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال طاہر بن عبدالرشیدؒ: وفی الاصل لا بأس بان یصلی الرجل فی ثوب واحد متوشحًا و یوم کذلك والمستحب ان یصلی الرجل فی ثلاثة اثواب قمیص وازار وعمامة اما لو صلی فی ثوب واحد متوشحًا به جمیع بدنه کازار المیت یجوز صلوٰته من غیر کراهة۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۱۳۵ الفصل السادس فی ستر العورة) [1]

لیکن یہ حکم امام کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ حکم ہر نماز پڑھنے والے کے لیے ہے۔ عمامہ کی اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اس کو صرف منصب امامت سے خاص کرنا زیادت علی الشرع کے مترادف ہے اور اس کے نہ پہننے کو مفسدات نماز میں شمار کرنا فقہی ذخیرہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

البتہ اگر ایک شخص پگڑی کو عزت کا لباس سمجھے، کسی بڑی محفل اور مجلس میں جاتے وقت پگڑی کا استعمال کرے لیکن نماز پڑھتے وقت اس کا اہتمام نہ کرے تو ایسی صورت میں ثیاب بذلہ کے حکم میں ہو کر ہر مصلی کے لیے یہ مکروہ ہے، اور جو شخص اس کا پابند نہ ہو اور نہ پگڑی اس کی عادت بنی ہوئی ہو تو ایسی صورت میں بغیر عمامہ کے امام کی اقتداء کرتے میں کوئی حرج نہیں۔

تاہم جہاں پر عمامہ کا ترک کرنا فتنہ وفساد کے برپا ہونے کا سبب بنتا ہو تو ایسی جگہ میں عمامہ کے بغیر نماز نہ پڑھائی جائے کیونکہ عمامہ کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں، اور فتنہ وفساد کا انسداد بھی ضروری ہے۔

قاتل کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ کیا قاتل تائب کی اقتداء جائز ہے جبکہ مقتول کے ورثاء نے اس کو معاف نہ کیا ہو؟

---

[1] قال ابن نجیمؒ: والمستحب ان یصلی فی ثلاثه اثواب قمیص وازار وعمامة۔ (البحر الرائق ج۱ ص۲۶۹ باب شروط الصلوٰة)

وفی الهندیة: والمستحب ان یصلی الرجل فی ثلاثة اثواب قمیص وازار وعمامة اما لو صلی فی ثوب واحد متوشحًا به تجوز صلوٰته من غیر کراهة۔ (ج۱ ص۵۹ الباب الثالث فی شروط الصلوٰة)

الجواب:۔ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے، ایسا گناہ صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتا بلکہ مقتول کے ورثاء کو راضی کرنا ضروری ہے۔ صورتِ مذکورہ میں زبانی توبہ نکالنے کے باوجود اس شخص کا فسق وفجور باقی ہے جس کی اقتداء بوجہ فسق کے مکروہ تحریمی ہے لہٰذا ایسے شخص کو مستقل امام نہ بنایا جائے۔

قال ابن عابدینؒ (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی وآکل الربوٰ ونحو ذلک۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامة)

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول لا تصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقود وهاهنا ای لا تکفیه التوبة وحدها قال فی تبیین المحارم واعلم ان توبة القاتل لا تکون بالاستغفار والندامة فقط بل یتوقف علی ارضاء اولیاء المقتول۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۶ ص۵۴۸ کتاب الجنایات) [1]

نابالغ کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ نابالغ امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ بصورتِ ثانی تراویح اور فرائض کا حکم ایک ہے یا ان دونوں میں فرق ہے؟

الجواب:۔ نابالغ کی اقتداء مطلقاً (خواہ فرائض میں ہو یا نوافل میں) مکروہ تحریمی ہے، نابالغ کی جگہ کسی بالغ کو امام بنایا جائے۔

وفی الهندیة: امامة الصبی المراهق لصبیان مثله یجوز کذا فی الخلاصة وعلی قول ائمة بلخ یصح الاقتداء بالصبیان فی التراویح والسنن المطلقة کذا فی فتاوی قاضی خان۔ المختار انه لا یجوز فی الصلوٰة کلها کذا فی الهدایة وهو الاصح هکذا فی المحیط وهو قول العامة وهو ظاهر الروایة۔ هکذا فی البحر الرائق ج ۱ ص۸۵ باب الامامة الفصل الثالث

---

[1] وفی الهندیة تجوز امامة الاعرابی والاعمی والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصة الا انها تکره هکذا فی المتون۔ (ج ۱ ص۸۵ باب الامامة)

قال العلامة الشیخ محمد کامل الطرابلسی: لا تصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقود۔ (الفتاوی الکاملیة ص۲۵۲ کتاب الجنایات)

فی بیان من یصح اماماً لغیرہ) [1]

صاحبِ نسبت نہ ہونے والے امام کی اقتداء

سوال:۔ ایک شخص کسی متبعِ شریعت پیر سے بیعت ہو گیا اس کے لیے کسی ایسے امام کی اقتداء جائز ہے جو نیک اور متقی ہونے کے باوجود کسی پیر سے بیعت نہ ہو۔

الجواب:۔ مروجہ بیعت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصلاحِ نفس کا ایک ذریعہ ہے، اگرچہ موجودہ فتنہ وفساد کے دور میں اصلاحِ نفس کے لیے کسی متبعِ شریعت پیر سے بیعت کرنے کے علاوہ کوئی اکسیر نسخہ موجود نہیں، تاہم متقی ہونے کے باوجود صاحبِ نسبت نہ ہونا اس کے لیے موجبِ تفسیق نہیں، اس لیے صاحبِ نسبت مقتدی کی اقتداء بغیر کسی کراہیت کے غیر بیعت شدہ امام کے پیچھے جائز ہے ۔ فقہاء نے وجوہاتِ ترجیح میں بیعت کرنا نہیں لکھا ہے۔

قال الحصکفیؒ : والاحق بالامامة الاعلم باحکام الصلوٰة ثم الاحسن تلاوة للقرأة ثم الاورع ای الاکثر اتقاء للشبہات والتقوٰی اتقاء المحرمات ثم الاسن ثم الاحسن خلقاً ثم الاحسن وجھاً ثم الاشرف نسباً ثم الانظف ثوباً۔

(الدرالمختار علیٰ صدر ردّالمختار ج ۱ ص۵۵۷ باب الامامۃ) [2]

معذور کی امامت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص وضو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے شرعی معذور ہے اور حاضرین میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں جو متشرع ہو کہ وہ جماعت کرا سکے، کیا ایسی صورت میں معذور امام کی اقتداء جائز ہے یا اس کی جگہ کسی داڑھی منڈے کو جماعت کے لیے آگے کیا جائے؟

---

[1] قال الحصکفیؒ: (لا یصح اقتداء رجل بامرأة) وخنثٰی (وصبیّ مطلقاً) ولو فی جنازة ونفل علی الاصح۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردّالمختار ج ۱ ص۵۷۶ باب الامامة)
ومثلہٗ فی البحرالرائق ج ۱ ص۳۵۹ باب الامامة۔

[2] وفی الھندیة اولٰی بالامامة اعلمہم باحکام الصلاة ھٰکذا فی المضمرات وھو الظاھر ھٰکذا فی التبیین: ھٰذا اذا علم من القرأة قدر ما تقوم بہ سنة القرأة ھٰکذا فی البحرالرائق ھٰذا اذا علم من القرأة۔ (الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۸۳ باب الامامة الفصل الثانی فی بیان من ھو احق بالامامة)

الجواب:۔ معذور امام تندرست اور غیر معذور مقتدیوں کو عذر کے ہوتے ہوئے نماز نہیں پڑھا سکتا، ایسی حالت میں بوقتِ ضرورت فاسق و فاجر کی اقتدا جائز ہے اس لیے داڑھی منڈے کو نماز کے لیے آگے کیا جا سکتا ہے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی المجتبٰی وھٰذہ الکراھۃ تنزیھیۃ لقولہ فی الاصل امامۃ غیرھم احب الیّ وھٰکذا فی معراج الدرایۃ وفی الفتاوٰی لو صلی خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعۃ لکن لاینال کما ینال خلف تقی ورع لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف نبی۔

وفیہ: وفی السراج الوھاج: فان قلت فما الافضلیۃ ان یصلی خلف ھٰؤلاء اوالانفراد قیل اما فی حق الفاسق فالصلوٰۃ خلفہ اولٰی لما ذکر فی الفتاوٰی۔

(البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۹ باب الامامۃ)

قال الحصکفیؒ: (ولا طاھر بمعذور) ھٰذا ان قارن الوضوء الحدث او طرأ علیہ) بعدہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۵۷۸ باب الامامۃ) [1]

گانا سننے والے امام کی اقتدا کا حکم

سوال:۔ ایک امام خود گانا سنتا ہو اور اس میں غلو کرکے بسا اوقات مستورات کے گیت گانے کو جائز قرار دیتا ہو، دلیل میں شادی بیاہ کے موقعہ پر دف کے جواز سے استدلال کرتا ہو اور یہ بھی کہتا ہو کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی ان عورتوں کے ساتھ مل کر گیت گاؤں، یہ عورتیں بہت ہی اچھا گاتی ہیں، شرعاً ایسے شخص کی امامت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شادی بیاہ میں مشروط تغنی سے مطلقاً گانے سننے پر استدلال کرنا قواعدِ شرعیہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے، موجودہ دور میں بے حیائی اور بے دینی کے واقعات سے بھرے ہوئے گانے شادی بیاہ میں ہوں پھر بھی ناجائز ہے۔ موجودہ دور کے مروجہ گانے بے شمار مفاسد کا پیش خیمہ

---

[1] قال ابن نجیمؒ تحت ھٰذا القول (وطاھر بمعذور) ای وفسد اقتداء طاھر بصاحب العذر المفوت للطھارۃ لان الصحیح اقوی حالاً من المعذور والشئ لایتضمن ما ھو فوقہ والامام ضامن بمعنی تضمن صلاتہ صلاۃ المقتدی۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۳۶۷ باب الامامۃ) ومثلہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۸۴ الفصل الثالث فی بیان من یصلح اماماً لغیرہ۔

ہونے کی وجہ سے ان کا سننا ناجائز ہے، ایسی صورت میں کسی امام کا گانے سننا اور پھر اس کے جواز کے لیے مواد مہیا کرنا امورِ فسقیہ میں سے ہے لہٰذا ایسے فاسق وفاجر کی اقتدا مکروہ تحریمی ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ تحت قوله ومن یلعب بالطنبور او یغنی للناس لانه یجمع الناس علی ارتکاب کبیرة کذا فی الهدایة وظاهرہ ان الغناء کبیرة ...... وفی المعراج: الملاهی نوعان محرم وهو الآلات المطربة من غیر الغناء کالمزمار سواء کان من عود او قصب کالشبابة او غیرہ کالعود والطنبور۔ لما روی ابو امامة انه علیه الصلوٰة والسلام قال ان الله بعثنی رحمةً للعالمین وامرنی بمحق المعازف والمزامیر ولانه مطرب مصدٌّ عن ذکر الله تعالیٰ النوع الثانی مباح وهو الدف فی النکاح۔

(البحر الرائق ج ۷ ص ۸۸ باب من تقبل الشهادته ومن تقبل الشهادة) [1]

مقرر امام کی اجازت کے بغیر نماز پڑھانا

سوال:۔ ایک شخص کسی مسجد کا باقاعدہ امام ہے کوئی اور شخص اس کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نماز پڑھانے کے لیے مصلّٰی پر کھڑا ہوجائے تو ایسے شخص کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مقررہ امام کی اجازت کے بغیر کسی شخص کے لیے نماز پڑھانا مکروہ ہے، ایسی صورت میں مقررہ امام کی اقتداء بہتر ہے اگرچہ وہ مفضول ہو۔ تاہم اگر کسی مسجد کا مقررہ امام حاضر نہ ہو اور نہ اس کا کوئی نائب ہو تو ایسی صورت میں متعلقہ امام کی اجازت کے بغیر بھی جماعت کرائی جا سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هٰذا القول۔ صاحب البیت وَمِثْلُهٗ امام المسجد الراتب (اولٰی بالامامة من غیرہ) مطلقاً ای وان کان غیرہ من الحاضرین من هو اعلم واقرأ منه۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۵۵۹ باب الامامة) [2]

---

[1] قال العلامة التورپشتیؒ: انه حرام علی قول اکثر المشائخ وما ورد من ضرب الدف فی العرس کنایة عن الاعلان۔ (امداد الفتاوٰی ج ۲ ص ۲۸۳ کتاب النکاح) وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۳ ص ۴۵۳۔

[2] قال ابن نجیمؒ: واما الامام الراتب فهو احق من غیرہ وان کان غیرہ افقه منه۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۷ باب الامامة) وَمِثْلُهٗ الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص ۸۳ باب الامامة۔

گروپ فوٹو بنوانے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے چند دوستوں کے درمیان بیٹھ کر شوقیہ تصاویر بنوا تا ہے اور پھر اس گروپ فوٹو کو بطور یادگار اپنے پاس رکھنے کے علاوہ دوستوں میں بھی تقسیم کرتا ہے جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ گویا یہ عمل اس کے نزدیک جائز ہے۔ کیا ایسے امام کو امامت پر باقی رکھا جا سکتا ہے یا اس کو معزول کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ بلاضرورت کسی ذی روح کی تصویر بنانا عندالشرع غیر مشروع ہے چاہے کیمرہ سے بنائی جائے یا قلم سے، تاہم ضروریات اس سے مستثنیٰ ہیں، بلاضرورت اس کا ارتکاب امورِ فِسقیہ میں سے ہے، خاص کر جب کوئی امام اعلانیہ طور پر ان امورِ فِسقیہ کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ان معاصی پر اصرار کے باوجود اگر اس کے معزول کرنے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو پھر بوجہ مجبوری اس کو باقی رکھا جا سکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہوگا کہ کسی نیک امام کی اقتداء کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکنے کی وجہ سے ایک شخص کو امامت کرانے سے روک دیا تھا۔ تاہم یہ شخص اگر توبہ کرے اور اس کام کو گناہ سمجھتا ہو اور اس پر اصرار نہ کرتا ہو تو پھر اس کی اقتداء میں کوئی حرج نہیں۔

عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون۔ (مشکوٰۃ ص۳۸۵ باب التصاویر الفصل الاول)

قال ابن عابدینؒ: (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی واکل الربوٰ و نحو ذلک کذا فی البرجندی (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامۃ) [1]

امام کے لیے محراب میں کھڑے ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا امام کے لیے بوقتِ جماعت محراب میں کھڑے ہونا ضروری ہے؟ اگر کوئی امام مسجد کے صحن میں بغیر محراب کے کھڑا ہو جائے تو اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟ ہمارے علاقہ میں بعض لوگ شدت کے اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں کہ محراب کے بغیر اگر امام نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہو جائے تو

---

[1] وفی الھندیۃ تجوز امامۃ الاعرابی والاعمیٰ والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصۃ الا انہا تکرہ ھکذا فی المتون۔ (فتاویٰ ھندیۃ ج ۱ ص۸۵ باب الامامۃ)

[2] ومثلہ فی الخلاصۃ ج ۱ ص۱۴۵ الفصل الخامس عشر فی الامامۃ والاقتداء۔

اس کو ملامت کرتے ہیں، شرعاً اس مسئلہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: امامت کے لیے محراب میں کھڑا ہونا کوئی مستقل سنت نہیں ہے کہ جس کے بغیر امامت ادھوری رہ جائے، حقیقت میں امام کے لیے یہ سنت ہے کہ وہ صف کے آگے وسط میں کھڑا ہو جائے، چونکہ محراب سے عموماً توسط کی نشاندہی ہوتی ہے اس لیے سنت کی ادائیگی کے لیے معاون ہونے کی وجہ سے مساجد میں محراب بنائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ محراب میں طاق بنانا بھی ضروری نہیں۔ لیکن اگر امام کسی محراب کے بغیر صف کے آگے وسط میں کھڑا ہو تو اس کی اقتداء کرنے میں کوئی حرج نہیں، ایسی صورت میں محراب کو چھوڑنے والے کو ملامت کرنا زیادت علی الشرع کے مترادف ہے۔

قال ابن عابدینؒ: یفهم من قوله اولی ساریة کراهة قیام الامام فی غیر المحراب ویؤیده قوله قبله السنة ان یقوم فی المحراب وکذا قوله فی موضع اٰخر السنة ان یقوم الامام ازاء وسط الصف الا تری ان المحاریب مانصبت الا وسط المساجد وهی قد عینت لمقام الامام۔ والظاهر ان هذا فی الامام الراتب لجماعة کثیرة للئلا یلزم عدم قیامه فی الوسط فلو لم یلزم ذٰلك لا یکره تأمل۔ (ردالمحتار ج۱ ص۵۶۸ مطلب فی کراہیۃ الامام فی غیر المحراب)

قال الحصکفیؒ: (ویصف) ای یصفهم الامام بان یامرهم بذٰلك قال الشمنی وینبغی ان یامرهم بان یتراصوا ویسدوا الخلل ویسووا مناکبهم یقف وسطاً وخیر صفوف الرجال اولها۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۱ ص۵۶۸ باب الامامة) [1]

امامت پر اجرت لینے والے کی اقتداء

سوال: کیا ایک مالدار شخص امامت پر اُجرت لے سکتا ہے؟ ایسی صورت میں اگر بغیر کسی اجرت کے امام کی اقتداء میسر ہو تو کون سے امام کی اقتداء بہتر رہے گی؟

الجواب: متاخرین فقہاء نے اُجرت علی الامامت کی اجازت دی ہے لہٰذا مالدار اور فقیر دونوں قسم کے ائمہ منصب امامت پر اُجرت مقرر کر کے وصول کر سکتے ہیں، اُجرت کے جواز کی

---

[1] وفی الهندیة: ینبغی للامام ان یقف بازاء الوسط فان وقف فی میمنة الوسط او فی میسرته فقد اساء لمخالفة السنة هٰکذا فی التبیین۔ (ج۱ ص۸۹ باب الامامة)
ومثلهٗ فی الطحطاوی ج۱ ص۱۶۷ باب الامامة۔

صورت میں بلا اجرت نماز پڑھانے والے امام کو ترجیح حاصل نہیں، لہٰذا دونوں کی اقتداء کا حکم ایک ہے۔

قال ابن عابدین: ویفتی الیوم بصحتھا لتعلیم القرآن والفقہ والامامۃ والاذان ویجبرالاجر علیٰ دفع ما قیل۔ (ردالمحتار ج ۵ ص۳۴ باب اجارۃ الفاسدۃ)[۱]

نابینے کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص پہلے بینا تھا لیکن کسی عارضہ کی وجہ سے وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گیا، اس کے بعد وہ اپنے آپ کو کامل طہارت کی حالت میں نہیں رکھ سکتا، اکثر اس کے کپڑے بوجہ عدم علم ہونے کے ناپاک ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی وہ قبلہ کی تمیز بھی نہیں کر سکتا، قبلہ کے تعین کے لیے اسے دوسرے شخص سے مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے اور منصب امامت پر یہ قائم رہ سکتا ہے جبکہ اس سے بہتر عالم بھی آسانی سے مل سکتا ہے؟

الجواب:۔ نابینا اگر نجاست سے بچنے پر قادر نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، لیکن ہر نابینے کو غیر محتاط سمجھنا عقلمندی نہیں، جو نابینا نجاست سے بچنے کا انتظام کر سکتا ہو تو پھر اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتومؓ کو مدینہ منورہ کا امام بنایا تھا حالانکہ وہ نابینا تھے۔ بلکہ اگر کوئی نابینا دوسروں سے اعلم اور اقراء ہو تو پھر اس کی امامت دوسروں سے افضل ہے۔

وقال ابن نجیمؒ: وقید کراھۃ امامۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضلھم فھو اولیٰ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۳۴۸ باب الامامۃ)[۲]

زبان میں لکنت والے کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ہماری مسجد کے امام صاحب کی زبان میں لکنت ہے الفاظ صحیح طریقہ سے ادا نہیں کر سکتے اور اکثر الفاظ میں غلطی کر جاتے

---

[۱] قال صاحب الھدایۃ: وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علیٰ تعلیم القرآن الیوم لانہ ظھر التوانی فی الامور الدینیۃ ففی الامتناع یضیع حفظ القرآن وعلیہ الفتویٰ۔ (باب اجارۃ الفاسدۃ ج ۳ ص۳۰۱)
ومثلہٗ فی فتاویٰ الھندیۃ ج ۴ ص۴۴۸ الفصل الرابع فی فساد الاجارۃ۔

[۲] قال ابن عابدینؒ: قال فیہ کراھۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضلھم فھو اولیٰ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامۃ)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۸۵ باب الامامۃ۔ الفصل الثالث فی بیان من یصلح اماما لغیرہ۔

جاتے ہیں، کیا ایسے امام کی اقتداء درست ہے ؟

الجواب:۔ جس شخص کی زبان میں لکنت ہو اور باوجود کوشش کے الفاظ درست ادا نہ کر سکتا ہو تو اس کے اپنے حق میں تو نماز درست ہے البتہ ان لوگوں کا امام نہیں بن سکتا جن کی زبان درست ہو (یعنی اس میں لکنت نہ ہو) تاہم اگر امام صاحب باوجود لکنت کے الفاظ کو صحیح ادا کر سکتے ہوں اگرچہ اٹک اٹک کر ادا کریں تو ان کی اقتداء صحیح ہے۔

ولا یجوز امامۃ الالثغ الذی لا یقدر علی التکلم ببعض الحروف الا لمثلہ اذا لم یکن فی القوم من یقدر علی التکلم بتلک الحروف فاما اذا کان فی القوم من یقدر علی التکلم بہا فسدت صلوتہ وصلوۃ القوم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۸۶ باب الامامۃ، الفصل الثالث فی بیان من یصلح اماماً لغیرہ۔

قاری کی موجودگی میں غیر قاری کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ کسی مقام میں عالم فاضل و قاری کے ہوتے ہوئے اُمّی اور جاہل شخص نماز پڑھائے جبکہ وہ قرأۃ پر بھی قادر نہ ہو، ایسی صورت میں کیا اس کا نماز پڑھانا جائز ہے ؟

الجواب:۔ عرف میں قاری کا اطلاق مجوّد پر ہوتا ہے لیکن فقہاء کی اصطلاح میں اس سے یہ مراد نہیں۔ اگر فن قرأۃ سے باخبر قاری کسی ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھے جو عام قرأۃ پر قادر ہو لیکن فنِ قرأت سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتا ہو تو اس سے اُس کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسی حالت میں اگر مروّج قاری کے علاوہ غیر قاری امام ہو تو مجوّد قاری امام کی اجازت کے بغیر نماز نہیں پڑھا سکتا، تاہم اگر کوئی شخص قدر ما یجوز الصلوٰۃ آیتوں کی قرأت پر قادر نہ ہو تو قاری کی موجودگی میں ایسے شخص کی اقتداء جائز نہیں۔

امامۃ الامی قوماً امیین جائزۃ کذا فی السراجیۃ اذا أم امی امیاً وقارئاً فصلوۃ الجمیع فاسدۃ عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ وقال لا صلوۃ القاری وحدہ واما اذا صلّوا وحدانا فقیل انہ علی الخلاف وقیل یصح وھو الصحیح۔

لہ امامۃ الالثغ لغیرہ ذکر الامام الفضلی انہ یجوز لان ما یقول صار لغۃ لہ وقال غیرہ صحیح (خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۱۴۸ باب الامامۃ۔ الفصل الخامس عشر)

ومثلہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۵۸۰ باب الامامۃ۔

هٰكذا في شرح مجمع البحرين للمصنّف ۔ (الهندية ج ا ص۸۵ باب الامامة الفصل الثالث في بيان من يصلح اماماً لغيره) ؎۱

ایک مسجد میں متعدد امام ہونا

سوال :۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں تین امام ہیں؛ ان میں سے ایک امام نے ۱۵ امام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ حضرت تھانوی نے بہشتی زیور کے حصہ یازدہم ص۵۳/۸۰۳ میں لکھتے ہیں کہ ایک مسجد میں ایک امام کے ہوتے ہوئے دوسرے امام کو بغیر اذن کے جماعت کرانے کا استحقاق نہیں اور حوالہ دُرِ مختار کا دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک مسجد میں کتنے امام ہو سکتے ہیں اور اگر نہ ہو سکیں تو کیا وجوہات ہیں؟

الجواب :۔ بہتر یہی ہے کہ ایک مسجد میں ایک ہی امام ہو اور اسی پر سب اہلِ محلہ اتفاق کریں اور اسی پر اُمت کا تواتر چلا آرہا ہے، اور جب تک امامِ مقرر موجود ہو تو اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو امامت کرنے کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ: واعلم ان صاحب البیت ، وَمِثْلُهٗ امام المسجد الراتب (اولیٰ بالامامة من غیرہ) مطلقاً ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر رد المحتار ج ا ص۵۵۹ باب الامامۃ) ؎۲

اگر اہلِ محلہ نے پہلے سے کوئی امام مقرر نہیں کیا ہے اور یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ دو یا تین یا اس سے زیادہ امام رکھیں تو عندالشرع جائز ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایک وقت میں دو یا متعدد جماعتیں نہ ہوں ورنہ سب لوگ گنہگار ہونگے۔

دوسرے مسلک کے مطابق نماز پڑھانا

سوال :۔ میں ایک ایسے مقام پر امام ہوں جہاں کے تمام لوگ شافعی ومالکی مذہب کے ہیں، کیا میں اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک پر نماز پڑھا سکتا ہوں، مثلاً رفع یدین، آمین بالجہر اور فجر کی نماز میں دُعائے پڑھوں، عندالشرع اس کا کیا حکم ہے؟

؎۱ ولا یصح اقتداء القاری بالامی ۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۱۴۶ الفصل الخامس عشر فی الامامة)۔ وَمِثْلُهٗ فی الدرالمختار علیٰ صدر رد المحتار ج ا ص۵۷۹ باب الامامة ۔

؎۲ قال ابن نجیمؒ: اما الامام الراتب فهو احق من غیرہ وان کان غیرہ افقه منه ۔ (البحرالرائق ج ا ص۳۴۴ باب الامامة) وَمِثْلُهٗ فی الهندیه ج ا ص۸۳ باب الامامة ۔

الجواب:۔ اپنے مذہب کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر بغیر کسی دلیل کے اسے ترک کرنا شرعاً جائز نہیں بلکہ فقہاء کرام نے ایسے شخص پر تعزیر کا حکم لگایا ہے، لہٰذا ایسے مقام میں حنفی مسلک کو لالچ کی خاطر چھوڑ کر دوسرے مسلک پر نماز پڑھانا قبیح عمل ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: ارتحل الیٰ مذھب الشافعیؒ یعزر۔ قال ابن عابدینؒ: ای اذا کان ارتحاله لا لغرض محمود شرعاً اما انتقال غیرہ من غیر دلیل بل لما یرغب من عرض الدنیا وشھوتھا فھو المذموم الاٰثم المستوجب للتادیب والتعزیر لارتکابه المنکر فی الدین واستخفافه بدینه ومذھبه اھ ملخصاً۔ وفیھا عن الفتاویٰ النسفیة الثبات علیٰ مذھب ابی حنیفة خیر واولیٰ قال وھٰذہ الکلمة اقرب الی الالفة۔ (ردّالمختار ج ۳ ص۲۰۹ باب التعزیر) [1]

وضو کے بارے میں شک کی حالت میں نماز پڑھانا

سوال:۔ وضو کرنے کے بعد مجھے وضو میں شک رہتا ہے اور اس بات پر یقین نہیں ہوتا کہ میرا وضو باقی ہے یا ختم ہو گیا، لیکن لوگ مجھے نماز پر مجبور کرتے ہیں کیا اس شک کی حالت میں نماز پڑھا سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ معذور شخص امامت کے لائق نہیں، آپ امامت سے اجتناب کرنا چاہیئے، لیکن صرف شک کی بنیاد پر امامت کا ترک کرنا بھی مناسب نہیں، البتہ جب یقین ہو جائے اور اس کے قرائن بھی موجود ہوں کہ وضو ٹوٹ گیا ہے تو پھر ایسی صورت میں امامت جائز نہیں، تاہم شک اور تردد کی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا وجد احدکم فی بطنه شیئاً فاشکل علیه اخرج منه شیٔ ام لا فلا یخرجن من المسجد حتیٰ یسمع صوتاً او یجد ریحاً۔ (رواہ مسلم) مشکوٰۃ ج ۱ ص۴۵ باب ما یوجب الوضوء۔ [2]

---

[1] حنفی ارتحل الیٰ مذھب الشافعی رحمه اللہ تعالیٰ یعزر کذا فی جواھر الاخلاطی قال الصحیح قوله ارتحل الیٰ مذھب الشافعی یعزر ای اذا کان ارتحاله لا لغرض محمود شرعاً کما افادہ فی التاتارخانیة۔ (الفتاویٰ الھندیة ج ۲ ص۱۶۹ فصل فی التعزیر)

[2] عن عباد بن تمیم عن عمه انه شکی ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الرجل الذی یخیل الیه انه یجد فی الصلوٰۃ فقال لا ینفتل اولا ینصرف حتی یسمع صوتاً او یجد ریحاً۔ (بخاری ج ۱ ص۲۵ کتاب الوضوء باب لا یتوضؤ من شک حتی) ومثله فی المسلم ج ۱ ص۱۵۸ باب طھارۃ جلود المیتة۔

فطری طور پر مفقود اللحیۃ کی امامت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے اور اُس کی عمر تقریباً ۲۲ سال ہے لیکن فطری طور پر اُس کی داڑھی نہیں، کیا ایسے امام کی اقتداء درست ہے؟

الجواب:۔ اگر مدتِ بلوغ گزرنے کے باوجود بھی کسی کی داڑھی نہ آئے تو اس کی اقتداء جائز ہے، البتہ اگر صبیح الوجہ ہو تو پھر اس کی اقتداء مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله وکذا تکرہ خلف امرد) الظاهر انها تنزیهیة ایضاً والظاهر ایضاً کما قال الرحمتی ان المراد به الصبیح الوجه لانه محل الفتنة وهل یقال هنا ایضاً اذا کان اعلم القوم تنتفی الکراهة فان کانت علة الکراهة خشیة الشهوة وهو الاظهر فلا وان کانت غلبة الجهل او نفرة الناس من الصلوٰة خلفه فنعم فتامل۔ والظاهر اذا العذار الصبیح المشتهی کالامرد تامل۔ هذا وفی حاشیة المدنی عن الفتاوٰی العفیفة۔ سئل العلامة الشیخ عبد الرحمٰن ابن عیسٰی المرشدی عن شخص بلغ من السن عشرین سنة وتجاوز حد الانبات ولم ینبت عذاره فهل یخرج بذٰلک عن حد الامردیة وخصوصاً قد نبت له شعرات فی ذقنه تؤذن بانه لیس من مستدیری اللحی فهل حکمه فی الامامة کالرجال الکاملین ام لا اجاب سئل العلامة الشیخ احمد بن یونس المعروف بابن الشلبی من متاخری علماء الحنفیة عن هٰذه المسئلة فاجاب بالجواز من غیر کراهة وناهیک به قدوة۔ واللّٰه اعلم۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۶۲ باب الامامة)[1]

امام کے لیے ضروری صفات

سوال:۔ ایک امام کون کون سی صفات کا حامل ہونا چاہیئے جن کے نہ ہونے کی صورت میں وہ اس عظیم منصب کا اہل نہ ہو؟

الجواب:۔ امام علم اور تقوٰی کی صفات سے جتنا زیادہ مزین ہو تو یہ خصوصیت متصور ہوگی، تاہم عمومی طور پر امام کے لیے مندرجہ ذیل صفات سے متصف ہونا ضروری ہے: (۱) اسلام

---

[1] قال فی الخلاصة وفی شرح القدوری یجوز امامة الامرد واذا کان بالغاً ویکره اذا کان صبیح الوجه۔ (خلاصة الفتاوٰی ج ۱ ص۱۴۸ الفصل الخامس عشر فی الامامة والاقتداء)

(۲) بلوغ (۳) عقل (۴) مرد ہونا (۵) علم وقرأت (۶) اعذار سے سلامت ہونا۔

قال ابن عابدینؒ: وشروط الامامة للرجال للاصحاء ستة اشياء الاسلام والبلوغ والعقل والذكورة والقراءة والسلامة من الاعذار كالرعاف والفأفأة والتمتمة واللثغ۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص۵۵ باب الامامة) [1]

سودی رقم سے تنخواہ لینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال: ایک شہر کے سٹیٹ بنک کے احاطہ میں ایک مسجد ہے جو کہ سٹیٹ بنک کی ملک میں ہے، اگر کوئی شخص اس بنک کا ملازم ہو یا فقط اس مسجد کا امام ہو، جبکہ سٹیٹ بنک کا کاروبار من کل الوجوہ سُود پر ہے اور امام صاحب کو بھی اسی سُود کے پیسوں سے تنخواہ دی جاتی ہے، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

الجواب: مسجد کی امامت کرنا فی ذاتہ اس میں کوئی امر غیر مستحسن نہیں البتہ ایسی مسجد کی امامت باُجرت کرنا جس کی اُجرت سود کے کاروبار سے دی جائے، جو حرام خوری کی وجہ سے فسق ہے اور بوجہ فسق ہونے کے ایسے امام کے پیچھے اقتداء کرنا مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت هٰذا القول (ويكره امامة عبد واعرابي وفاسق واعمى) (قوله فاسق) اى من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر والزاني واكل الربا ونحو ذٰلك۔

(ردّ المحتار ج ۱ ص۵۶ باب الامامة) [2]

البتہ اگر اس امام کو اجرت بنک کے اموال میں سے نہ دی جاتی ہو بلکہ کسی اور ذریعہ سے ملتی ہو مثلاً قریب کے محلہ والے اپنی جانب سے دیتے ہوں تو اقتداء بلاکراہت جائز ہے۔

---

[1] قال الشرنبلالیؒ شروط صحة الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء الاسلام وهو شرط عام فلا تصح امامة منكر البعث او خلافة الصديق او صحبته او يسب الشيخين او ينكر الشفاعة الى اخره۔ (مراقي الفلاح على حاشية الطحطاوي ص۱۵۶ باب الامامة)

[2] وفي الهندية تجوز امام الاعرابي والاعمى والعبد وولد الزنا والفاسق كذا في الخلاصة الا انها تكره هكذا في المتون۔ (فتاوىٰ هندية ج ۱ ص۸۵ الفصل الثالث، باب الامامة) ومثله في خلاصة الفتاوىٰ ج ۱ ص۱۴۵ الفصل الخامس عشر في الامامة۔

سرخ کپڑے پہننے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک امام مسجد سرخ کپڑوں کا استعمال کرتا ہے اور انہی کپڑوں میں نماز بھی پڑھاتا ہے تو کیا ان کپڑوں میں اس امام کی اقتداء صحیح ہے؟

الجواب:۔ سرخ کپڑوں کے پہننے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض اس کے جواز کے قائل ہیں اور بعض اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور احناف میں بھی یہی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے لہٰذا اس بنیاد پر نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اس لیے ایسے شخص کی اقتداء جائز ہے۔ تاہم اگر سرخ کپڑے پہننے میں کسی لادین جماعت سے اپنی وابستگی کا اظہار مقصود ہو تو اللہ کے دربار میں ایسی امتیازی حیثیت رکھنے والے شخص کی اقتداء سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

عن براء قال ما رأیت عن ذی لمة فی حلة حمراء احسن من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم له شعر یضرب منکبیه بعید ما بین المنکبین لم یکن بالقصیر ولا بالطویل۔ (ترمذی ج ۱ ص۳۰۲ ابواب اللباس، باب ما جاء فی الرخصة فی الثوب الاحمر

قال شمس الائمة السرخسی وفیه دلیل انه لا بأس بلبس الثوب الاحمر (شرح السیر الکبیر ج ۱ ص۱۱۵ باب السلام والعروسیة) [1]

باپ کا جنازہ نہ پڑھنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک امام مسجد اپنے والدین سے بوجۂ دنیاوی معاملات ناراض ہے اور اس ناراضگی کی بناء پر اس کے دوسرے بہن بھائی بھی اُس سے لاتعلق ہوں، پھر اس امام نے اپنے والد کے مرض الوفات میں نہ تو اس کی عیادت کی اور نہ دوسرے بھائیوں کے ڈر کی وجہ سے اس کی نماز جنازہ میں شرکت کی، تو اُس کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ والدین سے ناراض ہونا امرِ قبیح ہے، پھر ان کی عیادت اور جنازہ میں شریک

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ (ولا بأس بسائر الالوان) وفی المجتبیٰ والقهستانی وشرح النقایة لابی المکارم لا بأس بلبس الثوب الاحمر ومفاده ان الکراهیة تنزیهیة لکن صرح فی التحفة بالحرمة فافاد انها تحریمیة وهی المحمل عند الاطلاق۔
(رد المحتار ج ۶ ص۳۵۸ کتاب الکراهیة، فصل فی اللبس۔ ومثلهٗ فی فتاویٰ هندیة ج ۵ ص۳۳۲۔

نہ ہونا یہ اقبح القبائح ہے، لیکن اگر کسی شرعی امر اور جائز کام کی وجہ سے بیٹا اپنے باپ سے ناراض ہو تو اس کے پیچھے اقتداء درست ہے، البتہ اگر وہ کسی غیر شرعی امر یا شرعی امور میں حد سے تجاوز کرکے باپ کے حق میں کوتاہی کرتا ہے تو بوجہ فسق ہونے کے اس کی اقتداء مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذا القول (ویکرہ امامۃ عبد واعرابی وفاسق واعمیٰ) ای من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی و اکل الربا ونحو ذٰلک۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص۵۶۰) [1]

غیر مسلم کی اقتداء میں پڑھی ہوئی نمازوں کا حکم

سوال: ۔ایک شخص عرصہ دراز تک کسی مسجد کا امام رہا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص اپنے عقائد کے لحاظ سے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، کیا ایسے شخص کے پیچھے پڑھی ہوئی نمازوں کا لوٹانا واجب ہے؟

الجواب: ۔کسی شخص کی اقتداء کرتے وقت اس کے عقائد کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہوں اور بعد میں اس کے کفر کے بارے میں یقین ہوجائے تو پڑھی ہوئی نمازوں کے بارے میں احتیاط یہ ہے کہ وہ نمازیں دوبارہ پڑھی جائیں۔

وفی الھندیۃ: رجل ام قوماً شھراً ثم قال کنت مجوسیًا فانہ یجبر علی الاسلام ولا یقبل قولہ وصلوٰتہم جائزۃ ویضرب ضرباً شدیداً وکذا لوقال صلیت بکم مدۃ علی غیر وضوء وھو ماجن لا یقبل قولہ وان لم یکن کذٰلک واحتمل انہ قال علیٰ وجہ التورع والاحتیاط اعادوا صلوٰتہم وکذا اذا قال کان فی ثوبی قذر کذا فی الخلاصۃ وکذا اذا بان ان الامام کافر او مجنونٌ او امرأۃ او خنثیٰ الی آخرہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۸۷) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ تجوز امامۃ الاعرابی والاعمیٰ والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصۃ الا انہا تکرہ ھکذا فی المتون۔ (فتاوی ہندیۃ ج۱ ص۸۵ باب الامامۃ الفصل الثالث) ومِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص۱۴۵)

[2] قال الحصکفیؒ (واذا ظھر حدث امامہ) وکذا کل مفسد فی رای مقتد (بطلت فیلزم اعادتھا) لتضمنھا صلوٰۃ المؤتم صحۃ وفساداً (کما یلزم الامام اخبار القوم اذا امھم وھو محدث او جنب) او فاقد شرط او رکن وھل علیہم اعادتھا ان عدلا نعم والا ندبت وقیل لا لفسقہ باعترافہ ولو زعم انہ کافر لم یقبل منہ لان الصلوٰۃ دلیل الاسلام واجبر علیہ (بالقدر الممکن) بلسانہ او ریکتاب او رسول علی الاصح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۱ ص۳۴۰ باب الامامۃ)۔ ومِثْلُہٗ فی الخلاصۃ ج ۱ ص۱۴۵ الفصل الخامس عشر

صاحبِ علم کے ہوتے ہوئے چند پاروں کے حافظ کی اقتداء

سوال:۔ ایک شخص چند پاروں کا حافظ ہے صاحبِ علم کے ہوتے ہوئے وہ امامت کا حقدار ہے یا نہیں ؟

الجواب: امامت کے لیے مستقل علومِ دینیہ سے فراغت ضروری نہیں جب قرأت پر قدرت رکھنے کے بعد نماز کے مسائل سے واقف ہو تو عالمِ دین کے ہوتے ہوئے اس کی اقتداء میں کوئی حرج نہیں، البتہ بہتر یہ ہے کہ عالمِ دین امامت کرائیں بشرطیکہ موصوف حافظ مسجد کا مستقل امام نہ ہو۔

قال ابن عابدینؒ: وشروط الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء الاسلام والبلوغ والعقل والذكورة والقرأة والسلامة من الاعذار كالرعاف والفأفأة والتمتمة واللثغ۔ (رد المحتار على الدر المختار ج ۱ ص۵۵۰ باب الامامة) [1]

عورتوں کی جماعت کا حکم

سوال:۔ عورتوں کی مستقل جماعت کا کیا حکم ہے ؟ اگر کہیں جماعت کا اتفاق ہو جائے تو امامت کرانے والی عورت کہاں کھڑی ہوگی ؟

الجواب:۔ صرف عورتوں کی مستقل جماعت مکروہ تحریمی ہے، اس کے باوجود بھی اگر عورتیں باجماعت نماز پڑھنا چاہیں تو امامت کرانے والی عورت درمیان میں کھڑی ہوگی مردوں کی طرح صف کے آگے نہیں رہے گی اور اگر عورت مرد امام کی طرح صف کے آگے کھڑی ہوگی

---

[1] قال الشرنبلالیؒ: شروط صحة الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء (الاسلام) وهو شرط عام فلا تصح امامة منكر البعث او خلافة الصديقؓ او صحبته او يسب الشيخين او ينكر الشفاعة او نحو ذلك من يظهر الاسلام مع ظهور صفة المكفرة له (والبلوغ) لان صلوٰة الصبی نفل ونفله لا يلزمه (والعقل) لعدم صحة صلاته بعدمه كالسكران (والذكورة) خرج به المرأة للامر بتاخيرهن والخنثی امرأة فلا يقتدی به غيرها (والقراءة) بحفظ آية تصح بها الصلوٰة على الخلاف (و) السادس (السلامة من الاعذار) فان المعذور صلوٰته ضرورية فلا يصح اقتداء غيره به۔ (مراقی الفلاح على حاشية الطحطاوی ص۱۵۶ باب الامامة)

تو یہ گناہ ہے، تاہم علامہ عینیؒ، ابن الہمامؒ اور شیخ عبدالحی صاحبؒ وغیرہ کی تحقیق کے مطابق جماعۃ النساء خلافِ اولیٰ ہے۔

قال الحصکفیؒ (و) یکرہ تحریماً (جماعۃ النساء) ولو فی التراویح فی غیر صلوۃ جنازۃ (لانھا لم تشرع مکررۃ (فان فعلن تقف الامام وسطھن) فلو قدمت اثمت۔

(الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۱ ص ۵۶۵ باب الامامۃ)

ولما قال الشیخ ابن الھمامؒ: ولا یخفی ما فیہ وبتقدیر التسلیم فانما یفید نسخ السنیۃ وھو لا یستلزم ثبوت کراھۃ التحریم فی الفعل بل التنزیۃ مرجعھا الیٰ خلاف الاولیٰ۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۷ باب الامامۃ)[۱]

ضعیف امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص ضعف وکمزوری کی وجہ سے نماز میں اٹھنے بیٹھنے میں وقت محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی، کیا شرعاً ایسے امام کی اقتداء جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر ضعف وکمزوری نماز کے کسی رکن کے لیے مُضر نہ ہو تو محض کمزوری کی وجہ سے اقتداء میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر تکبیرات وسلام سننے میں تکلیف ہو تو مکبّر کی تقرری سے اس کا ازالہ ممکن ہے، تاہم خود امام کے لیے چاہیئے کہ وہ یہ ذمہ داری کسی ایسے باصلاحیت شخص کے سپرد کر دے جو اہلِ محلہ کے نزدیک باعتماد ہو۔

قال ابن نجیمؒ: واشار الی ان اقتداء القاعد خلف مثلہ جائز اتفاقاً وکذا الاقتداء بالاعرج أو من بقدمہ عوج وان کان

---

[۱] وفی الھندیۃ: ویکرہ امامۃ المرأۃ للنساء فی الصلوۃ کلھا من الفرائض والنوافل الا فی صلوۃ الجنازۃ ھٰکذا فی النھایۃ۔ فان فعلن وقفت الامام وسطھن وبقیامھا وسطھن لا تزول الکراھۃ وان تقدمت علیھن امامھن لم تفسد صلوتھن ھٰکذا فی الجوھرۃ النیرۃ وصلاتھن فرادی افضل ھٰکذا فی الخلاصۃ ج ۱ ص ۸۵ باب الامامۃ۔ وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۵۱ باب الامامۃ۔

قال العلامۃ العینیؒ:۔ فالاولیٰ ان یصلین وحدھن وان صلین بجماعۃ قامت اماھن وسطھن وان تقدمت جاز۔ (البنایۃ شرح الھدایۃ ج ۲ ص ۳۹۲)

غیرہ اولیٰ۔ (البحرالرائق ج ۱ ص۳۸۷ باب الامامۃ) [1]

پاؤں سے معذور امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ کی مسجد کا امام دونوں پاؤں سے معذور ہے، اٹھنے بیٹھنے میں اس کو دوسرے شخص کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے، تو ایسے شخص کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ امام قاعد (بیٹھا) ہو اور مقتدی کھڑے ہوں تو ایسی صورت میں نماز جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے، البتہ اگر کوئی صحیح سلامت شخص امامت کے لیے نہ ملے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا بہ نسبت انفرادی نماز پڑھنے کے بہتر ہے۔

کما فی الهندیة: ویصح اقتداء القائم بالقاعد الذی یرکع ویسجد لا اقتداء الراکع والساجد بالمومی ھکذا فی فتاوی قاضی خان وفیه ایضاً ولو کان لقدم الامام عوج وقام علی بعضها یجوز وغیره اولیٰ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۸۵ باب الامامة) [2]

پاؤں پر صحیح طریقہ سے کھڑا نہ ہونے والے کی اقتداء

سوال: کسی شخص کے پاؤں میں کوئی تکلیف ہو جس کی وجہ سے وہ صحیح طریقہ سے اٹھنے اور کھڑا ہونے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر پاؤں کی معذوری اس درجہ کی ہو کہ اس پر کھڑا ہونے کی قدرت نہیں رکھتا ہو بلکہ بیٹھ کر نماز پڑھتا ہو تو اس کی اقتداء اس جیسے لوگوں کے لیے جائز ہے، البتہ کھڑے ہونے پر قادر لوگوں کے لیے بیٹھ کر اشارہ کے ساتھ نماز پڑھنے والے کی اقتداء جائز نہیں، البتہ اگر پاؤں میں عذر کی وجہ سے مکمل قیام ممکن نہ ہو لیکن پھر بھی پاؤں کے کچھ حصے یا ایک قدم پر کھڑا ہو سکے تو اس کی اقتداء جائز ہے بشرطیکہ وہ رکوع اور سجدہ پر قدرت رکھتا ہو، تاہم اس کی جگہ کسی صحیح امام کی

---

[1] قال الحصکفیؒ: (وقائم باحدب) وان بلغ حدبه الرکوع علی المعتمد وکذا باعرج وغیرہ اولیٰ۔ (الدرالمختار علی هامش رد المحتار ج ۱ ص۳۶۱ باب الامامۃ)

وَمِثْلُهُ فی الهندیة ج ۱ ص۸۵ باب الامامة۔

[2] قال الحصکفیؒ: (وقائم بقاعد) یرکع ویسجد لانه صلی الله علیه وسلم صلی آخر صلوٰته قاعداً وهم قیام (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۱ ص۳۵۹ باب الامامة وفیه غیرہ اولیٰ)

وَمِثْلُهُ فی البحرالرائق ج ۱ ص۳۸۶ باب الامامة۔

اقتداء بہتر ہے۔

کما فی الهندیة: ویصح اقتداء القائم بالقاعد الذی یرکع ویسجد لا اقتداء الراکع والساجد بالمومی۔ هکذا فی فتاوٰی قاضی خان وفیه ایضًا ولو کان لقدم الامام عوج وقام علی بعضها یجوز وغیرہ اولٰی۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۸۵ باب الامامة) ؎۱

جس امام کے گھر میں شرعی حجاب نہ ہو اس کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے لیکن اس کے گھر میں پردہ کی رعایت کے بغیر عام لوگوں کی آمد و رفت آزادی کے ساتھ رہتی ہو، باوجود قدرت کے موصوف ان لوگوں کو منع بھی نہیں کرتا، تو شرع میں ایسے شخص کی اقتداء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر باوجود قدرت ہونے کے اپنے گھر کی عورتوں کو حجاب پر مجبور نہ کرے اور اس کی عورتیں بے پردگی سے گھومتی پھرتی رہیں اور موصوف باوجود علم اور قدرت کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا تو یہ شخص دیوث اور فاسق کے حکم میں ہو کر اس کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے۔

قال الحصکفیؒ (ویا دیوث) هو من لا یغار علی امرأته او محرمه۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۲ باب التعزیر)

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول (ویکرہ امامة عبد واعرابی وفاسق) ای من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی آکل الربا ونحو ذلك۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۵۶۰ باب الامامة) ؎۲

دیوث کی امامت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص جس کی بیٹی یا بیوی کسی غیر محرم سے ناجائز تعلقات میں مبتلا ہو اور یہ شخص باوجود عالم ہونے کے اس پر خاموشی اختیار

؎۱ قال الحصکفیؒ (وقائم بقاعد) یرکع ویسجد لانه صلی الله علیه وسلم صلّی آخر صلٰوته قاعدًا وهم قیام۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۱ ص۲۳۵ باب الامامة وفیه غیرہ اولٰی۔ ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۶۴ باب الامامة۔

؎۲ وفی الهندیة: تجوز امامة الاعرابی والاعمٰی والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصة الا انها تکرہ هکذا فی المتون ج۱ ص۸۵ باب الامامة) ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۱۴۵۔

کرے اور بسا اوقات بالذات یا بالواسطہ ان کو ملانے میں معاونت بھی کرے، ایسے شخص کی اقتداء کا شرع میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسے بے غیرتی کے افعال پر باوجود قدرت اور طاقت کے خاموش رہنا یا تعاون کرنا امورِ فسقیہ میں سے ہے جس کی اقتداء بوجہ فسق مکروہ تحریمی ہے، اس لیے ایسے شخص کو منصبِ امامت سپرد کرنا اس عظیم منصب کے تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔

قال الحصکفیؒ (دیاثۃ) (دیوث) ھو من لا یغار علی امرأتہ او محرمہ۔
(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص۲۰۲ باب التعزیر)

قال ابن عابدینؒ تحت ھذا القول (ویکرہ امامۃ عبد واعرابی وفاسق) ای من الفسق وھو الخروج من الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی اکل الربا ونحو ذلک۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۵۶۰ باب الامامۃ)[1]

مُردوں کو غسل دینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ مُردوں کو غسل دینے والے امام کی اقتداء کا عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مُردے کو غسل دینا حقوق المسلمین کا ایک شعبہ ہے بذاتِ خود اس میں کوئی تذلیل یا تحقیر نہیں پائی جاتی لیکن اگر کسی علاقہ میں پیشہ ورغسال کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور اس کی تقدیم تنفیرِ جماعت کا سبب بنتا ہو تو پھر ایسے شخص کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے البتہ اگر حقوق المسلمین سمجھ کر بغیر کسی اُجرت کے کوئی شخص کسی مُردے کو غسل دے دے، یا بغیر اجرت کے غسل دینے والے کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہو تو اس سے اس کی شرعی حیثیت متاثر نہیں ہوتی، اندریں صورت ایسے شخص کی اقتداء جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: والافضل ان یغسل المیت (مجانا فان ابتغی الغاسل الاجر جاز ان کان ثمہ غیرہ والا لا۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۱ ص۶۳۴ کتاب الجنائز)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ تجوز امامۃ الاعرابی والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصۃ الا انھا تکرہ ھکذا فی المتون۔ (فتاوی ھندیۃ ج ۱ ص۸۵ باب الامامۃ) ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۱۴۵ ۔

[2] قال المرغینانیؒ: ویکرہ تقدیم العبد ۔۔۔۔ ولان فی تقدیم ھؤلاء تنفیر الجماعۃ فیکرہ ۔
(الھدایۃ ج ۱ ص۱۲۲ باب الامامۃ)

احمد رضا خان کے معتقد کی اقتداء کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کسی مسجد کا امام ہے لیکن عقائد و نظریات کے لحاظ سے احمد رضا خان بریلوی کے مسلک سے تعلق رکھتا ہے، کیا ان عقائد کے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے اقتداء جائز ہے ؟

الجواب :۔ اکثر بریلوی مسلک کے عقائد ایسے نہیں ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتے ہوں، اگر بعض کے ایسے عقائد بھی ہوں تو ان میں بھی تاویل ہو سکتی ہے کیونکہ کفر پر ایمان کی وجوہات کو ترجیح دی جائے گی، البتہ ان عقائد کی وجہ سے یہ مبتدع شمار ہوگا، لہٰذا مبتدع ہونے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی، تاہم احتراز میں احتیاط زیادہ ہے۔

قال الحصکفیؒ (ویکرہ مبتدع) ای صاحب بدعة وھی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لابمعاندة بل بنوع شبھة وکل من کان من قبلتنا (لایکفر بھا)

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۵۶۱ باب الامامة) [1]

غیر شرعی افعال کے مرتکب کی اقتداء کا حکم

سوال :۔ کیا اس شخص کی اقتداء جائز ہے جو کئی ایسے غیر شرعی افعال کا اعلانیہ ارتکاب کر رہا ہو جن کا تعلق اس کی ذات سے ہو مثلاً چوری کرنا، کسی کا حق غصب کرنا، جھوٹ بولنا، غیر محرم عورتوں سے میل جول، بے ریش لڑکوں سے بلا ضرورت اختلاط وغیرہ، اور وہ شرعی احکام کے تقدس اور عظمت کی رعایت بھی نہ کرتا ہو، بے حیائی کی مجالس میں اس کی آمد و رفت ہو، سینما گھروں میں آنا جانا ہو، یہاں تک کہ بعض اوقات سینما گھروں میں رسمی طریقہ پر ختم قرآن بھی کرتا ہو ؟

الجواب :۔ یہ سب کام امور فسقیہ ہیں جب تک اس شخص کا یہ کردار ہو یا اس میں یہ افعال موجود ہوں تو اس کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے، اس کی جگہ کسی نیک شخص کی اقتداء کرنی چاہیئے، البتہ

---

[1] قال ابن نجیمؒ: تحت ھذا القول (واما المبتدع) وعرفھا الشمنی بانھا ما احدث علی خلاف الحق المتلقی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبھة واستحسان وجعل دیناً قویماً وصراطاً مستقیما واطلق المصنف فی المبتدع فشمل کل مبتدع ھو من اھل قبلتنا وقیدہ فی المحیط والخلاصة والمجتبی وغیرھا بان لا تکون بدعتہ تکفرہ فان کانت تکفرہ فالصلاة خلفہ لا تجوز (البحر الرائق ج۱ ص۳۴۹ باب الامامة) ومثلہ فی الھندیة ج۱ ص۸۴ باب الامامة۔

اگر وہ توبہ کرلے تو اسکے بعد اسکی اقتداء میں کوئی حرج نہیں۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذا القول (ویکرہ امامۃ عبد واعرابی وفاسق) ای من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی واکل الربا ونحو ذلک۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۵۶۰ باب الامامۃ) [1]

داڑھی منڈوانے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک حافظ قرآن سال بھر داڑھی منڈاتا ہے صرف رمضان آنے پر نماز تراویح میں قرآن سنانے کے لیے داڑھی رکھ لیتا ہے، اپنی داڑھی منڈوانے کے لیے وہ یہ عذر پیش کرتا ہے کہ ابھی میرے چہرے پر پورے طریقہ سے داڑھی نہیں آئی ہے جب پوری داڑھی آئے گی تو رکھوں گا، فی الحال یہ داڑھی بدنما لگتی ہے، اسی عذر کی بناء پر داڑھی منڈواتا ہوں، کیا عند الشرع ایسے شخص کی اقتداء جائز ہے؟

الجواب:۔ داڑھی خواہ ناقص ہو یا مکمل ہر صورت میں منڈوانا ناجائز اور حرام ہے، داڑھی منڈوانے کے لیے مذکورہ عذر پیش کرنا سنتِ رسولؐ کے مقابلہ میں اپنی خواہش کی تابعداری کے مترادف ہے، ایسے امام کی اقتداء دیگر فساق وفجور کے حکم میں ہو کر مکروہ تحریمی ہے۔ جب رمضان سے قبل اور بعد میں داڑھی نہ رکھتا ہو صرف رمضان میں داڑھی کی حجامت سے باز رہنے کو داڑھی کا رکھنا نہیں کہا جا سکتا ہے، تاہم اگر رمضان سے قبل مستقل طور پر توبہ نکال کر آئندہ کیلئے داڑھی رکھنے اور پھر کبھی نہ منڈوانے کا عزم کرلے تو پھر اس کی اقتداء جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: واما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بانہ لا یھتم لامر دینہ وبان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعاً۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۵۶۰ باب الامامۃ) [2]

****

---

[1] وفی الھندیۃ: تجوز امامۃ الاعرابی والاعمیٰ والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصۃ الا انھا تکرہ ھکذا فی المتون۔ (فتاویٰ ھندیۃ ج ۱ ص ۸۵ باب الامامۃ)

[2] وفی الھندیۃ: تجوز امامۃ الاعرابی والاعمیٰ والعبد وولد الزنا والفاسق کذا فی الخلاصۃ الا انھا تکرہ ھکذا فی المتون۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۸۵ الفصل الثالث فی بیان من یصلح اماماً لغیرہ) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۸ باب الامامۃ۔

امام مسجد کا عشاء کے وتر پڑھے بغیر نماز فجر پڑھانا

سوال:۔ ہماری مسجد کے امام صاحب نے نمازِ عشاء کے وتر نہ پڑھے اور صبح کو علم ہونے کے باوجود کہ میں نے وتر نہیں پڑھے تھے نمازِ فجر کے علاوہ اور بھی نمازوں کی امامت کرائی، ان نمازوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ قضاء شدہ وتر کے یاد آنے کے باوجود امام صاحب نے جو نمازیں پڑھائیں وہ تب فاسد ہوں گی جب قضاء شدہ وتروں کو پانچویں نماز کا وقت ختم ہونے کے اندر اندر قضا کیا ہو، اگر پانچویں نماز کا وقت خارج ہونے کے بعد قضاء شدہ وتر نماز ادا کی ہو تو پھر یہ نمازیں فاسد نہ ہوں گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (فلم یجز) تفریع علی اللزوم (فجر من تذکر أنہ لم یؤتر۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۱ ص۴۸۸ باب قضاء الفوائت مطلب فی تعریف الاعادة)

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفساد اصل الصلوٰة موقوف عند ابی حنیفةؒ سواء ظن وجوب الترتیب، اولا فان کثرت وصارت الفوائت مع الفائتة ستاً ظهر صحتها بخروج وقت الخامسة التی هی سادسة الفوائت الخ وفی رد المحتار: قولہ (فان کثرت) ای الصلوٰة التی صلاها تارکاً فیها الترتیب بان صلاها قبل قضاء الفائتة ذاکراً لها وهذا التفریع لبیان قولہ موقوف وتوضیحہ انہ اذا فاتتہ صلوٰة ولو وتراً فکلما صلی بعدها وقتیة وهو ذاکر لتلک الفائتة فان قضاها بعد ان یصلی بعدها خمس صلوٰة صار الفساد باتاً وانقلبت الصلوٰة التی صلاها قبل قضاء المقضیة نفلاً وان لم یقضها حتی خرج وقت الخامسة وصارت الفواسد مع الفائتة ستاً انقلبت صحیحة لانہ ظهرت کثرتها ودخلت فی حد التکرار المسقط للترتیب وبیان وجہ ذٰلک فی البحر وغیرہ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۴۹۱ باب قضاء الفوائت، تحت مطلب فی تعریف الاعادة) [۱]

---

[۱] وفی الهندیة: فالاصل ان عند ابی حنیفةؒ مراعاة الترتیب بین الفائتة والوقتیة کما تسقط بکثرة الفوائت تسقط بکثرة المؤدی کذا فی المحیط۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۲۲ الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت)

کسی پر بہتان لگانے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر بہتان لگایا کہ تو نے اپنے بھائی کی بیوی سے بُرا فعل کیا ہے، حالانکہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، شرعی اعتبار سے اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ بشرط صحتِ سوال اگر واقعی یہ بہتان ہو اور اس شخص نے توبہ نہ کی ہو تو پھر بہتان لگانے کی وجہ سے یہ شخص فاسق ہو گیا ہے اور صالحین کا اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اکیلے نماز پڑھنے سے کسی فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

لما فی الهندیة: ولو صلّٰی خلف مبتدع او فاسق فهو محرز ثواب الجماعة لکن لا ینال مثل ما ینال خلف تقی کذا فی الخلاصة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۸۴ الفصل الثالث فی بیان من یصلح اماما لغیره) ؎۱

پٹی پر مسح کرنے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کا ہاتھ زخمی ہو اور اس نے اس پر پٹی باندھ رکھی ہو اور وہ وضو کرتے وقت پٹی پر مسح کرتا ہو تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اعذار شرعاً مقبول ہیں، اگر یہ شخص عذر شرعی کی بناء پر پٹی پر مسح کر کے نماز پڑھاتا ہو اور اس زخم سے از خود پیپ وغیرہ نہ بہتی ہو تو فقہی ذخائر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اقتداء درست ہے اور نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الهندیة: ویجوز اقتداء الغاسل بماسح الخف وبالماسح علی الجبیرة وکذا امامة المفتصد لغیره من الاصحاء اذا کان یأمن خروج الدم۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۸۴ فصل فی من یصلح اماماً لغیره) ؎۲

؎۱ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو صلّٰی خلف مبتدع او فاسق فهو محرز ثواب الجماعة لکن لا ینال مثل ما ینال خلف تقی۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۱۵۰ الفصل الخامس عشر فی الامامة والاقتداء)

؎۲ قال العلامة حسن بن عمارؒ: وصح اقتداء غاسل بماسح علی الخف والجبیرة او خرقة قرحت لا یسیل منها شیٔ۔ (مراقی الفلاح مع الطحطاوی ص۱۶۱ باب الامامة)

صدقۃ الفطر جبراً وصول کرنے اور لوگوں کو مسجد سے منع کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ ایک پیش امام نے ایک مولوی صاحب کو اپنی مسجد سے اس سبب سے منع کر دیا کہ وہ بچوں کو قرآن مجید کا درس دے رہے تھے، پیش امام نے مولوی صاحب کا درس قرآن مجید اپنی مسجد میں اس لیے بند کر دیا کیونکہ اسے یہ خدشہ تھا کہ وہ مجھ سے امامت چھین لے گا، اس پر لوگ اُس سے ناراض ہو گئے۔ دوسرا اس کے مقتدیوں کا قول ہے کہ یہ امام دل میں بہت زیادہ بغض رکھتا ہے۔ تیسرا اس کا یہ معمول ہے کہ خواہ کوئی غریب ہو یا امیر سب سے جبراً صدقۃ الفطر وصول کرتا ہے، اگر کوئی نہ دے تو اس کو نماز میں اپنے پیچھے کھڑا ہونے سے منع کر دیتا ہے۔ اب اُس کے اِس سخت رویّہ کی وجہ سے تمام مقتدی اس سے بھاگ گئے ہیں اور صرف دو آدمی اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ کیا ایسے پیش امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو بصورت کراہیت ہے یا عدم کراہیت؟ اور لوگ پیش امام کے اس سخت رویّہ کی وجہ سے اپنی مسجد چھوڑ کر تقریباً تین ماہ سے دوسرے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو کیا وہ گنہگار ہیں یا نہیں؟

الجواب :- شریعت کی رُو سے امام دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جسے محکمہ اوقاف یا خود واقف نے منصبِ امامت پر اُسے مقرر کیا ہو اور وقف کی آمدنی سے اس کے لیے وظیفہ بصورت تنخواہ امامت مقرر کیا گیا ہو، ایسے امام کو فقہائے احناف نے اہلِ وظائف میں شمار کیا ہے۔ اور اس کو وہ امام الحمل اور منصوب الواقف کے ناموں سے ذکر کرتے ہیں اور کبھی اُسے ذو وظیفہ بھی کہتے ہیں، ایسے پیش امام کے بارے میں فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ اُسے شرعی مجرم یا نا اہلی کے بغیر معزول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، فلا یحل للقاضی عزل صاحب وظیفۃ بغیر جنحۃٍ وعدم اھلیۃ ولو لم یصح۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۷)

دوسری قسم کا پیش امام وہ ہے جسے اہلِ محلہ نے امام مقرر کیا ہو اور اہلِ محلہ ہی سے اُسے اپنی آمدنیوں سے تنخواہ بصورت اُجرت امامت دے رہے ہوں تو ایسے پیش امام کو نہ تو اہلِ وظائف میں شمار کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کے عزل کا وہ حکم ہے جو پہلی قسم کے

امام کا ذکراوپر کیا گیا ہے بلکہ اس کی حیثیت محض اجیرِ خاص کی ہے اور قوم کے ساتھ عہدِ امامت ایک عقدِ اجارہ ہے، لہٰذا ایسے پیش امام پر اجیرِ خاص کے اور اس کی امامت پر عقدِ اجارہ کے احکام جاری ہوں گے جس کی تفصیل درج ذیل ہے :-

ابتدائی تقرر : فقہاء کرام نے اس کے ابتدائی انتخاب اور تقرر کے بارے میں یہ تصریحات ذکر کی ہیں کہ اگر قوم اور اہل محلہ سب اس کی امامت پر متفق ہوں تو بلا کسی نزاع کے اسے منتخب کیا جائے گا۔ اور اگر قوم میں اس کے انتخاب کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اکثریت کا اعتبار کیا جائے گا۔

درمختار ج ۱ صـ۵۲۳ میں جہاں احقیت الامامت پر بحث کی گئی ہے وہاں یہ لکھا گیا ہے: والاحق بالامامة تقدیمًا بل نصبًا الاعلم باحکام الصلوٰۃ الخ فان استووا فیقرع اوالخیار الی القوم فان اختلفوا اعتبر اکثرھم ـــ اس عبارت میں صراحۃً یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ نصب الامام میں اگر قوم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اکثریت کی رائے پر عمل کیا جائے گا اور اس کا اعتبار ہوگا۔ یعنی اکثریت اس کے تقرر اور انتخاب پر متفق ہو تو اسے امام منتخب کیا جائے گا ورنہ نہیں ـــ باقی رہا اس کے عزل کا مسئلہ تو اس کے بارے میں مسلمہ قواعد کی روشنی میں شرعی حکم یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کے ابتدائی تقرر اور انتخاب میں اکثریت کی رائے معتبر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر اس کے عزل میں اختلاف واقع ہو جائے تو اکثریت کی رائے کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ اس میں بھی اگر اکثریت اس کے عزل پر متفق ہو تو اسے معزول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوم کے لیے ہر حالت میں پیش امام کو معزول کرنا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی گناہ نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کسی شرعی نقص اور عیب کی وجہ سے اسے معزول کر دیا گیا تو عزل کا فیصلہ بھی نافذ ہے اور اگر اس میں کوئی شرعی عیب بھی نہیں ہے اور اسے ذاتی عناد یا کسی دُنیوی معاملہ کی بنیاد پر معزول کر دیا گیا تو قوم کا یہ اقدام جرم اور شرعاً گناہ ہے مگر عزل کا فیصلہ نافذ ہوگا اور پیش امام کو معزول سمجھا جائے گا، اور کسی فعل کے مجرم اور گناہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے سے نافذ اور کسی درجہ میں معتبر ہی نہ ہو اس لیے فقہاء کے مسلّمات میں بکثرت نظائر موجود ہیں: (۱) قاضی کا کسی فاسق کی شہادت پر فیصلہ کر دینا (۲) افیون کی بیع (۳) قربانی کی کھالوں کی بیع۔ پس اس طرح

شرعی جرم اور نقص کے بغیر اگر قوم نے پیش امام کے عزل کا فیصلہ کر دیا تو اگرچہ قوم اس فیصلہ کی وجہ سے گناہ گار ہوگی مگر عزل کا فیصلہ بہر حال نافذ ہوگا اور پیش امام کو معزول سمجھا جائے گا اس کیلئے فقہاء کے مسلمات کی روشنی میں وجوہات مندرجہ ذیل ہیں :۔

وجہ اوّل: عقد امامت ایک قسم کا عقد اجارہ ہے، اور جب قوم کل یا اس کی اکثریت اس عقد پر امضاء کرنے کے لیے تیار نہ ہو، اور کسی صورت میں اس کو امام نہیں رکھنا چاہتی ہو تو ایسی صورت اور حالت میں ظاہر ہے کہ عقد امامت کا اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، لوگ نماز باجماعت کو یا تو اکثر چھوڑ دیں گے یا ایک ہی مسجد میں بیک وقت دو دو جماعتیں مختلف اماموں سے کرائی جائیں گی اور یہ طرز عمل امامت کے اصل مقصد اور غرض وغایت ہی کے منافی اور جڑ کو کاٹ دینے والا ہے۔ اور ایسے مواقع میں بارہا اس کا مشاہدہ بھی کیا گیا ہے، فساد کا بھی قوی ذریعہ ہے۔

وجہ دوم: اور جب اس اجارے کا اصل مقصد اس صورت میں حاصل نہیں بلکہ فوت ہو جاتا ہے، تو چاہیئے کہ یہ اجارہ فسخ کر کے امام مذکور کو معزول کر دیا جائے اور کسی دوسرے صالح اور دیندار پیش امام کا انتخاب کیا جائے کہ جس پر قوم متفق ہو تاکہ امامت کا اصل مقصد جو کہ اقامت جماعت ہے فوت نہ ہونے پائے ۔۔۔ ایسی صورتوں میں فقہاء کرام نے فسخ اجارہ کی تصریحات کی ہیں، اس کے امثلہ کتب فقہ میں "کتاب الاجارہ" کے عنوان سے موجود ہیں، وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

وجہ سوم: عزل کو ابتدائی تقرر پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کل قوم یا اس کی اکثریت درصورت اختلاف معزول کرنے کی مجاز ہے اور اس کی رائے کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر قوم کی اکثریت پیش امام کی مخالف ہو اور نماز پڑھنا اس کے پیچھے چھوڑ دے تو امام کو امامت کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ قال احمد: اذا کرهه واحد او اثنان او ثلاثة فله ان یصلی بهم حتی یکرهه اکثر الجماعة۔ الخ (مرقاۃ)

احناف نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کوئی اختلاف ظاہر نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم احناف بھی اس کے مخالف نہیں ہیں، نیز فقہاء احناف رحمہم اللہ نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ اگر پیش امام میں کوئی شرعی عیب ہو اور اس

وجہ سے لوگ اس کے پیچھے نماز نہ پڑھتے ہوں تو گناہ امام پر ہے، اور اگر امام میں کوئی شرعی عیب نہ ہو اور مقتدی بلا وجہ اس سے ناراض ہو کر دوسری جگہ نماز پڑھتے ہوں تو گناہ اُن پر ہے۔
ولو اَمَّ قوماً وھم لہٗ کارھون۔ ان الکراھۃ لفساد فیہ اولانھم احق بالامامۃ منہ کرہ لہٗ ذلک تحریماً لحدیث ابی داؤد لا یقبل اللّٰہ صلوٰۃ من تقدم قوماً وھم لہٗ کارھون وان ھو احق) لا والکراھۃ علیھم۔
(الدر المختار بہامش ردالمحتار ج۱ ص۵۲۲)

اس تمہید کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت مسئولہ مذکورہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیش امام صاحب کی حیثیت دوسرے قسم کے پیش امام کی ہے جو اجیر خاص کے حکم میں ہے، اور پہلی قسم کے امام کی نہیں کہ اس کو اہل وظائف میں شمار کیا جا سکے۔ اور مسئولہ عنہ پیش امام کے وہ نقائص جس کی وجہ سے تمام قوم اس سے ناراض ہو کر دوسری مسجدوں میں نمازیں پڑھتی ہے جس کی وجہ سے عقد امامت کا اصلی مقصد فوت ہو جاتا ہے، یہ وہ نقائص ہیں جو شرعاً معتبر ہیں، لہٰذا اگر کل قوم یا اکثریت اس عقد کو فسخ کر کے امام مذکور کو معزول کر دے اور اس کی جگہ دوسرے کسی صالح اور دیندار شخص کو پیش امام مقرر کرے جس پر تمام قوم متفق ہو تو قوم کا یہ عزل نافذ ہوگا، اور اس طرح امامت کا اصل مقصد بھی فوت نہ ہونے پائے گا اور قوم بھی گنہگار نہ ہوگی، کیونکہ یہ عزل بوجہ نقص شرعی کے ہوگا۔ اور اگر مذکورہ پیش امام صاحب باوجود کل قوم یا اکثریت کے ناراض ہونے کے بدستور نمازیں پڑھانے پر بضد ہو اور لوگ اس کے پیچھے نماز نہ پڑھیں بلکہ دوسری مسجدوں میں پڑھیں تو گناہ پیش امام پر ہے قوم پر نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

باب القرأة

(قرأت کے احکام ومسائل)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں اِتصال ہے یا اِنفصال

سوال:۔ سورۃ الفاتحہ میں اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے مابین وصل یا فصل کرنے میں کون سا طریقہ بہتر ہے؟

الجواب:۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں اتصال وانفصال دونوں طریقے جائز ہیں، اس سے نماز میں کوئی کراہیت یا فساد لازم نہیں آتا۔ البتہ قرأت میں اتصال وانفصال کی تفسیر وتفصیل قراءحضرات سے پوچھی جائے۔

وصل حرف من کلمة بحرف من کلمة اخرٰی ان وصل حرفاً من کلمة بحرف من کلمة اُخرٰی نحو ان قرأ ایّاک نعبد ووصل الکاف بالنون او غیر المغضوب علیہم ووصل الباء بالعین او سمع اللّٰہ لمن حمدہ ووصل الھاء من اللّٰہ باللام فالصحیح انہ لایفسد ولو تعمد ذٰلک۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۱۱۲ باب فی زلة القاری) [1]

انّا کو اِن اور اَرسلنا کو ارسلن پڑھنا

سوال:۔ ہمارے محلہ کی مسجد کے امام صاحب ہمیشہ قرأت میں غلطی کرتے ہیں، مثلاً قرأت کرتے وقت کئی ایسے مقام جہاں لفظ اِنَّا ہوتا ہے لیکن ہمارے مولوی صاحب اِنُ پڑھتے ہیں، ایسے ہی اَرْسَلْنَا کے بجائے ارسلن پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اغلاط کرتے ہیں۔ کیا ان اغلاط کی وجہ سے نماز میں کوئی فساد تو نہیں آتا؟

الجواب:۔ اگر قرآن مجید کے الفاظ میں کمی اور زیادتی سے معنٰی میں تغیر نہ آئے تو نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ قاری کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنی قرأت کو درست کرے۔

---

[1] فی الھندیة: ان وصل حرفاً من کلمة بحرف من کلمة اخرٰی نحو ان قرأ ایاک نعبد ووصل الکاف بالنون او غیر المغضوب علیہم ووصل الباء بالعین او سمع اللّٰہ لمن حمدہ ووصل الھاء من اللّٰہ باللام فالصحیح انہ لایفسد وکذا لو تعمد ذٰلک۔

(الھندیة ج۱ ص۷۹ الفصل الخامس فی زلة القاری)

چونکہ صورتِ مسئولہ میں جمع متکلم کا صیغہ جمع مؤنث غائب کا بنا ہے جو فسادِ معنیٰ کو مستلزم ہے جس کی بناء پر نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن اگر سامع کے سننے میں جمع مؤنث کا صیغہ ہو لیکن قاری صاحب نے جمع متکلم پڑھا ہو تو اس صورت میں نماز بلا کراہت درست ہے تاہم قرأت کو وضاحت سے پڑھنا چاہیئے۔

قال الحصکفیؒ: ومنها القرأن بالالحان ان غیر المعنیٰ والا لا الا فی حرف مد ولین۔۔۔۔فلو فی اعراب او تخفیف مشدد وعکسہ او بزیادۃ حرف۔

(الدرالمختار صدر ردالمحتار ج۱ ص۶۳۰ باب ما یفسد الصلوٰۃ) ؎۱

فرض نماز میں تکرارِ سورۃ

سوال:۔ ایک مسجد کے امام صاحب نے فرض نماز کی دونوں رکعتوں میں سورۃ اخلاص پڑھی، کیا ایسا کرنے سے نماز پر کچھ اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ نوافل میں تکرارِ سورۃ جائز لیکن غیر اولیٰ ہے، البتہ فرائض میں تکرارِ سورۃ مکروہ تنزیہی ہے، اس سے نماز میں کوئی فساد لازم نہیں آتا۔

قال الحصکفیؒ: لا بأس ان یقرأ سورۃ ویعیدھا فی الثانیۃ۔

قال ابن عابدینؒ: افاد انہ یکرہ تنزیھًا وعلیہ یحمل جزم القنیۃ بالکراھۃ ویحمل فعلہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لذلک علیٰ بیان الجواز ھذا اذا لم یضطر۔

(ردالمحتار ج۱ ص۵۴۶ باب القرأۃ) ؎۲

؎۱ اما ان قرأ حرفًا مکان حرف او زاد حرفًا او نقص او قدم المؤخر او اخر المقدم واما ان کان کلمۃ مکان کلمۃ او زاد کلمۃ او نقص او قدم او اخر واما ان قرأ اٰیۃ مکان اٰیۃ او نقص او زاد مقدم المؤخر او اخر المقدم اما اذا قرأ حرفًا مکان حرف ولم یغیر المعنیٰ بان قرأ ان المسلمون لا یفسد۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۱۰۶ الفصل الثانی عشر زلۃ القاری)

ومثلہ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۷۹ الفصل الخامس فی زلۃ القاری۔

؎۲ وفی الاصل اذا قرأ سورۃ واحدۃ فی رکعتین اختلف المشائخ رحمھم اللہ فیہ والاصح انہ لا یکرہ ولکن لا ینبغی ان یفعل ولو فعل لا بأس بہ۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۹۶ الفصل الحادی عشر فی القرأۃ)

مغرب کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ کا پڑھنا

سوال:۔ ہماری مسجد کے امام صاحب اکثر مغرب کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ پڑھتے ہیں، جبکہ عام کتابوں میں مغرب کی نماز میں چھوٹی سورتوں کے پڑھنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ کیا مغرب کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ پڑھنے سے نماز پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں بہتر یہ ہے کہ امام صاحب مقتدیوں کی رعایت رکھ کر قرأت کریں کیونکہ مقتدیوں میں سے بعض بیمار اور کمزور بھی ہوتے ہیں، اس لیے فقہاء کرام نے نماز میں طوالتِ قرأت کو مکروہ جانا ہے، البتہ طویل قرأت سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں کئی مرتبہ سورۃ الطور اور سورۃ المرسلات پڑھی ہے۔

لما قال العلامة حسن بن الحسن الشرنبلالی: وكره للامام تطويل الصلوٰة لما فيه من تنفير الجماعة لقوله عليه السلام من أمّ فليخفف ـــ قال العلامة احمد الطحطاوی تحت قول تطويل الصلاة بقرأة او تسبيح اوغيرهما۔

(الطحطاوی ص۲۴۶ باب الامامة) ؎۱

عن جبير ابن مطعم عن ابيه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب بالطور۔

عن ام الفضل بنت الحارث قالت سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ بالمغرب بالمرسلٰت۔ (الصحيح المسلم ج۱ ص۱۸۷ باب القرأة فی المغرب) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصكفیؒ: ويكره تحريماً تطويل الصلوٰة على القوم زائداً على قدر السنة في قرأة واذكار رضى القوم ام لا لاطلاق الامر بالتخفيف۔

(رد المحتار ج۱ ص۵۶۴ باب الامامة)

؎۲ وعن جبير ابن مطعم عن ابيه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب بالطور۔

وعن ام الفضل بنت الحارث قالت سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب بالمرسلٰت۔ (كلاهما فی البخاری ج۱ ص۱۰۵ باب الجهر في المغرب)

ومثله فی المشكوٰة ج۱ ص۷۹ باب القرأة فی الصلوٰة ـــ ومثله فی الجوهرة النيرة ج۱ ص۷۰

سورۃ اور تکبیر میں وصل کرنا

سوال:- ہماری مسجد کے امام صاحب آخری دس سورتوں میں سے جب بھی کوئی ایک سورۃ نماز میں پڑھتے ہیں تو رکوع میں جاتے وقت تکبیر کو سورۃ سے ملا کر کہتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا غلطی ہے بلکہ جب سورۃ کے آخر میں پہنچا جائے تو سورۃ کے آخر اور تکبیر کے درمیان نؔ وقایۃ کی زیادتی کی جائے، بغیر نؔ زائد کرنے کے پڑھنا صحیح نہیں، جبکہ ہمارے امام صاحب جواز کے قائل ہیں۔ کیا وصل کے وقت نؔ کا پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- ایک کلمے کو دوسرے کلمے سے اس طور پر ملا کر پڑھنا جس سے معنیٰ میں فساد پیدا ہو درست نہیں اور اگر فساد کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، لہٰذا اللہ اکبر کو سورۃ کے آخری لفظ کے ساتھ ملا کر پڑھنا عدم فسادِ معنی کی وجہ سے جائز ہے، البتہ وصل کی صورت میں نُون وقایہ قرأت کے قواعد کی بناء پر پڑھا جائے گا۔ تاہم چونکہ اس صورت میں اللہ اکبر کا سورۃ کے جزو ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے بغیر ملائے پڑھنا افضل ہے۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ان وصل حرف من کلمۃ بحرف من کلمۃ اخری ان وصل حرفًا من کلمۃ بحرف من کلمۃ اخریٰ نحو ان قرأ ایاك نعبد ووصل الکاف بالنون اوغیر المغضوب ووصل البا بالعین اوسمع اللہ لمن حمدہ ووصل الھاء من اللہ باللام فالصحیح انہ لا یفسد وکذا اوتعمد ذٰلك۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۱۱۲ زلۃ القاری) [1]

قرأت کی تقدیم و تاخیر

سوال:- ایک مولوی صاحب نے جمعہ کی نماز میں پہلی رکعت میں سورۂ مریم کی کچھ آیات تلاوت کیں جبکہ دوسری رکعت میں سورۃ البقرہ سے کچھ آیات کی قرأت کی۔ کیا ایسا کرنا شرعًا جائز ہے کہ آیات میں تقدیم کردی جائے یا بعض میں تاخیر کر کے پڑھی جائیں؟

الجواب:- قرآن مجید کی بالترتیب تلاوت کرنا آدابِ تلاوت میں سے ہے اسلئے

---

[1] وفی الھندیۃ: ان وصل حرفًا من کلمۃ بحرف من کلمۃ اخریٰ نحو ان قرأ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ووصل الکاف بالنون اوغَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ ووصل الیاء بالعین اوسَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ ووصل الھاء من اللہ باللام فالصحیح انہ لا تفسد ولو تعمد ذٰلك۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۷۹ الفصل الخامس فی زلۃ القاری)

محققین فقہاء کے ہاں قرآنِ کریم کی منکوس تلاوت مطلقاً مکروہ ہے، صرف بچوں کی تعلیم کے لیے منکوس تلاوت بلاکراہت جائز ہے۔

اگرچہ بعض فقہاء نے داخل صلوٰۃ منکوس تلاوت کرتے میں فرائض یا نوافل کا کچھ فرق کیا ہے لیکن محققین کے ہاں مطلقاً منکوس تلاوت چاہے داخل نماز ہو یا خارج نماز، کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة عماد بن حسن الشرنبلالی: ویکرہ قرأۃ سورۃ فوق التی قرأھا۔ قال ابن مسعودؓ: من قرأ القرآن منکوسًا فھو منکوس وماشرع لتعلیم الاطفال لا کتیسیر الحفظ یقصر السور۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۸۶ باب مکروھات الصلوٰۃ)[ل]

فجر کی نماز میں چھوٹی سورتیں پڑھنا

سوال:۔ دیہات میں معمولی علم رکھنے والے بعض ائمہ مساجد کو قرآنِ مجید کی چند مختصر سورتیں یاد ہوتی ہیں بڑی سورتیں یاد نہیں ہوتیں۔ تو کیا فجر کی نماز ان چھوٹی سورتوں سے پڑھائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فجر کی نماز میں مستحب یہ ہے کہ اسفار میں نماز شروع کرے، کم از کم چالیس آیات کی مقدار کے مطابق قرأت کرے۔ اگر نماز میں کچھ فساد ہو جائے تو دوبارہ سنت کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز پڑھ سکے، اگر اتنی تاخیر کی جائے کہ اس سے نماز میں فساد آجائے تو دوبارہ اسے استحباب کے طریقہ سے نہ پڑھی جاسکے، اچھا نہیں سمجھا گیا۔

البتہ اگر کوئی چھوٹی سورتیں پڑھتا ہے اور اس پر اُس کا دوام ہے تو اس سے نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معوذتین پر فجر کی نماز پڑھائی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ فی الجامع الصغیر: یقرأ فی الفجر فی الرکعتین

ل لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ وان یقرأ منکوسًا۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله وان یقرأ منکوسًا) بان یقرأ فی الثانیة سورۃ الاعلیٰ مما قرأ فی الاولیٰ الان لترتیب السورۃ فی القرأۃ من واجبات التلاوۃ وانما جواز الصغار تسھیلاً لضرورۃ التعلیم۔ (رد المحتار ج ا ص۵۴۶ فصل فی القراءۃ، مطلب الاستماع للقرآن غرض کفایة)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ا ص۲۹۹ باب صفة الصلوٰۃ۔

سورۃ الفاتحۃ وقدر اربعین اوخمسین واختصر فی الاصل علی الاربعین۔ الخ
(رد المحتار ج ۱ ص۵۴۰ فصل فی القرأۃ)

وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: کما ذکر انہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ بالمعوذتین فی الفجر۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۶۵ باب الامامۃ۔ مطلب اذا صلی الشافعی قبل الحنفی۔ الخ) [۱]

قرآن مجید کا بہت تیز پڑھنا

سوال:۔ بعض مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ امام صاحب فرض نماز اور خصوصاً تراویح میں، اسی طرح بعض لوگ انفراداً بہت تیز قرأۃ کرتے ہیں اور بہت جلد نماز سے فارغ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ قرآن مجید کو اگر تیز روانگی سے پڑھا جائے بشرطیکہ تلفظ صحیح ہو اور حروف میں کوئی کمی نہ ہو تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ اتنا تیز پڑھنا کہ جس سے الفاظ میں غلطی یا کمی بیشی پیدا ہو جائے جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: ویجتنب المنکرات ھذ الامۃ القرأۃ۔

قال ابن عابدینؒ: ای سرعۃ الکلام والقرأۃ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۴۷ فصل فی التراویح) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ السید احمد الطحطاوی: واختلف الآثار فی حد ما یقرأ فی کل صلوٰۃ وفی الجامع الصغیر انہ یقرأ فی الفجر فی الرکعتین جمیعًا اربعین اوخمسین اوستین ایۃ سوی الفاتحۃ۔ وروی الحسن ما بین ستین الی مائۃ فالمائۃ اکثر ما یقرأ فیہما والاربعون اقلہ، الخ۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی ص۲۱۳ فصل فی بیان سننہا)

قال یؤیدہ ما فی الصحیحین انہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ بالمعوذتین فی الفجر فلما فرغ قالوا لہ اوجزت قال سمعت بکاء صبیٍ۔

(طحطاوی حاشیہ مراقی ص۲۴۶ فصل فی بیان احق بالامامۃ)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۵۱ باب الامامۃ۔ والفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۷۷ الفصل الرابع فی القرأۃ۔

[۲] ویکرہ الاسراع فی القرأۃ وفی اداء الارکان کذا فی السراجیۃ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۸ فصل فی التراویح)

ظہر و عصر کی فرض نماز میں مقتدی کا سورۃ فاتحہ پڑھنا

سوال:- ظہر و عصر کی فرض جماعت میں جبکہ امام سرًا قرأت کرتا ہے، اگر مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- فقہ حنفی میں مقتدی کے لیے، چاہے امام سرًا قرأت کرے یا جہرًا قرأت کرے، خاموش رہنا ضروری ہے، اور مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت کرنا مکروہ تحریمی ہے، البتہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

قال الحصکفیؒ: (المؤتم لا یقرأ مطلقًا) ولا الفاتحة فی السریة اتفاقًا وما نسب لمحمد ضعیف کما بسطه الکمال (فان قرأ کره تحریمًا)... (بل یستمع) اذا جهر (وینصت) اذا اسر لقول ابی هریرة رضی الله عنه کنا نقرأ خلف الامام فنزل وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۵۴۴ فصل القرأة) [1]

قرأت میں امام کا حد سے تجاوز کرنا

سوال:- ہماری مسجد کے امام صاحب جہری نمازوں میں اتنی بلند آواز سے قرأت کرتے ہیں کہ دور دور تک سنائی دیتی ہے جبکہ مسجد میں چند ایک لوگ ہوتے ہیں، اگر امام صاحب ذرا آہستہ قرأت کریں تب بھی سب کو آسانی سے سنائی دیتی ہے۔ کیا جہری نمازوں میں حد سے زیادہ بلند آواز میں قرأت کرنا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہری نمازوں میں بلند آواز سے قرأت کرنا (امام کیلئے) واجب ہے البتہ اتنی بلند آواز سے قرأت کرنا کہ جس سے لوگ بھی تنگ ہوں، اور اپنی بشری طاقت سے بھی تجاوز کرے، یہ مکروہ تنزیہی ہے، احسن یہ ہے کہ ایسا نہ کیا جائے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس سے نماز میں کوئی فساد لازم نہیں آتا۔

ولا یجهد الامام نفسه بالجهر کذا فی البحر الرائق، واذا جهر الامام فوق حاجة الناس

---

[1] قال الامام محمد بن الحسن الشیبانی: لا قرأة خلف الامام فیما جهر فیه ولا فیما لم یجهر بذلک جاءت عامة الآثار وهو قول ابی حنیفةؒ۔
(مؤطا امام محمدؒ ص ۹۷ باب قرأة الامام)
وَمِثْلُهُ فی فتح القدیر ج ۱ ص ۲۹۷ فصل فی القرأة۔

فقد اساء لان الامام انما یجهر لاسماع القوم لیدبروا فی قراتہ لیحصل احضار القلب کذا فی السراج الوھاج ۔ (الھندیة ج ۱ ص۷۲ واجبات الصلوٰۃ) [۱]

نماز میں ایک آیتِ طویلہ کا پڑھنا

سوال:۔ ہماری مسجد کے امام صاحب نے ایک مرتبہ جہری نماز کی پہلی رکعت میں لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے اَلْمَصِیْر تک قرأت کی، جو دو آیتیں بنتی ہیں، اور دوسری رکعت میں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا الی اٰخرہٖ تک قرأت کی جو ایک آیت بنتی ہے۔ کسی نے اعتراض کیا کہ یہ نماز نہیں ہوئی کیونکہ دوسری رکعت میں ایک آیت پڑھی گئی ہے اور پہلی رکعت میں دو آیتیں، جبکہ قرأۃ کے لیے تین آیات شرط ہیں، لہٰذا اس سے نماز نہیں ہوئی۔ اعتراض کرنے والے نے اپنی نماز کا اعادہ کیا، جبکہ امام صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ نماز ہوگئی، کیونکہ نماز میں اگر ایک آیتِ طویلہ پڑھ لی جائے جو تین آیاتِ قصیرہ کے برابر ہو تو اس سے نماز ہو جاتی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک آیتِ طویلہ (جو تین آیاتِ قصیرہ کے برابر ہو) پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں قرأت کی مقدار تین آیاتِ قصیرہ یا ایک آیت طویلہ ہے، اور آیاتِ قصیرہ کی مقدار سورۃ الکوثر اور سورۃ عبس کی پہلی آیات ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام صاحب نے ایک آیت طویلہ پڑھی ہے جس کی مقدار ان دونوں سے زیادہ بنتی ہے لہٰذا اس سے نماز میں کوئی فساد نہیں آیا اور نہ ہی یہ نماز واجب الاعادہ ہے۔

اما الجواز ان قرأ فی کل رکعة من صلوٰتہ بایة اجزاہ قصیرة کانت الآیة او طویلة وھو مسیٔ وھٰذا عند ابی حنیفة وعندھما لایجزیہ مالم یقرأ فی کل

---

[۱] قال السید احمد الطحطاوی : والاولیٰ ان لایجھد نفسہ بالجھر بل بقدر الطاقة لان اسماع بعض القوم یکفی والمستحب ان یجھر بحسب الجماعة فان زاد فوق حاجة الجماعة فقد اساء کما لو جھر المصلی بالاذکار قھستانی عن کشف الاصول ۔
(طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص۲۰۴ فصل فی واجبات الصلوٰۃ)
ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۱ ص۵۸۹ باب الامامة ، مطلب فی رفع المبلغ صوتہ زیادة علی الحاجة ۔

رکعۃ ثلاث آیات قصار او آیۃ طویلۃ وھٰذا قول ابی حنیفۃؒ اولیٰ۔
(خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۹۳ فصل فی القرأۃ) لہ

حرف ض کا صحیح تلفظ

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں لفظ (ض) کے تلفظ پر علماء کے مابین بہت سخت اختلاف ہے، حتیٰ کہ کفر و اسلام کا فرق (ض) کا پڑھنا قرار دے دیا گیا ہے۔ بعض اس حرف کو دَال کے مشابہ پڑھتے ہیں اور بعض ظَ کے مشابہ پڑھتے ہیں اور بعض ذَال اور زَا کے مشابہ پڑھتے ہیں۔ البتہ اگر صفات و مخرج کی رعایت رکھ کر اس کو ادا کرنے کی کوشش کی جائے تو قدرے ظَا کے مشابہ ہوتا ہے۔ کیا اس حرف کو مذکورہ حروف کے مشابہ پڑھ لیا جائے تو اس سے نماز میں کوئی کراہت یا فساد لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تلفظ کے دوران اگر ایک حرف کو دوسرے حرف میں تبدیل کرنے سے معنیٰ میں تغیر آتا ہو تو بالاتفاق اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی اگر ضَ کو زَا، ذَال، دَال، ظَ سے بدل کر بعینہٖ دَال و ظَا پڑھا جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ اگر ضَ کو اپنے مخرج و صفات سے ادا کرنے پر کسی دوسرے لفظ کے مشابہ آواز نکل جائے لیکن صراحتہً فرق و تمیز نظر نہ آئے اور نہ ہی بلا مشقت کے ان کے درمیان میں فرق کیا جا سکے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر صراحتہً تمیز ہو جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قولہ الا ما یشق) قال فی الخانیۃ والخلاصۃ الاصل فیما اذا ذکر حرفاً مکان حرفٍ وغیر المعنیٰ ان امکن الفصل ما بینھما بلا مشقۃ تفسد والا یمکن الا بمشقۃ کالظاء مع الضاد المعجمتین والصاد مع السین

لہ قال الحصکفیؒ: قرأ المصلی لو اماماً او منفرداً الفاتحۃ و) قرأ بعدھا وجوباً (سورۃ او ثلاث آیات) ولو کانت الآیۃ او الآیتان تعدل ثلاث آیات قصاراً انتفت کراھۃ التحریم ذکرہ الحلبی ولا تنتفی التنزیھیۃ الا بالمسنون۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۴۹۱ صفۃ الصلوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی کبیری ص۲۷۸ باب القرأۃ۔

المهملتين والطاء مع التاء قال اکثرهم لا تفسد ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۳۳ زلة القاری) [۱]

ص کی جگہ س پڑھنا

سوال: ۔ اگر کوئی امام صِرَاطَ الَّذِیْنَ کے بجائے سِرَاطَ الَّذِیْنَ پڑھ لے تو اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔ اگرچہ ایک حرف کا دوسرے حرف سے اس طور پر بدلنا جس سے معنیٰ میں تبدیلی واقع ہوتی ہو مفسدِ صلوٰۃ ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں مفسد تبدیلی نہیں بلکہ صراط بالسین بھی ایک قرأت ہے اس لیے سِرَاطَ الَّذِیْنَ پڑھنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا تاہم صِرَاطَ پڑھنا اولیٰ ہے۔

لما قال العلامة جمال الدین ابوالفرج ابن الجوزی الصراط:۔ الطریق یقال ان اصله بالسین لانہ من الاستراط وھو الابتلاع فالسراط کانه یسترط المارین علیه فمن قرأ بالسین کمجاھد وابن محیصن ویعقوب فعلیٰ اصل الکلمة ومن قرأ بالصاد کابی عمرو والجمھور فلانھا اخف علی اللسان......قال الفرأ اللغة الجیدة بالصاد وھی لغة قریش الاولیٰ ۔ (زاد المیسر ج۱ ص۱۴ تحت صِرَاطَ الَّذِیْنَ) [۲]

سورۃ فاتحہ سے قبل بسم اللہ پڑھنا

سوال: ۔ نماز میں سورۃ فاتحہ یا کوئی دوسری سورۃ شروع کرتے وقت بِسْمِ اللہ پڑھنے کا

---

[۱] قال طاہر بن عبد الرشیدؒ: والاصل فی ھذا انہ ان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاد بان قرأ الطالحات مکان الصالحات تفسد صلوته وان کان لا یمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والطاء مع التاء اختلف المشائخ فیه قال اکثرھم لا یفسد قال بعضھم یفسد ۔
(خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص۱۰۶ زلة القاری)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج ۱ ص۷۹ زلة القاری۔

[۲] قال العلامة محمود الآلوسیؒ: (الصراط) الطریق واصله بالسین من السرط.....و بالسین علی الاصل قرأ ابن کثیر بروایة قنبل واویس اللؤلؤی عن یعقوب وقرأ الجمھور بالصاد وھی لغة قریش ۔
(روح المعانی ج۱ ص۹۲ تحت الصراط المستقیم)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۲۳ تحت اھدنا الصراط ۔

کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ سورۃ فاتحہ سے قبل تسمیہ کا پڑھنا سنت ہے، البتہ فاتحہ اور سورۃ کے درمیان تسمیہ پڑھنا سنت تو نہیں مگر محققین کے ہاں پڑھنا بہتر اور مستحب ہے۔

قال الحصکفیؒ:۔ (سمی) غیر المؤتم بلفظ البسملۃ لا مطلق الذکر کما فی ذبیحۃ وضوء (سرا فی) اول (کل رکعۃ) ولو جھریۃ (لا) تسن (بین الفاتحۃ والسورۃ مطلقاً) ولو سریۃ ولا تکرہ اتفاقاً وما صححہ الزاھدی من وجوبھا ضعفہ فی البحر۔

قال ابن عابدینؒ: کذا صرح فی الذخیرۃ والمجتبیٰ بان سمّی بین الفاتحۃ والسورۃ المقروءۃ سراً اوجھراً کان حسناً ورجحہ ابن الھمام۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۴۹۱ باب صفۃ الصلوٰۃ فصل فی الشروع)[۱]

اعراب میں غلطی کرنا

سوال:۔ نماز میں امام صاحب نے قرآنِ کریم کی ایک آیت شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ کو بکسر الشین کی بجائے شَفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ

---

[۱] (ثم یاتی بالتسمیۃ) ویخفیھا وھی من القرآن اٰیۃ انزلت للفصل بین السُّوَر کذا فی الظھیریۃ فیما یکرہ فی الصلوٰۃ ...۔ ولا یسمّی بین الفاتحۃ والسّورۃ ھٰکذا فی الوقایۃ والنقایۃ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۷۴ الفصل الثالث فی سُنَنِھا)

قال العلامۃ حسن بن عمّار الشرنبلالی: (و) تسن (التسمیۃ اول کل رکعۃ) قبل الفاتحۃ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یفتتح صلوٰتہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وفی الطحطاوی واتفقوا علی عدم الکراھۃ فی ذکرھا بین الفاتحۃ والسورۃ بل ھو حسن سواءٌ کانت الصلوٰۃ سریۃً اوجھریۃً وینافیہ ما فی القھستانی انہ لا یسمّی بین الفاتحۃ والسُّورۃ فی قولھا۔ وفی روایۃ عن محمد قال فی المضمرات والفتویٰ علی قولھما۔

وفی حاشیۃ تبع۔ فیہ الکمال وتلمیذہ ابن امیر الحاج حیث رجحا ان الخلاف فی السنیۃ فلا خلاف انہ لو سمّی لکان حسناً لشبھۃ الخلاف فی کونھا اٰیۃ من کل سورۃ۔

(طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص۱۴۲ باب سننھا)

وَمِثْلُہٗ فی عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص۲۳۵ کتاب الصلوٰۃ۔

بفتح الشین پڑھ لیا۔ اب لوگوں میں اختلاف پڑ گیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے نماز میں کوئی فرق نہیں آیا، جبکہ بعض کہتے ہیں کہ نماز واجب الاعادہ ہے۔ کیا اس طرح کی اعراب کی غلطی کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟

الجواب: جبکہ شَفَاءً بفتح الشین کا مثل نہ قرآن مجید میں موجود ہے (البتہ لفظ شَفَا بفتح الشین بغیر الھمزہ قرآن مجید میں موجود ہے) اور نہ ہی اس کے لیے کوئی صحیح معنی موجود ہے، لہٰذا اعراب کی ایسی غلطی کی وجہ سے متقدمین کے نزدیک نماز واجب الاعادہ ہے اور متاخرین کے نزدیک نماز واجب الاعادہ نہیں، اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ اس سے معنی میں ایسی تبدیلی نہیں آتی جو مفسدِ صلوٰۃ ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله فلو فی اعراب) ککسر قواما مکان فتحها وفتح باء نعبد مکان ضمها ومثال ما یعتبر إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ بضمها الجلالة وفتح همزة العلماء وهو مفسد عند المتقدمین واختلف المتاخرون فذهب ابن مقاتل ومن معه انه لا یفسد والاول احوط وهذا اوسع کذا فی زاد الفقیر لابن الهمام۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۳۱ باب زلة القاری)[1]

مَسَدٌ کو مشدّد پڑھنا

سوال: ہماری مسجد کے مولوی صاحب نے ایک دفعہ مغرب کی نماز میں سورۃ تبت پڑھی اور لفظ مَسَدٌ جو کہ مخفف ہے اس کو مشدّد پڑھا۔ کیا اس سے نماز کی صحت پر کوئی اثر پڑا یا نہیں؟

---

[1] اذا لحن فی الاعراب لحنا لا یغیر المعنیٰ بان قرأ لا ترفعوا اصواتکم برفع التاء لا تفسد صلوٰته بالاجماع وان غیر المعنیٰ تغییرا فاحشا بان قرأ وعصیٰ آدمُ ربَّه بنصب المیم ورفع الرب وما اشبه ذلك مما لو تعمد به یکفر اذا قرأ خطاً فسدت صلوٰته فی قول المتقدمین واختلف المتاخرون قال محمد بن مقاتل وابو نصر محمد بن سلام وابو بکر بن سعید البلخی والفقیه ابو جعفر الهندوانی وابو بکر محمد بن الفضل والشیخ الامام الزاهد وشمس الائمة الحلوانی لا تفسد صلوٰته وما قاله المتقدمون احوط۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۸۱ باب زلة القاری)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۱۱۳ زلة القاری۔

الجواب:۔ مخفف کو مشدّد پڑھنا اور ایسے ہی مشدّد کو مخفف پڑھنا اگر اس سے فسادِ معنیٰ لازم آتا ہو تو نماز فاسد ہے ورنہ نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال الحصکفیؒ: او تخفیف مشدّد وعکسہ او بزیادۃ حرف فاکثر نحو الصراط الذین او بوصل حرف بکلمۃ نحو ایاکنعبد او بوقف وابتداء لم تفسد ـــ وان غیر المعنیٰ بہ یفتی بزازیۃ الا تشدید رب العالمین وایاک نعبد فیترکہ تفسد۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۳۱ زلۃ القاری) ؎۱

نماز میں قرأت کی غلطی کا علم ہونے کے بعد اُسے درست کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص نماز میں قرأت کے دوران الفاظ یا اعراب کی غلطی کر جائے اور بعد میں علم ہونے پر فوراً اس کا ازالہ کر دے اور دوبارہ درست قرأت پڑھے، تو اس سے نماز میں کوئی فرق تو نہیں آئے گا؟

الجواب:۔ نماز میں قرأت کی غلطی ہو جانے کے بعد اس کا تدارک کرنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نماز درست اور صحیح ہوگی۔

ذکر فی الفوائد لو قرأ فی الصلوٰۃ بخطا فاحش ثم رجع وقرأ صحیحا قال عندی صلاتہ جائزۃ وکذلک الاعراب۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۸۲ باب زلۃ القاری) ؎۲

؎۱ ولو ترک التشدید فی موضعہ او اتی بالتشدید فی غیر موضعہ صح فان کان لا یغیر المعنیٰ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۱۲ زلۃ القاری)

؎۲ قال الشیخ مولانا شاہ اشرف علی التھانویؒ: وفی العالمگیری:۔ ذکر فی الفوائد لو قرأ فی الصلوٰۃ بخطاءٍ فاحش ثم رجع وقرأ صحیحًا قال عندی صلوٰتہٗ جائزۃٌ وکذلک الاعراب، قلت: وکذلک سمعتُ شیخی مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۶۸ باب القرأۃ)

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہ کی جگہ اِذَا جَاءَ النَّصْرُ اللّٰہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص نماز میں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہ کی جگہ اِذَا جَاءَ النَّصْرُ اللّٰہ پڑھے تو اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ تغیر معناً بھی پایا جاتا ہے اور لغتاً بھی، لہٰذا نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔

وفی الهندیة: (ومنها) ذکر حرف مکان حرف۔ ان ذکر حرفاً مکان حرف ولم یغیر المعنی بان قرأ ان المسلمون ان الظالمون وما اشبه ذٰلك لم تفسد صلاته وان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مکان الصالحات تفسد صلاته عند الکل الخ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۷۹ کتاب الصلٰوة۔ الفصل الخامس فی زلة القاری)[1]

دوسری رکعت میں ایک آیت کی زیادتی سبب کراہت نہیں

سوال:۔ ہمارے امام صاحب نے نمازِ مغرب کی پہلی رکعت میں تین آیات تلاوت کیں اور دوسری میں چار آیات تلاوت کیں جس کی وجہ سے دوسری رکعت پہلی رکعت سے طویل ہوگئی، کیا ایسا کرنا شرعاً مکروہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ دوسری رکعت کو پہلی رکعت سے لمبا کرنا مکروہ ہے مگر یہ کراہت تب ہے کہ دوسری رکعت کی قرأت دو آیات سے زیادہ ہوجائے ورنہ دو آیات یا کم کی زیادتی سبب کراہت نہیں۔

لما قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: اما اطالة الرکعة الثانیة علی الرکعة الاولی فمکروه بالاجماع لکن لا بمطلق الاطالة بل ان کانت الاطالة بثلاث آیات اوبما فوقها تکره وان کانت تلك الاطالة آیة او آیتین لا تکره۔ (حلبی کبیر ص۱۳۰ باب صفة الصلٰوة)

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: وان کان الخطاء بابدال حرف بحرف فان امکن الفصل بینهما بلا کلفة کالصاد مع الطاء بان قرأ الطالحات مکان الصالحات فاتفقوا علی انه مفسد وان لم یمکن الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین فاکثرهم علی عدم الفساد لعموم البلوٰی الخ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۶۶ باب ما یفسد الصلٰوة وما یکره فیها۔ مطلب مسائل زلة القاری)

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۴۳ کتاب الصلٰوة۔

تین آیات پڑھ چکنے کے بعد مقتدی کا امام کو فتحہ دینا

سوال :۔ ایک مسجد کے امام صاحب نے تین آیات کے برابر نماز کے اندر قرأت کی کہ اچانک آگے پڑھنا بھول گئے، اس صورت میں اگر کوئی مقتدی امام کو فتح دے اور امام مقتدی کا فتحہ لے لے تو کیا اس سے نماز فاسد ہو جائے گی یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب :۔ جب امام نے تین آیات کے برابر قرأت کر لی تو اُسے چاہیئے کہ وہ رکوع میں چلا جائے مقتدی کو فتحہ دینے کے لیے مجبور نہ کرے اور اگر بالفرض مقتدی نے تین آیات کے بعد امام کو فتحہ دیا اور امام نے قبول بھی کر لیا تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : بخلاف فتحہ علیٰ امامہ فانہ لا یفسد مطلقاً لفاتح و اٰخذ بکل حال ای سواء قرأ الامام قدر ما تجوز بہ الصلوٰۃ ام لا انتقل الیٰ اٰیۃ اخریٰ ام لا تکرر الفتح ام لا ھو الاصح ۔

(رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۶۰ باب ما یفسد الصلوٰۃ الخ) [1]

ایک ہی رکعت میں ایک سے زیادہ سورتیں پڑھنے کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ہی رکعت میں ایک سے زیادہ سورتیں ملا کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ بہتر یہ ہے کہ ایک رکعت میں ایک ہی سورت پڑھی جائے تاہم اگر ایک ہی رکعت میں دو یا تین سورتیں پڑھی گئیں تو اس سے نماز پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا اگرچہ خلافِ اولیٰ ضرور ہے ۔

لما قال العلامة السید احمد الطحطاوی رحمہ اللہ : و یکرہ ...... والجمع بین سورتین ای فی رکعۃ واحدۃ لما فیہ من الشبہۃ التفضیل والھجر ۔

(طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح صفحہ ۲۰۶ باب ما یکرہ فی الصلوٰۃ)

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : لما صرحوا فی فتح المصلی علیٰ امامہ بانہا لا تفسد علی الصحیح سواء قرأ الامام ما تجوز بہ الصلوٰۃ اولا۔

(البحر الرائق ج ۱ صفحہ ۳۲۷ باب الحدث فی الصلوٰۃ)

باب المسبوق واللاحق

(مسبوق اور لاحق کے احکام ومسائل)

مسبوق اور لاحق کی تعریف

سوال :- جناب مفتی صاحب! مسبوق اور لاحق کی تعریف کیا ہے؟ یہ کسے کہتے ہیں؟

الجواب :- **مسبوق :** وہ نمازی ہے جس کو امام کے ساتھ پوری رکعات یا بعض پڑھنے کا موقع نہ ملے۔

لاحق : وہ مقتدی ہے جس سے بصورتِ مجبوری اقتداء کرنے کے بعد پوری یا بعض رکعات فوت ہو جائیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ : واللاحق من فاتته الرکعات کلّها او بعضها لکن بعد اقتداءٍ بعذرٍ کغفلة وزحمة۔۔۔ والمسبوق من سبقه الامام بها او بعضها۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۵۹۴ تا ۵۹۶ کتاب الصلوٰة ۔مطلب فی احکام المسبوق الخ) [1]

مسبوق کیلئے ثناء پڑھنے کا حکم

سوال :- ایک شخص مغرب کی نماز میں دوسری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہوا تو وہ ثناء کب پڑھے گا؟

الجواب :- اگر مسبوق امام کو اُسی رکعت میں پائے جس میں قرأت ہو رہی ہو تو یہ مسبوق ثناء نہیں پڑھے گا بلکہ امام کی قرأت سنے گا اور جب امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہی مسبوق فوت شدہ رکعت کی قضاء کرنے کے لیے اٹھے تو ثناء پڑھے گا۔ تاہم امام ابو یوسفؒ کے نزدیک امام کے ساتھ ملتے ہی تعوذ پڑھنا مستحب ہے، جبکہ بعد میں (یعنی امام کی فراغت کے بعد) بھی قرأت سے پہلے تعوذ پڑھے گا۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : المسبوق اذا ادرک الامام فی القرأة التی یجهر فیها لا یأتی بالثناء فاذا قام الی قضاء ما سبق یأتی بالثناء ویتعوذ للقرأة وعند ابی یوسفؒ یتعوذ عند الدخول فی الصلوٰة وعند القرأة وهذا استحباب

---

[1] وفی الهندیة : المسبوق من لم یدرک الرکعة الاولیٰ مع الامام .... واللاحق هو الذی ادرک اولها وفاته الباقی فی النوم او حدث او بقی قائماً للزحام ..... الخ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۹۲ الباب الخامس، الفصل السابع فی المسبوق واللاحق)

اما کونہ سنۃ فقد مر فی فصل الاداب ثم فی الثناء سواءٌ کان قریباً من الامام اولا یسمع فی صلوٰۃ الجھر یسکت۔ وفی صلوٰۃ المخافۃ یأتی بالثناء اذا ادرکہ قائماً۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۱۶۵ مسائل المسبوق) [1]

دوسری رکعت میں ملنے والے مسبوق کیلئے تشہد پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص ظہر کی نماز میں امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو جائے اور امام جب دوسری رکعت پہ بیٹھ جائے تو اس مسبوق پر بھی تشہد پڑھنا لازم ہے یا نہیں؟ بعض متون اور حواشی میں لکھا ہے کہ مسبوق پر یہ ضروری نہیں۔

الجواب:۔ مسبوق پر بھی تشہد پڑھنا واجب ہے۔

قال ابن عابدینؒ: والمسبوق یسجد مع امامہ) قید بالسجود لانہ لایتابعہ فی السلام بل یسجد معہ ویتشھد فاذا سلم الامام قام الی القضاء الخ
(رد المحتار ج ۱ ص۵۴۹ حکم المسبوق واللاحق)

وایضاً قال بعد ورقۃ: لکن لو ادرک الامام فی القعدۃ الاولیٰ فقعد معہ فقام الامام قبل شروع المسبوق فی التشھد فانہ یتشھد تبعاً لتشھد امامہ۔
(رد المحتار ج ۱ ص۵۵۱ حکم فی اللاحق والمسبوق) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: وفی صلوٰۃ المخافۃ یأتی بہ الخ۔ ویسکت المؤتم عن الثناء اذا جھر الامام۔ وان ادرک الامام فی الرکوع او السجود یتحری ان کان اکبر رأیہ انہ لو أتی بہ ادرکہ فی شیء من الرکوع او السجود یأتی بہ قائماً والا یتابع الامام ولا یأتی بہ۔ واذا لم یدرک الامام فی الرکوع والسجود لایأتی بھما وان ادرک الامام فی القعدۃ لایأتی بالثناء بل یکبر للافتتاح ثم للانحطاط ثم یقعد۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۹۱ الباب فی اللاحق والمسبوق)

[2] وفی الھندیہ: اذا ادرک الامام فی التشھد وقام الامام قبل ان یتم المقتدی او سلم الامام فی آخر الصلوٰۃ قبل ان یتم المقتدی التشھد فالمختار ان یتم التشھد۔ کذا فی الغیاثیۃ وان لم یتم اجزأہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۹۰ الفصل السادس فیما یتابع الامام۔ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۵۱ باب فیما یفعلہ المقتدی۔

امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں ملنے کی صورت میں تشہد پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر مسبوق امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں شرکت کرے اور مسبوق کے بیٹھتے ہی امام کھڑا ہوجائے تو کیا ایسی صورت میں امام کی متابعت ضروری ہے یا مسبوق تشہد مکمل کرنے کے بعد کھڑا ہوگا؟

الجواب:۔ ایسی صورت میں تشہد مکمل کرنے کے بغیر بھی اگر مسبوق امام کی متابعت کی وجہ سے کھڑا ہوجائے تو نماز مع الکراہت ہوجاتی ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ تشہد پوری پڑھ کر پھر اُٹھے کیونکہ قعدہ میں تشہد پڑھنا واجب ہے، لہٰذا ایک واجب کی وجہ سے دوسرے واجب کو ترک نہیں کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ مدرک بھی تشہد پورا کرنے کے بغیر نہیں اٹھے گا، بلکہ تشہد مکمل کرے پھر اٹھ کر امام کی متابعت کرے، تاکہ دونوں واجب کی رعایت ہو۔

وفی الھندیة: اذا ادرك الامام فی التشھد وقام الامام قبل ان یتم المقتدی او سلم الامام فی اٰخر الصلوٰة قبل ان یتم المقتدی التشھد فالمختار ان یتم التشھد کذا فی الغیاثیة۔ وان لم یتم اجزأہ۔ (الھندیة ج ۱ ص۹۰ الفصل السادس فیما یتابع الامام الخ)[1]

امام کی متابعت کا حکم

سوال:۔ اگر امام قعدۂ اولیٰ سے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے اور مسبوق جس نے التحیات کو ادھورا پایا ہو، پیچھے رہ جانے کی وجہ سے التحیات مکمل کرے، اور اتفاق ایسا ہو کہ امام قیام سے رکوع میں چلا جائے، تو کیا یہ مسبوق تین تسبیحات کے برابر قیام کرکے لاحق کی طرح امام کے ساتھ شریک ہوگا یا رکوع کرنے کے بعد امام سے ملنے کی کوشش کرے گا؟

الجواب:۔ اصل جواب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ متابعتِ واجبہ کی تین قسمیں ہیں:۔
(۱) بشکلِ مقارنت: امام کے ساتھ تمام رکن میں شریک رہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: فان عارضها واجب لاینبغی ان یفوته بل یأتی به ثم یتابع کما لو قام الامام قبل ان یتم المقتدی التشھد فانه یتمه۔ ثم یقوم لان الاتیان به لایفوت المتابعة بالکلیة۔ وانما یؤخرھا والمتابعة مع قطعه تفوته بالکلیة فکان تاخیر احد الواجبین مع الاتیان بهما اولیٰ من ترك احدھما بالکلیة۔
(ردالمحتار ج ۱ ص۴۷۰ مطلب مھم فی تحقیق متابعة الامام)

(۲) بصورتِ تعاقب: کہ ابتداءِ فعل میں امام مقدم اور مقتدی مؤخر ہو۔
(۳) بصورتِ تأخر: کہ فعل سے امام پہلے فارغ ہوجائے اور مقتدی امام کی ادائیگی کے بعد ادا کرے ان تینوں صورتوں میں متابعت کا حق ادا ہو کر مقتدی کی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں چونکہ تشہد پڑھنا واجب ہے اس لیے لاحق یا مسبوق تشہد پڑھنے کے بعد قیام کرکے تنہا رکوع کرکے امام کے ساتھ شریک ہوجائے، اور اس میں بھی متابعت بصورت تأخر کا حق ادا ہوتا ہے۔ البتہ مندرجہ بالا صورتوں میں اگر مقتدی اصل فعل ہی (یعنی فرض رکن مثلاً رکوع) ترک کردے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد مستقل رکعت ادا کرکے سلام پھیردے، اور اگر مستقل رکعت امام کی فراغت کے بعد ادا نہیں کی تو نماز ادا نہ ہوئی، اس لیے نماز واجب الاعادہ بلکہ فرض ہو کر دوبارہ ادا کرے گا۔

قال ابن عابدینؒ: والحاصل ان متابعۃ الامام فی الفرائض والواجبات من غیر تاخیر واجبۃ۔ فان عارضہا واجب لاینبغی ان یفوتہ بل یأتی بہ ثم یتابع کما لو قام قبل ان یتم المقتدی التشہد فانہ یتمہ ثم یقوم لان الاتیان بہ لایفوت المتابعۃ بالکلیۃ۔ وانما یؤخرہا۔ والمتابعۃ مع قطعہ تفوتہ بالکلیۃ فکان تاخیر احد الواجبین مع الاتیان بہما اولیٰ من ترک احدہما بالکلیۃ۔ (رد المحتار جلد۱ صفحہ۴۷۰ مطلب مہم فی تحقیق متابعۃ الامام) [1]

مسبوق سلام میں امام کی متابعت نہیں کرے گا خواہ سجدۂ سہو کی کیوں نہ ہو

سوال: مسبوق اگر امام کے ساتھ سجدۂ سہو کے لیے سلام پھیر دے تو سہواً یا عمداً کی صورت میں نماز پر کیا اثر پڑتا ہے؟ نیز قعدہ اخیرہ میں ملنے والے شخص کے لیے امام کی سجدۂ سہو میں متابعت ضروری ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ حماد بن حسن الشرنبلالی: لو سلم الامام او تکلم قبل فراغ المقتدی من قراءۃ التشہد یتمہ۔۔۔۔ ولایتبع الامام وان خاف فوت الرکوع لان قراءۃ بعض التشہد لم تعرف قربۃ والرکوع لایفوت فی الحقیقۃ لانہ یدرکہ فکان خلف الامام ومعارضۃ واجب آخر لایمنع الاتیان بما کان فیہ من واجب غیرہ لاتیانہ بہ بعدہ فکان تاخیر احد الواجبین مع الاتیان بہما اولیٰ من ترک احدہما بالکلیۃ۔
(مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۵۱ فصل فیما یفعلہ المقتدی بعد فراغ امامہ ۔۔۔۔ الخ)

الجواب: مسبوق کی حیثیت یادہونے کے باوجود سلام پھیرنا موجب فسادِ صلوٰۃ ہے، البتہ نسیان کی صورت میں سلام پھیرنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا جبکہ امام کے سلام کے ساتھ یا قبل سلام پھیرا ہو، لہٰذا یہ شخص امام کی فراغت کے بعد کھڑے ہو کر اپنی نماز مکمل کرے گا، تاہم مسبوق پر امام کے سجدہ سہو میں متابعت ضروری ہے البتہ سلام پھیرنے میں امام کی تابعداری نہیں کرے گا تاکہ من وجہ محلل نماز کے وسط میں واقع نہ ہو اور امام کی فراغت کے بعد سہواً سلام پھیرنے سے مسبوق پر سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: والمسبوق یسجد مع امامہ مطلقاً سواء کان السھو قبل الاقتداء او بعدہٗ۔ قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہ العبارۃ:- قید بالسجود لانہ لایتابعہ فی السلام بل یسجد معہ ویتشھد ماذا سلم الامام قام الی القضاء فان سلم فان کان عامداً فسدت والا لا ولا سجود علیہ ان سلّم سھواً قبل الامام او معہ وان سلّم بعدہ لزمہ لکونہ منفرداً حینئذٍ (بحر) واراد بالمعیۃ المقارنۃ وھونادر الوقوع کما فی شرح المنیۃ وفیہ ولو سلّم علیٰ ظن ان علیہ أن یسلّم فھو سلام عمد یمنع البناء۔

(الدر المختار ورد المحتار ج۲ ص۸۲ باب سجود السھو)[۱]

مسبوق کے لیے سہواً سلام پھیر کر خارج سے لُقمہ ملنے پر نماز کا حکم

سوال:- مسبوق اگر سہواً سلام پھیر دے، دوسرا شخص اسے مسبوقیت کی یاد دہانی کرائے اور یہ مسبوق اس پر عمل کر کے بقیہ نماز کے لیے کھڑا ہو جائے تو اس مسبوق کی نماز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:- اس مسئلہ میں فقہاء کا آپس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ایسا کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور بعض کے نزدیک نماز درست ہے اور یہی راجح قول ہے، لہٰذا احتیاطاً

---

[۱] وفی الھندیۃ: سھو الامام یوجب علیہ وعلیٰ من خلفہ السجود کذا فی المحیط ولا یشترط ان یکون مقتدیاً بہ وقت السھو حتی لو ادرک الامام بعد ما سھا یلزمہ ان یسجد مع الامام تبعاً لہٗ۔ ولو دخل معہ بعد ما سجد سجدۃ السھو۔ یتابعہ فی الثانیۃ ولا یقتضی الاول وان دخل معہ بعد ما سجدھما لا یقضیھما۔ (الھندیۃ باب فی سجود السھو ج۱ ص۱۲۸)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۷۸ باب الحدث فی الصلوٰۃ فی استخلاف المسبوق۔

یہ ہے کہ مصلی (نمازی) خارج سے لقمہ ملنے پر تحری کر کے اٹھ جائے اور اپنی باقی ماندہ نماز پوری کرے تاکہ اختلاف کی صورت نہ رہے۔ تاہم اگر اس نے امام کے ساتھ متصل سلام پھیرا ہو تو نماز کے آخر میں سجدۂ سہو کی ضرورت بھی نہیں، اور اگر امام کے سلام کے بعد سلام پھیرا تو ایسی صورت میں اس مسبوق پر نماز کے آخر میں سجدۂ سہو واجب ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولو سلّم (ای المسبوق) ساھیًا ان بعد امامه لزمه السهو والا لا۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۱ ص۴۴۳ باب سجود السهو) [۱]

سوال: اگر ایک شخص مغرب کی نماز میں امام کے ساتھ آخری رکعات میں شامل ہو جائے تو وہ باقی نماز کیسے ادا کرے گا؟

مغرب کی جماعت میں آخری رکعت پانے والے کا حکم

الجواب: یہ مسبوق امام کے سلام پھیرنے کے بعد اُٹھ کر ثنا، تعوذ، تسمیہ، فاتحہ اور سورت پڑھ کر رکوع اور سجدہ کر کے قعدہ پر بیٹھ کر تشہد پڑھے، پھر اٹھ کر دوسری رکعت میں فاتحہ اور سورت پڑھے پھر رکوع اور سجدہ کے بعد بیٹھ کر التحیات پوری کر کے سلام پھیرے، اور تیسری رکعت اس نے امام کے ساتھ ادا کی ہے۔ اور اگر دوسری رکعت (یعنی امام سے فراغت کے بعد پہلی رکعت) پر نہیں بیٹھا ہو پھر بھی نماز استحساناً جائز ہے اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں۔

لما قال ابراهیم الحلبیؒ: لو ادرك مع الامام ركعة من المغرب فانه یقرأ فی الركعتین الفاتحة والسورة ویقعد فی اولیهما لانها ثنائیة ولو لم یقعد جاز استحساناً لا قیاساً ولم یلزمه سجود السهو۔ (کبیری ص۴۶۸ فی آخر فصل سجود السهو) [۲]

---

[۱] قال القاضی خان: اذا سلّم المسبوق ساھیًا یلزمه السهو قیل هٰذا اذا سلّم بعد الامام فان سلّم مع الامام لا سهو علیه۔ (الفتاوی القاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۱۲۳ باب سجود السهو)

[۲] قال ابن نجیم المصریؒ: لو ادرك مع الامام ركعة من المغرب فانهٗ یقرأ فی الركعتین بالفاتحة والسورة ولو ترك القرأة فی احدهما فسدت صلوته وعلیه ان یقضی ركعة بتشهد لانها ثانیته ولو ترك جازت استحساناً لا قیاساً۔ وقال ابن عابدینؒ تحت هٰذه العبارة۔ ولو لم یقعد جاز استحساناً لا قیاساً ولم یلزمه سجود السهو ولو سهوًا۔ (البحر الرائق ومنحة الخالق جلد ۱ ص۳۷۹ باب الحدث فی الصلوٰة)

وَ مِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۱ ص۵۹۷ احکام المسبوق۔

تین رکعات کے مسبوق کے لیے امام کے فارغ ہونے کے بعد دو رکعت متصل پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال:۔ اگر مسبوق نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت ادا کر کے بعد میں بناء کی صورت میں دو رکعتیں بلافصلِ قعدہ کے پڑھ لیں، تو کیا اس مسبوق پر سجدۂ سہو لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ معتمد علیہ قول امام محمدؒ کا ہے اور صورتِ مذکورہ میں امام محمدؒ کے قول کے خلاف کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی اس شخص کی نماز استحساناً جائز اور درست ہے، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویقضی اول صلوتہٖ فی حق قرأتہٖ وآخرھا فی حق تشھد فمدرك رکعۃ من غیر فجر یأتی برکعتین بفاتحۃ وسورۃ وتشھد بینھما وبرابعۃ الرباعی بفاتحۃ فقط ولا یقعد قبلھا ــــ وقال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہ العبارۃ (قولہ ویقضی صلوتہٖ فی حق قرأتہ اول الخ) وھٰذا قول محمدؒ کما فی مبسوط السرخسیؒ وعلیہ اقتصر فی الخلاصۃ وشرح الطحاوی والاسبیجابی والفتح والدرر والبحر وغیرھم وذکر الخلاف کذلك فی السراج الوھاج لکن فی صلوۃ الجلابی ان ھٰذا قولھما وتمامہٗ فی شرح الشیخ اسمٰعیل وفی الفیض عن المستصفی لو ادرکہ فی رکعۃ الرباعی یقضی رکعتین بفاتحۃ وسورۃ ثم یتشھد ثم یأتی بالثالثۃ بفاتحۃ خاصۃ اھ وظاھر کلامھم اعتماد قول محمدؒ (قولہ تشھد بینھما) قال فی شرح المنیۃ ولو لم یقعد جاز استحساناً لاقیاساً ولم یلزمہ سجود السھو لکون الرکعۃ اُولیٰ من وجہ اھ

(الدر المختار ورد المحتار ج ۱ ص ۵۹۶ احکام المسبوق واللاحق)[۱]

---

[۱] قال ابراھیم الحلبیؒ: ومن جملتھا ما اشرنا الیہ انہ یقضی اوّل صلوتہ فی حق القرأۃ وآخرھا فی حق القعدۃ حتّٰی لو ادرك مع الامام رکعۃ من المغرب بانہ یقرأ فی الرکعتین الفاتحۃ والسورۃ ویقعد فی اولیھما لانھا ثنائیۃ ولو لم یقعد جاز استحساناً لاقیاساً ولم یلزمہ سجود السھو لو سھواً لکونھا اولیٰ من وجہ الخ ۔ (کبیری ص ۴۶۸ باب سجود السھو)

وَمِثْلُہٗ فی منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج ۱ ص ۳۷۹ باب الحدث فی الصلوۃ ۔

چوتھی رکعت میں امام کو پانے والے مسبوق کی نماز کا حکم | **سوال**:- جب ایک شخص نے چار رکعات والی نماز میں امام کو آخری رکعت میں پایا اور پہلی تین رکعات اُس سے فوت ہوئی ہیں، تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:- یہ مسبوق امام کی فراغت کے بعد کھڑے ہو کر ایک رکعت پڑھنے کے بعد بیٹھ کر قعدہ کرے، تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کی صورت میں فاتحہ اور ضم سورت کرے گا اور آخری رکعت میں صرف فاتحۃ الکتاب پر اکتفاء کرے گا۔ گویا اس صورت میں مسبوق کو امام کے ساتھ پڑھی ہوئی رکعت کے علاوہ باقی تین رکعات میں ترتیب کی یوں رعایت رکھنی ہے۔

قال الحصکفیؒ: (والمسبوق من سبقه الامام بہا او ببعضها (ای بکل الرکعات او بعض الرکعات) (وھو منفرد) حتّٰی یثنّی ویتعوذ ویقرأ وان قرأ مع الامام لعدم الاعتداد بہا لکراھتہا مفتاح السعادۃ (فیما یقضیه) ای بعد متابعۃ لامامه الخ۔ ویقضی اوّل صلوٰتہ فی حق قرأۃ واٰخرھا فی حق التشہد۔ فمدرك رکعۃ من غیر فجر یأتی برکعتین بفاتحۃ وسورۃ وتشہد بینہما وبرابعۃ الرباعی فقط ولا یقعد قبلہا۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار، ج ۱ ص ۵۹۶ احکام المسبوق واللاحق) [1]

مسبوق کیلئے امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم | **سوال**:- اگر ایک شخص جماعت میں ایسی حالت میں شامل ہو کہ امام نے ایک یا دو رکعت پڑھی ہوں تو مقتدی قعدہ اخیرہ میں امام کے ساتھ بیٹھتے ہوئے درود شریف اور دُعاء پڑھے گا یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو ادرك رکعۃ مع الامام فی صلوٰۃ الظھر والعصر والعشاء وقام الی القضاء فعلیه ان یقضی رکعۃ ویقرأ فیہا بالفاتحۃ وسورۃ ویتشہد لانه یقضی اٰخر الصلوٰۃ فی حق التشہد ویقضی رکعۃ ویقرأ فیہا بالفاتحۃ والسورۃ ولا یتشہد وفی الثانیۃ بالخیار والقرأۃ افضل ولو ادرك رکعتین منہا یقضی رکعتین ویقرأ فیہما ویتشہد۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۶۶ مسائل المسبوق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۷۹ فی باب الحدث فی الصلوٰۃ فی استخلاف المسبوق۔

الجواب: مسبوق امام کے قعدہ اخیرہ میں وسط صلوٰۃ کے حکم میں ہے اس لیے اُسے درود شریف نہیں پڑھنا چاہیئے کیونکہ درود شریف نماز کے آخر میں پڑھا جاتا ہے، اسلئے مسبوق کو قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنے میں اطمینان سے کام لینا چاہیئے تاکہ امام کے سلام پھیرنے تک یہ تشہد میں مشغول رہے، اور اگر اس نے تشہد جلدی ختم کر دیا تو پھر بار بار شہادتین پڑھے۔

وفی الهندیة: ومنها ان المسبوق ببعض الرکعات یتابع الامام فی التشهد الاخیر واذا اتم التشهد لایشتغل بما بعده من الدعوات ثم ماذا یفعل تکلموا فیه۔ وعن ابن شجاع: انه یکرر التشهد ای قوله اشهد ان لآ اله الا الله وهو المختار کذا فی الغیاثیة۔

(الهندیة ج۱ ص۹۱ الفصل السابع فی المسبوق واللاحق)[1]

پانچویں رکعت کے لیے سہواً امام کے قیام پر مسبوق کی نماز کا حکم

سوال: قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد امام پانچویں رکعت کے لیے سہواً کھڑا ہو گیا تو ایسی صورت میں مسبوق (جس نے امام کے ساتھ کچھ رکعات پڑھی ہوں اور کچھ باقی ہوں) کیا طریقہ اختیار کرے؟ کیا مسبوق بھی امام کی تابعداری کرتے ہوئے پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے یا بیٹھ کر ہی امام کے بیٹھنے اور سلام پھیرنے کا انتظار کرے اور یا امام کی تابعداری چھوڑ کر اپنی بقیہ نماز پوری کرے، تینوں صورتوں میں مسبوق کے لیے کون سی صورت قابلِ عمل ہے؟

الجواب: واضح ہو کہ مسبوق کی حالت مدرک سے مختلف ہے، مدرک تو ابتداء سے لے کر آخر تک امام کا تابع رہتا ہے، لیکن مسبوق امام کی تابعداری میں صرف اُس وقت تک ہے جب تک امام کی نماز بحال ہو، بایں معنیٰ کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد کی طرح اپنی نماز پوری کرتا ہے۔ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ نماز پڑھنے والے مسبوق کو احتیاط سے کام لینا ہوگا، ایسا نہ ہو کہ کہیں امام کی ایسی زائد تابعداری سے اس کی نماز متأثر ہو۔ لہٰذا امام جب قعدۂ اخیرہ کے بعد پانچویں رکعت کے لیے سہواً کھڑا ہو تو یہ ایسی حالت ہے کہ

---

[1] قال قاضی خانؒ: المسبوق اذا قعد مع الامام کیف یفعل اختلفوا فیه والصحیح انهٗ یترسل فی التشهد حتی یفرغ من التشهد عند سلام الامام۔
(فتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة ص۱۰۳-۱۰۴ فصل فی المسبوق)

جس کا تعلق اصلی نماز سے نہیں، کیونکہ نماز تو پوری ہوچکی ہے اس لیے پانچویں رکعت کے لیے کھڑے ہونے پر امام کی تابعداری ضروری نہیں، مسبوق تشہد کی حالت پر بیٹھ کر ہی امام کا انتظار کرے گا۔ اور اگر مذکورہ صورت میں قعدہ اخیرہ کرنے کے بعد امام کے ساتھ مسبوق بھی کھڑا ہو گیا تو اس کی تابعداری کرنے سے مسبوق کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

قال ابن نجیم المصریؒ : ولو قام الامام الی الخامسة فی صلوٰة الظہر فتابعه المسبوق ان قعد الامام علی رأس الرابعة تفسد صلوٰة المسبوق۔ (البحر الرائق جلد ۱ ص ۳۷۸)

وایضاً قال علاؤ الدین الحصکفیؒ : ولو قام امامه لخامسة فتابعه ان بعد القعود تفسد۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۵۹۹ قبل باب الاستخلاف)

لہٰذا انتظار پانچویں رکعت کے سجدہ تک ممتد رہے گا۔ اس دوران اگر سجدہ کرنے سے قبل یاد آنے پر امام لوٹ کر تشہد پر بیٹھ گیا تو مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے، جب امام سلام پھیر دے تو مسبوق حسب قاعدہ اٹھ کر اپنی بقیہ نماز پوری کرے لیکن اگر امام نے پانچویں رکعت بھی پڑھی تو پھر مسبوق قدر تشہد بیٹھنے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرے۔

قال العلامة طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی الاصل لو قام المسبوق الی قضاء ما سبق به بعد فراغه من التشہد قبل السلام جاز۔ (خلاصة الفتاوی ج ۱ ص ۱۶۹ قبل الفصل السادس عشر فی السہو)

اور اگر پانچویں رکعت کے لیے تشہد پڑھنے کے بغیر کھڑا ہوا تو پھر اس صورت میں مسبوق امام کی تابعداری کرے یا نہ کرے دونوں صورتوں میں پانچویں رکعت کے لیے سجدہ کرنے سے نماز نفل ہوگی۔

قال ابن نجیم المصریؒ : وان لم یقعد لم تفسد حتی یقید الخامسة بالسجدة فاذا قیدها بالسجدة فسدت صلوٰة الکل۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۳۷۸ باب الحدث فی الصلوٰة) [1]

---

[1] ولو قام امامه لخامسة فتابعه ان بعد القعود تفسد والا لا حتی یقید الخامسة بسجدة۔
قال ابن عابدین (قوله تفسد) ای صلوٰة المسبوق لانه اقتداء فی موضع الانفراد۔
وقال ایضاً: (تحت قوله والا) ای وان لم یقعد وتابعه المسبوق لاتفسد صلوٰته ....
فان قیدها بسجدة انقلبت نفلاً۔ (رد المحتار ج ص ۵۹۹ احکام المسبوق)
قال الحصکفیؒ : ولو قام قبل السلام هل یعتد بادائه ان قبل قعود الامام قدر التشہد لا وان بعد نعم وکره تحریماً الا لعذر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۵۹۷ احکام المسبوق)
ومثله فی الہندیة ج ۱ ص ۹۱، ۹۲ باب اللاحق والمسبوق۔

مسبوق کے لیے فوت شدہ رکعات میں قرأت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے امام کے ساتھ آخری رکعت میں شامل ہو کر نماز ادا کی، امام کی فراغت کے بعد یہ شخص فوت شدہ رکعات کی قضاء کرتے ہوئے قرأت پڑھے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک یہ مسبوق فوت شدہ رکعات میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملا کر پڑھے گا، کیونکہ مسبوق قرأت کے اعتبار سے نماز کا پہلا حصہ ادا کر رہا ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویقضی (ای المسبوق) اول صلوٰته فی حق قرأة الخ

قال ابن عابدینؒ: تحت هٰذه العبارة (قوله ویقضی اول الخ) هٰذ قول محمد کما فی مبسوط السرخسیؒ وعلیه اقتصر فی الخلاصة وشرح الطحاوی لو ادرکه فی رکعة الرباعی یقضی رکعتین بفاتحة وسورة ثم یتشهد ثم یأتی الثالثة بفاتحة خاصة عند ابی حنیفة وقالا رکعة بفاتحة وسورة ثم یتشهد ثم رکعتین اولاها بفاتحة وسورة وثانیهما بفاتحة خاصة وظاهر کلامهم اعتماد قول محمد۔

(رد المحتار ج۱ ص۵۹۶ احکام المسبوق)[1]

امام کی سرعت کی وجہ سے مقتدی سے رکوع یا سجدہ کی تاخیر کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص نماز کی ابتداء سے امام کے ساتھ جماعت میں شریک رہا، درمیان میں امام کی سرعت کی وجہ سے مقتدی رکوع یا سجدہ کا ادراک نہ کر سکے تو اس شخص کو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ ایسا شخص ترتیب سے چلتے ہی رکوع اور سجدہ کر کے امام کے ساتھ ملنے کی کوشش کرے گا، فرض یا واجب کے ترک کی صورت سے یہ بہتر ہے کہ امام کی رفاقت میں تاخیر ہو، کیونکہ تاخیر کی صورت میں بھی فی الجملہ متابعت موجود ہے۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: والمسبوق فیما یقضی یقضی اول صلوٰته فی حق القرأة واٰخر صلوٰته فی حق التشهد الخ ولو ادرک رکعتین منها (ای من صلوٰة الظهر او العصر او العشاء) یقضی رکعتین ویقرأ فیهما ویتشهد۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۱۶۵، ۱۶۶)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۹۱ باب احکام اللاحق والمسبوق)

قال ابن عابدینؒ: فلونام فی الثالثۃ واستیقظ فی الرابعۃ فانہٗ یأتی بالثالثۃ بلا قرأۃ فاذا فرغ منہا صلی مع الامام الرابعۃ وان فرغ منہا الامام صلاہا وحدہا بلا قرأۃ ایضاً فلوتابع الامام ثم قضی الثالثۃ بعد السلام صح واثم۔
(رد المحتار ج۱ ص۵۹۵ احکام اللاحق)[1]

سجدۂ سہو کے لیے سلام پھیرنا باعتبارِ ذات مخرج عن الصلوٰۃ نہیں

سوال:۔ امام سجدۂ سہو کے لیے سلام پھیرنے سے نماز سے خارج سمجھا جائے گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو مسبوق کو امام کے ساتھ سلام پھیرنے کی ممانعت کیوں ہے؟ اور اگر نماز سے خارج مانا جائے تو پھر اسی اثناء میں امام کے پیچھے نئے مسبوق کی اقتداء کیوں صحیح ہے؟ دونوں صورتوں کے دلائل کیا ہیں؟ اور کیا سجدۂ سہو سلام پھیرنے کے بغیر ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص سجدہ کے لیے سلام پھیر دے وہ نماز سے اصلاً خارج نہیں ہوتا ہے اور یہ سلام موقوفاً اور ذاتاً کسی اعتبار سے مخرج و محلل نہیں، جبکہ شیخینؒ کے نزدیک یہ سلام تو فی نفسہ محلل اور مخرج ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تحلیلہا التسلیم، لیکن صاحبِ سہو کے حق میں محلل اور مخرج ذاتاً و قطعاً نہیں بلکہ موقوف ہے، یعنی اگر اس نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کر لیا تو مخرج اور محلل نہیں سمجھا جائے گا۔ اور اگر سجدۂ سہو نہیں کیا تو مخرج اور محلل قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا سلام پھیرنے کے وقت اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا، نہ مخرج اور محلل کا اور نہ غیر مخرج اور محلل کا۔ اس تحقیق سے مسبوق کے لیے سلام پھیرنے کی ممانعت کی وجہ معلوم ہوگئی کہ مسبوق کے حق میں چونکہ یہ سلام پھیرنا نماز کے درمیان میں ہونے کا احتمال ہے، اس لیے مسبوق کے لیے سلام پھیرنا ممنوع ہے تاکہ محلل اس کے حق میں فی خلال الصلوٰۃ لازم نہ آئے اگرچہ من وجہ محلل کیوں نہ ہو۔ رہا یہ کہ پھر ایسی حالت میں امام کے پیچھے ایک نئے مسبوق کی اقتداء کیوں صحیح

---

[1] وفی الہندیۃ: ولو لم یشتغل بقضاء ما سبقہ الامام ولکن یتابع الامام اوّلاً ثم قضی ما سبقہ الامام بعد تسلیم الامام جازت صلوٰتہٗ عندنا ھٰکذا فی شرح الطحاوی۔
(الہندیۃ ج۱ ص۹۳ الفصل السابع فی المسبوق واللاحق)

ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اقتداء اس وقت صحیح تسلیم کی گئی ہے جبکہ امام سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرے کیونکہ سجدہ سہو کرنے کے بعد یہ سلام بالاتفاق مخرج اور محلل نہیں ہے، اسلیئے امام نماز سے اسی صورت میں بالاتفاق خارج نہیں ہوا ہے لہٰذا دوسرے مسبوق کی اقتداء اس کے پیچھے جائز اور درست ہے۔ علاوہ ازیں سجدہ سہو قبل از سلام بھی جائز ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کا عمل روایات اور احادیث میں منقول ہے، مگر چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امت کے لیے تشریع عام پر قرار دیا ہے: لکل سہو سجدتان بعد السلام۔ اس لیے سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کو افضل قرار دیا گیا ہے، کیونکہ سلام تک جتنے واجبات رہ جائیں سب کے لیے ایک دفعہ سے سجدہ سہو کرنے سے تدارک ہو جاتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: وسلام من علیہ سجود سھو یخرجہ من الصلوٰۃ خروجاً موقوفاً ان سجد عاد الیھا والا لا وعلیٰ ھٰذا یصح الاقتداء بہ الخ

قال ابن عابدینؒ: تحت ھٰذہ العبارۃ (قولہ یخرجہ من الصلوٰۃ الخ) ھٰذا عندھما واما عند محمدؒ فانہ لا یخرجہ منھا اصلاً کما فی البحر وغیرہ۔

(قولہ ان سجد عاد الخ) افاد ان معنی التوقف انہ یخرجہ منھا من کل وجہ علی احتمال ان یعود الی حرمتھا بالسجود بعد خروجہ منھا ولھم فیہ تفسیر اٰخر وھو انہ قبل السجود یتوقف علی ظھور عاقبتہ ان سجد تبیّن انہ لم یخرجہ وان لم یسجد تبیّن انہ اخرجہ من وقت وجودہ۔ (رد المحتار ج۲ ص۸۹ باب سجود السھو)[1]

---

[1] قال الامام اکمل الدین محمد بن محمد البابرتیؒ: (لان ھٰذا السلام) ای سلام من علیہ سجدتا السھو (غیر قاطع) ای بالاتفاق اما عند محمد فلانہ لم یشرع محللاً واما عندھما فلانہ ان کان محللاً فھو محلل علیٰ سبیل التوقف لا علیٰ سبیل البتات وکل ما لم یشرع قاطعاً لا یقطع الصلوٰۃ فدل علیٰ ان القطع لا یحصل بالسلام۔ (العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج۱ ص۴۲۵ باب سجود السھو)

قال ابن الھمامؒ: فکل سلام الاصل فیہ ان یکون مخرجاً لانہ جعل محللاً شرعاً۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحلیلھا التسلیم ولانہ من باب الکلام علیٰ ما مرّ الّا انہ منع من الاخراج حالۃ السھو دفعاً للحرج لکثرۃ السھو وغلبۃ النسیان ولا یکثر سلام من علم ان علیہ الواجب لان ظاھر حال المسلم انہ لا یترک الواجب فیبقی مخرجاً علیٰ اصل الوضع۔ (فتح القدیر ج۱ ص۴۵۱ باب سجود السھو)

مسافر امام کے پیچھے دوسری رکعت یا قعدہ میں شامل ہونے والے مقیم مقتدی کی نماز کا حکم

سوال:۔ ایک مقیم شخص مسافر امام کے پیچھے دوسری رکعت یا قعدہ میں شریک ہوا، تو مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ مسبوق مقیم بقیہ نماز کس طرح پڑھے گا؟

الجواب:۔ جب ایک مقیم شخص مسافر امام کے پیچھے اقتداء کرے، ظہر، عصر یا عشاء کی نماز ہو تو امام کے سلام کے بعد مقتدی تیسری اور چوتھی رکعت میں قرأت نہیں پڑھے گا اور جس رکعت میں مسبوق ہو تو اس میں فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملا کر پڑھے گا۔ گویا اس صورت میں یہ نماز کے مختلف حصوں میں مسبوق اور لاحق دونوں کے حکم میں ہے۔

قال الحصکفیؒ: واللاحق من فاتته الرکعات کلها او بعضها لکن بعد اقتدائه لعذر کسبق حدث وصلوٰۃ خوف ومقیم ائتم بمسافر۔ قال ابن عابدینؒ تحت هٰذه العبارۃ (قوله مقیم الخ) ای فهو لاحق (ای مقیم المقتدی بالمسافر) بالنظر للاخیرتین وقد یکون مسبوقاً ایضاً کما اذا فاته اول صلوٰۃ امامه المسافر۔ اھ

(الدر المختار ورد المحتار ج ۱ ص ۵۹۴ مسائل مسبوق واللاحق)

وایضاً قال ابن عابدینؒ: ان اللاحق المسبوق یقضی وجوباً اولاً ما لحق به ثم ما سبق به الخ وان صح عکسه عندنا خلافاً لزفر۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۴۲۵)[1]

لاحق کی نماز کا طریقہ

سوال:۔ زید ظہر کی نماز میں شریک ہوا، دو رکعت امام کے ساتھ پڑھنے کے بعد اسے حدث کا عارضہ پیش آیا تو فوراً وضو کر کے امام کے ساتھ قعدہ میں شامل ہو گیا، تو بقیہ نماز امام کی فراغت کے بعد کیسے ادا کرے گا؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں وضو کرنے کے بعد اسے پہلے فوت شدہ نماز بلا قرأت پڑھنی چاہیئے جو حدث کی وجہ سے فوت ہو چکی ہے۔ پھر اگر امام نماز میں ہو تو اس کے ساتھ شمولیت اختیار کرے ورنہ اکیلا اپنی نماز پوری کرے۔ تاہم اگر امام کے ساتھ مل کر امام کی فراغت کے بعد اپنی نماز پوری کرے تو یہ بھی جائز ہے لیکن پہلی صورت بہتر ہے۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشیدؒ: ان المسبوق فیما یقضی کالمنفرد واللاحق کانه خلف الامام ولهٰذا لاقرأۃ علی اللاحق و یفترض علی المسبوق۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۶۶ مسائل المسبوق)

وفی الهندیة: اللاحق اذا عاد بعد الوضوء ینبغی لهٗ ان یشتغل اوّلاً بقضاء ما سبقه الامام بغیر قرأة یقوم مقدار قیام الامام ورکوعه وسجوده۔ ولو زاد او نقص فلا یضرّه هٰکذا فی شرح الطحاوی۔ وقال بعد سطر واحدۃٍ ولو لم یشتغل بقضاء ما سبقه الامام ولکن یتابع الامام اولاً ثم قضٰی ما سبقه الامام بعد تسلیم الامام جازت صلوٰتهٗ عندنا۔ هٰکذا فی شرح الطحاوی۔ (الهندیة ج۱ ص۹۲ الفصل السابع فی المسبوق واللاحق)[1]

مدرک کی سستی کی وجہ سے رکن رہ جانے پر اعادہ کا حکم

سوال:۔ اگر وتر میں مقتدی کہیں دعاءِ قنوت مکمل کر رہا تھا کہ امام رکوع سے قومہ میں چلا گیا تو اب یہ شخص نماز کیسے ادا کرے گا؟

الجواب:۔ اس صورت میں مقتدی فوراً رکوع اور قومہ کرکے سجدہ میں امام کے ساتھ شریک ہوگا، اگرچہ متابعت مقارنہ یا متعاقبہ نہ ہوسکا لیکن متابعت کی تیسری قسم متابعت بالتاخیر کی بنا پر اس شخص کی نماز درست ہوگی جیسا کہ لاحق کی نماز کا حکم ہے، اور اگر رکوع و قومہ چھوڑ کر فوراً امام کی متابعت کرے تو امام کی فراغت کے بعد ایک رکعت مستقل ادا کرے نماز درست ہوگی، اور اگر سرے سے رکعت ادا نہیں کی تو نماز باطل ہو کر اعادہ کرے گا۔

قال ابن عابدینؒ: نعم تکون المتابعة فرضاً بمعنی ان یأتی بالفرض مع امامه او بعده کما لو رکع امامه فرکع معه مقارناً او معاقباً وشارکه فیه او بعد ما رفع منه فلو لم یرکع اصلاً او رکع ورفع قبل ان یرکع امامه ولم یعده معه او بعده لبطلت صلوٰته الخ۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۷۱ مطلب مهم فی تحقیق متابعة الامام)

❁

---

[1] قال ابن عابدینؒ: ففی شرح المنیة وحکمه (ای اللاحق) انه یقضی ما فاته اوّلاً ثم یتابع الامام ان لم یکن قد فرغ۔ وفی النتف اذا توضأ ورجع یبدأ بما سبقه الامام به۔ ثم ان ادرک الامام فی شیءٍ من الصلوٰة یصلیه معهٗ اھ وفی البحر وحکمه انهٗ یبدأ بقضاء ما فاتهٗ بالعذر ثم یتابع الامام ان لم یفرغ۔ وهٰذا واجب لا شرط حتی لو عکس یصح الخ۔ (رد المحتار ج۱ ص۵۹۵ احکام المسبوق واللاحق)

ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۲۱، ۱۲۲ الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت۔

باب مکروہات الصّلوٰۃ

(نماز کے مکروہات کا بیان)

شلوار یا تہبند کا ٹخنوں سے نیچے ہونا

سوال:۔ اگر حالتِ نماز میں شلوار یا تہبند کعبین (ٹخنوں) سے نیچے ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ جبکہ اس دور میں اکثر لوگوں کی شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوتی ہے اور وہ اسی حالت میں نماز بھی پڑھتے ہیں، کیا اس طرح نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب:۔ شلوار یا تہبند بطورِ تکبّر کے ٹخنوں سے نیچے رکھنا مکروہ تحریمی ہے، اسلئے ایسی حالت میں نماز پڑھنا بھی کراہت سے خالی نہیں، البتہ نماز میں فساد نہیں آتا۔

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من جرّ ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیٰمۃ۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اسفل من الکعبین من الازار فی النّار۔ (کلاھما فی الصحیح البخاری ج ۲ ص ۸۶۱ کتاب اللباس)[1]

نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آنا

سوال:۔ نماز میں التحیات کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آنے سے نماز فاسد ہو جائے گی یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

الجواب:۔ نماز میں حضور انورؐ کا تصوّر میں آنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ

---

[1] لما قال العلامۃ الملّا علی القاریؒ: قال ابن الملک: ویفھم منہ ان جرہ لغیر ذلک لایکون حرامًا لکنہ مکروہ کراھۃ تنزیۃ۔

وایضًا قال: وقد نص الشافعی علی ان التحریم مخصوص بالخیلاء لدلالۃ ظواھر الاحادیث علیھا فان کان للخیلاء فھو ممنوع منع تحریم والا فمنع تنزیۃ۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۸ ص ۱۳۸ کتاب اللباس، الفصل الاوّل)

ومِثْلُہٗ فی مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۷۱، ۳۷۲ کتاب اللباس۔

التحیات اور درود شریف میں انسان کو حضور انورؐ کا خیال آ ہی جاتا ہے البتہ خیال علیٰ سبیل التعظیم والعبادۃ لانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ نماز صرف اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ نماز میں غیر اللہ کے خیال سے اجتناب کیا جائے، اور محض خیال سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

عن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدورھا ما لم تعمل بہ او تتکلم۔ متفق علیہ۔
(مشکوٰۃ ج ۱ ص۱۸ باب فی الوسوسۃ) لـه

مسجد میں جگہ ہونے کے باوجود چھت پر نماز پڑھنا

سوال: مسجد میں جگہ ہونے کے باوجود بعض لوگ مسجد کی چھت پر نماز پڑھتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ اور اس سے نماز میں تو کوئی فرق نہیں آتا؟

الجواب: مسجد کی چھت پر انفرادی طور پر یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بلا عذر ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں بشرطیکہ امام کی حالت اس پر مشتبہ نہ ہو اور نہ امام پر مقدم ہو، اور اگر امام کی حالت اس پر مشتبہ ہو یا امام پر مقتدی مقدم ہو جائے تو پھر جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: سطح المسجد لہ حکم المسجد فھو کاقتدائہ فی جوف المسجد اذا کان لا یشتبہ علیہ الامام ...... ولھذا یصح اقتداء من علیٰ سطح المسجد بمن فیہ اذا لم یتقدم علی الامام۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد) لـه

لـه عن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ عزوجل تجاوز لامتی عما حدثت بہ نفسھا ما لم تعمل او تتکلم بہ۔ (الصحیح لمسلم ج ۱ ص۷۸ باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس)

لـه لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشھیر بقاضی خان: ولو قام علیٰ سطح المسجد واقتدی بامام فی المسجد ان کان للسطح باب فی المسجد ولا یشتبہ علیہ حال الامام یصح الاقتداء وان اشتبہ علیہ حال الامام لا یصح۔
(الفتاوی القاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۹۲ باب الامامۃ)
ومثلہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۸۸ باب الامامۃ الفصل الرابع فی بیان ما یصح الاقتداء۔

پگڑی باندھنے میں اگر سر کا درمیانہ حصہ خالی رہ جائے تو نماز کا کیا حکم ہے

سوال:۔ بعض بوڑھوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ پگڑی باندھتے ہیں تو سر کا درمیانہ حصہ ننگا چھوڑ دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اس طرح نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح پگڑی باندھنے سے منع فرمایا ہے کہ سر پر پگڑی تو موجود ہو مگر اس کا درمیانہ حصہ خالی ہو، اس لیے اس کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: یکرہ اشتمال الصماء والاعتجار.... قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ والاعتجار) لنھی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم عنہ وھو شد الرأس أو تکویر عمامۃ علیٰ رأسہ وترك وسطہ مکشوفاً۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۲ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ مطلب الکلام علیٰ اتخاذ المسبحۃ)[۱]

جالی والی ٹوپی میں نماز کا حکم

سوال:۔ آجکل چینی (جالی دار) ٹوپیوں کا رواج عام ہے اور نماز میں لوگ اکثر ان کو استعمال کرتے ہیں جبکہ سر کے بال اُن میں نظر آتے ہیں، کیا ان کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ نماز میں سترِ عورت ضروری ہے اور وہ بھی اُس کپڑے سے جو اس کیلئے مباح ہو، چونکہ سر مردوں کے ستر (عورت) میں داخل نہیں اور جالی دار ٹوپی بھی مردوں کے لیے مباح ہے اس لیے اس میں نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰنؒ: (الجواب) جو کپڑا مردوں کو پہننا مباح ہو اگر وہ جالی دار ہو تو اس کی ٹوپی سے نماز درست ہے اور استعمال اس کا اس طریقہ پر کہ کشفِ عورت نہ ہو۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد۴ ص۱۰۹ باب مکروہات الصلوٰۃ)

چوری شدہ ٹوپی سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ میرا ایک دوست درزی ہے، اس کے پاس لوگ کپڑے سلوانے کیلئے لاتے ہیں

---

[۱] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ الاعتجار وھو شد الرأس بالمندیل أو تکویر عمامۃ علیٰ رأسہ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحاوی ص۲۸۴ فصل مکروہات الصلوٰۃ)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۰۶ الفصل الثانی فیما یکرہ الصلوٰۃ۔

اس سے کچھ کپڑا بچ بھی جاتا ہے، اُس کپڑے سے اگر ٹوپی وغیرہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ کپڑا جو درزی کے پاس بچ جاتا ہے اور مالک نے بطیبِ خاطر چھوڑ دیا ہو تو اس سے بنی ہوئی ٹوپی میں نماز پڑھنا بلاکراہت درست ہے، البتہ اگر مالک کی رضامندی کے بغیر اس نے اس کپڑے سے اپنے لیے ٹوپی بنالی تو اس چوری کردہ کپڑے کی ٹوپی میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکذا تکرہ فی اماکن کفوق کعبۃ......... وارض مغصوبۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۸۱ کتاب الصلوٰۃ قبیل باب الاذان) ؎۱

کباڑ (لنڈے) کے کپڑوں میں نماز کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ کباڑ (لنڈے) کے کپڑے استعمال کرتے ہیں، کیا بغیر دھوئے ان کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ کباڑ (لنڈے) کا اکثر حصہ یہود و نصاریٰ یا فساق کے استعمال شدہ کپڑوں کا ہوتا ہے، فقہاء کرام نے ان کی شلوار، پتلون وغیرہ کے علاوہ دیگر کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز لکھا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ ایسے کپڑے دھو کر استعمال کیے جائیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ثیاب الفسقۃ واھل الذمۃ طاھرۃ۔ قال ابن عابدینؒ: قال فی الفتح قال بعض المشائخ تکرہ الصلوٰۃ فی ثیاب الفسقۃ لانھم لایتقون الخمور۔ قال المصنف یعنی صاحب الھدایۃ الاصح انہ لایکرہ لانہ لم یکرہ من ثیاب اھل الذمۃ الا السراویل مع استحلالھم الخمر فھذا اولیٰ۔ (رد المحتار ج۱ ص۳۵۰ فصل فی الاستنجاء قبیل کتاب الصلوٰۃ) ؎۲

؎۱ قال العلامہ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وتکرہ فی ارض الغیر بلا رضاہ۔

(مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۹۱ باب مکروہ الصلوٰۃ)

؎۲ قال العلامہ السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قولہ وثیاب الفسقۃ واھل الذمۃ) مثلھم اھل الحرب (قولہ طاھرۃ) ظاھرہ جواز الصلوٰۃ فیھا من غیر کراھۃ فی التجنیس ان الصلوٰۃ فی سراویل اھل الذمۃ مکروھۃ۔ قال الحلبیؒ: ولعلہ لانھم لایستنزھون ولایستنجون۔ (الطحطاوی حاشیۃ الدر المختار ج۱ ص۱۶۸ فصل فی الاستنجاء قبیل کتاب الصلوٰۃ)

ومثلہ فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۴ ص۱۲۵ باب مکروھات الصلوٰۃ۔

باریک کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے

سوال:۔ آجکل ایسے کپڑوں کا استعمال عام ہے جن میں سارا بدن واضح طور پہ نظر آتا ہے، ایسے کپڑوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ آزاد عورت کا تمام بدن عورت (ستر) ہے اور مردوں کا ناف سے لے کر گھٹنوں تک، نماز میں بدن کے ان حصوں کا چھپانا فرض ہے، لہٰذا اگر کسی عورت کے بدن کا کوئی حصہ ان کپڑوں میں نظر آتا ہو یا مرد کا ستر والا حصہ چھپا ہوا نہ ہو تو اس صورت میں نماز نہیں ہوتی اور اس کا اعادہ واجب ہے۔

ولما قال العلامة الحصکفیؒ: وللحرۃ ولو خنثیٰ جمیع بدنها حتّی شعرها النازل فی الاصح خلا الوجه والکفین فظهر الکف عورۃ علی المذهب والقدمین علی المعتمد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۴۰۵ باب شروط الصلوٰۃ)۔

وقال ابن عابدینؒ: تحت قوله ولا یصف ما تحته بان لا یری منه لون البشرۃ احترازاً عن الرقیق ونحو الزجاج ۔(رد المحتار ج۱ ص۴۱۰ باب شروط الصلوٰۃ مطلب فی النظر الیٰ وجه الامرد) لہ

سجدہ میں جاتے وقت شلوار اوپر اٹھانے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ سجدہ میں جاتے وقت اپنی شلوار وغیرہ کو اوپر کرتے رہتے ہیں، کیا اس طرح کرنے سے نماز پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کی حالت میں بلا ضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے البتہ اگر ضرورت ہو تو پھر اس میں کوئی کراہت نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وکرہ کفه ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم او ذیل وعبثه

لہ وفی الهندیة: وبدن الحرۃ عورۃ الا وجهها وکفیها وقدمیها۔ کذا فی المتون وشعر المرأۃ وما علی رأسها عورۃ واما المسترسل ففیه روایتان الاصح انه عورۃ۔ کذا فی الخلاصة وهو الصحیح وبه اخذ الفقیه ابو اللیث وعلیه الفتویٰ..... والثوب الرقیق الذی یصف ما تحته لا تجوز الصلوٰۃ فیه کذا فی التبیین ۔(الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۵۸ الباب الثانی فی شروط الصلوٰۃ)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۱ ص۹۶ باب شروط الصلوٰۃ۔

به ای بثوبه وبجسده للنهی الا لحاجة ولا بأس به خارج صلوٰة ۔ قال ابن عابدین ؒ (تحت قوله وعبثه) قال فی النهایة وحاصله ان کل عمل هو مفید للمصلی فلا بأس به ...... فاما ما لیس بمفید فهو العبث ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۴۲ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها) [۱]

غیر مسلموں کے بنائے ہوئے کپڑوں میں نماز پڑھنا

سوال: ۔ بازاروں اور مارکیٹوں میں آجکل جاپان اور دیگر یورپی ممالک کا تیار کردہ کپڑا فروخت کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کپڑا کفار کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہوتا ہے، کیا ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ۔ غیر مسلم کے ہاتھوں کے بنے ہوئے کپڑوں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں، جہاں تک اس میں نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو اگرچہ ایسے کپڑے کے نجس ہونے کا احتمال ہے لیکن اس میں طہارت کی جانب راجح ہے اسلئے اس میں نماز پڑھنا بھی درست ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : لو شك فی نجاسة ماء او ثوب لم یعتبر ۔ قال ابن عابدینؒ : (تحت قوله من شك) فی انائه وثوبه فهو طاهر الخ کذا ما یتخذه اهل الشرك او الجهلة من المسلمین کالسمن والخبز والاطعمة ۔

(رد المحتار ج ۱ ص۱۵۱ کتاب الطهارة مطلب ابحاث الغسل) [۲]

آنکھیں بند کرکے نماز پڑھنا مکروہ ہے

سوال: ۔ بعض لوگ آنکھیں بند کرکے نماز پڑھتے ہیں، تو کیا اس طرح نماز

---

[۱] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : وکره تقلبه ای رفعه بین یدیه او من خلفه اذا اراد السجود وقیل ان یجمع ثوبه ویشده فی وسطه لما فیه من التجبر المنافی للخشوع لقوله صلی الله علیه وسلم امرت ان اسجد علی سبعة اعظم وان لا اکف شعراً ولا ثوباً ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۸۴ باب مکروهات الصلوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۰۵ الفصل الثانی فیما یکره فی الصلوٰة ۔

[۲] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : قال ابو حفص البخاری رحمه الله من شك فی انائه او ثوبه او بدنه اصابته نجاسة ام لا فهو طاهر ما لم یستیقن ۔

(الفتاوی التاتارخانیة ج ۱ ص۱۴۶ کتاب الطهارة ۔ نوع فی مسائل الشك ۔

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۴ ص۱۰۲ باب مکروهات الصلوٰة ۔

پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ تنزیہی یعنی خلافِ اولیٰ ہے اس لیے آنکھیں بند کرکے نماز نہیں پڑھنی چاہیئے، تاہم اگر خشوع وخضوع کے لیے نماز میں آنکھیں بند کرلی جائیں تو بلاکراہت جائز ہے بعض علماء نے اس کو اولیٰ بھی قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وکرہ ---- تغمیض عینیہ للنهی الا لکمال الخشوع۔
قال ابن عابدینؒ: تحت قوله للنهی ثم الظاهر ان الکراهة التنزیهیة:
(رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۵ باب مایفسد ومایکرہ فیها) [1]

منہ ڈھانپ کر نماز پڑھنا

سوال:۔ سردیوں کے موسم میں لوگ چادر یا رومال سے منہ ڈھانپ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس طرح نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز میں ناک اور منہ کا چھپانا مکروہ ہے، اس لیے سردیوں یا گرمیوں میں اس طرح کرنے سے اجتناب کیا جائے اس سے نماز میں کراہت آتی ہے۔

لما فی الهندیة: ویکرہ التلثم وهو تغطیة الانف والفم فی الصلوٰۃ والتثاؤب الخ
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۰۷ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ) [2]

نسوار اور سگریٹ کے ساتھ نماز پڑھنا

سوال:۔ بعض لوگ نسوار کی پڑیا یا ڈبیہ نماز پڑھتے وقت جیب میں ہی رکھتے ہیں۔ کیا نسوار یا سگریٹ جیب میں رکھ کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

الجواب:۔ تمباکو کا استعمال شرعاً مباح ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ نماز پڑھنا

---

[1] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ تغمیض عینیه الا لمصلحة لقوله صلی الله علیه وسلم اذا قام احدکم فی الصلوٰۃ فلا یغمض عینیه لانه یفوت النظر للمحل المندوب ولکل عضو وطرف حظ من العبادة وبرؤیة مایفوت الخشوع ویفرق الخاطر ربما یکون التغمیض اولیٰ من النظر۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۲۸۸ باب مکروهات الصلوٰۃ)

[2] لما قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ ---- وتغطیة انفه وفمه لما روینا قال السید احمد الطحطاویؒ (تحت قوله لما روینا) من انه صلی الله علیه وسلم نهی عن ان یغطی الرجل فاہ کذا فی الشرح۔ (الطحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص ۲۸۹ فصل فی مکروهات الصلوٰۃ)

نماز پڑھنا بھی درست ہے، البتہ اگر نسوار یا سگریٹ میں کوئی نجس چیز ملائی گئی ہو تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ تاہم یہ یاد رہے کہ گوبر کی بنی ہوئی راکھ اگر نسوار میں ملائی گئی ہو تو چونکہ یہ راکھ پاک ہے اس لیے اس سے نسوار کی طہارت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (واللہ اعلم)

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: فانه لم یثبت اسکاره ولا تفتیره ولا اضراره بل ثبت له منافع فهو داخل تحت قاعدة الاصل فی الاشیاء الاباحة وان فرض اضراره للبعض لا یلزم منه تحریمه علیٰ کل احد الخ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۶۵ کتاب الاشربة) [1]

نماز میں تھوک آجائے تو کیا کرنا چاہیئے

سوال:۔ اگر کسی کو نماز میں تھوک اور بلغم آجائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اگر دوران نماز کسی کو بلغم یا تھوک آجائے اگر اس کو نگلنا ممکن ہو تو نگل کر نماز پڑھے ورنہ کپڑے کے کونے میں تھوک لے۔

لما اخرج الامام محمد البخاریؒ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلا تبزقن احدکم فی قبلته ولکن عن یساره او تحت قدمه ثم اخذ طرف ردائه فبزق فیه ثم رد بعضه علیٰ بعض فقال او یفعل ھکذا۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص۵۹ باب اذا بدرة البزاق فلیاخذ بطرف ثوبه) [2]

بالوں کا جوڑا بنا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: آجکل اکثر خواتین سر کے بالوں کو ایک جگہ جمع کر کے باندھ لیتی ہیں جس کو جوڑا کہا جاتا ہے، کیا اس حالت میں نماز پڑھنا درست ہے؟

الجواب:۔ عورتوں کا بالوں کو ایک جگہ جمع کر کے باندھ کر (جوڑا کر کے) نماز پڑھنا مکروہ ہے اگرچہ

---

[1] لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: لما سئل عنه الدخان الذی شاع فی زماننا وعمت به البلوی وحکم اللہ فیه۔ قال الجواب: ان المجتهدین لم یتکلمون علیه لانه انما حدث بعدهم والمتاخرون اختلفوا فیه فمنهم من یقول بتحریمه ومنهم من یقول باباحته ومنهم من توسط وقال بکراهته احسن ما رأیت فیه قول شیخ مشائخنا خاتمة المحققین العلامة الاسیر المالکی واختلف فی الدخان والورع ترکه۔ (فتاوی کاملیة ص۲۶۹ کتاب الحظر والاباحة)
ومثلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۴ ص۱۰۸ باب مکروهات الصلوٰة۔

[2] قال النبی صلی اللہ علیه وسلم فلا یبزقن احدکم قبل قبلته ولکن عن یساره او تحت قدمه ثم اخذ طرف ردائه فبصق فیه ثم رد بعضه علیٰ بعض۔ (مشکوٰة المصابیح ج ۱ ص۷۲ باب المساجد)

بدون حالتِ نماز بوقتِ ضرورت بالوں کا جوڑا بنانا مباح ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعقص شعره اھ۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله وعقص شعره) ای ضفره وفتله والمراد به ان یجعله علی هامته ویشده بخیط او ان یلف ذوائبه حول رأسه کما یفعله النساء فی بعض الاوقات او یجمع الشعر کله من قبل القفا ویشده بخیط او خرقة وجمیع ذلک مکروه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۴۲ باب المکروهات) [1]

اگر مسجد میں قبر ہو تو نماز کا حکم

سوال: ہمارے محلے کی مسجد میں ایک پرانی قبر ہے، کبھی کبھی بعض لوگ قبر کے بالکل سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نمازیں درست ہیں یا نہیں؟

الجواب: قبر کے سامنے نماز پڑھنا چاہے فرض ہو یا نفل، مکروہ ہے البتہ اگر قبر کے سامنے کوئی دیوار وغیرہ ہو تو پھر اس میں کوئی کراہت نہیں تاہم اس صورت میں بھی قبر پرستی کی تہمت سے بچنے کے لیے وہاں نماز نہ پڑھی جائے، جبکہ مسجد کے دوسرے حصوں میں نماز بلا کراہت جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وکذا تکره فی اماکن کفوق کعبة.... ومقبرة۔ قال ابن عابدینؒ: واختلف فی علته فقیل لان فیها عظام الموتی وصدیدهم وهو نجس وفیه نظر وقیل لان اصل عبادة الاصنام اتخاذ قبور الصالحین مساجد وقیل لانه تشبه بالیهود وعلیه مشی فی الخانیة ولا بأس بالصلوٰة فیها اذا کان فیها موضع اعد للصلوٰة ولیس فیه قبر ولا نجاسة ولا قبلته الی قبر (رد المحتار ج ۱ ص۳۸۰ کتاب الصلوٰة قبل باب الاذان) [2]

---

[1] وفی الهندیة: ویکره عقص شعره وهو جمع الشعر علی الرأس ویشده بشیء حتی لا ینحل کذا فی التبیین واختلف الفقهاء فیه علی اقوال فقیل ان یجمعه وسط رأسه ثم یشده وقیل ان یلف ذوائبه حول رأسه کما یفعله النساء وقیل ان یجمعه من قبل القفا ویمسکه بخیط او خرقة وکل ذلک مکروه کذا فی البحر الرائق۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۰۶ الفصل الثانی فیما یکره فی الصلوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۳ باب یفسد فی الصلوٰة وما یکره۔

[2] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وتکره الصلوٰة فی المقبرة وامثالها۔ قال الطحطاویؒ: (تحت قوله فی المقبرة) لانه تشبه بالیهود والنصاری ــــ وفی زاد الفقیر وتکره الصلوٰة فی المقبرة الا ان یکون فیها موضع اعد للصلوٰة لا نجاسة فیه ولا قذر فیه۔ قال الحلبیؒ: لان الکراهة معللة بالتشبه وهو منتف حینئذٍ۔ وفی القهستانیؒ عن جنائز المضمرات لا تکره الصلوٰة الی جهة القبر الا اذا کان بین یدیه بحیث لو صلی صلوٰة الخاشعین وقع بصره علیه۔ (طحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۲۹۰ باب مکروهات الصلوٰة)

امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا

سوال:۔ اگر امام مکمل طور پر محراب کے اندر کھڑا ہو جائے تو اس سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا امام کا یہ عمل جائز ہے؟

الجواب:۔ امام کا مکمل طور پر محراب کے اندر کھڑا ہونا صحیح نہیں، اس سے نماز پر بُرا اثر پڑتا ہے، اس لیے امام کو چاہئیے کہ محراب سے باہر کھڑا ہو اگرچہ رکوع، سجدہ محراب کے اندر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وکرہ ...... وقیام الامام فی المحراب لاسجودہ فیہ وقدماہ خارجہ لان العبرة للقدم مطلقاً وان لم یشتبہ حال الامام۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۵ باب مکروھات الصلوٰة) [1]

قضاء حاجت کی شدید ضرورت کے باوجود نماز پڑھنا

سوال:۔ بعض اوقات انسان کو قضاء حاجت کی سخت ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اس کو روک کر نماز پڑھتا ہے، اس طرح پڑھی گئی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ جب قضاء حاجت کی شدید ضرورت ہو تو اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، بہتر یہ ہے کہ قضاء حاجت سے فارغ ہو کر نماز پڑھی جائے، تاہم اگر نماز قضاء ہونے کا خطرہ ہو تو اس حالت میں نماز پڑھنا بلاکراہت درست ہے۔ [2]

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قولہ وصلوٰتہ مع مدافعة الاخبثین) قال فی الخزائن: سواء کان بعد شروعہ او قبلہ فان شغلہ قطعھا ان لم یخف فوت الوقت وان اتمھا اثم۔ یبقی ما اذا خشی فوت الجماعة ولا یجد جماعة غیرھا فھل یقطعھا کما یقطعھا اذا رای علی ثوبہ نجاسة قدر الدرھم لیغسلھا او لا کما اذا کانت النجاسة اقل من الدرھم والصواب الاول۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۱ باب مکروھات الصلوٰة)

---

[1] قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ قیام الامام بجملتہ فی المحراب لا قیامہ خارجہ وسجودہ فیہ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص ۲۹۴ فصل فیما یکرہ فی الصلوٰة)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکرہ فیھا

[2] لما قال حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ومدافعاً لأحد الأخبثین البول والغائط والریح ..... الا اذا خاف فوت الوقت وفوت الجماعة فحینئذٍ یُصلی بتلک الحال لأن اخراج الصلوٰة عن وقتھا حرام والجماعة مُؤکدة واجبة۔ قال السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قولہ الا اذا خاف فوت الوقت) ظاھرہ أنھا تنتفی الکراھة عند ذٰلک۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص ۲۹۲ فصل فیما یکرہ فی الصلوٰة)

لہسن، پیاز وغیرہ کھاکر نماز پڑھنے کا حکم | **سوال:۔** لہسن، پیاز یا مولی کھاکر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ لہسن، پیاز یا مولی وغیرہ کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے بہتر ہے کہ اس کو زائل کر کے نماز پڑھی جائے۔ اس بدبو کے ساتھ نماز پڑھنا مسجد کے علاوہ ہر جگہ مکروہ ہے اس لیے کہ حدیث میں ان کو کھاکر نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال نھی عن اکل الثوم الا مطبوخاً۔
(الجامع الترمذی ج ۲ ص۳ باب ماجاء فی الرخصۃ فی اکل الثوم مطبوخاً)[1]

نماز میں ایڑیوں کے بل بیٹھنے سے نماز کا حکم | **سوال:۔** بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے نماز میں اپنے پاؤں صحیح طریقہ سے نہیں رکھ سکتے اس لیے وہ نماز میں ایڑیوں کے بل بیٹھتے ہیں، کیا اس صورت میں نماز صحیح ہوگی؟

الجواب:۔ نماز میں ایڑیوں کے بل بیٹھنا مکروہ ہے البتہ اگر کسی کو بیماری ہو تو اس کی نماز اسی حالت میں (یعنی ایڑیوں کے بل بیٹھ کر) بلاکراہت درست ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ واقعاؤہ) والکرخی بان ینصب قدمیہ و یقعد علی عقبیہ ویضع یدیہ علی الارض..... قال فی البحر وینبغی ان تکون الکراھۃ التحریمیۃ علی الاول تنزیھیۃ علی الثانی۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۴۳ باب مکروھات الصلوۃ)[2]

مساجد میں پڑی ہوئی ٹوپیوں میں نماز کا حکم | **سوال:۔** بعض مساجد میں ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں، کیا ان میں نماز پڑھنا

---

[1] عن علی رضی اللہ عنہ قال نھی عن اکل الثوم الا مطبوخاً۔
(ابوداؤد ج ۲ ص۱۸۰ کتاب الاطعمۃ باب فی اکل الثوم)
وَمِثْلُہٗ فی مشکوٰۃ ج ۲ ص۳۶۷ کتاب الاطعمۃ۔ الفصل الثانی۔

[2] قال العلامۃ السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قولہ کرہ الاقعاء) وقال الکرخی ھو ان ینصب قدمیہ ویقعد علی عقبیہ واضعا یدیہ علی الارض۔ قال الزیلعی..... لان ماقالہ الکرخیؒ غیر مکروہ بل یکرہ ذٰلک ایضاً۔ (الطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۲۸۳ باب مایکرہ فی الصلوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص۲۲ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ۔

جائز ہے جبکہ انہیں پہن کر انسان کو باہر پھرنا معیوب معلوم ہوتا ہے۔

الجواب:۔ نمازی کو چاہیئے کہ نماز کے لیے ٹوپی یا رومال ایسا ہو جس کو پہن کر وہ کسی مجلس میں بغیر شرمائے ہوئے جا سکتا ہو، موجودہ ٹوپیاں جو مساجد میں پڑی ہوتی ہیں چونکہ نمازی ان کو پہن کر دوسری مجالس میں نہیں جا سکتا ہے اس لیے ثیاب بذلہ کے حکم میں ہو کر ان کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وکرہ...... وصلاتہ فی ثیاب بذلۃ یلبسھا فی بیتہ۔ قال ابن عابدینؒ: تحتہ.... وفسرھا فی شرح الوقایۃ بما یلبسہ فی بیتہ ولا یذھب بہ الی الاکابر والظاھر ان الکراھۃ تنزیھیۃ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۱ باب مکروھات الصلوٰۃ) [1]

نماز میں کندھوں سے چادر کا گر جانا

سوال:۔ کبھی نماز کی حالت میں نمازی کے کندھوں سے چادر گر جاتی ہے، اس صورت میں نمازی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اگر نماز کے اندر کندھوں سے چادر گر جائے اور سدل کی صورت اختیار کرلے تو اس کی اصلاح عملِ قلیل سے اگر ممکن ہو تو چادر کو ایک ہاتھ سے کندھوں پر ڈال لینا چاہیئے کیونکہ نماز میں سدل مکروہ ہے، اسی طرح اِس اصلاح سے ذہنی تشویش بھی ختم ہو جائے گی جو چادر کے گرنے سے پیدا ہو چکی تھی۔

لِما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکرہ..... سدل تحریمًا للنھی ثوبہ أی ارسالہ بلا لُبس معتاد وکذا القباء بکم الی ولاء ذکرہ الحلبی کشد منديل ويرسله من كتفيه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۳۹ باب مکروھات الصلوٰۃ) [2]

---

[1] قال العلامہ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وتکرہ الصلوٰۃ فی ثیاب البذلۃ..... ما لا یذھب بہ الی الکبراء ورأی عمرؓ رجل فعل ذلک فقال أرأیت لو کنت أرسلتک الی بعض الناس أکنت تمر فی ثیابک ھذہ فقال لا فقال عمرؓ اللہ احق ان تتزین لہ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۲۹۲ فصل مکروہات الصلوٰۃ)

[2] لما قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ویکرہ سدلہ تکبرًا وتھاونًا وبالعذر لا یکرہ وھو ان یجعل الثوب علی رأسہ وکتفیہ او کتفیہ فقط ویرسل جوانبہ من غیر ان یضمھا۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص ۲۸۵ باب فیما یکرہ فی الصلوٰۃ) (ومِثلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ)

ٹائی باندھ کر نماز پڑھنا

سوال:۔ بعض بابو قسم کے لوگ ٹائی باندھ کر نماز پڑھتے ہیں کیا ٹائی کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ٹائی غیر مسلموں کی علامت ہے۔

الجواب:۔ ٹائی (صلیب کا نشان) عیسائیوں کے دینی شعائر میں سے ہے، چونکہ ٹائی باندھنے سے اُن کے اس مذہبی نشان کی تائید ہوتی ہے اس لیے تشبہ بالکفار کی وجہ سے اس کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لقوله علیه السلام: من تشبّه بقوم فهو منهم قال الطیبیؒ: قوله من تشبه بقوم هذا عام فی الخلق والخلق والشعار ولما کان الشعار اظهر فی التشبیه ذکر فی هذا الباب۔
(طیبی شرح مشکوٰة ج۸ ص۲۱۹ کتاب اللباس، الفصل الثانی)[1]

تشہد میں دامن صحیح کرنا

سوال:۔ بعض لوگ جب التحیات میں بیٹھتے ہیں تو اپنا دامن صحیح کرتے رہتے ہیں، انکے اس عمل سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ نماز میں تشہد یا دوسرے مواقع میں اپنے کپڑوں یا بدن یا کسی اور چیز سے کھیلنا شرعاً مکروہ ہے اگرچہ اس سے نماز تو فاسد نہیں ہوتی مگر مکروہ ضرور ہوتی ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں تشہد میں دامن کا صحیح کرنا عملِ کثیر ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، تاہم اگر دامن گھٹنوں کے نیچے آکر تکلیف کا باعث بنتا ہو تو بدون عملِ کثیر کے درست کر سکتا ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وکره کفه ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم او ذیل وعبثه به ای بثوبه وبجسده للنهی الا لحاجة ولا بأس به۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۶۴۰ باب مکروہات الصلوٰة)[2]

---

[1] قال العلامة ملا علی القاریؒ: عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من تشبّه بقوم ای من شبه نفسه بالکفار مثلاً فی اللباس وغیره او بالفساق او الفجار او باهل التصوف والصلحاء الابرار فهو منهم ای فی الاثم والخیر۔ قال الطیبیؒ: هذا عام فی الخلق والخلق والشعار ولما کان الشعار اظهر من التشبه ذکر فی هذا الباب۔ (مرقاة شرح مشکوٰة ج۸ ص۲۵۵ کتاب اللباس، الفصل الثانی)

ومثله فی مشکوٰة ص۳۷۵ کتاب اللباس، الفصل الثانی۔

[2] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وکره عبثه بثوبه وبدنه وقلب الحصا الا للسجود مرة وفرقعة الاصابع۔ (کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۲ ص۱۹ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)

ومثله فی مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص۲۸۰ فصل فی مکروهات الصلوٰة۔

مالی نقصان ہونے کی صورت میں نماز کا توڑنا

سوال:۔ اگر کسی کی کوئی چیز ضائع ہو رہی ہو اور وہ نماز میں مشغول ہو تو کتنی مالیت تک کی چیز کے لیے نماز توڑی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے ایک درہم کی مالیت والے سامان کے ضائع ہونے کی صورت میں نماز توڑنے کو جائز کہا ہے، جبکہ ایک درہم تین ماشہ ایک رتی کا ہوتا ہے، اس لیے دورِ حاضر میں تین ماشہ ایک رتی چاندی کی قیمت کے برابر مالیت کی چیز ضائع ہونے کی صورت میں نماز توڑنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: رجل قام الی الصلوٰة فسرق منه شئ قیمته درهم له ان یقطع الصلوٰة ویطلب السارق سواء کانت فریضة او تطوعاً لان الدرهم مال۔ (الهندیة ج۱ ص۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکره الصلوٰة) [له]

سینٹ (سپرے) میں الکحل کی ملاوٹ ہو تو اس کے استعمال کا حکم

سوال:۔ آجکل بعض ایسے خوشبودار اسپرے (سینٹ) ملتے ہیں جن میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے، کیا ایسے اسپرے کو استعمال کر کے نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ شراب جو کھجور اور انگور سے بنائی گئی ہو تو وہ حرام اور ناپاک ہے، البتہ جو شراب اس کے علاوہ دیگر اشیاء سے تیار کی گئی شراب پاک ہے، متاخرین فقہاء نے عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

لما قال الشیخ المفتی محمد تقی العثمانی: وأما غیر الاشربة الاربعة فلیست نجسة عند الامام ابی حنیفةؒ..... وان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرها لا تتخذ من العنب أو التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور أو البترول وغیره کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذٍ هناک فسحة فی الاخذ بقول ابی حنیفةؒ عند عموم البلوی۔ (تکملة فتح الملهم ج۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربة)۔

[له] قال العلامة الحصکفیؒ: ویباح قطعها لنحو قتل حیة وندابة وفور قدر وضیاع ما قیمته درهم له او لغیره۔ قال ابن عابدینؒ تحت قوله وضیاع ما قیمته درهم قال فی مجمع الروایات: لان ما دونه تصیر فلا یقطع الصلوٰة لاجله الخ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۴ باب مکروهات الصلوٰة قبل فی احکام المسجد)

و مثلهٗ فی مراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ص۳۰۰ فصل فیما لا یکره۔

سوئے ہوئے شخص کے سامنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی نمازی کے آگے کوئی شخص سورہا ہو تو اس نمازی کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ سویا ہوا شخص قبلہ رُخ ہو کر سویا ہو اور نمازی کی طرف اس کی پشت ہو تو اس کے سامنے نماز پڑھنا بلاکراہت درست ہے، تاہم اگر اس کا رخ نمازی کی طرف ہو تو نماز مکروہ ہوگی۔

لما قال الحصکفیؒ: ولا یکرہ صلوٰۃ الیٰ ظہر قاعد أو قائم ولم یتحدث الا اذا خیف الغلط بحدیثہ[1]

قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ الیٰ ظہر قاعد) قید بالظہر احترازاً عن الوجہ فانھا تکرہ الیہ کما مر..... وفی شرح المنیۃ: افادبہ نفی قول من قال بالکراھۃ بحضرۃ المتحدثین وکذا بحضرۃ النائمین .... وفی النائمین اذا خاف ظہور شئ یضحکہ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۶۵۱ باب مکروہات الصلوٰۃ)[1]

نماز میں عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں دعائیں مانگنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص نماز میں عربی کے علاوہ اردو، پشتو وغیرہ زبانوں میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنا شروع کردے تو اس سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز میں صرف عربی زبان میں دعا کی جائے، اگر کسی اور زبان میں دُعا کی جائے تو نماز کراہت سے خالی نہ ہوگی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وظاھر التعلیل ان الدعاء بغیر العربیۃ خلاف الاولیٰ وان الکراھۃ تنزیھیۃ۔ (ردالمحتار ج۱ ص۵۲۱ مطلب فی الدعاء بغیر العربیۃ، باب صفۃ الصلوٰۃ)[2]

---

[1] قال ابراھیم الحلبیؒ: ولا بأس بان یصلی متوجھاً الیٰ ظہر رجل قاعداً لظاھر ان التقیید بہ باعتبار الغالب وانہ لا فرق بین کونہ قاعداً او قائماً وقولہ یتحدث لافادۃ نفی قول من بالکراھۃ بحضرۃ المتحدثین وکذا بحضرۃ النائمین۔
(کبیری ص۳۵۸ کراھیۃ الصلوٰۃ)

[2] قال العلامۃ عبدالحی اللکھنوی رحمہ اللہ: ومنھا ان یدعو بالعربیۃ لیکون اقرب الی الاجابۃ فان اللسان العربی من الفضل مالیس لغیرہ .... فی غرر الافکار شرح درر البحار فی بحث الدعاء بعد التشھد کرہ الدعاء بالاعجمیۃ الخ
(السعایۃ ج۲ ص۲۴۵ باب صفۃ الصلوٰۃ)

دورانِ نماز بچے کا گود میں بیٹھ جانا

سوال:۔ نماز کی حالت میں اگر بچہ سامنے آجائے یا گود میں بیٹھ جائے تو اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بچہ خود قصداً گود میں آکر بیٹھ جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، ایسے ہی اگر بچے کے رونے یا گر جائے کا خطرہ ہو اور اس مقام میں کوئی دوسرا نہیں جو اس کی حفاظت کر سکے، اس صورت میں بھی بچے کو گود میں لینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ ان مذکورہ شرائط کے علاوہ قصداً بطورِ محبت بچے کو اٹھا کر نماز پڑھتا ہے تو اس سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔

صلی وھو حامل صبیًا جازت صلوٰته ویکرہ لو لم یکن ھناك من یحفظه ویتعھد وھو یبکی فلا یکرہ ھٰکذا فی محیط السرخسی۔

(الفتاوٰی الھندیة ج۱ ص۱۰۲ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰة) [1]

آستین کہنیوں سے اوپر کر کے نماز پڑھنا

سوال:۔ اگر نماز میں آستینوں کو کہنیوں سے اوپر کیا جائے تو اس سے نماز میں کوئی کراہیت لازم آتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کپڑا موجود ہوتے ہوئے آستینوں کو کہنیوں سے اوپر کرنا مکروہ ہے، البتہ کپڑا موجود نہ ہونے کی صورت میں کوئی کراہیت نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کفه) ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم اوذیل وفی ردّ المحتار فیه الکراھة فی الخلاصة والمنیة بان یکون رافعا کمیه الی المرفقین۔

(ردالمحتار ج۱ ص۶۴۰ مکروھات الصلوٰة)

---

[1] قال الحصکفیؒ: یکرہ..... وحمل الطفل وما ورد نسخ بحدیث ان فی الصلوٰة شغلاً۔ (الدرالمختار علی صدر ردّ المحتار ج۱ ص۶۳۵ مکروھات الصّلوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۵۹ الجنس فیما یکرہ۔

[2] ولو صلی رافعا کمیه الی المرفقین کذا فی فتاوٰی قاضی خان۔

(الھندیة ج۱ ص۱۰۶ الفصل الثانی ما یکرہ فی الصلوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۲ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکرہ فیھا)

امام سے پہلے سلام کہنا

سوال:۔ امام کے سلام سے قبل سلام پھیرنے کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی ہے۔

الجواب:۔ تتبع کتب سے اس کا حکم معلوم نہیں ہوا، البتہ احادیث کی رو سے مکروہ تحریمی معلوم ہوتا ہے۔

عن انس قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم فلما قضی صلوٰتہ اقبل علینا بوجھہ فقال ایھا الناس انی امامکم فلا تسبقونی بالرکوع ولا بالسجود ولا بالقیام ولا بالانصراف فانی اراکم امامی ومن خلفی۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۰۱ ما علی الماموم من المتابعۃ) [1]

چادر بچھا کر نماز پڑھنا

سوال:۔ مسجد میں چادر بچھا کر اس پر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں چادر بچھا کر اس پر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ زمین کی صلابت موجود رہے، اگر زمین کی صلابت معلوم نہ ہو تو پھر مکروہ ہے۔

رجل یصلی علی الارض ویسجد علی خرقۃ وضعھا بین یدیہ لیتقی بھا الحر لا بأس بہ کذا فی الظھیریۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۰۸ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ ومالا یکرہ) [2]

مکروہ وقت میں نماز پڑھنا

سوال:۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر مکروہ ہے تو یہ مکروہ کی کون سی قسم ہے؟ فرض اور نفل پڑھنے میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

---

[1] عن انسؓ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم فلما قضی الصلوٰۃ اقبل علینا بوجھہ فقال ایھا الناس انی امامکم فلا تسبقونی بالرکوع ولا بالسجود ولا بالقیام ولا بالانصراف فانی اراکم امامی ومن خلفی۔
(مسلم ج ۱ ص ۱۸۰ باب تحریم سبق للامام برکوع وسجود ونحوھما)

[2] قال طاھر بن عبد الرشید البخاری: ولو سجد علی ذیلہ او کمہ او کور عمامتہ یتقی بذلک حرالارض وبردھا یجوز عندنا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۵۹ جنس آخر فیما یکرہ)

الجواب: مکروہ اوقات یعنی طلوع وغروب اور استواءِ شمس کے دوران نماز پڑھنا شرعاً مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ غروبِ شمس کے وقت اُسی دن کی عصر کی نماز جائز مع الکراہت ہے۔ تاہم فجر اور عصر کی نماز کے بعد قضا نماز پڑھنا جائز ہے۔ مکروہ اوقات تین قسم پر ہیں: ۱۔ طلوع الشمس ۲۔ نصف النہار ۳۔ اور عند غروب الشمس۔

قال الحصکفیؒ: (وکره) تحریماً وکل مالا یجوز مکروه (صلٰوة) مطلقاً (ولو) قضاءً او واجبة اونفلاً (علی جنازة وسجدة تلاوة وسهو) لا شکر قنیة (مع شروق) الا العوام فلا یمنعون من فعلها لانهم یترکونها والاداء الجائز عند البعض اولٰی من الترك کما فی القنیة وغیرها۔ (واستواء) الا یوم الجمعة ...... (وغروب الا عصر یومه)

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۳۷۰ کتاب الصلوٰة)

نماز میں ایک سورۃ کو شروع کر کے بغیر عذر کے دوسری سورۃ شروع کرنا

سوال: اگر کوئی شخص نماز میں ایک سورۃ کی قرأت پڑھنا ابتداء کرے لیکن پھر قصداً بغیر کسی وجہ کے اسے ترک کر کے دوسری سورۃ شروع کر دے تو کیا اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: نماز میں ایک سورۃ کو شروع کرنے کے بعد اس کے مکمل ہونے سے قبل بغیر کسی عذر کے اسے ترک کر کے دوسری سورۃ شروع کر دینا شرعاً مکروہ ہے، البتہ اس سے نماز جائز ہے۔

افتتح سورة وقصد سورة اخری فلما قرأ آیة او آیتین اراد ان یترك السورة ویفتتح التی ارادها یکره۔ وکذا اقرأ اقل من آیة وان کان حرفاً ولو کبر للرکوع فی الصلوٰة ثم بدا له ان یزید فی القراءة لا بأس به مالم

---

[۱] قال قاضیخانؒ: یجوز قضاء الفوائت فی وقت شاء الا فی ثلاث ساعات لا یجوز فیها المکتوبة ولا صلوٰة الجنازة ولا سجدة التلاوة اذا طلعت الشمس حتی ترفع وعند الانتصاف الی ان تزول وعند احمرارها الی ان تغیب الا عصر یومه ذلك فانه یجوز اداء عند الغروب۔

(الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۱ ص۷۳ باب الاذان)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ص۶۹ ج ۱ الفصل ... فی المواقیت۔

یرکع۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۹۸ فصل فی القرأۃ) ؎۱

ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ بغیر کسی عذر کے ننگے سر نماز پڑھتے ہیں، کیا شرعاً ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ سستی اور بغیر کسی عذر کے ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ آجکل کے بعض فیشن ایبل حضرات کا وطیرہ ہے، البتہ عذر اور تذلل کے طور پر ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: (وصلوٰتہ حاسرا) ای کاشفا (راسہ للتکاسل) و(لا) بأس بہ (للتذلل) اما للاھانۃ بھا فکفر۔

(الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص ۶۴۱ مکروھات الصلوٰۃ) ؎۲

جس قالین پر صلیب کی تصویر ہو اُس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ آجکل بعض قالین یا دریاں ایسی بنائی جاتی ہیں جن میں صلیب کی صورتیں بنی ہوتی ہیں، کیا ایسے قالین یا دری پر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے غیر مسلموں کے دینی شعائر سے تشبہ کو مکروہ قرار دیا ہے جن کے چند نظائر فقہاء کرام نے بیان بھی فرمائے ہیں۔ لہٰذا صلیب چونکہ عیسائیوں کی مذہبی علامت ہے اس لیے صلیب کے نشان والے قالین یا دری پر نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ ہے، اس لیے ایسے قالین یا دری پر نماز پڑھنے سے اجتناب لازمی ہے ـــ لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من تشبہ بقوم

؎۱ وفی الھندیۃ: افتتح سورۃ وقصد سورۃ اخری فلما قرأ آیۃ او آیتین اراد ان یترک السورۃ ویفتتح التی ارادھا وکذا قرأ اقل من آیۃ وان کان حرفا ولو کبر للرکوع فی الصلوٰۃ ثم بدا لہ ان یزید فی القرأۃ لا بأس بہ ما لم یرکع۔ (الھندیۃ ج ۱ ص ۷۹ فصل فی القرأۃ)

؎۲ تکرہ الصلوٰۃ حاسرا راسہ اذا کان یجد العمامۃ وقد فعل ذلک تکاسلاً او تہاونًا بالصلوٰۃ ولا بأس بہ اذا فعلہ تذللا وخشوعا بل ھو حسن کذا فی الذخیرۃ۔

(الھندیۃ ج ۱ ص ۱۰۶ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا۔

فهو منه۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۵۵۹ کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة) لہ

نماز میں کپڑوں کو صحیح کرنا

سوال:۔ رکوع سے سجدہ کو انتقال کے وقت شلوار کو اوپر کی طرف کھینچنا، ایسے ہی سجدہ سے اٹھتے وقت اپنے کپڑوں کو صحیح کرنا، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بغیر حاجت کے کپڑوں کو صحیح کرنا جب عملِ کثیر تک نوبت نہ پہنچے تو مکروہ ہے اور حاجت کے ساتھ بلا کراہت جائز ہے، اور اگر عملِ کثیر تک نوبت پہنچے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

قال الحصکفیؒ: (و) کره (کفه) ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم او ذیل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۴۰ مکروهات الصلوٰة) ۲ہ

امام کا محراب کے اندر کھڑے ہونے کا حکم

سوال:۔ امام کا بحالتِ نماز بالکل محراب کے اندر کھڑا ہونا جس سے امام کی وضع قطع مقتدیوں سے بالکل مخفی ہو جائے، یا اس کا برآمدہ میں کھڑا ہونا اور مقتدیوں کا صحن میں ہونا، اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ امام کا محراب میں اس طرح سے کھڑا ہونا کہ اس کے افعال مقتدیوں سے

لہ قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: (قوله او شمع او سراج) لانهما لا یعبدان والکراهة باعتبارها وانما تعبدها المجوس اذا کانت فی الکانون وفیها الجمر او فی التنور فلا یکره التوجه الیها علی غیر ذلك الوجه۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص۱۶۷ فصل فی مکروهات الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۲ باب مکروهات الصلوٰة۔

۲ہ ویکره للمصلی ان یعبث بثوبه او لحیته او جسده وان یکف ثوبه بان یرفع ثوبه من بین یدیه او خلفه اذا اراد السجود کذا فی معراج الدرایة ولا بأس بان ینفض ثوبه کیلا یلتصق بجسده فی الرکوع ولا بأس بان یمسح جبهته من التراب والحشیش۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۰۵ الفصل الثانی مکروهات الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹ مکروهات الصلوٰة۔

مخفی رہیں مکروہ ہے، البتہ اگر امام ایسی صورت میں کھڑا ہو کہ اس کی ساری ہیئت مقتدیوں سے مخفی نہ ہو تو اس صورت میں کوئی کراہیت نہیں۔

ایسے ہی اگر امام برآمدہ میں اور مقتدی صحن میں ہوں، اگر ان کو امام کی ساری ہیئت کا علم ہوتا ہے تو نماز بلا کراہت جائز ہے اور عدمِ علم میں مکروہ ہے۔

وقال الحصکفیؒ: (قیام الامام فی المحراب لا سجودہ فیہ) وقدماہ خارجہ لان العبرة للقدم (مطلقاً) وان لم یتشبہ حال الامام ان علل بالتشبہ وان بالاشتباہ ولا اشتباہ فلا اشتباہ فی نفی الکراھة۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۵ باب ما یفسد الصلوٰة) [۱]

نماز میں ذی روح چیز کی تصویر پاؤں تلے رکھنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی جاندار کی تصویر سے منقش مصلّی پر نماز پڑھ رہا ہو اور پاؤں اس تصویر پر رکھے ہوں تو اس شخص کی نماز کا کیا حکم ہے؟ کیا نماز مکروہ ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ جس کمرے میں کسی ذی روح (جاندار) کی تصویر آویزاں ہو تو وہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے چاہے تصویر سامنے ہو یا پیچھے، دائیں ہو یا بائیں۔ فقہاء کرام نے اس کراہت کی وجہ صنم پرستی سے مشابہت اور تعظیم بیان کی ہے لیکن اگر کسی مصلّی پر جاندار کی تصویر اس طرح بنی ہو کہ اس پر پاؤں رکھے جاتے ہوں تو ایسے مصلّی پر نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، اس لیے کہ اس عمل سے اس تصویر کی تذلیل ہوتی ہے نہ کہ تعظیم، کیونکہ اسلام نے تصویر کی تعظیم کرنے سے منع کیا ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا بأس بان یصلّی علیٰ بساط فیہ تصاویر لان فیہ استھانة بالصور ولا یسجد علی التصاویر لانہ یشبہ عبادة الصور واطلق الکراھیة فی الاصل لان

---

[۱] قال الشیخ السید احمد الطحطاوی: (لا) یکرہ (قیام الامام) بجملة (فی المحراب) لا قیامہ خارجہ وسجودہ فیہ مسمّی محراباً لانہ یحارب النفس والشیطان بالقیام الیہ والکراھة لاشتباہ الحال علی القوم واذا ضاق المکان فلا کراھة۔

(الطحطاوی ص ۲۹۴ فصل فی المکروھات)

ومثلہ فی الھندیة ج ۱ ص ۱۰۸ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰة --- الخ۔

المصلی معظم ویکرہ ان یکون فوق رأسہ فی السقف وبین یدیہ او بحذائہ تصاویر او صورۃ معلقۃ ...الخ (الھدایۃ ج ا ص۱۲۶ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ)

خانۂ کعبہ اور روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تصاویر سے منقش جائے نماز پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک استفتاء کا جواب نظر سے گذرا جس کی وجہ سے بہت تشویش لاحق ہوئی، استفتاء کا جواب یہ تھا کہ جس جائے نماز (مصلّی) پر کعبۃ اللہ اور روضۂ اقدس کی تصویر منقش ہو اس پر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ اکثر مسلمان ان منقش جائے نمازوں پر نمازیں پڑھتے ہیں، بڑی بڑی مساجد میں بڑے بڑے علماء و مفتیانِ عظام کو ایسے جائے نمازوں پر نمازیں پڑھتے دیکھا گیا ہے، اور خصوصاً تشویش کی بات یہ ہے کہ ایسے منقش جائے نماز لوگ بڑے شوق سے سعودی عرب سے لاتے ہیں۔ اب اگر مذکورہ استفتاء کے جواب کے مطابق ایسے جائے نمازوں پر نماز پڑھنا جائز نہیں تو ہماری پڑھی گئی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ساری نمازوں کو دوبارہ قضاء کریں گے یا نہیں؟ مہربانی فرماکر ہمیں اس تشویش سے نکالیں؟

الجواب:۔ جائے نماز (مصلّی) پر غیر ذی روح شئے کی تصویر کا ہونا مانع صلوٰۃ نہیں اور نہ اس سے کوئی کراہت لازم آتی ہے۔

لما قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: واما صورۃ غیر ذی روح فلا خلاف فی عدم کراھۃ الصلوٰۃ علیھا او الیھا۔ (کبیری ص۳۴۶ مکروھات الصلوٰۃ)

خانہ کعبہ اور روضۂ اقدس کی تصاویر بھی غیر ذی روح میں داخل ہیں اس لیے جس مصلّی پر اس قسم کی تصاویر ہوں اس پر نماز پڑھنا مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر جائز ہے۔

(۱) عین کعبہ یا اس کی دیواروں پر نماز پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ: لو صلّی علیٰ جدار الکعبۃ فان کان وجھہ الیٰ سطح الکعبۃ یجوز والا فلا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ا ص۶۳ باب صلوٰۃ فی الکعبۃ)

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو صلّی فی جوف الکعبۃ او علیٰ سطحھا جاز الیٰ ای جھۃ۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج ا ص۴۳۵ باب صلوٰۃ فی الکعبۃ)

البتہ ایسا کرنے سے بوجہ اساءۃ ادب صرف کراہت تنزیہی ہے۔

لما قال العلامۃ السید احمد الطحطاویؒ: صح فرض ونفل فوقھا وان لم یتخذ

مصلیها سترة لما ذکرنا لکنه مکروه لا سارة الادب باستعلائه علیها وترك تعظیمها یفید ان الکراهة التنزیة ۔ (الطحطاوی ص۳۳۹ باب صلوٰۃ فی الکعبة)

(۲) تصویر کا حکم عین شے کا حکم نہیں ہوتا ۔

(۳) نماز پڑھنے کے دوران ان تصاویر پر سر رکھا جاتا ہے پاؤں نہیں جو کہ موجبِ تعظیم ہے ، یہی وجہ ہے کہ جو تصاویر نماز میں پاؤں تلے آتی ہوں تو نماز بلا کراہت جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ولا یکرہ لو کانت تحت قدمیه او محل جلوسه لانها مهانة ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۴۸ مکروہات الصلوٰۃ)

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر خانہ کعبہ اور روضۂ اقدس کی تصاویر سے منقش جائے نماز (مصلّٰی) پر نماز پڑھنا جائز ہے، تاہم اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان تصاویر پر پاؤں نہ آئے تاکہ بے ادبی کا شبہ پیدا نہ ہو ۔ جہاں تک ادا شدہ نمازوں کا مسئلہ ہے تو وہ بلا کراہت جائز ہیں دوبارہ قضاء کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ جن حضرات نے عدم جواز کا فتوٰی دیا ہے ان کا فتوٰی قابلِ غور ہے، اس لیے کہ جب عین کعبہ کے اوپر نماز پڑھنا جائز ہے تو منقش جائے نماز پر بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔[۱]

✲

---

[۱] لما قال العلامة المفتی محمود حسن گنگوھیؒ : (سوال) جائے نماز پر خانہ کعبہ کی تصویر ہے اُس پر نماز پڑھنا کیسا ہے، آیا اس تصویر کو دوسرا کپڑا چڑھا کر چھپا دیا جائے یا کیا کیا جائے، اگر فروخت کرتے ہیں تو چوتھائی قیمت ملتی ہے اور مسجد کو نقصان ہے ؟

(الجواب) صورت مسئولہ میں ان مصلوں پر نماز پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں نہ ان پر کپڑا چڑھانے کی ضرورت ہے نہ ان کو فروخت کرنے کی ضرورت ہے ۔ فی منیة المصلی : واما صورة غیر ذی روح فلا خلاف فی عدم کراھة الصلوٰۃ علیها والیها (ص۳۱۴) اور اس تصویر سے خانہ کعبہ کی تعظیم میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ تصویر کا حکم عین شئی کا حکم نہیں ہوتا، دوسرے خود خانہ کعبہ میں جب نماز پڑھی جاتی ہے تو وہاں بھی زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے جب وہ تعظیم کے منافی نہیں تو تصویر کا پیروں کے نیچے ہونا بطریقِ اولیٰ تعظیم کے منافی نہ ہوگا۔ فقط ، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ۔ (الفتاویٰ المحمودیہ جلد۷ ص۱۱۱ کتاب الصلوٰۃ)

باب مفسدات الصلوٰۃ

(نماز کے مفسدات کے بیان میں)

نماز میں پاؤں ہلانا

سوال:۔ کیا نماز میں پاؤں ہلانے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ نماز میں پاؤں ہلانا جب تک عملِ کثیر کے درجے میں نہ ہو تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، تاہم بلاضرورت پاؤں ہلانے سے اجتناب کرنا چاہیئے، البتہ دونوں پاؤں کا ہلانا عملِ کثیر کے زمرے میں داخل ہے۔

ان حرك رجلاً واحدة لا على الدوام لا تفسد صلوٰته وان حرك رجليه تفسد و اعتبر هذا القائل العمل بالرجلين بالعمل باليدين والعمل برجل واحدة بالعمل بيد واحدة قال بعضهم ان حرك رجليه قليلاً لا تفسد صلوٰته كذا في المحيط وهو الاوجه هٰكذا في البحر الرائق۔ (الهندية ج ۱ ص۱۰۳ الباب السابع فيما يفسد الصلوٰة)[1]

نماز میں کھانسنا

سوال:۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ بعض نمازی نماز میں کھانستے رہتے ہیں اور بعض لوگ تو کھانسی میں حد سے تجاوز کرجاتے ہیں۔ کیا نماز میں کھانسنا شرعاً جائز ہے اور اس کی مقدار کیا ہے؟

الجواب:۔ اگر نماز میں کھانسی بلا اختیار مع العذر ہو تو شرعاً جائز ہے اور بغیر عذر محض تحسینِ صوت کے لیے ہو تو بھی جائز ہے۔ البتہ نماز میں کھانسنے کے لیے کوئی خاص حد مقرر نہیں تاہم بلاعذر کھانسنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، بشرطیکہ اس سے حروف پیدا ہوجائیں اور بغیر اظہارِ حروف کے بلاعذر کھانسنا مکروہ ہے۔

---

[1] قال ابن نجيم: ان حرك رجلا واحدة لا على الدوام لا تفسد صلوٰته وان حرك رجليه تفسد فمشكل لان الظاهر ان تحريك اليدين في الصلوٰة لا يبطلها متى يلحق بهما تحريك الرجلين فالاوجه قول بعضهم ان حرك رجليه قليلاً لا تفسد صلوٰته وان كان كثيراً فسدت كما في الذخيرة۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۱۳ باب مفسدات الصلوٰة)

قال الحصکفیؒ: (والتنحنح) بحرفین (بلاعذر) اما به بان نشأ طبعه فلا (او) بلا (غرض صحیح) فلو لتحسین صوته او یهتدی امامه او للاعلام انه فی الصلوٰۃ فلا فساد علی الصحیح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۱۸ مطلب المواضع التی لایجب الخ)[۱]

بحالتِ نماز قرآن سے دیکھ کر قرأت کرنا

سوال: اگر کوئی شخص بحالتِ نماز قرآن مجید سے دیکھ کر قرأت کرے تو کیا اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے؟ نیز اس میں حافظ اور غیر حافظ کا فرق ہے یا نہیں؟

الجواب: مصحف شریف سے دیکھ کر بحالتِ نماز قرأت کرنا مختلف فیہ مسئلہ ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا کرنا مفسدِ نماز ہے جبکہ صاحبینؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مفسدِ نماز نہیں، البتہ صحیح قول یہی ہے کہ مفسدِ نماز ہے، اس میں حافظ اور غیر حافظ دونوں برابر ہیں۔

ویفسدها قرأته من مصحف عند ابی حنیفۃؒ وقال لایفسد ان حمل المصحف وتقلیب الاوراق والنظر فیه عمل کثیر وللصلوٰۃ عنه بُدّ وعلی هٰذا لوکان موضوعاً بین یدیه علی رحل وهو لایحمل ولایقلب اوقرأ المکتوب فی المحراب لاتفسد ولان التلقن من المصحف تعلم لیس من اعمال الصلوٰۃ وهٰذا یوجب التسویة بین المحمول وغیره فتفسد بکل حال وهو الصحیح هٰکذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۰۱ مفسدات الصلوٰۃ)[۲]

---

[۱] ویفسد الصلوٰۃ التنحنح بلاعذر بان لم یکن مدفوعاً الیه حصل منه حروف هٰکذا فی التبیین ولولم یظهر له حروف فانه لایفسد اتفاقاً لکنه مکروه کذا فی البحر الرائق۔ (الهندیة سعیدی ج۱ ص۵۲ الباب السابع الفصل فیما یفسد الصلوٰۃ)

[۲] قال ابن نجیم: (قوله وقرأته من مصحف) ای یفسدها عند ابی حنیفةؒ وقالا هی تامة لانها عبادة انضافت الی عبادة الا انها یکره لانه تشبه بصنیع اهل الکتاب ولابی حنیفةؒ وجهان احدهما ان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الاوراق عمل کثیر الثانی انه تلقن من المصحف فصار کما اذا تلقن من غیره وعلی هٰذا الثانی لافرق بین الموضوع والمحمول عنده وعلی الاوّل یفترقان وصحح المصنف فی الکافی الثانی وقال انها تفسد بکل حال تبعاً لما صححه شمس الائمة السرخسی۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۰ مایفسد الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۲۳ مفسدات الصلوٰۃ۔

نماز میں قبلہ سے منحرف ہوجانا

سوال:۔ نماز پڑھنے کے دوران کسی شخص کے دھکا دینے سے نمازی کا سینہ قبلہ سے کچھ منحرف ہوگیا، تو اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قبلہ سے تھوڑی سی مقدار میں منحرف ہوجائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر من کل الوجوہ منحرف ہوگیا تو اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

قال الحصکفیؒ: (و لغیرہ) ای غیر معاینھا (واصابۃ جھتھا) بان یبقی شیٔ من سطح الوجہ مسامتا للکعبۃ او لھوائھا. (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص ۴۲۸ شروط الصلوٰۃ) [۱]

لاؤڈ سپیکر میں نماز پڑھنا

سوال:۔ آجکل اکثر مساجد میں لاؤڈ سپیکر میں نماز پڑھائی جاتی ہے، آیا شرعاً اس آلہ کے ذریعہ نماز پڑھنا ناجائز ہے؟

الجواب:۔ لاؤڈ سپیکر ایک جدید آلہ ہے اس سے مکبر یا امام کی آواز دور تک پہنچتی ہے۔ فنی لحاظ سے چونکہ یہ آواز اس امام ہی کی آواز ہوتی ہے اسلئے محققین علماء کرام کا اتفاق ہے کہ لاؤڈ سپیکر میں نماز پڑھانا جائز ہے لیکن بلا ضرورت لاؤڈ سپیکر پر نماز پڑھانے سے اجتناب کیا جائے۔ البتہ بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق چونکہ یہ آواز امام کی اپنی نہیں بلکہ صدائے بازگشت ہے اس لیے اس (لاؤڈ سپیکر) سے نماز درست نہیں۔

قال المفتی کفایت اللہ:۔ میں کئی مرتبہ اس آلہ کے نماز میں استعمال کا حکم لکھ چکا ہوں اور اخبارات میں شائع کروا چکا ہوں، وہ یہ کہ فی حد ذاتہٖ اس آلہ کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں اس لیے خطبہ جمعہ وعیدین اور وعظ وتقریر کی مجالس میں اس کا استعمال مباح ہے، نماز کے بڑے مجمعوں میں جو لوگ تبلیغ تکبیر کرتے ہیں اُن کی آواز کو بلند کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ (کفایت المفتی ج ۹ ص ۳۰۷ کتاب الحظر والاباحۃ) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیم: (قولہ ولغیرھا اصابۃ جھتھا) لغیر المکی فرضہ اصابۃ جھتھا وھوا لجانب الذی اذا توجہ الیہ الشخص یکون مسامتا للکعبۃ اولھوائھا۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۳۰۰ شروط الصلوٰۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۶۳ الفصل الثالث فی استقبال القبلۃ۔

[۲] امداد الفتاوٰی ج ۱ ص ۶۰۵ تا ۶۰۸ و آلاتِ جدیدہ ص ۵۳ کی تحریر سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے۔

عورت کے محاذات کا مسئلہ

سوال:۔ اگر نماز میں ایک عورت مرد کے محاذات میں کھڑی ہوجائے اور مرد اس کی اقتداء کی نیت بھی کرے اور عورت بالغہ بھی ہو تو کیا اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟ کیا مسئلہ محاذات میں محرمہ اور اجنبیہ میں کوئی فرق ہے؟ اور محاذات کے شرائط کیا ہیں؟

الجواب:۔ اگر بالغہ عورت کسی مرد کے محاذات میں کھڑی ہوجائے تو چند شرائط کے ساتھ اس مرد کی نماز فاسد ہوجاتی ہے، مثلاً بغیر کسی حائل ورکاوٹ کے مکان ایک ہو، عورت بالغہ عاقلہ ہو جس کی نماز صحیح ہو، مجنونہ نہ ہو، امام عورت کی اقتداء کی نیت کرے، محاذات رکن کامل میں ہو، اور دونوں کی جہت متحد ہو۔

اور محاذات میں پنڈلی اور ٹخنوں کا اعتبار ہوتا ہے، اس میں محرمہ اور غیر محرمہ کا کوئی فرق نہیں، دونوں برابر ہیں۔

(ومنها) ان یکون فی مکان واحد حتی لو کان الرجل علی الدکان والمرأۃ علی الارض والدکان مثل قامۃ الرجل لا تفسد صلوته (ومنها) ان یکون بلا حائل حتی لو کان فی مکان متحد بان کانا علی الارض او علی الدکان الا ان بینهما اسطوانۃ لا تفسد صلوته هکذا فی الکافی وادنی الحائل قدر مؤخر الرحل وغلظه غلظ الاصبع والفرجۃ تقوم مقام الحائل وادناه قدر ما یقوم فیه الرجل کذا فی التبیین (ومنها) ان تکون ممن تصح منها الصلوۃ حتی ان المجنونۃ اذا حاذته لا تفسد صلوته (ومنها) ان ینوی الامام امامتها او امامۃ النساء وقت الشروع لا بعده ولا یشترط حضور النساء لصحۃ نیتهن (ومنها) ان تکون المحاذات فی رکن کامل حتی لو کبرت فی صف ورکعت فی آخر وسجدت فی ثالث فسدت صلاۃ من عن یمینها ویسارها خلفها من کل صف (ومنها) ان تکون جهتهما متحدۃ حتی لو اختلف لا تفسد ولا یتصور اختلاف الجهۃ الا فی جوف الکعبۃ او فی لیلۃ مظلمۃ وصلی کل بالتحری الی جهۃ والمعتبر فی المحاذات الساق والکعب علی الصحیح هکذا فی التبیین والمرأۃ نتنا ول الاجنبیۃ والمحرمۃ والحلیلۃ والصغیرۃ المشتهاۃ والکبیرۃ التی ینفر عنها الرجال هکذا فی الکفایۃ۔ (الهندیۃ ج ۱ ص ۸۹ باب الامامۃ۔ الفصل الخامس)

قال الحصکفیؒ : (واذا حاذ ته) ولو بعضو واحد وخصه الزیلعی بالساق والکعب (امرأة) ولو امة (مشتهاة) حالاً کبنت تسع مطلقاً وثمان وسبع لو ضخمة او ماضیا کعجوز (ولا حائل بینهما) اقله قدر ذراع فی غلظ اصبع او فرجة تسع رجلاً (فی صلوٰة) وان لم تتخذ کیفیتها ظهر ابمصلّی عصرعلی الصحیح سراج فانه یصح نقلاً علی المذهب بحر وسیجیء (مطلقة) خرج الجنازة (مشترکة) فمحاذاة المصلیة لمصل لیس فی صلاتها مکروهة لامفسد فتح (تحریمة) وان سبقت ببعضها (واداءً) ولو حکما کلاحقین بعد فراغ الامام بخلاف المسبوقین والمحاذاة فی الطریق (واتحدت الجهة) فلو اختلفت کما فی جوف الکعبة ولیلة مظلمة (فسدت صلوٰته) لو مکلّفاً والا لا (ان نوی) الامام وقت شروعه لا بعده (امامتها) وان لم تکن حاضرة علی الظاهر ولو نوی امرأة معینة اوالنساء الا هذه عملت نیته (والا) تنوها (فسدت صلوتها)۔

(الدّر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۱ ص۵۷۲ تا ص۵۷۵ باب الامامة)

لبس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال :۔ بعض اوقات بس میں سفر کے دوران نماز کا وقت ہوتا ہے لیکن نماز کے لیے بس کا ڈرائیور کسی مقام پر بس کو نہیں روکتا۔ اگر بس میں بیٹھ کر نماز پڑھلی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے؟

الجواب :۔ بس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا مع العذر جائز ہے جب قبلہ کا رُخ ابتداً میں صحیح ہو لیکن بہتر یہ ہے کہ انتظار کرے، ممکن ہے کہ باقاعدہ نماز کا وقت مل جائے، بشرطیکہ پہلے ڈرائیور سے بات کرلی ہو اور ڈرائیور گاڑی نہ روکنے پر مُصر ہو، البتہ ڈرائیور اگر گاڑی کھڑی کردے تو پھر جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ : (صلی الفرض فی فلك) صار (قاعداً بلاعذر صح) لغلبة العجز (واساء) وقالا لا یصح الا بعذر وهو الاظهر برهان۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۱۰۱ باب صلوٰة المریض)

(اما الصلوٰة علی العجلة ان کان طرف العجلة علی الدابة وهی تسیر او لا تسیر (فهی صلوٰة علی الدابة فتجوز فی حالة العذر) المذکور فی التیمم (لا فی [illegible])

ومن العذر المطروطين يغيب فيه الوجه وذهاب الرفقاء ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۴۱ باب النوافل ، مطلب الصلوٰۃ علی الدابۃ) ؎۱

مسجد میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے دو کانوں میں نماز پڑھنا

سوال:۔ ہماری مسجد چھوٹی ہے، بعض اوقات نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد میں جگہ نہیں رہتی خصوصاً جمعہ کے دن، تو بعض لوگ مسجد کے باہر ہی دو کانوں میں کھڑے ہو کر نیت باندھ لیتے ہیں، جس کی بنا پر ظاہراً صفوف میں اتصال نہیں رہتا کیا ایسی صورت میں امام کے پیچھے نماز جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد میں جگہ نہ ہو تو مسجد کے باہر دو کانوں میں نماز پڑھنا اُس وقت درست ہے جس وقت مسجد اور دو کانوں کے درمیان کا راستہ بند کیا جائے اور صفوف میں اتصال ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ ان مقتدیوں کو امام کی حالت کا علم بھی ہو۔ اگر صفوف میں اتصال نہ ہو، یا قاعدہ راستہ درمیان میں خالی ہو اور ایسے ہی امام مسجد کی حالت کا بھی علم نہ ہو تو ایسی صورت میں اقتداء درست نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (ویمنع من الاقتداء طریق تجری فیہ عجلۃ) الۃ یجرھا الثور (او نھر تجری فیہ السفن) ولو زورقا ولو فی المسجد (او خلاء) ای فضاء (فی الصحراء) او فی مسجد کبیر جدا کمسجد القدس (یسع صفین) فاکثر الا اذا اتصلت الصفوف فیصح مطلقاً کان قام فی الطریق ثلاثۃ وکذا اثنان عند الثانی لا واحد اتفاقاً لانہ لکراھۃ صلاتہ صار وجودہ کعدمہ فی حق من خلفہ (والحائل لا یمنع) الاقتداء (ان لم یشتبہ حال امامہ بسماع او رؤیۃ) ولو من باب مشبک یمنع الوصول فی الاصح (ولم یختلف المکان) حقیقۃ کمسجد

؎۱ ولا تجوز المکتوبۃ علی الدابۃ الا من عذر۔۔۔۔۔۔ اما الصلوٰۃ علی العجلۃ فان کان طرفھا علی الدابۃ وھی تسیر اولا فھی صلوٰۃ علی الدابۃ وقد مر حکمھا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۳ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

ومثلہٗ فی معارف السنن ج۳ ص۳۹۵ باب الصلوٰۃ علی الدابۃ حیث توجھت بہ ۔

وبیت فی الاصح ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۵۸۴ باب الامامۃ) ۱؎

نماز میں واجبات کا چھوٹ جانا

سوال:۔ اگر کسی شخص سے نماز کے واجبات چھوٹ جائیں اور وہ سجدہ سہو بھی نہ کرے تو اس سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں قصداً و عمداً واجبات کو ترک کرنا گناہ کبیرہ ہے، البتہ واجبات چھوٹ جانے پر اگر سجدہ سہو کر لیا جائے تو نماز صحیح ہو جاتی ہے، اگر سجدۂ سہو نہ کیا تو پھر نماز کا اعادہ واجب ہے، اگر نماز کا اعادہ نہ کیا تو نماز کراہتِ تحریمہ کے باوجود جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: (لہا واجبات) لا تفسد بترکہا وتعاد وجوبًا فی العمد والسہو ان لم یسجد لہ وان لم یعدہا یکون فاسقًا اٰثمًا وکذا کل صلوٰۃ ادیت مع کراھۃ التحریم یجب اعادہا والمختار انہ جابر للاول لان الفرض لا یتکرر۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۴۵۶ واجبات الصلوٰۃ) ۲؎

زلزلہ کے وقت نماز کا توڑنا

سوال:۔ بحالتِ نماز اگر زلزلہ آجائے تو نماز کو توڑ کر باہر کسی محفوظ جگہ پر جانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۱؎ ومنہا طریق عام یمر فیہ العجلۃ والاوقار ھکذا فی شرح الطحاوی۔ اذا کان بین الامام وبین المقتدی طریق ان کان ضیقًا لا یمر فیہ العجلۃ والاوقار لا یمنع وان کان واسعًا یمر فیہ العجلۃ والاوقار یمنع کذا فی فتاوٰی قاضی خان والخلاصۃ ھذا اذا لم تکن الصفوف متصلۃ علی الطریق اما اذا اتصلت الصفوف لا یمنع الاقتداء ولو کان علی الطریق واحد لا یثبت بہ الاتصال وبالثلث یثبت بالاتفاق۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۸۷ باب الامامت، الفصل الرابع فی بیان ما یمنع صحۃ الاقتداء۔۔ الخ)

۲؎ فلا تفسد الصلوٰۃ بترکہا عامدًا او ساھیًا بل یجب علیہ سجود السہو فی السہو جبرا للنقصان الحاصل بترکہا سہوًا والاعادۃ فی العمد والسہو اذا لم یسجد لتکون مؤداۃ علی وجہ لا نقص فیہ فاذا لم یعدہا کانت مؤداۃ اداء مکروھا کراھۃ تحریم وھذا ھو الحکم فی کل واجب ترکہ۔

(البحرالرائق ج ۱ ص۲۹۵ شروط الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی ص۱۳۲ فی بیان واجبات الصلوٰۃ۔

الجواب:- زلزلہ کے باعث باجماعت نماز توڑ کر باہر نکلنے کے بارے میں صریح جزئیہ نہیں ملا، مگر فقہی ذخائر میں بعض ایسے جزئیات موجود ہیں کہ مالی نقصان سے بچنے کے لیے نماز کو توڑا جاسکتا ہے تو جانی نقصان سے بچنے کے لیے نماز توڑنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا، چونکہ زلزلہ میں جانی نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے نماز چھوڑ کر باہر نکلنا جائز ہے۔

لما قال ابن عابدینؒ: (تتمۃ) نقل عن خط صاحب البحر علیٰ ھامشہ:
ان القطع یکون حرامًا ومباحًا ومستحبًا وواجبًا فالحرام لغیر عذر والمباح اذا خاف فوت مال والمستحب القطع للاکمال والواجب لاحیاء النفس۔[1]

(رد المحتار ج ۱ ص۵۲ باب ادراک الفریضۃ مطلب قطع الصلوٰۃ یکون حرامًا ومباحًا۔۔الخ)

نماز میں امام کی غلطی پر لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال: ہماری مسجد کے امام صاحب سے صبح کی نماز میں غلطی ہوگئی جس پر ایک مقتدی نے لقمہ دیا لیکن امام صاحب نے اس کا لقمہ نہیں لیا بلکہ اپنی نماز جاری رکھی، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ جس نے لقمہ دیا ہے اس کی نماز فاسد ہوگئی ہے لہٰذا وہ اپنی نماز لوٹا دے۔ کیا اس طرح لقمہ دینے سے واقعی نماز فاسد ہوجاتی ہے؟

الجواب:- نماز میں امام کے غلطی کرنے سے اگر مقتدی لقمہ دے دے تو اس سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی اور نہ ہی امام کے لقمہ نہ لینے سے نماز فاسد ہوتی ہے، البتہ لقموں کی کثرت سے اجتناب کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ: (بخلاف فتحہ علیٰ امامہ) فانہ لا یفسد (مطلقًا) لفاتح واخذ بکل حال الا اذا سمعہ المؤتم من غیر مصلٍ ففتح بہ تفسد

---

[1] وفی الھندیہ: وکذا الاجنبی اذا خاف ان یسقط من سطح اوتحرقہ النار او یغرق فی الماء واستغاث بالمصلی وجب علیہ قطع الصلوٰۃ رجل قام الی الصلوٰۃ فسرق منہ شئ قیمتہ درھم لہ ان یقطع الصلوٰۃ ویطلب السارق سواء کانت فریضۃ اوتطوعًا لان الدرھم مال۔۔۔الخ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ ومما یتصل بذلک مسائل)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۷ باب ادراک الفریضۃ۔

صلوٰۃ الکل وینوی الفتح لا القرأۃ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۲۲ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [۱]

نماز میں باتیں کرنا

سوال:۔ نماز میں اگر ایک شخص بھول کر بات کرے تو اس سے نماز پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ نماز میں باتیں کرنا خواہ عمداً ہو یا نسیاناً ہو مفسدِ صلوٰۃ ہے، ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھی جائے۔

قال ابن عابدینؒ: (یفسدھا التکلم) ای یفسد الصلوٰۃ ومثلھا سجود السھو والتلاوۃ والشکر علی القول عن الحموی (قولہ ھو النطق بحرفین الخ) ای ادنیٰ ما یقع اسم الکلام علیہ المرکب من حرفین کما فی القھستانی عن الجلابی۔

(رد المحتار ج ۱ ص۶۱۳ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا) [۲]

نماز کے دوران عورت کے دوپٹے میں سے بال نظر آنا

سوال:۔ آجکل بعض عورتیں ایسے دوپٹہ کا استعمال کرتی ہیں

---

[۱] وان فتح علی امامہ لم تفسد ثم قیل ینوی الفاتح بالفتح علی امامہ التلاوۃ والصحیح ان ینوی الفتح علی امامہ دون القرأۃ قالوا ھذا اذا ارتج علیہ قبل ان یقرأ قدر ما تجوز بہ الصلوٰۃ او بعد ما قرأ و لم یتحول الی آیۃ اخریٰ واما اذا قرأ وتحول ففتح علیہ تفسد صلوٰۃ الفاتح والصحیح انھا لا تفسد صلوٰۃ الفاتح بکل حال ولا صلوٰۃ الامام لو اخذ منہ علی الصحیح ھٰکذا فی الکافی۔ (فتاوی ھندیۃ ج ۱ ص۱۱۳ الباب السابع فیما یفسد الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۶ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا۔

[۲] اذا تکلم فی صلوٰتہ ناسیاً او عامداً خاطئاً او قاصداً قلیلاً او کثیراً تکلم لاصلاح صلوٰتہ بان قام الامام فی موضع القعود فقال لہ المقتدی اُقعد اَو قعد فی موضع القیام فقال لہ قم او لا لاصلاح صلوٰتہ ویکون الکلام من کلام الناس استقبل الصلوٰۃ عندنا کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۹۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۲ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا۔

جس سے عورت کی ہیئت بالکل نمایاں ہوتی ہے خاص کر جب نماز میں ہو تو عورت کے بال اور جسم کے اعضاء واضح دکھائی دیتے ہیں، کیا اس طرح بالوں کے ظاہر ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے ؟

الجواب:۔ آزاد عورت کا جملہ بدن نماز میں بلکہ تمام اوقات میں مخفی رہنا ضروری ہے اور عورت کے سر کے بال بھی ستر میں سے ہیں اُن کا چھپانا لازم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عورت نماز میں ایسا دوپٹہ استعمال کرتی ہو جس سے سر کے تمام بال نہیں چھپتے بلکہ ظاہر رہتے ہیں تو اس سے نماز نہیں ہوتی بلکہ اس نماز کا اعادہ واجب ہے۔

قال الحصکفیؒ : (وللحرۃ) ولو خنثیٰ (جمیع بدنہا) حتی شعرہا النازل فی الاصح خلا الوجہ والکفین) فظہر الکف عورۃ علی المذہب (والقدمین) علی المعتمد۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۰۵ باب شروط الصلوٰۃ)

لما قال ابن عابدینؒ : تحت قولہ ولا یصف ماتحتہ) بان لایریٰ منہ لون البشرۃ احترازاً عن الرقیق ونحو الزجاج ۔ (الرد المحتار ج ۱ ص۴۱۰ باب شروط الصلوٰۃ - مطلب فی النظر الی وجہ الامرد)[۱]

نماز میں درود و دعا کے الفاظ دل میں پڑھنا

سوال:۔ میری زبان میں لکنت ہے جس کی وجہ سے نماز میں الفاظ کو صحیح طریقہ سے ادا نہیں کر سکتا ہوں، خصوصاً جب تشہد میں ہوتا ہوں تو درود و دعا کے الفاظ بالکلیۃ میری زبان پر نہیں آتے جس کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، تو میں دل ہی دل میں الفاظ و معانی پہ غور و فکر کر کے پڑھ لیتا ہوں۔ تو کیا اس سے نماز میں فساد وغیرہ لازم آتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ نماز میں تشہد کا پڑھنا واجبات الصلوٰۃ میں سے ہے اس کا ترک کرنا

---

[۱] وبدن الحرۃ عورۃ الا وجہہا وکفیہا وقدمیہا کذا فی المتون وشعر المرأۃ ما علی رأسہا عورۃ واما المسترسل ففیہ روایتان الاصح انہ عورۃ کذا فی الخلاصۃ وھو الصحیح وبہ اخذ الفقیہ ابو اللیث وعلیہ الفتوی ۔۔۔ والثوب الرقیق الذی یصف ما تحتہ لا تجوز الصلوٰۃ فیہ کذا فی التبیین۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۵۸ الباب الثانی فی شروط الصلوٰۃ)

ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج ۱ ص۹۶ باب شروط الصلوٰۃ۔

گناہ ہے، اور نہ ہی دل میں غور وفکر کرنے سے تشہد ادا ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنی طاقت کے مطابق ان الفاظ کو ادا کرنے کی کوشش کی جائے اگرچہ الفاظ صحیح ادا نہ ہوں لیکن اتنا یقین ہو کہ میں نے ان الفاظ کو ادا کیا ہے۔ تاہم درود شریف اور دعا چونکہ سنت ہے اس لیے اگر بصورتِ مجبوری رہ بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اگرچہ پڑھنا مناسب ہے۔

فان کان لاینطق لسانہ فی بعض الحروف ان لم یجد آیۃ لیس فیھا تلک الحروف یجوز صلوتہ ولا یؤم غیرہ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۷۹ زلۃ القاری)

و یجب التشھد فی القعدۃ الاخیرۃ و کذا فی القعدۃ الاولیٰ وھو الصحیح ھٰکذا فی السراج الوھاج وھو الاصح کذا فی محیط السرخسی۔

(الھندیۃ ج۱ ص۷۱ واجبات الصلوٰۃ) [1]

نمازی کے آگے کُتا اور عورت کے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال:۔ اگر بحالتِ نماز سامنے سے عورت یا کُتا گذر جائے تو اس سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت اور کُتے کا نمازی کے سامنے سے گذرنا مفسدِ نماز نہیں۔

قال ابن عابدین: (قولہ ولو امرأۃ اوکلب) بیان للاطلاق والاشارۃ الی الرد علی الظاھریۃ بقولھم یقطع الصلوٰۃ مرور المرأۃ والکلب والحمار وعلی احمد فی الکلب الاسود۔ (ردالمحتار ج۱ ص۴۶۹ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لھا واجبات ..... (قولہ والتشھد ان) ای تشھد القعدۃ الاولیٰ وتشھد الاخیرۃ۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۶۶ واجبات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۱ ص۳۱۸ واجبات الصلوٰۃ۔

[2] (مار فی موضع سجودہ لا تفسد) سواء المرأۃ والکلب والحمار لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقطع الصلوٰۃ شیٔ وادرؤا ما استطعتم فانما ھو شیطان (وان اثم المار)

(مراقی الفلاح علیٰ ھامش الطحطاوی ج۱ ص۱۸۷)

نماز میں سری ذکر کرنا

سوال:۔ بعض لوگ نماز میں ذکرِ سری کرتے ہیں، اس سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب: نماز مخصوص اذکار کا نام ہے، ان اذکار کے علاوہ نماز میں دوسرے اذکار کا ورد کرنا مفسدِ صلوٰۃ ہے، اس لیے جو شخص مخصوص مقامات میں مخصوص اذکار کے علاوہ ذکر کرے اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبيؒ: ذكر في المتقط ان المصلي اذا لسعته الحية فقال بسم الله الرحمن الرحيم تفسد صلوته الخ وذكر في الذخيرة انه اذا قال المريض يارب اوقال بسم الله لما يلحقه من المشقة اما عندهما اى الطرفين فتفسد۔ (كبيرى ص۴۳۷ فصل فيما يفسد الصلوٰة)[1]

کپڑوں پر نجاست ہو تو نماز کا حکم

سوال:۔ دہقان (کاشتکار) لوگ بعض اوقات جلدی میں کھیتوں میں کام کرنے والے کپڑوں میں ہی نماز پڑھ لیتے ہیں جبکہ کبھی کبھی ان کو اپنے کپڑوں پر نجس اشیاء مثلاً گوبر وغیرہ کی موجودگی کا علم نہیں ہوتا، کیا ان اشیاء کے باوجود نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ نجاست درہم کی مقدار سے زیادہ ہو تو ہر حال میں نماز درست نہیں چاہے سہواً ہو یا قصداً اس کا اعادہ لازمی ہے، البتہ اگر درہم کی مقدار سے کم ہو اور اس کو پتہ ہو تو نماز واجب الاعادہ ہے اور اگر علم نہ ہو تو نماز درست ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: وعفى الشارع عن قدر درهم وان كره تحريماً.... وفوقه مبطل۔ قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله وان كره تحريماً) ففى المحيط يكره ان يصلى ومعه قدر درهم اودونه من النجاسة عالماً به۔ (ردالمحتار ج۱ ص۳۱۶ باب الانجاس)[2]

زکوٰۃ کی رقم سے خریدی ہوئی صفوں پر نماز کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص مسجد کے لیے زکوٰۃ کے پیسوں سے صفوں کا انتظام کرے تو کیا

---

[1] قال الشيخ المفتى عزيز الرحمٰن فى جواب هٰذه المسئلة قال: ظاہر ہمیں است کہ نماز فاسد شود لہٰذا احتیاط دریں امر واجب است۔ (فتاوٰى دارالعلوم ديوبند ج۴ ص۴۶ فصل فيما يفسد الصلوٰة)

[2] قال الشيخ عبد الرحمٰن الجزائريؒ: ويعفى فى النجاسة المغلظة عن امور منها قدر الدرهم ويقدر فى النجاسة الكثيفة بما يزن عشرين قيراطاً وفى النجاسة الرقيقة بعرض مقعر الكف.... فان الصلوٰة تكون به مكروهاً كراهة تنزيه .... والمشهور عند الحنفية كراهة التحريم۔ (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ج۱ ص۱۸ مبحث ما يعفى عنه من النجاسة)

ان صفوں پر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز کے لیے مکان (جگہ) کا پاک ہونا شرط ہے چاہے جیسا بھی ہو۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ صفیں چونکہ پاک ہیں اس لیے ان پر نماز پڑھنا درست ہے، اگرچہ لانے والے کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اس لیے کہ تملیک کی شرط مفقود ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یشترط ان یکون الصرف..... تملیکاً لا اباحة کما مرّ لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد ولا الیٰ کفن میت۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب المصرف)[1]

زیرِ ناف بالوں کی موجودگی میں نماز کا حکم

سوال:۔ اکثر لوگوں سے یہ سننے میں آیا ہے کہ جس شخص نے زیرِ ناف بال چالیس دن تک صاف نہ کیے ہوں تو اس کی نماز نہیں ہوتی، کیا یہ شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ زیرِ ناف بالوں کو ہفتہ میں ایک بار صاف کیا جائے، چالیس دن تک بلا عذر تاخیر کرنا مکروہ ہے لیکن اس کراہت کے باوجود نماز پڑھنا درست ہے، اگرچہ یہ عمل بذاتِ خود مناسب نہیں۔

لما فی الهندیة: والافضل ان یقلم اظفاره ویحفی شاربه ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل سبوع مرة فان لم یفعل ففی کل خمسة عشر یوماً ولا یعذر فی ترکه وراء الاربعین فالاسبوع هو الافضل والخمسة عشر الاوسط والاربعون الابعد ولا عذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۵۸ کتاب الکراهة الباب التاسع عشر)[2]

---

[1] فی الهندیة: ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰة المسجد وکذا القناطر والسقایات..... وکل ما لا تملیك فیه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۸۸ الباب السابع فی المصارف)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۲۰۸ باب من یجوز دفع الصدقة الیه ومن لا یجوز۔

[2] لما قال العلامة الحصکفیؒ: وحلق عانته وتنظیف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرّة والافضل یوم الجمعة وجاز فی کل خمسة عشر وکره ترکه وراء الاربعین۔ قال ابن عابدینؒ: تحت قوله (وکره ترکه) ای تحریماً لقول المجتبیٰ ولا عذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۰۷ کتاب الکراهة فصل فی البیع)

نماز میں اللہ یا اِنّا للہ کہنا

سوال:۔ اگر دورانِ نماز کوئی ناگہانی سانحہ پیش آجائے یا کوئی ہولناک خبر سنے اور زبان سے بے اختیار اَللہ یا اِنّا لِلّٰہِ کے الفاظ نکل جائیں تو اس کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی دو رائے ہیں، ایک رائے کے مطابق یہ نماز فاسد ہو جائے گی جبکہ دوسری رائے کے مطابق چونکہ یہ الفاظ کلام الناس سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ علامہ ابن عابدینؒ وغیرہ محققین نے قولِ ثانی کو راجح اور مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قوله لوسقط شئ من السطح فبسمل) يشكل عليه ما فى البحر لولدغته عقرب او اصابه وجع فقال لبسم الله قيل تفسد لانه كالانين وقيل لا لانه ليس من كلام الناس وفى النصاب وعليه الفتوىٰ وجزم به فى الظهيرية وكذا لوقال يارب كما فى الذخيرة. (ردالمحتار ج ۱ صـ۶۲۲ باب مايفسد الصلوٰة ومايكره ـ الخ) [۱]

پاگل (مجنونہ) خاتون کے محاذات سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال:۔ ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ عورت کا نماز میں مرد کے محاذات میں آنا مفسدِ صلوٰۃ ہے تو کیا اگر کوئی پاگل (مجنونہ) عورت کسی مرد کے ساتھ نماز میں کھڑی ہوجائے تو نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز میں اگرچہ اجنبی عورت کا مرد کے محاذات میں آنا مفسدِ صلوٰۃ ہے مگر یہ فساد چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے جس میں تکبیرِ تحریمہ کا ایک ہونا بھی شامل ہے جو کہ مکلف سے متوقع ہے چونکہ مجنونہ عورت کی نماز سرے سے صحیح نہیں اس لیے اس سے فسادِ صلوٰۃ بھی لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قوله فى صلوٰة وان لم تتخذ)...... قال وفيه اشارة الى ان محاذاة المجنونة لا تفسد لان صلوتها ليست

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم المصريؒ: ذكر فى الفتاوىٰ الظهيرية فى بعض المواضع انه لواجاب بالقول بان يخبر بخبر يسره فقال الحمد لله رب العالمين او بخبر يسوءه فقال انا لله وانا اليه راجعون. تفسد صلوته والاصح انه لاتفسد صلوته وهو تصحيح مخالف للمشهور. (البحرالرائق ج ۲ صـ۲ باب مايفسد الصلوٰة الخ)

وَمِثْلُهٗ فى فتاوىٰ دارالعلوم ديوبند ج ۴ صـ۶۵ فصل مفسدات الصلوٰة۔

بصلاۃ فی الحقیقۃ ۔ (رد المحتار ج۱ ص۵۷۳ باب الامامۃ) [1]

زخم پر اسپرٹ لگا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:۔ جب کوئی شخص زخمی ہو جاتا ہے تو خون کو بند کرنے کے لیے زخم پر اسپرٹ لگایا جاتا ہے، تو کیا زخم پر اسپرٹ لگا کر نماز پڑھنا درست ہے؟

الجواب:۔ اسپرٹ میں چونکہ الکحل استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اگر الکحل عنب، زبیب اور کھجور سے بنایا گیا ہو تو بالاتفاق اس کا استعمال جائز نہیں اور نہ اس کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے اور اگر ان چار کے علاوہ دیگر اشیاء سے تیار کیا گیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پاک ہے اور اس کے استعمال میں رخصت کی گنجائش ہے۔

چونکہ آجکل کا الکحل ان چاروں اشیاء کے علاوہ دیگر حبوب اور چھلکوں، پٹرول وغیرہ سے بنایا جاتا ہے اس لیے عموم بلوی کے پیشِ نظر امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ کے مطابق نماز درست ہے۔

لما قال الشیخ المحقق المفتی محمد تقی عثمانی : وان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویۃ والعطور وغیرھا لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیرہ کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذٍ ھناک فسحۃ فی الاخذ لقول ابی حنیفۃؒ عند عموم البلوی ۔ (تکملۃ فتح الملھم ج۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربۃ حکم الکحول المکرۃ) [2]

آدھی آستین والی بنیان میں نماز پڑھنے کا مسئلہ

سوال:۔ کیا بلا ضرورت صرف آدھی آستین والے

---

[1] لما فی الہندیۃ: (ومنھا) ان تکون ممن تصح منھا الصلوۃ حتی ان المجنونۃ اذا حاذتہ لاتفسد کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۸۹ باب الامامۃ، الفصل الخامس)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الاحکام ج۱ ص۵۶۱ باب مفسدات الصلوٰۃ ۔

[2] لما قال الشیخ مولانا اشرف علی التھانویؒ: اسپرٹ اگر عنب، زبیب، رطب، تمر سے حاصل نہ کی گئی ہو تو اس میں گنجائش ہے للاختلاف ورنہ گنجائش نہیں للاتفاق ۔

(امداد الفتاوی ج۱ ص۸۲ باب الانجاس)

بنیان میں نماز پڑھنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ نماز میں بلاضرورت کہنیوں کو کھلا رکھنا مکروہ ہے چونکہ بنیان میں کہنیاں کھلی رہتی ہیں اس لیے بلاضرورت اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے تاہم اگر کسی کے پاس قمیص نہ ہو تو اس صورت کے پیش نظر صرف بنیان میں نماز پڑھنا بلاکراہت جائز ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وکرہ کفه ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم او ذیل ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۴۰ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ)[۱]

نماز میں تنحنح (کھانسنے) کا حکم

سوال:۔ سردی کے ایام میں یا کبھی ویسے ہی بعض لوگ گلا صاف کرنے کے لیے تنحنح کرتے (کھانستے) ہیں ، تو اس سے نماز پر کیا اثر پڑتا ہے ؟

الجواب:۔ تنحنح یعنی گلا صاف کرنے کیلئے یا تحسین صوت یعنی آواز کی وضاحت کیلئے یا بوجہ مجبوری ایسا کیا جائے تو نماز بلاکراہت درست ہے، البتہ اگر بغیر ضرورت کے کیا جائے تو مکروہ ہے ۔

لما قال الحصکفیؒ : التنحنح بحرفین بلاعذر اما به بان نشأ من طبعه فلا او بلا غرض صحیح فلو لتحسین صوته اولیھتدی امامه اوللاعلام انه فی الصلوٰۃ فلا فساد علی الصحیح ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۱۶۸ باب مفسدات الصلوٰۃ)[۲]

---

[۱] قال العلامه حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : وکرہ ......وتشمیر کمیه عنهما للنهی عنه لما فیه من الجفاء المنافی للخشوع ۔ قال السید احمد الطحطاویؒ : (تحت قوله تشمیر کمیه) ای عن ذراعیه سواء کان الی المرفقین او الاعلی الظاهر ۔

(طحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۲۸۳ فصل فی مکروهات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الاحکام ج ۲ ص۵۵۴ باب مفسدات الصلوٰۃ ۔ الخ

[۲] قال العلامه حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : ویفسدها التنحنح بلاعذر لما فیه من الحروف وان کالعذر کنعة البلغم من القرأة لا یفسد ۔قال السید احمد الطحطاویؒ : (تحت قوله وان کان لعذر الخ) منه التنحنح لاصلاح الصوت وتحسینه اولیهتدی امامه من خطیئته او للاعلام بانه فی الصلوٰۃ علی الصحیح ۔ (طحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۲۶۳ باب مفسدات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ ۔

نماز میں بار بار جسم کو کھجلانے کا حکم

سوال:۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی نماز کے اندر تین بار اپنے جسم کو کھجلائے تو اُس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، آیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو خارش کے مریض کے لیے اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز کے ایک رکن کے اندر بلا عذر شرعی مسلسل بدن کو کھجلانا نقصان دہ ہے، البتہ عذر شرعی کی بناء پر ایسے کرنے سے نماز پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا، اس لیے لوگوں کی بات صحیح ہے لیکن خارش کے مریض کے لیے عذر کی بناء پر ایسا کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: وعبثه به اى بثوبه وبجسده للنهي الا لحاجة ولا بأس به۔ قال ابن عابدينؒ (قوله الا لحاجة) كحك بدنه لشئ اكله واضره وسلت عرق يؤلمه ويشغل قلبه وهذا لو بدون عمل كثير قال في الفيض الحك بيد واحدة في ركن ثلاث مرات يفسد الصلوٰة ان رفع يده في كل مرة۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص۶۴۳ فصل فيما يفسد ومايكره الصلوٰة) [۱]

نماز میں بار بار تعوّذ پڑھنا

سوال:۔ ایک شخص کو نماز میں بکثرت وسوسے آتے ہیں اگر وہ ان کو دفع کرنے کے لیے بار بار تعوذ پڑھے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب:۔ دفعِ وساوس کے لیے بار بار تعوذ پڑھنا مفسدِ صلوٰۃ نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دفعِ وساوس کیلئے بار بار اَعُوْذُ بِاللہ الخ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی ہے۔

لما قال العلامة السيد احمد الطحطاويؒ: ولو تعوذ لدفع الوسوسة لا تفسد مطلقًا........ ولو تعوذ لدفع الوسوسة لا تفسد مطلقًا نظرا اذ لا فرق بينها وبين الحوقلة۔ (طحطاوی على الدر المختار ج ۱ ص۲۱۶ باب ما يفسد الصلوٰة ويكره بها)

---

[۱] لما قال السيد احمد الطحطاويؒ: انما يكره العبث في الصلوٰة اذا لم تدع الحاجة اليه دعت فلا بأس به كسلت العرق عن وجهه او التراب عنه الا يذاء۔
(طحطاوى على مراقى الفلاح ص۱۹۹ باب ما يكره الصلوٰة)

باب الوتر

(وتر کے مسائل)

وتر کا باجماعت پڑھنا رمضان کی خصوصیت ہے

سوال:۔ ایک شخص بوجہ عذر یا بلا عذر روزہ نہیں رکھتا ہے لیکن نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہے، کیا ایسا شخص عشاء کی نماز کے بعد وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رمضان المبارک میں وتر کا باجماعت پڑھنا روزے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ خود رمضان کی خصوصیت ہے۔ پس جو شخص کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکتا ہو وہ رمضان المبارک میں وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے روزہ رکھنے پر مکلف نہ ہونے کے باوجود وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتے ہیں۔

قال مولانا جلال الدین الخوارزمی الکرلانی:۔ وفی رمضان الصحیح ان الجماعۃ افضل لان عمر رضی اللہ عنہ کان یؤمھم فی الوتر ولانہ لما جاز الاداء بالجماعۃ کانت الجماعۃ افضل اعتبارًا بالمکتوبۃ کذا فی فتاوٰی قاضی خان۔

(الکفایۃ فی ذیل فتح القدیر فصل فی قیام رمضان ج۱ ص۴۰۹) [1]

وتر کی رکعات میں شک پڑ جانا

سوال:۔ اگر ایک شخص کو وتر پڑھتے وقت دوسری رکعت میں تیسری رکعت ہونے کا شک ہو جائے تو ایسی صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیونکہ یہ احتمال ہے کہ یہ دوسری رکعت تیسری رکعت ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ واقعی یہ دوسری رکعت ہو؟

الجواب:۔ اگر کسی کو وتر پڑھتے ہوئے شک پیدا ہو جائے کہ یہ اس کی دوسری یا

---

[1] وقال ابن عابدینؒ: والصحیح ان الجماعۃ فیھا افضل الا ان سنیتھا لیست کسنیۃ جماعۃ التراویح اھ (رد المحتار باب الوتر والنوافل ج۲ ص۴۹)
ومثلہ فی البحر الرائق باب الوتر والنوافل ج۱ ص۶۹)

تیسری رکعت ہے تو یہ شخص اُسی رکعت میں دعاءِ قنوت پڑھے گا جس رکعت میں اُسے شک پیدا ہُوا ہے اور اُسی رکعت میں بیٹھ کر قعدہ کرے گا، کیونکہ یہ احتمال ہے کہ یہ اُس کی تیسری رکعت ہو، قعدہ کے بعد جب تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو دوبارہ دعاءِ قنوت پڑھ کر رکعت پوری کرے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔

قال ظاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: لو شك فی الوتر وهو قائم انها ثانیة أم ثالثة یتم تلك الرکعة ویقنت فیها ویقعد ثم یقوم فیصلی رکعة أخری ویقعد ثم یقوم فیصلی رکعة أخری ویقنت فیها ایضًا ویسجد للسهو هو المختار۔

(خلاصة الفتاوی، فصل فی سجود السهو ج ۱ ص ۱۷۱، ۱۷۲) لـه

وتر میں مشہور دعاءِ قنوت پڑھنا بہتر ہے

سوال:۔ وتر میں دعاءِ قنوت پڑھنے کی حیثیت کیا ہے؟ اگر ایک شخص سے دعاءِ قنوت رہ جائے تو نماز کا کیا حکم ہے؟ نیز اگر ایک شخص کو مشہور دعاءِ قنوت یاد نہ ہو تو ایسی حالت میں وتر میں متبادل کیا پڑھنا چاہیئے؟

الجواب:۔ وتر میں نفسِ قنوت واجب ہے، لہٰذا جو دعاء بھی پڑھی جائے تو وتر کی نماز ادا ہو جاتی ہے، اگر کوئی شخص بالکل کچھ نہ پڑھے تو ترکِ واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہوگا، البتہ مشہور دعاءِ قنوت کا پڑھنا بہتر ہے۔

والقنوت واجب علی الصحیح (الی قوله) ولیس فی القنوت دعاء مؤقت۔ والاولی ان یقرأ اللّٰهم انا نستعینك۔ الخ (الهندیة ج ۱ ص ۱۱۱ باب الوتر)

اور جس شخص کو دعاءِ قنوت یاد نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ پڑھے اور اگر "یَا رَبِّ" یا "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ"

لـه وفی الهندیة: ذکر الناطفی فی اجناسه۔ لو شك احد فی الوتر انه فی الاولی او الثانیة او الثالثة۔ فانه یقنت فی الرکعة التی هو فیها ثم یقعد ثم یقوم فیصلی رکعتین بقعدتین ویقنت فیهما احتیاطًا۔ وفی قول آخر لا یقنت فی الکل اصلاً۔ والاول اصح لان القنوت واجب وما تردد بین الواجب والبدعة یأتی به احتیاطًا کذا فی محیط السرخسی۔ (الهندیة ج ۱ ص ۱۱۱ باب الوتر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱ باب الوتر والنوافل۔

تین دفعہ پڑھے تو ذمہ فارغ ہو جاتا ہے۔

وقال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ :۔ ومن لایحسن القنوت بالعربیۃ اولا یحفظہ ففیہ ثلاثۃ اقوال مختلفۃ قیل یقول یارب ثلاث مرات ثم یرکع وقیل یقول اللّٰھم اغفرلی ثلاث مرات وقیل اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۴۲ باب الوتر والنوافل)[1]

رمضان میں تراویح باجماعت پڑھنے کے بعد وتر منفرداً پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص تراویح باجماعت پڑھے لیکن کسی عذر یا بغیر عذر کے وتر انفراداً ادا کرے تو کیا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رمضان المبارک میں وتر کی نماز تراویح کی طرح نہیں بلکہ اس میں توسع ہے باجماعت اور انفراداً دونوں طریقے سے پڑھنا جائز ہے، لہٰذا صورت مذکورہ میں اس شخص کے لیے وتر انفراداً پڑھنے میں کوئی حرج نہیں تاہم جماعت سے پڑھنا افضل ہے۔

قال الحصکفیؒ: ھل الافضل فی الوتر الجماعۃ ام المنزل تصحیحان۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذہ العبارۃ: رجح الکمال الجماعۃ الی ان قال وفی شرح المنیۃ والصحیح ان الجماعۃ فیھا افضل الا ان سنیتھا لیست کسنیۃ جماعۃ التراویح۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۹ مبحث صلوٰۃ التراویح)[2]

---

[1] قال الامام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی الحنفیؒ: واما دعاء القنوت فلیس فی القنوت دعاء مؤقت کذا ذکرہ الکرخی فی کتاب الصلوٰۃ لانہ روی عن الصحابۃ ادعیۃ مختلفۃ فی حال القنوت ولان الموقت من الدعاء یجری علی لسان الداعی من غیر احتیاجہ الی احضار قلبہ وصدق الرغبۃ منہ الی اللہ تعالیٰ فیبعد عن الاجابۃ۔ ولانہ لاتوقیت فی القراءۃ لشئ من الصلوٰۃ ففی دعاء القنوت اولیٰ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۷۳ فصل فی القنوت)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۱۷۱ باب الوتر والنوافل)

[2] قال ابن نجیم المصریؒ: فالوتر کالتراویح فکما ان الجماعۃ فیھما سنۃ فکذلک فی الوتر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۷ باب الوتر والنوافل)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۱ ص۴۰۹ فصل فی قیام رمضان۔

رمضان کے بغیر وتر باجماعت پڑھنے کا حکم | **سوال**:۔ شرح الیاس میں لکھا ہے کہ:۔ ان الاقتداء فی الوتر بالامام خارج رمضان جائز۔" (شرح الیاس علیٰ هامش شرح الوقایۃ۔ ج ۱ ص۲۴۲) کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اگر مسئلہ واقعی ایسا ہو تو پھر رمضان کے علاوہ سال کے دوسرے مہینوں میں وتر کی نماز جماعت کے ساتھ کیوں نہیں پڑھی جاتی ہے؟

الجواب:۔ وتر کی جماعت رمضان میں بالاتفاق سنت ہے، اور رمضان کے علاوہ سال کے دوسرے مہینوں میں وتر کی جماعت مسنون نہیں، سنت نہ ہونے کی وجہ سے وتر کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی جاتی ہے۔ شرح الیاس کی عبارت سے نفسِ جواز معلوم ہوتی ہے، عام فقہاء بھی نفسِ جواز کے قائل ہیں لیکن اگر علیٰ سبیل التداعی ہو کر اس پر دوام اختیار کیا جائے تو یہ صورت مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ:۔ ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعۃ خارج رمضان ای یکرہ ذٰلک لو کان علیٰ سبیل التداعی بان یقتدی اربعۃ بواحد۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۸ مطلب فی کراھۃ الاقتداء فی النفل)

قال ابن عابدینؒ:۔ ویمکن ان یقال الظاھر ان الجماعۃ فیہ (ای الوتر) غیر مستحبۃ ثم ان کان ذٰلک احیاناً کما فعل عمرؓ کان مباحاً غیر مکروہ۔ وان کان علیٰ سبیل المواظبۃ کان بدعۃ مکروھۃ لانہ خلاف المتوارث۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص۴۸ مطلب فی کراھیۃ الاقتداء فی النفل) [۱]

ماہِ رمضان میں فرض نماز باجماعت نہ پڑھنے کی صورت میں وتر باجماعت پڑھنے کا حکم | **سوال**:۔ اگر کسی شخص سے

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: لو صلوا الوتر بجماعۃ فی غیر رمضان فھو صحیح مکروہ کالتطوع فی غیر رمضان بجماعۃ وقیدہ فی الکافی بان یکون علیٰ سبیل التداعی۔ اما لو اقتدی واحد بواحد او اثنان بواحد لا یکرہ واذا اقتدیٰ ثلاثۃ بواحد اختلفوا فیہ وان اقتدیٰ اربعۃ بواحد کرہ اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج ۱ ص۲ باب النوافل)

ومثلہ فی الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۲۰ باب قیام رمضان۔

رمضان المبارک میں فرض نماز باجماعت فوت ہو جائے تو کیا یہ شخص وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رمضان المبارک میں انفراداً فرض پڑھنے کے بعد وتر کی جماعت میں شرکت کے بارے میں فقہاء کرام کا آپس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کے قول سے شرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

قال الشیخ ابراهیم الحلبی: واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمة الکرابیسی انه لایتبعه فی التراویح ولا فی الوتر۔ وکذا اذا لم یتابع فی التراویح لایتابعه فی الوتر۔ وقال ابویوسف الثلجی اذا صلی مع الامام شیئاً من التراویح یصلی معه الوتر۔ وکذا اذا لم یدرك معه شیئاً منها۔ وکذا اذا صلی مع غیره له ان یصلی الوتر معه وهو الصحیح ذکره ابواللیث اھ۔ (کبیری ص۴۵۹ باب التراویح)

جبکہ علامہ محمد امین المعروف بابن عابدینؒ عدم جواز کی طرف مائل ہیں، لیکن متاخرین فقہاءؒ نے جواز کے قول کو ترجیح دی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: لکن فی التتارخانیة عن التتمة انه سئل علی بن احمد عمن صلی الفرض والتراویح وحده او التراویح فقط۔ هل یصلی الوتر مع الامام فقال لا اھ۔ ثم رأیت القهستانی ذکر تصحیح ماذکره المصنف۔ ثم قال لکن اذا لم یصل الفرض معه لایتبعه فی الوتر اھ۔ فقوله ولو لم یصلها ای وقد صلی الفرض معه، ینبغی ان یکون قول القهستانی "معه" احترازاً عن صلاتها منفرداً۔ اما لو صلاها جماعة مع غیره۔ ثم صلی الوتر معه لاکراهة۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۸ باب التراویح) [1]

---

[1] لما قال الشیخ عبد الحیؒ: در قنیہ از عین الائمہ و در تاتارخانیہ از علی بن احمد مرقوم کہ ہر فرض باجماعت ادا نکردہ باشد وتر ہم بجماعت ادا نہ سازد و ہم چنیں در غنیہ وغیرہ مذکور ست لیکن قدامی وجہ قوی معتد بہ عدم جواز معلوم نمی شود حتی جواز معلوم می شود۔ واللہ اعلم

(مجموعۃ الفتاوی علی ہامش خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۱۳۴ فصل فی الوتر)

ومثلہ فی امداد الاحکام ج۱ ص۶۰۰ فصل فی الوتر ودعاء القنوت

وتر کی جماعت میں مقتدی کیلئے دعاءِ قنوت کے اتمام کے بغیر رکوع کا حکم

سوال: رمضان شریف میں اگر مقتدی سے وتر میں دعاءِ قنوت میں غلطی یا کوئی خلل واقع ہو جائے اور دعاءِ قنوت لوٹا کر پڑھے، اسی اثناء میں امام رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کیا کرنا چاہیئے۔ نیز اگر امام سے دعاءِ قنوت رہ گئی اور امام رکوع میں چلا گیا تو مقتدی کو یاد ہونے کی صورت میں کیا عمل اختیار کرنا ہوگا؟

الجواب: جب امام رکوع میں چلا جائے اور مقتدی ابھی دعاءِ قنوت سے فارغ نہیں ہوا ہو، تو اگر مقتدی کو رکوع کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو امام کی متابعت کرے اور اگر رکوع میں کسی قدر ملنے کا امکان ہو تو اس اندازہ سے دعاءِ قنوت پڑھ کر رکوع میں جائے تاکہ دونوں اعمال کی رعایت ہو سکے۔

قال طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: فلو رکع الامام فی الوتر قبل ان یفرغ المقتدی من القنوت فانه یتابع الامام۔ ولو رکع الامام ولم یقرأ القنوت، یقرأ المقتدی من القنوت شیئاً ان خاف الرکوع فانه یرکع وان کان لا یخاف یقنت ثم یرکع۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۱۶۱ النوع من یتابع الامام) [1]

عید الفطر کے شک کی صورت میں وتر باجماعت پڑھنے کا حکم

سوال: جب عید الفطر میں شک واقع ہو یعنی چاند دیکھنے کا حتمی ثبوت میسر نہ ہو تو ایسی صورت میں عشاء کے وقت تراویح اور وتر باجماعت پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ نیز وتر باجماعت پڑھنے کے بعد اگر چاند کا ثبوت مل جائے تو کیا وتر کی دوبارہ قضاء ہے یا نہیں؟

الجواب: رمضان المبارک کے علاوہ دیگر مہینوں میں بھی وتر باجماعت پڑھنا ہے تاہم مواظبت اور مداومت مکروہ ہے، جب وتر کی جماعت ایسی صورت میں ہو کہ عید کا ثبوت یقینی نہ ہو

---

[1] قال قاضی خانؒ: ولو رکع الامام فی الوتر قبل ان یفرغ المقتدی من القنوت فانه یتابع لان القنوت لیس بموقت ولا مقدر، ولو رکع الامام فی الوتر ولم یقرأ المقتدی من القنوت شیئاً ان خاف فوت الرکوع فانه یرکع۔ وان کان لا یخاف یقنت ثم یرکع۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش العالمگیریہ ج۱ ص۲۰۹ باب الوتر)

تو وتر کی جماعت بلاکراہت جائز ہے اور دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: ثم قال ویمکن ان یقال الظاهر ان الجماعة فیه (ای الوتر) غیر مستحبة۔ ثم ان کان ذالک احیاناً کما فعل عمرؓ کان مباحاً غیر مکروه وان کان علیٰ سبیل المواظبة کان بدعة مکروهة۔ (ردالمحتار جلد ۲ ص۴۸ باب الوتر والنوافل) [1]

وتر کی آخری رکعت میں رکوع یا رکوع سے پہلے ملنے والے کیلئے قنوت پڑھنے کا حکم

سوال:۔ رمضان المبارک میں ایک شخص وتر کی تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شریک ہوا اور دعاء قنوت امام کے ساتھ پڑھی، اب باقی نماز میں دعاء قنوت پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ یا امام کو تیسری رکعت کے رکوع میں پایا اور مسبوق نے دعاء نہیں پڑھی تو ایسے مسبوق کے لیے دوبارہ قنوت پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دونوں صورتوں میں مسبوق کے لیے دوبارہ قنوت پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، پہلی صورت میں اس نے دعاء قنوت حقیقۃً اور دوسری صورت میں حکماً پڑھی ہے۔

قال الحصکفیؒ: واما المسبوق فیقنت مع امامه فقط ویصیر مدرکا بادراک رکوع الثالثة۔

وقال ابن عابدینؒ تحت هذه العبارة (فیقنت مع امامه فقط) لانه آخر صلوته وما یقضیه اولها حکماً فی حق القرأة وما اشبهها وهو القنوت۔ واذ وقع قنوته فی موضعه بیقین لا یکرر لان تکراره غیر مشروع شرح المنیة۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱ باب الوتر والنوافل) [2]

---

[1] قال ابن الهمام: وفی بعض الحواشی قال بعضهم لو صلاها بجماعة فی غیر رمضان له ذالک وعدم الجماعة فیها فی غیر رمضان لیس لانه غیر مشروع بل باعتبار انه یستحب تاخیرها الیٰ وقت یتعذر فیه الجماعة۔ (فتح القدیر ج۱ ص۴۰۹ فصل فی قیام رمضان)

[2] قال ابن نجیمؒ: المسبوق برکعتین فی الوتر فی شهر رمضان اذا قنت مع الامام فی الرکعة الاخیرة من صلوة الامام حیث لا یقنت فی الرکعة الاخیرة اذا قام الیٰ القضاء فی قولهم جمیعاً۔ والفرق ان تکرار القنوت فی موضعه لیس بمشروع الیٰ ان قال۔ فاما المسبوق فهو مأمور بان یقنت مع الامام فصار ذالک موضعاً له۔ (البحر الرائق ج۲ ص۴۱ باب الوتر والنوافل)

ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۱ ص۱۷ الفصل السادس عشر فی سجود السهو۔

ایک رکعت وتر پڑھنے والے امام کی اقتداء درست ہے

سوال:۔ غیر حنفی امام کی اقتداء میں ایک وتر پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ غیر حنفی امام اگر دو رکعت کے بعد بغیر سلام کے تین وتر پورا کرتا ہو تو اس کی اقتداء درست ہے۔

اسی طرح اگر وتر بالتسلیمتین یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر وتر پورا کرے تو امام ابوبکر الجصاص اور متاخرین فقہاء کے ہاں اقتداء درست ہے اور یہی ترجیح حالات کی مقتضی ہے۔

لما قال الامام ابو بکر الجصاص الرازی: یجوز اقتداء الحنفی بمن یسلم علی الرکعتین فی الوتر ویصلی معہ بقیۃ الوتر لان امامہ لا یخرج بسلامہ عندہ لانہ مجتہد فیہ۔ (البنایۃ شرح الهدایۃ ج۲ ص۵۲ باب صلوٰۃ الوتر)[1]

عشاء کی فرض نماز فاسد ہونے کی صورت میں وتر کی قضاء کا حکم

سوال:۔ ایک روز صبح صادق طلوع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز عشاء کی فرض رکعتیں فاسد ہوئی ہیں جبکہ وتر اور سنن صحیح تھے۔ کیا قضاء کی صورت میں عشاء کی نماز میں سے صرف فرض پڑھے جائیں گے یا سنن و وتر کی قضاء بھی ضروری ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے اقوال آپس میں مختلف ہیں لیکن اصول افتاء کی رو سے امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ مناسب ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی الفتاوی السراجیۃ: ثم الفتوی علی الاطلاق علی قول ابی حنیفۃؒ۔ ثم قول ابی یوسفؒ الخ۔ وقیل اذا کان ابوحنیفۃؒ فی جانب وصاحباہ فی جانب فالمفتی بالخیار۔ والاول اصح اذا لم یکن المفتی مجتہداً انتہی۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۷)

لہٰذا صرف فرض نماز کی جائے اور وتر کی نماز قضاء نہیں کی جائے، کیونکہ ترتیب تو صرف

---

[1] قال العلامۃ محمد انور شاہ الکشمیریؒ: نعم لو اقتدی خلف الشافعی وسلم الشافعی علی الرکعۃ الثانیۃ کما ھو مذھبھم ثم اتم الوتر الحنفی عند ابی بکر الرازی و ابن وھبان۔۔۔الخ (عرف الشذی علی الترمذی جلد۱ ص۱۰۲ باب ماجاء فی فصل الوتر)

ومثلہ فی معارف السنن ج۴ ص۱۷۱ باب ماجاء فی الوتر۔

تذکر کی حالت میں واجب ہے، نسیان یا وقت نکل جانے سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور دو رکعت سنت کی قضا کسی کا مذہب نہیں۔

وفی الہندیۃ: لو تبین ان العشاء صلاھا بلا طہارۃ دون التراویح والوتر اعاد التراویح مع العشاء دون الوتر لانہا تبع للعشاء ھذا عند ابی حنیفۃ۔ فان الوتر غیر تابع للعشاء فی الوقت عندہ والتقدیم انما وجب لاجل الترتیب وذلک یسقط بعذر النسیان۔ فیصح اذا ادی قبل العشاء بالنسیان بخلاف التراویح فان وقتہا بعد اداء العشاء فلا یعتد بما ادی قبل العشاء وعندھما الوتر کالتراویح وبالجملۃ اعادۃ الوتر مختلف فیہا۔ واما اعادۃ التراویح وسائر سنن العشاء فمتفق علیہا اذا کان الوقت باقیۃ۔ (الہندیۃ ج۱ ص۱۱۵ فصل فی التراویح) [1]

---

[1] قال الامام الکاسانی الحنفیؒ: اما اصل الوقت (للوتر) فوقت العشاء عند ابی حنیفۃ الا انہ شرع مرتبا علیہ حتی لا یجوز اداءہ قبل صلوٰۃ العشاء مع انہ وقتہ لعدم شرطہ وھو الترتیب الا اذا کان ناسیا کوقت اداء الوقتیۃ وھو وقت الفائتۃ لکنہ شرع مرتبا علیہ۔ وعند ابو یوسفؒ ومحمدؒ والشافعیؒ وقتہ بعد اداء صلوٰۃ العشاء وھذا بناء علی ما ذکرنا۔ ان الوتر واجب عند ابی حنیفۃؒ وعندھم سنۃ۔ ویبنیٰ علیٰ ھذا الاصل مسئلتان احداھما ان من صلی العشاء علی غیر وضوء وھو لا یعلم ثم توضأ واوتر ثم تذکر اعاد صلوٰۃ العشاء بالاتفاق ولا یعید الوتر فی قول ابی حنیفۃؒ۔ وعندھما یعید ووجہ البناء علیٰ ھذا الاصل انہ لما کان واجبا عند ابی حنیفۃؒ کان اصلا بنفسہ فی حق الوقت لا تبعا للعشاء فکما غاب الشفق دخل وقتہ کما دخل وقت العشاء الا ان وقتہ بعد فعل العشاء الا ان تقدیم احدھما علی الآخر واجب حالۃ التذکر فعند النسیان یسقط۔ (بدائع الصنائع جلد۱ ص۲۷۲ باب الوتر)۔ ومثلہ فی الزیلعی ج۱ ص۱۷۸ باب الوتر والنوافل۔

باب السنن والنوافل
(سنن اور نوافل کے مسائل)

فجر کی سنتیں زیادہ مؤکدہ ہیں

سوال :- جناب مفتی صاحب! ایک صاحب سے سنا ہے کہ صبح کی سنتیں سب سے زیادہ مؤکدہ ہیں، کیا پانچوں نمازوں کی سنتیں ایک جیسی ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے؟ جواب عنایت فرماکر مشکور فرمائیں؟

الجواب :- فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے کہ پانچ وقتہ نمازوں کی سنتوں میں سب سے زیادہ فجر کی دو رکعت سنتیں مؤکدہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر خاص مواظبت فرمائی ہے، اس کے بعد ظہر کی چار رکعت سنتیں ہیں جبکہ باقی سنتیں برابر ہیں۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ : والسنن آکدها سنة الفجر اتفاقاً ثم الاربع قبل الظهر فی الاصح لحدیث من ترکها لم تنله شفاعتی ثم الکل سواء۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص ۱۴ باب النوافل)[۱]

سنن مؤکدہ کا ثبوت

سوال :- فجر، ظہر، مغرب، عشاء اور جمعہ کی نمازیں سنن مؤکدہ کا ثبوت کس حدیث سے ثابت ہے اور کون سی کتاب میں موجود ہے؟

الجواب :- سنن مؤکدہ کے بارے میں متعدد قولی اور فعلی احادیث وارد ہیں۔ نسائی کی

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اقوی السنن المؤکدة رکعتا الفجر حتیٰ روی عن ابی حنیفةؒ انها لاتجوز مع القعود بغیر عذر لقوله علیه الصلوٰة والسلام صلوها ولو طردتکم الخیل .... والاصح ان التی قبل الظهر آکد بعد الفجر ثم الباقی سواءٌ۔ (منحة الخالق حاشیة البحرالرائق ج ۲ ص ۴۸ باب النوافل)

ومثله فی مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص ۳۱۴ باب النوافل۔

روایت کے مطابق بارہ رکعات سُنن یومیہ ہیں، اور جمعہ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق چودہ بنتی ہیں اور یہی راجح ہے، جبکہ صاحبینؒ کے ہاں سولہ ہیں جس کو امام طحاویؒ نے راجح کہا ہے۔

بحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ علیہ وسلم من ثابر علی اثنتی عشرۃ رکعۃ فی الیوم واللیلۃ دخل الجنۃ اربعًا قبل الظہر ورکعتین بعدھا ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر۔

(النسائی ج۱ ص۲۵۶ باب ثواب من صلی فی الیوم واللیلۃ)

وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا صلی احدکم فلیصلّ اربعا۔ (النسائی ج۱ ص۲۱ باب عدد الصلوٰۃ بعد الجمعۃ)

وعن ابن عمر انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لایصلی بعد الجمعۃ حتّٰی ینصرف فیصلّی رکعتین۔ (النسائی ج۱ ص۲۱ باب صلوٰۃ الامام بعد الجمعۃ) لیکن یہ دو رکعت صرف سُنت ہیں مؤکد نہیں۔

والدلیل علیٰ استنان الاربع قبل الجمعۃ ما رواہ مُسلم مرفوعًا من کان مُصلّیًا قبل الجمعۃ فلیصل اربعًا۔ (البحر الرائق باب النوافل ج۲ ص۴۹)[1]

جمعہ کے سُنن کی تعداد اور آخری دو رکعات میں جمعہ کی نیّت

سوال: جمعہ کی نماز میں آخری دو رکعت

---

[1] عن ام حبیبۃ: قالت قال رسول اللہ علیہ وسلم من صلی فی یوم ولیلۃ ثنتی عشرۃ رکعۃ بنی لہ بیت فی الجنۃ اربعًا قبل الظہر ورکعتین بعدھا ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر صلوٰۃ الغداۃ۔ (الجامع الترمذی ج۱ ص۹۴ باب ماجاء فی من صلّی فی یوم ولیلۃ ... الخ)

وروی عن ابن مسعود: انہ کان یصلی قبل الجمعۃ اربعًا وبعدھا اربعًا۔

وروی عن علی بن ابی طالب: انہٗ اَمَرَ اَن یُّصلّی بعد الجمعۃ رکعتین ثم اربعًا۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۱۱۷، ۱۱۸ باب ماجاء فی الصلوٰۃ قبل الجمعۃ وبعدھا)

وَمِثْلُہٗ فی فتح الملہم ج۲ ص۴۲۱ قبل کتاب العیدین۔

سنتِ مؤکدہ ہیں یا نہیں؟ اس میں جمعہ کی نیّت ضروری ہے یا نہیں؟ علاوہ ازیں جمعہ کے سنن قبلیہ و بعدیہ کی تعداد کتنی ہے؟ بعض لوگ جمعہ کی نماز کی کُل تعداد سولہ، بعض لوگ بارہ اور بعض دس رکعات بیان کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آخری دو رکعت نہ پڑھے تو نماز پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نمازِ جمعہ دو رکعت فرض، چار رکعت سنت مؤکدہ فرض نماز سے پہلے، چار رکعت سنت مؤکدہ فرض کے بعد اور اس کے بعد دو رکعت کے سنت مؤکدہ ہونے میں اختلاف ہے لیکن مفتی بہ قول کی رُو سے ان کا پڑھنا افضل ہے، اور ان دونوں رکعات میں بھی جمعہ کی نیت کی جائے گی، ان دو رکعتوں کو بلاعذر چھوڑنا خلافِ اولیٰ ہے لیکن جمعہ کی نماز درست ہے ۔۔۔ رہی یہ بات کہ جو لوگ جمعہ کی نماز کی تعداد دس رکعات کے قائل ہیں وہ آخری دو رکعت کے سنت مؤکدہ ہونے کے قائل نہیں (جیسے امام ابوحنیفہؒ) اور جو لوگ بارہ رکعات کے قائل ہیں (جیسے صاحبینؒ) اُن کے نزدیک آخری دو رکعت سنت مؤکدہ ہیں۔ اور جو لوگ سولہ رکعات بتاتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اس میں نوافل یا احتیاطی نماز شمار کرتے ہوں۔

قال ابن نجیم المصریؒ:۔ والدلیل علیٰ استنان الاربع قبل الجمعة ما رواه مسلم مرفوعاً من کان مصلّیاً قبل الجمعة فلیصل اربعاً مع ما رواه ابن ماجة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرکع من قبل الجمعة اربعاً لایفصل فی شئ منهن۔ وعلیٰ استنان الاربع بعدها ما فی صحیح مسلم عن ابی هریرة مرفوعاً اذا صلی احدکم الجمعة فلیصل بعدها اربعاً وفی روایة اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا اربعاً۔ وذکر فی البدائع انه ظاهر الروایة۔ وعن ابی یوسفؒ انه ینبغی ان یصلّی اربعاً ثم رکعتین۔ وذکر محمّدؒ فی کتاب الاعتکاف ان المعتکف یمکث فی المسجد الجامع مقدار ما یصلی اربعاً او ستّاً اھ۔ وفی الذخیرة والتجنیس وکثیر من المشائخ علیٰ قول ابی یوسفؒ۔ وفی منیة المصلی الافضل عندنا ان یصلّی اربعاً ثم رکعتین۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۴۹ باب السنن والنوافل) [۱]

---

[۱] قال الامام ابوبکر الکاسانی: فقد ذکر فی الاصل اربع قبل الجمعة واربع بعدها کذا ذکر الکرخی وذکر الطحاوی عن ابی یوسفؒ انه قال یصلی بعدها ستّاً وقیل هو مذهب علیؓ وما ذکرنا انهٗ کان یصلی اربعاً مذهب عبد اللہ بن مسعودؓ۔۔۔۔۔۔۔ ونحن لا نمنع من یصلّی بعدها کم شاء غیر انا نقول السنّة بعدها اربع رکعات لا غیر لما روینا۔

(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۸۵ فصل اما الصلوٰة المسنون)

[۲] ومثلهٗ فی کبیری ص ۳۸۸ فصل فی النوافل۔

مکروہ اوقات کے علاوہ ہر وقت نفل نماز پڑھنا جائز ہے

سوال :۔ ریاکاری سے بچنے کی نیت سے دن میں سنن زوائد کے چھوڑنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ ریاکاری سنن، نفل اور فرائض تمام عبادات میں حرام ہے، ریاکاری سے بچنے کے بہانے سے چھوڑنا مناسب نہیں، اس کا احتمال تو فرض نماز میں بھی ہو سکتا ہے، جبکہ فرض کا ترک کرنا کسی صورت میں جائز نہیں، نوافل رات دن میں مکروہ اوقات کے علاوہ ہر حالت میں مشروع ہیں جس کی تفصیل سے فقہ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

وفی الهندية: ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة ولا صلوة الجنازة ولا سجدة التلاوة۔ اذا طلعت الشمس حتى ترفع وعند الانتصاف الى ان تزول وعند احمرارها الى ان تغيب الا عصر يومه ذلك۔ فانه يجوز اداؤه عند الغروب هكذا في فتاوى قاضي خان۔

وقال بعد عدة اسطر:۔ والتطوع في هذه الاوقات يجوز ويكره كذا في الكافي وشرح الطحاوي۔ (الهندية ج۱ ص۵۲ كتاب الصلوة۔ الباب الاول في مواقيت الصلوة)[1]

نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت نفل پڑھنے کا حکم

سوال :۔ نمازِ عصر سے پہلے چار رکعات نفل کی فضیلت کسی روایت سے ثابت ہے؟ اس کے وقت کا صحیح تعین اور حکم بیان فرمائیں؟

الجواب :۔ نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے اور اس کا صحیح وقت عصر کی نماز کے وقت سے شروع ہوتا ہے، البتہ یہ نفل عصر کی نماز سے قبل

---

[1] قال الامام الكاساني: اما الذي يكره التطوع فيها لمعنى يرجع الى الوقت ثلاثة اوقات احدها ما بعد طلوع الشمس الى ان ترتفع وابيض والثاني عند استواء الشمس الى ان تزول والثالث عند تغير الشمس وهو احمرارها الى ان تغرب الشمس ففي هذه الاوقات الثلاثة يكره كل تطوع في جميع الازمان يوم الجمعة وغيره وفي جميع الاماكن بمكة وغيرها۔ وسواء كان تطوعاً مبتدأ لا سبب له او تطوعاً له سبب كركعتي الطواف وركعتي تحية المسجد ونحوهما۔ الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۹۶ فصل في بيان ما يكره في التطوع)

پڑھے جائیں گے۔

بحدیث النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم: عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم رحم اللہ امراً صلی قبل العصر اربعًا۔ (الترمذی جلد ۱ ص ۹۸ باب ما جاء فی الاربع قبل العصر) [1]

نمازِ عصر سے پہلے نفل جماعت سے خاص نہیں

سوال:۔ اگر ایک شخص نمازِ عصر با جماعت ادا ہو جانے کے بعد انفراداً نماز پڑھنے سے پہلے نفل ادا کرے تو کیا اس کی نفل نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ اور نفل کی ادائیگی کے لیے جماعت میں شرکت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نمازِ عصر سے قبل چار سنتیں پڑھنا افضل ہے۔ چاہے عصر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر رہا ہو یا انفراداً پڑھ رہا ہو۔ شریعتِ مقدسہ میں جماعت یا غیر جماعت کی کوئی قید نہیں، تاہم اگر چار کے بجائے دو رکعت پڑھ لے تو بھی کافی ہے لیکن اصفرار کے وقت نوافل پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویستحب اربع قبل العصر — وقال ابن عابدینؒ: تحت ھٰذہ العبارۃ لم یجعل للعصر سنۃ راتبۃ لانہ لم یذکر فی حدیث عائشۃؓ المار۔ قال فی الامداد وخیّر محمد بن الحسنؒ والقدوری المصلی بین ان یصلی اربعًا او رکعتین قبل العصر لاختلاف الآثار۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۳ مطلب فی السنن والنوافل) [2]

عصر سے پہلے سنن توڑ کر نماز کے بعد پڑھنا مکروہ تحریمی ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص نمازِ عصر سے پہلے نفل پڑھنا

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وندب الاربع قبل العصر ---- الخ وقال بعد ثلاثۃ اسطر وروی ابوداؤد عنہ (ای عن علی رضی اللہ عنہ) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی قبل العصر رکعتین فلذا خیّرہ فی الاصل بین الاربع وبین الرکعتین والا فضل الاربع الخ۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۵۰ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۳ مطلب فی السنن والنوافل)

[2] وفی الھندیۃ: وخیّر محمدؒ (ای فی الاصل) بین الاربع والرکعتین قبل العصر والعشاء والافضل الاربع فی کلیھما۔ (الھندیۃ ج ۱ ص ۱۱۲ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۵۰ باب النوافل۔

شروع کرے لیکن جماعت کھڑی ہونے کی وجہ سے اسے توڑ کر فرض نماز میں شامل ہو جائے تو کیا عصر کی نماز کے بعد یہ نفل نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا اس پر لزم النفل بالشروع کے قاعدہ کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ نفل نماز توڑنے سے بقاعدہ لزم النفل بالشروع واجب ہو جاتی ہے، لیکن یہ واجب لغیرہ کے حکم میں ہے اور عصر کی نماز کے بعد جیسا کہ نفل نماز نہیں پڑھی جا سکتی ہے ایسا ہی واجب لغیرہ کی ادائیگی بھی جائز نہیں، لہٰذا کسی دوسرے صحیح وقت میں پڑھے۔

وفی الهندیة: لو افتتح صلوٰة النفل فی وقت مستحب ثم افسدها فقضاها بعد صلوٰة العصر قبل مغیب الشمس لا یجزیه هٰکذا فی محیط السرخسی۔ انتهٰی۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۵۳ کتاب الصلوٰة، فصل الاوقات التی لا تجوز فیها الصلوٰة… الخ) [۱]

اصفرارِ شمس کے وقت نمازِ عصر سے پہلے نفل پڑھنا

سوال:۔ اگر عصر اور مغرب کے درمیان وقت مختصر ہو تو ایسی صورت میں نمازِ عصر ضروری ہے یا اس سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہیئے؟

الجواب:۔ جب تک سورج کی روشنی متغیر نہ ہوئی ہو بلکہ اپنی اصلی حالت پر قائم ہو تو ایسے وقت میں عصر کی نماز سے پہلے نفل پڑھنا جائز ہے۔ البتہ اگر سورج کی روشنی میں زردی کے اثرات شروع ہو چکے ہوں تو پھر وقت کی نماز پر اکتفاء کر کے نفل پڑھنا مکروہ ہے۔

قال الامام الکاسانیؒ: والثالث عند تغیر الشمس وهو احمرارها واصفرارها الی ان تغرب ففی هٰذه الاوقات الثلاثة یکره کل تطوع فی جمیع الاماکن یوم الجمعة وغیره۔ وفی جمیع الاماکن بمکة وغیرها۔ وسواء کان تطوعاً مبتدأً حینئذٍ لا سبب له۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۹۵ فصل فی بیان ما یکره من التطوع) [۲]

---

[۱] قال الحصکفیؒ: وکره نفل وکل ما کان لا لعینه بل لغیره کمنذور والذی شرع فیه فی وقت مستحب او مکروه ثم افسده ولو سنة الفجر بعد صلوٰة وصلوٰة عصر انتهٰی مختصراً۔ وقال ابن عابدینؒ تحت هٰذه العبارة والکراهة هٰهنا تحریمیة ایضاً کما صرح به فی الحلیة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۵ کتاب الصلوٰة)

[۲] قال برهان الدین المرغینانیؒ: لا یجوز عند طلوع الشمس ولا عند قیامها فی الظهیرة ولا عند غروبها لحدیث عقبة بن عامرؓ قال ثلٰثة اوقات نهانا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نصلی فیها وان نقبر فیها موتانا عند طلوع الشمس حتی ترتفع وعند زوالها حتی تزول وحین تضیف للغروب حتی تغرب۔ وقال بعد اسطر الا عصر یومه۔ (الهدایة ج ۱ ص ۶۸ فصل فی الاوقات یکره فیها الصلوٰة)

سُنن قبل الظہر کی تعداد

سوال: زوال کے بعد صحیح حدیث کے مطابق کتنی رکعات پڑھنی چاہییں؟

الجواب: صحیح حدیث کے مطابق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ آفتاب کے بعد چار رکعات کی ادائیگی فرماتے تھے جبکہ بعض روایات میں دو رکعات پڑھنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، لیکن ان دو رکعات کو امام محمد اور ابن الہمام رحمہما اللہ نے تحیۃ المسجد پر محمول کیا ہے۔

عَنْ عَلِيٍّؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قبل الظہر اربعًا و بعدھا رکعتین۔

عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قبل الظہر رکعتین و بعدھا رکعتین و بعد صلوٰۃ المغرب رکعتین فی بیتہ و بعد صلوٰۃ العشاء رکعتین وکان لا یصلی بعد الجمعۃ فی المسجد حتی ینصرف فیسجد سجدتین۔

قال محمدؒ ھٰذا التطوع، وھو حسن، وقد بلغنا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی قبل الظہر اربعًا اذا زالت الشمس... الخ (مؤطا امام محمد ص۱۶۲)

وقال ابن الھمامؒ: ثم کان یصلی رکعتین تحیۃ المسجد فکان ابن عمرؓ یراھما۔ (فتح القدیر ج ۱ ص۳۸۶ باب النوافل) [۱]

---

[۱] ذکر الامام ابو عیسٰی الترمذیؒ: عن علیؓ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قبل الظہر اربعًا و بعدھا رکعتین۔ قال ابو عیسٰی والعمل علٰی ھٰذا عند اکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و من بعدھم یختارون ان یصلی الرجل قبل الظہر اربع رکعات وھو قول لسفیان وابن المبارک.... الخ

قال العلامۃ محمد یوسف البنوریؒ: تحت ھو قول لسفیان والیہ ذھب ابوحنیفۃ واصحابہ۔ (معارف السنن ج۴ ص۱۰۴، ۱۰۵ باب ماجاء فی الاربع قبل الظہر)

وعن ابن عمرؓ قال صلیت مع النبیؐ رکعتین قبل الظہر و رکعتین بعدھا۔ (معارف السنن ج ۴ ص۱۰۶، ۱۰۳)

قال ابن عابدینؒ وما رآہ ابن عمر تحیۃ المسجد۔ (منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج ۲ ص۵۵ باب النوافل)

مغرب کی نماز کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص نمازِ مغرب کے بعد دو رکعات نفل ادا کرے تو ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ نماز اوابین کے زمرے میں آسکتی ہے؟

الجواب:۔ نفل نماز مکروہ اوقات کے علاوہ ہر وقت جائز ہے، مذکورہ وقت نفل پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ دو رکعات صلوٰۃ اوابین میں شمار نہیں ہونگی، کیونکہ اوابین کی تعداد روایات میں چھ رکعات بتائی گئی ہے۔ تاہم اگر چار رکعات نفل سے دو سنن ملا کر چھ رکعات شمار کی جائیں تو یہ نماز اوابین میں شمار کی جاسکتی ہے، البتہ مستقلاً چھ رکعات اوابین پڑھنا بہتر ہیں۔

لحدیث النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی بعد المغرب ست رکعات لم یتکلم فیما بینھن بسوءٍ عُدِلن له بعبادۃ ثنتی عشرۃ سنۃ۔ (الجامع الترمذی ج۱ ص۹۸ باب ماجاء فی فضل التطوع ست رکعات بعد المغرب)

قال مُلّا علی قاریؒ تحت ھٰذِہِ الحدیث (قوله ست رکعات) المفھوم ان الرکعتین الراتبتین داخلتان فی الست الیٰ ان قال قاله الطیبی فیصلی المؤکدتین بتسلیمۃ وفی الباقی الخیار الخ۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۳ ص۱۱۲ باب النوافل الفصل الثانی)[1]

نمازِ مغرب کی دو رکعت سنتِ مؤکدہ کی نیت باندھ کر چار رکعت پڑھنے اور آخری دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص مغرب کی دو رکعت سنتِ مؤکدہ کی نیت باندھ کر دو رکعت پڑھنے کے بعد قعدہ میں چار رکعت پڑھنے کا ارادہ کرے اور پھر آخری دونوں رکعات کے لیے کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر پڑھے تو کیا اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟

---

[1] قال الشیخ ابراھیم الحلبیؒ: وان تطوع بعد المغرب ست رکعات فھو افضل۔ لحدیث ابن عمرؓ انه علیه السلام قال: من صلی بعد المغرب بست رکعات کتب من الاوابین وتلا انه کان للاوابین غفورا۔ (کبیری ص۳۸۵ باب فصل فی النوافل)

ومِثْلُهٗ فی الجامع الترمذی ج۱ ص۹۸ باب ماجاء فی فضل التطوع الخ۔

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں دو مسئلے قابلِ غور ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کیا سنت کی نماز کے ساتھ نفل نماز اکٹھا کر کے سنت کے قعدہ اخیرہ میں تاخیر کرنے سے اس کی نماز پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نفل نماز میں قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جہاں تک دوسرے مسئلے کا حکم ہے تو نفل نماز ابتداءً یا بناءً قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہے تاہم کھڑے ہو کر پڑھنا بہتر ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویتنفل مع قدرتہ علی القیام قاعداً لا مضطجعاً الا بعذر ابتداءً وکذا بناءً بعد الشروع بلا کراھۃ علی الاصح کعکسہ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۶ باب السنن والنوافل) [1]

اور پہلے مسئلے میں سنت کی ادائیگی درست ہو جائے گی، البتہ سلام کی تاخیر سے سجدہ سہو واجب رہے گا۔

قال المرغینانیؒ: لا یجب السھو الا بترک الواجب او تاخیرہ او تاخیر رکن ساھیاً۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۳۷ باب سجود السھو)

تراویح اور وتر کے درمیان نفل پڑھنا

سوال:۔ نماز تراویح اور وتر کے درمیان نفل پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ نماز تراویح اور وتر کے درمیان نفل پڑھنا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ: یجلس ندباً بین کل اربعۃ بقدرھا کذا بین الخامسۃ والوتر

---

[1] وفی الھندیۃ: وحکم السھو فی الفرض والنفل سواءً۔ وقال بعد اسطر۔ ولا یجب السجود الا بترک واجب او تاخیرہ او تاخیر رکن او تقدیمہ او تکرارہ او تغیر واجب بان یجھر فیما یخافت۔ وفی الحقیقۃ وجوبہ بشئ واحد وھو ترک الواجب۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۲۶)

وفی الھندیۃ: واذا فتح التطوع قائماً ثم اراد ان یقعد من غیر عذر فلہ ذلک عند ابی حنیفۃؒ استحساناً۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۱۳ باب النوافل)
ومثلہ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۸۹-۹۲ باب النوافل۔

و یخیرون بین تسبیح وقرأۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادی۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۶ بحث صلوٰۃ التراویح)[1]

وتر کے بعد دو رکعت نفل کی شرعی حیثیت

سوال:۔ وتر کے بعد دو رکعت نفل کسی روایت سے ثابت ہیں یا نہیں؟ بصورتِ ثبوت کیفیت کا تعین فرمائیں؟ کیا دیگر نوافل کی طرح بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب میں کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وتر کے بعد دو رکعت نفل کے بارے میں قولی اور فعلی دونوں قسم کی روایات وارد ہیں۔ ترمذی کی روایت میں ہے: عن ام سلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی بعد الوتر رکعتین۔ (الجامع الترمذی ج ۱ ص۱۰۸ ابواب الصلوٰۃ الوتر)

اور ابن ماجہ میں اس پر یہ اضافہ ہے: "خفیفتین وھو جالس"۔ (ابن ماجہ ص۸۵ باب ماجاء فی الرکعتین بعد الوتر جالساً)

لہٰذا یہ دو رکعات بلا شک وشبہ سنن زوائد ہیں، باقی ابن ماجہ کی روایت کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں رکعات بیٹھ کر پڑھی ہیں۔ اس لیے فقہاء کرام کا ان کے افضل ہونے میں اختلاف ہے، بعض فقہاء ان کو کھڑے ہو کر پڑھنا افضل قرار دیتے ہیں جبکہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق اور دیگر محققین کی رائے کے مطابق چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا تعبداً اور قصداً تھا اس لیے بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے۔

لما فی قال الشیخ انور شاہ الکشمیریؒ: یعنی ان الجلوس فیہما اتفاقی او قصدی فاختار النووی الاوّل عندی المختار ھو الثانی لانہما لم تثبتا عنہ قائماً قط فحمل فعلہ فی جمیع عمرہ علی الاتفاق مما

---

[1] وقال ابن نجیم المصریؒ: وقد قالوا انہم مخیّرون فی حالۃ الجلوس ان شاؤا سبحوا وان شاؤا قروا القرآن۔ وان شاؤا صلوا اربع رکعات فرادی وان شاؤا قعدوا ساکتین۔ واھل مکۃ یطوفون اسبوعاً ویصلون رکعتین واھل المدینۃ یصلون اربع رکعات فرادی۔ وبہذا علم انہ لو قال بانتظار بعد کل ترویحۃ بدل قولہ بجلسۃ لکان اولی۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۶۹ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی غنیۃ المستملی ص۴۰۳ باب النوافل۔

یصادم المداهنة۔ (فیض الباری ج ۲ ص۴۲۶ باب المداومة علی رکعتی الفجر) [1]

نوافل کے قعدۂ اولیٰ میں درود اور تیسری رکعت کی ابتداء میں ثناء اور تعوّذ پڑھنے کا حکم

سوال: نوافل اور سنن کے قعدۂ اُولیٰ میں صرف تشہد پر اکتفاء کرنا چاہیئے یا اس کے ساتھ درود شریف بھی ملانا ضروری ہے؟ ایسا ہی تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کے بعد ثناء اور تعوذ ضروری ہے یا فرض نمازوں کی طرح فاتحۃ الکتاب سے شروع کیا جائے گا؟

الجواب: سُنن مؤکدہ کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء اور تعوّذ نہیں پڑھا جائے گا، اس کے علاوہ دوسرے نوافل میں ہر شفع (یعنی دو دو رکعت) مستقل نماز ہے، اس لیے ہر شفع کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء و تعوّذ پڑھنا چاہیئے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القعدۃ الاولیٰ فی الاُربع قبل الظھر والجمعۃ وبعدھا الیٰ ان قال ولا یستفتح اذا قام الی الثالثۃ منھا۔ لانھا لتأکدھا اشبھت الفریضۃ وفی البواقی من ذوات الاربع یصلی علی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ویستفتح ویتعوّذ ولو نذراً لان کل شفع صلاۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۱۶ باب السنن والنوافل) [2]

سنن زوائد میں قعدۂ اولیٰ کے بعد درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء پڑھنے کا حکم

سوال: نماز جمعہ و ظہر کی چار رکعات میں قعدۂ اولیٰ کے تشہد کے بعد درود شریف اور تیسری رکعت میں کھڑے ہوکر ثناء

---

[1] قال العلامۃ محمد یوسف البنوری: لو ثبت الرکعتان بعد الوتر فالسنۃ فیھما الجلوس دون القیام فان الجلوس فیھما قصدی۔ (معارف السنن ج ۴ ص۲۵۹، بحث رکعتین بعد الوتر جالساً)
وَمِثْلُہٗ فی عرف الشذی علی الترمذی ج ۱ ص۱۰۲ باب ما جاء فی رکعتین بعد الوتر۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وفی الاربع قبل الظھر والجمعۃ وبعدھا لا یصلی علی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ولا یستفتح اذا قام الی الثالثۃ بخلاف سائر ذوات الاربع من النوافل۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۴۹ باب السنن والنوافل)

پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ نیز سنن مؤکدہ اور زوائد میں کوئی فرق ہے یا دونوں یکساں ہیں؟

الجواب:۔ ظہر اور جمعہ کی سنن کے علاوہ باقی تمام چار رکعت والی سنن ونوافل کے قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء وتعوذ پڑھنا چاہیئے، کیونکہ نوافل میں ہر شفع مستقل نماز ہے جبکہ سنن مؤکدہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

قال الحصکفیؒ: ولا یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی القعدۃ الاولیٰ فی الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدها۔ وقال بعد سطر واحدۃ۔ ولا یستفتح اذا قام الی الثالثة منها۔ لانها لتأکدها اشبهت الفریضة۔ وفی البواقی من ذوات الاربع یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ویستفتح ویتعوذ ولو نذرًا لان کل شفع صلوٰۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۶ باب السنن والنوافل)[1]

سنن اور فرائض کے درمیان دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص گھر میں ظہر کی سنن قبلیہ ادا کرکے مسجد جائے اور مسجد میں جماعت کھڑے ہونے سے پہلے دو رکعات تحیۃ المسجد پڑھے تو کیا شرعاً اس کی کوئی ممانعت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سنن ظہر اور فرضوں کے درمیان دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا جائز ہے اور فقہاء کرام میں سے کسی ایک نے بھی اس وقت نفل پڑھنے کی ممانعت نہیں کی ہے، بلکہ بعض محققین کی رائے کے مطابق شارع علیہ السلام سے ظہر کی چار رکعت سنت قبلیہ کے بعد دو رکعت تحیۃ المسجد ثابت ہے۔ تحیۃ المسجد کی صحت کے لیے کوئی خاص وقت متعین نہیں البتہ اوقات مکروہہ میں ایسی نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ تاہم سنن اور فرائض کے درمیان بلا عذر کسی ایسے کام سے اجتناب کرنا چاہیئے جو تحریمہ کے منافی ہو کیونکہ اس سے ثواب پر اثر پڑتا ہے۔

لما قال العلامة ابن الھمام: فالاولی الاستدلال بمجموع حدیثین حدیث

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وفی المجتبیٰ وفی الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدها لایصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی القعدة الاولیٰ ولا یستفتح اذا قام الی الثالثة بخلاف سائر ذوات الاربع من النوافل۔ (البحرالرائق ج۲ ص۴۹ باب النوافل)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۱۳ باب النوافل۔

ابن عمرؓ......وحدیث عائشۃؓ...... فان الاربع کان یصلیھا فی بیتہ فاتفق عدم علم ابن عمرؓ بھن وان علم غیرھا مما صلی فی بیتہ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی الکل فی البیت ثم کان یصلی رکعتین تحیۃ المسجد ـ ان ابن عمرؓ یراھا۔

(فتح القدیر ج۱ صـ۳۸۶ باب النوافل)

قال العلامۃ الشرنبلالیؒ: سن تحیۃ المسجد برکعتین فی غیر وقت مکروہ قبل الجلوس.... الخ۔ (مراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی صـ۲۱۵ فصل فی تحیۃ المسجد)[1]

سننِ جمعہ مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ جمعہ کی سنن مسجد کے ساتھ مختص ہیں یا کسی اور جگہ بھی پڑھی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ سنن پڑھنے کے لیے مسجد کی کوئی تخصیص نہیں، یہ مسجد کے علاوہ گھر میں بھی پڑھی جاسکتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں جگہ (گھر اور مسجد) میں پڑھنا ثابت ہے، تاہم مسجد کی بجائے گھر میں پڑھنا افضل ہے۔

لحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عن زید بن ثابتؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال افضل صلوتکم فی بیوتکم الا المکتوبۃ۔ (الترمذی ج۱ صـ۱۰۲ باب ما جاء فی فضل الصلوٰۃ فی البیت)

عن ابن عمرؓ قال کان اذا کان بمکۃ فصلی الجمعۃ تقدم فصلی رکعتین ثم تقدم فصلی اربعا۔ واذا کان بالمدینۃ صلی الجمعۃ ثم رجع الی بیتہ فصلی رکعتین فقیل لہ فقیل کان رسول اللہ یفعل ذلک۔ (ابوداؤد ج۱ صـ۱۶۱ باب الصلوٰۃ بعد الجمعۃ)[2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: وھوالذی جمع بہ فی الفتح بین ھذا الحدیث (ای حدیث ابن عمرؓ) وحدیث عائشۃ انہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان یصلی اربعا قبل الظھر بقولہ اما بان الاربع کان یصلیھا علیہ السلام فی بیتہ۔ وما راٰہ ابن عمر تحیۃ المسجد او بان ابن عمرؓ کان یری تلک وردا آخر بسبب الزوال وھو مذھب بعض العلماء۔ (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج۲ صـ۵۰ باب الوتر والنوافل)

[2] قال الشیخ ابراھیم الحلبی الکبیریؒ: واما السنن التی بعد الفریضۃ فانہ ان تطوع بھا فی المسجد فحسن وتطوعہ بھا فی البیت افضل۔ وھذا غیر مختص بما بعد الفریضۃ بل بجمیع النوافل ماعدا التراویح وتحیۃ المسجد قال بعدعدۃ اسطر التطوع فی المسجد حسن و فی البیت احسن۔ کما قال المصنفؒ وبہ افتی الفقیہ ابوجعفر قال الا ان یخشی ان یشغل عنھا اذا رجع۔ (کبیری صـ۳۹۹،۴۰۰ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ صـ۲۰ باب السنن والنوافل)

سنن نہ پڑھنے والے کا حکم

سوال:۔ اگر سنن مؤکدہ یا غیر مؤکدہ نہ پڑھی جائیں تو نماز پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ اور اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ سنن مؤکدہ سفر میں بعذر شرعی چھوڑنا جائز ہیں، ویسے سنن مؤکدہ کو چھوڑنا موجب عتاب ہے۔ سنن فرائض کے مکملات ہیں، گویا سنن نہ پڑھنے کی وجہ سے فرائض ادھورے رہ جاتے ہیں، ترک پر مداومت کرنا عملاً نافرمانی کے مترادف ہے۔

قال ابن نجیمؒ: رجل ترک سنن الصلوٰۃ الخمس ان لم یر السنن حقاً فقد کفر لانہ ترک استخفافاً۔ وان رأی حقاً منھم من قال لا یأثم والصحیح انہ یأثم لانہ جاء الوعید بالترک۔ وقال بعد سطر ان السّنّۃ المؤکدۃ بمنزلۃ الواجب فی الاثم بالترک الیٰ ان قال وانہ لا یجوز ترک السنن المؤکدۃ ولو صلّی وحدہٗ وھو احوط۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۴۹ باب الوتر والنوافل) [۱]

نفل کی بجائے قضا نمازوں کی ادائیگی بہتر ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کے ذمہ فوت شدہ فرض نمازیں ہوں تو اس کے لیے نفل پڑھنا افضل ہے یا قضاء نمازیں؟

الجواب:۔ جب فوت شدہ نمازوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے بہتر یہ ہے کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز کی قضاء کرے، تو ایسی صورت میں نوافل پڑھنے سے قضاء نماز کا پڑھنا زیادہ بہتر ہوگا۔

وفی الھندیۃ: وفی الحجۃ والاشتغال بالفوائتۃ اولیٰ واھم من النوافل الا السنن المعروفۃ وصلوٰۃ الضحیٰ وصلوٰۃ التسبیح والصلوٰۃ التی رویت فی الاخبار فیھا سور معدودۃ واذکار معھودۃ فتلک بنیۃ النفل وغیرھا

---

[۱] وفی الھندیۃ: رجلٌ ترک السنن الصلوٰۃ ان لم یر السنن حقاً فقد کفر لانہ تارکھا استخفافاً وان راھا حقاً فالصحیح انہ یاثم لانہ جاء الوعید بالترک کذا فی محیط السرخسی۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۲ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی کبیری ص۳۸۹ باب النوافل (فروع)

بِنِیَّۃِ الْقَضَاءِ کذا فی المضمرات۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۱۲۵ باب قضاء الفوائت) [1]

تہجد کی رکعات کی تعداد

سوال:۔ نمازِ تہجد کی کتنی رکعات ہیں؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تہجد کی نماز مختلف اوقات میں مختلف رکعات کے ساتھ ثابت ہے جس میں اقل (کم از کم) دو رکعت اور اکثر زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات مروی ہیں، کیونکہ اکثر اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعات پڑھی ہیں اسلئے بعض محققین نے اکثر کی تعداد آٹھ رکعات نقل کی ہیں جبکہ زیادہ سے زیادہ بارہ تک بھی ثابت ہے۔

لما ذکرہ الامام محمد بن اسماعیل البخاری: ان عبد اللہ بن عباس اخبرہ انہٗ بات عند میمونۃ زوج النبیؐ وھی خالتہ الیٰ قال عبد اللہ فقمت فصنعتُ مثل مَاصنع ثم ذھبتُ فقمت الیٰ جنبہ فوضع رسول اللہ یدہ الیمنیٰ علیٰ رأسی واخذ بِاُذُنِی یفتلھا فصلّی رکعتین ثم رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ اوتر ثمّ اضطجع حتیٰ جاء المؤذن فقام فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ خرج فصلّی الصبح۔ (الجامع البخاری ج ۱ ص۱۳۵ ابواب الوتر، باب ماجاء فی الوتر) [2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: واما النفل فقال فی المضمرات الاشتغال بقضاء الفوائت اَولیٰ واھمّ من النوافل۔ (رد المحتار ج ۲ ص۷۴ باب قضاء الفوائت)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۱ ص۷۷ کتاب الصلوٰۃ۔ باب قضاء الفائتۃ۔

[2] قد ذکر الامام البیھقی عن کریب مولیٰ ابن عباسؓ ان عبد اللہ بن عباسؓ اخبرہ انہ بات عند میمونۃؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ھی خالتہ الیٰ قال عبد اللہ فقمتُ فصنعتُ مثل ما صنع ثمّ ذھبتُ فقمتُ الیٰ جنبہ فوضع رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدَہُ الیمنیٰ علیٰ رأسی واخذ بِاُذُنِیْ یفتلھا فصلّی رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین قال القعنبی ستّ مرار ثمّ اوتر ثم اضجع حتّی جاء المؤذن فقام فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ خرج فَصَلَّی الصُّبْحَ۔

(السنن الکبریٰ ج ۳ ص۷ باب عدد رکعات قیام النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم وصفتھا)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاویٰ ج ۱ ص۳۰۹ نماز وتر۔

تہجد کی جماعت کا حکم

سوال:۔ تہجد کی نماز جماعت سے پڑھنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا ہمیشہ کے لیے یا کبھی کبھار؟ اور کتنے لوگ جمع ہو کر بلا کراہت جماعت سے ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب:۔ تہجد کی نماز نفل ہے اور نفلی نماز میں ایک یا دو آدمی امام کے پیچھے اقتداء کریں تو کبھی کبھار بلا تداعی بغیر کراہت کے جائز ہے، البتہ اگر مقتدی تین سے زائد ہوں تو احناف کے ہاں بالاتفاق مکروہ ہے، اور تین کی صورت میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مکروہ اور بعض کے نزدیک تین سے کم کی طرح بلا کراہت جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ، ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان ای یکرہ ذٰلک لو علیٰ سبیل التداعی بان یقتدی اربعة بواحد — قال ابن عابدینؒ: تحت ھٰذہ العبارۃ اما اقتداء واحد بواحد او اثنین بواحد فلا یکرہ وثلاثة بواحد فیہ خلاف وایضاً قال فوق ھٰذہ العبارۃ ویمکن ان یقال الظاھر ان الجماعة فیہ غیر مستحبة۔ ثمّ ان کان ذٰلک احیاناً کما فعل عمر کان مباحاً غیر مکروہ۔ وان کان علیٰ سبیل المواظبة کان بدعة مکروھة خلاف المتوارث۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۴۸ بحث صلوٰۃ التراویح)

نمازِ تہجد کے آخر میں وتر پڑھنا افضل ہے

سوال[1]:۔ نمازِ تہجد کے آخر میں وتر پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص رات کو صرف چند رکعات نفل پڑھے اور وتر اس کے ساتھ نہ پڑھے تو اس سے تہجد پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری: ولا یصلی تطوعاً بجماعة الا قیام رمضان وحکی عن شمس الائمة السرخسیؒ: ان التطوع بالجماعة علیٰ سبیل التداعی مکروہ اما لو اقتدیٰ واحد بواحد او اثنان بواحد لا یکرہ واذا اقتدیٰ ثلاثة بواحد ذکر ھو رحمہ اللہ ان فیہ اختلاف المشائخ قال بعضھم واذا اقتدیٰ اربع بواحد کرہ بلا خلاف۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج ۱ ص ۴۶۷ باب الوتر)

وَمِثْلُهٗ فی کبیری ص ۴۰۸ باب التراویح۔

الجواب: تہجد وہ نفل نماز ہے جو عشاء کی نماز کے بعد نیند سے اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اس کے ساتھ آخر میں وتر ملا کر پڑھے جائیں تو بہتر ہے، تاہم اگر اس کے ساتھ آخر میں وتر نہ ملائے جائیں تو بھی تہجد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

بحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عن نافع أنّ ابن عمرؓ قال مَن صلّی مِنَ اللّیلِ فلیجعل آخر صلوٰتہٖ وترًا فانّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یأمر بذٰلک۔ (النسائی ج ۱ ص۲۴۷ باب وقت الوتر) لہ

سوال ۲: اگر کوئی رات کے آخری حصہ میں نیند سے اٹھنے کے بعد قضاء نماز کی ادائیگی کرے تو اس کو تہجد کی نماز کہا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: اگر کوئی نیند سے اٹھ کر فوت شدہ نماز کی قضاء کرے تو بعض فقہاء کے نزدیک یہ بھی تہجد میں سے شمار ہوتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: لانّ التھجّد ازالۃ النوم۔ وقال بعد سطر واحدٍ انّ التھجّد لایحصل اِلّا بالتطوع فلو نام بعد صلوٰۃ العشاء ثمّ قام فصلّی فوائت لایسمّی تھجّدًا وتردّد فیہ بعض الشافعیۃ قلت والظاھر انّ تقییدہ بالتطوّع بناء علی الغالب وانہ یحصل بای صلوٰۃ کانت فی الحدیث المار وماکان بعد صلوٰۃ العشاء فھو من اللیل۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۴ مطلب فی صلوٰۃ اللیل)

تحیۃ المسجد دوسری نماز کے ضمن میں بھی ادا ہوسکتی ہے؟ | **سوال:** اگر مسجد میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد پڑھنے

لہ اخرج الامام الترمذی: عن مسروق انہ سأل عائشۃ عن وتر النّبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت من کل اللیل قد اوتر اولہ واوسطہ وآخرہ فانتھی وترہ حین مات فی وجہ السحر۔ (الجامع الترمذی جلد ۱ ص۱۰۳ باب ماجاء فی وتر من اول اللیل وآخرہ۔

کان ابو بکر یوتر ثمّ ینام ثمّ یقوم ویتھجّد وعمر کان ینام قبل ان یوتر ثمّ یقوم ویصلّی ویوتر فقال النبیؐ لابی بکر اخذت بالحزم وقال لعمر اخذت بالقوّۃ۔ (مجموعۃ الفتاوٰی اردو ص۳۳۱ ج۱ کتاب الصلوٰۃ تراویح وتہجد الخ)

کی بجائے کسی دوسری نماز کی سنن یا قضا میں مشغول ہو جائے تو کیا اس سے تحیۃ المسجد کا ثواب مل سکتا ہے یا نہیں؟ اگرچہ اس دوسری نماز میں تحیۃ المسجد کی نیت نہیں کی گئی ہو، بہشتی زیور میں ثواب ملنے اور حنفی نماز کامل میں نہ ملنے کا لکھا ہے، لہٰذا جو راجح ہو وضاحت فرمائیں؟

الجواب: تحیۃ المسجد مسجد میں داخلہ کے وقت دو رکعات پڑھنے سے عبارت ہے، روایات کی رُو سے یہ سنّت ہے۔ اگر مستقل دو رکعات ادا کی جائیں تو بہتر ہے ورنہ سُنن وقتیہ کے ضمن میں بھی نماز تحیۃ المسجد ادا ہو سکتی ہے۔ خیال رہے کہ تحیۃ المسجد مکروہ اوقات میں فقہ حنفی کی رُو سے جائز نہیں، ایسے اوقات میں تحیۃ المسجد کی جگہ تسبیح وتہلیل اور درود شریف سے تحیۃ المسجد کا ثواب ملتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: ویسن تحیّۃ المسجد وھی رکعتان واداء الفرض اوغیرہٖ وکذا دخوله بنیّة فرض او اقتداء ینوب عنها بلا نیّةٍ ۔ قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہٖ العبارۃ ۔ اذ دخل فیه (ای المسجد) بعد الفجر او العصر فانهٗ یسبّح ویهلّل ویصلّی علی النّبیّ صلی الله علیه وسلم فانّهٗ حینئذٍ یؤدّی حق المسجد کما اذا دخل المکتوبة فانهٗ غیر مامور بها حینئذٍ کما فی التمرتاشی ۔ وقال بعد عدۃ اسطر قال فی الحلیة لو اشتغل داخل المسجد بالفریضة غیر ناوٍ للتحیة قامت تلك الفریضة مقام تحیّة المسجد لحصول تعظیم المسجد کما فی البدائع ۔

(رد المحتار ج ۱ ص۱۸ باب السنن والنوافل)[1]

صلوٰۃ التسبیح کے قومہ میں ہاتھ باندھنے کا حکم

سوال: صلوٰۃ التسبیح کے قومہ میں تسبیحات پڑھنے میں کافی وقت لگتا ہے، ایسی حالت میں کیا دوسری نمازوں کی طرح ہاتھ کھول کر چھوڑنا چاہیئے یا ہاتھ باندھنا بہتر ہے؟

الجواب: ہر وہ قیام جس میں ذکر مسنون نہ ہو تو اس میں ہاتھ نہیں باندھے جائیں گے

---

[1] قال العلامة الشرنبلالیؒ: سن تحیة المسجد برکعتین یصلّیھما فی غیر وقت مکروہ قبل الجلوس الخ الی ان قال واداء الفرض ینوب عنها قاله الزیلعی وکذا کل صلوٰۃ اداها عند الدخول بلا نیّة التحیّة لانها لتعظیمه وحرمته وقد حصل ذٰلك بما صلوٰۃ ولا تفوت بالجلوس عندنا۔ (مراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی ص۳۲۰ فصل فی تحیة المسجد)

صلوٰۃ التسبیح کے قومہ میں اگرچہ ذکرِ مسنون یعنی تسبیحات ہیں لیکن قیام کے لیے قرار نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ہاتھ نہیں باندھے جائیں گے بلکہ ارسال ہوگا۔

قال العلامة الشیخ احمد الطحطاوی :۔ تحت قول المصنف (ولیس بوضع الرجل یدہ الیمنیٰ علی الیسریٰ) مانصہ دکما فرغ من التکبیر للاحرام بلا ارسال ویضع فی کُلّ قیام من الصلوٰۃ ولو حکماً فدخل القاعد وکلابد فی ذالك القیام ان یکون فیہ ذکر مسنون ومالا فلا کما فی السراج وغیرہ۔ وقال محمدؒ لا یضع حتی یشرع فی القراءۃ فھو عندھما سنۃ قیام فیہ ذکر مشروع وعندہ سنۃ للقراءۃ فیرسل عندہ حالۃ الثناء والقنوت وفی صلوٰۃ الجنازۃ وعندھما یعتمد فی الکل الیٰ ان قال فان قیل فی القومۃ من الرکوع ذکر مشروع وھو التسمیع والتحمید فینبغی ان یضع فیھا علیٰ قولھما اجیب بان المراد قیام لہ قرار فیہ ذکر مسنون براجع۔

(طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص۱۴۰ فصل فی بیان سُنن الصلوٰۃ) [1]

اِستخارہ کی نماز کا مسنون طریقہ

سوال :۔ استخارہ کی نماز کا مسنون طریقہ کیا ہے اور کس وقت پڑھنا بہتر ہے ؟

الجواب :۔ نماز استخارہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسے کام کا ارادہ کرے جس میں ضرر اور نفع دونوں کا احتمال ہو تو ایسی حالت میں نمازِ عشاء کے بعد دو رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ پہلی رکعت میں سورۃ کافرون اور دوسری میں سورۃ اخلاص پڑھے، نماز کے بعد پوری توجہ سے یہ دُعا پڑھے

اللّٰھمّ انّی استخیرك بعلمك واستقدرك بقدرتك واسئلك من فضلك العظیم۔ فانك تقدر ولا اقدر وتعلمُ ولا اعلم وانت علّام الغیوب۔ اللّٰھمّ ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر خیرلی فی دینی ومعیشتی وعاقبۃ امری او قال فی عاجل امری وآجلہ فاصرفہ عنّی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثمّ ارضنی بہ قال ویسمّی حاجتہ۔ (الجامع الترمذی ج ۱ ص۱۰۹ باب ماجاء فی الاستخارہ)

---

[1] قال الملا خسرو الحنفیؒ : فالحاصل ان کل قیام فیہ ذکر مسنون ففیہ الوضع وکل قیام لیس کذلك ففیہ الارسال۔ (الدرر والغرر ج ۱ ص۶۷ باب صفۃ الصلوٰۃ)

اورجب ھٰذا الامر پر پہنچے تو متعلقہ کام کی طرف توجہ کر کے دل میں لائے، ایسے عمل کے بعد جس جانب دل کا میلان ہوا تو اس کو اختیار کرے۔ اگر ایک دفعہ کرنے سے اطمینان حاصل نہ ہو تو سات دفعہ تک یہ عمل کرے، متعدد بار کرنے سے تردد اور شک نہیں رہے گا۔

قال ابن عابدینؒ: وفی الحلیة ویستحب افتتاح ھٰذا الدعاء وختمه بالحمد له والصلٰوة۔ وفی الاذکار انهٗ یقرأ فی الرکعة الاولیٰ الکافرون وفی الثانیة الاخلاص اھ۔ وعن بعض السلف انه یزید فی الاولیٰ "وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ويختار الیٰ "یعلنون"۔ وفی الثانیة "وما کان لمؤمن ولا مؤمنة" الآیة" وینبغی ان یکررھا سبعاً لما روی ابن السنی یا انس اذا ھممت بامر فاستخر ربک فیه سبع مرات۔ ثم انظر الی الذی سبق الی قلبك فان الخیر فیه ولو تعذرت علیه الصلٰوة استخار بالدعاء اھ۔ وفی شرح الشرعة المسموع من المشائخ انهٗ ینبغی ان ینام علی طھارة مستقبل القبلة بعد قراءة الدعاء المذکور فان رأی فی منامه بیاضاً اوخضرة فذلك الامر خیر۔ وان رأی فیه سواداً اوحمرة فھو شر ینبغی ان یجتنب اھ۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۶ مطلب فی رکعتی الاستخارة)

نفل نماز بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا

سوال: نفل نماز پڑھنے کی کیفیت کیا ہے؟ کیا بعذر یا بلاعذر بیٹھ کر پڑھنے سے نماز پر کوئی اثر پڑھتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نفل نماز بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، البتہ بیٹھ کر نفل پڑھنے والے کا ثواب کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے مقابلہ میں نصف ہوتا ہے۔

قال الامام البخاریؒ: عن عمران بن حصین قال سألت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم عن صلٰوة الرجل وھو قاعدٌ فقال من صلّی قائماً فھو افضل ومن صلّی قاعداً فلهٗ نصف اجر القائم۔ (الحدیث)

(الجامع الصحیح البخاری ج۱ ص۱۵۰ ابواب تقصیر الصلٰوة)

جبکہ معذور کو بیٹھ کر پڑھنے سے پورا ثواب ملے گا۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ویتنفل مع قدرته علی القیام قاعداً لا

مضطجعاً الّا بعذر ابتداءً وکذا بناءً بعد الشروع بلا کراهۃ کعکسہ۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۶ باب السنن والنوافل) [۱]

عالم دین کے لیے سُنتیں چھوڑنا جائز ہے

سوال:۔ کیا کوئی عالم دین یا مفتی لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے سُنتوں کو چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے اور ان کی تعلیم وتعلم کے لیے شریعتِ مقدسہ نے ایک عالم دین کو اس مشغولیت کی بناء پر سُنتیں چھوڑنے کی اجازت دی ہے لیکن فجر کی سنتیں چھوڑنے کی اس کو بھی اجازت نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ولا یجوز ترکھا لعالم صار مرجعاً فی الفتاوی بخلاف باقی السنن کلہ ترکھا لحاجۃ الناس الیٰ فتواہ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۵ باب النوافل) [۲]

حاجی نفل نماز حرم شریف میں پڑھے یا ڈیرہ میں؟

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا حج پر جانے کا ارادہ ہے، دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایک حاجی کیلئے نفل نماز حرم شریف میں پڑھنا افضل ہے یا وہ اپنے ڈیرہ میں نفل نماز ادا کرے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ نفل نماز اپنی رہائش گاہ میں ادا کی جائے لیکن حرمین شریفین کی شرافت و عظمت کی بناء پر حاجی کیلئے نفل نماز حرمین شریفین میں پڑھنا افضل ہے اسلئے کہ حاجی کو یہ شرف کسی اور جگہ حاصل نہ ہوگا۔

لما قال العلامۃ مُلّا علی القاریؒ: والظاھر ان الکعبۃ والروضۃ الشریفۃ تستثنیان للغرباء لعدم حصولھما فی مواضع آخر فتغتنم الصّلوٰۃ فیھما قیاساً علیٰ ما قالہ ائمتنا ان الطواف للغرباء افضل من الصلوٰۃ النافلۃ۔ (مرقاۃ ج ۳ ص ۱۸۶ کتاب الصلوٰۃ)

---

[۱] قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ویتنفل قاعداً مع قدرتہ علی القیام ابتداءً وبناءً وقد حکی فیہ اجماع العلماء۔ وبعد عدۃ اسطر قال واما اذا صلاہ مع عجزہ فلا ینقص عن ثوابہ قائماً۔ (البحر الرائق جلد ۲ ص ۶۲ باب النوافل)

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (فلہ ترکھا) الظاھر ان معناہ انہ یترکھا وقت اشتغالہ بالافتاء لاجل حاجۃ الناس المجتمعین علیہ وینبغی انہ یصلیھا اذ فرغ فی الوقت وظاھر التفرقۃ بین سنۃ الفجر وغیرھا الخ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۵)

عصر کی نماز کے بعد منذور نفل پڑھنا

سوال:۔ ویسے تو عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب نفل نماز کی ادائیگی مکروہ ہے لیکن اگر کسی نے نفل نماز کی نذر مانی ہو تو ان نوافل کو واجب ہونے کی بناء پر بعد از نمازِ عصر ادا کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ عصر اور فجر کی نمازوں کے بعد مطلقاً نفل پڑھنا مکروہ ہے چاہے ان نوافل کا تعلق نذر شدہ نوافل سے ہو یا عام نوافل سے، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق عصر کی نماز کے بعد نفل نماز کی مانی ہوئی نذر کو کسی غیر مکروہ وقت میں ادا کیا جائے، عصر کے بعد ادا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة المرغیناني رحمه الله: ویکره ان یتنفل بعد الفجر حتی تطلع الشمس و بعد المغرب حتی تغرب لماروی انه علیه السلام نهی عن ذٰلك ولا بأس بان یصلی فی هٰذان الوقتین الفوائت ویسجد للتلاوة ویصلی علی الجنازة لان الکراهة کانت لحق الفرض لیصیر الوقت کالمشغول به لالمعنی فی الوقت فلم تظهر فی حق الفرائض وفیما وجب لعینه کسجدة التلاوة وظهر فی حق المنذور لانه تعلق وجوبه بسبب من جهته۔ (الهدایة ج ۱ ص۸۲ فصل فی الاوقات المکروه - کتاب الصلوٰة)[1]

تحیۃ الوضو پڑھنے سے قبل بیٹھنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص وضو کرکے مسجد میں آئے اور کچھ دیر کے لیے بیٹھ جائے پھر کھڑے ہو کر تحیۃ الوضو پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص وضوء کرکے مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے قبل ہی دو رکعت نماز تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد پڑھے، تاہم اگر کسی عذر کی بناء پر پہلے بیٹھ کر پھر نماز پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

لقوله علیه السلام: اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس۔

---

[1] لما فی الهندیة: ولو نذر ان یصلی فی الوقت المکروه فأدی فیه یصح ویأثم ویجب ان یصلی فی غیره۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۲ کتاب الصلوٰة - الباب الاول فی المواقیت - الفصل الثالث)

صلوٰۃ التسبیح با جماعت پڑھنے کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ رمضان المبارک میں صلوٰۃ التسبیح باجماعت پڑھتے ہیں اور خواتین کو خصوصی طور پر لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرکے یہ نماز جماعت سے پڑھنے کے لیے مسجد میں بلایا جاتا ہے، تو صلوٰۃ التسبیح باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ صلوٰۃ التسبیح کا باجماعت پڑھنا شارع علیہ السلام سے منقول نہیں، اور چونکہ یہ نفل نماز ہے اور نفل نماز باجماعت پڑھنا خاص کر جب تداعی[1] کے ساتھ ہو تو مکروہ ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: التطوع بالجماعۃ اذا کان علی سبیل التداعی یکرہ فی الاصل للصدر الشہید اما اذا صلوا بجماعۃ بغیر اذان واقامۃ فی ناحیۃ المسجد لا یکرہ۔ وقال شمس الائمۃ الحلوانی: ان کان سوی الامام ثلاثۃ لا یکرہ بالاتفاق وفی الاربع اختلف المشائخ والاصح انہ یکرہ۔ ھکذا فی الخلاصۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۸۲ الباب الخامس الامامۃ الفصل الاول فی الجماعۃ من کتاب الصلوٰۃ)

صلوٰۃ التسبیح میں تسبیحات رہ جانے سے نماز کا حکم

سوال :۔ اگر کسی شخص سے صلوٰۃ التسبیح کی پہلی رکعت میں تسبیحات رہ جائیں اور سلام پھیرنے سے قبل یاد آجائے کہ مجھ سے فلاں رکعت میں تسبیحات رہ گئی ہیں تو کیا سجدۂ سہو کرنے سے یہ نماز صحیح ہو جائے گی یا نہیں؟ اور اگر سجدۂ سہو نہ کرے تو کیا شرعاً یہ نماز صلوٰۃ التسبیح شمار ہوگی یا صرف نفل؟

الجواب: سجدۂ سہو ترکِ واجب سے لازم ہوتا ہے جبکہ تسبیحات واجب نہیں اس لیے ان کے رہ جانے سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، البتہ تسبیحات رہ جانے سے یہ نماز صرف نفل شمار ہوگی صلوٰۃ التسبیح کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔ ھکذا فی فتاوی رحیمیۃ ج ۴ ص ۳۲ باب النوافل۔

---

[1] تداعی کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی چار ہوں تو یہ بالاتفاق مکروہ ہے اور اگر مقتدی تین ہوں تو کراہت میں اختلاف ہے، اور اگر مقتدی دو ہوں تو بلا کراہت جائز ہے لیکن جماعت کا ثواب پھر بھی نہ ہوگا۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص ۳۷۱: وفیہ قولہ علی سبیل التداعی بان یقتدی اربعۃ فاکثر بواحد)

باب التراویح
(تراویح کے احکام ومسائل)

سحری کو تراویح پڑھنے کا حکم

سوال: بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تراویح سحری کے وقت پڑھتے ہیں، کیا سحری تک تراویح مؤخر کرنا مکروہ تو نہیں ہے؟

الجواب: مستحب یہ ہے کہ تراویح کو ثلث لیل یا نصف تک مؤخر کیا جائے، سحری تک مؤخر کرنا اگرچہ صحیح قول کے مطابق مکروہ تو نہیں مگر اس سے اجتناب کرنا مناسب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویستحب تأخیرها الیٰ ثلث اللیل او نصفه ولا تکره بعده فی الاصح۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۲ ص۴۴ باب الوتر والنوافل) [1]

تراویح سنت مؤکدہ ہیں

سوال: نماز تراویح پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ موجودہ وقت میں جس اہتمام سے ہم تراویح پڑھتے ہیں دورِ رسالت یا خلفاء راشدین کے دور میں اس کی حیثیت کیا تھی؟

الجواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی ہیں البتہ باقاعدہ اہتمام کی رعایت نہیں کی ہے، کیونکہ آپ کے اہتمام سے امت پر لزوم کا خطرہ تھا اس لیے آپ نے بوجہ عذر چھوڑ دیں البتہ خلفاء راشدین کے دور میں یہ عذر باقی نہ رہا تو خلفاء راشدین نے باقاعدہ اہتمام سے تراویح پڑھی ہیں، بنا بریں مواظبت تراویح سنتِ مؤکدہ ہے۔

لما قال العلامة عبد الله بن محمود الموصلی: التراویح سنة مؤکدة لان النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم اقامها فی اللیالی......
واظب علیها الخلفاء الراشدین وجمیع المسلمین من زمن عمرؓ الیٰ یومنا هٰذا۔ ان ابا یوسف سأل ابا حنیفة عنها وما فعله عمرؓ۔ فقال التراویح سنة مؤکدة ولم یتخرجه عمرؓ من تلقاء نفسه۔ ولم یکن فیه مبتدعاً۔ ولم یأمر به الا عن اصل لدیه وعهد من

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: وما فی البحر من ان الصحیح انه لا بأس بالتاخیر لا یدل علیٰ ثبوت کراهة التنزیه۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۴ باب الوتر والنوافل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۶۸ فصل فی التراویح)[۱]

بیس رکعت تراویح کا ثبوت

سوال: بیس رکعات تراویح کی دلیل کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کن وجوہات کی بناء پر اتنی اہمیت دی؟

الجواب: رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح پڑھنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے جس پر آج تک تعامل چلا آرہا ہے، جہاں تک تعداد رکعات کا تعلق ہے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے علاوہ اکثر خلفاء راشدین کا متوارث طریقہ ہے، جب خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیس رکعت تراویح ایک قاری کی اقتداء میں پڑھنے کا حکم دیا تو اس دور صحابہؓ میں کسی نے آپ پر نکیر نہیں کی گویا انہوں نے آپؓ کے فیصلہ پر اجماع کیا، اصولی طور پر یہ فیصلہ بھی مرفوع روایت کے حکم میں ہے، اس لیے کہ صحابی کا عبادات میں خلاف قیاس بات کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس نے یہ بات حضورؐ سے سُنی ہوگی، اس کے علاوہ جملہ امت کا اس پر اجماع ہوچکا ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ: وقد سنها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وندبنا الیہا واقامہا فی بعض اللیالی ثم ترکہا خشیۃ ان تکتب علی امتہ کما ثبت ذلک فی الصحیحین وغیرہما ثم وقعت المواظبۃ علیہا فی اثناء خلافۃ عمر رضی اللہ عنہ

---

[۱] قال الحصکفیؒ: التراویح سنۃ مؤکدۃ لمواظبۃ الخلفاء الراشدین ـــ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ سنۃ مؤکدۃ صححہ فی الہدایۃ وغیرہا وھو المروی عن ابی حنیفۃ و ذکر فی الاختیار ان ابا یوسف سأل اباحنیفۃ عنہا وما فعلہ عمر فقال التراویح سنۃ مؤکدۃ ولم یتخرجہ عمر من تلقاء نفسہ ولم یکن فیہ مبتدعًا ولم یامر بہ الا عن اصل لدیہ وعہد من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال ایضًا تحت قولہ لمواظبۃ الخلفاء الراشدین ای اکثرھم لان المواظبۃ علیہا وقعت فی اثناء خلافۃ عمرؓ ووافقہ علی ذلک عامۃ الصحابۃ ومن بعدھم الی یومنا ھذا بلا نکیر۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۲ ص۴۳، باب التراویح)

ومثلہ الفتاوی التاتارخانیۃ ج۱ ص۶۵۳ الفصل الثالث عشر فی التراویح۔

ووافقه علیٰ ذٰلک عامة الصحابة رضی اللہ عنہم کما ورد ذٰلک فی السنن ثم ما زال الناس من ذٰلک الصدر الیٰ یومنا ھٰذا علیٰ اقامتھا من غیر نکیر وکیف لا وقد ثبت عنه صلی اللہ علیه وسلم علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ، کما رواہ ابوداؤد۔ واطلقه فشمل الرجال والنساء کما صرح به فی الخانیة والظھیریة۔ الخ

وقوله عشرون رکعة بیان لکمیتھا وھو قول الجمھور لما فی المؤطا عن یزید بن رومان قال کان الناس یقومون فی زمن عمر بن الخطاب بثلاث وعشرین رکعة وعلیه عمل الناس شرقاً وغرباً ۔۔۔ وذکر العلامة الحلبیؒ: ان الحکمة فی کونھا عشرین ان السنن شرعت مکملات للواجبات وھی عشرون بالوتر فکانت التراویح کذٰلک لتقع المساواة بین المکمل والمکمل انتھی۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۶۶ تراویح فی باب الوتر والنوافل) [۱]

بیس رکعات تراویح کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی حیثیت

سوال: بیس رکعات تراویح کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی کیا حیثیت ہے؟ بعض اقوال سے تضعیف کی طرف میلان معلوم ہوتا

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: التراویح سنة مؤکدة توارثھا الخلف عن السلف من لدن تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الیٰ یومنا ھٰذا ھٰکذا روی الحسن عن ابی حنیفة وقد واظب علیھا الخلفاء الراشدون وقال علیه السلام علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی، واقامھا ازواج النبی علیه السلام۔

(الفتاویٰ التاتارخانیة ج ۱ ص ۶۵۳ الفصل الثالث عشر فی التراویح)

وعن السائب بن یزید قال: کانوا یقومون علی عھد عمر بن الخطاب فی شھر رمضان بعشرین رکعة۔ رواہ البیھقی واسنادہ صحیح۔

(آثار السنن ص ۲۵۰ باب فی التراویح بعشرین رکعات)

ومثله فی فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیة ج ۱ ص ۲۳۲ باب التراویح۔

آثار السنن ص ۲۵۳ باب فی التراویح بعشرین رکعات۔

ہے، کیا اس کے ضعیف ہونے سے بیس رکعات کی حیثیت متاثر ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو اگر کسی نے ضعیف بھی کہا ہو تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہو مگر جب اس پر خیر القرون کے زمانے سے مسلسل عمل ہو رہا ہو تو امت کے تواتر عمل سے وہ حدیث مضمون کے اعتبار سے قوی بن جاتی ہے پھر وہ ضعیف نہیں رہتی، یہ اصولِ حدیث کا مسلّم اصول ہے۔

قال ابن عابدینؒ: واما ما روی ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ والطبرانی وعند البیہقی من حدیث ابن عباسؓ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلّی فی رمضان عشرین رکعۃ سوی الوتر فضعیف بابی شیبۃ ابراھیم بن عثمان جد الامام ابی بکر بن ابی شیبۃ متفق علی ضعفہ مع مخالفتہ للصحیح اھ۔ قلت اما مخالفتہ للصحیح فقد یجاب عنہا بان ما فی الصحیح مبنی علی ما ھو الغالب من احوالہ صلّی اللہ علیہ وسلّم وھذہ اللیلتین فقط ثمّ ترکہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام فلذا لم تذکرہ عائشۃ رضی اللہ عنہا واما تضعیف من ذکر فقد یقال انہ بما مر من نقل الاجماع علی سنتہا من غیر تفصیل مع قول الامام رحمہ اللہ ان ما فعلہ عمر رضی اللہ عنہ لم یتخرجہ من تلقاء نفسہ ولم یکن فیہ مبتدعًا ولم یأمر بہ الّا عن اَصْلٍ لدیہ وعہد من رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نتامل منصفًا۔

(منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج ۲ ص۶۶ باب السنن والنوافل) [1]

صلوٰۃ اللیل اور قیام رمضان جدا جدا نمازیں ہیں

سوال: صلوٰۃ اللیل (تہجد) یا قیام رمضان (تراویح) ایک ہی نماز

---

[1] وذکر العلامۃ عبد العلی بحر العلومؒ: وروی ابن ابی شیبۃ عن ابن عباس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر۔ قال الشیخ عبد الحق قالوا اسنادہ ضعیف وتعارضہ حدیث اُمّ المؤمنین ------ انہ لا معارضۃ لان اُمّ المؤمنین اخبرت لما علمت ولعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلّی عشرین فی بیت اُمّ المؤمنین میمونۃ وشاھد ذلک ابن عباس ومواظبۃ الصحابۃ علی عشرین قرینۃ صحۃ ھذہ الروایۃ۔ (رسائل الارکان ص۱۳۸ فصل فی التراویح)

کے نام ہیں یا جدا جدا نمازیں ہیں؟

الجواب: صلوٰۃ اللیل اور تہجد کے درمیان عموم وخصوص کی نسبت ہے۔

کما یعلم من قول ابن عابدینؒ: نعم صلوٰۃ اللیل وقیام اللیل اعم من التھجد۔ الخ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۲ ص۲۴ مطلب فی صلوٰۃ اللیل)

البتہ قیام رمضان اور تراویح دونوں ایک ہیں۔

کما یعلم من صنیع برھان الدین المرغینانیؒ فصل فی قیام رمضان: یستحب ان یجتمع الناس فی شھر رمضان بعد صلوٰۃ العشاء فیصلی بھم امامھم خمس ترویحات کل ترویحۃ بتسلیمتین الخ۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۳۴ باب النوافل، فصل فی قیام رمضان)[1]

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث کا مقصد

سوال: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، یہ تراویح کے متعلق ہے یا تہجد کے متعلق؟

الجواب: یہ حدیث تہجد کے متعلق ہے تراویح کے متعلق نہیں ہے کیونکہ غیر رمضان میں تو تراویح نہیں پڑھی جاتی ہیں تراویح صرف رمضان کے ساتھ مخصوص ہیں لہٰذا غیر رمضان تہجد پر دال ہے۔

یحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عن ابی سلمۃ انہ اخبرہ انہ سأل عائشۃؓ کیف کانت صلوٰۃ رسول اللہ ﷺ فی رمضان۔ فقالت ماکان رسول اللہ ﷺ یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ ثم یصلی اربعًا۔ فلا تسئل عن حسنھن وطولھن۔ ثم یصلی اربعًا۔ فلا تسئل عن حسنھن ثم یصلی ثلاثًا۔ الخ

قال شیخ مشائخنا مولانا الجنجوھیؒ: کان السائل ظن ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلہ کان یزید فی رمضان علی ما تھجد فی غیرہ فردتہ بقولھا ما کان یزید فی رمضان ولا فی غیرہ ای فی غالب الاحوال والاوقات فالغرض الانکار علی زیادۃ رکعات التھجد لخصوصیتہ رمضان فلا ینافیہ ما کان یصلیہ

---

[1] قال العلامۃ السید محمد یوسف البنوریؒ: وبالجملۃ فالمراد بقیام رمضان التراویح۔ (معارف السنن ج۵ ص۵۴۳ باب ما جاء فی قیام رمضان)

في بعض الاحيان فوق احدٰى عشرة ركعة وكذا لا تعلق له بصلوٰة التراويح نفياً ولا اثباتاً۔ (فتح الملهم ج ۲ ص۲۹۱ باب صلوٰة الليل وعدد ركعات النبيؐ) [۱]

فرض نماز پڑھے بغیر نمازِ تراویح پڑھانے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی امام رمضان المبارک میں فرض نماز پڑھے بغیر تراویح کی نماز پڑھائے تو کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس امام نے خود فرض نماز نہیں پڑھی ہو تو تراویح میں اس کی اقتداء درست نہیں اور نہ خود اس کا ذمہ فارغ ہوتا ہے، کیونکہ تراویح سے پہلے عشاء کی نماز کا پڑھنا ضروری ہے۔

وفي الهندية: فان وقتها (اي التراويح) بعد اداء العشاء فتجب الاعادة اذا ادّي قبل العشاء۔ (الهندية ج ۱ ص۱۱۵ فصل في التراويح) [۲]

تراویح میں شفعِ ثانیہ فاسد ہونے سے دو رکعات کی قضاء کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص نے چار رکعت تراویح کی نیت باندھی اور پھر تیسری یا چوتھی رکعت کے دوران سلام پھیر دیا یا شفعِ ثانیہ میں نماز فاسد ہوگئی تو کیا وہ نفل کی طرح دو رکعت یا چار رکعت کی قضاء کرے گا؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ تراویح اگرچہ بذاتِ خود سُنّت ہیں لیکن چار چار رکعت پڑھنا سُنّت نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں صرف دو رکعت کی قضاء کرنا کافی

---

[۱] قال الشيخ ظفر احمد العثماني: حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جس میں آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ رمضان وغیر رمضان میں نہیں پڑھتے تھے.... الخ، تراویح کے متعلق نہیں بلکہ صرف تہجد کے متعلق ہے، یعنی آپ تہجد میں اس سے زیادہ غالب اوقات میں نہیں پڑھتے تھے۔
(امداد الاحکام جلد ۱ ص۶۴۷ باب التراویح)

[۲] قال الشيخ ابراهيم الحلبيؒ: وقال القاضي الامام النسفي۔ الصحيح ان وقتها (اي التراويح) بعد العشاء لا يجوز قبلها سواءً كانت بعد الوتر او قبله وهو المختار۔
(غنية المستملي (كبيري) ص۴۰۳ باب التراويح)
ومثله في ردّ المحتار ج ۲ ص۴۴ مبحث صلوٰة التراويح)

ہوگا۔

قال الحصکفیؒ: وقضی رکعتین لونوی اربعًا غیر مؤکدۃ علی اختیار الحلبی وغیرہ۔ ونقض فی خلال الشفع الاول او الثانی ای وتشہد للاوّل۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۲ باب الوتر والنوافل)

لیکن شفع اولیٰ کا اعادہ ترکِ واجب کی وجہ سے ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله او الثانی) ای وکذا یقضی رکعتین لو اتم الشفع الاوّل بقعدته۔ ثم شرع فی الثانی فنقضه فی خلاله قبل القعدۃ فیقضی الثانی فقط لتمام الاوّل لکن ینبغی اعادۃ الاول لترك واجب السلام مع عدم انجبارہ بسجود سهو کما هو الحکم فی کل صلوٰۃ ادیت مع ترك الواجب۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲ باب السنن والنوافل)[1]

چار رکعات تراویح قعدۂ اولیٰ کے بغیر پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر چار رکعات تراویح قعدۂ اولیٰ کے بغیر پڑھی جائیں اور آخر میں سجدۂ سہو کرلیا جائے، تو کیا یہ چار رکعات ہیں یا دو رکعات شمار ہوں گی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں دوسرا شفع اور قرأت دوبارہ پڑھے گا، یہ صرف دو رکعات شمار ہوں گی۔

وفی الهندیۃ: عن ابی بکر الاسکاف انهٗ سئل عن رجل قام الی الثالثۃ فی التراویح ولم یقعد فی الثانیه قال ان تذکر فی القیام ینبغی ان یعود ویسلم۔ وان تذکر بعد ما سجد للثالثۃ فان اضاف الیها رکعۃ اُخریٰ کانت هٰذه الاربع عن تسلیمۃ

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قوله وقضی رکعتین لونوی اربعًا وافسدہ بعد القعود الاوّل او قبله یعنی فیلزمه الشفع الثانی ان افسدہ بعد القعود الاوّل والشروع فی الثانی۔ والشفع الاوّل فقط ان افسدہ قبل القعود بناءً علی انه لا یلزمه بتحریمه النفل اکثر من الرکعتین وان نوی اکثر منها وهو ظاهر الروایۃ عن اصحابنا الّا بعارض الاقتداء۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۵۸ باب النوافل)

ومثلهٗ فی الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیۃ ج ۱ ص۲۳۴ باب التراویح، فصل فی السجود۔

واحدة ۔ (الهندية ج۱ ص۱۱۸ فصل فی التراویح) ؎۱

ترویحہ خامسہ اور وتر کے درمیان نفل پڑھنے سے ضعفاء کی رعایت اولیٰ ہے

سوال:۔ تراویح اور وتر کے درمیان نفل پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ قوم میں ضعیف لوگ بھی موجود ہوں اور تاخیر کرنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہو تو کیا نفل پڑھنا بہتر ہے یا ضعفاء کی رعایت ضروری ہے؟

الجواب:۔ اگر قوم کے ضعفاء کو انتظار کرنے سے تکلیف ہوتی ہو تو نفل پڑھنے کی بجائے جلدی وتر پڑھنے چاہئیں، کیونکہ نفل پڑھنے سے ضعفاء کی رعایت اہم ہے۔

وفی الهندية: ويستحب الجلوس بين الترويحتين قدر ترويحة وكذا بين الخامسة والوتر كذا فی الكافی وهكذا فی الهداية۔ ولو علم ان الجلوس بين الخامسة والوتر يثقل علی القوم لايجلس هكذا فی السراجية۔ (الهندية ج۱ ص۱۱۵ فصل فی التراويح) ؎۲

تراویح کے درمیان بیٹھنے کی صورت میں سکوت بھی جائز ہے

سوال:۔ چار رکعات تراویح کے بعد جو دعا پڑھی جاتی ہے اگر کسی کو وہ دعا یاد نہ ہو تو تسبیح وتہلیل پر اکتفاء جائز ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص خاموش رہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ چار رکعت تراویح کے بعد نفس بیٹھنا مستحب ہے، تسبیح وتہلیل ضروری نہیں البتہ اگر تین دفعہ یہ دعا پڑھے: سبحان ذی الملك والملكوت.... الخ تو اچھا رہے گا۔ اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو تسبیح وتہلیل بھی پڑھ سکتا ہے اور خاموش رہنے سے بھی سنت ادا ہو جاتی ہے۔

؎۱ قال ابن نجيم المصریؒ: فلو صلی الامام اربعا بتسليمة ولم يقعد فی الثانية فاظهر الروايتين عن ابی حنيفةؒ وابی يوسفؒ عدم الفساد۔ ثم اختلفوا هل تنوب عن تسليمة او تسليمتين۔ قال ابو الليث تنوب عن تسليمتين۔ وقال ابو جعفر وابن الفضل تنوب عن واحدة وهو الصحيح كذا فی الظهيرية والخانية وفی المجتبیٰ وعليه الفتویٰ۔ (البحر الرائق جلد۲ ص۶۷)

ومثلہٗ فی الفتاویٰ القاضی خان علیٰ هامش الهندية ج۱ ص۲۳۰ فصل فی السهو)

؎۲ قال الحصكفیؒ: يجلس ندبا بين كل اربعة بقدرها كذا بين الخامسة والوتر ويخيرون بين تسبيح وقرأة وسكوت وصلوة فرادیٰ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۴۶ باب التراويح)

قال الحصکفیؒ: ویجلس ندباً بین کل اربعة بقدرها وکذا بین الخامسة والوتر ویخیرون بین تسبیح وقرأة وسکوت وصلوٰة فرادیٰ۔ وقال ابن عابدینؒ: تحت هٰذه العبارة۔ قال القهستانیؒ: فیقال ثلاث مرات سبحان ذی الملك والملکوت سبحان ذی العزة والعظمة والقدرة والکبریاء والجبروت سبحان الملك الحی الذی لایموت سبوحٌ قدوس رب الملٰئکة والروح لا اله الا الله نستغفر الله نسئالك الجنة ونعوذ بك من النار۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۶ مبحث فی صلوٰة التراویح)[1]

چار رکعات تراویح اور ظہر کی سنن قبلیہ کی ادائیگی میں فرق

سوال:۔ اگر کسی شخص نے نماز تراویح میں چار رکعت کی نیت باندھی، دو رکعت پر درمیانی تشہد بھول کر سجدۂ سہو کیا، کیا یہ چار رکعت شمار ہوں گی یا دو رکعات کے حکم میں رہیں گی؟ نیز ظہر کی سنن قبلیہ میں اگر قعدۂ اولیٰ رہ جائے اور آخر میں سجدۂ سہو کیا جائے تو تراویح اور سنن مذکورہ کا ایک حکم ہے یا الگ؟

الجواب:۔ نماز تراویح میں چار رکعات کی نیت باندھ کر قعدۂ اُولیٰ کے رہ جانے سے مفتی بہ قول کے مطابق تراویح ایک تسلیمہ یعنی دو رکعت سے شمار کی جائیں گی۔ جبکہ سُنن ظہر میں سجدۂ سہو کرنے سے نماز مکمل ہوجاتی ہے، گویا ظہر کے سُنن کا حکم تراویح سے الگ ہے۔

لما فی الهندیة: ولوصلی اربعاً بتسلیمة ولم یقعد فی الثانیة ففی الاستحسان لاتفسد هو اظهر الروایتین عن ابی حنیفة وابی یوسف واذا لم تفسد قال محمد بن الفضل تنوب الاربع عن تسلیمة واحدة هو الصحیح۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۱۸ فصل فی التراویح)

وفی الهندیه: ولوصلی الاربع قبل الظهر ولم یقعد علیٰ رأس الرکعتین جاز استحساناً۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۱۲ باب النوافل)

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وقد قالوا انهم مخیرون فی حالة الجلوس ان شاؤا سبحوا وان شاؤا قرؤا القرآن۔ وان شاؤا صلوا اربع رکعات فرادیٰ۔ وان شاؤا قعدوا ساکتین۔ واهل مکة یطوفون اسبوعاً ویصلون رکعتین واهل المدینة یصلون اربع رکعات فرادیٰ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۶۹ باب الوتر والنوافل)

(وفی الهندیة: ومنها القعدة الاولی حتی لو ترکها یجب علیه السهو۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۲۷ باب سجود السهو) [۱]

تیس۳۰ رمضان کو شوّال ہونے کے احتمال پر تراویح پڑھنے یا پڑھانے کا حکم

سوال: ہمارے علاقے میں اکثر تیس رمضان کو شوّال ہوتا ہے، اگر صحیح شہادت نہ ملے تو اسی رات کو تراویح کی نماز پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟ اگر پڑھنی چاہیئے تو معمول کے مطابق یا رات کے آخری حصّہ میں؟

الجواب: تراویح رمضان المبارک کا وظیفہ ہے، جب عید الفطر کا حکم نہ ہوا ہو روزہ اور تراویح دونوں معمول بہ ہوں گے۔ لہٰذا اگر شوّال کا احتمال بھی ہو تو تراویح اپنے مقررہ وقت پر ادا کی جائیں گی، تاہم اگر آخری شب میں عید الفطر کا چاند دیکھنے کی خبر آجائے تو تراویح نوافل میں تبدیل ہو جائیں گی۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تصوموا قبل رمضان صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته۔ (معارف السنن جلد ۵ ص۳۳۶ باب ما جاء ان الصوم لرؤیة الهلال والافطار) [۲]

---

[۱] قال العلامة حسن بن منصور الشهیر بقاضی خانؒ: اذا صلی الامام اربع رکعات بتسلیمة واحدة ولم یقعد فی الثانیة فی القیاس تفسد صلوته وهو قول محمدؒ وزفرؒ یلزمه قضاء هذه التسلیمة وهو روایة عن ابی حنیفة وفی الاستحسان هو اظهر الروایتین عن ابی حنیفة وابی یوسف لا تفسد...... قال الفقیه ابوجعفر والشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل فی التراویح تنوب الاربع عن تسلیمة واحدة۔ وکذا لو صلی الاربع قبل الظهر ولم یقعد علی رأس الرکعتین جاز استحساناً۔
(الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیة ج۱ ص۲۳۹، ۲۴۰ فصل فی التراویح)

قال العلامة قاضی خان: اذا ترک القعدة الاولی من ذوات الاربع والثلاثة یلزمه السهو ولو ترک فی التطوع لا تفسد صلوته فی قول ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله ویلزمه السهو۔
(الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیة ج۱ ص۱۲۱ باب سجود السهو)

[۲] وعن رجل من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم قال اختلف الناس فی اخر یوم من رمضان فقدم اعرابیان فشهدا عند النبی صلی الله علیه وسلم بالله لاهل الهلال امس عشیة فامر رسول الله صلی الله علیه وسلم الناس ان یفطروا زاد خلف فی حدیثه وان یغدوا الی مصلاهم۔ (سنن ابی داؤد ج۱ ص۳۲۰ باب شهادة رجلین علی رؤیة هلال شوال)
ومثله فی رسائل الارکان ص۲۰۶ فصل یفترض علی المکلفین ان یطلبوا هلال۔

حنفی المسلک آدمی کے لیے رمضان میں تراویح باجماعت پڑھانے کیلئے مستقل امام رکھنے کا حکم

سوال:۔ ہم بسلسلۂ روزگار متحدہ عرب امارات میں مقیم ہیں، وہ لوگ تراویح کی نماز بارہ رکعات پڑھتے ہیں، اگر ہم اپنے لیے یہاں رمضان میں حنفی امام رکھ کر مکان پر تراویح با جماعت پڑھنے کا انتظام کریں تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب:۔ اگر قانونی طور پر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ایسا کرنا درست بلکہ بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ولو کان لکل مذھب امام کما فی زماننا فالافضل الاقتداء بالموافق سواء تقدم او تأخر علی ما استحسنه عامة المسلمین وعمل به جمھور المؤمنین من اھل الحرمین قدس ومصر والشام ولا عبرة بمن شذ منھم۔

(رد المحتار ج۱ ص۵۶۵ باب الامامة، مطلب اذا صلی الشافعی قبل الحنفی الخ)

تراویح میں ختمِ قرآن کا حکم

سوال:۔ تراویح کی نماز میں ختمِ قرآن کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تراویح کی نماز میں ایک دفعہ ختمِ قرآن سُنت ہے اور ایک سے زائد بار افضل ہے۔

قال الحصکفی رحمه الله: والختم مرة سنة ومرتین فضیلة وثلاثا افضل۔ (الدر المختار علی رد المحتار ج۲ ص۴۶ باب التراویح) [1]

آٹھ رکعات تراویح میں مسنون ختمِ قرآن کا حکم

سوال:۔ جس قرأت سے بیس رکعات تراویح جلدی جلدی پڑھائی جاتی ہیں اگر وہی قرأت آٹھ رکعات میں آہستہ آہستہ پڑھ کر ختم کی جائے تو کیا اس سے کفایت ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ سُنتِ ختمِ قرآن تو ادا ہو جائے گی مگر تراویح کی سُنت ادا نہ ہو گی وہ

---

[1] قال ابن نجیمؒ: والجمھور علی ان السنة الختم مرة... الخ۔ ومرتین فضیلة وثلاث مرات فی کل عشرة مرة افضل۔ (البحر الرائق ج۲ ص۶۸)

ومثله فی الھندیة ج۱ ص۱۱۷ الباب التاسع فی النوافل۔ فصل فی التراویح۔

بیس رکعات پڑھانے سے ادا ہو گی۔

قال عبداللہ بن عمر النسفیؒ: وسن فی رمضان عشرون رکعۃ بعد العشاء قبل الوتر وبعدہ بجماعۃ والختم مرۃ بجلسۃ بعد کل اربع بقدرھا۔[1]

(کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۲ ص۶۶ فصل فی التراویح)

آٹھ رکعات تراویح پڑھنے اور پڑھانے کا حکم

سوال:۔ کیا آٹھ رکعات تراویح پڑھنے اور پڑھانے والا فاسق اور بدعتی ہے یا نہ؟

الجواب:۔ بیس رکعات تراویح باجماعِ امت وبمواظبت خلفاء الراشدین سُنت مؤکدہ ہیں لہٰذا بغیر عذر شرعی بیس رکعت کو چھوڑ کر آٹھ رکعات تراویح پڑھنا موجبِ ملامت ہے جبکہ بیس رکعات کا منکر ضال اور مضل ہے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: فقیام رمضان بعشرین رکعۃ والوتر ھو السنۃ المؤکدۃ یضلل تارکھا ویلام من نقص عنھا۔ (اعلاء السنن ج۷ ص۷۳ کیفیۃ القرأۃ فی التراویح)[2]

ختمِ قرآن کا سنت ہونا تراویح کی نماز کے ساتھ خاص ہے

سوال:۔ (۱) زید اور بکر دونوں حافظِ قرآن ہیں اور دونوں ایک ہی مسجد میں تراویح کی نماز میں قرآن مجید سنانا چاہتے ہیں، تو کیا ان کے لیے یہ درست ہے کہ پہلی دس رکعات نماز تراویح میں زید اپنی منزل (سوا پارہ) تلاوت کرکے سنادے، اور باقی دس رکعات

---

[1] قال ابن عابدینؒ: تحت قولہ وھی عشرون رکعۃ ھو قول الجمھور وعلیہ عمل الناس شرقاً وغرباً۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۵ باب النوافل والتراویح)

وَمِثْلُہٗ فی رسائل الارکان ص۱۳۸ فصل فی التراویح۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: التراویح سنۃ مؤکدۃ لمواظبۃ الخلفاء الراشدین للرجال والنساء..... وھی عشرون رکعۃ۔ قال ابن عابدینؒ تحت عشرون) ھو قول الجمھور وعلیہ عمل الناس شرقاً وغرباً۔ (رد المحتار والدر المختار ج۲ ص۴۳،۴۵ باب التراویح)

قال العلامۃ ابن عابدین: تارکھا یستوجب اساءۃ ای التضلیل واللوم۔ (رد المحتار ج۱ ص۴۷۴ باب صفۃ الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۱۷ باب قیام رمضان۔ ومنحۃ الخالق علی البحر الرائق ج۱ ص۳۰۲ باب صفۃ الصلوٰۃ

ہیں بکر اپنی منزل پڑھے، یوں ایک مسجد میں دو ختم قرآن ہو جائیں گے؟

(ب) زید تراویح کی نماز میں قرآن مجید سناتا ہے جبکہ بکر فرض اور وتر کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا چاہتا ہے تاکہ دو ختم کرلیں، شرعاً ان دونوں صورتوں میں کون سی درست ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلی صورت جائز ہے اور دوسری صورت خلافِ سُنّت ہے کیونکہ تراویح میں قرآن مجید کا ختم کرنا سُنت ہے، وتر یا فرائض میں یہ حکم نہیں، خاص کر یہ حکم اس صورت میں ہوگا جبکہ تطویلِ قرأت لوگوں کے لیے باعثِ زحمت ہو۔

قال الحصکفیؒ: والختم مرة سنة و مرتين فضيلة وثلاثاً افضل۔ وقال ابن عابدینؒ: تحت هٰذه العبارة ای قرأة الختم فی صلوٰة التراويح سنة۔ وصححه فی الخانية وغيرها وقال بعد اسطر لكن فی الخانية وغيرها ما يفيد تخصيص التراويح)۔ (الدرالمختار ورد المحتار جلد ۲ ص۴۶ مبحث صلوٰة التراویح)[له]

تراویح میں کئی بار قرآن ختم کرنے کا حکم

سوال:- ایک حافظ کسی مسجد میں ایک دفعہ ختم کرنے کے بعد کسی دوسری مسجد میں ختم کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- ہاں کرسکتا ہے، کیونکہ امام اور مقتدیوں سب کے لیے نمازِ تراویح سُنت ہے اس میں اقتداء المثل بالمثل ہے، لہٰذا مقتدیوں کی اقتداء درست ہے، اور یہ بات کہ ختم قرآن، امام کے حق میں دوبارہ کسی قوم کے لیے پڑھنا فضیلت کے درجہ میں ہے اور مقتدیوں کے حق میں سُنت ہے۔

علاوہ ازیں اقتداء سے پہلے قرأت نہ امام پر اور نہ مقتدیوں پر لازم ہے، اقتداء کرنے کے بعد امام پر بقدر ما تجوز به الصلوٰة فرض ہے اور اب امام جتنی قرأت بھی پڑھے حتیٰ کہ دو ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کردے امام اور مقتدیوں کی سنت ادا ہو جاتی ہے۔ **حاصل** یہ ہوا کہ حافظ کو دوسری مسجد میں قرآن ختم کرنے سے مقتدیوں کے مسنون ختم پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

وفی خزانة الروايت: قد روی بعض اهل العلم عن كنز الفتاوی رجل أمّ قوماً

له قال العلامة قاضی خان: ولو قرأ بعض القرآن فی سائر الصلوٰة بان كان القوم يملون من القرأة فی التراويح فلا بأس به لكن يكون لهم ثواب الصلوٰة لا ثواب الختم وقد ذكرنا ان السنة هی الختم فی التراويح۔ (الفتاوى القاضی خان على هامش الهندية جلد ۱ ص۲۳۸ فصل فی مقدار القرأة فی التراويح)

ومِثلُهُ رسائل الاركان ص۱۳۷ فصل فی التراويح۔

فی التراویح وختم فیہا ثم اَمّ قوماً آخرین لہ ثواب الفضیلۃ ولہم ثواب الختم ۔
(مجموعۃ الفتاوٰی ج ۱ ص۲۲۴ باب التراویح) لہ

تراویح کی دو رکعات فاسد ہونے سے مسنون ختم ادا نہیں ہوتا

سوال :۔ اگر ایک شخص نے تراویح میں قرآن سنا دیا ہو، دو رکعات میں قرآن مجید کا معتد بہ حصہ پڑھ کر اس کی نماز فاسد ہو گئی جس کی وجہ سے دوبارہ یہ دو رکعات ادا کرنی پڑیں، تو کیا اس فاسد نماز میں پڑھی ہوئی تلاوت کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب :۔ فاسد نماز میں جو قرأت کی گئی ہو اس کا ختم قرآن میں اعتبار نہیں ہوگا، اس کے لیے چاہیئے کہ یہ قرأت دوبارہ کی جائے ورنہ ختم قرآن ناقص رہے گا۔

وفی الہندیۃ واذا فسد الشفع وقد قرأ فیہ لا یعتد بما قرأ فیہ ویعید القرأۃ لیحصل لہ الختم فی الصلوٰۃ الجائزۃ۔ قال بعضہم یعتد بہا کذا فی الجوھرۃ۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۱۸ فصل فی التراویح) ۲ ہ

ختم قرآن میں بسم اللہ پر جہر کا حکم

سوال :۔ تراویح میں ختم قرآن مجید کی کسی سورت پر ایک دفعہ جہراً بسم اللہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ یا تمام سورتوں کی ابتداء میں اخفاء ضروری ہے؟

الجواب :۔ احناف کے نزدیک سورۃ النمل کی آیت بسم اللہ کے علاوہ بسم اللہ پورے قرآن مجید سے مستقل آیت ہے جو سورتوں کے درمیان فاصلہ اور فرق کے لیے نازل ہوئی،

لہ قال الشیخ ظفر احمد العثمانی: وسن ختم القرآن فیہا ای مرۃ فی الشہر علی الصحیح وھو قول الاکثر۔ قال الطحطاوی ومرتین فضیلۃ وثلاثۃ فی کل عشرۃ مرۃ افضل اھ قلت والاطلاق یدل علی فضیلۃ الختم ثلاثا مطلقاً سواء کان فی مسجد واحد او فی ثلاث مساجد فی کل مسجد مرۃ۔ (امداد الاحکام ج ۱ ص۶۲۰ باب التراویح)
وَمِثْلُہٗ فی کفایت المفتی ج ۳ ص۳۶۵ باب التراویح۔

۲ہ قال شیخ الاسلام ابوبکر الحدار: واذا فسد الشفع وقد قرأ فیہ لا یعتمد بما قرأ فیہ ویعید القرأۃ لیحصل لہ الختم فی الصلوٰۃ الجائزۃ قال بعضہم یعتد بہا۔
(الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۱۸ باب قیام رمضان)۔

خصوصی طور پر کسی ایک سورۃ کا جزء نہیں، لیکن قرآن سے نفس آیت ہونے کی وجہ سے کسی ایک مقام پر بسم اللہ پر جہر کرنا ضروری ہے تاکہ قرآن مجید کا کوئی حصہ بغیر جہر کے نہ رہے، بنابریں صورت اگر کسی ایک سورت کے سامنے بسم اللہ پر جہر نہ کی جائے تو سامعین کے حق میں قرآن کا ختم ایک آیت سے ناقص سمجھا جائےگا۔ تاہم اگر یہ سورت کے ابتداء میں سرًا پڑھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (لا تسن (بین الفاتحة والسورة مطلقاً) ولو سریة ولا تکرہ اتفاقاً وما صححه الزاهدی من وجوبها ضعفه فی البحر (وهی آیة) واحدة (من القرآن) کله (انزلت للفصل بین السور) فما فی النمل بعض آیة اجماعاً (ولیست من الفاتحة ولا من کل سورة فی الاصح. (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۶۲ مطلب قرأة البسملة بین الفاتحة والسورة حسن)[1]

رمضان المبارک کے علاوہ دیگر مہینوں میں باجماعت نفل نماز میں ختم قرآن کرنے کا حکم

سوال:۔ رمضان المبارک کے علاوہ دیگر مہینوں میں باقاعدہ نفل نماز میں شبینہ یعنی ختم قرآن کرانے کا کیا حکم ہے؟ اور ایسی حالت میں رمضان کی طرح وتر باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: رمضان المبارک کے علاوہ دیگر مہینوں میں نفل نماز کے لیے باقاعدہ جماعت کا اہتمام ہمارے مسلک (احناف) کے قواعد سے موافق نہیں، ایسی حالت میں شبینہ کے لیے لوگوں کو جمع کرکے تراویح کی طرح نفل نماز میں قرآن کریم سننا کراہت سے خالی نہیں۔ تاہم اگر انفرادی طور پر ایک شخص نفل نماز میں قرآن کی تلاوت کا اہتمام کرے یا بغیر کسی اہتمام اور تداعی کے کسی نفل نماز میں ایک یا دو آدمی کسی حافظ قرآن کی اقتداء کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جبکہ وتر کی نماز رمضان کے علاوہ دوسرے اوقات میں جماعت سے علیٰ سبیل التداعی پڑھنا مکروہ ہے

---

[1] قال الامام ابو بکر الجصاص الرازیؒ: فالاولیٰ ان تکون آیة تامة من القرآن من غیر سورة النمل لان التی فی سورة النمل لیست بآیة تامة والدلیل علیٰ انها آیة تامة حدیث ابن ابی ملیکة عن ام سلمةؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قرأ فی الصلوٰة فعدّها آیة۔

(احکام القرآن ج۱ ص۱۲ فصل اما القول فی انها آیة اولیست آیة)

وقال ایضاً وان قرأها مع کل سورة فحسن۔ (احکام القرآن ج۱ ص۱۴)

ومثله فی معارف السنن ج۲ ص۲۶۲ باب ما جاء ترک الجهر ببسم اللہ الخ

البتہ اگر ایک دو آدمی بغیر کسی التزام یا تداعی کے وتر با جماعت ادا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

قال ابن نجیم المصریؒ: ولو صلوا الوتر بجماعة فی غیر رمضان فھو صحیح مکروہ کالتطوع فی غیر رمضان بجماعة وقیدہ فی الکافی بان یکون علی سبیل تداعی۔ اما لو اقتدی واحد بواحد او اثنان بواحد لا یکرہ۔ واذا اقتدی ثلاثة بواحد اختلفوا فیہ وان اقتدی اربعة بواحد کرہ اتفاقاً۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۷ باب الوتر والنوافل) [1]

تراویح با جماعت ادا کرنا سنت کفایہ ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! تراویح کی نماز الگ پڑھی جائے یا جماعت کے ساتھ ادا کی جائے؟ اگر کوئی شخص جماعت کے ساتھ ادا نہیں کرتا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تراویح کی نماز بذاتِ خود سنتِ مؤکدہ ہے لیکن جماعت کے ساتھ پڑھنا سنتِ کفایہ ہے، اگر محلے کے چند افراد اس سنت کو جماعت کے ساتھ ادا کریں تو سب کا ذمہ فارغ ورنہ سب گنہگار ہوں گے، اگر کوئی شخص انفرادی طور پر نمازِ تراویح پڑھے تو اس سے سُنت تو ادا ہو جائے گی مگر جماعت کے ثواب سے محروم رہے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: والجماعة فیھا سُنة علی الکفایة فی الاصح فلو ترکھا اھل مسجد اثموا الا لو ترک بعضھم وکل ماشرع بجماعة فالمسجد فیہ افضل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۵ باب النوافل) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان۔ ای یکرہ ذٰلک لو علی سبیل التداعی بان یقتدی اربعة بواحد۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۸ بحث صلوٰة التراویح)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۱ ص۴۰۹ فصل فی قیام رمضان۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: والجماعة فیھا سنة علی الکفایة الخ افاد ان اصل التراویح سنة عین فلو ترکھا واحد کرہ بخلاف صلاتھا بالجماعة فانھا سنة کفایة فلو ترکھا الکل اَسَاءُوْا اما لو تخلف عنھا رجل من افراد الناس وصلّی فی بیتہ فقد ترک الفضیلة۔

(رد المحتار ج ۲ ص۴۵ باب النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۶۸ باب النوافل۔

صلوٰۃ التراویح آٹھ رکعت ہیں یا بیس؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین صلوٰۃ التراویح کی مقدار کے متعلق کہ اس کی تعداد آٹھ رکعت ہے یا بیس رکعت؟ بعض غیر مقلدین حدیث عائشہ صدیقہؓ کی بناء پر جو کہ بخاری شریف وغیرہ میں مروی ہے، آٹھ رکعات کو سنت قرار دیتے ہیں اور بیس رکعات کا انکار کرتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:- واضح رہے کہ ماہ رمضان المبارک میں نماز تراویح پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ کما صرح بہ فی الھندیۃ وشرح التنویر و مراقی الفلاح والجوھرۃ من کتب الحنفیۃ۔ وفی الروضۃ والتوشیح من کتب الشافعیۃ، والشرح الکبیر من کتب المالکیۃ، والروض ونیل المآرب من کتب الحنابلۃ۔

البتہ نماز تراویح کے عدد میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس نماز کا عدد بیس رکعات ہے۔

کما صرح بہ فی البدائع وغیرہ من کتب الحنفیۃ و فی المجموع من کتب الشافعیۃ وھی روایۃ عن مالک کما فی شرح المھذب، واختارہ ابوعمر ابن عبدالبر المالکی کما فی شرح التقریب، وذکرہ ابن رشد فی البدایۃ عن احمد، ورواہ ابن قدامۃ فی المغنی عن احمد۔

اور ابن قاسم نے مدونہ میں امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ تراویح ۳۶ رکعات ہیں اور وتر تین رکعات ہیں۔ اور امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی خاص عدد کے قائل نہیں ہیں اُن کے نزدیک اس میں توسع ہے، آٹھ رکعات، بیس رکعات، چھتیس رکعات تمام کی تمام جائز ہیں۔ اور حنفیہ کے مشائخ میں سے علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ آٹھ رکعات سنتِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے مؤکدہ ہیں اور بیس رکعات سنت خلفاء راشدین ہونے کی وجہ سے سنتِ زائدہ ہیں۔ بہرحال ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین میں سے کسی نے بھی آٹھ رکعات سے زائد (مثلاً بیس رکعات) کو بدعت یا مکروہ قرار نہیں دیا ہے۔

البتہ بعض غیر مقلدین نے آٹھ رکعات کو مسنون قرار دیا ہے اور اس سے زائد تعداد پر انکار کیا ہے اور اس مسئلہ کو، طلاقِ ثلاثہ کو ایک طلاق قرار دینے کے مسئلہ کی طرح بے علم اور کم علم لوگوں کے شکار کا دام بنا رکھا ہے۔ اعاذنا اللہ من شر الفرق الشاذۃ المخالفۃ عن السواد الاعظم۔

یہ غیر مقلدین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے تمسک کرتے ہیں۔

وھو ما رواہ البخاری ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ۔ "یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو رمضان المبارک میں گیارہ رکعت پر اضافہ فرماتے تھے اور نہ غیر رمضان میں"۔ (بخاری ج ۱ ص۱۵۴ کتاب التھجد)

نیز یہ لوگ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے حجت پکڑتے ہیں:

وھو ما رواہ ابن خزیمۃ وابن حبان انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام بھم فی رمضان فصلی ثمانی رکعات ووتر۔ "(یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہؓ کے ساتھ) رمضان میں قیام فرمایا اور آٹھ رکعات نماز ادا فرمائی اور وتر بھی پڑھے")۔ قال النیمویؒ مدارہ علی عیسی بن جاریۃ۔ قال الذھبیؒ قال ابن معینؒ عندہ مناکیر۔ وقال النسائیؒ منکر الحدیث۔ وعنہ ایضاً متروک۔ وقال ابو زرعۃ لا بأس بہ۔ وقال فی الخلاصۃ وثقہ ابن حبان۔ وقال ابو داؤد منکر الحدیث۔ انتھی

نیز یہ لوگ سائب بن یزید کی حدیث سے تمسک کرتے ہیں:

وھو ما رواہ مالک فی الموطا۔ انہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیما الداری ان یقوما للناس باحدی عشرۃ رکعۃ۔

اور جمہور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں:۔

وھو ما رواہ ابن ابی شیبۃ والطبرانی والبیھقی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ سوی الوتر۔ انتھی "(یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں سوائے وتر کے بیس ۲۰ رکعات نماز ادا فرمایا کرتے تھے")۔ قال الزیلعیؒ ھو معلول بابی شیبۃ وھو متفق علی ضعفہ۔

اور اس حدیث کے معلول ہونے کے باوجود اس سے استدلال درست ہے کیونکہ اس حدیث کی امت نے تلقی کی ہے۔ اور امام ابن قیمؒ اور امام سیوطیؒ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ جس حدیث کی امت تلقی کرے تو اس کو صحیح قرار دیا جائے گا اگرچہ وہ حدیث سنداً غیر صحیح ہو۔ نیز اس حدیث کو خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے عظیم تائید اور تقویت حاصل ہوئی ہے۔

نیز جمہور امام بیہقیؒ کی "سنن کبریٰ" کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

وھو ما رواہ یزید بن خصیفۃ عن السائب بن یزید قال کانوا یقومون علی عھد عمر بن الخطاب فی رمضان عشرین رکعۃ

وفی عہد عثمان وعلی[1]

اس حدیث سے واضح طور سے ثابت ہوتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ راشدین کے دور میں بیس رکعات پر استقرار آیا ہے اور اس پر تعامل اور توارث رہا ہے" اور حدیث علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ (رواہ ابن ماجہ وغیرہ) کی بنا پر جیسا کہ سنت رسول کا اتباع ضروری ہے اسی طرح سنت خلفاء راشدین کا اتباع بھی ضروری ہے اور اس سے اعراض یا اس پر اعتراض، حدیث رسول اور قول رسول سے اعراض اور اس پر اعتراض ہے۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

نیز یہ سنت خلفاء راشدین وہ سنت ہے جس کا ادراک عقل اور اجتہاد سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی چیز کا عدد اور مقدار فکر اور رائے سے متعین نہیں ہوسکتا تو ایسی سنت درحقیقت سنت رسول ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اہل ظاہر نے اس حدیث کو سنداً اور متناً معلول قرار دیا ہے، کیونکہ امام آجری نے امام ابوداؤدؒ سے روایت کیا ہے کہ امام احمدؒ نے یزید بن خصیفہ کو منکر الحدیث کہا ہے، نیز اہل ظاہر کہتے ہیں کہ یہ حدیث متناً مضطرب ہے" اس کی بعض روایات میں گیارہ رکعات پڑھنا بھی مروی ہے۔ کما رواہ مالک فی الموطا۔ نیز یہ حدیث حدیث عائشہ صدیقہؓ سے معارض ہے جو کہ اس حدیث سے قوی ہے۔

جمہور نے ان اعتراضات کے اہل ظاہر کو دنداں شکن جوابات دیئے ہیں۔ اوّل یہ کہ ائمہؒ نے اس حدیث کی تلقی کی ہے اور اس پر اخذ کیا ہے، اور خطیبؒ نے اپنی کتاب الفقیہ والمتفقہ میں اور ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں اور علامہ سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں اور ابن عبدالبرؒ نے استذکار میں اور دیگر اہل فن نے اپنی تالیفات میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس حدیث کی اہل علم تلقی کریں تو یہ تلقی اس حدیث کی صحت کی شہادت عادلہ ہے۔

دوم یہ کہ یزید بن خصیفہؒ مشہور تابعی ہے اور اس سے امام مالکؒ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے" ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے، یحییٰ بن معینؒ، ابوحاتمؒ، نسائیؒ، ابن سعدؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ کما فی تہذیب التہذیب، وتہذیب الکمال للمزی، والہدی الساری" اور حافظ ابن حجرؒ نے الہدی الساری میں آجری کی روایت کا یہ جواب دیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اثرم کی روایت میں اس کو ثقہ کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ امام احمدؒ اس راوی کو منکر الحدیث کہتے ہیں کہ وہ اپنے اقران میں کسی حدیث کی روایت کرنے میں منفرد ہو اور یہ

---

[1] حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اوّلاً ۱۳ رکعات نماز پڑھی جاتی تھی پھر حضرت عمرؓ نے ۲۳ رکعات پڑھنے کا حکم دیا، ۲۰ تراویح اور ۳ وتر، بعد میں اسی پر استقرار ہوا۔

قاعدہ مسلمہ ہے کہ ثقہ راوی کا تفرد مقبول ہوتا ہے جب تک دلیل سے اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو پس اسی بناء پر یزید بن خصیفہ کی حدیث مقبول ہو گی۔

اور دعویٰ اضطراب کا جواب یہ ہے کہ ابن عبدالبر اور ابوبکر بن العربی نے روایت احدیٰ عشر کو امام مالکؒ کا وہم قرار دیا ہے لیکن چونکہ عبدالعزیز بن محمد اور یحییٰ بن سعید القطان امام مالکؒ کے متابع ہیں، کما لا یخفی علیٰ من راجع الی سنن سعید بن منصور و مصنف ابن ابی شیبہ لہٰذا امام مالکؒ کا وہم میں پڑنا ناقابل تسلیم ہے۔

اور حافظ ابن حجرؒ نے اس اختلاف کو اختلاف اوقات پر محمول کیا ہے یعنی جب طویل قرأت کرتے تو آٹھ یا بارہ رکعات پڑھتے اور جب مختصر قرأت کرتے تو بیس رکعات پڑھتے۔ کما فی فتح الباری۔
اور بعض ائمہ نے اس اختلاف کو ترویج پر محمول کیا ہے، یعنی اولاً آٹھ یا بارہ رکعات پڑھی جاتی تھیں اور بالعاقبت بیس پر استقرار ہوا۔ کما قال الشعرانی فی کشف الغمۃ کانوا یصلونہا فی اول زمان عمر ثلث عشر رکعۃ ثم عمر امر بفعلہا ثلاثا وعشرین رکعۃ، ثلاث لہا وتر، واستقر الامر علیٰ ذلک.   قالہ النیموی۔ کما استقر الامر فی خلافتہ علیٰ ضرب الثمانین فی الخمر وکما استقر الامر علی النہی عن بیع امہات الاولاد وکما استقر الامر علیٰ اربع تکبیرات الجنائز وکما استقر الامر علی القرأۃ فی خلافۃ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کما فی الاوجز۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ ترجیح اور تطبیق سے اضطراب ساقط ہو جاتا ہے۔

اور اہل ظاہر کے اس اعتراض کا کہ یزید کی حدیث حدیث عائشہؓ سے معارض ہے جو کہ اقوی ہے، جواب یہ ہے کہ حدیث یزید اور حدیث عائشہ صدیقہؓ میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حدیث عائشہؓ میں ان رکعات سے نماز تہجد مراد ہے نہ کہ قیام تراویح اور قیام رمضان، کیونکہ غیر رمضان میں تراویح نہیں پڑھی جاتیں، اور عندالتحقیق تراویح اور تہجد الگ الگ حقائق ہیں، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تراویح اور تہجد الگ الگ نمازیں نہیں ہیں تو اہل ظاہر کو کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث میں بھی اختلاف ہے کیونکہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں باب ما یقرء فی رکعتی الفجر کے تحت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے تیرہ رکعات کی حدیث روایت کی ہے۔

ولفظہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی باللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ ثم یصلی اذا سمع النداء بالصبح رکعتین۔

اس اختلاف اور تعارض کا اہل ظاہر کیا جواب دیتے ہیں؟

اگر اہلِ ظاہر یہ جواب دیں کہ احدیٰ عشر والی حدیث غالب پر محمول ہے اور زیادت بعض اوقات پر محمول ہے تو ان اہلِ ظاہر کا آٹھ رکعات پر جمود باطل ہوا اور خود اپنی تلوار سے قتل ہوئے، اور اگر اہلِ ظاہر اس تطبیق سے اعراض کریں تو اختلاف کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رض کی دونوں روایات ساقط ہوئیں اور یزید بن خصیفہ کی حدیث بلا تعارض رہ گئی اور واجب العمل ہوئی۔

واضح رہے کہ جمہور کا مسلک نظر اور شواہد کی رو سے بھی قوی ہے کیونکہ دن رات میں بیس رکعات فرائض اعتقادیہ اور فرائض عملیہ ہیں تو مناسب یہ ہے کہ تراویح بھی جو کہ فرائض کے مکملات ہیں بیس رکعات ہیں جیسا کہ سنن قبلیہ اور بعدیہ بھی بیس رکعات ہیں۔

اہلِ ظاہر کے دلائل کے جوابات یہ ہیں کہ حدیثِ عائشہ صدیقہ رض تہجد پر محمول ہے نہ کہ تراویح پر، نیز غالب پر محمول ہے نہ کہ دائم پر، ورنہ حضرت عائشہ صدیقہ رض کی روایات متعارض ہوں گی، بلکہ امام احمد نے زیادات مسند میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسنادِ حسن سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سولہ رکعات نفل پڑھتے تھے، نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ابتداء پر محمول ہے جبکہ بیس رکعات پر استقرار نہ ہوا تھا۔

اور حدیثِ جابر رض سے حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے: لأنه فعل جزئي في ليلة واحدة لا يدل على نفي الزيادة تلك الليلة -

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ابتداء الامر پر محمول ہے۔ وقد مر سابقا جواب حديث السائب -

واضح رہے کہ ابن الہمام سے دیگر مشائخ نے اتفاق نہیں کیا کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں بیس رکعت پڑھنا فعلِ رسول سے ثابت ہے، نیز حدیث عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين میں لفظ عليكم سنتِ رسول اور سنتِ خلفاء کو یکساں متوجہ ہے، تو دونوں میں فرق کرنا سمجھ سے بالا ہے، نیز یہ سنتِ خلفاء اگرچہ ظاہراً موقوف ہے لیکن درحقیقت مرفوع ہے۔

بعد من كونه مدركا بالرأي والقياس وهو الموفق والهادي۔

وصلى الله تعالىٰ على سيدنا
خير خلقه محمد وآله
واصحابه واتباعه اجمعين۔

باب ادراک الفریضۃ

(جماعت میں ملنے کے احکام و مسائل)

صرف اقامت سننے ہی نماز نہ توڑے

سوال:- ایک شخص نے نفل کی نیت باندھ کر نماز شروع کی ہی تھی کہ مؤذن نے جماعت کیلئے اقامت شروع کردی، تو کیا یہ شخص نفل نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے یا نفل نماز پوری کرے؟

الجواب:- جماعت میں شرکت واجب ہے لہٰذا متنفل کو چاہیئے کہ جماعت فوت ہو جانے کی وجہ سے نفل توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے تاہم صرف مؤذن کی اقامت سننے کی صورت میں دو رکعت پورا کرنے سے قبل نماز نہ توڑے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: شرع فیہا اداء..... منفرداً ثم اقیمت ای شرع فی فریضۃ لا اقامۃ المؤذن ولا الشروع فی مکان وھو فی غیرہ یقطعہا لعذر احراز الجماعۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۵۰ باب ادراک الفریضۃ)[1]

جماعت ملنے کی اُمید پر فجر کی سنتیں پہلے پڑھنے کا حکم

سوال:- صبح کی نماز باجماعت ہو رہی ہو اور مسجد کے صحن میں کوئی مستقل جگہ سنت پڑھنے کے لیے نہ ہو جبکہ امام کی قرأت بھی سنائی دیتی ہو تو ایسی حالت میں سنت پڑھنا ضروری ہے یا جماعت کے ساتھ شریک ہو کر سنت ترک کرنا چاہیئے؟

الجواب:- فجر کی سنتوں کی احادیث میں بہت تاکید وارد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تدعوھما ان طردتکم الخیل۔ (ابوداؤد ج۱ ص۱۸۶ فی باب فی تخفیفھما) اس لیے حتی الامکان سنت پڑھنے کی کوشش کی جائے اور جماعت میں شریک ہونے سے قبل کسی علیحدہ جگہ سنتیں پڑھی جائیں، جب تک جماعت میں دوسری رکعت کے رکوع کا ادراک ممکن ہو تو سنتیں ترک نہیں کی جائیں گی، اگرچہ بعض نے تشہد کے ادراک کے ممکن ہونے کا قول کیا ہے جبکہ ابن الہمام کے

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: اذا شرع المصلی فی اداء الفرض او قضائہ منفرداً او فی نفل..... فاقیمت الجماعۃ فی محل ادائہ..... قطع بتسلیمۃ قائماً و بعدہ اقتدیٰ علی الصحیح۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۶۵ باب النوافل)

قول کے مطابق قبل سلام تک ادراک کی امید ہو تو سنت پڑھی جائیں گی۔ تاہم اگر مسجد کے اندر جگہ نہ ہو تو دروازہ کے قریب پڑھنی چاہئیں۔

قال الحصکفیؒ: واذا خاف فوت رکعتی الفجر لاشتغاله بسنتها ترکها لکون الجماعة اکمل۔ والا بان رجاء ادراك رکعة فی ظاهر المذهب وقیل التشهد۔ واعتمده المصنف والشرنبلالی تبعاً للبحر لکن ضعفه فی النهر لا یترکها بل یصلیها عند باب المسجد ان وجد مکاناً والا ترکها۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار جلد۲ ص۵۶ باب ادراك الفریضة، مطلب هل الاساءة دون الکراهة الخ) [1]

فجر کی سنتوں کی قضاء کا حکم

سوال:۔ اگر فجر کی سنت فرض نماز کی وجہ سے فوت ہو جائیں تو فرض نماز کے بعد ادا کرنی چاہئیں یا طلوعِ آفتاب کے بعد؟ بعض علماء سے سنا ہے کہ اس کا سرے سے اعادہ ہے ہی نہیں؟

الجواب:۔ صبح کی سنتوں کی اہمیت اور تاکید متعدد روایات سے ثابت ہے، بہتر یہ ہے کہ حتی الامکان فرض نماز سے قبل پڑھی جائیں، البتہ اگر کسی سے بصورتِ مجبوری ترک ہو جائیں تو فرض نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک باتفاقِ علماءِ احناف قضاء نہیں کی جائیں گی، البتہ طلوعِ آفتاب کے بعد اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے ہاں قضاء نہیں جبکہ امام محمدؒ کے ہاں بحکم نفل قضاء کرنا افضل ہے، طلوعِ آفتاب کے بعد فرض کی تبعیت میں یہ دو رکعت ادا کی جاسکتی ہیں۔

قال ابن نجیم المصریؒ: لم تقض سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفرض فتقضی تبعاً للفرض سواءً قضاها مع الجماعة او وحده لان الاصل فی السنة ان لاتقضی لاختصاص القضاء بالواجب۔

والحدیث ورد فی قضائهما تبعاً للفرض فی غداة لیلة التعریس فبقی ماوراءه

---

[1] قال برهان الدین المرغینانیؒ: ومن انتهی الی الامام فی صلوٰة الفجر وهو لم یصل رکعتی الفجر ان خشی ان تفوته رکعة ویدرك الاخری یصلی رکعتی الفجر عند باب المسجد ثم یدخل لانه امکنه الجمع بین الفضیلتین وان خشی فوتهما دخل مع الامام لان ثواب الجماعة اعظم والوعید بالترك الزم بخلاف سنة الظهر الخ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج۱ ص۴۱۲ باب ادراك الفریضة)

على الاصل۔ فافاد المصنف انها لا تقضىٰ قبل طلوع الشمس اصلاً ولا بعد طلوع اذا كان قد أدى الفرض وشمل كلامه ما اذا قضاهما بعد الزوال او قبله ولا خلاف فى الثانى۔ واختلف المشائخ فى الاوّل على قولهما والصحيح كما فى غاية البيان انها لا تقضىٰ تبعاً۔ لان النص ورد بقضائها فى الوقت المهمل بخلاف القياس وما ورد على خلاف القياس فغيرہ عليه لا يقاس۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۷۴ باب ادراك الفريضة) [1]

چار رکعات ظہر کی سنت رہ جانے کی صورت میں آخری دو رکعات سنت سے ترتیب کا مسئلہ

سوال:۔ اگر ایک شخص سے ظہر کی پہلی چار رکعات سنت فوت ہوجائیں تو فرض پڑھنے کے بعد دو رکعات سنت پڑھتے کے وقت ترتیب کیسے ہونی چاہیئے؟ کیا چار رکعت سنت پہلے پڑھی جائیں گی یا آخری دو رکعات کو مقدم کرے؟

الجواب:۔ جواز میں دونوں صورتیں برابر ہیں البتہ افضلیت میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کی تحقیق کو مدِنظر رکھ کر دو رکعات سنتیں پہلے پڑھنی چاہئیں، کیونکہ چار رکعات سنت کے فوت ہونے کی وجہ سے دو رکعات تو کم از کم اپنے مقام پر رہیں، ورنہ بصورتِ دیگر دونوں سنن کی ادائیگی اپنے مقام پر نہیں رہے گی۔

قال الحصكفیؒ: ثمّ يأتى بها (اى على سنة الظهر القبلية) على انها سنة فى وقته (اى الظهر) قبل شفعه عند محمدؒ وبه يفتى۔

قال ابن عابدينؒ تحت هٰذه العبارة: اقول وعليه المتون لكن راجح فى الفتح تقديم الركعتين قال فى الامداد وفى فتاوى العتابى انه المختار وفى مبسوط شيخ الاسلام انه الاصح لحديث عائشةؓ عليه الصلوٰة والسلام اذا فاتت الاربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين وهو قول ابى حنيفة

---

[1] قال الحصكفیؒ: ولا يقضيها (اى سنة الفجر) الا بطريق التبعية لقضاء فرضها قبل الزوال لا بعده فى الاصح لورود الخبر بقضائها فى الوقت المهمل بخلاف القياس فغيره عليه يقاس۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص ۵۷ باب ادراك الفريضة)

^1 كذا فى جامع قاضی خان۔ (الدر المختار ورد المحتار ج ۲ ص ۵۸ باب ادراك الفريضة)

جمعہ کے دوگانہ فرض سے قبل چار رکعت سُنتوں کا حکم

سوال: نماز جمعہ سے پہلے چار رکعات سنت رہ جانے کی صورت میں نماز جمعہ کے پڑھنے کے بعد فوت شدہ سنن کی قضاء پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ سننے میں آیا ہے کہ بعض لوگ اس کی قضاء کے قائل ہیں اور کچھ لوگ انکار کر رہے ہیں۔ از رُوئے شرع مفتیٰ بہ قول کا تعین کریں؟

الجواب: اس مسئلہ میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہی چار رکعت سنت جمعہ پڑھنے کے بعد پڑھی جائیں۔ قال ابن نجیم المصریؒ: وحکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر۔ (البحر الرائق جلد ۲ ص ۵۹) مگر بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ یہ چار رکعت سنت جو جمعہ سے پہلے ہیں جب وہ اپنے وقت سے فوت ہو جائیں تو فرض کے بعد نہیں پڑھی جائیں گی، ابن عابدینؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ظہر کی سُنتوں کے متعلق حضرت عائشہؓ کی روایت موجود ہے، اس بناء پر ظہر کی سُنن قبلیہ فرض نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں مگر جمعہ کی سنن قبلیہ کے متعلق کہیں بھی روایات میں یہ ذکر نہیں کہ وہ جمعہ کے بعد پڑھی گئی ہیں۔ اور اصل

---

^1 قال ابن نجیم المصریؒ: وقضى التي قبل الظهر فى وقته قبل شفعه بيان لشيئين احدهما القضاء والثانى محله اما الاول ففيه اختلاف والصحيح انها تقضى كما ذكره قاضى خان فى شرحه مستدلا بما عن عائشةؓ ان النبى صلى الله تعالى عليه وسلم كان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضاهن بعده۔ وظاهر كلام المصنف انها سنة لا نفل مطلق۔ وذكر قاضيخان انه اذا قضاها فهى لا تكون سنة عند ابى حنيفة وعندهما سنة وتبعه الشارح۔ وتعقبه فى فتح القدير بانه من تصرف المصنفين فان المذكور من وضع المسئلة الاتفاق على قضاء الاربع وانما الاختلاف فى تقديمها او تاخيرها۔ والاتفاق على انها تقضى اتفاق على وقوعها سنة الى آخر ما ذكره۔ واما الثانى فاختلف فيه النقل عن الشيخين فذكر فى الجامع الصغير للحسامى ان ابا يوسفؒ يقدم الركعتين ومحمدؒ يؤخرهما۔ وفى المنظومة وشروحها على العكس۔ وفى غاية البيان ويحتمل ان يكون عن كل واحد من الامامين روايتان۔ ورجح فى فتح القدير تقديم الركعتين لان الاربع فاتت عن الموضع المسنون فلا يفوت الركعتين عن موضعها قصدا بلا ضرورة۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۷۹ باب ادراك الفريضة)

سنتوں میں یہ ہے کہ ان کی قضاء نہ ہو، اس بناء پر جمعہ کی سنتیں فرض نماز کے بعد نہیں پڑھنی چاہئیں۔

قال ابن عابدینؒ: اقول قال شیخنا الشیخ محمد السراجی الحانوتی۔ واما کونہا اھل تقضی اولا فعلی ما قالوہ فی المتون وغیرھا من ان سنۃ الظھر تقضی یقتضی ان تقضی سنۃ الجمعۃ اذ لا فرق لکن فی روضۃ العلماء فی باب من سمع الاذان واذا جاء الرجل الی الجمعۃ فی وقت الامامۃ ھل یصلی اربع رکعات التی یصلیھا قبل الجمعۃ ام لا۔ قال لا یصلی بل یسکت ثم یدخل مع الامام فی صلوٰتہ وسقطت عنہ ھذہ الاربع۔ لما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہ قال اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ اھ ذکرہ فی فتاواہ التی وقعت لہ۔ واللہ اعلم خیر الدین الرملی۔ اقول فی ھذا الاستدلال نظر فانہ یدل علی انھا لا تصلی بعد خروجہ لا علی انھا تسقط بالکلیۃ حتی انھا تقضی بعد فراغہ من المکتوبۃ والا لزم ان لا تقضی سنۃ الظھر ایضاً اذا جاء وجد الامام شارعاً فی الظھر مع انہ ورد النھی عن الصلوٰۃ عند الامامۃ کما فی حدیث الصحیحین وغیرھما اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ نعم قد یقال ان الاصل عدم قضائھا اذا فاتت عن محلھا۔ واما السنۃ الظھر قائماً قالوا بقضائھا لحدیث عائشۃ انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا فاتتہ الاربع قبل الظھر قضاھن بعدہ کما تقدمہ المؤلف فتکون سنۃ الظھر خارجۃ عن القیاس للحدیث المذکور فلا تقاس علیھا سنۃ الجمعۃ فتامل۔ (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ محمد امین الشھیر بابن عابدینؒ: قولہ وکذا الجمعۃ ای حکم الاربع قبل الجمعۃ کالاربع قبل الظھر کما لا یخفی بحر وظاھرہ انہ لم یرہ فی البحر منقولاً صریحاً وقد ذکرہ فی القھستانی لکن لم یعزہ الی احد وذکر السراج الحانوتی ان ھذا مقتضی ما فی المتون وغیرھا لکن قال فی روضۃ العلماء انھا تسقط لما روی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ اقول وفی ھذا الاستدلال نظر لانہ انما یدل علی انھا لا تصلی بعد خروجہ لا علی انھا تسقط بالکلیۃ ولا تقضی بعد الفراغ من المکتوبۃ والا لزم ان لا تقضی سنۃ الظھر ایضاً فانہ ورد فی حدیث مسلم وغیرہ اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ نعم قد یستدل للفرق بینھما بشئ آخر وھو ان القیاس فی السنن عدم القضاء کما مر وقد استدل قاضی خان لقضاء سنۃ الظھر بما عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا فاتتہ الاربع قبل الظھر قضاھن بعدہ فیکون قضاؤھا ثابت بالحدیث علی خلاف القیاس کما فی سنۃ الفجر کما صرح بہ فی الفتح فالقول بقضاء سنۃ الجمعۃ یحتاج الی دلیل خاص وعلیہ فتنصیص المتون علی سنۃ الظھر دلیل علی ان سنۃ الجمعۃ لیست کذلک۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۵۸ باب ادراک الفریضۃ)

اداء کی ہوئی نماز کو دوبارہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص ایک دفعہ فرض، واجب یا سنّت ادا کرلے تو دوبارہ پڑھنے سے اس کی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ جب فرض نماز ایک دفعہ ادا کرلی گئی تو اس سے ذمہ فارغ ہو جاتا ہے دوبارہ پڑھنا کسی سے منقول نہیں، بلکہ حدیث میں ایک فرض کو دو مرتبہ پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ بحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن سلمان بن یسار "یعنی مولٰی میمونۃ" قال اتیت ابن عمرؓ علی البلاط وھم یصلون فقلت الا تصلّی معھم قال قد صلیت انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تصلوا صلوٰۃ فی یوم مرتین۔ (ابوداؤد ج۱ ص۹۳ فی باب اذا صلّی فی جماعۃ ثم یدرک جماعۃ یعید)

البتہ ایک دفعہ انفراداً پڑھ لینے کے بعد جب جماعت میں شرکت کا موقعہ ملے تو ظہر اور عشاء کی نماز میں امام کے ساتھ شرکت بہتر ہے تاکہ جماعت سے مخالفت نہ آئے اور اس کی حیثیت نفل کی ہوگی، لیکن عصر، مغرب اور فجر میں اپنی نماز پر اکتفاء کرے گا، جماعت میں شرکت جائز نہیں، کیونکہ عصر اور فجر کے بعد نفل پڑھنا مشروع نہیں اور مغرب کی نماز میں تین رکعات نفل پڑھنا شرعاً ثابت نہیں، اور اسی طرح وتر نماز کا بھی یہی حکم ہے۔ بناء بریں صورت سنن کا دوبارہ پڑھنا بطریقِ اولیٰ نفل ہے۔

قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لان الفرض لا یتکرر فی وقت واحد وصرح فی الحاوی القدسی ان ما یؤدی مع الامام نافلۃ یدرک بھا فضیلۃ الجماعۃ۔ وقال بعد عدۃ اسطر اما اذا ادّی الامام الفرض والقوم التنفل فلا (یعنی فلا کراھۃ) لقولہ علیہ السلام للرجلین اذا صلیتما فی رحالکما ثم اتیتما صلوٰۃ قوم فصلیا معھم واجعلا صلوٰتکما معھم سبحۃ ای نافلۃ کذا فی الکافی۔

(البحرا لرائق جلد۲ ص۲۷،۷۱ باب ادراک الفریضۃ)

وایضاً قال بعد صفحۃ واحدۃ: والتنفل بعدھا تین الصلاتین ای الظھر والعشاء لیس بمکروہ۔ واَمّا فی الفجر والعصر فلا یکرہ لہ الخروج لکراھۃ التنفل بعدھما۔ واَما فی المغرب فلمّا فیہ من التنفل بالثلاث اَو مخالفۃ الامام

ان اتمّها اربعًا۔ وکل منهما مکروہ کما سبق۔ (البحر الرائق جلد۲ ص۷۳ باب ادراک الفریضۃ)[1]

کسی کے امداد طلب کرنے یا والدین کے بلانے پر نماز توڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر والدین بیٹے کو آواز دیں اور بیٹا فرض یا سنت نماز میں مشغول ہو تو کیا والدین کے بلانے پر بیٹا نماز توڑ سکتا ہے یا نہیں؟ ایسا ہی اگر ایک شخص نماز میں مشغول کسی شخص کو مدد کے لیے بلائے تو یہ شخص تعاون اور امداد کرنے کے لیے اپنی نماز توڑ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر والدین یا اجداد صرف آواز دیں تو تعمیلِ حکم کے لیے نفل نماز توڑنا جائز ہے البتہ بلا ضرورت فرض نماز توڑنے کی اجازت نہیں، جبکہ بصورت استغاثہ (امداد طلبی) کے فرض نماز بھی توڑنا واجب ہے، بلکہ کسی شخص کی امداد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بِن بلائے بھی فرض نماز توڑنا واجب ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولو دعاہ احد ابویہ فی الفرض لایجیبُہٗ الّا ان یستغیث بہ وفی النفل ان عَلِمَ انہٗ فی الصلٰوۃ فدعاہ لایجیبُہٗ والّا اجَابَہٗ۔

وقال ابن عابدینؒ: تحت ھٰذہ العبارۃ ای یطلب منہ الغوث والاعانۃ وظاھرہ ولو فی امرٍ غیر مھلکٍ واستغاثہ غیر الابوین کذٰلک۔ط والحاصل ان المصلّی متٰی سمع احدًا یستغیث وان لم یقصدہ بالنداء او کان اجنبیًّا وان لم یعلم ما حل بہ او عَلِمَ وکان لہٗ قدرۃ علی اعانتہ وتخلیصہ

---

[1] لما قال العلامۃ الحسن بن عمار الشرنبلالی: وان صلی ثلاثًا من رباعیۃ فاقیمت اتمّها اربعًا منفردًا ..... ثم بعد الاتمام اقتدٰی متنفلا ان شاء وھو افضل لعدم الکراھۃ الّا فی العصر والفجر للنھی عن التنفل بعدھما وفی المغرب للمخالفۃ لانہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا صلّیت فی اھلک ثم ادرکت الصلوٰۃ فصلّها الا الفجر والمغرب وقولہ فصلّها یعنی نفلاً لانہٗ اَمَرَ بہ نصًّا لرجلین لم یصلیا معہ الظھر واخبرا بصلاتهما فی رحالهما فقال علیہ السلام اذا صلیتما فی رحالکما ثم اتیتما صلوٰۃ قوم فصلّیا معھم واجعلا صلاتکما معھم سبحۃ ای نافلۃ قال السید احمد الطحطاوی تحت قولہ اقتدٰی متنفلا ان شاء) قال فی البحر عن الحاوی انہ یدرک ھٰذہ النافلۃ فضیلۃ الجماعۃ۔ (الطحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۲۶۶ باب ادراک الفریضۃ)

وجب علیه اعانته وقطع الصلٰوة فرضًا کانت اوغیرہ ۔ [1]

(الدرالمختار و ردالمحتار ج۲ ص۵۱ باب ادراک الفریضۃ وایضًا فی ج۲ ص۲۷)

وتر کی جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد فرض نماز پوری کرنے کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی آدمی چار رکعت فرض نماز کی نیت باندھے، تین رکعت پڑھ چکنے کے بعد وتر نماز کی جماعت کھڑی ہو جائے، تو اب اس آدمی کو کیا کرنا چاہیئے ؟ کیا یہ اپنی نماز پوری کرے یا نماز توڑ کر وتر کی جماعت میں شامل ہو جائے ؟

الجواب :۔ جو شخص وتر کی جماعت سے قبل فرض نماز کے لیے کھڑا ہو جائے اور پھر تین رکعت پڑھنے کے بعد وتروں کی جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ شخص اپنی چار رکعت فرض نماز پوری کرکے پھر نفل کی نیت سے جماعت میں شریک ہو جائے تاہم عصر کی نماز میں ایسا کرنا صحیح نہیں ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ان صلّی ثلاثًا منها ای الرباعیة اتم منفردًا ثم اقتدی بالامام متنفلاً ویدرك بذلك فضیلة الجماعة الا فی العصر فلا یقتدی لکراهة النفل بعده ۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۵۲ باب ادراک الفریضۃ) [2]

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ : وفی فتاوی الولوالجی ۔ اذا دعاه المصلی احد ابویه فلا یجیبه مالم یفرغ من صلٰوته الا ان یستغیث به ۔ لان قطع الصلٰوة لایجوز الا لضرورة وکذلك الاجنبی اذا خاف ان یسقط من سطح او تحرقه النار ویغرقه الماء وجب علیه ان یقطع الصلٰوة هٰذا اذا کان فی الفرض ۔ فاما فی النفل اذا ناداه احد ابَوَیْهِ ان عَلِمَ انه فی الصلٰوة وناداه لا بأس به ان لا یجیبه ۔ وان لم یعلم یُجیبُهٗ اھ

(البحرالرائق ج۲ ص۷۱ باب ادراك الفریضة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۰۹ الباب السابع فی یفسد الصلٰوة ومایتصل بذلك المسائل ۔

[2] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : ان صلی ثلاثا من رباعیة فاقیمت اتمها اربعًا منفردًا حکمًا للاکثر ..... ثم بعد الاتمام اقتدی متنفلاً ان شاء وهو افضل لعدم الکراهة الا فی العصر والفجر ۔ (مراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ص۲۴۶ باب ادراك الفریضة)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۷۱ باب ادراك الفریضة ۔

باب القضاء

(قضا نمازوں کے احکام ومسائل)

صاحبِ ترتیب کی بحالی

سوال: اگر ایک شخص سے اتنی نمازیں قضاء ہوں جن سے یہ صاحبِ ترتیب نہ رہا تو کیا ان نمازوں کی قضاء کر لینے سے یہ شخص دوبارہ صاحبِ ترتیب بن سکتا ہے؟ یا ایک دفعہ ترتیب ساقط ہونے سے دوبارہ صاحبِ ترتیب بننا ممکن نہیں؟

الجواب: صاحبِ ترتیب درحقیقت ایک ایسی صفت ہے کہ اس شخص کے ذمہ شب و روز کی نمازیں باقی نہ ہوں۔ صورت مذکورہ میں قضاء سے چونکہ ذمہ فارغ ہو جاتا ہے لہٰذا پوری نمازیں لوٹانے سے یہ شخص دوبارہ صاحبِ ترتیب متصوّر ہوگا تاہم اگر ذمے پر چھ نمازوں سے کم رہ جائیں تب ہی صاحبِ ترتیب بن جائے گا۔

قال العلامۃ ابن العابدینؒ: وقیل بقضاء البعض لانہ لو قضی الکل عاد الترتیب عند الکل الخ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲ باب قضاء الفوائت) [1]

نفل کی جگہ قضاء نمازیں پڑھنا بہتر ہے

سوال: اگر کسی شخص کے ذمے نامعلوم نمازیں باقی ہوں تو کیا اس شخص کے لیے نوافل پڑھنا بہتر ہے یا قضاء نمازیں؟ جبکہ قضاء نمازوں کی تعداد اور وقت بھی معلوم نہ ہو؟

الجواب: اگرچہ نوافل پڑھنا بذاتِ خود موجبِ برکت اور باعثِ ثواب ہیں لیکن ایسے شخص کے لیے نوافل کی جگہ قضاء نمازوں کا پڑھنا بہتر ہے۔ اگر رکعات اور اوقات کا علم نہ ہو لیکن اجمالی طور پر اتنا معلوم ہو کہ مجھ سے اتنی عمر کی نمازیں فوت ہوئی ہیں تو ہر وقتیہ نماز

---

[1] قال صدر الشریعۃؒ: فانہ لما قضی صلوٰۃ الشہر الا فرضاً او فرضین قلت الفوائت بعد الکثرت فلا یعود الترتیب الا ان یقضی الکل: وقال ناکت فانہ اذا قضی جمیع الفوائت یلزمہ الترتیب جدید۔ (شرح الوقایۃ ج۱ ص۲۱۹ قضاء الفوائت)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۸۶ قضاء الفوائت۔

کے ساتھ پہلی قضاء شدہ نماز پڑھے۔

قال فی الھندیۃ، وفی الحجۃ والاشتغال بالفوائت اولیٰ واھم من النوافل الا السنن المعروفۃ الخ (الھندیۃ ج ۱ ص۱۲۵ الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت مسائل شتی)[1]

نفل نماز میں شروع کرنے سے لزوم

سوال:۔ اگر کسی نے صبح کی سنت شروع کرکے اچانک باجماعت نماز میں شرکت کی غرض سے توڑ دیا، تو کیا اس سنت کی قضاء لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر تشہد ملنے کا بھی امکان ہو تو سنت پڑھی جائے گی، لیکن کسی صورت میں توڑنے پر اس کی قضاء لازم ہے کیونکہ نفل یا سنت میں شروع کرنے سے لزم النفل بالشروع کی رُو سے اس کی ادائیگی ضروری ہو جاتی ہے۔

قال برھان الدین المرغینانیؒ: ومن شرع فی نافلۃ ثم افسدھا قضاھا الخ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۲۸ باب النوافل، فصل فی القراءۃ)[2]

ظہر کی پہلی چار سنت رہ جانے سے فرض کے بعد پڑھنا

سوال:۔ اگر کسی سے ظہر کی پہلی چار رکعات سنت کسی عذر کی وجہ سے رہ جائیں تو فرض پڑھنے کے بعد اس کی ادائیگی کا کیا حکم ہے اور کس طریقے سے پڑھی جائیں گی؟

الجواب:۔ فرض پڑھنے کے بعد سنت پڑھی جائیں گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ اگر فرضوں سے پہلے سنت پڑھنے کی فرصت نہ مل سکے تو فرضوں کے بعد دو رکعات سنت سے پہلے بھی پڑھی جا سکتی ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ بعد میں پڑھی جائیں۔

لما قال الحصکفیؒ: فانہ ان خاف فوت رکعۃ یترکھا ویقتدی ثم یاتی بھا

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: الاشتغال بقضاء الفوائت اولیٰ واھم من النوافل الا السنن المعروفۃ۔ (التاتارخانیۃ ج ۱ ص۷۷ کتاب الصلوٰۃ قضاء الفوائت)
وَمِثْلُہٗ فی المبسوط ج ۱ ص۱۵۵ باب قضاء الفوائت۔

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: اما الاول فقد قال اصحابنا اذا شرع فی التطوع یلزمہ المضی فیہ واذا افسدہ یلزمہ القضاء الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۲۹۰ فصل فی صلوٰۃ التطوع)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۳ الباب التاسع فی النوافل۔

علیٰ انہا سنۃ فی وقتہ ای الظہر قبل شفعہ عند محمدؒ وبہ یفتی۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۲ ص۵۸ باب ادراک الفریضۃ)[1]

سنن کی قضاء ضروری نہیں

سوال:۔اگر ایسی نماز قضاء ہو جس کے ساتھ سنن بھی ہوں تو نماز قضاء ادا کرتے وقت فرض کے ساتھ سنن بھی پڑھی جائیں گی یا نہیں؟

الجواب:۔فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ کسی نماز کا قضاء پڑھنا فرض یا واجب کے ساتھ مختص ہے، اس لیے اگر کسی سے سنن قضاء ہو جائیں تو ان کا قضاء کرنا دوسرے وقت میں جائز نہیں، تاہم صبح کی سنتیں تبعاً للفرض قضاء کرنا درست ہے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: قولہ ولم تقض الا تبعاً) ای لم تقض سنۃ الفجر الا اذا فاتت مع الفرض فتقضیٰ تبعاً للفرض سواء قضاھا مع الجماعۃ او وحدہٗ لان الاصل فی السنۃ ان لا تقضی لاختصاص القضاء بالواجب۔ (البحر الرائق ج۲ ص۷۵ باب ادراک الفریضۃ)[2]

قضاء نمازوں میں ترتیب کی رعایت

سوال:۔اگر فوت شدہ نمازیں متعدد ہوں تو پڑھتے وقت ان کی ترتیب کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا اس ترتیب سے پڑھی جائیں گی جس ترتیب سے قضاء ہوئی ہیں یا جیسا پڑھنے والے کو

---

[1] وفی الھندیۃ: واما الاربع قبل الظہر اذا فاتتہ وحدھا بان شرع فی صلوٰۃ الامام ولم یشتغل بالاربع فعامتہم علیٰ انہ یقضیہا بعد الفراغ من الظہر ما دام الوقت باقیاً وھو الصحیح۔ وفی الحقائق یقدم الرکعتین عندھما وقال محمد یقدم الاربع وعلیہ الفتوٰی۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۱۲ الباب التاسع فی النوافل)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۷۵ باب ادراک الفریضۃ۔

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا فاتتہ رکعتا الفجر لا یقضیھا قبل طلوع الشمس ولا بعد ارتفاعہا عند ابی حنیفۃ وابی یوسف۔۔۔۔۔ ولھما ان الاصل فی السنۃ ان لا تقضی لاختصاص القضاء بالواجب والحدیث ورد فی قضائہا تبعاً للفرض فبقی ما رواہ علیٰ الاصل وانما تقضی تبعاً لہٗ وھو یصلی بالجماعۃ او وحدہٗ الیٰ وقت الزوال وفیما بعدہٗ اختلاف المشائخ واما سائر السنن سواھا لا تقضی بعد الوقت وحدھا۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۳۲ باب ادراک الفریضۃ)

وَمِثْلُہٗ فی النبایۃ ج۳ ص۱۲۷ باب ادراک الفریضۃ۔

وقت میسر ہو؟

الجواب:۔ صاحبِ ترتیب کے لیے قضاء کرتے وقت ترتیب کی رعایت ضروری ہے تاہم جب وہ امور پائے جائیں جن سے ترتیب ساقط ہوتی ہے تو پھر ترتیب واجب نہیں رہتی تاہم اگر قضاء نمازیں ترتیب کے ساتھ ادا کی جائیں تو بہتر ہے ۔

قال برھان الدین المرغینانیؒ: ولوفاتتہ صلٰوۃ رتبھا فی القضاء کما وجبت فی الاصل الخ۔ وبعد اسطر قال الاان یزید الفوائت علی ستۃ صلٰوۃ لان الفوائت قد کثرت فتسقط الترتیب الخ۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۳۴ باب قضاء الفوائت) [1]

دورانِ سفر فوت شدہ نماز کی قضاء

سوال:۔ سفر کی حالت میں اگر ایک شخص سے نماز فوت ہو جائے تو اقامت کی حالت میں کیا یہ نماز پوری پڑھی جائے گی یا قصر؟

الجواب:۔ نماز کی قضاء میں وجوب کی حالت معتبر ہوتی ہے، حالتِ سفر میں چونکہ قصر ہے اس لیے حالتِ اقامت میں اس کی قضاء کرتے وقت قصر پڑھی جائے گی ۔

قال العلامہ ابن العابدینؒ: ولذا یقضی المسافر فائتۃ الحضر الرباعیۃ اربعاً و یقضی المقیم فائتۃ السفر رکعتین الخ (ردالمحتار ج ۲ ص۷۶ باب قضاء الفوائت مطلب اذا اسلم المرتد ھل الخ) [2]

نمازِ فجر وعصر کے بعد قضاء نماز پڑھنا جائز ہے

سوال:۔ فجر وعصر کی نماز کے بعد نوافل پڑھنا تو غیر مشروع ہے، لیکن کیا ان اوقات میں قضاء نمازیں پڑھنا جائز ہیں یا ان کا حکم بھی نوافل کی طرح ہے؟

---

[1] وقال محمد بن عبداللہ التمرتاشیؒ: الترتیب بین الفروض الخمسۃ والوتر اداء و قضاء لازم الخ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۲ ص۶۵ باب قضاء الفوائت)
وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص۷۹ باب قضاء الفوائت ۔

[2] وفی الھندیۃ: ومن حکمہ ان الفائتۃ تقضی علی الصفۃ التی فاتت عنہ الا لعذر وضرورۃ فیقضی مسافر فی السفر مافاتتہ فی الحضر من الفرض الرباعی اربعًا والمقیم فی الاقامۃ ما فاتہ فی السفر منھا رکعتین ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص۱۲۱ الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۷۹ باب قضاء الفوائت ۔

الجواب: نماز فجر کے بعد طلوع الشمس تک اور عصر کی نماز کے بعد قبل تغیر الشمس قضاء نمازوں کا پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: لا یکرہ قضاء فائتۃ الخ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد ۱ ص۳۷۵ کتاب الصلوٰۃ) [1]

قرأت میں اداء و قضاء کی یکسانیت

سوال: اگر رات و دن کی نمازیں قضاء ہوں اور وہ دیگر اوقات میں پڑھی جائیں تو قرأت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ دونوں اوقات کی قرأت کا سراً و جہراً حکم مختلف ہے؟

الجواب: قضاء نماز کا حکم اداء کی طرح ہے، جس نماز کی اداء میں قرأت کی جو کیفیت ہو تو قضاء میں اسی کیفیت کی رعایت مرخص ہے۔

قال فی الھندیۃ: ومن حکمہ ان الفائتۃ تقضی علی الصفۃ التی فاتت عنہ الخ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۲۱ الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت) [2]

وتر کی قضاء

سوال: کیا وتر کی قضاء ضروری ہے یا عام سنن کی طرح ایک دفعہ فوت ہو جانے سے قضاء لازم نہیں؟

الجواب: وتر چونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہیں اس لیے فوت ہونے کی صورت میں ان کی قضاء واجب ہے اور قضاء نہ کرنے والا گنہگار ہوگا۔

کما قال محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: وقضاء الفرض والواجب والسنۃ

---

[1] وفی الھندیۃ: فیجوز فیھا قضاء الفائتۃ وصلوٰۃ الجنازۃ۔ الخ
(الھندیۃ ج۱ ص۵۲ الباب الاول فی المواقیت۔ الفصل الثانی الخ)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۵۱ باب قضاء الفوائت۔

[2] وقال علاؤ الدین ابی بکر الکاسانیؒ: والاصل کل صلوٰۃ ثبت وجوبھا فی الوقت وفاتت عن وقتھا انہ یعتبر فی کیفیۃ قضائھا وقت الوجوب وتقضی علی الصفۃ التی فاتت عن وقتھا۔
(بدائع الصنائع ج۱ ص۲۴۷ فصل فی بیان حکم الصلوٰۃ الفائتۃ)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۲ ص۹۷ باب قضاء الفوائت۔

فرض وواجب وسنۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۶۶ باب قضاء الفوائت)[1]

قضاء عمری کی حقیقت

سوال:۔ رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں بعض لوگ "قضاء عمری" کے نام سے دو رکعات باجماعت پڑھتے ہیں، پڑھنے والوں کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر کی قضاء شدہ نمازوں سے ذمہ فارغ ہوجاتا ہے۔ اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ نماز کی قضاء بذاتِ خود امر مشروع ہے لیکن مروجہ قضاء عمری کی یہ رسم بعض پٹھانوں کے علاقہ تک محدود ہے جو کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں بلکہ عام قواعد اور اصول سے متصادم ہے، علماء دیوبند نے اس کو بدعتِ سیئہ میں شمار کیا ہے جو کہ عوام کے لیے مہلک ہے اور خواص کو اس کی ضرورت نہیں، اس لیے کسی جگہ اس میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔

لما قال العلامۃ عزیز الرحمٰنؒ فی فتاوٰی: قضاء عمری عند الحنفیۃ مشروع نیست پس التزام آں خصوصاً در آخر جمعہ رمضان المبارک کہ چہار رکعت نفل بہ نیت قضاء عمری ادا کردہ شود شرعاً بے اصل است واین چنیں اعتقاد کردن کہ از چہار رکعت نفل صلوٰۃ فائتۃ عمر حاصل شود خلاف نصوص صحیحۃ وصریحۃ وقواعد شرعیۃ ہست۔ (عزیز الفتاوٰی ج۱ ص۲۵۴ المعروف بدار العلوم دیوبند، فصل فی خطأ الفوائت)[2]

چوروں کے خوف سے نماز کو مؤخر کرنا

سوال:۔ کیا مسافر ڈاکوؤں اور راہزنوں کے ڈر سے نماز کو مؤخر کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت نے فرض نمازیں اپنے اپنے وقت پر پڑھنے کا حکم دیا ہے تاہم شرعی عذر کی وجہ سے نماز مؤخر کی جاسکتی ہے، چوروں، ڈاکوؤں کا خوف بھی عذر شرعی میں داخل ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کما اذا خاف المسافر من اللصوص او قطاع الطریق جاز لہٗ ان یؤخر الوقتیۃ لانہٗ بعذر۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۲ باب قضاء الفوات)

---

[1] وفی الھندیۃ: والقضاء فرض فی الفرض وواجب فی الواجب وسنۃ فی السنۃ۔ الخ
(الھندیۃ ج۱ ص۱۲۱ الفصل الحادی عشر فی صلوٰۃ قضاء الفوائت)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۸۰ باب قضاء الفوائت)

[2] لما قال المفتی کفایت اللہ: پس قضائے عمری کی نماز بے اصل ہے اور جماعت سے پڑھنا ناجائز ہے۔
(کفایت المفتی ج۳ ص۳۳۸ قضا نمازیں)

کیا قضاء نمازوں کی وجہ سے سُننِ مؤکدہ ترک کی جاسکتی ہیں؟

سوال:۔ اگر کسی کے ذمے قضاء نمازیں باقی ہوں تو کیا اُن کی ادائیگی کی وجہ سے سُننِ مؤکدہ کو ترک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ قضاء نمازوں کی ادائیگی میں مشغول ہونا نفلی عبادت میں مصروفیت سے بہتر ہے مگر یہ عام نوافل کے بارے میں مروی ہے، جہاں تک مخصوص نوافل یا سُننِ مؤکدہ کا تعلق ہے تو وہاں قضاء نمازوں کی وجہ سے سُنن کو ترک نہیں کیا جائے گا۔

وفی الهندية :والاشتغال بالفوائت اولیٰ واھم من النوافل الا السنن المعروفة وصلوٰة الضحٰی وصلوٰة التسبیح والصلوات التی رویت فی الاخبار فیها سور معدودة واذکار معهودة فتلك بنیة النفل وغیرها بنیة القضاء۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۲۵ فی آخر الباب الحادی عشر فی قضاء الفوائت)[۱]

قضاء نماز فوراً ادا کی جائے یا اس میں تاخیر کی گنجائش ہے؟

سوال:۔ اگر نماز قضاء ہو جائے تو کیا وہ علی الفور ادا کرنا ضروری ہے یا اس میں تاخیر کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب نماز قضاء ہو جائے تو اس کو فوراً ادا کرنا ضروری ہے بلا عذرِ شرعی اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں، البتہ مکروہ اوقات میں پڑھنا صحیح نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: وجمیع اوقات العمر وقت للقضاء الا الثلاثة المنهية کما مر۔ قال ابن عابدینؒ: تحت (قوله وقت للقضاء) ای لصحته فیها وان کان القضاء علی الفور الا لعذر۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۶ باب قضاء الفوائت)[۲]

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: الاشتغال بقضاء الفوائت اولیٰ واھم من النوافل الا السنن المعروفة وصلوٰة الضحٰی وصلوٰة التسبیح والصلوات التی رویت فی الاخبار فیها سور معدودة واذکار معهودة فتلك یصلی بنیة النفل وغیرها بنیة القضاء۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۱ ص۷۷ باب صلوٰة الاستسقاء)

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وذکر اللولوالجی من الصوم ان قضاء الصوم علی التراخی وقضاء الصلوٰة علی الفور الا لعذر۔
(البحر الرائق ج۲ ص۷۹ باب قضاء الفوائت)

قضاء نمازیں باجماعت ادا کی جاسکتی ہیں

سوال:۔ اگر چند اشخاص سے اجتماعی طور کچھ نمازیں قضاء ہوئی ہوں اور وہ لوگ ان نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا چاہیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ وقتی نمازوں کی طرح قضاء نمازیں بھی جماعت کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں، اگر نمازیں جہری ہوں تو اُن میں جہراً قرأت کرنا ضروری ہے اگر سرّی نمازیں ہوں تو سرّاً قرأت کرنا لازمی ہے۔

قال القاضی خانؒ: اذا ترک صلوٰۃ اللیل ناسیاً فقضاھا فی النہار وامّ فیھا وخافت ساھیاً کان علیہ السھو وینبغی ان یجھر لیکون القضاء علی وفق الاداء وان امّ لیلاً فی صلوٰۃ النہار یخافت ولایجھر فان جہر ساھیاً کان علیہ السھو۔ (فتاوی قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۱ ص۱۲۳ باب سجود السھو) [1]

احتیاطاً عشاء کے وتر اور مغرب کی قضاء نمازیں کس طرح پڑھی جائیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص احتیاطاً قضاء نمازیں پڑھنا چاہتا ہو تو مغرب کے فرض اور عشاء کے وتر کس طرح پڑھے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص احتیاطاً قضاء نمازیں پڑھنا چاہتا ہو تو مغرب کے فرض اور عشاء کے وتر کی بھی چار چار رکعتیں پڑھے گا مگر اس میں فاتحہ کے ساتھ سورۃ اور تیسری رکعت کے بعد قعدہ بھی کرے گا اسی طرح دُعاء قنوت وتروں کی تیسری رکعت میں پڑھی جائے گی۔

قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: ومن قضی صلوٰۃ عمرہ مع انہ لم یفتہ شیٔ منھا احتیاطاً قیل یکرہ .... ویقنت فی الوتر ویقعد قدر التشھد فی ثالثۃ ثم یصلّی رکعۃ رابعۃ فان کان وتراً فقد اداہ وان لم یکن فقد صلی التطوع اربعاً ولایضرہ القعود وکذا یصلّی المغرب اربعاً بثلاث قعدات۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۲۴۳ باب القضاء) [2]

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا قضی الفوائت ان قضاھا بجماعۃ وکان صلوٰۃ یجھر فیھا بالقرأۃ یجھر فیھا الامام وان قضاھا وحدہ یخیر ان شاء خافت والجھر افضل ویخافت فیما یخافت حتماً وکذا لک الامام۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۱ ص۷۶۲ باب قضاء الفوائت) ــــ ومثلہٗ فی امداد الاحکام ج۱ ص۶۶۸ باب القضاء۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: رجل یقضی صلوات عمرہ مع انہ لم یفتہ شیٔ منھا احتیاطاً قال بعضھم یکرہ وقال بعضھم لا یکرہ لانہ اخذ بالاحتیاط لکنہ لایقضی بعد صلوٰۃ الفجر ولا بعد صلوٰۃ العصر ویقرأ فی الرکعات کلھا الفاتحۃ مع السورۃ قد قدمنا من مآل الفتاوی انہ یصلی المغرب اربعاً بثلاث قعدات وکذا الوتر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۸۰ باب قضاء الفوائت) ــــ ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۲۴ باب القضاء۔

وتر قضاء ہونے کے باوجود نمازِ فجر کا حکم | **سوال:۔** کیا فرماتے ہیں فقہائے شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک امام مسجد نے عشاء کی نماز کے بعد وتر نہیں پڑھے، فجر کی نماز پڑھانے کے لیے مصلے پر کھڑا ہونے کے بعد اور نماز شروع کرنے سے پہلے اُسے یاد آ گیا کہ میں نے وتر نہیں پڑھے اس کے باوجود اس نے فجر کی نماز پڑھا دی، اسی طرح کئی دن نمازیں پڑھاتا رہا۔ جبکہ راقم السطور نے کہیں پڑھا ہے کہ اگر کوئی شخص نمازوں کی ترتیب کا لحاظ نہ رکھے اور اس کی پہلی نماز ہی قضاء ہوئی ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی لیکن اگر پانچ نمازیں اسی طرح پڑھتا رہا تو فساد رفع ہو جائے گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ترتیب کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اس امام کی فجر کی نماز اور باقی نمازوں کا کیا حکم ہے؟ اور جو لوگ اس کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ کر چلے گئے اور باقی نمازیں اس کی اقتداء میں نہیں پڑھیں اُن کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ درمختار میں ہے: فلم یجز تفریع علی اللزوم فجر من تذکر انہ لم یوتر لوجوبہ عندہ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۱ ص۵۳۷ باب قضاء الفوائت)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفساد اصل الصلوٰۃ موقوف عند ابی حنیفۃؒ سواء ظن وجوب الترتیب اولا فان کثرت وصارت الفوائت مع الفائتۃ ستا ظھر صحتھا بخروج وقت الخامسۃ التی ھی سادسۃ الفوائت الخ۔ وفی رد المحتار (قولہ فان کثرت) ای الصلوٰۃ التی صلاھا تارکا فیھا الترتیب بان صلاھا قبل قضاء الفائتۃ ذاکرا لھا وھذا التفریع لبیان قولہ موقوف وتوضیحہ انہ اذا فاتتہ صلوٰۃ ولو وترا فکلما صلی بعدھا وقتیۃ وھو ذاکر لتلک الفائتۃ فسدت تلک الوقتیۃ فسادا موقوفا علی قضاء تلک الفائتۃ فان قضاھا بعد ان یصلی بعدھا خمس صلوٰۃ صار الفساد باتا وانقلبت الصلوٰۃ التی صلاھا قبل قضاء المقضیۃ نفلا وان لم یقضھا حتی خرج وقت الخامسۃ وصارت الفواسد مع الفائتۃ ستا انقلبت صحیحۃ لانہ ظھرت کثرتھا و دخلت فی حد التکرار المسقط للترتیب وبیان وجہ ذلک فی البحر وغیرہ۔ الخ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۵۴۱ باب قضاء الفوائت)

مندرجہ بالا عبارات کی روشنی میں صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ امام مسجد قضاء شدہ وتر نماز کے یاد آنے کے باوجود جو نمازیں پڑھتا رہا وہ فاسد ہوں گی لیکن ان کا فساد موقوف

ہے اس پر کہ اگر اس نے اس طرح پانچ نمازیں اور ادا کیں حالانکہ اس کو وہ قضاء شدہ نماز یاد ہو اور پانچویں نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے اس قضاء شدہ نماز کی قضاء لائی تو یہ ساری نمازیں فاسدہوں گی اور اگر پانچویں نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے اس قضاء شدہ نماز کی قضاء لائی تو سب نمازیں صحیح ہو جائیں گی۔

وقت کی کمی کی وجہ سے قضاء کی بجائے ادا نماز پڑھنے کا حکم

سوال: اگر کسی سے عصر کی نماز قضاء ہو جائے اور مغرب کا اتنا وقت باقی ہو کہ اگر وہ عصر کی قضاء نماز پہلے پڑھتا ہے تو مغرب کی نماز بھی قضاء ہونے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں اس شخص کو پہلے قضاء نماز پڑھنی چاہیئے یا ادا نماز؟

الجواب: جس آدمی سے کوئی نماز قضاء ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ وہ دوسرے وقت میں اولاً قضاء نماز پڑھے بعدہٗ ادا نماز پڑھے لیکن اگر وقت کم ہوا ور قضاء نماز پڑھنے کے بعد وقتی نماز کے لیے وقت نہ بچتا ہو تو اس صورت میں یہ شخص پہلے وقتی نماز پڑھے پھر قضاء نماز۔

لمافی الہندیۃ: ان کان بحیث اذا قطع الجمعۃ واشتغل بالفجر یفوتہ الوقت اتم الجمعۃ اجماعاً ثم یصلی الفجر بعدھا۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۱۲۲ باب القضاء الفوائت)

قضاء نمازوں کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب! اگر کسی شخص سے بہت ساری نمازیں قضاء ہو جائیں اور وہ ان کو ادا کرنا چاہے تو کیا قضاء نمازوں کے لیے کوئی خاص وقت مقرر ہے یا جب بھی فرصت ملے قضاء نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں؟

الجواب: قضاء نمازوں کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں جب بھی فرصت ملے قضاء نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں تاہم اوقاتِ مکروہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ثم لیس للقضاء وقت معین۔ (البحر الرائق ج۲ ص۸۰ باب الفوائت)[1]

---

[1] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: قضاء پڑھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جس وقت فرصت ہو وضو کر کے پڑھے البتہ اتنا خیال رکھے کہ مکروہ وقت نہ ہو۔
[بہشتی زیور ص۱۳۴، قضاء نمازوں کے پڑھنے کا بیان]

باب صلوٰۃ الاستسقاء

(نماز استسقاء کے احکام ومسائل)

بارش کے لیے سورۃ یٰس پڑھ کر اذان دینا مسنون طریقہ نہیں

سوال: بعض علاقوں میں بارش مانگنے کے لیے نماز استسقاء کی بجائے مندرجہ ذیل طریقہ رائج ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد ایک آدمی سورۃ یٰسین ابتداء سے لے کر اول مُبین تک تلاوت کرتا ہے، اس کے بعد ایک شخص بآوازِ بلند نماز کے لیے مسنونہ اذان دینا شروع کر دیتا ہے، اس کی آواز کے ساتھ ہی مسجد کی ہر جانب میں لوگ اذان دینا شروع کر دیتے ہیں، بعد اذان قاری سورۃ یٰسین کی ابتداء سے جب دوسرے مبین تک پہنچتا ہے تو پھر اسی طریقہ سے اذانیں شروع ہوتی ہیں حتیٰ کہ آخر مُبین تک یہی طریقہ جاری رہتا ہے اور آخر میں ایک لمبی دعاء سے یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ کیا بارش کیلئے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے؟

الجواب: نماز استسقاء کی بجائے یہ طریقہ بطور سنت شریعت میں ثابت نہیں، نیز اذان کے مواضع مسنونہ میں بارش کے لیے اذان دینا ثابت نہیں۔

قال العلامۃ ابن العابدینؒ: تحت قولہ لایسن لغیرھا کعید۔ ای ووتر وجنازۃ وکسوف واستسقاء الخ۔ (رد المحتار ج ۱ صفحہ ۳۸۵ باب الاذان)[1]

نماز استسقاء باجماعت پڑھنے کا حکم

سوال: نماز استسقاء باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ نماز باجماعت پڑھنا بدعت ہے؟

الجواب: نماز استسقاء باجماعت پڑھنا صاحبینؒ کے نزدیک سنت اور

---

[1] وفی الھندیۃ: ولیس لغیر صلوٰۃ الخمس والجمعۃ نحو السنن والوتر والتطوعات والتراویح والعیدین اذان ولا اقامۃ کذا فی المحیط وکذا للمنذورۃ وصلوٰۃ الجنازۃ والاستسقاء والضحیٰ الخ۔ (الھندیۃ ج ۱ صفحہ ۵۳ باب الاذان)
ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ صفحہ ۴۸ باب الاذان۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مستحب ہے لیکن بغیر جماعت پڑھنا بھی درست ہے، کسی ایک کو بدعت کہنا فقہی ذخائر سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

قال العلامۃ ابن العابدینؒ : فالحاصل ان الاحادیث لما اختلف فی الصلوٰۃ بالجماعۃ وعدمھا علیٰ وجہ لا یصح بہ اثبات السنیۃ لم یقل ابوحنیفۃؒ بسنیتھا ولا یلزم منھا قولہ بانھا بدعۃ کما نقل عنہ بعض المتعصبین بل ھو قائل بالجواز الخ۔ قلت والظاھر ان المراد بہ الندب والاستحباب۔
(رد المحتار ج ۲ ص۱۸۴ باب الاستسقاء)[۱]

نمازِ استسقاء صحراء میں پڑھنا چاہیئے

سوال:۔ نمازِ استسقاء کس جگہ پڑھنی چاہیئے؟

الجواب:۔ استسقاء کے لیے صحراء کی طرف نکلنا بہتر ہے۔

لما ورد فی الحدیث : حدثنا ابوداؤد قال حدثنا مسدد قال حدثنا ھشیم عن یحییٰ بن سعید عن عبد اللہ بن ابی بکر عن عباد بن تمیم عن عبد اللہ بن زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج بالناس الی المصلی فاستسقیٰ فحول ردائہ واستقبل القبلۃ۔ (طحاوی ج ۱ ص۲۲۵ باب الاستسقاء الخ)[۲]

نمازِ استسقاء کی دو رکعات ہیں

سوال:۔ استسقاء کی نماز کی کتنی رکعات ہیں؟ کمی بیشی سے استسقاء کی نماز متاثر ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص دو رکعات جماعت کے ساتھ اور دو رکعات انفرادًا اس نیت سے پڑھے کہ صاحبین اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں کے اقوال پر عمل ہوجائے

---

[۱] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ : والجماعۃ غیر مسنونۃ فی ھٰذہ الصلوٰۃ عندہٗ وعندھما سنۃ ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۲۸۳ فصل فی بیان صلوٰۃ الاستسقاء)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۵۳ الباب التاسع عشر فی الاستسقاء۔

[۲] وقال العلامۃ ابن العابدینؒ : ویخرجون ای الی الصحراء کما فی الینابیع ۔ ھٰذا فی غیر اھل المساجد الثلاثۃ ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۱۸۵ باب صلوٰۃ الاستسقاء)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۲ ص۵۸ باب صلوٰۃ الاستسقاء۔

تواس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں صاحبینؒ کا قول مفتی بہ ہے اس لیے دو رکعات باجماعت پر اکتفاء کرکے انفراداً پڑھنے کی کوشش نہ کی جائے تاہم اگر مزید دو رکعات پڑھے تو اصل نمازِ استسقاء متاثر نہیں ہوتی ہے۔

قال العلامہ ابن العابدینؒ: ای بان یصلی بھم رکعتین یجھر فیھما بالقرائۃ بلا اذان ولا اقامۃ ثم یخطب بعدھا قائماً علی الارض معتمداً علی قوس او سیف او عصا خطبتین عند محمدؒ وخطبۃ واحدۃ عند ابی یوسفؒ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۸۵ باب الاستسقاء)[1]

نمازِ استسقاء کا مسنون طریقہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! نمازِ استسقاء پڑھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ صلوٰۃ الاستسقاء پڑھنے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ نماز کے لیے نکلنے سے قبل تین دن متواتر روزے رکھیں اور توبۃ النصوح کریں اور چوتھے دن پیدل پرانے دھوئے ہوئے کپڑے پہن کر تواضع اور عجز وانکساری کے ساتھ اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنے سروں کو جھکاکر میدانِ استسقاء کی طرف چلیں، اور جاتے سے پہلے صدقہ دیں، چھوٹے بچوں کو ماؤں سے جدا کریں اور نماز کے لیے اپنے ساتھ بچوں، بوڑھوں، کمزور، ضعفاء اور جانوروں کو بھی ساتھ لے جائیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: یستحب للامام ان یأمرھم بصیام ثلاثۃ ایام قبل الخروج وبالتوبۃ ثم یخرج بھم فی الرابع مشاۃ فی ثیاب غسیلۃ او مرقعۃ متذللین متواضعین خاشعین للّٰہ ناکسین رؤسھم ویقدمون الصدقۃ کل یوم قبل خروجھم ویجددون التوبۃ ویستغفرون للمسلمین ویستسقون بالضعفۃ والشیوخ والعجائز والصبیان ویبعدون الاطفال من امھاتھم ویستحب اخراج الدواب الخ۔

(ردالمحتار ج۲ ص۱۸۵ باب صلوٰۃ الاستسقاء)

---

[1] وقال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: یصلی الامام رکعتین الخ
(الھدایۃ ج۱ ص۱۴۶ باب صلوٰۃ الاستسقاء)
ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۶۹ باب الاستسقاء۔

نمازِ استسقاء میں ہاتھ اُلٹے کرکے دعا مانگنا

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک دن استسقاء کی نماز ہورہی تھی کہ امام صاحب نے ہاتھ اُلٹے کرکے دُعا مانگنا شروع کردی، کیا نمازِ استسقاء میں دعا مانگنے کا یہ طریقہ درست ہے؟

الجواب:۔ نمازِ استسقاء میں ہاتھ اُلٹے کرکے دُعا مانگنا جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس لیے فقہاءِ اُمت نے نمازِ استسقاء کے دوران دعا کرتے وقت اُلٹے ہاتھوں کو مسنون قرار دیا ہے، لہٰذا آپ کے امام صاحب نے صحیح اور درست کام کیا ہے، تاہم استسقاء میں سیدھے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی جائز ہے۔

اخرج امام مسلم بن حجاج القشیریؒ: عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم استسقی فاشار بظھر کفیہ الی السماء۔

قال النوویؒ: تحتہ قال جماعۃ من اصحابنا وغیرھم السنۃ فی کل دعاء لرفع بلاء کالقحط ونحوہ ان یرفع یدیہ ویجعل ظھر کفیہ الی السماء واذا دعا بسوال شیٔ وتحصیلہ جعل بطن کفیہ الی السماء۔ (صحیح مسلم مع شرح للنوویؒ ج ۱ ص۲۹۳ کتاب صلوٰۃ الاستسقاء)[1]

نمازِ استسقاء میں قلبِ رداء (چادر کا اُلٹانا) ثابت ہے

سوال:۔ کیا نمازِ استسقاء میں قلبِ رداء (چادر اُلٹا کرنا) ثابت ہے یا نہیں، اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ نمازِ استسقاء میں صرف امام کے لیے یہ مستحب ہے کہ وہ نماز کے بعد قلبِ رداء اس طرح کرے کہ چادر کا اوپر والا حصّہ نیچے آجائے اور نیچے والا حصہ اوپر کی طرف، جبکہ یمین شمال کی طرف اور شمال یمین کی طرف منتقل ہوجائے۔

قال العلامۃ ابن الھمامؒ: وعلم ان کون التحویل کان تفاؤلاً جاء مصرحابہ فی المستدرک من حدیث جابر وصححہ قال وحول رداءہ لیتحول القحط وفی طوالات

---

[1] اخرج ابوداؤد عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یستسقی ھٰکذا یعنی وَمَدَّ یدیہ وجعل بطونھما مما یلی الارض حتی رأیت بیاض ابطیہ۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۱۶۲ باب رفع الیدین فی الاستسقاء)
ومثلہ فی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۱۳۱ باب الاستسقاء۔

الطبرانی من حدیث انس وقلب رداءہ لکی ینقلب القحط الی الخصب۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۶۲ باب الاستسقاء) [1]

نمازِ استسقاء کے بعد کثرتِ بارش کی وجہ سے نقصان سے بچنے کے لیے دعا کرنا

سوال:۔ اگر نمازِ استسقاء کے بعد بارش اتنی زیادہ ہو جائے کہ وہ نقصان دہ ثابت ہو تو کیا اس کے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بارش اتنی زیادہ ہو جائے کہ لوگ اس سے تنگ آجائیں اور اس میں جانی و مالی نقصان کا خطرہ ہو تو اس کے روکنے کے لیے دعا کی جا سکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بذاتِ خود ایسا کرنا ثابت ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (فلا بأس بالدعاء بحبسہ) ای فیقول کما قال صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم حوالینا ولا علینا اللّٰھم علی الآکام والظراب وبطون الاودیۃ و منابت الشجر۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۱۸۶ باب الاستسقاء) [2]

نمازِ استسقاء کے لیے تین دن سے زیادہ باہر نکلنے کا حکم

سوال:۔ عام طور پر لوگ نمازِ استسقاء کے لیے تین دن تک نکلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تین دن سے زیادہ نکلنا جائز نہیں، کیا یہ درست ہے؟

الجواب:۔ سلف صالحین اور فقہی ذخائر سے تین دن تک نکلنا منقول ہے اس سے

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: قال محمد یقلب الامام رداءہ دون القوم (و بعد اسطر) وما رواہ محمد محمول علی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فعلہ تفاؤلاً...... او عرف بالوحی تغیر الحال عند تغییر الرداء وکیفیۃ القلب علی قول من یراہ ان یجعل اعلاہ اسفلہ ما امکن وان لم یمکن کالجبۃ جعل یمینہ علی یسارہ۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۳۱ باب الاستسقاء)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۵۴ باب الاستسقاء۔

[2] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: واذا دام المطر حتی خیف ضررہ قالوا اللّٰھم حوالینا ولا علینا اللّٰھم علی الآکام الی آخرہ۔ (کبیری ص ۴۲۵ باب الاستسقاء)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۲ ص ۴۲۷ باب الاستسقاء۔

زیادہ نہیں، اس لیے صرف تین دن تک مسلسل نکلنا جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ویخرجون ثلاثۃ ایام لانہ لم ینقل اکثر منھا متتابعات۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۱۸۵ باب الاستسقاء) [1]

سوال: کیا استسقاء کے لیے صرف نماز پڑھنا مسنون

نمازِ استسقاء کے لیے صرف دعا پر اکتفاء کرنا جائز ہے

ہے یا فرض نمازوں کے بعد یا دیگر حالات میں بھی دعا کی جا سکتی ہے؟ ایک مولوی صاحب نے نمازِ استسقاء کی تقریر میں صرف دعا کو بدعت کہا ہے؟

الجواب: استسقاء کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اعمال مروی ہیں جن میں دُعا بھی منقول ہے، اس لیے امام ابوحنیفہؒ جماعت کے ساتھ استسقاء کو صرف جواز تک محدود رکھتے ہیں، لہٰذا اگر استسقاء کے لیے صرف دعا کی جائے تو بھی جائز ہے اس کو بدعت کہنا شرعی دلائل سے ناسمجھی کی دلیل ہے، البتہ امام دعا کے لیے قبلہ رُخ ہو کر کھڑا ہو اور مقتدین بیٹھے رہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ھو دعاء واستغفار لانہ السبب لارسال الامطار بلا جماعۃ مسنونۃ بل ھی جائزۃ اھ۔ قال ابن عابدینؒ : (قولہ ھو دعاء) وذٰلک ان یدعو الامام قائما مستقبل القبلۃ رافعًا یدیہ والناس قعود مستقبلین القبلۃ یؤمنون علیٰ دعائہ باللّٰھم اسقنا غیثًا مغیثًا ھنیئًا مریئًا مریعًا غدقًا مجللا سحا طبقًا دائمًا الخ (ردّ المحتار ج۲ ص۱۸۴ باب الاستسقاء) [2]

❋❋

---

[1] قال العلامۃ الکاسانیؒ : ثم المستحب ان یخرج الامام والناس ثلاثۃ ایام متتابعۃ لان المقصود من الدعاء الاجابۃ والثلاثۃ مدۃ ضربت لابلاء الاعذار۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۸۴ صلوٰۃ الاستسقاء)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۵۴ باب الاستسقاء۔

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ : قال ابوحنیفۃؒ لیس فی الاستسقاء صلوٰۃ مسنونۃ فی جماعۃ فان صلی النّاس وحدانا جاز، انما الاستسقاء الدعاء والاستغفار لقولہٖ تعالیٰ: اَسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا ہ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِدْرَارًا ہ (الھدایۃ ج۱ ص۱۵۸ باب الاستسقاء)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۵۳ باب الاستسقاء۔

باب سجود السّھو

(سجدۂ سہو کے احکام ومسائل)

سجدۂ سہو کے لیے ایک طرف سلام پھیرنا کافی ہے

سوال:۔ سجدۂ سہو میں دونوں طرف سلام پھیرا جائے گا یا ایک طرف؟ اور کیا اس میں امام اور منفرد کے لیے حکم یکساں ہے یا جدا؟

الجواب:۔ امام، مقتدی اور منفرد کے لیے سجدۂ سہو میں تمام فقہاء کے ہاں ایک طرف یعنی دائیں طرف سلام پھیر کر سجدہ کرنا بہتر ہے لیکن بعض محققین مثلاً صاحبِ ہدایہ وغیرہ نے دونوں طرف سلام کو راجح قرار دیا ہے، اگرچہ بعض فقہاء کے ہاں دونوں طرف سلام پھیرنے سے بوجہ خروج عن الصلوٰۃ کے سجدۂ سہو ساقط ہو جاتا ہے، البتہ جائز دونوں ہیں لیکن ایک طرف سلام پھیرنا افضل ہے۔

قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ویأتی بتسلیمتین ھو الصحیح۔
(الھدایۃ ج۱ ص۱۴۰ باب سجود السھو)

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: یجب بعد سلام واحد عن یمینہ فقط۔ لانہ المعھود وبہ یحصل التحلیل وھو الاصح بحر عن المجتبیٰ وعلیہ لو أتی بتسلیمتین سقط منہ السجود۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۷۸ باب سجود السھو)[1]

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: (ویکتفی بتسلیمۃ واحدۃ) قالہ شیخ الاسلام وعامۃ المشائخ وھو الاضمن للاحتیاط والاحسن (ویکون (عن یمینہ) لان تمام المعھود وبہ یحصل التحلیل فلا حاجۃ الی غیرہ خصوصاً وقد قال شیخ الاسلام خواھر زادہ لا یأتی بسجود السھو بعد التسلیمتین لان ذلک بمنزلۃ الکلام (فی الاصح)۔ وفی الھدایۃ ویأتی بتسلیمتین ھو الصحیح۔ قال العلامۃ السید احمد الطحطاوی تحت قولہ ویأتی بتسلیمتین ھو الصحیح) ایدہ العلامۃ خسرو بما لا مزید علیہ۔
(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۳۷۶، ۳۷۷ باب سجود السھو)
ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۲۵ الباب الثانی عشر فی سجود السھو۔

سوال:۔ نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ | **سورۂ فاتحہ سے اگر ایک حرف بھی رہ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے**

میں سے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سہواً رہ جائے تو کیا نماز ہو جاتی ہے یا اس کا اعادہ واجب ہے؟

الجواب:۔ فرائض کی پہلی دو رکعت اور سُنن، وتر اور نفل کی تمام رکعات میں سورۂ فاتحہ سے اگر ایک حرف بھی رہ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا اور اگر سجدہ سہو ادا نہیں کیا گیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

قال الحصکفیؒ: (قرأة فاتحة الکتاب) فیسجد للسهو بترك اکثرها لا اقلها لکن فی المجتبیٰ یسجد بترك اٰیة منها وهو اولیٰ۔ قلتُ وعلیه فکل اٰیة واجبة۔

قال ابن عابدینؒ تحت هٰذه العبارة ای وبناءً علی ما فی المجتبیٰ فکل اٰیةٍ واجبة وفیه نظر لان الظاهر ان ما فی المجتبیٰ مبنی علی قول الامام بانها بتمامها واجبة۔ وذکر الآیة تمثیل لا تقیید۔ اذ بترك شیءٍ منها اٰیة او اقل ولو حرفاً لا یکون آتیا بکلها الذی هو الواجب کما ان الواجب ضم ثلاث آیات فلو قرأ دونها کان تارکا للواجب افادہ الرحمتی۔ (الدر المختار ورد المحتار ج۱ ص۴۵۸ مطلب کل صلوٰة ادیت مع کراهیة التحریم تجب اعادتها)[1]

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: الاول قرأة الفاتحة الخ الیٰ ان قال وان ترك اقلها لا یجب (ای السجود) لان للاکثر حکم الکل کذا فی المحیط وسواء کان اماماً او منفرداً کذا فی التجنیس وفی المجتبیٰ اذا ترك من الفاتحة اٰیة وجب علیه السجود وان ترکها فی الاخریین لا یجب ان کان فی الفرض وان کان فی النفل او الوتر وجب علیه لوجوبها فی الکل الخ۔

وقال ابن عابدینؒ تحت هٰذه العبارة (قوله وفی المجتبیٰ اذا ترك الخ) قال فی النهر وهو اولیٰ ویؤیدہ ما سیأتی وحکاہ فی المعراج عن شیخ الاسلام ثم قال وعند ابی یوسفؒ ومحمدؒ اذا قرأ اکثرها لا یجب اھ۔

(البحر الرائق علی صدر منحة الخالق ج۲ ص۹۳-۹۴ باب سجود السهو)

سورۃ فاتحہ کے ترک پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے

سوال:۔ زید فجر کی نماز با جماعت پڑھا رہا تھا، تکبیر اولیٰ کے بعد بجائے سورۃ فاتحہ کے کسی دوسری سورت کی تلاوت شروع کی، یاد آنے کی صورت میں اگر فاتحہ پڑھے تو کیا اس امام پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں ؟ نیز اگر متعلقہ رکعت میں یاد نہ رہے بلکہ دوسری رکعت میں کہیں علم ہو جائے تو کیا سجدۂ سہو پر اکتفاء ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں اگرچہ امام نے یاد آنے پر سورۃ فاتحہ پڑھی ہے لیکن سورتِ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت اور فاتحہ کے درمیان یہ ترتیب بھی واجب ہے، سورتِ فاتحہ پہلے ہو اور ضم سورت بعد میں متصل ہو، چونکہ مذکورہ امام نے ترتیب اُلٹ دی ہے اس لیے اس پر سجدۂ سہو واجب ہے، جیساکہ سورت فاتحہ کے رہ جانے یا ضم سورت ترک کرنے سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔

وقال ابن نجیم المصریؒ: وقد قدمنا فی ذکر الواجبات انہٗ یجب تقدیم الفاتحۃ علی السورۃ وانہ یجب ان یؤخر السورۃ عن قرأۃ الفاتحۃ فکذ الو بدأ بالسورۃ ثم تذکر یبدأ بالفاتحۃ ثم یقرأ السورۃ ویسجد للسہو وان قرأ من السورۃ حرفاً کذا فی المجتبیٰ۔ وقیدہ فی فتح القدیر بان یکون مقدار ما یتأدی بہ رکن عن قرأۃ الفاتحۃ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۹۴ باب سجود السہو)

وایضاً قال ابن نجیمؒ: الاوّل قرأۃ الفاتحۃ فان ترکہا فی احدی الاولیین او اکثرھا وجب علیہ السجود۔ (البحرالرائق ج۲ ص۹۳ باب سجود السہو)[1]

ضم سورۃ رہ جانے سے سجدۂ سہو کا وجوب

سوال:۔ اگر ایک نمازی سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد ضم سورۃ بالکل چھوڑ دے تو اس سے

---

[1] قال العلامۃ فخرالدین الزیلعیؒ: منہا قرأۃ الفاتحۃ والسورۃ فلو ترک الفاتحہ او اکثرھا فی الاولیین وجب علیہ سجود السہو۔۔۔۔ ولو قرأ الفاتحۃ وحدھا وترک السورۃ یجب علیہ سجود السہو کذا لو قرأ مع الفاتحۃ آیۃ قصیرۃ لان قرأۃ ثلاث آیات قصار او آیۃ طویلۃ مع الفاتحۃ واجبۃ ولو اخر الفاتحۃ عن السورۃ فعلیہ سجود السہو۔ (تبیین الحقائق ج۱ ص۱۹۳ باب سجود السہو)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۲۶ باب سجود السہو۔

نماز پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ نیز اگر یہ نمازی سجدۂ سہو ادا کرے تو نماز تام ہوجائے گی یا اعادہ کرنا ضروری ہے؟

الجواب: نماز میں نفسِ قرأت فرض ہے، البتہ سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورۃ ملاکر پڑھنا واجب ہے، ان دونوں میں سے جو بھی پڑھنے سے رہ جائے تو نماز ناقص ہوکر قعدۂ اخیرہ میں سجدۂ سہو ادا کرنے سے مکمل ہوجائے گی، اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو قصداً چھوڑ دے تو پھر سجدۂ سہو سے نماز مکمل نہ ہوگی بلکہ نماز کا اعادہ واجب ہوگا، ایسا ہی نفسِ قرأت رہ جانے سے ترکِ فرض کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی ہے۔

قال الامام الکاسانیؒ: منها قراءۃ الفاتحۃ والسورۃ فی صلوۃ ذات رکعتین وفی الاولیین من ذوات الاربع والثلاث حتی لو ترکهما او احدهما فان کان عامداً کان مسیئاً۔ وان کان ساهیًا یلزمه سجود السهو۔[1] (بدائع الصنائع ج ۱ ص۱۶۶ باب سجود السهو)

ضمِ سورۃ اور فاتحہ کے درمیان صلوٰۃ وتر میں تکبیر کہنے پر سجدہ سہو کا حکم

سوال: اگر ایک مصلّی وتر کی تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد تکبیر کہہ کر رفع الیدین کرے لیکن فوراً ضمِ سورۃ یاد آنے پر سورت پڑھے، پھر تکبیر کہہ کر رفع الیدین کرکے دعاءِ قنوت پڑھے، تو اس صورت میں سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں حسبِ قواعد سجدہ سہو واجب نہیں، کیونکہ سجدۂ سہو کسی رکن میں اس قدر تاخیر پر واجب ہوتا ہے کہ جس میں مسنون طریقہ سے چھوٹا رکنِ صلوٰۃ مثلاً سجدہ یا رکوع ادا ہو، لہٰذا رکوع یا سجدہ میں تین بار سبحان ربی العظیم یا

---

[1] قال ابن نجیمؒ: الاول قراءۃ الفاتحۃ فان ترکها فی احدی الاولیین او اکثرها وجب علیه السجود وان ترک اقلها لایجب لان للاکثر حکم الکل کذا فی المحیط وسواء کان اماماً او منفرداً کذا فی التجنیس۔ وان ترکها فی الاخریین لایجب ان کان الفرض وان کان النفل اوالوتر وجب علیه لوجوبها فی الکل۔ وقد قدمنا انه لو ترکها فی الاولیین لایقضیها فی الاخریین فی ظاهر الروایۃ۔ وایضاً قال فلو لم یقرأ شیئاً مع الفاتحۃ او قرأ آیۃ قصیرۃ لزمه السجود۔ (البحر الرائق ج۲ ص۹۳/۹۴ باب سجود السهو)

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھنے پر ۲۴=۳×۱۴ حروف کے تلفظ کا وقت صرف ہوتا ہے اس لیے مذکورہ صورت میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ میں صرف آٹھ حروف کے تلفظ کی تاخیر سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا ہے۔

قال العلامہ الشیخ احمد الطحاویؒ : ومن الواجب تقدیم الفاتحۃ علی السورۃ وأن لا یؤخر السورۃ عنها بمقدار اداء رکن[۱] الخ۔

(طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص۳۷۵ باب سجود السھو)

سجدۂ ثانیہ صلوٰتیہ بھول جانے کی صورت میں سلام پھیرنے کے بعد پڑھ سکتا ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کسی رکعت میں سجدۂ ثانیہ ادا کرنا بھول گیا، سلام پھیرنے کے بعد اس کو سجدہ یاد آیا، تو کیا اس طرح سلام پھیرنے سے یہ شخص خارج صلوٰۃ متصور ہوگا یا نہیں؟ نیز نماز کے منافی کام کرنے کی صورت میں شرعاً اسے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ جب تک نماز کے منافی کام نہیں کیا ہو تو سلام پھیرنے کے باوجود یہ شخص داخل صلوٰۃ متصور ہوگا، اس صورت میں یہ شخص سجدۂ ثانیہ صلوٰتیہ صلبیہ ادا کرے، پھر قعدہ میں بیٹھ کر تشہد پڑھ کر سجدۂ سہو ادا کرے، پھر قعدہ پر بیٹھ کر نماز مکمل کرکے سلام پھیر دے۔ اور اگر کوئی ایسا کام کیا ہو جو نماز کے منافی ہو تو نماز سے خارج ہوکر سجدہ کے اعادہ سے نماز مکمل نہیں ہوتی ہے بلکہ نماز کا اعادہ واجب ہے۔

قال الامام الکاسانیؒ : وان کان ساهیاً عنهما أی عن سجدۃ صلبیۃ وسجدۃ التلاوۃ وسلّم لا یخرج عن الصلوٰۃ۔ وعلیه ان یسجد لکل واحدۃ منهما الاوّل فالاوّل منهما ثمّ یتشهد بعدهما ویسلّم۔ ثمّ یسجد سجدتی السهو ثمّ یتشهد ثمّ یسلّم الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۱۷۰)[۲]

---

[۱] وفی الهندیۃ : ولو أخر الفاتحۃ عن السورۃ فعلیه سجود السهو کذا فی التبیین۔ (الهندیۃ ج۱ ص۱۲۶ باب سجود السّهو)

لیکن یہ جزئیہ مجمل ہے اور بالائی جزئیہ صریح ہے اسلئے مفتی بہ قول طحطاوی کا ہے۔ منہ (مرتب)

[۲] قال الشیخ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : وان سلّم وهو غیر ذاکر لهما أی سجدۃ صلبیۃ وسجدۃ التلاوۃ فان سلامه لا یکون قطعاً وعلیه أن یسجد للتلاوۃ ویسجد للصلوتیۃ الاوّل فالاوّل ثمّ یتشهد ثمّ یسلّم ثمّ یسجد سجدتی السهو ثمّ یتشهد ثمّ یسلّم الخ (خلاصۃ الفتاویٰ جلد۱ ص۱۸۰ باب سجود السهو)

رکعتِ اُولیٰ وثالثہ کے بعد طویل جلسہ موجب سہو ہے

سوال:۔ دو یا چار رکعت فرض نماز میں امام پہلی رکعت یا تیسری رکعت میں سجدۂ ثانیہ کے بعد قعدہ پر اتنا بیٹھ گیا کہ مقتدی سب کھڑے ہو گئے، بکر (مقتدی) نے فتح دیا تب امام صاحب قعدہ سے اٹھ کر قیام میں گئے۔ تو کیا ایسی صورت میں سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ قعدہ پہلی رکعت یا تیسری رکعت کے بعد لمبی ہو یعنی اتنی تاخیر ہو کہ اُس جتنے وقت میں نماز کا کوئی رکن مسنون طریقہ سے ادا ہوتا ہو، مثلاً رکوع یا سجدہ میں تین دفعہ تسبیحات پڑھنے پر جتنا وقت خرچ ہو سکے اتنی مقدار تاخیر کرنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

قال ابن عابدینؒ: وکذا القعدۃ فی آخر الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ فیجب ترکھا۔ ویلزم من فعلھا ایضاً تاخیر القیام الی الثانیۃ او الرابعۃ عن محلہ۔ وھذا اذا کانت القعدۃ طویلۃ۔ اما الجلسۃ الخفیفۃ التی استحبھا الشافعیؒ فترکھا غیر واجب عندنا بل ھو الافضل کما سیأتی۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۴۷ واجبات الصلوٰۃ) [1]

مغرب کی نماز میں امام کے ساتھ ایک رکعت پانے کے بعد دوسری رکعت پر قعدۂ اولیٰ چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کا حکم

سوال:۔ ایک شخص مغرب کی نماز میں امام کے ساتھ ایسے وقت شامل ہُوا کہ امام صاحب دو رکعت پڑھ چکے تھے، عام اقوال کے مطابق یہ شخص ایک رکعت پڑھ کر قعدۂ اُولیٰ کرے گا، لیکن ایسی حالت میں اگر مسبوق سے یہ قعدہ جو امام سے فراغت کے بعد انفرادی طور پر ادا کر رہا ہے چھوٹ جائے

---

[1] قال صاحب ملتقی الابحر:۔ تحت ان قرأ فی رکوع او قعود او قدم رکناً او اخرہٗ او کررہ او غیّر واجباً او ترکہ کرکوع قبل القرأۃ وتاخیر القیام الی الثالثۃ بزیادۃ التشھد قال شارحہ شیخ زادہ واختلفوا فی مقدار الزیادۃ فقال بعضھم بزیادۃ حرف وکلام المصنف الیٰ ھذا وقال بعضھم بقدر رکن وھو الصحیح کما فی اکثر الکتب۔

(مجمع الانھر ج ۱ ص ۱۴۸ باب سجود السھو)

ومثلہٗ فی حاشیۃ امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۵۲ تا ۳۵۵ باب سجود السھو۔

تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ قعدۂ اولیٰ اگرچہ واجب ہے جس کے ترک پر سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے لیکن صورت مذکورہ میں مسبوق سے یہ قعدہ چھوٹ جانے پر سجدہ سہو استحساناً واجب نہیں اور نماز بھی درست ہے ۔

قال ابن عابدینؒ : (قوله وعليه ان يقضى ركعة يتشهد الخ) يعنى الركعة الاولى من الركعتين ۔ قال فى شرح المنية حتى لو ادرك مع الامام ركعة من المغرب فانه يقرأ فى الركعتين الفاتحة والسورة ۔ و يقعد فى اولهما لانها ثانية ولو لم يقعد جاز استحساناً لا قياساً و لم يلزمه سجود السهو و لو سهواً لكونها اولىٰ من وجه اھ ولا يخالفه ما نقله العينىؒ عن المبسوط من ان هذا استحسان والقياس ان يصلى ركعتين ثم يقعد ووجه الاستحسان ان هذه الركعة ثانية لهذا المسبوق ۔ والقعدة بعد الركعة الثانية من المغرب سنة اھ ۔

(منحة الخالق على البحر الرائق ج ۱ ص۳۷۹ باب الحدث فى الصلوٰة)[1]

قعدۂ اولیٰ رہ جانے یا اس پر زیادتی سے سجدۂ سہو کا حکم

سوال ۱:۔ کسی شخص نے ظہر کی چار رکعت سنتِ مؤکدہ میں قعدۂ اولیٰ چھوڑ دیا تو کیا سجدۂ سہو سے سُنتیں درست ہوجائیں گی ؟

سوال ۲:۔ اگر کوئی چار رکعت سنتِ مؤکدہ کے قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے علاوہ درود شریف کے چند کلمات کی زیادتی کرے تو ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے ؟

الجواب ۱:۔ فرض نماز کی طرح سنتِ مؤکدہ میں قعدہ اولیٰ بھی چونکہ واجب ہے، اور واجب کے ترک سے سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے، اس لیے سجدۂ سہو

---

[1] قال الحصكفىؒ : فمدرك ركعة من غير فجر يأتى بركعتين بفاتحة وسورة وتشهد بينهما ۔ قال ابن عابدين تحت قوله وتشهد بينهما) قال فى شرح المنية ولو لم يقعد جاز استحساناً لا قياساً ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة اولى من وجه ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۹۷ باب اللاحق والمسبوق)
وَمِثْلُهٗ فى كبيرى ص۴۶۸ باب سجود السهو ۔

کرنے سے نماز درست ہو جائے گی۔

قال ابن نجیم المصریؒ: السادس القعود الاول وکذا کل قعدۃ لیست اخیرۃ سواء کان فی الفرض او فی النفل فانہ یلزمہ سجود السہو بترکہا ساھیًا۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۹۵ باب سجود السہو) [۱]

الجواب ۲:۔ درود شریف پڑھنا بذاتِ خود موجب سجدہ سہو نہیں بلکہ درود شریف پڑھنے سے رکعتِ ثالثہ کے قیام میں تاخیر آتی ہے جو موجبِ سجدہ سہو ہے بلکہ قعدۂ اولیٰ کے تشہد پڑھنے کے بعد اگر ویسے بھی ایک شخص خاص مقدار میں تاخیر کرے تو پھر بھی سجدۂ سہو واجب رہے گا۔

قال ابن نجیم المصریؒ: ومنها لو کرر التشہد فی القعدۃ الاولیٰ فعلیہ السہو لتاخیر القیام وکذا لو صلّٰی علی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم فیہا لتاخیرہ واختلفوا فی قدرہ والاصح وجوبہ باللّٰھم صلّ علیٰ محمّدٍ وان لم یقل وعلیٰ آلہ۔ وذکر فی البدائع انہ یجب علیہ السجود عندہٗ وعندھما لا یجب لانہٗ لو وجب لوجب لجبر النقصان ولا یعقل نقصان فی الصّلوٰۃ علی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ وابو حنیفۃ رحمہ اللہ یقول لا یجب علیہ بالصلوٰۃ علی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم بل بتاخیر الفرض وھو القیام الا ان التاخیر حصل بالصلوٰۃ فیجب علیہ من حیث انّہا تاخیر لا من حیث انہا صلوٰۃ علی النبی صلّی اللہ علیہ وسلم۔ اھ وقد حکی فی المناقب ان ابا حنیفۃ (رحمہ اللہ) رأی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم فی المنام فقال لہٗ کیف اوجبت علیٰ من صلّٰی عَلَیَّ سجود السہو فاجابہ بکونہ

---

[۱] قال الحصکفیؒ: والقعود الاوّل ولو فی النفل علی الاصح۔ قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہ العبارۃ لانہٗ وان کان کل شفع صلوٰۃ علیحدۃ حتّٰی افترضت القراءۃ فی جمیعہ لکن القعدۃ انّما فرضت للخروج من الصلوٰۃ۔ فاذا قام الی الثالثۃ تبیّن ان ماقبلہا لم یکن اوان الخروج من الصلوٰۃ فلم تبق الفریضۃ۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۴۶۵ واجبات الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱ ص ۱۷۷ باب فی عشر الصلوٰۃ السہو۔

صلی علیك ساھیًا فاستحسنه منه ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۹۷ باب سجود السھو)[1]

چار رکعت نفل میں قعدۂ اولیٰ کے ترک پر نماز کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی شخص چار رکعت نفل نماز میں قعدۂ اولیٰ پر بیٹھنے کی بجائے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے، چونکہ نفل میں ہر شفع مستقل نماز ہونے کی وجہ سے قعدۂ اولیٰ فرض ہے اس لیے اُس کی نماز درست نہیں ہونی چاہیئے، شرعاً جو حکم ہو واضح فرماکر عنداللہ ماجور ہوں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ جب تک مصلّی (نمازی) نے تیسری رکعت کا سجدہ نہیں کیا ہو تو بعض کے نزدیک قعدۂ اُولیٰ کو لوٹ کر بیٹھے گا اور تشہد پڑھ کر تیسری رکعت کے لیے پھر اٹھے گا، اور بعض فقہاء کے نزدیک فرائض کی طرح تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کے بعد واپس نہیں لوٹے گا بلکہ نماز جاری رکھ کر قعدہ اخیرہ میں ترکِ واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو کرکے اس کی نماز پوری ہو جائے گی۔ اور یہی آخری رائے علّامہ شامیؒ کی بھی ہے اور یہی سہل ہے۔

قال الحصکفیؒ: سھا عن القعود الاوّل الی ان قال اما النفل فیعود مالم یقید بالسجدۃ۔ قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہ العبارۃ (قولهٗ اما النفل فیعود الخ) جزم به فی المعراج والسّراج وعللهٗ ابن وھبان بان کل شفع منه صلوٰۃ علی حدہ ۔لاسیّما علی قول محمدؒ بان القعدۃ الاولیٰ منه فرض فکانت کالاخیرۃ وفیھا یقعد وان قام وحکی فی المحیط فیه خلافاً۔ وکذا فی شرح التمرتاشی قیل یعود، وقیل لایعود۔ وقال بعد

---

[1] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ: فان زاد علی القدر التشھد ۔قال المشائخؒ: ان قال اللّٰھم صلّ علیٰ محمّدٍ ساھیًا یجب علیه سجدتا السھو وعن ابی حنیفۃؒ فیما رواہ الحسن عنه ان زاد حرفًا واحدًا فعلیه سجدتا السّھو۔ قال المص واکثر المشائخ علی ھٰذا ای علیٰ انهٗ یلزمه السھو بزیادۃ حرفٍ واحدٍ۔ وفی الخلاصۃ والمختار انهٗ یلزمه السھوان قال اللّٰھم صلّ علیٰ محمّدٍ۔ قال البزازیؒ: لانه ادی سنۃ وکیدۃ فیلزم بتاخیر الرکن یجب سجود السھو۔

(کبیری ص۴۳۳ باب سجود السھو)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱، ص۱۷۷ باب فی عشر الصلوٰۃ السھو، جنس اٰخر فی المقدمۃ۔

سطر واحدۃ ۔ لکن فی التتارخانیۃ عن العتابیۃ قیل فی التطوع یعود مالم یقیدہ بالسجدۃ والصحیح انہ لایعود۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۸۳ باب سجود السھو)

وایضاً قال الحصکفیؒ: ولو ترک القعود الاول فی النفل سھواً سجد (ای للسھو) ولم تفسد استحساناً لانہ کما شرع رکعتین شرع اربعاً ایضاً وقد منا انہ یعود مالم یقید الثالثۃ بسجدۃ وقیل لا۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۸۸ باب سجود السھو)[1]

قعدۂ اولیٰ چھوڑ کر قیام میں جانے سے واپس لوٹنے پر نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال: اگر امام عشاء کی نماز میں قعدۂ اولیٰ پر بیٹھنے کی بجائے قیام میں چلا جائے، پیچھے سے مقتدی فتح دیں اور امام مکمل کھڑے ہونے کے باوجود فوراً بیٹھ جائے تو کیا اس سے نماز پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حسب قواعد قعدۂ اولیٰ واجب ہے اور قیام فرض ہے، اس لیے واجب کے رہ جانے سے امام کو واپس نہیں آنا چاہیے تھا لیکن جب یہ امام دوبارہ واپس قعدہ پر بیٹھ گیا تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوگی لیکن نماز میں نقصان ہوگا، البتہ سجدہ سہو ادا کرنے سے نماز پوری ہو جائے گی، اور اگر سجدہ سہو ادا نہیں کیا گیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

قال ابن نجیم المصریؒ: وان سھا عن القعود الاول وھو الیہ اقرب عاد والا لا۔ وقال بعدعدۃ اسطر۔ وذکر فی المبسوط ان ظاھر الروایۃ اذا لم یستتم قائماً یعود واذا استتم قائماً لایعود لانہ جاء فی الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قام من الثانیۃ الی الثالثۃ قبل ان یقعد فسبحوا بہ فعاد وروی انہ لم یعد وکان یعد ما استتم قائماً وھذا لانہ لما استتم قائماً اشتغل بفرض القیام فلا یترک اھ وصححہ الشارح۔ وفی فتح القدیر انہ ظاھر المذھب والتوفیق بین الفعلین المرویین بالحمل علی حالتی القرب من القیام وعدمہ لیس باولیٰ منہ بالحمل علی الاستواء وعدمہ ثم لو عاد

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: اما فی النفل اذا قام الی الثالثۃ من غیر قعدۃ فانہ یعود ولو استتم قائماً مالم یقیدھا بسجدۃ کذا فی السراج الوھاج۔ وحکی فیہ خلافاً فی المحیط۔ قیل لایعود لانہ صار کالفرض۔ وقیل یعودھا لم یقیدھا بالسجدۃ۔ لان کل شفع صلوٰۃ علیٰ حدہ فی حق القرأۃ فأمرناہ بالعود الی القعدۃ احتیاطاً۔ ومتی عاد تبین ان القعدۃ وقعت فرضاً فیکون رفض الفرض لمکان فیجوز۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۰۱ باب سجود السھو)

فی موضع وجوب عدمه اختلفوا فی فساد صلوٰته فصحح الشارح الفساد لتکامل الجنایة برفض الفرض بعد الشروع فیه لاجل مالیس بفرض وفی المبتغیٰ بالغین المعجمة انه غلط لانهٗ لیس بترك وانما هو تأخیر کما لوسهاً عن السورة فرکع فانه یرفض الرکوع ویعود الی القیام ویقرأ لاجل الواجب الخ ان قال لاتفسد علی الاصح۔

(البحر الرائق ج۲ ص۱۰۱، ۱۰۱ باب سجود السهو)[1]

عشاء کی آخری رکعات میں جہر موجب سجدہ سہو ہے

سوال: عشاء کی نماز میں فرضوں کی آخری دونوں رکعات میں جہراً قرأت کرنے سے نماز پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیا اس میں نسیان اور عمد برابر ہیں یا دونوں میں فرق ہے؟

الجواب: عشاء کے فرضوں کی آخری دو رکعات میں اخفاء واجب ہے لہٰذا جہراً قرأت پڑھنے سے ترکِ واجب لازم آنے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، اور عمداً قرأت بالجہر پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو سے کفایت نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں اعادہ واجب ہوگا کیونکہ سہو سے جبیرۂ نسیان کا ہوتا ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو جهر فیما یخافت فیه وهو امام علیه السهو قل ذٰلك او کثر۔ وکذا اذا خافت فیما یجهر فیه قلّ ذٰلك او کثر علیه السهو ان فعل ساهیًا فی ظاهر الروایة۔ وعلیه اعتماد شمس الائمة الحلوانیؒ لا علی روایة النوادر۔ ولا سهو علی المنفرد فی شیء من ذٰلك ولو جهر فی الاخرین لزمه السهو۔

(خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۱۷۵ جنس فی القرأة والاذکار)[2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: وقد نقل المقدسی عن شرحی القدوری للمذکورین بعد نقله تصحیح الصحة عن المعراج والدرایة۔ مانصه۔ ان عاد للقعود یکون مسیئًا ولا تفسد صلوٰته ویسجد لتاخیر الواجب۔ (منحة الخالق علیٰ هامش البحر الرائق ج۲ ص۱۰۱ باب سجود السهو)

[2] قال الحصکفیؒ: والجهر فیما یخافت فیه للامام (وعکسه) لکل مصل فی الاصح۔ والاصح تقدیره (بقدر) ما تجوز به الصلوٰة فی الفصلین۔ وقیل قائله قاضی خانؒ۔ یجب السهو بهما أی بالجهر والمخافتة مطلقًا ای قل او کثر وهو ظاهر الروایة۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۸۱ باب سجود السهو)

تکرار دعاءقنوت سے سجدہ سہو کا حکم

سوال:۔ دعاءقنوت کے تکرار کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دعاء قنوت کے تکرار کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہوجاتا ہے کیونکہ اس سے رُکن کی تاخیر لازم آتی ہے جو ترکِ واجب کے مترادف ہے۔

وفی الھندیۃ: ولا یجب السجود الا بترك واجب او تاخیرہ او تاخیر رکن او تقدیمہ او تکرارہ او تغییر واجب۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۲۶ باب سجود السھو)[1]

دُعاءقنوت سہواً ترک ہونے سے سجدہ سہو واجب ہوجاتا ہے

سوال:۔ اگر وتر میں دعاءقنوت بھول جائے تو سلام پھیرنے کے بعد یاد آجانے کی صورت میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ اگر وتر کی نماز میں دعاءقنوت بھُول جائے اور سلام پھیرنے کے بعد یاد آنے سے فوراً بعد سجدہ سہو کرے تو نماز مکمل ہوجائے گی، بشرطیکہ سلام کے بعد کوئی ایسا کام نہیں کیا ہو جو نماز کے منافی ہو ورنہ اعادہ واجب ہے، اسی طرح عمداً قنوت چھوڑنے کی صورت میں بھی اعادہ ضروری ہے۔

قال طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولو سلّم وعلیہ السجدۃ الصلوتیۃ او التلاوۃ او السھو۔ ان سلّم وھو غیر ذاکر للکل او ذاکر للسھو لا یکون قطعًا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۱۸۰ سجود السھو)

وایضًا ذکر:۔ وان سلّم وھو لا یرید ان یسجد لسھوہ لم یکن تسلیمہ ذٰلك قطعًا حتّٰی لو بدا لہ ان یسجد وھو فی مجلسہ ذٰلك قبل ان یقوم وقبل ان یتکلّم فانّہٗ یسجد سجدتی السّھو فان تکلّم او خرج من المسجد لا تأتی بھما ویسجد لسھوہٖ بعد السلام عندنا ولو سجد قبل السّلام لا یجب علیہ

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: وفی فتح القدیر ولو قرأ القنوت فی الثالثۃ ونسی قرأۃ الفاتحۃ او السورۃ او کلیھما فتذکر بعد ما رکع قام ولو قرأ او اعاد القنوت والرکوع لانہ رجع الی محلہ قبلہ ویسجد للسّھو۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۹۶ باب سجود السھو)
ومِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۱ ص ۴۳۹ باب سجود السھو۔

اعادتهما بعد السّلام ثمّ یتشهد ثانیاً بعد السجدتین ویقرأ التّشهد۔
(خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۱۷۳ سجود السہو)[1]

قعدہ اخیرہ چھوڑ کر دو رکعت ملانے سے نماز کی فرضیّت نفل میں بدل جاتی ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے چار رکعت فرض کی نیت باندھ لی، قعدہ اخیرہ چھوڑ کر دو رکعت اور ملاکر پڑھ لیں، شرعاً اس نماز کی حیثیت کیا ہے؟ اور سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جب مصلّی نے قعدہ اخیرہ چھوڑ کر دو رکعت اور ملائیں تو یہ چھ رکعات تمام کے تمام نفل ہوئے اور سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں، فرض نماز دوبارہ پڑھی جائے گی۔

قال الشیخ ابراهیم الحلبیؒ: وان سها عن القعدة الاخیرة فی ذوات الاربع وقام الی الخامسة الی ان قال وان قید الرکعة الخامسة بالسجدة بطل فرضه تحولت صلوته نفلاً عند ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ۔ وبطلت اصلاً عند محمدؒ۔ وعلیه ان یضم الیها (ای الی الخامسة) رکعة سادسة عندهما خلافاً لمحمدؒ۔ قوله ویسجد للسهو۔ هو قول بعض المشائخ وفی النهایة والاصح انه لایسجد وکذا قال ابن الهمام الصحیح انهٗ لایسجد لان النقصان بالفساد لاینجبر بالسجود الخ۔ (کبیری ص۴۶۲ باب سجود السهو)[2]

قعدۂ اخیرہ میں دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت رہ جانے کا ظن غالب یا شک

سوال: اگر کسی شخص کو

---

[1] قال قاضی خانؒ: ولو ترک القنوت فذکر فی القعدة او بعد ما قام من الرکوع لایقنت وعلیه السهو۔ (الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیة ج ۱ ص۱۲۱ باب سجود السهو)

[2] وفی الهندیة: وان لم یقعد علی رأس الرابعة حتی قام الی الخامسة الی ان قال۔ وان قید الخامسة بالسجدة فسد فرضه عندنا کذا فی المحیط وتحولت صلوته نفلاً عند ابی حنیفةؒ وابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ۔ ویضم الیها رکعة سادسة ولو لم یضم فلاشیٔ علیه کذا فی الهدایة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۲۹ باب سجود السهو)
ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۰۴ باب سجود السهو۔

قعدہ اخیرہ میں دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت چھوٹ جانے کا ظن غالب آئے اور وہ اس ظنِ غالب کی وجہ سے بناء کر کے ایک اور رکعت پڑھنے کے لیے اٹھ جائے اور اسی زائد رکعت کو پڑھتے ہوئے قیام یا رکوع میں یاد آیا کہ سب رکعتیں پوری پڑھی جا چکی ہیں تو شرعاً اس شخص کو کیا صورت اختیار کرنی چاہیئے ؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص ظنِ غالب پر قعدۂ اخیرہ کے بعد سلام سے پہلے یا سلام کے متصلاً بعد کھڑا ہو جائے کہ اس کے ذمے کوئی رکعت باقی ہے اور پھر اس کو قیام یا رکوع میں یاد آیا کہ اس نے نماز مکمل پڑھی ہے تو یہ شخص فوراً بیٹھ کر سلام پھیرے اور کھڑے ہوئے سلام پھیرا تو بھی جائز ہے مگر خلافِ سُنت ہے۔

لما قال العلامة حماد بن حسن الشرنبلالیؒ: وان قعد الجلوس الاخیر قدر التشهد ثم قام ولو عمدًا وقرأ وركع عاد للجلوس لان مادون الركعة بمحل الرفض وسلّم فلو سلّم قائمًا صح وترك السنّة لانّ السنّة للتسليم جالسًا من غير اعادة التشهد لعدم بطلانه بالقيام۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۳۸۳ باب سجود السهو)[1]

قعدہ اخیرہ کے بعد رکعتِ خامسہ پر سجدہ کرنے یا نہ کرنے سے نماز کا حکم

سوال:۔ اگر امام قعدۂ اخیرہ کر کے کھڑے ہونے کی صورت میں پانچویں رکعت پڑھ لے اور اسی پانچویں رکعت پر سجدۂ سہو کر کے نماز ختم کر لے تو کیا امام اور مسبوق کی نماز درست ہو گی ؟

الجواب:۔ قعدہ اخیرہ کرنے سے اس کی نماز پوری ہو گئی، رکعتِ خامسہ کرنے سے سلام میں تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو سے کفایت ہو سکتی ہے، لہٰذا سجدۂ سہو کرنے کے بعد امام اور مقتدیوں کی نماز درست رہے گی، لیکن مسبوق کے لیے ضروری ہے کہ قعدۂ اخیرہ کے بعد امام

---

[1] لما قال العلامة الحصكفیؒ: وان قعد فی الرابعة مثلاً قدر التشهد ثم قام عاد وسلّم ولو سلّم قائمًا صح۔ قال العلامه ابن عابدینؒ قوله عاد وسلّم ای عاد للجلوس لما مر ان ما دون الركعة محل الرفض وفيه اشارة الى انه لا يعيد التشهد وبه صرح فی البحر قال فی الامداد والعود للتسليم جالسًا سُنّةٌ لِاَنّ السُّنّةَ التّسليم جالسًا الخ۔ (رد المحتار ج۲ ص۸۷ باب سجود السهو)

سے الگ ہوکر اپنی نماز پوری کرے، اگر مسبوق رکعتِ خامسہ میں امام کی اقتدا کرے گا تو اس کی نماز
فاسد ہوجائے گی اور عدمِ موافقت کی صورت میں مسبوق پر سجدۂ سہو بھی لازم نہیں ہوگا، اس لیے کہ
امام پر سجدۂ سہو اُس وقت لازم ہوا جبکہ مسبوق منفرد ہوچکا تھا۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: (وان قعد فی الرابعۃ) الخ (ثم قام عاد وسلّم) ولو سلّم قائماً صح
ثم الاصح ان القوم ینتظرونہ فان عاد تبعوہ (وان سجد للخامسۃ سلّموا) لانہ تمّ فرضہ
اذ لم یبق علیہ الا السلام الخ۔ الی ان قال وسجد للسھو فی الصورتین (یعنی لم یسجد للخامسۃ
وسجد) لنقصان فرضہ بتاخیر السلام فی الاولیٰ وترکہ فی الثانیۃ (یعنی بعد السجدۃ للخامسۃ)
(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار بتغیر عبارۃٍ قلیلٍ وکثیر۔ ج ا ص۵۵۳ باب سجود السھو)

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو قام امامہ لخامسۃ فتابعہ ان بعد القعود تفسد والا لا حتی یقید الخامسۃ
بسجدۃ۔ قال العلامۃ محمد امین قولہ تفسد ای صلوٰۃ المسبوق لانہ اقتدا فی موضع الانفراد وکان اقتداء
المسبوق بغیرہ مفسد کما مر قولہ الا ای وان لم یقعد وتابعہ المسبوق لا تفسد صلوٰتہ لان ما قام الیہ
الامام علیٰ شرف الرفض ولعدم تمام الصلوٰۃ الخ۔ (ردّ المحتار ج ا ص۵۹۹ باب اللاحق والمسبوق)

لہ قال ابن نجیم المصریؒ: (وان قعد فی الرابعۃ ثم قام عاد وسلم) الخ وقال بعد سطر واحدۃ ثم قیل القوم
یتبعونہ فان عاد عادوا معہ وان مضی فی النافلۃ اتبعوہ لان صلوٰتہم تمت بالقعدۃ۔ والصحیح
انہم لا یتبعونہ لانہ لا اتباع فی البدعۃ۔ فان عاد قبل تقیید الخامسۃ بالسجدۃ اتبعوہ بالسلام
فان قید سلموا فی الحال (وان سجد للخامسۃ تم فرضہ وضم الیہا سادسۃ) ای لم تفسد
فرضہ بسجودہ کما فسد فیما اذا لم یقعد ھٰذا ھو المراد بالتمام والا فصلاتہ ناقصۃ کما سیاتی۔ وانما لم
یفسد لان الباقی اصابۃ لفظ السلام وھی واجبۃ۔ وانما یضم الیہا اخریٰ لتصیر الرکعتان لہ نفلاً
للنہی عن الرکعۃ الواحدۃ۔ فاذا ضم فانہ یتشہد ویسلم ثم یسجد للسھو کما سیاتی۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۰۲ باب سجود السھو)

وایضاً قال ابن نجیم المصریؒ: وَلَوْ قام الامام الی الخامسۃ فی صلوٰۃ الظہر فتابعہ
المسبوق ان قعد الامام علیٰ رأس الرابعۃ تفسد صلوٰۃ المسبوق وان لم یقعد لم تفسد حتی
یقید الخامسۃ السجدۃ۔ فاذا قیدھا بالسجدۃ فسد صلوٰۃ الکل۔ لان الامام اذا قعد علی
الرابعۃ تمت صلوٰتہ فی حق المسبوق فلا یجوز للمسبوق متابعتہ۔

(البحر الرائق ج ا ص۳۷۸ باب الحدث فی الصلوٰۃ)
ومثلہ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ا ص۱۶۱، ۱۶۳۔ الفصل فی السجود السھو

فرائض اور نوافل میں سجدۂ سہو کا حکم

سوال:۔ نفل نماز کے اندر سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سجدۂ سہو درحقیقت نماز میں کسی واجب کے ترک پر جو قصور رہ گئی ہو اس کا جبیرہ ہوتا ہے، اور ترک واجب صرف فرض سے خاص نہیں بلکہ نفل نماز میں بھی ہوسکتا ہے، اس لیے سجدۂ سہو کا حکم فرض اور نفل نماز میں یکساں ہے۔

وفی الهندیة: وحکم السهو فی الفرض والنفل سواء۔ کذا فی المحیط۔
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۲۶ باب سجود السهو)[1]

نماز کے آخر میں سلام کا حکم

سوال:۔ ایک مصلّی (نمازی) نے ایک طرف سلام پھیرا اور دوسری طرف سلام نہیں پھیرا بلکہ ویسے ہی اٹھ کھڑا ہوا، یا اگر دونوں طرف سلام نہ پھیریں تو ایسے نمازی کی نماز کا کیا حکم ہے؟ کیا دوبارہ نماز پڑھنی چاہیئے یا یہ کافی ہے؟

الجواب:۔ ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد نماز بلا کراہت درست ہو جائے گی، کیونکہ جب پہلا سلام پھیر دیا تو نماز پوری ہو گئی، ہاں دوسری طرف سلام پھیرنا بھی واجب ہے۔ لہٰذا سینہ پھیرنے اور بات کرنے سے قبل یاد آنے پر دوسری طرف بھی سلام پھیر دے، اور اگر دونوں طرف سلام نہیں پھیرا ہو تو نماز سے منافی کام کرنے سے قبل یاد آنے کی صورت میں فوراً بیٹھ کر سجدۂ سہو کر کے پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے تو نماز درست تصور ہو گی، ورنہ ترکِ واجب سے مکروہ تحریمی ہو کر نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے، جیسا کہ دونوں طرف قصداً سلام چھوڑنے پر سجدۂ سہو کرنے سے نماز پوری نہیں ہو گی بلکہ اعادہ واجب رہے گا۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولفظ السلام مرّتین فالثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وینقضی قدوة بالاوّل قبل علیکم علی المشهور

---

[1] قال ابن نجیم المصری (رحمه الله): فان سجود السهو فی مطلق الصلوٰة۔ ولا یختص بالفرائض۔
(البحر الرائق جلد ۲ ص ۹۱ باب سجود السهو)

عندنا وعلیہ الشافعیؒ خلافاً للتکملۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۸۹)[1]

سجدہ سہو کے سلام میں امام کی متابعت نہ کرنے سے نماز کا حکم

سوال:۔ اگر مدرک نے امام کے ساتھ سجدہ سہو کا سلام پھیرنے کے وقت قصداً سلام نہیں پھیرا، صرف سجدۂ سہو میں شریک ہوا، تو کیا ترکِ واجب کی وجہ سے وہ اپنی نماز کو لوٹائے؟ اور اگر سہواً سلام نہیں پھیرا ہو تو مقتدی پر الگ سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا، اس لیے نماز ہو جائے گی، کیا یہ درست ہے؟

الجواب:۔ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے قبل ہو یا بعد میں، ہر دو صورتوں میں جائز ہے، کیونکہ روایات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کا عمل منقول ہے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریع عامہ کے لیے فرمایا ہے: لکل سھو سجدتان بعد السلام۔ اسلیئے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرنا افضل ہے اور سلام پھیرنے سے قبل خواہ قصداً ہو یا سہواً، ہر دو صورتوں میں جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ: وھذا الخلاف فی الاولویۃ حتی لو سجد قبل السلام لا یعیدہ لانہ لو اعاد یتکرر وانہ خلاف الاجماع۔ الخ۔ وذلک کان مجتھدٌ فیہ۔ وروی عن اصحابنا انہ لا یجزئہ یعیدہ کذا فی المحیط وفی غایۃ البیان ان الجواز ظاھر الروایۃ وفی التجنیس لو کان الامام یریٰ سجدتی السھو قبل السلام والمأموم بعد السلام قال بعضھم یتابع الامام

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: الثامن لفظ السلام ولا یتصور ایجاب السجود بترکہ لانہ بعد القعود الاخیر اذا لم یأتِ بمنافٍ فانہ یسلم وان اُتی بمنافٍ فلا سجود ولھذا قال فی التجنیس والسھو عن السلام یوجب سجود السھو۔ والسھو عنہ ان یطیل القعدۃ ویقع عندہٗ انہ خرج من الصلوٰۃ ثمّ یعلم ذلک فیسلّم ویسجد لانہ اخر واجباً او رکناً علی اختلاف الاصلین اھ۔ وانما یتصور ایجابہ بتاخیرہٖ کما قدمناہٗ وذکرنا فی باب صفۃ الصلوٰۃ۔ ان الواجب منہ التسلیمۃ الاولیٰ وھی السلام دون علیکم ورحمۃ اللہ۔ وفی البدائع انہ لو سلّم عن یسارہٖ اولاً لا سھو علیہ لانہٗ ترک السّنۃ۔ وفی الظھیریۃ واذا سلم الرجل عن یمینہٖ وسھا عن التسلیمۃ الاخریٰ فما دام فی المسجد یأتی بالاخریٰ وان استدبر القبلۃ وعامۃ المشائخ علی انہٗ لا یأتی متی استدبر القبلۃ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۹۵ باب سجود السھو)

لان حرمة الصلوٰة باقية فيتركه رأيه برأى الامام تحقيقاً للمتابعة - وقال بعضهم لايتابع ولوتابعه لا اعادة عليه اھ وكان القول الاول مبنى على ظاهر الرواية والثانى على غيرها كما لايخفىٰ - وذكر الفقيه ابو الليث فى الخزانة انه قبل السلام مكروه - والظاهر انها كراهة تنزيه الخ - (البحر الرائق باب سجود السهو ج ۱ ص۹۲) له

فاسد نماز واجب الاعادہ ہے

سوال:- اگر کسی نمازی سے ترک واجب کی صورت میں سجدہ سہورہ جائے اور سلام پھیرنے کے بعد اس کو سجدۂ سہو کا موقع نہ ملے تو اس کی نماز کا عند الشرع کیا حکم ہے ؟

الجواب:- ترکِ واجب کی صورت میں نماز کا اعادہ (لوٹانا) واجب ہے، مکمل فراغتِ ذمہ کے لیے دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ : (لها واجبات) لاتفسد بتركها وتعاد وجوبًا فى العمد والسهو ان لم يسجد له -

قال ابن عابدينؒ تحت هٰذه العبارة - وهل تجب بترك سجود السهو لعذر كما لسيه او طلعت الشمس فى الفجر لم اره قليراجع والذى يظهر الوجوب كما هو مقتضى اطلاق الشارح - لان النقصان لاينجبر بجابر وان لم يأثم بتركه فليتأمل -

(ردالمحتار ج ۱ ص۴۵۶ مطلب واجبات الصلوٰة) ۲ه

امام کے سجدہ سہو سے فراغت کے بعد مسبوق کے لیے سجدۂ سہو کا حکم

سوال:- اگر مسبوق امام کے ساتھ ایسی حالت میں آملے کہ امام سجدہ کر چکا ہو تو کیا مقتدی مسبوق سجدہ سہو کرے گا

له قال طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : ولو سجد قبل السلام لايجب عليه اعادتهما -

(خلاصة الفتاوىٰ ج ۱ ص۱۷۳ باب سجود السهو)

۲ه لما قال العلامة السيد احمد الطحطاوى: قوله واعادتها بتركه عمدا اى مادام الوقت باقيا وكذا فى السهوان لم يسجد له وان لم يعدها حتى خرج الوقت تسقط مع النقصان وكراهة التحريم - (الطحطاوى حاشية مراقى الفلاح ص۱۳۰ باب واجبات الصلوٰة)

وَ مِثْلُهٗ فى امداد الاحكام ج ۱ ص۲۸۱ كتاب الصلوٰة -

یا نہیں ؟

الجواب:۔ اس صورت مقتدی مسبوق پر سجدہ سہو ادا کرنا واجب نہیں، بلکہ اگر یہ مسبوق دوسرے سجدہ میں شامل ہوا ہو تب بھی اس پر پہلے سجدہ کی قضاء واجب نہیں۔

وفی الهندية: ولو دخل معه (ای مع الامام) بعد ما سجد سجدتی السهو یتابعه فی الثانية ولا یقضی الاول وان دخل معه بعد ما سجدهما لا یقضیهما کذا فی التبیین۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۲۸ باب سجود السهو) [1]

عیدین وجمعہ کی نماز میں کثرت جماعت کی وجہ سے سجدۂ سہو نہ کرنے کا حکم

سوال:۔ عیدین کی نماز میں تکبیرات رہ جانے پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ اور کیا عیدین کی نماز میں سجدہ سہو واجب ہونے کے باوجود چھوڑنے کی صورت میں نماز ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ عیدین کی تکبیرات واجب ہیں، اور واجب کے ترک پر سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے لیکن عیدین کی نماز میں ازدحام اور افراتفری کی وجہ سے متأخرین نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ عیدین کی نماز میں سجدہ سہو واجب ہونے کے باوجود نہ کیا جائے تاکہ لوگوں میں فتنہ وفساد برپا نہ ہو، تاہم اگر سجدہ سہو ادا کیا گیا تو لوگوں کے اٹھ جانے سے ان کی نماز میں فساد لازم نہیں آتا کیونکہ سجدہ سہو کے بعد اگر کوئی شخص اٹھ کر چلا جائے تو اس کی نماز پوری شمار کی جائے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سجدۂ سہو کے بعد قعدہ فرض نہیں بلکہ واجب ہے، اس لیے سجدۂ سہو کے بعد بغیر قعدے کے چلے جانے سے نماز مع الکراہت ادا ہوگی اور کل صلوٰۃ ادیت مع کراهة التحریم یجب اعادتها کا قاعدہ اس پر جاری ہوگا اور اگر مجمع کثیر نہ ہو تو سجدۂ سہو کیا جائے گا۔

قال الحصکفیؒ: والسهو فی صلوٰة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواءٌ۔ والمختار عند المتاخرين عدمه فی الاولیین لدفع الفتنة کما فی جمعة البحر واقره المصنف وبه جزم

---

[1] قال الحصکفیؒ: والمسبوق يسجد مع امامه مطلقاً سواءٌ کان السهو قبل الاقتداء او بعده۔ قال ابن عابدینؒ تحت هذه العبارة (قوله سواءٌ کان السهو الخ) بیان للاطلاق وشمل ایضاً ما اذا سجد الامام واحدة ثم اقتدی به قال فی البحر فانه یتابعه فی الاخری ولا یقضی قضاء الاولی کما لا یقضیهما لو اقتدی به بعد ما سجدهما۔ (رد المحتار ج ۲ ص۸۳ باب سجود السهو)

فی الدر اھ۔ قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذہ العبارۃ (قولہ عدمہ فی الاولیین) الظاھر ان الجمع الکثیر فیما سواھما کذٰلک کما بحثہ بعضھم وکذا بحثہ الرحمتی۔ وقال خصوصاً فی زماننا وفی جمعۃ حاشیۃ ابی السعود عن العزمیۃ ان لیس المراد عدم جوازہ بل الاولیٰ ترکہ لئلا یقع الناس فی فتنۃ اھ قولہ وبہ جزم فی الدرر لکنہ قیدہ محشیھا الوانی بما اذا حضر جمیع کثیر والا فلا داعی الی الترک۔ (ردّ المحتار ج۱ ص۵۵۶ باب سجود السہو)[1]

نماز میں زیادہ دیر خاموش رہنے کا حکم

سوال:۔ ہماری مسجد کے امام صاحب عشاء کے وتر باجماعت پڑھا رہے تھے جب تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہوئے تو چند لمحے خاموش رہے پھر قرأت شروع کی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، کیا امام مذکور کا ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں اتنی دیر بلا عذر خاموش رہنا کہ اس میں تین بار سُبحَانَ اللّٰہ پڑھا جا سکتا ہو موجب سجدہ سہو ہے، اسلئے صورتِ مذکورہ میں امام صاحب کا سجدۂ سہو کرنا درست اقدام ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: واعلم انہ اذا شغلہ ذٰلک الشک فتفکر قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقراءۃ ولا تسبیح ذکرہ فی الذخیرۃ وجب علیہ سجود السہو۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۵۰۶ باب سجود السہو)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: قال فی الفتاویٰ القعدۃ بعد سجدتی السہو لیست برکنٍ وانما اُمِر بھا بعد سجدتی السہو لیقع ختم الصلوٰۃ بھا حتّٰی لو ترکھا فقام وذھب لا تفسد صلاتہ کذا قالہ الحلوانی کذا فی السراج الوھاج۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۲۶ باب سجود السہو)

وفی الھندیۃ: السہو فی الجمعۃ والعیدین والمکتوبۃ والتطوع واحد الا ان مشائخنا قالوا لا یسجد للسہو فی العیدین والجمعۃ لئلا یقع الناس فی فتنۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۲۸ باب سجود السہو)

[2] وفی الھندیۃ: واذا شک فی صلوٰتہ فلم یدر اثلاثاً صلی ام اربعاً وتفکر فی ذٰلک کثیراً ثم استیقن انہ صلی ثلاث رکعات فان لم یکن تفکر شغلہ عن اداء رکن بان یصلی ویتفکر فلیس علیہ سجود السہو وان طال تفکرہ حتّٰی شغلہ عن رکعۃ او سجدۃ او یکون فی رکوع او سجود فیطول تفکرہ فی ذٰلک وتغیر حالہ بالتفکر فعلیہ سجود السہو استحساناً۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۳۱ باب سجود السہو)

باب صلوٰۃ المریض

(بیمار کی نماز کے احکام و مسائل)

بیماری کی حالت میں فوت ہوجانے والی نمازوں کی قضاء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص شدید بیمار رہے اور کسی بھی صورت میں نماز پڑھنے پر قادر نہیں جس کی وجہ سے اس کی چند نمازیں فوت ہو گئیں، جبکہ اسی مرض میں اس کا انتقال ہوگیا، اب اس کی فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کسی بیمار سے شرعی عذر کی وجہ سے کچھ نمازیں فوت ہوجائیں تو صحتیابی کے بعد ان کی قضاء لازمی ہے، تاہم اگر اسی بیماری میں مریض کا انتقال ہوجائے تو شرعاً اس سے قضا شدہ نمازیں ساقط ہو جائیں گی اور فدیہ وغیرہ دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: فلومات ولم یقدر علی الصلوٰۃ لم یلزمه القضاء حتی لایلزمه الایصاء بها کالمسافر اذا افطر ومات قبل الاقامة۔ (رد المحتار ج۲ ص۹۹ باب صلوٰۃ المریض)[1]

مریض کو نماز کے لیے اٹھانا سنت ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص دل و دماغ کا مریض ہو اور اسی تکلیف کی وجہ سے ساری رات بے خوابی میں رہ کر صبح کے قریب سوجائے، تو ایسے بیمار کی نماز کا کیا حکم ہے؟ اور اگر کوئی شخص اُسے نماز کے لیے اٹھائے تو شرعاً یہ کیسا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ مریض نماز پر قدرت رکھتا ہو، خواہ اشارہ سے کیوں نہ ہو، تو اس مریض کو نماز کے لیے اٹھانا بہتر بلکہ نیکی کے کام میں امداد اور عبادت ہے۔

لقوله تعالیٰ: تَعَاوَنُوا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ (سورۃ المائدہ پ۶، رکوع ۱ آیت ۲)

وبحدیث النبی صلی اللہ علیه وسلم: عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنه عن ابیه خرجت مع النبی صلی اللہ علیه وسلم لصلوٰۃ الصبح فکان لایمرّ برجلٍ الّا ناداه بالصلوٰۃ

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: حتی لومات المریض ایضاً من ذٰلك الوجه ولم یقدر علی الصلوٰۃ لایجب علیه القضاء حتی لایلزمه الایصاء قصار کالمسافر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۱۵ باب صلوٰۃ المریض)

او حرکه برجله۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۲۹ باب الاضطجاع بعدها) ؎

نماز کے قیام کے سقوط میں ڈاکٹر کے مشورہ کی حیثیت

سوال:۔ ایک مریض کو ڈاکٹر کہتا ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کریں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے تمہاری بیماری بڑھ جائے گی، لیکن وہ ڈاکٹر کا کہنا نہیں مانتا اور کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھتا ہے، لہٰذا اس شخص کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز میں قیام فرض ہے، اگر مریض کو قیام پر قدرت حاصل ہو اور مرض کی زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، کھڑے ہونے سے کوئی تکلیف بھی نہ ہوتی ہو تو بلا عذر قیام ترک کرنا جائز نہیں، البتہ معذور شخص کو قیام ترک کرنا مرخص ہے۔ عذر کے تحقق کا دارومدار نفس الامر میں موجود ہونے پر ہے، اگر بیمار کو خود یہ احساس ہو کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے بیماری بڑھ جاتی ہے، علاوہ ازیں ڈاکٹر اگر متعلقہ بیماری میں ماہر ہو اور مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ نماز کی حقیقت کا بھی قائل ہو تو ایسے ڈاکٹر کے مشورہ پر مریض عمل کر سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن الهمامؒ: قوله اذا عجز المريض عن القيام صلّٰى قاعداً يركع ويسجد) المراد اعم من العجز الحقيقي حتى لو قدر على القيام لكن يخلف بسببه ابطاء برءٍ اوكان يجد الماً شديداً اذا قام جازله تركه۔ (فتح القدير ج ۱ ص ۴۵۷ باب صلٰوۃ المريض)

قال ايضاً: ثمّ معرفته (اى ازدياد المرض) ذٰلك باجتهاد المريض والاجتهاد غير مجرّد الوهم بل هو غلبة ظن عن امارة اوتجربة او باخبار طبيب مسلم

؎ اخرج الامام ولى الدين ابو عبد الله بن محمد بن عبد الله الخطيب: عن ابى بكرة قال خرجتُ مع النبىؐ لصلٰوة الصّبح فكان لايمر برجلٍ الا ناداه بالصلٰوة او حركه برجله۔

قال الملّا علی قاریؒ فی شرح الحديث: فيه حث على ايقاظ النّائم ونحوه للصلٰوة ويؤخذ من تحريكه برجله جواز ذٰلك من غير كراهة۔

(المرقاة شرح مشكٰوة المصابيح ج ۲ ص ۱۵۷ باب الاذان الفصل الثالث)

غیرظاهرالفسق۔ (فتح القدیر ج۲ ص۲۷۲ فصل ومن کان مریضاً فی رمضان الخ) ؎۱

رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ رکھنے والے کیلئے قیام کا حکم

سوال:۔ ایک مریض نے آنکھوں کا آپریشن کرایا ہے، ڈاکٹر نے اُسے رکوع اور سجدہ کرنے سے منع کیا ہے لیکن قیام پر وہ خوب قادر ہے۔ تو کیا اس صورت میں اسکی نماز بیٹھ کر قیام کے بغیر درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص سجدہ پر قادر نہیں تو اس سے قیام ساقط ہے تاوقتیکہ صحتیاب ہوجائے لہٰذا یہ شخص بیٹھ کر رکوع اور سجدہ اشارہ سے پڑھے کیونکہ کھڑے ہونے کی بجائے بیٹھ کر اشارہ کرنا زمین کے نزدیک ہے، اشارہ کرتے وقت سجدہ کیلئے رکوع کی بہ نسبت ذرا نیچے ہوکر اشارہ کرے۔

قال الحصکفیؒ: او صلّی قاعداً کیف شاء برکوع وسجود وان قدر علیٰ بعض القیام قام وان تعذرا (ای الرکوع والسجود) لیس تعذرھما شرطاً بل تعذر السجود کاف (لاالقیام اومأ قاعداً) وھو افضل من الایماء قائماً لقربہ من الارض۔ ویجعل سجودہ اخفض من رکوعہ لزوماً ولا یرفع الیٰ وجھہ شیئاً یسجد علیہ فانہ یکرہ تحریماً۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۹۸،۹۷ باب صلوٰۃ المریض) ؎۲

؎۱ قال الحصکفیؒ: من تعذر علیہ القیام لمرض قبلھا اوفیھا (ای الفریضۃ) بان خاف زیادتہ اوبطاء برئہ بقیامہ اودوران رأسہ اووجد لقیامہ الماً شدیداً صلّی قاعداً کیف شاء برکوع وسجود وان قدر علیٰ بعض القیام ولو متکئاً علیٰ عصا اوحائط قام۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۹۶،۹۵ باب صلوٰۃ المریض)

وایضاً قال: اومریض خاف الزیادۃ لمرضہ وصحیح خاف المرض وخادمۃ خافت الضعف بغلبۃ الظن بأمارۃ اوتجربۃ اوباخبار طبیب حاذق مسلم مستور۔

(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۴۲۲ فصل فی العوارض المبیحۃ للصوم)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۳۶، ج۱ ص۲۰۷ الباب الخامس فی الاعذار التی تبیح الافطار۔ صلوٰۃ المریض۔

؎۲ قال عبداللہ النسفیؒ: اوخاف زیادۃ المرض صلّی قاعداً یرکع ویسجد وموميًا ان تعذر وجعل سجودہٗ اخفض ولا یرفع الیٰ وجھہ شیئاً یسجد علیہ۔ فان فعل وھو یخفض رأسہ صح والّا لا۔ وان تعذر الرکوع والسجود لا القیام اومأ قاعداً۔

(کنزالدقائق علیٰ ھامش البحرالرائق ج۲ ص۱۱۳،۱۱۲ باب صلوٰۃ المریض)

ومثلہٗ فی الھدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۱ ص۴۵۷ باب صلوٰۃ المریض۔

معذور کی نماز کا طریقہ

سوال:- ایک شخص کسی شدید حادثہ کا شکار ہوا ہے، اب اس کی حالت یہ ہے کہ ناف کے نیچے بالکل بے حس ہو چکا ہے، حادثے کے بعد سے اس کا پیشاب پائپ کے ذریعہ نکالا جاتا ہے، پیشاب کی نالی کے ساتھ دن رات پائپ لگا رہتا ہے جس کے ذریعے قطرہ قطرہ پیشاب رِس رِس کر بوتل میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے نماز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ وہ قیام و رکوع اور سجدہ پر بھی قادر نہیں، اس کے علاوہ خود وضوء کرنے سے قاصر ہو کر کسی دوسرے سے استنجاء اور وضو کرانا بھی مشکل ہے، تو ایسے شخص کے لیے تیمم اور وضو کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- ایسے معذور شخص کا یہ عذر جب تک موجود ہو تو ایسی صورت میں یہ بغیر وضو کے تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے، اور اگر تیمم کی قدرت بھی نہ ہو تو بغیر طہارت نماز ادا کرے گا اور اعادہ بھی واجب نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (والمحصور فاقد) ای الماء والتراب الخ وکذا العاجز عنهما لمرض (یؤخرها عنده وقالا یتشبه) بالمصلین وجوبًا الخ وبه یفتی والیه صح رجوعه) ای الامام کما فی الفیض وفیه ایضًا (مقطوع الیدین والرجلین اذا کان بوجهه جراحة یصلی بغیر طهارة ولا تیمم (ولا یعید علی الاصح)۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۱ ص۱۸۵ باب التیمم)

اور جب قیام، رکوع اور سجدہ پر بھی قادر نہ ہو تو یہ شخص اشارہ سے نماز ادا کرے گا۔ اشارہ کی کیفیت یہ ہو گی کہ چارپائی پر لیٹ کر پاؤں قبلہ کی جانب کرے، پیچھے سے کوئی شخص بیٹھے یا پیٹ کے نیچے سرہانہ یا کوئی دوسری چیز رکھے تاکہ سر ذرا اونچا ہو کر اشارہ کر سکے۔ اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر جیسے بھی اشارہ ممکن ہو وہ کیفیت اختیار کر کے نماز پڑھے۔

قال الحصکفیؒ: (من تعذر علیه القیام) ای کله (لمرض) حقیقی وحدہ ان یلحقه بالقیام ضرر به یفتی قبلها (وفیها) ای الفریضة (أو) حکمی بأن یخاف زیادته او بطء برئه بقیامه او دوران رأسه او وجد لقیامه ألمًا شدیدًا او کان لو صلی قائمًا سلس بوله الخ (صلی قاعدًا) ولو مستندًا الی وسادة او انسان فانه یلزمه ذلك علی المختار کیف شاء علی المذهب لان المرض أسقط عنه الارکان فالهیئات اولی الخ۔ وایضًا قال (وان تعذر القعود) ولو حکمًا (أومأ مستلقیًا علی ظهره) (ورجلاه نحو القبلة) غیر انه ینصب رکبتیه لکراهة مد الرجل الی القبلة ویرفع رأسه یسیرًا لیصیر وجهه الیها الخ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص۹۷، ۹۸، ۹۹ باب صلوٰة المریض)[1]

---

[1] ومثله فی کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج ۲ ص۱۱۲-۱۱۳ باب صلوٰة المریض۔

باب سجدۃ التلاوۃ

(سجدۂ تلاوت کے احکام ومسائل)

سجدۂ تلاوت کے وجوب کیلئے پوری آیت کا پڑھنا یا سننا ضروری ہے

سوال:۔ اگر سجدہ کی پوری آیت تلاوت نہ کی جائے بلکہ نصف یا اس سے زائد حصہ تلاوت کی جائے تو اس صورت میں سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ سجدۂ تلاوت کے وجوب کے لیے پوری آیت کا پڑھنا یا سننا ضروری ہے، اگر نصف یا اس سے زائد حصہ کی تلاوت کی ہو اور جس کلمہ میں حروفِ سجدہ واقع ہوئے ہوں اس کی تلاوت نہ ہوسکے تو سجدہ واجب نہیں رہے گا، البتہ ایسا کرنا صحیح نہیں کہ سجدہ کی جگہ پر پہنچکر اس کو چھوڑ دے۔

قال علامہ ابن العابدینؒ: (تحت قولہ یجب بسبب التلاوۃ آیۃ ای اکثرھا مع حرف السُّورۃ) والصحیح انہٗ اذا قرأ حرف السجدۃ وقبلہ کلمۃ او بعدہ کلمۃ وجب۔الخ

(ردالمحتار ج ۱ ص۱۰۳ باب سجود التلاوۃ)[1]

سجدۂ تلاوت کے لیے طہارت شرط ہے

سوال:۔ قرآن مجید کو بن دیکھے تلاوت کے لیے طہارت شرط نہیں، اس لیے بلا وضو تلاوت کرتے ہوئے اگر کہیں آیتِ سجدہ تلاوت کی جائے تو سجدہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں تلاوتِ قرآن کے لیے اگرچہ طہارت (وضوء) شرط نہیں لیکن سجدۂ تلاوت کی ادائیگی کے لیے طہارت شرط ہے، اور چونکہ سجدۂ تلاوت علی الفور واجب نہیں اس لیے بغیر وضوء کے جو آیتِ سجدہ پڑھی جائے تو طہارت حاصل کرنے کے بعد سجدہ ادا کیا جائے گا، بغیر وضو کے اگر سجدہ کیا گیا تو از روئے شرع اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: واما شرائط الجواز فکل ماھو شرط جواز الصلوٰۃ من

---

[1] لمافی الھندیۃ: ولو قرأ آیت السجدۃ الا الحرف الذی فی اٰخرھا لا یسجد۔الخ
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۳۲ الباب الثالث عشر فی سجود التلاوۃ)

طهارت الحدث وهی الوضوء والغسل وطهارت النجس وهی طهارت البدن ۔ الخ
(بدائع الصنائع ج ۱ ص۱۸۶ فصل اما شرائط الجواز) [۱]

آیتِ سجدہ پڑھنے اور سُننے سے سجدہ کا وجوب

سوال:۔ آیتِ سجدہ پڑھنے یا سُننے سے سجدہ کے وجوب کی دلیل کیا ہے؟ بسا اوقات سُننے والے کا ارادہ نہیں ہوتا، کیا ارادہ نہ ہونے کے باوجود سجدۂ تلاوت واجب ہوگا؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک آیتِ سجدہ پڑھنے یا سُننے سے سجدہ واجب ہوجاتا ہے اس میں سننے یا پڑھنے والے کے قصد وارادہ کا کوئی دخل نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: اذا قرأ ابن آدم السجدة اعتزل الشیطن یبکی ویقول یاویلہ امر ابن آدم ۔ الخ (الصحیح المسلم ج ۱ ص۶۱ باب بیان اطلاق اسم الکفر الخ)

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی طور پر بھی آیتِ سجدہ پڑھنے سے سجدہ کرنا ثابت ہے، جبکہ اکثر روایات میں سجدہ کا حکم دیا گیا ہے جس سے خلاصی سجدہ کے بغیر ممکن نہیں [۲]

آیتِ سجدہ سُننے سے بھی سجدہ واجب ہوتا ہے

سوال:۔ کیا سجدۂ تلاوت آیتِ سجدہ پڑھنے کے علاوہ سُننے سے بھی واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ نیز کیا سننے میں قصد وارادہ کا کوئی دخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سجدۂ تلاوت کے وجوب ادا کے لیے آیتِ سجدہ پڑھنے کے علاوہ سُننا بھی ایک سبب ہے، لہٰذا جب بھی آیتِ سجدہ سُنی جائے تو اس سے سجدہ واجب ہوجائے گا، تاہم اگر اس وقت

---

[۱] وقال طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ویشترط لاداء السجدة ما یشترط لاداء الصلوٰة من طهارة الثوب والبدن والمکان ۔ الخ (خلاصة الفتاوٰی ج ۱ ص۱۸۹ باب سجود التلاوة)
ومثلہ فی الهندیة ج ۱ ص۱۳۵ الباب الثالث عشر فی سجود التلاوة ۔

[۲] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: قولہ فکان فی الحدیث دلیل علی کون ابن آدم مامور بالسجود ومطلق الامر للوجوب الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۱۸۰ فصل اما سجود التلاوة)
ومثلہ فی الهندیة ج ۱ ص۱۳۲ الباب الثالث عشر فی سجود التلاوة ۔

سجدہ کرنے کی فرصت نہ ہو تو بعد میں ادا کیا جائے۔

قال برهان الدین المرغینانیؒ: والسجدة واجبة فی هذه المواضع علی التال والسامع سواء قصد سماع القرآن او لم یقصد الخ (الهدایة ج۱ ص۱۴۳ باب سجود التلاوة) [۱]

ٹی وی، ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ سجدۂ تلاوت کا عدم وجوب

سوال:۔ ٹیپ ریکارڈ ریڈیو یا ٹی وی کے ذریعہ اگر آیتِ سجدہ سنی جائے تو کیا اس کے سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ بسا اوقات کسی قاری کی آواز براہِ راست بھی سنی جاتی ہے، کیا ریکارڈنگ اور براہِ راست دونوں کا حکم ایک ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

الجواب:۔ ریڈیو، ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ ریکارڈ شدہ تلاوت جب سنی جائے تو آیتِ سجدہ سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، اگرچہ بعض کے نزدیک براہِ راست سننے سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: لا تجب بسماعه من الصدی والطیر ومن کل قال حرفاً ولا بالتهجی۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۰۸ باب سجود التلاوة) [۲]

اوقاتِ مکروہہ میں سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر اوقاتِ مکروہہ میں تلاوت کرتے ہوئے کہیں سجدہ کی آیت پڑھی جائے تو کیا اس وقت سجدہ کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ خارج از صلوٰۃ سجدۂ تلاوت کی ادائیگی علی الفور واجب نہیں، یہ جس وقت بھی ادا کیا جائے تو ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، پھر بھی مکروہ اور غیر مکروہ وقت کی رعایت ضروری

---

[۱] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: واما سبب وجوب السجدة فسبب وجوبها احد شیئین التلاوة او السماع الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۱۸۰ باب سجود التلاوة، فصل سبب الوجوب)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۲ ص۱۰۸ باب سجود التلاوة۔

[۲] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: فینظر الی اهلیة التال واهلیته بالتمیز وقد وجد فوجد سماع تلاوت صحیحة تتجب السجدة بخلاف السماع من الببغاء والصدی فان ذٰلك لیس بتلاوت۔ الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۱۸۶ باب سجود التلاوة۔ فصل بیان من تجب علیه)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۱۸۴ الفصل السابع عشر فی وجوب سجدة التلاوت۔

ہے، جب سجدہ کا وجوب وقت مشروع میں ہو تو اس کی ادائیگی اوقاتِ مکروہہ میں جائز نہیں، البتہ اگر اوقاتِ مکروہہ میں جب آیتِ سجدہ کی تلاوت کی جائے تو سجدہ کی ادائیگی ان اوقات میں جائز ہے۔

لما فی الهندیة: ولو تلاها فی وقت مباح فسجدها فی اوقات مکروهة لم تجز۔ الخ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۳۵ الباب الثالث عشر سجود التلاوة) [1]

متعدد آیاتِ سجدہ کے لیے ایک سجدہ کافی نہیں

سوال:۔ اگر ایک مجلس میں ایک شخص قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت متعدد آیاتِ سجدہ پڑھے تو کیا یہ شخص ہر ایک آیتِ سجدہ کے لیے علیحدہ علیحدہ سجدہ کرے گا یا تمام آیات کے لیے ایک ہی سجدہ کافی ہے؟

الجواب:۔ متعدد آیاتِ سجدہ پڑھتے وقت ہر سجدہ کے لیے سبب مختلف ہے، اس لیے ایسی صورتِ سجدات میں تداخل مرخص نہ ہونے کی وجہ سے ہر ایک آیت پر الگ الگ سجدہ کیا جائے گا، البتہ ایک آیتِ سجدہ کسی ایک مجلس میں بار بار پڑھنے سے جب تک مجلس برخاست نہ ہو تو ایک سجدہ کافی رہے گا۔

قال علامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله ولو کررها فی مجلسین تکررت) الاصل انه لا یتکرر الوجوب الا باحد امور الثلثة اختلاف التلاوة او السماع او المجلس۔ الخ

(رد المحتار ج۲ ص۱۱۲ باب سجود التلاوة) [2]

سجدہ صلوتیہ کی نیت رکوع میں جائز ہے

سوال:۔ نماز میں سجدۂ تلاوت کے وجوب پر اگر مستقل سجدہ کی جگہ رکوع میں

---

[1] وقال علامة ابن العابدینؒ: (تحت قوله بشروط الصلوة) ولکن یشترط لها الوقت حتی لو تلاها او سمعها فی وقت غیر مکروه فادّها فی وقت مکروه لا تجز۔ الخ

(رد المحتار ج۲ ص۱۰۶ باب سجود التلاوة)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۱ ص۱۹۰ قبیل الفصل الثامن عشر فی النذر ومایلزمه الخ

[2] وقال ملا علاء الدین الکاسانیؒ: فنقول الاصل ان السجدة لا یتکرر وجوبها الا باحد امور۔ الخ

(بدائع الصنائع ج۱ ص۱۸۱ باب سجود التلاوة)

سجدہ کی نیت کرے تو کیا اس سے ذمہ فارغ ہوجاتا ہے یا مستقل سجدہ ضروری ہے ؟

الجواب :۔ واضح ہو کہ سجدۂ صلوٰتیہ نماز سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے جو سجدہ تلاوت نماز میں واجب ہو تو وہ نماز ہی میں ادا کیا جائے گا۔ اب اگر نمازی نماز میں مستقل سجدہ کر کے اپنی بقیہ نماز جاری رکھتا ہے تو شرعاً جائز ہے اور اگر رکوع میں جاتے وقت سجدۂ تلاوت کے لیے دل سے ارادہ کرے تو بھی مشروع ہے، البتہ نیت کے بغیر رکوع میں سجدۂ صلوٰتیہ ادا نہیں ہوگا، لیکن رکوع میں سجدہ کی نیت کے لیے یہ شرط ہے کہ آیت سجدہ پڑھنے کے بعد رکوع کرنے کو تین آیات پڑھنے سے زیادہ فاصلہ نہ ہو ورنہ پھر رکوع میں نیت صحیح نہیں۔

قال حسن بن عمارؒ: ویجزی عنها ای عن سجدة التلاوت رکوع الصلوٰة ان نواها ای نوی اداءها فیه، وفیه وانقطاعه بان یقرأ اکثر من اٰیتین بعد اٰیة السّجدة بالاجماع۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۶۴ باب سجود التلاوت) [1]

عصر اور صبح کے وقت سجدۂ تلاوت جائز ہے

سوال :۔ صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک یا عصر سے مغرب تک نوافل کا پڑھنا جائز نہیں، کیا ان اوقات میں سجدۂ تلاوت کیا جا سکتا ہے یا یہ بھی ممنوع ہے ؟

الجواب :۔ ان اوقات میں نوافل اگرچہ ممنوع ہیں لیکن قضا نمازوں کی طرح اِن اوقات میں سجدۂ تلاوت کی ادائیگی جائز ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: لایکون قضاء فائتة ولو وترًا اوسجدة تلاوت و صلوٰة جنازة۔ الخ (الدر المختار ج۱ ص۳۷۵ کتاب الصلوٰة) [2]

---

[1] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: فینظر ان کانت اٰیة السّجدة فی وسط السورة فینبغی ان یختم۔ الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۱۸۸ فصل فی کیفیة اداءها)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۲۲ باب سجود التلاوة۔

[2] وقال ابن همامؒ: واداءها لیس علی الفور، حتی لو اداها فی ای وقت کان یکون مؤدیًا لاقاضیًا۔ (فتح القدیر ج۱ ص۲۰۷ کتاب الصلوٰة فصل فی الاوقات التی تکره فی الصلوٰة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۳۳ الباب الثالث عشر باب سجود التلاوة۔

کیا بغیر قیام کے سجدۂ تلاوت کرنا جائز ہے؟

سوال:۔ اگر کوئی شخص خارج صلوٰۃ (نماز کے علاوہ) آیتِ سجدہ پڑھ کر فوراً بغیر قیام کے سجدۂ تلاوت کرے تو کیا یہ جائز ہوگا یا کہ کھڑے ہوکر پھر سجدۂ تلاوت ادا کرے؟

الجواب:۔ نماز سے خارج سجدۂ تلاوت کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے ہوکر نیّت کرکے اللہ اکبر کہنے کے بعد سجدہ کے لیے بغیر رفع الیدین کے چلا جائے، سجدہ میں تسبیحات کا ورد کرکے پھر تکبیر کہہ کر سجدہ سے بغیر سلام کے اٹھ جائے، البتہ اگر کوئی بیٹھے بیٹھے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرلے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ومما یستحب لاداٴیھا ان یقوم فیسجد لان الخرور وسقوط من القیام والقرآن ورد بہ وھو مروی عن عائشۃ رضی اللہ عنھا وان لم یفعل لم یضرہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۲۶ باب سجود التلاوۃ) [۱]

بلا وضو سجدۂ تلاوت کرنا

سوال:۔ ایک شخص بغیر وضو تلاوتِ قرآنِ مجید کررہا تھا کہ اس دوران اس نے آیتِ سجدہ تلاوت کی، تو کیا یہ شخص بغیر وضوء کے سجدۂ تلاوت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے سجدۂ تلاوت فوراً کرنا متعذر ہو تو آیتِ سجدہ پڑھنے کے بعد یہ کلمات پڑھ لیے جائیں، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ، اور پھر جب موقع ملے تو سجدہ ادا کرلیا جائے۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ویستحب للتالی اوالسامع اذا لم یمکنہ السجود ان یقول، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ (الفتاویٰ التاتارخانیہ ج۱ ص۴۸۹ کتاب الصلوٰۃ۔ التلاوۃ فصل سجدۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن ھمامؒ: وقیل یکبر فی الابتداء بلاخلاف وفی الانتھاء علیٰ قول محمدؒ نعم وعلیٰ قول ابی یوسفؒ لا والظاھر الاول للاعتبار المذکور ویستحب ان یقوم فیسجد روی ذٰلک عن عائشۃؓ۔ (فتح القدیر ج۱ ص۴۷۷ باب سجود التلاوۃ)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاویٰ ج۱ ص۳۷۳ باب فی سجود التلاوۃ۔

[۲] قال العلامۃ حسن بن عمارؒ: ویستحب للتالی والسامع اذا لم یمکنہ السجود ان یقول، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ اھ ثم یقضیھا۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۲۰۷ باب سجود التلاوۃ)

سوئے ہوئے آدمی سے آیتِ سجدہ سُننا

سوال:۔ اگر کوئی شخص سوئے ہوئے آدمی کی زبان سے آیتِ سجدہ سُنے تو کیا اُس پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سجدۂ تلاوت ہر اُس آیتِ سجدہ کی تلاوت کے سماع سے واجب ہوتا ہے جو مکلّف شخص سے سُنی جائے چاہے وہ شخص بیدار ہو یا سویا ہُوا ہو، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سجدۂ تلاوت کرنا لازم ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: تلا آیۃ السجدۃ وھو نائم فسمعه رجل تلزمه السجدۃ۔ (البحرالرائق ج ۱ ص۱۶۱ باب سجود التلاوۃ) [1]

سورۂ حج کی دوسری آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنا

سوال:۔ ہمارے محلہ کی مسجد کے قاری صاحب نے سورۂ حج (اقترب للناس) کی دوسری آیتِ سجدہ کے پڑھنے پر سجدہ کیا جو کہ امام شافعیؒ کے نزدیک مقامِ سجدہ ہے، تو کیا فقہ حنفی کے مطابق اس مقام پر سجدہ کرنے سے نماز پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا کرنے سے نماز میں تو کوئی نقصان نہیں آیا البتہ اگر اس مقام پر سجدہ کرنے والا عالم ہو اور اس نے قوتِ دلیل سے راجح سمجھ کر سجدہ کیا ہو تو کوئی کراہت نہیں اور اگر بلا دلیل کے سجدہ کیا ہو تو چونکہ حنفی فقہ کے مطابق موصوف نے بلا ضرورت تاخیر کی ہے اس لیے سجدۂ سھو واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والظاھر ان ھذہ السجدۃ من المجتھد فیه ای مما للاجتھاد فیه مساغ۔ (ردّالمحتار ج ۱ ص۵۶۶ باب سجود التلاوۃ) [2]

سورۂ صٓ میں آیتِ سجدہ کون سی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مجھے ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ سورۂ صٓ میں ایک جگہ

---

[1] قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ومن النائم الصحیح انها یجب ان سمعها منه۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱ ص۱۸۴ الفصل السابع عشر فی وجوب السجدۃ التلاوۃ) ومثله فی التاتارخانیۃ ج ۱ ص۷۷۳ سجدۃ التلاوۃ۔

[2] قال العلامة سید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله والحج) ای اولی الحج لا الثانیۃ وقال الشافعیؒ فیھا سجدتان لنا ما عن ابن عباسؓ وابن عمرؓ قالا السجدۃ التلاوۃ فی الحج الاولی والثانیۃ سجدۃ الصلٰوۃ۔ (طحطاوی ص۲۹۲ باب سجدۃ التلاوۃ)

خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ آیا ہے اور ایک جگہ حسن مآب آیا ہے، ان دونوں مقامات میں سے کس مقام کی تلاوت پر سجدہ واجب ہوجاتا ہے؟

الجواب:۔ سورۂ صٓ کے مقامِ سجدہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام زیلعیؒ نے خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ کو سجدہ کی جگہ قرار دیا ہے مگر علامہ شرنبلالیؒ نے حسن مآب کو سجدہ کی جگہ قرار دے کر اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: وفی صٓ عند حسن مآب هو اولى من قول الزيلعیؒ عند و انَاب۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۰۴ باب سجود التلاوة)[۱]

آیتِ سجدہ کو ترک کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت سے بچنے کے لیے آیتِ سجدہ کی تلاوت چھوڑ دے، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص تلاوت کے دوران سجدۂ تلاوت سے بچنے کی غرض سے آیتِ سجدہ کو ترک کردے تو ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں، اسلئے ایسا کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبیؒ: ويكره ان يقرأ سورة فی صلوة اوغيرها ويترك آية السجدة لانه يشبه الفرار عن السجدة والاستنكاف عنها وذا ليس من اخلاق المؤمنين۔ (كبيری ص۴۷۰ باب سجود التلاوة)[۲]

نماز سے خارج شخص کا آیتِ سجدہ پڑھنا اور نمازی کا سننا

سوال:۔ اگر کوئی شخص نماز میں مشغول ہو کر اچانک غیر نمازی

---

[۱] قال العلامة حسن بن عمارؒ:۔ (وصٓ) وظن داؤد انما فتناه فاستغفر ربه وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ فغفرنا له ذلك وان له عندنا لزلفى وحسن مآب وهذا هو الاولى مما قال الزيلعیؒ تجب عند قوله تعالى: وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ، وعند بعضهم عند قوله تعالى: وحسن مآب۔ (مراقی الفلاح ص۳۹۳ باب سجود التلاوة)

[۲] قال العلامة الكاسانیؒ: يكره للرجل ترك آية السجدة من سورة يقرأها لان فيه قطعًا لنظم القرآن وتغيرًا لتاليف واتباع النظم والتاليف مامور به قال الله تعالى: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ اى تاليفه كان تغييره مكروهًا يقتضى كراهة ذلك۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۱۹۲ باب سجود التلاوة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۲۷ باب سجود التلاوة۔

نے آیتِ سجدہ تلاوت کی اور نمازی نے دورانِ نماز سُنی تو سامع (نمازی) کب سجدۂ تلاوت ادا کرے گا؟

الجواب:۔ سجدۂ تلاوت آیتِ سجدہ سنتے ہی ادا کرنا چاہیئے مگر جو آیتِ سجدہ غیر نمازی سے دورانِ نماز سُنی جائے تو سجدہ کی ادائیگی بعد از نماز کی جائے گی، دوران نماز سجدۂ تلاوت نہیں کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو سمع المصلی السجدۃ من غیرہ لم یسجد فیھا لانھا غیر صلاتیۃ بل یسجد بعدھا۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۱۱۲ باب سجود التلاوۃ) [1]

صرف آیتِ سجدہ لکھنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر کوئی آدمی آیتِ سجدہ ہاتھوں سے لکھے مگر زبان پر اُس کا اجراء نہ کرے تو کیا اس پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: سجدۂ تلاوت کے وجوب کے لیے پوری آیتِ سجدہ کا زبانی پڑھنا ضروری ہے اگر کوئی آدمی آیتِ سجدہ صرف کاغذ وغیرہ پر لکھے اور زبان پر اس کا اجراء نہ کرے تو ایسے آدمی پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: یجب بسبب تلاوۃ آیۃ السجدۃ۔ قال ابن عابدینؒ: احترز عما لو کتبھا او تھجاھا فلا سجود علیہ۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۰۳ باب سجود التلاوۃ) [2]

صرف آیتِ سجدہ کے ترجمہ سے بھی سجدۂ تلاوت لازم ہے

سوال:۔ کیا صرف آیتِ سجدہ کا ترجمہ پڑھنے سے

---

[1] قال العلامۃ الکاسانیؒ: اما اذا سمع المصلی ممن لیس معہ فی الصلوٰۃ حیث یسجد خارج الصلوٰۃ لان السجدۃ وجبت علیہ ولیست من افعال الصلوٰۃ لأن تلک التلاوۃ لیست من افعال الصلوٰۃ لعدم الشرکۃ بنیۃ بین التالی فی الصلوٰۃ والوجوب علیہ بسبب سماعہ والسماع لیس من افعال الصلوٰۃ اذا لم یکن من افعال الصلوٰۃ امکن اداء خارج الصلوٰۃ فیؤدی اھ۔ (البدائع الصنائع ج۱ ص۱۸۸ باب سجدۃ التلاوۃ) ومثلہ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۲۱ باب سجود التلاوۃ۔

[2] قال العلامۃ ابراھیم الحلبیؒ، وکذا لا تجب بالکتابۃ والنظر من غیر تلفظ لانہ لم یقرأ ولم یسمع۔ (کبیری ص۴۶۴ باب سجود التلاوۃ)۔

سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قرآن چونکہ الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے اس لیے اگر کوئی شخص پوری آیتِ سجدہ کا ترجمہ پڑھے تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے گا، البتہ مفہوم یا تفسیر بیان کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: والسماع شرط فی حق غیر التالی ولو بالفارسیة اذا اخبر۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله اذا اخبر) ای بانها آیة سجدة سواء فهمها اولا۔

(رد المحتار ج ۲ ص۱۰۵ باب سجود التلاوة) [1]

نماز میں سجدۂ تلاوت بلا تاخیر فوراً ادا کرنا ضروری ہے

سوال :۔ اگر کسی شخص نے نماز میں آیتِ سجدہ تلاوت کی مگر فوراً سجدہ نہیں کیا بلکہ کچھ اور آیات تلاوت کرنے کے بعد سجدۂ تلاوت کیا، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ سجدۂ تلاوت آیتِ سجدہ پڑھنے یا سننے کے بعد فوراً ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ آیتِ سجدہ پڑھتے یا سنتے ہی اُسی وقت سجدۂ تلاوت ادا کیا جائے تاخیر کرنا موجبِ گناہ ہے البتہ بصورتِ مجبوری تاخیر کی جا سکتی ہے ۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: وصفتها الوجوب علی الفور فی الصلوٰة وعلی التراخی ان کانت غیر صلوٰتیة۔ قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله علی الفور) ای فور التلاوة وظاهر انه لو آخرها الی رکعة ثانیة اثم۔ الخ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۲۶۰ باب سجود التلاوة) [2]

---

[1] قال العلامة فخر الدین الشهیر بقاضی خانؒ: ولو تلی بالفارسیة تجب علیه وعلی من سمعها السجدة فهم السامع اولم یفهم اذا اخبر السامع انه قرأ آیة السجدة۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۱ ص۱۵۶ فصل فی قرأة القرآن خطاء الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۳۳ الباب الثالث عشر فی سجود التلاوة۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: اما وقت اداءها فی الصلوٰة فوقتها فوراً الصلوٰة لما مران وجوبها فی الصلوٰة علی الفور وهو ان لا تطول المدة بین التلاوة وبین السجدة فاما اذا طالت فقد دخلت فی القضاء وصار آثماً بالتفویت عن الوقت۔ (البدائع الصنائع ج ۱ ص۱۹۱ باب سجود التلاوة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۲۴ باب سجود التلاوة۔

پرندے کی زبان سے آیتِ سجدہ سننے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص پالتو اور سدھائے ہوئے طوطے یا کسی دوسرے پرندے سے آیتِ سجدہ سُن لے تو کیا اس پر سجدۂ تلاوت کرنا لازمی ہے یا نہیں؟

الجواب:- وجوب سجدۂ تلاوت کے لیے ضروری ہے کہ تالی (تلاوت کرنے والا) مکلف اور اہل ہو، اگر آیتِ سجدہ کا ظہور کسی غیر مکلف شئے سے ہو جائے تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی شخص کسی سدھائے ہوئے پرندے یا کسی دوسرے غیر مکلف آلات (مثلاً ٹی وی، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ) سے آیتِ سجدہ کی سماعت کرے تو اس پر سجدہ تلاوت لازمی نہیں۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ولو سمع اٰیة السجدة من حیوان صرحوا بعدم وجوبها علی المختار لعدم اھلیة القاری۔ (الاشباه والنظائر ج۱ ص۱۸۱ القاعدة الثانیة ص۳۲ خاتمة) [۱]

پاگل اور مجنون سے آیتِ سجدہ سننے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص کسی پاگل یا سوئے ہوئے آدمی سے آیتِ سجدہ کی تلاوت سُنے تو اس پر اور تالی پر سجدہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ وجوبِ سجدۂ تلاوت کے لیے تالی کا اہل اور مکلف ہونا ضروری ہے اور پاگل چونکہ اس کا مکلف اور اہل نہیں اسلئے اس سے آیتِ سجدہ کی سماعت سے سجدہ لازم نہیں آتا۔ البتہ نائم (سویا ہُوا) تو ایک حقیقت کی بناء پر مکلّف ہے اس لیے اس سے آیتِ سجدہ سننے پر مختار قول کے مطابق سجدہ لازم ہے لیکن خود نائم پر عدمِ علم کی وجہ سے سجدہ لازم نہیں۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: والسماع من المجنون لا یوجبها ومن النائم یوجبها علی المختار۔ (الاشباه والنظائر ج۱ ص۱۸۱ القاعدة الثانیة خاتمة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: لکن ذکر شیخ الاسلام انه لا تجب بالسماع من مجنون ونائم وطیر لأن السبب سماع تلاوة صحیحة وصحتها بالتمیز ولم توجد۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۰۷ باب سجدة التلاوة)

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: وتجب بتلاوتهم یعنی لمذکورین خلا المجنون المطبق فلا تجب بتلاوته لعدم اھلیته۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۰۷ باب سجدة التلاوة)

سورۃ حج کی آیتِ سجدہ کی تلاوت میں شافعی المسلک امام کی متابعت کرنا

سوال:۔ احناف کے نزدیک سورۃ حج کی آخری آیت: یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ سے تُفْلِحُوْنَ تک موجبِ سجدہ نہیں، لیکن اگر ایک شافعی المسلک امام کی اقتداء کی صورت میں جب امام صاحب یہ آیت پڑھ کر سجدہ کریں تو حنفی المسلک مقتدی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ ایسے اجتہادی اور اختلافی مسائل میں شدت سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ امام کی متابعت ضروری ہونے کی وجہ سے امام کے ساتھ سجدہ کر لینا چاہیئے۔

قال العلامۃ ابن العابدینؒ: (تحت قوله للمتابعۃ) وظاهره انه يتبعه فيها لوكان فى الصلوٰة لكونه تابعًا۔۔۔الخ

(رد المحتار ج۲ ص۱۰۵ باب سجود التلاوۃ)

آیتِ سجدہ کی تلاوت کے بعد پانچ چھ آیتیں پڑھ کر سجدہ کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور قرأۃ میں آیتِ سجدہ تلاوت کی لیکن اس پر سجدہ کرنا بھول گیا اور مزید پانچ چھ آیتیں پڑھنے کے بعد سجدۂ تلاوت کرنا یاد آیا تو فوراً سجدہ کیا، تو کیا اس شخص کی نماز ہو گئی یا نہیں، جبکہ آخر میں اس نے سجدہ سہو بھی کر لیا؟

الجواب:۔ تلاوت آیتِ سجدہ کے فوراً بعد سجدہ کر لینا چاہیئے، اگر نماز میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے اور یاد آنے پر سجدہ کرے تو نماز ہو جائے گی مگر تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا ضروری ہو گا اس لیے کہ سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہو چکا ہے اور سجدۂ سہو نہ کرنے کی صورت میں نماز واجب الاعادہ ہو گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فعلى الفور لصيرورتها جزء منها ويأثم بتاخيرها ويقضيها مادام فى حرمۃ الصلوٰۃ ولو بعد السلام۔ قال ابن عابدینؒ: ثم تفسير الفور عدم طول المدۃ بين التلاوۃ والسجدۃ بقرأۃ اكثر من آيتين اوثلاث على ماسيأتى حليۃ قوله يأثم بتاخيرها الخ لانها وجبت بما هو من افعال الصلوٰۃ وهو القرأۃ وصارت من اجزائها فوجب اداؤها مضيقا كما فى البدائع ولذا كان المختار وجوب سجود السهو لوتذكرها بعد محلها۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۰۹، ۱۱۰ باب سجود التلاوۃ)

باب صلوٰۃ المسافر

(مسافر کی نماز کے احکام و مسائل)

قصر نماز کے لیے مقدارِ سفر

سوال:۔ کیا مطلق سفر کے ارادہ سے نکلنے پر نماز قصر کرنا ہوگی یا سفر کا کوئی اندازہ مقرر ہے؟

الجواب:۔ فقہ حنفی کی رُو سے مطلق سفر سے نماز قصر نہیں کی جائے گی بلکہ اس سے پہلے کم از کم تین دن کی مقدار سے سفر ضروری ہے۔ موجودہ وقت میں علماء نے اڑتالیس (۴۸) میل یا بہتر (۷۲) کلومیٹر اندازہ مقرر کیا ہے، اس سے کم مسافت کے ارادہ سے نکلنے والے کو شرعی مسافر نہیں کہا جائے گا۔

قال برھان الدین المرغینانیؒ: السفر الذی یتغیر بہ الاحکام ان یقصد مسیرۃ ثلثۃ ایام ولیالیھا الخ (الھدایۃ ج۱ ص۱۴۸ صلوٰۃ المسافر)[1]

قصر فرائض تک خاص ہے

سوال:۔ فرائض کے علاوہ سُنن میں قصر کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر سُنن پڑھنے کے لیے موقع نہ ہو تو پڑھنے کی ضرورت نہیں البتہ جب وقت ہو تو سُنت کی نماز پوری پڑھی جائے گی۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ویأتی المسافر بالسنن ان کان فی حال امن وقرار والا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۳۱ باب صلوٰۃ المسافر)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: اقل مسافۃ تتغیر فیھا الاحکام مسیرۃ ثلثۃ ایام کذا فی التبیین۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۳۸ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

وَمِثْلُہٗ فی الزیلعی ج۱ ص۲۰۹ باب صلوٰۃ المسافر۔

[2] وقال علاؤالدین الکاسانیؒ: وکذا لا قصر فی السنن والتطوعات..... الخ

(بدائع الصنائع ج۱ ص۹۲ فصل الکلام فی صلوٰۃ المسافر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر۔

مسافت اڑتالیس ۴۸ میل کے مقابلے میں فراسخ معتبر نہیں

سوال:- بعض کتابوں میں فراسخ کے لیے اعتبار نہ ہوتے کے باوجود احناف اڑتالیس میل کو اعتبار کیوں دیتے ہیں؟

الجواب:- احناف کے مذہب میں بنیادی طور پر فراسخ کے لیے اعتبار نہیں بلکہ تین دن کے سفر پر دار و مدار ہے، لیکن ایک دن میں انسان اوسطاً سولہ ۱۶ میل کی مسافت طے کرسکتا ہے اس لیے ہم نے ۱۶×۳ = ۴۸ میل کو اعتبار دیا۔

قال برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح۔

(الهداية ج۱ ص۱۴۸ باب صلوٰة المسافر) [1]

مسافر کا پوری نماز پڑھنے کی صورت میں ذمّہ فارغ ہونا

سوال:- اگر ایک مسافر نے قصر کی بجائے پوری نماز پڑھی تو کیا اس کا ذمّہ فارغ ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر درمیان میں قعدے پر بیٹھ چکا تو نماز درست ہوکر فراغت ذمّہ کے لیے کافی ہے، البتہ تاخیرِ سلام کی وجہ سے گنہگار رہے گا، لیکن اگر قعدۂ اُولیٰ کے بغیر کھڑے ہوکر مسافر نے چار رکعات پڑھ لیں تو اس کی نماز باطل ہوکر دوبارہ پڑھی جائے گی۔

قال علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: فلو اتم مسافر ان قعد في قعدة الاولى تم فرضه لكنه آساء...الخ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۸ صلوٰة المسافر) [2]

---

[1] وقال علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: ولا اعتبار بالفراسخ على المذهب ... الخ
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۳ صلوٰة المسافر)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۲ ص۱۲۹ باب المسافر۔

[2] وفي الهندية: فان صلّى اربعًا وقعد في الثانية قدر التشهد اجزأته والاخريان نافلة ويصير مسيئًا لتاخير السلام وان لم يقعد في الثانية قدرها بطلت كذا في الهداية۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر في صلوٰة المسافر)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۲ ص۱۳۰ باب المسافر۔

قصرِ نماز کے لیے سفر میں مشقت کا ہونا ضروری نہیں

سوال:۔ موجودہ دور کے اسفار میں کسی خاص مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، مثلاً ایک آدمی جب کراچی سے پشاور کا سفر کرتا ہے تو بغیر کسی تکلیف کے چند گھنٹوں میں منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے، کیا ایسی صورت میں سہولت اور راحت کے باوجود نماز قصر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سفر میں رخصت پر رعایت کسی مشقت کے ہونے پر مبنی نہیں بلکہ نفسِ سفر کے ہوتے ہوئے رخصت دی گئی ہے، خود سفر مشقت کے لیے سبب ہونے کی وجہ سے احکام اس پر مرتب ہو کر محض سفر کی موجودگی میں قصر کی جائے گی۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: حتی لو اسرع فوصل فی یومین قصر۔ الخ

(الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۲۴ صلوٰۃ المسافر) [1]

وطنِ اصلی میں تعدد ممکن ہے

سوال:۔ کیا ایک شخص کے لیے متعدد مقامات وطنِ اصلی بنانا ممکن ہے یا نہیں؟ جبکہ ہر ایک جگہ میں اس کا مستقل رہنے کا ارادہ ہو، یہاں تک کہ ایک گاؤں میں چھ مہینے اور دوسرے گاؤں میں چھ مہینے رہتا ہو اور وہاں جملہ ضروریاتِ زندگی اس کو میسر ہوں؟

الجواب:۔ وطنِ اصلی میں تعدد ممنوع نہیں۔ صورتِ مذکورہ کے مطابق ہر ایک جگہ میں جب مستقل رہنے کا عزم اس طرح ہو کہ چھ مہینے ایک جگہ میں اور چھ مہینے دوسری جگہ میں رہتا ہو، مثلاً دونوں جگہ شادی کر کے گھر آباد کیا ہو تو دونوں جگہیں موصوف کے حق میں وطنِ اصلی شمار ہوں گی اور دونوں جگہوں میں پوری نماز پڑھی جائے گی۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: ثم الوطن الاصلی یجوز ان یکون واحداً او اکثر من ذلک بان کان لہ اھل ودار فی بلدتین او اکثر ولم یکن من نیۃ اھلہ الخروج منھا وان کان ھو ینتقل من اھل الی اھل فی السنۃ حتی انہ لو خرج مسافر

---

[1] وفی الھندیۃ: ولو کانت المسافۃ ثلاثاً بالسیر المعتاد فسار الیھا علی الفرس جریاً حثیثاً فوصل فی یومین او اقل قصر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

ومثلہ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۳۹ باب المسافر۔

من بلدة فيها اهله ودخل فى اى بلدة من بلاد التى فيها اهله فيصير مقيماً من غير نية الاقامة ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۱۰۳ فصل فى بيان مايصير به المسافر مقيماً) ؎۱

ایک وطنِ اصلی کا دوسرے وطنِ اصلی سے متاثر ہونا

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنے وطنِ اصلی کو چھوڑ کر سفر کی مسافت کے اندازہ سے کسی دوسرے مقام میں اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کرے تو یہ شخص اگر دو تین دن کے لیے اپنے آبائی وطن آجائے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہاں آبائی وطن میں مملوکہ زمین بھی موجود ہو؟

الجواب:۔ کسی آدمی کا اپنے وطن سے مسافتِ سفر پر نکلنا اگر بہ نیتِ سفر ہو تو پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں نماز قصر کرنا واجب ہے، البتہ یہ شخص اگر اپنے آبائی وطن چلا جائے اور وہاں اس کی مملوکہ جائیداد بھی ہو تو یہ مقام اس کا وطنِ اصلی شمار ہو کر اتمام کرنا لازمی ہے، اس لیے کہ وطنِ اصلی متعدد بھی ہو سکتے ہیں۔

لما قال صاحب مجمع الانهر: (تحت قوله) ويبطل الوطن الاصلى بمثله لوكان له اهل الكوفة واهل البصرة فمات اهله بالبصرة وبقى له دور وعقار بالبصرة قيل البصرة لاتبقى وطناً له لانه انما كانت وطناً له بالاهل لا بالعقار الا ترى انه لو تأهل ببلدة ولم يكن له عقار صارت وطناً له وقيل تبقى وطناً له لانه كانت وطناً له بالاهل والدار جميعاً وان احدهما لايرتفع الوطن كوطن الاقامة تبقى ببقاء الثقل ۔

(مجمع الانهر ج ۱ ص۱۶۲ باب المسافر) ؎۲

؎۱ وفى الهندية، ويبطل وطن الاصلى بالوطن الاصلى اذا انتقل عن الاول باهله واما اذا لم ينتقل باهله ولكنه استحدث اهلاً ببلدة اخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيها۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۴۲ الباب الخامس عشر فى صلوٰة المسافر)

ومِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۲ ص۱۳۶ باب المسافر۔

؎۲ لما فى الهندية: ولو انتقل باهله ومتاعه الى بلد وبقى له دور وعقار فى الاول قيل بقى الاول وطناً له واليه اشار محمدؒ فى الكتاب ۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۴۲ الباب الخامس عشر فى صلوٰة المسافر)

ومِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۲ ص۱۳۶ باب المسافر۔

شادی کے بعد والدین کا گھر عورت کیلئے وطنِ اصلی نہیں رہتا

سوال:۔ شادی کے بعد عورت اگر چند دنوں کے لیے والدین کے گھر آئے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ قصر کرے گی یا پوری نماز پڑھے گی؟ جبکہ مسافت اڑتالیس ۴۸ میل ہو؟

الجواب:۔ والدین کا گھر اگرچہ عورت کے لیے وطنِ اصلی تھا لیکن شادی کے بعد خاوند کے ہاں مستقل رہائش اختیار کرکے الوطن الاصلی یبطلہ بمثلہ کی وجہ سے ابھی یہ وطنِ اصلی نہیں رہتا، اس لیے یہاں پر اقامت کی نیت نہ کرنے کی صورت میں نماز قصر ادا کی جائے گی۔

قال ابن عابدینؒ: تحت قولہ الوطن الاصلی ھو موطن ولادتہ او تأھلہ او توطنہ ای عزم علی القرار فیہ وعدم الارتحال وان لم یتأھل فلو کان لہٗ ابوان ببلد غیر مولدہ وھو بالغ ولم یتاھل بہ فلیس ذلک وطنا لہ الا اذا عزم علی القرار فیہ وترک الوطن الذی کان لہٗ قبلہ۔

(رد المحتار ج۲ ص۱۳۱ صلوٰۃ المسافر، مطلب فی الوطن الاصلی الخ)[1]

وطنِ اصلی کی آبادی کی حدود سے نکلتے ہی سفر شروع ہوگا

سوال:۔ بسا اوقات وطنِ اصلی کے حدود ممتد رہتے ہیں، ایسی حالت میں سفر کی ابتداء کہاں سے ہونی چاہیئے؟

الجواب:۔ جائے اقامت کی آبادی کی حدود سے نکلتے ہی سفر شروع ہوگا، بڑے شہروں میں محصول چونگی کے مراکز سے عموماً شہر کے حدود شروع ہوتے ہیں، تاہم بعض جگہوں میں تقدیم و تاخیر بھی ممکن ہے۔

قال عبداللہ التمرتاشیؒ: مَنْ خرج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً مسیرۃ ثلثۃ ایام ولیالیھا بالسیر الواسط مع الاستراحات المعتادۃ صلی الفرض الرباعی رکعتین الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۴ باب صلوٰۃ المسافر)[2]

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: اما اذا کان لہٗ ابوان ببلدۃ وھو بالغ فلیس بوطن لہٗ.... الخ

(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۰۴ الفصل الثانی والعشرون فی صلوٰۃ المسافر)

ومثلہٗ فی کبیری ص۵۴۴ صلوٰۃ المسافر۔ الرابع فی الوطن۔

[2] وفی الھندیۃ: الصحیح ماذکر انہ یعتبر مجاوزۃ عمران المصر الخ (الھندیۃ ج۱ ص۱۳۹، الفصل الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۲۸ باب المسافر۔

سامان کے ہوتے ہوئے انشاء سفر سے وطن اقامت باطل نہیں ہوتا

سوال:۔ بسا اوقات وطن اقامت سے سفر کے اندازہ سے باہر جانا پڑتا ہے لیکن وطن اقامت سے ترکِ تعلق کا بالکل ارادہ نہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پورا گھرانہ اور سامان اپنی جگہ پر ہوتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں اِنشاء سفر سے وطن اقامت باطل ہوکر واپس آنے پر دوبارہ نیت کی ضرورت پڑے گی یا نہیں؟ جبکہ بعض اوقات پندرہ دن کے اندر اندر دوبارہ بھی سفر کا ارادہ ہوتا ہے؟

الجواب:۔ جب تک اہل وعیال یا سامان وطنِ اقامت میں موجود ہوں تو اِنشاء سفر سے وطنِ اقامت باطل نہیں ہوتا، ایسی حالت میں دو تین دن وطن اقامت میں موقع ملنے کی صورت میں بھی پوری نماز پڑھی جائے گی، تاہم اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ایک دفعہ پندرہ دن رہنے کا باقاعدہ ارادہ کرکے قیام کرے تاکہ وطنِ اقامت کی حقیقت ثابت ہوکر دوبارہ بطلان کی صورت سے بچ جائے۔

قال علامہ ابن نجیمؒ: کوطن الاقامة یبقی ببقاء الثقل وان قام بموضع آخر۔ الخ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۳۶ باب المسافر)[1]

مسافر جس راستہ سے جارہا ہو اس کی مسافت معتبر ہوگی

سوال:۔ اگر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہوں جن میں ایک قریب اور دوسرا راستہ دور ہو تو سفر کے لیے کون سے راستہ کا اعتبار ہوگا؟

الجواب:۔ جس راستے سے مسافر جارہا ہو اُسی راستہ کی مسافت کا اعتبار ہوگا، لہٰذا اگر اس راستہ کی مسافت سفرِ شرعی کے اندازہ سے پوری ہو تو چلنے والا مسافر شمار ہوگا، اگرچہ دوسرا راستہ قریب کا بھی ممکن ہو۔

لما فی الھندیة: فاذا قصد بلدة والی مقصده طریقان احدهما مسیرة ثلثة

---

[1] وقال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویبطل بمثله اذا لم یبق له بالاول اهل فلو بقی لم یبطل بل یتم فیها۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۲ ص ۱۳۲ صلوٰة المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج ۱ ص ۱۴۲ الفصل الخامس عشر فی صلوٰة المسافر۔

ایام ولیالیہا والاخر دونہا فسلك الطریق الا یعد کان مسافراعند نا ۔الخ
(الفتاوی الھندیۃ ج ا ص۱۳۸ الفصل الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)[۱]

دونمازوں کو بیک وقت پڑھنا

سوال:۔ سفر کی حالت میں اگر مغرب کی نماز مؤخر کر کے عشاء کے وقت میں دونوں اکٹھی پڑھی جائیں تو اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب: دونمازوں کا بیک وقت پڑھنا اگر صوری ہو (یعنی ایک نماز مؤخر کر کے آخری وقت میں اور دوسری نماز پہلے وقت میں پڑھی جائے) تو بوقتِ ضرورت اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کے علاوہ کسی دونمازوں کا بیک وقت پڑھنا جس میں ایک نماز اپنے وقت سے پہلے یا بعد میں پڑھی جائے فقہ حنفی کی رو سے یہ ناجائز ہے۔ فقہ حنفی میں بجز عرفات اور مزدلفہ کے حقیقی طور سے جمع بین الصلوٰتین مشروع نہیں۔

قال محمد بن حسن الشیبانیؒ: لایجمع بین صلوٰتین فی وقت واحد فی حضر ولاسفر الّا بین العرفۃ والمزدلفۃ۔ (المبسوط ج ا ص۱۴۷ مواقیت الصلوٰۃ)[۲]

غیر آباد جگہ میں اقامت کی نیّت

سوال:۔ بسا اوقات انسان کسی ایسی جگہ خیمہ زن ہوجاتا ہے جہاں پر کوئی آبادی نہیں ہوتی، یہ بھی ممکن ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے فقدان کی وجہ سے یہ شخص نیّت کے مطابق ایک دن بھی پورا نہ کر سکے تو کیا ایسے جنگل اور غیر آباد جگہ میں اقامت کی نیت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اقامت کی نیّت کے لیے محل کی صلاحیت ضروری ہے، صورتِ مذکورہ

---

[۱] وقال علامہ ابن نجیمؒ: وفی فتاوی قاضی خان، الرجل اذا قصد بلدۃ والی مقصدہ طریقان احدھما مسیرۃ ثلثۃ ایام ولیالیھا والاخر دونہا فسلك الطریق الا یعد کان مسافرا عندنا۔ الخ (البحرالرائق ج ۲ ص۱۲۹ باب المسافر)

وفی خلاصۃ الفتاوی ھکذا ج ا ص۱۹۸ الفصل الثانی والعشرون فی صلوٰۃ المسافر۔

[۲] وفی الھندیۃ: ولایجمع بین الصلوٰتین فی وقت واحد لافی السفر ولافی الحضر بعذر ما ماعدا عرفۃ والمزدلفۃ کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ا ص۵۲ الباب الاوّل فی المواقیت)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی التاتارخانیۃ ج ا ص۴۰۲ کتاب الصلوٰۃ، المواقیت۔

ہیں ایسی غیر آباد جگہ میں اقامت کی نیت معتبر نہیں اسلئے نیت کے باوجود نماز قصر پڑھی جائے گی ۔

كما في الهندية: حتى نوى الاقامة في برّ او بحر او جزيرة لم يصح. الخ

(الفتاوى الهندية ج ا ص۱۳۹ الباب الخامس عشر في صلوٰة المسافر) [1]

مدتِ اقامت کی نیّت کے بغیر قصر واجب ہے

سوال: اگر ایک شخص وطن اقامت سے ۴۸ میل کی مسافت کے سفر کے ارادہ سے نکلے مگر پندرہ دن قیام یقینی نہ ہونے کی صورت میں نماز کا کیا حکم ہے ؟

الجواب: کسی موزوں مقام پر باقاعدہ پندرہ دن کی اقامت کی نیّت کے بغیر یہ شخص مسافر کے حکم میں رہے گا جس پر نماز قصر کرنا واجب ہے ۔

قال برهان الدين المرغيناني: ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة في بلدة او قرية خمسة عشر يومًا او اكثر وان نوى اقل من ذٰلك قصر... الخ

(الهداية ج ا ص۱۲۹ باب صلوٰة المسافر) [2]

اقامت میں ماتحت افراد با اختیار افسران کے تابع رہیں گے

سوال: عسکری تربیت کے دوران جب فوجی لوگ کسی جگہ اقامت کریں تو کیا پوری نماز پڑھیں گے یا قصر نماز ادا کریں گے ؟

الجواب: ایسی حالت میں بالائی افسران کی نیت پر دار و مدار ہے، اگر با اختیار افسران نے مدت اقامت کی نیت کی ہو تو ماتحت عملہ نیت نہ کرنے کے باوجود بھی پوری نماز پڑھے گا ورنہ مدت اقامت سے کم پر فوجی متنقوں میں قصر کی جائے گی ۔

قال علاؤ الدين الحصكفي: والمعتبر نية المتبوع لانه الاصل لا التابع كامرأة

---

[1] قال علامه ابن نجيم: وقيد بالبلد والقرية لان نية الاقامة لا تصح في غيرهما فلا تصح في مفازة ولا جزيرة ولا بحر ولا سفينة. الخ (البحر الرائق ج۲ ص۱۳۱ صلوٰة المسافر)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج ا ص۹۸ فصل في بيان ما يصير المسافر به مقيمًا ۔

[2] وقال علاؤ الدين الكاساني: فالذي يصير المقيم به مسافرًا نية مدة السفر والخروج من عمران المصر. الخ (بدائع الصنائع ج ا ص۹۳ فصل في بيان يصير به المقيم مسافر)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج ا ص۱۳۹ الباب الخامس عشر في صلاة المسافر ۔

وفاها مهرها المعجل وعبد غیر مکاتب وجندی اذا کان یرزق من الامیر او بیت المال۔الخ
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۳۳ باب صلاۃ المسافر) ؎۱

مہاجرینِ افغانستان کی نیتِ اقامت

سوال: افغانستان سے ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں نے دشت و بیابان میں خیمے لگا کر ڈیرے ڈال دیئے ہیں، کیا ان جنگلوں میں ان کی نیتِ اقامت درست ہے یا نہیں؟ جبکہ اقامت کی نیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں رہائش ممکن ہو؟

الجواب: مہاجرین نے کیمپوں کے قریہ کبیرہ کی شکل اختیار کرکے جنگل میں منگل کا سا سماں پیدا کیا ہے لہٰذا جملہ ضروریاتِ زندگی میسر ہونے کی وجہ سے ان کی نیت اقامت جائز ہے، اس لیے یہ مستقل مقیم شمار ہوں گے۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: واختلف المتاخرون فی الاعراب والاکراد والترکمان الذین یسکنون فی بیوت الشعر والصفوف۔ قال بعضهم لا یکون مقیمین ابدًا وان نوی الاقامۃ مدۃ الاقامۃ لان المفازۃ لیست موضع الاقامۃ والاصح انهم مقیمین لان عادتهم الاقامۃ فی المفاوز دون الامصار والقریٰ فکانت المفاوز لهم کالامصار الخ
(بدائع الصنائع ج ۱ ص۹۹ فصل فی بیان مایصیر المسافر به مقیما) ؎۲

؎۱ وفی الهندیۃ: وکل من کان تبعًا لغیرہ یلزمه طاعته یصیر مقیمًا باقامته ومسافرًا بنیته وبعد اسطر قال والجندی مع امیرہ فهٰؤلاء لا یصیرون مقیمین بنیۃ انفسهم فی ظاهر الروایۃ۔
(الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۱۴۱ الباب الخامس عشر فی صلاۃ المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۲۰۳ الفصل الثانی والعشرون فی صلوٰۃ المسافر۔

؎۲ وفی الهندیۃ: اختلف المتاخرون فی الذین یسکنون فی الخیام والاخبیۃ فی المفازۃ من الاعراب والتراکمۃ هل صاروا مقیمین بالنیۃ عن ابی یوسفؒ فیه روایتان فی احداهما لا۔ وفی الاخریٰ قال یصیرون مقیمین وعلیه الفتویٰ۔
(الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۳۳ صلاۃ المسافر۔

دائمی مُسافر کی نماز کا حکم

سوال: اگر ایک شخص عام زندگی میں مسافر رہے، کسی جگہ میں مستقل اقامت کا موقع بہت کم میسر ہو، مثلاً ڈرائیور یا پائلٹ جوکہ ہمیشہ کیلئے سفر میں رہتے ہیں، تو ان کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اقامت کے لیے باقاعدہ پندرہ دن کی نیت ضروری ہے، جہاں پر نیت نہ ہو تو مسافر شمار ہوگا۔ صورتِ مذکورہ میں ایسے لوگ جب بھی ایسی حالت میں اپنی ڈیوٹی پر رہیں تو نماز قصر کریں گے، البتہ اپنی سکونت کی جگہ اتمام کریں گے، اگرچہ چند نمازیں پڑھنے کا موقع کیوں نہ ہو۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ومن طاف الدنیا بلاقصد لم یقصر مسیرة ثلثة ایام ولیالیها صلی الفرض الرباعی رکعتین حتی یدخل موضع مقامه اوینوی اقامة نصف شهر۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۲ باب صلاة المسافر) [1]

مقیم امام کی اقتداء میں پوری نماز پڑھی جائے گی

سوال: اگر ایک مسافر نے مقیم امام کے پیچھے اقتداء کی ہو تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: امام کی متابعت کی وجہ سے مسافر مقتدی قصر نہیں کرسکتا بلکہ اتمام کرے۔

قال برهان الدین المرغینانیؒ: وان اقتدی المسافر بالمقیم فی الوقت اتم اربعًا لانه یتغیر فرضه الی اربع للتبعیة کما تتغیر بنیة الاقامة لاتصال المغیر بالسبب و هو الوقت۔ (الهدایة ج۱ ص۱۴۹ باب صلوٰة المسافر) [2]

مسافر امام کی اقتداء میں مقیم کیلئے بقیہ نماز میں قرأت نہیں

سوال: اگر ایک مقیم مُقتدی نے کسی مسافر امام

---

[1] وقال علامه ابن نجیمؒ: واما الثانی فهولان یقصد مسیرة ثلثة ایام فلوطاف الدنیا من غیر قصد الی قطع مسیرة ثلثة ایام لا یترخص۔ الخ (البحر الرائق ج۲ ص۱۲۸ باب المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی الزیلعی ج۱ ص۲۰۹ صلوٰة المسافر۔

[2] وقال علاؤ الدین الحصکفیؒ: واما اقتداء المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۳۰ باب صلوٰة المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۳۴ صلوٰة المسافر۔

کے پیچھے اقتداء کی تو امام کی فراغت کے بعد مقتدی باقی رکعات میں قرأت کرے گا یا نہیں؟

الجواب: امام کی فراغت کے بعد مقیم مقتدی کے لیے اپنی بقیہ نماز کا پڑھنا ضروری ہے لیکن چونکہ یہ امام کے پیچھے شمار ہوتا ہے اس لیے مقتدی کے ذمے آخری رکعات میں قرأت ضروری نہیں ہے بلکہ فاتحہ کی مقدار سے خاموش کھڑے ہو کر رکوع کرے گا۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وصح اقتداء المقیم بالمسافر فی الوقت وبعدہ فاذا قام المقیم الی الاتمام لایقرأ۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۹ باب صلوٰۃ المسافر)[1]

مسافر امام کے اتمام کی وجہ سے مقتدیوں کی نماز کا فاسد ہونا

سوال: اگر مقیم نے مسافر امام کی اقتداء کی، اس حالت میں مسافر امام نے قصر کے بجائے پوری نماز پڑھ لی اور اس کے ساتھ مقتدیوں نے بھی پوری نماز پڑھ لی تو مقیم مقتدیوں کی نماز کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: مسافر امام کے حق میں آخری دو رکعات نفل رہیں گی جبکہ مقیم مقتدیوں کی پوری نماز فرض ہے، لہٰذا مفترض کی اقتداء متنفل کے پیچھے لازم ہو کر مقتدیوں کی نماز فاسد کرتی ہے اس لیے اس کا اعادہ ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ لم یصر مقیما) فلو اتم المقیمون صلوٰتھم معہ فسدت لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل۔ الخ (رد المحتار ج۲ ص۱۳۰ باب صلوٰۃ المسافر)[2]

امام کی حالت سے واقفیت کی ضرورت

سوال: کسی امام کے سفر یا اقامت کے بارے میں جب مقتدی کو علم نہ ہو تو مقتدی کی ذمہ داری کیا ہے اور اس کی نماز پر اس کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟

---

[1] وفی الھندیۃ: وصاروا منفردین کالمسبوق الا انھم لا یقرؤن فی الاصح۔ الخ (الھندیۃ ج۱ ص۱۴۲ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۳۵ صلوٰۃ المسافر۔

[2] قال ابن عابدینؒ: حتی لو اتم المقیمون صلوٰتھم معہ فسدت صلوٰتھم لان ھٰذا اقتداء المفترض بالمتنفل ولا یصح۔ الخ (منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج۲ ص۱۳۵ صلوٰۃ المسافر)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۲۰۲ صلوٰۃ المسافر۔

الجواب:۔ امام کی حالتِ سفر یا اقامت سے ناواقفیت کی وجہ سے بسا اوقات مقتدی شکوک وشبہات کا شکار ہوتا ہے اس لیے امام کی حالت سے واقفیت مقتدی کے لیے ضروری امر ہے۔ اس لیے مقتدی کو امام کی حالتِ سفر وحضر معلوم کرنا چاہیئے تاکہ اس کی اقتداء درست ہو ورنہ لاعلمی کی صورت میں اقتداء صحیح نہ ہوگی۔

قال علامہ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ان العلم بحال الامام شرط لکن) وحاصلہ تسلیم اشتراط العلم بحال الامام۔
(ردالمحتار ج۲ ص۵۳۱ صلوٰۃ المسافر)[۱]

میدانِ عرفات میں حنفی المسلک کے لیے مقیم امام کی اقتداء کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! حج کے دوران عرفہ کے دن اگر شرعی مسافت سے کم مسافت سے آنے والا امام قصر نماز پڑھائے تو کیا حنفی المسلک شخص کے لیے اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک مسافتِ قصر سے کم سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز نہیں لہٰذا جو امام مقیم ہونے کے باوجود قصر نماز پڑھائے گا حنفی مقتدی کی نماز اسکے پیچھے جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ لوکان مقیما کامام مکۃ صلی بہم صلوٰۃ المقیمین لایجوز لہ القصر ولا للحجاج الاقتداء بہ۔ قال الامام الحلوانیؒ کان الامام النسفی یقول العجب من اھل الموقف یتابعون امام مکۃ فی القصر فانی یستجاب لہم اویرجی لہم الخیر وصلوتہم غیر جائز۔
(ردالمحتار ج۲ ص۵۰۵ کتاب الحج۔ مطلب فی شروط الجمع بین الصلوتین بعرفۃ)[۲]

---

[۱] وقال علامہ ابن نجیم المصریؒ: وھذا محمل ما فی الفتاوٰی اذا اقتدی بالامام لایدری أ مسافر ھو ام مقیم لایصح لان العلم بحال الامام شرط الاداء بجماعۃ۔ الخ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۱۳۵ باب المسافر)
وَمِثْلُہٗ فی الکبیری ص۵۹۱ باب صلوٰۃ المسافر۔

[۲] قال العلامۃ عبدالرحیم لاجپوریؒ رحمہ اللہ: عرفات میں حنبلی امام مقیم ہونے کے باوجود قصر کرتا ہو تو اس کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز ادا نہ ہوگی خواہ مقیم ہو یا مسافر۔
(فتاوٰی رحیمیہ ج۱ ص۱۵۹ باب صلوٰۃ المسافر)

مسافر کا غلطی سے چار رکعت کی نیّت کرنا

سوال:۔ اگر مسافر غلطی سے دو رکعت کی بجائے چار رکعت کی نیّت کرلے تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا وہ نیّت کے مطابق چار رکعت ہی پڑھے یا دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے؟

الجواب:۔ نماز کی نیّت میں نماز اور وقت کا تعین ضروری ہے تعداد کی تعیین ضروری نہیں یہ ضمناً خود بخود آجاتی ہے، چونکہ مسافر کے ذمّے صرف دو رکعت فرض ہے اس لیے نماز کی نیت بھی مسافرانہ ہوگی اگر زبان پر غلطی سے تعداد رکعات میں زیادتی ہوئی ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لابد من التعیین عند النیة ..... لفرض...... دون تعیین عدد رکعاته لحصولها ضمناً فلا یضر الخطأ فی عددها۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۴۱۸ تا ۴۲۰ باب شروط الصلوٰة مطلب فی النیة)[1]

باپ بیٹا مختلف شہروں میں رہتے ہوں تو ان کی نمازوں کا حکم

سوال:۔ اگر باپ بیٹا دو مختلف شہروں میں مقیم ہوں اور باپ بیٹے کے ہاں یا بیٹا باپ کے ہاں چلا جائے تو کیا یہ دونوں نماز قصر کریں گے یا اتمام؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں ہر شخص کے الگ الگ وطن کا اعتبار رہے، صورتِ مسئولہ میں جب دونوں کے وطن اصلی الگ الگ ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے پاس جانے سے مقیم نہیں ہوں گے بلکہ مسافر ہو کر قصر کریں گے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: الوطن الاصلی هو موطن ولادته او تأهله او توطنه یبطل بمثله اذا لم یبق له بالاول اهل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۳۲ باب صلوٰة المسافر)[2]

عمرہ کیلئے سعودی عرب جانے والوں پر قصر نماز کا حکم

سوال:۔ جو لوگ عمرہ کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جاتے ہیں اُن کا ویزہ صرف

---

[1] وفی الهندیة: النیة ارادة الدخول فی الصلوٰة والشرط ان یعلم بقلبه ای صلوٰة یصلی وادناها مالو سئل لامکنه ان یجیب علی البدیهة. ...ولا عبرة للذکر باللسان۔ (الفتاوی الهندیه ج۱ ص۶۵ الباب الرابع)

وفیه ایضاً: عزم علی الظهر وجری علی لسانه العصر۔ (الفتاوی الهندیه ج۱ ص۶۶ الفصل الرابع فی النیة)

[2] قال الشیخ وهبة الزحیلی: الوطن الاصلی هو الذی ولد فیه او تزوج او لم یتزوج وقصد التعیش فیه لا الارتحال فیه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۳۲۴ العودة الی محل الاقامة الدائم)

پندرہ دن کا ہوتا ہے ان ایام میں یہ لوگ مدینہ منورہ میں بھی قیام کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ میں بھی، تو کیا ایسے لوگ وطنِ اقامت کی طرح مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی نمازیں قصر کریں گے یا اتمام؟

الجواب: نیتِ اقامت کے لیے پندرہ دن کی نیت کا ایک ہی مقام پر ہونا ضروری ہے صورتِ مسئولہ کے مطابق چونکہ ایسے لوگ مختلف مقامات میں پندرہ دن گذارتے ہیں اس لیے اُنکی نیتِ اقامت کا اعتبار نہیں بلکہ یہ لوگ قصر کرکے نمازیں پڑھیں گے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لودخل الحاج مکة ایام العشر لم تصح نیته لانه یخرج الیٰ منیٰ وعرفة فصار کنیته الاقامة فی غیر موضعها۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۳۶ کتاب المسافر) [1]

سوال: جہادِ افغانستان میں بعض علاقے **مجاہدین غلبہ کے دوران قصر کریں گے یا اتمام** افغان مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو گئے ہیں مگر ابھی انہیں مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہو سکا تو کیا یہ مجاہدین وہاں غلبہ کے دوران پوری نماز ادا کریں یا قصر؟

الجواب: مسلم افواج جب کسی علاقہ میں فاتحانہ داخل ہوں تو جب تک وہاں پورا کنٹرول ان کے ہاتھوں میں نہ ہو تو یہ افواج وہاں نماز قصر کریں گی، البتہ جب پوری طرح کنٹرول حاصل ہو جائے اور اس علاقے کو اپنا علاقہ سمجھا جائے تو پھر نیتِ اقامت کی صورت میں نماز پوری ادا کرنا ہو گی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله (للتردد بین القرار والفرار) وفی البحر عن التجنیس اذا غلبوا علیٰ مدینة الحرب ان اتخذ وها دارا اتموا والا بل ارادوا الاقامة بها شهرا او اکثر قصروا لبقائها دار حرب وهم محاربون فیها بخلاف الاول۔ (ردالمحتار ج۱ ص۱۲۷ کتاب المسافر) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا نوی المسافران یقیم بمکة ومنیٰ خمسة عشر یومًا لم یتم الصلوٰة لان الاعتبار للنیة فی موضعین یقتضی اعتبارها فی مواضع وهو ممتنع۔ (الهدایه ج۱ ص۱۴۷ کتاب المسافر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۴۰ الباب الخامس عشر فی صلوٰة المسافر

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا دخل العسکر ارض الحرب فنووا الاقامة بها قصروا وکذا اذا حاصروا فیها مدینة او حصنًا لان الداخل بین ان یهزم فیقر وبین ان ینهزم فیفر فلم تکن دار اقامة۔ (الهدایة ج۱ ص۱۴۶ کتاب المسافر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۴۰ الباب الخامس عشر فی صلوٰة المسافر۔

دورانِ جہاد کمانڈر کا کسی جگہ پندرہ دن قیام کی نیت کرنا

سوال:۔ افغان مجاہدین اگر کسی علاقہ میں روسی افواج سے برسرِ پیکار ہوں تو کیا وہ اپنے کمانڈر کی پندرہ روزہ اقامت کی نیت کی بناء پر وہاں اتمام کریں گے یا کہ قصر؟

الجواب:۔ تابعین کے لیے اگرچہ متبوع کی نیت کا اعتبار ہے کہ وہ جہاں اقامت کی نیت کرے تو تابعین پوری نماز ادا کریں گے مگر محاذِ جنگ ایسی جگہ ہے جہاں امیرِ جماعت کی نیت کا بھی کوئی اعتبار نہیں وہاں قصر کرنا لازمی ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی جنگ کی صورت ہے اس لیے مجاہدین وہاں قصر نماز پڑھیں گے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: اذا دخل العسكر ارض الحرب فنووا الاقامة بها قصروا وكذا اذا حاصروا فيها مدينة اوحصنًا لان الداخل بين ان يهزم فيقر وبين ان يهزم فيفر فلم تكن دار اقامةٍ۔ (الهداية ج ۱ ص۱۴۶ كتاب المسافر) [1]

مسافر کا سہواً پوری نماز پڑھنا

سوال:۔ اگر کوئی مسافر سہواً قصر نماز کی بجائے پوری نماز پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسافر کے ذمے چار رکعت والی نمازوں میں صرف دو رکعت سفر انہ لازم ہے، اگر کوئی مسافر سہواً پوری چار رکعت پڑھ لے اور اُس نے قعدۂ اولی بھی کیا ہو تو نماز درست ہے اگرچہ سجدۂ سہو اُس کے ذمہ واجب ہے، اور اگر قعدۂ اولی اس سے رہ گیا ہو تو نماز نہیں ہوئی دوبارہ پڑھنا فرض ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفي رحمه الله :۔ فلو أتم مسافر ان قعد في القعدة الاولى تم فرضه ولكنه اساء لو عامدًا لتاخير السلام وترك واجب القصر وواجب تكبيرة افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض

---

[1] وفي الهندية : حاصر قوم مدينة في دار الحرب او أهل البغي في دار الاسلام في غير مصر ونووا الاقامة خمسة عشرا يومًا قصروا لان حالهم متردد بين قرار وفرار فلا تصح نيتهم وان نزلوا في بيوتهم۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۴۰ الباب الخامس عشر في صلوة المسافر)
ومثله في الدر المختار على صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۱۲۷ كتاب المسافر۔

وھٰذا لا یحل۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۱۲۸ کتاب المسافر) لـہ

مسافر قصداً پوری نماز پڑھے تو اس کا حکم

سوال: ۔اگر کوئی مسافر قصداً وعمداً پوری نماز پڑھ لے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے ؟

الجواب: ۔سفر میں نماز قصر کرنا شرعاً عزیمت ہے اس میں اپنی طرف سے قصداً وعمداً زیادتی کرنا موجب گناہ ہے اس لیے جو شخص قصداً سفر میں پوری نماز پڑھے تو گنہگار ہو گا جس سے توبہ کرنا لازم ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: وان صلى اربعًا وقعد فى الثانية قدر التشهد اجزته الاوليان عن الفرض والاخريان لهٗ نافلة اعتبارًا بالفجر ويصير مسيئًا لتاخير السلام۔ (الهداية ج۱ ص۱۴۶ کتاب المسافر) ۲ـہ

قیدی مجاہدین قصر کریں گے یا اتمام

سوال: ۔ہمارے بعض مجاہدین افغانستان میں دشمن کی قید میں ہیں جو اپنے گھروں سے مسافتِ شرعی سے زیادہ دور ہیں مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ دشمن کب انہیں یہاں سے نکالیں گے، تو کیا یہ قیدی قصر (سفرانہ) نماز پڑھیں یا پوری نماز پڑھیں ؟

الجواب: ۔اگر قیدیوں کو اپنے گھر جانے یا کسی دوسرے شہر منتقل ہونے کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ دشمن کب اور کتنے دنوں بعد ان کو رہا کرے گا یا کتنے دنوں کے بعد دوسرے شہر منتقل کرے گا، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ قیدی قصر (سفرانہ) نماز پڑھیں گے اگرچہ

لـہ قال العلامة برهان الدين المرغيناني: ان صلى اربعًا وقعد فى الثانية قدر التشهد اجزأته الاوليان عن الفرض والاخريان لهٗ نافلة اعتبارًا بالفجر ويصير مسيئًا لتاخير السّلام۔

(الهداية ج۱ ص۱۴۶ کتاب المسافر)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فى صلوٰة المسافر۔

۲ـہ قال العلامة الحصكفي: فلواتم مسافران قعد فى القعدة الاولىٰ تم فرضه ولكنه أساء لو عامدًا لتاخير السّلام وترك واجب القصر وواجب تكبيرة افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض وهٰذا لا يحل۔ (الدرالمختار علىٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۲۸ کتاب المسافر)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فى صلوٰة المسافر۔

کئی سال اُسی جگہ گذر جائیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ ولو دخل مصراً علیٰ عزم ان یخرج غداً اوبعد غد ولم ینو مدۃ الاقامۃ حتی بقی علیٰ ذٰلک سنین قصر لان ابن عمرؓ اقام باذربیجان ستۃ اشھر وکان یقصر وعن جماعۃ من الصحابۃ مثل ذٰلک۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۴۶ کتاب المسافر)[۱]

قصرواتمام میں فوجی سپاہی اپنے افسرانِ بالا کے تابع ہیں

سوال:۔ میں ایک فوجی ملازم ہوں جب میں گھر سے نکلتا ہوں تو میرے علاوہ دوسرے ساتھیوں کے بھی ٹھکانے کا کوئی علم نہیں ہوتا کبھی کہاں اور کبھی کہاں، کبھی کسی جگہ کئی کئی مہینے تک قیام کرتے ہیں اور کبھی دو دن کے بعد ہی روانہ ہوجاتے ہیں، تو ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ کیا ہم نمازیں قصر کریں یا پوری پڑھیں؟

الجواب:۔ فوجی ملازم یا سپاہی اپنے افسرانِ بالا کے تابع ہوتے ہیں اگر افسرانِ بالا کسی جگہ پندرہ دن کے قیام کی نیت کریں تو وہاں دیگر ماتحت فوجیوں کو بھی پوری نماز پڑھنا واجب ہے اور جس جگہ پندرہ دن سے کم کی نیت ہو تو وہاں قصر کریں، البتہ اگر کسی فوجی افسر کی نیت کا علم نہ ہو تو صحیح معلومات تک قصر کریں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولابد من علم التابع بنیۃ المتبوع فلو نوی المتبوع الاقامۃ ولم یعلم التابع فھو مسافر حتی یعلم علی الاصح۔ وفی الفیض وبہ یفتی کما فی المحیط وغیرہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۳۴ کتاب المسافر)[۲]

کیا سنتِ مؤکدہ کی رکعتوں میں بھی قصر کی جائے گی؟

سوال:۔ حالتِ سفر میں چار رکعت والی فرض نماز دو رکعت

---

[۱] وفی الھندیۃ: ولو بقی فی المصر سنین علی عزم انہ اذا قضی حاجتہ یخرج ولم ینو الاقامۃ خمسۃ عشر یوماً قصر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

ومثلہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۲۶ کتاب المسافر۔

[۲] وفی الھندیۃ: ان لم یعلم التبیع باقامۃ الاصل قیل یصیر مقیماً وقیل لایصیر مقیماً وھو الاصح کان فی لزوم الحکم قبل العلم بہ حرجاً وضرراً وھو مدفوع شرعاً۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۴۱ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر)

ہو جاتی ہے تو کیا سنتِ مؤکدہ میں بھی کچھ تخفیف ہے یا کہ وہ چار ہی پڑھی جائیں گی ؟

الجواب :۔ اس بات پر تو سب فقہاء متفق ہیں کہ فرض نمازوں کے علاوہ کسی نماز میں بھی قصر نہیں البتہ ترک اور عدمِ ترک میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں لیکن افضل و بہتر یہ ہے کہ اگر موقع ہو اور قافلہ چھوٹنے یا مقصود میں خلل آنے کا اندیشہ نہ ہو تو سنتیں پڑھنی چاہئیں ۔

لمافی الھندیۃ : ولا قصر فی السنن کذا فی المحیط السرخسی وبعضھم جوز للمسافر ترك السنن والمختار أنه لا یأتی بھا فی حال الخوف ویأتی بھا فی حال القرار والامن ھکذا فی الوجیز للکردری ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۳۹ الباب الخامس عشر فی صلوٰۃ المسافر) [۱]

مسافر کا مقیم امام کے ساتھ نماز کے آخر میں ملنا

سوال :۔ اگر مسافر نے مقیم امام کی اقتداء نماز کے آخر میں کی تو کیا اس صورت میں بھی مسافر پر اتمام کرنا (پوری نماز پڑھنا) ضروری ہے یا قصر کرے گا ؟

الجواب :۔ مسافر مقتدی جب مقیم امام کی اقتداء کی نیت کرے تو اتباعِ امام کی وجہ سے اُسے پوری نماز ادا کرنی ہوگی اگرچہ وہ بالکل آخر میں شامل ہوا ہو ۔

قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : وان اقتدی مسافر مقیما یصلی رباعیۃ ولو فی التشھد الاخیر ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۴۷ کتاب المسافر) [۲]

بحری جہاز کے ملازمین کپتان کے تابع ہیں

سوال :۔ بحری جہاز کے ملازمین ہمیشہ جہاز کے کپتان کے تابع ہوتے ہیں، کپتان جس ملک میں جتنے ایام گذارنا چاہے گذارتا ہے، کیا سفر کی نیت میں بھی ملازمین اپنے کپتان کی نیت کے تابع ہوں گے یا کہ ہر ملازم کو اپنی نیت کرنی ہوگی ؟

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ : ویأتی المسافر بالسنن ان کان فی حال أمن وقرار و إلّا بأن کان فی خوف وقرار لا یأتی بھا ھو المختار لأنّہٗ ترك لِعُذرٍ ۔

(الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۱۳۱ کتاب المسافر)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلّتہٗ ج۲ ص۳۴۹ سابعاً صلوٰۃ السنن فی السفر ۔

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ : واما اقتداء المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم ۔ قال ابن عابدینؒ : (تحت قولہ او القرأۃ) ... فی السراج الی الحواشی قید خل فیہ مالو اقتدی بہ فی القعدۃ الاخیرۃ ۔ (رد المختار ج۲ ص۱۳۰ باب صلوٰۃ المسافر)

الجواب:- بحری جہاز کے ملازمین جس طرح چلنے پھرنے اور کسی ملک میں قیام کرنے میں اپنے کپتان کے تابع ہوتے ہیں تو اسی طرح احکام سفر میں بھی کپتان کی نیت کا اعتبار ہوگا ملازمین جتنے بھی ایام کی نیت کریں معتبر نہیں، کتب فقہ میں اس کی نظیر امیر الجیش یا آقا کی ہے۔

وفی الھندیۃ: وکل من کان تبعاً لغیرہ یلزمہ طاعتہ یصیر مقیما باقامتہ ومسافراً بنیتہ وخروجہ الی السفر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۱ الباب الخامس عشر فی صلوۃ المسافر) [۱]

سفر کی نیت نہ ہونے کے باوجود مہینوں سفر کرنا

سوال:- بعض لوگ مہینوں سفر کرتے ہیں مگر ان کی نیت سفر کی نہیں ہوتی تو کیا وہ لوگ قصر کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟

الجواب:- مسافر کے لیے تین دن کے سفر (موجودہ دور میں ۴۸ میل یا ۷۵ کلومیٹر کے برابر مسافت) کی نیت ضروری ہے، بغیر سفر کی نیت کے سفر کرنے والا آدمی مسافر شمار نہیں ہوگا اگرچہ وہ مہینوں یا سالوں تک سفر کرتا رہے، اس لیے ایسے شخص کو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ:- ومن طاف الدنیا بلا قصد لم یقصر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۲۲ باب صلوۃ المسافر) [۲]

سفر میں شاگرد یا مرید اپنے استاد اور مرشد کا تابع ہے

سوال:- شاگرد یا مرید اپنے استاد یا پیر (مرشد) کے ساتھ سفر میں ہوں تو کیا شاگرد یا مرید اپنے استاذ یا مرشد کے تابع ہونگے یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: والمعتبر نیۃ المتبوع لأنہ الاصل لا التابع کامرأۃ وفاھا مھرھا المعجل وعبد غیر مکاتب وجندی اذا کان یرتزق من الامیر او بیت المال واجیر و اسیر وغریم۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۳۲ کتاب المسافر)

وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۴۵ کتاب المسافر۔

[۲] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: والثانیۃ بنیۃ مدۃ السفر لان الانسان قد یخرج من مصرہ الی موضع لاصلاح الضیعۃ ثم تبدو لہ حاجۃ اخری الی المجاوزۃ عنہ الی موضع آخر لیس بینھما مدۃ السفر ثم وثم الی ان یقطع مسافۃ بعیدۃ اکثر من مدۃ السفر۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۹۳ کتاب المسافر)

الجواب:۔ اگر شاگرد یا مرید کا سفری خرچہ اُستاد و مُرشد برداشت کر رہا ہو تو اس صورت میں شاگرد و مرید تابع ہو کر استاد کی نیت سے مقیم اور اس کی نیت سے مسافر ہونگے ورنہ نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله (وتلمیذ) اذا کان یرتزق من استاذه والمراد به مطلق المتعلم مع معلمه الملازم له لاخصوص طالب العلم مع شیخه۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۴ کتاب المسافر) [1]

فرمانبردار بالغ بیٹا باپ کے تابع ہے

سوال:۔ کیا سفر میں بالغ بیٹا باپ کے تابع ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بیٹا فرمانبردار ہو اور وہ باپ کے اشارے پر چلتا ہو تو بالغ ہونے کے باوجود سفر میں باپ کے تابع ہوگا اور باپ کی نیتِ اقامت سے مقیم اور نیتِ سفر سے مسافر شمار ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قلت وَمِثْلُهُ بالاولی الابن البار البالغ مع ابیه۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۴ کتاب المسافر)

پشاور کا رہنے والا کراچی میں سسرال کے ہاں دورانِ قیام قصر کریگا یا اتمام؟

سوال:۔ پشاور کے رہنے والے ایک شخص نے کراچی میں شادی کی ہوئی ہے، اب اگر یہ شخص اپنے سسرال کے ہاں کراچی جائے جبکہ اُس کی نیت بھی پندرہ دن سے کم کی ہو تو یہ شخص کراچی میں نمازیں قصر کرے گا یا اتمام؟

الجواب:۔ صرف شادی کرنے سے سسرال کا وطن وطنِ اصلی نہیں بنتا بلکہ شادی کے بعد وہاں مستقل سکونت کی نیت بھی ضروری ہے چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس شخص نے کراچی میں صرف شادی کی ہے وہاں اپنا مسکن نہیں بنایا اس لیے یہ شخص جب کراچی میں پندرہ دن سے کم قیام کرنے کی نیت کرے گا تو وہاں مسافر متصور ہو کر قصر کرے گا۔

---

[1] وفی الهندیة: والتلمیذ مع استاذه والاجیر مع مستأجره والجندی مع امیره فهؤلاء لایصیرون مقیمین بنیة انفسهم فی ظاهر الروایة ...... اما اذا کانت ارزاقهم من اموال انفسهم فالعبرة لنیتهم۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۴۱ الباب الخامس عشر فی صلوة المسافر)

وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۳۸ باب صلوة المسافر۔

قال الامام فخرالدین الشهیر بقاضی خانؒ: المسافر اذا جاوز عمران مصره.... وان کان ذٰلک وطناً اصلیاً بان کان مولدہٗ وسکن فیه اولم یکن مولدہٗ لکنه تأهل به وجعله دارا۔

(فتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیه ج ۱ ص۱۶۵ باب صلوٰۃ المسافر) لہ

اغوا ہونے والا شخص قصر کرے گا یا اتمام

سوال:۔ جو شخص اغوا ہو جائے اور اسے کسی دور دراز مقام پر لے جا کر محبوس کر دیا جائے تو اس شخص کے لیے نماز میں قصر یا اتمام کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جو شخص اغوا کر کے مسافتِ شرعی کی مقدار پر لے جایا گیا تو وہ اغوا کرنے والے کا تابع ہے اگر اغوا کرنے والا وہاں مقیم ہے تو یہ شخص اتمام کرے گا اور اگر متبوع بھی مسافر ہو تو یہ شخص بھی قصر کرے گا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله (واسیر) ذکر فی المنتقی أن المسلم اذا أسره العدو ان کان مقصده ثلاثة ایام قصر وان لم یعلم سأله فان لم یخبره و کان العدو مقیماً أتم وان کان مسافراقصر۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۱۳۴ کتاب المسافر) ۲ہ

کیا مفرور شخص کی نیّتِ اقامت صحیح ہے؟

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی جرم میں گرفتار ہونے کے خوف سے مفرور ہو کر کسی دور دراز شہر میں چلا جائے اور وہاں نیت اقامت کی کر لے تو کیا اس شخص کی نیت کا اعتبار صحیح ہوگا یا نہیں؟ جبکہ کسی وقت بھی اس کو گرفتار کر کے وہاں سے لے جایا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص مفرور ہو کر کسی ایسے مقام میں ہو جہاں کی انتظامیہ یا پولیس سے مجرم کے اپنے وطن کی پولیس یا انتظامیہ کا مجرموں کو پکڑنے یا چھاپہ مارنے کا معاہدہ ہو تو اس شخص کے

لہ قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: فالاصلی هو مولد الانسان او موضع تأهل به ومن قصده التعیش به لا الارتحال۔ (کبیری ص۵۴۵ فصل فی صلوٰۃ المسافر)

ومثله فی فتح القدیر ج۲ ص۱۶ کتاب المسافر۔

۲ہ قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: أن المسلم أسره العدو وان کان مقصده ثلاثة ایام قصر وان لم یعلم سأله فان لم یخبره وکان العدو مقیماً أتم وان کان مسافراً اقصر۔ (کبیری ص۵۴۱ فصل فی صلوٰۃ المسافر)

نیت کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ اس قرار و فرار کے مابین شک و تردد ہے، البتہ اگر اس مقام کی انتظامیہ کے ساتھ مجرم (مفرور) کے وطن کی انتظامیہ کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ نہ ہو تو نیت کا اعتبار کر کے مقیم متصور ہو گا۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : لان حالهم یخالف عزیمتهم للتردد بین القرار والفرار۔ (البحر الرائق ج ا صـ۱۳۳ باب صلوٰۃ المسافر) لہ

سوال:۔ ہم چند ساتھی بلوچستان سے یہاں دارالعلوم میں حصولِ تعلیم کیلئے آئے ہوئے ہیں، دورانِ تعلیم اگر ہم مدرسہ سے کسی کام کے لیے پشاور جائیں تو کیا ہم وہاں قصر کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مقیم بلوچستانی طلبہ پشاور میں قصر کریں گے یا اتمام؟

الجواب:۔ آپ لوگوں کا سفر یہاں تک ختم ہوا ہے اب یہاں آپ لوگ مقیم متصور ہوں گے، اگر آپ یہاں سے کسی ایسے مقام کو جائیں جو اکوڑہ سے شرعی حدِ مسافت سے کم مسافت پر واقع ہو تو پوری نماز پڑھیں گے اور اگر مسافتِ شرعی پر یا اس سے زیادہ پر واقع ہو تو پھر قصر کرنا واجب ہے اس لیے کہ آپ لوگوں کا دوسرا سفر اکوڑہ سے شروع ہو گا بلوچستان سے نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : والحاصل ان انشاء السفر یبطل وطن الاقامة اذا کان منه اما لو انشاءه من غیرهٖ فان لم یکن فیه مرور علی وطن الاقامة او کان ولکن بعد سیر ثلثة ایام فکذلک ولو قبله لم یبطل الوطن بل یبطل السفر لان قیام الوطن مانع من صحته۔ واللہ اعلم۔ (ردالمحتار ج ۲ صـ۱۳۲ کتاب المسافر) ؎۲

لہ قال العلامة الحصکفیؒ : او حاصر اهل البغی فی دارنا فی غیر مصر مع نیة الاقامة مدتها للتردد بین القرار والفرار۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ صـ۱۲۷ کتاب المسافر)
وَمِثْلُهٗ فی کبیری صـ۵۴۲ فصل فی صلوٰۃ المسافر۔

؎۲ لما قال الشیخ وهبة الزحیلی : وقد اتفق الفقهاء علی ان اول السفر الذی یجوز به القصر ونحوه هو ان یخرج المسافر من بیوت البلد التی خرج منها و یجعلها وراء ظهره۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ صـ۳۲۴ البحث الثالث الموضع الذی یبدأ منه المسافر) ـــ وَمِثْلُهٗ فی مراقی الفلاح صـ۲۳ باب صلوٰۃ السفر۔

سفر کے چند مسائل کے بارے میں معلومات

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ :۔

(۱) مسافر اور مسافت کی توضیح حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کیا ہے اور کتنی اور کس چیز پر؟ کیا وقت حاضرہ کی سواری اور سفر کی دیگر سہولیات کے پیش نظر حکم شرع میں تبدیلی جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کیا مسافر کے لیے نماز قصر پڑھنا ضروری ہے، اگر پوری پڑھے گا تو گنہگار ہوگا یا ثواب ملے گا؟

(۳) کیا کوئی آثار موجود ہیں کہ مجاہدین اسلام (حالت جنگ میں) قصر کیا کرتے تھے؟ اور اس کی قید پندرہ دن یا دس سال تک بھی کیوں نہ ہوا تھیں قصر نماز پڑھنے کا حکم تھا کیونکہ قیام کی غرض تو نہ تھی۔ ایسے ہی موجودہ دور میں اگر عساکر اسلامی کو کسی ایسی مہم پر بھیجدیا جائے، کوئی سریہ کی شکل میں کوئی حفاظت کی شکل میں، تو کیا نماز قصر کریں گے؟ اور کیا سنت مؤکدہ ادا کرنا ان کے لیے ضروری ہے یا چھوڑ دینے کی اجازت ہے؟ کیا اطمینان شرط ہے؟

(۴) ایسا مسافر جو غیر مطمئن ہوا اور اس کو کسی قسم کا علم نہ ہو کہ میں نے کتنے دن قیام کرنا ہے اور ایسی صورت میں انفرادی ارادہ کام دے گا یا اجتماعی؟ کیا نقل وحرکت کا اعتبار فرد پر ہے یا حاکم کے حکم پر؟

(۵) ایسے مجاہدین جو افسران بالا کے حکم کے منتظر ہوں اور انتظار میں ان کا چاہے کتنا ہی عرصہ قیام کریں وہ نماز قصر ادا کریں گے یا نہیں؟

(۶) کیا ایسے عساکر کو ہر وقت مسافر تصور کیا جائے گا یا اطمینان کی حالت میں مقیم مسافر امام نماز جمعہ پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ تو گویا ضروری نہیں کہ جمعہ ترک کیا جائے بلکہ باعث اجر ہے اور نہ پڑھنے میں گناہ نہیں۔

(۷) عساکر اسلامی اگر مسجد کا سامان اپنے ساتھ پھرائیں تو کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ مقامی مسجد کا سامان سفر چلتا پھرتا ہے تو کیا حکم ہے ایسے سامان کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں؟

الجواب: ۔ مسافت کی توضیح میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے "فتاویٰ رشیدیہ" میں تحریر فرمایا ہے جس کی عبارت یہ ہے: "چار برید جس کی سولہ سولہ میل کی تین منزلیں ہوتی ہیں ،

حدیث مؤطا امام مالکؒ سے ثابت ہوتی ہیں مگر مقدار میل کی مختلف ہے لہذا تین منزل کا سفر سب کے ہاں متفق ہے، یہی مقدار سفر شرعی ہے جس کی وجہ سے احکام میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ اور جس کو فقہاء کرام نے مختلف عبارات میں اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، جیساکہ فتاوٰی عالمگیری میں ہے: اقل مسافة تتغیر فیها الاحکام مسیرة ثلاثة ایام کذا فی التبیین هو الصحیح کذا فی جواهر الاخلاطی۔ (فتاوٰی عالمگیری ج ۱ ص۱۳۶) اس قدر سفر کا قصد کرنے والے کو شرعاً مسافر کہا جاتا ہے اور جو احکام اس قدر سفر سے متغیر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں: الاحکام التی تتغیر بالسفر هی قصر الصلٰوة واباحة الفطر وامتداد مدة المسح الی ثلٰثة ایام وسقوط وجوب الجمعة والعیدین والاضحیة وحرمة الخروج علی الحرة بغیر محرم کذا فی العتابیة۔ (فتاوٰی عالمگیری) اور اس مقدار سفر کو طے کرنے میں درمیانی رفتار معتبر ہے: والمعتبر السیر الوسط کذا فی السراجیة۔ اور فقہاء اس درمیانی رفتار کی وضاحت یوں کرتے ہیں: وهو سیر الابل ومشی الاقدام فی اقصر ایام السنة کذا فی التبیین۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اعتبار مسافت کا ہے اگرچہ سواری کے تیز رفتار ہونے سے وہ جلدی طے ہو جائے، جیساکہ ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ کے سفر میں یہی حکم ہے مثلاً ایک منزل مقصود کو آدمی اگر پیدل یا اونٹ پر سوار ہو کر تین دن میں پہنچ جاتا ہے اور ریل کے ذریعہ ایک دن میں اور ہوائی جہاز کے ذریعہ پچیس تیس منٹ میں، تو یہ آدمی قصر کرے گا، کیونکہ اعتبار مسافت کا ہے اور فقہاء نے بھی یہی ذکر کیا ہے، جیساکہ عالمگیری میں ہے۔ ولو کانت المسافة ثلاثاً بالسیر المعتاد فسار الیها علی الفرض جریاً فوصل فی یومین او اقل قصر، کذا فی الجوهرة النیرة (فتاوٰی عالمگیری)

اس سے ثابت ہوا کہ وقت حاضرہ کی تیز رفتار سواریوں سے حکم شرع میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔ ایسا ہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی امداد الفتاوٰی جلد ۱ میں تحریر فرمایا ہے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق قصر واجب ہے۔ والقصر واجب عندنا کذا فی الخلاصة۔ اب جس نے اتمام کیا تو ضرور گنہگار ہوگا: فان صلی اربعا وقعد فی الثانیة قدر التشهد اجزائه والاخریان نافلة ویصیر مسیئا اخیر السلام الخ

كذا في الهداية ـــــ درمختار میں ہے: صلی الفرض الرباعی رکعتین وجوبًا ـــــ علامہ شامیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: فیکرہ الاتمام عندنا حتی روی عن ابی حنیفۃؒ لانہ قال من اتم الصلوٰۃ فقد اساء وخالف السنۃ۔ (شرح منیہ ـــ شامی ج۱ ص۷۳۵)

(۳) (الف) عسکر اسلامی اگر دار الحرب میں داخل ہو جائے یا دار الحرب میں ایک شہر یا ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیں اور وہ نیّتِ اقامت کر بھی لیں تو ان کی نیتِ اقامت درست نہیں بلکہ وہ قصر کریں گے کیونکہ وہ بین القرار والحضرار ہیں۔ ھدایہ میں ہے: واذا دخل العسکر ارض الحرب فنووا الاقامۃ بہا قصروا وكذا اذا حاصروا فيها مدينۃ او حصنًا لان الداخل بين ان يهزم فيقر وبين ان يهزم فيفر فلم تكن دار اقامۃ۔ (شامی اور عالمگیری میں بھی اسی طرح لکھا ہے) اور ایک شخص مسافر اس وقت تک رہے گا جب تک کہ وہ کسی شہر یا گاؤں میں کم از کم پندرہ دن کی نیت اقامت نہ کرے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں اور اگر پندرہ دن سے کم نیتِ اقامت کرے گا تو وہ مقیم نہ ہوگا اور قصر کرے گا۔ اسی طرح امام طحاویؒ نے ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے نقل کر کے اخراج کیا ہے۔ ہدایہ میں ہے: ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامۃ فى بلدۃ او قريۃ خمسۃ عشر يومًا او اكثر ولو نوى اقل من ذلك قصر وهو ماثور عن ابن عباسؓ وابن عمرؓ (اخرجہ الطحاوی عنہما) والاثر فى مثلہ كالخبر لانہ لا مدخل للرأى فيہ فالظاہر انہ الصحابى رواه عن النبى صلى الله عليه وسلم۔ (الهدايۃ ج۱ ص۱۴۹ باب صلوٰۃ المسافر)

لہٰذا موجودہ دور میں اگر عساکر اسلامی ایسی مہم پر جا کر دار الحرب میں اتریں یا وہاں کے کسی شہر یا گاؤں کا محاصرہ کریں تو وہ اگر نیتِ اقامت کر لیں تو اتمام کریں گے نہیں۔

(ب) رہا سنتوں کا مسئلہ تو اس کے لیے سفر میں اطمینان شرط ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولا قصر فى السنن كذا فى محيط السرخسیؒ۔ وبعضہم جوزوا للمسافر ترك السنن والمختار انہ لا ياتى بہا فى حال الخوف ويأتى بہا فى حال القرار والامن ھكذا فى الوجيز للكردرى (فتاوىٰ عالمگیری ج۱ ص۱۲۸) اور اسی طرح صاحب درمختار نے بھی لکھا ہے۔

(۴) ایسا مسافر جو کسی حاجت کے لیے کسی شہر میں داخل ہو جائے اور ارادہ یہ ہو کہ جب بھی حاجت پوری ہو جائے تو نکلے گا اور پندرہ یوم نیتِ اقامت نہیں کی ہے، اور اسی طرح وہ کئی سال

وہاں رہا تو قصر کرے گا۔ عالمگیری میں ہے: ولو بقی فی المصر سنین علی عزم انہ اذا قضی حاجتہ یخرج ولم ینو الاقامۃ خمسۃ عشر یوما قصر کذا فی التھذیب۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۳۹ باب صلوٰۃ المسافر) اسی طرح ہدایہ میں ہے: ولو دخل مصرا علی عزم ان یخرج غدا او بعد غد ولم ینو مدۃ الاقامۃ حتی بقی علی ذلک سنین قصر لان ابن عمر رضی اللہ عنہ اقام باذربیجان ستۃ اشھر وکان یقصر (رواہ عبدالرزاق) وعن جماعۃ من الصحابۃ مثل ذلک۔ (رواہ البیھقی عن سعد ابن ابی وقاص وانس وغیرھما)

(الھدایۃ ج ۱ ص ۱۳۹ باب صلوٰۃ المسافر)

ایسی صورت میں انفرادی یا اجتماعی ارادے کے متعلق فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ نیتِ اقامت کے لیے پانچ شرائط ہیں جن میں ایک شرط استقلال رائے بھی ہے۔ اگر مستقل بالرائے نہ ہو بلکہ کسی دوسرے کا تابع ہو تو اس کے متعلق فقہاء کرام نے لکھا ہے:

الاصل ان من لا یمکنہ الاقامۃ باختیارہ لا یصیر مقیما بنیۃ نفسہ حتی ان المرأۃ اذا کانت مع زوجھا فی السفر والرفیق مع مولاہ والتلمیذ مع استاذہ والاجیر مع مستاجرہ والجندی مع امیرہ فھٰؤلاء لا یصیرون مقیمین بنیۃ انفسھم فی ظاہر الروایۃ کذا فی المحیط۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۱)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فوج کی اقامت اور غیر اقامت کا مدار حاکم یا اعلیٰ افسر کی نیت پر ہے اور خود اس کی اپنی نیتِ اقامت کام نہیں دے گی۔

(۵) جس کے حکم کے انتظار میں ہیں اگر اس کی طرف سے نیتِ اقامت کا کچھ پتہ نہ ہو اور اس میں کئی سال کا عرصہ گذر جائے تو قصر ہی کرے گا۔

(۶) جب یہ معلوم ہو چکا کہ یعنی فوجی سپاہی اپنے اختیار کا مالک نہیں ہے پس اگر وہ نیتِ اقامت کر بھی لے تو یہ نیت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ تو جب تک فوج کے حاکمِ اعلیٰ نے اقامت کی نیت نہیں کی ہے تو اس کے ماتحت سب مسافر ہیں اور مسافر پر اگرچہ اطمینان ہو نمازِ جمعہ نہیں ہے، کیونکہ شرائط جمعہ میں ایک شرط اقامت کی بھی ہے، سفر کی حالت میں جمعہ چھوڑ کر ظہر پڑھے گا، اس کی تو شرعاً اجازت ہے لیکن اگر مسافرین نے نمازِ جمعہ ادا کی تو یہ باعثِ اجر ہے مگر فرض وقت سے حساب ہوگا۔

شرائط وجوبِ جمعہ میں فقہاء کرام لکھتے ہیں: وھی الحریۃ والذکورۃ والاقامۃ والصحۃ

کذا فی الکافی۔ حتی لا یجب الجمعۃ علی العبد والنسوان والمسافرین والمرضیٰ کذا فی المحیط ـــــ اس سے چند سطر آگے کی عبارت کچھ اس طرح ہے: ومن لا جمعۃ علیہ اذا اداھا جاز عن فرض الوقت کذا فی الکنز۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۴ الباب السادس عشر فی صلوٰۃ الجمعۃ)

(۷) جس طرح کہ اور ضروری سفری سامان عساکرِ اسلامی اپنے ساتھ لیتے ہیں اسی طرح اگر مسجد کا سامان مثلاً چٹائی وغیرہ اپنے ساتھ لے لیں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(فقط واللہ اعلم)

جس سفر کے درمیان وطن اقامت ہو، کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! میں بسلسلہ ملازمت نوشہرہ کینٹ میں ملازم ہوں، ایک بار کسی کام کے لیے مردان گیا اور وہاں سے اسلام آباد جانے کی نیت کی، جب رسالپور پہنچا تو میں نے عصر کی نماز دو رکعت پڑھی، اس پر میرے ایک ساتھی نے کہا کہ آپ کو تو پوری نماز پڑھنی تھی، تمہارا قصر نوشہرہ سے نکل جانے کے بعد شروع ہوگا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا میرے ساتھی کی بات درست ہے یا میرا عمل؟ قرآن وسنت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ کی رو سے سفر کا انشاء وطن اقامت سے ہوتا ہے کسی دوسرے مقام سے نہیں، چونکہ آپ کا وطنِ اقامت نوشہرہ ہے مردان نہیں، جبکہ مردان اور نوشہرہ کے درمیان مسافت سفر بھی نہیں اس لیے آپ کو پوری نماز پڑھنی چاہیئے تھی، قصر کا حکم نوشہرہ سے نکل جانے کے بعد متوجہ ہوتا۔ اس لیے آپ کے ساتھی کی بات درست ہے، اگر آپ نے دوبارہ نماز نہ لوٹائی ہو تو نماز کا اعادہ کرلیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والحاصل ان انشاء السفر یبطل وطن الاقامۃ اذا کان منہ اما لو انشاہ من غیرہ فان لم یکن فیہ مرور علی وطن الاقامۃ او کان ولکن بعد سیر ثلثۃ ایام فکذلک ولو قبلہ لم یبطل الوطن بل یبطل السفر لان قیام الوطن مانع من صحتہ واللہ اعلم......... وقال فی الفتح ان السفر الناقض لوطن الاقامۃ مالیس فیہ مرور علی وطن الاقامۃ او یکون فیہ المرور بہ بعد سیر مدۃ السفر۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۸۳۰ کتاب السفر)

پندرہ دن اقامت کی نیّت کے بعد ارادہ بدلنے پر قصر ہے یا اتمام؟

سوال:- ایک شخص کسی شہر میں پندرہ دن کی نیّت سے رہنے لگا لیکن اچانک نیّت تبدیل کرکے تین چار دن کے بعد جانے کا ارادہ کرلیا حتیٰ کہ سفر کے لیے ٹکٹ بھی لے لی تو کیا یہ شخص اب قصر کرے گا یا اتمام؟

الجواب:- جس شخص نے ایک دفعہ اقامت کی نیت کرکے رہنا شروع کردیا تو وہ اُس وقت تک اس شہر میں مقیم متصوّر ہوگا جب تک وہ اس شہر کی حدود سے باہر نہ نکلے اگرچہ درمیان میں اس نے نیت تبدیل کرکے مُدّتِ اقامت سے قبل جانے کا ارادہ کرلیا ہو۔

قال العلامۃ السرخسیؒ: ولا یکون مسافراً بالنیۃ کما یکون مقیماً بالنیۃ لانہ لایکون مسافراً حتیٰ یسیر والاقامۃ تکون بالنیۃ لان الاقامۃ لیس بعمل۔ (المبسوط السرخسی ج۱ ص۲۰۰) ؎۱

کرفیو کی وجہ سے قصر و اتمام کا حکم

سوال:- ایک شخص کسی شہر میں ضروری کام کے لیے گیا مگر اتفاق سے وہاں کرفیو نافذ تھا جس کی وجہ سے پندرہ دن سے قبل وہاں سے نکلنا ممکن نہ رہا، تو کیا یہ شخص وہاں مقیم تصوّر ہوگا یا مسافر؟

الجواب:- جب کسی شہر میں پندرہ دن کا قیام یقینی ہو تو وہاں آدمی مقیم متصوّر ہوگا صورتِ مسئولہ میں چونکہ کرفیو کی وجہ سے پندرہ دن سے قبل نکلنا ممکن نہ رہا اگرچہ یہ اتفاقیہ حادثہ ہے تب بھی یہ شخص مقیم متصوّر ہوگا۔

قال العلامۃ برهان الدین المرغینانیؒ: ولایزال علیٰ حکم السفر حتیٰ ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ خمسۃ عشر یوماً او اکثر۔ (الھدایہ ج۱ ص۱۳۲ باب المسافر) ؎۲

کسی دوسرے شہر میں ذاتی مکان ہو تو اس میں قصر و اتمام کا حکم

سوال:- بعض مالدار لوگ موسم گرما کے ایام سوات، چترال،

؎۱ قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: والثالث: الخروج من عمران المصر فلا یصیر مسافراً بمجرد نیۃ السفر مالا یخرج من عمران المصر۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۹۴ فصل مایصیر بہ المقیم مسافر)

؎۲ قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ولا یزال المسافر علیٰ حکم السفر حتیٰ ینوی الاقامۃ مدۃ معینۃ ستذکرھا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۲ ص۳۲۵ الثالث الموضع الذی یبدأ منہ الخ)

ومثلہٗ فی کبیری ص۵۳۹ فصل فی صلوٰۃ المسافر۔

ایبٹ آباد، مری وغیرہ ٹھنڈے علاقہ جات میں گذارتے ہیں، اس مقصد کے لیے انہوں نے وہاں اپنے ذاتی مکان بھی بنا رکھے ہیں، تو کیا یہ لوگ ان علاقوں میں مقیم متصور ہوں گے یا مسافر؟ خواہ وہ ایک دو دن کے لیے ہی جاتے ہوں؟

الجواب: - جو شخص کسی دوسرے شہر میں اپنا ذاتی مکان بنائے اور وہاں ایک دفعہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ موسم گرما گذارے تو وہ اس شخص کا وطنِ اصلی شمار ہوگا، اس طرح یہ شخص جب بھی اس شہر میں آئے گا مقیم ہو کر پوری نماز پڑھے گا جب تک اس کا مکان اس شہر میں ہو، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسے لوگ مقیم ہوں گے اور ان پر اتمام واجب ہے یعنی پوری نماز پڑھیں گے۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: الوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذها دارًا او توطن بها مع اهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها بل التعیش بها۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۳۶ باب صلوٰۃ المسافر)[1]

---

[1] قال العلامۃ ابراهیم الحلبیؒ: فالاصلی هو مولد الانسان او موضع تأهل به ومن قصده التعیش به لا الارتحال عنه۔ (کبیری ص۵۴۴ فصل فی صلوٰۃ المسافر)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۱ ص۱۰۳ مطلب فی ان الاوطان ثلاثة۔

باب الجمعة والعيدين

(جمعہ وعیدین کے احکام ومسائل)

نمازِ جمعہ کی فرضیت سے منکر کا حکم

سوال: ۔ نمازِ جمعہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ایک شخص اس کی فرضیت سے انکار کرے تو کافر ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب: ۔ دیگر نمازوں کی طرح جمعہ کی نماز بھی فرضِ عین ہے، اس کی فرضیت سے انکار موجبِ کفر ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ھی فرض عین یکفر جاحدھا لثبوتھا بالدلیل القطعی۔
(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۳۶ باب الجمعۃ) [1]

جمعہ کے وجوب کے لیے حاکم کی اجازت کی شرعی حیثیت

سوال: ۔ فقہاء نے نمازِ جمعہ کے وجوب ادا میں بادشاہ کی اجازت کا ہونا ضروری لکھا ہے لیکن جہاں کہیں مسلمانوں کا حاکم نہ ہو تو وہاں پر جمعہ پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: ۔ جہاں کہیں اسلامی سلطنت قائم ہو تو وہاں پر اجازت صراحتاً یا دلالۃً ضروری ہے لیکن اگر کہیں ایسا انتظام نہ ہو تو بعد از رعایتِ شرائط عام مسلمان خود اپنی ذمہ داری محسوس کر کے نمازِ جمعہ کا اہتمام کریں گے۔

لماذکر فی الھندیۃ: ولو تعذر الاستیذان من الامام فاجتمع الناس علیٰ رجل یصلی بھم الجمعۃ جاز۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۶ باب صلوٰۃ الجمعۃ) [2]

---

[1] وقال علامۃ ابن نجیمؒ: وھی فریضۃ محکمۃ بالکتٰب والسنۃ والاجماع یکفر جاحدھا الخ (البحرالرائق ج۲ ص۱۳۹ باب الجمعۃ)
ومِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۲۱ باب الجمعۃ)

[2] وقال الشبلی فی حاشیۃ الزیلعی: ولو اجتمعت العامۃ علیٰ ان یقدموا رجلا من غیر امر خلیفۃ المیت او القاضی لم یجز ولم تکن جمعۃ لانہ لم یفوض الیھم امرھم الا اذا لم یکن فیھم قاض ولا خلیفۃ المیت بان کان الکل میت فحینئذٍ یجوز للاجل الضرورۃ الخ (الزیلعی جلد۲ ص۱۴۳ باب صلوٰۃ الجمعۃ)
ومِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۴۳ باب صلوٰۃ الجمعۃ۔

مصر کے توابع میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی قریۂ کبیرہ کے قریب ایک چھوٹا گاؤں ہو، اس کی اپنی آبادی تو کم ہو لیکن رسم ورواج، غمی اور خوشی میں اس کے تمام تعلقات بڑے گاؤں پر مبنی ہوں تاہم درمیان میں کچھ زمین خالی پڑی ہے جس میں تاحال کوئی آبادی نہیں۔ کیا اس چھوٹے گاؤں میں نمازِ جمعہ وعیدین پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس چھوٹے گاؤں کی حیثیت ایک محلہ کی طرح ہو تو پھر درمیان میں خالی زمین اس کے لیے مانع نہیں کہ اس کو اس بڑے گاؤں کے توابع میں شمار کیا جاسکے، توابع ہونے کی صورت میں جمعہ وعیدین یہاں واجب رہیں گے اگرچہ اس کی مستقل آبادی کم ہو۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: وکذا لا یصح اداء الجمعة الا فی المصر وتوابعه فلا تجب علی اهل القری التی لیست من توابع المصر الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۵۹ فصل بیان شرائط الجمعة) [۱]

فناءِ مصر کی مقدار

سوال:۔ کسی مصر یا قریۂ کبیرہ کے توابع اور فناء کا دائرہ کتنی مسافت تک ممتد رہتا ہے جبکہ بڑے بڑے گاؤں کا دائرہ میلوں تک رہتا ہے، کیا یہ تمام علاقہ مضافات میں شمار ہوگا؟

الجواب:۔ گاؤں یا مصر کے توابع کی تعیین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، لیکن قاضی ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق جہاں تک اذان کی آواز سنائی دیتی ہو تو وہ علاقہ توابع میں شمار ہوگا۔ دوسرے متعدد اقوال مسافت کے بارے میں بھی مروی ہیں، لیکن موجودہ وقت میں کسی بڑے گاؤں کا وہ علاقہ جو انتظامی طور پر نافذ العمل ہو وہی علاقہ توابع میں شمار ہوگا۔ مثلاً گاؤں کمیٹی کارپوریشن وغیرہ کا متعلقہ توابع سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہی علاقہ متعلقہ تنظیموں کی آمدنی اور مصارف کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں، البتہ یونین کونسل کا اس زمرہ میں آنا مشکل ہے، پھر بھی ایسے بڑے گاؤں علاقہ کے عرف کے تابع ہونے چاہئیں۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: واما تفسیر توابع المصر فقد اختلفوا فیها روی عن ابی یوسف رحمہ اللہ ان المعتبر فیه سماع النداء ان کان موضعًا یسمع فیه النداء

---

[۱] وقال محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: تقع فرضا فی القصبات والقری او فناءه وهو ما اتصل به لاجل مصالحه۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۳۸ باب الجمعة)

[۱] ومثله فی الهندیة ج۱ ص۱۴۵ صلوٰة الجمعة)

من المصر فهو من توابع المصر الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۶۰ فصل بیان شرائط الجمعة) [1]

متعدد آبادیوں پر مشتمل قریہ میں جوازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ چند چھوٹے گاؤں جن کی مجموعی آبادی تو قریۂ کبیرہ تک پہنچتی ہے لیکن انفراداً ہر ایک کی آبادی دیہات کے حکم میں ہے، کیا ان متعدد آبادیوں کو ملا کر یہاں پر جمعہ وعیدین پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ چھوٹی آبادیاں محلہ جات کی شکل میں ہوں اور ایک محلہ سے دوسرے محلہ تک خالی جگہ پڑی ہو تو اِس معمولی مسافت کی وجہ سے اگرچہ نام الگ ہوں لیکن پھر بھی باہمی تعلقات، غمی اور خوشی اور دُوسرے امور میں شرکت کی وجہ سے ایک قریۂ کبیرہ شمار ہو کر ایسی جگہ میں نمازِ جمعہ وعیدین ادا کرنا درست ہے۔ اور اگر ایک گاؤں کا کسی دوسرے گاؤں سے کوئی خاص تعلق نہ ہو ہر ایک میں انفرادیت ہو اور ان متعدد جگہوں کی حیثیت الگ الگ دیہات کی ہو تو اس کو مجموعی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ دیہات کی صورت میں فقہاء احناف کے نزدیک جمعہ وعیدین پڑھنا جائز نہیں۔

قال علامہ ابن العابدینؒ: تقع فرضُ فی القصبات والقری الکبیرۃ التی فیھا اسواق۔ الخ۔ (شامی ج۲ ص۱۳۸ باب الجمعة) [2]

ہنگامی حالات کے تحت بازار میں نمازِ جمعہ پڑھنا درست ہے

سوال:۔ اگر کسی جگہ کی مقامی آبادی قریہ کبیرہ تک نہ پہنچتی ہو لیکن جمعہ کے دن کاروباری مرکز ہونے کی وجہ سے لوگوں کا اژدحام رہتا ہے۔ تو کیا اس وقتی کثرت کی وجہ

---

[1] وقال علامہ ابن عابدینؒ: وجملة اقوالهم فی تقدیرہ ثمانیة اقوال۔ اوتسعة علوہ میل میلان ثلثة فرسخ فرسخان ثلثة سماع الصوت سماع الأذان الخ۔ (شامی ج۲ ص۱۳۹ باب صلوٰۃ الجمعہ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۴۱ باب صلوٰۃ الجمعة۔

[2] قال ابن نجیمؒ، وجوب الجمعة علیٰ ثلثة اقسام فرض علی البعض وواجب علی البعض وسنة علی البعض اما الفرض فعلی الامصار وا ما الواجب فعلی توابعها وا ما السنة فعلی القری الکبیرۃ والمستجمعة للشرائط۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۴۱ باب الجمعة)
وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوٰی ج۱ ص۴۵۰ باب الجمعة۔

سے اس جگہ میں نمازِ جمعہ ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ سال بھر ہر جمعہ میں یہ کیفیت قائم رہتی ہے۔

الجواب: ہنگامی حالات کے پیشِ نظر جمعہ کے دن یہ جگہ جب مصر یا قریۂ کبیرہ بن سکے تو اس میں "منیٰ" کی طرح وقتی کثرت کی وجہ سے نمازِ جمعہ پڑھنا درست ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ویجوز بمنیٰ ان کان الامیر امیر الحجاز او کان الخلیفة مسافراً عند ابی حنیفةؒ و ابی یوسفؒ وقال محمدؒ لاجمعة بمنیٰ لانها من القریٰ حتی لایعید بها۔ ولهما انها تتمصر فی ایام الموسم الخ۔ (الهدایة ج۱ ص۱۶۸ باب صلوٰة الجمعة) [۱]

متعدد مقامات پر نمازِ جمعہ کا حکم

سوال: اگر کسی جگہ جمعہ کی شرائط پوری ہوں تو متعدد مقامات پر نمازِ جمعہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ کیا ایک جامع مسجد کے ہوتے ہوئے دوسری جگہ جمعہ شروع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شرائط پوری ہونے کے بعد جب ایک دفعہ جمعہ وعیدین واجب ہو جائیں تو متعدد مقامات پر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ ابتداء ہی سے متعدد جگہوں میں جمعہ شروع ہو، بلکہ ایک جامع مسجد کے ہوتے ہوئے دوسری جگہ ضرورت محسوس ہو تو نمازِ جمعہ پڑھی جا سکتی ہے۔ تاہم کسی فتنہ وفساد اور مسلمانوں کے درمیان افتراق کے لیے آلۂ کار بن کر جامع مسجد سے علیحدگی کا بہانہ بنانا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وتؤدی فی مصر واحد بمواضع کثیرة مطلقاً علی المذهب وعلیه الفتوٰی الخ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۴۴ باب الجمعة) [۲]

فوجی چھاؤنی یا کسی ممنوعہ علاقہ میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال: بعض حساس علاقوں یا فوجی چھاؤنیوں میں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ قانوناً ممنوع ہوتا ہے، ایسے مقامات پر جہاں ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے "اذنِ عام" مفقود

---

[۱] وقال علاؤالدین الحصکفیؒ: وجازت الجمعة بمنیٰ فی الموسم الخ۔ (رد المحتار جلد۲ ص۱۴۴ باب صلوٰة الجمعة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۴۲ باب صلوٰة الجمعة۔

[۲] وفی الهندیة: وتؤدی فی مصر واحد فی مواضع کثیرة وهو قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ وهو الاصح۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۴۵ صلوٰة الجمعة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۴۲ باب صلوٰة الجمعة۔

ہوتا ہے نمازِ جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ جبکہ فقہ کی کتابوں میں ایک شرط "اذنِ عام" بھی لکھی گئی ہے۔

الجواب:۔ ایسے مقامات پر داخلہ کی پابندی انتظامی امور کا حصہ ہے تاکہ اشرار اور مفسدین کے شر سے محفوظ رہے، اس لیے اس پابندی سے جمعہ کی حیثیت متاثر نہیں ہوتی، تاہم یہاں پر بھی متعلقہ افراد کو داخلہ کی کھلی اجازت ہو کر "اضافی اذنِ عام" پایا جاتا ہے اس لیے یہ مقام جب ایسے علاقہ میں واقع ہو جہاں پر جمعہ وعیدین واجب ہو تو متعدد مقامات پر نماز مشروع ہونے کی وجہ سے یہاں پر جمعہ وعیدین پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: تحت "قولہ الاذن العام" فلا یضر غلق باب القلعۃ لعدو اولعادۃ قدیمۃ لان الاذن العام مقرر لاهله الخ۔ (درمختار ج۲ ص۱۵۲ باب الجمعۃ)[1]

دیہات میں نمازِ جمعہ وعیدین کا حکم

سوال:۔ دیہات میں نمازِ جمعہ وعیدین کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ فقہاءِ احناف نے نمازِ جمعہ کے وجوبِ ادا کیلئے دیگر شرائط کے علاوہ قریۂ کبیرہ مصر یا فناءِ مصر کا ہونا ضروری لکھا ہے، اس لیے دیہات میں شرائط کے فقدان کی وجہ سے نمازِ جمعہ وعیدین کا پڑھنا واجب نہیں، عدمِ وجوب کے باوجود پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وفی القنیۃ صلوٰۃ العید فی القری تکرہ تحریمًا ای لانہ اشتغال بما لایصح الخ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۶۷ باب العیدین)[2]

دیہات میں جمعہ پڑھنے سے ظہر کی نماز سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا

سوال:۔ جہاں پر جمعہ واجب نہ ہو اور مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود محض ہٹ دھرمی پر قائم رہ کر بعض لوگ جمعہ پڑھتے رہیں، تو کیا ان سے ظہر کی نماز کی ذمہ داری چھوٹ جاتی ہے یا نہیں ؟

---

[1] قال داماد آفندیؒ: ومایقع فی بعض القلاع من غلق ابوابه خوفًا من الاعداء او کانت له عادة قدیمة عند حضور الوقت فلا بأس به لان الاذن العام مقرر لاهله الخ۔ (مجمع الانھر ج۱ ص۱۶۶ باب الجمعۃ)

[2] وقال علامہ ابن نجیم المصریؒ: ای شرط صحتها ان تؤدی فی مصر حتی لاتصح فی قریۃ ولامفازۃ ۔ الخ ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۱۴۰ صلوٰۃ الجمعۃ)

ومثلہ فی الزیلعی ج۱ ص۲۱۷ باب صلوٰۃ الجمعۃ ۔

الجواب: جب جمعہ واجب نہ ہو تو ظہر کی نماز فرض ہوگی، ایسی حالت میں باوجود عدم وجوب جمعہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہوکر ظہر کی نماز سے فراغت ذمہ کے لیے بے سود ہے۔

قال العلامہ ابن العابدینؒ: وفیما ذکرنا اشارۃ الیٰ انہ لاتجوز فی الصغیرۃ التی لیس فیھا قاضٍ ومنبر وخطیب کما فی المضمرات والظاھر انہ اُرید بہٖ الکراھۃ لکراھۃ النفل بالجماعۃ الا تریٰ ان فی الجواھر لوصلوا فی القُریٰ لزمھم اداء الظھر الخ (شامی ج۱ ص۱۳۸) [۱]

صحرا میں نماز جمعہ پڑھنا

سوال: کسی صحراء میں (لوگ جمع ہوکر) نماز جمعہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ خاص کر لوگ جب وہاں پر کثیر تعداد میں موجود تو ہوں لیکن مستقل طور پر وہاں آباد نہ ہوں؟

الجواب: اگر یہ صحراء کسی مصر یا قریۂ کبیرہ کے توابع میں سے نہ ہو تو نماز جمعہ وعیدین ایسی جگہ میں ادا کرنا جائز نہیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ولا بعرفات لانھا مفازۃ۔ الخ
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۴۴ باب الجمعۃ) [۲]

دیہات میں نماز جمعہ

سوال: عام علاقوں میں جمعہ کی نمازیں احناف کے نزدیک مصر یا فناء مصر ہونے کے شرائط میں کافی کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ لوگ چند گھرانوں پر مشتمل آبادی کو کافی جان کر جمعہ کی نماز شروع کر دیتے ہیں، جبکہ فقہ حنفی میں بیں مصر کی تعریف مختلف عبارات سے ہوتی ہے، کسی ایک تعریف کو دیکھ کر ہمارے لیے فیصلہ کرنے کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟

الجواب: احناف کے نزدیک نماز جمعہ کے وجوب اداء کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ مصر یا فناء مصر ہونا مستقل شرط ہے، تاہم قریۂ کبیرہ بھی مصر کے حکم میں داخل ہے، لیکن مصر

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: قولہ شرطُ دائھا المصر ای شرط صحتھا ان تؤدی فی مصرٍ حتی لاتصح فی قریۃ ولا مفازۃ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۴۰ باب الجمعۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البنایۃ شرح الھدایۃ ج۳ ص۲۸۶ باب الجمعۃ۔

[۲] وفی الھندیۃ: ولاجمعۃ بعرفات اتفاقًا کذا فی الکافی۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۴۵)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۴۲ باب الجمعۃ۔

اور قریۂ کبیرہ کی کوئی خاص حد مقرر نہیں جس کو ہم اعتبار کا درجہ دے دیں۔ یہ ایک عرفی حقیقت ہے جو زمانہ اور حالات سے متاثر ہوتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے اپنے زمانے کے اعتبار سے مصر کی تعریف کی ہے جو ہماری کتابوں میں مختلف عبارات سے نقل ہوئی ہے۔ یہاں تک تو اتفاق ہے کہ دیہات میں جمعہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس سے ظہر کی نماز کی ذمہ داری فارغ نہیں ہوتی۔ موجودہ وقت کے اعتبار سے جس گاؤں کی مستقل آبادی بشمول مرد وزن، چھوٹے بڑے اور مسلم وغیر مسلم دو ہزار تک پہنچتی ہو تو وہ گاؤں بڑا سمجھا جاتا ہے اور اس میں ضروریاتِ زندگی کا سامان بھی موجود ہو۔

لہٰذا نمازِ جمعہ کے وجوب کے لیے ایک گاؤں کی آبادی کم از کم دو ہزار ہونا ضروری ہے لیکن واضح ہو کہ یہ گاؤں کی اپنی آبادی ہونی چاہیئے ورنہ قرب وجوار "جو اس کے فناء میں نہ ہو" کی آبادی ملا کر اگر کئی ہزار تک ہو تو اسے دیہات ہونے کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: وفی القنیة صلوٰة العید فی القریٰ تکرہ تحریمًا ای لانه اشتغال بما لا یصح لان المصر شرط لصحته۔ (رد المحتار ج ۲ ص۱۶۷ باب العید) [1]

مسافر کے لیے جمعہ کا حکم

سوال:۔ مسافر پر نمازِ جمعہ واجب نہ ہونے کے باوجود اگر ادا کرے تو کیا اس کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے یا نمازِ ظہر الگ پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ اقامت نمازِ جمعہ کے وجوبِ اداء کے شرائط میں سے ہے جن کی عدم موجودگی میں بھی نمازِ جمعہ پڑھی جا سکتی ہے، اس لیے مسافر کی نمازِ جمعہ درست ہے، اس پر ظہر کی نماز جمعہ پڑھنے کے بعد لازم نہیں۔

قال علامہ ابن عابدینؒ: تحت قوله واقلها ثلثة رجال اطلق فیهم فشمل العبید والمسافرین والمرضیٰ والامیین والخرسیٰ لصلاحیتهم للامامة الخ (شامی ج ۲ ص۱۵۱ باب الجمعة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ای شرط صحتها ان تؤدی فی مصر حتی لا تصح فی قریة ولا مفازة۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۴۰ باب الجمعة)
ومثله فی تبیین الحقائق ج ۱ ص۲۱۷ باب الجمعة۔

[2] وفی الهندیة: وتنعقد الجمعة بأتمام العبید والمسافرین والمرضیٰ وکذا بالامیین والخرس الخ۔ (الهندیة ج ۱ ص۱۴۸ صلوٰة الجمعة)
ومثله فی فتح القدیر ج ۲ ص۳۳ باب صلوٰة الجمعة۔

نمازِ جمعہ وعیدین کے لیے عورتوں کی حاضری | **سوال:۔** مساجد میں جمعہ وعیدین کے لیے عورتوں کی حاضری کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ عورتوں کے لیے مستقل طور پر جمعہ وعیدین کا اہتمام مشروع نہیں اور نہ ان پر واجب ہے، تاہم کسی جامع مسجد میں تبعاً شرکت بذاتِ خود ممنوع نہیں۔ لیکن دورِ حاضر میں عورتوں کا نکلنا فتنہ وفساد سے خالی نہیں اس لیے جمعہ کے لیے کسی مسجد میں حاضری کے بجائے خود گھر میں ظہر کی نماز پڑھیں(۱) اور عیدین کی نماز ان (عورتوں) پر واجب نہیں۔

قال علاء الدین الکاسانیؒ: وأما المرأۃ فلانہا مشغولۃ بخدمۃ الزوج ممنوعۃ عن الخروج الی محافل الرجال لکون الخروج سببًا للفتنۃ ولہٰذا لاجماعۃ علیہن ولاجمعۃ الخ ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۲۵۸ فصل بیان شرائط الجمعۃ)[۱]

معذور پر نمازِ جمعہ واجب نہیں | **سوال:۔** ایسا شخص جو چلنے پھرنے پر قادر نہ ہو اُس کے لیے نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جب کسی قریبی جامع مسجد تک نمازِ جمعہ کے لیے پہنچنے پر قادر نہ ہو تو ایسا شخص دوسرے معذورین کے حکم میں ہو کر نمازِ جمعہ کے وجوب سے مستثنیٰ ہے، تاہم اگر کسی طریقہ پر کہیں جا کر جمعہ پڑھے تو ادا صحیح ہے لیکن نہ جانے سے گنہگار نہیں ہوگا۔

قال العلامہ ابن العابدینؒ: (تحت قولہ وقدرتہ علی المشی) فلا تجب علی المقعد وان وجد حاملاً اتفاقًا غانیۃ۔ لانہ غیر قادر علی السعی اصلاً فلا یجری فیہ الخلاف فی الاعمٰی کما نبہ علیہ القہستانی۔

(رشامی ج۲ ص۱۵۴، مطلب فی شروط وجوب الجمعۃ)

---

[۱] وذکر السرخسی: والمرأۃ کذلک مشغولۃ بخدمۃ الزوج منہیۃ عن الخروج شرعًا لما فی خروجہا الی مجمع الرجال فتنۃ۔ (المبسوط ج۲ ص۲۲ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۱۲ باب الجمعۃ۔

[۲] وفی الہندیۃ: حتٰی لا تجب الجمعۃ علی العبید والنسوان والمسافرین والمرضٰی کذا فی المحیط السرخسی ولا علی المقعد بالاجماع الخ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۱۴۴ باب صلوۃ الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۵۱ باب صلوۃ الجمعۃ۔

خطبہ کی اذان خطیب کے سامنے دینے کا حکم

سوال: جمعہ کے لیے خطبہ کی اذان کہاں دی جائے گی؟ کیا امام سے دائیں بائیں جانب اذان کہنا جائز ہے یا لازمی طور پر امام کے سامنے دی جائے گی؟

الجواب: اگرچہ اذان ایک اعلان ہونے کی حیثیت سے کسی مقام سے مخصوص نہیں لیکن خطبہ سے قبل اذان کے لیے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ یہ مسجد کے اندر خطیب کے سامنے ہونی چاہیئے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ : ویؤذن ثانیاً بین یدیہ ای الخطیب۔

(رد المحتار ج ۲ ص۱۶۱ مطلب فی حکم الاذان بین یدی الخطیب) [۱]

جمعہ کے لیے ایک خطبہ پر اکتفاء خلافِ سنّت ہے

سوال: اگر کسی خطیب نے دو خطبوں کی جگہ ایک خطبہ پر اکتفاء کیا تو کیا اس سے خطبہ ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور اسی حالت میں نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایک خطبہ پڑھنے سے اگرچہ خطبہ کی شرط پوری ہو جاتی ہے لیکن دو خطبے پڑھنا مسنون ہے، اس لیے ایک خطبہ پر اکتفاء کرنا خلافِ سنت ہے تاہم نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال محمد بن عبداللہ التمرتاشی : ویسن خطبتان بجلسة بینھما۔

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۴۸ باب الجمعة) [۲]

خُطبہ سُننے کیلئے بیٹھنے کی کیفیّت

سوال: خطبہ کے دوران بیٹھنے کی کیفیت کیسی ہونی چاہیئے؟ کیا تشہد کی حالت بنانا ضروری ہے؟

الجواب: عام کتابوں میں تشہد کی سی کیفیت اختیار کرنے کو بہتر لکھا گیا ہے لیکن روایات کی رُو سے اس کے علاوہ طبعی کیفیت پر بیٹھنا بھی ممنوع نہیں۔

---

[۱] وفی الھندیة : واذا جلس علی المنبر اذن بین یدیہ .... الخ (الفتاوی الھندیة جلد ۱ ص۱۴۹ صلوٰة الجمعہ)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۵۷ باب صلوٰة الجمعة۔

[۲] قال برھان الدین المرغینانیؒ : ویخطب خطبتین یفصل بینھما بقعدة وبہ جرّی التوارث۔ (الھدایة ج ۱ ص۱۴۸ باب صلوٰة الجمعة)

ومثلہٗ فی الزیلعی ج ۱ ص۲۲۰ باب الجمعة۔

لما ورد فی الحدیث : حدثنا داؤد بن رشید نا خالد بن حیان الرقی نا سلیمان بن عبد اللہ بن الزبرقان عن یعلی بن شداد بن اوس قال شھدت مع معاویۃ بیت المقدس فجمع بنا فنظر فاذا اجل من فی المسجد اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرأیتھم محتبین والامام یخطب۔ قال ابو داؤد وکان ابن عمر یحتبی والامام یخطب ....الخ (ابوداؤد شریف ج۱ ص۱۵۸) [1]

منبر پر خطبہ دینا مسنون ہے

سوال :۔ منبر کے بغیر خطبہ دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب :۔ منبر پر خطبہ دینا سنتِ نبوی ہے اس کے بغیر خطبہ دینا خلافِ سُنت ہے۔

قال العلامۃ جلال الدین عبد الرحمٰن ابن ابی بکر السیوطیؒ :۔ واخرج ابن ابی شیبۃؒ عن الشعبیؒ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صعد المنبر یوم الجمعۃ استقبل الناس بوجہہ الکریم فقال السلام علیکم ویحمد اللہ ویثنی علیہ ویقرأ سورۃ ثم یجلس ثم یقوم فیخطب ثم ینزل وکان ابوبکرؓ وعمرؓ یفعلانہ۔ (تفسیر در منثور ج۶ ص۲۲۲) [2]

دورانِ خطبہ خلفاء راشدینؓ کے تذکرہ کا حکم

سوال :۔ عام کتابوں میں خطبۂ جمعہ میں حمد و صلوٰۃ اور وعظ و نصائح کا تذکرہ ملتا ہے، اس کے علاوہ خلفاء راشدینؓ کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اور اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب :۔ اگرچہ خطبہ کا جواز خلفاء راشدینؓ کے تذکرہ پر موقوف نہیں لیکن پھر بھی صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدین کا تذکرہ کرنا مستحسن فعل ہے۔

قال الحصکفیؒ :۔ ویندب ذکر الخلفاء الراشدین والعمین الخ۔ (درمختار ج۲ ص۱۴۹ مطلب فی قول الخطیب الخ) [3]

---

[1] وفی الھندیۃ :۔ اذا شھد الرجل عند الخطبۃ ان شاء جلس محتبیاً او متربعاً او کما تیسر لانہ لیس بصلوٰۃ عملاً وحقیقۃ کذا فی المضمرات۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۴۸، الباب السادس عشر فی صلوٰۃ الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۶۳ باب الجمعۃ، شرائط الجمعۃ۔

[2] وقال العلامۃ ابن العابدینؒ : ومن السنۃ ان یخطب علیہ اقتداءً بہ صلی اللہ علیہ وسلم ....الخ۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۶۱ باب العیدین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۷ الباب السادس عشر فی صلوٰۃ الجمعۃ۔

[3] وفی الھندیۃ : وذکر خلفاء الراشدین والعمین رضوان اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین مستحسن بذلک جری التوارث کذا فی التجنیس۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۴۷، الباب السادس عشر فی صلوٰۃ الجمعۃ)۔

دورانِ خطبہ درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:۔ دورانِ خطبہ آیتِ کریمہ ﴿یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ سُن کر درود شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دل میں درود شریف پڑھے، البتہ زبان سے پڑھنے سے احتراز کرے تاکہ خطبہ کا سننا متاثر نہ ہو۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: وروی عن ابی یوسفؒ انہ ینبغی ان یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی نفسہ عند سماع اسمہ ...الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۲۶۴، فصل بیان شرائط الجمعۃ)[۱]

دورانِ خطبہ باتیں کرنے کا حکم

سوال:۔ خطبہ کے دوران باتیں کرنے کا کیا حکم ہے؟ اگر خطیب دورانِ خطبہ کوئی بات کرے تو کیا اس سے خطبہ کی متاثر ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دورانِ خطبہ خطیب کے لیے امر بالمعروف کے علاوہ دوسری قسم کی باتیں کرنا مکروہ ہے تاہم خطبہ کا اعادہ کرنا ضروری نہیں، البتہ سامعین کو سماعِ خطبہ کے وجوب کی وجہ سے مطلقاً کلام کرنا یا اشارہ کرنا مکروہ ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویکرہ تکلمہ فیھا الا لامر بمعروف لانہ منھا ...الخ

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۴۹ باب الجمعۃ)

وایضاً کل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیھا ای فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرھا فیحرم اکل وشرب وکلام ولو تسبیحاً او رد السلام او امراً بمعروف بل یجب علیہ ان یستمع ویسکت۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۵۹ مطلب فی شروط وجوب الجمعۃ)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: والصواب انہ یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عند سماع اسمہ فی نفسہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۵۹ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۲ ص۳۸ باب الجمعۃ۔

[۲] لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: تحت قولہ واذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام) ویکرہ للخطیب ان یتکلم فی حال الخطبۃ الا اذا کان امراً بمعروف فلا یکرہ .... اما وقت الخطبۃ قال کلام مکروہ تحریماً لو کان امراً بمعروف او تسبیحاً او غیرہ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۵۵ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص۲۰۶، الفصل الثالث والعشرون فی صلوٰۃ الجمعۃ۔

دورانِ خُطبہ دُعا کرنے کا حکم

سوال: جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان خطیب یا سامعین کے لیے دعا کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی دعا کا ثبوت مروی نہیں، اس لیے اس وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے۔

حدثنا احمد بن منیع، ناھشیم، ناحصین قال سمعتُ عمارة بن رُوَیْبَة وبشر بن مروان یخطب فرفع یدیه فی الدعاء، فقال عمارة قبح الله هاتین الیدینین القصیرتین لقد رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم وما یزید علی ان یقول هٰکذا واشار هشیم بالسبابة قال ابوعیسٰی هٰذا حدیث حسن صحیح۔ (الجامع الترمذی ج ۱ ص ۱۱۴) لہ

نمازِ جمعہ کے لیے مسجد شرط نہیں

سوال: کیا مسجد سے باہر کسی مکان وغیرہ میں چند آدمی جمع ہو کر نمازِ جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ مقامی طور پر یہ جگہ قریۂ کبیرہ یا مصر کے حکم میں ہو؟

الجواب: نمازِ جمعہ کے لیے مسجد شرط نہیں، اس لیے کسی بیرونی جگہ میں نمازِ جمعہ پڑھنا باعثِ الزام نہیں، جبکہ یہ جگہ قریۂ کبیرہ کے فناء میں ہو، تاہم بہتر یہ ہے کہ جمعہ جامع مسجد میں ادا کیا جائے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ویشترط لصحتها ... الخ المصر الخ او فنائه وھو ماحوله اتصل به او لا الخ (الدرالمختار علٰی صدر ردالمحتار ج ۲ ص ۱۳۷ باب الجمعة) ؎ ۲

عیدین کی جماعت ہونے کے بعد دوبارہ جماعت کا اہتمام کرنا

سوال: عیدین کی جماعت ہو جانے کے بعد جن لوگوں سے نماز رہ گئی ہو اُن کیلئے دوبارہ جماعت کا اہتمام کرنے کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

الجواب: ایک ہی شہر کے اندر متعدد مقامات پر ایک ہی وقت میں جمعہ وعیدین کی

لہ وقال الشیخ عبدالحق دھلویؒ: و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درمیان ہر دو خطبہ لحظۂ بنشستی چنانچہ در حدیث جابر بن سمرہؓ آمدہ و خاموش بودی و دعا از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دریں وقت بصحت نرسیدہ (شرح سفر السعادت ص ۲۷۲)
وَمِثْلُهٗ فی غایة الاوطار ج ۱ ص ۳۷۳ باب الجمعة۔

لہ وقال ابن نجیمؒ المصریؒ: اومصلاه ای مصلی المصر لانه من توابعه فکان فی حکمه والحکم غیر مقصور علی المصلی بل یجوز فی جمیع افنیة المصر لانها بمنزلة المصر ... الخ۔ (البحرالرائق ج ۲ ص ۱۴۰، باب صلوٰة الجمعة۔
ومثلهٗ فی فتح القدیر ج ۲ ص ۲۴ باب الجمعة۔

نماز پڑھنا درست ہے، ایک ہی جگہ پر متعدد جماعات کرانا جائز نہیں۔ لہٰذا جن لوگوں سے عید کی نماز رہ گئی ہو وہ کسی اور جگہ میں دوسرے امام کی اقتداء کرسکتے ہیں یا دوسرے مقام پر جماعت کا اہتمام کرسکتے ہو تو درست ہے، ورنہ اسی جگہ (مسجد یا عیدگاہ) میں دوبارہ نماز پڑھنا درست نہیں۔

وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: والا اذا فاتت مع امام وامکنه ان یذهب الی امام آخر فانه یذهب الیه لانه یجوز تعددها فی مصر ولحد فی موضعین واکثر اتفاقاً۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۶۲ باب العیدین)

عیدین کی نماز میں مسبوق کا حکم

سوال:۔ اگر کسی نے عیدین کی نماز میں امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شرکت کی تو فوت شدہ رکعت کس طرح پوری کی جائے گی؟

الجواب:۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق کھڑے ہو کر سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھ کر بعد میں اپنے مسلک کے مطابق تکبیراتِ زوائد کہہ کر اپنی رکعت مکمل کرے۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: فاذا فرغ الامام من صلٰوته یقوم الی قضاء ما سبق به ثمّ ان کان رأیه یخالف رأی الامام یتبع رأی نفسه لانه منفرد فیما یقضی بخلاف اللاحق لانه فی الحکم کانه خلف الامام وان کان رأیه موافقاً لرأی امامه بان کان امامه یری رأی ابن مسعودؓ وهی کذلك بدأ بالقرأة ثمّ بالتکبیرات ....الخ[1]

(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۷۹ فصل بیان صلوٰۃ العیدین)

عیدین کی نماز کے لیے باہر نکلنا بہتر ہے

سوال:۔ عیدین کی نماز محلہ یا گاؤں کی جامع مسجد میں پڑھی جائے یا اس کے لیے آبادی سے باہر عیدگاہ کو نکلنا ضروری ہے؟ جبکہ بعض مقامات پر عیدگاہ میسر نہیں ہوتی؟

الجواب:۔ عیدگاہ کا گاؤں سے باہر ہونا کوئی ایسا امر نہیں جس کو واجب یا فرض قرار دیا جائے، اور نہ ہی فقہاء کرام نے اشتراط پر قول کیا ہے، نہ ہی عیدین کی نماز کی صحت اس پر موقوف

---

[1] وقال العلامۃ ابن العابدینؒ: یقرأ ثم یکبر ای اذا قام الی قضائها لئلا یتوالی التکبیر۔
(شامی ج ۲ ص ۱۷۴ باب العیدین، مطلب امر الخلیفۃ لایبقی بعد موته۔
ومثلهٗ فی الطحطاوی ص ۴۳۷ باب احکام العیدین۔

ہے۔ تاہم بعض اقوال اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ صحراء میں ہونا بہتر ہے لیکن گاؤں کی جامع مسجد میں بھی عیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: والخروج الیہا ای الجبانۃ لصلوٰۃ العید سنۃ وان وسعھم المسجد الجامع۔۔۔ الخ۔ (درمختار ج۲ ص۱۶۹ باب العیدین) [۱]

نمازِ جمعہ کے لیے افضل وقت

سوال: فقہ حنفی کی رو سے ظہر کی نمازیں سردیوں میں تعجیل اور گرمیوں میں ابراد افضل ہے، لیکن جمعہ کی نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: وقت کے تعین اور افضلیت دونوں کے اعتبار سے جمعہ کا حکم ظہر کی نماز کی طرح ہے، اس لیے نمازِ جمعہ کے لیے بھی سردیوں میں تعجیل اور گرمیوں میں ابراد مستحب ہے۔

قال العلامہ ابن نجیم المصریؒ: والجمعۃ کالظہر اصلاً واستحباباً فی الزمانین کذا ذکرہ الاسبیجابی۔ (البحرالرائق ج۱ ص۲۴۷ کتاب الصلوٰۃ فی المواقیت الصلوٰۃ) [۲]

عیدین کے لیے صاف ستھرے کپڑے پہننا

سوال: عیدین میں نئے یا دھلے ہوئے کپڑے پہننے کے اہتمام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: ایسے اجتماعی مواقع میں صاف ستھرے یا نئے کپڑے پہننا مستحب ہے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وندب یوم الفطر اکلہ الخ ولعل سطر۔ ولبس احسن ثیابہ ولو غیر ابیض۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۶۸ باب العیدین) [۳]

---

[۱] وفی الھندیۃ: الخروج الی الجبانۃ فی صلوٰۃ العید وان کان یسعھم المسجد الجامع علیٰ ھٰذا عامۃ المشائخ وھو الصحیح ھٰکذا فی المضمرات۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۵۰ صلوٰۃ العیدین)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۵۹ باب صلوٰۃ العیدین۔

[۲] وقال برھان الدین المرغینانیؒ: ومن شرائطھا الوقت فتصح فی وقت الظہر ولا تصح بعدہٗ لقولہ علیہ السلام اذا مالت الشمس فصل بالناس الجمعۃ۔ الخ (الھدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۲۷ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الزیلعی ج۱ ص۲۱۹ باب الجمعۃ۔

[۳] وفی الھندیۃ: ویستحب فی یوم الفطر للرجل الاغتسال والسواک ولبس احسن ثیابہ ..... الخ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۴۹ صلوٰۃ العیدین)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۵۷ باب صلوٰۃ العیدین۔

جمعہ کے دن ناخن کٹوانے کا وقت

سوال: جمعہ کے دن ناخن کٹوانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور کس وقت ناخن کٹوانا مناسب ہے؟

الجواب: بعض علماء نے جمعہ کی سعادتمندی کے حصول کی خاطر نماز جمعہ کے بعد ناخن کٹوانا موزوں جانا ہے، لیکن رسول اللہؐ سے نماز جمعہ سے قبل ناخن کاٹنے کے بارے میں روایت ثابت ہے، اگرچہ محدثین نے اس روایت پر کلام کیا ہے لیکن فضائل میں ایسی روایات کو اعتبار دیا جاتا ہے۔

عن ابی هریرةؓ: کان یقلم اظفاره ویقص شاربه یوم الجمعة قبل ان یخرج الی الصلوٰة

اخرجه البزاز والطبرانی والبیهقی بسند حسن هکذا فی الدر المنثور ج ۱ ص۱۱۲) ۱

جمعہ کی اذان کے بعد کھانے کا حکم

سوال: اگر جمعہ کے دن کھانا کھاتے کے دوران جمعہ کی اذان شروع ہو جائے تو کیا اس کے بعد کھانا کھانا جائز ہے یا خرید و فروخت کی طرح حرام ہے؟

الجواب: اذان کے وقت اگر کھانے میں رغبت زیادہ ہو یا نماز سے فارغ ہوتے تک اس کے خراب یا بے لذت ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کھانا جاری رکھ کر فراغت کے بعد نماز پڑھی جائے، تاہم اگر کہیں نماز جمعہ فوت ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کھانا بند کر کے نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، کیونکہ ہر وہ عمل جس سے جمعہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو اذان کے بعد اس کا جاری رکھنا حرام ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: سمع النداء وهو یأکل ترکه ان خاف فوت الجمعة او مکتوبة وذکر الشامی تحت قوله والاصل ای الذی تمیل الیه النفس ویخاف ذهاب لذته عنه فی ترك الجماعة۔ (شامی ج ۲ ص۱۶۳ قبیل مطلب اذا شرك فی عبارته الخ) ۲

---

۱ وقال العلامة ابن العابدینؒ: قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص شاربه ویقلم ظفاره یوم الجمعة قبل ان یروح الی الصلوٰة۔ قال السیوطیؒ: وبالجملة فارجحها ای الاقوال دلیلاً ونقلاً یوم الجمعة والاخبار الواردة فیه لیست بواهیة جداً مع ان الضعیف یعمل به فی فضائل الاعمال (الدر المختار مع رد المختار ج ۵ ص۲۸۷ فی فصل البیع)

ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۱ ص۱۷ الفصل التاسع فی الحظر والاباحة۔ کتاب الطهارة۔

۲ وقال العلامة ابن نجیمؒ: وفی کثیر من الکتب لو سمع النداء وقت الاکل یترکه اذا خاف فوت الجمعة الخ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۵۷ باب الجمعة)

ومثلهٗ فی التاتارخانیة ج ۲ ص۸ باب صلوٰة الجمعة المتفرقات۔

عیدین کے لیے اذان دینا خلافِ سنت ہے | **سوال** :۔ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے لیے اذان دینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ کے علاوہ اور نمازوں کے لیے اذان واقامت دینا خلافِ سنت ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ : لا یسن لغیرھا کعید ۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۳۸۵ باب الاذان) [۱]

خطیب کی تقرری کا حق کس کو ہے | **سوال** :۔ اگر متعدد افراد کسی مسجد میں خطیب بننے کا دعویٰ کریں تو ان میں کون زیادہ حق دار ہے؟

الجواب :۔ جہاں پر قاضی یا حاکم ذمہ داری محسوس کرکے جس کسی کو بھی خطیب مقرر کرے تو وہ خطبہ دینے کا زیادہ حقدار ہے، البتہ جہاں پر ایسا انتظام نہ ہو تو پھر قوم کا مقرر کردہ خطیب جمعہ پڑھا سکتا ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ : او القاضی الماذون لہٗ فی ذٰلک، الیٰ ان قال: ونصب العامۃ الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر اما مع عدمھم فیجوز للضرورۃ ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۴۳ باب الجمعۃ) [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین جمعہ پڑھنا | **سوال** :۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اولین جمعہ کہاں ادا فرمایا؟

الجواب :۔ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے مدینہ منورہ تشریف لائے

---

[۱] وفی الھندیۃ : ولیس لغیر الصلوٰۃ الخمس والجمعۃ نحو السنن والوتر والتطوعات والتراویح والعیدین اذان ولا اقامۃ کذا فی المحیط ۔ (الھندیۃ ج ۱ ص ۵۳ الباب الثانی فی الاذان)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۴۸ الفصل الاول فی الاذان۔

[۲] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ المصری : ولو اجتمعت العامۃ علی تقدیم رجل لم یامرہ القاضی والخلیفۃ المیت لم یجز ولم تکن جمعۃ ولو لم یکن ثمۃ القاضی ولا خلیفۃ المیت فاجتمع العامۃ علی تقدیم رجل جاز للضرورۃ ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۴۳ باب الجمعۃ ۔
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۴۶ صلوٰۃ الجمعۃ ۔

اس وقت کوئی مسجد آباد نہیں تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی بنی سالم بن عمرو میں جمعہ کا خطبہ پڑھا، یہ جمعہ کا اولین خطبہ تھا جو آپ سے سنا گیا۔

کما فی البدایۃ والنہایۃ: قال ابن جریر حدثنی یونس بن عبد الاعلی اخبرنا ابن وهب عن سعید بن عبد الرحمٰن الجمحی انہ بلغہ عن خطبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اول جمعۃ صلاها بالمدینۃ فی بنی سالم بن عمرو بن عوف رضی اللہ عنہم الخ (البدایہ والنہایہ ج۳ ص۲۱۳)[1]

تکبیراتِ ایامِ تشریق کن پر واجب ہیں

سوال: کیا تکبیراتِ ایامِ تشریق صرف مردوں پر واجب ہیں یا عورتیں بھی اس حکم میں شریک ہیں؟ جبکہ عورتیں عموماً انفراداً نماز پڑھتی ہیں؟

الجواب: چونکہ صاحبینؒ کے نزدیک تکبیراتِ تشریق کیلئے جماعت، اقامت اور مصر کی شرط نہیں بلکہ تمام نمازیوں پر یہ واجب ہیں، خواہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے یا انفراداً ادا ہو، بنا برایں صورت مردوں کی طرح عورتوں پر بھی تکبیرات واجب ہیں، تاہم عورتوں کیلئے ضروری ہے کہ تکبیرات پڑھتے وقت اخفاء کریں۔ کتبِ فقہ سے صاحبینؒ کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وقالا بوجوبه فور کل فرض مطلقاً ولو منفرداً او مسافراً او امرأۃً لانہ تبع للمکتوبۃ الی عصر یوم الخامس آخر ایام التشریق وعلیہ الاعتماد والعمل والفتویٰ فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار... الخ (در مختار ج۲ ص۱۷۹ قبل باب الکسوف، طلب المختار... الخ)[2]

---

[1] قال العلامۃ السیوطیؒ: واخرج الزبیر بن بکار فی اخبار المدینۃ عن شہاب قال رکب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ من قباء فمر علی بنی سالم فصلّی فیہم الجمعۃ بنی سالم وهو المسجد الذی فی بطن الوادی وکانت اوّل جمعۃ صلاها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الدر المنثور ج۶ ص۲۱۸ سورۃ الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۳۹ باب الجمعۃ۔

[2] قال حسن بن عمار الشرنبلالی: وقالا ای ابو یوسفؒ ومحمدؒ یجب التکبیر فور کل فرض علی من صلاہ ولو کان منفرداً او مسافراً او قرویاً لانہ تبعٌ للمکتوبۃ من فجر عرفۃ الی عقیب عصر الیوم الخامس من یوم العرفۃ فیکون الی آخر ایام التشریق وبہ ای بقولہما یعمل وعلیہ الفتویٰ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۹۳ احکام العیدین)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۶۶ باب العیدین۔

بحری جہاز میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ بعض عازمینِ حج بحری جہاز کے ذریعے حج کے لیے جاتے ہیں، اگر وہ سب مل کر جہاز میں ہی نمازِ جمعہ ادا کرنا چاہیں تو کیا فقہ حنفی کے مطابق ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ فرضیتِ جمعہ کے لیے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مصر یعنی شہر کا ہونا ضروری ہے اور جہاز چونکہ مصر کے حکم میں نہیں اگرچہ اس میں عازمینِ حج کافی تعداد میں موجود ہوں، اس لیے فقہ حنفی کی رُو سے بحری جہاز میں نمازِ جمعہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ويشترط لصحتها سبعة اشياء المصر وهو ما لا يسع اكبر مساجده اهله المكلفين بها وعليه فتوى اكثر الفقهاء۔ (الدر المختار علیٰ هامش الطحطاوی ج ۱ ص۳۳۸ باب الجمعۃ)[1]

جیل میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ آج کل پاکستان میں اکثر جیلیں شہروں کے وسط میں واقع ہیں جن میں باہر سے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی جبکہ ان جیلوں میں قیدیوں کی تعداد ہزاروں تک ہوتی ہے، اندریں صورت ایسی جیلوں میں نمازِ جمعہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ فقہ حنفی کے مطابق جمعہ کی ادائیگی کے لیے اِذنِ عام شرط ہے چونکہ جیل کے اندر باہر سے لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے جیل میں جمعہ وعیدین ہر دو جائز نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: الشرط السادس الإذن العام وهو ان تفتح ابواب الجامع فيؤذن بالناس كافة حتى ان جماعة لو اجتمعوا فی الجامع وأغلقوا أبواب المسجد علىٰ انفسهم وجمعوا لم يجزهم۔ (الفتاوىٰ التاتارخانية ج ۲ ص۷ شرائط الجمعۃ)[2]

عیدین کی نماز مسجد میں ادا کرنا

سوال:۔ آجکل اکثر دیہاتوں (گاؤں) اور کئی شہروں میں بھی عیدین کی نماز مساجد میں ادا کی جاتی ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا

---

[1] لما قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: لا تصح الجمعة الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر ولا تجوز فی القرى لقوله عليه السلام لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى الا فی مصر جامع

(الهداية ج ۱ ص۱۵۰ باب صلوٰة الجمعة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۱ ص۱۴۵ الباب السادس عشر فی صلوٰة الجمعة۔

[2] قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: صحت صلوٰۃِ جمعہ کے شرائط میں سے اِذنِ عام بھی ہے اور صورت مذکورہ فی السوال وہ مفقود ہے لہٰذا جمعہ صحیح نہ ہوگا۔ (امداد الاحکام ج ۱ ص۷۵۵ فصل فی الجمعہ والعیدین)

وَمِثْلُهٗ فی كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ج ۱ ص۳۸۰ فصل شروط الجمعة۔

عید گاہ کو نکلنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید باہر عید گاہ میں ادا فرمائی ہے اس لیے عیدین کی نماز کے لیے عید گاہ کو نکلنا مسنون ہے تاہم مساجد میں بھی عیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے۔

وفی الهندیة: الخروج الی الجبانة فی صلٰوة العید سنة وان کان یسعهم المسجد الجامع علی هذا عامة المشائخ وهو الصحیح۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۱۵۰ الباب السابع عشر فی صلٰوة العیدین)[۱]

خطبہ میں تعوّذ اور تسمیہ جہراً کہنا

سوال:۔ اگر کوئی خطیب خطبہ شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ جہراً پڑھے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ خطیب کے لیے خطبہ شروع کرنے سے پہلے آہستہ سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیئے بِسْمِ اللہ الخ منقول نہیں تاہم اگر پڑھ لیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله قال فی الدر ویبداء بالتعوذ سرًّا) ای قبل الخُطبة الاولٰی بالتعوذ سرًّا ثم بحمد الله .... والثانیة کالاولٰی الا ان یدعوا للمسلمین مکان الوعظ۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۴۹ باب الجمعة، مطلب فی قول الخطیب)[۲]

دوسرے شخص کے تعاون کے بغیر نابینا آدمی کے لیے جمعہ کا حکم

سوال:۔ زید کا بھائی بصارت سے محروم (نابینا) ہے مگر اس کو چلنے پھرنے میں دقّت نہیں ہوتی بلکہ بغیر کسی دوسرے آدمی کی مدد کے دور دور تک چلتا پھرتا ہے، کیا اس نابینا پر جمعہ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ نابینا جو دوسرے شخص کی مدد کے بغیر اپنے دنیاوی کام کاج کر سکتا ہو اور اس کو چلنے پھرنے میں تکلیف نہ ہو تو اس پر جمعہ واجب ہے اس کو جمعہ و عیدین کے لیے جانا ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: واقول بل یظهر لی وجوبها علی العمیان الذی یمشی فی الاسواق

---

[۱] لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وفی التجنیس والخروج الی الجبانة سنة لصلٰوة العید ان کان یسعهم المسجد الجامع عند عامة المشائخ وهو الصحیح۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۵۹ باب صلٰوة العید)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج۲ ص۳۷۷ رابعاً موضع اداء صلٰوة العید۔

[۲] لما قال الشیخ ظفر العثمانیؒ: پہلا خطبہ شروع کرنے سے پہلے صرف اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم آہستہ پڑھے جہر کر کے اور بسم اللہ کا پڑھنا منقول نہیں ...... اس عبارت کے اخیر جُز سے قیاساً حیث قال والثانیة کالاولٰی معلوم ہوا کہ دوسرے خطبہ کو اعوذ باللہ الخ آہستہ پڑھ کر شروع کیا جائے۔ (امداد الاحکام ج۱ ص۷۲۳ فصل فی الجمعہ والعیدین)

ويعرف الطريق بلا قائد ولا كلفة ويعرف اى مسجد اراده بلا سوال احد لانه حينئذٍ كالمريض القادر على الخروج بنفسه۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۵۴ مطلب شروط الجمعة) لـه

خطبہ میں عصا پکڑنا

سوال: کیا جمعہ وعیدین کے خطبوں کے لیے ہاتھ میں عصا پکڑنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خطبہ کے لیے ہاتھ میں عصا پکڑنا مسنون ہے مگر اس کو مقصودی سنت نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ ایک استحبابی امر تک محدود رکھا جائے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ويكره ان يتكئ على قوس او عصا۔ قال ابن عابدينؒ: نقل القهستاني عن عبد المحيط ان اخذ عصا سنة كالقيام۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۶۳ باب الجمعة۔ مطلب اذا شرك فى عبادته الخ) لـه

نمازِ عید کے بعد دُعا مانگنا

سوال: عیدگاہوں میں لوگ نمازِ عید کے بعد دُعائیں مانگتے ہیں کیا نمازِ عید کے بعد دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قرآن وسنت نے دعا مانگنے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا بلکہ دُعا کے وقت کو مطلق رکھا ہے، جس وقت بھی کوئی دعا مانگے جائز ہے۔ نمازِ عیدین کے بعد دعا مانگنے پر اکابرینِ اُمت کا تعامل بھی چلا آرہا ہے اس لیے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بلکہ دُعا مانگنا مستحب ہے۔

لما قال الله تبارك وتعالىٰ: اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (سورة البقرة آيت ۱۸۶) لـه

لـه كتب الشيخ عبد الكريم وصححه العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: الجواب: جو نابینا بدون دوسرے شخص کے ہمراہ ہوئے بھی پھرتا ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس کے ذمہ جمعہ واجب ہے۔ (امداد الاحکام ج۱ ص۷۶ فصل فى الجمعة والعيدين)

لـه قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: عصا لینا مستحب ہے لیکن اگر اس کو ضروری سمجھا جاوے اور تارک پر ملامت کی جائے تو التزام ما لا یلزم کی وجہ سے منع کیا جائے گا۔

(امداد الاحکام ج۱ ص۱۵۹ فصل فى الجمعة والعيدين)

لـه قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: پس عیدین کی نماز کے بعد مناجات و دعا کرنا عموماتِ حدیث سے مستحب ہے بلکہ ہر نماز کے بعد دعا کرنا مستحب ہے۔ (امداد الاحکام ج۱ ص۱۴۲ فصل فى الجمعة والعيدين)

خطبۂ جمعہ کے بعد اقامت سے پہلے حدیث کا ترجمہ کرنا

سوال:۔ ہماری مسجد کے خطیب صاحب خطبۂ جمعہ کے بعد اور اقامت سے پہلے کبھی کبھی خطبہ کی حدیث وغیرہ کا ترجمہ فرماتے ہیں، کیا ایسا کرنا ممنوع ہے یا نہیں؟

الجواب: خطبۂ جمعہ اور اقامت کے درمیان دنیاوی باتیں کرنے سے منع کیا گیا ہے البتہ دینی وعظ یا مسئلہ اگر مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فاذا اتم اقیمت ویکره الفصل بامر الدنیا۔ ذکره العینی۔
قال ابن عابدینؒ:...... اما بنهی عن منکر او امر بمعروف فلا۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۶۱ باب الجمعة) [1]

جمعہ کے دن اذانِ ثانیہ کا جواب دینا

سوال:۔ فرض نماز کے لیے کہی گئی اذان کا جواب دینا تو ضروری ہے کیا جمعہ کے دن اذانِ ثانیہ کا جواب دینا بھی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ اذان کا جواب دینا ضروری امر ہے لیکن جمعہ کے دن اذانِ ثانی کا جواب زبان سے دینا فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے مناسب یہ ہے کہ جواب نہ دیا جائے، البتہ اگر دل ہی دل میں جواب دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وینبغی ان لا یجیب بلسانه اتفاقاً فی الاذان بین یدی الخطیب۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۳۹۹ باب الاذان) [2]

نمازِ جمعہ میں تاخیر کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض خطیب صاحبان جمعہ اتنی دیر سے پڑھتے ہیں کہ مثلِ اول کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

الجواب:۔ ظہر کا وقت مثلِ ثانی کے اختتام تک ہے اور مثلِ اول سے مثلِ ثانی کا وقت

---

[1] قال العلامة السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله ویکره الفصل بامر الدنیا) یفهم منه انه لایکره الفصل بامر الاخرة کذکر۔ (حاشیة طحطاوی علی الدر المختار ج۱ ص۳۴۸ باب الجمعة)

[2] قال الشیخ العلامة عبد الحی اللکھنویؒ: ینبغی ان لایجیب بلسانه اتفاقاً فی الاذان بین یدی الخطیب وان یجیب اتفاقاً فی الاذان الاول یوم الجمعة۔
(السعایة فی حل شرح الوقایة ج۲ ص۵۳ باب الاذان)

مکروہ ہے اس لیے جو جمعہ مثل اول کے بعد پڑھا جائے تو وہ مکروہ ہے، اگرچہ بعض علماء کے نزدیک مثلِ اول کے بعد جمعہ باطل ہے اس لیے جمعہ مثلِ اول سے پہلے پہلے پڑھنا چاہیئے۔

لما قال الشیخ السید احمد الطحطاویؒ : رتحت قولہ ویستحب الابراد بالظھر) وفی الخزانۃ الوقت المکروہ فی الظھران یدخل فی حد الاختلاف واذا اخرہ حتی صار ظل کل شیٔ مثلہ فقد دخل فی حد الاختلاف۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۴۵ کتاب الصلوٰۃ) ۱؎

ایک ہی دن میں جمعہ اور عید کے خطبہ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگوں سے سُنا گیا ہے کہ اگر جمعہ اور عید دونوں ایک دن جمع ہو جائیں تو عید کی نماز پڑھنے سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے اس لیے کہ دو خطبے ایک دن جمع کرنا صحیح نہیں، کیا واقعی دو خطبے ایک دن جمع کرنا صحیح نہیں یا کہ دونوں واجب ہیں ؟

الجواب:۔ جمعہ وعید کی نمازیں دونوں الگ الگ واجبات ہیں، ایک کی ادائیگی سے دُوسرا ساقط نہیں ہوتا اس لیے دونوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اما مذھبنا فلزوم کل واحد منھما۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۶۶، باب العیدین مطلب فی الفأل والطیرۃ) ۲؎

جمعہ کے دن نماز سے پہلے سورۂ کہف کی تلاوت کرنا

سوال:۔ ہمارے بعض احباب کا معمول ہے کہ وہ جمعہ کے دن نماز سے پہلے سورۂ کہف ضرور تلاوت کرتے ہیں، شرعاً اس کا کیا ثبوت ہے ؟

الجواب:۔ احادیثِ مبارکہ میں جمعہ کے دن سورۂ کہف تلاوت کرنے کی بہت فضیلت

۱؎ قال الشیخ محمد یوسف البنوریؒ : قال شیخنا والحق ما قالہ صاحب الدر المختار فان المثل الثانی وقت الضرورۃ للظھر وحکی الشیخ السید احمد زینیؒ دحلان الشافعی فی رسالۃ لہ عن الفتاوی الظھیریۃ وخزانۃ المفتیین رجوع ابی حنیفۃؒ الی المثل الاوّل۔ اھ (معارف السنن ج۲ ص۱۲۱، باب ماجاء فی مواقیت الصلوٰۃ)

۲؎ قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ، فی الجامع الصغیر عیدان اجتمعا فی یوم واحد فالاوّل سنۃ والثانی فریضۃ ولا یترک واحد منھا. قال بدرالدینؒ : تحتہ ای من العید والجمعۃ اما الجمعۃ فلانھا فریضۃ واما العید فلان ترکھا بدعۃ وضلال۔ (البنایہ ج۳ ص۳۵ باب صلوٰۃ العیدین)

ومثلہٗ فی امداد الفتاوی ج۱ ص۴۳۱ باب صلوٰۃ الجمعۃ والعیدین۔

آئی ہے کہ یہ دو جمعوں کے درمیان ایک نور ہوگا۔ شراح حدیث نے اس کو دل، قبر، حشر کی چمک پر محمول کیا ہے۔

عن ابی سعیدؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من قرأ سورۃ الکھف فی یوم الجمعۃ اضاءَ له النور ما بین الجمعتین۔ (رواہ البیہقی) ــــ قال العلامۃ الطیبیؒ: قولہٗ اضاء له فی قلبه او فی قبره او یوم حشره۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۸۹) [۱]

بارش کی وجہ سے جمعہ کی نماز کا ترک کرنا

سوال:۔ اگر عین جمعہ کی اذان کے بعد تیز بارش شروع ہوجائے تو کیا پھر بھی جمعہ کے لیے مسجد میں جانا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر بارش اتنی شدید ہو کہ اس میں جمعہ کیلئے مسجد میں جانا ممکن نہ رہے تو اس مجبوری کی وجہ سے جمعہ کو ترک کرنا مرخص ہے تاہم کوشش کر کے جانا بہتر ہے۔

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: اذا اصاب الناس مطر شدید یوم الجمعۃ فھم فی سعۃ من التخلف۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱ ص ۲۱۱ باب الجمع و ما یتصل بھٰذا) [۲]

مریض کی عیادت پر مامور تیماردار کے لیے جمعہ کا حکم

سوال:۔ ہسپتال میں بیمار کی خدمت پر مامور تیماردار سے جمعہ ساقط ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مریض کی حالت زیادہ خراب ہو اور تیماردار کے جمعہ کیلئے جانے سے اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو تیماردار سے جمعہ ساقط ہے، مریض کے پاس رہ کر صرف ظہر کی نماز

---

[۱] عن ابی سعید الخدریؓ انہٗ قال من قرأ سورۃ الکھف یوم الجمعۃ اضاء لهٗ من النور ما بینه وبین البیت العتیق ھٰکذا وقع موقوفاً۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۹ سورۃ الکھف)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المنثور ج ۴ ص ۲۰۹ سورۃ الکھف۔

[۲] قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ: فلابُدَّ لمن تجب علیه الجمعۃ من الصحۃ والامن والحریۃ والبصر والقدرۃ علی المشی وعدم الحبس وعدم المطر الشدید والوحل والثلج ونحوھا۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص ۲۷۴ باب الجمعۃ۔ السلامۃ من الاعذار)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۵۴ باب الجمعۃ۔

پڑھے اور اگر ہلاکت کا خطرہ نہ ہو تو جمعہ ساقط نہیں ہوگا۔

قال العلامۃ السید احمد الطحطاویؒ: الحق بالمریض الممرض ان بقی المریض ضائعًا بخروجہ علی الاصح۔ (طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۴۱۲ باب الجمعۃ) [1]

خطبۂ جمعہ کے دوران کسی کو منکر کام سے منع کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص دورانِ خطبۂ جمعہ کسی کو منکر کام کرتے دیکھے اور اس کو اشارہ سے منع کرے تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دورانِ خطبہ ہر ایسا عمل جو استماعِ خطبہ کے منافی ہو کرنا جائز نہیں البتہ اگر کسی کو منکر کام کرتے دیکھ کر اشارہ سے منع کرے تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔

لما قال العلامہ ابراھیم الحلبیؒ: وکذا لو اشار برأسہ او عینہ او یدہ عند رؤیۃ المنکر ولم یتکلم بلسانہ الصحیح انہ لا یکرہ۔ (کبیری ص۵۶۰ باب الجمعۃ) [2]

خطبہ کے دوران خطیب کا دائیں بائیں دیکھنا

سوال:۔ بعض خطباء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خطبہ کے دوران دائیں بائیں دیکھتے ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خطبہ کے دوران سنت طریقہ یہ ہے کہ خطیب سامنے کی طرف توجہ کرے اِدھر اُدھر نہ دیکھے، فقہاء کرام نے اس طرح کرنے (دائیں بائیں دیکھنے) سے منع فرمایا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وما یفعلہ بعض الخطباء من تحویل الوجہ جھۃ الیمین وجھۃ الیسار عند الصلوۃ علی النبی علیہ الصلوۃ والسلام فی الخطبۃ الثانیۃ لم ار من ذکرہ والظاھر انہ بدعۃ ینبغی ترکہ لئلا یتوھم انہ سنۃ ثم رأیت فی منھاج النووی

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فلا تجب الجمعۃ علی مریض لعجزہ عن ذلک وممرض ان بقی المریض ضائعًا وشیخ فان۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۲۷۰ باب الجمعۃ، السلامۃ من الاعذار)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۲ ص۱۵۳ باب الجمعۃ۔ مطلب فی شروط وجوب الجمعۃ۔

[2] ذکر العلامہ ابن نجیمؒ: وعن ابی یوسفؒ انہ کان ینظر فی کتابہ ویصححہ وقت الخطبۃ ولو لم یتکلم لکن اشار بیدہ او بعینہ حین رأی منکرا الصحیح انہ لا بأس بہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۵۶ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۷ الباب السادس عشر فی الجمعۃ۔

ولا یلتفت یمیناً وشمالاً فی شیٔ منها قال ابن حجر فی شرحہ لان ذٰلک بدعۃ ۔

(ردالمحتار ج۲ ص۱۴۹ باب الجمعۃ مطلب فی قول الخطیب الخ) [1]

خطبہ کے دوران سُنتیں پڑھنا

سوال:۔ بعض لوگ عین خطبہ کے دوران جمعہ کے لیے مسجد آتے ہیں اور آتے ہی سُنتیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، کیا خطبہ کے دوران سُنتیں پڑھنا جائز ہے؟

الجواب: جمعہ کا خطبہ سننا واجب ہے اس دوران ہر وہ عمل جو خطبہ سننے سے مشغول رکھے کرنا جائز نہیں اس لیے فقہ حنفی کی رُو سے دورانِ خطبہ سُنتیں پڑھنا درست نہیں۔

لما قال العلامۃ ابوالبرکات النسفیؒ: اذا خرج الامام فلاصلوٰۃ ولا کلام ـــ قال ابن نجیمؒ: فی شرحہ لما رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ عن علیؓ وابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہم کانوا یکرھون الصلوٰۃ والکلام بعد خروج الامام وقول الصحابی حُجّۃ ۔

(البحرالرائق ج۲ ص۱۵۵ باب الجمعۃ) [2]

دورانِ خطبہ مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا

سوال:۔ یہاں ہمارے محلے کی مسجد میں خطبۂ جمعہ کے دوران مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: جمعہ کا خطبہ سننا اور اس کے لیے متوجہ ہو کر خاموش رہنا واجب ہے اس دوران نماز و کلام جیسے امور جائز نہیں، لہٰذا دورانِ خطبہ مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا صحیح نہیں، چندہ کیلئے

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: اما سُنن الخطبۃ فھی عند الحنفیۃ ثمانی عشر سنۃ..... استقبال القوم بوجھہ دون التفات یمیناً وشمالاً سُنۃ بالاتفاق لما روی ابن ماجہ: عن عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ قال کان النبیؐ اذا قام علی المنبر استقبلہ الناس بوجوھھم ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۲۹۱ المطلب السادس سُنن الخطبۃ ومکروھاتھا)

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا خرج الامام من الحُجرۃ ان کان والا فقیامہ للصعود شرح الجمع فلاصلوٰۃ ولا کلام الیٰ تمامھا۔ قال ابن عابدینؒ: (قولہ فلاصلوٰۃ) شمل السنۃ وتحیۃ المسجد۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۵۸ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۱ ص۱۵۱ باب الجمعۃ ۔

کوئی اور وقت مقرر کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: واذا خرج الامام فلا صلوٰة ولا کلام ۔

(کنزالدقائق علیٰ هامش البحرالرائق ج ۲ ص۱۵۵ باب الجمعة) لے

خطبہ کے لیے منبر پر بیٹھتے وقت خطیب کا السلام علیکم کہنا

سوال:۔ ہمارے خطیب صاحب جب خطبہ کے لیے منبر پر بیٹھتے ہیں تو حاضرین کو السلام علیکم کہتے ہیں، کیا اس وقت سلام کرنا سنت ہے؟

الجواب:۔ جب خطیب خطبہ کے لیے منبر پر بیٹھ جائے تو اس دوران اُس کا حاضرین کو سلام کہنا احناف کے ہاں درست نہیں، اگرچہ امام شافعیؒ نے جواز کا قول نقل کیا ہے مگر چونکہ یہ بھی کلام ہے جو بنصِ حدیث ممنوع ہے اس لیے فقہاء کرام نے اس کو مکروہ کہا ہے ۔

لما قال العلامة محمد ابراهیم الحلبیؒ: الخطیب اذا صعد المنبر لایسلم علی القوم عندنا وبه قال مالك وقال الشافعی واحمد یسلم علیهم (المروی من سلام عندنا غیر مقبول) قال البیهقیؒ: لیس بالقوی ۔ وقال عبدالحق فی الاحکام الکبریٰ هو موسل قال واسند ابواحمد من حدیث ابن لهیعة وهو معروف فی الضعفاء ولا یحتج به ۔

(کبیری ص۵۶۲ باب الجمعة البحث الثالث) ۲ے

کیا خطبہ بلند آواز سے پڑھنا چاہیئے

سوال:۔ ہماری مسجد کے خطیب اتنی آواز کے ساتھ خطبہ پڑھتے ہیں کہ بمشکل ایک دو صف والے سن سکتے ہیں، کیا خطبہ بلند آواز سے پڑھنا چاہیئے یا آہستہ آواز سے؟

الجواب:۔ اصلاً تو کلماتِ خطبہ پر تلفظ ضروری ہے بمع صوت (آواز کے ساتھ) اگرچہ ...

لے قال العلامة الحصکفیؒ: اذا خرج الامام من الحجرة ان کان والا فقیامه للصعود شرح المجمع فلا صلوٰة ولا کلام الی تمامها وان کان فیها ذکر الظلمة فی الاصح ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۱۵۸ باب الجمعة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۱ ص۱۵۱ باب الجمعة ۔

۲ے لما قال العلامة الحصکفیؒ: ومن السنة جلوسه فی مخدعه عن یمین المنبر ولبس السواد وترك السلام من خروجه الی دخوله فی الصلوٰة ۔ وقال الشافعیؒ اذا استوی علی المنبر سلّم ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۱۵۰ باب الجمعة)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۱ ص۴۰۸ باب صلوٰة الجمعة والعیدین ۔

یہ ہے کہ خطبہ معتاد آواز سے اونچا پڑھا جائے۔

لما فی الھندیۃ: ومن المستحب ان یرفع الخطیب صوتہ وان یکون الجھر فی الثانیۃ دون الاولیٰ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۴۷ الباب السادس عشر فی الجمعۃ) [1]

خطبہ کے دوران بیٹھنے کا طریقہ

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ خطبہ سننے کے لیے کس طرح بیٹھنا چاہیے؟ جبکہ بعض لوگ پہلے خطبے میں زیرِ ناف ہاتھ رکھتے ہیں اور دوسرے خطبے میں التحیات کی طرح گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

الجواب:۔ خطبہ سننا واجب ہے، اس کے سننے کے لیے جیسے بھی سہولت ہو بیٹھنا جائز ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ خطبہ سننے کے لیے ایسے بیٹھنا چاہیے جس طرح نماز میں التحیات کے لیے بیٹھا جاتا ہے، باقی پہلے خطبہ میں ناف اور دوسرے میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنا عامیانہ عمل ہے شرعاً اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

وفی الھندیۃ: اذا شھد الرجل عند الخطبۃ ان شاء جلس محتبیا او متربعا او کما تیسر لانہ لیس بصلوۃ عملا وحقیقۃ کذا فی المضمرات ویستحب ان یقعد فیھا کما یقعد فی الصلوۃ کما فی معراج الدرایۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۴۸ الباب السادس عشر فی الجمعۃ) [2]

خطبے کے دوران وعظ کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض خطباء خطبہ کے دوران ہی خطبے کا ترجمہ بصورتِ وعظ شروع کر دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی سارے خطبے کا ترجمہ بھی کر جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ خطیب کے لیے دورانِ خطبہ گفتگو کرنا مکروہ ہے، علماء امت کا تعامل یہی آرہا ہے کہ وہ خطبہ میں عربی عبارت کے علاوہ دوسری کسی بھی زبان کے الفاظ کو ملحق نہیں

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ومن المستحب أن یرفع الخطیب صوتہ کما فی السراج الوھاج ومنہ أن یکون الجھر فی الثانیۃ دون الاولیٰ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۴۶ باب الجمعۃ)

[2] قال العلامۃ مفتی رشید احمد لدھیانوی: اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں لہٰذا یہ فعل بدعت ہے، دونوں کے دوران حالتِ تشہد میں بیٹھنا مستحب، دونوں میں ہاتھ رانوں پر ہی رکھے، یہ نشست مستحب ہے ویسے جس طرح چاہے بیٹھ سکتا ہے۔ (احسن الفتاوی ج ۴ ص ۱۳۳ باب الجمعۃ)

کرتے، اس لیے خطبہ کے دوران خطبہ کا ترجمہ کرنا خلافِ سُنت ہے تاہم مختصراً بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما قال الامام شاہ ولی اللہ المحدث الدھلویؒ: ولما لاحظنا خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخلفائہ رضی اللہ عنہم وھلم جرا فتنفحنا وجود اشیاء منھا الحمد والشھادتین والصلوٰۃ علی النبی والامر بالتقوی وتلاوۃ اٰیۃ والدعا للمسلمین والمسلمات وکون الخطبۃ عربیۃ الی قولہ واما کونہا عربیۃ فلا ستمرار اھل المسلمین فی المشارق والمغارب بہ مع ان فی کثیر من الاقالیم کان المخاطبون اعجمیین۔ وقال النووی فی الاذکار رحمہ اللہ تعالیٰ ویشترط کونہا ای خطبۃ الجمعۃ وغیرھا بالعربیۃ۔

(المصفیٰ شرح مؤطا مالک بحوالہ الجواھر الفقہ ج۱ ص۳۵۴) ۱؎

خطبہ جمعہ کے بغیر نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ کیا بغیر خطبہ جمعہ کے نماز ادا ہو جائے گی؟

الجواب:۔ خطبہ جمعہ کے شرائط میں داخل ہے اس لیے بغیر خطبہ کے نمازِ جمعہ درست نہیں۔

وفی الھندیۃ: ومنھا الخطبۃ قبلھا حتی لو صلوا بلا خطبۃ او خطب قبل الوقت لم یجز۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۴۶ الباب السادس عشر فی صلوۃ الجمعۃ) ۲؎

سلطان یا اسکے نائب کے بغیر نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:۔ کتبِ فقہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ جمعہ کی امامت کے لیے

۱؎ قال العلامۃ الشیخ اشرف علی التھانویؒ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے اب تک امت میں یہی تعامل وتوارث رہا کہ خطبہ میں اور کوئی غیر چیز لاحق نہیں کرتے اس لیے فقط عربی خطبہ پر اکتفاء کرنا چاہیے ہاں اگر کوئی نصیحت مناسب وقت پر کسی واقعہ درپیش شدہ میں کردے تو جائز ہے۔ (آگے ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں)...... باقی اس کی عادت کر لینا یا بلاضرورت ایسا کرنا یا زیادہ حصہ کا ترجمہ کرنا یا طویل وعظ کہنا اتنا خطبہ میں خلافِ سُنت ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۱ ص۴۳۵، ۴۳۶ باب صلوٰۃ الجمعہ والعیدین)

وَمِثْلُہٗ فی الجواھر الفقہ ج۱ ص۳۶۶ خلاصہ احکام الخطبۃ۔

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وفی فتح القدیر واعلم ان الخطبۃ شرط الانعقاد فی حق من ینشئ التحریمۃ للجمعۃ الخ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۴۷ باب الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۲۸۲ باب الجمعۃ الخطبۃ قبل الصلوٰۃ۔

امام (سلطان) یا اس کے مقرر کردہ نائب کا ہونا ضروری ہے جو زمانہ حال میں ناپید ہے جبکہ ہر جگہ جمعہ کی نماز ادا کی جاتی، کیا امام یا اس کے نائب کے بغیر اقامتِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہی ذخائر کی عبارات پر غور کرنے سے اس شرط کے بارے میں معلوم ہو جائے گا کہ سلطان یا اس کے نائب کا وجود مقصود بالذات نہیں بلکہ فتنہ کے سدِ باب کے لیے ہے، لہٰذا اگر مسلمان باہمی رضامندی سے کسی اور شخص کو امامتِ جمعہ کے لیے مقرر کریں تو اس کی اتباع میں ادائیگی جمعہ میں کوئی شک نہیں، لہٰذا موجودہ زمانہ میں بھی جمعہ کی امامت اور دوسری نمازیں صحیح ہیں۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی: ولا یجوز اقامتها الا للسلطان اولمن امره السلطان لانها تقام بجمع عظیم وقد تقع المنازعة فی التقدم والتقدیم۔
(الهدایة ج۱ ص۱۵۱ باب الجمعة) [۱]

خطبۂ جمعہ اور نماز کیلئے علیحدہ علیحدہ اماموں کا حکم

سوال: بعض جگہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جمعہ کا خطبہ ایک آدمی نے دیا اور نماز دوسرے شخص نے پڑھائی، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں اور اس سے جمعہ کی نماز پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا؟

الجواب: خطبۂ جمعہ اور نماز دونوں تقریباً ایک چیز ہیں اس لیے ان دونوں کے لیے ایک ہی شخص ہونا چاہیئے، البتہ اگر کہیں ایسا ہو جائے تو جمعہ ادا ہو جائے گا البتہ اس کو عادت نہیں بنانا چاہیئے، تاہم تقریر اور خطبہ و نماز الگ الگ آدمی پڑھائیں تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفی: لاینبغی ان یصلی غیر الخطیب لانهما کشیء واحد فان فعل بان خطب صبی باذن السلطان وصلی بالغ جاز۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۶۲ باب الجمعة) [۲]

دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار

سوال: دو خطبوں کے درمیان کتنی دیر بیٹھنا سُنّت ہے؟

---

[۱] قال العلامة الحصکفی: ونصب العامة الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر اما مع عدمهم فیجوز للضرورة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۴۳ باب الجمعة۔ مطلب فی جواز استنابة الخطیب)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج۱ ص۴۳۴ باب صلوٰة الجمعه والعیدین۔

[۲] وفی الهندیة: ولاینبغی أن یصلی غیر الخطیب کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۴۷ الباب السادس عشر فی الجمعة)
وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۲۸۴ الخطبة قبل الجمعة۔

الجواب: دونوں خطبوں کے درمیان ایک مرتبہ اتنی دیر بیٹھنا کہ بدن کے اعضاء اپنی جگہ پر قرار پکڑ سکیں مسنون ہے۔

وفی الهندیة: والخامس عشر الجلوس بین الخطبتین هكذا فی البحر الرائق ومقدار الجلوس بینهما مقدار ثلاث آیات فی ظاهر الروایة هكذا فی السراج الوهاج ناقلاً عن الفتاوی۔ قال شمس الائمة السرخسیؒ: فی تقدیر الجلسة بین الخطبتین انه اذا تمكن فی موضع جلوسه واستقر كل عضو منه فی موضعه قام من غیر مكث ولبث۔ كذا فی التاتارخانیة والمختار ما قاله شمس الائمة السرخسیؒ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۴۷ الباب السادس عشر فی الجمعة) [1]

جمعہ وعیدین کا خطبہ بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! جمعہ اور عیدین کے خطبہ کو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے یا کھڑے ہو کر پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب: جمعہ وعیدین کے خطبہ کو کھڑے ہو کر پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے بیٹھ کر خطبہ پڑھنا خلافِ سنت ہے البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو بیٹھ کر پڑھنا بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: ویُسنّ خطبتان ...... وطهارته وستر عورة قائماً۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۵۱ باب الجمعة) [2]

غیر مستقل امام یا خطیب نمازِ جمعہ وعیدین پڑھا سکتا ہے

سوال: اگر کوئی عالمِ دین کسی مسجد کا امام یا خطیب نہ ہو اور وہ عید کی نماز پڑھائے تو عید کی نماز ادا ہوگی یا نہیں؟ جبکہ ایک عالم صاحب نے عدم ادائیگی

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: ویُسنّ خطبتان خفیفتان وتكره زیادتهما علی قدر سورة من طوال المفصل بجلسة بینهما بقدر ثلاث آیات علی المذهب وتاركها مسیئ علی الاصح۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۱۴۸ باب الجمعة)

وَمِثْلُهُ فی الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص ۲۸۳ الخطبة قبل الجمعة۔

[2] قال الشیخ وهبة الزحیلی: قال الحنفیة ...... ویخطب قائما ...... ولو خطب قاعداً أو علی غیر طهارة جاز لحصول المقصود الا أنه یكره لمخالفته المورث۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص ۲۸۳ باب الجمعة۔ الخطبة قبل الصلوٰة)

وَمِثْلُهُ فی امداد الفتاوی ج ۱ ص ۴۲۵ باب صلوٰة الجمعة والعیدین۔

کا کہنا ہے؟

الجواب: مناسب اور بہتر یہ ہے کہ جمعہ اور عیدین کی نماز اُسی مسجد کا امام یا خطیب خود ہی پڑھائے اور اگر اس (امام وخطیب) کو کوئی شرعی عذر ہو تو کسی دوسرے عالم دین کا جمعہ وعیدین کی نماز پڑھانا بلا کراہت جائز ہے، البتہ اگر کوئی شرعی عذر نہ ہو تو اس صورت میں اگرچہ عیدین اور جمعہ کی نماز تو ادا ہو جائے گی مگر یہ عمل خلافِ اولیٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: الشرط الخامس للجمعة لكن سيجيئ انه لايشترط الامام والخطيب (وقال بعد صفحات)....لاينبغي ان يصلي غير الخطيب...... جاز هو المختار۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۱۶۲،۱۵۱ باب الجمعة) [۱]

خطیب کا خطبہ کے دوران منکر سے منع کرنا

سوال: خطبۂ جمعہ کے دوران مسجد کے صحن میں چند بچے شور شرابہ کر رہے تھے کہ اچانک خطیب نے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ خاموش، آرام سے بیٹھ جاؤ۔ دریافت طلب بات یہ ہے کیا خطبہ کے دوران خطیب صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: خطبۂ جمعہ کے دوران اگرچہ باتیں کرنا جائز نہیں لیکن خطیب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اس حکم سے مستثنیٰ ہے، اگر وہ خطبہ کے دوران ہی کسی کو منکر و ناجائز کام سے منع کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور نہ اس سے خطبہ پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

لما في الهندية: ويكره للخطيب ان يتكلم في حال الخطبة الا ان يكون امراً بالمعروف۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۹۴ باب الجمعة) [۲]

---

[۱] قال الشيخ وهبة الزحيلي: ولا يشترط اتحاد الامام والخطيب لكن لا ينبغي ان يصلي غير الخطيب لانهما كشيئ واحد۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج۲ ص۲۹۴ الخطبة قبل الصلوٰة۔ باب الجمعة)

ومِثْلُهٗ في امداد الفتاوى ج۱ ص۴۲۶ باب صلوٰة الجمعة والعيدين۔

[۲] قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: يكره للخطيب ان يتكلم في حالة الخطبة للاخلال بالنظم الا ان يكون امر بمعروف لقصة عمرؓ وعثمانؓ وهي معروفة۔

{فتح القدير ج۱ ص۳۰
باب الجمعة ومن شرائطها الخطبة}

عیدین کی نماز کا اصل وقت

سوال :۔ عیدین کی نماز طلوعِ آفتاب سے کتنی دیر بعد پڑھنی چاہیئے؟

الجواب :۔ جب سورج ایک نیزہ کے برابر بلند ہو جائے اُس وقت سے لیکر زوال تک عیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ووقتها من الارتفاع قدر رمح فلا یصح قبله بل تکون نفلا محرما الی الزوال باسقاط الغایة۔ (الدرالمختار علی صدر ردّالمحتار ج ۲ ص۱۶۷ باب صلوٰۃ العیدین) [1]

حنفی العقیدہ کیلئے شافعی العقیدہ امام کے پیچھے نماز عید پڑھنے کا حکم

سوال :۔ ہم لوگ بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم ہیں، عیدین کی نماز میں ہمارا امام شافعی المسلک ہوتا ہے جو تکبیراتِ زوائد چھ سے زیادہ (۱۲) پڑھتا ہے، کیا ہم اس امام کی اقتداء کر سکتے ہیں؟

الجواب :۔ عیدین میں تکبیراتِ زوائد کی تعداد شرعاً مختلف ہے، احناف نے چھ کو ترجیح دی ہے جبکہ دیگر مذاہب والوں نے بارہ کو ترجیح دی ہے، چونکہ یہ اجتہادی ترجیح ہے اس لیے چھ سے زائد تکبیرات کہنے والے کی اقتداء میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو زاد تابعه الی ستة عشر لانه مأثور۔ اھ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله الی ستة عشر) کذا فی البحر عن المحیط وفی الفتح: قیل یتابعه الی ثلاث عشرة وقیل الی ستة عشر اھ...... فهذا یؤید القول الاوّل ولذا قدمه فی الفتح ونسبه فی البدائع الی عامة المشائخ على ان ضم الثلاث الاصلیة الی الزوائد بعید جداً لان القرأة فاصلة بینهما۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۱۷۲ باب صلوٰۃ العیدین، مطلب امر الخلیفة لا یبقی بعد موته) [2]

---

[1] قال العلامة حسن بن العمار الشرنبلالیؒ: وابتداء وقت صحة صلوٰۃ العید ارتفاع الشمس قدر رمح او رمحین حتی تبیض للنهی عن الصّلوٰۃ وقت الطلوع إن ان تبیض لانه صلی الله علیه وسلم کان یصلی العید حتی ترفع الشمس قدر رمح او رمحین فلو صلوا قبل ذلك لا تکون صلوٰۃ عید بل نفل محرما۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۳۶ باب صلوٰۃ العیدین)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۱ ص۲۱۴ الفصل الرابع والعشرون فی صلوٰۃ العیدین۔

[2] قال محمد فی الجامع: اذا دخل الرجل مع الامام فی صلوٰۃ العید وهذا الرجل یری تکبیر ابن مسعود رضی الله عنهما فکبر الامام غیر ذلك اتبع الامام الا اذا کبر الامام تکبیرا لم یکبر احد من الفقهاء فحینئذ لا یتابعه۔ (الفتاوٰی الهندیه ج ۱ ص۱۵۱ باب صلوٰۃ العیدین)

عیدگاہ جاتے وقت تکبیرات جہراً پڑھے یا سراً

سوال:۔ کیا عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے عیدگاہ جاتے وقت راستے میں تکبیرات جہراً (بآوازِ بلند) پڑھے یا سراً (دل میں)؟

الجواب:۔ عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے عیدگاہ جاتے وقت تکبیرات جہراً (بلند آواز سے) کہے جبکہ عیدالفطر کی نماز کے لیے جاتے وقت سراً (دل میں) پڑھی جائیں، یہی امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے اور علامہ قاسم بن قطلوبغا نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویوم الفطر لا یجهر به عنده وعندهما یجهر وهو روایة عنه والخلاف فی الافضلیة اما الکراهة فمنتفیة عن الطرفین۔ وقد ذکر الشیخ القاسم فی تصحیحه ان المعتدل قول الامام۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۷۰ باب صلوٰة العیدین مطلب یطلق المستحب علی السنة بالعکس) [1]

عید کی نماز اور خطبہ دو آدمیوں کے پڑھنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں عید کی نماز ایک مولوی صاحب پڑھاتے ہیں اور خطبہ دوسرے مولوی صاحب پڑھتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور اس سے نماز پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ اگر عید کی نماز ایک مولوی صاحب پڑھائیں اور خطبہ کوئی اور دے تو اس سے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ نماز صحیح اور درست ہوگی، البتہ مناسب یہ ہے کہ نماز اور خطبہ ایک ہی آدمی پڑھائے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ما یُسَنُّ فی الجمعة ویکره یُسَنُّ فیها ویکره۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۷۵ باب صلوٰة العید)

وقال ایضاً: لا ینبغی ان یصلی غیر الخطیب لانهما کشئ واحد۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۶۲ باب الجمعة) [2]

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یغدوا الی المصلی جاهراً بالتکبیر فی عید الاضحیٰ فاذا انتهی الی المصلی ترك ...... واما فی عید الفطر فلا یجهر بالتکبیر عند ابی حنیفة الخ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۷۹ باب صلوٰة العیدین)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۵۰ باب صلوٰة العیدین۔

[2] قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: ویسنُّ فیها ما یسنُّ فی خطبة الجمعة ویکره فیها ما یکره فیها۔

(کبیری ص۵۷۱ باب صلوٰة العیدین)

وفی الهندیة: ولا ینبغی أن یُصلّی غیر الخطیب کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۴۷ الباب السادس عشر فی الجمعة)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۲۸۴ الخطبة قبل الجمعة۔

تکبیراتِ زوائد بھول جانے کا حکم

سوال :۔ اگر کسی امام کو نمازِ عید میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے دوران یاد آئے کہ اس سے تکبیراتِ زوائد رہ گئی ہیں تو اس کو کیا کرنا چاہیئے ؟

الجواب :۔ عیدین کی نماز میں تکبیراتِ زوائد واجب ہیں، اگر امام کو درمیان فاتحہ یا فاتحہ پڑھنے کے بعد یاد آئے بشرطیکہ سورۃ نہ پڑھی ہو تو اس صورت میں امام اوّلاً تکبیرات کہے اور پھر از سرِ نو فاتحہ وسورۃ پڑھے اور اگر سورۃ پڑھ چکا ہو تو تکبیرات ساقط اور سجدۂ سہو لازم ہو جائے گا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : فی البحر عن المحیط بدأ الامام بالقرأة سهوًا فتذکر بعد الفاتحة والسورة یمضی فی صلوٰته وان لم یقرأ الا الفاتحة کبّر واعاد القرأة لزومالان القرأة اذا لم تتم کان امتناعا عن الاتمام لا رفضا للفرض۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۷۳ باب صلوٰة العیدین، مطلب امر الخلیفة لایبقی بعد موته) [1]

تکبیراتِ زوائد پڑھنے کے بعد نماز میں شامل ہونا

سوال :۔ اگر کوئی شخص تکبیراتِ زوائد کے بعد نماز میں شامل ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیئے ؟

الجواب :۔ جو شخص تکبیراتِ زوائد کے بعد نماز میں شامل ہو اس کی چند صورتیں ہیں :۔

۱ :۔ اگر پہلی رکعت میں شامل ہوا ہو تو اس صورت میں پہلے از خود تین تکبیرات کہے۔

۲ :۔ اور اگر دوسری رکعت میں امام کے ساتھ ملا ہو تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب قضاء شدہ رکعت کے لیے کھڑا ہو تو اوّلاً تکبیرات کہہ کر پھر قرأت وغیرہ پوری کرے۔

۳ :۔ اور اگر امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو تو اگر رکوع کے پانے کی اُمید ہو تو پہلے تکبیرات کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں ملے ورنہ ناامیدی کی صورت میں تکبیرات رکوع ہی میں ادا کرلے۔

۴ :۔ اور اگر تکبیرات کے دوران امام رکوع سے اُٹھ جائے تو جتنی تکبیرات کہہ چکا ہے وہ تو صحیح

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ : فاما اذا تذکر قبل الفراغ منها بان قرأ الفاتحة دون السورة ترك القرأة ویاتی بالتکبیرات لانه اشتغل بالقرأة قبل اوانها فیترکها ویأتی بما هو الاهم لیکون المحل محلا له ثم یعید القرأة لان الرکن متی ترك قبل تمامه ینتقض من الاصل۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۷۸ باب صلوٰة العیدین، فصل بیان قدر صلوٰة العیدین وکیفیة ادائها)
ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۶۱ باب صلوٰة العیدین۔

ہے اور باقی ساقط ہو جائیں گی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو ادرک المؤتم الامام فی القیام بعد ما کبّر کبّر فی الحال برأی نفسه لانه مسبوق ولو سبق برکعة یقرأ ثم یکبر لئلا یتوالی التکبیرات۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله فی القیام) ای الذی قبل الرکوع اما لو ادرکه راکعاً فان غلب علی ظنه ادرکه فی الرکوع کبر قائماً برأی نفسه ثم رکع والا رکع وکبر فی رکوعه خلافاً لابی یوسفؒ ولا یرفع یدیه لان الوضع علی الرکبتین سنة فی محله والرفع لا فی محله وان رفع الامام رأسه سقط عنه ما بقی من التکبیر لئلا تفوته المتابعة ولو ادرکه فی قیام الرکوع لا یقضیها فیه لانه یقضی الرکعة مع تکبیراتها۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۷۳ باب صلوٰة العیدین) [1]

تکبیراتِ تشریق کی تعداد

سوال:۔ تکبیراتِ تشریق فرض نمازوں کے بعد کتنی مرتبہ پڑھی جائیں؟

الجواب:۔ فرض نماز کے بعد ایک دفعہ تکبیر یعنی اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد پڑھنا واجب ہے اس سے زائد یعنی تین دفعہ پڑھنا مستحب ہے اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو خلافِ سنت کہا ہے۔ علامہ رافعیؒ نے حضرت عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنہما سے تین دفعہ پڑھنا نقل کیا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یجب تکبیر التشریق فی الاصح للامر به مرة وان زاد علیها یکون فضلاً۔ قال العینیؒ: صفته اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا اله الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد

---

[1] قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: وان ادرکه بعد ما کبر الامام الزوائد وشرع فی القرأة فانه یکبر تکبیرة الافتتاح ویأتی بالزوائد برأی نفسه لا برأی الامام لانه مسبوق وان ادرک الامام فی الرکوع فان لم یخف فوت الرکوع مع الامام یکبر الافتتاح قائما ویأتی بالزوائد ثم یتابع الامام فی الرکوع.......فان رفع الامام رأسه من الرکوع قبل ان یتمها رفع رأسه لان متابعة واجبة وسقط عنه ما بقی من التکبیرات لانه فات محلها۔۔۔۔ هذا اذا ادرک الامام فی الرکعة الاولیٰ فان ادرکه فی الرکعة الثانیة کبر للافتتاح وتابع الامام فی الرکعة الثانیة یتبع فیها رأی امامه لما قلنا فاذا فرغ الامام من صلوٰته یقوم الی قضاء ما سبق به۔ (بدائع الصنائع ج ۱ باب صلوٰة العیدین، فصل بیان قدر صلوٰة العیدین وکیفیة ادائها ص ۲۷۸،۲۷۹)

ومثله فی کبیری ص ۵۷۲ باب صلوٰة العیدین۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : (تحت قوله وان زاد الخ) أفاد أن قوله مرة بیان للواجب لکن ذکر ابوالسعود ان الحموی نقل عن القراحصاری ان الاتیان به مرتین خلاف السنة ۔

(رد المحتار ج۲ ص۱۷۸ باب صلوٰۃ العیدین) [۱]

تکبیراتِ تشریق عید کی نماز کے بعد پڑھنے کا حکم

سوال:۔ فقہی ذخائر میں تکبیراتِ تشریق کے بارے میں ہر فرض نماز کے بعد پڑھنے کا حکم ہے، ہمارے محلہ کی مسجد کے امام صاحب عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد میں بھی پڑھنے کا کہتے ہیں، کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے؟

الجواب:۔ ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ تکبیر کہنا واجب ہے اور عید کی نماز کے بعد تکبیر پڑھنا مستحب ہے، فقہاء کرام نے اس کی تصریح کر دی ہے اس لیے آپ کی مسجد کے امام صاحب کا عمل درست ہے اور فقہی ذخائر میں اس عمل کے ساتھ تعارض نہیں ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ولا بأس به عقب العید لان المسلمین توارثوه فوجب اتباعهم وعلیه البلخیون ۔ قال العلامة ابن عابدینؒ : (تحت قوله لا بأس به) تستعمل فی المندوب کما فی البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم قوله فوجب الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح علیه وفی البحر عن المجتبیٰ والبلخیون یکبرون عقب صلوٰۃ العید لانها تؤدی بجماعة فاشبهت الجمعة ۔

(رد المحتار ج۲ ص۱۸۰ باب صلوٰۃ العیدین، مطلب کلمه لا بأس الخ) [۲]

تکبیراتِ تشریق بھول جانے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص تکبیراتِ تشریق بھول جائے تو کیا اس پر دوبارہ پڑھنا واجب ہے یا کہ ذمہ سے

---

[۱] قال العلامة عبدالقادر الرافعیؒ : (تحت قوله خلاف السنة) لکن أخرج ابن المنذر ان ابن عمرؓ کان یکبر ثلاثا ولاء الصلوٰۃ ویقول لا اله الا الله وحده لا شریك له له الملك وله الحمد وهو علی کل شئ قدیر۔ (تقریرات رافعی علی رد المحتار ج۱ ص۱۱۶ باب صلوٰۃ العیدین)
ومثله فی الطحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۲۹۲ باب صلوٰۃ العیدین ۔

[۲] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : ولا بأس بالتکبیر عقب صلوٰۃ العیدین کذا فی المبسوط ابی اللیث لتوارث المسلمین ذلك ۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۹۴ باب صلوٰۃ العیدین)

ساقط ہو جائیں گی ؟

الجواب :۔ تکبیرات تشریق اگر کوئی شخص بھول جائے اور اسی حالت میں وہ مسجد سے باہر جا چکا ہو یا کسی کام میں مشغول ہو گیا ہو تو اس شخص کے ذمہ سے تکبیرات ساقط ہو جائیں گی البتہ اگر اپنی جگہ پر موجود ہو تو تاخیر کی صورت میں دوبارہ کہنا ضروری ہے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : عقب کل فرض عینی بلا فصل یمنع البناء فلو خرج من المسجد او تکلم عامداً او ساھیاً او احدث عامداً سقط عنه التکبیر وفی استدبار القبلة روایتان ولو احدث ناسیاً بعد السلام الاصح انه یکبر ولا یخرج للطھارة ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۷۹ باب صلوٰۃ العیدین) [۱]

تکبیرات تشریق میں مفتی بہ قول

سوال :۔ تکبیرات تشریق میں جو ائمہ احناف کا اختلاف ہے اس میں مفتی بہ رائے امام صاحبؒ کی ہے یا صاحبینؒ کی ؟ ازراہ کرم جواب مع حوالہ عنایت فرمائیں ۔

الجواب :۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیرات تشریق عرفہ کی صبح سے لے کر عید والے دن (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) کی عصر تک ہر اس شخص پر واجب ہیں جو فرض نماز جماعت سے ادا کرے اور صاحبین کے نزدیک عرفہ کی صبح سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہر اس عاقل بالغ مسلمان پر واجب ہیں جو فرض نماز پڑھے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، متاخرین فقہاء کرام نے صاحبینؒ کی رائے کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : قالا بوجوبه فور کل فرض مطلقاً ولو کان منفرداً او مسافراً او قرویاً لانه تبع للمکتوبة الی عصر الیوم الخامس آخر یوم التشریق وعلیه الاعتماد والعمل والفتویٰ فی عامة الامصار وکافة الاعصار ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۱۸۰ باب صلوٰۃ العیدین) [۲]

---

[۱] قال العلامه حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : وقالا ای ابویوسف ومحمد رحمھما اللہ یجب التکبیر فور کل فرض علی من صلاه ولو کان منفرداً او مسافراً او قرویاً لانه تبع للمکتوبة من فجر عرفة الی عقب عصر الیوم الخامس من یوم عرفة فیکون الی آخر ایام التشریق وبه ای بقولھما یعمل وعلیه الفتویٰ ۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۲۹۳ باب صلوٰۃ العیدین)

[۲] ایضاً (حوالہ مذکورہ بالا) (" " " " " " ")

ومثله فی البحر الرائق ج۲ ص۱۶۶ باب صلوٰۃ العیدین ۔

تکبیراتِ زوائد کے وقت ہاتھ باندھنا خلافِ سُنت ہے

سوال:۔ کیا تکبیراتِ زوائد کے وقت ہاتھوں کو زیرِ ناف باندھا جائے گا یا کہ چھوڑ دیا جائے گا؟

الجواب:۔ تکبیراتِ زوائد کہنے کے دوران ہاتھوں کو کھلا چھوڑنا مسنون ہے زیرِ ناف باندھنا خلافِ سنت ہے۔

لما قال العلامة ابراهیم الحلبیؒ: ویرفع یدیه عند کل تکبیرة منهن ویرسلهما فی اثنائهن ------ فاذا قام الی الرکعة الثانیة یبتدی بالقرأة ثم یکبر بعدها ثلث تکبیرات علیٰ هیئة تکبیرة الاولیٰ۔ (کبیری ص۵٦٧ باب صلوٰة العیدین)[1]

دو یا تین سو افراد پر مشتمل گاؤں میں نمازِ عید کا حکم

سوال:۔ جس گاؤں کی آبادی دو تین سو افراد پر مشتمل ہو تو کیا اُس گاؤں میں عید کی نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جمعہ کی طرح احناف کے ہاں عید کی نماز کے لیے بھی مصر یا قریۂ کبیرہ ہونا شرط ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ کے مطابق اس گاؤں پر مصر یا قریۂ کبیرہ کی تعریف صادق نہیں آتی اس لیے اس میں عید کی نماز جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وتقع فرضاً فی القصبات والقری الکبیرة التی فیها اسواق ...... وفیما ذکرنا اشارة الی انه لا تجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاض وامیر۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۱۳۸ باب الجمعة)[2]

---

[1] وفی الهندیة: ویرفع یدیه فی الزوائد ویسکت بین کل تکبیرتین مقدار ثلاث تسبیحات کذا فی التبیین وبه افتی مشائخنا ویرسل الیدین بین التکبیرتین ولا یضع هکذا فی الظهیریة۔ (الهندیة ج۱ ص۱۵۰ الفصل السابع عشر فی صلوٰة العیدین)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج۵ ص۲۲۸ مسائل نمازِ عیدین۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: لا تصح الجمعة الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر ولا تجوز فی القری لقوله علیه السلام لا جمعة ولا تشریق ولا فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع والمصر الجامع کل موضع له امیر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود۔ (الهدایة ج۱ ص۱۴۸ باب صلوٰة الجمعة)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج۵ ص۲۲۳ مسائل نمازِ عیدین۔

نمازِ عید کے لیے عید گاہ پیدل جانا سنت ہے

سوال:۔ نمازِ عید کے لیے عید گاہ پیدل جانا سُنت ہے یا سوار ہو کر جانا بہتر ہے ؟

الجواب:۔ کتبِ فقہ میں بتصریح یہ بات موجود ہے کہ نمازِ عید کے لیے عید گاہ پیدل جانا مسنون ہے البتہ اگر واپسی پر سوار ہو کر گھر آئے تو کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ثم خروجه .... ماشیاً الی الجبانة هی المصلی العام و الواجب مطلق التوجه ...... ولا بأس بعوده راکبا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۸۶ باب العیدین) [۱]

ایک ہی گاؤں میں دو عید گاہوں میں نمازِ عید کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں دو عید گاہیں ہیں جن میں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے، کیا دونوں عید گاہوں میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ ایک شہر یا گاؤں میں متعدد مقامات پر عید کی نماز ادا کرنا جائز ہے، اسلئے آپ کے گاؤں کی دونوں عید گاہوں میں نمازِ عید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة علاء الدین الحصکفیؒ : وتؤدی بمصر واحد بمواضع کثیرة اتفاقاً۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۱۷۶ باب العیدین) [۲]

ایامِ تشریق میں قضا نمازوں کے بعد تکبیراتِ تشریق پڑھنا

سوال:۔ ایک شخص ایامِ تشریق میں قضا نمازیں ادا کر رہا ہے تو کیا وہ ان قضا نمازوں کے بعد بھی تکبیراتِ تشریق پڑھے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس کی مختلف صورتیں لکھی ہیں: (۱) ایامِ تشریق

---

[۱] وفی الهندیة : والخروج الی المصلی ماشیا والرجوع فی طریق آخر کذا فی القنیة ولا بأس بالرکوب فی الجمعة والعیدین والمشی افضل فی حق من یقدر علیه کذا فی الظهیریة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۴۹ الباب السابع عشر فی صلوٰة العید)

ومثله فی مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۴۳۵ باب صلوٰة العیدین۔

[۲] وفی الهندیة : وتؤدی الجمعة فی مصر واحد فی مواضع کثیرة وهو قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ وهو الاصح۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۴۵ الباب السادس عشر فی صلوٰة الجمعة)

ومثله فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۵ ص۲۰۸ مسائل نمازِ عیدین۔

کے علاوہ ایام کی قضاء نمازیں ایام تشریق میں ادا کرے۔ (۲) ایام تشریق کی قضاء نمازیں غیر ایام تشریق میں قضاء کرے۔ (۳) ایک سال کے ایام تشریق کی قضاء نمازیں دوسرے سال قضاء کرے۔ (۴) ایک سال کے ایام تشریق کی قضاء نمازیں اسی سال کے ایام تشریق میں ادا کرے۔

ان جملہ صورتوں میں سے صرف اخیر صورت میں قضاء نمازوں کے بعد تکبیرات تشریق پڑھی جائیں گی باقی صورتوں میں نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: او قضی فیها منها من عامه لقیام وقته کالاضحیة۔ قال ابن عابدینؒ: تحته المسئلة رباعیة فائتة غیر العید قضاها فی ایام العید، فائتة ایام العید قضاها فی غیر ایام العید، فائتة ایام العید قضاها فی ایام العید عام آخر، فائتة ایام العید قضاها فی ایام العید من عامه ذلك لا یکبر الا فی الاخیر فقط۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۷۹ باب العیدین)[۱]

احناف کے نزدیک عیدین میں تکبیرات زوائد کی تعداد

سوال:- احناف کے ہاں عیدین کی نماز میں تکبیرات زوائد کی تعداد کتنی ہے؟

الجواب:- عیدین کی نماز میں تکبیرات زوائد کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چھ تکبیرات زائد ہیں یعنی ہر رکعت میں تین تکبیرات کہنی ہوں گی۔ یہی رائے عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے کبار صحابہؓ کی ہے، اور ایک روایت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویصلی الامام بهم رکعتین مثنیا قبل الزوائد وهی ثلاث تکبیرات فی کل رکعة۔ قال العلامة ابن عابدینؒ (تحت قوله ثلاث تکبیرات) هذا مذهب ابن مسعودؓ و کثیر من الصحابةؓ ورواية عن ابن عباسؓ وبه اخذ ائمتنا الثلاثة۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۷۲ باب العیدین، قبل مطلب.... الخ)[۲]

---

[۱] قال السید احمد الطحطاویؒ: تحت (قوله وقضی فیها) والمسئلة رباعیة فائتة غیر العید قضاها فی ایام العید فائتة ایام العید قضاها فی غیر ایام العید فائتة ایام العید قضاها فی ایام العیدین من عام آخر وفائتة ایام العید قضاها ایام العید من عامه ذلك ولا یکبر الا فی الاخیر فقط۔ (الطحطاوی حاشیة الدر المختار ج۱ ص۳۵۶ باب العیدین)

[۲] قال برهان الدین المرغینانیؒ: ویصلی الامام بالناس رکعتین یکبر فی الاولی للافتتاح وثلاثا بعدها ثم یقرأ الفاتحة وسورة ویکبر تکبیرة یرکع بها ثم یبتدی فی الرکعة الثانية بالقراءة ثم یکبر ثلاثا بعد ویکبر رابعة یرکع بها، وهذا قول ابن مسعودؓ وهو قولنا۔ اهـ قال بدر الدین العینیؒ (تحت قوله وهو قولنا) ای قول ابن مسعودؓ مذهبنا وهو مذهب جماعة من الصحابة والتابعین علی ما ذکرناه آنفا۔ (البنایة شرح الهدایة ج۳ ص۳۶۳، ۳۶۴ باب صلوٰة العیدین)

ومثله فی کبیری ص۵۶۹ باب صلوٰة العیدین۔

ساس کے پستانوں کو پکڑنے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے

سوال:- جناب مفتی صاحب! اگر داماد ساس کے پستانوں کو ہاتھوں سے پکڑ لے تو اس پر بیوی حرام ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اگر داماد نے بنظرِ شہوت ساس کے پستانوں کو بلا حائل ہاتھ لگایا یا حائل تھا مگر بہت باریک تھا جس کے ہوتے ہوئے بھی لذت حاصل ہو سکتی تھی تو اس شخص پر بیوی حرام ہو جائے گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:- وحرم اصل ممسوسۃ بشھوۃ ولو لشعر علی الرأس بحائل لا یمنع الحرارۃ...... وفروعھن مطلقاً والعبرۃ للشھوۃ عند المس۔ قال ابن عابدینؒ: تحت (قولہ بشھوۃ) ای ولو من احدھما (قولہ بحائل) ای لو بحائل...... فلو کان مانعاً لا تثبت الحرمۃ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۸۵ فصل فی المحرمات) [1]

حرمتِ مصاہرت کے اثبات کیلئے گواہوں کی تعداد

سوال:- حرمتِ مصاہرت کے اثبات کے لیے کتنے گواہوں کا ہونا ضروری ہے؟ جس کی وجہ سے بوقتِ انکار دعویٰ ثابت کیا جا سکے؟

الجواب:- زنا کے علاوہ دیگر حقوق اور دعاوی کے اثبات کے لیے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ ہونا ضروری ہے، لہٰذا حرمتِ مصاہرت بھی مذکورہ گواہوں کی گواہی سے ثابت کی جا سکتی ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:- ولغیرھا من الحقوق سواء کان الحق مالاً او غیرہ کنکاح وطلاق ووکالۃ...الخ۔ رجلان او رجل وامرأتان۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۵۱۴ کتاب الشھادۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: فاعلی الرأس کالبدن بخلاف المسترسل وانصرف اللمس الی ای موضع من البدن بغیر حائل واما اذا کان بحائل فان وصلت حرارۃ البدن الی یدہٖ تثبت الحرمۃ والا فلا۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۰ فصل فی المحرمات)

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ولغیرھا رجلان او رجل وامرأتان للاٰیۃ اطلقہ فشمل المال وغیرہ کالنکاح والطلاق والوکالۃ والوصیۃ والنسب۔ (البحر الرائق ج۷ ص۶۲ کتاب الشھادۃ)

مزنیہ کی بیٹی کا نکاح زانی کے بیٹے سے جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص اپنے ناجائز تعلقات والی عورت کی بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کا نکاح کرنا چاہتا ہے، تو کیا یہ نکاح جائز ہے جبکہ مزنیہ کی یہ بیٹی اپنے شوہر سے ہے؟

الجواب:۔ حرمتِ مصاہرت میں جانبین پر ایک دوسرے کے اصول وفروع حرام ہوجاتے ہیں، یہ حکم دوسروں تک متعدی نہیں ہوتا، صورتِ مرقومہ میں چونکہ زانی کے بیٹے اور مزنیہ کی بیٹی کے درمیان حرمت کا کوئی رشتہ نہیں اس لیے ان دونوں کا نکاح زانی اور مزنیہ کے ناجائز تعلقات کی وجہ سے متاثر نہیں ہوگا۔

وفی الهندية: لا بأس بان يتزوج الرجل امرأة ويتزوج ابنه ابنتها او امها كذا فی محيط السرخسی۔ (الفتاوی الهندية ج۱ ص۲۷۷ القسم الثانی فی المحرمات بالصهرية) [۱]

مزنیہ کی رضاعی بیٹی یا نواسی سے نکاح کرنا جائز نہیں

سوال:۔ کیا مزنیہ کی رضاعی بیٹی یا نواسی سے زانی کا نکاح کرلینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زنا چونکہ حرمتِ مصاہرت کا سبب ہے اور اس کی وجہ سے جانبین پر ایک دوسرے کے اصول وفروع حرام ہوجاتے ہیں چاہے وہ نسبی ہوں یا رضاعی! اسلیئے زانی کا مزنیہ کی رضاعی بیٹی یا نواسی وغیرہ سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: حرمت المرأة علی اصول الزانی وفروعه نسبًا ورضاعًا وحرمت اصولها وفروعها علی الزانی نسبًا ورضاعًا۔ (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۳۸۳ فصل فی المحرمات) [۲]

---

[۱] قال المرغینانیؒ: ويجوز ان يتزوج الرجل باخت اخيه من الرضاع لانه يجوز ان يتزوج باخت اخيه من النسب۔ (الهداية ج۲ ص۳۳۰ کتاب الرضاع) وَمِثْلُهٗ فی

[۲] قال العلامة ابوالبرکات النسفی رحمه الله: حرم تزوج امه وبنته وان بعدتا واخته وبنتها وبنت اخيه وعمته وخالته وام امرأته وبنتها ان دخل بها وامرأة ابيه وابنه وان بعدا والكل رضاعًا۔

(کنزالدقائق علی هامش البحرالرائق ج۳ ص۹۲ فصل فی المحرمات)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات۔

مزنیہ کی پوتی سے زانی کا نکاح جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص کے کسی عورت سے نا جائز تعلقات تھے جس میں لمس وتقبیل کے علاوہ زنا کا ارتکاب بھی ہو چکا ہے، اب یہ شخص اس عورت کی پوتی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب:۔ لمس وتقبیل اور زنا کے ارتکاب سے مزنیہ کے اصول وفروع زانی پر اور زانی کے اصول وفروع مزنیہ پر حرام ہو جاتے ہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں مزنیہ کی پوتی زانی کے لیے حرام ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: حرمۃ المرأۃ علی اصول الزانی وفروعہ نسباً ورضاعاً وحرمت اصولہا وفروعہا علی الزانی نسباً ورضاعاً۔

(الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۳۸۴ فصل فی المحرمات) [1]

منکوحہ کی ربیبہ بیٹی کے ساتھ زنا کرنے سے منکوحہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی منکوحہ کی بیٹی (جو کہ اُسکے پہلے شوہر سے ہے) کے ساتھ زنا کیا، تو کیا اس شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جائیگی یا نہیں؟

الجواب:۔ شوہر کا اپنی منکوحہ کی ربیبہ بیٹی سے زنا کرنا موجبِ حرمتِ مصاہرت ہے اس لیے اس شخص پر اُس کی بیوی حرام ہو جائے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال فی البحر اراد بحرمۃ المصاھرۃ المحرمات الاربع حرمت المرأۃ علی اصول الزانی وفروعہ نسباً ورضاعاً وحرمت اصولہا وفروعہا علی الزانی نسباً ورضاعاً۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۸۴ فصل فی المحرمات) [2]

---

[1] وفی الهندیۃ: فمن زنا بأمرأۃ حرمت علیہ امہا وان علت وابنتہا وان سفلت الخ

(الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۲۷۴ القسم الثانی فی المحرمات بالصہریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۳ ص۹۲ فصل فی المحرمات۔

[2] وفی الهندیۃ: فمن زنی بأمرأۃ حرمت علیہ امہا وان علت وابنتہا وان سفلت۔ الخ

(الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۲۷۴ القسم الثانی فی المحرمات بالصہریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۳ ص۹۲ فصل فی المحرمات۔

منکوحہ غیر مدخول بہا کی بیٹی کے ساتھ نکاح کا مسئلہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن ابھی تک دخول نہیں ہوا ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ اس عورت کی بیٹی جو کہ اسکے پہلے شوہر سے ہے کے ساتھ نکاح کرلے، تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مرقومہ میں منکوحہ عورت کی بیٹی اگرچہ محرمات میں داخل ہے مگر اس کی حرمت بشرط دخول کے ساتھ معلق ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں دخول نہیں ہوا ہے اس لیے یہ شخص اس عورت کو طلاق دینے اور عدت گذر جانے کے بعد اس کی بیٹی سے نکاح کرسکتا ہے۔

لقولہ تعالیٰ: وربائبکم التی فی حجورکم من نساءکم التی ان دخلتم بھن۔ (النساء ۲۳) [1]

بیٹے کی منکوحہ غیر مدخول بہا سے نکاح کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم نے اپنے ایک رشتہ دار کی ایک جگہ منگنی کی جس میں باقاعدہ طور پر نکاح بھی باندھا گیا، ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک حادثے میں انتقال کر گیا، اب اگر اس لڑکے کا باپ اس لڑکی سے نکاح کرنا چاہے تو شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ نہیں؟

الجواب:۔ جب گواہان شرعی کے سامنے ایک مرتبہ ایجاب وقبول بصورتِ نکاح صحیح ہو جائے تو یہ لڑکی اب شخص مذکور کے بیٹے کی منکوحہ ہے باپ کا اس کے ساتھ نکاح کرنا ناجائز اور حرام ہے چاہے بیٹے نے دخول کیا ہو یا نہیں اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ولا بامرأۃ ابنہ وبنی اولادہ لقولہ تعالیٰ: وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۸۸ فصل فی بیان المحرمات) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: وحرم بالمصاھرۃ بنت زوجۃ الموطوءۃ وام زوجتہ وجدتہا مطلقاً بمجرد العقد الصحیح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۳۸۲ فصل فی المحرمات)۔ ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۲۸۷ فصل فی بیان المحرمات۔

[2] قال ابن نجیمؒ: اما حلیلۃ الابن فبقولہ تعالیٰ: وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم۔ فاعتبرت الحلیلۃ من حلول الفراش وحل الازار تنا ولت الموطوءۃ بملک الیمین اوشبھۃ اوزنی فیحرم الکل علی الاباء۔۔۔۔ والفرض انہا بمجرد العقد تحرم علی الاباء۔ (البحر الرائق ج۳ ص۹۴ فصل فی المحرمات)

ومثلہ فی الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۲۶۸ فصل فی المحرمات۔

خُسر پر فقط دعویٰ زنا سے بیٹے پر اسکی بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال:۔ اگر کوئی عورت یہ دعویٰ کرے کہ میرے ساتھ میرے خُسر نے زنا کیا ہے جبکہ خُسر اس سے انکاری ہو تو کیا یہ عورت اس کے بیٹے کے لیے حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں عورت کا دعویٰ بغیر شہادتِ معتبرہ یا خُسر کے اقرار کے ثابت نہ ہوگا اور نہ صرف دعویٰ کرنے سے میاں بیوی کے درمیان حرمت ثابت ہوگی جب تک کہ شوہر اس امر کو قبول نہ کرے، بغیر تسلیم الزوج اقرار کی صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں، تاہم واقعتاً عورت کے ساتھ ایسا معاملہ ہو چکا ہو تو کسی مناسب طریقے سے جدائی اختیار کی جاسکتی ہے۔

وفی الہندیۃ: رجل تزوج امرأۃً علیٰ انہا عذراء فلما اراد وقاعہا وجدہا قد افتضت فقال لہا من افتضک فقالت ابوک ان صدقہا الزوج بانت منہ ولا مہر لہا وان کذبہا فھی امرأتہ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۷۶ القسم الثانی المحرمات بالصہریۃ)

مزنیہ کے اصول وفروع زانی پر حرام ہوجاتے ہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک مطلقہ سے عدتِ طلاق ختم ہونے سے پہلے ہی نکاح کرلیتا ہے، پھر اپنی فاسد منکوحہ سے جماع کے کچھ عرصہ بعد اپنی ساس سے زنا کا مرتکب ہوجاتا ہے، مطلقہ منکوحہ سے زید کے بچے بھی ہیں اور اب بھی اس کا زید سے حمل ہے، تو دونوں کے نکاح کا کیا حکم ہے؟ کیا دوبارہ کسی طریقہ سے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ زید اور موصوفہ کے درمیان نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، کوئی حیلہ یا طریقہ اس نکاح کے جواز کا نہیں۔

قال الحصکفیؒ: وحرم ایضاً بالصہریۃ اصل مزنیتہ واصل ممسوستہ بشہوۃ واصل ماستہ وناظرۃ الی ذکرہ ـــ الیٰ قولہ وفروعہن مطلقاً۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۳۰۳، ۳۰۴ فصل فی المحرمات)[۱]

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ومن زنی بامرأۃ حرمت علیہ امہا وبنتہا..... فیصیر اصولہا وفروعہا کاصولہ وفروعہ الخ۔ (الہدایۃ ج۲ ص۲۸۹ فصل فی بیان المحرمات)

وَ مِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۹۸ فصل فی المحرمات۔

خون دینے سے حرمتِ مصاہرت کا حکم

سوال :- اگر خاوند اور بیوی کے خون کا گروپ ایک ہو تو خاوند کا خون بیوی کو چڑھانے سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خاوند کا بیوی کو خون دینے سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوگی جیسے کوئی شخص کسی عورت کا دودھ پی لے تو باوجود اس فعل کے حرام ہونے کے ان کے درمیان حرمتِ مصاہرت ثابت نہ ہوگی حالانکہ وہ دودھ جزوِ بدن بنے گا۔

سالی کے ساتھ زنا کرنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال :- اگر زید اپنی بیوی کی بہن سے زبردستی زنا کرے تو کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے یا نہیں ؟

الجواب : سالی سے زبردستی زنا کرنے پر زید کی بیوی اس پر حرام نہیں ہوگی، البتہ سخت گنہگار ہوگا۔

قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ : وفی الفتاوی النسفی رجلٌ وطیٔ اُخت امرأته لاتحرم علیه امرأته اھ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۲ ص۵ کتاب النکاح الفصل الثانی فیمن یکون محلاً للنکاح وفیما لا یکون) لـه

لـه قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ : وفی الخلاصۃ وطی اخت امرأته لاتحرم علیه امرأته۔ قال ابن عابدینؒ (قوله فی الخلاصۃ) ھذا محترزاً لتقیید بالاصول والفروع وقوله لاتحرم ای لاتثبت حرمۃ المصاھرۃ فالمعنی لاتحرم حرمۃ مؤبدۃ والا فتحرم الی انقضاء عدۃ الموطؤۃ لوبشبھۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۳ ص۳۴ کتاب النکاح۔ فصل فی المحرمات)

ومثلهٗ فی فتاوی دارالعلوم دیوبند ج ۷ ص۳۴۴ کتاب النکاح۔ فصل فی حرمت مصاھرۃ۔

باب الحضانۃ

(چھوٹے بچوں کی پرورش کے مسائل)

چھوٹے بچوں کی پرورش کا حق ماں کو ہے

سوال:۔ ایک عورت خاوند کی وفات کے بعد اپنے والدین کے گھر چلی گئی اور اس کے چھوٹے بچوں پر دادا اور دادی نے قبضہ کیا ہوا ہے جو بچوں کو والدہ کے پاس جانے نہیں دیتے، ایسی حالت میں تربیت کا حق ماں کو حاصل ہے یا دادا دادی کو؟

الجواب:۔ از روئے شرع مرقومہ صورت میں بچوں کی تربیت کا حق والدہ کو حاصل ہے خواہ والدہ نکاح میں ہو یا میاں بیوی کے درمیان جدائی ہوگئی ہو، صورتِ مذکورہ میں جب بچوں کی والدہ انکی تربیت کے لیے بیتاب ہے تو باپ کے ورثاء کا بچوں کو اپنے پاس رکھ کر والدہ کے پاس نہ چھوڑنا ظلم وزیادتی کے مترادف ہے۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: تثبت للأمّ ولو بعد الفرقۃ الا ان تکون مُرتدّۃ۔

(تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۶۸۷ باب الحضانۃ) [1]

والدہ کے بعد تربیت کا حق نانی کو ہے

سوال:۔ ایک عورت کی وفات کے بعد اس کی چھوٹی بچی کی تربیت وپرورش کے بارے میں نانی اور دادی کے مابین تنازع پیدا ہوگیا ہے، ہر ایک بچی کی تربیت کرنے کا دعویدار ہے، ایسی حالت میں از روئے شرع کس کو تربیت کا حق پہنچتا ہے؟

الجواب:۔ از روئے شرع بچی کی پرورش کا حق ماں کے بعد اس کی نانی کو حاصل ہے، بالغ ہونے تک بچی نانی کے پاس رہے گی، بالغ ہونے کے بعد اس کی مرضی ہے کہ چاہے تو باپ کے گھر رہے یا نانی کے گھر، بشرطیکہ نانی کے گھر میں اس وقت اسکی عصمت

---

[1] وقال فی الھندیۃ:۔ احق الناس بحضانۃ الصغیر حال قیام النکاح او بعد الفرقۃ الأمّ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۵۴۱ الباب السادس عشر فی الحضانۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۶۷ باب الحضانۃ)

کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

لما قال فی الهندیة: وان لم یکن له أم تستحق الحضانة بان کانت غیر اهل للحضانة او متزوجة بغیر محرم او ماتت فأم الأم اولیٰ من کل واحدة۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۵۴۱ الباب السادس عشر فی الحضانۃ)[۱]

والد کی بجائے نانی پرورش کی زیادہ حقدار ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زوجہ کو طلاقِ ثلاثہ دے دی، مطلّقہ کے بطن سے ایک بچی ہے جو طلاق کے بعد اس کے پاس رہی اور باپ اس بچّی کا خرچہ دیتا رہا، کچھ عرصہ بعد مطلّقہ مذکورہ نے نکاح ثانی کر لیا، اب نانی کہتی ہے کہ بچّی کی پرورش کا مجھے حق ہے جبکہ باپ کہتا ہے کہ بچی میرے پاس رہے گی۔ از روئے شرع بچی کی پرورش کا کس کو حق پہنچتا ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مرقومہ کے مطابق مطلّقہ کا نکاح ثانی کر لینے سے اس کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے، لیکن والد کی بجائے بچّی کی تربیت کی نانی زیادہ حق دار ہے تاہم بچّی کے جملہ اخراجات باپ کے ذمہ ہوں گے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: ثم ای بعد الأمّ أمّ الأمّ۔

(تنویر الابصار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۹۲ باب الحضانۃ)[۲]

لڑکی کے حقِ پرورش کی مُدت

سوال:۔ اگر ایک بچی کی تربیت اس کی والدہ کے ذمہ ہو تو والدہ کو کتنی مُدت تک یہ حق حاصل ہے؟ کیا والدہ کو بچی اپنے ساتھ لے جانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

---

[۱] وقال العلامة الحصکفیؒ: (ثم) ای بعد الأمّ بان ماتت او لم تقبل او سقطت حقها او تزوجت بأجنبی (أمّ الأمّ)۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المختار ج۲ ص۶۹۲ باب الحضانۃ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۶۷ باب الحضانة

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ثمّ أمّ الام ای بعد الام۔

(البحر الرائق ج۴ ص۱۶۷ باب الحضانۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۱ الباب السادس عشر فی الحضانة۔

الجواب:۔ بچی کے بالغ ہونے تک والدہ اُسے اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس دوران اُس کو بچی کی تربیت کا حق حاصل ہے، جب تک حق تربیت کے اسقاط کے اسباب موجود نہ ہوں تو والد اس بچی کو والدہ سے نہیں لے جا سکتا، البتہ بالغ ہونے کے بعد بچی اپنی مرضی سے والدین میں سے جس کے پاس رہنا چاہے رہ سکتی ہے ۔

لما ذکر علاؤ الدین الحصکفیؒ: والأم والجدۃ احق بھا حتی تحیض وغیرھما احق بھا حتی تشتھی وقدر بتسع وبه یفتی ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۶۹۵ باب الحضانۃ) [۱]

بیوہ کا نکاح ثانی کرنے سے شیر خوار بچی کی تربیت کا مسئلہ

سوال:۔ ایک بیوہ عورت نے جب نکاح ثانی کیا تو اس کی گود میں چار ماہ کی شیر خوار بچی بھی تھی، نکاح کے وقت طرفین میں سے کسی نے بھی بچی کی تربیت کے استحقاق کا مسئلہ نہیں چھیڑا تھا، اب جبکہ بچی سات سال کی ہو گئی ہے تو اس کے عصبہ (ورثاء) واپسی کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس بچی کو عصبہ واپس لے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ بچی کا سوتیلا باپ اس کی تربیت اور اخراجات کے تکفل کے لیے تیار ہے؟

الجواب:۔ جب خاوند ربیبہ کے اخراجات اور تربیت کی تبرعاً ذمہ داری قبول کرتا ہو تو ظاہر ہے کہ ماں کے پاس رہنے سے بچی کو جو سکون و اطمینان حاصل ہوگا وہ عصبہ (یعنی ورثاء) کے پاس ممکن نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ بچی والدہ کے پاس رہے اور ورثاء کے پاس نہ جائے ۔

قال الحصکفیؒ: وفی الحاوی تزوجت باجنبی وطلبت تربیته بنفقته والتزمه ابن عمه مجاناً ولا حاضنة له فله ذلك ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۶۹۰ باب الحضانۃ) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیم المصریؒ: وقدرہ ابو اللیث بتسع سنین وعلیه الفتویٰ ۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۷۰ باب الحضانۃ)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۱ ص۵۴۲ الباب السادس عشر فی الحضانة ۔

[۲] قال ابن نجیم المصریؒ: والصحیح انه یقال للوالدۃ اما ان تمسکی الولد بغیر اجر واما ان تدفعیه الی العمة ۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۰۴ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۱ ص۵۴۳ الباب السادس عشر فی الحضانة ۔

سوال:۔ ایک | **بیوہ کا کسی غیر محرم سے نکاح کرنے سے حق تربیت کا ساقط ہونا**

بیوہ نے عدّت گذارنے کے بعد کسی ایسے شخص سے نکاح کر لیا جو اس کے سابقہ خاوند کی بچی کا رشتہ دار نہیں بلکہ اجنبی ہے اور وہ بیوہ کی بچّی کو اپنے پاس رکھنے اور تربیّت کرنے پر کبیدہ خاطر بھی ہے لیکن عورت استحقاقِ تربیت کا دعویٰ کر کے اس پر مُصر ہے کہ بچی میرے پاس رہے گی، کیا یہ عورت بچی کو اپنے پاس رکھنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بچی کے غیر محرم کے ساتھ نکاح کرنے سے والدہ کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں حق حضانت بچی کی نانی کو حاصل ہے ۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: یسقط حقھا بنکاح غیر محرمہ۔

(تنویر الابصار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۹۴ باب الحضانۃ) [۱]

سوال:۔ ایک | **اخلاقی حالت اور کردار متاثر ہونے کی صورت میں والدہ کا حق تربیّت ساقط ہو جاتا ہے**

بچی ماں کی گود میں پل رہی ہے، اگرچہ شرعًا اور عُرفًا والدہ کو تربیّت کا حق زیادہ حاصل ہے اور والدہ اپنی بچی کی جو تربیّت کر سکتی ہے وہ کسی دُوسرے کے ہاں مشکل ہے لیکن اسکے باوجود والدہ کی اخلاقی حالت اور کردار مخدوش ہے، اب اگر بچی کو والدہ کے پاس رہنے دیا جائے تو ڈر ہے کہ وہ والدہ کی تربیّت سے متاثر ہو کر بے راہروی کا شکار نہ ہو جائے، تو کیا اس حالت میں والدہ کا حق تربیّت ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ازرُوئے شرع بچّی کی دینی تربیت اور کردار کے تحفظ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن جب والدہ کے فسق و فجور کی وجہ سے بچی کے بے دین اور بے راہروی کا شکار ہونے کا خدشہ ہو اور اخلاقی تربیت کے تحفظ کے سقوط کا قوی احتمال ہو تو اصحابِ تربیت کو چاہیئے کہ جہاں کہیں اسکی زندگی، اخلاق اور عصمت و عفت کے تحفّظ کی ضمانت پائی جاتی ہو وہاں اس کی تربیّت کا انتظام کریں۔

لما قال التمرتاشیؒ: تثبت للأم ولو بعد الفرقۃ الاّ ان تکون مرتدۃ او فاجرۃ او غیر مأمونۃ۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۸۶ باب الحضانۃ) [۲]

---

[۱] وقال الشیخ ابی البرکات عبد اللہ بن احمد النسفیؒ: ومن نکحت غیر محرم سقط حقھا۔ (کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج۴ ص۱۶۸ باب الحضانۃ) ـــ وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۴ ص۱۸۵ باب الولد من احق بہ ۔

[۲] وفی الھندیۃ: احق الناس بحضانۃ الصغیر حال قیام النکاح او بعد الفرقۃ الأم الاّ ان تکون مرتدۃ او فاجرۃ غیر مأمونۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۵۴۱ الباب السادس عشر فی الحضانۃ) ـــ وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۶۸ باب الحضانۃ۔

ولدالزنا کی حضانت (پرورش) کس کے ذمہ ہے

سوال:۔ جو بچہ ناجائز حمل سے پیدا ہوا اس کی پرورش کا ذمہ دار کون ہے؟ زانی یا مزنیہ (بچے کی ماں)؟

الجواب:۔ جس بچے کا باپ معلوم نہ ہو اس کی نسبت ماں کی طرف ہوتی ہے، لہٰذا اس کی پرورش کی ذمہ داری بھی ماں پر ہی ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: الحضانۃ تثبت للأم النسبیۃ۔

(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۶۸۸ باب الحضانۃ) [1]

عورت کو بچہ دارالحرب لے جانے کا حق نہیں

سوال:۔ ایک شخص یہاں سے جاپان چلا گیا اور وہاں اس نے ایک عورت سے شادی کر لی، کئی سال کے بعد واپس پاکستان آ گیا اور یہیں رہنے لگا اور کچھ عرصہ بعد گھریلو ناچاکی کی وجہ سے طلاق تک نوبت پہنچ گئی اور اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اس شخص کا اس عورت سے ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے جسے اب وہ عورت اپنے ساتھ جاپان لے جانا چاہتی ہے جبکہ یہ شخص بچے کو اس کے ساتھ جاپان نہیں دیتا، تو کیا اس عورت کو بچہ لے جانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حضانت میں یہ ضروری ہے کہ بچہ زوجین میں سے کسی ایک کے گھر میں پرورش پائے مگر دارالحرب اس حکم سے مستثنیٰ ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں یہ عورت اس بچے کو شرعاً اپنے ساتھ جاپان نہیں لے جا سکتی بلکہ بچے کی تربیت پاکستان میں رہ کر ہی کرے گی۔

لما فی الھندیۃ: لیس للمرأۃ ان تنقل ولدہ الی دار الحرب وان کان تزوجھا ھناک وکانت حربیۃ بعد ان یکون زوجھا مسلما او ذمیا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۵۴۵ الباب السادس عشر فی الحضانۃ)

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: اذا وقعت الفرقۃ بین الزوجین فالأم احق بالولد۔

(الھدایۃ ج۲ ص۴۱۳ باب حضانۃ الولد ومن احق بہ)

ومثلہ فی فتاوی دارالعلوم دیوبند ج۱۱ ص۹۱ باب الحضانۃ۔

باب الولیمۃ
(ولیمہ کے مسائل و احکام)

ولیمہ کی شرعی حیثیت

سوال: جناب مفتی صاحب! شریعتِ مقدسہ میں ولیمہ کی حیثیت واجب کی ہے یا سُنت کی؟

الجواب: دعوتِ ولیمہ کرنا سنت ہے، جناب نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا قول و فعل اس پر دال ہے تاہم واجب نہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

فخرج إلى السُّوق فباع واشترى فاصاب شيئًا من أقط وسمن فتزوج فقال النبي صلى الله عليه وسلم أولم ولو بشاة ۔ (الصحيح البخاري ج۲ ص۷۷۷ باب من أولم على بعض نسائه)

وعن انسؓ وعنه قال ما أولم رسول الله صلى الله عليه وسلم على أحد من نسائه ما أولم على زينب أولم بشاة ۔ (مشكوٰة ج۲ ص۲۷۸ باب الوليمة) لہ

دعوتِ ولیمہ کا مسنون وقت

سوال: دعوتِ ولیمہ کا مسنون وقت کون سا ہے؟ شادی کے بعد یا پہلے؟

الجواب: دعوتِ ولیمہ کا مسنون وقت دُلہن کو گھر لانے کے بعد کا ہے، خلوتِ صحیحہ اور دخول کے بعد دعوت کھلانا مسنون ولیمہ ہے، تاہم دُلہن کو گھر لانے سے قبل کھلایا جانے والا طعام مسنون ولیمہ نہیں بلکہ عام دعوت کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے قربانی کے جانور کو قربانی کے وقت سے پہلے ذبح کیا جائے تو قربانی نہیں ہوگی تاہم اس کا کھانا جائز ہے۔

قال في الهندية: ووليمة العرس سُنة وفيها مثوبة عظيمة وهي إذا بنى الرجل بامرأته ينبغي أن يدعوا الجيران والاقرباء والاصدقاء ويذبح

لہ قال في الهندية: ووليمة العرس سنة وفيها مثوبة عظيمة ۔
(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۴۳ الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات)
ومِثلُهٗ في اعلاء السنن ج۱۱ ص۱ باب استحباب الوليمة ۔

لهم وليصنع لهم طعاماً۔ (الفتاوی الهندیه ج۵ ص۳۴۳ الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات) [1]

دعوتِ ولیمہ میں غیر شرعی امور کے ارتکاب کی وجہ سے شرکت نہ کرنا

سوال:۔ جس دعوتِ ولیمہ میں غیر شرعی امور کا ارتکاب کیا جا رہا ہو اُس میں شرکت کرنی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس دعوتِ ولیمہ وغیرہ میں غیر شرعی امور کا ارتکاب کیا جا رہا ہو اور یہ بات پہلے سے معلوم ہو تو اس میں شرکت جائز نہیں اور اگر چلے جانے کے بعد معلوم ہوا تو اگر دسترخوان کے پاس نہ ہو عالم اور مقتدا ہونے کی صورت میں واپس آجائے اور اگر عوام الناس میں سے ہے تو ٹھہر جانے میں بھی گنجائش ہے، اور اگر غیر شرعی امور کا ارتکاب دسترخوان کے قریب ہو رہا ہو تو پھر واپس ہو جانا ضروری ہے چاہے عوام الناس میں سے کیوں نہ ہو۔

قال المرغینانیؒ: ومن دعی الی ولیمة او طعام فوجد ثمه لعباً او غناء فلا بأس بأن یقعد ویأکل۔ قال ابوحنیفةؒ ابتلیت بهذا مرة فصبرت وهذا لأن إجابة الدعوة سنة۔ قال علیه السلام من لم یجب الدعوة فقد عصی أبا القاسم فلا یترکها لما اقترنت به من البدعة من غیره کصلوٰة الجنازة واجبة الإقامة وإن حضرتها نیاحة فان قدر علی المنع منعهم وان لم یقدر یصبر وهذا إذا لم یکن مقتدی فان کان ولم یقدر علی منعهم یخرج ولا یقعد لأن فی ذلك شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین والمحکی عن ابی حنیفةؒ فی الکتاب کان قبل أن یصیر مقتدی ولو کان ذلك علی المائدة لا ینبغی أن یقعد وإن لم یکن مقتدی لقوله تعالیٰ: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ هذا کله بعد الحضور، ولو علم قبل الحضور لا یحضر لأنه لم یلزمه حق الدعوة بخلاف ما إذا هجم علیه لأنه قد لزمه۔ (الهدایة ج۴ ص۴۵۵ کتاب الکراهیة) [2]

---

[1] عن انس رضی الله عنه قال اصبح النبی صلی الله علیه وسلم بها بزینب ابنة جحشؓ عروساً فدعا القوم فاصابوا من الطعام ثم خرجوا وبقی رهط۔ (الصحیح البخاری ج۲ ص۷۷۶)۔ وقال الشیخ العثمانیؒ: نقلاً عن فتح الباری وحدیث أنس فی هذا الباب صریح أنها ای الولیمة بعد الدخول لقوله فیه أصبح عروساً بزینبؓ فدعا القوم۔ (اعلاء السنن ج۱۱ ص۱۱)

[2] قال الطوریؒ: وان کان ذلك علی المائدة فلا یقعد وان کان هناك لعب وغناء قبل ان یحضر فلا یحضر لانه لا یلزمه الاجابة اذا کان هناك منکر لما روی عن علیؓ قال صنعت للنبی صلی الله علیه وسلم طعاماً فدعوته له فحضر فرأی فی البیت تصاویر فرجع۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۸ کتاب الکراهیة)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۸ کتاب الاستحسان۔

لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا ولیمہ شمار نہیں ہوگا

سوال:- لڑکی والوں کی طرف سے رخصتی سے پہلے مہمانوں (برات) کو جو کھانا کھلایا جاتا ہے کیا وہ ولیمہ میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:- لڑکی والوں کی طرف سے رخصتی سے پہلے مہمانوں (برات) کو کھانا کھلانا ولیمہ میں داخل نہیں، ولیمہ اس طعام کو کہتے ہیں جو شادی کے بعد خاوند کی طرف سے کھلایا جاتا ہے۔

قال فی الهندیة: ووليمة العرس سنة وفيها مثوبة عظيمة وهي إذا بنى الرجل بإمرأته أن يدعوا الجيران والاقرباء والاصدقاء ويذبح لهم ويصنع لهم طعامًا۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۴۳ الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات) [۱]

ولیمہ کئی دن تک کرنا جائز ہے

سوال:- جناب مفتی صاحب! ولیمہ صرف ایک دن ہی ہونا چاہیئے یا ایک دن سے زیادہ بھی کرنا جائز ہے؟

الجواب:- ولیمہ اُس دعوت کو کہا جاتا ہے جو شادی کے بعد دی جاتی ہے شریعت نے اس کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں کیا بلکہ اس دعوت کو شادی کرنے والے کی استطاعت پر چھوڑا گیا ہے، اگر وہ ایک دن سے زیادہ یہ دعوت کرنا چاہتا ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لما فی الحدیث: عن انسٍ رضی الله عنه قال تزوّج النبیّ صلّی الله علیه وسلّم صفیةؓ وجعل عتقها صداقها وجعل الولیمة ثلاثة ایّام۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص۱۳ باب جواز الولیمة الی ایام ان لم یکن فخرًا) [۲]

---

[۱] عن انس رضی الله عنه قال ما رأیت النّبی صلی الله علیه وسلّم أولم علی أحد من نساءه ما أولم علی زینب أولم بشاةٍ۔ (مشکوٰة المصابیح ج ۲ ص۲۷۸ باب الولیمة۔

وَمِثْلُهٗ فی اعلاء السنن ج۱۱ ص۱ باب استحباب الولیمة۔

[۲] عن حفصة بنت سیرین قالت لما تزوّج ابی دعا الصّحابة سبعة ایام فلمّا کان یوم الانصار دعا ابی بن کعب وزید بن ثابت وغیرهما فکان ابی صائمًا فلما طعموا دعا ابی واثنی۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص۱۳ باب جواز الولیمة الی ایام ان لم یکن فخرًا)

منگنی کے موقعہ پر مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ تقریب نکاح میں جس کو عرف میں (کوجلان) کہتے ہیں، سوائے کھجور یا مٹھائی کے دیگر خوردنی اشیاء کھانا ناجائز ہے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھجور یا مٹھائی ہیں ہے، اور دلیل میں یہ آیات کریمہ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (   ) وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ (   ) جبکہ عمرو کہتا ہے کہ چونکہ کھجور یا مٹھائی بھی ایک نوع خوراک ہے اس لیے کھانا پینا ہر قسم خوراک کا عقد خطبہ کے بعد جائز ہے اور دلیل میں آیت کریمہ ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (   ) پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حرمت کے لیے اس پر دلیل ہونا چاہیئے، نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کھانے پینے سے منع نہیں فرمایا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے؟

الجواب:۔ مجلس نکاح میں اشیاء خوردنی کی تقسیم خواہ وہ اشیاء از قسم کھجور یا مٹھائی ہوں یا دوسری چیزیں، نہ فرض ہے نہ واجب اور نہ سنت مؤکدہ کے قبیل سے ہے، کیونکہ صحیح روایات میں بوقت نکاح ان چیزوں کی تقسیم کا ذکر نہیں آیا ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے نہ آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے صحابہؓ نے اس پر مواظبت کے طور پر عمل فرمایا ہے، لہٰذا اگر اس عمل کو لازم یا سنت سمجھ کر اگر کیا جائے تو ناجائز ہوگا لیکن اگر بوقت نکاح اشیاء خوردنی کی تقسیم اس غرض سے کی جائے کہ چونکہ یہ ایک مبارک مجلس اور نیک تقریب ہے جس میں مسلمان مرد اور عورت کے درمیان عقد نکاح کیا گیا ہے جو ایک عبادت بھی ہے اور خدا کی طرف سے ایک نعمت بھی، لہٰذا اس موقعہ پر شکرانے کے طور پر یا فریقین میں سے ایک فریق اس نیت سے کھانا کھلانے کا انتظام کردے کہ آپس میں محبت بڑھے اور دوستی مضبوط ہوجائے تو ایسا کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور کچھ بعید نہیں کہ تالیف قلوب کی نیت سے کیا گیا یہ عمل اجر وثواب کا ذریعہ بن جائے، کیونکہ شریعت نے ہر اس عمل کی ہمیں ترغیب دی ہے جس کی وجہ سے آپس میں باہمی محبت بڑھتی ہو اور دینی تعلقات مضبوط ہوتے ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اطعموا الطعام وافشوا السلام الخ اور فرمایا کہ تہادوا تحابوا (الحدیث) اس کے علاوہ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بعض دفعہ اشیاء خوردنی مجالس نکاح میں کھائی بھی گئی ہیں۔ چنانچہ بیہقی، اوسط اور معجم میں مروی

مروی ہے: ان النبی علیہ السلام حضر فی املاك ای عقد نکاح فاتی باطباق علیہا جوز ولوز وتمر فنشرت فقبضنا ایدینا فقال رسول اللہ صلعم مالکم لا تاخذون فقالوا انك نہیت عن النہبیٰ فقال انما نہیتکم عن فہی العساکر خذ واعلیٰ اسم اللہ الخ (مجموعۃ الفتاوٰی ج۱ ص۴۴۶)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا واقعہ (جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شاہِ حبشہ نجاشی کے واسطہ سے ہو چکا تھا) طبقات ابن سعد سے نقل کر کے لکھتے ہیں: ثم بعد الفراغ من النکاح ارادوا ان یقوموا فقال اجلسوا فان سنۃ الانبیاء اذا تزوجوا ان یؤکل طعام علی التزویج ندعیٰ بطعام فاکلوا ثم تفرقوا. انتہیٰ (مجموعۃ الفتاوٰی ج۱ ص۴۴۶)

چونکہ ان دونوں روایتوں کی سندیں ضعیف ہیں لہٰذا ان سے سنیت، وجوب یا فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی، البتہ اباحت وجواز ثابت ہوسکتا ہے۔

بہرحال اگر ان چیزوں کا ثبوت عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہؓ میں صحیح احادیث اور معتبر روایات سے نہ بھی ملتا ہو تب بھی اس کو ناجائز اور حرام نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ عمل امورِ مباح میں شمار ہوگا بشرطیکہ اس میں کسی ناجائز کام کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ مثلاً کھانے کی یہ چیزیں یا طعام لڑکے یا لڑکی والوں نے بطیبِ خاطر تیار کیا ہو اور ان پر کسی قسم کا جبر نہ کیا گیا ہو، نہ وہ اس پر ناراض ہوں اور اس کو لازم اور سنت بھی نہ سمجھا جاتا ہو بلکہ ایسا صرف باہمی محبت ومودت کے استحکام کے لیے کیا گیا ہو تو ایسی حالت میں یہ ایک قسم کی ضیافت ہوگی جس کو کسی طرح بھی ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (فقط واللہ اعلم)

کتاب الجنائز

(جنازے کے مسائل و احکام)

نماز جنازہ کا حکم

سوال: کسی مسلمان کے فوت ہوجانے پر جنازہ کے بارے میں زندہ مسلمانوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اور یہ ذمہ داری کون کون لوگ نباہ سکتے ہیں؟

الجواب: احادیث کی رُو سے فوت ہوجانے والے مسلمان کی نماز جنازہ تمام اہلِ اسلام پر فرض کفایہ ہے یعنی بعض مسلمانوں کی ادائیگی سے باقی لوگوں کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے، البتہ اگر تمام لوگ اجتماعی طور پر نماز جنازہ چھوڑ دیں تو تمام لوگ گنہگار رہوں گے۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: والاجماع منعقد علیٰ فرضیتها ایضاً إلّا انها فرض کفایة اذا قام به البعض یسقط عن الباقین ... الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۳۱۱ فصل الکلام فی صلوٰة الجنازة)[۱]

بغیر نیّت کے نماز جنازہ کا کوئی اعتبار نہیں

سوال: نماز جنازہ میں کھڑے ہوتے وقت نیّت اگر بھول کر چھوڑ دی جائے تو اس طرح جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: دیگر نمازوں کی طرح نمازِ جنازہ میں بھی نیّت ضروری ہے لہٰذا بلانیت پڑھی ہوئی نماز جنازہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: اما ما تصح به فکل ما یعتبر شرطاً لصحة سائر الصلوات من الطهارة الحقیقیة والحُکمیة واستقبال القبلة وستر العورة والنیة یعتبر شرطاً لصحتها۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۳۱۵ فصل بیان ما تصح به وما یفسدہ)[۲]

---

[۱] وفی الهندیة: الصلوٰة علی الجنازة فرض کفایة اذا قام به البعض واحداً کان او جماعة ذکراً کان او انثیٰ سقط عن الباقین واذا ترك الکل اثموا۔ هکذا فی التاتارخانیة۔ (ج ۱ ص ۱۶۲ الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۷۹ فصل السلطان احق بصلوٰته۔

[۲] وقال العلامة ابن عابدینؒ: واما الشروط التی ترجع الی المصلی فهی شروط بقیة الصلوٰة من الطهارة الحقیقیة بدناً وثوباً ومکاناً والحکمیة وستر العورة والاستقبال والنیّة... الخ

(رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۲ مطلب فی صلوٰة الجنازة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۶۴ الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیّت۔

نمازِ جنازہ کے لیے طہارتِ مکان ضروری ہے

سوال:۔ نمازِ جنازہ کے لیے جس جگہ صفیں بنائی جاتی ہیں کیا اس کا پاک ہونا ضروری ہے؟ یا بغیر کسی امتیازِ طہارت و نجاست مکان کا استعمال جائز ہے؟

الجواب:۔ نمازِ جنازہ کے لیے جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے، لہٰذا ناپاک جگہ پر نمازِ جنازہ کی صفیں کھڑی ہو کر اگر نمازِ جنازہ ادا کی جائے تو وہ صحیح نہیں ہوگی، جیسا کہ بلا طہارت جنازہ کو اعتبار نہیں دیا جاتا۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: اما ماتصح به فکل مایعتبر شرطاً لصحة سائر الصلوات من الطهارة الحقیقیة والحکمیة الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۱۵ فصل بیان ماتصح به ومایفسد) لہ

ولد الزنا کا جنازہ

سوال:۔ اگر کوئی بچہ کسی غیر شرعی ذریعہ یعنی زنا سے پیدا ہو تو ایسے بچے کے مرنے کی صورت میں اس کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زنا کی قباحت کی نسبت بچے کی والدہ اور زانی کی طرف کی جاتی ہے، خود بچہ ایسے جرائم میں بری الذمہ متصور ہوتا ہے، لہٰذا اس کی معصومیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں پر ایسے بچہ کے مرنے کی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھنا ضروری ہے۔ اگر غور کیا جائے تو خود زانی اور مزنیہ کے اس شنیع فعل کے ارتکاب کے باوجود ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی تو پھر اس بچے کا جنازہ تو بطریقِ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوا خلف کل بر وفاجر وصلوا علیٰ کل بر وفاجر۔ (کنز العمال ج ۶ ص۵۴ حدیث ۱۲۱۱۵) لہ۲

لہ قال العلامة ابن العابدینؒ: واما الشروط التی ترجع الی المصلّی فهی شروط بقیة الصلوٰة من الطهارة الحقیقیة بدناً وثوباً ومکاناً ...... الخ (رد المحتار ج ۱ ص۶۴۲ مطلب فی صلوٰة الجنازة)

وَمِثْلُهٗ فِی الهندیة ج ۱ ص۱۶۴ الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت۔

لہ۲ وفی الهندیة: ویصلّی علیٰ مسلم مات بعد الولادة صغیراً کان او کبیراً ذکراً کان او انثیٰ ... الخ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۶۳ الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۲۱۰ باب الجنائز۔

جنازہ نہ پڑھانے کی صورت میں ماخوذ کون ہوگا؟ | سوال :- ایک مسلمان اگر بلا جنازہ دفنایا گیا تو اس کا گناہ کس پہ ہوگا؟ کیا مرنے والا مسلمان گنہگار ہوگا یا یہ پسماندگان کی ذمہ داری ہے؟

الجواب :- جو شخص شرعاً مستحق جنازہ ہو تو اس کا جنازہ پڑھنا تمام مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے، لہٰذا جو مسلمان بلا جنازہ دفن کیا گیا تو وہ مسلمان جو جنازہ پڑھنے کی قدرت رکھنے کے باوجود جنازہ نہ پڑھ سکے گنہگار ہوں گے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : ومن صفتها انها فرض كفاية اذا قام بها البعض وفي شرح الملتقى واحد كان اوجماعة ذكرًا كان او انثىٰ سقط عن الباقين واذا ترك كلهم اثموا ۔ (التاتارخانية ج ۲ ص۱۵۴ باب صلاة الجنازة ۔ نوع اخر من هذا الفصل في الصلوٰة على الجنازة) [1]

جنازہ پڑھانے کا زیادہ حق دار کون ہے؟ | سوال :- جنازہ پڑھانے کے لیے سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ کیا فرض نماز کی طرح جنازہ پڑھانے کیلئے بھی اہلیت کا اعتبار کیا جائے گا یا اس کا حکم الگ ہے؟

الجواب :- نماز جنازہ پڑھانے کا سب سے زیادہ حقدار حاکم وقت ہے بشرطیکہ وہ پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور اگر حاکم وقت نہ ہو تو علاقہ کے قاضی کو پڑھانے کا موقع دیا جائے گا ورنہ پھر محلہ کا امام جنازہ پڑھائے، ورنہ قرابتداروں میں سے کوئی قریبی رشتہ دار جنازہ پڑھانے کا حقدار ہے۔

لما في الهندية : اولى الناس بالصلوٰة عليه السلطان ان حضر فان لم يحضر فالقاضي ثم امام الحي ثم الولي ۔ (الهندية ج ۱ ص۱۶۳ الفصل الخامس في الصلوٰة على الميت) [2]

---

[1] وفي الهندية : الصلوٰة على الجنازة فرض كفاية إذا قام به البعض واحدًا كان اوجماعة ذكرًا كان او انثىٰ سقط عن الباقين واذا ترك الكل اثموا ۔ (الهندية ج ۱ ص۱۶۲ الفصل الخامس في الصلوٰة على الميت)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۲ ص۱۷۹ فصل في الصلوٰة على الميت ۔

[2] وقال علاؤ الدين الكاسانيؒ : وروى الحسن عن ابي حنيفةؒ ان الامام الاعظم احق بالصلوٰة ان حضر فان لم يحضر فامير المصر وان لم يحضر فامام الحي فان لم يحضر فالاقرب من ذوي قرابته وهٰذا هو حاصل المذهب عندنا ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۱۶)

وَمِثْلُهٗ في كبيری ص۵۸۴ باب الجنائز ۔

اگر مرد موجود نہ ہوں تو خواتین نماز جنازہ پڑھا سکتی ہیں

سوال:۔ اگر نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کوئی مرد حاضر نہ ہو تو کیا خواتین جنازہ پڑھا سکتی ہیں یا نہیں؟ نیز ان کی جنازہ پڑھانے کی کیا کیفیت ہوگی؟

الجواب:۔ جنازہ میں تبعاً عورتیں حاضر ہو سکتی ہیں، یہاں تک کہ جنازہ میں محاذات بھی مفسد نہیں البتہ اگر کہیں مرد نہ ہوں تو خواتین یہ حق ادا کر سکتی ہیں۔ اس حالت میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ عورتیں بلا جماعت انفراداً بیک وقت نماز جنازہ پڑھیں، البتہ اگر جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ارادہ ہو تو پھر امامت کرنے والی عورت درمیان میں رہے گی۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ، واذا صلین النساء جماعۃ علی جنازۃ قامت الامامۃ وسطھن کماقی الصلوٰۃ المفروضۃ المعھودۃ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۴ فصل بیان کیفیۃ الصلوٰۃ علی المیت)[1]

مُردے کا جنازہ کتنے دنوں تک جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی مسلمان کسی وجہ سے بغیر جنازہ کے دفنایا گیا تو اس کی قبر پر کتنے دنوں تک جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب تک اعضاء سالم ہوں اُس وقت تک قبر پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اس میں مدت کا کوئی تعین نہیں بلکہ زمین کی حرارت اور برودت کی وجہ سے جسد کے گلنے اور سڑنے میں تفاوت یقینی ہے۔ اس لیے غلبہ ظن کا اعتبار کر کے جب تک یقین ہو کہ جسم محفوظ ہوگا تو اس پر جنازہ پڑھا جائے گا۔

قال برھان الدین الفرغانیؒ: وان دفن المیت ولم یصلّ علیہ صلی علی قبرہ...الخ (الھدایۃ ج۱ ص۱۸۰ فصل فی الصلوٰۃ علی المیت)[2]

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ولوامت امرأۃ فیھا تأدت الصلوٰۃ......الخ (البحرالرائق ج۲ ص۱۸۰ فصل فی الصلوٰۃ علی المیت)
وَمِثْلُہٗ فی الصغیری ص۳۰۰ کتاب الجنائز۔

[2] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: ولو دفن بعد الغسل قبل الصلوٰۃ علیہ صلی علیہ فی القبر مالم یعلم انہٗ تفرق... الخ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۵ فصل فی بیان ما تصح بہٖ وما تفسد)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۶۵ الفصل الخامس فی الصلوٰۃ علی المیت۔

مُرتد کا جنازہ نہیں پڑھایا جائے گا

سوال:۔ اگر کوئی شخص علماء کرام کو محض اس وجہ سے گالی دے کہ یہ لوگ دینِ اسلام کے پاسبان ہیں، اس کے علاوہ علماء کی تشبیہ بدترین حیوانات سے دیتا ہو، حدیث کا منکر ہو اور اس کو عجمی سازش کہہ کر قرآنی آیات کی من مانی تاویل کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہو، ایسے شخص کی موت کے بعد اس کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسے عقائد رکھنے والا شخص کافر اور مُرتد ہو کر خارج از اسلام ہے اور مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے جنازے کا بھی اہل نہیں، جنازہ کے لیے میت کا مسلمان ہونا ضروری ہے جیسا کہ کتابوں میں، و من شرائطہ اسلام المیت ذکر ہوا ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وشرطہا ستۃ اسلام المیت۔ قال ابن عابدینؒ: ای ولو بطریق التبعیۃ لأحد ابویہ او للدار او للسابی کما سیأتی۔

(رد المحتار ج ۲ ص۲۰۷ مطلب فی صلوٰۃ الجنازۃ) [۱]

شیعہ کی نماز جنازہ کا حکم

سوال:۔ جو شخص ضروریاتِ دینِ اسلام کا منکر ہو، مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی الوہیت یا نبوت کا قائل ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے کا منکر ہو، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھنے والا ہو تو ایسے شیعہ کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟ اس کا جنازہ ادا کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسے عقائد رکھنے والا شیعہ کافر، مُرتد اور خارج از اسلام ہے، اس کا جنازہ نہیں پڑھایا جائے گا۔

قال علامہ ابن العابدینؒ: نعم لاشك فی تکفیر من قذف السیدۃ عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا او انکر صحبۃ الصدیقؓ او اعتقد الُوھیّۃ فی علیؓ.... الخ۔ (شامی ج ۳ ص۳۲۱ باب المرتد) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وشرطہا اسلام المیت فلا تصح علی الکافر للآیۃ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا الخ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۷۹ کتاب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیۃ ج ۱ ص۱۶۲ الفصل الخامس فی صلوٰۃ الجنازۃ۔

[۲] وفی الهندیۃ: ولو قذف عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بالزنا کفر باللہ ...الخ (الهندیۃ ج ۲ ص۲۶۴)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۱۲۱ باب المرتد۔

جرائم کے دوران ہلاک شدگان کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ تاوان کی بھاری رقم کی وصولی کے لیے انسانوں کو اغوا کرتے ہیں، اور اگر موقع ملے تو قتل وغارت سے بھی پہلوتہی نہیں کرتے، ایسے لوگ اگر ان جرائم کے دوران کسی طرح مارے جائیں تو کیا ان کا جنازہ پڑھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر دورانِ اغوا اور ڈاکہ یہ لوگ مارے جائیں تو ان کا جنازہ بطور تعزیر نہیں پڑھا جائے گا، البتہ اگر ان جرائم میں ملوّث افراد اپنی طبعی موت مرجائیں تو پھر مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وھی فرض علیٰ کل مسلم مات خلا اربعۃ بغاۃ وقطاع طریق فلا یغسلوا ولا یصلّی علیھم اذا قتلوا فی الحرب ولو بعدہ صلّی علیھم..... الخ۔[1]

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۴۲ باب الجنائز مطلب فی صلوٰۃ الجنازہ)[2]

فاسق کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا اور عمر بھر کسی نے اُسے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہو تو کیا ایسے شخص کا جنازہ پڑھا جائے گا یا نہیں؟ نیز زانی، چور اور دوسرے امورِ فسقیہ کے مرتکب کا جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی میت کی نمازِ جنازہ کے لیے صرف اس کا مسلمان ہونا شرط ہے، جب تک صریح کفر کا ثبوت نہ ہو تو اس کا جنازہ پڑھا جائے گا، نماز نہ پڑھنے یا دوسرے جرائم سے کوئی شخص اسلام کے دائرے سے نہیں نکلتا، اس لیے مسلمانوں پر ایسے شخص کا جنازہ پڑھنا ضروری ہے۔ البتہ جیّد علماء کرام اور اصحابِ مروت اسکے جنازہ میں تادیباً شریک نہ ہوں۔

لماورد فی الحدیث: وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلّوا خلف کل برّ وفاجر وصلوا علیٰ کل برّ وفاجر۔ (کنز العمال ج ۶ ص۵۴ حدیث ۱۴۸۱۵)

---

[1] وقال علاؤالدین الکاسانیؒ: اِلّا البغاۃ وقطاع الطریق ومن بمثل حالھم.... الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۱۱ فصل الکلام فی صلوٰۃ الجنازۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۳ الفصل الخامس فی الصلوٰۃ علی المیت۔

[2] وقال ابن العابدینؒ: وھی فرض علیٰ کل مسلم مات الخ (رد المحتار ج ۲ ص۲۱۰ باب الجنائز)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۲ الفصل فی الصلوٰۃ علی المیت۔

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:۔ خودکشی کرنا قرآن وحدیث کی رُو سے عظیم گناہ ہے، اس کا ارتکاب کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خودکشی کرنا یقیناً عظیم گناہ ہے لیکن اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک کسی گناہ کا ارتکاب موجبِ کفر نہیں، لہٰذا خودکشی کرنے والا بھی دیگر گنہگار مسلمانوں کی طرح ایک گنہگار ہے جس کا جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ جن روایات میں نفی آئی ہے وہ تعزیر پر محمل ہے تاکہ معاشرہ میں اس کے خوف سے کوئی ایسے قبیح فعل کا ارتکاب نہ کر سکے۔

قال طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وقاتل النفس يغسل ويصلّى عليه عند ابي حنيفةؒ ومحمّدؒ وبه كان يفتي شمس الائمة الحلوانيّ۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج ۱ ص ۲۱۷ الفصل الخامس والعشرون فی الجنائز، الجنس الاوّل فی الشهيد) [۱]

مجنون کے جنازے کی کیفیت

سوال:۔ جس شخص کے بارے میں قطعی طور پر یقین ہو کہ یہ مجنون ہے تو اس کی موت پر اس کے جنازہ کی کیفیت کیا ہوگی؟

الجواب:۔ اگر مجنون کی یہ بیماری بچپن سے چلی آرہی ہو حتیٰ کہ بالغ ہونے تک وہ صحتیاب نہیں ہوا ہو تو ایسا شخص نابالغوں کے زمرے میں شمار ہوتا ہے، اس کے جنازے کی آخری تکبیر میں وہی دعا پڑھی جائے گی جو نابالغ بچوں کے لیے پڑھی جاتی ہے! البتہ اگر یہ جنون بلوغت کے بعد اس پر طاری ہوا ہو تو پھر جنون اگرچہ معاصی کے لیے دافع ہے لیکن مزیل نہیں اسلئے مدتِ بلوغت کے ایامِ صحت کی رعایت کرتے ہوئے یہ شخص بالغ شمار ہوگا۔

قال العلامة ابن العابدينؒ: تحت قوله كصبيّ سبى مع احد ابويه والمجنون

---

[۱] وفی الهندية: ومن قتل نفسه خطأً بان ناول رجلاً من العدوّ وليضربه بالسيف فاخطأ واصاب نفسه ومات غسل وصلّى عليه وهٰذا بلاخلاف كذا فی الذخيرة۔ ومن قتل نفسه عمدًا يصلّى عليه عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله وهو الاصح كذا فی التبيين۔ (ج ۱ ص ۱۶۳ الفصل الخامس فی الصلوٰة على الميت)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج ۲ ص ۲۱۱ باب الجنائز۔

البالغ کالصبی۔ الخ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۵ باب الجنائز) ؎۱

جسم کے بعض اعضاء پر جنازہ کا حکم

سوال:۔ اگر جہاز کے حادثہ میں یا کسی دوسرے حادثہ میں انسانی جسم متاثر ہو کر بعض حصے دستیاب ہوں تو پورا جسم نہ ملنے کی صورت میں بعض دستیاب حصوں پر نماز جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر جسم کا اکثر حصہ مل جائے یا نصف حصہ سر کے ساتھ مل جائے تو پھر اس بعض حصہ پر جنازہ پڑھا جائے گا ورنہ اس کے بغیر جنازہ کی ضرورت نہیں۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: وذکر القاضی فی شرحہ مختصر الطحاوی انہ اذا وجد النصف و معہ الرأس یغسل وان لم یکن معہ الرأس لا یغسل فکانہ جعلہ مع الرأس فی حکم الاکثر لکونہ معظم البدن۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۰۲ فصل شرائط الوجوب، کتاب الجنائز) ؎۲

متعدد اموات کا ایک ہی جنازہ کافی ہے

سوال:۔ اگر ایک وقت میں متعدد جنازے جمع ہو جائیں تو ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا کہ تمام کے لیے ایک ہی جنازہ کافی ہے؟

الجواب:۔ ہر ایک میت پر علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ پڑھنا افضل ہے، اور اگر ایک ہی دفعہ تمام کا جنازہ پڑھا گیا تو یہ بھی صحیح ہے۔

قال العلامہ الحصکفیؒ: اجتمعت الجنائز فافراد الصلوۃ علیٰ کل واحدۃ اولیٰ من الجمع وان جمع جاز۔ الخ (الدر المختار علیٰ ردالمحتار ج ۲ ص۲۱۸ باب الجنائز) ؎۳

؎۱ وقال ابراھیم بن محمدؒ: والمجنون کالطفل وینبغی ان یقید بالمجنون الاصلی دون العارضی۔ الخ (صغیری ص۲۹۴ کتاب الجنائز)

وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۳۸۲ باب الجنائز، فصل فی الصلوۃ علی المیت۔

؎۲ وفی الھندیۃ: ولو وجد اکثر البدن اونصفہ مع الرأس یغسل ویکفن ویصلّی علیہ کذا فی المضمرات۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۱۵۹ الفصل الثانی فی الغسل)

وَمِثْلُہٗ فی ردّالمحتار ج ۲ ص۱۹۹ کتاب الجنائز، مطلب فی بحث کل سبب ونسب منقطع۔

؎۳ وفی الھندیۃ: ولو اجتمعت الجنائز یخیر الامام ان شاء صلّی علیٰ کل واحد۔ وان شاء صلّی علیٰ الکل دفعۃ بالنیۃ علی الجمع کذا فی معراج الدرایۃ (ج ۱ ص۱۶۵ الفصل الخامس فی الصلوۃ علی المیت)

وَمِثْلُہٗ فی الخلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص۲۲۴ الفصل الخامس العشرون فی الجنائز۔

جنازہ میں ہاتھ اٹھانے کا حکم

سوال:۔ جنازہ میں تکبیر کہتے وقت ہاتھ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک تکبیرِ اُولیٰ کے علاوہ دیگر تکبیرات میں ہاتھ اٹھانا سنّت نہیں (سوائے تکبیراتِ عیدین کے) اسلئے نمازِ جنازہ میں تکبیرِ اولیٰ کے وقت ہاتھ اٹھانا سنّت ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وھی اربع تکبیرات کل تکبیرۃ قائمۃ مقام رکعۃ یرفع یدیہ فی الاولیٰ فقط۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۱۲ باب الجنائز) [۱]

تکبیر کا رہ جانا مفسدِ جنازہ ہے

سوال:۔ چار تکبیرات میں سے کسی تکبیر کے رہ جانے کی صورت میں جنازے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات کی حیثیت ارکان کی ہے، کسی ایک تکبیر کے رہ جانے سے جنازہ فاسد ہوگا اور فساد کی صورت میں دوبارہ ادا کرنا لازمی ہے۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: وکان کل تکبیرۃ من ھٰذہ الصلوٰۃ قائمۃ مقام رکعۃ بدلیل انہٗ لو ترک تکبیرۃ منھا تفسد صلوٰتہ کما لو ترک رکعۃ من ذوات الاربع۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۴ فصل بیان کیفیۃ صلوٰۃ علی الجنازۃ) [۲]

جنازہ کی پانچویں تکبیر میں امام کی متابعت ضروری نہیں

سوال:۔ اگر امام نے غلطی سے پانچویں تکبیر شروع کی تو مقتدیوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا ایسی صورت میں امام کی متابعت ضروری ہے یا نہیں؟ ایسا ہی اگر امام نے غلطی سے پانچویں تکبیر کہہ دی تو مقتدیوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ جنازہ کل چار تکبیرات سے عبارت ہے اس لیے پانچویں تکبیر کہنے کی صورت

---

[۱] قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: ولا یرفع یدیہ الا فی التکبیرۃ الاولیٰ۔۔۔الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۴ فصل بیان کیفیۃ الصلوٰۃ علی الجنازۃ)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج ص۲۲۴ کتاب الجنائز۔

[۲] وقال العلامۃ ابن الھمامؒ: ولذا لو ترک تکبیرۃ واحدۃ منھا فسدت صلوٰتہ کما لو ترک رکعۃ من الظھر۔ (فتح القدیر ج۲ ص۸۸ باب الجنائز)
وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۲۴۱ کتاب الجنائز۔

میں امام کی متابعت نہیں ہوگی بلکہ مقتدی خاموشی سے سلام پھیرنے تک امام کا انتظار کریں گے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولو کبر امامہ خمسًا لم یتبع لانہ منسوخ فیمکث المؤتم حتی یسلم معہ اذا سلم بہ یفتی۔ (در مختار ج ۲ ص ۲۱۴ باب الجنائز) ۱ھ

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:۔ اگر بیرونِ مسجد جنازہ پڑھنے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہ ملے تو کیا مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ فقہ حنفی کی رُو سے بغیر کسی شرعی عذر کے مسجد کو جنازہ کے لیے بروئے کار نہیں لایا جاسکتا، البتہ اگر بارش ہو یا دوسرے ایسے اعذار ہوں کہ بیرونِ مسجد جنازہ پڑھنے میں تکلیف ہو تو پھر مسجد میں پڑھنا جائز ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ولم یصلوا رکبانا۔ الخ۔ وبعد اسطر ولا فی مسجد لحدیث ابی داؤد مرفوعًا: من صلی علی میت فی المسجد فلا اجر لہ وفی روایۃ فلا شیئ لہ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۶ کتاب الجنائز) ۲ھ

جنازہ الٹا رکھا گیا تو

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کبھی نمازِ جنازہ کے لیے میّت کی چارپائی الٹی رکھ دی جائے یعنی میّت کے پاؤں شمال کی طرف اور سر جنوب کی جانب ہو اور اسی کیفیت میں نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے تو کیا اس جنازہ کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جنازہ کیلئے میت کی چارپائی رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جن مقامات میں قبلہ مغرب کی جانب ہو تو میّت کا سر شمال کی جانب اور پاؤں جنوب کی جانب کرکے جنازہ کیلئے میت کی چارپائی رکھی جائے، اگر کہیں لاعلمی میں میّت کی چارپائی الٹی رکھی گئی اور اس پر نماز پڑھی گئی تو نماز ادا ہوگئی دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، البتہ جان بوجھ کر ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامۃ احمد الطحطاویؒ: وصحت لو وضعوا الرأس موضع الرجلین واساؤا ان تعمدوا۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۵۹۳ کتاب الجنائز) ۳ھ

۱ھ وقال برھان الدینؒ: ولو کبر الامام خمسًا لم یتابعہ المؤتم۔۔۔ الخ (الھدایۃ ج ۱ ص ۱۸۰)

۲ھ قال ابراھیم الحلبیؒ: وتکرہ الصلوٰۃ علی الجنازۃ فی مسجد جماعۃ عندنا۔۔۔ الخ (کبیری شرح المنیۃ ص ۵۸۸)

۳ھ لما قال العلامۃ المفتی عبد الرحیم: الجواب: جان بوجھ کر جنازہ الٹا رکھنا مکروہ ہے بھول سے ہوگیا تو کوئی حرج نہیں۔ (فتاوی رحیمیہ ج ۱ ص ۳۶)

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھے تو کیا جنازہ کا اعادہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک نمازِ جنازہ درحقیقت دُعا ہے اس میں سورۃ فاتحہ یا کسی دوسری سورۃ کی قرأت ضروری نہیں، اس میں صرف دُعائیں پڑھی جائیں گی۔ سورۃ فاتحہ بھی اگر کہیں دُعا کی نیت سے پڑھی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ قرأت کی نیت سے پڑھنا ناجائز ہے۔ چونکہ جنازہ چار تکبیرات سے عبارت ہے اس کے ہوتے ہوئے جنازہ ادا ہو گیا لہٰذا قرأتِ فاتحہ کی صورت میں اعادہ واجب نہیں۔

لما فی الهندية: ولا يقرأ فيها القرآن ولو قرأ الفاتحة بنية الدعاء فلا بأس به وان قرأها بنية القرأة لا يجوز لانها محل الدعاء دون القرأة كذا فى المحيط السرخسى (ج۱ ص۱۶۴ الفصل الخامس فى الصلوٰة على الميت) [1]

دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ بار بار جنازہ پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ ایک دفعہ میت کی نمازِ جنازہ پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا اگر میت کے ولی یا قاضی نے اصالۃً یا نیابتاً نمازِ جنازہ ایک دفعہ ادا کی تو دوبارہ یا متعدد بار جنازہ پڑھنا غیر مشروع ہے، البتہ اگر کہیں ولی کی اجازت کے بغیر اجنبی لوگ جنازہ پڑھا لیں تو ولی اور قاضی اعادہ کا حق رکھتے ہیں۔

قال فى الهندية: ولا يصلى على ميت الا مرة واحدة والتنفل بصلوٰة الجنازة غير مشروع كذا فى الايضاح ولا يعيد الولى ان صلى الامام الاعظم او السلطان او الولى او القاضى او امام الحى لان هؤلاء اولى منه وان كان غيرهؤلاء له ان يعيد۔ (الهندية ج۱ ص۱۶۳ الفصل الخامس فى الصلوٰة على الميت) [2]

---

[1] قال علاؤالدين الكاسانىؒ: ولا يقرأ فى الصلوٰة على الجنازة بشئ من القرآن۔ الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۳ فصل بيان كيفية الصلوٰة على الجنازة)

ومثله فى البحر الرائق ج۲ ص۱۸۳ باب الجنائز فصل فى الصلوٰة على الميت۔

[2] وقال علاؤالدين الكاسانىؒ: ولا يصلى على ميت الا مرة واحدة لا جماعة ولا وحدانا عندنا۔ الخ۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۱ فصل الكلام فى صلوٰة الجنازة)

غائبانہ نماز جنازہ میں شرکت کا حکم

سوال:۔ کیا نماز جنازہ کے لیے میت کا سامنے ہونا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہو تو ہمارے ملک میں عموماً کسی بڑے لیڈر کی موت پر حنفی مسلک کے لوگ بھی غائبانہ جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، شرعاً اس مسئلہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک نماز جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مرنے والے کی لاش سامنے ہو، یہی وجہ ہے کہ احناف غائبانہ جنازہ کے قائل نہیں ہیں، البتہ نامور شخصیات کی موت پر ملک کے طول و عرض میں ان کے جنازے اور حنفی المسلک لوگوں کا ان میں شریک ہونا ایک سیاسی حربہ ہے جس کا مسلک و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، یہ محض عوام کو خوش رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے جس میں شرکت سے اجتناب ضروری ہے۔

قال علاؤ الدين الحصكفیؒ: وشرطها ايضًا حضوره ووضعه وكونه هو او اكثره امام المصلی الخ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۰۸، باب الجنائز مطلب في صلوٰة الجنائز)[1]

نماز جنازہ میں درود شریف کا تعین

سوال:۔ عموماً نماز جنازہ میں درود شریف پڑھتے وقت کما صلیت و سلمت و بارکت و رحمت و ترحمت کا اضافہ کیا جاتا ہے، اس درود شریف کے ثبوت کے لیے دلیل کیا ہے؟ نیز اگر کسی شخص کو یہ درود شریف یاد نہ ہو تو وہ نماز میں پڑھا جانے والا مشہور درود شریف پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نماز جنازہ کے لیے کسی خاص درود شریف کا تعین نہیں صرف درود شریف پڑھنا سنت ہے لیکن اکثر کتابوں میں مشہور درود ابراہیمی لکھا گیا ہے لہٰذا اس کا پڑھنا بہتر ہے۔

قال علاؤ الدين الكاسانیؒ: واذا كبر الثانية يأتی بالصلوٰة على النبی صلى الله عليه وسلم وهی الصلوٰة المعروفة ...الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۳۱۳ فصل فی بیان كيفية الصلوٰة على الجنازة)[2]

---

[1] وفی الهندية: ومن الشروط حضور الميت ووضعه وكونه امام المصلی فلا تصح على غائب ولا على محمول على دابة ولا على موضع۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۱۶۴ الفصل الخامس فی الصلوٰة على الميت)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۷۹ فصل السلطان احق بصلاته۔

[2] وقال العلامة ابن العابدينؒ: (تحت قوله كما فی التشهد) ای المراد الصلوٰة الابراهيمية التی يأتی بها المصلی فی قعدة التشهد۔ (شامی ج ۲ ص ۲۱۲ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳ کتاب الجنائز۔

(نوٹ) تاہم مذکورہ درود شریف یعنی کما صلّیت وسلّمت ...الخ بعض روایات سے ثابت ہے اس لیے اس درود کا انکار کرنا یا اس کو بدعت کہنا مناسب نہیں ۔

اوقاتِ مکروہہ میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال :۔ کیا اوقاتِ مکروہہ میں دوسری نمازوں کی طرح نمازِ جنازہ بھی مکروہ ہے یا اس کا حکم علیحدہ ہے؟ حضرت علیؓ کی اس روایت سے کہ یا علی ثلاث لا تؤخرها الصلوٰة اذا اتت والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفوًا ۔ (مشکوٰة ص۶۱) معلوم ہوتا ہے کہ جنازہ جس وقت حاضر ہو جائے تو اسی وقت ادا کیا جائے گا، اس میں اوقاتِ مکروہہ کا استثناء نہیں، حالانکہ عام فقہاً نے اوقاتِ مکروہہ میں نمازِ جنازہ کے مکروہ ہونے کی صراحت کی ہے؟

الجواب :۔ تعجیل کے بارے میں جیسا کہ حضرت علیؓ کی روایت سے ثابت ہے، ایسا ہی منع کے بارے میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت بھی موجود ہے جو کہ صاحبِ مشکوٰة نے ان الفاظ سے نقل کی ہے: عن عقبة بن عامر قال ثلث ساعات کان رسول الله صلی الله علیه وسلم ینهانا ان نصلی فیهن او نقبر فیهن موتانا حین تطلع الشمس بازغة حتی ترتفع وحین یقوم قائم الظهیرة حتی تمیل الشمس وحین تضیف الشمس للغروب حتی تغرب ۔ (مشکوٰة ج ۱ ص۹۴)

دونوں روایات درجہ کے اعتبار سے مساوی ہیں، لہٰذا ایک روایت کو لے کر دوسری روایت کو ترک کرنا مناسب نہیں ۔ تو احناف نے ایسے وقت میں تطبیق کی صورت نکالی ہے تاکہ دونوں روایتوں پر عمل ہو سکے ۔ فقہی اعتبار سے ان روایات کی تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جنازہ کا پڑھنا اس وقت فرض ہو جاتا ہے جس وقت جنازہ حاضر ہو ۔ پھر فقہاء نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ وقت کی صحت اور نقصان سے وجوب کی حیثیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی، جہاں کہیں وقت صحیح ہو تو وجوب کامل رہے گا اور جہاں کہیں وقت ناقص ہو تو وجوب ناقص رہے گا ۔ کما بیّن بالتفصیل فی الاعصر یومه ۔ لہٰذا جنازہ اگر کہیں پہلے سے حاضر ہو تو وجوب کامل کی وجہ سے ایسا جنازہ وقت مکروہہ تک مؤخر کرنا ناجائز ہے اور اوقاتِ مکروہہ میں ایسے جنازے کا پڑھنا حضرت علیؓ کی روایت کی رُو سے مکروہ ہے لیکن اگر کہیں جنازہ وقتِ مکروہہ میں حاضر ہو تو پھر حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کی رُو سے اوقاتِ غیر مکروہہ تک اس کی تاخیر مکروہ ہے اور وجوب ناقص کی وجہ سے اس مکروہ وقت میں اس جنازہ کا پڑھنا جائز مع الکراہت ہے ۔

لما قال العلامة بدر الدین العینیؒ: لا تجوز الصلوٰة الجنازة فی الاوقات الثلاثة المذکورة هذا محمول علی جنازة حضرت قبل التغیر لان الصلوٰة وجبت بحضورها کاملة

ولا تؤدی بالناقص حتی لو حضرت جنازة فی هذا الوقت جازت الصلوٰة مع الکراهة لانها ادیت ناقصة کما وجبت ۔ (البنایة ج۱ ص۶۴ کتاب الصلوٰة باب المواقیت) [1]

نمازِ جنازہ کی دعاؤں میں اخفا سنت ہے

سوال: نمازِ جنازہ میں جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں ان کے پڑھنے کی مسنون کیفیت کیا ہے؟ اگر کوئی شخص یہ دعائیں جہر سے پڑھے تو کیا جنازہ کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: نمازِ جنازہ کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اس میں محض تکبیرات ارکان ہیں اور ان کے علاوہ ثناء، درود شریف یا جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں یہ تمام سنت ہیں، اس لیے یہ دعائیں خاموشی سے پڑھنا مسنون ہے، اگر کوئی شخص یہ دعائیں جہر سے پڑھے تو اس نے خلافِ سنت کا ارتکاب کیا تاہم اعادہ ضروری نہیں۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویسلم بلا دعاء بعد الرابعة تسلیمتین ناویًا المیت مع القوم ویسر الکل إلا التکبیر الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۱۳ باب الجنائز) [2]

جنازہ کی صفیں طاق رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال: نمازِ جنازہ میں صفیں طاق رکھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جبکہ بعض علاقوں میں اس پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ صفیں طاق ہونے تک تکبیر موقوف رہتی ہے؟

---

[1] لما قال العلامة الحصکفیؒ: (وکره) تحریمًا وکل ما لا یجوز مکروه (صلوٰة) مطلقًا (ولو) قضاءً او واجبة او نفلًا (او) (علی جنازة وسجدة تلاوة وسهو) لا شکر، تنبیه مع شروق واستواء..... وغروب الا عصر یومه ...... لا ینعقد الفرض وما هو ملحق به کواجب لعینه کوتر وسجدة تلاوة وصلوٰة جنازة تلیت الآیة فی کامل وحضرت الجنازة قبل لوجوبه کاملًا فلا یتأدی ناقصًا فلو وجبتا فیها لم یکره فعلهما ای تحریمًا۔ قال ابن عابدینؒ: قوله او تحریمًا افاد ثبوت الکراهة التنزیهیة ۔

(رد المحتار ج۱ ص۳۷۱ تا ۳۷۵ الاوقات المکروه)

وَمِثْلُهٗ فی مراقی الفلاح وطحطاوی ص۱۳۹ کتاب الصلوٰة، فصل فی الاوقات المکروهة ۔

[2] وفی الهندیة: ویخافت فی الکل إلا فی التکبیر کذا فی التبیین ۔ (الهندیه ج۱ ص۱۶۴ الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۸۳ باب صلوٰة الجنازہ ۔

الجواب :- بلاشک نماز جنازہ میں طاق صفوں کی فضیلت روایات سے ثابت ہے لیکن فقہی کتابوں کی عام عبارتیں تین صفوں تک کی نشاندہی کرتی ہیں اس لیے اس کی رعایت بہتر ہے تاہم جنازہ کو اس پر موقوف کرنا اچھا نہیں۔

لما ورد فی الحدیث : ما من مسلم یموت فیصلّی علیہ ثلٰثۃ صفوف من المسلمین الّا اوجب۔ (مشکوٰۃ شریف ص۱۴۷ الفصل الثالث فی المشی الی الجنازۃ)[1]

جنازہ میں قدم شمار کرنے کی شرعی حیثیت

سوال :- کئی علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جنازہ اٹھاتے وقت امام مسجد چارپائی کے دائیں پاؤں سے شروع ہوکر ہر پاؤں پر دس دس قدم اٹھاکر چالیس قدم پورے کرتا ہے، اور امام کے ہر دس قدم تبدیل کرنے پر دوسرے پاؤں والے بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض گاؤں میں امام مسجد کے لیے یہ عمل لازمی شمار ہوتا ہے اور ترک کرنے پر لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ از روئے شرع قدموں کا یہ شمار کیا حکم رکھتا ہے ؟

الجواب :- قدم شمار کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ جس نے کسی مسلمان کے جنازے کو چالیس قدم تک اٹھایا تو اس کے چالیس بڑے گناہ معاف ہوں گے۔ فقہاء نے اس حدیث پر عمل کی یہ صورت بیان کی ہے کہ چار پاؤں میں سے ہر پاؤں کے ساتھ دس دس قدم تک چلنے میں چالیس قدم پورے ہوکر میت کا حق ادا ہوجاتا ہے، لیکن مروجہ طریقہ سے قدم شمار کرنے میں کئی قباحتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً یہ صرف امام مسجد کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے حالانکہ یہ ہر اٹھانے والے کے لیے ہونا چاہیئے، مزید برآں یہ امام کے فرائض میں شمار ہوا، نیز اس میں خصوصی طور پر نیکی اور ثواب کا عقیدہ رکھا جاتا ہے جو زیادت علی الشرع کے مترادف ہے اس لیے اس لزوم سے اجتناب کیا جائے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ : واذا حمل الجنازۃ وضع مقدمہا یمینہ عشر خطوات لحدیث من حمل جنازۃ اربعین خطوۃ کفرت عنہ اربعین کبیرۃ۔ (الدر المختار ج۱ ص۹۳ الجنائز)

اور حدیث کنز العمال جلد ۱۵ ص حدیث ۴۲۳۶۵ میں مذکور ہے لیکن اس نے لفظ خطوۃ

---

[1] وقال علامہ ابن العابدینؒ : ویستحب ان یصف ثلٰثۃ صفوف ۔ الخ (رد المحتار جلد۲ ص۲۱۴ کتاب الجنائز)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۱۶۴ الفصل الخامس فی الصلوٰۃ علی المیت ۔

ذکر نہیں کیا ہے [1]

تعزیت کے لیے چند منٹ کے سکوت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل حکومتی سطح پر جب کسی وفات پر پسماندگان سے تعزیت کی جاتی ہے تو اس کے لیے چند منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے، کیا اسلام میں اس کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے کسی کی وفات پر میت کے پسماندگان کے غم میں شرکت اور تعزیت کا ایک طریقہ مسلمانوں کو بتایا ہے اور مسلمان اسی طریقہ کے مطابق کسی کے غم میں شرکت اور تعزیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ سوال میں اظہارِ تعزیت کا درج شدہ طریقہ یہود و ہنود کا ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں بلکہ یہود و ہنود سے مشابہت کی وجہ سے واجب الترک ہے۔

عن عبادة بن الصامت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لایجلس حتی یوضع المیت فی اللحد فکان قائمًا مع اصحابہ علی رأس قبر فقال یہودی ھکذا نصنع بموتانا فجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال خالفوھم۔

(بحوالہ فتاوٰی رحیمیہ ج ۱ ص۳۸۵ کتاب الجنازہ)

ولی کے لیے تیمم جائز نہیں

سوال:۔ کیا نماز جنازہ کے لیے باوجود پانی کے حصول پر قادر ہونے کے تیمم جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا اس رخصت سے میت کا ولی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے یا غیر اولیاء کے لیے خاص ہے اور میت کے ولی کے لیے وضو ضروری ہے؟

الجواب:۔ نماز جنازہ کے لیے تیمم کی اجازت اور رخصت ملنے میں بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ نماز جنازہ ایسی عبادت ہے جس کے فوت ہوجانے سے قضا نہیں، کیونکہ تنفل بالجنازہ غیر مشروع ہے، لہٰذا جب کسی سے جنازہ فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو تو معقول عذر کی وجہ سے یہ شخص وضو کی جگہ

---

[1] وقال ابراھیم بن محمدؒ: ویستحب من کل جانب عشر خطوات لقولہ علیہ السلام من حمل اربعین خطوة۔ الخ (صغیری ص۲۹۵ کتاب الجنائز)
ومثلہٗ فی غایة الاوطار ج ۱ ص۴۱۸ کتاب الجنائز۔

تیمم کر سکتا ہے، لیکن ولی کے مقام قرابت اور حیثیت کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ جنازہ اس کی اجازت پر موقوف ہے جب تک ولی اجازت نہ دے تو کوئی دوسرا شخص جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ لہٰذا اس کے حق میں جنازہ کا فوت ہو جانا متحقق نہیں، اس لیے ولی باقاعدہ وضو کرے وہ تیمم پر اکتفاء نہیں کر سکتا۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: وتيمم الصحيح في المصر اذا حضرت جنازة والولي غيره فخاف إن إشتغل بالطهارة ان تفوته الصلوٰة لانها لاتقضى.... الخ (الهداية ج۱ ص۵۵، ۵۶ باب التيمم) ؎۱

میت کے لیے چارپائی کا استعمال کرنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کی میت چارپائی پر رکھی جائے تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

الجواب:۔ چارپائی پر میت رکھنا مقصود بالذات نہیں، سہولت کی خاطر اگر میت کو چارپائی پر رکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور نماز جنازہ پڑھنا بھی جائز ہے، جنازہ پڑھنے کے لیے اس کو علیحدہ کرنا ضروری نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ بھی چارپائی پر رکھ کر پڑھی گئی تھی۔

لما ذكر في مسند إمام احمدؒ: عن عبد الله بن عمر بن علي ابن ابي طالب عن ابيه عن جده عن عليّ قال: لما وضع رسول الله صلى الله عليه وسلم على السرير قال لا يقوم عليه احد هو اما مكم حيّاً وميتاً فكان يدخل الناس رسلاً رسلاً فيصلون عليه صفاً صفاً ليس لهم امام ويكبرون۔ (ج ۳ ص۱۲۳) ؎۲

؎۱ وقال علاؤالدين الكاساني: حتى لو حضرته الجنازة وخاف فوت الصلوٰة لو اشتغل بالوضوء تيمم وصلّى تا قوله حتى لو كان ولي الميت لا يباح له التيمم.... الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۵۱ باب التيمم فصل كيفية التيمم)

وَمِثْلُهٗ في الشامي ج۱ ص۱۷۷ باب التيمم۔

؎۲ وفي المشكوٰة المصابيح: وعن نافع ابي غالب قال صليت مع انس بن مالك على جنازة رجل فقام حيال رأسه ثم جاؤا بجنازة امرأة من قريش فقالوا يا ابا حمزة صل عليها فقام حيال وسط السرير فقال له العلاء بن زياد هكذا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم قام على الجنازة مقامك منها ومن الرجل مقامك منه قال نعم۔ (ص۱۴۷)

وَمِثْلُهٗ في الفتاوى التاتارخانية ج۲ ص۱۵۶ كتاب الجنائز۔

جنازہ میں میت کی چارپائی کی جگہ کا پاک ہونا ضروری نہیں

سوال:۔ نماز جنازہ میں جس جگہ میت کی چارپائی رکھی جاتی ہے کیا اس جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ میت کی چارپائی کی جگہ کا پاک ہونا جنازہ کی صحت کی شرائط میں سے نہیں اسلئے یہ جگہ اگر پاک نہ ہو تو جنازے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامۃ ابن العابدینؒ وفی التاتارخانیۃ: سئل قاضی خان عن طھارۃ مکان المیت ھل تشترط لجواز الصلوٰۃ علیہ قال ان کان المیت علی الجنازۃ لاشک انہٗ یجوز والا فلا روایۃ لھٰذا وینبغی الجواز۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۱۸ مطلب فی صلوٰۃ الجنازۃ)[۱]

دعا بعد الجنازہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً امام قوم کی طرف منہ کر کے ہاتھ اٹھا کر قوم کی معیت میں ہیئتِ اجتماعی کے ساتھ دُعا مانگتے ہیں، لوگوں کے ذہنوں میں اجتماعی دعا کی اہمیت اتنی بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعا نہ کرے تو اس کو ملامت کی جاتی ہے بلکہ بعض علاقوں میں خود علماء کی دخل اندازی سے ایک دوسرے کو سبّ و شتم تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ از روئے شرع اس کیفیت سے دُعا کرنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ دعا بعد الجنازہ علیٰ ہیئتِ اجتماعی کا حکم بیان کرنے سے قبل چند مقدمات کی طرف توجہ دینی ضروری ہے : (۱) پہلا مقدمہ یہ ہے کہ نماز جنازہ بذاتِ خود دعا ہے، امام قوم کی معیت میں مرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں مغفرت اور رفعِ درجات کے لیے سفارش کرنا ہے (۲) دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ شریعت میں عمل کا وہی طریقہ معتبر ہوگا جس کی اجازت شریعت نے دی ہو، اگر کہیں شریعت کے عملِ متوارثہ کی شرعی حیثیت کسی ایسی حرکت سے مجروح ہوتی ہو تو ایسی حرکت سے اجتناب ضروری ہے (۳) تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ میت کیلئے اس کے پسماندگان جب

---

[۱] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: قید المصنف بطھارۃ المیت احترازاً عن طھارۃ مکانہ قال فی الفوائد التاجیۃ ان کان علیٰ جنازۃ لاشک انہٗ یجوز وان کان بغیر جنازۃ لاروایۃ لھٰذا وینبغی ان یجوز لان طھارۃ مکان المیت لیس بشرط لانہ بمعبود۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۲۹)

ومِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۶۳ الفصل الخامس فی الصلوٰۃ علی المیت۔

صدقِ نیّت سے دعا کریں تو اس کا فائدہ یقیناً میت کو پہنچتا ہے۔

ان تین مقدمات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میت کے لیے جب بھی کوئی دعا مانگی جائے تو اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ اُسے پہنچتا ہے لیکن مقدمہ ثانیہ کی رُو سے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کو کسی ایسی حرکت سے محفوظ رکھے جس سے اس کی شرعی حیثیت متاثر ہوتی ہو۔ مقدمہ اولیٰ کی رُو سے جب جنازہ خود دعا ہے تو سلام پھیرنے کے ساتھ ہی یہ دعا ختم ہو جاتی ہے، سلام پھیرنے کے بعد دوبارہ دعا مانگنے سے لازمی طور پر عمل متوارثہ یعنی جنازہ پر زیادت کا شبہ ہوتا ہے کیونکہ لوگ صفوں میں ایسی توجہ سے کھڑے رہتے ہیں جیسا کہ جنازہ کی تکبیر ادا ہو رہی ہو، لہٰذا اس اشتباہ سے بچنے کے لیے ایسی کیفیت پر دعا کرنے سے اجتناب ضروری ہے خاص کر جب اہتمام کی حالت یہ ہو کہ ایسی رسمی دُعا میں شرکت نہ کرنا موجب عار سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اگر بغیر کسی لزوم والتزام کے ایسے وقت میں دُعا کی جائے کہ صفیں توڑ دی گئی ہوں تو بعد کسرالصفوف اشتباہ نہ رہنے اور کسی اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر اس کو کہیں جنازہ کا جزء قرار دیا جائے تو اس سے بھی اجتناب ضروری ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري ؒ: لا يقوم بالدعاء بعد صلوٰة الجنازة ... الخ

(خلاصة الفتاوى ص۲۲۵ الفصل الخامس والعشرون فى الجنائز. نوع منه)[1]

میت کے پاس قرآن مجید پڑھنا

سوال: میت کے قرب وجوار میں بیٹھے ہوئے لوگ اگر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن کی تلاوت کریں تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر میت کو غسل دے کر کفنانے کے بعد اس کے پاس قرآن کی تلاوت کی جائے تو یہ بالاتفاق جائز ہے، البتہ غسل دینے سے پہلے تلاوت کرنے کو اکثر کتابوں میں مکروہ لکھا ہے، لیکن علامہ علاؤالدین ؒ فرماتے ہیں کہ میت قبل از غسل محدث تو ضرور ہے لیکن نجاست یقینی نہیں اس لیے قبل الغسل بھی قرآن پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال علاؤالدين الحصكفي ؒ: ويقرأ عنده القرآن الى ان يرفع

---

[1] قال ملا علی قاری ؒ: ولا يدعو للميّت بعد صلوٰة الجنازة لانه يشبه الزيادة فى صلوٰة الجنازة۔ (مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح ج۲ ص۳۶۹ كتاب الجنائز)
ومثلهٗ فى تجهيز الجنازة ص۶۱ كتاب الجنائز۔

الی الغسل۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۹۳ باب الجنائز) [۱]

شرکائے جنازہ کا ذکر بالجہر کرنا مکروہ ہے

سوال:۔ بعض جگہوں میں جنازہ اٹھاتے وقت شرکاء زور زور سے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کا ذکر کرتے ہیں، کیا راستہ میں یہ ذکر کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ دل میں ذکر کرتے میں کوئی حرج نہیں لیکن صورتِ مذکورہ میں بلند آواز سے ذکر کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما فی الهندیة: ویکره رفع الصوت بالذکر وقرأة القراٰن۔ وفیه ایضاً فان اراد ان یذکر الله یذکره فی نفسه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۶۲ الفصل الرابع فی حمل الجنازة) [۲]

تجہیز و تدفین میں تاخیر کرنا

سوال:۔ تجہیز و تدفین میں دُور دراز رہنے والے رشتہ داروں کی آمد کے انتظار میں تاخیر کرنا کیسا ہے؟ جبکہ بعض اوقات دوسرے شہروں سے اعزاء و اقرباء کے پہنچنے تک کافی انتظار کرنا پڑتا ہے؟

الجواب:۔ عام طور پر اموات کی نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین میں بغیر کسی معقول عذر کے زیادہ تاخیر کرنا جائز نہیں، البتہ اگر کسی معقول شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم قال یا علی ثلث لا تؤخرها الصلوٰة اذا اتت والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفواً۔ (مشکوٰة شریف ص۶۱) [۳]

---

[۱] وقال العلامة ابن عابدینؒ فی منحة الخالق: وتکره قرأة القراٰن عنده الیٰ ان یغسل...الخ (منحة الخالق حاشیة البحرالرائق ج۱ ص۱۹۱)

[۲] وقال ابن نجیمؒ: ویکره رفع الصوت بالذکر وقرأة القراٰن وغیرهما فی الجنازة الخ (البحرالرائق ج۲ ص۱۹۲ باب صلوٰة الجنازة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۱ ص۳۱۰ فصل الکلام فی حمله علی الجنازة۔

[۳] وقال عبدالله التمرتاشی: وکره تاخیر صلوٰته ودفنه لیصلی علیه جمع عظیم۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۲۳۲ کتاب الجنائز)۔

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۱۹۱ باب الجنائز۔

عورت کی تدفین میں غیر محارم کی شرکت

سوال:۔ کیا کوئی غیر محرم شخص کسی عورت کے جنازہ کو کندھا دے کر اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ ایسا ہی تدفین کے وقت قبر میں اتارنے میں غیر محرم شخص کی شرکت اور تعاون کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جہاں تک فوت شدہ عورت کی چارپائی اٹھانے کا مسئلہ ہے اس میں محارم کا ہونا ضروری نہیں بلکہ باپردہ ہونے کے بعد اجنبی اشخاص بھی اٹھا سکتے ہیں۔ امہات المؤمنینؓ کی ڈولیاں باقاعدہ صحابۂ کرامؓ اٹھایا کرتے تھے۔ اور قبر میں اتارنے کے وقت جب تک محارم موجود ہوں تو یہ ذمہ داریاں محارم خود نباہ لیا کریں، البتہ جب محارم موجود نہ ہوں تو پھر غیر محارم بھی ضرورت کے وقت یہ ذمہ ادا کر سکتے ہیں۔

قال علاؤ الدین الکاسانیؒ: ذوالرحم المحرم بادخال المرأة القبر من غیرہ لانہ یجوز لہ مسہا حالة الحیاة فکذا بعد الموت وکذا ذوالرحم المحرم منہا اولیٰ من الاجنبی ولو لم یکن فیہم ذو رحم فلا بأس للاجانب وضعہا فی قبرہا۔ الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۲۰) [1]

قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں ایک شخص کی نماز جنازہ ایسی جگہ پڑھائی گئی کہ قبر جنازہ سے ایک گز کے فاصلے پر واقع تھی، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ کا حکم ہے کہ کسی ایسی جگہ نماز جنازہ پڑھنا جہاں قبریں ہوں مکروہ ہے، فقہاء نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے، تاہم اگر قبریں اتنی دور ہوں کہ نمازیوں کو نظر نہ آئیں یا دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو اس صورت میں نماز جنازہ بلاکراہت جائز ہے۔ البتہ حضرت تھانویؒ سے قبر کے ہوتے ہوئے بھی نماز جنازہ جائز ہے۔

قال ابو حنیفةؒ ولا ینبغی ان یصلی علیٰ میت بین القبور، وکان علیؓ وابن عباسؓ یکرہان ذٰلک فان صلوا اجزءہم۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ باب الجنائز) [2]

---

[1] وفی الہندیة: ذوالرحم المحرم اولیٰ بادخال المرأة من غیرہم وکذا ذوالرحم غیر المحرم اولیٰ من الاجنبی فان لم یکن فلا بأس للاجانب وضعہا۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۱۶۶ الفصل السادس فی الدفن)
ومثلہ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۳ باب الجنائز۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: قال ابو حنیفةؒ ولا ینبغی ان یصلی علی المیّت بین القبور۔ (بدائع والصنائع ج ۱ ص۳۱۵ کتاب الجنائز)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ میں خلفاء اربعہ کی شرکت

سوال:۔ کیا حضور نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ میں خلفاء اربعہ شریک ہوئے تھے؟

الجواب:۔ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ میں چاروں خلفاء کی شرکت عام روایات سے ثابت ہے۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لما کفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضع علی سریرہ دخل ابوبکر وعمر فقال السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومعھما نفر من المھاجرین والانصار قدر ما یسع البیت فسلموا کما سلم ابوبکر وعمر الخ (طبقات الکبرٰی ج ۵ ص۲۹۰) [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ کی تحقیق

سوال:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ کیسے پڑھا گیا۔ آپ چونکہ گناہوں سے پاک تھے اس لیے آخری تکبیر میں آپ کے لیے کیسی دعا مانگی گئی؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ میں باقاعدہ امامت کا ثبوت نہیں اور نہ کسی کو امام بننے کی جرأت ہوئی بلکہ صحابہؓ جماعت در جماعت حجرۂ عائشہؓ میں داخل ہوکر آپ کا جنازہ پڑھتے رہے یوں متعدد بار آپ کا جنازہ ادا کیا گیا اور عام دعا کی بجائے مندرجہ ذیل کلمات پڑھے گئے:۔

قال العلامۃ سید زرقانیؒ: ومنھا انہ صلی علیہ الناس افواجًا افواجًا روی الترمذی قالوا لابی بکرؓ انصلی علی رسول اللہ قال نعم قال وکیف نصلی قال یدخل قوم ویصلون ویدعون ثم یدخل القوم فیصلون فیکبرون ویدعون فردًا۔ الخ (زرقانی ج ۵ ص۳۷۹) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن کثیر رحمہ اللہ: قال الواقدی حدثنی موسیٰ بن محمد بن ابراھیم قال وجدت کتابًا بخط ابی فیہ انہ لما کفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع علی سریرہ دخل ابوبکر وعمر الخ (البدایۃ والنھایۃ ج۶ ص۲۳۲)

[2] وفیہ ایضًا: وبغیر دعاء الجنازۃ المعروف عن علی انھم کانوا یکبرون ویقولون السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ اللھم انا نشھد ان محمد قد بلغ ما انزل علیہ ونصح لامتہ وجاھد فی سبیلک حتی اعز اللہ کلمۃ۔ (زرقانی ج ۵ ص۳۷۹)

مَسَائِلِ شَتّٰی بَابُ الْجَنَائِزْ

(جنائز کے مختلف مسائل واحکام)

میّت کو کنگھی کرنا یا سُرمہ لگانا ناجائز ہے

سوال:۔ بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کو کنگھی کرتے اور سرمہ وغیرہ لگاتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مرنے کے بعد میّت کی زینت کے لیے اُسے سُرمہ لگانا اور کنگھی وغیرہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ:۔ التزین بعد موتها والامتشاط وقطع الشعر لایجوز۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۱۹۸ کتاب الجنائز۔ قبل مطلب فی حل بیت کل سبب ونسب منقطع) لہ

میّت کو غسل دینے کے لیے تختہ پر لٹانے کا طریقہ

سوال:۔ میت کو غسل دیتے وقت اس کا رُخ کس طرف کرنا مسنون ہے؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر میں میّت کو غسل کے لیے تختے پر لٹانے کے دو طریقے لکھے گئے ہیں۔ ۱ میّت کے پاؤں کو قبلہ رُخ کرکے تختہ پر رکھا جائے ۲ صرف چہرہ قبلہ رُخ کرکے رکھا جائے جس طرح کہ میّت کو قبر میں رکھا جاتا ہے، یہ دونوں طریقے جائز ہیں البتہ دوسرا طریقہ مستحسن ہے۔

لما فی الهندیة: وکیفیة الوضع عند بعض اصحابنا الوضع طولاً کما فی حالة المرض اذا اراد الصلوٰة بایماء ومنهم من اختار الوضع کما یوضع فی القبر والاصح انه یوضع کما تیسر۔ (الفتاوی الهندیہ ج ۱ ص۱۵۸) ۲

لہ لما قال العلامة ابن نجیمؒ: قوله ولا یسرح شعره ولحیته ولا یقص ظفره وشعره) لانها للزینة وقد استغنی عنها والظاهر ان هذا الصنیع لایجوز۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۲۳ کتاب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۱ ص۴۸۵ باب الجنائز۔

۲ قال الشیخ العلامة اشرفعلی التھانویؒ: غسل کے وقت تختہ پر مُردہ کو رکھنے کی دو صورتیں لکھی ہیں، ایک تو قبلہ کی جانب پاؤں پاؤں کرکے لٹانا، دوسرے قبلہ کی طرف منہ کرنا جیسے قبر میں رکھتے ہیں اور دونوں صورتوں میں سے جو صورت ہو سکے جائز ہے ..... مگر زیادہ مستحسن صورت ثانیہ ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہے زندوں کا بھی اور مُردوں کا بھی۔

(امداد الفتاوی ج ۱ ص۴۹۳ باب الجنائز)

نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے وصیّت کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ فلاں شخص ہی میری نمازِ جنازہ پڑھائے، کیا ایسی وصیت پر عمل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میّت کی اس قسم کی وصیّت نافذ العمل نہیں ہوگی اس لیے کہ مرنے کے بعد اس کی وصیت باطل ہوجائے گی، نمازِ جنازہ جو بھی پڑھائے ادا ہوجائے گی۔

وفی الهندیة : فی الکبری المیت اذا اوصی بان یصلی علیه فلان فالوصیة باطلة وعلیه الفتوٰی۔ (الفتاوٰی الہندیہ ج ۱ ص۱۶۳ کتاب الجنائز، الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت) [۱]

نمازِ جنازہ میں درُود شریف کا پڑھنا

سوال:۔ نمازِ جنازہ میں کون سا درود شریف پڑھنا زیادہ مناسب ہے؟

الجواب:۔ نمازِ جنازہ میں وہ درود شریف پڑھنا چاہیئے جو پنج وقتہ فرض نمازوں میں پڑھا جاتا ہے، یعنی درود ابراہیمی مراد ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : (تحت قوله ویصلی علی النبیؐ کما فی التشهد) ای المراد الصلوٰة الابراهیمیة التی یأتی بها المصلّی فی قعدة التشهد۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۲۱۲ کتاب الجنازہ مطلب هل تسقط فرض الکفایہ بفعل الصبی) [۲]

قبر میں میّت کے صرف چہرے کو قبلہ رُخ کرنا چاہیئے

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقے میں میّت کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو صرف اس کے چہرے کو قبلہ رُخ کرتے ہیں، توکیا ایسا کرنا مسنون ہے یا چت لٹا کر قبلہ رُخ کرنا مسنون ہے؟

الجواب:۔ احادیثِ مبارکہ میں میّت کے چہرے کا رخ قبلہ کی طرف کرنے کا حکم ہے اور

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ : والفتوٰی علی بطلان الوصیّة بغسله والصّلوٰة علیه۔
(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۲ ص۲۲۱ کتاب الجنائز)
وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۲۲۱ کتاب الجنائز۔ مطلب تعظیم اولی الامر واجب۔

[۲] لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : والمراد بالصلوٰة الصلوٰة علیه فی التشهد وهوالاولیٰ۔
(البحرالرائق ج ۲ ص۱۸۳ کتاب الجنائز)
وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص۴۸۶ رابعًا ارکان صلوٰة الجنازة الخ

یہ امر دونوں صورتوں میں پورا ہو سکتا ہے تاہم دائیں کروٹ لٹا کر قبلہ رخ کرنا بہتر ہے اگرچہ چت لٹا کر قبلہ رُخ کرنا بھی جائز ہے۔

وفی الهندیة : ویوضع فی القبر علی جنبه الایمن مستقبل القبلة۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۶۶ الباب الحادی والعشرون)[1]

نمازِ جنازہ میں سلام بھول جانا

سوال:۔ اگر نمازِ جنازہ میں کسی سے سلام پھیرنا بھول جائے تو کیا اس سے نمازِ جنازہ متاثر ہوگی یا نہیں ؟

الجواب:۔ نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنا نہ فرض ہے اور نہ واجب، اس لیے بھول کر سلام نہ پھیرنے کی صورت میں نمازِ جنازہ متاثر نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : صلوٰة الجنازة ورکنها شیئان التکبیرات الاربع والقیام وسننها ثلٰثة التحمید والثناء والدعاء فیها۔ (الدر المختار علی هامش الطحطاوی ج ۱ ص۳۷۲ باب الجنائز)[2]

شوہر بیوی کو قبر میں نہیں اتار سکتا

سوال:۔ کیا شوہر اپنی بیوی کو قبر میں اتار سکتا ہے یا نہیں جبکہ عورت کے ورثاء موجود ہوں ؟

الجواب:۔ خاوند کے لیے اپنی بیوی کو مرنے کے بعد ہاتھ لگانا شرعاً ممنوع ہے لہٰذا دیگر ورثاء کی موجودگی میں خاوند بیوی کو قبر میں نہیں اتار سکتا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ویمنع زوجها عن غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الاصح منیة۔ وقالت الائمة الثلاثة یجوز لان علیا غسل فاطمةؓ قلنا هٰذا محمول علی بقاء الزوجیة الخ۔ (الدر المختار علی هامش الطحطاوی ج ۱ ص۳۶۷ باب الجنائز)[3]

---

[1] لما قال العلامة الحصکفیؒ : ویوجه الیها وجوبًا وینبغی کونه علی شقه الایمن ولا ینبش لیوجه الیها۔ (الدر المختار علی هامش الطحطاوی ج ۱ ص۳۸۱ باب صلوٰة الجنائز)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۲ ص۴۸۵ کتاب الجنائز۔

[2] قال العلامة اشرف علی التهانویؒ : وفی الدر المختار صلوٰة الجنازة ورکنها شیئان التکبیرات الاربع والقیام وسننها ثلٰثة التحمید والثناء والدعاء فیها۔ (امداد الفتاوی ج ۱ ص۵۰۳ باب الجنائز)

[3] لما قال الشیخ وهبة الزحیلی : قال الحنفیة لا یجوز للرجل غسل زوجته ومسها لانقطاع النکاح ویجوز له النظر الیها فی الاصح۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص۴۵۸ باب صلوٰة الجنازة ثانیًا صفة الغسل)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۲ ص۵۰۷ باب الجنائز۔

بیوی کی وفات پر شوہر اسے غسل نہیں دے سکتا

سوال:۔ کیا بیوی کے مرنے کے بعد شوہر اسے غسل دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض روایات سے جواز معلوم ہوتا ہے؟

الجواب: خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینے کے بارے میں روایات مختلف ہیں، اس لیے حنفیہ کی تحقیق کے مطابق بیوی کی وفات کے بعد چونکہ دونوں کا نکاح ختم ہو جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں اس لیے شوہر بیوی کو غسل نہیں دے سکتا۔

قال العلامة الحصكفیؒ: ويمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر إليها على الاصح۔ (الدر المختار على صدر ردالمحتار ج ۲ ص۱۹۸ کتاب الجنائز، مطلب في حديث كل سبب الخ) [1]

بیوی اپنے خاوند کو غسل دے سکتی ہے

سوال:۔ کیا عورت اپنے خاوند کو مرنے کے بعد غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شوہر کے مرنے کے بعد دونوں کا نکاح من کل الوجوہ ختم نہیں ہوتا، عورت ایام عدت میں من وجہ شوہر کے نکاح میں ہوتی ہے اس لیے شوہر کے مرنے کے بعد وہ اسے غسل دے سکتی ہے۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: وهي لا تمنع من ذلك۔ قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله وهي لا تمنع من ذلك) اي من تغسيل زوجها دخل بها اولا۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۱۹۸ کتاب الجنائز، مطلب في حديث كل سبب الخ) [2]

شوہر بیوی کو کفن نہیں پہنا سکتا

سوال:۔ کیا کوئی شوہر اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اسے کفن پہنا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیوی کے مرنے کے بعد میاں بیوی دونوں کا رشتہ ازدواج ختم ہو جاتا ہے

---

[1] لما قال الشيخ وهبة الزحيلي: قال الحنفية لا يجوز للرجل غسل زوجته ومسها لانقطاع النكاح ويجوز له النظر اليها في الاصح لان النظر اخف من المس۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۲ ص۴۵۸ کتاب الجنائز، ثانياً صفة الغاسل)

[2] لما قال العلامه ابن نجيمؒ: والزوجة تغسل زوجها دخل بها اولا بشرط بقاء الزوجية عند الغسل۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۷۴ باب الجنائز)

اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں اس لیے مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو کفن پہنائے تاہم دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ، ویمنع زوجها من غسلها ومسّها لا من النظر الیها علی الاصح۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۱۹۸ کتاب الجنائز مطلب فی حدیث کل سبب) [1]

چھوٹے بچے کا جنازہ ایک آدمی کے لیے اٹھانا جائز ہے

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی چھوٹا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اس کو ایک آدمی اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: کسی بڑے (مرد یا عورت) کا جنازہ اٹھانے کے لیے چار آدمیوں کا ہونا مناسب ہے البتہ چھوٹے بچے کے جنازہ کو اگر ایک آدمی بھی اٹھائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الھندیة، وذکر الاسبیجابی ان الصبی الرضیع او الفطیم او فوق ذٰلک قلیلاً اذا مات فلا بأس بان یحمله رجلٌ واحد علی یدیه ویتداوله الناس بالحمل علی ایدیھم۔ الخ (الفتاویٰ الھندیة ج ۱ ص۱۶۲) [2]

نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے ولی کی اجازت کا حکم

سوال: ہمارے محلے میں ایک آدمی ہے جو یہ کہتا ہے کہ میت کا ولی جس کو اجازت دے وہی نماز جنازہ پڑھائے چاہے محلے کی مسجد کا امام موجود ہو، تو کیا اس کا یہ کہنا درست ہے؟

الجواب: میت کے ولی کو اگرچہ نماز جنازہ پڑھانے کا اختیار ہے یا جس کو اجازت دے وہ پڑھا سکتا ہے لیکن محلے کی مسجد کا امام قاضی یا بادشاہ کی عدم موجودگی کی صورت میں یہ شخص مقدم ہے لہٰذا امام کی موجودگی میں وہ نماز جنازہ پڑھانے کا زیادہ حقدار ہے۔

---

[1] لما قال الشیخ وھبة الزحیلی: قال الحنفیة لا یجوز للرجل غسل زوجتها ومسها لانقطاع النکاح ویجوز له النظر الیها فی الاصح لان النظر اخف من المس۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص۴۵۸ کتاب الجنائز۔ ثانیاً صفة الغاسل)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج ۱ ص۴۸۵ باب الجنائز۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: والصبی الرضیع او الفطیم او فوق ذٰلک قلیلاً یحمله واحد علی یدیه ولو راکباً۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۲۳۱ کتاب الجنائز، مطلب فی حمل المیّت)

لما قال العلامة الحصكفی رحمہ اللہ :۔ ویقدم فی الصلوٰۃ علیه السلطان ان حضر او نائبه وهو امیر المصر ثم القاضی ثم صاحب الشرط ۔۔۔۔۔ ثم امام الحی فیه ابهام، وذلک ان تقدیم الولاۃ واجب وتقدیم امام الحی مندوب فقط بشرط ان یکون افضل من الولی ۔۔۔۔ ثم الولی الخ ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۱۹، ۲۲۰ کتاب الجنائز، مطلب فی بیان من هو احق بالصلوٰۃ علی المیت) [۱]

جنازہ اٹھانے سے قبل اجتماعی دعا کرنا

سوال :۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ جنازہ اٹھانے سے قبل قریب کی مسجد کے امام صاحب باآوازِ بلند میت اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے دعا کرتے ہیں اور حاضرین باآوازِ بلند آمین کہتے ہیں، دعا ختم ہونے کے بعد جنازہ اٹھایا جاتا ہے ۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس عمل کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ میت اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں، جنازہ اٹھانے سے قبل اور اس کے بعد انفرادی طور پر دعا کی جا سکتی ہے، البتہ اجتماعی طور پر باآوازِ بلند امام مسجد کا دعا کرنا اور حاضرین کا آمین کہنا سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں دعاء کا درج شدہ طریقہ کراہت سے خالی نہیں ۔

لما فی الهندیة : کره ان یقوم رجل بعد ما اجتمع القوم للصلوٰۃ ویدعوا للمیت ویرفع صوته ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۵ ص ۳۱۹ کتاب الکراهیة) [۲]

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے

سوال :۔ قبرستان میں جا کر وہاں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ اس کو بدعت و شرک کہتے ہیں؟

---

[۱] لما قال الشیخ وهبة الزحیلی : الرأی الاول للحنفیة : السلطان ان حضر اونائبه احق بالصلوٰۃ علی المیت بسبب السلطنة ولأن فی التقدم علیه ازدراء به فان لم یحضر فالقاضی لانه صاحب ولایة فان لم یحضر فیقدم امام الحی لأنه رضیه فی حیاته ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص ۴۸۳ کتاب الجنائز ثانیا من هو الاولی بالصلوٰۃ)

[۲] لما قال العلامة المفتی عبدالرحیم : الجواب : ہر ایک کو ذاتی طور پر دعا کرنے کی اجازت ہے سب کے جمع ہو کر دعا مانگنے کا دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نیز سلف صالحین کے عمل اور طریقہ کے خلاف ہے لہٰذا سوال میں جو طریقہ ذکر کیا گیا ہے وہ مکروہ ہے ۔ (فتاوٰی رحیمیہ ج ۱ ص ۳۶۳ کتاب الجنازہ)

الجواب:۔ قبرستان میں کھڑے ہو کر اہلِ قبور کے لیے دُعا کرنا شرعاً ثابت ہے اور پھر دُعا میں ہاتھ اٹھانا تو آدابِ دعا میں سے ہے لہٰذا قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا جائز ہے بدعت کہنا درست نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ومن ادابھا ان یسلم بلفظ السلام علیکم علی الصحیح لاعلیکم السلام فانہ ورد ...... ثم یدعوقائما طویلا وان جلس یجلس بعیدا اوقریبا بحسب مرتبتہ فی حال حیاتہ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۲۴۲ کتاب الجنائز۔ مطلب فی زیارۃ القبور) [1]

سوال وجواب کا سلسلہ میّت کو دفنانے کے بعد ہوگا

سوال:۔ بعض لوگ غیر ممالک میں فوت ہوجاتے ہیں اور ان کی میّت کو اپنے وطن لانے میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں، تو عرض ہے کہ ایسی اموات سے سوال جواب کب ہوگا؟ کیا فوت ہونے کے بعد پہلی رات جو بغیر دفنائے ہوئے گذرے اس رات میں سوال وجواب ہوگا یا میت کو دفنانے کے بعد ہوگا؟

الجواب:۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ میت سے سوال وجواب کا وقت اُسے دفن کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے جب تک میت کو دفن نہ کر دیا جائے اس وقت کوئی سوال وجواب نہیں ہوتا۔

قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: والسوال فی القبر بان مات ولم یدفن ایاما بان جعل فی التابوت لیحمل من مصر الی مصر اخرمالم یدفن لایسال۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱ ص۲۲۶ کتاب الجنائز) [2]

---

[1] لما قال الشیخ العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: وفی ردّ المحتار آداب زیارۃ القبور ثم یدعو قائما طویلا۔ اس سے دُعا کا جائز ہونا ثابت ہُوا اور ہاتھ اٹھانا مطلقاً آدابِ دُعا سے ہے پس یہ بھی درست ہُوا۔ (امداد الفتاوٰی ج ۱ ص۵۰ باب الجنائز)

[2] قال العلامۃ عبد الرحیم لاجپوریؒ: اس عبارت سے معلوم ہُوا کہ دفن کے بعد سوال ہوتا ہے۔ (فتاوٰی رحیمیہ جلد ۵ ص۹۷، باب احکام الجنائز)

میّت کو قبرستان تک لے جانے کا مسنون طریقہ

سوال:۔ میّت کو قبرستان تک لے جانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کے پاؤں کی طرف سے آگے لے جایا جائے گا یا سر کی طرف سے؟

الجواب:۔ جنازے کو قبرستان لے جاتے وقت میّت کے سر کو آگے کی طرف رکھنا چاہیئے۔

کما فی الهندیة: وفی حالة المشی بالجنازة یقدم الرأس۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۶۲ باب الجنائز) [1]

رنگ دار کپڑے میں میّت کو کفنانا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں کہ میّت کو سفید کپڑے کے علاوہ رنگدار کپڑے سے کفن پہنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میّت کے لیے کفن رنگین کپڑے سے تیار کیا جاسکتا ہے، جن رنگوں کا استعمال زندگی میں اس کے لیے جائز تھا مرنے کے بعد بھی کفن رنگ دار کپڑے سے تیار کرنا جائز ہے، البتہ افضل وبہتر یہ ہے کہ مُردے کو سفید کفن میں کفنایا جائے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولا بأس فی الکفن ببرود وکتان وفی النساء بحریر ومعصفر لجواز بما یجوز لبسه حال الحیٰوة واحبه البیاض اوما یصلی فیه۔

(الدر المختار علیٰ هامش الطحطاوی ج ۱ ص۳۷۶ باب صلوٰة الجنازة) [2]

---

[1] لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: جنازہ لے جانے کے وقت مُردہ کا سر آگے رکھنا چاہیئے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۱ ص۴۹۵ باب الجنائز)

[2] وفی الھندیة: ولا بأس بالبرود والکتان والقصب وفی حق النساء بالحریر والابریشم والمعصفر والمزعفر ویکره للرجال ذٰلك واحب الاکفان الثیاب البیض ..... وکل ما یباح للرجال لبسه فی حال الحیاة یباح تکفینه بعد الوفاة ومالا یباح له لبسه حال الحیاة لا یباح تکفینه بعد الوفاة۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۶۱ باب الجنائز۔ الفصل الثالث فی التکفین)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ دار العلوم الدیوبند ج ۵ ص۲۶۳ کتاب الجنائز۔

دریا میں ڈوب کر مرنے والے کو غسل دینے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص دریا میں ڈوب کر مر جائے تو کیا پانی سے نکالنے کے بعد بھی اسے غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- ہر مسلمان کو فوت ہو جانے کے بعد غسل دینا ضروری ہے چاہے وہ خشکی پر مرا ہو یا پانی میں ڈوب کر فوت ہوا ہو، تاہم اگر پانی سے نکالتے وقت غسل کی نیت سے میت کو تین غوطے دیئے جائیں تو اتنا ہی کافی ہے دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں۔

قال العلامة فخر الدین الشھیر بقاضی خانؒ: الغریق یغسل ثلٰثاً فی قول ابی یوسفؒ وعن محمدؒ فی روایۃ ان نوی الغسل عند الاخراج من الماء یغسل مرتین وان لم ینو یغسل ثلاثاً وعنہ فی روایۃ یغسل واحدۃ۔

(فتاوٰی قاضی خان ج ۱ ص۹۰ کتاب الجنائز) [1]

آبِ زمزم سے دھوئے ہوئے کفن کے استعمال کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک صاحب سے سنا ہے کہ زمزم کے پانی سے دھوئے ہوئے کپڑے کا کفن استعمال کرنا صحیح نہیں اس میں سوءِ ادب ہے، جس طرح اس پانی سے استنجاء وغیرہ کرنا مکروہ ہے تو اسی طرح اس سے کفن کے لیے کپڑے کو دھونا بھی کراہت سے خالی نہیں ہے، کیا واقعی مسئلہ کی نوعیت اسی طرح ہے؟

الجواب:- برکت کے حصول اور عذاب سے نجات کے لیے کوئی متبرک اپنے پاس رکھنا یا اس کو استعمال کرنا مرخص ہے، اسی طرح آبِ زمزم سے تر شدہ کفن استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: والغریق یغسل ثلاثاً عند ابی یوسفؒ وعن محمدؒ اذا نوی الغسل عند الاخراج من الماء یغسل مرتین وان لم ینو یغسل ثلاثاً۔ وفی روایۃ یغسل مرۃ واحدۃ۔

(البحر الرائق ج۲ ص۱۷۴ کتاب الجنائز)

قال العلامة اسماعیل حقی البروسویؒ : قال فی الاسرار المحمدیۃ لو وضع شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او عصاہ او سوطہ علی قبر عاص لنجا ذٰلک العاصی ببرکات تلک الذخیرۃ من العذاب ومن ھٰذا القبیل ماء زمزم والکفن المبلول بہ وبطانۃ استار الکعبۃ والتکفن بہا۔
(تفسیر روح البیان بحوالہ فتاوی رحیمیۃ ج ا ص۳۶۲ کتاب الجنائز) [۱]

جوتوں سمیت نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ دورِ حاضر میں بعض فیشن ایبل قسم کے لوگ جوتوں سمیت ہی نماز جنازہ پڑھ لیتے ہیں، تو کیا جوتوں سمیت نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر جوتے پاک، صاف اور ستھرے ہوں تو جوتوں سمیت نماز جنازہ پڑھنا صحیح ہے اور اگر جوتے نجس اور ناپاک ہوں تو ناپاک جوتوں کے ساتھ نماز جنازہ یا اور بھی کوئی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : ولو افترش نعلیہ وقام علیہما جازت وبھذا یعلم ما یفعل فی زماننا من القیام علی النعلین فی صلوٰۃ الجنازۃ لکن لا بد من طہارۃ النعلین۔
(البحر الرائق ج ۲ ص۱۲۹ کتاب الجنائز) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ المفتی عبد الرحیم لاجپوری : ہاں حصول برکت کی غرض سے آبِ زمزم میں تر کرکے خشک کیا ہوا کپڑا کفن میں استعمال کرسکتے ہیں اس میں سوءِ ادب جیسی کوئی چیز نہیں۔ (فتاوی رحیمیۃ ج ا ص۳۶۳ کتاب الجنائز)

[۲] قال العلامۃ المفتی عبد الرحیم لاجپوری : جوتیاں پہن کر یا جوتیاں نکال کر اس پر پاؤں رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کی صورت میں جوتیوں کا پاک ہونا ضروری ہے جوتیاں پاک ہوں گی تو نماز ہوگی ناپاک ہوں گی تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔
(فتاوی رحیمیۃ ج ا ص۳۶۰ کتاب الجنائز)

نفل نماز پڑھنے کے دوران جنازہ حاضر ہونے پر نماز توڑنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص نفل نماز کی نیت کر کے کھڑا ہو کہ اسی دوران کوئی جنازہ حاضر ہو جائے تو کیا یہ شخص اب نفل نماز توڑ کر جنازہ میں شریک ہو جائے یا نماز پوری کرے؟

الجواب:- نماز جنازہ ایک ایسی نماز ہے کہ اس کی کوئی قضاء نہیں، لہٰذا اگر متنفل (نفل نماز پڑھنے والے) کو نماز جنازہ کے فوت ہو جانے کا یقین ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ نفل نماز ختم کر کے نماز جنازہ میں شریک ہو جائے اور اگر اسے یہ یقین ہو کہ نفل نماز مکمل کر کے جنازہ میں شریک ہو سکے گا تو نفل نماز کو پورا کرے۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: اوكان في النفل فجئ بجنازة وخاف فوتها قطعه لامكان قضائه۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۶ باب النوافل)[1]

غلطی سے جنازہ الٹا رکھ کر اس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! اگر غلطی سے جنازہ الٹا رکھا گیا ہو یعنی میت کا سر جنوب کی طرف اور پاؤں شمال کی طرف ہو گئے ہوں اور اسی حالت میں جنازہ کی نماز بھی اس پر پڑھی گئی ہو تو کیا غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد اس پر دوبارہ نماز پڑھی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ میّت کا سر شمال اور پاؤں جنوب کی طرف کر کے جنازہ رکھا جائے، جان بوجھ کر قصداً و عمداً الٹا رکھنا کراہت سے خالی نہیں لیکن اگر سہواً ایسا ہو جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور نہ نماز دہرانے کی ضرورت ہے۔

قال العلامة السيد احمد الطحطاويؒ: وصحت لو وضعوا الرأس موضع الرجلين واساؤا ان تعمدوا۔ (طحطاوی حاشیة الدر المختار ج ۱ ص ۵۹۳ كتاب الجنائز)[2]

---

[1] قال المفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ: نماز جنازہ کے ہاتھ نہ آنے کا خوف ہو تو نماز میں شامل ہونے کی غرض سے نفل نماز توڑ سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۱ ص ۳۶۱ باب احکام الجنائز)

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا اخطئوا بالرأس وقت الصلوٰة فجعلوه في موضع الرجلين فصلوا عليها جازت الصلوٰة فان فعلوا ذلك عمداً جازت صلاتهم وقد اساؤا ولا تعاد۔ (فتاویٰ تاتارخانیة ج ۲ ص ۱۶۷ باب الجنائز المتفرقات)

قبرستان سے سبز گھاس ختم کرنے کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! بعض لوگ محرم الحرام کے مہینے میں اپنے رشتہ داروں کی قبروں سے سبز گھاس وغیرہ جڑسے اکھیڑتے ہیں اور ان پر نئی مٹی ڈالتے ہیں، شرعاً اس سبز گھاس کو ختم کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- سبز گھاس اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد بیان کرتی ہے اس لیے اسے قبروں سے ختم کرنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کے لیے خصوصاً محرم الحرام کا تعین تو اور زیادہ قبیح عمل ہے البتہ خشک گھاس کو مرخص ہے۔

قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: کرہ قطع الحشیش الرطب وکذا الشجرة من المقبرة لانہ مادام رطبا یسبح اللہ تعالیٰ فیونس المیت وتنزل بذکر اللہ تعالیٰ الرحمة ولا بأس بقلع الیابس منھما الحشیش والشجر لزوال المقصود۔

(مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص۱۲۱ کتاب الجنائز)[1]

قبرستان میں خشک گھاس کو آگ لگانے کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قبرستان میں جب بھی گھاس خشک ہوجاتی ہے تو لوگ اسے آگ لگادیتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اسلام نے قبرستان میں آگ لے جانے سے منع کیا ہے اس لیے خشک گھاس صاف کرنے کے لیے اُسے آگ نہ لگائی جائے بلکہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔

قال الشیخ المفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ:- جب قبرستان میں آگ لے کر جانے کی ممانعت ہے تو قبروں کے اوپر کی گھاس وغیرہ جلانے کی اجازت کس طرح ہوسکتی ہے! صفائی کے لیے دوسری تدبیر عمل میں لائی جائے۔

(فتاویٰ رحیمیہ ج۵ ص۱۰۳ باب احکام الجنائز)

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ویکرہ قطع الحطب والحشیش من المقبرة الا اذا کان یابساً ولا یستحب قطع الحشیش الرطب۔ (البحرالرائق ج۲ ص۱۹۶ باب الجنائز)

ومثلہ فی فتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۱۷۳ باب الجنائز المتفرقات۔

میّت کو دفن کرتے وقت اس کا منہ غلط سمت ہو جانے پر قبر کو دوبارہ کھولنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں ایک واقعہ پیش آیا ہے وہ یہ کہ ایک میت کو دفن کرنے والوں سے سہواً میّت کا منہ قبلہ رُخ کی بجائے مشرق کی جانب رہ گیا ہے، اب مٹی وغیرہ ڈالنے اور قبر برابر کرنے کے بعد یاد آیا کہ میت کا منہ تو قبلہ رُخ کرنا چاہیئے تھا، دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اب قبر کو دوبارہ کھول کر میت کا منہ قبلہ رُخ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمان میّت کو دفن کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ تدفین کے وقت میّت کا رُخ قبلہ کی طرف کیا جائے لیکن اگر غلطی سے میت کا رُخ قبلہ کی جانب نہ ہو سکے اور مٹی وغیرہ ڈالنے کے بعد یاد آئے تو اب قبر کو دوبارہ کھولنے کی ضرورت نہیں، تاہم اگر مٹی ڈالنے سے قبل یاد آجائے تو پھر مناسب یہ ہے کہ میّت کا رُخ قبلہ کی طرف کر دیا جائے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لودفن مستدبرًا لها واهالوا لتراب لاینبش لان التوجه الی القبلة سُنة والنبش حرام بخلاف ما اذا كان بعد اقامة اللبن قبل اهالة التراب۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۸۳۷ کتاب الجنائز۔ مطلب فی دفن المیّت) [1]

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: افاد کلام المصنف انهٗ لو وضع لغیر القبلة او علٰی شقه الایسر او جعل رأسهٗ فی موضع رجلیه او دفن بلا غسل واهیل علیه التراب فانهٗ لاینبش قال فی البدائع لان النبش حرامٌ

(البحرالرائق ج۲ ص۱۹۵ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی تاتارخانیة ج۲ ص۱۷۵ باب الجنائز المتفرقات۔

دفن سے پہلے میت کا چہرہ دیکھنا | سوال:۔ میت کو کفن دینے سے پہلے یا بعد اس کا چہرہ دیکھنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دفن سے پہلے پہلے میت کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، چاہے کفن دینے سے پہلے ہو یا کفن دینے کے بعد ہو۔

لما في الهندية: ولا بأس بأن يرفع ستر الميت ليرى وجهه وانما يكره ذلك بعد الدفن، كذا في القنية۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۵۱ كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيارة القبور وقراءة القرآن في المقابر)

دو قبروں میں سے میت کو نسی قبر میں دفن کی جائے | سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک عورت فوت ہوگئی ہے، شوہر والوں نے ایک جگہ قبر تیار کی اور اس کے بھائیوں نے دوسری جگہ، اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس عورت کو کس قبر میں دفن کیا جائے ؟

الجواب:۔ فتنہ اور فساد سے دور رہتے ہوئے جہاں چاہیں مرحومہ کو دفن کر دیں شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

رشتہ داروں کی قبریں ایک ساتھ ہونے کا حکم | سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے سخت بیماری کی حالت میں وصیت کی ہے کہ میرے مرنے کے بعد مجھے اپنے بھائی کے قریب دفن کیا جائے، تو کیا ان کی وصیت کو پورا کرنا ضروری ہے یا قبرستان میں جہاں جگہ ملے دفن کردیں شرعاً اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں اقارب اور رشتہ داروں کو ایک جگہ قریب قریب دفن کرنا مستحب ہے اس سے رشتہ داروں کی قبروں کی پہچان میں آسانی ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسکی خواہش فرمائی تھی اور ایسا کر کے دکھایا بھی ہے۔

لما ورد في الحديث: عن المطلب بن ابي وداعة قال: لما مات عثمان بن مظعون اخرج بجنازته فدفن فامر النبي صلى الله عليه وسلم رجلا ان يأتيه بحجر فلم يستطع حملها فقام اليها رسول الله صلى الله عليه وسلم .... فوضعها عند رأسه وقال اعلم بها قبر اخي وادفن اليه من مات من اهلي۔
(مشكوٰة ص۱۴۹ كتاب الجنائز، باب دفن الميت)

منکرِ حدیث کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! کسی پرویزی یعنی منکرِ حدیث کی نمازِ جنازہ پڑھنا، پڑھانا یا اس میں شرکت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ احادیثِ مبارکہ کو حجت ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے، اس کی حجیت کا انکار کرنا کفر ہے۔ اس لیے علماءِ امت نے پرویزی فرقے کے معتقدین کو خارج عن الاسلام قرار دیا ہے۔ چونکہ نمازِ جنازہ کے لیے میت کا مسلمان ہونا ضروری شرط ہے جو صورتِ مسئولہ میں مفقود ہے[۱] اس لیے کسی پرویزی (منکرِ حدیث) کی نمازِ جنازہ پڑھنا، پڑھانا یا اس میں شرکت کرنا ناجائز و حرام ہے۔

لقولہ تعالیٰ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ (سورۃ التوبۃ آیت ـــ)

قال اللہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى۔ (التوبہ ۱۱۳)

دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ زید بیرونِ ملک فوت ہوا وہاں اس کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی جس میں اس کے بیٹوں نے بھی شرکت کی، جب میت اس کے آبائی گاؤں لائی گئی تو اس کے دوسرے ورثاء نے اصرار کیا کہ ہم یہاں دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شرعاً اُن کو دوبارہ جنازہ پڑھنے کا حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ جب مسلمان میت پر اس کے ولی کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے تو دوبارہ (چاہے ولی موجود ہو یا نہ ہو) نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیئے اس لیے کہ ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[۱] لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: وشرطها ستۃ اسلام المیّت وطهارتہ مالم یهل علیہ التراب فیصلی علیٰ قبرہ بلا غسل۔
(رد المحتار ج ۱ ص ۶۴۲ باب الجنازہ، مطلب فی صلوٰۃ الجنائز)
ومثلہٗ فی طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص ۳۱۸ باب الجنائز۔

لما قال العلامة المرغينانیؒ: وان صلی غیر الولی او السلطان اعاد الولی یعنی ان شاء لما ذکرنا ان الحق للاولیاء وان صلی الولی لم یجز لاحد ان یصلّی بعدہ لان الفرض یتادی بالاول والنفل بہا غیر مشروع۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۶۲ کتاب الجنائز) ؎۱

میت کا قبر میں قبلہ رخ ہونا ضروری ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں قبریں شمالاً جنوباً کھودی جاتی ہیں، کیا ہر جگہ یہی حکم ہے یا نہیں؟ شرعی مسئلہ سے مطلع فرمائیں؟

الجواب:۔ میت کو قبر میں رکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کا چہرہ قبلے کی طرف ہو جاہے قبلہ شمالاً جنوباً ہو یا شرقاً غرباً، میت کے چہرے کا قبلہ کی طرف ہونا واجب ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ویوجہ الیہا وجوباً وینبغی کونہ علی شقہ الایمن ولاینبش لیوجہ الیہا۔ قال ابن عابدینؒ: قلتُ ووجہہ ان ظاہرہ التسویۃ بین الحیاۃ والموت فی وجوب استقبالہ۔

(رد المحتار ج ۲ ص۲۶۳ کتاب الجنائز، مطلب دفن المیت) ؎۲

؎۱ لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: لذا قلنا لیس لمن صلی علیہا ان یعید مع الولی لان تکرارہا غیر مشروع۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۲۳ کتاب الجنائز)

؎۲ لما فی الھندیۃ: ویدخل المیت مما یلی القبلۃ وذلک ان یوضع فی جانب القبلۃ من القبر ویحمل المیت منہ ویوضع فی اللحد فیکون الآخذ لہ مستقبل القبلۃ حالۃ الاخذ، کذا فی فتح القدیر ویقول واضعہ بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ کذا فی المتون ویوضع فی القبر علی جنبہ الایمن مستقبل القبلۃ، کذا فی الخلاصۃ۔

{الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۶ کتاب الجنائز
الفصل السادس فی القبر والدفن ...الخ}

ومثلہ فی قاضی خان علی ہامش الھندیۃ ج ۱ ص۱۹۴ باب غسل المیت.... الخ

باب فی حکم الشّھید

(شہید کے احکام و مسائل)

شہید کی حقیقت

سوال:۔ شریعتِ محمدی کی رُو سے ہم کس کو شہید کا نام دے کر بغیر غسل دینے کے دفن کر سکتے ہیں؟

الجواب: شہید کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے (۱) اُخروی شہید (۲) دنیوی شہید۔ اول الذکر شہید کا دائرہ وسیع ہے، لیکن احکام شہید کے اجراء کے لیے دنیاوی شہید ہونا ضروری ہے۔ فقہاء کرام کی عبارات کی رُو سے دُنیاوی شہید وہ مسلمان ہے جس کو کافر قتل کریں یا میدانِ جنگ میں مُردہ پایا جائے اور اس پر زخموں کے آثار ہوں یا ظلماً قتل کر کے اس کے قتل کے عوض دیت واجب نہ ہو۔ غسل نہ دینا دُنیاوی شہید کی خصوصیات میں سے ہے۔

قال برھان الدین المرغینانیؒ: الشھید من قتله المشرکون اووجد فی المعرکة وبه اثر اوقتله المسلمون ظلماً ولم یجب بقتله دیة فیکفن ویصلی علیه۔الخ ومن قتله اھل الحرب او اھل البغی اوقطاع الطریق فبایّ شیء قتلوه لم یغسل۔الخ

(الھدایة ج۱ ص۱۸۳ باب الشھید)[1]

اُخروی اور دنیوی شہید کے درمیان فرق

سوال:۔ اگر کوئی آدمی آگ میں جل جائے یا دریا میں ڈوب کر مر جائے یا کوئی گاڑی اُسے کچل ڈالے تو کیا اس کو شہید کہا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ ایسے شخص کو شہیدِ اُخروی کہنا درست ہے مگر دُنیوی شہید نہیں ہے، لہٰذا اس کو غسل وغیرہ دیا جائے گا، کیونکہ اخروی شہید وہ ہے جس کے بارے میں کتبِ فقہیہ نے

---

[1] وقال عبد اللہ التمرتاشیؒ: الشھید ھو کل مکلف مسلم طاھر قتل ظُلماً بجارحة ولم یجب بنفس القتل مال ولم یرتث وکذا لوقتله باغ اوحربی اوقاطع طریق او وجد جریحاً میتاً فی معرکتھم۔الخ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۴۷تا۲۴۹ باب الشھید)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۱ ص۱۶۷ باب الشھید۔

مندرجہ ذیل تعریف ذکر کی ہے :۔

قال الحصکفیؒ هو كل مكلف مسلم طاهر قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال ولم يرتث (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۲۴۷ باب الشهيد) ¹

زخمی ہونے کے بعد کھانے پینے کا موقع ملنے سے مقتول دُنیوی شہید نہیں رہتا

سوال :۔ اگر ایک مسلمان شہید کی تعریف کی رُو سے میدانِ کارزار میں زخمی ہو جائے یا کسی مسلمان کے ہاتھوں ظلماً زخمی ہو جائے اور پھر اس کا علاج بھی ہو، جس میں چند دن زندہ رہ کر کھانا پینا نصیب ہو جائے تو کیا اس سے دُنیاوی شہادت متاثر ہوتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایسا شخص اُخروی شہادت سے محروم نہیں رہتا، البتہ زخمی ہونے کے بعد کھانے پینے اور علاج معالجہ کے لیے موقع ملنے سے یہ دُنیوی شہید نہیں رہا، اس لیے اس کو غسل دیا جائے گا۔

لما فی الهندية :او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية كذا فی الكافی وبعد اسطر قال ويغسل من ارتث وهو من صار خلقاً فی حكم الشهادة لنيل مرافق الحياة وهو ان يؤكل او يشرب او ينام او يداوى ۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۶۸ باب الشهيد) ²

رات کے اندھیرے میں نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارا جانے والا شخص شہید ہے

سوال :۔ ایک شخص کو اپنے گھر میں رات کے وقت کسی نامعلوم آدمی نے قتل کر دیا تو کیا یہ مقتول شہداء میں شمار کیا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :۔ مذکورہ مقتول کا شہداء کے زمرے میں شمار کرنا صحیح ہے اور اس کا جنازہ

---

¹ وفی الهندية : وهو فی الشرع من قتله اهل الحرب والبغی وقطاع الطريق ۔ الخ
(الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۶۷ باب الشهيد)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۹۶ باب الشهيد ۔

² وقال محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ :هو كل مكلف مسلم طاهر قتل ظلماً ولم يجب بنفس القتل مال ولم يرتث ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۲۴۷ باب الشهيد)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدير ج۲ ص۱۰۸ باب الشهيد ۔

بغیر غسل کے پڑھا جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله او قاطع طریق) والمکابرون فی المصر لیلاً بمنزلة قطاع الطریق کما فی البحر عن شرح المجمع ممن قتلوه ولو بغیر محدد فهو شهید کما لو قتله القطاع وکذا من قتله اللصوص لیلاً۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۴۹ باب الشهید) [1]

محاذِ جنگ میں بم پھٹنے سے مرنے والوں کا حکم

سوال:۔ اگر ایک مجاہد محاذِ جنگ میں بم کے پھٹنے سے مر جائے تو کیا اس کو شہید سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ میدانِ کارزار میں شہادت کے لیے تلوار یا کسی دوسرے آلۂ جارحہ سے قتل ہونا ضروری نہیں بلکہ دشمن کے ہاتھوں سے جس کیفیت سے بھی مسلمان مر جائے تو وہ شہید سمجھا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں بم جدید ہتھیار کی ایک قسم ہے اس لیے اس کے ذریعے مقتول مسلمان شہید سمجھا جائے گا۔

لما فی الهندیة: والاصل ان کل من صار مقتولاً فی قتال ثلاث اهل الحرب او البغاة او قطاع الطریق بمعنی مضاف الی العدو وسواء کان بالمباشرة او السبب کان شهیداً۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۶۹ الفصل السابع فی الشهید) [2]

قاتل کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا ارادۂ قتل مبطل شہادت نہیں

سوال:۔ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کے ارادہ سے جا رہا تھا لیکن اُسے قتل کرنے سے پہلے اس کو کسی دوسرے آدمی نے بغیر کسی

---

[1] وقال علاؤ الدین الکاسانیؒ: ولو نزل علیه اللصوص لیلاً فی المصر فقتل بسلاح او غیره او قتله قطاع الطریق خارج المصر بسلاح او غیره فهو شهید۔ الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۳۲۱ فصل فی الشهید)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۹ باب الشهید۔

[2] وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وهو من قتله اهل الحرب او البغی او قطاع الطریق او وجد فی المعرکة وبه اثر۔ الخ۔ وبعد اسطر قال وقیدنا بکونه فی المعرکة وهی موضع الحرب لانه لو وجد فی عسکر المسلمین قتیلاً قبل لقاء العدو فلیس بشهید۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۶ باب الشهید)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص ۲۱۶ الفصل الخامس والعشرون فی الجنائز۔

وجہ کے راستہ میں قتل کر دیا، تو کیا اس مقتول کی شہادت میں قتل کا ارادہ کرنے سے کوئی خلل واقع ہُوا یا نہیں ؟

الجواب: یہ شخص از روئے شرع شہید ہے کیونکہ قاتل کے ہاتھوں سے وہ ظلماً قتل ہُوا ہے، البتہ دوسرے شخص کے قتل کے ارادہ سے اگرچہ یہ گنہگار ہوتا ہے لیکن قاتل کے حق میں مباح الدم نہیں ہو سکتا، اس لیے محض ارادہ کی وجہ سے اس کی شہادت متاثر نہیں ہوتی۔

قال برهان الدين المرغيناني: او قتله المسلمون ظلماً ولم يجب بقتله دية. الخ (الهداية ج ۱ ص۱۸۳ باب الشهيد) [۱]

تخریب کاری میں مرنے والے مسلمان شہید ہوتے ہیں

سوال: آجکل بڑے بڑے شہروں اور اجتماعات میں انتظامیہ کو بدنام کرنے کے لیے بموں کے دھماکے کیے جاتے ہیں جن میں بے شمار بےگناہ مسلمان مر جاتے ہیں ایسے مرے ہوئے لوگوں کا شریعت میں کیا حکم ہے ؟

الجواب: ایسے مقتولین شہداء کے حکم میں ہیں، ان کو غسل نہیں دیا جائے گا کیونکہ بم دھماکے کرنے والے افراد اسی نیت سے بم رکھتے ہیں تاکہ مظلوم مسلمانوں کا جانی نقصان ہو اور عوام جذبات میں آکر انتظامیہ کے متعلق کوئی قدم اٹھائیں۔

قال علامه ابن نجيم: كان ما قصد به القتل فهو تسبيب وما لا فلا۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۶ باب الشهيد) [۲]

ظلم کے تعین کے بغیر دنیوی شہید کا حکم لگانا درست نہیں

سوال: ایک شخص کسی جگہ مردہ پایا گیا، اس کے قتل کی وجوہات

---

[۱] وقال علاؤ الدين الكاساني: ومنها ان يكون مظلوماً الخ (بدائع الصنائع ج ۱ ص۳۲۰ فصل اما الشهيد)

[۲] وقال برهان الدين المرغيناني: او قتله المسلمون ظلماً ولم يجب بقتله دية فيكفن ويصلى عليه ولا يغسل لانه في معنى شهداء احد وقال عليه السلام فيهم زملوهم بكلومهم ودمائهم ولا تغسلوهم فكل من قتل بالحديدة ظلماً وهو طاهر بالغ ولم يجب به عوض مالى فهو في معناهم فيلحق بهم۔ (فتح القدير ج ۲ ص۱۰۳ باب الشهيد)

ومثله في تبيين الحقائق ج ۱ ص۲۴۷ باب الشهيد۔

معلوم نہیں، کیا ایسی صورت میں اسے شہید کہا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد ہے، البتہ دنیوی شہادت کا حکم لگانے کے لیے جب تک اس کا مظلوم ہونا ثابت نہ ہو تو اسے شہید نہیں کہا جائے گا۔

قال برھان الدین المرغینانیؒ: او قتله المسلمون ظلماً ولم یجب بقتله دیة الخ (الھدایة ج۱ ص۱۸۳ باب الشھید) [۱]

آپس کے تنازعات میں مرنے والے لوگوں کا حکم

سوال:۔ خاندانی اور قومی تنازعات میں مرنے والے لوگ شہداء کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ ایسے خاندانی تنازعات میں اگر مقتول نے فریقِ مخالف (قاتل) کے قتل کیلئے ابتداء نہیں کی ہو اور قاتل نے دیدہ دانستہ دوسرے مسلمان کا حق ظلماً چھین لینے کا ارادہ کیا ہو تو یہ مقتول شہید کے حکم میں آتا ہے، لہٰذا اس کا جنازہ بغیر غسل کے پڑھا جائے گا۔

قال علاؤالدین الکاسانیؒ: واذا عرف شرائط الشھادة فنقول اذا قتل الرجل فی المعرکة اوغیرھا وھو یقاتل اھل الحرب او قتل مدافعاً عن نفسه وماله واھله او واحد من المسلمین او اھل الذمة فھو شھید سواء قتل بسلاح او غیرہ لاستجماع شرائط الشھادة فی حقه۔ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۲۲ فصل اما الشھید) [۲]

دفاعی جنگ میں مرنے والوں کا حکم

سوال:۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان کی سرحدات پر جارحانہ حملہ کیا اور پاکستان کو بزعم خود ختم کرنے کا ارادہ کیا تو پاکستان کی طرف سے دفاع کرنا جہاد میں شمار

---

[۱] وقال علاؤالدین الکاسانیؒ: ومنھا ان یکون مظلوماً۔الخ (بدائع الصنائع ج۱ ص۳۲۰ فصل اما الشھید)
وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۲ ص— کتاب الجنائز باب الشھید۔

[۲] وفی الھندیة: ومن قتل مدافعاً عن نفسه او ماله او عن المسلمین او اھل الذمة بای آلة قتل بحدید او حجر او خشب فھو شھید۔الخ
(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۶۸ الفصل السابع فی الشھید)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۱۹۷ باب الشھید۔

ہوگا یا نہیں اور اس میں مرنے والے شہید ہوں گے یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ پاکستان نے یہ جنگ اپنے دفاع کے واسطے لڑی ہے لہٰذا یہ دفاعی جہاد شمار ہو کر اس میں حصّہ لینے والے مقتولین شہداء شمار ہوں گے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ودخل فیه المقتول مدافعاً عن نفسه او ماله او المسلمین او اهل الذمة فانهٗ شهید لکن لایشترط بحد دکما فی البحر عن المحیط - (ردالمحتار ج ۱ ص۶۷۲ باب الشهید) [1]

افغانستان کے جہاد میں مرنے والوں کا حکم

سوال :- افغانستان کے موجودہ جہاد کے دوران اگر کوئی قتل ہو جائے تو کیا اس کو شہادت کا مقام ملے گا یا نہیں ؟

الجواب :- جہادِ افغانستان چونکہ احیاءِ دین اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کیا جا رہا ہے لہٰذا اس میں حصّہ لینا ضروری ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حصّہ لینے والا اگر قتل ہو جائے تو وہ شہید ہوگا ۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : الشهید هو من قتله اهل الحرب او البغی او قطاع الطریق او وجد فی المعرکة وبه اثر او قتله مسلم ظلماً ولم یجب بقتله دیة -
(البحرالرائق ج ۲ ص۱۹۴ باب الشهید) [2]

---

[1] وفی الهندیة : ومن قتل مدافعاً عن نفسه او ماله او المسلمین او اهل الذمة بای آلة قتل بحدید او حجر او خشب فهو شهید کذا فی محیط السرخسی -
(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۶۸ باب الشهید)
وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص۱۹۷ باب الشهید -

[2] وقال العلامة الحصکفیؒ : وکذا یکون شهیداً لو قتل باغ او حربی او قاطع طریق - (درالمختار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۱ ص۶۷۲ باب الشهید)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۶۷ باب الشهید -

سوال ، از جناب مفتی صاحب! | شہید کو دفنانے سے قبل یا بعد اپنے وطن واپس لانا

عصرِ حاضر میں مجاہدین اسلام جس جگہ شہید ہو جائیں تو ان کی لاش کو قبل از دفن یا بعد از دفن قبر سے نکال کر اپنے وطن لانا شریعتِ مطہرہ کی رُو سے کیسا ہے؟ فائدہ اور نقصان، ثواب و عذاب جس میں ہو تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔ نیز عوام الناس میں یہ جو مشہور ہے کہ ہم نے فلاں میت کو اتنا عرصہ امانت کے طور پر دفنائے رکھا ہے پھر نکالنے میں جرم نہیں ہے، اس مسئلے کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ (الآیہ)

اسلام ایک مکمل دین اور مکمل قانون ہے۔ ہر ایک مسئلہ کے لیے اسلام میں جواز اور عدم جواز کی اصل اور دلیل موجود ہے۔ جن چیزوں کا تعلق مسلمانوں کی اس دنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی سے ہے قرآن و حدیث اور دیگر مذہبی کتب میں ان پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلمان کی زندگی اور موت سے وابستہ جتنے احکام ہیں ان کی تفصیلات میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی گئی، اور کسی شخص کی ذاتی رائے اور خواہش کو بھی اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مسلمانوں کو ہر حالت میں رضا بالقضا کا شیوہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالےٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے اور مطیع و فرمانبردار رہنے میں اس کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ مسلمان سے اس کی جان و مال کو اللہ تعالےٰ نے جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا اور اللہ کے دشمنوں سے لڑ کر ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرے گا اور اس میں اگر اسے اپنی جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ فرمانِ الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۱)

مسلمان کی موت جہاں بھی واقع ہو جائے وہ اس کے لیے مبارک ہے، چاہے تختِ پر ہو یا خاکِ زمین پر، لیکن اس سے ہزار درجہ بہتر و مبارک وہ موت ہے جو اللہ کے دین کی سربلندی میں تلواروں کے سایہ تلے واقع ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں شہداء کی امتیازی شان اور اعلیٰ مدارج پر فائز ہونے کا جا بجا ذکر ہے۔ شہید فی سبیل اللہ کی یہ

کتنی خوش قسمتی ہے کہ قیامت کے دن اُسی خون میں لت پت قبر سے اٹھایا جائے گا جو کہ معرکۂ کارزار میں دشمنوں کے وحشیانہ اور جارحانہ حملوں کے وار سہہ کر اللہ کی راہ میں نکل گیا تھا۔ ایسے مواقع میں ان اعلیٰ مدارج کی بناء پر شریعت نے شہید کے ورثاء کو استقلال اور صبر و استقامت کا سبق دیا ہے۔ غزوۂ اُحد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور کافروں نے ان کے کان اور ناک کاٹ کر مُثلہ بنا دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کا خطرہ میرے ساتھ نہ ہوتا کہ وہ کہیں گی کہ میرے بھائی کو دفن تک نہیں کیا گیا تو میں اپنے چچا کو ایسے ہی زمین پر چھوڑ دیتا اور درندے و پرندے آکر ان کے گوشت و پوست کو نوچ ڈالتے اور کل قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے حضور میں مجھے یہ سرخروئی حاصل ہوتی کہ میرے چچا کے گوشت و پوست کو درندوں اور پرندوں کے پیٹ سے جمع کیا جاتا اور میں کہتا کہ اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان نے تیری راہ میں یہ قربانی دی ہے ___ یہ کتنا بڑا مقام ہے اور کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر و استقلال کا مظاہرہ فرمایا اور ایسے مواقع پر صبر و استقلال سے کام لینے کی امت کو تعلیم دی۔

حضرت عمرو ابن جموح رضی اللہ عنہ ایک جان نثار اور عاشقِ رسول صحابی ہیں جو ایک پاؤں سے لنگڑے تھے، غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور جامِ شہادت نوش کیا، اور ساتھ آپ کے بیٹے بھی شہید ہوئے تو بیوی نے خاوند اور بیٹے کو اونٹنی پر لاد کر مدینہ طیبہ لے جانے کا ارادہ کیا تو اونٹنی میدانِ اُحد سے چند قدم آگے چل کر بیٹھ گئی، اور رُخ اُحد کی طرف کر لیا اور باوجود کوشش کے مدینہ منورہ کی طرف نہ چلتی تھی۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ گھر آتے وقت اس نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟ تو بیوی نے کہا جی ہاں! قبلہ کی طرف منہ کر کے یہ دُعا کی تھی: اللّٰہم لا تردّنی الیٰ اھلی، اے اللہ مجھے میدانِ جنگ سے گھر واپس نہ لانا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو یہیں دفن کر دو۔ چنانچہ وہیں دفن کئے گئے۔

ان فضائل، برکات اور بلند مراتب کی وجہ سے شریعت نے عام مردوں کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ جہاں ان کی موت واقع ہو وہیں ان کو دفن کرنے میں بہتری ہے ___ کتب مذہب میں میں یہاں تک لکھا ہے کہ آدمی کی جہاں موت واقع ہو جائے وہیں اسے دفن کرنا بہتر ہے ___ اور اگر قبل از دفن اس کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا جائے تو جائز ہے۔ لیکن جب ایک دفعہ اس کو دفن

کرکے اوپر مٹی ڈال دی گئی تو اب قبر کھودنا اور میت کو نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنا حرام اور گناہ ہے، ہاں اگر کوئی ضرورتِ شرعیہ داعیہ موجود ہو تو پھر ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً زمین مغصوبہ ہو یا شفعہ پر لی گئی ہو۔ ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل عبارات :۔

فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص۱۶۷ میں ہے: ویستحب فی القتیل والمیت دفنہ فی المکان الذی مات فی مقابر اولئک القوم، وان نقل قبل الدفن الی قدر میل او میلین فلا بأس بہ، کذا فی الخلاصۃ۔ وکذا لومات فی غیر بلدہ یستحب ترکہ فان نقل الی مصر آخر لا بأس بہ ولا ینبغی اخراج المیت من القبر بعد ما دفن الا اذا کانت الارض مغصوبۃ او اخذت بشفعۃ کذا فی فتاویٰ قاضی خان۔

درمختار میں ہے: ولا یخرج منہ بعد اھالۃ التراب الا لحق آدمی کان تکون الارض مغصوبۃ او اخذت بشفعۃ ــــ اس سے چند سطور آگے درمختار میں ہے: لا بأس بنقلہ قبل دفنہ ــــ اس کی شرح میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: واما نقلہ بعد دفنہ فلا مطلقاً قال فی الفتح واتفقت کلمۃ المشائخ فی امرأۃ دفن ابنھا وھی غائبۃ فی غیر بلدھا فلم تصبر وارادت نقلہ علی انہ لا یسعھا ذلک فتجویز شواذ بعض المتاخرین لا یلتفت الیہ واما نقل یعقوب و یوسف علیھما السلام من مصر الی الشام لیکونا مع آبائھما الکرام فھو شرع من قبلنا ولم یتوفر فیہ شروط کونہ شرعاً لنا۔ اھ

فقہاء کرام کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ میت شہید ہو یا غیر شہید قبل از دفن اس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن بہتر نہیں، اور بعد از دفن تو بالکل جائز نہیں، قبر کھولنا اور میت کا اخراج حرام ہے۔ ہاں اگر ضرورتِ شرعیہ پیش آجائے تو جائز ہے، اور ضرورتِ شرعیہ کی صورتیں اوپر مذکور ہوئی ہیں ــــ نیز میت کو کچھ عرصہ کے لیے امانتاً دفن کرکے پھر نکالنا یہ سب واہی تباہی باتیں ہیں، شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

فقط واللہ اعلم

حریق بالنار کے حکم کے بارے میں تعارض کا ازالہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! فتاویٰ ہندیہ کی ایک عبارت ولوکان المسلمون فی سفینۃ فرماھا العدو بالنار فاحترقوا من ذلک وتعدی الی سفینۃ اخری فیھا المسلمون فاحترقوا فھم کلھم شھداء کذا فی الخلاصۃ وحکمہ (ای الشھید) ان لا یغسل ویصلی علیہ کذا فی المحیط السرخسی ویدفن بدمہ وثیابہ کذا فی الکافی سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عبارت میں حریق بالنار کو حقیقی شہید کے حکم میں داخل کیا گیا ہے، حالانکہ عام فقہاء کرام نے حریق بالنار کو صرف اخروی شہداء میں شمار کیا ہے۔ برائے مہربانی اس تعارض کو رفع فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ حریق بالنار کے متعلق فتاویٰ ہندیہ اور دیگر کتب فقہ کی عبارات میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب اپنے اپنے محل کی مناسبت سے بالکل صحیح ہیں۔ اس لیے اگر آپ فتاویٰ ہندیہ کی مذکورہ بالا عبارت پر غور کریں تو اس میں فرماھا العدو بالنار کی قید بہت واضح نظر آتی ہے جو کہ قید احترازی ہے، اس لیے کہ دشمن خواہ کسی بھی چیز سے کسی مسلمان کو مار ڈالیں وہ شہید ہی ہوتا ہے۔ اور فتاویٰ ہندیہ کی عبارت میں دشمن کے آگ لگانے سے مرنے والے مسلمان کا حکم بیان ہوا ہے وہ بھی حریق بالنار العدو کے ساتھ خاص ہے، عام آگ سے جل کر مرنے والے کا حکم الگ ہے، جو کہ عام فقہاء کرام نے صرف شہید اخروی کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

ھکذا قال المفتی عبدالکریم: (الجواب) یہ حکم بالکل صحیح ہے کیونکہ رماھا العدو بالنار کی قید ہے، اور دشمن خواہ کسی چیز سے مار ڈالیں ہر حال میں شہید ہوتا ہے اور وہ حریق جس پر حکم شہید جاری نہیں ہوتا اس سے وہ مراد ہے جو بدون حملہ دشمنان ویسے ہی جل کر مر گیا ہو۔ (امداد الاحکام ج۱ ص۸۰۸ کتاب الجنائز، فصل فی الشہید)

کتاب الزکوٰۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

اُن کو اُن کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملیگا اور قیامت کے دن اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہونگے۔

سُورۃ البقرۃ : آیۃ ۲۷۷

بَاب وجوب الزکٰوۃ

(زکوٰۃ کے واجب ہونے کے مسائل)

دو ہزار روپے میں زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

سوال: ایک شخص کے پاس دو ہزار روپے ہیں، حولانِ حول (سال کے گذر جانے کے) بعد ان میں زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نصابِ زکوٰۃ ساڑھے باون (۵۲½) تولہ چاندی یا ساڑھے سات (۷½) تولہ سونا یا اس کی قیمت کے برابر نقدی ہے، لہٰذا اگر دو ہزار روپے چاندی یا سونے کی قیمت کے برابر بنتی ہو تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ اقل (رقم) میں زکوٰۃ نہیں۔

لما فی الھندیۃ: ومنھا کون المال نصاباً فلا تجب فی اقل منہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاول فی تفسیرھا وصفتھا) [۱]

زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیّت کی اہمیت

سوال: اگر ایک شخص پر زکوٰۃ فرض ہو اور وہ فقرا اور غرباء کو کچھ رقم صدقہ میں دے دے، کیا یہ ادائیگی زکوٰۃ میں شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب: زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت انتہائی ضروری ہے، صورتِ مسئولہ میں رقم دیتے وقت خیرات وصدقہ کی نیت تھی تو ادائیگی کے بعد زکوٰۃ کی نیت کرنے سے یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، تاہم اگر دینے کے وقت نیت کوئی نہ تھی لیکن بعد میں زکوٰۃ کی نیت کی اور رقم فقیر کی ملک میں ہو تو ایسی صورت میں یہ رقم زکوٰۃ میں شمار ہوگی۔

لما قال العلامۃ تمرتاشیؒ: وشرط صحۃ ادائہا نیۃ مقارنۃ لہ ای للاداء ولو کانت المقارنۃ حکماً کما لو دفع بلانیۃٍ ثم نوی والمال قائم فی ید الفقیر۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۸ کتاب الزکوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وسببہ ای سبب افتراضھا ملک نصابٍ حولی نسبۃ للحول لحولانہ علیہ تام بالرفع صفۃ ملک خرج مال المکاتب۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ۔

[۲] قال الشیخ نظام: واذا دفع الی الفقیر بلانیۃٍ ثم نواہ عن الزکوٰۃ فان کان المال قائماً فی ید الفقیر اجزاہ والا فلا۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی تفسیرھا وصفتھا)

وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علیٰ صدر طحطاوی ص ۳۸۸ کتاب الزکوٰۃ۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے حولانِ حول شرط ہے

سوال:۔ ایک آدمی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوگیا ہے جب تک اس کو جی پی فنڈ وغیرہ کی رقم حکومت کی طرف سے نہ ملے تو اس پر زکوٰۃ اور حج فرض نہیں لیکن جب اس آدمی کو یہ رقم مل جائے تو کیا اس پر فوری طور پر زکوٰۃ اور حج فرض ہوجائے گا یا سال گذرنے کے بعد؟

الجواب:۔ ایسے آدمی پر زکوٰۃ حولانِ حول کے بعد فرض ہوتی ہے، یعنی جب اس آدمی کو تمام واجبات کی رقم مل جائے اور اس کا اپنی رقم پر قبضہ ہوجانے کے بعد سال گذر جائے تو پھر اس آدمی پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور فوری طور پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی لیکن حج کے لیے حولانِ حول شرط نہیں صرف استطاعت شرط ہے۔

لما قال ابن نجیمؒ: والمراد بکونه حولیًا ان یتم الحول علیه وھو فی ملکه لقوله علیه السلام لا زکوٰۃ فی مالٍ حتی یحول علیه الحول۔ قال فی الغایه سمی حولاً لان الاحوال تحول فیه وفی القنیة العبرة فی الزکوٰۃ للحول القمری۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۰۳ کتاب الزکوٰۃ)[1]

زکوٰۃ کی ادائیگی میں قمری سال کا اعتبار ہوگا

سوال:۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے حولانِ حول کا ہونا جو ضروری قرار دیا گیا ہے تو اس سے کون سا سال مراد ہے؟ قمری یا شمسی؟ کیونکہ قمری سال شمسی سال سے نسبتاً کم ہوتا ہے۔

الجواب:۔ فقہاء کرام نے اس مسئلہ میں قمری سال کو اعتبار دیا ہے اس لیے زکوٰۃ کے فرضیت میں اسلامی (قمری) مہینوں کا سہارا لینا ضروری ہے، اور فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق قمری سال کی مقدار تین سو چون (۳۵۴) دن، آٹھ گھنٹے اور اڑتالیس منٹ ہیں۔

کما فی شرح الوقایة: والسنة القمریة اثنا عشر شهراً قمریاً و مدتها ثلاث مائة واربعة وخمسون یومًا وثُلُثُ یوم وثُلُثُ عشر یوم۔
(شرح الوقایة ج ۲ ص۱۴۴ باب العنین)

لما قال فی الهندیة: ومنها حولان الحول علی المال العبرة فی الزکوٰۃ

---

[1] قال شیخ الاسلام التمرتاشیؒ: وسببه ای سبب افتراضها ملک نصاب حولی نسبة للحول لحولانه علیه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ)
ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاول فی تفسیرها الخ

للحول القمری۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ) ؎۱

کئی سالوں کی زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے پاس تقریباً پندرہ (۱۵) تولے سونا تھا اور کئی سالوں تک اس کا مالک رہا لیکن ایک سال بھی زکوٰۃ نہ دی اب زکوٰۃ دینے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی میں بنیادی طور پر قیمت کی ادائیگی کا اعتبار فقراء کی ضرورت کے پیشِ نظر ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اس شخص کو جملہ ایامِ گذشتہ کی زکوٰۃ سونے کی مقدار سے فرض ہے، جملہ گذشتہ سالوں کا حساب کرکے پندرہ تولہ سے مفروضہ سونے کی مقدار مروجہ قیمت لگاکر ادا کرے، تاہم لاحق سال سے سابق سال کی مقدار منہاکرکے زکوٰۃ ادا کرے۔

لما قال التمرتاشیؒ: واللازم فی مضروب کل منہما (ای الذھب والفضۃ) ومعمولہ ولو تبرًا اوحلیاً مطلقاً مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقۃ لانہما خلقاً اثماناً فیزکیہما کیف کانا۔ (الدرالمختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۹۷ باب زکوٰۃ المال) ؎۲

کیا زکوٰۃ علی الفور واجب ہے یا علی التراخی

سوال:۔ نصاب مکمل ہونے کے بعد آدمی پر جب زکوٰۃ فرض ہوتی ہے تو یہ شخص زکوٰۃ کی رقم وقفے وقفے سے ادا کرتا رہے حتیٰ کہ اس پر سال گذرجائے تو آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ آیا زکوٰۃ علی الفور واجب ہے یا علی التراخی؟ جو ائمہ تراخی کے قائل ہیں اُن کے نزدیک وقفے وقفے میں زکوٰۃ دینا جائز ہے اور جو ائمہ علی الفور

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ نسبۃ للحول) ای الحول القمری لا الشمسی۔ (ردّ المختار ج۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: قمریۃ بالاھلۃ علی المذھب وھی ثلثمائۃ واربعۃ و خمسون یومًا وبعض یوم۔ (درالمختار ج۳ ص۴۹۷ باب العنین)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۰۳ کتاب الزکوٰۃ۔

؎۲ قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: وفی تبرالذھب والفضۃ وحلیھما واوانیھما الزکوٰۃ۔ (الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۶۳ باب زکوٰۃ فی الاموال فصل فی الذھب)

وَمِثْلُہٗ فی البدائع الصنائع ج۲ ص۱۷۶ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل صفۃ ھذا النصاب۔

کے قائل ہیں اُن کے نزدیک تراخی سے گناہ لازم آتا ہے، اور صاحب ہندیہ نے علی الفور کو اصح قرار دیا ہے جبکہ ابن الھمامؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ بلا عذر تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے ۔

لما قال الشیخ النظامؒ : وتجب علی الفور عند تمام الحول حتی یأثم بتاخیرہ من غیر عذر وفی روایة الرازی علی التراخی حتی یأثم عند الموت والاول اصح کذا فی التھذیب۔ (الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۱۷۰ کتاب الزکوٰة، الباب الاوّل) [۱]

زکوٰۃ کی ادائیگی میں وقت کا تعین کرنا

سوال: بعض لوگ زکوٰۃ رجب یا رمضان کے مہینے میں ادا کرتے ہیں، کیا ازروئے شرع اس کیلئے کوئی وقت متعین ہے یا نہیں؟

الجواب: ازروئے شرع زکوٰۃ کی ادائیگی سال پورا ہونے پر واجب ہے اس لیے اس میں کسی خاص مہینے کا تعین نہیں تاہم رمضان میں عبادات کی عظمت بڑھنے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس میں ادائیگی زیادہ مناسب ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ وجوب کے بعد رمضان تک مؤخر کرنے کے بجائے مالک ہونے کے بعد پہلے رمضان میں ادا کرے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وسببہ ای سبب افتراضھا ملک نصاب حولی نسبة للحول لحولانہ علیہ ۔ (الدر المختار ج ۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰة) [۲]

صاحبِ نصاب آدمی کے پاس سال کے درمیان میں مزید مال آجائے تو اس میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال: ایک شخص کے پاس رمضان میں دس ہزار روپے موجود تھے دوسرے سال رمضان آنے پر اس شخص کے پاس پچاس ہزار روپے پائے گئے، ظاہر ہے کہ دس ہزار روپے پر تو سال گذرا ہے لیکن بقیہ چالیس ہزار پر حولانِ حول

---

[۱] لما قال العلامة الحصکفیؒ : وافتراضھا عمری ای علی التراخی وصححہ الباقانی وغیرہ وقیل فوری ای واجب علی الفور وعلیہ الفتوی کما فی شرح الوھبانیة ۔ (الدر المختار ج ۲ ص۲۷۱ کتاب الزکوٰة قبیل من الباب السائمة)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایة علی صدر فتح القدیر ج ۲ ص۱۱۴ کتاب الزکوٰة ۔

[۲] قال الحسن بن عمار بن علیؒ : وشرط وجوب ادائھا حولان الحول علی النصاب الاصلی ۔ (مراقی الفلاح ص۳۸۹ کتاب الزکوٰة ۔

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرة النیرة ج ۱ ص۱۳۸/۱۳۹ کتاب الزکوٰة ۔

نہیں ہوا ہے، تو کیا اس شخص کو دس ہزار روپے سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا پچاس ہزار روپے پر زکوٰۃ لازم ہوگی؟

الجواب: ۔ زکوٰۃ کے نصاب پر سال کا گذرنا ضروری ہے یہ ضروری نہیں کہ تمام رقم پر پورا سال گذرے، صورتِ مذکورہ میں دورانِ سال جو آمدنی ہوتی ہے اس سے بھی رمضان میں زکوٰۃ ادا کی جائے گی، گویا مالِ مستفاد اگرچہ شعبان کے مہینے میں آیا ہو پھر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما قال العلامۃ حسن بن عمار بن علیؒ: وشرط وجوب ادائها حولان الحول علی النصاب الاصلی واما المستفاد فی اثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواء استفید بتجارة اومیراث اوغیره ۔ (مراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ص۳۸۸ کتاب الزکوٰۃ) [1]

سوال: ۔ اگر ایک آدمی نے غفلت سے یا قصداً اپنے مال سے زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے بعد عند الشرع کیا حکم ہے، آیا زکوٰۃ ساقط ہوگی یا پھر ادا کرنا ضروری ہے؟

زکوٰۃ قضاء ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: ۔ زکوٰۃ کے وجوب کے وقت جلدی ادا کرنا زیادہ مناسب ہے تاہم زکوٰۃ کسی وقت سے خاص نہیں کہ جس کے گذر جانے پر یہ قضا ہو بلکہ مدت گذرنے کے باوجود ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔

لما قال فی الهندیة: وتجب علی الفور عند تمام الحول حتی یأثم بتاخیره من غیر عذر وفی روایة الرازی علی التراخی حتی یأثم عند الموت والاوّل تصح ۔
(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاوّل فی تفسیرها الخ) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: والمستفاد ولو بهبةٍ او ارث وسط الحول یضم الی نصاب من جنسه فیزکیه بحول الاصل۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۲۸۸ باب زکوٰۃ الغنم)
وَمِثْلُہٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاوّل فی تفسیرها۔ الخ۔

[2] قال الشیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ: قال فی الوجیز علی الفور عند محمدؒ حتی لایجوز التراخی من غیر عذر فان لم یؤدها لا تقبل شهادته لانها حق للفقراء وفی تاخیر الاداء عنهم اضرارٌ لهم۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۳۸ کتاب الزکوٰۃ۔
وَمِثْلُہٗ فی المراقی الفلاح علی صدر طحطاوی ص۳۸۸ کتاب الزکوٰۃ۔

مکان کا نہ ہونا مانع وجوبِ زکوٰۃ نہیں

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے پاس نصاب کی مقدار سے زائد رقم موجود ہو لیکن اس آدمی کا ذاتی مکان نہیں ہے تو کیا یہ آدمی دوسروں سے زکوٰۃ لے سکتا ہے یا نہیں، اور اس پر اس رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک آدمی جب نصاب کا مالک ہو اور یہ رقم حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہو تو یہ آدمی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے بلکہ اس کو خود بھی اس رقم کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اگر مملوکہ مکان نہ ہو تو یہ ایسا عذر نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے اسے غریب شمار کیا جائے، جب تک یہ رقم خرچ نہ ہو تو ضرورت سے زائد متصور ہوگی۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا الی غنیّ یملک قدر نصاب فارغ عن حاجته الاصلية من ای مال کان۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۴۷ باب المصرف)[1]

مہتمم مدرسہ کا ذاتی مال طلباء پر خرچ کرنے کیلئے روزانہ نیت ضروری ہے یا ایک دفعہ کافی ہے

سوال:۔ ایک صاحب کا اپنا دینی مدرسہ ہے اور مدرسے کی تمام ضروریات مثلاً اساتذہ کی تنخواہ، بجلی کا بل وغیرہ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے، مہتمم صاحب نے شروع سے نیت کی ہے کہ مدرسے کے جس شعبہ میں زکوٰۃ جائز ہے تو وہ میری زکوٰۃ ہے اور جس میں زکوٰۃ جائز نہیں وہ میری طرف سے خیرات ہے، تو آیا مہتمم کے لیے روزانہ یا ماہانہ یا سالانہ نیت ضروری ہے یا ایک دفعہ ہی زکوٰۃ کی نیت کافی ہے؟

الجواب:۔ اگر مہتمم صاحب زکوٰۃ کا مال جدا کرتے وقت نیت کریں اور پھر وہ منہا شدہ رقم تھوڑی تھوڑی خرچ کریں تو دوبارہ نیت کی ضرورت نہیں بلکہ زکوٰۃ جدا کرتے وقت نیت کرنا ہی کافی ہے، اور اگر تھوڑا تھوڑا کرکے خرچ کرے اور پہلے سے نیت نہ ہو تو اس وقت نیت ضروری ہے ورنہ پھر زکوٰۃ نہ ہوگی۔

لما فی البزازية: قال کلما تصدّقت فی هذه السنة فهو عن الزكوٰة ثم جعل يتصدّق

---

[1] قال الشیخ النظام: ولا یجوز دفع الزکوٰة الیٰ من یملک نصاباً ای مال کان دنانیر او دراهم اوسوائم اوعروضاً للتجارة اولغیر التجارة فاضلاً عن حاجته فی جمیع السنة هکذا فی الزاهدی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة، الباب السابع فی المصارف)
ومِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۲۴۲ الفصل الثامن فی اداء الزکوٰة۔

ولا یحضرہ النیۃ ان کان افرز جملۃ من المال فی حرۃ وقال وقت الادی الا قوانہ ذلک وقع الکل عن الصدقۃ والا لا ۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الہندیۃ ج۴ ص۸۶ فصل الثانی فی المصرف نوع آخر)[1]

سوال:۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ آدمی کب صاحبِ نصاب بن گیا تو کیا کرنا چاہیئے؟

اگر کسی شخص کو اپنے غنی (یعنی صاحبِ نصاب) ہونے کا علم نہ ہو کہ میں کب سے صاحبِ نصاب ہُوا ہوں، تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب:۔ ایسے شخص کو جتنی مدت سے صاحبِ نصاب ہونے کا ظن غالب ہو تو اُس وقت سے حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے تاہم احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا زیادہ احوط ہے ۔

لما قال ابن نجیم المصریؒ: والظن الطرف الراجح وھو ترجیح جھۃ الصواب والوھم رجحان جھۃ الخطاء واما اکبر الرأی وغالب الظن فھو الطرف الراجح اذا اخذ بہ القلب وھو المعتبر عند الفقہاء... وبعد اسطر وغالب الظن عندھم ملحق با لیقین وھو الذی یبتنی علیہ الاحکام ۔ (الاشباہ والنظائر ج۱ ص۲۴۰/۲۴۱ القاعدۃ الثالثۃ الیقین لایزول بالشک)[2]

سوال:۔ حوائجِ اصلیہ کے لیے جمع کی ہوئی رقم میں زکوٰۃ کا مسئلہ

ایک شخص جو کسی سرکاری یا کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہو، ذاتی مکان نہ ہونے کی وجہ سے اپنی تنخواہ سے اس نے کئی سالوں میں کچھ بچا کر رقم جمع کی ہوئی ہو، یہ رقم اگرچہ ایک لاکھ روپے تک پہنچتی ہو لیکن ذاتی مکان کے لیے زمین خریدنے اور اس پر آبادی کے لیے یہ رقم ناکافی ہو، محض ذاتی ضرورت کی تکمیل کے لیے یہ رقم رکھی گئی ہو تو کیا حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس رقم سے کسی قسم کی تجارت بھی

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وشرط ادائھا نیۃ مقارنۃ للاداء او لعزل ما وجب او تصدق بکلہ ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۱۰ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثلُہٗ فی الھدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۲۵ کتاب الزکوٰۃ ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: (تحت قولہ ولو دفع بتحر الخ) والظن ترجیح احدھما من غیر دلیل والتحری ترجیح احدھما بغالب الرأی وھو دلیل یتوصل بہ الیٰ طرف العلم وان کان لایتوصل بہ الیٰ مایوجب حقیقۃ العلم ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۹ باب المصرف)

نہیں ہو رہی، ممکن ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کرنے یہ تمام رقم ختم ہو جائے اور مکان بنانے کی خواہش پوری نہ ہو سکے؟ اس بارے میں شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وجوبِ زکوٰۃ کے لیے فقہاء نے فارغ عن الدّین و عن حوائج الاصلیہ کی قید کا ذکر کیا ہے، ایسی صورت میں حوائج اصلیہ میں مصروف اور مشغولیت میں تو یقیناً زکوٰۃ واجب نہیں لیکن جو رقم کسی ضرورت کی تکمیل مثلاً مکان، اسلحہ، کتب وغیرہ کے لیے رکھی گئی ہو اور مجموعہ رقم پر سال گذر جائے تو ایسی رقم میں وجوبِ زکوٰۃ کے بارے میں فقہاء کی رائے مختلف ہیں، شیخ ابن الملک کے نزدیک ایسی رقم حکماً ضروریات میں مصروف ہے جو بمنزلہ معدوم ہو کر اس میں حولانِ حول کے باوجود زکوٰۃ واجب نہیں۔ فاذا کان عندہ دراھم اعدھا لھٰذہ الاشیاء وحال علیھا الحول لا تجب فیھا الزکوٰۃ۔ علامہ ابنِ عابدین کا میلان بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں: فاذا کان لہٗ دراھم مستحقۃ یصرفھا الی تلک الحوائج صارت کالمعدوم کما ان الماء المستحق یصرفہ الی العطش کان کالمعدوم وجاز عندہ التیمم الخ۔ لیکن ابن نجیمؒ کی عبارت سے ایسی رقم میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ ویخالف ما فی المعراج فی فصل زکوٰۃ العروض ان الزکوٰۃ تجب فی النقد کیفما امسکہ للنماء او للنفقۃ (ج ۲ ص ۲۰۶)

موجودہ وقت میں انسان کی غیر متناہی ضروریات کے تقاضا کی صورت میں کسی شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں رہے گی، ہر شخص ایک بڑی رقم کسی عالیشان محل، موٹر، ایئرکنڈیشن اور دوسری ضروریاتِ زندگی خریدنے کے ارادہ سے رکھے گا جو اس کی ضروریات میں مصروف ہو کر زکوٰۃ کا موقع نہیں رہے گا، اس لیے احتیاطاً ہر صورت میں زکوٰۃ ادا کی جائے گی خواہ یہ رقم مکان خریدنے کے ارادہ سے کیوں نہ ہو۔ اگر فقہاء کی عبارات کو دیکھا جائے تو ان میں بھی فارغ عن الدّین وعن الحوائج الاصلیۃ لکھا گیا ہے، اس پر کسی نے نہیں لکھا ہے کہ فارغ عن قیمۃ حوائج الاصلیۃ۔ یہ عبارت بھی وجوبِ زکوٰۃ کی نشاندہی کرتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ویخالف ما فی المعراج فی فصل زکوٰۃ العروض ان الزکوٰۃ تجب فی النقد کیفما امسکہ للنماء او للنفقۃ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ) [1]

---

[1] وفی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: وھو مخالف لما فی المعراج والبدائع ان الزکوٰۃ تجب فی النقد کیف امسکہ للنفقۃ او للنماء (ص ۳۸۹ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی حاشیۃ علی الدرر ص ۱۰۴ کتاب الزکوٰۃ۔

حوائجِ اصلیہ سے زائد رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ نصابِ زکوٰۃ روپوں کی تعداد کے لحاظ سے کتنی ہے اور گھر کی ضروری حاجات سے جو رقم زائد ہو اُس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر کسی کے پاس نقد روپے موجود ہوں جو تمام حوائجِ اصلیہ اور قرض وغیرہ سے خالی ہوں، حوائجِ اصلیہ زمانہ عرف اور حالات سے بدلتے رہتے ہیں، جب تمام اخراجاتِ ضروریہ کے علاوہ جو رقم مقدارِ نصاب تک پہنچے تو حولانِ حول سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور روپوں سے زکوٰۃ نکالنے میں سونا اور چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اس لیے نقد رقم کا نصاب ایک مقرر نہیں ہوسکتا کیونکہ سونے اور چاندی کی قیمت بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے اس لیے مقدارِ نصاب میں بھی کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وسببہ ای سبب افتراضھا ملک نصاب حولی نامٍ فارغ عن دین لہٗ مطالب من جھۃ العباد و فارغ عن حاجتہ الاصلیۃ لان المشغول بھا کالمعدوم۔
(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص ۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

محفوظ رقم میں ہر سال کی علیحدہ زکوٰۃ واجب ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس نقد اتنی رقم ہو جو مقدارِ نصاب کو پہنچتی ہے اور کئی سال تک اس کے استعمال کی نوبت نہ آئے تو کیا یہ شخص صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرے گا یا اسے ہر سال کی علیحدہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص کے پاس نقد اتنی رقم موجود ہو جو مقدارِ نصاب کو پہنچتی ہو یا نصاب سے زائد ہو تو سال کے گذرنے سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح جتنے سال یہ رقم محفوظ رہے گی اور مقدارِ نصاب میں بھی کوئی فرق نہ آیا ہو تو ہر سال کی علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: الزکوٰۃ واجبۃ علی الحر العاقل البالغ المسلم

---

[۱] قال زین الدین ابن نجیمؒ: وملک نصاب حولی فارغ عن الدّین وحوائجہ الاصلیۃ نامٍ ولو تقدیراً۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۷۳ کتاب الزکوٰۃ۔

اذا ملك نصاباً ملكاً تاماً وحال عليه الحول ۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۸۵ کتاب الزکوٰۃ) [1]

زکوٰۃ کی یکمشت ادائیگی ضروری نہیں

سوال :۔ اگر کسی کے پاس زکوٰۃ کی رقم موجود ہو اور وہ کسی مستحق کو ماہانہ کچھ رقم بطور زکوٰۃ دیتا ہے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب :۔ زکوٰۃ کی ادائیگی یکمشت ضروری نہیں، قسط وار دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو سکتی ہے، تاہم مجموعی طور پر ادائیگی کے وقت نیّت ضروری ہے ورنہ ہر قسط میں نیّت کرنا پڑے گی۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ : او مقارنۃ بعزل ما وجب کلہ او بعضہ ولا یخرج عن العھدۃ بالعزل بل بالاداء للفقراء ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۶۹ کتاب الزکوٰۃ) [2]

مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ ہے

سوال :۔ اگر کسی کے پاس نصابِ زکوٰۃ موجود ہو لیکن منکوحہ کے حق مہر کی ادائیگی تاحال اس کے ذمہ باقی ہو، ایں صورت یہ شخص اگر حق مہر ادا کرے تو باقی مال نصابِ زکوٰۃ سے کم رہتا ہے، کیا اس شخص پر زکوٰۃ واجب رہے گی یا نہیں؟

الجواب :۔ منکوحہ کا حق مہر مستقل حق ہے جس کی ادائیگی خاوند کے ذمہ واجب ہے، اگر خاوند فوت ہو جائے تو منکوحہ کا حقِ مہر دیگر قرضہ کی طرح متروکہ جائیداد سے ورثاء کے درمیان تقسیم کرنے سے قبل منہا کیا جائے گا۔ خاوند کی اس ذمہ داری سے فراغت کے لیے حق مہر کی ادائیگی یا منکوحہ کی طرف سے برضاء ورغبت معافی کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں لہٰذا خاوند کے ذمہ واجب الادا قرضہ ہونے کی وجہ سے یہ مانع وجوب زکوٰۃ ہے، اگر نصاب سے حق مہر منہا کرکے باقی کا نصاب نہ بنتا ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں رہے گی اور اگر بقایا مال نصاب کی مقدار

---

[1] قال علاؤالدین الحصکفیؒ : وسببہ ای سبب افتراضھا ملك نصاب حولی تام ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۹۵ کتاب الزکوٰۃ)

ومِثلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ ۔

[2] قال زین الدین ابن نجیمؒ : وشرط ادائھا نیّۃ مقارنۃ للاداء او لعزل ما وجب او تصدق بکلہ ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۰ کتاب الزکوٰۃ)

ومِثلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ ۔

تک پہنچتا ہو تو پھر مہر مؤجل منہا کر کے بقایا رقم سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ قال ابن عابدینؒ: فارغ عن دَین لهٗ مطالب من جهة العباد سواء کان للّٰه کزکوٰة وخراج او للعبد ولو کفالة او مؤجلاً ولو صداق زوجة المؤجل وفی رد المحتار والصحیح انه غیر مانع۔ (کتاب الزکوٰۃ ج۲ ص۵)

البتہ منکوحہ کے حق میں دَین قوی نہ ہونے کی وجہ سے جب تک حقِ مہر وصول نہ ہوا ہو تو اس کے ذمہ زکوٰۃ واجب الادا نہیں، منکوحہ پر مہر مؤجل میں زکوٰۃ کے وجوب کا اعتبار وصولی کے بعد رہے گا، تاہم اگر منکوحہ کے پاس اس کے علاوہ نصاب موجود ہو اور حولانِ حول سے قبل مہر مؤجل وصول ہو جائے تو پھر مالِ مستفاد کے حکم میں ہو کر تمام مال میں زکوٰۃ واجب رہے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وعند قبض مائتین مع حولان الحول بعده ای بعد قبض من دَین ضعیف وهو بدل غیر مال کمهر ودیة الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۰۶ باب زکوٰۃ المال) [1]

حج کے لیے جمع شدہ رقم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی نے حج کے لیے کئی سالوں سے کچھ رقم بینک میں جمع کی ہو اور رقم نصاب سے زیادہ ہو تو کیا حولانِ حول کے بعد اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ حج کے لیے رقم رکھنے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی، جب تک یہ رقم حج میں خرچ نہ ہوئی ہو اور اس کی ضروریات سے زائد ہو تو اس پر حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب رہے گی۔

قال ابن عابدینؒ: فی المعراج فی فصل زکوٰة العروض ان الزکوٰة تجب فی النقد کیفما امسکه للنماء او للنفقة۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: وعلٰی هٰذا یخرج مهر المرأة فانه یمنع وجوب الزکوٰة عندنا معجلا کان او مؤجلا لانها اذا طالبته یؤاخذ به۔ وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا یمنع لانه غیر مطالب به عادة۔ الخ (بدائع الصنائع ج۲ ص۶ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۳ کتاب الزکوٰة۔ الباب الاول۔

[2] قال زین الدین ابن نجیمؒ: ویخالفه ما فی المعراج الدرایة فی فصل زکوٰة العروض ان الزکوٰة تجب فی النقد کیفما امسکه للنماء او للنفقة۔ اھ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۶ کتاب الزکوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی حاشیة الطحطاوی علٰی مراقی الفلاح ص۳۸۹ کتاب الزکوٰة۔

منگنی یا شادی کے مال پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: منگنی یا شادی کے لیے خریدے ہوئے سامان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ جبکہ اس سامان کی قیمت مقدار نصاب سے بہت زیادہ ہے۔

الجواب: منگنی و شادی کے لیے جمع شدہ سامان چونکہ اثاث البیت میں داخل ہے اور اثاث البیت پر زکوٰۃ لازم نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں منگنی یا شادی کے سامان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمت وسلاح الاستعمال زکوٰۃ۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۶۹ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

شادی کے لیے جمع شدہ رقم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص نے شادی کے لیے کچھ رقم جمع کی ہے جو کہ نصاب سے متجاوز ہے اور یہ رقم کئی سال اُس شخص کے پاس موجود رہی لیکن پورے وسائل میسّر نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک شادی نہیں کی جبکہ یہ رقم ضرورتِ شادی کے لیے مختص ہے، کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: جب تک یہ رقم خرچ نہیں ہو تو شادی کی ضروریات کی وجہ سے وجوبِ زکوٰۃ متاثر نہیں ہوتی اور اس شخص پر باقاعدہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح اگر والد نے اپنی اولاد کی شادی کے لیے رقم جمع کی ہو اور نصابِ زکوٰۃ تک پہنچتی ہو تو حولانِ حول کے بعد اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے۔

وسبب لزوم ادائھا توجہ الخطاب یعنی قولہ تعالیٰ: وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ وشرطہ ای شرط افتراض ادائھا حولان الحول وھو فی ملکہ وَثَمَنِیَّۃُ المال کالدراھم والدنانیر لتعینھما للتجارۃ باصل الخلقۃ فتلزم الزکوٰۃ کیفما امسکھما

---

[۱] قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا فی ثیاب البدن المحتاج الیھا لرفع الحر والبرد ابن ملک واثاث المنزل ودور السکنی ونحوھا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۶۴ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔

و لونفقۃ عیالہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ) لـه

گھر میں استعمال ہونے والے سامان میں زکوٰۃ نہیں

سوال:۔ گھریلو ضروریات کیلئے رکھے ہوئے سامان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ نیز ضرورت کا معیار کیا ہونا چاہیئے؟ بسا اوقات گھر میں متعدد بسترے اور کھانے پینے کے برتن پڑے رہتے ہیں جن کی قیمت ہزاروں روپے تک پہنچتی ہے۔

الجواب:۔ ضرورت کے وقت جس سامان کے استعمال کی حاجت پڑے تو وہ اشیاء گھریلو ضروریات کے زمرہ میں شمار ہوں گی۔ معاشرہ میں وقت، حالات اور تعلقات میں اختلاف کی وجہ سے ضروریات میں تفاوت لازمی چیز ہے۔ اگر کسی مسلمان کے مہمان زیادہ آتے ہوں تو اس کیلئے زیادہ سامان رکھنا ضروری ہے، بہرحال ضرورت کا کوئی مخصوص معیار نہیں ہے۔ قال محمد ابن عبد الباقی الزرقانیؒ فی شرح الزرقانی علی المواھب اللدنیۃ فکان یقتصر منه قدرا اوصفۃ علیٰ قدر الحاجۃ الخ۔ وقال جنس الفراش فیصدق بتعددہ عند الاحتیاج الیه لکثرۃ ضیفاته عادۃ (ج ۵ ص۶) تاہم جو چیز گھر کے استعمال کے نام سے خریدی جائے خواہ ضرورت کے لیے ہو یا ضرورت سے زائد ہو لیکن تجارت کی نیت سے نہ خریدی گئی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ قربانی اور صدقۂ فطر کے لیے ضرورت سے زائد اشیاء کی قیمت لگا کر اگر نصاب کو پہنچے تو پھر قربانی اور صدقۂ فطر واجب رہے گا۔

قال الامام علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمۃ وسلاح الاستعمال زکوٰۃ۔
(الھدایۃ ج ۱ ص۱۶۹ کتاب الزکوٰۃ) ٢ـه

لـه وشرط وجوب ادائھا ای افتراضھا حولان الحول وھو فی ملکه ای فی ثمنیۃ المال کالدراھم والدنانیر۔ (حاشیۃ الطحطاوی ص۳۸۹ کتاب الزکوٰۃ حاشیۃ الطحطاوی الخ)
ومثلهٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ۔

٢ـه قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکذا فی ثیاب البدن المحتاج الیھا لدفع الحر والبرد ابن ملك واثاث المنزل ودور السکنی ونحوھا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ)
ومثلهٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔

نابالغ اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب! نابالغ اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: زکوٰۃ کے وجوب میں مُودی کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے، لہٰذا بناء برایں نابالغ اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولیس علی الصبی والمجنون زکوٰۃ۔
(الهدایة ج ۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

والد کے مال سے بیٹا بلا اجازتِ والد زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں

سوال: اگر والد کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہوتی ہو تو یہ زکوٰۃ بلا اجازتِ والد کے بیٹا کسی مستحق کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بغیر اجازت والد کے بیٹا اس کے مال میں سے زکوٰۃ نہیں دے سکتا، البتہ اگر والد کی اجازت کے بغیر بیٹے نے والد کے مال میں سے زکوٰۃ دے دی اور پھر والد نے ایسی حالت دیکھی کہ وہ زکوٰۃ کی رقم فقیر (محتاج) کے ہاتھ میں موجود تھی تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ والا فلا

لما قال فی الهندیة: رجل ادی زکوٰۃ غیرہ عن مال ذٰلك الغیر فاجازہ المالك فان کان المال قائماً فی ید الفقیر جاز والا فلا۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاول) [۲]

میّت کی طرف سے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی حینِ حیات میں خود زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو اس کی وفات کے بعد اگر اس کے ورثاء اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہیں تو یہ زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہ؟

الجواب: اگر میّت نے مرتے وقت وصیّت کی ہو کہ میرے ذمے اتنی زکوٰۃ کی ادائیگی

---

[۱] قال العلامة علاؤالدین الحصکفیؒ: وشرط افتراضها عقل وبلوغ ۔۔۔ الخ
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۵۸ کتاب الزکوٰۃ)
ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ۔

[۲] قال الحسن بن عمار بن علیؒ: ولو مقارنة حکمیة کما لو دفع بلا نیة ثم نوی والمال قائم بید الفقیر ولا یشترط علم الفقیر انها زکوٰۃ۔ (مراقی الفلاح ص۳۹۰ کتاب الزکوٰۃ)
ومِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۲۶۸ کتاب الزکوٰۃ۔

باقی ہے تو ثلث جائیداد سے وصیت پر عمل کرنا واجب ہے، ورثاء پر لازم ہے کہ ذمّہ کی فراغت کے لیے اس کی وصیت پر عمل کریں، اور اگر مرنے والے نے وصیت نہ کی ہو تو اگرچہ ورثاء پر لازم نہیں لیکن ادائیگی کی صورت میں فراغ ذمّہ کی اُمید ہے۔

لما قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله ولو مات فأداها وارثه جاز) فی الجوهرة اذا مات من علیه الزکوٰة اوفطرة اوکفارة اونذر لم تؤخذ من ترکته عندنا الا ان یتبرع ورثته وهم من اهل التبرع ولم یجبروا علیه وان اوصی تنفذ من الثلث۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۵۹ باب صدقة الفطر) [1]

نوٹ سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

سوال:۔ کیا زکوٰۃ میں دس پانچ یا دس روپے کے نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ مال نہیں بلکہ ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ حامل ھذا کو مطالبہ پر ادا کیا جائے گا۔

الجواب:۔ کرنسی نوٹ کی حقیقت کے بارے میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں، کچھ علماء کے نزدیک مروجہ کرنسی نوٹ ایک رسید کی مانند ہیں یعنی جس نوٹ پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اتنا حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کیا جائے گا" تو اس سے جنس میں خرچ ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا نہیں ہو سکتی، تاہم ایک روپے کے نوٹ پر یہ الفاظ نہیں لکھے ہوتے اس لیے اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ لیکن جن علماء کے نزدیک مروجہ کرنسی نوٹ ثمن عرفی کے حکم میں ہیں جیسا کہ یہ احتمال راجح ہے، تو اس صورت میں نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔

• قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز دفع القیمة فی زکوٰة وعشر وخراج وفطرة ونذر وکفارة غیر الاعتاق وتعتبر القیمة یوم الوجوب۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۵) [2]

---

[1] قال الشیخ النظامؒ: اذا مات من علیه زکوٰة اوفطرة اوکفارة اونذر لم یؤخذ من ترکته عندنا الا ان یتبرع ورثته بذلك وهم من اهل التبرع فان امتنعوا لم یجبروا علیه وان اوصی بذلك یجوز وینفذ من ثلث ماله۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۹۳ کتاب الزکوٰة الباب الثامن فی صدقة الفطر)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۳ کتاب الزکوٰة۔فصل بیان مایسقطها۔

[2] قال فی الهندیة: ویجوز دفع القیم فی الزکوٰة عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۱ الباب الثالث فی زکوٰة الذهب، مسائل شتّی)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۱ کتاب الزکوٰة۔

قرض پر دی ہوئی رقم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے پاس کچھ رقم موجود ہے جس کی زکوٰۃ وہ خود ادا کرتا ہے لیکن کچھ رقم اس سے عزیز و اقارب نے بطور قرض لی ہوئی ہے جس کی باوجود تحریری سند کے واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہو تو ایسے قرض پر دی ہوئی رقم میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر عزیز و اقارب اس قرض کا اقرار کرتے ہوں یعنی قرض واپس کرنے سے منکر نہ ہوں تو وصولی کی صورت میں گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی واجب ہوگی۔ تاہم اگر یہ رقم یکمشت حاصل ہو جائے تو رقم وصول ہونے ہی اس کی مقدار سے حساب کرکے ۴۰/۱ واں حصہ ادا کرے۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: واعلم ان الدیون عند الامام ثلٰثۃ قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکوٰتہا اذا تم نصاباً وحال الحول لکن لا فوراً بل عند قبض اربعین درھماً من الدین (اقول وھو خمس النصاب) من الدین القوی وبدل مال تجارۃ فکلما قبض اربعین درھماً یلزمہ الدرھم۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۰۵ باب زکوٰۃ المال) [1]

کمیٹی کی رقم یعنی بیسی میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ہم بائیس افراد نے مل کر ایک کمیٹی بنائی ہے جس میں ہر ایک ممبر پانچ سو روپیہ ماہوار جمع کراتا ہے، اور ہر ماہ کے آخر میں قرعہ اندازی سے نام نکالتے ہیں جس کا بھی نام نکل آئے تو جمع شدہ رقم (گیارہ ہزار روپے) اُسے دے دی جاتی ہے، اسی طرح اکیس ماہ بعد میرا نام نکل آیا تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اکیس ماہ بعد میں نے جو رقم حاصل کی ہے اس میں زکوٰۃ کا کیا طریقہ کار ہوگا؟ رقم ملتے ہی زکوٰۃ دینی ہوگی یا سال کے بعد؟

الجواب:۔ اگر آپ پہلے سے صاحبِ نصاب ہیں تو اپنے نصاب کے ساتھ اس کمیٹی والی

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمارؒ: الدین علیٰ اقسام قوی ووسط وضعیف فالقوی وھو بدل القرض ومال التجارۃ اذا قبضہ وکان علیٰ مقرٍ ولو مفلساً او علیٰ جاحدٍ علیہ بینۃ زکّاہ لما مضیٰ ویتراخی وجوب الاداء الیٰ ان یقبض اربعین درھماً ففیہا درھم لان ما دون الخمس من النصاب عفو لا زکوٰۃ فیہ صح وکذا فیما زاد بحسابہ۔

(مراقی الفلاح ص ۳۹۰ کتاب الزکوٰۃ)

ومثلہٗ فی الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص ۳۹۰ کتاب الزکوٰۃ۔

رقم کی زکوٰۃ بدستور دیا کریں، اور اگر آپ پہلے سے صاحبِ نصاب نہیں تو جب کمیٹی میں آپ کی رقم نصاب کے برابر جمع ہو جائے تو اُسی وقت سے آپ صاحبِ نصاب شمار ہوں گے اور اس کے حساب سے حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ دیں گے خواہ اقساط پر سال گذرا ہو یا نہ ؟

لما قال التمرتاشی والعلامۃ الحصکفیؒ: وَسَبَبُہٗ ای سبب افتراضھا ملك نصاب حولی نسبۃ للحول لحولانہ علیہ ...... والمستفاد ولو بھبۃٍ او ارثٍ وسط الحول یضم الی نصاب من جنسہ فیزکیہ بحول الاصل۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ولو بھبۃ اَو ارثٍ) ادخل فیہ المفاد بشراء او میراث او ھبۃ وما کان حاصلاً من الاصل کالاولاد والربح (رد المحتار ج۲ ص۲۸۸ کتاب الزکوٰۃ مطلب محمد امام فی اللغۃ واجب الخ) [1]

قرض منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ دی جائے گی یا قرض کی موجودگی میں؟

سوال:۔ ایک شخص کے پاس بیس ہزار روپے نقد ہوں لیکن اُس کے ذمہ واجب الادا قرض بھی ہو، اگرچہ قرض فی الحال ادا کرنا ضروری نہ ہو لیکن قرض خواہ کی طرف سے کسی وقت بھی اس کا مطالبہ ہو سکتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی حالت میں موجود تمام رقم پر زکوٰۃ واجب ہو گی یا پہلے قرض منہا کیا جائے گا؟

الجواب:۔ جو قرض واجب الادا ہو اور مدیون سے مطالبہ ہو رہا ہو یا دائن کے پاس گواہان موجود ہوں تو کل مال سے قرضہ منہا کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی اگرچہ کسی وقت بھی ادا ہو، لیکن اگر قرض پورے مال کو محیط ہو تو پھر اس کے ذمہ کوئی زکوٰۃ نہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ومن کان علیہ دَینٌ یحیط بمالہٖ فلا زکوٰۃ علیہ

---

[1] قال فی الھندیۃ: ومن کان لہٗ نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالاً من جنسہ ضمہ الیٰ مالہ وزکاہ سواء کان المستفاد من نمائہ اوْلا وبای وجہ استفاد ضمہ سواء کان بمیراث او ھبۃ او غیر ذٰلك ولو کان من غیر جنسہ من کل وجہ کالغنم مع الابل فانہٗ لایضم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۵ الباب الاوّل)

وفیہ ایضاً: تجب فی کل مائتی درھم خمسۃ دراھم وفی کل عشرین مثقال ذھب نصف مثقال الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۱ فصل حولان الحول فلیس من شرائط الاداء۔

وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصاباً۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۶۶ کتاب الزکوٰۃ) [1]

بیٹی کے حق مہر کی رقم والد نے لی ہو تو زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

سوال: ایک شخص نے اپنی بیٹی کا حق مہر تقریباً دس ہزار روپے لے کر اپنے پاس رکھا، تو سال گذر جانے کے بعد زکوٰۃ کس پر لازم ہو گی؟ باپ یا بیٹی پر؟

الجواب: اگر بیٹی نے شرم و حیاء کی وجہ سے یہ رقم اپنے والد کو دے دی ہو تو اس ہبہ کا اعتبار نہیں کیونکہ ہبہ میں رضاءِ واہب ضروری ہے، پس اس صورت میں زکوٰۃ لڑکی پر واجب ہو گی، اور باپ کے لیے اس رقم کا استعمال جائز نہیں، البتہ اگر بیٹی نے یہ رقم خوشی سے باپ کو دی ہو تو پھر باپ کے لیے اس کا استعمال جائز ہے اور اس رقم کی زکوٰۃ والد پر واجب ہو گی۔

لما فی الھندیۃ: ومن کان لہٗ نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالاً من جنسہ ضمہ الیٰ مالہ وزکّاہ سواءکان المستفاد من نمائہ اولا۔ وبای وجہٍ استفاد ضمہ سواءکان بمیراثٍ اوھبۃٍ اوغیر ذٰلک ولوکان من غیرجنسہ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاوّل فی تفسیرھا) [2]

وجوب زکوٰۃ کے لیے قرض کا منہا کرنا

سوال: ایک شخص کے پاس بارہ ہزار روپے کے زیورات ہیں اور دس ہزار روپے کا وہ مقروض بھی ہے تو کیا اس صورت میں وہ بارہ ہزار سے زکوٰۃ دے گا یا قرض منہا کرکے دو ہزار سے دے گا؟

الجواب: اگر اس آدمی کے پاس زیورات کے علاوہ کوئی دوسری رقم نہ ہو جس سے وہ قرضہ ادا کر سکے تو اس صورت میں وہ صرف دو ہزار روپے میں زکوٰۃ ادا کرے گا بشرطیکہ یہ رقم نصاب تک پہنچتی ہو، اور اگر قرضہ کی ادائیگی کے لیے اور بھی کچھ ہو تو اس صورت میں بارہ ہزار پر

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ فارغ عن دَین لہٗ مطالب من جھۃ العباد) وھٰذا اذا کان الدَّین فی ذمتہ قبل وجوب الزکوٰۃ فلو لحقہ بعدہ لم تسقط الزکوٰۃ لانھا ثبتت فی ذمتہ فلا یسقطھا مالحق من الدَّین بعد ثبوتھا۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۲۶۰ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۲/۱۷۳ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاوّل۔

[2] قال ابن نجیمؒ: والمطلق فی المستفاد تشمل المستفاد بمیراثٍ اَوْھِبَۃٍ اوشراءٍ اووَصِیَّۃٍ۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۲۲ فصل فی الغنم)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج ۲ ص۱۱۲ کتاب الزکوٰۃ۔

زکوٰۃ لازم ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: سَبَبُہٗ ای سبب افتراضھا ملک نصاب۔۔۔۔۔۔۔ تام۔۔۔۔۔۔ فارغ الدّین لہٗ مطالب من جھۃ العباد سواءٌ کان للہ کزکوٰۃ وخراج۔۔۔ وسبب لزوم ادائھا توجہ الخطاب رقولہ تعالیٰ: وَاٰتُوا الزکوٰۃ) وشرطہ ای شرط افتراض ادائھا حولان الحول وھو فی ملکہ وثمنیۃ المال کالدراھم والدنانیر لتعینھما للتجارۃ باصل الخلقۃ فتلزم الزکوٰۃ کیف امسکھما ولو للنفقۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۰/۲۶۷ کتاب الزکوٰۃ)[1]

امانت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک آدمی نے دوسرے شخص کے پاس کچھ رقم بطورِ امانت رکھی ہے، تو اس کی زکوٰۃ اصل مالک پر ہوگی یا جس کے پاس رقم بطورِ امانت رکھی ہے؟

الجواب: کسی کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھنے سے اس کی ملکیت زائل نہیں ہوتی، اس لیے جب تک ملکیت مبرہن اور مسلّم ہو تو اصل مالک پر بعد از حولانِ حول زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ فلولہ بینۃ تجب) والظاھر علی القول بالوجوب ان حکمہ حکم الدّین القوی۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۶۶ کتاب الزکوٰۃ)[2]

---

[1] قال فی الھندیۃ: منھا الفراغ عن الدّین قال اصحابنا کل دَین لہٗ مطالب من جھۃ العباد یمنع وجوب الزکوٰۃ۔۔۔۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۲ الباب الاوّل)

وفیہ ایضاً: تجب فی کل مائتی درھم خمسۃ دراھم وفی کل عشرین مثقال ذھب نصف مثقالٍ مضروباً کان اولم یکن مصوغاً کان اوغیر مصوغ حلیاً کان للرّجال اوللنساء تبرًا کان اوسبیکۃ کذا فی الخلاصۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع جلد۲ ص۱۶، ۱۷ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل فی صفۃ ھذا النصاب۔

[2] قال الامام ابن الھمامؒ: (تحت قولہ ولوکان الدّین علیٰ مقر) ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی الاداء الیٰ ان یقبض اربعین درھمًا۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۲۳ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی تفسیرہ۔

حلال وحرام سے مخلوط مال میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بینک کے سُودی کھاتہ جات میں نقد رقم جمع کی ہو اور کئی سال کے بعد سُود کے اضافے کی وجہ سے وہ رقم کئی گنا زیادہ ہوگئی، تو ایسی صورت میں اگر وہ شخص زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو کیا اصل رقم سے زکوٰۃ ادا کرے گا یا مع سود کُل رقم سے زکوٰۃ ادا کرے گا؟

الجواب:۔ اگر حلال اور حرام کی مقدار معلوم ہو تو حلال آمدنی سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، اور حرام مال کے بارے میں اصل حکم یہ ہے کہ اگر وہ کسی اور شخص کا مال ہو تو اس کو واپس کیا جائے اور جہاں کہیں مالک معلوم نہ ہوسکے تو بلانیتِ ثواب خیرات کردیا جائے تاکہ حرام مال سے ذمّہ فارغ ہوجائے اور اگر مالک کا ذہن نہیں بنا ہوا اور وہ دونوں (حرام اور حلال مال) سے مجموعی زکوٰۃ دینا چاہے تو یہ بھی اس کے حق میں باعثِ تخفیف ہے جس کی رُو سے حلال مال سے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی اور حرام مال میں زکوٰۃ کے نام سے ادا شدہ رقم سے اس کی ذمہ داری فارغ ہوگی، ایسی حالت میں اگر حلال اور حرام میں تمیز نہ ہوسکے اور دونوں قسم کا مال اکٹھا ہو تو پھر بھی یہی حکم ہے۔

لما قال ابن نجیمؒ: ولذا قالوا لو ان سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملكاً له حتى وجبت عليه الزكوٰة وورث عنه على قول ابوحنيفةؒ لان خلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهلاك اما على قولهما فلا۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۰۵ كتاب الزكوٰة) [1]

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ آجکل بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری محکموں میں ملازمین کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اور کچھ رقم محکمہ اپنی طرف سے ملا کر اس رقم کو ملازم کے نام پر جمع کرتا ہے، اور یہ رقم ملازم کو ملازمت کے ختم کرنے سے قبل نہیں دی جاتی بلکہ ملازمت ختم ہونے (یعنی ریٹائر ہونے) پر دی جاتی ہے اور عُرف

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لواخرج زكوٰة المال الحلال من مال حرام ذكر في الوهبانية انه يجزى عند البعض ونقل القولين في القنية۔ وقال في البزازية لونوى في المال الخبيث الذى وجبت صدقته ان يقع عن الزكوٰة وقع عنها اى نوى في الذى وجب التصدق به لجهل اربابه۔

(ردالمحتار ج ۲ ص۲۹۱ مطلب في التصدق من المال الحرام الثاني في المصرف نوع آخر)

وَمِثْلُهٗ في البزازية على هامش الهندية ج ۴ ص۸۶ كتاب الزكوٰة۔

میں اس رقم کو پراویڈنٹ فنڈ کہتے ہیں، کیا ایسی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ جو ملازم کی تنخواہ سے جبراً کچھ رقم کاٹتا ہے، اور باوجود ملازم کی ملک ہونے کے اس مال پر ملازم کو تصرف وقبضہ حاصل نہیں ہوتا تو فقہاء کی تصریح کے مطابق اس پر زکوٰۃ نہیں۔ علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں فرمایا ہے: روی ابن ابی شیبة فی مصنفه عن عمر ابن میمون قال قال اخذ الولید بن عبد الملك مال رجل من اهل الرقة یقال له ابو عائشة عشرین الفا فالقاها فی بیت المال فلما ولی عمر بن عبد العزیز اتاه ولده فرفعوا مظلمتهم الیه فکتب الی میمون ان ادفعوا الیهم اموالهم وخذوا زکوٰة عامهم هذا۔ الخ۔ کیونکہ یہ دَین ضعیف میں شامل ہے جو وصولی کے بعد حولانِ حول سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وعند قبض مائتین مع حولانِ حول بعده ای بعد القبض من دَین ضعیف وهو بدل غیر مال کمهر ودیة وبدل کتابة وخلع۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۰۶ باب زکوٰۃ المال)[1]

شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- اس جدید دور میں شیئرز کا کاروبار عروج پر ہے جس میں مشترکہ سرمایہ نصاب زکوٰۃ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے لیکن ان کو تقسیم کیا جائے تو بعض حصہ داروں کا حصہ نصاب تک پہنچتا ہے اور بعض کا نہیں، تو اس میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- زکوٰۃ کے معاملہ میں جیسا کہ مال کا نصاب تک پہنچنا ضروری ہے بالکل اسی طرح مزکّی کا بھی صاحبِ نصاب ہونا ضروری امر ہے۔ یہاں اگرچہ مشترکہ مال نصاب زکوٰۃ سے زیادہ ہے لیکن تقسیم کے بعد بعض حصہ داروں کا حصہ نصاب زکوٰۃ تک پہنچتا ہے اور بعض کا نہیں، اس لیے شیئرز کے کاروبار میں مشترکہ مال پر زکوٰۃ نہیں بلکہ ہر حصہ دار کے حصہ پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ حصہ دار صاحبِ نصاب بن سکتا ہو۔

---

[1] قال زین الدین ابن نجیمؒ: وفی الضعیف لا تجب ما لم یقبض نصاباً ویحول الحول بعد القبض علیه۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۷ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فیه ۔۔۔۔۔ وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ویتراجعان بالحصص وبیانه فی الحاوی فان بلغ نصیب احدھما نصاباً زکوٰۃ دون الاخر ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۰۴ باب زکوٰۃ السائمۃ) [1]

لمیٹڈ کمپنیوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ چند اشخاص مشترکہ کاروبار کرتے ہیں اور جس کی مالیت نصابِ زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے، لیکن اگر اس کو تقسیم کیا جائے تو ہر ایک کے حصہ کی مالیت نصابِ زکوٰۃ سے کم ہے، تو کیا اس پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے لیے جس طرح مال کا نصاب تک پہنچنا ضروری ہے اسی طرح مزکی (یعنی زکوٰۃ دینے والے) کا صاحبِ نصاب ہونا بھی ضروری ہے ۔ صورتِ مسئولہ میں اگرچہ مشترکہ مالیت نصابِ زکوٰۃ سے زیادہ ہے لیکن اگر تقسیم کرنے کے بعد ہر ایک کا حصہ نصاب تک نہ پہنچتا ہو تو اس مالِ مشترکہ پر زکوٰۃ نہیں، تاہم اگر مالیت اس قدر ہو کہ اگر اس کو تقسیم کیا جائے اور ہر ایک کا حصہ یا جس کسی کا حصہ نصاب تک پہنچتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے ۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فاما اذا کانت مشترکة بین اثنین فقد اختلف فیه قال اصحابنا انه یعتبر فی حال المشترکة مایعتبر حال الانفراد وھو کمال النصاب فی حق کل واحدٍ منھما فان کان نصیب کل واحد منھما یبلغ نصاباً تجب الزکوٰۃ والا فلا ۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۔۔۔۔) [2]

---

[1] لما قال العلامة الکاسانیؒ: فاما اذا کانت مشترکة بین اثنین فقد اختلف فیه قال اصحابنا انه یعتبر فی حال المشترکة مایعتبر حال الانفراد وھو کمال النصاب فی حق کل واحد منھما فان کان نصیب کل واحد منھما یبلغ نصاباً تجب الزکوٰۃ والا فلا ۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۔۔ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج ۲ ص۲۹۷ کتاب الزکوٰۃ ۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: لا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت ۔۔۔۔۔ وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ۔۔۔۔ فان بلغ نصیب احدھما نصاباً زکوٰۃ دون الاخر ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۰۴ باب زکوٰۃ المال)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوی تاتارخانیة ج ۲ ص۲۹۷ کتاب الزکوٰۃ ۔

فکسڈ ڈپازٹ پرزکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ جدید بینکاری نظام میں ایک کھاتا فکسڈ ڈپازٹ ہے جس میں رقم ایک مقررہ مدت مثلاً تین سال یا پانچ سال کے لیے جمع کی جاتی ہے اور اس مدت کے ختم ہونے سے قبل کھاتہ دار اپنی رقم بینک سے واپس نہیں لے سکتا، تو کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کے وجوب کے لیے اگرچہ ملکِ تام کا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر کوئی شخص اپنے اختیار سے اپنا مال دوسرے کے حوالہ کردے اور دوسرا شخص اس کا مقر ہو لیکن سردست دینے والا مال پر قبضہ نہ کرسکتا ہو تو یہ دَین میں داخل ہے اس لیے اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی مگر ادائیگی اس وقت ضروری ہے جب وہ مال قبضہ میں آجائے لہٰذا بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں زکوٰۃ فرض ہے مگر ادائیگی بوقتِ وصول لازمی ہوگی۔

لما قال الحصکفیؒ: لو کان الدین علی مقر ملی اوعلی معسر اومفلس ای محکوم بافلاسہ اوعلی جاحد علیہ بینۃ وعن محمدؒ لازکوٰۃ وھوالصحیح ذکرہ ابن ملک وغیرہ لان البینۃ قدلا تقبل اوعلم بہ قاض سیجیٔ ان المفتی بہ عدم القضاء بعلم القاضی فوصل الی ملکہ لزم زکوٰۃ ما مضی۔ (الدرالمختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۷ کتاب الزکوٰۃ)[1]

انعامی بانڈز پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے پاس ۵۰ ہزار روپے کے انعامی بانڈز ہیں، کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر واجب ہے تو کب ادا کی جائے گی؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے دَین کی تین[۳] اقسام لکھی ہیں جس میں دَین وسط کی تعریف بانڈز پر صادق آتی ہے اس لیے کہ بانڈز خود مال نہیں بلکہ یہ اُس مال کی رسید ہے جو آپ کا حکومت یا کسی پرائیویٹ ادارے کے پاس قرض کی شکل میں موجود ہے، اسلئے بانڈز کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن جب یہ بانڈز مالیت کی شکل اختیار کرکے آپ کے ہاتھ آجائے تو گذشتہ اور موجودہ سال سب کی زکوٰۃ دینا لازم ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولوکان الدّین علیٰ مقر ملئی اوعلی معسر اومفلس ای

---

[1] قال الامام المرغینانیؒ: ولوکان الدّین علیٰ مقر ملئی اومعسر تجب الزکوٰۃ لامکان الوصول الیہ ابتداء الخ — قال ابن الھمامؒ: تحتہ ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی الاداء الیٰ ان یقبض اربعین درھماً ففیھا درھم۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۲۳ کتاب الزکوٰۃ)

محکوم یا فلاسہ او علیٰ جاحد علیہ بینۃ .... فوصل الیٰ ملکہ لزم زکوٰۃ مامضی ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۶۷ کتاب الزکوٰۃ) [1]

پرائز بانڈز زکوٰۃ میں دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کے پاس پرائز بانڈز ہوں اور وہ اُن کو زکوٰۃ میں دینا چاہے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟

الجواب:۔ بانڈز خود مال نہیں بلکہ یہ اُس مال کی رسید ہے جو حکومت (بینک والوں) کے پاس آپ کی مالیت کی صورت میں موجود ہے جبکہ زکوٰۃ میں تملیک المال ضروری ہے اور زکوٰۃ کی ایک اہم شرط ہے جو یہاں مفقود ہے اس لیے زکوٰۃ میں پرائز بانڈز دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی ۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : ھی تملیک خرج الاباحۃ فلو اطعم نادیًا الزکوٰۃ لایجزیہ الا اذا دفع الیہ المطعوم ...... جزء مال خرج النفعۃ فلو اسکن فقیرا دارہ سنۃ نادیًا لایجزیہ ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۵۶ کتاب الزکوٰۃ) [2]

بینک اور انشورنس سے حاصل شدہ منافع پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ بینک کے مختلف کھاتہ جات یا انشورنس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینک یا دیگر سودی اداروں کی طرف سے جو منافع ملتا ہے وہ ربٰو (سود) ہے جو از روئے شرع حرام ہونے کی بناء پر واجب التصدق ہے اس لیے اس حاصل شدہ منافع پر کوئی زکوٰۃ نہیں، البتہ اگر یہ سود اصل مال کے ساتھ خلط ہوا ہو اور غالب حصہ حلال مال کا ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہی ذخائر میں اس کی نظیر یہ ہے کہ :۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ

---

[1] لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ : لو کان الدّین علیٰ مقر ملئ او معسر تجب الزکوٰۃ لامکان الوصول الیہ ۔ قال ابن الھمام تحت قولہ ...... ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی الاداء الیٰ ان یقبض اربعین درھما ففیھا درھم ۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۱۲۳ کتاب الزکوٰۃ)

[2] لما قال الامام ابو البرکات النسفیؒ : ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ ۔ (کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)

فتجب الزکوٰۃ فیہ ویورث عنہ لأن الخلط استھلاک اذا لم یمکن تمییزہ عند ابی حنیفۃ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۹ باب زکوٰۃ الغنم)

پیشگی کرایہ کی رقم میں زکوٰۃ مالک پر ہے نہ کہ کرایہ دار پر

سوال:۔ آجکل بازاروں میں ایک عجیب رواج چلا ہے کہ بڑی بڑی مارکیٹوں کے مالک دوکاندار (کرایہ دار) سے پیشگی کرایہ لیتے ہیں، اس خطیر رقم سے مالکِ دوکان ہر ماہ اپنا کرایہ منہا کرتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی یعنی کون زکوٰۃ ادا کرے گا؟ مالکِ دوکان یا کرایہ دار؟

الجواب:۔ فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشگی کرایہ لینے سے مالکِ دوکان اُس کرایہ کا مالک بن جاتا ہے، دوکاندار اُس سے مطالبہ نہیں کر سکتا، اس لیے اِس مالیت کی زکوٰۃ بھی مالکِ دوکان ہی پر واجب ہے اور وہی ادا کرے گا، دوکاندار (کرایہ دار) پر واجب نہیں۔

لما قال الشیخ ابن الھمامؒ: واما زکوٰۃ الاجرۃ المعجلۃ عن سنین فی الاجارۃ الطویلۃ التی یفعلھا بعض الناس عقوداً ویشترطون الخیار الثلاثۃ ایام فی رأس کل شھر فتجب علی الآجر لانہ ملکھا بالقبض۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۲۱ کتاب الزکوٰۃ) [1]

زرِضمانت کی رقم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ آجکل انگریزی قانون کے مطابق کوئی بھی عدالت جب کسی مجرم کو آزاد کرتی ہے تو اس سے زرِضمانت (کچھ نقد رقم) وصول کرتی ہے جو کہ حکومت کے خزانہ میں جمع ہوتی ہے، تو اس رقم کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے وجوب کیلئے اہم شرط ملکیتِ تامہ ہے یعنی مالک مال کے رقبہ کا بھی مالک ہو اور اُس پر ہر وقت تصرّف کر سکتا ہو یعنی اُس کے قبضہ میں ہو۔ یہاں زرِضمانت کی رقم اگرچہ اصلاً ضمانت جمع کرانے والے کی ملکیت ہے لیکن بطورِ ضمانت جمع کرنے کے بعد اُس

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: ذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفھا اھل بخاری ان الزکوٰۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الآجر لانہ ملکہ قبل الفسخ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۶ کتاب الزکوٰۃ)

کے تصرّف اور قبضہ سے خارج ہو کر حکومت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جس میں ملکیتِ تامہ باقی نہ رہی، اسلئے مالِ مرہونہ کی طرح اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ولا في مرهون بعد قبضه۔ قال ابن عابدينؒ: اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لايزكي عن السنين الماضية۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۳ كتاب الزكوٰة) [۱]

رہن (گروی) پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص کسی کے پاس کوئی چیز رہن (گروی) رکھے، تو اس رہن کی زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

الجواب:۔ زکوٰۃ میں مالیت کا ملکِ تام ہونا ضروری ہے کہ وہ شخص اس مال کا کُلی مالک ہو، چونکہ رہن میں راہن کا ملکِ تام نہیں ہے اس لیے کہ رہن اُس کے ہاتھوں سے باہر ہے اور نہ مُرتہن کو ملکِ تام حاصل ہے اس لیے کہ اس کو ملکِ رقبہ حاصل نہیں اسلئے رہن (گروی) کی مالیت کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں نہ راہن پر اور نہ مُرتہن پر، تاہم جب رہن کسی ایک کا ہو جائے تو پھر زکوٰۃ واجب ہو گی۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ولا في مرهون بعد قبضه۔ قال ابن عابدينؒ: تحت قوله اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لايزكي عن السنين الماضية۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۳ كتاب الزكوٰة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: واطلق الملك فانصرف الى الكامل وهو المملوك رقبة ويدا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ومن موانع الوجوب الرهن اذا كان في يد المرتهن لعدم ملك اليد۔
(البحر الرائق ج۲ ص۲۰۳ كتاب الزكوٰة)

[۲] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: واطلق الملك فانصرف الى الكامل وهو المملوك رقبة ويدا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ومن موانع الوجوب الرهن اذا كان في يد المرتهن لعدم ملك اليد۔
(البحر الرائق ج۲ ص۲۰۳ كتاب الزكوٰة)

کمیٹی کی رقم سے زکوٰۃ

سوال: آجکل کاروباری اور عام لوگوں میں یہ رواج ہے کہ چند آدمی جمع ہو کر آپس میں ماہانہ کے حساب سے کچھ پیسے مقرر کرتے ہیں اور وقت مقررہ کے بعد بذریعہ قرعہ اندازی وہ جملہ رقم ایک شخص کو دے دی جاتی ہے، اس کے بعد پھر جمع کرتے ہیں پھر اسی طرح بذریعہ قرعہ اندازی دوسرے شخص کو رقم دی جاتی ہے، حتیٰ کہ سب ممبروں کو اتنی ہی رقم مل جاتی ہے، تو جس کو یہ رقم اوّلاً مل گئی ہو اور اس پر سال گذر جائے تو کیا اس شخص کو جملہ رقم کی زکوٰۃ دینی ہوگی یا دوسروں کا قرض الگ کر کے باقی رقم کی زکوٰۃ دینی ہوگی، مثلاً بیس ہزار روپے کی کمیٹی ہے اور جملہ ممبران کی تعداد دس ہے اور اس بیس ہزار میں سے دو ہزار اس شخص کے اپنے ہیں اور باقی دوسرے ممبروں کے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اوّلاً مال سے قرض منہا کیا جائے گا اور قرض منہا کرنے کے بعد جو بھی مال باقی بچے اُسی کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی باقی ماندہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اوّلاً جس شخص کو بیس ہزار کی رقم ملی ہے اس میں سے صرف دو ہزار کی زکوٰۃ دینی ہوگی باقی اٹھارہ ہزار کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں۔

لما فی الهندية:- قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكوٰة من جهة العباد يمنع وجوب الزكوٰة سواء كان الدّين للعباد كالقرض وثمن البيع وضمان المتلفات وارش الجراحة، الخ- (الفتاوىٰ الهندية ج ۱ ص۱۷۳ كتاب الزكوٰة الباب الاول فی تفسيرها، الخ) [۱]

افیون کے کاروبار پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص افیون کا کاروبار کرتا ہے تو کیا اس کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- افیون سے چونکہ مہلک ترین نشہ آور چیز ہیروئن تیار کی جاتی ہے اسوجہ سے متأخرین اہلِ علم نے افیون کی کاشت اور اسکے کاروبار سے منع کیا ہے لیکن دوسری طرف اس کا استعمال ادویات میں بھی ہوتا ہے۔ اور بذاتِ خود یہ مالِ متقوم بھی ہے اس لئے فی الجملہ اس کی خرید و فروخت کی جائے تو جائز ہے اور

---

[۱] لما قال العلامه برهان الدين المرغيناني:- ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوٰة عليه. وقال الشافعي تجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام ولنا انه مشغول بحاجته الاصلية فاعتبر معدوماً ..... وان كان ماله اكثر من دينه زكى الفاضل اذا بلغ نصاباً لفراغه عن الحاجة الاصلية۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج ۲ ص۱۱۸ كتاب الزكوٰة)

اس سے حاصل شدہ مال پر زکوٰۃ واجب ہے

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وصح بیع غیر الخمر مما مر ومفادہ صحۃ بیع الحشیشۃ والافیون۔
قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ (وصح بیع الخمر) ای عندہ خلافاً لھما فی البیع والضمان لکن الفتوٰی علیٰ قولہ فی البیع وعلیٰ قولھما فی الضمان۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۶۵ کتاب الاشربہ) ؎۱

طویل المیعاد قرضوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ بنکوں سے طویل مدت کیلئے قرضے لیتے ہیں، کیا ایسے قرضے وجوبِ زکوٰۃ سے اسی طرح مانع ہیں جس طرح کہ دوسرے قرضے مانع ہیں؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں فقہاءِ کرام کی دو رائے ہیں لیکن قاعدہ اور ظاہر کے لحاظ سے جس کو متاخرین فقہاء نے راجح بھی قرار دیا ہے وہ یہ کہ ایسے قرضہ جات مانع زکوٰۃ نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ او مؤجلا) عزاہ فی المعراج الیٰ شرح الطحاوی وقال عند ابی حنیفۃؒ لا یمنع وقال الصدر الشہید لا روایۃ فیہ ولکل من المنع وعدمہ وجہ زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح غیر مانع

(رد المحتار ج۲ ص۲۶۱ کتاب الزکوٰۃ) ؎۲

میت کے ترکہ سے زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی آدمی (جس پر کہ زکوٰۃ فرض تھی) بغیر ادائیگی زکوٰۃ کے مرجائے تو کیا بعد الموت اس کے ترکہ

؎۱ لما قال الشیخ المفتی کفایت اللہ الدھلویؒ:۔ افیون، چرس، بھنگ، کوکین، یہ تمام چیزیں پاک ہیں اور ان کا ادویات میں خارجی استعمال جائز ہے (البتہ) نشہ کی غرض سے ان کو استعمال کرنا ناجائز (اور حرام) ہے، مگر ان سب کی تجارت بوجہ فی الجملہ مباح الاستعمال ہونے کے مباح ہے۔
(کفایت المفتی جلد ۹ ص۱۱۵ چھٹا باب ماکولات ومشروبات)

؎۲ لما قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰنؒ:۔ مہر مؤجل جیسا کہ اب عموماً ہوتا ہے صحیح مذہب کے موافق مانع زکوٰۃ سے نہیں ہے، یعنی یہ دین مہر مؤجل روپیہ موجودہ سے وضع نہ کیا جاوے بلکہ تمام روپیہ سے زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد ۶ ص۴۶ پہلا باب، شرائط وصفت زکوٰۃ)

سے زکوٰۃ لی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب :۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے نیت کا ہونا شرط ہے جب نیت کرے تب زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ چونکہ مرنے کے بعد انسان نیت کرنے کے قابل نہیں ہوتا اس لیے اُس کے ترکہ سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی ، تاہم اگر مرتے وقت کسی کو وصیت کر جائے کہ میرے مال سے زکوٰۃ ادا کی جائے تو پھر زکوٰۃ ادا کرنا درست ہو گا۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ : لو مات من علیہ الزکوٰۃ لا تؤخذ من ترکتہ لفقد شرط صحتھا وھو النیۃ ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ) [1]

حکومت کا زبردستی زکوٰۃ وصول کرنا

سوال :۔ اگر کوئی شخص خود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو کیا حکومت اس بات کی مجاز ہے کہ وہ زبردستی اس سے زکوٰۃ وصول کرے ؟

الجواب :۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ دینے سے انکاری ہے یا اقرار کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو حاکمِ وقت کو شرعًا یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس شخص سے زبردستی زکوٰۃ وصول کر کے فقراء میں تقسیم کرے ۔

لما قال الامام ابو جعفر الطحاویؒ : لو امتنع عن زکوٰۃ مالہ فاخذھا الامام کرھا فوضعھا فی اھلھا اجزأت عنہ ۔ (مختصر الطحاوی ص۴۵ باب صدقۃ الغنم) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ :۔ ولو مات فاداھا وارثہ جاز۔ قال ابن عابدینؒ فی الجوھرۃ : اذا مات من علیہ زکوٰۃ او فطرۃ او کفارۃ او نذر لم تؤخذ من ترکتہ عندنا .... وان اوصی تنفذ من الثلث ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۵۹ باب صدقۃ الفطر)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج ۶ ص۳۳۰ باب صدقۃ الفطر ۔

[2] لما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ :۔ تحت قولہ وشرط ادائھا نیۃ مقارنۃ ..... ومن امتنع عن اداء زکوٰۃ مالہ واخذھا الامام کرھًا منہ فوضعھا فی اھلھا اجزاءہ لان للامام لہ ولایۃ اخذ الصدقات فقام اخذہ مقام دفع المالک ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۲۶۸ کتاب الزکوٰۃ ۔

نابالغ اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ صبی (نابالغ بچے) اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ دینے والا مکلّف ہو یعنی عاقل و بالغ ہو، اس لیے فقہ حنفی کی تحقیق کے مطابق نابالغ اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ مجنون میں شرط یہ ہے کہ وہ سال بھر مجنون رہتا ہو اور اس دوران اگر وہ کسی وقت بھی صحیح اور بالکل تندرست ہو جائے تو مالکِ نصاب ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

لما قال العلامۃ ابوبکر بن علی بن محمد الحدادالیمنیؒ:۔ فلیس الزکوٰۃ علی صبیّ ومجنون اذا وجد منہ الجنون فی السنۃ کلھا۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۵۰ کتاب الزکوٰۃ) [1]

زمرد، جواہرات اور دیگر قیمتی پتھروں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص کے پاس ہیرے، زمرد اور دیگر قیمتی پتھر موجود ہوں مگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو کیا اس شخص پر ان جواہرات کی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تمام وہ قیمتی پتھر جو تجارت کی غرض سے اپنے پاس نہ رکھے ہوں ویسے شغلاً رکھے ہوں تو ان پتھروں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر الا ان تکون للتجارۃ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۱ ص۲۷۳ کتاب الزکوٰۃ قبیل باب السائمۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ:۔ ولیس علی الصّبی والمجنون زکوٰۃ خلافاً للشافعی.... ولو افاق (المجنون) فی بعض السنۃ فھو بمنزلۃ افاقتہ فی بعض الشھر فی الصّوم یعنی اذا کان مفیقاً جزءً من السنۃ اولھا وآخرھا قل اوکثر بعد ملك النصاب فلزمہ الزکوٰۃ کمالوا فاق فی جزءٍ من شھر رمضان۔ (العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج۲ ص۱۱۵تا۱۱۷ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۶۶ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] وفی الھندیۃ: واما الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیھا وان کانت حلیاً الا ان تکون للتجارۃ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۰ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ والعروض)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۵۱ کتاب الزکوٰۃ۔ باب زکوٰۃ الذھب۔

زیر مطالعہ کتابوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:- بندہ ایک ہائی سکول میں اسلامیات کا استاد ہے، میرے پاس ایک لاکھ روپے سے زیادہ رقم کی کتابیں ہیں جو صرف مطالعہ کے لیے ہیں تجارت کے لیے نہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان کتابوں کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- شرعاً زکوٰۃ اُس مال پر واجب ہوتی ہے جو حوائج اصلیہ سے زائد ہو اور بہ نیت تجارت رکھا ہو، مسئولہ صورت میں چونکہ کتب خانہ برائے مطالعہ ہے تجارت کے لیے نہیں اس لیے یہ حوائج اصلیہ میں داخل ہو کر اس کی مالیت پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

قال فی الهندیة: منها فراغ المال عن حاجته الاصلیة ...... وکذا کتب العلم ان کان من اهله وآلات المحترفین۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی تفسیرہ) [۱]

زکوٰۃ کی نیت کے بغیر فقراء اور مساکین میں رقم کی تقسیم زکوٰۃ نہیں

سوال:- اگر ایک شخص بغیر نیتِ زکوٰۃ کے کافی رقم فقراء و مساکین میں تقسیم کرے تو کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ جبکہ یہ شخص یہ عمل کئی سالوں سے کر رہا ہے؟

الجواب:- زکوٰۃ ادا کرتے وقت یا مالِ زکوٰۃ کو الگ کرتے وقت زکوٰۃ کی نیت لازمی ہے، لہٰذا اگر بغیر نیتِ زکوٰۃ کے کوئی شخص خطیر رقم بھی فقراء کو دے دے تو اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ یہ شخص گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دوبارہ ادا کرے گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:- وشرط صحة ادائها نیة مقارنة له ای للاداء ولو کانت المقارنة حکماً..... ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۱۳ کتاب الزکوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ:- رجلٌ له کتب العلم مایساوی مائتی درهم ان کانت مما یحتاج الیها فی الحفظ والدراسة والتصحیح لا یکون نصاباً وحل له اخذ الصدقة فقهاً کان او حدیثاً او ادباً۔ الخ

(خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۲۴۰ الفصل السابع فی الکتب والعروض)

[۲] لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ:- ولا یجوز اداء الزکوٰة الا بنیة مقارنة للاداء او مقارنة لعزل مقدار الواجب لان الزکوٰة عبادة فکان من شرطها النیة۔ (الهدایه ج ۱ ص۱۶۸ کتاب الزکوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۱ ص۱۳۱ کتاب الزکوٰة۔

حکومت کا اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ کاٹنا

سوال:۔ بینکوں میں عوام کی جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ کی کٹوتی میں حکومتی پالیسی یہ ہے کہ سیونگ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقوم سے تو زکوٰۃ کاٹتی ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ سے نہیں کاٹتی، اور پھر اس رقم کو غریب عوام پر تقسیم کرتی ہے، جبکہ عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ حکومتی زکوٰۃ سود ہے اور اس کو لینا جائز نہیں، تو کیا واقعی مذکورہ بالا طریقہ سے کاٹی گئی زکوٰۃ سود کے زمرے میں شمار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ حکومتِ وقت شرعاً اس بات کی مجاز ہے کہ وہ لوگوں کے اموال سے زکوٰۃ وصول کرے چاہے وہ سیونگ اکاؤنٹ میں ہو یا کرنٹ اکاؤنٹ میں ہو، جب حکومت کو شرعاً یہ استحقاق حاصل ہے تو معلوم ہوا کہ یہ واقعی زکوٰۃ ہے جس کا غریب عوام کے لیے لینا جائز ہے، البتہ حکومت کی یہ پالیسی غلط ہے کہ وہ سیونگ اکاؤنٹ سے تو زکوٰۃ لیتی ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ سے نہیں لیتی۔

ذکر الامام محمد بن حسن الشیبانیؒ:۔ کان ابوبکر اذا اعطی الناس اعطیاتہم یسئال الرجل ھل عندک من مال قد وجبت فیہ الزکوٰۃ فان قال نعم اخذ من عطائہ زکوٰۃ ذٰلک المال وان قال لا سلّم الیہ عطاءہٗ قال محمدؒ وبھذا نأخذ وھو قول ابی حنیفۃؒ

(موطا امام محمدؒ ص۱۷۱ باب الرجل یکون لہ الدین ھل علیہ فیہ زکوٰۃ) [۱]

سفراء مدارس کے لیے زکوٰۃ وصدقات کی رقوم سے حصہ لینا جائز نہیں

سوال:۔ بعض سفراء دینی مدارس کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں اور اس چندہ پر ایک مقررہ حصہ بطور کمیشن لیتے ہیں اور اس کے ساتھ دورانِ سفر اسی چندہ سے کھاتے پیتے بھی ہیں، کیا سفراء کو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سفیر چندہ دہندہ کا وکیل ہوتا ہے، تملیک سے قبل اس کے لیے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کی رقوم سے کھانا پینا اور اپنا مقررہ حصّہ وصول کرنا جائز نہیں، اور نہ ان کو عاملینِ زکوٰۃ پر قیاس کرنا درست ہے۔

---

[۱] عن عائشۃ بنت قدامۃ عن ابیھا انہ قال کنت اذا جئتُ عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) اقبض عطائی سئالنی ھل عندک من مال وجبت فیہ الزکوٰۃ قال فان قلتُ نعم اخذ من عطائی زکوٰۃ ذٰلک المال وان قلتُ لا دفع الی عطائی۔

(موطا امام مالک ص۲۷۲ الزکوٰۃ فی العین من الذھب والورق)

لما قال العلامة اکمل الدین البابرتی رحمہ اللہ :- العامل هو الذی یبعثه الامام لجبایة الصدقات۔ (العنایة علیٰ هامش فتح القدیر ج۲ ص۲۰۴ باب من یجوز دفع الزکوٰة۔الخ) ۱؎

سال گذر جانے کے بعد قرض مانع زکوٰۃ نہیں

سوال:- ایک شخص نے مکان بنانے کے لیے زمین خریدی جس کی بیع مکمل ہو چکی ہے لیکن مشتری نے ابھی تک بائع کو رقم ادا نہیں کی کہ مذکورہ رقم پر سال گذر گیا، تو کیا اس شخص پر ان پیسوں کی زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مذکورہ رقم پر سال گذر جانے کے بعد زمین خریدی گئی ہو تو یہ قرض گذشتہ سال کی زکوٰۃ کے لیے مانع نہیں بلکہ موصوف کو زکوٰۃ دینا پڑے گی اور اگر سال گذر جانے سے قبل زمین خریدی اور اس کی قیمت مشتری کے ذمے قرض ہے تو یہ قرض مانع وجوب زکوٰۃ ہے، تاہم اگر موصوف کے پاس اس قرضہ کے علاوہ اور مال نصاب کو پہنچتا ہو تو اس کی زکوٰۃ لازم ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان لایکون علیه دین مطالب به من جهة العباد عندنا فان کان فانه یمنع وجوب الزکوٰة بقدره حالاً کان او مؤجلاً...... فاما اذا استحق بعد الحول لایسقط الزکوٰة لانه دین حادث الخ۔
(بدائع الصنائع ج۲ ص۶ کتاب الزکوٰة۔فصل شرائط الفرضیة) ۲؎

۱؎ لما قال الشیخ عزیز الرحمٰنؒ: مد زکوٰۃ سے سفیر کو تنخواہ دینا جائز نہیں اور وہ عاملین علیہا میں داخل نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۶ ص۲۳۶ (امداد المفتیین) باب مصارف الزکوٰۃ)

۲؎ قال العلامة الحصکفیؒ: فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد سواء کان لله کزکوٰة۔

قال العلامة ابن عابدینؒ تحته۔ فلوکان له نصاب حال علیه حولان ولم یزکه فیهما لازکوٰة علیه فی الحول الثانی وکذا لو استهلك النصاب بعد الحول ثم استفاد نصاباً آخر وحال علیه الحول لازکوٰة فی المستفاد لاشتغال خمسة منه بدین المستهلك۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۰ کتاب الزکوٰة۔ مطلب الفرق بین السبب والشرط والعلة)

فوجی یونٹوں کے سرکاری فنڈز پر زکوٰۃ کا مسئلہ | **سوال**:۔ فوج کی مختلف یونٹوں میں جوانوں کی فلاح و بہبود کے لیے فنڈز مختص ہوتے ہیں جن کو متعلقہ افیسر صاحبان یونٹوں کے اندر رفاہی کاموں پر خرچ کرتے ہیں، تو کیا ان فنڈز پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب:۔ چونکہ بظاہر یہ فنڈز کسی بھی یونٹ کی ملکیت نہیں بلکہ صرف استعمال کے لیے دیئے جاتے ہیں، اس لیے فوجی یونٹوں کے ذمہ ان فنڈز کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

لما فی الهندیة: ومنها الملك التام وهو ما اجتمع فیه الملك والید واما اذا وجد الملك دون الید كالصداق قبل القبض او وجد الید دون الملك كملك المكاتب والمدیون لا تجب فیه الزكوٰة۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۷۲ كتاب الزكوٰة۔ الباب الاوّل فی تفسیرها وصفتها وشرائطها) [1]

نصاب سے کم سونے کے ساتھ نقدی پر زکوٰۃ کا حکم | **سوال**:۔ ایک عورت کے پاس چار تولے سونے کے زیورات اور ایک ہزار روپے نقد ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی ملک میں نہیں ہے، کیا سال گذرنے کے بعد اس عورت پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب کسی کے پاس چار تولے سونا اور ایک ہزار روپے نقد ہوں تو دونوں کو ملا کر ان کی قیمت اگر ۲/۱ ۵۲ تولے چاندی کے نصاب کو پہنچتی ہو تو حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

لما فی الهندیة: ولو ضم احد النصابین الی الاٰخر حتی یودی كله من الذهب او من الفضة لا بأس به لكن یجب ان یكون التقویم بما هو انفع

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصكفی رحمه الله: وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی۔ قال ابن عابدینؒ۔ فقد ذكر فی البدائع من الشروط الملك المطلق قال وهو الملك یداً ورقبةً۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۲ ص۴ مطلب الفرق بین السبب والشرط والعلّة)
ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲ كتاب الزكوٰة۔

للفقراء قدراً او رواجاً والا فليؤدى من كل واحد ربع عشرة ،كذا فى محيط السرخسى۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۷۹ الباب الثالث فى زكوٰة الذهب والفضة والعروض فصل اول)[1]

عید کے موقع پر زکوٰۃ بطور عیدی دینا

سوال :۔ کیا عید کے موقع پر زکوٰۃ عیدی کے طور پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ ہم نے ایک صاحب سے سُنا ہے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی ۔

الجواب :۔ زکوٰۃ دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کرنا ضروری ہے‘ اس لیے اگر عیدی دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہ ہو بلکہ صرف عیدی کی نیت ہو تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی تاہم اگر مال دیتے وقت یا اس کو علیحدہ کرتے وقت زکوٰۃ کی نیت کی ہو تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : دفع الزکوٰة الى صبيان اقاربه برسم عيد او الى مبشر او مهدى الباكورة جاز ۔ وقال ابن عابدينؒ: قوله الى صبيان اقاربه اى العقلاء والا فلا يصح الا بالدفع الى ولى الصغير۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۷۰ باب المصرف ، کتاب الزکوٰة)[2]

شوہر کے مقروض ہونے کی صورت میں بیوی سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کی بیوی کے پاس چودہ تولے سونا زیورات کی صورت میں موجود ہے جو اس کی ذاتی ملکیت ہے جبکہ زید اتنا مقروض ہے کہ اس کا قرضہ

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله : وقيمة العرض للتجارة تضم الى الثمنين لان الكل للتجارة وضعاً وجعلاً ۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۳۷ باب زکوٰة المال)
وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۰ باب زكوٰة المال ۔

[2] قال العلامة ابن البزاز الكردرى رحمه الله : ولو نوى الزكوٰة فيما يدفعه الى صبيان اقاربه عيديا او لمن يهدى اليه الباكورة اويبشره بقدوم صديقه ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ يجوز ۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۸۶ الباب الثانى فى المصرف)
وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج ۱ ص۱۹۰ الباب السابع فى المصارف ۔

زیورات کی قیمت سے زیادہ ہے، تو اس صورت میں زید کی بیوی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سونے کے زیورات چونکہ زید کی بیوی کی ملکیت ہیں، لہٰذا بیوی پر زکوٰۃ واجب ہے شوہر کے قرضے کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی..... نام الخ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۴ کتاب الزکوٰۃ) لہ

اسلحہ میں زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:۔ زید کے پاس ایک پستول ...۳۰ ہزار روپے کا اور ایک کلاشنکوف ۲۵ ہزار روپے کی ہے، اس کے علاوہ زید کے پاس اور کچھ نہیں ہے، تو کیا زید پر زکوٰۃ اور قربانی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پستول اور کلاشنکوف اگر اپنی حفاظت کے لیے ہو اور اس کے علاوہ زید کے پاس اور کوئی مال موجب زکوٰۃ وقربانی نہ ہو تو زید پر زکوٰۃ وقربانی واجب نہیں تاہم تجارت کی صورت میں دونوں واجب ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفارغ عن حاجته الاصلیة۔ قال ابن عابدینؒ: وھی مایدفع الهلاك عن الانسان تحقیقاً کالنفقة ودور السکنی وآلات الحرب والثیاب...... ان المراد به نفس الحوائج فانه قال ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل........ وسلاح الاستعمال الخ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۶ کتاب الزکوٰۃ) ۲ہ

لہ قال العلامة المرغینانیؒ: الزکوٰۃ واجبة علی الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملك نصاباً ملكاً تاماً وحال علیه الحول الخ۔ (الهدایة ج۱ ص۱۶۷ کتاب الزکوٰۃ)

وَمثلهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی بیان تفسیرها الخ

۲ہ قال العلامة المرغینانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰۃ لانها مشغولة بالحاجة الاصلیة ولیست بنامیة ایضاً۔ (الهدایة ج۱ ص۱۶۹ کتاب الزکوٰۃ)

وَمثلهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی تفسیرها الخ۔

زکوٰۃ لینے والے کو بتائے بغیر زکوٰۃ دینا

سوال :- کیا زکوٰۃ ادا کرتے وقت فقیر کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ رقم زکوٰۃ کی ہے، یا یہ بتائے بغیر بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

الجواب :- زکوٰۃ ادا کرتے وقت صرف زکوٰۃ کی نیت ضروری ہے، فقیر کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ کا مال ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : وشرط صحۃ ادائھا نیۃ مقارنۃ لہ ای اشار الیٰ انہ لا اعتبار للتسمیۃ فلو سماھا ھبۃ او قرضا تجزیہ فی الاصح والیٰ انہ لو نوی الزکوٰۃ والتطوع وقع عنھا عند الثانی لان نیۃ الفرض اقویٰ۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۱۱ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

افغان مہاجرین کو ملنے والی امداد میں زکوٰۃ کا حکم

سوال :- افغان مہاجرین بعض اسلامی اور یورپی ممالک میں سیاسی پناہ لیتے ہیں اور وہاں انہیں بطور امداد ماہوار اچھی خاصی رقم بھی ملتی ہے، تو کیا ان کیلئے اس امدادی رقم سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر یہ امداد افغان مہاجرین کو بصورتِ تملیک دی جاتی ہو جو نصاب شرعی کے برابر ہو تو سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ دینا ضروری ہے ورنہ نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : وسببہ ای سبب افتراضھا ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین لہ مطالب من جھۃ العباد...... وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ نام ولو تقدیرا۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۷ کتاب الزکوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال المرغینانیؒ : ولا یجوز اداء الزکوٰۃ الا بنیۃ مقارنۃ للاداء او مقارنۃ لعزل مقدار الواجب لان الزکوٰۃ عبادۃ فکان من شرطھا النیۃ والاصل فیھا الاقتران الا ان الدفع یتفرق فاکتفی بوجودھا حالۃ العزل تیسیرا کتقدیم النیۃ فی الصوم۔ (الھدایۃ ج ۱ ص ۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ - الباب الاوّل۔

[۲] قال المرغینانیؒ : الزکوٰۃ واجبۃ علی الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملک نصابا ملکا تاما وحال علیہ الحول۔ (الھدایۃ ج ۱ ص ۱۶۷ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ، الباب الاوّل فی تفسیرھا وصفتھا وشرائطھا۔

فارمی مرغیوں اور ان کی پیداوار میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ آجکل پولٹری فارموں میں مرغیاں چوزوں کی پیداوار کے لیے پالی جاتی ہیں جو تقریباً چھ ماہ بعد انڈے دینے لگتی ہیں جن سے خصوصی مشینوں کے ذریعے چوزے پیدا کیے جاتے ہیں، انڈوں کا یہ سلسلہ آٹھ ماہ تک جاری رہتا ہے اس کے بعد جب یہ مرغیاں انڈے دینا کم کر دیتی ہیں تو انہیں بھی بیچ دیا جاتا ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ مرغیوں اور پیداوار دونوں سے دینا ہوگی یا صرف پیداوار سے؟

الجواب:۔ جب مرغیاں اور انڈے وغیرہ فروخت کر دیئے جائیں تو جملہ سرمایہ میں حسبِ قاعدہ شرعی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

قال الحصکفیؒ: وشرطہ حولان الحول..... وثمنیۃ المال کالدراھم والدنانیر لتعینھما للتجارۃ باصل الخلقۃ..... اونیۃ التجارۃ فی العروض۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ ص۱ کتاب الزکوٰۃ) [1]

فلور ملز اور ویگن سٹینڈ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ زید ایک سے زیادہ ویگن سٹینڈ کا مالک ہے اور ان کو ٹیکسی کے طور پر چلاتا ہے، اسی طرح ایک فلور ملز کا بھی مالک ہے، تو کیا ان دونوں میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نقدین (دراہم و دنانیر) کے علاوہ جو بھی چیز تجارت کی نیت سے خریدی گئی ہو کہ اس کو نفع پر بیچوں گا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ چونکہ فلور ملز اور ویگن سٹینڈ کرایہ پر چلانے کے لیے خریدی گئی ہے لہٰذا ان کی ذات میں زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ ان کے اس منافع میں زکوٰۃ واجب ہے جو نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: الزکوٰۃ واجبۃ فی عروض التجارۃ کائنۃ ما کانت (ای من ای جنس کانت) اذا بلغت قیمتھا نصاباً من الورق او الذھب۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۷۷ باب زکوٰۃ المال)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۹ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ والعروض۔

پورا سال گذر جائے۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: قید بکون العروض للتجارة لانها لو کانت للغلة فلا زکوٰة فیها لانها لیست للمبایعة۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۲۸ باب زکوٰة المال)[1]

خالی سلنڈر اور مائع گیس میں زکوٰة کا مسئلہ

سوال:۔ میں نے مائع گیس کی ایجنسی سے پندرہ سو روپے فی سلنڈر کے حساب سے دس سلنڈر خریدے ہیں، اب یہ سلنڈر میری ملکیت بن گئے ہیں، چونکہ میں مائع گیس کا کاروبار کرتا ہوں، اس لیے جب یہ سلنڈر (یعنی گیس کے برتن) خالی ہو جاتے ہیں تو ایجنسی والوں کو اپنے خالی سلنڈر دے کر ان سے بھرے ہوئے سلنڈر لے لیتا ہوں اور فی سلنڈر مائع گیس کے سو روپے ادا کر دیتا ہوں، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے زکوٰة ان سلنڈروں اور گیس دونوں کے حساب سے دینی ہوگی یا مائع گیس کی زکوٰة دینی ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں خالی سلنڈروں میں کوئی زکوٰة نہیں ہے کیونکہ ان کا صرف تبادلہ ہوتا ہے اور یہ تجارتی مال میں شامل متصور نہیں ہوتے اس لیے ان کو دوسرے آلاتِ حرفت پر محمول کیا جائے گا اور زکوٰة صرف گیس میں دینی ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدین: وکذلك آلات المحترفین ای سواء کانت مما لا تستهلك عینه فی الانتفاع کالقدوم والمبرد او تستهلك... قال وقوارير العطارين ولجم الخيل والحمير المشتراة... ان کان من غرض المشتری بیعها بها ففیها الزکوٰة والا فلا۔ (ردالمحتار حاشیة الدرالمختار ج۲ ص۹ کتاب الزکوٰة)[2]

---

[1] وفی الهندیة: ویشترط ان یمکن من الاستنماء بکون المال فی یده او ید نائبه فان لم یتمکن من الاستنماء فلا زکوٰة علیه۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۴ ومنها کون النصاب نامیاً)

ومثلهٗ فی الدرالمختار علیٰ هامش ردالمحتار ج۲ ص۷ کتاب الزکوٰة۔

[2] وفی الهندیة: وآلات المحترفین کذا فی السراج الوهاج هذا فی الآلات التی ینتفع بنفسها ولا یبقی اثرها فی المعمول... وان لم یبق لذلك العین اثر فی المعمول کالصابون والحرض لا زکوٰة فیه کذا فی الکفایة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۳ کتاب الزکوٰة ومنها فراغ المال)

ومثلهٗ فی البزازیة ج۴ ص۸۴ کتاب الزکوٰة۔

زکوٰۃ میں قیمتِ فروخت کا اعتبار ہے

سوال:۔ آجکل بازار میں عموماً دو قسم کے نرخ ہوتے ہیں (۱) تھوک (۲) پرچون۔ تھوک کے نرخ میں مال کی قیمت کم ہوتی ہے اور پرچون کے نرخ میں عموماً زیادہ ہوتی ہے دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کس نرخ کے حساب سے ادا کی جائے گی؟

الجواب:۔ دوکاندار جس نرخ پر بھی سامان فروخت کرتا ہو اُسی نرخ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وتعتبر القیمة یوم الوجوب۔

(الدرالمختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۲۴ باب زکوٰۃ الغنم) لے

زیورات کے موتیوں کا وزن نصاب میں شامل نہیں

سوال:۔ سونے کے زیورات میں جو نگ اور موتی لگے ہوتے ہیں زکوٰۃ دیتے وقت ان کے وزن کو بھی شامل نصاب کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ سونے کے زیورات کی زکوٰۃ کو بغیر نگ و موتیوں کے ادا کیا جائے گا یعنی ان وزن سونے کے وزن میں شمار نہیں ہوگا تاہم اگر یہ تجارت کے لیے ہوں تو پھر ان کی مالیت کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

وفی الھندیة: واما الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیھا وان کانت حلیا الا ان تکون للتجارة۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۸۱ الفصل الثانی فی العروض) ۲ے

مکان کے لیے زمین خرید کر فروخت کرنے پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ زید نے تین سال پہلے مکان بنانے کے لیے ایک پلاٹ خریدا جس کی قیمت ۲ لاکھ روپے ہے، تو اب اس پلاٹ پر

لے وفی الھندیة: وان ادی القیمة تعتبر قیمتھا یوم الوجوب لان الواجب احدھما۔

(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۸۰ الفصل الثانی فی العروض)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۰ فصل فی الغنم۔

۲ے قال العلامة الحصکفیؒ: لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفا اتفاقاً الا ان تکون للتجارة۔ (الدرالمختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۱۵ کتاب الزکوٰۃ)

زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اور اگر زید اسے فروخت کردے تو پھر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وہ قطعہ زمین جو صرف مکان بنانے کے لیے خرید اگیا ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ فروخت کردینے کی صورت میں جب اس کی قیمت نصاب زکوٰۃ تک پہنچتی ہو تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واثاث المنزل ودور السکنی ونحوها وکتب العلم وان لم تکن لاهلها اذا لم تنو للتجارة، وقال ابن عابدینؒ واثاث المنزل الخ محترز قوله نام ولو تقدیراً وقوله ونحوها ای کثیاب البدن لغیر المحتاج الیها وکالحوانیت والعقارات۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص۸ کتاب الزکوٰة) [1]

خالص حرام مال میں زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے پاس خالص حرام کا مال ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی کے پاس جمع شدہ مال خالص حرام ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں اس لیے کہ مالک معلوم ہونے کی صورت میں مال کا واپس کرنا واجب ہے اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں مال خبیث ہے جو واجب التصدق ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (قوله لو کان الکل خبیثاً) فی القنیة لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمه الزکوٰة لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۲۵ باب زکوٰة الغنم) [2]

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة الخ لانها مشغولة بالحاجة الاصلیة ولیست بنامیة۔ (الهدایة ج ۱ ص۱۶۹ کتاب الزکوٰة)

وَمثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۷۲ الباب الاوّل فی تفسیرها وصفتها وشرائطها۔

[2] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: ولو بلغ المال الخبیث نصاباً لا یجب فیه الزکوٰة لان الکل واجب التصدق۔ (فتاویٰ بزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۴ ص۸۶ الباب الثانی فی المصرف)

وَمثلهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۶ باب الرکاز۔

مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کے پاس کچھ رقم پاکستانی کرنسی میں ہو اور کچھ رقم افغانی کرنسی میں ہو تو کیا ان دونوں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا کسی ایک قسم کی کرنسی سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب:۔ روپیہ اور سکہ افغانی ہو یا پاکستانی، اس میں نصاب زکوٰۃ ۵۲½ تولے چاندی یا ۷½ تولے سونا کی قیمت ہے، اسی طرح دونوں ملکوں کی کرنسی نوٹوں کی قیمت جب اس نصاب کو پہنچے تو جتنا مال ہو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا واجب ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفی عرض تجارة قیمة نصاب ۔۔۔۔ من ذهب اوورق ۔۔۔۔ مقومًا با حدهما ۔۔۔۔ ولو بلغ باحدهما نصابًا وخمسًا وبالآخر اقل قومه بالانفع للفقیر۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۳۱ باب زکوٰۃ المال)[1]

زیورات میں زکوٰۃ ہر سال واجب ہے

سوال:۔ کیا زیورات میں ہر سال زکوٰۃ دینا پڑے گی یا عمر بھر میں ایک ہی بار ادا کرنا کافی ہے، ہمارے یہاں اس بات پر اختلاف ہے کہ اگر ہر سال زیورات سے زکوٰۃ دی جائے تو وہ جلد ہی اصل زر کھو بیٹھے گا، شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ وجوبِ زکوٰۃ کا سبب نصاب پر سال کا گذر جانا ہے، جب سونے یا چاندی کے نصاب (چاہے وہ زیورات کی شکل میں ہو یا اپنی اصلی صورت میں) پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، تاہم اگر دوسرے سال نصابِ زکوٰۃ

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: الزکوٰة واجبة فی عروض التجارة کائنة ما کانت اذا بلغت قیمتها نصابًا من الورق او الذهب ۔۔۔۔۔۔ یقومها بما هو انفع للمساکین ۔۔۔۔ قال وتضم قیمة العروض الی الذهب والفضة حتّٰی یتم النصاب ۔۔۔۔ ۔۔۔ ویضم الذهب الی الفضة۔

(الهدایة ج۱ ص۱۷۷،۱۷۸ باب زکوٰۃ المال)

ومثلهٗ فی نور الایضاح للشرنبلالیؒ ص۱۵۶ کتاب الزکوٰة۔

۴/۱ ۷ تولے سونے اور ۲/۱ ۵۲ تولے چاندی سے کم رہ جائے تو اس سال کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن اگر ہر سال نصاب پورا ہو تو ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وشرطه ای شرط افتراض ادائها حولان الحول وهو فی ملکه۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ ص۱۰ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

نفع پر موقوف تجارت کی نیت زکوٰۃ کے لیے عملی تجارت کی محتاج ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے ایک عدد فلائنگ کوچ چار لاکھ پچاس ہزار روپے میں اس نیت سے خریدی کہ اگر کہیں سے منافع ملا تو میں اس کو فروخت کر دوں گا، پھر اُس نے فلائنگ کوچ کو دو سال مزدوری پر چلایا، تو کیا اب ذات فلائنگ کوچ میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی چیز کو خریدتے وقت اگر یہ نیت کی گئی ہو کہ اگر منافع ملا تو اسے فروخت کر دوں گا، بعد میں اس چیز کو ذاتی فائدے مثلاً مزدوری کے لیے استعمال کیا تو وہ چیز اس وقت تک تجارت کی شمار نہ ہوگی جب تک عملاً اس میں تجارت جاری نہ ہو جائے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ذات فلائنگ کوچ کے اندر زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: عن محمدؒ فی رجل اشترى عبدًا للخدمة وهو ينوی ان اصاب ربحاً يبيعه لا زکوٰۃ فيه۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج ۱ ص۲۴۰ کتاب الزکوٰۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامة الکاسانیؒ: اما الاول فنقول لاخلاف فی ان اصل النصاب وهو النصاب الموجود فی اول الحول يشترط له الحول لقول النبی صلی الله عليه وسلم لا زکوٰۃ فی مال حتی يحول عليه الحول۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۱۳ فصل واما الشرائط التی ترجع)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۱ ص۱۶۸ کتاب الزکوٰۃ۔

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: لا يبقی للتجارة ما ای عبد مثلاً۔ قال ابن عابدينؒ: واشار بقوله مثلاً الی ان العبد غير قيد لکن الاولیٰ ان يقول بعد ة فنوی استعماله ليعم مثل الثوب والدابة۔ قال الحصکفیؒ اشتراه لها فنوی بعد ذلك خدمته ثم ما نواه للخدمة لا يصير للتجارة وان نواه لها ما لم يبيعه الخ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ ص۱۳ قبيل باب السائمة)

وَمِثْلُهٗ فی البدائع الصنائع ج ۲ ص۱۲ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل واما الشرائط۔

زکوٰۃ کی مقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے

سوال :- یہاں ہمارے علاقے میں ایک شخص کہتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، کیا اس کی یہ بات صحیح ہے؟

الجواب :- زکوٰۃ کی مقادیر منصوص ہیں اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، مثلاً دوسو روپے میں پانچ روپے اور سو روپے میں اڑھائی روپے صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد عفوت عن مائۃ شئ فاذا بلغت مائتین ففیھا خمسۃ دراھم۔

(جامع الترمذی ج۱ ص۷۹ باب ما جاء فی زکوٰۃ الذھب والورق) [۱]

صدقہ زکوٰۃ کی مد میں شمار نہیں ہوگا

سوال :- ایک شخص کے پاس کچھ نقد رقم تھی جس میں سے چار سو روپے اُس نے صدقہ میں دے دیئے، کیا از روئے شرع صدقہ کئے ہوئے چار سو روپے زکوٰۃ کی مد میں شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- جو رقم صدقہ میں دے دی گئی ہو اس سے فرض زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی دوبارہ دینا ضروری ہے۔

وفی الھندیۃ: فاذا نوی ان یؤدی الزکوٰۃ ولم یعزل شیئاً فجعل یتصدق

---

[۱] عن ابی سعید ن الخدریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس فی ما دون خمس ذود صدقۃ من الابل ولیس فیما دون خمس اواق صدقۃ ولیس فی ما دون خمسۃ اوسق صدقۃ ۔ (الصحیح البخاری ج۱ ص۱۹۴ باب زکوٰۃ الورق)

وعن انسؓ ان ابا بکر کتب لہٗ ھذا الکتاب..... وفی الرقۃ ربع العشر فان لم تکن الا تسعین ومائۃ فلیس فیھا شئ الا ان یشاء ربھا ۔

(صحیح البخاری ج۱ ص۱۹۶ باب زکوٰۃ الغنم)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۱ ص۱۷۶ باب زکوٰۃ المال ۔

شیئاً فشیئاً الی اٰخر السنۃ ولم تحضرہ النیّۃ لم یجز عن الزکوٰۃ ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ) [۱]

نقد رقم کی بجائے دوسری اشیاء زکوٰۃ میں دینا

سوال:۔ ایک شخص کی زکوٰۃ ستّر روپے بنتی ہے لیکن وہ زکوٰۃ میں نقد رقم کے بدلے میں اس کے برابر کوئی اور چیز ادا کرنا چاہتا ہے، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ میں غرباء کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو چیز ان کے لیے مناسب ہو وہ انہیں دینا زیادہ مناسب ہے، تاہم اگر اس کے بدلے میں غیر ضروری چیز بھی دیدی جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: امّا اذا ادّی من خلاف جنسہ فالقیمۃ معتبرۃ اتفاقاً۔ (الدر المختار علی ہامش ردّ المحتار ج۲ ص۲۳ باب زکوٰۃ الغنم) [۲]

پینے کا پانی زکوٰۃ میں دینا

سوال:۔ بعض علاقوں میں پانی کی کمی کی وجہ سے یا سفر وغیرہ میں پانی کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے اگر کسی پیاسے یا مسافر کو پانی کی سخت ضرورت ہو تو کیا اسے زکوٰۃ میں پانی دینے سے

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وانّما تشترط النیۃ لدفع المزاحم فلمّا...... کما اذا دفع بلا نیۃ ثم حضرتہ النیۃ والمال قائم فی ید الفقیر فانہ یجزئہ وھو بخلاف ما اذا نوٰی بعد ھلاکہ۔
(البحر الرائق ج۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۱۳ کتاب الزکوٰۃ۔

[۲] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: وامّا الذی یرجع الی المؤدی فمنھا ان یکون مالاً متقوماً علی الاطلاق سواء کان منصوصاً علیہ اولا من جنس المال الّذی وجبت فیہ الزکوٰۃ او من غیر جنسہ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۴۱، فصل واما الّذی یرجع الی المؤدی)

وَمِثْلُہٗ فی نور الایضاح للشرنبلالیؒ ص۱۵۷ کتاب الزکوٰۃ۔

زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: ۔اگر ان علاقوں میں پانی قیمتاً فروخت کرنے کا رواج ہو اور عموماً پانی کی وہاں خرید و فروخت ہوتی ہو تو اگر پیاسا اور مسافر آدمی فقیر اور مصرفِ زکوٰۃ ہو تو اُسے زکوٰۃ میں پانی دیا جا سکتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اما اذا ادّی من خلاف جنسہ فالقیمۃ معتبرۃ اتفاقاً۔ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۲ ص۲۲ باب زکوٰۃ الغنم) [۱]

زکوٰۃ کی رقم قسطوں میں ادا کرنا

سوال: ۔ایک شخص زکوٰۃ کے ایک ہزار روپے میں سے ۸۲۰ روپے مستحقین میں بانٹ دیتا ہے اور باقی ۱۸۰ روپے کسی مستحقِ زکوٰۃ غریب طالب علم کو ایک سال کے لیے ۱۵ روپے ماہوار کے حساب سے دینا چاہتا ہے، تو کیا رقم ماہانہ قسطوں میں دینے سے زکوٰۃ شمار ہو گی یا نہیں؟

الجواب: ۔کسی غریب اور مستحق طالب علم کو ماہانہ اقساط کے حساب سے زکوٰۃ دینا اگرچہ جائز ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی تاہم بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ یکمشت ادا کی جائے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : وافتراضھا عمری ای علی التراخی وصححہ الباقانی وغیرہ وقیل فوری ای واجب علی الفور وعلیہ الفتویٰ کما فی شرح الوھبانیۃ فیأثم بتاخیرھا بلاعذر۔ وقال ابن عابدینؒ وقد یقال المراد ان لا یؤخر الی العام القابل لما فی البدائع ...اذا لم

---

[۱] قال العلامۃ علاؤ الدین الکاسانی رحمہ اللہ : واما الذی یرجع الی المؤدی فمنھا ان یکون مالاً متقوماً علی الاطلاق سواء کان منصوصاً علیہ اولا من جنس المال الذی وجبت فیہ الزکوٰۃ او من غیر جنسہ والاصل ان کل مالٍ یجوز التصدق بہ تطوعاً یجوز اداء الزکوٰۃ منہ ومالا فلا۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص۴۱ فصل واما الذی یرجع الی المؤدّی)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۹ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ والعروض۔ الفصل الاوّل۔

يئود حتى مضى حولان فقد اساء واثم - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۱۳ كتاب الزكوٰة) [1]

قرضہ وصولی کی اقساط شروع ہونے سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی گاڑی ۹۴ ہزار روپے ماہوار اقساط پر فروخت کی جبکہ معاہدہ کے مطابق اقساط چار سال بعد شروع ہوں گی، تو کیا ان چار سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوں گی یا جب قسطوں کی وصولی شروع ہو جائے تو اس وقت کا اعتبار ہوگا؟

الجواب:۔ زکوٰۃ جس طرح نقد مالیت پر واجب ہوتی ہے اسی طرح دینِ قوی پر بھی لازم ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں گاڑی فروخت کرنے کے بعد جب سال گذر جائے تو جملہ رقم پر زکوٰۃ دینا واجب ہو جائے گی چاہے اقساط شروع ہو چکی ہوں یا نہ۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: اذا عجل زكوٰة سنين يجوز عند علمائنا الثلاثة خلافا لزفر۔ وفى شرح الطحاوى: انما يجوز التعجيل بشرائط ثلاثة - احدها ان يكون الحول منعقدا وقت التعجيل، والثانى ان يكون النصاب كاملا فى التى عجل عنه فى آخر الحول، والثالث ان لا يفوت اصله فيما بين ذلك -

(تاتارخانية ج ۲ ص۲۵۳ باب التعجيل الزكوٰة) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانى رحمه الله: ثم قيل هى واجبة على الفور لانه مقتضى مطلق الامر وقيل على التراخى لان جميع العمر وقت الاداء ولهذا لا يضمن بهلاك النصاب بعد التفريط -

(الهداية ج ۱ ص۱۶۸ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۱ ص۱۷۰ كتاب الزكوٰة، الباب الاول فى تفسيرها وصفتها وشرائطها -

[2] قال العلامة الحصكفىؒ: ولو عجل ذو نصاب زكوٰته لسنين او لنصف صح لوجود السبب. قال ابن عابدينؒ: بان كان له ثلثمائة درهم دفع منها مائة درهم عن المائتين عشرين سنة - (رد المحتار ج۲ ص۹۷ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ فى فتاوى قاضيخان ج۱ ص۱۲۷ فصل فى تعجيل الزكوٰة -

گاڑی حوائج اصلیہ میں داخل ہے

سوال:۔ ایک شخص کے پاس دس لاکھ کی گاڑی ہے، تو کیا یہ شخص زکوٰۃ دیتے وقت اس گاڑی کی قیمت لگاکر اس کی بھی زکوٰۃ دے گا یا گاڑی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے؟

الجواب:۔ ہر وہ مال جو آدمی کے حوائج اصلیہ میں داخل ہو چاہے وہ کتنا ہی قیمتی ہو زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے اس لیے موصوف صرف زائد از حوائج اصلیہ مال کی زکوٰۃ دے گا، گاڑی کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰة لانها مشغولة بحاجته الاصلیة ولیست بنامیة۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ)[1]

سامانِ تجارت میں اندازہ سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال:۔ میری بہت بڑی دوکان ہے جس میں ہزاروں اشیاء موجود ہیں تو اگر میں اندازہ لگاکر ان کی زکوٰۃ ادا کروں تو کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ تجارت کے جملہ سامان پر جب سال گذر جائے تو اس کی قیمت لگاکر زکوٰۃ دینا لازمی ہے، بہتر یہ ہے کہ جملہ اشیاء کو گن کر ان کی قیمت لگائی جائے البتہ اگر شمار کیے بغیر اندازہ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہو تو اندازہ زیادہ لگانا چاہیے تاکہ زکوٰۃ مالِ تجارت کی قیمت سے کم ادا نہ ہو۔

لما فی الهندیة: الزکوٰة واجبة فی عروض التجارة کائنة ما کانت اذا بلغت قیمتها نصابا من الورق والذهب۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۷۹ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثانی)[2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰة لانها مشغولة بالحاجة الاصلیة۔ (الهدایہ ج ۱ ص۱۶۶ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص۸۵۵ کتاب الزکوٰۃ قبل شروط صحة اداء الزکوٰۃ۔

[2] لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: الزکوٰة واجبة فی عروض التجارة کائنة ما کانت اذا بلغت قیمتها نصاباً من الورق والذهب لقوله علیه السلام فیها یقومها فیؤدی من کل مائتی درهم خمسة دراهم۔

(الهدایة ج ۱ ص۱۷۷ باب زکوٰة المال، فصل فی العروض)

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۶ ص۱۴۳ پانچواں باب (سامانِ تجارت کی زکوٰۃ)

قرض پر زکوٰۃ کس کے ذمہ واجب ہے؟

سوال: جناب مفتی صاحب! میرے بیس ہزار روپے ایک شخص پر قرض ہیں لیکن وہ اِس سے منکر ہے اور میرے پاس کوئی تحریری ثبوت بھی نہیں اور نہ میرے پاس کوئی گواہ ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا میرے ذمہ اس قرض کی زکوٰۃ دینا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب[1]: جب دین (قرض) کی وصولی کا ظاہری طور پر کوئی امکان نہ ہو تو یہ مالِ ضمار میں داخل ہے چونکہ مالِ ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق آپ پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔

الجواب[2]: شریعتِ مقدسہ میں ہر اُس قرضہ پر زکوٰۃ واجب ہے جو دَینِ قوی یا متوسط ہو، یعنی دائن کے پاس گواہ یا تحریری ثبوت ہو یا پھر مدیون (قرضدار) قرضہ کا اقرار کرتا ہو، مگر ساتھ ہی دائن یعنی قرض دہندہ قرض کی وصولی پر قادر بھی ہو تب زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ بصورتِ دیگر یہ قرضہ مالِ ضمار کے حکم میں ہے جس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ودَین کان جحده المدیون سنین ولابینة علیه۔قال العلامة السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله ولا بینة علیه) بل ولوکان علیه بینة علی الصحیح۔

(الطحطاوی حاشیه الدر المختار ج ا ص۳۹۳ کتاب الزکوٰۃ) [1]

صاحبِ نصاب نے زکوٰۃ ادا نہ کی اور پھر وہ مال مکان کی تعمیر میں خرچ کرنے کے باوجود زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی

سوال: اگر کسی کے پاس مال نصاب سے بھی زیادہ ہو اور سال گذر جانے کے باوجود ابھی تک اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی ہو اور پھر وہ سارا مال اس نے مکان کی تعمیر میں خرچ کر دیا ہو تو کیا اس شخص کے ذمے زکوٰۃ باقی ہے یا کہ ساقط ہو جائے گی؟

---

[1] لما قال العلامه ابن نجیم المصریؒ:۔ وعن محمدؒ لا تجب الزکوٰۃ وان کان له بینة لان البینة قد لا تقبل والقاضی قد لا یعدل وقد لا یظهر بالخصومة بین یدیه لمانع فیکون فی حکم الهالك وصححه فی التحفة ۔کذا فی غایة البیان وصححه فی الخانیة ایضاً ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۷ کتاب الزکوٰۃ۔

الجواب:۔ جب نصاب پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی لیکن اگر کسی شخص نے ابھی تک زکوٰۃ ادا نہ کی ہو اور سارا مال مکان کی تعمیر یا اور کسی ضرورت میں خرچ کیا تو اس کے ذمے زکوٰۃ دینا باقی ہے، مال کو اس طرح خرچ کرنے سے زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی۔ البتہ اگر مال ہلاک یا تباہ ہوجائے جس میں مزکی کا ہاتھ نہ ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ ساقط ہے۔

لما قال الشیخ عبد الحی اللکھنویؒ: زکوٰۃ ذمہ پر ہے، خزانۃ الروایات میں عتابیۃ سے منقول ہے: اذا اھلک النصاب بعد الحول تسقط الزکوٰۃ عنہ وان استھلکہ ضمن الزکوٰۃ فی ذمتہ والاستھلاک اخراج النصاب عن ملکہ۔ (مجموعۃ الفتاویٰ (فارسی) ج۲ ص۳۰۰ کتاب الزکوٰۃ)[1]

قرضہ کی وصولی پر قادر نہ ہونے کی صورت میں زکوٰۃ

سوال:۔ ایک بدمعاش پر میرا کچھ قرضہ ہے تحریری ثبوت کے باوجود وہ میرا قرضہ نہیں دیتا اور نہ میں اس کی وصولی پر قادر ہوں، تو کیا مجھ پر اس مال کی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص کمزوری کی وجہ سے کسی بدمعاش قسم کے شخص سے اپنا قرضہ وصول نہیں کرسکتا ہو تو راجح یہ ہے کہ اس شخص پر اس قرضہ کی زکوٰۃ واجب نہیں تاہم جتنا وصول ہو جائے تو اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کرے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قلتُ وقد قدمنا اوّل الزکوٰۃ اختلاف التصحیح فیہ ومال الرحمتی الیٰ ھذا وقال بل فی زماننا یقر المدیون بالدین وبملائتہ ولا یقدر الدائن علی تخلیصہ منہ فھو منہ بمنزلۃ العدم۔ (رد المحتار ج۲ ص۹۹ کتاب الزکوٰۃ)[2]

حولانِ حول کے بعد شک گذرنے پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

سوال:۔ کسی آدمی کو سال گذر جانے کے بعد شک ہوا کہ آیا میں نے

---

[1] قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: ولا الھالک بعد الوجوب۔ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: تحتہ...... وقید بالھلاک لانہ لو استھلکہ بعد الحول لا تسقط عنہ لوجود التعدی۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۱۹، ۲۱۸ کتاب الزکوٰۃ فصل فی الغنم)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۲ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل فی الغنم۔

[2] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ودین کان جحدہ المدیون سنین ولا بینۃ علیہ قال العلامۃ السید الطحطاویؒ تحت (قولہ ولا بینۃ علیہ) بل ولو کان علیہ بینۃ علی الصحیح۔ (الطحطاوی حاشیۃ الدر المختار ج۱ ص۳۹۳ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاویٰ ج۲ ص۳۳ کتاب الزکوٰۃ۔

ادا کی ہے یا نہیں تو اب اس کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: ۔زکوٰۃ کی ادائیگی میں اگر کسی کو شک پڑ جائے کہ آیا اس نے زکوٰۃ ادا کی ہے یا نہیں تو چونکہ زکوٰۃ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں بخلاف صلوٰۃ کے اسلئے زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے۔

لما قال العلامة ابن نجیم :وفی الواقعات ولو شك رجل فی زکوٰۃ فلم یدر ازکی ام لا فانه یعید فرق بین ھٰذا وبین ما اذا شك فی الصلوٰۃ بعد ذھاب الوقت اصلاھا ام لا والفرق ان العمر کله وقت لاداء الزکوٰۃ فصار ھٰذا بمنزلة شك وقع فی اداء الصلوٰۃ انه ادی ام لا وھو فی وقتھا ولو کان کذلك یعید۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۱۲ کتاب الزکوٰۃ)[۱]

کیا ٹیکس زکوٰۃ کا متبادل ہو سکتا ہے

سوال: ۔حکومت جو انکم ٹیکس وصول کرتی ہے کیا اس ٹیکس کی وصولی سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ اسلامیہ میں زکوٰۃ ایک عبادت ہے جس کے لیے شرعاً حدود و مقادیر وغیرہ مقرر ہیں، بخلاف حکومتی ٹیکس کے کہ اس میں نہ مقدار مال مقرر ہے اور نہ یہ عبادت سمجھ کر لیا جاتا ہے اور نہ اس میں اسلام، بلوغ وعقل شرط ہے بلکہ یہ حکومت اُس فائدہ کا عوض لیتی ہے جو عوام الناس کو ریاست سے ملتا ہے اور نہ اس کے مصارف وہ ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں، لہٰذا ان شرائط کے فقدان کی وجہ سے موجودہ ٹیکس کو زکوٰۃ میں شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ مستقل زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

لما قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ : الزکوٰۃ واجبة علی الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملك نصاباً ملکاً تاماً وحال علیه الحول اما الوجوب فلقوله تعالیٰ واٰتوا الزکوٰۃ ولقوله علیه السلام ادوا زکوٰۃ اموالکم وعلیه اجماع الأمة۔

(الھدایة علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۱۲ کتاب الزکوٰۃ)[۲]

---

[۱] وفی الھندیة : ولو شك رجل فی الزکوٰۃ فلم یدر أزکی او لم یزك فانه یعیدھا۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۸۰ مسائل شتیٰ)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی السراجیة ص۲۶ باب نیة الزکوٰۃ وکیفیة الاداء۔

[۲] لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : قوله وشرط وجوبھا العقل والبلوغ والاسلام والحریة ای شرط افتراضھا لانھا فریضة محکمة قطعیة اجمع العلماء علیٰ تکفیر جاحدھا الخ۔

(البحر الرائق ج۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۷۳۸ کتاب الزکوٰۃ، شروط وجوب الزکوٰۃ۔

کپڑوں پر سونے یا چاندی کی کڑھائی میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ شادی بیاہ کے موقع پر بعض لوگ زنانہ کپڑوں پر سونے یا چاندی کے دھاگوں سے کڑھائی کراتے ہیں تو کیا سال گذر جانے کے بعد اس کڑھائی کی زکوٰۃ دینا بھی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کڑھائی کے لیے اگر خالص سونے یا چاندی کے دھاگے استعمال کئے جائیں تو اس صورت میں سال گذرنے کے بعد حساب کر کے زکوٰۃ دینا لازم ہے البتہ اگر دھاگے خالص سونے یا چاندی کے نہ ہوں بلکہ ان دھاگوں کو صرف سونے یا چاندی کا پانی دیا گیا ہو تو صرف سونے چاندی کا رنگ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: لا یعتبر فی ھذا النصاب صفة زائدة علیٰ کونہ فضة تتجب الزکوٰة فیھا سواء کانت دراھم مضروبة او نقرة او تبرا او حلیًا مصوغًا او حلیة سیف او منطقة او اللجام او سرج او الکواکب فی المصاحف والاوانی وغیرھا اذا کانت تخلص عند الاذابة اذا بلغت مائتی درھم وسواء کا یمسکھا للتجارة او للنفقة او للتجمل او لم ینوشیئًا۔

(البدائع الصنائع ج۲ ص۱۶ کتاب الزکوٰة۔ فصل: واما صفة ھذا النصاب) [1]

انسانی جسم کے بعض اعضاء پر سونے چاندی کا خول چڑھانے پر وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:۔ بعض لوگ شوقیہ طور پر دانتوں پر سونے چاندی کا خول چڑھاتے ہیں یا پھر اندر سے کھوکھلے دانتوں کو سونے چاندی سے بھر دیتے ہیں۔ تو کیا ایسے لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زمانہ قدیم سے بعض مصالح اور حالات کی بناء پر سونے چاندی کو انسانی جسم کے بعض اعضاء پر استعمال کرنے کا رواج چلا آ رہا ہے۔ سونے چاندی کے ان اعضاء کی دو قسمیں ہیں،

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: تجب الزکوٰة فی الذھب والفضة مضروبًا او تبرًا او حلیًا مصوغًا او حلیة سیف او منطقة او لجام او سرج او الکواکب فی المصاحف والاوانی وغیرھا اذا کانت تخلص عن الاذابة سواء کان یمسکھا للتجارة او للنفقة او للتجمل او لم ینوشیئًا۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۲۶ کتاب الزکوٰة۔ باب زکوٰة المال)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۱ ص۱۷۸ الباب الثالث فی زکوٰة الذھب والفضة۔

ایک وہ اعضاء جو انسانی بدن میں بالکل پیوست ہو جاتے ہیں اوران کو اپنی جگہ سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے اور الگ کرنے کی صورت میں سخت تکلیف ہوتی ہے گویا کہ وہ مصنوعی اعضاء انسانی جسم کے حقیقی اعضاء کی طرح ہو جاتے ہیں، اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو الگ کرنا آسان ہوتا ہے اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ تو اول الذکر میں زکوٰۃ واجب نہیں اسلئے کہ شریعتِ مقدسہ نے مالِ نامی ہونے کی جو علت وجوبِ زکوٰۃ کے لیے بیان وہ یہاں مفقود ہے، اور ثانی الذکر قسم میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ اس میں نمو حکمی پائی جاتی ہے۔

زکوٰۃ کا مال چوری ہو جائے تو

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے جملہ مال سے زکوٰۃ کا مال جدا کرکے اپنے پاس رکھ لیا، ابھی اس نے وہ مال غرباء و مساکین میں تقسیم نہیں کیا تھا کہ چوری ہو گیا، تو کیا یہ شخص اب زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کا اپنے جملہ مال سے صرف جدا کرنا کافی نہیں بلکہ ادائیگی کے لئے کسی فقیر و مسکین کو تملیک کر دینا لازمی امر ہے بدون اس کے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کا مال چوری ہو گیا ہے جس میں تملیک کی شرط[1] مفقود ہے اسلئے موصوف کیلئے زکوٰۃ کا دوبارہ ادا کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: رجل عزل زكوٰة ماله ووضعها في ناحية بيته فسرقها سارق لايقطع يده للشبهة وعليه ان يزكيها۔ (خلاصة الفتاوى ج ۱ ص۲۳۸ كتاب الزكوٰة قبيل الفصل السادس)

❋ ❋ ❋

---

[1] قال العلامة الحصكفي رح: (هي تمليك) خرج الاباحة (جزء مال) خرج المنفعة (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ولو معتوها (غير هاشمي ولا مولاه) اى معتقه (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) فلا يدفع لاصله وفرعه (لله تعالى) بيان لاشتراط النية۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص۵۶، ۵۸ كتاب الزكوٰة۔

باب زکوٰۃ فی الاموال

(سونا چاندی اور تجارتی سامان میں زکوٰۃ کے احکام)

زکوٰۃ میں سونے کی کون سی قیمت معتبر ہے؟

سوال:۔ اگر ایک شخص کے پاس سونا ہو تو اس میں کون سی قیمت معتبر ہوگی؟ جبکہ مروجہ قیمت قیمتِ خرید سے کئی گنا زیادہ ہے۔

الجواب:۔ سونا ایسا مال ہے جس میں قدرتی طور پر نمو پائی جاتی ہے، اس لیے زکوٰۃ کے وجوب کے وقت اس سے مقررہ حصہ نکالا جاتا ہے لیکن قیمت ادا کر کے بھی ذمہ فارغ ہوسکتا ہے، اس لیے اس میں قیمتِ خرید کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ زکوٰۃ دینے کے وقت جو قیمت ہوگی اس کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ:۔ وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء...... و یقوم فی البلد الذی المال فیہ ولو فی مفازۃ ففی اقرب الامصار الیہ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۶ باب زکوٰۃ الغنم) [1]

سونے کی مقررہ مقدار سے کم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے پاس ۲½ تولے سونا ہے جو اگرچہ سونے کی مقدارِ نصاب سے کم ہے لیکن اس کی قیمت کے حساب سے ۵۲ تولہ چاندی کی مروجہ قیمت سے اس کی قیمت زیادہ بنتی ہے، کیا ایسی حالت میں اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

لما قال ابن عابدین رحمہ اللہ:۔ افاد ان وجوب الضم اذا لم یکن کل واحد منہما نصاباً بان کان

---

[1] قال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ:۔ یقومھا ای المالک فی البلد الذی فیہ المال حتی لوکان بعث عبد التجارۃ الیٰ بلد اخری لحاجۃ فحال الحول یعتبر قیمتہ فی ذٰلک البلد ولوکان فی مفازۃ تعتبر قیمتہ فی اقرب الامصار الیٰ ذٰلک الموضع کذا فی الفتاویٰ ثم قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ فیہ انہ تعتبر القیمۃ یوم الوجوب وعندھما یوم الاداء۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۶۶ باب زکوٰۃ المال فصل فی العروض)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۹ باب زکوٰۃ المال۔

اقل فاما اذا کان کل واحد منهما نصاباً تاماً ولم یکن زائداً علیہ لایجب الضم بل ینبغی ان یؤدّی من کل واحد زکوٰته ولوضم احدھما الی الآخر حتی یؤدّی کلہ من الذھب او الفضۃ فلا بأس به عندنا ولکن یجب ان یکون التقویم بما ھوانفع للفقراء رواجاً والا فیؤدّی من کل واحد منھما ربع عشرہ ۔ (منحة الخالق علی ھامش البحر الرائق ج۲ ص۲۲۳ باب زکوٰۃ المال)[1]

میاں بیوی کے مشترکہ زیورات میں زکوٰۃ

سوال:۔ اگر عورت کو والدین نے جہیز میں کچھ زیورات بناکر دیئے ہوں، اس کے علاوہ خاوند نے بھی کچھ زیورات بناکر بیوی کو پہننے کے لیے دیئے ہوں، لیکن خاوند اور بیوی کے درمیان یہ معاہدہ ہے کہ خاوند نے جو زیورات بنائے ہیں وہ اُس کی ملکیت ہیں لیکن عورت کو پہننے کا حق حاصل ہے، کیا ایسی صورت میں عورت پر مجموعۂ زیورات کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت کو خاوند کی طرف سے دیئے گئے زیورات عورت کی ملکیت ہوں اور مجموعہ زیورات شمار کرکے جب نصاب تک پہنچ جائیں پھر تو عورت ان کی زکوٰۃ ادا کرے گی، لیکن اگر خاوند نے زیورات عورت کو عاریتاً دیئے ہوں تو ایسی حالت میں مشترکہ زیورات سے عورت کا اپنا حصہ اگر نصاب تک پہنچتا ہو پھر عورت کے لیے اپنے حصہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے، اور اگر مشترکہ زیورات نصاب کو پہنچتے ہوں لیکن انفرادی طور پر خاوند اور بیوی کا حصہ نصاب سے کم ہو تو پھر کسی ایک پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ وَسَبَبُهٗ ای سبب افتراضھا ملک نصاب حولی نسبة للحول لحولانه علیه ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ)[2]

---

[1] قال فی الھندیة: ولوضم احد النصابین الی الآخر حتی یؤدّی کله من الذھب او من الفضۃ لا بأس به لکن یجب ان یکون التقویم بما ھوانفع للفقراء قدراً ورواجاً والا فیؤدّی من کل واحد ربع عشرہ ۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۷۹ کتاب الزکوٰۃ ۔ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۳۰۳ باب زکوٰۃ المال)

[2] قال فی الھندیة: ومنھا کون المال نصاباً فلا زکوٰۃ فی اقل منه ۔

(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ ۔ الباب الاول)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ ۔

سونے چاندی کی مقدار میں علامہ عبدالحیؒ اور حضرت تھانویؒ کی عبارات میں تطبیق

سوال:۔ سونے اور چاندی کے نصاب میں اکابرین کی عبارتیں مختلف ہیں، حضرت تھانویؒ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے لیے نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کے لیے ساڑھے باون تولہ ہے، جیسا کہ "امداد الفتاوٰی" کی عبارات سے واضح ہے لیکن مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کا قول مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے "اوزانِ شرعیہ" میں نقل فرمایا ہے کہ علامہ عبدالحی رحمہ اللہ کے نزدیک سونے کا نصاب ساڑھے پانچ تولہ اور چاندی کا نصاب ۳۶ تولہ ۵½ ماشہ ہے، ان دونوں اکابرینؒ کی رائے میں سے کس کو اعتبار دینا مناسب ہے؟

الجواب:۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اوفق بالروایات ہے، آپ نے جس تولہ سے حساب کیا ہے ہمارے ہاں یہی نصاب مروّج ہے، ممکن ہے مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے تولہ کی مقدار میں اختلاف کرکے اُس تولہ کا حساب کیا ہو جو مروجہ تولہ سے زیادہ ہو، اس لیے آپ نے کم حساب کیا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی حضرت تھانویؒ کی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ لما قال مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "اوزانِ شرعیہ" میں فرمایا ہے کہ علامہ عبدالحی رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء کرام کی تحقیقات اس بارے میں متفاوت ہیں اور تفاوت بھی معمولی نہیں کیونکہ مولانا عبدالحی صاحبؒ کے نزدیک چاندی کا نصاب چھتیس ۳۶ تولے اور ساڑھے پانچ ماشہ ہے اور سونے کا نصاب پانچ تولہ اور اڑھائی ماشہ ہے، اس تفاوت سے تمام احکام شرعیہ پر اثر پڑتا ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ سونے کا نصاب شرعی بیس (۲۰) مثقال ہے اور ایک مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہے تو اسی حساب سے سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ ہوگا اور چاندی کا نصاب دوسو ۲۰۰ درہم ہے۔ اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ ایک رتی اور ایک رتی کا پانچواں حصہ ہے تو اس حساب سے چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ ہے۔[1]

---

[1] والتفصیل فی الاوزان الشرعیۃ للمفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ۔

زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے | **سوال:۔** اگر زیورات استعمال کے لیے ہوں تو کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سونا چاندی زیورات کی شکل میں ہو یا ویسے، ہر حالت میں زکوٰۃ واجب رہے گی، استعمال کے باوجود اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے بشرطیکہ وہ زیور نصاب تک پہنچتا ہو۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: وفی تبر الذهب والفضة وحليهما واوانيهما الزكوٰة۔ (الهداية ج ۱ ص۱۹۵ باب زكوٰة المال) [۱]

سونے کی قیمت کو اعتبار نہیں | **سوال:۔** ایک عورت کے پاس پانچ تولہ سونا ہے جو اُس کو خاوند نے حق مہر میں دیا ہے، اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی نقد رقم یا چاندی وغیرہ نہیں، اگرچہ سونے کی یہ مقدار نصاب تک نہیں پہنچتی ہے کہ جس سے زکوٰۃ ادا ہو، لیکن سونے کی مروجہ قیمت کے اعتبار سے اس کی اتنی قیمت ضرور بنتی ہے کہ جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے۔ اس طریقہ سے اگر سونے کی قیمت کا حساب کیا جائے تو عورت صاحبِ نصاب بن سکتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس صورت میں عورت صاحبِ نصاب شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ جب اس عورت کے پاس صرف سونا ہو تو اس میں قیمت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ نصاب کی رعایت ہوگی، سونے کا نصاب چونکہ ۷½ تولہ ہے اور ۵ تولہ اس سے کم ہے اسلئے یہ عورت صاحبِ نصاب نہیں۔

لما قال فی الهندية: ومنها كون المال نصابًا فلا تجب فی اقل منه۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۷۲ كتاب الزكوٰة۔ الباب الاول) [۲]

---

[۱] قال الامام علاؤ الدين ابی بكر بن مسعود الكاسانی الحنفیؒ: فتجب الزكوٰة فيها سواء كانت دراهم مضروبة او نقرة او تبرا او حليا مصوغا او حلية سيف او منطقة او لجام او سرج او الكواكب فی المصاحف والاوانی وغيرها۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۱۷ فصل فی اما صفة هذا النصاب)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۱ ص۱۷۸ باب الثالث فی زكاة الذهب والفضة والعروض۔

[۲] قال العلامة الحصكفی رحمه الله: وَسَبَبُهٗ ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی نسبة للحول لحولانه عليه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۵۹ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲ كتاب الزكوٰة۔

سونا چاندی سے ہر سال زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے

سوال:۔ ہم لوگ سونے کی زکوٰۃ اس طرح نکالتے ہیں کہ سونے کا حساب کرکے پہلے سال زکوٰۃ دیتے ہیں، اس کے بعد پھر کسی بھی سال میں ہم زکوٰۃ نہیں نکالتے ہیں، آیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر سال ایسے زیورات سے زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے ایک سال زکوٰۃ دینا کافی نہیں کیونکہ یہ ثمن خلقی ہیں خواہ جس طریقے سے آدمی کے پاس ہوں ہر سال زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، کیونکہ سونا چاندی ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور زیادت خود بخود آتی ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ :۔ واللازم فی مضروب کل منهما و معموله ولو تبرًا او حلیًا مطلقًا مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقة لانهما خلقًا اثمانًا فیزکیهما کیف کانا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۹۸ باب زکوٰۃ المال) [1]

حکومت کی طرف سے عائد جرمانہ کی ادائیگی کیلئے زکوٰۃ دینا

سوال:۔ اگر ایک شخص پر حکومت کی طرف سے کوئی جرمانہ واجب الادا ہو لیکن اس شخص کے پاس ادائیگی کے لیے کوئی رقم نہ ہو تو کیا اس کی طرف سے زکوٰۃ کی رقم جرمانہ میں دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی مجبور سے مالی تعاون کرنا بذاتِ خود بہت بڑی نیکی ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر یہ شخص غریب ہو تو بغیر کسی حیلہ کے اس کو زکوٰۃ کی رقم دے کر جرمانہ کے ادا کرنے میں مدد دینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر یہ شخص صاحبِ نصاب ہو لیکن جرمانہ کی ادائیگی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو تو کسی شرعی حیلہ کے بغیر اس کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لما قال الشیخ النظام رحمه الله :۔ ولو قضٰی دین الفقیر بزکوٰۃ ماله ان کان

---

[1] قال الامام برهان الدین المرغینانی رحمه الله :۔ وفی تبر الذهب والفضة وحلیهما واوانیهما الزکوٰۃ۔ (الهدایة علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۶۳ باب زکوٰۃ المال۔ فصل فی الذهب)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۱۶/۱۷ فصل صفة النصاب۔

بامرہ یجوز وان کان بغیر امرہ لایجوز وسقط الدّین ۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۹۰ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف) ؎۱

اموالِ تجارت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ تجارت میں نقد اور قرض دونوں کا معاملہ ہوتا ہے اس لیے حولانِ حول کے بعد اگر کسی تاجر کے پاس نقد رقم کم اور قرض کی رقم زیادہ ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی میں کون سا مال معتبر ہوگا؟

الجواب:۔ تجارت کے کاروبار میں جملہ مالیت کا اعتبار ہوگا خواہ وہ مالک کے پاس نقدی کی شکل میں ہو یا اموالِ تجارت (یعنی جنس) کی صورت میں موجود ہو، یہاں تک کہ قرض بھی اس میں شمار ہو کر جملہ مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ تاہم اگر قرض سے زکوٰۃ کی ادائیگی وصولی پر موقوف رہے تو یہ بھی جائز ہے۔

قال زین الدین ابن نجیمؒ: قوی وھو بدل القرض ومال التجارۃ...... ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی القضاء الی ان یقبض اربعین درھمًا ففیھا درھم وکذا فیما زاد بحسابہ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۰۷ کتاب الزکوٰۃ) ؎۲

اموالِ تجارت میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مروجہ قیمت کا اعتبار

سوال:۔ اموالِ تجارت سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جس مالیت کا اندازہ کیا جاتا ہے اس میں اموالِ تجارت کی کون سی قیمت معتبر ہوگی؟ کیونکہ

؎۱ قال العلامۃ ابن الہمام رحمہ اللہ:۔ ویحمل ھذا ان یکون بغیر اذن الحی اما اذا کان باذنہ وھو فقیر فیجوز عن الزکوٰۃ علیٰ انہ تملیک منہ والعاقد یقبضہ بحکم النیابۃ عنہ ثم یصیر قابضًا لنفسہ۔ وفی الغایۃ نقلًا من المحیط والمفید لوقضی بھا دین حی او میت بامرہ جاز ومعلوم ارادۃ قید فقیرا لمدیون ...... اوقضی دین حی او میت بغیر اذن الحی لایجوز۔

(فتح القدیر ج۲ ص۲۰۸ باب من یجوز دفع الصدقۃ الیہ۔ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف۔

؎۲ وفی الھندیۃ:۔ و (قوی) وھو مایجب بدلًا عن سلع التجارۃ اذا قبض اربعین زکی لما مضی کذا فی الزاھدی۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۳۰۵ باب زکوٰۃ المال۔

اشیاء کی قیمت خرید ایک ہوتی ہے جبکہ گاہک کو دوسری قیمت پر دی جاتی ہے۔

الجواب:۔ اموالِ تجارت کی قیمت لگانے میں مقامی قیمت کا اعتبار ہوگا پھر قیمت میں تفاوت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مارکیٹ کی موجودہ قیمت کو اعتبار دیا جائے گا، کیونکہ یہی اس کی مالیت کا معیار ہے۔

لما قال فی الهندیة :۔ ویقومها المالك فی البلد الذی فیه المال حتیٰ لو بعث عبداً للتجارة الیٰ بلدٍ اٰخر فحال الحول تعتبر قیمته فی ذٰلك البلد ولو كان فی مفازة تعتبر قیمته فی اقرب الامصار الیٰ ذٰلك الموضع۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۸۰ كتاب الزكوٰة۔ الباب الثالث فی زكوٰة الذهب والعروض۔ الفصل الثانی فی العروض) [1]

کاروبار کی جگہ کے فقراءِ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کا کاروبار ایک جگہ ہو اور رہائش دوسری جگہ ہو تو کہاں کے فقراء اُسکی زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں، کیا اس میں رہائش کا اعتبار ہوگا یا کاروبار کی جگہ کا؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام کی عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاروبار کی جگہ کے فقراء ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔

لما فی الهندیة : ویكره نقل الزكوٰة من بلدٍ الیٰ بلدٍ إلّا ان ینقلها الانسان الیٰ قرابته او الیٰ قوم هم احوج الیها من اهل بلده...... ثمّ المعتبر فی الزكوٰة مكان المال حتیٰ لو كان هو فی بلدٍ وماله فی بلدٍ اٰخر یفرق فی موضع المال۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۹۰ كتاب الزكوٰة الباب السابع فی المصارف) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : (تحت قوله: ویقوم فی البلد الذی المال فیه) فلو بعث عبداً للتجارة فی بلدٍ اٰخر یقوم فی البلد الذی فیه العبد۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۸۶ باب زكوٰة الغنم)
وَ مِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۹ باب زكوٰة فی الاموال۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : (تحت قول وكره نقلها) ای من بلدٍ الیٰ بلدٍ اٰخر لان فیه رعایة حق الجوار فكان اولیٰ والمتبادر منه ان الكراهة تنزیهیة تامل فلو نقلها جاز لان المصرف مطلق الفقراء و یعتبر فی الزكوٰة مكان المال۔
(ردّ المحتار ج۲ ص۳۵۳ باب المصرف)
وَمِثْلُهٗ فی المراقی الفلاح ص۳۹۲ باب المصرف۔

مالِ مضاربت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے دوسری کاروباری آدمی کو مضاربت پر کچھ رقم دی ہے، رُبّ المال دوسرے مال سے زکوٰۃ ادا کرتا رہتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو مال اس نے مضاربت پر دیا ہے کیا اس کی زکوٰۃ رُبّ المال پر ہے یا مضارب پر یا دونوں پر؟

الجواب:۔ مضاربت کی صورت میں جب تک فائدہ نہ ہو تو مضارب کے پاس رقم امانت ہوتی ہے اور مال رُبّ المال کا شمار ہوتا ہے اس لیے زکوٰۃ رب المال کے ذمہ واجب ہے لیکن اگر اس میں یعنی فائدہ ہو کر مضارب کا حصہ بھی اتنا ہو کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہو تو پھر ہر ایک پر اپنے حصے کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ویتراجعان بالحصص وبیانه فی الحاوی فان بلغ نصیب احدهما نصاباً زکاه دون الآخر۔۔۔۔واعلم ان الدیون عند الامام ثلاثة قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکوتها اذا تم نصاباً وحال الحول لکن لا فوراً بل عند قبض اربعین درهماً من الدّین القوی۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۰۴/۳۰۵ باب زکوٰۃ المال)[1]

مسجد کے لیے جمع شدہ رقم میں زکوٰۃ

سوال:۔ ایک شخص مسجد کا متولی ہے اُس نے اپنی ذاتی رقم سے مسجد تعمیر کرائی، اب متولی کا ارادہ یہ ہے کہ یہ قرضہ لوگوں سے وصول کروں، تو کیا متولی مذکور لوگوں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کر سکتا ہے تاکہ قرضہ ختم ہو جائے؟

الجواب:۔ مسجد میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جا سکتی کسی شرعی حیلہ کے بغیر مسجد میں زکوٰۃ کی رقم لگانا بے جا ہے، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لما قال فی الهندیة:ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰۃ المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانهار والحج والجهاد وکل مالا تملیك فیه۔ (الفتاویٰ الهندیہ ج۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف)[2]

---

[1] قال فی الهندیة: الخلیطان فی المواشی کغیر الخلیطین فان کان نصیب احدهما یبلغ نصاباً وجبت الزکوٰۃ علی الذی یبلغ نصیبه نصاباً دون الآخر وان کان احدهما ممن تجب علیه الزکوٰۃ دون الآخر فانها تجب علی من تجب علیه اذا بلغ نصیبه نصاباً۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۸۱ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثالث فی زکوٰۃ۔ مسائل شتیٰ)
ومثلهٗ فی المراقی الفلاح ص۳۹۰ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحة کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینه۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب المصرف)
ومثلهٗ فی الهدایة علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۲۰۷ باب من یجوز دفع الصدقة الیه۔ الخ

مسجد کی رقم پر تجارت کرنا اور اس میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ مسجد کے لیے جمع شدہ رقم میں ایک شخص اس نیت سے تجارت کرے کہ مسجد کی آمدنی میں ترقی ہو، تو از روئے شرع یہ تجارت جائز ہے یا نہیں ؟ اور اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں ؟

الجواب:۔ چندہ دہندگان یا ان کے معتمد علیہ کی اجازت سے اس رقم پر تجارت کرنا جائز ہے، تاہم اگر یہ رقم متولی کو نہ دی گئی ہو تو یہ رقم چندہ دہندگان کی ملکیت سے نہیں نکلتی، تو ایسی صورت میں چندہ دینے والے کی اجازت سے تجارت کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور مسجد کی جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شخصی ملکیت ضروری ہے جو کہ یہاں مفقود ہے۔

لما قال ابن عابدین رحمه الله: وَسَبَبُهُ ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی قوله ملك نصاب فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمختار ج۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ) [1]

جن اشیاء کے خریدنے میں تجارت کا ارادہ نہ ہو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:۔ اگر کسی نے کوئی چیز ذاتی استعمال کے لیے خریدی اور اس وقت یہ ارادہ کیا کہ یہ چیز جب مہنگی ہو جائے گی تو اس کو فروخت کر دوں گا، تو کیا یہ چیز اموالِ تجارت میں شمار ہوگی اور حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اموالِ تجارت میں خریداری کے وقت تجارت کی نیت ضروری ہے، جہاں کہیں نیت نہ ہو تو پھر ان چیزوں کا شمار اموالِ تجارت میں نہیں ہوگا۔ مذکورہ صورت میں چونکہ خریداری کے وقت تجارت کی نیت قطعی نہیں اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

قال علاؤ الدین الحصکفی ؒ:۔ او اشتریٰ شیئًا للقنیة ناویًا انه وجد ربحًا باعه لا زکوٰۃ علیه۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۲۷۴ کتاب الزکوٰۃ) [2]

---

[1] قال العلامه الکاسانیؒ:۔ واما الشرائط التی ترجع الی المال فمنها الملك فلا تجب الزکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك وهذا لان فی الزکوٰۃ تملیکًا والتملیك فی غیر الملك لایتصور۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۹)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۲۵۲ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال الشیخ ابن الهمامؒ: فلو اشتریٰ عبدًا مثلًا للخدمة ناویًا بیعه ان وجد ربحًا لازکوٰۃ فیه۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۶۶ فصل فی العروض)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج۱ ص۱۱۷ کتاب الزکوٰۃ۔

کتابوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص کے پاس ذاتی مطالعہ کے لیے کتابیں موجود ہیں، قیمت کا اعتبار کیا جائے تو ان کی مالیت لاکھوں روپے سے بھی زائد بنتی ہے، کیا ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

الجواب: کتابوں پر اُس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب وہ تجارت کے لیے ہوں، ذاتی کتب میں تجارت کی نیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اموالِ تجارت میں شمار مشکل ہے، اس لیے ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما فی الهندیة: ومنها فراغ المال عن حاجته الاصلیة...... وكذا كتب العلم ان كان من اهله وآلات المحترفین۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۲ كتاب الزكوٰة ـ الباب الاوّل) [۱]

گاڑیوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص کے پاس ایک گاڑی ہے جو مزدوری کیلئے استعمال ہوتی ہے، اس کی آمدنی سے عموماً یہ شخص دوسری گاڑی خریدتا ہے، یوں اس کے پاس سال بھر کی کمائی سے کئی گاڑیاں جمع رہتی ہیں لیکن نقد رقم سے تہی دست رہتا ہے، کیا اس شخص پر گاڑیوں میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی گاڑی یا دوسرے ذرائع محنت و مزدوری کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ ان سے حاصل شدہ آمدنی کے حساب سے حولانِ حول کے بعد اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بصورتِ مذکورہ میں جب نقد رقم نہ ہو اور گاڑی تجارت کی نیت سے نہیں خریدی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ تاہم اگر یہ حیلہ زکوٰۃ کے وجوب سے بچنے کیلئے کیا جاتا ہو تو اس شخص کے گنہگار ہونے میں کوئی شک نہیں۔

لما قال العلامه جلال الدین الخوارزمیؒ: واما آلات الصناع الذین یعملون بها وظروف الامتعة للتجارة لا تجب فیه الزكوٰة لانها لیست بمعدّ للتجارة۔ (الكفایة فی ذیل فتح القدیر ج۲ ص۱۷۰ باب زكوٰة الاموال فصل فی العروض) [۲]

---

[۱] قال سید احمد الطحطاویؒ: عن حاجته الاصلیه...... وكتب العلم لاهلها فاذا كان عنده دراهم اعدها لهذه الاشیاء وحال علیها الحول لا تجب فیها الزكوٰة وكتب العلم لغیر اهلها لیست من الحوائج الاصلیة وان كان الزكوٰة لا تجب علی صاحبها بدون نیّة التجارة۔ (حاشیة الطحطاوی ص۳۸۹ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی الشامی ج۲ ص۸ كتاب الزكوٰة۔

[۲] لما قال فی الهندیة: ولو اشتری قدورًا من صفر یمسكها ویواجرها لا تجب فیها الزكوٰة كما لا تجب فی بیوت الغلة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۰ كتاب الزكوٰة ـ الباب الثالث فی زكوٰة الذهب والعروض ـ الفصل الثانی فی العروض)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۸ باب زكوٰة المال۔

پلاٹ کی خرید و فروخت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ عموماً زمین سے زکوٰۃ ادا نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس کی آمدنی سے عشر یا نصف عشر ادا کیا جاتا ہے لیکن ایک آدمی پلاٹ یا عمارت کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے ایسی حالت میں اس کی تمام تر مالیت جائیداد غیر منقولہ ہوتی ہے تو اس صورت میں حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں ؟

الجواب:۔ پراپرٹی کے کاروبار کی صورت میں جائیداد غیر منقولہ اپنی اصلی حالت سے ہٹ کر اموالِ تجارت کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ دیگر اموالِ تجارت جیسا معاملہ ہوگا کہ حولانِ حول کے بعد قیمت لگا کر زکوٰۃ واجب ہوگی، تاہم اس میں کاروباری انعقاد ہونے کی حیثیت کا تعین خریداری کے وقت کا ہوگا جس کے لیے اس وقت تجارت کی نیت ضروری ہے ورنہ بعد ازاں کاروبار کی نیت کرنے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما قال ابن نجیمؒ:۔ واما الدلالۃ فھی ان یشتری عیناً من الاعیان بغرض التجارۃ او یواجر دارہ التی للتجارۃ بعرض من العروض فیصیر للتجارۃ وان لم ینو التجارۃ صریحاً لکن ذکر فی البدائع الاختلاف فی بدل منافع عین معدۃ للتجارۃ ففی کتاب الزکوٰۃ من الاصل انہ للتجارۃ بلا نیۃ وفی الجامع مایدل علی التوقف علی النیۃ فکان فی المسئلۃ روایتان ومشائخ بلخ کانوا یصححون روایۃ الجامع لان العین وان کانت للتجارۃ لکن قد یقصد ببدل منافعھا المنفعۃ فیؤاجر الدابۃ لینفق علیھا والدار للعمارۃ فلا تصیر للتجارۃ مع التردد الا بالنیۃ۔

(البحر الرائق ج۲ ص۲۱۰ کتاب الزکوٰۃ) [1]

اسلحہ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ علاقہ غیر میں رہنے والے اکثر لوگ اپنے ساتھ اسلحہ رکھتے ہیں اور اسلحہ کی قیمت مقدارِ نصاب سے بہت زیادہ ہوتی ہے، تو کیا اس اسلحہ پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جو اسلحہ مال و جان کے تحفظ کے لیے رکھا جائے اگرچہ وہ قیمت کے لحاظ سے مقدارِ نصاب سے بہت زیادہ ہو تو حوائج اصلیہ میں داخل ہو کر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: او فی عرض تجارۃ قیمتہ نصاب الجملۃ صفۃ عرض وھو ھنا ما لیس بنقد وھو م (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۹۸ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۹ کتاب الزکوٰۃ۔

اگر تجارت کی غرض سے رکھا گیا ہو تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

قال علی ابن ابی بکر الفرغانیؒ: ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰة۔ (الهداية ج ۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰة) [۱]

گدھے اموالِ تجارت میں ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے

سوال: ہمارے پاس کچھ گدھے ہیں جن سے ہماری غرض صرف کاروبار کا چلانا ہے، کیا ان گدھوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ بعض علماء کرام کہتے ہیں کہ ایک مُردار شے ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

الجواب: گدھوں کی زکوٰۃ کے بارے میں شریعتِ مقدسہ نے کوئی واضح حکم نہیں دیا ہے اسلئے گدھوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں، البتہ اگر گدھے تجارت کیلئے رکھے ہوں جیسا کہ سوال سے مستفاد ہے تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ لازم ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شئ فی البغال والحمیر لقوله علیه السلام لم ینزل علیّ فیهما شئ والمقادیر تثبت سماعاً الا ان یکون للتجارة لان الزکوٰة حینئذ تتعلق بالمالیة کسائر اموال التجارة۔ (الهداية ج ۱ ص۱۹۱ فصل فی الخیل) [۲]

اصل رقم اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی

سوال: ایک آدمی کے پاس کچھ رقم ہے اور اس نے ابتداء سال سے اس میں تجارت شروع کی اور سال کے آخر میں اس نے کچھ منافع حاصل کیا، تو کیا حولانِ حول کے بعد اصل رقم یا منافع پر الگ الگ زکوٰۃ واجب ہوگی یا دونوں پر ایک ساتھ؟

الجواب: اگر کسی نے اوّل سال کی کسی تاریخ سے تجارتی کاروبار شروع کیا اور سال کے

---

[۱] وفی الهندیة: ومنها فراغ المال عن حاجته الاصلیة فلیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰة۔ (الفتاویٰ الهندیه ج ۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰة۔ الباب الاول فی تفسیرها الخ)
ومثلهٗ فی فتح القدیر ج ۱ ص۱۱۹ کتاب الزکوٰة۔

[۲] قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: (و) لا فی (بغال وحمیر) سائمة اجماعاً لیست للتجارة (فلو لها فلا کلام) لانها من العروض۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۸۲ باب زکوٰة الغنم)
ومثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۵۸ فصل الخامس فیما تجب فیه الزکوٰة۔

آخر میں اس نے کوئی نفع حاصل کیا تو اس میں اصل رقم اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر سال کی ابتداء اور انتہاء میں نصاب پورا ہو تو دورانِ سال ناقص ہونے سے زکوٰۃ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، سال کے آخر میں تمام مال سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ :۔ ومن کان لہ نصاب فاستفاد فی اثناء الحول من جنسہ ضمہ الیہ وزکوٰۃ ۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۹۳ فصل فی الغنم) لہ

ضرورت کے لیے خریدی گئی زمین پر تجارت کی نیت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین گھر کی تعمیر کیلئے خریدی اور نصف تعمیر کے بعد تجارت کی نیت کرلی، اب تعمیر پر زکوٰۃ کب سے واقع ہوگی؟ ابتداءً یا بوقتِ نیت؟

الجواب:۔ جو زمین گھر کی تعمیر کے لیے خریدی جائے اور دورانِ تعمیر اگر تجارت کی نیت کرلی تو قبل النیت خرچ کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ نہیں، کیونکہ تجارت میں نیت بوقتِ عقد معتبر ہوتی ہے اور بعد نیت جو رقم خرچ کی گئی ہے باقی اموال سے ملاکر اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ :۔ لایبقی للتجارۃ ما ای عبد مثلاً اشتراہ لہا فنوی بعد ذلک خدمتہ ثم ما نواہ للخدمۃ لایصیر للتجارۃ وان نواہ لہا مالم یبعہ بجنس ما فیہ الزکوٰۃ والفرق ان التجارۃ عمل فلاتتم بمجرد النیۃ ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۷۲ کتاب الزکوٰۃ) ۲ے

ذاتی استعمال کیلئے خریدی گئی مشین کو نفع پر فروخت کرنے میں زکوٰۃ

سوال: اگر کسی شخص نے ایک مشین ذاتی استعمال کیلئے

لہ وفی الھندیۃ : ومن کان لہ نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالاً من جنسہ ضمہ الی مالہ وزکوٰۃ ۔ الخ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۵ فصل منہا حولان حول علی المال)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۲۲ فصل فی الغنم ۔

۲ے قال الامام فخر الدین القاضیخانؒ :۔ اشتری خادماً للخدمۃ وھو ینوی انہ لواصاب ربحاً یبیعہ فحال علیہ الحول لازکوٰۃ فیہ ۔ (الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۲۵۱ کتاب الزکوٰۃ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۹ کتاب الزکوٰۃ ۔

خریدی ہو لیکن کوئی نفع اور صورت دیکھ اس کو فروخت کر دے تو کیا اس میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص گذشتہ ایام سے صاحبِ نصاب ہو تو حولانِ حول کے بعد مشین کی قیمت اور منافع جملہ منافع شمار کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی ورنہ حولانِ حول کے بغیر اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ :۔ وَسَبَبُهُ اى سبب افتراضها ملك نصاب حولى نسبة للحول لحولانه عليه۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۲۵۹ كتاب الزكوٰة) [1]

کراکری کے سامان میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص کی دوکان میں کھانے پینے کے برتن، پکانے کی دیگیں اور دوسرے ایسی چیزیں ہوں جو اجتماعی طور پر دعوت اور دیگر پروگراموں میں استعمال ہوتی ہوں، ایسے برتن عموماً کرایہ پر دیئے جاتے ہیں۔ از روئے شرع ایسے شخص کی آمدنی میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ کیا برتن، ٹینٹ اور دیگوں کی قیمت سے بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا نہ ؟

الجواب:۔ برتنوں، دیگوں اور کراکری ٹینٹ وغیرہ کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ ان اشیاء سے جو کمائی حاصل ہو جائے اور نصاب کو پہنچ جائے تو حولانِ حول کے بعد اس نفع میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ولو اشترى قدوراً من صفرٍ يمسكها و يواجرها فلا تجب فيها الزكوٰة كما لا تجب فى بيوت الغلة۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۸۰ كتاب الزكوٰة۔ الباب الثالث فى زكوٰة الذهب والعروض۔ الفصل الثانى فى العروض) [2]

---

[1] قال ابن نجيم رحمه الله :۔ والمراد بكونه حولياً ان يتم الحول عليه وهو فى ملكه لقوله عليه السلام لا زكوٰة فى مالٍ حتى يحول عليه الحول قال فى الغاية سمى حولاً لان الاحوال تحول فيه۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۳ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهُ فى الهندية ج۱ ص۱۷۵ كتاب الزكوٰة۔ الباب الاوّل۔

[2] قال العلامة جلال الدين الخوارزمى رحمه الله :۔ واما آلات الصناع الذين يعملون بها وظروف للتجارة لا تجب فيه الزكوٰة لانها ليست بمعدة للتجارة كما لا تجب فى بيوت الغلة۔ (الكفاية فى ذيل فتح القدير ج۲ ص۱۷۰ فصل فى العروض)

وَمِثْلُهُ فى البحر الرائق ج۲ ص۲۲۸ باب زكوٰة المال۔

مالِ تجارت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کو اپنے مالِ تجارت میں نقصان ہوا اور مال میں کمی آئی اور سال کے بعد مذکورہ مال میں اضافہ ہوا اب وہ زکوٰۃ کس طریقے سے ادا کرے گا؟

الجواب:۔ حولانِ حول کے بعد اصل مال اور منافع کو جمع کر کے جب مقدارِ نصاب ہو تو مجموعہ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی خواہ منافع ہو یا نقصان، اور رأس المال جب مقدارِ نصاب سے زائد ہو تو باوجود خسارہ کے زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے۔

قال العلامة الشرنبلالیؒ:۔ وشرط وجوب ادائها حولان الحول على النصاب الاصلی واما المستفاد فی اثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواءٌ استفید بتجارة او میراث۔ (مراقی الفلاح ص۳۸۹ کتاب الزکوٰۃ) [1]

تجارت کے لیے مکانات میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مکانات، دوکانیں اور پلاٹ تجارت کی نیت سے خرید کر ان کا کاروبار کرتے رہتے ہیں، ممکن ہے بسا اوقات کچھ وقت کے لیے رہنے کا فائدہ بھی حاصل کریں لیکن عموماً پیشِ نظر اس میں تجارت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کرتے ہیں، ایسی حالت میں ان مکانات اور دوکانوں کی قیمت سے زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ منقولہ جائیداد کی طرح غیر منقولہ جائیداد کا کاروبار بھی معاشرہ کے اہم معاملات میں سے ہے، اگرچہ غیر منقولہ جائیداد بذاتِ خود نمو سے عاری ہونے کی وجہ سے وجوبِ زکوٰۃ کا محل نہیں، یہی وجہ ہے کہ رہن سہن یا کرایہ کے لیے بنائے ہوئے مکانات اور دوکانوں پر زکوٰۃ نہیں، لیکن جب یہی جائیداد کاروباری منڈی میں منتقل ہو کر خریدتے وقت باقاعدہ تجارت کی نیت کی گئی ہو تو پھر اموالِ تجارت کے حکم میں ہو کر اس کی قیمت میں حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہے گی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله:۔ وسواء کان مال التجارة عروضاً او عقاراً او شیئاً مما یکال او یوزن لان الوجوب فی اموال التجارة تعلق بالمعنی وهو المالیة والقیمة

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وشرط کمال النصاب ولو سائمة فی طرفی الحول فی الابتداء للانعقاد وفی الانتهاء للوجوب فلا یضر نقصانه بینهما۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۰۲ فصل فی زکوٰۃ الغنم)
ومثله فی البحر الرائق ج۲ ص۲۲۲ فصل فی الغنم۔

وهذه الاموال كلها في هذا المعنى جنس واحد ۔ (البدائع الصنائع ج۲ ص۲۱/۲۰ فصل اموال التجارة) [1]

اجارہ کیے ہوئے کان میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کی پتھر کی کان ہے جو اجارہ کی ہے لیکن اس کے جملہ ٹیکس بھی حکومت کو ادا کرتا ہے اور کان والوں کو بھی فی من کچھ رقم دیتا ہے، تو آیا یہ شخص کل آمدنی سے زکوٰۃ ادا کرے گا یا ٹیکس ادا کرنے کے بعد بقیہ رقم کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

الجواب:۔ اس شخص کے دیگر اموال پر جب حولانِ حول ہو جائے تو اس کان سے خارج شدہ جواہرات کی زکوٰۃ ادا کرے گا بشرطیکہ جواہرات فروخت شدہ ہوں اور اگر فروخت شدہ نہ ہوں تو اس میں زکوٰۃ دینا واجب نہیں اور ٹیکس ادا کیے بغیر زکوٰۃ دی جائے گی۔

لما قال ابن الهمام رحمه اللہ اخرج ابن ابی شیبة عن عكرمة رضی اللہ عنہ: ليس فی حجر اللؤلؤ ولا حجر الزمرد زكوٰة الا ان يكون للتجارة ۔ (فتح القدير ج۲ ص۱۸۵ باب المعادن والركاز) [2]

کارخانہ کی زمین اور مشینوں پر زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:۔ میں ایک تجارت پیشہ آدمی ہوں، صنعت کے لیے میں نے صابن کا ایک کارخانہ لگایا ہوا ہے جس کی کافی زمین ہے اور اس میں مشینیں بھی ہیں، تو کیا مجھ پر کارخانہ کی زمین اور مشینوں کی زکوٰۃ لازم ہے؟

الجواب:۔ صنعتی آلات و وسائل جب تجارت کے لیے نہ ہوں بلکہ کسب کے لیے ہوں تو اُن کی ذات پر زکوٰۃ لازم نہیں اگرچہ وہ زمین یا مشینری لاکھوں کروڑوں روپے کی ہی کیوں نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی پر زکوٰۃ لازم ہے، البتہ اگر زمین یا آلات تجارت کی غرض سے ہوں تو پھر

---

[1] قال فی الهندية: الزكوٰة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصابا ۔
(الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۷۹ كتاب الزكوٰة ۔ الباب الثالث فی زكوٰة الذهب والفضة والعروض ۔ الفصل الثانی فی العروض)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية على صدر فتح القدير ج۲ ص۱۶۵، ۱۶۶ فصل فی العروض ۔

[2] قال ابن نجيم رحمه اللہ: (تحت قوله لا ركاز دار حرب وفيروزج ولؤلؤ وعنبر) ای لا خمس هذه الاشياء اما الاول فلانه حجر مضئ يوجد فی الجبال وقد ورد فی الحديث لا خمس فی الحجر ونحوه الياقوت والجواهر كما قدمناه من كل جامد لا ينطبع ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۳۶ باب الركاز)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۱۸۵ كتاب الزكوٰة ۔ الباب الخامس فی المعادن والركاز۔

ان کی ذات میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا فی ثیاب البدن ..... وکذلک آلات المحترفین ۔قال ابن عابدینؒ: ای سواء کانت مما لا تستھلک عینہ فی الانتفاع کالقدوم والمبرد او تستھلک۔
(رد المحتار ج۲ ص۲۶۵ کتاب الزکوٰۃ) لہ

آٹے کی مشین اور ٹرک وغیرہ کی قیمت میں زکوٰۃ نہیں

سوال:۔ اگر کسی نے ٹرک یا گاڑی وغیرہ مزدوری کے لیے خریدے ہوں اور ایسا ہی آٹا پیسنے کی مشین کمائی کے لیے خریدی ہو، کیا حولانِ حول کے بعد آٹے کی مشین اور ٹرک وغیرہ کی قیمت لگا کر اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کی تصریحات کی روشنی میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نقد اور اجناس میں تجارت کی نیت ضروری ہے، ایسی صورت میں نصاب پر حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب رہے گی، اس کے علاوہ جو آلات یا گاڑی وغیرہ محنت و مزدوری کے لیے ہوں اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ٹرک اور آٹا پیسنے کی مشین چونکہ آلاتِ مزدوری ہیں اس لیے ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ حولانِ حول کے بعد ان کی آمدنی اگر نصاب تک پہنچتی ہو تو پھر ان پر زکوٰۃ واجب رہے گی۔

قال علی ابن ابی بکر الفرغانیؒ:۔ ولیس فی دور السکنی ..... زکوٰۃ ..... وآلات المحترفین لما قلنا۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰۃ) ۲ہ

لہ قال الدکتور وھبۃ الزحیلی:۔ ولا زکوٰۃ باتفاق المذاھب علی الحوائج الاصلیۃ .... وآلات المحترفین لانھا مشغولۃٌ بالحاجۃ الاصلیۃ ولیست بنامیۃ اصلاً۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۷۳۶ البحث الثانی سبب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۱ ص۱۶۶ کتاب الزکوٰۃ۔

۲ہ وفی الھندیۃ: ومنھا فراغ المال عن حاجتہ الاصلیۃ فلیس فی دور السکنی ..... وکذا الکتب العلم ان کان من اھلہ وآلات المحترفین کذا فی السراج الوھاج۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۲۶۲ کتاب الزکوٰۃ۔

زمین کا کرایہ (ٹھیکہ) پیشگی دینے میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص نے زمین کرایہ پر لی ہے اور دو تین سال کا کرایہ پیشگی مالکِ زمین کو دے دیا ہے۔ اس پیشگی کرایہ پر جو زکوٰۃ ہے وہ زمین کے مالک پر ہوگی یا مستاجر پر؟

الجواب: کرایہ دار نے جو رقم پیشگی دی ہے اگر زمین کی اُجرت کے طور پر دی ہے تو زکوٰۃ مالکِ زمین پر ہوگی اور اگر بطور قرض دی ہو تو زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب عند قبض اربعین درهمًا من الدّین القوی کقرض وبدل مال تجارة فکلما قبض اربعین درهمًا یلزمه درهم۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۰۵ باب زکوٰۃ المال) [1]

قیمتی پتھروں میں زکوٰۃ کس طرح ادا ہوگی

سوال: آجکل ایسے پتھر پائے جاتے ہیں جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، تو کیا ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

الجواب: قیمتی پتھروں مثلاً زمرد وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں، ہاں اگر تجارت کیلئے ہوں تو پھر ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما فی الهندیة:۔ ولا شیٔ فیما یخرج من البحر کالعنبر واللؤلؤ والسمك وفیها ایضًا ولا شی الّا ان یکون للتجارة فان کان للتجارة فحکمها حکم العروض۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۵،۱۸۷ کتاب الزکوٰة۔ الباب الخامس فی المعادن والرکاز) [2]

---

[1] قال زین الدین ابن نجیمؒ: قسّم ابوحنیفةؒ الدّین علیٰ ثلاثة اقسام قوی وهو بدل القرض ومال التجارة۔ الخ۔ ففی القوی تجب الزکوٰة اذا حال الحول ویتراخی القضاء الیٰ ان یقبض اربعین درهمًا ففیها درهم وکذا فیما زاد بحسابه۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۷)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۲۳۸ فصل السادس فی الدیون ومسائلها۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ:۔ لا زکوٰة فی اللآلیٔ والجواهر وان ساوت الفًا اتفاقًا الّا ان تکون للتجارة والاصل ان ماعدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیّة التجارة۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۲۷۳ کتاب الزکوٰة)

وَمِثْلُهٗ فی مراقی الفلاح ص۳۹۱ کتاب الزکوٰة۔ قبیل باب المصرف۔

زیورات کے نگینہ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر زیورات کی مجموعی تعداد دس تولہ ہو لیکن اس میں دو تولہ قیمتی پتھر اور جواہر بھی ہوں جو کہ بطور نگینہ زیورات میں استعمال ہو، تو کیا اس صورت میں مجموعی طور پر دس تولہ زیورات کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا نگینہ منہا کر کے بقیہ زیورات سے زکوٰۃ دینی ہوگی۔

الجواب:۔ نگینہ خواہ قیمتی پتھر کا ہو یا موتی کا ہو اُس میں بذاتِ خود زکوٰۃ واجب نہیں، اسلئے سونے (زیورات) سے اس کو منہا کر کے اصل سونے سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی سونے کی مقدار (وزن) میں اس کا شمار نہیں ہوگا۔

لما قال شیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ:۔ واما الیواقیت واللآلی والجواهر فلا زکوٰۃ فیها وان کانت حلیاً الّا ان تکون للتجارۃ۔ (الجوهرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۵۱ باب زکوٰۃ الذهب)[1]

قدرتی خزانہ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ قدرتی خزانہ پانے کی صورت میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بیت المال کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خمس یعنی ۵/۱ حصہ حکومت کو ملے گا اور بقیہ ۵/۴ حصے اس شخص کے پاس رہے گا جس کو خزانہ ملا ہے، خزانہ ملتے وقت اس میں زکوٰۃ واجب نہیں تاہم حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ دی جائے گی۔

لما قال الشیخ النظامؒ: مایخرج من المعادن ثلاثة منطبع بالنار ومائع وما لیس بمنطبع ولا مائع اما المنطبع کالذهب والفضة والحدید والرصاص والنحاس والصفر ففیه الخمس۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۴ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الخامس فی المعادن والرکاز)[2]

---

[1] قال فی الهندیة: واما الیواقیت واللآلی والجواهر فلا زکوٰۃ فیها وان کانت حلیاً الّا ان تکون للتجارۃ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۰ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثالث، الفصل الثانی فی العروض)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۷۳ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ:۔ ولنا قوله علیه السلام وفی الرکاز الخمس وهو من الرکز فاطلق علی المعدن ولانها کانت فی ایدی الکفرۃ فحوتها ایدینا غلبةً فکانت غنیمةً وفی الغنائم الخمس۔ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج ۲ ص۱۸۰ باب المعادن والرکاز)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۲ باب الرکاز۔

۲/۱ ۲ تولہ سونا اور ۴۰۰۰ روپے نقد پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ایک شخص کے پاس ۲/۱ ۲ تولہ سونا اور تقریباً ۴۰۰۰ روپے کا سامان زائد از ضرورت موجود ہے اور اس پر ۴۰۰۰ روپے قرض بھی ہے، تو کیا اس شخص پر قربانی اور زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- ہر وہ شخص جس کے پاس ۲/۱ ۷ تولہ سونا یا ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی یا اسکی قیمت کا سامان ضروریاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو تو ایسے شخص پر قربانی واجب ہے اور اگر دو تین اشیاء ہوں مذکورہ اشیاء میں سے تو پھر جو چیز سونا، چاندی میں سے انفع للفقراء ہو تو اسی نصاب سے تینوں یا دونوں کو قیمتاً ضم کرکے نصاب بنالیا جائے، اب اگر اس شخص پر قرضہ بھی ہو تو جملہ قیمت سے قرضہ منہا کرکے باقی مال اگر نصاب تک پہنچ جائے تو اس پر قربانی واجب ہے ورنہ نہیں۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ ۲/۱ ۲ تولہ سونا اور سامان کی قیمت تقریباً ۱۴،۱۵ ہزار روپے بنتی ہے اور اگر اس میں سے ۴ ہزار روپے کا قرضہ منہا کیا جائے تو بھی باقی مال نصاب تک پہنچتا ہے اسلئے اس شخص پر قربانی اور زکوٰۃ واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله والیسار) بان ملك مائتی درهم او عوضاً یساویها غیر مسکنه وثیاب اللبس او متاع یحتاجه الیٰ ان یذبح الاُضحیة ولم لهٗ عقار یستغله فقیل تلزم لوقیمته نصاباً۔ (ردالمحتار ج۵ ص۲۱۹ کتاب الاضحیة)

قال الامام ابوحنیفةؒ: یضم احدهما الی الاٰخر باعتبار القیمة۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۱۹ کتاب الزکوٰة)

سائیکل اور گھڑی وغیرہ ضروریات میں داخل ہیں

سوال:- اگر کسی شخص کے پاس اڑھائی تین ہزار کی سائیکل اور ایسے ہی ایک قیمتی گھڑی بھی ہو، تو کیا ان اشیاء کی مجموعی قیمت نصاب کو پہنچ کر مالک کو غنی کے حکم میں قرار دے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- موجودہ معاشرہ اور حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اشیاء حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں اس لیے ان کے مالک کو صاحبِ نصاب قرار نہیں دیا جا سکتا ہے بلکہ بعض اشخاص کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر موٹر سائیکل بھی ان کے لیے ضروریات میں داخل مانا گیا ہے اس لیے اگر یہ شخص غریب ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا یجوز دفع الزکوٰة الیٰ من یملك نصاباً من ای مال کان، الیٰ ان قال ویجوز دفعها الیٰ من یملك اقل من ذٰلك وان کان صحیحاً مکتسباً لانه فقیر الخ (الهدایة ج۱ ص۲۰۷ باب مصارف الزکوٰة)

باب زکوٰۃ السوائم

(چرنے والے جانوروں میں زکوٰۃ کے احکام)

بھیڑ بکریوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص کے پاس بیس۲۰ بھیڑ بکریاں ہوں اور ان کے ساتھ ان کے تیس۳۰ بچے بھی ہوں، اب ان بچوں پر تو سال نہیں گذرا جبکہ بیس۲۰ بھیڑ بکریوں پر سال گذر چکا ہے، اس حالت میں زکوٰۃ کس وقت ادا کی جائے گی۔

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں چونکہ چالیس۴۰ بھیڑ بکریوں پر سال نہیں گذرا ہے بلکہ بیس۲۰ پر سال گذرا ہے اور بقیہ (تیس۳۰ بچوں) پر سال پورا نہیں گذرا، اس لیے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہیں کی جائے گی جب تک چالیس۴۰ پر سال نہ گذر جائے۔

لما قال فی الهندیة:۔ لیس فی اقل من اربعین من الغنم السائمة صدقة فاذا کانت اربعین سائمة وحال علیه الحول ففیها شاة الی مائة وعشرین۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۸ کتاب الزکوٰة الباب الثانی الفصل الرابع فی زکوٰة الغنم)[1]

مویشیوں کے دودھ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی اپنے گھاس سے مویشی پال کر دودھ فروخت کرتا ہے، اس میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بذاتِ خود اس رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں تاہم حولانِ حول کے بعد تکمیلِ نصاب سے زکوٰۃ لازم ہو گی۔

لما قال الشیخ النظام رحمه الله:۔ ومنها کون المال نصابًا فلا تجب فی اقل منه۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰة۔ الباب الاول)

وقال ایضًا: (ومنها حولان الحول علی المال) العبرة فی الزکوٰة

---

[1] قال الامام برهان الدین المرغینانی رحمه الله:۔ لیس فی اقل من اربعین من الغنم السائمة صدقة فاذا کانت اربعین سائمة وحال علیها الحول ففیها شاة۔

(الهدایة علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۳۵ فصل فی الغنم)

ومثله فی البحر الرائق ج۲ ص۲۱۶ باب زکوٰة المال۔ فصل فی الغنم۔

للحول القمری۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۷۵ الباب الاول) ؎۱

چراگاہ کی اُجرت دینے سے زکوٰۃ متاثر نہیں ہوتی

سوال:۔ ایک آدمی کی ملکیت میں متعدد گائیں اور بھینسیں ہوں، سال کے اکثر حصہ میں یہ جانور چرتے ہوں لیکن جہاں پر یہ حیوانات چرتے ہیں اس کے لیے باقاعدہ سالانہ کچھ رقم ادا کرنا پڑتی ہے، اب جواب طلب بات یہ ہے کہ کیا رقم کی ادائیگی کے وقت یہ حیوانات سائمہ شمار ہوں گے یا غیر سائمہ؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے حیوانات میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے جو "سائمہ" کا ذکر کیا ہے تو ان حیوانات پر یہ حقیقت صادق آتی ہے، اس لیے ماہانہ یا سالانہ رقم کی ادائیگی سے یہ حیوانات "سائمہ" کے حکم سے نہیں نکلتے، لہٰذا سال کے اکثر حصہ میں چرنے کی وجہ سے ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله :۔ وشرعاً المکتفیة با لرعی المباح ذکره الشمنی فی اکثر العام لقصد الدر والنسل ذکره الزیلعی۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۲۷۵ باب السائمة) ؎۲

اتحادِ مرعیٰ ضروری نہیں

سوال:۔ اگر ایک شخص کے پاس ساٹھ بکریاں ہوں اور اس نے ان کے لیے دو نوکر رکھے ہوئے ہوں جن میں سے ایک نوکر تیس بکریاں ایک جگہ اور دوسرا نوکر تیس بکریاں دوسری جگہ چراتا ہے، تو کیا اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ ہمارے نزدیک نصاب پر حولانِ حول کے بعد مرعیٰ کا ایک ہونا ضروری نہیں، جب ساٹھ بکریاں ایک شخص کی ملکیت ہوں تو الگ الگ مقامات پر چرنے کے باوجود

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ :۔ وَسَبَبُهٗ ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی نسبة للحول لحولانه علیه ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰة ۔ مطلب فی احکام المعتوه)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص۲۰۲ کتاب الزکوٰة ۔

؎۲ قال ابن نجیم رحمه الله :۔ هی التی تکتفی بالرعی فی اکثر السنة بیان للسائمة با لمعنی الفقهی لان اسم السائمة لایزول با لعلف الیسیر ولانه لایمکن الاحتراز عنه قید با لاکثر لافادة إنّهٗ لو علفها نصف الحول فانها لاتکون سائمة فلا زکوٰة فیها لوقوع الشك فی السبب ۔

(البحرالرائق ج ۲ ص۲۱۲ باب صدقة السوائم)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۱ ص۱۲۷ باب زکوٰة الخیل ۔

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما قال فی الہندیۃ:۔ الخلیطان فی المواشی کغیر الخلیطین ...... اسباب الملک ......
وسواء کانت فی مرعیٰ واحد او فی مراعی مختلفۃ فان کان نصیب احدھما یبلغ نصاباً
ونصیب الآخر لا یبلغ نصاباً وجبت الزکوٰۃ علی الذی یبلغ نصیبہ نصاباً دون الآخر۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۸۱ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثالث، مسائل شتیٰ) ؎۱

گائے اور بھینس کی زکوٰۃ کے نصاب میں فرق ہے یا نہیں

سوال:۔ گائے اور بھینس کی نصاب زکوٰۃ میں کتنی تعداد ہے جس کو پہنچکر ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اور کیا گائے اور بھینس دونوں ایک شمار ہوں گے یا علیحدہ علیحدہ؟

الجواب:۔ گائے اور بھینس میں نصاب زکوٰۃ کم از کم تیس ہیں بشرطیکہ وہ سال کا اکثر حصہ باہر چراگاہ میں مفت کا چارہ کھاتی ہوں اور اس پر ایک سال کا بچہ یا بچی جو دوسرے سال میں داخل ہو زکوٰۃ میں دینا واجب ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ لیس فی اقل من ثلثین من البقر صدقۃ فاذا کانت ثلثین سائمۃ وحال علیھا الحول ففیھا تبیع او تبیعۃ وھی التی طعنت فی الثانیۃ والجوامیس والبقر سواء (الہدایۃ ج۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل فی البقر) ؎۲

؎۱ قال ابن الہمام رحمہ اللہ:۔ ففی الوجوب الجمع بین الاملاک المتفرقۃ اذ المراد الجمع والتفریق فی الاملاک لا الامکنہ الا تری ان النصاب المفرق فی امکنۃ مع وحدۃ الملک تجب فیہ ومن ملک ثمانین شاۃ لیس للساعی ان یجعلھا نصابین بان یفرقھا فی مکانین فمعنی لا یفرق بین مجتمع انہ لا یفرق الساعی بین الثمانین مثلاً۔
(فتح القدیر ج۲ ص۱۲۹ باب صدقۃ السوائم۔ فصل فی الابل)
ومثلہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الہندیۃ ج۱ ص۲۴۸ فصل فی صدقۃ الحملان والفصلان۔

؎۲ لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ نصاب البقر والجاموس ولو متولدا من وحش واھلیۃ بخلاف عکسہ ...... ثلاثون سائمۃ غیر مشترکۃ وفیھا تبیع لانہ یتبع امہ ذو سنۃ کاملۃ او تبیعۃ انثاہ۔ الخ
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸ کتاب الزکوٰۃ۔ باب زکوٰۃ البقر)
ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۲۸ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل فی نصاب البقر۔

بکریوں میں زکوٰۃ کا نصاب

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بکریوں کی تعداد نصابِ زکوٰۃ میں کتنی ہے جن میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

الجواب:۔ بھیڑ بکریوں کی تعداد جب چالیس تک پہنچ جائے اور سائمہ بھی ہوں تو سال گذرنے کے بعد اُن میں ایک بکری بطورِ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ ليس في اقل من اربعين من الغنم السائمة صدقة فاذا كانت اربعين سائمة وحال عليها الحول ففيها شاة۔

(الهداية ج ۱ ص۱۷۲ كتاب الزكوٰة۔ فصل في الغنم) [۱]

بھینسوں کا نصابِ زکوٰۃ

سوال:۔ احادیثِ مبارکہ میں گائے، اُونٹ، بکری وغیرہ کا نصابِ زکوٰۃ تو مقرر ہے مگر بھینس کا نہیں، تو شرعاً بھینسوں کا نصابِ زکوٰۃ کتنا ہے؟

الجواب:۔ بھینس نصابِ زکوٰۃ میں گائے کی طرح ہے یعنی جتنا نصاب گائے کا ہے (تیس گائے) اتنا ہی نصاب بھینسوں کا بھی ہے، اسی طرح اگر دونوں مخلوط ہوں تب بھی یہی ایک نصاب ہوگا یعنی دونوں کا نصاب ایک ہی شمار کیا جائے گا۔

لما قال العلامة ابن نجيم رحمه الله:۔ (قوله والجاموس كالبقر) لان اسم البقر يتناولها اذ هو نوع منه فيكمل نصاب البقر به وتجب فيه زكاتها وعند الاختلاط تؤخذ الزكوٰة من اغلبها الخ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۵ كتاب الزكوٰة، باب صدقة البقر) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاري رحمه الله:۔ وليس في اقل من الاربعين من الغنم صدقة فاذا كانت اربعين وفي الكل سائمة غير مشتركة ففيها شاة الى مائة وعشرين۔

(الفتاوى التاتارخانية ج ۲ ص۲۲۲ كتاب الزكوٰة۔ الفصل الاول في صدقة السوائم)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۸ كتاب الزكوٰة، فصل في نصاب الغنم۔

[۲] وفي الهندية: والجاموس كالبقر وعند الاختلاط يجب ضم بعضها الى بعض لتكميل النصاب ثم تؤخذ الزكوٰة من اغلبها ان كان بعضها اكثر من بعض۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۷۸ كتاب الزكوٰة۔ الفصل الثالث في زكوٰة البقر)

وَمِثْلُهٗ في الجوهرة النيرة ج ۱ ص۱۴۴ كتاب الزكوٰة ۔ باب زكوٰة البقر۔

گھر میں پالے ہوئے جانوروں میں زکوٰۃ

سوال:۔ اگر کوئی شخص جانوروں کی دیکھ بھال گھر ہیں ہی کرتا ہو لیکن یہ جانور تجارت کے لیے ہوں تو کیا ان جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو جانور بغرض تجارت رکھے جائیں چارے وغیرہ کا بندوبست گھر میں کیے یا باہر چراگاہ میں، مگر وہ جانور بمنزلہ سامانِ تجارت ہو کر سال گذرنے کے بعد ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ اُن کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب تک پہنچتی ہو۔

لما قال العلامة برهان المرغينانيؒ:۔ الزكوٰة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصاباً من الورق والذهب، لقوله عليه السّلام فيها يقومها فيؤدی من كل مائتی درهم خمسة دراهم، الخ۔ (الهداية ج ۱ ص۱۷۵ كتاب الزكوٰة، فصل فی العروض) [۱]

تجارت کے لیے جانوروں میں سونا چاندی کا نصاب معتبر ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص تجارت کیلئے گائے یا بیل رکھتا ہو اور ان کی تعداد تیس ۳۰ سے کم ہو تو کیا اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو جانور تجارت کی نیت سے پالے جائیں تو اس میں جانوروں کا نصابِ زکوٰۃ ضروری نہیں بلکہ جب ان جانوروں کی قیمت ۵۲½ تولہ چاندی یا ۷½ تولہ سونے کی قیمت تک پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی چاہے جانوروں کی تعداد نصابِ زکوٰۃ تک پہنچتی ہو یا نہ۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ:۔ الزكوٰة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصاباً من الورق والذهب لقوله عليه السلام فيها يقومها فيؤدی من كل مائتی درهم خمسة دراهم۔ (الهداية ج ۱ ص۱۷۵ كتاب الزكوٰة فصل فی العروض) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة ابن نجيمؒ:۔ (قوله ولا فی العلوفة والعوامل)...... والمراد بنفی الزكوٰة عن العلوفة زكوٰة السائمة لانها لو كانت للتجارة وجبت فيها زكوٰة التجارة۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۸ كتاب الزكوٰة فصل فی الغنم)

[۲] لما قال العلامة ابن نجيمؒ:۔ قوله وفی عروض تجارة بلغت نصاب ورق او ذهب......ای يجب ربع العشر فی عروض التجارة اذا بلغت نصاباً من احدهما۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۲۸ كتاب الزكوٰة۔ باب زكوٰة المال)

زکوٰۃ میں جانور کی بجائے اس کی قیمت دینا | **سوال**:۔ اگر کوئی شخص جانوروں کی زکوٰۃ میں جانور کی جگہ اس کی قیمت بدے

تو کیا اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی ؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں فقہ حنفی کی رُو سے بعینہٖ اُسی چیز کا دینا ضروری نہیں بلکہ اس کی جگہ قیمت بھی دی جا سکتی ہے بلکہ بسا اوقات قیمت دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ:۔ ویجوز دفع القیمۃ فی الزکوٰۃ والکفّارۃ وصدقۃ الفطر وَالْعُشُرِ وَالنَّذْرِ۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۲۱ کتاب الزکوٰۃ۔ باب فی الغنم)۔ ؎۱

گدھوں میں زکوٰۃ کا مسئلہ | **سوال**:۔ بعض علاقوں میں زیادہ تر گدھے پالے جاتے ہیں تو کیا ان میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ گدھے یا خچر ایسے جانور ہیں جن کی زکوٰۃ کے لیے شارع علیہ السلام نے کوئی حکم جاری نہیں فرمایا اس لیے ان میں زکوٰۃ نہیں، تاہم اگر تجارت کی غرض سے رکھے گئے ہوں تو پھر زکوٰۃ واجب ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ ولا شئ فی البغال والحمیر لقولہ علیہ السلام لم ینزل عَلَیَّ فیھما شئ والمقادیر تثبت سماعاً الّا ان تکون للتجارۃ لان الزکوٰۃ حینئذٍ تتعلق بالمالیۃ کسائر اموال التجارۃ۔ (الھدایہ ج۱ ص۱۷۳ کتاب الزکوٰۃ، فصل فی الخیل) ؎۲

ڈیری فارم کی بھینسوں میں زکوٰۃ کا حکم | **سوال**:۔ میرا ایک ڈیری فارم ہے جس میں تیس چالیس بھینسیں رکھی ہیں جن کے چارہ وغیرہ کا

؎۱ قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ ویجوز دفع القیم فی الزکوٰۃ عندنا وکذا فی الکفارات وصدقۃ الفطر والعُشر والنذر۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۷۴ کتاب الزکوٰۃ فصل فی الخیل)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۳۷ کتاب الزکوٰۃ۔ باب زکوٰۃ الخیل۔

؎۲ لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ:۔ (قولہ ولا فی الحمیر والبغال) لقولہ علیہ السلام لم ینزل عَلَیَّ فیھما شئ والمقادیر تثبت سماعاً الّا ان تکون للتجارۃ لان الزکوٰۃ حینئذ تتعلق بالمالیۃ کسائر اموال التجارۃ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۱۷ کتاب الزکوٰۃ، فصل فی الغنم)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الفصل الخامس فیما لا تجب فیہ الزکوٰۃ۔

انتظام میں فارم ہی میں اپنے خرچہ سے کرتا ہوں، تو کیا ان میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: جو جانور گھر میں پالے جاتے ہوں اور ان کے لیے چارہ وغیرہ بھی قیمتاً لیا جاتا ہو اور باہر چراگاہ میں چرتے ہوں لیکن سال کا کم حصہ، تو ایسے جانوروں میں زکوٰۃ واجب نہیں، لہٰذا آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر ان بھینسوں کو صرف دودھ کے لیے پال رکھا ہو اور ان کے دودھ کو فروخت کیا جاتا ہو تو اس صورت میں دودھ کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ اُس رقم پر پورا سال گذر جائے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولیس فی العوامل والعلوفة صدقة...... ثم السائمة هی التی تکتفی بالرعی فی اکثر الحول حتی لو علفها نصف الحول او اکثر کانت علوفة لان القلیل تابع للاکثر۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۷۴ کتاب الزکوٰة، فصل فی الخیل) [1]

گائے بیل اور دودھ کی ذاتی ضرورت کے لیے رکھی ہوئی بھینسوں میں زکوٰۃ

سوال: میں ایک کاشتکار آدمی ہوں میرے پاس کچھ بیل ہیں جو میں نے ہل چلانے کے لیے رکھے ہوئے ہیں اور دو بھینسے (سنڈے) رہٹ چلانے کے لیے اور کچھ گائے بھینسیں دودھ کی ذاتی ضروریات کے لیے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے بچے بھی ہیں، تو کیا میرے ذمے ان جانوروں کی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: جو جانور کسی عمل (ہل یا رہٹ وغیرہ) کے لیے رکھے جائیں اُن میں شرعاً زکوٰۃ نہیں اور جو جانور دودھ یا بچوں کے لیے پالے جاتے ہوں تو اُن میں زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وہ سال کا اکثر حصہ چراگاہ میں مفت کا چارہ کھاتے ہوں اور نصاب تک بھی پہنچتے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولیس فی العوامل والحوامل والعلوفة

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: (قوله هی التی تکتفی بالرعی فی اکثر السنة) بیان للسائمة بالمعنی الفقهی...... قید بالاکثر لافادة انه لو علفها نصف الحول فانها لا تکون سائمة فلا زکوٰة فیها لوقوع الشك فی السبب۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۲ کتاب الزکوٰة۔ باب صدقة السوائم)

ومثله فی الجوهرة النیرة ج ۱ ص ۱۴۸ کتاب الزکوٰة۔ باب زکوٰة الخیل۔

صدقة خلافا لمالك له ظواهر النصوص ولنا قوله علیه السلام لیس فی الحوامل والعوامل ولا فی البقرة المثیرة صدقة ۔ (الهدایة ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰة ۔فصل فی الخیل)[1]

بھیڑوں کے ساتھ ان کے بچے بھی نصاب میں شمار ہوں گے

سوال:۔ ہمارے ملک (افغانستان) میں اکثر لوگ بھیڑیں پالتے ہیں جن میں بسا اوقات بڑی بھیڑوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو نصاب تک نہیں پہنچ سکتی تو کیا بڑی بھیڑوں کے ساتھ اُن کے چھوٹے بچے بھی نصاب میں شمار کیے جائیں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ جانوروں کے نصاب زکوٰۃ میں بڑے جانوروں کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی شمار کیے جائیں اور جب نصاب کو پہنچیں تب اُن میں زکوٰۃ واجب ہوگی ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ ولا فی حمل وفصیل ولد الناقة وعجول ولد البقرة.....الا تبعًا لکبیر ولو واحداً ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۳ کتاب الزکوٰة ، باب زکوٰة الغنم)[2]

گھوڑوں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ میں نے سواری کے لیے ایک گھوڑا پال رکھا ہے تو کیا میرے ذمے اُس گھوڑے کی زکوٰۃ شرعًا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں جو گھوڑا سواری کے لیے رکھا جائے وہ وجوبِ زکوٰۃ سے خارج ہے یعنی اُس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لہٰذا آپ پر بھی اس گھوڑے کی

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ:۔ (قوله ولا فی العلوفة والعوامل) للحدیث لیس فی الحوامل والعوامل والعلوفة صدقة ولان السبب هو المال النامی ۔ الخ
(البحر الرائق ج۲ ص۲۱۸ کتاب الزکوٰة ، فصل فی الغنم)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۸ کتاب الزکوٰة ، الفصل الخامس فیما لا زکوٰة فیه ۔

[2] لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ:۔ ولیس فی الفصلان والعجاجیل والحملان صدقة عند ابی حنیفةؒ الا ان یکون معها کبار وهٰذا اٰخر اقواله وهو قول محمدؒ ۔
(الهدایة ج۱ ص۱۷۳ کتاب الزکوٰة ، فصل فی الخیل)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۱۷ کتاب الزکوٰة ، فصل فی الغنم ۔

زکوٰۃ واجب نہیں۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ وليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوٰة لانها مشغولة بالحاجة الاصلية ۔ (الهداية ج ۱ ص ۱۶۶ كتاب الزكوٰة) [1]

اونٹوں میں زکوٰۃ کا نصاب

سوال:۔ ہمارے علاقے میں لوگ اونٹ زیادہ پالتے ہیں تو شرعاً کتنے اونٹوں میں زکوٰۃ واجب ہے اور کتنی واجب ہے؟

الجواب:۔ اسلام کے قانونِ زکوٰۃ کے مطابق جب اونٹ سال کا اکثر حصہ باہر چراگاہ میں چرتے ہوں اور اُن پر پورا سال گذر جائے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے بشرطیکہ جب اونٹوں کی تعداد کم از کم پانچ ہو جائے تو ان میں ایک بکری واجب ہو جائے گی ۔

لما قال العلامة برهان الدين رحمه الله:۔ قال ليس في اقل من خمس ذود صدقة فاذا بلغت خمساً سائمة وحال عليها الحول ففيها شاة الى تسع، الخ ۔

(الهداية ج ۱ ص ۱۷۰ كتاب الزكوٰة ۔ فصل في الابل) [2]

صرف نصف سال چراگاہ میں چرنے والے جانوروں میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے پاس تقریباً پچاس گائے بھینسیں ہیں جن کو میں سال کے چھ ماہ اپنے گاؤں کے بیلے میں چراتا ہوں اور چھ ماہ اپنے گھر سے چارہ وغیرہ دیتا ہوں، کیا مجھ پر ان مویشیوں کی زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مویشیوں میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مویشی سائمہ

---

[1] لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله:۔ ليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة بحاجة الاصلية وليست بنامية ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۲ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ في عزيز الفتاوى ج ۱ ص ۳۴۸ كتاب الزكوٰة ۔

[2] لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاري رحمه الله:۔ قال محمد رحمه الله وليس فيما دون الخمس من الابل السائمة زكوٰة وفي الخمس شاة ۔ (الفتاوى التاتارخانية ج ۲ ص ۲۱۹ كتاب الزكوٰة الفصل الاول في صدقة السوائم)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۹ كتاب الزكوٰة ۔ باب نصاب الابل ۔

ہوں اور سائمہ ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو سال کا اکثر حصہ باہر چراگاہ میں چرتے ہوں۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق چونکہ آپ اپنے مویشیوں کو نصف سال اپنے گھر سے چارہ کھلاتے ہیں اور نصف سال باہر بیلہ میں چراتے ہیں اس لیے ان مویشیوں پر سائمہ کی تعریف صادق نہیں آتی، لہٰذا آپ پر ان مویشیوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: باب السائمة (هي) الراعية وشرعاً المتكفية بالرعي) المباح ذكره الشمني (في أكثر العام لقصد الدر والنسل) ذكره الزيلعي وزاد في المحيط (والزيادة في السمن) ليعم المذكور فقط لكن في البدائع لو أسامها للحم فلا زكوٰة فيها .... (فلو علفها) نصفه لا تكون سائمة) فلا زكوٰة فيها للشك في الموجب. اھ

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۷۵، ۲۷۶ كتاب الزكوٰة) له

* * *

له لما قال العلامة عبد الرحمن بن محمد الكليبولي الشهير بداماد افندي: (السائمة التي تكتفي بالرعي) الرعي بالكسر الكلاء وبالفتح مصدر..... (في أكثر الحول) فإن علفها نصف الحول أو أكثر فليست بسائمة لأن أربابها لا بد لهم من العلف أيام الثلج والشتاء فاعتبر الأكثر ليكون غالباً. (مجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر ج ۱ ص۲۹۲ باب زكوٰة السوائم)

ومثله في الفقه الاسلامي وادلته ج ۲ ص۸۳۲ كتاب الزكوٰة- الخطب الخامس زكوٰة الحيوان والانعام-

باب العشر
(عُشر کے احکام ومسائل)

چشمہ کے پانی سے سیرابی کی صورت میں عُشر کا حکم

سوال:- جو زمینیں چشموں سے سیراب ہوتی ہیں ان میں عُشر کا کیا حکم ہے؟ ان میں عُشر ہوگا یا نصف عشر؟

الجواب:- چشموں سے سیراب ہونے والی زمینوں میں عشر دینا واجب ہوگا کیونکہ اس میں مؤنت اور محنت کم ہوتی ہے اور عشر کا دارومدار مؤنت اور محنت پر ہے۔

لما قال فی الهندیة: ثم ماء العشر ماء البئر التی حفرت فی ارض العشر وماء العین التی تظهر فی ارض العشر وکذلك ماء السماء وماء البحار العظام عشری۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸٦ کتاب الزکوٰة. الباب السادس فی زکوٰة الزرع والثمار) [۱]

عُشر کس جگہ کے حساب سے واجب ہوتا ہے

سوال:- اگر ایک شخص نے ٹماٹر کی فصل کاشت کی ہو مگر نرخ کی کمی کی وجہ سے اپنے شہر میں کوئی قبول نہ کرتا ہو، تو اس صورت میں اگر یہ شخص وہ ٹماٹر فروخت کے لیے کسی دوسرے شہر لے جائے تو یہ آدمی عُشر کس جگہ کے حساب سے دے گا؟

الجواب:- اگر اپنے شہر میں جنس سے زکوٰۃ ادا کرے تو فبہا ونعمت، ورنہ دوسرے شہر میں فروخت کرتے وقت متعلقہ شہر میں جنس کی قیمت کا اعتبار کرکے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویقوم فی البلد الذی المال فیه ولو فی مفازة ففی اقرب الامصار الیه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸٦ باب زکوٰة الغنم) [۲]

---

[۱] قال الامام برهان الدین المرغینانیؒ: ثم الماء العشری ماء السماء والآبار والعیون والبحار التی لا تدخل تحت ولایة احد۔ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۹۹ باب زکوٰة الزرع والثمار)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۳۳ باب العشر۔

[۲] قال فی الهندیة: ویقومها المالك فی البلد الذی فیه المال حتی لو بعث عبداً للتجارة الی بلد آخر فحال الحول تعتبر قیمة فی ذلك البلد ولو کان فی مفازة تعتبر قیمته فی اقرب الامصار الی ذلك الموضع۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۰ کتاب الزکوٰة. الباب الثالث فی زکوٰة الذهب والفضة والعروض۔)

ٹیوب ویل سے سیراب ہونے والی نصف عُشر کا وجوب

سوال:۔ آبپاشی کے لیے اگر ٹیوب ویل استعمال ہوتا ہو جس میں زمیندار کو بجلی کے بل کے علاوہ مزید کچھ اخراجات بھی کرنے پڑتے ہیں، اس صورت میں آمدنی پر عُشر واجب ہوگا یا نصف عُشر؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق جس کھیت کی زراعت میں آبپاشی کے لیے بوجھ اٹھانا پڑے تو اس میں نصف عشر واجب ہوگا، جبکہ ٹیوب ویل سے آبپاشی کی صورت میں مالی بوجھ کسی سے مخفی نہیں اس لیے اس میں نصف عشر واجب ہے۔

لما فی الهندیة: وما سقی بالدولاب والدالیة ففیه نصف العُشر وان سقی سیحاً وبدالیةٍ یعتبر اکثر السنة فان استویا یجب نصف العُشر۔ (الهندیہ ج۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السادس فی زکوٰۃ الزروع والثمار)[1]

ائمہ مساجد کو دی گئی سیری کی آمدنی میں عشر یا نصف عشر کا وجوب

سوال:۔ بعض علاقوں میں سادات یا ائمہ مساجد کو قوم کچھ زمین دیتی ہے جس کو عرف میں سیری کہا جاتا ہے، بسا اوقات یہ زمین مالکانہ حقوق کے طور پر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ تو ائمہ مساجد کی ملکیت متصور ہوگی، لیکن جو سیری مساجد کے لیے وقف ہو اور ائمہ مساجد اس میں کاشت کریں تو اس میں عشر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ زمین سے عُشر کی ادائیگی کے لیے مالک ہونا شرط نہیں بلکہ زمین کی آمدنی جس کے لیے ہو اُس پر عشر یا نصف عشر واجب ہے۔ ائمہ مساجد سیری سے جو آمدنی لیتے ہیں اس میں عُشر یا نصف عشر واجب رہے گا۔

لما فی الهندیة: وکذا ملک الارض لیس بشرطٍ للوجوب لوجوبه فی الاراضی الموقوفة ویجب فی ارض الماذون والمکاتب۔ (الفتاویٰ الهندیہ ج۱ ص۱۸۵ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار)[2]

---

[1] قال الشیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ: وما سقی بغربٍ او دالیةٍ او سانیةٍ ففیه نصف العشر الدالیة الدولاب والسانیة البعیر الذی یستقی به الماء۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۵۴ باب العشر)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۲۸ باب العشر۔

[2] قال ابن نجیم المصریؒ: وکذا ملک الارض لیس بشرطٍ للوجوب لوجوبه فی الارض الموقوفه۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۳۷ باب العشر)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۵۳ باب زکوٰۃ الزرع والثمار۔

آئندہ سال کا عُشر پیشگی دینا

سوال:۔ اگر ایک شخص امسال عُشر ادا کرتے وقت آئندہ سال کا عُشر بھی ادا کر دے، تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب:۔ عُشر یا نصف عُشر چونکہ پیداوار پر واجب ہوتا ہے، آئندہ سال کا عُشر پیشگی دینا قبل الوجوب ادائگی کے مترادف ہے جس سے ذمہ داری فارغ نہیں ہوتی۔

ووقته وقت خروج الزرع وظهور الثمر عند ابی حنیفة فلو عجل عشر ارضه قبل الزرع لایجوز ولو عجل بعد الزراعة بعد النبات فانه یجوز ولو عجل بعد الزراعة قبل النبات فالاظهر انه لایجوز ولو عجل عشر الثمار ان کان بعد طلوعها یجوز وان کان قبل طلوعها لایجوز فی ظاهر الروایة۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار) [1]

قومی اخراجات منہا کیے بغیر عشر واجب ہے

سوال:۔ بعض علاقوں میں لوگوں کا یہ رواج ہوتا ہے کہ زمین کی آمدنی میں گاؤں کے لوہار، حجام یا دیگر کسب گروں کو ایک مخصوص حصہ دیتے ہیں۔ تو کیا عشر ان قومی یا علاقائی اخراجات کو منہا کیے بغیر ہی عشر ادا کیا جائے گا یا ان کا حصہ نکالنے کے بعد؟

الجواب:۔ عُشر یا نصف عُشر تمام آمدنی میں واجب ہے مذکورہ اخراجات بھی زمین کی آمدنی ہیں، اس لیے اس کا عشر یا نصف عشر ادا کرنا واجب ہے اور ان اخراجات کو منہا کیے بغیر ہی عشر ادا کیا جائے گا۔

لما قال الشیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ: وقال محمد اذا حصدت وصارت فی الجرین وفائدته فیما اذا اکل منه شیئاً بعد ما صار جهیشاً او اطعم غیرہ منه بالمعروف فانه یضمن عشر ما اکل واطعم عند ابی حنیفةؒ وزفرؒ ... وان اکل منها بعد بلغت الحصاد قبل ان حصد فمن عند ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ۔ (الجوهرة النیرة ج ۱ ص۱۵۱ باب زکوٰۃ الزرع والثمار) [2]

---

[1] قال العلامة جلال الدین الخوارزمیؒ: ثم اختلفوا فی وقت الوجوب فوقت الوجوب عند ابی حنیفة یکون عند ظهور الثمرة وعند ابی یوسفؒ الوجوب عند الادراک وعند محمد یکون عند استحکامه۔ (الکفایة فی ذیل فتح القدیر ج ۲ ص۱۹۱/۱۹۲ باب زکوٰۃ الزرع والثمار)

ومثلُهٗ فی البدائع الصنائع ج ۲ ص۵۴ فصل: زکوٰۃ الزرع والثمار۔

[2] قال ابن نجیمؒ: واما رکنه فالتملیک کالزکوٰۃ وشرائط الاداء ما قدمناہ فی الزکوٰۃ ..... وان استهلکه غیر المالک اخذ الضمان منه وادّی عشرہ وان استهلکه المالک ضمن عشرہ وصار دیناً فی ذمته۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۷ باب العشر)

ومثلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۸۷ کتاب الزکوٰۃ۔

حکومت کا عُشر اور زکوٰۃ وصول کرنا

سوال: حکومت عوام سے جو عُشر اور زکوٰۃ وصول کرکے تقسیم کرتی ہے تو کیا اس سے مالک کی ذمہ داری فارغ ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حکومت کے واسطہ سے زکوٰۃ اور عُشر ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن مروجہ نظامِ زکوٰۃ کی خامیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا کسی پر مخفی نہیں کہ عموماً زکوٰۃ اصل مصرف میں خرچ نہیں ہوتی بلکہ سیاسی وابستگی اور پارٹی تعلقات کی بنیاد پر عموماً غیر مستحقین کو دی جاتی ہے، اس لیے اس کو دیکھتے ہوئے کہ زکوٰۃ ضائع ہو رہی ہے اس پر اکتفاء کرنا دانشمندی نہیں بلکہ دوبارہ اعادہ کرنا بہتر ہے۔

لما قال العلامۃ صدر الشریعۃ: وان اخذ والزکوٰۃ المذکورۃ قال صرفوا الیٰ مصارفها وھی مصارف الزکوٰۃ فلا اعادۃ علی الملاّک وان لم یصرفوا الیٰ مصارفها فعلیہم الاعادۃ (شرح الوقایۃ ج۱ ص۲۸۰ کتاب زکوٰۃ الاموال)[1]

پاکستانی زمین کی شرعی حیثیت

سوال: پاکستان کی جو زمین ہے (خواہ اس کا تعلق کسی بھی صوبے سے ہو) ہموار ہو یا پہاڑی، ازروئے شریعت اس میں عُشر یا نصف عشر واجب ہوگا یا نہیں؟ نیز پاکستان بننے سے پہلے یا بعد جن لوگوں کو زمین ملی ہے اس میں عُشر کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ہمارے ملک کی زمین خواہ وہ پاکستان بننے سے قبل کسی کو ملی ہو یا بعد میں، تمام کو حکومت کی طرف سے مالکانہ قبضہ تسلیم کرکے جملہ مالکانہ تصرفات کا اختیار دے دیا گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کی ملکیت تسلیم ہونے کے بعد یہ زمین عشری ہے خراجی زمین نہیں[2]

---

[1] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: اخذ البغاۃ والسلاطین الجائرۃ زکوٰۃ الاموال الظاہرۃ کالسوائم والعشر والخراج لا اعادۃ علی اربابہا ان صرف الماخوذ فی محلہ الآتی ذکرہ والا یصرف فیہ فعلیہم فیما بینہم وبین اللہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۸ باب زکوٰۃ الغنم)
ومثلہ فی السراجیۃ ص۲۶ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] وللتفصیل فلیراجع الی الکتاب المسمّیٰ "بالقول الماضی فی الاحکام الاراضی" للعلامۃ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ۔

قرض مانع وجوبِ عشر نہیں

سوال:۔ اگر زمیندار پر کچھ قرض ہو تو کیا مقروض ہونے کے باوجود زمین کی آمدنی سے عشر کی ادائیگی ضروری ہے یا قرض مانع وجوبِ عشر ہے؟

الجواب:۔ عشر کا وجوب زمین کی آمدنی پر ہے اس میں غنا یا مالکِ نصاب ہونا ضروری نہیں ہے، اسلیے مقروض ہونے کے باوجود عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے گا۔

لما قال الامام برهان الدين المرغيناني رحمه الله: قال ابوحنيفة رحمه الله في قليل ما اخرجته الارض وكثيره العشر سواء سقي سيحًا او سقته السماء۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج۲ ص۱۸۶ باب زكوٰة الزرع والثمار) [1]

مالیہ یا آبیانہ سے عشر ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ فقہاء کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عشر اور خراج دونوں ایک زمین سے نہیں لیے جائیں گے، لیکن اگر حکومت زمیندار سے آبیانہ یا مالیہ کے نام پر ٹیکس وصول کرتی ہے تو کیا اس سے عشر ساقط ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فی زمانہ حکومتی ٹیکس دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) آبیانہ جو کہ پانی کے عوض لیا جاتا ہے (۲) زرعی ٹیکس، جو کہ پیداوار پر لگایا جاتا ہے۔ اول الذکر یعنی آبیانہ چونکہ اُس پانی کے عوض میں حکومت وصول کرتی ہے جس کا وہ انتظام کرتی ہے، اس لیے اس صورت میں بوجہ اخراجات اور محنت ومشقت عُشر (دسواں حصہ) کے بجائے نصف عشر (بیسواں حصہ) لازم ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: لان العلة في العدول عن العشر الى نصفه في مسقي غرب ودالية هي زيادة الكلفة كما علمت وهي موجودة في شراء الماء۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۲۸ باب العشر) [2]

---

[1] قال ابي بكر بن علي بن محمد رحمه الله: قال ابوحنيفة رحمه الله في قليل ما اخرجته الارض وكثيرا لعشر حد القليل الصاع ومادونه لا شئ فيه وقيل حده نصف الصاع والمراد بالارض هنا العُشر وفيه اشارة الى انه لا يلتفت الى المالك سواء كان بالغًا او صبيًا او مجنونًا او عبدًا او كانت الارض وقفًا على الرباطات او المساجد او المدارس۔
(الجوهرة النيرة ج۱ ص۱۵۳ باب زكوٰة الزرع والثمار)
ومِثْلُهٗ في الهندية ج۱ ص۱۸۶ كتاب الزكوٰة۔ الباب السادس في الزروع والثمار۔

[2] قال الشيخ المفتي عزيز الرحمٰن رحمه الله: نہری زمینوں میں جن میں پانی کا محصول دیا جاتا ہے نصف عُشر واجب ہوتا ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۶ ص۱۷۲ چھٹا باب عشر)

جبر و تشدد سے لیے ہوئے عُشر کا اعادہ بہتر ہے

سوال:۔ اگر کسی شخص سے حکمران یا کوئی ظالم بادشاہ جبر و تشدد سے عشر وصول کرے تو کیا اس سے ذمہ فارغ ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی سے بصورتِ ظلم و ستم جبراً عشر وصول کیا جائے تو مالک پر عشر کا اعادہ لازم نہیں۔ چونکہ یہ عُشر عموماً حکمرانوں کی عیاشیوں کی نذر ہو جاتا ہے اور کسی ایسی جگہ میں اس کا خرچ ہونا یقینی نہیں جو شریعت نے بطور مصارف متعین کی ہو، اس لیے از روئے احتیاط دوبارہ ادائیگی بہتر ہے تاکہ مالک خود اپنی مرضی سے غربا میں تقسیم کر کے اطمینان حاصل کرے۔

قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: واذا اخذ الخوارج الخراج وصدقة السوائم لايثنّٰى عليهم وافتوا ان يعيدوها دون الخراج الخ وقيل اذا نوی بالدفع التصدق عليهم سقط عنه وكذا ما دفع الى كل جائر لانهم بما عليهم من التبعات فقراء والاوّل احوط۔ (الهداية ج ۱ ص۱۷۵ فصل فی الخيل) [1]

سرکاری محصول سے عشر پر کوئی اثر نہیں پڑتا

سوال:۔ اگر کسی زمین پر حکومت کی طرف سے محصول مقرر ہو جو مقررہ وقت پر ادا کیا جاتا ہے، کیا اس سے عشر پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ حکومت محصول وغیرہ عشر کی نیت سے نہیں لیتی اور نہ صحیح مصرف پر خرچ کرتی ہے اور نہ صحیح طریقہ کار عشر جمع کرنے کے لیے موجود ہے، اس لیے سرکاری طور پر محصول ادا کرنے سے عُشر ساقط نہیں ہوتا اور نہ ذمہ فارغ ہوتا ہے۔

قال علاؤالدين الحصكفيؒ: اخذ البغاة والسلاطين الجائرة زكوٰة الاموال الظاهرة كالسوائم والعشر والخراج لا اعادة على اربابها ان صرف الماخوذ فی محله الآتی ذكره وان لا يصرف فيه فعليهم فيما بينهم وبين الله

---

[1] قال علاؤالدين الحصكفیؒ: اخذ البغاة والسلاطين الجائرة زكوٰة الاموال الظاهرة كسوائم والعشر والخراج لا اعادة على اربابها ان صرف الماخوذ فی محله الآتی ذكره وان لا يصرف فيه فعليهم فيما بينهم وبين الله اعادة غير الخراج ۔ الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۸۸ باب زكوٰة الغنم۔

ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۲۳ باب زكوٰة الغنم۔

اعادة غيرا لخراج - الخ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۸ باب زکاۃ الغنم) ؎۱

موقوفہ زمین کی آمدنی میں عشر کا حکم

سوال:۔ کسی مدرسہ و مسجد یا دوسرے اداروں کے لیے موقوفہ زمین کی آمدنی میں عشر اور نصف عشر کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ایسی زمین کی ملکیت شخصی نہیں ہوتی؛

الجواب:۔ وجوبِ عشر میں زمین کی ملکیت شرط نہیں بلکہ ماخرج من الارض کا مالک ہونا شرط ہے، جو چیز زمین سے حاصل ہو جائے اور جس کی ملکیت اس میں ہو تو اس مالک پر عشر دینا لازم ہے۔ اگر موقوفہ زمین میں اہلِ وقف کاشت کرتا ہو تو اس پر عشر دینا لازم ہے۔ اگر اہلِ وقف کے سوا کسی دوسرے شخص نے کاشت کی ہو تو اس میں اجارہ اور مزارعت کے اقسام کا حکم جاری ہوگا۔

قال علاؤ الدين الحصكفيؒ: ويجب مع الدين وفي ارض صغير ومجنون ومكاتب و ماذون ووقف — قال العلامه ابن عابدينؒ (تحت قوله ووقف) افاد ان ملك الارض ليس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملك الخارج لانه يجب في الخارج لا في الارض فكان ملكه وعدمه سواء۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۲۶ باب العشر) ؎۲

کرایہ پر دی ہوئی زمین پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: مزروعہ زمین اگر کرایہ پر دے دی جائے جو زراعت کے علاوہ کسی اور مصرف میں بھی استعمال کی جا سکتی ہو تو کیا مالکِ زمین پر عشر واجب ہوگا یا زکوٰۃ لازم ہوگی؟

الجواب:۔ مزروعہ زمین اگر کرایہ پر دے دی گئی ہو تو اگر اس کا کرایہ مقدارِ نصاب کے برابر یا اس سے زائد ہو تو حولانِ حول سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی عشر نہیں، اگر مقدارِ نصاب سے

؎۱ قال العلامة الكاسانيؒ: واما سلاطين زماننا الذين اذا اخذوا الصدقات والعشور والخراج لا يضعونها مواضعها..... فاما الزكوٰة والصدقات فانهم لا يضعونها في اهلها وقال ابوبكر الاسكاف ان جميع ذلك يسقط ويعطى ثانيًا الخ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۶ فصل واما بيان من له المطالبة)

وَمِثْلُهٗ في الهداية ج۱ ص۱۹۳ فصل في الغنم۔

؎۲ وفي الهندية: وكذا ملك الارض ليس بشرط للوجوب لوجوبه في الاراضي الموقوفة۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۸۵ باب السادس في زكاة الزرع والثمار)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۲ ص۲۳۷ باب العشر۔

کم ہو اور مالک بھی صاحبِ نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: الزکوٰۃ واجبۃ علی الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملک نصاباً ملکاً تاماً وحال علیہ الحول۔ (الھدایۃ ج ۱ ص۱۶۷ کتاب الزکوٰۃ) [1]

غصب پر عُشر کا وجوب

سوال: کسی کی زمین پر غاصبانہ قبضہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اُس پر عُشر کے وجوب کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ غاصب ادا کرے گا یا اصل مالک؟

الجواب: عُشر کے وجوب کے لیے زمین کا مملوکہ ہونا ضروری نہیں بلکہ آمدنی کی ملکیت ضروری ہے، اس لیے مغصوبہ زمین سے جو آمدنی غاصب کے پاس جمع ہو تمام سے عُشر کی ادائیگی غاصب پر ضروری ہے تاہم عشر کی ادائیگی سے آمدنی حلال نہیں ہوتی، البتہ اگر غاصب نے تمام آمدنی مالک کو واپس کر دی تو پھر مالک پر اس کا عشر واجب ہوگا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وان غصب عشریۃ فزرعھا ان لم تنقصھا الزراعۃ فلاعشر علی المالک، وان نقصتھا فالعشر علی المالک کانہٗ آجرھا بالنقصان۔

(رد المحتار ج ۲ ص۳۳۳ باب العشر) [2]

مشترکہ مال کی عارضی تقسیم مسقطِ زکوٰۃ نہیں

سوال: ہم چار بھائیوں کا کل سرمایہ ۱۸۰ بھیڑ بکریاں ہیں اور تمام زمین سے صرف ۲۰ من گندم ہوتی ہے، کیا ہم بھائیوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ مال کو اگر تقسیم کرنے سے ہر ایک حصہ دار صاحبِ نصاب بنتا ہو تو ہر ایک پر اپنے حصے کی زکوٰۃ دینا لازم ہے۔ چونکہ بکریوں میں شرعی نصاب چالیس (۴۰) بکریاں ہیں، چونکہ

---

[1] وفی الھندیۃ: ومنھا کون المال نصاباً فلاتجب فی اقل منہ ھکذا فی العینی شرح الکنز۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۲۳۵ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال العلامۃ زین الدین ابن نجیمؒ: وفی الارض المغصوبۃ علی الغاصب ان لم تنقصھا الزراعۃ وان نقصتھا فعلی رب الارض۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۷ باب العشر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۸۷ باب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار۔

تقسیم کے بعد ہر بھائی نصاب کا مالک بنتا ہے اس لیے ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہے۔

قال شیخ الاسلام محمد بن عبد اللّٰہ التمرتاشی الحنفیؒ: نصاب الغنم ضأناً او معزاً اربعون وفیھا شاۃ و فی مائۃ واحدی و عشرین شاتان و فی مائتین و واحدۃ ثلاث شیاۃ و فی اربعمائۃ اربع شیاۃ۔ (متن الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۱ باب فی الغنم) [1]

ناقابلِ کاشت زمین میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! ناقابلِ کاشت زمین پر نہ عشر واجب ہے اور نہ زکوٰۃ واجب ہے جبکہ قابلِ کاشت زمین میں عشر واجب ہے، لیکن جو آدمی بنک میں ایک لاکھ روپے جمع کراتا ہے اور بنک کی طرف سے اُس پر سالانہ منافع دیا جاتا ہے، تو جس طرح اصل زمین پر زکوٰۃ نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہے اسی طرح بنک میں جمع کردہ ایک لاکھ روپیہ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہونی چاہیئے بلکہ اس کے ذریعے حاصل شدہ منافع پر زکوٰۃ ادا کی جانی چاہیئے، شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اصل رقم اور منافع دونوں میں زکوٰۃ لازمی ہے اور اس رقم کا زمین پر قیاس غلط ہے کیونکہ یہ رقم خود ثمن ہے اور زمین خود ثمن نہیں ہے، اثمانِ رائجہ مالِ تجارت میں داخل ہیں اور زمین مال نامی نہیں لہٰذا اس میں زکوٰۃ لازمی ہے۔

لما قال علامۃ کاسانیؒ: فان کانت اثماناً رائجۃً او کان یمسکھا للتجارۃ یعتبر قیمتھا فان بلغت قیمتھا مائتی درھم من ادنی الدراھم التی تجب فیہ الزکوٰۃ وھی التی الغالب علیھا الفضۃ تجب فیہ الزکوٰۃ والا فلا، وان لم تکن اثماناً رائجۃً ولا معدۃً للتجارۃ فلا زکوٰۃ فیھا۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۱۷ فصل الاثمان المطلقۃ) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: لیس فی اقل من اربعین من الغنم السائمۃ صدقۃ فاذا کانت اربعین سائمۃ وحال علیہا الحول ففیھا شاۃ الی مائۃ وعشرین۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۸ فصل الرابع فی زکوٰۃ الغنم)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۱۶ فصل فی الغنم۔

[2] وقال الشیخ نظام: الدراھم اذا کانت مغشوشۃ فان کان الغالب ھو الفضۃ ...... فینظر ان کانت رائجۃً او نوی التجارۃ اعتبرت قیمتھا فان بلغت نصاباً من ادنی الدراھم التی تجب فیھا الزکوٰۃ وھی التی غلبت فضتھا وجبت فیھا الزکوٰۃ والا فلا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۹ کتاب الزکوٰۃ الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ)

سال کے بعد بیچ جانے والے غلّہ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے پاس کافی غلّہ ہے، اس میں ۲۵ پچیس من گندم ہے، پورا سال گذر گیا، اس میں زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب گندم برائے تجارت نہ ہو تو اس میں زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ اس میں نمو نہیں پائی جاتی اور گندم سے جب عشر ادا کر دیا گیا ہو تو دوبارہ سال گذرنے سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لما قال ابن نجیمؒ: وخرج ایضًا ما اذا دخل من ارضہ حنطۃ تبلغ قیمتھا قیمۃ نصاب ونوی ان یمسکھا ویبیعھا فامسکھا حولًا لا تجب فیھا الزکوٰۃ کما فی المیراث۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۹ کتاب الزکوٰۃ) [1]

عُشر کا وجوب بائع پر ہے یا مشتری پر؟

سوال:۔ اگر مالک نے کھیت کسی ٹھیکیدار پر فروخت کرکے اس کے حوالے کیا تو زمین کی آمدنی سے عُشر یا نصف عشر کی ادائیگی کس کی ذمہ داری ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اگر فصل تیار ہونے کے بعد فروخت کی جائے تو عشر کی ذمہ داری بائع پر ہے لیکن کچی فصل کے فروخت کی صورت میں عُشر مشتری کے ذمہ واجب ہوگا۔

لما قال فی الھندیۃ: واذا باع الارض العشریۃ وفیھا زرع قد ادرك مع زرعھا او باع الزرع خاصۃ فعشرہ علی البائع دون المشتری ولو باعھا والزرع بقل ان قصلہ المشتری فی الحال یجب علی البائع ولو ترکہ حتی ادرك فعشرہ علی المشتری۔ (الھندیۃ ج۱ ص۱۸۷ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ولا تصح نیۃ التجارۃ) لانھا لا تصح الا عند عقد التجارۃ فلا تصح فیما ملکہ بغیر عقد کارث ونحوہ کما سیاتی ومثلہ الخارج من ارضہ لان الملك یثبت بالارث اولا اختیار لہ فیہ ونوعہ فیہ قال فی البحر وخرج ای بقید العقد ما اذا دخل من ارضہ حنطۃ تبلغ قیمتھا نصابًا ونوی ان یمسکھا ویبیعھا فامسکھا حولًا لا تجب فیھا الزکوٰۃ کما فی المیراث۔ (رد المحتار ج ۲ ص۲۶۸ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۲ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو باع الزرع ان قبل ادراکہ فالعشر علی المشتری ولو بعدہ فعلی البائع۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۳۳ باب العشر)

وَمِثلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۶، ۵۷ فصل شرائط الفریضۃ۔

پہاڑوں کی آمدنی میں عشر کا مسئلہ

سوال:۔ پہاڑوں کے خودرو درختوں میں پھل دار درخت بھی ہوتے ہیں جیسے اخروٹ اور چلغوزی وغیرہ، اگرچہ ان کی مالیت کافی ہوتی ہے کیا اس میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پہاڑوں میں خودرو درختوں سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے تو جس کو یہ پھل وغیرہ ملیں اس پر عشر واجب رہے گا۔

لما قال فی الهندیة: وما یجمع من ثمار الاشجار التی لیست بمملوکة کاشجار الجبال یجب فیها العشر۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰة۔ الباب السادس فی زکوٰة الزرع والثمار)[1]

مزارعت میں عشر کا وجوب

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین کسی کاشتکار کو مزارعت پر دی ہوئی ہے، آمدنی تو مالکِ زمین اور کاشتکار حسبِ معاہدہ آپس میں تقسیم کرتے ہیں لیکن عشر یا نصف عشر کی ادائیگی کس پر واجب ہے؟

الجواب:۔ مروجہ مزارعت میں عموماً آمدنی مالکِ زمین اور کاشتکار پر مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم ہوتی ہے کسی ایک کے زیادہ فائدے کا قطعی علم نہیں ہوتا ہے، اس لیے ہر ایک پر اپنے اپنے حصہ سے عشر یا نصف عشر کا ادا کرنا لازم ہے۔ اس میں یہ بھی گنجائش ہے کہ مجموعی آمدنی سے مشترکہ طور پر عشر ادا کیا جائے یا تقسیم کے بعد ہر ایک اپنے حصّہ کی آمدنی سے ادا کرے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وبقولهما نأخذ وفی المزارعة ان کان البذر من رب الارض فعلیه ولو من العامل فعلیهما بالحِصَّة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۳۴ باب العشر)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله کذا یجب العشر فی ثمرة جبل ومفازة ان حماه الامام) ویجب العُشر ولو کان الشجر غیر مملوک ولم یعالجه احد۔۔۔۔ فان ثمر الجبال مباح لا یجوز منع المسلمین عنه۔ وقال ابو یوسف رحمه الله لا شیٔ فیما یوجد فی الجبال لان الارض لیست مملوکة وهما ان المقصود من ملکها النماء وقد حصل۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۵ باب العشر)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص۹۱ الباب الثالث فی العشر والخراج والجزیة۔

[2] وفی الهندیة: وفی المزارعة علی قولهما العشر علیهما بالحصة۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۷ باب السادس فی زکوٰة الزرع والثمار)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۷ باب العشر۔

پھل وغیرہ تیار ہونے سے قبل فروخت ہونے پر عشر کا مسئلہ

سوال:۔ ہمارے علاقے میں سیب وغیرہ کے باغات بکثرت ہیں جو کہ پھل ظاہر ہونے کے بعد خرید لیے جاتے ہیں، پھر پھل کی پختگی تک یہ سیب وغیرہ مالکوں کے باغات میں چھوڑ دیتے ہیں، جب پک کر تیار ہوجاتے ہیں تو یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں، کیا ان باغات کا عشر مالک پر واجب ہے یا مشتری پر ؟

الجواب:۔ پھلوں میں اس وقت عشر وا جب ہوتا ہے جب یہ درختوں میں ظاہر ہو جائیں اور پک جانے تک فساد وغیرہ سے محفوظ رہیں۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی الجوھرۃ واختلفوا فی وقت العشر فی الثمار والزرع ۔ فقال ابوحنیفۃؒ وزفرؒ یجب عند ظهور الثمرۃ والامن علیها من الفساد۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۳۱ باب العشر)

لیکن مروجہ بیوع فاسدہ ہیں اور بیع فاسدہ قبل القبض مفید للملک نہیں ہوتا لہٰذا عشر بائع پر ہوگا اور اگر بائع نے مشتری کو قبضہ دیا ہو تو پھر مشتری پر ہوگا۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ولو باع الزرع ان قبل ادراکہ فالعشر علی المشتری ولو بعدہ فعلی البائع۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۳۳ باب العشر) [1]

کسی دوسری جگہ فصل کو فروخت کرنے کی صورت میں عشر کی ادائیگی کا مسئلہ

سوال:۔ اگر فصل کسی دوسری جگہ بھیجکر فروخت کی جائے جہاں اس کی قیمت زیادہ ہو، تو عشر کس حساب سے ادا کیا جائے گا؟ کیونکہ مقامی طور پر اس کی قیمت کم ہوتی ہے۔

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ فصل سے علی الفور عشر ادا کیا جائے تاکہ ذمہ جلد فارغ ہو، لیکن اگر کسی نے فصل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لی جہاں پر وہ زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی تو جملہ قیمت کے اعتبار سے عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے گا، کرایہ یا محصول وغیرہ جملہ آمدنی سے کاٹنا جائز نہیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ویتقوم فی البلد الذی المال فیہ۔ وفی رد المحتار، فلو بعث

---

[1] وفی الھندیۃ: ولو باعها والزرع بقل ان فصله المشتری فی الحال یجب علی البائع ولو ترکه حتی ادرك فعشرہ علی المشتری۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار) ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۷ فصل واما شرائط الفرضیۃ۔

عبدا للتجارۃ فی البلد الذی فیہ العبد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۶ باب زکوٰۃ الغنم)

ایضاً قال ابن عابدینؒ: تحت قولہ بلا رفع مؤنت ای یجب العشر فی الاول ونصفہ فی الثانی بلا رفع اجرۃ العمال ونفقۃ البقر وکری الانہار واجرۃ الحافظ نحو ذلک۔

(رد المحتار ج۲ ص۳۲۸ باب العشر) [1]

فصل فروخت کرنے کی صورت میں عشر کس پر واجب ہے

سوال:۔ اگر کوئی آدمی اپنے کھیت کی فصل کاٹنے سے قبل کسی دوسرے شخص پر فروخت کردے تو فصل کاٹنے کے بعد عشر کی ادائیگی کس کے ذمہ ہوگی۔

الجواب:۔ اگر کسی نے اپنی فصل پختگی سے قبل فروخت کی ہو اور فصل مشتری کی ملکیت میں کمال تک پہنچ جائے تو عشر کی ادائیگی مشتری پر لازم ہے، البتہ اگر فصل پک جانے کے بعد فروخت کی جائے تو عشر بائع پر واجب رہے گا۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولو باع الزرع ان قبل ادراکہ فالعشر علی المشتری ولو بعدہ فعلی البائع۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۳۳ باب العشر) [2]

اجارہ پر دی ہوئی زمین میں عشر کس پر واجب ہے

سوال:۔ اگر زمین اجارہ پر دی جائے یعنی مالکِ زمین کاشتکار سے پہلے کرلے کہ مجھے فی کنال یا فی جریب مثلاً پانچ سو روپے یا پانچ من غلہ سالانہ دے کر تم جس طرح چاہو زمین کو استعمال کرسکتے ہو، اب اس صورت میں جو آمدنی حاصل ہوگی تو اس کا عشر کس پر

---

[1] قال العلامۃ ابن الہمامؒ: ویقومھا المالک فی البلد الذی فیہ المال حتی لو بعث عبداً للتجارۃ الی بلد اخری لحاجۃ فحال الحول تعتبر قیمتہ فی ذلک البلد۔ الخ (فتح القدیر ج۲ ص۱۶۷ فصل فی العروض)

وایضاً قال ولا یحتسب فیہ اجر العمال ونفقۃ البقر وکری الانہار واجرۃ الحارس وغیرہ ذلک۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۹۴ باب زکوٰۃ الزرع والثمار)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۱۸۰ الفصل الثانی فی العروض۔ والبحر الرائق ج۲ ص۲۳۸ باب العشر۔

[2] وفی الہندیۃ، ولو باعھا والزرع بقل ان فصلہ المشتری فی الحال یجب علی البائع ولو ترکہ حتی ادرک فعشرہ علی المشتری۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۸۷ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۷ فصل واما شرائط الفرضیۃ۔

واجب ہوگا؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عشر مالکِ زمین پر ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک کاشتکار پر ہے، عام فقہاء صاحبینؒ کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔ علامہ ابن عابدینؒ نے اس میں یوں تفصیل نقل کی ہے کہ اگر زمین کا اجارہ اجرِ مثل کے برابر ہو یعنی جیسی زمین ہو اسی کی مناسبت سے اجرۃ مقرر کیا ہو تو عشر مالکِ زمین پر ہوگا اور اگر اجارہ میں اجرۃ اجرِ مثل سے کم مقرر کیا ہو تو عشر کاشتکار پر ہوگا۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ عرف عام پر چھوڑا جائے اگر علاقے کے رواج کے مطابق مالکِ زمین پر عشر ہو تو عشر مالکِ زمین سے لیا جائے گا اور اگر کاشتکار پر ہو تو کاشتکار پر لازم ہوگا، چونکہ ہمارے علاقے میں کاشتکار کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے اسلئے صاحبینؒ کے قول کی رُو سے کاشتکار کو ادا کرنا ہوگا۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: والعشر علی المؤجر کخراج موظف وقالا علی المستاجر کمُستعیر مسلم وفی الحاوی وبقولهما ناخذ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۳۳۴ باب العشر)[1]

سوال:۔ اگر ایک آدمی نے اپنی زمین میں شفتل (چارا) کاشت کیا ہو، اگر یہ بار بار کاٹا جائے تو کیا ہر بار عشر ادا کرنا ہوگا یا ایک دفعہ کافی ہے؟

شفتل (چارے) میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفتل کاشت کرنے سے چونکہ زمین کا اشتغال پایا جاتا ہے اس لیے اس میں عُشر یا نصف عُشر کی ادائیگی ضروری ہے، پھر چونکہ یہ بار بار کاٹا جاتا ہے اس لیے اس کی مجموعی آمدنی کا حساب کرکے عشر ادا کیا جائے گا ورنہ ہر بار ادا کرنا ہوگا۔

لما قال ابی بکر بن علی بن محمدؒ: اما اذا تخذ ارضه مقصبةً اوشجرةً اومنبتًا للحشیش وساق الیه الماء ومنع الناس منه یجب فیه العشر۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۵۳ باب زکوٰة الزرع والثمار)[2]

---

[1] وفی الهندیة: ولو آجر ارضًا عشریة کان العشر علی الاجر عند ابی حنیفةؒ وعندهما علی المستاجر۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۱۸۷ الباب السادس فی زکوٰة الزرع والثمار)
وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۳۷ باب العُشر۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله الافیما لایقصد) ...... وان المدار علی القصد حتّٰی لوقصد به ذٰلك وجب العُشر۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۲۷ باب العشر)

گنے میں عُشر کا حکم

سوال:۔ گنے سے اگر گڑ تیار کیا جائے تو اس سے تو عُشر یا نصف عُشر دیا جائے گا اور اگر گنا شوگر ملز میں فروخت کیا جائے تو اس میں عشر کا کیا طریقہ کار ہوگا؟

الجواب:۔ گنا زمین کی مستقل آمدنی ہے اسلئے اس میں عشر یا نصف عشر کی ادائیگی ضروری ہے، تاہم اگر گنا مل پر فروخت ہو تو قیمت سے عشر ادا کیا جائے گا ورنہ گڑ بنانے کے بعد اس کی جنس یا قیمت سے عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے گا۔ یہ یاد رہے کہ قیمت سے عشر ادا کرنے کی صورت میں خرچ شدہ رقم منہا کرنا جائز نہیں بلکہ کل قیمت سے عشر ادا کیا جائے گا۔

لما قال الشیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ: واما قصب فھو ثلثة انواع قصب السکر وقصب الذریرۃ والقصب الفارسی قصب السکر وقصب الذریرۃ فیھما العشر۔

(الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۵۳ باب زکوٰۃ الزرع والثمار) ؎۱

گڑ یا اس کی قیمت سے عشر ادا کرنا جائز ہے

سوال:۔ گنے سے گڑ تیار کرنے کی صورت میں کیا زمیندار گڑ سے عشر ادا کرے گا یا گڑ کی قیمت سے؟ جبکہ دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

الجواب:۔ چاہی یا سیرابی زمین سے نصف عشر اور بارانی زمین سے عشر ادا کیا جائے گا اور گڑ یا اس کی قیمت دونوں سے عشر ادا کرنا جائز ہے، مثلاً بیس من گڑ میں سے ایک من گڑ یا اس کی قیمت بطور عشر دینا لازمی ہے اور بارانی زمین کے بیس من گڑ یا اسکی قیمت دینا ہوگی۔ (مرتب)

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: وماسقی بغرب او دالیۃ او سانیۃ ففیہ نصف العشر علی القولین لان المؤنۃ تکثر فیہ وتقل فیما یسقی بالسماء او سیحاً وان سقی سیحاً او بدالیۃ فالمعتبر اکثر السنۃ کما مر فی السائمۃ۔ (الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۹۰ باب زکوٰۃ الزرع والثمار) ؎۲

؎۱ قال الامام برھان الدین المرغینانیؒ: اما قصب السکر وقصب الذریرۃ ففیھما العشر لانہ یقصد بھما استغلال الارض بخلاف السعف والتبن لان المقصود الحب۔

(الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۱۹۰ باب زکوٰۃ الزرع والثمار)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۲۷ باب العشر۔

؎۲ قال شیخ الاسلام ابی بکر بن علی بن محمدؒ، وما سقی بغرب او دالیۃ او سانیۃ ففیہ نصف العشر الدالیۃ الدولاب والسانیۃ البعیر الذی یستقی بہ الماء۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۵۴ باب زکوٰۃ الزرع والثمار)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۲۸ باب العشر۔

مونگ پھلی میں عشر کا بیان

سوال:۔ مونگ پھلی جو کہ اکثر بارانی زمین میں ہوتی ہے اور اس کی فصل کو پانی کی بھی خاص ضرورت نہیں ہوتی، تو کیا اس میں عشر یا نصف عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ فصل عموماً بارانی زمین کی پیداوار ہوتی ہے اس لیے اس میں عُشر واجب رہے گا۔

لما قال فی الهندیة: ویجب العشر عند ابی حنیفةؒ فی کل ما تخرجه الارض من الحنطة والشعیر والدخن والارز واصناف الحبوب والبقول والریاحین والاوراد والرطاب وقصب السکر والذریرة والبطیخ والخیار والقثاء والباذنجان والعصفر واشباه ذلك مما له ثمرة باقیة او غیر باقیة قل او کثر......ولا تحسب اجرة العمال ونفقة البقر وکری الانهار واجرة الحافظ وغیر ذلك فیجب اخراج الواجب من جمیع ما اخرجته الارض نصفاً او عشراً۔ (الفتاوی الهندیة ج ا ص۱۸۶ کتاب الزکوٰة۔الباب السادس فی زکوٰة الزروع والثمار)[۱]

تمباکو کا عشر کب ادا کیا جائے گا؟

سوال:۔ تمباکو کا عشر سبز پتوں سے دینا ہوگا یا ان کی قیمت سے؟ جبکہ تمباکو کو بھٹی میں پکانے پر کافی خرچہ آتا ہے تو آیا سبز پتوں سے عشر ادا کرنا ہوگا یا بھٹی میں پک جانے کے بعد عشر دینا ہوگا؟

الجواب:۔ شریعت مقدسہ میں عشر اصل میں اُس پیداوار سے دینا ہے جو زمین سے حاصل ہوتی ہو، تاہم اگر قیمت دینا چاہے تو پہلے عشر علیحدہ کرکے پھر علاقے کی مروجہ قیمت لگاکر مساکین کو دے دی جائے، اور اگر پکنے سے قبل عشر ادا نہ کیا گیا تو پکنے کے بعد تمام تمباکو سے عشر یا نصف عشر دینا واجب ہوگا اور اس میں سے خرچہ منہا نہیں ہوگا۔

لما قال الامام برهان الدین المرغینانیؒ: قال ابوحنیفةؒ فی قلیل ما اخرجته الارض وکثیره العشر سواء سقی سیحاً او سقت السماء۔ (الهدایة علی صدر الفتح القدیر ج ۲ ص۱۸۶ باب زکوٰة الزروع والثمار)[۲]

---

[۱] قال الامام برهان الدین المرغینانیؒ: وکل شیء اخرجته الارض مما فیه العشر لا یحتسب فیه اجر العمال ونفقة البقر۔ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج ۲ ص۱۹۴ باب زکوٰة الزروع والثمار)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۸ باب العشر۔

[۲] قال الشیخ ابی بکر بن علی بن محمدؒ: قال ابوحنیفة فی قلیل ما اخرجته الارض وکثیره العشر حد القلیل الصاع ومادونه لاشی فیه وقیل حده نصف صاع والمراد بالارض هنا العشریة۔

(الجوهرة النیرة ج ا ص۱۵۳ باب زکوٰة الزروع والثمار)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج ا ص۲۷۶ کتاب الزکوٰة فصل فی العشر۔

گھر کے اندر پھل دار درختوں میں عشر واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے گھر میں کچھ پھل دار درخت ہوں تو کیا ان کے پھلوں میں عُشر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ گھر کے اندر اگر پھل دار درخت یا سبزی وغیرہ ہو تو ان میں عشر واجب نہیں کیونکہ یہ گھر کے تابع شمار ہوں گے۔

لما قال طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: رجل فی دارہ شجرۃ مثمرۃ لاعشر فیھا وان کانت البلدۃ عشریۃ بخلاف ما اذا کانت فی الاراضی۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۴۷ الفصل العاشر فی العُشر والخراج) [1]

مزروعہ زمین کے اردگرد پھل دار درختوں میں عُشر کا مسئلہ

سوال:۔ اگر زمین میں باقاعدہ زراعت ہوتی ہو اور اس کے اردگرد پھل دار درخت ہوں جن سے کافی پھل اور آمدنی حاصل ہوتی ہو تو کیا اس آمدنی میں عشر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر زمین قابلِ زراعت ہو اور مستقل باغ نہ ہو تو مزروعہ زمین کے حکم میں ہو کر اس کے درختوں کی آمدنی میں عشر واجب نہیں۔

لما قال الامام حافظ الدین محمد بن محمد بن شھاب: والبستان ما یحوطہ حائط فیہ نخیل متفرقۃ یمکن الزراعۃ وسط الاشجار وان کانت الاشجار ملتفۃ لا یمکن الزراعۃ فی وسطھا فھی کرم ولیس فی الاشجار التی علی المسناۃ شئی۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۴ ص۹۱ الباب الثالث فی العشر والخراج) [2]

درختوں کے پتوں میں عشر کا حکم

سوال:۔ اگر کسی علاقہ میں درختوں کے پتے فروخت کیے جاتے ہوں تو کیا ان کی آمدنی میں عشر یا نصف العشر

---

[1] قال فی الھندیۃ: ولو کان فی دار رجل شجرۃ مثمرۃ لاعشر فیھا۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۸۶ کتاب الزکوٰۃ، الباب السادس فی زکوٰۃ الزروع والثمار)

[2] قال فی الخلاصۃ الفتاویٰ: والبستان کل محوط فیہ اشجار متفرقہ یمکن زراعۃ ما وسط الاشجار ولیس فی اشجار التی علی المسناۃ شئی فان کانت الاشجار ملتفۃ لا یمکن زراعۃ ارضھا فھی کرم۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۴۶ الفصل العاشر فی العُشر والخراج)
وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۵۳ باب العشر۔

واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ عشر کے وجوب کے لیے استنماء کا قصد اور نیت کرنا شرط ہے، چونکہ درختوں کے پتے مقصود بالزرع نہیں ہوتے اس لیے ان کی آمدنی میں عشر واجب نہیں ہے۔ قال ابن نجیمؒ:
وان یکون الخارج منها مما یقصد بزراعتہ نماء الارض الخ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۳۷ باب العشر)
البتہ اگر زمین کا تیار کرنا اور درخت لگانا اس لیے ہو کہ مقصود بالزراع ہو تو پھر ان کے پتوں میں عشر واجب ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: اما الحطب والقصب والحشیش لا تستنبت فی الجنان عادۃ بل تنقّٰی عنها حتٰی لو اتخذها مقصبۃ او مشجرۃ او منبتا للحشیش یجب فیها العُشر۔ (الهدایۃ ج۱ ص۱۸۴ باب زکوٰۃ الزرع والثمار) [1]

بھوسہ میں عشر واجب نہیں

سوال:۔ بسا اوقات غلّہ سے بھوسے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، کیا ایسی صورت میں بھوسہ میں عشر کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جس مقصد کے لیے فصل بوئی جاتی ہو یعنی جو مقصود بالمزرع ہو تو عشر اس سے ادا کیا جائے گا، اس کے علاوہ ضمنی طور پر جو چیز حاصل ہو اگرچہ اس کی قیمت زیادہ ہو اُس میں عُشر یا نصف عشر واجب نہیں۔ چونکہ گندم اور مکئی کی کاشت سے مقصود غلّہ ہوتا ہے اس لیے اس کے بُھوسہ یا گھاس میں عشر واجب نہیں۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: اما الحطب والقصب والحشیش لاتستنبت فی الجنان عادۃ بل تنقّٰی عنها حتٰی لو اتخذها مقصبۃ او مشجرۃ او منبتا للحشیش یجب فیها العشر۔
(الهدایۃ ج۱ ص۱۸۴ باب زکوٰۃ الزرع والثمار) [2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: فلو استنمٰی ارضه بقوائم الخلاف وما اشبهه او بالقصب او الحشیش وکان یقطع ذٰلك و یبیعه کان فیه العشر۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۲۷ مطلب مهم فی حکم اراضی مصر والشام، باب العشر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیۃ ج۱ ص۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: الا فیما لا یقصد به استغلال الارض (نحو حطب وقصب) فارسی (وحشیش) وتبن وسعفه الخ حتٰی لو اشتغل ارضه بها یجب العشر۔ (الدرالمختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۲۷ باب العشر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیۃ ج۱ ص۱۸۶ باب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار۔

سبزیوں میں عشر کا وجوب

سوال: بعض سبزیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے سال بھر رہنے کا امکان نہیں ہوتا اور وہ جلدی خراب ہو جاتی ہیں، کیا زمین سے ایسی سبزیوں کے حاصلات پر عشر یا نصف عشر واجب رہے گا یا نہیں؟

الجواب: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عشر یا نصف عشر کے وجوب کیلئے زمین کی آمدنی میں کسی مدت کیلئے باقی رہنا ضروری نہیں، اسلئے وہ آمدنی جو زمین سے حاصل ہو اُس میں عشر یا نصف عشر واجب رہے گا، اگرچہ یہ محدود وقت کے لیے کھانے کی صلاحیت رکھتی ہو، موجودہ دور میں تو ان سبزیوں کا بڑے بڑے گوداموں کے ذریعے کافی عرصے تک محفوظ رہنا کوئی بعید امر نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله بلا شرط نصاب وبقاء) فيجب فيما دون النصاب بشرط ان يبلغ صاعًا وقيل نصفه وفي الخضراوات التي لا تبقى هذا قول الامام وهو الصحيح۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۶ باب العشر) [۱]

افیون میں عُشر کے وجوب کا مسئلہ

سوال: کیا افیون کی آمدنی سے عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: افیون متعدد مُفتر اشیاء کا مادہ ہے اسلئے اس کی زراعت اور تجارت سے علی سبیل التمول احتراز ضروری ہے، تاہم اگر تداوی کیلئے ہو تو پھر اس کی کاشت اور کاروبار جائز ہے۔ زمین سے آمدنی کے وقت نیت چونکہ مقصود بالزراع کی ہوتی ہے اسلئے آمدنی میں عشر کی ادائیگی لازمی امر ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: قال ابوحنیفةؒ في قليل ما اخرجته الارض وكثيره العشر سواء سقي سيحا او سقته السماء الا القصب والحطب والحشيش۔ (الهداية ج۱ ص۲۰۱ باب زكوٰة الزرع والثمار) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابوبكر الكاسانيؒ: فاما كون الخارج مما له ثمرة باقية فليس بشرط لوجوب العُشر بل يجب سواء كان الخارج له ثمرة باقية او ليس له ثمرة باقية وهي الخضراوات كالبقول والرطاب والخيار والقثاء والبصل والثوم ونحوها۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۵۸ فصل واما شرائط المحلية)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج ۱ ص۱۸۶ الباب السادس في زكوٰة الزرع والثمار۔

[۲] وفي الهندية: ويجب العُشر عند ابي حنيفةؒ في كل ما تخرجه من الحنطة...وسواء ذلك مما له ثمرة باقية او غير باقية قلّ او اكثر۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۸۶ باب السادس في زكوٰة الزرع والثمار)

وَمِثْلُهٗ في تبيين الحقائق ج ۱ ص۲۹۱ باب العشر۔

مقروض پر بھی عشر واجب ہے

سوال: اگر کوئی شخص مقروض ہو تو کیا اس پر عشر کی ادائیگی واجب ہے یا نہیں؟ یا کہ قرض مسقطِ عشر ہے؟

الجواب: قرض اگرچہ وجوبِ زکوٰۃ سے مانع ہے لیکن وجوبِ عشر سے مانع نہیں، مقروض ہونے کے باوجود بھی عشر ادا کیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویمنع الدّین وجوب العشر وخراج وکفارۃ۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۲۶۱ کتاب الزکوٰۃ) [1]

رفاہِ عامہ کے کاموں پر عشر کی رقم خرچ کرنا

سوال: کیا عشر کی رقم کو رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: عشر کا تعلق صدقاتِ واجبہ سے ہے جس میں غیر کی تملیک شرط ہے، چونکہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں غیر کی تملیک نہیں پائی جاتی اس لیے رفاہِ عامہ کے کاموں میں عشر کی رقم نہیں لگائی جا سکتی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ھی تملیک خرج الاباحۃ فلو اطعم یتیما ناویا الزکوٰۃ لایجزیہ الا اذا دفع الیہ المطعوم..... جزء مال خرج المنفعۃ عینہ الشارع۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۲۵۶ کتاب الزکوٰۃ) [2]

شہد میں عشر واجب ہے یا زکوٰۃ؟

سوال: میں نے شہد کی مکھیاں پال رکھی ہیں جن سے شہد کا کاروبار کرتا ہوں، کیا اس میں عشر واجب ہے یا زکوٰۃ؟

الجواب: فقہاء کرام نے مطلقاً شہد میں عشر کا قول کیا ہے اس میں شہد کی پالتو یا جنگل مکھیوں کی کوئی قید نہیں، اس لیے آپ پر اس شہد میں عشر ادا کرنا لازمی ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: ثم انما یجب العشر فی العسل اذ کان فی ارض العشر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وقید المصنف بالزکوٰۃ لان الدّین لایمنع وجوب العشر والخراج ویمنع صدقۃ الفطر۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۶ کتاب الزکوٰۃ)

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للہ تعالیٰ لقولہ تعالیٰ: وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ والایتاء ھو التملیک ومرادہ تملیک جزء من مالہ وھو ربع العشر او ما یقوم مقامہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)

فاما اذا کان فی ارض الخراج فلاشئ فیہ ۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۶۲ قبل فصل مقدار الواجب) [1]

تاہم اگر مچھلیاں خراجی زمین میں رکھی گئی ہوں تو عشر لازم نہیں۔

کیا مچھلیوں میں عشر واجب ہے

سوال:۔ حضرت مفتی صاحب! ہم نے قابلِ کاشت زمین میں سے کچھ حصہ پر مچھلیاں پالنے کے لیے ایک تالاب بنایا ہوا ہے جس میں مچھلیاں پال کر فروخت کرتے ہیں، تو اس قطعہ زمین میں عشر کس طرح ادا کیا جائے گا، مچھلیوں سے یا ان کی قیمت سے؟

الجواب:۔ عشر کے لیے زمین ہی کی پیداوار ہونا شرط ہے، مچھلیاں چونکہ زمین کی پیداوار نہیں اس لیے ان میں عشر نہیں، البتہ اگر مچھلیاں تجارت کی نیت سے پالی جاتی ہوں اور جب وہ نصابِ زکوٰۃ کو پہنچ جائیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال الشیخ ابی عبیدؒ: ان لا یأخذ من السمك شیئًا حتی یبلغ مائتی درهم فاذا بلغ مائتی درهم نخذ منه الزکوٰة ۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۳۴۸) [2]

کافر حکمران کا مسلمانوں سے ٹیکس یا عشر وصول کرنا

سوال:۔ اگر ایک مسلمان کاشتکار سے کافر بادشاہ ٹیکس یا عشر وصول کرے تو کیا اس کا عشر ادا ہو جائے گا یا دوبارہ دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ کافر حکومت کو مسلمانوں سے خراج وغیرہ لینے کا کوئی حق نہیں، اس لیے کافر حکومت جب کسی مسلمان زمیندار سے عشر یا ٹیکس وصول کرے تو اس سے عشر ادا نہ ہوگا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: یجب العشر فی عسل وان قل ارض غیر الخراج ولو غیر عشریة کجبل ومفازة بخلاف الخراجیة لئلا یجتمع العشر والخراج ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۲۵ باب العشر) وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۸۶ باب زکاة الزرع والثمار۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: ولا فی عین قیر ای زفت نفط دهن یعلو الماء مطلقاً ای فی ارض عشر اوخراج ولکن فی حریمها الصالح للزراعة من ارض الخراج خراج لا فیها لتعلق الخراج بالتمکن من الزراعة واما العشر فیجب فی حریمها العشری ان زرعه والا لا لتعلقه بالخارج ۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله ولا فی عین قیر) لانه لیس من انزال الارض انما هو عین فوارة کعین الماء فلا عُشر فیها ولا خراج ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۳۱ باب العُشر)

مسلمان پر دوبارہ عشر دینا لازمی ہے۔

لما قال العلامۃ عبدالغفور الہمایونی السندی: واما آنچہ حکام نصاری می گیرند پس در ادا خراج محسوب نمی گردد لان الکافرین لیس لھم ولایۃ اخذ الخراج من المسلمین والمؤمنین وایضاً لیسوا بمصادف الخراج حتی اذا ادّی المسلمون الیھم مالاً بنیۃ الخراج لایخرجون عن عھدتہ لانھم لیسوا بمقاتلین لاھل الحرب ولا دافعین اعداء الاسلام عنھم و عن دارھم بل ھم اھل الحرب واعداء المسلمین والاسلام اعاننا اللہ تعالیٰ علیھم والمصرف للخراج المقاتلون لاھل الحرب ورافعوا الاعداء عن دار الاسلام۔الخ

(سراج الھند فی تحقیق خراج السند بحوالہ احسن الفتاویٰ ج۴ ص۳۴۸ باب العشر)[1]

فرنیچر اور کھیلوں کے سامان کیلئے کاشت شدہ درختوں میں عشر کا مسئلہ

سوال:۔ ہمارے علاقے میں لوگ بعض درختوں کو فرنیچر، کھیلوں کے سامان اور دیگر اشیاء کی بناوٹ کے لیے کاشت کرتے ہیں، کیا ان میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ خود درختوں میں عشر نہیں لیکن جب درختوں کی ذات ہی کو مقصد بنایا جائے تو اس میں عشر واجب ہے۔

کما قال الشیخ عبدالحی الکھنویؒ: المراد ما لایقصد بہ استغلال الارض غالباً کالتبن نعم لو قصد الاستغلال بشئ منھا کما اذا اتخذ الجنان مقصبۃ ومشجرۃ۔

(بحوالہ جدید فقہی مباحث ج۹ ص۲۳۲)[2]

---

[1] قال العلامۃ الشیخ اشرف العلی التھانوی رحمہ اللہ: عشر و خراج از حقوق شرعیہ است پس چنانکہ انکم ٹیکس مسقط زکوٰۃ نیست ہمچنیں محصول سرکاری مسقط ایں حقوق نباشد

(امداد الفتاویٰ جلد۲ ص۷۵ باب العشر)

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ حتی لو اشغل ارضہ بھا یجب بھا العشر) فلو استنمیٰ ارضہ بقوائم الخلاف وما اشبھہ اوبالقصب او الحشیش وکان یقطع ذلک و یبیعہ کان فیہ العشر۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۲۷ باب العشر مطلب فی حکم اراضی مصر والشام)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۶ باب زکوٰۃ الزرع والثمار۔

ایک ہی رقم سے عشر اور زکوٰۃ دونوں ادا کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص پیداوار سے عشر ادا کر کے پھر اس کو فروخت کر دے تو کیا اُس پر اس رقم میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس شخص کے پاس نقدی کا نصاب بھی ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص پہلے سے صاحبِ نصاب ہو اور اس نے ابھی تک نصاب کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو اور یہ رقم زکوٰۃ کی ادائیگی سے قبل صاحبِ نصاب کے ہاتھ آجائے تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی۔

لما قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: اکان لہ طعام فادی عشرہ ... اوکان لہ ارض فادی خراجہا... ثم باعہا یضم الی ثمنہا اصل النصاب۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۱۴، فصل شرائط التی ترجع الی الحال)

ذاتی استعمال کیلئے کاشت کردہ سبزی میں عشر واجب ہے

سوال:۔ اگر کوئی زمیندار اپنے ذاتی استعمال کے لیے سبزی وغیرہ کاشت کرے تو اُس پر عشر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ عشر ہر اُس پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو زمین سے نکلے چاہے اپنی ذات کے لیے کاشت کی جائے یا تجارت کے لیے، اس لیے ذاتی استعمال کے لیے کاشت کی ہوئی سبزی میں بھی عشر واجب ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: واما وقتہ فوقت خروج الزرع وظہور الثمر عند ابی حنیفۃؒ وعند ابی یوسفؒ وقت الادراک۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۳۷ باب العشر)[۲]

خودرو پودوں میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

سوال:۔ ہماری زمین میں قدرتی گھاس اور خودرو پودے بکثرت ہیں ہم اس کی

---

[۱] قال الشیخ الدکتور وھبۃ الزحیلیؒ: اما المستفاد فی اثناء الحول من جنس المال غیر النتاج والارباح فیضم الیہ ویزکی معہ عند الحنفیۃ تیسیراً علی المزکی۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۷۴۲ المبحث الثانی سبب الزکوٰۃ الخ)

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویؤخذ العشر عند الامام عند ظہور الثمرۃ وبدو صلاحہا۔ ...... (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۳۱ باب العشر)

ومثلہ فی الہندیۃ ج۱ ص۱۸۶/۱۸۷ باب زکوٰۃ الزرع والثمار۔

حفاظت کرتے ہیں اور دوسروں کو اُس میں آنے جانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس میں عشر واجب ہے؟

الجواب:۔ خودرو گھاس میں اگرچہ عشر واجب نہیں لیکن جب اس کی حفاظت کرکے اس کو ذریعۂ آمدنی بنایا جائے تو پھر عشر واجب ہے۔

لما فی الهندية : فلا عشر فی الحطب والحشيش..... ولو کان يقطعه ويبيعه يجب فيه العشر کذا فی محيط السرخسیؒ ۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۸۶ باب زکوٰة الزرع والثمار) [1]

جدید طریقۂ کاشت کے عشر پر اثرات

سوال:۔ آج کے جدید طریقۂ کاشت میں زراعت پر کافی خرچہ آتا ہے جیسے کھاد، ادویات وغیرہ، تو کیا ان اخراجات کی وجہ سے عشر پر کوئی اثر پڑے گا؟ یعنی کامل عشر نصف میں تبدیل ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ادویات و کھاد پر خرچ ہونے والی رقم منہا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین کی پیداوار پر اخراجات زیادہ ہوتے ہوں تو اُس پیداوار میں بیسواں حصہ عشر واجب ہوگا اور جس زمین پر اخراجات کم ہوتے ہوں تو دسواں حصہ عشر لازم ہوگا لیکن اخراجات کو منہا کرنا جائز نہیں، لہٰذا جدید طریقۂ کاشت پر اخراجات زیادہ آنے کے باوجود منہا کرنا جائز نہیں، البتہ عشر بیسواں حصہ کے حساب سے ادا کرنا ہوگا۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ : وتجب فی مسقی سماء وسيح بلا شرط نصاب وبقاء وحولان حول الخ...... ويجب العشر ويجب نصفه فی سقی غرب ودالية لكثرة المؤنة ۔ قال ابن عابدينؒ : (تحت قوله لكثرة المؤنة) علة لوجوب نصف العشر فيما ذكر۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۶ تا ۳۲۸ باب العشر، مطلب فی حكم اراضی مصر والشام) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : (تحت قوله حتى لو اشغل ارضه بها يجب العشر) فلو استنمٰى أرضه بقوائم الخلاف و ما اشبهه او بالقصب أو الحشيش وكان يقطع ذلك و يبيعه كان فيه العشر۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۷ باب العشر مطلب مهم فی حكم اراضی مصر والشام)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی ادلته ج ۲ ص۸۰۵ المطلب الرابع زكوٰة الزرع والثمار۔

[2] قال الشيخ وهبة الزحيلی : ويجب نصف العشر فيما سقی كالدالی (المنواعير) النواضح..... وسبب التفرقة واضح وهو كثرة المؤنة فی ارض السقی وخفتها فی ارض البعل كما هو الفرق بين الماشية المعلوفة والسائمة الخ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۲ ص۸۱۳ المطلب الرابع زكوٰة الزروع والثمار۔ خامساً مقدار الواجب وصفته ۔

فصل مقصودہ پر عشر واجب ہے

سوال:۔ ہمارے علاقے میں مکئی وغیرہ کثرت سے کاشت کی جاتی ہے اور اس سے کاشتکار کے پیشِ نظر اناج نہیں بلکہ چارا ہوتا ہے جو جانوروں کے لیے انتہائی کارآمد شے ہے تو مقصود بالذات فصل ہوتی ہے نہ کہ اناج ، اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ اناج اور فصل دونوں میں عشر ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک میں عشر ادا کر دیا جائے تو دوسرے میں عشر نہیں ہے ، مسئلہ ہذا واضح فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں ؟

الجواب:۔ مکئی کے دانوں میں عشر واجب ہے اس کے گھاس (ٹانٹوں) میں عشر واجب نہیں ، البتہ باجرہ اور جوار جو کہ بطور گھاس کاشت کی جاتی ہو دانہ مقصود نہ ہو تو اسکے دس گٹھوں میں سے ایک گٹھا عشر دینا واجب ہوگا ، اسی پر وہ سب چیزیں قیاس کی جاسکتی ہیں جن میں مقصود گھاس ہوتی ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : إلّا فيما لا يقصد به استغلال الارض نحو حطب وقصب فارسی وحشيش وتبن وسعف الخ حتی لو اشتغل ارضه بها يجب العشر۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۸ باب العُشر)

البتہ اگر صرف ٹانٹے کاٹ کر فروخت کرنے ہوں یا جانوروں کو کھلانے ہوں تو ان میں بھی عشر واجب ہے ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : قال فی الفتح غیر انه لو فصله قبل انعقاد الحب وجب العُشر فیه لانه صار هو المقصود فلو استنمی ارضه بقوائم الخلاف وما اشبهه او بالقصب او الحشيش وكان يقطع ذلك ويبيعه كان فيه العشر كذا فی البدائع۔ (رد المحتار ج۲ ص۵۸ باب العشر)[1]

---

[1] قال العلامة الكاسانیؒ : ومنها ان یکون الخارج من الارض مما یقصد بزراعته نماء الارض وتستغل الارض به عادة......... حتی قالوا فی الارض اذا اتخذها مقصبة وفی شجرة الخلاف التی یقطع فی کل ثلاث سنین او اربع سنین انه یجب فیها العُشر لان ذلك غلة وافرة ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۵۸ فصل واما شرائط المحلیة)

ومثله فی الهداية ج۱ ص۱۸۳ باب زکوة الزروع والثمار۔

بائع کا مشتری کو کچھ رقم چھوڑ دینے پر عشر کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو سے پچاس ہزار روپے میں باغ خریدا اب زید کو اس باغ میں نقصان ہوگیا ہے اور زید نے عمرو کی منت سماجت کرکے دس ہزار روپے معاف کرا لیے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کو عشر پچاس ہزار روپے میں سے دینا ہوگا یا چالیس ہزار کے حساب سے؟

الجواب:۔ عشر پیداوار کی اس رقم کے مطابق واجب ہوتا ہے جس پر بیع ہوچکی ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں عمرو نے اصل ثمن سے دس ہزار روپے چھوڑ دیئے ہیں اس لیے زید چالیس ہزار روپے کا عُشر ادا کرے گا، کیونکہ عمرو نے بیع میں جو کمی کی ہے وہ اصل بیع یعنی عقد کے ساتھ ملحق ہوگی گویا کہ بیع چالیس ہزار روپے پر ہی ہوئی ہے۔

لما فی الھندیۃ: حط بعض الثمن صحیح ویلتحق باصل العقد عندنا کالزیادۃ سواء بقی محلا للمقابلۃ وقت الحط اولم یبق محلا کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۱۷۳ کتاب البیوع، الباب السادس عشر فی الزیادۃ فی الثمن) [1]

جنگلات میں عُشر واجب نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ سوات، ہزارہ اور کوہستان وغیرہ کے پہاڑوں پر گھنے جنگلات کی کثرت ہے جن میں سے بعض عوام کی اور بعض حکومت کی ملکیت ہیں، تو کیا عوامی جنگلات میں پورا عُشر واجب ہے یا نصف؟ یا سرے سے عُشر واجب ہی نہیں ہے؟

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: والزیادۃ فیہ والحط منہ ای من الثمن ویلتحقان باصل العقد عندنا وعند زفر لا یلتحقان .... ولنا انہما بالحط والزیادۃ یغیران العقد من وصف مشروع الی وصف مشروع وھو کونہ رابحًا او خاسرًا اوعدلًا ولھما ولایۃ الرفع فاولی ان یکون لھما ولایۃ التغییر فصار کما اذا سقطا الخیار او شرطاہ بعد العقد واذا صح یلتحق بالعقد لان وصف الشئ یقوم بہ لا بنفسہ بخلاف حط الکل لانہ تبدیل لاصلہ لا تغییر لوصفہ۔

(البحر الرائق ج۶ ص۱۱۹ فصل فی بیان التصرف فی المبیع والثمن الخ)

الجواب:۔جنگلات کے ان درختوں میں عُشر نہیں ہے تاہم فروختگی کی صورت میں سال گذرنے پر ان کی قیمت پر حسبِ ضابطہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: وکذا لا عشر فیما ھو تابع للارض کالنخل والاشجار لانہ بمنزلۃ جزء الارض لانہ یتبعھا فی البیع الخ۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۳۸ باب العُشر) لہ

باراتی اور چاہی زمین میں عشر کا حکم

سوال:۔ایک شخص مثلاً زید کی زمین کنوئیں سے سیراب ہوتی ہے لیکن امسال برسات کے موسم میں بارشوں کی کثرت کی وجہ سے کنواں چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، تو کیا زید حسبِ سابق نصف عُشر ادا کرے گا یا پورا عُشر ادا کرے گا؟

الجواب:۔عُشر کا تعلق چونکہ پانی سے ہے اور فصل جس پانی سے بھی سیراب ہوتی ہو اُس کے مطابق عُشر واجب ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چونکہ فصل بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اور کنواں چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اس لیے اس فصل میں پورا عشر واجب ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتجب فی مسقی سماء ای مطر وسیح کنھر بلا شرط نصاب..... ولو سقی سیحاً وبالۃ اعتبر الغالب ولو استویا فنصفہ وقیل ثلاثۃ وقیل اربعۃ۔ (الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج ۲ ص۵۱ باب العُشر) ۲ہ

لہ وفی الھندیۃ: ولا عُشر فیما ھو تابعٌ للارض کالنخل والاشجار۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰۃ الزروع والثمار)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص۵۸ فصل واما شرائط المحلیۃ۔

۲ہ قال العلامۃ الکاسانیؒ: وعن انس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال فیما سقتہ السماء والعیون وکان بعلا العُشر وما سقی بالرشاء ففیہ نصف العُشر ولان العُشر وجب مؤنۃ الارض فیختلف الواجب بقلۃ المؤنۃ وکثرتھا ولو سقی الزرع فی بعض السنۃ سیحاً وفی بعضھا بآلۃ یعتبر فی ذلک لان للاکثر حکم الکل کما فی السوم فی باب الزکوٰۃ۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص۶۲ فصل واما بیان مقدار الواجب)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۱ ص۱۸۴ باب زکوٰۃ الزروع والثمار۔

عشر میں حولانِ حول شرط نہیں

سوال:- زید کی ایک ہزار روپے کی افیون کی فصل ہوئی تھی تو اس نے سو روپے عُشر ادا کر کے افیون اپنے پاس رکھ لی جو کہ پورا ایک سال اس کے پاس پڑی رہی، تو کیا سال گذرنے پر اس افیون میں دوبارہ عُشر یا زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- ایک فصل میں صرف ایک بار عُشر ادا کیا جائے گا، بار بار سال گذرنے سے عشر واجب نہیں ہوتا اور اگر فصل بار بار اُگتی ہو تو ہر بار عشر واجب ہوگا تاہم اگر فصل فروخت کی جائے اور اس کے بدلے میں نقد رقم مل جائے اور اس رقم پر سال گذر جائے تو ضابطۂ زکوٰۃ کے مطابق زکوٰۃ واجب ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قوله وحولان حول حتی لو اخرجت الارض مرارًا وجب فی کل مرّة لاطلاق النصوص عن قید الحول ولان العشر فی الخارج حقیقةً فیتکرر بتکرره۔ (رد المحتار علیٰ هامش الدر المختار ج۲ ص۴۹ باب العشر) لہ

پھل پکنے سے پہلے بیع کی صورت میں عُشر مشتری پر ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ اگر کوئی شخص اپنے باغ کو پھل آنے سے پہلے کسی دوسرے آدمی پر فروخت کر دے اور پھل پکنے تک مشتری بائع سے درختوں پر رہنے کی اجازت بھی لے لے تو پھل پکنے کے بعد عشر بائع پر واجب ہوگا یا مشتری ادا کرے گا؟

الجواب:- عُشر ہر اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس کی ملکیت میں فصل پیدا ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں پھل مشتری کی ملکیت میں پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا عشر دینا بھی اسی کے ذمّے ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو باع الزرع ان قبل ادراکه فالعُشر علی المشتری

لہ قال العلامة الکاسانیؒ: والحول لیس بشرط لوجوب العشر حتی لو اخرجت الارض فی السنة مرارًا یجب العُشر فی کل مرّة لان نصوص العشر مطلقة عن شرط الحول۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۶۲ فصل واما شرائط المحلیة)

ومِثلُهٗ فی الهدایة ج۱ ص۱۸۳ باب زکوٰة الزروع والثمار۔

ولو بعدہٗ فعلی البائع۔ قال ابن عابدینؒ: قولہ ولو باع الزرع...... ثم ھذا اذا باع الزرع وحدہ وشمل ما اذا باعہ وترکہ المشتری باذن البائع حتی ادرک فعشرھما عشرہ علی المشتری...... ولو فیھا زرع لم یبلغ فعلی المشتری بکل حال۔ (الدر المختار علی ہامش ردالمحتار ج۲ ص۵۴ باب العشر) ۱؎

وجوبِ عشر کے لیے زمین کا مالک ہونا شرط نہیں

سوال:۔ ہم نے کچھ بنجر زمین قابلِ کاشت بنائی ہے جس میں سالانہ ۲ دو فصلیں ہوتی ہیں، تو کیا اس طرح کی زمین سے بھی عشر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس صورت میں بھی آپ پر عشر ادا کرنا واجب ہے کیونکہ وجوبِ عُشر کے لیے ملکیتِ زمین شرط نہیں ہے۔

لما فی الھندیۃ: وکذا ملک الارض لیس بشرط للوجوب لوجوبہ فی الاراضی الموقوفہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۵ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار) ۲؎

لکڑیوں میں عشر نہ ہونے کی علّت کی وضاحت

سوال:۔ کتبِ فقہ میں لکھا ہے کہ حَطَب (لکڑیوں) میں عُشر واجب نہیں ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ گھاس، لکڑی اور پانی انسانوں میں مشترک ہے لیکن آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ باقاعدہ کھیتوں کے کناروں یا پانی کے نالوں پر درخت لگائے جاتے ہیں اور لوگوں کو آگ جلانے کے لیے یا مکان کی تعمیر وغیرہ کے لیے درخت کاٹنے

۱؎ وفی الھندیۃ: ولو باعھا والزرع ان فصلہ المشتری فی الحال یجب علی البائع ولو ترکہ حتی ادرک فعشرہ علی المشتری کذا فی شرح الطحاوی۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۷ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار)

۲؎ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قولہ ووقف افادان ملک الارض لیس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملک الخارج لانہ یجب فی الخارج لا فی الارض فکان ملکہ لھا وعدمہ سواء۔ (ردالمحتار علی ہامش الدرالمختار ج۲ ص۴۹ باب العُشر)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵۶ فصل واما شرائط الفرضیۃ۔

سے منع کیا جاتا ہے، تو کیا اس صورت میں بھی عُشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاءِ کرام نے درختوں میں عُشر واجب نہ ہونے کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ درخت زمین کے تابع ہیں، لہٰذا اس علت کے باعث کسی بھی صورت میں عُشر واجب نہیں ہوگا۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: وکذا لاعشر فیما ھو تابع للارض کالنخل والاشجار لانه بمنزلة جزء الارض لانه یتبعها فی البیع الخ۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۲۳۸ باب العشر) [1]

فروخت کرنے کی نیت سے اگائے ہوئے بیج (پنیری) پر عشر کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں مرچ، پیاز، ٹماٹر، بینگن وغیرہ کا بیج (پنیری) کاشت کیا جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اسے باقاعدہ فصل حاصل کرنے کے لیے دوسرے کھیت میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے بیج (پنیری) کچھ لوگ تو صرف اپنے لیے کاشت کرتے ہیں اور بعض لوگ فروخت کرنے کے لیے کاشت کرتے ہیں، تو کیا ایسے بیج سے عُشر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی چیز کے اگانے اور کاشت کرنے کا رواج ہوا ور عادتًا اس کی کاشت سے نفع اٹھایا جاتا ہو یعنی آمدنی کی غرض سے کاشت کیا جاتا ہو تو اس میں عُشر ہے اور اگر فروخت کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے کھیت کے لیے برائے فصل کاشت کیا گیا ہو تو پھر جب یہ فصل کامل ہو جائے تو اس میں سے عشر ادا کیا جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قوله لا فیما لا یقصد الخ اشار الی ان ما اقتصر علیه المصنف کالکنز وغیرہ لیس المراد به ذاته بل لکونه من جنس ما لا یقصد به استغلال الارض غالبًا وان المدار علی القصد

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون الخارج من الارض مما یقصد بزراعته نماء الارض وتشتغل الارض به عادة فلا عُشر فی الحطب والحشیش والقصب الفارسی۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۸ فصل واما شرائط المحلیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰة الزروع والثمار۔

حتیٰ لو قصل به ذٰلك وجب العشر کما صرح به بعده۔

(رد المحتار علیٰ هامش الدر المختار ج ۲ ص۵۰ باب العشر) [1]

فصل کے بار بار اُگنے پر عُشر کا حکم

سوال:۔ جوار، باجرہ وغیرہ کی فصل کئی بار اُگتی ہے تو کیا ہر بار اس سے عُشر دینا واجب ہے یا ایک بار ہی دینا کافی ہے؟

الجواب:۔ عشر کا تعلق فصل کے اُگنے کے ساتھ ہے چاہے وہ ایک بار آگے یا بار بار، ہر مرتبہ اس سے عشر ادا کیا جائے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جوار، باجرہ وغیرہ زمین سے جتنی بار بھی اُگے آتنی بار عشر دینا واجب ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وحولان حول حتیٰ لو اخرجت الارض مراراً وجب فی کل مرة لاطلاق النصوص عن قید الحول ولان العشر فی الخارج حقیقةً فیتکرر بتکرره الخ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۴۹ باب العشر) [2]

درختوں اور لکڑیوں میں عشر و زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:۔ زید نے اپنے کھیت سے کچھ درخت کاٹے جن کی قیمت تخمیناً چار ہزار روپے ہے جس میں ایک ہزار روپے اس نے مزدوری میں دیدیئے، اب زید باقی رقم میں عشر ادا کرے گا یا زکوٰۃ، اور کس حساب سے ادا کرے گا۔

الجواب:۔ اگر زید نے یہ درخت کھیت میں بقصد فصل بوئے تھے تو پھر ان

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون الخارج من الارض مما یقتصد بزراعته نماء الارض وتشتغل الارض به عادةً۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۵۸ فصل واما شرائط المحلیة)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج ۱ ص۱۸۴ باب زکوٰة الزروع والثمار۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: والحول لیس بشرط لوجوب العشر حتیٰ لو اخرجت الارض فی السنة مراراً یجب العشر فی کل مرة لان نصوص العشر مطلقة عن شرط الحول ولان العشر فی الخارج حقیقة فیتکرر الوجوب بتکرار الخارج۔
(بدائع الصنائع ج ۲ ص۶۲ فصل واما شرائط المحلية)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج ۱ ص۱۸۳ باب زکوٰة الزروع والثمار۔

درختوں کی کل قیمت یعنی چار ہزار روپے میں عشر واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قوله الا فیما لا یقصد ...... ان المدار علی القصد حتی لو قصد به ذلك وجب العشر کما صرح به بعد ہ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۵۰ باب العشر)

اور اگر یہ درخت کھیت کے تابع تھے اور بقصد فصل نہیں تھے تو پھر ان میں عشر واجب ہے نہ زکوٰۃ۔

لما فی الهندیة: ولا عشر فیما هو تابع للارض کالنخل والاشجار۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار) ۱ھ

اجارہ کی نقد رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- اجارہ اگر نقد رقم پر ہوا ہو مثلاً فی جریب ایک ہزار روپے، یہ اجارۂ زمین تو مال ہے، اب اس رقم پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی یا عشر؟

الجواب:- اجارہ کی یہ رقم دوسری آمدنی کے تابع ہو کر سال بھر گذرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی عشر نہیں، البتہ اس زمین سے فصل حاصل کرنے والے پر عشر واجب ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: والعشر علی المؤجر کخراج موظف وقالا علی المستأجر کمستعیر مسلم وفی الحاوی وبقولهما ناخذ۔ وقال ابن عابدینؒ: قال فی فتح القدیر لهما ان العشر منوط بالخارج وهو للمستأجر ..... فلا ینبغی العدول عن الافتاء بقولهما فی ذلك۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۵۵ مطلب هل یجب العشر علی المزارعین فی اراضی السلطانیة) ۲ھ

۱ھ قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون الخارج من الارض مما یقصد بزراعته نماء الارض وتشتغل الارض به عادة فلا عشر فی الحطب والحشیش والقصب الفارسی۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۸ فصل واما شرائط المحلیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۱ ص ۱۸۳ باب زکوٰۃ الزروع والثمار۔

۲ھ قال العلامة الکاسانیؒ: ولو آجر ارضه العشریة فعشر الخارج علی المؤاجر عنده وعندهما علی المستأجر وجه قولهما ظاهر لما ذکرنا ان العشر یجب فی الخارج والخارج ملك المستأجر فکان العشر علیه کالمستعیر الخ۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۶ فصل واما شرائط الفرضیة)

وَمِثْلُهٗ فی النتف فی الفتاوی ج ۱ ص ۱۲ المعاملة فی الاراضی العشریة۔

عُشر فی الفور واجب ہے یا علی التاخیر؟

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ایک زمیندار آدمی بہت زیادہ مقروض ہے، جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو اس کا عشر اُسی وقت ادا نہیں کرتا بلکہ ایک کاپی پر لکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ قرض خواہ بہت تنگ کر رہے ہیں اس لیے پہلے قرضہ ادا کرتا ہوں، کیونکہ یہ حقوق العباد میں سے ہے جبکہ میری ساری فصل بھی قرضہ کی مقدار سے کم ہے، جب خدا تعالیٰ قرضہ سے نجات دے دیں گے تو پھر یہ سب عشر ادا کروں گا۔ تو کیا از روئے شرع اس زمیندار کا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اسلام میں عشر کی ادائیگی علی الفور واجب ہے اس کی ادائیگی میں تاخیر کرنا گناہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص محض مقروض ہونے کی وجہ سے عشر دینے میں تاخیر کرے گا تو اس عمل سے گنہگار ہو جائے گا، کیونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے : وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (سورۃ ..... ع .....)

جبکہ احادیث میں بھی عشر کی جلد از جلد ادائیگی کا حکم وارد ہوا ہے۔

لما فی الھندیۃ : ولا یأکل شیئاً من طعام العُشر حتیٰ یؤدی عشرہٗ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۷ باب العشر)

تاہم اگر وہ عشر کا مال اپنے قرض میں دیدے تو اِس سے اُس کا قرضہ تو ادا ہو جائے گا مگر عُشر اُس کے ذمہ قرض رہے گا، اور اگر زندگی میں ادا نہ کیا ہو تو اس کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ سے وصول کیا جائے گا۔

(کما فی القاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۱ ص۲۷۶)

اسی طرح الدر المختار میں بھی یہ تصریح ہے کہ : ولذا کان للامام اخذہٗ جبرًا ویؤخذ من الترکۃ و یجب مع الدین فی ارضٍ صغیر الخ

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۲۶ باب العُشر)

نہری و بارانی پانی سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار میں عشر کا مسئلہ

سوال :۔ اگر کسی زمین کو نہری اور بارانی پانی سے سیراب کیا جاتا ہو تو اس کی پیداوار پر عشر کس حساب سے واجب ہوگا؟ کیا اس زمین کی پیداوار میں بارانی پانی سے سیرابی کے حساب سے عشر واجب ہوگا یا نہری پانی کے حساب سے ؟ برائے مہربانی تفصیلی جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب:۔ جو زمین دو مختلف الانواع پانی سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں وجوبِ عشر کے لیے اکثریت کا اعتبار ہوگا، مثلاً ایک فصل کو اگر پانچ بار آبپاشی کی ضرورت ہے تو تین بار جس پانی سے اسے سیراب کیا جائے عشر اس کے حساب سے دیا جائے گا یعنی ایک فصل کی آبیاری تین بار نہری یا کنوئیں کے پانی سے کی گئی اور دو بار بارانی پانی سے تو اس کی پیداوار میں نصف العشر کے حساب سے عشر ادا کیا جائے گا اور اگر تین بار بارانی پانی سے سیراب کی گئی ہو تو پورا عشر لازم ہوگا۔ البتہ اگر اس زمین کو دونوں قسم کے پانی سے مساوی طور پر سیراب کیا جائے تو فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ نظراً للفقراء کی وجہ سے نصف العشر کے حساب سے عشر ادا کیا جائے گا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وان سقی بعض السنة بالة والبعض بغیرھا فالمعتبر اکثر کما مر فی السائمة والعلوفة وان استویا یجب نصف العشر نظراً للفقراء کما فی السائمة۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۱۶ باب العشر)

امارتِ اسلامیہ جبراً عشر وصول کرسکتی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے، وہ یہ کہ کیا امارتِ اسلامیہ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی سے زبردستی عشر وصول کرے؟ برائے مہربانی جواب باحوالہ عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ عشر چونکہ زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے اور زمین کی پیداوار اموالِ ظاہری کی طرح ہے اسلئے اگر کوئی شخص خود عشر ادا نہ کرتا ہو تو امارتِ اسلامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے بزور دستی عشر وصول کرے اور اس وصولی سے اگر چہ اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا مگر ثواب نہیں ملے گا، تاہم اگر اپنے اختیار سے عشر ادا کرے تو اجر و ثواب کا بھی مستحق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: لھذا جاز ان یأخذہ جبراً ویسقط عن صاحب الارض الا انہ لاثواب لہ الا اذا ادی اختیاراً۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۱۳ باب العشر)[۱]

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: وحولان حولالات فیہ معنی المؤنة ولذا کان للامام اخذہ جبراً ولؤخذ من الترکہ۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قولہ اخذہ جبراً) ویسقط عن صاحب الارض کالوادی بنفسہ الا انہ اذا ادی بنفسہ یثاب ثواب العبادة واذا اخذہ الامام یکون لہ ثواب ذھاب مالہ فی وجہ اللہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۲۶ باب العشر)

نابالغ کی مملوکہ زمین میں عشر کا مسئلہ

سوال:۔ کیا نابالغ بچوں کی مملوکہ زمین کی پیداوار پر عشر واجب ہے یا نہیں؟ کیا عشر کے وجوب کے لیے بلوغ شرط ہے جس طرح زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مزکی (زکوٰۃ دینے والے) کا بالغ ہونا شرط لازم ہے؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے اگرچہ مزکی (زکوٰۃ دینے والے) کا بالغ ہونا ضروری ہے مگر عشر کا معاملہ اس سے الگ ہے، عشر زمین کی پیداوار پہ لاگو ہوتا ہے اس میں مالک کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے صورت مسئولہ میں نابالغ کی مملوکہ زمین کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے، مالک کا بالغ ہونا ضروری نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: واما العقل والبلوغ فلیسا من شرائط الوجوب حتی یجب العشر فی ارض الصبی والمجنون لان فیہ معنی المؤنۃ۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۳ باب العشر) [1]

خودرو گھاس میں عشر کے وجوب کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں ایک خاص قسم کا گھاس ہوتا ہے جسے لوگ جانوروں کے لیے چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، بعض لوگ اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے پانی دیتے ہیں تاکہ سوکھ نہ جائے۔ اس مقصد کے لیے اپنی زمین کا کچھ حصہ مخصوص کر دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اس گھاس سے منع بھی کرتے ہیں، کیا ایسی گھاس میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عشر زمین کی ہر اس پیداوار میں واجب ہے جو مقصود ہو، چاہے اس کی کاشت کی جائے یا از خود پیدا ہو جائے، چونکہ خودرو گھاس عموماً مقصود اصلی نہیں ہوتا

---

[1] لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویؤخذ من الترکۃ ویجب مع الدین وفی ارض صغیر ومجنون ومکاتب ومأذون ووقف وتسمیتہ زکوٰۃ۔ قال العلامۃ ابن عابدینؒ تحت قولہ (وفی ارض صغیر ومجنون ومکاتب) من مدخول العلۃ فلا تشترط فی وجوبہ العقل والبلوغ والحریۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۲۶ باب العشر)

ومثلہ فی الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۸۵ الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار۔

اس لیے اس میں عشر واجب نہیں، لیکن جب اس کی حفاظت کی جائے، اس کو بر وقت پانی دیا جائے، اور دوسروں کو اس سے منع کیا جائے تو پھر اس صورت میں وہ گھاس مقصودی ہو جاتا ہے جس کی طرف حکم شرعی متوجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر واقعی اس قسم کے گھاس کے لیے زمین مخصوص کرکے اس میں گھاس کی نشو و نما کی جاتی ہو تو پھر اس میں عشر واجب ہے، بصورتِ دیگر کوئی عشر نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: (الا فیما) لا یقصد به استغلال الارض (نحو حطب وقصب) فارسی (وحشیش) وتبن وسعف وصمغ وقطران وخطمی و اشنان وشجر قطن وباذنجان وبزر بطیخ وقثاء وادویة کحلیة وشونیز حتی لو اشتغل ارضه بها یجب العشر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۲۷ باب العشر) [1]

فتاویٰ ہندیہ اور دُرِّ مختار کی عبارت و شجر القطن سے پیدا ہونے والے شبہ کا ازالہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض کتب فقہ مثلاً الدر المختار اور ہندیہ وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شجر قطن (کپاس کے پودے) میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ تو کیا واقعی کپاس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے؟ جبکہ کپاس آجکل ہمارے کی بہت اہم پیداوار ہے، براہِ مہربانی فقہ حنفی کی روشنی میں ہماری اس اُلجھن کو دور فرمائیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں عشری زمین کی ہر اس پیداوار میں واجب ہے جو مقصودی ہو کپاس چونکہ مقصودی پیداوار ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ بالاتفاق واجب ہے، البتہ مقدارِ نصاب میں احناف کے ہاں اختلاف ہے۔

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمه الله: وعلی هذا کل ما لا یقصد به استغلال الارض لا یجب فیه العشر مثل السعف و التبن۔ اھ

وقال فیه ایضاً: انما استثنی الثلاثة لانه لا یقصد بها استغلال الارض غالبًا حتی لو اشتغل بها ارضه وجب العشر۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۵ باب العشر)

ومثله فی الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۸۶ الباب السادس فی زکوٰة الزرع والثمار۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: قال ابو یوسفؒ فیما لا یوسق کالزعفران والقطن یجب فیہ العشر اذا بلغت قیمتہ خمسۃ اوسق من ادنیٰ ما یوسق۔ الخ قال محمدؒ: ویجب العشر اذا بلغ الخارج خمسۃ امداد من اعلیٰ ما یقدر بہ نوعہ۔ (الہدایۃ ج ا ص۱۸۲ باب العشر)

وقال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ویجب فی العصفر والکتان وبزرہ لان کل واحد منہما مقصود فیہ ثم اختلفا فیما لا یوسق کالزعفران والقطن فاعتبر ابو یوسفؒ قیمۃ ادنیٰ ما یوسق کالذرۃ واعتبر محمد خمسۃ اعداد من اعلیٰ ما یقدر بہ نوعہ فاعتبر فی القطن خمسۃ احمال کل حمل ثلاث مائۃ من۔ الخ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۱۵ باب العشر)

اور جہاں تک درمختار اور ہندیہ کی عبارات کا تعلق ہے تو وہاں شجرہ قطن یعنی کپاس کے پودے کی نفی ہے کپاس کی نہیں، اس لیے کہ اس کی پیداوار میں مقصود اصلی کپاس ہوتی ہے اس کا پودا نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ وشجرۃ قطن) اما القطن نفسہ ففیہ العشر کما مر۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۳۲۷ باب العشر) لہ

☼

لہ لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ بلا شرط نصاب وبقاء فیجب فیما دون النصاب بشرط ان یبلغ صاعاً وقیل نصفہ وفی الخضراوات التی لا تبقیٰ وھذا قول الامام وھو الصحیح کما فی التحفۃ وقالا: لا یجب الا فیما لہ ثمرۃ باقیۃ حولاً بشرط ان یبلغ خمسۃ ان کان فما یوسق والوسق ستون صاعاً کل صاع اربعۃ امناء والا فحتیٰ یبلغ قیمۃ نصاب من ادنیٰ الموسوق عند الثانی واعتبر عند الثالث خمسۃ امثال مما یقدر بہ نوعہ ففی القطن خمسۃ احمال وفی العسل افراق وفی السکر امناء وتمامہ فی النہر۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۶ باب العشر)

نہری زمین میں عشر اور نصف عشر کا مسئلہ

سوال:- ایسی نہری زمین جس کی نہر کے کھودنے، اصلاح اور دیکھ بھال پر محنت اور رقم خرچ کرنی پڑتی ہو کی پیداوار میں عشر واجب ہوگا یا نصف عشر؟

الجواب:- سوال میں مذکورہ نہری زمین کے بارے میں دو مختلف اور متضاد رائیں ملتی ہیں، اوّل یہ کہ سوال میں مذکور جیسی زمین میں عُشر لازم ہوگا، اور اس کے مقابلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ ایسی زمین کی پیداوار میں نصف عُشر لازم ہے۔ درج ذیل کتابوں کی عبارات اپنے اطلاق وصراحت سے رائے اوّل کا ثبوت دے رہی ہیں:-

(۱) دُرمختار میں ہے: ویجب ای العُشر فی مسقی سماء ای مطر وسیح کنھر ویجب نصفه فی مسقی غرب ای دلو کبیر ودالیة ای دولاب الخ۔ (ج ۲ ص۵۳تا۵۵ باب العشر)

یعنی جو زمین مطر ونہر سے سیراب ہو رہی ہو اس کی پیداوار میں عشر واجب ہوگا اور غرب ودالیہ سے سیراب کی جاتی ہو اس کی پیداوار میں نصف عشر لازم ہوگا۔

(۲) کنز الدقائق علیٰ ہامش البحرالرائق میں ہے: یجب فی عسل ارض العشر ومسقی سماء وسیح ونصفه فی مسقی غرب ودالیة۔ (ج ۲ ص۲۳۶، ۲۳۸ باب العشر)

یعنی عشری زمین کے شہد اور مطر ونہر سے سیراب کی گئی زمین کی پیداوار میں عشر لازم ہے اور وہ زمین جو غرب ودالیہ سے سیراب کی جاتی ہو اس کی پیداوار میں نصف عشر لازم ہے۔

(۳) بدائع الصنائع میں ہے: فما سقی بماء السماء او سقی سیحا ففیه عشر کامل وما سقی بغرب او دالیة او سانیة ففیه نصف العشر۔ (ج۲ ص۶۲ باب العشر)

یعنی جو زمین باران ونہر سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں عُشر اور جو غرب ودالیہ اور سانیہ سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عُشر لازم ہے۔

(۴) فتاوٰی الہندیہ میں ہے: وما سقی بالدولاب والدالیة ففیه نصف العُشر وان سقی سیحا وبدالیة یعتبر اکثر السنة فان استویا یجب نصف العُشر۔ (ج۱ ص۱۸۶ الباب العشر)

یعنی جو زمین دولاب و دالیہ سے سیراب کی گئی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عشر لازم ہے (اور جو نہر ومطر سے سیراب کی گئی ہو تو اس کی پیداوار میں عُشر لازم ہے) اور جس زمین کو دونوں قسم کا پانی دیا گیا ہو تو پھر ان میں سے جو پانی زیادہ دیا گیا ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا،

البتہ مساوات کی صورت میں نصف عشر لازم ہوگا۔

(۵) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے: سوال نمبر ۲۶۲: ایک قطعہ زمین جو پہاڑ کے پانی سے سیراب ہوتا ہے مگر محنت و مشقت سے بند باندھ کر سیراب کیا جاتا ہے، تو شرعاً اس میں عشر واجب ہے یا نصف عشر؟ الجواب: عُشر واجب ہے کیونکہ مسقی سماء و سیح میں عُشر واجب ہوتا ہے، کذا فی الدرالمختار۔ انتہی ملخصاً۔ (ج ۶ ص ۱۶۴ باب العشر کتاب الزکوٰۃ)

نیز فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہی ہے: سوال: نہری زمینوں میں عُشر ہے یا نصف عُشر؟ الجواب: نہری زمینیں جن میں پانی کا محصول دیا جاتا ہے نصف عشر واجب ہوتا ہے۔ کما فی الدرالمختار: ویجب نصفہ فی مسقی غرب و دالیہ وفی کتب الشافعیۃ او سقاہ بماء اشتراہ وقواعدنا لاتاباہ الخ فقط (ج ۶ ص ۱۶۲ باب العشر)

اس جواب سے بطور مفہوم مخالف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس نہری زمین کے پانی کا محصول نہ لیا جاتا ہو اُس میں پورا عُشر واجب ہوگا اور مفہوم مخالف نصوص میں اگرچہ معتبر نہیں لیکن روایاتِ فقہیہ میں معتبر ہے۔ (شرح عقود رسم المفتی)

(۶) الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے: وحکم زکوٰۃ الزروع والثمار ھو انہ یجب فیھا العشر اذا کانت خارجۃ من ارض تسقی بالمطر والسیح والماء الذی یسیح علی الارض من المصارف ونحوھا ونصف العُشر اذا کانت خارجۃ من ارض تسقی بالدلاء ونحوھا۔ (ج ۱ ص ۶۱۶ باب العشر)

وفیہ ایضاً: وانما یجب نصف العشر ان سقی بالآلات فان سقی بالمطر اوالسیح فالعُشر ولو اشتری المطر ممن نزل بارضہ وانفق علیہ حتی اوصلہ لارضہ من غیر آلۃ رافعۃ ففیہ العشر ایضاً۔ (ج ۱ ص ۶۲۰ باب العشر)

(ترجمہ) "بارش و نہر وغیرہ سے جو زمین سیراب کی جاتی ہے تو اس کی پیداوار میں عُشر واجب ہوگا اور جو زمین دلاء و نحوھا سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عشر واجب ہوگا۔

نیز الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے کہ جو زمین آلات کے ذریعہ سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عشر واجب ہوگا اور بارش و نہر وغیرہ سے سیراب ہونے کی صورت میں عُشر واجب ہوگا، لہٰذا اگر کسی شخص نے بارش کا پانی خرید کر محنت و خرچے سے بغیر آلہ رافعہ کے

اپنی زمین تک پہنچا دیا تو اس کی زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہوگا۔

(۷) امداد الفتاوٰی میں ہے: الجواب فی رد المحتار ویجب ای العشر فی مسقی سماء وسیح ونصفه فی مسقی غرب ودالیه وفی کتب الشافعیة او سقاه بماء اشتراه وقواعدنا لاتاباه ولو سقی سیحا او بالة اعتبر الغالب ولو استویا فنصفه وقیل ثلاثة ارباعه ا ه۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آبپاشی پانی خرید کر کرتا ہے تو بیسواں حصہ پیداوار کا دے اور اگر مفت کے پانی سے کرتا ہے تو کنوئیں سے آبپاشی کرتے ہیں بھی بیسواں حصہ دے اور نہر سے کرنے میں دسواں حصہ دے جبکہ زمین عشری ہو یعنی کسی کافر سے نہ لی گئی ہو۔ (جلد ۲ ص۵۸ باب العشر۔ کتاب الزکوٰۃ)

اور ایضاً امداد الفتاوٰی میں ہے: سوال: بہشتی زیور حصہ سوم ص۳۹ میں ہے اگر کھیت کو سینچنا نہ پڑے فقط بارش کے پانی سے پیداوار ہوگئی یا ندی اور دریا کے کنارے پر ترائی میں کوئی چیز بوئی اور بے سینچے پیدا ہوگئی، تو ایسے کھیت میں جتنی پیداوار ہوئی ہے اس کا دسواں حصہ خیرات کرنا واجب ہے، اور اگر کھیت کو رہٹ چلا کر کے یا کسی اور طریقہ سے سینچا ہو تو پیداوار کا بیسواں حصہ خیرات کرے۔ فقط۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہری اور بارانی کھیت میں دسواں حصہ واجب ہے اور چاہی میں بیسواں۔ اور علاج القحط والوبا میں مرقوم ہے: اگر بارانی ہو تو دسواں حصہ اور اگر چاہی ہو یا نہری ہو تو بیسواں حصہ واجب ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ علاج القحط میں نہری زمین کا حکم صراحتاً بیسواں حصہ مرقوم ہے اور عربی کتابوں میں سے بھی نہری کا حکم دسواں حصہ معلوم ہوتا ہے۔ کمافی القدوری: العشر واجب سوا رسقی سیحا او سقته السماء۔ ازیں سواء اس عرضداشت کے جواب سے ممتاز فرمانا۔ (۱) سینچنے سے کیا مراد ہے (۲) گرستی کا اسباب، گرستی کے کیا معنی ہیں؟

الجواب: کچھ تعارض نہیں ہے، جس نہری میں دسواں حصہ لکھا ہے وہ وہ ہے جس میں سینچنا یعنی آبپاشی کرنا اور قیمت دینا نہ پڑے، چنانچہ بہشتی زیور کی پہلی عبارت میں اس کی تصریح ہے اور جس نہری میں بیسواں حصہ لکھا ہے مراد اس سے وہ ہے جس میں آبپاشی کرنا پڑے یا پانی کی قیمت دینا پڑے الخ (جلد ۲ ص۶۱ کتاب الزکوٰۃ۔ باب العشر)

اور بہشتی زیور کی اس عبارت "اور طریقہ اس کا یہ ہے کہ اگر کھیت کو سینچنا نہ پڑے" الخ

کا ترجمہ "جنتی کالے" میں یہ لکھا گیا ہے: "طریقہ داوہ چہ کہ دا زمکہ بارانی وہ باؤ سیلند دریاب وغیرہ نہ اوبہ کیدہ او ابورا ویستوشۂ حاجت تۂ وہ نو پہ بیدا اوارکنبے ئے لسمہ حصّہ خیرات ورکول واجب ہی الیٰ قولہ اوکۂ پتہ ارتی وویا پہ بلہ شۂ طریقہ اوبہ کیدہ نو بیا شلمہ دہ" اس ترجمہ سے معلوم ہوا کہ سینچنے کا معنیٰ ہے کہ پانی کو کسی چیز (آلہ) کے ذریعے نکال کر زمین کو دیا جائے۔

(۸) خیر الفتاویٰ میں ہے: (سوال) چترال میں گرمیوں کے موسم میں برف کا پانی ندیوں اور وادیوں میں بہتا ہے، لوگ ان سے نہریں نکالتے ہیں اور اپنی اراضی کو پانی دیتے ہیں یہ نہریں کہیں ایک فرلانگ لمبی، کہیں ایک میل کہیں زیادہ لمبی ہوتی ہیں، پھر سردیوں میں یہ نہریں خراب ہو جاتی ہیں تو لوگ بعض جگہ تقریباً بیس دن تک ان کی اصلاح کرتے رہتے ہیں پھر اس نہر میں پانی جاری کرنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ (۱½) ماہ تک دو آدمی نہر کی دیکھ بھال کرتے ہیں تاکہ کہیں ٹوٹ نہ جائے، اب اس پانی سے جو زمینیں سیراب ہوتی ہیں ان میں عُشر ہوگا یا نصف عُشر۔ درمختار وغیرہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عُشر ضروری ہے جبکہ حکومت آبیانہ وغیرہ بھی نہیں لیتی۔ (سائل: مولوی فضل مولیٰ، چترال)

الجواب: آپ کی اراضی میں عشر ہی واجب ہوگا، چند دن نہر کی کھدائی میں لگ جائیں اور پھر دو ماہ تک اس سے سیرابی ہوتی رہے تو اسے مؤنت کبیرہ قرار نہیں دیا جاسکتا، خصوصاً جبکہ آپ کے یہاں سابقہ تعامل بھی عشر ہی کا ہے وتجب فی مسقی سماء ای مطر وسیح کنھر۔ معلوم ہوا کہ نہر سے سیراب شدہ فصل پر عشر ہوگا اور اس کی عمومی صورت یہی ہوتی ہے کہ نالی کاٹ کر لائی جاتی ہے۔ (جلد ۱ ص ۴۴۵، ۴۴۶ باب العشر)

(۹) شرح التنویر میں ہے: ولو سقی سیحا وبآلة اعتبر الغالب ولو استویا فنصفه وقیل ثلاثة ارباعه۔ (ج ۲ ص ۵۵ باب العشر) یعنی جو فصل نہر سے سیراب ہونے کے ساتھ آلہ (رافعہ) کے ذریعہ بھی سیراب کی جاتی ہو تو اس صورت میں غالب کا اعتبار کیا جائے گا، یعنی زیادہ پانی سیح (کالنھر) کا دیا گیا ہو تو عشر لازم ہوگا اور اگر زیادہ پانی آلہ رافعہ سے دیا گیا ہو تو نصف عشر لازم ہوگا اور مساوات کی صورت میں نصف عشر لازم ہوگا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عشر کا تین چوتھائی لازم ہے۔

اور رائے اوّل کی تائید فقہاء کی اس تعبیر ویجب نصفه فی مسقی غرب ودالیه (یعنی جو زمین غرب و دالیہ سے سیراب ہوتی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عُشر لازم ہے) سے بھی ہو رہی ہے، کیونکہ یہ تعبیر صاف طور سے بتا رہی ہے کہ نصف عشر کے لزوم میں اُس خرچ و مؤنت کا اعتبار ہے جو پانی دینے اور زمین کو سیراب کرنے کے وقت لازم آتا ہے اور جو اس سے پہلے آیا ہو اُس کا نصف عشر میں دخل نہیں ہے، ورنہ پھر فقہاء اس تعبیر "ویجب نصفه فی مسقی غرب ودالیه" کی جگہ یہ تعبیر فرماتے "ویجب نصفه فی مسقی البیر" یعنی جو زمین کنوئیں سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں نصف عشر لازم ہے، مگر فقہاء نے پہلی تعبیر کو اختیار فرمایا ہے جس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار اُس خرچ اور مؤنت کا ہے جو پانی دینے اور زمین کے سیراب کرنے کے وقت آتا ہے اور جو خرچ و مؤنت اس سے پہلے آتا ہے وہ معتبر نہیں ہے ــــ نیز اس رائے کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے:
عن عبد اللّٰہ ابن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فیما سقت السماء والعیون او کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۷ کتاب الزکوٰۃ)
(ترجمہ) "حضرت عبد اللّٰہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ زمین جو آسمان (بارش کے پانی) یا چشمہ سے سیراب ہوتی ہو یا عاثور سے سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں دسواں حصہ لازم ہے اور وہ زمین جو کنوئیں سے کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو تو اس کی پیداوار میں بیسواں حصہ لازم ہے" ــــ اور حاشیہ مشکوٰۃ میں ہے کہ عاثور نہر جیسا ایک گڑھا ہوتا ہے جو زمین میں کھودا جاتا ہے جس سے فصل سیراب کی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل کتابوں سے رائے ثانی کا ثبوت ملتا ہے:۔

(۱) احسن الفتاوٰی میں ہے: "چہ می فرمایند علماء دین ومفتیان شرع متین کہ در دیار مایان کاریز وقنا تہا ہستند کہ از مزرعہ تا منبع آب مثلاً دوازدہ ہزار بغل فاصلہ دارد وہر سال کار وزحمت میخواہد کہ اگر کار کردہ نشود آبش خشک شود و خرچ ومصرف کارش باندازہ ای میباشد کہ نصف بلکہ دو حصہ محصول پیداوارش بکارکنان صرف میشود، دریں صورت عشر واجب شود یا نصف عُشر؟ مسئلہ مذکورہ بالا بالتحقیق وبحوالۂ کتاب وباب تحریر فرمودہ رفع اشتباہ فرمایند واجر دارین حاصل فرمایند۔"

الجواب باسم ملهم الصواب:۔ دریں صورت نصف عشر واجب است قیاساً علی الغرب

والدالیۃ۔قال فی الشامیۃ تحت قولہ روقو اعدنالاتاباہ) لان العلّۃ فی العدول عن العشرالیٰ نصفہ فی مستقی غرب ودالیہ ھی زیادۃ الکلفۃ کما علمت وھی موجودۃ فی شراء الماء۔ (رد المحتار ج ۱ ص۵۵ باب العشر) فقط واللہ تعالیٰ اعلم
(ج۲ ص۳۳۶ باب العشر)

(۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں اس سوال کے جواب میں ہے کہ نصف عشر کا کیا معنیٰ ہے؟ میں عُشر دوں یا نصف ؟ الجواب: نصف عُشر بیسواں حصہ ہے اور یہ فرق پانی کی قیمت وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی اراضی عشریہ میں اصل عشر یعنی دسواں حصہ پیداوار کا دینا واجب ہے لیکن اگر زمین کو پانی دینے میں مزدوری زیادہ صرف ہوتی اور مشقت ہوتی اور خرچ بڑھ گیا تو بجائے عُشر کے نصف عشر دینا واجب رہ جاتا ہے۔

لہٰذا احتیاط رائے اوّل میں ہے کہ عُشر لازم ہوگا کیونکہ زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور کم دینے میں عدم فراغ ذمہ کا خطرہ ہے۔

میت کے مال میں وجوبِ عُشر

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم کاشتکار لوگ ہیں، اپنی اور دوسروں کی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں، چند دن قبل میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، انتقال سے پہلے انہوں نے کچھ زمین میں گندم کاشت کی جوان کی زندگی میں ہی پختہ ہوگئی تھی، اب ہم نے اس کی کٹائی وغیرہ مکمل کی ہے۔تو کیا ان کے اس مال پر عشر لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عُشر حاصلِ اراضی کا وظیفہ ہے اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق آپ کے والد مرحوم کی کاشت کردہ اراضی کی پیداوار میں بھی عشر واجب ہے۔

لماقال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ ، لذا لو مات من علیہ العشر والطعام قائم یؤخذ منہ بخلاف الزکوٰۃ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۱۳ باب العشر)[۱]

۞ ۞

---

[۱] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : یؤخذ من الترکۃ ویجب مع الدّین وفی ارض صغیر ومجنون۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۳۲۶ باب العشر)

كتاب

الزكوٰة

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

اُن کو اُن کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملیگا اور قیامت کے دِن اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہونگے۔

سُورۃ البقرۃ : آیۃ ۲۷۷

باب صدقۃ الفطر

(صدقۃ الفطر کے احکام ومسائل کا بیان)

صدقۃ الفطر میں غناء کا نصاب

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے پاس کئی قسم کے حیوانات ہوں لیکن ان میں سے ایک صنف بھی نصاب کو نہیں پہنچتی ہو اور تجارت کے لیے بھی نہ ہوں تو کیا ایسے آدمی پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قربانی اور صدقۂ فطر کے وجوب کے لیے بنیادی طور پر غنا کی موجودگی کافی ہے اگرچہ اموال میں نمو نہ ہو ۔ اموال کا نامی ہونا زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر ایک آدمی کے پاس ضرورت سے زائد ایک جنس ہو اور اس کی قیمت مقدار نصاب کے برابر ہو تو اُس پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے جبکہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے تاہم اس میں اُس کی ضرورت کی رعایت کی جائے گی، زمیندار کو کھیتی باڑی کیلئے دو بیلوں کی ضرورت ہوتی ہے تو تیسرا بیل بلاضرورت شمار ہوگا۔

لما قال فی الھندیۃ: وبقرۃ واحدۃ غنی وبثلاثۃ ثیران اذا ساوی احدھما مائتی درھم صاحب نصاب۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۲۹۳ کتاب الاضحیۃ الباب الاول فی تفسیرھا)[1]

زکوٰۃ اور صدقۂ فطر کے وجوب کا نصاب

سوال:۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نصاب اور صدقۂ فطر کے نصاب میں کیا فرق ہے؟

الجواب:۔ دونوں کا نصاب ایک ہے یعنی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی ملکیت ہونے پر زکوٰۃ اور صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے، تاہم زکوٰۃ کے لیے حولانِ حول یا سال بھر ہونا ضروری ہے جبکہ صدقۂ فطر کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ: ولا یشترط فیہ النموای لا یشترط ان

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: وبقرۃ واحدۃ غنی بثلاثۃ ثیران اذا تساوی احدھما مائتی درھم صاحب نصاب۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۱۰ الفصل الثانی فی نصاب الاضحیۃ)

يكون النصاب بمالٍ نام لانها وجبت بالقدرة الممكنة والنمو انما يشترط فيما يكون وجوبه بالقدرة الميسرة كالزكوٰة على ما عرف فى الاصول ۔

(العناية على هامش فتح القدير ج ۲ ص ۲۱۹ باب صدقة الفطر) [1]

صدقۂ فطر کی مقدار

سوال: صدقۂ فطر کی مقدار کیا ہے، اور قیمت کی ادائیگی میں بصورتِ تفاوت کون سی قیمت معتبر ہوگی؟

الجواب: فقہ حنفی کی رُو سے نصف صاع یعنی ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ گندم صدقۂ فطر کی مقدار ہے، البتہ جَو یا کھجور سے ایک صاع یعنی دو سو اسی (۲۸۰) تولہ ادا کیا جائے گا۔ و فى الهندية: وهى نصف صاع من بر او صاع من شعير او تمر۔ (ج ۱ ص ۱۹۱ باب صدقة الفطر)

اس میں انگریزی کلو اور علاقائی سیر متفاوت ہے اس لیے تولہ کی مقدار سے علاقائی سیر کا تعین آسان ہے۔ ادائیگی میں فقیر کے مفاد کو مدِ نظر رکھا جائے، اگر قیمت میں فائدہ ہو تو مروجہ قیمت ادا کی جائے۔

قال علاؤ الدين الحصكفى رحمه الله: ويقوّم فى البلد الذى المال فيه۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۸۶ باب زكوٰة الغنم) [2]

صدقۃ الفطر میں شرعی صاع معتبر ہوگا یا مروجہ صاع؟

سوال: صدقۂ فطر میں شرعی صاع معتبر ہوگا یا مروجہ صاع؟ اور اگر لوگ مروجہ صاع کے مطابق صدقۃ الفطر ادا کریں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال حسن بن عمار بن علیؒ: مالك النصاب اعلم ان النصب ثلاثة نصاب يشترط فيه النماء وتتعلق به الزكوٰة وسائر الاحكام المتعلقة بالمال النامى ونصاب تجب به احكام اربعة حرمة الصدقة ووجوب الاضحية وصدقة الفطر ونفقة الاقارب ولا يشترط فيه النمو بالتجارة ولا حولان الحول ونصاب تثبت به حرمة السؤال وهو ما اذا كان عنده قوت يومه۔ الخ

(مراقى الفلاح ص ۳۹۴ باب صدقة الفطر)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج ۱ ص ۱۹۱ كتاب الزكوٰة الباب السابع فصل ما يوضع فى بيت المال)

[2] قال الشيخ ابن الهمامؒ: (ويقوّمها) اى المالك فى البلد الذى فيه المال۔ الخ

(فتح القدير ج ۲ ص ۱۶۷ فصل فى العروض)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج ۱ ص ۱۸۰ الفصل الثانى فى العروض۔

الجواب:۔ صدقۃ الفطر ادا کرنے میں اصل اعتبار صاعِ شرعی کو ہے تاہم اگر مروجہ صاع کی مقدار مجہول ہو تو پھر اس کا اعتبار نہیں اور اگر مروجہ صاع شرعی صاع سے زائد ہو تو پھر زیادہ ادائیگی میں کوئی حرج نہیں، البتہ جب مروجہ صاع کم ہو تو جب تک شرعی صاع کے مطابق ادائیگی نہ ہو تو ذمہ داری فارغ نہیں ہوگی ۔

لما قال فی الهندیة :۔ ثم یعتبر نصف صاع من برّ او صاع من غیرہ بالوزن فیما روی ابو یوسفؒ عن ابی حنیفۃؒ لان اختلاف العلماء فی الصاع بانه کم رطلاً وهو اجماع منهم بانه معتبر بالوزن وقبل هٰذہ العبارۃ والصاع ثمانیة ارطال بالبغدادی والرطل البغدادی عشرون استاراً ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۹۲ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الثامن فی صدقۃ الفطر) [۱]

حکومت کے جرمانہ کی ادائیگی میں صدقۂ فطر سے تعاون کرنا

سوال:۔ اگر کسی قیدی پر حکومت کے جرمانہ کی ادائیگی لازم ہو تو اس کو صدقہ فطر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صدقۂ فطر اور زکوٰۃ کا مصرف ایک ہے لہٰذا مذکورہ شخص کے ذمہ جب حکومت کا جرمانہ واجب الادا ہو تو مدیون ہونے کی وجہ سے اس کو صدقہ فطر دینا جائز ہے ۔

قال العلامة ابن نجیم رحمه الله :۔ وصدقة الفطر کالزکوٰۃ فی المصارف ۔الخ

(البحر الرائق ج۲ ص۲۵۶ باب صدقة الفطر) [۲]

اُجرت میں صدقہ فطر دینا جائز نہیں

سوال:۔ اگر ائمہ مساجد کو امامت کی اجرت میں صدقۂ فطر دیا جائے تو کیا اس سے صدقۂ فطر ادا ہوگا یا نہیں؟ اور خود امام کے لیے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

---

[۱] قال الامام برهان الدین المرغینانیؒ : ثم یعتبر نصف صاع من برّ وزناً فیما یروی عن ابی حنیفةؒ وعن محمدؒ انه یعتبر کیلاً والدقیق اولیٰ من البرّ والدراهم اولیٰ من الدقیق ۔ (الهدایة علیٰ صدر فتح القدیر ج۲ ص۲۲۹ باب صدقة الفطر)

ومثله فی البحر الرائق ج۲ ص۲۵۴ باب صدقة الفطر ۔

[۲] وفی الهندیة : ومصرف هٰذہ الصدقة ما هو مصرف الزکوٰۃ ۔ (الفتاوی الهندیہ ج۱ ص۱۹۴ باب صدقة الفطر)

ومثله فی الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۸۶ باب صدقة الفطر۔

الجواب:۔ صدقۂ فطر کی ادائیگی میں یہ ضروری ہے کہ کسی خدمت کے عوض نہ ہو، صدقاتِ واجبہ کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں تملیک بلا عوض شرط ہے۔ امامت یا اذان پر بذاتِ خود اُجرت لینے میں اگرچہ کوئی حرج نہیں لیکن صدقۂ فطر امامت کی اُجرت میں دینا ناجائز ہے، تاہم اگر دیا گیا تو اجرت کی ادائیگی تو ہو جائے گی صدقۂ فطر کا ذمہ باقی رہے گا۔ البتہ اگر ایک امام غریب ہو اور اس کے لیے امامت کی اُجرت (تنخواہ یا فیس) مقرر کی گئی ہو تو پھر اضافی تعاون کی صورت میں غریب امام کو صدقۂ فطر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وصدقة الفطر کالزکوٰة فی المصارف الا فی الدفع الی الذمی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۶۹ باب صدقة الفطر)[1]

صدقۂ فطر میں تجزی مضر نہیں

سوال:۔ کیا ایک صدقۂ فطر ایک آدمی کو دینا لازمی ہے یا متعدد فقراء پر تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ صدقۂ فطر میں تجزی اور تقسیم مضر نہیں، اس لیے ایک صدقۂ فطر متعدد فقراء پر تقسیم کرنے میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح ایک ہی شخص کو متعدد صدقاتِ فطر دیئے جا سکتے ہیں۔

قال شیخ الاسلام محمد بن عبد الله التمرتاشی الحنفیؒ: وجاز دفع کل شخص فطرته الی مسکین علی المذهب کما جاز دفع صدقة جماعة الی مسکین واحد بلا خلاف۔ (تنویر الابصار متن الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۶۷ باب صدقة الفطر)[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] قال ابن نجیم رحمه الله:۔ وصدقة الفطر کالزکوٰة فی المصارف۔ الخ
(البحر الرائق ج۲ ص۲۵۶ باب صدقة الفطر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۹۴ باب صدقة الفطر۔

[2] قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمه الله:۔ ویجوز ان یعطی ما یجب فی صدقة الفطر عن انسان واحد جماعة مساکین ویعطی ما یجب عن جماعة مسکیناً واحداً۔
(بدائع الصنائع ج۲ ص۷۵ فصل واما رکنها)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۲۳۱ باب صدقة الفطر۔

بیوی کا فطرانہ کس کے ذمّہ واجب ہے

سوال:۔ کیا بیوی کا فطرانہ شوہر کے ذمّے واجب ہے یا وہ خود ادا کرے گی، جبکہ اس کا مہر یا مال نصاب کو نہیں پہنچتا ہو؟

الجواب:۔ جب عورت مالکِ نصاب ہو تو صدقۂ فطر کی ادائیگی کی وہ خود ذمہ دار ہوگی شوہر کے ذمّے بیوی کا فطرانہ ادا کرنا لازم نہیں تاہم اگر شوہر نے بیوی کی طرف سے فطرانہ دیدیا تو ادا ہو جائے گا۔ اور اگر وہ نصاب کا مالک نہ ہو تو سرے سے اس پر فطرانہ واجب ہی نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ:۔ ولا یؤدی عن زوجته ولا عن اولادہ الکبار وان کانوا فی عیاله ولو ادی عنهم او عن زوجته اجزاهم استحساناً۔ (الہدایہ ج ۱ صـ۱۹۱ باب صدقۃ الفطر) لہ

کیا قرض معاف کر دینے سے صدقہ فطر ادا ہوگا؟

سوال:۔ ایک شخص کے ذمّے کچھ قرض ہے، اگر قرض دہندہ وہ قرض اس غریب آدمی کو صدقہ فطر کی جگہ معاف کردے تو کیا اس شخص کا صدقہ فطر ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ فطرانہ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے جس میں تملیک شرط ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چونکہ تملیک نہیں ہوئی بلکہ بغیر وصولی کے معاف کیا جاتا ہے اسلئے صدقہ فطر ادا نہیں ہوگا۔ تاہم اگر اس طرح کرنا بھی ہو تو پہلے غریب مقروض کو فطرانہ ادا کرے اور اس کے بعد اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ صـ۳۴۴ باب المصرف) ؎۲

لہ وفی الهندیة:۔ ولا یؤدی عن زوجته ولا عن اولادہ الکبار وان کانوا فی عیاله ولو ادی عنهم او عن زوجته اجزاهم استحساناً۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ صـ۱۹۳ الباب الثامن فی صدقة الفطر)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۱ صـ۱۶۳ باب صدقة الفطر۔

؎۲ وفی الهندیة:۔ فهی تملیك المال من فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لِلّٰهِ تعالیٰ هٰذا فی الشرع۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ صـ۱۷۰ کتاب الزکوٰة۔ الباب الاول فی تفسیرہ۔

صدقہ فطر اور قربانی میں احتیاط

سوال:۔ ایک شخص صاحب جائداد ہے لیکن اس کی آمدنی (قوتِ لایموت) کا جو ذریعہ ہے اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی نقد مال نہیں، تو کیا اس شخص پر صدقہ فطر یا قربانی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں مفتیٰ بہ رائے یہ ہے کہ اس شخص پر قربانی یا فطرانہ واجب نہیں البتہ احتیاط یہی ہے کہ حتی الامکان فطرانہ یا قربانی ادا کرے۔ اور اگر جائیداد کی آمدنی اسکی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہو تو اس صورت میں بالاتفاق فطرانہ اور قربانی واجب ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ سئل محمدؒ عمن لہٗ ارض یزرعھا او حانوت یستغلھا او دار غلتھا ثلاثۃ آلاف لا تکفی لنفقتہ ونفقۃ عیالہ سنۃ یحل لہ اخذ الزکوٰۃ وان کانت قیمتھا تبلغ اُلوفا وعلیہ الفتویٰ وعندھما۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۴۸ باب المصرف)[1]

رمضان کے دوران صدقہ فطر ادا کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص صدقہ فطر رمضان المبارک میں ادا کرے تو کیا اس سے اُس شخص کا ذمہ فارغ ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ صدقہ فطر کا وجوب عید الفطر کے دن طلوعِ فجر سے پہلے متحقق ہوگا لیکن اگر کوئی شخص عید سے قبل ہی فطرانہ ادا کرتا ہے چاہے وہ رمضان کے کسی بھی دن میں ادا کرے تو اس کا فطرانہ ادا ہوجائے گا، اگرچہ مستحب عید کے دن عیدگاہ میں جانے سے قبل ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ والمستحب ان یخرج الفطرۃ یوم الفطر قبل الخروج الی المصلی۔۔۔۔۔ فان قدمھا یوم الفطر جاز لانہٗ ادی بعد تقرر السبب فاشبہ التعجیل فی الزکوٰۃ۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۹۳ باب صدقۃ الفطر)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ:۔ وکذا لو کان لہ حوانیت او دار غلۃ تساوی ثلاثۃ آلاف درھم وغلتھا لاتکفی لقوتہ وقوت عیالہ یجوز صرف الزکوٰۃ الیہ فی قول محمدؒ ولو کان لہ ضیعۃ تساوی ثلاثۃ آلاف الخ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۸۹ الباب السابع فی المصارف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۰ باب المصرف۔

[2] لما فی الھندیۃ:۔ والمستحب للناس ان یخرجوا الفطرۃ بعد طلوع الفجر یوم الفطر قبل الخروج الی المصلی۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۹۲ باب الثامن فی صدقۃ الفطر)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۶۵ باب صدقۃ الفطر۔

کیا فطرانہ میں غلہ کی قیمت دینا جائز ہے

سوال:۔ آجکل لوگ فطرانہ میں گندم وغیرہ کی قیمت دیدیتے ہیں، تو کیا فطرانہ میں غلہ کی قیمت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ اور فطرانہ کا حکم ایک جیسا ہے جس طرح عشر میں پیداوار کی قیمت ادا کرنا جائز ہے اسی طرح فطرانہ میں بھی غلہ کی قیمت دینا درست ہے بلکہ بہتر ہے، بخلاف قربانی کے وہاں جانور ذبح کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ دفع القیمۃ ای الدراھم افضل من دفع العین علی المذھب المفتی بہ جوھرۃ وبحر عن الظھیریۃ وھذا فی السعۃ اما فی الشدۃ فدفع العین افضل کما لایخفی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۶۶ باب صدقۃ الفطر) لـہ

علاقائی سطح پر گندم کی قیمت میں تفاوت کی صورت میں کس قیمت کا اعتبار ہوگا

سوال:۔ اگر پنجاب میں گندم کی قیمت کم ہو اور سرحد میں زیادہ ہو تو کیا ہم پنجاب میں گندم کی قیمت کا اعتبار کر کے فطرانہ دیں تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟

الجواب:۔ اصل یہ ہے کہ فطرانہ میں گندم یا وہ چیز دی جائے جس کا اعتبار شریعت نے کیا ہے، اور اگر اس کے بدلے میں قیمت دینا چاہیں تو اپنے شہر کی قیمت کا اعتبار کرکے دی جائے، دوسرے علاقے یا شہر کی قیمت کا اعتبار کرنا درست نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ ویقوم فی البلد الذی المال فیہ ولو فی مفازۃ ففی اقرب الامصار الیہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۸۶ باب زکوٰۃ الغنم) ۲ـہ

لـہ وفی الھندیۃ: والدقیق اولیٰ من البر والدراھم اولیٰ من الدقیق لدفع الحاجۃ وما سواہ من الحبوب لایجوز الا بالقیمۃ وذکر فی الفتاوی ان اداء القیمۃ افضل من غیر منصوص علیہ وعلیہ الفتویٰ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۹۲ الباب الثامن فی صدقۃ الفطر)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۱۶۴ باب صدقۃ الفطر۔

۲ـہ وفی الھندیۃ:۔ ویقومھا المالک فی البلد الذی فیہ المال حتی لو بعث عبداً للتجارۃ الی بلد آخر فحال الحول تعتبر قیمتہ فی ذلک البلد ولو کان فی مفازۃ تعتبر قیمتہ فی اقرب الامصار الی ذلک الموضع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۰ الباب الثالث فی زکوٰۃ الذھب والفضۃ والعروض)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی دارالعلوم دیوبند ج۶ ص۳۰۸ مسائل صدقۃ الفطر۔

نصف صاع سے کم آٹا صدقہ فطر میں دینے کا حکم

سوال:۔ اگر گندم کی بجائے آٹا نصف صاع سے کم اس لیے دیا جائے کہ گندم کے صاف کرنے اور اس کی پسائی پر کچھ رقم بھی خرچ ہوتی ہے، تو کیا اس طرح فطرانہ ادا ہو جائے گا؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کی صریح عبارات نے گندم اور آٹے کو برابر شمار کیا ہے کہ فطرانہ میں نصف صاع گندم یا آٹا یا ستو دینا واجب ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں فطرانہ پوری طرح ادا نہیں ہوا، نصف سے جتنا کم آٹا دیا ہوا ہے اُتنا آٹا اور دینا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ نصف صاع من بر او دقیقہ او سویقہ او زبیب

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۶۴ باب صدقۃ الفطر)[۱]

غیر منصوص اشیاء میں فطرانہ کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں چاول کی فصل زیادہ ہوتی ہے، اگر ہم صدقہ فطر میں چاول دینا چاہیں تو کس مقدار سے ادا کریں، نصف صاع کے اعتبار سے یا پورے صاع کے اعتبار سے؟

الجواب:۔ فقہاء احناف نے غیر منصوص اشیاء سے فطرانہ ادا کرنے کے بارے میں تصریح کی ہے کہ اگر کوئی غیر منصوص اشیاء سے فطرانہ ادا کرنا چاہتا ہو تو منصوص اشیاء کی قیمت کا اعتبار کر کے اُس قیمت کے برابر جتنا چاول یا دیگر غیر منصوص اشیاء بنتے ہوں دیئے جائیں تو اس طرح فطرانہ ادا ہو جائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ نصف صاع فاعل یجب من بر او دقیقہ او سویقہ او زبیب ..... او صاع تمر او شعیر ولو ردیئًا وما لم ینص علیہ کذرۃ وخبز یعتبر فیہ القیمۃ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۶۴ باب صدقۃ الفطر)[۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ:۔ وھی نصف من بر او صاع من شعیر او تمر ودقیق الحنطۃ والشعیر وسویقھما مثلھما والخبز لایجوز الا باعتبار القیمۃ وھو الاصح۔ الخ (الفتاویٰ الہندیہ ج ۱ ص۱۹۱ الباب الثامن فی صدقۃ الفطر)

وَمِثلُہٗ فی الھدایۃ ج ۱ ص۱۹۲ باب صدقۃ الفطر۔

[۲] وفی الھندیۃ:۔ ثم الدقیق اولیٰ من البر والدراھم اولیٰ من الدقیق لدفع الحاجۃ وماسواہ من الحبوب لایجوز الا بالقیمۃ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۱۹۲ الباب الثامن فی صدقۃ الفطر)

وَمِثلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۶۵ باب صدقۃ الفطر۔

میوہ جات میں گندم کی قیمت کا اعتبار ہوگا | **سوال**:۔ اگر کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں گندم وغیرہ منصوص اشیاء کی پیداوار نہ ہو بلکہ وہاں دیگر میوہ جات کے باغات ہوں تو وہاں کے رہنے والے فطرانہ میں گندم کی قیمت کا اعتبار اپنے علاقہ کی قیمت کے مطابق کریں یا جہاں گندم پیدا ہوتی ہو وہاں کی قیمت کا اعتبار کریں؟

الجواب:۔ جہاں گندم وغیرہ منصوص اشیاء پیدا نہ ہوتی ہوں تو فطرانہ میں اپنے علاقہ کی پیداوار کو گندم وغیرہ کی قیمت کے برابر ادا کیا جائے جبکہ گندم کی قیمت کا اعتبار اپنے علاقے یا شہر کا ہوگا، جہاں گندم پیدا ہوتی ہو وہاں کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ نصف صاع یجب من بر او دقیقه او سویقه او زبیب او صاع تمر او شعیر ولو ردیًا ولم ینص علیه کذرۃ وخبز یعتبر فیه القیمۃ ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۶۴ باب صدقۃ الفطر)

وقال ایضاً، ویقوم فی البلد الذی المال فیه ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد ۲ ص۲۸۶ باب زکوٰۃ الغنم)[1]

کم سنی میں بچی کے نکاح کی وجہ سے اس کے صدقۂ فطر کا حکم | **سوال**:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ بہت کم سنی میں ماں باپ بچی کا نکاح کر دیتے ہیں، تو شرعاً ایسی بچی کا صدقۂ فطر ماں باپ پر واجب ہے یا سسرال والوں پر؟

الجواب:۔ جس لڑکی کا نکاح کم سنی میں ہوا ہو تو اس کے صدقۂ فطر کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ خود صاحبِ مال ہو تو صدقۂ فطر اُسی کے مال سے دیا جائے گا اور صاحبِ مال نہ ہو تو اگر رخصتی نہ ہوئی ہو تو باپ کے ذمے ورنہ کسی پر بھی واجب نہیں۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ: زوج ابنته الصغیرۃ من رجل وسلمها الیه ثم جاء یوم الفطر لا یجب علی الاب

---

[1] وفی الهندیۃ: ثم الدقیق اولیٰ من البر والدراهم اولیٰ من الدقیق لدفع الحاجۃ وماسواہ من الحبوب لا یجوز الا بالقیمۃ ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۱۹۲ الباب الثامن فی صدقۃ الفطر)
ومثلهٗ فی الجوهرۃ النیرۃ ج ۱ ص۱۶۵ باب صدقۃ الفطر۔

صدقة الفطر۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج ۲ ص ۴۲۶ الفصل الثالث عشر فی صدقة الفطر) [۱]

حقیقی بھائی کو صدقۂ فطر دینا جائز ہے

سوال:۔ کیا اپنے حقیقی بھائی کو صدقۂ فطر اور نماز وروزے کا فدیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بہن بھائی چونکہ اصول وفروع میں داخل نہیں ہیں اس لئے ان کو جملہ صدقات دینا جائز ہیں چاہے زکوٰۃ ہو یا صدقۂ فطر وغیرہ، اسی طرح نماز روزے کا فدیہ دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندیة: والافضل فی الزکوٰة والفطر والنذر والصرف اولاً الی الاخوة والاخوات ثم الی اولادهم ثم الی الاعمام والعمات الخ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۱۹۰ باب المصارف) [۲]

صدقۂ فطر دوسرے شہر کو منتقل کرنا کیسا ہے؟

سوال:۔ زکوٰۃ تو ایک شہر سے دوسرے شہر کو منتقل کرنا مکروہ ہے تو کیا صدقۂ فطر کا بھی یہی حکم ہے؟

الجواب:۔ جس طرح زکوٰۃ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنا مکروہ ہے اسی طرح صدقۂ فطر کا انتقال بھی کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر ایک شہر کے لوگ زیادہ حاجتمند نہ ہوں تو پھر اس کے انتقال میں کوئی کراہت نہیں۔

وفی الهندیة: ویکره نقل الزکوٰة من بلد الی بلد الا ان ینقلها الانسان الی قرابته او الی قوم هم احوج الیها من اهل بلده۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۱۹۰ باب المصارف) [۳]

---

[۱] لما فی الهندیة: زوج ابنته الصغیرة من رجل وسلمها الیه ثم جاء یوم الفطر لاتجب علی الاب صدقة الفطر۔ (الفتاویٰ الهندیه ج ۱ ص ۱۹۲ باب صدقة الفطر)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۸۰ باب صدقة الفطر۔

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: قید باصله وفرعه لان من سواهم من القرابة یجوز الدفع لهم وهو اولیٰ لما فیه من الصلة مع الصدقة کالاخوة والاخوات والاعمام والعمات والاخوال والخالات الفقراء۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴۲ باب المصارف)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۸۰ باب صدقة الفطر۔

[۳] قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: وکره نقلها الی بلد آخر لغیر قریب واحوج۔ (کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵۰ باب المصارف)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۷۶ باب صدقة الفطر۔

نابالغ بچے کا فطرانہ اس کے والد پر واجب

سوال:۔ اگر ایک نابالغ بچہ نصاب کا مالک ہو یا نہ ہو مگر باپ نے اس کا صدقۂ فطر ادا نہ کیا ہو تو کیا یہ بچہ بلوغ کے بعد اپنا صدقۂ فطر ادا کرے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ صدقۂ فطر ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر واجب ہے چاہے بالغ ہو یا نابالغ، اور اگر نابالغ بچے کا باپ مالدار ہو تو اُس پر اپنے نابالغ بچے کا فطرانہ دینا واجب ہے۔ اب اگر بچہ خود مالدار ہو مگر اس کے سرپرست نے فطرانہ اُس کی طرف سے ادا نہ کیا تو بعد البلوغ بچے پر اپنا فطرانہ ادا کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: علیٰ کل حرّ مسلم ولو صغیرًا ومجنونًا حتّٰی لو لم یخرجھما ولیھما وجب الاداء بعد البلوغ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش الطحطاوی ج ۱ ص۴۳۳ باب صدقۃ الفطر) [۱]

قیدیوں کو صدقۂ فطر دینا جائز ہے

سوال:۔ اگر جیل میں قیدیوں کو صدقۂ فطر دیا جائے تو کیا اس سے صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ صدقۂ فطر کے لیے بھی زکوٰۃ کی طرح فقیر وغریب شخص کو تملیک کرانا لازمی ہے لہٰذا اگر جیل میں قیدی غریب اور فقیر ہوں تو ان کو صدقۂ فطر دینا جائز ہے۔

لما قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ من المملک من کل وجہ۔

(کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ) [۲]

---

[۱] لما قال الشیخ اشرف علی شاہ التھانوی رحمۃ اللہ:۔ ہاں اس صبی کو بعد بلوغ صدقۂ فطر ادا کرنا ہوگا، اور اگر صبی مالکِ نصاب نہ ہو گو باپ صاحبِ نصاب تھا اور اُس نے ادا نہ کیا تو صبی پر بعد البلوغ واجب ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۸۷ باب صدقۃ الفطر)

[۲] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: ھی تملیک خرج الاباحۃ فلو اطعم یتیمًا ناویا الزکوٰۃ لا یجزیہ ..... جزء مال .... عینہ الشارع وھو ربع عشر نصاب حولی..... من مسلم فقیر ولو معتوھا غیر ھاشمی ولا مولاہ مع قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ فلا یدفع لاصلہ وفرعہ للہ تعالیٰ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۲۵۶ تا ۲۵۸ کتاب الزکوٰۃ)

پچاس روپے کے نصاب پر قربانی فطرانہ کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۴۳۱ میں لکھا ہے کہ جس کے پاس پچاس روپیہ نقد ہو اس پر قربانی اور صدقۃ الفطر واجب ہے، کیا یہ نصاب صحیح ہے؟

الجواب: فتاویٰ رشیدیہ میں پچاس روپے کے نصاب سے مراد اس زمانے کے سونے کے روپے ہیں جن کی قیمت نصاب کے برابر تھی۔ آجکل کاغذی نوٹوں کا یہ نصاب نہیں ہے بلکہ چاندی یا سونے کے نصاب کے حساب سے جو پیسے بنتے ہوں اتنے ہی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ موجودہ دور کے کاغذی نوٹ عروض تجارت کے حکم میں ہیں۔

وفی الهندية: الزكوٰة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصاباً من الورق والذهب كذا فی الهداية۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص ۱۲۹ الفصل الثانی فی العروض) لہ

زکوٰۃ اور صدقہ فطر کے نصاب میں مال نامی اور غیر نامی کا فرق

سوال:- ایک شخص نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جس آدمی پر زکوٰۃ واجب نہ ہو اس پر صدقہ فطر بھی واجب نہیں، تو کیا یہ بات صحیح ہے یا دونوں کے نصاب میں کچھ فرق ہے؟

الجواب:- زکوٰۃ، صدقہ اور قربانی کا نصاب اگرچہ ایک ہی ہے یعنی جس شخص کے پاس ۵۲½ تولہ چاندی یا ۷½ تولہ سونا یا دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر موجودہ کرنسی یا دوسرا سامان جو حوائجِ اصلیہ اور قرض سے زائد موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ، صدقہ فطر اور قربانی تینوں واجب ہیں، البتہ زکوٰۃ کے نصاب کے ساتھ نمو اور سال کا گذرنا ضروری ہے جبکہ صدقہ فطر اور قربانی کے نصاب کے ساتھ یہ دونوں شرطیں ضروری نہیں، لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ جس کے ذمے زکوٰۃ دینا لازم نہ ہو وہ صدقہ فطر بھی

لہ قال العلامة ابن نجيمؒ: وفی عروض تجارة بلغت نصاب ورق اوذهب معطوف علىٰ قوله اول الباب فی مائتی درهم۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲۵ باب زكوٰة المال)

ومثلهٗ فی الدر المختار ج ۲ ص ۳۳ باب زكوٰة المال۔

ادا نہ کرے بلکہ نفس نصاب ہونے کی صورت میں صدقہ فطر واجب ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی.... تام.... فارغ عن دین له مطالب الخ. (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص کتاب الزکوٰة)

وقال الحصکفیؒ: علی کل حر مسلم..... ذی نصاب فاضل عن حاجته الاصلیة کدینه وحوائج عیاله وان لم ینم کما مر.... وانما لم یشترط النمو لان وجوبها بقدرة ممکنة - (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۷۴–۷۳ کتاب الزکوٰة، باب صدقة الفطر)[1]

سوال:۔ کیا صدقۂ فطر کے وصول کے لیے عامل مقرر کرنا ضروری ہے

سوال:۔ کیا زکوٰۃ کی طرح صدقۃ الفطر کے وصول کے لیے بھی حاکم وقت عامل مقرر کرکے وصول کرے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے اگرچہ حاکم وقت کو اختیار ہے کہ وہ عامل مقرر کرکے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے مگر صدقۃ الفطر کا حکم اس سے الگ ہے اس کی وصولی کے لیے حکومت وقت عامل مقرر نہیں کر سکتی۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ:۔ ولا یبعث الامام علی صدقة الفطر ساعیًا لان النبی صلی الله علیه وسلم لم یبعث .... الخ (البدائع والصنائع ج ۲ ص ۵۷ فصل صدقة الفطر فی آخر الزکوٰة)[2]

سوال:۔ صدقہ فطر میں اسی ملک کی کرنسی کا اعتبار ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک آدمی انگلینڈ میں رہتا ہے اور وہ صدقۂ فطر پاکستان میں ادا کرنا چاہتا ہے، تو کیا وہ اس رقم کو پونڈ کی شکل میں یا پاکستانی کرنسی کی شکل میں ادا کرے گا؟ شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ آدمی جہاں بھی ہو صدقۂ فطر وہاں کی کرنسی کے حساب سے ادا کیا جائے گا۔

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: ولا یشترط فیه النمو ویتعلق بهذا النصاب حرمان الصدقة ووجوب الاضحیة والفطر۔
(الهدایة ج ۱ ص ۱۹۰ باب صدقة الفطر)
ومثله فی الهندیة ج ۱ ص ۱۹۱ الباب الثامن فی صدقة الفطر۔

[2] لما قال ابن نجیمؒ: ولا یبعث الامام علی صدقة الفطر ساعیًا لان النبی صلی الله علیه وسلم لم یبعث ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵۶ باب صدقة الفطر)

اگر کوئی شخص انگلینڈ میں رہتا ہے تو وہ پاؤنڈ کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کرے گا اور اگر پاکستان میں رہتا ہو تو پاکستانی روپیہ کے حساب سے ادا کرے گا۔

بھائی کی طرف سے ادا کردہ صدقۂ فطر کی رقم لینے کا حکم

سوال:۔ میرا بھائی سعودی عرب میں ہے اور اس کے بیوی بچے پاکستان میں ہیں، عید الفطر پر اسکے پیسے لیٹ ہو گئے تو میں نے اپنی جیب سے اسکے بال بچوں کا صدقۂ فطر ادا کر دیا، اب اسکے پیسے پہنچ گئے ہیں اور اس نے صدقۂ فطر ادا کرنے کا کہا بھی ہے، تو کیا میں اُن پیسوں سے اپنے وہ پیسے لے سکتا ہوں یا نہیں جو میں نے بھائی کی طرف سے صدقہ کیے تھے؟

الجواب:۔ چونکہ صدقہ فطر آپ کے بھائی پر واجب تھا جو آپ نے اسکی طرف سے ادا کیا تو یہ پیسے اسکے ذمہ قرض ہو گئے، اب چونکہ اُسکے پیسے پہنچ گئے ہیں اس لیے آپ اُن پیسوں سے اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔

لما قال المفتی عبد الرحیمؒ، (الجواب) صدقہ کی رقم موصول ہونے سے پہلے اپنی رقم میں سے بھائی صدقہ کر دے اور آنے والی رقم خود رکھ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ (فتاوی رحیمیۃ ج۸ ص۲۲۵ احکام صدقہ فطر)

زمیندار کیلئے صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک شخص کی بہت زیادہ زمین ہے لیکن اس کے پاس کوئی نقدی وغیرہ نہیں اور نہ ہی اس زمین سے کوئی خاص آمدنی حاصل ہوتی ہے، تو کیا اس شخص پر صدقۂ ادا کرنا لازمی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ زمین اس کے اہل وعیال کے جملہ نان ونفقہ اور دیگر اخراجات سے زائد ہو اور اس کی قیمت نصاب تک پہنچتی ہو تو اس شخص پر صدقہ فطر ادا کرنا لازمی ہے اور اگر زمین کی جملہ آمدنی سے بمشکل اس کی گذر بسر ہوتی ہو اور اس کے پاس کوئی نقدی وغیرہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے ذمہ صدقۃ الفطر لازم نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: تجب علی کل مسلم ولو صغیرًا مجنونًا ...... ذی نصاب فاضل عن حاجتہ الاصلیۃ کدینہ وحوائج عیالہ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۵۸ تا ۳۶۰ باب صدقۃ الفطر)

باب مصارف الزکوٰۃ

(زکوٰۃ کے مصارف کے بیان میں)

مال دار کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص کی جائیداد غیر منقولہ کی قیمت لگا کر حساب لگایا جائے تو قیمت کے اعتبار سے یہ شخص غنی شمار ہو سکتا ہے لیکن اس جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدنی اتنی نہیں کہ جس سے اس کی گزر اوقات ہو، کیا ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں غیر منقولہ جائیداد کی قیمت کو اعتبار نہیں بلکہ غنا میں بنیادی طور پر اس کے گزر اوقات کو دیکھا جاتا ہے، اس لیے جب کسی شخص کی جائیداد کی قیمت تو زیادہ ہو لیکن آمدنی کے اعتبار سے اس کے معاش کیلئے یہ ناکافی ہو اور نہ اس کے پاس نقد رقم ہی ہو تو ایسا شخص مصرفِ زکوٰۃ ہے اور اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

لما قال فی الھندیة: وکذا لوکان عندہ من المصاحف وھو محتاج إلیہ و إن کان ...... وکذا لوکان لہٗ حوانیت او دار غلة تساوی ثلٰثة آلاف درھم وغلتھا لاتکفی لقوتہ وقوت عیالہ یجوز صرف الزکوٰة إلیہ فی قول محمدؒ ولوکان لہٗ ضیعة تساوی ثلٰثة آلاف ولا تخرج ما یکفی لہٗ ولعیالہ إختلفوا فیہ قال محمد بن مقاتل یجوز لہ أخذ الزکوٰة۔

(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔ الباب السابع فی المصارف)[1]

صاحب جائیداد کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ ایک آدمی کے پاس تقریباً ۲۵ کنال زمین ہے اور اس کی قیمت نصاب زکوٰۃ یعنی ۵۲ ۱/۲ تولہ چاندی سے زیادہ ہے، اور اس کے پاس رہنے کے لیے اپنا مکان بھی ہے، تو کیا یہ شخص دوسروں سے

---

[1] قال طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولوکان لہ ضیعة تساوی ثلٰثة آلاف درھم ولا یخرج منھا ما یکفی لہ ولعیالہ إختلفوا فیہ قال محمد بن مقاتل یجوز لہ أخذ الزکوٰة۔

(خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۴۲۔ الفصل الثامن فی اداء الزکوٰة)

ومثلہٗ فی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۴ ص۸۵ الباب الثانی فی المصرف)

زکوٰۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں زمین کی قیمت کا اعتبار نہیں اور نہ قیمت سببِ غنا ہے بلکہ زمین کی آمدنی اگر جملہ اخراجات کے لیے کافی ہو تو یہ شخص صاحبِ جائیداد ہے اور اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں اور اگر زمین کی آمدنی ضرورت کے لیے کافی نہ ہو تو پھر اس شخص کے لیے زکوٰۃ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

ولو کان له ضیعة قیمتها آلاف ولا یحصل منه ما یکفی لهٗ ولعیاله اختلف فیه قال ابن مقاتل یجوز صرف الزکوٰة الیه۔ (بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۴ ص۸۵ الثانی فی المصرف) [1]

گائے یا بیل کے مالک کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے پاس ایک گائے ہو اور اس کی قیمت مقدارِ نصاب کو پہنچتی ہو تو اس شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی صرف ایک گائے کا مالک ہونے سے وہ آدمی غنی شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ غنا کے لیے حوائجِ اصلیہ سے ۵۲½ تولہ چاندی کی مروجہ قیمت کے مالیت کا مالک بننا ضروری ہے، اگر کسی شخص کی ضروریات سے زائد ایک گائے یا بیل ہو اور اس کی قیمت ۵۲½ تولہ چاندی تک پہنچتی ہو تو اس سے یہ شخص غنی متصور ہوگا اور اس کیلئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔

قال فی الهندیة: وببقرة واحدة غنی وبثلاثة ثیران إذا ساوی أحدها مائتی درهم صاحبِ نصاب۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاضحیة۔ الباب الأول فی تفسیرها۔ الخ) [2]

---

[1] قال طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: وکذا لو کان له ضیعة تساوی ثلاثة آلاف درهم ولا یخرج منها ما یکفی له ولعیاله إختلفوا فیه قال محمد بن مقاتل یجوز لهٗ أخذ الزکوٰة۔
(خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۴۲ الفصل الثامن فی أداء الزکوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۸۹ الباب الثالث فی زکوٰة الذهب والفضة والعروض۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاریؒ: وببقرة واحدة غنی وبثلاثة ثیرانٍ غنی إذا تساوی أحدها مائتی درهم صاحبِ نصابٍ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۱۰ الفصل الثانی فی نصاب الاضحیة)

غنی آدمی کا زکوٰۃ قبض کر کے پھر فقیروں کو دینے کا حکم

سوال:۔ ایک صاحب نصاب آدمی زکوٰۃ کی رقم اپنے قبضے میں لے کر خود تو استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ فقیروں اور مستحقین کو دیدیتا ہے تو اس شخص کے لیے زکوٰۃ کے مال کا اپنے قبضہ میں لینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ شخص کے لیے دوسروں سے زکوٰۃ لینا جائز نہیں کیونکہ یہ غنی ہے اور غنی آدمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور اس صورت میں یہ آدمی نہ اصیل ہے اور نہ وکیل، اور مالِ زکوٰۃ کو اپنے قبضہ میں لے کر دوسروں کو بطور صدقہ دیتا ہے لہٰذا اس طریقے سے مالِ زکوٰۃ اپنے قبضہ میں لے کر محتاجوں اور فقیروں کو دینا مناسب نہیں، تاہم توکیلاً قبضہ کر کے فقیروں میں تقسیم کرنا مرخص ہے۔

لما فی الهندیة: وکذا لوکان عنده من المصاحف وهو یحتاج إلیه وإن کان لا یحتاج الیه وهو یساوی مائتی درهم لا یجوز صرف الزکوٰة إلیه ولا یجوز له أخذها۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔ الباب السابع فی المصارف)[1]

اصول و فروع زکوٰۃ کا مصرف نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کے والدین علیحدہ علیحدہ رہتے ہوں، آمدو خرچ کا نظام ایک دوسرے سے الگ ہو، کیا ایسی صورت میں کسی ایک کے غریب ہونے کی صورت میں اس کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اصول وفروع اور میاں بیوی کا رشتہ ایسا قوی رشتہ ہے جو املاک کے الگ ہونے کے باوجود بھی الگ نہیں ہوتا، اس لیے علیحدہ علیحدہ کاروبار کے ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمه الله:۔ ولا یدفع المزکی زکوٰة ماله إلی ابیه وجده وإن علا ولا إلی ولده وولد ولده وإن

---

[1] قال الامام برهان الدین المرغینانی: ولا تدفع الی غنی لقوله علیه السلام ولا تحل الصدقة لغنی۔ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۲۰۸ باب ما یجوز دفع الزکوٰة ومالا یجوز) ومثله فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ کتاب الزکوٰة باب المصرف۔

سفل ۔الخ (الھدایۃ ج ۱ ص۲۰۶ باب المصارف) [1]

رشتہ دار کو زکوٰۃ دینے میں صلہ رحمی کی رعایت ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کے رشتہ دار محتاج ہونے کے باوجود دیندار نہ ہوں تو کیا کسی اجنبی فقیر (جو دیندار ہو) کو زکوٰۃ دینی چاہیئے یا اس قریبی رشتہ دار کو؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ میں ملنے والی رقم بے دینی کے کاموں میں خرچ کرتا ہو تو ایسے شخص کو خواہ وہ رشتہ دار ہو یا اجنبی ہو زکوٰۃ دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے، البتہ اگر بے دینی کے کاموں میں خرچ نہ کرتا ہو ذاتی ضروریات میں صرف کرتا ہو تو پھر رشتہ دار کی رعایت اولیٰ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے علاوہ اس میں صلہ رحمی کی رعایت بھی ہے۔ البتہ اگر کسی اجنبی کو زکوٰۃ دی گئی ہو تو ذمہ فارغ متصوّر ہوگا۔

قال ابن عابدینؒ: وقید بالولاد لجوازہ لبقیۃ الاقارب کالاخوۃ والاعمام والاخوال الفُقراء بل ھم اولیٰ لانہ صلۃ وصدقۃ وفی الظھیریۃ ویبدأ فی الصدقات بالاقارب ثمّ الموالی ثمّ الجیران۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۳۴۶ باب المصرف) [2]

بہن بھائی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے

سوال:۔ اگر بہن بھائی غریب ہوں تو کیا ایک شخص اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے نادار بہن و بھائی کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میاں بیوی اور اصول وفروع کے علاوہ باقی تمام رشتہ داروں کو

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ ولا الیٰ من بینھما ولاد.....ای اصلہ وان علا کابویہ واجدادہٖ وجدّاتہ من قبلھما وفرعہ وان سفل۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۳۴۳ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۴۳ باب المصرف۔

[2] قال زین الدین ابن نجیمؒ: وقید باصلہ وفرعہ لان من سواھم من القرابۃ یجوز الدفع لھم وھو اولیٰ لما فیہ من الصلۃ مع الصدقۃ کالاخوۃ والاخوات والاعمام والعمّات والاخوال والخالات الفقراء ولھذا قال فی الفتاوی الظھیریۃ ویبدأ فی الصدقات بالاقرب ثمّ الموالی ثمّ الجیران۔ الخ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۴۳ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۹۰ باب المصرف۔

زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے بشرطیکہ وہ صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ اور بہن و بھائی اس زمرہ میں آکر ان کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: وقیّد بالولاد لجوازہ لبقیۃ الاقارب کالاخوۃ والاعمام والاخوال الفقراء بل ھم اولیٰ لانہٗ صلۃ وصدقۃ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۴۶ باب المصرف) [1]

کسی غریب کو ہبہ یا قرض کے نام سے زکوٰۃ دینا

سوال:۔ بعض لوگ زکوٰۃ نہیں لیتے حالانکہ وہ کافی غریب ہوتے ہیں تو اگر اُن کو ہبہ یا قرض کے نام پر زکوٰۃ دی جائے اور اس میں نیّت زکوٰۃ کی ہو تو کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ دو اوقات میں کسی ایک وقت کے اندر زکوٰۃ کی نیّت ضروری ہے، ایک[1] زکوٰۃ کی رقم کو الگ کرتے وقت اور دُوسرے[2] زکوٰۃ دیتے وقت۔ ان اوقات میں جس وقت بھی زکوٰۃ کی نیّت کرے اور کسی غریب و مستحق کو جس طرح بھی دے دی جائے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب کسی مستحق کو ہبہ یا قرض کے نام پر زکوٰۃ دے دی گئی اور نیت زکوٰۃ کی ہو تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ اگر یہ غریب اُس رقم کو واپس کر دے تو اُس سے لے کر کسی دُوسرے مستحق کو دیدی جائے۔

لما فی الھندیۃ:۔ ومن اعطی مسکیناً دراھم سمّٰھا ھبۃ او قرضاً ونوی الزکوٰۃ فانھا تجزیہ وھو الاصح۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاوّل) [2]

جس شخص کی آمدنی میں بچت نہ ہو تو وہ زکوٰۃ کا حقدار ہے

سوال:۔ ایک شخص کی آمدنی تو معقول ہے لیکن گھریلو اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ بمشکل اس کا گذارہ ہوتا ہے بلکہ عموماً یہ شخص

---

[1] قال زین الدین ابن نجیمؒ: وقیّد باصلہٖ وفرعہٖ لان من سواھم من القرابۃ یجوز الدفع لھم وھو اولیٰ لما فیہ من الصّلۃ مع الصدقۃ کالاخوۃ والاخوات والاعمام والعمات والاخوال والخالات الفقراء۔ الخ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۹۰ باب المصرف۔

[2] لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ:۔ من اعطی مسکیناً دراھم وسمّاھا ھبۃ او قرضاً ونوی الزکوٰۃ فانھا تجزیہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۱۲ کتاب الزکوٰۃ)

سال بھر مقروض رہتا ہے، کیا ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ گھریلو اخراجات کو اس وقت اعتبار دیا جاتا ہے جب شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسان کی ضرورت کا تکفل ہو، غیر شرعی اور تبذیر و اسراف کے اخراجات کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص کے گھریلو اخراجات اس کی آمدنی سے بمشکل پورے ہوتے ہوں، نصاب کی مقدار سے بچت ہو کر اس کی ضروریات سے زائد رقم اس کے پاس نہ ہو تو یہ شخص زکوٰۃ کا مصرف (حقدار) ہے اور اس کو زکوٰۃ دینا از روئے شرع جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وذکر فی الفتاوی فیمن لہ حوانیت ودور للغلۃ لکن غلتہا لاتکفیہ وعیالہ انہ فقیر ویحل لہ اخذ الصدقۃ عند محمد۔ (رحمہ اللہ)

(ردّ المحتار ج ۲ ص ۳۴۸ باب المصرف قبیل مطلب فی جہاز المرأۃ) [1]

صاحبِ نصاب شخص کے بچوں کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ کسی مالدار شخص کے بچوں کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بچوں کی کفالت اور خرچ وغیرہ باپ کے ذمہ ہو؟

الجواب:۔ بلوغ کے بعد اولاد اور والدین میں ملکیت کے اعتبار سے اجنبیت محسوس ہونے کی وجہ سے کوئی ملکیتی اتحاد نہیں رہتا اس لیے باپ کی مالداری سے بچے کی حالت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے مالدار آدمی کے غریب بالغ بچے کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ لیکن قبل البلوغ بچے کی تمام ضروریات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ غنا میں والد کے تابع رہ کر والد کے غنی ہونے کے وقت اس کے نابالغ بچوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا الیٰ ولد غنی اذا کان صغیرا لانہ یعدّ غنیا بمال ابیہ بخلاف ما اذا کان کبیرًا فقیرًا لانہ لایعدّ غنیًا بیسار ابیہ وان کانت نفقتہ علیہ۔ (الہدایۃ ج ۱ ص ۱۸۸ باب المصرف) [2]

---

[1] قال العلامۃ فخر الدین قاضیخانؒ: وکذا لو کان لہ حوانیت او دار غلۃ تساوی ثلثۃ آلاف درہم وغلتہا لا تکفی لقوتہ وقوت عیالہ یجوز صرف الزکوٰۃ فی قول محمدؒ (فتاوی قاضیخان ج ۱ ص ۱۲۷ فصل فیمن یوضع فیہ الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۱۸۹ باب المصرف۔

[2] قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا الیٰ طفلہ بخلاف ولدہ الکبیر وابیہ قال ابن عابدینؒ: وقولہ (ولا الیٰ طفلہ) ای الغنی فیصرف الیٰ البالغ ولو ذکرًا صحیحًا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۴۹، ۳۵۰ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۱ ص ۱۸۹ باب المصرف۔

مہاجرین کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ کیا مہاجرین کو محض ہجرت کی وجہ سے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ کیا اگر کسی مہاجر کے پاس اپنے ملک میں نصاب کی مقدار کے برابر مال ہو لیکن ہجرت کرنے کے بعد غربت کی زندگی گزار رہا ہو تو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ میں بنیادی چیز فقراء کی مشکلات کو آسان کرنا ہوتا ہے، محض اس وجہ سے کہ فلاں مہاجر ہے اس کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا یجوز دفع الزکوٰۃ الیٰ من یملک نصاباً من ای مال کان۔ (الہدایہ باب المصرف ص۱۸۹) [۱]

البتہ جو شخص اپنے ملک میں صاحبِ نصاب تھا لیکن ہجرت کرکے کسی اور جگہ جانے کے بعد جب یہ شخص صاحبِ نصاب نہ رہے تو اپنے ملک میں مالدار ہونے کی وجہ سے ہجرت کی جگہ صاحبِ نصاب نہیں بن سکتا ہے، لہٰذا ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ لقولہٖ تعالیٰ: لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ۔ (الآیۃ)

کسی غیر مسلم کو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ دینے کا حکم

سوال:۔ کسی غیر مسلم کو اس کی غربت کی وجہ سے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی صحتِ ادائیگی کے لیے مصرف کا مسلمان ہونا شرط ہے، اس لیے زکوٰۃ اور دیگر صدقاتِ واجبہ کسی غیر مسلم کو نہیں دیئے جا سکتے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا یجوز ان یدفع الزکوٰۃ الیٰ ذمی لقولہ علیہ السلام لمعاذؓ خذھا من اغنیائھم وردھا فی فقرائھم ویدفع الیہ ما سوٰی ذالک من الصدقۃ (الہدایہ ج۱ ص۲۰۵ باب من یجوز دفع الصدقات الیہ ومن لا یجوز) [۲]

---

[۱] قال الحصکفیؒ: ولا الیٰ غنی یملک قدر نصاب فارغ عن حاجتہ من ای مال کان۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۷ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف۔

[۲] قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: (و) لا تدفع الیٰ (ذمی) لحدیث معاذؓ (وجاز) دفع (غیرھا وغیر العشر والخراج (الیہ) ای الذمی ولو واجباً کنذر وکفارۃ وفطرۃ خلافاً للثانی۔ الخ

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۵۱ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۸ باب المصرف۔

نابالغ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ نابالغ کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے مصرف میں یہ ضروری نہیں کہ جس کو زکوٰۃ دی جائے وہ بالغ ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ قبض کرنے والا عاقل ہو، رقم لینے اور اس کو خرچ کرنے کے بارے میں فہم رکھتا ہو۔ مراہق بچہ عموماً اس درجہ کا عقل ضرور رکھتا ہے، اس لیے مراہق عاقل بچے یا بچی کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم ایسا نابالغ بچہ غربت و مالداری میں والد تابع ہوتا ہے، اس لیے اگر اس کا والد صاحبِ نصاب ہو تو پھر اس کے نابالغ بچے کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ودفع الزکوٰۃ الیٰ صبیان آقاربه برسم عید او الیٰ مبشر او مهدی الباکورة جاز۔ وقال ابن عابدینؒ فی تشریح۔ قوله (الیٰ صبیان آقاربه) ای العقلاء والا فلا یصح الا بدفع الیٰ ولی الصغیر۔ (الدرالمختار والیٰ صدرہ ردالمحتار ج۲ ص۳۵۶ باب المصرف)[۱]

علمِ دین کا طالب زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہے

سوال:۔ دینی مدارس کے طلباء کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان میں اکثر طلباء محتاج ہوتے ہیں اور اہلِ خیر کی توجہات کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں؟

الجواب:۔ دینی مدارس کے طلباء شب و روز علمِ دین کے حصول میں مصروف رہتے ہیں اور دنیوی کاموں کی طرف بہت کم توجہ دے پاتے ہیں، اس لیے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کے یہ لوگ زیادہ مستحق ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی نسبت ان کو زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے، تاہم کسی مالدار طالب علم کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وفی المعراج التصدق علی العالم الفقیر افضل۔ وفی ردالمحتار ای من الجاهل الفقیر قهستانی۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۳۵۳ باب المصرف)[۲]

---

[۱] وفی الهندیة: ولو قبض الصغیر وهو مراهق جاز وکذا لو کان یعقل القبض بان کان لا یرمی به ولا یخدع عنه ولو دفع الی الفقیر معتوه جاز۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۹۰ باب المصرف)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان ج۱ ص۱۲۸ فصل فیمن یوضع فیه الزکوٰة۔

[۲] وفی الهندیة: التصدق علی الفقیر العالم افضل من التصدق علی الجاهل۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۷ الباب السابع فی المصارف)
وَمِثْلُهٗ فی الطحطاوی حاشیه مراقی الفلاح ص۳۹۴ باب المصرف۔

کسی دینی مدرسہ کے مالدار استاذ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اسلامی مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے اپنے آپ کو فارغ کیا ہو اور مالی اعتبار سے اس کی حالت مستحکم ہو یعنی مالکِ نصاب ہو تو کیا ایسے شخص کو علومِ دینیہ کا مدرس ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ چونکہ زکوٰۃ کی تملیک میں قبض کرنے والے کا فقیر ہونا شرط ہے اس لیے عامل کے علاوہ زکوٰۃ کے مصرف کی دوسری قسموں میں کسی فقیر کے علاوہ غنی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ تدریس کرنا کوئی ایسا عمل نہیں جو اس کو زکوٰۃ کا مصرف بنادے۔ اس لیے صاحبِ نصاب مدرس کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ : ھٰذا الفرع مخالف لاطلاقھم الحرمۃ فی الغنی ولم یعتمدہ احد۔ قلت وھو کذٰلک والاوجہ تقییدہ بالفقیر ۔۔۔ قال للاتفاق علیٰ ان الاصناف کلّھم سوی العامل یعطون بشرط الفقر۔ (ردالمحتار ج۲ ص ۳۴۰، ۳۴۳ باب المصرف)[۱]

سادات زکوٰۃ کا مصرف نہیں

سوال:۔ سادات کے لیے مالِ غنیمت میں خمس الخمس باقی نہ رہنے کی وجہ سے کیا ان کو زکوٰۃ یا دیگر صدقاتِ واجبہ دیئے جا سکتے ہیں یا نہیں، خاص کر جب سادات فقراء ہوں ؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک خاندان کی طرف منسوب سادات حضرات بذاتِ خود ہر وقت تعظیم و احترام کے قابل ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ان کو عظمت و عزت کی نگاہ سے دیکھنا ایمانی جذبہ کا تقاضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زکوٰۃ نہ دینے کا حکم ان کی عظمت و احترام کی وجہ سے دیا تھا اس لیے ان کا حکم مرورِ زمانہ یا خمس الخمس نہ رہنے کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتا تاہم اربابِ استطاعت کے لیے ضروری ہے کہ نفلی صدقات اور عطیات سے ان کے ساتھ تعاون کریں تاکہ ان کی حالت بہتر رہے، اور صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، صدقۃ فطر وغیرہ) نہ دیا کریں، اگرچہ امام طحاویؒ سے جواز کا قول مروی ہے۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ : ولا تدفع الیٰ بنی ھاشمی۔ لقولہ علیہ السلام : یابنی ھاشم

---

[۱] قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ : ولا یجوز دفع الزکوٰۃ الیٰ من یملک نصاباً من ای مال کان۔ الخ (الھدایۃ ج۱ ص۲۰۲ باب المصرف)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۹ باب المصرف۔

ان اللہ تعالیٰ حرم علیکم غسالۃ الناس واوساخھم۔الخ (الھدایۃ ج۱ ص۲۰۶ باب المصرف) لے

کسی مستحق کو مقدارِ نصاب زکوٰۃ دینا جائز ہے

سوال:۔ اگر کسی فقیر اور مستحق کو اتنی زکوٰۃ دی جائے جو اس کے غنا کا سبب بن سکے اور وہ اس سے صاحبِ نصاب بن جائے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں ؟

الجواب:۔ زکوٰۃ دینے میں بنیادی فلسفہ فقراء کی حالت بہتر بنانا ہے، اس لیے ان کو اتنا مال دینا مناسب ہے جس سے ان کی غربت دور ہو سکے، لہٰذا اگر کوئی شخص مقروض ہو تو اس کو قرضہ کی ادائیگی کے لیے جملہ رقم دینا جائز ہے اگرچہ یہ رقم نصاب سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو لیکن بلا وجہ کسی شخص کو نصاب کی مقدار کی زکوٰۃ دینا مکروہ ہے تاہم زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے ۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ : وکرہ اعطاء فقیر نصابا او اکثرالا اذا کان المدفوع الیہ مدیون اوکان صاحب عیال بحیث لوفرقہ علیھم لایخص کل اولا یفضل بعد دینہ نصابًا فلایکرہ الخ ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردّالمحتار ج۲ ص۳۵۳ باب المصرف) ۲

عصری علوم حاصل کرنے والے طالب علم کو زکوٰۃ دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک طالب علم کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتا ہو اور تعلیمی اخراجات اس کی استطاعت سے بالا ہوں، تو کیا اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے ؟

الجواب:۔ عصری علوم کی تعلیم حاصل کرنا کوئی ناجائز نہیں اور نہ اس میں مصروفیت کی وجہ سے انسان کی اہلیت متاثر ہوتی ہے، اس لیے ایسا طالب علم جب مسلمان اور بالغ ہو اور صاحبِ نصاب نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اگرچہ اس کا والد مالدار ہو کیونکہ بالغ بیٹا والد کی مالداری سے مالدار نہیں بنتا ہے، تاہم غیر شرعی اخراجات میں تعاون کرنا تعاون علی المعصیت

لے وفی الھندیۃ : ولایدفع الی بنی ھاشم وھم آل علیؓ وآل عباسؓ وآل جعفرؓ وآل عقیلؓ وآل الحرثؓ بن عبدالمطلب، الخ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۹ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۲۴۶ باب المصرف ۔

۲ قال زین الدین ابن نجیمؒ : (قولہ وکرہ الاغناء) ای کرہ ان یدفع الی فقیر مایصیر بہ غنیًا ۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۴۹ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۸ باب المصرف ۔

کے مترادف ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا الی طفله بخلاف ولده الکبیر وابیه۔ الخ۔ وفی ردّ المحتار: ولا الی طفله ای الغنی فیصرف الی البالغ ولو ذکراً صحیحاً۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص ۳۴۹، ۳۵۰ باب المصرف) [1]

مالدار طالب علم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں | اگر کوئی طالب علم مالدار ہو تو کیا اُسے زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

الجواب:- اگر کسی طالب علم کے پاس اپنے گھر میں مال موجود ہو اور وُہ نصاب کے برابر ہو۔ مگر سفر کی حالت میں اس کے پاس مال نصاب سے کم ہو تو ایسے طالب علم کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ ملکیت ید کا اعتبار ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وابن السبیل اذا کان له فی وطنه مال بمنزلة الفقیر۔

(رد المحتار، باب المصرف ص ۳۴۳)

البتہ اگر طالب علم کے پاس موجود مال اتنا ہو کہ نصاب تک پہنچتا ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، کیونکہ تملیکِ فقیر زکوٰۃ دینے میں شرط ہے، البتہ عامل زکوٰۃ اس شرط سے مستثنیٰ ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وهذا الفرع مخالف لاطلاقهم الحرمة فی الغنی ولم یعتمده احد قلت وهو کذلک والاوجه تقییده بالفقیر.... ثم قال الاتفاق علیٰ ان الاصناف کلهم سوی العامل یعطون بشرط الفقر۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۳۴۰ باب المصرف) [2]

---

[1] قال زین الدین ابن نجیم الحنفیؒ: (قوله وعبده وطفله) ای لایجوز دفع الزکوٰۃ وما الحق بها لعبد الغنی وولده الصغیر لان الملک فی العبد یقع لمولاه وهو لیس بمصرف۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴۶ باب المصرف)

ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۱۸۹ باب المصرف۔

[2] قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: ولایجوز دفع الزکوٰۃ الی من یملک نصاباً من ای مال کان لان الغنی الشرعی مقدر به۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۸۹ باب المصرف)

وایضاً: وابن السبیل من کان له مال فی وطنه وهو فی مکان لاشیٔ له فیه۔

(الهدایة ج ۱ ص ۱۸۷ باب المصرف)

مدارس عربیہ کو سفراء کے ذریعہ زکوٰۃ دینا

سوال:۔ مدارسِ عربیہ کے لیے کوئی مستقل ذرائع آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ و دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقوم سفراء کی وساطت سے جمع کی جاتی ہیں، کیا مدارس کے سفراء کو زکوٰۃ دیدینے سے انسان کی ذمہ داری فارغ ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ و دیگر صدقاتِ واجبہ کی صحتِ ادائیگی کے لیے فقراء اور مساکین کی تملیک شرط ہے، اس لیے جن مدارس میں طلباء کو کھانا دیا جاتا ہے تو تملیکاً کھلانے سے زکوٰۃ کی رقوم کی ادائیگی درست ہے، البتہ جن مدارس میں مطبخ کا انتظام نہ ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے طلباء کا اصالتاً یا وکالتاً قبض ضروری ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ علماء اور طلباء کو خود صدقات وغیرہ دیئے جائیں۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: یصرف المزکی الی کلھم او الی بعضھم الخ تملیکاً لا اباحۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب المصرف)[۱]

میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے

سوال:۔ کیا خاوند اپنی مسکین بیوی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟ ایسا ہی خاوند کو بیوی زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی زکوٰۃ کے لیے مصرف نہیں اس لیے ایک دوسرے کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ:۔ ولا الی امرأتہ للاشتراک فی المنافع عادۃ ولا تدفع المرأۃ الی زوجھا عند ابی حنیفۃؒ۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۸۸ باب المصارف)[۲]

قریبی مدرسہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مدرسہ میں زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص زکوٰۃ ہمیشہ اپنے قریبی دینی مدرسہ کو

---

[۱] وقال زین الدین ابن نجیم الحنفیؒ: ھی تملیک المال من فقیر مسلم الخ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ۔

[۲] قال علاؤالدین الحصکفیؒ: ولا الی من بینھما ولاد ولو مملوکاً لفقیر او بینھما زوجیۃ ولو مبانۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۶ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۹ باب المصرف۔

چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کے مدرسہ کو زکوٰۃ دیتا ہے، کیا عند الشرع ایسا کرنا جائز ہے، اور کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنے شہر سے دوسرے شہر کی طرف زکوٰۃ منتقل کرنا عند الشرع مکروہ تنزیہی ہے، البتہ اگر عزیز و اقارب کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوں یا اپنے شہر سے دوسرے شہر والے زیادہ حاجتمند ہوں یا وہاں ایسا مدرسہ ہو جو اس قریبی مدرسہ سے زیادہ امانت دار اور حاجتمند ہو تو اس صورت میں کوئی کراہت نہیں اور ایسا کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ اولیٰ ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: (و) کرہ (نقلها الا الی قرابة) بل فی الظهیریة لاتقبل صدقة الرجل وقرابته محاویج حتی یبدأ بهم فیسد حاجتهم (او احوج) او اصلح او اورع او انفع للمسلمین۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۵۳-۳۵۴ باب المصرف) لہ

کسی سیاسی تنظیم یا انجمن کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:۔ ایک تنظیم مذہبی اور سیاسی ہو جو کہ ملک میں نفاذ اسلام کے لیے کوشش کرتی ہو، تو کیا ایسی تنظیم کو زکوٰۃ اور عشر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی میں مسلمان فقیر کو مالک بنانا ضروری ہے، لہٰذا کوئی تنظیم یا انجمن اگرچہ مذہبی ہی کیوں نہ ہو، ان شرائط کی وجہ سے زکوٰۃ و عشر اور صدقاتِ واجبہ کی مستحق نہیں، لہٰذا ایسی کسی تنظیم کو زکوٰۃ و عشر اور صدقاتِ واجبہ دینا جائز نہیں۔

قال ابن نجیمؒ:۔ هی تملیك المال من فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالی الخ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ) ۲ہ

لہ وفی الهندیة: ویکره نقل الزکوٰة من بلد الی بلد الا ان ینقلها الانسان الی قرابته او الی قوم هم احوج الیها من اهل بلده ولو نقل الی غیرهم اجزأ وان کان مکروها۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۹۰ الباب السابع فی المصارف)

ومثله فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵۰ باب المصرف۔

۲ہ قال شیخ الاسلام محمد بن عبد الله التمرتاشی الحنفیؒ: هی تملیك جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر۔ الخ (تنویر الابصار متن الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۲۵۶-۲۵۷ کتاب الزکوٰۃ)

ومثله فی الهندیة ج ۱ ص ۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ۔

زکوٰۃ کی نیت سے غریب کو کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کسی غریب اور مستحق زکوٰۃ کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا جائے اور اس کھانے میں نیت زکوٰۃ کی کر لی جائے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں اہم شرط تملیک کی ہے کہ کسی غریب یا یتیم کو اس کا مالک کر دیا جائے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں غریب کو کھانا کھلانے میں تملیک نہیں بلکہ اباحت ہے اس لیے اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہو گی، تاہم اگر وہ کھانا کسی غریب کو بطورِ تملیک دیا جائے تو وہ درست ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ فلو اطعم یتیماً ناویاً الزکوٰۃ لایجزیہ الا اذا دفع الیہ المطعوم لانہ بالدفع الیہ بنیۃ الزکوٰۃ یملکہ فیصیر اٰکلا من ملکہ بخلاف ما اذا اطعمہ معہ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۵۷ کتاب الزکوٰۃ) [1]

وکیل کا زکوٰۃ کی رقم کو خود استعمال کرنا

سوال:۔ اگر کسی شخص کو زکوٰۃ کے پیسے کسی مدرسہ یا غریب شخص کے لیے دیئے جائیں لیکن یہ شخص وہ خود اپنے اوپر خرچ کرے جبکہ یہ شخص (وکیل) خود بھی مستحق ہے تو کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب:۔ اگر مزکی (زکوٰۃ دینے والے) نے اس آدمی کو کسی خاص شخص یا مدرسہ کو زکوٰۃ پہنچانے کا وکیل بنا کر زکوٰۃ کے پیسے دیئے ہوں اور اس صورت میں وکیل نے وہ رقم اپنے اوپر خرچ کر لی تو زکوٰۃ ادا نہ ہو گی اور یہ وکیل ضامن ہو گا۔ البتہ اگر مزکی کی طرف سے مطلق اختیار دیا گیا ہو کہ جہاں چاہے اس کو خرچ کرے تو اگر یہ شخص خود مستحق زکوٰۃ ہوا اور اس نے وہ رقم بطور زکوٰۃ اپنے لیے قبض کر لی تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وللوکیل ان یدفع لولدہ الفقیر وزوجتہ لا لنفسہ الا اذا قال ربہا ضعہا حیث شئت۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۲۶۹ کتاب الزکوٰۃ) [2]

---

[1] قال العلامہ ابن نجیمؒ: واما الاطعام ان دفع الطعام الیہ بینۃ یجوز — ایضاً: لہذہ العلۃ وان کان لمرید فع الیہ ویأکل الیتیم لم یجز لانعدام الرکن ھو التملیک۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: للوکیل أن یدفع الزکوٰۃ لولدہ الفقیر او زوجتہ الفقیرۃ اذا لم یأمرہ بالدفع الی شخص معین ولا یجوز لہ أن یأخذ الزکوٰۃ لنفسہ الا اذا قال لہ الموکل ضعہا حیث شئت (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۲ ص۸۹۱ کتاب الزکوٰۃ۔ ثانیا التوکیل فی اداء الزکوٰۃ۔

وکیل کا اپنے اقربا کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ اگر کسی شخص کو تقسیم زکوٰۃ کی ذمہ داری سونپی گئی ہو تو کیا یہ شخص اپنے اصول اور فروع کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ وکیل ذاتی طور پر مالک کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ نہیں لے سکتا ہے لیکن اس کے اصول وفروع جب مصرفِ زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ الامام حافظ الدینؒ: الوکیل باداء الزکوٰۃ اذا صرفہ الی ولدہ الکبیر او الصغیر او امرأتہ وھم محاویج جاز ولا یمسك لنفسہ شیئاً۔

(بزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۴ ص۸۶ کتاب الزکاۃ۔ الثانی فی المصرف)[1]

غنی مجاہد کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ وہ لوگ جو جہاد میں شریک ہوں، اگرچہ مالی اعتبار سے ان کی حیثیت مستحکم ہو لیکن پھر بھی محض اس مقدس کام کی وجہ سے ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ایسا شخص اگر وطن میں مال رکھتا ہو لیکن میدانِ جہاد میں جاتے وقت اُس کے پاس مال نہ ہو تو پھر جہاد کے لیے نکلنے والے اس شخص کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم غنی کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

لما قال الکاسانیؒ: واما استثناء الغازی فمحمول علی حال حدوث الحاجۃ وسماء غنیاً علی اعتبار ما کان قبل حدوث الحاجۃ وھو ان یکون غنیاً ثم حدث بہ الحاجۃ....... ثم یعزم علی الخروج فی سفر غزوٍ فیحتاج الی آلات سفر وسلاح یستعملہ فی غزوٍ ومرکب یغزو علیہ...... فیجوز ان یعطی من الصدقات ما یستعین بہ فی حاجتہ التی تحدث لہ فی سفرہ وھو فی مقامہ غنی بما یملکہ لانہ غیر محتاج فی حال اقامتہ فیحتاج فی حال سفرہ فیحمل

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (ولا الی طفلہ) ای الغنی فیصرف الی البالغ ولو ذکراً صحیحاً.....فافاد ان المراد بالطفل غیر البالغ ذکراً او اُنثیٰ فی عیال ابیہ اولا علی الاصح لما انہ یعد غنیاً بغناہ بخلاف ولدہ الکبیر فانہ لا یعد غنیاً بغنا ابیہ ولا الاب بغنا ابنہ .... ولا الطفل یغنی امہ۔

(ردالمحتار ج۲ ص۳۴۹/۳۵۰ باب المصرف، مطلب فی الحوائج الاصلیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف۔

قولہ لا تحل الصدقة لغنی الا لغازٍ فی سبیل اللہ علی من کان غنیاً فی حال مقامہ فیعطی بعض ما یحتاج الیہ لسفرہ لما احدث السفر لہ من الحاجة الا انہ یعطی حین یعطی وھو غنی۔ (البدائع الصنائع ج۲ ص۴۶ فصل الذی یرجع الی المودی) [1]

داماد کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ کیا کوئی آدمی اپنے غریب اور مفلس داماد کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کا مال اپنے اُس رشتہ دار کو دینا جائز نہیں جو اصول یا فروع میں داخل ہو، داماد چونکہ بذاتِ خود ان دونوں میں کسی میں بھی داخل نہیں اس لیے اگر وہ غریب ہو تو دیگر رشتہ داروں کی طرح اس کو بھی زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: قید باصلہ وفرعہ لان من سواھم من القرابة یجوز الدفع لھم وھو اولی لما فیہ من الصلة مع الصدقة کالاخوة والاخوات والاعمام والعمات والاخوال والخالات الفقراء۔ ولھذا قال فی الفتاوی الظھیریة ویبدا فی الصدقات بالاقارب۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف) [2]

بہو (بیٹے کی بیوی) کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ اگر باپ بیٹا دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہوں، کھانا پینا آپس میں اکٹھا ہو تو ایسی حالت میں بہو کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بہو کو زکوٰۃ دینے سے فوائد اس کے گھر میں محصور رہ جاتے ہیں۔

الجواب:۔ اصول اور فروع کے علاوہ دیگر سب رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے۔ زوجة الابن یعنی بہو اصول اور فروع میں نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کا

---

[1] لما قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ ما نسب للواقعات) وفی المبسوط لا یجوز دفع الزکوٰة الی من یملک نصاباً الا الی طالب العلم والغازی ومنقطع الحج لقولہ علیہ السلام یجوز دفع الزکوٰة لطالب العلم وان کان لہ نفقة اربعین سنة۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۴۳ کتاب الزکوٰة)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰة۔ الباب السابع فی المصارف)

[2] وفی الھندیة: والافضل فی الزکوٰة والفطر والنذر الصرف اولاً الی الاخوة والاخوات ثم الی اولادھم ثم الی الجیران۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۱۹۰ باب المصارف)
وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۲ ص۳۴۶ بابُ المصرف۔

مصرف ہے اس لیے اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اگرچہ اس کے فوائد گھر ہی میں رہیں بشرطیکہ ہو مستحقِ زکوٰۃ ہو۔

لما قال ابن نجیمؒ: وقید با صلہ وفرعہ لان من سواھم من القرابۃ یجوز الدفع لہم وھو اولیٰ لما فیہ من الصلۃ مع الصدقۃ کالاخوۃ والاخوات والاعمام والعمات والاخوال والخالات الفقراء۔ ولھذا قال فی الفتاوی الظھریۃ ویبدأ فی الصدقات بالاقارب ثم الموالی ثم الجیران وذکر فی موضع آخر معزیًا الی ابی حفص الکبیر لا تقبل صدقۃ الرجل وقرابتہ محاویج فیسد حاجتہم۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف) [1]

امام مسجد کو عُشر و زکوٰۃ دینا

سوال:۔ اگر ایک امام مسجد اپنے مقتدیوں سے جبرًا زکوٰۃ وصول کرتا ہو یعنی مقتدیوں پر لازم ہو کہ وہ زکوٰۃ وعشر امام کو دے گا، تو کیا اس سے زکوٰۃ وعشر ادا ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اُجرت میں زکوٰۃ دینا خواہ جبرًا ہو یا رضاءً ہو جائز نہیں، ایسی حالت میں قوم کی زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی۔ تاہم اگر امام غریب ہو تو بطور صلہ اس کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما فی الھندیۃ:۔ ولو نوی الزکوٰۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان ایضًا اجزاہ والا فلا وکذا ما یدفعہ الی الخدم من الرجال والنساء فی الاعیاد وغیرھا بنیۃ الزکوٰۃ۔ (الفتاوی الھندیہ ج۱ ص۱۹۰ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف) [2]

مالدار امام کو صدقۂ فطر دینا

سوال:۔ اگر امام کی مالداری اس کے اقرار سے ثابت ہو تو اس کے باوجود اس کو صدقۂ فطر دینے کا کیا حکم ہے جبکہ امام امامت

---

[1] قال فی الھندیۃ: یکرہ نقل الزکوٰۃ من بلد الی بلد۔۔۔۔ والافضل فی الزکوٰۃ والفطر والنذور الصرف اوّلاً الی الاخوۃ والاخوات ثمّ الی اولادھم ثمّ الی الاعمام والعمات ثمّ الی اولادھم ثمّ الی الاخوال والخالات ثمّ الی اولادھم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۹۰ کتاب الزکوٰۃ الباب السابع فی المصارف)
وَمِثْلُہٗ فی الرد المحتار علی الدر المختار ج۲ ص۳۵۳ باب المصرف۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وفی الملتقط من الاجارۃ المعلم اذا اعطی خلیفتہ شیئًا ناویًا الزکوٰۃ فان کان بحیث یعمل لہ لو لم یعطہ یصح عنھا والا فلا۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۶۲)

کی اُجرت لینے کے حق میں ہو؟

الجواب:۔ صدقۂ فطر غرباء، فقراء اور مساکین کو بطورِ تملیک دیا جاسکتا ہے، امام جب مالدار ہو تو اس کو صدقۂ فطر دینے سے ذمہ داری فارغ نہیں ہوتی، قوم کو چاہیئے کہ امام کی خدمت متبادل طریقے سے کرے، نیز امامت کی اجرت میں صدقۂ فطر دینا جائز نہیں خواہ امام غریب ہی کیوں نہ ہو، تاہم اگر ایک امام غریب ہو تو اُجرت کی نیت کیے بغیر محض ایک عالم دین کی ضروریات کے تکفل کی نیت سے دینے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال فی الهندیة : ومصرف هذہ الصدقة ماهو مصرف الزکوٰة ۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۹۴ کتاب الزکوٰة ۔الباب الثامن فی صدقة الفطر) [۱]

زکوٰۃ میں دینی کتابیں دینا

سوال :۔ اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم سے کتابیں خرید کر طلباءؑ میں تقسیم کیں، تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :۔ کتابیں بھی دیگر اجناس کی طرح قابلِ تملیک و تملک ہیں، اس لیے زکوٰۃ میں کتابیں دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے تاہم اس میں طلباء کو تملیکاً دینا ضروری ہے صرف عاریتہً دینا یا مدرسہ کے کتب خانہ میں بطورِ وقف رکھنے سے تملیک کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی ۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ : یصرف المزکی الی کلهم او الی بعضهم الخ تملیکاً لا اباحة ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۴۴ باب المصرف) [۲]

عیاشی کی وجہ سے مقروض کو زکوٰۃ دینا

سوال :۔ ایک شخص عیاشی کی وجہ سے مقروض ہو گیا تو کیا اس کو مدیون کے زمرہ میں شمار کر کے زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مقروض کے قرض میں یہ ضروری نہیں کہ اُس کا دَین کسی نیکی کی وجہ سے ہو،

---

[۱] قال ابن نجیمؒ : وصدقة الفطر کالزکوٰة فی المصارف ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۵۶ باب المصارف) وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۳۶۹ باب المصرف ۔

[۲] قال زین الدین ابن نجیمؒ :۔ هی تملیك المال من فقیر مسلم الخ ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰة) وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۶۰ کتاب الزکوٰة ۔

تاہم اگر مقروض کے قرض کی ادائیگی سے اس کے فسق وفجور میں اضافہ ہوسکتا ہو اور بے دینی کی راہیں کھل سکتی ہوں تو ایسی حالت میں کسی نیک آدمی کو زکوٰۃ دینا اولیٰ ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: التصدق علی الفقیر العالم افضل من التصدق علی الجاھل۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۷ کتاب الزکوٰۃ الباب السابع فی المصارف)[1]

مقروض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کے پاس اتنا مال موجود ہو جو مقدار نصاب کو پہنچتا ہے لیکن یہ شخص مقروض بھی ہے، اگر قرضہ اس مال سے نکالا جائے تو نصاب پورا نہیں رہتا، کیا اس مال پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص کے پاس اتنا مال ہو جو مقدار نصاب کو پہنچتا ہو لیکن مقروض ہونے کی وجہ سے اگر قرضہ اس سے نکالا جائے تو باقی مال سے مال نصاب پورا نہیں ہوتا اس لیے اس شخص پر زکوٰۃ لازم نہیں، البتہ قرضہ نکالنے کے بعد اتنا مال بچے جو مقدار نصاب کو پہنچے تو حولان حول سے اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ: وان کان مالہ اکثر من دینہ زکی الفاضل اذا بلغ نصاباً۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۶۸ کتاب الزکوٰۃ)[2]

زکوٰۃ دیتے وقت ظاہری حالت پر اکتفاء کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص کی ظاہری حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے فقیر و محتاج سمجھ کر زکوٰۃ دی جائے جبکہ اس کی اصل حالت سے ناواقفیت ہو تو کیا ایسی حالت میں زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اس میں دارومدار زکوٰۃ دینے والے کے غلبۂ ظن پر ہے، اگر زکوٰۃ دیتے وقت

---

[1] قال الحصکفیؒ: او احوج او اصلح او اورع او انفع للمسلمین..... اولیٰ طالب العلم وفی المعراج التصدق علی العالم الفقیر افضل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۵۳، ۳۵۴ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الطحطاوی ص۳۹۴ باب المصرف۔

[2] قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: فلا زکوٰۃ علیٰ مکاتب ومدیون للعبد بقدر دَینہ فیزکی الزائد ان بلغ نصاباً۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۶۳ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۱۱۸ کتاب الزکوٰۃ۔

اس کا غالب گمان یہ ہو کہ یہ شخص مصرفِ زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ دی جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی اگرچہ بعد میں اس شخص کا غنا ثابت ہو جائے۔

لما قال فی الهندیة : اذا شك وتحری فوقع فی اکبر رأیه انه محل الصدقة فدفع الیه اوسأل منه فدفع اورآه فی صف الفقراء فدفع فان ظهرانه محل الصدقة جاز بالاجماع وکذا ان لم یظهر حاله عنده واما اذا ظهر انهٗ غنی اوهاشمی...... فانه یجوز وتسقط عنه الزکوٰة فی قول ابی حنیفةؒ ومحمدؒ. الخ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۱۸۹، ۱۹۰ کتاب الزکوٰة الباب السابع فی المصارف)[1]

کاروبار کی جگہ کے مستحقین میں زکوٰۃ تقسیم ہوگی

سوال:۔ فقہاءِ کرام نے جہاں یہ لکھا ہے کہ زکوٰۃ کا مال اپنے گاؤں کے فقراء کو چھوڑ کر دوسری جگہ فقراء کے لیے لے جانا مکروہ ہے، تو اس سے کون سا گاؤں مراد ہے؟ اگر ایک شخص وطنِ اصلی کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کو وطنِ اقامت بنا کر تجارت کرے تو اس کی زکوٰۃ کی رقم کیلئے اس کا وطنِ اصلی یا وطنِ اقامت اپنا گاؤں شمار ہوگا؟

الجواب:۔ اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں پر کاروبار کیا جاتا ہو، خواہ وطنِ اصلی ہو یا وطنِ اقامت، ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی جائے پیدائش (وطنِ اصلی) کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ مصروفِ عمل ہو تو اس کو چاہیئے کہ کاروبار کی جگہ میں فقراء پر زکوٰۃ تقسیم کرے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ : والمعتبر فی الزکوٰة فقراء مکان المال الخ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۵ باب المصرف)[2]

زکوٰۃ کی رقم سے دینی کتاب چھپوانا

سوال:۔ ایک شخص نے دینی کتاب چھپوانے کا ارادہ

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : قال ابوحنیفةؒ ومحمدؒ اذا دفع الزکوٰة الی رجل یظنهٗ فقیراً ثم بان انه غنی اوهاشمی اوکافر اودفع فی ظلمة فبان انه ابوه اوابنه فلا اعادة علیه..... وهذا اذا تحری فدفع وفی اکبر رأیه انه مصرف اما اذا شك ولم یتحر اوتحری فدفع وفی اکبر رأیه انه لیس بمصرف لایجزیه الا اذا علم انه فقیر هو الصحیح . (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج ۲ ص ۲۱۴، ۲۱۵ باب من یجوز دفع الصدقة الیه . الخ)

ومثلهٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص ۲۴۷ باب المصارف .

[2] قال زین الدین ابن نجیمؒ : والمعتبر فی الزکوٰة مکان المال فی الروایات کلها . (البحرالرائق ج ۲ ص ۲۵۰ باب المصرف)

ومثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۱۹۰ الباب السابع فی المصارف)

ارادہ کیا لیکن وہ مفلس ہے تو اگر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرکے کتاب چھپوائے اور پھر مستحقین زکوٰۃ پر تقسیم کرے، تو کیا یہ جائز ہے یا نہ؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص خود مصرفِ زکوٰۃ ہو اور زکوٰۃ دہندگان کی اجازت سے طباعت کے بعد یہ کتاب مستحقین میں تقسیم کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی کیونکہ ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور جہاں تملیک ممکن نہ ہو وہاں زکوٰۃ کا حکم لگانا درست نہیں۔

لما قال الحصکفیؒ: ویشترط ان یکون الصرف تملیکًا لا اباحۃ فلا یصرف الی بناء نحو المسجد ولا الی کفن میت وقضاء دینہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۴۴ باب المصرف) [۱]

سوال:۔ مدارس کے مہتمم یا کسی خانقاہ کے رئیس کے پاس زکوٰۃ جمع ہو کر مطبخ وغیرہ پر خرچ ہوتی ہے، ایسی حالت میں مطبخ سے کھانے والوں میں یہ فرق نہیں ہوتا ہے کہ یہ کسی مالدار نے کھایا یا غریب نے، تو کیا اس سے زکوٰۃ کی رقم ادا ہوگی یا نہیں؟

مدارس اور خانقاہوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا

الجواب:۔ زکوٰۃ کی رقم کی صحتِ ادائیگی کے لیے کسی فقیر اور مسکین کو مالک بنانا ضروری ہے، مدارس دینیہ میں عموماً غریب اور نادار طلباء ہوتے ہیں جن کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، لیکن خانقاہوں کے لنگر سے کھانے والوں میں صرف مساکین نہیں ہوتے بلکہ مالدار لوگ بھی شامل ہوتے ہیں، ویسے بھی کھانا کھلانے میں جب تک باقاعدہ تملیک نہ ہو تو صرف اباحت کے طور پر زکوٰۃ کی ادائیگی صحتِ زکوٰۃ کے لیے کافی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ فقراء زکوٰۃ قبض کرکے پھر اگر چاہیں تو مطبخ یا لنگر میں خرچ کریں، لیکن اس میں بھی فقیر سے جبراً رقم واپس لینا حیلۂ تملیک میں ہزل کی نشاندہی کرتا ہے، بہرحال کسی حیلۂ تملیک کے بغیر زکوٰۃ کی رقم لنگر میں خرچ کرنا نقصان سے خالی نہیں۔

قال فی الہندیۃ: منہا الفقیر وھو من لہٗ ادنیٰ شیٔ وھو ما دون النصاب اوقدر نصاب

---

[۱] قال فی الہندیۃ: اما تفسیرہ فھی تملیک المال من فقیر مسلم۔ الخ (الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۷۰ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول)

وفیہ ایضًا: ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰۃ المسجد وکذا القناطر والسقایات...... وکل ما لا تملیک فیہ۔ الخ (الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف)

ومثلہٗ فی فتح القدیر ج ۲ ص۲۰۷/۲۰۸ باب المصرف۔

غیر نامٍ وھو مستغرق فی الحاجۃ فلا یخرجہ عن الفقر ملک نصاب کثیرۃ غیر نامیۃ اذا کانت مستغرقۃ بالحاجۃ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۱۸۷ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف) [1]

دینی مدارس یا رفاہی اداروں کے مال پر زکوٰۃ

سوال:۔ بعض دینی مدارس اور رفاہی اداروں کی کافی آمدنی ہوتی ہے، کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شخصی ملکیت کا ہونا ضروری ہے اس لیے مدارس یا کسی رفاہی ادارے کی آمدنی پر حولانِ حول کے باوجود زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

لما قال ابن عابدینؒ: (قولہ ملک نصاب) فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل والمسبلۃ لعدم الملک۔ (رد المحتار ج ۲ ص۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ) [2]

کسی سیاسی جماعت کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ دورِ حاضر میں بعض سیاسی جماعتیں اپنے لیے زکوٰۃ اور چرمِ قربانی جمع کرتی ہیں، کیا ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ اور اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

الجواب:۔ زکوٰۃ یا صدقاتِ واجبہ میں تملیک بلاعوض شرط ہے، چونکہ سیاسی جماعتوں میں یہ چیز مفقود ہوتی ہے اس لیے اموالِ زکوٰۃ کو سیاسی مقاصد، مقدمات، الیکشن یا دیگر کاموں میں استعمال کرنا جائز نہیں اور نہ اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی بلکہ اس کے بجائے دینی مدارس زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ھی تملیک خرج الاباحۃ فلو اطعم یتیمًا ناویا الزکوٰۃ لا یجزیہ الا اذا دفع الیہ المطعوم...... جزء مالہ اخرج المنفعۃ فلو اسکن فقیرًا دارہ سنۃ ناویًا

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ای مصرف الزکوٰۃ والعُشر ھو فقیر وھو من لہٗ ادنیٰ شئ ای دون نصاب او قدر نصابٍ غیر نامٍ مستغرق فی الحاجۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۳۹ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی المراقی الفلاح ص۳۹۲ باب المصرف۔

[2] قال العلامۃ کاسانیؒ: واما الشرائط التی ترجع الی المال فمنھا الملک فلا تجب الزکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم المِلک وھٰذا لان فی الزکوٰۃ والتملیک فی غیر الملک لا یتصور۔
(بدائع الصنائع ج ۲ ص۹ فصل الشرائط التی ترجع الی المال)
وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج ۱ ص۲۵۲ کتاب الزکوٰۃ۔

لایجزیہ عینہ الشارع ...... من مسلم فقیر ولو عتوھا۔
(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص ۲۵۸،۲۵۷ کتاب الزکوٰۃ) [1]

ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ اور عشر کا وجوب متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ حکومت کاروباری اور صنعتی اداروں سے بھاری ٹیکس وصول کرتی ہے اور ان ٹیکسوں کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی خرچ کرتی ہے، کیا اس طرح ٹیکس ادا کرنے سے زکوٰۃ کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مختلف قسم کے ٹیکس حکومت کا ذریعۂ آمدنی ہوتے ہیں جن میں عبادت کا عنصر مفقود ہوتا ہے اس لیے اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ٹیکس ہر شہری سے وصول کرتی ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، جبکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: الزکوٰۃ واجبۃ علی الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملک نصابًا ملکًا تامًا وحال علیہ الحول۔ (الھدایہ ج ۱ ص ۱۸۵ کتاب الزکوٰۃ) [2]

موقوفہ زمین کے مقدمہ پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا

سوال:۔ ہمارے گاؤں کے قبرستان کی زمین پر ایک آدمی نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے، کیا ہم اس کے مقدمے میں اپنی زکوٰۃ کی رقم خرچ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک بلاعوض شرط ہے، چونکہ اس مقدمہ میں یہ شرط مفقود ہے اس لیے قبرستان کے مقدمے یا دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں میں زکوٰۃ کے روپے لگانا صحیح نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

---

[1] لما قال العلامۃ ابوالبرکات النسفیؒ: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی۔
(کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)

[2] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وشرط افتراضھا عقل وبلوغ واسلام وحریۃ والعلم بہ ولو حکمًا ککونہ فی دار نا فلا زکوٰۃ۔ قال ابن عابدینؒ: قولہ واسلام فلا زکوٰۃ علی کافر لعدم خطابہ بالفروع۔
(ردّ المحتار ج ۲ ص ۲۵۸/۲۵۹ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۱ ص ۲۶۹ کتاب الزکوٰۃ۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصکفیؒ: ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحۃ کما مرّ لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میت وقضاء دینہ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب المصرف) [1]

زکوٰۃ کی رقم سے مشترکہ مفاد کے لیے سامان خریدنا

سوال:۔ اگر محلہ کے لوگ خوشی اور غم کے لیے کچھ برتن، ٹینٹ یا کرسیاں وغیرہ اجتماعی طور پر خریدنے کا ارادہ کریں، تو کیا اس کام کے لیے زکوٰۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ یا صدقاتِ واجبہ میں تملیک بلا عوض شرط ہے، مشترکہ مفاد کے لیے جو اشیاء خریدی جاتی ہیں اُن میں چونکہ کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتی اس لیے ایسے مواقع میں زکوٰۃ کی رقم کا استعمال جائز نہیں۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحۃ کما مرّ لا یصرف الی بناء نحو المسجد ولا الی کفن میت...... لعدم التملیک وھو الرکن۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب المصرف) [2]

کیا سُنی العقیدہ شخص کسی شیعہ کو زکوٰۃ دے سکتا ہے

سوال:۔ اگر قرب وجوار میں شیعہ آبادی کی اکثریت ہو اور سُنی العقیدہ شخص اگر اپنی زکوٰۃ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والوں میں تقسیم کرے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کے مصرف کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، جبکہ غالی قسم کے شیعہ اپنے عقائدِ باطلہ کی وجہ سے اسلام سے خارج ہیں اس لیے وہ لوگ سُنی العقیدہ شخص کی زکوٰۃ کا مصرف نہیں اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، تاہم زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلم کو دینے میں

---

[1] لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: تحت قولہ ولا الی ذمّی وغیرھا وبناء مسجد وتکفین میّت وقضاء دینہ وشراء قن یعتق...... وعدم الجواز لانعدام التملیک الذی ھو الرکن فی الاربعۃ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصارف)

[2] قال فی الھندیۃ: ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰۃ المسجد وکذا القناطر والتعایات واصلاح الطرقات...... وکل ما لا تملیک فیہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب السابع فی المصارف)

ومِثْلُہٗ فی الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج۲ ص۲۰۲ باب من یجوز دفع الصدقۃ الیہ۔ الخ

کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وهی تملیك جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر۔
(الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۲۵۶/۲۵۷ کتاب الزکوٰۃ) ؎۱

قسطوں پر کوئی چیز فروخت کرنا اور اس پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے ایک گاڑی نقد ایک لاکھ سو پیہ پر خریدی اور پھر اس کو ایک لاکھ پچیس ہزار (۱۲۵۰۰۰) روپے قسطوں پر اس طرح فروخت کیا کہ ہر سال پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) روپے بطور قسط خریدار ثانی اُسے ادا کرے گا، اس طرح زکوٰۃ مجموعی رقم پر آئے گی یا صرف اقساط پر ہوگی؟

الجواب:۔ اگر کسی نے کوئی چیز تجارت کی نیت سے خریدی ہو اور پھر اس کو قسطوں میں منافع پر فروخت کیا ہو تو ان میں زکوٰۃ ہر قسط وصول کرنے کے بعد واجب ہوگی، جب بھی کم از کم چالیس روپے بطور قسط وصول ہوں تو اس میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینا لازم ہوگا، اگر چالیسویں حصہ سے کم ہو تو اگر اس کے پاس پہلے سے کوئی نصاب موجود ہے تو قسط سے حاصل ہونے والا مال اس کے ساتھ ملا کر کل مال سے زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے ورنہ چالیس دراہم کے پورا ہونے کے بعد زکوٰۃ دینا لازمی ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب زکوتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فورا بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۳۰۵ باب زکوٰۃ المال) ؎۲

حیلۂ زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ مدارس اور مساجد میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کے لیے عموماً یہ حیلہ کیا جاتا ہے کہ ایک شخص حیلہ رقم زکوٰۃ قبض کر کے تعمیر یا دوسرے امور

؎۱ قال فی الهندیة: واما الحربی المستامن فلا یجوز دفع الزکوٰة والصدقة الواجبة الیه بالاجماع ویجوز صرف التطوع الیه۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰۃ الباب السابع فی المصارف)
وَ مِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصارف۔

؎۲ وفی الهندیة: وقوی وهو ما یجب بدلا عن سلع التجارة اذا قبض اربعین زکی لما مضی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۷۵ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۰۷ کتاب الزکوٰۃ۔

میں خرچ کرتا ہے۔ بسا اوقات قبض کرنے والا متولی مسجد یا مہتمم مدرسہ خود زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہوتا ہے، اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے ذمہ فارغ ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحت کے لیے تملیک شرط ہے لیکن تملیک میں یہ ضروری ہے کہ قبض کرنے والا خود صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر مہتمم یا ناظم مدرسہ بذاتِ خود صاحبِ نصاب نہ ہو تو ان سے قبض جائز ہے اور پھر اس کو مدرسہ یا مسجد میں خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ اس حیلہ کو اپنانے کی بجائے زکوٰۃ کی رقم طلباء میں تقسیم کی جائے تاکہ بہتر طریقہ سے ادائیگی ہو سکے۔

قال علاؤالدین الحصکفیؒ: وحیلۃ التکفین بھا التصدق علیٰ فقیر ثم ھو یکفن فیکون الثواب لھما وکذا فی تعمیر المسجد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۳۴۵ کتاب الزکوٰۃ) [1]

زکوٰۃ دینے کی بجائے قرض معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

سوال:۔ اگر دائن مدیون کی مفلسی اور حالتِ زار کو دیکھ کر اپنا دَین وقرضہ اس کو زکوٰۃ میں معاف کردے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسقاط میں تملیک نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی اور اگر اس کو زکوٰۃ کی رقم دے دے اور پھر اپنے قرضہ میں وصول کرلے تو اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الھندیۃ: ولو وھب دَینہ من فقیر ونوی زکوٰۃ دین آخر لہ علیٰ رجل آخر او نوی زکوٰۃ عین لہ لم یجز کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰۃ۔ الباب الاول فی تفسیرھا۔ الخ) [2]

---

[1] قال زین الدین ابن نجیمؒ: والحیلۃ فی الجواز فی ھٰذہ الاربعۃ ان یتصدق بمقدار زکوٰتہ علیٰ فقیر ثم یامرہ بعد ذٰلک بالصرف الیٰ ھٰذہ الوجوہ فیکون لصاحب المال ثواب الزکوٰۃ وللفقیر ثواب القرب۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۴۳ کتاب الزکوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۲۲۴ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال فخر الدین الشھیر بقاضی خانؒ: وان کان المدیون فقیراً فوھب الدَّین ینوی بہ زکوٰۃ مال عین عند الواھب لا یسقط عنہ زکوٰۃ ذٰلک المال وکذا انوی بہ زکوٰۃ دَین آخر علیٰ غیرہ۔

(الفتاوی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۲۶۳/۲۶۴ فصل فی ھبۃ الدَّین من المدیون)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۲۴۴ جنس فی ھبۃ الدَّین۔

زکوٰۃ کی رقم چوری ہوجائے یا کوئی جبراً چھین لے توزکوٰۃ کے ادا ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ

سوال:۔ اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم الگ کر کے اس غرض سے اپنے پاس رکھی کہ جب کوئی مسکین مل جائے تو اس کو دے دوں گا، پھر کسی چور نے اس سے یہ رقم چرالی یا کسی نے اس سے جبراً چھین لی تو کیا اس سے ذمہ داری فارغ ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں ادا کرنے والے کی نیت ضروری ہے، بصورتِ جبر جب نیت نہ ہو توزکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ قال زین الدین ابن نجیمؒ: لو امتنع من ادائها فالساعی لا یاخذ منه کرها ولو اخذ لا یقع عن الزکوٰۃ لکونها بلا اختیار۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ)
نیت کا ہونا زکوٰۃ دینے کے وقت ضروری نہیں بلکہ اگر کہیں پوری زکوٰۃ منہا کرتے وقت نیت کی ہو تو کافی ہے تاہم اس سے ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی جب تک فقراء قبض نہ کریں، چوری کے وقت چونکہ فقراء کی تملیک مفقود ہے اس لیے ایسی صورت میں مالک پر دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے البتہ اموالِ ظاہرہ میں جبراً زکوٰۃ کی وصولی درست ہے۔

قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: وشرط صحة ادائها نیة مقارنة له ای للاداء ولو حکماً او بعزل ما وجب کله او بعضه ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء۔

(الدرالمختار علی صدر رد المختار ج ۲ ص۲۶۸ کتاب الزکوٰۃ) [1]

منی آرڈر کے ذریعے زکوٰۃ بھیجنا کیسا ہے؟ جبکہ وہی رقم نہیں پہنچتی جو زکوٰۃ ادا کرنے والے نے دی ہو

سوال:۔ ایک آدمی کسی دوسرے کے ذریعے زکوٰۃ دیتا ہے تو کیا اس شخص کی دی ہوئی رقم بعینہٖ دینا ضروری ہے یا تبدیل کی جاسکتی ہے؟ نیز بذریعہ منی آرڈر زکوٰۃ کی جو رقم کسی مستحق کو بھیجی جاتی ہے تو بعینہٖ وہی رقم اس تک نہیں پہنچتی بلکہ تبدیل ہوجاتی ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی دوسرے آدمی کو زکوٰۃ کی رقم دے کر مستحقین زکوٰۃ کو دینی جائز ہے اور

---

[1] قال زین الدین ابن نجیمؒ: انه لا یخرج بعزل ما وجب عن العهدة بل لا بد من الاداء الی الفقیر۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ)
ومثله فی الطحطاوی حاشیة الدر المختار ج ۱ ص۳۹۰ کتاب الزکوٰۃ۔

تبدیلیٔ رقم اگر مزکی کی اجازت سے ہوئی ہو تو یہ آدمی ضامن نہ ہوگا۔ اور بذریعہ منی آرڈر زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن منی آرڈر بھیجتے وقت نیت کرنا لازمی ہے۔ لما فی الشامی لایخرج المزکی عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: تملیک الدین ممن لیس علیه الدّین باطل الّا فی ثلث حوالة او وصیة واذا سلّطه ای سلط المملك غیر المدیون علی قبضه ای الدّین فیصح حینئذٍ ومنه مالو وهبت من ابنها ما علی ابیه فا لمعتمد الصحة للسلیط۔

(الدر المختار جلد ۲ ص۵۲۱) ؎۱

کسی دوسری جگہ رہنے والے رشتہ دار کو زکوٰۃ بھیجنا

سوال:۔ ایک شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم اپنے کسی رشتہ دار کے لیے دوسری جگہ بھیجنا چاہتا ہے جبکہ وہ خود جس جگہ مقیم ہے وہاں بھی غریب لوگ ہیں، تو کیا قرب وجوار کے غرباء کو چھوڑ کر دور رہنے والے رشتہ دار کو زکوٰۃ بھیجنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ویسے تو عموماً ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا مکروہ ہے لیکن اگر زکوٰۃ دینے والے کے محتاج رشتہ کسی دوسری جگہ رہتے ہوں تو رشتہ داری کی بناء پر زکوٰۃ منتقل کرنا مرخص ہے، بلکہ زکوٰۃ پہلے رشتہ داروں میں تقسیم کرنا افضل ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (تحت قوله بل فی الظهیریة لاتقبل) عن ابی هریرة (رضی الله عنه) موقوعاً الی النبی صلی الله علیه وسلم انهٗ قال یا اُمّة محمد والذی بعثنی بالحق لایقبل الله صدقة من رجلٍ وَلَهٗ قرابة یحتاجون الی صلته و یصرفها الی غیرهم والذی نفسی بیده لاینظر الله الیه یَومَ القیٰمة والمراد بعدم القبول عدم الاصابة علیها وان سقط بها الفرض لان المقصود منها سد خلة المحتاج وفی القریب جمع بین الصلة والصدقة

؎۱ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: کما اذا وکل رجلاً بدفع زکوٰة ماله ونوی المالك عند الدفع الی الوکیل بلانیة یجزیه لان المعتبر نیة الامر لانه المودی حقیقةً۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۱۷۱ کتاب الزکوٰة۔

والافضل اخوته واخواته الخ۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۵۳/۳۵۴ باب المصرف) [1]

زکوٰۃ کی رقم سے تقسیم کنندہ کو مزدوری دینا

سوال:۔ موجودہ دور میں حکومتِ وقت بینکوں میں عوام کی جمع شدہ رقوم سے کچھ کٹوتی کرتی ہے پھر وہ رقم لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کام کے لیے حکومت نے کچھ آدمی مقرر کیے ہوئے ہیں جن کو اس رقم کی تقسیم اور دیگر معاملات کے عوض ماہانہ کچھ رقم بطور تنخواہ و الاؤنس کے ملتی ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ حکومت کے بیان کے مطابق یہ زکوٰۃ کی رقم ہوتی ہے اور ان تقسیم کاروں میں اکثریت مصرفِ زکوٰۃ بھی نہیں ہوتی؟

الجواب:۔ ایسی رقوم پر حکومت کی تمام کٹوتی زکوٰۃ پر نہیں ہوتی بلکہ اس میں سود کا بھی کچھ حصہ شامل ہوتا ہے تاہم اگر زکوٰۃ بھی ہو تو عامل کو زکوٰۃ کی رقم سے مزدوری دینا جائز ہے اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو؟

لما فی الهندیة: ومنها العامل وهو من نصبه الامام لاستیفاء الصدقات والعشور ویعطیه مایکفیه واعوانه بالوسط مدة ذهابهم وایابهم مادام المال باقیاً الا اذا استغرقت کفایته الزکوٰة فلا یزاد علی النصف۔ (الفتاوی الهندیة جلد ۱ ص۱۸۸ کتاب الزکوٰة۔ الباب السابع فی المصاحف) [2]

---

[1] قال ابن نجیم رحمه الله: ویبدأ فی الصدقات بالاقارب ثم الموالی ثم الجیران وذکر فی موضع اٰخر معزیاً الیٰ ابی حفص الکبیر لاتقبل صدقة الرجل وقرابته محاویج فیسد حاجتهم۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی نور الایضاح ص۱۶۱ کتاب الزکوٰة۔ باب المصارف۔

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله:۔ وعامل یعم الساعی والعاشر فیعطی ولو غنیاً لا هاشمیاً لانه فرغ نفسه لهٰذا العمل فیحتاج الی الکفایة والغنی لا یمنع من تناولها۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۳۳۹/۳۴۰ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۱ باب المصارف

مدارس کے مہتمم زکوٰۃ کو اپنی صوابدید کے مطابق یا حیلہ تملیک کے بعد خرچ کریں

سوال:۔ مدارس کے مہتمین کو جب زکوٰۃ کی رقم مدارس کے لیے دی جائے تو کیا وہ اسے اپنی صوابدید کے مطابق مدارس کے جملہ امور میں خرچ کرسکتے ہیں یا کہ حیلہ تملیک کے بعد خرچ کریں؟

الجواب:۔ مدارس کے اہلِ اہتمام اگرچہ عاملین کی طرح ہیں مگر جس طرح عاملین مالِ زکوٰۃ کو اپنی صوابدید کے مطابق غیر شرعی مصارف میں خرچ نہیں کرسکتے تو اسی طرح مہتمین بھی مالِ زکوٰۃ کو نادار طلباء پر تملیکاً کے علاوہ ان کے دیگر امور میں خرچ نہیں کرسکتے بلکہ مدرسہ کے متعلق امور میں خرچ کرنے کے لیے حیلۂ شرعی ضروری ہے۔

لما قال ابوبکر الکاسانیؒ: مایوضع فی بیت المال من الاموال فاربعة انواع الاول زکوٰة السوائم والعشور وما اخذه العشار من تجار المسلمین اذا مروا علیهم ومحله ما ذکرنا من المصارف ای الفقراء والمساکین۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۶۸ فصل واما بیان مایوضع... الخ)[1]

مدارسِ دینیہ کے مہتمین کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ لوگ مدارسِ دینیہ کے مہتمین کو زکوٰۃ دیتے دیتے ہیں حالانکہ وہ خود مالدار ہوتے ہیں، تو کیا ان مہتمین کو زکوٰۃ دینے سے مزکّی کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا یہ کہ جب تک مہتمم کسی مصرف میں خرچ نہ کرے اس وقت تک زکوٰۃ کی ادائیگی موقوف ہو گی؟

الجواب:۔ موجودہ دور میں مدارس کے مہتمین کی حیثیت عاملینِ زکوٰۃ کی سی ہے، جب کوئی شخص ان کو زکوٰۃ ادا کرے تو اس کی زکوٰۃ اسی وقت سے ادا ہو جائے گی البتہ مہتمین کے لیے لازم ہے کہ وہ زکوٰۃ کو اپنے ذاتی مصارف میں خرچ نہ کریں بلکہ طلباء علومِ دینیہ پر خرچ کریں اور غیر ضروری مصارف سے احتیاط لازمی ہے۔

لما قال العلامة ابن همامؒ:۔ فهذه جهات الزکوٰة فللمالك ان یدفع الی کل واحد

---

[1] وفی الهندیة، مایوضع فی بیت المال اربعة انواع الاول زکوٰة السوائم والعشور وما اخذه العاشر من تجار المسلمین الذین یمرون علیه ومحله ما ذکرنا من المصارف (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۹۰ کتاب الزکوٰة۔
ومثلهٗ فی ردّ المحتار ج۲ ص۶۳ کتاب الزکوٰة۔

منہم ولہ ان یقتصر علیٰ صنف واحد۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۲۰۵ کتاب الزکوٰۃ) لـه

مالدار کے لیے زکوٰۃ کا لینا صحیح نہیں

سوال:۔ بعض علاقوں میں بعض مولوی صاحبان بڑے مالدار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر وغیرہ لیتے ہیں، تو کیا ان علماء کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے؟ اور اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب:۔ زکوٰۃ صرف فقراء و مساکین کا حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اغنیاء پر مقرر کیا ہے، اس لیے مالدار چاہے وہ مولوی ہو یا غیر مولوی اُسے زکوٰۃ لینا صحیح نہیں، ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

لما قال الشیخ عبد الحی اللکھنویؒ: علماء اغنیاء را زکوٰۃ گرفتن بالاتفاق حرام است۔
(مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۲۸۷ باب تصرف الزکوٰۃ) ٢ـه

کیا اموال ظاہرہ سے حکومت زکوٰۃ وصول کرے گی؟

سوال:۔ کیا آدمی اپنے اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے یا کہ حکومت کے ذمے زکوٰۃ کی وصولی واجب ہے؟

الجواب:۔ اموال دو قسم کے ہیں (۱) اموال ظاہرہ (۲) اموالِ باطنہ۔ فقہ حنفی کی رُو سے اموالِ ظاہرہ سے حکومت زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے اور اموالِ باطنہ سے مالک خود زکوٰۃ ادا کرے گا۔ ابتداء سے یہی صورت چلی آرہی تھی لیکن بعد میں حضرتِ عثمانؓ نے اموالِ ظاہرہ سے بھی زکوٰۃ ادا کرنا

لـه وذکر الامام ابو بکر الجصاص الرازیؒ: عن علیؓ وابن عباس رضی اللہ عنہما قالا اذا اعطی الرجل الصدقۃ صِنفًا واحدًا من الاصناف الثمانیۃ اجزأ ہ وروی مثل ذلک عن عمر بن الخطاب وحذیفۃ وعن سعید بن جبیر وابراہیم وعمر بن عبد العزیز وابی العالیۃ ولا یروی عن الصحابۃ خلافہ فصار اجماعًا من السلف لا یسع احد خلافہ لظہورہٖ وَاسْتِفَاضَتِہٖ فیہم الخ (احکام القرآن ج۳ ص۱۳۹)

٢ـه لما قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ۔ (کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۲۵۶ تا ۲۵۸ کتاب الزکوٰۃ۔

صاحبِ مال کے سپرد فرمایا لہٰذا اموال ظاہرہ و باطنہ سے صاحبِ مال خود زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: قال عامۃ مشائخنا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طالب زکوٰتہ وابوبکر وعمر طالبًا وعثمان طالب زمانًا ولما کثرت اموال الناس ورأی ان فی تتبعھا حرجًا علی الامۃ وفی تفتیشھا ضررًا بارباب الاموال فوّض الاداء الیٰ اربابھا۔

(بدائع الصنائع ج۲ ص۳۵ کتاب الزکوٰۃ، فصل بیان من لہ المطالبۃ)

نشہ کرنے والوں کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ آجکل اکثر ہیروئنی اور چرسی قسم کے لوگ زکوٰۃ و خیرات مانگتے ہیں اگر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دی جائے تو کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

الجواب:۔ زکوٰۃ ہر فقیر و مسکین کو دینے سے ادا ہو جاتی ہے چاہے وہ اس مالِ زکوٰۃ کو معاصی پر خرچ کرے تاہم زکوٰۃ دینے والے کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ کسی عاصی (گناہ کے عادی) شخص سے معصیت کے کاموں میں تعاون نہ کرے، لہٰذا بنا براں ہیروئنچی، چرسی، افیمی وغیرہ کو ان امور کے ارتکاب کیلئے زکوٰۃ دینا مناسب نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ ھی تملیک خرج الاباحۃ فلو اطعم یتیمًا ناویًا الزکوٰۃ لاتجزئہ الا اذا دفع الیہ المطعوم ۔۔۔۔۔ جزء مال خرج المنفعۃ فلو اسکن فقیرًا دارہ سنۃ ناویًا لایجزیہ عینہ الشارع ۔۔۔۔۔۔۔ من مسلم فقیر غیر ھاشمی ولا مولاہ۔

(الدر المختار علیٰ ھامش الطحطاوی ج۱ ص۳۸۹ کتاب الزکوٰۃ)[1]

دینی مدارس میں زکوٰۃ کی تصریح ضروری

سوال:۔ کسی دینی مدرسہ میں زکوٰۃ دیتے وقت صرف نیّت کافی ہوتی ہے یا رسید لکھتے وقت مالِ زکوٰۃ کی تصریح ضروری ہے؟

الجواب:۔ مدارسِ دینیہ میں زکوٰۃ دیتے وقت زکوٰۃ کی تصریح کرنا ضروری ہے تاکہ

---

[1] قال الامام ابوالبرکات النسفیؒ:۔ ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للہ تعالیٰ۔

(کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج۲ ص۲۰۱ کتاب الزکوٰۃ)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۵ کتاب الزکوٰۃ۔ فصل شرائط الفریضۃ۔

مدرسے والے اس کو زکوٰۃ کے مصرف میں خرچ کر سکیں، صرف نیت کافی نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یخرج عن العھدۃ بالعزل بل بالاداء للفقراء۔ وقال ابن عابدینؒ: فلو ضاعت لا تسقط عنہ الزکوٰۃ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المختار ج۲ ص۱۲ قبیل افتراضھا عمری) [1]

خرد برد کرنے والے کو زکوٰۃ کا وکیل بنانا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی مدرسے کا مہتمم زکوٰۃ وصدقات جمع کرکے خرد برد کرتا ہو، طلباء کے نام پر زکوٰۃ وصدقات کی رقم خود کھاجاتا ہو (اور مدرسے میں طالب علموں کا نام ونشان نہیں) حالانکہ یہ زکوٰۃ مدرسے کے طالبعلموں کے لیے مہتمم کو وکیل بنا کر دی جاتی ہے، تو کیا اس طرح کے مہتمم مدرسہ کو مدرسہ کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- جہاں خرد برد کا غلبۂ ظن ہو وہاں زکوٰۃ وغیرہ دینا مناسب نہیں اور اگر دی جا چکی ہو اور یہ خدشہ ہو کہ صحیح جگہ پر خرچ نہ کی جائے گی تو دوبارہ ادا کرنا چاہیئے تاکہ ادائیگی یقینی ہو جائے۔

قال الحصکفیؒ: دفع بتحرٍّ لمن یظنہ مصرفًا۔۔۔۔ لا یعید لانہ اتی بما فی وسعہ حتی لو دفع بلا تحرٍّ لم یجز ان اخطأ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المختار ج۲ ص۶۸ باب المصرف) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: واذا وضعھا ولم یخطر ببالہ انہ مصرف ام لا فھو علی الجواز الا اذا تبیّن انہ غیر مصرف ------- او غلب علی ظنہ انہ لیس بمصرف فھو علی الفساد۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۹۰ الباب السابع فی المصارف)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۱۱ کتاب الزکوٰۃ۔

[2] قال المرغینانیؒ: قال ابو حنیفۃؒ ومحمدؒ اذا دفع الزکوٰۃ الی رجل یظنہ فقیرا ثم بان انہ غنی او ھاشمی او کافر۔۔۔۔ فلا اعادۃ علیہ۔ وقال ابو یوسفؒ علیہ الاعادۃ۔۔۔۔ والظاھر ھو الاوّل وھذا اذا تحری و دفع وفی اکبر رأیہ انہ مصرف اما اذا شک ولم یتحرّ او تحرّی فدفع وفی اکبر رأیہ انہ لیس بمصرف لا یجزیہ الا اذا علم انہ فقیر ھو الصحیح۔
(الھدایۃ ج ۱ ص۱۸۹ باب من یجوز دفع الصدقات الیہ ومن لا یجوز)
وَمِثْلُہٗ فی نور الایضاح ص۱۶۰ باب المصرف۔

فقیر عالم دین کو زکوٰۃ دینا افضل ہے

سوال:- ہمارا ایک مستقل با تنخواہ امام مسجد ہے لیکن وہ فقیر بھی ہے، تو کیا ہم اس غریب امام کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں یا نہیں؟ یا کسی اور فقیر کو دینا ضروری ہے؟

الجواب:- اگر امام مسجد کی مستقل تنخواہ ہو لیکن غربت کی وجہ سے زکوٰۃ کا حقدار ہو تو کسی جاہل کو زکوٰۃ دینے کی بجائے اس غریب عالم دین کو دینا بہتر ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی المعراج التصدق علی العالم الفقیر افضل۔ قال ابن عابدینؒ عن القھستانی قولہ افضل ای من الجاھل الفقیر۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۶۹ کتاب الزکوٰۃ۔ باب المصرف)[1]

مقدارِ نصاب زکوٰۃ میں دینا مکروہ ہے

سوال:- میرے ایک دوست کو حج کرنے کا بے پناہ شوق ہے لیکن استطاعت نہیں رکھتا، کیا میں از روئے شرع اُسے زکوٰۃ کی رقم دے کر حج کرا سکتا ہوں؟

الجواب:- اگر آپ کے دوست کی ملکیت میں وہ مال جو اس کی حوائج اصلیہ سے زائد ہو اگر ۵۲/۱/۲ تولہ چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر ہو تو وہ زکوٰۃ کا حقدار نہیں اس لیے اُسے زکوٰۃ کے پیسے دینا جائز نہیں، اور اگر فقیر ہو تو مصرفِ زکوٰۃ ہونے کی وجہ سے اسے زکوٰۃ کی اتنی رقم جو مقدارِ نصاب تک پہنچتی ہو دینا مکروہ ہے لیکن پھر بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر آپ اپنے دوست کو مقدارِ نصاب سے زیادہ مال زکوٰۃ میں دے دیا اور وہ قبض کرنے کے بعد اس سے حج کر لے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ مقدار میں زکوٰۃ دینا بھی کراہت سے خالی نہیں۔

لما فی الھندیۃ: ویکرہ ان یدفع الی رجل مائتی درھم فصاعداً وان دفعہ جاز۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۸ الباب السابع فی المصارف)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: التصدق علی الفقیر العالم افضل من التصدق علی الجاھل کذا فی الزاھدی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۸۷ الباب السابع فی المصارف) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۵۴ قبیل باب صدقۃ الفطر۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکرہ اعطاء فقیر نصابا او اکثر الا اذا کان المدفوع الیہ مدیونا او کان صاحب عیالٍ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۷۴ باب المصرف)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۴۹ باب المصرف۔

گھریلو ملازم کو زکوٰۃ دینے کا حکم | **سوال:**- میرے پاس دو ہزار روپے ماہوار پر ایک گھریلو ملازم ہے، کیا میں اسے زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟

الجواب:- فقیر ملازم کو زکوٰۃ اور صدقہ دونوں دینا درست ہے اور ملازم کے لیے لینا بھی جائز ہے تاہم تنخواہ میں زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لما فی الهندیة: ویجوز دفعها الیٰ من یملك اقل من النصاب وان کان صحیحًا مکتسبا کذا فی الزاهدی۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ الباب السابع فی المصارف) [۱]

حکومت کی طرف سے مدارسِ دینیہ کو زکوٰۃ دینے کا حکم | **سوال:**- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ حکومت بینکوں کی رقم سے دینی مدارس کو کچھ رقم بطور زکوٰۃ دیتی ہے، تو کیا یہ رقم زکوٰۃ شمار ہوگی یا سود یا کوئی تیسری جنس، اور طلباء کو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- یہ بظاہر زکوٰۃ کی رقم ہے، لہٰذا طلبہ جو مصرفِ زکوٰۃ ہوں ان کے لیے اس رقم سے کھانا لا بأس بہ ہے، اگرچہ اس میں سودی رقم کے اختلاط کا وہم بھی موجود ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: لو اخرج زکوٰة المال الحلال من مال حرام ذکر فی الوهبانیة انه یجزی عند البعض۔۔۔۔۔۔ولو نوی فی المال الخبیث الذی وجبت صدقة ان یقع عن الزکوٰة وقع عنها۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۸ مطلب فی التصدق من المال الحرام) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: یجوز دفع الزکوٰة الیٰ من یملك ما دون النصاب او قدر نصاب غیر تام وهو مستغرق فی الحاجة۔
(البحر الرائق ج ۲ ص۲۴۰ باب المصرف)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۶۳ باب المصرف۔

[۲] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: والعبرة لنیة الدافع لا لعلم المدفوع الیه وبعد اسطر فلا یأخذه لامن لا یجوز له اخذ الصدقة۔
(فتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۴ ص۸۸،۸۶ الباب الثانی فی المصرف)
وَمِثْلُهٗ فی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۴۰۰ کتاب الحظر والاباحة وما یکره اکله وما لا۔

سیداورکسی بزرگ کی اولادمیں باعتبارمصرفِ زکوٰۃ فرق ہے

سوال:۔ ہمارے علاقے میں "سید" اور "میاں" کی یکساں قدر کی جاتی ہے، "سید" تو آلِ نبی ہیں اور "میاں" لوگ کسی بزرگ اور ولی اللہ کی اولاد ہوتے ہیں، تو کیا میاں لوگ مصرفِ زکوٰۃ ہیں یا میاں اور سید برابر ہیں؟

الجواب:۔ سید اور میاں میں فرق واضح ہے، اس لیے کہ اگر میاں صاحبان کسی غیر سید بزرگ کی اولاد ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اور سید کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

لما فی الھندیۃ: ولا یدفع الیٰ بنی ھاشم وھم آلِ علیؓ وآلِ عباسؓ وآلِ جعفرؓ وآلِ عقیلؓ وآلِ الحرث بن عبد المطلبؓ کذا فی الھدایۃ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۸۹ الباب السابع فی المصارف) [1]

عباسی خاندان مصرفِ زکوٰۃ نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا تعلق عباسی خاندان سے ہے، کیا میں عباسی خاندان کے مساکین ویتامیٰ کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں، یا کوئی ایسا شخص جو عباسی نہ ہو وہ عباسی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عباسی فقیر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ آلِ عباس آلِ ہاشم سے ہیں اور آلِ ہاشم مصرفِ زکوٰۃ نہیں، خواہ زکوٰۃ دینے والا عباسی ہو یا کوئی دوسرا۔

لما فی الھندیۃ: ولا یدفع الیٰ بنی ھاشم وھم آلِ علیؓ وآلِ عباسؓ وآلِ جعفرؓ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: قولہ وبنی ھاشم وموالیھم ای لایجوز الدفع لھم لحدیث البخاری نحن اھل بیت لاتحل لنا الصدقۃ ولحدیث ابی داؤد مولی القوم من انفسھم وانا لاتحل لنا الصدقۃ اطلق فی بنی ھاشم فشمل فان کان ناصراً للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن لم یکن ناصراً لہٗ منھم کولد ابی لھب فیدخل من اسلم منھم فی حرمۃ الصدقۃ لکونہ ھاشمیاً...... (وا ما ابولھب وابناہ) وروی حدیثا لا قرابۃ بینی وبین ابی لھب ونص فی البدائع علی ان الکرخی قید بنی ھاشم بالخمسۃ الخ

(البحرالرائق ج۲ ص۲۴۶ باب المصرف)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۷۳ باب المصرف۔

وآلِ عقیلؓ وآل الحارث بن عبد المطلب کذا فی الهدایة۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ الباب السابع فی المصارف) ؎۱

فقیر دائن کو زکوٰۃ لینا جائز ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید فی الحال مسکین ہے لیکن اس کا عمرو پر اتنا قرضہ ہے کہ اگر وہ وصول ہوجائے تو زید صاحب نصاب بن جاتا ہے لیکن عمرو بھی مسکین ہے اور قرضہ ادا کرنے سے قاصر ہے، تو کیا زید کو زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس صورت میں زید کا حکم ابن السبیل جیسا ہے کہ اگرچہ وہ صاحب نصاب ہے لیکن اس کے ہاتھ میں وہ مال موجود نہیں لہٰذا ایسے مقروض کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور اس کو زکوٰۃ دینے سے فریضہ بھی ساقط ہوجائے گا۔

لما فی الهندیة: وان کان الدّین غیر مؤجل فان کان من علیه الدین معسرًا یجوز له اخذ الزکوٰة فی اصح الاقاویل لانه بمنزلة ابن السبیل۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ الباب السابع فی المصارف ومنها الغارم) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: والخمسة المذکورون من بنی هاشم لان العباس والحارث عمان للنبی صلی الله علیه وسلم وجعفر وعقیل اُخوان لعلیّ رضی الله عنه بن ابی طالب وهو ابن عم النبی صلی الله علیه وسلم۔

(البحر الرائق ج۲ ص۲۴۶ باب المصرف)

ومثلهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۶۲ باب المصرف۔

؎۲ قال العلّامة ابن عابدینؒ: قوله من له مال لا معه ای سواء کان هو فی غیر وطنه او فی وطنه وله دیون لا یقدر علی اخذها کما فی النهر.......... قال والحق به کل من هو غائب عن ماله وان کان فی بلده لان الحاجة هی المعتبرة وقد وجدت لانه فقیر یدا وان کان غنیًا ظاهرًا۔

(رد المحتار علیٰ هامش الدر المختار ج۲ ص۶۲ باب المصرف)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الخانیة ج۲ ص۲۶۶ باب المصرف۔

قرضہ کو زکوٰۃ میں مجرا کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ایک شخص متعدد اہلِ نصاب کا مقروض ہے، کیا اہلِ نصاب حضرات اگر اپنا قرضہ زکوٰۃ میں مجرا کریں تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں اس طرح زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی دو صورتیں ہیں: (۱) قرض خواہ اپنی طرف سے واجب الادا رقم اس کو زکوٰۃ میں دے کر قرضے میں وصول کرے۔ (۲) مقروض کسی اور سے قرض لے کر قرض خواہ کو دیدے اور قرض خواہ اپنے قرض میں وصول کرکے مقروض کو زکوٰۃ میں واپس کر دے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: واداء الدّین عن العین وعن دین سیقبض لایجوز وحیلۃ الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکوٰتہ ثمّ یأخذھا عن دینہ ولو امتنع المدیون مدید مواخذھا لکونہ ظفر بجنس حقہ فان مانعہ دفعہ للقاضی۔ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۱۳ قبیل افتراضہا عمری)[۱]

زکوٰۃ کی رقم سے دینی مدرسہ کے لیے قرآنِ مجید خریدنا

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک دینی مدرسہ ہے جبکہ گاؤں کے اکثر لوگ غریب ہیں اور مدرسے کو اپنی مدد آپ کے تحت چلا رہے ہیں، تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے اس مدرسے کے لیے قرآن مجید اور دینی کتب خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے بدون تملیک کے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، تاہم اگر تملیک کے بعد وہ آدمی جسے زکوٰۃ دی گئی ہے اپنی طرف سے مدرسے کیلئے قرآنِ مجید اور دینی کتب خرید کر وقف کر دے تو جائز ہے۔

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: ویستفاد منہ ان رجوع المتبرع بقضاء الدین عند التصادق علی الدائن محمول علیٰ ما اذا کان بغیر امر المدیون اما اذا کان بامرہ فھو تملیک منہ فلا رجوع عند التصادق بانہ لا دین علی الدائن وانما یرجع علی المدیون وھو بعمومہ..... والحیلۃ فی الجواز فی ھٰذہ الاربعۃ ان یتصدق بمقدار زکوٰتہ علیٰ فقیر ثمّ یأمرہ بعد ذٰلک بالصرف الیٰ ھٰذہ الوجوہ الخ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف)

قال العلامة الحصکفیؒ: الحیلة ان یتصدق علی الفقیر ثم یأمرہ ان یفعل ھٰذہ الاشیاء وھل له ان یخالف امرہ لم ارہ والظاھر نعم۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۴۳ باب المصرف)

قال العلامة الحصکفیؒ: وحیلة التکفین بھا التصدق علیٰ فقیر ثم ھو یکفن فیکون الثواب لھما وکذا فی تعمیر المسجد۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۱۲ قبیل افتراضھا عمری) [۱]

سید فقیر کیلئے زکوٰة کی رقم سے کفن خریدنا

سوال:- اگر کوئی سید فقیر اور محتاج فوت ہوجائے اور اس کے پاس کفن وغیرہ کیلئے کچھ نہ ہو، تو کیا زکوٰة کی رقم سے سید فقیر کے لیے کفن خریدنا جائز ہے، اور اس سے زکوٰة کی ادائیگی ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:- زکوٰة کی ادائیگی کے لیے زکوٰة کا مال کسی نادار اور فقیر کو تملیکاً دینا ضروری ہے تکفین میت میں چونکہ تملیک کی شرط مفقود ہے لہٰذا میت کیلئے چاہے سید ہو یا غیر سید، زکوٰة کے مال سے کفن خریدنا جائز نہیں، تاہم اگر مال زکوٰة کسی فقیر کے قبضے میں دے دیا جائے اور وہ اپنی طرف سے میت کے لیے کفن خرید کر اس کو پہنا دے تو زکوٰة بھی ادا ہوجائے گی اور فقیر کو بھی صدقے کا ثواب ملے گا۔

قال الحصکفیؒ: وحیلة التکفین بھا التصدق علیٰ فقیر ثم ھو یکفن فیکون الثواب لھما وکذا فی تعمیر المسجد وتمامه فی حیل الاشباہ۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۱۲ کتاب الزکوٰة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: والحیلة فی الجواز فی ھٰذہ الاربعة ان یتصدق بمقدار زکوٰته علیٰ فقیر ثم یأمرہ بعد ذٰلك بالصرف الیٰ ھٰذہ الوجوہ فیکون لصاحب المال ثواب الزکوٰة وللفقیر ثواب ھٰذہ القرب۔ کذا فی المحیط۔
(البحرالرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف)

[۲] قال العلامة ابن نجیمؒ: والحیلة فی الجواز فی ھٰذہ الاربعة ان یتصدق بمقدار زکوٰته علیٰ فقیر ثم یأمرہ بعد ذٰلك بالصرف الیٰ ھٰذہ الوجوہ فیکون لصاحب المال ثواب الزکوٰة وللفقیر ثواب ھٰذہ القرب، کذا فی المحیط۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۴۳ باب المصرف)

زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کا فقہی جائزہ اور ترامیم وتجاویز

سابق صدر پاکستان اور بری فوج کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں جب زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے اجراء کا فیصلہ کیا اور رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے اسے مشتہر کیا تو مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے جید اور مقتدر علماء کرام نے اس آرڈیننس کا جائزہ لیا اور چند خامیوں کو دور کرنے اور اسے عملی طور پر مؤثر بنانے کے لئے حکومت کو اپنی طرف سے ترامیم وتجاویز پیش کیں۔ اس بورڈ میں جو علماء شامل تھے اُن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔

(۲) فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی دارالافتاء ناظم آباد کراچی۔

(۳) مفتئ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسنؒ دارالافتاء بنوری ٹاؤن کراچی

(۴) شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نائب رئیس دارالعلوم کراچی

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رئیس دارالعلوم کراچی

(۶) حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر مہتمم جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

(۷) شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمودؒ دارالعلوم کراچی

(۸) حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی دارالافتاء دارالعلوم کراچی

ان تجاویز وترامیم کو فقہی مباحث سے مناسبت کی بناء پر فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مُرتب)

صدر پاکستان کی طرف سے جاری کردہ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کا

فقہی جائزہ اور ترامیم وتجاویز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

حال ہی میں حکومتِ پاکستان نے سرکاری سطح پر زکوٰۃ اور عُشر کی وصولی اور تقسیم کے لیے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے جس کے ذریعے مسلمانوں پر واجب الاداء زکوٰۃ کا ایک حصہ حکومت وصول کرکے اس کی تقسیم کا انتظام کرے گی۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری ہے اور اگر حکومت یہ انتظام ٹھیک ٹھیک شرعی احکام کے مطابق قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یہ نفاذِ شریعت کی طرف ایک نہایت مثبت قدم ہوگا اور انشاء اللہ اس ملک کے مسلمان اس کی دنیوی اور اُخروی برکات سے بہرہ ور ہوسکیں گے، لیکن اس نظام کو سرکاری سطح پر جاری کرتے وقت حکومت کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ اسلامی معیشت کے قیام کے لیے جتنا ضروری اور اہم ہے اتنا ہی نازک اور توجہ طلب بھی ہے۔ زکوٰۃ دوسرے محاصل یا ٹیکسوں کی طرح کوئی ٹیکس نہیں ہے بلکہ یہ وہ عظیم الشان عبادت ہے جو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن قرار دی گئی ہے[1] لہٰذا اس میں عبادت اور اطاعتِ خداوندی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

---

[1] عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بُنی الاسلام علیٰ خمس شہادۃ ان لآ الٰہ الا اللّٰہ وان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۲ کتاب الایمان۔ الفصل الاول)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قدموا الزکوٰۃ علیہ اقتداءً بکتاب اللّٰہ ... ولانہا افضل العبادات بعد الصلوٰۃ قہستانی۔ (ردّ المحتار علیٰ ہامش الدر المختار ج ۲ ص ۲ کتاب الزکاۃ)

حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اپنے ذمے لے کر ایک ایسی گرانبار اور نازک ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہے جو اس کے دینی جذبے، اس کے خلاص اور اس کے حسن انتظام کے لیے ایک زبردست آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں حکومت کو ایک طرف تو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کسی مسلمان کے ساتھ زکوٰۃ کی وصولی میں کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے اور جتنی رقم اس کے ذمے شرعاً واجب الاداء ہے اس سے ایک پائی بھی زائد وصول نہ ہو کیونکہ حدیث پاک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: المعتدی فی الصدقۃ کمانعہا[1] یعنی زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسا ہی گنہگار ہے جیسے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا۔

اور دوسری طرف اس بات پر کڑی نظر رکھنی ہوگی کہ زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی یہ مقدس رقوم ٹھیک شریعت کے مطابق اس کے صحیح مستحقین تک پہنچیں اور اس میں کوئی خیانت، خورد برد، بدعنوانی یا شرعی احکام سے تجاوز نہ ہونے پائے، زکوٰۃ کے تقدس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے مصارف کا تعین انبیاء علیہم السلام پر بھی نہیں چھوڑا بلکہ اسے بذات خود قرآن کریم میں متعین فرما دیا ہے[2] چنانچہ جب تک زکوٰۃ کو ان مصارف پر صحیح طور سے خرچ کرنے کا اطمینان بخش انتظام نہ ہوجائے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم دونوں کا نظام صحیح طور سے مقرر کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ اس کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا جس کی برکات انشاء اللہ کھلی آنکھوں محسوس ہوں گی۔

اگر خدانخواستہ زکوٰۃ کی ان مقدس رقوم کو مستحقین تک پہنچانے کا انتظام صحیح نہ ہوسکا تو کروڑوں مسلمانوں کی عبادت خراب ہونے کا وبال بھی دنیا و آخرت میں بڑا سنگین ہوسکتا ہے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو اس کڑی آزمائش میں پورا

---

[1] عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المعتدی فی الصدقۃ کمانعہا، رواہ ابوداؤد والترمذی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۵۹ باب ما یجب فیہ الزکوٰۃ۔ الفصل الثانی)

[2] قال اللہ تعالیٰ: انما الصدقات للفقراء والمساکین العاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل۔ (سورۃ التوبۃ آیت ۶۰)

اترنے کی توفیق کامل عطا فرمائے اور اس نازک مرحلے کو اس کے لیے آسان فرمائے۔ آمین

اس مقصد کے حصول کے لیے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ زکوٰۃ وعشر کا جو قانون نافذ کیا گیا ہے وہ شرعی اعتبار سے درست ہو اور اس میں شرعی لحاظ سے کوئی سقم باقی نہ رہے اور دوسرا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اس قانون کے مطابق عمل درست ہو، جہاں تک قانون کا تعلق ہے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے اجلاس میں حالیہ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر غور کیا گیا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل تبصرہ اتفاق رائے کے ساتھ منظور کیا گیا۔

(۱) نصاب زکوٰۃ | اس آرڈیننس کی سب سے زیادہ سنگین غلطی یہ ہے کہ اس میں ہر اس شخص پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم کر دی گئی ہے جس کے بینک اکاؤنٹ میں زکوٰۃ منہا کرنے کے دن ایک ہزار روپے سے زائد رقم جمع ہو، اور بینکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی اداروں میں یہ ایک ہزار روپے کی قید بھی نہیں ہے بلکہ ان اثاثوں کے حامل افراد کو ان کے اثاثوں کی مالیت کا لحاظ کئے بغیر لازمی طور پر زکوٰۃ کا مستوجب قرار دے دیا گیا ہے، یہ شرعی لحاظ سے انتہائی سنگین غلطی ہے اور عملاً اس قانون سے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی ہو سکتی ہے کہ ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے باوجود ان سے زکوٰۃ وصول کر لی جائے، حالانکہ شریعت کی رو سے زکوٰۃ صرف اس شخص پر فرض ہے جو نصاب[۱] یعنی ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی یا اتنی مالیت کی نقدی، سونے یا مالِ تجارت کا مالک ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کی ملکیت میں ہو، البتہ اگر کسی شخص کے پاس سونے کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ ہو تو اس کا نصاب ۲/۱ ۷ تولہ سونا ہے[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین: قوله نصاب هو ما نصبه الشارع علامة علی وجوب الزکوٰة من المقادیر۔ (رد المحتار علی هامش الدر المختار ج۲ ص۵ کتاب الزکوٰة)

[۲] قال العلامة الحصکفی: نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم کل عشرة دراهم وزن سبعة مثاقیل...... فی غرض تجارة قیمته نصاب۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۳۱ باب زکوٰة المال)

پھر اگرچہ شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر رقم پر علیحدہ سال پورا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ سارے سال کم از کم بقدر نصاب مالیت کا مالک رہا ہو،[1] آرڈیننس میں زکوٰۃ کی ان بنیادی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لہٰذا اگر نظام زکوٰۃ کو واقعۃً شرعی اصولوں کے مطابق قائم کرنا ہے تو آرڈیننس میں ایسی ترمیم ناگزیر ہے جس کی رُو سے زکوٰۃ صرف انہی افراد سے وصول کی جا سکے جن کے ذمے شرعاً زکوٰۃ فرض ہے[2] اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ دفعہ ۲، ذیل: ۲۳ میں "صاحبِ نصاب" کی جو تعریف لکھی گئی ہے یعنی:

"صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کے ذمے اس آرڈیننس کی رُو سے زکوٰۃ واجب الادا ہو"

اسے تبدیل کر کے "صاحبِ نصاب" کی تعریف اس طرح کی جائے:۔

"صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو"[3]

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رح، قوله لحولانه عليه اى لان حولان الحول على النصاب شرط لكونه سببًا وهذا اعلته للنسبة وسمى الحول حولاً لان الاموال تتحول فيه اولانه يتحول من فصل الى فصل من فصوله الاربع - (ردّ المحتار على هامش الدر المختار ج ۲ ص۵ مطلب الفرق بين السبب والشرط والعلّة)

[2] عن ابى سعيد الخدرى رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس فيما دون خمسة اوسق من التمر صدقة وليس فيما دون خمس اواق من الصدق صدقة وليس فيما دون خمس الخ - (مشكوٰة المصابيح ج ۱ ص۱۵۸ باب ما يجب فيه الزكوٰة)

[3] قال العلامة الحصكفى رحمه الله، نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم كل عشرة دراهم وزن سبعة مثاقيل ..... فى عرض تجارة قيمة نصاب - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۲ ص۳۱ باب زكوٰة المال)

پھر ہر سال تاریخ زکوٰۃ سے پہلے ۲/۱ ۵۲ تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس قیمت کو وصولیٔ زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

(۲) سال گذرنے کا مسئلہ

زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مقدارِ نصاب پر پورا سال گذر چکا ہو۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ صاحبِ نصاب بن جائے اور سارا سال صاحبِ نصاب رہے تو سال کے اختتام پر جتنی بھی رقم اس کی ملکیت میں ہوگی اُس ساری رقم پر شرعاً زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے خواہ اس رقم کا کچھ حصہ ایک دن پہلے ہی اس کی ملکیت میں آیا ہو، لہٰذا ہر ہر رقم پر تو سال گذرنا ضروری نہیں ہے لیکن مقدارِ نصاب کا پورے سال ملکیت میں رہنا ضروری ہے[۲]

موجودہ آرڈیننس کے تحت ایسی صورتیں عملاً ممکن ہیں کہ جس تاریخ میں کسی شخص کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع کی جائے اس سے صرف چند روز پہلے ہی وہ صاحبِ نصاب بنا ہو تو ایسی صورت میں اس سال ایسے شخص سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنا شرعاً درست نہیں ہے[۳] لہٰذا آرڈیننس میں ایسی گنجائش موجود ہونی چاہیئے کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ اسے مقدارِ نصاب کا مالک بنے ہوئے سال پورا نہیں ہوا تو اس کی زکوٰۃ وضع نہ کی جائے[۴]

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: مقوّماً باحدهما ان استویا فلو احدهما اروج تعین التقویم به ولو بلغ باحدهما نصاباً دون الآخر تعیّن ما یبلغ به الخ

(الدر المختار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۲ ص۳۴ باب زکوٰة المال)

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: والمستفاد ولو بهبة او ارث وسط الحول یضم الیٰ نصاب من جنسه فیزکیه بحول الاصل۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردالمحتار ج۲ ص۲۵ باب زکوٰة الغنم)

[۳] قال العلامة ابن عابدینؒ: فمن انکر تمام الحول ای علیٰ ما فی یده وعلیٰ ما فی بیته فلو کان فی بیته مال آخر قد حال علیه الحول وما مر به لم یحل علیه الحول واتحد الجنس فان العاشر لا یلتفت الیه لوجوب الضم فی متحد الجنس الا لما تبع بحر۔

(ردالمحتار علیٰ هامش الدر المختار ج۲ ص۴۳ باب العاشر)

[۴] قال العلامة الحصکفیؒ: وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی۔

(الدر المختار علیٰ هامش ردالمحتار ج۲ ص۲ مطلب الفرق بین السبب والشرط والعلة)

(۳) قرضوں کا مسئلہ | آرڈیننس میں قرضہ جات کو قابل زکوٰۃ مالیت سے منہا کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، اس سلسلے میں فقہائے امت کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر طرح کے قرضے منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے [۱] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قدیم بھی یہی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرضے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ سے مانع ہیں اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ سے نہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قولِ جدید یہ ہے کہ کسی بھی طرح کا قرض زکوٰۃ سے منہا نہیں ہوگا۔[۲] ملاحظہ ہو (المجموع شرح المہذب ج۵ ص۳۱۴/۳۱۳)

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو زکوٰۃ آرڈیننس کے جس مسودے کو رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا تھا اس میں بھی قرضوں کی منہائی کی گنجائش موجود تھی اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" نے اس وقت بھی یہی رائے پیش کی تھی۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ "بینات" ص۸ جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ)

لہٰذا مجلس کی رائے میں نصاب، حولانِ حول اور قرضوں کے بارے میں مذکورہ بالا تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے آرڈیننس کی دفعہ ۳ مجوزہ ترمیم کے بعد اس طرح ہونی چاہیئے:۔

> "آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحب نصاب شخص سے شیڈول ۱ میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سال زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی، شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ "تاریخ زکوٰۃ کے دن اس کی قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گذرا" اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔ مزید شرط یہ ہے کہ "جو شخص یہ ثابت کر دے کہ وہ مقروض ہے اور

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفی رح: فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۵ کتاب الزکوٰۃ)

[۲] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رح، ومن کان علیه دین یحیط بماله فلا زکوٰۃ علیه۔ وقال الشافعی رح یجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام۔
(الهدایة ج۱ ص۱۶۸ کتاب الزکوٰۃ)

اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا، تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔"

(۴) اموالِ ظاہرہ و باطنہ بینک اکاؤنٹس اور دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ منہا کرنے پر ایک علمی اشکال یہ ہے کہ فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق حکومت کو اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے اموالِ باطنہ سے نہیں [1]۔

عام طور پر فقہاء نے مفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں، کھیتوں اور باغات کی پیداوار اور اس مالِ تجارت کو جو شہر سے باہر لے جایا جا رہا ہو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا ہے اور نقدی، زیورات وغیرہ باقی تمام قابلِ زکوٰۃ اموال کو اموالِ باطنہ قرار دیا ہے، بینک اکاؤنٹس چونکہ بصورتِ نقد ہوتے ہیں اس لیے علمی طور پر یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟ تو اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ موجودہ دور میں بینک اکاؤنٹس کو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے [2]۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ و باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی بلکہ دونوں قسم

---

[1] قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: ان مال الزکوٰة نوعان ظاهر وهو المواشی والمال الذی یمر به التاجر علی العاشر وباطن وهو الذهب والفضة واموال التجارة فی مواضعها اما الظاهر فللامام ونوابه وهم المصدقون من السعاة والعشار ولایة الاخذ الخ قال بخلاف الاموال الباطنة۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۲۳۱ باب العاشر)

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ليأخذ الصدقات..... من التجار المارين باموالهم الظاهرة والباطنة عليه۔ قال ابن عابدین ومراده ههنا بالباطنة ما عدا المواشی بقرينة قوله المارين باموالهم۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۴۲ مطلب ما ورد فی ذم العشار)

کے اموال سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب قابلِ زکوٰۃ اموال کی کثرت ہوگئی اور آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر عاملینِ زکوٰۃ لوگوں کے گھروں اور دوکانوں میں پہنچکر ان کی املاک کی چھان بین کریں گے تو اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی اور اس سے ان کے مکانات، دوکانوں، گوداموں اور محفوظ شخصی مقامات کی نجی حیثیت مجروح ہوگی، تو آپؓ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صرف اُن اموال کی زکوٰۃ حکومت کی سطح پر وصول کی جائے جن کی زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مضرت لاحق نہ ہو اور جس کا حساب کرنے کے لیے گھروں اور دوکانوں کی تلاشی نہ لینی پڑے۔ ایسے اموال اُس زمانے میں صرف دو قسم کے تھے یعنی "مویشی اور زرعی پیداوار"۔ چنانچہ صرف ان کی زکوٰۃ آپؓ نے سرکاری سطح پر وصول کرنے کا اعلان فرمادیا اور باقی اموال کو باطنہ قرار دے کر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود مالکان کی ذمہ داری قرار دے دی۔

بعد میں جب حضرت عمرو بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا دور آیا تو انہوں نے شہروں کے باہر ایسی چوکیاں مقرر فرمادیں کہ جب کوئی شخص مالِ تجارت لے کر وہاں سے گذرے تو اس سے وہیں زکوٰۃ وصول کرلی جائے، اس مقام پر شہر سے باہر جانے والے مالِ تجارت کو بھی اموالِ ظاہرہ میں شمار کرلیا گیا، کیونکہ حکومت کو اس کی زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کا حساب کرنے کے لیے مالکان کے گھروں، دوکانوں اور نجی مقامات کی تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کی وضاحت کے لیے حضرات فقہاء کرام کی تصریحات مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

ظاهر قوله تعالىٰ "خذ من اموالهم صدقة" (الآية) توجب اخذ الزكوٰة مطلقاً للامام، وعلى هٰذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده فلما ولى عثمان رضى الله عنه وظهر تغير الناس كره ان يفتش السعاة على الناس مستور اموالهم ففوض الدفع الى الملاك نيابة عنه ولم يختلف الصحابة فى ذٰلك عليه وهٰذا لا يسقط طلب بها۔ (فتح القدير ج ۱ ص۴۸۷ كتاب الزكوٰة)

(۲) اور امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :-

وقوله تعالىٰ: "خذ من اموالهم صدقة" (الآية) يدل على ان اخذ الصدقات

الی الامام وانہ متی أداها من وجبت علیه الی المساکین لم یجزہ لان حق الامام قائم فی اخذها فلا سبیل الیٰ اسقاطه وقد کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یوجه العمال علی صدقات المواشی ویأمرهم بان یاخذوا علی المیاہ فی مواضعها۔

آگے تحریر فرماتے ہیں :۔

اما زکوٰۃ الاموال فقد کانت تحمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وابی بکر وعمر وعثمان ثم خطب عثمان فقال هذا شهر زکوٰتکم فمن کان علیه دین فلیؤدہ ثم لیزک بقیة ماله فجعل لهم اداءها الی المساکین وسقط من اجل ذٰلک حق الامام فی اخذها لانه عقد عقدہ امام من ائمة العدل فهو نافذ علی الامة لقوله علیه السلام علیهم او لهم و لم یبلغنا انه بعث سعاۃ علیٰ زکوٰۃ الاموال کما بعثهم علی صدقات المواشی والثمار فی ذٰلک لان سائر الاموال غیر ظاهرۃ للامام وانما تکون مخبوۃ فی الدور والحوانیت والمواضع الحریزۃ ولم یکن جائزاً للسعاۃ دخول احرازهم ولم یجز أن یکلفوهم احضارها...... ولما ظهرت هٰذہ الاموال عند التصرف بها فی البلدان اشبهت المواشی فنصب علیها عمال یاخذون منها ما وجب من الزکوٰۃ ولذٰلک کتب عمر بن عبد العزیز الیٰ عماله ان یاخذ وا ممامر به المسلم من التجارات عن کل عشرین دیناراً نصف دینار۔

(احکام القرآن ج ۳ ص۱۵۵ مطبوعه استنبول ۱۳۳۵ھ)

(۳) اور فقہ حنفی کی معروف کتاب "الاختیار" میں ہے :۔

لان الاخذ کان للامام وعثمان رضی اللہ عنه فوضه الی الملاک وذٰلک لا یسقط حق طلب الامام حتی علم ان اهل بلدۃ لا یؤدون زکاتهم طالبهم بها ولو مر بها علی الساعی کان له اخذها۔ (الاختیار ج ۱ ص۱۰۰ کتاب الزکوٰۃ)

(۴) اور علامہ برہان الدین المرغینانی تحریر فرماتے ہیں :۔

ومن مرّ علی عاشر بمائة درهم واخبرہ ان له فی منزله مائة اخری وقد حال علیها الحول لم یزک التی مرّ بها لقلته۔ وما فی بیته لم ید خل تحت حمایته۔ (الهدایة ج ۱ ص۱۸۱ باب من یمرّ علی العاشر)

فقہاء کرام کی مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ نقد روپیہ اور سامانِ تجارت

اُس وقت تک اموالِ باطنہ رہتے ہیں جب تک وہ پوشیدہ نجی مقامات پر مالکان کے زیرِ حفاظت ہو، ایسے اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے میں چونکہ ان نجی مقامات میں دخل اندازی کرنی پڑتی ہے اسلئے انہیں حکومت کی وصولیابی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، لیکن جب یہی اموال مالکان ان نجی مقامات سے نکال کر باہر لے آئیں اور وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں تو وہ اموالِ ظاہرہ کے حکم میں آجاتے ہیں [1] اور حکومت کو ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، گویا کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار ہونے کے لیے دو بنیادی امور ضروری ہیں :۔

ایک یہ کہ وہ ایسے نجی مقامات پر رکھے ہوئے نہ ہوں جہاں سے ان کا حساب کرنے کے لیے نجی مقامات کی تفتیش کرنی پڑے۔ کما فی العبارۃ الاولیٰ والثانیۃ۔

اور دوسرے یہ کہ وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں۔ کما فی العبارۃ الرابعۃ۔

اگر اس معیار پر موجودہ بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیا جائے تو ان میں یہ دونوں باتیں پوری طرح موجود ہیں۔ ایک طرف تو یہ وہ اموال ہیں جنہیں ان کے مالکان نے اپنی حرزِ احفاظت سے نکال کر خود حکومت پر ظاہر کردیا ہے اور ان کے حسابات میں نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے، دوسری یہ حکومت کے زیرِ حمایت ہی نہیں بلکہ زیرِ ضمانت آچکے ہیں، بالخصوص جب بینک سرکاری ملکیت میں ہوں اور ان کو جو سرکاری تحفظ حاصل ہے وہ عاشر پر گذرنے والے اموال کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس لیے مجلس کی رائے یہ ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھے ہوئے اموال، اموالِ ظاہرہ کے حکم میں ہیں اور حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے۔

اور اگر بالفرض انہیں یا ان میں سے بعض کو اموالِ باطنہ ہی قرار دیا جائے تب بھی

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رح: نصبہُ الامام علی الطریق ..... لیاخذ الصدقات .... من التجار ...... المارین باموالہم الظاھرۃ والباطنۃ علیہ - قال ابن عابدین رح: ومرادہ ھنا بالباطنۃ ماعدا المواشی بقرینۃ قولہ المارین باموالہم والا فکل مامربہ علی العاشر فھو من نوع ظاھر وسماھا باطنۃ باعتبار ماکان قبل المرور۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص۴۲ مطلب ماورد فی ذم العشار)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۸۳ الباب الرابع فیمن یمر علی العاشر۔

فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ جن علاقے کے لوگ از خود زکوٰۃ ادا نہ کریں تو وہاں حکومت اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرسکتی ہے، جیسا کہ "فتح القدیر" اور "الاختیار" کی عبارتوں سے اس کی تصریح گذر چکی ہے، اور یہی مسئلہ "بدائع الصنائع جلد ۲ ص ۷" میں بھی موجود ہے۔

(۵) زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ | بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنے کے بارے میں ایک دوسرا علمی اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور دوسری عبادتوں کی طرح اس کی ادائیگی میں بھی نیت ضروری ہے لیکن جب مذکورہ اداروں سے جبراً زکوٰۃ وضع کی جائے گی تو اس میں مالکان کی طرف سے شاید نیت نہ ہوسکے؟

لیکن فقہاء کرام کی تصریحات میں اس اشکال کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہو جاتا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

وفی مختصر الکرخیؒ اذا اخذها الامام کرها فوضعها موضعها اجزاء لان له ولایة اخذ الصدقات فقام اخذه مقام دفع المالك وفی القنیة فیه اشکال لان النیة فیه شرط ولم توجد منه اه قلت: قول الکرخیؒ فقام اخذه الخ یصلح للجواب تامل۔ (رد المحتار حاشیہ الدر المختار ج ۲ ص ۲۷ مطلب فیما لو صادر السلطان)

(۶) بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی حیثیت | بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر تیسرا شبہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینکوں میں جو رقوم جمع کرائی جاتی ہیں وہ فقہی اعتبار سے قرض کے حکم میں ہیں اور مقروض کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ قرض خواہ کی رقم سے زکوٰۃ وضع کرلے۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض بن جانے کے بعد تو یہ اموال مضمون ہونے کی بناء پر اور زیادہ سرکاری تحفظ میں آگئے ہیں اس لیے قرض ہونے سے حکومت کے وصولی زکوٰۃ کے حق پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا، یہ بلا شک وشبہ دَینِ قوی ہے جس پر بالاتفاق زکوٰۃ فرض ہے اور بینکوں کے سرکاری ملکیت ہونے کی وجہ سے یہ رقوم حکومت کے صرف علم ہی میں نہیں بلکہ اس کے قبضے اور ضمانت میں آجاتی ہیں، اسلئے اگر حکومت ولایتِ عامہ کی بناء پر ان سے زکوٰۃ وضع کرلے تو اس کو کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

(۷) محتاط طریقہ | لیکن مجلس یہ سمجھتی ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا محتاط طریقہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص ان اداروں میں اپنی رقم رکھوانے کے لیے آئے تو وہ ایک فارم پُر کرے جس میں اس کی طرف سے متعلقہ ادارے کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ تاریخ زکوٰۃ آنے پر اس کی رقم سے زکوٰۃ منہا کرکے زکوٰۃ فنڈ کو دے دے۔ اس طرح یہ ادارے مالکان کی طرف سے باقاعدہ وکیل بادا الزکوٰۃ بن جائیں گے اور پھر اس میں نہ اموالِ باطنہ کی بنیاد پر کوئی اشکال باقی رہے گا نہ نیت کی بنیاد پر اور نہ اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی بنیاد پر۔

(۸) سُودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ | بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک اور خلجان بعض ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ یہ تو سُودی اکاؤنٹس ہیں اور سود اور زکوٰۃ دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں سودی کاروبار کا وجود اس کے ماتھے پر کلنک کا شرمناک ٹیکہ ہے اور بالخصوص زکوٰۃ کا نظام جاری کرنے کے بعد اس حرام وناپاک ذریعۂ آمدنی کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے لہٰذا یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بعجلتِ ممکنہ مسلمانوں کو سودی نظام کی اس لعنت سے نجات دلائے۔ لیکن جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے فقہی اعتبار سے اگر کسی شخص کی آمدنی حرام و حلال سے مخلوط ہو اور وہ مجموعے پر سے زکوٰۃ نکال دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں[۱] فرق صرف اتنا ہے کہ حلال آمدنی کا ڈھائی فیصد شرعاً زکوٰۃ ہوگا اور حرام آمدنی کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ نہیں ہوگا بلکہ وہ صدقہ سمجھا جائے گا، جو حرام آمدنی سے جان چھڑانے کی غرض سے کیا جاتا ہے، اصل شرعی حکم یہ ہے کہ سود لینا حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص سُود وصول کرے تو وہ سارے کا سارا

---

[۱] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: اما اذا اخذ من انسان مائۃ ومن آخر مائۃ وخلطہا ثم تصدق لا یکفر لانہ لیس بحرام بعینہ۔ قال ابن عابدینؒ بان المراد لیس ھو نفس الحرام لانہ ملکہ بالخلط۔

{ الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۲۸، ۲۹
مطلب فی التصدق من المال الحرام }

واجب التصدق ہے [1] اب اگر حکومت نے اس میں سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ فنڈ میں دیدیا ہے (جبکہ زکوٰۃ فنڈ میں صدقاتِ نافلہ اور عطیات بھی شامل ہیں) تو مالکان پر شرعاً واجب ہے کہ باقیماندہ سود بھی چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے صدقہ کریں نہ یہ کہ اس کی بنیاد پر اصل مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہ کریں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے ایک ہزار روپے بنک میں جمع ہیں اور اس پر ۱۰۰ سو روپے سود کا اضافہ ہو گیا ہے تو حکومت پورے گیارہ سو روپے پر ڈھائی فیصد کے حساب سے ساڑھے ستائیس روپے وصول کرے گی، ان ساڑھے ستائیس روپوں میں سے پچیس روپے تو اس شخص کے اصل یعنی ایک ہزار روپے کی زکوٰۃ ہے اور ڈھائی روپے زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ سود کی جو رقم پوری کی پوری صدقہ ہونی چاہیئے تھی اس کا ایک حصہ ہے، اگر یہ بھی زکوٰۃ فنڈ میں چلا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس کا مصرف بھی فقراء ہی ہیں۔

(۹) نابالغ کی زکوٰۃ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لیے صاحبِ نصاب کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے [2] جبکہ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک نابالغ اور فاتر العقل کے مال پر بھی زکوٰۃ لازم ہے۔ آرڈیننس میں چونکہ بالغ اور نابالغ کے اکاؤنٹس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، اس لیے اس میں غالباً شافعی مسلک اختیار کیا گیا ہے اور لوگوں کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اگر ضرورت ہو تو اس کی گنجائش ہے لیکن پھر بھی حکومت کے لیے اس میں بڑی احتیاط کرنا لازم ہے۔

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: انما یکفر اذا تصدق بالحرام القطعی۔ قال ابن عابدینؒ: ای مع رجاء الثواب الناشی عن استحلالہ۔ وقال الحصکفی رحمہ اللہ: فلا زکوٰۃ کما لو کان الکل خبیثاً۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۲۸ مطلب فی تصدق من المال الحرام)

[2] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وشرط افتراضھا عقل وبلوغ واسلام وحریة۔ قال ابن عابدینؒ فلا تجب علی مجنون وصبی لانھا عبادة محضة ولیسا مخاطبین بھا۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۳ مطلب الفرق بین السبب والشرط والعلة)

(۱۰) ترکے کا مال البتہ بینک اکاؤنٹس میں بعض اموال ایسے ہو سکتے ہیں جو کسی مرحوم شخص کا ترکہ ہوں، چونکہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ساتھ ان اموال پر ورثاء کا حق ثابت ہو جاتا ہے اور ورثاء میں سے ہر ایک کا صاحب نصاب ہونا ضروری نہیں اس لیے اس مال سے بھی زکوٰۃ وصول کرنا درست نہیں ہوگا۔ [ل] لہٰذا آرڈیننس میں یہ استثناء بھی ہونا چاہیئے کہ جو شخص زکوٰۃ وضع کرنے کے دن انتقال پا چکا ہو اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

(۱۱) کمپنیاں اور شیئرز آرڈیننس میں کمپنیوں کو بھی صاحب نصاب قرار دیا گیا ہے اور کمپنیوں کے حصص کو بھی شیڈول ۱ میں درج کر کے ان سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کمپنی کے بینک اکاؤنٹس سے بحیثیت فرد قانونی الگ زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کمپنی کے حصہ داروں سے ان کے حصص پر الگ زکوٰۃ وصول ہوگی، اگر واقعہ یہی ہے تو یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ایک ہی مال سے سال میں دو مرتبہ زکوٰۃ وصول ہونے کا احتمال ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔ لہٰذا اگر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصول کی جا رہی ہے تو حصہ داروں الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، اور اگر حصہ داروں سے وصول کی جارہی ہے تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں سے مجلس کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ حصص پر وصول کی جائے۔

(۱۲) عُشر بصورت نقد آرڈیننس میں عُشر کا بھی ایک حصہ لازماً وصول کرنے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مثلاً بارانی زمینوں کی پیداوار کا پانچ فیصد، ہر قسم کی زمینوں میں کاشتکار کا حصہ وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ ان پر شرعاً عُشر واجب ہے جسے مالکان اپنے طور پر ادا کریں گے۔ اس حکم میں شرعاً کوئی خرابی نہیں، البتہ آرڈیننس کی دفعہ ۵ ذیل ۵ میں صراحت کی گئی ہے کہ عُشر بصورتِ نقد وصول کیا جائے گا، صرف گندم اور دھان کے بارے میں یہ

[ل] قال العلامة الحصکفی رح: ولذا لا یؤخذ العُشر من الوصی اذا قال هذا مال الیتیم۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص ۴۷ قبیل باب الرکاز)

استثناء رکھا گیا ہے کہ اگر صوبائی کونسل چاہے تو اسے بصورتِ جنس وصول کرے۔
مجلس کی رائے میں یہ حصہ بھی لائقِ ترمیم ہے کیونکہ شرعاً عشر کو بصورتِ نقد ادا کرنا لازم نہیں بلکہ شریعت نے اس میں مالکِ پیداوار کی سہولت کو ملحوظ رکھا ہے[1] لہٰذا یہ پابندی ختم کر کے اس معاملے کو مالکِ پیداوار کی صوابدید پر چھوڑنا چاہیئے۔

(۱۳) چوتھائی پیداوار کا عشر سے استثناء | آرڈیننس میں زرعی پیداوار کے چوتھائی حصہ کو اخراجات کی مد میں عشر سے مستثنیٰ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگرچہ بعض ائمہ کے اقوال اس قسم کے منقول ہیں کہ چوتھائی پیداوار تک اخراجات کی مد سے مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۳ ص ۲۷۴ باب خرص التمر، لیکن حنفیہ اور اکثر فقہاء کے مسلک میں یہ چھوٹ نہیں ہے[2] لہٰذا اگر حکومت یہ چوتھائی حصہ لازمی وصولی سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرنا چاہیئے کہ اس حصہ کا عشر مالکان خود ادا کر دیں[3]۔

(۱۴) تاریخ زکوٰۃ | موجودہ آرڈیننس کے مطابق ہر سال زکوٰۃ یکم رمضان المبارک سے شروع ہو کر شعبان کے آخری دن پر ختم ہوگا، اور یہ بات اطمینان بخش ہے کہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کی تقسیم کے لیے ہجری سال کو اختیار کیا گیا ہے[4] لیکن

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ویجوز دفع القیم فی الزکوٰۃ عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر...... ولنا ان الامر بالاداء الی الفقیر ایصال للرزق الموعود الیه الخ۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۷۲ فصل فی الخیل)

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: وکل شیٔ اخرجته الارض مما فیه العُشر لا یحتسب فیه اجر العمال ونفقة البقر لان النبی علیه السلام حکم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة فلا معنیٰ لرفعها۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۸۵ باب زکوٰۃ الزروع والثمار)

[3] قال العلامة المرغینانیؒ: فی قلیل ما اخرجته الارض وکثیره العُشر سواء سقی سیحاً الخ۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۸۳ باب زکوٰۃ الزروع والثمار)

[4] قال العلامة الحصکفیؒ: وحولها ای الزکوٰۃ قمری بحر عن القنیة لا شمسی۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص ۳۰ قبیل باب زکوٰۃ المال)

مختلف اثاثوں کی قیمت لگانے کے لیے پہلے شیڈول میں مختلف تاریخیں مقرر کی گئی ہیں، یہ صورتحال شرعاً درست نہیں ہے۔ شرعی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص صاحب نصاب بن جائے تو اس کی ہر رقم کے لیے الگ سال شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے تمام اثاثوں کے لیے زکوٰۃ کے وجوب کی ایک ہی تاریخ ہوتی ہے [۱] لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام اثاثوں میں قیمت لگانے کی تاریخ (VALUTION DATE) ایک ہی رکھی جائے۔ البتہ اس قیمت کی بنیاد پر زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں (DEDUCKTION DATE) مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔

(۱۵) قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کی زکوٰۃ آرڈیننس کے شیڈول ۲ میں اشیاء کی فہرست دی گئی ہے جن پر حکومت لازماً زکوٰۃ وصول نہیں کرے گی بلکہ مالکان پر بطور خود ان کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اس فہرست میں قیمتی پتھروں اور مچھلیوں پر بھی زکوٰۃ عائد کی گئی ہے، حالانکہ ان دونوں اشیاء پر اُس وقت زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک تجارت کی نیت سے انہیں خریدا نہ گیا ہو [۲] لہٰذا ان دونوں اشیاء کو اس شیڈول سے خارج کرنا چاہئے کیونکہ بہ نیت تجارت خریداری کی صورت میں یہ "اموالِ تجارت" میں شامل ہو جائیں گے جن کا ذکر شیڈول ۲ میں موجود ہے۔

(۱۶) مصارفِ زکوٰۃ مصارفِ زکوٰۃ کے بیان میں آرڈیننس میں براہ راست فقراء کو زکوٰۃ پہنچانے کے ساتھ مختلف اداروں کے توسط سے فقراء کی

---

[۱] قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ:۔ ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول من جنسه ضمه الیه وزکوٰۃ به۔۔۔۔ لنا ان المجانسة هی العلة فی الاولاد والارباح لان عندها یتعسر التمییز فیعسر اعتبار الحول لکل مستفاد وما شرط الحول الا للتیسیر۔ (الهدایة ج ۲ ص ۱۷۵ فصل فی الخیل)

[۲] وفی الهندیة: ولا شئ فیما یستخرج من البحر کالعنبر واللؤلؤ والسمك کذا فی فتاوی قاضی خان۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۸۵ قبیل الباب السادس فی زکوٰۃ الزرع والثمار)

وقال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفاً اتفاقاً الا ان تکون للتجارة۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۱۵ قبیل باب السائمة)

امداد کا بھی ذکر ہے، اس میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ ہر صورۃ میں زکوٰۃ کی ادائیگی مستحق زکوٰۃ کو باقاعدہ مالک بنا کر کی جائے گی[1]

خلاصۂ تجاویز برائے حکومت

(۱) صاحب نصاب کی موجودہ تعریف کی جگہ حسب ذیل تعریف لکھی جائے:۔

"صاحب نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، سونا یا سامانِ تجارت ہو، یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔"

پھر ہر سال تاریخ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کیا جائے اور اس قیمت کو وصولی زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے، یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

(۲) آرڈیننس کی دفعہ ۳ میں ترمیم کر کے اس کو اس طرح بنایا جائے:۔

"آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحب نصاب شخص سے شیڈول ۱ میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سال زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔"

شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ تاریخ زکوٰۃ کے دن اس کی جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گذرا، تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا تو اس کے قرضے کی رقم کو قابل زکوٰۃ رقم سے منہا

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: الزكوٰة شرعاً تمليك خرج الاباحة فلو اطعم يتيماً ناويا الزكوٰة لايجزيه الا اذا دُفع اليه المطعوم۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۲ ص۲ كتاب الزكوٰة)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۱ كتاب الزكوٰة۔

کیا جائے گا۔

مزید شرط یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں باضابطہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ذریعے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخ میں انتقال پا چکا تھا تو اس کے اکاؤنٹ سے بھی زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

(۳) بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں رقم رکھوانے والوں سے ایک وکالت نامہ تحریر کرایا جائے جس میں وہ متعلقہ مالی ادارے کو یہ اختیار دیں کہ تاریخ زکوٰۃ آنے پر وہ ادارہ ان کی طرف سے زکوٰۃ وضع کر کے زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرا دے۔

(۴) کمپنیوں اور ان کے حصص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے بلکہ اگر کمپنیوں سے وصول کی جا رہی ہے تو حصص پر وصول نہ ہو، اور اگر حصص پر وصول کی جا رہی ہو تو کمپنیوں پر وصول نہ ہو، ان دونوں صورتوں میں سے بہتر یہ ہے کہ حصص پر وصول کی جائے۔

(۵) عُشر کے بصورت نقد وصول کرنے کی پابندی ختم کی جائے بلکہ یہ امر مالک پیداوار پر چھوڑا جائے کہ وہ چاہے تو بصورتِ جنس ادا کرے اور چاہے تو بصورت نقد ادا کرے۔

(۶) ہر زرعی پیداوار میں سے چوتھائی حصہ جو کہ حکومت بطور منہائی اخراجات چھوڑ رہی ہے اس کے بارے میں یہ اعلان کیا جائے کہ اس حصہ کا عُشر مالکان خود ادا کریں۔

(۷) شیڈول ۱ کے تحت تمام اثاثوں کے لیے قیمت مقرر کرنے کی تاریخ (VALUATION DATE) ایک ہی مقرر کی جائے اور مختلف اثاثوں کے لیے مختلف تاریخیں نہ رکھی جائیں البتہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اثاثوں کے اسباب مختلف ہوں۔

(۸) قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کو شیڈول ۲ سے خارج کیا جائے۔

(۹) شیڈول ۲ میں مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرح بیان کرتے ہوئے پانچ سے پچیس اونٹ تک کی شرح بہت مجمل ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پانچ سے پچیس اونٹوں تک ایک اونٹ واجب ہے۔ اس کی اصلاح کر کے واضح پر یہ لکھنا چاہیئے کہ پانچ سے پچیس اونٹوں تک ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری واجب ہوگی۔

(۱۰) مصارفِ زکوٰۃ میں یہ وضاحت کی جائے کہ ہر صورت میں مستحق زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا

مالک وقابض بتایا جائے گا، اور ادارے یہ رقمیں تعمیرات اور اساتذہ کی تنخواہوں میں صرف نہیں کرسکیں گے۔

—— یہ چند تجاویز ہیں جو آرڈیننس کے فوری مطالعے سے سامنے آئیں۔ ——

ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

(۱) بندہ عبدالحق مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) ۲۴/۹/۱۴۰۰ھ
(۲) رشید احمد عفا اللہ عنہ، دارالافتاء دارالعلوم کراچی۔ ۲۱/۸/۱۴۰۰ھ
(۳) محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۲۱/۸/۱۴۰۰ھ
(۴) احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ خادم 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
(۵) (مفتی) ولی حسن دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی ۲۱/۸/۱۴۰۰ھ
(۶) عبدالرزاق اسکندر 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
(۷) بندہ سبحان محمود، دارالعلوم کراچی ۱۴
(۸) بندہ عبدالرؤف سکھروی، دارالافتاء 〃 〃

اسلامی قوانین کے نفاذ میں شیعہ سنّی تفریق تباہ کن ہے

وفاقی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۷ اور ۹ فروری ۱۹۸۳ء میں نظام عشر اور قاضی عدالتوں کے مسودوں پر مولانا سمیع الحق صاحب نے دس منٹ کے محدود وقت میں مختصر خطاب کے دوران دو اہم امور پر توجہ دلائی، مولانا کے اس خطاب کو قانون عشر و خراج کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے وفاقی مجلس شوریٰ کی رپورٹنگ سے من و عن نقل کر کے افادہ عام کیلئے قناوی میں شامل کیا جارہا ہے (مرتب)

جناب چیئرمین: مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق: نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب چیئرمین صاحب: عشر کے بارے میں ہمارے دوستوں نے نہایت فاضلانہ گفتگو کی ہے اور اس کے شرعی حیثیت سے جو نکات تھے وہ ہمارے علماء کرام نے بالتفصیل واضح کئے ہیں۔ اس محدود وقت میں مختصراً تین نکات کے بارے میں کچھ عرض کروں گا جن کی طرف بعض حضرات نے اشارہ بھی کیا ہے۔

عشر کے ساتھ خراج بھی ہے

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اراضی کے متعلق، زمینوں کے متعلق اسلام کا جو نظامِ محاصل ہے وہ دو چیزوں سے عبارت ہے، عشر اور خراج۔ تو ہم اس سمت میں جب قدم اٹھا رہے ہیں اور یہ ایک نہایت قابلِ تحسین قدم ہے، انشاء اللہ اس راستے میں جو خامیاں اور رکاوٹیں ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی، لیکن ہم نے نظام عشر کے ساتھ ساتھ خراج کے نظام کو بالکل یکسر نظرانداز کر دیا ہے، خراج معنیٰ یہ ہے کہ جو اراضی غیر مسلموں کی ہیں اُن پر بھی عُشر کی طرح ایک خاص شرح سے ٹیکس لگایا جائے، عشر تو عبادات میں شامل ہے اور غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے محاصل کو ہم عشر نہیں کہہ سکتے، لیکن اسلام کی نظر میں ایک اسلامی مملکت کے تمام شہری حقوق کے لحاظ سے بھی برابر ہوتے ہیں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے بھی۔ زمین جب اسلامی مملکت کی کسی مسلمان کے پاس ہے یا

دیئے جائیں گے اور اس کے محاصل بھی متعین ہیں اور جہاں جہاں اس کو خرچ کیا جائے گا وہ مصارف بھی متعین ہیں۔ لہٰذا موجودہ طریقہ تو بے حد خطرناک ہے کہ جس کی سارے عالم اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی، احوالِ شخصیہ کا معاملہ الگ ہے ۔ پرسنل لاز میں ہم فقہی اختلافات کی گنجائش اور رعایت رکھیں گے لیکن جہاں مسئلہ آئے گا احوالِ عامہ اور پبلک لاز کا تو اس معاملے میں تفریق کسی جگہ بھی اختیار نہیں کی جائے گی۔ اس کے ایک خطرناک پہلو کا میں نے بجٹ کے موقع پر بھی ذکر کیا تھا۔ ہم سُنی حضرات یا شیعہ حضرات کے لیے اس طرح اپنے مسلک بدلنے کا راستہ نکالیں، مالی مفادات کی وجہ سے ایک شخص فارم میں یہ لکھے کہ میں فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہوں اور جہاں اُسے نقصان ہے وہ لکھے گا کہ میں فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہوں، اور جناب صدر صاحب نے خود ایک میٹنگ میں وعدہ کیا کہ غلط ڈیکلریشن پر سخت سزا مقرر کی جائے گی۔ مگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں ایسا ہوا کہ ہزاروں لوگوں نے غلط ڈیکلریشن دیدیئے اور سُنی نے اپنے آپ کو شیعہ لکھ دیا، تو کیا کسی ایک ڈیکلریشن کو بھی شریعت کورٹ میں چیلنج کیا گیا ہے؟ نقصان اس کا سُنیوں کو ہے جو بد قسمتی یا خوش قسمتی سے اکثریت میں ہیں لیکن وہ گھاٹے میں جا رہے ہیں، سُنی محض مالی مفادات کی خاطر ایسا کر رہے ہیں کیونکہ یہ لوگوں کی کمزوری ہے ۔ تو کوئی لکھ دیتے ہیں کہ ہم شیعہ ہیں۔ زکوٰۃ کے مسئلے میں بھی ایسا ہی ہوا، یہی فارم کل ہمارے خلاف دلیل بنیں گے کہ شیعوں کی اتنی بڑی تعداد ہے تو تم شیعہ کو سُنی اور سُنی کو شیعہ بننے کا راستہ کیوں کھولتے ہو؟ اس کو اسلامی اصطلاح میں الحاد اور زندقہ کہا جاتا ہے ۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر حکومت نے اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو خدا را ان کے اصول کے مطابق، ان کے مسلک کے مطابق، ان کی رائے کے مطابق بھی کوئی طریق کار وضع کیا جائے، ان کو کھلا نہیں چھوڑ دینا چاہیئے ۔ کمال تو یہ ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ اور مصارفِ عُشر کی تقسیم میں تو آپ نے کوئی تمیز متعین نہیں کی کہ اس میں شیعہ یا سُنی کا امتیاز کس طرح کیا جائے گا؟ لیکن لیتے تو آپ ایک خاص طبقہ (اہلسنت) سے ہیں اور تقسیم کرنے میں فراخ دلی اختیار کرتے ہیں، لینے والا خواہ شیعہ ہو یا سُنی وہ لے سکتا ہے۔

مراعات کے لیے حکومتِ عادلہ ضروری نہیں تو ذمہ داریوں کے لیے کیوں؟

ہمارے شیعہ دوست کہتے ہیں کہ جب حکومت عادلہ ہو گی تب یہ چیزیں ہم پر لازم ہونگی حکومتِ عادلہ کی یہ نرالی منطق ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ اگر دنیاوی عہدوں کیلئے، مناصب کے لیے، مراعات کے لیے حکومتِ عادلہ

کسی کافر کے پاس ہے تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ غیر مسلم کی زمین اسی طرح چھوڑ دو اور صرف مسلمانوں پر ٹیکس لگا دو یا عشر لگا دو۔ تو جو اراضی غیر مسلم حضرات اور شہریوں کے پاس ہے اس پر بھی خراج لگایا جائے اگر ہمیں اسلامی اصطلاحات سے شرم آتی ہے اور ہم احساس کمتری میں ضرورت سے زیادہ مبتلا رہتے ہیں تو ہم خراج کی بجائے اس کا نام کوئی اور بھی رکھ سکتے ہیں، لیکن خدا کی ساری زمین برابر ہے، یہ جن لوگوں کی ملکیت ہے ان میں کسی کو "مستثنیٰ" قرار دینا اور کسی کو پابند بنانا اس کی اسلامی تاریخ میں کہیں بھی مثال نہیں ملتی۔

پبلک لاء میں تفریق تباہ کن ہے اس کے علاوہ ایک دوسری بات بھی بڑے درد اور افسوس سے کہتا ہوں، اسے کوئی غلط معنی نہ پہنایا جائے جناب وزیر خزانہ صاحب نے کل بڑے مدلل جواب دیئے لیکن اس مسئلے کو انہوں نے ہلکا سمجھا اور گول مول کے انداز میں اسے چھوڑ دیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک مسلم مملکت کے مسلمان شہری ہیں تو ہمیں مکمل فکری یکجہتی اور یگانگت کی ضرورت ہے، ہماری حمزہ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی اس جانب مناسب انداز سے توجہ دلائی گئی ہے کہ عشر کے معاملے میں یا کسی بھی اسلامی قانون کے بارے میں دو طریقے اختیار کرنا اور فقہی مسائل کو راستے کی رکاوٹ سمجھ کر کچھ لوگوں کو "مستثنیٰ" قرار دیدینا، یہ چیز آگے چل کر ملک کے لیے بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ خدا کی قسم میں یہ کسی تعصب کی وجہ سے نہیں کہتا ہوں بلکہ شیعہ حضرات کی خیر خواہی میں کہتا ہوں جنہوں نے خود مجھ سے بات کی ہے، یہاں میرے بھائی نصرت علی شاہ صاحب اور کئی دوسرے حضرات بھی ہیں جنہوں نے اس وقت بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا کہ چند سیاسی طالع آزماؤں کی وجہ سے (اور وہ ہر فرقہ میں ہوتے ہیں) ملک کی گاڑی کو ایسی پٹڑی پر ڈالا جا رہا ہے جس کا انجام بالآخر انتشار و افتراق ہوگا، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ حدود آرڈیننس کے مسئلہ میں ایسے ہی ہوا اور پھر زکوٰۃ کے مسئلہ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ اگر کسی فرقہ کو ہمارے فقہی مسلک سے اختلاف ہے تو ہم بڑی فراخدلی سے اس کا خیر مقدم کریں گے، لیکن ان کے ہاں بھی ایک نظام ہے، کچھ قوانین ہیں، کچھ احکام ہیں جبکہ شریعتِ اسلامیہ نے کسی بھی فرقے کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا۔

مثلاً ہمارے شیعہ حضرات کی فقہ میں بھی چار چیزوں پر عشر ہے، گیہوں، کھجور، کشمش اور جو ہیں، ان کی فقہ میں بھی ان چار چیزوں پر عشر ہے، اور جن چیزوں پر وہ عشر کے قائل نہیں ہیں ان کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کا خمس دینا چاہیئے، ان کا عقیدہ ہے کہ سو من میں سے بیس من

ہے تو حکومت کی طرف سے جو ذمہ داریاں رعایا پر عائد ہوتی ہیں تو اس کے لیے وہ حکومت کیوں حکومتِ عادلہ نہیں سمجھی جاتی؟ تو میں کہتا ہوں کہ اس طرح بدقسمتی سے ایک چیز عوام کے دلوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ شیعہ اور سنی ہمیشہ بھائیوں کی طرح رہیں اور ملک یہ آواز نہ اٹھے اور لوگ یہ نہ کہیں کہ آج اس معاملہ میں شیعہ ہم سے جدا ہو گئے ہیں تو آخر کار سنیوں کی طرف سے بھی یہ آواز اٹھے گی کہ بھائی جب یہ الگ ہو رہے ہیں تو ہمیں بھی الگ کر دو اور انہیں بھی الگ کر دو۔ خدا نہ کرے خدا نہ کرے اگر ایسا ہو گیا تو یہ ملک و قوم کیلئے نہایت خطرناک ہوگا۔

کل جناب وزیرِ خزانہ نے کہا کہ یہ مسئلہ علماء کی افہام و تفہیم کا ہے۔ کمال یہ ہے کہ کیا علماء میں افہام و تفہیم سے ایسے احکامات لاگو ہو سکتے ہیں جو حکومت لاگو نہیں کر سکتی، علماء کیسے بیٹھ کر کیسے افہام و تفہیم کریں؟ علماء تو آپ کو کہتے ہیں کہ بھائی عشر نافذ ہی نہ کرو، آپ کے جو علماء ہیں ان کی اکثریت آپ کے خلاف ہے۔ میں آپ کو یہ حقیقت بتاؤں کہ علماء کہتے ہیں کہ عشر نافذ ہی مت کرو، زکوٰۃ مت نافذ کرو، لیکن اس مسئلے میں تو آپ علماء کو نہیں دیکھتے اور اس مسئلہ میں آپ علماء کو کہتے ہیں کہ آپس میں افہام و تفہیم پیدا کریں جو علماء کے بس کی بات نہیں۔ باہمی مفاہمت پیدا کرنا، یکجہتی کو قائم کرنا ان قوانین میں، یہ حکومت کا اولین فرض ہے اور انشاء اللہ دونوں طبقوں میں معتدل، سنجیدہ اور مخلص حضرات موجود ہیں وہ اس چیز کو گوارا نہیں کریں گے۔ تو انشاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ آپ کیلئے یہ راستہ آسان بنا دے گا ورنہ کہاں کہاں آپ یہ دو عملی اور تفریق کا سلسلہ جاری رکھیں گے؟

عشر اور نصف العشر تیسری میری گذارش یہ تھی کہ اخراجات کے سلسلے میں مسئلہ کو خواہ مخواہ الجھا دیا گیا ہے، شریعت نے خود کھیتی باڑی پر اٹھنے والے مصارف پر رعایت رکھی ہے بارانی زمینوں پر زیادہ اخراجات نہیں اٹھتے اسلئے اس پر عشر یعنی دسواں حصہ اور نہری یا چاہی زمینوں پر نصف العشر یعنی بیسواں حصہ، یعنی عشر کی اس کو رعایت دیدی گئی ہے۔ تو یہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ اخراجات کو منہا کرنے کی کو منہا کرنے کی پوری اسلامی تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ عشر نافذ کیا گیا ہو تو اس میں اخراجات کو منہا کیا گیا ہو۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کی رعایت رکھی ہے، تو اس مسئلے کو اتنا نہ الجھایا جاتا اور عشر اور نصف العشر پہ چھوڑ دیا جاتا۔

تو جناب والا میری بنیادی بات وہ ہے جو درمیان میں میں نے کہہ دی کہ فقہی اختلافات کا یہ سلسلہ نہ ایران میں ہے نہ عراق میں، نہ مصر میں اور نہ شام میں ہے، خدا کے لیے اس سلسلے کو روکا جائے اور اس کی اب بھی تلافی کی جائے۔ شکریہ!

زکوٰۃ ——— اور متجددین
قصرِ اسلام میں شگاف کی سعی

زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ نصاب مسلمانوں پر فرض کی ہے بلکہ اس کو اسلامی عمارت کا ایک اہم ستون قرار دیا ہے۔ عصر حاضر میں بعض "روشن خیال" اور "متجددین" مثلاً ڈاکٹر فضل الرحمٰن سابق ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان، وغیرہ نے حکمرانوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے علماء اسلام، مدارسِ دینیہ اور دین کا درد رکھنے والوں کے نام ناکام مہم شروع کی تھی اس ضمن میں زکوٰۃ کو عبادت سے نکال کر ٹیکس قرار دینے کے لیے تحریری طور پر آغاز کر دیا گیا۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی نے اس باطل نظریئے اور متجددین کی تحریرات کا تعاقب کرتے ہوئے "قصرِ اسلام میں شگاف کی سعی" کے عنوان سے ایک جاندار مضمون لکھا جو ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا، جسے اب "فتاویٰ حقانیہ" میں افادۂ عام کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ (مرتب)

وہ ملک جو ایک طویل اور پیہم جدوجہد اور انمٹ قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں کو آگ اور خون کے طوفانوں سے گزرنا پڑا۔ ہزاروں عصمتوں کے چراغ بجھے اور لاکھوں مظلوم زندگیاں اغیار کے ہاتھوں لٹ گئیں۔ غرض مسلمان زندگی کی ہر متاع اور عمر بھر کی پونجی اس کی راہ میں لٹا کر بھی مسرور و شاداں تھے کہ ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اب اگر کوئی بدبخت اور ناعاقبت اندیش اٹھے اور اس کی بنیادوں کو ہی ڈائنامیٹ کرے، اس کی دیواروں میں شگاف ڈالے تو گیا اس کے ایسے غدارانہ حرکات کو لمحہ بھر برداشت

کیا جائے گا۔ کیا ایسا شخص قومی غدار کہلانے کا مستحق نہ ہو گا جو اس مضبوط حصار میں نقب لگا کر قومی قتل کا مجرم بنے؟

ملت حنیفیہ کی حفاظت کیلئے حضورؐ اور صحابہؓ کی قربانیاں

امت مسلمہ کا وہ مضبوط اور آہنی حصار جس کے استحکام پر نہ صرف ہماری بلکہ رہتی دنیا تک سسکتی ہوئی انسانیت کا مدار ہے اور جسے ہم اسلام اور ملت حنیفیہ کے پیارے نام سے تعبیر کرتے ہیں، کی خشت اوّل معمار اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں رکھی گئی اور تکمیل نوامیس فطرت کے سب سے بڑے علمبردار اور کامل و اکمل ہستی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ نے دن کا سکھ اور رات کا چین اس راہ میں قربان کر دیا۔ اس گھر کی تکمیل میں وہ مصیبتیں جھیلیں جو مخلوق میں سے کسی نے اس سے پہلے نہ سہیں۔ اوذیت فی اللہ مالم یوذ احداوکما قال ان کے معصوم اور پاکیزہ دل کی ہر دھڑکن، اور ہر آرزو اس حصار کے استحکام اور مضبوطی سے وابستہ رہی کہ اب قیامت تک آنے والی مخلوق کی حقیقی فلاح و بقا اس "خدائی قلعہ" کی مضبوطی سے وابستہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقدس صحابہ سمیت اپنی زندگی، مال و جان، عزت و آبرو، گھر بار، ملک و وطن، غرض سب کچھ اسی اسلام کی حفاظت و اشاعت اور مدافعت میں قربان کر دیا اور جس وقت وہ ذات قدسی صفات اس عالم خاکی سے روپوش ہوئی تو دین کا یہ "قصر" ایک حسین و جمیل کامل و مکمل مرقع کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود تھا۔ اس میں ذرہ بھر خامی نہ تھی جس کی تکمیل و تعبیر کے لئے کسی دوسرے معمار کی ضرورت پڑے

ارکانِ خمسہ

ہر عمارت ستونوں، چھتوں اور در و دیوار سے عبارت اور اپنی مضبوط اور راسخ بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی عظیم الشان عمارت بھی ان بنیادوں اور ستونوں پر قائم ہے جسے ہم ارکان خمسہ (شہادتین، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کے نام سے جانتے اور

پہچانتے ہیں اور جسے حضور اقدس ؐ نے دعائم الاسلام (اسلام کے ستون) سے تعبیر کیا۔ (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری جلد ا ص۱۲۱ بحوالہ مصنف عبدالرزاق) اگر ان بنیادی ستونوں میں سے ایک کو ہٹا دیا جائے یا ذرا ٹیڑھا کر دیا جائے تو پوری عمارت دھڑام سے گر جائے گی جو بالآخر اس کے تمام مکینوں کی تباہی اور ہلاکت پر منتج ہوگی۔ اگر کوئی خود یا منہ شخص اس عمارت کی بنیادوں پر ضرب لگاتا اور اسے اپنی جگہ سے ہلاتا ہے تو عاقبت اندیشی یہی ہے کہ اس عمارت کے تمام باشندے اٹھ کر ان ہاتھوں کو توڑ دیں جو پوری ملت کے نقصان اور تباہی کا سبب بن رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ تمام ہاتھ بھی شل کر دیئے جو پس پردہ اس "مل جوڑ" کی پشت پناہی کر رہے ہوں۔ یہ ایک بڑی اور سچی حقیقت ہے جو اسلام اور دین محمدی کی اہمیت، اس کی عظمت اور نزاکت کے بارہ میں خود حضور اقدس ؐ نے ایک سیدھی سادھی مثال سے ذہن نشین کرادی اور بار بار فرمایا جسے بے شمار صحابہ نے مختلف طرق سے نقل کیا۔

بنی الاسلام علی خمس	اسلام کا یہ عظیم الشان کارخانہ پانچ
شهادة ان لا اله الا الله وان محمداً	ستونوں پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
رسول الله واقام الصلوٰة	کی وحدانیت اور رسالت محمدی ؐ کا
وايتاء الزكوٰة والحج	اقرار نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا
وصوم رمضان۔	اور رمضان کے روزے رکھنا۔

عن عبد الله بن عمر۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی

کہیں ان ارکان کو دعائم الاسلام کہا گیا اور کہیں عماد کے لفظ سے ان کی اساسی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی۔ خود قرآن مجید کے اکثر مضامین، احکام اور اوامر و نواہی قصص و آداب امثال و مواعظ کا مرکزی نقطہ بھی یہی ارکان پنجگانہ ہیں کہ ان ہی پر دین و آخرت اور غیب کا سارا عالم استوار ہے

ارکان کا باہمی ربط و تعلق پھر نہ صرف یہ کہ اس قصر دین کی بقا ان ارکان کی مجموعی حیثیت پر موقوف ہے بلکہ یہ سارے ارکان آپس میں ایسے مربوط اور وابستہ ہیں کہ اگر ان میں ایک نہ ہو تو باقی

تمام ارکان میں اضمحلال رونما ہو اور پوری عمارت کا توازن برقرار نہ رہ سکے۔ اگر ان میں سے ایک کی ضرورت و اہمیت بھی محسوس نہ ہو یا اسے فالتو سمجھ لیا جائے یا اس کی ہیئت اساسی میں تبدیلی کی سعی کی جائے خواہ وہ ایمان باللہ ہو یا نماز زکوٰۃ ہو یا حج اور روزہ تو ایسا شخص اس پوری عمارت کا دشمن ہے کیونکہ اس قصر متین کا ہر جز دیگر اجزاء و ارکان کو سنبھالے ہوئے ہے، جس معمار نے ہدایات ربانی کی روشنی میں یہ عمارت تیار کی اور اس کا نقشہ بنایا۔ اس نے ان ارکان کا یہ باہمی ربط و تعلق اور اس کی اہمیت بھی ان الفاظ میں بتلادی کہ:۔

(ایمان لانے کے بعد) چار چیزیں ہیں جنہیں	قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا	اربع فرضهن اللہ فی الاسلام
ہے۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور بیت	فمن جاء بثلاث
اللہ کا حج جو شخص ان میں سے تین بھی	لم یغنین عنه
ادا کرے (اور کسی ایک کی فرضیت کا	شیئا حتی یأتی بهن
بھی منکر ہو) تو وہ اس کے کام نہیں	جمیعا الصلوٰة والزکوٰة
آسکتیں جب تک سب کے سب	وصیامُ رمضان وحج البیت
نہ کرے (یعنی سب پر ایمان ویقین نہ ہو)	(ترجمان السنۃ بحوالہ احمد وطبرانی)

ان چاروں ارکان میں زکوٰۃ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ نماز (اور اسی وجہ سے قرآن نے ہر جگہ اقیموا الصلوٰۃ کے بعد وآتوا الزکوٰۃ کا حکم دیا۔) روزہ بھی ایسا ہی فرض ہے اور بنیادی عبادت ہے جیسا کہ حج۔

کسی ایک رکن سے انکار یا تبدیلی کرنا بھی کفر ہے

اگر کوئی شخص ایمان کا مدعی ہے۔ مگر نماز یا زکوٰۃ سے انکار کرتا ہے یا اس خاکہ میں تبدیلی و ترمیم کی ناروا جسارت کرتا ہے جو اس کے معمار اوّل نے ان عبادات کے لئے تیار فرمایا تو اسے اس قصر محمدی میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ اس کا دعوٰے ایمانی قابل اعتنا ہے خواہ وہ ہزار بار اس کے استحکام و

تعمیر کی رٹ لگاتا رہے اور ہمارے اس دعوے کا ماخذ خود قرآن کریم، سنت رسولؐ اور صحابہ کرامؓ و خلفائے راشدین کا طرز عمل ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم	ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ پس
فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ	اگر وہ تائب ہو کر نماز قائم کریں اور
فخلوا سبیلھم (توبہ)	زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک لوگ توحید اور رسالت کا اقرار اور نماز و زکوٰۃ ادا نہ کریں تو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان سے جنگ کرتا رہوں۔ جب وہ ایسا کرنے لگیں تب وہ اپنے مال و آبرو کو مجھ سے محفوظ کر سکیں گے۔ (بخاری و مسلم)

پھر ان ارکان کے باہمی ارتباط کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ جب بنو ثقیف کے ایک وفد نے طائف سے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر اس شرط پر کہ اسلام کے ایک اہم رکن نماز سے ہمیں معاف رکھا جائے تو حضورؐ نے بڑی سختی اور حقارت سے ان کی یہ درخواست ٹھکرا دی اور فرمایا کہ:۔

لاخیر فی دین لاصلوٰۃ فیہ	بھلا وہ دین ہی کیا کہ جس میں نماز ہی نہ ہو

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:۔

من لم یزک فلا صلوٰۃ لہ (ترجمان السنۃ ص۲۸۵)	جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں

خلیفۃ الرسولؐ سیدنا صدیق اکبرؓ نے صحابہ کے بھرے مجمع میں اعلان فرمایا کہ:

واللہ لاقاتلن من	خدا کی قسم جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق
فرق بین الصلوٰۃ	کرے گا۔ (ان میں سے ایک کی تعبدی
والزکوٰۃ۔	حیثیت سے انکار کرے گا) تو میں اس
	سے قتال کروں گا۔

منکرین زکوٰۃ اور فراست صدیقی

عہد رسالت کے فوراً بعد جب بعض غیر راسخ الایمان قبائل۔ عبس و ذبیان۔ بنو کنانہ۔ غطفان اور بنو فزارہ نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو خلیفۃ المؤمنین سیدنا صدیق اکبرؓ نے اپنی ایمانی فراست کی بنا پر اس باغیانہ اور کافرانہ جسارت کے مہلک اثرات اور نتائج کو فوراً بھانپ لیا کہ اگر اس وقت قصر محمدی کی بنیادوں پر یہ پہلی کاری ضرب برداشت کر لی گئی تو آگے چل کر بد باطن منافقین، زنادقین اور محرفین کے ہاتھوں یہ پوری عمارت پیوند خاک ہو کر رہ جائے گی (ولا فعل اللّٰہ کذلک الی یوم القیامۃ) حضرت صدیق اکبرؓ نے جرأت ایمانی سے کام لے کر تلوار نیام سے نکالی اور ایک خونریز جنگ کے بعد اس فتنہ کو تہ خاک کر دیا — جزاہ اللّٰہ عن الاسلام والمسلمین۔

حضرت صدیقؓ کو زکوٰۃ یا اس کے تعبدی حیثیت سے کام کرنے والوں کے اقدام کے کفر وارتداد ہونے میں ذرا بھر تردد نہ ہوا اور یہ اس لئے کہ بقول امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمۃ:۔

ان الایمان اسم لالتزام کل الدین فمن فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔ فکانہ لم یؤمن بالکل ومن لم یؤمن بالکل فھو کافر قطعاً۔

(فیض الباری ص۱۰۸)

بنابریں کہ ایمان نام ہے پورے دین کے التزام کا۔ پس اگر کوئی نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتا ہے۔ گویا وہ پورے دین پر ایمان نہ لایا اور جو پورے دین پر ایمان نہ لایا وہ شخص قطعی کافر ہے۔

حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ کو بھی جب اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی جسارت محض حکومت سے سرکشی یا بغاوت نہیں بلکہ سرے سے دین کے ایک اہم رکن کا انکار یا اس میں تحریف اور غلط تاویل کرنا ہے جس کے تباہ کن اثرات پورے دین پر پڑ سکتے ہیں تو اس کا سینہ بھی اس بارہ میں

کھل گیا اور نہ صرف حضرت فاروق اعظمؓ بلکہ تمام صحابہ نے حضرت صدیقؓ کا قولاً وعملاً ساتھ دیا اور اس طرح ایک رکن اسلام (زکوٰۃ) کی قطعیت میں صحابہ کا اجماع منعقد ہوا۔ اور ایسا اجماع جس کے نفاذ میں مخالفین کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

مانعین زکوٰۃ بھی زکوٰۃ کو ٹیکس سمجھ رہے تھے

مانعین زکوٰۃ کے اس اقدام کے اسباب وعوامل کی تلاش میں ہمیں یہ بات بھی مل جاتی ہے کہ منکرین زکوٰۃ نہ صرف سیدنا صدیق اکبرؓ کو زکوٰۃ دینے کے مخالف تھے بلکہ اپنی ایک من گھڑت رائے اور نظریہ کی بنا پر زکوٰۃ کو صرف ایک ٹیکس سمجھنے لگے تھے اور اس طرح اس کی عبادتی حیثیت سے انکار کر رہے تھے۔ محدث جلیل علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:-

وانما زعموا ان الزکوٰۃ جبایۃ مال کما یجبی السلطان من الرعایا جبایات من جہات فکانت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی عہدہ واذا ولینا نحن ولاۃ منا سقطت وبقیت کسائر الجبایات علی رائی الوالی۔ (فیض الباری ص ۱۰۹/۱ج۲)	منکرین زکوٰۃ کا گمان تھا کہ زکوٰۃ ایک مالی ٹیکس ہے۔ جیسا کہ بادشاہ اپنی رعایا سے کئی طرح کے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ پس حضورؐ کے زمانہ میں تو اس ٹیکس کی وصولی حضورؐ کا حق تھا اور جب ہم نے اپنوں میں سے والی اور حاکم چن لئے تو زکوٰۃ ہم سے ساقط ہوئی اور دیگر ٹیکسوں کی طرح اب زکوٰۃ کا معاملہ بھی حاکم کی رائے پر ہے۔

ٹھیک چودہ سو سال بعد قرن اوّل کے مانعین زکوٰۃ کا یہی استدلال اور ارکان اسلام سے بغاوت کا اعادہ ہے جو آج اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمان اور اس کی لادینی ریسرچ وتحقیق کی صورت میں ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔

زکوٰۃ کے مقادیر اور مصارف میں قطع برید جائز نہیں

ڈاکٹر فضل الرحمان فرماتے ہیں۔"معاشرہ کی ضروریات کے لئے زکوٰۃ کی موجودہ شرح کافی نہیں۔ حکومت کو اس میں اضافہ کا حق حاصل ہے (فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۴ء) پی پی اے کے نمائندہ کو اپنے انٹرویو میں بتایا۔ قرآن مقدس میں مسلمانوں پر مملکت کو صرف ایک ہی ٹیکس لگانے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ زکوٰۃ ہے۔ یہ ٹیکس بنیادی طور پر اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ اسے مملکت کی مختلف ضروریات پوری کرتے ہوئے مسلم معاشرہ کی سماجی ترقی بلکہ مملکت کی دفاعی اور دیگر ضروریات سول سروس ٹرانسپورٹ اور بیرونی قرضے وغیرہ پر بھی لگایا جائے۔ الخ

کیا خوب فرمایا ڈاکٹر صاحب نے خدا نے تو قرآن میں زکوٰۃ کے خرچ کے لئے مصارف ہشتگانہ مخصوص فرمائے۔ رسولؐ نے اس کے نصاب اور مقادیر متعین کئے اور اس کے تقسیم و خرچ میں اتنا اہتمام برتا کہ ایک بار جب ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ دینے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا۔" اے شخص اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ خود پیغمبر تک کو خود اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کر دیئے ہیں۔ اگر تم ان آٹھ مصارف میں داخل ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں ——— (ورنہ نہیں) (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ)

اسلامی ریاست کے مدات آمدنی

پھر یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کے علاوہ ملکی ضروریات کے لئے کوئی اور آمدنی مقرر نہیں کی گئی۔ آخر ڈاکٹر ایسے "محقق" کے بارہ میں یہ بات نادانی پر محمول کی جائے گی یا تجاہل عارفانہ پر۔ اسلام نے ایک اسلامی ریاست کے مصارف اور ضروریات کے لئے بے شمار ذرائع متعین فرمائے ہیں۔ آمدنی کا ایک ذریعہ خراج ہے۔ جو غیر مسلموں کی ان اراضی سے لیا جائے گا جس پر مقابلہ یا صلح کے بعد مسلمانوں کا تسلط قائم ہوا ہو اور جو زمین کی پیداوار، زرخیزی اور وسائل آبپاشی کی سہولت کو ملحوظ رکھ کر پیمائش یا بٹوارے کے طریقے پر لگایا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے الفاظ میں اس کی وصولی کے لئے وہ افسر مقرر ہوں گے جو فقیہ، عالم،

پاکبازانہ، معتدل مزاج، متدین اور خودرائی سے اجتناب کرنے والے ہوں۔

ایک ذریعہ جزیہ[۲] ہے جو غیر مسلم اہل ذمہ سے وصول ہوگا اور اسلامی ریاست ان کے شہری حقوق اور مال و جان کی محافظ ہوگی۔ اس طرح غنیمت[۳] کا مخصوص حصہ جو غیر مسلموں سے جنگ کے دوران قیدیوں اور مال و دولت کی صورت میں حاصل ہوگا۔ فئے[۴] جو دشمن سے بغیر جنگ و جدال کے مسلمانوں کے ہاتھ آئے گا معاون[۵] اور رکاز۔ مدفون خزانہ یا معدن کا پانچواں حصہ بھی بیت المال میں داخل ہوگا اس طرح لگان، اجارہ یا ٹھیکہ کی آمدنی کہ زمین کا کوئی قطعہ کسی کاروبار کے لیے کسی شخص کو اس شرط پر دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے منافع میں سے ایک مخصوص قسط بیت المال میں داخل کرے گا۔ اس کے علاوہ عشر[۶] کی شکل میں زمین پر محصول یعنی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ یا دوسری قسم اراضی پر نصف العشر یعنی ۱/۲۰ حصہ جس میں کمی یا زیادتی کا اختیار نہیں اور جس کے مصارف اور مقدار بھی مقدر اور معین ہیں۔ ان کے علاوہ غیر ملکی درآمد[۸] پر محصول (امپورٹ ڈیوٹی) جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لگایا گیا جبکہ دوسرے ممالک مسلمان تاجروں کے اموال پر اس قسم کی ڈیوٹی لگانے لگے۔ اگر ایک اسلامی حکومت واقعی اسلامی بنیادوں اور حقوق پر قائم ہو۔ اسلامی نظام کا احیاء اور نفاذ کرتی ہو اور محاصل و مصارف میں قرآن و سنت کی ہدایات کی سختی سے پیروی کرتی ہو تو ایسی حکومت مذکورہ اشیاء کے علاوہ دوسرے محاصل اور ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔ فقہائے اسلام نے تصریح کر دی ہے کہ ملکی دفاع، فوجی قوت کے استحکام، پولیس کے اخراجات یا رفاہی امور نہروں کی کھدائی، پلوں کی تعمیر، قیدیوں کی رہائی وغیرہ کے لیے مقررہ اور ہنگامی دونوں قسم کے محاصل وصول کئے جا سکتے ہیں۔ (ہدایہ کتاب الکفالۃ اور دیگر کتب فقہ) نہ یہ کہ زکوٰۃ کی ہیئت سالمہ کو بدل کر ٹیکس بنا دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر و معین مصارف کے علاوہ اسے دیگر ضروریات پر خرچ کیا جائے۔

جاہلی نظریات کی جدید تعبیر

عہد حاضر کے ان نام نہاد محققین نے آج ان تمام جاہلی نظریات کو دجل و تلبیس اور تحریف و تاویل کے حربوں سے مسلح ہو کر اسلام کی جدید تعبیر کے روپ میں دوبارہ پیش کر دیا ہے جن کو اسلام نے سختی سے غلط ٹھہرایا اور جسے اس کے پیغمبر اعظمؐ نے

قدموں کے نیچے پائمال کیا۔ جاہلیت اولیٰ کے منحوس دیوکی وہی روح بد ہے جو کبھی مرزا غلام احمد قادیانی کے بھیس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی غلام احمد پرویز کا روپ دھار لیتی ہے اور کبھی ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان جیسے محققین اور مغرب زدہ دانشوروں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اور پھر تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ اسلام کے ایک ایک رکن اور ایک ایک اساس پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اپنے وقت کے شیطانی ذرائع اور وسائل اس کی پشت پر ہوتے ہیں۔ کبھی اس کا وار رسالت محمدی کی بنیاد "ختم نبوت" پر ہوتا ہے تو کبھی آپ کی سنت کی تشریعی حیثیت اور منصب رسالت پر۔ کبھی تجدد اور نئی روشنی کے نام پر مسلمانوں کے "پرسنل لاء" کو مسخ کیا جاتا ہے تو کبھی ظاہری ترقی اور مغربیت کی چمک دمک سے اسلام کے پورے معاشرتی نظام، طلاق، نکاح، عدۃ، میراث وغیرہ میں دست درازیاں کی جاتی ہیں اس صدی میں اس طاغوتی روح نے مسلمانوں کے پورے اقتصادی ڈھانچہ، تجارت اور صنعت کو اسی جاہلی نظام، سود، قمار، حرام کاروبار، معاشی دستبرد اور ظلم و تعدی کی بنیادوں پر کھڑا کر دیا ہے اور سارے عالم اسلام کی ہیئت حاکمہ اور قوت نافذہ کو اپنے ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ اس کا منحوس سایہ مسلمانوں کے پورے نظام اخلاق و کردار، تمدن اور طرز معاشرت پر پڑ چکا ہے اور اس کی جگہ مغربی خود غرضی، نفس پروری، مادہ پرستی جنسی ہیجان اور اباحیت نے قدم جما لئے ہیں اور بدءَ الاسلامُ غریباً وسیعودُ غریباً کا منظر سامنے ہے۔

غفلت یا مداہنت کے ہولناک نتائج ان حالات میں اگر ملت مسلمہ لمحہ بھر بھی غفلت اور مداہنت یا رواداری سے کام لے اور اسلام کی ایک ایک بنیاد اور اصول پر شیطنت کا یہ وار سہتی رہے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتائج کتنے مہلک اور کتنے تلخ ہوں گے؟ پھر معلوم نہیں یہ سلسلہ آخر کہاں جا کر ختم ہوگا۔ اگر آج زکوٰۃ کی شرعی حیثیت کو غتر بود کیا گیا کہ زکوٰۃ کی موجودہ شرح حکومت کے مصارف کے لئے کافی نہیں تو کل نمازوں کی تعداد اور مقدار میں بھی یہ کہہ کر قطع و برید کی جائے گی کہ آج کل کی مصروف زندگی میں اس پنج وقتہ ضیاع وقت (نارش بدہن) کی فرصت کہاں؟ اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اس صنعتی اور مشینی دور میں مہینہ کے پورے تیس دن روزے رکھ کر ملک کی مادی

حیثیت کو نقصان پہنچایا جائے ؟ اور "حج و زیارت" کے نام پر ہزاروں میل کا سفر کر کے ملک اور قوم کا وقت اور ریاست کا زرمبادلہ "ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ؟ والعیاذ باللہ العظیم۔
اگر آج سود کے حلال ٹھہرائے جانے کو گوارا کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کل زنا اور خمر کو حلال نہ کہنا پڑے اور اگر آج مسلمانوں کے معاشرتی معاملات میں تحریف و تبدیل پر صبر کر لیا جائے تو کونسی ضمانت ہے کہ کل عبادات اور اعتقادات تک سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں ؟

نفاق زدہ لوگوں کی مضحکہ خیز حالت

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس سے دیگر ارکان کے علاوہ زکوٰۃ کی بنیادی اور تعبدی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمان اور اس قماش کے دیگر ثقافتی اور ریسرچی "ارباب فکر و نظر" کی تحقیقات کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔

دراصل جو لوگ اسلام کے بارہ میں سوء ظن، سطحیت یا حسد و عناد کے شکار ہیں اور اسلام کی موجودہ "عہد جاہلیت" کے لئے ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ بعض سیاسی اور مادی اغراض کی وجہ سے نہ تو کھل کر اسلام کے "دین ابدی" اور ضابطہ حیات ہونے کا انکار کر سکتے ہیں اور نہ اندرونی نفاق کی وجہ سے اسلام کی جامعیت اور دین حنیفی کی سچائیوں کا اقرار۔ اس گومگو حالت نے انہیں تضاد، تعارض اور تذبذب و نفاق کے ایک عجیب مضحکہ خیز مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ کبھی وہ سرمایہ دارانہ نظام پر اسلام کا ٹھپہ لگائیں گے تو کبھی کمیونزم اور مارکسیت کو دنیا کا کامیاب مذہب قرار دیں گے۔ کبھی کہیں گے کہ سائنس و حکمت اور دین و مذہب کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہو سکتا کبھی کہیں گے کہ اسلام کا مقصد ہی صرف سائنسی ترقی اور مادی عروج و ارتقاء ہے۔ کبھی سرے سے سنت رسول کے حجت ہونے سے انکار کر بیٹھتے ہیں تو کبھی ہر زمانہ کے مادیت یا استشراق زدہ دل و دماغ کے اجتہادات کو بھی سنت جاریہ کا نام و مقام دیں گے۔ گویا ان کی کیفیت ٹھیک اس ارشاد خداوندی کی مصداق ہے:

فكانما خر من السماء — گویا وہ آسمان سے گر پڑا۔ پھر اسے

فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق (حج پ ۱۷ ع ۱۱)　　پرندے اچک لیتے ہیں یا اسے ہوا اڑا کر کسی دور جگہ میں پھینک دیتی ہے

پھر یہ لوگ اپنی نت نئی "اختراعات" اور تحریفات کے اثبات کے لئے جو دلائل دہرا رہے ہیں پیش کرتے ہیں کوئی عقل سلیم اور قلب مومن تو اسے کیا قبول کرے گا خود ان کا ضمیر بھی ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔ علم و تحقیق کی دنیا اس تحریف و تلبیس پر سر پیٹنے لگتی ہے مگر تحقیق و ریسرچ کے یہ دعویدار پوری ڈھٹائی سے اپنے تبحر و تعمق کا شور مچاتے رہیں گے اور ہر طرح دین کو بازیچۂ اطفال بناتے رہیں گے

ملت مسلمہ کا فریضہ | اگر ملت مسلمہ کو اسلام کے "شجرۂ طوبیٰ" کے سایہ عاطفت اور قصر محمدی کی پناہ میں رہنا ہے اور اس کی ہر دیوار اور بنیاد کو اعداء و اغیار کی نقب سے بچانا ہے تو ضرورت ہے کہ اس ملت کا ہر نام لیوا خواہ عامی ہو یا عالم، جاہل ہو یا مقتدار اپنے تمام اغراض اور مصلحتوں سے دست بردار ہو کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی کی فراست اور فاروق اعظم رض کی جرأت سے کام لے کر میدان میں کود پڑے اور جو زبان و قلم اور جو ہاتھ بھی اس قصر محمدی میں شگاف پیدا کرنے کی سعی کرے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش اور مفلوج کر دیا جائے کہ بقول کسے یہ وقت "بدر و حنین کا ہے جمل و صفین کا نہیں۔ واللہ فی عونکم مادمتم فی عون الاسلام

کتاب الصوم

يا أيها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون

باب رؤیۃ الھلال

(چاند دیکھنے کے احکام و مسائل)

اخبارِ رؤیت کے لیے شہادت کی شرائط ضروری نہیں

سوال:۔ اگر ایک گاؤں میں رؤیتِ ہلال ثابت ہوجائے اور گاؤں والے اس پر یقین کرکے روزہ رکھ لیں تو دوسرے گاؤں کے لوگوں کو خبر دینے کے لیے کن شرائط کی رعایت ضروری ہے تاکہ وہاں کے لوگ اس کے مطابق روزہ رکھ سکیں؟

الجواب:۔ شہادت اور اخبار میں نمایاں فرق ہے، دوسرے گاؤں والوں کو رؤیت کی خبر دینے کے لیے شہادت کی شرائط کی ضرورت نہیں بلکہ جب بھی کسی شخص کی خبر غلبۂ ظن کے لیے مفید ہو تو یہ خبر کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کتاب القاضی الی القاضی کی شرائط کی رعایت بھی ضروری نہیں۔

قال عالم بن العلاء رحمہ اللہ:۔ وتقبل شھادۃ الواحد علیٰ شھادۃ الواحد فی ھلال رمضان ولا تشرط فیہ لفظ الشھادۃ۔ (فتاویٰ تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۵۲ کتاب الصوم۔ الفصل الثانی فی رؤیۃ الھلال)

قال عالم بن العلاء:۔ وذکر الامام الائمۃ الحلوانیؒ: ان الصحیح من مذھب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اھل احدی البلدتین یلزمھم حکم اھل ھذا البلدۃ۔ (فتاویٰ تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۵۵ کتاب الصوم۔ الفصل الثانی رؤیۃ الھلال) [1]

دوربین سے ہلال (چاند) دیکھنے والوں کی گواہی کا حکم

سوال:۔ اگر کچھ لوگ دوربین سے ہلال (چاند) دیکھ کر گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، تو کیا اُن کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ بخبرھم وھو مُفَوَّضٌ الیٰ رأی الامام) والصحیح من ھذا کلہ انہٗ مُفَوَّضٌ الیٰ رأی الامام ان وقع فی قلبہٖ صحتہ ما شھدوا بہٖ وکثرت شھود امر بالصوم او وکذا صححہ فی المذاھب۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۸۸ کتاب الصوم۔ فصل فیما یثبت بہ الھلال الخ)
وَمِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علی اصدر الطحطاوی ص۵۳۸ کتاب الصوم۔ فصل فیما یثبت بہ الھلال۔ الخ

الجواب:۔ موجودہ دور میں طرح طرح کے جدید آلات وجود میں آرہے ہیں جن میں دوربین بھی ایک ایسا آلہ ہے کہ جس کے ذریعے چاند دیکھنے والوں کی گواہی سے غلبۂ ظن حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ ولو کانوا ببلدۃ لا حاکم فیہا صاموا بقول ثقۃ وافطروا باخبار عدلین مع العلۃ للضرورۃ الی ان قال وقیل بلا علۃ جمع عظیم یقع العلم الشرعی ھو غلبۃ الظن بخبرھم وھو الامام انہ یکتفی بشاھدین واختارہ فی البحر۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۸۷ کتاب الصوم) [1]

اختلافِ مطالع شرعاً معتبر ہے یا نہیں

سوال:۔ اختلافِ مطالع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ اختلافِ مطالع کے بارے میں فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں اور یہی ظاہر المذہب ہے اور اسی قول پر فتویٰ منقول ہے اسلئے جہاں کہیں شرعی قواعد وضوابط کا لحاظ رکھتے ہوئے خبر پہنچ جائے تو وہاں روزہ رکھنا اور عید منانا چاہیئے۔

قال فی الھندیۃ: ولا عبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاھر الروایۃ وعلیہ الفتوی الفقیہ ابی اللیث وبہ کان یفتی شمس الائمۃ الحلوانی قال لو رأی اھل مغرب ھلال رمضان یجب الصوم علی اھل المشرق۔ کذا فی الخلاصۃ ثم انما یلزم الصوم علی متاخری الرؤیۃ اذا ثبت عندہ رؤیۃ اولئک بطریق موجب۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۱۹۸-۱۹۹ الباب الثانی فی رؤیۃ الھلال) [2]

---

[1] قال عالم بن العلاءؒ:۔ وقیل الامام شہادۃ شاھدین عدلین وقد سکن قلب القاضی علی قولھما جاز وثبت حکم رمضان۔ (فتاوی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۵۰ کتاب الصوم رؤیۃ الھلال)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۱۹۸ الباب الثانی فی رؤیۃ الھلال۔

[2] قال محمد بن عبد اللہؒ:۔ واختلاف المطالع ورؤیتہ نہاراً قبل الزوال وبعدہ غیر معتبر علی ظاھر المذھب وعلیہ اکثر المشائخ وعلیہ الفتوی بحر من خلاصۃ (فیلزم اھل المشرق برؤیۃ اھل المغرب) اذا ثبت عندھم رؤیۃ اُولٰئک بطریق موجب کما مر۔

قال ابن عابدینؒ:۔ (قولہ بطریق موجب) کان یحمل اثنان الشہادۃ او یشھدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر۔ (شامی ج۲ ص۳۹۳-۳۹۴ کتاب الصوم مطلب اختلاف المطالع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۳۲۳ کتاب الصوم۔

شرعی ثبوت کے بعد عید منانے پر حکومت کا رکاوٹ ڈالنا بے دینی کے مترادف ہے

سوال:۔ جہاں کہیں علاقائی علماء شرعی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عید کا اعلان کریں لیکن حکومت اپنی انانیت پر اتر کر لوگوں کو عید منانے سے منع کرے تو اس کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ عید اور رمضان کا ثبوت رؤیتِ ہلال کے اعلان پر موقوف ہے اگر علاقائی علماء شرعی تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے اعلان کریں تو عام لوگوں کے حق میں خواہ وہ سرکاری ملازم ہوں یا غیر سرکاری، تمام پر روزہ رکھنا یا عید منانا واجب ہوجاتا ہے، ایسی حالت میں حکومت کا عید منانے میں رکاوٹ ڈالنا بے دینی کے مترادف ہے اور نہ ایسی صورت میں حکومت کی تابعداری کرنا ضروری ہے۔ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق۔ (رواہ فی الشرح السنۃ، مشکوٰۃ ج۲ ص۳۲۱)

قال ابو محمد محمود العینیؒ:۔ ولا عبرة باختلاف المطالع بل اذا ثبت فی مصر لزم الناس۔

(شرح کنز عینی ج۱ ص۸۱ کتاب الصوم) [۱]

رؤیت اور تکمیلِ ثلاثین کے علاوہ نفسِ حساب کا اعتبار نہیں

سوال:۔ اگر کسی جگہ رؤیت نہ ہو اور نہ شعبان کے تیس دن پورے ہوں تو کیا کسی حساب کو اعتبار دے کر روزہ کا حکم دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ حساب ماہ میں تطبیق قائم ہوکر غلبۂ ظن کے لیے مفید بھی ہو؟

الجواب:۔ روزہ کا ثبوت رؤیت یا تکمیل ثلاثین شعبان پر موقوف ہے۔ لحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم: صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ۔ اس کے علاوہ کسی حساب و کتاب کی وجہ سے روزہ فرض نہیں ہوتا اگرچہ غلبۂ ظن کے لیے مفید کیوں نہ ہو۔

قال عالم بن العلاء رحمہ اللہ علیہ:۔ یجب صوم رمضان برؤیة الهلال او باستکمال شعبان ثلاثین ولا یجوز تقلید المنجم فی حسابہ لا فی الصوم

---

[۱] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ: واذا ثبت الهلال (فی) بلدة (مطلع قطر) هاد لزم سائر الناس فی ظاهر المذهب وعلیه الفتوی۔

(مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ج۱ ص۵۴۰ کتاب الصوم، فصل فیما لا یثبت بہ الهلال الخ)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۷۰ کتاب الصوم۔

ولا فی الافطار۔ (فتاویٰ تاتارخانیۃ ج ۲ ص۳۵۶ کتاب الصوم الفصل الثانی رؤیۃ الھلال) لے

تکمیلِ شعبان کے لیے ایک شخص کی گواہی قبول نہیں

سوال:۔ شعبان کے تیسویں دن کی خبر اگر ایک شخص دے دے تو اس کی گواہی معتبر ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ رؤیتِ ہلال میں رمضان کے علاوہ ہر ماہ کے ثبوت کے لیے آسمان پر علت کے دوران دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی بخلاف رمضان کے کہ اس کے ثبوت کے لیے ایک فرد کی گواہی مقبول ہے، لہٰذا شعبان کے تیسویں دن کی خبر ایک آدمی کی مقبول نہ ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وھلال الاضحیٰ وبقیۃ الاشھرالتسعۃ کا لفطر علی المذھب۔ قال ابن عابدینؒ: قولہ وبقیۃ الاشھرالتسعۃ فلایقبل فیھا الاشھادۃ رجلین او رجل وامرأتین عدول احرارغیر محدودین۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۹۱ کتاب الصوم۔ مطلب ما قالہ السبکی من الاعتماد علی قول الحساب مردودؒ) ۲ے

یوم الشّک میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال:۔ رمضان کی پہلی اور شعبان کی تیس تاریخ کو اشتباہ کی صورت میں اس دن روزہ رکھنے کا

لے قال العلامۃ الکاسانیؒ:۔ واما صوم رمضان فوقتہ شھر رمضان لایجوز فی غیرہ فیقع الکلام فیہ فی موضعین احدھما فی بیان وقت صوم رمضان والثانی فی بیان مایعرف بہ وقتہ اما الاول فوقت صوم رمضان شھر رمضان لقولہ تعالیٰ: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ای فلیصُم فی الشھر وقول النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم وصوموا شھرکم ای فی شھرکم لان الشھر لایصام وانما یصام فیہ واما الثانی وھو بیان مایعرف بہ وقتہ فان کانت السّماء مصحیہ یعرف برؤیۃ الھلال وان کانت متغیمۃ یعرف باکمال شعبان ثلاثین یومًا ثم صوموا۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۸۰ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۳۱۶ کتاب الصوم۔

۲ے قال فی الھندیۃ: وان کان بالسماء علۃ لا تقبل الاشھادۃ رجلین او رجل وامرأتین ویشترط فیہ الحریۃ ولفظ الشھادۃ کذا فی خزانۃ المفتین۔ ونشترط العدالۃ ھکذا فی النقایۃ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۱۹۸ کتاب الصوم۔ الباب الثانی فی رؤیۃ الھلال)

وَمِثْلُہٗ فی الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ج۱ ص۵۳۳ کتاب الصوم فصل فیما یثبت بہ الھلال۔الخ

کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ فقہی کتابوں میں اس دن جب باقاعدہ رؤیت نہ ہوا ور نہ شعبان کے تیس دن پورے ہوں تو اس کو یوم الشک کہا جاتا ہے۔بسا اوقات رمضان کے احتمال کی وجہ سے اس دن بھی فرض روزہ نیت کرکے رمضان کا روزہ رکھا جاتا ہے ، اسی طرح بعض لوگ نفل اور فرض میں تردید کرکے روزہ رکھتے ہیں ، ایسی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔

وروی عمران بن حصین :انه علیه الصلوة والسلام قال الرجل هل صمت من صوم شعبان قال لا۔

البتہ اگر خواص کہیں نفل کی نیت کرکے روزہ رکھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ، ایسا ہی اگر کہیں اس دن میں اتفاق سے کوئی قضاء روزہ آجائے تو اس دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال عالم بن العلاءؒ وفی التهذیب :۔ والمختار ان یفتی بالتطوع فی حق الخواص والانتظار والتلوم فی حق العوام وفی السغناقی : والفاصل بین الخاصة والعامة هو ان کل من یعلم فیه صوم یوم الشك فهو من الخواص والا فهو من العوام ۔

(فتاوی تاتارخانیة ج۲ ص۳۹۲ الفصل الثامن الاوقات المکروه فیها الصوم) لہ

سوال :۔ طلوع آفتاب کے بعد رؤیت ہلال کی اطلاع آنا

رمضان کی خبر اگر زوال سے قبل آجائے تو جن لوگوں نے صبح کے بعد کھانا کھایا ہو اُن کے لیے اس خبر پر عمل کرنے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ یوم الشک کے دن تمام اہل اسلام کو چاہیئے کہ زوال تک کھانے پینے اور روزہ کے منافی کاموں سے اجتناب کریں ، اگر رؤیت کی اطلاع ہو جائے تو روزہ پورا کریں اور اطلاع نہ آئے تو خواص کے لیے اجازت ہے اور عوام افطار کرلیں ، البتہ جن لوگوں نے کچھ کھا یا پیا ہو اُن پر

لہ قال ابن الهمام رحمه الله :۔ کان المختار ان یصوم المفتی بنفسه اخذا بالاحتیاط ویفتی العامة بالتلوم الی وقت الزوال ثم بالافطار حسما لمادة اعتقاد الزیادة ویصوم فیه المفتی سرا لئلا یتهم بالعصیان فانه افتاهم بالافطار بعد التلوم لحدیث العصیان وهو مشتهر بین العوام فاذا خالف الی الصوم اتهموه بالمعصیة ۔ (فتح القدیر ج۲ ص۲۴۳ کتاب الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۷۹ کتاب الصوم فصل شرائطها فنوعان ۔

رمضان کے تقدس کی خاطر امساک واجب ہے، اگر کوئی اس کے باوجود رعایت نہ رکھے تو صرف قضاء واجب رہے گی کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

قال قاضیخانؒ:۔ غلام بلغ فی النصف من رمضان ای نصف النهار او نصرانی اسلم فانہ لا یأکل بقیۃ یومہ۔ (فتاوی قاضی خان ج۱ ص۹۶ کتاب الصوم) [۱]

سوال:۔ نصف النہار یعنی آدھا دن گذرنے کے بعد اگر رمضان کے روزے کی فرضیت کی اطلاع آجائے تو مغرب تک امساک کا کیا حکم ہے؟

دن کے وقت رؤیت کی خبر ہو تو امساک ضروری ہے

الجواب:۔ اگر نصف النہار کے بعد روزے کی فرضیت ثابت ہو جائے تو جن لوگوں نے ابھی تک روزے کے منافی چیزیں استعمال نہ کی ہوں تو وہ اپنے امساک کو مغرب تک برقرار رکھیں اس کے ساتھ بقیہ مسلمانوں پر بھی امساک واجب ہے، البتہ اگر نصف النہار سے قبل روزے کی نیت نہ کی ہو تو کھانے پینے سے کفارہ واجب نہ ہوگا اور بقیہ دن امساک رکھنے کا حکم رمضان کے حیثیت کی وجہ پر خاص ہے، تاہم جن لوگوں نے رمضان کے منافی اشیاء کے استعمال کے بغیر امساک کیا ہو اُن کا امساک رمضان کا روزہ متصور ہوگا جبکہ بقیہ لوگوں پر اس دن کی قضاء لازمی ہے۔

لما قال العلامۃ محمد انور شاہ الکشمیریؒ:۔ لو شھد رجل بانی رأیت الھلال فی النھار لا یعتبر قولہ اصلاً سواء شھد قبل نصف النھار او بعدہ ولو قال رأیتہ فی اللیل الماضیۃ فان کان ھلال رمضان وکان قبل نصف النھار فمن لم یأکل بعد الصبح یصوم ومن اکل یقضیہ۔

(عرف الشذی علی الجامع الترمذی ج۱ ص۱۴۹ باب ما جاء فی الصوم بالشھادۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ:۔ (یجب علی الصحیح وقیل یستحب الامساک بقیۃ الیوم علی من فسد صومہ) ولو بعذر ثم زال وعلی حائض ونفساء طھرتا بعد طلوع الفجر۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ج۱ ص۵۵۸ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۳۴۷ کتاب الصوم ۔ فی بیان وقت الصوم وما یتصل بہٖ۔

[۲] لما قال العلامۃ السید محمد یوسف البنوریؒ: لو شھد برؤیتہ فی اللیلۃ الماضیۃ فان کان ھلال رمضان فلیصم بقیۃ یومہ ولیقضیہ ان اکل وان لم یأکل وکان قبل الضحوۃ الکبریٰ صام ولا قضاءً۔

(معارف السنن ج۵ ص۳۴۵ مسئلۃ رؤیۃ الھلال نھاراً)

رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی شرعی حیثیت

سوال:- رؤیتِ ہلال کمیٹی کا اعلان عموماً علاقائی فیصلوں سے مختلف ہوتا ہے، ایسی حالت میں کمیٹی کے فیصلوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:- رؤیتِ ہلال کمیٹی جو باعتماد علمی اشخاص پر مشتمل ہو اسلئے ایسی کمیٹی کے اعلان کو ساقط الاعتبار کہنا دانشمندی نہیں، یہ الگ بات ہے کہ بعض انتظامی کمزوریوں کی وجہ سے ان کا اعلان عموماً غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے اگر حکومت اس کے سدِّ باب کے لیے کوشش کرکے علاقائی علماء کی رؤیت کو اعتبار دے تو شاید یہ اختلاف دور ہو جائے، تاہم جہاں کہیں علاقائی اعلان اگر شرعی تقاضوں کو مدِّنظر رکھ کر کیا جائے تو رؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان نہ ہونے کے باوجود علاقائی علماء کے فیصلہ کا پابند رہنا ضروری ہے۔

وفی الهندیة:- لما فی الفصل الثانی من اوّل الکراهیة من الهندیة یقبل قول الواحد فی المعاملات عدلاً کان اوفاسقاً حُرّاً کان اوعبداً ذکراً کان او انثیٰ مسلماً کان اوکافراً دفعاً للحرج والضرورة ومن المعاملات الوکالات والمضاربات والرسالات فی الهدایا والاذن فی التجارات کذا فی الکافی اذا صح قول الواحد فی اخبار المعاملات عدلاً کان اوغیر عدل فلابد فی ذٰلک من تغلیب رایه فیه ان اخبره صادق فان غلب علیٰ رایه ذٰلک عمل علیه والا فلا کذا فی السراج الوهاج۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۱۰ الفصل الثانی فی العمل بخبر الواحد فی المعاملات)[1]

ریڈیو اور ٹی وی کی خبر فرضیتِ رمضان کا حکم

سوال:- ریڈیو اور ٹی وی کی خبر فرضیتِ رمضان اور عید کے ثبوت کے لیے ذریعہ بن سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جب قاضی یا ہلال کمیٹی کسی شہادت پر مطمئن ہو کر عید یا رمضان کا اعلان ریڈیو اور

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ:- قال العیون والفتویٰ علیٰ قولهما اذا تیقن انه خطه سواء کان فی القضاء اوالرؤیة اوالشهادة علی الصك وان لم یکن الصك فی یدالشاهد لان الغلط نادر واثرالتغییر یمکن الاطلاع علیه فلما یشبه الخط من کل وجه فاذا یتقن جاز الاعتماد علیه توسعة علی الناس. اھ (شامی ج ۵ ص۴۳۷ کتاب القاضی الی القاضی ـ مطلب فی دفتر البیاع)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج ۳ ص۱۱۶ کتاب القاضی الی القاضی۔

ٹی وی پر نشر کرے تو یہ اعلان ثبوتِ رمضان وعیدین کا ذریعہ بن سکتا ہے، قدیم زمانہ میں، توپ، دف اور قنادیل کی روشنی کو اعلانِ رمضان یا عیدین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا تاہم یہ ضروری ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی پر صرف قاضی یا ہلال کمیٹی کا اعلان انتہائی احتیاط سے سُنانا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ :۔ والظاهر انه یلزم اهل القرٰی الصوم بسماع المدافع اوالرؤیة القنادیل من المصر لانه علامة ظاهرة تفید غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل کما صرحوا به۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۶ مبحث فی صوم یوم الشک) لہ

عید اور رمضان کے ثبوت کیلئے ٹیلیفون کی خبر کا حکم

سوال :۔ فرضیتِ رمضان اور ثبوتِ عید کے لیے ٹیلیفون کی خبر کی حیثیت کیا ہے؟

الجواب :۔ اگر ٹیلیفون کے ذریعے خبر غلبۂ ظن کے لیے مفید ہو اور کسی کے دھوکہ دینے کا اندیشہ نہ ہو تو ٹیلیفون کی خبر پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ :۔ ولو سمع من وراء حجاب کثیف لا یشف من ورائه لا یجوز له ان یشهد لان النغمة تشبه النغمة الا اذا احاط بعلم ذلک لان المسوغ هو العلم غیر ان رؤیة متکلمًا بالعقد طریق العلم به فاذا فرض تحقق طریق اٰخر جاز۔

(فتح القدیر ج ۶ ص ۴۶۳ کتاب الشهادة - فصل ما یتعلق بکیفیة الشهادة) ٢ه

لہ لما قال الشیخ مفتی محمد شفیع صاحبؒ :۔ البتہ جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کرکے عید وغیرہ کا اعلان کر دیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے اس شہر اور اس کے مضافات و دیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے صرف وہ فیصلہ نشر کرے جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے۔

(آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام ص ۱۷۷ باب ہلال کے معاملہ میں آلاتِ جدیدہ کی خبروں کا درجہ)

ومثله فی امداد المفتیین الشهیر بفتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۴۷۷ کتاب الصوم۔

ٹه قال ابن عابدینؒ :۔ قال فی العیون والفتوٰی علی قولهما اذا تیقن انه خطه سواء کان فی القضاء اوالروایة اوالشهادة علی الصک وان لم یکن الصک فی ید الشاهد لان الغلط نادر واثر التغیر یمکن الاطلاع علیه وقلما یشتبه الخط من کل وجه فاذا تیقن جاز الاعتماد علیه توسعة علی الناس. (رد المحتار ج ۵ ص ۴۳۷ کتاب القاضی الی القاضی)

ومثله فی امداد الفتاوٰی ج ۲ ص ۹۴ کتاب الصوم۔

بذریعہ خط عید یا روزے کا ثبوت

سوال:۔ جہاں کہیں رویت ثابت ہو اور دوسری جگہ بذریعہ خط اطلاع دی جائے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس سے روزے کی فرضیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں، کیا اس کے لیے کتاب القاضی الی القاضی کی شرائط کی رعایت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دینی معاملات کا تعلق عموماً غلبۂ ظن پر مبنی ہے۔ اگر کسی کا خط ثبوتِ رمضان اور عیدین کے لیے اطمینان کا ذریعہ بنے اور خط لکھنے والا عادل ہو اور اس کے خط کی شناخت ہو سکتی ہو تو اطمینان کے بعد ثبوتِ رمضان وعیدین کا سبب بن سکتا ہے۔ شریعتِ مقدسہ میں خط کی حجیت کے کافی نظائر موجود ہیں۔

لما قال العلامۃ ابن الھمام ؒ: الکتابۃ الموسوسۃ بخلاف خط السمسار والصراف لانہ حجۃ للعرف الجاری۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۴۶۴ کتاب الصوم) [۱]

ٹیلیگرام (تار) سے عید ورمضان کا ثبوت

سوال:۔ از روئے شرع عید ورمضان کے بارے میں ٹیلیگرام کی خبر کی تصدیق کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ٹیلیگرام یعنی تار چونکہ کوئی بھی شخص دے سکتا ہے اس لیے یہ پتہ چلنا ہی دشوار ہے کہ یہ تار کس شخص نے دیا ہے، اسی وجہ سے دورِ حاضر کے جید فقہاء کرام اس کے خبر یعنی اطلاع کا اعتبار نہیں کرتے۔

لما قال الشیخ عبد الحی اللکھنوی ؒ:۔ بحسب ضوابط فقہیۃ تار کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ (مجموعۃ الفتاوی (اردو) ج ۱ ص ۳۵۳ باب رؤیۃ الھلال) [۲]

---

[۱] لما قال العلامۃ ابن عابدین ؒ:۔ صراف کتب علی نفسہ بمال وخطہ معلوم بین التجار واھل البلد ثم مات فجاء غریم یطلب المال من الورثۃ وعرض خط المیت بحیث عرف الناس خطہ یحکم بذلک فی ترکتہ ان ثبت انہ خطہ وقد جرت العادۃ بین الناس بمثلہ وھو حجۃ۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۴۳۵ کتاب القاضی الی القاضی)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوی ج ۲ ص ۹۴ کتاب الصوم۔

[۲] قال الشیخ اشرف علی التھانوی ؒ:۔ چونکہ تار میں اس کی کوئی علامت نہیں کہ کس کا تار ہے نیز اس میں غلط اور خلط بھی کثیر ہوتا ہے اس لیے معتبر نہیں۔ (امداد الفتاوی ج ۲ ص ۹۳ کتاب الصوم والاعتکاف، تحقیق خبر تار)

وَمِثْلُہٗ فی عزیز الفتاوی الشہیر فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۱ ص ۳۸۳ کتاب الصوم۔

ہلال کمیٹی کی موجودگی میں عالم دین کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے قومی اسمبلی حلقہ این اے ۱۹۸ پشین جس میں کچلاک، پشین بازار، یارو بازار، جنگل پیر، علی زئی بازار، قلعہ عبداللہ بازار، چمن بازار، گلستان بازار، سے نڈی اڈہ بازار کے علاوہ دیگر بڑے بڑے گاؤں مثلاً کربلا، حرمزئی، کانکزئی، ٹانکزئی، ملانگی، کلی کلک وغیرہ چھوٹے بڑے علاقے شامل ہیں، ان علاقوں پر حکومت پاکستان کا قانون لاگو ہے اور یہ تمام علاقے صوبائی حکومت کے کنٹرول میں ہیں لیکن یہاں عید اور روزہ بڑے عجیب طریقہ سے منایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں عید دوسری میں روزہ، ایک گھر میں عید دوسرے گھر میں روزہ یہاں تک کہ گھر کے ایک فرد کا روزہ اور دوسرے لوگوں کی عید ہوتی ہے۔ جبکہ علاقہ کے معروف عالم دین مولانا عبدالغنی صاحب شرعی گواہان پر عید اور روزے کا فیصلہ فرماتے ہیں، تو کیا ان کے فیصلہ پر عمل کیا جائے یا حکومت کی طرف سے قائم ہلال کمیٹی کے فیصلہ پر عمل کیا جائے؟ نیز بعض لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ہم افغانستان کے اعلان کے مطابق عید اور روزہ کا اہتمام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ از راہ کرم شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیلاً وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ اسلام لوگوں کو اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے اسلئے مسلمانوں کے ذمے اجتماعی احکام فرض کئے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اس کی مثالیں ہیں، اسی طرح عیدین بھی اجتماعیت کی داعی ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک ساتھ روزہ رکھیں اور ایک ساتھ عید منائیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: صوموا لرؤیۃ الھلال فافطروا بہ۔ (مشکوٰۃ ص۱۷۴ باب رؤیۃ الھلال۔ الفصل الاول)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صومکم یوم تصومون واضحاکم یوم تضحون وفطرکم یوم تفطرون۔ (مجموعۃ الفتاویٰ لابن تیمیۃ ج ۲۵ ص۱۰۵ فصل مسألۃ رؤیۃ بعض البلاد الخ)

یہی وجہ ہے کہ فقہاء مذہب ثلاثہ بالاتفاق اور مذہب شافعیہ کے بعض فقہاء اور مذہب اہل حدیث، زیدیہ، ظاہریہ وغیرہ کا اجتماعی فیصلہ ہے کہ اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں، اہل غرب کی رؤیت اہل شرق کے لیے قابل حجت ہے۔ لہٰذا رمضان یا عیدین کا چاند جب نظر آجائے تو قاضی وقت، ہلال کمیٹی یا علاقے کے معتمد عالم دین کو چاہیئے کہ وہ اس شہادت کو قبول کر کے اس کے مطابق روزہ یا عیدین کا حکم صادر کرے، وہ حساب وکتاب

یا کمپیوٹر کی اطلاع عدم احکام کو نہ دیکھے۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: حتی لو اخبرہ عدل عدم القاضی بمجیئ رمضان یقبل ویأمر الناس بالصوم یعنی فی یوم الغیم ولا یشترط لفظ الشہادۃ وشرائط القضاء۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۹ کتاب الصوم۔ مطلب فی رؤیۃ الہلال)

وایضاً قال بان المعمول به فی المسائل الثلاث ما شهدت به البینة لان الشهادة نزلها الشارع منزلة الیقین۔ وما قاله السبکی مردود ردّه علیه جماعة من المتاخرین ولیس فی العمل بالبینة مخالفة لصلاته صلی الله علیه وسلم۔ ووجه ما قلنا ان الشارع لم یعتمد الحساب بل الغاه بالکلیة بقوله نحن امة امیة لا نکتب ولا نحسب الشهر هکذا وهکذا۔ وقال ابن دقیق العید الحساب لا یجوز الاعتماد علیه واصلا۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۷ کتاب الصوم۔ مطلب فی رؤیۃ الہلال)

اس لیے کہ قاضی شرعی کو بدون وجہ شرعی کے کسی شہادت کو رد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ وہ شہادت کے حوالہ سے فیصلہ کرے گا۔

علامہ علاؤالدین الحصکفیؒ فرماتے ہیں: رأی مکلف هلال رمضان او الفطر ورد قوله بدلیل شرعی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۴ کتاب الصوم)

(۲) اگرچہ قاضی شرعی کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کا فیصلہ عیدین و رمضان میں قابل قبول ہے، احکام شرعی کے بارے میں صرف قاضی شرعی کا فیصلہ قبول ہوگا۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلی: القیام علی شعائر الدین من اذان واقامة واقامة الصلوٰة الجمعة والجماعة والاعیاد وصیام وصبح۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۷۰۰ کتاب الامارۃ)

لیکن جہاں کہیں قاضی شرعی نہ ہو یا وہ شرعی دلائل کی روشنی میں حکم صادر نہ کرتا ہو تو عیدین و رمضان وغیرہ عبادات کے قیام میں علاقے کا معتمد عالم دین قاضی شرعی کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔

احسن الفتاوی میں ہے کہ: جہاں مسلم حاکم موجود نہ ہو یا وہ فیصلہ شرعی نہ کر سکتا ہو وہاں اگرچہ جمیع معاملات میں تو عالم قاضی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا البتہ رؤیت ہلال وغیرہ بعض جزئیات میں اس کا فیصلہ حکم قاضی کے قائم مقام ہو جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الفتح اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هو

فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة الآن یجب علی المسلمین ان یتفقوا علی واحد منهم۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۲ کتاب الجهاد)

وفی عمدة الرعایة: والعالم الثقة فی بلدة لا حاکم فیها قائم مقامه۔ (ج۱ ص۳۰۹، احسن الفتاوی ج۴ ص۴۶۶ کتاب الصوم)

موجودہ ہلال کمیٹی کا اعلان اگرچہ قابلِ اعتبار ہے، اس پر مسلمان عید و رمضان جیسے امور انجام دے سکتے ہیں، مگر اس کے علاوہ علماء کی کمیٹی یا ایک معتمد عالمِ دین بھی اس بات کا مجاز ہے کہ وہ شہادت یا دیگر اطلاعات کی بناء پر رمضان و عیدین کا فیصلہ کر سکے، یہ بھی قضاء قاضی کے قائم مقام ہے، اعلانِ رمضان و عیدین کا حق صرف ہلال کمیٹی کو حاصل نہیں۔ چنانچہ علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

واعلم ان بلاد الهند الیوم لیست فیها حکومة اسلامیة ولیس فیها دار القضاء للمسلمین فالحکم فی مثلها الصوم باخبار ثقة والفطر بقول ثقتین ولا ینبغی لعلماء العصر من المفتیین المشی علی ماهو شان قضاة دار الاسلام من الشهادة وغیرها۔ (معارف السنن ج۵ ص۳۴۵ کتاب الصوم)

اس لیے کہ ہلال کمیٹی دیگر تسامحات کے ساتھ ساتھ شہادتِ شرعی کو بھی اپنی مفروضہ رائے اور عدمِ رؤیت کے اعلان کے بعد قبول نہیں کرتی اور شہادت کو کمپیوٹر کے حساب سے پرکھا جاتا ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، جس پر گذشتہ عیدین (عید الفطر، عید الاضحیٰ) کا اعلان واضح دلیل ہے جو کہ سب کے سامنے ہے اور اخبارات و جرائد میں اس کے خلاف کافی مدلل و مفصل مضامین لکھے گئے ___ اس کے ساتھ قاضی شرعی کا حکم بھی تب نافذ ہوتا ہے جب وہ شریعت کے موافق ہو۔

لہٰذا جب ایک علاقہ میں رؤیت چاند ہو جائے تو رؤیت جہاں بھی ہو ثبوتِ شرعی کے ساتھ ثابت ہونے پر ہلال کمیٹی یا علاقے کا معتمد عالمِ دین روزہ یا عیدین کا فیصلہ (اعلان) کر دے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس فیصلہ پر عمل کریں۔ اختلاف کو ختم کرنے کے لیے آسان سی تجویز یہ ہے کہ ہلال کمیٹی صرف مخصوص وقت تک شہادت یا اطلاع کی پابندی نہ کرے بلکہ رات گئے تک ملک و بیرونِ ملک رابطہ کرتی رہے جہاں پر بھی رؤیتِ ہلال شرعاً ثابت ہو جائے تو رمضان یا عید کا اعلان کر دیا جائے۔

ہلال کمیٹی کمپیوٹر کے حساب پر شہادت کو نہ پرکھے اس لیے کہ ممکن ہے پاکستان میں طول البلد اور

عرض البلد کے حساب سے امکانِ رویت نہ ہو اور دیگر ممالک میں امکانِ رؤیت ممکن نہ ہو اس لیے شہادت کو شرعی اصول پر پرکھا جائے۔

لیکن اگر ہلال کمیٹی والے اپنے خودساختہ اصولوں پر قائم رہتے ہوئے رابطہ سے روگردانی کرتے ہوں تو مسلمانوں پر لازمی ہے کہ وہ علاقے کے معتمد عالمِ دین کے اعلان پر رمضان و عیدین کا اہتمام کریں تاکہ اختلاف ختم ہو کر لوگوں میں وحدت پیدا ہو جو کہ اسلام کا فلسفہ ہے، لہٰذا ہلال کمیٹی یا علاقے کے معتمد عالمِ دین کو ثبوتِ شرعی کے ساتھ رؤیتِ ہلال کی اطلاع مل جائے تو اس کے اعلان پر علاقے کے مسلمانوں کو رمضان کا روزہ یا عید (افطار) کر لینا چاہیئے، اس طرح انشاءاللہ وحدت قائم ہو گی۔

کسی دوسرے ملک کے صرف اعلان پر روزہ یا افطار (عید) کرنا شرعاً صحیح نہیں جب تک وہاں کی رؤیت دوسرے طُرقِ شرعی (شہادۃ علی الرؤیت یا شہادۃ علی الشہادۃ یا شہادۃ علی القضاء یا استفاضہ) کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے اور علاقے کا معتمد عالمِ دین یا علماء کمیٹی وغیرہ اعلان نہ کرے۔

صاف مطلع کے دوران جمِ غفیر ضروری ہے

سوال: اگر مطلع بالکل صاف ہو تو پھر کتنے آدمیوں کی رؤیت پر اعتماد کر کے روزے یا عیدین کا اعلان کیا جائے گا؟ اگر بالفرض تین یا چار آدمی چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو کیا ان کی گواہی قابلِ قبول ہو گی یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں چاند کی رؤیت کے لیے قانون یہ ہے کہ اگر ۲۹ کی رات کو مطلع بالکل صاف و شفاف ہو تو پھر جمِ غفیر کی رؤیت روزہ اور عید کے لیے ضروری ہے، جمِ غفیر کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال ذخیرۂ فقہ میں درج ہیں، بعض سے ۵۰ اور بعض سے ۵۰۰ وغیرہ مروی ہے۔ البتہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے تعداد سے قطع نظر کر کے قاضی صاحب کے مطمئن ہونے کو ترجیح دی ہے، لیکن قاضی کا اطمینان بھی دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

(۱) امکانِ رؤیت (۲) کثرتِ شہود۔

اس لیے صاف مطلع کے دوران تین یا چار آدمیوں کی گواہی ناقابلِ قبول ہے۔

کذا فی ردّ المحتار ج۲ ص۱۰۱ کتاب الصوم۔

رویتِ ہلال کے بارے میں ایک استفسار کا جواب

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل کے بارہ میں :-

(۱) ۲۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو حکومتِ پاکستان کی وزارتِ داخلہ کی طرف سے جو عید کا اعلان کیا گیا ہے کیا یہ اعلان شریعت کے اعتبار سے درست تھا یا نہیں ؟

(۲) جن لوگوں نے اس اعلان کے مطابق عید کی نماز پڑھی ہے ان کا نمازِ عید پڑھنا شرعاً جائز تھا یا نہیں ؟

(۳) اور جن لوگوں نے اس دن روزہ نہیں رکھا یا رکھ کر توڑ دیا ہے اُن پر اس روزہ کی قضاء واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب :- (۱) ہمارے ہاں اکوڑہ خٹک میں خود بندہ کے پاس رویت ماہ شوال حاضر کی شہادت گذری اور آٹھ گواہوں سے شرعی طریقے پر شہادت لی گئی، ہر ایک گواہ نے بلفظ اشہد رویت ماہ شوال حاضر کی بشب اتوار بعد از نماز مغرب مع وجود علت (گرد و غبار اور بادل) کے شہادت دی، جس پر ہم نے بروز اتوار عید کا اعلان کیا اور ان سب واقعات (شہادت اور اعلانِ عید) کی اطلاع مقامی تھانے کے ذریعے ڈپٹی کمشنر اور کمشنر پشاور کو بھی دے دی گئی، اور انہوں نے وزارتِ داخلہ کے ہوم سیکرٹری کو اطلاع دی۔ اب وزارتِ داخلہ نے جو ہلال کمیٹی مقرر کی ہے وہ اگر ثقات عادل علماء پر مشتمل ہو اور انہوں نے ہماری اس اطلاع کو اور اسی طرح دوسری جگہوں سے جو اطلاعات ان کو دی گئیں اُن کو قبول کر کے عید کا فیصلہ کیا ہو اور پھر حکومت کی نگرانی میں یہ فیصلہ اور حکم مختلف ریڈیو سٹیشنوں سے ثقات کے ذریعہ کیا ہو تو یہ اعلان شریعت کے اعتبار سے درست ہے۔

(۲) اب جن لوگوں نے اس اعلان کے مطابق (یعنی اتوار کے دن) نماز عید پڑھی ہے وہ بالکل جائز اور درست پڑھی ہے۔

(۳) مذکورہ طریق پر اعلانِ عید کے بعد جن لوگوں نے اس دن روزہ رکھا نہیں یا رکھ کر توڑ دیا ہے ان پر قضاء واجب نہیں ہوگی۔

استفتاء مندرجہ بالا کے جواب پر اشکال اور اس کا جواب

سوال :- محترم حضرت مفتی صاحب! گذشتہ عید کے خلفشار میں آپ سے میں نے ایک فتویٰ منگوایا تھا جو کہ مجھے وصول ہو چکا ہے، اس کو مکرر مطالعہ

فرمانا چاہیں تو اس کا نمبر ۲۹۶ ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں۔

(۱) آپ کے فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکوڑہ خٹک میں چاند کا ثبوت شرعی طور پر ہو گیا تھا اس صورت میں بصورتِ ابر وغیرہ آپ کا جو فیصلہ تھا وہ اگر شرعی شرائط کے ساتھ نشر ہوا ہو تو کیا یہ اُن لوگوں کے لیے بھی حجت ہے جہاں مطلع صاف تھا یا وہاں پھر جم غفیر کی علیحدہ شہادت معتبر ہو گی؟

(۲) اگر حکومت کی نگرانی ہی میں موجودہ اعلان ہونا فرض کیا جائے تو کیا یہ اعلان پاکستان کے دونوں حصوں میں واجب العمل ہو گا یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اس کا اندازہ کیا ہو گا؟

(۳) میرے گذشتہ استفتاء کے سوال نمبر ۳ کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مذکورہ طریق پر اعلانِ عید کے بعد جنہوں نے روزہ نہیں رکھا ان پر اس کی قضاء واجب نہیں، یہ تو تب درست ہو سکتا ہے جبکہ خود آپ کے فتویٰ میں مذکورہ شرائط پائی جائیں۔ تو کیا آپ کے علم میں حکومت کے اعلان سے پہلے یہ تمام شرطیں پائی گئی ہیں یا نہیں؟ قابلِ حوالہ باتوں میں حوالہ بھی ضرور تحریر فرمائیں؟

نوٹ: آپ کی عید سے ہمیں تعرض نہیں ہے، غرض صرف یہ ہے کہ آپ کا فیصلہ صحیح ہونے کی صورت میں ہم تک شرعی طریق سے پہنچا ہے یا نہیں۔ (مولوی محمد یونس ساکن لورہ ضلع راولپنڈی)

الجواب:- مخدومی المحترم جناب مولانا محمد یونس صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں گے، آپ کے دونوں نوازش نامے ایک بنام حضرت شیخ الحدیث صاحب اور دوسرا اس بندۂ عاجز (قاضی انوار الدین) کے نام مشتمل بر چند استفسارات بوقتِ سعید شرفِ صدور لائے، حالات و کوائف سے مطلع ہوئے، گوناگوں مصروفیات اور مشاغل کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، امید ہے آں محترم محسوس نہ فرمائیں گے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب کو درسِ حدیث اور اہتمام کے کام سے بالکل فرصت نہیں ملتی جو کسی کے ساتھ اس طرح خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھ سکیں، جس طرح کہ آں محترم نے مطالبہ کر کے تحریر فرمایا ہے، اس لیے وہ آپ کے اشکالات کا جواب نہیں دے سکیں گے، البتہ دارالافتاء سے آپ اپنے اشکالات حل فرما سکتے ہیں، وہ بھی مناظرہ کی شکل میں نہیں بلکہ تشفی اور تسلی حاصل کرنے کی غرض سے، اور اگر دارالافتاء کے جواب سے آپ کی تسلی نہ ہوتی ہو تو پاکستان کے کسی بھی دوسرے دارالافتاء سے اپنی تشفی کرا سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ کا ایک شعبہ ہے، کسی مسئلے کا جو جواب یہاں سے جاری ہوتا ہے،

وہ حضرت شیخ الحدیث صاحب کی نظر ثانی اور ذمہ داری سے نکلتا ہے، وہ بحیثیت مہتمم دارالعلوم حقانیہ اور شیخ الحدیث اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ واقعی حضرت مولانا حسین الدین صاحب خطیب سبزی منڈی راولپنڈی بمع تین اور ساتھیوں کے یہاں تشریف لائے تھے اور رویت ہلالِ عید کے متعلق انہوں نے شرعی طور پر اپنی تسلی کرائی تھی، جو کچھ انہوں نے یہاں اپنے آنے کے متعلق لکھا ہے وہ درست ہے اور واقعہ صحیح ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب کے نام آپ کا جو نوازش نامہ ہے اس کے جواب میں اتنا ہی کافی ہے، بندہ کے نام نوازش نامہ کے جواب میں یہ عرض ہے کہ :-

(۱) رویتِ ہلال میں شہروں کی دُوری کا اعتبار نہیں اور اکثر فقہاء کرام نے اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ کتبِ فقہ کی عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہر کی رویت کی وجہ سے دوسرے شہر میں ثبوت رویت کا فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ الدرالمختار میں ہے: فیلزم اھل المشرق برویۃ اھل المغرب اذا ثبت عندھم رویۃ اولئك بطریق موجب اھ (الدرالمختار ج ۲ ص ۲۹۳) یہ دوسری بات ہے کہ جو بلاد قواعد ہیئت کے اعتبار سے اختلافِ مطالع رکھتے ہوں ان میں اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے گا جیسا کہ محققین کے نزدیک ثابت ہے۔ مگر ہمارے بلاد میں قواعد ہیئت کے اعتبار سے بھی اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ایک شہر کی رویت کا ثبوت بطریق موجب ہو جائے جس تین صورتیں فقہاء نے بیان کی ہیں: ۱ شہادۃ علی الرویۃ ۔ ۲ شہادۃ علی شہادۃ الرویۃ ۔ ۳ شہادۃ علی قضاء الحاکم الشرعی ۔ ایک ۴ چوتھی صورت بھی ہے جس کو استفاضۃ الخبر کہا جاتا ہے۔ ان چار صورتوں میں جس صورت سے بھی رویت ہلال کا ثبوت ہو جائے تو وہ حجت ہو گا۔

اس تحقیق کے بعد آپ کے اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ اعلیٰ ہمارے ہاں جو شہادت رویتِ ہلال کی گذری تھی جس کی بناء پر ہم نے بروز اتوار عید کا اعلان کر دیا اور بالوسائط اس کی اطلاع مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کو دیدی، اب اگر مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے ارکان نے اس کو منظور کر کے حکومت کی نگرانی میں شرائط کے ساتھ نشر کیا ہو تو یہ استفاضۃ الخبر بن کر ان لوگوں کے لیے بھی حجت ہو گا جہاں مطلع صاف تھا اور انہوں نے چاند دیکھنے کا اہتمام نہیں کیا یا کیا تو ہو لیکن نظر نہیں آیا ہو تو جمِ غفیر کی علیحدہ شہادت کی ضرورت اس کے بعد نہ ہو گی۔

(۲) جی ہاں اگر حکومت کی نگرانی میں شرائط مذکورہ "فتویٰ سابقہ کے ساتھ" یہ اعلان ہونا فرض کیا

جائے تو پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے واجب العمل ہوگا۔

(۳) اپنے علم کی حد تک جتنا کہ مجھے معلوم ہے وہ یہ ہے حکومت نے وزارتِ داخلہ کے ماتحت ایک مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی مقرر کی ہے جس کے اعلیٰ رکن (سربراہ) ڈسٹرکٹ خطیب اولپنڈی مولانا فیض علی فیضی ہیں اور وہ رویتِ ہلال کے متعلق کمیٹی کے دوسرے ارکان کی معیت میں فیصلہ کر کے حکومت کی نگرانی میں ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کرتے ہیں، اس لیے بندہ نے سابق فتویٰ میں آپ کے سوال ۳ کے جواب میں لکھ دیا تھا کہ مذکورہ طریق پر اعلانِ عید کے بعد جنہوں نے اس دن روزہ رکھا نہیں یا رکھ کر توڑ دیا ہے ان پر قضا واجب نہیں ہے اور بجائے "نہیں ہوگا" کے صرف "نہیں" لکھ دیا، اگر آپ کے علم میں یہ اعلان شرائط کے ماتحت نہیں کیا جاتا ہو اور یہ استفاضۃ الخبر میں داخل نہ ہو تو میں بجائے صرف "واجب نہیں" کے "واجب نہیں ہوگا" لکھ کر بری الذمہ ہو جاؤں گا۔

التماس جناب من! آپ کے عید نہ کرنے سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تو اپنی معلومات کی حد تک یہ مسئلہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اعلانِ عید یا روزہ بذریعۂ ریڈیو حجت ہے یا نہیں؟ تو میری رائے میں جو اطلاعات رویت اور شہادت ہلالِ عید کے متعلق ہم نے مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کو پہنچائی تھیں اور کمیٹی والوں نے اس پر فیصلہ کر کے بذریعہ ریڈیو نشر کر کے اعلانِ عید کیا ہے وہ استفاضۃ الخبر ہے اور جنہوں نے اس اعلان کو سن لیا ہے ان پر حجت ہے۔ اب اگر ہماری اس رائے کے ساتھ آپ کو اتفاق نہ ہو تو ہم آپ کو مجبور نہیں کر سکتے۔ (فقط والسلام)

٭ ٭

باب تعریف الصّوم واقسامہٖ وشرائطہٖ

(روزہ کی تعریف، اقسام اور شرائط کے بیان میں)

روزہ کی نیت کا وقت

سوال:۔ اگر رات کو روزہ کی نیت کرنی بھول جائے تو کس وقت تک نیت کر کے روزہ رکھنا درست ہے؟

الجواب:۔ اگر طلوعِ فجر کے بعد روزہ دار سے روزہ کے منافی کسی امر کا ارتکاب نہ ہوا ہو تو نصف النہار سے قبل تک نیت کر کے روزہ رکھ سکتا ہے، البتہ نصف النہار گذرنے کے بعد نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ:۔ ویسن لہٗ ان یتلفظ بھا۔ وقتھا کل یوم بعد غروب الشمس الیٰ ما قبل نصف النھار والنھار الشرعی: من انتشار الضوء فی الافق الشرقی عند طلوع الفجر الیٰ غروب الشمس فیقسم ھٰذا الزمن نصفین وتکون النیۃ فی النصف الاول بحیث یکون الباقی من النھار الیٰ غروب الشمس اکثر مما مضی۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص۵۴۵) لہ

روزہ کی فرضیت کے لیے عمر کی حد

سوال:۔ ایک مسلمان پر روزہ کس عمر میں فرض ہوتا ہے؟

الجواب:۔ بنیادی طور پر بالغ ہوتے پر روزہ فرض ہو ہو جاتا ہے جس کی پہچان لڑکے کو احتلام ہونے اور لڑکی کو حیض آنے سے ہوتی ہے، البتہ اگر کسی بچے پر بلوغت کے آثار نمایاں نہ ہوں تو پھر پندرہ سال کی عمر تک پہنچنے کی صورت میں روزہ رکھنا واجب ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ:۔ فان لم یوجد فیھما شیئ منھما فحتی یتم لکل منھما

لہ قال العلامۃ سید احمد طحطاوی رحمہ اللہ:۔ (ولو نھاراً الیٰ ما قبل نصف النھار) المراد انہٗ من اللیل الیٰ ھٰذا الوقت ظرف النیۃ وفمتی حصلت فی جزء من ھٰذا الزمان صح الصوم لما ذکرہ المصنف، وان نوی الصوم من النھار ینوی انہٗ صائم من اولہٖ حتی لو نوی قبل الزوال انہٗ صائم من حین نوی، لا من اول النھار لا یصیر صائماً حموی وانما تجوز قبل الضحوۃ اذا لم یوجد قبلھا ماینافی الصوم کاکل وشرب وجماع۔ (مراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی ص۵۳۰ کتاب الصوم)

ومثلہٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص۹۵ کتاب الصوم۔

خمس عشرة سنة وبه يفتى ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۵۳ کتاب الحجر) [1]

یوم الشک میں نفل کی نیت کے باوجود روزہ فرض شمار ہوگا

سوال:۔ اگر شک والے دن نفل کی نیت سے روزہ رکھا جائے مگر بعد میں شرعی ثبوت سے یہ معلوم ہوجائے کہ آج تو یوم رمضان ہے، تو عند الشرع اس نفلی روزے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یوم رمضان ثابت ہونے پر یہ دن یوم الشک کا نہیں بلکہ رمضان کا شمار ہوگا، چونکہ ماہ رمضان فرض روزوں کے لیے مقرر ہے اس لیے کسی نفل کی نیت سے فرض روزہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ یہی روزہ رمضان کا روزہ شمار ہوگا اور اس پر قضاء بھی لازم نہیں۔

قال عالم بن العلاءؒ:۔ فان ظهر انه من رمضان كان صائماً عن رمضان۔ وفي الخانية وقيل على قول محمد لا يكون صائماً۔ (فتاوىٰ تاتارخانية ج ۲ ص۳۹۲ کتاب الصوم، الفصل الثامن الاوقات التي يكره فيها الصوم) [2]

پوری زندگی روزہ رکھنے کی منت ماننا

سوال:۔ اگر کسی شخص نے تمام عمر روزہ رکھنے کی نذر مان لی تو اس کے لیے افطار کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ تمام عمر روزہ رکھنے کی نذر مان لینا بلا شبہ درست ہے مگر بہتر نہیں، اسلئے کہ انسان ہر حالت میں ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ تمام عمر روزہ رکھنے کی نذر ماننے میں کبھی کبھی افطار

---

[1] قال العلامة فخر الدينؒ:۔ بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال والا فحتى يتم له ثماني عشر سنة والجارية بالحيض والاحتلام والحبل والا فحتى يتم لها سبع عشر سنة ويفتى بالبلوغ فيهما بخمس عشرة سنة۔ (تبيين الحقائق ج ۵ ص۲۰۳ کتاب الحجر)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۸ ص۸۵ کتاب الحجر۔

[2] قال ابن نجيمؒ:۔ واعلم انهٗ يتفرع على كيفية النية ووقتها مسئلة الاسير في دار الحرب اذا اشتبه عليه رمضان فتحرى وصام شهراً عن رمضان فلا يخلوا ما ان يوافق اولا بالتقديم او بالتاخير فان وافق جاز وان تقدم لم يجز۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۶۳ کتاب الصوم)
وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج ۲ ص۲۴۴ کتاب الصوم۔

کرنے کی گنجائش نہیں البتہ ایام منہیات میں روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے، اس لیے افطار کرنے کے بعد ہر سال پانچ روزے اس کے ذمہ باقی رہیں گے، فراغتِ ذمہ کے لیے فدیہ کی ادائیگی کی وصیت کرنی ہوگی۔

قال طاهر بن احمدؒ :۔ رجل قال لله علیّ صوم هٰذه السنة فانه یفطر یوم الفطر ویوم النحر وایام التشریق ویقضی تلك الایام وعلیه کفارة الیمین ۔

(خلاصة الفتاوٰی ج ۱ ص۲۶۱ کتاب الصوم۔ الفصل الرابع فی النذر) [1]

شہر میں روزہ افطار کرنے کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعے سورج دیکھنے سے روزہ دار کیلئے کیا حکم ہے؟

سوال:۔ شہر میں سورج غروب ہونے کے بعد روزہ افطار کر لیا مگر اس کے فوراً بعد ہوائی جہاز میں سفر کے دوران سورج دوبارہ دیکھ لیا تو کیا اس سے قضاء لازم ہوگی یا نہیں؟ اور امساک کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ چونکہ اس شخص کو یقینی طور پر سورج کے غروب ہونے کا علم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے روزہ افطار کر لیا اب جبکہ دوبارہ سورج دیکھ لیا تو اس کو امساک (یعنی سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے، تاکہ حقیقی طور پر سورج غروب ہو جائے) یہ امساک فقط روزہ داروں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے ضروری ہے ورنہ اس کا روزہ تو ادا ہو گیا ہے اس پر کوئی قضاء لازم نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ :۔ قال فی شرح التنویر فلو غربت ثمّ عادت هل یعود الوقت بالظاهر نعم ۔ وقال ابن عابدینؒ : (قوله الظاهر نعم) بحث صاحب النهر حیث قال ذکر الشافعیة ان الوقت یعود الیٰ قوله قلت علیٰ ان الشیخ اسمٰعیل رد ما بحثه فی النهر تبعا للشافعیة

---

[1] قال عالم بن العلاءؒ :۔ واذا قال و لله علیٰ صوم الابد یفطر ایّام العید ویطعم عن کل یوم مسکیناً نصف صاع من حنطة ۔ هشام عن محمدؒ : فیمن جعل علیٰ نفسه صوم الابد فافطر یوم الفطر ویوم الاضحیٰ ۔ لا یطعم هٰذه الایام فی حیاته وعلیه ان یوصی ان یطعم ۔ الخ ۔ (فتاوٰی تاتارخانیة ج ۲ ص۴۰۵ کتاب الصوم، الفصل الحادی عشر فی النذور۔)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۱ ص۲۲۸ کتاب الصّوم، فی مایوجبه علیٰ نفسه ۔

بان صلوٰۃ العصر بغیبوبۃ الشفق تصیر قضاءً ورجوعها لا یعیدها اداءً ومافی الحدیث خصوصیۃ لعلیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کما یعطیہ قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام انہ کان فی طاعتک وطاعۃ رسولک اھ ۔ عود الوقت بعودها للکل، واللہ تعالیٰ اعلم ۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۳۶۱،۳۶۰ کتاب الصوم) [۱]

طویل النہار (لمبے دن) والے ممالک میں روزہ رکھنے کا طریقہ

سوال:۔ دنیا کے بعض خطے اور ممالک ایسے ہیں جہاں دن بہت لمبے ہوتے ہیں، وہاں روزے رکھنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ جن ملکوں میں دن چوبیس ۲۴ گھنٹوں سے بڑا ہو تو ان ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو قریب ملک اور علاقے کے وقت کی پابندی کا لحاظ رکھنا ہوگا، کیونکہ عام طور پر انسان چوبیس ۲۴ گھنٹے کا روزہ رکھنا برداشت نہیں کرسکتا، البتہ اگر چوبیس ۲۴ گھنٹے سے دن اس قدر چھوٹا ہو کہ سحری اور افطاری کھانے کا وقت ملتا ہو اور طلوع وغروب بھی ہوتا ہو تو اس ملک کے وقت کے موافق روزے رکھنے ہوں گے، تاہم یقیناً بیماروں کے لیے شریعت میں مراعات پائی جاتی ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ :۔ (تتمۃ) لم ار من تعرض عندنا لحکم صومهم فیما اذا کان یطلع الفجر عندهم کما تغیب الشمس او بعدہ بزمان لا یقدر فیہ الصائم علی ما یقیم بنیتہ ولا یمکن ان یقال بوجوب الصوم موالاۃ الصوم علیهم لانہ یؤدی الی الهلاک فان قلنا بوجوب الصوم یلزم القول بالتقدیر وهل یقدر لیلهم باقرب البلاد الیهم۔ کما قالہ الشافعیۃ هنا ۔ ایضاً ام یقدر لهم بما یسع الاکل والشرب یجب علیهم القضاء فقط

---

[۱] لما قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ :۔ وکذا من وجب علیہ الصوم فی اول النهار لوجود سبب الوجوب والاهلیۃ ثم تعذر علیہ المضی فیہ بان افطر متعمداً او اصبح یوم الشک مفطراً ثم تبین انہ من رمضان او تسحر علی ظن ان الفجر لم یطلع ثم تبین لہ انہ طلع فانہ یجب علیہ الامساک فی بقیۃ الیوم تشبها بالصائمین ۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۰۲،۱۰۳ کتاب الصوم الفصل ام حکم الصوم المؤقت)

ومثلہ فی مراقی الفلاح علی هامش طحطاوی ج ۱ ص ۵۵۸ کتاب الصوم ۔

دون الاداء کل محتمل فلیتامل ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۳۳۹ کتاب الصلوٰۃ ۔ مطلب فی طلوع الشمس من مغربھا) [1]

عیدین کے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ احادیث مبارکہ اور کتب فقہ سے یہ حکم واضح ہے کہ پورے سال میں پانچ دن روزہ رکھنا ممنوع ہے جن میں دو دن عیدین (یعنی عید الاضحیٰ اور عید الفطر کا پہلا دن) کے بھی شامل ہیں، لہٰذا ایسے شخص کو عیدین کے دن روزہ نہیں رکھنا چاہیئے ورنہ گنہگار ہو جائے گا۔

قال عبد الرحمٰن جزریؒ:۔ الصوم المکروہ ینقسم الی قسمین مکروہ تحریماً وھو صوم ایام الاعیاد والتشریق فاذا صامھا انعقد صومہ مع الاثم ۔ (فقہ مذاہب اربعہ ج ۱ ص۵۵۹) [2]

---

[1] قال العلامۃ کمال الدینؒ:۔ ولا یرتاب متامل فی ثبوت الفرق بین عدم محل الفرض وبین سببہ الجعلی الذی جعل علامۃ علی الوجوب الخفی الثابت فی نفس الامر وجواز تعدد المعرفات للشی فانتفاء الوقت انتفاء للعرف وانتفاء الدلیل علی الشی لا یستلزم انتفاءہ لجواز دلیل اخر وقد وجد وھو ما تواطات علیہ اخبار الاسراء من فرض اللہ الصلوٰۃ خمسیاً بعد ما امروا اوّلاً بخمسین ثم استقر الامر علی خمس شرعاً عاماً لاھل الافاق تفصیل فیہ بین اھل قطر وقطر وما روی ذکر الدجال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلنا ما لبثہ فی الارض قال اربعون یوماً یوم کسنۃ ویوم کشھر ویوم کجمعۃ وسائر ایامہ کایامکم فقیل یارسول اللہ فذلک الیوم الذی کسنۃ ایکفینا فیہ صلوٰۃ یوم قال لا اقدروا لہ (رواہ مسلم) فقد اَحب فیہ ثلثمائۃ عصر قبل صیرورۃ الظل مثلاً او مثلین وقس علیہ فاستفدنا ان الواجب فی نفس الامر خمس علی العموم غیر ان توزیعھا علی تلک الاوقات عند وجودھا فلا یسقط بعدمھا الوجوب ۔ وکذا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس صلوٰۃ کتبھن اللہ علی العباد ومن افتی بوجوب العشاء یجب علی قولہ الوتر اھ (حاشیۃ شلبی علی تبیین الحقائق ج ۱ ص۸۱ کتاب الصلوٰۃ ۔ باب المواقیت)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۲۲۶ کتاب الصلوٰۃ باب المواقیت ۔

[2] قال ابن نجیمؒ:۔ وعندنا یکرہ الصوم فی یومی العید وایام التشریق ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۵۸)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۲۰۱ کتاب الصوم ۔ الباب الثالث فی ما یکرہ للصائم ۔

مجنون پر روزے کا فدیہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر مجنون روزہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اس کے اولیاء فدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ احکام شرعیہ کا مکلف عاقل و بالغ انسان ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مجنون مکلف بالعبادات نہیں ہوتا، اس لیے اس کے مرنے کے بعد ورثاء پر فدیہ دینا بھی لازم نہیں، بشرطیکہ یہ عارضہ ممتد ہو (یعنی رمضان کا پورا مہینہ مجنون ہو) اور اگر عارضہ غیر ممتد ہو تو اس صورت میں ما فات کی قضاء لازمی ہے، اور اگر قضاء سے قبل مرجائے تو بصورتِ وصیت فدیہ دینا لازمی ہے۔

قال العلامۃ کاسانیؒ:۔ ولا وجوب علی المجنون لان الوجوب بالخطاب ولا خطاب علیہ لانعدام القدرتین ولھذا لم یجب القضاء فی الجنون المستوعب شہرا وجہ قول اصحابنا ..... فی الجنون العارض ما اذا افاق فی وسط الشہر او فی اولہ حتی لوجن قبل الشہر ثم افاق فی آخر یوم منہ یلزمہ قضاء جمیع الشہر۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۸۸، ۸۹ کتاب الصوم فصل شرائط الصوم)[۱]

کس چیز سے روزہ افطار کرنا چاہیئے؟

سوال:۔ شرعاً روزہ کس چیز سے افطار کرنا افضل ہے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ روزہ دار کھجور سے روزہ افطار کرے اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پھر پانی سے افطار کرنا بہتر ہے، تاہم اس کے علاوہ بھی دیگر اشیاء سے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

اخرج ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰؒ:۔ عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم من وجد تمراً فلیفطر علی ماء فان الماء طہور۔ (الجامع الترمذی ج۱ ص۱۴۹)[۲]

سحری و افطاری کا مستحب طریقہ

سوال:۔ سحری اور افطاری میں تعجیل و تاخیر کا حکم ایک ہے یا ان میں کچھ فرق ہے؟

---

[۱] قال ابن نجیمؒ:۔ (قولہ و بجنون غیر ممتد) ای یقضیہ اذ فاتہ بجنون غیر ممتد وھو ان لا یستوعب الشہر والممتد ھو ان یستوعب الشہر وھو مسقط للحرج۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۹۰ کتاب الصوم فصل فی العوارض)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۹۶ کتاب الصوم۔ الفصل العاشر فی الجنون۔

[۲] محمد بن یزیدؒ:۔ عن سلیمان بن عامر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا افطر احدکم فلیفطر علی تمر فان لم تجد فلیفطر علی الماء فانہ طہور۔ (ابن ماجۃ ج۱ ص۱۲۲ باب ما جاء علی ما یستحب الفطر)

وَمِثْلُہٗ فی ابی داؤد ج۱ ص۳۲۱ باب ما یستحب الفطر۔

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں سورج غروب ہونے کے فوراً بعد افطاری کرنا مستحب ہے اور سحری میں آخر وقت تک تاخیر کرنا اولیٰ ہے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ ظن غالب پر طلوعِ فجر سے چند منٹ پہلے سحری بند کر دینی چاہیئے۔

قال العلامۃ سید احمد طحطاویؒ: النہار عبارۃ عن زمان ممتد من طلوع الفجر الصادق الی غروب الشمس وھو قول اصحاب الفقہ واللغۃ (قولہ الی الغروب) ھو اول زمان بعد غیبوبۃ تمام جرم الشمس بحیث تظھر الظلمۃ فی جھۃ المشرق۔ وفی البخاری عنہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا اقبل اللیل من ھٰھنا فقد افطر الصائم۔ ای اذا وجدت الظلمۃ حسا فی جھۃ المشرق فقد دخل وقت الفطر او صار مفطرا فی الحکم۔ لان اللیل لیس ظرفا للصوم قھستانی۔

(مراقی الفلاح علیٰ ھامش طحطاوی ج ۱ ص ۵۲۱ کتاب الصوم) [۱]

کیا اذانِ فجر انتہاءِ سحری کی دلیل ہے

سوال: سحری کا آخری وقت معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا فجر کی اذان انتہاءِ سحری کی دلیل بن سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: روزہ بند کرنے میں بنیادی اعتبار انتہائے وقت کا ہے اسلئے طلوعِ فجر سے قبل روزہ رکھنا واجب ہے، البتہ اگر اذان صحیح وقت پر دی جاتی ہو تو پھر یہ انتہائے وقت کی دلیل بن سکتی ہے ورنہ تقدیم وتاخیر کی صورت میں اسے انتہاءِ سحر سمجھنا درست نہیں۔ ہمارے علاقوں میں اذان عموماً وقت داخل ہونے کے بعد دی جاتی ہے اسلئے اس دوران کھانا پینا جائز نہیں بلکہ اس سے چند منٹ پہلے ہی کھانا پینا بند کر دینا چاہیئے۔

قال العلامۃ عالم بن العلاءؒ: قال اصحابنا وقت الصوم من حین یطلع الفجر الثانی۔ وھو الفجر المستطیر المنتشر فی الافق الی غروب الشمس، واذا غربت الشمس خرج وقت الصوم ولم ینقل عنھم ان العبرۃ لاول طلوع الفجر الثانی او لاستطارتہ وانتشارہ۔ وقد اختلف المشائخ فیہ قال بعضھم: العبرۃ لاولہ۔ وبعضھم قالوا العبرۃ لاستطارۃ۔ قال الشمس الائمۃ الحلوانیؒ: القول الاول احوط والثانی اوسع۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۲ ص ۳۴۶ کتاب الصوم الفصل الاول فی بیان وقت الصوم) [۲]

---

[۱] قال طاھر بن احمد عبد الرشیدؒ: ویستحب للصائم تعجیل الافطار قبل الصلوٰۃ وتاخیر السحور وفی یوم الغیم لا یستحب التعجیل ولا یفطر مالم یغلب علیٰ ظنہ غروب الشمس۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۶۶ کتاب الصوم الفصل الخامس فی الحظر والاباحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۲ ص ۴۱۹ کتاب الصوم مطلب فی حدیث التوسعۃ علی العیال الخ۔

[۲] قال ابن عابدینؒ: (قولہ وھو الیوم) ای الیوم الشرعی من طلوع الفجر الی الغروب وھل المراد اول زمان الطلوع او انتشار الضوء؟ فیہ خلاف کالخلاف فی الصلوٰۃ والاول احوط والثانی اوسع۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۷۱ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۹۴ کتاب الصوم الباب الاوّل تعریفہ وتقسیمہ۔

صرف جمعہ کے دن روزے کا حکم

سوال: حنفیہ کثر اللہ سوادھم کے نزدیک صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا کیسا ہے ؟

الجواب: علماء احناف کے ہاں راجح مذہب یہ ہے کہ تنہا جمعہ کا روزہ رکھنا مکروہ نہیں البتہ جن احادیث میں نہی وارد ہے وہ ضعف اور کمزوری وغیرہ پیدا ہو جانے پر محمول ہے کہ جس کی وجہ سے جمعہ کی ادائیگی میں فرق آتا ہو۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: ولا بأس بصوم یوم الجمعۃ عند ابی حنیفۃؒ ومحمدؒ لما روی عن ابن عباسؓ انہ کان یصومہ ولا یفطر۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۹۱ کتاب الصوم)[1]

ذی الحجہ میں ایام بیض کے روزوں کا حکم

سوال: ایام بیض کے روزے رکھنا شرعاً مسنون ہیں جو ہر ماہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کو آتے ہیں، کیا ماہ ذی الحجہ میں بھی انہی تاریخوں کو روزے رکھے جائیں یا دوسری تاریخوں کو رکھے جائیں ؟

الجواب: شریعت مقدسہ میں ایام عید الاضحیٰ یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کے روزے رکھنا ممنوع ہیں اس لیے ماہ ذی الحجہ میں ۱۳ تاریخ کا روزہ رکھنا جائز نہیں بلکہ بجائے ۱۳ کے ۱۴، ۱۵، ۱۶ کے روزے رکھے جائیں۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ: یکرہ الصوم فی العیدین وایام التشریق لانعقاد الاجماع ولو صام یکون صائماً مسیئاً ولو افسدہ لا یقضی عند ابی حنیفۃؒ۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۳۸۸ کتاب الصوم[2] فصل فی بیان الاوقات التی یکرہ فیہا الصوم)

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ومنہ صوم یوم الجمعۃ ولو منفرداً فلا بأس بصیامہ عند ابی حنیفۃؒ ومحمدؒ۔ مما روی عن ابن عباسؓ انہ کان یصومہ ولا یفطر۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۵۹۲ مسائل صوم مندوب)

ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۲۶۵ کتاب الصوم، الفصل الخامس فی الحظر والاباحۃ۔

[2] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالیؒ: والثانی الذی کرہ تحریماً صوم عیدین الفطر والنحر ومنہ صوم ایام التشریق۔ وقال السید احمد الطحطاویؒ: قولہ (ومنہ صوم ایام التشریق) ھی ثلاثۃ بعد ایام النحر۔ (طحطاوی ص ۳۵۱ کتاب الصوم) ومثلہ فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۵۸۲۔

حاجی کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں

سوال:۔ احادیثِ مبارکہ میں یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا منقول ہے، کیا یہ حکم حاجی کے لیے بھی ہے یا نہیں؟

الجواب: یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا شرعاً مسنون ہے اور یہ حکم سب کے لیے یکساں ہے البتہ اگر حاجی کو روزہ رکھنے سے ضعف لاحق ہو جائے جس کی وجہ سے مناسکِ حج میں خلل واقع ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: المستحبة وعرفة ولو لحاج لم یضعفه الخ۔ قال ابن عابدینؒ: (قوله لم یضعفه صفة لحاج) ای اکان لا یضعفه عن الوقوف بعرفات ولا یخل بالدعوات محیط فلو اضعفه کره۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۹۱ کتاب الصوم) [۱]

یومِ عاشورہ کے روزے کا حکم

سوال:۔ محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے، کیا یہ صرف ایک دن کا روزہ رکھنا ہوگا یا اس سے پہلے یا بعد والے دن کا روزہ بھی ملانا ہوگا؟

الجواب:۔ یومِ عاشورہ یعنی دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا مسنون ہے مگر اس روزے کے ساتھ ایک دن پہلے یا بعد والے دن کا روزہ ملانا ضروری ہے اس لیے کہ صرف دس محرم کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: واما صوم یوم عاشوراء فیستحب ان یصوم قبله یوماً وبعده یوماً۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۲۶۵ کتاب الصوم۔ باب الحظر والاباحة) [۲]

---

[۱] قال الشیخ الدکتور وهبة الزحیلی:۔ ومنه صوم یوم عرفة ولو لحاج لم یضعفه عن الوقوف بعرفات ولا یخل بالدعوات فلو اضعفه کره۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج۲ ص۵۹۲ اراء المذاهب فی الصوم المندوب)
ومِثلُهٗ فی الفتاویٰ التاتارخانیة ج۲ ص۳۸۹ الاوقات التی یکرہ فیها الصوم۔

[۲] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وکانوا یستحبون ان یصوموا قبل عاشوراء او بعده یوماً۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج۲ ص۳۹۰ کتاب الصوم فی الاوقات التی یکرہ فیها الصوم)
ومِثلُهٗ فی الفقه الاسلامی وَادِلّتُهٗ ج۲ ص۵۹۰ النوع الرابع، صوم التطوع۔

رمضان المبارک میں مہمان کی خاطر وتواضع کا حکم

سوال:۔ جناب محترم مفتی صاحب! میں بسلسلہ روزگار انگلینڈ میں مقیم ہوں وہاں میرے کچھ انگریز دوست ہیں اگر وہ میرے پاس رمضان المبارک میں دن کے وقت ملاقات کے لیے آئیں تو کیا میں ان کی خاطر وتواضع کر سکتا ہوں یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب: اسلام نے مہمان کی خاطر مدارات کے لیے نفلی روزہ تک توڑ دینے کی گنجائش رکھی ہے، اس لیے اگر کوئی شخص مہمان کی خاطر وتواضع کے لیے نفلی روزہ توڑ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ اس روزہ کی قضاء کرنا ضروری ہے، جب غیر رمضان میں مہمان کی خاطر نفلی روزہ افطار کیا جا سکتا ہے تو پھر رمضان المبارک میں ایسا کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہے اس سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم آپ کے لئے مہمان کی خاطر رمضان کا روزہ توڑنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی: کسی کے گھر مہمان گئے یا کسی نے دعوت کر دی اور کھانا نہ کھانے سے اس کا جی برا ہوگا، دل شکنی ہوگی تو اس کی خاطر سے نفل روزہ توڑ دینا درست ہے اور مہمان کی خاطر سے گھر والی کو بھی توڑ دینا درست ہے۔

(بہشتی زیور ص۲۰۴ کتاب الصوم)

عاشورہ کے دن قضاءِ رمضان کا حکم

سوال:۔ جناب محترم مفتی صاحب! یوم عاشورہ (دس محرم الحرام) کو قضاءِ رمضان کا روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی رکھ لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں مسئلے کا حل بیان فرمائیں؟

الجواب:۔ اسلام نے سال بھر میں صرف پانچ دن[۱] روزہ رکھنے کو موجبِ گناہ قرار دیا ہے، اس کے علاوہ باقی ایام میں جس دن چاہے قضاءِ رمضان کا روزہ رکھا جا سکتا ہے ایسا کرنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

لما فی الھندیة: لو نوی قضاء رمضان والتطوع کان من القضاء۔
(فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیة ج۱ ص۲۰۰ کتاب الصوم)

---

[۱] ان پانچ دنوں کی تفصیل یہ ہے: عید الفطر کا دن، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ

پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھنے کا حکم

سوال:- جناب محترم مفتی صاحب! میری والدہ صاحبہ کئی برسوں سے پیر اور جمعرات کا روزہ رکھ رہی ہیں، کیا قرآن وسنت میں اس کے بارے میں کوئی فضیلت آئی ہے یا نہیں؟

الجواب:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں اعمال نامے پیش کیے جاتے ہیں، مجھے یہ پسند ہے کہ میرے اعمال اللہ تعالےٰ کے حضور اس حال میں پیش ہوں کہ میں روزہ سے ہوں۔ لہٰذا پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھنا کارِ ثواب ہے۔

عن عائشة رضؓ قالت: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتحری صوم الاثنین والخمیس۔ (الجامع الترمذی ج۱ ص۱۵۸ باب ماجاء فی صوم الاثنین والخمیس) [۱]

پندرہ شعبان کے روزے کا شرعی حکم

سوال:- جناب محترم مفتی صاحب! ۱۵ شعبان کے روزے کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ نیز اس روزے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:- فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں مرغوب روزوں میں ۱۵ شعبان (شب برات) کا روزہ بھی ہے، لہٰذا اس قسم کا روزہ رکھنا موجبِ اجر و ثواب ہے۔

لمافی الهندية: المرغوبات من الصيام انواع اولها صوم المحرم والثانی صوم رجب والثالث صوم شعبان۔ (الفتاویٰ الهندية ج۱ ص۲۰۲) [۲]

---

[۱] عن حفصة رضؓ قالت: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصوم ثلثة ایام من الشهر الاثنین والخمیس والاثنین من الجمعة الاخری۔ (ابوداؤد ج۱ ص۳۳۲ باب من قال الاثنین والخمیس)

ومثله فی مشکوٰة المصابیح ص۱۷۹ کتاب الصوم، باب صیام التطوع۔

[۲] لما قال العلامة اشرف علی التهانوی رحمه الله:- شب برات کی پندرہویں اور عید الفطر کے چھ دن نفل روزہ رکھنے کا بھی اور نفلوں سے زیادہ ثواب ہے۔

(بہشتی زیور حصہ ۳ ص۲۰۲ کتاب الصوم)

مروّجہ افطار پارٹیوں میں شرکت کا مسئلہ

سوال:۔ رمضان المبارک میں بعض سیاسی لوگ ایک دوسرے کو افطار پارٹیوں میں مدعو کرتے ہیں جن میں عموماً کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ شرعاً اس قسم کی افطار پارٹیوں میں شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ کسی روزہ دار کو روزہ افطار کرانا بہت بڑے ثواب کا کام ہے، احادیث مبارکہ میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے، مگر مروجہ افطار پارٹیوں میں چونکہ اکثر کبائر کا ارتکاب ہوتا ہے اس لیے اس قسم کی افطار پارٹیوں میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے تاکہ ارتکاب گناہ سے بچا جاسکے۔

لما قال علیہ السلام : من فطر صائماً کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبتہ من النار وکان لہ مثل اجرہ من غیر ان ینقص من اجرہ شیٔ۔

(مشکوٰۃ ص۱۷۳ کتاب الصوم۔ الفصل الثالث) [1]

مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں روزہ افطار کرنے کا حکم

سوال:۔ ماہ رمضان میں اگر کسی دن آسمان پر بادل ہوں اور سورج غروب ہونے کا صحیح اندازہ نہ ہوسکتا ہو تو ایسے میں روزہ افطار کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مستحب تو یہ ہے کہ جیسے سورج ہو فوراً روزہ افطار کرلیا جائے، اور اگر مطلع صاف نہ ہو، یا آسمان پر بادل وغیرہ ہوں تو پھر روزہ افطار کرنے میں اتنی دیر کی جائے کہ سورج ہونے یا نہ ہونے کا شک ختم ہوجائے۔ اور آجکل تو ویسے بھی تقریباً ہر آدمی کے پاس گھڑی ہوتی ہے اس کے حساب سے سورج ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد روزہ افطار کرلینا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ، ولو شک فی غروب الشمس لایحل لہ الفطر۔

(الھدایۃ ج ۱ ص۱۸۷ کتاب الصوم) [2]

---

[1] لقولہ علیہ السلام، من فطر صائماً فلہٗ مثل اجرہ۔
(مجمع الزوائد ج ۳ ص۳۷۲ کتاب الصوم، باب فیمن فطر صائماً)

[2] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ، جب تک سورج کے ڈوبنے میں شبہ ہے تب تک (روزہ) افطار کرنا جائز نہیں۔ (بہشتی زیور حصہ سوم ص۲۰۹ کتاب الصوم)

روزہ افطار کرنے کیلئے وقت مقرر کرنے کا حکم

سوال:۔ افطاری کتنے منٹ تک ہونی چاہیئے؟ بعض لوگ افطاری کے وقت پورا کھانا کھاتے ہیں اور اس کے بعد نماز پڑھتے ہیں، شریعتِ مطہرہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ افطاری کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں، ضروری امر یہ ہے کہ مغرب کی نماز ادا کی جائے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ مختصر افطاری کر کے پہلے مغرب کی نماز ادا کر لی جائے اس کے بعد کھانا کھایا جائے۔ تاہم اگر پورا کھانا کھانے کے بعد نماز وقت پر ادا کی جا سکتی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

روزے کی نیت عربی یا مادری زبان میں کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! رمضان المبارک کے روزوں کی نیت عربی زبان میں کرنا ضروری ہے یا اپنی مادری زبان میں کرنا بھی صحیح ہے؟

الجواب:۔ نیت کا تعلق دل سے ہے، نفسِ ارادہ کرنے سے روزہ صحیح ہو جاتا ہے، تاہم زبان سے نیت پر تلفظ کرنا بہتر ہے چاہے عربی زبان میں ہو یا مادری زبان میں، دونوں طرح سے صحیح ہے۔

لمافی الهندية: والنية معرفته بقلبه أن يصوم كذا في الخلاصة و محيط السرخسي والسنة ان يتلفظ بها كذا في النهر الفائق۔

(الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۱۹۵ كتاب الصوم۔ الباب الاول فی تعریفه)[1]

جہاز میں سفر کے دوران جہاز کا وقت روزہ افطار کرنے کے لیے معتبر ہوگا

سوال:۔ ایک آدمی ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا، زمینی وقت کے لحاظ سے سورج غروب ہو چکا تھا مگر جہاز کی بلندی کی وجہ سے ابھی تک سورج اُفق پر چمکتا نظر آ رہا تھا، تو کیا یہ آدمی زمینی وقت کے لحاظ سے روزہ افطار کرے یا حالتِ سفر

---

[1] قال العلامة المفتی عبد الرحیمؒ: روزہ کی نیت میں زبان سے بولنا ضروری نہیں صرف دل کا ارادہ کافی ہے، اپنی مادری زبان یا عربی میں زبان سے بھی کہے تو بہتر ہے منع نہیں۔
فتاویٰ رحیمیہ ج۸ ص۲۶۳ کتاب الصوم)

میں جب سورج غروب ہو تب افطار کرے؟

الجواب:۔ قاعدہ یہ ہے کہ روزہ اور نماز میں اُس مقام کا وقت معتبر ہوگا جہاں پر آدمی ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ شخص جہاز میں ہے اس لیے جب اس حالت میں سورج غروب ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: المراد بالغروب زمان غیبوبة جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة الشرق۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۸۸ کتاب الصوم) [۱]

شوال کے چھ روزوں کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کئی سالوں سے بندہ عید الفطر کے دوسرے دن سے شوال کے چھ روزے رکھ رہا ہے، میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ شوال کے چھ روزے مکروہ ہیں اور یہ احناف کا مذہب ہے، اس نے ایک رسالہ بھی مجھے دیا ہے جو اسی موضوع پر لکھا ہوا ہے، اپنے دوست کی باتیں سُنکر اور رسالہ دیکھ کر سخت اُلجھن کا شکار ہوں، مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ احادیث مبارکہ میں شوال کے چھ روزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث قرار دیا ہے۔ اس لیے فقہاء احناف کی تقریباً ہر کتاب میں ان روزوں کو مستحب قرار دیا ہے، جہاں تک کراہت کے قول کا تعلق ہے تو اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ سے ایک شاذ قول مروی ہے، احناف کا مذہب نہیں، ورنہ فقہاء کرام اس کو بڑے اہتمام سے ذکر کر کے مفتیٰ بہ قرار دیتے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: ومنه ایضاً صوم ستة من شوال عند ابی حنیفة متفرّقاً کان او متتابعاً وعن ابی یوسف کراهته متتابعاً لا متفرّقاً لکن عامة المتاخرین لم یروا به بأساً۔ وقال ابن عابدینؒ: (تحت قوله ولم یروا به بأساً) قد سرد عبارتهم العلامة قاسم فی فتاواه وردّ قول من صحح الکراهة فراجعه۔

(البحر الرائق و منحة الخالق ج۲ ص۲۵۸ کتاب الصوم)

---

[۱] قال الشیخ السیّد احمد الطحطاویؒ: تحت (قوله وهو الیوم) ای هو من اوّل زمان الصبح الصادق الی المغرب ای زمان غیبوبة تمام جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة المشرق۔ (الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص۳۴۶)

باب مایفسد الصّوم وما لا یفسد

(کن کن اشیاء سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن سے نہیں)

مذی اور ودی کے نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال:۔ بیوی کے ساتھ لمس وتقبیل یا ملاعبہ کرتے وقت اگر کبھی پانی نکل جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں اور اگر پیشاب کے ساتھ کچھ قطرے گر جائیں تو روزہ پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے؟

الجواب:۔ لمس وتقبیل کی صورت میں اگر انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ کر قضاء واجب ہے اور کفارہ نہیں، البتہ کسی کمزوری کی وجہ سے پیشاب کرتے وقت کچھ قطرے گریں تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال فی الھندیة:۔ واذا قبّل امرأته وانزل فسد صومه من غیر کفارة — ایضاً فی الھندیه وکذا لا یفطر بالفکر اذا امنی ھٰکذا فی السراج الوھاج۔

(الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۲۰۴ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد) [1]

خاوند کی سخت طبیعت کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں کا چکھنا

سوال:۔ روزہ کی حالت میں خاوند کے خوف سے عورت کے لیے پکی ہوئی اشیاء کا چکھنا کیسا ہے، کیا یہ عمل روزہ پر اثر انداز ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ روزہ کی حالت میں عموماً چیزوں کا چکھنا مکروہ ہے اور بعض اوقات مفسدِ صوم بھی بن جاتا ہے، لیکن اگر کسی عورت کا خاوند بدمزاج اور تلخ طبیعت کا مالک ہو اور عورت کو

---

[1] قال محمد بن عبداللہؒ:۔ او وطی امراته میتة او بھیمة او فخذا او بطنا او قبل او لمس فانزل قید للکل حتی لم ینزل لم یفطر کما مر۔ قال محمد بن عبد اللہؒ: او قبّل ولم ینزل او احتلم او انزل بنظر او بفکر۔ الخ

(شامی ج ۲ ص۳۹۶ کتاب الصوم۔ باب مایفسد الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۷۲ باب مایفسد الصوم وما لا یفسده۔

اس سے مار کھانے اور گالی گلوچ کا خطرہ ہو تو ایسی عورت کے لیے پکی ہوئی چیزیں چکھنا بلا کراہت جائز ہے۔

قال قاضی خان رحمہ اللہ:۔ اذا کان الزوج سیٔ الخلق لا بأس للمرأۃ ان تذوق المرقۃ بلسانہ۔ (فتاوٰی قاضی خان ج ۱ ص۹۸ کتاب الصوم) [1]

حاملہ کو اگر خون آجائے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا

سوال:۔ حالتِ حمل میں اگر عورت کو کبھی کبھار خون آجائے تو اس سے روزہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ مفسداتِ صوم میں سے ایک مفسد حیض ونفاس کا آجانا بھی ہے اور جو خون عورت کو حمل کی حالت میں آئے تو وہ بیماری کا خون ہے جو روزہ رکھنے کے منافی نہیں لہٰذا اس سے روزہ متاثر نہیں ہوتا۔

قال عبدالرحمٰن الجزائریؒ:۔ ان الدّم الّذی یخرج عند خروج اکثر الولد ھو دم نفاس کالدم الذی یخرج عقب خروجہ اما الدم الذی یخرج بخروج اقل الولد او قبلہ فھو فساد ولا تعتبر نفساء ویفعل مایفعلہ الطاھرات۔

(الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ج ۱ ص۱۳۱ باب الحیض) [2]

---

[1] قال عالم بن العلاءؒ:۔ ان کان زوجھا سیٔ الخلق بذی اللسان یضایقھا فی ملوحۃ الطعام فلا بأس بہ۔ (فتاوٰی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸ کتاب الصوم الفصل السادس فی الاسباب المبیحہ)

وَمِثْلُہٗ فی شامی ج۲ ص۴۱۶ کتاب الصوم مطلب فیما یکرہ للصائم۔

[2] قال کمال الدینؒ:۔ لما کان الحیض اکثر وقوعاً قدمہ ثمّ اعقبہ الاستحاضۃ لانھا اکثر وقوعاً من النفاس باعتبار کثرۃ اسبابھا فانّھا تکون مستحاضۃ بما رأت الدم حالۃ الحبل اوزاد الدم علی عشرۃ اوزاد علی معروفھا وجاوز العشرۃ اورأت مادون الثلاث اورأت قبل تمام الطھر اورأت قبل أن تبلغ تسع سنین علی ماعلیہ العامۃ بخلاف النفاس فان سببہ شئ واحد وقدّم حکم المستحاضۃ ومن بمعناھا علی تعریفھا لان المقصود بیان الحکم۔ قال برھان الدینؒ: یتوضئون لوقت کل صلوٰۃ۔ (العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج ۱ ص۱۵۹ باب الحیض)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص۲۱۵ باب الحیض۔

روزہ جلدی افطار کرنا بہتر ہے

سوال:۔ افطار میں احتیاط کے لیے تاخیر کرنے کا شریعتِ مطہرہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ غروبِ آفتاب قطعی اور بدیہی امر ہے، اس کے بعد غلبۂ ظن اور احتیاط کا دعویٰ کرنا بے بنیاد ہے یہی وجہ ہے کہ از روئے شرع روزہ افطار کرنے میں تعجیل افضل ہے۔

قال عالم بن العلاءؒ:۔ ویستحب للصائم تعجیل الافطار قبل طلوع النجوم۔

(فتاویٰ تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸۱ کتاب الصوم، الفصل السادس فی الاسباب المبیحۃ) [1]

رمضان میں ادویات سے حیض بند کرنے کا حکم

سوال:۔ کئی عورتیں رمضان میں روزہ کی محرومی سے بچنے یا غیر رمضان میں نماز کے فوت ہونے سے بچنے کے لیے مانع حیض ادویات استعمال کرتی ہیں، کیا از روئے شرع عورت کے لیے یہ اقدام مرخص ہے یا نہیں، نیز شرعی احکام پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں؟

الجواب:۔ عورت کے لیے حیض کا آنا ایک طبعی اور فطرتی امر ہے اس لیے شریعت مطہرہ نے ان ایام میں عورت کو معذور سمجھ کر عبادات کی ذمہ داری اس سے اٹھائی ہے، یہی وجہ ہے کہ جدید اور قدیم طب میں حیض عورت کی صحت اور تندرستی کی نشانی سمجھی جاتی ہے، اگر کوئی عورت ادویات کے ذریعے اس کو بند رکھے تو شرعی احکام اس سے متاثر نہیں ہوتے، یعنی حیض نہ آنے پر روزہ اور نماز کی ادائیگی ضروری ہے لیکن عورت کی صحت کے لیے نقصان دہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے سے احتراز بہتر ہے، تاہم اس طرح حیض بند کرنے سے روزہ درست رہے گا۔

قال عالم بن العلاءؒ:۔ وشرط صحۃ الاداء وھو الوقت القابل وھو الیوم المتعرّی عن الاکل والشرب وطھارۃ المؤدیین من الحیض والنفاس۔ (فتاویٰ تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۴۵ کتاب الصوم) [2]

---

[1] قال طاھر بن احمدؒ:۔ ویستحب للصائم تعجیل الافطار قبل طلوع النجوم۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۶۶ کتاب الصوم۔ الفصل الخامس فی الحظر والاباحۃ)

ومِثْلُہٗ فی مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۵۶۲ کتاب الصوم۔

[2] قال طاھر بن احمد بن عبد الرشیدؒ:۔ اعلم بان الصوم ھو الکف عن المفطرات شرعاً فی وقتہ بنیۃ یشترط من اھلہ واھلہ العاقل البالغ المسلم وفی المرأۃ الطھارۃ من الحیض والنفاس۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۵۱ کتاب الصوم۔ الفصل الثانی فی المقدمۃ)

ومِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۵۹ کتاب الصوم۔

زہریلے حشرات الارض کے کاٹنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا بچھو اور بھِڑ کے کاٹنے سے روزہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں جبکہ ایسی حالت میں عموماً کاٹنے والے بچھو وغیرہ کا زہر روزہ دار کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے؟

الجواب:۔ کسی چیز کا معدہ یا دماغ میں پہنچنا مفسدِ صوم تب بنتا ہے کہ وہ چیز جوفِ دماغ یا جوفِ معدہ میں بطریقِ منفذ (نالی کے ذریعے) داخل ہو، اگر وہ چیز بصورتِ ترشح (بذریعہ پسینہ) جوفِ دماغ یا جوفِ معدہ میں پہنچ جائے تو مفسدِ صوم نہیں، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں زہر چونکہ معدہ میں بصورتِ ترشح پہنچ جاتا ہے اس لیے مفسدِ صوم نہیں۔

لما قال العلامہ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ ولو اکتحل لم یفطر لانہٗ لیس بین العین والدماغ منفذ والدمع یترشح کالعرق والداخل من المسام لا ینافی کما لو اغتسل بالماء البارد۔ (الھدایۃ ج ا ص۱۹۷ کتاب الصوم۔ باب ما یوجب القضاء والکفارۃ) ؎

بدنگاہی سے انزال مفطرِ صوم نہیں

سوال:۔ کسی حسین عورت کو دیکھنے سے شہوت کا شکار ہو کر اگر روزہ دار کا انزال ہو جائے تو اس سے روزہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ انزال سے فسادِ صوم کے لیے جماعِ حقیقی یا معنوی کا ہونا ضروری ہے، چونکہ شہوانی نظر سے انزال میں دونوں کا فقدان ہے اس لیے فقہاء کرام نے عدمِ افطار کا فتویٰ دیا ہے۔

قال ابن الھمام رحمہ اللہ:۔ اذا نظر الی امرأۃ بشھوۃ الی وجھھا او فرجھا کرر النظر او لا یفطر اذا انزل لما بینا انہٗ لم توجد صورۃ الجماع ولا معناہ وھو الانزال

؎ قال العلامۃ عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلیؒ:۔ واما الاقطار فی الاحلیل فعندھما لا یفطر۔ و قال ابو یوسفؒ: یفطر بناء علی ان بینہ و بین الجوف منفذ بدلیل الخروج البول والاصح انہ لیس بینھما منفذ بل البول یترشح الی المثانۃ ثم یخرج وما یخرج رشحا لا یعود رشحا فلا یصل۔

(الاختیار لتعلیل المختار ج ا ص۱۳۳ کتاب الصوم۔ فصل فی وجوب الکفارۃ والقضاء الخ)

ومثلہٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۲۶۹ کتاب الصوم۔ باب ما یوجب القضاء والکفارۃ۔

عن مباشرة وهو حجة على مالك في قوله اذا كرره فانزل افطر۔

(فتح القدير ج ۲ ص۲۵۶ کتاب الصوم۔ باب ما یوجب القضاء والکفارة) ؎۱

منہ میں دوائی کے ذائقہ کا احساس مفسدِ صوم ہے

سوال:۔ دوائی کھانے کے بعد اگر طلوعِ فجر کے وقت یا بعد منہ میں دوائی کا اثر محسوس ہو تو کیا اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ منہ میں دوائی کے ذائقہ کا احساس فسادِ صوم کا ذریعہ نہیں بشرطیکہ حلق سے نیچے نہ جائے لیکن جب حلق سے اتر کر پیٹ کے اندر پہنچ جائے تو پھر روزہ باقی نہیں رہتا۔

قال ابن نجیمؒ:۔ وفي المحيط يجوز ان يقال لا بأس به كي لا يغبن والمضغ بعذر بان لم تجد المرأة من يمضغ لصبيها الطعام من حائض او نفساء اوغيرهما ممن لا يصوم ولم تجد طبيخًا ولا لبنا حليبا لا بأس به للضرورة الا ترى انه يجوز لها الافطار اذا خافت على الولد فالمضغ اولىٰ واطلق في الصوم فشمل الفرض والنفل۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۲۸ باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد) ؎۲

ملک کی تبدیلی پر روزہ کی تعداد میں پہلے ملک کا اعتبار ہوگا

سوال:۔ اگر ایک شخص رمضان کے دوران سفر کر کے کسی ایسے ملک چلا جائے جہاں چاند کی رؤیت مقدم ہونے کی بناء پر اس کے تیس ۳۰ روزے پورے نہ ہوئے ہوں تو ایسی حالت میں اس شخص کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا روزہ کی تعداد میں موجودہ ملک کا

؎۱ لما قال العلامة بدرالدين العينيؒ: وكذا لا يفطر اذا نظر الى امرأة فامنى اى انزل المنى لما بينا وهو قوله لانه لم يوجد صورة الجماع ولا معناه ثم انه سواء اذا نظر الى وجهها او فرجها بخلاف حرمة المصاهرة فانها تثبت بالنظر الى فرجها۔ (البناية شرح الهداية ج ۴ ص۲۸۴ باب ما يوجب القضاء والكفارة)

ومثله في طحطاوى ص۳۶۱ باب في بيان ما لا يفسد الصوم۔

؎۲ قال العلامة محمد عبدالحيؒ:۔ ودخول شئ في فمه فانه لو دخل شئ من الخارج في فمه لا يفسد صومه ما لم يدخل في حلقه وهذه آية كونه خارجًا فانه لو كان داخلا لفسد صومه في هذه الصورة لان دخول شئ من الخارج الى الداخل مفسد له۔ (السعاية ج ۱ ص۲۷۸ كتاب الطهارة وفرض الغسل)

ومثله في الشامى ج ۲ ص۴۱۶ كتاب الصوم۔ مطلب فيما يكره للصائم۔

اعتبار ہوگا جہاں پر مثلاً ۲۹ روزے ہوں یا اپنے علاقے کا اعتبار ہوگا جہاں پر ۳۰ روزے پورے ہوئے ہوں؟

الجواب: ۔جہاں تک عید منانے کا حکم ہے تو یہ موجودہ ملک کا تابع ہے لیکن روزہ کی تعداد میں اس ملک کا اعتبار ہے جہاں پر اس شخص نے ابتدائی روزہ رکھا ہے، اور اگر اس ملک کی حالت معلوم نہ ہو تو پھر از روئے احتیاط تیس روزے پورے کرے بشرطیکہ اس کے روزے پورے نہ ہوئے ہوں۔

قال فی الھندیۃ: اذا صام اھل مصر تسعۃ وعشرین یومًا للرؤیۃ وفیھم مریض لم یصم فعلیہ القضاء تسعۃ وعشرین یومًا فان لم یعلم ھٰذا الرجل ما صنع اھل المصر صام ثلاثین یومًا یخرج عن العھدۃ بیقین کذا فی المحیط۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۱۹۹ کتاب الصوم۔الباب الثانی فی رؤیۃ الھلال) [۱]

فصل کی کٹائی کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا شرعی عذر نہیں

سوال: ۔اگر رمضان میں اگر رمضان میں فصل پک جائے اور رمضان کے گزرنے کا انتظار کرنے کی صورت میں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہے، تو فصل کی کٹائی کے لیے روزہ نہ رکھنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: ۔موجودہ دور میں فصل کی کٹائی کے لیے جدید ترین طریقے موجود ہیں مثلاً ہارویسٹر مشین وغیرہ، البتہ اگر خود کٹائی کی طاقت نہ ہو تو اُجرت پر بھی کٹائی ممکن ہے، اس لیے فصل کی کٹائی روزہ نہ رکھنے کے لیے عذر شرعی نہیں۔

قال ابن نجیم رحمہ اللہ:۔ وفی القنیۃ لا یجوز للخباز ان یخبز خبزاً یوصلہ الی ضعف مبیح للفطر بل یخبز نصف النہار ویستریح فی النصف الباقی لہ لا یکفیہ اجرتہ او ربحہ

---

[۱] قال عالم بن العلاء رحمہ اللہ:۔ اذا صام اھل المصر تسعۃ وعشرین یومًا للرؤیۃ وفیھم مریض لم یصم فعلیہ القضاء تسعۃ وعشرین یومًا فان لم یعلم ھٰذا الرجل ما صنع اھل المصر صام ثلاثین یومًا لیخرج عن العھدۃ بیقین۔

(فتاوٰی تاتارخانیۃ ج ۲ ص۳۵۴ کتاب الصوم۔رؤیۃ الھلال)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۶۴ کتاب الصوم وثبت رمضان۔الخ

فقال هو کاذبٌ وھو باطل باقصر ایّام الشتاء۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۸۲ باب مایفسد الصوم ومالا یفسد) ؎۱

قاضی کے لیے مسندِ قضاء روزہ نہ رکھنے کا سبب نہیں

سوال:۔ اگر کوئی قاضی مسند قضاء میں ایسی حالت سے دوچار ہو کر فیصلہ کرتے وقت روزہ اس کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہو تو کیا اس کے لیے افطار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ کوئی ایسا شرعی عذر نہیں کہ جس سے روزے کا افطار مرخص ہو اس لیے اس پر روزہ واجب ہے۔

قال فی الهندیة: شرط وجوبه الاسلام والعقل والبلوغ وشرط وجوب الاداء الصحة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۹۵ کتاب الصوم، الباب الاوّل تعریفه الخ) ؎۲

روزہ کی حالت میں انجکشن لگانا مفطرِ صوم نہیں

سوال:۔ روزہ میں انجکشن لگانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا رگ والے اور دوسرے انجکشن میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ مطلق کسی چیز یا اس کے اثرات کا

؎۱ قال عالم بن العلاء رحمه الله:۔ سألت اباحامد عن خباز یخبز فی شهر رمضان ویضعف فی آخر النهار هل یجوز له ان یعمل هٰذا العمل فقال لا یجوز له بان یعمل ما یوصله الی هٰذا النوع من الضعف ولکن یخبز نصف النهار ویستریح فی النصف الباقی قیل له: اذا کان لا یکفیه ما یاخذ فی نصف النهار، فقال هو کاذبٌ فان ایّام الشتاء اقصر الایّام فما یفعل فی تلک الایام یفعله الیوم۔

(فتاوی تاتارخانیة ج ۲ ص۳۸۵ کتاب الصوم، الفصل السابع الاسباب المبیحة للفطر)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص۱۰۱ کتاب الصوم، فصل فی فساد الصوم۔

؎۲ قال عالم بن العلاء رحمه الله: شرط نفس الوجوب وهو الاسلام والعقل والبلوغ وشرط وجوب الاداء وهو الصحة والاقامة وشرط صحة الاداء وهو الوقت القابل۔

(فتاوی تاتارخانیة ج ۲ ص۳۴۳ کتاب الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص۲۵۱ کتاب الصوم، الفصل الثانی فی المقدمة۔

بدن تک پہنچنا مفطر صوم نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت مفطر صوم ہے جب معتاد ذرائع سے بدن میں داخل ہو کر پیٹ یا دماغ تک پہنچے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں انجکشن کے اثرات معدہ یا دماغ تک نہیں پہنچتے بلکہ یہ رگوں میں حلول کرکے بدن کو راحت پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں اسلیئے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، چونکہ یہ علت ہر قسم کے انجکشن میں موجود ہے اس لیے کسی بھی انجکشن (خواہ رگ والا ہو یا عام) سے روزہ متاثر نہیں ہوتا جیسا کہ پیاس کے وقت مسامات کے ذریعے برودت کا پہنچنا مفطر صوم نہیں تاہم حتی الامکان روزہ کی حالت میں رگ والے انجکشن سے اجتناب کیا جائے۔

قال فی الهندیة: ومن اغتسل فی ماء وجد برودة فی باطنه لا یفطر۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۰۳ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد)

قال ابن نجیمؒ: وفی التحقق ان بین الجوفین منفذا اصلیا فما وصل الی جوف الرأس یصل الی جوف البطن۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۷۹ باب ما یفسد الصوم ومالا یفسد) [۱]

روزے کی حالت میں شرمگاہ سے کھیلنا

سوال: کیا روزے کی حالت میں شرمگاہ سے کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: روزہ کی حالت میں شرمگاہ سے کھیلنا کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے، تاہم اس عمل سے اجتناب بہتر ہے کیونکہ اس سے روزہ جانے کا خطرہ ضرور ہے۔

قال المرغینانیؒ: ولا باس بالقبلة اذا أمن علی نفسه ای الجماع او الانزال ویکره اذا لم یأمن۔ (الهدایة ج۲ ص۱۹۹ کتاب الصوم۔ باب ما یوجب القضاء والکفارة) [۲]

دانت نکالتے وقت نکلنے والے خون کے روزہ پر اثرات

سوال: تکلیف کی وجہ سے روزہ دار کیلئے دانت نکلوانا شرعاً

---

[۱] قال اکمل الدین محمد بن محمودؒ:۔ (اذا علم ان الدواء الیابس وصل الی جوفه) لم یفسد صومه عنده الا انه ذکر الرطب والیابس بناء علی العادة۔
(العنایة علی هامش فتح القدیر ج۲ ص۲۶۶ باب ما یوجب القضاء والکفارة)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۵۳ کتاب الصوم۔ الفصل الثالث فیما یفسد الخ۔

[۲] قال محمّد بن عبد اللهؒ:۔ (او قبل) ولم ینزل (او احتلم او انزل بنظر) ولو الی فرجها مراراً (او بفکر) وان طال مجمع۔ (شامی ج۲ ص۳۹۵، ۳۹۶ کتاب الصوم۔ باب ما یفسد الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۷۲ باب ما یفسد الصوم ومالا یفسد۔

کیسا ہے؟ اگر دانت نکالتے وقت یا بعد میں خون نکل آئے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معالجہ کی صورت میں دانت نکلوانا جائز ہے، البتہ دانت نکالتے وقت یا ویسے منہ سے خون بہہ جائے اور نگل لیا جائے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

قال ابن نجیمؒ:۔ اذا خرج من الاسنان ودخل الحلق ان کانت الغلبة للبزاق لایفسد صومه وان کانت للدم فسد۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۳ باب مایفسد الصوم ومالایفسد) [۱]

قے کا بلا قصد آنا مفسدِ صوم نہیں

سوال:۔ روزہ دار کو اگر قے آجائے اور اس کا کچھ حصہ اندر چلا جائے تو اس کے روزے کی صحت کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ قے کا خود بخود آجانا فسادِ صوم کا سبب نہیں، البتہ اگر چنے کی مقدار یا اس سے زائد حصہ خوراک لوٹا دی جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ بلا قصد قے کے اندر جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ وان ذرعه القیئ وخرج) ولم یعد (لایفطر مطلقاً) ملأ اولا (فان عاد) بلاصنعه (و) لو هو ملأ الفم مع تذکره للصوم (لایفسد) قال ابن عابدینؒ: ان کان ملأ الفم واعاده اوشیئاً منه قدر الحمصة فصاعداً افطر اجماعاً لانه خارج ادخله جوفه ولوجود الصنع۔ (شامی ج ۲ ص ۴۱۴ کتاب الصوم۔ باب مطلب فی الکفارة) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: (اوخرج الدم من بین اسنانه ودخل حلقه) یعنی ولم یصل الی جوفه اما اذا وصل فان غلب الدم اوتساویاً فسد والا لا، الا اذا وجد طعمه۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۳۹۶ کتاب الصوم۔ باب مایفسد الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی تاتارخانیة ج ۲ ص ۳۶۹ کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم ومالایفسد۔

[۲] قال ابن الهمام رحمه الله:۔ والکل اما ان خرج او عاد او اعاده فان ذرعه وخرج لایفطر قل اوکثر لاطلاق مارویناوان عاد بنفسه وهو ذاکر للصوم ان کان ملأ الفم فسد صومه عند ابی یوسفؒ لانه خارج شرعاً حتی انتقضت به الطهارة وقد دخل وعند محمد لایفسد وهو الصحیح الخ

(فتح القدیر ج ۲ ص ۲۵۹ باب مایوجب القضاء والکفارة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۴ باب مایفسد الصوم ومالایفسد۔

پانی میں غوطہ لگانا مفسدِ صوم نہیں

سوال :۔ اگر روزہ دار کسی تالاب یا حوض میں غوطہ لگائے، اس طرح اس کا روزہ کہاں تک متاثر ہوتا ہے؟

الجواب :۔ اگر منہ میں پانی داخل نہ ہو بلکہ کان میں پانی یا بدن میں برودت (ٹھنڈک) کا احساس ہو تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا البتہ اگر پانی بدن میں داخل ہو جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا تاہم ایسے عمل سے اجتناب مناسب ہے۔

قال عالم بن العلاءؒ :۔ ولو اغتسل ۔ وفی الفتاوی العتابیۃ او خاض الماء فدخل الماء اُذُنہ لایفسد صومہ بلاخلاف۔ (فتاوی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۶۴ کتاب الصوم ۔ الفصل الثالث مایفسد الصوم الخ) لہ

روزہ کی حالت میں احتلام ہوجانے کا حکم

سوال :۔ روزہ دار کو اگر احتلام ہو جائے تو اس کے روزہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ احتلام ہو جانا ایسا عمل نہیں جو روزے کے منافی ہو، اس لیے روزہ کی حالت میں احتلام ہو جانے سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال برھان الدین رحمہ اللہ :۔ فان نام فاحتلم لم یفطر لقولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم ثلث لایفطرن الصیام القیٔ والحجامۃ والاحتلام۔ الخ (الھدایۃ ج۱ ص۱۹۹ کتاب الصوم) ۲ہ

روزہ میں بیوی سے بوس وکنار کا حکم

سوال :۔ روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے کس درجہ کا انتفاع شرعًا جائز ہے؟

الجواب :۔ طرفین کے امن کی صورت میں لمس وتقبیل اور بوس وکنار میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر فساد کا خطرہ ہو تو ایسا کرنا بھی مکروہ ہے۔

قال محمد رحمہ اللہ :۔ (و) کرہ (قبلۃ) ومس ومعانقۃ ومباشرۃ فاحشۃ

لہ قال ابن نجیم المصریؒ :۔ ان خاض الماء فدخل اُذُنہ لایفسد۔
(البحر الرائق ج۲ ص۲۷۸ باب مایفسد الصوم ومالایفسد)
وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۳۲۳ باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ

۲ہ قال العلامۃ الحصکفیؒ :۔ او احتلم او انزل بنظر ولو الی فرجھا مرارا او بفکر ..... لم یفطر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۹۶ کتاب الصوم ۔ باب مایفسد الصوم)
وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۳۲۲ باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ۔

(ان لم یأمن) المفسد وان امن لا بأس۔ (فتاویٰ شامی ج۲ ص۴۱۷ کتاب الصوم مطلب فیما یکرہ للصائم) [1]

روزہ کی حالت میں بھول کر کھاتے پینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں بھول کر روزے کے منافی کام کا ارتکاب کرے تو اس سے روزہ کی حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ روزہ تب فاسد ہوتا ہے جب روزہ کے منافی کوئی کام دیدہ دانستہ کیا جائے محض بھول کر کھانے پینے یا جماع کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

قال عبد الرحمٰن الجزیریؒ:۔ اما النسیان فانہ لا یفسد الصیام اصلاً فلا یجب بہ قضاء ولا کفارۃ۔ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ج۱ ص۵۶۵ باب ما یوجب القضاء ودون الکفارۃ ....الخ) [2]

حوض میں غسل کرتے وقت خروج ریح مفسد صوم نہیں

سوال:۔ کسی تالاب میں نہاتے وقت اگر ہوا خارج ہوجائے اور استرخاء کی وجہ سے پانی اندر جانے کا احتمال پیدا ہوجائے تو کیا صرف اس احتمال کی وجہ سے روزہ پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ محض استرخاء مفاصل کی وجہ سے پانی کے اندر جانے کے احتمال سے روزہ فاسد نہیں ہوتا تاہم مکروہ ہونے کی وجہ سے اجتناب ضروری ہے۔

قال فی الہندیۃ: ولو فسا الصائم او ضرط فی الماء لا یفسد الصوم ویکرہ لہ ذلک ھٰکذا فی معراج الدرایۃ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۱۹۹ کتاب الصوم الباب الثالث فیما یکرہ للصائم) [3]

---

[1] ولا بأس بالقبلۃ اذا امن علی نفسہ الجماع والانزال ویکرہ ان لم یأمن۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۲۰۰ کتاب الصوم۔ الباب الثالث فیما یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۷۳ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسدہ۔

[2] قال برہان الدین رحمہ اللہ: اذا اکل الصائم او شرب او جامع ناسیًا لم یفطر۔ (الہدایۃ ج۱ ص۱۹۹ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۲۰۲ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد۔ الخ

[3] قال العلامۃ سید احمد طحطاویؒ:۔ ولا صام سبعۃ اشیاء: (قولہ ذوق شی) مثلہ مثلہٗ فساءہ او ضراطہ فی الماء۔ (طحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح ص۵۵۹ کتاب الصوم)

نسوار کا استعمال مفسدِ صوم ہے

سوال:۔ کیا نسوار منہ میں ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسوار استعمال کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا!

الجواب:۔ نسوار منہ میں ڈالنے سے لعاب کے ساتھ مل کر پیٹ کے اندر چلی جاتی ہے جو کہ فسادِ روزہ کا ذریعہ ہے بلکہ نسوار کے عادی لوگ تو اس کو غذا کا نعم البدل سمجھتے ہیں، اسلئے نسوار منہ میں ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ اختلفوا فی معنی التغذی قال بعضهم ان يميل الطبع الى اكله وتنقضی شهوة البطن به وقال بعضهم هو ما يعود نفعه الى صلاح البدن وفائدته فيما اذا مضغ لقمة ثم اخرجها ثم ابتلعها۔ فصل الثانی يكفر لا على الاول وبالعكس فی الحشيشة لانه لا نفع فيها للبدن وربما تنقص عقله ويميل اليها الطبع وتنقضی بها شهوة البطن۔

(ردالمحتار ج۲ ص۱۱۲ کتاب الصوم۔ باب مایفسد الصوم) [۱]

بندوق کی گولی مفسدِ صوم ہے

سوال:۔ بندوق کی گولی پیٹ میں لگنے سے روزہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ بندوق کی گولی اگر پیٹ میں لگ کر باہر نکل جائے تو اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا، البتہ اگر گولی پیٹ میں ہی رہ جائے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

قال العلامة شمس الدينؒ:۔ ولو طعن برمح حتى وصل الى جوفه لم يفطره لان كون الرمح بيد الطاعن ممن يمنع وصوله الى باطنه حكماً فان بقی الزج فی جوفه فسد صومه (المبسوط للسرخسی ج۳ ص۹۸) [۲]

---

[۱] قال شيخ الاسلام ابی بکر بن علیؒ: قوله ومن ابتلع الحصاة او الحديد افطر ولا كفارة عليه ذكره بلفظ الابتلاع لان المضغ لا يتأتى فيه وانما افطر لوجود صورة الفطر ولا كفارة عليه لعدم المعنى وهو قضاء شهوة البطن۔ (الجوهرة النيرة ج۱ ص۱۷۱ فصل فيما يفسد الصوم)

ومثله فی مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۳٦۱ باب فی بیان مالا يفسد الصوم۔

[۲] قال طاهر بن احمد بن عبد الرشيدؒ:۔ ولو طعن برمح فوصل الى جوفه ثم نزعه لا تفسد صومه ولو بقی الرمح فی جوفه اختلف المشائخ والصحيح انه لا يفسد صومه هذا فی نسخة الامام فخر الدين وفی التجريد يفسد۔ (خلاصة الفتاوى ج۱ ص۲۵۳ کتاب الصوم۔ الفصل الثالث فيما يفسد الصوم)

ومثله فی فتح القدير ج۲ ص۲٦٦ باب ما يوجب القضاء والكفارة۔

رحم میں دوائی رکھنا مفسدِ صوم ہے

سوال:۔ اگر عورت کسی بیماری کی وجہ سے رحم میں بطورِ علاج دوائی رکھے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علاج کے طور پر رحم میں دوائی رکھنا جائز ہے بشرطیکہ کسی دوسرے طریقہ سے علاج ممکن نہ ہو، تاہم جب دوائی روزہ کی حالت میں اندر رکھی جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا، البتہ فرج کے بیرونی حصہ پر دوائی لگانا فسادِ صوم کا ذریعہ نہیں۔

قال طاهر بن احمدؒ:۔ وتكلم المشائخ فى الاقطار فى اقبال النساء منهم من قال على الخلاف ومنهم من قال تفسد بلاخوف وهو الصحيح۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۱ ص۲۵۳ كتاب الصوم الفصل الثالث فيما يفسد الصوم)[۱]

روزہ دار کیلئے ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا

سوال:۔ روزہ دار کے لیے ٹوتھ پیسٹ کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ٹوتھ پیسٹ میں معجون کا ذائقہ چکھا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات دوائی کا حلق سے نیچے اُترنے کا بھی احتمال ہوتا ہے اس لئے روزہ کی حالت میں اس کا استعمال مکروہ ہے اور اگر حلق سے اندر چلا جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

قال قاضى خانؒ:۔ وكذا اذا ذاقت شيئاً بلسانها لان فيه تعريض الصوم للفساد۔ (فتاوىٰ قاضى خان ج۱ ص۹۷ الفصل الرابع فى فيما يكره للصائم وما لايكره)[۲]

بدنظری سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ اگر روزہ کی حالت میں نظر بے جا استعمال ہو تو اس سے

---

[۱] قال عالم بن العلاءؒ:۔ وتكلم المشائخ فى الاقطار فى اقبال النساء منهم من قال هو على هٰذا الاختلاف، ومنهم من قال: يفسد الصوم بلاخلاف كالحقنة وهو الصحيح۔
(فتاوىٰ تاتارخانية ج۲ ص۳۶۵ كتاب الصوم الفصل الرابع مايفسد الخ)
وَمِثْلُهٗ فى الجوهرة النيرة ج۱ ص۱۷۴ باب مايفسد الصوم۔

[۲] قال ابن الهمامؒ:۔ (قوله لما بينا) من انه تعريض للصوم على الفساد اذقد يسبق شئ منه الى الحلق فان من حام حول الحمى يوشك ان يقع فيه۔
(فتح القدير ج۲ ص۲۶۸ باب مايوجب القضاء والكفارة)
وَمِثْلُهٗ فى البحرالرائق ج۲ ص۲۸۰ باب مايفسد ومالايفسد۔

روزہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔

الجواب:۔ روزہ کی حالت میں نظر کی حفاظت بھی ایک ضروری امر ہے، نظر میں بے احتیاطی سے روزہ کی حقیقت لازمی طور پر متاثر ہوتی ہے لیکن اس سے فسادِ صوم لازم نہیں آتا۔

قال ابن نجیمؒ: لان عینه لیس بمفطر۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۷۲ باب مایفسد الصوم ومالایفسد)[۱]

دانتوں سے خون آنا مفسدِ صوم نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے دانتوں سے ہر وقت خون آتا رہتا ہے تو کیا اس سے میرے روزوں پر کچھ اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ دانتوں سے صرف خون کا نکل آنا مفسدِ صوم نہیں بلکہ اس میں قدرِ تفصیل ہے کہ اگر خون قلیل مقدار میں ہو اور تھوک خون پر غالب ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا تاہم اگر خون کا ذائقہ حلق میں محسوس ہو تو روزہ فاسد ہو جائے گا، اسی طرح اگر خون تھوک پر غالب ہو یا مساوی ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا مگر صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ نہیں۔

وفی الهندیة: الدم اذا خرج من الاسنان ودخل حلقه ان کانت الغلبة للبزاق لایضرہ وان کانت للغلبة للدم یفسد صومه وان کان سواءً افسد ایضاً استحساناً۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۰۳ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد ومالایفسد)[۲]

---

[۱] قال العلامة فخر الدینؒ:۔ واما اذا انزل بنظر فلعدم المباشر: ولنا ان النظر مقصور علیه متصل بها فصار کالانزال بالتفکر۔ (تبیین الحقائق ج۱ ص۳۲۳ باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۲۵۷ باب مایوجب القضاء والکفارة۔

[۲] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: او خرج الدم من بین اسنانه ودخل حلقه یعنی ولم یصل الی جوفه اما اذا وصل فان غلب الدم اوتساویا فسد والا لا الا اذا وجد طعمه بزازیة۔
{الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۹۶ کتاب الصوم۔ باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ}

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۹۸ کتاب الصوم، الثالث فیما یفسد ومالایفسد۔

اِنہیلر کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! عصرِ حاضر میں طب کے میدان میں کافی ترقی ہوئی ہے، خاص کر دمہ جیسی خطرناک بیماری کے علاج میں اِنہیلر (ایک خاص قسم کی گیس) کامیاب ایجاد ہے جسے دمہ کے مریض بوقتِ ضرورت سانس کی رکاوٹ ختم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا اس کا استعمال روزے پر اثر انداز ہوتا ہے یا نہیں؟ وضاحت سے بیان فرمائیں؟

الجواب:۔ مذکورہ اِنہیلر پمپ کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اگر روزہ کی حالت میں انتہائی مجبوری کے وقت اس کو استعمال کیا گیا تو رمضان کے بعد اس روزے کی صرف قضا کرنا ہوگی کفارہ نہیں۔ تاہم اگر مریض کی حالت ایسی ہو کہ اس کے بغیر اس کا گذارہ نہ ہوتا ہو تو وہ روزہ نہ رکھے صرف فدیہ دینا ہوگا۔

حالتِ صوم میں آنکھوں میں دوائی ڈالنا

سوال:۔ اگر کسی کی آنکھوں میں بہت سخت تکلیف ہو تو کیا وہ روزہ کی حالت میں دوائی استعمال کر سکتا ہے؟ جبکہ دوائی ڈالنے کے بعد اس کا اثر حلق میں محسوس ہوتا ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے حالتِ اضطرار یعنی انتہائی تکلیف کے وقت رمضان کا روزہ افطار کرنے کی گنجائش بھی دی ہے کہ حاذق اور مسلمان طبیب کے مشورہ سے روزہ توڑ دیا جائے، البتہ آنکھوں میں دوائی ڈالنے سے روزہ متاثر نہیں ہوتا، اس لیے اگر تکلیف کے وقت روزہ کی حالت میں آنکھوں میں دوائی ڈالنا جائز ہے، اس عمل سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، اگرچہ اس دوائی کا اثر حلق کے اندر محسوس ہو۔

لما فی الهندية: لو اقطر شيئًا من الدواء فی عينيه لا يفطر صومه عندنا و ان وجد طعمه فی حلقه۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۰۳ كتاب الصوم، باب ما لا يفسد الصوم)[1]

---

[1] لما قال العلامة الحصكفیؒ: او ادهن او اكتحل او .... وان وجد طعمه فی .... لم يفطر حلقه۔ قال ابن عابدینؒ: قوله ان وجد طعمه فی حلقه ای طعم الكحل او الدهن كما فی السراج وكذا لو بزق فوجد لونه فی الاصح۔
(رد المحتار ج۲ ص۳۹۵ كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم الخ)

روزہ کی حالت میں بار بار غسل کرنے یا سر دھونے کا حکم

سوال:۔ اگر رمضان کے روزے سخت گرمی کے موسم میں آجائیں تو کیا روزہ دار آدمی گرمی کی شدت کی وجہ سے بار بار غسل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شدتِ حرارت (سخت گرمی) کی وجہ سے حالتِ صوم میں بار بار غسل کرنا یا بار بار سر دھونا بشرطیکہ پانی کے قطرات حلق میں نہ جائیں، جائز اور مرخص ہے، ایسا کرنے سے روزے پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔

عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر الناس فی سفرہ عام الفتح بالفطر وقال تقووا لعدوکم وصام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوبکر قال الذی حدثنی لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعرج یصب علیٰ رأسہ الماء وھو صائم من العطش او من الحر۔ (ابو داؤد ج ۱ ص۳۲۲ باب الصائم یصب علیہ الماء من العطش، کتاب الصوم)

روزہ کی حالت میں بیوی سے بغلگیر ہونا

سوال:۔ اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے میں روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ بغلگیر ہو کر سو جائے اور دونوں میں سے کسی کو انزال نہ ہو، تو کیا اس سے روزہ متاثر ہوگا یا نہیں؟ برائے مہربانی فقہ حنفی کی رو سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا، ایک دوسرے کے ساتھ چمٹنا یا بغلگیر ہو کر سو جانا ممنوع نہیں بشرطیکہ اپنے اوپر پوری قدرت ہو اور اگر قدرت نہ ہو تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تاکہ کسی محظور میں نہ پڑ جائے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر میاں بیوی دونوں میں سے کسی کا انزال نہ ہوا ہو تو روزہ فاسد نہیں، البتہ دونوں میں سے جس کا بھی انزال ہو جائے تو اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس پر اس روزہ کی قضاء لازم ہوگی۔

لما قال العلامۃ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ، یا زن را بوسہ کرد یا مس بشہوت کرد اگر انزال شد روزہ فاسد شود و الا فاسد نہ شود۔

(مالا بد منہ ص۹۷ کتاب الصوم)

باب القضاء والکفارۃ

(قضاء اور کفارہ کے احکام ومسائل)

سفر پر روانگی سے پہلے افطار کرنے والے کا حکم

سوال:۔ کیا سفر کا ارادہ کرنے والے کے لیے روانگی سے پہلے گھر میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی شخص نے ایسی حالت میں گھر میں کچھ کھا پی لیا تو اس پر قضاء لازم ہے یا کفارہ واجب ہے؟

الجواب:۔ سفر پر نکلنے سے قبل افطار مرخص نہ ہونے کی وجہ سے اگر کسی شخص نے گھر میں کھانا کھایا اور پھر سفر پر روانہ ہوا تو اس پر کفارہ اور قضاء دونوں واجب ہیں، سفر کا ارادہ کفارہ پر اثر انداز نہیں ہوتا، تاہم اگر خروج کے بعد روزہ افطار کیا تو صرف قضاء لازم ہوگی کفارہ نہیں۔

لما قال الشیخ ابو اللیث السمرقندیؒ:۔ ولو افطر ثم سافر فعلیہ الکفّارۃ۔
(فتاوٰی نوازل ص۹۹ کتاب الصوم۔فصل فیما یفسد الصوم) [1]

قصداً روزہ نہ رکھنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص رمضان المبارک کی عظمت اور تقدس میں شک ڈال کر قصداً وعمداً روزہ نہ رکھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ رمضان المبارک کے روزہ کو قصداً وعمداً توڑنے سے قضاء وکفارہ دونوں لازم ہوجاتے ہیں۔ شریعتِ مقدسہ نے کفارہ میں اوّلاً غلام آزاد کرنا مقرر کیا ہے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے اور اگر روزوں کی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا صدقہ کی مقدار کے برابر ہر مسکین کو غلّہ یا رقم دے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ قضاء کا روزہ اس کے علاوہ ہے جس کا رکھنا تینوں صورتوں میں ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ:۔ ولو اکل او شرب مایتغذی بہ او یتداوی

---

[1] لما قال العلامۃ محمد کامل الطرابلسیؒ:۔ان سافر بعد طلوع الفجر لایفطر ذلک الیوم لانہ لزمہ صومہ وھو مقیم فلا یبطلہ باختیارہ فان افطر قبل الخروج فعلیہ القضاء والکفارۃ بخلاف مالو افطر بعد الخروج فعلیہ القضاء دون الکفارۃ۔ (الفتاوٰی الکاملیۃ ص۱۶ کتاب الصوم)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸۵ کتاب الصوم۔الاسباب المبیحہ للفطر۔

بہ فعلیہ القضاء والکفّارۃ .... وکفارۃ الظہار- قال العلامۃ بدرالدین العینیؒ: تحت قولہ مثل کفارۃ الظہار ای الکفارۃ التی تجب بالوقاع مثل کفارۃ الظہار وھی عتق رقبۃ فان لم یجد فصیام شہرین متتابعین فان لم یستطع فاطعام ستین مسکیناً لکل مسکین نصف صاع من بر او صاع من تمر-الخ (البنایۃ شرح الھدایۃ ج۴ ص۳۰۸ باب ماتوجب القضاء والکفارۃ) لـہ

رمضان میں دن کے وقت بیوی سے جماع موجب کفارہ وقضاٗ ہے

سوال:- اگر ایک شخص ماہ رمضان میں دن کے وقت اپنی بیوی سے روزہ کی حالت میں جماع کرے اور اس عمل پر نادم بھی ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا عورت پر بھی کفارہ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں دن کے وقت جماع کرنے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے جس کے بدلے میں قضاء وکفارہ دونوں لازم ہیں، ایسے عمل پر اگر میاں بیوی دونوں راضی ہوں تو دونوں پر کفّارہ وقضاء واجب ہے ورنہ بیوی کو مجبور کرنے کی صورت میں بیوی پر صرف قضاء اور خاوند پر قضاء وکفارہ دونوں واجب ہوں گے۔

قال طاھر بن احمدؒ:- اذا جامع امرأتہ متعمّداً فی نہار رمضان فعلیہ القضاء والکفارۃ اذا توارت الحشفۃ انزل اولم انزل- (خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۲۵۹ کتاب الصوم- الفصل الثالث فیما یفسد- الخ) ؏

لـہ لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ:- ان جامع فی رمضان اداء اوجومع فی احد السبیلین او اکل او شرب غذاء اودواء عمداً او احتجم فظن فطرہ بہ فاکل عمداً اقضی وکفر ککفارۃ المظاھر- قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ ککفارۃ المظاھر مرتبط بقولہ وکفر ای مثلہا فی الترتیب فیعتق اوّلاً فان لم یجد صام شہرین متتابعین فان لم یستطع اطعم ستّین مسکیناً-

(رد المحتار ج۲ ص۴۱۲ مطلب فی الکفّارۃ)

وَمِثْلُہٗ فی طحطاوی ص۶۶ فصل فی الکفّارۃ ومایسقطھا عن الذمۃ بعد الوجوب)

؏ قال برھان الدینؒ:- ومن جامع فی احد السبیلین عامداً فعلیہ القضاء استدراکاً للمصلحۃ الفائتۃ والکفّارۃ لتکامل الجنایۃ- (الھدایۃ ج۱ ص۲۰۱ کتاب الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۹۱ کتاب الصوم فصل رکنہ-

کفارہ سے بچنے کا حیلہ

سوال:۔ ایک شخص نے خواہشات سے مجبور ہوکر بیوی سے جماع کا ارادہ کیا لیکن رمضان میں کفارہ کے وجوب کا ڈر بھی تھا، کفارہ سے بچنے کے لیے اس نے یہ حیلہ سوچا کہ پہلے منہ میں کاغذ رکھوں تاکہ روزہ ٹوٹ جائے، چنانچہ روزہ ٹوٹ جانے کے بعد اُس نے بیوی سے جماع کیا، کیا اس شخص پر اس صورت میں کفارہ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کاغذ منہ میں رکھ کر نگل لیا ہو تو حیلہ کارآمد ہوکر روزہ ٹوٹ جانے سے قضاء واجب ہے اور جماع کرنے پر کفارہ واجب نہیں کیونکہ جماع کے وقت اس کا روزہ نہیں تھا تاہم گناہ ضرور ہے، البتہ اگر کاغذ منہ میں رکھا ہوا ہو حلق سے نیچے نہیں اترا ہو تو پھر حیلہ بے سود ہوکر قضاء و کفارہ دونوں واجب رہیں گے، کیونکہ صرف منہ میں کاغذ رکھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال طاھر بن احمدؒ:۔ ولو اکل حصاۃ اونواۃ اوحجرا او مدرا فعلیہ القضاء ولا کفارۃ وکذا لو اکل القطن او الحشیش او التراب او الکاغذ او السفرجل اذا لم یکن مدرکا۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۲۵۵ کتاب الصوم الفصل الثالث فیما یفسد)[1]

روزہ کی حالت میں منجن کے استعمال کا حکم

سوال:۔ منجن کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ منجن کا استعمال روزہ کی حالت میں کسی چیز کو چکھنے کی طرح سے مکروہ ہے تاہم اگر غلطی سے معدہ میں پہنچ جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: اوذاق شیئاً بفمہ وان کرہ لم یفطر۔ قال ابن عابدینؒ تحت قولہ ان کرہ ای الاکل کما یأتی۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۶۸ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسدہ مطلب فی حکم الاستمناء بالکف)

قال الحصکفیؒ:۔ وکرہ مضغ علک ابیض ممضوغ ملتئم والا فیفطر۔
قال ابن عابدینؒ تحتہ: فان کان مما یصل عادۃ حکم بالفساد لانہ

---

[1] لما قال قاضی خان رحمہ اللہ:۔ اذا اکل الصائم ما لا یوکل عادۃ کالحصاۃ والنواۃ وکالقطن والحشیش والتراب والکاغذ والبزاق..... فسد صومہ۔ (فتاوٰی قاضی خان ج۱ ص۱۰۲ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسد)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۰۲ الباب الرابع فیما یفسد کتاب الصوم۔

کالمتیقن ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۴۱۶ مطلب فیما یکرہ للصائم) ۱؎

ناس کا روزہ پر اثر انداز ہونے کا حکم

سوال:۔ ناس کے سونگھنے سے روزہ پر کیا اثر پڑتا ہے، اور ناس کی حقیقت کیا ہے؟

الجواب:۔ ناس ہندی زبان کا لفظ ہے، فیروز اللغات میں اس کا معنیٰ نسوار لکھا ہے اور اس کا استعمال ناک کے ذریعے ہوتا ہے۔ چونکہ اس نسوار کے ذرّات اتنے باریک ہوتے ہیں کہ سانس کے ذریعے جوفِ دماغ یا جوف معدہ میں پہنچ جاتے ہیں جو کہ مُفسدِ صوم ہے لہٰذا ناس سونگھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

لما قال فی الهندیة :۔ وفی دواء الجائفة والآمة أکثر المشائخ علی ان العبرة للوصول الی الجوف والدماغ لا لکونه رطبًا او یابسًا حتّٰی اذا علم ان الیابس وصل یفسد صومه ولو علم ان الرطب لم یصل لم یفسد ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۰۴ الباب الرابع فیما یفسد وما لا یفسد) ۲؎

دھوئیں اور غبار کے روزے پر اثرات

سوال:۔ دھواں اور گرد و غبار اگر حلق کے اندر چلا جائے تو اس سے روزہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ دھواں یا گرد و غبار اگر حلق کے اندر بلا قصد چلا جائے تو روزہ متأثر نہیں

۱؎ لما قال الامام برهان الدین المرغینانیؒ :۔ ومن ذاق شیئًا بفمه لم یفطر لعدم الفطر صورة و معنًی ویکره له ذٰلك لما فیه من تعریض الصوم علی الفساد ۔ قال العلامة بدر الدین العینیؒ : تحت قوله من تعریض الصوم علی الفساد لانه لا یؤمن ان یصل الی جوفه ......
قال ایضًا تحت قوله ومضغ العلك لا یفطر الصائم لانه لا یصل الی جوفه وقیل اذا لم یکن ملتئمًا یفسد لانه یصل الیه) ای الی جوفه بعض اجزائه) لانه اذا لم یکن ملتئمًا یتفتت فیدخل فی حلقه من ذٰلك شئ فیفسد صومه ۔ (البنایة شرح الهدایة ج۴ ص۱۸۱،۱۸۲ باب ما یوجب القضاء والکفارة)
ومِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۲ ص۱۴۱ کتاب الصوم ۔

۲؎ لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ :۔ وما وصل الی جوف الرأس والبطن من الاذن والانف والدّبر فهو مفطر بالاجماع وفیه القضاء ۔
(خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۵۳ الفصل الثالث فیما یفسد الصوم وفیما لا یفسد)
ومِثْلُهٗ فی امداد المفتیین ج۱ ص۴۹۲ المعروف بفتاوی دار العلوم دیو بند)

ہوتا البتہ اگر قصداً و عمداً ادخال کی صورت ہو تو روزہ فاسد ہو کر قضاء کا موجب بن جاتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ او دخل حلقه غبار او ذباب او دخان ولو ذاکرا استحسانا لعدم امکان التحرز عنه ومفاده انه لو ادخل حلقه الدخان افطر ای دخان کان ولو عودا او عنبرا لو ذاکرا لامکان التحرز عنه۔ (الدرالمختار ج۲ ص۳۹۵ باب ما یفسد الصوم ومالا یفسده)[1]

روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود فدیہ دینا بے سود ہے

سوال:۔ کفارہ کے وجوب کی صورت میں اگر روزہ کی استطاعت ہو تو کیا فدیہ کی ادائیگی مفید ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود فدیہ دینا بے سود ہے، ایسی حالت میں روزہ رکھنا ضروری ہے تاہم اگر روزہ رکھنے کی استطاعت نہ ہو تو فدیہ دینا جائز ہے۔

لما قال العلامة بدرالدین العینیؒ: والکفارة مثل کفارة الظهار ای الکفارة التی تجب بالوقاع مثل کفارة الظهار وهی عتق رقبة فان لم یجد فصیام شهرین متتابعین فان لم یستطع فاطعام ستین مسکینا الخ۔ (البنایة شرح الهدایة ج۴ ص۳۰۸ باب ما یوجب القضاء والکفارة)[2]

جبراً روزہ افطار کرانے پر قضاء لازم ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص پر جبر کرکے روزہ افطار کرایا جائے تو کیا اُس پر کفّارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی نے زبردستی کرکے دوسرے کا روزہ افطار کرایا تو کھانے پینے والے پر

---

[1] لما قال العلامة عبدالعلی بحرالعلوم:۔ ولو دخل مالا یستطاع الاحتراز عنه فی الجوف بلاصنع منه کالدخان والغبار لا یفسد الصوم لان التکلیف بحسب الوسع واما لو ادخل الدخان کما یعتاد الیوم فی اکثر الناس فینبغی ان یفسد به الصوم خصوصاً دخان التنباک لانه یورث الفرح وتحصل التسکین للمعتادین ودخول الذباب فی الحلق من قبیل الدخان عندنا۔ (رسائل الارکان ص۲۱۱ بیان دخول الدخان والغبار فی الجوف)

وَمِثْلُهٗ فی حاشیة الهدایة ج۱ ص۲۰۰ باب ما یوجب القضاء والکفارہ۔

[2] لما قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ تحت قوله ککفارة المظاهر مرتبط بقوله وکفر ای مثلها فی الترتیب فیعتق اولاً فان لم یجد فصام شهرین متتابعین فان لم یستطع اطعم ستین مسکینا۔ الخ (ردالمحتار ج۲ ص۴۱۲ مطلب فی الکفارة)

وَمِثْلُهٗ فی طحطاوی ص۳۶۶ فصل فی الکفارة وما یسقطها عن الذمة بعد الوجوب۔

کفارہ واجب نہیں البتہ اسی دن کی قضاء لازم ہوگی۔

قال شمس الدین سرخسیؒ:۔ ولو اکرہ علی اکل وشرب فعلیہ القضاء دون الکفارہ۔
(مبسوط سرخسی ج ۳ ص۹۸ باب ما یفسد الصوم) [1]

غروبِ آفتاب سے قبل افطار موجبِ قضاء ہے

سوال:۔ ایک شخص نے غروبِ آفتاب کے وقت عید کا چاند دیکھ کر یہ خیال کیا کہ آج عید کا دن ہے اور یہ چاند دوسری رات کا ہے اس لیے آج ہمارا روزہ جائز نہیں، پھر اس نے فوراً روزہ توڑ کر دوسروں کو بھی افطار کرنے کی دعوت دی، تو ایسے شخص کے روزہ کا کیا حکم ہے؟ کیا اس پر صرف قضاء واجب ہے یا کفارہ یا دونوں؟

الجواب:۔ روزہ اور عید کا دارومدار باقاعدہ چاند کی رؤیت پر ہے، حساب وکتاب کی روشنی میں عید منانا از روئے شرع مرخص نہیں۔ صورتِ مذکورہ میں محض چاند کی کمیت وکیفیت سے روزہ توڑنا مناسب نہیں، اگر پہلے دن کی باقاعدہ رؤیت نہ ہو تو اس شخص پر قضاء وکفارہ دونوں واجب ہیں۔

قال طاہر بن احمد رحمہ اللہ:۔ ولو افطروا کثر رایہ ان الشمس لم تغرب فعلیہ القضاء والکفارۃ لان النہار کان ثابتاً وقد انضم الیہ اکبر رایہ فصار بمنزلۃ الیقین۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۲۵۶ کتاب الصوم۔ الفصل الثالث فیما یفسد۔الخ) [2]

بڑھاپے کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے والے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص ضعف وبڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو کیا

---

[1] قال برهان الدین رحمہ اللہ:۔ ولو کان مخطیاً او مکرهاً فعلیہ القضاء۔
(الهدایۃ ج۱ ص۱۹۹ کتاب الصوم، باب ما یوجب القضاء والکفارۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۲۵۵ کتاب الصوم۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ:۔ (الفجر طالع والشمس لم تغرب) عملاً بالاصل فیهما۔ قال ابن عابدین رحمہ اللہ: ای فی الاوّل والثانی فان الاصل فی الاوّل بقاء اللیل، فلا تجب الکفارۃ وفی الثانی بقاء النہار فتجب علی احد الروایتین کما علمت۔
(شامی ج۲ ص۴۰۵ کتاب الصوم۔ باب ما یفسد الصوم)
وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۱ ص۲۲۵ باب ما یفسد الصوم۔

فدیہ دے کر اس کا ذمہ فارغ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا شخص جو ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے روزہ کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے روزہ کی جگہ فدیہ ادا کرنا جائز ہے جو کہ ایک روزہ کے بدلہ نصف صاع یعنی ایک سو چالیس تولہ گندم یا اس کی مروجہ قیمت کی ادائیگی ہے۔

قال عبدالرحمٰن جزریؒ:۔ الشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصوم فی جمیع فصول السنۃ یفطر وتجب من کل یوم فدیۃ طعام مسکین۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۲۷ کتاب الصوم)[1]

میت کے ذمہ روزوں کا حکم

سوال:۔ اگر بیمار کو بیماری سے شفا ملنے کے بعد اتنا وقت ملا ہو کہ اس میں وہ قضاء روزے رکھ سکتا تھا لیکن سستی کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکا اور اچانک وفات پا گیا، ایسی صورت میں پسماندگان و ورثاء کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت کے مطابق اگر روزے رکھنے کا موقع نہ ملے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ورثاء پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، البتہ اگر موقع ملا ہو اور قدرت کے باوجود روزے نہ رکھے تو عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَر ملنے کی وجہ سے روزے واجب رہیں گے۔ اگر مرتے وقت وصیت کی ہو تو ورثاء کو ثلث مال سے وصیت کے مطابق عمل کر کے فدیہ ادا کرنا ضروری ہے، وصیت نہ کرنے پر میت گنہگار ہے، تاہم تبرع اور احسان کر کے ورثاء بلا وصیت بھی فدیہ ادا کر سکتے ہیں۔

قال محمد بن اسرائیلؒ:۔ لو افطر المریض یقضی بلا فدیۃ ولو مات قبل البرء لاشئ علیہ اذلم یدرک عِدَّۃً من ایام اُخر وعلیہ ان یوصی بفدیۃ مکان کل یوم نصف صاع من بر او صاع من غیرہ فیما یجوز فی صدقۃ الفطر فیہ ورد النص فیہ ویعتبر ذلک من ثلث مالہ ولو لم یوص وتبرع عنہ ورثتہ جاز ولا یلزمہم بلا ایصاء عندنا (جامع الفصولین ج ۲ ص ۱۹۸ کتاب الصوم)[2]

---

[1] قال فی الھندیۃ:۔ فالشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصیام یفطر ویطعم لکل یوم مسکیناً کما یطعم فی الکفارۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۰۷ کتاب الصوم۔ الباب الخامس فی الاعذار التی تبیح الافطار)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۰۵ کتاب الصوم۔ فصل فی حکم الصوم المؤقت۔

[2] قال ابن نجیمؒ:۔ ولا قضاء ان ماتا علیہما ای ولا قضاء علی المریض والمسافر اذا ماتا قبل الصحۃ والاقامۃ لانہما لم یدرکا عدۃ من ایام اُخر فلم یوجد شرط وجوب الاداء فلم یلزم القضاء قید بہ لانہ لو صح المریض او اقام المسافر ولم یقض حتی مات لزمہ الایصاء بقدرہ وھو مصرح بہ فی بعض نسخ المتن لوجود الادراک بھذا المقدار۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۸۳ فصل فی العوارض)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۲۶۲ کتاب الصوم۔ الفصل الرابع النذر۔

روزہ کی حالت میں دانت میں دوائی ڈالنا

سوال:۔ شدتِ درد کی وجہ سے اگر دانتوں میں دوائی ڈالی گئی یا دانت نکلوانے کے بعد تکلیف ناقابلِ برداشت ہو تو روزہ افطار کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اور کیا اس روزے کی قضا واجب ہو گی یا کفارہ؟

الجواب:۔ دانت کا درد اگر برداشت سے باہر ہو تو ایسی حالت میں دوا استعمال کر لینا جائز ہے اور اس کے لیے روزہ افطار کرنا مرخص ہے جس کی وجہ سے قضا واجب ہے کفارہ نہیں۔

قال قاضی خانؒ:۔ لا فرق بین الرطب والیابس اذا وصل الجوف فسد صومہ وان لم یصل لا یفسد وذکر فی الاصل انہ یفسد الصوم مطلقاً بنا علی الغالب والغالب ھو الوصول الی الجوف وذکر الشرط فی تفسیر المجرد۔ (فتاوٰی قاضی خان ج۱ ص۲۰۸ الفصل الخامس فیما لا یفسد الصوم) [1]

شرمگاہ میں انگلی داخل کرنے سے روزہ کا حکم

سوال:۔ اگر عورت اپنی قُبل میں یا مرد اپنی دُبر میں انگلی داخل کرے تو کیا اس سے روزہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر انگلی داخل کرتے وقت خشک ہو تو روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ تیل یا پانی سے اگر تر کر کے داخل کیا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا واجب ہو گی کفارہ نہیں تاہم اس سے اجتناب ہر حالت میں ضروری ہے۔

قال فخر الدین الزیلعیؒ:۔ لو ادخلت الصائمۃ اصبعھا فی فرجھا او دبرھا لا یفسد علی المختار الا ان تکون مبلولۃ بماء او دھن۔ (تبیین الحقائق ج۱ ص۳۲۳ باب ما یفسد الصوم) [2]

---

[1] قال عالم بن العلاءؒ:۔ ان فعل ذٰلک بہ من غیر اختیارہ او باختیارہ لان بہ عذرا لا تلزمہ الکفارۃ۔ (فتاوٰی تاتارخانیۃ ج۲ ص۳۶۵ کتاب الصوم الفصل الرابع فیما یفسد الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۸۲ فصل فی العوارض۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: (او ادخل اصبعہ الیابسۃ فیہ) ای دبرہ او فرجھا ولو مبتلۃ فسد۔ (شامی ج۲ ص۳۹۷ کتاب الصوم۔ باب ما یفسد الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۲۶ کتاب الصوم ۔ الفصل الثالث فیما یفسد الخ

عورت کے لیے کفّارہ کا طریقہ

سوال:۔ اگر عورت کو روزے کا کفّارہ ادا کرنے کے دوران حیض آجائے تو کیا وہ دوبارہ از سرِ نو روزے رکھے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ ادائے کفّارہ کے دوران اگر عورت کو حیض آجائے تو اس کے غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے روزوں کی توالی (پے درپے) پر کوئی اثر نہیں پڑتا تاہم حیض کے ختم ہوتے ہی فوراً روزہ رکھا جائے گا تاخیر کی صورت میں استیناف لازم ہوگا۔

قال العلامة شمس الدین سرخسیؒ:۔ فان کانت امرأة فافطرت فیما بین ذٰلک للحیض لم یکن علیها استقباله۔ (مبسوط سرخسی ج۳ ص۸۱ کتاب الصوم) [۱]

کفّارہ میں تداخل ممکن ہے

سوال:۔ ماہ رمضان میں متعدد بار روزہ افطار کرنے یا پھر متعدد ماہِ رمضان میں کئی مرتبہ جماع یا افطار کرکے ان میں تداخلِ کفّارہ ممکن ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تداخلِ کفّارہ کے بارے میں فقہاء کرام کے متعدد اقوال ہیں، ظاہر الروایت اور محتاط قول یہ ہے کہ ہر روزے کا الگ الگ کفّارہ ادا کیا جائے، تاہم اکثر فقہاء کرام نے تداخل کفّارہ کی صورت اختیار کی ہے اس لیے کفّارہ میں تداخل مرخص ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ ولو تکرر فطرہ ولم یکفر للاول یکفیه واحدة ولو فی رمضانین عند محمدؒ وعلیه الاعتماد بزازیة ومجتبیٰ وغیرهما واختار بعضهم للفتویٰ ان الفطر بغیر الجماع تداخل والا لا۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۱۳ کتاب الصوم ۔مطلب فی الکفارة) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وکذا فی کفارة القتل والظهار للنص علی التتابع لا لعذر الحیض لانها لا تجد شهرین عادة لا تحیض فیهما لکنها اذا طهرت تصل بما مضیٰ فان لم تصل استقبلت۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۷۷ باب ما یفسد الصوم...الخ)
وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج۱ ص۱۰۶ الفصل الخامس فیما یفسد الصوم۔

[۲] قال ابن نجیمؒ:۔ ولو جامع مرارًا فی ایام من رمضان واحد ولم یکفر کان علیه کفّارة واحدة لانها شرعت للزجر وهو یحصل بواحدة فلو جامع وکفر ثم جامع مرة اخر فعلیه کفارة اخری فی ظاهر الروایة للعلم بان الزجر لم یحصل بالاول ولو جامع فی رمضانین فعلیه کفارتان وان لم یکفر للاولیٰ فی ظاهر الروایة وهو الصحیح۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۷۷ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسده)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۱۰۱ کتاب الصوم۔ فصل فی حکم فساد الصوم۔

روزہ کی حالت میں جماع مع حائل کا حکم

سوال: رمضان میں اگر بیوی سے جماع کرتے وقت کوئی چیز حائل ہو تو کیا اس سے کفارہ ساقط ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی چیز کے حائل ہونے کے باوجود حرارت اور لذت محسوس ہو تو جماع بلا حائل اور مع حائل دونوں کا حکم ایک ہے، قضاء و کفارہ دونوں واجب ہوں گے، تاہم بصورتِ حائل اگر حرارت محسوس نہ ہو تو صرف قضاء واجب ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ:۔ کذا فی المعراج والمراد باللمس اللمس بلا حائل فان مسها وراء الثیاب فامنی فان وجد حرارة جلدها فسد والا فلا۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۲۷۲، ۲۷۳ باب ما یفسد وما لا یفسد)[۱]

اغلام (لواطت) موجب کفارہ وقضاء ہے

سوال: کیا لواطت جیسا قبیح کام کرنے سے کفارہ واجب ہوتا ہے یا صرف قضاء کافی ہے؟

الجواب: قضاء شہوت کا محل مشتہات ہونا ضروری ہے جو احد السبیلین ہے، ایسی جگہوں کو جب بھی روزہ کی حالت میں استعمال کیا جائے تو کفارہ و قضاء دونوں واجب ہو جاتے ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دونوں لازم ہیں۔

قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: وقوله او جومع نص علی انها تجب علی المفعول به وعلی المرأة ان کان بطوعها۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص۳۲۷ باب ما یفسد الصوم)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ قوله ولو بحائل لا یمنع الحرارة) نقیض ما بعد لو وهو عدم الحائل المذکور اولی بالحکم وهو وجوب القضاء لکن لا تظهر الاولویة بالنظر الی عدم الکفارة مع ان الکلام فیما یوجب القضاء دون الکفارة وقید الحائل بکونه لا یمنع الحرارة لما فی البحر لو مسها وراء الثیاب فامنی فان وجد حرارة جلدها فسد والا فلا۔

(شامی ج ۲ ص۴۰۲ کتاب الصوم۔ باب ما یفسد الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۲۰۴ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد الصوم۔ الخ

[۲] قال العلامة قاضیخانؒ: وان جامعها فی دبرها او جامع امته فی دبرها متعمدا علیه القضاء والکفارة انزل او لم ینزل۔ (فتاوی قاضی خان ج ۱ ص۱۰۲ الفصل الخامس فی ما یفسد الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج ۲ ص۷۹ کتاب الصوم۔

روزہ کی حالت میں زنا کرنے پر قضاء اور کفّارہ کا وجوب

سوال:۔ بظاہر زنا کرنے سے انسان پر حد جاری ہوتی ہے، تو کیا حد کے اجراء کی وجہ سے کفّارہ کے وجوب پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع یا کسی اجنبیہ سے زنا کرنے میں وجوبِ قضاء اور کفّارہ میں کوئی فرق نہیں جبکہ حد کا اجرا الگ مسئلہ ہے جس کا کفّارہ و قضاء کے وجوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تاہم جبر و اکراہ کی صورت میں کفّارہ واجب نہیں ہوتا۔

قال العلامة طاهر بن احمدؒ:۔ وان کانت المرأة مکرهة فعلیها القضاء دون الکفارة ولو کان الرجل مکرها علی الجماع فعلیه الکفّارة فی قولِ ابی حنیفةؒ الاوّل ثم رجع وقال علیه القضاء دون الکفارة وهو قولهما وعلیه الفتوٰی۔
(خلاصة الفتاوٰی ج۱ ص۲۵۹ کتاب الصوم الفصل الثالث فیما یفسد الصوم)[1]

بہیمہ (جانور) سے وطی کرنے سے روزہ کا حکم

سوال:۔ کسی جانور کے ساتھ وطی کرنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جانوروں کے ساتھ وطی کرنے سے روزہ یقیناً فاسد ہو کر قضاء لازم ہو جاتی ہے اور کفّارہ لازمی نہیں، تاہم نفسِ دخول سے روزہ فاسد نہیں ہوتا لیکن یہ فعل ہر صورت میں حرام ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: وکذا اذا جامع بهیمة ولم ینزل او میتة ولم ینزل الخ وان انزل فی هٰذه الوجوه کان علیه القضاء دون الکفّارة۔ (فتاوٰی قاضی خان ج۱ ص۲۰۱ الفصل الخامس فیما یفسد الصوم)[2]

جماع کے بغیر انزال سے صرف قضاء واجب ہے

سوال:۔ احد السبیلین کے علاوہ اگر کسی حرکت سے

---

[1] قال فی الهندیة: ولو مکنت نفسها من صبیّ او مجنون فزنی بها فعلیها الکفّارة بالاتفاق۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۲۰۵ کتاب الصوم النوع الثانی ما یوجب القضاء والکفّارة)
وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۱ ص۳۲۷ باب ما یفسد الصوم۔

[2] قال عالم بن العلاء رحمه الله:۔ ولو جامع میتة او بهیمة فلا کفّارة علیه انزل او لم ینزل۔ (فتاوٰی تاتارخانیة ج۲ ص۳۷۱ کتاب الصوم۔ الفصل الرابع فیما یفسد)
وَمِثْلُهٗ فی شامی ج۲ ص۳۹۹ کتاب الصوم مطلب فی حکم الاستمناء بالکف۔

انزال ہو جائے تو اس پر قضاء اور کفّارہ دونوں واجب ہیں یا صرف قضاء؟

الجواب: کفارہ چونکہ ایک عظیم جرمانہ ہے اور جرم کی نوعیت کو دیکھ کر اس کا حکم لگایا جاتا ہے، احد السبیلین کے علاوہ کسی اور طریقہ سے انزال میں چونکہ قضاء شہوت کامل طریقہ سے نہیں پایا جاتا اس لیے اس میں صرف قضاء واجب ہے اور کفّارہ کی ضرورت نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ اوجامع فیمادون الفرج ولم ینزل یعنی فی غیر السبیلین کسرۃ وفخذ وکذ الاستمناء بالکف (او ادخل ذکرہ فی بھیمۃ) اومیتۃ من غیر انزال اومسّ فرج بھیمۃ اوقبلھا فانزل او افطر فی احلیلہ۔

(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۲ ص ۳۹۸،۳۹۹ کتاب الصوم باب مایفسد الصوم) [1]

سوال:۔ اگر کوئی شخص رمضان کے علاوہ روزہ

غیر رمضان میں روزہ افطار کرنے سے صرف قضاء لازم ہے

(بلاعذر شرعی) افطار کرے تو اس پر صرف قضاء لازم ہے یا کفّارہ بھی لازم ہے؟

الجواب:۔ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر روزہ توڑنے سے فقط قضاء واجب ہے خواہ روزہ فرض ہو یا نفل یا نذر ہو کفّارہ واجب نہیں ہوتا، یہ صرف رمضان کے ساتھ خاص ہے۔

وفی الھندیۃ:۔ ولا کفّارۃ بافساد صوم غیر رمضان کذا فی الکنز۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۲۱۵ کتاب الصوم۔ باب المتفرقات) [2]

سوال:۔ اگر ایک شخص سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھے تو ایسے شخص کے لیے

سفر میں روزہ نہ رکھنے پر صرف قضاء واجب ہے

---

[1] قال العلامۃ الکاسانیؒ:۔ ولوجامع بھیمۃ فانزل فسد صومہ وعلیہ القضاء ولاکفّارۃ علیہ لانہ وان وجد الجماع صورۃ ومعنی وھو قضاء الشھوۃ لکن علیٰ سبیل القصور لسعۃ المحل ولوجامعھا ولم ینزل لایفسد۔ الخ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۹۴ کتاب الصوم۔ فصل فی رکنہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۲ ص ۲۷۲ باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ۔

[2] قال العلامۃ برھان الدینؒ:۔ انّ الکفّارۃ تعلقت بجنایۃ الافطار فی رمضان علیٰ وجہ الکمال۔ (الھدایۃ ج ۱ ص ۲۱۹ باب مایفسد الصوم) الخ

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ قاضیخان ج ۱ ص ۱۰۳ الفصل الخامس فیما یفسد الصوم۔

شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسافر کے لیے حالتِ سفر میں روزہ نہ رکھنا مرخص ہے لہٰذا اگر کوئی شخص حالتِ سفر میں روزہ نہ رکھے تو اس پر صرف قضاء واجب ہے کفّارہ نہیں۔

قال قاضی خان رحمہ اللّٰہ:۔ لو اصبح المقیم صائماً ثمّ سافر فافطر بعد ذٰلک لاکفّارۃ علیہ۔ (فتاوٰی قاضیخان ج۱ ص۱۰۲ الفصل السابع فیما یسقط الکفّارۃ ومالایسقط) [1]

استمناء بالید سے انزال میں قضاء واجب ہے

سوال: روزے کی حالت میں اگر کوئی شخص استمناء بالید (ہاتھ سے انزال) کرے تو کیا اس شخص پر کفّارہ واجب ہے یا صرف قضاء کافی ہے؟

الجواب: استمناء بالید میں چونکہ قضاءِ شہوت کامل نہیں ہوتی اس لیے اس سے کفارہ واجب نہیں ہوتا تاہم قضاء لازمی ہے، اور اگر انزال نہ ہو تو پھر قضاء بھی واجب نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وکذا الاستمناء بالکف) قال ابن عابدینؒ:۔ ای فی کونہ لایفسد لکن ھٰذا اذا لم ینزل اما اذا انزل فعلیہ القضاء کماسیصرح بہ وھوالمختار۔

(شامی ج۲ ص۳۹۹ کتاب الصّوم مطلب فی حکم الاستمناء بالکف) [2]

غلط فہمی سے کھانا پینا موجبِ کفّارہ نہیں

سوال: اگر کسی نے بھول کر کھاپی لیا یا بلا سببِ انزال سے یہ سمجھا کہ میرا روزہ ابھی نہیں رہا اس لیے میرے لیے کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تو کیا ایسے شخص کے اس طرح قصداً کھانے پینے سے کفّارہ واجب ہوگا یا قضاء؟

---

[1] قال عالم بن العلاء رحمہ اللّٰہ:۔ المسافر قدم مصرہ وھو صائم فافتی ان صومہ لایجزیہ فافطر بعد ذٰلک متعمّداً لاکفارۃ علیہ۔ (فتاوٰی تاتارخانیہ ج۲ ص۳۷۹ کتاب الصوم۔ الفصل الخامس وجوب الکفارہ)

وَمِثْلُہٗ فی شامی ج۲ ص۴۰۸ کتاب الصوم مطلب فیما یکرہ للصائم۔

[2] قال قاضی خانؒ:۔ وکذا اذا جامع بہیمۃ ولم ینزل اومیتۃ ولم ینزل اوناکح بیدہ ولم ینزل اوجامع فیما دون الفرج ولم ینزل وان انزل فی ھٰذہ الوجوہ کان علیہ القضاء دون الکفّارۃ۔

(فتاوٰی قاضی خان ج۱ ص۱۰۱ الفصل الخامس فیما لایفسد الصوم)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۲۰۵ الباب الرابع فیما یفسد ومالا یفسد۔

الجواب:۔ اگر کسی نے بھول کر کھانا کھالیا یا بلا سبب کے انزال ہوا تو اس کا روزہ باقی ہے البتہ اگر بعد میں غلط فہمی سے کھانا کھایا کہ میرا روزہ ختم ہو چکا ہے، تو محض کسی غلط فہمی کی وجہ سے کھانا پینا موجبِ کفارہ نہیں بلکہ صرف اُسی دن کی قضاء واجب ہوگی۔ کفارہ ایسی سزا ہے جو دیدہ دلیری سے کسی جرم کے ارتکاب پر دی جاتی ہے۔

قال طاهر بن احمدؒ :- ولو نظر الی محاسن المرأة فانزل فظن ان ذٰلك فطرة فاكل بعد ذٰلك فهو كالقئ وقد ذكرنا حكمه وقال البعض ان كان عالماً عليه القضاء والكفارة عند الكل وان كان جاهلاً عليه القضاء دون الكفارة۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۱ ص۲۵۹ كتاب الصوم الفصل الثالث فيما يفسد الخ) [1]

سگریٹ نوشی مفطرِ صوم ہے

سوال:۔ کیا سگریٹ پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں، اگر ٹوٹ جاتا ہے تو اس سے قضاء لازم ہوگی یا کفارہ؟

الجواب:۔ سگریٹ کا دھواں منہ کے ذریعے حلق کے اندر چلا جاتا ہے جو کہ فسادِ صوم کا سبب ہے لہٰذا سگریٹ نوشی مفطرِ صوم ہے، تاہم اس صورت میں قضاء لازم ہے کفارہ نہیں۔

قال علاؤ الدینؒ :- ولو دخل الغبار او الدخان او الرائحة فی حلقه لم یفطروا ان ادخله حلقه متعمداً۔ روی عن ابی یوسفؒ انه ان تعمد علیه القضاء ولا کفارة علیه۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۹۰ کتاب الصوم۔ فصل رکنه) [2]

---

[1] قال قاضی خانؒ :- ولو نظر الی محاسن المرأة فانزل اوتفکر فانزل فظن ان ذٰلك فطرة فاکل متعمداً فهو بمنزلة القئ۔ وقال بعضهم ان کان عالماً علیه القضاء والکفارة عند الکل وان کان جاهلاً علیه القضاء دون الکفارة۔
(فتاویٰ قاضی خان ج۱ ص۱۰۵ الفصل السابع فیما یقسط الکفارة ملا یسقط)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۰۶ کتاب الصوم۔ الباب الرابع فیما یفسد۔ الخ)

[2] قال عبدالرحمٰن الجزائریؒ :شرب الدخان المعروف وتناول الافیون والحشیش ونحو ذٰلك فان الشهوة فیه ظاهرة۔ (الفقه علی المذاهب الاربعة ج۱ ص۵۶۰ کتاب الصوم)
ومثله فی رد المحتار ج۲ ص۱۲ کتاب الصوم۔ باب فیما یفسد الخ۔

بے خبری میں طلوعِ فجر کے بعد کھانا کھانے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص نے ماہ رمضان میں بے خبری میں فجر کے طلوع ہونے کے بعد کھانا کھایا جبکہ اس کا گمان یہ تھا کہ فجر اب تک طلوع نہیں ہوئی ہے، اس صورت میں ایسے شخص کے روزے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ روزہ رکھنے کی ابتداء طلوعِ فجر سے ہوتی ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں موصوف نے غلط فہمی کی بناء پر طلوعِ فجر کے بعد کھانا کھایا اس لیے اُس کا یہ روزہ ختم ہوچکا ہے اب اسکے ذمے اس دن کے روزہ کی قضاء لازم ہے کفارہ نہیں۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: اذا تسحر وهو يظن ان الفجر لم يطلع فاذا هو قد طلع الخ عليه القضاء..... ولا كفارة عليه لان الجناية قاصرة لعدم القصد۔

(الهداية ج۱ ص۲۰۷ باب ما يوجب القضاء) [۱]

فدیہ دینے سے عاجز شخص کو کیا کرنا چاہیئے

سوال:۔ اگر کوئی شخص فدیہ دینے سے عاجز ہو اور ڈاکٹر نے بھی اس کو روزہ رکھنے سے منع کر رکھا ہو تو یہ شخص کیا کرے؟

الجواب:۔ جب کوئی شخص اتنا بیمار ہو کر اس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اور بھر مسلمان ڈاکٹر نے بھی اسے روزہ رکھنے سے منع کیا ہو تو اس شخص پر فدیہ دینا واجب ہے لیکن اگر کوئی فدیہ دینے کا بھی متحمل نہ ہو تو اس صورت میں استغفار کثرت سے پڑھا کرے۔

لما قال العلامة الحصكفي ؒ: وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدي وجوبًا..... لو موسرًا والا يستغفر الله۔ قال ابن عابدين ؒ: (قوله والا يستغفر الله) هذا ذكره في الفتح والبحر عقيب مسئلة نذر الأبد اذا اشتغل عن الصوم بالمعيشة فالظاهر انه راجع اليها دون ما قبلها من مسئلة الشيخ الفاني لانه لا تقصير منه بوجه۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۲۷ فصل في العوارض) [۲]

---

[۱] ولو قدم مسافر او طهرت حائض او تسحر ظنه ليلاً والفجر طالع او افطر كذلك والشمس حية أمسك يومه وقضى ولم يكفر كأكله عمدًا بعد أكله ناسيًا ونائمة ومجنونة وطئتا۔

(تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ج۱ ص۳۴۱ كتاب الصوم)

[۲] قال العلامة ابو البركات النسفي ؒ: وللشيخ الفاني وهو يفدي فقط۔ قال ابن نجيم ؒ، تحته..... وان لم يقدر على الاطعام لعسرته يستغفر الله تعالى۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۸۶ كتاب الصوم۔ فصل في العوارض)

مُسافر یا مریض کو روزہ کی قضاء کا موقع نہ ملے تو کچھ مواخذہ نہیں

سوال:۔ اگر کسی مسافر کو سفر سے واپسی پر یا بیمار کو صحتیابی کے فوراً بعد فرض روزہ کی قضاء کا موقع نہیں ملا تو کیا اس شخص پر فدیہ دینا واجب ہے یا کہ معافی ہے؟

الجواب:۔ مرض اور سفر میں روزہ افطار کرنا مرخص ہے جس کی حالتِ صحت و اقامت میں قضاء واجب ہے، اب اگر مریض و مسافر کو قضاء کرنے کا کسی وجہ سے قضاء کا موقع نہیں مل سکا اور وہ فوت ہو گیا تو اس شخص پر کچھ مواخذہ نہیں البتہ اگر موقع ملنے کے باوجود روزہ نہ رکھے تو بعد الموت فدیہ دینا لازم ہے۔

وفی الھندیة: ولوفات صوم رمضان بعذر المرض اوالسفر واستدام المرض والسفر حتی مات لاقضاء علیه..... وان برء المریض اوقدم المسافر وادرك من الوقت بقدر ما فاته یلزمه قضاء جمیع ما ادرك فان لم یصم حتی ادرکه الموت فعلیه ان یوصی بالفدیة۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۰۷ الباب الخامس فی الاعذار الذی یبیح الافطار) [۱]

غیر رمضان کا روزہ قصداً توڑنے پر صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص قصداً و عمداً غیر رمضان کا روزہ توڑ دے تو کیا اس شخص پر کفارہ واجب ہے یا صرف قضاء؟

الجواب:۔ قصداً روزہ توڑنے سے کفارے کا وجوب صرف رمضان شریف کے روزے کے ساتھ خاص ہے اس کے علاوہ جو بھی روزہ قصداً یا سہواً توڑ دیا جائے تو اس پر کوئی کفّارہ نہیں البتہ اُس دن کی قضاء واجب ہے۔

قال العلامة ابن همامؒ: ولیس فی افساد صوم غیر رمضان کفّارة لان الافطار فی رمضان ابلغ فی الجنایة فلا یلحق به غیره۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۲۶۵ باب مایوجب القضاء والکفّارة) [۲]

---

[۱] قال الحصکفیؒ: فان ماتوا فیه ای فی ذلك العذر فلا تجب علیهم الوصیّة بالفدیة لعدم ادراکهم عدة ایام اخر ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت الوصیة بقدر ادراکهم عدة من ایام اخر۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمختار ج ۲ ص۴۲۳ فصل فی العوارض) ومثله فی الفتاوی التاتارخانیة ج ۲ ص۳۸۵ فصل فی الاسباب المبیحة للفطر۔

[۲] قال العلامة عالم بن علاء الانصاریؒ: ولیس فی افساد الصوم فی غیر رمضان کفّارة۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج ۲ ص۳۷۷ الفصل الخامس فی وجوب الکفار فی افساد الصوم) ومثله فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۱۵ باب المتفرقات۔

سگریٹ یا حقّہ پینے سے جب روزہ ٹوٹ جائے تو صرف قضا کرے یا کفّارہ بھی؟

سوال:- حقّہ یا سگریٹ پینے سے روزہ کا ٹوٹ جانا تو معلوم ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو شخص بحالتِ روزہ حقّہ یا سگریٹ پیتا ہے اُس پر قضاء و کفّارہ دونوں واجب ہیں یا صرف قضاء؟

الجواب:- حقّہ نوشی اور سگریٹ نوشی سے روزہ ختم ہوجاتا ہے جس سے قضاء بدون کفّارہ کے لازم ہوجاتی ہے لیکن اگر حقّہ نوشی تلذّذ، شہوتِ نفس یا کسی اور نفع کے لیے کی جائے تو اس صورت میں قضاء کفّارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: انهٗ لو ادخل حلقه الدُّخان افطر.... ویمنع من بیع الدخان۔

؎ وشاربه فی الصوم لاشك یفطر ویلزمه التکفیر لوظنّ نافعًا

کذا دافعًا شهوات بطن فقرر ها۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۹۵ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسد) [۱]

سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد گھر واپس آکر روزہ افطار کرنے پر قضاء و کفّارہ کا حکم

سوال:- ایک شخص سفر کی نیّت سے گھر سے نکلا مگر راستے میں کچھ ضروری کام یاد آنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے گھر واپس آگیا اور روزہ افطار کر لیا، تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حالتِ سفر میں اگرچہ روزہ افطار کرنا جائز ہے چاہے سفر تکلیف دہ ہو یا آرام دہ، لیکن صورتِ مسئولہ میں چونکہ اس شخص نے گھر ہی کے اندر روزہ افطار کیا ہے جو کہ حالتِ اقامت ہے اس لیے اس پر قضاء و کفّارہ دونوں لازم ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اذا دخل مصرہٗ لشیئٍ نسیه لسفر فافطر فانه یکفر ای قیاسًا لانه مقیم عند الأکل حیث رفض سفره بالعود۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۱۳۳ فصل فی العوارض) [۲]

---

[۱] قال الشیخ المفتی عزیز الرحمنؒ: الجواب: حقّہ پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضاء لازم ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں کفّارہ بھی لازم ہوتا ہے یعنی اگر اسے نفع بخش سمجھا تب تو کفّارہ و قضاء دونوں لازم ہونگے ورنہ صرف قضاء۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۶ ص۴۱۹ مسائل مفسد الصوم)

[۲] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو سافر فی نهار رمضان ولم یفطر حتی تذکر شیئًا فی منزله قد نسیه فرجع الی منزله واکل شیئًا ثم خرج من المنزل فعلیه القضاء والکفّارة کالمقیم اذا اکل ثم سافر۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۵۷ الفصل الثالث ما یفسد الصوم فی ما لا یفسد۔ الخ)

ومِثلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۰۶ الباب الخامس فی الاعذار المبیحة للفطر۔

نومسلم خوف کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو اس پر قضاء و کفّارہ دونوں واجب ہیں

سوال:۔ اگر ایک نومسلم خاندانی خوف و ڈر کی وجہ سے روزہ نہ رکھے تاکہ اُن پر اس کا اسلام ظاہر نہ ہو، تو کیا اس شخص پر بھی قضاء و کفارہ دونوں واجب ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کلمہ طیبہ پڑھنے سے ایک غیر مسلم آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اُس پر جملہ احکام اسلام پر پورا عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق نومسلم اسلامی احکامات کا مکلّف ہے، اس لیے روزہ نہ رکھنے کی وجہ سے اس پر قضاء لا کفارہ نہیں۔

لما قال العلامہ الحصکفی أو لم ینو فی رمضان کلہ صوماً ولا فطراً مع الامساک لشبہۃ خلاف زفر او اصبح غیرنا و للصوم فاکل عمداً ولو بعد النیۃ قبل الزوال لشبہۃ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۲-۴۰۳، کتاب الصوم)[1]

قصداً روزہ توڑنے کے بعد مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے تو صرف قضاء لازم ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص قصداً و عمداً روزہ توڑ دے مگر اچانک کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے کہ روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے تو کیا اس شخص پر صرف کفارہ واجب ہے یا قضاء؟

الجواب:۔ قصداً روزہ توڑنے کی صورت میں کفّارہ اُس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی عمل مسقطِ کفّارہ رونما نہ ہو جائے۔ صورتِ مسئولہ میں مرض (جو کہ مسقطِ کفارہ ہے) کی موجودگی کی وجہ سے کفّارہ ساقط ہو جائے گا البتہ اُس دن کی قضاء لازم ہوگی۔

لما قال الحصکفیؒ، انما یکفران نوی لیلاً ولم یکن مکرہاً ولم یطرء مسقط کمرض وحیض۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۲ ص۴۱۲،۴۱۳ مطلب فی الکفّارۃ)[2]

---

[1] لما قال الکاسانی ومن اصبح فی رمضان لا ینوی الصوم فاکل او شرب او جامع علیہ قضاء ذلک الیوم ولا کفارۃ علیہ عند اصحابنا الثلاثۃ (بدائع الصنائع ۲/۲۵۸ کتاب الصوم)

[2] وفی الہندیۃ: والصحیح اذا فطر ثم مرض مرضاً لا یستطیع معہ الصوم تسقط الکفّارۃ عندنا۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۱۵ الفصل السابع فیما یسقط الکفّارۃ ومالا یسقط)

ومثلہٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج۶ ص۴۲۸ مسائل مفسد الصوم۔

باب الاعذار المبیحۃ للافطار

(روزہ افطار کرنے (توڑنے) کے اعذار کا بیان)

ناقابلِ برداشت تکلیف کے وقت روزہ توڑنا

سوال:۔ اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے روزہ بحال رکھنا مشکل ہو تو کیا افطار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی ناقابلِ برداشت تکلیف کی وجہ سے روزہ افطار کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسی حالت میں روزہ توڑنا بہتر ہے تاکہ ہلاکت کا موجب نہ بنے، البتہ اگر برداشت کی طاقت ہو تو پھر روزہ پورا کرنا بہتر ہے۔

قال فی الھندیۃ:۔ المریض اذا خاف علیٰ نفسہ التلف اوذھاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادۃ العلۃ وامتدادہ فکذالک عندنا وعلیہ القضاء اذا افطر۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۲۰۷ کتاب الصوم، الباب الخامس فی الاعذار) [1]

حائضہ کے لیے امساک ضروری نہیں

سوال:۔ طلوعِ فجر کے بعد اگر عورت کو حیض آجائے تو عند الشرع عورت کے لیے بقیہ یوم کا امساک (کھانا پینا بند) کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ طلوعِ فجر کے بعد عورت کو ماہواری شروع ہو جائے تو اس سے روزہ ختم ہوجاتا ہے، لہٰذا ایسی عورت کے لیے کھانا پینا جائز ہے امساک ضروری نہیں تاہم ایسی عورت دوسرے روزہ داروں سے خفیہ طور پر کھانا کھائے یا پانی پئے۔

قال حسن بن عمار بن علی الشرنبلالیؒ:۔ ومن لہ نوبۃ حمی او عادۃ حیض

---

[1] قال ابن عابدین رحمہ اللہ:۔ (تحت قولہ وخادمۃ) اذا اشتد الحر وخاف الھلاک فلہ الافطار۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص۴۲۲ کتاب الصوم، فصل فی العوارض)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۲۸۲ فصل فی العوارض۔

لابأس بفطرة علیٰ ظن وجوده ۔ (مراقی الفلاح علیٰ صدر الطحطاوی ص۵۶۳ کتاب الصوم) [1]

مسافر کے لیے افطار میں عزیمت پر عمل کرنا بہتر ہے

سوال:۔ سفر کے دوران مسافر کو روزہ رکھنا چاہیئے یا روزہ رکھنا بہتر ہے ؟

الجواب:۔ روزہ رکھنا اور نہ رکھنا مسافر کی حالت پر مبنی ہے جس میں اس کو آسانی ہو وہی طریقہ اختیار کرے، تاہم اگر کوئی شدید ضرورت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور یہی عزیمت ہے ۔

قال برهان الدین رحؒ:۔ وان کان مسافراً لایستضر بالصوم فصومه افضل وان افطر جاز لان السفر لایعری عن المشقة ۔الخ (الهدایة ج۱ ص۲۰۱ کتاب الصوم) [2]

شدید بیمار کیلئے روزہ افطار کرنا جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص بلند فشارخون (ہائی بلڈ پریشر) یا اس جیسی کسی دوسری بیماری میں مبتلا ہو جائے جس میں دوائی کا استعمال لازمی ہو تو ایسی حالت میں روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے یا نہیں ؟ جبکہ اس جیسی بیماریاں بعض اوقات ہلاکت کا باعث بھی بن جاتی ہیں ۔

الجواب:۔ جب بھی روزہ بیماری میں اضافہ کا سبب بنتا ہو تو اس میں کسی دیندار ماہر حکیم یا ڈاکٹر کے مشورہ سے یا اپنے غلبۂ ظن پر عمل کرتے ہوئے روزہ افطار کیا جا سکتا ہے تاہم معمولی قسم کی بیماری میں افطار کرنا ضروری نہیں ۔

قال عبدالرحمٰن الجزائری :۔ الاعذار التی تبیح الفطر للصائم کثیرة ۔منها المرض، فاذا مرض الصائم وخاف زیادة المرض بالصوم او خاف تاخر البرء من المرض او حصلت له مشقة شدیدة بالصوم فانه یجوز له الفطر ۔ (فقه مذاهب الاربعه ج۱ ص۵۷۲) [3]

---

[1] قال علامة ابی بکر بن علیؒ :۔ واذا حاضت المرأة افطرت وقضت وکذا اذا انفست وهی تاکل سراً اوجهراً ولایجب علیه التشبه ۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۷۷ کتاب الصوم)

وَمِثْلُهُ فی الهندیة ج۱ ص۲۰۷ کتاب الصوم ۔الباب الخامس فی الاعذار ۔الخ

[2] قال ابن نجیمؒ : وللمسافر وصومه احب ان لم یضره ای جاز للمسافر الفطر ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۸۳ کتاب الصوم)

وَمِثْلُهُ ردّ المحتار ج۲ ص۱۲۱ کتاب الصوم ۔فصل فی العوارض ۔

[3] قال العلامة کاسانیؒ : وما وجوب القضاء فشرطه العجز عن القضاء عجز الا ترجی معه القدرة فی جمیع عمره ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۱۰۵ کتاب الصوم فصل فی حکم الصوم المؤقت)

وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۸۱ فصل فی العوارض ۔

کیا بیماری کی وجہ سے روزہ افطار کرنے پر کفّارہ لازم ہے یا قضاء

سوال:۔ اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں اچانک شدید بیمار ہو جائے تو کیا اس کو روزہ افطار کر لینا چاہیئے یا نہیں؟ اور افطار کرنے کی صورت میں قضاء وکفّارہ دونوں لازم ہوں گے یا صرف قضاء؟

الجواب:۔ شدتِ مرض میں جب نقصان کا خوف ہو تو اس صورت میں روزہ افطار کر لینا جائز ہے اور اس روزہ کی صرف قضاء لازم ہے کفارہ نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولتی الاکراہ وخوف ھلاك او نقصان عقل ولو بعطش او جوع شدید الخ الفطر یوم العذر...... وقضوا لزوماً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۲۱ فصل فی العوارض المبیحة) [۱]

شدّتِ پیاس سے روزہ توڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر کبھی اتنی گرمی ہو جائے کہ پیاس کی وجہ سے لوگوں کی ہلاکت یا کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو تو کیا اِس صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھوک اور پیاس کی شدّت میں جب کسی سخت نقصان کا خطرہ ہو تو اس صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے لیکن اس روزہ کی قضا لازمی ہوگی اگرچہ کفّارہ واجب نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولتی الاکراہ وخوف ھلاك او نقصان عقل ولو بعطش او جوع شدید او لسعة حیة...... الفطر وقضوا لزوماً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۲۱ فصل فی العوارض المبیحة) [۲]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سفر میں افطار کیا تھا

سوال:۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی سفر میں روزہ افطار کیا تھا یا نہیں؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مُعلّم بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ حالات اور تقاضے کے مطابق روزہ رکھتے بھی تھے اور افطار بھی کرتے تھے، بعض حالات میں آپؐ نے

---

[۱] وفی الھندیة: المریض اذا خاف علی نفسہ التلف او ذھاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة وامتدادہ فکذلك عندنا وعلیہ القضاء اذا افطر کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۲۰۷ فصل فی العوارض المبیحة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۳۸۳ فصل فی الاسباب المبیحة للفطر۔

[۲] وفی الھندیة: اذا خیف منھما الھلاك او نقصان العقل کالامة اذا ضعفت عن العمل وخیفت الھلاك بالصوم وکذا الذی ذھب بہ...... (الفتاوی الھندیة ج۱ ص۲۰۷ فصل فی العوارض والمبیحة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۳۸۷ فصل فی الاسباب والمبیحة للفطر۔

افطار نہ کرنے والوں پر نکیر بھی فرمائی۔

عن ابن عباسؓ :سافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان حتی بلغ عسفان ثم دعا باناء فیہ شراب فشربہ نہارا لیراہ الناس ثم افطر حتی دخل مکۃ. قال ابن عباسؓ فصام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافطر ومن شاء صام ومن شاء افطر۔

(صحیح مسلم ج۱ ص۲۵۶ باب جواز الصوم والفطر فی شہر رمضان للمسافر) لہ

کیا سفر میں روزہ افطار کرنا قصر نماز کی طرح لازم ہے؟

سوال:۔ حالتِ سفر میں تو نماز قصر کرکے پڑھنا واجب ہے، کیا روزے کا حکم بھی نماز کی طرح ہے کہ سفر میں لازماً افطار کیا جائے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے حالتِ سفر میں نماز کو قصر کرکے پڑھنا ایک نعمتِ خداوندی قرار دے کر اس میں قصر کو واجب کیا ہے مگر روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار بندے کو دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بحالتِ عافیت روزہ رکھنے کو افضل قرار دیا ہے اس لیے سفر میں روزہ رکھنا افضل و بہتر ہے بخلاف نماز کے، تاہم اگر روزہ رکھنے سے تکلیف زیادہ ہوتی ہو تو روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

قال العلامہ ابن نجیمؒ : وانما کان الصوم افضل ان لم یضرہ لقولہ تعالیٰ "وان تصوموا خیر لکم" ولان رمضان افضل الوقتین فکان فیہ الاداء اولیٰ ولا یرد علینا القصر فی الصلوٰت فانہ واجب حتی یأثم بالاتمام لان القصر ھو العزیمۃ.

(البحر الرائق ج۲ ص۲۸۳ فصل فی العوارض) ؎۲

لہ وعن جابر بن عبد اللہؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الیٰ مکۃ عام الفتح فصام حتی بلغ کراع الغمیم وصام الناس معہ فقیل لہ ان الناس شق علیہم الصیام وان الناس ینظرون فیما فعلت فدعا بقدح من ماء بعد العصر فشرب والناس ینظرون الیہ فافطر بعضھم وصام بعضھم۔ (ترمذی ج۱ ص۱۵۱ باب ما جاء فی افطار الصوم فی السفر)

؎۲ وفی الہندیۃ : ویکرہ للمسافر ان یصوم اذا جھدہ الصوم فان لم یکن کذلک فالصوم افضل۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج۱ ص۲۰۱ الباب الثالث فیما یکرہ للصائم ومالا یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸۳ فصل الاسباب مبیحۃ للفطر۔

مہمان کے مجبور کرنے پر روزہ افطار کرنا

سوال:۔ اگر کسی شخص کا نفلی روزہ ہو مگر مہمان اس کو روزہ توڑنے پر مجبور کرے تو کیا وہ شخص روزہ توڑ سکتا ہے؟

الجواب:۔ مہمان کی ضیافتِ طبع اور خاطر تواضع کے لیے نفلی روزہ توڑنا عند الشرع مرخص ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: الضیافۃ عذر للضیف والمضیف ان کان صاحبھا ممن لا یرضی بمجرد حضورہ ویتأذی بترک الافطار فیفطر والا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۲۹ فصل فی العوارض)[1]

آدمی جس علاقے یا ملک میں ہو وہاں چاند کے اعتبار سے روزہ رکھے

سوال:۔ ایک شخص سعودی عرب سے پاکستان آیا، وہاں چاند کے حساب سے اس کے تیس روزے پورے ہو چکے ہیں جبکہ پاکستان میں روزہ ہے، تو کیا یہ شخص اب افطار کرے یا روزہ رکھے؟

الجواب:۔ سعودی عرب میں چاند کے اعتبار سے اگرچہ اس شخص کے فرض روزے پورے ہو چکے ہیں مگر یہاں کے لوگوں کے ساتھ مشابہت کی خاطر روزہ رکھے گا افطار کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: فانہ یجب علیہ الامساک تشبھا۔

رد المحتار ج۲ ص۴۰۸ مطلب فی جواز الافطار بالتحری[2]

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: والصحیح من المذھب ان ینظر فی ذلک ان کان صاحب الدعوۃ ممن یرضی بمجرد حضورہ ولا یتأذی بترک الفطر لا یفطر وان کان یعلم انہ یتأذی بترک الافطار یفطر۔
(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸۲ فصل الاسباب مبیحۃ للفطر)

ومثلہ فی ما لا بد منہ ص۱۰۰ کتاب الصوم۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: الاخیران یمسکان بقیۃ یومھما وجوباً علی الاصح لان الفطر قبیح وترک القبیح شرعاً واجب (کمسافر) اقام وحائض ونفساء طہرتا ومجنون افاق ومریض صح)۔

قال الشیخ احمد الطحطاویؒ: تحت قولہ (کمسافر) اقام ، الاصل فی ھذا ان کل من صار علی حالۃ فی آخر النھار لو کان علیھا اولہ بلزمہ الامساک قضاء الحق الوقت تشبیھا بالصائمین۔
(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج۱ ص۴۵۵ باب ما یفسد الصوم وما لا یفسد)

شوگر کے مریض کے لیے روزے کا حکم

سوال :- جناب محترم مفتی صاحب! میرے والد صاحب شوگر کے مریض ہیں، ڈاکٹر نے انہیں روزہ رکھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر انہوں نے روزہ رکھا تو بیماری بڑھ جائے گی، جبکہ حقیقت بھی یہی ہے اس لیے کہ جب بھی انہوں نے روزہ رکھا تو تکلیف زیادہ ہوئی ، اس صورت میں شرعاً ان کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور اگر نہ رکھ سکیں تو انہیں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب :- اسلام کسی کو بلا وجہ تکلیف میں نہیں ڈالتا ۔ اگر آپ کے والد محترم کو واقعی شوگر کا شدید مرض لاحق ہے کہ ان میں روزہ رکھنے کی بھی طاقت نہیں اور اگر رکھ لیں تو مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہے اور ساتھ ہی مسلمان ڈاکٹر نے بھی خوب تشخیص کے بعد روزے نہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے تو شرعاً ان کو اجازت ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں۔ اور اگر مرض دائمی ہو تو ہر روزے کا فدیہ دینا ہوگا جو ایک روزے کے بدلہ میں صدقہ فطر کی مقدار کے برابر ہے ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوباً

قال ابن عابدینؒ المریض اذا تحقق الیأس من الصحة فعلیه الفدیة لکل یوم من المرض - (ردّ المحتار ج ۲ ص۴۲۷ کتاب الصوم، فصل فی العوارض المبیحة لعدم الصوم)

ظنِ غالب کی بناء پر مرض بڑھ جانے کے خوف سے روزہ نہ رکھنا

سوال :- ایک شخص بیمار ہے اور اس نے ڈاکٹر سے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں پوچھا نہیں، مگر اس کا غالب گمان یہ ہے کہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو اس کی بیماری بڑھ جائے گی ،تو کیا یہ بیمار شرعاً درست کر رہا ہے یا یہ کہ اس کو روزہ نہ رکھنے کے بارے ڈاکٹر سے لازمی پوچھنا پڑے گا؟

الجواب :- شرعاً شدتِ مرض یا خوفِ مرض کی وجہ سے روزہ افطار کرنا جائز ہے بشرطیکہ کسی ماہر مسلمان طبیب نے کہا ہو ۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں مریض کا غالب شدتِ مرض ہے اس لیے اس کو اپنے گمان کی بناء پر روزہ نہ رکھنا مرخص ہے ، ڈاکٹر سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : او مریض خاف زیادة مرضه وصحیح خاف المرض المراد بالخوف غلبة الظن-

(رد المحتار ج ۱ ص۱۵۳ کتاب الصوم)

باب الاعتکاف

(اعتکاف کے احکام ومسائل)

روزہ کے فاسد ہونے سے اعتکاف کا حکم

سوال:۔ اگر معتکف سے خطأً روزہ فاسد ہو جائے تو کیا اس کا اعتکاف باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اعتکاف مسنون اور واجب دونوں کے لیے روزہ رکھنا چونکہ شرط ہے اسلئے اگر کسی عذر کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے تو اعتکاف بھی باقی نہیں رہتا، البتہ اگر بلا صوم اعتکاف میں بیٹھا رہا تو نفلی اعتکاف شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصكفي:۔ وشرط الصوم لصحة الاول اتفاقاً على المذهب۔ قال العلامة ابن عابدين: قلتُ ومقتضى ذلك ان الصوم شرط ايضاً فى الاعتكاف المسنون لانهٗ مقدر بالعشر الاخير حتى لو اعتكفه بلا صوم لمرض اوسفر ينبغي ان لا يصح عنه بل يكون نفلاً۔

(رد المحتار ج ۲ ص۴۴۲ باب الاعتكاف) [1]

اعتکاف فاسد ہونے پر اس کی قضاء نہیں

سوال:۔ اگر کسی وجہ سے اعتکاف فاسد ہو جائے تو کیا اس کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف (مسنون اور نفلی) ٹوٹ جانے سے اس کی قضاء واجب نہیں تاہم اگر جس دن یا رات کو اعتکاف ٹوٹ جائے اور اُسی دن رات کی قضاء کی جائے تو بعض کے قول پر بھی عمل ہو جائے گا جو کہ بہتر ہے مگر ضروری نہیں۔

قال العلامة عالم بن العلاء:۔ ولوشرع فيه ثم قطع لا يلزمه القضاء فى رواية الاصل

---

[1] لما قال برهان الدين المرغيناني:۔ قال الاعتكاف مستحب والصحيح انه سُنّة مؤكدة لان النبى صلى الله عليه وسلم واظب عليه فى العشر الاواخر من رمضان والمواظبة دليل السنة وهو اللبث فى المسجد مع الصوم...... والصوم من شرطه...... ثم الصوم شرط لصحة الواجب منه۔ (الهداية ج۱ ص۲۱۱ باب الاعتكاف)

ومِثلُهٗ فى البناية شرح الهداية ج۴ ص۳۸۲،۳۸۴ باب الاعتكاف۔

وفی روایۃ الحسن یلزمہ۔ وفی الظھیریۃ عن ابی حنیفۃؒ انہ یلزمہ یوماً۔
(فتاوٰی تاتارخانیۃ ج ۲ ص ۴۱۲ الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف)[1]

اعتکاف کا اہتمام نہ کرنے کے اثرات

سوال:۔ اگر محلہ والے اعتکاف کا اہتمام نہ کریں تو اس سے ان کی ذمہ داری کہاں تک متاثر ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اعتکاف جملہ محلے والوں کے لیے سنت مؤکدہ کفایہ ہے، اگر تمام محلہ والوں کی طرف سے ایک شخص بھی اعتکاف کے لیے بیٹھ جائے تو جملہ محلہ والوں کا ذمہ فارغ ہو جائے گا، لیکن اگر پورے محلہ میں سے کوئی ایک شخص بھی اعتکاف کے لیے نہ بیٹھے تو تمام محلہ والے گنہگار ہوں گے۔
قال ابن عابدینؒ:۔ (وسن مؤکداً) ای استناناً مؤکداً۔ بمعنی انہ طلب طلباً۔ مؤکداً زیادۃ علی بقیۃ النوافل۔ ولھذا کانت السنۃ المؤکدۃ قریبۃ من الواجب فی لحوق الاثم کما فی البحر۔ ویستوجب تارکھا التضلیل واللوم کما فی التحریر۔
(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۲ باب الوتر۔ مطلب فی السنن والنوافل)[2]

معتکف کا کسی دوسری مسجد میں قرآن کریم سننے یا سنانے کیلئے نکلنا

سوال:۔ اگر (حافظ قرآن) معتکف کے لیے تراویح میں قرآن سنانے کا اپنی مسجد میں انتظام نہ ہو تو کیا وہ صرف قرآن سنانے کے لیے کسی دوسری مسجد میں جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تراویح میں قرآن کا ختم بلاشک سنت ہے، البتہ بصورتِ استثناء (یعنی اعتکاف میں چند امور کی نیت سے) مسجد سے نکلنا مرخص ہے لیکن بہتر عدمِ خروج ہے تاکہ اعتکاف کے

---

[1] قال ابن عابدینؒ: فلو شرع فی نفلہ ثم قطعہ لا یلزمہ قضاءہ لانہ لا یشترط لہ الصوم علی الظاھر من المذھب وما فی بعض المعتبرات انہ یلزم بالشروع مفرع علی الضعیف قالہ المصنف وغیرہ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۴۴۴ باب الاعتکاف)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۱ ص ۲۱۱ باب الاعتکاف۔

[2] قال العلامۃ محمد عبدالحیؒ:۔ والصحیح الذی علیہ جمھور الفقھاء ھو انہ سنۃ مؤکدۃ فی العشر الاواخر من رمضان علی سبیل الاستیعاب کفایۃ علی اھل کل بلدۃ۔ (حاشیہ ھدایہ ج ۱ ص ۲۱۱ باب النوافل۔
وَمِثْلُہٗ فی حاشیۃ مستخلص الحقائق ج ۱ ص ۳۰۹ باب النوافل

تقدس پر کوئی اثر نہ پڑے۔

وفی الهندية: ولو شرط وقت النذر والالتزام ان يخرج الى عيادة المريض وصلوٰة الجنازة وحضور مجلس العلم يجوز له ذلك۔ (الفتاویٰ الهندية ج ۱ ص۲۱۲ الباب السابع فی الاعتکاف) [1]

اعتکاف کے دوران بے فائدہ باتوں سے اجتناب کا حکم

سوال:۔ کیا اعتکاف کے دوران فضول باتیں کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ بسا اوقات انسان غیر اختیاری طور پر ایسی باتیں کر جاتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا؟

الجواب:۔ اعتکاف کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کثرت سے کی جائے لہٰذا دورانِ اعتکاف دنیاوی باتوں سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہیئے تاہم دینی مسائل پر گفتگو کرنا اور ضروریات اس سے مستثنیٰ ہیں، البتہ دنیاوی باتیں کرنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔

قال العلامة عبد الرحمٰن جزریؒ:۔ وما آدابه فمنها الا يتكلم الا بخير۔

(الفقه على المذاهب الاربعة ج ۱ ص۵۸۹ باب الاعتكاف) [2]

معتکف کی موت پر اعتکاف کی تکمیل کا حکم

سوال:۔ اگر معتکف دورانِ اعتکاف انتقال کر جائے تو کیا کسی اور کا اُس کی جگہ اعتکاف بیٹھنا ضروری ہے یا نہیں تاکہ اعتکاف مکمل ہو جائے؟

الجواب:۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں پورے دس دن کا اعتکاف کرنا سنت ہے چند ایام اعتکاف کرنے سے سنت ادا نہیں ہوتی، موت واقع ہونے کی صورت میں معتکف نے اعتکاف پورا نہیں کیا کیونکہ اس کا اعتکاف عشرہ تک نہ رہا۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور شخص اعتکاف پر

---

[1] قال عالم بن العلاءؒ:۔ ولو شرط وقت النذر والالتزام ان يخرج الى عيادة المريض و[illegible] وحضور مجلس العلم يجوز له ذلك۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ ج۲ ص۴۱۲ الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف)

ومثله فی ردالمحتار ج۲ ص۴۴۸ باب الاعتکاف۔

[2] قال عالم بن العلاءؒ:۔ ولا يتكلم بفضول كلام الدنيا۔۔۔۔۔۔ ولا يتكلم بما فيه اثم فان النبی صلی الله عليه وسلم كان يحدث مع الناس فی اعتكافه۔

(فتاوی تاتارخانية ج۲ ص۴۱۱ تا ۴۱۴ الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف)

ومثله فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۲ باب الاعتکاف۔

نہ بیٹھا ہو تو پوری بستی پر ذمہ داری باقی رہے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ:- (قولہ ای سنۃ کفایۃ) نظیرھا اقامۃ التراویح بالجماعۃ فاذا قام بھا البعض سقط الطلب عن الباقین فلم یاثموا بالمواظبۃ علی الترک بلا عذر ولو کان سنۃ عین لاثموا بترک السنۃ المؤکدۃ اثما دون اثم ترک الواجب۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۴۲ باب الاعتکاف)[1]

کیا معتکف کیلئے نماز جنازہ پڑھنا درست ہے؟

سوال:- معتکف کے لیے شرعاً نماز جنازہ پڑھانا جائز ہے یا نہیں اور اس کے اعتکاف پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- وجوبی اور مسنون اعتکاف سے بلا ضرورت نکلنا مفسد اعتکاف ہے، البتہ اگر ابتداء میں نماز جنازہ وغیرہ کے لیے نکلنے کی شرط رکھی جائے تو اس صورت میں نماز جنازہ کا پڑھنا یا پڑھانا مفسد اعتکاف نہیں لیکن بغیر شرط کے نماز جنازہ پڑھنے یا پڑھانے کے لیے نکلنا فساد اعتکاف کا ذریعہ ضرور ہے تاہم نفلی اعتکاف میں توسع کی بناء پر بغیر استثناء کے نکلنا مفسد اعتکاف نہیں۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاءؒ:- ولا یخرج لا کلہ و شربہ ولا لعیادۃ المریض ولا لصلوٰۃ الجنازۃ......ولو شرط وقت النذر والالتزام ان یخرج الی عیادۃ المریض وصلوٰۃ الجنازۃ و حضور مجلس العلم یجوز لہ ذلک...... واما فی الاعتکاف النفل فلا بأس بان یخرج بعذر او بغیر عذر۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۴۱۲،۴۱۳ کتاب الصوم باب الاعتکاف)[2]

---

[1] قال العلامۃ محمد عبد الحیؒ:- ھو سنۃ مؤکدۃ کفایۃ اذا قام بھا البعض سقط عن الآخرین۔ (عمدۃ الرعایۃ علی ھامش شرح وقایۃ ج ا ص۳۲۱ باب الاعتکاف)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ا ص۱ کتاب الطھارۃ ـــ

[2] لما قال العلامۃ السید محمد یوسف البنوریؒ:- لا یخرج المعتکف من معتکفہ الا لحاجۃ شرعیۃ او طبعیۃ...... واما اذا خرج من المسجد بغیر حاجۃ شرعیۃ او طبعیۃ فیفسد الاعتکاف...... لو شرط وقت النذر ان یخرج لعیادۃ مریض وصلاۃ الجنازۃ وحضور مجلس علم جاز ذلک...... وما روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الرخصۃ فی عیادۃ المریض وصلوٰۃ جنازۃ فقال ابو یوسف ذلک محمول علی اعتکاف التطوع۔ (معارف السنن ج۵ ص۵۳۹،۵۴۰ باب المعتکف یخرج لحاجۃ ام لا)

معتکف کا نماز باجماعت کے لیے مسجد سے نکلنا

سوال:۔ جس مسجد میں نماز باجماعت پابندی کے ساتھ نہ ہوتی ہو یا سرے سے جماعت ہوتی ہی نہ ہو تو معتکف کے لیے کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ مرد کے اعتکاف کے لیے جماعت والی مسجد ضروری ہے، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت کی کوئی ممکن صورت نہ ہو تو معتکف کے لیے کسی دوسری مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے جانا درست ہے البتہ اگر نہ جائے تو اس کے اعتکاف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ:۔ فی مسجد جماعة هو ماله امام ومؤذن ادیت فیه الخمس ام لا، وعن الامام اشتراط اداء الخمس فیه صححه بعضهم وقال لا یصح فی کل مسجد وصححه السروجی واما الجامع فیصح فیه مطلقاً اتفاقاً۔ قال ابن عابدینؒ: ای وان لم یصلوا فیه الصلوٰة کلها......

ایضاً قال الحصکفیؒ:۔ حرم علیه الخروج الا لحاجة الانسان) طبیعة کبول وغائط وغسل...... او شرعیة کعید واذان لو مؤذنا وباب المنارة خارج المسجد۔

(الدرالمختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۴۴۲ باب الاعتکاف) [1]

معتکف کا غسل جمعہ کے لیے مسجد سے نکلنا

سوال:۔ دورانِ اعتکاف جمعہ کے دن غسل کرنے کے لیے مسجد سے نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ معتکف کا جمعہ کے دن غسل کے لیے مسجد سے نکلنا جائز ہے، بعض جزئیات میں سنتِ مؤکدہ اعتکاف کو نفلی اعتکاف میں شمار کیا گیا ہے اسی طرح ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے کے لیے مسجد سے نکلنے کی صورت میں اعتکاف فاسد نہیں ہوتا تاہم اجتناب اولیٰ ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ واما النفل فله الخروج لانه منه له لا مبطل کما امر

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ثم المسجد الجامع ویجوز الاعتکاف فی الجامع وان لم یصلوا فیه بالجماعة ...... ولا یخرج المعتکف من المسجد الا لحاجة لازمة شرعیة کالجمعة اولحاجة طبعیة کالبول والغائط۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۶۷ الفصل السادس فی الاعتکاف)

وَمِثْلُهٗ فی الکفایة فی ذیل فتح القدیر ج۲ ص۳۰۸ باب الاعتکاف۔

قال ابن عابدینؒ: (واما النفل) ای الشامل للسنۃ المؤکدۃ۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۴۳ باب الاعتکاف) ؎۱

معتکف جمعہ پڑھنے کے لیے کتنی دُور تک جا سکتا ہے

سوال:۔ اگر محلے کی مسجد میں جمعہ نہ ہوتا ہو تو معتکف جمعہ پڑھنے کے لیے کتنی دور کی مسجد تک جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ معتکف کے لیے شرعاً جمعہ پڑھنے کے واسطے مصر (شہر) جانے کی اجازت ہے اگر مصر دور ہو تو قبل از زوال اپنی مسجد سے جمعہ پڑھنے کے لیے روانہ ہو سکتا ہے، تاہم ایسے وقت پر روانہ ہونا چاہیئے کہ وہاں پہنچ کر تسلی کے ساتھ سنتیں اور فرض پڑھ سکے، فرض پڑھنے کے فوراً بعد اپنی مسجد کو واپس آجائے لیکن بقیہ سنتیں پڑھنے کے لیے اگر وہیں ٹھہر جائے تو اس سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا۔

قال فی الهندیة: ویخرج للجمعة حین تزول الشمس ان کان معتکفه قریباً من الجامع بحیث لو انتظر زوال الشمس لا تفوته الخطبة والجمعة واذا کان بحیث تفوته لم ینتظر زوال الشمس لکنه یخرج فی وقت یمکنه ان یأتی الجامع فیصلی اربع رکعات قبل الاذان عند المنبر وبعد الجمعة یمکث بقدر ما یصلی اربع رکعات اوستا علی حسب اختلافهم فی سنة الجمعة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۱۲ الباب السابع فی الاعتکاف) ؎۲

اعتکاف کی حالت میں تعلیم کے لیے نکلنا

سوال:۔ اگر اعتکاف کے دوران تعلیم کی ضرورت پڑے تو معتکف کے لیے مسجد سے نکلنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص اعتکاف میں بیٹھنے سے قبل بعض امور کے کرنے کو مشروط کرے تو

؎۱ قال العلامة عالم بن العلاءؒ:۔ واما فی الاعتکاف النفل فلا بأس بان یخرج بعذر او بغیر عذر۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۴۱۲ الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۱۳ الباب السابع فی الاعتکاف۔

؎۲ قال العلامة طاهر بن احمد بن عبد الرشیدؒ:۔ وعن محمدؒ انه ان کان منزله بعیداً من الجامع یخرج حین تری انه یبلغ الجامع عند النداء وان کان خروجه قبل الزوال هو الصحیح۔ (خلاصة الفتاوی ج۱ ص۲۶۷ الفصل السادس فی الاعتکاف)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۳۰۱ باب الاعتکاف۔

اس دوران اس کے لیے وہ عمل کرنا جائز ہوگا اور اس سے اس کا اعتکاف متاثر نہیں ہوگا۔

قال العلامة عالم بن العلاءؒ:۔ ولو شرط وقت النذر والالتزام ان یخرج الی عبادة المریض وصلوٰة الجنازة وحضور العلم یجوز له ذٰلك۔

(فتاوٰی تاتارخانیة ج۲ ص۴۱۲ الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف) [۱]

بوقتِ ضرورت اعتکاف سے نکلنا

سوال:۔ اہل وعیال کی بیماری یا کسی بہت بڑے حادثہ کی وجہ سے اعتکاف کا چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جان ومال یا اہل وعیال کے کسی ممکنہ یقینی خطرہ کی وجہ سے اعتکاف کو چھوڑنا جائز ہے، ایسی حالت میں ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے اگر معتکف باہر چلا جائے تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا لیکن گنہگار نہ ہوگا، تاہم اگر مسجد کے انہدام کی وجہ سے یا جبراً مسجد سے نکالے جانے کی صورت میں فوراً دوسری مسجد میں داخل ہو جائے تو اعتکاف برقرار رہے گا۔

لما قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ:۔ وكذا لو خرج للجنازة یفسد اعتكافه وكذا لصلوٰتها ولو تعینت علیه او لانجاء الغریق او الحریق او الجهاد اذا كان النفیر عامًا او لاداء الشهادة كل ذٰلك مُفسد بخلاف الخروج لحاجة الانسان لانها معلومة الوقوع فتكون مستثناة ولهٰذا لو انهدم المسجد الذی هو فیه فانتقل الیٰ مسجد آخر لم یفسد اعتكافه للضرورة لانه لم یبق مسجدًا بعد ذٰلك ففات شرطه وكذا لو تفرق اهله لعدم الصّلوات الخمس فیه ولو اخرجه ظالم كرهًا او خاف علی نفسه اوماله من المكابرین فخرج لا یفسد اعتكافه۔ (تبیین الحقائق ج۱ ص۳۵۱ باب الاعتكاف) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصكفیؒ: لو شرط وقت النذر ان یخرج لعیادة مریض وصلوٰة جنازة وحضور مجلس علم جاز ذٰلك فلیحفظ۔ (الدر المختار ج۲ ص۱۴۶ باب الاعتكاف)

وَمِثْلُهٗ فی حاشیة طحطاوی ج۱ ص۴۸۴

[۲] قال العلامة الحصكفیؒ: ولما لا یغلب كانجاء غریق وانهدام مسجد فمسقط للاثم لا للبطلان والا لكان النسیان اولیٰ بعدم الفساد كما حققه الكمال خلافًا لما فصله الزیلعی وغیره۔ قال ابن عابدینؒ: تحت قوله خلافًا لما فصله الزیلعیؒ حیث جعل الخروج لعیادة المریض والجنازة وصلوٰتها وانجاء الغریق والحریق والجهاد اذا كان النفیر عامًا واداء الشهادة مفسدًا بخلاف خروجه الیٰ مسجد آخر بانهدام المسجد او تفرق اهله لعدم صلوٰة الخمس فیه واخراج ظالم كرهًا وخوفه علیٰ نفسه اوماله من المكابرین۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۴۹ باب الاعتكاف)

اخراجِ ریح کے لیے معتکف کا مسجد سے نکلنا

سوال:۔ ظاہر ہے کہ مسجد میں ریح نکالنا مناسب نہیں، کیا معتکف اس کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مسجد میں اخراجِ ریح اگرچہ بالاتفاق مکروہ ہے لیکن طبعی تقاضے کی وجہ سے معتکف کے بارے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں، بعض فقہاء اخراجِ ریح کے لیے مسجد سے نکلنا افضل مانتے ہیں جبکہ بعض فقہاء مسجد سے نکلنے کو منع کرتے ہیں، اگرچہ سب کے ہاں مسجد ہی میں ریح نکالنا مرخص ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اخراجِ ریح کے لیے مسجد سے باہر نکلے۔

قال ابن عابدینؒ :۔ (تحت قوله ولا البول والفصد فيه) وكذا لا يخرج فيه الريح من الدبر كما في الاشباه واختلف فيه السلف فقيل لا بأس وقيل يخرج اذا احتاج اليه وهو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغير للتمرتاشي۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۸۶ مطلب فی احکام المسجد) [۱]

بھول کر اعتکاف سے نکلنے کا حکم

سوال:۔ کسی آدمی کا بھول کر اپنے معتکف سے نکلنے کی وجہ سے اس کے اعتکاف کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ بھول کر معتکف سے نکلنا صاحبین کے نزدیک مفسدِ اعتکاف نہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف باقی نہیں رہتا، احتیاط اسی میں ہے۔

قال برهان الدینؒ :۔ ولو خرج من المسجد ساعة بغير عذر فسد اعتكافه عند ابی حنيفةؒ رحمه الله تعالیٰ لوجود المنافی وهو القياس وقالا لا يفسد۔ (الهداية ج ۱ ص۲۱۲ باب الاعتکاف) [۲]

---

[۱] لما فی الهندية: سئل ابوحنيفةؒ عن المعتكف اذا احتاج الى الفصد او الحجامة هل يخرج فقال لا وفی اللآلی واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لا يفسو ويخرج اذا احتاج اليه وهو الاصح كذا فی التمرتاشی۔ (الفتاوی الہندیہ جلد ۵ ص۳۲۱ کتاب الکراہیۃ، الباب الخامس فی آداب المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج ۲ ص۵۱۶ باب الاعتکاف۔

[۲] قال العلامة شيخ الاسلام ابی بكر بن علی رحمه الله :۔ وكذا اذا خرج من المسجد ساعة بغير عذر فسد اعتكافه عند ابی حنيفة لوجود المنافی وعندهما لا يفسد۔
(الجوهرة النيرة ج ۱ ص۱۸۰ باب الاعتکاف۔
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدير ج ۲ ص۳۱۰ باب الاعتکاف۔

حُقّہ پینے کے لیے مسجد سے نکلنا مرخص نہیں

سوال:۔ اگر معتکف حُقّہ پینے کا عادی ہو تو کیا اس کے لیے حُقّہ پینے کی خاطر مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حُقّہ نوشی کوئی ایسی چیز نہیں جو معتکف کے حوائجِ طبعی میں شمار ہوسکے جس کے لیے مسجد سے نکلنا مرخص ہو، اگر مسجد کے احاطہ میں کھڑے ہوکر دھواں باہر نکالنا ممکن ہو تو تطبیق کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، ورنہ مسجد سے محض اس کے لیے نکلنا یا مسجد میں حُقّہ پینا معتکف کو زیب نہیں دیتا، تاہم دورانِ اعتکاف ایسی چیزوں کا استعمال آزمائش سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ:۔ (الخروج الّا لحاجة الانسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد او شرعية كعيد واذان لو مؤذنا وباب المنارة خارج المسجد ...... فلو خرج ولو ناسيًا ساعة زمانية لا رملية كما مر بلا عذر فسد۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۴۸ باب الاعتكاف) [۱]

معتکف کا بیرونِ مسجد باتیں کرنا

سوال:۔ اگر معتکف کسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مسجد سے باہر نکلے تو راستے میں کسی سے باتیں کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی مُعتکف کسی ضرورت کے تحت مسجد سے باہر نکل کر چند باتیں کرے تو اس سے اعتکاف پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا البتہ اگر بلا ضرورت باتوں کیلئے ٹھہر جائے تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا تاہم بہتر یہ ہے کہ بلا ضرورت باتوں سے اجتناب کیا جائے۔

قال ابن نجيمؒ:۔ واما التكلم بغير خير فانه يكره لغير المعتكف فما ظنك للمعتكف۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۴ باب الاعتكاف) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة عماد بن حسن الشرنبلاليؒ:۔ ولا يخرج منه) من معتكفه فيشمل المرأة.... الّا لحاجة شرعية كالجمعة..... او حاجة طبعية كالبول والغائط وازالة نجاسة ..... فان خرج ساعة بلاعذر فسد الواجب۔ (مراقي الفلاح على صدر الطحطاوي ص۵۲۹ باب الاعتكاف)

وَمِثْلُهٗ في كفاية المفتي ج ۴ ص۲۳۲ باب الاعتكاف۔

[۲] قال طاهر ابن احمد ابن عبد الرشيدؒ:۔ واذا خرج لبول او غائط لا يمكث في منزله بعد الفراغ من الطهور۔ (خلاصة الفتاوى ج ۱ ص۲۶۷ باب الاعتكاف۔

وَمِثْلُهٗ في الجوهرة النيرة ج ۱ ص۱۸۱ باب الاعتكاف

حالتِ اعتکاف میں بیوی سے بوس وکنار کا حکم

سوال:۔ مسجد میں اعتکاف کے دوران اپنی بیوی سے بوس وکنار سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جماع مفسدِ اعتکاف ہے البتہ دواعی جماع (بوس وکنار) مفسدِ اعتکاف نہیں مگر اس کا ارتکاب حرام ضرور ہے، تاہم اس دواعی سے اگر انزال ہو جائے تو اس صورت میں اعتکاف ختم ہو جائے گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ:۔ وبطل بوطء فی فرج انزل ام لا ولو کان وطؤہ خارج المسجد لیلا اونہارًا عامدًا او ناسیًا فی الاصح لان حالتہ مذکرۃ وبطل بانزال بقُبلۃ اولمس او تفخیذ ولولم ینزل لم یبطل وان حرم الکل لعدم الحرج ــ قال ابن عابدینؒ تحت قولہ (وان حرم الکل) ای کل ماذکر من دواعی الوطء اذ لایلزم من عدم البطلان بہا حلہا۔

(الدرالمختار مع ردالمحتار ج۲ ص۴۵۰ باب الاعتکاف) [۱]

حالتِ اعتکاف میں بیوی سے باتیں کرنا

سوال:۔ کیا اعتکاف کی حالت میں بیوی سے باتیں کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ معتکف مسجد میں ہو اور اس کی بیوی گھر میں ہو؟

الجواب:۔ حالتِ اعتکاف میں بالکل خاموش رہنا مکروہ ہے، خیر اور بھلائی کی باتیں کرنا ہر کسی سے جائز ہے چاہے انسان کی شریکِ حیات ہو یا کوئی اور، تاہم بیوی سے پیار ومحبت کی باتیں کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ ویکرہ تحریمًا صمت ان اعتقدہ قربۃ والا لا تکلم الا بخیر وھو مالا اثم فیہ ومنہ المباح عند الحاجۃ الیہ لاعند عدمہا الخ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۴۴۹ باب الاعتکاف)

---

[۱] وفی الہندیۃ: (ومنہا الجماع ودواعیہ) فیحرم علی المعتکف الجماع ودواعیہ نحو المباشرۃ والتقبیل واللمس والمعانقۃ والجماع فیما دون الفرج واللیل والنہار فی ذٰلک سواء والجماع عامدًا اوناسیًا لیلاً اونہارًا یفسد الاعتکاف انزل اَو لم ینزل وماسواہ یفسد اذا انزل وان لم ینزل لا یفسد۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۲۱۳ الباب السابع فی الاعتکاف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۱۱۶ کتاب الاعتکاف۔

کیا محلّے کی ہر مسجد میں اعتکاف ضروری ہے؟

سوال:۔ کیا رمضان المبارک میں محلے کی ہر مسجد میں اعتکاف کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رمضان کے مہینے میں اعتکاف مسنون علی الکفایہ ہے لیکن فقہی ذخائر میں اس بات کی کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری ہے کہ ہر محلے کی ہر مسجد میں اعتکاف کرنا ضروری ہے، البتہ علامہ شامیؒ کی ایک تشبیہ سے جو انہوں نے اعتکاف کو تراویح کے ساتھ دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کی طرح اعتکاف بھی ہر محلے کی ہر مسجد میں مسنون ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قوله سنة على الكفاية) نظيرها اقامة التراويح بالجماعة فاذا قام بها البعض سقط الطالب عن الباقين فلم يأثموا بالمواظبة على الترك بلا عذر ولو كان سنة عين لأثموا بترك السنة المؤكدة اثماً دون اثم ترك الواجب۔
(ردّ المحتار ج ۲ ص۴۴۲ فصل فی الاعتکاف)[1]

وقال ایضاً (تحت قوله والجماعة فيها سنة على الكفاية) افاد ان اصل التراويح سنة عين (الی ان قال) وهل المراد انها سنة كفاية لاهل كل مسجد من البلدة او مسجد واحد منها او من المحلة ظاهر كلام الشارح الاول واستظهر الثاني ويظهر لی الثالث لقول المنية حتى لو ترك اهل محلة كلهم الجماعة فقد تركوا السنة واساؤا۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۴۳ فصل فی التراویح)

معتکف کا اذان کے لیے خارج از مسجد اذان خانہ کو جانا

سوال:۔ اگر اذان خانہ مسجد سے باہر ہو تو کیا مؤذن جو کہ مسجد میں معتکف ہے اذان کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معتکف کا بلا ضرورت شرعی وطبعی کے مسجد سے نکلنا جائز نہیں، چونکہ اذان دینا ایک امر شرعی ہے اسلئے اذان کے لیے مسجد سے باہر اذان خانے کو جا سکتا ہے اور اس سے اعتکاف متاثر نہیں ہوگا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: اوشرعية اى تخرج لحاجة شرعية كعيد واذان لو مؤذنا وباب المنارة خارج المسجد۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۴۸ باب الاعتکاف)

---

[1] قال العلامۃ ابن همامؒ:۔ وصعود المئذنة ان كان بابها من خارج المسجد لا يفسد فی ظاهر الرواية وقال بعضهم هذا فی حق المؤذن لان خروجه للاذان معلوم فيكون مستثنى اما غيره فيفسد اعتكافه وصحح قاضيخان انه قول الكل فی حق الكل۔
(فتح القدیر ج ۲ ص۳۱۱ باب الاعتکاف) ــــ ومثله فی خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص۲۶۹ الباب السادس فی الاعتکاف۔

عورتوں کے لیے اعتکاف کا حکم

سوال:۔ عورتوں کا اعتکاف کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ علماء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ ہمارے علاقے کے گھروں میں عورتوں کے لیے نماز پڑھنے کی کوئی خاص جگہ مقرر نہیں ہوتی اور وہ ہر پردہ کی جگہ میں نماز ادا کر لیتی ہیں، تو کیا وہ گھر میں جس جگہ نماز پڑھتی ہیں اُسی جگہ اعتکاف کر سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ عورتوں کا اپنے گھروں میں اعتکاف کرنا احناف کے ہاں جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، عورتیں گھر کے کسی بھی کونے میں پردہ لگا کر اعتکاف کر سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ عورتوں کا نماز کے لیے گھر کے اندر کوئی خاص جگہ مقرر کرنا ضروری نہیں، جہاں بھی ممکن ہو نماز بلا کراہت ادا کی جا سکتی ہے، تاہم جہاں تک ہو سکے پردہ میں نماز ادا کی جائے تو بہتر ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: او لبث امرأة فی مسجد بیتها. قال العلامة ابن عابدینؒ: قوله فی مسجد بیتها وهو المعد لصلاتها الذی یندب لها ولکل احد اتخاذه۔ (رد المحتار ج ۲ ص۴۴۱ باب الاعتکاف)[1]

حالتِ اعتکاف میں اخبار وغیرہ پڑھنے کا حکم

سوال:۔ معتکف آدمی اعتکاف کے دوران اخبار ورسائل پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح خبریں سننے کی غرض سے ریڈیو اپنے پاس رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اخبارات میں اکثر عریاں تصویریں ہوتی ہیں جبکہ ریڈیو میں صرف آواز سنائی دیتی ہے، تو کیا خبریں سننا زمرۂ عبادت میں شمار ہیں یا معاملات میں؟ ان افعال کے مرتکب شخص کو بار بار سمجھایا گیا کہ معتکف کے لیے یہ فعل غیر مناسب ہے، معتکف چونکہ ریٹائرڈ ٹیچر ہے اس لیے وہ اپنے اس فعل کو مجتہد کی حیثیت سے چھوڑنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ برائے مہربانی تقدسِ مسجد اور آدابِ اعتکاف سے تفصیلاً آگاہ فرمائیں؟

---

[1] وفی الهندیة: المرأة تعتکف فی مسجد بیتها اذا اعتکفت فی مسجد بیتها فتلک البقعة فی حقها کمسجد الجماعة فی حق الرجل لا تخرج منه الا لحاجة الانسان۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۱۱ الباب السابع فی الاعتکاف)

الجواب:۔ اعتکاف کا بنیادی مقصد رضاء الٰہی ہے اس لیے اعتکاف کے دوران اُن عبادات میں مشغول ہونا چاہیئے جو رضاء الٰہی کا باعث بنتی ہوں۔ فقہاء کرام نے معتکف کے لیے قرآنِ کریم کی تلاوت، احادیثِ مبارکہ اور دینی کتابوں کا مطالعہ اور نوافل کثرت سے پڑھنا تجویز کیا ہے، لہٰذا ایک معتکف کو ان امور میں مشغول رہنا چاہیئے نہ کہ اخبار پڑھنے اور خبریں سُننے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔ اور ویسے بھی مسجد کے اندر تصاویر اور آلاتِ لہو و لعب لے جانا شرعاً جائز نہیں۔ اس لیے کسی معتکف کو ریڈیو سے خبریں سننا اور اخبارات دیکھنا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: تکلم إلا بخیر وهو ما لا اثم فیه ومنه المباح عند الحاجة الیه لا عند عدمها........ کقراٴة قرآن وحدیث وعلم وتدریس فی سیر الرسول علیه الصّلوٰة والسّلام وقصص الانبیاء علیهم السّلام وحکایة الصالحین وکتابة امور الدّین۔ [1]

{الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۴۴۹، ۴۵۰ باب الاعتکاف}

بحالتِ اعتکاف جگہ تبدیل کرنا

سوال:۔ عمومی طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اعتکاف کے لیے ایک جگہ مخصوص کرتے ہیں، کیا جگہ مخصوص کرنے کے بعد بحالتِ اعتکاف اُس جگہ کو تبدیل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اعتکاف کیلئے مسجد کا ہونا ضروری ہے، معتکف مسجد کے اندر جہاں چاہے رہ سکتا ہے، حالتِ اعتکاف میں مسجد کے اندر جگہ تبدیل کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ عزیز الرحمنؒ: تمام مسجد میں جہاں چاہے اعتکاف میں بیٹھنے میں کچھ حرج نہیں۔

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۶ ص ۵۰۲ باب الاعتکاف)

---

[1] وفی الهندیة: و یلازم التلاوة والحدیث والعلم وتدریسه وسیر النبی صلی الله علیه وسلم والانبیاء علیهم السّلام واخبار الصالحین وکتابة امور الدّین۔

{الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۲۱۲ الباب السابع فی الاعتکاف}

معتکف دھوپ کے لیے مسجد کے صحن میں بیٹھ سکتا ہے

سوال :۔ کیا سردی کے دنوں میں معتکف اپنی مخصوص جگہ سے نکل کر باہر صحن میں دھوپ میں بیٹھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ حالتِ اعتکاف میں مسجد کے اندر رہنا ضروری ہے، تمام مسجد مُعتَکِف کے لیے مُعتَکَف ہے، لہٰذا مُعتکِف آدمی مسجد کے اندر جہاں چاہے قیام کرے اگرچہ مخصوص جگہ کے علاوہ ہی ہو۔

لما قال الشیخ عزیز الرحمنؒ :۔ مُعتکِف جس مسجد میں مُعتَکَف ہے اُس تمام مسجد میں جس جگہ چاہے رہ سکتا ہے اور سو سکتا ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۶ ص ۵۰۳ باب الاعتکاف) [۱]

حالتِ اعتکاف میں کھانا لانے کیلئے گھر جانے اور وہاں منہیات کا ارتکاب کرنے والے کے اعتکاف کا حکم

سوال :۔ ہمارے گاؤں کا ایک شخص رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنے کیلئے محلے کی مسجد میں بیٹھ گیا۔ چونکہ اس کے لیے گھر سے سحری اور افطاری لانے کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے اسے خود ہی سحری اور افطاری لانے کے لیے گھر جانا پڑتا، ایک دن سحری لانے کیلئے جب وہ گھر گیا تو لاعلمی میں اس نے ضرورت سے زیادہ وقت گزارا اور اپنی بیوی کا بوسہ بھی لیا لیکن جماع نہیں کیا۔ اس پر مسجد کے امام نے اس سے کہا کہ آپ کا اعتکاف ٹوٹ گیا ہے اسلئے آپ اس کی قضاء کریں۔ آنجناب سے التجاء ہے کہ کیا یہ شخص تمام دنوں کے اعتکاف کی قضاء کرے گا یا صرف اسی دن کی؟ نیز یہ بھی واضح فرمائیں کہ کیا اعتکاف کی قضاء غیر رمضان میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ جو شخص رضا الٰہی کے لیے اعتکاف کی نیت سے مسجد میں معتکف ہو جائے تو وہ بلا ضرورتِ شرعی یا دنیاوی مسجد کی حدود سے باہر نہ نکلے۔ بہتر یہ ہے کہ گھر سے سحری یا افطاری لانے کے لیے کوئی دوسرا انتظام کیا جائے لیکن اگر کوئی دوسرا انتظام ممکن نہ ہو تو پھر خود بھی جا سکتا ہے مگر بقدرِ ضرورت یعنی صرف سحری یا افطاری اٹھا کر مسجد میں لے آئے۔

---

[۱] قال العلامة الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ : ہر وقت گوشہ میں رہنا ضروری نہیں بلکہ عبادتِ نافلہ و ذکر کے لیے اس میں رہنا بہتر ہے، باقی اوقات میں مسجد کے اندر جہاں چاہے اُٹھے بیٹھے۔ (امداد الاحکام ج ۲ ص ۱۴۵ باب الاعتکاف)

کما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یخرج من المسجد الا لحاجة الانسان والجمعة۔ (الهداية ج ۱ ص۲۱۲ کتاب الصوم، باب الاعتکاف)

ضرورت سے زیادہ تاخیر نہ کرے اور نہ اُن اوامر کا ارتکاب کرے جو شرعاً اعتکاف کے دوران ممنوع ہیں، مثلاً بیوی سے جماع کرنا یا دعاوی جماع کرنا وغیرہ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چونکہ اس شخص نے حالتِ اعتکاف میں دو منہیات کا ارتکاب کیا ہے (۱) سحری لاتے وقت بلاضرورت گھر میں ٹھہرا۔ (۲) اپنی منکوحہ کا بوسہ لیا۔ اس لیے اس کا اس دن کا اعتکاف ٹوٹ گیا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وخص المعتکف باکل وشرب ونوم وعقد احتاج الیه ۔۔۔ فلو خرج لاجلها فسد لعدم الضرورة۔ (رد المحتار ج۲ ص۱۴۲ باب الاعتکاف)

اس لیے اس پر صرف اسی دن کے اعتکاف کی قضا لازم ہے۔

کما قال العلامة ابن عابدینؒ: ای علیٰ قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله نیقضی الیوم الذی افسده لاستقلال کل یوم بنفسه۔

(رد المحتار ج۲ ص۱۴۳ کتاب الصوم۔ باب الاعتکاف)

قضا چاہے رمضان میں کرے یا غیر رمضان میں، لیکن غیر رمضان میں اعتکاف کی قضا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دن روزہ بھی رکھے۔

کتاب الحج

بسم الله الرحمن الرحیم

ولله علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا

صدق الله العظیم

مصر کے مشہور استاد خطاط محمد حسنی کا خط ثلث کا ایک نادر نمونہ

باب شرائط الحج وأركانه

(حج کے شرائط و ارکان کے بارے میں)

حج کی فرضیت کا وقت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو رمضان کے مہینہ میں اپنے دادا کی میراث سے کافی مقدار میں مال ملا اور محرم کے مہینہ تک مال موجود رہا بعد میں مال خرچ ہو گیا تو کیا اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: فرضیتِ حج کے لیے اشہرِ حج میں مالِ کثیر کا مالک ہونا ضروری ہے، چونکہ یہ آدمی اشہرِ حج میں مال کا مالک بنا تھا اس لیے اس پر حج فرض ہو گیا ہے، البتہ اگر یہ آدمی کسی ایسے بعید ملک میں رہتا ہو کہ وہاں سے اشہرِ حج سے قبل حجاج روانہ ہوتے ہوں تو قافلۂ حجاج کی روانگی کا وقت معتبر ہوگا۔

قال الامام ابن همامؒ:- والاولی ان یقال اذا کان قادراً وقت خروج اهل بلده ان کانوا یخرجون قبل اشهر الحج لبعد المسافة اوقادراً فی اشهر الحج ان کانوا یخرجون فیها ولم یحج حتی اذتقر تقررد ینًا - (فتح القدیر ج۲ ص۳۲۱ کتاب الحج) [۱]

ضرورت سے زائد زمین ہو تو حج فرض ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کی زمین اس کی ضروریات سے زائد ہے تو کیا اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: مصارف حج ادا کرنے کے بعد اتنی زمین باقی رہتی ہو کہ وہ اس کے اور اس کے اہل و عیال کی معاشش کے لیے کافی ہو تو اس پر حج فرض اور لازمی ہے۔

وفی الهندية :- ان کان له من الضياع لوباع مقدار ما یکفی لزاد والراحلة ذاهب

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ : (تحت قوله علیٰ مسلم الاوّل شروط الوجوب والوقت ای القدرة فی اشهر الحج او فی وقت خروج اهل بلدة علیٰ ما یأتی -

(رد المحتار ج۲ ص۴۵۸ کتاب الحج، مطلب فیمن حج بمال الحرام)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۲۱۹ کتاب المناسك، الباب الاوّل -

وجاثياً ونفقة عياله واولاده ويبقى له من الصنيعة قدر ما يعيش بغلّة الباقي يفترض عليه الحج والا فلا ۔ (الفتاوٰی الهندية ج ۱ ص۲۱۸ الباب الاول فی تفسیر الحج) [1]

زمین کی آمدنی پر حج کی فرضیت

سوال:۔ میری کچھ زمین ہے اُس سے جو سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے اس سے صرف میرا خرچہ پورا ہوتا ہے تاہم اگر زمین کی قیمت لگائی جائے تو وہ کافی مالیت کی بنتی ہے، کیا اس قیمت کی وجہ سے مجھ پر حج فرض ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حج کی فرضیت کے لیے مالی استطاعت کا ہونا ضروری ہے صرف زمین کی قیمت پر حج فرض نہیں ہوتا البتہ اگر زمین کی آمدنی اتنی مقدار میں ہو کہ جس سے اہل و عیال کا اور حج کے لیے آمد و رفت کا خرچہ پورا ہوتا ہو تو حج فرض ہے ورنہ نہیں ۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ اذا قدر على الزاد والراحلة فاضلة عن المسكن ومالا بد منه وعن نفقة عياله الى حين عوده ۔ (الهدایہ ج ۱ ص۲۱۲ کتاب الحج) [2]

صرف تصرّف کا اختیار حج کی فرضیّت کے لیے کافی نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بیوہ عورت کی اولاد مالدار ہے اور ماں کو بھی اولاد کے مال پر تصرّف کرنے کا پورا پورا اختیار ہے، تو کیا اس اختیار کی وجہ سے اس عورت پر حج فرض ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر اس عورت کے پاس مال بطور مِلک ہو اور اس میں شرائطِ حج بھی پائی جائیں تو اس پر حج فرض ہے، صرف مال پر اختیار ہونے کی وجہ سے شرعاً حج فرض

---

[1] وقال قاضيخان:۔ وان كان صاحب صنيعة ان كان له من الضياع لو باع مقدار ما يكفي لزاد والراحلة ذاهباً وجاثياً ونفقة عياله واولاده ويبقى له من الصنيعة قدر ما يعيش بغلّة الباقي يفترض عليه الحج والا فلا ۔ (الفتاوٰی قاضی خان علیٰ ہامش الهندیہ ج ۱ ص۲۸۱ کتاب الحج)
وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۱۴ کتاب الحج ۔

[2] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: وراحلة فضلة عما لا بد منه وفضلا عن نفقة عياله الى حين عوده ۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص۴۶۲ کتاب الحج)
وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۱۱ کتاب الحج ۔

نہیں ہوتا۔

واما شرائط الوجوب منها الاسلام ومنها العقل ومنها القدرة على الزاد والراحلة بطريق الملك۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۱۷ کتاب الحج، الباب الاول فی تفسیر الحج) [۱]

مشترکہ مال سے حج کی فرضیت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چار بھائی مشترکہ کاروبار کرتے ہیں، کیا اس کاروبار سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے ایک بھائی حج کرسکتا ہے؟ نیز مشترکہ مال پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مشترکہ کاروبار کے اس منافع کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد ہر ایک کے حصہ میں اتنی رقم آئے کہ اس سے حج کے جملہ اخراجات پورے ہوتے ہوں تو ہر حصہ دار پر حج فرض ہے، مال مشترکہ کے کل نفع پر مجموعی طور پر حج فرض نہیں ہوتا۔

قال العلامة الحصكفی رحمه الله:۔ على مسلم ذى زاد، الخ۔ وراحلة فضلاً عما لا بد منه و فضلاً عن نفقة عياله الى حين عوده۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ص۴۵۸ ج۲ کتاب الحج) [۲]

حکومت کے خرچ پر حج کرنے سے حج کا فریضہ ساقط ہوجاتا ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک آدمی سرکاری ملازم ہے اور وہ ۱/۴ حصہ رقم جمع کراتا ہے باقی رقم حکومت اپنی جانب سے ادا کرتی ہے لہٰذا اگر یہ شخص اس طرح حج کرے تو کیا یہ حج فرض حج شمار ہوگا یا نفل؟

الجواب:۔ اس سفر سے اس کا حج فرض ادا ہو کر اس کا ذمہ فارغ ہوجائے گا، کیونکہ

---

[۲] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: على مسلم ذى زاد وراحلة وفضلاً عن نفقة عياله الى حين عوده۔ (تنوير الابصار على صدر رد المحتار ج۲ ص۴۶۱ کتاب الحج)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحج۔

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله:۔ شرائط وجوب الحج العقل والبلوغ والحرية والاستطاعة وتكلموا فی تفسير الاستطاعة۔ قال ابو حنيفة رحمه الله فی ظاهر رواية تفسيرها سلامة البدن وملك الزاد والراحلة۔ (فتاوى تاتارخانیہ ج۲ ص۴۲۹ کتاب الحج، الفصل الاول فی شرائط الوجوب)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۲۱۷ الباب الاول فی تفسير الحج۔

حکومت نے جو رقم دی ہے وہ حج بدل کے لیے نہیں بلکہ بطور تعاون دی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ :- بخلاف ما لو خرج لیحج عن نفسه وفقیرحا زعنه وصوله الی المیقات صار قادرا لقدرة نفسه وفیه ایضًا الا فاتی اذا وصل الی المیقات فهو کالمکی ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۶۲ کتاب الحج) لہ

حرام مال سے حج کرنے کا حیلہ

سوال:- ایک شخص کے مال میں حرام مال کا اختلاط ہے اب وہ حج کرتا ہے تو اس کے لیے کسی سے کچھ رقم قرض پر لیتا ہے لیکن جب قرض ادا کرتا ہے تو حرام مال سے ادا کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا حج صحیح ہے یا غلط؟

الجواب:- وجوب حج کے لیے مالِ حلال یا مخلوط مال کا ہونا ضروری ہے چونکہ اس شخص نے قرض (مالِ حلال) سے کر حج کیا تو اس کا حج صحیح ہے اگرچہ اس شخص نے قرض کو مالِ حرام سے واپس کیا ہو تاہم اس طرح کی حیلہ بازیوں سے اجتناب ضروری ہے۔

اذا اراد الرجل ان یحج بمال الحلال فیه شبهة فانه یستدین للحج ویقضی دینه من ماله کذا فی فتاوٰی قاضیخان۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۲۰ الباب الاول فی الحج) ۲ہ

چوری کا مال مخلوط ہو جانے پر حج کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص چوری کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر تجارت کرے اور جب اسے غنا حاصل ہو اور اس پر حج فرض ہو جائے تو کیا یہ شخص اُس مال سے حج کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- چوری کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانے سے کل مال اس کی ملک میں

لہ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ :- والفقیر اذا حج ماشیا ثم ایسر لاحج علیه ۔
(الفتاوٰی التاتارخانیة ج ۲ ص۴۳۲ کتاب الحج۔ الفصل الاول فی شرائط الوجوب)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۱۷ کتاب المناسک الباب الاول ۔
۲ہ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ :- واذا اراد ان یحج بمال الحلال فیه شبهة فانهٗ یستدین للحج ولقضی دُینه من ماله ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۵۷۶ کتاب الحج الفصل العشرون فی المتفرقات)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۹ کتاب الحج ۔

داخل ہوگیا ہے تو وجوب کے شرائط پائے جانے کی صورت میں اس پر حج فرض ہے، اسلئے حج سے بچنے کیلئے مالِ حرام کی موجودگی کا بہانہ نہ بنائے بلکہ حج ادا کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کالحج بمال حرام) لیس الحرام بل حرام ھو الانفاق للمال الحرام ولا للازم بینھما۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الحج مطلب فیمن حج بمال حرام) [۱]

حج فرض ہونے کے بعد تنگدستی سے حج ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر حج فرض تھا لیکن بعض عوارض کی وجہ سے وہ حج نہ کرسکی جبکہ اب وہ تنگدست ہوچکی ہے، کیا اس تنگدستی کی وجہ سے اُس سے حج ساقط ہوگیا یا نہیں؟ نیز اگر کوئی آدمی حج فرض ہونے کے باوجود صرف عمرہ کرلے تو کیا اُس سے حج ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی عورت کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ اپنا اور محرم کا خرچہ برداشت کرسکتی ہو تو اس پر حج فرض ہے، تنگدست ہو جانے سے یا عمرہ کرلینے سے حج ساقط نہ ہوگا زندگی میں حج کرنا ضروری ہے اور اگر حج نہ کرسکا تو پھر موت سے قبل حج کی وصیت کرے اور اس کی وصیت پر عمل کیا جائے گا۔

ومنھا المحرم للمرأۃ شابۃ کانت او عجوزاً اذا کانت بینھا و بین مکۃ ثلاثۃ ایام، ھکذا فی المحیط۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۱۹ کتاب الحج)

وقال ایضاً:۔ واما شرائط وجوبہ منھا الاسلام حتی لو ملک بہ الاستطاعۃ حال کفرہ ثم اسلم بعد ما افتقر لا یجب علیہ شئ بتلک الاستطاعۃ بخلاف ما لو ملکہ مسلماً فلم یحج حتی افتقر حیث یتقرر الحج فی ذمتہ دیناً علیہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۱۷ کتاب المناسک، الباب الاول) [۲]

---

[۱] وفی الھندیۃ: ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لا یقبل الحج بالنفقۃ الحرام مع انہ یسقط الفرض معھا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۲۰ الباب الاول فی تفسیر الحج)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۹ کتاب الحج۔

[۲] قال العلامۃ ابن ھمامؒ:۔ بخلاف ما لو ملکہ مسلماً فلم یحج حتی افتقر حیث یتقرر الحج فی ذمتہ دیناً علیہ۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۳۳۲ کتاب الحج)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج ۲ ص۳۱۵ کتاب الحج۔

مکانات حوائج اصلیہ سے زائد ہوں تو حج فرض ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے پاس زمین کے علاوہ مکانات بھی ہیں جو حوائج اصلیہ سے زائد ہیں تو کیا اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ شخص حج نہ کرے تو گنہگار ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ زرعی زمین، مکانات اور دیگر جائیداد وغیرہ اگر حوائج اصلیہ سے زائد ہوں تو اس پر حج فرض ہے لہٰذا یہ شخص فریضۂ حج ادا کرے تاہم اگر حج ادا نہ کرے تو گنہگار ہوگا۔

قال العلامۃ التمرتاشیؒ : وراحلۃ فضلۃ عما لا بد منہ وفضلاً عن نفقۃ عیالہ الخ الیٰ حین عودہ۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الحج) [۱]

بیٹی کی شادی کرنا مانع حج نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید پر حج فرض ہوچکا ہے لیکن اس کی ایک غیر شادی شدہ بالغہ لڑکی ہے جس کا ابھی تک نکاح بھی نہیں ہوا ہے، تو کیا زید گھر میں غیر شادی شدہ بیٹی کی موجودگی میں حج کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر شادی شدہ اولاد کا ہونا والدین کی عدالت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور اولاد کی شادی کے لیے کثیر مال خرچ کرنا نہ ضروری ہے اور نہ ہی یہ حج کے لیے مانع شرعیہ میں سے ہے، لہٰذا جب زید پر شرعاً حج فرض ہوچکا ہے تو اس کے لیے حج پر جانا ضروری ہے۔

قال فی الھندیۃ :۔ ومنھا القدرۃ علی الزاد والراحلۃ بطریق الملک والاجارۃ۔ الخ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۲۱۷ الباب الاوّل فی تفسیر الحج۔) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ :۔ اذا قدر علی الزاد والراحلۃ فاضلۃ عن المسکن ومالا بد منہ وعن نفقۃ عیالہ الیٰ حین عودہ۔

(الھدایۃ ج ۱ ص ۲۱۲ کتاب الحج)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱۱ کتاب الحج ۔

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ :۔ (علی المسلم) تحت ھٰذہ العبارۃ الاوّل شروط والوجوب اذا وجبت بتمامھا وجب الحج والافلا ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۴۵۹ کتاب الحج)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱۱ کتاب الحج ۔

صاحبِ استطاعت کیلئے مکان کا نہ ہونا مانع حج نہیں

سوال: میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ جس سے میں فریضہ حج ادا کر سکتا ہوں، اگر اس رقم سے مکان بناؤں تو حج کے لیے پیسے نہیں بچتے، کیا اس وقت مکان بنانا ضروری ہے یا حج کرنا؟

الجواب: ۔ مکان ایسی ضرورت نہیں جو شرعاً فریضۂ حج کے لیے مانع بنے، جب آپ کے پاس حج کی ادائیگی کے لیے مناسب رقم موجود ہے تو اس پر حج کرنا فرض ہے مکان بنانا ضروری نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ :۔ هو فرض بشرط حرية وبلوغ وعقل وصحة وقدرة و زاد وراحلة وفضلت عن مسكنه ۔ وفي قوله وما لا بد منه اشارة الى ان المسكن لا بد ان يكون محتاجاً اليه لسكنى فلا يثبت الاستطاعة بدار يسكنها وعبد يستخدمه وثياب يلبسها و متاع يحتاج اليه وثبت الاستطاعة بدار يسكنها وعبد لا يستخدمه فعليه ان يحج۔

(البحر الرائق ج۲ ص۳۱۳ کتاب الحج) [۱]

اولاد کا غیر شادی شدہ ہونا وجوبِ حج سے مانع نہیں

سوال: ۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اس سال بمع اہلیہ حج بیت اللہ کا ارادہ کیا ہے لیکن اتفاق سے میرا ایک بالغ لڑکا غیر شادی شدہ ہے کیا بیٹے کا غیر شادی شدہ ہونا عذرِ شرعی بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ بیٹے کا غیر شادی شدہ ہونا عذرِ شرعی نہیں جو وجوبِ حج سے مانع بنے، لہٰذا جب آپ پر حج فرض ہو چکا ہے اور کوئی شرعی مانع نہیں تو جتنا جلد ممکن ہو سکے آپ فریضۂ حج ادا کریں۔

قال العلامة الحصكفيؒ : وفي الاشباه ومع الف وخاف العزوبة ان كان قبل خروج اهل بلدة فله التزوج ولو وقته لزم الحج ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الحج) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ : وان لم يكن له مسكن ولا شئ من ذلك وعنده دراهم تبلغ به الحج وتبلغ الثمن مسكنها وخادم وطعام وقوت وجب عليه الحج وجعلها فى غيره (رد المحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الحج تحت مطلب فی قولهم یقدم حق العبد)

وَمِثْلُهُ فى التاتارخانية ج۲ ص۴۳۳ کتاب الحج، الفصل الاول فى شرائط الوجوب۔

[۲] وفى الهندية: اذا وجد ما يحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج لان الحج فريضة اوجبها الله تعالى على عبده كذا فى التبيين ۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۱۷ کتاب المناسک الباب الاول فى تفسير الحج)

وَمِثْلُهُ فى التاتارخانية ج۲ ص۴۳۳ کتاب الحج، الفصل الاول فى شرائط الوجوب۔

سعودی عرب میں رہ کر بھی حج نہیں کیا تو اب حج فرض ہے یا نہیں

سوال:۔ایک شخص کاروبار کی غرض سے کچھ عرصہ سعودی عرب میں رہا اور چند عمرے بھی کر لیے لیکن کسی وجہ سے سعودی حکومت نے گرفتار کرکے وطن واپس بھیجدیا، کیا اس آدمی پر اب حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔حج کی فرضیت کے لیے استطاعتِ حج ہونا ضروری ہے صرف سعودی عرب جانے سے حج فرض نہیں ہوتا، چونکہ اس شخص نے نہ احرام باندھا ہے اور نہ ایامِ حج تک وہاں رہا ہے لہٰذا اس شخص پر حج فرض نہیں۔

کما ھو فی الھندیۃ: ثمّ ذکرمن شرائط الوجوب الحج عن الزاد والراحلۃ وغیرذلک یعتبر وجودھا وقت خروج اھل بلدہ الی مکۃ۔(الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۲۱۹ الباب الاول فی تفسیر الحج) [۱]

عورت پر حج فرض ہو تو خاوند کی اجازت ضروری نہیں

سوال:۔ایک عورت پر حج فرض تھا اُس نے خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے بھائی کے ہمراہ حج ادا کیا تو کیا اس عورت کا حج صحیح ہُوا یا نہیں؟

الجواب:۔اگر اس عورت پر شرعاً حج فرض تھا تو اس کا بغیر اجازتِ شوہر کے بھائی کے ساتھ حج ادا کرنا صحیح ہے، لیکن اگر نفلی حج ہو تو خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا وجدت محرمًا ولا یأذن لھا زوجھا ان تخرج فلھا ان تخرج بغیراذنہ فی حجۃ الاسلام دون التطوع۔

(الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۱ ص۴۳۵ کتاب الحج، الفصل الاول فی شرائط الوجوب) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وقت خروج اھل بلدھا وکذا سائرالشرائط۔
(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۴۶۵ کتاب الحج)
وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحج۔

[۲] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: واشار بعدم اشتراط رضا الزوج الی انہ لیس لہٗ منعھا عن حجۃ الاسلام واذا وجدت محرما لانہ حقہ لایظھر فی الفرائض بخلاف التطوع۔ (البحرالرائق ج۲ ص۳۱۵ کتاب الحج)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۱۹ کتاب الحج۔الباب الاوّل فی تفسیرالحج.

عورت کا کراچی سے جدہ تک بغیر محرم کے سفر کرنا اور حج محرم کے ساتھ ادا کرنے کا حکم

سوال: اگر ایک آدمی سعودی عرب سے اپنی والدہ کے لیے حج کا داخلہ کرے اور اس کی والدہ کراچی سے جدہ تک بلا محرم سفر کرے اور حج اپنے بیٹے کے ساتھ ادا کرے تو اس کا حج شرعاً ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کے مطابق عورت کا بغرضِ حج کراچی سے جدہ تک بلا محرم سفر کرنا ناجائز ہے تاہم اس کے باوجود حج ادا ہو جائے گا اگرچہ مکروہ ضرور ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: ولو حجت بلا محرم جاز مع الکراھة۔

(الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص ۴۶۵ کتاب الحج) [۱]

عورت کے لیے اس کا بہنوئی محرم نہیں

سوال: میرا خاوند بیمار ہے کیا میں حج کے لیے اپنے بہنوئی کے ساتھ جا سکتی ہوں یا نہیں؟

الجواب: فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے عورت کے ساتھ اس کے محرم کا ہونا لازمی ہے بہنوئی چونکہ شرعاً محرم نہیں اس لیے بہنوئی کے ساتھ فریضۂ حج کے لیے کسی بھی عورت کا جانا درست نہیں، البتہ اگر کوئی عورت بغیر محرم کے حج کے لیے جائے تو ذمہ فارغ ہو جائے گا مگر ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

ومنها المحرم للمرأة شابة کانت عجوزاً إذا کانت بینها وبین مکة ثلاثة ایام ھکذا فی المحیط وان کان اقل من ذٰلك حجت بغیر محرم والمحرم الزوج ومن لا یجوز مناکحتها علی التابید بقرابة اور ضاع او مصاهرة کذا فی الخلاصة۔

(الفتاوٰی الھندیة ج ۱ ص ۲۱۹ الباب الاوّل فی تفسیر الحج) [۲]

---

[۱] وفی الھندیة: ووجود المحرم للمرأة شرط لوجوب الحج ام لاداثه بعضهم جعلوها شرط للوجوب وبعضهم شرط لادائه وهو الصحیح۔ (الفتاوٰی الھندیة ج ۱ ص ۲۱۹ الباب الاوّل فی تفسیر الحج)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱۵ کتاب الحج۔

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: ومع زوج او محرم وفی ردّ المحتار والمحرم من لا یجوز له مناکحتها علی التابید بقرابة او رضاع او صهریة۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۲ ص ۴۶۴ کتاب الحج مطلب فی قولهم یقدم حق العبد)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱۵ کتاب الحج۔

عورت کیلئے خاوند کے بھائی یا بھتیجے کے ساتھ حج کرنے کا حکم

سوال: ۔ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہے، خاوند کی زندگی میں وہ حج ادا کر چکی ہے اب وہ دوبارہ حج کرنا چاہتی ہے تو کیا وہ اپنے خاوند کے بھائی یا بھتیجے کے ساتھ حج کے لیے جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔عورت کے لیے حج پر جانے کے لیے کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے، خاوند کا بھائی اور بھتیجا چونکہ محرم نہیں اس لیے عورت کا ان کے ساتھ حج پر جانا صحیح نہیں۔

ومنها المحرم للمرءة شابة كانت او عجوزًا اذا كانت بينها وبين مكة ثلاثة ايام۔ هكذا في المحيط وان كان اقل من ذلك حجت بغير محرم والمحرم الزوج ومن لا يجوز مناكحتها على التابيد بقرابة او رضاع او مصاهرة كذا في الخلاصة۔

(الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۱۹ الباب الاول في تفسير الحج) ؎۱

عورت غیر محرم ہمسایہ کے ساتھ حج کیلئے نہیں جا سکتی

سوال: ۔کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت حج ادا کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا خاوند، بھائی وغیرہ نہیں ہے، کیا وہ اپنے غیر محرم ہمسایہ کے ساتھ حج کے لیے جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔جب تک اس عورت کے ساتھ اس کا محرم نہ ہو اس وقت تک اس پر حج فرض نہیں اور یہ کسی غیر محرم پڑوسی کے ساتھ حج کے لیے نہیں جا سکتی۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ويعتبر في المرءة ان يكون لها محرم تحج به او زوج ولا يجوز لها ان تحج بغيرهما اذا كان بينها وبين مكة سيرة ثلثة ايام۔ (الهداية ج۱ ص۲۱۳ كتاب الحج) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصكفيؒ: ومع زوج او محرم. وفي ردّ المحتار والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد لقرابة او رضاع او صهرية۔ (الدر المختار على صدر ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۴ كتاب الحج مطلب في قولهم يقدم حق العبد)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۲ ص۳۱۵ كتاب الحج۔

؎۲ قال العلامة الحصكفيؒ: ومع زوج او محرم مع وجوب النفقة لمحرمها عليها الخ لا امرأة (وفي حاشية) والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة او رضاع او صهرية۔ (الدر المختار على صدر ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۴ كتاب الحج)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۲ ص۳۱۵ كتاب الحج۔

عورت کا دیور یا شوہر کے چچا کے ساتھ حج کے لیے جانا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی عورت اپنے دیور یا شوہر کے چچا کے ساتھ حج کے لیے جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کے لیے حالتِ سفر میں محرم یا خاوند کا ساتھ ہونا ضروری ہے، دیور اور شوہر کا چچا محارم نہ ہونے کی وجہ سے عورت شرعاً ان کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی، اس لیے کسی بھی عورت کا اپنے دیور یا شوہر کے چچا کے ساتھ حج پر جانا صحیح نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: ویؤیدہ حدیث صحیحین لایحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تسافر مسیرۃ یوم ولیلۃ الا مع ذی محرم علیھا۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۵ کتاب الحج)[1]

رہن کے پیسوں سے حج کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے اپنی زمین رہن پر دے دی اس مرہونہ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ اس رقم سے حج کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا یہ حج ادا ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ رہن سے انتفاع لینا جائز نہیں، البتہ حج نام ہے ارکانِ حج کی ادائیگی کا، چاہے جس مال بھی ہو، اولیٰ یہی ہے کہ حلال مال سے ہو البتہ حرام مال سے حج کرنے سے بھی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے اس لیے راہن کا رہن کے پیسوں سے حج کرنا جائز ہے۔

وفی الھندیۃ: ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لایقبل الحج بالنفقۃ الحرام مع انہ یسقط الفرض معھا وان کان مغصوبۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۲۰ کتاب المناسک۔ الباب الاول)[2]

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: (تحت ھذہ العبارۃ) ومحرم اوزوج لامرأۃ فی سفر ای ولیشترط محرم الیٰ آخرہ۔ کما فی الصحیحین لا تسافر امرأۃ الا ومعھا محرم وزاد مسلم فی روایۃ اوزوج۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۱۴ کتاب الحج)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۱۸، ۲۱۹ الفصل الاول فی تفسیر الحج۔

[2] قال ابن نجیم المصریؒ: ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لایقبل بالنفقۃ الحرام کما ورد فی الحدیث مع انہ یسقط الفرض۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۰۹ کتاب الحج)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۲ ص۴۵۶ کتاب الحج۔ مطلب فیمن حج بمال الحرام۔

صرف نیت کر لینے سے حج فرض نہیں ہو جاتا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند آدمیوں نے زید سے کہا کہ تم حج کی نیت کرو ہم تم کو حج کے لیے بھیج دیں گے، زید نے حج کی نیت کی مگر انہوں نے زید کو حج کے لیے نہیں بھیجا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا صرف نیت کر لینے سے حج فرض ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صرف نیت کر لینے سے حج فرض نہیں ہوتا جب تک تلبیہ نہ پڑھا ہو، لہٰذا زید پر صرف نیت کر لینے سے حج فرض نہیں ہوا ہے۔

وفی الھندیۃ :۔ ولا یصیر شارعاً بمجرد النیّۃ ما لم یأت بالتلبیۃ او ما یقوم مقامھا۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۲۲ کتاب المناسک۔ الباب الاوّل فی تفسیر الحج) [۱]

خاوند کی اجازت کے بغیر حج کرنا

سوال:۔ عورت پر حج فرض ہونے کے بعد اس کے لیے خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حج ایک عبادت ہے جو مالدار مسلمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے اس کی ادائیگی کیلئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی عورت پر حج فرض ہو جائے تو اس کے لیے خاوند سے اجازت لینا ضروری نہیں اور وہ خاوند کی اجازت کے بغیر بھی حج کر سکتی ہے بشرطیکہ محرم ساتھ ہو۔

وفی الھندیۃ : وعند وجود المحرم کان علیھا ان یحج حجۃ الاسلام وان لم یأذن لھا زوجھا۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۱۹ الباب الاوّل فی تفسیر الحج) [۲]

والدہ کی اجازت کے بغیر نفل حج کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نفلی حج کے لیے جانا چاہتا

---

[۱] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ : ولا یصیر داخلاً فی الاحرام بمجرد النیّۃ ما لم یضم الیہ التلبیۃ او یسوق ھدیاً۔ (الفتاوٰی التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۴۳۹ الفصل الثالث فی تعلیم اعمال الحج)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۲۲ کتاب الحج۔ باب الاحرام۔

[۲] قال الشیخ ابن عابدینؒ : ولیس لزوجھا منعھا عن حجۃ الاسلام (ای اذا کان معھا محرم والا فلہ منعھا۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۴۶۵ کتاب الحج۔ مطلب فی قولھم یقدم حق العبد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۱۵ کتاب الحج۔

ہے لیکن والدہ اجازت نہیں دیتی، تو کیا زید والدہ کی اجازت کے بغیر نفلی حج کے لیے جا سکتا ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری پر بہت زور دیا ہے لہٰذا زید کو نفلی حج ادا کرنے کے لیے والدہ سے اجازت لینا ضروری ہے بغیر اجازت کے جانا کراہت سے خالی نہیں البتہ فرض حج کے لیے والدہ یا کسی اور کی اجازت ضروری نہیں۔

وفی الهندیة: ویکره الخروج الی الحج اذا کره احد ابویه ان کان الولد محتاجاً الی خدمة الولد وان کان مستغنیاً عن خدمته فلا بأس ... الملتقط حج الفرض اولیٰ من طاعة الوالدین وطاعتهما اولیٰ من حج النفل۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۲۱ الباب الاوّل فی تفسیر الحج)[1]

نفلی حج کیلئے خاوند کی اجازت ضروری ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت فرض حج ادا کر چکی ہے، اب وہ نفلی حج ادا کرنا چاہتی ہے، اس عورت کے لیے خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: فرض حج کی ادائیگی کے لیے کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں البتہ عورتوں کیلئے نفلی حج ادا کرنے میں اپنے خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے بشرطیکہ محرم ساتھ ہو، خاوند سے اجازت لیے بغیر عورت کا نفلی حج پر جانا درست نہیں۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا وجدت محرما ولا یأذن لها زوجها ان تخرج فلها ان تخرج بغیر اذنه فی حجة الاسلام دون التطوع۔

(فتاوی تاتارخانیة ج ۲ ص۴۳۵ کتاب الحج الفصل الاوّل فی شرائط الوجوب)[2]

---

[1] قال الشیخ ابن عابدینؒ: (تحت هٰذه العبارة) ممن یجب استیذانه کاحد ابویه المحتاج الیٰ ... آگے فرماتے ہیں: وهٰذا کلهم فی حج الفرض اما حج النفل وطاعة الوالدین ... اولیٰ مطلقاً۔ (رد المحتار ج ۲ ص۴۵۲ کتاب الحج مطلب فیمن حج بمال حرام)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۸ کتاب الحج۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: واشار بعدم اشتراط رضا الزوج الی انه لیس له منعها عن حجة الاسلام واذا وجدت محرماً لانه حقه لایظهر فی الفرائض بخلاف حج التطوع۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۳۱۵ کتاب الحج)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۲۱۹ الباب الاوّل فی تفسیر الحج۔

نفلی حج افضل ہے یا صدقہ | **سوال**:۔ فرض حج ادا کرنے کے بعد نفلی حج کرنا افضل ہے یا اس رقم کو غرباء اور محتاجوں پر خرچ کرنا افضل ہے ؟

الجواب:۔ فرض حج ادا کرنے کے بعد فقراء و مساکین پر مال کو خرچ کرنا نفلی حج سے افضل و بہتر ہے خاص کر جہاں پر فقراء کو ضرورت زیادہ ہو۔

قال الشیخ ابن عابدینؒ: روا فی البزازیۃ افضلیت الحج وحیث قال الصدقۃ افضل من الحج التطوع واذاکان الفقیر مضطراً الخ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۱۶۶ کتاب الحج مطلب فی تفضیل الحج عن الصدقۃ) ؎۱

حائضہ عورت طواف زیارت چھوڑ دے تو کیا حکم ہے ؟ | **سوال**:۔ اگر کسی عورت نے بوجہ حیض طواف زیارت نہ کیا ہو تو کیا اس پر دم لازم ہے ؟ کیا یہ عورت اب حلال ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ طواف زیارت حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے ، اگر حائضہ عورت حالت حیض میں طواف زیارت کرے تو اس پر ایک بدنہ (اونٹ) دم آتا ہے اور اگر طواف زیارت کے بغیر ہی وطن واپس آگئی ہے تو یہ عورت حلال نہ ہو گی بلکہ اُسے دوبارہ مکہ مکرمہ جاکر طواف زیارت کرنا ہوگا۔

قال العلامۃ ابن العلاء الانصاریؒ:۔ اذا ترکھا جمیعا ان کان بمکۃ فانہ یعیدھا وان رجع الی اھلہ فھو محرم من النساء ابداً فیعود الی مکۃ بذلک الاحرام۔

(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۱۸،۵۱۹ الفصل السابع فی الطواف والسعی) ؎۲

❖ ❖ ❖

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قد یقال ان صدقۃ التطوع فی زماننا افضل لما یلزم الحاج غالباً من ارتکاب المحظورات۔ (منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج۲ ص۳۱ کتاب الحج)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۷۲ کتاب الحج۔الفصل العشرون فی المتفرقات۔

؎۲ قال الشیخ ابن عابدینؒ: ویمتد الوقت الی آخر العمر فان اخرہ عنھا ای ایام النحر ولیالیھا منھا کرہ تحریما ووجب الدم ولو لم یطف اصلاً لایحل لہ النساء وان طال ومضت سنون باجماع۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۵۱۸ مطلب فی طواف الزیارۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۴۵ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الرابع۔

زمین حل میں رہنے والے کے لیے طوافِ قدوم کا حکم

سوال:۔ اگر ایک آدمی زمینِ حل میں رہتا ہو تو وہ طوافِ قدوم کرے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ طوافِ قدوم جس کو طوافِ تحیۃ الکعبہ بھی کہا جاتا ہے ہر اُس شخص پر واجب ہے جو حدودِ حرم سے باہر رہتا ہو چونکہ یہ شخص ارضِ حل میں رہتا ہے جو حدودِ حرم سے باہر ہے اس لیے اس شخص کے لیے طوافِ قدوم کرنا ضروری ہے۔

وفی الھندیۃ: وھٰذا الطواف یسمیٰ طواف القدوم والتحیۃ واللقاء ولیس علیٰ اھلِ مکّۃ طواف القدوم کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۲۶ الباب الخامس فی کیفیۃ اداء الحج) [۱]

میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے طوافِ وداع کا حکم

سوال:۔ جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہوں ان لوگوں پر طوافِ وداع واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طوافِ وداع اُن لوگوں پر واجب ہے جو حج کے لیے باہر سے آتے ہوں اور جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہوں اُن پر طوافِ وداع واجب نہیں۔

قال ابن نجیم المصریؒ: واراد باھلِ مکۃ من اتخذ مکۃ اوداخل المواقیت داراً فلا طواف صدر علی من کان داخل المواقیت۔ (البحرالرائق ج۲ ص۳۵۱ باب الاحرام) [۲]

فجر اور عصر کی نماز کے بعد احرام کی نماز کا حکم

سوال:۔ کیا نمازِ فجر اور عصر کے بعد احرام کی دو رکعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نمازِ فجر اور عصر کے بعد مطلقاً نفل پڑھنا جائز نہیں اس لیے نوافل ذوات الاسباب (احرام یا طواف وغیرہ کی نماز) بھی ممنوع ہے۔

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: للآفاقی ای لا غیر فتح فلا یسن للمکی ولا لاھل المواقیت ومن دونھا الی المکۃ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۹۴ کتاب الحج، مطلب فی دخول مکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۲ ص۳۳۲ باب الاحرام۔

[۲] قال ابن عابدینؒ: ثم طواف الصدر (ای الوداع سبعۃ اشواط بلا رمل وسعی وھو واجب الا علی اھل مکۃ ومن فی حکمھم۔ (درالمختار ج۲ ص۵۲۳ مطلب فی طواف الصدر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۳۵ الباب الخامس فی کیفیۃ اداء الحج۔

وفی الهندیة : ویصلی رکعتی الطواف فی وقت یباح له اداء التطوع فیه کذا فی شرح الطحاوی۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۲۶ الباب الخامس فی کیفیة اداء الحج)[1]

مکروہ اوقات میں احرام کی دو رکعت پڑھنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جن اوقات میں احناف کے نزدیک نفل پڑھنا جائز نہیں احرام کی نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں جن اوقات میں مطلقاً نفل نماز پڑھنا جائز نہیں تو انہی اوقات میں نوافل ذوات الاسباب (مثلاً احرام یا طواف وغیرہ کی نماز) بھی پڑھنا ممنوع ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ثم صلی شفعا فی وقت المباح۔ قال ابن عابدینؒ تحت هذه العبارة وفی اطلاقه نظر کما مر فی اوقات الصلوٰة من ان الواجب ولو لغیره کرکعتی الطواف والنذر لا تنعقد فی ثلاثة من الاوقات المنهیة ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۹۹ مطلب فی طواف القدوم)[2]

احرام باندھنے سے قبل غسل کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے حج کے لیے روانگی کے وقت بخار کی وجہ سے احرام باندھنے سے قبل غسل نہیں کیا صرف وضو کرکے احرام باندھ لیا تو کیا اس سے زید کے حج میں کوئی نقص تو نہیں آیا؟ اگر نقص آیا ہو تو زید کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب: احرام باندھنے سے قبل غسل کرنا فرض یا واجب نہیں بلکہ ایک مستحب عمل ہے اگر بغیر غسل کے صرف وضو پر اکتفاء کرکے احرام باندھا جائے تو بھی حج میں کوئی نقص نہیں آتا۔

قال العلامة ابن العلاء الانصاریؒ: ویستحب عن ارادة الاحرام ان یقص شاربه واظفاره

---

[1] قال الشیخ ابن عابدینؒ: ثم صلی شفعا فی وقت مباح۔ قال ابن عابدینؒ تحت هذه العبارة وفی اطلاقه نظر لما مر فی اوقات الصلوٰة من ان الواجب ولو لغیره کرکعتی الطواف والنذر لا تنعقد فی ثلاثة من الاوقات المنهیة ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۹۹ مطلب فی طواف القدوم)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۳۲ کتاب الحج، باب الاحرام۔

[2] لما فی الهندیة: ویصلی رکعتی الطواف فی وقت مباح له اداء التطوع فیه کذا فی شرح الطحاوی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۲۶ الباب الخامس فی کیفیة اداء الحج)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۲ ص۳۳۱ باب الاحرام۔

وفی الینابیع ویحلق عانۃ ۔ ثمّ یغتسل اویتوضاء و فی الکافی فیقوم الوضوء مقام الغسل کما فی العیدین والجمعۃ ۔ والغسل افضل وھٰذا الاغتسال لنظافۃ ولیس بواجب ۔

(الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۴۴۱ الفصل الثالث فی اعمال الحج) ؎۱

احرام کی چادروں کے رنگ کا مسئلہ

سوال:۔ کیا احرام کی چادروں کا رنگ سفید ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ احرام کی چادروں کا رنگ سفید ہونا ضروری نہیں البتہ مستحب یہ ہے کہ احرام سفید رنگ کا ہو۔

قال الحصکفیؒ: ولبس ازار ورداء جدیدین اوغسیلین طاھرین ۔ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ابیض ککفن الکفایۃ وھٰذا بیان السنۃ والا فساتر العورۃ کاف ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۴۸۱ کتاب الحج ، فصل فی الاحرام) ؎۲

تبلیغ پر حج مقدم ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ پر حج فرض ہے لیکن میرا ارادہ ایک سال کے لیے جماعت میں جانے کا ہے، کیا میں پہلے حج کروں یا تبلیغ میں ایک سال لگاؤں ؟

الجواب:۔ جب آپ پر حج فرض ہو چکا ہے تو آپ تمام چیزوں سے حج کو مقدم رکھیں، تبلیغ عذر شرعی نہیں۔ البتہ ایسا کیا جا سکتا ہے کہ کوشش کر کے آپ کسی ایسی جماعت میں تشکیل کرائیں جس میں حج ہو سکتا ہو تو اس طرح ایک ہی سفر میں آپ کے دونوں مقاصد پورے ہو جائیں گے۔

خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا یھا النّاس قد فرض علیکم الحج فحجوا (مشکوٰۃ ج ص۲۲۱ کتاب الحج) ؎۳

؎۱ قال الشیخ ابن الھمامؒ: واخرج ایضاً عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال من السنّۃ ان یغتسل اذا اراد ان یحرم ۔ (فتح القدیر ج۲ ص۴۲۹ باب الاحرام)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۲۲ الباب الثالث فی الاحرام ۔

؎۲ قال ابن نجیمؒ: ومافی الکتاب بیان السنۃ والا فساتر العورۃ کما فی المجمع واشارۃ بتقدیم الجدید الی افضلیۃ وکونہ ابیض افضل ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۲۱ باب الاحرام)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۳۲ الباب الثالث فی الاحرام ۔

؎۳ قال ابن عابدینؒ: الاوّل شروط الوجوب وھی التی اذا وجدت بتمامھا وجب الحج والافلا وھی سبعۃ الاسلام والعلم بالوجوب لمن فی دار الحرب والبلوغ والعقل والحریۃ ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۵۸ مطلب فیمن حج بمال حرام)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۱۶ کتاب المناسک ۔ الباب الاوّل فی تفسیر الحج ۔

بلوغت کے بعد دوبارہ حج کی فرضیت

سوال:۔ میں نے پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ حج کیا تھا جبکہ اب میں بالغ اور صاحبِ استطاعت ہوں، کیا میرے پر اب حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بلوغت سے قبل جو حج کیا جاتا ہے اس سے حج فرض ادا نہیں ہوتا کیونکہ فرض حج کے لیے بالغ ہونا شرط ہے اسلیے سوال مذکور کے مطابق بلوغت کے بعد دوبارہ حج کرنا ضروری ہے۔

عن ابی ظبیان عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ایما صبی حج ثم بلغ الحنث فعلیہ ان یحج حجۃ اخری۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۳۲۵ کتاب الحج) [۱]

فقر کی حالت میں حج کرنے کے بعد غنی ہونے کی صورت میں دوبارہ حج کرنا فرض نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے حالتِ بلوغ اور فقر میں اپنے والد کے مال سے حج کیا ہے جبکہ اب زید خود غنی ہو چکا ہے، کیا اس پر دوبارہ حج کرنا فرض ہے یا پہلے حج سے فرضیت ساقط ہو گئی ہے؟

الجواب:۔ فرضی حج کی ادائیگی کے لیے غناء شرط نہیں، بلوغت کے بعد جب بھی یا جیسے بھی حج ادا کرے تو فرضیت ساقط ہو جائے گی، لہٰذا زید نے جو حج حالتِ فقر میں اپنے والد کے مال سے کیا ہے اُس سے حج فرض ہی ادا ہوا ہے، اب غنی ہونے کے بعد دوبارہ حج کرنا لازمی نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ للآفاقی لا لمکی) ان الفقیر الآفاقی اذا وصل الی المیقات فھو کالمکی فی انہ ان قدر علی المشی لزمہ الحج ولا ینوی النفل علی زعمہ انہ فقیر۔ (رد المحتار ج ۲ ص۴۶۱ کتاب الحج، مطلب فیمن حج بمال حرام) [۲]

---

[۱] لما فی الھندیۃ: ولو ان الصبی اذا حج قبل البلوغ فلا یکون ذلک حجۃ الاسلام ویکون تطوعاً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۱۷ الباب الاول فی تفسیر الحج)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۲ ص۴۳۶ الفصل الحادی عشر فی الاحصار۔

[۲] وفی الھندیۃ: الفقیر اذا حج ماشیا ثم ایسر لاحج علیہ ھٰکذا فی فتاوی قاضی خان۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۱۷ الباب الاول فی تفسیر الحج)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۲ ص۴۳۷ الفصل الثانی عشر فی بیان رکن الحج۔

حج میں تجارت کی وجہ سے ثواب کم نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک آدمی حج کے لیے جاتا ہے لیکن وہ کچھ سامان وغیرہ بھی تجارت کی نیت سے ساتھ لے جاتا ہے، کیا ایسے آدمی کا حج صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حج مخصوص نیت کے ساتھ خاص اوقات میں مخصوص ارکان کے ساتھ مخصوص مقامات کی زیارت کا نام ہے جو کہ اس شخص نے پورا کیا ہے لہٰذا اس کا حج صحیح ہے، تاہم حج میں تجارت کی نیت نہیں کرنی چاہیئے۔

قال ابن نجیمؒ:۔ وتجرید السفر عن التجارة احسن ولو اتجر لا ینقص ثوابه۔
(البحر الرائق ج ۲ ص۳۰۹ کتاب الحج) [1]

۱۰ ذی الحجہ کے بعد آئندہ رات کا حکم

سوال:۔ عام طور پر قربانی سے فارغ ہوتے ہوتے منیٰ میں ہی شام ہو جاتی ہے، اب اگر عشاء کے بعد آدمی طوافِ زیارت کے لیے مکہ مکرمہ جائے تو واپس ہوتے ہوئے فجر ہو جائے گی اور رات کا اکثر حصہ منیٰ سے باہر گذرے گا، تو کیا دس ذی الحجہ کو طوافِ زیارت نہ کرے یا دس ذی الحجہ کو طوافِ زیارت کر کے رات کا اکثر حصہ منیٰ سے باہر مکہ میں گذارے؟ اگر ایسا کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہائے کرام نے ذی الحجہ کے دسویں دن کے بعد آنے والی رات کو بھی دسویں کے حکم میں قرار دیا ہے۔ اور عام فقہاء کرام کی تعبیر بھی یہی ہے کہ طوافِ زیارت کے بعد منیٰ کو واپس چلا جائے، نیز یہ پیشرفت رمی جمار کے لیے ہے اور رمی کا رتبہ طواف کے بعد ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله ولیالیها منها) والمراد بلیلة کل یوم من ایام النحر اللیلة التی تعقب ذلك الیوم کما ان لیلة یوم عرفة اللیلة التی تعقب الوجود قلت وهذا علی اطلاقه ظاهر فی حق الرمی فانه اذا لم یرم نهاراً من النحر یرمی اللیلة التی تعقب فی ذلك۔ (رد المحتار ج ۲ ص۵۱۸ فصل فی الاحرام، مطلب فی طواف الزیارة) [2]

---

[1] لما فی الهندیة: وتجرید السفر عن التجارة احسن ولو اتجر لا ینقص ثوابه کذا فی البحر الرائق۔
(الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۲۲۲ کتاب المناسك۔ الباب الاوّل)

وَمِثْلُهٗ فِی احکام القرآن ج ۲ ص۳۰۹

[2] قال السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله ولیالیها منها)..... والمراد بلیلة کل یوم من ایام النحر اللیلة التی تعقب ذلك الیوم فی الوجود کما ان لیلة یوم عرفة اللیلة التی تعقبه فی الوجود۔ اھ
(الطحطاوی حاشیة الدر المختار ج ۱ ص۵۰۸ کتاب الحج، فصل فی الاحرام)

حائضہ عورت کے لیے حج کرنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک عورت حج کے لیے جائے اور دورانِ حج اسے حیض آجائے تو اس عورت کے لیے کیا حکم ہے؟ اور وہ ارکانِ حج کیسے ادا کرے گی؟

الجواب: حج کے دوران جب کسی عورت کو حیض شروع ہو جائے تو اس کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ طواف وسعی بین الصفا والمروہ کے علاوہ تمام ارکانِ حج ادا کرے گی، مثلاً وقوفِ عرفات ومزدلفہ، رمی جمار و ذبح وغیرہ، اور جب پاک ہو جائے تو پھر طوافِ زیارت وغیرہ کرے گی۔

قال العلامة المرغیناني: اذا حاضت المرأة عند الاحرام اغتسلت واحرمت وصنعت کما یصنع الحاج غیر انها لا تطوف بالبیت حتی تطهر لحدیث عائشة رضی اللہ عنها۔
(الهدایة ج ۱ ص ۲۴۵ کتاب الحج) [۱]

حائضہ عورت پر طوافِ صدر لازمی نہیں

سوال: زید کی زوجہ نے دورانِ حج حیض کی وجہ سے طوافِ صدر چھوڑ دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایامِ حیض کے اندر عورت کے لیے طوافِ کعبہ شرعاً ممنوع ہے، اگر حائضہ طوافِ صدر ترک کردے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال ابن عابدین: فلا یجب علی المکی ولا علی المعتمر مطلقاً وفائت الحج والمحصر والمجنون والصبي والحائض والنفساء کما فی اللباب وغیره۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۵۲۳ مطلب فی طواف الصدر) [۲]

---

[۱] قال ابن العلاء الانصاری: والمرأة اذا حاضت فی الحج ان حاضت قبل ان تحرم وانتهت الی المیقات فانها تغتسل فتحرم فاذا قدمت مکة وهی حائض تصنع کما یصنع الحاج غیر انها لا تطوف بالبیت وتسعی بین الصفا والمروة وتشهد جمیع المناسک۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج ۲ ص ۴۷۱ کتاب الحج)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج ۲ ص ۵۲۸ قبل باب القران)

[۲] قال ابن العلاء الانصاری: وکذلک لیس علی الحائض والنفساء طواف الصدر۔
(الفتاوی التاتارخانیة ج ۲ ص ۵۲۲ الفصل السابع فی الطواف والسعی)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۳۵۱ الباب الاحرام۔

حج میں گرمی کی وجہ سے صرف تہبند پر اکتفاء کرنا

سوال:۔ اگر حج کے ایام میں سخت گرمی ہو اور کوئی حاجی گرمی کی شدت کی وجہ سے احرام کی چادر اتار کر صرف تہبند پر اکتفاء کرے تو کیا اس سے حج متاثر ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ احرام میں سترِ عورت کے لیے تہبند باندھنا فرض ہے، لہٰذا اگر کسی عُذر کی وجہ سے کوئی حاجی چادر اتار کر صرف تہبند پر اکتفاء کرے تو حج پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکن ایستحب لمرید الاحرام......لبس ازار ورداء علی ظهره..... وهذا بیان السنۃ والافستر العورۃ کاف۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۴۸۱ کتاب الحج فصل فی الاحرام) [1]

عورت کی طرف سے مرد کا رمی جمار کرنا

سوال:۔ حج میں رمی جمار کے وقت بہت زیادہ رش ہوتا ہے جس میں عورتیں رمی جمار نہیں کر سکتیں، تو اگر مرد ان کی طرف سے رمی جمار کریں تو کیا اس سے دم لازم ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ رمی جمار واجباتِ حج میں داخل ہے، اگر کسی شرعی عذر کی وجہ سے واجب ترک کیا جائے تو ترک کرنے والے پر دم لازم نہیں ہوتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں عورت پر دم واجب نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: اما اذا ترک واجب لعذر فانہ لاشئ علیہ۔

(البحرالرائق ج ۲ ص۲۳ فصل فی الجنایات) [2]

رمی جمرات کیلئے حاجی کنکریاں کہاں سے لے؟

سوال:۔ اگر کوئی شخص شیطان کو مارنے کے لیے کنکریاں وہیں سے اٹھائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ رمی جمار یعنی شیاطین کو مارنے کے لیے کنکریاں مزدلفہ یا راستے

---

[1] قال العلامۃ المفتی عزیز الرحمٰنؒ: ہر وقت اوڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، پسینہ وغیرہ کی ضرورت سے علیٰحدہ کی جا سکتی ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۶ ص۵۵۲ تیسرا باب احرام)

[2] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لو ترک شیئاً من الواجبات بعذر لا شئ علیہ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۷۵ کتاب الحج، باب الجنایات)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۱۳۴ فصل فی بیان واجبات الحج۔

سے اٹھاکر ساتھ لائے اُسی جگہ (یعنی جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں) سے نہ لے تاہم اگر وہیں سے اٹھا کر رمی جمار کرے تو ایسا عمل مکروہ تنزیہی ہے۔

وفی الهندیة : ویستحب ان یأخذ حصی الجمار من المزدلفة من الطریق ولا یرمی بحصاة اخذها من عند الجمرة فان رمی بها جاز وقد اساء۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۲۱۸ کتاب الحج)[1]

عرفات میں نمازِ مغرب پڑھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص عرفات میں مغرب کی نماز پڑھ کر مزدلفہ چلا جائے اور عشاء کی نماز وہاں ادا کرے تو کیا اس شخص کی نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- حج میں عرفات کے بعد مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں ادا کرنا لازمی ہے اگر کوئی شخص مغرب کی نماز عرفات کے میدان کے راستے میں ادا کرے تو نماز کا اعادہ لازمی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : ولو صلی المغرب والعشاء فی الطریق اوفی عرفات اعاده۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۵۰۹ کتاب الحج، مطلب فی اجابة الدعاء)[2]

عرفات میں جمع تاخیر کی صورت میں ظہر اور عصر ایک ساتھ پڑھنے کا حکم

سوال:- اگر عرفات میں امام حج کی نماز پڑھانے کے بعد چند آدمی اکٹھے ہوکر جمع تقدیم یعنی ظہر اور عصر کی نماز باجماعت پڑھنا چاہیں تو کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- احناف کے ہاں عرفات کے میدان میں جمع تقدیم کے لیے چند شرائط کا ہونا ضروری ہے: (۱) احرام (۲) عرفات کا میدان (۳) عرفہ کا دن (۴) امام اعظم یا ان کا نائب۔ ان شرائط میں سے اگر ایک بھی نہ پائی جائے تو نماز صحیح نہیں ہوگی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نماز درست نہیں ہے، البتہ اگر اپنے اپنے اوقات میں اکیلے پڑھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : وشرط لصحة هذا الجمع الامام الاعظم

---

[1] قال العلامة حسن بن عمار الشرنبلالیؒ : ویستحب اخذ الجمار من المزدلفة او من الطریق ویکره من الذی عند الجمرة۔ (مراقی الفلاح علی صدر الطحطاوی ص۴۰۵ فصل فی کیفیة افعال الحج)

[2] وفی الهندیة : ولو صلی المغرب بعد غروب الشمس قبل ان یأتی المزدلفة فعلیه ان یعیدها اذا أتی مزدلفة فی قول ابی حنیفةؒ ومحمدؒ الخ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۳۰ فصل فی کیفیة اداء الحج)

اونائبہ والاصلوا وحدانًا۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۵۰۲ کتاب الحج مطلب فی شروط الجمع بین الصلوتین)[1]

مُزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز جمع تاخیر میں پڑھنا

سوال:۔ عرفات سے مُزدلفہ جانے کے بعد اگر چند لوگ اکٹھے ہوکر مغرب اور عشاء کی نماز ایک وقت جمع تاخیر کے ساتھ پڑھیں تو کیا ان کی یہ جمع بین الصلوتین صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں عرفات میں جمع تقدیم کے اندر امام کا ہونا ضروری ہے مگر مُزدلفہ میں یہ شرط نہیں ہے، اس لیے اگر چند آدمی اکٹھے ہوکر مُزدلفہ میں جمع بین الصلوتین یعنی مغرب اور عشاء کی نماز ایک وقت میں پڑھیں تو جائز اور صحیح ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کمالا احتیاج ھٰھُنا للامام ۔ قال ابن عابدینؒ: وشرائط ھٰذا الجمع حرام بالحج وتقدیم الوقوف علیہ الزمان والمکان والوقت الخ (رد المختار ج۲ ص۵۰۹ کتاب الحج مطلب فی اجابۃ الدعاء)[2]

میلے احرام کو تبدیل کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کا احرام بہت گندا ہو جائے تو کیا وہ احرام بدل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حج میں احرام باندھنا ضروری امر ہے چاہے ایک ہی احرام باندھ کر حج ادا کرے یا تبدیل کرکے مناسکِ حج ادا کرتا رہے، اس تبدیلیٔ احرام کی وجہ سے حج پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

تلبیہ جہراً پڑھے یا سراً، کیا مرد اور عورت دونوں اس میں یکساں ہیں؟

سوال:۔ کیا عمرہ یا حج کی نیت کرنے اور احرام باندھنے کے بعد تلبیہ بآوازِ بلند پڑھا جائے یا کہ آہستہ؟ کیا تلبیہ کا یہ حکم مرد و عورت دونوں کے لیے ایک ہی ہے یا الگ الگ؟

---

[1] وفی الہندیۃ: ومنہا ان یکون الامام ھو الامام الاعظم اونائبہ وھو شرط عند ابی حنیفۃؒ فلوصلی الظھر بجماعۃ لا مع الامام والعصر مع الامام لم یجز العصر عند ابی حنیفۃؒ والصحیح قولہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۲۸ فصل فی کیفیۃ اداء الحج)

[2] قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: اس سے معلوم ہوا کہ جمع میں امام الحج شرط نہیں، پس اگر فرادیٰ پڑھیں یا چند آدمی جمع ہوکر جماعت سے پڑھیں ہر طرح صحیح ہے۔ (امداد الفتاوی ج۲ ص۱۷۰ کتاب الحج)

الجواب:- حج یا عمرہ کی نیت کرنے اور احرام باندھنے کے بعد بلند آواز سے تلبیہ پڑھا جائے لیکن زیادہ چیخنے چلانے (جہر مفرط) کی بجائے اعتدال یعنی درمیانی آواز سے تلبیہ پڑھا جائے، البتہ عورت اس انداز سے تلبیہ پڑھے کہ خود سن سکے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ:- ويرفع صوته بالتلبية لقوله عليه السلام افضل الحج العج والثج فالعج رفع الصوت بالتلبية - قال ابن همام ؒ: قوله ويرفع صوته بالتلبية وهو سنة فان تركه كان مسيئاً ولا شئ عليه ولا يبالغ فيه فيجهد نفسه۔ (فتح القدير ج۲ ص۳۵۵ باب الاحرام) [۱]

احرام باندھنے سے قبل ناخن وغیرہ کاٹنا

سوال:- کیا احرام باندھنے سے قبل ناخن کاٹنا، مونچھیں اور دیگر غیر ضروری بال صاف کرنا لازمی ہے یا نہیں؟

الجواب:- ایسا کرنا لازمی تو نہیں البتہ مستحب یہ ہے کہ احرام باندھنے سے قبل ناخن کاٹ لیے جائیں، مونچھیں اور دیگر غیر ضروری بال صاف کر لینے چاہئیں اور اس کے بعد وضو یا غسل کر کے احرام باندھا جائے۔

قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلي رحمه الله: واذا اراد ان يحرم يستحب له ان يقلم اظفاره ويقص شاربه ويحلق عانته وهو المتوارث لانه انظف للبدن فكان احسن ثم يتوضأ او يغسل وهو افضل۔
(الاختيار لتعليل المختار ج۱ ص۱۴۳ كتاب الحج) [۲]

---

[۱] قال العلامة عثمان الزيلعي رحمه الله:- قال النخعي كان السلف يستحبون التلبية في هذه الاحوال ولان التلبية في الحج بمنزلة التكبير في الصلوة اوّل لها شرط وباقيها سنة فيأتي بها عند الانتقال من حال الى حال ويرفع بها صوته۔ اھ
(تبيين الحقائق ج۲ ص۱۴ باب الاحرام)

[۲] قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: وكذا يستحب لمريد الاحرام ازالة ظفره وشاربه وعانته وحلق رأسه ان اعتاده والافيسرحه اھ
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۱۸۱ كتاب الحج)

قصر کی مقدار کا مسئلہ

سوال:۔ حج کے دوران سر کے بال کٹوانے کی مقدار کتنی ہے؟

الجواب:۔ حج اور عمرہ کے احرام سے نکلنے کے لیے حلق وقصر دونوں جائز ہیں البتہ حلق افضل ہے اور عورت کے لیے حلق نہیں بلکہ مرد اور عورت کے لیے ایک بند انگشت کی مقدار تمام سر سے بال کتروانا ضروری ہے، اور اس طریقہ کو قصر کہتے ہیں۔

قال العلامة ابن العلاء الانصاریؒ: اما المرأة فلا علیها ولکنها تقصر باخذ شئ من اطراف الشعر مقدار انملہ والافضل لہا ان تقصر من کل شعرۃ مقدار انملہ وان قصرت بعض رأسها وترکت البعض اجزاها اذا کانت ما قصرت مقدار ربع رأس فصاعداً وان کان اقل من ذلك لا یجزیها اعتباراً لتقصیر فی حقها بالحلق وفی حق الرجال۔

(الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۴۷۳ الفصل الرابع عشر فی الحلق والقصر)[1]

حج اور نکاح کی تقدیم وتاخیر کا مسئلہ

سوال:۔ ایک آدمی کے پاس اتنا مال ہے کہ وہ حج کے لیے جاسکتا ہے مگر وہ شادی کا بھی خواہشمند ہے، تو کیا یہ شخص پہلے شادی کرے یا حج کے لیے جائے، شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر موصوف اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکتا ہو اور زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے لیے حج کی ادائیگی شادی پر مقدم ہے، اور اگر کسی فتنے میں مبتلا ہونے کا خوف قوی ہو تو پھر اس کیلئے شادی کرنا حج پر مقدم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قوله فی الاشباہ) المسئلة منقولة عن ابی حنیفةؒ فی تقدیم الحج علی التزویج ..... ولذا اعترضه ابن کمال باشا فی شرحه الهدایة بانه حال التوقان مقدم علی الحج اتفاقاً لان فی ترکه امرین ترك الفرض والوقوع علی الزنا وجواب ابی حنیفةؒ فی غیر حال التوقان۔

(رد المحتار ج۲ ص۱۹۷ کتاب الحج)

---

[1] قال صاحب البحرؒ: والمراد بالتقصیر ان یأخذ الرجل او المرأة من رؤس اشعر ربع رأس مقدار انملہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۴۶ باب الاحرام)

ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۳۱ الباب الثالث فی الاحرام۔

استفتاء

حج کے متعلق چند سوالات

اور

اُن کے جوابات

ہم چند خادمانِ حرم شریف کو چند مسائل کے بارے میں کافی تشویش ہے، امید ہے کہ آنجناب ان سوالات کے جوابات تفصیل سے ارسال فرمائیں گے ۔

(۱) تقریباً سات سو افراد نے (جو کہ سعودی عرب جا رہے تھے) اسلام آباد سے احرام نہیں باندھا کیونکہ کمپنی والوں نے احرام باندھنے کی اجازت نہیں دی، کمپنی والوں نے تیسرے دن ہمیں عمرہ کی اجازت دیدی، چونکہ اس میں ہمارا اپنا اختیار نہیں تھا، تو کیا ہم پر دم واجب ہے یا نہیں؟

(۲) کمپنی والے ہمیں مدینہ منورہ زیارت کے لیے لے گئے واپسی پر ہم نے احرام باندھا اور عمرہ ادا کیا، یہ حج افراد ہے یا تمتع؟ عمرہ شوال میں ادا کیا ۔

(۳) بعض افراد نے احرام نہیں باندھا اور مدینہ منورہ سے شوال میں واپسی عمرہ نہیں کیا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہم نے احرام باندھ لیا تو ہم پر قربانی واجب ہوگی ۔ تو کیا ان افراد پر دم واجب ہو گیا ہے یا نہیں؟

(۴) جن لوگوں نے مدینہ منورہ سے واپسی پر عمرہ کیا تو ان کا کون سا حج ہوگا اور جن لوگوں نے احرام باندھا ہی نہیں تو ان پر کون سا حج واجب ہوگا؟

(۵) کیا ہم خادمانِ حرم شریف پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم یہاں صرف چار ماہ کے لیے آئے ہیں ۔

(۶) اگر کسی پر دم واجب ہو گیا اور وہ غریب ہے تو وہ متبادل مسئلے کے مطابق کیا کرے گا؟

(۷) اے (A) شفٹ والے صبح چھ بجے سے لے کر ڈھائی بجے تک حرم شریف میں ڈیوٹی کرتے ہیں، وہ کس طریقے سے حج کر سکتے ہیں؟

بی (B) شفٹ ڈھائی بجے دن سے لے کر رات ساڑھے دس بجے تک ہوتی ہے، وہ کس

طریقے سے حج کر سکتے ہیں ؟

سی (ج) شفٹ رات ساڑھے دس بجے سے لے کر صبح چھ بجے تک ہوتی ہے، اس شفٹ والے کس طریقے سے حج کر سکتے ہیں ؟

الجواب (۱) بغیر احرام کے دخولِ حرم سخت گناہ ہے اور ایسی صورت میں توبہ اور آفاق کی کسی میقات پر واپس جاکر حج یا عمرہ کا احرام باندھنا واجب ہے، اگر واپس نہ ہوا اور وہیں سے احرام باندھا تو گنہگار ہوگا اور دم واجب ہوگا۔ البتہ اگر اسی سال آفاق کی کسی بھی میقات پر جاکر حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا یا حرم میں احرام باندھ لیا مگر طواف کا ایک شوط پورا کرنے سے قبل کسی میقات پر جاکر تلبیہ کہہ کر حج یا عمرہ کر لیا تو دم ساقط ہو جائے گا۔ اس حج یا عمرہ میں بدون احرام تجاوز کی وجہ سے واجب کی ادائیگی کی نیت ضروری نہیں بلکہ حج یا عمرہ نفل یا نذر یا حج فرض، جو نیت بھی کرے گا اس سے بدون احرام تجاوز کے واجب ادا ہو جائے گا اور اگر اس سال آفاق کی کسی میقات سے حج یا عمرہ نہیں کیا بلکہ دوسرے سال کیا تو دم ساقط نہ ہوگا البتہ تجاوز کی وجہ سے جو نسک واجب ہوا تھا وہ ادا ہو جائے گا اگرچہ نفل یا نذر یا فرض کی نیت کی ہو۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے: ولو دخل آفاقی مکۃ بغیر احرام ثم رجع الی المیقات فی تلک السنۃ واحرم بحجۃ الاسلام سقط عنہ ما کان واجبا بالمجاوزۃ ودخول مکۃ بغیر احرام عند نا وان لم یخرج من مکۃ حتی مضت السنۃ ثم خرج الی المیقات فی السنۃ الثانیۃ واحرم بحجۃ الاسلام وحج یجزیہ حجۃ الاسلام ولا یسقط عنہ الدم الذی کان واجبا علیہ فی العام الاول۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۱ ص ۲۸۷)

اور ھدایہ میں ہے: واذا اتی الکوفی بستان بنی عامر فاحرم بعمرۃ فان رجع الی ذات عرق ولبی بطل عنہ دم الوقت۔ وفی ھامشہ قولہ الی ذات عرق التخصیص بہ بالنظر الی حال الکوفی والا فالرجوع الیہ والی غیرہ من مواقیت الآفاقیین سواء فی سقوط الدم فی ظاھر الروایۃ۔ (ج ۱ ص ۲۶۸ باب مجاوزۃ الوقت بغیر احرام)

اور مواقیت الآفاق یہ ہیں: ذوالحلیفہ، ذات عرق، جحفہ، قرن، یلملم۔

یہ ہیں آفاقی کے مواقیت، اور میقاتی کا میقات وہ زمین حل ہے جو حرم اور میقات کے درمیان ہو، اور مکی کا میقات حج کے لیے حرم ہے اور عمرہ کیلئے زمین حل۔ (فتاویٰ علائیہ ج ۲ ص ۱۶۵ تا ۱۶۹)

اور عذر من جہت العباد مسقطِ دم نہیں ہے۔

اور مسائلِ حج لسیدی مولانا المفتی الاعظم مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ میں ہے کہ:۔

مسئلہ: اگر ایک محرم میقات سے احرام کی نیت نہ کرے اور اس سے آگے دوسرا میقات ہو تو دوسرے میقات سے احرام باندھے گا اور اگر دوسرا میقات نہ ہو اور احرام باندھ لیا تو طواف شروع کرنے سے پہلے ایک میقات کی طرف واپس لوٹے گا، اگر واپس نہ ہوا تو دم واجب ہے۔ (شرح لباب وغیرہ / مسائلِ حج پشتو ص ۹۳)

فائدہ: ایسا ڈرائیور یا ملازم جو خارج میقات سے حرم یا مکہ مکرمہ کو کثرت سے جایا کرتا ہے تو اس کے لیے ہر بار عمرہ کرنا ضروری ہے، اور جتنی دفعہ بغیر احرام کے ارضِ حرم یا مکہ مکرمہ میں داخل ہوا اتنی دفعہ عمرے اور دم اس پر واجب ہوئے۔

اور صدر الشریعہ اور صاحبِ دُرر اور صاحبِ ایضاح فرماتے ہیں کہ جس آدمی کا حج یا عمرے کا ارادہ نہ ہو تو وہ زمینِ حرم اور مکہ معظمہ بغیر احرام کے آمد و رفت کر سکتا ہے، لیکن محققین احناف نے ان کی تغلیط کی ہے۔ (شرح لباب وغیرہ)

(۲) ھندیہ میں ہے: ولو احرم لعمرۃ قبل اشھر الحج فقضاھا وتحلل بمکۃ فاحرم بعمرۃ ثم حج من عامہ ذلک لم یکن متمتعا فان کان حین فرغ من الاولی خرج فجاوز المیقات قبل اشھر الحج فاھل منہ لعمرۃ فی اشھر الحج وحج من عامہ فھو متمتع وان کان جاوز المیقات فی اشھر الحج لم یکن متمتعاً الا اذا خرج الی اھلہ ثم اعتمر ثم حج من عامہ عند ابی حنیفۃ وعندھما ھو متمتع جاوز المیقات قبل اشھر الحج او بعدہ ھکذا فی محیط سرخسی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۴۰ باب العمرۃ۔ کتاب الحج)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ خدام مکہ مکرمہ میں قیام اور عمرہ کی ادائیگی کی صورت میں اگر مدینہ منورہ کو شوال سے پہلے چلے گئے ہوں اور شوال (یعنی اشہر حج) میں مدینہ منورہ سے عمرہ ادا کیا ہو اور پھر اسی سال آپ لوگ حج بھی ادا کریں تو پھر تمہارا حج حج تمتع ہو گا اور اگر آپ لوگ شوال ہی میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ چلے گئے ہوں اور مدینہ منورہ سے شوال میں عمرہ کر چکے ہوں اور پھر حج بھی کریں تو آپ لوگ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق متمتع نہ ہوں گے اور امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ کے مذہب کے مطابق متمتع ہوں گے۔

(۳) جن حضرات نے شوال میں مدینہ منورہ سے عمرہ کیا ہے وہ سوالِ ثانی کا جواب ملاحظہ کریں اور جنہوں نے مدینہ منورہ سے عمرہ نہیں کیا ہے اور بغیر احرام کے مکہ مکرمہ آئے ہیں وہ سوالِ اول کا جواب ملاحظہ کریں۔

(۴) جن لوگوں نے شوال سے پہلے مدینہ منورہ جاکر وہاں سے شوال یعنی اشہرِ حج میں عمرہ کیا ہے اور اس سال حج بھی کرلیں تو ان کا حج بالاتفاق تمتع ہے اور شوال یعنی اشہرِ حج میں مدینہ طیبہ جاکر مدینہ طیبہ سے اشہرِ حج میں عمرہ کیا گیا ہو اور پھر حج کیا جائے تو یہ حج حجِ تمتع نہ ہوگا، اور یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اور مذہب ہے، اور امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک یہ حج بھی حجِ تمتع ہے اور جو لوگ مدینہ منورہ سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ آئے ہیں ان کا حج حجِ تمتع نہیں، البتہ ان کے ذمہ سابقہ تفصیل کے مطابق میقات سے بغیر احرام کے تجاوز کی وجہ سے دم لازم آئے گا، اور اس صورت میں بھی اگر اشہرِ حج سے پہلے آفاق کی کسی میقات سے تجاوز کیا جائے اور پھر اسی میقات سے اشہرِ حج میں عمرہ کیا جائے اور اسی سال میں حج بھی کیا جائے تو یہ بھی بالاتفاق تمتع حجِ تمتع ہوگا، اور اگر اشہرِ حج میں تجاوز کیا گیا ہو اور اسی میقات سے عمرہ کیا جائے اور اسی سال میں حج بھی کیا جائے تو یہ حج امام صاحبؒ کے نزدیک تمتع نہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک تمتع ہے ۔۔۔۔

اب ملاحظہ ہو ھندیہ کی وہ عبارت جو جوابِ ثانی کی ابتداء میں درج کی گئی ہے اور تمتع کی تعریف بھی ملاحظہ ہو اور وہ یہ ہے: والمتمتع من یاتی بافعال العمرۃ فی اشھر الحج او یطوف اکثر طوافھا فی اشھر الحج ویحج من عامہ ذلک قبل ان یلم باھلہ بینھما المامًا صحیحًا سواء حل من احرامہ الاول اولا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۳۸) نیز "غنیۃ المناسک" کی یہ عبارت ملاحظہ ہو: التاسع ان لا یدخل علیہ اشھر الحج وھو حلال بمکۃ اوماحولھا او محرم طاف لعمرتہ اکثرہ قبلھا حتی لو احرم بعمرۃ اخری وحج من عامہ لا یکون متمتعا الا ان یعود الی اھلہ فیحرم بھا فیکون متمتعا اتفاقًا او الی خارج المیقات فیکون متمتعًا عندھما۔ (غنیۃ المناسک ص۱۱۴)

(۵) ہندیہ میں ہے: ولا یجب علی المسافر ولا علی الحاج اذا کان محرمًا وان کان من اھل مکۃ، کذا فی شرح الطحاوی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۲۹۳)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ وہ حاجی جو حج کے احرام میں ہو اس پر قربانی واجب نہیں اگرچہ مکہ میں مقیم ہو، اور دوسرا قول اس مسئلہ مذکورہ کی مخالفت میں یہ ہے کہ منیٰ اور مکہ میں مقیم پر

قربانی واجب ہے اگرچہ وہ حج کے احرام میں ہو۔

فتاوی علائیہ میں ہے: (فتجب ای التضحیۃ) علی حر مقیم فلا تجب علی حاج مسافر فاما اھل مکۃ فتلزمھم وان حجوا وقیل لا تلزم المحرم۔ سراج وفی رد المحتار قولہ وقیل لا تلزم المحرم وان کان من اھل مکۃ جوھرۃ عن الخجندی وحملہ فی الشرنبلالیۃ علی المسافر وفیہ نظر ظاھر۔ (فتاوی علائیہ ج ۵ ص ۲۲۲)

(۵) مگر میرے شیخ اور مربی سیدی حضرت مفتی اعظم مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم قولِ اول کو پسند فرمایا کرتے ہیں۔

(۶) ردالمحتار میں ہے: تحت شرح قول صاحب الدرالمختار: الواجب دم علی محرم بالغ۔ الخ

(تنبیہ) فی شرح النقایۃ للقاری ثم الکفارات کلھا واجبۃ علی التراخی فیکون مؤدیا فی ای وقت وانما یتضیق علیہ الوجوب فی آخر عمرہ فی وقت یغلب علی ظنہ انہ لو لم یودہ لفات فان لم یودفیہ حتی مات اثم وعلیہ الوصیۃ ولو لم یوص لم یجب علی الورثۃ ولو تبرعوا عنہ جاز الا الصوم۔ وفیہ ایضاً (قولہ ولو ناسیاً) قال فی اللباب ثم لا فرق فی وجوب الجزاء بینما اذا جنی عامدا او خاطئا مبتدئاً او عائداً ذاکراً او ناسیاً عالماً او جاھلاً طایعاً او مکرھا نائماً او منتبھاً سکرانا او صاحیا مغمی علیہ او مفیقا موسراً او معسراً بمباشرتہ او مباشرۃ غیرہ بامرہ۔ (ج ۲ ص ۲۱۷ باب الجنایات۔ کتاب الحج)

ان عبارات وروایات سے معلوم ہوا کہ غریب کے لیے بھی دم دینا ضروری ہے، البتہ دم دینے میں اتنی سہولت ہے کہ علی الفور ضروری نہیں بلکہ اگر موت سے پہلے پہلے دے دیا تو بھی اس سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

(۷) یہ تو آپ اور کمپنی والوں پر منحصر ہے کہ کمپنی والے آپ لوگوں کی اتنی رعایت تو کریں کہ آپ لوگ کم از کم ضروریاتِ حج تو ادا کر سکیں۔

(ھوالموفق)

✲ ✲

باب التمتع والقران

(حج قران وتمتع کے مسائل واحکام)

حج تمتع میں قربانی نہ کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے حج تمتع کے ارادہ سے سفر کیا لیکن بعض اعذار کی وجہ سے قربانی نہ کرسکا، اب اس قربانی کا نقصان مکہ مکرمہ ہی میں قربانی کرنے سے پورا ہوگا یا اپنے وطن میں بھی قربانی کرسکتا ہے۔

الجواب: متمتع پر چونکہ قربانی کرنا واجب ہے اور اگر کسی شرعی عذر کی بناء پر قربانی نہ کرسکا تو حج کے بعد اس شخص کو دو قربانیاں کرنی ہوں گی اور دونوں قربانیاں مکہ مکرمہ میں ہی کرنی ہیں اصالتاً کرے یا وکالتاً، چاہے جن ایام میں ہو۔

قال ابن نجیم المصریؒ: فلو لم یقدر علی الهدی تحلل وعلیه دمان دم التمتع ودم التحلل قبل الهدی۔ (البحرالرائق ج۲ ص۳۶۱ باب القران) [1]

متمتع اور قارن کا قربانی سے پہلے حلق کرنا

سوال: متمتع یا قارن اگر قربانی سے پہلے حلق کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: اگر مفرد بالحج ہو تو دم واجب نہیں کیونکہ جنایت نہیں ہوا، اور اگر متمتع یا قارن ہو تو قربانی سے قبل حلق کرنے سے دم واجب ہوا اور اس پر زمین حرم میں ہی قربانی کرنی پڑے گی۔

قال ابن نجیمؒ: فان حلق القارن قبل ان یذبح فعلیه دمان عند ابی حنیفةؒ دم بالحلق فی غیر اوانه لان اوانه بعد الذبح ودم بتاخیر الذبح عن الحلق وعندهما یجب علیه دم واحد هو الاول۔ (البحرالرائق ج۲ ص۳۶۱ باب القران) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: فلو لم یقدر تحلل وعلیه دمان۔ قال ابن عابدینؒ: فی قوله دمان دم التمتع ودم التحلل قبل اوانه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۵۳۳ کتاب الحج، باب القران)

وَمِثْلُهُ فی الهدایة ج۲ ص۲۲۰ باب القران۔

[2] لما قال ابن همامؒ: قال محمدؒ فی الروایة دم للقران ودم للحلق قبل ان یذبح الا تری ان المفرد لو حلق قبل ان یذبح لم یلزمه شیٔ بالاتفاق لعدم استلزامه لتاخیر الواجب۔ (فتح القدیر ج۲ ص۴۲۳ باب الجنایات)

وَمِثْلُهُ فی رد المحتار ج۲ ص۵۵۵ باب الجنایات۔

حج قِران و تمتع کی تعریف

سوال: زید نے اگر سفرِ حج میں عُمر کی طرف سے عمرہ ادا کیا تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہے تو کیا زید حج ادا کرنے تک احرام میں رہے گا یا اس سے پہلے بھی حلال ہو سکتا ہے؟

الجواب: زید نے اگر عمرے کا ثواب عمر کو بخش دیا تو صحیح ہے اور اشہرِ حج میں عمرہ کر کے احرام سے نکلنے کے بعد حج کے لیے دوبارہ احرام باندھے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ شخص متمتع کہلاتا ہے اور اگر یہ دونوں ایک احرام سے کرے تو قِران ہے اور اس پر دمِ شکر واجب ہوگا۔

کما فی الھندیۃ: ھو ان یجمع بین احرامی الحج والعُمرۃ من المیقات او قبلہ فی اشھر الحج او قبلھا۔ ھٰکذا فی معراج الدرایۃ والمتمتع من یأتی باعمال العُمرۃ فی اشھر الحج او یطوف اکثر طوافھا فی اشھر الحج ثم یحرم بالحج ویحج من عامہ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۲۳۷ الباب السابع فی القران والتمتع)[۱]

متمتع کے لیے عمرہ کرنے کے بعد حج کا احرام باندھنے کی جگہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متمتع عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام کہاں سے باندھے گا؟

الجواب: متمتع جب عمرہ سے فارغ ہو کر حلال ہو جائے تو جب حج کے لیے احرام باندھنے کا ارادہ کرے تو مکہ مکرمہ اور تمام زمینِ حرم سے احرام باندھ سکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: قال فی اللباب والافضل ان یحرم من المسجد ویجوز من جمیع الحرم ومن مکّۃ افضل من خارجھا۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۲ ص۵۳۷ باب التمتع)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن العلاء الانصاریؒ:۔ والقارن ھو الجامع بین الحج والعُمرۃ سواء احرم بھما معًا او احرم بالحجۃ واضاف الیھا العُمرۃ وعلیہ دم الشکر لما انعم اللّٰہ علیہ من التوفیق للحج بین العبادتین بسفر واحد۔ (الفتاوٰی التاتارخانیۃ ج ۱ ص۵۲۶ الفصل التاسع فی القارن)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۵۷ باب القران۔

[۲] قال الشیخ ابن الھمامؒ: فاذا کان یوم الترویۃ احرم بالحج من المسجد۔ ھدایۃ وفی فتح القدیر والمسجد لیس بلازم بل ھو افضل ومکۃ افضل من غیرھا من الحرم۔

(فتح القدیر ج ۲ ص۴۲۳ باب التمتع)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۳۶۳ باب التمتع۔

حج تمتع کرنے والے کے لیے عمرہ کے بعد احرام کھولنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پاکستان سے کچھ حجاج کرام حج تمتع کے ارادہ سے شعبان میں مکہ مکرمہ گئے اور عمرہ کرنے کے بعد حلال ہو گئے، رمضان کا مہینہ انہوں نے بیت اللہ ہی میں گذارا، شوال کے مہینے میں زیارتِ نبوی کے ارادے سے مدینہ منورہ چلے گئے، واپسی پر پھر عمرہ کا احرام باندھا، تو اب عمرہ کرنے کے بعد انہیں احرام کھولنے کی اجازت ہے یا نہیں یا حج تک وہ اسی احرام میں رہیں گے؟

الجواب:۔ مدینہ منورہ سے واپسی پر اگر کوئی شخص حج تمتع کا ارادہ رکھتا ہو تو ذوالحلیفہ والے احرام سے عمرہ کرکے بعد میں احرام کھول دے اور اس کے بعد حج کے لیے احرام باندھے جو کہ واجب ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ: ولم یقید احرامھا باشھر الحج لانہ لیس بشرط لکن اداء اکثر طوافھا فیھا شرط فلو طاف الاقل فی رمضان مثلاً ثم طاف الباقی فی الشوال ثم حج من عامہ کان متمتعا۔ (البحرالرائق ج۲ ص۲۶۲ کتاب الحج) [1]

میقات میں رہنے والے کیلئے حج تمتع اور قران کا حکم

سوال:۔ جو شخص میقات کے اندر رہتا ہو وہ حج تمتع اور قران کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قران اور تمتع ہر اُس شخص کے لیے ہے جو میقات سے باہر رہتا ہو، لہٰذا جو شخص میقات کے اندر رہتا ہو وہ تمتع اور قران نہیں کرسکتا وہ صرف حج یا صرف عمرہ کرے گا۔

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: والمکی ومن فی حکمہ ای من اھل داخل المواقیت یفرد فقط ولو قران او تمتع جاز واساء وعلیہ دم جبر۔ (تنویرالابصار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۵۳۹ باب التمتع) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: ولیس من شرائط التمتع وجود الاحرام بالعُمرۃ فی اشھرالحج بل اداؤھا فیھا او اداء اکثر طوافھا۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۲۳۸ الباب السابع فی القِران والتمتع)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۳۱ الفصل العاشر فی التمتع۔

[2] وفی الھندیۃ: ولیس لاھل مکۃ تمتع ولا قِران وانّما لھم الافراد خاصۃ۔ کذا فی الھدایۃ وکذلک اھل المواقیت۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۲۳۹ الباب السابع فی القِران والتمتع)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۱ ص۱۴۳ باب القِران والتمتع۔

حج تمتع کی نیت کرنے کے بعد حج قران کی نیت کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص پاکستان سے حج تمتع کی نیت سے مکہ مکرمہ جائے مگر وہاں پہنچ کر عمرہ کرنے کے بعد مدینہ منورہ جا کر وہاں سے حج قران کی نیت کرے تو کیا یہ شخص حج قران کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صاحبینؒ کے نزدیک جب محرم حدودِ حرم سے نکل جائے تو اس کی حیثیت آفاقی کی ہوگی، اب اگر وہ تمتع کی جگہ قران کی نیت کرے تو حج قران جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں حدودِ حرم سے نکل جانے سے نیتِ تمتع باطل ہو جاتی ہے اور امام صاحبؒ کے نزدیک خروجِ حرم سے نیتِ تمتع باطل نہیں ہوتی اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق حج قران کی نیت کرنا جائز نہیں البتہ موجودہ حالات کو مدِ نظر رکھ کر صاحبینؒ کی رائے کو مفتیٰ بہ قرار دینا چاہیئے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ، وھو متمتع ان حج من عامہ وکذا لو خرج الی الآفاق لحاجۃ فقرن لا یکون قارنًا عند ابی حنیفۃؒ وعلیہ رفض احدھما ولا یبطل تمتعہ لان الاصل عندہ ان الخروج فی اشھر الحج الی غیر اھلہ کالاقامۃ بمکۃ فکانہ لم یخرج وقرن من مکۃ اما عندھما فکالرجوع الی اھلہ فاذا خرج بطل تمتعہ ثم اذا قرن من المیقات کان قارنًا۔ (امداد الاحکام ج ۲ ص۱۸۱ کتاب الحج)

حج تمتع افضل ہے یا قران؟

سوال:۔ حج تمتع اور قران میں سے احناف کے ہاں کون سا حج افضل ہے؟

الجواب:۔ حج کی تین قسمیں ہیں (۱) حج افراد (۲) حج تمتع (۳) حج قران۔ احناف کے ہاں ان تینوں میں سے حج قران افضل ہے اور قران کے بعد حج تمتع بہتر ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: باب القران وھو افضل لحدیث اتانی اللیلۃ من ربی وانا بالعقیق فقال یا آل محمد اھلوا بحجۃ وعمرۃ معا........ ثم التمتع ثم الافراد۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۵۳۰ باب القران، کتاب الحج)ﷺ

بَابُ الْحَجِّ عَنِ الْغَيْرِ
(حج بدل کے مسائل واحکام)

نفلی حج میں حج بدل کی نیت کرنا ضروری نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب پر حج فرض نہیں تھا اور نہ انہوں نے وصیت کی تھی، اب میں ان کے ایصالِ ثواب کیلئے نفلی حج میں حج بدل کی نیت کروں یا صرف نفلی حج کی؟

الجواب:۔ جب کسی پر حج فرض ہی نہ ہو تو اس کی طرف سے حج بدل بھی نہیں ہوتا لہٰذا اس صورت میں آپ نفلی حج ادا کریں اور اس کا ثواب اپنے والد کو بخش دیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (بعبادة ماله جعل ثوابها لغیره) ای سواء کانت صلوٰة او صوما او صدقة او قراءة قرآن او ذکرا او طوافا او حجا او عمرة او غیر ذٰلک۔

(ردالمحتار ج۲ ص۵۹۵ باب الحج عن الغیر، مطلب فی إهداء ثواب الاعمال الخ) [1]

فوت شدہ آدمی کے لیے نفل حج کا ثواب

سوال:۔ اگر ایک آدمی اپنے فوت شدہ والد کے ایصالِ ثواب کے لیے نفلی حج کرے تو کیا اس کو نفلی حج کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر نفلی عبادت چاہے بدنی ہو یا مالی، کرنے سے اس کا ثواب کسی فوت شدہ کو بخشنا شرعاً صحیح اور ثابت ہے اور یہی اہل السنة والجماعة کا عقیدہ ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے فوت شدہ والد کے لیے نفلی حج کرکے اس کا ثواب اُسے بخش دے تو وہ ثواب اس کو پہنچے گا۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ:۔ فان من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ:۔ فان من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنة والجماعة کذا فی البدائع۔

(البحرالرائق ج۳ ص۵۹ باب الحج عن الغیر)

ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر۔

من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابہا الیہم عند اہل السنۃ والجماعۃ کذا فی البدائع ۔

(البحرالرائق ج ۳ ص۵۹ باب الحج عن الغیر) [1]

نفلی حج کے لیے والدہ سے اجازت لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی سعودی عرب میں مقیم ہے وہ اپنی بوڑھی والدہ کے لیے نفلی حج کرنا چاہتا ہے جو کہ پاکستان میں رہتی ہے، کیا اُسے اپنی والدہ سے اجازت لے کر پاکستان سے سفرِ حج اختیار کرنا ہوگا یا سعودی عرب سے ہی والدہ کی طرف سے حج ادا کرے؟

الجواب:۔ حج بدل فرضی میں اُس مکان سے بہ نیّتِ حج جانا ضروری ہے جہاں پر رہتا ہو، البتہ اگر کوئی کسی کی طرف سے نفلی حج کا ارادہ کرے تو اس میں اجازت لینا ضروری نہیں اور نہ ہی صورتِ مسئولہ کے مطابق پاکستان آنے کی ضرورت ہے، لہٰذا آپ اپنی والدہ کی طرف سے بغیر اُن کی اجازت کے سعودی عرب سے ہی نفلی حج کر سکتے ہیں ۔

وفی الہندیۃ: الآمر بالحج فلا یجوز حج الغیر عنہ بغیر أمرہ الا الوارث ۔ ہندیۃ ففی الحج النفل تجوز النیابۃ حالۃ القدرۃ لأن باب النفل اوسع کما فی سراج الوہاج ۔ (الفتاوٰی الہندیہ ج۱ ص۲۵۷ الباب الخامس عشر فی الوصیۃ بالحج) [2]

نفلی حج کے لیے پاکستان آنا ضروری نہیں

سوال:۔ اگر کوئی آدمی اپنے فوت شدہ والدین یا کسی رشتہ دار کے لیے نفلی حج کرتا ہے اور وہ ابوظہبی میں ملازم ہے تو کیا وہ ابوظہبی سے ہی نفلی حج کیلئے جا سکتا

---

[1] ان الانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلوٰۃ کان اوصومًا اوصدقۃ اوغیرہا کالحج ۔الخ (الفتاوٰی الہندیۃ ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۴۵ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر ۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وانما شرط غیر المنوب للحج الفرض لا النفل لجواز الانابۃ مع القدرۃ فی حج النفل لأن المقصود منہ الثواب ۔

(البحرالرائق ج ۳ ص۶۲ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۴۵ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر ۔

ہے یا اس کے لیے پاکستان آنا ضروری ہے ؟

الجواب:۔ کسی فوت شدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے نفل حج ممنوع نہیں اور نہ اس کے لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق ابوظہبی سے پاکستان آنا ضروری ہے بشرطیکہ فوت شدہ آدمی نے وصیّت نہ کی ہو تو فوت شدہ کی طرف سے نفلی حج کرنے والا جہاں بھی ہو وہاں سے مکہ مکرمہ جا کر حج کرے تو صحیح ہے، کیونکہ نفل حج کی صورت میں توسیع ہے البتہ حج بدل وصیّت کی صورت میں ہو تو پھر پاکستان آنا ضروری ہے ۔

وفی الهندية: ففی الحج النفل تجوز نیابة حال القدرة لان باب النفل اوسع کما فی السراج الوهاج ۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [1]

غریب آدمی سے حج بدل کرانا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص غریب و نادار ہے جسے ایک صاحبِ ثروت حج بدل کے لیے بھیج رہا ہے، کیا کسی غریب و نادار کو جس نے خود حج نہیں کیا ہو حج بدل کے لیے بھیجنا جائز ہے یا اس کیلئے کسی ایسے شخص کا انتخاب ضروری ہے جس نے خود حج کیا ہو ؟

الجواب:۔ بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لیے کسی ایسے آدمی کو بھیجا جائے جس نے خود فریضۂ حج ادا کیا ہو، لیکن با وجود اس کے اگر ایک غریب و نادار شخص کو حج بدل کے لیے بھیجا جائے تو اس سے بھی حج بدل ادا ہو جاتا ہے اور اس شخص پر حج فرض نہیں ہوتا ۔

وفی الهندية: والافضل للانسان اذا اراد ان یحج رجلاً عن نفسه ان یحج رجلاً قد حج عن نفسه ومع هذا لو أحج رجلاً لم یحج عن نفسه حجة الاسلام یجوز عندنا وسقط الحج من الآمر کذا فی المحیط ۔ (الهندية ج ۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله :- وانما شرط عجز المنوب للحج الفرض لجواز الانابة مع القدرة فی حج النفل لان المقصود منه الثواب ۔

(البحر الرائق ج ۳ ص۶۲ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانية ج ۲ ص۵۴۵ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر ۔

[2] قال ابن عابدین :- (ثم فرع علیه) علی ان الشرط هو الاهلية دون اشتراط ان یکون المامور قد حج عن نفسه ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۶۰۳ باب الحج عن الغیر قبل مطلب فی حج الضرورة)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانية ج ۲ ص۵۴۶ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر ۔

حج بدل میں آمر کی اطاعت کا حکم

سوال:۔ زید نے عمر کو حج بدل کے لیے بھیجا، عمر نے میقات سے عمرہ کی نیت کرلی اور جب حج میں پانچ روزہ رہ گئے تو عمر نے زید کی طرف سے حج بدل کے لیے احرام باندھ کر افعال حج ادا کیے تو کیا شرعاً زید کا حج بدل ادا ہوگیا یا نہیں؟

الجواب:۔ حج بدل کرنے والے کے لیے آمر کے حکم کی اطاعت ضروری ہے، صورت مسئولہ کے مطابق چونکہ عمر نے زید کے امر کی مخالفت کی ہے اس لیے اس صورت میں زید کی طرف سے حج بدل ادا نہیں ہوا آئندہ سال عمر کو زید کیلئے دوسرا حج کرنا پڑے گا۔

قال ابن عابدینؒ:۔ الثانی عشران یحرم من المیقات فلو اعتمر وقد امرہ بالحج ثم حج من مکۃ لا یجوز ویضمن۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۰۱ باب الحج عن الغیر) [1]

حج بدل میں عمرہ کی نیت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حج بدل میں عمرہ کی نیت صحیح ہے یا نہیں، اور اگر کسی شخص نے حج بدل میں عمرہ کی نیت کرلی تو اس سے حج بدل صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حج بدل میں صرف حج کی نیت کرنا اُس وقت ضروری ہے جبکہ آمر نے مامور کو حج افراد پر مامور کیا ہو، چونکہ ہمارے بلاد میں حج قران، تمتع اور افراد تینوں کو حج کہا جاتا ہے اور آمر کی طرف سے تینوں کی اجازت ہوتی ہے لہٰذا تمتع کرسکتا ہے، بہتر یہی ہے کہ آمر سے اس کی تصریح کرالی جائے۔

وفی الھندیۃ: واذا امر غیرہ بالافراد بحجۃ اوعمرۃ فقرن فھو ضامنٌ فی قول ابی حنیفۃؒ۔ وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ رحمھما اللہ یجزیٔ عن الآمر استحساناً۔ (الفتاویٰ الھندیہ ج۱ ص۲۵۸ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [2]

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو امرہ بالحج فاعتمر ثم حج من مکۃ فھو مخالف فی قولھم۔ (الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۲۶ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۱۵۸ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر۔

[2] قال ابن عابدینؒ: فلو امرہ الافراد فقرن اوتمتع ولو للمیت لم یقع عنہ ویضمن النفقۃ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۰۱ باب الحج عن الغیر، مطلب شروط الحج عن الغیر عشرون)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۲۶ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر۔

ذیابیطس کے مریض کے لیے حج بدل کا حکم

سوال: ایک آدمی ذیابیطس (شوگر) کے مرض میں مبتلا ہے، ڈاکٹر اور حکیم اسے سفر کی اجازت نہیں دیتے، تو کیا ایسا شخص اپنی طرف سے کسی کو حج بدل کے لیے بھیج سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ذیابیطس کا مریض اگر کسی دوائی یا اور کسی واسطہ سے اپنے مرض پر وقتی طور پر کنٹرول حاصل کر سکتا ہو یا اس کو امید ہو کہ عنقریب اس مرض سے صحتیاب ہو جاؤں گا تو یہ شخص کسی کو اپنی طرف سے حج بدل نہیں کرا سکتا اور اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر حج بدل کرا سکتا ہے۔

وفی الهندية: ومنها ان یکون المحجوج عنه عاجزًا عن الاداء۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [۱]

حج بدل میں خرچہ محجوج عنہ کی طرف سے ہوگا

سوال: کیا حج بدل محجوج عنہ کے مال سے کرنا ضروری ہے یا کوئی شخص اپنی جانب سے بھی کر سکتا ہے؟

الجواب: حج بدل میں یہ شرط ہے کہ مامور کا حج محجوج عنہ کے مال سے ہو، پس اگر حج بدل کرنے والے نے اپنے مال سے حج کر لیا تو محجوج عنہ کی طرف سے ادا نہ ہوگا۔

کما فی الهندیه: ومنها ان یکون حج المامور بمال المحجوج عنه فان تطوع الحاج عنه بمال نفسه لم یجز عنه حتی یحج بماله۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [۲]

میقات کی بجائے حرم سے حج بدل کا احرام باندھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے حج بدل میں میقات سے حج کا احرام نہیں باندھا بلکہ عمرہ احرام باندھا ہے، تو کیا

---

[۱] قال العلامة الحصكفیؒ: لكن بشرط دوام العجز الى الموت ونية الحج عنه هذا اذا كان المرض یرجى زواله۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۵۹۸ باب الحج عن الغیر)
وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج۲ ص۵۲۵ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر۔

[۲] قال العلامة الحصكفیؒ: وبقی من الشرائط النفقة من مال الآمر كلها او اكثرها۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۶۰۱ باب الحج عن الغیر)
وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج۲ ص۵۲۵ الفصل الخامس عشر فی الرّجل یحجّ عن الغیر۔

حرم شریف سے دوبارہ حج بدل کا احرام باندھنے سے حج بدل ادا ہو جائے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ مامور کے لیے آمر کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے افعالِ حج ادا کرنے چاہئیں اس لیے اگر آمر نے مامور کو حج تمتع کی اجازت دی ہو تو بنا بر تحقیق آمر کا ذمہ فارغ ہوگا ورنہ نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ان اذن له الامر بالقران والتمتع والا فیصیر مخالفاً۔ (الدر المختار ج۲ ص۶۱۱ باب الحج عن الغیر) [1]

حج بدل میں خرچہ آمر کی طرف سے ضروری ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر حج فرض ہے اور اس عورت نے بنا بر ضعف اپنے بیٹے کو رقم دے کر حج بدل کے لیے روانہ کیا ہے کیا مامور بہ کو آمر کے مال سے ہی حج کرنا ضروری ہے یا اپنی طرف سے بھی کچھ خرچ کر سکتا ہے ؟

الجواب:۔ حج بدل میں ضروری ہے کہ خرچہ آمر کی طرف سے ہو، صورتِ مسئولہ کیمطابق اس بیٹے کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ اپنی والدہ کے لیے حج بدل کر رہا ہے تو خرچہ بھی والدہ کے مال سے کرے گا تاہم اگر حج فرض نہ ہو تو نفلی حج میں توسع ہے۔

وفی الهندیة: ومنها ان یکون الحج بمال المحجوج عنه فان تطوّع الحاج عنه بمال نفسه لم یجز عنه حتی یحج بماله۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [2]

حج بدل میں اپنے لیے حج کرنا اور کسی دوسرے کو حج بدل کیلئے مقرر کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمر کو اپنی والدہ کی طرف سے حج بدل کے لیے کہا، تو عمر نے

---

[1] قال العلامة الانصاریؒ: ولو امره بالحج فاعتمر ثم حج من مکة فهو مخالف فی قولهم۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۵۴۶ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۵۸ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر۔

[2] قال ابن عابدینؒ: (فتطوع رجل) اطلق الرجل المتطوع فیشمل الوارث۔ وبه صرح قاضیخانؒ بقوله المیت اذا اوصی بان یحج عنه بماله فتبرع عنه الوارث او الاجنبی لایجوز یعنی لایجوز عن فرض المیت والا فله ثواب ذٰلک الحج۔ قلت (رد المحتار ج۲ ص۶۰۶ باب الحج عن الغیر مطلب العمل علی القیاس دون الاستحسان هٰذا)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۶۲ باب الحج عن الغیر۔

سے کہا کہ آپ آمدورفت کا خرچہ مجھے دے دیں میں مکہ مکرمہ میں کسی آدمی کو حج بدل کے لیے مقرر کردوں گا اور ان پیسوں سے میں اپنی جانب سے حج کر لوں گا۔ تو کیا یہ طریقہ درست ہے؟

الجواب: حج بدل میں آمر کے وطن سے جانا ضروری ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں طریقۂ مذکورہ سے حج کرنا غیر مشروع ہے اور نہ ہی اس طریقہ سے حج بدل ادا ہوتا ہے اور زید کی والدہ ذمہ بھی فارغ نہ ہُوا۔

قال العلامۃ محمد امین الشہیر بابن عابدین رحمہ اللہ: الحادی عشر ان یحج عنہ من وطنہ ان اتسع الثلث والا فمن حیث یبلغ۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۶۰۰ باب الحج عن الغیر۔ مطلب شروط الحج عن الغیر)[۱]

سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے حج بدل ادا کرنا صحیح نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی پر حج فرض ہو چکا ہے لیکن سفر کی تکالیف اور تھکاوٹ کی وجہ سے وہ حج بدل کرانا چاہتا ہے، کیا یہ حج بدل صحیح ہوگا۔

الجواب: اگر کسی پر حج فرض ہو جائے تو حج کی ادائیگی اُسی شخص پر ضروری ہے محض تھکاوٹ کی وجہ سے حج بدل نہیں کرا سکتا کیونکہ حج بدل کے لیے فقہاء کرام نے جو شرائط ذکر کی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں: ۱۔ کہ محجوج عنہ ادائے حج سے خود عاجز ہو، ۲۔ یہ کہ یہ عجز موت تک قائم ہو وغیرہ، چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ شرائط مفقود ہیں اس لیے حج بدل نہیں کرایا جا سکتا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: لکن بشرط دوام العجز الی الموت ونیۃ الحج عنہ ھذا اذا کان المرض یرجی زوالہ۔ الخ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۲ ص ۵۹۸ باب الحج عن الغیر)

---

[۱] رجل اوصٰی ان یحج عنہ فأحج عنہ رجلاً فلما بلغ الکوفۃ مات اوسرقت نفقتہ وقد انفق النصف فانہ یحج عن المیت منزلہ بثلث ما بقی۔ (جامع الصغیر ص ۱۳۵ کتاب الحج)
وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۵۵۲ الفصل السادس عشر فی الوصیۃ بالحج۔

[۲] وفی الھندیۃ: ومنھا ان یکون المحجوج عنہ عاجز عن الاداء ومنھا استدامۃ العجز من وقت الاحجاج الی وقت الموت۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر)
وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۵۴۵ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر۔

حج بدل کی شرائط | **سوال** :۔ ایک شخص حج بدل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے شرعاً کیا شرائط ہیں ؟

الجواب :۔ فقہاء اسلام نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے کتب فقہ میں مستقل باب (باب فی الحج عن الغیر) قائم کیا ہے جس میں حج بدل کی شرائط ذکر ہیں اگر ان شرائط کے تحت حج بدل کیا جائے تو درست ہے ورنہ نہیں ، اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں :۔
۱ محجوج عنہ خود ادائے حج سے عاجز ہو اور وہ مال کا مالک ہو ۲ وہ حج کرنے سے عاجز ہو اور عجز موت تک قائم ہو ۳ امر بالحج ہو ۴ احرام کے وقت نیت محجوج عنہ کی طرف سے ہو ۵ مامور کا حج محجوج عنہ کے مال سے ہو۔

کما فی الھندیۃ: ومنھا ان یکون المحجوج عنہ عاجزًا عن الاداء ومنھا استدامۃ العجز من وقت الاحجاج الی وقت الموت ومنھا الامر بالحج ومنھا نیۃ المحجوج عنہ عند الاحرام ومنھا ان یکون الما مور بمالہ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر)[۱]

وصیت کے بغیر حج بدل کا حکم | **سوال** :۔ ایک آدمی پر حج فرض تھا زندگی میں اس نے حج ادا نہ کیا اور نہ ہی مرتے وقت وصیت کی تو اس کے لیے حج بدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر کوئی شخص وفات پا گیا اور اس پر حج فرض ہو چکا تھا مگر اس نے حین حیات ادا نہ کیا اور مرتے وقت وصیت بھی نہ کی تو اب اگر اس کے ورثاء اپنی خوشی سے میت کی طرف سے حج بدل کریں تو جائز ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میت کی طرف سے قبول فرمالیں گے ، مگر میت کی وصیت ضروری ہے۔

کما فی الھندیۃ :من علیہ الحج اذا مات قبل ادائہ من غیر وصیۃ یاثم بلاخلاف وان احب الوارث ان یحج عنہ یحج وارجو ان یجزیہ ذلک ان شاء اللہ تعالیٰ ، کذا ذکر ابوحنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ وان مات عن وصیۃ لا یسقط الحج عنہ واذا حج عنہ یجوز عندنا باستجماع

---

[۱] قال الحصکفی رحمہ اللہ :لکن بشرط دوام العجز الی الموت ونیۃ الحج عنہ ھذا اذا کان المرض یرجی زوالہ ۔ الخ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۲ ص۵۹۸ باب الحج عن الغیر)
ومثلہ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۴۵ الفصل الخامس فی الرجل یحج عن الغیر۔

شرائط الجواز۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۲۵۸ الباب الخامس عشر فی الوصیة بالحج) [1]

عورت کا مرد کی طرف سے حج بدل کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مرد کی طرف سے عورت حج بدل کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حج بدل کے لیے مسلمان عاقل بالغ ہونا ضروری ہے خواہ مرد ہو یا عورت! البتہ اگر عورت نے حج بدل کیا تو فقہاء کی تصریح کے مطابق مکروہ ہے تاہم حج بدل ادا ہوجائے گا۔

وفی الهندیة: ولواحج عنه امرأة او عبدًا او امة باذن السیّد جاز ویکره هکذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [2]

غیر وصی کا حج بدل ادا کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے موت کے وقت چار اشخاص کو وصیت کی کہ مجھ پر حج فرض ہے آپ میری طرف سے حج بدل ادا کر دیں، تو کیا حج بدل صرف اوصیاء اور وارثین کو ادا کرنا ضروری ہے یا غیر وصی بھی حج بدل کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ حج بدل اوصیاء وارثین کو ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ غیر وصی بھی حج بدل ادا کرسکتا ہے۔

یکون الاوصیاء مطلقًا ویدل علیه ما فی الهندیة۔ ولو اوصٰی المیت ان یحج عنه ولم یزد کان للوصی ان یحج بنفسه فان کان الوصی وارث المیت او دفع المال الی وارث المیت لیحج عن المیت (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۲۵۹ الباب الخامس عشر فی الوصیة بالحج) [3]

---

[1] قال الشیخ ابن العلاء الانصاریؒ: ومن مات وعلیه فرض الحج ولم یوص به لم یلزم الوارث ان یحج عنه وان احب ان یحج عنه وارجوا ان یجزیه ان شاء الله۔ (الفتاویٰ التاتارخانیه ج ۲ ص۵۶۴ الفصل السابع عشر فی احرام المرأة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۶۱ باب الحج عن الغیر۔

[2] قال الشیخ ابن الهمامؒ: ویجوز حجاج الحر والامة والحرة وفی الاصل نص علی کراهة المرأة۔ (فتح القدیر ج ۳ ص۱۵۱ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۶۳ باب الحج عن الغیر۔

[3] قال الشیخ ابن العلاء الانصاریؒ: وفی الکبریٰ اوصی بان یحج عنه ولم یوص الی احد فاجتمعت الورثة لیحجوا عنه رجلًا جاز۔ (الفتاویٰ التاتارخانیه ج ۲ ص۵۵۶ الفصل السادس عشر فی الوصیة بالحج)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۵۹۹ باب الحج عن الغیر۔

ایک سال کے بعد حج بدل ادا کرنا

سوال:۔ گذشتہ سال رمضان میں زید نے عمر کے ساتھ وعدہ کیا کہ آپ میرے بھائی بکر مرحوم کی طرف سے حج بدل ادا کریں میں آپ کو ماہ شوال میں پانچسو روپیہ ارسال کروں گا، عمر نے رقم کا انتظار کیا لیکن زید نے شوال میں رقم ارسال نہیں کی، جب دس روز حج کو رہ گئے تو عمر نے اپنی والدہ کی طرف سے حج بدل ادا کیا، پھر تین ماہ بعد زید نے عمر کو پانچسو روپے ارسال کئے اور عمر ایک سال مکہ مکرمہ میں رہا اور ۱۳۸۴ھ میں بکر مرحوم کی طرف سے حج بدل ادا کیا، تو کیا حج بدل ادا ہوا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بکر مرحوم کے لیے حج نفلی برائے ایصالِ ثواب ہو تو ہر کس اور ہر جگہ سے ہر وقت درست ہے اور اگر فرض حج بدل ہو تو میت کے ثلث کا یا وصی کی وصیت کا اعتبار ہوگا، لہٰذا اگر ثلث میت کے وطن سے حج بدل کے لیے کافی ہو تو میت کے وطن سے سفرِ حج ضروری ہے اور اگر کافی نہ ہو تو جہاں سے ممکن ہو سکے ادا کر لیا جائے۔

قال الحصکفیؒ: الاصل ان کل من اتی بعبادۃ ما جعل ثوابها لغیرہ وان نواها عند الفعل لنفسه۔
قال ابن عابدینؒ: بعبادۃ ما) ای سواء کانت صلوٰۃ او صوما الخ (رد المحتار ج۲ ص۵۹۵ باب الحج عن الغیر)

قال ابن عابدینؒ: الحادی عشر ان یحج عنه من وطنه ان اتسع الثلث والا فمن حیث یبلغ کما سیاتی بیانه۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۰۰ باب الحج عن الغیر، مطلب شروط الحج عن الغیر) [۱]

صاحبِ عذر کا عذر ختم ہو جانے کے بعد حج بدل کا حکم

سوال:۔ اگر ایک معذور آدمی (جس پر حج فرض تھا) حج بدل کرائے،

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: اذا اوصی بان یحج عنه وهو فی منزله ان بین مکانا یحج عنه من ذلك المکان بالاجماع، فان لم یبین مکانا یحج عنه من وطنه عند علمائنا وهذا اذا کان ثلث ماله یکفی للحج من وطنه فاما اذا کان لا یکفی لذلك فان یحج عنه من حیث یمکن الاحجاج عنه بثلثه۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۵۵۲ الفصل السادس عشر فی الوصیة بالحج)

وفی الهندیة: الاصل فی هذا الباب ان الانسان له ان یجعل ثواب عمله لغیرہ صلوٰۃ کان او صوما او صدقة او غیرها کالحج وقراءۃ القرآن۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر)

اور حج بدل کے بعد اس کا عذر کسی بھی وقت ختم ہوجائے تو باقی ماندہ زندگی میں اُسے دوبارہ حج کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ حج بدل کے لیے عجز (مرض) کا دائمی ہونا ضروری ہے، اگر مرض دائمی نہ ہو تو اس کی طرف سے حج بدل ادا نہ ہوگا، چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا مرض تاموت دائمی نہ تھا بلکہ مرنے سے پہلے پہلے ہوگیا تو اس پر دوبارہ خود حج کرنا لازمی ہے حج بدل سے ذمہ فارغ نہ ہوگا ۔

وفی الهندیة : ومنها استدامة العجز من وقت الاحجاج الی وقت الموت هکذا فی البدائع حتی لو احج عن نفسه وهو مریض یکون مراعی فان مات اجزءه وان تعافی بطل ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [۱]

حج بدل کے بعد منذورہ عُمرہ ادا کرنا

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرہ کی نذر مانی ہے دریں اثنا زید کسی آدمی کے لیے حج بدل کرنے کے لیے گیا تو حج بدل ادا کرنے کے بعد زید نے اپنا منذورہ عمرہ ادا کیا، تو کیا زید کا یہ عمرہ صحیح ہُوا یا نہیں؟

الجواب :۔ بظاہر اس نے اداء کا التزام کیا ہے، کیونکہ اس نے اوّلاً حج بدل ادا کیا ہے اور آمر کے حکم کی کوئی مخالفت نہیں کی اس لیے زید کا یہ عمرہ ادا کرنا صحیح ہے اور اس سے زید کا ذمہ فارغ ہوگیا ۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : ۲ ابن سماعة عن محمدؒ : لما مور بالحج اذا حج عن الامر ثم احرم بعمرة ینفق من مال نفسه ما دام معتمراً فاذا انفق من مال الامر ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۵۴۷ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ : وان کان مرضاً یرجی زواله فاحج فالامر مراعی فان استمر العجز الی الموت سقط الفرض والا لا ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۶۱ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۵۹۸ باب الحج عن الغیر ۔

[۲] قال ابن عابدینؒ : (تحت هذه العبارة تیصر مخالفاً) ولو امره بالعمرة فاعتمر ثم حج عن نفسه لم یکن مخالفاً بخلاف ما اذا حج اوّلاً ثم اعتمر ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۶۱۱ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۶۳ باب الحج عن الغیر ۔

والدین کی طرف سے حج کرنے میں زیادہ ثواب ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض ادا کرنے کے بعد اپنے لیے نفلی حج کرنا افضل ہے یا والدین کی طرف سے حج کرنا افضل ہے؟

الجواب:- اگر والدین پر حج فرض نہیں تھا تو اپنے لیے نفلی حج کرنے کی بجائے والدین کی طرف سے حج کرنا افضل و اولیٰ ہے اور بعض احادیث میں دس گنا کی زیادتی آئی ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : بخلاف مالو اهل عن ابویه او غیرهما من الاجانب حال کونه متبرعا فعین بعد ذٰلك جاز لانه متبرع بالثواب فله جعله لاحدهما او لهما وفی الحدیث من حج عن ابویه فقد قضیٰ عنه حجته وکان له فضل عشر حجج و بعث من الابرار۔

(ردّ المحتار ج ۲ ص۶۰۸ باب الحج عن الغیر) [1]

دم تمتع و دم قران آمر پر ہے یا مامور پر

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی میّت کی طرف سے حج بدل میں تمتع یا قران کی نیت کرے تو کیا اس کا حج ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اور دم کس پر واجب ہوگا، آمر پر یا مامور پر؟

الجواب:- اگر آمر نے حج تمتع یا قران کی اجازت نہ دی ہو تو اس کا حج ادا نہ ہوگا اور اگر اجازت دی ہو تو حج ادا ہو جائے گا مگر دم تمتع یا قران مامور پر ہوگا آمر پر نہیں۔

قال الحصکفیؒ: ودم القران والتمتع والجنایة علی الحاج ان اذن له الآمر بالقران والتمتع والا فیصیر مخالفا فیضمن۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۶۱۱ باب الحج عن الغیر) [2]

---

[1] قال النبی صلی الله علیه وسلم من حج عن ابیه واُمه فقد قضیٰ عنه حجته وکان له افضل عشر حجج۔ (فتح القدیر ج ۳ ص۹۸ باب الحج عن الغیر)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۶۹ باب الحج عن الغیر۔

[2] قال ابن نجیمؒ: ودم الحصار علی الآمر ودم القران ودم الجنایة علی المامور۔ قال ابن نجیمؒ: وانما وجب دم القران علی المامور باعتبار انه وجب الشکر لما وفقه الله تعالیٰ من الجمع بین النسکین۔
(البحر الرائق ج ۳ ص۶۵ باب الحج عن الغیر)
وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج ۲ ص۵۴۸ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر۔

محرم نہ ملنے کی صورت میں عورت حج بدل بھی نہیں کرا سکتی

سوال: اگر کسی پردہ دار عورت کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ اپنا اور محرم کا خرچہ کر سکتی ہے مگر اس کو کوئی ایسا محرم نہیں مل رہا کہ اس کے ساتھ حج ادا کرنے کے لیے جا سکے، تو کیا یہ عورت حج بدل کرا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: عورت پر حج کی فرضیت کے لیے محرم کا ہونا شرط ہے بغیر محرم کے عورت پر حج فرض ہی نہیں اگرچہ اس کے پاس مال زیادہ ہو، اس لیے اس عورت پر حج بدل کرانا بھی لازمی نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ومع زوج أو محرم ولو عبدًا اوذمیًا أو برضاع بالغ قید لهما۔

قال ابن عابدینؒ: تحت (قوله ومع زوج أو محرم) هٰذا وقوله ومع عدم عدة علیها شرطان مختصان بالمرأة۔ الخ (ردالمحتار ج ۲ ص۴۶۴ کتاب الحج) [1]

حج بدل ادا کرنے کے بعد مامور وطن واپس نہ آئے تو حج کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص کسی کی طرف سے حج بدل ادا کرنے کے لیے سعودی عرب (مکہ مکرمہ) چلا جائے اور حج ادا کرنے کے بعد واپس وطن نہ آئے بلکہ وہیں رہے تو کیا اس طرح حج بدل ادا ہو جائے گا؟

الجواب: حج بدل میں آمر کے ملک / شہر سے جانا ضروری اور شرط ہے حج ادا کرنے کے بعد آمر کے وطن واپس آنا ضروری نہیں، اس لیے اگر کوئی حج کے بعد وہیں مقیم ہو جائے تو حج بدل ادا ہو جائے گا، اقامت اختیار کرنے سے حج متاثر نہ ہوگا، البتہ بہتر یہ ہے کہ واپس آجائے۔

لمافی الهندیة: ولو احج رجلاً یؤدی الحج ویقیم بمکة جاز والافضل ان یحج ویرجع واذا فرغ المامور من الحج ونوی الاقامة خمسة عشر یومًا فصاعدًا انفق من مال نفسه ولو انفق من مال الآمر یضمن۔ الخ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۵۸ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر) [2]

---

[1] قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلیؒ: ولا تحج المرأة الا بزوج أو محرم اذا کان سفرًا ونفقة المحرم علیها۔ وفی شرحه ولا بد من العقل والبلوغ لعجز الصبی والمجنون عن الحفظ۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص۱۴۱ کتاب الحج)

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: ولو احج رجلاً یؤدی الحج ویقیم بمکة جاز لانه فرض الحج صار مؤدیًا بالفراغ عن افعاله والافضل ان یحج ثم یعود الیه لان الحاصل للآمر ثواب النفقة فمهما کانت النفقة اکثر کان الثواب اکثر۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۱۵ کتاب الحج، فصل فی الذی یرجع الی النیات)

حج افراد پر مامور شخص اپنے لیے عمرہ کرسکتا ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کو حج افراد کرنے کے لیے اپنا نائب مقرر کرے تو مامور حج افراد کے بعد اپنے لیے عمرہ کرے تو کیا یہ حج بدل جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اصل میں حج بدل کے اندر یہ ضروری ہے کہ مامور اپنے آمر کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرے، صورتِ مسئولہ میں مامور نے چونکہ پہلے آمر کے حکم کو پورا کیا ہے اور بعد میں اپنے لیے عمرہ کیا تو اس سے آمر کی طرف سے حج پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ حج اور عمرہ دونوں درست ہیں تاہم اس عمرے کا خرچہ مامور کے ذمے واجب ہو گا۔

لما قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ:۔ اما لو امرہ بالعمرۃ فنفذ امرہ واعتمر عنہ ثم حج عن نفسہ او امرہ بالحج فحج عنہ ثم اعتمر عن نفسہ فان ذٰلک یجوز وتجزی العمرۃ فی الصورۃ الاولیٰ والحج فی الصورۃ الثانیۃ عن المستنیب الا ان نفقۃ اقامتہ للحج عن نفسہ فی الاولیٰ والعمرۃ عن نفسہ فی الثانیۃ فلزمہ فی مالہ۔

(کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ج۱ ص۷۰۶ کتاب الحج) [1]

حج کے منافی عمل سے فسادِ حج کی صورت میں حج کا خرچ کس پر ہوگا؟

سوال:۔ اگر مامور سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جائے کہ جس سے حج فاسد ہوتا ہے تو اب حج کا خرچہ آمر پر ہو گا یا مامور پر ؟

الجواب:۔ اگر حج میں فساد وقوفِ عرفہ سے قبل آیا ہو تو مامور آمر کے خرچے کا ضامن ہو گا اس لیے کہ مامور اس فساد کا سبب بنا ہے اور اگر وقوفِ عرفہ کے بعد فساد آیا ہو تو مامور ضامن نہ ہو گا اس لیے کہ وہ حج کا رکنِ اعظم ادا کر چکا ہے۔

لما قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ:۔ واذا فعل المامور ما یفسد الحج فان کان ذٰلک قبل الوقوف بعرفۃ فانہ یضمن المال للمنیب وان کان ذٰلک بعد الوقوف فلا یضمن لانہ ادی الرکن الاعظم وھو الوقوف

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ:۔ ولو امرہ بالعمرۃ فاعتمر اولاً ثم حج عن نفسہ لم یکن مخالفاً...... (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۲۶ الحج عن الغیر) ومثلہ فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۳ ص۵۶ باب النیابۃ فی الحج۔ الخ

وكل كفارة جناية تجب على المأمور لانه سببها۔

(كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ج ۱ ص۸۰۲ كتاب الحج) [1]

کیا حج افراد پر مامور شخص تمتع یا قران کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال:۔ اگر آمر نے حج افراد کا حکم دیا ہو اور مامور حج تمتع یا قران کرے تو اس حج کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ مامور حج میں ہر وقت آمر کے حکم کا تابع ہے اگر آمر نے صرف افراد کا حکم دیا ہو تو مامور کو صرف حج افراد کرنا چاہیئے، اگر اس نے آمر کے حکم کے خلاف حج تمتع یا قران کیا تو حج مامور کی طرف سے ادا ہوگا اور مامور آمر کی رقم کا ذمہ دار ہوگا، تاہم اگر آمر کی طرف سے کھلی اختیار ہو کہ مامور جس قسم کا حج کرنا چاہے کرسکتا ہے تو اس صورت میں مامور جو بھی حج ادا کرے گا وہ آمر ہی کی طرف سے ہوگا۔

قال الشيخ عبد الرحمن الجزائري رحمه الله : ومنها عدم مخالفة ما شرطه المستنيب، فلو أمر بالافراد فحج عنه الغائب قارنا او متمتعا لم يقع عنه ويضمن النفقة التي صرفت له ۔ (كتاب الفقة على المذاهب الاربعة ج ۱ ص۸۰۲ كتاب الحج) [2]

مامور کا مدینہ منورہ جانے کے لیے آمر کی رقم سے خرچ کرنا

سوال:۔ حج بدل میں مامور جب مدینہ منورہ جائے تو یہ خرچہ کس پر واجب ہوگا، مامور پر یا آمر پر؟ کیا مامور آمر کے مال سے اس سفر کے لیے خرچ کرسکتا ہے یا نہیں ؟

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ : قال ابو يوسف الحاج عن الغير اذا افسد حجه قبل الوقوف عليه ضمان النفقة وعليه الحج الذي افسده وعمرته وحجته للآمر ولو فاته الحج لا يضمن لأنه امين وعليه قضاء الفائت وحج عن الآمر۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۲ ص۵۲۹ الحج عن الغير)

وَمِثْلُهُ في الهداية ج ۱ ص۲۷۹ الحج عن الغير۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ : واذا أمر غيره بالافراد بحجة او عمرة فقرن فهو مخالف ضامن ۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۲ ص۵۲۶ الحج عن الغير)

وَمِثْلُهُ في الفقه الاسلامي وادلته ج۳ ص۵۱ النيابة في الحج ۔

الجواب:۔ حج سے پہلے یا بعد مدینہ طیبہ جانا چونکہ نہ فرض ہے نہ واجب، اس لیے آمر کی اجازت کے بغیر مامور اُس کے مال سے خرچ نہیں کرسکتا بلکہ اس خرچہ کو خود برداشت کرے، ہاں اگر آمر کی اجازت ہو تو پھر اُس کے مال سے خرچ کرنا جائز ہے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی رحمہ اللہ: ولو امرہ ان یعتمر، فاحرم بالعُمرۃ واعتمر، ثمّ احرم بالحج عن نفسہ، لم یکن مخالفاً، لانہٗ فعل ما امر بہ، اوھو اداء العمرۃ وحجۃ عن نفسہ بعد ئذ کاشتغالہ بعمل آخر من التجارۃ وغیرھا، لکن النفقۃ فی حجہ تکون من مالہ، لانہ عمل لنفسہ۔

(الفقہ الاسلامی وَاَدِلَّتُہٗ ج۳ ص۵۷ کتاب الحج) [۱]

حج بدل میں نیت آمر کی طرف سے ہوگی

سوال:۔ حج بدل کی نیت مامور اپنی طرف سے کرے گا یا آمر کی طرف سے کرے گا؟

الجواب: جب ایک آدمی کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل کرنا چاہتا ہو تو احرام باندھ کر اُسی کی طرف سے نیت کرے اور تلبیہ کہتے وقت آمر کا نام لیکر تلبیہ پڑھے۔

لما قال العلامۃ عبد اللہ بن مودود الموصلی رحمہ اللہ: ومن حج عن غیرہ ولیستوی الحج عنہ ویقول لبیك بحجۃ عن فلان۔

(المختار علیٰ صدر الاختیار ج ا ص۱۷۱، ۱۷۲ باب الحج عن الغیر) [۲]

---

[۱] قال الکرمانی رحمہ اللہ: ثمّ عندنا المحرم الذی یحجّ عن المیّت او عن غیرہ من العاجزین علیٰ ذکرنا فی الفصول المتقدّمۃ یحج عنہ بنفقۃٍ وسط من غیر تقتیر ولا اسراف ذاھبًا وجائیًا راکبًا غیر ماش ۔۔۔۔۔۔

(حاشیۃ الشلبی علیٰ تبیین الحقائق ج ۲ ص۸۸ باب الحجّ عن الغیر)

[۲] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وبشرط نیۃ الحج عنہ ای عن الآمر فیقول احرمتُ عن فلان ولبیت عن فلان ولنسی اسمہ فنوی عن الآمر صح وتکفی نیۃ القلب۔

{ الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۵۹۹
باب الحج عن الغیر }

باب الجنایات

(حج میں غلطی کرنے کے مسائل)

رمی چھوڑنے کی وجہ سے دم واجب ہونے کا حکم

سوال: ایام حج میں ایک آدمی کے ساتھ اپنی عورت ہو اور وہ رمی جمار کی استطاعت نہیں رکھتی ہو، اگر یہ عورت اپنے شوہر کو رمی جمرات میں وکیل مقرر کرے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں، اور اس پر دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: ایام حج میں رات کے وقت رمی جمار کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اسلئے بلا عذر شرعی اس کو ترک کرنا اور کسی کو وکیل بنانا موجب دم ہے، لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق اس عورت پر دم واجب ہے۔

وفی الهندیة: ولو ترك الجمار کلها او رمی واحدۃ او جمرۃ العقبة یوم النحر فعلیه شاۃ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۴۷ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الخامس)[1]

جمرۃ العقبہ کی رمی بلاعذر شرعی چھوڑنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی ایام حج میں شرعی عذر کے بغیر جمرۃ العقبہ کی رمی چھوڑ دے تو کیا اس پر دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: رمی جمار واجبات حج میں سے ہے جس کے چھوڑ دینے سے دم واجب ہو جاتا ہے لہٰذا جس شخص نے جمرۂ عقبہ کی رمی ترک کر دی اُس پر دم لازم ہے۔

وفی الهندیة: ولو ترك الجمار کلها او رمی واحدۃ او جمرۃ العقبة یوم النحر فعلیه شاۃ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۴۷ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الخامس)[2]

---

[1] قال المرغینانیؒ: ومن ترك رمی الجمار فی الایام کلها فعلیه دم لتحقق ترك الواجب۔ (الهدایہ ج۱ ص۲۵۵ باب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۲ ص۵۵۴ باب الجنایات۔

[2] قال الحصکفیؒ: او الرمی کله او فی یوم واحد۔ قال ابن عابدینؒ: انما وجب بترکه کله دم واحد۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۵۵۴ کتاب الحج باب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۳ باب الجنایات۔

۱۱ ذی الحجہ کی رمی چھوڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک آدمی گیارہ ذی الحجہ کی رمی بلاعذر شرعی نہ کرے تو کیا اس پر دم واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ ذی الحجہ کی گیارہ اور بارہ تاریخ کو جمرات کی رمی واجب ہے اگر کوئی شخص ان دنوں میں رمی نہ کرے تو اس پر دم واجب ہے جو کہ ارضِ حرم میں خود یا کسی اور سے ذبح کرائے ۔

وفی الهندية : ولو ترك الجمار او رمی واحد او جمرة العقبة يوم النحر فعليه شاة ۔ (الفتاوی الهندية ج۱ ص۲۴۷ الباب الثامن فی الجنايات، الفصل الخامس) [۱]

ترکِ سنت کی وجہ سے دم لازم نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص رمی جمار کے بعد منیٰ میں قیام نہ کرے بلکہ مکہ معظمہ میں قیام کرے تو کیا اس پر دم واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ رمی جمار کے بعد منیٰ میں قیام کرنا سنت ہے واجب نہیں اور ترکِ سنت پر دم لازم نہیں آتا اگرچہ ایسا کرنا خلافِ سنت ہے ۔

قال الشيخ ابن عابدينؒ : فيبيت بها للرمی ای ليالی ايام الرمی هو السنة فلو بات بغيرها كره ولا يلزمه شیٔ ۔ اھ ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۵۲۰ فصل فی الاحرام، مطلب فی حکم صلوٰۃ العید والجمع فی منیٰ) [۲]

مفرد پر دمِ شکریہ لازم نہیں

سوال:۔ کیا حج افراد کرنے والے پر دمِ شکر واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حج افراد کرنے والے پر دم شکر واجب نہیں افضل ضرور ہے تاہم حج تمتع اور حج قران کرنے والے پر واجب ہے ۔

کما قال العلامة الحصکفیؒ : ثم بعد الرمی ذبح ان شاء لانه مفرد ۔ علامہ شامی اس عبارت

---

[۱] قال الحصکفیؒ : او الرمی كله او فی يوم واحد ۔ قال ابن عابدينؒ : انما وجب بتركه كله دم واحد ۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۲ ص۵۵۳ باب الجنايات)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۱ ص۲۵۵ باب الجنايات ۔

[۲] قال الشيخ ابن نجيم المصریؒ :۔ (تحت ثم الی منیٰ الخ) ثم الی منیٰ فارم الجمار اقتداءً برسول الله صلی الله عليه وسلم ولم يذكر البيتوتة بمنیٰ لانها ليست بواجبة لان المقصود الرمی لكن هی السنة ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۴۸ باب الاحرام)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۲۱۹ الباب الاول فی تفسير الحج ۔

کے تحت لکھتے ہیں: والذبح لهٗ افضل ویجب علی القارن والمتمتع ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۵۱۵ فصل فی الاحرام وصفة المفرد، مطلب فی رمی جمرة العقبی) ؎۱

احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہننے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک آدمی حج کے دوران سلے ہوئے کپڑے پہن لے بعض سلے ہوئے کپڑوں میں تین گھنٹے اور بعض میں آٹھ گھنٹے وقت گذارے تو دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دن یا رات سے کم وقت میں سلے ہوئے کپڑے پہننا موجب صدقہ ہے اور دن یا رات سے زائد وقت تک سلے ہوئے کپڑے پہننا موجب دم ہے۔

قال الحصکفیؒ: اولبس مخیطا اوستر رأسه یوماً کاملاً۔ قال فی شرح التنویر فی الاقل صدقة ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۵۴۷ کتاب الحج، فصل الجنایات) ؎۲

حالتِ احرام میں سر ڈھانپنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مچھروں سے تنگ آکر اپنے سر کو تمام رات احرام کی چادر میں ڈھانپے رکھا، کیا اس شخص پر دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احرام کی حالت میں مردوں کے لیے سر چھپانا جائز نہیں، البتہ اگر کسی نے تمام رات سر کو ڈھانپے رکھا تو اس پر دم واجب ہے البتہ اگر کسی نے اس سے کم وقت تک سر کو ڈھانپے رکھا تو اس پر صدقہ واجب ہے۔

وفی الهندیة: ولو غطی المحرم رأسه اووجهه یوماً فعلیه دم وان کان اقل من

؎۱ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولم یذکر الذبح هذا الرمی قبل الحلق لانهٗ مفرد فلا یلزم الذبح والا ضحیة علیه لانه مسافر وان کان قارن او متمتع یذبح۔
(الفتاوی التاتارخانیہ ج۲ ص۴۶۴ الفصل الثالث فی تعلیم اعمال الحج)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۱ ص۲۱۳ کتاب الحج ۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیمؒ: وکذا قوله والا تصدق ای وان کان لبس المخیط وتغطیة الرأس اقل من یوم لزمه صدقة ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۶ باب الجنایات)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۴۲ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الثانی فی اللبس ۔

ذٰلك فعليه صدقة ۔ (الفتاوی الہندیہ ج۱ ص۲۴۲ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الثانی فی اللبس) [۱]

حالتِ احرام میں چہرے کو ڈھانکنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے شرعی عذر کے بغیر احرام کی حالت میں پورا ایک دن اپنے چہرے کو ڈھانکا، تو کیا اس پر دم واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حالتِ احرام میں عذر کے بغیر چہرے کو چھپانا جائز نہیں، اگر بلا عذر چہرے یا سر کا چوتھائی یا چوتھائی سے زیادہ حصہ ایک دن یا ایک رات ڈھانکا تو دم واجب ہے ۔

قال ابن عابدینؒ : فی تغطیة کل الوجه او الرأس یوماً اولیلة دم والربع منهما کالکل الخ

(ردّ المحتار ج۲ ص۴۸۸ کتاب الحج مطلب فی یحرم بالاحرام ولا یحرم) [۲]

حالتِ احرام میں عطاری کی دوکان میں بیٹھنا

سوال:۔ حالتِ احرام میں عطاری کیساتھ مصافحہ کرنا یا اسکی دوکان میں بیٹھنا موجبِ دم ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ عطاری کی دوکان میں بیٹھنا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کے بدن پر خوشبو کی ذات یعنی عطر وغیرہ نہ لگے اور اگر عطر وغیرہ اس کو لگ جائے تو زیادہ لگنے سے دم اور معمولی مقدار میں لگ جائے تو صدقہ واجب ہوگا ۔

قال ابن نجیمؒ :۔ ولا بأس ان یجلس فی حانوت عطار ولا فرق ایضاً بین ان یقصده اولا ولذا قال فی المبسوط : وان استلم الرکن فاصاب فمه او یده خلوف کثیر فعلیه دم وان کان قلیلاً فصدقة ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۳ باب الجنایات) [۳]

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : وکذا اذا غطی اربع رأسه یوماً فصاعداً فعلیه دم ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۴۹۵ الفصل الخامس فیما یحرم علی المحرم، نوع منه فی لبس المخیط)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۶ باب الجنایات

[۲] وفی الهندیة : ولو غطی المحرم رأسه اووجهه یوماً فعلیه دم وان کان اقل من ذٰلك فعلیه صدقة ۔ کذا فی الخلاصة ۔ (الفتاوی الہندیہ ج۱ ص۲۴۲ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الثانی فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی تاتارخانیة ج۲ ص۴۹۳ الفصل الخامس، نوع منه فی لبس المخیط ۔

[۳] وفی الهندیة : ولا بأس ان یقعد فی دوکان عطار او موضع یتبخر فیه قبر الا انه یکره ۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۴۲ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الاوّل)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی تاتارخانیة ج۲ ص۵۰۶ الفصل الخامس فیما یحرم علی المحرم ۔ نوع منه فی الدهن والتطیب والخضاب ۔

ذبح اور حلق میں ترتیب

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حکومت سعودی عرب نے قربانی کے گوشت کو محفوظ کرنے کے لیے ایک نئی قربان گاہ قائم کی ہے، بعض حاجی حضرات سہولت کے لیے اپنی قربانی کو دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں یا قربانی کی قیمت بینک میں جمع کرا دیتے ہیں، اس طرح قربانی کا وقت کامل طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس وقت ذبح کی گئی، اب اگر کسی شخص نے حلق کر لیا اور یہ حلق ذبح پر مقدم ہو گیا تو کیا اس مقدم ہونے پر دم واجب ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک ذبح حلق پر مقدم کرنا واجب ہے مؤخر کرنے سے دم واجب ہو گا، اسلئے اگر بینک والوں نے ذبح بعد میں کیا اور حاجی نے حلق پہلے کیا ہو تو دم لازم ہوتا ہے اسلئے بہتر یہ ہے کہ اپنی قربانی خود ذبح کر کے پھر حلق کرے۔

قال ابن نجیمؒ:۔ فان حلق القارن قبل ان یذبح فعلیه دمان عند ابی حنیفةؒ دم بالحلق فی غیر اوانه لان اوانه بعد الذبح و دم بتاخیر الذبح عن الحلق۔

(البحر الرائق ج۲ ص۳۶۱ باب القران) [1]

ترکِ سعی کا دم ایام النحر کے ساتھ مخصوص نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک آدمی آدمی سے واجب سعی ترک ہو جائے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حج وعمرہ میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے ترک کرنے کی صورت میں دم واجب ہو جاتا ہے اور یہ ذبح ہر وقت جائز ہے ایام نحر کے ساتھ مخصوص نہیں کسی کو بھی پیسے دے کر مکہ مکرمہ میں ذبح کیا جا سکتا ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ومن ترك السعی بین الصفا والمروة فعلیه دم وحجة تام وفیها ایضاً یجوز ذبح بقیة الایام فی ای وقت شاء۔ (الهدایة ج۱ ص۲۵۵ باب الجنایات) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ:۔ ثم بعد الرمی ذبح ثم قصر و فی رد المحتار ای او حلق کما دل علیه قوله و حلقه افضل۔ (رد المحتار ج۲ ص۵۱۵ فصل فی الاحرام وصفة الحج مطلب فی رمی العقبة)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۲ ص۳۴۳ باب الجنایات۔

[2] قال فی الهندیة: من ترك السعی بین الصفا والمروة فعلیه دم وحجة تام۔
(الفتاوی الهندیه ج۱ ص۲۴۷ الباب الثامن الجنایات ، فصل خامس فی الطواف والسعی)
ومثلهٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۸۱ باب الهدی۔

طوافِ صدر چھوڑنے پر دم واجب ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طوافِ صدر کے ترک کرنے سے دم واجب ہوتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ طوافِ صدر ترک کرنے سے دم واجب ہوتا ہے، البتہ طوافِ صدر اب بھی کرسکتا ہے، یعنی عمرہ کی نیت کرکے عمرہ ادا کیا جائے تو اس طوافِ عمرہ سے طوافِ صدر ادا ہوجائے گا۔

وفی الھندیۃ: ولو ترك طواف صدر او اکثر تجب علیہ الشاۃ۔
(الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص۲۶۶ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الخامس) [۱]

عورت کے لیے وقوفِ مزدلفہ کا دم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض اعذار کی وجہ سے اگر کوئی عورت وقوفِ مزدلفہ اور رمی نہ کر پائے تو اس پر دم واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ بغیر عذرِ شرعی کے وقوفِ مزدلفہ اور رمی کو ترک کرنا صحیح نہیں چھوٹ جانے کی صورت میں دم لازم ہے، البتہ کسی شرعی عذر کی وجہ سے وقوفِ مزدلفہ اور رمی چھوٹ جانے پر دم واجب نہیں۔

قال العلامۃ الشامی رحمہ اللہ:۔ ثم وقف بمزدلفۃ ووقتہ من طلوع الفجر الی طلوع الشمس ولو مارًا کما فی عرفۃ لکن لو ترکہ بعذر کزحمۃ بمزدلفۃ فلاشئ علیہ۔ قال ابن عابدینؒ: الا اذا کانت لعلۃ اوضعف او یکون امرأۃ تخاف الزحام فلاشئ علیہ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۵۱۱ کتاب الحج، مطلب فی الوقوف بالمزدلفۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ولما کان طواف الصدر واجبًا وجب بترك کلہ او اکثرہ دم۔ (البحرالرائق ج۳ ص۲۱ باب الجنایات)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۲ ص۵۵۵ باب الجنایات۔

[۲] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: اراد بالترك الترك لغیر عذر اما اذا ترك واجبًا لعذر فانہ لاشئ علیہ۔ (البحرالرائق ج۳ ص۲۳ باب الجنایات)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۲۴۷ الباب الثامن فی الجنایات، الفصل الخامس۔

دمِ جنایت زمینِ حرم سے خاص ہے

سوال:۔ ایک شخص پر ترکِ رمی کی وجہ سے دَم واجب ہُوا اُس کا ذبح کرنا کہاں ضروری ہے ؟

الجواب:۔ دمِ جنایت زمینِ حرم سے خاص ہے خواہ منیٰ ہو یا مکہ مکرمہ، لیکن حرم کی زمین ضروری ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ:۔ ولا يجوز ذبح الهدايا الا في الحرم لقوله تعالىٰ: في جزاء الصيد هديًا بالغ الكعبة فصار اصلا في كل دم ۔ (الہدایہ ج۱ ص۲۸۱ باب الہدی) [1]

بلا احرام میقات سے تجاوز کرکے پھر عود کرنا

سوال:۔ ایک شخص جو آفاقی ہے ماہ شوال میں حج کے لیے آیا اور میقات سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت کر لی، اس کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا پھر مکہ مکرمہ میں بغیر احرام داخل ہُوا تو کیا اس آدمی پر دم واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اس آفاقی پر دونوں صورتوں میں دم واجب نہیں، پہلی صورت میں اس وجہ سے کہ ابتداء میں اس نے عمرہ کا احرام میقات سے باندھا ہے تو تجاوز میقات سے بلا احرام نہ پایا گیا اور مدینہ منوّرہ جانے میں تجاوز میقات سے بلا احرام پایا گیا ہے لیکن پھر عود کرکے واپس مکہ مکرمہ میں داخل ہُوا ہے اور حج کا احرام زمینِ حرم سے باندھا ہے اسلئے دم ساقط ہُوا ہے ۔

وفي الهندية: فان عاد حلالاً ثم احرم سقط عنه الدم۔

(الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۲۵۳ الباب العاشر في مجاوزة الميقات بغير احرام) [2]

آفاقی شخص کا زیارتِ نبوی کیلئے بغیر احرام جانا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آفاقی شخص

---

[1] وفي الهندية: ولا يجوز ذبح الهدايا الا في الحرم۔ (الفتاوىٰ الہندیہ ج۱ ص۲۶۱ - الباب السادس عشر في الهدی)

ومثلهٗ في التاتارخانية ج۲ ص۵۳۶ الفصل الحادي عشر في الاحصار ۔

[2] قال الشيخ ابن نجيم المصري ؒ: ومن جاوز آخر المواقيت بغير احرام ثم عاد اليه وهو محرم ولبّى فيه فقد سقط عنه الدم اللازم له بالمجاوزة بغير احرام ۔

(البحر الرائق ج۳ ص۴۸ باب مجاوزة الميقات بغير احرام)

ومثلهٗ في التاتارخانية ج۲ ص۴۷۶ الفصل الرابع في بيان مواقيت الاحرام ۔

مکہ مکرمہ آیا اور وہاں اقامت کی نیّت کر کے شوال میں مدینہ منورہ زیارتِ روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چلا گیا پھر ذوالحلیفہ سے عمرہ کے لیے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ آیا، تو کیا اس شخص پر دم واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب: مواقیت سے بلا احرام تجاوز کرتے ہوئے حج وعمرہ کے لیے جانا جائز نہیں، چونکہ اس شخص نے میقات سے تجاوز حج یا عمرہ کے لیے نہیں بلکہ زیارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا ہے اس لیے ایسا کرنے سے اس پر کوئی دم وغیرہ لازم نہیں ہوا۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله کمکی یرید الحج) اما لو خرج الی الحل لحاجة فاحرم منه ووقف بعرفة فلا شیٔ علیه کالآفاقی اذا جاوز المیقات قاصداً البستان ثم احرم منه۔

(ردّ المحتار ج ۲ ص۵۸۱ باب الجنایات، مطلب لا یجب الضمان بکسر الات اللهو) [1]

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے

جدّہ جانے والے کے لیے میقات سے بلا احرام تجاوز کرنا

میں کہ ایک شخص جدّہ جانے کا قصد کرتا ہے تو کیا وہ میقات سے بغیر احرام کے گذر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگر کوئی شخص ہوائی جہاز سے صرف جدّہ تک سفر کا قصد رکھتا ہو تو وہ میقات سے بلا احرام تجاوز کر سکتا اور اس شخص پر کوئی دم لازم نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: اما لو قصد موضعا من الحل کخلیص وجدة حل له مجاوزته بلا احرام۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۴۷۷ مطلب فی المواقیت) [2]

---

[1] قال الشیخ ابن الهمام رحمه الله: لانه خرج الی الحل لحاجة فاحرم منه ووقف بعرفة فلا شیٔ علیه کالآفاقی اذا جاوز المیقات قاصداً للبستان ثم احرم منه...... التمتع بما اذا خرج لحاجة الی الحل ثم احرم بالحج منه لا یجب علیه شیٔ کالمکی۔

(فتح القدیر ج۳ ص۴۴ باب مجاوزة المیقات بغیر احرام)

ومثله فی التاتارخانیة ج۲ ص۴۷۶ الفصل الرابع فیما یلزم لمجاوزة المیقات بغیر احرام۔

[2] قال ابن العلاء الانصاریؒ: رجل دخل بستان بنی عامر وفی التجرید وبستان بنی عامر لحاجة فله ان یدخلها مکة بغیر احرام۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۲ ص۴۷۷ الفصل الرابع ما یخرج علی المحرم)

میقات میں تلبیہ بھول جانے پر دم کا وجوب

سوال:۔ ایک آدمی نے میقات سے عمرہ و حج وعمرہ کے لیے احرام باندھا اور تلبیہ پڑھنا بھول گیا اور میقات میں داخل ہونے کے بعد تلبیہ شروع کیا تو کیا اس آدمی پر دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: شرعی قواعد کی رو سے اس آدمی پر دم واجب ہے کیونکہ صرف نیت کرنا اور بغیر تلبیہ کے احرام میں داخل ہونا غیر ظاہر روایت ہے، پس اس آدمی پر ضروری ہے کہ دوسرے شخص کے ذریعے حدودِ حرم میں ذبح کرائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (وجاوز وقتہ) ظاهر ما فی النهر عن البدائع اعتبار الارادة عند المجاوزة (ثم احرم) لزمه دم کما اذا لم یحرم۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج ۲ ص۵۲۹ باب الجنایات)[1]

طوافِ زیارت سے پہلے بیوی سے جماع حرام ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی سے طوافِ رہ جائے تو طوافِ زیارت ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جماع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طوافِ زیارت ادا کرنے سے پہلے بیوی سے جماع کرنا حرام ہے، اگر حلق کے بعد اور طواف سے پہلے جماع کرے تو دم لازم ہوگا، اور اگر حلق وطواف دونوں سے پہلے اور وقوفِ عرفہ کے بعد کرے تو ایک بدنہ (یعنی اونٹ ذبح کرنا) واجب ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وطؤہ بعد وقوفه لم یفسد حجه وتجب بدنة وبعد الحلق قبل الطواف شاة لخفة الجنایة۔ قال ابن عابدینؒ: بعد وقوفه ای قبل الحلق والطواف۔

(رد المختار ج۲ ص۵۶۱ باب الجنایات۔ کتاب الحج)[2]

---

[1] لما فی الهندیة: اذا دخل الآفاقی مکة بغیر احرام وهو لا یرید الحج والعمرة فعلیه لدخول مکة اما حجة او عمرة فان احرم بالحج او العمرة من غیر ان یرجع الی المیقات فعلیه دم لترك حق المیقات۔ (الفتاوى الهندیة ج۱ ص۲۵۳ الباب العاشر فی مجاوزة المیقات بغیر احرام)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۴۸ باب مجاوزة المیقات بغیر احرام۔

[2] لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ومن جامع بعد الوقوف بعرفة لم یفسد حجه وعلیه بدنة۔۔۔۔ وان جامع بعد الحلق فعلیه شاة لبقاء احرامه فی حق النساء دون لبس المخیط۔۔۔ (الهدایة ج۱ ص۲۵۱، ۲۵۲ کتاب الحج، باب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۴۵ الباب الثامن فی الجنایات۔ الفصل الرابع فی الجماع۔

عینک کے ساتھ حج کرنا درست ہے

سوال:۔ اگر کسی شخص کی آنکھیں خراب ہوں تو کیا وہ چشمہ لگا کر حج کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احرام کی حالت میں پورے چہرے کا چھپانا ممنوع ہے اور چشمہ سے چونکہ چہرہ نہیں چھپتا ہے لہٰذا چشمہ لگا کر حج کرنا جائز ہے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: لگا سکتا ہے۔ (امداد الاحکام ج۲ ص۱۸۰) [1]

احرام کی حالت میں خوشبودار پان کھانے کا مسئلہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص پان کھانے کا عادی ہو اور وہ احرام کی حالت میں خوشبودار پان کھائے تو کیا اس سے دم لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ خوشبودار چیز کسی اور کھانے والی شئے میں پکا کر یا بغیر پکائے استعمال کی جائے تو اگر خوشبودار چیز مغلوب ہو جائے تو اس چیز کے کھانے سے دم لازم نہیں آتا مگر کراہت سے خالی بھی نہیں اور اگر خوشبودار شئے غالب ہو تو اس کے کھانے کی صورت میں دم ضرور لازم ہوگا، لہٰذا پان میں چونکہ خوشبودار چیز مغلوب ہوتی ہے اس لیے پان کھاتے سے دم تو لازم نہیں ہوتا مگر ایسا کرنا مکروہ ضرور ہے، بہتر یہ ہے کہ احرام کی حالت میں پان میں خوشبودار چیز استعمال نہ کی جائے۔

وفی الهندية: ولو كان الطيب فی طعام طبخ وتغير فلا شئ علی المحرم فی اكله سواء يوجد رائحته اولا كذا فی البدائع وان خلطه بما يوكل بلا طبخ فان كان مغلوبا فلا شئ عليه غير انه ان وجدت معه الرائحة كره وان كان غالبا وجب الجزاء۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۲۴۱ الباب الثامن فی الجنايات) [2]

✠✠

---

[1] لما قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ:۔ سوال: محرم چشمہ لگا سکتا ہے یا نہیں؟ جواب: لگا سکتا ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۶ ص۵۵۴ مسائل جنایات)

[2] قال العلامۃ الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: پان چونکہ داخل طیب نہیں بلکہ موجب زینت ہے منافی احرام نہیں اور الائچی اور مثل اس کے طیب ضرور ہیں مگر چونکہ پان و تمباکو میں مغلوب ہیں لہٰذا وہ بھی جنایت نہیں گو خالی از کراہت بھی نہیں۔ اھ

(امداد الفتاویٰ ج۲ ص۱۶۲ باب الاحرام)

دورانِ حج خرید و فروخت کرنا جائز ہے

سوال:۔ جو شخص حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جائے تو کیا وہ وہاں حج کے دوران تجارت یعنی خرید و فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں منٰی وغیرہ کے مقامات میں بازار لگتے تھے تو جو لوگ حج کے لیے آتے تھے وہ حج کے ساتھ ساتھ خرید و فروخت بھی کرتے تھے، قرآنِ کریم نے بھی اس کے جواز کا حکم دیا ہے، یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ سفر صرف حج کی نیت سے ہونا چاہیئے اور اگر یہ سفر تجارت کی غرض سے ہو تو حج ادا نہ ہوگا۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۸) [1]

حدودِ حرم سے باہر حلق یا قصر کرکے احرام سے نکلنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص عمرہ کا احرام باندھے، طواف اور سعی کے بعد حلق نہ کرے اور حدودِ حرم سے باہر چلا جائے اور وہاں یا دآنے پر حلق کرکے احرام کھول دے تو کیا اس شخص پر دم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ احرام سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ حلق یا قصر حدودِ حرم کے اندر کیا جائے، اگر کوئی محرم حالتِ احرام میں حدودِ حرم سے باہر جاکر حلق یا قصر کرکے احرام سے نکلے تو اس پر دم لازم ہوگا اور اُس دم کو حدودِ حرم کے اندر ذبح کرنا لازم ہوگا۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واعتمر فخرج من الحرم وقصر فعلیہ دم عندھما۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۲۵ کتاب الحج)

❋ ❋

---

[1] قال ابوبکر الجصاص الحنفی رحمہ اللہ ... حتّٰی قال فی جوازہ بعد ذکر الدلائل وجمیع ذٰلك یدل علی ان الحج لا یمنع التجارۃ وعلی ھذا امر الناس من عصر النبی علیہ السلام الی یومنا ھٰذا فی مواسم منٰی ومکۃ فی ایام الحج۔ واللہ اعلم ــــ وکذا قال محمد بن احمد الانصاری القرطبی فی تفسیرہ احکام القرآن ج۳ ص۴۱۳۔ (احکام القرآن ج۱ ص۳۲۵ باب التجارۃ فی الحج)

باب الهدی

(قربانی کے احکام ومسائل)

قارن یا مُتمتع کا اپنی قربانی سے گوشت کھانا | **سوال:**۔ کیا مُتمتع اور قارن اپنی قربانی سے گوشت کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں دمِ تمتع اور دمِ قران دمِ شکر ہے اور اس کے گوشت کا حکم بھی عام قربانی کی طرح ہے یعنی جس طرح اضحیۃ سے مالک خود کھا سکتا ہے اسی طرح دمِ قران اور دمِ تمتع سے بھی کھا سکتا ہے بلکہ اوروں کو بھی کھلایا جا سکتا ہے۔

قال الشیخ وهبة الزحیلی : ویری الحنفیة انه یجوز الأکل من هدی التطوع والتمتع والقِران اذا بلغ الهدی محله لانه دم نسك فیجوز الأکل منه بمنزلة الاضحیة وما جاز لصاحبه الأکل منه جاز للغنی الأکل منه۔

(الفقه الاسلامی وادلّته ج۳ ص۳۰۳ باب الهدی رابعا الأکل من الهدی)[1]

دمِ جنایت سے خود کھانا جائز نہیں | **سوال:**۔ دمِ جنایات مثلاً احرام میں خوشبو لگانے یا تقدیم وتاخیر وغیرہ سے جو دم لازم آتا ہے حاجی کا اس سے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ قربانی (دم) جو کسی جنایت کی وجہ سے حاجی پر لازم ہو جائے یا وہ خود اس کو اپنے اوپر لازم کرلے تو اس قربانی کا استعمال (کھانا وغیرہ) خود حاجی اور اغنیاء دونوں کے لیے حرام ہے بلکہ صرف فقراء ہی اس سے کھا سکتے ہیں۔

قال الشیخ وهبة الزحیلی: ولا یجوز الأکل من بقیة الهدایا کدماء الکفارات والنذور وهدی الاحصار والتطوع اذا لم یبلغ محله و

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: یجوز الأکل من هدی التطوع والمتعة والقِران ویستحب له ان یأکل منها۔ (الهدایة ج۱ ص۲۸۰ کتاب الحج)
وَمِثلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۸۹ باب الهدی۔

محله منیٰ او مکة ۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۳ ص۳۰۳ باب الهدی رابعاً الأکل من الهدی)[1]

حرم کی حدود میں تحلیل کے لیے یوم النحر سے قبل ذبح کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد کسی عذرِ شرعی کی وجہ سے حج کے لیے نہ جا سکے اور وہ تحلیل کے لیے حرم کی حدود میں یوم نحر سے قبل جانور ذبح کرے تو کیا یہ آدمی ایسا کرنے سے حلال ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دمِ احصار کے ذبح کے لیے صرف حرم کی حدود کا ہونا ضروری ہے اگرچہ یوم نحر سے قبل ہو، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس محصر کا احرام سے حلال ہونا درست ہے۔

قال الشیخ وهبة الزحیلی : فیجوز عند ابی حنیفةؒ ذبح الهدی قبل یوم النحر لاطلاق النص ولأنه لتعجیل التحلل۔ وقال الصاحبان لایجوز الذبح للمحصر بالحج الّا فی یوم النحر کدم التمتع والقِران وعلی الرای الاوّل هو الراجح یکون زمان ذبح الهدی مطلق الوقت لایتوقف بیوم النحر سواء کان الإحصار من الحج أم عَنِ العُمْرَةِ ۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۳ ص۲۹۲ باب الهدی ۔ امازمان ذبح الهدی)[2]

حج سے واپسی کے بعد دم اپنے وطن میں ادا کرنا

سوال:۔ اگر کسی شخص پر دم لازم آئے اور اس کے پاس قربانی کے لیے پیسے نہ ہوں تو کیا یہ شخص واپس آکر اپنے وطن میں دم دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو قربانی (دم) ایامِ حج میں حج کی وجہ سے یا جنایات کی وجہ سے حاجی پر

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ :۔ ولایجوز الأکل من بقیة الهدایا لانها دماء کفاراتٍ ۔ (الهدایة ج ۱ ص۲۸۰ کتاب الحج ۔ باب الهدی)
وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج ۲ ص۸۹ کتاب الحج ۔ باب الهدی۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ :۔ ولایجوز دم الاحصار الا فی الحرم ویجوز ذبحه قبل یوم النحر عند ابی حنیفةؒ وقالا لایجوز الذبح للمحصر بالحج الا فی یوم النحر۔ (الهدایة علی صدر فتح القدیر ج ۳ ص۵۵ باب الاحصار)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۵۶ الباب الثانی عشر فی الاحصار۔

لازم آئے تو ان ھدایا کا حدودِ حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے، حدودِ حرم سے باہر اُن کا ذبح کرنا جائز نہیں، اس لیے یہ شخص اپنے وطن میں ذبح کرنے کے بجائے حرم میں ہی ذبح کرے گا۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ولا یجوز ذبح الھدایا الا فی الحرم لأن الھدی اسم لما یھدی الی مکان ومکانہ الحرم۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج۳ ص۳۰۷ خامساً مکان ذبح الھدی)[1]

دمِ جنایات کے لیے وقت یا دن کا مشروط ہونا

سوال:۔ کیا دمِ جنایات کے لیے کوئی وقت یا دن شرعاً مقرر ہے یا کہ جس وقت اور جب چاہے ادا کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ حج میں نقصان کے جبیرہ (ازالہ) کے لیے جو دم لازم ہوتا ہے شرعاً اس کے ادا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ حاجی جب اور جس وقت چاہے ادا کر سکتا ہے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ویجوز ذبح بقیۃ الھدایا ای وقت شاء لانہا دماء کفارات فلا یختص بیوم النحر لانہا وجبت لجبر النقصان۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۳ ص۳۰۷ خامساً مکان ذبح الھدی وزمانہ)[2]

منیٰ میں قربانی پر عدمِ قدرت کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

سوال:۔ اگر حاجی منیٰ میں قربانی کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیئے، شرعاً اس کا کوئی بدل ہے؟

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: لایجوز ذبح الھدایا الا فی الحرم۔ لقولہ تعالیٰ: فِیْ جَزَاءِ الصَّیْدِ ھَدْیًا بَالِغَ الْکَعْبَۃِ ..... ولان الھدی اسم لما یھدیٰ الی مکانٍ و مکانہ الحرم۔ (الھدایۃ ج۱ ص۲۸۱ باب الھدی)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۹۰ باب الھدی۔

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ویجوز ذبح بقیۃ الھدایا فی أی وقت شاء ولنا ان ھذہ دماء کفارات ولا یختص بیوم النحر لانہا لما وجبت بجبر النقصان کان التعجیل بہا أولیٰ لارتفاع النقصان بہ من غیر تأخیر بخلاف دم المتعۃ والقِران لانہٗ دم نسک۔

(الھدایۃ ج۱ ص۲۸۱ کتاب الحج، فصل فی الھدی)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۶۱ الباب السادس عشر فی الھدی۔

الجواب: منیٰ میں قربانی پر عدم قدرت کی وجہ سے قربانی کے بدلے میں ایامِ حج میں تین روزے اور حج سے فارغ ہوکر گھر آجانے کے بعد سات روزے رکھنے لازمی ہیں، یاد رہے کہ یہاں عدم قدرت سے مراد منیٰ میں قربانی کرنے پر قادر نہ ہونا ہے اگرچہ اپنے وطن میں قادر ہو۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فان لم یجد المتمتع الھدی ینتقل الی صیام ثلاثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجع الی وطنه وتعتبر القدرۃ علی الھدی فی موضعه فمتی عدمه فی موضعه جاز له الانتقال الی الصیام وان کان قادراً علیه فی بلدہ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۳ ص۳۰۲ باب الھدی)[1]

بینک کے ذریعے قربانی کرنا جائز ہے

سوال: آجکل بعض حجاج حکومتی بینکوں میں قربانی کے پیسے جمع کرادیتے ہیں اور بینک والے اُن کی طرف سے قربانی کرتے ہیں، جبکہ اس طریقہ میں تقدیم وتاخیر اور نہ کرنے کا خطرہ بھی رہتا ہے، توکیا ان شبہات کے ہوتے ہوئے بینک کے ذریعے قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قربانی کرنا ایسا عمل ہے جس میں نیابت درست ہے اس لیے بینک کی معرفت قربانی کرنے سے قربانی کا فریضہ ادا ہوجائے گا، مگر اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حلق اور قربانی میں تقدیم وتاخیر نہ ہو ورنہ حنفیہ کے نزدیک دمِ جنایت لازم آئے گا، اسی طرح قربانی میں جانور کا ذبح کرنا ضروری ہے صرف قربانی کے پیسے جمع کرادینے سے ذمہ فارغ نہ ہوگا، لہٰذا مذکورہ شبہات کے ہوتے ہوئے بینک کے ذریعے قربانی نہ کرائی جائے بلکہ خود قربانی کرکے حلال ہوجائے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: والاولی بالاتفاق ان یتولی الانسان ذبح الھدی بنفسه ان کان یحسن ذلك لانه قربۃ والعمل بنفسه فی القربات اولی لما فیه من زیادۃ الخشوع..... وان ذبح الھدی غیر صاحبه اجزأہ والمستحب ان یشھد ذبحه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۳ ص۳۰۹ باب الھدی، سادساً ذبح الھدی)[2]

---

[1] قال اللّٰه تبارك وتعالیٰ: فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۶)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۳۸۵ کتاب الحج۔ تفسیر الھدی۔

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی: والاولی ان یتولی ذبحها بنفسه اذا کان یحسن ذلك..... الا ان الانسان قد لایھتدی لذلك ولا یحسنه فجوزناہ تولیۃ غیرہ۔ (الھدایۃ ج۱ ص۲۸۱ باب الھدی)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۹ باب الھدی۔

باب العمرة
(عمرہ کے مسائل واحکام)

عمرہ کے بعد سر منڈانے کا حکم

سوال: عمرہ ادا کرنے کے بعد سر کو منڈانا ضروری ہے یا نہیں اگر سر نہ منڈائے تو کیا گنہگار ہوگا؟

الجواب: عمرہ میں بقاعدہ حلق یا تقصیر واجب ہے اس کو ترک کرنا یا حرم سے باہر جاکر حلق کرنا موجب دم ہے۔
کما فی الهندیة: اما واجباتها فالسعی بین الصفا والمروة والحلق او التقصیر۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۲۳۷)
وقال ایضاً: وتجب شاة بتاخیر النسك عن مكانه كما اذا خرج من الحرم وحلق رأسه سواء كان الحلق للحج او للعمرة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۲۴۷۔ الباب الثامن فی الجنایات۔ الفصل الخامس) [۱]

متعدد عمرے کرنے کی صورت میں حلق کیسے کیا جائے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے عمرہ کرنے کے بعد حلق کر لیا، اس کے بعد جب دوسرا عمرہ کیا تو چونکہ اس کا سر پہلے سے محلوق تھا، اب یہ شخص کیا کرے، سر پر استرہ پھیرلے یا ویسے ہی چھوڑ دے؟

الجواب: جب ایک عمرہ ادا کرنے کے بعد حلق کر لیا جائے تو دوسرے اور تیسرے عمرے کی ادائیگی کے بعد سر پر صرف استرہ ہی پھیر دے جو کہ قائم مقام حلق کے ہوگا۔
قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا جاء وقت الحلق ولم یکن علیٰ رأسه شعر بان کان حلق قبل ذلك اوبسبب آخر ذکر فی الاصل انه یجری موسیٰ علیٰ رأسه۔ (الفتاویٰ تاتارخانیة ج ۲ ص ۵۴۳ الفصل الرابع عشر فی الحلق والقصر) [۲]

---

[۱] قال الحصکفیؒ: وغیرهما واجب وفی ردّ المحتار: اراد بالغیر من المذکورات هنا وذلك اقل اشواط الطواف والسعی والحلق او التقصیر۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۴۷۳ کتاب الحج، مطلب فی احکام العمرة)
ومثله فی تاتارخانیة ج ۲ ص ۵۲۶ الفصل الثامن فی بیان وقت الحج والعمرة۔

[۲] قال فی الهندیة: واذا جاء وقت الحلق ولم یکن علیٰ رأسه شعر بان کان حلق قبل ذلك او بسبب آخر ذکر فی الاصل انه یجری موسیٰ علیٰ رأسه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۲۳۱ الباب الثالث فی الاحرام۔)

عمرہ اور مزدوری

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید عمرہ کے ویزہ سے سعودی عرب جانا چاہتا ہے، عمرہ کے بعد اگر وہ وہاں مزدوری کرے تو کیا اسلام میں یہ اقدام جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ طریقۂ کار قانونی جرم تو ہے اسلامی جرم نہیں، جیسا کہ حج وعمرہ کے لیے جاتے وقت تجارت کا ارادہ کرنا اسلامی جرم نہیں، اس لیے زید کا عمرہ کے ویزہ سے سعودی عرب جانے کے بعد وہاں مزدوری کرنا درست ہے۔

کما فی قوله تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ قال ابن العربیؒ: ای فی مواسم الحج المسئلة الثانیة فی هٰذا دلیل علی جواز التجارة فی الحج للحاج مع اداء العبادة۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۳۶ سورة البقرة)[1]

بسلسلہ مزدوری جدّہ جانے والے پر عمرہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک شخص جدّہ میں ملازمت کے سلسلہ میں رہتا ہے تو کیا اس پر عمرہ کرنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جدّہ چونکہ حرم کعبہ کی حدود سے خارج ہے اور خارج حرم میں جانے سے عمرہ واجب نہیں ہوتا، لہٰذا جدّہ جانے والے پر عمرہ واجب نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: اما لو قصد موضعاً من الحل کخلیص وجدة حل له مجاوزته بلا احرام۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص ۴۷۷ کتاب الحج، مطلب فی المواقیت)[2]

حج کی بجائے عمرہ ادا کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص پر حج فرض ہے لیکن اس نے حج کی بجائے عمرہ

---

[1] قال الشیخ ابن نجیمؒ: و تجرید السفر عن التجارة احسن ولو اتجر لاینقص ثوابه کالغازی۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۰۹ کتاب الحج)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۲۲۰ کتاب المناسك، الباب الاول فی تفسیر الحج۔

[2] قال العلامة العالم بن العلاء الانصاریؒ: رجل دخل بستان بنی عامر وفی التجرید وغیره لحاجته فله ان یدخل مکة بغیر احرام۔ (الفتاوٰی التاتارخانیة ج ۲ ص ۴۷۷ الفصل الرابع فی ما یحرم علی المحرم)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۲۲۱ الباب الثانی فی المواقیت۔

ادا کیا، تو کیا اس سے فریضۂ حج ساقط ہوا یا نہیں؟

الجواب:۔ حج ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جو خاص وقت میں مخصوص مقامات کی زیارت وافعال کا نام ہے اسلئے عمرہ ادا کرلینے سے حج کا فریضہ ساقط نہیں ہوتا بلکہ ایسا کرنے والے کو حج کرنا ضروری ورنہ مستحقِ وعید ہے۔

عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ملک زادا وراحلۃ تبلغہ الی بیت اللہ ولم یحج فلا علیہ ان یموت یھودیًا اونصرانیًا۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۲۲ کتاب الحج)[۱]

دن میں متعدد عمرے کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا ایک دن میں ایک سے زائد عمرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عمرہ کی ادائیگی کے لئے شریعتِ مقدسہ نے کسی وقت یا تعداد کا تعین نہیں کیا بلکہ ایک شخص دن میں جتنے عمرے ادا کرسکتا ہے کرلے اس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

وفی الھندیۃ: ووقتھا جمیع السنۃ الا فی خمسۃ ایام تکرہ فیھا العمرۃ لغیر قارن واما رکنھا فالطواف واما واجبتھا فالسعی بین الصفا والمروۃ والحلق او التقصیر۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۳۷ الباب السادس فی العمرۃ)[۲]

شوال اور ذیقعدہ میں عمرہ ادا کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اشہرِ حج میں عمرہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر کسی نے عمرہ کرلیا تو کیا اس پر دم لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ ایامِ تشریق، عرفہ اور عید کے دن کے علاوہ تمام سال میں عمرہ کرنا جائز ہے چاہے اشہرِ حج ہوں یا غیر اشہرِ حج۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ووقت العمرۃ السنۃ کلھا۔ وفی الھدایۃ والعمرۃ

---

[۱] قال ابن الھمامؒ: یشترط نوعان ولو ملکہ مسلمًا فلم یحج حتی افتقر حیث یتقرر الحج فی ذمتہ دینا علیہ۔ (فتح القدیر ج ۲ ص۳۲۰ کتاب الحج)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۲۱۷ الباب الاول فی تفسیر الحج۔

[۲] لما قال الحصکفیؒ: وھی احرام وطواف وسعی وحلق او تقصیرٌ فالاحرام شرط .... وجازت فی کل سنۃٍ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۷۲، ۴۷۳ مطلب فی احکام العمرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۲ ص۵۲۵ الفصل الثامن فی بیان وقت الحج والعمرۃ۔

لا تفوت ولکن تکرہ فی یوم عرفۃ وایام التشریق۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۲۵ الفصل الثامن فی بیان وقت الحج والعمرۃ) [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں کوئی عمرہ نہیں کیا

سوال:۔ کیا رمضان شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ ادا فرمایا ہے، اگر ادا فرمایا ہے تو وہ رمضان شریف کی کون سی تاریخ تھی؟

الجواب:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف میں کوئی عمرہ نہیں کیا ہے، البتہ رمضان شریف میں عمرہ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

قال البراء ابن عازب: اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرتین قبل ان یحج فلم یحتسب لعمرۃ الحدیبیۃ کذا فی الصحیحین وکلھن فی ذیقعدۃ علیٰ ما ھو الحق۔ (فتح القدیر ج۳ ص۱۳۷ باب العمرۃ) [2]

زندہ آدمی کیلئے طواف اور عمرہ کرنا

سوال:۔ عمرہ اور طواف کا ثواب اگر کسی زندہ آدمی کو بخشا جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زندہ آدمی کے لیے عمرہ اور طواف کا ثواب بخشا جائز ہے اس کی مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذہ العبارۃ بعبادۃ ما لہ جعل ثوابھا لغیرہ ای سواء کانت صلوٰۃ او صوماً او صدقۃ او قرأۃ او ذکراً او طوافاً او حجاً او عمرۃً او غیر ذلک۔ (ردالمحتار ج۲ ص۵۹۵ مطلب فی اھداء ثواب الاعمال للغیر) [3]

---

[1] قال الحصکفیؒ: (وجازت کل سنۃ) وندبت فی رمضان (وکرھت) تحریماً یوم عرفۃ واربعۃ بعدھا۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۲ ص۴۷۳ مطلب احکام العمرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۳۷ الباب السادس فی العمرۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وندب فی رمضان وقد اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اربع عمرات کلھن بعد الھجرۃ فی ذیقعدۃ علیٰ ما ھو الحق وتمام فیہ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۴۷۳ مطلب احکام العمرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۲ ص۵۲۶ کتاب الحج۔ باب العمرۃ۔

[3] قال ابن نجیمؒ: فان من صام او صلیٰ او تصدق وجعل ثوابہ لغیرہ من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابھا الیھم عند اھل السنۃ والجماعۃ، کذا فی البدائع۔ (البحر الرائق ج۳ ص۵۹ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر۔

حج بدل کے بعد کسی کے ایصالِ ثواب کیلئے عمرہ کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی حج بدل کے لیے گیا، حج بدل ادا کرنے کے بعد اُس نے اپنے والد مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے عمرہ ادا کیا، تو کیا اس کا یہ عمرہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:- حج بدل کرنے والے پر ادائیگیٔ حج تک اپنے آمر کے فرمان کے مطابق ارکانِ حج ادا کرنے لازمی ہیں تاکہ آمر کے حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے، صورتِ مسئولہ میں اُس نے چونکہ پہلے حج بدل ادا کیا اور پھر ایصالِ ثواب کیلئے عمرہ کیا اس طرح اس نے آمر کے حکم کی مخالفت نہیں کی اس لیے اس کا یہ عُمرہ صحیح ہے۔

قال عالم بن العلا الانصاریؒ: ابن سماعة عن محمدؒ لا المأمور بالحج اذا حج عن الآمر ثم احرم بعمرة ينفق من مال نفسه ما دام معتمرًا فاذا انصرف من مال آمر۔ (الفتاوىٰ التاتارخانية ج۲ ص۵۴۷ الفصل الخامس عشر فی الرجل یحج عن الغیر) [1]

بیوی کی طرف سے عُمرہ کرنا

سوال:- کیا صحت مند آدمی کی طرف سے عمرہ ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں، بیوی کی طرف سے خاوند کے عمرہ ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- عمرہ اور نفلی حج ہر شخص چاہے صحت مند ہو یا غیر صحت مند، اور بیوی یا کسی اور خاتون کی طرف سے ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: بعبادة ماله جعل ثوابها لغير (ای سواء کانت صلوٰة اوصومًا او صدقة او قراءة اوذکرًا او طوافًا او عُمرةً وغير ذلك۔

(ردالمحتار ج۲ ص۵۹۵ مطلب فی اِهدَاء ثواب الاعمال للغیر) [2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: ولو امره بالعُمرة فاعتمر ثم حج عن نفسه لم یکن مخالفًا بخلاف ما اذا حج اولًا ثم اعتمر۔ (ردالمحتار ج۲ ص۶۰۲ مطلب شروط الحج عن الغیر عشرون)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۶۳ باب الحج عن الغیر۔

[2] قال ابن نجیمؒ: فان من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنة والجماعة کذا فی البدائع۔

(البحرالرائق ج۳ ص۵۹ باب الحج عن الغیر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۵۷ الباب الرابع عشر فی الحج عن الغیر۔

عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد تلبیہ کتنی مرتبہ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:۔ عمرہ کے لیے احرام باندھنے کے بعد کتنی مرتبہ تلبیہ پڑھنا چاہیئے، کیا شرعاً اس کے لیے کوئی تعداد مقرر ہے؟

الجواب:۔ عمرہ یا حج کے لیے احرام باندھنے کی نیت کرنے کے بعد ایک مرتبہ تلبیہ پڑھنا شرط ہے اور تین مرتبہ پڑھنا مستحب امر ہے۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: ثم لبی دبر صلوته ناویًا بها الحج وھی لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك۔ وزاد فیها ولا تنقص۔ قال شارح التنویر: (ولا تنقص) ای منها فانها مکروه ای تحریما لقولهم انها مرة شرط والزیادة سنة ویکون مسیئا بترکها وبترك رفع الصوت بها۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۲ ص۴۸۲ فصل فی الاحرام)[1]

عمرہ فرض ہے یا واجب یا سنّت؟

سوال:۔ عُمرہ فی نفسہٖ کیا حکم رکھتا ہے، فرض ہے یا واجب یا سنت ہے؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں زندگی میں ایک بار عمرہ کرنا سُنتِ مؤکدہ ہے فرض نہیں۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائریؒ: المالکیة والحنفیة قالوا العمرة سُنة مؤکدة فی العمر مرة لا فرض لقوله صلی اللہ علیه وسلم الحج مکتوب والعمرة تطوع۔

(کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج۱ ص۶۸۴ مبحث العمرة)[2]

---

[1] لما فی الهندیة: وله رکن وشرط (فالرکن) ان یوجد منه فعل من خصائص الحج وهو نوعان (احدهما قول) بان یقول لبیك اللّٰهم لبیك، لبیك لا شریك لك .... الخ وھی مرة شرط والزیادة سنة۔ الخ

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۲۲،۲۲۱ کتاب المناسك۔ باب الثالث فی الاحرام)

[2] وفی الهندیة: العمرة عندنا سنة ولیست بواجبة ویجوز تکرارها فی السنة الواحدة (ووقتها) جمیع السنة الا خمسة ایام وتکره فیها العمرة لغیر القارن کذا فی فتاوی قاضیخان، وھی یوم عرفة ویوم النحر وایام التشریق والاظهر من المذهب ما ذکرنا ولکن مع هذا لو اداها فی هذه الایام صح ویبقی محرما بها فیها کذا فی الهدایة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۳۷ الباب السادس فی العمرة)

ومثلهٗ فی رد المحتار ج۲ ص۱۵۱ مطلب احکام العمرة۔

کن ایام میں عمرہ کرنا منع ہے؟

سوال:۔ سال کے کون کون سے دنوں میں عمرہ کرنا جائز نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں عمرہ سال بھر میں صرف پانچ دن کرنا مکروہ ہے:(۱) یوم العرفہ (۲) یوم النحر (۳) اور عید الضحیٰ کے بعد تین دن۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائریؒ: قال الحنفیۃ: یکرہ الاحرام بالعمرۃ تحریماً فی یوم عرفۃ قبل الزوال وبعدہ علی الراجح وکذلک یکرہ الاحرام بہا فی یوم عید النحر وثلاثۃ ایام بعدہ۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص۶۸۵ کتاب الحج، ارکان العمرۃ) [1]

عمرہ کے کتنے ارکان ہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص عمرہ کرنا چاہتا ہو تو اس کیلئے کیا کیا کرنا ضروری ہے یعنی عمرہ کے ارکان کیا ہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں عمرہ کے لیے ایک رکن (طواف) ایک شرط (احرام) اور سعی بین الصفا والمروۃ اور حلق یا قصر واجبات میں شامل ہیں، عمرہ کرنے والے کے لیے ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائریؒ: الحنفیۃ قالوا للعمرۃ رکن واحد ھو معظم الطواف اربعۃ اشواط، اما الاحرام فھو شرط لہا واما السعی بین الصفا والمروۃ فھو واجب کما تقدم فی الحج ومثل السعی الحلق او التقصیر فھو واجب۔

(کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعۃ ج ۱ ص۶۸۵ کتاب الحج۔ ارکان العمرۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی رحمہ اللہ:۔ العمرۃ سنۃ وتصح فی جمیع السنۃ، وتکرہ یوم عرفۃ ویوم النحر وایام التشریق۔

(مراقی الفلاح علیٰ نور الایضاح ص۶۰۸ کتاب الحج فی فصل العمرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۱ ص۲۵ کتاب الحج۔

[2] لما قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ:۔ ورکن العمرۃ شیئان الاحرام والطواف بالبیت وواجبہا شیئان السعی بین الصفا والمروۃ والحلق ولیس علیہ ماسوی ذلک من رمی الجمار۔

(فتاویٰ قاضی خان علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۱ ص۳۰۱ فصل فی العمرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۱ ص۲۳۷ الباب السادس فی العمرۃ۔

ایامِ تشریق میں عمرہ کرنے کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص ایّامِ تشریق میں عمرہ کرے تو کیا اس کا عمرہ ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ عید الاضحیٰ اور ایّامِ تشریق میں عمرہ کرنا شرعاً ممنوع یعنے مکروہ تحریمی ہے، تاہم اگر ایامِ تشریق یا یوم النحر میں عمرہ کیا جائے تو کراہتِ تحریمی کے ساتھ ادا ہوجائے گا۔

قال العلامة عبد اللہ بن مودود الموصلیؒ : تکرہ یوم عرفة والنحر وایّام التشریق.......... ولو اداها فیها جاز مع الکراهیة کصلاة التطوع فی الاوقات الخمسة المکروة۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص۱۵۷ فصل فی العمرة۔)[1]

ارکانِ عمرہ میں تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص عمرہ کے طواف اور سعی کے بعد حلق کرنے کی بجائے پہلے زیرِ ناف بالوں کی صفائی کرے اور پھر حلق کرے تو کیا اس پر دم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- جس طرح حج کے ارکان وواجبات میں ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے اور تقدیم و تاخیر کی وجہ سے دم لازم آتا ہے، تو اسی طرح عمرہ میں بھی ترتیب کا خیال رکھا جائے اگر کہیں ترتیب ساقط ہوجائے تو دم دینا لازم ہوگا۔

لما قال المفتی عبدالرحیم لاجپوری : ہاں دم واجب ہوگا، پہلے سر منڈا کر پھر مونچھ یا دیگر مواضع کے بال کٹوانا چاہئیں، الٹا کرنے سے دم لازم آئے گا، فتاویٰ اسعدیہ میں ہے۔ (سوال) فی رجل اهل بعمرة وطاف وسعی وحلق احد ابطیه ثم حلق رأسه وحلق ابطیه الآخر ماذا یجب علیه افتونا۔ (الجواب) یجب علیه دم والصورة ماشرح۔

(فتاویٰ رحیمیة ج ۲ ص۵۲ کتاب الحج)

---

[1] وفی الهندیة: جمیع السنة الآخمسة ایام تکره فیها العمرة لغیر القارق وهی یوم عرفة والنحر وایام التشریق والاظهر من المذهب ما ذکرنا ولکن مع هذا لو اداها فی هذه الایام صح۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۲۳۷ الباب السادس فی العمرة)

باب فی زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(روضۂ اقدس کی زیارت کے بیان میں)

حج یا عمرہ میں روضۂ اقدس کی زیارت کیلئے جانا لازمی ہے

سوال: جو شخص حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ جائے تو کیا اس پر روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ جانا لازمی ہے؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بارے میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں بعض مندوب کہتے ہیں، بعض واجب اور بعض واجب کے قریب کے قائل ہیں۔ علامہ شامیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تیسرے قول کو ترجیح دی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وشرح المختار انہا قریبۃ من الوجوب لمن لہٗ سعۃ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۵۲ باب الھدی) [۱]

زیارتِ روضۃ النبیؐ کے وقت کیا کرنا چاہیئے؟

سوال: جو شخص روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جانا چاہتا ہو تو مدینہ منورہ داخل ہونے سے قبل اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: جو شخص زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیئے کہ کثرت سے درود پڑھے اور جب مدینہ طیبہ کی حدود یعنی شہر کی دیواریں نظر آنے لگیں تو درود شریف پڑھ کر یہ دعا مانگے: اللھم ھذا حرم نبیك فاجعلہ وقایۃ لی من النار وأمانا من العذاب وسوء الحساب، اور مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے قبل غسل کر کے، اچھا لباس زیب تن کر کے خوشبو لگا کر تواضع اور وقار کے ساتھ داخل ہو کر یہ دعا پڑھے: بِسْمِ اللّٰہِ وعلیٰ ملّۃِ رسول اللہ

---

[۱] قال العلامۃ عبد اللہ بن مودود الموصلیؒ: اذ ھی من افضل المندوبات والمستحبات بل تقرب من درجۃ الواجبات فانہٗ صلی اللہ علیہ وسلم حرص علیھا وبالغ فی الندب الیھا۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۱۷۵ فصل فی زیارۃ النبی)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوی ج۲ ص۱۶۹ کتاب الحج۔

رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ الخ

لما قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلیؒ: ینبغی لمن قصد زیارة قبر النبی صلی الله علیه وسلم ان یکثر الصلوٰة علیه فقد جاء فی الحدیث انه یبلغه ویصلّ علیه فاذا عاین حیطان المدینة یصلی علیه ویقول اللّٰھم ھٰذا حرم نبیّك فاجعله وقایة لی من النار وأمانا من العذاب وسوء الحساب ویغتسل قبل الدخول او بعده ان امکنه ویتطیب ویلبس احسن ثیابه فهو اقرب الی التعظیم ویدخلها متواضعا علیه السکینة والوقار ویقول بسم الله وعلیٰ ملّةِ رسول الله رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ.... الیٰ آخر الآیة ۔

(الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص۱۷۵ فصل فی زیارة قبر النبیؐ) ؎۱

زیارت روضۃ الرسولؐ کیلئے مسجدِ نبوی میں داخلہ کے وقت دو رکعت پڑھنا

سوال: جو شخص زیارت روضۃ الرسولؐ کیلئے مسجدِ نبوی میں داخل ہو تو کیا وہ دُو رکعت نماز پڑھے یا نہیں؟

الجواب: جو شخص زیارت کے لیے مسجدِ نبوی میں داخل ہو تو اُسے چاہیئے کہ پہلے دُو رکعت نماز اگر ممکن ہو تو منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس طرح پڑھے کہ منبر کے ستون اُسکے دائیں طرف آجائیں ورنہ جہاں بھی موقع ملے نماز ادا کرے اور پھر سلام کیلئے روضۂ اطہر پر حاضر ہو۔

لما قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلیؒ: ثم یدخل المسجد فیصلی عند منبره صلی الله علیه وسلم رکعتین یقف بحیث یکون عمود المنبر بحذاء منکبه الایمن فهو موقفه صلی الله علیه وسلم وهو بین قبره ومنبره ۔

(الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص۱۷۵ فصل فی زیارة النبی صلی الله علیه وسلم) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة: اذا توجه الی الزیارة یکثر من الصلوٰة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم مدة الطریق ..... واذا عاین حیطان المدینة یصلی علیه ویقول اللّٰھم ھٰذا حرم نبیّك فاجعله وقایة لی من النار وأمانا من العذاب وسوء الحساب ویغتسل قبل الدخول او بعده ان امکنه ویتطیب ویلبس احسن ثیابه ویدخلها متواضعاً علیه السکینة والوقار ۔ (الفتاویٰ الهندیہ ج ۱ ص۲۶۵ کتاب الحج، خاتمہ فی زیارۃ قبر النبیؐ)

؎۲ وفی الهندیة: ویصلّی عند منبره رکعتین یقف بحیث یکون عمود المنبر بحذاء منکبه الایمن وهو موقفه علیه السلام وهو بین قبره ومنبره ثم یسجد شکراً لله تعالیٰ ۔

(الفتاویٰ الهندیہ ج ۱ ص۲۶۵ کتاب الحج، خاتمہ فی زیارۃ قبر النبیؐ)

حرمِ نبویؐ کی زیارت کے وقت کیا کرنا چاہیئے

سوال:۔ روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے مسجد نبوی میں داخل ہوتو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد جب قبر شریف کی زیارت کے لیے جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے قبلہ رُخ مواجہہ شریف سے تین چار ذراع (گز) دور اس طرح آرام سے کھڑا ہو جیسا کہ نماز کے لیے کھڑا ہوا جاتا ہے، اور یہ تصوّر کرے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کے آنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہے اور آپؐ اس کے کلام کو سن رہے ہیں، اور پھر آہستہ سے سلام پیش کرے۔

لما قال العلامة عبد اللہ بن مودود الموصلیؒ: ثمّ ینھض فیتوجّہ الی قبرہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقف عند رأسہ صلی اللہ علیہ وسلم مستقبلاً للقبلۃ ید نومنہ قدر ثلاثۃ أذرع او اربعۃ ولا ید نومنہ اکثر من ذٰلک.....ویقف کما یقف فی الصلوٰۃ ویمثل صورتہ الکریمۃ البھیۃ صلی اللہ علیہ وسلم کانہ نائم فی لحدہٖ عالم بہٖ یسمع کلامہ۔ قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی عند قبری سمعتہ وفی الخبر انہ وکل بقبرہ ملک یبلغہ سلام من سلّم علیہ من اُمتہ.....ویقول السّلام علیک یارسول اللہ۔ الخ (الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۱۷۵ فصل فی زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) [۱]

قانوناً حجاز میں مدّتِ قیام کم ہونے کی وجہ سے حاجی مدینہ طیّبہ نہ جاسکے تو کیا اس کا حج متاثر ہوگا یا نہیں؟

سوال:۔ اگر ملکی قانون کی وجہ سے حج کے ویزے میں وقت کم ہونے کی وجہ سے حاجی مدینہ طیّبہ نہ جاسکے تو کیا اس کا حج متاثر ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] وفی الھندیۃ: ثمّ ینھض فیتوجہ الیٰ قبرہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقف عند رأسہ مستقبل القبلۃ ثم ید نومنہ ثلاثۃ أذرع او أربعۃ ولا ید نومنہ أکثر من ذٰلک ولا یضع یدہ علیٰ جدار التربۃ فھو أھیب وأعظم للحرمۃ ویقف کما یقف فی الصلوٰۃ ویمثل صورتہ الکریمۃ البھیۃ کانہ نائم فی لحدہ عالم بہٖ یسمع کلامہ ثمّ یقول اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نبی اللہ الخ (الفتاوی الہندیہ ج۱ ص۲۶۵ کتاب الحج خاتمہ فی زیارۃ قبر النبیؐ)

الجواب: جس کو روضۂ اقدس کی زیارت کرنے کی طاقت و قدرت ہو تو اس پر زیارت روضۂ اقدس کے لیے جانا قریب الی الوجوب (حکماً واجب) ہے، البتہ اگر کسی قانونی اور عذرِ شرعی کی وجہ سے نہ جا سکے تو اس کا حج کامل اور صحیح ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وزیارة قبره صلی اللہ علیه وسلم مندوبة بل قیل واجبة لمن له سعة ویبدأ بالحج لو فرضاً ویخیر لو نفلاً ما لم یمر به۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۵۲ باب الهدی) ؎۱

اُسطوانۃ ابولبابۃ کے پاس دو رکعت پڑھنے کا حکم

سوال: کیا اُسطوانہ ابولبابہ کے پاس دو رکعت پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: زیارت قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فارغ ہو کر مستحب یہ ہے کہ اُسطوانہ ابولبابہ کے قریب دو رکعت نماز ادا کی جائے اور اپنے لیے مغفرت کی دعا کی جائے۔

قال العلامة عبد اللہ بن مودود الموصلی رحمه اللہ: ثم یأتی أسطوانة أبی لبابة التی ربط نفسه فیها حتی تاب اللہ علیه وهی بین القبر والمنبر ویصلی رکعتین ویتوب الی اللہ تعالی ویدعو بما شاء۔

(الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۱۷۷ فصل زیارة قبر النبی صلی اللہ علیه وسلم) ؎۲

؎۱ قال العلامة عبد اللہ بن مودود الموصلی رحمه اللہ: اذ هی من افضل المندوبات والمستحبات بل تقرب من درجة الواجبات فانه صلی اللہ علیه وسلم حرص علیها وبالغ فی الندب إلیها فقال من وجد سعة ولم یزرنی فقد جفانی۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۱۷۵ فصل فی زیارة قبر النبی صلی اللہ علیه وسلم)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج۶ ص۵۸۱ مسائل حج۔

؎۲ وفی الهندیة: ثم یأتی أسطوانة ابی لبابة التی ربط نفسه فیها حتی تاب اللہ علیه وهی بین القبر والمنبر فیصلی رکعتین ویتوب الی اللہ ویدعو بما شاء۔

[الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۶۶ کتاب الحج
خاتمة فی زیارة قبر النبی صلی اللہ علیه وسلم]

روضۂ اطہر کی زیارت کے وقت صلوٰۃ وسلام کا طریقہ

سوال :- جب کوئی شخص روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ حاضر ہو تو وہ کن الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پیش کرے، اور اس کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب :- اللہ تعالیٰ جب کسی کو روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی توفیق عطا فرمائے تو اسے چاہیئے کہ وہ روضۂ اطہر پر مواجہ شریف کے سامنے نہایت ادب واحترام سے کھڑا ہو جائے اور یہ تصور کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں آرام فرما رہے ہیں اور یہ بھی خیال کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ جانتے ہیں کہ فلاں ابن فلاں حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام پیش کر رہا ہے، اس کے بعد درمیانی آواز سے مؤدبانہ لہجے میں ان الفاظ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پیش کرے۔

السلام علیك ایها النبی ورحمة الله ۔ السلام علیك یا خیر خلق الله ۔ السلام علیك یا خیرة الله من خلق الله ۔ السلام علیك یا حبیب الله ۔ السلام علیك یا سید ولد آدم ۔ السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته ۔ یا رسول الله انی اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له واشهد انك عبده ورسوله ۔ اشهد انك بلغت الرسالة وادیت الامانة ونصحت الامة وکشفت الغمة فجزاك الله خیرا جزاك الله عنا افضل ما جزی نبیا عن امته ۔ اللهم اعط لسیدنا عبدك ورسولك محمد الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته انك لا تخلف المیعاد وانزله المنزل المقرب عندك انك سبحانك ذوا الفضل العظیم ۔

(قرۃ العینین الشہیر بفتاویٰ حرمین ص۳۰۴)

✪

کتاب
النکاح

هو الذى خلقكم من

نفس واحدة وجعل منها

زوجها ليسكن اليها

باب آداب النّکاح وشرائطہ
(نکاح کے آداب وشرائط)

خطبہ نکاح سے پہلے پڑھنا چاہیئے

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ نکاح (ایجاب وقبول) کے بعد خطبہ پڑھا جاتا ہے، کیا خطبہ ایجاب وقبول سے قبل پڑھنا چاہیئے یا بعد میں؟

الجواب:۔ نکاح باہمی رضامندی سے ایجاب وقبول کا نام ہے، البتہ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھنا ایک استحبابی عمل ہے اس لیے نکاح سے پہلے خطبہ پڑھا جائے بعد میں پڑھنا صحیح نہیں۔[1]

قال الحصکفیؒ: ویندب اعلانه وتقدیم خطبة۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۳ ص۸ کتاب النکاح)

لفظ "نکاح" کے بجائے "بیع" کا لفظ کہنے سے نکاح کا حکم

سوال:۔ اگر نکاح کے وقت لفظ نکاح کے بجائے بیچنے وغیرہ کے الفاظ کہہ دیئے جائیں تو ان الفاظ سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟

الجواب: خرید وفروخت اور بیچنے وغیرہ کے الفاظ جب نکاح کی نیت سے استعمال کیے جائیں تو نکاح بلااختلاف صحیح ہے۔

قال ابن نجیمؒ: فینعقد النکاح بلفظ الهبة والعطیة والصدقة والملك والتملیك والجعل والبیع والشراء علی الاصح۔ (البحرالرائق ج۳ ص۸۵ کتاب النکاح)[2]

---

[1] قال ابن نجیم رحمہ اللہ، وفی المجتبیٰ یستحب ان یکون النکاح ظاهرًا وأن یکون قبله خطبة۔ (البحرالرائق ج۳ ص۸۱ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الفقه الاسلامی وأدلتهٗ ج۷ ص۱۲۲ البحث الخامس مندوبات عقد النکاح)

[2] قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله: وکل ما تملك به الرقاب) کالجعل والبیع والشراء فانه ینعقد بها ...... ثم قال هذا حاصل ما فی الفتح وملخصه انه لا بد فی کنایات النکاح من النیة مع قرینة او تصدیق القابل للموجب وفهم الشهود المراد اعلامهم۔ (ردالمحتار ج۳ ص۱۸ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۷۱ الباب الثانی فیما ینعقد به النکاح ومالا ینعقد به)

نکاح کے لیے عورت کی زبان پر اعتماد کرنا

سوال:۔ ایک لڑکی نے بیان دیا کہ میں بالغ ہو چکی ہوں اور اس سے پہلے میرا کسی کے ساتھ نکاح نہیں ہوا ہے، تو کیا اُس کے اس اقرار پر اُس سے نکاح کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت کا بیان غلبۂ ظن کے لئے مفید ہو تو اس کے قول پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ایسی حالت میں اس سے نکاح درست رہے گا بشرطیکہ بالغہ عاقلہ ہو۔

قال ابن عابدینؒ: قالت ارتدت زوجی بعد النکاح وسعه أن یعتمد علی خبرها و یتزوجها و إن اخبرت بالحرمة بأمر عارض بعد النکاح من رضاع طاری او نحو ذلك فان کانت ثقة او نحو ذلك فان کانت ثقة أو لم تکن و وقع فی قلبه صدقها فلا بأس بأن یتزوجها۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۲۹) [1]

"رشتہ منظور ہے" سے نکاح کے انعقاد کا حکم

سوال:۔ لڑکی کے والد نے لڑکے کو دیکھتے وقت کہا کہ مجھے یہ رشتہ منظور ہے، تو کیا یہ الفاظ کہنے سے نکاح منعقد ہو گیا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر لڑکی کے والد نے ایجاب وقبول کی مجلس میں باقاعدہ گواہوں کے سامنے یہ الفاظ کہے ہوں تو شرعاً نکاح منعقد ہو چکا ہے، اگر لڑکی نابالغ ہے تو خیارِ فسخ بھی حاصل نہیں اور اگر بالغ ہے تو نکاح اس کی اجازت پر موقوف ہے، اور اگر ان الفاظ سے فقط وعدۂ نکاح مقصود ہو تو پھر شرعاً نکاح منعقد نہیں ہوا۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله اذا لم یرد الاستقبال) قال فی شرح الطحاوی لو قال هل اعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح۔

(ردّ المحتار ج۳ ص۱۱ کتاب النکاح) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: وحاصله أنه متی أخبرت بأمر محتمل فان ثقة أو وقع فی قلبه صدقها لا بأس بتزوجها وان بأمر مستنکر لا۔ مالم یستفسرها۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۵ ص۲۹۸)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۰۹ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات۔

[2] قال الحصکفی رحمہ اللّٰہ: وینعقد ملتبسا بایجاب من احدهما وقبول من الآخر۔

(الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۳ ص۹ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۸۳ کتاب النکاح۔

بغیر گواہوں کے ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر کسی بالغ لڑکی اور لڑکے کے درمیان گواہوں کے بغیر ایجاب وقبول ہو جائے تو کیا یہ شرعی نکاح متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح کے انعقاد کے لیے باقاعدہ دو گواہوں کا موجود ہونا شرط ہے، اس لیے اگر مجلس نکاح میں گواہوں کے بغیر ایجاب وقبول ہو جائے تو بے سود ہے، شرعاً ایسے معاہدۂ نکاح کو نکاح نہیں کہا جا سکتا۔

قال ابن نجیم المصریؒ: وھو الاشھاد فلم یصح بغیر شھود لحدیث الترمذی البغایا اللاتی ینکحن انفسھن من غیر بینۃ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۸۸ کتاب النکاح) [۱]

اثباتِ نکاح کیلئے شہادت بالتسامع کافی ہے

سوال:۔ کیا نکاح کے ثبوت کیلئے ان لوگوں کی گواہی قبول ہو سکتی ہے جو نکاح کے وقت حاضر نہ ہوں بلکہ دوسروں سے نکاح کی خبر سُنکر گواہی دیں؟

الجواب: اثباتِ نکاح کے لیے جو گواہی دی جاتی ہے اُس کے لیے گواہوں کا مجلسِ نکاح میں حاضر ہونا ضروری نہیں بلکہ ثبوتِ نکاح کے لیے شہادت بالتسامع بھی کافی ہے بشرطیکہ اتنے لوگوں سے نکاح کے انعقاد کی سماعت ہو چکی ہو جن کا جھوٹ بولنے پہ اتفاق کرنا متصور نہ ہو۔

قال فی الھندیۃ: الشھادۃ بالشھرۃ والتسامع تقبل فی اربعۃ اشیاء بالاجماع وھی النکاح والنسب والموت والقضاء کذا فی المحیط السرخسی۔ (الفتاوی الھندیہ ج۳ ص۲۵۷) [۲]

---

[۱] وھو حدیث صحیح روی مرفوعاً وموقوفاً قالہ العثمانیؒ۔ (اعلاء السنن ج۱۱ ص۱۷)

قال فی الھندیۃ: ومنھا الشھادۃ۔ قال عامۃ العلماء انھا شرط جواز النکاح ھکذا فی البدائع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۶۷ کتاب النکاح۔ الباب الاول فی تفسیرہ شرعاً)

ومثلہ فی فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۱ ص۳۳۱، ۳۳۲ فصل فی شرائط النکاح۔

[۲] قال الکاسانیؒ: فلا تطلق الشھادۃ بالتسامع الا فی اشیاء مخصوصۃ وھی النکاح والنسب والموت فلہ تحمل الشھادۃ فیھا بالتسامع من الناس وان لم یعاین بنفسہ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۶)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۳ ص۸۹ کتاب النکاح۔

نکاح کی اجازت لیتے وقت گواہ بنانا مستحب ہے

سوال:۔عورت سے نکاح کی اجازت طلب کرتے وقت گواہوں کی موجودگی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔عورت سے نکاح کی اجازت طلب کرتے وقت دو گواہوں کی موجودگی مستحب ہے البتہ نکاح پڑھاتے وقت دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہے ۔

قال ابن نجیم المصریؒ : ولا یشترط الاشهاد علی التوکیل۔(البحرالرائق ج ۳ ص۸۹ کتاب النکاح)[1]

بذریعۂ دف نکاح کا اعلان کرنا

سوال:۔نکاح کا اعلان دف کے ذریعے کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔نکاح کی تشہیر واعلان سنت ہے پھر دیگر ممنوعاتِ شرعیہ سے خالی ہونے کی صورت میں دف کے ذریعے نکاح کا اعلان کرنا جائز ہے ۔

روی عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم : اعلنوا هٰذا النکاح......الخ

(مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)[2]

جوان بیٹیوں کو گھر میں رکھ کر بلا عذرِ شرعی اُن کا نکاح نہ کرنا

سوال:۔کیا جوان بیٹیوں کو گھر میں رکھنے اور بلا کسی شرعی رکاوٹ کے اُن کے نکاح نہ کرنے سے سرپرست یا والد کی شرعی حیثیت متأثر ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔کفوء ملنے کی صورت میں جوان بیٹیوں کا نکاح جلد از جلد کر دینا ضروری ہے تاہم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ : واعلم انه لا تشترط الشهادة علی الوکالة بالنکاح بل علی عقد الوکیل وانما ینبغی أن یشهد علی الوکالة اذ اخیف جحد الموکل إیاها۔ (رد المحتار ج ۳ ص۹۵ باب الاکفاء،مطلب فی الوکیل والفضول فی النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۵۶ کتاب النکاح فصل ومنها العدد۔

[2] قال الشیخ الطوریؒ : وعن الحسن بن زیاد لا بأس بأن یکون فی العرس دف یضرب به یشتهر ویعلن النکاح.....وفی الذخیرة لا بأس بضرب الدف فی العرس والولیمة والاعیاد ۔(تکملة البحرالرائق ج ۸ ص۱۸۹ کتاب الکراهیة قبل فصل فی اللبس)

موزوں رشتہ کی تلاش میں تاخیر ہوجانا ممنوع نہیں اور اس سے سرپرست یا والد کی شرعی حیثیت متأثر نہیں ہوتی، البتہ موزوں رشتہ ملنے کی صورت میں سازگار حالات کے باوجود بیٹیوں کو رسمی غیرت کی وجہ سے نکاح سے محروم رکھنا زیادت علی الشرع کے مترادف ہے۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔ (سورۃ النور آیت ۳۲)

قال ابن عابدینؒ: ویزوجها کفواً فان خطبها الکفو لا یؤخرها وهو کل مسلم تقی۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۲۸۵ کتاب النکاح) [1]

رخصتی کے وقت دوبارہ نکاح پڑھانا جائز ہے

سوال:۔ ایک بالغہ لڑکی کا نکاح اس کے باپ نے کر دیا تو رخصتی کے وقت دوبارہ نکاح پڑھانا کیسا ہے؟

الجواب:۔ بالغہ عورت کے نکاح کا حکم یہ ہے کہ جب دوسرا کوئی شخص (سرپرست یا والد) اس کا نکاح کسی سے کردے اور اس کی خبر پہنچے پر وہ اسے رد نہ کرے بلکہ رضامندی ظاہر کرے تو نکاح درست ہے، تاہم رخصتی کے وقت دوبارہ نکاح پڑھانا جائز اور مستحسن ہے۔

قال فی الهندیة: لا یجوز نکاح احد علیٰ بالغة صحیحة العقل من أب وسلطان بغیر إذنها بکراً کانت او ثیباً فَإنْ فعل ذٰلك فالنکاح موقوف علیٰ إجازتها فَإنْ أجازته جاز۔ وَ إنْ ردّته بطل کذا فی السراج الوهاج ولو ضحکت البکر عند الاستئمار او بعد ما بلغها الخبر

---

[1] وعلی رضی اللہ عنه مرفوعاً: ثلاث لا تُؤخر: اَلصَّلٰوةُ إذَا أَتَتْ وَالْجَنَازَةُ إذَا حَضَرَتْ وَالْأَيِّمُ، إذَا وَجَدْتَ لها کفوًا۔ اخرجه الترمذی والحاکم باسناد ضعیف۔ قلت حسنه السیوطی فی الجامع الصغیر وصححه الحاکم والذهبی کلاهما فی المستدرك۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ ص۶۷ فصل فی الکفاءة، باب مراعاة الکفاءة وجواز النکاح)

وعن عمر بن الخطابؓ وَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال فی التوراة مکتوب من بلغت إبنته اثنتی عشرة سنة ولم یزوجها فاصابت اثماً فاثم ذٰلك علیه۔ رواه البیهقی فی الشعب۔ (مشکوٰة المصابیح ج ۲ ص۲۷۱ کتاب النکاح)

فهو رضا۔ (الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۲۸۷ الباب الرابع فی الاولیاء) [1]

منگنی ہوجانے کے بعد کسی لڑکی کا دوسری جگہ نکاح کرانا

سوال:۔ ایک لڑکی کی باقاعدہ منگنی ہوچکی ہے جبکہ اُس نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلیا ہے، کیا یہ دوسرا نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ منگنی کی مجلس میں باقاعدہ گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول نہ ہُوا ہو تو یہ فقط وعدۂ نکاح ہے نکاح نہیں، لہٰذا اس لڑکی کا کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہے، البتہ وعدے کی خلاف ورزی کرنا مروت کا تقاضا نہیں جسکی وجہ سے گناہ لازم ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله اذا لم ینوا الاستقبال) قال فی شرح الطحاوی لو قال هل أعطیتنیها فقال اعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح۔ (ردالمحتار ج۳ ص۱۱ کتاب النکاح) [2]

صرف وعدۂ نکاح سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:۔ بعض علاقوں میں منگنی کی رسومات کی ادائیگی پر کافی مالی اخراجات کیے جاتے ہیں لیکن کوئی باقاعدہ ایجاب وقبول نہیں ہوتا ہے، کیا ایسی رسومات کی ادائیگی کو نکاح کہا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح نام ہے گواہوں کے سامنے باقاعدہ ایجاب وقبول کرنے کا، چونکہ منگنی کی جملہ رسومات میں باقاعدہ طور پر ایجاب وقبول کا اہتمام نہیں ہوتا صرف رشتہ دینے یا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: فإن استاذنها هو أی الولی وهو السنة أو وکیله أو رسوله أو زوّجها ولیها وأخبرها رسوله أو فضولی عدل فسکتت عن ردّه مختارة أو ضحکت غیر مستهزءة أو تبسمت أو بکت بلاصوت .... فهو إذن۔ (ثم قال بعد أسطر) ولذا استحسنوا التجدید عند الزفاف لأن الغالب اظهار النفرة عند فجاة السماع۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۳ ص۶۰ کتاب النکاح)
وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۱۱۱ کتاب النکاح۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: وینعقد ملتبسا بایجاب من أحدهما وقبول من الآخر۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۳ ص۹ کتاب النکاح)
وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۸۳ کتاب النکاح۔

لینے کا وعدہ ہوتا ہے اس لیے صرف ان رسومات کے ادا کر لینے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا اور نہ اس پر شرعی ازدواجی احکام جاری ہوں گے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله اذا لم ینوالاستقبال) قال فی شرح الطحاوی لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت إن كان المجلس للوعد فوعد وان كان للعقد فنكاح۔
(رد المحتار ج ۳ ص۱۱ کتاب النکاح) [۱]

بالغہ عورت سے زبردستی کئے گئے نکاح کا حکم

سوال:۔ اگر کسی عورت سے زبردستی ایجاب وقبول کرایا جائے تو کیا جبر و اکراہ سے کئے گئے ایجاب وقبول سے شرعاً نکاح منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عاقلہ بالغہ عورت سے زبردستی ایجاب وقبول کرایا جائے تو چونکہ اس میں من وجہ اس عورت کی رضامندی شامل ہے اس لیے اس صورت میں شرعاً نکاح منعقد ہو جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله لیتحقق رضاهما) ای لیصدر منهما ما من شأنه ان یدل علی الرضاء إذ حقیقة الرضاء غیر مشروطة فی النكاح لصحته مع الاكراه والهزل۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۱ کتاب النکاح) [۲]

بالغہ عورت کو نکاح کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا

سوال:۔ کیا کسی عاقلہ بالغہ عورت کو شادی پر مجبور کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے زبردستی اس کا نکاح کسی مرد سے کر دیا جس سے وہ عورت انکاری ہو تو یہ نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح مسلمان مرد وعورت کی باہمی رضامندی سے منعقد ہوتا ہے، اس میں

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیتك ان كان المجلس للوعد فوعد وان كان للعقد فنكاح۔ (البحر الرائق ج ۳ ص۸۳ کتاب النکاح)
ومثله فی الهندیة ج ۱ ص۲۶۷ کتاب النکاح، الباب الاول فی تفسیره شرعاً۔ الخ

[۲] وقال الطوریؒ: وفی المبسوط فكل تصرف یصح مع الهزل كالطلاق والعتاق والنكاح یصح مع الاكراه۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۷۵ کتاب النکاح)
ومثله فی الفقه الاسلامی وأدلته ج ۷ ص۷۹ کتاب النکاح۔

کسی بالغہ عورت کو شرعاً مجبور نہیں کیا جاسکتا بلکہ نکاح میں اس کی رضامندی ضروری ہے بغیر اسکی رضامندی کے اگر نکاح کیا جائے تو وہ نکاح شرعاً منعقد نہیں ہوگا۔

قال ابن نجیمؒ :(تحت قول صاحب الکنز) ولا تجبر بکر بالغة علی النکاح أی لا ینفذ عقد الولی علیها بغیر رضاها عندنا۔انتھیٰ (البحرالرائق ج۳ ص۱۱۷ کتاب النکاح، باب الاولیاء والاکفاء) لہ

بالغہ کی اجازت سے والد کا کرایا ہوا نکاح ناقابلِ فسخ ہے

سوال:۔ باپ نے اپنی بالغہ بیٹی کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے ایک نابالغ لڑکے سے کردیا اور نکاح کے بعد اس نے بیٹی کو خبر دی کہ میں نے تیرا نکاح فلاں لڑکے سے کردیا ہے، اس پر اسکی بیٹی نے صرف یہ کہا کہ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتے، اسکے بعد وہ خاوند کے گھر چلی گئی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ نکاح نافذ ہے، اور وہ عورت دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بالغہ بیٹی کے نکاح کے لیے باپ کو بیٹی سے اجازت لینا ضروری ہے، اگر لاعلمی میں باپ نے بالغہ بیٹی کا نکاح کردیا اور پھر باپ نے جب اپنی بالغہ بیٹی کو اس نکاح کی خبر دی اور اس نے ردّ نہیں کیا تو یہ نکاح اب لازم اور منعقد ہے اور بالغہ دوسری جگہ نکاح نہیں کرسکتی تاہم اگر وہ پہلے سے ردّ کرتی تو اس کو یہ حق حاصل تھا۔

قال صاحب الکنز : فإن استأذنها الولی فسکتت أو ضحکت أو زوجها فبلغها الخبر فسکتت فهو إذن۔ (کنزالدقائق ج۲ ص۱۱۱ کتاب النکاح)

لہ قال فی الهندیة :لایجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر إذنها بکرا کانت اوثیبا۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۲۸۷ کتاب النکاح)

وقال العلامة العثمانی رحمه الله : روی عن ابن عباسؓ ان جاریة بکرا أتت النبی صلی الله علیه وسلم فذکرت أن أباها زوجها وهی کارهة فخیرها النبی صلی الله علیه وسلم۔(رواه الامام أحمد ورجاله ثقات) وقال ابن القطان صحیح۔(درایة ص۲۲۱)۔ (إعلاء السنن ج۱۱ ص۶۷ کتاب النکاح)

لہ قال ابن نجیمؒ : والسنة أن یستأمر البکر ولیها قبل النکاح .... وإن زوجها بغیر استئمار فقد أخطأ السنة و توقف علی رضاها انتهی فهو محمل النهی فی حدیث مسلم لاتنکح الأیم حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستأذن قالوا یارسول الله وکیف إذنها قال أن تسکت : فهو لبیان السنة للاتفاق علی أنها لو صرحت بالرضاء بعد العقد نطقًا فانه یجوز۔ (البحرالرائق ج۳ ص۲۸۳ کتاب النکاح۔باب الاولیاء والاکفاء) ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۸۷ الباب الرابع فی الاولیاء۔

نکاح کا شرعی حکم

سوال:۔ شریعتِ مقدسہ میں نکاح کرنے کا کیا حکم ہے؟ فرض ہے، واجب ہے یا سُنّت؟

الجواب:۔ نکاح کرنا تمام انبیاء کرام کی سُنّت ہے، جو شخص نکاح کے جملہ حقوق ادا کر سکتا ہو تو اس کو نکاح کر لینا چاہیئے۔ اور اگر شہوت کا غلبہ ہو تو واجب جبکہ خوفِ زنا کے وقت فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویکون ای النکاح واجب عند التوقان فان تیقن الزنا الا بہ فرض نہایۃ وھذا ان ملک المھر والنفقۃ والا فلا اثم بترکہ، بدائع ویکون سنۃ مؤکدۃ فی الاصح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۳۵۷ تا ۳۵۹ کتاب النکاح) [۱]

نکاح نفلی عبادت سے بہتر ہے

سوال:۔ کیا احناف کے ہاں نکاح کرنا افضل ہے یا نفل عبادت کرنا؟

الجواب:۔ حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں جو شخص بیوی کے نان و نفقہ کی طاقت رکھتا ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا نفلی عبادت کرنے سے افضل ہے، البتہ شوافع کے ہاں نفلی عبادت نکاح سے افضل ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قالوا ان الاشتغال بہ ای بالنکاح افضل من التخلی لنوافل العبادات ای الاشتغال بہ وما یشتمل علیہ من القیام بمصالحہ ولعفاف النفس عن الحرام وتربیۃ الولد ونحو ذلک۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۵۵ کتاب النکاح) [۲]

اسلام میں بیک وقت تعدادِ ازواج کا حکم

سوال:۔ اسلام نے ایک مرد کے لیے بیک وقت کتنی بیویاں جمع کرنے

---

[۱] وقال فی الھندیۃ: واما صفتہ فھو انہ فی حالۃ الاعتدال سُنّۃ مؤکدۃ وحالۃ التوقان واجب وحالۃ خوف الجور مکروہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۲۶۷ کتاب النکاح، فصل اوّل)

[۲] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: وعلی ھذا الاصل بنی اصحابنا من قال منھم ان النکاح فرض او واجب لان الاشتغال بہ مع اداء الفرائض والسنن اولی من التخلی لنوافل العبادات مع ترک النکاح وھو قول اصحاب الظواھر۔

(بدائع الصنائع ج۲ ص۲۲۹ کتاب النکاح)

کی گنجائش رکھی ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے ایک مرد کے لیے بشرطِ عدل ومساوات ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے، ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے۔

قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: فانکحوا ما طاب لکم۔ ای تزوجوا ما بمعنی من النساء مثنیٰ وثلث وربع (ولا تزیدوا علیٰ ذٰلک)۔ (تفسیر جلالین ص۶۹ سورۃ البقرۃ) [۱]

دوسری شادی کیلئے پہلی بیوی کی اجازت کا مسئلہ

سوال:۔ کیا دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں مرد کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ ان کے درمیان عدل ومساوات قائم رکھ سکتا ہو، اس کے علاوہ کسی بھی شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح نکاح اربع من الحرائر والاماء فقط للحر لا اکثر۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۳۰۴ باب المحرمات) [۲]

خطبۂ نکاح کے دوران باتیں کرنا گناہ ہے

سوال:۔ اگر قاضی نکاح کا خطبہ پڑھ رہا ہو اور لوگ آپس میں باتوں میں مشغول ہوں تو کیا وہ لوگ گنہگار ہوں گے یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح نکاح اربع من الحرائر والاماء فقط للحر لا اکثر وله التسری بما شاء ما الاماء۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۳۰۴ فصل فی المحرمات)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۷ کتاب النکاح۔

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وللحر ان یتزوج اربعًا من الحرائر والاماء ولیس له ان یتزوج اکثر من ذٰلک، لقولہٖ تعالیٰ: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔

(الھدایۃ ج۲ ص۷ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی تفسیر جلالین ص۶۹ سورۃ البقرۃ۔

الجواب: ہر خطبہ چاہے وہ نکاح کا ہو یا عیدین وجمعہ کا، سننا واجب ہے، اور جو شخص وجوب کو قصداً ترک کرے تو گنہگار ہوگا، اسی طرح خطبۂ نکاح کے دوران باتیں کرنے والے لوگ بھی گنہگار ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وکذا یجب الاستماع لسائر الخطب کخطبۃ نکاح وخطبۃ عید وختم علی المعتمد۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۷۶۹ کتاب النکاح)[1]

عدالتی نکاح (کورٹ میرج) کا شرعی حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی اور لڑکے نے اپنے ورثاء اور اولیاء کو بتائے بغیر چپکے سے عدالت میں جاکر کورٹ میرج (نکاح) کرلیا، جبکہ مجلس نکاح میں سرکاری خطیب صاحب کے علاوہ صرف دو اور آدمی بطور گواہ موجود تھے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ نکاح شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس نکاح سے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں یا نہیں؟

الجواب: احادیثِ مبارکہ میں ذکر ہے کہ عقدِ نکاح خوب ظاہر کرکے علی الاعلان کیا جائے، چپکے سے بغیر گواہوں کے نکاح کرنے کو شریعتِ مقدسہ نے باطل قرار دیا ہے۔ چونکہ صورتِ مسئولہ کے مطابق اس نکاح میں لڑکے لڑکی کے علاوہ سرکاری خطیب اور دو آدمی اور بھی بطور گواہ شریک تھے اس لیے یہ نکاح جائز اور درست ہے مگر کراہت سے خالی نہیں تاہم اس عقدِ نکاح کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں۔

کما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) نکاح سرکہ ممنوع وباطل است آن است کہ دو شاہدین علاوہ ناکح ومنکوحہ نباشد واگر شاہدین یا شہود حاضر باشند ایں چنیں نکاح نکاح سرکہ باطل نباشد اما خالی از کراہت نباشد۔ لان السنۃ فی النکاح الاعلان ولذا شرع لہ الدف ونحوہ وفی الحدیث الفرق بین الحلال والحرام الدف ولان فیہ القاء نفسہ فی التہمۃ ویتہمہ بالزنا من لم یعلم بالنکاح والحدیث اتقوا مواضع التہم۔ (امداد الاحکام ج ۲ ص ۲۳۷)

بالغ اولاد کا نکاح کرنا والدین کی ذمہ داری ہے

سوال: عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ والدین کا یہ فرض ہے کہ

---

[1] قال العلامۃ ابن الہمام رحمہ اللہ: وھٰذہ فروع تتعلق بالمحل وقدمناھا فی باب صفۃ الصلوٰۃ ویتعین ان لایخلی عنہا مظنتہا یحرم فی الخطبۃ الکلام وان کان امراً بمعروف او تسبیحاً والاکل والشرب والکتابۃ۔ (فتح القدیر ج ۲ ص ۳۷ کتاب النکاح)

جب اولاد بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کریں، کیا واقعی یہ بات صحیح ہے؟

الجواب: ۔ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی بالغ ہوجائے تو والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کی شادی کا انتظام کریں، اور اگر بغیر کسی شرعی عذر کے نہ کیا اور وہ کسی معصیت میں مبتلا ہوگئے تو والدین بھی اس گناہ میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے، اس لیے عوام الناس کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

عن ابی سعید وابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ من ولد لہٗ فلیحسن اسمہ وادّبہ فاذا بلغ فلیزوّجہ فان بلغ ولم یزوجہ فاصاب اثماً فانما اثمہٗ علی ابیہ۔

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۱ کتاب النکاح ۔ باب الولی) لہ

بیوہ کے نکاحِ ثانی کا حکم

سوال: ۔ پٹھانوں میں یہ رواج ہے کہ جس بیوہ کا چھوٹا بچہ ہو تو اس کے لیے نکاحِ ثانی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، تو کیا بیوہ عورت کا چھوٹے بچے کی وجہ سے نکاحِ ثانی نہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ نکاح کرنا یا نہ کرنا انسان کا ذاتی عمل ہے، بیوہ کو عدتِ وفات کے بعد دوسرا نکاح کرنے کی شرعاً اجازت ہے اس کو رواج یا رسم کی وجہ سے نہ روکا جائے، تاہم اگر کوئی بیوہ عورت اپنی اولاد کی پرورش کے لیے دوسرا نکاح نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان امرأۃ قالت یارسول اللہ ان ابنی ھٰذا کان بطنی لہ وعاء وثدی لہٗ سقاء وحجری لہ حواء وان اباہ طلقنی واراد ان ینزعہ منی فقال علیہ السلام انت احق بہ مالم تنکحی۔ رواہ احمد وابوداؤد

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۹۳ کتاب النکاح) ؎۲

لہ وعن عمر بن الخطاب وانس بن مالک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی التوراۃ مکتوب من بلغت ابنتہ عشرۃ سنۃ ولم یزوجھا فاصابت اثماً فاثم ذٰلک علیہ رواھما البیہقی فی شعب الایمان۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۱ کتاب النکاح ۔ باب الولی)

؎۲ وفی الھندیۃ: ولو تزوجت الام بزوج آخر وتمسک الصغیرۃ معھا ام الام فی بیت الراب فللاب ان یاخذھا منھا صغیرۃ عند جدۃ تخون حقھا فلعما تھا ان تأخذھا منھا اذا طھرت خیانتھا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۵۴۱ الباب السادس عشر فی الحضانۃ)

لڑکیوں کے نکاح میں بلاوجہ تاخیر کرنا گناہ ہے

سوال:۔ بعض لوگ مالدار داماد نہ ملنے کی وجہ سے لڑکیوں کی شادیوں میں تاخیر کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ احادیثِ مبارک میں نکاح میں تعجیل کی ترغیب دی گئی ہے، جس کی وجہ سے بالغ لڑکے لڑکیوں کا نکاح جلدی کرنا چاہیئے، محض دنیاوی اغراض اور رسم و رواج کی وجہ سے تاخیر کرنا موجبِ گناہ ہے۔

قال علیہ السلام: من ولد له ولد فليحسن اسمه وادبه فاذا بلغ فليتزوجه فان بلغ ولم يزوجه فاصاب اثماً فانما اثمه على ابيه۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۲۷۱ کتاب النکاح) [1]

کیا لڑکی کو از خود نکاح کا حق حاصل ہے

سوال:۔ اگر والدین نے اس بات کی وصیت کی ہو کہ ان کی لڑکی کا نکاح فلاں مرد سے کردیا جائے لیکن کسی وجہ سے لڑکی اُس مرد سے نکاح نہیں کرتی تو کیا لڑکی کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ بالغ مرد و عورت اپنے نفس کے خود حقدار ہیں، صورتِ مسئولہ میں اگر کسی وجہ سے لڑکی والدین کی وصیت پر عمل نہیں کرتی تو اس کو یہ حق حاصل ہے دُوسری جگہ نکاح اس سے متاثر نہ ہوگا، اور اگر لڑکی نابالغ ہو تو یہ حق اُس کے ورثاء کو حاصل ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الثيب احق بنفسها من وليها والبكر يستاذنها ابوها فی نفسها واذنها صماتها۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۰ باب الولی فی النکاح واستیذان المرأۃ) [2]

---

[1] قال علیه السلام: من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة ولم يزوجها فاصابت اثماً فاثم ذٰلك عليه۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۲۷۱ کتاب النکاح)

[2] قال العلامة الحصكفی رحمه الله: (فنفذ نكاح حرة مطلقة بلا) رضا (ولی) والاصل ان كل من تصرف فی ماله تصرف فی نفسه وما لا فلا (وله اذا كان عصبة الاعتراض فی غير الكفء) .... (ويفتى) فی غير الكفوء (لعدم جوازه اصلاً) وهو المختار للفتوى (لفساد الزمان) فلا تحل مطلقة ثلاثاً نكحت غير كفء الخ

(الدر المختار مع رد المحتار ج۲ ص۳۲۲ کتاب النکاح۔ باب الولی)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۲ ص۲۹۳ باب فی الاولياء والاكفاء۔

مجلسِ نکاح میں لڑکی کا نام لینا | سوال:۔ کیا نکاح کے انعقاد کے وقت لڑکی کا نام مجمع کے سامنے لینا ضروری ہے یا کہ بغیر نام لیے بھی نکاح صحیح ہوجائے گا؟

الجواب:۔ نکاح کے انعقاد کے لیے لڑکی کا امتیاز ضروری ہے، یہ امتیاز چاہے نام سے حاصل ہو یا اشارے سے یا دیگر صفات سے حاصل ہوجائے جس کے بعد کوئی کوئی شبہ نہ رہے، صرف نام لینا ضروری نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قلتُ و ظاهره انها لو جرت المقدمات علی معیّنة وتمیزت عند الشهود ایضًا یصح العقد وهی واقعة الفتوی لان المقصود نفی الجهالة وذٰلك حاصل بتعینها عند العاقدین والشهود وان لم یصرح باسمها۔

(ردّ المحتار ج ۲ ص۳۲۷ کتاب النکاح) [۱]

نکاح میں ایجاب وقبول کا تین بار دہرانا ضروری نہیں | سوال:۔ ہمارے علاقے کے نکاح خوان حضرات نکاح باندھتے وقت ایجاب وقبول کے الفاظ تین مرتبہ دہراتے ہیں، کیا یہ امر مستحب ہے یا ضروری ہے؟

الجواب:۔ نکاح کا انعقاد نفسِ ایجاب وقبول کے صرف ایک مرتبہ کرنے سے ہوجاتا ہے، تین مرتبہ دہرانا ضروری نہیں اور نہ یہ امر مستحب ہے۔

قال المرغینانیؒ: وینعقد بلفظین یعبر باحدهما عن الماضی وبالآخر عن المستقبل ان یقول زوّجنی فیقول زوجتك ....الخ (الهدایة ج ۲ ص۲۸۵ کتاب النکاح) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: لا بد من تمییز المنکوحة عند الشاهدین لتنتفی الجهالة فان کانت حاضرة متنقبة کفی الاشارة الیها ------ ان کانت المرأة فی البیت وحدها جاز النکاح لزوال الجهالة۔

(البحر الرائق ج ۳ ص۸۸ کتاب النکاح)

[۲] قال العلامة ابن نجیمؒ: وینعقد بایجاب وقبول وضعًا للمضی او احدهما۔ الخ

(کنز الدقائق علی هامش بحر الرائق ج ۳ ص۸۱ کتاب النکاح)

ومثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۲۷ کتاب النکاح۔ الباب الثانی فیما ینعقد به النکاح۔ الخ

ثیبہ (مطلقہ) عورت سے نکاح ثانی کیلئے اجازت بالقول کا حکم | **سوال:۔** اگر کسی عورت کا پہلے نکاح ہو چکا ہو پھر شوہر نے اُسے طلاق دیدی ہو تو کیا دوسرے نکاح کے لیے اُس سے اجازت بصورتِ سکوت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ثیّبہ عورت جب دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اجازت دیتے وقت زبان سے کہنا ضروری ہے اس کا سکوت وغیرہ اجازت کے قائم مقام نہیں، یہ حکم صرف باکرہ لڑکی کے ساتھ مختص ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الثّیّب احق بنفسها من ولیها والبکر یستاذنها ابوها فی نفسها واذنها صماتها۔ (مسلم بحواله مشکوٰة ج۲ ص۲۷ باب الولی فی النکاح واستیذان المرأة)[1]

زفاف (پہلی ملاقات) کے وقت دُعا پڑھنے کا حکم | **سوال:۔** جناب مفتی صاحب! زفاف کے وقت کون سی دُعا پڑھنی چاہیئے؟

الجواب:۔ جب کوئی آدمی شادی کرے تو پہلی ملاقات میں سنّت یہ ہے کہ بیوی کے پیشانی کے بال پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے برکت کی دُعا مانگے اور پھر بسم الله پڑھ کر یہ دُعا مانگے: اللّٰهمّ انّی اسئلك خیرها وخیر ما جبلت علیه واعوذ بك من شرّها وشرّ ما جبلت علیه۔ اور جب جماع کا ارادہ ہو تو یہ دُعا پڑھے: بسم الله اللّٰهم

---

[1] قال العلّامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: (فنفذ نکاح حرّة مکلفة بلا رضا (ولی) والاصل ان کل مَنْ تصرف فی ماله تصرف فی نفسه وما لا فلا (ای الولی اذا کان عصبةً الاعتراض فی غیر الکفء)...... (ویفتی) فی غیر الکفء (بعدم جوازه اصلاً) وهو المختار للفتوٰی (لفساد الزمان) فلا تحل مطلّقة ثلاثاً نکحت غیر کفء الخ۔

(الدر المختار مع ردّ المحتار ج۲ ص۳۲۲ کتاب النکاح۔ باب الولی)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۲۹۳ باب فی الاولیاء والاکفاء۔

جَنّبنا الشیطٰن وجنب الشّیطٰن ما رزقتنا۔

عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما قال قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم امّا لو احدھم یقول حین یأتی اھلہ بسم اللہ اللّٰھمّ جنّبنی الشّیطٰن وجنّب الشّیطٰن ما رزقتنا ثمّ قدر بینھما فی ذٰلك او قضی ولدٌ لم یَضُرّہٗ شیطٰنٌ اَبَدًا۔

(صحیح البخاری ج ۲ ص۷۷۶ کتاب النکاح۔ باب ما یقول الرجل اذا اتی اھلہ) لہ

نکاح کے وقت بھول کر کسی دوسری عورت کا نام لینا

سوال:۔ نکاح کے انعقاد کے وقت وکیل نے غلطی سے اصل لڑکی کے نام کی بجائے اس کی دوسری بہن کا نام لیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نکاح کس کے ساتھ منعقد ہوگا؟

الجواب:۔ مجلسِ نکاح میں جب کوئی ممیّز، اشارہ وغیرہ نہ ہو جس کی وجہ سے اصل لڑکی دوسروں سے الگ ہو، صورتِ مسئولہ میں وکیل نے جس لڑکی کا نام لیا ہے تو نکاح اُسی کے ساتھ ہُوا ہے، اس لیے اب اصل لڑکی کی بہن کو طلاق دے کر اس کے ساتھ نکاح باندھا جائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: غلط وکیلھا بالنکاح فی اسم ابیھا بغیر حضورھا لم یصح للجھالۃ وکذا لو غلط فی اسم ابنتہ الا اذا کانت حاضرۃ واشار الیھا فیصح ولو لہ بنتان اراد تزویج الکبریٰ فغلط فسماھا باسم الصغریٰ صح للصغریٰ خانیہ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ ص۲۵ کتاب النکاح) ۲ہ

لہ اخرج امام الترمذی رحمہ اللہ: عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لو ان احدکم اذا اتی اھلہ قال بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطٰن وجنب الشیطٰن ما رزقتنا فان قضی اللہ بینھما ولدًا لم یضرہ الشیطان۔ (الجامع الترمذی ج ۱ ص۲۰۷ ابواب النکاح۔ باب ما جاء فیما یقول اذا دخل علی اھلہ)

۲ہ قال العلامۃ قاضی خانؒ: امرأۃ وکلت رجلا بان یزوجھا فزوجھا وغلط فی اسم ابیھا لا ینعقد النکاح اذا کانت غائبۃ۔ رجل لہ ابنۃ واحدۃ واسمھا عائشۃ فقال الاب وقت العقد زوجت منك ابنتی فاطمۃ لا ینعقد النکاح بینھما ولو کانت المرأۃ حاضرۃ فقال الاب زوجتك ابنتی فاطمۃ ھٰذہ واشار الی عائشۃ وغلط فی اسمھا وقال الزوج قبلتُ جاز النکاح۔

(فتاوٰی قاضیخان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۳۲۴ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الاحکام ج ۲ ص۲۲۶ کتاب النکاح۔

بیوی کو خاوند کے پاس جانے سے روکنا

سوال:- جناب مفتی صاحب! میری شادی کے کچھ عرصہ بعد سسرال والوں نے میری بیوی کو اپنے پاس روک رکھا ہے اور اُسے میرے گھر آنے نہیں دیتے۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- جب ایک مرتبہ کسی لڑکی اور لڑکے کا نکاح ہو جائے تو وہ لڑکی شوہر کے تابع ہے والدین کو شرعاً یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو بلاوجہ روکیں، تاہم شوہر کو بھی بیوی کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں لکھتے ہیں :-

"الجواب :- بے وجہ لڑکی کو شوہر کے گھر نہ بھیجنے کا والدین کو کچھ حق نہیں ہے، والدین دختر بسبب روکنے اپنی دختر کے گنہگار ہیں، ان کو لازم ہے کہ اس سے توبہ کریں اور لڑکی کو اسکے شوہر کے پاس بھیجیں اور لڑکی کو لازم ہے کہ اس بارہ میں وہ والدین کی اطاعت نہ کرے اور شوہر کی فرمانبرداری کرے کیونکہ اس بارہ میں شوہر کی اطاعت زوجہ کو کرنا مقدم ہے۔" فقط

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۸ ص۳۵۷ کتاب النکاح) [۱]

رخصتی میں تاخیر کا حکم

سوال:- ایک لڑکی کا نکاح صغر سنی میں ہوا تھا، اب وہ تیرہ سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے لیکن اس کے والدین ابھی تک رخصتی سے انکار کر رہے ہیں، کیا شرعاً اُن کو یہ حق حاصل ہے؟

الجواب:- رخصتی کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں لیکن جب لڑکی جماع کے قابل ہو جائے تو شوہر اس کو اپنے گھر لاسکتا ہے والدین کو منع کرنے کا حق نہیں اور اگر لڑکی جماع کے قابل نہ ہو تو اس صورت میں رخصتی سے منع کیا جاسکتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وقدمنا ان الصغيرة لا تطيق الوطي لا تسلم الى الزوج حتى تطيقه والصحيح انه غير مقدر بالسن بل يفوض الى القاضي بالنظر اليها من سمن او هزال۔ (رد المحتار ج ۲ ص۵۴۹ باب القسم) [۲]

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: قالوا للزوج ان يسكنها حيث احب ولكن بين جيران صالحين۔ (رد المحتار ج ۲ ص۹۱۴ باب النفقة)

[۲] وفي الهندية: واذا نقد الزوج المهر وطلب من القاضي ان يأمر ابا المرأة بتسليم المرأة فقال ابوها انها صغيرة لا تصلح للرجال ولا تطيق الجماع وقال الزوج بل هي تصلح وتطيق ينظرون كانت ممن تخرج اخرجها واقفرها وينظر اليها وان صلحت للرجال امر بدفعها الى الزوج وان لم تصلح لم يأمره۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۲۸۷ الباب الرابع في الاولياء)

وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۳ ص۱۱۹ کتاب النکاح، باب الاولياء والاكفاء۔

بیوی کو وطن سفر میں ساتھ لے جانے کا مسئلہ

سوال:- جناب مفتی صاحب! میں بسلسلۂ روزگار لندن میں مقیم ہوں، میں نے پاکستان میں ایک جگہ شادی کی، اب میں بیوی کو اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتا ہوں مگر میرے سسرال والے اس کو میرے ساتھ نہیں جانے دیتے، کیا میں شرعًا اس کو ساتھ لے جا سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:- اگر آپ کی بیوی آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو اُس کے والدین یا دیگر رشتہ داروں کو منع کرنے کا کوئی حق نہیں اور اگر آپ کی بیوی ہی آپ کے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہو تو مفتیٰ بہ رائے کی رُو سے اُسے ساتھ جانے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: لکن فی النھر والذی علیہ العمل فی دیارنا انہ لایسافر بھا جبرًا علیھا وجزم بہ البزازی وغیرہ وفی المختار وعلیہ الفتویٰ۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۲ ص۲۹۵ باب المھر) [۱]

مفقود الخبر کی موت کی خبر کا مسئلہ

سوال:- ایک شخص کئی سالوں تک غائب رہا، کافی مدت کے بعد کسی نے یہ اطلاع دی کہ فلاں شخص فوت ہوچکا ہے اور میں اس کے جنازہ میں بھی شرکت کرچکا ہوں (جبکہ حقیقت میں وہ زندہ تھا) اس اطلاع کے بعد اس کی بیوی نے عدتِ وفات گذار کر دوسری شادی کرلی، اب وہ شخص زندہ واپس آگیا ہے تو یہ عورت کس کی بیوی شمار ہوگی؟

الجواب:- کسی آدمی کے زیادہ مدت غائب رہنے سے نکاح متاثر نہیں ہوتا اور نہ خبرِ وفات کی شہرت سے نکاح ختم ہوتا ہے، اس صورتِ مسئولہ میں یہ عورت بدستور پہلے خاوند کی بیوی ہے تجدیدِ نکاح کی ضرورت نہیں۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولو ان امرأۃ اخبرھا ثقۃ ان زوجھا الغائب مات عنھا او طلقھا ثلاثًا او کان غیر ثقۃ واتاھا بکتاب من زوجھا بالطلاق الخ

---

[۱] قال المرغینانیؒ: وقیل لایخرجھا الی بلد غیر بلدھا لان الغریب یوذی وفی قری المصر القریبۃ لاتتحقق الغربۃ۔ وقال ابن الھمامؒ: فی شرح ھٰذہ العبارۃ وافتی کثیر من المشائخ بقول الفقیہ لان النص مقید بعدم المضارۃ بقولہ تعالیٰ: وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ، بعد اسکنوھن والنقل الیٰ غیر بلدھا مضارۃ۔ الخ (فتح القدیر ج۳ ص۲۵۰ باب المھر)

فلا بأس بان تعتد ثم تتزوج ۔ (الهداية ج۴ ص۴۵۳ کتاب الکراهیة) لـه

نکاح میں نان ونفقہ نہ دینے کی شرط لگانا

سوال: - اگر کوئی شخص بوقتِ نکاح یہ شرط لگائے کہ میں بیوی کے نان ونفقہ کا ذمہ دار نہ ہوں گا، کیا شرعاً یہ شرط درست ہے؟ اور اگر اس شرط پر نکاح ہو گیا تو شوہر بیوی کے نان ونفقہ سے مبرّا ہو گا یا نہیں؟

الجواب: - شریعتِ مقدسہ میں ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو وہ ناقابلِ عمل اور باطل ہے، اور اس شرط پر کیا گیا نکاح فی ذاتہٖ جائز اور درست ہے، اور شرط کالعدم ہونے کی وجہ سے شوہر پر بیوی کے جملہ حقوق مثلاً نان ونفقہ وغیرہ لازم ہوں گے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تحت قوله والنکاح) کتزوجتك علیٰ ان لا یکون لك مهر فیصح النکاح ویبطل الشرط ۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۱۶، ۳۱۷ کتاب النکاح) لـه

ٹیلیفون پر نکاح کا حکم

سوال: - اگر مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول ٹیلیفون کے ذریعے ہو جبکہ نکاح کے گواہ اور حاضرینِ مجلسِ نکاح اس ایجاب وقبول کو سُن بھی لیں تو کیا اِس سے نکاح ہو جائے گا؟

الجواب: - آجکل ٹیلیفون سیٹ کئی قسم کے ملتے ہیں مثلاً (۱) وہ ٹیلیفون سیٹ جس سے

لـه وفی الهندیة : امرأة غاب زوجها فاتاها مسلم غیر ثقة بکتاب الطلاق من زوجها ولا تدری انه کتابه ام لا الا ان اکبر رائیها انه حق فلا بأس ان تعتد ثم تتزوج ۔ کذا فی محیط السرخسی : اذا غاب الرجل عن امرأته فاتاها مسلم عدل فاخبرها ان زوجها طلقها ثلاثاً اومات عنها فلها ان تعتد وتتزوج بزوج آخر ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۱۲ الفصل الثانی فی العمل بخبر الواحد فی المعاملات)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۸ ص۵۰۶ کتاب النکاح ۔

لـه قال الشیخ مولانا محمد زکریا کاندهلویؒ : مایبطل الشرط ویصح العقد مثل ان یشترط ان لامهر لها وان لاینفق علیها وان لایطاها اوشرط علی المرأة ان تنفق علیه اوتعطیه شیئاً فهٰذه الشروط کلها باطلة والعقد صحیح ۔ (اوجز المسالک ج۲ ص۲۶۵ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۳۳۱ فصل فی النکاح علی الشرط ۔

صرف ایک آدمی آواز سُن سکتا ہے۔ (۲) وہ ٹیلیفون سیٹ جن کے ذریعے بات کرنے والے ایک دوسرے کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ (۳) وہ ٹیلیفون سیٹ جن کے ذریعے بات چیت کرنے والوں کی آواز حاضرین مجلس بھی سُن سکتے ہیں۔ اوّل الذکر میں نکاح منعقد نہ ہوگا، اس لیے کہ گواہوں کے لیے ایجاب وقبول کا ایک ساتھ سننا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے اور اخیرین میں چونکہ شہادت کے تمام تقاضے پورے ہوسکتے ہیں لہٰذا نکاح درست ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وشرط حضور شاہدین حرین او حر وحرتین مکلفین سامعین قولہما معاً علی الأصح۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردّالمختار ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح) ؎۱

بالغ اولاد کی شادی کرنا والدین کا فرض ہے

سوال:۔ ہمارے پٹھانوں میں یہ رواج ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی بالغ ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ باپ کے فرائض میں سے ہے کہ وہ ان کی شادی کا انتظام کرے کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ جب اولاد بالغ ہوجائے اور اسکے کفو کی لڑکی یا لڑکا مل جائے تو یہ باپ کے فرائض منصبی میں داخل ہے کہ وہ ان کی شادی کا بندوبست کرے اور اس میں دیر کرنا مناسب نہیں۔

عن ابی سعید و ابن عباسٍ قالا قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من ولد لہٗ ولد فیحسن اسمہ وادبہ فاذا بلغ فلیزوّجہ فان بلغ ولم یزوجہ فاصاب اثماً فانما اثمہ علیٰ ابیہ۔

(مشکوٰۃ المصابیح ص۲۷۱ باب الولی) ؎۲

؎۱ وفی الھندیۃ: ومنھا سماع الشاھدین کلامھما معاً ھٰکذا فی فتح القدیر فلاینعقد بشھادۃ نائمین اذا لم یسمعا کلام العاقدین۔ الخ

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۲۶۸ کتاب النکاح، الفصل الاوّل)

؎۲ عن عمر بن الخطاب وانس بن مالک (رضی اللہ عنہما) عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: فی التوراۃ مکتوبٌ من بلغت ابنتہ اثنتی عشرۃ سنۃ ولم یزوجہا فاصابت اثماً فاثمُ ذٰلک علیہ۔

(مشکوٰۃ المصابیح ص۲۷۱ باب الولی)

قوتِ گویائی سے محروم شخص کے نکاح کا حکم

سوال:۔ کیا قوتِ گویائی سے محروم شخص کا نکاح اشارے سے منعقد ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ بہت سارے احکامات میں اشارہ قائم مقام ملفوظ ہوتا ہے، اس لیے اگر نکاح کے معاملے میں فریقین یا ایک فریق بات کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ ایجاب وقبول اشارے سے کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اشارہ رشتۂ زوجیت کے انسلاک کو واضح کرتا ہو۔

قال العلامة الکاسانیؒ: کما ینعقد النکاح بالعبارة ینعقد بالاشارة من الاخرس اذا کانت اشارته معلومة الخ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۳۱ فصل اما رکن النکاح) [۱]

وکیل کے ذریعے تحریری ایجاب سے نکاح کا حکم

سوال:۔ کیا مجلسِ نکاح میں فریقین کا حاضر ہونا اور زبانی ایجاب وقبول کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کسی کی طرف سے مجلسِ نکاح میں تحریری صورت میں بغیر اس کی موجودگی کے ایجاب پیش کیا جائے اور فریقِ ثانی گواہوں کے سامنے اُس ایجاب کو قبول کرے تو کیا اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ بہتر یہ ہے کہ دونوں عاقدین یا ان کے وکلاء مجلسِ نکاح میں موجود ہوں لیکن اگر کوئی فریق خود یا اس کا وکیل نہ ہو مگر اس کی طرف سے ایجاب مستند تحریری شکل میں موجود ہو اور فریقِ ثانی گواہوں کی موجودگی میں قبول کا اظہار کرے تو نکاح درست ہوگا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ولو ارسل الیها رسولاً وکتب الیها بذٰلک کتاباً فقبلت بحضرة شاهدین سمعا کلام الرسول وقرأة الکتاب جاز ذٰلک لاتحاد المجلس من حیث المعنی۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۳۳ فصل اما شرائط النکاح) [۲]

---

[۱] قال ابن عابدینؒ، فان کان الاخرس لا یکتب وکان له اشارة کعرف فی طلاقه ونکاحه وشرائه وبیعه فهو جائز۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۲۱ کتاب الطلاق)

[۲] وفی الهندیة: ولو ارسل الیها رسولاً وکتب الیها بذٰلک کتاباً فقبلت بحضرة الشاهدین سمعا کلام الرسول وقرأة الکتاب جاز ذٰلک لاتحاد المجلس من حیث المعنی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۶۹ کتاب النکاح۔ باب الاوّل)

نکاح کے لیے قاضی کالاناضروری نہیں | **سوال:**۔ کیا نکاح پڑھانے کے لیے قاضی یا نکاح رجسٹرار وغیرہ کو مجلس نکاح میں لاناضروری ہے کہ وہ نکاح پڑھائیں یا یہ کہ مرد وعورت کو باہم ایجاب وقبول سے گواہوں کے سامنے نکاح باندھنے کی اجازت ہے ؟

الجواب:۔ جب عاقدین باہم گواہوں کے سامنے ایک مرتبہ ایجاب وقبول کرلیں تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے، انعقادِ نکاح کے لیے رجسٹرار یا قاضی کو نکاح پڑھانے کے لیے بلاناضروری نہیں اور نہ مروجہ نکاح نامے کو پُر کرنا لازم ہے تاہم فسادِ زمانہ اور قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے نکاح نامہ پُر کرنا مستحسن ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: النكاح ينعقد بالايجاب والقبول بلفظين يعبر بهما عن الماضي...... ولاينعقد نكاح المسلمين الا بحضور الشاهدين حرين عاقلين بالغين مُسلمين رجلين ورجل وامرأتين الخ۔ (الهداية ج۲ ص۲۸۵،۲۸۶ كتاب النكاح)[1]

نکاح نامہ پُر کرنے کی شرعی حیثیت | **سوال:**۔ آجکل پورے ملک میں یہ رواج ہے کہ نکاح کے وقت نکاح نامہ فارم لازمی پُر کرنا ہوتا ہے، کیا انعقادِ نکاح کے لیے شرعاً یہ فارم پُر کرنا ضروری ہے ؟

الجواب:۔ نکاح عاقدین کے ایجاب وقبول کا نام ہے جبکہ یہ دوگواہوں کے سامنے کیا جائے، انعقادِ نکاح کے لیے قاضی کے پاس نکاح نامہ فارم پُر کرنا، اسٹامپ لکھوانا شرعاً ضروری نہیں، تاہم آجکل کے حالات کے پیشِ نظر قانونی گرفت سے بچنے کے لیے نکاح نامہ فارم پُر کرنا مستحسن ضرور ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: النكاح ينعقد بالايجاب والقبول يعبر بهما عن الماضي...... ولا ينعقد نكاح المسلمين الا بحضور شاهدين حرين

---

[1] قال داماد آفندی رحمه الله: وينعقد بايجاب عن الزوج اوعن الزوجة وقبولٍ من الآخر كلاهما بلفظ الماضي...... وشرط سماع كل واحدٍ من العاقدين..... وحضورُ شاهدين حرين اوحرٍ وحرتين عاقلين بالغين مسلمين سامعين معًا لفظهما۔
(دُرر المنتقى على هامش مجمع الانهر ج۱ ص۳۱۷ و ۳۲۰ كتاب النكاح)

عاقلین بالغین مسلمین رجلین اورجل وامرأتین ۔ الخ (الھدایۃ ج ۲ ص ۲۸۵، ۲۸۶ کتاب النکاح) لہ

ایجاب نامے پر دستخط کردینے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:- اگر کوئی شخص کسی عورت سے دھوکہ سے اسٹامپ دستخط کرالے جس میں نکاح پر ایجاب وقبول درج ہو، تو کیا نفسِ تحریر سے نکاح منعقد ہوگا یا نہیں جبکہ عورت نے زبان سے قبول نہ کیا ہو؟

الجواب:- شریعتِ اسلامی میں نکاح دوگواہوں کے سامنے زبانی ایجاب و قبول کا نام ہے نفسِ تحریر سے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: فلوکتب تزوجتک فکتبت قبلت لم ینعقد بحر۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۸۸ کتاب النکاح) ۲ہ

ایجاب وقبول میں مطابقت ضروری ہے

سوال:- اگر ایجاب وقبول میں بظاہر مطابقت نہ ہو تو کیا اس سے نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب:- ہر معاملہ میں ایجاب وقبول کے اندر مطابقت ضروری ہے، اگر دونوں میں مطابقت نہ ہو تو معاملہ صحیح نہ ہوگا، اسی طرح اگر نکاح کے ایجاب وقبول میں بھی مطابقت نہ ہو تو نکاح درست نہ ہوگا۔

کما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وینعقد النکاح بایجاب من احدھما وقبول من الآخر وضعا للمضی لان الماضی ادل علی التحقیق کزوجت نفسی اوبنتی اومؤکلتی منک و یقول الآخر تزوجتُ الخ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۳ کتاب النکاح) ۳ہ

لہ قال العلامۃ داماد افندیؒ: وینعقد بالایجاب من الزوج اومن الزوجۃ وقبول من الآخر کلاھما بلفظ الماضی .... وشرط سماع کل واحد من العاقدین .... وحضور شاھدین حرین اوحر وحرتین عاقلین بالغین مسلمین سامعین معاً لفظھما۔ الخ (درر المنتقی علی ھامش مجمع الانھر ج ۱ ص ۳۱۶، ۳۲۰ کتاب النکاح)

۲ہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: افاد المصنف أن انعقاد النکاح بکتاب احدھما یشترط فیہ سماع الشاھدین قرأۃ الکتاب مع قبول الآخر۔ (البحرالرائق ج ۳ ص ۸۹ کتاب النکاح)

۳ہ وفی الھندیۃ: ومنھا ان لایخالف القبول الایجاب فاذا قال الآخر زوجتک ابنتی علی الف درھم فقال الزوج قبلت النکاح ولا اقبل المھر کان باطلاً ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۶۹ کتاب النکاح الباب الاول)

نکاح میں نابینا شخص کی گواہی

سوال: اگر نکاح کی مجلس میں دو گواہ تو موجود ہوں مگر نابینا (بصارت سے محروم) ہوں تو کیا ان کی گواہی سے نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء احناف کے ہاں نکاح کے گواہوں میں چار شرائط کا ہونا ضروری ہے: (۱) حریت (۲) عقل (۳) بلوغ (۴) اسلام۔ چونکہ بینا ہونا ان شرائط میں داخل نہیں لہٰذا نکاح کے معاملہ میں ان کی گواہی احناف کے ہاں درست ہے۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وشرط فی الشاهد اربعة امور الحریة والعقل والبلوغ والاسلام۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۹۵ کتاب النکاح) [۱]

مجلس نکاح میں گواہوں کی موجودگی ضروری ہے

سوال: کیا مجلس انعقادِ نکاح میں گواہوں کی موجودگی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مجلس انعقادِ نکاح میں ماسوائے مالکیہ کے تمام ائمہ کے ہاں گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے، گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔

قال العلامة صدر الشریعة رح: وحضور حرین او حر وحرتین مکلفین مسلمین سامعین معاً لفظهما۔ (شرح الوقایة ج ۲ ص ۹ کتاب النکاح) [۲]

زانی اور مزنیہ کا نکاح پڑھانے والے پر کوئی عتاب نہیں

سوال: اگر بے خبری میں نکاح خوان زانی اور مزنیہ کا نکاح پڑھادے تو کیا نکاح خوان پر کوئی عتاب ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامة المرغینانی رح: ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین حرین عاقلین بالغین مسلمین رجلین او رجل وامرأتین۔ (الهدایة ج ۲ ص ۲۸۶ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص ۹ کتاب النکاح۔

[۲] قال العلامة المرغینانی رح: ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین حرین عاقلین بالغین مسلمین رجلین او رجل وامرأتین۔ (الهدایة ج ۲ ص ۲۸۶ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص ۲۶۹ کتاب النکاح۔ الباب الاول۔

الجواب: زانی اور مزنیہ کا آپس میں نکاح کرنا صحیح ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح نکاح حبلیٰ من زنا الیٰ قولہ وان حرم وطؤھا ودواعیہ حتی تضع الیٰ قولہ لونکحھا الزانی حل لہ وطؤھا اتفاقاً۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج۲ ص۳۱۶ فصل فی المحرمات مطلب فی وطء السراری المحرم)[1]

لہٰذا جب زانی اور مزنیہ کا آپس میں نکاح کرنا جائز ہے تو پھر نکاح پڑھانے والے (نکاح خواں) پر بھی کوئی عتاب نہیں ہوگا۔

نکاح میں صرف آمین کہہ کر قبول کرنا درست ہے

سوال: نکاح پڑھتے وقت مولوی صاحب کے اس قول کے جواب میں کہ میں نے فلاں کی بیٹی فلانہ کو اتنے حق مہر کے عوض آپ کے نکاح میں دیدی تو لڑکے نے جواب میں "قبول ہے" کی بجائے تین بار "آمین" کہا، تو کیا اس سے نکاح ہوجاتا ہے یا نہیں؟

الجواب: آمین کا لفظ قبول کا فائدہ دیتا ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں لڑکے کا ایجاب کے مقابلے میں آمین کہنے سے نکاح درست ہے اور مہر لازم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وعبارۃ الفتح لما علمنا ان الملاحظۃ من جھۃ الشرع ثبوت الانعقاد ولزوم حکمہ جانب الرضاء فعدینا حکمہ الیٰ کل لفظ یفید ذٰلک الخ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۲۸۷ کتاب النکاح، مطلب التزوج بارسال کتاب الخ)[2]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وان تزوج حبلیٰ من زنا جاز النکاح ولایطاءھا حتی تضع حملھا الخ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۹۱، ۲۹۲ فصل فی بیان المحرمات)۔

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۰۶ فصل فی المحرمات۔

[2] وفی الھندیۃ: امرأۃ قالت لرجل زوجت نفسی منک فقال الرجل بخدا وندکاری پذیرفتم یصح النکاح ولو لم یقل الرجل ذٰلک لکنہ قال لھا ستانش ان لم یقل بطریق الطنز یصح النکاح۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۲۷۲ الباب الثانی فیما ینعقد بہ النکاح ومالا ینعقد)

ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۲ ص۳ کتاب النکاح۔ الفصل الاول فی جواز النکاح والاجازۃ۔

نکاح پر اظہارِ مسرت کے بعد ناراضگی کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی محمد اسلم نے اپنی لڑکی نور جہاں کی منگنی مسمّی بشیر محمد ولد سلطان محمد سے آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے کی، اور اس وقت مظفر اللہ ولد محمود خان، محمد قریش ولد مقدر، اسرار محمد ولد نوارے، عثمان غنی اور دیگر افراد کی موجودگی میں مسماۃ نور جہاں کے والد حاجی محمد اسلم نے یہ الفاظ کہے کہ "میں نے اپنی بیٹی نور جہاں کی شادی بشیر محمد ولد سلطان محمد سے کر دی" اور فضل محمد ولد سلطان محمد (جو کہ دولہا کا بھائی ہے) نے اسی وقت گواہوں کے سامنے بطور وکیل یہ الفاظ کہے کہ: "میں نے اپنے بھائی بشیر محمد ولد سلطان محمد کے لیے قبول کیا"، اور سات تولہ سونا حق مہر مقرر کیا گیا، اس کے بعد مٹھائی وغیرہ بھی تقسیم کی گئی لیکن رواج اور عرف کی وجہ سے یہ کاروائی تحریر میں نہ لائی جاسکی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) قرآن وسنت کی رُو سے مندرجہ بالا الفاظ کہنے سے یہ نکاح منعقد ہُوا ہے یا نہیں؟ حالانکہ مذکورہ لڑکی نور جہاں کو اس کاروائی کی خبر کر دی گئی تھی اور وہ راضی بھی تھی، جبکہ پٹھانوں کے رواج کے مطابق سونے کی انگوٹھی بطور نشانی اُسے پہنا دی گئی۔

(۲) اب اتنا عرصہ گذرنے کے بعد چند ماہ پہلے مسماۃ نور جہاں دختر حاجی محمد اسلم نے کہا کہ میں خوش نہیں ہوں حالانکہ اس سات آٹھ سال کے عرصے میں وہ برابر خوشی کا اظہار کرتی رہی اس کے بعد مسماۃ نور جہاں نے اپنے والد کی مرضی اور اسے اطلاع کیے بغیر چوری چھپے مسمّی خالد سے نکاح کر لیا اور سرکاری کاغذات میں بھی نکاح رجسٹرڈ کرا لیا —— اب عرض یہ ہے کہ حاجی محمد اسلم جو کہ دُلہن کا والد ہے (اور اب بھی بقائمی ہوش وحواس ہے) نے عدالت میں یہ گواہی دی ہے کہ میں نے اپنی بیٹی نور جہاں کا نکاح تقریباً آٹھ سال پہلے مسمّی بشیر محمد ولد سلطان محمد سے کر دیا تھا۔ تو اس کے باوجود قرآن وسنت کی روشنی میں نور جہاں کا نکاح مسمّی خالد سے منعقد ہو گیا ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ لڑکی اس طریقہ سے والد کی مرضی کے بغیر اپنا سابقہ نکاح فسخ کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ (۱) شریعتِ محمدی میں نکاح جانبین کی طرف سے باہمی ایجاب وقبول کو کہا جاتا ہے چاہے یہ ایجاب وقبول عاقدین کے وکلاء کے مابین ہوں یا خود عاقدین ایک دوسرے سے ایجاب وقبول کر لیں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ لمافی الدرالمختار: وینعقد

ملبسًا بایجاب من احدهما وقبول من الآخر وضعًا للمضی ..... الخ
(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۲۶۳ کتاب النکاح)

(۲) اور گواہوں کی موجودگی اور حق مہر کا تقرر بھی نکاح کی شرائط میں سے ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وشرط حضور شاهدین حرین او حر و حرتین مکلفین الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)

ولقولہ تعالی: وابتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین۔ الآیۃ

(۳) اور جب ایک عورت کا نکاح اس کی خوشی اور رضامندی سے کسی مرد سے کر دیا جائے یا بغیر اس کے علم کے کر دیا جائے اور اس کی خبر ہونے کے بعد وہ اُسے رد نہ کرے بلکہ اس پر خاموش رہے یا رضامندی کا اظہار کر دے تو اس کے بعد عورت کا نکاح سے انکار ناقابلِ مسموع ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فان استاذنها هو ای الولی او وکیله او رسوله او زوجها ولیها واخبرها رسوله او فضولیٌ عدل فسکتت او ضحکت غیر مستهزأۃ او تبسمت او بکت بلا صوت فهو اذن۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۲۹۹ کتاب النکاح)

ان جملہ مقدمات کے بعد صورتِ مسئولہ کے مطابق حاجی محمد اسلم کی بیٹی نور جہاں کا نکاح بشیر محمد ولد سلطان محمد کے ساتھ منعقد ہو چکا ہے اور شرعاً یہ لڑکی اس کی منکوحہ ہے لہٰذا خالد کے ساتھ اس کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوا ہے اور خالد کا نکاح منکوحۃ الغیر کے ساتھ نکاح ہے جو بنصِ قرآنی ممنوع ہے۔

لقولہ تعالی: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ۔ (سورۃ النساء آیت ۲۴)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: واما النکاح منکوحۃ الغیر ومعتدته ..... لانه لم یقل احد بجوازه فلم ینعقد اصلاً۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۶۵۹ باب العدۃ)

نکاح کے انعقاد کو صفحۂ قرطاس پر لانا شرعاً ضروری نہیں ہے بلکہ صرف گواہوں کی موجودگی شرط ہے لہٰذا مسماۃ نور جہاں بنت حاجی محمد اسلم شرعاً بشیر محمد ولد سلطان محمد کی منکوحہ ہے اور مسمی خالد سے اس کا نکاح کالعدم ہے اور اسی طرح مسماۃ نور جہاں کا بشیر محمد ولد سلطان محمد سے نکاح کے لیے اجازت دینے کے بعد نکاح پر عدمِ رضامندگی کا اظہار کرنا بھی ناقابلِ تسلیم ہے۔

حلفاً نکاح کا وعدہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں ایک شخص کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی، ایک دفعہ مجھے اکیلا دیکھ کر قرآن مجید لے کر وہ میرے پاس آگیا اور مجھے ڈرا دھمکا کر کہنے لگا کہ اس پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ تم مجھ سے شادی کرو گی، میں نے خوف کی وجہ سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر ہاں کہہ دیا، کیا ایسا کرنے سے میرا اس شخص کے ساتھ نکاح ہو گیا ہے یا میں آزاد ہوں؟ میں اب بھی اس کو دیکھنا نہیں چاہتی، اگر میں نے یہ گناہ کیا ہے تو قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا کفارہ بھی بتائیں، میں دعاگو رہوں گی۔ (ایک دُکھی بیٹی)

الجواب:۔ سوال میں مذکورہ الفاظ نکاح کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ وعدۂ نکاح ہے اور اگر یہ الفاظ الفاظِ نکاح ہوتے تو پھر بھی نکاح نہ ہوتا، کیونکہ مستفتی کے بیان کیمطابق یہ بات بغیر گواہوں کے ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ آزاد ہیں، البتہ بظاہر یہ معاملہ حلف وقسم کا ہے اس لیے حنث کی صورت میں کفارہ دینا پڑے گا۔

خطبہ پر خطبہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے ساتھ ایک عورت کا رشتہ طے ہو گیا ہے اب دوسرے لوگوں کا اس عورت کے ساتھ رشتہ کی بات کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ جب کسی عورت کا ایک جگہ رشتہ طے پاجائے تو جب تک لڑکے اور لڑکی کے رشتہ دار اس رشتہ سے اعراض نہ کریں تو دوسرے لوگوں کے لیے اس عورت سے رشتہ کی بات کرنا شرعاً جائز نہیں، اس سے شرع کی مخالفت لازم آتی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث ولا تجسسوا ولا تحسسوا ولا تباغضوا وکونوا إخوانا ولا یخطب الرجل علی خطبۃ أخیہ حتی ینکح او یترک۔

(صحیح البخاری کتاب النکاح ج ۵ ص ۱۹۷۶) [۱]

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: ولا یخطب مخطوبۃ غیرہ لأنہٗ جفاء وخیانۃ۔
(ردّ المحتار ج ۳ ص ۹ کتاب النکاح)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص ۸۱ کتاب النکاح۔

بوقتِ نکاح چھوہارے پھینکنا سنّت ہے

سوال:۔ نکاح کے وقت چھوہارے پھینکنا سنّت ہے یا کہ حاضرینِ مجلسِ نکاح میں فرداً فرداً تقسیم کرنا افضل ہے۔

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک اور فقہاء کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلسِ نکاح کے شرکاء میں فرداً فرداً چھوہارے تقسیم کرنے کی بجائے پھینکنا سنت ہے۔

ذکر العلامہ ظفر احمد العثمانیؒ: انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضر فی املاک (ای نکاح) فاتی بطباق علیہا جوز ولوز وتمر فنثرت فقبضنا ایدینا فقال ما بالکم لا تأخذون فقالوا لانک نہیت عن النہبی فقال انما نہیتکم عن نہبی العساکر خذوا علی اسم اللہ فجاذبنا وجاذبناہ ۔ (اعلاء السنن ج ۱۱ ص۱۱ کتاب النکاح، باب الولیمۃ) [۱]

اغواء سے نکاح متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک عورت کو اغواء کرکے اغواکنندہ نے اس سے دوسرا نکاح کرلیا ، تو کیا دوسرے نکاح سے عورت کے پہلے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک مرتبہ کسی عورت کا نکاح کسی مرد سے ہوجائے تو یہ عورت اس مرد کی بیوی ہے، اب اس کا کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا ناجائز ہے اور اس سے پہلا نکاح متاثر نہیں ہوگا جب تک خاوند اس کو طلاق نہ دے۔

لما فی الہندیۃ: لا یجوز للرجل ان یتزوّج زوجۃ غیرہ وکذلک المعتدۃ۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۲۸۰ الباب الثالث فی بیان المحرمات) [۲]

---

[۱] لما فی خیر الفتاوی: سوال:۔ شادی کے موقع پر چھوہارے پھینکنا سنّت ہے یا تقسیم کرنا سنّت ہے؟
الجواب: صورتِ مسئولہ میں شادی کے موقع پر چھوہارے پھینکنا سنّت ہے۔
(خیر الفتاوی ج ۴ ص۵۸۵ کتاب النکاح، باب متفرقات النکاح)

[۲] قال عالم بن علاء الانصاریؒ: ولا یجوز نکاح منکوحۃ الغیر ومعتدۃ الغیر عند الکل۔ (الفتاوی التاتارخانیہ ج ۲ ص۱۶ کتاب النکاح، فی بیان ما یجوز من الانکحۃ ومالا یجوز)
ومثلہ فی ردّ المحتار ج ۲ ص۳۰۰ فصل فی المحرمات۔

سول میرج کا شرعی حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو مسلمان یورپین ممالک میں "سول میرج" کے ذریعے شادی کرتے ہیں، شریعتِ اسلامیہ میں ایسے مسلمانوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ اور کیا اس نظریہ کو شریعتِ اسلامیہ قبول کرتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کرتی تو ان کی جو اولاد پیدا ہوتی ہے اسلامی معاشرے میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور اس کو کس نظر سے قبول کرتا ہے اگر نہیں کرتا تو ایسے میاں بیوی کا اسلامی معاشرے میں کیا درجہ رہ جاتا ہے؟ اس کے علاوہ اگر وہ "سول میرج" کے بعد اسلامی قواعد وضوابط کے مطابق دوبارہ تجدیدِ نکاح کرلیں تو پھر ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ "سول میرج" کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ "سول میرج" کس طریقہ پر کیا جاتا ہے، تاکہ شرعی نکاح اور سول میرج کا مقابلہ کرکے اس جواز اور عدمِ جواز پر کچھ اظہارِ خیال کیا جاسکتا۔ تاہم اپنی معلومات کی حد تک شرعی طریقہ کے مطابق ازدواجی سلسلے کے چند اصول قانونی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں، اگر سول میرج ان اصولوں کے مطابق ہو تو اس کو نکاح تسلیم کیا جائے اور اس پر تمام وہ احکام جاری ہوں گے جو کہ شرعی نکاح پر جاری ہوتے ہیں، اور اگر "سول میرج" ان اصولوں کے مخالف ہو تو شریعتِ اسلامی اس کو "نکاح" تسلیم نہیں کرے گی، اور ایسے میاں بیوی سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولدالزنا شمار کی جائے گی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ مطلق نکاح قطع نظر منکوحین کے بالغ یا نابالغ ہونے سے آیا دُنیا کا کام ہے یا دین کا، تاکہ اس سے یہ سمجھنا آسان ہو کہ اس میں تصرّف کرنا یہ تصرّف فی الدنیا ہے یا فی الدین! سو اس کا ایک معیار ہے، وہ یہ کہ جس کا شریعت میں تاکیدی یعنی وجوبی یا ترغیبی یعنی استحبابی حکم کیا گیا ہو یا اس پر ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو، تو وہ دین کا کام ہے۔ پھر اگر اس کے ترک کرنے پر کوئی وعید یا ناراضگی بھی وارد ہوئی ہو تو وہ فرض ہے یا واجب، اور جس کے ترک پر کوئی وعید یا ناراضگی وارد نہ ہوئی ہو تو وہ مستحب ہے، اور جس میں یہ بات نہ ہو وہ دنیا کا کام ہے، اگرچہ اس کے متعلق جو احکام

وارد ہوں وہ احکام ہر حال میں دین ہی ہیں، اور جس اعتقاد یا عمل سے ان احکام میں تغیر ہوتا ہو وہ تغیر فی الدین ہے ـــ اب نکاح کو اس معیار پر منطبق کر کے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ دین کا کام ہے، کہ بعض حالات میں اس کا تاکیدی اور بعض میں ترغیبی حکم بھی ہے، اور اس پر ثواب کا وعدہ بھی ہے اور اس کے ترک پر مذمت اور شناعت بھی فرمائی گئی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وانکحوا الایامیٰ منکم (سورۃ النور ع۱۱) تم میں سے جو بے نکاح عورتیں ہوں تم ان کا نکاح کر دیا کرو۔ وغیرھا من الآیات والاحادیث۔

علماء امت اور ائمہ کے اقوال سے بھی اس کے امرِ دینی ہونے کا اثبات موجود ہے، دُرِّ مختار میں ہے: لیس لنا عبادۃ شرعت من عھد آدم علیہ السلام الی الآن ثم تستمر فی الجنۃ الا النکاح والایمان۔ اس میں نکاح کے عبادت ہونے کی تصریح ہے، اور عبادت بھی ایسی کہ تمام شرائع میں مشترک اور عبادت کے دینی کام ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے، اگرچہ اس کے استمرار فی الجنۃ پر بعض نے کلام کیا ہے لیکن باقی دوسرے اجزا سب کے نزدیک مسلّم ہیں ـــ اور شامی میں لکھا ہے: وقدمہ علی الجھاد الیٰ قولہ وکذا علی العتق والوقف والاضحیۃ وان کانت عبادات ایضًا لانہ اقرب الی الارکان الاربع حتی قالوا ان الاشتغال بہ افضل من التخلی لنوافل العبادات ای الاشتغال بہ وما یشتمل علیہ من القیام بمصالحہ واعفاف النفس عن الحمام وتربیۃ الولد ونحو ذلک اھ

دیکھئے اس عبارت میں کس شدّ و مد کے ساتھ نکاح کی فضیلتِ دینیہ کو بیان کیا گیا ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ نکاح ایک امرِ دینی ہے اور ہر ایک دینی کام کے لیے شریعت نے کچھ اسلوب اور طریقے بیان کیے ہیں، نکاح کے لیے بھی ضرور ارکان اور شرائط ہوں گے، جن کے مطابق اگر کیا جائے تو اس کو نکاح کہا جائے گا اور اس پر سب نتائج درست مرتب ہوں گے، اور اگر ان شرائط اور ارکان کے مطابق نہ کیا جائے تو اس کو شرعًا نکاح نہیں کہا جائے گا اور اسلامی معاشرہ میں اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی اور بجائے بہتر نتائج کے بد نتائج اس پر مرتب ہوں گے ـــ اس مقصد کے حصول اور اس مشکل کے حل

کے لیے جب ہم اپنی شریعتِ اسلامی کی کتابوں کی تتبع اور تلاش کرتے ہیں، تو کتابوں میں اس کے متعلق ایک مستقل بحث "کتاب النکاح" کی شکل میں موجود ہے جس کا مطالعہ کرنے سے شرعی نکاح کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ شریعتِ اسلامی کے فقہاء کرام نے شرعی نکاح کی تفسیر یوں بیان کی ہے: هو عقد يفيد ملك المتعة اى حل استمتاع الرجل من امرأة لم يمنع من نكاحها مانع شرعي۔ الدر المختار ج ۳ ص۳ کتاب النکاح

یعنی یہ مرد اور عورت کے درمیان ایک ایسا ربط و تعلق قائم کرنا ہے کہ جس سے آدمی کو عورت سے اور عورت کو آدمی سے نفع حاصل کرنا حلال ہوجاتا ہے۔ جن الفاظ سے یہ خاص ربط و تعلق پیدا ہوجاتا ہے وہ نکاح کے ارکان ہیں۔ کسی چیز کا رکن اس کو کہتے ہیں کہ اس چیز کی ذات کا دار و مدار اسی پر ہو۔ واما ركنه فالايجاب والقبول كذا فى الكافى۔ والايجاب ما يتلفظ به اولا من اى جانب كان والقبول جوابه۔ هكذا فى العناية۔ یعنی شرعی نکاح کا انعقاد ایجاب و قبول سے ہوتا ہے، چاہے یہ ایجاب و قبول خود مرد و عورت کرلیں، اگر خوفِ فتنہ نہ ہو یا بذریعہ اولیاء یا وکیل یا فضولی کے ہوجائے۔ اب اس ایجاب و قبول کے معتبر اور مسلم ہونے کے لیے چند شرائط ہیں جن پر اس ایجاب و قبول کے معتبر ہونے کا توقف ہے۔ واما شروطه فمنها العقل والبلوغ والحرية فى العاقد الا ان الاول شرط الانعقاد فلا ينعقد نكاح المجنون والصبى الذى لا يعقل والاخيران شرط النفاذ فان نكاح الصبى العاقل يتوقف نفاذه على اجازة وليه هكذا فى البدائع۔ ونيها المحل القابل وهى المرأة التى احلها الشرع بالنكاح كذا فى النهاية۔ ومنها سماع كل من العاقدين كلام صاحبه هكذا فى فتاوى قاضى خان۔ ومنها الشهادة قال عامة العلماء انها شرط جواز النكاح هكذا فى البدائع ومنها سماع الشاهدين كلامهما معاً، هكذا فى فتح القدير۔ ومنها رضا المرأة اذا كانت بالغة بكراً كانت او ثيباً ومنها ان يكون الايجاب والقبول فى مجلس واحد۔ الخ ومنها ان لا يخالف القبول الايجاب ومنها ان يضيف النكاح

الی کلّها او مایعبر من الکل .... الخ۔ ومنها ان یکون الزوج والزوجۃ معلومین فلو زوج بنتہ ولہٗ بنتان لایصح الا اذا کانت احداھما متزوجۃ فینصرف الی الفارغۃ کذا فی النھما لفائق والکل۔
(الفتاوٰی المھندیۃ ج ۱ ص۲۸۵ تا ص۲۸۷ کتاب النکاح)

ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ ایجاب وقبول کرنے والا عاقل بالغ اور آزاد ہو۔ اس میں اوّل شرط یعنی عقل شرط انعقاد ہے، اس لیے کہ مجنون اور صبی غیر عاقل کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا، اور آخیر دو شرط بلوغ وحریت شرائط ہیں نفاذِ نکاح کے کیونکہ اگر لڑکا عاقل ہو تو اس کا نکاح منعقد تو ہو جاتا ہے مگر اجازتِ ولی پر موقوف ہوتا ہے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ جس عورت کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے وہ محلِ صالح ہو یعنی وہ عورت محرماتِ شرعیہ سے نہ ہو بلکہ شریعتِ مطہرہ نے نکاح میں لینا اس کا حلال کیا ہو، اور یہ کہ نکاح کرنے والے متعاقدین ایک دوسرے کی بات سُن لیں۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ یہ ایجاب وقبول روبروئے گواہان کے ہو جس کو شہادت کہتے ہیں۔

عام علماء نے یہ لکھا ہے کہ شہادت جوازِ نکاح کے لیے شرط ہے، اگر ایجاب و قبول ہو جائے مگر روبروئے گواہان کے نہ ہو تو یہ نکاح ہی نہیں۔۔۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ شاہدین (گواہان) دونوں متعاقدین کی بات سُن لیں۔ اگر عورت بالغہ ہو، چاہے باکرہ ہو یا ثیبّہ، تو اس کی رضامندی اور اجازت لینا بھی ضروری ہے، اور یہ کہ ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں ہوں، اور یہ کہ قبول ایجاب سے مخالف نہ ہو، اور یہ کہ نکاح کی اضافت اس کے کل بدن کی طرف ہو یا ایسے جزء کی طرف جس کو کل بدن سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ زوج اور زوجہ دونوں معلوم ہوں، مجہول نہ ہوں۔

ان شرائط اور ارکان کے علاوہ نکاح میں بعض امور ایسے ہیں جو سُنن اور مستحبات کے درجہ میں ہیں جن پر عمل کرنے سے اس ازدواجی سلسلہ میں خیر وبرکت پیدا ہوتی ہے۔ فقہ اسلامی کی معتبر کتاب "درمختار" میں ہے: ویندب اعلانہٗ وتقدیم

خطبۃ۔ وفی الشامی: لحدیث الترمذی: اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد۔ (الحدیث) والمراد من تقدیم الخطبۃ ما یذکر قبل اجراء العقد من الحمد والتشھد وانھا لا تتعین بالفاظ مخصوصۃ وان خطب بما ورد فھو احسن۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلانِ نکاح مستحب ہے، اور اسی طرح ایجاب و قبول کرنے سے قبل خطبہ پڑھنا جو حمد و شہادت پر مشتمل ہو مستحب ہے۔ آگے لکھتے ہیں: وکونہ فی المسجد یوم جمعۃ بعاقد رشید وشھود عدل والاستدانۃ لہ والنظر الیھا قبلہ وکونھا دونہ سنا وحسبا وعزا ومالا وفوقہ خلقا وادبا وورعا وجمالا ۔۔۔ مگر یہ تمام امور ایسے ہیں کہ جن سے اس ازدواجی سلسلہ میں مزید استحکام اور خیر و برکت پیدا ہوتی ہے، اور یہ امور شرائط اور ارکان نہیں ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے نکاح صحیح نہ ہوگا بلکہ یہ مستحب امور ہیں جن کا لحاظ رکھنا نہ رکھنے سے بہتر ہے۔

اس تمام تفصیل کو مدنظر رکھ کر شرعی نکاح کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "سول میرج" (جو یورپ وغیرہ میں مسلمان لوگ کرتے ہیں) اور "شرعی نکاح" میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہے کہ دونوں میں کچھ فرق نہیں تو فبہا ونعمت، اور اگر جواب اثبات میں ہے کہ دونوں میں کچھ فرق ہے تو سول میرج کو ہرگز شرعی نکاح نہیں کہا جا سکے گا۔ ہاں اگر بعد میں مذکورہ بالا شرائط کے مطابق تجدیدِ نکاح کر لیں تو درست ہوگا، ورنہ حرام کاری سے جو گندگی معاشرہ میں پھیلتی ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ عقلِ سلیم، فطرتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامیہ مرد و عورت کے ایسے بے باکانہ اور اصولِ دین کے خلاف ملنے کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

حضرت آدم علیہ السّلام کے نکاح کے گواہوں کی تحقیق

سوال:۔ حضرت آدم علیہ السلام کا نکاح کس جگہ ہوا اور کس نے یہ نکاح کیا، نیز اس کے گواہ کون تھے اور حق مہر کیا مقرر ہوا؟

الجواب:۔ اس مسئلہ کے متعلق وحی (قرآن و حدیث) میں کوئی تفصیل نہیں ملتی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کو وحی کے ذریعہ سے اذنِ استمتاع ملا جیساکہ ہمیں گواہوں کے رُوبرو ایجاب و قبول کرنے سے اذن ملتا ہے۔ البتہ حق مہر کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا حقِ مہر قرار دیا گیا۔ کما فی الصاوی وغیرہ فلیراجع۔

لما قال العلامۃ احمد الصاوی المالکی رحمہ اللہ: وقد خلقت بعد دخوله الجنّة نام فلما استيقظ وجدها فاراد ان يمد يده اليها فقالت له الملٰئكة مه يا آدم حتّٰى تؤدى مهرها وما مهرها فقالوا ثلاث صلوات اوعشرون صلاة على سيدنا محمّد صلى الله عليه وسلم۔

(الصاوی ج ۱ ص ۲۲ سورة البقرة)

باب من یجوز بہا النکاح ومن لا یجوز

(کن عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے اور کن کے ساتھ ناجائز ہے)

خنثیٰ مشکل سے نکاح کا حکم

سوال: خنثیٰ مشکل سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نکاح کے لیے محلِ نکاح ہونا ضروری ہے خنثیٰ مشکل چونکہ محلِ نکاح نہیں اس لیے خنثیٰ مشکل سے نکاح جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: ای حل استمتاع الرجل من إمرأة لم یمنع من نکاحہا مانع شرعی فخرج الذکر والخنثیٰ المشکل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۳ ص۱ کتاب النکاح) [1]

بانجھ عورت سے نکاح کرنا

سوال: بانجھ عورت سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بانجھ عورت سے نکاح کرنے میں چونکہ بعض منافع حاصل ہوتے ہیں اس لیے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم نکاح سے چونکہ اعلیٰ مقصود افزائش نسل ہے اس لیے بانجھ عورت کے علاوہ کسی صحیح اور قابلِ اولاد عورت سے نکاح کرنا افضل ہے۔

بوب الامام النسائی فی سننہ "کراھیۃ تزویج العظیم" وذکر تحتہ حدیثاً عن معقل بن یسارؓ قال جاء رجل الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اصبت إمرأۃ ذات حسب ونسب إلا أنہا لا تلد أفأتزوجہا فنہاہ ثم أتاہ الثانیۃ فنہاہ ثم أتاہ الثالثۃ فنہاہ وقال تزوجوا الولود الودود فإنی مکاثر بکم۔ (سنن النسائی ج۶ ص۵۴) [2]

---

[1] قال ابن نجیم المصریؒ: وفی العنایۃ محلہ إمرأۃ لم یمنع من نکاحہا مانع شرعی فخرج الذکر للذکر والخنثیٰ مطلقاً۔ (البحر الرائق ج۳ ص۸۴ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۶۷ کتاب النکاح۔ الباب الاول فی تفسیرہ شرعاً۔

[2] قال الشیخ خلیل احمد السہارنفوریؒ: (تحت حدیث معقل بن یسار جاء رجل الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ) وھذا یدل علیٰ أن النہی ما کانت للتحریم بل کان مبنی النہی المکاثرۃ فی الآخرۃ وھی لا تقتضی التحریم۔ (بذل المجہود ج۱۰ ص۱۵)

ومثلہٗ فی نیل الاوطار ج۶ ص۱۱۰ تا ۱۱۲ وعون المعبود ج۶ ص۴۵

پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا شرعاً جرم نہیں

سوال:۔ ملکی قانون کے اعتبار سے دوسری شادی کے لیے خاوند کو اپنی پہلی بیوی سے بذریعہ یونین کونسل اجازت لینا ضروری ہے اور پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسرا نکاح کرنا عائلی قوانین کی رُو سے جرم سمجھا جاتا ہے، کیا از روئے شرع بھی یہ جُرم ہے ؟

الجواب:۔ پہلی بیوی کے جملہ حقوق کی رعایت کرتے ہوئے دوسری شادی کرنا خاوند کا انفرادی حق ہے اس میں پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں اور نہ کسی یونین کونسل کو اس میں واسطہ بنانا ضروری ہے، ایسا کرنا قانونی تقاضا تو ہوسکتا ہے شریعتِ اسلامی کا نہیں۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ الآیۃ[1]

قال العلامۃ طاہر البخاریؒ: رجل له إمرأة أراد يتزوج إمرأة أخرى إن خاف أن لا يعدل لا يسعه وإن لم يخف جاز۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۱ ص ۲۴۶ کتاب النکاح)

زانی اور مزنیہ کے درمیان نکاح

سوال:۔ زانی اور مزنیہ کے درمیان رشتہ نکاح قائم ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ زانی اور مزنیہ کے درمیان نکاح ہوسکتا ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: أما تزوج الزانی فجائز اتفاقاً وتستحق النفقۃ عند الکل ويحل وطؤها عند الکل كما في النهاية۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۱۰۶ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)[2]

---

[1] عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن غیلان بن سلمۃ الثقفی اسلم وله عشر نسوۃ فی الجاهليۃ فأسلمن معه فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: أمسك اربعاً وفارق سائرهن۔ رواه احمد والترمذی وابن ماجۃ۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۴ باب المحرمات)

ومثلهٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۶۵ کتاب النکاح، فصل الجمع فی الوطیٔ۔

[2] قال الحصکفی رحمہ اللہ: لو نکحها الزانی حل وطؤها اتفاقاً۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج ۳ ص ۴۹ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)

ومثلهٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۶۹ کتاب النکاح، فصل ان لا یکون بها حمل۔

حاملہ عورت سے نکاح کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاملہ عورت سے نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر کوئی عورت نکاح سے حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس سے نکاح کرنا جائز نہیں اور اگر زنا سے حاملہ ہو تو اگرچہ نکاح کرنا جائز ہے لیکن اگر اسی زانی سے نکاح ہو گیا ہو تو اس کے لیے جماع بھی جائز ہے اور اگر کسی اور سے نکاح ہو گیا ہو تو اس شخص کے لیے وضع حمل تک جماع ممنوع ہے ۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان لا یکون بها حمل ثابت النسب فان کان لا یجوز نکاحها..... وعلی هذا یخرج ما اذا تزوج إمرأة حاملاً من الزنا انه یجوز فی قول ابی حنیفةؒ ومحمدؒ ولکن لا یطؤها ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۹ کتاب النکاح ۔فصل ومنها ان لا یکون بها حمل) [1]

سوتیلی ماں کی بیٹی سے نکاح کا مسئلہ

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ سوتیلی ماں کی بیٹی جو اس کے پہلے شوہر سے ہو، کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر اور کوئی ذریعۂ حرمت موجود نہ ہو تو سوتیلی ماں کی بیٹی سے نکاح کرنا ازروئے شرع جائز ہے ۔صورتِ مسئولہ میں بظاہر چونکہ کوئی ایسی صورت نہیں اس لیے سوتیلی ماں کی بیٹی جو اسکے پہلے شوہر سے ہوئی سے نکاح جائز ہے ۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : وأما بنت زوجة أبیه أو ابنه فحلال ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۳۱ کتاب النکاح ۔فصل فی المحرمات) [2]

---

[1] وقال ابن نجیمؒ : ای وحل تزوج الحبلیٰ من الزنا ولا یجوز تزوج الحبلیٰ من غیر الزنا.....أما تزوج الزانی فجائز اتفاقاً وتستحق النفقة عند الکل ویحل وطؤها عند الکل کما فی النهایة ۔
(البحر الرائق ج۳ ص۱۰۶ کتاب النکاح ۔فصل فی المحرمات)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۴۸ کتاب النکاح ۔فصل فی المحرمات ۔

[2] وقال الشیخ وهبة الزحیلی : والمحرم بهذه الآیة هو زوجة الأب فقط أما بنتها أو أمها فلا تحرم علی الابن ۔ (الفقه الاسلامی وأدلته ج۷ ص۱۳۲ حرمة القرابة الخ)
وَمِثْلُهٗ فی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج۳ ص۹۴ کتاب النکاح ۔فصل فی المحرمات ۔

مخطوبۃ الأب سے نکاح جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی عورت سے باقاعدہ نکاح نہیں کیا صرف نکاح کا پیغام دیا ہے، اب اس شخص کے فوت ہو جانے کے بعد اس شخص کا بیٹا اس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر اس مرد اور عورت کا باقاعدہ ایجاب وقبول نہیں ہوا ہے تو اس صورت میں اس مرد کے اعراض کرنے یا فوت ہو جانے کے بعد اس کا بیٹا اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے، اس لیے کہ یہ عورت اس شخص کے باپ کی منکوحہ نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله مصاهرة) وتحرم موطوأت آبائه وأجداده وإن علوا ولو بزنا والمعقودات لهم عليهن بعقد صحیح۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۸ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)[1]

بیوہ عورت سے نکاح کرنا جائز ہے

سوال:۔ جو عورت بیوہ ہو جائے اس سے نکاح کرنے میں شرعاً کوئی حرج تو نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی دوسری وجہ حرمت موجود نہ ہو تو بیوہ عورت سے نکاح درست ہے، شریعتِ مقدسہ میں کہیں بھی بیوہ عورت سے نکاح ناجائز ہونے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باقی تمام ازواجِ مطہرات بیوہ یا مطلقہ تھیں، اس لیے بیوہ عورت سے نکاح کرنے کو منحوس جاننا زیادت علی الشرع ہے۔

قال اللہ سبحانه وتعالیٰ: "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ الخ" والأیامی جمع الأیم من النساء من لا زوج لها بکراً کانت اومطلّقة او ارملة۔ (معجم لغة الفقهاء ص۹۹)[2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: أی ینعقد النکاح أی ذلك العقد الخاص ینعقد بالایجاب والقبول حتی یتم حقیقتهٔ فی الوجود۔ (البحر الرائق ج۳ ص۸۱ کتاب النکاح)

وَمِثْلُهٗ فی البدائع الصنائع ج۲ ص۲۲۹۹ کتاب النکاح۔ فصل رکن النکاح۔

[2] وعن انس رضی اللہ عنه قال من السنة إذا تزوج الرجل البکر علی امرأته أقام عندها سبعاً وقسم واذا تزوج الثیب علی إمرأته قام عندها ثلاثاً۔

(نصب الرایة ج۳ ص۲۱۵ کتاب النکاح۔ باب القسمة)

وَمِثْلُهٗ فی ردّالمحتار ج۲ ص۴۳۴ کتاب النکاح۔

سوتیلی ساس سے نکاح کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ سوتیلی ساس سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دو رشتہ دار عورتوں کا ایک شخص کے نکاح میں جمع ہونا تب حرام ہے جب دونوں میں سے ہر ایک مرد فرض کرکے دوسری اس کے لیے حرام ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں صرف ایک جانب سے حرمت ہے دوسری جانب سے نہیں، اس لیے سوتیلی ساس سے نکاح جائز ہے اگرچہ اس کی سوتیلی بیٹی اس کے نکاح میں پہلے سے موجود ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: فجاز الجمع بین إمرأة وبنت زوجها.....لأنه لو فرضت المرأة ذکراً لم یحرم بخلاف عکسه۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۳ ص۳۹ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)[1]

سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سوتیلی ماں کی بہن اور اس مرد کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں جس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان نکاح جائز نہ ہو، اور یہ عورت نہ محرمات علی التابید اور نہ محرمات غیر مؤبد میں شامل ہے، اس لیے سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح درست ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: والمحرمات علی التابید ثلاثة انواع محرمات بالقرابة والمحرمات بالمصاهرة ومحرمات بالرضاع۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۲۵۶ کتاب النکاح فصل ان تکون المرأة محللة)[2]

---

[1] قال فی الهندیة: ویجوز (الجمع) بین المرأة وبنت زوجها فان المرأة لو فرضت ذکراً حلت له تلك البنت بخلاف العکس۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۷ فصل فی المحرمات)
ومثله فی البحر الرائق ج۳ ص۹۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات۔

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: أسباب التحریم انواع قرابة مصاهرة رضاع جمع ملك شرك ادخال أمة علی حرة فهی سبعة ذکرها المصنف بهذا الترتیب وبقی التطلیق ثلاثا وتعلق حق الغیر بنکاح أو عدة ذکرهما فی الرجعة۔
{الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۲۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات}
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۷۳ الباب الثالث فی المحرمات۔

بیوی کی وفات کے چند دن بعد اس کی بہن سے نکاح کرنا

سوال:۔ جب کسی شخص کی بیوی فوت ہو جائے تو اس کی وفات کے ایک یا دو دن بعد وہ اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خاوند کے لیے بیوی کا سوگ منانے کی ضرورت نہیں اور نہ اس پر عدّت ہے اس لیے بیوی کے فوت ہونے کے فوراً بعد اس کی بہن سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :۔ (تحت قوله ولو من طلاق بائن) ۔۔۔۔ (فرع) ماتت امرأة له التزوج بأختها بعد یوم من موتها. کما فی الخلاصة عن الاصل. وکذا فی المبسوط لصدر الاسلام والمحیط السرخسی۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات) [۱]

عدّتِ وفات میں کیے گئے نکاح کا حکم

سوال:۔ اگر ایک عورت خاوند کی وفات کے بعد چار ماہ کے اندر اندر دوسرے آدمی سے نکاح کرے تو یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق یا وفات کی عدت میں کیا گیا نکاح کالعدم رہے گا عدت گذرنے کے بعد جو نکاح پڑھایا جائے اس کا اعتبار ہوگا۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله :۔ ومنها ان لا تکون معتدة الغیر لقوله تعالیٰ: "وَلَا تعزموا عقدة النکاح حتیٰ یبلغ الکتاب اجله" أی ماکتب علیها من التربص ثم قال وسواء کانت العدة عن طلاق او عن وفات الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۶۸، ۲۶۹ کتاب النکاح فصل ان لا یکون بها حمل) [۲]

---

[۱] وقال فی الهندیة : ویجوز لزوج المرتدة اذا لحقت بدار الحرب تزوج أختها قبل انقضاء عدتها کما اذا ماتت ۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص ۲۷۹ القسم الرابع المحرمات بالجمع)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۲ ص ۶ الفصل الثانی فیمن یکون محلا للنکاح وفیما لا یکون ۔

[۲] قال فی الهندیة : لا یجوز للرجل ان یتزوج زوجة غیره وکذلك المعتدة کذا فی السراج الوهاج سواء کانت العدة عن طلاق او وفات الخ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۲۸۰ کتاب النکاح الباب الاول القسم السادس المحرمات التی یتعلق الخ)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص ۴۱ کتاب النکاح فصل فی المحرمات ۔

سوتیلی ماں غیر مدخولہ سے نکاح حرام ہے

سوال:۔ کیا سوتیلی ماں سے نکاح درست ہے جبکہ والد نے دخول نہ کیا ہو؟

الجواب:۔ جس عورت کے ساتھ باپ کا عقد نکاح ہو جائے چاہے باپ نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو بیٹے کا اس عورت سے نکاح کرنا بنص قرآنی حرام ہے۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ: (تحت قولہ مصاهرة) وتحرم موطوٴات آبائه واجداده وإن علو ولو بزنا والمعقودات لهم عليهن بعقد صحيح۔
(ردّ المحتار ج۳ ص۲۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات) [1]

ساس اور بہو دونوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا

سوال:۔ کیا کسی عورت اور اس کے بیٹے کی بیوی (بہو) کو نکاح میں جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ان عورتوں میں ایسا کوئی رشتہ نہیں جو حرمتِ اجتماع کا باعث بنے اس لیے اس عورت اور اس کے بیٹے کی بیوی (بہو) کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: فجاز الجمع بين امرأة وبنت زوجها أو إمرأة ابنها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۳ ص۳۶ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: أما حليلة الأب فبقوله تعالى: "وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ" فتحرم بمجرد العقد عليها۔
(البحر الرائق ج۳ ص۹۴ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)
وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۰ کتاب النکاح، فصل الفرقة الرابعة۔

[2] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: في بحث: لأنه لو جاز نكاح إحداهما على تقدير مثل المرأة وبنت زوجها أو إمرأة ابنها فانه يجوز الجمع بينهما عند الأئمة الاربعة۔ (البحر الرائق ج۳ ص۹۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)
وَمِثْلُهٗ في الفتاوى الهندية ج۱ ص۲۷۷ القسم الرابع المحرمات بالجمع۔

نانی اور نواسی کو ایک نکاح میں جمع کرنا | **سوال**:۔ کیا کوئی شخص ایک عورت اور اس کی نواسی کو ایک نکاح میں جمع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نواسی اور نانی کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں، اس کے لیے فقہاء نے ایک قاعدہ تحریر فرمایا ہے کہ دو عورتوں میں سے کسی ایک کو مذکر (مرد) فرض کر کے اگر ان کا نکاح آپس میں جائز نہ ہو تو ایسی دو عورتوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ :حرم الجمع وطأ بملك يمين بين امرأتين أيتهما فرضت ذكراً لم تحل للاخرى أبدا۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۳ ص۳۸ كتاب النكاح ،فصل فی المحرمات) [۱]

پھوپھی اور بھتیجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا | **سوال**:۔ کیا سگی پھوپھی اور بھتیجی کو ایک نکاح میں شرعاً جمع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پھوپھی اور بھتیجی کے درمیان ایسا رشتہ ہے کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مرد فرض کر لیا جائے تو دوسری کا نکاح اس سے جائز نہیں اس لیے ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال ابن نجيم المصريؒ : حرم الجمع بين امرأتين إذا كانتا بحيث لو قدرت إحداهما ذكراً حرم النكاح بينهما أيتهما كانت المقدرة ذكراً كالجمع بين المرأة وعمتها..... لحديث مسلم لا تنكح المرأة على عمتها۔الخ (البحر الرائق ج۳ ص۹۷ كتاب النكاح ،فصل فی المحرمات) [۲]

دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کا حکم | **سوال**:۔ ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا ہوا ہے، اب وہ اس عورت کو طلاق

---

[۱] قال ابن نجيم المصريؒ :۔ للاصل الذی بينا ان كل امرأتين لو كانت إحداهما ذكرا والاخرى انثى لم يجز للذكر ان يتزوج الانثى فانه يحرم الجمع بينهما۔ (البحر الرائق ج۳ ص۹۵ كتاب النكاح ۔فصل فی المحرمات)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۲ كتاب النكاح ۔فصل ان لا يقع نكاح المرأة ۔

[۲] قال ابن عابدينؒ :(تحت قوله وايتهما فرضت) أی اية واحدة منهما فرضت ذكراً لم يحل للاخرى كالجمع بين المرأة وعمتها الخ۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۸ كتاب النكاح ،فصل فی المحرمات)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۲ كتاب النكاح ،فصل ان لا يقع نكاح المرأة ۔

دیئے بغیر اس کی بہن سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو کیا اس آدمی کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ ایک عورت کا کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی سگی بہن سے یہ شخص نکاح نہیں کر سکتا ہے جو کہ بنص قرآنی حرام ہے، ایسا کیا ہوا نکاح کالعدم ہے گا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: لا خلاف فی أن الجمع بین الاختین فی النکاح حرام لقوله تعالیٰ: "و أن تجمعوا بین الاختین معطوفاً" علی قوله عزوجل: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۲ کتاب النکاح، فصل ان لایقع النکاح المرأة) [۱]

والدہ کو بیوی سمجھ کر ہاتھ لگانے کے اثرات

سوال:۔ رات کے وقت بے خبری کی حالت میں زید نے اپنی والدہ کو بیوی سمجھ کر شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تو کیا زید کی والدہ اس کے والد پر حرام ہوگئی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر زید نے اپنی والدہ کو شہوت کی حالت میں بلا حجاب ہاتھ لگایا ہو اور زید کے والد کو یہ معاملہ معلوم ہو اور اس کی تصدیق کرتا ہو تو اب یہ عورت اپنے خاوند پر حرام ہے ورنہ حرام نہیں۔

قال ابن نجیم المصریؒ: واراد بحرمة المصاهرة المحرمات الاربع، حرمة المرأة علی اصول الزانی وفروعه نسباً ورضاعاً وحرمة اصولها وفروعها علی الزانی نسباً ورضاعاً کما فی الوطأ الحلال۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۱ کتاب النکاح فصل فی المحرمات) [۲]

ساس کے ساتھ نکاح کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ساس کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟

---

[۱] قال فی الهندیة: فإنه لایجمع بین الاختین ولا بوطء ملك یمین۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۷ القسم الرابع المحرمات بالجمع)

ومثله فی البحر الرائق ج۳ ص۹۵ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات۔

[۲] قال فی الهندیة: فلو أیقظ زوجته لیجامعها فوصلت یده الی بنت منها فقرصها بشهوة وهی ممن تشتهی یظن أنها أمها حرمت علیه الأم حرمة مؤبدة۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۴ فصل فی المحرمات)

وقال ایضاً: ثم المس انما یوجب حرمة المصاهرة إذا لم یکن بینهما ثوب۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۵ فصل فی المحرمات)

الجواب: ساس کے ساتھ نکاح کرنا قطعی حرام ہے اگرچہ بیوی کو طلاق دے دی ہو یا وہ وفات پا گئی ہو، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں محرمات کی فہرست میں بیوی کی ماں کو بھی ذکر کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے: وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ ...... الخ۔ (سورۃ النساء آیت ـــ)

قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: اسباب التحریم انواع قرابۃ مصاھرۃ۔ قال ابن عابدینؒ: مصاھرۃ کفروع نسائہ المدخول بھن او نزلن وأمھات الزوجات وجداتھن بعقد صحیح وإن علون۔ الخ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۳۸ کتاب النکاح فصل فی المحرمات) [1]

سوتیلی ماں کی بیٹیوں سے نکاح کرنا

سوال: اگر ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر فارغ کر دیا ہو تو کیا اس مطلقہ کے پہلے خاوند سے جو بیٹیاں ہیں اُن کے ساتھ دوسرے شوہر کی پہلی بیوی کے بیٹوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حرمتِ نکاح کے لیے مابین جزئیت کا رشتہ ہونا ضروری ہے، صورتِ مسئولہ میں بظاہر حرمت کی ایسی کوئی خاص وجہ نہیں پائی جاتی جس سے حرمتِ نکاح ثابت ہو سکے بلکہ فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں بھی نسبی بھائی کی نسبی بہن سے نکاح کا جواز ثابت ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں کیا گیا نکاح درست ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتحل أخت أخیہ رضاعًا ..... وکذا نسبًا بأن یکون لأخیہ لأبیہ أخت لأم۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۲۱۷ کتاب النکاح، فصل فی الرضاع) [2]

---

[1] قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: تحت قول الماتن وأم إمرأتہ بیان لما ثبت بالمصاھرۃ۔ لقولہ تعالیٰ: "وأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ" أطلقہ فلا بین کونہ إمرأتہ مدخولا بھا أو لا وھو المجمع علیہ عند الأئمۃ الأربعۃ۔
(البحر الرائق ج۳ ص۹۳ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۲۵۸ کتاب النکاح، فصل النوع الثانی فالمحرمات۔

[2] قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: أی تحل اخت اخیہ نسبًا بان یکون لہ أخ من أب لہ أخت من أمہ فانہ یجوز لہ التزوج بھا۔
(البحر الرائق ج۳ ص۲۲۷ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع۔

فیملی کورٹ سے تنسیخ نکاح کے بعد نکاحِ ثانی کا حکم

سوال:۔ آجکل حکومت کے قائم کردہ فیملی کورٹس سے اگر کوئی عورت تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کرلے جبکہ شوہر اسے طلاق نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ اس کو رکھنے کا خواہشمند ہو تو کیا اس طرح تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کا دوسری جگہ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے طلاق کا حق صرف شوہر کو دیا ہے، اس کے علاوہ کسی اور کو یہ حق نہیں، اسلئے فیملی کورٹس شرعاً اسکی مجاز نہیں کہ کسی عورت کو بلاعذرِ شرعی خاوند سے جدا کرے، لہٰذا اگر کوئی عورت بلاعذرِ شرعی فیملی کورٹ سے تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کرلیتی ہے تو اس پر طلاق واقع نہ ہوگی اس لیے دوسری جگہ نکاح کرنا باطل ہے کیونکہ یہ عورت شرعاً پہلے شوہر کی منکوحہ ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔ (البقرہ آیت ۔)

قال العلامۃ شوکانیؒ: (تحت ھٰذہ الآیۃ) فیکون الذی بیدہ عقدۃ النکاح حقیقۃً ھو الزوج لانہ ھو الذی الیہ رفعہ بالطلاق۔ (تفسیر فتح القدیر ج۱ ص۲۲۷) [1]

طلاقِ مغلظہ میں بغیر حلالہ کے تجدیدِ نکاح کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلے کے ایک آدمی نے تین گواہوں کے سامنے اپنی بیوی کو تین طلاق مغلظہ دیں، اب چند دنوں کے بعد بغیر حلالہ شرعی کے بذریعہ جرگہ اس سے تجدیدِ نکاح کرلی ہے، کیا اس طرح میاں بیوی کا تجدید نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں بغیر حلالہ شرعی کے اس عورت کا سابقہ شوہر سے نکاح کرنا باطل ہے اور یہ دونوں بحیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے حلال نہیں، ان کا بذریعہ جرگہ تجدیدِ نکاح کرنا باطل ہے، جب تک عورت حلالہ شرعی نہ کرے

---

[1] قال العلامۃ ابنِ رُشد المالکیؒ: الاصل ان الطلاق لیس بید احدٍ سوی الزوج او من یوکلہ الزوج۔ (بدایۃ المجتہد ج۲ ص۸۱ کتاب الطلاق۔)

وَمِثْلُہٗ فی مقدمات ابن رشدؒ ج۲ ص۳۸۲ کتاب طلاق السنۃ۔

پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰) [1]

مطلقہ عورت کا وضع حمل سے قبل نکاحِ ثانی کرنا

سوال:۔ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو اس حالت میں طلاق دے کہ وہ اس سے دو تین ماہ کی حاملہ ہو اور پھر یہ عورت وضع حمل سے پہلے دوسری جگہ نکاح کرے تو کیا اس عورت کا یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی مطلقہ عورت جو کہ حاملہ ہو اور حمل بھی ثابت النسب ہو، کا نکاحِ ثانی کرنا باطل ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس مطلقہ کا نکاح وضع حمل سے قبل باطل ہے لہٰذا اس عورت کو وضع حمل کے بعد دوبارہ نکاح باندھنا چاہیئے۔

وفی الهندیة: وحبلی ثابت النسب لا یجوز نکاحها اجماعًا۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۸۰، کتاب النکاح، القسم السادس المحرمات التی یتعلق بها حق الغیر) [2]

متعہ کی شرعی حیثیت

سوال: متعہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی امام مالکؒ متعہ کے جواز کے قائل تھے؟

الجواب:۔ ابتداء اسلام میں متعہ جائز تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اسلئے اہل السنۃ والجماعت کے ہاں متعہ بالاتفاق حرام ہے۔ اگرچہ ھدایہ میں امام مالک رحمہ اللہ کی طرف جواز کا قول

---

[1] وفی الهندیة: وان کان الطلاق ثلاثًا فی الحرة ثنتین فی الامة لم تحل حتی تنکح زوجًا غیره نکاحًا صحیحًا ویدخل بها ثم یطلقها اویموت عنها۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۷۳، الباب السادس فی الرجعة۔ فصل فیما تحل به المطلقة ومایتصل به)
ومثله فی الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۵۸۳ باب الرجعة، مطلب فی العقد علی المبانة۔

[2] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: ومنها ان لا یکون بها حمل ثابت النسب من الغیر فان کان لایجوز نکاحها وان لم تکن معتدة ...... لوجود حمل ثابت النسب..... الخ۔
(بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۹ کتاب النکاح۔ فصل ومنها ان لا یکون بها حمل)
ومثله فی البحرالرائق ج۳ ص۱۰۶ اوائل کتاب النکاح۔

ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، یہاں کاتب یا ناسخ ھدایہ سے غلطی ہوئی ہے۔

قال العلامۃ شیخ زادہؒ: واعلم ان نکاح المتعۃ قد کان مباحًا بین ایام خیبر وایام فتح مکۃ الا انہ صار منسوخًا باجماع الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حتی لو قضی بجوازہ لم یجز ولو اباحہ صار کافرًا۔۔۔۔ فعلی ھذا یلزم عدم ثبوت ما نقل من اباحتہ عند مالکؒ۔ الخ

(مجمع الانھر ج ۱ ص۳۳۱ کتاب النکاح۔ باب المحرمات) [1]

نکاح مؤقت کی تعریف

سوال:۔ نکاح مؤقت کسے کہتے ہیں؟ اور شریعت مقدسہ میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ نکاح مؤقت کی تعریف یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی دو گواہوں کے سامنے ایک معین مدت مثلاً ایک یا دو ماہ وغیرہ کے لیے نکاح کریں، اس قسم کا نکاح شرعاً باطل ہے، تاہم اگر نکاح ایسی مدت مقرر کر دی جائے کہ جہاں تک دونوں یا ایک کا جینا محال ہو تو ایسا نکاح جائز اور صحیح ہوگا۔

قال العلامۃ شیخ زادہؒ: ولا یصح نکاح المتعۃ والموقت والفرق بینھما ان یذکر فی الموقت لفظ النکاح او التزویج مع التوقیت ۔۔۔۔۔ وعن الامام اذا وقتا وقتا لا یعیشان الیہ کمائۃ سنۃ او اکثر یکون صحیحًا۔ (مجمع الانھر ج ۱ ص۳۳۱ کتاب النکاح، باب المحرمات) [2]

عیسائی اور یہودی عورت سے نکاح

سوال:۔ کیا موجودہ دور کی عیسائی یا یہودی عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح کرنا اگرچہ

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ونکاح المتعۃ باطل وھو ان یقول لامرأۃ اتمتع بک کذا مدۃ بکذا من المال وقال مالکؒ ھو جائز لانہ کان مباحًا فیبقی الا ان یظھر ناسخہ قلنا ثبت النسخ باجماع الصحابۃؓ۔ الخ (الھدایۃ ج ۲ ص۲۹۲ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۳ ص۱۵۰ کتاب النکاح، فصل فی بیان المحرمات۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: والنکاح الموقت باطل مثل ان یتزوج امرأۃ بشھادۃ شاھدین عشرۃ ایام۔ الخ (الھدایۃ ج ۲ ص۲۹۲ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص۲۰ کتاب النکاح۔

مرخص ہے لیکن ان کے ساتھ نکاح کرنے سے اگر کسی مسلمان کا عقیدہ اور مذہب متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔

کما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح نکاح کتابیۃ وان کرہ تنزیہًا مومنۃ بنبی مرسل مقرۃ بکتاب منزل وان اعتقد واالمسیح الٰہا۔ وقال ابن عابدینؒ: ففی الفتح ویجوز تزوج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل ولا یأکل ذبیحتھم الا لضرورۃ وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعًا لافتتاح باب الفتنۃ من امکان التعلق المستدعی للمقام معہا فی دار الحرب۔ (رد المحتار ج۳ ص۴۵ کتاب النکاح۔ مطلب مہم فی وطء السراری الخ)[۱]

مسلمان عورت کا غیر مسلم سے نکاح

سوال:۔ ایک مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد کے ساتھ جائز نہیں، خواہ یہ نکاح طوعًا ہو یا کرہًا، خواہ یہ غیر مسلم اہل کتاب سے یا غیر اہل کتاب سے ہو۔

لقولہ تعالیٰ: ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۱)[۲]

قادیانی عورت سے نکاح جائز نہیں

سوال:۔ اہل کتاب عورت سے تو مسلمان مرد نکاح کر سکتا ہے تو کیا ایک قادیانی عورت

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وحل تزوج الکتابیۃ۔ لقولہ تعالیٰ: والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب ...... والاولیٰ ان لا یتزوج کتابیۃ ولا یأکل ذبائحھم الا لضرورۃ وفی المحیط یکرہ تزوج الکتابیۃ الحربیۃ لان الانسان لا یأمن ان یکون بینھما ولد فینشأ علی طبائع اھل الحرب۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۳ فصل فی المحرمات)۔

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۱۳۵ فصل فی المحرمات۔

[۲] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: ومنھا اسلام الرجل اذا کانت المرأۃ مسلمۃ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۷۱ فصل کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۸۲ کتاب النکاح۔

سے بھی مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قادیانی چونکہ باجماعِ امت مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اس لیے ان سے کسی قسم کا رشتہ ناطہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔ جس طرح کسی قادیانی سے مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا ایسے ہی کوئی مسلمان شخص کسی قادیانی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا، اس لیے کہ قادیانی اہلِ کتاب کے حکم میں نہیں بلکہ مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

کما قال شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ: ان تصرفات المرتد علی اقسام نافذ بالاتفاق کالاستیلاء والطلاق لانہ لایفتقر الی حقیقۃ الملک وتمام الولایۃ وباطل بالاتفاق کالنکاح والذبیحۃ لانہ یعتمد الملۃ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۰۳ باب المرتد)[۱]

خاوند کے مُرتد ہو جانے سے نکاح کا حکم

سوال: میاں بیوی دونوں مسلمان تھے اور خوشگوار زندگی گذار رہے تھے کہ اچانک خاوند قادیانیوں کا شکار ہو کر مُرتد ہو گیا جبکہ عورت دینِ حق یعنی اسلام پر قائم ہے، ایسی حالت میں اس عورت کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: قادیانی چونکہ مُرتد کے حکم میں ہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں خاوند کے مُرتد ہو جانے سے مسلمان بیوی سے اس کا گذشتہ نکاح ختم ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ عورت عدّت گذار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

قال الحصکفیؒ: وارتداد احدھما ای الزوجین فسخ عاجل۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۴۲۵ باب نکاح الکافر)[۲]

لاعلمی میں قادیانی سے نکاح کا حکم

سوال: ایک مسلمان عورت کا نکاح لاعلمی میں کسی قادیانی سے ہو گیا، یعنی نکاح کے وقت مرد نے

---

[۱] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: والمرتدۃ لایجوز نکاحھا مع احد وکذلک المرتد لایجوز نکاحہ مع احد۔ (فتاوٰی تاتارخانیۃ ج۳ ص۸ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۳ ص۲۳۰ باب المرتد۔

[۲] وقال فی الھندیۃ: ارتد احد الزوجین عن الاسلام وقعت الفرقۃ بینھما کذا فی الکافی۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۳۳۹ الباب العاشر فی النکاح الکفار)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۳۴۸ فصل فی النکاح الکافر۔

اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا لیکن نکاح کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شخص قادیانی ہے، اندریں صورت یہ نکاح منعقد ہوا ہے یا نہیں ؟

الجواب:- قادیانی چونکہ مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں، اس لیے جس شخص کا قادیانی ہونا قطعی اور یقینی ہو تو اس کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح شرعاً جائز نہیں اور لاعلمی میں کیا ہوا نکاح کالعدم رہے گا۔

کما فی الہندیۃ: ارتد احد الزوجین عن الاسلام وقعت الفرقۃ بغیر طلاق فی الحال۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۳۳۹ الباب العاشر فی نکاح الکفار) [1]

شیعہ عورت سے سُنّی مرد کے نکاح کا حکم

سوال:- جو شیعہ حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل ہو اور حضرت جبریل سے غلطی صادر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور صحبتِ ابوبکر صدیقؓ کا منکر ہونے کے ساتھ ساتھ قذفِ عائشہؓ کا قائل ہو اور قرآنِ مجید کو منحرف سمجھتا ہو تو ایسے شیعہ مرد کے ساتھ سُنّی عورت یا سُنّی مرد کے ساتھ شیعہ عورت کا نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- جو روافض قطعیاتِ اسلام کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتے ہوں وہ کافر ہیں مثلاً حضرت علیؓ کی الوہیت اور حضرت عائشہؓ پر قذف کا قائل ہونا، جو قرآنِ کریم کی نص قطعی کے خلاف ہے، اور حضرت جبریلؑ سے غلطی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوں اور صحبتِ ابوبکر صدیقؓ کے منکر ہوں تو اس قسم کے گمراہ فرقہ کے لوگوں سے رشتۂ مناکحت سے احتراز و اجتناب لازم ہے اور ایسے لوگوں کا حکم مُرتد کی طرح ہے اور مُرتد کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔

کما فی الہندیۃ: ویجب اکفار الروافض فی قولہم برجعۃ الاموات الی الدنیا..... واحکامھم احکام المرتدین۔ (الفتاوی الہندیہ ج۲ ص۲۶۴) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: وارتداد احدھما ای الزوجین فسخ عاجل۔ (الدر المختار ج۲ ص۲۵۳ کتاب النکاح)
وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۲ ص۳۴۸ کتاب النکاح۔

[2] قال العلامۃ عالم بن العلاء انصاریؒ: یجب اکفار الروافض فی قولہم لرجع الاموات الی الدنیا..... وھؤلاء القوم خارجون عن ملۃ الاسلام واحکامھم احکام المرتدین۔ (فتاوی تاتارخانیہ ج۵ ص۵۳۸ کتاب احکام المرتدین)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی قاضیخان علی ھامش الہندیۃ ج۶ ص۳۱۸ باب المرتد۔

لاعلمی میں رضاعی بہن سے نکاح کا حکم

سوال: اگر کہیں لاعلمی اور غلطی سے رضاعی بہن بھائی کا نکاح غلطی سے ہوجائے اور سال دو سال کے بعد رضاعت کا علم ہوجائے تو دونوں میں جدائی ہوجائے گی یا دونوں کا نکاح برقرار رہے گا؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق اگرچہ رضاعی بہن سے نکاح شرعاً حرام ہے مگر جب نکاحِ فاسد سے دونوں کا ملاپ ہوجائے تو مہر واجب ہوجاتا ہے، لہٰذا یہ عورت شوہر سے مہر لینے کی حقدار ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویجب مھر المثل فی نکاح فاسد بالوطء لابغیرہ۔
(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۴۸۱،۴۸۲ باب المہر)[1]

غیر مسلم عورت کو جبراً مسلمان کرکے اس سے نکاح کرنا

سوال: افغانستان میں روس کی آمد کے بعد جب جہاد شروع ہوا تو بعض مجاہدین نے روسی عورتوں کو جبراً مسلمان کرکے اُن کے ساتھ نکاح کیا، کیا ان عورتوں کا اسلام معتبر ہے؟ اور ان کے ساتھ نکاح کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جب کسی کافر کو اسلام پر مجبور کیا جائے اور وہ کلمۂ شہادت پڑھ لے تو وہ مسلمان متصور ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں روسی عورتوں کا اسلام لانا اور بعض مجاہدین کا ان کے ساتھ نکاح کرنا دونوں صحیح ہے۔

لما قال العلامة فخرالدین الشھیر بقاضی خانؒ: واذا اجبر الکافر علی الاسلام فاسلم صح اسلامہ فان ارتد بعد ذٰلک یجبر علی الاسلام ولایقتل۔
(فتاوٰی قاضی خان ج۴ ص۴۱۶ باب الاکراہ)

کسی عورت کا جن مرد سے نکاح کرنا

سوال: اگر کوئی عورت کسی جن مرد سے اپنا نکاح کرالے تو کیا یہ نکاح شرعاً جائز

---

[1] وفی الھندیة: ولو تزوج امرأة فقالت امرأة ارضعتکما...... واذا فارقھا...... وان کان بعد الدخول بھا فالافضل للزوج ان یعطیھا کمال المھر والنفقة والسکنیٰ۔
(الفتاوٰی الھندیة ج۱ ص۳۴۷ کتاب الرضاع)

ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں نکاح کرنے کے لیے دونوں کا ایک جنس ہونا ضروری ہے، مختلف الاجناس میں نکاح جائز نہیں، اس لیے جن مرد سے اس عورت کا نکاح شرعاً جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الاشباہ عن السراجیة لاتجوز المناکحة بین بنی آدم والجن وانسان ای لاختلاف الجنس ومفاد المفاعلة انه لایجوز للجنی ان یتزوج انسیة ایضًا۔۔۔۔۔ عن شرح الملتقی عن زواہر الجواہر الاصح انه لایصح نکاح آدمی جنّیة کعکسه لاختلاف الجنس فکانوا کبقیة الحیوانات۔

(ردالمحتار ج ۲ ص۲۸۱ اوائل کتاب النکاح) ؎۱

بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلقات کے نکاح پر اثرات

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنے بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا ہو اور وہ اس ناجائز عمل پر رنگے ہاتھوں پکڑا بھی گیا ہو تو کیا اس سے اس کے بھائی کی بیوی کا نکاح متاثر ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دیور سے ناجائز تعلقات قائم کرنے سے شوہر کا نکاح متاثر نہیں ہوگا بلکہ وہ تاحال اس کی منکوحہ ہے، تاہم اگر شوہر اس کو طلاق دے کر الگ کرنا چاہتا ہو تو کر سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو زنت امرأة رجل لم تحرم علیه وجاز له وطؤها عقب الزنا۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۳۸۶ فصل فی المحرمات) ؎۲

؎۱ قال العلامة علی بن عثمان سراج الدین رحمه اللّٰه: لایجوز المناکحة بین بنی آدم والجن والانسان المائی لاختلاف الجنس اذا مسّ بشهوة تثبت حرمة المصاهرة۔ (الفتاوٰی السراجیة ص۲۷ کتاب النکاح باب نکاح المحارم۔)

؎۲ قال الشیخ وهبة الزحیلی: یحل بالاتفاق للزانی ان یتزوج بالزانیة التی زنی بها فان جاءت بولد۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۷ ص۱۴۶، کتاب النکاح، المرأة الحامل من الزنا۔۔۔ الخ)

جنسی کمزوری کی صورت میں نکاح کرنے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ جنسی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور بیوی کے حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وہ شادی کر لیتے ہیں، تو ایسے شخص کے لیے نکاح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شادی کرنا ہر اُس مسلمان مرد کے لیے سُنّت ہو نان ونفقہ اور حقوقِ زوجیت پورا کر سکتا ہو، لہٰذا جو شخص یہ حقوق ادا نہیں کر سکتا اُس کے لیے نکاح کرنا جائز نہیں، کرنے کی صورت میں مرد گنہگار ہو گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویکون سنة مؤکدة فی الاصح فیأثم بترکه ویثاب ان نوی تحصیناً وولداً حال الاعتدال ای القدرة علیٰ وطء ومهر ونفقة۔ الخ

قال العلامة ابن عابدینؒ: (تحت قوله ای القدرة علیٰ وطء) ای الاعتدال فی التوقان ان لا یکون بالمعنی المار فی الواجب والفرض وهو شدة الاشتیاق وان لا یکون فی غایة الفتور کالعنین ـــــ بان یکون بین الفتور والشوق وزاد المهر والنفقة لان العجز عنهما یسقط الفرض فیسقط السنیة بالاولیٰ۔

(الدر المختار مع الرد المحتار ج۳ ص۷ کتاب النکاح (مطلب کثیراً مّا تبساهل فی اطلاق المنجر علی السنة) [۱]

کسی اسلامی ملک میں مسلمان ہونے والی شادی شدہ عورت سے نکاح کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کسی اسلامی ملک میں کوئی شادی شدہ غیر مسلم عورت اسلام قبول کرے تو کیا اس عورت کے ساتھ بغیر عدت گذارے ہوئے کسی مسلمان مرد کے لیے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی غیر مسلم شادی شدہ عورت اسلام قبول کرے تو یہ عورت اوّلاً عدالت میں اپنے اسلام لانے کا قصہ پیش کرے، اور عدالت اس کے غیر مسلم شوہر پر اسلام پیش کرے گی، اب اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو عدالت عورت کو تنسیخِ نکاح

---

[۱] ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۶۷ کتاب النکاح۔ الباب الاوّل۔

کی ڈگری جاری کرے گی اور یہ عورت عدتِ طلاق گذار کر کسی مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے، اس کے علاوہ بغیر عدالتی فیصلے اور مرورِ عدت کے نکاح نہیں کر سکتی۔

قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: واذا اسلمت المرأة وزوجها کافرٌ عَرَضَ القاضی علیہ الاسلام فان اسلم فهی امرأته وان ابی فرّق بینهما وکان ذٰلك طلاقاً عند ابی حنیفة ومحمد۔ (رحمهم الله)

(الهداية ج ۲ ص۳۲۵ باب نکاح اهل الشرك) ؎۱

ماموں کی بیوہ سے نکاح کا حکم

سوال: سگے ماموں کی بیوہ سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حقیقی ماموں کی بیوہ کے ساتھ بعد از اختتامِ عدت نکاح کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ اب ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جو حرمت کا سبب ہو۔

لما قال الله تعالیٰ: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ (سورة النساء آیت ۲۴) ؎۲

؎۱ قال ابن الهمامؒ: اذا احد الزوجين اللذين هما مجوسيان او الزوجة عنها مجوسية والزوج کتابی او الزوجة من الکتابین او الزوجة الکتابية والزوج قائم فان ابی فرق بينهما۔ (فتح القدیر ج ۳ ص۲۸۸ باب نکاح اهل الشرك)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۱ ص۳۳۷ الباب العاشر فی نکاح الکفار۔

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی التاتارخانية ج ۳ ص۱۸۱ کتاب النکاح۔ باب نکاح الکفار۔

؎۲ قال العلامة علاؤ الدين الکاسانیؒ: والمحرمات علی التابید ثلاثة انواع محرّمات بالقرابة ومحرّمات بالمصاهرة ومحرّمات بالرضاع، امّا النوع الاوّل فالمحرّمات بالقرابة سبع فرقٍ الاُمّهات والبنات والعمّات۔۔۔۔ قال الله تعالیٰ: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ۔ الآية۔ وفی الصفحة الثانية وتحل له بنت العمّة والخالة وبنت العمّ والخال لان الله تعالیٰ ذکر المحرمات فی اٰية التحريم ثمّ اخبر سبحانهٗ وتعالیٰ انّه احل ماوراء ذٰلك بقوله واُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (الآية) الخ

(بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۵۶، ۲۵۷ فصل ومنها ان تکون المرأة محللة)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج ۲ ص۲۸۷ فصل فی بیان المحرمات۔

بھانجی کی بیٹی سے نکاح کا حکم

سوال:۔ زید زینب کا علاتی بھائی ہے، زینب کی بیٹی رقیہ ہے، رقیہ کی بیٹی کلثوم ہے، تو کیا زید کا نکاح کلثوم کے ساتھ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنے والدین کے کسی بھی فروع (یعنی اولاد جس درجے میں بھی ہو) سے نکاح کرنا درست نہیں، لہٰذا زید کا نکاح کلثوم کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفروع ابویہ وان نزلن فتحرم بنات الاخوۃ والاخوات وبنات اولاد الاخوۃ والاخوات وان نزلن۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۳۰ فصل فی المحرمات) [۱]

بہنوئی کی دوسری بیوی کی لڑکی سے نکاح کا حکم

سوال:۔ بہن کے شوہر کی دوسری بیوی کی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بہن کے شوہر کی دوسری بیوی کی لڑکی سے نکاح کرے کیونکہ اس لڑکی میں اس بھائی کی نسبت حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ بعد ذکر المحرمات: وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ۔ سورۃ النساء آیت ۲۴ [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: القسم الاول المحرمات بالنسب وهن الامهات والبنات والاخوات ....الیٰ قوله واما الاخوات فالاخت لاب والام والاخت لاب والاخت لام وکذا بنات الاخ والاخت وان سفلن۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۳ الباب الثالث فی بیان المحرمات)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۲۸۷ فصل فی بیان المحرمات۔

[۲] قال العلامة الکاسانیؒ: والمحرمات علی التابید ثلاثة انواع محرمات بالقرابة ومحرمات بالمصاهرة ومحرمات بالرضاع اما النوع الاول فالمحرمات بالقرابة سبع فرق الامهات والبنات والعمات والخالات وبنات الاخ وبنات الاخت ..... وفی الصفحة الثانیة۔ وتحل له بنت العمة والخالة وبنت العم والخال لان اللّٰہ تعالیٰ ذکر المحرمات فی آیة التحریم ثم اخبر سبحانه وتعالیٰ انه احل ما وراء ذٰلك بقوله واحل لکم ما وراء ذٰلکم الآیة الخ

(بدائع الصنائع ج۲ ص۲۵۶، ۲۵۷ فصل ومنها ان تکون المرءۃ محللة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۲۸۷ فصل فی بیان المحرمات۔

ایک جگہ منگنی کردینے کے بعد لڑکی کا نکاح کسی دوسری جگہ کرنا

سوال:۔ اگر ایک لڑکی کی کسی جگہ منگنی ہوجانے کے بعد اس کے والدین اس کا نکاح کسی دوسری جگہ کردیں، تو کیا اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر منگنی کے موقع پر صحیح اور شرعی طریقے سے ایجاب وقبول ہوچکا ہو تو اس کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنا درست نہیں، اور اگر ایجاب وقبول نہ ہوا ہو تو یہ منگنی صرف وعدۂ نکاح ہے نکاح نہیں اِس صورت میں دوسری جگہ نکاح درست ہے لیکن وعدہ خلافی کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوں گے ۔

قال ابن عابدینؒ : لو قال هل اعطتنیها فقال اعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح۔ اھ (ردالمحتار ج۲ ص۲۸۷ کتاب النکاح) [1]

کسی لڑکی اور اس کی سوتیلی ماں کا ایک مرد کے نکاح میں آنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی لڑکی اور اس کی سوتیلی ماں کو اپنے نکاح میں جمع کیا ہے، کیا ایسا کرنا شرعًا جائز ہے ؟ کیا یہ اَنْ تَجْمَعُوا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ میں داخل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جَمْعَ بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ کی پہچان کے لیے فقہاء کرام نے جو قاعدہ مقرر کیا ہے کہ دونوں میں سے جس کو بھی مرد تصوّر کرکے دوسرے کے ساتھ اس کا نکاح صحیح نہ ہو، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکی کو مرد تصوّر کرکے سوتیلی ماں کا تو منکوحۃ الاب کی وجہ سے نکاح صحیح نہیں مگر سوتیلی ماں کو مرد تصوّر کرنے کے بعد لڑکی سے نکاح کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں، اس لیے یہ صورت اَنْ تَجْمَعُوا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ میں داخل نہیں، دونوں ایک شخص کے نکاح میں جمع کی جاسکتی ہیں ۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : حرم الجمع وطاء بملك یمین بین

---

[1] وفی الهندیة : ولو قال تزوجینی نفسك فقبلت العقد، ان لم یقصد به الاستقبال، هکذا فی النهر الفائق ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۰ الباب الثانی فیما ینعقد به النکاح)
وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۹۶ کتاب النکاح ۔

امرأتین ایتهما فرضت ذکرًا لو تحل للأخرٰی ابدًا..... فجاز الجمع بین امرأة وبنت زوجها او امرأة ابنها .الخ۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۳۰۹ فصل فی المحرمات) ؎۱

مذاق میں کیا گیا نکاح منعقد ہوجاتا ہے

سوال:۔ اگر کوئی لڑکی اور لڑکا دونوں آپس میں مذاق ہی مذاق میں گواہوں کے رُوبرو نکاح کے ایجاب وقبول کر لیے، اب لڑکا کہتا ہے کہ تم نے میرے ساتھ نکاح کیا ہے اس لیے تم میری بیوی ہو، جبکہ لڑکی کا دعوٰی ہے کہ وہ تو مذاق کر رہی تھی میرا ارادہ نکاح نہ تھا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مذاق ہی مذاق میں کیا گیا نکاح منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں چند امور ایسے ہیں کہ جن میں مذاق اور حقیقت دونوں مساوی ہیں جن میں سے ایک نکاح بھی ہے، اس لیے نکاح خواہ مذاق ہی مذاق میں کیوں نہ کیا جائے منعقد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ لڑکی اب اس لڑکے کی منکوحہ ہے لڑکی کا دعوٰی باطل ہے۔

لقوله علیه الصلوٰة والسلام: ثلاث جدهن جد وهزلهن جد الطلاق والعتاق والنکاح۔ (مشکوٰة ص۲۸۴ باب الخلع والطلاق) ؎۲

چھوٹی بچی اور بچے کے نکاح کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں دیر کے علاقہ میں والدین چھوٹے چھوٹے بچوں کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں سمجھتے ہیں، کیا ان بچوں کا نکاح جائز ہے؟ کیا یہ چھوٹے بچوں پر ظلم تو نہیں؟

؎۱ فی الهندیة: ویجوز بین امرأة وبنت زوجها۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۲۷۷ الباب الثانی فی بیان المحرمات، القسم الرابع المحرمات بالجمع)

؎۲ عن ابی هریرةؓ: قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ثلاث جد هن جد وهزلهن جد۔ (ابوداؤد ج۱ ص۱۴۲ باب ما جاء فی الجد والهزل فی الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی الترمذی، باب ما جاء فی الجد والهزل فی الطلاق۔

الجواب: شریعتِ اسلامی میں جب بچے کا ولی اس کا نکاح کردے تو نکاح صحیح ہے نابالغ کے سمجھنے کی ضرورت نہیں صرف ولی کا سمجھنا ہی کافی ہے اور نہ یہ بچوں پر ظلم ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: یجوز نکاح الصغیر والصغیرة اذا زوجهما الولی بکراً کانت الصغیرة او ثیباً۔

(الهدایة ج۲ ص۲۹۵ باب الاولیاء) [1]

ربیب کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص ایک عورت سے شادی کرے اور اس عورت کے ساتھ پہلے شوہر سے ایک لڑکا بھی ہے جس کی پرورش اس زوجِ ثانی نے کی، اب اگر یہ لڑکا اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا وہ فوت ہو جائے، تو کیا یہ شخص اپنے ربیب کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ربیب یا متبنیٰ حقیقی یا رضاعی بیٹوں کی طرح نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ربیب کی بیوہ یا مطلقہ سے یہ مربی (منہ بولا باپ) شادی کرسکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (تحت قوله، واما بنت زوجة ابیه وابنه فحلال) ولا تحرم زوجة الربیب ولا زوجة الراب۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۳۰۳ فصل فی المحرمات) [2]

عدت کے دوران سالی سے نکاح کرنا صحیح نہیں

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر عدت

---

[1] وفی الهندیة: لولیّ الصغیر والصغیرة ان ینکحهما وان لم یرضیا بذلك سواءً کانت بکراً او ثیباً۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۸۵ کتاب النکاح۔ الباب الرابع فی الاولیاء)

ومثلهٗ فی الدر المختار ج۳ ص۵۵ کتاب الولی۔

[2] وفی الهندیة: ولاتحرم حلیلة الابن المتبنی علی الاب المتبنّی۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۴ الباب الثالث فی بیان المحرمات۔ القسم الثانی المحرمات بالصهریة)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۲۸۸ کتاب النکاح۔ فصل فی بیان المحرمات۔

کے دوران ہی اس کی بہن سے نکاح کرے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے ؟

الجواب: چونکہ عدت کے اندر عورت شوہر کے نکاح میں من وجہ داخل ہے اس لیے اس دوران بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ تاہم اگر عدت کے بعد نکاح کرنا چاہتا ہو تو کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: والجمع نکاحاً وعدۃ ولو من طلاق بائن۔ (الدر المختار علی ھامش ردالمحتار ج۲ ص۳۰۸ فصل فی المحرمات) ؎۱

منکوحہ کی بیٹی سے نکاح کرنا

سوال: ایک شخص نے کسی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کیا، اس عورت کی سابقہ خاوند سے ایک جوان بیٹی بھی ہے جبکہ اس شخص نے دخول سے قبل ہی اس کو طلاق دیدی، اور اب وہ اس کی بیٹی سے نکاح کرنے کا خواہشمند ہے، تو کیا اس شخص کا اپنی مطلقہ کی بیٹی سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: منکوحہ کی بیٹی سے نکاح شرعاً حرام ہے مگر یہ حرمت دخول یا خلوتِ صحیحہ کے ساتھ مشروط ہے، اگر یہ شرط پائے جانے سے قبل طلاق واقع ہو جائے تو منکوحہ مطلقہ کی بیٹی سے نکاح کرنا مرخص ہے ورنہ خلوتِ صحیحہ یا دخول کی صورت میں نکاح ناجائز وحرام ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ خلوتِ صحیحہ یا دخول کی شرط مفقود ہے اس لیے اس شخص کا اس لڑکی سے نکاح درست ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا بام امرأتہ دخل بھا اولم یدخل، لقولہ تعالیٰ: وامھات نسائکم من غیر قید الدخول ولا ببنت امرأتہ التی دخل بھا لثبوت قید الدخول بالنص سواءً کانت فی حجرہ او فی حجر غیرہ۔

(الھدایۃ ج۲ ص۲۸۷ کتاب النکاح۔ فصل فی المحرمات) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا طلق امرأتہ طلاقاً بائناً او رجعیاً لم یجز لہ ان یتزوج باختھا حتی تنقضی عدتھا۔

(الھدایۃ ج۲ ص۲۸۹ کتاب النکاح۔ فصل فی بیان المحرمات)

ومثلہ فی الھندیۃ: الباب الثالث فی بیان المحرمات۔ القسم الرابع المحرمات بالجمع۔

؎۲ قال اللہ تعالیٰ: وربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم اللتی دخلتم بھن۔ (سورۃ البقرہ ۔۔۔)

باپ کی سوتیلی بیٹی سے نکاح جائز ہے

سوال:۔ باپ کی دوسری بیوی کی بیٹی سے جبکہ وہ بیٹی اس بیوی کے پہلے خاوند سے ہو نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باپ کی دوسری بیوی کی بیٹی جو کہ اس کے پہلے خاوند سے ہو اُس سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (واما بنت زوجۃ ابیہ او ابنہ فحلال) قال ابن عابدینؒ: وکذا بنت ابنہما الخ. (الدر المختار مع رد المحتار ج۲ ص۳۰۲،۳۰۳ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)[۱]

بیٹے کی مزنیہ سے نکاح کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکے کے کسی لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، اب چند دن قبل دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے، علاقائی جرگہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس لڑکی کا اسی لڑکے سے نکاح کردیا جائے لیکن لڑکا کسی صورت میں بھی اس سے نکاح کے لئے تیار نہیں، جبکہ لڑکے کا باپ کہتا ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا لڑکے (زانی) کے باپ کا نکاح اس لڑکی (مزنیہ) سے جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی رُو سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ فقہ حنفی کی رُو سے زنا بھی سبب مصاہرت ہے۔ لہٰذا اگر واقعی لڑکے نے اس لڑکی کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا ہو تو یہ لڑکی لڑکے کے باپ کی بمنزلہ بہو (منکوحۃ الابن) کے ہے جبکہ بہو سے نکاح کرنا شرعاً جائز نہیں، اسی وجہ سے بیٹے کی مزنیہ سے اس کا باپ نکاح نہیں کرسکتا۔

لما فی الھندیۃ: کذا تحرم المزنی بہا علیٰ اباء الزانی واجدادہ وان علوا وابنائہ وان سفلوا کذا فی فتح القدیر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۔۔۔ کتاب النکاح الباب الثالث)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ صدر الشہید رحمہ اللہ: وتحل اخت اخیہ رضاعاً کما تحل نسبا کاخ من الاب لہ اخت من امہ تحل لاخیہ من ابیہ۔
(شرح الوقایۃ ج۲ ص۶۸،۶۹ کتاب النکاح)

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وحرم ایضاً بالصھریۃ اصل مزنیۃ۔ قال ابن عابدینؒ: تحتہ حرمۃ المرأۃ علیٰ اصول الزانی وفروعہ نسباً ورضاعاً۔
(الدر المختار علیٰ ھامش رد المختار ج۲ ص۳۸۴ کتاب النکاح)

بیٹے کی ساس سے نکاح کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا سسر فوت ہوچکا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیوہ ساس کا نکاح اپنے باپ سے کردوں تاکہ ہم مشترکہ طور پر ان کی دیکھ بھال کرسکیں، تو کیا شرعاً ان دونوں کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق دونوں کے مابین کوئی ایسا رشتہ نہیں جو کہ موجبِ حرمت ہو، اس لیے ان دونوں کا نکاح شرعاً جائز ہے، اور امید ہے کہ اس کارِ خیر پر آپ کو منجانب اللہ اجر بھی ملے گا۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولا تحرم ام زوجۃ الابن۔ (رد المحتار جلد ۲ ص۳۸۳ کتاب النکاح)[1]

نومسلمہ عورت سے عدت ختم ہونے سے قبل نکاح کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم شادی شدہ عورت اسلام قبول کرلے تو کیا عدت گذارنے سے قبل اس کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی غیر مسلمہ شادی شدہ عورت اسلام قبول کرلے اور اس کا خاوند غیر مسلم ہو تو اس کا نکاح از خود ختم ہوجاتا ہے، اب اگر وہ عورت دار الحرب میں ہو تو صرف تین حیض گذار کر کسی مسلمان مرد سے نکاح کرسکتی ہے، اور اگر دار الاسلام میں ہو تو تفریقِ قاضی کے بعد دوبارہ نکاح کیلئے تین حیض گذارنا لازمی ہے، بدون اس کے نکاح جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ولو اسلم احدھما ای احد المجوسین او امرأۃ الکتابی ثمۃ ای فی دار الحرب وملحق بھا کالبحر الملح لم تبن حتی تحیض ثلاثاً وتمضی ثلاثۃ اشھر قبل اسلام الآخر اقامۃ لشرط الفرقۃ مقام السبب۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۲۹۰ کتاب النکاح)

---

[1] قال العلامۃ مفتی عبد الرحیم رحمہ اللہ: الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً! زید کا باپ زید کی زوجہ کی ماں یعنی باپ اپنے بیٹے کی خوشدامن سے نکاح کرسکتا ہے یہ رشتہ حرام نہیں ہے۔ {فتاوی رحیمیۃ ج ۱۰ ص۱۹۴ کتاب النکاح}

باب المهر

(حق مہر کے احکام و مسائل)

رخصتی سے قبل طلاق دے کر لڑکی والوں کو کچھ رقم دینا

سوال:۔ یہاں ایک لڑکے کا نکاح ہوا لیکن کسی وجہ سے رخصتی نہ ہوسکی بلکہ لڑکے نے بیوی کو طلاق دے دی، اب اگر یہ لڑکا لڑکی والوں کو کچھ رقم دے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا ہو تو طلاق قبل الدخول کی صورت میں نصف مہر مسمّٰی لازم ہے اور اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو تو متعہ دینا لازمی ہے، تاہم اگر لڑکے والے اپنی طرف سے مہر مسمّٰی کے علاوہ کچھ رقم لڑکی یا اس کے رشتہ داروں کو بطور ہدیہ دیدیں تو بہتر ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ومن سمى مهرًا عشرة فما زاد فعليه المسمى ان دخل بها او مات عنها .... وان طلقها قبل الدخول والخلوة فلها نصف المسمى ...... قال وان تزوجها ولم يسم لها مهرًا او تزوجها على ان لا مهر لها فلها مهر مثلها ان دخل بها او مات عنها...... ولو طلّقها قبل الدخول بها فلها المتعة -

(الهداية ج ۲ ص۳۰۴ باب المهر) [1]

---

[1] قال الله تبارك وتعالیٰ: (لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً) (وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ) وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ) - (سورة البقره پ۲ آیت ۲۳۶)

وَمِثْلُهٗ فِى الهندية ج ۱ ص۳۰۳ كتاب النكاح، باب المهر-

مہر کی کم از کم مقدار

سوال:۔ شریعتِ اسلامی میں مہر کی کم از کم مقدار کتنی ہے اور اس کی قیمت کیا ہوگی؟

الجواب:۔ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے جس کی وزنی مقدار تقریباً ۳۵ گرام چاندی ہے یا اس کی قیمت رائج الوقت قیمت کے اعتبار سے ہے۔

قال فی الھندیۃ: اقل المھر عشرۃ دراھم مضروبۃ اوغیر مضروبۃ حتی یجوز وزن عشرۃ تبرًا وان کانت قیمتہ اقل۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۳۰۲ الفصل الاول فی بیان ادنیٰ مقدار المھر) [1]

مہر فاطمی کی مقدار

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مہر فاطمی (حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے حق مہر) کی مقدار کیا ہے؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر صاحبزادی رضی اللہ عنہا کا حق مہر ۴۸۰ درہم ہے جو کہ موجودہ نظام اوزان کے مطابق ۱.۴۹۶ ۶۳ کلو چاندی کا وزن بنتا ہے یا رائج الوقت کرنسی کے حساب سے اس کی قیمت کا اعتبار ہے۔

قال عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ما علمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکح شیئًا من نسائہ ولا انکح شیئًا من بناتہ علی اکثر من ثنتی عشرۃ اوقیۃً ھذا حدیث حسن صحیح۔ (ترمذی ج ۱ ص ۱۶۵ باب ما جاء فی مھور النساء) [2]

حلالہ کے بعد نکاح میں مہر مقرر کرنا لازمی ہے

سوال:۔ جو شخص طلاقِ مغلظہ کے بعد حلالہ شرعی کرکے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہو تو اس کو دوبارہ مہر مقرر کرنا ضروری ہے یا کہ سابقہ مہر ہی کفایت کرجائے گا؟

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: واما بیان ادنی المقدار الذی یصلح مھرًا فادناہ عشرۃ دراھم او ما قیمتہ عشرۃ دراھم۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۷۵ فصل واما بیان ادنی المقدار)

[2] وذکر الامام ابوداؤد السجستانیؒ: عن ابی العجفاء قال خطبنا عمرؓ فقال الا لا تغالوا بصدق النساء فانھا لو کانت مکرمۃً فی الدنیا او تقوًی عند اللہ کان اولاکم بھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما اصدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امراۃ من نسائہ ولا اصدقت امراۃ من بناتہ اکثر من ثنتی عشرۃ اوقیۃً۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۴ باب الصداق)

الجواب:۔ مہر کے تقرر کا تعلق نکاح باندھنے کے ساتھ ہے، جب بھی نکاح باندھا جائے گا تو مہر مقرر کیا جائے گا چاہے اپنی مطلقہ سے حلالہ شرعی کے بعد نکاح کرنا ہو یا کسی اور عورت سے نکاح کرنا ہو، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دوبارہ مہر مقرر کرنا ہوگا ورنہ مہرِ مثل لازم ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وکذا یجب مهر المثل فیما اذا لم یسم مهرًا اونفی ان وطئ الزوج أو مات عنها اذا لم یتراضیا علی شئ یصلح مهرًا والا فذلك الشئ هو الواجب۔
(الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۳۶۳ باب المهر)[1]

متعدد ازواج کی صورت میں مہر میں مساوات کا مسئلہ

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم نے سنا ہے کہ جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان برابری شرعاً ضروری ہے، تو کیا مہر میں بھی برابری ضروری ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے حقوقِ نسواں کا خیال رکھ کر مرد کو ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان مساوات کا حکم دیا ہے لیکن یہ مساوات کھانے پینے، لباس، رہائش اور رات گذارنے میں ہے، مہر میں یہ تساوی جاری نہ ہوگا، اس لیے مہر مقرر کرنا صرف مرد کا کام نہیں بلکہ باہمی رضامندگی کا مسئلہ ہے، اس لیے متعدد بیویوں کے درمیان مہر میں تفاوت موجبِ گناہ نہیں ہے۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: یجب علیه التسویة بین الحرتین او الامتین فی المأکول والمشروب والملبوس والسکنی والبیتوتة ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۳۴ باب القسم)[2]

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: المهر یتکرر بالعقد مرة وبالوطئ اخری یتکرر بهما۔
(فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۳۹۲ فصل فی تکرار المهر)

[2] قال العلامة قاضیخانؒ: ومایجب علی الازواج للنساء العدل والتسویة بینهن فیما یملك وهو البیتوتة عندها للصحبة والمؤانسة لافیما لایملك۔
(الفتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۳۹ فصل فی القسم)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۲ ص۳۳۲ فصل ومنها وجوب العدل بین النساء۔

حقِ مہر میں نقدی کے بجائے زمین وغیرہ دینا | **سوال:۔** جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں یہ دستور ہے کہ لوگ حقِ مہر میں نقدی کے بجائے مکان، زمین یا سونے کے زیورات دیتے ہیں، کیا نقد رقم کی جگہ مذکورہ اشیاء دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ مہر میں ہر وہ چیز دینا جائز ہے جو بذاتِ خود مال ہو۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مذکورہ اشیاء بھی مالِ متقوم ہیں اس لیے ان اشیاء کو مہر میں دینا جائز ہے۔

وفی الهندية: المهر انما يصح بكل ماهو مال متقوم۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۳۰۲ الفصل الاوّل فی بيان ادنیٰ مقدار المهر و بيان ما يصلح مهرًا.....) [۱]

انعقادِ نکاح کے بعد حقِ مہر میں زیادتی کرنا | **سوال:۔** کیا انعقادِ نکاح کے بعد شوہر مہر میں زیادتی کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرے تو کیا بیوی اُس زیادتی کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح نکاح سے قبل حقِ مہر میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے اسی طرح نکاح کے انعقاد کے بعد بھی شوہر مہر میں زیادتی کر سکتا ہے اور اس زیادتی کا مطالبہ عورت کا حق بن جائے گا۔

وفی الهندية: الزيادة فی المهر صحيحة حال قيام النكاح......فاذا زادها فی المهر بعد العقد لزمته الزيادة كذا فی السراج الوهاج۔
(الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۳۱۲ الفصل السابع فی الزيادة فی المهر والحطعنه وفيما يزيد وينقص) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابوبكر الكاسانیؒ: منها ان يكون المسمّى مالاً متقومًا۔
(بدائع الصنائع ج۲ ص۲۷۷ فصل واما بيان ما يصح تسمية مهر)

[۲] قال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله: (تحت قوله وما فرض بعد العقد او زيد لا يتنصف)..... دل وضع المسئلة علىٰ جواز الزيادة فی المهر بعد العقد وهی لازمة له بشرط قبولها فی المجلس على الأصح۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۴۸ باب المهر)

اپنی حیثیت سے زیادہ مہر مقرر کرنا

سوال:۔ جو شخص نکاح کے وقت اپنی حیثیت سے زیادہ مہر مقرر کرے تو اس کے اس عمل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مہر کی تقرری میں اپنی حیثیت کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر میں زیادتی کو ناپسند فرمایا ہے اس لیے حیثیت سے زیادہ مہر مقرر کرنا اچھا نہیں لیکن تقرر کے بعد شوہر کے ذمے ادا کرنا لازم ہو جائے گا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تغالوا صدقۃ النساء۔ (مشکوٰۃ ص۲۷۷ باب الصداق) [1]

عورت مہر کا مطالبہ کس سے کرے گی

سوال:۔ یہاں صوبہ سرحد میں اکثر والدین بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں کراتے ہیں، تو کیا عورت مہر کا مطالبہ شوہر سے کرے گی یا سسر سے؟ (جس نے اس کا نکاح کرایا ہے)

الجواب:۔ مہر منفعتِ زوجیت کا عوض ہے جو شرعاً شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکے کے باپ نے مہر کا ضمان اپنے ذمے لے لیا ہو تو عورت سسر اور شوہر دونوں سے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے بصورتِ دیگر مہر کا مطالبہ صرف شوہر سے ہوگا۔

وفی الهندیۃ: زوج ابنتہ الصغیرۃ اوالکبیرۃ وھی بکر اومجنونۃ رَجُلاً اوضمن عنہ مھرھا صح ضمانہ ثم ھی بالخیار ان شاءت طالبت زوجھا اووليھا ان كانت اھلاً لذلك ويرجع الولی بعد الاداء علی الزوج ان ضمن بامرہ۔
(الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۳۲۶ الفصل الرابع عشر فی ضمان المهر) [2]

---

[1] قال المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: زیادہ مہر مقرر کرنا اچھا نہیں سمجھا گیا۔
(فتاوی دارالعلوم دیوبند ج۸ ص۲۴۱ مسائل واحکام مہر)

[2] وقال العلامۃ الحصکفیؒ: (وتطالب أیاً شاءت) من زوجھا البالغ اوالولی الضامن۔
{ الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار ج۲ ص۳۸۷ مطلب فی ضمان المهر }
ومِثلُہٗ فی فتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۲۴۴ مسائل واحکام مھر۔

عورت کے ورثاء شوہر سے مہر کا مطالبہ کرسکتے ہیں

سوال: ایک عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی، طلاق کے بعد اس عورت کا نکاح دیور سے ہوگیا، اب وہ عورت وفات پاگئی ہے تو کیا عورت کے ورثاء دونوں شوہروں سے مہر کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: نکاح کرنے کے بعد مہر عورت کا حق بن جاتا ہے جو کسی وقت بھی مطالبہ کرسکتی ہے چونکہ اس عورت نے دو مردوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہے لہٰذا اگر دونوں نے اس کی وفات تک حقِ مہر ادا نہ کیا ہو تو ان کے ذمے عورت کا مہر لازمی ہے، اس لیے وفات کے بعد عورت کے ورثاء دونوں سے مطالبہ کرسکتے ہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: افاد ان المهر وجب بنفس العقد۔
(ردّ المحتار ج۲ ص۳۵۸ باب المهر) ؎۱

مہر عورت کے ورثاء کو دیا جاسکتا ہے

سوال: اگر کوئی عورت شوہر کے گھر فوت ہوجائے اور اُس کے والدین و دیگر رشتہ دار شوہر سے مہر کا مطالبہ کریں تو کیا مہر ورثاء کو دیا جاسکتا ہے یا شوہر ہی اس کا حقدار ہے؟

الجواب: اگر مہر شوہر کے ذمے قرض ہو تو بیوی کی وفات کے بعد مہر بطریقہ میراث تقسیم ہوگا جس میں شوہر عورت کی اولاد اور والدین شریک ہیں، اس لیے کل مہر نہ تو شوہر کے پاس رہے گا اور نہ کل مہر عورت کے رشتہ داروں کو دیا جائے گا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها الارث من الجانبین جمیعاً لقوله عزّوجلّ: ﴿ولکم نصف ما ترک ازواجکم﴾ الیٰ قوله عزّوجلّ: ﴿ولهنّ الثمن مما ترکتم من بعد وصیة توصون بها او دین﴾ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۳۲ فصل ومنها الارث) ؎۲

؎۱ قال العلامة الکاسانیؒ: المهر فی النکاح الصحیح یجب بالعقد لانهٗ احدث الملک والمهر یجب بمقابلة احداث الملک۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۸۷ فصل واَمّا بیان ما یجب المهر)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۳۹۲ فصل فی تکرار المهر۔

؎۲ قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰنؒ: جو مہر ہندہ کا بذمہ شوہر ہے اس میں نصف شوہر کو پہنچے گا اور نصف ہندہ کے والدین کو ملے گا، زید کو اپنے حصہ کا اختیار ہے کہ خیرات کردے، والدین کا حصہ ان کو دینا چاہیئے۔
(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۸ ص۲۱۴ فصل اوّل مسائل واحکام مہر)

نابالغ لڑکے کی شادی کے مہر کا حکم

سوال: ایک آدمی نے بچپن میں اپنے لڑکے کی شادی کردی تو اب بیوی کا حق مہر نابالغ شوہر پر واجب ہوگا یا سسر پر؟

الجواب: مہر کے وجوب کے لیے بلوغ شرط نہیں اس کا تعلق نکاح سے ہے یعنی جس سے نکاح ہوا ہو اُس کے ذمے مہر دینا واجب ہے چاہے بالغ ہو یا نابالغ، اگرچہ باپ ضامن بن سکتا ہے۔

وفی الهندیة: واذا زوج ابنه الصغیر امرأة وضمن عنه المهر وکان ذلك فی صحته جاز اذا قبلت المرأة الضمان واذا ادی الاب ذلك ان کان الاداء فی حالة الصحة لا یرجع علی الابن بما ادی استحسانًا الا اذا کان بشرط الرجوع فی اصل الضمان۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۳۲۶ الفصل الرابع عشر فی ضمان المهر) [1]

بذریعہ جرگہ طلاق لینے کی صورت میں مہر کا مطالبہ کرنا

سوال: بعض عورتیں گھریلو ناچاقی کی وجہ سے شوہر سے بذریعہ جرگہ وغیرہ طلاق لے لیتی ہیں، تو کیا طلاق لینے کے بعد مہر کا مطالبہ کرسکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب: اگر طلاق دیتے وقت شوہر نے مہر معاف کرنے کی شرط لگائی ہو اور عورت نے قبول کرکے شوہر سے طلاق لی ہو تو اُسے مہر کے مطالبہ کا حق نہیں رہتا اور اگر طلاق دیتے وقت ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو اور نہ عورت نے مہر معاف کیا ہو تو مہر اس کا حق ہے اور وہ مطالبہ کرسکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افادان المهر وجب بنفس العقد... انما یتاکد لزوم تمامه بالوطء ونحوه۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۵۸ باب المهر) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: (وتطالب ای اشارت) من زوجها البالغ او الولی الضامن۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۷ مطلب فی ضمان الولی المهر)

[2] وفی الهندیة: امرأة قالت لزوجها اخلعنی فقالت خویشتن خریدم فقال الزوج مجیبا لها انت طالق صار بمنزلة قوله خلعت هکذا ذکر فی النوازل والفتوی علی انه اراد به الجواب یکون جوابًا ولو قال فروختم بیک طلاق ویکون جوابًا بدون النیة وبعد اسطر... وهل یبرء الزوج عن المهر اختلفوا فیما بینهم قال بعضهم لا یبرأ وهو الاصح۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۴۹۱ الفصل الاول فی شرائط الخلع وحکمه وما یتعلق به)

ومثله فی فتاوی دیوبند ج ۸ ص ۲۱۵ مسائل واحکام مهر۔

جبراً مہر معاف کرانا

سوال:۔ اگر کوئی عورت جبر و اکراہ سے یا کسی دباؤ میں آ کر حق مہر معاف کردے تو کیا مہر معاف ہو جائے گا؟

الجواب:۔ بتقاضائے نصِ قرآنی مہر کی معافی کے لیے طیبِ نفس کا ہونا ضروری ہے جبر و اکراہ کے ساتھ معاف کرانے سے مہر معاف نہیں ہوتا۔

لقوله تعالىٰ: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا۔

(سورۃ النساء آیت ۴) [1]

مقدارِ مہر میں اختلاف کا پیدا ہونا

سوال:۔ اگر کبھی میاں بیوی کے درمیان مہر کی مقدار میں اختلاف ہو جائے اور شرعی دلیل کسی کے پاس نہ ہو تو دونوں میں سے کس کا قول معتبر ہوگا؟

الجواب:۔ نکاح کے معاملے میں اصل مہر مثل ہے، جب میاں بیوی کا مقدارِ مہر میں اختلاف پیدا ہو جائے اور دلیل کسی کے پاس نہ ہو تو اس متنازع صورت میں فیصلہ مہر مثل پر ہوگا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وقالا يقضى بمهر المثل كحال حياة وبه يفتى۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۳۹۳ باب المهر) [2]

عدالت کے ذریعے مہر کم کروانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص مفلس ہو اور بوقتِ نکاح لڑکی والوں نے مہر زیادہ مقرر کر دیا ہو، تو اب اگر وہ عدالت کے ذریعے مہر کو کم کروانا چاہے تو کروا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مہر کا تقرر میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، تقرری کے بعد

---

[1] قال الشيخ المفتي محمد شفيع رحمه الله: دورِ حاضر میں چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنے والا نہیں ہے، اگر سوال کروں یا معاف نہ کروں تو بد دلی یا بدمزگی پیدا ہوگی، اس لیے بادلِ نخواستہ معاف کر دیتی ہیں، اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں۔ (معارف القرآن ج۲ ص۲۹۸ سورۃ النساء)

[2] وفي الهندية: إذا اختلف الزوجان في قدر المهر حال قيام النكاح عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى يحكم مهر المثل۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۳۱۹ الفصل الثاني عشر في اختلاف الزوجين في المهر)

ومثله في بدائع الصنائع ج۲ ص۳۰۵ فصل واما حكم اختلاف الزوجين في المهر۔

جب مہر ایک مرتبہ متاکد ہو جائے تو بیوی کی رضامندی کے بغیر عدالت یا کوئی جرگہ وغیرہ نہ تو مہر کم کرا سکتے ہیں اور نہ ختم کر سکتے ہیں، شوہر پر اس کی ادائیگی لازم ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: فالمھر یتاکد باحد معانٍ ثلاثۃ ......لایسقط بعد ذلک الا بالابراء۔ (بدائع الصنائع ج۲ صـ۲۹۱ فصل بیان مایتاکد بہ المھر) [1]

تاجیل وتعجیلِ مہر میں عرف کا اعتبار ہے

سوال:۔ اگر بوقتِ نکاح مہر کی تاجیل وتعجیل کا کوئی ذکر نہ ہوا ہو تو کیا عورت مہر فوراً لینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: جس مہر کی تاجیل وتعجیل کا ذکر بوقت انعقادِ نکاح نہ ہو تو اس صورت میں مہر عرف کا تابع ہو کر جتنا مال مؤجل دیا جاتا ہے تو اتنی مقدار میں عورت حقِ مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولھا منعہ عن الوطء والسفر بھا ولو بعد وطء وخلوۃ رضیتھما لاخذ مابین تعجیلہ اوقدر مایعجل لمثلھا عرفاً وان لم یؤجل قال الحصکفیؒ: بہ یفتی لان المعروف کالمشروط۔ (ردالمحتار ج۲ صـ۳۶۹ باب المھر) [2]

رخصتی سے قبل شوہر کی وفات پر عورت پورے مہر کی حقدار ہے

سوال:۔ اگر کسی عورت کا شوہر رخصتی سے قبل وفات پا جائے تو کیا عورت پورے مہر کی حقدار ہوگی یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما المسمی فانما قام مقامہ للتراضی بہ ثم عرف المصر فی العنایۃ بانہ اسم للمال الذی یجب فی عقد النکاح علی الزوج فی مقابلۃ البضع اما بالتسمیۃ او بالعقد۔
(ردالمحتار ج۲ صـ۳۵۷ باب المھر)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ صـ۳۰۳ الفصل الثانی فیما یتاکد بہ المھر والمتعۃ۔

[2] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: اذا کان المھر معجلاً بان تزوجھا علی صداق عاجل او کان مسکوتاً عن التعجیل والتاجیل لان حکم المسکوت حکم المعجل لان ھذا عقد معاوضۃ فیقتضی المساواۃ من الجانبین والمرأۃ لمیت حق الزوج فیجب ان یعین الزوج حقھا وانما یتعین بالتسلیم۔
(بدائع الصنائع ج۲ صـ۲۸۸ فصل واما بیان مایجب بہ المھر وبیان وقت وجوبہ)

الجواب:۔ موت ایک ایسا حادثہ ہے کہ جس کی وجہ سے مہر متأکد ہوجاتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر رخصتی سے قبل کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے تو عورت بوقتِ نکاح مقرر کردہ پورے مہر کی حقدار ہے ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویتأکد عند وطء او خلوۃ صحت من الزوج او موت احدھما۔ الخ (الدر المختار علٰی ہامش رد المحتار ج۲ ص۳۵۸ باب المہر) ؎۱

بیٹی کے حق مہر کی رقم سے جہیز کا سامان خریدنا

سوال: بعض علاقوں میں رواج ہے کہ باپ بیٹی کا مہر لے کر اُس سے بیٹی کے لیے جہیز کا سامان خریدتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مہر کی رقم سے بیٹی کے لیے جہیز کا سامان خریدنا جائز ہے اور یہ سامان لڑکی کی ذاتی ملکیت تصور ہوگا، باپ کے اس قبضے سے شوہر کا ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

قال ابن عابدینؒ: وفیھا قبض الاب المھر وھی بالغۃ اولا وجھزھا او قبض مکان المھر عینا لیس لھا ان لا تجیز لان ولایۃ قبض المھر الی الاباء وکذا التصرف فیھا ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۵۰۸ باب المھر قبیل باب النکاح الرقیق) ؎۲

جہیز کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل ہم اکثر لوگوں سے یہ الفاظ سنتے رہتے ہیں کہ جہیز کی لعنت ہمارے سروں پر سوار ہے۔ تو کیا واقعی ایک لعنت ہے؟ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایک باپ جب اپنی بیٹی کے لیے کہیں شادی کا ارادہ رکھتا ہو تو سنت یہ ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق کچھ نہ کچھ سامان بیٹی کو جہیز میں دینا چاہیئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ رضی اللہ عنہا کو شادی کے موقع پر جہیز دیا تھا۔ تاہم اپنی وسعت سے زیادہ کام کرنا مناسب نہیں ۔

؎۱ قال فی الھندیۃ: والمھر یتأکد باحد معان ثلاثۃ الدخول والخلوۃ الصحیحۃ وموت احد الزوجین ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۳۰۳ الفصل الثانی فیما یتأکد بہ المھر والمتعۃ)

؎۲ قال العلامۃ المفتی عزیز الرحمٰنؒ: لڑکی کے سامان کے لیے باپ کو مہر کا کچھ حصہ لے کر اس میں صرف کرنا جائز ہے۔ (فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۸ ص۲۴۳ مسائل و احکام مہر)

عن علیؓ: انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لما زوّجه فاطمةؓ بعث معها بخميلة ووسادة أدم حشوها ليف ورحائين وسقائين ...... الحديث (الاصابة ج۴ ص۳۷۹)

حضرت علیؓ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کی شادی میرے ساتھ کی تو جہیز میں ساتھ ایک چادر اور ایک گدا جس کے اندر کھجور کے پتے بھرے تھے اور دو چکیاں اور دو مشکیں بھیجی تھیں۔ (امداد الاحکام جلد۲ ص۳۷۱ باب المهر) [1]

جہیز کے سامان کی ملکیّت کا حکم

سوال:۔ لڑکی کے والدین جو جہیز کا سامان اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر دیتے ہیں، یہ سامان کس کی ملکیت ہے؟ لڑکی کی یا شوہر کی؟

الجواب:۔ یہ تو جہیز کا سامان دینے والے کی نیّت پر موقوف ہے، اگر اُس نے لڑکے کو دیا ہو تو اُس کی ملکیت ہے اور اگر لڑکی کو دیا ہو تو اُس کی ملکیت ہے۔ چونکہ یہ سامان لوگ عموماً اپنی بیٹی کو دیتے ہیں اسلئے عدم نیّت کی صورت میں یہ سامان لڑکی کا متصوّر ہوگا۔

قال فی الهندية: لو جهّز ابنته وسلمه اليها ليس له فی الاستحسان استرداده وعليه الفتوى ..... واذا بعث الزوج الی اهل زوجته اشياء عند زفافها منها ديباج فلمّا زفت اليه أراد ان يسترد من المرأة الديباج ليس له ذلك اذا بعث اليها علیٰ جهة التمليك كذا فی الفصول العمادية۔ (الفتاوی الهندية ج۱ ص۳۲۷ الفصل السادس عشر فی جهاز البنت) [2]

---

[1] عن علیؓ رضی الله عنه قال: جهّز رسول الله صلی الله عليه وسلم فاطمةؓ فی خميل وقربة ووسادة حشوها اذخر۔ (سنن النسائی ج۲ ص۹۲ جهاز الرجل ابنته)

[2] وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: "سئل" فيما اذا زوّجا بنتهما البالغة وجهّزها بجهاز سلماه منها فی صحتهما ثمّ ماتا عنها وعن ورثة غيرها يريدون قسمة الجهاز بينهم مع البنت فهل ليس له ذلك۔ الجواب "نعم"

(تنقيح الحامدية ج۱ ص۲۶ مسائل الجهاز)

وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولين جلد ۱ ص۱۹۲ فی الفصل العشرون فی دعوی النكاح۔

مہر معاف کرنے کے بعد دوبارہ مطالبہ کرنا

سوال:۔ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک عورت نے شوہر کو اپنا حق مہر معاف کردیا تھا، اب کسی گھریلو نا چاقی کی وجہ سے نوبت طلاق تک پہنچ گئی ہے، تو کیا یہ عورت دوبارہ اپنے مہر کا مطالبہ کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی عورت برضا ورغبت ایک مرتبہ اپنا حق مہر معاف کردے تو اس کو دوبارہ مطالبہ کا حق حاصل نہیں رہتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں عورت کا دوبارہ مطالبہ کرنا صحیح نہیں۔

وفی الهندية :۔ للمرأة ان تهب مالها لزوجها من صداق دخل بها زوجها أو لم يدخل وليس لاحد من اوليائها ات ولا غيره الاعتراض عليها۔ (الفتاوى الهندية ج۸۔ ص۳۱۶ الباب السابع فى المهر الفصل العاشر فى هبة المهر)[1]

مہر معاف کرنے پر اولیاء کا اعتراض کرنا

سوال:۔ کیا عورت اپنے شوہر کو حق مہر معاف کر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کرسکتی ہے تو کیا معاف کرنے کے بعد عورت کے باپ یا دیگر رشتہ داروں کا اعتراض معتبر ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں عورت اپنے مہر کی خود مالکہ ہے وہ اسکو جس طرح استعمال کرسکتی ہے چاہے شوہر کو معاف کرے یا کسی اور کو ہدیہ دیدے، باپ یا کسی اور رشتہ دار کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

وفی الهندية : للمرأة ان تهب مالها لزوجها من صداق دخل بها زوجها اولم يدخل وليس لاحد من اوليائها ات ولا غيره الاعتراض عليها۔ (الفتاوى الهندية ج۸۔ ص۳۱۶ الباب السابع فى المهر الفصل العاشر فى هبة المهر)[2]

خلوتِ صحیحہ کے بعد نامرد شوہر کامل مہر دے گا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں چند سال قبل ایک لڑکے کی شادی ہوئی، شادی کے بعد وہ نامرد ثابت ہوا جبکہ عورت نے رات کے وقت اپنے آپ کو

---

[1] و [2] قال العلامة الحصكفى رحمه الله : (وصح حطها) لكله او بعضه (عنه) قبل اولا الخ
قال العلامة ابن عابدين رحمه الله :۔ تحت هذه العبارة (وصح حطها) وقيد بحطها لأن حط ابيها غير صحيح لو صغيرةً ولو كبيرة توقف على اجازتها ولا بد من رضاها۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۳ ص۱۱۳ باب المهر مطلب فى حط المهر والابراء منه)
ومثله فى الهداية ج۲ ص۳۰۵ باب المهر۔

شوہر کے حوالے کر دیا تھا، تو کیا اب طلاق کے بعد عورت کو نصف مہر ملے گا یا کامل؟

الجواب:۔ مہر کی تاکید صرف دخول پر موقوف نہیں بلکہ عورت کا اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کرنے پر بھی مہر مؤکد ہو جاتا ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ عورت نے اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کیا ہے اس لیے وہ کامل مہر کی حقدار ہے۔

وفی الهندية: وخلوة المجبوب خلوة صحيحة عند ابی حنيفة وخلوة العنين والخصی خلوة صحيحة۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص ۳۰۵ الباب السابع فی المهر، الفصل الثانی فيما يتأكد به المهر والمتعة) [۱]

تجھے خُلع دیا ہے، سے سقوطِ مہر کا حکم

سوال:۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہے کہ میں نے تجھے خلع دیا ہے مگر عوضِ خُلع ذکر نہیں کیا، اور عورت اس کو قبول کرلے تو کیا اس سے مہر ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ خلع سے چونکہ میاں بیوی کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں، اب اگر عورت نے اپنا مہر وصول نہ کیا ہو تو خلع قبول کر لینے سے اس کا حقِ مہر شوہر کے ذمّے سے ساقط ہو جائے گا اور اگر وصول کیا ہو تو اس خلع کے عوض کچھ لازم نہ ہوا اور نہ عورت پر مہر واپس کرنا لازم ہے اسلئے کہ سوال میں بدلِ خلع مذکور نہیں۔

وفی الهندية: واذا خالعها علیٰ مالٍ مسمی معروف سوی الصداق فان كانت المرأة مدخولاً بها والمهر مقبوضاً فانها تسلم الی الزوج بدل الخلع ولا يتبع احدهما صاحبه بعد الطلاق بشیٴ وان كان المهر غير مقبوض فالمرأة تسلم الی الزوج بدل الخلع ولا ترجع علی الزوج بشیٴ من المهر الخ۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص ۴۸۹ الباب الثامن فی الخلع ....الخ) [۲]

---

[۱] قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: واذا خلا المجبوب بامرأته ثم طلقها فلها كمال المهر عند ابی حنيفة رح وقال عليه نصف المهر لانه اعجز من المريض بخلاف العنين....لان الحكم ادير علی سلامة الالة۔ الخ
(الهداية ج ۲ ص ۳۰۶ باب المهر)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار مع رد المحتار ج ۳ ص ۱۱۷، ۱۱۸ باب المهر۔ مطلب فی احكام الخلوة۔

[۲] قال العلامة قاضيخان رح: واما حكم المهر فان كانت المرأة مدخولة فقد قبضت المهر يلزمها البدل ولا يرجع احدهما علی صاحبه بشیٴ فی قولهم۔ (فتاوی قاضيخان ج ۲ ص ۲۵۶ باب الخلع)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۲ ص ۱۰۱ الفصل الثالث فی الخلع۔

لڑکے والوں سے شادی کا خرچہ لینا

سوال:۔ بعض لوگ لڑکی کا رشتہ دینے کے بعد لڑکے والوں سے مختلف رسومات کے نام پر شادی کا خرچہ وغیرہ لیتے ہیں، تو کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ عقدِ نکاح میں لڑکی دینے کی وجہ سے لڑکے یا اس کے رشتہ داروں سے رسومات کے بہانے شادی بیاہ کا خرچہ لینا ناجائز اور حرام ہے، اگر پیسے لیے ہوں تو واپس کرنا لازمی ہے، تاہم اس سے نکاح متاثر نہیں ہوتا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ومن السحت ما يأخذه الصهر من الختن بسبب بنته بطيب نفسه حتى لو كان بطلبه يرجع الختن۔

(ردّالمحتار ج ۵ ص۳۰۱ کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع) [۱]

حقِ مہر کی قسمیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مہر کی کتنی قسمیں ہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں حقِ مہر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں:۔

(۱) **مہرمسمّٰی:** یہ وہ مہر ہے جو زوجین یا ان کے وکلاء نکاح کرتے وقت باہمی رضامندی سے مقرر کرتے ہیں۔

(۲) **مہرمثل:** یہ وہ مہر ہے جو عورت کے خاندان کی دیگر عورتوں مثلاً سگی بہنوں، پھوپھیوں اور چچازاد بہنوں کے مہر کے برابر مقرر کیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اصل مہر مہرِ مثل ہے۔

قال الشیخ وهبة الزحيلي: المهر عند الفقهاء نوعان مهر مسمّٰى ومهر مثل۔ اما المهر المسمّٰى فهو ما سمي في العقد او بعد بالتراضي.....اما مهر المثل فقد حدده الحنفية بانه مهر امرأة تماثل الزوجة وقت العقد من جهة ابيها لا امها ان لم تكن من قوم ابيها كاختها وعمتها وبنت عمها في بلدها وعصرها۔

(الفقه الاسلامی وادلّته ج۷ ص۲۶۶ رابعاً انواع المهر)

---

[۱] قال العلامة الحصكفيؒ: اخذ اهل المرأة شيئاً عند التسليم فللزوج ان يسترده لانه رشوة۔
(الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۳۹۶ مطلب انفق علی معتدة الغير)
ومثله في الهندية ج۱ ص۳۲۷ الفصل السادس عشر في جهاز البنت۔

حق مہر خاوند کے ذمہ واجب ہے

سوال: نکاح باندھتے وقت اگر بالغ لڑکے کا باپ حق مہر میں مقررشدہ مال کی ادائیگی کا وعدہ کرے مگر ناداری اور غربت کی وجہ سے ادا نہ کرسکے تو کیا خاوند کے ذمے مہر دینا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: صراحتاً یا عرفاً لڑکے کی طرف سے اجازت کی صورت میں مذکورہ حق مہر اس کے ذمہ واجب الاداء ہے، حق مہر کی ادائیگی کا اصل ذمہ دار خاوند ہے، تاہم اگر باپ نے بیٹے کی جگہ حق مہر میں کوئی چیز دے دی تو وہ حق مہر شمار ہوگا خاوند پر دوبارہ ادائیگی ضروری نہیں، اور اگر باپ وعدہ کرکے نہ دے سکے تو خاوند پر لازمی ہے کہ مقررشدہ حق مہر ادا کرے۔

قال ابن نجیمؒ: أما ولی الزوج الکبیر فھو وکیل عنه کالاجنبی وکالته علیه وکالة استحبابؔ وحکم ضمان مھرہ کحکم ضمان الاجنبی فان ضمن عنه باذنه رجع والا فلا۔ (البحرالرائق ج ۳ ص۱۲۵ باب المہر) [۱]

حق مہر کے بغیر نکاح کا حکم

سوال: نکاح کے انعقاد کے وقت اگر ایجاب وقبول کے دوران حق مہر مقرر نہ کیا جائے تو کیا اس صورت میں نکاح شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حق مہر کا تقرر ضروریاتِ نکاح میں سے ہے رکن نہیں، لہٰذا اگر مجلسِ نکاح میں گواہوں کے سامنے شرعی طریقہ پر نکاح پڑھا گیا ہو تو اگرچہ اس میں مہر کا ذکر نہ کیا جائے تب بھی نکاح درست ہے لیکن خاوند کے ذمہ دخول کے بعد مہرِ مثل کی ادائیگی لازم ہے۔

قال ابن نجیمؒ: (تحت قول الماتن) صح النکاح بلا ذکرہ لأن النکاح عقد انضمام وازدواج لغة فیتم بالزوجین ثم المھر واجب شرعاً إبانة لشرف المحل فلا یحتاج إلی ذکرہ لصحة النکاح .... وذکر الأکمل والکمال أنه لاخلاف لاحد فی صحته بلا ذکر المھر۔ (البحرالرائق ج ۳ ص۱۴۲ باب المہر) [۲]

---

[۱] قال فی الهندیة: ویرجع الولی بعد الأداء علی الزوج إن ضمن بأمرہ ھٰکذا فی التبیین۔
(الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۳۲۶ الفصل الرابع عشر فی ضمان المہر)

ومثلہٗ فی الدرالمختار علی صدر ردّالمحتار ج ۲ ص۱۲۱ باب المہر مطلب فی ضمان الولی المھر۔

[۲] قال العلامة العثمانیؒ: عن علقمة قال أتی عبداللّٰه فی إمرأة تزوّجھا رجل ثم مات عنھا ولم یفرض لھا صداقاً ولم یکن دخل قال فاختلفوا إلیه فقال أری لھا مثل مھر نسائھا ثم ذکر أن معقل بن سنان الأشجعی شھد أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قضی فی واقعة مثل ما قضیت۔ رواہ الخمسة وصححه الترمذی۔ (اعلاء السنن ج۱۱ ص۸۷) وقال فی الهندیة: وان تزوّجھا ولم یسم لھا مھراً أو تزوّجھا علی أن لامھر لھا فلھا مھر مثلھا إن دخل بھا أو مات عنھا۔
(الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۳۰۴ الفصل الثانی فیما یتأکد به المھر والمتعة)
ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۷۴ فصل ان لایکون مجھولا جھالة۔

مقررشدہ حق مہر میں اضافہ کرنا جائز ہے

سوال:- اگر خاوند کی طرف سے مقررشدہ حق مہر میں کوئی اضافہ ہو جائے تو کیا عورت اس اضافے کی حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:- حق مہر میں اضافہ اور کمی دونوں شرعاً جائز ہیں اس لیے بیوی کے قبول کرنے کی صورت میں خاوند کی طرف سے مقررشدہ مہر میں اضافہ درست اور نافذ ہے اور عورت اس کی مالکہ متصور ہوگی۔

قال فی الهندیة: الزیادة فی المهر صحیحة حال قیام النکاح عند علمائنا الثلاثة. کذا فی المحیط: فاذا زادها فی المهر بعد العقد لزمته الزیادة. کذا فی السراج الوهاج: هذا اذا قبلت المرأة الزیادة سواء کانت من جنس المهر أو لا، من زوج أو من ولی کذا فی النهر الفائق۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۱۲ الفصل السابع فی الزیادة فی المهر۔الخ) [1]

خاوند سے حق مہر کے علاوہ لیے گئے مال کا حکم

سوال:- شادی سے پہلے لڑکی والوں کا لڑکے سے حق مہر کے علاوہ کچھ روپیہ وغیرہ لینا شرعاً کیسا ہے؟ کیا لڑکا شادی کے بعد یا پہلے اس کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- شادی سے پہلے لڑکی کے والدین یا دوسرے اولیاء کے لیے حق مہر کے علاوہ لڑکے سے نقدی یا جنس کی شکل میں کچھ لینا حرام اور ناجائز ہے، ایسا مال لڑکے کی ملکیت ہے اور وہ کسی وقت بھی اس کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

قال الحصکفی رحمه الله: اخذ اهل المرأة شیئا عند التسلیم فللزوج أن یسترده لانه رشوة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۱۵۶ آخر باب المهر) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ودل وضع المسئلة علی جواز الزیادة فی المهر بعد العقد وهی لازمة له بشرط قبولها فی المجلس علی الأصح۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۴۸ باب المهر)

[2] قال فی الهندیة: ولو أخذ أهل المرأة شیئاً عند التسلیم فللزوج ان یسترده لانه رشوة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۲۷ الفصل السادس عشر فی جهاز البنت)
ومثله فی البحر الرائق ج۳ ص۱۸۶، ۱۸۷ باب المهر۔

حصولِ مہر کیلئے عورت اپنے آپ کو خاوند سے روک سکتی ہے

سوال:۔ حق مہر حاصل کرنے کے لیے عورت اپنے آپ کو خاوند کے سپرد کرنے سے روک سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر خاوند بیوی کو مہر معجل ادا نہ کرے تو مہر کے حصول کے لیے عورت اپنے آپ کو اُس وقت تک خاوند سے روک سکتی ہے جب تک وہ اُسے مہر ادا نہ کر دے۔

قال فی الھندیۃ: فی کل موضع دخل بھا أو صحت الخلوۃ وتأکد کل المھر لو أرادت أن تمنع نفسھا لاستیفاء المعجل لھا ذلک عندہ خلافاً لھما..... وقبل تسلیم النفس لھا ذلک بالاجماع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۳۱۷ الفصل الحادی عشر فی منع المرأۃ نفسھا بمھرھا) [1]

حق مہر قسط وار ادا کرنا جائز ہے

سوال:۔ اگر مہر کی مقدار زیادہ ہو کہ خاوند کیلئے یکمشت ادا کرنا مشکل ہو تو کیا اس کیلئے قسط وار ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عقدِ نکاح کے وقت تمام مہر یا بعض کا مؤجل یا معجل (یکمشت یا قسط وار) دینے کا فیصلہ ہوا ہو تو اس کے موافق عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال الحصکفیؒ:۔ ان لم یؤجل أو یعجل کلہ فکما شرط لأن الصریح یفوق الدلالۃ۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۳ ص۱۴۴ مطلب زمان الولی) [2]

---

[1] قال ابن عابدین رحمہ اللہ: تحت قول الماتن ولھا منعہ من الوطء وکذا الولی الصغیرۃ المنع المذکور حتی یقبض مھرھا۔ (ردالمحتار ج۳ ص۱۴۳ مطلب فی منع الزوجۃ نفسھا لقبض المھر)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۲۸۸ فصل یجب بہ المھر۔

[2] قال فی الھندیۃ: وإن بینوا قدر المعجل یعجل ذلک وان لم یبینوا شیئاً ینظر الی المرأۃ والی المھر المذکور فی العقد أنہ کم یکون المعجل لمثل ھذہ المرأۃ من مثل ھذا المھر فیجعل ذلک معجلا ولا یقدر بالربع ولا بالخمس وإنما ینظر الی المتعارف وان شرطوا فی العقد تعجیل کل المھر یجعل الکل معجلاً ویترک العرف۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۳۱۸ الفصل الحادی عشر فی منع المرأۃ نفسھا)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۷۸ باب المھر۔

تقلیلِ مہر مندوب ہے

سوال: مہر میں کیا معیار ہونا چاہیئے، بعض علاقوں میں زیادہ مہر مقرر کرنا بڑائی اور عظمت و شرافت کی علامت سمجھا جاتا ہے جبکہ کئی علاقوں میں تقلیلِ مہر ثواب سمجھا جاتا ہے؟

الجواب: لڑکے کی مالی حالت کو مدِنظر رکھ کر مہر مقرر کرنا چاہیئے، اگر لڑکے کی غربت معلوم ہونے کے باوجود زیادہ مہر مقرر کر دیا جائے تو یہ لڑکے پر بے جا بوجھ لادنے کے مترادف ہے تاہم زیادہ سے زیادہ کے لیے کوئی خاص حد مقرر نہیں پھر بھی مہر ایسا ہونا چاہیئے جس کی ادائیگی لڑکے کے دائرہ اختیار میں ہو۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إن أعظم النکاح برکۃ أیسرہ مؤنۃ۔ رواہ احمد (اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۸۹ کتاب النکاح) ؎۱

تحدیدِ مہر جائز نہیں

سوال: کیا حاکمِ وقت یا علاقے کے بڑوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مہر کثیر کی حد مقرر کریں کہ مثلاً کوئی بھی دس ہزار روپے سے زیادہ مہر نہیں باندھ سکتا، اور یہ اسلئے کیا جائے کہ لوگ مغالاۃ فی المہور (مہروں میں زیادتی) سے باز آجائیں؟

الجواب: مہر کی حد اکثر اور تحدید قرآن وحدیث کی کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ بعض آیاتِ کریمہ سے تکثیر اور بعض دلائل سے اس کا اطلاق معلوم ومفہوم ہوتا ہے، لہٰذا حاکمِ وقت یا اہلِ حل وعقد کیلئے جائز نہیں کہ وہ مہر کی تحدید کریں، تاہم ذرائع ابلاغ بطورِ علم ووعظ عوام کے اندر اسکی تقلیل کی مسنونیت پر ترغیب دیں اور صاحبِ اقتدار طبقہ، علماء وحکام اس کا عملی نمونہ پیش کریں۔

قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ: وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۝ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (سورۃ النساء) ؎۲

؎۱ وعن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال إن من یمن المرأۃ تیسر خطبتھا وتیسر صداقھا وتیسر رحمھا، اخرجہ الحاکم وغیرہ بسند حسن قالہ الالبانی (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ ج ۳ ص ۲۲۴)

ومثلہ رواہ احمد واصحاب السنن الاربعۃ والدارمی عن عمر رضی اللہ عنہ۔ (مشکوۃ المصابیح ج ۲ ص ۲۷۷)

؎۲ قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وقد نبھت إمرأۃ الی ھذہ الآیۃ بینما اراد عمر بن الخطاب تحدید المھور فنھی ان یزاد فی الصداق علی اربعمأۃ درھم وخطب الناس فیہ..... فقالت لہ إمرأۃ من قریش بعد نزولہ من علی المنبر لیس ذلک الیک یا عمر فقال ولم؟ قالت لأن اللہ تعالیٰ یقول وآتیتم احداھن قنطارا فلا تأخذوا منہ شیئا أتأخذونہ بھتانا واثما مبینا، فقال عمر رضی اللہ عنہ امرأۃ اصابت ورجل أخطأ۔ ورواہ ابو یعلی فی الکبیر فقال اللھم غفرا کل الناس أفقہ من عمر ثم رجع فرکب المنبر فقال أیھا الناس انی کنت نھیتکم أن تزیدوا النساء فی صدقاتھن علی اربعمأۃ درھم فمن شاء أن یعطی من مالہ ما أحب۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۷ ص ۲۵۶)

ومثلہ فی الفتاویٰ الاسلامیۃ ج ۲ ص ۳۳۳ وابحاث ھیئۃ کبار العلماء ج ۲ ص ۳۰۹

جہیز کس کا حق ہے؟ | **سوال:۔** شادی کے وقت جو مال، سامان وغیرہ والدین لڑکی کے ساتھ اُس کے شوہر کے گھر بھیجتے ہیں یہ کس کا حق ہے؟ شوہر کا یا بیوی کا؟

الجواب:۔ والدین کی طرف سے شادی کے وقت جو سامان وغیرہ لڑکی کو دیا جاتا ہے اس کی اصل حقدار لڑکی ہی ہے خاوند کا اُس سامان کے ساتھ کچھ تعلق واسطہ نہیں۔

قال فی الهندیة: لوجهز ابنته وسلمه الیها لیس له فی الاستحسان استرداده منها و علیه الفتوٰی۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۲۷ الفصل السادس عشر فی جهاز البنت)[1]

مُطلّقہ مہر کی حقدار ہے | **سوال:۔** ایک آدمی نے اپنی مدخولہ بیوی کو فاحشہ ہونے کی وجہ سے طلاق دے دی، تو کیا یہ عورت اب مہر کی حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دخول سے مہر مؤکد ہوجاتا ہے اس لیے بعدازاں طلاق دینے سے حق مہر پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مطلقہ عورت شرعاً مہر کی حقدار ہے طلاق خواہ کسی بھی وجہ سے دی گئی ہو۔

قال فی الهندیة: والمهر یتأکد باحد معان ثلاثة، الدخول والخلوة الصحیحة وموت احد الزوجین سواء کان مسمی أو مهر المثل حتی لا یسقط منه شئ بعد ذلک الا بالإبراء من صاحب الحق۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۰۴ الباب السابع فی المهر)[2]

خاوند کے مرنے کے بعد بھی بیوہ مہر کی حقدار ہے | **سوال:۔** بعض علاقوں میں یہ رسم ہے کہ اگر خاوند مر جائے اور اُس کی بیوہ کسی دُوسری جگہ شادی کرے تو اس کو پہلے خاوند سے مہر نہیں دیا جاتا کیا یہ شرعاً درست ہے؟

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: جهز ابنته بجهاز وسلمها ذلک لیس له الاسترداد ولا لورثته بعده ان سلمها ذلک فی صحته بل تختص به۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۱۶۵ مطلب انفق علی معتدة الغیر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۸۷ باب المهر۔

[2] قال الحصکفیؒ: ویتأکد عند وطأ او خلوة صحت من الزوج أو موت أحدهما۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۱۰۲ باب المهر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۴۳ باب المهر۔

الجواب: نکاح کے انعقاد کے بعد خاوند کے فوت ہوجانے سے بیوی کا حق مہر مؤکد ہوجاتا ہے اسلیے بیوہ مہر کی حقدار ہے خواہ وہ دوسری جگہ شادی کرے یا نہ کرے۔

قال فی الهندیة: والمهر یتأکد باحد معان ثلاثة الدخول والخلوة الصحیحة وموت احد الزوجین سواء کان مسمیٰ او مهر المثل حتی لا یسقط منه شئ بعد ذلک الا بالابراء من صاحب الحق۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۳۰۴ الباب السابع فی المهر) [۱]

طلاق قبل الدخول میں مہر کی مقدار

سوال: ایک منکوحہ عورت کو رخصتی سے پہلے طلاق دی گئی تو یہ عورت کتنے مہر کی حقدار ہے؟

الجواب: اگر کسی منکوحہ عورت کو خلوتِ صحیحہ اور جماع سے پہلے طلاق دی جائے تو وہ عورت مقررشدہ مہر کے نصف کی حقدار ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویجب نصفه بطلاق قبل وطء او خلوة فلو کان علیٰ ما قیمته خمسة کان لها نصفه۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص ۱۰۴ باب المهر) [۲]

مہر دینے کے لیے باپ کا بیٹے کی طرف سے ضامن ہونا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کا باپ گواہوں کے سامنے بیٹے کے حق مہر کی ادائیگی کا وعدہ کرے اور گواہوں کے سامنے دستخط بھی کردے تو بیٹے کی وفات کی صورت میں لڑکی یا اُسکے والدین لڑکے کے باپ سے مہر کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں باپ بیٹے کی طرف سے مہر کا ضامن ہے، اگر عورت مہر معاف نہیں کرتی تو اس کے شوہر کے انتقال کے بعد عورت یا اس کے والدین لڑکے کے باپ سے مہر کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وتطالب ایّاً شاءت من زوجها البالغ او الولی الضامن۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۷ باب المهر) [۳]

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: ویتأکد عند وطء او خلوة صحت من الزوج او موت احدهما۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص ۱۰۲ باب المهر) وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص ۱۴۳ باب المهر۔

[۲] قال النسفیؒ: وبالطلاق قبل الدخول یتنصف۔ (کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج ۳ ص ۱۴۴ باب المهر)

[۳] قال العلامة المرغینانیؒ: واذا ضمن الولی المهر صح ضمانه ثم المرأة بالخیار فی مطالبتها زوجها او ولیها الخ۔ (الهدایة ج ۲ ص ۳۱۳ باب المهر)

باب الاولیاء والاکفاء

(ولایت اور کفو کے مسائل واحکام)

قریشی سادات کے کفو ہیں

سوال:۔ کیا غیر سید قریشی سادات کے کفو ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ قریش کے جملہ خاندان یعنی شعوب آپس میں برابر ہیں کسی کو دوسرے پر نکاح کے معاملے میں کوئی فوقیت حاصل نہیں، اس لیے قریشی سادات کا نکاح غیر سید قریشی سے جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قول الحصکفیؒ) فقریش بعضهم أکفاء بعض أشار به الی أنه لا تفاضل فیما بینهم من الهاشمی والنوفلی والتیمی والعدوی وغیرهم ولهذا ازوج علی وهو هاشمی ام کلثوم بنت فاطمة لعمر وهو عدوی۔ (ردالمحتار ج۳ ص۸۶ باب الاکفاء)[1]

غیر عالم کا عالم دین کی لڑکی سے نکاح کرنا

سوال:۔ کسی عالم دین یا پیش امام کی لڑکی سے غیر عالم کا نکاح کرنا کیسا ہے؟ کیا جاہل آدمی عالم دین کی بیٹی کا کفو ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علم یا جہالت کفو بننے کی صفات نہیں، اس لیے اگر کفایت کے دیگر اقسام موجود ہوں تو ولی کی رضامندی سے غیر عالم عالم دین کی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہے۔

قال العلامہ الکاسانیؒ:۔ لأن فی الکفاءة حقاً للأولیاء لانهم ینتفعون بذلك..... ولو کان التزویج برضاهم یلزم حتی لایکون لهم حق الاعتراض۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۸ فصل فی النکاح الذی الکفاءة)[2]

---

[1] قال فی الهندیة: فقریش بعضهم أکفاء لبعض کیف کانوا حتی ان القریشی الذی لیس بهاشمی کفاء للهاشمی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۹۰ الباب الخامس فی الاکفاء)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۱۳ ج۳ ص۱۳۰ فصل فی الاکفاء۔ وبدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۹۔

[2] قال ابن نجیمؒ: تحت قول النسفیؒ ورضاء البعض کالکل أی ورضاء بعض الاولیاء المستویین فی الدرجة کرضاء کلهم حتی لایتعرض أحد منهم بعد ذلك۔ (البحرالرائق ج۳ ص۱۲۹ باب الاولیاء والاکفاء)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۲ ص۳۴۴ باب الاولیاء۔

فاسق لڑکے کو صالح سمجھ کر رشتہ دینا

سوال:۔ ایک شخص نے بے دین لڑکے کو صالح سمجھ کر اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کر دیا، نکاح کے بعد لڑکے کا فسق معلوم ہوا، تو اب نکاح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر لڑکی نے بالغ ہونے کے بعد اس نکاح پر ناراضگی کا اظہار کیا ہو اور لڑکی کے خاندان کے اکثر افراد صالح ہوں تو یہ نکاح باطل ہے، دونوں کے درمیان تفریق کی جائے گی۔

قال ابن عابدینؒ: تحت قوله ان عرف لا یصح النکاح) زوج بنته الصغیرة ممن ینکر انه یشرب مسکراً فاذا هو مدمن له فقالت لا أرضی بالنکاح ای بعد ما کبرت ان لم یکن یعرفه الأب بشربه وکان غلبة أهل بیته صالحین فالنکاح باطل لانه انما زوج علیٰ ظن أنه کف اھ۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۶۷ باب الاولیاء) ؎۱

غیر سیّد کا سیّدزادی سے نکاح کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین کہ کسی غیر سید کا نکاح سیّدزادی سے ہوسکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر سیّدہ لڑکی کا باپ کسی غیر سید لڑکے کو رشتہ دینے میں عار محسوس نہیں کرتا ہو اور لڑکی بھی راضی ہو تو سیّدزادی کا نکاح غیر سید لڑکے سے کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

قال ابن نجیمؒ: تحت قول النسفیؒ (ورضاء البعض کالکل) أی ورضاء بعض الاولیاء المستوین فی الدرجة کرضاء کلهم حتی لایتعرض احد منهم بعد ذلك۔

(البحر الرائق ج۳ ص۱۲۹ فصل فی الاکفاء) ؎۲

؎۱ قال فی الهندیة: رجل زوج ابنته الصغیرة من رجل علیٰ ظن أنه صالح لایشرب الخمر فوجدہ الأب شریباً مدمنا وکبرت الابنة فقالت لا أرضی بالنکاح إن لم یعرف أبوها بشرب الخمر وغلبة اهل بیته الصالحون فالنکاح باطل وهذه المسئلة بالاتفاق کذا فی الذخیرة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۲۹۱ الباب الخامس فی الاکفاء)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۳۵ فصل فی الاکفاء۔

؎۲ قال العلامة الکاسانیؒ: لأن فی الکفاءة حقاً للاولیاء لأنهم یتضعون بذلك..... ولو کان التزوج برضاهم یلزم حتی لایکون لهم حق الاعتراض۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۸ فصل فی النکاح الذی الکفاءة فیه شرط)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۸۴ فصل فی الاکفاء۔

مجنون اور دیوانہ عاقلہ عورت کا کفو نہیں ہو سکتا

سوال: کیا مجنون اور دیوانہ شخص کسی عاقلہ عورت کا کفو ہو سکتا ہے اور ان دونوں کے درمیان نکاح درست ہے؟

الجواب: جنون ایسی چیز ہے جو عار بننے کا سبب بنتا ہے اس لیے مجنون اور پاگل مرد راجح قول کے مطابق عاقلہ عورت کا کفو نہیں ہو سکتا ہے، لہٰذا ان دونوں کے درمیان نکاح بھی درست نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی النهر وقیل یعتبر لأنه یفوت مقاصد النکاح فکان أشد من الفقر ودناءة الحرفة وینبغی اعتماده لأن الناس یعیرون بتزویج المجنون أکثر من دنئ الحرفة الدنیئة وفی البنایة عن المرغینانیؒ لایکون المجنون کفوًا للعاقلة وعند بقیة الائمة هو من العیوب التی ینفسخ لها النکاح۔

(منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج ۳ ص ۱۳۲ فصل فی الأکفاء) [1]

نکاح میں ولایت کی ترتیب

سوال: نکاح میں ولایت کی ترتیب کیا ہے اور کون کس پر مقدم ہے؟

الجواب: ولایتِ نکاح میں سب سے مقدم ولی ارث وحجب کی ترتیب سے عصبہ ہوتا ہے پھر اگر عصبہ نہ ہوں تو ماں ولی ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: واما شرط التقدم فشیئان احدهما العصوبة عند ابی حنیفةؒ فتتقدم العصبة علی ذوی الرحم سواء کانت العصبة أقرب أو أبعد..... وعند عدم العصبات تثبت الولایة لذوی الرحم الأقرب منهم یتقدم علی الأبعد۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۵۰ فصل شرط التقدم فشیئان) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: فی النهر عن المرغینانیؒ، المجنون لیس بکفء للعاقلة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۹۳ فصل الاکفاء)

[2] قال فی الهندیة: وعند عدم العصبة کل قریب یرث الصغیر والصغیرة من ذوی الارحام یملك تزویجهما فی ظاهر الروایة..... والاقرب عند ابی حنیفةؒ الأم ثم البنت ثم بنت الإبن الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۲۸۴ الباب الرابع فی الاولیاء)
ومثله فی البحر الرائق ج ۳ ص ۱۲۴ باب الاولیاء والاکفاء۔

قریب کے ولی کی موجودگی میں بعید کا ولی نکاح کرے تو اس کا حکم

سوال: باپ کی موجودگی میں ایک نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا چچا کر دے اور باپ اس پر ناراضگی کا اظہار کرے تو کیا یہ نکاح شرعاً صحیح ہے؟

الجواب: قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار نکاح کر دے تو یہ نکاح قریبی رشتہ دار کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، اگر وہ اجازت دے تو نکاح درست ہے ورنہ اس نکاح کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں چچا کا کیا ہوا نکاح باپ کی ناراضگی کی وجہ سے درست نہیں۔

قال ابن نجیمؒ: وأما اذا كان احدهما اقرب من الآخر فلا ولاية للابعد مع الاقرب الا اذا غاب غيبة منقطعة۔ (البحر الرائق ج ٣ ص ١١٩ باب الاولياء والاكفاء) [١]

باپ دادا کے علاوہ کسی ولی کا نابالغہ کا نکاح غیر کفو میں کر دینے کا حکم

سوال: چچا نے اپنی نابالغ بھتیجی کا نکاح ایک فاسق لڑکے سے کر دیا جبکہ لڑکی صالحہ، نیک سیرت ہے، تو کیا شرعاً یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب: فسق چونکہ عار بننے کا سبب ہے اسلئے صالح عورت کا فاسق مرد کفو نہیں اور باپ دادا کے علاوہ ولیوں کا نابالغ صالحہ عورت کا فاسق اور غیر کفو کے نکاح میں دینے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا بلکہ بالغ ہونے پر لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، چاہے تو نکاح ختم کر سکتی ہے۔

قال العلامة الكاسانيؒ: وأما إنكاح الأب والجد الصغير والصغيرة فالكفاءة فيه ليست بشرط للزومه عند ابي حنيفةؒ...... بخلاف إنكاح الأخ والعم من غير الكفء أنه لا يجوز بالاجماع لأنه ضرر محض۔ (بدائع الصنائع ج ٢ ص ٣١٨ فصل فالنكاح الذى الكفاءة فيه شرط) [٢]

---

[١] قال فى الهندية: وان زوج الصغير او الصغيرة أبعد الأولياء فان كان الأقرب حاضرا وهو من أهل الولاية توقف نكاح الأبعد على اجازته۔ (الفتاوى الهندية ج ١ ص ٢٨٥ الباب الرابع فى الاولياء)

وَمِثْلُهُ فى ردّ المحتار ج ٣ ص ٨١ باب الاولياء۔

[٢] قال النسفىؒ: ولو زوج طفله من غير كفء او بغبن فاحش صح ولم يجز ذلك لغير الأب والجد۔ (البحر الرائق ج ٣ ص ١٣٤ فصل فى الاكفاء) ومثله فى ردّ المحتار ج ٣ ص ٦٧ باب الاولياء۔

کسی ایک ولی کا اپنا حق ولایت استعمال کرنے سے دوسرے اولیاء کا حق ساقط ہو جاتا ہے

سوال: اگر کسی عورت کے متعدد اولیاء ہوں اور ان میں سے کسی ایک ولی کا اپنا حق استعمال کرنے سے نکاح کے بعد دوسرے اولیاء کو نکاح کے ردّ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی عورت کے متعدد اولیاء جب مرتبہ میں برابر ہوں تو جس ولی نے پہلا نکاح کرایا تو وہ درست ہے، دوسرے اولیاء کے ردّ کرنے سے نکاح باطل نہیں ہوگا۔

قال ابن نجیمؒ: ثم إذا اجتمع فی الصغیر اوالصغیرۃ ولیان فی الدرجۃ علی السواء فزوج أحدھما جاز أجاز الاٰخر اوفسخ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۱۹ باب الاولیاء والاکفاء) [1]

نابالغہ کا نکاح دادی کے کر دینے سے لڑکی کو خیار بلوغ کا حق ہے

سوال: دادی نے اپنی نابالغہ پوتی کا نکاح کر دیا تو بالغ ہوتے پر لڑکی کو خیارِ بلوغ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ باپ یا دادا جب نابالغ کا نکاح کرائیں تو بعد البلوغ اس کو نکاح فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں، صورتِ مسئولہ میں چونکہ نکاح دادی نے کرایا ہے جس کو حقِ ولایت بھی حاصل نہیں اس لیے لڑکی بلوغ کے بعد خیارِ بلوغ کی وجہ سے فسخِ نکاح کا حق رکھتی ہے تاہم نکاح فسخ کرنے کا حق قاضی/حاکم کے ذریعے ہوگا جس کے بعد لڑکی دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

قال النسفیؒ: ولھما خیار الفسخ بالبلوغ فی غیر الأب والجد بشرط القضاء۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۲۰ باب الاولیاء والأکفاء) [2]

---

[1] قال فی الھندیۃ: وإذا اجتمع للصغیر والصغیرۃ ولیان مستویان کالاخوین والعمین فأیھما جاز عندنا۔ کذا فی فتاویٰ قاضیخان۔ (الفتاوی الہندیہ ج۱ ص۲۸۴ الباب الرابع فی الاولیاء)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۳ ص۸۱ باب الاولیاء۔

[2] قال ابن عابدینؒ: وحاصلہ أنہ اذا کان المزوج للصغیر أو الصغیرۃ غیر الأب والجد فلھما الخیار بالبلوغ او العلم بہ فان اختار الفسخ لایثبت الفسخ إلا بشرط القضاء۔ (رد المحتار ج۳ ص۷۰ باب الاولیاء)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۲۸۵ الباب الرابع فی الاولیاء۔

کفائت میں مالداری کے اعتبار کا حکم | **سوال:۔** چچا نے اپنی نابالغہ یتیم بھتیجی کا نکاح اپنے عدیم المال بیٹے سے کر دیا، تو کیا یہ نکاح شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بناء بر روایت مختار کفائت صحت نکاح کے لیے شرط ہے اور جن چیزوں میں کفایت شرط ہے ان میں سے ایک مال بھی ہے، پس صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکا مہر معجل اور محترف نہ ہونے کی صورت میں ایک ماہ کے نفقے پر قادر ہو اور لڑکی بھی بلوغ کے بعد راضی ہو تو نکاح درست ہے ورنہ نہیں۔

قال ابن عابدینؒ:۔ تحت قول الحصکفیؒ (الکفاءة معتبرة فی ابتداء النکاح للزومه اولصحته) وهذا بناءً علی ظاهر الروایة من ان العقد صحیح وللولی الاعتراض اما علی روایة الحسن المختارة للفتوی من انه لایصح فالمعنی معتبرة فی الصحة۔ انتهی۔ وقال الحصکفیؒ: ومالاً بأن یقدر علی المعجل ونفقة شهر لوغیر محترف۔ (رد المحتار ج۳ ص۸۴ باب الکفاءة)[1]

شریعت میں بلوغ کی حد | **سوال:۔** شریعت میں لڑکے اور لڑکی کی حدِ بلوغ کیا ہے؟

الجواب:۔ لڑکے میں بلوغ کی نشانی احتلام کا ہونا ہے اور لڑکی کے بلوغ کی علامت حیض کا آنا ہے، اگر یہ دونوں نشانیاں نہ ہوں تو مفتیٰ بہ قول کی رُو سے پندرہ سال پورے ہوجانے پر بلوغ کا حکم جاری کیا جائے گا۔

قال فی الهندیة: بلوغ الغلام بالاحتلام او الاحبال او الانزال والجاریة بالاحتلام والحیض او الحبل کذا فی المختار: والسن الذی یحکم ببلوغ الغلام والجاریة اذا انتهیا الیه خمس عشرة سنة عند ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ وهو روایة عن ابی حنیفةؒ وعلیه الفتوی۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۶۱ الباب الثانی فی الحجر الفصل الثانی فی معرفة البلوغ)[2]

---

[1] وقال ابن نجیم المصریؒ: الفقیر لایکون کفوًا للغنیة کبیرة کانت اوصغیرة إلا ان یکون عالمًا او شریفًا۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۱۶ کتاب النکاح)

ومثلهٗ فی بدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۹ فصل ما تعتبر فیه الکفاءة۔

[2] قال النسفیؒ: بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال..... والجاریة بالحیض والاحتلام والحبل...... ویفتی البلوغ فیهما بخمسة عشرة سنة۔ (البحر الرائق ج۸ ص۸۵ باب الحجر)

ومثلهٗ فی البدائع الصنائع ج۷ ص۱۷۱ کتاب الحجر فصل حکم الحجر اما معرفة البلوغ۔

وکیل کے ذریعے نکاح کا حکم

سوال:۔ اگر لڑکا یا لڑکی اپنے نکاح کے لیے کسی کو وکیل بنائیں اور وہ ان کی طرف سے ایجاب قبول کرے تو اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح و انکاح ان امور میں سے ہے جن میں وکالت جائز ہے پس لڑکا یا لڑکی اپنے نکاح میں ایجاب وقبول کے لیے کسی کو وکیل بنا سکتے ہیں اور اس پر اکتفاء کر کے ان کا نکاح منعقد ہوگا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ثم النکاح کما ینعقد بھذہ الالفاظ بطریق الإصالة ینعقد بھا بطریق النیابة بالوکالة والرسالة لأن تصرف الوکیل کتصرف الموکل۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص۲۳۱ فصل رکن النکاح) [1]

نکاح میں نابالغ کی وکالت کا حکم

سوال:۔ کیا نکاح میں کسی نابالغ لڑکے کو وکیل بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نابالغ لڑکا جب عاقل اور ممیز ہو تو نکاح میں اس کی وکالت درست ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: واما البلوغ والحریة فلیسا بشرط لصحة الوکالة فتصح وکالة الصبی العاقل الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۲۰ فصل الشرائط الوکالة) [2]

نکاح میں کسی اجنبی کی توکیل کے لیے تصریح ضروری ہے

سوال:۔ بالغہ عورت سے اگر کوئی اجنبی شخص نکاح کی اجازت مانگے تو ایسی حالت میں عورت کا رونا یا خاموش رہنا اجازت کے مترادف ہے یا صراحتاً اجازت ضروری ہے؟

الجواب:۔ اجنبی شخص کا اجازت طلب کرتے وقت عورت کا رونا یا خاموش رہنا اجازت

---

[1] قال فی الھندیة: یصح التوکیل بالنکاح وان لم یحضرہ الشھود۔ کذا فی التاتارخانیة۔
(الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۲۹۴ الباب السادس فی الوکالة بالنکاح)
ومثلہ فی رد المحتار ج ۳ ص۹۵ مطلب فی الوکیل والفضولی فی النکاح۔

[2] قال الشیخ النسفیؒ: صح التوکیل وھو اقامة الغیر مقام نفسہ فی التصرف ممن یملکہ اذا کان الوکیل یعقل العقد ولو صبیاً الخ۔ (البحر الرائق ج ۷ ص۱۴۲ کتاب الوکالة)
ومثلہ فی الھندیة ج ۳ ص۵۶۲ کتاب الوکالة۔ الباب الاول

شمار نہیں ہوگی بلکہ اس میں تصریح بالقول دواضح الفاظ میں اجازت دینا ضروری ہے۔

قال الحصکفیؒ: فان إستاذنها غیر الاقرب کأجنبي أو ولي بعید فلا عبرة لسکوتها بل لا بد من القول کالثیب البالغة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۶۲ کتاب النکاح۔ باب الولی) [1]

نکاح میں عاقد کا خود وکیل بننا

سوال:۔ ایک عورت نے ایک مرد کو اختیار دیا کہ تم میری طرف سے وکیل ہو تم میرا نکاح اپنے نفس کے ساتھ باندھ لو، اس شخص نے دو گواہوں کے رو برو ایسا ہی کیا تو کیا اس طریقہ سے نکاح کا شرعاً انعقاد ہو جاتا ہے؟

الجواب:۔ عقد نکاح میں جیسا کہ ایک آدمی مرد عورت دونوں کی طرف سے وکیل بن سکتا ہے، ایسا ہی کوئی مرد ایک طرف سے اصیل اور دوسری طرف سے وکیل ہو کر نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت نے جب اس مرد کو وکیل بنایا کہ اپنے نفس کے ساتھ میرا نکاح باندھ لو تو جب اس شخص نے رو برو گواہان نکاح باندھ لیا تو یہ نکاح درست اور صحیح ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کما للوکیل الذي وکلته أن یزوجها من نفسه فان له ذلک فیکون اصیلاً من جانب وکیلاً من آخر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۹۸ کتاب النکاح۔ باب الکفاءة) [2]

خیار بلوغ میں عدالت سے نکاح فسخ کرائے بغیر دوسری جگہ نکاح کرنا

سوال:۔ ایک لڑکی جس کا نکاح بچپن میں اس کی ماں نے کسی سے کر دیا تھا بلوغ کے بعد عدالت سے فسخ کرائے بغیر دوسری جگہ

---

[1] قال ابن نجیم المصری رحمه الله: تحت قول المتن: وإن إستاذنها غیر الولی فلا بد من القول کالثیب أی فلا یکفی لقلة الالتفات أی کلامه فلم یقع دلالة علی الرضا۔

(البحر الرائق ج۳ ص۱۱۵ کتاب النکاح۔ باب الاولیاء والأکفاء)

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۱۲۷ باب الاولیاء والاکفاء۔

[2] قال ابن نجیم المصری رحمه الله: تحت قول الماتن: وللوکیل أن یزوج موکلته من نفسه والمراد بالوکیل الوکیل فی أن یزوجها من نفسه لما فی المحیط لو وکلته بتزویجها من رجل فزوجها من نفسه لم یجز۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۳۶ کتاب النکاح۔ فصل لابن العم ان یزوج الخ)

ومثله فی الهندیة ج۱ ص۲۹۵ الباب السادس فی الوکالة بالنکاح وغیرها۔

نکاح کیا تو کیا یہ نکاح درست ہے؟

الجواب:۔ جس لڑکی کو خیارِ بلوغ کا حق حاصل ہو بالغ ہونے کے بعد باقاعدہ عدالت سے فسخ نکاح کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری حاصل کیے بغیر دوسری جگہ نکاح کا اعتبار درست نہیں، تنسیخ نکاح کے لیے عدالت کا سہارا لینا ضروری ہے۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ: (تحت بشرط القضاء للفسخ) وحاصله أنه اذا كانت المزوج للصغير او لصغيرة غير الأب والجد فلهما الخيار بالبلوغ أو العلم به فإن اختارا لفسخ لا يثبت الفسخ الا بشرط القضاء۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۷۲ کتاب النکاح، باب الولی، مطلب مهم هل للعصبة تزويج الصغير الخ) [۱]

وکیلِ نکاح کی شرائط

سوال:۔ جو نکاح وکیل کے ذریعے باندھا جائے تو اس کے انعقاد کے لیے وکیل میں کون کون سی شرائط ہونی چاہئیں؟

الجواب:۔ نکاح کا انعقاد وکلاء کے ذریعے ہو سکتا ہے بشرطیکہ وکلاء عاقل و بالغ ہوں ورنہ نکاح صحیح نہیں ہوگا، تاہم اگر وکیل نابالغ ہو مگر اچھے بُرے اور نفع نقصان میں تمیز کر سکتا ہو تو بایں صورت حنفیہ کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا۔

قال العلامة داماد أفندیؒ: فیصح توکیل الحر البالغ العاقل بقرینة الاتی او المأذون الصبی او البالغ من جهة الولی او المولی حرًا بالغًا او مأذونًا۔ (در المنتقی علی هامش مجمع الانهر ج۲ ص۲۲۲ کتاب الوکالة)

وفی مجمع الانهر: الصبی العاقل الذی اذن له الولی والعبد الذی اذن له المولی ای یصح توکیل کل منهما۔ (مجمع الانهر ج۲ ص۲۲۲ کتاب الوکالة) [۲]

---

[۱] قال النسفیؒ: ولهما خیار الفسخ بالبلوغ فی غیر الأب والجد بشرط القضاء۔
(البحر الرائق ج۳ ص۱۲۱ کتاب النکاح، باب الاولیاء والاکفاء)
ومثلهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۸۵ الباب الرابع فی الاولیاء۔

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: ثم ذکر شرط التوکیل فقال اذا کان الوکیل یعقل ولو صبیًا او عبدًا محجورًا لا یخفی ان الکلام الآن فی صحة الوکالة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۵۱۱ کتاب الوکالة)
ومثلهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۵۱۱ کتاب الوکالة۔

ولایت میں قریب وبعید کے ورثاء کا اعتبار

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں ایک یتیم بچی ہے جس کے اولیاء میں دادا اور دو چچے ہیں، بچی کے بالغ ہونے پر چھوٹے چچا نے باپ اور بڑے بھائی کی اجازت کے بغیر بچی کا ایک جگہ نکاح کر دیا، جب بچی کے دادا کو پتہ چلا تو اس نے یہ نکاح نامنظور کر دیا، تو کیا اس بچی کا نکاح صحیح ہے یا کہ دادا کے انکار کی وجہ سے اس کی حیثیت ختم ہو جائے گی ؟

الجواب:۔ واضح ہو کہ اولیاء دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) قریب (۲) بعید۔ اگر کسی بچی کا نکاح اس کا ولیٔ بعید بغیر اجازت ولیٔ قریب کے کسی جگہ کر دے تو وہ نکاح ولی قریب کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر وہ نافذ کر دے تو فبہا ونعما ورنہ ناجائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر دادا اجازت دیدے تو نکاح صحیح ہے ورنہ نہیں۔

قال العلامۃ السرخسیؒ : فان زوجها الابعد والاقرب حاضر توقف علیٰ اجازۃ الاقرب لان الابعد کالاجنبی عند حضرۃ الاقرب فیتوقف عقدہ علیٰ اجازۃ الولی ۔ الخ

(المبسوط ج۴ ص۲۲۰ کتاب النکاح۔ باب نکاح الصغیر والصغیرۃ) [1]

مساوی ورثاء میں سے کسی ایک کا نابالغ لڑکی کا نکاح کرا دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی نابالغ لڑکی کا باپ فوت ہو جائے اور اس کے اولیاء میں تین چچا ہوں اور ان میں سے ایک چچا اس بچی کا نکاح کرا دے تو کیا یہ نکاح صحیح ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ لڑکی کے تینوں چچا رشتے میں مساوی ہیں اور قرابت میں تجزیہ بھی نہیں ہو سکتا ہے اس لیے راجح مذہب یہ ہے کہ تینوں چچا میں سے کوئی ایک چچا بھی لڑکی کا نکاح کرا دے تو جائز ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ السرخسیؒ : واذا اجتمع فی الصغیرۃ اخوان لاب وام فایهما زوجها جاز عندنا........ علیٰ ان کل واحد منهما ینفرد بالعقد والمعنی فیہ ان سبب الولایۃ

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (قوله والا) ای وان لم یستووا فی الدرجۃ وقد رضی الابعد فللاقرب الاعتراض۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۲۳ کتاب النکاح۔ باب الولی)

ومثلہ فی درر المنتقی شرح الملتقی ج۱ ص۳۳۹ کتاب النکاح باب الاولیاء والاکفاء۔

هو القرابة وهو غير محتمل للوصف بالتجزی۔ الخ (المبسوط ج ۴ ص۲۱۸ کتاب النکاح، باب نکاح الصغیر والصغیرۃ) ؎۱

عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کرانے سے حق مہر کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی نے از خود غیر کفو میں نکاح کرلیا اور ورثاء نے بذریعہ عدالت نکاح ختم کرالیا، تو کیا لڑکی اب مہر کی مالکہ ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں غیر کفو میں نکاح کے بعد اگر دخول ہوا ہو تو حقِ مہر شوہر کے ذمے لازم ہے اور عدمِ دخول کی صورت میں تفریق ہوجانے سے بیوی حق مہر کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

وفی الهندية: ولو تزوجت المرأة ونقصت من مهر مثلها فللولی الاعتراض عليها حتى يتم لها مهرها أو يفارقها واذا فارقها قبل الدخول فلا مهر لها وان فارقها بعده فلها المسمى الخ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۲۹۳، ۲۹۴ الباب الخامس فی الاکفاء) ؎۲

عدالت سے تنسیخِ نکاح کی ڈگری حاصل کیے بغیر عورت کا دوسری جگہ نکاح کردینے کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی نے ورثاء کی رضامندی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرلیا، بعد ازاں ورثاء اُسے اپنے گھر لے آئے اور اس کا نکاح کسی دوسرے مرد سے کردیا جبکہ انہوں نے عدالت سے تنسیخ نکاح کی ڈگری نہیں لی ہے، تو کیا یہ دوسرا نکاح صحیح ہے یا عدالت سے تفریق کرانا لازمی ہے؟

الجواب: بعض تفاریق ایسے ہیں کہ جن میں قضاء قاضی (یعنی بذریعہ عدالت تفریق کرانا) لازمی

؎۱ قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله لثبوته لکل کملا) لانه حق واحد لا یتجزأ لانه ثبت بسبب لا یتجزأ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۲۳ کتاب النکاح، باب الولی)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۱ ص۲۸۴ کتاب النکاح، الباب الرابع فی الاولیاء۔

؎۲ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: واذا فسخ القاضی بينهما تكون هذه فرقة بغير طلاق حتى لو لم يكن الزوج دخل بها فلا شئ لها من المهر وان كان قد دخل بها فلها ما سمى من المهر وعليها العدة۔ (الفتاوى التاتارخانية ج ۳ ص۲۶ کتاب النکاح الفصل الخامس عشر فی الکفاءة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص۳۵۲ باب الکفاءة۔

ہے ان میں سے ایک صورتِ مسئولہ بھی ہے لہٰذا مذکورہ عورت کا دوسرا نکاح اُس وقت تک صحیح نہیں جب تک عدالت سے تنسیخِ نکاح کی ڈگری نہ لی جائے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ثم الفرقة التی تختص بقضاء القاضی، هی الفرقة بالجب والعنة واللعان واباء الزوج الاسلام ۔ هو طلاقٌ وبخیار البلوغ وعدم الکفاءة ونقصانٌ فی المهر فسخٌ۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۳ ص۲۸ کتاب النکاح، الفصل الحادی عشر فی معرفة الاولیاء) [1]

کفاءت ایک جانب سے ہوتی ضروری ہے

سوال:۔ کیا کفوت جانبین سے ہونی چاہیئے یا کہ صرف مرد کے لیے عورت کا کفو ہونا ضروری ہے؟

الجواب:۔ ائمہ کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نکاح میں صرف مرد کا عورت کا کفو ہونا ضروری ہے، باقی عورت کے لیے یہ شرط لازمی نہیں اس لیے کہ نکاح کے بعد بیوی شوہر کا کفو بن جاتی ہے۔

قال العلامة الجزریؒ: انّ الکفاءة معتبرةٌ فی جانب الرجل لا فی جانب المرأة فللرجل ان یتزوج من یشاء ولو امةً او خادمةً الخ ۔ (الفقه علی المذاهب الاربعة ج۴ ص۵۷، کتاب النکاح، مبحث الکفاءة فی الزواج) [2]

کفوت کی شرائط

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کفاءت کے اندر کون سے امور داخل ہیں جن کی عدم موجودگی کی وجہ سے مرد عورت کے

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: (وله) ای للولی (اذا کان عصبة) ... (الاعتراض فی غیر الکفء) فیفسخه القاضی ویتجدد بتجدد النکاح الخ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۳۲۲ کتاب النکاح باب الولی)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۲۹۲ کتاب النکاح ۔ الباب الخامس فی الاکفاء ۔

[2] قال العلامة وهبة الزحیلی: یریٰ جمهور الفقهاء ان الکفاءة تطلب للنساء لا للرجال بمعنیٰ ان الکفاءة تعتبر فی جانب الرجال للنساء، فهو حق فی صالح المرأة لا فی صالح الرجل ۔ الخ

(الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۲۳۹ الفصل الخامس الکفاءة فی الزواج ۔ المبحث الرابع من تطلب الکفاءة فی جانبه)

وَمِثْلُهٗ فی الاحوال الشخصیة ص۱۴۱ ۔ ۱۱۷ ۔ الجانب الذی تشترط فیه الکفاءة ۔

کفو بننے سے نکل جاتا ہے؟

الجواب:۔ کفاءت کے بارے میں ائمہ اربعہؒ نے مختلف امور ذکر کئے ہیں مگر حنفیہ کے نزدیک اسلام، نسب، آزادی، پیشہ، دیانت اور مال جیسے امور کفوت میں داخل ہیں۔

قال العلامة الجزریؒ: انّ الکفاءة هی مساواة الرجل للمرأة فی امور مخصوصة وهی ستٌّ: النسب، والاسلام، والحرفة، والحریة، والدیانة، والمال۔ الخ

(الفقه علی المذاهب الاربعة ج۴ ص۵۴ کتاب النکاح، مبحث الکفاءة فی الزواج) لـہ

تفریقِ قاضی طلاق ہے یا فسخ؟

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم نے استاذ سے سبق میں پڑھا ہے کہ عدم کفو کی بناء پر قاضی تفریق کرسکتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ تفریق بمنزلۂ طلاق ہوگی یا فسخ؟ فقہاءِ احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ عدمِ کفاءت کی وجہ سے عدالت جو تفریق بین الزوجین کرائی ہے وہ بمنزلہ فسخِ نکاح ہوگی بمنزلہ طلاق نہیں۔

وفی الهندیة: ولا یکون التفریق بذلك الّا عند القاضی، امّا بدون فسخ القاضی فلا ینفسخ النکاح بینهما وتکون هذه فرقةً بغیر طلاق حتّی لو لم یکن الزوج دخل بها فلا شیٔ لها من المهر۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۹۲ الباب الخامس فی الاکفاء) لـہ۲

لـہ قال الدکتور وهبة الزحیلیؒ: وفی اصطلاح الفقهاء: المماثلة بین الزوجین دفعاً للعار فی امورٍ مخصوصة هی عند المالکیة: الدین والحال (ای السلامة من العیوب التی توجب لها الخیار) وعند الجمهور: الدین والنسب والحریة والحرفة (او الصناعة) وزاد الحنفیة والحنابلة الیسار (او المال)

(الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۲۳۹ الفصل الخامس الکفاءة فی الزواج)

وَمِثْلُهٗ فی الاحوال الشخصیة ص۱۳۵ کتاب النکاح۔ الجانب الذی تشترط فیه الکفاءة۔

لـہ۲ قال ابن عابدین رحمه الله: تحت هذه العبارة (قوله او یفرق القاضی) ولا تکون هذه الفرقة الّا عند القاضی وما لم یقض القاضی بالفرقة بینهما فحکم الطلاق والظهار والایلاء والمیراث باق..... وبعد اسطر: قال تحت قوله فلا مهر لها) لان الفرقة جائت من قبل من له الحق وهی فسخٌ۔ الخ (الدر المختار مع ردّ المحتار ج۲ ص۳۵۳ کتاب النکاح، باب الکفاءة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی قاضیخان ج۲ ص۱۶۴ کتاب النکاح، فصل فی الکفاءة۔

کسی لڑکی کا غیر کفو میں اپنی مرضی سے نکاح کرنا

سوال:۔ اگر کوئی لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جائے اور لڑکا پیشے کے اعتبار سے لڑکی کا کفو نہ ہو یعنی اس کا پیشہ قابلِ عار ہو، جبکہ لڑکی کے رشتہ داروں کو اس نکاح کا علم اُس وقت ہوا جب لڑکی کے ہاں اُس لڑکے سے ایک بچہ پیدا ہوا، تو کیا لڑکی کے ورثاء اب اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ عدم کفوئت کی وجہ سے مرورِ زمانہ سے اولیاء کا حق ساقط نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ اولیاء رضامندی ظاہر کر دیں، یا اُس مرد کا عورت سے بچہ پیدا ہو جائے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بچے کی پیدائش کے بعد اولیاء کو کسی قسم کے اعتراض کا حق نہیں رہتا۔

قال العلامة الدکتور وھبة الزحیلی: ویثبت ھذا الحق عند الحنفیة للاقرب من الاولیاء العصبة فالاقرب، فاذا لم یرضوا فلھم ان یفرقوا بین المرأة وزوجھا مالم تلد اوتحمل حملاً ظاھراً فی ظاھر الروایة الخ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۷ ص۲۳۷ الفصل الخامس الکفاءة فی الزواج ۔ المبحث الثالث صاحب الحق فی الکفاءة)[1]

کفوۃ میں وقت کا اعتبار ہے

سوال:۔ ایک شخص جو کہ نیک، پرہیزگار اور صاحبِ ثروت تھا، اُس نے ایک مالدار گھرانے میں شادی کی، چند سال بعد وہ آدمی دیوالیہ ہو گیا اور اب وہ ایک ایک پائی کا محتاج ہے اور اس کے سسرال والے اپنی بیٹی کو اُس سے چھڑانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہمارے کفو نہیں رہے، یہ ہمارے لیے عار کا سبب ہے۔ کیا اتنی مدت گذرنے کے بعد اس بہانے وہ لوگ بذریعہ عدالت اپنی بیٹی کو آزاد کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامیہ نے نکاح کے لیے اگرچہ کفو کا اعتبار کیا ہے مگر

---

[1] قال العلامة عبدالرحمٰن الجزریؒ: انّ الکفاءة فی الامور المذکورة من حق الولی بشرط ان یکون عصبة ولوکان غیر محرم کأن ابن عمّ یحل لہ زواجھا ..... ثمّ اذا سکت الولی عن الاعتراض حتّی ولدت المرأة فان حقہ یسقط فی الکفاءة۔ الخ۔

(الفقہ علی المذاھب الاربعة ج۴ ص۵۶ کتاب النکاح مبحث الکفاءة فی الزوج)

وَمِثْلُہٗ فی الاحوال الشخصیة للامام محمد ابوزھرة ص۱۴۲ والامن لہ حق الکفاءة۔

یہ یاد رہے کہ اس کا اعتبار ایک خاص وقت میں کیا جائے گا اور جب وہ مُدت ختم ہو جائے تو پھر اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں لڑکی کے والدین کو اتنی مُدت کے بعد یہ حق حاصل نہیں اور نہ ہی عدالت میاں بیوی میں تفریق کرنے کی مجاز ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ :- والکفاءة اعتبارها عند ابتداء العقد فلا یضر زوالها بعده فلوکان وقته کفوا ثم فجر لم یفسخ - الخ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص۳۴۵ کتاب النکاح - باب الکفاءة) [1]

گونگے شخص کا اشارے سے نکاح کرانا

سوال :- اگر کوئی گونگا آدمی اپنی بیٹی کا نکاح مجلسِ نکاح میں مخصوص اشارے سے کرائے تو کیا یہ نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- گونگے شخص کا اپنے مخصوص اشاروں سے (جو صرف نکاح کیلئے مخصوص ہوں اور حاضرینِ مجلسِ نکاح بھی ان اشاروں سے نکاح مراد لیتے ہوں) بیٹی کا نکاح کرانا صحیح اور درست ہے ۔

قال ابن نجیمؒ :الاشارة من الاخرس معتبرة قائمة مقام العبارة فی کل شئ الی ان قال الا فی الحدود ..... ولا بد فی اشارة الاخرس ان تکون معهودة والا لا تعتبر ۔

(الاشباه والنظائر ج ۳ ص۲۵۴ فی بیان احکام الاشارة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : ولا یخفی ان اعتبار هذه الکفاءة بین الزوج وأبیها وان الظاهر اعتبارها وقت الزوج - الخ

(البحر الرائق ج ۳ ص۱۳۳ کتاب النکاح - فصل فی الاکفاء)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی قاضی خان ج ۲ ص۱۶۳ فصل فی الکفاءة ۔

[2] قال العلامة ابن الهمامؒ : (تحت قول صاحب الهدایة) وطلاق الاخرس واقع بالاشارة لانها صارت مفهومة فکانت کالعبارة فی الدلالة استحسانًا فیصح بها نکاحه وطلاقه وعتاقه وبیعه وشراؤه سواء قدر علی الکتابة أو لا وهذا استحسانا بالضرورة - الخ

(فتح القدیر ج ۳ ص۳۴۸ کتاب الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۲۴۸ کتاب الطلاق ۔

بالغہ لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کرنا

سوال: بعض علاقوں میں لڑکیوں کو پتہ تک نہیں ہوتا اور والدین اُن کا نکاح کرا چکے ہوتے ہیں، کیا بالغہ لڑکی کا نکاح اس کا باپ بغیر اس کی اجازت کے کرا سکتا ہے؟

الجواب: شریعتِ اسلامیہ نے بالغہ حرہ لڑکی کو اپنے نفس کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے، اس لیے اگر کسی نے اس کی اجازت کے بغیر نکاح کرادیا تو وہ نکاح اس کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر وہ اجازت دے اور رضامندی کا اظہار کرے تو درست ہے ورنہ نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (سئل) فی بکر بالغۃ عاقلۃ رشیدۃ زوجها ابوها رجلاً بلا اذنها ولا وکالۃ عنها فردّت النکاح حین بلغها فوراً فهل یرتد بردّها والحالۃ هٰذہ (الجواب) نعم - (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۳۰ کتاب النکاح، فی مسائل منثورۃ من ابواب النکاح) [1]

بیوی کو کتنے دنوں کے بعد والدین کے گھر جانے کی اجازت ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! شرعاً بیوی کو کتنے دنوں کے بعد والدین کے گھر جانے دینا چاہیئے؟ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو سالہا سال والدین کے گھر نہ جانے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ اگر ممکن ہو تو ہفتے میں ایک مرتبہ والدین کی زیارت کے لیے جاسکتی ہے یہ اس کا شرعی حق ہے، جو شخص ظلم و تعدّی کے ساتھ اپنی بیوی کو والدین کی زیارت کے لیے جانے سے روکتا ہو تو وہ گنہگار ہے، تاہم اگر والدین کے گھر جانے سے فتنے کا اندیشہ ہو تو والدین کو چاہیئے کہ وہ خود بیٹی کو دیکھنے کے لیے آیا کریں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمه الله: ولا یمنعها من الخروج الی الوالدین فی کل جمعۃ ان لم یقدرا علی اتیانها علی ما اختیارہ فی الاختیار فی هامشہ

---

[1] قال العلامۃ فخر الدین المعروف بقاضی خانؒ: ولا یزوج البکر البالغۃ أبوها علی کرہ منها خلافاً للشافعیؒ - (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندیۃ ج۱ ص۳۵۸ فی الفصل الاولیاء)
ومثلہ فی الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج۳ ص۲۴ کتاب النکاح، معرفۃ الاولیاء۔

ھٰکذا نعم ماذکرہ الشارح ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۶۴ کتاب النکاح) لہ

سورہ کی رسم کا شرعی حکم

سوال:۔ پٹھانوں میں ایک رسم زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ جب وہ کسی جھگڑے کے سلسلہ میں راضی نامہ کرتے ہیں تو اس میں فریق مخالف کو لڑکی نکاح میں دی جاتی ہے جس کو عرف میں سورہ کہا جاتا ہے ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کے معاملے میں اگر باپ اپنی نابالغ بیٹی دے دے تو کیا اس لڑکی کو بعد البلوغ خیار حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ یہ ایک جاہلانہ رسم ہے، اس میں لوگ انتقام اس مظلوم لڑکی سے لیتے ہیں، گھر میں اس کو زرخرید باندی کی طرح رکھا جاتا ہے بلکہ معاشرہ میں بھی یہ معیوب سمجھا جاتا ہے لہٰذا ایسی مظلوم لڑکی کو باپ کے سوءِ اختیار کی وجہ سے خیارِ بلوغ حاصل ہے اگر وہ چاہے تو خیار استعمال کر کے الگ ہو سکتی ہے ۔

عن خنساء بنت خذام الانصاریۃؓ ان اباھا زوجھا وھی ثیبٌ فکرھت ذٰلک فاتت رسول اللّٰہ فَرَدَّ نِکاحہ ۔ (مختصر صحیح البخاری ج۲ ص۴۳۱ باب اذا زوج الرجل ابنتہ وھی کارھۃ فنکاحہ مردودٌ) ؎۲

؎۱ قال قاضی خان : ویجوز للزوج ان یأذن لھا بالخروج ولا یصیر عاصیًا بالاذن ومنھا الخروج الیٰ زیارۃ الوالدین وتعزیتھما وعیادتھما وزیارۃ المحارم ۔ (الفتاوی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۱ ص۴۴۳ کتاب النکاح)

وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ و النظائر ج۲ ص۱۰۹ کتاب النکاح ۔

؎۲ قال العلامۃ المرغینانیؒ : ولا یجوز للولی اجبار البکر البالغۃ علی النکاح ۔ وبعد اسطرٍ ولنا انھا حرۃ فلا یکون للغیر علیھا ولایۃ الاجبار ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۱۰ کتاب النکاح)

وقال ایضًا : واذا زوج الاب ابنتہ الصغیرۃ ونقص من مھرھا او ابنہ الصغیر وزاد فی مھر امرأتہ جاز ذٰلک علیھما ولا یجوز ذٰلک لغیر الاب والجد وھٰذا عند ابی حنیفۃؒ وقال لایجوز الحط والزیادۃ الا بما یتغابن الناس فیہ ومعنی ھٰذا الکلام انہ لا یجوز العقد عندھما لان الولایۃ مقیدۃ بشرط النظر فعند فواتہ یبطل العقد ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۱۷ کتاب النکاح ۔ فصل فی الکفاءۃ)

بیٹی کا غیر کفو میں نکاح کروانا سوال:۔ اگر باپ کسی دینی یا دنیاوی مصلحت کی خاطر اپنی بیٹی کا نکاح غیر کفو میں کر دیتا ہے جبکہ لڑکی بھی اِس پر راضی ہے، تو کیا یہ نکاح صحیح ہے؟

الجواب: غیر کفو میں نکاح عیب و رسوائی کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے ورنہ فی نفسہٖ اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے اگر لڑکی بالغہ ہو اور وہ باپ کے اس فیصلے پر راضی ہو تو نکاح درست ہے۔

قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ: اگر لڑکی بالغہ اور باکرہ ہے اور اس کا ولی غیر کفو سے نکاح کرتا ہے اور لڑکی اس پر خاموش رہے یا زبان سے اس کو منظور کرے تو نکاح صحیح ہے، غیر کفو سے نکاح کرنا اس صورت میں مضائقہ نہیں رکھتا۔ واللہ اعلم

(امداد الاحکام ج۲ ص۳۲۳ کتاب النکاح) [1]

غیر کفو میں نکاح پر اولیاء کا اعتراض سوال:۔ آجکل بعض لڑکیاں کسی غیر کفو والے لڑکے کے ساتھ فرار ہو کر نکاح کر لیتی ہیں، کیا ایسی لڑکی کے اولیاء کو نکاح پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: جب کوئی لڑکی از خود غیر کفو میں شادی کرے جو خاندان کیلئے ذلت و رسوائی کا باعث ہو تو لڑکی کے ورثاء کو اس نکاح پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: اذا زوجت المرأۃ نفسہا من غیر کفو فللاولیاء ان یفرّقوا بینہما دفعًا لضرر العار عن انفسہم۔ (الہدایۃ ج۲ ص۲۹۹ کتاب النکاح۔ باب الاکفاء والاولیاء) [2]

---

[1] قال الکاسانیؒ: واما انکاح الاب والجدّ الصغیر والصغیرۃ فالکفاءۃ فیہ لیست بشرط للزومہ عند ابی حنیفۃؒ کما انہا لیست بشرط الجواز عندہ فیجوز ذٰلک ویلزم الصدرہ ممن لہ کمال النظر لکمال الشفقۃ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۸ فصل واما الثانی فالنکاح الذی) ومثلہ فی امداد الاحکام ج۲ ص۳۲۳ کتاب النکاح۔

[2] قال الکاسانیؒ: حتی لو زوجت نفسہا من غیر کفو عن غیر رضاء الاولیاء لایلزم وللاولیاء حق الاعتراض لان فی الکفاءۃ حقًّا للاولیاء لانہم ینتفعون بذٰلک الا تری انہم یتفاخرون بعلو نسب الختن ویتعیرون بدناءۃ نسبہ فیتضررون بذٰلک فکان لہم ان یدفعوا الضرر عن انفسہم بالاعتراض۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۱۸ کتاب النکاح۔ فصل واما الثانی)

فاسق وفاجر لڑکا دیندار خاندان کی لڑکی کا کفو نہیں

سوال:۔ ایک نیک اور دیندار خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی نے معاشقہ میں کسی فاسق وفاجر اور بے دین لڑکے کے ساتھ بلا رضا اولیاء کے از خود شادی کر لی، تو کیا اِس شادی پر لڑکی کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جو بھی شادی لڑکی کے خاندان والوں کے لیے عار کا باعث بنتی ہو تو اس پر لڑکی کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ چونکہ فسق وفجور اور بے دینی بھی ایک عیب ہے جو نیک اور دیندار خاندان کے لیے باعثِ عار ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں لڑکی کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں فسق سے مراد وہ فسق ہے جو عار کا باعث بنے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: حتیٰ لو ان امرأة من بنات الصالحین اذا زوجت نفسھا من فاسق کان للاولیاء حق الاعتراض......لان التفاخر بالدین احق من التفاخر بالنسب۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۲۱ کتاب النکاح۔ الفصل الثانی)[۱]

ولایت میں ماں دادی سے مقدّم ہے

سوال:۔ اگر کسی لڑکی کے آبائی رشتہ میں کوئی مرد نہ ہو تو کیا ولایت کا حق لڑکی کی دادی کو حاصل ہوگا یا اس کی ماں کو ؟

الجواب:۔ جب کسی لڑکی کے آبائی رشتہ میں کوئی مرد نہ ہو تو ولایت کا حق اس لڑکی کی ماں کو حاصل ہے نہ کہ کسی اور کو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: فان لم تکن عصبة فالولایة للأم ثم لام الاب۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۳ ص۷۸ باب الاولیاء)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: والظاھر ان الصلاح لو منھا او من ابائھم کاف لعدم کون الفاسق کفأً ھم۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۳۲ کتاب النکاح۔ فصل فی الاکفاء والاولیاء)

[۲] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ثم عصبة مولی العتاقة ثم الأم ثم ذو الارحام الأقرب فالأقرب وھذا قول ابی حنیفةؒ وانہ استحسان۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۳ ص۱۹ الفصل الحادی عشر فی معرفة الاولیاء)

ولی کی اجازت کے بغیر بالغ مرد اور عورت کے نکاح کا حکم

سوال:- کیا کسی بالغ مرد اور بالغ عورت کا نکاح بلا اجازت ولی کے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حنفیہ کے نزدیک بالغ مرد اور عورت اپنے نفس کے خود مختار ہیں اس لیے دونوں ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرا سکتے ہیں اور ایسا نکاح شرعاً صحیح اور درست ہوگا، لیکن موجودہ دور کے نازک حالات کو سامنے رکھ کر ولی سے اجازت لینا فتنہ و فساد ختم کرنے کا ذریعہ ہے۔

قال المرغینانیؒ: وینعقد نکاح الحرة العاقلة البالغة برضاها وان لم یرض علیها ولی بکراً کانت او ثیباً عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله فی ظاهر الروایة۔
(الهدایة ج۲ ص۲۹۳ باب فی الاولیاء والاکفاء) [1]

بالغہ کا اپنے کفو میں نکاح کرنا صحیح ہے

سوال:- اگر ایک بالغہ لڑکی والدین کی رضامندی کے بغیر اپنے کفو میں نکاح کرلے تو کیا یہ نکاح صحیح ہے؟

الجواب:- ایک عاقلہ بالغہ لڑکی کے لیے والدین کی رضامندی کے بغیر اپنے کفو میں نکاح کرنا احناف کے ہاں درست ہے اس لیے کہ بالغہ لڑکی اپنے اختیار کی حقدار ہے۔

قال المرغینانیؒ: وینعقد نکاح الحرة العاقلة البالغة برضاها وان لم یعقد ولی..... للولی الاعتراض فی غیر الکفو وعن ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ انه لا یجوز فی غیر الکفو الخ۔ (الهدایة ج۲ ص۲۹۳ باب فی الاولیاء والاکفاء) [2]

---

[1] قال العلامة داماد افندیؒ: نفذ ای صح نکاح حرة احترازاً عن الامة لان نکاحها موقوف علی إذنِ مولاها کتوقف نکاح الصغیرة والمجنونة والمعتوهة علی اذن المولی ولذا قال مکلفه بکراً کان او ثیباً بلا ولی ای ولوکان النکاح بلا اذن ولی وحضوره عند الشیخینؒ فی ظاهر الروایة لانها تصرف فی خالص حقها وهی من اهله لکونها عاقلةً بالغةً۔ الخ (درر المنتقی شرح ملتقی ج۲ ص۳۳۲ باب الاولیاء والاکفاء)

[2] وفی الهندیة: ثم المرأة اذا زوجت نفسها من غیر کفو صح النکاح فی ظاهر الروایة..... ولکن للاولیاء حق الاعتراض وروی الحسن عن ابی حنیفةؒ ان النکاح لا ینعقد وبه اخذ کثیر من مشائخنا والمختار فی زماننا للفتوی روایة الحسن الخ۔ (الفتاوی الهندیة جلد۱ ص۲۹۲ الباب الخامس فی الاکفاء)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۱۱۰ باب الاولیاء والاکفاء۔

باب الرّضاع

(رضاعت کے مسائل)

رضاعی بھائی کی ماں سے نکاح کا مسئلہ

سوال:۔ زید نے بکر کی ماں کا دودھ مدتِ رضاعت میں پیا ہے، اب بکر زید کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں بکر کی ماں زید کی رضاعی والدہ ہے اور اس کی اولاد زید کے رضاعی بھائی بہن ہیں جن سے زید کا نکاح جائز نہیں، البتہ زید کی ماں کا اگر بکر کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہ ہو جس سے حرمتِ نکاح ثابت ہو جائے اس لیے بکر کا نکاح زید کی حقیقی ماں سے جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصریؒ: تحت قوله (وحرم به وإن قل فی ثلاثین شهرا ما حرم منه النسب إلا أم أخته وأخت ابنه) یعنی فإنهما یحلان من الرضاع دون النسب، أطلق المضاف والمضاف إلیه ففی أم أخته ثلاث صور الأولى الأم رضاعاً والاخت نسباً بأن أرضعت أجنبیة أخته نسباً ولم ترضعه الثانیة عکسه ان یکون لاخته رضاعاً أم من النسب۔
(البحر الرائق ج۳ ص۲۲۳ کتاب الرضاع)[۱]

رضاعی بھتیجی سے نکاح حرام ہے

سوال:۔ رشیدہ نے خالد کی بیوی کا دودھ مدتِ رضاعت میں پیا ہے، کیا خالد کے بھائی بکر کا نکاح رشیدہ سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں رشیدہ خالد کے بھائی (بکر) کی رضاعی بھتیجی ہے تو

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: (وأم اخت) صادق بأن یکون کل منهما من الرضاع کأن یکون لك أخت من الرضاع لها أم أخرى من الرضاع أرضعتها وحدها وبأن تکون الأخت فقط من الرضاع لها أم نسبیة۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۱۴ کتاب الرضاع)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع۔

جیسے نسبی (حقیقی) بھتیجی سے نکاح جائز نہیں اسی طرح رضاعی بھتیجی سے بھی رضاعی چچا کا نکاح ناجائز اور حرام ہے۔

عن ابن عباسؓ قال قیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الا تزوج ابنۃ حمزۃؓ قال انہا ابنۃ اخی من الرضاعۃ۔ (الصحیح البخاری ج۲ ص۷۶۴ کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب)[۱]

منکوحہ کا دودھ پینے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا

سوال:۔ اگر کسی نے اپنی بیوی کے پستان پر منہ رکھ کر قصداً یا سہواً دودھ پی لیا تو کیا اس سے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت کے لیے مدتِ رضاعت (دو سال) کی عمر میں کسی عورت کا دودھ پینا ضروری ہے اور جو دودھ مدتِ رضاعت کے بعد پیا جائے اگرچہ حرام ہے مگر اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، صورتِ مسئولہ میں خاوند کی عمر اگر دو سال سے زیادہ ہو تو نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا البتہ ایسا کرنا حرام ضرور ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: مص رجل ثدی زوجتہ لم تحرم۔ قال ابن عابدینؒ: تحتہ قیل بہ احترازاً عما اذا کان الزوج صغیراً فی مدۃ الرضاع فانہا تحرم علیہ۔

(ردّ المحتار ج۳ ص۲۲۵ کتاب الرّضاع)[۲]

رضاعی بھائی کی بہن سے نکاح کا حکم

سوال:۔ رضاعی بھائی کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً زید اور بکر رضاعی بھائی ہیں زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے، اب بکر زید کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زید کی بہن اور بکر کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جو حرمت کا سبب بنے اس لیے بکر اپنے رضاعی بھائی کی سگی بہن سے نکاح کر سکتا ہے، البتہ زید

---

[۱] قال الشیخ النسفیؒ: زوج مرضعۃ لبنہا منہ أب للرضیع وابنہ أخ وبنتہ أخت وأخوہ عم وأختہ عمۃ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۳ ص۲۲۶ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع۔

[۲] قال فی الہندیۃ: ولا بأس بان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشربہ للدواء وفی شرب لبن المرأۃ للبالغ من غیر ضرورۃ اختلاف المتأخرین۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی الخ)

بکر کی نسبی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا اس لیے کہ یہ لڑکی زید کی رضاعی بہن ہے ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتحل أخت اخیہ رضاعاً یصح اتصالہ بالمضاف کان یکون لہ أخ لسبی لہٗ أخت رضاعیۃ و بالمضاف إلیہ کان یکون لأخیہ رضاعاً اخت نسباً وبہما وھو ظاھر۔ (الدر المختار علیٰ صدر المختار ج ۳ ص۲۱۷ کتاب الرضاع) [1]

نکاح کے بعد رضاعت کے ثبوت کا حکم

سوال:۔ نکاح ہوجانے کے بعد اگر لڑکی کا والد کبھی رضاعت کا دعویٰ کردے تو کیا اس دعویٰ کو اعتبار دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ ثبوتِ رضاعت کے لیے حجتِ کاملہ ضروری ہے یعنی دو عادل مرد یا ایک عادل مرد اور دو عادل عورتیں ہیں) صرف ایک مرد یا صرف دو عورتوں کا قول دعویٰ رضاعت کے ثبوت کے لیے کافی نہیں، تاہم نکاح سے پہلے اگر ایک عورت کا بیان جو موجب ظنِ غالب ہو تو احتیاط اس میں ہے کہ اس کو اعتبار دے کر نکاح سے اجتناب کیا جائے، البتہ جہاں زوجین کسی عورت کے بیان پر اعتماد کرکے یقین کریں تو ایسی حالت میں انکی تصدیق گواہوں یا کسی گواہی کی محتاج نہیں ۔

قال طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولا تجوز شہادۃ إمرأۃ واحدۃ علی الرضاع اجنبیۃ کانت أو أم أحد الزوجین، فان وقع فی قلبہ صدق المخبر فا لأفضل أن یتنزہ قبل العقد وبعد العقد یسعہا المقام معہ حتی یشہد علی ذٰلک رجلان أو رجل وإمرأتان عدول ولا یقبل شہادۃ النساء وحدھن ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۲ ص۱۱ الفصل الرابع فی الرضاع) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: تحت قول النسفیؒ (وتحل أخت أخیہ رضاعاً) یصح إتصالہ بکل من المضاف والمضاف إلیہ وبہما کما قدمناہ ۔ (البحرالرائق ج ۳ ص۲۲۷ کتاب الرضاع)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: تحت قول النسفیؒ (ویثبت بما یثبت بہ المال) وھو شہادۃ رجلین عدلین أو رجل وإمرأتین عدول..... وان کان الخبر بعد النکاح وھما کبیران فالأحوط أن یفارقہا روی ذٰلک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنہ أمر بالمفارقۃ ۔ (البحرالرائق ج ۳ ص۲۳۳ کتاب الرضاع)

ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۳ ص۲۲۴ کتاب الرضاع ۔

رضاعت کے ثبوت کے لیے ایک بار پستان چوسنا کافی ہے

سوال:۔ کیا رضاعت کے اثبات کے لیے پانچ مرتبہ پستان چوسنا ضروری ہے یا صرف ایک بار چوسنے سے رضاعت ثابت ہوگی؟

الجواب:۔ احناف کثر اللہ سوادہم کے نزدیک دودھ حلق کے اندر اُترنے سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے، چاہے وہ ایک مرتبہ ہو یا پانچ مرتبہ، البتہ شوافع کے ہاں پانچ مرتبہ چوسنا ضروری ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: قلیل الرضاع وکثیرہ سواءٌ اذا حصل فی مدت الرضاع یتعلق بہ التحریم قال الشافعی لایثبت التحریم الا بخمس رضعات۔

(الھدایۃ ج۱ ص۳۲۹ کتاب الرضاع) [1]

رضاعی بیٹی کی نسبی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال:۔ کیا رضیعہ کی نسبی بہن سے مرضعہ کا شوہر نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت میں رضیعہ کی طرف سے مرضعہ اور اس کے شوہر پر صرف رضیعہ اور اس کی بیوی اور اس کی اولاد حرام ہوتی ہے باقی کے ساتھ مرضعہ اور اس کے شوہر کا کوئی حرمت والا رشتہ نہیں اس لیے مرضعہ کا شوہر رضیعہ کی نسبی بہن سے نکاح کرسکتا ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: وتجوز تزوج اخت ابنہ من الرضاع ولا یجوز ذٰلک من النسب۔ (الھدایۃ ج۱ ص۳۳۰ کتاب الرضاع) [2]

---

[1] قال العلامۃ صدر الشریعۃؒ: یثبت بمصۃ فی حولین ونصف لابعدہ۔۔۔۔۔۔ عند الشافعی یثبت بخمس مصاتٍ۔ (شرح الوقایۃ ج۲ ص۶۴ کتاب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۰۷ کتاب الرضاع۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ویحرم منہ ما یحرم من النسب۔۔۔۔الا ام اخیہ واختہ۔۔۔۔۔ وقس علیہ اخت ابنہ وبنتہ۔ قال ابن عابدینؒ: تحت قولہ اخت ابنہ انما حرمت علیہ اخت ابنہ وبنتہ نسبًا لکونہ بنتہ اوبنت امرأتہ وھٰذا المعنی مفقود فی الرضاع۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۰۶ باب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۳ کتاب الرضاع۔

رضیعہ پر مرضعہ اور شوہر کے اصول وفروع حرام ہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رضیعہ یعنی دودھ پینے والے بچے پر مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی عورت اور اس کے شوہر کی طرف سے کون کون سے رشتہ دار حرام ہوجاتے ہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت مرضعہ اور اس کے شوہر کی طرف سے رضیعہ پر اصول اور فروع دونوں حرام ہیں، یعنی مرضعہ کے آباؤ اجداد اور اس کی اولاد اور اسی طرح شوہر کے آباؤ اجداد مع اس کی اولاد کے حرام ہوں گے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله : ويحرم من الرضاع ما يحرم من النسب لحديث الذى رويناه۔ (الهداية ج ۱ ص۳۳۳ كتاب الرضاع) [۱]

رضاعت پر اُجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ کیا مرضعہ عورت رضاعت پر رضیعہ کے باپ یا ولی سے اجرت لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رضاعت ایسا عمل ہے کہ اس کے کرنے کی اُجرت کے جواز پر سب علماء کا اتفاق ہے اس لیے مرضعہ رضاعت پر اجرت لے سکتی ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی الهندية : واجمعوا على ان مدة الرضاع فی استحقاق اجرة الرضاع مقدر بحولين حتى ان المطلقة اذا طالبته بعد الحولين باجرة الرضاع فابى الاب ان يعطى لا يجبر ويجبر فى الحولين۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۳۴۳ كتاب الرضاع) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصكفى رحمه الله : فيحرم منه اى بسببه ما يحرم من النسب۔
(الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۲ ص۴۰۵ باب الرضاع)
ومثله فى البحر الرائق ج ۳ ص۲۲۲ كتاب الرضاع۔

[۲] قال العلامة فخر الدين قاضى خانؒ : واجمعوا على ان مدة الرضاع فى استحقاق اجرة الرضاع على الاب مقدر بحولين حتى ان المطلقة اذا طالبته بعد الحولين اجرة الرضاع فابى الاب ان يعطى لا يجبر و يجبر فى الحولين۔
(فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج ۱ ص۴۱۷ باب الرضاع)

عمر رسیدہ عورت کے پستان سے نکلنے والے سفید پانی سے رضاعت ثابت نہیں

سوال:- اگر کسی بچے نے انتہائی بوڑھی عورت (جو سن ایاس کو پہنچ چکی ہے) کے پستان سے سفید پانی پیا ہو تو کیا اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- اگر کسی بوڑھی عورت کے پستان سے سفید پانی نکل آئے جو دودھ جیسا نہ ہو تو اس کے پینے سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی بچے نے سفید پانی پیا ہو تو حرمت نہیں ورنہ ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: ولبن بکر بنت تسع سنین فاکثر محرم والا لا جوھرۃ۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ: تحت ھٰذا القول ای وان لم تبلغ تسع سنین فنزل لھا لبن لا تحرم جوھرۃ لانھم نصبوا علی ان اللبن لا یتصور الا ممن تتصور منہ الولادۃ فیحکم بانہ لیس لبناً کما لو نزل للبکر ماء اصفر لا یثبت من ارضاعہ تحریم کما فی شرح الوھبانیۃ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۳۳ باب الرضاع)

صرف دعویٰ کرنے سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی

سوال:- اگر مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) یہ دعویٰ کرے کہ فلاں لڑکے کو میں نے دودھ پلایا ہے مگر اس پر گواہ نہیں، تو کیا صرف مرضعہ کے اس دعویٰ سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو کر لڑکے کا مرضعہ کی بیٹی سے نکاح حرام ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- رضاعت کے اثبات کے لیے شرعی گواہوں کا ہونا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے، اس لیے صرف مرضعہ کے دعویٰ سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی، البتہ اگر مرضعہ اپنے دعویٰ میں سچی ہو تو جتنا ہو سکے اجتناب بہتر ہے اگرچہ نکاح صحیح ہوگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وحجتہ حجۃ المال وھی شھادۃ عدلین او عدل وعدلتین۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ: ولو احدھما المرضعۃ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۴۸ باب الرضاع)[1]

[1] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: ولا یقبل فی الرضاع شھادۃ النساء منفردات وانما یثبت بشھادۃ رجلین او رجل وامرأتین۔ (الھدایۃ ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۳۲ کتاب الرضاع۔

شوہر کا بیوی کے پستان چوسنے سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال: عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر شوہر بیوی کے پستان پر منہ رکھ کر اس کا دودھ چوس لے جو اس کے حلق سے اتر جائے تو اس شخص کا نکاح ٹوٹ جائے گا اور اس کی بیوی بمنزلہ ماں کے ہو جائے گی۔ شرعاً اس کی حقیقت کیا ہے؟

الجواب: حرمتِ رضاعت کے لیے مدتِ رضاعت کے اندر دودھ پینا لازمی ہے، اگر مدتِ رضاعت کے بعد دودھ پیا جائے تو حرمت ثابت نہ ہوگی اس لیے عوام الناس کی یہ بات غلط ہے اور شوہر کا بیوی کا دودھ پینے سے نہ نکاح متاثر ہوگا اور نہ بیوی اس کی ماں بن سکتی ہے، تاہم مرد کے لیے بیوی کا دودھ پینا حرام ضرور ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ثم مدّة الرضاع ثلثون شهراً عند ابي حنيفة رحمه الله وقالا سنتان وهو قول الشافعي رحمه الله ۔۔۔۔ قال النبي عليه السلام لا رضاع بعد حولين۔ (الهداية ج۲ ص۳۲۹ كتاب الرضاع) [1]

رضاعی بیٹی کا مرضعہ کے سابقہ خاوند سے نکاح جائز ہے

سوال: ایک بچی نے کسی عورت مثلاً ہندہ کا بچپن میں دودھ پیا ہے، ظاہر ہے کہ اس بچی کا نکاح ہندہ کے موجودہ شوہر سے (جس کی وجہ سے اسے یہ دودھ آیا ہے) تو جائز نہیں لیکن کیا یہ لڑکی ہندہ کے سابقہ شوہر کے لیے بھی حرام ہے یا نہیں؟

الجواب: رضیعہ (بچی) پر مرضعہ کا وہ شوہر حرام ہے جس کی وجہ سے اسے موجودہ دودھ آیا ہو، یہ شخص اب اس بچی کا رضاعی باپ ہے، اس کے علاوہ اگر ہندہ کا کوئی سابقہ خاوند ہو اور اس کے ساتھ اس بچی کا کوئی رشتہ نہیں جو سببِ حرمت کا بنے اس لیے ان دونوں کا نکاح صحیح ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: لبن الفحل يتعلق به التحريم وهو ان ترضع المرأة صبية

---

[1] قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: وحولان ونصف عنده وحولان فقط عندهما وهو الاصح فتح وبه يفتى كما في تصحيح القدوري۔
(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۴۰۳ باب الرضاع)
ومثله في فتح القدير ج۳ ص۳۰۹ كتاب الرضاع۔

فتحرم هٰذہ الصبیۃ علیٰ زوجھا وعلیٰ ابائہ وابنائہ ویصیر الزوج الذی نزل لھا منہ اللبن ابا للمرضعۃ ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع) لہ

رضاعی بیٹے کی بیوہ سے نکاح جائز نہیں

سوال:۔ زید نے بچپن میں زینب کا دودھ پیا ہے، اب جبکہ زید کا انتقال ہوگیا ہے تو کیا زید کا رضاعی باپ اس کی بیوہ سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو اس عورت کا شوہر جس سے یہ دودھ ہے اس بچے کا رضاعی باپ بن جاتا ہے، جس طرح سگے بیٹے کی بیوہ سے نکاح صحیح نہیں اسی طرح رضاعی بیٹے کی بیوہ سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں، اس لیے زینب کا شوہر زید کی بیوہ سے نکاح نہیں کرسکتا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: لاحلال حلیلۃ الابن رضاعًا فانھا تحرم کالنسب بحر وغیرہ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۸۳ فصل فی المحرمات) ۲ہ

نسبی بھائی کا رضاعی بہن سے نکاح کرنا

سوال:۔ زید نے ہندہ کے ساتھ بچپن میں اس کی ماں کا دودھ پیا ہے، کیا ہندہ کا نکاح زید کے دوسرے بھائی بکر سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت میں وہ رشتہ دار حرام ہو جاتا ہے جس میں جزئیت ثابت ہوتی ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں ہندہ کا زید کے ساتھ جزئیت کا رشتہ ثابت ہوا ہے اُسکے

لہ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: (زوج مرضعۃ لبنھا منہ ابٌ للرضیع) بیان لان لبن الفحل یتعلق بہ التحریم لعموم الحدیث المشھور واذا ثبت کونہ ابا لہ لایحل لکل منھما موطوءۃ الاخر۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۲۶ کتاب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع۔

۲ہ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: معناہ ان الحرمۃ بسبب الرضاع تعتبر بحرمۃ النسب فتشمل حلیلۃ الابن والاب من الرضاع لانھا حرام بسبب النسب وکذا بسبب الرضاع۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع۔

بھائی بکر کے ساتھ نہیں اس لیے ہندہ کا نکاح بکر کے ساتھ جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وتحل اخت اخیه رضاعًا یصح اتصاله بالمضاف کان یکون له اخ نسبی له اخت رضاعیة۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۵۶۱ باب الرضاع) [۱]

رضاعی باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا

سوال:۔ ایک لڑکے نے کسی شخص کی بیوی کا دودھ مدتِ رضاعت میں پیا تھا، اب وہ بالغ ہو چکا ہے اور اس شخص کی دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، کیا یہ لڑکا اس شخص کی دوسری بیوی سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ شخص اس لڑکے کا رضاعی باپ ہے، تو جس طرح اپنے نسبی باپ کی موطوئہ سے نکاح کرنا جائز نہیں تو اسی طرح رضاعی باپ کی موطوءہ سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله مایحرم من النسب) معناه ان الحرمة بسبب الرضاع معتبرة بحرمة النسب فشمل زوجة الابن والاب من الرضاع لانها حرام بسبب النسب وکذا بسبب الرضاع وهو قول اکثر اهل العلم کذا فی المبسوط بحر۔
(رد المحتار ج۲ ص۵۵۵ باب الرضاع) [۲]

غلطی سے کسی عورت کا دودھ پینے سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے

سوال:۔ اگر کوئی بچہ غلطی سے یا دھوکہ سے کسی عورت کا دودھ پی لے تو کیا اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو گی یا نہیں؟

---

[۱] قال المرغینانیؒ: ویجوز ان یتزوج الرجل باخت اخیه من الرضاع لانه یجوز ان یتزوج باخت اخیه من النسب۔ (الهدایة ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج۲ ص۶۷ کتاب الرضاع۔

[۲] قال المرغینانیؒ: وامرأة ابیه وامرأة ابنه من الرضاع لایجوزان یتزوجها کما لایجوز ذٰلک من النسب۔ (الهدایة ج۲ ص۳۱ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع۔

الجواب:۔ مدتِ شیرخواری میں جب بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوجائے گی چاہے بچہ نے غلطی سے پیا ہو یا دھوکہ اور قصد وارادہ سے۔

قال فخر الدین قاضی خانؒ: قلیل الرضاع وکثیرہ سواء عندنا...... کما یحصل الرضاع بالمص من الثدی یحصل بالصب والسعوط۔

(الفتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۴۱۷،۴۱۶ باب الرضاع) لہ

بچہ سے بچہ کو دودھ دینا موجبِ رضاعت ہے

سوال:۔ اگر کسی بچے کو چمچہ کے ذریعے کسی عورت کا دودھ پلایا جائے تو کیا اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ جب دودھ بچے کے حلق کے نیچے چلا جائے چاہے کسی بھی طریقے سے ہو تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں دودھ حالتِ صغر میں بچے کے بدن میں پہنچ چکا ہے اس لیے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگئی ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: اذا اختلط اللبن بالماء واللبن ھو الغالب تعلق بہ التحریم وان غلب الماء لم یتعلق التحریم۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۳۳۱ کتاب الرضاع) ۲ہ

رضاعی بہن بھائی کا نکاح حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد واجب التفریق ہے

سوال:۔ اگر ایک عورت کا نکاح لاعلمی میں کسی ایسے مرد سے ہوجائے جس نے بچپن میں اس کے ساتھ کسی عورت کا دودھ پیا تھا، کیا اب حقیقتِ حال کا علم ہونے کے بعد ان کے درمیان تفریق کرانی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ دونوں آپس میں رضاعی بہن بھائی ہیں اسلیے ان دونوں کا نکاح شرعاً

لہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ھو مص الرضیع من ثدی الآدمیۃ فی وقت مخصوص ای وصول اللبن من ثدی المرأۃ الی جوف الصغیر من فمہ او انفہ فی مدۃ الرضاع۔ (البحر الرائق ج ۳ ص۲۲۱ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۳۴۲ کتاب الرضاع۔

۲ہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: لو اختلط اللبن لما ذکر یعتبر الغالب فان کان الغالب الماء لایثبت التحریم۔ (البحر الرائق ج ۳ ص۲۲۸ کتاب الرضاع)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۳۴۴ کتاب الرضاع۔

جائز نہیں ہے اور دونوں کے درمیان تفریق لازمی ہے جو نفس متارکت سے ثابت ہوسکتی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (ولا) حل (بین الرضیعة وولد مرضعتها) ای التی ارضعتها (وولد ولدها) لانه ولد الاخ ۔۔۔ الخ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۴۴۳ باب الرضاع)

وقال ایضاً: (فیحرم منه) ای بسببه (ما یحرم من النسب) ۔۔۔ الخ

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۴۳۹ باب الرضاع) لہ

بلوغ کے بعد دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں

سوال: کسی عورت کے ساتھ ایک لڑکے نے زنا کے دوران اس کے پستان کو منہ میں لے کر اس کا دودھ پیا، کیا اب اس مزنیہ اور زانی کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حرمتِ رضاعت کے لیے دو اڑھائی سال کے اندر اندر کسی عورت کا دودھ پینا ضروری ہے، اس مدت کے بعد دودھ پینے سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لہٰذا اس زانی لڑکے کا نکاح مزنیہ سے جائز ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: مدت الرضاع ثلثون شهراً عند ابی حنیفةؒ ۔ وقالا سنتان وهو قول الشافعیؒ ۔۔۔۔ وقال النبی علیه السلام لا رضاع بعد حولین ۔

(الهداية ج ۲ ص۳۲۹ کتاب الرضاع) لہ

شک کی بنا پر رضاعت ثابت نہیں

سوال: رات کے وقت ایک شیر خوار بچی نے کسی عورت کے پستان کو منہ میں لیا

لہ وفی الهندية: یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصولهما وفروعهما من النسب ۔۔۔۔۔ فالکل اخوة الرضیع واخواته واولادهم اولاد اخوته واخواته الخ ۔

(الفتاوٰی الهندية ج ۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع)

لہ قال العلامة الحصکفیؒ: هو حولان ونصف عنده وحولان فقط عندهما وهو الاصح فتح وبه یفتی کما فی تصحیح القدوری ۔۔۔۔۔ ولا یصح الارضاع بعد مدته ۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۴۰۴/۴۰۳ باب الرضاع)

ومِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۳ ص۳۰۹ کتاب الرضاع ۔

مگر اس بات کا یقین نہیں کہ آیا بچی نے دودھ پیا ہے یا نہیں، تو کیا اب اس بچی کا نکاح مذکورہ عورت کے لڑکے سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لیے یقینِ محکم کا ہونا ضروری ہے محض شک کی بناء پر حرمت ثابت نہ ہوگی، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ مذکورہ بچی کا نکاح اس عورت کے کسی بھی بیٹے کے ساتھ نہ کیا جائے۔

قال الشیخ ابن الھمامؒ: بان ادخلت الحلمۃ فی فم الصغیر وشکت فی الارتضاع لا تثبت الحرمۃ بالشك۔ (فتح القدیر ج۳ ص۳۰۴ کتاب الرضاع)[۱]

مدتِ رضاعت کے بعد دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال:۔ اگر کوئی عورت کسی کے بچے کو دوسال کے بعد اپنا دودھ پلائے تو کیا اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لیے مدتِ رضاعت کے اندر اندر دودھ پینا یا پلانا ضروری ہے جو بنصِ قرآن دوسال ہے، لہٰذا اگر کوئی عورت کسی غیر کے بچے کو دوسال کے بعد دودھ پلائے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

قال النبیؐ علیہ السلام: لارضاع بعد حولین۔ (الھدایۃ ج۲ ص۳۲۹ کتاب الرضاع)[۲]

رضاعی ماں کی پوتی سے نکاح کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ ایک لڑکے نے دوسال کی عمر سے پہلے اپنی دادی کا دودھ پیا تھا، اب وہ اپنے چچا کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو کیا یہ لڑکی اس کے لیے حلال

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: فلو التقم الحلمۃ ولم یدر ادخل اللبن فی حلقہ ام لالم یحرم لان فی المانع شکا۔ (الدر المختار علی ہامش رد المختار ج۲ ص۵۵۶ باب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع۔

[۲] قال الحصکفیؒ:۔ فی وقت مخصوص ھو حولان ونصف عندہ وحولان فقط عندھما وھو الاصح فتح وبہ یفتی کما فی تصحیح القدوری...... ولم یصح الارضاع بعد مدتہ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۴۰۳،۴۰۴ باب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۰۹ کتاب الرضاع۔

ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ لڑکی مذکورہ لڑکے کی رضاعی بھتیجی لگتی ہے، اور بھتیجی سے نکاح کرنا شرعًا درست نہیں لہٰذا یہ لڑکا چچا کی بیٹی سے نکاح نہیں کرسکتا۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللّٰہ : ویحرم من الرضاع ما یحرم من النسب للحدیث الذی روینا۔ (الھدایة ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع) ؎۱

مُدتِ رضاعت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مدتِ رضاعت کے اثبات کے لیے کتنا وقت مقرر ہے؟ یا یہ کہ جب بھی کوئی کسی عورت کا دُودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ حرمتِ رضاعت کے لیے جمہور علماء کے نزدیک دو سال کی مدت مقرر ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللّٰہ کے نزدیک تیس مہینے یعنی اڑھائی سال مقرر ہے، لہٰذا اس مدت کے اندر اندر جب بھی والدہ کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ پیا جائے تو رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللّٰہ :۔ مدة الرضاع ثلٰثون شهرًا عند ابی حنیفةؒ وقالا سنتان وھو قول الشافعیؒ۔ (الھدایة ج۲ ص۳۲۹ کتاب الرضاع) ؎۲

رضاعی بھانجی سے نکاح جائز نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت نے کسی لڑکے کو دودھ پلایا ہو اور اس عورت کی بیٹی نے کسی اور لڑکی کو دودھ پلایا ہو تو اس لڑکے اور لڑکی کا آپس میں نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھانجی سے چاہے وہ حقیقی ہو یا رضاعی دونوں صورتوں میں نکاح جائز نہیں

؎۱ قال العلامة الحصکفی رحمہ اللّٰہ :۔ ویحرم منه ای بسببه ما یحرم من النسب۔ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۰۵ باب الرضاع)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع۔

؎۲ قال العلامة الحصکفی رحمہ اللّٰہ :۔ ھو حولان ونصف عندہ وحولان فقط عندھما وھو الاصح فتح وبه یفتی کما فی تصحیح القدوری۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۲ ص۴۰۳ باب الرضاع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۰۹ کتاب الرضاع۔

چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ لڑکی اس لڑکے کی رضاعی بھانجی لگتی ہے اس لیے ان دونوں کا نکاح شرعاً جائز نہیں۔

قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: ویحرم من الرضاع ما یحرم من النسب للحدیث الذی رویناہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع) [۱]

حرمت رضاعت صرف اسلام کا حکم ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! کیا حرمتِ رضاعت اسلام کے علاوہ دوسرے شرائع میں بھی نازل ہوئی تھی یا نہیں؟

الجواب: اسلام دیگر منفردات کے علاوہ اس مسئلہ میں بھی منفرد مذہب ہے جس میں رضاعت کی وجہ سے بھی نسبی رشتہ جیسی حرمت بیان فرمائی گئی، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں یہ حکم نہ تھا۔

قال الشیخ ابوزھرۃؒ: انفردت الشریعۃ الاسلامیۃ من بین الشرائع السماویۃ القائمۃ الان یجعل الرضاع سبباً من اسباب التحریم۔

(الاحوال الشخصیۃ ص۸۳ التحریم بالرضاع)

اپنی والدہ اور نانی کا دودھ پینے سے ماموں کی اولاد سے نکاح کا حکم

سوال: میرے بڑے بھائی اور ایک بہن نے اپنی والدہ اور نانی کا دودھ پیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم اپنے کسی بھائی کا نکاح اپنے ماموں یا خالہ کی لڑکی سے کرنا چاہیں تو وہ شریعتِ مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جس بھائی اور بہن نے نانی کا دودھ پیا ہے اس کا نکاح ماموں اور خالہ کی اولاد سے حرام ہے اور جس بھائی اور بہن نے نانی کا دودھ نہ پیا ہو تو اس کا نکاح خالہ اور ماموں کی اس اولاد سے درست ہوگا جس نے نہ نانی کا دودھ پیا ہو اور نہ اس بھائی اور بہن کی والدہ کا دودھ پیا ہو۔

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ویحرم منہ ای بسببہ ما یحرم من النسب۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۴۰۵ باب الرضاع)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع۔

قال العلامة الحصکفیؒ : فیحرم منه ای بسببه ما یحرم من النسب الا ام اخیه واخته واخت ابنه وبنته وجدة ابنه وبنته وام عمه وعمته الخ

(الدر المختار علی هامش رد المختار ج۲ ص۴۳۹ کتاب النکاح۔ باب الرضاع) ؎۱

رضاعی خالہ سے نکاح کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! ایک لڑکے نے صغر سنی میں ایک عورت کا دودھ پیا ہے اب اُس کے والدین اُس عورت کی چھوٹی بہن سے اس لڑکے کا نکاح کرنا چاہتے ہیں، کیا شرعاً اِن دونوں کا نکاح درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قانونِ شریعت کی رُو سے جس عورت سے نکاح نسبی رشتے کے حوالے سے حرام ہے تو رضاعی رشتے کے حوالے سے بھی اس عورت سے نکاح جائز نہیں ، صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ لڑکی چونکہ اس لڑکے کی رضاعی خالہ ہے اس لیے نسبی خالہ کی طرح رضاعی خالہ سے بھی نکاح ناجائز وحرام ہے، لڑکے کے والدین کو چاہیئے کہ وہ اس ارادے کو ترک کردیں ۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمه الله : یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب للحدیث الذی رویناہ ۔

(الهدایة ج۲ ص۳۳۳ کتاب الرضاع) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة: وتثبت حرمة المصاهرة فی الرضاع حتیٰ ان امرأة الرجل حرام علی الرضیع وامرأة الرضیع حرام علی الرجل وعلیٰ هذا القیاس الا فی المسئلتین احدٰهما ان لا یجوز للرجل ان یتزوّج اخت ابنه من النسب ویجوز فی الرضاع والمسئلة الثانیة لا یجوز لرجل ان یتزوج ام اُخته من النسب ویجوز فی الرضاع ۔ الخ

(الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۴۳ کتاب الرضاع)

؎۲ قال العلامة الحصکفیؒ ، ویحرم منه ای بسببه ما یحرم من النسب ۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۲۰۵ باب الرضاع)

ومثله فی البحر الرائق ج۳ ص۲۲۲ کتاب الرضاع ۔

باب فی حرمت المصاهرت

(حُرمت مُصاہرت کے احکام ومسائل)

ساس کو بغیر شہوت کے ہاتھ لگانا

سوال:۔ ایک شخص کا اپنی بیوی کو جگاتے وقت بیوی کے بجائے ساس کو ہاتھ لگ گیا اور دل میں جماع کا خیال تھا لیکن شہوت نہیں تھی، تو کیا اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگی؟

الجواب:۔ حرمتِ مصاہرت کے اثبات کے لیے لمس (چھونا) ضروری ہے جو کہ شہوت سے ہو اور جس لمس (چھونے) میں شہوت نہ ہو اُس سے حُرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اس شخص پر بیوی حرام نہیں ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفی المس لا تحرم ما لم تعلم الشهوة لان الاصل فی التقبیل الشهوة بخلاف اللمس۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۳ ص۳۶ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)[۱]

ساس کو شہوت سے دیکھنا

سوال:۔ اگر کسی نے اپنی ساس کو شہوت کی نگاہ سے دیکھا تو کیا اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر فرج داخل کو شہوت کی نظر سے دیکھا ہو تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی ورنہ مطلق نظر شہوت سے حرمتِ مصاہرت کا اثبات نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله والمنظور الی فرجها) قید بالفرج لأن ظاهر الذخیرة وغیرها أنهم اتفقوا علی أن النظر بشهوة الی سائر اعضائها لاعبرة به ماعدا الفرج۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۳۳ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)[۲]

---

[۱] قال ابو البرکات النسفیؒ: والزنا واللمس والنظر بشهوة یوجب حرمة المصاهرة۔ (کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۳ ص۹۸ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات) ــــ قال ابن نجیمؒ: وقید بکون اللمس عن غیر شهوة لم یوجب الحرمة۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۱ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات۔

[۲] قال فی الهندیة: لا تثبت بالنظر الی سائر الاعضاء لا بشهوة ولا بمس سائر الاعضاء لا عن شهوة بلا خلاف۔ کذا فی البدائع والمعتبر النظر الی الفرج الداخل، هکذا فی الهدایة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۲۷۴ فصل فی المحرمات)

ساس سے زنا کرنے پر بیوی کے حرام ہونے کا حکم

سوال:۔ اپنی ساس سے زنا کا ارتکاب کرنے والے شخص کے لیے اس عورت کی بیٹی حلال رہے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص اپنی ساس سے زنا کرے یا شہوت کے ساتھ مس یا تقبیل کرے تو اس سے اُس عورت کی بیٹی ہمیشہ کے لیے زنا کے مرتکب داماد پر حرام ہوجاتی ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واراد بحرمة المصاهرة المحرمات الاربع حرمة المرأة علی أصول الزانی وفروعه نسبًا ورضاعًا وحرمة أصولها وفروعها علی الزانی نسبًا ورضاعًا۔ کما فی الوطئ الحلال۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۱ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)[۱]

بیٹی کو شہوت سے ہاتھ لگانے سے نکاح پر اثرات

سوال:۔ اگر کسی نے اپنی بیٹی کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تو اس عمل سے اس کے نکاح پر کیا اثر پڑسکتا ہے؟ کیا بیوی اس کے لیے حرام ہوجائے گی یا حلال رہے گی؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص نے بیٹی کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا ہو اور درمیان میں کوئی ایسی چیز بھی حائل نہ ہو جو بیٹی کے بدن کی حرارت کے احساس سے مانع ہو اور نہ بیٹی کی عمر نو سال سے کم ہو تو اس صورت میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہو کر لڑکی کی ماں اس شخص پر حرام ہو جائے گی، اور اگر مذکورہ شرائط میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو پھر حرمت ثابت نہیں۔

قال فی الهندیة: فلو أیقظ زوجته لیجامعها فوصلت یده إلی بنته منها فقرصها بشهوة وهی ممن تشتهی یظن أنها أمها حرمت علیه الأم حرمة مؤبدة کذا فی فتح القدیر..... ثمّ لا فرق فی ثبوت الحرمة بین کونه عامدًا أو ناسیًا..... ثمّ المس إنّما یوجب حرمة المصاهرة إذا لم یکن بینهما ثوب أما إذا کان بینهما ثوب فإن کان رقیقا بحیث تصل حرارة الممسوس الی ید ه تثبت کذا فی الذخیرة.... والفتوی

---

[۱] وفی الهندیة: فمن زنی بامرأة حرمت علیه أمها وإن علت وإبنتها وإن سفلت۔ (الفتاوی الهندیه ج۱ ص۲۷۴ الباب الثالث فی المحرمات۔
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۳ ص۳۲ کتاب النکاح۔ فصل فی المحرمات۔

علیٰ أن بنت تسع محل الشھوۃ لا ما دونھا۔ کذا فی معراج الدرایۃ۔ انتھٰی

(الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص ۲۷۴ الباب الثالث فی المحرمات) لہ

زانی اور مزنیہ کی اولاد کے درمیان نکاح جائز ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب اس مسئلہ کی وضاحت درکار ہے کہ زانی اور مزنیہ کی اولاد کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے زنا سے حرمتِ مصاہرت کا اثبات چار گروہ میں کیا ہے جن میں صورتِ مسئولہ شامل نہیں ہے اس لیے زانی اور مزنیہ کی اولاد کا آپس میں نکاح جائز اور درست ہے۔

قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وأراد بحرمۃ المصاھرۃ المحرمات الاربع حرمۃ المرأۃ علی اصول الزانی وفروعہ نسبًا ورضاعًا وحرمۃ أصولھا وفروعھا علی الزانی نسبًا ورضاعًا کما فی الوطئ الحلال ویحل لأصول الزانی وفروعہ أصول المزنی بھا وفروعھا۔

(البحر الرائق ج ۳ ص ۱۰۱ کتاب النکاح۔ فصل فی المحرمات) ۲ہ

نابالغ لڑکے کا بالغہ سے زنا کرنے سے حرمتِ مصاہرت کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی نابالغ لڑکا کسی بالغہ عورت سے زنا

لہ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ولا فرق فیما ذکر بین اللمس والنظر بشھوۃ بین عمدٍ ونسیان وخطاء وإکراہ فلو ایقظ زوجتہ أو أیقظتہ ھی لجماعھا فمست یدہ بنتھا المشتھاۃ أو یدھا إبنہ حرمت الأم أبدًا۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۵ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص ۱۰۱ کتاب النکاح۔ فصل فی المحرمات۔

۲ہ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ حرم ایضًا بالصھریۃ اصل مزنیتہ)۔۔۔۔ ومثلہٗ ما قدمناہ قریبًا عن القھستانی عن النظم وغیرہ وقولہ وبحل الخ ای کما یحل ذلک بالوطئ الحلال وتقییدہ بالحرمات الاربع مخرج لما عداھا وتقدم آنفا الکلام علیہ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۲ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات۔

کرے تو اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: زنا سے حرمتِ مصاہرت کے لیے لڑکے لڑکی کا بالغ ہونا ضروری ہے یا کم از کم دونوں کا مراہق ہونا شرط ہے، اس لیے وہ نابالغ لڑکا جو مراہق نہیں کے زنا کرنے سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔

قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وکذا تشترط الشھوۃ فی الذکر حتی لو جامع أربع سنین زوجۃ أبیہ لاتثبت الحرمۃ۔ وفی الذخیرۃ خلافہ وظاھر الأول أنہ یعتبر فیہ السن المذکور لھا وھو تسع سنین۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۹۹)

وقال ایضاً: المراھق کالبالغ۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۱۰۰ کتاب النکاح فصل فی المحرمات) [۱]

بیٹے کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے

سوال: ایک لڑکے نے نکاح کیا لیکن وہ جماع کرنے پر قادر نہیں، اب اگر لڑکے کا باپ اس لڑکی سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ اسلامی میں جب کوئی عورت ایک مرتبہ کسی شخص کے نکاح میں آجائے تو وہ عورت ہمیشہ کے لیے اس شخص کے باپ پر حرام ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ کسی بھی صورت میں نکاح نہیں کر سکتا۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ۔ (سورۃ النساء ۲۳) [۲]

سوتیلے بیٹے سے زنا کرانے والی عورت اپنے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے

سوال: اگر کوئی عورت اپنے سوتیلے بیٹے سے زنا کرائے تو کیا یہ عورت اب اپنے شوہر کے لیے حلال ہے یا حرام؟

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ کبالغ) ..... وفی الفتح لومس المراھق وأقر أنہ بشھوۃ ثبت الحرمۃ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۷ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات۔

[۲] وفی الھندیۃ: وحلیلۃ الابن وابن الابن وابن البنت وان سفلوا دخل بھا الابن ام لا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۷۴ القسم الثانی فی المحرمات بالصھریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص ۲۸۸ کتاب النکاح۔

الجواب:۔ جب کوئی عورت اپنے یا شوہر کے بالغ یا مراہق بیٹے سے جماع کرائے تو اس زنا کی وجہ سے اب یہ عورت اپنے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال فی البحر اراد بحرمۃ المصاهرۃ الحرمات الاربع حرمۃ المرأۃ علی اصول الزانی وفروعہ نسباً ورضاعاً وحرمۃ اصولها وفروعها علی الزانی نسباً ورضاعاً۔ (الدر المختار علی هامش رد المختار ج۲ ص۳۸۴ فصل فی المحرمات) لہ

نابالغ لڑکے سے زنا کرانا حرمتِ مصاہرت کا سبب نہیں

سوال:۔ ایک عورت نے شدتِ شہوت کی وجہ سے ایک نابالغ لڑکے سے زنا کرایا، اب یہ عورت اس لڑکے کو اپنی بیٹی نکاح میں دینا چاہتی ہے، کیا ان دونوں کا نکاح جائز ہے؟

الجواب:۔ حرمتِ مصاہرت کے ثبوت میں وہ زنا قابلِ اعتبار ہے جس میں دونوں افراد بالغ یا مراہق ہوں، صورتِ مسئولہ میں چونکہ لڑکا مراہق بھی نہیں ہے لہٰذا حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں اس لیے دونوں (لڑکے اور لڑکی) کا نکاح جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ فلو جامع غیر مراهق زوجۃ ابیہ لم تحرم۔

(الدر المختار علی هامش رد المختار ج۲ ص۳۸۹ فصل فی المحرمات) ۲ھ

فرج داخل کو دیکھنا موجبِ حرمتِ مصاہرت ہے

سوال:۔ کتبِ فقہ میں مذکور ہے کہ شہوۃ کی نظر سے دیکھنے سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے، جبکہ آجکل تو بازاروں میں اکثر اوباش قسم کے لڑکے

لہ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: والمحرمین واراد بحرمۃ المصاهرۃ الحرمات الاربع حرمۃ المرأۃ علی اصول الزانی وفروعہ نسباً ورضاعاً وحرمۃ اصولها وفروعها علی الزانی نسباً ورضاعاً۔

(البحر الرائق ج۳ ص۱۰۱ فصل فی المحرمات)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج۱ ص۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات۔

۲ھ وفی الهندیۃ: وکذا تشترط الشهوۃ فی الذکر حتی لو جامع ابن اربع سنین زوجۃ ابیہ لا تثبت بہ حرمۃ المصاهرۃ کذا فی فتح القدیر۔ (الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۲۷۵ القسم الثانی فی المحرمات بالصهریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۹۹ فصل فی المحرمات۔

لڑکیوں کو شہوت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، تو کیا اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:- مطلقاً شہوت کی نظر سے دیکھنا حرمتِ مصاہرت کا سبب نہیں بلکہ کسی عورت کے داخلِ فرج کو بنظرِ شہوت دیکھنا سببِ حرمت ہے باقی دیگر اعضاء کو دیکھنے سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہ ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: والمنظور الی فرجها الداخل۔

(الدر المختار علیٰ هامش ردّ المختار ج۲ ص۳۸۶ باب المحرمات) [1]

کم سن بچی کو شہوت کیساتھ چھونا حرمتِ مصاہرت کا سبب نہیں

سوال: اگر کسی مرد نے ۸/۷ سال سے کم عمر کی بچی کو شہوت کے ساتھ چھوا تو کیا اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:- حرمتِ مصاہرت کے اثبات کے لیے لڑکی کا مشتہات ہونا ضروری ہے چونکہ ۸/۷ سال کی بچی مشتہات نہیں ہوتی، اس لیے مذکورہ صورت میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وبنت سنها دون تسع لیست بمشتهاة۔

(الدر المختار علیٰ هامش ردّ المختار ج۲ ص۳۸۹ فصل فی المحرمات) [2]

---

[1] وفی الهندیة: والمعتبر النظر الی الفرج الداخل هٰکذا فی الهدایة وعلیه الفتوٰی هٰکذا فی الظهیریة۔ الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۴ القسم الثانی فی المحرمات بالصهریة)

ومِثلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۲۷۹ کتاب النکاح۔

[2] وفی الهندیة: الفتوٰی علی بنت تسع محل الشهوة لاما دونها۔ کذا فی معراج الدرایة۔ قال الفقیه ابو اللیثؒ: ما دون تسع سنین لاتکون مشتهاة وعلیه الفتوٰی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۷۵ القسم الثانی فی المحرمات الصهریة)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۹۹ فصل فی المحرمات۔ کتاب النکاح۔

ساس سے زنا کے اقرار کے بعد انکار کی کوئی حیثیت نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں علاقائی جرگہ کے سامنے ایک شخص نے اقرار کیا کہ اس نے اپنی ساس کے ساتھ زنا کیا ہے مگر اب وہ اس بات سے منکر ہے، تو کیا اس عورت کی بیٹی اس شخص کے لیے حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد اب اس کے انکار کا کوئی فائدہ نہیں، اس شخص کی بیوی اس پر حرام ہوگئی ہے جرگہ اس کے انکار کی تصدیق نہ کرے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فی الخلاصۃ قیل لہ ما فعلت بام امرأتک فقال جامعتُہا تثبت الحرمۃ ولا یصدق انہ کذب ولو ہازلا۔ قال ابن عابدینؒ: (قولہ ولا یصدق انہ کذب الخ) ای عند القاضی اما بینہ وبین اللہ تعالیٰ وان کان کاذبًا فیما اقر لم تثبت الحرمۃ۔ (رد المحتار ج۲ ص۳۹ فصل فی المحرمات) [1]

مزنیہ کافرہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں

سوال:۔ یہاں لندن میں ایک مسلمان مرد کے ایک کافرہ عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، اب وہ شخص توبہ کرکے اُس عورت کی مسلمان بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے، تو کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی عورت کو شہوت کے ساتھ چھونا یا اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا موجبِ حرمتِ مصاہرت ہے، عورت چاہے مسلمان ہو یا کافرہ اِس حرمت کی وجہ سے ممسوسہ کے اصول وفروع چھونے والے پر حرام ہوجاتے ہیں، اِس لیے صورتِ مسئولہ میں مسلمان مرد کا نکاح اس ممسوسہ کافرہ کی مسلمان بیٹی سے جائز نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: واصل ممسوسۃ بشہوۃ ولو بشعر علی الرأس ..... وفروعہنّ مطلقاً۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۳۸۵ فصل فی المحرمات) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قیل لرجل ما فعلت بأم امرأتک قال جامعتُہا تثبت الحرمۃ ولا یصدق انہ کذب وان کان ہازلاً لان الاصرار لیس بشرط فی الاقرار لحرمۃ المصاہرۃ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۰۱ کتاب النکاح، فصل فی المحرمات)

[2] وفی الہندیۃ: فمن زنیٰ بامرأۃ حرمت علیہ أمہا وان علت وابنتہا وان سفلت وکذا تحرم المزنی بہا علیٰ اٰباء الزانی واجدادہ وان علوا وابنائہ وان سفلوا کذا فی فتح القدیر..... کما تثبت ہٰذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس والتقبیل والنظر الی الفرج بشہوۃ کذا فی الذخیرۃ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۱ ص۲۷۴ القسم الثانی فی المحرمات بالصہریۃ) ومثلہ فی الہدایۃ ج۲ ص۲۸۹ کتاب النکاح۔

چھوٹے گاؤں میں جاری شدہ نماز جمعہ کو بند کرنا

سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں ٹینگی دہزارہ) میں تقریباً آٹھ سال سے نماز جمعہ پڑھی جارہی ہے، تبلیغ اور درود وسلام کا سلسلہ بھی جاری ہے، حال ہی میں ایک مولوی صاحب نے اس بستی کو چھوٹی بستی میں شمار کرکے عوام سے نماز جمعہ بند کرنے کو کہا بستی کے کوائف حسب ذیل ہیں: گھر تقریباً ۳۰۰- ووٹ ۸۰۰- مسجدیں ۸ ملحقہ ہیں۔ ایک عدد پرائمری سکول۔ ایک چھوٹا بازار۔ کل آبادی تقریباً ۴۰۰۰- ایک نمبردار- ایک پٹواری۔ ایک ممبر یونین کونسل۔ ایک چوکیدار۔ ایک سکول ماسٹر بھی ہے۔ یہ گاؤں یونین کونسل کی طرف سے ایک جدا وارڈ ہے بستی کے تمام بالغ مرد اگر جمع ہوجائیں تو ایک بڑی مسجد میں نہیں سماسکتے۔ مندرجہ بالا کوائف کی روشنی میں شرعی حکم صادر فرمایا جائے کہ اگر واقعی بستی ھذا میں نماز جمعہ نہیں ہوسکتی اور آئندہ کے لیے ترک کی جاوے اور سابقہ کی قضاء ادا کی جائے؟

الجواب:- جناب کو معلوم ہوگا اور کتب فقہ میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ ہمارے امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک میں صحت اور جواز جمعہ کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ جگہ مصر ہو یا فناء مصر ہو، اگر وہ جگہ مصر یا فناء مصر نہ ہو، تو اگرچہ دوسرے شرائط ہوں پھر بھی امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہاں جمعہ جائز اور صحیح نہ ہوگا۔ تحدید مصر میں اگرچہ فقہاء احناف آپس میں مختلف نظر آتے ہیں اور مصر کی مختلف تعریفیں فقہاء نے کی ہیں اُن میں سے ایک تعریف یہ ہے کہ مالا یسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بھا۔ اور دوسری تعریف جس کو ظاہر المذہب کہا گیا ہے، یہ ہے: انہ کل موضع لہ امیر وقاض یقدر علی اقامۃ الحدود۔ (الدر المختار)

علامہ ابن عابدینؒ المعروف بہ شامی نے "شرح منیہ" سے جو حد صحیح نقل کی ہے اور جس کو صاحب ھدایہ نے اختیار کیا ہے، یہ ہے: انہ الذی لہ امیرٌ وقاضٍ ینفذ الاحکام ویقیم الحدود۔

بہر حال مصر کی تحدید کے بارہ میں اقوال بکثرت ہیں، بعض میں افراط ہے اور بعض میں تفریط، اور بعض اعدل واوسط ہیں، اور وہی احق بالقبول ہیں۔

صورت مسئولہ کے مطابق موضع مذکور ہر حال میں اعدل الاقاویل پر مصر میں تو داخل نہیں ہے لیکن فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ قصبات وقریٰ کبیرہ بھی مصر کے حکم میں ہیں، چنانچہ

ردالمحتار جلد ۱ ص ۷۴۸ میں بصراحت موجود ہے : وعبارة القهستانی وتقع فرضاً فی القصبات والقرای الکبیرة التی فیها اسواق الیٰ قوله لا یجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاضی ومنبر وخطیب ۔ اھ ــــ اور نظر برحالت مذکورہ سوال موضع مذکورہ قریٰ کبیرہ میں ضرور داخل معلوم ہوتا ہے ۔ اور کبیرہ وصغیرہ میں اگر ما بہ الفرق آبادی کی مقدار لی جائے تو اس کا مدار عرف پر ہوگا ، اور عرف کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام وقت جو کہ حکمائے تمدن بھی ہیں چار ہزار کی آبادی والے گاؤں کو قصبہ میں شمار کرتے ہیں اور چار ہزار کے قریب بوجہ معتبر نہ ہوتے کسر کے حکم میں چار ہزار کے ہیں ۔ پس موضع مذکورہ اگر قصبہ نہیں ہے تو قریۂ کبیرہ ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہے ، اس بناء پر تو مناسب ہے کہ موضع مذکورہ میں جمعہ کا جائز ہونا مان لیا جاوے ، لیکن فقہاء کرام نے قریہ صغیرہ اور کبیرہ میں ما بہ الفرق وہ صفات مراد لی ہیں جو عبارت مرقومہ میں کبیرہ وصغیرہ کی صفت میں وارد ہیں ۔ یعنی اسواق ، حاکم ، خطیب کا ہونا یا نہ ہونا ، اس بناء پر موضع مذکور قریۂ کبیرہ میں داخل نہیں ہے اور یہاں جمعہ کا جائز ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ موضع مذکور میں ایک چھوٹا بازار ہے جو قریۂ صغیرہ کی نشانی ہے ، مصر اور قریۂ کبیر میں کم از کم تین بازار ہونے چاہئیں ــــ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم سے بڑا حاکم قاضی اور والی مراد ہیں جو وہاں مقیم ہوں ، یہ صفت بھی موضع مذکور میں معدوم ہے اسلئے یہ جگہ قریہ صغیرہ ہونی چاہیئے اور جب قریہ صغیرہ ہوا تو پھر جواز جمعہ کے ساتھ چند مفاسد لاحق ہوتے ہیں کیونکہ پھر جمعہ کی نماز نفل ہوگی اور نفل تداعی کے ساتھ باجماعت بدعت ومکروہ ہیں ، ظہر جو اصل فریضہ ہے اس کا ترک یا جماعت کا ترک لازم آتا ہے ۔ اس لیے ذاتی مشورہ یہ ہے کہ اکابرین دیوبند نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایک قریہ صغیرہ میں عرصہ دراز سے جمعہ قائم ہو اور اُسے بند کرنے میں فساد کا خطرہ ہو تو اس کو فوراً بند نہ کیا جائے بلکہ جمعہ پڑھایا جائے اور لوگوں کو آہستہ آہستہ سمجھایا جائے کہ چونکہ یہ جگہ نہ مصر ہے نہ قریۂ کبیرہ ، اور ہمارے مسلک میں ایسی جگہ جمعہ جائز نہیں اور خود گھر میں جا کر چار رکعت بہ نیت آخر ظہر پڑھ لیا کریں ، اس طریقہ سے درست مسئلہ بھی واضح ہو جائے گا اور فساد بھی بپا نہ ہوگا ۔ فقط واللہ اعلم

خطبۂ جمعہ کے بارے میں چند سوالات

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین متدرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ :-

(۱) جمعہ کا خطبہ بدستور عربی زبان میں رکھا جائے یا عوام الناس کے سمجھنے کے لیے مقامی زبان میں رواج دیا جائے ؟

(۲) اگر خطبہ عربی زبان ہی میں باقی رکھا جائے تو جو لوگ عربی زبان نہ سمجھنے کا اشکال کرتے ہیں اس کا کیا حل ہے ؟

(۳) خطبہ میں سلطانِ وقت کا نام لانا چاہیئے یا نہیں ؟

الجواب :- اس مسئلہ پر کئی عرصہ پہلے علماء راسخین نے قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کی روشنی میں اپنے اپنے فتاوٰی رسالوں کی شکل میں شائع کیے ہیں اور قوی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اگر جمعہ و عیدین میں خطبہ بجائے عربی کے اردو یا فارسی میں پڑھا جائے تو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک ایک قول میں خطبہ صحیح اور ادا نہ ہوگا اور جب خطبہ ادا نہ ہوگا تو نمازِ جمعہ بھی نہ ہوگی کیونکہ جمعہ کی ادائیگی کی شرائط میں سے خطبہ بھی ہے ۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فتاوٰی دار العلوم دیوبند کے حصہ "عزیز الفتاوٰی" میں اس فتوٰی کے دلائل میں "درمختار" کی یہ عبارت پیش فرماتے ہیں : والرابع الخطبۃ فیہ فلو خطب قبلہ وصلّی فیہ لم تصح ۔ درمختار باب الجمعۃ کما صح لو شرع بغیر عربیۃ ۔ الخ وشرط عجزہ وعلٰی ھٰذا الخلاف الخطبۃ وجمیع اذکار الصلوٰۃ ۔ درمختار و فی الشامی وعلٰی ھٰذا الخلاف لو سبح فی الفارسیۃ فی الصلوٰۃ او دعا ۔ الخ ای یصح عندہٗ لکن ھیئاتی کراھۃ الں عام بالاعجمیۃ الخ شامی باب صفۃ الصلوٰۃ وفی باب الجمعۃ من رد المحتار لم یقید الخطبۃ بالعربیۃ اکتفاء بما قدمہٗ فی باب صفۃ الصلوٰۃ من انہا غیر شرط ولو مع القدرۃ علی العربیۃ عندہٗ خلافًا لہما حیث شرطاھا الا عند العجز ۔ الخ

ان عبارات سے واضح ہے کہ عربی زبان پر قدرت کے باوجود اردو یا فارسی وغیرہ میں خطبہ جمعہ پڑھنا صاحبینؒ کے نزدیک اور ان کے قول کے موافق صحیح نہیں ، اور امام صاحبؒ کے نزدیک اگرچہ خطبہ ادا ہو جائے گا مگر مکروہ تحریمی ہوگا ۔

اسی طرح مولانا محمد تمیم بن محمد المدراسی نے اس موضوع پر دو عدد رسالے زبدۃ التحقیقات، عمدۃ التحقیقات فی اکراھۃ الخطبۃ بغیر العربیۃ تالیف فرمائے ہیں، جن پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے تقریظ لکھی ہے۔ نیز حضرت مفتی صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بنام "الاعجوبۃ" تحریر فرمایا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ تقریظ میں لکھتے ہیں: الخطبۃ بالعربیۃ سنۃ مؤکدۃ لمواظبۃ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام لا یقال ان المواظبۃ تکون دلیل السنۃ اذا لم یکن ثمۃ دلیل الخصوص وکفیٰ کونہ علیہ الصلوٰۃ والسلام عربیاً او کون لغتہ عربیۃ دلیل الخصوص فانا نقول ان الخلفاء الراشدون ومن سواھم من اصحابہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بلغوا مشارق الارض ومغاربھا وافتتحوا العرب والعجم ولم یثبت من احد منھم انہ خطب بغیر العربیۃ مع القدرۃ علیہ لما ثبت من کثیر من الصحابۃ معرفتھم بلغۃ العجم وقدرتھم علی الخطبۃ بھا کزید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان یعلم اللسان العجمی والحبشی والرومی وکسلمان الفارسیؓ کان یعلم الفارسیۃ ومع ذٰلک لم یاًمرھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالخطبۃ بلسان العجم مع مس الحاجۃ الیہ ومعرفتھم بہ فی شیء من الاحادیث علیٰ انہ قد ثبت من الاحادیث الصحیحۃ والسیرۃ النبویۃ حضور العجمیین عندہٗ صلی اللہ علیہ وسلم وحدانا وجماعات وکانوا فی اول امرھم لا یعرفون العربیۃ فان کان تفھیم الخطبۃ الحاضرین من ضروریات الخطبۃ فقد مس الحاجۃ الیٰ ترجمتھا بلسانھم ولم یفعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مع القدرۃ علیہ باقامۃ الترجمان من جماعۃ الصحابۃ فعلم ان مواظبتہ علیہ السلام علی اللغۃ العربیۃ فی الخطبۃ لیس لمحض کونہ عربیاً وعلیٰ سبیل جریان العادۃ کما ظنہ بعض الفضلاء بل کان ذٰلک مقصوداً منہ علیہ الصلوٰۃ والسلام والحاصل ان جعل الخطبۃ بالعربیۃ سنۃ مؤکدۃ۔

اسی تقریظ میں محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ فی ارض اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں جو انہوں نے شرح مؤطا میں ذکر فرمایا ہے: ولما لاحظنا خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخلفائہؓ وهلم جرًا فنقحنا وجود اشياء فيها الحمد والشهادتين والصلوٰة على النبي صلى الله عليه وسلم والامر بالتقوىٰ وتلاوة آيته والدعا للمسلمين فی المشارق والمغارب به مع ان فی كثير من الاقاليم كان المخاطبون اعجميين۔

آگے امام نووی رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں جو انہوں نے "اذکار کتاب رحمہ اللہ تعالیٰ" میں ذکر کیا ہے: ويشترط كونها يعنی خطبة الجمعة وغيرها بالعربية انتهى والحاصل ان اللغة العربية فی الخطبة سنة مؤكدة عندنا ولكن ترك العربية وجعلها بالعجمية مكروه تحريمًا وتاركها آثم ولاسيمًا المدمن عليه۔

اس موقع پر صاحب تقریظ ایک اعتراض کو نقل کر کے اس کا دفعیہ بھی فرماتے ہیں: ولا يرد علينا ما نص عليه فی رد المحتار من ان ترك الواجب مكروه تحريمًا وترك السنة تنزيهًا وايضًا صرح به الحلبی فی شرح المنية حيث قال والمراد بها ما لزمه ترك السنة وهو كراهة تنزيهة او ترك واجب وهو كراهة تحريم كما ذكره المصنفؒ فی رسالته هذه زبدة التحقيقات وذلك لان الحكم بتنزيهية الكراهة فی ترك السنة انما هو اذا لم يخالطه غيره من احداث بدعة او ادمان على تركها والا فالفقهاء مصرحون بكونه آثمًا ضالًا۔ قال الشامیؒ فی اوائل سنن الوضوء وهی سنن المؤكدة القريبة من الواجب التی يضلل تاركها لان تركها استخفاف بالدين۔ (ج ۱ صـ ۹۶) ثم قال فی المضمضة والاستنشاق فلو تركهما اثم على الصحيح۔ (سراج) وقال فی الحلية لعله محمول على ما اذا جعل الترك عادة له من غير عذر كما قالوا مثله فی التثليث۔ (شامی ج ۱ صـ ۱۰۸) وقال فی البدائع لان من لم ير سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنة فقد ابتدع فيلحقه الوعيد۔ (بدائع الصنائع ج ۱ صـ ۲۲) قلت والمراد بالوعيد

قوله علیه السلام فی حدیث الاعرابی من زاد علی هذا او نقص فقد تعدّی وظلم ۔ ومن هذه الجملة وضح ان تارک العربیة فی الخطبة آثمٌ مبتدع فانہ لا یراہ سنۃً فالحاصل ان اختصاص اللغة العربیة فی الخطبة وان کان فی الاصل من السنن الا انہ لحق بترکہ امورآخر من ابداع بدعة وآثم الادمان علی ترک السنة وترک البدعة واجب فجاء الوجوب من هذا القبیل لا بمحض المواظبة علیه وبالجملة فالحکم بوجوب العربیة وآثم تارکها فی خطبة الجمعة وان ترجمتها بغیر العربیة بدعة حق لا ریب ۔

اسی طرح حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاوی" میں بھی تحریر فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: قرآن مجید اور خطبہ دونوں کا اصل مقصد ایک ہی ہے، چنانچہ خطبہ کو قرآن مجید میں ذکر اللہ فرمایا ہے ۔ یہی لفظ ذکر قرآن مجید کے لیے فرمایا ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ بلکہ قرآن مجید کے لیے لفظ ذکریٰ بمعنیٰ تذکیر بھی وارد ہے ۔ إِنْ هُوَ ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ○ ۔ پس اگر لفظ ذکر اس پر دال ہے کہ اس سے لوگوں کو ان کی زبان میں نصیحت کی جاوے تو چاہیئے کہ قرآن مجید کی جگہ بھی یا اس کے ساتھ نماز میں حاضرین کی زبان میں ترجمہ پڑھا جاوے بلکہ لفظ ذکریٰ اس پر زیادہ دال ہے، اور اگر قرآن مجید سے تفہیم ناس کو خارج نماز کے ساتھ مخصوص کیا جاوے اور نماز میں محض تلاوت کا حکم کیا جاوے تو خطبہ سے تفہیم ناس کو بھی خارج ہیئت خطبہ کہا جاوے مثلاً خطبہ سے قبل یا نماز کے بعد پھر ضرورت تفہیم کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے زیادہ جانتے تھے، اور روم و فارس اس وقت فتح ہو چکا تھا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان زبانوں کے جاننے والے بھی موجود تھے، پھر کیا وجہ کہ اُس وقت ایسا نہیں کیا گیا؟ پھر اگر سامعین میں آٹھ دس زبانوں والے ہوں تو کیا خطیب کے لیے یہ شرط ہوگی کہ وہ سب زبانوں کا ماہر ہو، اگر نہیں تو پھر دوسری زبانوں والوں کی کیا رعایت ہوئی؟ نیز اسی بحث میں حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ جمعہ کا خطبہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں پڑھنا خلافِ سُنتِ متوارثہ ہے اس لیے ممنوع ہے ۔ انتھی ۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے "مجموعۃ الفتاویٰ" میں اس بارہ میں تفصیل سے کلام کیا ہے، چند عبارات حوالۂ قلم کی جاتی ہیں :۔

(سوال) خطبۂ جمعہ اردو زبان میں یا فارسی زبان میں یا اردو وفارسی اشعار میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور جو ہے تو کس کتاب میں مذکور ہے ؟ بینوا وتوجروا

هوالعليم الخبير۔

(جواب) خطبۂ جمعہ اردو زبان میں نثر ہو خواہ نظم اور اسی طرح فارسی زبان میں بھی نثر ہو یا نظم، وعلیٰ هذا القیاس۔ جو خطبہ کہ اس کی کچھ عبارات لغتِ عربی میں ہو اور کچھ زبان فارسی یا اردو وغیرہما میں نظم ہو یا نثر مکروہ بکراہت تحریمی ہے کیونکہ مخالف ہے سنتِ ھدٰی کے، اس لیے کہ پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثناء اور صحابۂ کرامؓ نے علی الدوام خطبہ زبانِ عربی میں پڑھا ہے اور اس وقت کسی سے خطبہ پڑھنا غیر زبان عربی میں منقول نہیں ہے، جیسا کہ کتاب "آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس" میں مسطور ہے : وهٰذه عبارته الكراهة انما هي لمخالفة السنة لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابه قد خطبوا دائماً دائماً بالعربية ولم ينتقل عن احد منهم انهم خطبوا خطبةً ولو خطبة غير الجمعة لغير العربية ۔انتہیٰ

اور یہ پوشیدہ نہ رہے کہ باعثِ احداث خطبہ غیر عربیہ کا نہیں ہے مگر نہ سمجھنا عجم کا عباراتِ عربیہ کو، حالانکہ یہ امر قرونِ ثلاثہ میں بھی موجود تھا، اس واسطے کہ جب اطرافِ مختلفہ میں بلاد وامصار مفتوح ہوئے اور اکثر مردمان فارس و حبش وروم وغیرہ کے مشرف بہ اسلام ہوئے، وہ لوگ مجالس شعائر اسلام مثل جمعہ وعیدین وغیرہما کے حاضر ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو بوجہ عدم وقوف لغتِ عرب کے شعور فہم عبارات عربیہ کا نہ تھا بایں ہمہ کسی نے برعایت فہم اشخاص عربیہ عجمیہ کے غیر زبانِ عربی میں خطبہ نہ پڑھا، باوجودیکہ تعلیم وتفہیم کہ خطباء وعلماء کی شان سے ہے مقتضی اس کی تھی، جبکہ ایسا نہ ہوا تو خطبۂ عربیہ کے مکروہ ہونے میں جو ادنیٰ مرتبہ ضلالت کا ہے کچھ شک نہ رہا۔ الیٰ آخر ما قال واطال نوراللہ مرقدہٗ ۔

محققین کی ان تصریحات کو مدنظر رکھ کر ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ وعیدین کا خطبہ بدستور عربی زبان میں رکھا جائے، اور اس کا دوسری زبان (مثل اردو یا فارسی وغیرہ) میں بدل دینا مکروہ تحریمی ہے۔

(۲) آپ کے اس سوال کا جواب سوالِ اول کے جواب کے ضمن میں ہوگیا ہے تاہم اتنا لکھا جاتا ہے کہ خطبۂ عربی سے پہلے وعظ وتبلیغ کرنے میں یہ اشکال رفع ہو سکتا ہے، خاص خطبہ کے الفاظ کے معانی اور مطالب لوگوں کو سمجھانا اس وقت کوئی شرط نہیں ہے۔

(۳) خطبے میں کسی کا شخصی نام لانا شرط نہیں ہے، فقہاء اسلام خطبے کے متعلق جو تفصیل بیان فرماتے ہیں اس میں کہیں اس کا ذکر نظر سے نہیں گذرا، مشہور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ خطبہ کے شرائط میں سے ایک شرط خطبہ ہے۔ (ومنها الخطبة قبلها) —— آگے لکھتے ہیں: الخطبة تشتمل على فرض وسنة فالفرض شيئان الوقت الى قوله والثانى ذكر الله —— آگے لکھتے ہیں: واما سننها فخمسة عشر —— خطبہ کی تفصیل میں بھی کہیں کسی بادشاہ کا شخصی نام ذکر کرنے کی تصریح نہیں ہے، علیحدہ بھی کوئی جزئیہ دستیاب نہیں ہو سکا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ خطبے میں شخصی نام نہ لایا جائے، خطبہ میں اوصاف پر دُعا اور ترغیب وترہیب ہونی چاہیئے، جیسا کہ خطبوں میں اسلاف کا معمول رہا ہے کہ اُن کے خطبوں میں یہ الفاظ موجود ہیں: والسلطان المسلم ظلّ الله فى الارض من اهان سلطان الله فى الارض اهان الله۔

هٰذا ما عندى والله اعلم

☆ ☆

عیدین کی نماز کتنے دنوں تک ادا کی جاسکتی ہے

سوال:۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز کتنے دنوں تک ادا کی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر عید الفطر کی نماز بوجہ شرعی مجبوری کے نہ پڑھائی جاسکے تو دوسرے دن پڑھی جاسکتی ہے اس کے بعد جائز نہیں اور عید الاضحیٰ کی نماز تین دن تک جائز ہے بشرطیکہ کسی شرعی عذر کی وجہ سے ترک کی گئی ہو۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولو زالت الشمس يوم الفطر قبل ان يصلى صلوٰة العيد سقطت صلوٰة العيد ولا يصلى من الغد الا اذا تركوا بعذر فيصلى من الغد قبل الزوال وان زالت الشمس من الغد سقطت صلوٰة العيد سواء تركوها بعذر او بغير عذر وفي عيد الاضحىٰ اذا لم يصل من الغد حتى زالت الشمس يصلى بعد الغد قبل الزوال فاذا زالت الشمس في آخر ايام النحر ولم يصل سقطت سواء كان بعذر او بغير عذر غير ان التاخير ان كان بعذر لا يلحقهم الاساءة وان كان بغير عذر فقد اساؤا۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۱ ص۲۱۴ باب صلوٰة العيدين)[1]

✲ ✲

---

[1] وفي الهندية: وتؤخر صلوٰة عيد الفطر الى الغد اذا منعهم من اقامتها عذر بأن غم عليهم الهلال و شهد عند الامام بعد الزوال او قبله بحيث لا يمكن جمع الناس قبل الزوال وصلاها في يوم غيم فظهر انها وقعت بعد الزوال ولا تؤخر الى بعد الغد والامام لو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا يقضيها من فاتته خرج الوقت او لم يخرج واذا حدث عذر يمنع من الصلوٰة في يوم الاضحىٰ صلاها من الغد وبعد الغد ولا يصليها بعد ذلك، ثم العذر ههنا لنفي الكراهة حتى لو اخروها الى ثلاثة ايام من غير عذر جازت الصلوٰة وقد اساؤا وفي الفطر للجواز حتى لو اخروها الى الغد من غير عذر لا يجوز۔

(الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۵۱ الباب السابع عشر في صلوٰة العيد)

وَمِثْلُهٗ في الطحطاوي حاشيه مراقي الفلاح ص۴۳۹ باب صلوٰة العيدين۔

احکام ومسائل
عید و صدقۃ الفطر

دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء کی طرف سے عوام الناس کے افادہ کے لیے احکام ومسائل کے عنوان سے ماہنامہ الحق میں وقتاً فوقتاً مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں. ذیل کا مضمون بھی ماہنامہ الحق میں شائع ہوچکا ہے۔ فتاویٰ کی مناسبت سے اسے یہاں بھی شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

- یکم شوال کو شکرانے کے طور پر دو رکعت نمازِ عید ادا کرنا واجب ہے [۱]
- عید کے دن غسل کیا جائے، مسواک کی جائے، عمدہ کپڑے جو میسر ہوں پہن کر خوشبو لگائی جائے بالوں کو تیل لگا کر کنگھا کیا جائے [۲]
- صبح سویرے عیدگاہ جلد پہنچنے کی کوشش کی جائے اور نمازِ عید کے لیے جانے سے قبل کوئی میٹھی چیز کھالی جائے [۳]
- عید کی نماز پڑھنے کے لیے ایک راستے سے جائے اور نماز کے بعد دوسرے راستے سے واپس آئے اور اگر ممکن ہو تو عیدگاہ پیدل چل کر جائے [۴]
- راستے میں یہ تکبیریں آہستہ آہستہ پڑھے: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد [۵]
- نمازِ عید سے پہلے کسی جگہ نوافل پڑھنا مکروہ ہے البتہ عید کی نماز کے بعد گھر آکر پڑھ سکتے ہیں [۶]
- نمازِ عید میں صرف چھ تکبیریں زائد ہوتی ہیں، پہلی رکعت میں سبحانک اللّٰھم کے بعد تین تکبیریں زائد ہاتھ چھوڑ کر اور دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے تین تکبیریں زائد ہاتھ چھوڑ کر کہی جاتی ہیں باقی نماز دوسری نمازوں کی طرح ہے، نماز کے بعد خطبہ سننا واجب ہے [۷]

نمازِ عید کے متفرق مسائل

- عیدین کے خطبوں کی ابتدا تکبیر سے کرنا مستحب ہے پہلے خطبے میں نو مرتبہ تکبیر پڑھی جاتی ہے [۸]
- عید کے دونوں خطبوں کے درمیان امام کے لیے تھوڑی دیر بیٹھنا مسنون ہے [۹]

○ عید کے دن عورتوں، مریضوں اور مسافروں کے لیے بھی نمازِ عید سے پہلے نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔[10]

○ عیدین کی نماز عیدگاہ میں ادا کرنا مسنون ہے، البتہ معذوروں کے لیے مساجد میں نمازِ عید ادا کرنا جائز ہے۔[11]

○ نمازِ عید کا باجماعت ہونا شرط ہے لہٰذا اگر کسی وجہ سے نمازِ عید کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکا تو تنہا نمازِ عید ادا نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی کی نمازِ عید کسی وجہ سے فاسد ہو گئی ہو تو اس کی قضا واجب نہیں ہے۔[12]

○ اگر کسی شرعی عذر کی وجہ سے نمازِ عید پہلے دن نہ پڑھی جا سکے تو دوسرے دن نمازِ عید پڑھ لیں۔[13]

○ اگر کسی کی واجب زائد تکبیریں چھوٹ گئی ہوں اور وہ امام کے ساتھ قیام میں آکر شریک ہوا تو نیت باندھ لینے کے بعد وہ سب سے پہلے تین زائد تکبیریں کہے خواہ امام نے قرأت شروع کر دی ہو یا نہ کی ہو۔[14]

○ ایک شخص نماز کی دوسری رکعت کے رکوع میں آکر شریک ہوا تو ایسے موقع پر اگر اُسے یقین ہو کہ تینوں تکبیریں کہہ کر رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے گا تو وہ پہلے کھڑے ہو کر تینوں تکبیریں کہے اس کے بعد رکوع میں شریک ہو جائے۔ اگر ایسے شخص کو رکوع چھوٹ جانے کا خوف ہو تو وہ رکوع میں شریک ہو جائے اور سبحان ربی الاعلیٰ کی بجائے رکوع ہی میں زائد تکبیریں کہے مگر رکوع میں ہاتھ نہ اٹھائے۔[15]

○ اگر تینوں تکبیریں پوری کرنے سے پہلے امام صاحب رکوع سے سر اٹھا لیں تو وہ بھی امام کی اقتدا میں کھڑا ہو جائے، جس قدر تکبیریں رہ گئی ہیں وہ معاف ہوں گی۔[16]

○ اگر کسی کی ایک رکعت نمازِ عید جاتی رہے تو اس کو چاہیئے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ رکعت ادا کرے، سب سے پہلے قرأت کرے اس کے بعد زائد تکبیریں کہہ کر رکوع میں چلا جائے۔[17]

○ اگر امام صاحب رکوع سے پہلے زائد تکبیریں کہنا بھول جائے اور رکوع کی حالت میں انہیں وہ تکبیریں یاد آئیں تو وہ حالتِ رکوع میں ہی تکبیریں کہہ لیں قیام کی طرف نہ لوٹیں تاہم اگر غلطی سے امام صاحب کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہو کر انہوں نے یہ زائد تکبیریں کہیں تو یہ صورت بھی جائز ہے نماز فاسد نہیں ہو گی۔[18]

○ ہجوم کی کثرت کی وجہ سے عیدین کی نماز میں سجدۂ سہو معاف ہے۔[19]

○ عیدین کا خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے لیکن اگر امام کسی مجبوری کی وجہ سے کھڑا

نہ ہو سکے تو بیٹھ کر خطبہ پڑھنا جائز ہے[۲۰]

مستحب یہ ہے کہ جو شخص عید کی نماز پڑھائے وہی خطبہ بھی پڑھے، تاہم اگر امام کو کوئی شرعی عذر پیش آجائے تو دوسرا شخص بھی خطبہ دے سکتا ہے[۲۱]

مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز طویل ہو اور خطبہ مختصر ہو یعنی پوری نماز سے کم وقت میں خطبہ ختم ہو جائے[۲۲]

صدقۃ الفطر | صدقۃ الفطر اس شخص پر واجب ہے جس کے پاس ضروریاتِ خانہ کے علاوہ ساڑھے باون تولہ چاندی یا اسی وزن کے روپے ہوں یا زیور ہوں یا مال و جائیداد یا تجارت کا مال ہو یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو یا اس وزن کے برابر اشرفیاں یا زیور ہو، یہ شرط نہیں کہ اس مال پر سال گذر چکا ہو، اگر کسی کے پاس بہت مال ہے لیکن قرض اس قدر ہے کہ اگر ادا کیا جائے تو ۵۲½ تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا اسباب باقی نہیں رہتا تو اس پر صدقۂ فطر واجب نہیں۔ جس شخص کے پاس مذکورہ مال یا اس سے زیادہ ہو وہ اپنی طرف سے بھی صدقۂ فطر ادا کرے اور اپنی نابالغ اولاد اور بیوی کی طرف سے بھی[۲۳]

صدقۂ فطر ایک آدمی کا بوزن انگریزی پونے دو سیر گندم ہے یا اس کی قیمت، اور جو ۳½ سیر ہے، اپنے عزیز و اقارب سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ایک شخص کو کئی آدمیوں کا صدقۂ فطر دیا جائے تو درست ہے (اور اگر ایک آدمی کا صدقۂ فطر کئی محتاجوں کو دیدیا جائے تو بھی درست ہے)۔ عید کی نماز سے پہلے ادا کر دینا بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ جس نے کسی عذر یا غفلت سے روزے نہیں رکھے اس پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے بشرطیکہ مذکورہ بالا مقدار کا مال رکھتا ہو۔ صدقۂ فطر مؤذن یا امام وغیرہ کو اجرت میں دینا جائز نہیں۔ صدقۂ فطر مسجد کی تعمیر اور اس کے مصارف میں لگانا بھی درست نہیں۔

۱؎ قال العلامۃ المرغینانیؒ: تجب صلوٰۃ العید علیٰ کل من تجب علیہ صلوٰۃ الجمعۃ۔ (الھدایۃ ج۱ ص۱۵۱ باب العیدین)

۲؎، ۳؎ ندب یوم الفطر اکلہ حلواً وتراً قبل خروجہ الی صلوٰتھا واستیاکہ واغتسالہ تطیبہ ولبسہ احسن ثیابہ ولو غیر ابیض.... ثم خروجہ الی الجبانۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۶۸ باب العیدین)

۴ـه جس راستے سے جائے اس کے سوا دوسرے راستے سے واپس آنا۔
(بہشتی زیور ص۱۰۱ عیدین کی نماز کا بیان)

۵ـه لما قال العلامة ابوبکر الحداد الیمنیؒ: ولا یکبر فی طریق المصلی عند ابی حنیفةؒ یعنی جهراً اما سراً فمستحب وهذا فی یوم الفطر لان الاصل فی الثناء الاخفاء۔
(الجوهرة النیرة ج۱ ص۱۱۲ باب العیدین)

۶ـه لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولا یتنفل قبلها مطلقاً...... وکذا لا یتنفل بعدها فی مصلاها وان تنفل بعدها فی البیت جاز۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار جلد ۲ ص۱۷۱ باب العیدین)

۷ـه لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویصلی الامام بهم رکعتین مثنیا قبل الزوائد وهی ثلاث تکبیرات فی کل رکعة۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۷۲ باب العیدین)

۸ـه وفی الهندیة: ویستحب ان یفتتح الخطبة الاولیٰ بتسع تکبیرات تتری والثانیة بسبع۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۵۰ باب العیدین)

۹ـه ویسن خطبتان...... بجلسة بینهما۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۱۷۸ باب العیدین)

۱۰ـه وہ عورتیں اور لوگ جو کسی وجہ سے نمازِ عید نہ پڑھیں ان کو قبل نمازِ عید کے کوئی نفل وغیرہ پڑھنا مکروہ ہے۔ (بہشتی زیور ص۸۸ حصہ یازدہم)

۱۱ـه قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: والسنة ان یخرج الامام الی الجبانة ویستخلف غیره لیصلی فی المصر بالضعفاء والمرضی بناءً علیٰ ان صلوٰة العیدین فی موضعین جائزة بالاتفاق۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۱ ص۲۱۳ باب العیدین)

۱۲ـه وفی الهندیة: ولو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا یقضیها من فاتته خرج الوقت او لم یخرج۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۵۲ باب العیدین)

۱۳ـه قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وان فاتت مع الامام وتؤخر بعذر الی الغد فقط۔ (کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج۲ ص۱۶۲ باب صلوٰة العیدین)

۱۴ـه، ۱۵ـه لما فی الهندیة: ولو انتهی رجل الی الامام فی الرکوع فی العیدین فانه یکبر الافتتاح قائماً فان امکنه ان یاتی بالتکبیرات ویدرک فعل ویکبر علیٰ رأی نفسه وان لم یمکنه رکع واشتغل بالتکبیرات ولا یرفع یدیه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۱۵۱ الباب السابع عشر فی صلوٰة العیدین)۔

۱۶؎ لما فی الهندیة : ولو رفع الامام رأسه بعد ما أدّی بعض التکبیرات فانہ یرفع رأسه ویتابع الامام وتسقط عنہ التکبیرات الباقیة ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۵۱ باب صلوٰة العیدین)

۱۷؎ ولو ادرکہ فی القومة لایقضی فیها لانہ یقضی الرکعة الاولیٰ مع التکبیرات ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۵۱ باب العیدین)

۱۸؎ واذا نسی الامام تکبیرات العیدین حتی قرء فانہ یکبر بعد القراءة او فی الرکوع مالم یرفع رأسه ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۵۱ الباب السابع عشر فی صلوٰة العیدین)

۱۹؎ لما فی الهندیة : الا مشائخنا قالوا لایسجد للسهو فی العیدین والجمعة لئلا یقع الناس فی الفتنة ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۲۸ باب العیدین)

۲۰؎ ومنها ان یخطب قائماً فالقیام سنة فلیس بشرط حتی لو خطب قاعداً یجوز عندنا ۔
(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۶۳ باب الجمعة)

۲۱؎ قال العلامة الحصکفیؒ : لاینبغی ان یصلی غیر الخطیب لانهما کشیٔ واحد فان فعل بأن خطب صبیٌ باذن السلطان وصلی بالغ جاز هو المختار ۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۱ ص ۵۵۲ باب الجمعة)

۲۲؎ قال العلامة الکاسانیؒ وعن عمر رضی الله عنه انہ قال طولوا الصلوٰة وقصروا الخطبة ۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۶۳ باب الجمعة)

۲۳؎ صدقة الفطر واجبة علی الحر المسلم اذا کان مالکا لمقدار النصاب فاضلاً عن مسکنه وثیابه واثاثه وفرسه وسلاحه وعبیده ۔ اما وجوبها فلقوله علیه السلام فی خطبته ادوا عن کل حرّ وعبد صغیر او کبیر نصف صاع من بر او صاع من شعیر ۔ رواه ثعلبة بن صعیر العدوی ۔ (الهدایة ج ۱ ص ۱۹ باب صدقة الفطر)

۲۴؎ وزن انگریزی سے وزن صاع کا قریب آدھ پاؤ اور ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے اور نصف صاع پونے دو سیر ایک چھٹانک ہوتا ہے ۔ (بہشتی زیور باب صدقۃ الفطر)

کتاب الجنائز

باب حقوق الزوجین

(خاوند اور بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق کے بیان میں)

میاں بیوی کے ایکدوسرے پر حقوق کا حکم

سوال:۔ از روئے شرع بیوی پر خاوند کے اور خاوند پر بیوی کے کیا کیا حقوق ہیں؟

الجواب:۔ خاوند اور بیوی کے ایک دوسرے پر بہت سے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اور پورا کرنا از روئے شریعتِ مطہرہ لازمی ہے، ان میں بعض حقوق مشترکہ ہیں اور بعض خاص ہیں، مثلاً مہر، نان نفقہ، کسوہ، مکان، اعفاف الزوجہ، عدل وانصاف وغیرہ بیوی کے حقوق منفردہ ہیں اور جائز امور میں خاوند کی اطاعت، اس کی امانت کی حفاظت (مثل عصمت کا تحفظ، مال واولاد وغیرہ کی حفاظت) خاوند کا حق تادیب اور عورت کا حیض ونفاس سے پاک ہونے پر جنابت کے لیے غسل کرنا اور دیگر خاوند کے حقوق منفردہ ہیں۔ اور ایک دوسرے سے حسنِ معاشرت، نرمی کا مظاہرہ اور ایک دوسرے کی تکلیف برداشت کرنا وغیرہ حقوق مشترکہ ہیں، لیکن خاوند کی ذمہ داریوں کی کثرت کیوجہ سے اس کا حق عورت پر زیادہ ہے۔ ویدل علیہ ما یأتی۔ قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ: اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (سورۃ النساء آیت ۳۴) وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸) وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۹)

وَقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وان لزوجك علیك حقاً۔ (صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۹۹۵ کتاب النکاح)

واستوصوا بالنساء خیراً۔ (صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۹۸۷ کتاب النکاح)[۱]

بیوی کا خاوند کے مال سے اپنا حق وصول کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بیوی کو نفقہ دینے سے انکار کرے تو کیا اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خاوند کے مال سے اپنا حق اس کی اجازت کے بغیر وصول کرے؟

الجواب:۔ اگر خاوند کا بیوی کو نفقہ دینے سے انکار کسی ایسی وجہ سے ہو جس میں عورت کے کسی جرم کا دخل نہ ہو تو نفقہ بوجہ لزوم عورت کا حق ہے اور وہ کسی بہانے سے خاوند کے مال سے

---

[۱] وَانْظُرْ لِلتَّفْصِیْلِ: (البحر الرائق ج ۴ ص ۱۲۸ کتاب النکاح، والفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۷ ص ۳۲۷ الی ۳۴۳ الفصل السابع حقوق الزواج وواجباتہ)

اپنا حق وصول کرسکتی ہے، تاہم اگر کہیں عورت کی نافرمانی کی وجہ سے خاوند نے اس کو نفقہ سے محروم کررکھا ہوتو پھر عورت کی نافرمانی کی وجہ سے اس کا یہ حق باقی نہیں رہتا۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت إن ھند بنت عُتبۃ قالت یارسول اللہ إن اباسفیان رجل شحیح ولیس یعطینی مایکفینی وولدی إلا ما أخذت منہ وھو لا یعلم فقال خذی مایکفیك وولدك بالمعروف ۔متفقٌ عَلَیْہِ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۲ ص۲۹۰ کتاب النکاح)[1]

ایک بیوی سے زیادہ محبت رکھنا دوسری بیویوں کی حق تلفی نہیں

سوال:- اگر ایک آدمی کی تین یا چار بیویاں ہوں اور ان میں کسی ایک کی طرف اس کا قلبی میلان اور اس کے ساتھ محبت زیادہ ہو تو کیا اس سے دوسری بیویوں کی حق تلفی لازم آتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- تین یا چار بیویوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کسی وجہ سے قلبی محبت زیادہ ہو اور دیگر حقوق میں سب کے ساتھ برابری اور عدل کرتا ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں، شریعتِ مطہرہ کی نظر میں خاوند ایسے حقوق کا مکلف ہے جو اس کے دائرہ اختیار میں ہوں جبکہ ایک سے زیادہ بیویوں میں سے کسی ایک کے ساتھ قلبی محبت اس کی قدرت سے باہر ہے۔

قال فی الھندیۃ: ومما یجب علی الازواج للنساء العدل والتسویۃ بینھن فیما یملکہ والبیتوتۃ عندھا للصحبۃ والمؤانسۃ لا فیما لا یملك وھو الحب والجماع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۳۴۰ الباب السابع عشر فی النفقات)[2]

---

[1] قال فی الھندیۃ: فی کل موضع کان للقاضی أن یقضی لھا بالنفقۃ فلھا ان تأخذ من مال الزوج مایکفیھا بالمعروف بغیر قضاء۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۵۵۰ الباب السابع عشر فی النفقات)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۷۷-۱۹۶ باب النفقۃ۔

[2] قال الشیخ الکاسانی رحمہ اللہ: وروی عن ابی قلابۃ أنّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یعدل بین نساءہ فی القسمۃ ویقول اللھم ھذہ قسمتی فیما أملك فلا تؤاخذنی فیما تملك ولا أملك۔

(بدائع الصنائع ج۲ ص۳۳۲ باب النفقات)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۳۲ کتاب النکاح۔ باب النفقات۔

بیوی کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے

سوال:۔ اگر بیوی خاوند کے اقارب (ماں باپ) کے ساتھ رہنا پسند نہ کرے اور اپنے رہنے کے لیے علیحدہ مکان کا مطالبہ کرے تو کیا خاوند کے ذمہ لازم ہے کہ اس کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کرے؟

الجواب:۔ اگر بیوی کسی وجہ سے خاوند کے عزیز واقارب کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کے لیے علیحدہ جگہ کا انتظام کرے یہ ضروری نہیں کہ کسی علیحدہ جگہ میں مکان بنانے کی تکلیف کرے بلکہ گھر کے اندر ہی اگر کوئی ایسا کمرہ بیوی کے لیے ہو جس میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہو تو پھر بھی اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ: وکذا تجب لہا السکنی فی بیت خالٍ عن أھلہ سوی طفلہ الذی لایفھم الجماع وأمتہ وأم ولدھا من غیرہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۷۱۹)[1]

خاوند بیوی کی رضامندی کے بغیر اسے کسی دوسرے ملک میں ساتھ نہیں لے جا سکتا

سوال:۔ ایک لڑکے اور لڑکی کے درمیان نکاح ہوگیا ہے، لڑکا کسی دوسرے ملک میں رہتا ہے اور وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے جبکہ لڑکی اور اس کے والدین یہ نہیں چاہتے کہ لڑکی اس کے ساتھ دوسرے ملک چلی جائے، تو کیا خاوند کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے طاقت استعمال کرے؟

الجواب:۔ اگر لڑکی اور اس کے والدین راضی نہ ہوں تو لڑکا لڑکی کو جبراً اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک نہیں لے جا سکتا۔

قال فی الھندیۃ: وکثیر من المشائخ علیٰ أنہ لیس للزوج أن یسافر بہا فی زماننا

---

[1] قال ابن نجیمؒ: أی الإسکان للزوجۃ علیٰ زوجہا لأن من کفایتہا فتجب لہا کالنفقۃ وقد أوجبہا اللہ تعالیٰ کما أوجب النفقۃ۔ بقولہٖ تعالیٰ: أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ۔ ای من طاقتکم مما تطیقونہ مِلکاً أو إجارۃً او عاریۃ اجماعاً واذا وجبت حقاً لہا لیس لہ أن یشترک غیرہا لأنہا تتضرر بہٖ...... ولو کان الخلاء مشترکا بعد أن غلقہ یخصہ ولیس لہا أن تطالبہ بمسکن آخر۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۹۳، ۱۹۴ باب النفقۃ)

ومِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۵۵۶ الباب السابع فی النفقات۔

وإنْ أوفاها المهر ولكنّ بنقلها إلى القرى أين أحبّ وعليه الفتوى۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۳۱۷ الفصل الحادي عشر في منع المرأة نفسها بمهرها) [۱]

بیوی سے ہمبستری کرنا کن اوقات میں جائز نہیں

سوال:۔ کیا بیوی سے جماع کے لیے کچھ ممنوعہ اوقات ہیں؟ جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز ظہر کے بعد، عید کے دن، شب برات وغیرہ اوقات ومواضع میں جماع کرنا منع ہے، کیا یہ درست ہے؟

الجواب:۔ شرعی موانع (حیض ونفاس کی حالت) کے علاوہ جماع کے لیے مخصوص اوقات کے تعین اور بعض سے ممانعت کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ قال اللہ سبحانہ وتعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ۔ (البقرہ آیت ۲۲۳)

قال الرّازی رحمہ اللہ: اختلف المفسرون فی تفسیر قولہ أنّیٰ شِئْتُمْ: والمشهور ما ذكرناه أنه يجوز للزوج أن يأتيها من قُبُلها ومن دُبُرها فى قُبُلها والثاني أن المعنى أى وقت شئتم من أوقات الحل يعنى إذا لم تكن أجنبية أو محرمة أو صائمة أو حائضا... والخامس متى شئتم من ليل أو نهار۔ (تفسیر کبیر للرازی ج ۶ ص ۶۸ سورة البقرة) [۲]

مباشرت کا طریقہ

سوال:۔ مباشرت کا صحیح طریقہ شرعاً کس طرح ہے؟

الجواب:۔ منہ اور دُبر سے اجتناب کیا جائے اور حیض ونفاس کی حالت میں ناف سے لیکر زانو تک بلا حائل نفع نہ لیا جائے، باقی تمام کیفیات جائز ہیں۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ۔ (البقرہ ۲۲۳)

---

[۱] قال ابن عابدینؒ: ثم ذکر عن الفقيهين أبي القاسم الصفار وأبي الليث أنه ليس له السفر مطلقاً بلا رضاها لفساد الزمان لأنها لا تأمن على نفسها في منزلها فكيف إذا خرجت وأنه صرح في المختار بأن عليه الفتوى وفي المحيط أنه المختار وفي الولوالجية أن جواب ظاهر الرواية كان في زمانهم أما في زماننا فلا۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۹۱ باب النفقة)

ومثلہ في البحر الرائق ج ۳ ص ۱۷۹ باب النفقة۔

[۲] قال الكاسانیؒ: وللزوج أن يطالبها متى شاء إلا عند اعتراض أسباب مانعة من الوطء كالحيض والنفاس والظهار والإحرام وغير ذلك۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۳۱ النفقات)

ومثلہ في نيل الأوطار ج ۶ ص ۲۲۵ باب النفقات۔

وقال الله عزّ وجل: فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ۔ (البقرة ۲۲۲)

جماع کے آداب

سوال:۔ جماع کے کیا کیا آداب ہیں؟ وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ جماع سے مقصود اولاد اور تحصین الفرج ہو شہوت رانی مقصود نہ ہو، پردے کا اہتمام ہو، بالکل برہنہ نہ ہو، قبلہ رخ نہ ہو، جماع سے قبل ماثورہ دعائیں پڑھی جائیں، حالتِ جماع میں زیادہ باتیں نہ کی جائیں، جماع سے قبل ملاعبت وضم وتقبیل کی جائے، مرد عورت کے انزال کے بعد اٹھے۔[۳]

قال الله عزّ وجل: وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ۔ (النساء)

وقال النبيّ صلى الله عليه وسلم: لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَتَى أَهْلَهُ قَالَ بسم الله اللهم جنبنا الشيطٰن وجنب الشيطٰن ما رزقتنا فقضي بينهما ولد لم يضره۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۶۶ کتاب الوضوء)[۲]

---

۱ عن ابن عباسؓ قال جاء عمرؓ إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله هلكت قال وما الذي اهلكك قال حولت رحلي البارحة فلم يرد عليه شيئاً قال فأوحى الله إلى رسوله هذه الآية: نساءكم حرث لكم فأتوا حرثكم أنى شئتم۔ أقبل وأدبر واتقوا الدبر والحيضة۔ رواه احمد والترمذي وقال هذا حديث حسن غريب۔ (نيل الاوطار ج۶ ص۲۱۷) وذكر الشوكاني حديث آخر۔ فلما قدم المهاجرون المدينة تزوج رجل إمرأة من الانصار فذهب يصنع بها ذلك فأنكرته عليه وقالت إنما كنا نؤتى على حرف فاصنع ذلك وإلا فاجتنبني فسرى أمرهما حتى بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم فأنزل الله عزوجل: نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ۔ يعني مقبلات ومدبرات ومستلقيات يعني بذلك موضع الولد۔ (المرجع السابق)۔ ومثله في تفسير القرطبي ج۳ ص۹۳ سورة البقرة۔

۲ قال النبي صلى الله عليه وسلم: إذا أتى أحدكم أهله فليستتر ولا يتجردا تجرد العيرين۔ رواه ابن ماجه۔ (نيل الاوطار ج۶ ص۲۴۴ كتاب النكاح، باب التسمية والستر عند الجماع)

ومثله في إعلاء السنن ج۷ ص۴۰۸ كتاب الحظر والإباحة۔

قال الدكتور وهبة الزحيلي: للجماع آداب كثيرة ثابتة في السنة النبوية منها ما يأتي تستحب التسمية ويقرأ قل هو الله أحد ويكبر ويهلل ويقول ولو مع اليأس عن الولد بسم الله العلي العظيم اللهم اجعلها ذرية طيبة إن كنت قدرت أن تخرج ذلك من صلبي اللهم جنبني الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتني رواه ابوداؤد۔ وينحرف عن القبلة ولا يستقبل القبلة بالوقاع اكراماً للقبلة وأن يتغطى نفسه هو وأهله بغطاء وأن لا يكونا متجردين فذلك مكروه كما سيأتي۔ وان يبدأ بالملاعبة والضم والتقبيل وإذا قضى وطره فليتمهل لتقضي وطرها فإن إنزالها ربما تأخر ويكره الاكثار من الكلام حال الجماع۔ (الفقه الاسلامي وأدلته ج۳ ص۵۵۵ الفصل السابع في حقوق الزواج)

بیوی کے علاج معالجہ کا خرچہ کس کے ذمہ ہے

سوال:۔ شادی کے بعد بیماری کے دوران لڑکی کے والدین اس کے علاج معالجہ پر جو خرچ کریں تو کیا وہ یہ خرچہ خاوند سے لے سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیماری و مرض کے علاج کا خرچہ شرعاً خاوند کے ذمہ نہیں تاہم اگر خاوند تبرع کرے تو باعثِ اجر ہے ۔

قال فی الهندیة : ولا یجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة۔
(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۵۴۹ الباب السابع عشر فی النفقات) [۱]

حاملہ بیوی سے جماع کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ کیا بیوی سے حالتِ حمل میں جماع کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر ضرر اور تکلیف پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو حاملہ بیوی کے ساتھ جماع کرنا جائز ہے ۔

قال فی الهندیة : وأما اذا أقر الزوج أن الحبل منه فالنکاح صحیح بالاتفاق وهو غیر ممنوع من وطئها۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۵۴۶ الباب السابع عشر فی النفقات) [۲]

نابالغ بیوی سے جماع کرنا

سوال:۔ کیا خاوند اپنی نابالغ بیوی سے جماع کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ بیوی کے ساتھ جماع کرنے کے لیے عمر کی کوئی خاص قید نہیں بلکہ جب بھی منکوحہ میں جماع کے لیے قوتِ برداشت پیدا ہو اور اس سے جماع کرنے سے کسی بیماری کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی حالت میں نابالغ بیوی کے ساتھ جماع کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر بیوی کی حالت ایسی ہو کہ بالغ ہونے کے باوجود اس کی صحت جماع

---

[۱] قال ابن عابدین رحمہ اللہ :- وعلیه ما تقطع به الخصام لا الدواء للمرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصاد ولا الحجام ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۶۰۴ باب النفقة)
ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ۴ ص ۱۷۷ باب النفقة ۔

[۲] قال ابن نجیمؒ : أما التزوج الزانی بها (للحاملة) فجائز اتفاقاً وتستحق النفقة عند الکل ویحل وطؤها عند الکل کما فی النهایة ۔ (البحر الرائق ج ۴ ص ۱۰۶ باب النفقة)
ومثلهٗ رد المحتار ج ۲ ص ۳۱۷ باب النفقة ۔

کی اجازت نہیں دیتی ہو بلکہ جماع کرنے کی وجہ سے امراض پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ان حالات میں منکوحہ کے بالغ ہونے کے باوجود اس سے جماع جائز نہیں۔

قال فی الھندیۃ : واکثر المشائخ علیٰ انہ لا عبرۃ للسن فی ھذا الباب وانما العبرۃ للطاقۃ إن کانت فخمۃ سمینۃ تطیق الرجال ولا یخاف علیھا المرض من ذلک کان للزوج أن یدخل بھا وان لم تبلغ تسع سنین وان کانت نحیفۃ مھزولۃ لا تطیق الجماع ویخاف علیھا المرض لا یحل للزوج أن یدخل بھا وإن کبر سنھا۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۲۸۷ الباب الرابع فی الاولیاء (الفصل الرابع) [1]

حالتِ حیض میں منکوحہ سے جماع کے علاوہ استمتاع کرنا

سوال :۔ حالتِ حیض میں خاوند اپنی بیوی سے جماع تو نہیں کرسکتا لیکن اس کے علاوہ استمتاع کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ حیض ونفاس کی حالت میں خاوند کے لیے اپنی بیوی سے جماع کرنا ناجائز اور حرام ہے لیکن اس کے علاوہ "مافوق الازار" استمتاع میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر استمتاع سے جماع تک نوبت پہنچنے کا احتمال ہو تو اس سے بھی بچنا چاہیئے، جبکہ وقوع فی الزنا سے بچنے کے لیے مافوق الازار استمتاع کا طریقہ اپنانا زیادہ محتاط ہے۔

قال فی الھندیۃ : ولہ أن یقبلھا ویضاجعھا ویستمتع بجمیع بدنھا ماخلا بین السرۃ والرکبۃ عند أبی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۳۹ الفصل الرابع فی احکام الحیض والنفاس) [2]

بیوی سے استمناء بالید کرانا

سوال :۔ اگر بیوی حیض ونفاس یا دیگر امراض کی وجہ سے جماع کے قابل نہ ہو اور خاوند کو جماع کی ضرورت ہو تو کیا وہ بیوی کے ہاتھ

---

[1] قال ابن نجیمؒ : وفی الخلاصۃ واکثر المشائخ علیٰ أنہ لا عبرۃ للسن فیھما وانما المعتبر الطاقۃ ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۱۲۰ باب الاولیاء والاکفاء)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۳۲۹ و ص۳۷۷ باب الاولیاء والاکفاء ۔

[2] قال ابن نجیمؒ : ویمنع الحیض قربان زوجھا ماتحت ازارھا اماحرمۃ وطئھا فجمع علیھا لقولہ تعالیٰ : وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ ...... واما الاستمتاع بھا بغیر الجماع فمذھب ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ والشافعیؒ ومالکؒ یحرم علیہ ما بین السرۃ والرکبۃ وھو المراد بما تحت الازار۔ (البحر الرائق ج۱ ص۱۹۷)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۱ ص۴۴ کتاب الحیض۔

سے استمناء کراسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ ایسی حالت میں فعل حرام سے بچنے کا امکان ہو۔

الجواب: مذکورہ اعذار کی وجہ سے اپنی بیوی سے استمناء بالید کرانا جائز ہے ورنہ مکروہ تنزیہی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: ویجوز ان یستمنی بید زوجته وخادمته ولینظر ما ذکرہ الشارح فی الحد وعن الجوهرة انه یکره ولعل المراد به کراهة تنزیهیة۔ (رد المحتار ج ۲ ص۱۰۹) [1]

بیوی کے برہنہ بدن کو دیکھنا

سوال: کیا خاوند اپنی بیوی کا برہنہ بدن جماع کے وقت یا اس کے علاوہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قرآن کریم کے انداز بیان "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان رشتۂ ازدواج کی وجہ سے پردہ کی کیفیت باقی نہیں رہتی، اس لیے میاں بیوی کے لیے ایک دوسرے کے بدن پر نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم فقہاء کرامؒ نے شرمگاہ پر نظر ڈالنے سے اجتناب کرنے کو بہتر لکھا ہے۔

قال الطوریؒ تحت قول النسفیؒ: "وینظر الرجل الیٰ فرج امته وزوجته" یعنی عن شهوة وغیر شهوة۔ قال علیه الصلوٰة والسلام غض بصرك الا عن زوجتك وامتك وما روی عن عائشةؓ قالت کنت اغتسل انا ورسول الله صلی الله علیه وسلم من اناء واحد۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۹۳ کتاب الکراهیة۔ فصل فی النظر) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ المصری رحمة الله: وهل یحل الاستمناء بالکف خارج رمضان ان اراد الشهوة لا یحل لقوله علیه السلام ناکح الید ملعون وان اراد التسکین الشهوة یرجی ان لا یکون علیه وبال۔ (البحر الرائق ج۲ ص۲۷۲ باب ما یفسد الصوم ما لا یفسد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۲۰۳ الباب الرابع فیما یفسد وما لا یفسد۔

[2] قال فی الهندیة: اما النظر الیٰ زوجته ومملوکته فهو حلال من قرنها الیٰ قدمها عن شهوة وغیر شهوة وهذا ظاهر الا ان الاولیٰ ان لا ینظر کل واحد منهما الیٰ عورة صاحبه کذا فی الذخیرة۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۲۷ الباب الثامن فیما یحل للرجل النظر الیه)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۱۹ کتاب الاستحسان۔

كتاب الطلاق

الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان

باب شرائط الطلاق

(طلاق کی شرائط اور اسکے احکام و مسائل)

نکاح سے پہلے دی گئی طلاق کالعدم ہے

سوال:- ایک شخص نے خطبہ کے بعد نکاح سے قبل اپنے سسر کو خط لکھا کہ آپ کی بیٹی مجھ سے آزاد ہے اور مجھ پر طلاق ہے، کیا اس کے بعد ان دونوں کے درمیان نکاح جائز ہے ؟

الجواب:- چونکہ طلاق قبل النکاح کالعدم ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں الفاظ لغو ہو کر بعد میں نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ:- فلغا قوله لاجنبية ان زرت زيدًا فانت طالق فنكحها فزارت۔ وقال لعدم الملك والاضافة اليه (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۵۳۶ کتاب الطلاق، مطلب التعليق المراد به المجازاة دون الشرط).[1]

طلاق میں اضافت ضروری ہے

سوال:- ایک شخص کو طلاق دینے پر مجبور کرتے ہوئے ڈرایا دھمکایا گیا جس سے وہ شخص حواس باختہ ہو گیا اور طلاق دیتے وقت بیوی کا نام لے کر اس کے باپ کی جگہ دادا کی طرف نسبت کی، کیا والد کے نام میں غلطی سے طلاق پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- طلاق پر تلفظ کرتے وقت اکراہ مؤثر نہیں اس لیے جبر و اکراہ کے باوجود طلاق واقع ہو جاتی ہے، خاوند عموماً اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں باپ کی طرف نسبت نہ ہونے کے باوجود صرف عورت کا نام لینے سے طلاق واقع ہو جائے گی، ایسا ہی باپ کی جگہ دادا کی طرف نسبت کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، بظاہر طلاق کے واقع

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: فلو قال لاجنبية ان زرت زيدًا فانت طالق فنكحها فزارت لم تطلق لانه حين عقده لا يصح جعله ايقاعًا لعدم المحل۔

(البحرالرائق ج ۴ ص ۸ کتاب التعليق، تحت قوله فلو قال لاجنبية)

ومثلهٗ فی فتح القدیر ج ۳ ص ۱۲۶ کتاب الطلاق، باب الایمان فی الطلاق۔

ہونے میں کوئی امر مانع نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : لو قال امرأۃ طالق او قال طلقت امرأۃ ثلاثاً وقال لم اعن امرأتی یصدق ویفہم منہ انہ لو لم یقل ذلک تطلق امرأتہ لان العادۃ ان من لہ امرأۃ انما یحلف بطلاقہا لا بطلاق غیرہا۔ وقال: بخلاف ما لو ذکر اسمہا او اسم ابیہا اوامہا او ولدھا..... فقد صرحوا بانہا تطلق وانہ لو قال لم اعن امرأتی لا یصدق قضاءً اذا کانت امرأتہ کما وصف۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۶۶ باب الصریح، کتاب الطلاق) ؎۱

بیوی کو ڈرانے دھمکانے کیلئے طلاق کا لفظ کہنا

سوال:۔ کسی شخص نے بیوی کو ڈرانے دھمکانے کے لیے طلاق کا لفظ استعمال کیا جبکہ اسکی نیت طلاق کی نہ تھی، تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق کے لفظ صریح میں نیت وارادہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، اس لیے جب بھی عورت کو یہ الفاظ استعمال کئے جائیں تو اس سے طلاق واقع ہو جائے گی۔

قال النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام: ثلاث جدھن جد وھزلھن جد النکاح والطلاق والعتاق۔ (نصب الرایۃ ج۳ ص۲۹۳ کتاب الایمان) ؎۲

طلاق کے وقوع کے لیے خاوند کا بلوغ شرط ہے

سوال:۔ والد نے نابالغ بیٹے کا کسی بالغ لڑکی سے نکاح کر دیا اب دونوں خاندانوں کے تعلقات اس حد تک خراب ہو گئے ہیں کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی ہے

؎۱ وقال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ولذا لو لم ینسبہا الی ابیہا وانما نسبہا الی امہا او ولدھا تطلق۔ وقال: فقال ذلک وھو یعلم نسب امرأتہ او لا یعلم طلقت امرأتہ ولا یصدق قضاء وفیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ لا یقع ان کان یعرف نسبہا وان کان لا یعرف یقع دیانۃ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۵۳،۲۵۴ کتاب الطلاق)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق۔

؎۲ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: اوھازلا لا یقصد حقیقۃ کلامہ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۴۵۹ کتاب الطلاق، مطلب فی المسائل التی تصح للاکراہ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۴۴ کتاب الطلاق۔

اندریں صورت کیا نابالغ لڑکا طلاق دے گا یا اس کا والد اُس کی طرف سے طلاق دے کر عورت کو فارغ کرے گا؟

الجواب:۔ ایسی صورت میں نابالغ خاوند خود طلاق نہیں دے سکتا کیونکہ طلاق کے وقوع کے لیے خاوند کا بلوغ شرط ہے اور نہ یہ لڑکا اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کر سکتا ہے، والد نابالغ بیٹے کا نکاح تو خود کرا سکتا ہے لیکن اس کی طرف سے طلاق دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں عورت خاوند کے بلوغ کا انتظار کرے گی، البتہ اگر کہیں عصمتِ نفس یا نان نفقہ کا مسئلہ درپیش ہو تو پھر مجبوراً عورت حاکمِ وقت کی وساطت سے فسخِ نکاح کی ڈگری حاصل کر سکتی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا یقع الطلاق الصّبیّ ولو مراهقًا۔

(الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الطلاق)

اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: الطلاق لمن اخذ الساق۔

(ابن ماجة ص۱۴۷ ابواب الطلاق) لہ

نابالغہ کو دی گئی طلاق کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے نابالغ لڑکی سے نکاح کیا اور ابھی وہ نابالغ تھی کہ اس نے طلاق بھی دے دی، کیا اس نابالغ لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وقوعِ طلاق میں منکوحہ کا اعتبار ہے چاہے منکوحہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لیے نابالغ لڑکی پر طلاق کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں لڑکی مطلقہ ہو جائے گی۔

قال العلامة ابن همامؒ: فی بیان شرائط الطلاق، وفی الزوجة ان تکون منکوحته۔ (فتح القدیر شرح الهدایة ج۳ ص۳۲۶ کتاب الطلاق تحت شرطه) ۲ہ

لہ وفی الهندیة: ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۵۳، کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة وفتح القدیر ج۳ ص۳۴۳ کتاب الطلاق۔

۲ہ قال العلامة التمرتاشیؒ: ومحله (ای الطلاق) المنکوحة۔

(تنویر الابصار علیٰ هامش ردالمختار ج۳ ص۳۵۲ کتاب الطلاق، مطلب طلاق الدور)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۳ ص۲۳۶ کتاب الطلاق۔

مجنون کی طلاق کا حکم سوال:۔ اگر ایک شخص مجنون ہو اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق کے وقوع کے لیے خاوند کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے، چونکہ مجنون عقل کی نعمت سے محروم ہوتا ہے اس لیے مجنون اگر طلاق دیدے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

لما فی الھندیۃ: ولا یقع طلاق الصبیّ وان کان یعقل والمجنون۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقہ وفیمن لا یقع طلاقہ)[۱]

بے وقوف کی طلاق کا حکم سوال:۔ کسی شخص میں بالغ ہونے کے بعد کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی بلکہ شروع ہی سے سادہ اور بھولا بھالا چلا آرہا ہے، والدین نے اس کی شادی کردی، دنیا کے جس کام پر اس کو لگایا جائے تو بڑی چستی سے وہ کام کرتا ہے لیکن دنیا کے کسی بھی رسم ورواج سے واقف نہیں، کھانے پینے یا کپڑے پہننے میں عام لوگوں کی طرح ہے، کیا ایسے شخص کی دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا شخص سفیہہ ہے اور اسکی دی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اس کے تصرفات شرعاً معتبر ہیں، البتہ جو شخص فاسد التدبیر ہو اور اس کو اپنی باتوں کا اندازہ نہ ہو عموماً بیہودہ، بے ربط اور بے جوڑ باتیں کرتا ہو ایسا شخص معتوہ ہے جسکی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لما فی الھندیۃ: ولا یقع طلاق الصبیّ وان کان یعقل والمجنون وکذلک المعتوہ لا یقع طلاق۔ ایضاً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقہ وفیمن لا یقع طلاقہ)[۲]

بیہوشی کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم سوال:۔ اگر ایک شخص حواس باختہ ہوکر ایسی کیفیت میں طلاق دے کہ اس کو یہ پتہ نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں یہاں تک کہ اس کو رات ودن کی تمیز بھی نہ ہو، تو کیا ایسے شخص کی دی گئی طلاق واقع

---

[۱] قال العلامۃ صدر الشریعۃ: لا طلاق صبیّ ومجنون ونائم۔ (شرح الوقایہ ج ۲ ص۷۱ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق)
ومثلہٗ فی فتح القدیر ج ۳ ص۳۵ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق۔

[۲] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: واحسن الاقوال فی الفرق بینھما ان المعتوہ ھو قلیل الفھم المختلط الکلام، الفاسد التدبیر لکن لا یضرب ولا یشتم بخلاف المجنون۔ (رد المحتار ج ۲ ص۶۲۴ کتاب الطلاق)
ومثلہٗ فی البحر الرائق شرح الکنز الدقائق ج ۳ ص۲۴۹ کتاب الطلاق۔

الجواب:۔ طلاق دیتے وقت عقل وحواس کی موجودگی ضروری ہے، اگر کسی شخص کے حواس بیہوشی کی وجہ سے ختم ہوجائیں تو اس حالت میں دی ہوئی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لایقع طلاق المولی علی امرأة عبده والمجنون والمدهوش فتح وفی القاموس: دهش الرجل تحیر ودهش بالبناء للمفعول فهو مدهوش وادهشه الله ۔الخ (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۴۶۳ کتاب الطلاق، مطلب طلاق المدهوش) [1]

معتوہ کی طلاق کا حکم

سوال:۔ جس شخص کو یہ پتہ نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، عموماً بے ربط اور بے جوڑ باتیں کرتا ہو، اگر ایسا شخص اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو کیا اس کی طلاق واقع ہوجائے گی؟

الجواب:۔ طلاق دینے کے لیے عاقل بالغ ہونا ضروری ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسے شخص کو فقہاء کرام "معتوہ" کہتے ہیں جس کی طلاق شرعاً واقع نہیں ہوتی ۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: ولا یقع طلاق الصبی والمعتوه ۔ (تنویرالابصار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الطلاق، تحت مطلب فی الحشیشة والافیون..... الخ) [2]

وسوسہ کی بیماری میں مبتلا شخص کی طلاق کا حکم

سوال:۔ ایک شخص جو کہ وسوسہ کی بیماری میں مبتلا ہو اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں ہمیشہ تردد رہتا ہو اور بسا اوقات کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر طلاق معلق کرتا ہو پھر اس کو طلاق معلق کرنے میں بھی وسوسہ اور شک پیدا ہوجاتا ہے، کبھی تو یہ گمان کرتا ہے کہ میں نے طلاق دی ہے اور کبھی طلاق نہ دینے کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے، جبکہ یقینی طور پر اس کو معلوم نہیں کہ اس نے طلاق دی ہے یا نہیں، تو ایسے شخص کی طلاق کی شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ طلاق کے وقوع کے لیے باقاعدہ قطع اور یقین ضروری ہے، جب تک

---

[1] وفی الهندیة: ولایقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیه والمدهوش۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لایقع طلاقه)
وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۲۴۹ کتاب الطلاق ۔

[2] وفی الهندیة: وکذلك المعتوه لایقع طلاقه ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لایقع طلاقه)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر شرح الهدایة ج۳ ص۳۴۳ فصل ولایقع طلاق الصبی..... الخ ۔

اس کو یقین نہ ہو تو شک اور وسوسہ کی بناء پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: علم انہ حلف ولم یدر بطلاق اوغیرہ لغا کما لوشك اطلق ام لا۔ (الدرالمختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۹۲ باب طلاق غیر مدخول بہا) [1]

نشہ کی حالت میں طلاق کا حکم | **سوال:۔** کیا نشہ کی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نشہ کی حالت میں اگرچہ انسان حواس کھو بیٹھتا ہے لیکن نشہ بذاتِ خود چونکہ غیر مشروع فعل ہے اس لیے اس سے طلاق زجراً واقع ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل.... ولو عبداً اومکرھاً اوسکران۔ (الدرالمختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۵۶ کتاب الطلاق، مطلب فی الاکراہ) [2]

غصہ کی حالت میں طلاق دینا | **سوال:۔** کیا غصہ کی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق عموماً غصہ کی حالت میں دی جاتی ہے اس لیے غصہ کا ہونا طلاق پر اثر انداز نہیں ہوتا، تاہم اگر غصہ کی کیفیت اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کو کلام سمجھنے کی طاقت نہ رہے تو مدہوش کے حکم میں ہو کر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: والذی یظهر لی ان کلامن المدهوش والغضبان لایلزم فیہ ان یکون بحیث لایعلم مایقول بل یکتفی فیہ بغلبة الهذیان واختلاط الجد بالهزل کما هو المفتی بہ فی السکران۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۳ تحت مطلب طلاق المدهوش، کتاب الطلاق) [3]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: سئل فی الرجل اذا شك انہ طلق امرأتہ ام لا فہل لایقع علیہ الطلاق الجواب نعم لایقع الطلاق۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۱ ص۳۷ کتاب الطلاق)

[2] قال العلامة ابن الهمامؒ: وطلاق السکران واقع۔ (فتح القدیر ج۳ ص۳۴۵ فصل ویقع طلاقہ کل زوج اذا کان عاقلاً بالغاً ولایقع طلاق الصبی والمجنون والنائم)

ومثلہٗ فی البحرالرائق شرح کنز الدقائق ج۳ ص۲۴۷ کتاب الطلاق۔

[3] قال العلامة ابن همامؒ: ولایقع طلاق الصبی والمجنون والمبرسم والمغمی علیہ والمدهوش کذلك۔ (فتح القدیر ج۳ ص۳۴۳ کتاب الطلاق، فصل ویقع طلاق کل زوج..... الخ

ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۲۴۹ کتاب الطلاق۔

غافل کی طلاق کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص نے کسی وجہ سے اپنے والد کو نکاح کرانے کی اجازت دی ہو مگر بعد میں وہ اپنی اجازت بھول گیا جبکہ والد نے اس کا نکاح کر دیا تھا تو اس شخص نے اپنی اجازت کے بھول جانے پر لاعلمی کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کو طلاق ہو، تو کیا اس کی طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا شخص غافل کے حکم میں داخل ہے اس لیے اسکی طلاق واقع نہیں ہو گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: او مخطئا بان اراد التکلم بغیر الطلاق فجری علی لسانه الطلاق او تلفظ به غیر عالم بمعناه او غافلاً او ساهیاً وبالفاظ مصحفة یقع قضاءً فقط بخلاف الهازل واللاعب فانه یقع قضاءً ودیانة۔ (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۲ ص۴۶۱ کتاب الطلاق) [1]

حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق دینا

سوال:۔ عن عبد الله ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه انه طلق امرأته وهی حائض علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فسأل عمر ابن الخطاب (رضی الله تعالیٰ عنه) رسول الله علیه عن ذٰلك فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم مره فلیراجعها ثم لیمسکها حتی تطهر ثم تحیض ثم تطهر ثم ان شاء امسك بعد ذٰلك وان شاء طلق قبل ان یمسها فتلك العدة التی امر الله ان تطلق لها النساء۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۳۰۳ کتاب الطلاق۔ باب الطلاق فی الحیض)

مذکورہ بالا حدیث شریف کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ عبداللہ سے کہہ دو کہ وہ بیوی سے رجوع کرلے۔ اس واقعہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا حالتِ حیض میں طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی شخص نے حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو اس کے لیے رجوع کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وقوعِ طلاق کے لیے حیض مانع نہیں اس لیے اگر خاوند بیوی کو حیض کی حالت میں

---

[1] وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وافاد ان طلاق الهازل واللاعب والمخطئ واقع کما قدمناه لکنه فی القضاء واما فیما بینه وبین الله تعالیٰ فلا یقع علی المخطئ۔
(البحرالرائق ج۳ ص۲۵۸ باب الطلاق ای الفاظه فی اوّل الصفحه)
ومثلهٗ فی فتح القدیر شرح الهدایة ج۳ ص۳۵۲ کتاب الطلاق۔

طلاق دے دے تو اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے تاہم حیض کی حالت میں چونکہ میاں بیوی کے درمیان عارضی دوری موجود رہتی ہے اس لیے حیض کی حالت میں طلاق دینا کراہت سے خالی نہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ عارضی بُعد طلاق کا محرک بن کر ایک گھرانے کو اجاڑ دے۔ حضرت ابن عمرؓ کے واقعہ میں ممانعت میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔

عن عبد اللّٰہ ابن عمر انہ طلق امرأتہ وھی حائض علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فسأل عمر ابن الخطاب رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن ذٰلک فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مرہ فلیراجعھا ثم لیمسکھا حتی تطھر ثم تحیض ثم تطھر ثم ان شاء امسک بعد ذٰلک وان شاء طلق۔ (ابو داؤد ج ۱ ص۲۵۳ کتاب الطلاق۔ باب الطلاق فی الحیض)

ورنہ حضرت ابن عمرؓ کو رجوع کرنے کے حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلاق تو واقع ہو گئی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع کا حکم فرمایا تھا۔

وقال الحصکفیؒ :۔ والبدعی ثلاث متفرقۃ اوثنتان بمرۃ اومرتین فی طھر واحد لارجعۃ فیہ اوواحدۃ فی طھر وطئت فیہ اوواحدۃ فی حیض ...... الخ

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۴۵۵ کتاب الطلاق واقسامھا ثلاثۃ ... الخ) لہ

طلاق کے لیے گواہ ضروری نہیں

سوال :۔ اگر ایک شخص بیوی کو گواہوں کے بغیر طلاق دیدے تو کیا اس سے طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

الجواب :۔ طلاق کا دارومدار خاوند کے تلفظ پر ہے، طلاق کا وقوع گواہوں کی موجودگی پر موقوف نہیں، بغیر گواہوں کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

وقال العلامۃ الحصکفیؒ :۔ لان رکن الطلاق ھو اللفظ او ما یقوم مقامہ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۴۶۵ کتاب الطلاق۔ باب الصریح)

لہ وفی الھندیۃ : والبدعی من حیث الوقت ان یطلق المدخول بھا وھی من ذوات الاقراء فی حالۃ الحیض۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۳۴۹ کتاب الطلاق واما البدعی فنوعان)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر شرح الھدایۃ ج ۳ ص۳۲۹ کتاب الطلاق۔ باب طلاق السنۃ۔

۲ لہ وقال الامام الکاسانیؒ : فرکن الطلاق ھو اللفظ الذی جعل دلالۃ علی معنی الطلاق لغۃ .... او ما یقوم مقام اللفظ۔ (بدائع الصنائع ج ۳ ص۹۸ فصل واما بیان رکن الطلاق)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۳ ص۳۲۵ کتاب الطلاق۔

حمل مانع وقوعِ طلاق نہیں

سوال :۔ اگر طلاق دیتے وقت منکوحہ حاملہ ہو تو کیا حمل کی موجودگی سے طلاق کے وقوع پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ منکوحہ کا حاملہ ہونا وقوعِ طلاق کیلئے مانع نہیں جس طرح غیر حاملہ منکوحہ پر طلاق واقع ہوسکتی ہے اسی طرح حاملہ بیوی کو طلاق دینے سے طلاق واقع ہوسکتی ہے، تاہم حاملہ مطلقہ کی عدت وضعِ حمل سے ہوگی۔ لقولہ تعالیٰ : واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔ (الطلاق ۴) م [۱]

حالتِ نفاس میں طلاق دینا

سوال :۔ کیا عورت کو نفاس کی حالت میں طلاق دینا جائز ہے؟ اور ایسی حالت میں عدت کیا رہے گی ؟

الجواب :۔ حیض کی طرح نفاس کی حالت میں طلاق دینا اگرچہ صحیح نہیں لیکن بہرحال طلاق واقع ہوجاتی ہے تاہم جب حالتِ نفاس میں طلاق دی جائے تو یہ ایام عدت میں شمار نہیں ہونگے بلکہ مستقل تین حیض عدت شمار ہوں گے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : والنفاس کالحیض۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۱ ص۲۴۲ کتاب الحیض) [۲]

جھوٹی گواہی کی بنیاد پر طلاق کا ثبوت

سوال :۔ اگر ایک عورت جھوٹے گواہوں کا سہارا لے کر حاکم کی عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرلے جبکہ خاوند طلاق دینے سے بالکل بے خبر ہو، کیا ایسی جھوٹی گواہی کی بنیاد پر عورت آزادی کے زعم میں عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ حقیقتِ حال کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، قاضی صرف گواہوں پر اعتماد کرکے فیصلہ کرتا ہے اس لیے حاکم یا قاضی کو جب گواہوں کے جھوٹ کا علم نہ ہوا ور ان کے ظاہر پر اعتماد کرکے فیصلہ کرے تو اس سے طلاق ثابت ہوکر عورت مطلقہ متصور ہوگی، تاہم قاضی کو گواہی قبول

---

[۱] قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ : وان کانت حاملا فعدتھا ان تضع حملھا۔
(الہدایۃ ج۲ ص۴۲۳ باب العدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۳ ص۱۹۳ فصل واما عدۃ الحیض۔۔۔ الخ۔

[۲] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ : ولما کان المنع منہ فیہ لتطویل العدۃ علیھا کان النفاس کالحیض۔ (البحرالرائق ج۳ ص۲۴۳ کتاب الطلاق)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۳۴۸ کتاب الطلاق۔ مطلب تفسیر الطلاق ورکنہ وشرطہ۔

کرتے وقت احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

لما فی الهندیة : وکذٰلك لوقضٰی بالطلاق بشهادة الزور مع علمها حل لها التزوج باخر بعد العدة...الخ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۲۸۳ الباب الثالث فی بیان المحرمات القسم التاسع المحرمات بالطلقات) ؎۱

طلاق نامہ پر جبراً دستخط کرانا

سوال :۔ ایک شخص سے زبردستی طلاق نامہ لکھوایا گیا ، زبان پر تلفظ نہ کرنے کے باوجود اس نے دستخط بھی کر دیئے، کیا اس حالت میں طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

الجواب: جبر واکراہ سے طلاق پر تلفظ کروانے میں زبردستی مؤثر نہیں، ایسی حالت میں مکرہ کی طلاق واقع ہو گی البتہ تحریری طلاق میں نیت کا اعتبار ہے، اس لیے تحریری طور پر طلاق لکھوانے میں جب زبردستی ہو تو نیت نہ ہونے کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہو گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وفی البحران المراد الاکراه علی التلفظ بالطلاق فلو اکراه علی ان یکتب طلاق امراته فکتب لا تطلق ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۴۲۱ کتاب الطلاق، مطلب فی الاکراه علی التوکیل بالطلاق والنکاح والعتاق) ؎۲

جبراً طلاق کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص پر جبر واکراہ کر کے طلاق دلوائی جائے تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائے گی؟

الجواب :۔ صورت مسئولہ کے مطابق احناف کے نزدیک مکرہ (جس پر جبر واکراہ کیا جائے) کی

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ : ولو قضی بطلاقها بشهادة الزور مع علمها بذٰلك نفذ وحل لها التزوج باخر بعد العدة۔ وقال ابن عابدینؒ : قوله وبقولهما یفتی قال الکمال وقول الامام اوجه واستدل له بدلالة الاجماع ۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۱۹ باب المحرمات مطلب فیما لو زوج المولیٰ امته.... الخ)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر علی الهدایة ج۳ ص۱۵۵ فصل فی بیان المحرمات ۔

؎۲ قال العلامة قاضی خانؒ : رجل اکره بالضرب او الحبس علی ان یکتب طلاق امرأته فلانة بنت فلان بن فلان فکتب فلانة بنت فلان بن فلان طالق لا تطلق..... الخ

(الفتاوی الخانیة علی هامش الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۷۲ فصل فی الطلاق بالکتابة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۳۷۹ الفصل السادس فی الطلاق بالکتابة ۔

طلاق واقع ہوتی ہے، لہٰذا عورت مطلقہ ہوجائے گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویقع طلاق کل زوج عاقل ..... ولو عبداً او مکرھا۔

(الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۲ ص۲۳۵ کتاب الطلاق) [۱]

بطورِ استہزاء دی ہوئی طلاق کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو بغیر نیت کے استہزاءً طلاق دی اور یہ طلاق اس نے بار بار دہرائی، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صریح الفاظ طلاق میں نیت کا کوئی اعتبار نہیں، نفس تلفظ سے طلاق واقع ہو جائے گی، اس لیے اگر کسی شخص نے بطورِ استہزاء بھی بیوی کو طلاق دیدی تو پھر بھی طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر متعدد بار یوں اقدام کیا تو متعدد طلاق واقع ہوں گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: بخلاف الھازل واللاعب فانہ یقع قضاءً و دیانۃً لان الشارع جعل ھزلہ بہ جداً۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۲۵ کتاب الطلاق، مطلب فی الحشیشۃ والافیون والبنج) [۲]

کنکریاں پھینکنے کا اعتبار نہیں بلکہ الفاظِ طلاق معتبر ہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بیوی کو ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا ہے البتہ ہاتھ میں تین پتھر رکھ کر پھینکے ہیں، کیا ایسی حالت میں الفاظ کا اعتبار ہے کہ جس سے بیوی پر ایک طلاق واقع ہو یا کنکریوں کا اعتبار کرکے تین طلاق معتبر ہوں گی؟

الجواب:۔ طلاق کے وقوع میں بنیادی حیثیت الفاظ کی ہے، پتھر پھینکنا بذاتِ خود کوئی طلاق

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: و طلاق المکرہ واقع۔ (الہدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج ۳ ص۳۴۴ باب الطلاق)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۳۵۳ فصل فیمن یقع طلاقہ وفیمن لایقع طلاقہ۔

[۲] وفی الھندیۃ: وفی واقعات الناطفی رجل قال لامرأتہ انت طالق کذ اتقع ثلاث کانہٗ قال انت طالق احد عشر کذا فی التاتارخانیۃ۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۳۵۷ الفصل الاول فی الطلاق الصریح)

وفیہ ایضاً: وطلاق اللاعب والھازل بہ واقع۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۳۵۳ فصل فیمن یقع طلاقہ وفیمن لایقع طلاقہ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص۶۸ کتاب الطلاق۔

نہیں، اس لیے اگر کسی نے بیوی کی طرف صرف پتھر پھینکے اور زبان پر کسی تلفظ سے باز رہا تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ زبان پر تلفظ کرتے وقت پتھر پھینکنے سے مافی الضمیر کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے اس لیے اگر تین پتھر پھینکتے ہوئے "تو طلاق ہے" کہہ دیا تو تین کی نیت کرتے ہوئے تین طلاق واقع ہو سکتی ہیں ورنہ ایک طلاق واقع ہو کر منکوحہ قابلِ رجوع ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وکذا لو القیٰ ثلاثة احجار الیها ولم یذکر لفظ الطلاق ونوی بها الطلاق الثلث لم یقع لعدم الرکن وهو اللفظ والنیّة انما تصح فی الملفوظ او ما یقوم مقامه۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۶۵ کتاب الطلاق) ۱ہ

اشارہ سے طلاق کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو ہاتھ سے اشارہ کر کے طلاق دے دے تو اس سے طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟ جبکہ زبان سے کچھ نہ کہے؟

الجواب:۔ اشارہ سے اس وقت طلاق واقع ہوتی ہے جب انسان بات کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو ورنہ تکلّم پر قدرت کے باوجود صرف اشارہ کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی الهندیة: ویقع طلاق الاخرس بالاشارة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۵۴ کتاب الطلاق، الباب الثانی، فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه) ۲ہ

۱ہ وفی الهندیة: ولو قالت لزوجها طلقنی فاشار بثلاث اصابع واراد بذلك ثلاث تطلیقات لا یقع مالم یقل بلسانه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۵۷ الفصل الاوّل فی الطلاق الصریح)

قال الحصکفیؒ: انت طالق هٰکذا مشیرًا بالاصابع المنشورة وقع بعدده۔ وفیه: ولو لم یقل هٰکذا یقع واحدة ------- ای بأن قال أنت طالق واشار بثلاث اصابع ونوی الثلاث ولم یذکر بلسانه فانها تطلق واحدة۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۴۷ کتاب الطلاق)۔

ومثل هٰذا فی الهدایة علیٰ صدر فتح القدیر ج۳ ص۳۸۷ فصل فی تشبیه الطلاق ووصفه۔
وَمِثْلُهٗ ذٰلك فی التاتارخانیة ج۳ ص۶۹۸ کتاب الطلاق۔

۲ہ قال الحصکفیؒ: ویقع طلاق الاخرس بالاشارة یرید به الذی ولد وهو اخرس او طرأ علیه ذٰلك ودام حتی صارت اشارته مفهومة والالم تعتبر۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج۳ ص۲۳۹ کتاب الطلاق، مطلب فی الخنثیٰ والمجنون والصبی)
وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۷۲ کتاب الطلاق، فصل فی الطلاق بالکتابة۔

ھازل کی طلاق کا حکم

سوال: اگر کسی شخص نے اپنے بچے کے ساتھ مزاح کرتے ہوئے کہا کہ تیری ماں طلاق ہے جبکہ اس کا ارادہ طلاق دینے کا قطعاً نہیں تھا، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: صریح طلاق کے الفاظ میں نیت و ارادہ کا ہونا ضروری نہیں، ارادہ نہ ہونے کے باوجود مزاح میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ایک طلاق واقع ہوگی، کیونکہ اس میں عدد کا ذکر نہیں۔ اور اگر کسی شخص نے ایسی حالت میں تین طلاق دی تو منکوحہ مطلقہ مغلظہ ہوگی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ویقع طلاق کل زوج عاقل ...... ولو ھازلاً۔
(الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۵۹ کتاب الطلاق۔ مطلب فی المسائل التی یقع مع الاکراہ)[1]

طلاق پر جھوٹی قسم کھانا

سوال: اگر کسی شخص نے طلاق پر جھوٹی قسم اس طرح کھائی کہ اگر میں فلاں کام کے بارے میں جھوٹ بولوں، سچ نہ بولوں تو میری بیوی مجھ پر طلاق ہے، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا اور وہ کام اس کی قسم سے پہلے متحقق ہوچکا تھا، اب اس شخص پر اس کی بیوی طلاق ہوگی یا نہیں؟

الجواب: اس شخص پر بیوی طلاق ہے، البتہ اگر اس نے یہ الفاظ ایک مرتبہ کہے ہوں تو ایک طلاق واقع ہوگی اور اگر تین دفعہ تکرار کیا ہو تو پھر تین طلاق واقع ہوں گی۔

لما فی الھندیة: واما الحلف بالطلاق والعتاق وما اشبہ ذٰلک فما یکون علی امر فی المستقبل فھو کالیمین المعقودۃ وما یکون علی امر فی الماضی فلا یتحقق اللغو والغموس ولکن اذا کان یعلم خلاف ذٰلک او لا یعلم فالطلاق واقع۔ (الفتاوی الھندیة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان، فی الباب الاول)[2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ولم یشترط ان یکون جاداً فیقع طلاق الھازل بہ واللاعب للحدیث المعروف ثلاث جدھن جد وھزلھن جد ... الخ۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۴۴ کتاب الطلاق، تحت قولہ: (ویقع طلاق کل زوج عاقل بالغ)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۴۴ کتاب الطلاق، فصل فی ایقاع الطلاق۔

[2] قال العلامة التمرتاشیؒ: ان حلف علی کاذب عمداً کواللہ ما فعلت کذا عالماً بفعلہ .... ویأثم بھا فتلزمہ التوبة وثانیھا لغو۔ وقال العلامة الحصکفیؒ: تحت ھذا القول: لامؤاخذۃ فیھا الا فی ثلاث طلاق وعتاق ونذر اشباہ۔ (تنویر الابصار علی ھامش ردّ المحتار ج۳ ص۵۱ کتاب الایمان۔ مطلب فی حکم الحلف بغیرہ تعالیٰ)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۴ ص۲۶۵ کتاب الایمان۔ فی الفصل الاول۔

طلاق کا وقوع ثبوت کا محتاج ہے

سوال:- ایک شخص پر اس کی ساس دعویٰ کرتی ہے کہ تم نے بیوی کو طلاق دے کر فارغ کر دیا ہے لیکن خاوند انکار کر رہا ہے، تو کیا ساس کے کہنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:- اگر خاوند طلاق کا اقرار کرتا ہو تو کسی دوسرے کے ماننے کے بغیر بھی طلاق واقع ہو جائے گی لیکن جہاں کہیں خاوند طلاق سے منکر ہو تو وہاں پر ساس کا بیان ناکافی ہے، ایسی صورت میں طلاق تب ثابت ہوگی جب باقاعدہ دو گواہ پیش کئے جائیں۔ تاہم جہاں کہیں عورت کو یہ یقین ہو کہ خاوند نے اس کو طلاق ثلاثہ دے کر فارغ کر دیا ہے لیکن اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو اور خاوند انکاری ہو تو عورت کسی ذریعہ (خلع) سے خاوند سے فراغت حاصل کر سکتی ہے۔

كما فی الهندية: سئل شيخ الاسلام ابو القاسم رحمه الله تعالىٰ عن امرأة سمعت من زوجها انه طلقها ثلاثًا ولا تقدر ان تمنع نفسها منه هل يسعها ان تقتله قال لها ان تقتله۔
(الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۴۷۵ كتاب الطلاق۔ الباب السادس فی الرجعة وفيما تحل به المطلقة ومايتصل به فی فصل فيما تحل به المطلقة) [۱]

طلاق کے ثبوت کے لیے ایک گواہ ناکافی ہے

سوال:- اگر خاوند پر عورت یا کسی اجنبی شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ تم نے بیوی کو طلاق دی ہے اور ایک شخص اس کی گواہی دے رہا ہے جبکہ خاوند اس کا انکار کر رہا ہو تو اس سے نکاح پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:- ایسی حالت میں اگر مدعیٔ طلاق کے پاس دو گواہ ہوں اور وہ گواہی دیں تو طلاق ثابت رہے گی، صرف ایک گواہ طلاق کے ثبوت کے لیے ناکافی ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ونصابها لغيرها فی الحقوق سواء كان مالا او غيره كنكاح

---

[۱] قال العلامة الحصكفی رحمه الله: سمعت من زوجها انه طلقها ولا تقدر على منعة من نفسها الا بقتله لها قتله ــــ وقال العلامة ابن عابدينؒ: قال فی المحيط وينبغی لها ان تفتدی بمالها او تهرب منه وان لم تقدر قتله۔ (الدرالمختار على الرد المحتار ج۲ ص۵۹۰ باب الرجعة۔ وفی مطلب الاقدام على النكاح اقرار بمعنى العدة)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوىٰ التاتارخانية ج۳ ص۶۰۹ كتاب الطلاق روسائل الحلل وغيرها م۔

و طلاق رجلان او رجل وامرأتان ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۱۳ کتاب الشہادات) ؎۱

بذریعہ ڈاک بھیجی گئی طلاق کا حکم

سوال: اگر ایک شخص بغیر کسی گواہ کے بیوی کو ڈاک کے ذریعہ طلاق بھیجے تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: طلاق کے وقوع کے لیے گواہوں کا ہونا شرط نہیں، جیسا کہ خاوند زبانی طور پر طلاق دے سکتا ہے تو تحریری طور پر بھی طلاق دینے کے لیے کوئی امر مانع نہیں، لہٰذا بغیر گواہوں کے بذریعہ ڈاک ارسال کی گئی طلاق سے بھی بیوی مطلقہ ہوجائے گی۔

لما فی الھندیۃ: رجل استکتب من رجل آخر الیٰ امرأتہ کتاباً بطلاقھا وقرأہ علی الزوج فاخذہ وطواہ وختم وکتب فی عنوانہ وبعث بہ الیٰ امرأتہ فاتاھا الکتاب واقر الزوج انہ کتابہ فان الطلاق یقع علیھا۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۳۷۹ کتاب الطلاق۔ الفصل السادس فی الطلاق بالکتابۃ) ؎۲

طلاق نامہ پر لاعلمی میں دستخط کرنا

سوال: اگر کسی شخص نے لاعلمی کی حالت میں طلاق نامہ پر دستخط کئے تو اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: طلاق بالکتابت میں نیت وارادہ ضروری ہے، اس لیے طلاق نامہ پر لاعلمی کی صورت میں دستخط کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی الھندیۃ: کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لا یقع بہ الطلاق اذا لم یقر انہ کتابہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۳۷۹ کتاب الطلاق، الفصل السادس فی الطلاق بالکتابۃ) ؎۳

؎۱ وفی الھندیۃ: وشرط فیھا شھادۃ رجلین او رجل وامرأتین سواء کان الحق مالا او غیر مال کالنکاح والطلاق۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۳ ص ۴۵۱ کتاب الشھادات۔ فی الباب الاول)

ومثلہ فی فتح القدیر ج ۳ ص ۱۵۵ کتاب النکاح۔

؎۲ قال العلامۃ ابن ھمامؒ: ولو کتب الصحیح الیٰ امرأتہ بطلاقھا ثم انکر الکتاب وقامت علیہ البینۃ انہ کتبہ بیدہ فرق بینھما فی القضاء واما فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ ان کان لم ینو بہ الطلاق فھی امرأتہ۔ (فتح القدیر شرح الھدایۃ ج ۳ ص ۴۰۲ کتاب الطلاق۔ فصل فی الطلاق قبل الدخول)

ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۲ ص ۳۷۹ کتاب الطلاق۔ وفی مطلب الطلاق۔

؎۳ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لا یقع الطلاق ما لم یقر انہ کتابہ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۴۶۵ کتاب الطلاق۔ مطلب فی الطلاق بالکتابۃ)

ومثلہٗ فی التاتارخانیۃ ج ۴ ص ۴۸ کتاب الطلاق۔ ایقاع الطلاق بالکتاب۔

مرضِ سرسام میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! سرسام ایک ایسی بیماری ہے کہ اس میں مریض پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اس سے دیوانوں کی سی حرکات سرزد ہوتی ہیں، اگر اس مرض میں مبتلا شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: سرسام زدہ شخص کے افعال و اعمال کا حکم مجنون اور معتوہ جیسا ہے اس کی طلاق باتفاقِ علماء واقع نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کوئی ایسی حالت میں بیوی کو طلاق دے تو بیوی مطلقہ نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: فمنها ان یکون عاقلاً حقیقۃً او تقدیرًا فلا یقع طلاق المجنون والصبی الذی لا یعقل لان العقل شرط اھلیۃ التصرف لان بہ یعرف کون التصرف مصلحۃ۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۹۹ فصل شرائط الرکن) [۱]

خواب کی حالت میں دی گئی طلاق لغو ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص خواب (نیند) کی حالت میں اپنی بیوی کا نام لے کر کہے کہ ہندہ کو طلاق طلاق طلاق ہے تو کیا اس سے اُس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: نیند میں انسان کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اُسے کچھ سمجھ نہیں آتا بلکہ اس کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس لیے یہ شخص شرعاً معذور ہے اور اس کی دی ہوئی طلاق لغو ہے، اس سے بیوی مطلقہ نہیں ہوگی۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: ومنها ان لا یکون معتوھًا ولا مدھوشًا ولا مبرسمًا ولا مغمی علیہ ولا نائمًا فلا یقع طلاق ھؤلاء لما قلنا فی المجنون۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۰۰ فصل شرائط الرکن) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن الھمامؒ: قولہ لا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمعتوہ کالمجنون ..... لکن معلوم من کلیات الشریعۃ ان التصرفات لا تنفذ الا ممن لہ اھلیۃ التصرف وادرناھا بالعقل والبلوغ۔

(فتح القدیر ج۳ ص۳۴۳ فصل ویقع طلاق کل زوج۔ الخ)

وَمِثْلُہٗ ردّ المحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الطلاق مطلب تعریف السکران۔

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یقع طلاق المولیٰ علیٰ امرأۃ عبدہ ..... والصبی والمعتوہ من العتہ وھو اختلال فی العقل والمبرسم من البرسام والمغمی علیہ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۲ ص۴۶۲ کتاب الطلاق)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۴۳ فصل ویقع طلاق کل زوج۔ الخ

طلاق الصّریح والکنایۃ

(طلاقِ صریح وکنایہ کے احکام ومسائل)

"تم طلاق ہو" میں تین طلاق کی نیت کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ "تم طلاق ہو" اور اس میں اس کی نیت تین طلاق کی ہو، تو کیا اس سے تین طلاق واقع ہوں گی یا ایک؟

الجواب:۔ صریح الفاظِ طلاق میں نیّت کا کوئی اعتبار نہیں، اسلئے "تم طلاق ہو" سے صرف ایک طلاق واقع ہوگی، تین طلاق کی نیّت کرنا اس میں لغو ہے۔

لمافی الھندیۃ: کانت طالق ومطلقۃ وطلقتك تقع واحدۃً رجعیۃ وان نوی الاکثرَاوِالاَّ ابانۃ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۳۵۴ کتاب الطلاق، الباب الثانی فی ایقاع الطلاق)[1]

سوچ وفکر کے عالم میں طلاق کالفظ اداکرنا

سوال:۔ ایک شخص سوچ وفکر میں گم تھا اس کی کوشش تھی کہ زبان سے طلاق کالفظ ادا نہ کرے لیکن اچانک اس کی زبان سے نکل گیا کہ "چلو میں نے تجھ کو طلاق دے دی" تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر سوچ وفکر سے مجبور ہوکر ان الفاظ سے مراد بیوی کو طلاق دینا ہو تو صریح طلاق میں واقع ہونے کے لیے اس کا ارادہ اور نیّت ضروری نہیں، تاہم اگر یہ تلفظ کسی واقعہ کی حکایت ہو جو اس کے ذہن میں کسی فرضی واقعہ کا پیش خیمہ ہو یا نفس الامر کے کسی واقعہ کی حکایت ہو تو حکایت کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لمافی الھندیۃ: رجل قال لامرأتہ انت طالق فقال لہ رجل ما قلت فقال طلقتہا

---

[1] قال ابوالحسن علی المرغینانیؒ: الصریح ھو کانت طالق ومطلقۃ وطلقتك فھٰذا یقع بہ الطلاق الرجعی ولایقع بہ الاواحدۃ وان نوی الاکثر۔ ملخصاً۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۳۶۱ کتاب الطلاق۔ باب ایقاع الطلاق۔ مکتبۂ حقانیہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علی ھامش ردّ المحتار ص۴۲۹ ج ۲ کتاب الطلاق، باب الصریح۔

اوقال قلت هی طالق فهی واحدۃ۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج ۱ ص۳۵۵ کتاب الطلاق، الباب الثانی فی ایقاع الطلاق)

وقال العلامۃ ابن الہمامؒ: ثمّ قولنا لا یتوقف علی النیّۃ معناہ اذا لم ینو شیئًا اصلًا یقع لا انہ یقع وان نوی شیئًا آخر لما ذکر انہ اذا نوی الطلاق عن وثاق صدق دیانۃ لا قضاءً وکذا عن العمل۔ (فتح القدیر شرح الہدایہ ج ۳ ص۳۵ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق) [1]

عورت کی عدم موجودگی میں خطاب کے صیغے سے طلاق دینا

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو اس کی عدم موجودگی میں یوں کہے کہ "جاؤ تم طلاق ہو" تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی مرد کا اپنی بیوی کو انت طالق کہنے کے لیے اس کی موجودگی ضروری نہیں، بسا اوقات اس کو حاضر فرض کر کے خطاب کیا جاتا ہے، اس لیے ایسی حالت میں "جاؤ تم طلاق ہو" کہنے سے طلاق واقع ہو جائے گی۔

لما فی الہندیۃ: ان ارسل الطلاق بان کتب اما بعد فانت طالق، فکلما کتب ھٰذا یقع الطلاق۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۱ ص۳۷۸ کتاب الطلاق، الفصل السادس فی الطلاق بالکتابۃ) [2]

ایک دو تین کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: "ایک دو تین تم طلاق ہو"، ایسی حالت میں عورت پر کونسی طلاق واقع ہوگی، کیا اس سے منکوحہ مطلقہ مغلظہ بنتی ہے یا طلاق رجعی واقع ہوگی؟

الجواب:۔ اگر اس عدد کے ساتھ نسبت ہو یعنی عورت سے یوں کہے تجھے ایک دو تین

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان الصریح لا یحتاج الی النیّۃ ولکن لا بد فی وقوعہ قضاءً ودیانۃً من قصد اضافۃ لفظ الطلاق الیہا عالمًا بمعناہ ولم یصرفہ الیٰ ما یحتملہ۔ الخ

(ردّ المحتار ج ۲ ص۴۲۳ کتاب الطلاق، باب الصریح)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۲۵۹ کتاب الطلاق، باب الطلاق ای الغلظہ۔

[2] قال العلامۃ ابن الہمامؒ: فان کان علی رسم کتب الرسالۃ بان کتب اما بعد یا فلانۃ فانت طالق او انت حر او اذا وصل الیک کتابی فانت طالق فانہٗ یقع الطلاق۔ الخ

(فتح القدیر ج ۳ ص۴۰۳ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق، بحث الکنایات)

وَمِثْلُہٗ فی قاضی خان علیٰ ھامش الہندیۃ ج ۱ ص۴۷۱ کتاب الطلاق، فصل فی الطلاق بالکتابۃ۔

تم طلاق ہو؛ ظاہر ہے کہ اضافت کی موجودگی میں اس سے تین طلاق واقع ہوں گی، لیکن جب اضافت نہ ہو صرف یہ ہو کہ ایک دو تین تم طلاق ہو یا تم طلاق ہو ایک دو تین، ایسی حالت میں "تم طلاق ہو" مستقل جملہ مبتداء خبر ہو کر عدد سے بظاہر اس کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، اس لیے عدد لغو ہو کر ایک طلاق واقع ہوگی، تاہم اگر یوں کہا کہ تم ایک دو تین طلاق یا تم طلاق ایک دو تین ہو تو اس سے پھر لازمی طور پر تین طلاق واقع ہوں گی۔

والدلیل علیٰ ما قلنا ما قاله العلامة الحصکفیؒ: والطلاق یقع بعدد قرن به لا نفسه عند ذکر العدد وعند عدمه الوقوع بالصیغة۔ الخ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الطلاق، مطلب الطلاق یقع بعدد قرن به) [۱]

بیوی کے نام کی جگہ دوسرا نام لیکر طلاق دینا

سوال:۔ اگر ایک شخص نے کسی مصلحت کے لیے بیوی کے اصل نام کی جگہ دوسرے نام سے یاد کر کے طلاق دی ہو تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر بیوی کی طرف اشارہ نہ ہو تو تعارف اور تعین کے لیے نام کا سہارا لیا جاتا ہے یہ تب ہو سکتا ہے کہ نام درست ہو؛ جب اصل نام کو چھوڑ کر دوسرے نام سے یاد کیا جائے تو بیوی مطلقہ نہیں ہوگی تاہم اگر اس شخص کی نیت اپنی بیوی کو طلاق دینے کی ہو تو طلاق واقع ہو جائیگی۔

وفی الهندیة: ولو قال امرأته الحبشیة طالق ولا نیة له فی طلاق امرأته وامرأته لیست بحبشیة لا یقع علیها وعلیٰ هذا اذا سمی بغیر اسمها ولا نیة له فی طلاق امرأته۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۳۵۸ کتاب الطلاق، الباب الثانی فی ایقاع الطلاق) [۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید الانصاریؒ: رجل قال لامرأته ترا یکی وترا سه او قال تو یکی سه۔ قال ابوالقاسم الصفارؒ: لا یقع شیٔ۔ وقال صدر الشهیدؒ: یقع اذا نوی وبه یفتی۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۲ ص۹۸ کتاب الطلاق، الفصل الثانی فی الکنایات جنس آخر ۳م)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۴ ص۱۲۹ کتاب الطلاق، مسائل الایقاع بلا قصد واضافة۔

[۲] قال العلامة ابن همامؒ: ولو قال امرأتی فلانة بنت فلان طالق وسماها بغیر اسمها لا تطلق امرأته الا بالنیّة۔ (فتح القدیر شرح الهدایة ج۳ ص۳۵۳ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص۴۶۱ کتاب الطلاق مطلب فیما لو قال امرأته طالق الخ

طلاقِ رجعی کی عدت گذرنے کے بعد طلاق دینا مؤثر نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو زبانی ایک طلاق دی اور عدت گذرنے کے بعد اس نے پھر دو طلاق تحریری طور پر دیں، تو کیا اس سے طلاقِ مغلظہ واقع ہو گی یا تجدیدِ نکاح ہی کافی ہے؟

الجواب:۔ اگر خاوند نے پہلی زبانی طلاق کی عدت گذرنے کے بعد دو طلاق تحریری طور پر دی ہوں تو تجدیدِ نکاح کافی ہے کیونکہ پہلی زبانی طلاق کی عدت گذرنے کے بعد عورت خاوند سے جدا ہو کر محلِ طلاق نہیں رہی اس لیے پہلی طلاق کی عدت کے بعد دی گئی دو طلاق لغو تصوّر ہوں گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: والرجعی لا یزیل الملك الا بعد مضی العدۃ۔
(ردّ المحتار علی الدر المختار ج۲ ص۵۲۷ کتاب الطلاق) [۱]

طلاقِ صریح کے بعد دی گئی طلاق (بائن) کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے دو دفعہ کہا تم طلاق ہو، تم طلاق ہو۔ اور پھر کہا "میرے گھر سے چلی جاؤ" تو اس سے کون سی طلاق واقع ہو گی۔

الجواب:۔ "تم طلاق ہو" دو دفعہ کہنا طلاقِ رجعی ہے لیکن اس کے بعد یہ کہنا کہ "میرے گھر سے چلی جاؤ" طلاق بائن ہے، طلاقِ رجعی میں اس کو رجوع کا حق حاصل تھا، لیکن طلاقِ رجعی کے بعد جب طلاق بائن (یعنی میرے گھر سے چلی جاؤ) سے یہ حق ختم ہو کر منکوحہ مطلّقہ بائنہ ہو گی کیونکہ طلاقِ رجعی کے بعد طلاقِ بائن دی جا سکتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ۔ الآیۃ (البقرۃ آیت ۲۲۹)
قال الحصکفیؒ: والبائن یلحق الصریح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۵۰۹ کتاب الطلاق، باب الکنایات) [۲]

---

[۱] وقال العلامة الکاسانیؒ: فلا یصح الطلاق الا فی الملك او فی علقة من علائق الملك وهی عدۃ الطلاق۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۲۶ کتاب الطلاق (فصل) واما الذی یرجع الی المرأۃ الخ)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر علی الهدایة ج۳ ص۳۲۶ کتاب الطلاق فی تفصیل اول کتاب الطلاق لا باب قبله۔

[۲] وَفی الهندیة: والطلاق البائن یلحق الطلاق الصریح بان قال انت طالق ثم قال لها انت بائن طلقة اخری ولا یلحق البائن البائن۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۷۷ کتاب الطلاق، الفصل الخامس فی الکنایات)
وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۲۱۹ باب الکنایات۔ (قوله: والصریح یلحق الصریح والبائن)

دو دفعہ طلاق دینے کے بعد رجوع کیا جا سکتا ہے

سوال:۔ بیوی کو دو دفعہ طلاق دینے کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صریح طلاق جب تک تین دفعہ استعمال نہ ہو تو ایک یا دو دفعہ لفظ طلاق صریح کو استعمال کرنے کی صورت میں خاوند بیوی کی طرف رجوع کر سکتا ہے، ایسی حالت میں صرف رجوع ہی کافی ہے۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال انت طالق الطلاق وقال عنیت بقولی طالق واحدۃ وبقولی الطلاق اخری یصدق فتقع رجعیتان ان کانت مدخولا بھا۔[1]

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۳۵۵ کتاب الطلاق باب الثانی فی ایقاع الطلاق الفصل الاول فی الطلاق الصریح)

دو طلاق کے بعد رجوع کر کے دوبارہ طلاق دینا

سوال:۔ ایک شخص نے بیوی کو دو طلاق دیں اور پھر رجوع کر لیا لیکن کچھ مدت کے بعد میاں بیوی کے درمیان پھر اختلافات پیدا ہو گئے تو خاوند نے چھ طلاقیں دے دیں، تو کیا خاوند اب بھی رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دو طلاق کے بعد رجوع مفید ہے اور اس سے میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں لیکن دو طلاق دینے کے بعد خاوند کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہ جاتا ہے جو وہ کسی وقت بھی انفرادی طور پر استعمال کر سکتا ہے، صورت مسئولہ میں خاوند کا رجوع کرنے کے بعد چھ طلاقیں دینے میں ایک طلاق کے لیے محل کی موجودگی کی وجہ سے یہ طلاق واقع ہو جائے گی اور عورت مطلقہ مغلظہ ہو کر خاوند کے لیے حلالہ کے بغیر جائز نہیں اور باقی پانچ طلاقیں محل نہ ہونے کی وجہ سے لغو متصور ہوں گی۔

قال الحصکفیؒ: ولا ینکح مطلقۃ من نکاح صحیح نافذ بھا ای بالثلث حتی یطأھا غیرہ۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۵۸۳ کتاب الطلاق، باب الرجعۃ، مطلب فی العقد علی المبانۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: کقولہ انت طالق انت طالق فیقع رجعیتان اذا کانت مدخولا بھا۔
(تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج۲ ص۱۹۹ کتاب الطلاق)
ومثلہ فی الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۴۶۸ کتاب الطلاق، باب الصریح، مطلب فی قول البحران الصریح یحتاج الخ۔

[2] وفی الھندیۃ: واذا کان الطلاق بائنا دون الثلاث فلہ ان یتزوجھا فی العدۃ وبعد انقضائھا وان کان الطلاق ثلاثا فی الحرۃ وثنتین فی الامۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ نکاحا صحیحا۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۴۷۳ الباب السادس فی الرجعۃ وفیما تحل بہ المطلقۃ الخ، فصل فیما تحل بہ المطلقۃ وما یتصل بہ)

طلاقِ بائن کے اثرات

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی ہے اور اس پر سات آٹھ مہینے گذر گئے ہیں، اب اگر وہ دوبارہ میاں بیوی کی طرح زندگی گذارنا چاہیں تو ان کو کیا لائحۂ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب :۔ طلاقِ بائن میں تجدیدِ نکاح ضروری ہے خواہ عدت کے اندر ہو یا بعد میں ہو، طلاقِ بائن میں رجوع کرنا ناکافی ہے، صورتِ مسئولہ میں یہ مرد وزن دوبارہ نکاح کرکے ازدواجی زندگی گذار سکتے ہیں۔

لما فی الهندية : واذا كان الطلاق بائنا دون الثلاث فله ان يتزوجها فى العدة وبعد انقضائها ۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۴۷۲ كتاب الطلاق، باب السادس فى الرجعة وفيما تحل به المطلقة وما يتصل به فصل فيما تحل به المطلقة ... الخ) [۱]

لفظ "ہاں" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال :۔ میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر کشیدگی پیدا ہوگئی، بیوی نے خاوند سے کہا بے غیرت مجھے طلاق دے دو، خاوند نے زمین سے پتھر اٹھا کر بیوی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "ہاں"۔ کیا اس سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

الجواب :۔ خاوند کے یہ الفاظ "ہاں" یا بیوی کی طرف پتھر پھینکنا نہ طلاقِ صریح ہے اور نہ طلاقِ کنایہ ہے، اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الهندية : ولو قالت انا طالق فقال نعم طلقت ولو قاله فى جواب طلقنى لا تطلق وان نوى ۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۳۵۶ مطلب فى الطلاق بالواو أو بغيرها ونوى بالثانى الاول) [۲]

طلاق کی حکایت کا بیان کرنا

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی پھر اس طلاق کی حکایت کسی مجلس میں اس طرح بیان کیا کہ میں نے اس کو طلاق دی ہے، کیا اس حکایت سے دوسری طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامة المرغينانیؒ: واذا كان الطلاق بائنا دون الثلاث فله ان يتزوجها فى العدة وبعد انقضائها لان حل المحلية باق ۔ (الهداية ج۲ ص۳۷۸ كتاب الطلاق ۔ باب الرجعة)

ومثله فى الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۵۸۲ كتاب الطلاق، باب الرجعة، مطلب فيما قيل .... الخ

[۲] وقال الشيخ ابن البزاز الكردریؒ: ولو قالت طلقنى فقال نعم لا وان نوى ۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۱۷۶ كتاب الطلاق، تسعة فصول، الاول فى صريح الطلاق، نوع آخر فى الفاظ)

الجواب:۔ پہلی طلاق کی حکایت سے دوسری طلاق واقع نہیں ہوتی صرف ایک طلاق متصور ہوگی۔

لما فی الہندیۃ: رجل قال لامرأتہ انت طالق فقال لہ رجل ما قلت فقال طلقتها او قال قلت هی طالق فهی واحدۃ فی القضاء کذا فی البدائع۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۳۵۵ مطلب اذا کرر الطلاق علی المرأۃ المدخول بها ونوی الاخبار) [۱]

طلاق کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم کھا کر کہا کہ اگر میں نے سگریٹ نوشی کی تو میری بیوی کو طلاق ہوگی، تو اس طرح قسم کھانے کے بعد سگریٹ نوشی کرنے سے نکاح پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ قسم کھانے کی صورت میں حانث ہونے پر ایک طلاق واقع ہوگی لہٰذا سگریٹ نوشی کے بعد رجوع بالقول یا بالفعل کافی ہے۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: قولہ انت طالق ومطلق وطلقتك فهذا یقع بہ الطلاق الرجعی۔ (الہدایۃ ج۲ ص۳۳۸ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق) [۲]

مجھ پر "بیوی ناجائز طلاق ہوگی" سے طلاق کا حکم

سوال:۔ کوئی شخص اگر یہ کہے کہ میں نے فلاں کام کیا تو میری بیوی مجھ پر ایسی طلاق ہوگی جو ناجائز ہو تو اس سے کون سی طلاق واقع ہوگی؟

الجواب:۔ حانث ہونے کی صورت میں اس شخص کی بیوی پر طلاق رجعی واقع ہوگی جس میں رجوع بالفعل یا بالقول کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

قال العلامۃ سراج الدینؒ: ولو قال انت طالق ما لا یجوز علیك من الطلاق

---

[۱] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ:۔ ولو قال لامرأتہ انت طالق فقال لہ رجل ما قلت فقال طلقتها الخ لان کلامہ انصرف الی الاخبار الخ۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۰۲ فصل ومنها النیۃ فی احد نوعی الطلاق)

[۲] وفی الہندیۃ: هو کانت طالق ومطلقۃ وطلقتك وتقع واحدۃ رجعیۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۳۵۴ الباب الثانی فی ایقاع الطلاق، وفیہ سبعۃ فصول)

ومثلہ فی الدر المختار علی هامش ردالمحتار ج۲ ص۴۳۹ کتاب الطلاق، باب الصریح۔

طلقت واحدۃ۔ (الفتاوٰی السراجیۃ ص۴۳ کتاب الطلاق، باب عدد الطلاق) [1]

دو بیویوں میں سے ایک کو مبہم طلاق دینا

سوال:۔ ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، اس نے اُن سے کہا تم میں سے ایک طلاق ہے، تو اس سے کون سی عورت مطلقہ متصور ہوگی؟

الجواب:۔ طلاق کا وقوع یقینی ہے تاہم تعیین کا اختیار خاوند کو حاصل ہے کہ دونوں میں سے جس کو چاہے مطلقہ قرار دے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو قال امرأتی طالق وله امرأتان او ثلاث تطلق واحدۃ منهن وله خیار التعیین۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۴۹۷ باب طلاق غیر المدخول بها، مطلب فیما لو قال امرأته طالق وله امرأتان او اکثر تطلق واحدۃ) [2]

معاہدہ کی خلاف ورزی پر مشروط طلاق کا حکم

سوال:۔ اگر چند افراد کسی معاہدہ پر پابندی کے لیے ایک تحریر لکھیں جس میں یہ ہو کہ ہم میں سے جو بھی اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو اس کی بیوی اس پر تین طلاق سے طلاق ہو گی، بعد ازاں بعض لوگوں کے مشورہ سے طلاق کا لفظ ساقط کر دیا گیا اور دستخط کرتے وقت طلاق کی شرط معاہدہ میں شامل نہیں تھی، تو کیا معاهدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی معاہدہ پر پابندی کے لیے کوئی تحریر لکھنا درحقیقت ایک مشورہ ہے اسلئے

---

[1] وفی الهندیۃ: ولو قال لامرأته انت طالق ما لا یجوز علیك من الطلاق او ما لا یقع لو علی انی بالخیار ثلاثۃ ایام تقع واحدۃ۔ (الفتاوٰی الهندیۃ ج۱ ص۳۷۲ الفصل الثالث فی تشبیه الطلاق ووصفه)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۳۹۰ کتاب الطلاق۔

[2] وفی الهندیۃ: ولو قال امرأته طالق وله امرأتان کلتاهما معروفتان کان له ان یصرف الطلاق الی ایتهما شاء۔ (الفتاوٰی الهندیۃ ج۱ ص۳۵۸ کتاب الطلاق، الباب الثانی فی ایقاع الطلاق، فصل الاوّل فی الطلاق الصریح)۔

وَمِثْلُهٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۲ ص۷۹ کتاب الطلاق، فصل اوّل، جنس آخر۔

صورتِ مسئولہ میں طلاق اس وقت نافذالعمل ہوگی جب اس پر دستخط ہوکر ثبت ہوں، اندریں صورت جب اصل معاہدہ میں طلاق کا ذکر نہیں تو خلاف ورزی کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: وان لم یقرّ انّہ کتابہ ولم تقم بینۃ لکنّہ وصف الامر علیٰ وجھہ لاتطلق قضاءً ولا دیانۃ وکذا کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملّہ بنفسہ لا یقع الطلاق مالم یقرّ انہ کتابہ۔ (رد المحتار ج۲ ص۴۶۵ کتاب الطلاق۔مطلب باعتبار عدد الطلاق بالنساء فی الطلاق بالکتابۃ)[1]

غیر مدخول بہا کو طلاق دینا

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو نکاح کے بعد قبل الدخول طلاق دیدی ہو، بعد ازاں وہ اُسے پھر نکاح میں لانے کا خواہشمند ہو، تو ایسی صورت میں اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ طلاق کے وقوع کے لیے مِلک نکاح ضروری ہے اس لیے قبل الدخول بھی طلاق واقع ہونے کے لیے کوئی امر مانع نہیں، تاہم اگر تین طلاق متفرق دی ہوں یا صرف ایک طلاق دی ہو تو ایسی حالت میں ایک طلاق سے منکوحہ جدا ہوکر دوبارہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لیے صرف تجدیدِ نکاح کافی ہوگی، البتہ اگر بیک وقت تین طلاق دی ہوں تو پھر منکوحہ مطلقہ مغلظہ کے حکم میں رہے گی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: قال لزوجتہ غیر المدخول بہا انت طالق ثلاثاً۔الخ وقعن والا فرق بانت بالاولیٰ ولم تقع الثانیۃ بخلاف الموطأۃ۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمختار ج۲ ص۴۹۲ کتاب الطلاق، باب طلاق غیر مدخول بہا)[2]

طلاقِ ثلاثہ کے بیک وقت واقع ہونے کی تحقیق

سوال:۔ زید کی اپنی بیوی سے گھریلو تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے دونوں میں

---

[1] وفی الھندیۃ: وکذالک کل کتاب لم یکتبہ بخطبۃ ولم یملہ بنفسہ لا یقع بہ الطلاق۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۳۷۹ کتاب الطلاق، باب الثانی، الفصل السادس فی الطلاق بالکتابۃ)

[2] وفی الھندیۃ: اذا طلق الرجل امرأتہ ثلاثاً قبل الدخول بہا وقعن علیہا فان فرق الطلاق بانت بالاولیٰ ولم تقع الثانیۃ والثالثۃ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۳۷۳ کتاب الطلاق، الباب الثانی فی ایقاع الطلاق، الفصل الرابع فی الطلاق قبل الدخول)

ومثلہٗ فی الھدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۳ ص۳۹۱ کتاب الطلاق، فصل فی التشبیہ الطلاق ووصفہ۔

کچھ رنجش تھی، ایک روز ان کا چھوٹا لڑکا گھر آیا اور اپنی والدہ سے باتوں باتوں میں گھر کے حالات پوچھے تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ گھر خرچ نہیں دیتا، اس پر لڑکے نے والدہ سے کہا کہ میری کچھ رقم آپ کے پاس موجود ہے آپ اس میں سے خرچ کیوں نہیں کر لیتیں، تو اس کی والدہ نے کہا کہ میں اس رقم کو اُن کی امانت تصور کرتی ہوں، اسی دوران میں زید اور اس کا بڑا لڑکا بھی آ گئے تو بڑے لڑکے نے کہا کہ ان دونوں کی رنجش میں ۱۲ آنے میرے والد کا قصور ہے اور ۴ آنے والدہ کا، زید بیٹے کی اس بات پر مشتعل ہو گیا اور اس نے کہا اگر تم سب ایسا سمجھتے ہو تو یہ میرے تن پر حرام حرام حرام، اور اس سے کہو کہ چار دیواری چھوڑ کر باقی جو چیزیں بھی لے جانا چاہے اجازت ہے اور جو رقم اس کے پاس موجود ہے اس میں سے اپنا حق المہر وصول کر لیوے اور جو باقی بچے وہ میں نے اس کو بخش دیا۔ ان الفاظ کے بعد جب زید کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہ پشیمان ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا، اب آنجناب قرآن و حدیث کی رُو سے صحیح فتویٰ صادر فرمائیں۔

نوٹ:۔ اس استفتاء کے جواب میں ایک عالم صاحب نے درج ذیل جواب دیا ہے:۔

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: صورتِ مسئولہ میں حرام حرام حرام کے لفظ سے کہنے والے کی نیت مراد ہوگی، چنانچہ ھدایہ میں ہے: قال وبقیة الکنایات اذا نوی بها الطلاق کانت واحدة بائنة۔ (ج ۲ ص ۳۸۹) اگر ان الفاظ سے طلاق ہی مراد لی جائے تو بیوی ایک طلاق بائن سے طلاق ہوگی اور وہ اس عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین بار طلاق کے لفظ سے یا حرام کے لفظ سے طلاق کہہ دیتا ہے تو یہ طلاق ایک طلاق رجعی شمار ہوگی اور ایسے شخص کو چاہیئے کہ فوری طور پر اپنی بیوی سے رجوع کر لے اور اپنے گھر میں بسائے کیونکہ تین طلاق ایک بار دینا ویسے علی الاجماع بدعت ہے، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ایسی طلاق کو ایک طلاق شمار کرتے ہیں، مدخولہ کے حق میں حدیث شریف میں وارد ہے کہ: عن محمود بن لبیدؓ قال اخبرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأته ثلث تطلیقات جمیعًا فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ تعالیٰ وانا بین اظهرکم ـــــ سائل کی صورت دوسری حدیث میں اول دلیل موجود ہے: عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما قال طلق ابو رکانة ام رکانة فقال النبی علیه الصلوٰة والسلام ارجع امرأتك فقال انی طلقتها ثلاثًا قال

قد علمت ارجعها۔ (رواہ ابوداؤد) اس حدیث میں ہے کہ ابورکانہؓ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں نے اس کو (یعنی بیوی کو) تین بار اکٹھی طلاق دے دی ہے، حضورؐ نے فرمایا مجھے معلوم ہے تم رجوع کرلو۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مسند میں کچھ زائد الفاظ سے روایت فرمایا ہے کہ:۔ طلق ابورکانۃ امرأتہ فی مجلس واحد ثلاثاً فحزن علیھا فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانھا واحدۃ۔ ابورکانۃ۔ چنانچہ ابورکانہؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم پر بیوی سے رجوع کرلیا۔ یہ مسئلہ بڑا طویل ہے، اس مسلک پر حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قائم ہیں اور تابعین و تبع تابعین میں سے حافظ قاسم، امام جعفر صادق، امام باقر، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ ہیں۔

سائل یہ واضح ہو کہ دین کے معاملہ میں تنگی نہیں، امام اعظمؒ کے مسلک میں یہ بات شامل ہے کہ کوئی شخص نقصان سے بچنے کے لیے دوسرے امام کے مسلک پر فتویٰ حاصل کرکے اس پر عمل کر سکتا ہے، چنانچہ "سبل السلام ص۲۴۳" پر علامہ صنعانیؒ نے طویل بحث فرمائی ہے، اس کی شرح کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے، اس کا اختصار یہ ہے کہ مسئلہ درست ہے کہ اگر تعصب کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو اس شخص پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ان میں سے کس پر عمل کرے کوئی امر ممنوع نہیں ہے۔ اس لیے ان حالات میں سائل کو فتویٰ دیا جاتا ہے کہ وہ حدیث شریف اور صحابہ کرامؓ و ائمہ عظامؒ کے اقوال کے مطابق اپنی بیوی سے دو گواہوں کے سامنے رجوع کرلے اور اپنے گھر میں لے جائے اور اسے بسائے۔ علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہو کہ موجودہ عائلی قوانین کے مطابق ایسی صورت میں سرے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی اس لیے فوری طور پر رجوع کرلیا جائے اور سائل دل میں ذرہ برابر بھی ملال پیدا نہ کرے۔ والسلام

یہاں تک تو اس عالم صاحب کا جواب تھا لیکن اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں جو کہ قابل توجہ ہیں :۔

(۱) صورت مسئولہ میں کون سی طلاق واقع ہوگی؟ وقوع طلاق ثلاثہ کے بارہ میں ائمہ اربعہؒ کا کیا مسلک ہے؟

(۲) حدیث شریف: عن محمود بن لبید قال اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأتہ ثلث تطلیقات جمیعاً۔ (الحدیث) کا محدثین کے نزدیک صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور

کیا اس حدیث سے عدم وقوع طلاقِ ثلاثہ کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟

(۳) مذکورہ جواب میں ابو داؤد شریف کی ابورکانہ والی حدیث تحریر کی گئی ہے تو کیا یہ حدیث قابلِ حجت اور قابلِ عمل ہے یا نہیں؟

(۴) صورتِ مسئولہ کے مذکورہ جواب میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر شہوانی اور نفسانی خواہشات کے لیے دوسرے امام کے مسلک پر عمل کر سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) مذکورہ جواب میں مجیب نے موجودہ ملکی عائلی قوانین پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے تو ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

(۶) امام نووی رحمہ اللہ کی تحقیق کے خلاف طلاقِ ثلاثہ کو ایک طلاق شمار کرنے سے کیا تضلیل ائمہ اربعہ لازم آتی ہے یا نہیں؟

مذکورہ بالا سوالوں کے بالوضاحت جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب (من دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ):۔ ان امور کی طرف توجہ دینے سے قبل اصل مسئلہ کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ حرام کا لفظ طلاقِ کنائی ہے اور کنائی طلاق سے طلاقِ بائن واقع ہوتی ہے، لہٰذا زید کی بیوی پر ایک طلاقِ بائن واقع ہو چکی ہے اگرچہ اس نے طلاق کی نیت نہ کی ہو، علامہ شامیؒ نے "بحث طلاق کنائی" میں تصریح کی ہے کہ لفظ حرام عرفاً چونکہ طلاق ہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس لیے مفتی بہ قول یہ ہے کہ اس سے عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہو گی اگرچہ اس میں نیت نہ بھی کی گئی ہو، اور دوسرا و تیسرا لفظ حرام لغو ہے کیونکہ بائن طلاق سے نکاح فوراً ٹوٹ جاتا ہے، اور جب پہلی دفعہ حرام کہنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے تو پھر حرام حرام کہنا لغو ہے اس سے زائد طلاق واقع نہ ہو گی، لہٰذا اس عورت کو عدت میں یا بعد از عدت دونوں حالتوں میں تجدیدِ نکاح کے ذریعہ سے دوبارہ اپنے نکاح میں لا سکتا ہے اور صرف رجوع ہی کافی نہیں ہے تاوقتیکہ بیوی کی رضامندی سے دوبارہ نکاح نہ کیا جائے، یہ اُس وقت کہ جب زید نے حرام کے لفظ سے تین طلاقوں کی نیت نہ کی ہو، اور اگر اس نے تین طلاقوں کی نیت کر لی ہو تو اس صورت میں بیوی مغلظہ ہو گی جو حلالہ کے بغیر اس کے لیے ہرگز جائز نہ ہو گی ۔ آپ نے جو چھ سوالات اٹھائے ہیں ان کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں:۔

(۱) صورتِ مسئولہ میں بائن طلاق واقع ہو گئی ہے نہ کہ رجعی، اور عورت کو دوبارہ نکاح میں لانے کے لیے رجوع کافی نہیں بلکہ تجدیدِ نکاح بالرضا ضروری ہو گی، طلاقِ ثلاثہ کے بارے

ہیں ائمہ اربعہؒ کا مسلک یہ ہے کہ طلاقِ ثلاثہ خواہ دفعۃً واحدۃً دی جائیں یا متفرقاً ایک ہی طُہر میں ہو یا متفرق اطہار میں تمام صورتوں میں تین طلاق ہی واقع ہوں گی نہ کہ ایک، امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

(۲) حدیث مذکور کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک ہی طہر میں تین طلاق دینا خواہ متفرقاً تین دفعہ الفاظِ طلاق کہہ دے یا ایک ہی دفعہ اَنْتَ طَالِقٌ ثَلَاثًا کہہ دے یہ سب بدعی طلاق ہیں اور اس طرح طلاق دینا گناہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تین طلاق واقع نہ ہوں گی بلکہ طلاق تو تین واقع ہوں گی، اور چونکہ اس طرح طلاق دینا شرعی طریقۂ طلاق کے خلاف ہے اس لیے اس طرح طلاق دینے والے گنہگار ہوں گے، اس کی نظیر وہ واقعہ ہے جو مُسلم وغیرہ کتبِ حدیث میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک دفعہ اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح طلاق دینے پر سرزنش کر کے رجوع کا حکم فرمایا لیکن طلاق کو معتبر قرار دیا (مسلم) اسی طرح ایک دوسرے شخص نے اپنی بیوی کو معاً تین طلاق دے دی تو حضور انورؐ نے فرمایا: عصیت ربك و بانت منك امرأتك - (دارقطنی بحوالہ مشکوٰۃ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل اگرچہ معصیت اور گناہ ہے مگر طلاق تین ہی واقع ہوں گی۔ جو لوگ محمود ابن لبیدؓ کی حدیث سے عدم وقوع طلاق پر استدلال کرتے ہیں ان کا یہ استدلال غلط ہے اور عدم وقوع طلاق کا ثبوت اس سے نہیں ملتا، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاً تین طلاق دینا گناہ ضرور ہے لیکن گناہ سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ طلاق واقع نہیں ہوگی، زہر کا پیالہ پینا گناہ ہے مگر موت کا اثر ضرور کرے گا، اسی طرح یہ طلاق اگرچہ بدعی ہے مگر ضرور واقع ہوگی۔

(۳) رکانہؓ والی حدیث میں دو قسم کے الفاظ مروی ہیں، ایک یہ کہ "طلق امرأته ثلاثا"۔ دوسری قسم کے الفاظ یہ ہیں کہ "انه طلق امرأته البتة فقال له النبی علیه الصلوٰة والسلام آللّٰه ما اردت الا واحدة فقال آللّٰه ما اردت الا واحدة"۔ پہلی روایت کو جس میں طلق امرأته ثلاثا کے الفاظ ہیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: "واما الروایة التی رواها المخالفون ان رکانة طلق ثلاثا فجعلها النبی علیه الصلوٰة والسلام واحدة فروایة ضعیفة عن قوم مجهولین"

وأمّا الصحیح منہا ما قدمناہ انہ طلقہا البتۃ ۲ (شرح نووی للمسلم ص۴۷۸/ج۱) ابو داؤد نے بھی طلقہا البتۃ والی روایت کو طلقہا ثلاثًا کی روایت سے اصح قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: وھٰذا اصح من حدیث ابن جریج ان رکانۃ طلق امرأتہ ثلاثًا اھ۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ طلقہا البتۃ والی حدیث کے رواۃ رکانہ کے اہلبیت اور اولاد ہیں اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگوں کی بہ نسبت رکانہؓ کے واقعۂ طلاق کا علم ان کے اہلبیت اور اولاد کو زیادہ ہوگا۔ فرماتے ہیں: وحدیث نافع ابن عجیر وعبداللہ ابن علی ابن یزید ابن رکانۃ عن ابیہ عن جدّہ ان رکانۃ طلق امرأتہ البتۃ فردّھا النبیّ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اصح من حدیث ابن جریج لانہم ولد الرجل ادھل بیتہ وھم اعلم بہ۔ (ابوداؤد ج امن۳) اس سے معلوم کہ رکانہؓ نے انت طالق البتۃ کے الفاظ سے طلاق دی تھی نہ کہ اَنْتَ طَالِقٌ کے الفاظ سے اور چونکہ البتۃ کنائی طلاق کا لفظ ہے، اس میں تین کی نیت بھی صحیح ہے، تو خطرہ تھا کہ رکانہؓ نے تین کی نیّت سے یہ الفاظ کہہ دیئے ہوں اور اس تقدیر پر بیوی اس کے نکاح میں نہیں آسکتی تھی، اس لیے اس کی نیّت کے بارے میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے حضور اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا آاللہ ما اردت الّا واحدۃ، جب آپؐ کو رکانہؓ کے جواب آللہ ما اردت الّا واحدۃ سے اطمینان حاصل ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح جدید سے اس کو بیوی واپس کردی۔ چنانچہ فردھا کے معنی بیان کرتے ہوئے محدثین لکھتے ہیں: "قلت معنی قولہ فردّھا الیہ یعنی بالنکاح لانہا مطلقۃ بتطلیقۃ واحدۃ البتۃ اھ (فتح القدیر) لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رکانہؓ نے تین طلاق دی تھیں اور انہی کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ایک رجعی طلاق قرار دیا، یہ غلط محض ہے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

(۴) خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مذہب ہو یا کسی دوسرے امام کا، اس کا چھوڑنا گناہِ عظیم اور خطرۂ سلبِ ایمان ہے۔ کما صرح بہ العلماء قاطبۃ فی زبرھم واسفارھم لان ھٰذا ترک الدین لاجل ھوی النفس وھو مذموم جدًّا۔

(۵) عائلی قوانین میں جو دفعات نکاح و طلاق کے بارے میں رکھی گئی ہیں اُن میں سے اکثر دفعات کو ہر مکتبِ فکر کے علماء نے قرآن وحدیث کے صریح خلاف قرار دیا ہے، لہٰذا جو شخص

ایسی دفعات پر مشتمل عائلی قوانین پر لوگوں کو چلنے کی تلقین کر رہا ہے وہ لوگوں کو قرآن وحدیث کے خلاف ورزی کی تلقین کر رہا ہے جو کسی طرح بھی ایک عالم دین بلکہ ایک مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے، ایسے قوانین کے مصنفین اور واضعین کے بارے میں قرآنِ کریم کا فیصلہ یہ ہے:
فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ٥ (سورۃ البقرۃ ع ۹) آجکل کے قانون سازوں کی حالت اُن لوگوں کی حالت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں جن کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

(۶) طلاقِ ثلاثہ کو واحد شمار کر لینے سے اگر ائمہ اربعہ رحمہما اللہ کی تضلیل لازم نہ بھی آتی ہو مگر تخطیہ تو ضرور لازم آتا ہے اور یہ بھی کچھ کم درجہ کا جرم نہیں ہے، جن حضرات کی امامت اور پیشوائیتِ مذہبی پر اُمت کا سوادِ اعظم متفق ہو اُن کا تخطیہ کرنے والوں کو کس منطق کی رُو سے حق بجانب تصور کیا جائے گا، حالانکہ حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: "اتبعوا السواد الاعظم۔ (الحدیث) نیز ان تمام ائمہ اربعہ کا فیصلہ اجماعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خلیفۂ راشد کے فیصلہ پر مبنی ہے جس کے متعلق ارشادِ نبوی ؐ ہی میں بصراحت یہ آچکا ہے کہ وہ ملہم او محدث فی ھٰذہ الامۃ ہیں۔ یہ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں جنہوں نے یکجائی طلاقِ ثلاثہ کو تین ہی شمار کیا ہے اور کسی صحابی یا تابعی نے ان کے اس فیصلہ کے خلاف رائے نہیں دی ہے، تو اُن کے اس فیصلہ کی حیثیت تو ایک گونہ اجماع کی ہے جس سے بعد میں آنے والوں کے لیے خلاف کرنے کا کوئی حق معقول سے ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسے فیصلوں کے بارے میں حضور نبیٔ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔

لہٰذا ائمہ اربعہ اور اُمت کے سوادِ اعظم کے اجماعی فیصلہ کے مقابلہ میں ایک یا دو عالم یا امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ کی ذاتی رائے اور اجتہاد میں وہ وزن ہرگز نہیں ہو سکتا ہے جو ائمہ اربعہ رحمہما اللہ تعالےٰ اور اُمت کے سوادِ اعظم کے متفقہ فیصلہ میں ہے اور فیصلہ بھی وہ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جیسے ملہم اور محدث خلیفۂ راشد کے فیصلہ پر مبنی ہو[1]

---

[1] قد ذکرہ ھٰذہ المسئلۃ العلامۃ ابن الھمام الحنفیؒ: وقد اثبت انہ یقع ثلاث تطلیقات بلفظ واحد وھو یقول "وذھب جمھور الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم من ائمۃ المسلمین الیٰ انہ یقع ثلاث" و ایضاً قال: وقد اثبتنا النقل عن اکثرھم صریحاً بایقاع الثلاث ولم یظھر لھم مخالف فماذا بعد الحق الا الضلال وعن ھٰذا قلنا لو حکم حاکم بان الثلاث بفم واحد واحدۃ لم ینفذ حکمہ لانہ لا یسوغ الاجتہاد فیہ فھو خلاف لا اختلاف۔" (فتح القدیر شرح الہدایہ ج ۳ ص۳۳۰ کتاب الطلاق)

حضرت ابن ہمامؒ کے مذکورہ بالا اقوال سے ثابت ہوا کہ ایک لفظ سے تین طلاق کے وقوع پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اس سے خلاف کرنا جائز نہیں اور صحابۂ کرامؓ کے اجماع پر عمل نہ کرنا گمراہی ہے۔

اور ملک العلماء امام کاسانی حنفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق واقع ہوتی ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں صرف شیعہ نے اختلاف کیا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق واقع ہونے کا فیصلہ کیا ہے آپ کے ساتھ کسی صحابی نے اس فیصلہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع منعقد ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں: واما حکم طلاق البدعۃ فھو انہ واقع عند عامۃ العلماء وقال بعض الناس انہ لا یقع وھو مذھب الشیعۃ۔ وقال ھٰکذا۔ وروینا عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہٗ کان لا یؤتی برجل قد طلق امرأتہ ثلاثاً الا اوجعہ ضرباً واجاز ذٰلک علیہ وکانت قضایاہ بمحضر من الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین فیکون اجماعاً منھم علیٰ ذٰلک۔

(بدائع الصنائع ج۳ ص۹۶ کتاب الطلاق)

بہر تقدیر یہ مسئلہ امتِ اسلامیہ اور اہل السنۃ والجماعۃ کے سلف و خلف جن میں جمہور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین بھی ہیں، ان تمام کا اس بات پر اجماع کہ ایک لفظ "طلاق ثلاث" سے تین طلاق واقع ہوتی ہیں۔ اب اُن کے اس اجماع سے ایک دو یا کچھ زائد افراد کا خلاف اس اجماع پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ قاضی شوکانیؒ نے یہی فرمایا ہے کہ داؤد ظاہریؒ کی مخالفت سے اس مسئلہ میں اجماع پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ (دیکھئے شرح بلوغ المرام ص۶)

اور علامہ احمد بن محمد القسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تین طلاقوں کو ایک سمجھنے والوں کے مذہب کے متعلق فرمایا ہے": بانہ مذھب شاذ فلا یعمل بہ اذھو منکر۔"

(ارشاد الساری ج۸ ص۱۵۷ طبع فی المصر)

طلاق دیتے وقت منہ بند کرنے کا حکم | **سوال:-** ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا ایک دو تین، ان الفاظ کے کہنے کے بعد فوراً کسی دوسرے شخص نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ بند کر دیا اس کے بعد اس نے کسی چیز پر تلفظ نہیں کیا، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی کو طلاق نہیں ہوتی کیونکہ اس نے طلاق پر تلفظ نہیں کیا، نہ صریح پر اور نہ کنائی پر، بلکہ اس نے صرف عدد پر تلفظ کیا ہے، اور صرف عدد نہ صریح طلاق ہے اور نہ کنائی، طلاق میں عدد کا وہاں اعتبار ہوگا جب طلاق کے بعد متصلاً ذکر کیا جائے۔

قال العلامۃ قاضی خانؒ: قالت المرأۃ لزوجھا طلقنی فقال الزوج ان شئت الف مرۃ لا یقع شیء۔ (الخانیۃ ج۲ ص۲۱۷ کتاب الطلاق) [1]

"میرے گھر سے نکل جاؤ" کے الفاظ کے طلاق پر اثرات | **سوال:-** اگر خاوند بیوی کو لڑائی جھگڑے کے وقت غصہ کی حالت میں یہ کہے کہ میرے گھر سے نکل جاؤ اور یہ الفاظ وہ بار بار دہرائے تو اس سے بیوی پر کون سی طلاق واقع ہوگی؟

الجواب:- یہ الفاظِ طلاق کنایہ کے ہیں، اس سے نیت یا دلالتِ حال کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوگی، تاہم جھگڑے کے وقت چونکہ دلالتِ حال موجود ہے اس لیے بیوی پر طلاقِ بائن واقع ہوگی جو تجدیدِ نکاح سے ختم ہو جائے گی۔

قال التمرتاشیؒ: فنحو اخرجی واذھبی وقومی.... ففی حالت الرضا تتوقف الاقسام علی نیۃ....الخ (تنویر الابصار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۲ ص۵۰۳ باب الکنایات) [2]

"ماں باپ کے پاس چلی جاؤ" کہنے سے نکاح پر اثرات کا حکم | **سوال:-** خاوند نے بیوی سے جھگڑے کے وقت غصہ کی حالت میں یہ کہا کہ "جاؤ، ماں باپ کے پاس چلی جاؤ" کیا اس سے نکاح متاثر ہوگا یا نہیں؟

---

[1] **الجواب:-** جب تک شوہر الفاظ طلاق نہ کہے ان الفاظ سے کوئی طلاق نہیں ہوگی۔ (امداد المفتین ج۲ ص۶۱۳ کتاب الطلاق)

[2] قال العلامۃ قاضی خانؒ: قومی اخرجی اذھبی.....لا یقع الطلاق الا بالنیۃ واذا قال لم انوی الطلاق کان مصدقاً....الخ (الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۱ ص۴۶۸ فصل فی الکنایات والمدلولات)۔۔۔ ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۳۷۵ الفصل الخامس فی الکنایات۔

الجواب: مذکورہ الفاظ کی عربی میں "الحق باھلك" سے تعبیر کی جاتی ہے، فقہاء کرام کی تصریحات کی روشنی میں یہ طلاق کنائی ہے جس پر تلفظ کرتے وقت نیت کرنے سے طلاق واقع ہو گی ورنہ نہیں۔

قال العلامة قاضی خانؒ: وعن ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ فی الامالی: انه الحق بهٰذه الخمسة اربعة اخری لاملك لی علیك لاسبیل لی علیك خلیت سبیلك الحق باھلك۔ الخ

(الفتاوی قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۶۷ فصل فی الکنایات والمد لولات) [1]

"میری بیوی نہیں" کہنے سے طلاق نہیں ہو گی

سوال: ایک شخص نے حاکم کے سامنے یہ کہا کہ "میری بیوی نہیں ہے"، حالانکہ اُس کے گھر میں اس کی بیوی ہے، کیا ان الفاظ سے اس شخص کا نکاح متاثر ہو گا یا نہیں؟

الجواب: چونکہ یہ الفاظ طلاق کے نہیں اس لیے ان سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو سئل الك امرأة فقال لا لا تطلق اتفاقًا وان نوی۔

(الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۴۹۱ باب الصریح) [2]

بیوی کو اجازت ہے کہ وہ دوسرا خاوند کرلے

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا قصد کیا لیکن اب تک زبانی کچھ نہیں کہا ہے لیکن اس نے ارادہ کے بعد یہ کہا کہ میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ دوسرا خاوند کرے، کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة صدر الشریعةؒ: وکنایته مالم یوضع له واحتمله وغیره فلا تطلق الابنیته اودلالة الحال وفیه۔ الحقی باھلك تقع واحدة بائنة ان نواھا۔ ملخصًا۔

(شرح الوقایة ج۲ ص۷۷ کتاب الطلاق، باب ایقاع الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۵۰۲ تا ص۵۰۴ باب الکنایات۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وقوله لا عن سؤاله بقوله الك امرأة وقوله لا حاجة لی فیك، کما فی البدائع فهٰذه الالفاظ لا یقع وان نوی۔

(البحر الرائق ج۳ ص۳۰۵ باب الکنایات فی الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۳ ص۴۰۲ باب ایقاع الطلاق، فصل فی الطلاق قبل الدخول۔

الجواب:۔ صرف ارادۂ طلاق سے طلاق نہیں ہوتی البتہ اس شخص نے جو یہ کہا ہے کہ میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ دوسرا خاوند کرلے اِس سے ایک طلاقِ بائن تب واقع ہوگی جب اس سے طلاق کی نیّت ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: اذھبی وتزوجی تقع واحدة۔ قال العلامة ابن عابدینؒ:
(تحت ھٰذا القول) عنٰی ان تزوجی کنایة مثل اذھبی فیحتاج الی النیّة۔
(رد المحتار ج ۲ ص۵۱۴ باب الکنایات مطلب المتلفة المبانة نسبة امرأة من کل وجه)[1]

مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو یہ کہہ دیا کہ "مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں" تو ان الفاظ سے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ یہ الفاظ کنایات میں داخل کرکے اگر شوہر نے طلاق کی نیت کی ہو تو اس سے طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر طلاق کی نیت نہ کی ہو تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

لما فی الھندیة: ولو قال لاحاجة لی فیك ینوی الطلاق فلیس بطلاق۔
(الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۳۷۵ الفصل الخامس فی الکنایات)[2]

"تو مجھ سے آزاد ہے" سے طلاق کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ "آج سے تو مجھ سے آزاد ہے" تو ان الفاظ سے کون سی طلاق واقع ہوگی؟

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو قال لها اذھبی فتزوجی لا یقع الطلاق الا بالنیّة واذا نوی فھی واحدة واذا نوی الثلاث فثلاث۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج ۳ ص۳۱۶ کتاب الطلاق۔باب الکنایات۔ نوع آخر فی قوله خلیة واشباھھا)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۲ ص۹۸ الفصل الثانی فی الکنایات، جنس آخر فی الامر بالذھاب۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وقوله لاحاجة لی فیك لما فی البدائع ففی ھٰذہ الالفاظ لایقع وان نوی۔ (البحر الرائق ج ۳ ص۳۰۵ باب الکنایات فی الطلاق)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج ۲ ص۵۱۰ باب الکنایات۔

الجواب: ۔بیوی سے یہ کہنا کہ "تُو مجھ سے آزاد ہے"، ان الفاظ کی عربی زبان میں "سرحتك" سے تعبیر کی جاتی ہے جو عرف میں طلاقِ رجعی میں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے ان الفاظ سے طلاقِ رجعی واقع ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : فاذا قال سرحتك یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة ایضًا ۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۵۰۳ باب الکنایات) ۱؎

"تُو مجھ سے جدا ہے" کا حکم

سوال: ۔ایک شخص نے غصّہ کی حالت میں بیوی سے یہ کہا کہ "تو مجھ سے جدا ہے جیساکہ یہ چیز میرے ہاتھ میں ہے" اور اس چیز کو ہاتھ سے پھینک دے، اس سے کونسی طلاق واقع ہوگی ؟

الجواب: "تو مجھ سے جدا ہے" کے الفاظ عرف میں طلاق کے لیے اِستعمال ہوتے ہیں اس لیے ان سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔

لما فی الهندیة : ولو قال لها انت بائن ثم قال لها انت بائن، لا یقع الاّ طلقة واحدة بائنة لانه یمکن جعله خبرعن الاوّل وهو صادق فیه فلاحاجة الٰی جعله انشاء۔وفیه۔ والحق ابویوسف بخلیة وبریة ، خلیت سبیلك فارقتك ۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۷۵ تا ۳۷۷ الفصل الخامس فی الکنایات) ۲؎

"تو مجھ پر حرام ہے" کا حکم

سوال: ۔اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کے بارے میں تین دفعہ یہ کہہ دیا کہ "وہ مجھ پر حرام ہے"، تو اس سے نکاح پر کیا اثر پڑے گا ؟

الجواب: ۔منکوحہ کو یہ کہنا کہ "تو مجھ پر حرام ہے"، طلاقِ کنائی ہے جس سے طلاق کا وقوع

۱؎ وفی الهندیة : ولو قال الرجل لامرأته تراچنگ باز داشتم او بهشتم او یله کردم ترا۔ فهٰذا کله تفسیر قوله طلقتك عرفًا حتّٰی یکون رجعیًا ویقع بدون النیّة ۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۷۹ ۔ الفصل السابع فی الطلاق بالفاظ الفارسیة)

وَمثلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۲ ص۹۹ الفصل الثانی فی الکنایات جنس آخر۔ وفی الفتاوی۔

۲؎ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : حتّٰی ان الرجل لواذا قال للمرأة انت بائن ولم یقل منّی یقع الطلاق اذا نوی ۔ (الفتاوٰی التاتارخانیة ج۳ ص۳۱۱ کتاب الطلاق۔ باب الکنایات ، نوع منه فی قوله انت حرام علیّ)

نیّت پر موقوف ہے، اس لیے اگر خاوند نے تین طلاق کی نیت کی ہو تو تین طلاق واقع ہوں گی، اور اگر تین کی نیت نہ ہو صرف یہ ارادہ ہو کہ اس سے بیوی کو ایک طلاق دیتا ہوں تو پھر طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر متعدد بار یہ لفظ استعمال کئے جائیں اور اس سے طلاق کی نیت ہو تو ایک طلاق بائن واقع ہو کر دوسری دفعہ اور تیسری دفعہ اس کا ذکر لغو رہے گا کیونکہ عورت ایک دفعہ طلاق بائن سے جدا ہو جاتی ہے، دوسری یا تیسری دفعہ کے الفاظ کے لیے کوئی محل باقی نہیں رہتا۔ بہر حال اس میں نیّت یا مذاکرہ طلاق کے بغیر طلاق کا وقوع ممکن نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لان البائن لایلحق البائن۔ وایضًا قال: قلت لکن عبارة البزازیة لو قال امرأتیه انتما علیّ حرام ونوی الثلاث فی احداهما والواحدة فی الاخری صحت نیته عند الامام وعلیه الفتوٰی۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۵۰۳/۵۱۰ باب الکنایات) لـه

"میں نے اسے چھوڑ دیا ہے" کا حکم

سوال: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کے متعلق یہ کہا کہ میں نے اُسے چھوڑ دیا ہے، ان الفاظ سے کونسی طلاق واقع ہوگی؟

الجواب: اپنی بیوی کے متعلق یوں کہنا کہ "میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے" یہ الفاظ طلاقِ کنایہ کے ہیں، نیّت کی موجودگی میں ان سے طلاق بائن واقع ہوگی، لیکن ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عرف کے حوالہ سے طلاق رجعی میں شمار کیا ہے جس سے نیّت کے بغیر بھی طلاقِ رجعی واقع ہوتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فاذا قال سرحتك یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة۔ ایضًا الخ
(رد المحتار ج ۲ ص ۵۰۳ باب الکنایات) لـه ۲

لـه قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وفی الفتاوٰی اذا قال لامرأته انت علیّ حرام والحرام عنده طلاق ولکن لم ینوی طلاقًا وقع الطلاق۔ (الکنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج ۳ ص ۲۹۹ باب الکنایات فی الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص ۱۸۸ الفصل الثانی فی الکنایات وفیه اجناس الاوّل۔

لـه ۲ وفی الهندیة: ولو قال الرجل لامرأته تراچنك باز داشتم او بهشتم اویله کردم ترا، فهذه الجملة تفسیر قوله طلقتك عرفًا حتی یکون رجعیًا ویکون بدون النیّة۔
(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص ۳۷۹ الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوٰی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص ۱۸۹ الفصل الثانی فی الکنایات وفیه اجناس الاوّل۔

وہ مجھے نہیں چاہیئے، کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال کر بعد میں یہ کہا کہ "وہ مجھے نہیں چاہیئے" کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی اگرچہ طلاق کی نیّت سے کہے جائیں۔

لما فی الهندیة: ولو قال لاحاجة لی فیك ینوی الطلاق فلیس بطلاق۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۳۷۵ الفصل الخامس فی الکنایات) [۱]

تم چاروں طرف جاسکتی ہو، سے طلاق کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے غصّہ کی حالت میں اپنی بیوی سے کہا "تیرے لیے چاروں راستے کھلے ہیں جس طرف چاہو جاسکتی ہو" شریعتِ مقدسہ میں ان الفاظ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ الفاظ طلاق کنائیہ کے ہیں نیّت کے ہوتے ہوئے اس سے طلاق واقع ہوگی اور بغیر نیّت کے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی الهندیة: رجل قال لامرأته اربعة طرق علیك مفتوحة لایقع بهذا شیٔ وان نوی الّا اذا قال خذی ای طریق شئت وقال نویت الطلاق۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۷۶ الفصل الخامس فی الکنایات) [۲]

---

[۱] وقال العلامة الکاسانی رحمه الله: ولو قال لاحاجة لی فیك لایقع الطلاق وان نوی لان عدم الحاجة لایدل علی عدم الزوجیة۔ (بدائع الصنائع ج ۳ ص۱۰۷، فصل و امّا الکنایات و امّا القسم الثالث)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص۳۰۳ باب الکنایات فی الطلاق۔

[۲] وقال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا یقع باربعة طرق علیك مفتوحة وان نوی مالم یقل خذی ای طریق شئت۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۵۱۵، باب الکنایات)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۳۰۴ باب الکنایات فی الطلاق۔

اِس کُتیا کی بچّی کو طلاق

سوال: اگر کوئی شخص گھریلو تنازعہ میں اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے کہ اس خنزیر کی بچی کو طلاق، اِس کُتیا کی بچی کو طلاق، اِس کتیا کو طلاق، اور ساتھ ساتھ ہاتھ سے اشارہ بھی کرتا رہا، اس طریقہ سے کتنی طلاق واقع ہوں گی؟

الجواب: طلاق میں بیوی کو متعین کرنے کے لیے نفسِ اشارہ کافی ہے باقی اس کے بعد ذکر شدہ صفات کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور عورت بغیر حلالہ شرعی کے شوہر کے لیے حلال نہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ: قال لامرأته هٰذه الكلبة طالق طلقت۔ قال ابن عابدينؒ: لا تعتبر الصفة والتسمية مع الاشارة۔ (رد المحتار ج۲ ص۲۹۳ فی آخر باب طلاق غیر المدخول بها) [۱]

بلاقصد وارادہ طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال: اگر کوئی شخص بلاقصد وارادہ یہ الفاظ کہے کہ میری بیوی کو طلاق، طلاق، طلاق ہو، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: طلاق کے الفاظِ صریح ایسے الفاظ ہیں کہ ان میں ارادہ اور قصد کی کوئی ضرورت نہیں بلا ارادہ بھی واقع ہوجاتی ہے اگرچہ اس شخص کی نیت طلاق کی ہو یا نہ ہو، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر تین طلاق قضاءً واقع ہوچکی ہو۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا او مكرهًا او هازلًا۔۔۔۔۔ او مخطئًا بان اراد التكلم بغير الطلاق فجرى على لسانه الطلاق۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۴۶۱ كتاب الطلاق، قبل مطلب فی طلاق المدهوش) [۲]

---

[۱] قال الحصكفيؒ: قال لامرأته هٰذه الكلبة طالق طلقت۔ قال السيد احمد الطحطاويؒ تحته الظاهر انه لو لم ينو [illegible] ولم يكن بينه بال عهد وجه انها لا تطلق لكون الكلبة غير محل للطلاق۔ (طحطاوی حاشیہ الدر المختار ج۲ ص۱۳۰ باب طلاق غیر المدخول بها)

[۲] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد الانصاري رحمه الله۔ وطلاق اللاعب والهازل وطلاق الرجل الذي اراد ان يتكلم فسبق لسانه بالطلاق واقع۔ الخ (خلاصة الفتاوى ج۲ ص۸۵ كتاب الطلاق)

ومثله فی الهندية ج۱ ص۳۵۳ كتاب الطلاق فصل فيمن يقع طلاقه وفيمن لا يقع طلاقه۔

طلاق طلاق طلاق دیتا ہوں کہنے سے طلاقِ ثلاثہ واقع ہونے کا حکم

سوال:۔ جنابِ محترم مفتی صاحب! میرا سوال یہ ہے کہ میں نے اپنی زوجہ مسماۃ کلثوم جان دختر سراج احمد ساکن آلوی تحصیل و ضلع ہری پور کو مورخہ ۹۸/۳/۲۱ کو اُس وقت تحریری طلاق روانہ کی جب وہ اپنی ایک عزیزہ کی فوتیدگی پر تعزیت کے لیے کراچی گئی ہوئی تھی۔ معمولی سی بات پر میں نے وہ قدم اٹھایا جس سے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنی تحریر میں یہ الفاظ تحریر کئے کہ ''میں کلثوم جان دختر سراج احمد کو طلاق طلاق طلاق دیتا ہوں'' اور ساتھ ہی میں نے حق مہر کا چیک بھی بذریعہ رجسٹری مسماۃ مذکورہ کو ارسال کر دیا۔

جنابِ محترم! بعد ازاں مجھے اس بات کا بے حد افسوس اور صدمہ ہوا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، اس دن سے آج تک سخت پریشان ہوں۔ جس وقت میں طلاق نامہ لکھ رہا تھا اُس وقت میں کمرے میں بالکل تنہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے مندرجہ بالا الفاظ کیوں اور کیسے تحریر کئے اور میرا قلم رُک کیوں نہیں گیا۔

جنابِ محترم! میں سمجھتا ہوں کہ طلاق دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے، لیکن سمجھنے کے باوجود نہ جانے ایسے کیوں ہو گیا؟ میں نے اپنی اس غلطی کی معافی اللہ تعالیٰ سے سربسجود ہو کر طلب کی، امید ہے اللہ تعالیٰ ضرور معاف فرمائیں گے۔

جنابِ محترم! میں نے حال ہی میں اپنے علاقہ کے علماءِ دین سے رابطہ کیا کہ شاید اس مسئلہ کا کوئی مثبت حل قرآن و سنت اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں بلا حلالہ و تجدید نکاح ہو سکے۔ علمائے کرام نے میرے اس مسئلہ کا مثبت حل نکالا جس سے مجھے تسلی ہوئی۔ لیکن پھر بھی میں آپ جیسے عظیم مفکر اور عالمِ دین کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ مزید تسلی کے لیے آپ قرآن و سنت اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں جواب سے جس قدر جلد ہو سکے نوازیں۔ شکریہ

علاقہ کے علمائے کرام کے جواب اور تصدیق و تائید کی فوٹو کاپی بھی ارسالِ خدمت ہے۔

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں از روئے قرآن و حدیث و اجماعِ اُمت تین طلاقیں واقع ہو گئی ہیں، اگرچہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینا خلافِ سنت اور گناہ ہے لیکن جب دے دیں تو تینوں طلاق کے واقع ہونے میں تمام اہلسنت والجماعت کے نزدیک کوئی شبہ نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور تمام امتِ محمدیہ کا یہی مذہب ہے، اب بجز حلالۂ شرعی کے کوئی چارہ کار نہیں، ارشادِ قرآنی ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ (الآیۃ)

وقال الامام النوویؒ فی شرح مسلم: وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعی ومالك وابوحنیفة واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلث واحتج الجمهور لقوله تعالیٰ . وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (الآیۃ) لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا قالوا معناہ ان المطلق قد یحدث له ندم فلا یمکنه تدارکه لوقوع البینونة فلو کانت الثلاث لم یقع لم یقع طلاقه هذا الا رجعیا فلا یندم ۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۸ کتاب الطلاق، باب طلاق الثلاث)

قال الشامیؒ: وذهب جمهور الصحابة والتابعین ومن بعدهم من ائمة المسلمین الی انه یقع الثلاث ۔ قال فی الفتح بعد سوق الاحادیث الدالة علیه وهذا یعارض ما تقدم واما امضاء عمر الثلث علیهم مع عدم مخالفة الصحابة له وعلمه بانها کانت واحدة فلا یمکن الا وقد ثبت النقل عن اکثرهم صریحا بایقاع الثلث ولم یظهر لهم مخالف فماذا بعد الحق الا الضلال ومن هذا قلنا لو حکم حاکم بانها واحدة لم ینفذ حکمه الخ ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۴۱۹ کتاب الطلاق)

قرآن، حدیث اور فقہاء کرام کی عبارتوں کی رُو سے آپ کی منکوحہ مطلقہ ثلاثہ ہے بدون حلالہ آپ کے لیے حلال نہیں ہے ۔ جن لوگوں نے حکم صحت رجعت کا عدت میں کیا یا وہ عدم وقوع طلاق کے قائل ہوئے وہ مخالف ہیں حکم خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۔

حلالہ کی صورت یہ ہے کہ آپ کی مطلقہ بعد گذارنے عدت تین حیض کے کسی اور شخص سے کفو میں نکاح کرے اور وہ شخص اس سے جماع کرنے کے بعد اپنی مرضی سے اُسے طلاق دے دے اور وہ اُس کی عدت گذار کر خاوند اوّل کے نکاح میں آسکتی ہے ۔ اور اگر اس بات کا خطرہ ہو کہ دوسرا خاوند طلاق نہ دے گا تو اس کا ایک حیلہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ عورت اس شرط پر اس سے نکاح کرے کہ اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اُس کو اختیار ہو، پس جب وہ خاوند ایک مرتبہ اس سے جماع کر چکے تو یہ عورت اپنے اوپر از خود طلاق واقع کر سکتی ہے اور بعد گذارنے عدت کے خاوند اول کے نکاح میں آسکتی ہے ۔

اگر بالفرض حلالہ ساقط کرنے کے لیے آپ غیر مقلد بن جائیں تو بھی حلالہ ساقط نہیں ہو سکتا

اور بدون حلالہ کے شوہر اوّل مطلقہ ثلاثہ سے دوبارہ نکاح نہیں کرسکتا۔ در مختار میں ہے،
ان الحکم الملفق باطل بالاجماع وان الرجوع عن التقلید بعد العمل باطل اتفاقاً وھو المختار فی المذھب۔ (ج ۱ ص۵۱)

اور اس غرض کے لیے غیر مقلد ہونے سے بجائے حلالہ ساقط ہونے کے ایک اور بہت بڑا گناہ سرزد ہو جائے گا جس سے ذہاب ایمان کا بھی اندیشہ ہے۔

کما قال الجوہری جانی فی رجل ترک مذھب ابی حنیفہؒ لنکاح امرأۃ من اھل الحدیث فقال اخاف علیہ ان یذھب ایمانہ وقت النزع لانہ استخف بمذھبہ الذی ھو حق عندہ وترکہ لاجل جیفہ۔ (شامی ج ۳ ص۳۰۶،۳۹۰، امداد المفتین ج ۱ ص۱۹۱)

ایک، دو، تین "تم آزاد ہو" کہنے سے طلاق واقع ہونے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ناچاقی کی صورت میں یہ کہے کہ ایک، دو، تین (تم آزاد ہو) ان الفاظ طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ اگر ہو گی تو کتنی؟ جبکہ عرف میں اس کو تین طلاق شمار کیا جاتا ہے، لوگ ان الفاظ "تم مجھ پر تین طلاق سے طلاق ہو" اور مذکورہ بالا الفاظ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ایک عالم دین نے بتایا ہے کہ ان الفاظ سے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مذکورہ بالا الفاظ کی شرعی حیثیت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ وقوع طلاق میں عرف کا بہت بڑا دخل ہے، اگر کسی جگہ صورت مسئولہ میں درج شدہ الفاظ عرف میں تین طلاق کیلئے استعمال ہوتے ہوں تو وہاں عرف کے مطابق تین طلاق مغلظہ شمار ہوں گی، اسلئے کہ "تم آزاد ہو" کے الفاظ کو فقہاء نے عرف کی بناء پر طلاق صریح کے معنی میں لیا ہے۔ اگرچہ بظاہر مذکورہ جملہ میں عدد اور معدود کا کوئی تعلق نہیں ہے، دونوں ایک دوسرے سے مغائر ہیں مگر عرف نے دونوں کو ایک کر دیا ہے، اسی طرح آزاد اگرچہ الفاظ کنائی ہے مگر عرف نے ان کو الفاظ صریح میں استعمال کیا ہے اس لیے مذکورہ الفاظ انت طالق ثلاثاً کی طرح ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وان کان الحرام فی الاصل کنایۃ یقع بھا البائن لانہ لما غلب استعمالہ فی الطلاق لم یبق کنایۃ ولذا لم یتوقف علی النیۃ او دلالۃ الحال ..... ثم فرق بینہ وبین سرحتک فان سرحتک کنایۃ لکنہ فی عرف الفرس غلب استعمالہ فی الصریح ای سرحتک یقع بہ الرجعی مع ان اصلہ کنایۃ ایضاً وما ذاک الا لانہ غلب فی عرف الفرس استعمالہ فی الطلاق وقد مر ان الصریح ما لم یستعمل الا فی الطلاق من ای لغۃ کانت۔ (رد المحتار ج ۲ ص۶۳۸ باب الکنایات، کتاب الطلاق)

کئی دفعہ یہ کہناکہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" سے طلاقِ مغلظہ کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب!

میں بہت آس امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں امید ہے آپ ضرور میری راہنمائی کریں گے۔
میری شادی کو ۱۵ سال ہو چکے ہیں، دو بیٹے ہیں جن کی عمریں بالترتیب چودہ اور تیرہ سال ہیں،
میں یہاں ابوظہبی میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں، میرا مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ:-

(۱) شادی کے شروع سالوں میں ہی میرے شوہر نے مجھ پر پابندی لگائی کہ اگر تم نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں سے بال صاف کئے تو میری طرف سے تمہیں طلاق ہے" لیکن اس کے باوجود میں نے بہت دفعہ یہ بال صاف کئے کیونکہ مجھے یہ بال پسند نہیں ہیں۔

(۲) ۱۹۹۲ء میں میرے شوہر نے یہاں ایک فلپائنی عورت سے تعلق قائم کر لیا اور اس کی اکثر راتیں اس عورت کے ساتھ گذرنے لگیں، مجھے جب پتہ چلا تو میں نے اس بات پر ان سے جھگڑا کیا، بہت زیادہ لڑائی ہوئی تو انہوں نے مجھے منہ پر کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔

(۳) ۱۹۹۳ء میں میرے شوہر کی یہاں سے نوکری ختم ہوگئی تو انہوں نے اس فلپائنی عورت کو ہمارے ساتھ ہی فلیٹ میں بلا لیا اور اس کے ساتھ رہنے لگے، میں اور میرے بچے دوسرے کمرے میں ہوتے تھے اور وہ فلپائنی عورت جس کا نام میری وک (MERRY VICK) کیونکہ وہ کرسچن تھی وہ لوگ بیڈروم میں ہوتے تھے، ہر عورت کی طرح یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی، اگرچہ ہمارے درمیان جسمانی تعلقات ختم ہو چکے تھے پھر بھی ذہن میں یہ بات تھی کہ رشتے کی ایک ڈور تو باقی ہے۔ ایک دن اسی عورت کی وجہ سے ہمارے درمیان پھر لڑائی ہوئی تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ نے اس عورت کو بغیر نکاح کے رکھا ہوا ہے جو کہ بہت بڑا گناہ ہے، اس انہوں نے کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، میں مرد ہوں جو چاہوں کروں تم کون ہوتی ہو مجھے منع کرنے یا روکنے والی؟ میں نے جواب دیا کہ آخر میں تمہاری بیوی ہوں میرا تم سے رشتہ ہے، اس نے کہا کہ اگر تم اس رشتے پر اکڑتی ہو تو جاؤ میں اس رشتے کو ختم کرتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے کئی لوگوں سے کہا کہ چونکہ میری بیوی میرے ذاتی معاملا میں دخل دیتی ہے اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا ہے، وہ میرے ساتھ لڑائی کرتی ہے وغیرہ۔

(۴) اس لڑائی کے کچھ دنوں بعد میرا بیٹا بیمار ہو گیا تو میں نے اسے کہا کہ بچہ بیمار ہے اور اسے ہسپتال لے کر جانا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں میری طرف سے تم

تم آزاد ہو جو چاہے کرو مجھے بچے کی پرواہ نہیں ہے، میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ بچے میرے لیے زنجیر نہیں ہیں۔

جناب مفتی صاحب! ۱۹۹۳ء کے آخر میں اس کا ویزہ یہاں سے ختم ہو گیا اور وہ واپس پاکستان چلا گیا کیونکہ اس وقت تک فلپائنی عورت میری وک سے بھی اس کا دل بھر چکا تھا، یہاں سے جانے کے بعد اس نے ہم لوگوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھا لیکن ہمیں کہیں نہ کہیں سے خبر ملتی رہی کہ وہ پاکستان جا کر کسی اور عورت کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے اور شادی کر رہا ہے، پھر شاید ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

اب تقریباً چھ سال کے بعد وہ لوٹ آیا ہے کیونکہ اسے کسی نے بھی قبول نہیں کیا، اب وہ یہاں آکر مجھے کہتا ہے کہ میں بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، کیونکہ ہمارا رشتہ ختم نہیں ہوا تم میرے بچوں کی ماں ہو مجھے پاکستان میں ایک مولوی نے کہا ہے کہ تم اسی بیوی سے تجدید نکاح کر سکتے ہو، اس لیے اب تم میرے ساتھ ان بچوں کی خاطر بیوی بن کر رہو میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا، وغیرہ وغیرہ۔

جناب مفتی صاحب! میں جانتی ہوں کہ یہ زندگی عارضی ہے اور میں اب کوئی غلط کام کر کے اپنی آخرت خراب کرنا نہیں چاہتی۔ اس لیے آپ سے رجوع کر رہی ہوں کہ اس مسئلے میں میری راہنمائی فرمائیں کہ شریعتِ مقدسہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی اپنا فیصلہ ایک الگ صفحے پر لکھ کر بھیجیں تاکہ میں اس کے وکیل کو دکھا سکوں، خدا آپ کو اس کی جزائے خیر دے گا، میں جواب کی شدت سے منتظر رہوں گی۔ (پریشان حال: مسز شہناز چوہدری ابوظہبی)

الجواب: شریعتِ اسلامی میں حلال اور جائز اشیاء میں سے مبغوض ترین شے طلاق ہے اس سے وہ عظیم رشتہ جو میاں بیوی کے مابین ہوتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں حقیقت و مذاق شرعاً دونوں برابر ہیں بلکہ ادھر شوہر کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا ہوتا ہے ادھر بیوی مطلقہ ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ الفاظ صریح (لفظ طلاق) بغیر نیت کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے اسلئے شوہر کو ان الفاظ کے استعمال سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیئے۔

صورتِ مسئولہ کے مطالعہ اور غور سے دیکھنے کے بعد دو قسم کی طلاق کا ثبوت ملتا ہے (۱) طلاقِ معلق کا جو عام شادی کے شروع سالوں میں..... "کہ اگر تم نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں سے بال صاف کیے تو تمہیں طلاق ہے"۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی طلاق کا حکم یہ ہے کہ

جس شرط کے ساتھ اس طلاق کو معلق کیا گیا ہو اس کے پورا ہونے کے بعد بیوی پر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہاں یہ شرط پوری ہو چکی ہے جس پر آپ کے یہ الفاظ "لیکن اس کے باوجود میں نے بہت دفعہ یہ بال صاف کئے" دلالت کرتے ہیں، لہٰذا آپ پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہو چکی ہے۔

(۲) دوسری "طلاق مؤجز": ایک طلاق مؤجز تو رقم ۲ کے ان الفاظ "کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" سے معلوم ہوتا ہے اور دوسرے رقم ۳ ۱۹۹۳ء کے الفاظ "میں اس رشتے کو ختم کرتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" سے معلوم ہوتا۔ اس دوسری قسم کی دو طلاق بھی صریح ہیں اس لیے واقع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اگر صورتِ مسئولہ کے مطابق تمام واقعات درست ہوں اور شوہر نے وہ الفاظ بعینہٖ اسی طرح کہے ہوں جو آپ کے خط میں تفصیلاً مذکور ہیں تو بناء بریں آپ کا خاوند بیوی کا رشتہ طلاقِ مغلظہ کے ساتھ ختم ہو چکا ہے، اب آپ اس کی بیوی نہیں رہیں اگرچہ بچوں کی ماں ضرور ہیں لیکن ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ اکٹھے رہنا بغیر حلالۂ شرعی کے ناجائز و حرام ہے۔ اور اگر کسی مولوی صاحب نے آپ کے شوہر کو بغیر حلالہ کے تجدیدِ نکاح کا کہا ہو تو یہ شرعاً غلط ہے اُس کے قول پر عمل کرنا آپ کے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

لقولہٖ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ۔ (البقرۃ آیت ۔۔۔) [1]

تمہاری بیوی پر طلاق ہو، کے جواب میں "ہاں" کہنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کسی دوست کے ساتھ کسی موضوع پر میری بات چیت ہو رہی تھی، اس نے باتوں کے درمیان مجھ سے کسی بات کے متعلق پوچھا اور کہا کہ آپ پر آپ کی بیوی تین طلاق پر طلاق ہو کہ جھوٹ نہ بولو گے۔ جواب میں مَیں نے صرف ہاں کہا، اور پھر مَیں نے وہ جھوٹ بات کہہ دی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح میری بیوی پر تین طلاق واقع ہو گئی ہے یا نہیں؟ تفصیل سے مجھے سمجھائیں تاکہ

---

[1] لما فی الهندیۃ: من قال لامرأتہ ان دخلت الدار فانت طالق یتعلق الطلاق بالدخول۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۱ ص ۴۲۰ کتاب الطلاق)

میرے دل سے شک و شبہ نکل جائے؟

الجواب:۔ عبارت مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے جب اپنے دوست کے خط کشیدہ الفاظ کہنے پر "ہاں" کہا تو سائل ہی حالف بن گیا یعنی اس نے اپنی بیوی پر تین طلاق واقع ہونے کو جھوٹ کہنے سے مشروط کر دیا اور جب اس نے گفتگو میں جھوٹی بات کہی تو اس کی بیوی پر شرط موجود ہونے کی وجہ سے تین طلاق واقع ہو کر مطلقہ مغلظہ ہو چکی ہے اور اب وہ حلالہ شرعی کے بغیر اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

درمختار میں ہے، ولو قال علیك عهد الله إن فَعَلْتَ كذا فقال نعم فالحالف المجيب۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۳ ص۱۵۲ کتاب الطلاق)

وفی الشامیۃ: ولا یمین علی المبتدئ وان نوی الیمین خانیۃ وفتح الخ ای لاسنادہ الحلف الی المخاطب فلا یمکن أن یکون الحالف غیرہ۔ (جلد ۳ ص۱۵۲)

وفی الدر المختار: قیل لہ ان کنت فعلت کذا فامرأتك طالق فقال نعم وقد کان فعل طلقت۔ وفی الاشباہ القاعدۃ الحادیۃ عشر السؤال معاد فی الجواب، قال امرأۃ زید طالق أو عبدہ حر أو علیہ المشی لبیت اللہ إن فعل کذا وقال زید نعم کان حالفاً۔ الی آخرہ

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۳ کتاب الطلاق)

باب تعلیق وتفویض الطلاق

(طلاق معلق ومفوض کے مسائل و احکام)

طلاق کوکسی کام سے معلق کرنا

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اس طرح قسم کھائی کہ اگر میں گھر جانے سے پہلے مکہ مکرمہ نہ جاؤں تو مجھ پر بیوی طلاق ہے، پھر وہ شخص مکہ مکرمہ جانے سے پہلے ہی گھر چلا گیا، تو اس سے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مرقومہ میں گھر کو مکہ مکرمہ جانے پر موقوف کر کے قسم اٹھائی گئی ہے لہٰذا جب یہ شخص مکہ جانے سے پہلے گھر چلا جائے تو اس کی بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی، چونکہ مکہ مکرمہ جانا امرِ ممکن ہے اس لیے مالی وسائل کے فقدان کی وجہ سے حنث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لمافی الہندیۃ: واذا اضافہ الی الشرط وقع عقیبہ اتفاقاً۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج۱ ص۴۲۰ الفصل الثالث فی تعلیق الطلاق بکلمۃ ان واذا وغیرھا) [1]

کسی کو قتل کرنے پر طلاق معلق کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم اٹھائی کہ اگر میں نے تم کو قتل نہ کیا تو میری بیوی پر طلاق ہوگی، بعد میں اس شخص نے قتل سے اجتناب کیا ہے، اندریں صورت اس کی بیوی پر طلاق ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق کو عدم قتل سے معلق کرنا ممکن الوقوع ہے اس لیے یہ قسم اپنی جگہ میں منعقد ہے تاہم اس شخص پر علی الفور حنث لازم نہیں جس سے اس شخص پر بیوی طلاق ہو، البتہ اگر متعلقہ شخص اپنی موت مر جائے یا قسم کھانے والا اس کو قتل کرنے کے بغیر مر جائے تو ایسی حالت میں اس کی بیوی اس پر طلاق ہوگی، بظاہر الفاظِ قسم میں طلاق کی تعداد کا ذکر نہیں اس لیے ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: لوحلف لیفعلنہ برّ بمرۃ۔ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت ھذا القول، واذا لم یفعل لا یحکم بوقوع الحنث حتی یقع الیأس

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا اضافہ الی شرط وقع عقیب الشرط۔
(الہدایۃ ج۲ ص۳۸۵ باب الایمان فی الطلاق)
ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۳ ص۳۰ کتاب الایمان۔

عن الفعل وذٰلك بموت الحالف او بفوت محل الفعل۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۱۴۸ باب الیمین فی الضرب والقتل وغیر ذٰلک)[۱]

جان بچانے کے لیے طلاق پرجھوٹی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے جان کی خلاصی کے لیے طلاق پر جھوٹی قسم اٹھائی اور یوں کہاکہ طلاق پر قسم ہے میں سچ کہہ رہا ہوں، جبکہ حقیقت میں وہ سچا نہیں، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسے الفاظ عرف میں طلاق کے لیے استعمال نہیں ہوتے اس لیے ان سے طلاق واقع نہیں ہوگی اور نہ ان الفاظ سے قسم منعقد ہوتی ہے۔

لما فی الهندیة: وفی الفتاوٰی لو قال سوگند خورم بطلاق لیس بتطلیقة لان الناس لم یتعارفوہ یمیناً بالطلاق۔ (الفتاوٰی الہندیہ ج ۲ ص ۵۸ الباب الثانی فیما یکون یمیناً ومالا یکون یمیناً۔ الفصل الاوّل فی تحلیف الظلمة وفیما ینوی الحالف غیر ما ینوی المستحلف)[۲]

نکاح سے قبل طلاق معلق کا حکم

سوال:۔ کسی لڑکے کے لیے اس کے والدین نے ایک گھر میں رشتہ کرنا چاہا لیکن لڑکی والوں کے ناجائز مطالبات کی وجہ سے لڑکے نے کہا کہ اگر اس نے اس لڑکی سے نکاح کیا تو یہ مجھ پر طلاق ہوگی۔ تو کیا نکاح ہونے کے بعد یہ لڑکی اس لڑکے کے نکاح میں رہ سکتی ہے یا اس پر طلاق واقع ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مرقومہ میں چونکہ طلاق کو نکاح سے معلق کیا گیا ہے اس لیے نکاح ہوجانے کے بعد لڑکی پر طلاق واقع ہوگی لیکن قسم میں طلاق کا چونکہ ایک دفعہ ذکر ہے اس لیے دوسری دفعہ نکاح کرنے کے بعد لڑکی اس کے نکاح میں آسکتی ہے، تاہم اگر ایجاب وقبول دوبارہ یا سہ بارہ ہو تو

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: وان حلف لیفعلن کذا ففعله مرّة واحدة برّ فی یمینه لان الملتزم فعل واحد غیر عین اذ المقام مقام الاثبات فبایّ فعل فعله وانما یحنث لوقوع الیأس عنه وذٰلک بموته اوبفوت محل الفعل۔ (الهدایة ج ۲ ص ۵۰۶ باب الیمین فی تقاضی الدراهم)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص ۱۲۹ الباب الحادی عشر فی الیمین فی الضرب۔

[۲] قال العلامة قاضی خانؒ: ولو قال سوگند خورم بطلاق که این کار نکنم لا یکون یمیناً۔ (الفتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۲ ص ۷ فصل فی الفاظ الیمین بالفارسیة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص ۲۷۶ کتاب الایمان۔ نوع الثانی فیما یکون یمیناً۔

پہلی بار ایجاب سے نکاح ہوکر طلاق واقع ہو گی، دوسری یا تیسری بار ایجاب وقبول سے دوبارہ نکاح منعقد ہو گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: شرطہ الملك او الاضافۃ الیہ کان نکحتك فانت طالق۔
(الدرالمختار علی ھامش ردّالمحتار ج۲ ص۵۳۷ باب التعلیق) لہ

طلاق معلّق سے بچنے کا حیلہ

سوال:- ایک شخص نے کسی کام کے کرنے سے تین طلاق معلّق کی ہیں، ابھی تک تو حنث کا موقع نہیں آیا ممکن ہے کسی وقت حنث واقع ہو کر عورت مطلقہ مغلظہ بن جائے، ایسی حالت میں اس خطرہ سے بچنے کیلئے اس شخص کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:- طلاق معلق کی صورت میں شرط کی موجودگی میں طلاق کا واقع ہونا ایک ضروری امر ہے تاہم اس سے بچنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے کہ یہ شخص بیوی کو طلاق بائن دے کر فارغ کرے، عدّت گذارنے کے بعد یہ عورت اس کے نکاح سے نکل جائے تو آزادی کی حالت میں یہ شخص وہ کام کرے جس سے طلاق معلّق کی ہے، چونکہ اس وقت عورت اس کی ملک میں نہ ہونے کی وجہ سے طلاق غیر مؤثر رہے گی، اور ایک دفعہ حانث ہونے سے یمین پورا ہو کر دوبارہ کرنے سے حنث لازم نہیں آتا اس لیے جب دوبارہ نکاح کرے تو ابھی متعلقہ کام کرنے سے حنث لازم نہیں آئے گا۔

قال ابن عابدینؒ: لو حلف لایخرج امرأتہ الا باذنہ فخرجت بعد الطلاق وانقضاء العدۃ لم یحنث وبطلت الیمین بالبینونۃ حتی لو تزوجھا ثانیاً ثم خرجت بلا اذن لم یحنث۔ (ردالمحتار ج۲ ص۵۴۴ باب التعلیق مطلب زوال الملک...الخ) لہ

لہ: قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا اضاف الطلاق الی النکاح وقع عقیب النکاح مثل ان یقول لامرأۃ ان تزوجتك فانت طالق او کل امرأۃ اتزوجھا فھی طالق۔
(الھدایۃ ج۲ ص۳۸۵ باب الایمان فی الطلاق)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۴۲۰ الفصل الثالث فی تعلیق الطلاق بکلمۃ ان و اذا وغیرھا۔

لہ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: فحیلۃ من علق الثلاث بدخول الدار ان یطلقھا واحدۃ ثم بعد العدۃ تدخلھا فتنحل الیمین فینکحھا۔ (الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار جلد۲ ص۵۴۵ باب التعلیق۔ مطلب اختلاف الزوجین فی وجود الشرط)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۱ ص۴۱۶ الباب الرابع فی الطلاق بالشرط، الفصل الاول فی الفاظ الشرط۔

طلاق کُلَّمَا کی حقیقت

سوال: ایک شخص نے گواہوں کے سامنے اقرار کیا کہ میں نے طلاق کلما دی ہے، اس سے کون سی طلاق واقع ہو گی؟

الجواب: طلاق کلما کی حقیقت حروفِ شرط کے ساتھ ذکر ہو کر خاص الفاظ ہیں، ویسے یہ عنوان معنون کے وجود کے لیے لازم نہیں، اس لیے صرف عنوان ذکر کرنے سے اس کی کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ناقلاً عن البزازیۃ انہ قد اشتہر فی رساتیق شروان ان من قال جعلت کلما او علیّ کلما انہ طلاق ثلاث معلّق وھٰذا باطل من ھذیانات العوام۔ (ردّ المحتار حاشیہ الدّر المختار ج۲ ص۴۶۵ باب الصریح) [1]

کُلَّمَا طلاق کے وقوع سے بچنے کی صورت

سوال: ایک شخص نے کسی کام سے اجتناب اور پرہیز کرنے کے لیے بڑی تاکید کرتے ہوئے کہا: "اگر میں نے فلاں کام کیا تو جب بھی میں نکاح کروں وہ بیوی مجھ پر طلاق ہو گی" ایسے شخص کو طلاق سے بچانے کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے؟

الجواب: ایسی طلاق فقہاء کی اصطلاح میں "طلاق کلما" کے عنوان سے معنون ہے جس میں شخص مذکور اگر متعلقہ کام کرنے کے بعد اصالتًا یا وکالتًا نکاح کرے تو بیوی اس پر طلاق ہو گی، کیونکہ نکاح کے وکیل کے تصرفات کی نسبت بھی مؤکل کی طرف ہوتی ہے۔ تاہم فقہاء نے اس سے بچنے کے لیے ایک حیلہ تجویز کیا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی بن جانے کی توقع کی جا سکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنی حالت کسی ایسے عالم کے سامنے بیان کرے جو اس کی ضروریات کو جان کر اس کے لیے بحیثیت فضولی نکاح کرائے اور شخص مذکور کسی توکیل یا زبان سے ایجاب و قبول کے بجائے عملی طور پر اجازت دے دے جس سے نکاح متصوّر ہو گا۔

قال ابن عابدینؒ والحیلۃ فیہ تماقی لیحی ان یزوجہ فضولی ویجیز بالفعل کسوق الواجب الیھا۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۵۳۷ باب التعلیق) [2]

---

[1] وقال ابن البزازؒ: واشتہر ایضًا انہ اذا قال جعلت کلما او علی کلما انہ طلاق ثلاث معلق وھٰذا ایضًا باطل وھٰذا من ھذیانات العوام لانھا یۃ لھا۔ (الفتاوٰی البزازیۃ علی ہامش الہندیہ ج۴ ص۳۴۷ نوع فی تعلیقہ بالملک)

[2] وفی الھندیۃ: واذا قال کل امرأۃ اتزوجھا فھی طالق فزوجہ فضولی واجازہ بالفعل بان ساق المھر ونحوہ لا تطلق۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۱ ص۴۱۹ الفصل الثانی فی تعلیق الطلاق بکلمۃ کل وکلما)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علی ہامش الھندیۃ ج۴ ص۲۵۴ نوعٌ فی تعلیقہ بالملک۔

میں گھر آیا تو تجھے طلاق ہو گی

سوال: ایک شخص نے بیوی سے کہا اگر میں گھر آیا تو تجھے طلاق ہو گی، اب وہ خود تو گھر نہیں گیا لیکن کسی دوسرے شخص نے اسے اٹھا کر جبراً گھر میں داخل کر دیا، تو کیا اس سے طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

الجواب: شخص مذکور کی مرضی کے بغیر اسے اٹھا کر جبراً گھر میں لانے سے طلاق واقع نہیں ہو گی۔

لما فی الهندیة: فان احتمله غیره فادخله بغیر امره لم یحنث سواء کان راضیاً بذلک بقلبه او ساخطاً وسواء کان قادراً علی الامتناع او لم یکن۔[1]

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۶۸ الباب الثالث فی الیمین علی الدخول والسکنیٰ)

کسی کے گھر جانے سے منع کرنے کیلئے طلاق پر قسم کھانا

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو کسی کے گھر جانے سے منع کرنے کے لیے کہا کہ اگر تو اس وقت فلاں کے گھر گئی تو تُو مجھ پر طلاق ہے، اب اگر اس کی بیوی اُسی وقت یا اس کے بعد اُس گھر گئی تو طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زوج کا قول اُسی مجلس سے خاص ہے، اگر بیوی اس مجلس سے اٹھ کر فلاں کے گھر چلی گئی تو طلاق ہے اور اگر اس مجلس کے بعد اس گھر گئی تو پھر طلاق واقع نہیں ہو گی۔

قال المرغینانیؒ: ولو ارادت المرأة الخروج فقال ان خرجت فانت طالق فجلست ثم خرجت لم یحنث وکذلک ان اراد ضرب عبده فقال له اخر ان ضربته فعبدی حر فترکه ثم ضربه وهذه تسمیٰ یمین فور تفرد ابوحنیفة باظهاره الخ۔ (الهدایة ج۲ ص۴۸۶ باب الیمین فی الخروج والاتیان والرکوب وغیر ذلک)[2]

---

[1] قال قاضیخانؒ: ولو حلف ان لا یدخل .... وان احتمله انسان وادخله فیها فان کان الحالف لا یقدر علی الامتناع لا یحنث فی قولهم وان کان یقدر ولم یمتنع وهو راض بقلبه اختلفوا فیه والصحیح انه لا یحنث۔ (فتاویٰ قاضیخان ج۲ ص۳۱۸، فصل فی الدخول، کتاب الایمان) ــــ ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۱۶۵ الفصل السابع عشر فی الیمین فی الدخول۔

[2] قال ابن نجیمؒ: امرأة تهیأت للخروج فحلف لا تخرج فاذا جلست ساعة ثم خرجت لا یحنث لان قصده ان یمنعها من الخروج الذی تهیأت له فکانه قال ان خرجت الساعة ومنه من اراد ان یضرب عبده فحلف علیه لا یضربه فاذا ترکه ساعة بحیث یذهب فوره ذلک ثم ضربه لا یحنث۔ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۴ ص۳۱۵ باب الیمین فی الدخول والخروج والسکنیٰ والاتیان وغیر ذالک) ــــ ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۱۰۷ کتاب الایمان، الفصل الثانی عشر فی الخروج والاتیان والذهاب)

طلاق کے ساتھ متصل انشاء اللہ کہنے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر ساتھ ہی متصلاً یہ کہے "انشاء اللہ تعالیٰ"۔ کیا اس طرح یہ طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: جب طلاق دینے کے بعد متصلاً انشاء اللہ تعالیٰ کہا جائے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: واذا قال الرجل لامرأته انت طالق انشاء الله متصلاً لم يقع الطلاق۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج۳ ص۱۴۶ كتاب الايمان فى الطلاق) ؎۱

اگر فلاں کام کیا تو طلاقی ہوں گا

سوال: کسی شخص نے قسم اٹھاتے ہوئے یوں کہا "اگر اس نے فلاں کام کیا تو طلاقی ہوں گا" کیا اس کام کے کرنے پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: طلاقی عرف میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے بیوی کو طلاق دیدی ہو اس لیے مذکورہ الفاظ کہنے کے بارے میں مستقل جزئیہ نہیں ملا لیکن عام قواعد سے اندازہ ہوتا ہے کہ حانث ہونے پر ایک طلاق واقع ہوگی۔

لما قال العلامة ابن عابدين: وقد تعورف فى عرفنا فى الحلف الطلاق يلزمنى لا افعل كذا يريد ان فعلته لزم الطلاق ووقع فيجب ان يجرى عليهم لانه صار بمنزلة قوله ان فعلت فانت طالق، وكذا تعارف اهل الارياف الحلف بقوله على الطلاق لا افعل۔ الخ

(ردّ المحتار على الدر المختار ج۲ ص۴۶۹ باب الصريح) ؎۲

طلاق کے لیے کسی اور کو حق دینا

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق اپنے والد کو اس طرح دیا کہ میں فلاں ابن فلاں بقائمی ہوش و حواس،

؎۱ قال العلامة التمرتاشی: قال لها انت طالق انشاء الله تعالى متصلاً مسموعاً لا يقع۔

(تنوير الابصار على هامش ردّ المحتار ج۲ ص۵۵۲ باب التعليق)

وَمِثْلُهٗ فى كنز الدقائق ج۱ ص۱۲۳ باب التعليق۔

؎۲ وقال العلامة ابن نجيم: وفى فتح القدير وقد تعورف فى عرفنا فى الحلف الطلاق يلزمنى لا افعل كذا يريد ان فعلته لزم الطلاق ووقع فوجب ان يجرى عليهم ۔۔۔ الخ

(البحر الرائق شرح كنز الدقائق ج۳ ص۲۵۲ باب الطلاق)

وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج۳ ص۱۴۶ كتاب الايمان فى الطلاق۔

برضا و رغبت، بلاکسی جبر و اکراہ کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق اپنے والد کو تفویض کرتا ہوں، اس پر اس کے دستخط اور گواہ بھی موجود ہوں، کیا اس کے بعد والد بیٹے کی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق میں مطلقاً توکیل درست ہے، اس لیے اگر بیٹے نے باپ کو طلاق دینے کے اختیارات دیئے ہوں تو والد کسی وقت بھی ان اختیارات کو استعمال کرکے اپنے بیٹے کی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، تاہم بیٹا کسی وقت بھی اس سے رجوع کر سکتا ہے جس کے بعد والد کو طلاق دینے کا حق باقی نہیں رہے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واما فی طلقی ضرتك او قوله لاجنبی طلق امرأتی فیصح رجوعه منه ولم یتقید بالمجلس لانه توکیل محض۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۳ ص۳۱۷ باب تفویض الطلاق) ؎۱

بیوی کو طلاق کا حق دینا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق کا حق سونپتے ہوئے کہا طلقی نفسك، تو کیا اس اختیار سے عورت تین طلاق بھی استعمال کر سکتی ہے، کیا اس سے تین طلاق واقع ہوں گی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ شوہر کی طرف سے بیوی کو اختیارِ کلی حاصل ہے لہٰذا اگر عورت تین طلاق استعمال کرنی چاہے تو بھی درست ہے بشرطیکہ شوہر نے تین کی نیّت کی ہو ورنہ ایک طلاق کا اختیار تو عورت کو حاصل ہے ہی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: قال لها طلقی نفسك ھذا تفویض بالصریح ولا یحتاج الی النیّة والواقع به رجعی وتصح فیه نیة الثلاث۔ (الدر المختار علی ھامش ردالمحتار ج۲ ص۵۱۵ باب تفویض الطلاق) ؎۲

؎۱ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ما یدل علی جواز الوکالة فی الطلاق وصحته ما نصه۔ وفی المحیط: سئل شمس الاسلام عمن قال لغیره طلق امرأتك فقال ذلك الغیر الحکم لك فقال ان کان الحکم لی طلقتها .... الخ

(خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۸۹ کتاب الطلاق، جنس آخر فی التوکیل ..... الخ)

؎۲ وفی الهندیة: قال لها طلقی نفسك سواء قال لها ان شئت او لا فلها ان تطلق نفسها۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۴۰۲ الفصل الاول فی المشیئة)

باب تفریق مفقود الخبر ونحوہ

(مفقود الخبر وغیرہ کی تفریق کے مسائل)

مفقود الخبر کی بیوی کا نکاح ثانی کرنا

سوال:۔ ایک بالغ لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیا گیا، ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی کہ اس کا خاوند لاپتہ ہو گیا جس پر آٹھ سال گذر گئے ہیں، تمام ذرائع ابلاغ اور دستیاب وسائل سے اس کی تلاش کی گئی تاہم اس کی موت و حیات کا پتہ نہ چل سکا، لڑکی جوان ہے اور اس کا کوئی سرپرست بھی نہیں، کیا شریعت میں اس کیلئے فسخ نکاح کی کوئی صورت ہے تاکہ وہ کسی دوسری جگہ نکاح کرے۔

الجواب:۔ زوجۂ مفقود الخبر کے بارے میں فقہ حنفی کی جزئیات پر عمل کرنا مشکل ہے، کیونکہ مدت دراز تک بیوی کیلئے خاوند کا انتظار کرنا متعدد معاشی اور اخلاقی مسائل کا موجب بن سکتا ہے۔ اس لئے فقہاء کرام نے امام مالکؒ کے مذہب کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ آسانی کی صورت پیدا کی ہے کیونکہ بوقت ضرورت دوسرے فقہاء کے مذہب پر عمل کرنا مرخص ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وقد کان بعض اصحابنا یفتون بقول مالکؒ فی ھذہ المسئلة للضرورة ثم رأیت ما بحثته بعینه۔ ذکرہ محشی مسکین عن السید الحمویؒ وسیأتی نظیر ھذہ المسئلة فی زوجة المفقود حیث قیل انه یفتی بقول مالک انھا تعتد عدة الوفاة بعد مضی اربع سنین۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۳ ص۵۰۹ باب العدة)

وقال فی موضع آخر: وذکر الفقیه ابو اللیثؒ فی تأسیس النظائر انه اذا لم یوجد فی مذھب الامام قول فی مسئلة یرجع الی مذھب مالکؒ لانه اقرب المذاھب الیه۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۱ ص۳۸۴)

وقال فی مذھب مالک زوجة المفقود: وقال فی الدر المنتقی لیس باولیٰ لقول القھستانی لو افتی به فی موضع الضرورة لا بأس به علیٰ ما اظن (الیٰ ان قال) وقد قال فی البزازیة الفتویٰ فی زماننا علیٰ قول مالکؒ۔ (ردالمحتار جلد ۴ ص۲۹۵ کتاب المفقود، مطلب فی الافتاء بمذھب مالکؒ فی زوجة المفقود)

اسلئے ایسی حالت میں امام مالکؒ کے مذہب پر عمل کرنا جائز ہے، چونکہ فقہاء احناف

نے اس پر عمل کی گنجائش پیدا کی ہے اس لیے یہ فقہ حنفی ہی کا حکم شمار ہوگا۔

پس جس عورت کا خاوند لاپتہ ہوا اور چار سال اس کے لاپتہ ہونے پر گذر جائیں اور اس کی حیات و ممات کے بارے میں کوئی معلومات نہ ہوں تو اب اگر عورت خاوند کے انتظار میں بیٹھی رہے تو اس کو نان و نفقہ کا مسئلہ درپیش ہوگا، اگر اخراجات کا مسئلہ کہیں سے حل ہوجائے لیکن بغیر خاوند کے بیٹھنے میں کسی بے راہروی کے شکار ہونے کا اندیشہ ہو تو اس حالت میں اپنے آپ کو کسی امتحان میں ڈالنے کے بجائے خلاصی کی صورت تلاش کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ عورت اپنی مرضی سے کسی دوسری جگہ نکاح کر سکے۔

ایسی عورت کو علماء کرام یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ چار سال تک انتظار کرنے کے بعد کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جائے، عدالت ایک سال تک ممکنہ ذرائع سے اس کے خاوند کو تلاش کرے، اگر خاوند کہیں مل جائے یا اس کی موت قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو تو فبہا و نعمت، ورنہ ایک سال کی تحقیق کے بعد متعلقہ عدالت خاوند کی عورت کو فسخ نکاح کی ڈگری صادر کرے گی جو عورت کے حق میں طلاق بائن شمار ہوگی جس کی رو سے عدت گذارنے کے بعد یہ عورت دوسری جگہ نکاح، اسی حالت میں اگر خاوند کہیں سے آجائے تو عدالت کا فیصلہ اس کے آنے سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ بیوی دوسرے خاوند کے پاس رہے گی۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس مسئلہ کے بارے میں یوں روشنی ڈالتے ہیں: "مفقود کو باتفاق ائمہ مجتہدین اپنے مال کے بارہ میں اس وقت تک زندہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جبتک اسکے ہم عمر و ہم قرن لوگ زندہ پائے جائیں، جس وقت بستی میں اسکے ہم عمر لوگ ختم ہوجائیں اس وقت اس کی موت کا حکم کیا جاتا ہے یعنی قاضی اسکی موت کا حکم دیدیتا ہے اور اس کی میراث وغیرہ تقسیم کرنے کی اجازت ہوجاتی ہے، اس پر ائمہ ثلاثہ یعنی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالی اجمعین کا اتفاق ہے۔ کما ھو مصرح فی کتبہم اور امام اعظم اور امام شافعی اور بہت سے دوسرے مجتہدین نے زوجۂ مفقود میں بھی یہی حکم باقی رکھا کہ جبتک مفقود کے ہم عمر لوگ ختم نہ ہوں اس وقت تک وہ زندہ ہے اور حسب قاعدہ اسکی بیوی کو دوسری جگہ نکاح کرنا جائز نہیں، البتہ بعض صورتوں میں حنفیہ کے نزدیک زوجۂ مفقود الخبر کو اسکے ہم عمروں کے ختم ہونے سے بیشتر بھی قاضی نکاح کی اجازت دے سکتا ہے یعنی جبکہ

اس مفقود کے ظاہر حال سے اس کی ہلاکت وموت کا غالب گمان ہو جیسے وہ شخص جو معرکۂ جنگ میں گم ہو گیا یا ایسے مرض کی حالت میں نکل گیا ہو جس میں موت کا گمان غالب ہے یا سمندر میں سفر کیا ہو اور ساحل پر پہنچنے کا پتہ نہ چلا ہو) اس قسم کی صورتوں میں اتنا انتظار کرکے موت کا حکم دے دیا جاوے گا کہ جس میں حاکم کو مفقود کے فوت ہو جانے کا غلبۂ ظن ہو جاوے اور اس حکم بالموت کے بعد اس کی عورت کو عدتِ وفات گذار کر نکاح کر لینا جائز ہو گا۔

کما فی الشامیۃ تحت قول الدر ــــ (واختار الزیلعی تفویضہ الی الامام) قال فی الفتح فای وقت رأی ــــ المصلحۃ حکم بموتہ (الیٰ ان قال) ومقتضاہ انہ یجتھد ویحکم بالقرائن الظاھرۃ الدالۃ علیٰ موتہ وعلیٰ ھٰذا ینبغی ما فی الجامع الفتاویٰ حیث قال واذا فقد فی المھلکۃ فموتہ غالب فیحکم بہ کما اذا فقد فی وقت الملاقات مع العدو او قطاع الطریق او سافر علی المرض الغالب ھلاکہ او کان سفرہ فی البحر وما اشبہ ذٰلک حکم بموتہ لانہ الغالب فی ھٰذہ الحالات وان کان احتمالین واحتمال موتہ ناشئ عن دلیل لا احتمال حیاتہ لان ھٰذا الاحتمال کاحتمال ما اذا بلغ المفقود مقدار ما لا یعیش علیٰ حسب ما اختلفوا فی مقدارہ نقل عن الغنیۃ انتھیٰ مافی جامع الفتاویٰ وافتی بہ بعض مشائخنا وقال انہ افتی بہ قاضی زادہ صاحب بحر الفتاویٰ لکن لا یخفی انہ لا بد من مضی مدۃ طویلۃ حتّٰی یغلب علی الظنّ موتہ لا بمجرد فقدہ عند ملاقات العدو او سفر البحر ونحوہ ۔
(ردالمحتار ص۳۶۳ ج ۳ مطلب فی الافتاء بمذھب مالک فی زوجۃ المفقود)

اس قسم کی صورتوں کے علاوہ فقہ حنفی میں زوجۂ مفقود کے واسطے اس کے سوا کوئی گنجائش نہیں کہ مفقود کے ہم قرن لوگوں کے ختم ہونے پر قاضی اس کی موت کا حکم کر دے اور بعد ازاں عورت عدتِ وفات گذار کر نکاح کرے۔

لیکن امام مالکؒ نے چند شرائط کے ساتھ (جن کی تفصیل عنقریب آتی ہے) ہر حال میں (یعنی ہلاک مظنون ہو یا نہ ہو) مفقود کی بیوی کو حکم حاکم کے بعد چار سال انتظار کرکے عدت گذرنے پر دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدی ہے، اور امام احمدؒ نے بھی مفقود کی بعض صورتوں میں چار سال کی مدت کو اختیار فرمایا ہے۔ کما فی المغنی ج ۹ ص۱۳۳)

اور ہر چند کہ حنفیہ کا مذہب از روئے دلیل نہایت قوی اور غایت احتیاط پر مبنی ہے مگر فقہاء حنفیہؒ میں سے بعض متاخرین نے وقت کی نزاکت اور فتنوں پر نظر فرماتے ہوئے اس مسئلہ میں امام مالکؒ

کے مذہب پر فتویٰ دیا ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ اور منتقیؒ نے قہستانیؒ کا (جو چوتھی صدی ہجری کے مشائخ
حنفیہ میں ہیں) کا قول نقل کیا ہے: لو افتی بہ فی موضع الضرورۃ جاز۔ (ج ۳ ص ۳۶۲ مطلب
قضاء القاضی علی ثلاثۃ اقسام) اور ایک عرصہ سے اربابِ فتویٰ اہلِ ہند و بیرونِ ہند تقریباً
سب نے اسی قول پر فتویٰ دینا اختیار کر لیا ہے اور یہ مسئلہ اس وقت ایک حیثیت سے فقہ حنفی ہی میں
داخل ہو گیا ہے، لیکن جب تک عورت صبر کر سکے اس وقت تک اصل مذہب حنفی پر عمل کرنا لازم ہے،
ہاں بوقتِ ضرورتِ شدیدہ کہ مثلاً خرچ کا انتظام نہ ہو سکے یا بوجہ خوفِ معصیت کے بیٹھنا مناسب نہ
ہو سکے تو اس وقت مذہب مالکیہ پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور ایسے ہی مواقع کے لیے یہ
فتویٰ مرتب کیا گیا ہے، مگر کسی مسئلہ میں دوسرے امام کا مذہب لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس
مسئلہ میں اس امام کے نزدیک جو شرطیں ہوں ان سب کی رعایت کی جاوے۔ لما فی الدر المختار
من ان الحکم الملفق باطل بالاجماع قال الشامیؒ تحتہ مثالہ متوضئ سال من بدنہ دم ولمس
امرأۃ ثم صلی فان صحت ہذہ الصلوۃ ملفقۃ من مذہب الشافعی والحنفی والتلفیق باطل
فصحتہ منتفیۃ اھ۔ وایضاً قال الشامیؒ عن الشرنبلالیؒ تحت قول الدر وان الرجوع
عن التقلید بعد العمل باطل اتفاقاً وانہ یجوز لہ العمل بما یخالف ما عملہ علی
مذہبہ مقلداً فیہ غیر امامہ مستجمعاً شروطہ۔ (ج ۱ ص ۵۵ مطلب لا یجوز العمل بالضعیف) لہٰذا مسئلہ مفقود الخبر
میں مالکیہ کی تمام شرائط کا معلوم کرنا لازم ہوا اور شامی وغیرہ میں احناف نے اس کے متعلق جو
مذہب مالکیہ نقل کیا ہے وہ محض اجمال تھا اور مسئلہ کی پوری تنقیح اور اس کے تمام قیود و شرائط علمائے
مالکیہ ہی سے معلوم ہو سکتے تھے اس لیے اس ضرورت کا احساس کر کے مالکی المذہب اربابِ فتویٰ
کی خدمت میں مدینہ طیبہ (زادہا اللہ شرفاً و نوراً) مفصل استفتاء بھیجا گیا، وہاں کے متعدد علمائے محققین
نے نہایت تفصیل و توضیح کے ساتھ جوابات تحریر فرمائے، لیکن پھر ان میں کچھ شبہات باقی رہے اور
بعض نئے سوالات پیدا ہوئے اس لیے مکرر ان حضرات کو تکلیف دی گئی مکرر جوابات کے بعد بھی
کچھ اور سوالات کی ضرورت ہوئی تو سہ بارہ ان کی خدمت میں سوالات بھیج کر جوابات حاصل کئے، یہ تمام
مراسلت کتب خانہ مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں محفوظ ہے اور ان فتاویٰ کا مجموعہ آخر رسالہ میں
ملحق کر دیا گیا ہے، ان فتاویٰ کی جس جس عبارت سے ہمارے سوالات کا جواب ملتا ہے ان سب پر
الفاظ سے نمبر شمار ڈال دیئے گئے ہیں اور جوابات مندرجہ ذیل ہیں، ان عبارات کے صرف حوالہ پر اکتفاء
کیا گیا ہے کیونکہ عوام کو تو عربی عبارات کی ضرورت نہیں اور اہلِ علم اس نمبر کے حوالہ سے آخر رسالہ میں

استدلال کی عبارت خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں، اب سوالات اور جوابات اردو میں یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

سوالات

کیا فرماتے ہیں علمائے مالکیہ مسائل ذیل میں کہ:۔

(اوّل) جو شخص مفقود الخبر (للبتہ) ہو اور باوجود تحقیق و تفتیش کے اس کا حال معلوم نہ ہو کہ زندہ ہے یا مرگیا کیا اس کی زوجہ کے لیے حق ہے کہ وہ کسی طرح اپنے کو اس کی زوجیت سے نکال کر دوسرا نکاح کرسکے، اگر یہ حق ہے تو کیا اس کو کچھ مدت انتظار کرنے کی ضرورت ہے یا بلامہلت اس کو اختیار دے دیا جائے گا؟

(دوم) اگر مہلت دی جاوے گی تو اس کی ابتدا کب سے شمار ہوگی؟ مرافعہ اور مخاصمہ کے وقت سے یا گم ہونے کے وقت سے یا حکمِ حاکم کے بعد سے؟

(سوم) کیا زوجۂ مفقود فسخ نکاح میں خود مختار ہے یا قضاء قاضی شرط ہے اور صورت فسخ کی کیا ہوگی؟

(چہارم) اگر قضائے قاضی شرط ہے تو کیا قاضی پر بھی یہ بات لازم ہے کہ پہلے مفقود کی خود تفتیش و تلاش کرے، جب اس کو مایوسی ہو جائے اس وقت زوجہ کو کوئی مہلت وغیرہ دے یا عورت اور اس کے اولیاء کا تلاش کر لینا کافی ہے؟

(پنجم) جن بلاد میں قاضی شرعی موجود نہیں جیسے ہندوستان وغیرہ تو وہاں اسکی کیا صورت کی جائے؟

(ششم) مفقود کا حکم دارالحرب اور دارالاسلام میں یکساں ہے یا مختلف؟ اگر مختلف ہے تو پھر ہندوستان جیسے ممالک جن میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں وہ دارالاسلام سمجھے جاویں گے یا دارالحرب؟ (اعینونا اعانکم اللہ تعالیٰ)

جوابات

(جواب سوال اوّل) زوجۂ مفقود کے لیے مالکیہ کے نزدیک مفقود کی زوجیت سے علیحدہ ہونے کی دارالاسلام میں صورت یہ ہے کہ عورت قاضی کی عدالت میں مرافعہ کرے اور بذریعہ شہادتِ شرعیہ یہ ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، (اگر نکاح کے عینی گواہ موجود نہ ہوں تو اس معاملہ میں شہادت بالتسامع بھی کافی ہے یعنی شہرتِ عام کی بناء پر بھی شہادت دی جاسکتی ہے۔ کما فی المنتقی للباجی المالکی ص۲۰۳ ج۵ کتاب الاقضیۃ) (فرع) واما النکاح ففی العتبیۃ عن سحنون قال جل اصحابنا یقولون فی النکاح اذا استنشر خبرہ فی الجیران ان فلاناً تزوج فلانۃ

وسمع الزفاف فله ان یشهدا ان فلانۃ زوجۃ فلان الخ) اس کے بعد گواہوں سے اس کا مفقود لاپتہ ہونا ثابت کرے بعدازاں قاضی خود بھی اس مفقود کی تفتیش و تلاش کرے اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہو جائے تو عورت کو چار سال مزید انتظار کا حکم کرے، پھر اگر ان چار سال کے اندر بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو مفقود کو اس چار سال کی مدت ختم ہونے پر مُردہ تصوّر کیا جائے گا، اور نیز ان چار سال کے ختم ہونے کے بعد چار ماہ دس دن عدتِ وفات گذار کر عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا۔ اوراب چار سال گذرنے کے بعد دوبارہ قاضی کی عدالت میں درخواست دینا اور عدتِ وفات کے لیے حکم حاصل کرنا مالکیہ کے نزدیک ضروری نہیں بلکہ قضائے قاضی صرف اول بار بوقتِ تاجیل ضروری ہے۔ کما صرح بذٰلک فی شرح الدرر۔ (صـ ۴۸۲ ج ۱) حیث قال الخلیل فیؤجل الحر اربع سنین (الی قولہ) ثم اعتدت عدت الوفاۃ وسقطت بہا النفقۃ ولا یحتاج فیہا الاذن، وقال الدردیر تحتہ لاذن من الحاکم لان اذنہ حصل بضرب الاجل اولاً اھ۔ ویأتی فی الروایۃ السابعۃ من فتوی العلامۃ محمد طیب بن اسحٰق مفتی المالکیۃ بالمدینۃ المنورۃ۔ مگر احتیاط اس میں ہے کہ جب وہ چار سال جو قاضی نے مقرر کیے تھے ختم ہو چکیں تو دوبارہ درخواست دے کر قاضی سے حکم بالموت بھی حاصل کر لیا جائے تاکہ مذہبِ حنفیہ کی حتی الوسع رعایت ہو جائے لیکن جس جگہ قاضی وغیرہ کو دوبارہ مرافعہ دشوار ہو وہاں بغیر مرافعہ دشوار ہو وہاں بغیر مرافعہ ثانی کے ہی عمل کرنے میں مضائقہ نہیں۔

یہ حکم مذکور تو دارالاسلام میں تھا اور دارالحرب میں زوجۂ مفقود کا جمہور مالکیہ کے نزدیک

عـہ کیونکہ ان کے نزدیک مفقود کے تمام ہم عمر لوگوں کے ختم ہو جانے پر بھی حکم بالموت حاصل کرنا شرط ہے۔ کما فی شرح الدر عن القنیۃ انہ انما یحکم بموتہ بقضاء لانہ امر محتمل فما لم ینضم الیہ القضاء لا یکون حجۃ اھ اور مقتضائے قواعد واحتیاط ہونے کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے کہ عورت کی دوبارہ درخواست پر موتِ مفقود کا حکم کرکے عدتِ وفات گذارنے کا حکم دیا تھا۔ اور مسئلہ مفقود میں مالکیہ کے مذہب کی اصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا فیصلہ ہے پھر نہ معلوم اس جزو میں کیوں خلاف کرتے ہیں۔ نیز عنین کو قاضی کی طرف سے سال بھر کی مہلت ملنے کے باوجود بھی زوجۂ عنین کو اس سال کے گذر جانے پر دوبارہ درخواست دینی پڑتی ہے اس میں حنفیہ کے ساتھ مالکیہ بھی متفق ہیں پس نہ معلوم انہوں نے عنین اور مفقود میں کیا فرق سمجھا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ منہ

تو وہی حکم ہے جو حنفیہ کے نزدیک ہے یعنی جب تک اس کے ہم عمر لوگ زندہ ہیں اس وقت تک اس کی بیوی کے لیے اس کے نکاح سے جدا ہونے اور دوسرا نکاح کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ کما فی الروایۃ الثالثۃ من فتوی العلامۃ سعید بن صدیق مفتی المالکیۃ بالمدینۃ الطاہرۃ زادھا اللہ تعالیٰ شرفا واجلالاً۔ (اور بعض حضرات نے اس کی مدت طبعی عمر کے لحاظ پر متعین بھی کر دی ہے جس میں مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک نوّے برس بعض کے نزدیک پچھتّر برس بعض کے نزدیک ستّر برس وغیر ذلک۔ (ولکن الاولیٰ ان یفوض الیٰ رای اھل الخبرۃ واھل العلم بحالہ من صحتہ وسقمہ وقوتہ وضعفہ) مگر اشہب نے (جو کہ امام مالکؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں اور فقہاء مالکیہ میں بلند پایہ مقام رکھتے ہیں) دار الحرب میں بھی زوجۂ مفقود الخبر کا وہی حکم رکھا ہے جو دار الاسلام میں گذر چکا ہے۔ کما ذکرہ ابن رشد فی مقدماتہ (مدونۃ ص۱۵۶ ج۲)

حیث قال واما المفقود فی بلاد الحرب فحکمہ حکم الاسیر لا تتزوج امرأتہ ولا تقسم مالہ حتی یعلم موتہ او یأتی علیہ من الزمان ما لا یحییٰ الیٰ مثلہ فی قول اصحابنا کلھم حاشا اشھب فانہ حکم لہ بحکم المفقود فی المال والزوجۃ جمیعًا اھ۔

(جواب سوال دوم) حاکم جو چار سال انتظار کے لیے مقرر کرے گا اس کی ابتداء اس وقت سے کی جاوے گی جس وقت حاکم خود بھی تفتیش کر کے پتہ چلنے سے مایوس ہو جائے اور قاضی کی عدالت میں پہنچنے اور اس کی تفتیش سے قبل خواہ کتنی ہی مدت گذر چکی ہو اس کا کچھ اعتبار نہ ہوگا۔ کما فی ادل الفتویٰ من العلامۃ سعید بن صدیق المالکی ویؤیدہ باوضح وجہ ما فی الروایۃ العشرین من العلامۃ الموصوف۔

(جواب سوال سوم) زوجۂ مفقود کسی صورت میں اس کے نکاح سے خارج ہونے خود مختار نہیں بلکہ ہر حال میں قضائے قاضی شرط ہے۔ کما ھو مصرح فی الروایۃ العشرین من الامام مالک رحمہ اللہ، اور صورتِ مرافعہ اور فسخ کی سوال اوّل کے جواب میں گذر چکی ہے۔

(جواب سوال چہارم) ہاں قاضی پر بھی ضروری ہے کہ صرف عورت اور اسکے اولیاء کی تفتیش اور اُن کے بیان پر اکتفاء نہ کرے بلکہ خود قاضی بھی تلاش کرائے اور تلاش کرنے کی صورت یہ ہے کہ قاضی و حاکم کو جہاں جہاں مفقود کے جانے کا غالب گمان ہو وہاں وہاں آدمی بھیجا جاوے۔ کما فی شرح الدردیر ص۳۹۹ من حین العجز عن خبرہ بالبحث عنہ فی الاماکن التی یظن ذھابہ الیھا من البلدان بان یرسل الحاکم رسولاً بکتاب لحاکم تلک الاماکن مشتمل علیٰ صفۃ الرجل وحرفتہ

ونسبه لیفتش عنه فیها ا ھ۔ اور جس جگہ جانے کا گمان غالب نہ ہو صرف احتمال ہو وہاں اگر خط کو کافی سمجھے تو وہاں خطوط بھیجکر تحقیق کرے اور اگر اخبار میں شائع کر دینے سے خبر ملنے کی امید ہو تو یہ بھی کرلے، الغرض تفتیش میں پوری کوشش اور جہد بلیغ کرے کما لایخفی اور جب تلاش کے بعد پتہ ملنے سے مایوس ہو جائے اس وقت مذکورۃ الصدر طریق پر چار سال مزید انتظار کا حکم کرے۔ کما فی الروایۃ العشرین من فتوی العلامۃ سعید بن صدیق مفتی المالکیۃ بالمدینۃ المنورہ (زادھا اللہ شرفاً) اور تفتیش کے مصارف کی بابت فقہائے مالکیہ میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ عورت کے ذمہ ہے اور بعض نے کہا کہ بیت المال کے ذمے ہے، اور بعض کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ اگر زوجہ عـــه کے پاس مال ہو تو مصارفِ تفتیش اس کے ذمہ ہوں گے، کما فی الروایۃ الخامس عشر من فتوی العلامۃ الفاھاشم عـــه اور جس جگہ بیت المال نہ ہو جیسے ہندوستان وغیرہ، اگر ان مواقع میں حکومت مصارف برداشت کرے تو بہتر ہے ورنہ مسلمانوں سے چندہ کر لیا جائے۔

(جواب سوالِ پنجم) جن بلاد میں قاضی شرعی موجود نہیں جیسے اسلامی ریاستوں کے علاوہ ہندوستان کے تمام شہروں کا حال ہے تو وہاں وہ حکام جو گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اگر وہ مسلمان ہوں اور فیصلہ شریعت کے موافق کریں تو اُن کا فیصلہ بھی قضائے قاضی کا قائم مقام ہو جاتا ہے جیسا کہ اس جُزء (دوم) کے مقدمہ میں مفصل گذر چکا ہے، اور اگر مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا اس کی عدالت سے فیصلہ شریعت کے مطابق نہ ہوتا ہو تو پھر مذہبِ مالکیہ کے موافق دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت پنچایت کر کے حسبِ بیان مذکور تحقیق کرے اور تحقیق کامل کے بعد فیصلہ کردے تو یہ فیصلہ بھی قضائے قاضی کے حکم میں ہو جائے گا لیکن پنچایت کا ان شرائط کے موافق ہونا ضروری ہے جو مقدمہ میں گذر چکی ہیں وہاں دیکھ لیا جاوے۔

تتمہ ھٰذا الجواب | اگر زوجۂ مفقود ایسی جگہ چلی جاوے جہاں قاضی شرعی یا مسلمان حاکم موجود ہو اور وہ اس کے پاس مقدمہ دائر کرے تو اس کا فیصلہ بھی زوجۂ مفقود کے لیے کافی ہے۔ فانھا اذا دخلت فی بلد القاضی دخلت

عـــه وھٰذا القول الثالث اعدل الاقاویل عندنا، واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ منہ

عـــه افسوس ہے کہ علامہ موصوف اس فتوے کی اشاعت سے قبل ہی رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ۱۲ منہ

تحت ولایتہ واما المفقود فالولایۃ علیہ لیس ؎ بشرط کما لا یخفیٰ، لیکن اگر زوجۂ مفقود یا زوجۂ عنین تنہا کسی قاضی کے علاقہ میں چلی جائے تو قاضی کا فیصلہ معتبر نہ ہوگا بلکہ یہ ضروری ہے کہ مجنون و عنین بھی اُس قاضی کے علاقہ میں ہوں۔

؎ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ مفقود الخبر جس جگہ کا باشندہ ہے وہاں کے قاضی کی ولایت گو اس وقت تو اس پر ثابت نہیں مگر پیشتر اس کے اس پر ولایت تھی اس واسطے ولایتِ اصلیہ کی بنا پر وہاں کے قاضی کی قضاء نافذ ہو سکتی ہے اور جس قاضی کی ولایت میں اول ہی سے نہ تھا اس کی قضاء نافذ نہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفاذِ قضاء کے لیے ولایتِ حال شرط ہے ولایتِ سابقہ معتبر نہیں، پس سب جگہ کے قاضی مفقود کے بارہ میں یکساں شمار ہوں گے۔ وھذا لما فی رد المحتار ج ۲ ص۵۱۵ باب الولی۔ مطلب لا یصح تولید الصغیر شیئا علی الصغیرات ص۳۱۴ المجلد الثانی مطبع دار احیاء تراث العربی) تحت قول الدر صغیرۃ زوجت نفسھا ولا ولی ولا حاکم ثمۃ توقف و نفذ باجازتھا بعد بلوغھا لان له مجیزاً وھو السلطان۔ قوله ولا حاکم ثمۃ ای فی موضع العقد قوله توقف ھذا مبنی علیٰ کفایۃ ذٰلک المکان تحت ولایت السلطان وان لم یکن تحت ولایۃ قاض وعلیه فبطلان العقد یتصور فیما اذا کان فی دار الحرب او البحر او المفازۃ ونحو ذٰلک بخلاف القری والامصار ویدل علیه ما فی الفتح فی فصل الوکالۃ بالنکاح حیث قال وما لا مجیز لهٗ ای ما لیس له من یقدر علی الاجازۃ یبطل کما اذا کانت تحت حرۃ فزوجه الفضولی امۃ او اخت امرأته او خامسۃ او زوجه معتدۃ او مجنونۃ او صغیرۃ او یتیمۃ فی دار الحرب او اذا لم یکن سلطان ولا قاض لعدم من یقدر علی الامضاء حالۃ العقد فوقع باطلاً۔ اھ۔ چونکہ اس روایت میں مجنونۃ او صغیرۃ فی دار الحرب عام ہے اس کو کہ وہ مجنونہ یا صغیرہ اول ہی سے دار الحرب میں ہو یا پیشتر دار الاسلام میں بھی اور اب دار الحرب میں چلی گئی، اس عموم کی وجہ سے ثابت ہوا کہ ولایتِ سابقہ کا اعتبار نہیں ورنہ اس مجنونہ و صغیرہ کا جو دار الاسلام سے گئی ہو اعتبار ہوتا۔ و نیز قول الشامی ای فی موضع العقد اور ذٰلک المکان تحت ولایت السلطان کے لفظ سے واضح ہے کہ ولایت کے لیے سلطان و قاضی کے علاقہ میں ہونا شرط ہے، اور مالکیہ نے تو اس کی صاف تصریح کی ہے، چنانچہ شرح دردیر میں ہے (ولا یزوج) (القاضی) (امرأۃ) ای لا یتولی عقد نکاحھا حیث لا ولی لھا الا الحاکم (لیست بولایتہ) بان کانت خارجۃ عنھا اذ لا ولایت علیھا وان کان اصلھا من اھلھا۔ اھ (ص۲۹۹ جلد ۲) واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۲ منہ

(ماخوذ از حیلۃ ناجزہ از ص۵۹ تا ص۶۶)

(جواب سوال ششم) مفقود کا حکم دارالحرب اور دارالاسلام میں مختلف ہے جیسا کہ سوال اول کے جواب میں مفصل گذر چکا ہے۔

مگر علمائے مالکیہ کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان ومصر وشام وغیرہ ممالک کہ جن میں باوجود حکومت کافر مسلط ہوجانے کے شعائرِ اسلام ہنوز قائم ہیں ان سب میں مفقود کا حکم وہی ہے جو دارالاسلام میں ہے بلکہ جس دارالحرب میں شعائرِ اسلام بھی موجود نہ ہوں مگر وہاں مسلمانوں کو صلح وغیرہ کی وجہ سے آنا جانا اور تفتیش کرنا ممکن ہو تو اس دارالحرب میں بھی مفقود کا وہی حکم ہے جو دارالاسلام میں ہے پس اصل بناء امکانِ تفتیش ہے۔ اس لیے ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں جو علماء کا اختلاف ہے اُس کا اِس مسئلہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور زوجۂ مفقود کو ان ممالک میں چار سال کی مہلت کے بعد عدتِ وفات گذار کر نکاحِ ثانی کا اختیار دیدیا جاوے گا کما فی الروایۃ الخامسۃ للعلامۃ الفاھاشم اھ۔ والخامسۃ والعشرین للعلامۃ الطیب رحمہ اللہ۔

نامرد شخص کی بیوی کی علیحدگی کا مسئلہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی عورت سے باقاعدہ نکاح کرلیا، رخصتی کے بعد عورت کو معلوم ہوا کہ خاوند حقوقِ زوجیت کی ادائیگی پر قادر نہیں، اب یہ عورت اگر خاوند سے علیحدگی حاصل کرنا چاہے تو از روئے شرع اس کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ جس عورت کا خاوند پیدائشی طور پر یا کسی ضعف وکمزوری یا کسی بیماری کی وجہ سے جماع پر قادر نہ ہو فقہاء کی اصطلاح میں اس شخص کو عنین کہا جاتا ہے ایسے شخص کیلئے بہتر یہی ہے کہ جب اس کو اپنی کمزوری کا یقین ہوجائے، یہاں تک کہ کہیں ایک دفعہ بھی جماع پر اس کو قدرت حاصل نہ رہی ہو، علاج ومعالجہ سے بھی اس کو قوت کی بحالی ممکن نظر نہیں آتی ہو تو یہ شخص خود عورت کو طلاق دے کر فارغ کردے تاکہ عورت عدت گذارنے کے بعد باقاعدہ دوسری جگہ نکاح کرکے سکون واطمینان کی زندگی گذار سکے، اسی حالت میں اگر ایک دفعہ بھی خلوتِ صحیحہ ہوئی ہو تو خاوند کو حق مہر بھی ادا کرنا ہوگا۔

اگر خاوند باعزت طریقہ سے عورت کو آزاد کرنے پر تیار نہ ہو تو پھر عورت مجبور ہوکر اپنا مقدمہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں لے جاسکتی ہے، حاکمِ وقت تحقیق کے بعد اپنے صوابدیدی اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے عورت کو فسخ نکاح کی ڈگری دے سکتا

ہے جو عورت کے حق میں طلاق بائن متصور ہوگی اور وہ عدت طلاق گذارنے کے بعد آزاد ہو کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن یہ اقدام بھی چند شرائط پر مبنی ہے، چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ان شرائط کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

پہلی شرط یہ ہے کہ نکاح سے پیشتر عورت کو اس شخص کے عنین ہونے کا علم نہ ہو پس اگر اس وقت علم تھا اور باوجود معلوم ہونے کے نکاح کیا ہے تو اب اس کو تفریق کا حق نہیں مل سکتا۔ لما فی الهندیة : ان علمت المرأة وقت النكاح انهٗ عنين لا يصل الى النساء لا يكون لها حق الخصومة۔ وفی الدر المختار: تزوج الاولى او امرأة اخرى عالمة بحاله لاخيار لها على المذهب المفتى به۔ بحر عن المحيط خلا فالتصحيح الخانية ۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۵۲۴ الباب الثانی عشر فی العنين)

دوسری شرط یہ ہے کہ نکاح کے بعد ایک مرتبہ بھی اس عورت سے جماع نہ کیا ہو اور اگر ایک مرتبہ جماع کر چکا ہے اور پھر عنین ہو گیا تو عورت فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا۔ لما فی الدر المختار، فلو جُبّ بعد الوصول اليها۔ (ج ۲ ص۶۴۴ باب العنين) مرة قال الشامی: قوله مرة وما زاد عليها فهو مستحق ديانية لا قضاء بحر عن جامع قاضيخان ويأثم اذا ترك الديانة متعنتا مع القدرة على الوطى۔ (باب العنين ج ۲ ص۶۴۵ مطلب باب العنين وغيره)

تیسری شرط یہ ہے کہ جب سے عورت کو شوہر کے عنین ہونے کی خبر ہوئی ہے اس وقت سے عورت نے اس کے ساتھ رہنے پر رضا کی تصریح[عہ] نہ کی ہو مثلاً یہ نہ کہا ہو کہ جیسا بھی ہے اب تو میں اسی کے ساتھ زندگی بسر کروں گی کیونکہ اگر وہ اپنی رضا کی تصریح کر چکی ہو تو پھر اس کو مطالبۂ تفریق کا حق نہیں رہتا ہاں محض سکوت[عہ] سے اس جگہ رضا نہ

عہ یعنی زبان سے کہہ دیا ہو خواہ تنہائی میں یا کسی کے سامنے۔ کما یدل علیه اطلاق مالم تقل فی الروایة الاتیه - اور تاجیل سے پیشتر بعد از تاجیل کما هو المصرح فی البدائع ونصه هذا فالنص هو تصريح اسقاط الخيار وما يجرى مجراه سواء كان ذلك بعد تخيير القاضی او قبله اھ مختصراً۔ ۱۲ منہ

عہ بلکہ تقبیل ومضاجعت وغیرہ افعال بھی موجب رضا نہیں۔ کما هو المصرح فی الدر عن الخانیة۔ ۱۲ منہ

سمجھی جائے گی۔ لما فی الدر المختار: فلو وجدته عنینا او مجبوبا ولم تخاصم زمانا لم یبطل حقہا۔ قال الشامی قولہ لم یبطل ای مالم تقل رضیت بالمقام معہ کذا قیدہ فی التاتارخانیۃ عن المحیط۔ (الدر المختار ورد المحتار ج ۲ ص۶۲۶ باب العنین وغیرہ۔ مطلب فی طبائع فصول النیۃ الاربع)

چوتھی شرط یہ ہے کہ جس وقت سال بھر کی مدت گذرنے کے بعد قاضی عورت کو اختیار دے تو عورت اُسی مجلس میں تفریق کا اختیار حاصل کرے، پس اگر اس مجلس میں اُس نے اپنے خاوند کے ساتھ رہنا پسند کر لیا یا اس قدر سکوت کیا کہ مجلس برخاست ہوگئی خواہ اس طرح کہ یہ عورت مجلس سے اٹھ گئی یا اس طرح کہ قاضی مجلس سے کھڑا ہو گیا تو اب اُس کا اختیار باطل ہو گیا اب کسی طرح تفریق نہیں ہو سکتی۔

لما فی الہندیۃ: فان اختارت زوجہا اوقامت عن مجلسہا او اقامہا اعوان القاضی او قام القاضی قبل ان تختار بطل خیارہا وکذا فی المحیط۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۵۲۴ الباب الثانی عشر فی العنین)۔

ونیز مجلس برخاست ہونے اور عورت کے اٹھ جانے کے علاوہ اور صورتیں بھی ایسی ہیں جن سے مجلس بدل جاتی ہے اور اختیار باطل ہو جاتا ہے، مثلاً عورت کوئی دوسری گفتگو کرنے لگی یا نماز پڑھنے لگی، وغیر ذلک مما یدل علی الاعراض، اور تبدل مجلس شامی باب تفویض الطلاق سے معلوم ہو سکتی ہے۔ والدلیل علیٰ ان بطلان الخیار لا یختص بقیامہا وقیام القاضی بل کل ما یدل علی الاعراض یبطل الخیار۔ قول الدر حیث قال لو وجد منہا دلیل اعراض بان قامت الخ۔ لان ھذا یدل علیٰ ان القیام ذکر حیث ذکر تمثیلاً والمراد مطلق الاعراض، ھذا ما عندنا واللہ اعلم بالصواب۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ عنین کو سال بھر کی مہلت دینا اور سال گذرنے پر عورت کو اختیار دینا اور بعد ازاں اگر خاوند طلاق سے انکار کرے تو تفریق کر دینا وغیرہ یہ سب امور جن کا ذکر اوپر مفصل ہو چکا قضائے قاضی کے محتاج ہیں بدون حکم قاضی کے از خود عورت کو تفریق کا اختیار نہیں۔

کمافی ردّ المحتار تحت قول الدر: ولا عبرۃ بتاجیل غیر قاضی البلدۃ لان ھذا مقدمۃ امر لا یکون الا عند القاضی وھو الفرقۃ فکذا مقدمۃ۔ والوالجیۃ۔ (رد المحتار ج ۲ ص۶۲۶ باب العنین وغیرہ مطلب فی عطف الخاص علی) ۔ (الحیلۃ الناجزۃ ص۱۴۷ تا ص۱۴۹)

سزا یافتہ قیدی کی بیوی کا حکم

سوال :۔ اگر کسی شخص کو کسی جرم کی پاداش میں عدالت کی طرف سے عمر قید کی سزا ہو جائے تو اس کی بیوی کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب : ایسے شخص کی بیوی تاحیات صبر کرے گی، اس لیے کہ اس شخص پر مفقود کی تعریف صادق نہیں آتی اس لیے کہ یہ مفقود کے حکم میں نہیں ۔

لما قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ : یہ شخص مفقود نہیں کیونکہ مفقود وہ ہے جس کی موت اور حیات کا علم نہ ہو اور اس شخص کی جگہ بھی معلوم ہے، حیات بھی معلوم ہے لہٰذا یہ مفقود نہیں بلکہ تحییتہ ضار ہے ۔۔۔۔۔۔ اس صورت میں امام مالکؒ کے نزدیک بھی وسعت نہیں، لہٰذا زید کی بیوی بدون زید کی طلاق یا موت کے کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی ۔ (امداد الاحکام جلد ۲ ص۱۷ کتاب الطلاق باب التفریق) [۱]

مرتد کی بیوی کا حکم

سوال :۔ اگر ایک مسلمان شخص دشمنانِ اسلام کے جال میں پھنس کر مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) تو ایسی حالت میں اس کی بیوی کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب :۔ خاوند کے مرتد ہو جانے سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے لہٰذا عورت عدت گزارنے کے بعد آزاد ہو کر باقاعدہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے ۔

لما فی الھندیۃ : ارتد احد الزوجین عن الاسلام وقعت الفرقۃ بغیر طلاق فی الحال ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۳۳۹ الباب العاشر فی نکاح الکفار) [۲]

---

[۱] قال الشیخ المفتی عزیز الرحمنؒ : مفقود الخبر کا حکم دوسرا ہے، اور جس کو سزا دریائے شور دی گئی وہ مفقود الخبر نہیں اور اس کی زوجہ دوسرا عقد شوہر کی زندگی میں نہیں کر سکتی، اور مفقود الخبر وہ ہے جس کا نشان و پتہ اور موت و حیات کچھ معلوم نہ ہو اس کو ایک وقت مقرر پر شرعاً موت کا حکم دے دیا جاتا ہے ۔
(فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۱۰ ص۲۷۹ کتاب الطلاق)

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ : وارتداد احد الزوجین فسخ فلا ینقص عدد عاجل بلا قضاء ۔
(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۴۲۵ باب نکاح الکافر ۔ مطلب الصبی والمجنون لیسا باھل لایقاع طلاق بل للوقوع)
ومثلہ فی الھدایۃ ج ۲ ص۳۲۷ باب نکاح اھل الشرک ۔

متعنت کی زوجہ کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! میرا نکاح آج سے چھ سال قبل ہوا تھا، دو تین سال گذرنے کے بعد ہمارے گھریلو حالات خراب ہوگئے اور میرے شوہر نے مجھے میرے والدین کے گھر بھیجدیا اور آج تک میری خبر نہیں لی، میں اس مصیبت سے کیسے خلاصی حاصل کرسکتی ہوں ؟

الجواب :۔ متقدمین علماء کے ہاں تو اس قسم کے عوارضات کی وجہ سے عدالت یا مسلمان حاکم نکاح فسخ کرنے کا مجاز نہیں لیکن متاخرین علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ عورت شرعی عدالت کی طرف رجوع کرے وہ اس کا حل نکالے گی ۔

قال الشیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ :صورتِ بالا میں زوج کی حیثیت متعنت کی ہے جس کے بارے میں حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں :۔ الجواب :۔ زوجۂ متعنت کو اول تو لازم ہے کہ کسی طرح خاوند سے خلع وغیرہ حاصل کرے لیکن اگر باوجود کوشش کے (خلاصی کی) کوئی صورت نہ بن سکے تو پھر عورت اپنا مقدمہ قاضی اسلام یا مسلمان حاکم اور بصورت نہ ہونے حاکم کے جماعت مسلمین کے سامنے پیش کرے، پھر تحقیق کے بعد شرعی شہادت سے جب عورت کا دعویٰ صحیح ثابت ہوجائے کہ باوجود وسعت کے خرچ نہیں دیتا تو اس کے خاوند سے کہا جاوے کہ اپنی عورت کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو ورنہ تفریق کردیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ خاوند کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی یا شرعًا جو اسکے قائم مقام ہو طلاق واقع کر دے، اس میں کسی مدت کے انتظار و مہلت کی ضرورت نہیں ۔

(الحیلۃ الناجزۃ ص۷۳ حکم زوجۃ متعنت فی النفقۃ) [1]

دیوث سے بیوی کی نجات کا طریقہ

سوال :۔ اگر کوئی شخص دیوث ہو اور وہ اپنی بیوی سے زبردستی زنا کرواتا ہو تو

---

[1] قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ و مفتی ظفر الدینؒ : ایسی صورت میں کہ شوہر حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا اور نفقہ نہیں دیتا اس کو لازم ہے کہ زوجہ کو طلاق دیدے، پس اس کو مجبور کیا جائے اور کرایا جائے کہ جس طرح ہو وہ طلاق دے دے، بدون طلاق کے عند الحنفیہ نفقہ وغیرہ نہ دینے کی وجہ سے زوجین میں تفریق نہیں ہو سکتی ...... بعد کے علماء نے تفریق کی صورت نکالی ہے جو قاضی شریعت یا شرعی پنچایت کے ذریعہ ہو سکتی ہے ۔ (ظفر) ۔ (فتاویٰ دار العلوم ج۔ ا ص۲۲۶ کتاب الطلاق)

اس عورت کے لیے کیا حکم ہے؟ وہ کس طرح خاوند سے نجات حاصل کرے؟

الجواب: ویسے تو ایک مرتبہ نکاح ہو جانے کے بعد عورت بدون طلاق کے شوہر سے آزاد نہ ہو گی لیکن صورتِ مسئولہ میں یہ عورت شرعی عدالت سے اس بارے میں رجوع کرے یا شرعی پنچایت کے پاس اپنا مقدمہ دائر کرے، عدالت زبردستی شوہر سے طلاق دلوائے گی یا خود نکاح فسخ کرے گی۔

لما قال الشیخ مفتی عزیز الرحمنؒ و مفتی ظفیر الدینؒ: اس صورت میں جب تک اس لڑکی کا شوہر طلاق نہ دیوے اور عدت نہ گزر جائے اُس وقت تک اِس لڑکی کا دوسری جگہ نکاح کرنا شرعاً درست نہیں ہے، دار القضاء اور شرعی پنچایت کے ذریعے اس طرح کے مصائب سے عورت کو نکالا جا سکتا ہے۔

(فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج ۱۰ ص۲۳۲ باب التفریق) ؎

مجنون کی بیوی کے فسخ نکاح کا حکم

سوال: ایک شخص نکاح کرنے کے چند سال بعد پاگل ہو گیا، علاج و معالجہ سے بھی کوئی فرق نہیں آیا، حالتِ جنون میں وہ بہت کچھ کر جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی بیوی کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، تو کیا یہ عورت اپنے مجنون خاوند سے اپنا نکاح بذریعہ عدالت فسخ کرا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: بشرطِ صدق و صحتِ سوال اگر اس عورت کا شوہر واقعی مجنون (پاگل) ہو اور وہ اچھے بُرے کی تمیز نہیں کر سکتا ہو اور جنون بھی اس حد تک ہو کہ بیوی کا اس کے ساتھ رہنا ممکن نہ ہو اور علاج و معالجہ سے بھی بات نہیں بنتی ہو تو اس عورت کو شرعاً اجازت ہے کہ اگر وہ اپنا نکاح شوہر سے فسخ کروانا چاہتی ہو تو عدالت کی طرف رجوع کرے، عدالت مکمل تحقیقات کے بعد اس کو تنسیخِ نکاح کی ڈگری جاری کر سکتی ہے جو اس کے لیے کارآمد ہو گی۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: امام محمدؒ کے نزدیک اس کو حق حاصل ہے کہ قاضی کے یہاں درخواست دے کر تفریق کا مطالبہ کرے اور اپنے آپ کو مجنون کی زوجیت سے علیحدہ کرا لے بشرطیکہ جنون اس درجہ کا ہو کہ اس کے ساتھ رہنا قدرت سے خارج ہو مثلاً اس سے قتل کا اندیشہ ہو، الخ۔ (حیلۃ الناجزۃ ص۵۱، ۵۲ حکم زوجۂ مجنون)

باب الایلاء

(ایلاء کے مسائل و احکام)

بیوی کے قریب نہ جانے کی قسم کھانا

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا خدا کی قسم میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا لیکن چند دن کے بعد یہ شخص اپنی اس بات پر پشیمان ہوا، اب اس کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

الجواب:- اگر یہ شخص چار ماہ تک اپنی قسم پر قائم رہتے ہوئے بیوی کے قریب نہ جائے تو بیوی خود بخود علیحدہ ہو جائے گی جس کی تحلیل کیلئے تجدیدِ نکاح ضروری ہے، لیکن اگر اس مدت کے دوران بیوی کے قریب چلا جائے تو اس پر قسم کا کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فمن الصریح لو قال واللّٰہ لا اقربک۔ قال ابن عابدینؒ: ای بلا بیان مدة اشارة الی انه کالموقت بمدة الایلاء لان الاطلاق کالتابید (

(ردّ المحتار ج ۲ ص ۵۹۳ باب الایلاء) [1]

بیوی کے قریب نہ جانے کی مشروط قسم کھانا

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تم نے اپنی سوکن کو راضی نہ کیا تو خدا کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤں گا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسی حالت میں اگر کئی سال گذر جائیں اور وہ شخص عورت کے قریب نہ جائے اور نہ اس کی بیوی اپنی سوکن کو راضی کرے تو اس سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں یہ قسم ایلاء کے حکم میں ہے، اگر شرط کی موجودگی کے بغیر خاوند بیوی کے قریب گیا تو حانث ہو کر کفارۂ قسم ادا کرنا واجب ہوگا، اور اگر اس قسم پر چار مہینے گذر گئے اور خاوند اپنی قسم پر قائم رہا تو عورت بوجہ ایلاء طلاق بائن سے جدا ہو جائے گی،

---

[1] وفی الهندیة: الایلاء منع النفس عن قربان المنکوحة منعاً مؤکداً بالیمین باللّٰہ مطلقاً اومؤقتاً باربعة اشهر۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۴۷۶ الباب السابع فی الایلاء)

ومثله فی الهدایة ج ۲ ص ۹۶، ۹۷ باب الایلاء۔

جس میں دوبارہ تحلیل اور تجدیدِ نکاح کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: والمدۃ اقلها للحرۃ اربعۃ اشهر ثم قال فقی الحلف باللّٰہ وجبت الکفارۃ وفی غیرہ وجب الجزاء وسقط الایلاء لانتهاء الیمین والایقربها بانت بواحدۃ۔ انتھی
وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت ھذا القول فلو مضت اربعۃ اشهر لا یقع الطلاق لانحلال الیمین بالحنث سواء حلف علی اربعۃ اشهر او اطلق او علی الابد "وقال کذلک" بانت بواحدۃ لاحاجۃ الی انشاء تطلیق او الحکم بالتفریق۔ (ردّ المحتار علی الدر المختار ج۲ ص۵۹۳ باب الایلاء)[1]

ایلاء میں رجوع کیلئے بیوی کا انکار کرنا

سوال:۔ اگر خاوند ایلاء میں مدت کے اندر رجوع کرنا چاہتا ہو لیکن بیوی اس سے انکار کر رہی ہو تو خاوند کو کیا کرنا چاہیئے تاکہ اس کا نکاح بحال رہے؟

الجواب:۔ ایلاء کی مدت کے دوران منکوحہ خاوند کے نکاح میں رہتی ہے ایسی حالت میں اگر خاوند رجوع کرنا چاہے اور عورت انکار کر رہی ہو تو منکوحہ (ناشزہ) نافرمان کے حکم میں ہے تاہم اس کے انکار سے نکاح پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اگر خاوند عملی طور پر رجوع سے قاصر ہو تو زبانی طور پر ہی اس کا رجوع کافی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکذا حبسها ونشوزها ففیؤہ قوله بلسانه فئت الیها۔
(الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۵۹۹ باب الایلاء)[2]

✱ ✱

---

[1] وفی الهندیۃ: فان قربها فی المدۃ حنث وتجب الکفارۃ فی الحلف باللّٰہ --- وان لم یقربها فی المدۃ بانت بواحدۃ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۴۷۶ الباب السابع فی الایلاء)

[2] وفی الهندیۃ: ولو عجز عن جماعها لرتقها او لکونها ممتنعۃ او کانت فی مکان لا یعرفها وهی ناشزۃ ففیؤہ باللسان بان یقول فئت الیها۔
(الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۴۸۵ الباب السابع فی الایلاء ثم الایلاء علی اربعۃ اوجه)
ومثله فی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج۲ ص۲۵۱ باب الرجعۃ۔

باب اللعان

(لعان کے احکام ومسائل)

لعان کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بیوی پرزنا کاالزام لگاکر والدین کے گھر بھیجدیا، عورت نے فیملی ۔۔" سے تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کرلی، کیا اس کے بعد یہ عورت دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یانہیں ؟

الجواب:۔ ازروئے شرع بیوی پرزنا کی تہمت لگانے میں خاوند کیلئے چارگواہوں کاپیش کرنا ضروری ہے ورنہ اس پر حدِقذف جاری کی جائے گی۔ تاہم ایسی حالت میں شریعت میں اس کے لیے خصوصی طورپر جو قانون موجود ہے اس کو لعان کہاجاتا ہے جس میں خاوند قاضی کی عدالت میں چاربار قسم کھاکراپنی صداقت ثابت کرے گا او پانچویں بار یوں کہے گاکہ اگرمیں جھوٹ بولوں تومجھ پرخدا کی لعنت ہو،اس کے بعدپھرعورت بھی چار بارقسم کھاکرخاوند کی تکذیب اوراپنی صداقت ثابت کرے گی اورپانچویں باریوں کہے گی کہ اگرمیں جھوٹ بولوں تومجھ پرخدا کاقہروغضب ہو،اس سے لعان مکمل ہوجائے گا اورقاضی ان کے درمیان تفریق کردے گا۔

اگرعدالتی فیصلہ اس حقیقت کا حامل ہوتواس سے عورت کوآزادی مل سکتی ہے ورنہ صرف زنا کی تہمت لگنے سے عورت اپنی ناراضگی کی وجہ سے تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے سے آزادی حاصل نہیں کرسکتی ہے۔

لما فی الهندية : اذاقال لها یازانیة اوانت زنیت اورأیتك تزنی فانه یجب اللعان۔

(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۱۵ کتاب الطلاق الباب الحادی عشر فی اللعان)

وقال الله تعالیٰ : وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(پ۱۸، سورة النور آیت ۶،۷،۸،۹)

وفی الهندیة : واذا التعنا فرق الحاکم بینهما ولا تقع الفرقة حتی یقضی بالفرقة

علی الزوج فیفارقها بالطلاق ۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۱ ص۵۱۶ کتاب الطلاق الباب الحادی عشر فی اللعان) لہ

لعان کے بعد دوبارہ نکاح کرنا

سوال :۔ لعان کے ذریعہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ہوجانے کے بعد بغیر حلالہ کے میاں بیوی کے درمیان ازدواجی تعلق قائم ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ لعان کی صورت میں چونکہ تفریق قاضی کی طرف سے ہوتی ہے اس لیے ان دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا ، الّا یہ کہ خاوند اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو اُسے حدِقذف لگاکر پھر ان دونوں کے درمیان نکاح ہوسکتا ہے ۔

قال العلامة المرغینانیؒ : وتکون الفرقة تطلیقة بائنة عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله لان فعل القاضی انتسب الیہ کما فی العنین وهو خاطب اذا اکذب نفسه۔ الخ

(الهدایة ج ۲ ص۳۹۷ کتاب الطلاق - باب اللعان) ۲ہ

لعان کے بعد عدالت کا میاں بیوی میں تفریق کرنا

سوال : جب میاں بیوی آپس میں لعان کرلیں تو کیا دونوں کا نکاح خودبخود ختم ہوجائے گا یا حاکمِ وقت ان میں تفریق کرے گا ؟

الجواب :۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کاالزام لگائے اور اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو عندالمطالبہ دونوں کاآپس میں لعان ضروری ہے ، دونوں کا نکاح بسبب لعان خودبخود ختم نہیں ہوگا بلکہ حاکمِ وقت ، قاضی دونوں میں تفریق کرے گا اگرچہ دونوں اس پر

لہ قال العلامة المرغینانیؒ : واذا التعنا لا تقع الفرقة حتی یفرق القاضی بینهما۔

(الهدایة ج ۲ ص۳۹۷ کتاب الطلاق ۔ باب اللعان)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۳۹ باب اللعان قبیل مطلب فی الدعاء باللعن علیٰ معین ۔

۲ہ وفی الهندیة : قال ابوحنیفة رحمه الله تعالیٰ الفرقة الواقعة فی اللعان فرقة بتطلیقة بائنة فیزول ملك النکاح وتثبت حرمة الاجتماع والتزوج مادا ما علیٰ حالة اللعان ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۵۱۶،۵۱۵ کتاب الطلاق الباب الحادی عشر فی اللعان)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۳۹ باب اللعان ۔ قبیل مطلب فی الدعاء باللعن علیٰ معیّن ۔

راضی نہ ہوں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وصفتہ ما نطق النص الشرعی بہ من کتاب وسنۃ فان التعنا ولو اکثرہ بانت بتفریق الحاکم فیتوارثان قبل تفریقہ الذی وقع اللعان عندہ ویفرق وان لم یرضیا بالفرقۃ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۳ ص۴۸۸ باب اللعان)[1]

شوہر کا بیوی پر تہمتِ زنا سے انکار کرنا

سوال:۔ اگر عورت کسی کے کہنے پر اپنے شوہر کے خلاف تہمت زنا کا دعویٰ کرے کہ میرا شوہر مجھ پر زنا کی تہمت لگاتا ہے جبکہ شوہر اس بات کا انکار کرتا ہو کہ میں نے کسی کو بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی، تو کیا اس صورت میں دونوں کے درمیان لعان ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً لعان اُسے کہا جاتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی پر ایسی تہمت لگائے جو کسی غیر منکوحہ میں موجبِ حدِ زنا ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں لعان کی تعریف صادق نہیں آتی اور نہ اس میں شرائطِ لعان موجود ہیں اس لیے اس میں لعان نہیں ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وسببہ قذف الرجل زوجتہ قذفاً یوجب الحد فی الاجنبیۃ ..... فمن قذف بصریح الزنا فی دار الاسلام زوجتہ الحیۃ بنکاح صحیح۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۲ ص۸۰۵، ۸۰۶ باب اللعان)[2]

دار الکفر میں بیوی پر تہمتِ زنا سے لعان لازم نہیں آتا

سوال:۔ اگر کوئی شخص دار الکفر مثلاً امریکہ یا لندن میں اپنی بیوی

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: تحت قولہ وصفتہ مانطق بہ النص فان التعنا بانت بتفریق الحاکم ولا تبین قبلہ! ای الحاکم الذی وقع اللعان عندہ لو لم یفرق الحاکم حتی عزل او مات فالحاکم الثانی یستقبل اللعان عندھما۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۱۷ باب اللعان)

وَمِثلُہٗ فی الاحوال الشخصیۃ ص۳۴۷ باب اللعان۔

[2] قال المفتی عزیز الرحمنؒ: (اس قسم کا ایک سوال آپ سے بھی کیا گیا تو فرمایا) "حکم لعان دریں صورت بحالت موجودہ بلا تحقق شرائط لعان کردن درست نیست و حکم تفریق نافذ نیست و اگر کسے فتویٰ دادہ است آں صحیح نیست بروعمل نباید کرد۔"

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۱۰ ص۱۹۷ باب یازدہم لعان)

پر زنا کی تہمت لگائے اور عورت بھی شوہر سے جدا ہونا چاہتی ہو تو کیا وہ بذریعہ لعان جدائی اختیار کرسکتی ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ زنا کی تہمت لگانے کا یہ معاملہ دارالاسلام میں ہو، دارالکفر میں ایسا نہ ہوگا، چونکہ صورتِ مسئولہ میں تہمتِ زنا کا معاملہ دارالکفر میں پیش آیا ہے اس لیے یہاں لعان نہ ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویشترط ۔۔۔۔ کون القذف بصریح الزنا کونه فی دارالاسلام۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت (قوله دارالاسلام) اخرج دارالحرب۔ (ردّالمحتار ج۲ ص۵۸۶ باب اللعان) [1]

شبۂ زنا موجب لعان نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا شبہ ظاہر کرے پورے یقین سے نہیں کہتا ہو، تو کیا عورت کے مطالبے پر لعان ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ لعان تب ہوگا جب شوہر بیوی پر صریح الفاظ سے زنا کی تہمت لگائے صرف شبہ کی صورت میں لعان نہیں اس لیے صورتِ مسئولہ میں صرف عورت کے مطالبے پر لعان نہیں کرایا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: فمن قذف بصریح الزنا فی دارالاسلام۔
(الدرالمختار علی ہامش ردّالمحتار ج۲ ص۵۸۶ باب اللعان) [2]

❋ ❋

---

[1] قال المفتی عزیز الرحمنؒ: (اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا) "لعان کے لیے چونکہ دارالاسلام کا ہونا بھی شرط ہے، کما صرح به فی کتب الفقه۔ لہٰذا اس ملک میں لعان کی کوئی صورت نہیں ہے، اور جبکہ لعان نہیں ہے تو تفریق بھی نہ ہوگی۔"
(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۱۰ ص۱۹۹ باب یازدہم۔ لعان)

[2] وفی الهندیة: سببه قذف الرجل امرأته قذفاً یوجب الحد فی الاجانب فیجب به اللعان بین الزوجین کذا فی النهایة: واذا قال لها یا زانیة او انت زنیت او رأیتك تزنین فانه یجب اللعان۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۵۱۵ الباب الحادی عشر فی اللعان)
ومثله فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۱۰ ص۱۹۸ باب اللعان۔

باب الظّہار

(ظہار کے مسائل)

ظہار میں تشبیہ ضروری ہے

سوال: ۔ایک شخص کا کسی بات پر اپنی بیوی سے جھگڑا ہوگیا تو اس نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میری ماں خاموش ہوجاؤ۔" تو ان الفاظ سے اس شخص کے نکاح پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

الجواب: بیوی کو "ماں" جیسے الفاظ سے مخاطب کرنا بذاتِ خود سے بغاوت کے مترادف ہے اس لیے یہ الفاظ فقہاء کے نزدیک مکروہ ہیں، تاہم اداتِ تشبیہ نہ ہونے کی وجہ سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال لھا انت اُمّی لا یکون مظاھرًا وینبغی ان یکون مکروھا۔ الخ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۵۰۷ کتاب الطلاق۔ الباب التاسع فی الظھار)[۱]

اپنی منکوحہ کو بہن کہنے کا حکم

سوال: ۔اگر کسی شخص نے اپنی منکوحہ کو یہ کہہ دیا کہ "تو مجھ پر طلاق ہے" اور پھر متصل یہ بھی کہا کہ "اگر میں نے تیرے ہاتھ کا کھانا کھایا یا چائے پی لی تو تُو میری بہن ہے" کیا ان الفاظ سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ظہار کے مسئلہ میں اداتِ تشبیہ کا ہونا لازمی ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں کوئی حرف تشبیہ نہیں ہے اس لیے "تُو میری بہن ہے" کہنے سے نکاح پر کوئی بُرا اثر مرتب نہیں ہوگا تاہم ایسے الفاظ کہنا کراہت سے خالی نہیں، البتہ یہ کہنا کہ "تو مجھ پر طلاق ہے" سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی جس میں رجوع بالقول یا بالفعل کافی ہے۔

لما قال الحصکفیؒ: وان نوی بانت علیّ مثل اُمّی برًّا اوظھارًا او طلاقًا صحت نیتہ ووقع مانوی وان لم ینو شیئًا اوحذف الکاف لغواً (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ ص۶۲۶ باب الظہار۔ مطلب بلاغا محمد رحمہ اللہ سندہ)[۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: فعلم انہ لابد فی کونہ ظھارًا من التصریح باداۃ التشبیہ شرعًا (البحر الرائق ج۴ ص۹۵ باب الظھار۔ کتاب الطلاق)

ومِثلُہٗ فی ردّ المحتار ج ۲ ص۶۲۶ باب الظھار۔ مطلب بلاغات محمدؒ۔

[۲] قال المرغینانیؒ: ولو قال انت علیّ حرام کاُمّی ونوی ظھارًا اوطلاقًا فھو علیٰ مانوی۔ (الھدایۃ ج۲ ص۳۸۹ کتاب الطلاق باب الظھار)

ومِثلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۵۰۷ کتاب الطلاق۔ الباب التاسع فی الظھار۔

ظہار میں عقل وبلوغ شرط ہے

سوال:۔ کیا طلاق کی طرح ظہار میں بھی مظاہر کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے یا کہ صبی اور مجنون کا ظہار بھی درست ہوگا؟

الجواب:۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر تصرف کیلئے عاقل و بالغ ہونا شرط ہے تو طلاق کی طرح ظہار میں بھی مظاہر کا عاقل بالغ ہونا لازمی ہے۔

وفی الهندية: من الشرائط ان لا يكون معتوهاً ولا مدهوشاً ولا مبرسما ومغمىٰ عليه ولا نائماً فلا يصح ظهار هٰؤلاء۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۵۰۸ الباب التاسع فی الظهار)[1]

ظہار میں بطورِ کفارہ کیا واجب ہوتا ہے

سوال: اگر کوئی شخص اپنی منکوحہ سے ظہار کرے تو اس پر بطور کفارہ کیا اور کتنا لازم ہوگا؟

الجواب:۔ ظہار کرنے سے بیوی شوہر پہ اُس وقت تک حرام ہوجاتی ہے جس وقت تک وہ کفارہ ادا نہ کرے، جس کے لیے دو ماہ مسلسل روزے رکھنا یا عدم استطاعت کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے، جس کے بعد بیوی اُس کے لیے حلال ہوجائے گی۔

وفی الهندية: وحكم الظهار حرمة الوطئ والدواعی الیٰ غاية الكفارة۔
(الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۵۰۶ باب الظهار)[2]

---

[1] قال العلامة ابو بكر الكاسانیؒ: منها ان يكون عاقلاً اما حقيقة او تقديراً فلا يصح ظهار المجنون والصبی الذی لا يعقل لان حكم الحرمة وخطاب التحريم لا يتناول من لا يعقل۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۲۳۰ فصل الشرائط فانواع بعضها)

[2] قال الشيخ الدكتور وهبة الزحيلی: تحريم الوطئ بالاتفاق قبل التكفير كذا عند الجمهور غير الشافعية تحريم جميع انواع الاستمتاع ...... الكفارة كما دل القرآن والسنة النبوية فيما سبق انواع ثلاثة: (۱) عتق رقبة سالمة من العيوب صغيرة او كبيرة ذكراً ام انثىٰ (۲) صيام شهرين متتابعين (۳) اطعام ستين مسكيناً يوماً واحداً اغداءً وعشاءً عند الحنفية۔
[الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۶۰۱، ۶۰۲ المطلب الثالث اثر الظهار۔ المطلب الرابع كفارة الظهار]

سوال:۔ ایک شخص نے غصے میں اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں تیرے قریب آیا تو گویا میں اپنی ماں کے قریب آیا، تو کیا ان الفاظ سے ظہار واقع ہوگا یا طلاق؟

تیرے قریب آؤں تو اپنی ماں کے قریب آؤں

الجواب:۔ ظہار میں اداۃِ تشبیہ ضروری ہے اور طلاق مزیل نکاح کے الفاظ کہنا لازمی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ یہ الفاظ ان دونوں میں داخل نہیں اس لیے ظہار یا طلاق واقع نہیں ہوگا۔

وفی الھندیۃ: ولو قال ان وطئتُکِ وطئتُ اُمّی فلا شیٔ علیہ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۵۰۵ الباب التاسع فی الظہار) [۱]

سوال:۔ میاں بیوی کے مابین کسی بات پر تنازعہ ہوا تو شوہر نے چادر اٹھا کر کہا کہ اگر میں اس گھر میں واپس آؤں تو گویا میں اپنی ماں بہن سے زنا کروں۔ شرعاً ان الفاظ کا کیا حکم ہے؟ یہ شخص مظاہر شمار ہوگا یا نہیں؟

اگر میں گھر واپس آؤں تو گویا ماں کے ساتھ زنا کروں

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ ظہار میں اداۃِ تشبیہ ہونا ضروری ہے بغیر اس کے ظہار نہیں ہوگا۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں اداۃِ تشبیہ نہیں، لہٰذا اس سے نہ ظہار واقع ہوگا نہ طلاق۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: تعریفہ شرعاً تشبیہ المسلم زوجتہ بمحرم علیہ تابیداً۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۷۹۴ باب الظہار) [۲]

---

[۱] قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: سوال:۔ زید نے اپنی منکوحہ کو لڑائی اور غصہ کی حالت میں کہہ دیا کہ اگر میں تجھ سے جماع کروں تو گویا اپنی ماں یا بہن سے کروں، ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگی یا ظہار؟

الجواب:۔ عالمگیریہ میں ہے: ولو قال ان وطئتُکِ وطئتُ اُمّی فلا شیٔ علیہ۔ الخ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں طلاق وظہار کچھ نہیں ہوا۔

(فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۱۰ ص۲۱۲ کتاب الطلاق)

[۲] قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: اگر یہ کہا زوجہ کو کہ اگر میں تیرے گھر میں گھسوں تو اپنی ماں سے بدفعلی کروں تو یہ بھی لغو ہے، نہ ظہار ہے نہ طلاق۔ (فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج ۱۰ ص۲۱۳ باب الظہار)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۳ ص۲۲۹ کتاب الظہار۔

بیوی کا خاوند کو بھائی کہنے سے ظہار لازم نہیں آتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک دن ٹی وی پروگرام نے "دین و دنیا" پروگرام میں ایک ڈاکٹر صاحب سے یہ سنا کہ اگر عورت اپنے شوہر سے یہ کہہ دے کہ تو میرا بھائی ہے تو اس سے ظہار واقع ہوجاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی شرعاً عورت کے ان الفاظ سے ظہار لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں ظہار کا تعلق مرد سے ہے، عورت کے ایسے الفاظ کہنے کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: اس صورت میں نکاح قائم ہے عورت کے اس کہنے سے کچھ نہیں ہوا۔ (فتاوٰی دارالعلوم دیوبند جلد ۱۰ ص۲۱۱ باب الظہار) [1]

بار بار ظہار کے الفاظ منہ سے نکالنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے ابھی کفارہ ادا نہیں کیا تھا کہ پھر اس قسم کے الفاظ منہ سے نکالے پھر تیسری بار بھی اسی طرح کیا اس شخص پر تین دفعہ کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا یا ایک بار ادا کرنے سے ذمہ فارغ ہوجائے گا؟

الجواب:۔ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کئی بار ظہار کے الفاظ کہے اور اس دوران کوئی کفارہ ادا نہیں کیا ہو تو ایک بار کفارہ ادا کرنے سے ذمہ فارغ ہوجائے گا، اور اگر ایک بار ظہار کرکے کفارہ ادا کردیا پھر ظہار کیا تو دوبارہ کفارہ ادا کرنا ہوگا اس سے پہلے ادا کیا گیا کفارہ کفایت نہیں کرے گا۔

لما قال الشیخ عبد الرحمٰن بن ناصر السعدیؒ: واذا کرر الظهار من زوجة واحدة فعلیه کفارة واحدة الا ان ظاهر ثم کفر ثم ظاهر بعد الکفارة فعلیه کفارة اخرٰی۔ (الفتاوٰی المرأة المسلمة ج ۲ ص۸۰۲ باب الظهار)

---

[1] قال الامام ابو بکر الجصاص الرازیؒ، قال اصحابنا لا یصح ظهار المرأة من زوجها وهو قول مالک والثوری واللیث والشافعی۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۵ ص۳۱۱ فی ظهار المرأة من زوجها)
ومثله فی احکام القرآن للتھانویؒ ج ۵ ص۱۱۲ المسئلة الرابعة۔

"اگر تجھے رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں" کہنے سے طلاق کا حکم

سوال:۔ اگر کسی نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ "اگر تجھے رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں" کیا ایسے الفاظ کہنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ان الفاظ میں اداتِ تشبیہ نہیں ہے لہٰذا صورتِ مرقومہ میں ظہار نہیں اور طلاق یا قسم کا ہونا خاوند کی نیّت پر موقوف ہے، اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو طلاق واقع ہو کر تجدیدِ نکاح کافی ہے، اور اگر قسم کی نیّت تھی تو یہ الفاظ ایلاء میں شمار ہو کر اس میں بھی تجدیدِ نکاح کافی ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: فعلم انہ لابد فی کونہ ظہاراً من التصریح باداۃ التشبیہ شرعاً۔ (البحر الرائق ج۴ ص۹۸ باب الظہار)[1]

دس مرتبہ ظہار سے کفّارہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ تم میرے اوپر میری ماں کی طرح دس مرتبہ ہو تو کیا یہ شخص ایک مرتبہ کفّارہ دے گا یا دس مرتبہ کفّارہ دے گا؟

الجواب:۔ کسی بھی لفظ کی تعداد ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اتنی بار اس نے اس لفظ پر تلفظ کیا ہو، جیسے کوئی شخص طلاق دیتے وقت لفظ طلاق عدد کا ذکر کرے تو اتنی طلاق واقع ہو جاتی ہیں، لہٰذا یہاں (صورتِ مسئولہ میں) بھی دس مرتبہ ظہار واقع ہو چکا ہے، اس لیے یہ شخص دس بار کفّارہ دے گا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: لو قال ان تزوجتك فانت علی کظہر امی مائۃ مرۃ فعلیہ لکل مرۃ کفارۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المختار ج۳ ص۴۶۷ باب الظہار)

⊕ ⊕ ⊕

---

[1] وقال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ:۔ فعلم انہ لابد فی کونہ ظہاراً من التصریح باداۃ التشبیہ شرعاً ومثلہ ان یقول لھا یا بنتی او یا اختی ونحوہ وفی مثل امی اوکامی ینوی فان کان ینوی الطلاق وقع بائناً۔ (فتح القدیر شرح الھدایۃ ج۴ ص۹۱ کتاب الطلاق، فصل فیما تحل بہ المطلقۃ۔ باب الایلاء)

ومثلہٗ فی الدر المختار علی ھامش ردّ المختار ج۲ ص۶۲۶ کتاب الطلاق۔ باب الایلاء۔

باب الخلع

(خُلع کے مسائل واحکام)

صرف خُلع کے وعدہ سے عورت آزاد نہیں ہوسکتی

سوال:۔ ایک شخص اگر جرگہ (پنچایت) کے سامنے وعدہ کرے کہ میں فلاں تاریخ تک بیوی سے اتنی رقم لے کر اس کو آزاد کردوں گا، لیکن اب وہ شخص وعدہ پورا نہیں کررہا، کیا اس کا وعدۂ خُلع متصوّر ہوکر عورت آزاد ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خلع میں میاں بیوی کے درمیان باقاعدہ ایجاب وقبول کرنا ضروری ہے صرف خُلع کے وعدہ سے عورت کو آزادی نہیں ملتی کیونکہ خُلع ایک عقد اور انشاء کا نام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: یقال خالعت المرأۃ زوجها مخالعة اذا افتدت منه فخلعها۔
(ردّ المحتار ج۲ ص۶۰۴ باب الخلع)[1]

اجنبی شخص پر بدلِ خلع کے لزوم کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ خلع کرنے پر آمادہ ہو اور اُس کے پاس بدلِ خلع نہ ہو اور کوئی دُوسرا شخص جو اِس عورت کے ساتھ آزادی کے بعد نکاح کا ارادہ رکھتا ہو وہ بدلِ خلع کی ذمہ داری اٹھائے تو کیا اس شخص پر بدلِ خُلع کی ادائیگی لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بدلِ خلع کی ادائیگی کی ذمہ داری اگر کوئی اجنبی شخص اٹھائے تو خُلع واقع ہوکر عورت بائن ہوجاتی ہے اور اجنبی شخص پر بدلِ خُلع کی ادائیگی لازم ہے تاہم اس کے بعد اس عورت سے نکاح کرنا الگ معاملہ ہے جس کے وجود یا عدمِ وجود پر خلع کا وجود موقوف نہیں۔

---

[1] وفی الهندیة: وکذا لو قالت طلقتنی بکذا فقال نعم فلیس بشئ لانه وعد۔
(الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۸۸ الباب الثامن فی الخلع وما فی حکمه)
وقال ابن نجیمؒ: وشرعاً علی ما اخترناہ ازالة ملک النکاح المتوقفة علی قبولها بلفظ الخُلع او ما فی معناه۔ (البحر الرائق ج۴ ص۷۷ باب الخلع)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۳ ص۱۵۲ فصل واما الطلاق علی مال فهو فی احکامه کالخلع۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : فان خالعھا الاب علی مال ضامنًا لہ ــــ وقال : کالخلع مع الاجنبی۔
قال ابن عابدینؒ : تحت ھٰذا القول، وحاصل الامر فیہ انہ اذا خاطب الزوج فان اضاف البدل الی نفسہ یفید ضمانہ لہ او ملکہ ایاہ کاخلعھا بالف علیّ او علی انی ضامن صح والبدل علیہ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۶۱۸ باب الخلع، مطلب فی خلع الفضولی) ۱؎

نافرمان عورت سے خُلع کرنا

سوال :۔ اگر کسی شخص کی بیوی نافرمان ہو اور والدین کے گھر مدّتوں بلا وجہ بیٹھی رہتی ہو، خاوند کے باربار مطالبہ پر اس کے پاس نہ آتی ہو۔ تو اگر خاوند ایسی نافرمان عورت سے خلع کر کے کچھ رقم وصول کرلے تو کیا خاوند کے لیے اس رقم کا کھانا حلال ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر عورت کی نافرمانی بلا وجہ ہو اور خاوند اس میں قصور وار نہ ہو تو خاوند کے لیے خُلع کر کے رقم لینے میں کوئی حرج نہیں، اس حالت میں حق مہر سے زیادہ رقم بھی خُلع میں وصول کی جاسکتی ہے، البتہ اگر خاوند کی کسی کمزوری کی وجہ سے بیوی نافرمان ہو تو خاوند کے لیے حق مہر سے زائد رقم لینا اگرچہ قضاءً جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : وکرہ تحریمًا اخذ شیٔ ویلحق بہ الابراء عمالھا علیہ ان نشز وان نشزت لا ولو منہ نشوز۔ ایضًا ولو باکثر مما اعطاھا علی الاوجہ فتح وصحح الشمنی کراھۃ الزیادۃ وتعبیر الملتقی لاباس بہ یفید انھا تنزیھیۃ ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۴۴۵ باب الخلع) ۲؎

۱؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : وفی البزازیۃ الکبیرۃ اذا خلعھا ابوھا او اجنبی باذنھا جاز والمال علیھا۔ (البحر الرائق ج۴ ص۹۱ باب الخلع)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۴ ص۷۹ باب الخلع

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : تحت قولہ وکرہ لہ اخذ شیٔ ان نشز وان نشزت لا ای لایکرہ لہ الاخذ اذا کانت ھی الکارھۃ اطلقہ فشمل القلیل والکثیر وان کان اکثر مما اعطاھا وھو المذکور فی الجامع الصغیر والمذکور فی الاصل کراھۃ الزیادۃ علی ما اعطاھا ینبغی حملہ علی خلاف الاولیٰ ۔
(البحر الرائق ج۴ ص۷۶ باب الخلع)

خاوند کی رضامندی کے بغیر قاضی کو خلع کرانے کا حق نہیں

سوال:۔ ایک شخص صحت و مال کے اعتبار سے نیز دیگر اعتبارات سے بھی معیوب نہیں لیکن اس کی بیوی نے عدالت میں اس کے خلاف خلع کا دعویٰ دائر کر رکھا ہے جبکہ خاوند تفریق پر راضی نہیں، تو کیا قاضی خاوند کی رضامندی کے بغیر تفریق یا خلع کرا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب خاوند بیوی کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا ہو تو اس صورت میں خاوند کی رضامندی کے بغیر قاضی کو خُلع و تفریق کرانے کا حق نہیں، کیونکہ طلاق اور خلع میں رضاءِ زوج شرط ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: واما رکنه فهو الایجاب والقبول لانه عقد علی الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا یستحق العوض بدون القبول۔

(بدائع الصنائع ج۳ ص۱۴۵ کتاب الطلاق۔ فصل فی الخلع)

وقال الامام السرخسی رحمه الله: والخلع جائز عند السلطان وغیره لانه عقد یعتمد التراضی کسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولایة ایقاع الطلاق ولها ولایة الالتزام العوض۔ (المبسوط للشمس الائمة السرخسیؒ ج۶ ص۱۷۳ باب الخلع)[1]

بدلِ خلع کی مقدار

سوال:۔ کیا بدلِ خُلع کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اگر حقِ مہر سے زائد مال سے خلع کیا جائے تو خاوند کے لیے اس زائد مال کا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بدلِ خلع کے لیے کوئی خاص مقدار متعین نہیں، میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے جس مقدار پر بھی اتفاق ہو تو خلع سے بیوی آزاد ہو جائے گی، تاہم اگر اس طرح سے باہمی جدائی کا سبب خاوند کا معاندانہ رویہ اور انسانیت سوز سلوک ہو تو خاوند کے لیے حقِ مہر سے زائد رقم لینا مکروہ ہے ورنہ بصورتِ دیگر ناشزہ (نافرمان) عورت سے حقِ نکاح کے عوض جو مقدار بھی مقرر ہو خاوند کے لئے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما فی الهدایة: وان کان النشوز منها کرهنا له ان یأخذ منها اکثر مما

---

[1] وفی الهندیة: وشرطه (ای الخلع) شرط الطلاق۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۸۸ الباب الثامن فی الخلع وما فی حکمه۔ الفصل الاول فی شرائط الخلع وحکمه ومایتعلق۔

ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۶۰۶ باب الخلع۔

اعطاها...... ولواخذ الزیادة جاز قضاءً۔ (الهدایة ج۲ ص۳۸۳ باب الخلع) [1]

ناچاقی کی صورت میں خلع بہتر ہے

سوال:۔ اگر میاں بیوی کی طبیعتوں میں ایک دوسرے سے لگاؤ نہ ہو اور ہر وقت ناچاقی رہتی ہو اور حدود اللہ کی رعایت نہ رکھنے کا قوی اندیشہ ہو، اس صورت میں اگر عورت خلع کرنا چاہے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ جب طبائع میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی کے بجائے آپس میں نفرت پیدا ہو رہی ہو اور اس سے مختلف معاشرتی اور اخلاقی مسائل پیدا ہو رہے ہوں تو ان حالات میں اکٹھا رہنے کی بجائے بذریعہ خلع علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ (البقرة آیت ۲۲۹) [2]

خلع عورت کے قبول پر موقوف ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو کسی رقم کے عوض طلاق دینے پر آمادہ ہو تو اس کے نافذ ہونے کے لیے کن شرائط کی رعایت ضروری ہے؟

الجواب:۔ کسی نقد رقم یا جائداد خواہ حق مہر ہو یا اس سے زائد پر خاوند بیوی کو طلاق دینا چاہے تو اس صورت میں چونکہ عورت مقررہ مال کی خاوند کو ادائیگی کی پابند ہوتی ہے اس لیے اس کی صحت عورت کی قبول پر موقوف ہے، عورت اگر قبول نہ کرے تو خاوند اس سے جبری طور پر مطالبہ نہیں کر سکتا اور نہ عورت خاوند کو مال کے عوض طلاق دینے پر مجبور کر سکتی ہے، ایسی طلاق بالمال خلع کے نام سے موسوم ہے جس میں اگر خاوند تین طلاق اکٹھی دے دے تو منکوحہ مطلقہ مغلظہ کے حکم میں ہوگی ورنہ خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

---

[1] وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله: نعم یکون اخذ الزیادة خلاف الاولیٰ۔
(ردّ المحتار علی الدر المختار ج۲ ص۶۰۶ باب الخلع)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۴۹۵ باب الخلع۔

[2] قال المرغینانیؒ: واذا تشاق الزوجان وخافا ان لا یقیما حدود الله فلا بأس بان تفتدی نفسها منه بمال یخلعها به۔ (الهدایة ج۲ ص۳۸۳ کتاب الطلاق، باب الخلع)
ومثله فی الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۰۶ باب الخلع۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ :۔واما رکنه فهو کما فی البدائع اذا کان بعوض الایجاب والقبول۔ (ردالمحتار ج۲ ص۶۰۶،۶۰۵ باب الخلع)[1]

بیٹے کی طرف سے باپ خلع نہیں کرسکتا

سوال:۔ایک نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کا نکاح دونوں کے والدین نے بچپن میں کردیا تھا اب جبکہ لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور لڑکا ابھی تک نابالغ ہے، دونوں میں ناچاقی پیدا ہوکر لڑکی باپ کے گھر چلی گئی ہے، بعد میں لڑکے کے والد نے لڑکی والوں سے بدلِ خلع تین سو روپے لیکر خلع کرلیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ لڑکے کی طرف سے باپ کا کیا گیا خُلع درست ہے؟ اور لڑکی دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔نابالغ نہ خود خلع کا اہل ہے اور نہ ہی والد اس کی طرف سے خُلع کرسکتا ہے لڑکی تاحال لڑکے کے نکاح میں ہے اورکسی دوسری جگہ اس کا نکاح جائز نہیں، لڑکے کے بالغ ہونے کے بعد صحیح صورتحال سامنے آسکتی ہے۔

لما فی الهندیة : اذا خلع الاب علی ابنه الصغیر لا یصح ولا یتوقف علیٰ اجازته. کذا فی فتاوٰی قاضیخان .خلع السکران والمکره جائز وخلع الصبی باطل۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۵۰۴ الفصل الثالث فی الطلاق بالمال)[2]

---

[1] وفی الهندیة :ولو زاد الزوج علی حرف الجواب فقال طلقتک ثلاثاً بالف عند ابی حنیفةؒ یتوقف علیٰ قبولها فان قبلت یقع الثلاث ویلزمها ألف وان لم تقبل بطل وعلیٰ قولهما یقع الثلاث بألف قبلت ام لا کذا فی شرح الجامع الصغیر لقاضی خانؒ ۔

{الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۴۹۶ الباب الثامن فی الخُلع}

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : وقید بالانثیٰ ای فی متن الکنز لانه لو خلع ابنه الصغیر لایصح ولا یتوقف خلع الصغیر علی اجازة الولی۔

(البحر الرائق شرح الکنز الدقائق ج۴ ص۹۱ باب الخلع)

ومثلهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۵۳۶ باب الخلع۔

خُلع طلاقِ بائن کے حکم میں ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خلع فقہاءِ احناف کے ہاں طلاق ہے یا فسخ نکاح؟

الجواب:۔ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، احناف کثر اللہ سوادہم کے نزدیک خُلع طلاقِ بائن کے حکم میں ہے جبکہ شوافع اس کو فسخِ نکاح میں شمار کرتے ہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وقع طلاق بائن فی الخلع رجعی فی غیرہ وقوعاً۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ (بائن فی الخلع) لانہ من الکنایات الدالۃ علی قطع الوصلۃ فکان الواقع بہ بائناً۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۶۰۹ باب الخلع) لہ

ایجابِ خُلع کے بعد شوہر کا رجوع صحیح نہیں

سوال:۔ خلع میں شوہر نے ایجاب کیا، ابھی عورت نے قبول نہیں کیا تھا کہ شوہر نے رجوع کے الفاظ کہے مگر اس کے باوجود بھی عورت نے خلع قبول کر لیا تو کیا اس سے خلع لازم ہوگا یا شوہر کا رجوع صحیح ہے؟

الجواب:۔ خلع چونکہ مرد کی جانب سے یمین ہے اور یمین میں شرعاً رجوع نہیں کیا جا سکتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں شوہر کا رجوع کرنا درست نہیں بلکہ عورت کے قبول کر لینے سے خلع نافذ العمل ہوگا، البتہ اگر ایجاب عورت کی طرف سے ہو تو شوہر کا رجوع کرنا صحیح ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: هو یمین فی جانبہ لانہ تعلیق الطلاق بقبول المال فلا یصح رجوعہ عنہ قبل قبولها ولا یصح شرط الخیار لہ ولا یقتصر علی المجلس ای مجلسہ ویقتصر قبولها علی مجلس علمها وفی جانبها معاوضۃ بمال فصح رجوعها قبل قبولہ وصح شرط الخیار لها۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۲ باب الخلع ص ۶۰۷،۶۰۶) لہ ۲

لہ قال الشیخ وهبۃ الزحیلی: یقع بہ طلقۃ بائنۃ ولو بدون عوض اونیۃ فی رأی الحنفیۃ والمالکیۃ والشافعیۃ فی الراجح واحمد فی روایۃ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۷ ص ۵۰۴ المبحث الخامس آثار الخلع)

ومثلہ فی الهندیۃ ج ۱ ص ۴۸۸ الباب الثامن فی الخلع وما فی حکمہ۔

لہ ۲ قال الشیخ وهبۃ الزحیلی: وذهب ابوحنیفۃؒ الی ان الخلع قبل قبول المرأۃ یمین من جانب الزوج فلا یصح الرجوع عنہ لانہ علق طلاقها علی قبول المال والتعلیق یمین اصطلاحاً ویعتبر معاوضۃ بمال من جانب الزوجۃ لانها التزمت بالمال فی مقابل افتداء نفسها وخلاصها من الزوج۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۷ ص ۴۸۸ المبحث الثانی، صفۃ الخلع۔

خلع کے بعد تجدیدِ نکاح صحیح ہے

سوال:۔ ایک شخص نے بیوی کے ساتھ خلع کیا، اب وہ دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو کیا شرعاً تجدیدِ نکاح سے نکاح ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں چونکہ خلع سے طلاقِ بائن واقع ہوتی ہے اور طلاقِ بائن کے بعد تجدیدِ نکاح سے نکاح صحیح ہوجاتا ہے، لہٰذا اگر صورتِ مسئولہ میں صرف خلع ہوا ہو تو دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: الواقع ولو بلامال (و بالطلاق) الصریح علیٰ مال طلاق بائن۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۰۹ باب الخلع) لـه

صبی ومجنون کا خُلع نافذ العمل نہیں

سوال:۔ کیا صبی ومجنون وغیرہ کا خلع صحیح ہے جب وہ اپنی بیوی سے بعوض حق مہر یا دیگر اموال کے بدلے خلع کرے؟

الجواب:۔ خلع ایک قسم کی طلاق ہے اس میں ہر اُس شرط کا ہونا ضروری ہے جو طلاق کیلئے ضروری ہو، چونکہ صبی ومجنون اور معتوہ کی طلاق شرعاً صحیح نہیں اسلئے ان کا خلع کرنا بھی درست نہیں۔

وفی الهندیة: وخلع الصبیّ باطلٌ والمعتوة والمغمیٰ علیه ومن مرضٍ بمنزلة الصّبیّ فی ذٰلك هٰکذا فی المبسوط۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۵۰۴ الباب الثامن فی الخلع) ٢ـه

☆ ☆

لـه وفی الهندیة: وحکمه وقوع الطلاق البائن کذا فی التبیین۔
(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۴۸۸ الباب الثامن فی الخلع وماحکمه)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۲ ص۲۶۷ باب الخلع۔

٢ـه قال الشیخ الدکتور وهبة الزحیلی: یشترط فی الخلع ما یأتی (۱) اهلیة الزوج لایقاع الطلاق بان یکون بالغاً عاقلاً فی رأی الجمهور .... فکل من لا یصح خلعه کالصّبیّ والمجنون والمعتوه ومن اُختل عقله لمرض اوکبر سنٍ۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۴۹۰ المبحث الثالث، شروط الخلع)

باب العنین

(نامرد کے مسائل واحکام)

زوجۂ عنین کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیا گیا، شادی کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکا تو عنین (نامرد) ہے اور حقوقِ زوجیت ادا نہیں کر سکتا، علاج و معالجہ سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا، لڑکی جوان ہے شرعاً اس مسئلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر خاوند کے عنین ہونے کا علم نکاح سے قبل منکوحہ کو نہ ہو نیز عورت نے اسکے نامرد ہونے پر علم حاصل ہونے کے بعد اسکے نکاح میں رہنے پر رضامندی ظاہر نہ کی ہو اور خاوند نے اسکے ساتھ ایک دفعہ بھی جماع نہ کیا ہو تو پھر قاضی یا مسلمان حاکم کے حکم سے خاوند کو علاج معالجہ کیلئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی، ایک سال میں اگر وہ صحتیاب نہ ہوسکا تو عورت کے مطالبہ پر قاضی یا مسلمان حاکم دونوں کے درمیان تفریق کرکے نکاح فسخ کردے گا، اور اگر قاضی یا حاکم فسخ نکاح کے لیے میسّر نہ ہوں تو عورت خود بھی اپنا نکاح فسخ کرسکتی ہے جب وہ اپنے نفس کو اس کے نکاح سے علیحدہ کرنے کے لیے اختیار حاصل کرے۔

لما قال ابن عابدینؒ: ویکفی اختیار نفسها ولا یحتاج الی القضاء کخیار العتق قیل وهو الاصل۔ کما فی غایة البیان وفی البدائع عن شرح مختصر الطحاوی ان الثانی ای عدم الاحتیاج الی القضاء ظاهر الروایة۔ (ردّ المحتار علی الدّر المختار ج۲ ص۶۴۷ باب العنین، مطلب فی طبائع فصول السنة الاربع)۔

یہاں یہ یاد رہے کہ علاج معالجہ کیلئے ایک سال کی مہلت قاضی یا حاکم ہی کے حکم سے جھگڑنے کے وقت سے مقرر کی جائے گی، کسی دوسرے شخص کے کہنے سے قبل از خصومت و تنازع تقرر کا اعتبار نہ ہوگا۔

قال ابن عابدینؒ: وعبرة بتاجیل غیر قاضی البلد الواجبة ولا یعتبر بتاجیل غیر الحاکم کائنًا من کان۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۴۹ باب العنین، مطلب فی عطف الخاص علی العام) وفی الدّر المختار: ویؤجل من وقت الخصومة۔ (ج۲ ص۶۴۶ باب العنین)[1]

---

[1] قال المرغینانیؒ: واذا کان الزوج عنینًا اجل الحاکم سنة فان وصل الیها فیها والا فرق بینهما اذا طلبت المرأة ذلک۔ (الهدایة ج۲ ص۳۹۹ باب العنین وغیره)

ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۲۳ الباب الثانی فی العنین۔

ابتداءً رضامندگی سے خیار باطل ہوجاتا ہے

سوال:۔ اگر کوئی عورت ابتداءً عنین شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کرے اور سال دو سال بعد شوہر سے الگ ہونے کا دعویٰ عدالت میں دائر کردے تو کیا اس عورت کو شوہر سے الگ ہونے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی عورت شادی کے بعد اپنے شوہر کو عنین پائے تو اس کو بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے مگر جب وہ ایسے شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کردے تو پھر اس کو تفریق یعنی فسخ نکاح کا حق باقی نہیں رہتا۔

قال الشیخ وهبة الزحیلی: اشترط الفقهاء شرطین لثبوت الحق فی طلب التفریق بالعیب وهما......(۲) الا یرضی بالعیب بعد العقد فان کان طالب التفریق جاهلاً بالعیب ثم علم به بعد ابرام العقد ورضی به سقط حقه فی طلب التفریق ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۵۲۱ شروط التفریق بالعیب)[۱]

خیار فسخ کے ختم ہونے کی شرائط

سوال:۔ اگر ایک عورت کو کسی طریقہ سے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ جماع پر قادر نہیں اس کے باوجود وہ اس کے ظاہری حسن وجمال یا اس کے مال ودولت کے لالچ کی وجہ سے اس سے نکاح کرے اور کچھ عرصہ کے بعد اس بناء پر تفریق کا مطالبہ کرے کہ یہ شخص جماع پر قادر نہیں ہے تو کیا اس عورت کو نکاح فسخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علماء احناف کے ہاں شوہر میں عیب کی وجہ سے فسخ نکاح کیلئے چند شرائط ہیں۔ (۱) یہ کہ اس عورت کو شوہر کے اُس عیب کا علم نکاح سے قبل نہ ہو۔ (۲) یہ کہ اس عورت کو شوہر کا یہ عیب نکاح سے پہلے معلوم ہو اور اس کے باوجود وہ اس سے نکاح کرے تو پھر اس کو طلب تفریق (یعنی نکاح فسخ کرنے) کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح صورت مسئولہ

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: وان اختارته بطل حقها...... اشار ببطلانه باختیارها الی انه لو فرق بینهما ثم تزوجها ثانیاً لم یکن لها خیار لرضاها بحاله کما لو تزوجته عالمة بحاله علی المفتی به ۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۲۵ باب العنین)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۵۰۰ باب العنین۔

بیں بھی اس عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال الشیخ ابوزھرۃ رحؒ: ولیشترط للتفریق فی العنۃ والجب والخصاء ثلاثۃ شروط (اولاً) ... تکون عالمۃ بذٰلک عند العقد فان علمت بہٖ عند العقد ورضیت فانہٗ لیس لہا الحق فی طلب التفریق بسببہ۔

(الاحوال الشخصیۃ ص۳۵۶ التفریق للعیب) لے

خصی اور عنین کا حکم ایک ہی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جس طرح عنین کے لیے دبغرض علاج معالجہ) ایک سال کی مہلت ہے تو کیا خصی کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی یا بغیر مہلت کے ہی میاں بیوی میں تفریق کی جائے گی؟

الجواب:۔ عنین اور خصی دونوں کو قاضی علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دے گا تاکہ وہ اس مدت میں اپنا علاج کرا کے جماع کے قابل ہو سکے، اور اگر اس کے باوجود وہ جماع کے قابل نہ ہو سکے تو ایک سال کے بعد دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔

لما قال الشیخ الامام ابو زھرۃ رحؒ: أما العنۃ والخصاء فلا یحکم القاضی بالتفریق فیھما بمجرد طلبھا وثبوت عدم قبولھا بل لا بد من تاجیلھا سنۃ ویثبت انہ لم یقربھا وذٰلک لان عمر رضی اللہ عنہ أجل التفریق سنۃ عندما طلبت امرأۃ التفریق لأن زوجھا لم یقربھا۔ (الاحوال الشخصیۃ ص۳۵۷ التفریق للعیب) ٢ے

لے قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: اشترط الفقہاء شرطین لثبوت الحق فی طلب التفریق بالعیب وھما (١) الا یکون طالب التفریق عالمًا بالعیب وقت العقد فان علم بہٖ فی العقد وعقد الزواج لم یحق لہ طلب التفریق لأن قبولہ التعاقد مع علمہ بالعیب رضا منہ بالعیب۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۷ ص۵۲۱ شروط التفریق بالعیب)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علٰی صدر رد المحتار ج۳ ص۵۰۰ باب العنین۔

٢ے قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحؒ: وأجل سنۃ لو عنینا اوخصیا وھو من نزع خصیتاہ وبقی ذکرہ۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۲۴ باب العنین)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علٰی صدر رد المحتار ج۳ ص۴۹۶ باب العنین۔

مقطوع الذکر کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص مجبوب ہو (یعنی جس کا آلۂ تناسل بالکل نہ ہو) تو کیا اسے بھی ایک سال کی مہلت دی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب :- رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد اگر کسی عورت کا شوہر مجبوب یا مقطوع الذکر ہو جائے تو اس کو مہلت دینے میں چونکہ کوئی فائدہ نہیں اور نہ وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو مہلت دینے سے مقصود ہوتا ہے اس لیے مجبوب کو مہلت دیئے بغیر دونوں کے درمیان قاضی یا جج تفریق کر دے گا ۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : وجدت زوجها مجبوباً فرق فی الحال وهو من استوصل ذکره و خصیتاه ...... وانما لم یؤجل لعدم الفائدة ۔

(البحر الرائق ج ۴ ص۱۲۲ باب العنین وغیره) [1]

عقیم مرد سے فسخ نکاح کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب ! ایک شخص جماع پر تو قادر ہے لیکن ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اس کے مادۂ منویہ میں اولاد پیدا کرنے والے جراثیم ختم ہو چکے ہیں جبکہ اس کی بیوی تندرست اور بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، تو کیا عورت نکاح فسخ کرا سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کسی کو اولاد دینا یا نہ دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہے بچے عنایت فرمائے اور جسے چاہے نہ دے، جراثیم کا ختم ہونا کوئی عیب نہیں اور نہ ڈاکٹری رپورٹ حکمِ قطعی ہے، لہٰذا جب کسی عورت کا خاوند نفسِ جماع پر قادر ہو تو اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنا نکاح بذریعہ عدالت فسخ کرالے ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ : اذا کان الزوج عنیناً اجل الحاکم سنة فان وصل الیها فیها والا فرق بینهما اذا طلبت المرأة ذلك ۔ (الهدایة ج ۲ ص۳۹۹ باب العنین)

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : اذا وجدت المرأة زوجها مجبوبا او مقطوع الذکر فقط او صغیره جداً کالزر ...... فرق الحاکم بطلبها ...... بینهما فی الحال ولو المجبوب صغیرا لعدم فائدة التأجیل ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۳ ص۴۹۴ باب العنین)

باب العدّة

(عدّت کے مسائل)

بیوہ عورت کی عدّت

سوال:۔ جس عورت کا خاوند فوت ہوجائے اس کو دوسرا نکاح کرنے کے لیے کتنی مدت انتظار کرنا پڑے گا؟ کیا حمل کی وجہ سے عدّت میں کمی بیشی ممکن ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس عورت کا خاوند فوت ہوجائے اس کے لیے چار ماہ دس دن عِدّت گزارنا ضروری ہے، عدّت کے دوران دوسرا نکاح یا اس کی دیگر سرگرمیوں میں وابستہ رہنا ناجائز اور حرام ہے۔ اور جو عورت حاملہ ہو اس کی عدّت وضع حمل پر موقوف ہے، چاہے ایک گھنٹہ بعد ہو یا نو مہینے لگ جائیں۔

وقال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۴) وایضاً قال عزّوجلّ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۴)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تحد علیٰ میت فوق ثلاث الا علیٰ زوج اربعۃ اشھر وعشرًا۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸۶ باب وجوب الاحداد فی عدّۃ الوفات وتحریمہ فی غیر ذلک الا ثلاثۃ ایام)

وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: تحت قول الحصکفیؒ، وضع جمیع حملھا ای بلا تقدیر بمدۃ سواء ولدت بعد الطلاق او الموت بیوم او اقل۔

(ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۵۶ باب العدّۃ)[1]

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: فان کانت المعتدۃ عن الطلاق او الموت حاملاً فعدتھا بوضع الحمل۔ وفیہ ایضاً وعدّۃ الوفاۃ علی الحرۃ اربعۃ اشھر وعشرًا۔

(الفتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص ۵۵۰ باب العدّۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص ۵۲۸-۵۳۳ الباب الثالث العشر فی العدّۃ۔

مطلقہ قبل الدخول کی عدت

سوال:۔ اگر ایک شخص نے قبل الدخول اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو کیا ایسی حالت میں مطلقہ پر عدت گذارنا ضروری ہے؟

الجواب: ہمبستری یا خلوتِ صحیحہ سے قبل طلاق دینے کی صورت میں مطلقہ کے ذمہ عدت گذارنا واجب نہیں، لہٰذا طلاق سے جدا ہو کر اس کے فوراً بعد یا تاخیر سے بغیر کسی تحدید مدت کے دوسری جگہ نکاح کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال اللّٰہ عزوجل: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۹) [۱]

نابالغہ کی عدت

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اپنی نابالغ بیوی کو ہمبستری کے بعد طلاق دی ہو تو اس کی عدت کیا ہوگی؟

الجواب:۔ نابالغ عورت حیض نہ ہونے کی وجہ سے مہینوں کے اعتبار سے عدت گذارے گی لہٰذا تین ماہ گذر جانے کے بعد مطلقہ آزاد ہوگی، تاہم اگر دوران عدت حیض کا خون آنا شروع ہو گیا تو پھر عدت مہینوں کے بجائے حیض سے شمار ہوگی۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاللّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (سورۃ الطلاق آیت ۴)

وفی الهندية: والعدة لمن لم تحض لصغر وكبر او بلغت بالسن ولم تحض ثلاثة اشهر كذا فی النقاية، وكذا لو رأت دمًا يوماثم لم ترفعدتها بالشهور وهو الصحيح ولو رأت ثلاثة دمًا ثم انقطع فعدتها بالحيض۔الخ (الفتاوی الہندیہ ج۱ ص۵۲۶ باب العدۃ) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة الكاسانی رحمه اللّٰه: وشرط وجوبها (ای العدة) ..... الدخول وما يجری مجرا الدخول وهو الخلوة الصحيحة۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۹۱ باب العدة۔ فصل ومنها ان يكون النكاح الثانی صحيح)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۱ ص۵۲۶ الباب الثالث عشر فی العدة۔

[۲] قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: وان كانت ممن لاتحيض من صغر او كبر فعدتها ثلاثة اشهر۔ (الهداية ج۲ ص۴۰۱ باب العدة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۳۰ باب العدة۔

معتدۃ عدّت کہاں گذارے گی

سوال:- عدت گذارنے والی عورت کیلئے عدت کے دوران خاوند کے گھر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ رہائش اختیار کرنا کیسا ہے؟

الجواب:- معتدۃ کے لیے خاوند کے گھر سے نکلنا جائز نہیں، جس گھر میں اس کو طلاق ملی ہو یا خاوند وفات پاگیا ہو عورت وہاں پر ہی عدت گذارے گی، اس لیے کہ جس عورت کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں اُس کے لیے خاوند کے گھر سے کسی وقت نکلنا جائز نہیں ہے۔ البتہ متوفیٰ عنہا زوجہا کے لیے دن میں اتنی ضرورت کے لیے نکلنا مرخص ہے کہ جتنے وقت میں اپنی دنیاوی ضرورت پوری کرے لیکن رات کو لازمی طور پر شوہر کے گھر آنا ضروری ہوگا، تاہم اگر مکان کرایہ کا ہو اور بیوہ کے لیے کرایہ کا انتظام مشکل ہو تو پھر اس ضرورت کے تحت والدین کے گھر ایام عدت گذار سکتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتعتدان ای معتدۃ طلاق وموت فی بیت وجبت فیہ الا ان تخرج او ینہدم المنزل او تخاف انہدامہ او تخاف تلف مالہا اولا تجد کراء البیت ونحو ذٰلک من الضرورات فتخرج لاقرب موضع الیہ۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۶۷۴ باب العدّۃ)[1]

دورانِ عدت خاوند کے گھر رہنا ضروری ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیں، اب دونوں دوبارہ آبادی کیلئے حلالہ پر راضی ہیں لیکن عورت چونکہ حاملہ ہے جس کے لیے وضع حمل کے بغیر دوسری جگہ نکاح کرنا جائز نہیں، اس صورت میں یہ عورت کہاں سکونت اختیار کرے گی؟ کیا خاوند کے ہاں رہ سکتی ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق اس عورت کے لیے دورانِ عدت خاوند کے گھر رہنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، تاہم اگر نکاح سے قبل خاوند کی طرف سے کسی فسق وفجور کا خطرہ ہو تو

---

[1] وفی الهندیۃ: علی المعتدۃ ان تعتد فی المنزل الذی یضاف الیها بالسکنی حال وقوع الفرقۃ او الموت، وفیہ۔ وان اضطرت الی الخروج من بیتها..... فی عدۃ الوفات فلا بأس عند ذٰلک ان تنتقل....الخ (الفتاویٰ الهندیۃ ج۱ ص۵۳۵ الباب الرابع عشر فی الحداد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۵۴ فصل فی الاحداد۔

اس کے انسداد کے لیے خلوت سے اجتناب کرنا یا دیگر احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ زنا وغیرہ کے ارتکاب سے بچا جا سکے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: لهما ان یسکنا بعد الثلث فی بیت واحد اذا لم یلتقیا التقاء الازواج ولم یکن فیه خوف فتنة وفیه عن المجتبیٰ الافضل الحیلولة بستر ولو فاسقاً فبامرأة۔ الخ

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۶۷۵ باب العدة)[1]

زنا کے ارتکاب سے عدت متاثر نہیں ہوتی

سوال:۔ اگر مطلقہ مغلظہ سے خاوند باوجود اقرارِ حرمت کے دورانِ عدت زنا کرے تو کیا اس سے عدت پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مطلقہ مغلظہ سے اگر خاوند دورانِ عدت زنا کا ارتکاب کرے تو عدت جاری رہے گی اس سے عدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الهندیة: واما المطلقة ثلاثاً اذا جامعها زوجها فی العدة مع علمه انها حرام علیه ومع اقراره بالحرمة لا تستانف العدة۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۱ ص۵۳۲ الباب الثالث عشر فی العدة)[2]

عورت کا خاوند کے گھر میں عدت گذارنے کی وجہ

سوال:۔ طلاق ہو جانے کے بعد عورت کو خاوند کے گھر میں عدت گذارنے کا پابند کیوں کیا گیا ہے؟ جبکہ عورت کسی دوسری جگہ بھی عدت گذار سکتی ہے؟

الجواب:۔ اگرچہ عورت پر یہ لازم نہیں کہ وہ طلاق سے معتدة ہونے کی صورت میں خاوند کے

---

[1] قال ابن نجیم: فلا بأس بان یسکنا فی بیت واحد اذا کان عدلاً سواء کان الطلاق رجعیاً او بائناً او ثلاثاً والافضل ان یحال بینهما فی البیتوتة بستر الا ان یکون الزوج فاسقاً فیحال بامرأة ثقة تقدر علی الحیلولة بینهما۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۵۴ باب العدة فصل فی الاحداد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۳۵ الباب الرابع عشر فی الاحداد۔

[2] قال العلامة ابن عابدین: لو وطئها بعد الثلاث فی العدة بلا نکاح عالماً بحرمتها لا تجب عدة اخری لانه زنا۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۶۱ باب العدة)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۵۵۳ فصل فی انتقال العدة۔

گھر میں رہے، لیکن عدت کے دوران چونکہ اس کا نکاح دوسری جگہ نہیں ہوسکتا، اس لیے شریعت نے اس کے اخراجات کا (متبادل انتظام نہ ہونے تک) خاوند کو ذمہ دار قرار دیا ہے، مزید برآں یہ بھی ممکن ہے کہ عورت حاملہ ہو اور بچہ کی ولادت تک عورت خاوند کے حق میں محبوس رہے گی، اس لیے عورت کے لیے خاوند کے گھر کے علاوہ کوئی اور بہتر جگہ میسر نہیں اور طلاقِ رجعی کی صورت ممکن ہے کہ عورت کا خاوند کے گھر میں رہنا دوبارہ تعلقات کی بحالی کا ذریعہ ثابت ہو۔

قال العلامة الامام الکاسانیؒ: وانما تجب هذه العدّة ای عدة الاقراء لاستبراء الرحم فوجبت العدة لیعلم بها فراغ الرحم وشغلها۔ وایضاً قال: وانها تجب لاظهار الحزن بفوت نعمة النکاح۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۹۱،۱۹۲ کتاب الطلاق۔ فصل واما العدة بالاشهر فنوعان وفی فصل قبله)[1]

عدّت کی کم از کم مدّت

سوال:۔ غیر حاملہ عورت طلاق کے بعد دعویٰ کرے کہ میری عدّت گذر گئی ہے تو کتنی مدت میں اس کے قول کو اعتبار دیا جائے گا؟

الجواب:۔ صاحبینؒ کے نزدیک ایسے دعویٰ کے لیے کم از کم ۳۹ دن کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کم از کم تین حیض کے لیے نو۹ دن اور دو۲ طہر کے لیے تیس۳۰ ایام درکار ہوں گے تاہم عورت کی عادت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۳۹ سے زائد ایام کے وقت فیصلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: قالت مضت عدتی والمدة تحتمله وکذبها الزوج قبل قولها والا تحتمله المدة لا۔ وقال العلامة ابن عابدینؒ: فی هذا المقام وعندهما اقل مدة تصدق فیها الحرة تسعة وثلاثون یوماً ثلاث حیض بتسعة ایّام وطهران بثلاثین۔

(ردّالمحتار ج۲ ص۶۶۵ باب العدة۔ مطلب فی وطئ المعتدة بشبهة)[2]

---

[1] قال الشیخ الدکتور وهبة الزحیلی: "فی بیان وجه العدّة" براءة الرّحم وصون النسب واعطاء الفرصة الکافیة للزوج بعد الطلاق لیعود لزوجته المطلقة۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۶۲۴ باب العدّة)

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا قالت المعتدة انقضت عدتی وکذبها الزوج کان القول قولها مع الیمین۔

(الهدایة ج۲ ص۴۰۳ کتاب الطلاق۔ باب العدّة)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۴ ص۱۵۶ باب العدّة۔ کتاب الطّلاق۔

باہمی تعلقات منقطع ہونے کے باوجود مطلقہ کیلئے عدت ضروری ہے

سوال:۔اگر ایک عورت اپنے خاوند سے بھاگ کر کسی اور شخص کے پاس مدت دراز تک غیر شرعی سرگرمیوں میں ملوث رہی اور کئی سالوں تک اس کا خاوند سے رابطہ نہیں رہا، اسی حالت میں اگر خاوند اس کو طلاق دیدے تو کیا اس عورت پر عدت گذارنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔جب تک منکوحہ کو خاوند سے طلاق نہ ملے تو میاں بیوی کی عرصۂ دراز تک باہمی جدائی سے نکاح متاثر نہیں ہوتا، نکاح کی موجودگی میں عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہو تو بوجۂ نکاح خاوند سے اس کا نسب ثابت ہوگا، اس حالت میں نسب کا انتفاء لعان پر موقوف ہے۔ بایں وجہ جب تک نکاح کی بقاء زوال پر منتج نہ ہو تو عورت کے لیے عدت ضروری ہوگی، اگرچہ عرصۂ دراز تک میاں بیوی کا رابطہ منقطع رہا ہو۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ (سورۃ البقرۃ آیت)

وقال النبیّ علیہ الصلوٰۃ والسلام: "الولد للفراش"۔ (رواہ ابوداؤد ج۱ ص۳۱۷) عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ [۱]

عدت کی ابتداء زوالِ نکاح سے شمار ہوگی

سوال:۔ایک عورت اپنے خاوند سے چار سال تک جدا رہی اور ایک دوسرے سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی، اب جبکہ خاوند نے خلع کر دیا ہے تو کیا اس عورت پر عدت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔صورتِ مرقومہ کے مطابق میاں بیوی کے ایک عرصہ تک علیحدہ رہنے کے باوجود ان کا نکاح باقی ہے، زوالِ نکاح چونکہ خلع کرنے یا طلاق دینے سے آتا ہے اس لیے یہ عدت زوال نکاح سے شروع ہو کر عورت پر عدت لازم ہے۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفیؒ: ومبدأ العدۃ بعد الطلاق وبعد الموت علی الفور۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۶۶۲ باب العدۃ۔مطلب فی وطئ المعتدۃ بشبہۃ) [۲]

---

[۱] قال المرغینانیؒ: ویثبت نسب ولد المطلقۃ الرجعیۃ اذا جاءت بہ لسنتین اواکثر مالم تقر بانقضاء عدتہا۔ (الہدایۃ ج۲ ص۴۰۹ کتاب الطلاق۔باب العدۃ) وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۲ ص۶۷۶ باب العدۃ۔فصل فی ثبوت النسب۔

[۲] قال المرغینانیؒ: وابتداء العدۃ فی الطلاق عقیب الطلاق۔ (الہدایۃ ج۲ ص۴۲۴ کتاب الطلاق۔باب العدۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۱ ص۵۳۱ کتاب الطلاق، فی الباب الثالث عشر فی العدۃ۔

عدّت کے اندر اندر رجوع بالقول کافی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی لیکن بعد ازاں عدت کے آخری ایّام میں رجوع کا ارادہ کیا، باہمی تعلّقات کا سہارا لینے کی بجائے صرف دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دیا کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا ہے، تو کیا شخص مذکور اب عورت کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عدّت گذرنے سے قبل خاوند کا رجوع معتبر ہے، عدّت کے دوران رجوع کے لیے کسی عملی اقدام کی بجائے رجوع بالقول ہی کافی ہے، اس لیے دو گواہوں کے سامنے اس کے رجوع کو اعتبار دے کر دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گذار سکتے ہیں۔

لمافی الهندية: قال الرجعة ان يراجعها بالقول ويشهد على رجعتها شاهدين۔ الخ[1]

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۴۶۸ كتاب الطلاق، الباب السادس في الرجعة وفيما تحل به المطلقة وما يتصل به)

عدت کے دوران عورت کے جملہ اخراجات کا خاوند ذمہ دار ہے

سوال:۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ ثلاثہ دے کر فارغ کر دیا ہو، اب جبکہ خاوند اور مطلّقہ کے باہمی تعلّقات مراجعت یا تجدیدِ نکاح سے نہیں بنتے ہوں تو عدت کے دوران مطلّقہ کے اخراجات کا کون ذمہ دار ہوگا؟

الجواب:۔ مطلّقہ مغلّظہ ہو یا بائنہ، عدّت کے دوران اس کی خوراک، پوشاک اور رہائش کے جملہ اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں، اگر خاوند باہمی رضامندی سے ان اخراجات کی ادائیگی کیلئے تیار نہ ہو تو عورت حاکمِ وقت یا قاضی کے ذریعہ اس سے ان حقوق کے حاصل کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

قال المرغيناني: واذا طلق الرجل امرأته فلها النفقة والسكنى فى عدّتها رجعيًا كان اوبائنًا۔ (الهداية ج۲ ص۴۲۱ كتاب الطلاق ۔ باب النفقة)[2]

---

[1] قال المرغيناني: والرجعة ان يقول راجعتك اوراجعت امرأتي۔ (الهداية ج۲ ص۳۷۳ كتاب الطلاق، باب الرجعة)
ومثله فى ردّ المحتار ج۲ ص۵۲۳ كتاب الطلاق، باب الرّجعة۔

[2] قال ابن عابدينؒ ۔ تحت قول الحصكفيؒ "وتجب لمطلقة الرجعي والبائن"۔ لان النفقة تابعة للعدّة وقيد بالرجعي والبائن احترازا عما لو اعتق ام ولده۔ (رد المحتار ج۲ ص۷۲۶ باب النفقة ۔ مطلب فى نفقة المطلّقة ......)
ومثله فى الهندية ؛ ج۱ ص۵۵۷ كتاب الطلاق، الفصل الثالث فى نفقة المعتدة۔

عدّتِ وفات میں عورت کا نان ونفقہ کس کے ذمہ ہے

سوال:۔ عدّتِ وفات میں جہاں بیوہ کو عدّت گذارنا لازم ہے اس کے اخراجات کی ادائیگی کس کے ذمہ ہے؟

الجواب:۔ منکوحہ کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوتے ہیں لیکن خاوند کی وفات سے باہمی تعلّق منقطع ہونے کی وجہ سے خاوند سے یہ ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے، چنانچہ ورثاء سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، عورت کو اپنے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے۔ تاہم جہاں کہیں عورت اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہو تو پھر عُصبہ (رشتہ داروں) پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

قال برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولا نفقة للمتوفّٰى عنها زوجها۔

(الهداية ج۲ ص۴۲۲ كتاب الطلاق۔ باب النفقة)

وقال ايضاً: والنفقة لكل ذي رحم محرم اذا كان صغيراً فقيراً او كانت امرأة بالغة فقيرة۔ (الهداية ج۲ ص۴۲۵ كتاب الطلاق۔ باب النفقة) [۱]

ایامِ عدّت میں عورت کا پنشن کیلئے جانا

سوال:۔ میرا شوہر فوت ہوگیا ہے اور مجھے ہر ماہ اپنی پنشن کے لیے اپنے متعلّقہ دفتر جانا پڑتا ہے جبکہ دفتر والے میرے بغیر کسی اور کو پنشن نہیں دیتے، غربت وافلاس کی یہ حالت ہے کہ اس کے بغیر گذارہ نہیں ہوتا، تو کیا میں دورانِ عدّت پنشن لینے کے لیے گھر سے باہر جاسکتی ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ عورت کے لیے دورانِ عدّت گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، مگر ضرورتِ شدیدہ کو شریعتِ مطہرہ نے مستثنٰی کیا ہے، اس لیے اگر آپ کا بغیر پنشن کے گذارہ نہیں ہوتا ہو تو آپ اس مجبوری کی وجہ سے پنشن لینے کے لیے جاسکتی ہیں

---

[۱] قال الحصكفيؒ: لا نفقة لاحد عشر وعد منها معتدة موت۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۶۰۳، باب النفقة، مطلب لا تجب على الاب نفقة زوجة ابنه الصغير)

ومثلُهٗ في الهندية ج۱ ص۵۵۸ كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النفقات وفيه ستة فصول، الفصل الثالث في نفقة المعتدة۔

مگر ضرورت پورا ہوتے ہی فوراً واپس آنا ضروری ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتعتدان ای معتدۃ طلاق وموت فی بیت وجبت فیہ ولا یخرجان منہ الا ان تخرج او یتھدم المنزل اوتخاف انھدامہ اوتلف مالہا اولا تجد کراء البیت ونحو ذلک من الضرورات فتخرج لأقرب موضع الیہ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۳ ص۵۳۶ فصل فی الحداد) [1]

دورانِ عدّت عورت کا ویزہ کے حصول کیلئے نکلنا

سوال:۔ اگر غریب الوطنی میں کسی عورت کا شوہر فوت ہوجائے اور دورانِ عدت عورت کو ویزہ لگوانے کی ضرورت پڑجائے اور عورت کے جائے بغیر ویزہ لگوانا ممکن نہ ہو تو کیا یہ عورت دورانِ عدّت ویزہ لگوانے کیلئے متعلّقہ دفتر جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: عدّت طلاق کی ہو یا وفات کی دونوں کے دوران عورت کا بلاضرورتِ شرعی کے گھر سے نکلنا جائز نہیں' البتہ اگر ضرورت اتنی شدید ہو کہ اُس کے جائے بغیر مسئلہ حل نہ ہوتا ہو تو اس مجبوری کی خاطر عورت گھر سے نکل سکتی ہے مگر رات کو گھر واپس آنا بہرحال ضروری ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت ویزہ کے لیے دورانِ عدّت جاسکتی ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وتعتدان ای معتدۃ طلاق وموت فی بیت وجبت فیہ ولا یخرجان منہ الا ان تخرج اویتھدم المنزل اوتخاف انھدامہ اوتلف مالہا اَوْ لا تجد کراء البیت ونحو ذلک من الضرورات فتخرج لأقرب موضع الیہ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۳ ص۵۳۶ فصل فی الحداد) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: فقالوا لا تخرج المعتدۃ عن طلاق اوموت الا لضرورۃ لأن المطلقۃ تخرج للضرورۃ بحسبہا لیلاً کان اونہاراً والمعتدۃ عن موت کذلک۔

(البحرالرائق ج۴ ص۱۵۳ فصل فی الحداد)

[2] ایضاً (حوالہ مذکورہ بالا)

دارالحرب میں نومسلم عورت کی عدت کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی غیرمسلم شادی شدہ عورت دارالحرب میں مسلمان ہوجائے تو کیا یہ عورت عدت گذار کر کسی مسلمان مرد سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کرسکتی ہے تو عدت گذارنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب:۔ جب کوئی غیرمسلم عورت دارالحرب میں مسلمان ہوجائے اور وہاں قاضی شرعی نہ ہو تو اولاً تین حیض عدت گذار کر پہلے شوہر سے آزاد ہوجائے گی اور پھر تین حیض عدت گذارنے کے بعد کسی مسلمان مرد سے اس کا نکاح صحیح اور درست ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو اسلم احدهما ثمه لم تبن حتی تحیض ثلاثاً او تمضی ثلاثة اشهر قبل اسلام الاٰخر۔ قال ابن عابدینؒ: وهل تجب العدة بعد مضی هٰذه المدة۔ (رد المحتار ج۲ ص۶۴۱ باب نکاح الکافر)[1]

عدتِ وفات کے دوران حج کے لیے جانا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں نے اپنے بھائی کے ساتھ حج کے لیے داخلہ کیا ہے اور منظوری بھی ہوچکی ہے کہ اس دوران میرے شوہر کا انتقال ہوگیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا میں اس حالت میں (عدت کے دوران) حج کی ادائیگی کے لیے جاسکتی ہوں؟

الجواب:۔ بیوہ عورت کا عدت کے دوران شرعاً بلاضرورتِ شدیدہ کے گھر سے نکلنا جائز نہیں، البتہ جہاں جان و مال یا کسی اندام کے تلف ہونے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کی وجہ سے نکلنا مرخص ہے۔ حج اگرچہ اسلامی فریضہ ہے مگر علی الفور نہیں، لہٰذا اگر داخلہ کرنے اور منظوری ہوجانے کے بعد رقم واپس مل سکتی ہو تو حج یا دیگر کسی بھی سفر کیلئے نکلنا جائز نہیں اور اگر رقم واپس ملنے کا امکان نہ ہو تو پھر مجبوراً سفرِ حج پر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: لا یخرج من بیتها الا ان

---

[1] قال العلامة المرغینانی رحمه الله: واذا اسلمت المرأة فی دار الحرب وزوجها کافر او اسلم الحربی وتحته مجوسیة لم یقع الفرقة علیها حتی تحیض ثلاث حیض ثم تبین من زوجها۔ (الهدایة ج۲ ص۳۴۲ باب نکاح اهل الشرک)

ومثله فی شرح الوقایة ج۲ ص۶۱ باب نکاح الرقیق والکافر۔

تخرج او ینهدم المنزل ...... وتخرج لا قرب موضع الیہ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۵۳۶ باب الحداد) [1]

حیض نہ آنے کی صورت میں مُطلّقہ کی عدّت کا حکم

سوال:۔ اگر کسی عورت کو شوہر طلاق دیدے اور کئی ماہ سے اس کو حیض بھی نہیں آرہا ہو جبکہ عورت کی عمر بھی تقریباً ۲۵، ۲۶ سال ہے، تو اس عورت کی عدّت کا کیا طریقہ ہوگا ؟ کیا یہ عورت حیض آنے تک انتظار کرے یا تین ماہ بعد دوسرا نکاح کرسکتی ہے ؟

الجواب:۔ حنفیہ کے نزدیک مطلّقہ کی عدتِ اصلی بالاحیاض ہے، عدّت بالاشہر آئیسہ کے اور صغیرہ کے ساتھ خاص ہے، اس لیے یہ عورت مُدّتِ ایاس تک انتظار کرے گی۔ مگر آج کل مجبوری کی وجہ سے متاخرین فقہاء نے امام مالکؒ کے قول "ایک سال تک انتظار کرکے دوسرا نکاح کرنے پر فتوٰی دیا ہے، تاہم اس قول پر عمل تب ہوگا جب علاج معالجہ کے بعد بھی حیض نہ آئے، اور یہ دُوسرا نکاح بھی باجازتِ قاضی و حاکم ہو۔

قال الشیخ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: حنفیہ کے نزدیک تو مُدّتِ ایاس تک انتظارِ حیض ضروری ہے اور مالکیہ کے نزدیک نو مہینے اور بقولِ معتمد ایک سال وقتِ طلاق سے عدّت ہے اور ضرورت کے وقت اس قول پر عمل جائز ہے۔ (امداد الفتاوٰی ج۲ ص۴۱۹ کتاب الطلاق، فصل فی العدۃ والرجعۃ) [2]

عدتِ طلاق کے دوران شوہر کا انتقال ہوجانا

سوال:۔ کسی عورت کو شوہر نے دُو طلاقیں دیں، عدّت کے دوران ہی

---

[1] قال الشیخ صدر الشریعۃ رحمہ اللہ: وتخرج معتدۃ الموت فی الملوین (ای اللیل والنھار) وتبیت فی منزلھا اذ لا نفقۃ لھا فتحتاج الی الخروج ...... وتعتد فی منزلھا وقت الفرقۃ والموت والطلاق الا ان تخرج او خافت تلف مالھا او الا نھدام ......
(شرح الوقایۃ ج۲ ص۱۵۳ باب العدۃ۔ کتاب النکاح)
ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۲۳ باب العدۃ۔ کتاب النکاح۔

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: سنۃ کاملۃ لممتدۃ الطھر التی لم یجئھا الحیض او جاءھا ثم انقطع ولم تبلغ سن الیاس۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۷ ص۶۴۱ الفصل الرابع فی العدۃ والاستبراد)

اس کا انتقال ہوگیا، تو اب یہ عورت کون سی عدت گذارے گی، عدتِ وفات یا عدتِ طلاق؟

الجواب: اس مسئلہ میں علماء اُمت کا اتفاق ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کی عدت کے دوران انتقال کر جائے کہ اس کی مطلقہ بیوی کی عدت، عدتِ طلاق سے عدتِ وفات میں تبدیل ہوجائے گی، لہٰذا یہ عورت، عدتِ طلاق کی بجائے عدتِ وفات (چار ماہ دس دن) گذارے گی بشرطیکہ شوہر نے طلاقِ رجعی دی ہو۔

قال الشیخ وهبة الزحیلی: اذا مات الرجل فی اثناء عدة زوجته التی طلقها طلاقاً رجعیًا انتقلت بالاجماع من عدتها بالاقراء او الاشهر الی عدة وفاة وهی اربعة اشهر وعشرة ایام سواء أكان الطلاق فی حال الصحة ام فی حال مرض الموت لان المطلقة رجعیًا تعد زوجة مادامت فی العدة وموت الزوج یوجب علی زوجته عدة الوفاة۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۶۴۶ الفصل الرابع فی العدة والاستبراء)[1]

حاملہ من الزنا عورت کی عدت

سوال: اگر کوئی عورت زنا کی مرتکب ہوا اور وہ اُس زنا سے حاملہ بھی ہو تو کیا ایسی عورت شادی کے لیے وضع حمل کا انتظار کرے گی یا نہیں؟ اور اگر حمل نہ ہو تو کیا اس عورت پر عدت ہے یا نہیں؟

الجواب: عدت کی مشروعیت ایک مقدس رشتے کے انقطاع کی صورت میں ہوتی ہے اس کے علاوہ کسی اور جگہ میں مشروعیت نہیں لہٰذا حاملہ من الزنا کیلئے کوئی عدت نہیں مگر شوہر جماع کرنے کے لیے ایک حیض تک انتظار کرے کہ کہیں حاملہ نہ ہو، اگر ہو تو وضع حمل تک جماع کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ولا تجب علی الحامل بالزنا لان الزنا لا یوجب العدة الا انه اذا تزوج امرأة وهی حامل من الزنا جاز النکاح عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ لا یجوز له ان یطأها مالم تضع لئلا یصیر ساقیًا ماءه زرع غیره۔ (بدائع الصنائع ج۳ ص۱۹۳ فصل واما عدة الحبل)[2]

---

[1] قال المرغینانیؒ: اما اذا کان رجعیًا فعلیها عدة الوفاة بالاجماع۔ (الهدایة ج۲ ص۴۰۲ باب العدة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۳ ص۲۰۲ فصل فی بیان انتقال العدة وتغیرها۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وقدمنا ان الحامل من الزنا لا عدة علیها عندهما ولذا صحّحا نکاحها لغیر الزانی وان حرما الوطء ولهذا الکلام فیما اذا تزوجت علی قول ابی حنیفة ومحمد وهی حامل من الزنا ثم طلقها او مات عنها فانها تعتد بوضع الحمل۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۴۳ باب العدة) ـــــ وَمِثْلُهٗ فی امداد الاحکام ج۲ ص۸۲۶ باب العدة۔

عدّتِ وفات شوہر کے گھر گذارنا لازمی ہے

سوال:۔ اگر کوئی عورت گھریلو ناچاقی کی وجہ سے میکے (والدین کے گھر) چلی جائے اور وہاں وہ کئی سالوں تک ناراض بیٹھی رہے کہ اچانک اس کا شوہر فوت ہوجائے تو اب یہ عورت عدّتِ وفات کہاں گذارے گی؟ والدین کے گھر میں یا شوہر کے گھر میں؟

الجواب:۔ عدّتِ وفات ایک قسم کا سوگ ہے جو کہ شرعاً شوہر کے گھر میں گذارنا لازمی ہے، شوہر کا گھر عورت کا اپنا گھر ہے، میکے میں جانا اس کا اتفاقی حادثہ ہے لہٰذا یہ عورت عدتِ وفات شوہر کے گھر گذارے گی، تاہم اگر اس کا شوہر کے گھر رہنا باعثِ فتنہ وفساد ہو تو پھر اس مجبوری کی خاطر والدین کے گھر میں بھی عدتِ وفات گذارنا مرخص ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: تعتد فى المنزل يضاف اليها بالسكنى حال وقوع الفرقة والموت ولهذا لو زارت اهلها وطلقها زوجها كان عليها ان تعود الى منزلها فتعتد فيه۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج۴ ص۱۶۶ باب العدة) ؎

عدّتِ وفات کے دوران عورت کا بیماری کی وجہ سے والدین کے گھر جانا

سوال:۔ اگر کوئی عورت عدّتِ وفات کے دوران بیمار ہوجائے اور شوہر کے گھر میں اس کی تیمارداری کے لیے کوئی نہ ہو تو کیا اس مجبوری کی وجہ سے اُس کے والدین علاج معالجہ کے لیے اُسے اپنے گھر لاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ عدّتِ وفات کے دوران اگرچہ عورت کے لیے شرعاً شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہیں مگر اس میں ضروریات مستثنیٰ ہیں، انہی ضروریات میں بیماری بھی داخل ہے، اس لیے اس مجبوری کی وجہ سے بیوہ عورت کے والدین کا اسے علاج کی غرض سے اپنے گھر لانا جائز ہے۔

؎ وفى الهندية: على المعتدة ان تعتد فى المنزل الذى يضاف اليها بالسكنى حال وقوع الفرقة والموت.... ولو كانت زائرة اهلها او كانت فى غير بيتها لامر حين وقوع الطلاق انتقلت الى بيت سكناها بلا تاخير۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۵۳۵ فصل فى الحداد)
وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج۴ ص۱۵۴ فصل فى الحداد۔

قال العلامة الحصكفیؒ :۔ وتعتدان فی بیت وجبت فیہ الا ان تخرج اویتھدم المنزل او تخاف انھدامہ او تلف مالھا او لا تجد کراء البیت ونحو ذلک من الضرورة۔

(الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۳ ص۵۳۶ باب الحداد) [1]

ہر بیوی کے لیے عدتِ وفات اپنے اپنے گھر میں گذارنا لازمی ہے

سوال :۔ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور ہر ایک کا مکان الگ الگ ہو اور شوہر کسی ایک بیوی کے مکان میں وفات پاجائے تو دوسری بیوی عدتِ وفات کہاں گذارے؟

الجواب :۔ عورت جس گھر میں رہتی ہو وہ اسی گھر میں ہی عدتِ وفات و طلاق گذارے، حتیٰ کہ اگر یہ عورت اپنی سوکن کے ہاں اظہارِ تعزیت کے لیے گئی ہو تو واپس آکر عدت کے ایام اپنے ہی گھر میں گذارے۔

قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ : طلقت اومات وھی زائرة فی غیر مسکنھا عادت الیہ فورًا لوجوبہ علیھا وتعتدان ای معتدة طلاق وموت فی بیتٍ وجبت فیہ ولا یخرجان منہ الا ان تخرج۔

(الدّر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۳ ص۵۳۶ باب العدة فصل فی الحداد) [2]

---

[1] قال العلّامۃ ابن نجیمؒ : (تحت قولہ وتعتدان فی بیت وجبت فیہ الا ان تخرج او یتھدم) ای معتدة الطلاق والموت تعتدان فی المنزل المضافات الیھما بالسکنیٰ وقت الطلاق والموت ولا یخرجان منہ الا لضرورة لما تلونا من الاٰیة ۔

(البحر الرائق ج۴ ص۱۵۴ فصل فی الحداد)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوی ج۲ ص۴۸۷ کتاب الطلاق ، باب العدة ۔

[2] قال فی الھندیة : علی المعتدة ان تعتد فی المنزل الذی یضاف الیھا بالسکنیٰ حال وقوع الفرقة والموت کذا فی الکافی : لوکانت زائرة اھلیھا اوکانت فی غیر بیتھا لامرحین وقوع الطلاق انتقلت الی بیت سکناھا بلا تاخیر۔

(الفتاوی الھندیة ج۱ ص۵۳۵ الباب الرابع عشر فی الحداد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۱۵۴ فصل فی الاحداد ۔

حیض والی عورت کی عدّت حیض سے ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو حالتِ رضاعت میں طلاق دی ہے جبکہ اس عورت کو رضاعت کی وجہ سے دو یا اس سے زائد ماہ تک حیض منقطع ہوتا ہے، اب اس عورت کے لیے عدّت کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا تین ماہ عدّت گزار کر نکاحِ ثانی کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جن مستورات کو حیض تو آتا ہو مگر کسی عارضی وجہ سے بند ہو تو ان کی عدّت بالاحیاض ہے اگرچہ تین چار سالوں میں پوری ہو جائے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں رضاعت کی وجہ سے حیض عارضی طور پر بند ہے اس لیے اس عورت کو تین حیض آنے تک انتظار کرنا پڑے گا یہی اس کی شرعی عدّت ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وھی فی حق حرۃ ولو کتابیۃ تحت مسلم تحیض لطلاق ولو رجعیا او فسخ بجمیع اسبابه بعد الدخول حقیقة او حکما... ثلاث حیض کوامل الخ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۵۰۴ باب العدۃ)[1]

شوہر مرزائی یا عیسائی ہو جائے تو عورت پر عدّت واجب ہے

سوال:- اگر کسی عورت کا شوہر عیسائی، قادیانی یا یہودی ہو جائے جس کی وجہ سے اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، کیا ایسی عورت پر عدّت واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:- شریعتِ اسلامی میں ہر اس جدائی پر عدّت واجب ہے جو میاں بیوی کے مابین کسی وجہ سے آجائے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ خاوند کے بوجہ غیر مسلم ہو جانے کے دونوں کے درمیان جدائی خود بخود آگئی لہٰذا اس عورت پر عدت لازمی ہے۔

قال فی الهندیة: وان اخبرت المرأۃ ان زوجها قد ارتد لها ان تتزوج بآخر بعد انقضاء العدۃ فی روایۃ الاستحسان وفی روایۃ السیر

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وھی حرۃ ممن تحیض فعدتها ثلاثة اقراء، لقوله تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ۔ (الهدایة ج۲ ص۴۱۱ باب العدۃ)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج۲ ص۱۴۴ باب العدۃ۔

لیس لہا ان تتزوج قال شمس الائمۃ السرخسیؒ الاصح روایۃ الاستحسان ۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص۳۳۴ الباب النکاح الکافر) ؎۱

خلوتِ صحیحہ کے بعد عدتِ طلاق کا حکم

سوال:۔ والدین نے ایک جگہ اپنے بیٹے کی شادی کر دی مگر بیٹا وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے قابل نہ تھا صرف ایک رات بیوی کے پاس چلا گیا اور بغیر جماع کیے صبح باہر آکر گواہوں کے سامنے منکوحہ کو طلاق دے دی، کیا اس عورت پر عدت واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خلوتِ صحیحہ (یعنی شوہر اور بیوی کا ایک کمرہ میں بلا کسی رکاوٹ وممانعت کے ایک دوسرے کے ساتھ ملنا) ایک قسم کا جماع ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس مطلقہ کے ذمے عدّتِ طلاق گذارنا لازمی ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: والخلوۃ بلا مانع حسی وشرعی کالوطئ ولو کان الزوج مجبوباً او عنیناً او خصیاً او خنثیٰ ان اظہر حالہ فی ثبوت النسب وتاکد المہر والنفقۃ والسکنی والعدّۃ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۱۱۴ مطلب احکام الخلوۃ) ؎۲

شادی شدہ حاملہ من الزّنا کی عدّت

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو اس بات پر طلاق دے کہ وہ بدکردار ہے جبکہ یہ عورت زنا سے حاملہ بھی ہو تو اب یہ عورت تین حیض عدّت گذارے گی یا وضعِ حمل تک انتظار کرے گی؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی نے عدت کی دو قسمیں مقرر کی ہیں (۱) جو عورت حاملہ نہ ہو

؎۱ قال العلّامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ۔ ثمّ ان کان الزوج ہو المرتد فلہا کل المہر ان دخل بہا ونصف المہر ان لم یدخل بہا۔
(الہدایۃ ج ۲ ص۳۴۳ فی فصل نکاح اہل الشرک)
وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص۶۲ فی باب نکاح اہل الرقیق۔

؎۲ قال فخر الدین قاضیخانؒ: المہر یتاکد بثلاث بالوطء وموت احد الزوجین وبالخلوۃ الصحیحۃ والخلوۃ الصحیحۃ ان یجتمعا فی مکان لیس ہناک مانع یمنعہ عن الوطی حساً او شرعاً او طبعاً۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیۃ ج ۱ ص۳۹۶ فصل فی الخلوۃ وتاکد المہر)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۱ ص۳۰۴ الفصل الثانی فیما یتاکد بہ المہر والمتعۃ۔

تو اس کی عدت بالاقرار ہے۔ (۲) جو عورت حاملہ ہو (اس بات سے قطع نظر کہ یہ حمل شوہر سے ہے یا کسی غیر سے) تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ عورت وضع حمل تک انتظار کرے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: والحامل مطلقاً ولو امة او کتابیة اومن زنا تعتد بالوضع۔

قال ابن عابدینؒ: اذا حبلت المعتدة وولدت تنقضی به العدة سواء کان من المطلق اومن زنا۔ (ردالمحتار ج۶ ص۲۰۶ باب العدة) [1]

عدتِ وفات میں جوؤں کی تلفی کیلئے شیمپو استعمال کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے شوہر کی وفات کو تقریباً دو ماہ ہو گئے ہیں اور مجھے سر میں جوؤں کی سخت شکایت ہے، کیا از روئے شرع جوؤں کی تلفی کے لیے ملنے والا شیمپو استعمال کر سکتی ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ عدتِ وفات کے دوران معتدہ کے لیے ترتیب وزینت کرنا جائز نہیں مگر بعض حالات ضرورت کی وجہ سے مستثنیٰ ہیں جن میں ایک بیماری بھی ہے، اس لیے آپ جوؤں کو ختم کرنے کے لیے ایسی ادویات استعمال کر سکتی ہیں جن میں خوشبو نہ ہو، چونکہ جوؤں کی تلفی کے لیے ملنے والے شیمپو میں خوشبو ہوتی ہے اس لیے اس کا استعمال شرعاً جائز نہیں، تاہم اگر کوئی ایسا شیمپو ہو جو بغیر خوشبو کے ہو تو اس کا استعمال مرخص ہے۔

قال الحصکفیؒ: والدهن ولو بلا طیب کزیت خالص ....الا بعذر راجع للجمیع اذ الضرورات تبیح المحظورات۔ قال ابن عابدینؒ: اوتشتکی رأسها فتدهن وتمشط بالاسنان الغلیظة المتباعدة من غیر ارادة الزینة لان هذا تداو لا زینة۔ (ردالمحتار ج۲ ص۲۶۱ فصل فی الحداد) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قوله وللحامل وضعه ای عدة الحامل وضع الحمل لقوله تعالیٰ: واولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن اطلقها فشمل الحرة والامة المسلمة والکتابیة مطلقة او متارکة فی النکاح الفاسد او وطی بشبهة والمتوفی عنها زوجها لاطلاق الآیة۔ (البحرالرائق ج۴ ص۱۳۳ باب العدة)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الاحکام ج۲ ص۸۲۱ باب العدة۔

[2] قال ابن نجیمؒ: قوله الا بعذر متعلق بالجمیع لا بالدهن وحده فلها یس لحریر للحکة والقمل ولها الاکتحال للضرورة۔ (البحرالرائق ج۴ ص۱۵۰ فصل فی الاحداد)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج۲ ص۵۱۱ باب العدة والحداد۔

عدتِ وفات میں چوڑیاں پہننا | سوال:- کیا وہ عورت جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو وہ چوڑیاں پہن سکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر چوڑیاں پہلے سے اس کے ہاتھوں میں ہوں تو ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- جس عورت کا شوہر فوت ہو گیا ہو اُس کے لیے چار ماہ دس دن زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کرنا حرام ہے، اس قسم کے جملہ امور کو ترک کرنا ضروری ہے، چونکہ چوڑیاں پہننا بھی زینت ہی کی ایک قسم ہے اسلئے عدتِ وفات میں ان کو پہننا جائز نہیں اور اگر پہلے سے ہاتھوں میں ہوں تو اُن کا اُتارنا لازمی ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: بترك الزينة بحلى - قال ابن عابدينؒ: اى بجميع انواعه من فضة وذهب وجواهر بحر - قال القهستانيؒ: والزينة ماتتزين به المرأة من حلى او كحل - (رد المحتار ج۲ ص۶۱۷ فصل فى الحداد) [۱]

دیور کے خوف سے شوہر کا گھر چھوڑنے کا حکم | سوال:- اگر کوئی معتدۃ الوفات اور اس کا نوجوان دیور دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوں اور وہ کئی بار اس کی عصمت دری کی کوشش کر چکا ہو تو کیا یہ معتدہ شوہر کا گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- اپنی عصمت کی حفاظت کرنا ہر مسلمان عورت پر فرض ہے، اگر کسی جگہ معتدہ کو اپنی عصمت دری کا خوف ہو تو وہ اپنی عزت بچانے کیلئے مجبوراً شوہر کا گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے ہاں جا سکتی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر معتدہ کیلئے دیور سے بچنے کا کوئی طریقہ ممکن نہ ہو تو اس کا اپنے والدین کے گھر جانا مرخص ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: والافضل ان يحال بينهما فى البيتوتة بستر الا ان يكون فاسقاً فيحال بامرأة ثقة وان تعذر فلتخرج هى خروجه - (رد المحتار ج۲ ص۶۷۵ باب العدة)

---

[۱] قال العلامه ابن نجيم المصرى رحمه الله: وشمل لبس الحرير بجميع انواعه والوانه ولو اسود وجميع انواع الحلى من ذهب وفضة وجواهر زاد فى التتارخانية القصب -
(البحر الرائق ج۴ ص۱۵۱ فصل فى الاحداد -
ومثله فى امداد الفتاوى ج۲ ص۵۱۲ كتاب الطلاق -

باب الحلالة

(حلالہ کے احکام ومسائل)

حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال: مطلقہ مغلظہ سے دوبارہ صحبت کے لیے حلالہ کا سہارا لیا جاتا ہے، شریعت مطہرہ کی رو سے یہ کہاں تک جائز ہے۔

الجواب: طلاق ثلاثہ پر اقدام کرنا کسی ناقابلِ مصالحت حالات کی نشاندہی کرتا ہے اس لیے شریعت نے ایسے خطرناک اقدام پر میاں بیوی کے لیے آپس میں دوبارہ جمع ہونے کی تمام راہیں مسدود رکھیں اِلّا یہ کہ وہ عورت کسی دوسرے خاوند سے جدا ہو کر اپنے رویہ پر نظرثانی کرکے سابقہ خاوند کے ساتھ رہنے پر راضی ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔ (البقرہ آیت ۔۔) ایسے حالات میں میاں وبیوی سے حلالہ پر اقدام کرنا مقصود نہیں اور نہ شریعت اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لعن اللہ المحلل والمحلل لہٗ۔

تاہم کسی دوسری جگہ نکاح کرنے سے عورت خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے اس لئے اندریں حالت اگر کوئی راہ تلاش کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں، ایسی حالت میں حلالہ کے بعد میاں بیوی دوبارہ نکاح کرکے نئی زندگی اختیار کرسکتے ہیں تاہم اس میں صرف نکاح کافی نہیں جب تک دوسرا خاوند بیوی سے ہمبستری نہ کرے۔

لماروی انہٗ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: لاتحل للاول حتی تذوق عسیلۃ الآخر یذوق عسیلتھا۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۳۲۲ کتاب الطلاق، باب المبتوتۃ لایرجع الیھا زوجھا...الخ)[1]

---

[1] قال المرغینانیؒ: وان کان الطلاق ثلاثًا فی الحرۃ او ثنتین فی الامۃ لم تحل لہٗ حتی تنکح زوجًا غیرہ نکاحًا صحیحًا ویدخل بہا ثم یطلقھا او یموت عنھا۔
(الھدایۃ ج ۲ ص۳۶۹ باب الرجعۃ، کتاب الطلاق)

ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۳ ص۴۰۹ باب الرجعۃ، مطلب فی العقد علی المبانۃ۔

حلالہ کے نکاح میں وطی کے بغیر عورت شوہرِ اوّل کیلئے حلال نہیں ہوسکتی

سوال:۔ اگر مطلقہ عورت کسی مرد کے ساتھ نکاح کرے مگر وطی سے قبل اس کی وفات ہوجائے تو کیا یہ عورت شوہرِ اوّل کے ساتھ تجدیدِ نکاح کرکے اس کے لیے حلال ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب: حنفیہ کے نزدیک حلالہ کے نکاح میں وطی کرنا ضروری ہے بغیر وطی کے یہ عورت شوہرِ اول کے لیے حلال نہ ہوگی، چونکہ موت قائم مقام وطی نہیں اس لیے شوہرِ ثانی کی وفات سے عورت شوہرِ اول کے لیے حلال نہیں ہوسکتی ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : لو مات عنها قبل الوطئ لا یحلها للاوّل ..... لان الشرط هنا الوطء ۔ (رد المحتار جلد ۲ ص۵۳۹ کتاب الطلاق ۔ باب الرجعۃ) [1]

حلالہ کے نکاح میں جماع کے لیے کنڈوم (ساتھی) استعمال کرنا

سوال:۔ اگر حلالہ کے نکاح میں وطی کے دوران کنڈوم استعمال کیا جائے اور اس کے ساتھ مباشرت ہو تو کیا اس طریقے سے عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی یا نہیں ؟

الجواب:۔ حلالہ کے نکاح میں مشتہی مرد کا ادخالِ ذکر ضروری ہے تاکہ دونوں کو کچھ لذت حاصل ہو انزال کرنا ضروری نہیں، لہٰذا اگر کنڈوم کے ساتھ وہی لذت حاصل ہوتی ہو تو یہ وطی (جماع) پہلے شوہر کے لیے محلل بن سکتی ہے ورنہ نہیں ۔

وفی الهندیۃ : اذا لف ذکرہ بخرقۃ وادخل فرجها فان وجد الحرارۃ تحل والا فلا ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج۱ ص۴۷۳ الباب السادس فی الرجعۃ ، فصل فیما تحل بہ) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : والموت لا یقوم مقام الدخول فی حق التحلیل ۔ (البحر الرائق ج۴ ص۵۶ کتاب الطلاق)

[2] قال العلامۃ طاهر بن عبد الرشید الانصاری رحمہ اللہ : اذا لف ذَکَرَہ بخرقۃ وادخل فرجها فان وجد الحرارۃ تحل والا فلا ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۲ ص۱۲۱ الجنس الثانی فی المحلل)

حلالہ کے نکاح میں بوقتِ جماع انزال کرنے یا نہ کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص مثلاً زید نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہے، اب وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کے لیے حلالہ شرعی کروانا چاہتا ہے، تو جس شخص سے وہ حلالہ کرواتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جماع کرتے وقت انزال کرے یا بغیر انزال کے بھی حلالہ ہو جائے گا کیونکہ وہ شخص حمل سے ڈرتا ہے ؟ لہٰذا اس بارے میں شرعی حکم کی وضاحت فرمائی جائے ؟

الجواب :- حلالہ شرعی میں ایلاج (دخول حشفہ) ضروری ہے اور وہ بھی منتشر حالت میں ہو تاکہ محلل کو کچھ لذت بھی حاصل ہو جائے، البتہ انزال ضروری نہیں، جس شخص سے بھی حلالہ کرایا جائے اور وہ جماع کرتے وقت نفس دخول حشفہ کر کے بغیر انزال کے جماع ختم کردے اور عورت کو طلاق دے دے تو اب یہ عورت عدتِ طلاق گذارنے کے بعد پہلے خاوند کے لیے حلال ہوگی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وان لم ینزل لان الشرط الزوق لا الشبع قلتُ وفی المجتبیٰ الصواب حلها بدخول الحشفة مطلقاً - (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد۲ ص۵۴۱ کتاب الطلاق - باب الرجعة) [1]

نابالغ سے حلالہ کرانے کا شرعی حکم

سوال :- ایک نابالغ لڑکا جس کی عمر ابھی ۱۳، ۱۴ سال ہے لیکن وہ جماع کرنے پر قادر ہے تو کیا اس کے حلالہ سے عورت شوہر اول کے لیے حلال ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- حلالہ کے لیے محلل (حلالہ کرنے والے) کا بالغ ہونا ضروری نہیں صرف جماع کرنے پر قادر ہونا ضروری ہے، اس لیے فقہاء کرام نے مراہق (قریب البلوغ لڑکے) کو جو جماع کرنے پر قادر ہو بالغ کے حکم میں داخل کیا ہے - لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر یہ نابالغ جماع پر قادر ہے تو اس کا حلالہ کرنا صحیح ہے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : وسواء کان الزوج الثانی بالغاً او

---

[1] وفی الهندیة :- اما الانزال فلیس بشرط للاحلال -
(الفتاوی الهندیة جلد ۱ ص۴۷۳ کتاب الطلاق فصل فیما تحل به المطلقة)

صبیاً یجامع فجامعها او مجنوناً فجامعها لقوله تعالیٰ: حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجاً غَیْرَہٗ۔ من غیر فصل بین زوج و زوج ولانه الصبیّ والمجنون یتعلق به احکام النکاح من المهر والتحریم کوطی البالغ العاقل۔
(بدائع الصنائع ج۳ ص۱۸۹ فصل فی ان یکون النکاح الثانی صحیحاً)[1]

دُبر میں جماع کرنے سے حلالہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص حلالہ کے نکاح میں بیوی کے ساتھ قوم لوط والا عمل کرے (یعنی دُبر میں جماع کرے) تو کیا اس سے یہ عورت زوجِ اوّل کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ حلالہ شرعی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جماع فی القُبل ہو، دُبر میں جماع کرنا حلالہ کے لیے کافی نہیں، اور ویسے بھی یہ عمل کبیرہ گناہ ہے۔

کما فی الفتاوی القنیة: اذا اتاها فی دبرها لا تحل للاوّل۔
(الفتاوی القنیة ص۳۲ کتاب الطلاق۔ باب الرجعة)

موت قائم مقام وطی نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک عورت نے زوجِ ثانی سے نکاح کیا جبکہ زوجِ اوّل اس کو طلاقِ مغلظہ دے چکا تھا، نکاح کے بعد زوجِ ثانی حقوقِ زوجیت ادا کئے بغیر فوت ہوگیا ہے، اب یہ عورت زوجِ اوّل سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو کیا اسے یہ حق حاصل ہے اور یہ نکاح صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حلالہ کے نکاح میں شوہرِ ثانی کا اپنی منکوحہ سے جماع کرنا ضروری ہے صورتِ مسئولہ کے مطابق بدون جماع کئے موت وطی کا قائم مقام نہیں بن سکتی اسلئے یہ عورت زوجِ اوّل کے لیے حلال نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: والموت لا یقوم مقام الدخول

---

[1] وفی الهندیة: وفی الانفع الصبی المراهق فی التحلیل کالبالغ ...... فسر المراهق فی الجامع الصغیر فقال غلام لم یبلغ ومثله یجامع جامع امرأته وجب الغسل علیها واحلها علی الزوج الاوّل ومعنی هذا الکلام ان تتحرک آلته ویشتهی۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۷۳)
ومثله فی مجموعة الفتاوی دفارسی) ج۲ ص۱۲ کتاب الطلاق)

فی حق التحلیل۔ (البحر الرائق ج ۴ ص۵۶ کتاب الطلاق۔ باب الرجعۃ) [1]

عورت کا قول کہ میں حلالہ کر چکی ہوں....

سوال:۔ طلاق ثلاثہ کے بعد ایک عورت اپنے میکے چلی گئی اور ایک سال کے بعد پہلے شوہر کو پیغام دیا کہ میں حلالہ کر چکی ہوں لہٰذا میں آپ سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہوں، تو کیا عورت کے اس طرح کہنے سے زوجِ اوّل کے لیے اس سے دوبارہ نکاح کرنا صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ عورت کا صرف یہ کہنا کہ میں حلالہ کر چکی ہوں زوجِ اوّل سے دوبارہ نکاح کی حلت کے لیے کافی نہیں، بلکہ زوجِ اوّل کو چاہیئے کہ عورت کی بات کی خوب تحقیق کرے اور اُس سے جملہ کیفیات اور حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرے، اگر وہ صحیح معلومات مہیا کرے اور وہ حلالہ کے لیے کارآمد بھی ہوں تو پھر اس صورت میں دوبارہ اس عورت سے نکاح کرنا صحیح ہوگا ورنہ نہیں۔

لما فی القنیۃ ، لو قالت حللت لك او قال حلا له کردم لایحل له التزوّج مالم یستفسرها لاختلاف الناس فی کیفیّۃ التحلیل وهو الصواب ۔

(القنیۃ ص۸۴ کتاب الطلاق۔ باب الرجعۃ)

حلالہ کے نکاح میں دُوسرے خاوند سے ہمبستری ضروری ہے

سوال:۔ کیا حلالہ کیلئے کی گئی شادی میں دُوسرے شوہر سے ہمبستری کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟ اگر ہمبستری نہ کی جائے تو کیا عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی یا نہیں ؟

الجواب:۔ حلالہ کی شادی میں دوسرے شوہر سے ہمبستری کرنا شرط ہے، بغیر ہمبستری کے یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہو گی۔

هکذا فی الهدایۃ ج ۲ ص۹۴ فصل فیما تحل به المطلقۃ۔ کتاب الطلاق۔

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولو مات عنها قبل الوطء لا یحلّها للاوّل ..... لان الشرط هنا الوطء ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۵۳۹ کتاب الطلاق۔ باب الرجعۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج ۱ ص۴۷۳ کتاب الطلاق۔ فصل فیما یتعلق به المطلقۃ ۔

باب ثبوت النّسب

(ثبوتِ نسب کے مسائل واحکام)

قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے کے ثابت النسب ہونے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کے ہاں شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو وہ ثابت النسب شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شادی کے چھ ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد پیدا ہونے والا بچہ ثابت النسب شمار ہوگا البتہ چھ ماہ سے کم مدت میں پیدا ہونے والا بچہ ثابت النسب شمار نہیں ہوگا۔

قال فی الهندیة : واذا تزوّج الرجل فجاءت بالولد لأقل من ستة اشهر منذ تزوّجها لم یثبت نسبه وإن جاءت به لستة أشهر فصاعدا یثبت نسبه اعترف به الزوج أو سکت۔ (الفتاویٰ الہندیہ ج ۱ ص۵۳۶ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب) [1]

مانع حمل ادویات کے استعمال کا حکم

سوال:۔ مانع حمل ادویات کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کن حالات اور صورتوں میں ایسی ادویات استعمال کی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ نکاح سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے اس لیے مانع حمل ادویات وآلات کا استعمال بعض جزئی صورتوں کے علاوہ شرعاً جائز نہیں اور خصوصاً رزق ووسائلِ معاش کے خوف کی وجہ سے تحدیدِ نسل اسلامی احکامات سے متصادم ہے، تاہم اگر بعض حالات میں عورت کو حمل کی وجہ سے بیماری یا غیر فطری طریقہ ولادت (آپریشن وغیرہ) کی ضرورت پڑتی ہو یا اس کے مثل دیگر ضروریاتِ شدیدہ کی صورت میں مانع حمل ادویات وآلات کا استعمال جائز ہے، یہاں تک کہ

---

[1] قال الحصکفیؒ : اکثر مدة الحمل سنتان لخبر عائشة رضی الله عنها کما مر وعند الائمة الثلاثة اربع سنین واقلها ستة اشهر اجماعًا۔ (رد المحتار ج ۳ ص۵۴۰ فصل فی ثبوت النسب)
ومثله فی البحر الرائق ج ۴ ص۱۵۷ باب النسب۔

بعض مہلک بیماریوں کی صورت میں انقطاعِ رحم بھی مرخص ہے۔

وفی الفتاوی الاسلامیۃ ...: تحدید النسل محرم مطلقاً لما جاء فی الشریعۃ الغراء من النہی عن التبتل والتشدید فی ذٰلک والترغیب فی التزوج بالولود الودود فیکون حبوب منع الحمل محرماً إلا فی حالات فردیۃ نادرۃ لاعموم لھا کما فی حالۃ التی تدعو الحامل إلی ولادۃ غیر عادیۃ ویضطر معھا إلی إجراء عملیۃ جراحیۃ لإخراج الولد وفی حالۃ ما إذا کان علی المرأۃ خطر من الحمل لمرض ونحوہ وھذا لاینطبق علی حالۃ المرأۃ۔ (الفتاوی الاسلامیۃ لکبار العلماء بالعربیۃ السعودیۃ ج۲ ص۳۷۶) [1]

اسقاطِ حمل کے جواز کا حکم

سوال: وہ کون سے اعذار و وجوہات ہیں جن کی بناء پر اسقاطِ حمل جائز ہوجاتا ہے؟

الجواب: حمل کے چار مہینے پورے ہونے سے پہلے پہلے بعض اعذار معتبر فی الشرع کے ہوتے ہوئے اسقاطِ حمل جائز ہے اور اعذار نہ ہونے کے وقت جائز نہیں، اعذار معتبرہ جیسے ظہورِ حمل کے بعد دودھ منقطع ہوجائے اور خاوند دائیہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو یا عورت پر شدید بیماری کا غلبہ ہو یا غیر عادی طریقہ ولادت پیش آتا ہو، تاہم بعض اشد صورتوں میں جن میں ہلاکت یقینی ہو تو پھر چار ماہ کے بعد بھی اسقاطِ حمل کی گنجائش ہے۔

قال فی الھندیۃ: إمرأۃ مرضعۃ ظھر بھا حبل وانقطع لبنھا وتخاف علی ولدھا الھلاک ولیس لأبی ھذا الولد سعۃ حتی یستأجر الظئر یباح لھا ان تعالج فی استنزال الدم مادام نطفۃ أو مضغۃ أو علقۃ لم یخلق لہ عضو۔ (الفتاوی الہندیہ ج۵ ص۳۵۶ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات) [2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ: ویکرہ أن تسعی لإسقاط حملھا وجاز لعذر کالمرضعۃ اذا ظھر بھا الحبل وانقطع لبنھا ولیس لأبی الصبی مایستأجر بہ الظئر ویخاف ھلاک الولد قالوا یباح لھا ان تعالج فی استنزال الدم ما دام الحمل مضغۃ أو علقۃ ولم یخلق عضو وقدروا تلک المدۃ بمائۃ و عشرین یوماً وجاز لأنہ لیس بآدمی وفیہ صیانۃ الآدمی۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۰۵ کتاب الکراھیۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۶ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات۔

[2] ایضاً (حوالۂ مذکورہ بالا)

ومثلہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۷ ص۱۰۸ کتاب النکاح۔ الاسقاط۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت

سوال: آجکل ایک خاص انجکشن کے ذریعے مادۂ منویہ عورت کے رحم میں پہنچایا جاتا ہے جس سے پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، اولاد کے حصول کیلئے اس طریقہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: سوال میں ذکر شدہ طریقہ جسے ٹیسٹ ٹیوب بے بی یا تلقیح صناعی بھی کہتے ہیں مفاسد کثیرہ پر مشتمل ہونے اور فحاشی و بے دینی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے باتفاق علماء جائز نہیں، تاہم اگر کسی میاں بیوی کے ہاں اولاد پیدا نہ ہوتی ہو اور دونوں میں اولاد کیلئے مطلوبہ صلاحیت موجود ہو لیکن خاوند کسی وجہ سے اپنا مادۂ منویہ بیوی کے رحم میں پہنچانے پر قادر نہ ہو یا عورت کے رحم میں امساک و استقرار کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے بچے کی پیدائش ممکن نہ ہو تو اس صورت میں مصنوعی نسل کشی کا یہ طریقہ جائز رہے گا بشرطیکہ مادۂ منویہ عورت کے اپنے خاوند کا ہی ہو، دونوں کی رضامندی ہو اور دونوں کے سامنے یہ عمل قرار پا رہا ہو اور مستند مسلمان ڈاکٹر یہ طریقہ تجویز کرے۔

قال فی یسئلونك فی الدین والحیاة: وقد قرر الفقهاء أن حمل المرأة بهذه الطریقة الصناعیة یعد جریمة خلقیة واجتماعیة وجنایة شرعیة..... بل هناك من الفقهاء من قرر أن هذه العملیة فی معنی الزنی وتستوجب التعزیر والتأدیب ولولا صورة الجریمة فیها مستورة بعض الشیٔ لکان حکمها الجلد الذی شرعه الله للزانی أما اذا کانت هناك إمرأة متزوجة برجل وهی صالحة للإنجاب وهو کذلك صالح للإنجاب ولکن هذا الزوج لا یستطیع بسبب ما أن یدخل مادته التناسلیة وتحقق فی رحم زوجته هو ورأی الطب المستقیم أن هذا هو الطریق الوحید والأیسر للحمل فلا مانع شرعاً من ذلك..... وهذه الحالة تکون نظرة الشریعة الی التلقیح الصناعی بین الزوجین تنطبق بها الی علاج الأمراض والعلل ونظرتها الی استبقاء العترة الزوجیة الطیبة بین هذین الزوجین - (یسئلونك فی الدین والحیاة ج ۱ ص۲۵۲) [۱]

---

[۱] وقال الشیخ الوهبة الزحیلی: التلقیح الصناعی هو استدخال المنی لرحم المرأة بدون الجماع فإن کان بماء الرجل لزوجته جاز شرعاً إذ لا محذور فیه..... وأما ان کان بماء رجل اجنبی عن المرأة لا زواج بینهما فهو حرام لأنه بمعنی الزنا الذی هو إلقاء ماء رجل فی رحم إمرأة لیس بینهما رابطة زوجیة ویعد هذا العمل أیضاً منافیاً للمستوی الإنسانی ومضارعاً للتلقیح فی دائرة النباتات والحیوان - (الفقه الاسلامی وأدلته ج ۳ ص۵۵۹ المبحث الرابع - التلقیح الصناعی)

جماع کے وقت کنڈوم (ساتھی) کا استعمال کرنا

سوال:۔ کیا شادی شدہ آدمی کیلئے بوقتِ جماع کنڈوم (ساتھی) استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کنڈوم (ساتھی) کا حکم عزل کی طرح ہے اس لیے فی نفسہٖ جماع کے وقت کنڈوم کا استعمال مباح ہے مگر بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے بدون بیوی کی اجازت کے مکروہ ہے، تاہم اگر کوئی شرعی عذر ہو تو بلا اجازت عزل کرتے یا کنڈوم استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویعزل عن الحرة باذنها لکن فی الخانیة انه یباح فی زماننا لفساده قال الکمال فلیعتبر عذرًا مسقطاً لاذنها۔
(الدر المختار علی هامش ردّ المختار ج۲ ص۴۱۲ باب نکاح الرقیق) ؎۱

عزل کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک شادی شدہ آدمی کے لیے عزل کرنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ عزل کرنا اگرچہ شرعاً جائز ہے مگر اس میں آزاد عورت (بیوی) سے اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اجازت کے عزل کرنا مکروہ ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویعزل عن الحرة باذنها لکن فی الخانیة انه یباح فی زماننا لفساده قال الکمال فلیعتبر عذرًا مسقطاً لاذنها۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المختار ج۲ ص۴۱۲ باب نکاح الرقیق) ؎۲

خاوند کے مادۂ تولید کا کسی اجنبیہ کے رحم میں نشوونما پانا

سوال:۔ جدید طریقۂ تولید میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے مادۂ منویہ کو ملا کر ٹیوب کے ذریعہ کسی اجنبیہ کے رحم میں رکھا جاتا ہے اور یہ مادہ اُس کے رحم میں

؎۱ و ؎۲ قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: لان العزل جائز عن امة نفسه بغیر اذنها والاذن فی العزل عن الحرة لها ولایباح بغیره لانه حقها، وفی الخانیة ذکر فی الکتاب انه لا یباح بغیر اذنها وقالوا فی زماننا یباح لسوء الزمان۔ الخ
(البحر الرائق ج۳ ص۲۰۳ کتاب النکاح، باب نکاح الرقیق)
ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۳۱۱ باب نکاح الرقیق۔

نشوونما پا کر بچہ بن کر پیدا ہو جاتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ اس بچے کا نسب کس سے ثابت ہوگا اور اس اجنبیہ کی کیا حیثیت ہوگی؟

الجواب: ثبوتِ نسب کے لیے ابتدائی وقت سے میاں بیوی کے نطفوں کا اختلاط ہونا کافی ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں جدید طریقۂ تولید میں ابتداءً میاں بیوی کا نطفہ مختلط ہو جاتا ہے اور اس اختلاط سے وہ ایک عَلَقَۃ کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر کسی اجنبیہ کے رحم میں رکھا جاتا ہے، تو ثبوتِ نسب کے لیے اختلاط کی صورت تک یعنی عَلَقَۃ بننے تک کا زمانہ کافی ہے، باقی یہ اجنبیہ ہونے والے بچے کے لیے بمنزلہ مرضعہ کے ہوگی، اُس کے حقیقی ماں باپ وہی میاں بیوی ہیں جن کا یہ نطفہ تھا۔

لما قال العلامۃ ابو بکر الکاسانی رحمہ اللہ: النسب الثابت بالنکاح لا ینقطع الا باللعان۔ (بدائع الصنائع ج ۳ ص۲۴۶ باب النسب)

جدید نظامِ تولید کا شرعی حکم

سوال: بعض یورپی ممالک میں جدید نظامِ تولید کے لیے اجنبیہ خواتین کے ارحام کو بطورِ اجارہ لیتے ہیں، یعنی میاں بیوی کے نطفوں کے اختلاط کے بعد جب اس کی نشوونما کا مرحلہ آتا ہے تو بجائے بیوی کے رحم میں رکھنے کے کسی اجنبی عورت کو معاوضہ دے کر نشوونما کے لیے اس کے رحم کو استعمال کیا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ اس طریقہ سے ہونے والا بچہ اصحابِ نطفہ سے منسوب ہوگا مگر اس ثبوت سے کسی اجنبیہ کے رحم کو بطورِ اجارہ لینا جائز نہیں ہوتا بلکہ شریعتِ مقدسہ میں اس قسم کی اشیاء صرف اپنے خاوندوں کے استعمال کے لیے جائز ہیں دوسروں کے لیے ان کا استعمال کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَأْتُوْا حَرْثَکُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۳) [1]

---

[1] روی العلامہ جلال الدین السیوطیؒ: عن ابن سیرینؒ وحسن بن زیاد لا یعار الفرج۔ (الدر المنثور ج ۶ ص۵ سورۃ الشوریٰ)

وَمِثْلُہٗ فی جواھر الفتاویٰ ج ۱ ص۲۰۷ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت

طلاقِ رجعی کے دوسال بعد پیدا ہونیوالے بچّے کا ثابت النّسب ہونا

سوال:۔ زید نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی دیدی، طلاق کے دوسال بعد بچہ پیدا ہوا، جب زید کو بچہ پیدا ہونے کی خبر پہنچی تو زید نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا میرا نہیں ہے، تو کیا یہ بچہ زید سے ثابت النسب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاقِ رجعی کے بعد اگر عورت نے عدت گذرجانے کا اقرار کیا ہو اور اس کے بعد بچہ پیدا ہو تو اس بچے کا نسب زید سے ثابت نہیں ہوگا، البتہ اگر عورت نے قبل از ولادت عدت گذرجانے کا اقرار نہیں کیا ہو تو بچہ زید سے ثابت النسب تسلیم کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ:۔ (فيثبت نسب) ولد (معتدة الرجعی ......) وان ولدت لاكثر من سنتين ...... مالم تقر بمضی العدة والمدة تحتمله وكانت الولادة رجعة لو فی الاكثر۔ (تنویرالابصار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۲ ص۶۲۶ فصل فی ثبوت النسب، مکتبہ رشیدیہ) ۱؎

باپ کا بچّے کے نسب سے انکار کرنا

سوال:۔ کوئی شخص اپنی منکوحہ کی اولاد سے انکار کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس کا انکار کرے تو اولاد کا نسب اس سے ثابت ہوگا یا کسی اور سے؟

الجواب:۔ منکوحہ سے اولاد کا نسب قوی ہے، اس کے ثبوت کے لیے نہ تو کسی دعوٰی کی ضرورت ہے اور نہ خاوند کے انکار سے اس کی نفی ہوسکتی ہے، جو جو بچہ بھی منکوحہ سے پیدا ہو وہ خاوند سے ثابت النسب ہوگا، تاہم اگر خاوند بیوی کے پیدا ہونے والے کسی بچہ سے انکار کرکے لعان کرے تو پھر خاوند سے اس بچے کا نسب ثابت نہیں ہوگا لیکن بعد ازاں میاں بیوی کی حیثیت سے دونوں کا اکٹھا رہنا مشکل ہے جس کیلئے یا تو خاوند بیوی کو طلاق دے گا یا پھر قاضی کو دونوں کے درمیان تفریق کرنی پڑے گی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: حيث قسم الفراش الى قوله وقوی وهو فراش

۱؎ قال ابن الهمامؒ: ويثبت نسب ولد المطلقة الرجعة اذا جاءت به لسنتين او اكثر مالم تقر بانقضاء عدتها۔ (فتح القدیر ج ۳ ص۱۴۲ باب الحضانة)

وَمِثْلُهٗ فی کنزالدقائق علیٰ هامش البحرالرائق ج ۴ ص۱۵۶ باب ثبوت النسب۔

المنکوحة ومعتدة الرجعی فانه فیہ لا ینتفی الا باللعان ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۶۹۸ باب الثبوت النسب ، کتاب الطلاق ، مطلب الفراش علیٰ اربع مراتب) [1]

ولد الزنا کا نسب

سوال :۔ جو بچہ زنا سے پیدا ہو اُس کا نسب کس سے ثابت ہو گا؟ کیا زانی اس کو اپنا بیٹا کہہ کر پکار سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ زنا سے پیدا ہونے والے بچے کا زانی سے نسب ثابت ہونا ممکن نہیں اور نہ ہی زانی اس کو بیٹا کہہ سکتا ہے۔ اگر مزنیہ کسی کے نکاح میں ہو تو زنا سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب مزنیہ کے خاوند سے ثابت ہوگا اور اگر کسی غیر شادی شدہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو تو اس کی نسبت والدہ (مزنیہ) کی طرف ہوگی ۔

لقوله علیه الصّلوٰة والسّلام : الولد للفراش وللعاهر الحجر۔

(مشکوٰة ج ۱ ص۲۸۷ باب اللعان۔ کتاب النکاح۔ فصل الاول) [2]

حاملہ من الزنا سے نکاح کے بعد بچہ کا نسب

سوال :۔ ایک شخص نے آزاد عورت سے زنا کیا، حاملہ ہونے کے بعد اس شخص نے مزنیہ سے نکاح کر کے معاملہ کو دبا دیا، لیکن زنا سے جو بچہ پیدا ہوا اور شخص مذکور یہ اقرار کرے کہ یہ بچہ میرے نطفہ سے ہے تو کیا اس سے نسب ثابت ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ زنا سے نسب کبھی ثابت نہیں ہوتا، مذکورہ شخص کا دعویٔ نسب نا قابلِ التفات

---

[1] قال فی الهندیة :۔ قال اصحابنا لثبوت النسب ثلاث مراتب الاولیٰ نکاح الصحیح وما هو فی معناه من النکاح الفاسد والحکم فیه انه یثبت النسب من غیر دعوة ولا ینتفی بمجرد النفی وانما ینتفی باللعان فان کان ممن لا لعان بینهما لا ینتفی نسب الولد۔

(الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۵۳۶ ، الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب ، کتاب الطلاق)

ومِثْلُهٗ فی الفتاوی التاتارخانیة ج۴ ص۸۷ باب الثبوت النسب ، کتاب الطلاق ۔

[2] قال فی الهندیة : اذا زنیٰ رجل بامرأة فجاءت بولد فادعاه الزانی لم یثبت نسب منه واما المرأة فیثبت نسب منها۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۱۲۷ فی الفصل الثامن فی دعوة الولد من الزنا وما فی حکمه ۔ کتاب الدعوی)

ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۵۴۰ فی الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب ، کتاب الطلاق ۔

ہے، تاہم اگر نکاح سے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو پھر قضاءً ناکح سے نسب ثابت ہوگا اور اگر نکاح کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو تو پھر اگر خاوند یہ اقرار کرے کہ یہ بچہ میرا ہے اگرچہ نسب کے ثبوت کے لیے یہ اقرار مفید نہیں لیکن اس کے اقرار نسب سے یہ بچہ میراث لے سکتا ہے، جبکہ زنا کا اقرار کرکے بچے کے نسب کا دعویٰ کرنے سے نہ نسب ثابت ہوتا ہے اور نہ میراث میں حصہ مل سکتا ہے۔

قال فی الهندية : ولو زنى بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدته ان جاءت به لستة أشهر فصاعدا ثبت نسبه الا ان يدعيه ولم يقل انه من الزنا اما ان قال انه منى من الزنا فلا يثبت نسبه ولا يرث منه - (الفتاوى الهندية ج۱ ص۵۴۰ فى الباب الخامس عشر فى ثبوت النسب - كتاب الطلاق) له

داشتہ کی اولاد کے نسب کا حکم

سوال: ایک شخص نے کسی کی منکوحہ کو اغوا کرکے مدتوں سے اپنے پاس رکھا ہوا ہے جس سے اُس کے بچے بھی پیدا ہوئے ہیں جبکہ خاوند نے طلاق بھی نہیں دی ہے، ایسی حالت میں اس عورت کی اولاد کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟

الجواب: اغوا کنندہ کا منکوحۃ الغیر سے مناقع لینا زنا ہے اور زنا سبب ثبوتِ نسب نہیں، ایسی داشتہ کے بچوں کا نسب خاوند سے ثابت ہوگا جن سے نفی کے لیے خاوند لعان کا ذریعہ اختیار کر سکتا ہے۔ ایسی عورت کو جب تک خاوند سے باقاعدہ آزادی نہ ملے تو مدتوں تک پاس رکھنے سے نہ تو اس سے نکاح جائز ہے اور نہ اس کی اولاد کا نسب ثابت ہوگا۔

لحديث النبى صلى الله عليه وسلم : الولد للفراش وللعاهر الحجر - (مشكوٰة ج۱ ص۲۸۷ باب اللعان كتاب النكاح)

وقال ابن عابدينؒ : اما نكاح منكوحة الغير ومعتدته ...... لانه لم يقل احد

له قال العلامة ابن الهمام رحمه الله تعالى : واذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بولد لاقل من ستة اشهر منذ يوم تزوجها لم يثبت نسبه -

(فتح القدير ج۴ ص۱۸۲ باب ثبوت النسب - كتاب الطلاق)

ومثله فى البحر الرائق ج۴ ص۱۵۵ باب ثبوت النسب - كتاب الطلاق -

بجوازہ نلم ینعقد اصلاً۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۳۰۰ باب المحرمات کتاب النکاح) ؎۱

گھر سے نکالے جانے کے بعد منکوحہ غیر مطلقہ کے ہاں پیدا ہونے والے بچہ کا حکم

سوال:۔ زید نے اپنی بیوی کو کسی وجہ سے بغیر طلاق دیئے اپنے گھر سے نکال دیا، دو سال بعد اس مذکورہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا، خاوند نے اطلاع ملتے ہی انکار کیا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے، کیا اس کا یہ انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ منکوحہ غیر مطلقہ کے ہاں نکاح کے چھ ماہ پورے ہونے کے بعد جو بچہ پیدا ہو خواہ زوج اس کا اعتراف کرے یا خاموشی اختیار کرے ہر حالت میں بچہ اس سے ثابت النسب ہوگا، گو یا گھر سے نکالے جانے کے بعد جب تک اس کے نکاح میں رہی اس عرصہ میں پیدا ہونے والا بچہ خاوند سے ثابت النسب ہوگا تاہم اگر اس کو واقعی بچے سے انکار کرنا مقصود ہو تو لعان کا طریقہ اختیار کر سکتا ہے جو اس کے لیے نسبت کے انکار کے لیے مفید رہے گا۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: واذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بولد لاقل من ستة اشهر منذ يوم تزوجها لم يثبت نسبه ..... وان جاءت به لستة اشهر فصاعداً يثبت منه اعترف الزوج اوسكت ...... فان جحد الولادة يثبت بشهادة امرأة واحدة تشهد بالولادة حتى لو نفاه الزوج يلاعن لان نسب يثبت بالفراش القائم۔ (الهداية ج۲ ص۴۰۹ باب ثبوت النسب) ؎۲

؎۱ وقال امام فخرالدين حسن بن منصور رحمه الله: الاوزجندي ولا يجوز نكاح منكوحة الغير عند الكل۔ (فتاویٰ خانیہ علی ہامش الہندیہ ج۱ ص۳۶۶ فی باب المحرمات کتاب النکاح)

ومثله في البحر الرائق ج۳ ص۹۲ باب المحرمات۔ كتاب النكاح۔

؎۲ قال في الهندية: واذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بالولد لاقل من ستة اشهر منذ تزوجها لم يثبت نسبه وان جاءت به لستة اشهر فصاعداً يثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سكت۔ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۵۳۶ الباب الخامس عشر في ثبوت النسب)

ومثله في ردّ المحتار ج۲ ص۶۲۷ فصل في ثبوت النسب۔ الباب الخامس عشر في ثبوت النسب۔

خاوند کی طویل غیر حاضری میں بیوی کا حاملہ ہونا

سوال:۔ اگر ایک شخص چند سالوں سے سفر میں ہو اُس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا نسب ثابت ہوگا یا نہیں؟

الجواب: نسب کے ثبوت کے لیے نکاح اہم سبب ہے، اس لیے نکاح کے موجودگی میں جو بچہ پیدا ہو تو وہ ثابت النسب ہوگا، صورتِ مرقومہ کے مطابق اگر خاوند کی طویل غیر حاضری میں بچہ پیدا ہوا ہو تو خاوند نفی کے لیے لعان کا طریقہ اپنا سکتا ہے۔

لقوله علیه الصّلوٰة والسّلام: الولد للفراش وللعاهر الحجر۔

(مشکوٰۃ ج۱ ص۲۸۷ باب اللعان۔ کتاب النکاح) [۱]

مُدّتِ حمل

سوال:۔ بچہ زیادہ سے زیادہ کتنی مدت تک ماں کے پیٹ میں رہ سکتا ہے اور کم از کم کتنی مدت ماں کے پیٹ میں رہ کر صحیح و سالم پیدا ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے اور زیادہ سے زیادہ دو برس، یعنی کم سے کم چھ ماہ بچہ ماں کے پیٹ میں رہ کر صحیح و سالم پیدا ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دو برس تک بچہ ماں کے پیٹ میں رہ سکتا ہے، فقہ حنفی کی رُو سے مدتِ حمل دو سال سے زائد نہیں ہو سکتی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واکثر مدة الحمل سنتان۔ لقول عائشةؓ: الولد لایبقی فی البطن اکثر من سنتین ولو بظل مغزل واقله ستة اشهر۔ لقوله تعالیٰ: وحمله وفصاله ثلثون شهرًا ثم قال وفصاله فی عامین فبقی للحمل ستة اشهر۔ (الهدایہ ج۲ ص۴۱۱ باب ثبوت النسب) [۲]

کم از کم مدتِ حمل سے پہلے پیدا ہونیوالے بچّے کے نسب کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی مطلقہ عورت سے نکاح کیا

---

[۱] وقال ابن عابدینؒ: حیث قسم الفراش علیٰ اربع مراتب وقوی وهو فراش المنکوحة ومعتدة الرجعی فانه فیه لاینتفی الّا باللعان۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۸۴ مطلب الفراش علیٰ اربع مراتب)

وَمِثلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۳۶ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب۔

[۲] وقال شیخ الاسلام محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: واکثر مدة الحمل سنتان لخبر عائشة رضی الله عنها..... واقلها ستة اشهر اجماعًا۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۲ ص۶۷۶ فصل فی ثبوت النسب)

وَمِثلُهٗ فی الکنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج۴ ص۱۶۳ باب ثبوت النسب۔

عورت نے نکاح کے وقت اطمینان دلایا تھا کہ میرا حمل نہیں ہے اور میری عدت گذر چکی ہے، اس شخص نے عورت کے قول پر اعتماد کیا، اب صورتحال یہ ہے کہ نکاح کے پانچ ماہ بعد اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا، ایسی حالت میں یہ بچہ پہلے خاوند کا شمار ہوگا یا دوسرے کا؟

الجواب:۔ نکاح کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ کا پیدا ہونا اس شخص سے ممکن نہیں، جب اس عورت کے ہاں اقل مدتِ حمل سے قبل بچہ پیدا ہو تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ عورت نے کذب بیانی کا سہارا لے کر دوسرے شخص کے ساتھ دھوکہ سے نکاح کیا ہے اسلیے اس نکاح کا کوئی اعتبار نہیں اور بچہ پہلے خاوند سے ثابت النسب ہوگا، اور یہ شخص بچہ پیدا ہونے کے بعد دوبارہ نکاح کرکے اس عورت کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

لمافی الهندیة: واذا تزوجت المعتدة بزوج آخر ثم جاءت بولد ان جاءت به لاقل من سنتین منذ طلقها الاول او مات ولاقل من ستة اشهر منذ تزوجها الثانی فالولد للاول۔
(الفتاوی الهندیه ج ۱ ص ۵۳۸ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب) [۱]

حمل کی کم از کم مدت

سوال:۔ اگر ایک شخص کے ہاں شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو کیا یہ بچہ ثابت النسب ہوگا یا نہیں؟ اور اگر والد اس کے نسب سے انکاری ہو تو اس سے بچے کے نسب کی نفی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح کے بعد اقل مدتِ حمل یعنی چھ ۶ ماہ کے بعد جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب باپ سے ثابت ہوگا اور اس کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہیں، نسب سے انکار کیلئے لعان کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ مفید اور بہتر نہیں۔

لمافی الهندیة: واذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بالولد لاقل من ستة اشهر منذ تزوجها لم یثبت نسبه وان جاءت به لستة اشهر فصاعدًا یثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سکت فان جحد الولادة یثبت بشهادة امرأة واحدة تشهد بالولادة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۵۳۶ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب) [۲]

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: واذا تزوج امرأة فجاءت بولد لاقل من ستة اشهر منذ یوم تزوجها لم یثبت نسبه۔ (الهدایة ج ۲ ص ۴۰۹ باب ثبوت النسب)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۴ ص ۱۶۸ باب ثبوت النسب۔

[۲] قال التمرتاشیؒ: واقلها ستة اشهر اجماعًا فیثبت نسب۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج ۲ ص ۶۲۶ باب ثبوت النسب) ـــ وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج ۴ ص ۱۶۳ باب ثبوت النسب۔

سوال :۔ ایک لڑکا جس کا نکاح

ثبوت النسب کے لیے مدت کا اعتبار وقتِ نکاح سے ہے

اپریل ۱۹۸۸ء میں ہوا اور لڑکی کی رخصتی ۸ رجولائی ۱۹۸۸ء کو ہوئی ، رخصتی کے تقریباً تین ماہ بعد لڑکی کے ہاں سسرال میں بچہ پیدا ہوا ، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس بچے کا نسب اس لڑکے سے ثابت ہوگا یا نہیں ؟ جبکہ لڑکی اور لڑکا آپس میں خالہ زاد ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا ۔

الجواب :۔ صورتِ مذکورہ میں اگر نکاح واقعی اپریل ۱۹۸۸ء میں ہی ہوا ہو اور رخصتی جولائی ۱۹۸۸ء میں ہوئی ہو اور پھر جولائی سے تین ماہ بعد ستمبر میں بچہ پیدا ہو جائے تو اندریں صورت ثبوت النسب کے لیے مدت کا اعتبار نکاح کے وقت سے ہوگا رخصتی کے وقت سے نہیں ۔ لہٰذا اگر نکاح سے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا ہو تو یہ بچہ اس خاوند سے ثابت النسب ہوگا تاہم اگر خاوند اس سے انکار کرے تو اس کے لیے لعان کا ذریعہ اختیار کرنا ضروری ہے اور چھ ماہ سے کم مُدّت کی صورت میں بچہ ثابت النسب نہ ہوگا ۔

لما فی الھندیۃ : واذا تزوّج الرجل امرأۃ فجاءت بولدٍ لاقل من ستۃ اشھرٍ منذ تزوّجھا لم یثبت نسبہ وان جاءت بہ ستۃ اشھر فصاعداً یثبت نسبہ الخ وفیہ بعد اسطرٍ : ولو جاءت لاقل من ستۃ اشھر من وقت النکاح لا یثبت الخ

(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۵۳۶، ۵۳۷ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ : واذا تزوّج الرجل امراۃ فجاءت بولدٍ لاقلّ من ستّۃ اشھرٍ منذ یوم تزوّجھا لم یثبت نسبہ لانّ العلوق سابق علی النکاح فلا یکون منہ وان جاءت بہ لستّۃ اشھرٍ فصاعداً یثبت نسبہ منہ .... لانّ الفراش قائم والمدّۃ تامّۃ الخ

(الھدایۃ ج ۲ ص ۴۱۱ باب ثبوت النسب)

ومثلہٗ فی فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج ۱ ص ۴۵۵ فصل فی النسب ۔

سادات کا نسب اور سیّدہ فاطمہؓ کی فضیلت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کئی دنوں سے ایک سوال ذہن میں ابھر رہا ہے کہ اولاد کی نسبت تو باپ کی طرف ہوتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد نہیں تھی تو سادات کا نسب کیسے باقی رہا؟ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو خود سیّد نہ تھے؟

الجواب:۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں اولاد کا نسب باپ کی طرف ثابت ہوتا ہے، مگر سیّدہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کی اولاد کی نسبت آپ کی طرف ہے اور آپ کے واسطہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، آپ کے علاوہ کسی بھی عورت کو یہ شرف حاصل نہیں، اسی لیے آج سادات کا سلسلہ نسب دنیا میں قائم ہے۔

روی الحاکم عن جابر بن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل بنی ادم ینتمون الی عصبۃ الا ولد فاطمۃ فانا ولیھم عصبتھم۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص۲۷۴ رقم حدیث ۱۵۰۱۳، کتاب المناقب۔ الباب ۱۴)[1]

تین سال بعد پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کے انتقال کے تین سال بعد اس کی بیوہ کے ہاں بچہ ہو جبکہ اس نے دوسری شادی بھی نہ کی ہو تو اس بچے کے نسب کے بارے میں شریعت مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ میت کی طرف منسوب ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مفتی بہ رائے کے مطابق حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال ہے، اس دوران جو بچہ پیدا ہو وہ ثابت النسب ہوگا، لیکن جو بچہ کسی کے انتقال کے دو سال بعد پیدا ہو جبکہ اس کی بیوہ نے دوسری شادی بھی نہ کی ہو تو وہ باپ سے ثابت النسب نہیں ہوگا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں جو بچہ باپ کے مرنے کے تین سال بعد پیدا ہوا ہے وہ باپ سے غیر ثابت النسب ہے اُس کو صرف ماں

---

[1] قال الشیخ المفتی عزیز الرحمٰنؒ: روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گو نسب باپ کی طرف سے ثابت ہوتا ہے لیکن بنی فاطمہ اس سے مستثنیٰ ہیں، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کا نسب حضرت فاطمہؓ کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے..... آئندہ کسی عورت کی جانب سے خواہ وہ سیّدہ ہی کیوں نہ ہو نسب ثابت نہ ہوگا۔
(فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۱۱ ص۷۵ باب ثبوت النسب)

کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

لما فی الهندیة : ولو فات عنها قبل الدخول او بعده ثم جاءت بولد من وقت الوفاة الی سنتین یثبت النسب منه وان جاءت به لاکثر من سنتین من وقت الوفاة لا یثبت النسب ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۔ الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب) ۔

بارہ سال کے لڑکے سے ثبوتِ نسب کا مسئلہ

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! یہاں علاقہ غیر میں لوگ اپنے بچوں کی شادیاں بہت کم سنی میں کر دیتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی لڑکے کی عمر ۱۲، ۱۳ سال ہو اور اس کی بیوی کو حمل ہو جائے تو کیا حمل کا نسب اِس لڑکے سے ہو گا یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر لڑکا مراہق یعنی قریب البلوغ ہو (جس کی ادنیٰ مدتِ عمر لڑکے کے لیے ۱۲ سال اور لڑکی کے لیے ۹ سال ہے) تو اس سے حمل کا نسب ثابت ہو سکتا ہے ورنہ نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اِس حمل کا نسب اس لڑکے سے ہو گا۔

قال الحصکفیؒ : ولا نسب فی حالیه اذ لا ماء للصبی نعم ینبغی ثبوته من المراهق احتیاطاً ۔ قال ابن عابدینؒ : (قوله اذ لا ماء للصبی) ای فلا یتصور منه العلوق و انما ثبت نسب ولد المشرقی من مغربیة اقامة للعقد مقام العلوق لتصورہ حقیقة بخلاف الصبی کما فی البحر قوله نعم ینبغی) عبارة الفتح ثم یجب کون ذلك الصبی غیر المراهق اما المراهق فیجب ان یثبت النسب منه ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۸۳۲ باب العدة)

وقال ایضًا : وادنیٰ مدته ای البلوغ له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنین فان راهقا بان بلغا هذا السن ۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۳۲ فصل فی بلوغ الغلام) [1]

◇ ◇

---

[1] قال الشیخ الامام ابو زهرةؒ : الشرط الاول : ان یکون الزوج یتصور منه حمل فان کان صغیرًا لا یتصور منه الحمل لا ینسب لان هذه قرینة قطعیة علی ان الحمل لیس منه وقد اتفق علی ذلك الائمة ۔

(الاحوال الشخصیة ص ۳۸۹ القسم الرابع ثبوت النسب)

بغیر حلالہ کے نکاح ثانی سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیدیں، پھر چند دنوں کے بعد دوبارہ بغیر حلالہ شرعی کے اس سے نکاح کر لیا، اس لیے کہ اس کو ایک غیر مقلد عالم دین نے تجدیدِ نکاح کا فتویٰ دیا تھا، جبکہ یہ شخص حنفی مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نکاحِ ثانی سے ایک بچہ بھی پیدا ہوا ہے اس کے نسب کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ نکاحِ ثانی شرعاً فاسد ہے، بغیر کسی تاخیر کے ان دونوں کو جدا ہو جانا چاہیئے، البتہ بچے کا نسب اپنے باپ سے ثابت ہے۔

لمافی الهندیة :ولو طلقها ثلاثاً ثم تزوجها قبل ان تنکح زوجاً غیرہ فجاءت منه بولد ولا یعلمان بفساد النکاح فالنسب ثابت وان کان یعلمان بفساد النکاح یثبت النسب ایضاً عند ابی حنیفةؒ، کذا فی التاتارخانیة ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص۵۴۰ الباب الخامس فی ثبوت النسب)[1]

عدت کے دوران سالی سے نکاح کرنا اور اس سے پیدا ہونیوالے بچہ کے نسب کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی، طلاق کی وجہ یہ تھی کہ موصوف کی بیوی کو شک تھا کہ اس کے سالی سے ناجائز تعلقات ہیں اور اسی وجہ سے دونوں اکثر اوقات خلوت میں رہتے ہیں۔ اب یہ عورت حاملہ ہے اور اس کا شوہر سالی سے نکاح کر کے فرار ہو گیا ہے اور ان کے ہاں ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ تو کیا اس بچے کا نسب اس شخص سے ثابت ہو گا یا نہیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق دورانِ عدت سالی کے ساتھ نکاح جائز نہیں اگر کر لیا جائے تو نکاح فاسد ہو گا جو واجب الفسخ ہے۔ جہاں تک بچے کا تعلق ہے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نکاحِ فاسد سے پیدا ہونے والا بچہ ثابت النسب ہوتا ہے اس لیے اس بچے کا نسب اپنے باپ سے ثابت ہے۔ تاہم ان دونوں کے لیے زوجۂ اول مطلقہ کی عدت ختم ہونے کے بعد دوبارہ نکاح

---

[1] لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ ، ولو طلقها ثلاثاً ثم تزوجها قبل ان تنکح زوجاً غیرہ فجاءت منه بولد ولا یعلمان بفساد النکاح فالنسب ثابت وان کان یعلمان بفساد النکاح یثبت النسب ایضاً عند ابی حنیفةؒ ۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج۴ ص۸ کتاب الطلاق ۔ الفصل التاسع والعشرون باب ثبوت النسب)

کرنا ضروری ہے بدون اس کے دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: أن تزوج احداھما بعد الاخریٰ جاز نکاح الاولیٰ وفسد نکاح الثانیۃ۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۲۶۱ کتاب النکاح)

وقال ایضاً: واما نکاح الفاسد فلا حکم لہٗ قبل الدخول واما بعد الدخول فیتعلق بہٖ احکام منھا ثبوت النسب۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص۳۳۵ باب ثبوت النسب)[1]

ساس سے نکاح کے بعد پیدا ہونیوالے بچوں کے نسب کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی منکوحہ کے انتقال کے بعد ساس سے شادی کر لی، کئی سال تک دونوں غائب رہے اس دوران ان کے ہاں چار بچے بھی پیدا ہوئے، اب اس شخص کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا وہ بچے ثابت النسب ہو کر موصوف کے ترکہ میں میراث کے حقدار ہیں یا نہیں؟ جبکہ مرحوم کی پہلی بیوی سے ہونیوالے بچے ان بچوں کو اپنے بہن بھائی نہیں مانتے اور باپ کے ترکہ سے ان کے حصۂ میراث کو تسلیم نہیں کرتے۔ مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی روشنی میں اس نزاع کو ختم فرمائیں؟

الجواب:۔ ساس سے نکاح کرنا شرعاً ناجائز ہے اور اگر کر لیا جائے تو نکاح فاسد ہے جبکہ نکاحِ فاسد سے عدت اور ثبوت النسب کے مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگرچہ ساس سے نکاح فاسد اور واجب الفسخ تھا مگر پیدا شدہ بچوں کا نسب باپ سے شرعاً ثابت ہے اور یہ بچے باپ کے مرنے کے بعد دیگر بھائی بہنوں کی طرح ترکہ میراث میں برابر کے حقدار ہونگے، کوئی بھی شخص ان کو اپنے حصۂ میراث سے منع نہیں کر سکتا اور نہ ہی منع کرنے کا کسی کو اختیار ہے۔

لما فی الھندیۃ: رجل مسلم تزوج بمحارمہ فجئن باولاد یثبت نسب الاولاد منہ عند ابی حنیفۃؒ خلافاً لھما بناء علیٰ ان النکاح فاسد عند ابی حنیفۃؒ باطل عندھما۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۱ ص۵۴۰ باب ثبوت النسب)

---

[1] وفی الھندیۃ: وان تزوجھما فی عقدتین فنکاح الاخیرۃ فاسد یجب علیہ ان یفارقھا.......... یجب الاقل من المسمی ومن مھر المثل وعلیھا العدۃ و یثبت النسب ویعتزل عن امرأتہ حتی تنقضی عدۃ اختھا۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۷۷/۲۷۸ کتاب النکاح، القسم الرابع المحرمات بالجمع)

مزنیہ کی بیٹی سے نکاح کے بعد پیدا شدہ بچی کے نسب کا حکم

سوال:- ایک آدمی کے کسی عورت سے ناجائز تعلقات تھے جن کو برقرار رکھتے ہوئے موصوف نے اس عورت کی لڑکی سے شادی کر لی، اس کے بعد بھی ان کے تعلقات اسی طرح قائم رہے، دو سال بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بچی کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟ کیونکہ علاقے کے علماء نے موصوف سے کہا تھا کہ اس لڑکی سے تمہارا نکاح صحیح نہیں لیکن پھر بھی اس نے نکاح کر لیا اور یہ بچی پیدا ہوئی؟

الجواب:- بشرط صحتِ سوال نہایت قبیح اور ناجائز تعلقات کے باعث اس عورت کی بیٹی اس مرد پر اپنی بیٹیوں کی طرح حرام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر محارم کے ساتھ نکاح کر لیا جائے تو وہ واجب الفسخ ہے مگر فاسد ہونے کے باوجود اولاد کا نسب باپ سے ہی ثابت ہوگا۔ اور عوام و خواص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان دونوں کو الگ کر دیں۔

لما فی الهندية: رجل مسلم تزوج بمحارمه فجئن باولاد يثبت نسب الاولاد منه عند ابی حنيفةؒ خلافاً لهما بناءً علیٰ ان النكاح فاسد عند ابی حنيفةؒ باطل عندهما۔ (الفتاوی الهندية ج۱ ص۵۴۰ باب ثبوت النسب) [1]

اپنی ذات یعنی شجرۂ نسب بدلنا

سوال:- ذات (شجرۂ نسب) بدلنا یا کسی دوسری قوم کی طرف اپنی نسبت کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ایک مسلمان کیلئے اپنی ذات (شجرۂ نسب) بدلنا یا کسی دوسری قوم کی طرف اپنی نسبت کرنا شریعت کی رو سے حرام اور گناہ ہے، حدیث شریف میں اس پر بڑی وعید آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نسب بدلنے والے آدمی پر جنت حرام ہے۔

عن سعدؓ قال سمعت النبی صلی الله عليه وسلم يقول من ادعیٰ الیٰ غير ابيه وهو يعلم انه غير ابيه فالجنة عليه حرام۔ (صحیح البخاری ج۱ ص۱۰۰۱ کتاب الفرائض)

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: نكاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عنده خلافاً لهما۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۵۹ باب العدّة۔ مطلب عدّة المنكوحة فاسداً)

وقال ايضاً: قوله لانه نكاح باطل ای فالوطء فيه زنا لا يثبت به النسب بخلاف الفاسد فانه وطء بشبهة فيثبت به النسب ولا تكون بالفاسد فراشاً لا بالباطل۔ (ردّ المحتار ج۲ ص۶۸۹ باب ثبوت النسب قبل باب الحضانة)

غیر کی منی کا انجکشن لگوانے سے پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا حکم

سوال:- ہمارے گاؤں گھلوڑ ضلع مظفر آباد آزاد کشمیر میں ایک آدمی ہے جس کی شادی ہوئے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن وہ خدا کی قدرت سے ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے، اس نے اپنی جائیداد کا وارث بنانے کے لیے ایک کھیل کھیلا کہ شاید اس طرح میرے ہاں بیٹا پیدا ہو جائے، اس طرح اس نے اپنی بیوی کو کسی نامعلوم شخص کی منی کا) ٹیکہ لگوایا جس سے وہ حاملہ ہو گئی، مقررہ مدت کے بعد اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی جو کہ قدرتی نشوونما سے محروم اور ہر وقت بیمار رہتی ہے، اس کا قد بڑھنے کا عمل بہت سست ہے، بچی کی شکل بھی اس کے خاندان کے کسی فرد سے معمولی مشابہت بھی نہیں رکھتی اس بچی کی پیدائش کے بعد چھ سال تک اس کے ہاں کوئی بچی، بچہ نہیں ہوا، واضح ہو کہ اس شخص کا باپ اپنے آپ کو اسلام کا بہت بڑا دعویدار سمجھتا ہے اور کسی کا حق دبانے میں ذرا برابر فرق نہیں کرتا، بینک کے سودی معاملات میں بڑی گہری دلچسپی رکھتا ہے، اُسے بھی اپنے بیٹے کی اِس گھناؤنی حرکت کا بخوبی علم ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کا اسلام میں کوئی مقام ہے؟ اگر ہے تو اس کی وضاحت فرمائیں؟ اور اگر وہ اسلامی حدود و قیود سے تجاوز کا مرتکب ہوا ہے، تو قرآن و سنت کا اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ آپ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب:- مذکورہ بالا طریقہ (انجکشن کے ذریعے) سے اولاد حاصل کرنا حرام اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہے تاہم اگر اس طرح تولید کا عمل مکمل کر لیا جائے تو نسب ثابت ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: الولد للفراش وللعاهر الحجر (الحدیث) تو اس آدمی سے اس بچے کا نسب ثابت ہوگا اور وراثت اور رضاعت وغیرہ کے احکام جاری ہوں گے ۔ ثبوتِ نسب کے لیے وطی کی فطری صورت ضروری نہیں، اس کے بغیر بھی اگر کسی طرح خاوند کا مادۂ منویہ عورت کے رحم میں پہنچ جائے تو نسب ثابت ہو جائے گا، فقہاء کرام کی بعض عبارتوں سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ خلاصۃ الفتاویٰ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

البکر اذا جومعت فی مادون الفرج فحملت بان دخل الماء فی فرجها فلما قرب اوان ولادتها تزال عذرتها ببیضة او بحرف درهم۔ (ج۲ ص۱۱۴) "کنواری لڑکی سے شرمگاہ کے باہر ہمبستری کی جائے پھر وہ حاملہ ہو جائے بایں طور کہ (مرد کا) مادۂ منویہ اس کی شرمگاہ میں

داخل ہو جائے اور جب ولادت کا وقت آئے تو انڈے یا درہم کے کونوں کے ذریعے اس کا پردۂ بکارت (کنوارپن) چاک کر دیا جائے گا۔" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حرمتِ نسب کا حکم بھی ثابت ہو جائے گا یعنی ماں باپ، دادا دادی وغیرہ کا سلسلہ نسب ٹھیک اسی طرح حرام ہو جائے جس طرح فطری توالد و تناسل کی وجہ سے ہوتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ صورت عملاً زنا ہوگی اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد ولد الزنا، البتہ اس پر اسلامی ممالک میں زنا کی شرعی سزا نافذ نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ یہ سزا صرف ناجائز حمل پر ہی نہیں ہے بلکہ باہم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونے پر ہے۔ (جدید فقہی مسائل جلد ص۱۵۲)

مذکورہ بالا صورت میں اس آدمی کا کیا ہوا عمل جائز نہیں بلکہ حرام ہے، البتہ اس پر نسب وغیرہ کے احکام سب ثابت ہوتے ہیں، خواہ اس بچی کی شکل وصورت اس خاندان کے افراد مشابہ ہو یا نہ ہو۔ واللہ اعلم

چودہ پندرہ سال جُدائی کے باوجود بچہ ثابت النسب ہے

سوال:۔ ایک صاحب ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں لاپتہ ہو گیا کئی سال تک اس کی موت وحیات کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا، اب اس کے لاپتہ ہونے کے تقریباً چودہ پندرہ سال بعد اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس بچے کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ اسلام نے ہر ممکن حد تک بچے کا نسب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، صورتِ مسئولہ میں اگرچہ بظاہر شوہر سے اثباتِ نسب مشکل نظر آتا ہے، مگر شریعتِ مطہرہ نے اس بچے کے نسب کو بھی ثابت کر دیا ہے اور اس کے لیے ایک قانونی دفعہ چھوڑی ہے کہ "الوالد للفراش والعاھر الحجر (بخاری شریف) بچہ فراش کا تابع ہوگا اور زانی کے لیے صرف پتھر ہے۔" اسی قانون کے تحت صورتِ مسئولہ میں بھی اس بچے کا نسب اپنے باپ سے ثابت ہے اگرچہ وہ حقیقتاً نہیں ہے، اس کا نسب علاوہ لعان کے ختم نہیں ہوگا۔

لما فی الهندیة: والحکم فیه انه یثبت النسب من غیر دعوة لاینتفی بمجرد النفی وانما ینتفی باللعان۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۶۳ باب ثبوت النسب)

مسائلِ شتّٰی

(طلاق کے متفرق مسائل)

طلاقِ مغلظہ سے بچنے کے لیے حیلہ

سوال: جناب مفتی صاحب! میری اور میرے بھائی کے درمیان کچھ ناراضگی تھی، اب ہماری صلح ہوچکی ہے اور صلح کے وقت میں نے بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں نے فلاں شخص کے ساتھ تعلقات رکھے تو میری بیوی کو تین طلاق ہو، اب جبر کہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اُس شخص کے ساتھ بول چال شروع کرلوں کیونکہ یہ شخص میرا قریبی رشتہ دار بھی ہے، اب از روئے شرع مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ ہماری بول چال بھی شروع ہوجائے اور بیوی پر طلاق بھی نہ پڑے؟

الجواب: ویسے تو صورتِ مسئولہ میں تین طلاق مشروط بشرط ہیں، جب بھی شرط پوری ہوجائے تو طلاقِ مغلظہ واقع ہوجائے گی۔ اب اس سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ اوّلاً آپ اپنی بیوی کو ایک طلاق دے کر جدا کردیں اور جب اس کی عدّت ختم ہوجائے تو آپ اس شخص سے بول چال شروع کردیں اور پھر دوبارہ عورت سے نکاح کرلیں، صرف اِس صورت میں آپ کی بیوی طلاقِ مغلظہ کے وقوع سے بچ سکتی ہے ورنہ شخص مذکور کے ساتھ بول چال اور تعلقات شروع کرتے ہی آپ کی بیوی پر طلاقِ مغلظہ واقع ہوجائے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: فحیلة من علق الثلاث بدخول الدار ان یطلقها واحدة ثمّ بعد العدّة تدخلها فتنحل الیمین فینکحها۔ (الدّر المختار علی هامش ردّ المحتار ج۲ ص۵۴۵ قبل مطلب اختلاف الزّوجین فی وجود الشّرط)

مضارع کے صیغہ سے طلاق کا حکم

سوال: اگر کسی عورت سے کوئی غلط کام ہوجائے اور اس کا شوہر بطورِ تنبیہ کے اسے یہ کہے کہ اگر تم نے آئندہ یہ کام کیا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا، چند دنوں بعد اُس عورت سے وہی کام سرزد ہوگیا تو کیا اس عورت پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: گرائمر کے اصول کے مطابق مضارع کے صیغے دو طرح کے ہیں، بعض ایسے صیغے ہیں جو حال کے معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض صیغے مستقبل کے لیے استعمال ہوتے

ہیں، چونکہ صورتِ اولیٰ میں انشاء فی الحال اور انشاء فی الماضی ہے لہٰذا مضارع کے ان صیغوں کے ساتھ طلاق واقع ہوجائے گی، اور صورتِ ثانیہ میں چونکہ اظہارِ ارادہ ہوتا ہے لہٰذا اس میں بغیر انشاء طلاق واقع نہ ہوگی۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں فقط اظہارِ ارادہ ہے اس لیے طلاق واقع نہ ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: صيغة المضارع لا يقع بها الطلاق الا اذا غلب في الحال، كما صرح به الكمال ابن الهمام۔ (تنقيح الحامدية ج۱ صـ۳۸ كتاب الطلاق)[۱]

بلانیتِ طلاق بیوی کو "دوسرا خاوند تلاش کرلو" کے الفاظ کہنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بیوی سے لڑائی جھگڑے کے دوران یہ کہہ دے کہ "جاؤ دوسرا خاوند تلاش کرلو" مگر اس میں اس کی نیّت طلاق کی نہ ہو تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ "جاؤ دوسرا خاوند تلاش کرلو" یہ طلاقِ کنائی کے الفاظ ہیں جو وقوعِ طلاق میں نیّت یا دلالتِ حال و قرینہ وقیاس کے محتاج ہیں۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس آدمی کی نیّتِ طلاق کی نہیں اس لیے طلاق واقع نہ ہوگی ورنہ بصورتِ نیّت بیوی پر طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی۔

وفي الهندية: وابتغي الازواج تقع واحدة بائنة ان نواها او اثنتين وثلاث ان نواها۔ (الفتاوى الهندية ج۱ صـ۳۷۵ الفصل الخامس في الكنايات)[۲]

اور طلاقِ بائن کا حکم یہ ہے کہ عدت کے اندر یا عدت گذر جانے کے بعد تجدیدِ نکاح سے بیوی خاوند کے لیے حلال ہوجائے گی حلالہ کی ضرورت نہیں۔

---

[۱] قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: صیغۂ مضارع ہے اور مضارع سے وقوعِ طلاق نہیں ہوتا مگر جب مضارع بمعنی حال غالب ہوجائے تو فقہاء نے اس سے وقوعِ طلاق کی تصریح کی ہے۔ (امداد الاحکام جلد ۲ صـ۳۸۷ کتاب الطلاق)

[۲] قال العلامة ابو البركات النسفي رحمه الله: وغيرها بائنة وان نوى ثنتين وتصح نية الثلاث وهي بائن بتة بتلة حرام .... تزوجي ابتغي الازواج۔

(كنز الدقائق على هامش البحر الرائق ج۳ صـ۳۰۰، ۳۰۲ باب الكنايات)

نافرمان بیوی کو طلاق دینا مستحب ہے

سوال: ایک شخص کی بیوی فاحشہ اور نافرمان ہے، اب اگر یہ شخص اس کو طلاق دیدے تو گنہگار تو نہیں ہوگا؟

الجواب: جو عورت اپنے شوہر کی نافرمان ہو اور اس کے حقوق میں کوتاہی کرتی ہو اور حدودِ شرعی کو بھی پامال کرتی ہو تو اس کو طلاق دینے سے شوہر گنہگار نہ ہوگا بلکہ ایسی عورت سے خلاصی حاصل کرنا مستحب امر ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وایقاعه مباح وقیل الاصح خطره الا لحاجة کریبة وکبر... بل یستحب لومؤذیة اوتارکة صلوٰة غایة ومفاده ان لا اثم بمعاشرة من لاتصلی ویجب لوفات الامساك بالمعروف۔ قال ابن عابدینؒ تحت قوله (ومؤذیة) اطلقه فشمل المؤذیة له اولغیره بقولها اوبفعلها۔ الخ

(ردّ المحتار ج۲ ص۴۲۵ کتاب الطلاق) ؎۱

لڑکی پسند نہ آنے کی صورت میں طلاق دینے کا حکم

سوال: والدین نے ایک جگہ میری شادی کردی، رخصتی کے بعد مجھے لڑکی پسند نہیں، تو کیا اب میں اس کو طلاق دے سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب: طلاق دینا شوہر کی ملکیت ہے وہ جس وقت چاہے طلاق دے سکتا ہے مگر بلا عذر شرعی طلاق دینا کراہت سے خالی نہیں۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ طلاق کی صورت میں والدین کی نافرمانی بھی لازم آتی ہے اس لیے حتی الامکان طلاق دینے سے گریز کیا جائے، اور اگر باوجود کوشش کے نباہ ممکن نہ ہو تو پھر طلاق دینا مباح ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وایقاعه مباح عند العامة لا طلاق الآیات اکمل وقیل قائله الکمال الاصح خطره ای منعه الا لحاجة کریبة وکبره۔ (الدر المختار علی ہامش ردّ المختار ج۲ ص۴۲۵ کتاب الطلاق) ؎۲

؎۱ و ؎۲ قال الشیخ وهبة الزحیلیؒ: ذهب الحنفیة علی المذهب الی أن ایقاع الطلاق مباح لاطلاق الآیات...... قال الکمال بن الهمام الاصح خطر الطلاق أی منعه الا لحاجة کریبة وکبر وزجر۔ قال ابن عابدینؒ: هذا الرأی ولیست الحاجة مختصة بالکبر والریبة بل هی اعم۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۳۶۲ المبحث الاول.... حکم الطلاق)

صرف طلاق کا خیال آنے سے طلاق نہیں ہوتی

سوال:- اگر کسی شخص کے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہو کہ میری بیوی مجھ پر طلاق ہے جبکہ ابھی تک اُس نے زبان سے یہ الفاظ ادا نہیں کیے ہیں، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- طلاق کے وقوع کے لیے الفاظِ طلاق کا زبان سے ادا کرنا لازمی اور ضروری ہے، نفسِ طلاق کا خیال آنے سے طلاق نہیں ہوتی۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: فقد افاد ان رکنه ای الطلاق اللفظ الدال علیٰ ازالة حل المحلیة۔ (البحر الرائق ج۳ ص۲۵۲ کتاب الطلاق) [1]

شک کی صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی

سوال:- اگر کسی شخص کو طلاق کی تعداد میں شک پڑ جائے کہ اُس نے بیوی کو ایک طلاق دی ہے یا دو یا تین، تو اس صورت میں اس شخص کی بیوی پر کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

الجواب:- تعدادِ طلاق میں شک پڑ جانے چونکہ عددِ اقل متیقن ہوتا ہے وہی واقع ہوگا حتیٰ کہ اس کو اکثر کا یقین ہو جائے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بصورتِ شک دو طلاق واقع ہوں گی، تاہم اگر تین طلاق کا گمان زیادہ ہو تو تین ہی واقع ہوں گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: رجل حلف بالطلاق وشك انه طلق واحدة او ثلاثاً فهی واحدة حتیٰ یستیقن او یکون اکثر ظنه علیٰ خلافه۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۲ ص۱۲ کتاب الطلاق) [2]

---

[1] قال الشیخ وهبة الزحیلی: یشترط بالاتفاق القصد فی الطلاق وهو ارادة التلفظ به ولو لم ینوه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۳۶۸ المبحث مایشترط فی الرکن الثانی للطلاق القصد)

[2] قال الشیخ الدکتور وهبة الزحیلی ومن شك فی صفة الطلاق: انه طلقها رجعیة او بائنة یحکم بالرجعیة لانها اضعف الطلاقین فکانت متیقناً بها۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۴۵۷ المبحث السادس الشك فی الطلاق)

مرض الموت کی طلاق سے حق وراثت ختم نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک شخص نے مرض الموت کی حالت میں بیوی کو طلاق دی، اسکے چند دن بعد وہ اس بیماری سے فوت ہوگیا تو کیا اس مطلّقہ عورت کو خاوند کی میراث سے حصّہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مرض الوفات میں طلاق دینے سے خاوند کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید اس نے بیوی کو میراث سے محروم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہو، اس لیے ازروئے شرع مرض الموت میں طلاق دینے سے عورت کا حق میراث ختم نہیں ہوتا۔

لمافی الھندیۃ: الرجل اذا طلق امرأتہ طلاقًا رجعیًا فی حال صحتہ اوفی حال مرضہ برضاھا اوبغیر رضاھا ثم مات وھی فی العدۃ فانھما یتوارثان بالاجماع۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المریض) [۱]

فاحشہ عورت کو طلاق واجب نہیں مستحب ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص کی بیوی آوارہ پھرتی رہتی ہو اور خاوند کی طرف سے پابندی کو ایک بوجھ سمجھ کر ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کرتی ہو یہاں تک کہ اس سے فسق وفجور میں مبتلا ہونے کا خطرہ بھی ہو تو ایسی حالت میں عورت کو طلاق دینا شرعًا کیسا ہے؟

الجواب:۔ فاحشہ اور فاسقہ عورت کے بارے میں اس کے خاوند کو فکرمند ہونا چاہیئے اوّلین فرصت میں اس کی اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیئے، ممکن ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرکے فسق وفجور سے باز آجائے، لیکن اگر خاوند تمامتر کوشش کے باوجود اس کی اصلاح سے کُلّی طور پر ناامید ہوجائے تو پھر ایسی عورت کو طلاق دینا مستحب ہے تاہم واجب نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللّٰہ: بل یستحب (ای الطلاق) لومؤذیۃ اوتارکۃ صلٰوۃ۔ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ: اطلقہ فشمل المؤذیۃ لہٗ او لغیرہ بقولھا۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۴۵۱ کتاب الطلاق) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: الطلاق اذا کان رجعیًا فانھا ترثہ وکذا یرثھا لو ماتت فی العدّۃ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۵۶۷ باب طلاق المریض)

ومثلہٗ فی کنز الدقائق علٰی ھامش البحر الرائق ج ۴ ص۴۲ باب طلاق المریض۔

وفیہ کذلک فی موضع آخر۔لا یجب علی الزوج تطلیق الفاجرۃ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص۳۱۸ فصل فی المحرمات، مطلب فیما لو زوج المولیٰ أمتہ) [۱]

طلاق کے لیے خاوند پر جبر کرنے کا حکم

سوال:۔ کن صورتوں میں خاوند پر جبر و اکراہ کرکے طلاق حاصل کی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ طلاق میں خاوند مستقل ہے، طلاق حاصل کرنے کے لیے اس پر جبر کرنا اس کے حقوق میں دخل اندازی کے مترادف ہے، تاہم لعان کی صورت میں جب خاوند طلاق نہ دے تو قاضی میاں بیوی کے درمیان تفریق کرسکتا ہے، ایسے ہی ظہار میں کفارہ کی ادائیگی یا طلاق دینے پر مجبور کرسکتا ہے۔

لما فی الھندیۃ : المظاھر إذا لم یکفر ورفع امرہ الی القاضی یحبسہ القاضی حتی یکفر او یطلق ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۵۰۷ الباب التاسع فی الظھار) [۲]

والدین کی رضامندی کے لیے بیوی کو طلاق دینا

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی میں کوئی شرعی نقص نہیں کہ جس کی وجہ سے اُسے طلاق دیدی جائے لیکن خاوند کے والدین اور بیوی کا آپس میں اکٹھا رہنا مشکل ہے، ایسی حالت میں کیا یہ شخص محض والدین کی رضامندی کے لیے بیوی کو طلاق دے سکتا ہے؟

الجواب:۔ والدین کی رضامندی کے لیے بیوی کو قربان کرنا اگرچہ بیٹے کی فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ ہے، لیکن ایسی حالت میں جبکہ عورت کا کوئی جرم بھی نہ ہو ایک عورت کی زندگی سے کھیلنا

---

[۱] قال ابن نجیم المصریؒ : وفی غایۃ البیان یستحب طلاقھا اذا کانت سلیطۃ مؤذیۃ او تارکۃ للصلوٰۃ۔ الخ (البحر الرائق ج ۳ ص۲۳۷ کتاب الطلاق)

وفیہ ھکذا۔ وفی المجتبیٰ من آخر الحظر والاباحۃ لا یجب علی الزوج تطلیق الفاجرۃ ولا علیھا تسریح الفاجر۔ (البحر الرائق ج ۳ ص۱۰۱ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)

[۲] وقال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : وعلیھا ان تمنعہ من الاستمتاع حتی یکفر وعلی القاضی الزامہ بہ بالتکفیر دفعًا للضرر عنھا بحبس او ضرب الی ان یکفر او یطلق۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص۶۲۶ باب الظھار)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۵۴۴ باب الظھار۔ مطلب بلاغات محمد سنۃ)

اور اس کو جدائی کی وادی میں دھکیلنا یا اپنے آپ کو جدائی کے نا قابل برداشت بوجھ کے نیچے دبانا کسی بڑے امتحان سے کم نہیں، عام معاشرہ میں حضرت عمرؓ جیسے والد کس کو نصیب ہوتے ہیں کہ جس سے ابن عمرؓ کے کردار کی توقع رکھی جاسکے، اس لیے والدین کی رضامندی کے لیے طلاق دینا اگرچہ جائز ہے لیکن حالات پر نظر رکھنے کے بغیر یہ اقدام کرنا کسی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط (النساء آیت ۱۲۹)

وایضاً قال: وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللهِ هُزُوًا ط (سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۱) لہ

مطلقہ کی میراث کا حکم

سوال:- اگر عدت کے دوران مطلقہ کے خاوند کا انتقال ہو جائے تو کیا مطلقہ معتدۃ کو خاوند کی جائیداد میں ارث کا حق مل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر عورت کے مطالبہ پر خاوند نے طلاق (دی) ہو تو ایسی حالت میں مطلقہ حق وراثت سے محروم رہے گی اسکے علاوہ چونکہ معتدۃ خاوند کے نکاح میں پابند رہتی ہے اس لیے اس کو میراث سے حصہ ملے گا اگرچہ عورت مطلقہ مغلظہ ہی کیوں نہ ہو۔

لما فی الھندیۃ: الرجل اذا طلق امرأته طلاقاً رجعیاً فی حال صحته او فی حال مرضه برضاها او بغیر رضاها ثم مات وھی فی العدۃ فانھما یتوارثان....ولو طلقها طلاقاً بائناً او ثلاثاً ثم مات وھی فی العدۃ فكذلك عندنا ترث، الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المریض) ۲ہ

لہ وعن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه: قال كانت تحتی امرأة احبها وكان عمرؓ يكرهها فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلقها۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۴۲۱ کتاب الطلاق)

وقال الشیخ عبد الحقؒ فی شرح ھذا الحدیث: ان كان الحق فی جانب الوالدين فطلاقها واجب للزوم العقوق فی الحقوق وان كان فی جانب المرأة فان طلقها لرضاء الوالدين فھو جائز۔ (اللمعات شرح المشکوٰۃ)

۲ہ قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: اذا طلق المریض امرأته طلاقاً رجعیاً ورثت ما دامت فی العدۃ۔ وفیہ۔ ولو طلقها بائناً او ثلاثاً ثم مات وھی فی العدۃ فكذلك عندنا ترث۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۳ ص۵۷۷ الفصل العشرون فی طلاق المریض کتاب الطلاق)

ومثلہ فی رد المحتار ج۲ ص۵۶۷ باب طلاق المریض۔

بغیر رجوع کیے عدّت گذرنے پر عورت جُدا ہوگی

سوال :- ایک شخص نے بیوی سے غصّہ کی حالت میں کہا کہ "تو مجھ پر طلاق ہے" جبکہ اس وقت طلاق دینے کا ارادہ نہ تھا لیکن عورت کو ناچاقی کی وجہ سے کہہ دیا، اس کے بعد عورت والدین کے گھر چلی گئی، پانچ سال تک ان کے باہمی تعلقات نہیں رہے، اب وہ دونوں دوبارہ نکاح بحال کرنا چاہتے ہیں تو انہیں شرعاً کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے ؟

الجواب :- "تو مجھ پر طلاق ہے" کے الفاظ صریح ہیں، ایسے الفاظ میں نیت وارادہ کی ضرورت نہیں اس کے بغیر بھی طلاق ہوجاتی ہے ، صورت مذکورہ میں چونکہ ایک طلاق واقع ہوکر عدت گذر گئی ہے، اگرچہ عدت کے دوران خاوند کیلئے رجوع بالقول یا بالفعل کافی تھا لیکن رجوع کے بغیر عدت گذرنے سے عورت جدا ہوگئی ہے، اب دونوں باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کے ذریعے دوبارہ اپنا گھر آباد کرسکتے ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : والرجعی لا یزیل الملک الا بعد مضی العدۃ ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۵۲۶ کتاب الطلاق ، باب الرجعۃ)[۱]

مطلّقہ مغلّظہ کا خاوند کے گھر رہنا

سوال :- ایک شخص نے بیوی کو طلاقِ مغلّظہ دے کر فارغ کردیا ہے، حلالہ کے لیے تیار نہ ہونے کی وجہ سے اگر یہ عورت خاوند کے گھر میں بطور خادمہ کے رہے تو کیا یہ جائز ہے ؟

الجواب :- اگر خاوند فاسق فاجر نہ ہو اور اس سے زنا کا خطرہ نہ ہو تو مطلّقہ مغلّظہ کا بطور خادمہ خاوند کے گھر میں رہنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم پھر بھی احتیاط ضروری ہے تاکہ کسی قسم کی بے راہروی میں مُبتلا نہ ہو۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : سئل شیخ الاسلام عن زوجین افترقا ولکل منھما ستون سنۃ وبینھما اولاد تتعذر علیھما مفارقتھم فیسکنان فی بیتھم ولا یجتمعان

---

[۱] قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ : فما دامت العدّۃ باقیۃ کانت ولایۃ الرجعۃ باقیۃ واذا انقضت من غیر رجعۃ بانت ۔ (العنایۃ شرح الھدایۃ علی ھامش فتح القدیر ج ۳ ص ۳۵۲ باب ایقاع الطلاق ، کتاب الطلاق)

ومثلہ فی البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۳ ص ۲۵۶ باب الطلاق ۔

فی فراش ولا یلتقیان التقاء الازواج ھل لھما ذلک قال نعم ۔
(الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۷۵ باب العدۃ۔کتاب الطلاق) [۱]

عدّت گذرنے میں عورت کے بیان پر اعتماد کرنا

سوال:۔ اگر کسی عورت نے یہ کہا کہ میرا خاوند فوت ہوگیا ہے اور اس کے بعد میری عدت گذر گئی ہے، تو کیا اس کے بیان کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر عورت کا بیان غلبۂ ظن کا مفید ہو اور اس کے بیان میں سچائی کی طرف میلان زیادہ ہو تو اس سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم بہتر یہ ہوگا کہ عورت کے بیان کو معاشرہ کے حالات کے مطابق پرکھا جائے، قرائنِ خارجیہ کا سہارا لیے بغیر شاید صرف اس عورت کا بیان ظن کے لیے مفید نہ بن سکے ۔

لما فی الھندیۃ: ولو ان امرأۃ قالت لرجل ان زوجی طلقنی ثلاثاً وانقضت عدتی فان کانت عادلۃ وسعہ ان یتزوجھا وان کانت فاسقۃ تحری وعمل بما وقع علیہ تحریہ کذا فی الذخیرۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۳۱۳ کتاب الطلاق۔الباب الثالث عشر فی العدۃ) [۲]

نفاس کی عدّتِ طلاق

سوال:۔ ایک آدمی نے حالتِ نفاس میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اب یہ عورت عدت گذارنے کے بغیر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت حیض کے آنے سے نا اُمید نہ ہوچکی ہو تو اس صورت میں اُس پر

---

[۱] وفی الھندیۃ: اذا طلقھا ثلاثاً او واحدۃ بائنۃ ولیس لہٗ الا بیت واحد فینبغی لہ ان یجعل بینھما حجاباً حتی لا تقع الخلوۃ بینہ وبین الاجنبیۃ ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۵۳۵ کتاب الطلاق۔الباب الثالث عشر فی العدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۵۳۵ کتاب الطلاق۔الباب الرابع عشر فی الحداد)

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وحل نکاح من قالت طلقنی زوجی وانقضت عدتی اوکنت امۃ فلان واعتقنی۔ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۹۸ کتاب الطلاق۔باب العدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۱ ص۴۲۱ کتاب الطلاق باب العدۃ۔

تین حیض گذارنا لازم ہیں اور اگر سنِ ایاس کو پہنچنے کی وجہ سے حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہو تو اس صورت میں تین ماہ کی عدت گذارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، بہرحال عدت گذارنا ضروری ہے۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذا طلق الرجل امرأتہ وھی حرۃ ممن تحیض فعدتھا ثلاثۃ اقراء۔ (الھدایۃ ج۲ ص۴۲۲ کتاب الطلاق۔ باب العدۃ)[1]

نومسلم عورت کی عدت کا حکم

سوال:۔ اگر ایک عورت اسلام سے مشرف ہو جائے اور اس کا خاوند اسلام قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو یہ عورت اگر کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی عدت کیا ہو گی؟

الجواب:۔ مسلمان عورت کا خاوند اگر اسلام قبول کرنے سے انکار کر رہا ہو تو یہ عورت کسی غیر مسلم شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتی، اس لیے مسلمان حاکم یا قاضی خاوند کے اسلام لانے سے انکار کے بعد دونوں کے درمیان جدائی کا حکم صادر کرے گا جو عورت کے حق میں طلاق شمار ہو گی، ایک اسلامی ملک اور معاشرہ میں رہائش رکھتے ہوئے عورت کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے کہ عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کرے۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا اسلمت المرأۃ وزوجھا کافر عرض علیہ الاسلام فان اسلم فھی امرأتہ وان ابی فرق القاضی بینھما و کان ذلک طلاقاً عند ابی حنیفۃ ومحمد رحمھما اللہ تعالیٰ۔

(الھدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۳ ص۲۸۸ کتاب النکاح۔ باب نکاح اہل الشرک)[2]

---

[1] وفی الھندیۃ: واذا طلق الرجل امرأتہ ..... وھی ممن تحیض فعدتھا ثلاثۃ اقراء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۵۲۶ کتاب الطلاق۔ باب الثالث عشر فی العدۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۲ ص۶۵۱ کتاب الطلاق، باب العدۃ۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: واذا اسلم احد الزوجین المجوسیین او امرأۃ الکتابی عرض الاسلام علی الآخر فان اسلم فبھا والا بان ابی او سکت فرق بینھما۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۲ ص۴۲۲ باب نکاح الکافر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۳ ص۲۱۲ باب نکاح الکافر۔

تجھے طلاق دی، دی، دی، سے تین طلاق کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی، دی، دی، تو کیا اس سے ایک طلاق واقع ہوگی یا تین؟ جبکہ اس کی نیت بھی تین ہی کی ہو؟

الجواب: جب کسی آدمی کی نیت ایسے الفاظ سے تین طلاق کی ہو تو اس سے تین طلاق واقع ہوں گی اور بدون حلالہ شرعی کے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے حلال نہیں ہو سکتے۔

لما فی الهندیة، ولو قالت مرا طالق کن، مرا طالق کن، مرا طالق کن۔ فقال کردم، کردم، کردم، تطلق ثلثا وهو الاصح۔ (الفتاویٰ الهندیہ ج ۱ ص۳۸۴ کتاب الطلاق) [1]

بنتِ فلاں کو طلاق ہو، کا شرعی حکم

سوال: ایک شخص نے کئی آدمیوں کے سامنے یہ کہا کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو فلاں کی بیٹی (اپنے سسر کا نام لیا) کو طلاق ہو، چند دنوں بعد ہی اس نے وہی کام کر لیا، اب وہ شخص یہ کہتا ہے کہ ان الفاظ میں میں نے اپنی سالی کی نیت کی تھی بیوی کی نہیں، تو کیا شریعتِ مقدسہ کی رو سے موصوف کی بیوی کو طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کے مطابق موصوف کا متعلقہ کام سرانجام دینے کے بعد اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی، قضاءً اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں، دیانتًا اور معاملہ ہے۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: ولکذا قال بنت فلان طالق ذکر اسم الاب ولم یذکر اسم المرأة وامرأته بنت فلان وقال لم اعن به امرأتی لا یصدق قضاءً وتطلق امرأته۔ (الفتاویٰ قاضی خان ج ۲ ص۲۱۵ کتاب الطلاق)

---

[1] لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: **الجواب:** یہ زبان سے کہا ہے کہ میں نے طلاق دے دی، دے دی، دے دی، اگر دمیرا کریا کرتی ہو الخ دیکھا جائے گا کہ اس کا مطلب کیا تھا، اگر مطلب یہ تھا کہ گو اب تک نہ دی تھی مگر اب دے دی تب تو تین طلاق واقع ہوگئیں، بدون حلالہ تجدید نکاح درست نہیں۔ الخ

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۴۳۰ کتاب الطلاق)

لفظ تلاق سے طلاق کے وقوع کا حکم

سوال:۔ ایک عورت نے اپنے شوہر پر دعوی کیا کہ اس نے مجھے طلاق دیدی ہے جبکہ اس کے شوہر کا کہنا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ میری بیوی کو تلاق ہو یعنی تا کے لفظ کہا ہے طا کے ساتھ نہیں، تو کیا لفظ تلاق سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ طلاق کے معاملہ میں اگر قا یا لام کے کلمات کو کچھ تبدیل کردیا جائے اور لام کا کلمہ اپنی حالت پر رہے تو اس سے قضاءً طلاق واقع ہوجاتی ہے، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں بھی تلاق کے لفظ سے طلاق واقع ہوگئی ہے اور عورت کا دعوی صحیح ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقع بھا ای بھذہ الالفاظ وما بمعناھا من الصریح ویدخل نحو طلاغ وتلاغ وطلاک وتلاک۔ قال ابن عابدینؒ، ومنہ الالفاظ المصحفة وھی خمسة فزاد علی ماھنا تلاق۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۳ ص۲۴۸ کتاب الطلاق، باب الصریح) لہ

طلاق نامہ میں بیوی کے باپ کا نام غلط لکھنا مانع وقوع طلاق نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق نامہ ارسال کیا جس کا متن یہ ہے: "کہ من مسمی محمد عمران بن محمد سلطان نے اپنی بیوی سعیدہ بنت سعیدالرحمن کو تین طلاق دیدی ہے" جبکہ سعیدہ کے والد کا نام عبدالرحمن ہے، تو کیا اس طلاق نامہ سے سعیدہ پر طلاق واقع ہوچکی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب طلاق میں کسی اضافت سے اپنی منکوحہ کا قصد و ارادہ ہو تو باپ کا نام غلط لکھا جانا مانع وقوع طلاق نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں محمد عمران کی بیوی سعیدہ پر تین طلاق سے مطلقہ مغلظہ ہوچکی ہے جو بدون حلالہ شرعی کے موصوف کے لیے حلال نہیں۔

لما فی الھندیة: قال امرأته عمرة بنت صبیح طالق وامرأته عمرة بنت حفص

لہ قال العلامة ابن نجیمؒ: ومنہ الالفاظ المصحفة وھی خمسة تلاق وتلاغ وطلاغ وطلاک وتلاک فیقع قضاء ولا یصدق الا اذا اشھد علی ذلک قبل التکلم۔
(البحرالرائق ج ۳ ص۲۵۲ کتاب الطلاق، باب الصریح)

ولا نیۃ لہ لا تطلق...... وان نوی امرأتہ فی ھٰذہ الوجوہ طلقت امرأتہ فی القضاء وفیما بینہ وبین اللّٰہ کذا فی خزانۃ المفتین۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۳۶۳ الفصل الاول فی الطلاق الصریح، مطلب اذ شک انہ طلق الخ) [۱]

کسی جاہل سے امرأتی طالق کے الفاظ کہلوانے کا حکم

سوال: ایک صاحب نے ایک جاہل آدمی سے کہا کہ تم یہ الفاظ کہو کہ امرأتی طالق، تو اس نے یہ الفاظ کہہ دیئے، حالانکہ یہ الفاظ کہنے والا نہ تو ان کے معانی کو جانتا ہے اور نہ اس کی نیت طلاق کی تھی، تو کیا اس سے طلاق واقع ہو گئی یا نہیں؟

الجواب:۔ الفاظ صریح میں اگرچہ نیت کی ضرورت نہیں تاہم وقوع طلاق کیلئے ضروری ہے کہ طلاق کی اضافت میں بیوی کا قصد و ارادہ ہو، اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی، لہٰذا بشرط صحت سوال صورت مذکورہ میں اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولکن لابد فی وقوعہ قضاء ودیانۃ من قصد اضافۃ لفظ الطلاق الیہا عالماً بمعناہ ولم یصرفہ الیٰ ما یحتملہ کما افادہ فی الفتح وحققہ فی النہر احترازاً عما لو کرر مسائل الطلاق بحضرتہا او کتب ناقلاً من کتاب امرأتی طالق مع التلفظ او حکی یمین غیرہ فانہ لا یقع اصلاً ما لم یقصد زوجتہ وعما لو لقنتہ لفظ الطلاق فتلفظ بہ غیر عالم بمعناہ فلا یقع اصلاً علیٰ ما افتی بہ مشائخ۔ (رد المحتار ج۲ ص۵۹۳ کتاب الطلاق)

تیرا میرا معاملہ ”ختم“ کہنے کے نکاح پر اثرات

سوال:۔ میاں بیوی کے ما بین کسی وجہ سے تلخ کلامی پیدا ہوگئی تو شوہر نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ، اسلئے کہ میرا اور تیرا معاملہ ختم

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وکذا لو قال بنت فلان طالق ذکر اسم الاب ولم یذکر اسم المرأۃ وامرأتہ بنت فلان وقال لم اعن امرأتی لا یصدق قضاءً وتطلق امرأتہ۔

(البحر الرائق ج۳ ص۲۵۳ کتاب الطلاق، باب الصریح)

ہو چکا ہے، تو کیا ان دونوں کا نکاح برقرار ہے۔ یا ختم ہو چکا ہے؟

الجواب:۔ "میرا تیرا معاملہ ختم ہو چکا ہے" یہ الفاظ طلاق کنائی کے ہیں، اگر شوہر نے اس سے طلاق کی نیت کی ہو تو اس کی بیوی مطلقہ بائنہ ہو چکی ہے ورنہ الفاظ لغو ہیں۔

لما فی الهندیة: لم یبق بینی وبینك عمل ونوی یقع۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۳۷۶ کتاب الطلاق، الفصل الخامس فی الکنایات)

اثباتِ طلاق کے لیے باپ کی گواہی کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک مسئلہ در پیش ہے کہ ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کے خاوند نے اسے تین طلاق دی ہیں جبکہ اس کا خاوند اس بات کا منکر ہے، عورت گواہی میں اپنے باپ اور ایک ہمسایہ کو پیش کرتی ہے، کیا اس گواہی سے عورت کا دعویٰ طلاق درست ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دعویٰ طلاق کے اثبات کے لیے دیگر مقدمات کی طرح دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے بشرطیکہ گواہوں میں کوئی ایسا گواہ نہ ہو جس کی گواہی سے اقربا پروری کی تہمت لگ سکتی ہو۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں اثباتِ طلاق کا ایک گواہ عورت کا باپ ہے جس کی گواہی اس دعویٰ طلاق کے اثبات کے لیے شرعاً درست نہیں، لہٰذا ایک گواہ سے دعویٰ ثابت نہیں ہوسکتا اس لیے عورت پر وقوعِ طلاق کا فیصلہ کرنا مشکل ہے، تاہم اگر واقعتاً ایسا معاملہ ہو چکا ہو تو عورت کسی اور ذریعہ (خلع) سے شوہر سے جدائی اختیار کرسکتی ہے۔

لما فی الهندیة: لاتجوز شهادة الوالدین لولدیهما۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۴۶۹ باب الشهادة) لہ

تعدادِ طلاق میں شک ہو تو

سوال:۔ اگر کسی شخص کو یہ شک پڑ جائے کہ اس نے بیوی کو دو طلاق دی ہیں یا تین، تو کیا یہ شخص بیوی سے رجوع کرسکتا ہے یا یہ کہ حلالہ شرعی لازمی ہے؟

الجواب:۔ اگر کسی شخص کو تعدادِ طلاق میں شک پڑ جائے تو اس کو چاہیئے کہ وہ

لہ قال المرغینانیؒ: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لابویه ولا جداده والاصل فیه قوله علیه السلام لایقبل شهادة الولد لوالده ولا الوالد لولده ولا المرأة لزوجها الخ۔ (الهدایة ج ۳ ص ۱۶۱ کتاب الشهادة، فصل من یقبل شهادته ومن لایقبل)

کم عدد پر عمل کرے اس لیے کہ وہ یقینی ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق عورت پر دو طلاق واقع ہوچکی ہیں اور طلاق رجعی ہونے کی بناء پر آدمی رجوع کرسکتا ہے۔
لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو شك اثنتان أو واحدة او اکثر بنی علی الاقل۔
(الدرالمختار علی صدر رد المحتار ج۲ ص۳۸۳ باب الصریح)[1]

رجوع میں بیوی کی رضامندی شرط نہیں

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے دی، اب وہ اپنے اس اقدام پر نادم اور پشیمان ہے، گواہوں کے سامنے اس نے رجوع کا اعلان کیا ہے لیکن بیوی نہیں مانتی وہ کہتی ہے کہ مجھے رجوع قبول نہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عورت کی رضامندی کے بغیر خاوند رجوع کرسکتا ہے؟

الجواب: ۔ فقہ حنفی کی رُو سے طلاقِ رجعی میں نکاح زائل نہیں ہوتا صرف عدد میں کمی آتی ہے، اس لیے خاوند کے رجوع کرنے کے لیے بیوی کی رضامندی شرط نہیں، منکوحہ راضی ہو یا نہ ہو لیکن جب خاوند باقاعدہ رجوع کرے تو دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔

لما فی الهندیة: واذا طلق الرجل امرأته تطلیقة رجعیة او تطلیقتین فله ان یراجعها فی عدتها رضیت بذلك اولم ترض۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۷۰ کتاب الطلاق۔ الباب السادس فی الرجعة)[2]

○

---

[1] وفی الهندیة: عن محمدؒ اذا شك فی انه طلق واحدة او ثلاثا فهی واحدة حتی یستیقن او یکون اکبر ظنه الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۳۶۳ کتاب الطلاق۔ الفصل الثانی فی طلاق الصریح)

[2] قال الحصکفیؒ: وتصح الرجعة بتزوجها فی العدة۔ وفیه: ان لم یطلق بائنا فان ابا بها فلا وان أبت۔ قال ابن عابدینؒ: ای سواء رضیت بعد علمها او أبت۔
(رد المحتار ج۲ ص۵۷۶ کتاب الطلاق۔ باب الرجعة)
وَمثلُهٗ فی فتح القدیر ج۴ ص۱۴ کتاب الطلاق۔ باب الرجعة۔

موجودہ جج قاضی شرعی کے قائم مقام ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک عورت نے کسی مرد سے شادی کی، شادی کے چند ماہ بعد شوہر نے بیوی کو نان ونفقہ دینا چھوڑ دیا، کئی بار علاقائی جرگوں کے ذریعے اُسے سمجھانے کے باوجود وہ لیت ولعل سے کام لیتا رہا، آخر کار عورت نے مجبور ہو کر عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دیا، عدالتی حکم پر شوہر صرف ایک بار عدالت میں حاضر ہوا، اس کے بعد عدالتی اطلاع اور سمن کے باوجود عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ آخر کار عدالت نے عورت کے حق میں تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کر دی۔ اب دریافت طلب امر یہ کہ:۔

(۱) کیا موجودہ عدالتوں کے جج صاحبان قاضی شرعی کے قائم مقام ہیں یا نہیں؟
(۲) کیا ان عدالتوں کے جج صاحبان بیوی کو نان ونفقہ نہ دینے والے شوہر کی بیوی کی درخواست پر اس کا نکاح فسخ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ پاکستان کے فیملی لاء میں سے بعض کا تعلق قضاء قاضی کے ساتھ ہے بغیر اس کے وہ حکم تمام نہیں ہوتا، مگر قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ گورنمنٹ یعنی حاکمِ وقت کا مقرر کردہ ہو، بغیر حاکم کی اجازت کے کوئی شخص قاضی یا جج نہیں بن سکتا۔

قال الامام ماوردیؒ: والثانی لان التقلید لایصح الا من جهته وایضاً فتقلید القضاء من جهته فرض یتعین علیه ۔ (ادب القاضی ج۱ ص۱۳۷)

اگرچہ حکومت کسی فاسق وفاجر یا کافر کی ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: فیه دلیل علیٰ جواز التقلید من الکافر المسلم الجائر بالاولیٰ۔ (اعلاء السنن ج۱۵ ص۵۴ کتاب القضاء، باب صحة تقلد القضاء...الخ)

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ: ”جو گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کا اختیار رکھتے ہیں اگر وہ مسلمان ہوں اور شرعی قاعدہ کے موافق فیصلہ کریں تو ان کا حکم بھی قضاء قاضی کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔“ (حیلۂ ناجزہ ص۱۴۸ المرقومات للمظلومات)

اس لیے موجودہ جج ومجسٹریٹ وغیرہ جو گورنمنٹ کی طرف سے ان احکامات کے اجراء کیلئے مقرر ہوں قاضی شرعی کے قائم مقام ہیں بشرطیکہ فیصلہ شرعی قواعد کے مطابق ہو۔

اسی طرح جو شخص بیوی کو باوجود وسعت کے نان ونفقہ نہ دیتا ہو اور نہ ہی اُسے طلاق دینے پر آمادہ ہو اور نہ خلع کرنا چاہتا ہو تو اگرچہ حنفیہ کے ہاں عورت کو نکاح کی تنسیخ کی

اجازت نہیں مگر بناء بر مجبوری متاخرین علماء نے مالکیہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے بشرطیکہ شوہر طلاق یا خلع سے بھی انکاری ہو اور نان ونفقہ بھی نہ دیتا ہو اور عورت کے نان ونفقہ کا کوئی متبادل انتظام بھی نہ ہوسکتا ہو جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں مذکور ہے کہ بار بار سمجھانے اور وسعت کے باوجود شوہر بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور طلاق وغیرہ سے کنارہ کشی کر رہا ہے تو عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے اس مسئلہ کے حل کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اب اگر عدالت تحقیقِ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے عورت کو تنسیخِ نکاح کی ڈگری جاری کردے تو یہ عورت شوہر کے نکاح سے آزاد ہوجائے گی اور عدت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

لما قال الشيخ وهبة الزحيلي : لا يجوز في مذهب الحنفية والامامية التفريق لعدم الانفاق ، اجاز الائمة الثلاثة التفريق لعدم الانفاق .... والراجح لدى رأى الجمهور لقوة ادلتهم ودفعاً للضرر عن المرأة ولاضرر ولاضرار في الاسلام۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۷ ص۵۱۲ كتاب الطلاق)

(وهكذا في الحيلة الناجزة ص۷۳ حكم زوجه متعنت)

برطانیہ میں شریعت کونسل کی طرف سے فسخ نکاح کے فیصلے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب!

یہاں برطانیہ کی شریعت کونسل نے ایک مقدمہ میں مدعیہ کے حق میں فسخ نکاح کی ڈگری جاری کی ہے، اب آنجناب سے عرض ہے کہ قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں، اس مقدمہ کا پس منظر یہ ہے کہ:۔

مسمی صفدر زمان نے ۱۹۸۳ء دسمبر میں بی بی فاطمہ سے پاکستان میں شادی کی اور کچھ عرصہ بعد انگلینڈ آگئے، پانچ سال تک اچھے تعلقات رہے، اس کے بعد اُس نے ظلماً بی بی فاطمہ کو گھر سے نکال دیا اور وہ اس وقت سے اب تک (تقریباً بارہ سال سے) بہن کے گھر بیٹھی ہوتی ہے، کوئی بھی اسے منانے نہیں آیا، اس دوران صفدر زمان نے دوسری شادی کرلی جس سے اس کی چار بچیاں بھی ہوگئی ہیں، چونکہ صفدر زمان نہ تو بی بی فاطمہ کو طلاق دینے پر تیار تھا اور نہ آباد کرنے کے لیے، مجبوراً بی بی فاطمہ نے شرعی کونسل برطانیہ میں دعویٰ دائر کردیا، ایک سال تک کیس چلتا رہا، اس کے بعد شریعت کونسل نے بی بی فاطمہ کے حق میں فسخ نکاح کی ڈگری جاری

کر دی اور لکھ دیا کہ بی بی فاطمہ عدت گذار کر نکاح ثانی کر سکتی ہے۔
شریعت کونسل برطانیہ کے چیئرمین مفتی محمد اسلم صاحب ہیں، دیگر ممبران حضرات بھی علماء کرام ہیں، مفتی صاحب جمعیۃ علماء برطانیہ کے جنرل سیکریٹری بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا محمد امداد اللہ قاسمی صاحب خطیب مسجد حمزہ برمنگھم فاضل بنوری ٹاؤن کراچی، مولانا حافظ محمد نگین صاحب خطیب جامع مسجد سینٹ البن شاگرد حضرت غور غشتی رح، مولانا محمد زمان صاحب فاضل جامعہ اشاعت القرآن حضرو ضلع اٹک بھی شریعت کونسل کے ممبر ہیں۔
فسخ نکاح کے فیصلہ نقل حاضر خدمت ہے۔
(بی بی فاطمہ۔ یوکے۔ انگلینڈ)

الجواب: اسلام نے کسی کو بھی دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں دیا ہے چاہیے وہ اس کا مملوک ہو یا منکوحہ ہو، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک اور برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی عورت کا شوہر ظالم ہو اور ہر وقت بیوی کو بلا وجہ زدوکوب کرتا رہتا ہو، سب وشتم سے اس کا جینا دوبھر کر رکھا ہو، نان ونفقہ سے بھی پہلوتہی کرتا ہو، بیوی کو نہ تو اچھے طریقہ سے آباد کرتا ہو اور نہ اس کو چھوڑتا ہو۔ تو مذہب مالکیہ کے مطابق ایسی مجبور عورت اپنی گلوخلاصی کے لیے عدالت میں دعویٰ کرنے کا حق رکھتی ہے اور عدالت پوری تحقیقات اور کوشش کے بعد صلح نہ ہونے کی صورت میں عورت کو تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کرنے کی مجاز ہے، تنسیخ نکاح کی ڈگری ملنے کے بعد عورت عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر کہیں شرعی عدالت نہ ہو یا دارالحرب ہو تو وہاں اس عہدہ کو پنچایت (جو کہ دیندار مسلمان ممبران پر مشتمل ہو) سنبھال سکتی ہے اور اس کی طرف سے جاری کی گئی تنسیخ نکاح کی ڈگری شرعی قواعد کے مطابق مقبول ہوگی اور اس کا بھی وہی مقام ہے جو کسی شرعی عدالت کے فیصلے کا ہوتا ہے۔ فقہ حنفی میں بھی بناء بر ضرورت شدیدہ دوسرے مذہب پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق برطانیہ میں شرعی عدالت کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہاں کی شریعت کونسل (جو ایک گونہ پنچایت ہے) اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی حقدار ہے اور اس فیصلہ نافذ العمل ہوگا۔ چونکہ بی بی فاطمہ کے نکاح کی تنسیخ کا فیصلہ بھی اس ضرورت شدیدہ کے تحت ہوا ہے کہ اس کا شوہر مسمی صفدر زمان نہ تو خلع کے لیے تیار تھا اور نہ طلاق دینے پر آمادہ تھا، اور نہ اس کو اچھی طرح آباد کرنے کے لیے تیار تھا، اس لیے شریعت کونسل کا تنسیخ کا یہ فیصلہ شرعاً

درست اور صحیح ہے، بی بی فاطمہ عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے اس کا نکاح شوہر اوّل سے ختم ہو چکا ہے۔

(۱) لما قوله تعالیٰ: وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۔ (الآیۃ) وقال الله تعالیٰ: فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (الآیۃ) وان البقاء مع عدم الانفاق ضرارۃ وامساك بغیر معروف وكان حقا علیه ان یطلق زوجة ولما لم یقم بذلك وقد تعین علیه قام القاضی مقامه فیه۔

قال صلی الله علیه وسلم لا ضرر ولا ضرار وان الامساك مع عدم الانفاق ضرارۃ وان الامساك مع عدم الانفاق مضارۃ وعلی القاضی ان یزیل الضرر یفك تلك العقد التی اصبحت ضررًا لامصلحة فیها۔ (الاحوال الشخصیۃ لابی زھرۃ ص۳۴۹)

(۲) فی مقدمات لابن رشد: ان تبین ان الضرر من قبل الزوج فرق بینهما بغیر غرم تغرمه المرأۃ۔ (الاحوال الشخصیۃ ص۳۶۴ التفریق للضرر ۲۷۴)

(۳) واجاز المالکیۃ التفریق للشقاق او للضرر منعا للنزاع وحتی لا تصبح الحیاۃ الزوجیۃ جحیما وبلاء۔ ولقوله علیه السلام لاضرر ولا ضرار و بناء علیه ترفع المرأۃ امرها للقاضی فان اثبت الضرر او صحۃ دعواها طلقها۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۷ ص۵۲۷ البحث الثالث التفریق للشقاق۔ الخ)

(۴) اگر کسی جگہ مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا اس کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کا قانوناً اختیار نہ ہو یا مسلمان حاکم قواعد شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو اس وقت مذہب امام مالکؒ کے موافق جس کا اختیار کرنا بضرورت شدیدہ حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے، مسلمانوں کی جماعت کا حکم بھی قضاء قاضی کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ محلہ یا بستی کے دیندار اور با اثر مسلمانوں کی ایک جماعت (جس کا عدد کم از کم تین ہو) کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا جائے اور وہ جماعت اس معاملے کی تحقیق کر کے شریعت کے مطابق فیصلہ کر دے۔

(حیلۂ ناجزہ ص۱۴۸-۳۴ المرقومات للمظلومات و تفریق بین الزوجین لحکم حاکم)

وھکذا فی اسلام کا مکمل نظام طلاق ص۲۰۹ تا ۲۱۱۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت

ہر دور میں سائنسی ایجادات نے کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ پیدا کیا ہے علماء اُمت اور مفتیان کرام نے شرعی نقطہ نظر سے ان ایجادات پر بحث وتحقیق کرتے ہوئے قرآن وسنت کے دلائل وشواھد کی روشنی میں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے پُرمغز مقالے، مضامین اور کتابیں تحریر فرمائیں جن کو اپنے اور بیگانے سب نے تسلیم کیا۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی بھی ان ہی سائنسی ایجادات کی کرشمہ سازی ہے جس میں انسانی تولید کے جدید (مگر حیا سوز اور اخلاقی باختہ) طریقے وضع کئے گئے ہیں۔

دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے اس کے جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کو دارالعلوم کے ترجمان ماھنامہ الحق نے اپنی اشاعت کی زینت بنایا۔ فتاوٰی اور فقہی مباحث کی مناسبت سے افادۂ عام کے لئے فتاوٰی دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت

نیک اور صالح اولاد انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی اور گراں مایہ سرمایہ ہے ، اولاد والدین کے لیے صرف دنیاوی عزت و افتخار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اُخروی سعادت اور نجات کیلئے بھی بہترین توشہ ہے ، اسلام میں اولاد کی زیادتی پر کوئی پابندی نہیں ، افرادی قوت کے اضافہ کے لیے اسلامی تعلیمات میں نکاح کی بار بار ترغیب دلائی گئی ہے ، پھر ایسی عورت سے نکاح کرنے کو ترجیح دی گئی ہے جو زیادہ بچے جننے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

تزوّجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الاُمم ۔ (ابوداؤد ، نسائی)

(ترجمہ) "تم ایسی عورت سے نکاح کرو جو اپنے خاوند سے محبت کرنے والی ہو ، جو زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو ، کیونکہ میں دُوسری اُمتوں کے مقابلے میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا ۔"

یہی وجہ ہے کہ جب ضبطِ تولید (FAMILY PLANNING) کی تحریک چلی تو علماءِ حق نے اس بے مقصد اور بے فائدہ تحریک کی شدید مخالفت کی ، بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا عقیدہ ہے کہ اولاد کا دینا یا نہ دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے ۔ اسباب اور وسائل اور ذرائع کا حصول اور استعمال اپنی جگہ ضروری اور مسنون ہے مگر اولاد جیسی نعمتِ عظمیٰ کے حصول کا توقف اور دار و مدار مشیتِ الٰہی پر موقوف ہے ، قرآنِ مجید میں اِس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے :۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (سورۃ الشوریٰ آیت ۴۹-۵۰)

(ترجمہ) "اللہ ہی کی ہے سب سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی ، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ، جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے اور

یا ان کو جمع کر دیتا ہے یعنی بیٹے اور بیٹیاں دونوں دے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے، بیشک وہ بڑا جاننے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔"

اس آیتِ کریمہ کے مطابق اولاد کے اعتبار سے افرادِ انسانی چند اقسام میں منقسم ہیں۔

(ا) ایسے افراد جن کو اللہ تعالیٰ بیٹیاں دیتا ہے جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی صرف بیٹیاں تھیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی تین یا دو بیٹیاں (زیتا اور زعورا) اور حضرت شعیب علیہ السلام کی دو (ریا، صفوریا) بیٹیاں تھیں۔

(ب) ایسے افراد جن کو بیٹے دے کر بیٹیوں سے محروم کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف بیٹے دیئے تھے آپؑ کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ اسماعیل، اسحٰق، مدین، مدائن، نعشان، زمران، نعشیق اور شیوخ۔

(ج) ایسے افراد جن کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں دے کر دونوں نعمتوں سے نوازتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ اور تین یا چار بیٹے بھی عطا فرمائے، قاسمؓ، طاہرؓ وطیبؓ اور ابراہیمؓ۔

(د) آخر الذکر وہ قسم ہے جن کو اللہ تعالیٰ ہر دو نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے انبیاء ہیں جو اولاد سے محروم رہے۔

اگرچہ نوعِ انسانی کی یہ تمام اقسام معاشرہ کے عام افراد میں پائی جاتی ہیں لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکرہ سے مقصد یہ ہے کہ نبی ہونے کے باوجود بیٹے یا بیٹی سے محروم ہونے میں یہ سبق ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بیٹوں کے دائرے میں محبوس کر دیتا ہے تو وہ بیٹی کے لیے ترستا ہے اور کسی کی زندگی بھر میں صرف ایک بیٹی ہوتی ہے اور وہ بیٹے کے حصول کے لیے سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوتا ہے لیکن مرتے دم تک اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوتی، عربی میں اسے "عقیم" اور اردو میں "بانجھ" کہتے ہیں۔

بانجھ پن کے اسباب

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لانے کے باوجود اولاد کا نہ ہونا مشیتِ الٰہی

کا نتیجہ ہے، ممکن ہے کہ میاں اور بیوی میں ہر لحاظ سے (بچے کی پیدائش کی) صلاحیت موجود ہو لیکن جب اللہ تعالیٰ ہی نہ چاہے تو دُنیا بھر میں گھومتے اور بہتر سے بہتر علاج کرانے کے باوجود محروم ہمیشہ کے لیے محروم ہی رہتا ہے۔

اس باطنی اور حقیقی سبب کے علاوہ "اہل طبائع" کے نزدیک کچھ ظاہری اسباب اور عوامل کا بھی اثر رہتا ہے، اگرچہ امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں اس کا سختی سے انکار کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کسی کے نطفہ میں بچے کی پیدائش کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا نتیجہ ہے طبعی اسباب کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں، لیکن زیرِ نظر مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے ہمیں ان طبعی اسباب کو مدِنظر رکھنا ہوگا تاکہ اصل مسئلہ کے فہم وادراک میں کوئی دشواری نہ رہے۔ جملہ ضروری اور موقوف علیہ امور اور وسائل و ذرائع کے اختیار کر لینے کے باوجود اولاد نہ ہونے کے چند عوارض ہو سکتے ہیں، مثلاً:۔

(ا) ممکن ہے کہ مرد کے مادۂ تولید یعنی نطفہ میں وہ صلاحیت ہی نہ ہو کہ جس سے بچہ پیدا ہو۔

(ب) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصور عورت کی طرف سے ہو، عورت میں قصور ہونے کے مختلف اسباب ہیں، کبھی مادۂ تولید میں صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض اوقات مادۂ تولید میں صلاحیت تو موجود ہوتی ہے لیکن "رحم" میں استقرار کی طاقت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے نطفہ مقررہ مُدت تک "رحم مادر" میں نہیں رہ سکتا۔ انفرادی نقصان کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس جوڑے کے درمیان جدائی ہو جائے تو کسی ایک طرف کے ذی صلاحیت ہونے کی صورت میں کسی دوسرے ذی صلاحیت فرد سے رشتہ ہو جانے کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ پہچان لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔

(ج) ممکن ہے کہ دونوں جانب قصور کی وجہ سے یہ جوڑا عمر بھر بچے کی نعمت سے محروم رہے، جوڑے کی تبدیلی کے باوجود کسی ایک طرف سے ثمر آور ہونے کی اُمیدیں بہت کم ہوتی ہیں۔

بانجھ پن کے علاج کی ممکنہ صورتیں

بانجھ پن کے علاج کی جدید صورت "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ اس سے بانجھ پن کی تمام صورتوں کا علاج ممکن ہے کیونکہ اس طریقۂ علاج کے باوجود کئی محروم جوڑوں کی نا امیدی نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے یہ تجربہ گیارھویں مرتبہ کامیاب ہوا ہے۔ گویا متعلقہ ڈاکٹروں کی شبانہ روز کوششوں کے باوجود اگر سو بیماروں کا علاج کیا گیا ہے تو ان میں صرف دس افراد کے

بارے میں کامیابی ہوئی ہے اور باقی نوّے فیصد کے بارے میں ناکامی ہوئی۔ اس قلیل اندازے میں کامیابی سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ بانجھ پن کی بعض صورتیں ابھی تک لا علاج ہیں۔ بہرحال مرد یا عورت کی جانب سے قصور کی صورت میں علاج کی چند صورتیں ہیں:۔

(الف) مرد کے مادۂ تولید میں ضعف کا علاج ہو جائے یا متضاد مادہ کی علیحدگی کے لیے علاج کیا جائے تاکہ اصلاح کے بعد اس سے مطلوبہ نتائج برآمد ہوں، از روئے شرع یہ عام علاجوں کی طرح ایک علاج ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

(ب) ایسا ہی عورت کے قصور کی صورت میں اگر مادۂ تولید میں کوئی نقص ہو تو اس کی اصلاح کیلئے کوئی دوائی کھانا یا کھلانا جائز اور مشروع ہے۔

(ج) لیکن عورت میں نقص کی صورت میں اگر یہ نقص "رحم" میں ہو یعنی "رحم مادر" میں استقرار کی صلاحیت موجود نہ ہو تو اس صورت میں بھی اگر عورت کوئی ایسی دوائی کھائے جس سے رحم میں امساک اور استقرار کی صلاحیت پیدا ہو جائے، بظاہر یہ علاج بھی ممنوع نہیں بلکہ دوسری بیماریوں کے علاج کی طرح یہ بھی مشروع ہے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا طریقۂ علاج "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" کے ذریعہ آخر الذکر بیماری کا علاج دریافت کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے مادۂ تولید میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو لیکن "رحم مادر" میں امساک اور استقرار کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے بچہ پیدا نہ ہوتا ہو تو جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ طریقۂ علاج ایجاد کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے مادۂ تولید کو ملاکر ایک خاص ترتیب کے بعد عورت کے پیٹ میں ایک خالی جگہ میں معمولی اپریشن کرنے کے بعد رکھ دیا جاتا ہے اور متعلقہ ضروریات پہنچانے کے بعد مقررہ مدت میں یہ مادہ تدریجی ادوار طے کرنے کے بعد مکمل بچہ بن جاتا ہے۔

روزنامہ مشرق کے میگزین ۲۳ ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کے ایک جائزہ کی "تجرباتی رپورٹ" سے اس طریقۂ علاج کی نشاندہی ہوتی ہے جیسا کہ اخبار لکھتا ہے:۔

"آج سے آٹھ سال قبل نیوزی لینڈ کی ایک ۲۷ سالہ عورت مارگریٹ نے مئی ۱۹۷۹ء میں پانچ پونڈ کی ایک تندرست بچی کو جنم دیا، اس بچی کی پیدائش معمول کے مطابق نہ تھی، چونکہ اس عورت کا جسمانی نظام بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری تھا اس لیے

اس کے شوہر کے نطفہ کو لیبارٹری میں "ٹیبٹیری ڈش" تکنیک کے ذریعہ "امبری ٹو" کی شکل دے کر اس کی پرورش اس کے بطن میں کی گئی جہاں اس بچے نے بغیر "یوٹیرس" کی مدد کے تمام غذائیت حاصل کی اور پروان چڑھ کر اپنے دن پورے کیے، بچے کی پیدائش اپریشن کے ذریعہ ہوئی تھی۔"

یہ طریقہ علاج دن بدن متعارف ہو رہا ہے، ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں تین ہزار بچے ایسے ہیں جو اس جدید طریقہ تولید کی برکت سے پیدا ہوئے ہیں اور اب پاکستان بھی ان ممالک کی صف میں شامل ہو گیا ہے جو اس طریقہ تولید کے مطابق صفِ اوّل میں ہیں۔

بعض سادہ لوح احباب بھی عجلت پسندی میں بغیر کسی تحقیق کے حکم لگانے کے قائل ہیں، چنانچہ ہمارے چند معزز ڈاکٹروں کے حوالے سے چند روز قبل یہ خبر شائع ہوئی کہ:۔

"ٹیسٹ ٹیوب بے بی کسی مرتبان یا ٹیسٹ ٹیوب میں نہیں بلکہ ماں کے جسم میں ہی پروان چڑھتی ہے اور اس کا نام ٹیسٹ ٹیوب نہیں ہونا چاہیئے، یہ ایک جدید طریقہ علاج ہے اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر یوں شتر بے مہار کی طرح علاج کو بھی چھوڑ دیا جائے تو معلوم نہیں فائدے کی جگہ اس کے نقصان کیا ہوں گے؟"

اگرچہ تجربہ کی رو سے اس جدید عملِ تولید میں میاں بیوی کے مادۂ تولید سے کام لیا گیا ہے لیکن کیا اس بات کی کوئی ضمانت موجود ہے کہ آئندہ بھی یہ عمل صرف میاں بیوی تک ہی محدود رہے گا؟ ہرگز نہیں! بلکہ بطور ترقی کے اس تجربہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے جس میں اب میاں بیوی کی تمیز باقی نہیں رہی بلکہ عمدہ اور حسین نسل کے تخم حاصل کئے جارہے ہیں اور معلوم نہیں کہ آئندہ اس کو کہاں تک پہنچانے کا امکان ہے (العیاذ باللہ) اور اگر امکانی صورتوں کو مدنظر رکھ کر اس عمل کو دیکھا جائے تو اس کے بہت سے خطرناک نتائج کی نشاندہی بھی ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ یہ نتائج کسی وقت بھی محض امکان کی جگہ ایک حقیقتِ واقعہ کی صورت اختیار کرلیں۔ اب اصل مسئلہ کا حکم بیان کرنے سے قبل ایک مقدمہ بطورِ تمہید پیشِ خدمت ہے:۔

سدِّ ذرائع اور اسلام

اسلامی نقطہ نظر سے کسی شے کے حکم میں، اس کے اسباب وعوامل طریقہ کار یا نتائج کا بہت زیادہ اثر رہتا ہے، اسلام کسی شئے کی عارضی اور وقتی مصلحت کو دیکھ کر عجلت پسندی کے فیصلے کا حامی نہیں۔ اسلام چونکہ ابدی اور دائمی دین ہے اسلئے

اس میں موجودہ اور آئندہ ہر دور میں ہر حالت کی امکانی صورتوں کو مدِنظر رکھ کر حکم دیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ بہت سے امور بظاہر اچھے اور خوبصورت ہوں، ان میں کوئی قصور اور نقص نہ ہو لیکن اس ظاہری حُسن کے باوجود اگر کوئی شے کسی دوسرے ناجائز کام کے لیے مقدمہ اور پیش خیمہ ہو تو شریعت میں ناجائز کام کے لیے ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اس کام کا درجہ بھی ناجائز کام کا ہو جاتا ہے، اُس دوسرے ناجائز فعل کی وجہ سے اِس ذریعہ اور مقدمہ کو بھی حرام کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے فقہاء کرام کے ہاں یہ حکم "سدّالذرائع" کے نام سے متعارف ہے، علماء کرام کے ہاں یہ معتبر ہے، خاص کر حنابلہ اور مالکیہ اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، قرآن وحدیث کی رُو سے اس قاعدہ کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے قاعدہ کی وضاحت

مثلاً صحابہ کرامؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ شفقت اور توجہ دلانے وقت "رَاعِنَا" کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کا مقصد واضح تھا کہ یارسول اللہ ہماری مصلحت کی رعایت فرمائیے، اس میں کوئی بے ادبی نہیں تھی، لیکن یہود اور منافقین اس لفظ کو بول کر اس سے ایسا معنیٰ مراد لیتے تھے جو منصب نبوت کے مناسب نہیں تھا اور اس سے یہودیوں کو شرارت کے لیے ایک موقع ملتا تھا، اللہ تعالیٰ نے شرارت اور فساد کا پیش خیمہ ہونے کی وجہ سے اس جائز لفظ کے کہنے پر پابندی لگا کر متبادل لفظ تجویز فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا۔ (سورۃ البقرۃ ۱۰۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو تم رَاعِنَا کا لفظ مت کہا کرو اور اس کی جگہ لفظ اُنْظُرْنَا کہہ دیا کرو۔"

حدیث سے قاعدہ کی وضاحت

ایسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو قریش مکہ کے تعمیر کردہ بیت اللہ میں متعدد نقائص نظر آئے، آپؐ کو محسوس ہوا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں قریشِ مکہ نے اختیاری یا غیر اختیاری اسباب کی وجہ سے ایسے تصرفات کئے ہیں جو بناءِ ابراہیمی کے خلاف ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:-

"میرا دل چاہتا ہے کہ موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اسے بالکل بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنا دوں لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے اس لیے سردست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر ایک اہم اور ضروری مسئلہ تھا لیکن ناجائز امور یعنی فتنہ وفساد کے لیے پیش خیمہ ہونے کی وجہ سے آپؐ نے قریش مکہ کی تعمیر کو اُسی حالت پر چھوڑ دیا۔

اس قاعدہ کے ذہن نشین ہونے کے بعد اب ہم "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" کے طریقۂ علاج کے نتائج پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس طریقۂ علاج کے معاشرہ پر مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے کیا اثرات پڑتے ہیں؟ اس سے معاشرہ کس حد تک متاثر ہوتا ہے؟ تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ نسب محفوظ نہیں رہتا

اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو انسانیت کے لیے سب سے اہم مسئلہ تحفظ نسب کا ہے، دنیا باوجود ترقی کے آج اس میدان میں حیران ہے اور غیر ثابت النسب بچوں کی تعلیم وتربیت موجودہ دنیا کے لیے ایک عظیم مسئلہ ہے۔ اسلام ہی وہ واحد دین اور مذہب ہے جس میں تحفظ نسب کی مکمل ضمانت موجود ہے۔ زنا اور دواعی زنا کی حرمت اور ممانعت سے وہ تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں جس سے نسب متاثر ہوتا ہو، لیکن مذکورہ طریقہ علاج کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں انسان کا نسب محفوظ نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس عمل کا تجربہ اگرچہ ایک میاں بیوی کے مادۂ تولید سے کیا گیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کو صرف میاں بیوی تک محدود رکھا جائے گا۔ کیونکہ ایک خاوند کے نطفہ میں جب خود صلاحیت موجود نہ ہو اور مذکورہ طریقہ علاج میسر ہو تو اس میں مانع کیا چیز ہے؟ کہ ایک غیر شخص کے ذی استعداد نطفہ سے یہ کام لیا جائے اور یا ایک عورت کو یہ معلوم ہو کہ میرا خاوند نا قابل اور نالائق ہے تو ممکن ہے کہ اس کے نطفہ سے پیدا ہونے والا بچہ بھی باپ کی طرح نالائق اور نا قابل ہو اور عورت بہ نفس نفیس یا خاوند کے مشورہ سے حسین، قابل اور ماہر شخص کے نطفہ سے یہ مسئلہ حل کر سکتی ہے تاکہ اس سے پیدا ہونے والا بچہ قابل اور ذہین ثابت ہو۔ چنانچہ اس تجربہ سے کامیابی کے بعد ایک اخباری اطلاع ملاحظہ فرمائیے:۔

"آجکل امریکین کیلی فورنیا کے علاقہ "ریسکو ڈیڈو" میں رابرٹ گراہم نے عالی ظرف نطفوں کا ایک بینک قائم کیا ہے جس میں بڑے بڑے فنکار، سائنسدان، موسیقار، فلسفی اور بیشمار اعلیٰ صلاحیت کے حامل لوگوں کو تخ بستہ کر کے محفوظ رکھ لیا گیا ہے اور ان نطفوں کی تفصیل کیٹلاگ شائع کی جاتی ہے اور وہ ایسی ماؤں کی تلاش میں رہتے ہیں جو نطفوں کے لیے مختلف خصوصیات کی حامل ہوں جو "امبری ؤ" سے اولاد پیدا کر کے اعلیٰ عقل و خرد کے لوگوں کی آبادی میں اضافہ کر سکیں"۔

ظاہر ہے کہ غیر کے نطفہ سے پیدا ہونے والا بچہ اگرچہ قضاءً (الولد للفراش وللعاھر حجر) سے باپ کا بیٹا کہلائے گا لیکن خود جب اس بچے کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں اس شخص کے نطفہ سے نہیں ہوں میری پیدائش کے لیے مادۂ تولید کسی غیر شخص سے حاصل کیا گیا ہے، تو یہ بچہ کبھی بھی اس کو باپ تسلیم نہیں کرے گا اور نہ دیانۃً یہ شخص باپ کہلانے کا مستحق ہے۔

مادۂ تولید کا مذموم کاروبار روزمرہ کا معمول بن جائے گا

اگر اس عمل کو جاری رکھا گیا اور ان عالی ظرف نطفوں سے بچوں کی پیدائش کے اس طریقہ کو آگے بڑھا دیا گیا تو ظاہر ہے کہ عوام الناس کے رجحان کو دیکھ کر نطفوں کا باقاعدہ کاروبار شروع ہو جائے گا، کیونکہ بغیر قیمت کے میسر نہ ہونے کی صورت میں خواہ نخواہ خریدنے کی ضرورت ہوگی، شریعت میں مال نہ ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہے، لیکن عام انسان بھی طبعی طور پر اس مذموم کاروبار سے متنفر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خون کی خرید و فروخت کی طرح اس کو بھی بعض لوگ آمدنی کا ذریعہ بنالیں۔

معاشرہ میں نکاح کی اہمیت ختم ہو جائے گی

موجودہ دور میں ہر ایک معاشرہ کے اندر نکاح کے لیے خاص صورتیں موجود ہیں؛ زنا سے نفرت کے لیے مذہب، قانون یا فطرت ایک اہم سبب ہے۔ اگرچہ یورپی درندوں کے ہاں اخلاق سوز راہوں کو قانونی تحفظ حاصل ہے لیکن پھر بھی زنا سے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوں گے۔ لیکن زیر نظر طریقۂ علاج اپنانے سے نکاح کی یہ وقعت بھی ختم ہو جائے گی اور ایک نوجوان عورت کیلئے اس میں کونسی رکاوٹ ہے کہ وہ بغیر خاوند کے کسی غیر شخص کے نطفہ سے حاملہ ہو کر ماں بن جائے، بغیر خاوند کے حاصل ہونے والے بچے کو کنواری ماں اپنا بچہ سمجھے گی، اور یہ بچہ کل بڑا ہو کر اپنی پہچان کے لیے صرف ماں کی طرف نسبت پر اکتفاء کرے گا، یوں اس کی بچے کی خواہش تو پوری ہو جائے گی جبکہ طبعی خواہشات کی تکمیل کے لیے غیر شرعی اور غیر فطری طریقے اپنائے جائیں گے اور نکاح کو زائد از ضرورت چیز سمجھا جائے گا۔

افزائش نسلِ انسانی کے فارم

جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ ایک مرد کے نطفہ سے متعدد عورتیں حاملہ ہو سکتی ہوں تو پھر جس ملک کو افرادی قوت کی ضرورت ہوگی اور جہاں افزائش نسل پر متعلقہ جوڑوں کو انعام دیا جاتا ہے وہاں اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک آسان نسخہ ہاتھ آجائے گا کہ اعلیٰ ظرف اشخاص کے نطفوں کو اکٹھا کر کے

ذی استعداد عورتوں کے مرغیوں، گائے اور بھیڑ بکریوں کی طرح فارم بنا کر بچے پیدا کر لئے جائیں گے، ایک ہی انجکشن سے نا معلوم کتنے بچے پیدا ہوں گے؟ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان فارمی نوزائیدہ بچوں سے قوم و ملک اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے کیا اُمید کی جا سکتی ہے؟ جبکہ ایسے بچوں کا مستقبل تو درکنار خود افزائش نسل کا یہ طریقہ ایک قبیح حرکت ہے۔

ممکن ہے کہ اس سفر کی انتہا یہ نہ ہو بلکہ اس کے بعد ان فارموں کے لیے ذی استعداد عورتوں کی ضرورت ہوگی اور اس مقصد کے لیے رضا کار عورتوں کے میسّر نہ ہونے کی صورت میں مطلوبہ عورتوں کو قیمتاً خریدنا پڑے گا۔ چنانچہ عورتوں کی خرید و فروخت کا ایک مذموم کاروبار شروع ہو کر زمانہ جاہلیت کی یاد تازہ ہوگی۔

مرد بھی بچے پیدا کر سکیں گے

جب ایک نطفہ بغیر رحم مادر کے تولیدی ادوار طے کر کے بچہ بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور عورت کے پیٹ کے ایک خالی حصّہ سے یہ مقصد پورا ہوتا ہو تو پھر ممکن ہے کہ آئندہ اس عمل کا عورت کے پیٹ سے کوئی تعلق نہ رہے بلکہ مرد کے پیٹ میں بھی اس عمل کو جاری رکھ کر بچہ پیدا کیا جا سکے گا جیسا کہ اس کا تجربہ ہو چکا ہے، تو مرد کے ماں بن جانے کی صورت میں دوسرے مسائل تو درکنار خود مرد کیلئے بھی یہ ذلت اور رسوائی کا مقام ہے۔ مزید برآں عورت طبعی طور پر بچے کی تربیت اور پرورش کی صلاحیت رکھتی ہے، ایک عورت بچے کی جو تربیت کر سکتی ہے مرد میں اس ذمہ داری اور بوجھ کو اٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے یا نکاح قائم رہے حق حضانت یعنی بچوں کی تربیت کا حق عورت کو ہی حاصل رہے گا۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اص میں ہے کہ میاں بیوی میں جدائی کے بعد بھی لڑکے کے لیے سات یا نو سال تک اور لڑکی کیلئے تا بلوغ حق حضانت والدہ کو حاصل ہے۔ جبکہ مرد کے ماں بن جانے کے بعد دوسرے مسائل کے علاوہ ماں کی شفقت اور اس کے حق تربیت سے محروم رہ جائیں گے۔

زنا کاری کا بند نہ ہونے والا دروازہ کھل جائے گا

جب مرد خود بچے پیدا کرنے کا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال دے تو اس کو عورت کی ضرورت ہی کیا رہے گی، ایسے ہی جب ایک عورت خاوند کے بغیر بچے کو جنم دے سکتی ہے تو ایسی حالت میں وہ شادی کی ضرورت محسوس نہیں کرے گی، مرد اور عورت الگ الگ بچے پیدا کر لیں گے تو طبعی اور فطری خواہشات کی تکمیل کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کریں گے اور پھر زنا اور لواطت کا ایک بند نہ ہونے والا دروازہ

کھل جائے گا جس سے پوری انسانیت کی ہلاکت اور بربادی یقینی ہے۔

انسان کا رشتہ بندروں اور کتوں سے جڑ جائے گا

جب اس جدید طریقہ تولید کو جاری رکھا گیا اور تحقیق و ریسرچ کسی خاص حد تک منتہی نہ ہوئی تو عین ممکن ہے کہ انسانی مادۂ تولید کسی بندریہ یا کتیا کے پیٹ کی خالی جگہ میں رکھ کر اس عمل کو پورا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انسانی نطفہ سے پیدا ہونے والا بچہ انسان ہی شمار ہوگا لیکن ماتما کا یہ پیارا رشتہ پھر بندروں اور کتوں کی نوع سے منسلک ہو جائے گا۔

سوچنے کا مقام ہے کہ یہ ترقی ہے یا تنزلی! کہ اشرف المخلوقات اور مخدوم عالم کسی کتیا یا بندریہ کا بچہ کہلائے۔

ان متعدد ناجائز اور غیر شرعی امور کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ تولیدی عمل از روئے شرع ناجائز ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں لوگ اسے علمی اور سائنسی ترقی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں رسوائی اور تباہی کا پیش خیمہ ہونے کی وجہ سے آئندہ اس پر کنٹرول کرنا ایک مشکل مسئلہ ہوگا۔

خاندانی منصوبہ بندی

عالم کفر مسلمانوں کی ایمانی قوت کے ساتھ ساتھ ان کی افرادی قوت سے بھی خائف ہے، ان دونوں کو ختم کرنے کے لیے یورپ نے خاندانی منصوبہ بندی کا غیر فطری طریقہ ایجاد کیا، اور اپنے اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے سبز باغ کے طور پر وسائل کی کمی، رزق کی تنگی، صحیح تعلیم و تربیت خصوصاً عورتوں کی صحت وغیرہ کا نعرہ لگایا، جبکہ اس دلفریب نعرہ کی آڑ میں یہود و ہنود کا اصل مقصد مسلمانوں میں جنسی اختلاط کے ساتھ ساتھ ان کی ایمانی و افرادی قوت کو ختم کرنا ہے۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے خاندانی منصوبہ بندی کے خطرات اور نتائج پر انوکھے انداز میں روشنی ڈالی ہے، مولانا صاحب کے اس مضمون کو افادۂ عام کے لیے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

خاندانی منصوبہ بندی

خطرات و نتائج

اخبار میں خبر ہے کہ محکمۂ فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) ایبٹ آباد نے اپنے ضلعی افسروں کے ایک اجلاس میں یہ امر طے کر دیا ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی (ضبط ولادت) کی تحریک کو عوام میں پوری طرح مقبول کرائیں۔ ہم بقول ایک معاصر اس "بانگ بے ہنگام" پر خاموش نہیں رہ سکتے۔ ضبط ولادت کی تحریک پر ملک کے سنجیدہ علمی و دینی حلقے ابتدا ہی سے اظہار ناراضگی کر رہے ہیں اور برابر اس تحریک کی مضرتوں پر معاشی، اخلاقی، شرعی و عقلی ہر پہلو سے روشنی ڈالی جا چکی ہے اور اب تک ڈالی جا رہی ہے۔ طویل مشاہدات و تجربات کی روشنی میں مرتب کردہ اس تحریک کے عقلی و شرعی تجزیہ سے ہمیں کلی اتفاق ہے کہ اس مہم کا براہ راست اثر ہماری معاشرتی زندگی کی قدروں پر ہوگا لذت پرستی اور جنسی بے راہ روی کی ساری رکاوٹیں ختم ہو کر ایک اسلامی ملک میں اخلاقی انارکی فحاشی بے حیائی اور زنا کاری کا شجرہ خبیثہ خوب پروان چڑھے گا۔ ضبط ولادت کی غیر فطری کوششوں سے عورت و مرد کی جسمانی اور نفسیاتی صحت پر برا اثر پڑے گا۔ خانگی ذمہ داریوں اور اولاد کی تعلیم و تربیت سے سبکدوشی کے احساس سے نہ صرف شہوانی جذبات میں اضافہ ہوگا بلکہ پورا معاشرہ جو خاندان کے مضبوط و مستحکم رشتوں پر استوار ہوتا ہے بگڑ جائے گا۔ گھریلو فرائض جن کے نباہنے پر اولاد ہی ایک فرد کو مجبور کر سکتی ہے اس سے فرار بہت آسان ہو کر معاشرہ باہمی حقوق سے گریز طلاق اور ناچاقی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

قومی خودکشی

ان لازمی نتائج و خطرات کے علاوہ ایک ایسا منصوبہ جو ہمارے مسلم معاشرہ کے شرعی و معاشی اور اخلاقی اقدار کے کسی پہلو سے بھی جوڑ نہیں کھا رہا موجودہ سنگین حالات میں جو بھارت جیسے عیار سامراج کے مقابلہ کی شکل ہمارے سامنے ہے ضروری ہے کہ اس منصوبہ کے اس مہلک پہلو پر بھی توجہ کی جائے جس کا خمیازہ ساری قوم و ملت کو بھگتنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت جب کہ ظاہری اسباب میں ہماری کامیابی کا تمام تر دارومدار اس ملک کی عددی قوت اور افرادی اضافہ پر ایسی سکیموں کو زیر بحث لانا بھی قومی خودکشی کے مترادف ہے جن سے تحدید نسل یا نسل کشی کی حوصلہ افزائی ہو۔

افرادی قوت اور یورپ | یورپ نے جو اس لعنت کا اولین سرچشمہ اور داعی ہے انیسویں صدی کے آغاز سے اس تحریک کو اپنایا مگر بالآخر اس زوال پذیر تہذیب پر عیاں ہوا کہ قلت آبادی کی اس تحریک نے اگر ایک طرف اسے اخلاق و شرافت سے عاری بنا دیا تو دوسری طرف اس پر واضح ہوا کہ قلت آبادی کے یہی مساعی اس کی اجتماعی قوت کے اضمحلال اور سیاسی طاقت کے انحطاط کا باعث بن رہے ہیں۔ چنانچہ بعد از خرابی بسیار مغربی اقوام نے اپنا رویہ تبدیل کر لی فرانس کے مارشل پیٹین نے اسے اپنے ملک کے زوال کا بنیادی سبب قرار دیا۔ برطانیہ کے ایک مشہور مصنف اور ممبر اسمبلی رینڈالف چرچل نے شرح پیدائش کے گرنے کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا۔ یہی حال یورپ کی دیگر اقوام کا ہے۔ فرانس، جرمنی اور اٹلی نے اسقاط حمل اور تحدید نسل کے تمام اقدامات کو سخت تعزیری جرم قرار دیا بلکہ ملک کی معاشی ترقیات کے متبادل انتظامات کے ساتھ ساتھ افزائش نسل کی سرپرستی کی اور کر رہے ہیں۔ چنانچہ سویڈن وغیرہ میں بچوں کی تعداد بڑھانے والوں پر ٹیکس کی شرح میں تخفیف کی گئی۔ اس وقت یہی پالیسی امریکہ اور یورپ کی تمام اقوام کی ہے۔ ان پر بالآخر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اس ایٹمی دور میں کسی ملک کے استحکام، سیاسی برتری اور بین الاقوامی اہمیت

کے اسباب میں کثرت آبادی کا بھی کافی دخل ہے۔ کوریا کی جنگ میں چین نے اور جنگ عظیم نے جاپان میں محض اپنی عددی قوت سے دشمن کے منصوبوں کو بے اثر بنایا۔ آج ہمارے پڑوس میں چین اور روس کو جو سیاسی اقتدار اور تفوق حاصل ہے بالخصوص چین جو اپنی عظیم قوم ہی کے بل بوتے پر مغربی استبداد کے غرور و گھمنڈ کو چیلنج کر رہا ہے۔ اس میں کثرت آبادی کا بھی بڑا دخل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممالک اگر ایک طرف ملکی معیشت کی خوشحالی کے لئے قدرت کے عطا کردہ تمام وسائل اور ذرائع کو کام میں لا رہے ہیں تو دوسری طرف آبادی کے لحاظ سے اپنی تفوق اور برتری کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہی حال ہمارے عظیم مسلم ملک انڈونیشیا کا ہے۔

سیاسی اور دفاعی ضرورت | مغربی ممالک میں تکثیر آبادی کے مساعی کے باوجود مشرقی اقوام اور عالم اسلام کی شرح آبادی کی رفتار کی وجہ سے مغربی اقوام کو اپنی سیاسی قیادت خطرہ میں نظر آرہی ہے اور مغرب کی کوشش ہے کہ اپنی بین الاقوامی پوزیشن برقرار رکھنے کے لئے اسلامی اور مشرقی ممالک کی شرح اضافۂ آبادی کو روکا جا سکے اور ان ممالک میں تحدید نسل اور ضبط ولادت کی تحریک پروان چڑھا کر انہیں اپنی موت آپ مار دیا جائے۔ ادھر ہماری فریب خوردگی کا یہ عالم کہ ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں دام کا۔
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

ان وجوہات سے تحدید نسل کا مسئلہ صرف اخلاقی اور معاشی یا مذہبی مسئلہ نہیں رہا بلکہ بین الاقوامی حالات نے اسے پاکستان اور عالم اسلام کے لئے سیاسی اور فالحقیقۃ ایک دفاعی مسئلہ بنا دیا ہے پھر ہمارا ملک جغرافیائی لحاظ سے ایسی پوزیشن میں ہے کہ ہماری چاروں طرف کی آبادی ہم سے تین گنا بلکہ آٹھ گنا تک زیادہ ہے۔ خود بھارت جس کے سامراجی عزائم کو جب تک خاک میں نہ ملا دیا جائے ہم لحظہ بھر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے وہاں کی آبادی ساڑھے چار گنا زیادہ ہے۔

ایسے حالات میں عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس تحریک کے ڈھنڈورے پیٹنا ربوبیت عامہ اور شان رزاقیت کے لئے چیلنج اور قومی و ملی موت کے مترادف ہے اور اسلامی و قومی تقاضوں

کو بالائے طاق رکھ کر اس تحریک کی سرپرستی اور اسے قوم میں مقبول بنانے کی دعوت دینا قومی ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تعمیر و ترقی کا صحیح راستہ | ہماری دلی خواہش ہے کہ ملک کے حقیقی مفادات کی بنا پر آئندہ ہر اس تحریک، منصوبہ اور تکمیل سے اجتناب کیا جائے جو ہمارے ملی اور قومی مزاج اور تقاضوں سے جوڑ نہ کھائے اور اگر مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید میں ہم سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں تو حالیہ واقعات سے سبق لے کر انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے اور ہر اس علمی و عملی اقدام کو سختی سے روک دیا جائے جو ملت مسلمہ کے لئے دینی اور اخلاقی فتنوں کا سامان مہیا کرے جو اسلامی جمہوریہ اور اس کے غیور مسلمانوں کو دینی اقدار اور مجاہدانہ کردار سے دور ہٹائے اور جس سے اس عظیم قوم کی مومنانہ اور مجاہدانہ روح مجروح ہو۔ خواہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک ہو یا عائلی قوانین کی یہ فریب شکل یا تجدد، ترقی اور فیشن کے فکر انگیز نام اور یا اسلامی ریسرچ و تحقیق کے نام پہ تحریف دین کی تحریکیں —— ہمارے خیال میں یہی وہ طرز عمل ہے جو ہمارے مستقبل کی تعمیر اور خوشحالی اور ملک کی بقا و سلامتی کا ضامن ہو سکتا ہے اور یہی وہ طرز حیات ہے جسے حالیہ واقعات کے نتیجہ میں ہمارے لائق اور قابل احترام صدر مملکت محمد ایوب خان نے حسب ذیل الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ:-

> یہ تجربات گہرے اور ہمہ گیر ہیں کسی عارضی جوش و خروش کا نتیجہ نہیں اور نہ وقتی اور نہ گزرنے والی باتیں ہیں۔ ان واقعات نے ہمیں زندگی کے ہر میدان کے لئے ایک مستقل طریق عمل بخشا ہے اور یہی دراصل اسلام کا ضابطہ حیات ہے۔ انشاء اللہ اب یہی طریق عمل ہمارے آئندہ طرز فکر و عمل کے لئے مشعل راہ ہوگا۔ (نومبر ۱۹۶۵ء)

منصوبہ بندی کا اخلاقی اور سماجی پہلو

تحریک خاندانی منصوبہ بندی (ضبط ولادت) کی ترویج میں ہمارے ملک کی پوری

مشینری مصروفِ عمل ہے۔ اقتصادی فوائد کے علاوہ اس کی اخلاقی اور سماجی خوبیوں کا پرچار بھی ہو رہا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ نئے اسلام کی تخلیق کرنے والی ایک فیکٹری "ادارہ تحقیقات اسلامیہ" اور اس کے نام نہاد محققین کی ایک پوری کھیپ بھی قتل اولاد کی اس انسانیت کش تحریک کے ڈانڈے قرآن وسنت اور فقہاء اسلام کے اقوال سے ملانے میں مصروف ہے — اخبارات کے پورے ایڈیشن اور ضمیمے اس نسخہ شفاء کے پرچار کے لئے نکل رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نقار خانہ میں اہل حق کی صدائے عزیمت پر کوئی توجہ دے بھی تو کیسے؟ پھر بھی اہل حق علماء اپنے فریضہ احتساب کی بنا پر علماء بلا خوف وخشیت اس تحریک کے روحانی، سماجی اور سیاسی عواقب اور تباہ کن نتائج سے قوم کو آگاہ کر رہے ہیں۔ وہ قوم جو بلا جھجک یورپ کی بھیانہ کھیٹی میں کودتی چلی جا رہی ہے۔ آج کی فرصت میں ہم اس ماہ کی دو ایک خبریں اخلاقی زوال اور تحریک نسل کشی کے پرچار کرنے والوں کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے طبی پہلو پر اس خبر سے روشنی پڑتی ہے۔

"لندن کے ایک فزیشن نے کہا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی اور برتھ کنٹرول کے لئے جو انسدادی گولیاں استعمال کی جاتی ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ بعد ازاں مرد کی صحت پر اثر انداز ہوں اور مثانے کی بیماری پیدا ہو جائے۔ ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں"

(روزنامہ جنگ راولپنڈی ۷ر اکتوبر ۱۹۶۶ء)

"عورتوں کیلئے اس عمل کے بے شمار بیماریوں کا باعث ہونے کی خبریں بھی روزمرہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ برتھ کنٹرول کے سیاسی مضرات کا اندازہ اس خبر سے ہوتا ہے کہ اس ماہ رومانیہ (ایک اشتراکی ملک) میں اسقاط حمل کو ممنوع قرار دینے کے لئے قانون نافذ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں نافذ کئے جانے والے قانون کے تحت صرف شدید طبی ضرورت کے علاوہ اسقاط حمل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

(روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۵ر اکتوبر ۱۹۶۶ء)

اس سے قبل افرادی قلت اور قومی خودکشی کا تلخ تجربہ فرانس اور کئی دیگر ممالک کو ہو چکا ہے اور اس حماقت نے ان ممالک کی عظمت کو خاک میں ملا کے رکھ دیا ہے۔ رہا اس تحریک کا اخلاقی اور سماجی پہلو تو اس کا اندازہ آج یورپ کے ہر اس ملک سے لگایا جا سکتا ہے جہاں اخلاق و شرافت کے تمام بندھن ٹوٹ گئے ہیں اور جنسی ہیجان کے طوفان میں انسان محض ایک "انسان نما بھیڑیا" بن کر رہ گیا ہے۔ ذیل کے چند تازہ اعداد و شمار سے اس حیوانیت کا اندازہ لگائیے اور اس آئینہ میں اپنے ملک اور معاشرہ کے سیاہ مستقبل کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔ امریکہ میں صرف پچھلے ایک سال میں ۲ لاکھ ۰ ۵ ہزار طالبات کا اسقاط حمل کرایا گیا۔ (مجلۃ العربی ستمبر کویت)

خاندانی منصوبہ بندی کے آلات و ادویات نے کتنی لوگوں کو اس دھندہ سے چھٹکارہ دیا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ خود لگائیے۔ پھر مذکورہ تعداد بھی صرف طالبات کی ہے۔ انگلستان میں پچھلے ایک سال کے اندر ایک لاکھ ۲۷ ہزار ناجائز (حرامی) بچے پیدا ہوئے (العربی کویت) اور اس طرح حرامیوں کے اس لشکر نے "حلال پیداوار" کا کوٹہ پورا کر دیا ——— اب ایک ایسے ملک کا حال سنیئے جو یورپ کا نہیں مشرق وسطیٰ کا ملک ہے اور جہاں کی تقریباً نصف آبادی مسلمانوں کی ہے۔ کویت کا مشہور رسالہ "العربی" رقمطراز ہے :۔

بیروت میں ۰ ۸ فیصد طالبات شادی سے پہلے ہی جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے ہاں کے سرکاری حلقوں میں بھی اس تحریک کے ناجائز استعمال پر تشویش ظاہر کی گئی ہے جس کی خبریں اخبارات میں آچکی ہیں۔ انسان کے حقیقی رشد و ہدایت کی سچی اور لاجواب کتاب قرآن مجید نے بہت پہلے "قتل اولاد" سے منع کرنے کے فوراً بعد زنا اور اس کے محرکات روک کر اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ قتل اولاد کی ہر شکل اور زنا و فحاشی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں آیات کے باہمی تعاون سے عیاں ہے کہ پہلا جرم "قتل اولاد" دوسرے جرم (زنا اور فحاشی) کا محرک ہے ——— پڑھیئے اور قربان جائیے اس لافانی کتاب کے اعجاز سے ارشاد ربانی ہے۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق	اور مت کرو قتل اپنی اولا کو مفلسی کے
نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم	خوف سے۔ ہم ان کو بھی روزی دیں
کان خطاً کبیراً۔	گے اور تم کو بھی دیتے ہیں۔ بیشک
بنی اسرائیل ۳۱	اولاد کو قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے

اس آیت کے فوراً بعد ارشاد ہے۔

ولا تقربوا الزنیٰ انہ	اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو کیونکہ
کان فاحشۃً ط	زنا بڑی بے حیائی کی بات ہے
وساءَ سبیلاً ۔ ۳۲	اور بہت بری راہ ہے۔

نہ صرف اس مقام پر بلکہ دوسری جگہ انعام میں بھی قتل اولاد سے منع کرنے کے معاً بعد فحاشی اور بے حیائی کی نمایاں اور خفیہ تمام صورتوں سے روک دیا۔ اس اندازِ بیان سے بھی صاف نمایاں ہے کہ دوسرا جرم (بے حیائی اور فحاشی) پہلے جرم (قتل اولاد) یرتھ کنٹرول کا لازمی اور طبعی ردعمل ہے۔ ارشاد ہے:۔

ولا تقتلوا اولادکم من املاق	اور مت قتل کرو اپنی اولاد کو غربت
نحن نرزقکم وایاھم ولا تقربوا	کے سبب۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے
الفواحش ما ظھر منھا	ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی
وما بطن ج	باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ خواہ وہ
آیت ۱۵۱ ۔ انعام	اعلانیہ ہوں یا پوشیدہ ۔

(نومبر ۶۶ء)

كتاب
النفقات والأيمان والنذر

لينفق ذو سعة من سعته

ومن قدر عليه رزقه

فلينفق مما آتاه الله

↑↓

من حلف كاذباً

ادخله الله النار.

کتاب النفقات

(خرچہ کے احکام و مسائل)

بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں

سوال:- زید کی بیوی کافی عرصہ سے بیمار تھی اُس کے والدین بخوشی علاج کی غرض سے اپنے گھر لے گئے اور وہاں اس کا علاج معالجہ کرایا گیا، کچھ عرصہ بعد عورت کے والدین نے زید سے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کیا، تو کیا ان کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیوی کا علاج معالجہ کرانا بہر حال خاوند پر واجب نہیں البتہ مروت کے باب میں علاج کرانا مناسب ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولقائل ان يقول عليها كأجرة الطبيب الخ

(فتح القدير ج ۴ ص۲۰۰ باب النفقة - كتاب النكاح)[1]

والدین کے نان ونفقہ کا حکم

سوال:- والدین کا نان ونفقہ اولاد پر واجب ہے یا نہیں؟ نیز اگر اولاد تنگدست ہو تو پھر بھی اسے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- والدین اگر خود غنی ہوں تو اولاد کو ان کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاہے اولاد خوشحال ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب والدین کا مدار دل بتدرولبست نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بالغ اولاد پر عائد ہوتی ہے تاہم اگر اولاد خود تنگدست ہو تو اُسے اس کے لیے مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: (ولابويه واجداده وجداته لو فقراء) اى تجب

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: وقيد بالنفقة لان المداوة لا تجب عليه اصلاً۔ (البحرالرائق ج۴ ص۱۸۲ باب النفقة)

ومثله فى الهندية ج ۱ ص۵۴۹ كتاب النكاح - الباب النفقة -

النفقۃ لھم کلا...... واطلق فی الابن ولم یقید فی الغنی مع انہ مقید بہ لما فی شرح الطحاوی ولا یجبر الابن علی نفقۃ للابوین المعسرین اذا کا معسرًا۔
(البحر الرائق ج۴ ص۳۵ باب النفقۃ۔کتاب النکاح) لہ

بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ بالغ اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے یا وہ اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اولاد جب تک نابالغ ہو تو اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر والد فقیر ہو تو پھر بھی اس کو اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری ہے، البتہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری والد سے اٹھ جاتی ہے لیکن بچیوں کا خرچہ ان کی شادی ہونے تک والد ہی برداشت کرے گا۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وقید بالعجز عن الکسب وھو بالانوثۃ مطلقاً... فلا یعتبر فی الانثیٰ الا الفقر۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۱ باب النفقۃ) لہ۲

عدت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کے عدت کے دوران اخراجات کون برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ کسی شخص کی وفات سے اس کے ترکہ میں جملہ شرعی ورثاء کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں ثمن (آٹھواں حصہ) یا ربع

لہ لما قال شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ: وعلی الرجل الموسر ان ینفق علیٰ ابویہ واجدادہ وجداتہ اذا کانوا فقراء وان خالفوہ فی الدین۔
(الھدایۃ ج۲ ص۴۴۴ باب النفقۃ۔کتاب النکاح)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح۔ الباب فی النفقۃ۔

لہ۲ لما قال العلامۃ ابن ھمامؒ: والاولاد کبارًا ما اناث..... فللاناث علیہ نفقتھن الیٰ ان یتزوجن اذا لم یکن لھن مالٌ۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۶ باب النفقۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح۔ الباب فی النفقۃ۔

دیجو تھا حصہ ہے کے علاوہ اخراجات کے نام سے کچھ زائد لینے کی عورت مجاز نہیں اور نہ ہی دیگر ورثاء پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے عورت خاوند کے ترکہ سے اپنا حصہ لے کر عدت کے دوران گذارہ کرے گی، اگر اس سے اُس کے اخراجات پورے نہ ہوسکتے ہوں اور محارم میں سے کوئی بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر وہ ہاتھ کی کمائی سے گذارہ کرے گی۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (قوله لالموت .....) ای لا تجب النفقة لمعتدة الموت۔ (البحر الرائق ج۴ صـ۲۰۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة) ؎۱

چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان بچوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا یا ماں کے؟

الجواب:۔ بچوں کا جب اپنا مال نہ ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے خواہ یہ بچے باپ کے گھر میں رہ رہے ہوں یا میاں بیوی میں جدائی کی صورت میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: نفقة البنت البالغة یجب کالصغیرة وکل علیه اذا لم یکن للصغیر مال۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ صـ۶۳ کتاب النکاح۔ فصل فی النفقة) ؎۲

والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کی بیوی اس کی رضامندی سے اپنے والدین کے گھر رہتی ہو تو کیا شوہر کو اس کے

؎۱ قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا نفقة للمتوفی عنها زوجها۔ (فتح القدیر ج۴ صـ۲۱۴ باب النفقة)

؎۲ قال العلامة قاضیخانؒ: نفقة الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لایشارکه فیها احد ولایسقط بفقره۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ صـ۴۴۵ فصل فی النفقة)

ومثله فی الهندیة ج۱ صـ۵۶۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے یا اس کے والدین کو؟

الجواب: خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر جانا عورت کے لیے مرخص ہے اس لیے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر رہے تو اس کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے، گویا عورت کے محض والدین کے گھر رہنے سے خاوند اخراجات کی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت ناشزہ (نافرمان) نہ ہو۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب للزوجة علی زوجها (ولو هی فی بیت ابیها) اذا لم یطالبها الزوج بالنقلة به یفتی۔

(الدر المختار شرح تنویر الابصار ج۳ ص۵۷۵ باب النفقة) [1]

معذور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بچہ جب بالغ ہو جائے لیکن معذور یعنی نابینا ہو اور اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہو تو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے یا اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی باپ کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔

الجواب: اگر کسی کا بچہ معذور ہو تو بالغ ہو جانے کے باوجود اس کا نفقہ باپ سے ساقط نہیں ہوتا، جب تک والد زندہ ہو تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ معذور بچے کے اخراجات پورے کرے ورنہ بصورتِ دیگر دوسرے ورثاء پر بقدر الارث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمامؒ: والذکور اما عاجزون عن الکسب لزمانة وعمی اوشلل او ذهاب عقل فعلیه نفقتهم۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۷ باب النفقة) [2]

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: الناشزة لا نفقة لها وهی التی خرجت عن منزل الزوج بغیر حق۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۶ باب النفقة)
ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۴ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وحکم ولد الکبیر الزمن او الانثی مطلقاً کالصغیر لما سیأتی۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۹۶ باب النفقة۔ کتاب النکاح)
ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۶۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال تک والدین کے ہاں رہے اور بعد میں عدالت میں ناراضگی کے ایام کے نفقہ کی دعویداری کردے تو کیا یہ عورت گذشتہ ایام کے نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں جبکہ زیادتی شوہر کی طرف سے ہو؟

الجواب:۔ غلطی شوہر کی ہو یا بیوی کی اگر عورت ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو ناراضگی کے زمانہ کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں تاہم اگر قاضی بیوی کے حق میں فیصلہ کرے کہ شوہر بیوی کو اتنا نفقہ سالانہ یا ماہانہ ادا کرے گا لیکن بعد القضاء بھی اگر خاوند نفقہ نہ دے تو اس صورت میں یعنی قضاء کے بعد والے ایام کا نفقہ خاوند کے ذمے واجب الاداء ہے جو قرض شمار ہوگا۔

لما قال العلامة قاضیخانؒ: لاتطالب بنفقة ما مضیٰ من الزمان قبل القرض لانا عندنا لا تصیر النفقة دیناً الّا بالقضاء۔ (فتاوی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۳۰ باب النفقة)[۱]

نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلی جائے اور باربار بلانے کے باوجود خاوند کے گھر نہ آئے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کا بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلے جانا اور بلانے کے باوجود نہ آنا نشوز کے حکم میں ہے، ایسی ناشزہ (نافرمان) عورت کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں، جب تک عورت نافرمانی ترک کر کے خاوند کے گھر نہ آجائے اس وقت تک وہ خاوند سے خرچہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

قال المرغینانیؒ: وان نشزت فلا نفقة لها حتیٰ تعود الی منزله. (الهدایة ج۲ ص۴۱۶ باب النفقة)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن همامؒ: واذا مضت مدة لم ینفق الزوج علیها وطالبة بذٰلك فلا شئ لها الا ان یکون القاضی فرض لها النفقة۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۰۲ باب النفقة)

ومثلهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۵۹۳ باب النفقة۔

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: لانفقة لاحد عشر (وعد منها) وخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۲۰۲ باب النفقة)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ الباب السابع عشر فی النفقات الفصل الاوّل فی نفقة الزوجة۔

ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے

سوال:۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے زید نے اپنے اہل وعیال پر نفقہ بند کر دیا اب اس کی بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ شوہر کے ذمے اہل وعیال کا خرچہ شرعاً لازم ہے اگر وہ کسی وجہ سے خرچہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس کو بذریعہ جرگہ وغیرہ خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے یا پھر وہ طلاق دے کر بیوی کو فارغ کردے ، بلا عذر شرعی اہل وعیال کا خرچہ بند کرنا جائز نہیں ۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمۃ اللہ علیہ : ویجب لو فات الامساك بالمعروف۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار جلد۲ صـ۵۷۲ کتاب الطلاق) ؎۱

نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے

سوال:۔ اگر شوہر عنین (نامرد) ہو اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا نفقہ کس کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عورت اس شخص کے لیے محبوس ہے، اس لیے کہ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو بیوی کا خرچہ اس کے ذمے لازم ہے اگرچہ وہ وطی کرنے پر قادر نہ ہو۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: فتجب للزوجۃ بنکاح صحیح ۔الخ علیٰ زوجھا لانھا جزاء الاحتباس ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۹۹ باب النفقۃ) ؎۲

؎۱ قال الامام ابوزھرۃؒ : لقولہ تعالیٰ: (ولا تمسکوھن ضراراً لتعتدوا) وقولہ تعالیٰ: (فامساك بمعروف اوتسریح باحسان) وان البقاء مع عدم الانفاق ضرار۔ وامساك بغیر معروف، وکان حقاً علیہ ان یطلق زوجتہ۔ ولما لم یقم بذلك وقد تعین علیہ قام القاضی مقامہ فیہ۔ (الاحوال الشخصیۃ صـ۳۴۹ باب اللعان۔ التفریق لعدم الانفاق)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ج۱۱ صـ۱۱۳ باب النفقۃ۔

؎۲ قال العلامۃ ابوبکر المرغینانی رحمہ اللہ : النفقۃ واجبۃٌ للزوجۃ علیٰ زوجھا مسلمۃ کانت اوکافرۃً اذا اسلمت نفسھا الی منزلہ فعلیہ نفقتھا وکسوتھا وسکناھا الخ۔

(الھدایۃ ج ۲ صـ۴۱۳ کتاب الطلاق، باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۴ صـ۱۵ کتاب النفقۃ۔

فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن اور بدکردار ہو اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی بدچلنی سے باز نہیں آتی ہو مگر رہتی شوہر کے ساتھ اسکے گھر میں ہو تو کیا ایسی عورت کا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا؟

الجواب:۔ جو کوئی جس کی وجہ سے محبوس ہو اُس کا خرچہ بھی اُسی کے ذمے لازم ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ عورت باوجود اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے شوہر کے لیے محبوس ہے اس لیے شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: فتجب للزوجۃ بنکاح صحیح .... علیٰ زوجھا لانھا جزاءُ الاحتباس۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۶۹۹ باب النفقۃ) [۱]

خاوند سے ناراض ہوکر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک عورت خاوند سے ناراض ہوکر کئی سال اپنے والدین کے گھر رہی، اب جرگہ (پنچایت) والے میاں بیوی کے درمیان فیصلہ (راضی نامہ) کرانا چاہتے ہیں لیکن عورت والدین کے گھر گذارے ہوئے سالوں کے خرچے کا مطالبہ کرتی ہے، کیا شرعاً شوہر کے ذمے ان گذشتہ سالوں کا خرچہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ان سالوں کا خرچہ شوہر کے ذمے واجب نہیں اس لیے عورت مذکورہ کا یہ مطالبہ ناقابلِ قبول ہے تاہم اگر شوہر بخوشی یہ خرچہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ:۔ والنفقۃ لا تصیر دینا

---

[۱] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: واما نفقۃ المرأۃ فمقابلۃ بالاحتباس وقد احتسبت بحق الزوج فکان لھا النفقۃ علی الزوج۔ (الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۱ ص۴۲۵ باب النفقۃ)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۱۵ باب النفقۃ۔ ھٰکذا فی مجمع الانھر ج۲ ص۴۹۲ باب النفقۃ)

الا بالقضاء او الرضاء ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۱۵ باب النفقۃ) لہ

چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمّے ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے جبکہ اس کا ایک چھوٹا بچہ ماں کے پاس ہے، تو کیا اُس بچے کا خرچہ باپ کے ذمّے ہے یا نہیں؟ جبکہ بچے کا باپ خرچہ دینے سے انکار کرتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے اگرچہ سات سال تک بچے کی پرورش کا حق عورت (ماں) کو دیا ہے، بصورتِ مسئولہ میں اس بچے کا خرچہ باپ کے ذمّہ ہوگا، باپ حقِ حضانت کی وجہ سے بچے کے نفقہ سے بری نہیں ہوگا اور اس کا انکار درست نہیں ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وتجب النفقۃ بانواعہا علی الحر لطفلہ یعم الانثیٰ والجمع ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۶۲۸ باب النفقۃ) ۲ہ

زچہ بچہ کا خرچہ شوہر کے ذمّے ہے

سوال:۔ بچے کی ولادت کے وقت زچہ خانے میں عورت پر جو خرچہ ہو تو اسکی دائیگی شوہر کے ذمّے لازم ہے یا عورت کے والدین کے ذمّے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً یہ بچہ شوہر کا ہے لہٰذا اس کی پیدائش پر جو خرچہ ہوگا وہ بھی اسی کے ذمّے لازم ہوگا۔

قال المرغینانیؒ: ونفقۃ الاولاد الصغار علی الاب لایشارکہ فیہا احد کما لایشارکہ فی نفقۃ الزوجۃ ۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۴۲۰ باب النفقۃ) ۳ہ

لہ قال المرغینانیؒ: واذا مضت مدۃ لم ینفق الزوج علیہا وطالبتہ بذلک فلاشئ لہا الا ان یکون القاضی فرض لہا النفقۃ او صالحت الزوج علیٰ مقدار نفقتہا فیقضی لہا بنفقۃ ما مضی ۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۴۲۳ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مجمع الانہر باب النفقۃ ج ۲ ص ۴۹۹ باب النفقۃ ۔

۲ہ قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: نفقۂ صغیر بذمّہ پدر است، حسبِ عرفِ نفقہ از پدر گرفتہ شود و تا ہفت سال نزد حاضنہ اُمّ یا اُمّ الاُمّ یا غیر او شاں بماند ۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۱۱ ص ۱۱۸ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص ۱۵۸ باب النفقۃ ۔

۳ہ قال العلامۃ قاضیخانؒ: نفقۃ الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لایشارکہ فی ذٰلک احد ۔

(فتاویٰ الخانیۃ علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۱ ص ۴۴۵ فصل فی نفقۃ الاولاد)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۱ ص ۵۶۰ الفصل الرابع فی نفقۃ الاولاد ۔

نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں بوڑھا اور نادار شخص ہوں جبکہ میرے دو بیٹے صاحب ثروت (مالدار) ہیں، کیا میرا نان و نفقہ ان کے ذمّے ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گذارنے کے لیے کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر لازم ہے، اگر اولاد ادا نہ کرتی ہو تو گنہگار ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتجب علیٰ موسرٍ الخ النفقۃ لاصولہ الفقراء۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار جلد۲ ص۷۳۶ باب النفقۃ)[1]

باپ کی وفات کے بعد بچّے کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی بچے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس بچے کا خرچہ ماں کے ذمّے ہے یا کسی اور کے؟

الجواب: جس بچے کی حالتِ صغر میں اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ بچہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا جملہ خرچہ اس کی ماں کے ذمّے لازم ہوگا۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: وھی اولیٰ بالتحمل من سائر الاقارب۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۹۲۲ باب النفقۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: وعلی الرجل ان ینفق علیٰ ابویہ واجدادہ وجداتہ اذا کانوا فقراء وان خالفوہ فی دینہ۔

(الھدایۃ ج۲ ص۴۲۴ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی معین القضاۃ والمفتین ص۸۵ مادۃ ۴۹۵ الفصل الثالث عشر فی احکام النفقۃ۔

[2] وفی الھندیۃ: الامّ اولیٰ بالتحمل من سائر الاقارب حتیٰ لو کان الاب معسرًا والامّ موسرۃ وللصغیر جدّ موسر تؤمر الامّ بالانفاق من مال نفسھا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۵۶۲ باب النفقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۱ ص۴۴۷ باب النفقۃ۔ کتاب الطلاق۔

کتاب الأیمان والنّذر

(قسم اور نذر کے احکام و مسائل)

یمینِ منعقدہ کا حکم

سوال:۔ ایک لڑکی کے والد نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا۔ اب فریقین کی آپس میں صلح ہوگئی ہے البتہ قسم کا معاملہ باقی ہے، اب اگر یہ آدمی (لڑکی کا والد) اُس شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی دیدے تو اُس پر کیا لازم آئے گا؟

الجواب:۔ اگر لڑکی کے والد نے یوں قسم کھائی ہو کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا تو عقدِ نکاح کر دینے سے حانث ہو گا جس کے بدلے میں کفّارہ لازم آئے گا، تاہم اگر لڑکی بالغ ہو تو وہ والد کے کسی دخل کے بغیر اس شخص سے نکاح کرسکتی ہے اور اِس سے اُس کا والد حانث نہیں ہو گا۔

قال العلامة الحصکفی: (و) ثالثها (منعقدة وهی حلفه علی مستقبل (آت) الخ ...(و) هذا القسم (فی الکفّارة) الخ ... فقط الخ..... ان حنث ۔ (الدر المختار علی هامش رد المختار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان) ؎

حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں کام نہ کیا تو تمام حلال چیزیں مجھ پر حرام ہوں گی، تو اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے قسم منعقد ہوگی یا نہیں؟ اگر منعقد ہوگی تو اس کا کفّارہ کس وقت ادا کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں یہ شخص موت سے قبل وہ جائز کام کرے تو حنث سے بچ جائے گا، تاہم اگر پوری زندگی معہودہ جائز کام کرنے سے یہ شخص قاصر رہے تو زندگی کی آخری گھڑیوں میں حانث متصوّر ہو گا جس کی وجہ سے اس کے ورثاء پر کفّارہ ادا کرنا ہوگا۔ تمام

؎ قال العلامة ابو البرکات النسفی: وعلی آتٍ منعقد وفیه الکفّارة فقط۔ (کنز الدقائق ص۱۶۷ کتاب الایمان)
وَ مِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان۔ الباب الاوّل۔

حلال چیزوں کے عموم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی اس وقت طلاقِ بائن سے جدا ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (کل حل) او حلال اللہ او حلال المسلمین (علیّ حرام) زاد الکمال او الحرام یلزمنی ونحوہ (فھو علی الطعام والشراب) ولکن (الفتوٰی فی زماننا (علیٰ انہ تبین امرأتہ الخ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۶۵ کتاب الایمان)[1]

اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ہے یا نہیں؟

سوال:۔ ایک شخص نے یوں قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا۔ اب اگر وہ اس کام کو کرے تو اس کے عقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص بے علم ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایسی قسم سے حانث کافر ہو جاتا ہے تو یہ حنث کی صورت میں کافر ہو جائے گا، بصورتِ دیگر کافر تو نہ ہوگا بلکہ حانث ہو کر کفارہ لازم آئے گا۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال ان فعل کذا فھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی أو بری من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون اللہ أو یعبد الصلیب او نحو ذلک مما یکون اعتقاد کفر فھو یمین استحساناً کذا فی البدائع فی لو فعل ذلک الفعل یلزمہ الکفارۃ وھل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیہ قال شمس الائمۃ السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انہ کان عندہ انہ یکفر متیٰ أتی بھذا الشرط ومع ھذا أتی یصیر کافراً لرضاء بالکفر وکفارتہ أن یقول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ وان عندہ انہ اذا أتی بھذا الشرط لا یصیر کافراً لا یکفر و ھذا اذا حلف بھذا الالفاظ علیٰ أمر فی المستقبل وأما اذا حلف بھذا الالفاظ علیٰ أمر فی الماضی بان قال ھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی ان فعل کذا أمس وھو یعلم انہ قد کان فعل أنہ

---

[1] قال العلامۃ ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد ابن محمود النسفیؒ: کل حل علیّ حرام علی الطعام والشراب والفتوٰی علیٰ انہ تبین امرأتہ بلا نیۃ۔ (کنز الدقائق ص۱۶۶ کتاب الایمان)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۵۵،۵۶ کتاب الایمان۔ الباب الثانی۔ الفصل الاوّل۔

لا یلزمه الکفارة عندنا لانه یمین غموس وهل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیه قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انهٗ کان عندهٗ أن هٰذا یمین ولایکفر متٰی حلف به لایکفر وان عندهٗ انه یکفر متٰی حلف به یکفر رضاءً بالکفر۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص ۵۴ کتاب الایمان ، الباب الثانی) ؎۱

قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ قرآن پاک کی قسم کھانا کیسا ہے؟ کیا اس سے قسم ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اس لیے متأخرین اربابِ فتویٰ نے عرف کی بناء پر قرآنِ کریم کی قسم کھانے کو الفاظِ یمین سے شمار کیا ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: قال الکمالؒ ولایخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمیناً واما الحلف بکلام الله فیدور مع العرف۔ وقال العینیؒ وعندی أن المصحف یمین لاسیما فی زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وکلام الله یمین۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۵۱، ۵۲ کتاب الایمان) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: (و) القسم بقوله (ان فعل کذا فهو) یهودی او نصرانی او فاشهدوا علی بالنصرانیة او شریك الکفار او (کافر) فیکفر بحنثه لوفی المستقبل اما الماضی عالماً بخلافه فغموس واختلف فی کفره (و) الاصح ان الحالف (لم یکفر) سواء (علقه بماض او آت ان کان عندهٗ) فی اعتقادهٗ انهٗ (یمین وان) جاهلاً و عندهٗ انه یکفر فی الحلف بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (یکفر فیها لرضاهٗ بالکفر)۔ (الدر المختار علٰی هامش ردّ المحتار ج ۳ ص ۵۹ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۳ ص ۱۲۷ کتاب الایمان۔ الفصل الثانی۔

؎۲ قال العلامة زین الدین ابن نجیم المصریؒ: وفی فتح القدیر ثم لایخفٰی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمیناً کما هو قول الائمة الثلاثة

(البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۵۳ کتاب الایمان ، الباب الثانی ، الفصل الاوّل۔

ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ایک شخص نے کہا کہ میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا اور اگر کی تو قسم ہے میں ایک ہزار روزے رکھوں گا، بعد ازاں اس شخص نے کسی کی غیبت کی تو اب اس پر پورے ہزار روزے رکھنا لازم ہیں یا کفارۂ قسم؟

الجواب:۔یہ شخص کفارۂ یمین (یعنی تین روزے رکھنے) سے فارغ الذمہ ہوسکتا ہے۔

لما فی الهندیة :وان علق بشرط لا یرید کدخول الدار ونحوه یتخیر بین الکفارة و بین عین ماالتزمه ۔وروی ان اباحنیفةؒ الی التخییر ایضاً وبهذا یفتی اسماعیل الزاهد قال رضی الله عنه هو اختیاری ایضاً کذا فی المبسوط۔

(الفتاوی الهندیہ ج ۲ ص ۶۵ کتاب الایمان، الفصل الثانی فی الکفارہ)[۱]

فلاں مسجد میں نماز پڑھاؤں تو کافر ہوں گا

سوال:۔ایک شخص نے کہا کہ اگر میں فلاں مسجد میں نماز پڑھا دوں تو کافر ہوں گا، پھر اُس نے اس مسجد میں نماز پڑھا دی، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔یہ شخص اس مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد حانث ہوکر کفارہ ادا کرے گا لیکن کافر نہ ہوگا۔

لما فی الهندیة : ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله او یعبد الصلیب أو نحو ذلك مما یکون اعتقاده کفر فهو یمین استحساناً کذا فی البدائع حتی لو

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله :ان فعلت کذا فعلیَّ حجة أو صوم سنة اوصدقة ما أملکه أجزاه من ذلك کفارة یمین وهو قول محمدؒ و یخرج عن العهدة با لوفاء بماسمی ایضاً اذا کان شرطاً لا یرید کونه لان فیه معنی الیمین وهوالمنع وهو بظاهره نذر فیتخیر و یمیل الی ای الجهتین شاء ۔ (البحرالرائق ج ۴ ص ۲۹۵ کتاب الایمان)

وَ مِثْلُهُ فی الهدایة ج ۲ ص ۵۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی ۔

فعل ذٰلك الفعل يلزمه الكفارة وهل يصير كافرًا اختلف المشائخ فيه۔ قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انہ ان کان عندہٗ انہٗ یکفر متی اُتی بهٰذا الشرط ومع هٰذا اتی یصیر کافرالرضاءہ بالکفر وکفارتہ اَن یقول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وان کان عندہٗ انہٗ اذا اُتی بهٰذا الشرط لایصیر کافرًا لایکفر الخ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص۵۴ الباب الثانی فیما یکون یمینًا وَمَالَا یکون یمینًا) لـه

اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں، قسم نہیں

سوال:۔ زید نے کہا اگر میں نے عمر سے بات کی تو یہ ایسا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے زنا کیا، اب زید کو عُمر سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو باتیں کرنے کی صورت میں زید پر کچھ لازم آئے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں زید عمر سے باتیں کرسکتا ہے اور اس میں کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ قسم نہیں، مزید برآں یہ الفاظ موجبِ ظہار بھی نہیں لعدم التشبیہ اور نہ موجبِ ایلاء ہے لعدم ارادة زوجة۔

لما فی الهندیة :لوقال اَن فعلت کذا فانا زانٍ اَوسارق اَوشارب خمر اَواٰکل ربٰو فلیس بحالف کذا فی الکافی ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۵۵ الباب الثانی فیما یکون یمینًا ومالایکون یمینًا۔ الفصل الاول) ٢ـه

لـه قال العلامة الحصکفیؒ :(و) القسم بقوله (ان فعل کذا فهو) یهودی او نصرانی اَوفاشهدوا علیّ بالنصرانیة اوشریك الکفار او (کافر) تیکفر بحنثه لو فی المستقبل امّا الماضی عالمًا بخلافه فغموس واختلف فی کفرہ (و) الاصح اَنّ الحالف (لم یکفر) سواء (علقه بماض اَو اٰت ان کان عندہٗ) فی اعتقادہ انہٗ (یمین وان) جاهلًا و (عندہ انہٗ یکفر فی الحلف) بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (یکفر فیهما الرضاہ بالکفر) ۔ (الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۳ ص۵۵ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۲ ص۱۲۷ کتاب الایمان، الجنس الاوّل)

٢ـه قال العلامة الحصکفی رحمه اللّٰه :(والا ان) فعله غضبه الخ اَوهو زانٍ اَوسارق اَوشارب خمر اَواٰکل ربا لا) یکون قسمًا لعدم التعارف فلوتعورف هل یکون یمینا ظاهر کلامهم نعم وظاهر کلام الکمال لا وتمام فی

(الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج ۳ ص۶۲ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۱۵۵ کتاب الایمان۔

بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں آج کے بعد اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ تعلقات نہیں رکھوں گا، اب وہ والدہ کے ناراض ہونے کی صورت میں بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے، اور اگر وہ قسم توڑ دے تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی قسم کا توڑ دینا واجب ہے، یہ شخص بھی قسم توڑ کر کفّارہ دیدے ورنہ گنہگار ہوگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللّٰہ : ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه او قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۲ مطلب کفّارة الیمین) [1]

محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا اُمّتی نہ ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے یوں کہا کہ اگر میں نے فلاں کپڑے پہن لیے تو محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا اُمّتی نہیں ہوں گا، بعد میں اُس شخص نے وہ کپڑے پہن لیے، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ الفاظ یمین میں سے ہیں، لہٰذا حنث کی صورت میں یہ شخص کفّارہ ادا کرے گا تاہم حانث ہونے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللّٰہ: تعلیق الکفر بالشرط یمین وسیجیٔ بانه ان اعتقد الکفر به یکفر والّا یکفر ای تلزمه الکفّارة)۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۲ مطلب فی القرآن انما الخلق بکلام اللّٰہ) [2]

---

[1] قال العلامة عبید اللّٰہ بن مسعود بن تاج الشریعة رحمہ اللّٰہ: ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه حنث وکفر۔ (شرح الوقایة ج ۲ ص ۱۳۹ کتاب الایمان)

وَمثلُهٗ فی مختصر القدوری ص ۲۰۲ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللّٰہ: وفی قوله ھو یھودی ان فعل کذا وحنث لزمته الکفّارة وھل ... اختلف المشائخ فیه قال الشیخ الامام شمس الائمة ان اعتقد یمینا یکون یمینا واعتقده کفرا یکون کفرا علی ما یأتی فی الفاظ الکفر۔ (خلاصة الفتاوٰی ج ۲ ص ۲۱ کتاب الایمان)

وَمِثلُهٗ فی الھندیة ج ۲ ص ۵۲ الباب الاوّل، الفصل الثانی۔

کلمۂ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کسی بات کا یقین دلانے اور مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے کلمہ توحید پڑھ کر بات کرتے ہیں، عرف میں اس فعل کو قسم سمجھا جاتا ہے، کیا صرف کلمہ پڑھنے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ قسم کے انعقاد کا حکم نیت اور ارادہ پر ہے جس کے انعقاد میں عرف کا کافی عمل دخل پایا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھنا اگرچہ بذاتِ خود قسم نہیں لیکن جہاں عرف کی موجودگی میں کلمہ پڑھنا قسم کی نیت سے ہو تو اس سے قسم واقع ہو جائے گی۔

لما فی الهندية: ولو قال لا اله الا الله لا فعلن كذا لا يكون فليس بيمين الا أن ينوى يميناً وكذلك سبحان الله والله اكبر لا فعلن كذا فى سراج الوهاج۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۵۵ الباب الثانى ـ الفصل الاول)[۱]

آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ زید نے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں چار وں آسمانی کتابوں سے بری ہوں گا، اس کے بعد اس نے وہ کام کر لیا، تو اب اس صورت میں وہ حانث ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ الفاظ قسم کے ہیں اس لیے حنث کی صورت میں اس شخص پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔

قال العلامة ابو الليث السمرقندىؒ: ولو قال ان فعل كذا فانا برئ من الكتب الاربعة فان حنث فعليه كفارة واحدة۔ (الفتاوى النوازل ص۱۶۳)[۲]

---

[۱] قال الشيخ طاهر بن عبد الرشيد البخارىؒ: وفى التجريد عن محمد لو قال لا اله الا الله افعل كذا او سبحان الله ليس بيمين الا ان ينوى۔

(خلاصة الفتاوى ج۲ ص۱۲۶ كتاب الايمان ـ الجنس الاول)

وَمِثْلُهٗ فى ردّ المحتار ج۳ ص۵۲ كتاب الايمان۔

[۲] وفى الهندية: ولو قال ان فعلت كذا فانا برئ من الكتب الاربعة فهو يمين واحدة

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۵۵ الباب الثانى ـ الفصل الاول)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج۴ ص۲۸۵ كتاب الايمان۔

کسی دینی مصلحت کے لیے قسم توڑنا

سوال :- اگر قسم کھانے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو کہ قسم کھانے وقت میں نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے، تو کیا ایسی حالت میں قسم کا پورا کرنا ضروری ہے یا حانث ہو کر کفارہ دینا مناسب ہے؟

الجواب :- اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے اور بعد ازاں اس کام کی مخالفت میں کوئی دینی مصلحت سامنے آئے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی مخالفت کر کے کفارہ ادا کرے۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما علی الارض یمین احلف علیها فاری غیرها خیراً منها الا اتیته۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۴۳ باب من حلف علی یمین غیرها خیراً۔) [1]

کفارات یمین میں تداخل کا حکم

سوال :- ایک شخص نے متعدد بار قسمیں کھا کر ہر دفعہ قسم پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے حانث ہوتا رہا، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو کیا اس شخص کے لیے تمام قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہو گا یا متعدد کفارہ جات کی ادائیگی ضروری ہو گی؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ کے مطابق احتیاط اسی میں ہے کہ متعدد کفارات ادا کئے جائیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تتعدد الکفارة لتعدد الیمین۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۳ ص۵۲)

ہاں اگر پہلے کفارہ ادا نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک ایک کفارہ بھی کافی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفی البغیة کفارات الایمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارة الواحدة عن عهدة الجمیع۔ وقال شهاب الائمة

---

[1] قال الامام الحافظ المجتهد ابو عبد الله محمد بن الحسن الشیبانیؒ: وقد بلغنا عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال من حلف علی یمین فرأی غیرها خیراً منها فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عن یمینه۔ (کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۱۹۰ کتاب الایمان)
ومثله فی الهدایة ج۲ ص۴۸۳ کتاب الایمان۔

هٰذا قول محمّد قال صاحب الاصل هوا لمختار عندی اھ مقدسی۔ ومثلہ فی القہستانی عن المنیۃ۔ (رد المحتار ج ۳ ص۵۲ کتاب الایمان) ؎۱

کفارۂ قسم ادا کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص قسم توڑ دے تو اس پر کتنا کفارہ لازم ہوگا؟

الجواب:۔ قسم کا کفّارہ ایک غلام کو آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پوشاک دینا جو بدن کے اکثر حصہ کو ڈھانپ لے، البتہ اگر کوئی مالی کفّارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر تین روزے رکھنے سے وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہوسکے گا۔

قال اللّٰہ تبارك وتعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۸۹) ؎۲

کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ جس طرح روزہ کے کفارہ میں مساکین کو کھانا کھلانے میں تسلسل کا ضروری ہے اسی طرح قسم کے کفارہ میں بھی تسلسل کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کبھی ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلایا اور پھر ناغہ کردیا پھر کبھی ایک دو مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلادیا، اسی طرح مختلف اوقات میں

؎۱ وفی الہندیۃ: اذا حلف الرجل علیٰ امر لا یفعلہ ابدًا ثم حلف فی ذٰلك المجلس او مجلس اخر لا افعلہ ابدًا ثم فعلہ کانت علیہ کفارۃ یمینین وھٰذا اذا نوی یمینًا اخریٰ او نوی التغلیظ اولم یکن لہ نیۃ واذا نوی بالکلام الثانی الیمین الاولیٰ علیہ کفارۃ واحدۃ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان)

ومِثلُہٗ فی کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۲۳۷، ۲۳۸ کتاب الایمان۔

؎۲ قال ابو البرکات النسفیؒ: وکفارتہ تحریر رقبۃ او اطعام عشرۃ مساکین کہما فی الظہار او کسوتہم بما یستر عامۃ البدن فان عجز عن احدہا صام ثلٰثۃ ایام متتابعات

(کنز الدقائق ص۱۶۵، ۱۶۶ کتاب الایمان)

ومِثلُہٗ فی الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۶۷ کتاب الایمان۔

حساب پورا کر دینے سے کفارہ ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں اگر دس دن مسلسل کھانا نہیں کھلایا جا سکا بلکہ بیچ میں کچھ ناغے ہو گئے تو کچھ حرج نہیں صرف شمار اور تعداد پوری کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: وفی کفارة یمین یعتبر العدد۔ (فتاوٰی قاضیخان ج۲ ص۲۸۶) [1]

کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے

سوال: حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کے روزے رکھنے میں تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں رکھے جانے والے روزوں میں تسلسل ضروری ہے اگر کسی وجہ سے درمیان میں ناغہ ہو جائے تو از سرِ نو روزے رکھنے ہوں گے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: فان لم یقدر علی احد الاشیاء الثلاثة صیام ثلاثة ایام متتابعات۔ وقال الشافعیؒ: یخیر لاطلاق النص ولنا قراءة ابن مسعود رضی اللہ عنہما فصیام ثلاثة ایام متتابعات وھی کالخبر المشہور۔ (الہدایہ ج۲ ص۴۶۱ فصل فی کفارة الیمین) [2]

کفارۂ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم

سوال: کفارۂ یمین (قسم) کی ادائیگی میں اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت پیش ہو تو کیا یہ تمام فدیہ کسی ایک مسکین کو بطورِ ملکیت دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا دس مسکینوں کو ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب: کفارۂ یمین کا فدیہ کسی ایک مسکین کو ایک ہی دن میں یکمشت دینا اگرچہ بعض

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ولو عشاھم فی رمضان عشرین لیلة اجزاہ الخ۔ (ردالمحتار ج۳ ص۵۳ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۲ ص۱۲۵ جنس آخر فی کفارة الیمین۔

[2] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفیہ ایضاً کفارة المعسر صیام ثلاثة ایام متتابعات ولو حاضت المرأة فی الثلاث استقبلت بخلاف کفارة صیام رمضان۔

(خلاصة الفتاوٰی ج۲ ص۱۲۵ کتاب الایمان، کفارة الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۲ ص۶۱ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

اقوال کی رُو سے فراغتِ ذمّہ کے لیے کافی ہے لیکن صحیح رائے کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس میں تعدد کی رعایت ہو اور فدیہ دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: ولو اعطی مسکیناً واحداً عشرۃ اثواب فی مرۃ واحدۃ لم یجزہ کما فی الطعام وان اعطاہ فی کل یوم ثوبا حتی استکمل عشرۃ اثواب فی عشرۃ ایام اجزاہ کما فی الطعام۔ (الفتاوی الھندیہ ج۲ ص۶۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی) [1]

ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم

سوال:- اگر نذر ماننے والا شخص بہت زیادہ غریب ہو تو وہ اپنی نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں اس لیے نذر سے نہ تو اغنیاء کو کچھ کھلایا جاسکتا ہے اور نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اگرچہ نذر ماننے والا فقیر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ نذر غربت سے متاثر نہیں ہوتی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو ترك التضحیۃ ومضت ایامھا تصدق بھا حیۃ ناذر فاعل تصدق (لمعینۃ) ولو فقیرا ولو ذبحھا تصدق بلحمھا ولو نقصھا تصدق بقیمۃ النقصان ایضاً ولا یأکل الناذر منھا فان اکل تصدق بقیمۃ ما اکل۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۰۳/۲۰۴ کتاب الاضحیۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ای تحقیقاً او تقدیراً حتی لو اعطی مسکینا واحدا فی عشرۃ ایام کل یوم نصف صاع یجوز ولو اعطاہ فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجزوقیل لا ھو الصحیح۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۶۰ کتاب الایمان، مطلب کفارۃ الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸ کتاب الایمان۔

[2] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: لا یأکل الناذر منھا ولو اکل منھا فعلیہ قیمتھا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیۃ، الفصل الرابع فیما یجوز من الاضحیۃ وفیما لا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۸ کتاب التضحیۃ۔ فصل واما کیفیۃ الوجوب فانواع۔

نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے یوں نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں گائے یا بھینس ذبح کر کے اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا، کام ہو جانے پر اب نذر ماننے والا گائے یا بھینس کا گوشت فقراء میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی قیمت دینا چاہتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی یا عین منذور چیز ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب :۔ صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی میں بنیادی فلسفہ فقراء اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور انکی حاجت برآری ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے کیا ہے، اس لیے ناذر کو اختیار ہے کہ عینِ منذور ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔

قال العلامة الحصكفيؒ : نذر ان يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جاز ان ساوى العشرة كتصدقه بثمنه ـ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۷۱ مطلب في احكام النذر ـ النذر غير المعلق لايختص بزمان ومكان ودرهم وفقير)[1]

نذر کی پیشگی ادائیگی کرنا

سوال :۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں چیز اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ کام ہو جانے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ یا کام ہو جانے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟

الجواب :۔ نذر کا وجوب جب کسی کام کے ساتھ مشروط ہو جائے تو شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط واجب نہیں ہوتا اور نہ اس کی ادائیگی درست ہے اس لیے کام ہونے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہوسکتا بلکہ کام ہو جانے کے بعد دوبارہ نذر پوری کرنا ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : بخلاف النذر المعلق فانه لا يجوز

---

[1] وفي الهندية : ويجوز دفع القيم في الزكوٰة عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر كذا في الهداية ـ (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۸۱ الباب الثالث في زكوٰة الذهب والفضة والعروض ، الفصل الثاني في العروض)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج۱ ص۲۴۳ كتاب الزكوٰة ـ الفصل الثامن في اداء الزكوٰة۔

تعجیلہ قبل وجود الشرط۔ (الرد المحتار ج۳ ص۷۳۵ مطلب فی احکام النذر، النذر غیر المعلق لا یختص بزمان ومکان ودرھم)[1]

نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص چند روزے رکھنے کی نذر مانے تو کیا ان میں تسلسل ضروری ہے یا جب چاہے مختلف اوقات میں رکھ کر پورے کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر پے در پے روزوں کی نیت نہیں کی ہو تو نذر کے روزے رکھنے میں تسلسل ضروری نہیں ورنہ تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

وفی الھندیۃ: ولو قال للّٰہ علیّ ان اصوم شھراً متتابعًا لزمہ التتابع وان اطلق لیخیر۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۱۱ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر)[2]

نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم

سوال:۔ ایک گائے جو کہ اللہ کیلئے نذر کی گئی ہو اگر اس گائے کے بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ ناذر کا ہوگا یا اس کو بھی صدقہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ جب کسی جانور کو نذر کیا جائے تو یہ حکم اس کے جملہ اجزاء کو شامل

---

[1] قال العلامۃ علاؤ الدین الکاسانیؒ: وان کان معلقاً بشرط نحو ان یقول ان شفی اللّٰہ مریض او ان قدم فلان الغائب فللّٰہ علیّ ان اصوم شھراً او اصلی رکعتین او تصدق بدرھم ونحو ذلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلاً لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط۔
(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۹۳ کتاب النذر۔ فصل واما حکم النذر الخ
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۹۱ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور بن محمود المعروف بقاضیخانؒ: لو قال للّٰہ علیّ صوم مثل شھر رمضان قال ان اراد ومثلہ فی الوجوب فلہ ان یفرق وان اراد فی التتابع فعلیہ ان یتتابع وان لم یکن لہ نیۃ فلہ ان لصوم متفرقاً۔
(الفتاوی قاضیخان ج۱ ص۲۰۵ کتاب الصوم)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۰۹ کتاب الصوم۔ الباب السادس فی النذر۔

ہوتا ہے بچہ بھی اس کا ایک جزء ہے اس لیے گائے کی طرح بچہ بھی واجب التصدق ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: و[لدت] الاضحیة ولد قبل الذبح یذبح الولد معها و عند بعضهم یتصدق به بلا ذبح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص۲۰۵ کتاب الاضحیۃ) ؎۱

نذر کا دار و مدار الفاظ پر ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر مجھے فلاں چیز مل گئی تو اتنی رقم خیرات کروں گا جبکہ دل میں ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ چیز صحیح ہو لیکن زبان پر یہ تعین نہیں ہوا، اب متعلقہ چیز ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خراب ہے، تو کیا اس شخص پر اتنی ہی رقم خیرات کرنا واجب ہے یا مطلوبہ چیز میں نقص کی وجہ سے خیرات کی رقم میں کمی بیشی ہوسکتی ہے؟

الجواب:۔ نذر کی تکمیل کا تمام تر دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے، نیت کا زیادہ دخل نہیں رہتا اس لیے جب الفاظ مطلق ہوں تو اس چیز کے ملنے پر مقررہ رقم خیرات کرنا واجب ہے اگر وہ چیز درست حالت میں نہ ہوں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: ومن نذر نذرا مطلقا او معلقا بشرط وکان من جنسه (واجب) فرض وهو عبادة مقصودة ووجد الشرط المعلق به لزم الناذر (کصوم وصلٰوة وصدقة۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص۶۶،۶۷ کتاب الایمان) ؎۲

؎۱ قال الامام فخر الدین حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ: ولو ولدت ولدا یکون ولدها للاضحیة۔ (فتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة جلد ۳ ص۳۴۷ کتاب الاضحیة۔ فصل فی صفة الاضحیة ووقت وجوبها ومن تجب علیه)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۸،۷۹ کتاب التضحیة فصل واما بیان مایستحب قبل التضحیة۔

؎۲ قال العلامة برهان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وان علق النذر بشرط فوجد الشرط فعلیه الوفاء بنفس النذر۔

(الهدایة ج ۲ ص۴۶۳ کتاب الایمان۔ فصل فی الکفارة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص۲۴ کتاب الایمان۔

منذور روزوں میں عدم تسلسل کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! مجھے کینسر کا مرض لاحق تھا، بیماری کے دنوں میں میں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالےٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں دو ماہ روزے رکھوں گا۔ اب الحمد للہ میں صحتیاب ہوں اور روزے رکھنے کے قابل ہوں تو کیا میں دو ماہ مسلسل روزے رکھوں یا غیر مسلسل بھی رکھ سکتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ بیماری کی وجہ سے جسم میں کمزوری بھی بہت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے جواب میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو آپ نے نذر مانتے وقت تتابع یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی نیت کی ہو تو پھر دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہوں گے اور اگر یہ نیت نہ کی ہو تو شرعاً آپ کو اجازت ہے کہ غیر مسلسل روزے رکھیں یا مسلسل، غیر مسلسل کی صورت میں ساٹھ روزے پورے کرنے ہوں گے۔ باقی اگر کمزوری بہت زیادہ ہے تو مکمل صحتیابی تک انتظار بھی کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وکذا الحکم لو نکر السنۃ او شرط التتابع فیفطرھا لکنہ یقضیھا ھنا متتابعۃ ویعید لو افطر یوماً بخلاف المعینۃ ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسۃ وثلاثین۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۲ ص۴۳۴ کتاب الصوم، مطلب فی الکلام علی النذر)[1]

نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرے ایک بچے کی عمر دس سال ہے اور وہ پانچویں جماعت کا طالبعلم ہے جب اس کا سالانہ امتحان قریب آیا تو اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میں امتحان میں

---

[1] لما قال العلامۃ مولانا اشرف علی التھانویؒ: فی الدر المختار قبیل بالاعتکاف، وکذا الحکم لو نکر السنۃ او شرط التتابع الیٰ قولہ ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسۃ وثلاثین اھ
اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر تتابع کی شرط نہیں تو تتابع واجب نہیں البتہ ایام منہیہ کے عوض روزے رکھنے پڑیں گے تاکہ ایک ماہ کی تکمیل ہو جاوے۔

(امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۵۷، ۵۵۸ کتاب النذر)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۲۶۱ الفصل الرابع فی النذر۔

کامیاب ہوگیا تو چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دوں گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کے بعد اس بچے کے لیے چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دینا لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ نابالغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کی مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آپ کا بچہ پانچویں جماعت کے امتحان میں کامیاب بھی ہوجائے تو بھی اس کے ذمے چار روزے رکھنا اور سو روپے کی نذر دینا واجب نہیں۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: **سوال (۶۷۶)** طفلِ نابالغ جو عقل رکھتا ہے اس نے نذر معین یا غیر معین مانی، بعد حصولِ مقصود اُس پر ادا کرنا اس نذر کا واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب: واجب نہ ہوگا، اگر وہ نذر مالی ہے تو ادا کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۵۷ کتاب النذر)

منذور چیز نہ ملنے پر اس کے قائم مقام کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی لیکن اس کے علاقے میں اونٹ ملنا مشکل ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اتنا مہنگا کہ اس کی قوتِ خرید سے باہر ہے، اب اس شخص کے لیے اونٹ ہی ذبح کرنا ضروری ہے یا کوئی اور جانور اس کے بدلہ میں ذبح کرسکتا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ اگر یہ شخص واقعی کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہے جہاں اونٹ ملنا مشکل ہے تو اب اس کو اختیار ہے کہ یا تو سات بکریاں ذبح کرکے اپنی نذر پوری کرے یا پھر درمیانی قسم کے اونٹ کی قیمت صدقہ کردے، اس سے اس کی نذر پوری ہوجائے گی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو قال للہ علیّ ان اذبح جذوراً واتصدق بلحمہ فذبح مکانہ سبع شاۃ جاز۔ (الدر المختار بحوالہ امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۵۲ کتاب النذر) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: اس صورت میں اختیار ہے خواہ سات بکریاں ذبح کرکے مساکین کو خیرات کردیجئے یا متوسط درجہ کے اونٹ کی قیمت مساکین کو تقسیم کردیجئے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۵۲ کتاب النذر)

نذر مطلق واجب علی التراخی ہے

سوال: ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تین روزے رکھوں گا، لیکن ان کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ اب الحمد للہ اس شخص کا کام ہو گیا ہے، جبکہ موسم بہت گرم ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ تو کیا یہ شخص سردی کے موسم میں یہ روزے رکھ سکتا ہے یا کام ہو جانے کے فوراً بعد گرم موسم میں ہی رکھنے ضروری ہیں؟

الجواب:۔ نذر مطلق جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص کے لیے نذر روزوں کا رکھنا مرخص ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد نذر کے روزے ادا کیے جائیں۔

لما فی الهندیة: لو قال لله علیّ ان اصوم یوماً فانهٗ یلزمه صوم یوم و تعیین الاداء الیه وهو علی التراخی بالاجماع۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص ۲۰۹ الباب السادس فی النذر)

درود شریف پڑھنے کی نذر ماننے کا حکم

سوال:۔ میں نے ایک کارخانے میں نوکری کے لیے درخواست دی تھی، اس کی منظوری کے لیے میں نے نذر مانی کہ نوکری ملنے کے بعد چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھوں گا، اب جبکہ میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور اسی جگہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو کیا مجھ پر چالیس دن تک روزانہ درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کسی مقام پر فرض یا واجب ہو، درود شریف پڑھنا بھی بعض مواقع میں واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا صحیح ہے، اگرچہ بعض علماء کرام کا اس میں کلام ہے مگر صحیح اور راجح قول صحت کا ہے۔ لہٰذا اب آپ پر چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھنا واجب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو نذر ان یصلّی علی النبی صلی الله علیه وسلم کل یوم کذا لزمه وقیل لا۔ قال ابن عابدینؒ: تحته قوله لزمه لان من جنسه فرضاً........ منه یعلم انه لا یشترط کون الفرض قطعیاً وقوله قیل لا لعل وجهه اشتراط کون الفرض قطعیاً...... قلت والاحوط الاول۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۰۵ بحواله امداد الفتاوٰی ج ۲ ص ۵۹۲ کتاب النذور)

"میں اپنے باپ سے نہیں ہوں گا" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ پختون معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات پر کسی کو پختہ یقین دلانا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام اس طرح نہ کیا تو میں اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے الفاظ سے یمین (قسم) منعقد ہوجاتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی اس قسم کو پورا نہ کرسکے تو کیا اس کے ذمہ کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اٹھائی جائے بدون اس کے یمین منعقد نہیں ہوگی۔ صورتِ مسئولہ کے الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور نہ مخالفت کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

لما قال العلامۃ المفتی عزیزالرحمٰن رحمہ اللہ: (سوال) اگر یہ کہہ دے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں تو اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی خاکروب سے ہوں، پھر اگر چلا جاوے تو کفارہ لازم ہے یا نہ؟

(الجواب) اس میں کچھ کفارہ نہیں جانا درست ہے۔ (عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص ۵۷۲ کتاب الایمان)

کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بھرے مجمع میں کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا، کچھ عرصہ تو وہ اس توبہ پر قائم رہا لیکن پھر اس سے چوری کا جرم سرزد ہوگیا، اب اس شخص پر شرعاً کیا حکم لاگو ہوگا؟ یعنی توبہ کے مذکورہ الفاظ قسم شمار ہوکر اس شخص پر کفارۂ قسم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے الفاظ اگرچہ کسی بات کی توثیق کے لیے مفید ہوتے ہیں مگر یہ یمین کے لیے مثبت نہیں اس لیے اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں، البتہ چوری جیسے قبیح فعل کے دوبارہ ارتکاب پر مال اصل مالک کو واپس کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو انشاء اللہ گناہ معاف ہوجائے گا۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: (سوال) اگر کسی نے یہ کہا کہ میں فلاں گناہ سے توبہ کرتا ہوں اب کبھی نہ کروں گا، تو یہ قسم ہوگی یا نہیں؟

(الجواب) یہ قسم نہیں ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۵۴۹ کتاب الایمان)

کفارۂ یمین میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کفارۂ یمین کی ادائیگی اس طرح کرے کہ بیس٢٠ مساکین کو ایک ہی وقت کھانا کھلادے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کفارۂ یمین میں دس١٠ مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ایک وقت میں بیس٢٠ مسکینوں کو کھانا کھلادے تو اس سے دو وقتوں کی تلافی نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا اس کے ذمے دوسرے وقت کا کھانا کھلانا لازم ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واذا غدی مسکیناً وعشی غیرہ عشرۃ ایام لم یجزہ لانہٗ فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین کما اذا فرق حصۃ المسکین علیٰ مسکینین۔
(ردّ المحتار ج۳ ص۷۲٦ کتاب الیمین۔ مطلب کفارۃ الیمین) ؎۱

غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں کے لوگ جب کسی بات کی توثیق کرتے ہیں تو دوسرے سے کہتے ہیں کہ تیرے سر کی قسم میں یہ کام کروں گا۔ تو کیا اس سے شرعاً قسم منعقد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم اٹھانے کی صورت میں دو مقصد پیش نظر ہوتے ہیں (۱) مقسم بہ کی تعظیم (۲) بات کی پختگی۔ اگر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی یمین سے بات کی پختگی مراد ہو اور مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی شائبہ نہ ہو تو یہ شرعی قسم نہیں صرف بات کو پختہ کرنے کی وجہ سے اس کو یمین کہا گیا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے اس کو جائز کہا ہے اور اگر مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مشارکت کی بناء پر جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وھل یکرہ الحلف بغیر اللہ تعالیٰ قیل نعم للنھی وعامتھم لا وبہ افتوا لا سیما فی زماننا وحملوا النھی علی الحلف بغیر اللہ لا علیٰ وجہ الوثیقۃ کقولھم بابیک ولعمرک ونحو ذلک۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۳ ص۷۰۵ کتاب الیمین۔ مطلب فی حکم الحلف بغیرہ تعالیٰ)

؎۱ ولما قال العلامۃ ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: وان غدا عشرۃ وعشا عشرۃ غیرھم لم یجزیہ وکذا اذا غدا مسکیناً وعشا غیرہ عشرۃ ایام لم یجزیہ لانہ فرق طعام العشرۃ علیٰ عشرین یحصل لکل واحد منھم المقدار المقدر کما اذا فرق حصۃ المسکین علیٰ مسکینین۔
(الجوھرۃ النیرہ ج۲ ص۲۹۲ کتاب الایمان)

وَ مَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ سے کیا مراد ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی جنگل میں سفر کر رہا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی موت واقع ہونے کا بھی خدشہ ہے، جبکہ اس کے پاس کھانے کی صرف دو چیزیں موجود ہیں، ایک نذر غیر اللہ کی اور دوسرے خنزیر کا گوشت۔ اس صورت حال میں ان دونوں چیزوں میں سے کون سی کھانا اس کے لیے مرخص ہے کہ اس سے اُس کی جان بچ جائے؟ جبکہ قرآن کریم کی اس آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَ الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ( ) میں مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیتِ کریمہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:- مَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دوسری یہ کہ اس سے غیر اللہ کے نام کی نذر مراد ہے، یعنی کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو غیر اللہ کے لیے نامزد کی گئی ہوں اور اس سے غرض یہ ہو کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔ مَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی پہلی قسم اور خنزیر حرمت میں دونوں برابر ہیں، مضطر کو اختیار ہے کہ حالتِ اضطرار میں ان دونوں میں سے جو چاہے بقدر ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ اور دوسری قسم جو کہ نذر لغیر اللہ ہے وہ اگرچہ حرام ہے مگر حرمت میں خنزیر سے کمتر ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خنزیر کی حرمت لعینہٖ ہے اور غیر اللہ کے نام کی نذر کی حرمت لغیرہٖ ہے، اور حرمت لغیرہٖ بہ نسبت حرمت لعینہٖ کے کمتر درجے کی حرمت ہے۔ اس لیے مضطر پر لازم ہے کہ خنزیر کو چھوڑ کر نذر لغیر اللہ سے بقدر ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ فقط واللہ اعلم

ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :- ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ میں اپنے مرحوم والد کے ایصالِ ثواب کے لیے ہر روز چار رکعت نفل نماز پڑھوں گا اور ہر ماہ ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ کئی ماہ تک تو اس شخص نے اس پر عمل کیا مگر کچھ حادثات کی وجہ سے اب وہ مالی مشکلات سے دوچار ہے اور نفل نماز تو پڑھ لیتا ہے مگر ہر ماہ بکرا ذبح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اس شخص کے لیے شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ شخص ہر ماہ بکرا ذبح نہ کرے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جنس سے کوئی واجب یا فرض عمل موجود ہو۔ چونکہ ایصالِ ثواب ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی جنس میں کوئی واجب عمل موجود نہیں اسلئے صورتِ مسئولہ میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر منعقد نہیں ہوئی ہے، اور اب یہ شخص چونکہ نادار اور غریب ہے اور ہر ماہ بکرا ذبح نہیں کرسکتا تو اس عمل کے ترک کرنے سے وہ عنداللہ مجرم نہ ہوگا۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ : (الجواب) ایصالِ ثواب کی نذر منعقد نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جنس سے کوئی واجب نہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ما لیس من جنسہ واجب لاینعقد النذر بہ؟ اور گو تصدق کی جنس سے واجب ہے مگر یہاں اصل مقصود ایصالِ ثواب بروحِ میت ہے تصدق کی نذر تبعاً ہے، اور نذرِ صحیح میں بھی صحت نذر کی تعیین مکان و زمان و تعیین فقیر نہیں بلکہ اس میں تغیر کا اختیار رہتا ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۰ کتاب الأیمان والنذر) [1]

---

[1] قال العلامۃ ابن العربیؒ : حقیقۃ النذر التزام الفعل بالقول مما یکون طاعۃ للہ عزّ وجل ومن الاعمال قربۃ ولا یلزم نذر المباح ، بدلیل ما روی فی الصحیح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأی ابا اسرائیل قائماً فسأل عنہ فقالوا نذر أن یقوم ولا یقعد ولا یستظل و یصوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروہ فلیصم ولیقعد ولیستظل فأخبرہ باتمام العبادۃ ونھاہ عن فعل المباح ۔

(احکام القرآن ج۱ ص۲۵۲ سورۃ آلِ عمران)

ومثلہ فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ ج۲ ص۱۸ سورۃ آلِ عمران۔

کتاب الوقف

کتاب الوقف
(وقف کے مسائل واحکام)

مسجد کے لیے وقف مکان میں دعویٰ اِرث نہیں چلتا

سوال:۔ مسجد کیلئے وقف مکان میں امام مسجد رہائش پذیر تھے ان کی وفات کے بعد ورثاء اِرث کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ورثاء مسجد کی امامت و خطابت جیسی ذمہ داریوں سے وابستہ نہیں ہیں، توکیا ایسی حالت میں ورثاء اس مکان میں اِرث کا دعویٰ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ جائیداد پر کسی کو اِرث کے دعویٰ کا حق حاصل نہیں، مذکورہ مکان اگر مسجد کے لیے باقاعدہ وقف ہو تو امام کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں، صرف مسجد کے منافع کے لیے اس کا استعمال ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعندهما هو حبسها علیٰ حکم ملك الله تعالیٰ وصرف منفعتها علیٰ من احب ولو غنیا فیلزم فلا یجوز ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوٰی۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۷ کتاب الوقف)[1]

موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے باقاعدہ طورپر وقف کی، اب واقف موقوفہ زمین کو فروخت کرنا چاہتا ہے، توکیا موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف کو موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کے

---

[1] وقال العلامة المرغینانی رحمه الله: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ۔
(الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف، فصل فی المسجد۔
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۶۶ کتاب الوقف، الباب الثانی عشر فی الرباطات والمقابر۔

ردّو بدل کا اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: واذ اصح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۳۷ کتاب الوقف)[1]

باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک آدمی نے اپنا باغ وقف کرتے وقت زمین یا آمدن کا تعین نہیں کیا اُس کی وفات کے بعد جب باغ کے درخت فائدہ کے قابل نہ رہے تو ورثاء نے زمین کا دعویٰ کر دیا، ان کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے مورث نے باغ کے درخت اور اس کی آمدنی وقف کی تھی زمین نہیں، چونکہ اب نہ تو باغ کے درخت رہے ہیں اور نہ اس کی آمدنی، اس لیے یہ زمین ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو اس معاملہ میں ان کو کہاں تک حق بجانب سمجھنا چاہیئے؟

الجواب: شرعاً باغ کی زمین کی طرح اس کے درخت اور میوہ کا وقف کرنا بھی جائز ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں واقف کے الفاظ اور عرف کو مدِنظر رکھ کر فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر علاقہ میں وقف صرف درخت اور میوہ کیا جاتا ہو تو پھر اس کا اعتبار ہوگا ورنہ زمین بھی وقف متصور ہوگی۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: لان ھذا صدقۃ بالمنفعۃ او بالغلۃ وذلک قد یکون مؤبداً فمطلقہ لا ینصرف الی التابید فلا بد من التنصیص۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۳۹ کتاب الوقف)[2]

وقف سے رجوع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی اور وقف تام بھی ہوگیا، اب وہ اس

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملک ولا یعار ولا یرھن (ای لا یملک) لتملیک لغیرہ بالبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ فصل حکم الواقف الجائز۔

[2] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: واذا وقف مالاً لاجل المساجد فانہٗ جائز لجریان العرف بہ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۱۵ کتاب الوقف الفصل الثالث)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۲۷ کتاب الوقف۔

وقف سے رجوع کرنا چاہتا ہے، تو کیا واقف اپنے وقف سے رجوع کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: جو کوئی اپنی مملوکہ زمین ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کردے اور وقف بھی تام ہو جائے تو اس کے بعد واقف اپنے وقف سے رجوع کرنے کا شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة فخرالدین الرازی الشہیر بقاضی خانؒ: وعن محمدؒ وعن ابی حنیفۃؒ اذا جعل ارضہ وقفاً علی المسجد جاز ولا یکون لہ ان یرجع۔

(فتاویٰ قاضیخان علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۲۹۱ باب الرجل یجعل دارہ مسجداً الخ)[1]

موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لیے مکان بنانے کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اب مسجد کی انتظامیہ امام مسجد کے لیے اس موقوفہ زمین میں رہائشی مکان تعمیر کرنا چاہتی ہے، تو کیا انتظامیہ کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف ہو اس میں انتظامیہ کو امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے، کیونکہ امام مسجد کی ضرورت بھی مسجد کے مصالح میں شامل ہے۔[2]

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وبما ذکرناہ علم انہ لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الامام فانہ لا یضر فی کونہ مسجداً لانہ من المصالح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)

عیدگاہ میں کھیلنا جائز نہیں

سوال: عیدگاہ میں کھیلنا اور ورزش کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگرچہ عیدگاہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں، اسی لیے بعض فقہاء اس میں

---

[1] وقال العلامۃ برہان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا صح الوقف لم تجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الہدایۃ ج۲ ص۲۴۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ فصل الذی یرجع الی الموقوف۔

[2] وقال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: ویبدأ من غلتہ بعمارتہ ثم ما ھو اقرب لعمارتہ کامام مسجد ومدرس مدرسۃ یعطون بقدر کفایتھم۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۳۶۶ مطلب یبدأ من غلۃ الوقف بعمارتہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۵ ص۲۱۱ کتاب الوقف۔

ادب و احترام کے اس درجہ کے قائل نہیں جو مساجد کے لیے ہوتا ہے تاہم ہمارے معاشرہ میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا احترام زیادہ مناسب ہے اور اس میں ہر قسم کے کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما مصلی العید لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لہٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوی ذٰلک فلیس لہ حکم المسجد وقال بعضہم یکون مسجداً حال اداء الصلٰوة لاغیر وھو والجبانة سواءٌ ویجنب ھٰذا المکان عما یجنب عنہ المساجد احتیاطاً والظاھر ترجیح الاوّل لانہٗ فی الخانیة یقدم الاشھر۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۶ الوقف فی احکام المسجد)[لہ]

موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے

سوال:۔ ایک شخص نے مدرسہ کیلئے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف تام بھی ہوگیا ہے تو کیا اس موقوفہ زمین میں عُشر دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مدرسہ وغیرہ کے لیے وقف ہوجائے اور اس کے بعد اس میں کاشت وغیرہ کی جائے تو اس کی آمدنی میں عُشر دینا ضروری ہے۔

لما قال فی الھندیة: قال ارض الوقف اذا کانت عشریة دفعھا القیم مزارعة او معاملة فعشر جمیع الخارج فی نصیب الدافع وھٰذا علیٰ قول ابی حنیفةؒ فان عندہٗ فی الاجارة بالدراھم العشر علی الاجر کالخراج وعندھما یجب فی الخارج

لہ وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وما اتخذ لصلٰوة العید فانہٗ لایکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لہٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف اما فیما سوی ذٰلک لیس لہٗ حکم المسجد قال بعضہم لہٗ حکم المسجد حال اداء الصلٰوة لاغیر ھو والجبانة سواء ویجنب ھٰذا المکان عما یجنب المسجد احتیاطاً وفی الواقعات المسجد الذی اتخذ لصلٰوة العید۔ فالمختار للفتویٰ انہٗ مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصلت الصفوف واما فی ما عدا ذٰلک فلا رفقاً بالناس۔

(فتاویٰ تاتارخانیة ج۵ ص۸۴۵ کتاب الوقف، مسائل وقف المساجد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

فکذٰلک المزارعۃ ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۲ ص ۴۲۴ کتاب الوقف ۔ الباب الخامس) [۱]

موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعوای کرنے کا حکم

سوال :۔ کافی مدت سے ایک زمین مسجد کے لیے وقف کی ہوئی ہے لیکن اب وہ آدمی اُسی زمین کی دوبارہ ملکیت کا دعوٰی کررہا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعوٰی درست ہے یا نہیں ؟

الجواب : اگر اس زمین کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ مسجد ہی رہے گی اور کسی کی ملکیت متصور نہ ہوگی اور نہ رجوع صحیح ہے ۔

لما قال العلامۃ برهان الدین المرغینانیؒ : ومن اتخذ ارضہ مسجدًا لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصًا للہ تعالیٰ ۔

(الهدایۃ ج ۲ ص ۴۶۵ کتاب الوقف) [۲]

موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنے کا حکم

سوال : ایک شخص نے قبرستان کے لیے اپنی زمین وقف کی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مُردوں کو دفنایا جا چکا ہے، اب محلہ کی تنظیم والے اس قبرستان میں لوگوں کو اموات کے دفنانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر اس قبرستان کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ قبرستان ہی رہے گی ، اور محلہ کی تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست نہیں ہے، اس قبرستان میں مُردوں کو دفنایا جائے گا منع کرنا ناجائز ہے ۔

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانیؒ : قال ابوحنیفۃؒ فی قلیل ما اخرجتہ وکثیرہ العشر سواء سقی سیحًا او سقتہ السماء ۔ (الهدایۃ ج ۱ ص ۲۰۱ باب العشر)

وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص ۹ کتاب الصلوٰۃ ۔

[۲] وقال فی الهندیۃ : اما حکمہ عندهما زوال العین عن ملکہ .... فانہ یصح حتی لا یملک بیعہ ولا یورث ۔ (الفتاوی الهندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ الوقف الباب الاول فی تعریفہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب ۔

لما قال فی الهندیة : واذا کان یزول الملک عندهما یزول ملکه بالقول عند ابی یوسفؒ وهو قول الائمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلی هٰذا مشائخ بلخ وعلیه الفتوٰی ۔۔۔۔ امّا حکمه عندهما زوال العین عن ملکه الیٰ ۔۔۔۔۔ فانه یصح حتی لایملک بیعه ولا یورث۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ) [1]

وقف میں واقف کی شرائط کے معتبر ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے حالتِ حیات میں محلہ والوں کو مدرسہ کی تعمیر کے لیے جگہ دے دی اور کہا کہ جب تک اس مدرسہ میں طلباء تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو مجھے اور میرے ورثاء کو اس زمین میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے مدرسہ میں سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف میرا یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد سلسلہ تعلیم بند ہوگیا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اب میں اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں، اس پر لوگوں نے اُسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو کیا اس آدمی کو حق استرداد شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورۃ مذکورہ میں چونکہ واقف نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر سلسلۂ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف کردہ زمین میری یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگی، تو یہ وقف عدم تابید کی وجہ نامنظور رہے اور وقفِ تام نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے اس لیے واقف مذکورہ زمین کو واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان یجعل مالَه حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفاً من الفقراء۔

(ردالمحتار ج ۴ ص۳۶۱ کتاب الوقف) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع ولا یبیعه ولا یورث عنه ۔ (الهدایة ج ۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص۳۶۷ کتاب الوقف۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ : شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة ۔ (الاشباه والنظائر ج ۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف ۔

طلباء کے لیے مخصوص وقف کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس کے لیے جو بکرے یا گوشت آتا ہے کیا طلباء کے علاوہ اساتذہ اور دیگر عملہ بھی اس میں سے کھا سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر گوشت اور بکرے واقف نے صرف مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف کیے ہوں تو اس گوشت وغیرہ کو طلباء کے علاوہ کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں واقف کی شرط سے مخالفت لازم آتی ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ شرطِ واقف شارع کی نص کی طرح ہے، تاہم صرف مدرسہ کو دے کر مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو اختیار دینے کی صورت میں مدرسہ کے لیے دیئے گئے دیگر عطایا کے حکم میں ہو کر طلباء کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : قال فی الاسعاف یجب صرف الغلة علیٰ ما شرط الواقف وفی غیرہ شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة۔
(تنقیح الحامدیة ج۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف)[1]

شاملات دیہہ زمین کے وقف کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سرکاری کاغذات میں وہ شاملاتِ دیہہ ہے، گاؤں کے چند آدمیوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کر دیا اور وقف کی تحریری دستاویز پر انگوٹھے اور دستخط وغیرہ ثبت کیے، جبکہ گاؤں کے تمام لوگ اس وقف پر راضی نہیں، تو کیا ایسا وقف شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگر مذکورہ زمین واقعی پورے گاؤں والوں کی مشترکہ ہے اور اس کو تمام مالکان نے نہیں بلکہ بعض نے وقف کیا ہو تو یہ وقف شرعاً صحیح نہیں کیونکہ یہ وقف مشاع ہے لہٰذا شاملات دیہہ زمین کا وقف بدون تمام شرکاء کی رضا کے درست نہیں۔

لما قال العلامة فخرالدین حسن بن منصور الشهیر بقاضی خانؒ، وقف المشاع

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ : قولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة۔
(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۴ ص۴۳۳ کتاب الوقف)
ومثلهٗ فی الفتاوی الخیریة علیٰ هامش تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۲۷ کتاب الوقف۔

عند محمدؒ لا یجوز والفتویٰ علیٰ قول محمدؒ ۔ (فتاویٰ قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۳ فصل وقف المشاع)[1]

قاضی کے لیے استبدالِ وقف جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دینی مدرسہ کے لیے کچھ زمین وقف کرے اور بعد میں کسی مصلحت کی بناء پر اس کو بدلنا چاہے تو شریعت کی رو سے اس طرح کی استبدال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر قاضی استبدالِ وقف میں مصلحت سمجھے تو اسے شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ وقف میں استبدال کرے البتہ قاضی کے علاوہ کسی اور کو شرعاً یہ اختیارات حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ فخرالدین حسن بن منصور الشھیر بقاضی خانؒ: اما بدون الشرط اشار فی السیر انہ لا یملک الاستبدال الا القاضی اذا رأی المصلحۃ فی ذٰلک۔

(فتاویٰ قاضیخان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۳۰۶ فصل فی مسائل الشرط فی الوقف)[2]

مشترکہ جائیداد بلا تقسیم مسجد کے لیے وقف کرنا

سوال:۔ کئی مالکوں میں ایک زمین مشترکہ تھی ان میں سے چند ساتھیوں نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی جبکہ ان میں بعض ساتھی اس پر راضی نہیں ہیں، تو کیا شریعت کی رو سے یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد بغیر تقسیم کیے وقف مشاع کے مترادف ہے، اس لیے وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے ناراض مالکوں کی طرف وقف کنندگان بھی اپنے اپنے حصص سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

لما قال فی الھندیۃ: واتفقا علیٰ عدم جعل المشاع مسجدًا اومقبرۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: والحاصل ان وقف المشاع مسجدًا اومقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

[2] قال العلامۃ زین الدین بن ابراھیم الشھیر ابن نجیمؒ: شرط الوقف عدم الاستبدال فللقاضی الاستبدال اذا کان اصلح۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی مجموعۃ الفتاویٰ ج۲ ص۱۱۲ کتاب الوقف۔

مطلقاً سواء کان مما لا یحتمل القسمة او یحتملها۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع) [۱]

قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کرکے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگا دی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے، خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کرکے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جا سکتی ہے۔

لما فی الهندیة: مقبرة علیها اشجار عظیمة فهذا علی وجهین اما ان کانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرة او نبتت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففی الوجه الاول المسألة علی قسمین اما ان کانت الارض مملوکة لها مالک او کانت مواتاً لا مالک لها واتخذها اهل القریة مقبرة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۷۳ الباب الثانی عشر الخ) [۲]

[۱] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غیر جائز مطلقاً اتفاقاً وفی غیرهما ان کان مما لا یحتمل القسمة جاز اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۵ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

[۲] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: مقبرة علیها اشجار ان کانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوکة لها مالک جعلها مقبرة فالاشجار باصلها علی ملک رب الارض یصنع الورثة بالاشجار ما شاؤا لان الشجرة لا تدخل تحت الوقف۔۔۔ وان کانت الارض مواتا لا مالک لها باصلها علی حالها القدیمة هذا کله اذا کانت الاشجار نابتة قبل اتخاذها مقبرة ولم ینبت بعد ذلک لا یخلوا اما ان علم غارسها او لا یعلم ان علم کانت للغارس وان لم یعلم بها غارس فالحکم للقاضی۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف الفصل الثالث نوع آخر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

وقف مشاع کی خرید و فروخت کرنے کا حکم

سوال:- اگر چند آدمی کچھ رقم اکٹھی کر کے مسجد کے لیے زمین خرید یں جس کے مالکانہ حقوق بھی ان کو منتقل ہوئے ہوں لیکن اب اس جگہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، تو کیا یہ اشخاص اس جگہ کو فروخت کر کے کسی دوسری جگہ مسجد کے لیے زمین خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- چند اشخاص کا مشترکہ طور پر مسجد کے لیے زمین خریدنا وقف مشاع کے حکم میں ہے۔ جو صحیح نہیں، اس لیے صورتِ مذکورہ میں ان اشخاص کی خریدی ہوئی جگہ مسجد کے لیے وقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زمین خریدنے سے قبل یہ اشخاص کسی ایک کو رقم ہبہ کر دیں اور موہوب لہٗ اپنی رقم اور موہوبہ رقم ملا کر اس سے زمین خریدے اور بعد ازاں اس کو مسجد کے لیے وقف کر دے، اس طرح کرنے سے اس جگہ کی تبدیلی جائز نہیں ہوگی۔

لما قال فی الهندية: وقف المشاع المحتمل للقسمة لايجوز عند محمدؒ وبه اخذ مشائخ بخاری وعليه الفتوى۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[1]

مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کیلئے وقف کرنا

سوال:- ایک شخص تقریباً ۶۰ سال سے ایک وسیع جائیداد پر غاصب ہے اور اس جائیداد کی کافی آمدنی ہے، اب اگر یہ شخص اس جائیداد کی آمدنی کا کچھ حصہ مساجد کی تعمیر یا دیگر رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرے تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- مغصوبہ جائیداد واجب الرد ہے اور ایسی جائیداد کی آمدنی غاصب کیلئے ذاتی طور پر استعمال کرنا حلال نہیں اور نہ ثواب کی نیت سے کسی مسجد یا مفاد عامہ کے لیے وقف کر سکتا ہے، کیونکہ وقف کی صحت کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً اومقبرةً غير جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۷ كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۲ ص۶۰۱ كتاب الوقف۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ : ھو حبس العین علیٰ ملک الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۳ ص۳۹۱ کتاب الوقف) ۱؎

پرانے قبرستان پر مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال:۔ یہاں ایک ایسا قبرستان ہے جس کی تاریخ معلوم نہیں، قبریں بالکل ہموار ہو چکی ہیں، ان کے آثار پر حیوانات چرتے ہیں اور لوگوں کے واسطے بول و براز کا مرکز بن چکا ہے، کیا ایسے قبرستان پر دینی مدرسہ قائم کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی قبرستان کی موقوفہ زمین پر قبروں کے نشانات نہ ہوں اور پرانا قبرستان ہو اور اس کی زمین بھی ہموار ہو چکی ہو تو چراگاہ بنانے اور بول و براز پھینکنے کے بجائے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ اس پر کوئی دینی مدرسہ تعمیر کر لیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ولو بلی المیّت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز) ۲؎

جنازہ گاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین جنازہ گاہ کے لیے وقف کی جبکہ ایک دوسرے شخص نے اس میں ایک کنواں اس غرض سے کھودا کہ لوگ اس کے پانی سے وضو وغیرہ کریں گے، تو کیا اس شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق چونکہ کنواں کھودنے والے کا عمل اور ارادہ زمین وقف کرنے والے کے عمل اور ارادے کے منافی نہیں بلکہ کنواں کھودنے والا واقف

۱؎ وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ : ھو حبس العین علیٰ ملک الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج ۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف ۔ الباب الاوّل فی تعریفه ۔

۲؎ وقال فی الھندیة : ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (الفتاویٰ الھندیة ج ۱ ص۱۶۷ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ باب الجنائز ۔

کے عمل وارادے کے لیے مکمل اور معاون ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال فی الهندية : الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم إلی ماهو اقرب إلی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة ثم السراج و البسط کذٰلک الی آخر المصالح۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۳۶۸۔ الوقف۔ الباب الثانی) [1]

ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص زمین وقف کرتے وقت "ہبہ" کا لفظ استعمال کرے یا یوں کہے کہ میں نے یہ زمین مسجد کو دے دی ہے، کیا اس سے وقف جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ زمین وقف متصور ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ "ہبہ" اور "اعطاء" کے لفظ سے بھی دائمی حقوق دیئے جاتے ہیں اس لیے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں "ہبہ" اور "اعطاء" سے بھی وقف صحیح ہے، لہٰذا یہ زمین موقوفہ (وقف شدہ) زمین ہو گی۔

لما قال فی الهندية : ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیک اذا سلمه للقیم۔ (الفتاوی الهندية ج ۲ ص۴۶۱ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد) [2]

عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم

سوال:۔ شہر سے باہر لوگوں نے نماز عیدین کے لیے ایک میدان مقرر کیا ہے تقریباً نو ۹ سال تک

---

[1] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : الشعائر التی تقدم شرط ام لم یشرط بعد العمارة هی امام ....وقنادیل وحصر وماء وضوء۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۷۱ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الخانية علی هامش الهندية ج۳ ص۳۰۸ قبل کتاب اللقطة۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : ولو قال "وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد۔ (الفتاوی التاتارخانية ج۵ ص۸۵۳ کتاب الوقف۔ مسائل وقف المساجد)

اس میدان میں نماز عیدین ادا کی گئی ہے، اب حکومت اس جگہ پر ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور عیدگاہ کے لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جگہ بھی دینے کو تیار ہے، کیا حکومت کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ عیدگاہ موقوفہ ہو تو حکومت کا اس پر ہسپتال وغیرہ بنانا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ جہت وقف کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے، البتہ اگر یہ جگہ وقف نہ ہو بلکہ ویسے ہی اس جگہ پر کئی سالوں سے نماز عیدین پڑھی جا رہی ہو تو اس صورت میں اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع و هو مالك فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة۔[1]

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۹۵ کتاب الوقف۔ مطلب ما خالف شرط الواقف)

واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم

سوال: اگر ایک شخص مسجد سے ملحقہ اپنی ۲ دو مرلہ زمین اس شرط پر مسجد کے لیے وقف کرے کہ مسجد سے ملحقہ ایک دوسرا پلاٹ خرید کر اس پر جنازہ گاہ بنایا جائے گا، اور اگر کسی وجہ سے ملحقہ پلاٹ نہ مل سکے تو کیا یہ شخص اپنی دو مرلہ زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین واقف نے کسی شرط کے ساتھ وقف کی ہو اور وہ شرط پوری نہ ہو سکتی ہو تو واقف اپنی زمین کو واپس لینے کا شرعاً مجاز ہے، لہٰذا موصوف اپنی ۲ دو مرلہ زمین واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: و ما خالف شرط الواقف فهو خالف للنص وهو حکم لا دلیل علیه سواء کان نصه فی الوقف نصاً

---

[1] ولما قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: شرط الواقف کنص الشارع مالم تخالف الشرع۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۲۵۱ الباب الثانی فی نصب المتولی وما یملکه اولا ---- کتاب الوقف)
ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۵۶ کتاب الوقف۔

او ظاهراً وهٰذا موافق لقول مشائخنا کغیرهم شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعه۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۹۵ کتاب الوقف، مطلب ماخالف شرط الواقف) [۱]

قبرستان کے لیے موقوفہ زمین میں تصرّف کرنا

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین قبرستان کے لیے وقف کر دی، واقف کے فوت ہونے کے ۳۵/۳۶ سال بعد اس کے بیٹے نے موقوفہ زمین میں کچھ یوں تصرّف کیا کہ جسے چاہتا ہے میّت دفن کرنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے روک دیتا ہے، اس کے علاوہ وقف شدہ زمین کے کچھ حصہ میں فصل بھی کاشت کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ والد کی موقوفہ زمین میں بیٹے کا کسی قسم کا تصرّف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں واقف کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد اس موقوفہ زمین میں کسی قسم کے تصرّف کرنے کا حق دار نہیں رہتا، اس لیے کہ ایک دفعہ وقف تام ہونے کے بعد زمین مالک کی مِلک سے نکل جاتی ہے جس کے بعد واقف اور اس کے ورثاء کو تصرّف کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لما قال العلامة فخر الدین الزیلعی رحمہ اللہ: وعند ابی یوسفؒ یزول مِلکہ بالقول و عند محمدؒ اذا ستسقی الناس عن السقایة وسکنوا الخان والرباط ودفنوا فی المقبرة زال المِلک الخ۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۱ کتاب الوقف) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی مجموعة الفتاوٰی ج۲ ص۱۰۱ کتاب الوقف۔

[۲] وقال فی الهندیة: من جعل ارضهٗ مقبرة لم یزل مِلکه عن ذٰلک حتیٰ یحکم به الحاکم عند ابی حنیفةؒ وعند ابی یوسفؒ یزول ملکه بالقول کما هواصله..... ودفنوا فی المقبرة زال المِلک ویکتفی بواحد ذکر فی المبسوط ان الفتوٰی علیٰ قولهما فی هٰذه المسائل وعلیه الاجماع۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۴۶۴ الباب الثانی عشر فی الرباطات والمقابر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۳ کتاب الوقف۔

جنازہ گاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے جنازہ گاہ کے لیے تین کنال زمین وقف کر دی اور وقف تام بھی ہوگیا ہے، لیکن اب اس وقف شدہ زمین میں راستہ کی اشد ضرورت ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے اس سے راستہ جدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین کو وقف کرنے کے بعد نماز جنازہ کے لیے استعمال کیا گیا اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس سے وقف اب وقفِ تام ہوگیا ہے اب اس کا استعمال راستہ وغیرہ کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن (ای لا یقبل التملیك لغیره بالبیع)[1]

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۷۲ کتاب الوقف)

وقف غیر تام کے استبدال کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جبکہ اس کے قریب ہی ایک اور مسجد موجود ہے لیکن پھر بھی اس جگہ پر مسجد بنانے میں فائدہ ہے، لہٰذا اگر یہ شخص اس زمین کے بدلے جس پر ابھی تک مسجد نہیں بنائی گئی ہے کسی دوسری جگہ مسجد بنا لے تو شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی زمین کے وقف تام ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا راستہ الگ کرکے عام لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اذان اور اقامت سے کم از کم ایک دفعہ نماز باجماعت ادا ہوجائے چونکہ صورتِ مذکورہ میں یہ اقدامات نہیں ہوئے ہیں، لہٰذا یہاں وقفِ تام نہ ہونے کی وجہ سے مالکِ زمین اس میں ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے، اور جب کسی زمین پر ایک دفعہ باقاعدہ شرعی مسجد بن جائے تو ایسی جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لائی جاسکتی۔

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: اذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : ومن بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ واذا صلی فیہ واحد زال ملکہ۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ الوقف فصل فی احکام المسجد) لہ

وقف کے مملوکہ ہونے کا حکم

سوال: کسی نے مسجد کے واسطے زمین وقف کر دی اور اس پر مسجد بنا کر اس میں نماز باجماعت بھی ادا کی گئی، کیا یہ موقوفہ زمین مسجد کے بانی کی ملکیت متصور ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے واسطے بنائی جاتی ہیں، اسکی زمین پر باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت بن جاتی ہے، اس لیے مذکورہ موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں آ سکتی۔

لما قال فی الھندیۃ : وعندھما حبس العین علی ملک اللّٰہ تعالیٰ علی وجہ تعود منفعتہ الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف) ٢ہ

موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم

سوال: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہوتی ہو بلکہ چپلوں (جوتوں) اور

لہ لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللّٰہ : واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ واذا صلّی فیہ واحد زال عن ملکہ۔ الخ - (الھدایۃ ج ۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف)
ومثلہ فی الھندیۃ ج ۲ ص۴۵۴ الوقف، الباب الحادی عشر فی المسجد۔

٢ہ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : وعندھما حبسھما علی حکم ملک اللّٰہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علی من احب وعلیہ الفتوٰی، قولہ علی حکم ملک اللّٰہ تعالیٰ قدر لفظ الحکم لیفید ان المراد لم یبق علی ملک الواقف ولو انتقل الی ملک غیرہ وقولہ وعلیہ الفتوٰی ای علی قولھما یلزمہ۔
(ردالمحتار ج ۴ ص۳۳۸ کتاب الوقف)
ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۷ کتاب الوقف۔

استنجا خانوں وغیرہ کے لیے متعین نہ ہو اُس میں فلش (لیٹرین) بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہو بلکہ جوتوں، استنجا خانوں اور غسلخانوں وغیرہ کے لیے مختص ہو تو اس میں فلش (لیٹرین) بنانا جائز ہے۔

لما قال العلامة شهاب الدین احمد رحمه الله: لوجعل تحته حانوتا وجعله وقفاً على المسجد قیل لا یستحب ذٰلک ولکنه لو جعل فی الابتداء هٰکذا صار مسجداً وقفاً علیه ویجوز المسجد والوقف الذی تحته۔

(شلبی علی هامش تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۳ کتاب الوقف) [1]

موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا کچھ حصہ اہل محلہ کی ضروریات کے لیے وقف کر کے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا، کیا واقف کی وفات کے بعد اس کے ورثاء یہ زمین واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اہالیانِ محلہ کو اب بھی اس کی ضرورت ہے اور متعلقہ متولی بھی فوت ہو گیا ہے؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف یا متولی کی وفات سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا جب تک اہلِ محلہ کو اس کی ضرورت ہو تو واقف کے فیصلہ کی رعایت ہوگی، واضح ہو کہ موقوفہ زمین میں ارث جاری نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: فلا یجوز له ابطاله

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وبما ذکرناه علم انه لو بنی بیتاً على سطح المسجد لسکنی الامام فانه لا یضر فی کونه مسجداً لانه من مصالح المسجد .... اذا بنی مسجداً وبنی غرفة وهو فی یده فله ذٰلک وان کان حین بناه خلی بینه وبین الناس ثم جاء بعد ذٰلک یبنی لا یترکه وفی جامع الفتاوی اذا قال عنیت ذٰلک فانه لا یصدق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ الوقف، فصل فی احکام المسجد)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف۔

ولا یورث عنه وعلیہ الفتوٰی ابن الکمال وابن الشحنۃ۔

(الدرالمختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۲ کتاب الوقف)[1]

متروکہ جائیداد میں وقف پر اقرار کا حکم

سوال:۔ ایک شخص فوت ہوگیا اور کچھ جائیداد ترکہ میں رہ گئی، اس کے ورثاء میں ایک بیٹا یہ اقرار کرتا ہے کہ والد صاحب نے یہ زمین باقاعدہ وقف کی تھی جبکہ باقی ورثاء اس سے انکار کررہے ہیں، اندریں حالات کیا تمام جائیداد وقف متصور ہوگی یا یہ مقر کے حصہ تک محدود رہے گی؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں اقرار حجتِ قاصرہ بھی ہے اور دوسرے پر اقرار بھی چونکہ صحیح نہیں اس لیے مقر کا اقرارِ وقف صرف اس کے حصہ تک محدود رہے گا اور دوسرے ورثاء پر اس کا اقرار حجت نہیں بن سکتا، وہی حصہ موقوف رہے گا جو مقر کے حصہ میں آئے۔

لما قال فی الھندیۃ: ولو اقر بالوقف الیٰ..... وان کان مع المقر وارث آخر یجحد ذٰلک کان نصیب الجاحد من ھٰذہ الارض للجاحد یفعل ما یشآء، ونصیب المقر یکون وقفاً علیٰ ما اقر بہ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۴۴۲ الوقف، الباب الثامن فی الاقرار)[2]

---

[1] وقال فی الھندیۃ: وکذٰلک اذا جعل دارہ فی ثغر مسکنا للغزاۃ والمرابطین ودفعھا الیٰ وال یقوم علیھا فلیس لہ ان یرجع فیھا وان مات لم تکن میراثاً عنہ وان لم یسکنھا احد۔ (الفتاوی الہندیہ ج۲ ص۴۶۶ الباب الثانی عشر فی الرباطات)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ: واما اذا کان ثمۃ وارث آخر فان اقر الآخر بجمیع ما اقر بہ ھٰذا الوارث کان الجواب کما قلنا وان انکر الواقف کان نصیب المنکر ملکاً لہٗ یتصرف فیہ بما شآء ونصیب المقر وقفٌ۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۷۴۳ کتاب الوقف الاقرار بالوقف)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف، قبل الفصل الرابع فی المسجد۔

باب المساجد

(مساجد میں وقف کے احکام و مسائل)

وقف کی یادداشت (تحریر) لکھنے کا حکم

سوال :- ایک شخص مسجد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا وقف کرنا چاہتا ہے، اگر وہ بطور یادداشت یہ لکھے کہ میں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کے واسطے وقف کیا، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- کسی واقعہ کا تحریر میں لانا دوام اور استحکام کی دلیل ہے، عرف میں بھی جس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے یا سرکاری کاغذات میں اندراج کیا جائے تو وہ زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے، اس لیے وقف کو یادداشت کے لیے لکھنا یا سرکاری کاغذات میں انتقال کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے تاکہ بعد میں کسی وارث کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لما قال الله تبارك وتعالىٰ: إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ فَاكْتُبُوهُ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

ولما قال العلامة حافظ عماد الدین رحمه الله: هٰذا ارشاد منه تعالیٰ لعباده المؤمنین اذا تعاملوا بمعاملات مؤجلة ان یکتبوها لیکون ذٰلك احفظ لمقدارها ومیقاتها واضبط للشاهد فیها وقد نبه علیٰ هٰذا فی آخر الآیة۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۸ سورۃ البقرۃ پ ۳)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دوکانیں تعمیر کرنے کا حکم

سوال :- گاؤں کے چند معززین نے ایک پلاٹ تقریباً ۶ کنال برائے جامع مسجد وقف کیا، جس میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی

---

[1] وقال العلامة اشرف علی تھانوی رحمه الله :- معاملہ کا لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (بیان القرآن ج ۱ ص ۱۶۸ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)
ومثلہ فی تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۰ سورۃ البقرۃ۔

مسجد کی تعمیر سے بچ جانے والی زمین بنجر ہے جسے لوگ عیدین کی نماز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب اُن معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر دوکانیں یا کچھ مکانات بنا دیئے جائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مسجد پر صرف کیا جائے۔ تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ پلاٹ کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے خواہ اس میں مستقل چھت ڈالی گئی ہے یا عارضی چبوترہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جارہی ہو یا ویسے ہی کھلی جگہ ہو ایسی جگہ میں دوکانیں بنانا یا مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ مسجد کے نام سے جو زمین وقف کی گئی ہے اور اس میں کچھ حصّہ ویسے ہی غیر آباد چھوڑا گیا ہے اور تاحال اس پر آبادی نہیں ہوتی ہے تو وہ جگہ مسجد کے علاوہ مذکورہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکناً تسقط حرمتہ وھذا لایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف۔ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیرہ فی مال الوقف علیہ)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں پر ہندوؤں کی کچھ جائیدادیں رہ گئی ہیں جن پر کچھ لوگ قابض ہیں، بعض لوگوں کا تو قانونی قبضہ ہے اور بعض لوگ غیر قانونی طور پر محض قوت کے بل بوتے پر قابض ہیں، کیا ایسی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں حکومت نے قانونی طور پر جن قابضین کا حق تسلیم کرکے انہیں مالکانہ حقوق دیئے ہوں تو وہ جائز مالک متصوّر ہوکر ان کا وقف صحیح ہے

---

[1] وقال العلامۃ ابن الھمام: قیم المسجد اذا اراد ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائہ لایجوز لہ ان یفعل لانہ اذا جعل المسجد سکناً تسقط حرمۃ المسجد واما الفناء فلانہ تبع للمسجد۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۴۴۶ کتاب الوقف۔ الفصل الاول فی المتولی۔ ومثلہ فی التاتارخانیۃ ج ۵ ص ۸۶۰ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون فی المساجد۔

لیکن جس جائیداد پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہو تو مغصوبہ جائیداد کے وقف کی عدم صحت کی وجہ سے اس پر بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں رہے گی اِلّا یہ کہ حکومت باقاعدہ اجازت دے دے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: من شرائطہ الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضًا فوقفھا .... لا تکون وقفًا۔

(البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف) ؎۱

مسجد کی زمین سے مِلک کے زائل ہونے کا حکم

سوال:۔ مسجد کی زمین سے مالک کی مِلک کا ازالہ کب ہو جاتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کی زمین سے مالک کی ملک صرف نماز کی اجازت پر اسی مسجد میں یا انہی الفاظ کے معنی پر ملک زائل ہو جاتی ہے، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اور وقف کے باب اور وقف میں اس کا قول راجح ہو جاتا ہے۔

وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: وقال ابو یوسفؒ یزول مِلکہ بقولہ جعلتہ مسجدًا لان التسلیم عندہ لیس بشرط لانہ اسقاط لملک العبد فیصیر خالصًا لِلّٰہ تعالٰی بسقوط حق العبد وصار کالاعتاق۔

(البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔ فصل فی احکام المسجد) ؎۲

منہدم مسجد کی تبدیلی کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد کسی وجہ سے شہید ہو گئی ہے، اب گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ اسکے

؎۱ وقال فی الھندیۃ: (ومنھا) الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضا فوقفھا .... لا تکون وقفًا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف مطلب فی وقف الذی)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۳۸۱ کتاب الوقف۔

؎۲ وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وعند ابی یوسفؒ یزول بمجرد قول الواقف ولا یجوز بیعہ ولو متالایورث۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف الاوّل)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔

بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کر لی جائے اور اس مسجد کا ملبہ اور زمین وغیرہ فروخت کر دیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے منہدم مسجد کا سامان اور جگہ وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو اور اس پر مسجد بن گئی ہو تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کی تبدیلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذ صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔
(الھدایۃ ج ۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف) ۱؎

ارضِ مغصوبہ پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے غیر مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی، لوگوں نے اس میں تقریباً ۸/۹ سال تک نمازیں بھی پڑھیں، ۸/۹ سال بعد زمین کے اصل مالک نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں نے اس کو مسجد کے لیے وقف نہیں کیا ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کے بدلہ میں دوسری جگہ لے لیں اور مسجد کو اپنی جگہ پر رہنے دیں لیکن وہ نہیں مانتا، تو اب شریعت کی رُو سے اس مسجد کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ وقف کے لیے باقاعدہ ملک تام ہونا شرط ہے، جہاں کہیں کسی غیر کی زمین کو بغیر اس کی اجازت کے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، اس لیے مالک اگر چاہے تو وقف کر سکتا ہے ورنہ مغصوبہ زمین سے مسجد گرا کر زمین فارغ کرانا مالک کا حق ہے۔

لما فی الھندیۃ: (ومنھا) الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفھا ثم اشتراھا من مالکھا ودفع الثمن الیہ او صالح علیٰ مال دفعہ الیہ لا تکون وقفاً۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف مطلب فی وقف لازم) ۲؎

۱؎ وقال العلامۃ التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملک ولا یعار ولا یرھن) ای لا یقبل التملیک لغیرہ بالبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف۔

۲؎ وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: من شرائطہ الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفھا...... لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۳۸۱ کتاب الوقف۔

موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی جس پر ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے، کیا یہ زمین مسجد کے مصالح مثلاً دوکان وغیرہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کیلئے وقف کی گئی ہو اور اس پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی ہو تو اس کو مسجد کے مصالح پر صرف کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے۔

لما قال فی الهندیة: والاصح ما قال الامام ظهیر الدین رحمه الله ان الوقف علی عمارة المسجد وعلی مصالح المسجد سواء۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۴۵۰ کتاب الوقف، الفصل الاول فی المتولی)[1]

مسجد کی زمین پر گھر بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی، اور اس پر مسجد بھی بنادی گئی، لیکن اب یہ مسجد گاؤں کے لیے ناکافی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کے بدلے دوسری جگہ جس میں مسجد کے متعلقہ تمام انتظامات وسہولیات ہوں، وقف کی جائے اور پرانی مسجد کی جگہ مکان بنالیا جائے، تو کیا شریعت کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن گئی اور اس میں نماز بھی پڑھی گئی تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں ہے اس کو کسی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: یبقی مسجداً ابداً الی قیام الساعة وبه یفتی۔ وقال ابن عابدین رحمه الله فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه او لا وهو الفتوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد او غیره)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ان الوقف علی عمارة المسجد ومصالح المسجد سواء۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۵۰ کتاب الوقف) ومثله فی رد المحتار ج۳ ص۴۱۲ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمه الله: واما الذی یرجع الی نفس الوقف فهو التابید وهو ان یکون مؤبداً حتی لو وقت لم یجز لانه ازالة الملک لا الی حد۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقة، فصل واما شرائط الجواز) ـــــ ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۳۹ کتاب الوقف۔

مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم

سوال: بعض اوقات پرندے مساجد میں اپنے لیے گھونسلے بناتے ہیں اور ان میں انڈے اور بچے وغیرہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد میں کافی گندگی پھیل جاتی ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے ان کے گھونسلے اُتار کر باہر پھینکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ پرندوں کے گھونسلوں سے مساجد میں عموماً گندگی پھیلتی رہتی ہے نیز نمازیوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے مساجد سے ایسے گھونسلوں کا اکھاڑنا مرخص ہے۔

لما قال فی الهندیة: ولو کان فی المسجد عش خطاف او خفاش یقذر المسجد لا بأس برمیه بما فیه من الفراخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ الباب الخامس)[1]

مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم

سوال: بعض لوگ جمعرات کی شب اکھٹے ہو کر مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کے ساتھ ساتھ اُچھلتے اور کودتے ہیں جس کی وجہ سے نمازیوں کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا ان لوگوں کا یہ عمل (ذکر بالجہر) شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے، اس لیے اس میں ذکر کے نام پہ مذکورہ طرز اور طریقہ پر اچھلنا کودنا اور ایک ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرنا شریعت کی رُو سے ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ اگر ذاکرین ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے نمازیوں وغیرہ کو تکلیف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفی الملتقی وعن النبی صلی الله علیه وسلم انه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة فما ظنك به عند الغناء الذی یسمونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا اصل له فی الدین

---

[1] وقال العلامة الحصکفی: ولا بأس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۶۳ کتاب الصلوٰة۔ مطلب فیمن سبقت ... الخ)
ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۴۲ کتاب الکراهیة۔ الفصل التاسع فی المتفرقات۔

وزاد فی الجوهرة وما یفعله متصوفة فی زماننا حرام لا یجوز القصد والجلوس الیہ۔ (ردالمحتار ج ۶ ص ۳۴۹ کتاب الحظر والاباحت۔ قبل فصل فی اللبس) ؎۱

مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے میں بانئ مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے موقوفہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد بنائی، بعد میں کچھ لوگ باہر سے آکر اس مسجد کے قریب آباد ہوگئے، اب بانئ مسجد اور اہلِ محلہ میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق کون ہے؟ بانئ مسجد یا اہلِ محلہ؟

الجواب:۔ مسجد بنانے والا اہلِ محلہ کی نسبت مسجد کے تمام امور میں تصرف کرنے پر مقدم ہے کیونکہ بانی کو مسجد کی مرمت، بجلی، پانی کے اخراجات اور امام و مؤذن کے مقرر کرنے میں اہلِ محلہ پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامة ابراهیم الحلبی رحمہ اللہ: رجلٌ بنیٰ مسجداً وجعله لله فهو احق بمرمته وعمارته وبسط البواری والحصیر والقنادیل والاذان والاقامة والامامة فیه ان کان اهلاً لذٰلك وان لم یکن فالرأی فی ذٰلك الیه وکذا ولد البانی وعشیرته من بعده اولیٰ من غیرهم۔ (حلبی کبیری ص ۶۱۵ فصل فی احکام المسجد) ؎۲

؎۱ وقال العلامة حموی رحمه الله: واجمع العلماء سلفاً وخلفاً علیٰ استحباب ذکر الله تعالیٰ جماعة فی المساجد وغیرها من غیر نکیر الا ان یشوش جهرهم بالذکر علیٰ نائم او مصلٍ او قاریٍ کما هو مقرر فی کتب الفقه۔

(عیون البصائر حاشیة الاشباه والنظائر ج ۴ ص ۶۱ القول فی احکام المسجد)

ومِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج ۵ ص ۲۲۴ کتاب السیر۔ الفصل الاول فی بیان صفة الجهاد۔

؎۲ وقال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: فیکون اولیٰ بولایة کمن اتخذ مسجداً یکون اولیٰ بعمارته ونصب المؤذن فیه۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۶ کتاب الوقف)

ومِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۳۳ کتاب الوقف۔

غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسجد ویران ہو جائے اور لوگ اس میں نمازیں پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا از روئے شریعت درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک دفعہ شرعی مسجد بن جائے تو قیامت تک کے لیے وہ مسجد ہی رہتی ہے اس میں کسی قسم کی فصل کاشت کرنا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے اگرچہ ویران ہی ہو جائے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : یبقیٰ مسجداً ابداً الیٰ یوم القیامۃ وبہ یفتیٰ ۔
(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ الوقف ۔ مطلب فیما لوخرب المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کے لیے مکان وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک جامع مسجد بناتے وقت ابتداءً مسجد کے نیچے کچھ مکانات تعمیر کر کے کرائے پر دے دیئے گئے اور ان کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف ہو رہی ہے، اب مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان مکانات میں سے ایک مکان تبلیغی حضرات کے لیے وقف کیا جائے تو کیا عند الشرع یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر ان واقفین نے مکانات کے متعلق کوئی تصریح نہ کی ہو بلکہ مطلقاً وقف کیا ہو تو متولی اور انتظامیہ مسجد کے اہل حل وعقد کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، وہ اس مکان کو تبلیغی حضرات کی سکونت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ورنہ واقفین کی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ : قال واذا اراد القیم ان یبنی

ؔ وقال العلامۃ الکاسانیؒ : واما الذی یرجع الیٰ نفس الوقف فھو التابید وھو ان یکون مؤبداً حتیٰ لو وقت لم یجز لانہ ازالۃ الملک لا الیٰ حد۔
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔ الفصل واما شرائط الجواز)
ومثلہ فی الھدایۃ ج۳ ص۶۳۹ کتاب الوقف۔

فیھا قریۃ لاکرتھا وحفاظھا فیحرز فیھا الغلۃ لحاجتہ إلی ذلک کان لہ ان یفعل ذلک۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۷۴۵ کتاب الوقف، الفصل السابع فی تصرف القیم الخ) [1]

سوال:۔ کسی جگہ پر فوج کے دو یونٹ | مسجد کے لیے وقف شدہ گھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی

اکٹھے قیام پذیر تھے، وہاں پر ایک مسجد بھی تھی جس کے لیے ان فوجیوں نے مشترکہ طور پر چندہ کر کے ایک گھڑی خرید کر وقف کی، کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک یونٹ والے وہاں سے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ وقف شدہ گھڑی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اس یونٹ والوں کا مذکورہ گھڑی کو اپنے ساتھ لے جانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ کے مطابق یہ گھڑی چونکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی اور وقف تام ہونے کے بعد وہ کسی کی ملکیت نہیں رہی، لہٰذا اس موقوفہ گھڑی کو کسی بھی یونٹ والے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: إذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف) [2]

سوال:۔ ایک شخص نے قبرستان | قبرستان کے لیے وقف شدہ زمین پر جنازہ گاہ بنانے کا حکم

---

[1] وقال العلامۃ فخر الدین الرازی الشھیر بقاضی خانؒ: وکذا لو کان الوقف خانا علی الفقراء واحتاج الی خادم یکسح الخان ویقوم ویفتح بابہ ویسدہ فیسلم بعض البیوت الی رجل اجرۃ لہ لیقوم بذلک کان لہ ذلک۔ (فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۳۰۰ کتاب الوقف، باب الرجل یجعل دارہ مسجداً)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۴۶۱ کتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد ..... فی مال الوقف۔

[2] وقال العلامۃ التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لایملک ولا یعار ولا یرھن (ای لایقبل التملیک لغیرہ بالبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف، فصل واما الذی یرجع الی الموقوف فانواع۔

کے لیے زمین وقف کی، اب چونکہ قبرستان کے لیے جنازہ گاہ کی بھی اشد ضرورت ہے تو کیا واقف کی اجازت سے اس وقف شدہ زمین میں جنازہ گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف میں واقف کی نیت معتبر ہوگی لہٰذا اس کے لیے سوائے معصیت کے ہر قسم کے تصرفات جائز ہیں، اور مذکورہ صورت میں جنازہ گاہ چونکہ ضروریاتِ مقبرہ میں سے ہے اور واقف کی اجازت بھی موجود ہے لہٰذا جنازہ گاہ بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية وله ان يخص صنفاً من الفقراء۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ مطلب شرائط الواقف المعتبرة)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی آمدن مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا

سوال: کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کرکے اُسے کرایہ پر دیدیا جس سے کافی آمدنی حاصل ہوئی، توسوال یہ ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہوتی ہو تو متولی کے لیے اس آمدنی کو مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا جائز ہے۔

لما فی الهندية: مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولی ان یشتری من غلة الوقف للمسجد دهناً وحصيراً وحشيشاً .... تفعل ما تری من مصلحة المسجد كان له ان يشتری للمسجد ماشاء وان لم يوسع۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۱ كتاب الوقف الفصل الثانی .... فی مال الوقف)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن نجيمؒ: شرط الواقف كنص الشارع يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ كتاب الوقف۔ ومثله فی تنقيح الحامدية ج۱ ص۱۲۶ كتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدينؒ: والذی يبدأ به ارتفاع الوقف ای من غلته عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الى العمارة واعم للمصلحة كالامام للمسجد..... ثم السراج والبساط الى آخر المصالح۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۶۷ كتاب الوقف)

ومثله فی الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۲۹۷ كتاب الوقف۔ باب الرجل يجعل داره مسجداً۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی، مسجد کی دیوار سے ملحق ہی واقف کا گھر ہے، واقف نے وقف شدہ مسجد کے صحن میں اخروٹ کے درخت لگائے تھے، اب وہ کہہ رہا ہے کہ ان درختوں کے پھل پر صرف میرا ہی حق ہے جبکہ اہلِ محلہ اس کو اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو پورے محلہ کا حق قرار دیتے ہیں، شرعاً اس پھل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ وقف میں واقف کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، مذکورہ صورت میں واقف نے اگر وقف کرتے وقت تصریح کی ہو کہ میں نے اس درخت کو بھی وقف کیا تھا یا کچھ بھی نہ کہا ہو تو دونوں صورتوں میں درخت وقف ہوگا، البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اس درخت کا استثناء کیا ہو تو اس صورت میں واقف کے قول کا اعتبار کرکے درخت وقف شمار نہ ہوگا بلکہ واقف کی علیحدہ ملکیت متصور ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف ویدخل فی وقف الارض ما فیها من الشجر والبناء دون الزرع۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۶۱ مطلب فی وقف المنقول تبعاً للعقار)[1]

پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد کے متصل بہت پرانا قبرستان ہے جس میں ۲۰ سال سے کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا، اب اہلِ محلہ مسجد میں توسیع کے خواہشمند ہیں اور قبرستان کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں، تو کیا محلہ والوں کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قبرستان اگر موقوفہ ہو اور اموات کے اجسام ظنِ غالب میں خاک ہو چکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں اموات کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو پھر اس قبرستان کو مسجد میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان الوقف کالبیع لا یدخل فیها الزرع والثمر الا بالذکر۔ (البحرالرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۳۱۹ کتاب الوقف۔ الفصل الثالث۔

لما قال فی الھندیۃ : لو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز) لہ

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال :- کیا محلہ والے یا حاکمِ وقت متولیٔ مسجد کو معزول کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- متولیٔ مسجد اور اسی طرح امام مسجد کو بغیر خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کر سکتا البتہ اگر شرعی جرم ثابت ہو جائے تو متولی اور امام مسجد کو اہلِ محلہ یا قاضی معزول کرنے کے مجاز ہیں۔

لما قال فی الھندیۃ : ولو ان الواقف شرط الولایۃ لنفسہ وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی ان ینزعھا من یدہ ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۴۰۹ کتاب الوقف، الباب الخامس فی ولایۃ الوقف) لہ

طریق عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے مسجد کیلئے زمین وقف کی جو کہ طریق عام کے ساتھ متصل ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہوتی جارہی ہے، اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس عام راستہ سے زمین کا کچھ حصہ مسجد میں فراخی کے لیے شامل کر لیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر راستہ کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنے سے راستہ تنگ نہ ہوتا ہو

لہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۹ کتاب الجنائز ۔

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز ۔ الفصل السادس ۔

۲ؔ لہ ولما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : لا یصح عزل صاحب وظیفۃ بلا جنحۃ اوعدم اھلیۃ ـــــــ قال فی البحر واستفید من عدم عزل الناظر بلا جنحۃ عدمھا لصاحب وظیفۃ فی وقف بغیر جنحۃ وعدم اھلیۃ ۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص ۶۴۳ کتاب الوقف ۔

اور لوگوں کو آمدورفت میں تکلیف نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنا شرعاً مرخص ہے ورنہ نہیں؟

لما قال العلامة فخر الدين عثمان الزيلعي رحمه الله: اذا بنى قوم مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع فادخلوا شيئاً من الطريق فى المسجد وكان ذلك لايضر باصحاب الطريق جاز ذلك۔ (تبيين الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ كتاب الوقف، فصل ومن بنى مسجداً الخ)[۱]

مسجد کی زمین پر ڈاکخانہ بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف بھی تام ہوا ہے، اب حکومت اس مسجد کے ایک کونہ میں ڈاک خانہ بنانا چاہتی ہے جس کی آمدنی مسجد کو ملے گی لیکن ملکیت حکومت کی رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف شدہ زمین حکومت کے اغراض ومقاصد کے لیے دینا شریعتِ مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے ایک دفعہ وقف کی گئی ہو تو اس میں ماسوائے مسجد کے متعلقہ امور کے دیگر امور مثلاً دوکان یا ڈاکخانہ وغیرہ بنانا جائز نہیں کیونکہ واقف کی نیت سے مخالفت لازم آتی ہے اور واقف کی نیت کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ماخالف شرط الواقف فهو مخالف للنص والحكم به حكم بلادليل۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۴۹۵ كتاب الوقف)[۲]

---

[۱] وقال العلامة شهاب الدين احمد شلبي رحمه الله: طريق للعامة وهي واسعة فبنى فيه اهل المحلة مسجداً للعامة ولا يضر ذلك بالطريق قالوا لا بأس به وقوم بنوا مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع المسجد فخذوا من الطريق فادخلوه فى المسجد اذا كان ذلك يضر باصحاب الطريق لايجوز والا فلا بأس به۔ (شلبي على هامش تبيين الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ كتاب الوقف) ومثله فى البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۶ كتاب الوقف۔

[۲] وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وماخالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم بلادليل اى لادليل عليه سواء كان نصه فى الوقف نصاً اوظاهراً وهذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه كما صرح به فى شرح المجمع۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۳۴۴ كتاب الوقف)

ومثله فى الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ كتاب الوقف۔

مسجد میں خیاطت کرنے کا حکم

سوال: مسجد میں خیاطت کرنا (کپڑے سینا) شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خیاطت کا تعلق چونکہ دنیاوی امور سے ہے اور مسجد میں دنیاوی امور سے اجتناب ضروری ہے، لہٰذا مسجد میں خیاطت (درزی کا کام) کرنا شرعاً مکروہ ہے البتہ اگر کوئی مسجد کی حفاظت کے واسطے مسجد میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ ابراهیم الحلبی رحمه الله: والخیاطة فیه تکره الا اذا کان لضرورة حفظه عن الصبیان و نحوهم۔

(حلبی کبیری ص۶۱۱ کتاب الصلوٰۃ، فصل فی احکام المسجد)[1]

متولّی مسجد اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرّف کرنا

سوال: ایک شخص نے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی اور بعد میں وہ اس مسجد کا متولّی مقرر ہُوا، اب دوسرے محلے کا ایک شخص اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جبکہ متولّی اس کی اجازت نہیں دے رہا، تو کیا ازروئے شرع متولّی کا انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں متولّی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے محلہ والے کو اس مسجد میں هدماً و بناءً تصرّف کرنا جائز نہیں، ایسے معاملات کے اختیارات صرف اہلِ محلہ اور متولّی ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ارادو نقض المسجد وبناؤه احکم من الاول ان لم یکن البانی من اهل المحلة لیس لهم ذٰلك وان کان

---

[1] وقال العلامة حافظ الدین محمد بن محمد البزاز رحمه الله: والخیاطة فیه تکره الا اذا کان لحفظ المسجد عن الصبیان وخاط وکذا الکاتب۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۸۲ کتاب الصلوٰۃ الفصل السادس والعشرون)

ومثله فی الاشباه والنظائر ج۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد۔

من اهل المحلة لهم ذٰلك ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد) [۱]

بانی مسجد کے لیے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے

سوال :۔ ایک مسجد کے لیے کچھ زمین وقف تھی، کسی نے اس زمین پر اپنے خرچ سے مسجد بنائی اور مسجد کی آبادی میں کسی نے بھی اس سے تعاون نہیں کیا، اب اس بانی کے ساتھ اہلِ محلہ اور پیش امام کی ناراضگی پیدا ہو گئی ہے جبکہ بانی مسجد یہ چاہتا ہے کہ اہلِ محلہ اور پیش امام کو مسجد میں آنے جانے سے روک دے، تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بشرط صدق و ثبوت بانی مسجد کا پیش امام یا اہلِ محلہ کو مسجد سے منع کرنا شرعاً حرام ہے ۔

لما قال اللّٰہ تبارک وتعالٰی : وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۴) [۲]

ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال :۔ ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا اس وقت درست ہے جب اس مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر فی الحال اس چندہ کی مسجد کو ضرورت نہ ہو اور آئندہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہو تو پھر بھی دوسری مسجد میں اس چندہ کا استعمال

---

[۱] وَقال فی الھندیۃ : وفی الکبرٰی مسجد مبنی اراد رجل ان ینقضہ ویبنیہ ثانیاً احکم من البناء الاول لیس لہٗ ذٰلک لانہٗ لا ولایۃ لہٗ کذا فی المضمرات ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج۲ ص۴۵۷ کتاب الوقف ۔الباب الحادی عشر)
وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علٰی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۲۶۸ کتاب الوقف باب فی الرابع المسجد

[۲] وقال العلامۃ بیضاوی رحمہ اللّٰہ : عام لکل من خرب مسجداً او سعٰی فی تعطیل مکان مرشح للصلٰوۃ ۔(تفسیر بیضاوی ج۱ ص۱۰۴ ۔سورۃ البقرۃ)
وَمِثْلُہٗ فی تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۵۶ سورۃ البقرۃ ۔

درست نہیں، تاہم اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو پھر کسی دوسری مسجد پر صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وعن الثانی ینقل الی مسجد آخر باذن القاضی..... حشیش المسجد وحصرہ مع الاستغناء عنهما وکذ الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف فی وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الی اقرب مسجد او رباط او حوض۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۵۹ کتاب الوقف)[1]

مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم

سوال:- ایک مسجد جو کہ ۱۹۰۵ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی چھت چادروں کی تھی بعد میں اسے شہید کرکے اس میں توسیع کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اہل محلہ پیش امام کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اب اگر اس مسجد کی پرانی چادروں کو پیش امام کے گھر میں استعمال کیا جائے تو شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر یہ چادریں مسجد کے کسی کام میں استعمال نہ ہوسکتی ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کو فروخت کرنا یا امام صاحب کے گھر میں استعمال کرنا از روئے شریعت مرخص ہے بلکہ ان کو فروخت کرکے رقم مسجد کی تعمیر جدید میں خرچ کرنا بھی جائز ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : سئل ابوبکر عن حشیش المسجد یخرج عن المسجد ایام الربیع؟ قال ان لم یکن له قیمة فلا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس برفعه والانتفاع به۔ (فتاوی تاتارخانیة ج۵ ص۸۵ کتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون فی المساجد)[2]

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا یحتاج الیه لتفرق الناس هل للقاضی ان یصرف اوقافه الی مسجد آخر او حوض آخر؟ قال نعم۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۷۲ کتاب الوقف) ـــ ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۳۔

[2] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : حشیش المسجد اذا اخرج من المسجد ایام الربیع ان لم یکن له قیمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس بدفعه والانتفاع به۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۵ کتاب الوقف، الفصل الرابع)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۹ کتاب الوقف، الباب الحادی عشر۔

متولی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کسی مسجد کا بانی تھا اور مسجد کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے، تو اس کی وفات کے بعد اس کے اختیارات اُس کی اولاد کو منتقل ہوسکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کے بانی اور متولی کو تمام تر اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں اور مسجد کے لیے مؤذن، امام وخطیب وغیرہ مقرر کرنا اسی کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفات کے بعد تمامتر اختیارات اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوں گے، وہ اپنی خوشی سے مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: والبانی احق بالامامة والاذان وولدہٗ من بعدہ وعشیرتہٗ اولیٰ بذلك من غیرھم وفی المجرد عن ابی حنیفةؒ ان البانی اولیٰ بجمیع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأھل للامامة۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف) [1]

مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے پنکھا خریدا اور مسجد کے لیے وقف کیا، تو کیا مسجد کا پیش امام اس پنکھے کو اپنے گھر میں استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر یہ پنکھا واقعتاً مسجد کے لیے وقف شدہ ہو تو مسجد کے پیش امام کے لیے اس پنکھے کا اپنے گھر میں استعمال شرعاً جائز نہیں، اگرچہ پیش امام کا وجود مصالح مسجد میں سے ہے تاہم اگر واقف نے علی الاطلاق نیت کی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال فی الھندیة: متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد

---

[1] وقال الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: وکذا اولاد البانی وعشیرتہ من بعدہٖ اولیٰ من غیرھم۔ (حلبی کبیری ج ص۶۱۵ فصل فی احکام المسجد)
ومثلہٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الفصل، الباب الرابع۔

الیٰ بیتہٖ ولہٗ ان یحملہ من البیت الیٰ المسجد ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مسجد میں نکاح پڑھانے کو سنت سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسجد میں نکاح پڑھانا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح پڑھانا خود ایک ستونِ عمل ہے جو عبادت کا ایک شعبہ ہے اسلئے مسجد میں نکاح کے ایجاب وقبول کرانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم ایسے مواقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جو مسجد کے آداب کے منافی ہو سے اجتناب کرنا اشد ضروری ہے ۔

لما ورد فی الحدیث : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلنوا ھٰذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔
(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)[2]

ذکر واذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم

سوال:۔ مسجد میں لوگ عموماً ذکر واذکار اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں، تو ایسی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے اُن پر سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا شخص بھی حکماً ذاکر ہے جیسا کہ روایت

---

[1] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد الیٰ بیتہ ولہٗ ان یحمل من البیت الی المسجد۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف۔ الفصل الرابع)
وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۵۱ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون۔

[2] وقال فی الھندیۃ : مباشرۃ عقد النکاح فی المساجد مُستَحَبٌ ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۲۸۴ کتاب النکاح۔

سے ثابت ہے، اس لیے یہ بھی ذاکر کے حکم میں ہو کر اس کو سلام کرنا جائز نہیں، تاہم اگر کوئی نماز کے بعد ویسے ہی فارغ بیٹھا ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من جلس مجلس ینتظر الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ۔ (ترمذی ج۱ ص۱۱۱ ابواب الجمعۃ) [۱]

مسجد میں تھوکنے کا حکم

سوال:۔ سنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا تھوک پاک ہے، اس کے پاک ہونے کی صورت میں کیا مسجد میں تھوکنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور مسلمانوں کی عبادت گاہ ہیں اس لیے ان کی عظمت اور عزت برقرار رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، ایسے کام جن میں حقارت کا معمولی سا شائبہ بھی ہو ان سے بھی مساجد کو پاک رکھا جائے۔ مسلمان کی تھوک اگرچہ بالاتفاق پاک ہے لیکن مسجد کی عظمتِ شان اور آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں تھوکنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ:۔ ولا یبزق علیٰ حیطان المسجد ولا علیٰ ارضہ ولا علی البواری ولکن المخاط لکن یأخذہ بطرف ثوبہ ویدلک بعضہ ببعض۔ (کبیری ص۶۱۲ فصل فی احکام المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا

سوال:۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین مسجد کے

---

[۱] وقال فی الھندیۃ: ویکرہ السلام عند قرأۃ القرآن جھراً وکذا عند مذاکرۃ العلم وعند الاذان والاقامۃ والصحیح انہ لا یرد فی ھٰذہ المواضع ایضاً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۱ ص۴۵۶ باب ما یفسد الطلاق۔ مطلب المواضع التی یکرہ فیھا السلام۔

[۲] لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا۔ (ابوداؤد ج۱ ص۶۸ باب کراھیۃ البزاق فی المسجد)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس۔

مصارف کے لیے وقف کی گئی تھی، اس زمین میں مسجد کا پیش امام اپنے لیے کھیتی باڑی کرتا رہا، کچھ عرصہ بعد پیش امام نے چپکے سے مسجد کی انتظامیہ یا کسی اور کو بتائے بغیر اس زمین کا سرکاری کاغذات میں انتقال اپنے نام کرالیا ہے، تو پیش امام کے اس اقدام کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا یہ زمین پیش امام کی ملکیت ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مذکورہ زمین مسجد اور مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے جس میں پیش امام کی شخصیت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا مسجد کے مصارف کے لیے جو چیز وقف ہو وہ مسجد ہی کا حق ہے اور پیش امام کا قبضہ اور اپنے نام انتقال کرانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے پیش امام کا یہ اقدام خلافِ شرع ہو کر اس زمین کا مالک متصور نہ ہوگا۔

لما قال فی الهندیة: ارض وقف علیٰ مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضاً للعامة لا یجوز للمسلمین انتفاع عاد ذلک الحوض۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف الفصل الثانی)

ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ ایک وسیع و عریض مسجد کے باوجود بعض لوگ امام سے اختلاف کا بہانہ بنا کر دوسری مسجد تعمیر کرلیں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے قوم میں بے اتفاقی کا احتمال بھی ہو۔

الجواب:۔ ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قوم میں بے اتفاقی اور اختلافات کا ذریعہ بننا بدقسمتی کی دلیل ہے۔ اگر امام سے اختلاف ذاتی وجوہات یا غیر شرعی امور کی وجہ سے ہو تو ایسے اختلافات کا شکار ہونا خود بھی گناہ ہے، پھر اس ایک گناہ کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں میں بے اتفاقی کا موقع فراہم کرنا دوسرا بڑا جرم ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد بنانے کی ضرورت نہیں: تاہم اگر ان واقعات کی وجہ سے کوئی شخص زمین باقاعدہ وقف کرکے اس پر مسجد بنائے تو دوسری مسجد بھی مسجدِ شرعی رہے گی، اس کے ذاتی اغراض کا معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ البتہ بوقتِ ضرورت یا باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے دوسری مسجد بنانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فیه حائطا ولکل منهم امام علیٰ حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)

مسجد کے بعض حصّہ کو سڑک میں شامل کرنا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے، اور مسجد کے متصل ایک سڑک بھی بن رہی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصّہ اس سڑک میں شامل کردیا جائے تاکہ سڑک وسیع ہوکر لوگوں کے مفاد میں بہتر ثابت ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کا کچھ حصّہ افادۂ عام کے لیے سڑک میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اسے کسی اور کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں اگرچہ فوائد اس میں زائد ہوں، لہٰذا مسجد کا کوئی بھی حصّہ سڑک میں شامل کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (جعل شی) ای جعل البانی شیئاً (من الطریق مسجداً) لضیقه ولم یضر بالمارین (جاز) لانهما للمسلمین (کعکسه) ای کجواز عکسه وهو ما اذا جعل فی المسجد ممرّ لتعارف اهل الامصار فی الجوامع وجاز لکل احدان یمرّ فیه حتّی الکافر الا الجنب والحائض والدواب زیلعی (کما جاز جعل) الامام (الطریق مسجداً لا عکسه) لجواز الصلوٰة فی الطریق لا المرور فی المسجد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۳ ص ۳۷۷ احکام المساجد کتاب الوقف) ؎۱

مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا

سوال:- مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا جیسا کہ آجکل جلسوں میں ہوتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مساجد میں بلند آواز سے تقریر کرنا اور ایسے ہی نعت خوانی کرنا اگر کسی نمازی کی نماز میں باعثِ تشویش نہ ہو تو جائز ہے، لیکن اگر کہیں نمازیوں کی نماز میں تشویش کا ذریعہ ہو تو مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: انشاد ضالة او شعر الا مافیه ذکر و رفع صوت بذکر الا للمتفقهة۔

؎۱ وفی الهندیة ان ارادوا ان یجعلوا شیئاً من المسجد طریقاً للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذلك وانه صحیح کذا فی محیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فِی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب الوقف۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانیؒ:
اجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا ان یشوش جهرهم علی نائم او مصل او قاری۔ الخ۔ (ردالمحتار ج ا ص۶۶۰ احکام المساجد، کتاب الصلوٰۃ) [1]

سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا

سوال:۔ ایک مقام پر بعض لوگوں نے گورنمنٹ کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے مسجد تعمیر کر لی جبکہ حکومت نے انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب حکومت اپنے نقشہ کے مطابق شہر کی تعمیر چاہتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی غصب شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد مسجدِ شرعی کے حکم میں ہے؟ اور کیا حکومت اس کو منہدم کرکے اپنے مصرف میں لاسکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے لیے واقف کا ملکِ تام ہونا شرط ہے، جبکہ یہ زمین حکومت کی ملکیت ہے، تو عوام کو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں۔ کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے وہاں مسجد بنالی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں، اسلئے اگر حکومت ایسی مسجد کو منہدم کرکے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے تو جائز ہے تاہم اگر ضرر نہ ہو تو اسی جگہ مسجد کو باقی رکھنا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لا بدّ ان یکون مالکًا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔
(ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ) [2]

---

[1] فی الصحیح البخاری عن السائب بن یزید قال: کنتُ قائمًا فی المسجد فحصبنی رجلٌ فنظرت الیه فاذا عمر بن الخطابؓ اذهب فأتنی بهذین فجئته بهما فقال ممن انتما او من این انتما قال من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لاوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (الصحیح البخاری ج ا ص۶۷ باب رفع الصوت فی المسجد)
ومثلهٗ فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص۲۰۴ کتاب الصلوٰۃ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضًا فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه اوصالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفًا۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف) ومثلهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف۔

مسجد کے مسبع ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے لیکن ڈیزائن اور نقشہ کے لحاظ سے مسبع ہے جبکہ عام مساجد کی تعمیر مربع اور مستطیل شکل میں ہوتی ہے اور فقہاء اُمت کے اقوال سے بھی اس کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر جدید طریقہ سے مسجد بنانا جائز ہے ؟ جبکہ اس مسجد کا ڈیزائن بعض غیر مسلم عبادت گاہوں سے بھی متشابہ ہے ؟

الجواب:۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہ اور شعائر اللہ میں سے ہیں جن کا مقصد یادِ الٰہی اور صلوٰۃ واذکار ہیں، ان کی یہ حیثیت تب برقرار رہتی ہے جب یہ اسلامی مساجد کی ہیئت اور شکل وصورت کی طرح ہوں اور ان کو بعض غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کا ہم شکل بنانا جائز نہیں، تاہم اگر تشبہ کی نیت کے بغیر محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا نقشہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس مسجد کی شرعی حیثیت پر یہ نقشہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۔ الآية (سورۃ ھود، رکوع ۱۰)

عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من تشبّه بقوم فهو منهم۔ رواه احمد وابوداؤد۔ (مشكوٰة ج ۲ ص۳۷۵ كتاب اللباس)[۱]

مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم

سوال:۔ لاؤڈ سپیکر سے استفادہ کی خاطر عموماً گم شدہ اور جلسوں کے اعلانات مساجد میں ہوتے رہتے ہیں، کیا از روئے شرع یہ امور جائز ہیں ؟

الجواب:۔ مسجد عبادت گاہ ہے اس لیے جو چیز مسجد سے باہر گم ہوگئی ہو تو اس کا اعلان مسجد میں کرنا جائز نہیں البتہ جو چیز مسجد میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان مسجد کے اندر بھی مرخص ہے۔ اسی طرح مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان کرنا انسانی جان کی عظمت کی وجہ سے جائز ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: يكره انشاد الضالة) قال السيد احمد الطحطاوی فی حاشية على الدر المختار تحت قوله وانشاد الضالة لقوله عليه السلام اذا رأيتم من ينشد الضالة فی المسجد فقولوا لا ردها اللّٰه عليك قوله الا ما فيه ذكر نحوه الموعظة لانه

---

[۱] وَمِثْلُهٗ فی ابی داؤد ج ۲ ص۲۰۳ كتاب اللباس، باب القميص

کان ینشد الشعر بین یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی المسجد ویأمر حسانا بذلک۔
(الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص۲۷۸ مکروھات الصلوٰۃ۔فصل فی احکام المساجد) لہ

مسجد کی جائدادِ موقوفہ پر دعویٰ ارث

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی اور مکان کسی شخص نے مسجد کی ضروریات کے لیے وقف کیا، امام کو مسجد کے مکان میں رہائش کی اجازت دی گئی، جب تک موصوف مسجد کے امام رہے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا لیکن موصوف کی رحلت کے بعد اس کے پسماندہ ورثاء مکان پر قبضہ جما کر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کر رہے ہیں ۔۔۔ کیا مسجد کی موقوفہ جائداد پر کسی کے ارث کا دعویٰ درست ہے ؟

الجواب:۔ اگر مکان اور زمین مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہوں تو امام صاحب کے پسماندہ ورثاء بطور وراثت اس پر قابض نہیں ہو سکتے، کیونکہ مسجد کے لیے وقف شدہ چیز کسی کی ملک نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ مسجد کی ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوگی۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلھا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۶۰۸ کتاب الوقف، فصل فی المسجد) ۲ـہ

لہ لما قال العلامۃ محمد یوسف البنوری: واما انشاد الضالۃ فلھا صورتان احدھما وھی اقبح واشنع بأن یضل شیء خارج المسجد ثم ینشد فی المسجد لاجل اجتماع الناس فیہ۔

والثانیۃ ان یضل فی المسجد نفسہ فینشدہ فیہ وھذا یجوز اذا کان من غیر لغط وشغب۔ (معارف السنن ج ۳ ص۳۱۳ باب ماجاء فی کراھیۃ البیع والشراء.....والشعر فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۰ مطلب فی افضل المساجد، کتاب الصلوٰۃ۔

۲ـہ وفی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ علی ملکہ بحیث لا تقبل النقل عن ملک الی ملک والتصدق بالغلۃ المعدومۃ متی صح الوقف بان قال جعلت ارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ مؤبدۃ او اوصیت بھا بعد موتی فانہ یصح حتی لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۲ الباب الاول فی تعریف الوقف، کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۴ ص۳۵۱/۳۵۲ کتاب الوقف۔

مسجد میں کھانے پینے کا حکم

سوال:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو ان میں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں کھانا پینا صرف معتکف کے لیے جائز ہے، البتہ غیر معتکف یا مقیم وغیرہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو بغیر نیت اعتکاف کے مکروہ ہے، لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کرلی جائے۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین یا کمرہ کو چھوڑ کر بلا ضرورت مسجد میں ہی کھانا کھانا اچھا نہیں۔

وفی الھندیۃ: ویکرہ النوم والاکل لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ماشاء کذا فی السراجیۃ۔ (الفتاویٰ الھندیہ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد)[1]

مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا

سوال: مسجد میں بچوں کو پڑھانے والے استاد کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مدرس کو مسجد کے لیے جمع شدہ فنڈ سے تنخواہ دینا جائز نہیں کیونکہ مدرس مسجد کے مصارف میں سے نہیں ہے، اس لیے مدرس کی تنخواہ کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔ البتہ اگر جمع شدہ فنڈ مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو اقرب الاقرب ہو۔

قال الحصکفیؒ: حشیش المسجد وحصرہ مع الاستغناء عنھما وکذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بھما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الیٰ اقرب مسجد او رباط او بئر) وحوض (الیہ)۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

تاہم اگر واقف نے مال دیتے وقت یہ نیت کی ہو کہ اس مال سے مسجد اور اس کے متعلق امام و مؤذن اور مدرس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں جائز ہے۔[2]

---

[1] قال قاضی خانؒ: ویباح للمعتکف الاکل والشرب فی معتکفہ (ج۱ ص۲۳۲ باب الاعتکاف، قاضیخان علیٰ ھامش فتاویٰ ھندیہ)۔ ومثلہٗ فی رد المحتار ج۱ ص۶۶۱ احکام المساجد۔

[2] وفی الھندیۃ: واذا اراد ان یصرف شیئًا من ذٰلک الیٰ امام المسجد والیٰ مؤذن المسجد لیس لہٗ ذٰلک الا ان کان الواقف شرط ذٰلک فی الوقف۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد۔ الفصل الثانی)

مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا

سوال:۔ مسجد میں رہائش پذیر طلباء جو کہ علم دین حاصل کر رہے ہوں کیا وہ مسجد کی اشیاء مثلاً بجلی، لکڑی، دری وغیرہم استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ اشیاء کا طلباء کو استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ طلباء کرام مساجد کے مصالح سے متعلق نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو امام و مؤذن کی طرح ان کے لیے بھی استعمال جائز ہے۔

قال ابن عابدین (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والاٰخر الی امامه اومؤذنه والامام والمؤذن لایستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الاصلاح من اهل المحلة۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۶۰ کتاب الوقف) [1]

عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں

سوال:۔ ہم ایک سرکاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ اس کالونی میں کوئی مسجد نہیں ہے اور حکومت نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نقشہ کے مطابق آپ کو مسجد کے لیے زمین دیں گے، کالونی میں دو دکانیں اور ان کے سامنے برآمدہ بھی ہے۔ کیا فی الحال عارضی طور پر ہم ان دو کانوں کی ہیئت کو بدل کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مثلاً ان کے درمیان میں محراب بنا لیا جائے جبکہ یہ دکانیں حکومت کی ملک ہیں۔ اور بعد میں جب حکومت کی طرف سے مسجد کے نام پر زمین الاٹ ہو گی تو اس الاٹ شدہ زمین پر مستقل طور پر مسجد بنائی جائے گی۔ کیا یہ دو کانیں جن میں عارضی طور پر مسجد بنائی گئی تھی بعد میں اس کو دوبارہ دکانوں کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ جس زمین پر عارضی طور پر مسجد بنائی جائے یا مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو یہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں، ضرورت ختم ہونے پر مالک اس زمین کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے، چونکہ یہ دوکانیں بھی مالک کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے استعمال ہوئی ہیں

---

[1] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذٰلك الی امام المسجد اوالی مؤذن المسجد فلیس له ذٰلك الا ان کان الواقف شرط ذٰلك فی الوقف کذا فی الذخیرة۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف) ۔ ومثله فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۴۲۶

اس لیے یہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں بلکہ بعد مالک یعنی حکومت اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افادات الواقف لابدّ ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد وان لایکون محجورًا عن التصرف حتّٰی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [1]

معتکف کا مسجد میں ریح (ہوا) خارج کرنا

سوال:۔ رمضان المبارک میں اعتکاف کے دوران خروجِ ریح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بدبو پھیلنے کے سبب مسجد میں ہوا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے جس سے مسجد کو پاک رکھا جائے، چونکہ معتکف کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے اس لیے سونے کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں وہ سب جائز ہیں تاہم بہتر نہیں۔

وفی الھندیة: اختلف فی الذی یفسوا فی المسجد فلم یر بعضھم بأسًا وبعضھم قالوا لایفسوا ویخرج اذا احتاج الیه وھو الاصح ولا بأس للمحدث ان یدخل المسجد فی اصح القولین ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف۔
(الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیة) [2]
الباب الخامس

---

[1] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائطه الملك وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضًا فوقفھا ثم اشتراھا من مالکھا ودفع الثمن الیه او صالح علٰی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف)

[2] قال ابن عابدینؒ: وکذا لا یخرج فیه الریح من الدّبر کما فی الاشباه واختلف فیه السلف فقیل لا بأس وقیل یخرج اذا احتاج الیه ھو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی۔ (ردّ المحتار علی الدّر المختار جلد ۱ ص۴۸۶ احکام المساجد)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۴ ص۶۲ کتاب الوقف۔

مسجد کا پانی گھر لے جانا

سوال :۔ بعض علاقوں میں مسجد کا پانی اکثر لوگ گھر لے جاتے ہیں، کیا مسجد کا پانی گھر لے جانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب :۔ یہ پانی اگر صرف مسجد کے لیے وقف ہو تو پھر مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا، مسجد سے گھروں کو پانی لے جانا جائز نہیں، البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔

اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ: التوضی من السقایة اذا اتخذها للشرب اختلف المشائخ ولو اتخذها للتوضوء لا یجوز الشرب منه بالاجماع۔ (البحرالرائق جلد ۵ ص۲۵۵ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا

سوال :۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی تھی جس میں اس نے یہ تعین کیا تھا کہ نصف زمین کو فروخت کرکے مسجد کی تعمیر پر لگا دی جائے اور نصف زمین مزارعت کے لیے ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع امام کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔ اب جس مزارع کے پاس زمین ہے وہ نفع دینے سے انکاری ہے، ان حالات میں مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ ایسا فنڈ جو مسجد کی تعمیر کے لیے خاص ہو اس سے امام کو تنخواہ نہیں دی جاسکتی، اگر واقف اس کی نیت کرے تو اس صورت میں دینا جائز ہے، البتہ مسجد کی عام ضروریات کے لیے رکھے ہوئے چندہ سے امام کو تنخواہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ بھی مسجد کی ضرورت ہے۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله اتخذ الواقف والجهة) ان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والآخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر

---

[1] قال ابوالليث السمرقندیؒ: يبدأ بثمنه فی مسجد اخر فی موضع ماء لعمارة المسجد او فی الظرف للشرب لا یجوز التوضی به الا اذا کان کثیراً وکذا لایجوز دفع الجمر من السقایة۔ (الفتاوی النوازل ص۲۴۳ کتاب الوقف)
ومثلهٗ فی الهندیة ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف)

لقلة المرسوم للحاكم الدين وان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔
(رد المحتار على الدر المختار ج۴ ص۳۶۰ کتاب الوقف مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ) ؁

مسجد کے فنڈ سے امام کے لیے مکان بنانا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس کے ساتھ متصل رقبہ مسجد کے لیے وقف ہے اس میں بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کرا لیا جائے لیکن مکان کی تعمیر کے لیے مستقل چندہ نہیں کیا گیا بلکہ مسجد کے فنڈ سے ہی مکان کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ کیا عند الشرع مسجد کے فنڈ سے امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مکان کی تعمیر مسجد کے فنڈ کے مصارف میں سے نہیں ہے البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے کہ اس فنڈ سے امام مسجد کے لیے مکان بھی تعمیر کر لیا جائے تو پھر شرعاً جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفين على المسجد احدهما على العمارة والاخر الى امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الدين ان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔ (رد المحتار على الدر المختار ج۴ ص۳۶۰ کتاب الوقف) ؁

؁ قال طاهر بن عبد الرشيدؒ: ولو شرط الواقف فى الوقف الصرف الى امام المسجد وبين قدره يصرف اليه ان كان فقيرا وان كان غنيا لا يحل له وكذا الوقف على الفقهاء والمؤذنين۔
(خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فى الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۳ الباب الحادى عشر فى المسجد والفصل الثانى فى الوقف على المسجد۔

؁ وفى الهندية: واذا اراد ان يصرف شيئا من ذلك الى امام المسجد او الى مؤذن المسجد فليس له ذلك الا ان كان الواقف شرط ذلك فى الوقف كذا فى الذخيرة۔
(الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادى عشر فى المسجد الفصل الثانى)
وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

دو مسجدوں کا قریب قریب ہونا

سوال: ہماری مسجد کے قریب تقریباً ۵ گز کے فاصلہ پر ایک چبوترہ ہے، ہمارے محلہ میں عقائد کے لحاظ سے بہت اختلاف ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے، ان حالات میں ہر فریق نے اپنے لیے الگ الگ مسجد بنائی ہے لیکن دونوں مساجد اتنی قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک دوسرے کی تکبیرات اور قرأت سنی جاتی ہے۔ ان حالات میں دوسری مسجد کا قیام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اہل محلہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں صلح کرلیں اور اختلاف کو رفع کر دیں، اور اگر اختلاف رفع نہ ہو سکے تو رفع فساد کے لیے ایک مسجد کو تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے اس لیے قریب میں دوسری مسجد بنانا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فيه حائطاً ولكل منهم امام على حدة ومؤذنهم واحد لابأس به۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ و ما یکرہ فیها) [1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال: کسی کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کا شرع میں کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر ایک کو آنے کا حق حاصل ہے کہ اس میں نماز و تلاوت و ذکر کرے۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (سورۃ الجن آیت ۱۸) اس لیے مساجد میں آنے سے کسی کو منع کرنا گناہِ عظیم ہے، قرآن کریم میں مساجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا (البقرہ ۱۱۴) البتہ اگر مسجد تنگ ہو تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد آنے سے روکا جا سکتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی القنیة وكذا لاهل المحلة ان یمنعوا من لیس منهم

---

[1] قال الحصکفیؒ: وجعل المسجدین واحداً وعكسه لصلوٰة۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۶۳ احکام المساجد) - وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص۳۲ کتاب الکراهیة ۔

عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بھم مسجد۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۶۲ کتاب الصلوٰۃ)[1]

مسجد میں گوبر کا استعمال

سوال:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال کیسا ہے؟ جیسا کہ بعض مساجد میں آگ جلانے یا مٹی میں خلط کرکے گارا بنا کر استعمال کیا جاتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال جائز نہیں، البتہ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے تاہم اگر گوبر کے علاوہ کسی متبادل چیز سے ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس متبادل چیز کو استعمال کیا جائے۔

قال ابن عابدینؒ: (ولا تطیینه بنجس) فی الفتاوی الهندیة یکره ان یطین المسجد بطین تدبل بماء نجس بخلاف السرقین اذا جعل فیه الطین لان فی ذٰلک ضرورة وهو تحصیل غرض لا یحصل الا به کذا فی السراجیة۔

(رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المساجد)[2]

ویران مسجد کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک پرانی مسجد ہے جو کسی وقت آباد تھی لیکن اب لوگ اس میں نماز نہیں پڑھتے، بعض لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس پرانی اور ویران مسجد کو جنازہ گاہ میں تبدیل کیا جائے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب کسی مقام پر ایک دفعہ مسجد بنا دی جائے اور مستقلاً اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہو تو اس کو ویران ہونے کے بعد کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، لہٰذا اس ویران مسجد کو جنازہ گاہ یا اصطبل میں بدلنے کی اجازت

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وکذا الاهل المحلة ان یمنعوا من لیس منهم عن الصلوٰۃ فیه اذا ضاق بهم المسجد۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۰ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص۳۲۲ کتاب الکراهیة)

[2] قال ابن نجیمؒ: اذا نزح الماء النجس من البئر کره له ان یبل به الطین فیطین به المسجد علیٰ قول من اعتبر نجاسة الطین۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰۃ)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص۳۱۷ کتاب الکراهیة الباب الخامس فی آداب المسجد۔

نہیں بلکہ اگر ہو سکے تو از سرِ نو اس مسجد کو تعمیر کر کے آباد کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجدٍ اٰخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوٰی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبٰی وهو الاوجه۔

(رد المختار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیرہ) [1]

مسجدِ شرعی کا تبادلہ

سوال: زید نے مسجد کے لیے ایک جگہ دی تھی اور باقاعدہ طور پر اہلِ محلہ نے وہاں مسجد تعمیر کر کے نماز شروع کر دی، اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ جگہ مجھے واپس کر دی جائے میں اس کے بدلہ میں دوسری جگہ دیتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: جو جگہ ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دی گئی اور باقاعدہ طور پر وہاں مسجد بھی بنائی گئی اور نماز شروع ہو گئی تو ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی، اب اس کو منہدم کر اس کے بدلے میں دوسری مسجد بنانا یا اس کی جگہ کو تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجدٍ اٰخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوٰی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبٰی وهو الاوجه۔ (رد المختار ج۴ ص۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیرہ) [2]

---

[1] قال طاهر البخاریؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوٰی اذا خربت القریة فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوٰی جلد ۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد واوقافه) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] وفی الخلاصة الفتاوٰی: اذا خرب المسجد وفی الفتاوٰی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد وغیرہ) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

مسجد میں کسی کے لیے جگہ متعین کرنا

سوال:- بعض لوگ مسجد کے اندر اپنے رفقاء کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین کر دیتے ہیں اور اس جگہ پر چادر یا جائے نماز رکھ کر دوسروں کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے جبکہ ابھی تک وہ لوگ مسجد میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کسی کے لیے مسجد میں جگہ متعین کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- مسجد میں غیر موجود لوگوں کے لیے جگہ روکنا خصوصاً جمعہ کے دن ایسا کرنے کو غیر مستحسن اور ناجائز سمجھا گیا ہے کیونکہ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ حق پہلے آنے والوں کا بنتا ہے، علاوہ ازیں بعد میں آنے والا شخص بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنوں یا کندھوں کے اوپر سے گذر کر جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنے گا جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

عن ابی سعیدؓ و ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم ماکتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوٰتہ کانت کفارۃ لما بینھا وبین جمعۃ التی قبلھا۔ رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ ج ۱ ص۱۲۲ باب التنظیف والتکبیر، الفصل الثانی) [1]

مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا

سوال:- مسجد کے ساتھ صحن میں ایک باغیچہ ہے بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ اس باغیچہ پر چھت ڈال دی جائے تاکہ طلباء کرام دینی علوم حاصل کر سکیں یا کسی اور مصالح میں اس کو استعمال کیا جا سکے، کیا عند الشرع ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:- اگر مسجد کا یہ چمن مسجد کی حدود میں داخل ہو اور اس میں مستقل طور پر کسی وقت نماز

---

[1] حدثنا ھارون بن معروف نا بشر بن السری نا معاویۃ بن صالح عن الزاھریۃ قال کنا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد اللہ بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجلس فقد اذیت۔ (ابوداؤد ج ۱ ص۱۵۹ باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ)

ومثلہ فی الجامع الترمذی ج ۱ ص۶۷ باب فی کراھیۃ التخطی یوم الجمعۃ۔

بڑھ لی گئی ہو تو اب یہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کو کسی اور مصرف میں لانا عند الشرع جائز نہیں۔ تاہم چونکہ دینی تعلیم کا حصول مساجد کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے اس لیے مسجد یا اس کے کسی کونے کو مدرسے کے طور پر استعمال کرنا مرخص ہے لیکن دیگر مصالح کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔

لما روی ابوھریرۃ عن النبی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من جاء مسجدی لم یأت الا الخیر لتعلمہ اویعلمہ فھو بمنزلۃ المجاھد فی سبیل اللہ۔ الخ قال الملا علی القاری فیہ دلالۃ علی جواز التدریس فی المسجد۔ (المرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد۲ ص۲۲۱ باب المساجد الفصل الثالث، کتاب الصلوٰۃ)[1]

متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اُجرت لینا

سوال: اہلِ محلہ نے اپنی مسجد کے لیے ایک متولی مقرر کیا ہے لیکن اس کے لیے اہلِ محلہ نے کوئی مشاہرہ مقرر نہیں کیا، تو کیا متولی بغیر اذنِ اہلِ محلہ مسجد کے فنڈ میں سے اپنی اُجرت لے سکتا ہے؟

الجواب: چندہ کے اموال ایک امانت ہوتے ہیں اور یہ وقف عرفی ہے شرعی نہیں، لہٰذا ایسے امور کے لیے واقفین سے اس کی اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اذن کے متولی کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الھندیۃ: لووقف دراھم اومکیلاً اوثیاباً لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذٰلک یعنی بالجواز قیل کیف الدراھم تقرض للفقراء ثم یقبضھا اوتدفع مضاربۃ ویتصدق بالربح والحنطۃ تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منھم والثیاب الاکسیۃ تعطی للفقراء لیلبسوھا عند حاجتھم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف الباب الثانی فیما یجوز وقفہ الخ)

فھو فی الشرع عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعۃ علی الفقراء اوعلی وجہ من وجوہ الخیر بمنزلۃ العواری کذا فی الکافی فلایکون

---

[1] وفی الھندیۃ: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیہ استعمال اللبود والبواری المسبلۃ لاجل المسجد۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ الباب الخامس فی آداب المسجد) ومثلہٗ فی امداد المفتیین المعروف بفتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۸۱۲۔

لازمًا وله ان یرجع و یبیع کذا فی المضمرات ولا یلزم الا بطریقین احدهما قضاء القاضی بلزومه والثانی ان یخرجه مخرج الوصیة...... وعندهما حبس العین علی حکم ملك الله تعالی علی وجه تعود منفعته الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوهب ولا یورث کذا فی الهدایة الی العیون الیتیمة ان الفتوی علی قولهما کذا فی شرح الشیخ ابی المکارم للنقایة۔

(فتاوی هندیة ج۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ)[1]

مسجد میں ٹیپ ریکارڈر لانا

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں جس سے تقاریر اور تلاوت وغیرہ سنتے ہیں اور ریکارڈ کرتے ہیں، کیا ان کا یہ فعل شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ ٹیپ ریکارڈر بذاتِ خود ایک آلہ ہے، اس کو اچھے اور بُرے دونوں کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر اسے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے مثلاً تلاوتِ قرآن یا کسی کی تقریر ٹیپ کرنا، اگر اس نیت سے مسجد میں لایا جائے تو شرعاً اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اگر اس ٹیپ ریکارڈ سے گانے سُنے جائیں یا کسی اور گناہ کے کام کے لیے لایا جائے تو مسجد و خارج مسجد دونوں میں مطلقاً جائز نہیں۔

قال طاهر بن عبدالرشیدؒ: وفی الفتاوی استماع صوت الملاهی کالضرب بالقصب وغیرہ حرام لانه من الملاهی وقال علیه الصلوٰة والسلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسوق والتلذذ بها من الکفر هذا علی وجه التحدید ولکن وجب علیه ان یجتهد حتی لا یسمع لما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه ادخل اصبعه فی اذنه منذ ذکر اشعار العرب ان کان فیها ذکر الفسق کره هم بالمعصیة

---

[1] قال الحصکفی (حبس العین علی حکم) ملك (الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة والاصح انه (عنده) جائز غیر لازم کالعاریة (وعندهما هو حبسها علی) حکم (ملك الله تعالی وصرف منفعتها علی من احب۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۵۷ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: لا یزول ملك الواقف الا ان یحکم به الحاکم او یعلقه بموته فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا وقال ابو یوسفؒ یزول ملکه بمجرد القول وقال محمدؒ لا یزول حتی یجعل للوقف۔ (الهدایة ج۲ ص۶۳۷ کتاب الوقف)

ان عزم علیہ الاثم۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۴۵ کتاب الکراھیۃ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی)[1]

بوقتِ ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ اگر مسجد کے گرجانے کا خوف ہو تو دوسرے محلہ میں سے کسی شخص کو بغیر اذن متولی یا اہلِ محلہ کے اس کو شہید کرکے نئی مسجد تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بسا اوقات ایسے بلا اجازت تصرفات سے بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہوجاتی ہیں جس سے مساجد کا انتظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، ایسی مساجد میں جملہ تصرفات بانیٔ مسجد، متولی یا اہلِ محلہ کی اجازت پر موقوف رکھے جائیں، تاہم کسی متعنت اور اناڑی متولی کے جابرانہ رویہ کا اعتبار نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: البانی اولی بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرتہ اولی من غیرھم بنی مسجدا فی محلۃ تنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارۃ فالبانی اولی مطلقاً۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف)[2]

مسجد کے لیے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے، اس زمین سے اس شخص کی ملکیت کب زائل ہوگی کیا وقف کے بعد اس کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل رہتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین کا وقف باقاعدہ اجازت سے نماز باجماعت پڑھنے پر موقوف ہے لہٰذا ایک دفعہ نماز باجماعت پڑھنے سے اس کی ملکیت زائل ہوگئی، البتہ امام ابویوسفؒ

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کل لھو) لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کل لھو المسلم حرام الا ثلاثۃ ملاعبتہ اھلہ وتادیبہ لفرسہ ومناضلتہ بقوسہ۔ (درمختار جلد۵ ص۲۵۳ کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیہ ج۵ ص۳۵۱ کتاب الکراھیۃ۔

[2] قال طاہر بن عبدالرشیدؒ: رجل بنی مسجدا فی سکۃ فنازعہ بعض اھل السکۃ فی عمارتہ او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارۃ اولی بالاتفاق۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ باب احکام المساجد کتاب الوقف۔

کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف اس کے قول سے ملکیت زائل ہوجاتی ہے، باقاعدہ وقف کے بعد واقف کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل (بقولہ جعلتہ مسجداً) عند الثانی (وشرط محمد) والامام (الصلٰوۃ فیہ) بجماعۃ وقیل یکفی واحد وجعلہ فی الخانیۃ ظاہرالروایۃ۔ (الدرالمختار ہامش ردالمحتار جـ۳ صـ۳۶۹ کتاب الوقف)[1]

عورتوں کا مسجد میں جانا

سوال:۔ ہمارے شہر برما میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے وہاں کے لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اگر شریعت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے تو ایک جگہ متعین کر کے عورتوں کے لیے بھی مسجد بنا دی جائے جس میں عورتیں نماز پڑھیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس میں شمولیت اختیار کر سکیں۔ ایسا کرنا اس دور میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرونِ اولیٰ میں اگرچہ عورتوں کو مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن اس دور میں فتنہ و فساد کے عموم کی وجہ سے فقہاء نے انہیں مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عورتوں کی مساجد میں حاضری کے اتنے فوائد نہیں جتنے نقصانات یقینی ہوتے ہیں، لہٰذا فسادِ زمانہ کی وجہ سے عورتوں کا مسجد میں آنا مستحسن نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویکرہ حضورھن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعیدٍ ووعظٍ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذہب) المفتی بہ لفساد الزمان۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار جلد ا باب الامامۃ صـ۴۱۳)[2]

---

[1] واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفردہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عن ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسف یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الھدایۃ جـ۲ صـ۶۴۴ کتاب الوقف تصلی فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی جـ۴ صـ۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

[2] قال طاھرؒ: اما اذا ام الرجل النساء فی مسجد بجماعۃ لیس معھن رجل لا باس بہ وفی غیر المسجد من البیوت ونحوھا یکرہ الا ان یکون معہ ذات رحم محرم وتخرج العجوز الی العید والجمعۃ وفی الفجر والعشاء دون الظھر والعصر والمغرب مختلف فالحال ان فی المغرب اختلاف الروایۃ وعندھما تخرج الی جمیع الصلوٰۃ ھذا جواب الاصل وقال فی الفتاوٰی لا تخرج العجائز فی زماننا الی الجماعات۔

(خلاصۃ الفتاوٰی جـ۱ صـ۱۵۵ کتاب الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار جـ۱ صـ۵۹ فصل فی الجماعۃ۔

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد کے متولی کو بعض لوگ معزول کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس کی معزولی کے اسباب نہ جاننے کی وجہ سے ایسی سرگرمیوں میں شرکت نہیں کرتے۔ کیا کسی متولی مسجد کو اہلِ محلہ یا حاکم معزول کرسکتا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ اہلِ محلہ یا حاکم نے جن امورِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کو متولی بنایا تھا اگر یہ متولی اُن امورِ شرعیہ کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ کہیں خیانت کا ارتکاب کرکے وقف کے اموال کو غیر شرعی طور سے استعمال کررہا ہو اور اسی طرح ایسے دوسرے امور کا ارتکاب کررہا ہو جس سے اہلِ محلہ تنگ ہوں تو امورِ فسقیہ کی وجہ سے اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر ایسے امور کا خود واقف بھی مرتکب ہو تو اسے بھی معزول کیا جاسکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: (جعل الواقف (الولایة لنفسه جاز) وکذا لو لم یشترط لاحد فالولایة له عند الثانی وھو ظاھر المذھب نھر خلافًا لما نقله المصنف ثم لوصیه ان کان والا فللحاکم فتاوی ابن نجیمؒ، قاری الھدایة وسیجیٔ (وینزع وجوبًا بزازیة ولو) الواقف درر فغیره بالاولیٰ (غیر مامون) او عاجزا وظھر به فسق کشرب خمر ونحوه فتح او کان یصرف ماله فی الکیمیا نھر بحثًا (وان شرط عدم نزعه)

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۳۸۴ کتاب الوقف)

مصالحِ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کا حکم

سوال:۔ اکبر اور ریحان کے آباؤ اجداد نے مسجد میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک رہٹ لگایا تھا اور اس رہٹ کے اخراجات کے لیے ۵ کنال اور تین مرلہ زمین بخشی تھی جس کا اندراج کاغذات میں موجود ہے۔ اب جبکہ مسجد میں بجلی کا پمپ بھی ہے اور لکڑی کے رہٹ کے بجائے لوہے کا رہٹ لگا دیا گیا ہے، لہٰذا اس زمین سے جو اخراجات اس رہٹ کے پورے کیے جاتے تھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اہلِ مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ زمین جو پانی کی نکاسی

[له] وفی الھندیة: وان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مامون علی الوقف فللقاضی ان ینزعھا من یده کذا فی الھدایة۔ (ج ۳ ص ۴۰۹ کتاب الوقف)

ومِثْلُهٗ فی الھدایة ج ۲ ص ۶۴۳ کتاب الوقف)

کے لیے وقف کی گئی تھی اس کو مسجد کے کسی اور مصرف میں لایا جائے، مثلاً اجارہ پر دے دی جائے یا ان کے قبضہ میں سے اُن سے آدھا نفع لے کر مسجد کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے، لیکن ریحان اور اکبر مسجد کی اس اراضی کو اپنے قبضہ سے نکالنے کو تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف رہٹ کے ذمہ دار تھے جبکہ اب زمین اس سے مستغنی ہو گئی ہے لہٰذا یہ زمین اب ہماری ہے، اب ہم اسے اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: عرف کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ وقف کا ہے لہٰذا جس نے اپنی زمین کی آمدنی مسجد کے لیے معین کر دی ہے تو یہ زمین بھی وقف سمجھی جائے گی اس لئے ریحان اور اکبر کو اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ اس کی آمدنی کو پمپ یا مصارفِ مسجد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

ونظیرہ قال ابن نجیمؒ: اشتروا من غلة داری هذه كل شهر بعشرة دراهم خبزًا وفرقوه على المساكين صارت دار وقفًا۔ (البحرالرائق ج ۵ ص ۱۰ کتاب الوقف)[1]

مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم

سوال: مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کیا حکم ہے، خصوصاً جب مسجد میں کیا جائے؟ اس دور میں مساجد میں عام طور پر چندہ مانگا جاتا ہے، اگر کسی محلہ والوں کو ایک عام اور کچی مسجد بنانے کی استطاعت ہو لیکن وہ پکی مسجد بنانے کے لیے چندہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: مساجد کو تعمیر کرنا اصل کے لحاظ سے سلطانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانه يجب ان يتخذ الامام للمسلمين مسجدًا من بيت المال ومن مالهم ان لم يكن لهم بيت مال كذا فى فتح القدير۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۸ کتاب الوقف)

جبکہ اس دور میں عموماً سلاطین مساجد کی تعمیر کے لیے متوجہ نہیں ہوتے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مساجد کی تعمیر کے لیے چندہ کریں، چاہے یہ چندہ مساجد میں کریں یا مساجد سے

---

[1] وفی الهندية: رجل قال فی مرضه اشتروا من غلة داری هذه كل شهر بعشرة دراهم خبزًا وفرقوا على المساكين صارت الدار وقفًا۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۵۹ کتاب الوقف، فصل فی الالفاظ التی یتم بها الوقف)
ومثله فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۵۹ کتاب الوقف)

باہر، اور بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

عن جریر قال کنا فی صدر النہار عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجاءہ قوم عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتہم من مضر بل کلہم من مضر فتمعر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما رای بہم من الفاقۃ فدخل ثم خرج فامر بلالا فاذن و اقام فصلی ثم خطب فقال یٰاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (الی اخر الآیۃ) اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا - الآیۃ - التی فی الحشر اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ — تصدق رجل من دینارہ من درھمہ من ثوبہ من صاع برہ من صاع تمرۃ حتی قال ولو بشق تمرۃ الی آخر۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۳ کتاب العلم) [1]

مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں اکثر مہاجرین بستے ہیں جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تو اس علاقے میں کسی جگہ پر بھی کوئی مسجد نہیں تھی البتہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا جس کو ہم لوگوں نے نماز کے لیے متعین کر دیا اور کچھ عرصہ باقاعدہ اس میں نماز پڑھتے رہے، بعد میں گورنمنٹ سے منظوری لے کر ایک جگہ مسجد کے لیے متعین کر کے اس پر مسجد تعمیر کر دی، لیکن بعض لوگ اب بھی اس مسجد کے ہوتے ہوئے مندر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ تو کیا مسجد کے ہوتے ہوئے اس مندر میں نماز پڑھنی جائز ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ سوال میں مندر کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں، اگر اس کو مستقل طور پر مسجد کی ہیئت میں بنا دیا گیا ہو اور اس کی پہلی شکل میں تبدیلی کر دی گئی ہو تو اس کا حکم مسجد جیسا ہے، لہٰذا یہ مندر بھی مسجد میں شمار ہوگا۔ البتہ اگر مندر کی صورت تبدیل نہیں کی گئی ہو اور اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہو اور نہ ہی اس کو مستقل مسجد بنانے کی نیت کی گئی ہو تو یہ مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، تشبہ بالکفار کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں ——— کما قال تعالیٰ: لَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

---

[1] وفی المسلم: عن جریر قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحث علی الصدقۃ بمعنی حدیث جریر۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۱ کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ الخ)

فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ - قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم -
(ابوداؤد ج ۲ ص ۵۵۹ کتاب اللباس، باب لبس الشھرۃ) [۱]

قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا

سوال:- ہمارے شہر میں ایک مسجد تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اور اس کی عمارت بھی بوسیدہ ہو چکی ہے جس کے گرنے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کو ترک کر کے دوسری نئی مسجد میں جو کہ قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی ہے، نماز پڑھے تو شرعاً کیسا ہے؟ بعد میں اگر کسی شخص نے اس بوسیدہ مسجد کی عمارت کو شہید کر کے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرائی ہے، اس صورت میں اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جدید مسجد میں؟

الجواب:- کسی جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا قدیم مسجد جب نئے سرے سے بنائی گئی ہو تو اس کے حقوق مسجد قریب ہونے کی بہ نسبت دوسری مسجد کے زیادہ ہیں لہٰذا اس قدیم مسجد کو ہی آباد کیا جائے، بہرحال جدید مسجد میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں -

قال ابن عابدینؒ ومسجد حیۃ وان نقل جمعہ افضل من الجامع وان کثر جمعہ -
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۸۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [۲]

مسجد میں حوض بنانا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض بنانے کا ارادہ ہے، لیکن اگر حوض کو کامل طریقہ سے بنایا جائے تو مسجد کا کچھ حصہ اس حوض میں شامل ہو گا، اور مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی

---

[۱] وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ من تشبہ بقوم فھو منھم قال الملا علی القاری ای من تشبہ نفسہ بالکفار مثلاً فی اللباس وغیرہ... فھو منھم ای فی الاثم - (مرقاۃ جلد ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس الفصل الثانی)
وَمِثْلُہٗ فی جواھر الفقہ ج ۱ ص ۲۲۱ مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے مقاصد

[۲] وفی الخلاصۃ ان نسخہ القاضی للامام رجل یصلی فی الجامع لکثرۃ الجمع ولا یصلی فی مسجد حیہ فانہ یصلی فی مسجد منزلہ وان کان قومہ اقل وان لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن ویصلی وان کان ھناک واحد - (ج ۱ ص ۲۲۹ الفصل السادس والعشرون فی المسجد ینقل بعہم)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۸۳ باب الامامۃ -

بڑی ہے کہ اس کا کچھ حصہ حوض میں شامل کرنے کی وجہ سے مسجد کے صفوف میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے بعض حصے کو حوض میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہ تا قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لیے مسجد کے کسی بھی حصے پر حوض بنانا جائز نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: لانہ مسجد الی عنان السماء وفی ردالمحتار وکذا الی تحت الثریٰ۔

(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج ۱ ص۸۹۵ کتاب الصلوٰۃ فی الکعبۃ)

علاوہ ازیں فقہائے کرام نے مسجد میں مضمضہ واستنشاق مکروہ لکھا ہے، اسلئے مسجد کے کسی حصہ میں حوض بنانے سے اس کراہیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے۔

البتہ اگر مسجد بنانے کے ابتداء ہی میں کوئی جگہ حوض یا وضو کے لیے متعین کر دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الخلاصۃ ویکرہ التوضی والمضمضۃ فی المسجد الّا ان یکون فیہ موضع اتخذ للوضوء ولا یصلّی فیہ۔ (ج ۱ ص۲۲۹ الفصل السادس والعشرون ومایتصل بہ)[1]

دُکانوں پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے جو چند دُکانوں کے اوپر واقع ہے اور باقاعدہ اس میں اذان وجماعت بھی ہوتی ہے جبکہ یہ دوکانیں مالک کی مِلک میں ہیں۔ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو مسجدِ شرعی کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دوکانوں کے اوپر مالک کی اجازت سے مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں، اس میں نماز بلا کراہیت جائز ہے، اگر مالک کی اجازت کے بغیر یہ مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز مکروہ ہے، البتہ یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں بلکہ عُرفی مسجد کے حکم میں ہے، شرعی مسجد کا حکم اس پر

---

[1] قال ابن نجیمؒ، وفی الخلاصۃ وغیرھا ویکرہ الوضوء والمضمضۃ فی المسجد الّا ان یکون موضع فیہ اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۳۴ فصل مما فرغ من بیان الکراھۃ فی الصلوٰۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۰ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ۔

اُس وقت ہوگا جب دو کانوں سے مالک کی ملکیت کو ختم کر کے مسجد کی ملکیت میں دیدی جائیں۔

قال ابن عابدینؒ: وفی القہستانی ولا بد من افرازہ ای تمیزہ عن ملکہ من جمیع الوجوہ فلو کان العلو مسجداً والسفل حوانیت او بالعکس لا یزول ملکہ لتعلق حق العبد بہ کما فی الکافی۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۷۰ کتاب الوقف) ؎۱

مسجد کے متولی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا تولیت مسجد میں ارث جاری ہو سکتا ہے اور متولی مسجد کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الجواب:۔ متولی نسلاً بعد نسلٍ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بعد میں آنے والے کے اندر صلاحیت ہو، امام و مؤذن اور مسجد کی دوسری ضروریات کا اہتمام کرنا متولی کے فرائض منصبی ہیں۔

قال ابن نجیمؒ: البانی اولیٰ بنصیب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرتہ اولیٰ من غیرھم بنی مسجداً فی محلۃ فنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارۃ فالبانی اولیٰ مطلقاً۔

(الاشباہ والنظائر ج۲ ص۳۳۲ کتاب الوقف) ؎۲

کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا

سوال:۔ مسجد میں خانہ کعبہ کی ایسی تصاویر آویزاں کرنا جن میں کعبۃ اللہ کی تصویر کے علاوہ انسانی شکلیں بھی طواف کی ہیئت کو

؎۱ من بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلّی فیہ واحد زال ملکہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف)

وایضاً قال ابن نجیمؒ: وحاصلہ ان شرط کونہ مسجداً ان یکون سفلہ وعلوہ مسجداً لینقطع حق العبد عنہ لقولہ تعالیٰ وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف)

؎۲ وفی الھندیۃ: قال فی الجامع الفصولین لو شرط الواقف ان یکون المتولی من اولادہ واولاد اولادہ ھل للقاضی ان یولی غیرہ بلا خیانۃ لو ولاہ ھل یکون متولیاً قال الشیخ الاسلام برھان الدین فی فوائدہ لا کذا فی النھر الفائق۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص۴۱۲ کتاب الوقف)

(وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۱۰ کتاب الوقف)

ظاہر کرتی ہوں کیا ایسی تصاویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہیں؟

الجواب:۔ کعبۃ اللہ ایک قابلِ احترام جگہ ہے اور ایسے ہی غیر ذی روح ہونے کی بنیاد پر اس کی تصویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہے، البتہ کعبۃ اللہ کی ایسی تصویر آویزاں کرنا جس میں لوگوں کو طواف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور جس میں اشخاص کی معرفت ہوتی ہو شرعاً ناجائز ہے، پھر جائز نہ ہونے کے علاوہ ایسی تصاویر کو مسجد میں آویزاں کرنا یہ زیادت علی الاثم ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسجد میں تصویریں لٹکانا مسجد کی عظمت کے منافی ہے۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)

عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)[1]

مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ دو قوموں کا ایک قطعۂ زمین پر جھگڑا تھا ایک قوم نے دوسری قوم کی املاک پر حملہ کر کے جبراً قبضہ کر لیا اور تمام مکینوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان املاک میں مکان اور زمین کے علاوہ مساجد بھی ہیں اور ان مساجد پر بھی غاصبانہ طریقہ سے قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اندریں صورت ایسی مساجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قریہ مذکورہ میں جو مساجد ہیں وہ غصب سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جو کسی کی ملک نہیں اور غاصبین بھی مسلمان ہیں جن کے نزدیک بھی مساجد کا احترام ملحوظ ہے، ایسی مساجد میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں اور ان مساجد پر اس قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ کسی کو

---

[1] عن عائشۃ تقول دخل علیّ رسول اللہ ۔۔۔ یا عائشۃ رضی اللہ عنہا اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیٰمۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد الناس عذاباً یوم القیٰمۃ المصورون۔ (مسلم ج۲ ص۲۰۱ باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان وتحریم الخ)

مسجد سے منع کرنا ظلمِ عظیم کے مترادف ہے۔

وفی الهندیة: قال ابویوسف رحمه الله تعالیٰ اذا غصب ارضاً فبنی فیها مسجداً اوحماماً اوحانوتاً فلا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔ (ج ۵ ص۳۲۰ کتاب الکراهیة) [1]

مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جو کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی ہے، اس کے قریب ہی ایک خالی پلاٹ واقع ہے جبکہ مسجد اور پلاٹ کے درمیان ایک پختہ قبر ہے، اگر اس پلاٹ کو مسجد میں شامل کر دیا جائے تو قبر مسجد کے دروازہ پر آتی ہے جس سے مسجد کی زینت خراب ہوتی ہے، اگر اس دروازہ کو بند کیا جائے تو دوسری طرف دروازہ نکالنے پر حُسن قائم نہیں رہتا، اندریں صورت قبر کے ساتھ کیا کیا جائے؟

الجواب:۔ جب مسجد کی وسعت ناگزیر ہو تو قبر کے درمیان میں آنے کی صورت میں اگر قبر اتنی پرانی کہ اس میں انسانی اعضاء بوسیدہ ہوگئے ہوں تو اس صورت میں اس قبر کو بالکل منہدم کرکے مسجد کے ساتھ اس جگہ کو ملانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبر جدید ہو تو پھر قبر کے اردگرد تعین کے لیے دیوار بنا کر دوسرے حصہ میں مسجد بنائی، تاہم اس بات کا خیال رہے کہ مسجد کی وضع ایسی ہو کہ قبر کی طرف کہیں توجہ نہ رہے تاکہ قبر پرستی کا شبہ نہ رہے، ایسی حالت پر زینت کا مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیره وزراعته والبناء علیه (تبیین الحقائق ج۱ ص۲۴۶ باب الجنائز)

قال الطحطاویؒ وفی القهستانی عن جنائز المضمرات لا تکره الصلوٰة الیٰ

---

[1] قال فی الینابیع اذا غصب ارضاً فبنیٰ ها مسجداً اوحماماً فلا بأس بدخول المسجد للصلوٰة۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۵ کتاب الوقف)

قال قاضیخانؒ: عن ابی یوسفؒ ذکره الناطفی رحمه الله تعالیٰ فی الواقعات اذا بنی فی ارض الغصب مسجداً اوحماماً اوحانوتاً لا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔ (الفتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۶۶ فصل فی المسجد)

جهۃ القبر الا اذا کان بین یدیہ بحیث لو صلی صلوٰۃ خاشعین دفع بصرہ علیہ۔
(طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص۱۶۱ مکروھات الصلوٰۃ) ۱؎

مسجد کی دوکان پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال:۔ مسجد کے غسلخانوں اور دوکانوں پر دینی علوم کا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کے غسل خانے اور دوکانیں اگرچہ مسجد کے لیے وقف ہیں لیکن احکام کے اعتبار سے من کل الوجوہ ایک ہیں، لہٰذا جب مسجد کو دینی علوم کے لیے استعمال کرنا جائز ہے تو ان مقامات پر مدرسہ تعمیر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

وفی الخلاصۃ: اما المعلم الذی یُعلّم الصبیان باجر اذا جلس فی المسجد یعلّم الصبیان لضرورۃ الحر وغیرہ لا یکرہ۔ (ج ۱ ص۲۲۹ کتاب الصلوٰۃ) ۲؎

مسجد میں رقص وسرود

سوال:۔ مسجد میں رقص وسرود کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ رقص وسرود از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے مساجد تو درکنار کسی بھی مقام پر اس کا اہتمام اور اس میں شرکت عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

وفی الھندیۃ: قال رحمہ اللہ تعالیٰ السماع والقول والرقص الذی یفعلہ المتصوفۃ فی زماننا حرام لا یجوز القصد الیہ والجلوس علیہ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۵۲ کتاب الکراھیۃ۔الباب السابع عشر فی الغناء واللھو) ۳؎

۱؎ لما فی الھندیۃ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ کتاب الجنائز الفصل السادس فی القبر والدفن)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

۲؎ قال ابن نجیمؒ: لان المسجد ما بُنی الا لہا من صلوٰۃ واعتکاف وذکر شرعی وتعلیم علم وتعلمہ وقراءۃ قرآن۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۴) وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۰ کتاب الصلوٰۃ)

۳؎ قال المرغینانیؒ: ان الملاھی کلھا حرام حتی التغنی بضرب القضیب وکذا قول ابی حنیفہ
(الھدایۃ ج ۳ ص۴۵۳ کتاب الکراھیۃ فصل الاکل والشرب)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۹۵ کتاب الکراھیۃ، فصل فی البیع۔

عیدگاہ پر مسجد بنانا

سوال:۔ ایک شخص نے عیدگاہ کے لیے زمین وقف کی، اب وہاں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کیا شرعاً اس عیدگاہ کے رقبہ پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی قطعہ زمین صرف عید کی نماز کے لیے وقف کیا گیا ہو تو بغیر اذن واقف کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں۔ جب واقف اجازت دے دے تو اس تعمیر میں کوئی حرج نہیں الّا اگر یہ قطعہ زمین قانونی وقف ہو شرعی وقف نہ ہو تو اس کی خرید فروخت بھی جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصری ؒ۔ شرط الواقف یجب اتباعہ لقولھم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل بہ وفی المفھوم والدلالۃ کما بیناہ فی شرح الکنز الا فی مسائل۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف)[۱]

مسجد میں سوال کرنے کا حکم

سوال:۔ عموماً سائلین مساجد میں عوام کی حاضری کو غنیمت سمجھ کر سوال کرتے ہیں، ان کا یہ اقدام کیسا ہے اور ایسے سائلین کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سوال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ان کو دینے میں دو قول ہیں، بعض علماء تو مطلق کراہیت کے قائل ہیں، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر نمازیوں کی رعائیت رکھ کر سائل سوال کر رہا ہے تو اس کو دینا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھذا القول (ویحرم فیہ السوال ویکرہ الاعطاء مطلقاً وقیل ان تخطی) ای ھو الذی اقتصر علیہ الشارح فی الخطر حیث قال فرع یکرہ اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیاً تصدق بخاتمہ فی الصلوٰۃ فمدحہ اللہ تعالیٰ

---

[۱] قال ابن عابدینؒ فان شرائط الواقف معتبرۃ اذا لم تخالف الشرع وھو مالک فلہ ان یجعل مالہ حیث شاء مالم یکن معصیۃ ولہ ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلھم قربۃ۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۳ کتاب الوقف مطلب شرائط الواقف معتبرۃ ۔۔۔ الخ)

بقولہ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۹ فی افضل المساجد) [۱]

مساجد میں نمازی کی توجہ متاثر کرنے والی زینت کا حکم

سوال :۔ مساجد میں بطور آرائش و زیبائش ایسا نقش و نگار کرنا، طغرے یا خطوط لکھنا جو نمازی کے لیے نماز میں باعثِ تشویش و خلل اندازی ہوں۔ کیا اس طرح مسجد کی زیبائش کرنا جائز ہے؟

الجواب :۔ مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور اس کی تعمیر فقط عبادت اور یادِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے، اور اگر اس میں ایسے نقوش جو آجکل کی مروجہ تعمیرات میں ہیں بنادیئے جائیں تو اس سے مسجد کی تعمیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ جدید عمارات کی طرح یہ بھی ایک سیر و تفریح کا مقام بن جائیں گی، پھر اس میں نماز پڑھنے والے کا دھیان مکمل طور پر نماز میں بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا مسجد کی اتنی زینت کر لی جائے جس سے مسجد خوبصورت اور صاف ستھری نظر آئے البتہ ضرورت سے زیادہ اموال خرچ کر کے مسجد کو مزین کرنا مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: (ولا بأس بنقشه خلا محرابه) فانه یکره لانه یلهی المصلّی ویکره التکلّف بدقائق النقوش ونحوها خصوصًا فی جدار القبلة۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۸ احکام المساجد) [۲]

مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم

سوال :۔ ہماری مسجد کے صحن میں پھلدار درخت ہیں۔ کیا شرعاً ان پھلوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے یا ان کی قیمت سے مسجد کے مصارف پورے کئے جائیں؟

الجواب :۔ مسجد میں پھلدار درخت اگر وقف برائے مسجد ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں،

---

[۱] اعطأ سوال المسجد انه اذا کانوا لا یتخطون رقاب الناس ولا یمرون بین یدی المصلّین یسألون مالا بد لهم منه ولا یلحون فی السّوال فلا بأس ولا بالمطانة۔ (فتاوٰی غیاثیة ص ۲۱)

[۲] وفی الهندیة: اما المتولی یفعل من مال الوقف ما یرجع الی أحکام البناء دون ما یرجع الی النقش حتی لو فعل یضمن کذا فی الهدایة۔
(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص ۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکره فی الصلٰوة وما لا یکره)
وَمِثْلُهُ فی الهدایة ج ۱ ص ۱۴۲ باب ما یفسد الصلٰوة وما یکره فیها۔

البتہ اگر واقف نے ابتداءً اس کی شرط رکھی ہو تو پھر جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ مسجد کے پھل فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی الحاوی وما غرس فی المساجد من الاشجار المثمرۃ ان غرس للسبیل وھو الوقف علی العامۃ کان لکل من دخل المسجد من المسلمین ان یأکل منھا وان غرس للمسجد لایجوز صرفھا الا الیٰ مصالح المسجد الاھم فالاھم کسائر الوقوف۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف) [1]

امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا

سوال: مسجد کا صحن یا برآمدہ جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہو، کسی وقت حالات کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص یا امام مسجد اپنے ذاتی استعمال میں لا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے برآمدہ یا صحن کو جب باقاعدہ مسجد کا حصہ قرار دیا جا چکا ہو تو ایک دفعہ مسجد بن جانے کے بعد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو اب کسی دوسرے امور میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، تاہم اگر یہ برآمدہ کہیں مسجد کے لیے وقف ہو لیکن نماز اس میں نہیں پڑھی گئی ہو تو ایسی صورت میں مسجد پر وقف ہو کر واقف کی اجازت یا متولی کی صوابدید پر امام کا اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو خرب ماحولہ واستغنی عنہ یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعۃ (وبہ یفتی)۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیہ اولا وھو الفتویٰ حاوی القدسی

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن احمد بن عبد الرشید البخاریؒ: وسئل ابوبکر عمن وقف شجرۃ اصلھا والشجرۃ فیما ینتفع باوراقھا وثمرھا۔ قال فالوقف جائز وینتفع بثمرھا ولا یقطع اصلھا الا ان یفسد اغصانھا فان لم ینتفع باوراقھا وثمرھا فانھا تقطع وتصرف ثمنھا علی سبیلہ فان نبت ثانیا والا غرس مکانھا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ نوع منہ) ومثلہ فی الفتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف۔

واکثر المشائخ علیہ مجتبیٰ وھو الاوجہ فتح۔ (رد المحتار ج ۳ ص۳۵۸ مطلب فیما لو خرب المسجد)[1]

وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی

سوال:۔ اہل محلہ نے ایک جگہ کا تعین کرکے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور پتھر وغیرہ بھی جمع کر لیے، بعض وجوہات کی وجہ سے اس جگہ مسجد بنانا موزوں نہیں سمجھا گیا، اب ایک دوسری جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیا یہ تبادلہ جائز ہے یا اُسی جگہ پر جہاں پہلے ارادہ کیا گیا تھا مسجد کے لیے کام شروع کیا جائے؟

الجواب:۔ صرف ارادہ کرنے سے یہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کے علاوہ نماز پڑھنی بھی ضروری ہے لہٰذا وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرے مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال المرغینانیؒ: واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویاذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلّٰی فیہ واحدٌ زال عند ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسفؒ یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف فصل فی المسجد)[2]

مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک پرانی مسجد کا کچھ سامان مثلاً شہتیر وغیرہ زائد از ضرورت پڑا ہے، اگر اسے فروخت نہ کیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ کیا مسجد کے زائد سامان کو فروخت کرنا جائز ہے جبکہ اس کے نفع کو مسجد پر ہی خرچ کیا جائے؟

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ۔ وفی الفتاوٰی اذا خربت القریۃ التی فیھا المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیہ احدٌ فلا بأس بان یاخذہ صاحبہ ویبیعہ وھو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک البانی ولا الی ملک ورثتہ وھو مسجد ابداً۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد واوقافہ)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] قال طاھر بن عبد الرشیدؒ: ولو جعل دارہ مسجداً یجوز بالاجماع ولا یجوز مشاعاً وانما یجوز اذا سلمہ والتسلیم ان یصلی فیہ بجماعۃ باذان واقامۃ باذنہ عند ابی حنیفۃؒ ومحمدؒ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

الجواب: مسجد کے اموال کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی منقول چیز ہو یعنی جو مسجد کی جزئیت میں داخل نہ ہو، مثلاً دری وغیرہ۔ اگر اس کی ضرورت نہ رہے اور مالک موجود ہو یا مالک کے فوت ہونے کی صورت میں اسکے ورثاء موجود ہوں تو مالک یا ورثاء کی اجازت سے اس کی فروخت جائز ہے۔ اور اگر ان میں کوئی نہ ہو تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی وحاکم کی اجازت سے فروخت جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ چیزیں باقاعدہ مسجد کا حصہ بن جائیں اور علیحدہ کرنے میں مسجد کا نقصان نہ ہو لیکن کہیں تعمیر کی نیت سے یہ چیزیں الگ کی گئی ہوں تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی کی اجازت سے ان کی فروخت جائز ہے۔

وفی الهندية: ذکر ابو اللیث فی نوازله حصیر المسجد اذا صار خلقاً واستغنی اهل المسجد عنه وقد طرحه انسان ان کان الطارح حیا فهو له وان کان میتاً ولم یدع له وارثاً ارجو ان لا بأس بان یدفع اهل المسجد الی فقیر وینتفعوا به فی شراء حصیر آخر للمسجد والمختار انه لا یجوز لهم ان یفعلوا ذلك بغیر امر القاضی کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا

سوال: کیا مسجد کے چندہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر کے دیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بصورت نیلام ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میری بولی پوری نکلی تو میں ۹۰۰ روپے مسجد میں بطور چندہ دوں گا۔ اب اس کی بولی پوری نکل آتی ہے اور یہ ۹۰۰ روپے چندہ مسجد کے لئے دے دیتا ہے تو دوسرا شخص

---

[1] قال ابن عابدین: (حشیش المسجد) ای الحشیش الذی یفرش بدل الحصر کما یفعل فی بعض البلاد کبلاد الصعید کما اخبرنی به بعضهم قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه اذا استغنی عنهما یرجع الی مالکه عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ ینقل الی مسجد آخر ۔۔۔ وصرح فی الخانیة بان الفتوی علی قول محمدؒ قال فی البحر وبه علم ان الفتوی علی قول محمدؒ فی آلات المسجد۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۹ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۲ کتاب الوقف۔

اس کی بولی پر بولی بولتا ہے تو یہ شخص چندہ دینے سے انکاری ہے اور واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا یہ شخص چندہ کی واپسی کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کا چندہ ایک صدقہ ہے جس سے مقصود رضاءِ الٰہی کا حصول ہے، اگر اس کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے تو شرط باطل ہو کر صدقہ جائز ہو جاتا ہے بعد ازاں اس میں رجوع کا حق حاصل نہیں، لہٰذا یہ شخص متولی کے قبضہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔

وفی الهندية: وما لا يبطل بالشروط الفاسدة ستة وعشرون) القرض والهبة والصدقة (ج ۴ ص ۳۹۶ کتاب الهبة) الصدقة بمنزلة الهبة فى المشاع وحاجتها الى القبض الا انه لا رجوع فى الصدقة۔ (الفتاویٰ الهندية ج ۴ ص ۴۰۶ الباب الثانی عشر فی الصدقة)[لہ]

مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا

سوال:- سکھوں کے دور میں بازار کے اندر ایک خالی مقام کو مسلمانوں نے مسجد کے لیے متعین کیا اور اس پر نمازیں پڑھنے لگے، جب اس اراضی کی فروخت شروع ہوئی تو سکھ اس کو خریدنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس پر ایک کمرہ تعمیر کر لیا اور بعد میں اس پر دوسری منزل بنا دی اور باقاعدہ اس میں پنجگانہ نمازیں شروع کیں یہاں تک کہ جمعہ وعیدین بھی اس میں پڑھنے لگے۔ اب اس مسجد کے فنڈ میں کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے نچلے حصے دوکانیں بنا دی جائیں اور اوپر والا حصہ مستقل طور پر مسجد ہی رہے گا، جبکہ متولی کہہ رہا ہے کہ جس وقت ہم مسجد کی دوسری منزل بنا رہے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اگر ہمارے پاس گنجائش ہو گی تو ہم نچلے حصہ میں دوکانیں بنائیں گے۔ اندریں صورت مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قبہ مسلمانوں نے مشترکہ طور پر مسجد کے لیے متعین کیا ہے اور حکومتِ وقت کی طرف سے اس پر مسلسل خاموشی اختیار کرنا دلالتاً مسجد کی اجازت ہے۔ لہٰذا جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اسلئے

[لہ] قال الحصكفیؒ: (و) حكمها انها (لا تبطل بالشروط الفاسدة) فهبة عبد على ان يعتقه تصح ويبطل الشرط۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۵ ص ۶۸۸ کتاب الهبة)

(والصدقة كالهبة) بجامع التبرع وحينئذ (لا تصح غير مقبوضة ولا فى مشاع يقسم ولا رجوع فيها)۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۵ ص ۷۰۹ کتاب الهندية)

مسجد کے نچلے حصہ میں دوکانیں بنانا اگرچہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی ابتداً سے ہی نیچے دوکانیں بنائے اور اوپر مسجد بنائے اور وہ دوکانیں مصالح مسجد کے لیے ہوں تو یہ جائز ہے۔

وفی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً اومسکناً تسقط حرمته وهذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی. (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثانی الوقف فی المسجد) ؎۱

منبر کو محراب کی دائیں جانب رکھنا

سوال:۔ زمانۂ قدیم سے منبر عموماً محراب کے دائیں جانب رکھا جاتا تھا، موجودہ دور میں بعض مقامات پر ایسا نہیں ہوتا۔ کیا محراب کی دائیں طرف منبر کا ہونا ضروری ہے یا محض عرف کا فیصلہ ہے؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں منبر مصلّی کے دائیں طرف ہوا کرتا تھا، لہٰذا سنّت یہ ہے کہ منبر محراب ومصلّی کے دائیں جانب رکھا جائے۔

کان سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلة۔ (بذل المجهود ج۲ ص۱۷۸ باب موضع المنبر) ؎۲

مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا متولی مسجد کی بہتری کے لیے اپنی صوابدید پر مسجد کے چندہ میں تصرفات کر سکتا ہے، اگر خرید وفروخت میں مسجد کا فائدہ ہو تو متولی کو یہ حق حاصل ہے تاہم

؎۱ قال ابن نجیمؒ: فی المجتبیٰ لا یجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفنائه۔ (البحرالرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

؎۲ وقال النوویؒ: فی مناسکه ما لفظه وفی احیاء علوم الدین انه ای المصلّی یجعل عود المنبر حذا منکبه الایمن ویستقبل الساریة التی الی جانبها الصندوق وتکون الدائرة التی فی قبلة المسجد بین عینیه فذلك موقف رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (وفاء الوفاء ج۱ ص۳۷۲ محراب المسجد النبی ومنی)

چندہ دہندگان سے اجازت مستحسن ہے ۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتًا اودارًا ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان له ولایة الشراء واذا جاز له ان یبیعه کذا فی السراجیة ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم

سوال: مسجد کے صحن میں امام صاحب نے پھلدار درخت لگایا ہے اب جبکہ وہ درخت تناور ہو کر قیمتی درختوں میں اس کا شمار ہوا ہے تو امام موصوف اس درخت کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے ۔ از روئے شریعت اس درخت کا مالک امام موصوف ہے یا مسجد ؟

الجواب: کاشت کرتے وقت جب ذاتی اغراض کی نیت نہیں کی ہو جیسا کہ عام مسلمانوں سے یہی توقع کی جاتی ہے، تو مسجد کی ملکیت شمار ہوگی ۔

وفی الهندیة: سئل نجم الدین عن رجل غرس تالة فی مسجد فکبرت بعد سنین فاراد متولی المسجد ان یصرف هذه الشجرة الی عمارة بئر فی هذه السکة والغارس یقول هی لی فانی ما وقفتها علی المسجد قال الظاهر ان الغارس جعلها للمسجد فلا یجوز صرفها ای البئر ولا یجوز للغارس صرفها الی حاجة نفسه کذا فی محیط ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۷۷ کتاب الوقف) [2]

مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم

سوال: بعض لوگ مساجد میں مستقل طور پر تعویذ فروخت کرتے ہیں جس کے لیے نامحرم عورتیں بھی مساجد

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قیم یبیع فناء المسجد لیتجر فیه القوم او یضع فیه سررًا اجرها لیتجر فیها الناس فلا بأس اذا کان لصلاح المسجد ویعذر المستاجر ان شاء الله تعالی اذا لم یکن ممر العامة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۳ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد ۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وفی المحیط رجل غرس فی المسجد یکون للمسجد لانه بمنزلة البناء بالمسجد ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۰۴ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الخلاصة ج ۴ ص ۴۲۰ کتاب الوقف الفصل الثالث فی صحة الوقف ۔

کا رُخ کرتی ہیں، عین ممکن ہے کہ ان میں بعض عورتیں ایسی بھی ہوں جو طبعی بیماریوں کی وجہ سے مساجد میں داخل ہونے کی اہل نہیں ہوں۔ تو کیا مساجد میں تعویذ فروشی کرنا جائز ہے اور ایسی حالت میں شرعاً عورتوں کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی گنجائش ہے؟

الجواب:- مسجد میں عورتوں کا فی نفسہٖ داخل ہونا جائز ہے لیکن فسادِ ازمنہ کی وجہ سے انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے کس طرح اجازت دی جاسکتی ہے، خاص کر جبکہ ان میں بہت سی عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تاہم اگر پاک ہوں تو حدود کی رعایت رکھ کر تعویذ دے سکتی ہیں، لیکن مسجد میں تعویذ فروشی کا دھندہ مطلق جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (و) یمنع حل (دخول مسجد) ای ولو مسجد مدرسۃ او دار لایمنع اهلها الناس من الصلوٰۃ فیه۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص۲۹۱ باب الحیض) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ کمروں میں سونے کا حکم

سوال:- مساجد کے ساتھ متصل جو کمرے ہوتے ہیں ان میں سونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کمروں اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟

الجواب:- مسجد کے ساتھ متصلہ کمرے اگر ابتداء ہی سے مسجد سے باہر بنائے گئے ہوں تو ان میں سونا بلاکراہیت جائز ہے، البتہ اگر شروع ہی سے یہ کمرے مسجد میں شامل تھے بعد میں انہیں مسجد سے نکال کر کسی عذر کی بناء پر کمرے بنائے گئے ہوں تو ان کا حکم اور مسجد کا حکم ایک ہے، ان میں بلاضرورت سونا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک

---

[1] وفی الهندیة (ومنها) انه یحرم علیها وعلی الجنب الدخول فی المسجد سواء کان للجلوس او للعبور هٰکذا فی منیة المصلی (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۳۸ الفصل الرابع فی احکام الحیض)

رجل یبیع التعویذ فی المسجد الجامع ویکتب فی التعویذ التوراۃ والانجیل والفرقان ویاخذ علیه المال ویقول ادفع الی الهدایة لایحل له ذٰلک۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة الباب الخامس فی آداب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۸ باب الحیض۔

ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیۃ ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد فی الصحیح من المذھب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی خزانۃ الفتاوی۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراھیۃ) [۱۲۰]

قبلہ کی تحقیق

سوال:۔ ہمارے ہاں تقریباً ایک سو بیس سال سے آباد ایک پرانی مسجد ہے، اب بوسیدہ ہونے کی بناء پر اس کو شہید کرکے اس کی از سر نو تعمیر کرنے کے لیے جب نئی بنیادیں رکھنے کا وقت آیا تو مستری نے کہا کہ میں قطب ستارہ کا ماہر ہوں اور قطب ستارہ کی رُو سے اس مسجد کی سمتِ قبلہ صحیح نہیں۔ اب اگر اس کی بنیادوں میں تبدیلی کی جائے تو اس میں کئی مفاسد شرعیہ ہیں، مثلاً مسجد کے بعض حصے کا راستہ میں شامل ہوجانا وغیرہ جو کہ شرعاً جائز نہیں۔ کیا ایسی صورت میں اس مستری پر اعتماد کرکے اس کی بنیادوں میں برائے تعیینِ سمتِ قبلہ تبدیلی کی جاسکتی ہے یا قدیمی حالت میں بدستور برقرار رکھی جائے؟

الجواب:۔ اس مسئلہ پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ استقبالِ قبلہ فرض ہے البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماء احناف نے عوام کی آسانی کے لیے یہ حکم فرمایا کہ نمازی کا بحالتِ نماز مواجہت مابین المغربین اگر ہو تو استقبالِ قبلہ ہوجاتا ہے۔ یعنی موسم سرما میں مغرب کا آخر وقت اور موسم گرما میں مغرب کا آخر وقت کے درمیان میں جو فاصلہ ہو، اگرچہ عینِ قبلہ سے قدرے انحراف ہی کیوں نہ پایا جائے

البتہ مستری کا یہ کہنا کہ میں قطبی ستارہ کا ماہر ہوں، یہ اس کا دعویٰ ہے، اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہو اور اس میں اس کی شہرت ہو تو اس پر اعتماد کر لیا جائے ورنہ نہیں، بہرحال تحقیق پھر بھی ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وقال فی شرح زاد الفقیر وفی بعض الکتب المعتمدۃ فی استقبال القبلۃ الی الجھۃ اقاویل کثیرۃ واقربھا الی الصواب قولان الاول ان ینظر

---

[۱] قال القاضی خانؒ: وقیل لا بأس للغریب ان ینام فی المسجد۔
(فتاوی قاضی خان علی ھامش الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۶۶)
ومثلہٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۱ مکروھات الصلوٰۃ مطلب احکام المسجد۔

فی مغرب الصیف فی اطول ایامه ومغرب الشتاء فی اقصر ایامه فلیدع الثلثین فی الجانب الایمن والثلث فی الایسر والقبلة عند ذلک ولو لم یفعل ھکذا وصلی فیما بین المغربین یجوز واذا دفع خارجا منھا لایجوز بالاتفاق۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۴۳۰ مبحث فی استقبال القبلة)

قال ابن عابدینؒ: (قوله کالقطب) ھو اقوی الادلة وھو نجم صغیر فی بنات الصغری بین الفرقدین والجدی اذا جعله الواقف خلف اذنه الیمنی کان کان مستقبلا القبلة۔ (رد المحتار ج ۱ ص۴۳۰ مبحث فی استقبال القبلة) [۱]

سوال: مسجد کے اوپر راستہ کی طرف اگر بیت الخلاء بنا دیا جائے تو کیا شرع میں اس کی گنجائش ہے؟	مسجد کی چھت پر بیت الخلاء بنانا

الجواب: مسجد کی حدود میں بیت الخلاء بنانا شرعاً جائز نہیں اگرچہ مسجد کی چھت پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا راستہ علیحدہ ہو۔ البتہ مسجد کے نیچے ابتداء سے واقف کی نیت سے بیت الخلاء وغسلخانہ بنانا جائز ہے۔

قال الحصکفیؒ (و) کرہ تحریما (الوطء فوقه والبول والتغوط) لانه مسجد الی عنان السماء۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد) [۲]

---

[۱] قال ابو اللیثؒ: وقبلة اھل خراسان ما بین مغیب الصیف ومغیب الشتاء قال ابو منصور قبلة ماوراء النھر ھو ان یترک الثلثین من یمین المصلی والثلث من یساره من المغربین۔ (فتاوی نوازل ص۳۷ فصل فی شروط الصلوٰة)
وفی الطحطاوی اصابه جھتھا (قا) لمغرب قبلة لاھل المشرق بالعکس (ص۱۱۵ باب شروط الصلوٰة)
اما فی البحار فدلیل القبلة النجوم وقد روی عن عمر رضی اللّٰه عنه انه قال تعلموا من النجوم ما تھتدوا به الی القبلة اھ۔ وذلک کالقطب۔ (طحاوی ص۱۲۱)
[۲] قال ابن نجیم (والوطء فوقه والبول والتخلی) ای کرہ الوطء فوق المسجد وکذا البول والتغوط لان سطح المسجد له حکم المسجد۔
(البحر الرائق۔ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکرہ فیھا)
ومثلهٗ فی الفتاوی الھندیة ج ۱ ص۱۰۹ فصل فی غلق باب المسجد)

مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا

سوال:- مسجد کے تہہ خانہ میں سردی کے موسم میں بوقتِ ضرورت آگ جلانے کے لیے جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- نفسِ مساجد میں آگ کے جانا یا جلانا بذاتِ خود ممنوع نہیں' البتہ مجوسیوں کی طرح معبدگاہ بنانا جائز نہیں۔ اگر یہ آگ مسجد کے مصالح کے لیے جلائی جائے مثلاً پانی گرم کرنے یا مسجد کے گرم کرنے کے لیے، جیسا کہ بعض ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ مسجد کے تہہ خانہ میں آگ جلائی جاتی ہے جس سے موسمِ سرما میں مسجد گرم ہوجاتی ہے۔ تو یہ جائز ہے۔

قال ابن عابدین: (واذا جعل تحته سردابا لمصالحه) ای المسجد (جاز) کمسجد القدس اذا کان السرداب والعلو موقوفاً لمصالح المسجد فهو کسرداب بیت المقدس هذا هو ظاهر الروایة وهناک روایات ضعیفة مذکورة فی الهدایة۔
(رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فی احکام المساجد) [1]

مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا

سوال:- ایک شخص نے مسجد کی دیوار کے متصل غسلخانہ بنایا ہے اور غسل خانہ کی چاردیواری میں سے ایک دیوار مسجد کی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:- غسل خانہ کو مسجد کے اندر بنانا جائز نہیں' البتہ واقف مصالح مسجد کی رعایت کرتے ہوئے مسجد کے نیچے غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ بہرحال اگر کسی نے مسجد کے ساتھ متصل اپنی زمین میں غسل خانہ بنایا ہے اور مسجد کی دیوار کو بطورِ پردہ استعمال کیا ہے تو یہ جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اس بات کی رعایت ضرور رکھی جائے گی کہ اس سے مسجد کو نقصان نہ پہنچے اور کل کہیں محض پردہ کے استفادہ سے اس دیوار کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔

قال ابن عابدینؒ: لوجعل الواقف تحته بیتاً للخلاء هل یجوز کما فی مسجد

---

[1] وفی الهندیة: ومن جعل مسجداً تحته سرداب او فوقه بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزله فله ان یبیعه وان مات یورث عنه ولوکان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الهدایة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۵۵ کتاب الوقف) ــــ ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف۔

محلة الشحم فی دمشق؟ لم اکرہ صریحًا نعم سیأتی متنا فی کتاب الوقف انہ لوجعل تحتہ سردابًا لمصالحہ جاز تامل۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج ۱ ص۶۵۶ مکروھات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد) ؎۱

مسجد کی آمدنی کے لیے بینک میں کھاتہ کھولنا

سوال:۔ کیا امام یا خزانچی مسجد کا فنڈ اپنے نام پر بینک میں جمع کرا سکتا ہے؟ اور کیا اس فنڈ کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا فنڈ خرچ ہونے سے پہلے وقف عرفی ہوتا ہے شرعی نہیں ہوتا۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چندہ دہندگان کی اجازت کے بغیر مسجد کا فنڈ بینک میں داخل کرائے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے، البتہ اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو امام اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور بینک میں جمع کرنا بغیر اضطراری حالت کے اچھا نہیں، اگرچہ بغیر سود کے ہی کیوں نہ ہو۔

وفی الھندیۃ: لو وقف دراھم اومکیلا او ثیابا لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلک یفتی بالجواز قیل کیف قال الدراھم تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منھم والثیاب والاکسیۃ تعطی للفقراء لیلبسوھا عند حاجتھم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف)

قال الحصکفیؒ: (حبس العین علی) حکم (ملک الواقف والتصدق بالمنفعۃ) ولو فی الجملۃ والاصح انہ (عندہ) جائز غیر لازم کالعاریۃ وعندھما ھو حبسھا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علی من احب ؎۲ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۴۳۷ کتاب الوقف) ؎۲

؎۱ وفی الھندیۃ ومن جعل مسجدًا تحتہ سرداب اوفوقہ بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزلہ فلہ ان یبیعہ وان مات یورث عنہ ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الھدایۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۵۵ کتاب الوقف)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۶۲۳ کتاب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد۔

؎۲ قال المرغینانیؒ: قال ابوحنیفۃؒ لایزول ملک الواقف عن الوقف الا ان یحکم بہ الحاکم او یعلقہ بموتہ فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا۔ وقال ابویوسفؒ یزول ملکہ بمجرد القول۔ وقال محمد لایزول حتی یجعل للوقف متولیًا ویسلمہ الیہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۱۴ کتاب الوقف)

مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے چندہ دیا، اور اس میں سے بعض رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ ہو گئی ہے، جبکہ اس شخص کا اب یہ مطالبہ ہے کہ میں نے جو رقم مسجد کی تعمیر کے لیے دی تھی وہ مجھے واپس کی جائے میں اس رقم کو دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے دیتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی تمام رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں نہیں دے گا بلکہ نصف رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا اس شخص کو وقف کی رقم واپس لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد یا دینی مدارس میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ جب متصدق کے ملک میں داخل ہو جائے تو پھر اس میں رجوع کرنا درست نہیں۔

چونکہ فقہاء کی عبارات کی روشنی میں مسجد کے لیے تملیک درست ہے، تملیک کے بعد چندہ معطی کی ملک سے خارج متصور ہوتا ہے، لہٰذا دینی مدارس یا مساجد میں چندہ دینے کے بعد معطی کو حق رجوع حاصل نہیں۔

لما قال فی الهندية۔ رجل اعطى درهماً فی عمارة المسجد او نفقة المسجد او مصالح المسجد صح لانه وان كان لا يمكن تصحيحه وقفاً يمكن تصحيحه تمليكاً للمسجد فاثبات الملك للمسجد على هذا الوجه صحيح قيّم بالقبض...... كما لو قال وقفتُ هذه المائة للمسجد يصح بطريق التمليك اذا سلمه للقيّم -(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۴۶۰ كتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف على المسجد وتصرف القيم ---الخ)

وايضاً قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: الصدقة كالهبة لا تصح الا بالقبض ولا رجوع فی الصدقة لان المقصود وهو الثواب وقد حصل۔

(الهداية ج ۳ ص۲۹۳ كتاب الهبة، فصل فی الصدقة) [۱]

---

[۱] لما قال الشيخ ظفر احمد العثمانیؒ: التمليك للمسجد صحيح قلت فی الحديث دليل لما قال علماؤنا من ان التمليك للمسجد صحيح فی الهندية.... الخ (اعلاء السنن ج ۱۳ ص۱۹۸ باب الوقف على المصالح المسجد وحكم ما يهدى اليه من الاموال۔)

لما قال العلامة ابوبكر بن على الحداد اليمنی: الصدقة كالهبة لا تصح الا بالقبض لانها تبرع كالهبة.....ولا تصح الرجوع فی الصدقة بعد القبض لانه قد كمل فيها الثواب من الله تعالى - (الجوهرة النيرة ج ۲ ص۱۹ كتاب الهبة)

مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا

سوال:۔ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا اور اسی طرح مسجد کی چار دیواری کا انتظام نہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی چار دیواری تو مسجد کے فنڈ اور رقم سے بنائی جاتی ہے اور اگر مسجد کا فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چار دیواری تعمیر کی جا سکے اور اہلِ محلہ بھی باوجود قدرت رکھنے کے اس کا انتظام نہیں کرتے جس سے مسجد کی املاک کے تلف یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو عند اللہ اہلِ محلہ گنہگار ہوں گے ۔ البتہ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا یا اس میں گندے پانی کی نالی گذارنا عند الشرع جائز نہیں، کیونکہ مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (سورۃ البقرۃ) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کو جبراً مسجد کے لیے لینا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں مسجد کے ساتھ متصل ایک قطعہ زمین ہے جو کہ حکومت کی ملکیت ہے اور جو مسجد کے تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کو درکار ہے جبکہ حکومت یہ زمین مسجد کو دینے سے انکاری ہے۔ کیا مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر جبراً یہ زمین مسجد میں شامل کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ متصلہ زمین عام راستہ ہے یا مکان اور دوکان ہے، اگر راستہ ہو تو لوگوں کی مصلحت کو دیکھ کر اس کو مسجد میں شامل کر دیا جائے ۔ البتہ اگر اس کو مسجد میں شامل کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں، اور مکان و دوکان کو مسجد میں شامل کرنے کے لیے قاضی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

وفی الهندیة: قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الی مکان لیتسع المسجد واخذوا من الطریق وادخلوه فی المسجد ان کان یضر باصحاب الطریق لا یجوز و ان کان

---

[1] قال ابن عابدین: (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۶، مطلب فی احکام المسجد)۔ ومثلهٗ فی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۶۴ فصل فی المسجد ۔

لا یضرّ بھم رجوعٌ ان لا یکون بہ بأس کذا فی المضمرات... ایضاً نیہ ارض وقف علیٰ مسجد والارض بجنب ذٰلک المسجد وارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئاً من الارض جاز لکن یرفعون الی القاضی لیاذن لھم ومستغل الوقف کالدار والحانوت علیٰ ھٰذا کذا فی الخلاصۃ ۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف)

تاہم اگر مسجد کے ساتھ متصلہ زمین ہو اور حکومت دینے سے انکار کرتی ہو تو مسجد کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر جبراً قیمتاً حاصل کی جاسکتی ہے ۔

ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبہ ارض لرجل توخذ ارضہ بالقیمۃ کرھاً کذا فی فتاوٰی قاضی خان ۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف) [1]

کس بُرش کا استعمال مسجد میں جائز ہے ؟

سوال:۔ آجکل جو صفائی کے بُرش رائج ہیں اُن میں اکثر خنزیر کے بال استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ بُرش کئی لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اور بعض مساجد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کے لیے یہ بُرش استعمال کیے جاتے ہیں ۔ کیا ایسے برش کا مسجد میں استعمال شرعاً جائز ہے ؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں ان کو نجاست سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے، چونکہ خنزیر کا ہر ہر جزء نجس العین ہے اس لیے اس سے کسی صورت میں بھی انتفاع جائز نہیں، لہٰذا ایسے برش جو نجاست سے مخلوط ہوں مساجد ان سے پاک رکھی جائیں ۔ لیکن بلاتحقیق کسی چیز کے بارے میں نجس کا حکم صادر کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں ۔

قَوْلُہٗ تَعَالیٰ: طَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْعَاکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْد ۔ (سورۃ البقرۃ)

قال العلامۃ فخر الدین: ولا یبزق فی المسجد لافوق البواری ولا تحت الحصیر لانا امرنا بتعظیم المسجد وصونہ عن النجاسۃ فیاخذ النخامۃ

---

[1] قال الحصکفیؒ: (توخذ ارض) ودار وحانوت (بجنب مسجد ضاق علی الناس بالقیمۃ کرھا) ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص۳۷۹ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۶ کتاب الوقف ۔

بثوبه ولا يلقيها فى المسجد۔ (فتاوٰی قاضیخان علیٰ هامش الهندية ج۱ ص۶۴ فصل فی المسجد)[1]

عوام کی ضرورت کے لیے مسجد کو مسمار کرنا

سوال: ہمارے علاقہ میں عرصہ قدیم سے ایک مسجد آباد ہے جس میں گردو نواح کے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جبکہ یہ مسجد سڑک اور دوکانوں کے قریب واقع ہے۔ بعض دوکانداروں نے حکومت کو یہ درخواست دی ہے کہ اس مسجد کو مسمار کیا جائے کیونکہ اس مسجد کی وجہ سے ہمارے کاروبار میں فرق آتا ہے، کیونکہ یہ مسجد ہماری دوکانوں کے سامنے واقع ہے جس سے ہماری دوکانیں مخفی ہو جاتی ہیں۔ اندریں صورت کسی مسجد کو مسمار کرنا بوقتِ ضرورت جائز ہے؟

الجواب: امتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مقام یا جگہ میں جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی، اس کو مسمار کرنا یا کسی اور کام میں لانا شرعاً جائز نہیں، جن لوگوں نے اس کو مسمار کرانے کی درخواست دی ہے انہیں توبہ کرنی چاہیئے کسی مسلمان یا مومن سے ایسی درخواست کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

قال الحصكفیؒ: ولو خرب ما حوله واستغنیٰ عنه يبقى مسجدًا عند الامام (والثانى) ابدًا الیٰ قيام الساعة (وبه يفتى) حاوى القدسى۔

قال ابن عابدينؒ: (عند الامام والثانى) فلا يعود ميراثًا ولا يجوز نقله ونقل ماله الیٰ مسجد آخر سواء كان يصلون فيه او لا وهو الفتوىٰ حاوى القدسى واكثر المشائخ عليه مجتبى وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ باب الوقف، مطلب فيما لو خرب المسجد)[2]

---

[1] قال ابن عابدينؒ (قوله فادخال نجاسة فيه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فيه يخاف منها التلويث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لكن فى الفتاوىٰ الهندية لا يدخل المسجد من علىٰ بدنه نجاسة۔
(ردّ المحتار على الدّر المختار ج۱ ص۶۵۶ مطلب احكام المسجد)
وَمِثْلُهٗ فى الفتاوىٰ الهندية ج۱ ص۱۱۰ فصل غلق المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشيدؒ: اذا خرب المسجد وفى الفتاوىٰ اذا خربت القرية التى فيها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا يصلى فيه احد فلا بأس بان يأخذه صاحبه ويبيعه وهو قول محمدؒ وعن ابى يوسفؒ لا يعود الیٰ ملك البانى ولا الیٰ ملك ورثته وهو مسجد ابدًا۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۴۲۴ كتاب الوقف، الفصل الرابع فى المسجد)

مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرنا

سوال:۔ اگر ایک شخص کسی جذباتی فیصلہ کے تحت مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرے لیکن بعدازاں اس وعدہ پر پابندی نہیں کرتا ہو۔ کیا اس پر زمین دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین دینے کے وعدہ سے وقف تام نہیں ہوتا بلکہ وقف کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے زمین کو اپنی ملک سے خارج کرکے باقاعدہ عوام کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے، لہٰذا صرف وعدہ کی صورت میں وقف تام نہیں ہوا تاہم وعدہ کی خلاف ورزی گناہ ہے۔

وفی الہندیۃ: من بنی المسجدا لم یزل ملکہ عنہ حتّٰی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ اما الافراز فلانہ لایخلص اللہ تعالیٰ الا بہ کذا فی الہدایۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۴۵۴ کتاب الوقف)[1]

مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا

سوال:۔ کیا مسجد میں سونا جائز ہے؟ جبکہ بعض لوگ مسجد میں چارپائی بچھا کر سوتے ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سونا بغیر شرعی عذر کے مکروہ ہے، البتہ عذر شرعی ہو مثلاً معتکف ہو یا مسافر وغیرہ، تو اس کو مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور جس طرح مسجد میں بغیر چارپائی کے سونا جائز ہے اسی طرح چارپائی بچھا کر بھی سونا جائز ہے۔

وفی الہندیۃ: ویکرہ النوم والاکل فیہ لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی یفعل ما شاء کذا فی السراجیۃ ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد

---

[1] قال برھان الدین المرغینانیؒ: واذا بنیٰ مسجدًا لم یزل ملکہ عنہ حتّٰی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عند ابی حنیفہ (رحمہ اللہ) عن ملکہ اما الافراز فلانہ لایخلص اللہ تعالیٰ الا بہ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۲۴ کتاب الوقف، فصل فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف۔

فی الصحیح من المذهب والاحسن ان یتورع فلاینام کذا فی خزانة الفتاوی۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة) [۱]

البتہ اگر کوئی غیر معذور آدمی بھی اعتکاف کی نیت سے مسجد میں سو جائے تو جائز ہے

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین اور عرفی سیرئی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض مساجد کے ساتھ موقوفہ جائداد ہوتی ہے جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ زمین مستقل طور پر مسجد کے لیے وقف ہوتی ہے، ائمہ محض منصبِ امامت وخطابت کی وجہ سے اس سے استفادہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری ایسی جائداد بھی ہوتی ہے جو کسی امام کو شخصی طور پر دی جاتی ہے تاہم اس میں امام کے موجودہ منصبِ امامت کا دخل بھی ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے ترجیح کا کام دیتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں کیا یہ جائدادیں امام قانونی طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے؟ اور امام کی وفات کے بعد اگر اس کی اولاد امامت پر مامور نہ ہو پھر بھی اس کی حقدار ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاں تک اول الذکر قسم کا تعلق ہے تو چونکہ یہ مسجد کے لیے موقوفہ جائداد ہے اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں ارث جاری نہیں ہو سکتا، جو بھی منصبِ امامت پر فائز ہو وہ اس سے استفادہ کا حقدار ہوگا، اور جب اس ذمہ داری سے علیحدہ ہو جائے تو یہ شخص اس جائداد سے استفادہ کا حقدار نہیں رہتا، اس کی خرید وفروخت یا تقسیم کرنے کا اختیار اس کو حاصل نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالٰی وهذا لان الاشیاء کلها لله تعالٰی۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۵ باب الوقف)

وفی الهندیة: واما حکمه فعندهما زوال العین عن ملکه الی الله تعالٰی وعند

---

[۱] عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان اذا اعتکف طرح له فراشه او یوضع له سریرٌ وراء اسطوانة التوبة۔ (ابن ماجة ص۱۲۷ باب فی المعتکف یلزم مکانا من المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۶۱ مکروهات الصلوٰة مطلب احکام المسجد۔

ابی حنیفہؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ علی ملکہ بحیث لا تقبل النقل...... فانہ یصح حتی لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔

(الھندیۃ ج۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف)[1]

البتہ مؤخرالذکر جائداد کے بارے میں تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موھوب لہ کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اس کو ذاتی طور پر دی جاتی ہے، اس میں مسجد پر وقف کرنے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور محض امام وخطیب کے منصب کی تعظیم کی وجہ سے کوئی چیز دینے سے مسجد پر وقف نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا اس صورت میں امام مسجد کو جملہ مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے، عین حیات میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس منصب سے معزول ہونے کے بعد بھی یہ جائداد اس کی رہے گی اور مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

غیرمسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا

سوال:۔ ایک جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کیلئے روپوں اور مال کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے غیرمسلموں سے جبراً مال اور روپے وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں خرچ کیے۔ کیا غیرمسلم کا مال جبراً وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیرمسلموں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک غیرمسلم وہ ہے جو مستامن یا ذمی ہے، معاملات کے احکام میں مسلمان و ذمی ومستامن آپس میں برابر ہیں، ان کے اموال کو جبراً وصول کرکے مسجد میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ احکام کے لحاظ سے مسلمانوں مثل ہیں۔

البتہ جو حربی ہوں اور دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوئے ہوں اُن کا مال مالِ فئے

---

[1] قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولا یملک الوقف) باجماع الفقھاء کما نقلہ فی فتح القدیر ولقولہ علیہ السلام لعمر رضی اللہ عنہ تصدق باصلھا لا تباع ولا تورث ولانہ باللزوم خرج عن ملک الواقف وبلا ملک لا یتمکن من البیع۔

(البحرالرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ الا ان یکون مشاعاً عند ابی یوسفؒ فیطلب الشریک القسمۃ فیصح مقاسمۃ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۲۰ کتاب الوقف)

اور غنیمت ہے، ان کا مال مسجد کیلئے جبراً وصول کیا جا سکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لا یمکن حربی مستامن فینا سنة وقیل له ان قمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی ولا جزیة علیه فی حول المکث الا بشرط اخذها منه فیه ویجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطاء ویجب کف الاذی عنه۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله لا یمکن حربی مستامن) قید بالمستامن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیئا ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۶۸ فصل فی استئمان الکافر۔ کتاب الجهاد)

تاہم حرام مال کو مسجد پر خرچ کرنا جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هذا القول (قوله ولو بماله الحلال) قال تاج الشریعة اما لو انفق فی ذلك مالا خبیثا ولا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالیٰ لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد۱ ص۴۵۸ باب الامامة۔ مطلب کلمة لا بأس دلیل علی انه المستحب) [۱]

اور حرام مال سے بنائی ہوئی مساجد شرعی مساجد کے حکم میں سے نہیں ہیں لہٰذا ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے اجتناب کیا جائے البتہ پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں۔

بوقتِ ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے

سوال: مسجد کی کچھ دوکانیں ایسی جگہ واقع ہیں جو مسجد سے دور ہیں۔ کیا مسجد کے قرب و جوار میں واقع بعض دوکانوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے؟ جبکہ قریب کی دوکانوں میں یہ احتمال بھی ہے کہ کبھی مسجد کی توسیع میں کام آسکیں گی؟

الجواب: مسجد کے لیے ایسے فائدہ کی توقع میں وقف کا استبدال اور مبادلہ جائز ہے

---

[۱] عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل الله الا الطیب فان الله یتقبلها بیمینه ثم یربیها لصاحبها کما یربی احدکم فلوه حتی تکون مثل الجبل۔ متفق علیه۔ (مشکوٰة ج۱ ص۱۶۷ باب فضل الصدقة)

ومثله فی البخاری ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔

لہٰذا ان دوکانوں کے تبادلہ میں کوئی حرج نہیں ۔

وفی الھندیۃ : مبادلۃ دار الوقف بدار اخریٰ انما تجوز اذا کانت فی محلۃ واحدۃ تکون المحلۃ المملوکۃ خیراً من محلۃ الموقوفۃ وعلی عکسہ لا یجوز ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۴۰۲ کتاب الوقف ۔ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) [۱]

جدید قبرستان میں مسجد بنانا

سوال :۔ ایک قبرستان جس میں اب بھی مُردے دفنائے جاتے ہوں، کیا کسی محلہ میں مسجد کی ضرورت پڑنے پر قبرستان کو ہموار کرکے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ جس قبرستان میں مُردے فی الحال دفنائے جاتے ہوں اس کو مسجد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، تاہم جو قبرستان پرانا ہو چکا ہو اور اس میں مُردوں کی لاشیں گل سڑ کر ان کے نشانات ختم ہو چکے ہوں تو اس کو ہموار کرکے اس پر مسجد بنانا جائز ہے، البتہ مملوکہ ہونے کی صورت میں مالک سے اجازت لینا ضروری ہے ۔

قال ابن عابدینؒ ۔ وقال الزیلعی ولو بلی المیّت وصار تُرَابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص ۲۳۳ مطلب فی دفن المیت، کتاب الجنائز) [۲]

مندر سے مسجد بنانا

سوال :۔ تقسیم ہند کے وقت جو ہندو اور سکھ پاکستان سے چلے گئے تھے، اُن کے مندروں اور گوردواروں کو مسلمان مساجد میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں ؟ اگر کر سکتے ہیں تو کیا ان میں تغیر ضروری ہے ؟

الجواب :۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معابد (مندر اور گوردوارے) مساجد میں تبدیل کرنا

---

[۱] قال ابن نجیمؒ ۔ وفی القنیۃ مبادلۃ دار الوقف بدار اُخریٰ انما یجوز اذا کانتا فی محلۃ واحدۃ او تکون المحلۃ المملوکۃ خیراً من المحلۃ الموقوفۃ وعلی عکسہ لا یجوز ۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۳ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار علی الدُّر المختار ج ۴ ص ۳۸۶ کتاب الوقف، مطلب فی شرط الاستبدال ۔

[۲] وفی الھندیۃ : ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔
(فتاویٰ ھندیۃ ج ۱ ص ۱۶۷ ۔ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی آخر ۔
وَ مِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز ۔

شرعاً جائز ہیں بشرطیکہ ان کی عبادت کے نشانات مٹا دیئے جائیں اور اس میں تغیر کر دیا جائے، مثلاً ان کو قبلہ رو کرنا، اس میں محراب بنانا یا ان کو مستقل طور سے گرا کر از سرِ نو ان پر مسجد بنانا۔

عن طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلّینا معه واخبرناہ ان بارضنا بیعةً لنا فاستوهبناه من فضل طهوره فدعا بماءٍ فتوضاء وتمضمض ثم صبّه لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانها بهذا الماء واتخذوها مسجداً قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدّوه من الماء فانه لا یزیده الاطیبا۔ رواه النسائی۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۶۹ باب المساجد)

و فی حاشیته فاکسروا الخ غیروا محرابها وحولوه الی الکعبة وقیل خربوه۔[۱]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:۔ بعض لوگوں نے مسجد کیلئے چندہ جمع کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن ایک شخص اس تعمیر سے روک رہا ہے اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال کر رہا ہے، ایسے ہی ایک اور شخص مسجد کے راستہ کو بند کر رہا ہے جس سے مسجد ویران ہو رہی ہے اور اس سے مسجد میں آنے جانے والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد کی تعمیر سے منع کرنا اور ایسے ہی مسجد کا راستہ بند کرنا از روئے شرع جائز نہیں، یہ ایک فاسقانہ کام ہے اور یہ شخص قابلِ تعزیر ہے۔ البتہ اگر یہ راستہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اس کی اپنی ملکیت ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کا استعمال مالک کی اجازت پر

---

[۱] عن ابیه طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی النبیؐ فبایعناه وصلّینا معه واخبرناه ان بارضنا بیعةً لنا فاستوهبناه من فضل طهوره فدعا بماءٍ فتوضأ وتمضمض ثم صبّه فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانها بهذا الماء واتخذوها مسجداً قلنا ان البلد بعیدٌ والحر شدیدٌ والماء ینشف فقال مُدّوه من الماء فانه لا یزیده الاطیبًا فخرجنا حتی قدمنا بلدنا فکسرنا بیعتها ثم نضحنا مکانها فاتخذناها مسجداً فنادینا فیه بالاذان۔۔۔۔۔ الخ
(سنن النسائی ج ۱ ص ۱۱۲ باب اتخاذ البیع مساجد)

پر موقوف ہے۔
قال اللہ تبارک وتعالیٰ:۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا۔ (الآیۃ)
قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ)
(مشکوٰۃ ج ۱ ص۶۹ باب المساجد، الفصل الثانی)

مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا

سوال:۔ مسجد کی اشیاء کو عاریۃً کوئی شخص اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی اشیاء وقف علی المسجد ہیں ان کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو گنجائش ہے۔
قال الحصکفیؒ: فاذا تم ولزم الوقف ولا یملک ولا یعار ولا یرھن۔
قال ابن عابدینؒ: ولا یعار ولا یرھن لاقتضائھما الملک۔[1]
(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۴ ص۳۵۱ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب الخ)

مسجد کی زمین کا تبادلہ

سوال:۔ ہمارے والد صاحب نے ایک قطعۂ اراضی مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور باقاعدہ اس کی حدبندی کی گئی تھی اور اس میں شکرانے کے نفل بھی پڑھے گئے تھے، اب ہمارے والد صاحب فوت ہوچکے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین مسجد کے لیے متعین کردیں اور اس قطعۂ اراضی کو اپنے مصرف میں استعمال کریں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ زمین وقف کرکے اپنے سے جدا کردے تو اب اس زمین کے ساتھ اس کا مالکانہ تعلق ختم ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ واقف کے

---

[1] قال فی الھندیۃ: ولا یحمل القیم سراج المسجد الی بیتہ ویحمل من بیتہ الی المسجد ولا بأس ان یترک سراج المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذٰلک الا اذا شرط الواقف ذٰلک اوکان ذٰلک معتاداً ذٰلک الموضع۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۱۰، ھل فی کرہ غلق باب المسجد)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد۔

مرنے کے بعد اس موقوفہ زمین میں ورثاء کا حق وراثت ثابت نہیں اور اس کی بیع بھی جائز نہیں، جہاں تک استبدال کا تعلق ہے تو اس کی بھی چند صورتیں ہیں :۔

(۱) واقف اپنے لیے یا کسی وارث کے لیے استبدال کی شرط رکھے۔

(۲) اور اگر شرط نہ رکھی ہو لیکن اس جگہ سے انتفاع کلیتہً ختم ہو چکا ہو تو اس صورت میں باذن القاضی یا حاکم کے استبدال اصح قول کے مطابق درست ہے۔

چونکہ صورتِ مسئولہ میں دونوں وجوہ مفقود ہیں اس لیے مذکورہ زمین مسجد کی رہے گی اس کو دوسری کسی زمین میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن الہمامؒ : وقولہ ولو شرط ان یستبدل بہا ارضا اخریٰ تکون وقفاً مکانہٗ فہو جائز عند ابی یوسفؒ وہلال والخصاف وہو استحسان وکذا لو قال علیٰ ان ابیعہا واشتریٰ بثمنہا اخریٰ مکانا ولکن لیس للقیم الاستبدال الا ان ینص لہٗ بذلک.....ولو قید شرط الاستبدال للقیم بحیاۃ الواقف لیس لہ ان یستبدل بعد موتہ۔ وفی فتاویٰ قاضیخان قول ہلال وابی یوسفؒ ہو الصحیح.....وکذا ارض الوقف اذا قل نزلہا بحیث لا تحتمل الزراعۃ ولا تفضل غلتہا عن مونتہا ویکون صلاح الارض فی الاستبدال بارض اخریٰ وفی نحو ہذا عن الانصاری صحۃ الشرط لکن لا یبیعہا الا باذن الحاکم وینبغی للحاکم اذا دفع الیہ ولا منفعۃ فی الوقف ان یاذن فی بیعہا اذا راٰہ انظر لاہل الوقف۔

(فتح القدیر ج ۵ ص ۴۳۹ کتاب الوقف) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اعلم ان الاستبدال علیٰ ثلاثۃ وجوہ، الاول: ان یشرطہ الواقف لنفسہ او لغیرہ او لنفسہ وغیرہ فالاستبدال فیہ جائز علی الصحیح وقیل اتفاقاً، والثانی: ان لا یشرطہ سواء شرط عدمہ او سکت لکن صار بحیث لا ینتفع بہ بالکلیۃ بان لا یحصل منہ شیئ اصلاً او لا یفی بمؤنتہ فہو ایضاً جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی وراٰیہ المصلحۃ فیہ۔ والثالث: ان لا یشرطہ ایضاً ولکن فیہ نفع فی الجملۃ وبدلہ خیر منہ ریعا ونفعا وہذا لا یجوز استبدالہ علی الاصح المختار۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۴ کتاب الوقف۔ مطلب فی استبدال الوقف وشروطہ)

ومثلہٗ فی امداد المفتین المشہیر بفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۴۹۹۔

مساجد میں سکول کھولنا

سوال:۔ آجکل حکومت کی طرف سے مسجد مکتب سکول کے نام سے مساجد میں پرائمری سکول کھولے جارہے ہیں، اساتذۂ کرام مساجد میں کرسیاں لگاکر عام پرائمری سکولوں کی طرح بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے مسجد کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے اور مسجد کی حالت ایک عام حجرہ اور بیٹھک جیسی ہوجاتی ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ حالات کی روشنی میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے مسجد کا تقدس اور عظمت باقی نہیں رہتا جس سے اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ یہ کہیں خیرخواہی کے لبادہ میں شعائر اللہ کی توہین کا منظم پروگرام تو نہیں؟ اس لیے تعلیم کا یہ سلسلہ کسی دوسری جگہ پر جاری رکھنا چاہیئے، مساجد کو نماز، ذکر اللہ اور قرآن وحدیث کی تعلیم تک محدود رکھیں۔

لما قال الشیخ احمد الحمویؒ: فی شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی ولا یجوز تعلیم الصبیان القرآن فی المسجد للمروی جنبوا صبیانکم المساجد انتھیٰ۔ وھو صریح فی عدم الجواز سواء کان بأجرة ام لا۔ (الاشباہ والنظائر ج ۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد)[1]

مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت

سوال:۔ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے ایک قادیانی نے دو ہزار اینٹیں دیں، کیا از روئے شریعت یہ اینٹیں مسجد میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان اور اہلِ قبلہ کہتے ہیں، لیکن عقیدۂ ختمِ نبوت کے انکار اور دیگر بہت سی ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے مرتد کے زمرہ میں داخل ہیں، اس صورت میں ان کا ہبہ موقوف رہے گا اور اگر یہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہبہ نافذ ہوگا، اور اگر یہ اپنے ارتداد پر بدستور قائم رہیں تو بوجہ مرتد ہونے کے ان کا ہبہ باطل ہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لما اخرجه المنذری: مرفوعاً جنّبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشراءکم ورفع اصواتکم الیٰ اٰخرہ۔
(ردّ المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیة۔ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

قال ابن نجیمؒ: توقف مبایعته وعتقه وهبته فان امن نفذ و ان هلك بطل - (البحر الرائق ج ۵ ص۱۳۳ باب المرتد) [1]

قادیانیوں کے اموال قبول کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ ان کے کفر کے بارے میں پوری اُمتِ مسلمہ کا جو عقیدہ ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لیے ان کا ہبہ کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کی فروخت

سوال:۔ کیا مسجد کی منتظمہ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کر دے یا اجارہ پر دے یا اُسے کسی اور مصرف کے لیے استعمال میں لائے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ زمین کے تبادلہ کا جواز کتبِ فقہ سے ثابت ہے، یہ تبادلہ بھی اُس صورت میں جائز ہے کہ جس میں مسجد کا فائدہ ہو، اسی طرح مسجد کے نفع کی خاطر اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندية: مبادلة دار الوقف بدار اخرى انما تجوز اذا كانتا فی محلة واحدة تكون المحلة المملوكة خيرًا من محلة الموقوفة وعلى عكسه لا يجوز۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۴۰۱ كتاب الوقف، الباب الرابع فيما يتعلق بالشرط فی الوقف) [2]

---

[1] قال الحصكفیؒ: يتوقف منه عند الامام وينفذ عندهما كل ما كان مبادلة مال بمال او عقد تبرع (كالمبايعة) والصرف والسلم والعتق والتدبير والكتابة والهبة۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۳ ص۲۵۰ باب المرتد، قبيل من مطلب المعصية تبقى بعد الردة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النيرة ج ۲ ص۳۷۹ كتاب السير۔

[2] قال ابن عابدين: قال وفی القنية مبادلة دار الوقف بدار اخرى انما يجوز اذا كانتا فی محلة واحدة او محلة الاخرى خيرًا وبالعكس لا يجوز وان كانت المملوكة اكثر مساحة وقيمة واجرة لاحتمال خرابها فی ادون المحلتين لدناءتها وقلة الرغبة فيها۔ (رد المحتار على الدر المختار ج ۴ ص۳۸۶ كتاب الوقف مطلب فی شروط الاستبدال)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۳ كتاب الوقف۔

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس | **جس مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں**

مسئلہ کے بارے میں کہ انگلینڈ میں مکانات کی دو قسمیں ہیں، ایک فری ہولڈ اور دوسرا لیس فری ہولڈ۔ قسم اول میں زمین اور عمارت مالک مکان کی ملکیت ہوتی ہے، اور قسم ثانی میں صرف مکان پر مالک کی ملکیت کا حق ہوتا ہے جبکہ زمین اجارہ کی ہوتی ہے، لیکن یہ فرق بھی صرف امتیازی ہوتا ہے۔ دونوں قسموں کی صورت میں حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں قسموں کے لیے حکومت کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔ اگر مقررہ مدت سے قبل حکومت کو اس زمین کی ضرورت پڑ جائے تو حکومت اس مقررہ مدت کو منسوخ کر کے اس زمین کو اپنے مصرف میں لا سکتی ہے، اس میں کسی شخص کو بھی حکومت کے فیصلے کو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیا ایسی زمین جس پر مالک کو مکمل اختیار حاصل نہیں اگر اس پر مسجد تعمیر کر لی جائے اور باقاعدہ اس میں اذان اور جماعت بھی ہوتی ہو، لیکن جب اس زمین کو جس پر مسجد واقع ہے ضرورت پڑنے کی وجہ سے حکومت اسے اپنے مصرف میں لانے کا ارادہ کرے اور اس کے مالک کو اپنی جانب سے اس عمارت کا عوض دے دے، تو کیا ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنا مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی؟ اور آیا اس کی خرید و فروخت اور اس میں تغیر و تبدل جائز ہے؟ اور اس شہید کر کے کسی اور مصرف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ اہل علم کی تحقیق کے مطابق مسجد شرعی کے لیے زمین اور مکان دونوں کا وقف مؤبد ہونا شرط ہے، جبکہ یہ شرط یہاں متحقق نہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک مسجد کے معاملہ میں اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جس سے وقف مؤبد میں فرق آ رہا ہو تو وہ شرط باطل ہے اور وقف مطلق اور مؤبد ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ : تحت ھذا القول (قولہ ولا ذکر معہ اشتراط بیعہ الخ) فی الخصاف لو قال علی ان لی اخراجها من الوقف الی غیرہ او علی ان اھبها واتصدق بثمنها او علی ان اھبها لمن شئت او علی ان ارھنها متی بدا لی واخرجها عن الوقف بطل الوقف ثم ذکر ان ھذا فی غیر المسجد اما المسجد لو اشترط ابطالہ او بیعہ صح وبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الوقف قبل مطلب فی وقف المرتد والکافر)

جس ملک میں خود مالک کو کسی زمین یا مکان پر ملکِ مؤبد حاصل نہیں اور اُس کو اس زمین میں تصرف من کل الوجوہ حاصل نہیں تو وہ کس طرح وقف مؤبد کر سکتا ہے اور کس طرح اس مسجد کو مسجدِ شرعی کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعی مسجد نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لابد ان یکون مالکہ وقت الوقف ملکاً باتاً ولو بسبب فاسدٍ وان لایکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف المغصوب لم یصح وان ملکہ بعد بشراءٍ او صلح ولو اجاز المالك وقف فضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [۱]

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی

سوال: ایک شخص نے کسی محلہ میں مسجد بنوائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی عام اجازت دیدی، کچھ مدت کے بعد اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری ملکیت ہے لہٰذا اس میں تمام تصرف میرا ہی چلے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد کسی شخص کی ملکیت میں آسکتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ اس نے خود ہی یہ مسجد تعمیر کرائی ہو؟

الجواب: جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے اور اس میں لوگوں کو نماز کے لیے باقاعدہ اذنِ عام ہو تو پھر یہ کسی کی ملکیت نہیں رہتی، البتہ بانی کو تولیت کا حق حاصل ہے۔

قال الحصکفیؒ: اراد اهل المحلة نقض المسجد وبنائه احکم من الاول ان البانی من اهل المحلة لهم ذلك الا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ص۳۵۷ ج۳، کتاب الوقف، احکام المساجد) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لاتکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف۔

[۲] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: رجل بنی مسجداً فی سکة فنازعه بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولیٰ وفی العمارة اولیٰ باتفاق۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۱ الفصل الرابع فی المسجد واوقافه الخ)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف۔

مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں مسجد کے محراب کے ساتھ کچھ دوکانیں تھیں، جب مسجد کو شہید کرکے از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو یہ دوکانیں بھی منہدم ہوگئیں، حکومت نے دوکانداروں کی درخواست پر اس کے متبادل جگہ ان کو دے دی، اب اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ جتنے دن ہمارے کاروبار میں فرق آیا ہے اس کا معاوضہ دیا جائے، ہر دوکاندار تقریباً پانچ ہزار روپے کا طالب ہے اس طرح کل رقم تقریباً بیس ہزار روپے بنتی ہے، جبکہ مسجد کے پاس فنڈ بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ کیا دوکانداروں کے مطالبہ پر اُن کو یہ معاوضہ مسجد کے فنڈ سے دینا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں دوکانداروں کا یہ مطالبہ کہ تعمیرِ مسجد کی وجہ سے جتنے دن ہمارا کاروبار متاثر ہوا ہے اس کا معاوضہ ہمیں دیا جائے، غیر شرعی ہے۔ کیونکہ مالک مکان پر کاروبار کے متاثر ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تاہم ان ایام کا کرایہ دوکانداروں سے وصول نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ایسا غیر شرعی خرچہ مسجد کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اگر شر وفساد کا خطرہ ہو تو دفعِ شر کیلئے کچھ رقم دینا مرخص ہے لیکن دوکانداروں کے لیے اس کی وصولی ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: الثالث اخذ المال یسوی امرہ عند السلطان دفعاً للضرر اوجلباً للنفع وھو حرام علی الاخذ۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ج۴ ص۳۰۳، کتاب ادب القاضی، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ)[۱]

مسجد کی خرید وفروخت کا عدمِ جواز

سوال:۔ قیامِ پاکستان کے وقت جب ہندو اور سکھ پاکستان سے کوچ کرکے ہندوستان چلے گئے تو اپنے بہت سے مکانات، زمینیں اور جائداد چھوڑ گئے، مہاجرین کی ایک جماعت نے ایک جگہ کا انتخاب کرکے باقاعدہ ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیکر اور نقشہ منظور کراکر مسجد تعمیر کی، بعد ازاں جب حکومت متروکہ زمین کی قیمت وصول کرنے لگی تو حکومت نے اس جگہ کی قیمت وصول

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: ومنھا اذا دفع الرشوۃ یسوّی امرہ عند السلطان حل لہ الدفع ولا یحل للاخذ ان یأخُذَ۔ (البحرالرائق ج۶ ص۲۶۲ کتاب ادب القاضی)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر علی الھدایۃ ج۶ ص۳۵۹ کتاب ادب القاضی۔

کرنے سے پہلے ہی مسجد اپنی تحویل میں لے لی اور تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی تحویل میں رکھا اور مسجد کے لیے موقوفہ دو کانوں کی آمدنی بھی حکومت وصول کرتی رہی، اب جبکہ حکومت نے اس سے اپنا قبضہ اٹھا لیا ہے تو حکومت اس مسجد کی جگہ کی قیمت کا مطالبہ کرتی ہے، حالانکہ ہم نے یہ مسجد حکومت کی اجازت سے ہی بنائی تھی۔ اندریں صورت کیا اب مسجد کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: مستفتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت سے تعمیر کی گئی۔ لہٰذا اگر کسی سرکاری جگہ پر قیمت کی ادائیگی کے بغیر حکومت کی اجازت سے مسجد تعمیر کی جائے تو اس سے وہ جگہ مسجد شرعی بن جاتی ہے، کیونکہ مساجد کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال او من مالہم ان لم یکن لہم بیت المال۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۳۹، کتاب الوقف، مطلب لو وقف علی الاغنیاء وحدہم لم یجز)

اور حکومت کا نقشہ کی منظوری دینا باقاعدہ اجازت کے مترادف ہے، اب باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد اس کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلہا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۴۴ باب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد) [1]

---

[1] وفی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ عن ملکہ بحیث لا تقبل النقل عن ملک الی ملک والتصدق بالغلۃ المعدومۃ متی صح الوقف بان قال جعلت ارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ مؤبدۃ او اوصیت بہا بعد موتی فانہ یصح حتی لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۹۱ کتاب الوقف۔

عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم

سوال:- ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے وہ یہ کہ گاؤں کی وقف عیدگاہ ہے، محلے کے بچے جوتوں سمیت اس میں کھیلتے رہتے ہیں اس عیدگاہ کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ گاؤں کی طرف اور دوسرا سڑک کی طرف کھلتا ہے گاؤں کی طرف کھلنے والے دروازے کو لوگ عیدگاہ سے گذرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں بعض اوقات حیض اور نفاس والی خواتین بھی گذرتی ہیں۔ اب ایک صاحب نے عیدگاہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس کے ایک دروازے کو بند کر دیا ہے مگر گاؤں کے لوگ خصوصاً عیدگاہ کے قرب و جوار میں رہنے والے اُس صاحب کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر سخت ناراض بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عیدگاہ کو گذرگاہ بنانا، اس میں چلنا پھرنا اور کھیلنا کودنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب:- عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد شرعی کے حکم میں ہونا اگرچہ مختلف فیہ ہے مگر راجح مذہب یہ ہے کہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے۔

کما قال العلامۃ قاضی خانؒ: مسجد اتخذ لصلاۃ الجنازۃ او لصلوۃ العید هل یکون له حکم المسجد اختلف المشائخ فیه قال بعضهم یکون مسجد حتی لو مات الواقف لا یورث۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۲۹۰ کتاب الوقف)

وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: المتخذ لصلوۃ الجنازۃ العید فهو مسجد فی جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لا فی حق غیرہ به یفتی نهایۃ۔اھ وعبارۃ النهایۃ والمختار للفتوی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء..... فان الباقی لم یعده لذلک فینبغی ان لا یجوز..... وما صححه تاج الشریعۃ ان مصلی العید له حکم المساجد وتمامه فی الشرنبلالیۃ۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۴۲ کتاب الوقف)

وفی احسن الفتاوی: جمیع احکام میں عیدگاہ کا بحکم مسجد ہونا مختلف فیہ ہے، شامیہ سے جمیع احکام میں بحکم مسجد ہونے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاوی ج۶ ص۴۲۸ کتاب الوقف)

اس لیے عیدگاہ میں ہر وہ عمل جو اس کی بے حرمتی اور بے احترامی کی طرف مفضی ہو ناجائز و حرام ہے، مثلاً عیدگاہ میں راستہ بنانا اور اس میں ہر قسم کے لوگوں (حائضہ، نفساء، جنب وغیرہم) کا گذرنا، اس کو کھیل کود کا میدان بنانا، اس کی بے حرمتی کرنا وغیرہ۔

کما قال العلامۃ ابن نجیمؒ : وقال بعضھم لہ حکم المسجد حال اداء الصلوٰۃ لاغیر وھو والجنانۃ سواءٌ ویجتنب ھٰذا المکان عما یجتنب المسجد احتیاطاً۔

(البحرالرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وفی کفایت المفتی : عیدگاہ کے احاطے کے اندر کارخانہ کھولنا جس میں ہر قسم کے آدمی کام کرتے ہوں جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۷ ص ۱۱۴)

وفی امداد المفتیین : نیز احتیاطاً تعظیم و حرمت میں بھی فقہاء نے اس کو مثل مسجد قرار دیا ہے اور زراعت اس کے خلاف ہے۔ (فتاوٰی دارالعلوم دیوبند جلد ۲ ص ۸۱۵)

وفی احسن الفتاوٰی : عیدگاہ کا احترام بہر کیف واجب ہے اگرچہ اس کے مسجد ہونے میں اختلاف ہے مگر بحرمتی سے حفاظت بہر حال ضروری ہے لہٰذا امور مسئولہ (کھیل کود، دعوت وغیرہ کا انتظام کرنا) کی اجازت نہیں۔ (احسن الفتاوٰی جلد ۶ ص ۴۲۸ کتاب الوقف)

اور عیدگاہ میں یہ امور اس لیے بھی جائز نہیں کہ واقف نے اس زمین کو ان امورِ مذکورہ کیلئے وقف نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وقف صرف اور صرف عیدگاہ تک محدود ہے اور واقف کی نیّت کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ شامی میں ہے : نیۃ الواقف کنص الشارع۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)

اور پھر جب عیدگاہ کے ساتھ دوسرا متبادل راستہ موجود ہو تو پھر بھی اس میں راستہ بنانا مسجد میں راستہ بنانے کے مترادف ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : لاتجعلوا المساجد ممراً (الحدیث) کہ مسجد کو راستہ مت بناؤ۔

اس لیے شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عیدگاہ کی حفاظت کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کو راستہ نہ بنایا جاسکے، اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ تعاون کریں جو اس کی حفاظت کرتا ہو، عیدگاہ کو کھیل کود کا میدان یا راستہ بنانے سے منع کرنے والے پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا شرعاً حق حاصل نہیں، اس جگہ کو صرف عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کو بطور راستہ، کھیل کے میدان اور دیگر خلافِ شرع امور میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم و علمہ اتم

جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد و مدارس وغیرہ کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل سوالوں کے اندر کہ:

(۱) جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، حقیقت میں یہ ملک غیر آباد تھا، سب سے پہلے ہالینڈ کی ڈچ قوم جا واسے تین سو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اور یہی ڈچ قوم قریباً ڈیڑھ سو ملائی مسلمان، جو کہ سیاسی قیدی تھے، اپنے ساتھ لائی تھی، پھر انگریز آئے اور انہوں نے ہندوستان سے ہندوستانیوں کو کام کاج کے واسطے بلایا، جب ان ہندوستانیوں کا وقت پورا ہو گیا تو بعض واپس ہندوستان چلے گئے اور اکثر یہاں پر ہی مقیم ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجارت، کچھ مزدوری اور کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے۔ اس ملک میں سفید فام قوم ۳۵ لاکھ، جبشی نژاد ۱۵ لاکھ، ایشیائی قوم ۵ لاکھ، خالص حبشی ایک کروڑ بیس لاکھ اور مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہوں گے۔ اور حکومت اس ملک پر سفید فام عیسائی قوم کی ہے، مسلمان نماز اذان، قربانی اور حج وغیرہ ادا کرنے میں آزاد ہیں، مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے آباد ہیں، اب حکومت نے نسلی امتیاز کا قانون بنایا ہے جس کی بنیاد رنگ پر ہے، مذہب پر نہیں۔ اس قانون کی وجہ سے ہر قوم کو الگ الگ جگہوں پر آباد کیا جاتا ہے، اب جو علاقے سفید فاموں کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں وہاں سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے اور ان کے مکانوں اور زمینوں کی معمولی قیمت دے کر زبردستی ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے ـــ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملک دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر دارالحرب ہے تو پھر مسلمانوں کو یہاں پر رہنا جائز ہے یا ہجرت کر کے چلے جانا چاہیئے؟

(۲) جو علاقے سفید فام قوم کے لیے مقرر ہو چکے ہیں ان علاقوں کے اندر جو مسجدیں آگئی ہیں ان کو فروخت کر کے قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا ان کو ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیئے، جبکہ آج ان کی قیمت کئی لاکھ پونڈ سے بھی زیادہ ہے، اور جب ان علاقوں میں مسلمان ہی نہ رہیں گے تو یہ مسجدیں بھی غیر آباد اور شہید ہو جائیں گی۔ اب آپ سے التجا ہے کہ یہ ملک کیسا ہے، اور جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے اندر آگئی ہیں اُن کے

واسطے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب: محترم! آپ کے سوالات کے جوابات شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:-

(۱) عباراتِ فقہیہ پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ملک یعنی جنوبی افریقہ آپ کے واسطے نہ دارالحرب ہے کہ جس سے ہجرت لازم ہو جائے اور نہ مکمل دارالاسلام ہے، بلکہ دارالامن اور دارِ عہد اگر اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ اس بارے میں فقہائے کرام کی چند عبارات ملاحظہ ہوں:-

(ل) فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحدٍ وھو اظھار حکم الاسلام فیھا قال محمدؒ فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقٰی فیھا مؤمن ولا ذمی آمنًا بامان الاول الذی کان ثابتًا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ والذمی لعقد الذمۃ۔ وقال ابویوسفؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس۔ (ج۲ ص۲۳۲)

(ب) خزانۃ المفتین میں ہے: دارالاسلام لا تصیر دارالحرب الا باجراء احکام الشرک فیھا وان یکون متصلًا بدار الحرب لا یکون بینھا وبین دارالحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقٰی فیھا مسلم وذمی بالامان الاول فما لم توجد ھذہ الشرائط لا تصیر دارالحرب وقالا اذا اجروا فیھا احکام الشرک فانھا تصیر دارالحرب سواء کانت متصلۃ بدارالحرب اولم تکن بقی فیھا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول اولم یبق۔

(ج) اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے: قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لاشک انھا بلاد الاسلام بعد اتصالھا ببلاد دارالحرب ولم ... فیھا احکام الکفر بل القضاۃ مسلمون اما البلاد والتی

علیها قال مسلم جهتهم فیجوز فیها اقامة الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاة وتزویج الایامیٰ والادار مل لا یتلاء المسلم علیه اما البلاد والتی علیها ولاة کفار فیجوز فیها ایضًا اقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاضٍ بتراضی المسلمین الخ۔ وذکر الحلوائی انه انما لقیل دار الحرب باجراء احکام الکفر وان لا یحکم فیها بحکم من احکام الاسلام وان یتصل بدار الحرب وان لا یبقی فیها مسلم ولا ذمّی آمنًا بالاوّل فاذا وجدت الشرائط کلّها صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقی ما کان اویترجح جانب الاسلام احتیاطًا۔ انتهی ملخصًا۔

(د) اور *شرح زیادات للعتابی میں ہے*: دار الاسلام انما لقیل دار الحرب بثلاث شرائط احدها اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتهار، والثانی ان تکون متا بدار الحرب ای متصلة لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد المسلمین والثالث ان لا یبقی فیها مسلم او ذمّی آمنًا بالامان الاوّل فشرط هٰذه الشرائط لا یکون علمًا علی تمام القهر والاستیلاء اذا دار الاسلام یحتاط لاثباطلها وعندهما یصیر دار الاسلام دار الحرب باجراء احکام الکفر فیها۔ انتهٰی

(ھ) اور *طحطاوی حاشیہ درمختار میں ہے*: قوله باجراء احکام الشرک ای علی الاشتهار وان لا یحکم فیها بحکم اهل الاسلام هندیة۔ وظاهره انه لو اجریت احکام المسلمین واحکام اهل الشرک لا تکون دار الحرب۔ انتهٰی

ان مجموعہ عبارات اور ان کے امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار الاسلام کے دار الحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکامِ کفر علیٰ سبیل الاشتہار جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں اور شعائرِ اسلام وضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں، اور یہ شرط اتفاقی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کیں، ایک یہ کہ اس بلاد میں اور دار الحرب میں کوئی بندہ مملکتِ اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امانِ اول مرتفع ہو جاوے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آتی ہو، اور دار الحرب سے دار الاسلام ہونے میں ایک شرط ہے، اور وہ ہے اظہارِ حکمِ اسلام۔

اس ساری تفصیل کی روشنی میں جب جنوبی افریقہ کے ملک پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ شرائط مذکورہ کی رو سے دار الحرب نہیں ہے، اور یہ اس وجہ سے کہ وہاں شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت و ممانعت نہیں ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سفید فام عیسائی قوم کی ہے اور مسلمان جو کہ تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ اذان، نماز، قربانی اور حج وغیرہ شعائر اسلام میں آزاد ہیں، اس لیے اس ملک کو نہ تو دار الحرب کہہ سکتے ہیں اور نہ دار الاسلام کہہ سکتے ہیں کیونکہ سلطنت اور حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے، اور نہ پہلے کبھی اس ملک پر اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس ملک پر اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ ملک غیر آباد تھا، اور سب سے پہلے ایک ڈچ کافر قوم کی حکومت قائم ہوئی، پھر انگریزوں کی حکومت آئی اور اب سفید فام عیسائیوں کی حکومت ہے۔ غرضیکہ احکام مسلمین اور احکام شرک دونوں اس میں جاری ہیں، لہٰذا جانب اسلام کو ترجیح دے کر دار السلام بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک درمیانی صورت ہے کہ اس کو دار الامن اور دار عہد کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو آپ کا سفید فام حکومت سے باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا اور اگر باقاعدہ معاہدہ نہ ہوا ہو تو آپ کے ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے عملاً معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور آپ اپنے تصفیہ طلب معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں، اور دیگر معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ توڑا بھی نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی قومی تحریک شروع نہیں کی جس کی وجہ سے توڑ پھوڑ، مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی چیزوں تک نوبت پہنچ گئی ہو، اس لیے عہد بھی قائم ہے اور امن بھی، پس آپ کا ملک (جنوبی افریقہ) دار الامن اور دار عہد ہے۔ هذا ما ظهر لي وان لم يشرح به القلب ولم تطمئن به النفس فان للمقال فيه مجالاً، والله اعلم

(۲) جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے کے اندر آ گئی ہیں مجبوراً آپ ان کا عوض لے سکتے ہیں، ان کو فروخت کر کے قیمت لینا اور اس سے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کرنا درست

ہے۔ چند عبارتیں کتبِ فقہ کی اس مدعیٰ کے اثبات کے لیے درج کی جاتی ہیں:

وفی الخانیۃ: رباط بعید استغنیٰ عنہ المارۃ وبجنسہٖ رباط اٰخر قال السید الامام ابو شجاع: تصرف غلتہ الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنیٰ عنہ اھل القریۃ نرفع ذٰلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز۔

وفی فتاوی النسفی: سئل شیخ الاسلام عن اھل القریۃ رحلوا وتداعیٰ مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ لیستولون علیٰ خشبہٖ وینقلونہٗ الیٰ دورھم ھل الواحد من اھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک الثمن لیصرفہ الیٰ بعض المساجد او الیٰ ھٰذا المسجد قال نعم۔ اھ (شامی ج ۳ ص ۵۱۲)

اس فتویٰ کی تائید میں علامہ شامیؒ نے یہ دلیل بیان کی ہے: فان المسجد اوغیرہ من رباط اوحوضٍ اذا لم ینقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد۔

ہاں اگر ان کے ساتھ اس بات کا سمجھوتہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے شعائرِ دین کو اپنے حال پر ہی رہنے دیں گے اور انہیں ڈھاکر ویران و برباد نہ کریں گے تو اس صورت میں اصل حکم یہ ہے کہ ان مساجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو فروخت نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہٗ لایعود الیٰ ملک مالک ابداً کذا فی المضمرات۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۴۴۵)

فقط واللہ اعلم

كتاب الحدود والتعزيرات

ادرءُ وا الحدود عن المسلمين ما استطعتم

کتاب الحدود والتعزیرات

(حدود اور تعزیرات کے احکام ومسائل)

حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے

سوال:۔ کسی مجرم کو کوڑوں یا قصاص کی سزا دینے کا استحقاق صرف حاکم کو ہے یا عوامی جرگہ بھی جاری کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ حدود جاری کرنا حکام اور ان کی طرف سے مقرر شدہ قضاۃ وغیرہ کا حق ہے کسی اور کو حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

وفی الہندیۃ: ورکنہ (الحد) اقامۃ الامام اونائبہ فی الاقامۃ۔

(الفتاوی الہندیہ ج۲ ص۱۴۳ کتاب الحدود) [1]

کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت

سوال:۔ اسلامی قانون میں حدود اور تعزیرات میں جو کوڑے لگائے جاتے ہیں، اس کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ وہ کس طرح کا ہونا چاہیئے اور کس چیز سے بنا ہوا ہونا چاہیئے اور اس کی لمبائی چوڑائی کا کیا اعتبار ہے؟

الجواب:۔ حدود وتعزیرات میں استعمال ہونے والے کوڑے کی ساخت متوسط ہونا ضروری ہے خواہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہو، تاہم اگر لکڑی کا ہو تو نرم سی چھڑی ہونی چاہیئے حدود وتعزیرات میں لاٹھی کا استعمال جائز نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: (بسوط لا ثمرۃ لہٗ متوسطا) ای لاعقدۃ لہٗ لان

---

[1] وقال الامام علاؤالدین ابی بکر ابن مسعود الکاسانیؒ: واما شرائط جواز اقامتہا فمنہا مایعم الحدود کلہا ومنہا مایخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلہا فہو الامامۃ وھو ان یکون المقیم للحد ھو الامام او من ولاہ الامام وھذا عندنا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

ومثلہٗ فی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج۵ ص۲۴۹ کتاب الحدود۔

علیا فی اللہ عنہ لما اراد أن یقیم الحد کسر ثمرته والمتوسط بین المبرح وھو الجارح وغیر المؤلم لافضاء الاول الی الھلاک وخلوا الثانی عن المقصود وھو الانزجار کذا فی الھدایة وحاصله انه المؤلم غیر الجارح۔
(البحر الرائق جلد ۵ ص۹ کتاب الحدود) [1]

زنا کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک بالغ لڑکے نے بالغہ لڑکی کے ساتھ زنا کیا تو کیا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں جبکہ آجکل ملک میں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے، اگر وہ دونوں آئندہ اور ماقبل تمام گناہوں سے توبہ کرلیں تو کیا ان سے حد ساقط ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانون میں زنا کی سزا محصن (شادی شدہ) مرد و عورت کو زنا ثابت ہونے پر رجم (سنگسار) کرنا ہے اور غیر محصن کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔
قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: واذا وجب الحدود کان الزانی محصنا رجمه بالحجارة حتی یموت اھ وان لم یکن محصنا وکان حرا فحده مائة جلدة۔ (الھدایة ج۲ ص۵۰۱ کتاب الحدود)
تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حدود کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اسلئے اگر زناکار مرد اور عورت توبہ کرلیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ گناہ معاف کردے گا علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس توبہ کا طریقہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ "اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز نفل خشوع وخضوع سے پڑھے پھر نہایت آہ وزاری سے آنسو بہا کر عاجزی ظاہر کرکے جیسے کوئی مجرم غلام اپنے آقا سے قصور معاف کراتا ہے دعائے مغفرت کرے

---

[1] قال الزیلعیؒ: بسوط لا ثمرة له متوسطاً ان یضرب بسوط لا عقدة له ضرباً متوسطاً...... وعن علی رضی اللہ عنه انه کسر ثمرته ولو لم یکسر الثمرة بعد کل ضربة یضرب بتین...... والضرب المتوسط ھو المؤید غیر الجارح لان الجارح یفضی الی التلف او یبقی فی جسده أثر یشینه ولھذا یکسر عقدته وغیر المؤید لا یفید والواجب التادیب دون الھلاک۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۱۷۱ کتاب الحدود)

اور دل میں اس گناہ سے ندامت رکھے اور یہ قصد کرے کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا اللہ اس کے گناہ معاف کردے گا، اور اس عورت کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے اور اگر ابتداء میں وہ عورت راضی نہ تھی تو اُس سے بھی عفو قصور کرالے تاکہ وہ حشر میں دامنگیر نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ (مجموعۃ الفتاوٰی ج۳ ص۳۵۷ کتاب الحدود) [1]

نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک عاقل بالغ لڑکے نے نابالغ لڑکی سے زبردستی زنا کیا اور جرم ثابت بھی ہوگیا تو اس نابالغ لڑکی پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی عاقل بالغ لڑکا ایسی نابالغ لڑکی سے زنا کرے جس کے مثل کے ساتھ جماع کیا جاسکتا ہو اور قاضی کے ہاں اس کا ثبوت بھی ہو جائے تو لڑکے پر حد لگائی جائے گی اور لڑکی پر بوجہ عدم بلوغ کے کوئی حد نہ ہوگی۔

قال العلامة الحصكفيؒ: (ولا) حد (بزنى غير مكلف بمكلفة مطلقاً) لا عليه ولا عليها (وفى عكسه حد) فقط۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۶، ۱۵۷ الباب الوطء الذى يوجب الحد والذى لا يوجبه) [2]

حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کیا جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہوگئی اور وہ ناجائز بچے کی ماں بن گئی اور اس نے بلا جبر و اکراہ بچے کو اپنے سگے باپ کی طرف منسوب کیا اور

---

[1] قال العلامة ابوالبركات عبدالله بن احمد بن محمود النسفيؒ: فان كان محصنا رجمه فى فضاء حتى يموت ام ولو غير محصن جلده مائة۔ (كنز الدقائق ص۱۸۱ كتاب الحدود)
وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۲ ص۱۴۵، ۱۴۶ الباب الثالث فى كيفية الحد واقامته۔

[2] قال العلامة فخرالدين عثمان بن على الزيلعيؒ: (قوله وبزنا صبى او مجنون بمكلفة بخلاف عكسه) أى لا يجب الحد اذا زنى الصبى او المجنون بامرأة مكلفة وهى البالغة العاقلة بخلاف العكس وهو ما اذا زنى البالغ العاقل بصبية او مجنونة حيث يجب الحد على الرجل۔
(تبيين الحقائق ج۲ ص۱۸۳ باب الوطء الذى يوجب الحد والذى لا يوجبه)
وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۲ ص۱۴۹ الباب الرابع فى الوطء الذى يوجب الحد والذى لا يوجبه۔

باپ نے بھی بلا جبر و اکراہ بیٹی سے زنا کرنے کو تسلیم کر لیا، شریعتِ مقدسہ میں ان دونوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زنا کو اسلام میں ایک انتہائی قبیح فعل کہا گیا ہے، کسی بھی عورت کے ساتھ زنا کرنا قطعی حرام ہے اور بیٹی تو محرمات میں سے ہے اس کے ساتھ زنا کرنا تو اور بھی زیادہ سخت جرم ہے اور زنا کو حلال سمجھنا موجب کفر ہے، برادری کے لوگ ایسے شخص کے ساتھ قطع تعلق کریں اور حکومتِ وقت اس پر حدِ زنا جاری کرے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: من استحل ما حرمه اللّٰه تعالیٰ علیٰ وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالا۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۲۴ باب المرتد)[1]

پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی پاکدامن اور عفیفہ عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کی شرعاً کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ جو شخص کسی آزاد مسلمان مکلف اور پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو دار الاسلام میں ایسے شخص کو اسّی۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے، اور شریعت میں اس کو حدِ قذف کہا جاتا ہے بشرطیکہ قاذف (تہمتِ زنا لگانے والا) آزاد ہو اس لیے کہ غلام کو آدھی سزا دی جائے گی یعنی چالیس۴۰ کوڑے لگائے جائیں گے، البتہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں قاذف توبہ کرے اور مقذوف سے معافی مانگے۔

لما فی الهندية: اذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصريح الزنی بان قال زنيت او يا زانی وطالب المقذوف بالحد حده الحاكم ثمانين سوطاً ان كان القاذف حراً وان كان عبداً حده اربعين سوطاً كذا فی الفتح القدير۔ (الفتاویٰ الهندية ج ۲ ص۱۶۰ الباب السابع فی حد القذف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: من استحل ما حرمه اللّٰه تعالیٰ علیٰ وجه الظن لا يكفر وانما يكفر اذا اعتقد الحرام حلالا۔ (رد المحتار ج ۳ ص۱۵۴ باب المرتد)

[2] قال العلامة برهان الدين المرغينانیؒ: واذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصريح الزنا وطالب المقذوف بالحد حده الحاكم ثمانين سوطا ان كان حرا لقوله تعالیٰ: والذين يرمون المحصنٰت الیٰ ان قال فاجلدوهم ثمانين جلدة والمراد الرمی بالزنا بالاجماع وان كان القاذف عبدا جلد اربعين سوطاً۔ (الهداية ج ۲ ص۵۲۹ كتاب الحدود، باب حد القذف)

قابلِ تعزیر سرقہ کی مقدار

سوال:- قابلِ تعزیر سرقہ کا نصاب تو دس درہم ہے لیکن آجکل کی کرنسی کے حساب سے یہ نصاب کتنا بنتا ہے؟

الجواب:- "اوزانِ شرعیہ" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے دس درہم یا پینتیس ۳۵ ماشے چاندی یا اس کی مالیت نصابِ سرقہ بنتا ہے اور یہ بات تو مسلّم ہے کہ مقدار حدِ سرقہ دس درہم ہے، لہٰذا موجودہ کرنسی کے اعتبار سے جتنی قیمت ۳۵ ماشے چاندی کی بنتی ہو سرقہ لازم ہو گا۔

وفی الھندیۃ: اقل النصاب فی السرقۃ عشرۃ دراھم مضروبۃ بوزن سبعۃ جیاد کذا فی العنایۃ ۔ (الفتاوٰی الہندیہ جلد۲ ص۱۷۰ کتاب السرقۃ) ؎۱

سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم

سوال:- اگر سارق کا ہاتھ بطورِ حد کاٹ دیا جائے تو اجراء حد کے بعد اس کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- سارق کو سرقہ کے جرم میں صرف سزا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس کو ایک ہاتھ سے محروم کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لیے یہ کام نہ کرسکے اور اُسے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں، اس لیے سارق کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست نہیں ہے۔

وفی الھندیۃ: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم وثمن الذیت وکلفۃ الحم علی السارق عندنا ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۲ ص۱۸۲ الباب الثانی فیما یقطع فیہ وما لا یقطع ۔ الفصل الثالث) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: (ھی) الخ (عشرۃ دراھم) الخ (جیاداً ومقدارھا)
(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۱۹۲ کتاب السرقۃ)
وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص۱۷۰ کتاب السرقۃ ۔

؎۲ قال العلامۃ ابو البرکات النسفی رحمہ اللہ: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم۔
(کنز الدقائق ص۱۹۵ کتاب الحدود، باب حد السرقۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش ردّ المحتار ج۳ ص۲۰۶ باب کیفیۃ القطع اثباتہ۔

مزارات سے قیمتی اشیاء چُرانے کا حکم

سوال:- آجکل کچھ لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر عموماً قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں اس کے علاوہ مزارات پر روپے پیسے اور قیمتی چیزیں بھی رکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص ان اشیاء کو چرالے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ ان اشیاء کو چوری کرنا جائز تو نہیں تاہم ان اشیاء کو چرانے سے حدِ سرقہ واجب نہیں ہوتی اور ان اشیاء کا وہی مالک ہوگا جس نے مزار پر رکھی ہوں۔

وفی الھندیۃ: ولو سرق من القبر دراھم او دنانیراً وشیئاً غیر الکفن لم یقطع بالاجماع اختلف مشائخنا رحمہم اللہ تعالیٰ فیما اذا کان القبر فی بیتٍ مقفل الاصح انہٗ لایقطع سواء نبش الکفن او سرق مالاً آخر من ذٰلک البیت وکذا اذا سرق الکفن من تابوت فی القافلۃ لایقطع فی الاصح کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۱۷۸ الباب الثانی فیما یقطع فیہ وما لایقطع فیہ)[1]

رہزن کو قتل کرنے کا حکم

سوال:- کیا راہزن، ڈاکو اور ہر وہ آدمی جس کا فساد ظاہر اور عام ہو تو اس کو صرف حاکمِ وقت یا قاضی تعزیراً اور سیاسۃً قتل کر سکتے ہیں یا عوام الناس بھی دفعِ فساد کے لیے اس کو قتل کرنے میں مختار ہیں؟

الجواب:- اگرچہ دفعِ فساد کے لیے حاکمِ وقت اور قاضی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو قتل کردے، تاہم اگر عوام رہزن کو دورانِ واردات قتل کردیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (وعلیٰ ھٰذا) القیاس (المکابر بالظلم وقطاع الطریق

---

[1] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: (ونبش) لقبور (ولو کان القبر فی بیت مقفل فی الاصح) (او) کان (الثوب غیر الکفن) وکذا لو سرقہ من بیت فیہ قبر او میت لتأوّلہ بزیادۃ القبر او التجہیز۔
(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۳ کتاب السرقۃ مطلب فی ضمان الساعی)
ومثلہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب احکام الشرائع ج۷ ص۶۷ کتاب السرقۃ۔

وصاحب المکس وجمیع الظلمة اھ) وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ وفی ردالمحتار ج۳ ص۱۸۰ لعل الوجوب بالنظر للامام د انوآبه و الا باحة بالنظر لغیرھم۔

(الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۳ ص۱۸۰ مطلب ویکون التعزیر بالقتل) لے

مُفسد کو سزا دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو تو اس کے ساتھ شرعاً کیا سلوک کیا جائے گا؟

الجواب:۔ حاکمِ وقت کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ایسے شخص کو روکے اور اس کو تعزیراً سزا بھی دے، اور عوام الناس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ترکِ موالات کریں حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعلِ بد سے باز آجائے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (وعلیٰ ھٰذا) القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمة بأدنیٰ شئ له قیمة۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار جلد۳، ص۱۸۰، ۱۸۱ مطلب یکون التعزیر بالقتل) ۲ے

چار پائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بکری کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے، جبکہ اس کا یہ جرم گواہوں کے ذریعہ ثابت بھی ہوچکا ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت جانور سے وطی (بدفعلی) کرنے والے پر تعزیر ہے جو قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے تاہم کوڑوں کی سزا کی صورت میں چالیس سے کم کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑوں کے علاوہ بھی تعزیر ہوسکتی ہے بشرطیکہ یہ تعزیر

لے قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق......فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔ (البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حدالقذف، فصل فی التعزیر)

وَ مِثْلُهٗ فی الفتاوٰی الھندیة ج۲ ص۱۶۷۔ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

لے قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق وجمیع الظلمة بأدنیٰ شئ له قیمة وجمیع الکبائر والاعونة والظلمة والسعاة فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔

(البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حدالقذف، فصل فی التعزیر)

وَ مِثْلُهٗ فی الفتاوٰی الھندیة ج۲ ص۱۶۷۔ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

جان ضائع ہونے تک نہ پہنچے، البتہ جانور کو ذبح کرکے جلا دیا جائے، تاوان وطی کرنے والے کے ذمے ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی شرح الطحاوی رجل وطی بهیمة یعزر فان کانت البهیمة له تذبح ولا تؤکل وعن عمرؓ انه امر بالبهیمة حتی احرقت بالنار۔ وفی الفتاوی الصغری فی الذی یؤکل یذبح ویؤکل عند ابی حنیفةؒ ولا یحرق وعند ابی یوسفؒ لا یؤکل ویحرق بالنار الخ

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۵، ۳۴۶ کتاب الحدود، الفصل الثانی فی الزنا) [1]

بیوی کو وطی فی الدُّبر کے لیے مجبور کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک عورت کا دعویٰ ہے کہ اس کا خاوند اس کو وطی فی الدُّبر کے لیے مجبور کرتا ہے تو اس شخص کی سزا شرعاً کیا ہے؟ نیز اس عورت کے والدین اُسے اپنے گھر لے جانے کے حقدار ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں عورت اور اس کے اولیاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس خاوند کو اس قبیح فعل سے روکیں ورنہ ارتکاب کی صورت میں حاکم اس کو تعزیراً سزا دے اور عادی ہونے کی صورت میں حاکم وقت اس کو قتل بھی کرسکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: أو (لوطا دبر) وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبده وامته اوزوجته فلا حد اجماعاً بل یعزر قال فی الدرر الاحراق بالنار۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ باب التعزیر مطلب فیمن وطی ...) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: (و) لا یحد بوطء (بهیمة) بل یعزر وتذبح ثم تحرق ویکره الانتفاع بها میتة ومیتة مجتبی وفی النهر الظاهر انه یطالب ندباً لقولهم تضمن بالقیمة۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ مطلب فی وطی الدابة)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۳ ص۱۸۱ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ومن اتی امرأة فی الموضع المکروه او عمل عَمَلَ قوم لوط فلا حد علیه عند ابی حنیفةؒ ویعزر وقال فی الجامع الصغیر ویودع فی السجن وقالا هو کالزنا فیحد۔ (الهدایة ج۲ ص۵۱۶ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

جادُوگر کی سزا کا حکم سوال:۔ اگر کوئی کسی پر جادو وغیرہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل گواہی سے ثابت ہو جائے تو شرعاً اس کو کس قسم کی سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ جادوگر چونکہ مفسد فی الارض ہے اس لئے اگر جادوگر جادو کرتے ہوئے پکڑا جائے اور وہ خود بھی اس کا اقرار کرلے یا گواہی سے اس کا جادو کرنا ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکمِ وقت اس کو قتل کر سکتا ہے تاہم اگر وہ گرفتاری سے پہلے صدقِ دل سے توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور اس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدین الطرابلسیؒ : قال فی النوازل الخناق والساحر یقتلان اذا اقرا لانهما ساعیان فی الارض بالفساد فان تابا ان کان قبل الظهور بهما قبلت توبتهما وبعد ما اخذ الا ویقتلان کما قطاع الطریق۔ (معین الحکام ص۲۲۹)[1]

فاسق سے ترکِ موالات کا حکم سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں طلاق کے بعد علماء نے اسے بتایا کہ اب بغیر حلالۂ شرعی کے یہ عورت آپ کے لیے جائز نہیں لیکن اس کے باوجود اُس نے بدستور مطلقہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے، تو ایسے اعلانیہ فاسق اور فاجر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اُس کو اور اُس کے والد کو مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنی مطلقہ غلیظہ بیوی کے ساتھ بغیر حلالۂ شرعی کے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا صریح زنا ہے ایسا شخص مستحقِ سزا ہے مگر خود اُسے یا اس کے والد کو مسجد سے یا نماز باجماعت سے منع نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کے رشتہ داروں اور دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا سوشل بائیکاٹ (ترکِ موالات) کریں۔

ونهی رسول الله صلی الله علیه وسلم المسلمین عن کلامنا الخ واما انا فکنت اشب القوم واجلدهم فکنت اخرج فاشهد الصلوٰة واطوف فی الاسواق ولا یکلمنی احد وآتی رسول الله صلی الله

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ : قال ابو حنیفةؒ الساحر اذا اقر بسحره اثبت یقتل ولا یستتاب منه الخ۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۲۹۵ قوله والکافر بسبب اعتقاد السحر۔ باب المرتد)
ومثله فی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعیؒ ج۳ ص۲۹۲ باب المرتدین۔

علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ الخ
(الصحیح المسلم ج۲ ص۳۶۱ باب حدیث توبۃ کعب بن مالکؓ) [۱]

اغلام بازی کی سزا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اغلام بازی (مرد کا مرد سے منہ کالا کرنے) کی شرعی سزا کیا ہے؟

الجواب:۔ اغلام بازی ایک قبیح و خبیث فعل ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی باضابطہ سزا تو مقرر نہیں کی، البتہ اس قبیح فعل کی سزا کو حاکم کی صوابدید کے موافق رکھا ہے وہ چاہے تو اس فعل کے مرتکب کو جلا کر ختم کردے یا کسی بلند مقام سے اُلٹا (سر کے بل) گرا کر اوپر سے پتھر برسانے کا حکم دے یہاں تک کہ وہ مرجائے یا اس پر دیوار گرانے کا حکم دے یا سخت سزا دے کر قید کر دے یہاں تک کہ توبہ کرلے یا قید میں مرجائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یحد بوطء دبر وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبدہ اوامتہ او زوجتہ فلا حد اجماعاً بل یعذر، قال فی الدرر بنحو الاحراق بالنار وھدم الجدار والتنکیس من محل مرتفع باتباع الاحجار۔
(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۱۶۱ کتاب الحدود) [۲]

مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی مردہ عورت سے وطی (زنا) کرے

---

[۱] قال المفتی علاؤ الدین الطرابلسی الحنفیؒ: والتعزیر لا یختص بفعل معین ولا قول معین بل فقد عزر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالھجر وذٰلک فی حق الثلاثۃ الذین ذکرھم اللہ تعالیٰ فی القراٰن العظیم فھجروا خمسین یوماً لا یکلمھم احدٌ وقصتھم مشھورۃ فی الصحاح۔ (معین الحکام ص۲۳۱ باب التعزیر)
ومثلہٗ فی شرح الصحیح المسلم للنوویؒ ج۲ ص۳۶۳ باب حدیث توبۃ کعب بن مالک

[۲] لما قال المفتی محمد شفیعؒ: اس قبیح فعل کے لیے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔
(معارف القرآن ج۲ ص۳۴۰ سورۃ النساء)

تو کیا وہ حد کا مستحق ہے یا تعزیر کا ؟

الجواب:۔ مردہ عورت کے ساتھ زنا کرنے والے پر حد زنا لازم نہیں آتی تاہم وہ مستحق تعزیر ضرور ہے۔

وفی الهندیة : رجل زنٰی بامرأة میتة اختلفوا فیه قال اهل المدینة حدّ وقال اهل البصرة یعزر ولا یحد وقال ابو اللیث رحمه الله تعالیٰ وبه ناخذ۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لایوجبه) [۱]

والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا

سوال:۔ ایک شخص اپنے والد سے ہمیشہ بُری طرح پیش آتا ہے اور اس کو گالیاں بھی دیتا ہے، اس کے علاوہ بسا اوقات والد کو ایسی بے رحمی سے مارتا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ والدین کو مارنے یا گالی گلوچ کرنے پر شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کی سزا حاکم وقت اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرے، اگر کوڑے مارنے کی سزا تجویز کرے تو یہ سزا انتالیس ۳۹ کوڑوں سے زیادہ اور تین ۳ سے کم نہ ہو، یا پھر اس کو جیل میں اس وقت تک ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ نہ کرے۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : ومن یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس احبسه واخلده فی السجن حتّٰی یتوب۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار جلد۳ ص۱۸۸ مطلب فی تعزیر المتهم) [۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی الفتاویٰ رجل زنٰی بامرأة میتة لاحدّ علیه ولکن یعزر۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۳۴۵ کتاب الحدود۔ الفصل الثانی فی الزنا)

وَمِثْلُهٗ فی فتاویٰ قاضیخان ج۴ ص۴۰۶ کتاب الحدود۔

[۲] وفی الهندیة: من یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس الناس ویخلد فی السجن الیٰ أن تظهر التوبة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۶۹ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۴۲ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر۔

نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا دینا

سوال :- کیا حکومت کسی نابالغ قاتل کو تعزیر کے طور پر قتل کر سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جن جرائم عظیمہ میں حد اور قصاص عوارض خارجیہ کی وجہ سے ساقط ہوں تو اس میں حسب مصلحت تعزیراً سزا دینا جائز ہے چاہے تعزیر بسزائے موت تک پہنچ جائے خواہ مجرم نابالغ ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : رأیت فی الصارم المسلول للحافظ ابن تیمیۃؒ ان من اصول الحنفیۃ أن مالا قتل فیہ عندھم مثل القتل بالمثقل والجماع فی غیر القبل اذا تکرر فللامام أن یقتلہ فاعلہ الخ ویسمونہ القتل سیاسۃ وفیہ ایضاً۔ ومن ذلک ماسیذکرہ المصنف من ان للامام قتل السارق سیاسۃ أی ان تکرر منہ وفیہ وان الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر شرع علیہ ۔

(رد المحتار ج۳ ص۱۷۷ باب التعزیر، قولہ ویکون التعزیر بالقتل)

شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم

سوال :- دینی مدارس اور سکولوں میں طلباء کو کسی شرارت پر یا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے بطور تنبیہ اور تادیب کے سزا دی جاتی ہے، تو کیا استاد شاگرد کو شرعاً سزا دے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- استاد شاگرد کو تعزیر دینے کا حق رکھتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں تو معلم اسکے اولیاء کی طرف سے تادیب کا مالک بنا دیا گیا ہے اور بالغ نے خود معلم کو تعزیر کا اختیار دیا، لیکن یہ احتیاط ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ اس سے طالب علم بدنی یا ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : (قولہ وفی القنیۃ الخ) وفیہا عن الروضۃ ولو أمر غیرہ بضرب عبدہ حل للمأمور ضربہ بخلاف الحر فہذا تنصیص علی عدم جواز الضرب ولد الآمر بامرہ بخلاف المعلم لان المأمور یضربہ بنیابۃ عن الاب بمصلحتہ والمعلم یضربہ بحکم الملک بتملیک ابیہ بمصلحۃ الولد اھ وھذا اذا لم یکن الضرب فاحشا ۔ (رد المحتار جلد ۳ ص۱۸۹ باب التعزیر) [1]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ : ولو أمر غیرہ بضرب عبدہ حل للمأمور ضربہ بخلاف الحر قال رضی اللہ عنہ فہذا تنصیص علی عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمرہ بخلاف المعلم لان المأمور یضربہ بنیابۃ عن الاب لمصلحتہ والمعلم یضربہ بحکم الملک بتملیک ابیہ لمصلحۃ الولد اھ ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۹ فصل فی التعزیر)

بیوی کو بدفعلی کی بناء پر قتل کرنا

سوال :- اگر کسی شخص کو پختہ یقین ہو کہ اس کی بیوی بدکردار (زانیہ) ہے اور اسی وجہ سے وہ اُسے قتل کر دے تو اس شخص کا یہ انتہائی اقدام درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر شوہر دورانِ زنا بیوی کو قتل کر دے تو مجرم نہ ہوگا، بصورتِ دیگر بیوی کو قتل کرنا قابلِ مواخذہ جرم ہے ۔

وفی الهندیة : وان طاوعته المرأة حَلَّ لهُ قتلها ایضاً کذا فی النهایة وفیها ایضاً ج۲ ص۱۶۷ ۔ قالوا الکل مسلم اقامة التعزیر حال مباشرة المعصیة واما بعد المباشرة فلیس ذٰلك لغیر الحاکم ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر) [1]

جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم

سوال :- ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم بیلہ کہتے ہیں، گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جبکہ وہ جگہ غیر محفوظ ہے، اب اگر کوئی شخص اس بیلہ سے کسی کے مویشی چُرا کر لے جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :- قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوری کسی ایسے مقام سے ہوئی ہو جو محفوظ ہے، اور اگر چوری کسی غیر محفوظ جگہ سے ہو جائے تو سرقہ کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجرم سے حد ساقط ہو گی تاہم وہ تعزیر سے

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : سئل الهندوانی عن رجل وجد رجلاً مع امرأة ایحل له قتله قال ان کان یعلم انه ینزجر بالصیاح والضرب بما دون السلاح لا وان کان یعلم انهٗ لا ینزجر الا بالقتل حَلَّ له القتل وان طاوعته المرأة حَلَّ له قتلها ۔ ایضاً وفی المنیة رأی رجلاً مع امرأته وهو یزنی بها أو مع محرمه وهما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جمیعاً ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۱) ایضاً قالوا الکل مسلم اقامته حال مباشرة المعصیة واما بعد الفراغ منها فلیس ذٰلك لغیر الحاکم ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی شرح النقایة ج۲ ص۳۹۷ فصل فی التعزیر ۔

نہیں بچ سکتا۔

لما قال العلامة ابن البزازؒ: ومنهاان یکون المال الماخوذ محرزاً اما بالمکان للحفظ کالدور والدکاکین الخ (البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص۴۳۱ کتاب السرقة) لہ

سکول، کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم

سوال:۔ عصرِ حاضر میں سکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کا ایک دستور ہے کہ جب کوئی طالب علم غیر حاضری کرتا ہے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اساتذہ یا ادارے کا سربراہ اس سے مالی جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اصلاً ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے، تو کیا شرعاً یہ جرمانہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طالب علم کا مدرسہ وغیرہ سے انتظامیہ کی اجازت کے بغیر کثرت سے غیر حاضر رہنا یا دیگر کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا اگرچہ موجب سزا ہے مگر یہ سزا جسمانی حد تک محدود ہونی چاہیئے مالی جرمانہ شرعاً صحیح نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جرم تو طالب علم کرے اور سزا کے طور پر مالی جرمانہ اس کے والدین ادا کریں، یہ بات مناسب نہیں۔

لما قال العلامة اشرف على التهانوى رحمه الله: تعزیر مالی یعنی جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور حدیث لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه اس کی مؤید بھی ہے، پس جرمانہ کے طور پر تو لینا درست نہ ہوگا۔ (امداد الفتاوٰی ج ۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود، حکم جرمانہ بغیر حاضری طالب علم) ؎۲

لہ وفی الهندية: وهي في الشرع اخذ العاقل البالغ نصابا محرزا...... على وجه الخفية۔ (الفتاوٰى الهندية ج ۲ ص۱۷ کتاب السرقة)

وَمِثْلُهٗ في الهداية ج ۲ ص۲۳۱ کتاب السرقة۔

؎۲ قال المفتي محمود الحسنؒ: (الجواب) مالی جرمانہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں منسوخ ہے اگر لیا گیا ہو تو اسکی واپسی لازم ہے۔ (فتاوٰی محمودیہ ج ۵ ص۱۸۴ کتاب الحدود)

وَمِثْلُهٗ في كفاية المفتي ج ۲ ص۱۶۵ کتاب الحدود۔

فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا جانور دُوسرے کے کھیت میں چلا جائے اور فصل کو نقصان پہنچائے تو شرعاً جانور کے مالک کو کیا سزا دی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر جانور کے ساتھ مالک خود موجود ہو اور اس کی موجودگی میں وہ جانور دوسرے کے کھیت میں جا کر فصل کا نقصان کرے تو شرعاً صرف نقصان کے مطابق رقم وصول کرنا درست ہے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ تاہم اگر جانور کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو اور وہ فصل کا نقصان کرے تو اس صورت میں جرمانہ لینا ناجائز ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ: (الجواب) اگر جانور کے ساتھ کوئی نہ ہو اس صورت میں تو یہ جرمانہ ناجائز ہے اور اگر کوئی ساتھ ہو تو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا وصول کرنا درست ہے مگر وہ کھیت والے کا حق ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود) لہ

حفاظت کی نیّت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے دوسرے پر مال چوری کرنے کا دعویٰ کیا مگر مدعیٰ علیہ (جس پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص کا مال چوری کی نیت سے نہیں بلکہ حفاظت کی نیت سے اٹھایا ہے اور میں نے اس شخص کو اطلاع بھی دی ہے، تو کیا اس شخص پر چوری کی سزا نافذ ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے اس نے وہ مال کسی غیر محفوظ مقام سے اٹھایا ہے جس کی موصوف نے مال کے مالک کو اطلاع

لہ قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو انہ قال لصاحب الدابۃ ان دابتک فی الزرع ولم یقل اخرجہا فاخرجہا صاحبہا فافسدت شیئاً فی اخراجہا کان ضامناً...... ولو ان دابۃ رجل انفلتت لیلاً او نہاراً من غیر ارسال فافسدت زرع انسان لا یجب الضمان علیٰ صاحبہا لان فعل العجماء ھدر۔

(الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۴۵۷ باب جنایۃ البھائم)

ومثلہ فی شرح المجلۃ ج ۱ ص۲۵۹ کتاب الجنایۃ۔

بھی دی ہے اور دوسری طرف ملزم مال کو بطور امانت لینے کا بھی مدعی ہے، اس لیے ان حالات کے پیشِ نظر ملزم کو چوری کی سزا نہیں دی جائے گی (یعنی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) تاہم اگر مدعی گواہان شرعی سے اس بات کو ثابت کردے کہ یہ مال محفوظ مقام میں تھا تو پھر اس صورت میں اثباتِ جرم کے تحت مجرم کو چوری کی سزا دی جائے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وھبانیہ او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء ورب المتاع عندہٗ ای بحیث یراہ ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۲ کتاب السرقة) [۱]

حیوان سے بدفعلی کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی حیوان سے بدفعلی کرتے پکڑا جائے اور اس کے اس فعلِ بد پر گواہ بھی موجود ہوں تو شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنا اگرچہ شرعاً حرام اور غیر فطری فعل ہے لیکن شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کے لیے کوئی مقرر شدہ سزا نہیں ہے البتہ اس فعلِ بد کے مرتکب شخص کو تعزیراً سزا دی جا سکتی ہے جو حاکمِ وقت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جتنی مناسب سمجھے ایسے مجرم کو سزا دے سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تحت قوله (ولا عند وطء بھیمة) وفی القنیة مر فی اجناس الناطفی فرج البھیمة کفیھا لاغسل فیه بغیر انزال ویعزر وتذبح البھیمة وتحرق علی وجه الاستحباب

---

[۱] قال العلامة وھبة الزحیلی: الاصل فی اشتراط ھٰذا الشرط المتفق علیه قوله علیه السلام "لاقطع فی ثمرة ولا کثر حتی یؤویه الجرین فاذا اواہ الجرین ففیه القطع" وفی روایة فاذا اواہ المراح او الجرین والحرز لغة: الموضع الذی یحرز فیه الشیٔ وشرعاً ھو ما نصب عادةً لحفظ اموال الناس کالدار والحانوت والخیمة والشخص الخ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۱۰۷ الفصل الثالث فی حد السرقة)

ولا یحرم اکل لحمها بہ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۲۲ باب الغسل) ۱؎

بجلی چوری کرنے پر سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بجلی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور گواہان کے ذریعہ جرم ثابت ہو جائے تو کیا اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسکی جملہ شرائط پوری کی پوری پائی جائیں، اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو سزا جاری نہیں ہوگی۔ چوری کی سزا کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا جائے تب سزا نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بجلی مال ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہے اسلئے حد نافذ نہ ہوگی تاہم تعزیرًا سزا ضرور ملنی چاہیئے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویقطع لو سرق من السطح نصابًا لانہ حرز شرح وھبانیۃ او من المسجد اراد بہ کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء ورب المتاع عندہ ای بحیث یراہ ولو الحافظ نائمًا فی الاصح۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص۲۲۲ کتاب السرقۃ) ۲؎

۱؎ قال الشیخ علامۃ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ: واطئی البھیمۃ یعزر فان کانت البھیمۃ للواطی ففی شرح الطحاوی وحدودالاصل تذبح ولا تؤکل۔ وفی فتاوی الصغری انھا تؤکل وافتی ابوسعید بھٰذا وقال صدر الشھید الاعتماد علیٰ روایۃ شرح الطحاوی۔ (معین القضاۃ والمفتیین ص۹۴ مادۃ ۵۴۴)

وَمِثْلُہٗ فی الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۶ ص۶۶ کتاب الحدود۔

۲؎ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ومنھا ان یکون الماخوذ منہ محرزًا وانما یصیر المکان حرزًا باحد الامرین اما ان یکون معدًا لحفظ الاموال کالدور والحوانیت والخانات والخیمۃ والفساطیط او بالحافظ حتی لو سرق شیئًا من الصحراء ولہ حافظ بان سرق شیئًا من تحت رأسہ وھو نائم فی الصحراء او فی المسجد یقطع ولو کان المال موضوعا بین یدیہ اختلف المشائخ۔ قال الامام سرخسیؒ انہٗ محرز۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۳۴۷ کتاب السرقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۵ ص۱۶۸ کتاب السرقۃ۔

بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص پر زنا کا جرم بطریقہ شرعی ثابت ہو جائے اور وہ دل کا مریض بھی ہو، اب اگر اس پر حد جاری کی جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تو اس صورت میں شرعاً کیا کیا جائے، حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: اگر حدود کا مجرم کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کہ حد جاری کرنے کی صورت میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو مرض کے ختم ہونے تک حد کو موقوف کر کے مجرم کو جیل ہی میں رکھا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تقطع یمین السارق من زنده وتحسم الا فی حر وبرد شدیدین فلا تقطع لان الحد زاجر لا متلف ویحبس لیتوسط الامر۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله الا فی حر وبرد شدیدین) والا فی حال مرض مفتاح وغیره فی البنایة بالمرض الشدید افاده عن الحموی۔

[رد المحتار ج ۳ ص۲۲۶ کتاب السرقة
باب کیفیة القطع واثباته] [1]

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وشرط اصحابنا لقطع الید الیمنی ان تکون الید الیسری والرجل الیمنی صحیحتین حتی انه اذا کانت ید الیسری بحیث لا ینتفع بها لا تقطع یده الیمنی وکذلک اذا کانت الید الیسری صحیحة الا ان الرجل الیمنی مقطوعة او هی شلاء او بها عرج یمنع المشی علیها تقطع الیمنی۔

[الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۱۱۶ کتاب السرقة
الفصل الاول فی بیانها]

ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص۱۵۶ کتاب السرقة، فصل فی کیفیة قطع واثباته۔

زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا جو حرام قطعی ہے، اس کی قطعی حرمت کے پیش نظر صوبائی اسمبلی میں بعض اسلام پسند ممبروں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہے اس لیے شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کو قرآنی ہدایت کے مطابق زنا کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہیئے اور غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کو سَو سَو دُروں کی سزا دینی چاہیئے اور دونوں قسم کے مجرمین کو سزا دینے میں نرمی یا رعایت سے کام نہیں لینا چاہیئے ۔ مگر بجائے اس کے کہ یہ جائز اور اسلامی مطالبہ منظور کیا جاتا حکومت کی اکثریتی پارٹی نے زنا کو دو حصوں (زنا بالرضا اور زنا بالجبر) میں تقسیم کر کے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومتی سطح پر قرآن کریم کی نصوص قطعیہ کی صریح خلاف ورزی کر کے ایک حرام فعل کو قانون کی مدد سے جائز قرار دیا گیا، اور دوسری طرف اسلام کے عمومی حکم حرمت سے زنا بالرضا کو مستثنیٰ کر کے زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان حکم کے لحاظ سے تفریق کر دی گئی ہے ۔ تو کیا شرعی طور پر طے شدہ ایک حرام فعل کو جائز کرنے کا اختیار کسی شخص یا ادارہ کو حاصل ہو سکتا ہے ؟ اگر نہیں تو اسلامی شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے ؟ اور کیا زنا کے بارے میں قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں سے زنا بالرضا مستثنیٰ ہو سکتا ہے ؟ اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور فقہاء امت کے فیصلوں کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب :- سوال کے مضمون پر غور کرنے سے حسب ذیل تین امور پر روشنی پڑتی ہے :

(۱) قانونی سزا کے بارے میں اسلامی شریعت زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے درمیان تفریق کی قائل ہے ؟

(۲) اگر قائل نہیں تو پھر کیا کسی با اختیار ادارہ اور برسر اقتدار جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کر سکے ؟

(۳) حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں ؟

ذیل کی سطور میں تینوں اجزاء کے احکام کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور فقہاء اسلام کے قطعی فیصلوں کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں :-

(جواب جزء ۱) زنا کے لیے اسلامی شریعت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اس میں شریعت نے زنا کی دونوں قسموں کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے نہ وہ اس طرح کی کسی

تفریق کی قائل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے واضح احکام کی روشنی میں فقہاء اسلام بھی اس بات پر متفق ہیں کہ زنا کی دونوں قسموں میں زنا کرنے والے مرد پر قانونی سزا نافذ کی جائے گی، البتہ عورت زنا بالجبر کی صورت میں قانونی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اگرچہ اختیاری زنا کی صورت میں وہ بھی مرد کی طرح سزا کی مستحق رہے گی اور مرد کی طرح اس پر بھی حد شرعی قائم ہوگی۔ ذیل میں مذکورہ بالا دعویٰ کا تفصیلی ثبوت قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

زنا قرآن کی نظر میں | قرآنِ کریم نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں تجویز کی ہیں ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سزائیں جبری زنا کے لیے ہیں اور اختیاری زنا میں ان کا نفاذ نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں وہاں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کا نام تک نہیں لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا خواہ بالجبر ہو یا بالرضا قرآنی قانون کی نظر میں یکساں طور پر جرم ہیں، اور دونوں قسم کے زنا میں یہ قانونی سزائیں نافذ کی جائیں گی۔ اختیاری اور جبری زنا کا یہ فرق اگر مغربی اور عیسائی شریعت میں ہو تو ہو مگر اسلامی شریعت اس فرق سے قطعی طور پر نا آشنا اور یقینی طور پر نا بلد ہے اب ذیل میں وہ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں زنا کے لیے قانونی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

زنا ایک قبیح فعل ہے | وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۝ (بنی اسرائیل) "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ ایک قبیح فعل اور بُرا راستہ ہے"۔

اس آیت میں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے، خاص زنا بالرضا یا زنا بالجبر کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے بلکہ مطلق زنا کو فاحشہ (قبیح فعل) کہہ کر مسلمانوں کو اس کے قریب جانے سے روکا گیا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں مطلق زنا فاحشہ اور قبیح فعل ہے اور معاشرے کو اس سے پاک رکھنا انتہائی ضروری ہے ــــ اس بارے میں جو لوگ اس قسم کے قبیح افعال کو معاشرے میں فروغ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بے حیائی لوگوں میں پھیل جائے قرآنِ کریم نے صریح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (النور ۱۹) "جو لوگ مسلمانوں اور مسلم معاشرے میں بے حیائی اور قبیح افعال کو فروغ دے کر پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ ہی

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ خود زنا جیسے قبیح فعل میں اپنے آپ کو ملوّث کرے یا دوسرے مسلمانوں میں اس بے حیائی کے پھیلنے کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش ظاہر کرے۔

زنا کے چور دروازے | اسلام نے مسلم معاشرے میں زنا اور حرام کاری کے مکمل انسداد کے لیے یہاں تک انتظام کیا ہے کہ جو امور اس قبیح فعل کے لیے مبادی اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کے لیے بمنزلہ چور دروازہ کے ہیں قرآن کریم نے قفل لگا کر ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اور صریح طور پر انہیں ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ "سدّ للباب" اس نے مردوں اور عورتوں دونوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلم معاشرے میں زنا وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے سب سے پہلے عورتوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اجنبی اور غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردہ ہو کر نہ آئیں اور نہ ہی دورِ جاہلیت کے "تبرّج" کی نقالی کرتی پھریں، ارشادِ قرآنی ہے:۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الاحزاب ۳۳) "یعنی اپنے گھروں میں عزت اور وقار کے ساتھ رہو اور دورِ جاہلیت کے تبرّج کی نقالی نہ کرتی پھرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی فرمانبردار رہو"

لیکن بعض اوقات گھروں سے نکلنے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بے پردہ ہو کر نہ نکلیں بلکہ بڑی بڑی چادریں وغیرہ اپنے اوپر ڈال کر رکھیں تاکہ ایک طرف آپ کی زینت اور حسن و جمال دوسروں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بنے اور دوسری طرف آپ کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ شریف اور باحیا عورتیں ہیں جو شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں، تو بدطینت لوگ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اور نہ کوئی بدقماش آپ کو اذیت پہنچا سکے گا۔ ارشادِ قرآنی ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ (الاحزاب ۵۹) "اے پیغمبر حکم دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو، اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہ (گھروں سے نکلتے وقت) اپنے

اوپر بڑی بڑی چادریں وغیرہ ڈال کر نکلیں اس سے بآسانی ان کی پہچان ہوسکے گی اور انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔"

ایک دوسرے مقام پر پوری سوسائٹی کو جس میں مرد اور عورت سبھی شامل ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حجاب شرعی کے بغیر ایک دوسرے سے آزادانہ اختلاط نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھو بلکہ دونوں فریق "غضِ بصر" پر عمل کرتے رہو، اس سے آپ کی عفت محفوظ رہ سکتی ہے، اور زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے سے بھی آپ بچ سکتے ہیں ارشاد قرآنی ہے:-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ - (سورۃ النور ۳۰،۳۱) "اور مومن مردوں کو بھی یہ حکم کیجئے اور عورتوں کو بھی کہ وہ اپنی اپنی نگاہوں کو نیچے رکھ کر شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز اپنے شوہروں اور محارم کے عورتیں اپنی زینت کو دوسروں کے سامنے نہ کھولیں۔"

اس آیتِ مبارکہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اور زنا سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن "غضِ بصر" پر "حفاظت" کو مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کا قوی ذریعہ ہے لہٰذا ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ جائے تاکہ زنا میں ملوث ہونے کی نوبت ہی پیش نہ آئے۔ اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام کاروائیاں انسداد زنا کے لیے تدابیر کی حیثیت رکھتی ہیں، اب اگر اسلام کی نظر میں صرف زنا بالجبر ہی ممنوع ہوتا اور اختیاری زنا ممنوع نہ ہوتا تو "غضِ بصر" کا حکم صرف مردوں ہی کو دیا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں نظرِ شہوت سے، اجنبی عورتوں کی طرف ناجائز میلان پیدا ہو کر کسی وقت ان سے جبراً زنا کے مرتکب نہ ہوں عورتیں ہرگز اس حکم کے تحت نہ آجاتیں، کیونکہ ان کی طرف سے جبر بالزنا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیت ہذا میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر "غضِ بصر" کا حکم دیا گیا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں زنا بالاختیار بھی اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح زنا بالجبر سنگین جرم ہے اور چونکہ وہ مرد و عورت دونوں کی باہمی نظر بازی سے

پیدا ہوتا ہے اس لیے دونوں کو "غضِ بصر" کا حکم دے کر زنا بالاختیار کے اس چور دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

قانونی سزائیں | قرآنِ کریم میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں دونوں قسم کے زنا کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور زنا بالاختیار ان سے مستثنیٰ نہیں ہے، ارشادِ باری ہے:۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (النور ع ۲) "بدکاری کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو مارو سَو سَو دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم کے نافذ کرنے میں اگر تم یقین رکھتے ہو خدا پر اور پچھلے دن پر، اور دیکھیں ان کی یہ سزا کچھ لوگ مسلمانوں میں سے"۔

اس آیت میں کوڑوں کی جو سزا بیان کی گئی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے بیان کی گئی ہے بلکہ زانیہ عورت کو زانی مرد پر مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اس سزا کی زیادہ مستحق ہے، حالانکہ زنا بالجبر کی صورت میں پوری ملت اس پر متفق ہے کہ عورت نہ سزا کی مستحق ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی حد جاری کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں سزا کا مستحق صرف زانی مرد ہو گا اور اُسی پر کوڑوں یا رجم کی سزا نافذ کی جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ اختیاری زنا کی سزا ہے نہ کہ جبری زنا کی، لیکن الفاظ کے عموم میں چونکہ دونوں قسم کے زنا داخل ہیں اس لیے مرد کی سزا تو دونوں قسم کے زنا میں بحال رہے گی، اور عورت جبری زنا میں چونکہ مجرم نہیں ہوتی اس لیے وہ اس صورت میں سزا کی بھی مستحق نہ ہو گی۔ چنانچہ روایات میں آگے اس کی تصریح آتی ہے۔ اب قرآنِ کریم کی اس تصریح اور واضح فیصلے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یا ادارہ اس حکم سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو اُس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآنِ کریم کے صریح فیصلے میں تحریف کرنا چاہتا ہے۔

عہدِ نبوت میں یہ قانونی سزائیں زنا کے بارے میں قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی صاف طور پر عہدِ نبویؐ کے ایسے صریح فیصلے ملتے ہیں جن میں زنا بالاختیار کی صورت میں مرد اور عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔ اور اس بات کے لیے عہدِ نبویؐ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کبھی زنا بالاختیار کی صورت میں ثبوتِ جرم کے بعد مرد یا عورت پر قانونی سزا نافذ نہ کی گئی ہو، بلکہ عہدِ نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ زنا بالاختیار میں زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں پر کوڑوں کی سزا بھی اعلانیہ طور پر جاری کی گئی ہے اور سنگساری کی سزا بھی۔

رجم کی سزا چنانچہ مشہور صحابی حضرت ماعزؓ کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا حالانکہ وہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ حضرت ماعزؓ کی سنگساری کے ہولناک واقعہ کے بعد حضرت غامدیہؓ کو بھی حضرت ماعزؓ کی طرح سنگسار کیا گیا تھا، حالانکہ حضرت غامدیہؓ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے جبراً زنا کیا تھا ورنہ انہیں ہرگز سنگسار نہ کیا جاتا بلکہ اس شخص کو سنگسار کیا جاتا جس نے اُن سے زنا بالجبر کیا تھا۔ کیونکہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔

کوڑوں کی سزا اس کے علاوہ کوڑوں کی سزائیں بھی عہدِ نبوت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر دی گئی ہیں، حالانکہ عورت پر جبری زنا کی صورت میں کوڑوں کی سزا بھی جاری نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں ایک دو واقعات ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اختیاری زنا میں مرد و عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔

زنا کا جرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے عن ابی ھریرۃؓ ان رجلین اختصما الی النبیؐ فقال احدھما ان ابنی کان علی ھذا فزنی بامرأتہ فاخبرونی ان علی ابنی الرجم فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وبجاریۃ لی ثم انی سألت اھل العلم فاخبرونی ان علی ابنی جلد مائۃ وانما الرجم علی امرأتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ تعالیٰ اما غنمک وجاریتک فرد علیک وجلد ابنہ مائۃ وامر انیس الاسلمیؓ ان یاتی امرأۃ الا

فان اعترفت فارجمها فاعترفت فرجمها۔ (ابو داؤد ج ۲ صلا۶) "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنا ایک مقدمہ لے کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدوری کرتا تھا پس اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کی سزا سنگساری ہے، میں نے اس کے بدلے میں اس شخص کو سو بکریاں اور ایک جاریہ دے دی، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سو کوڑے ہے اور سنگساری اس شخص کی بیوی کی سزا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں آپ دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بکریاں اور جاریہ تمہیں واپس کی جائیں گی اور سزا کے طور پر تیرے بیٹے کو سو درّے لگیں گے۔ اور انیس اسلمیؓ کو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اس کی بیوی کے پاس اور معاملہ کی تحقیق کرو، اگر اس نے زنا کا اقرار کر لیا تو اس کو رجم کرو، چنانچہ اس نے اعترافِ جرم کر لیا اور رجم کی سزا اس پر جاری کی گئی۔

اس حدیث میں زنا کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جبری زنا کا واقعہ تھا کیونکہ یہ گھر کے ایک مزدور کا گھر کی مالکہ کے ساتھ زنا کا واقعہ ہے اور اس میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس مزدور کی کیا مجال تھی کہ وہ گھر کی مالکہ کے ساتھ جبراً زنا کرے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زنا جبری ہوتا تو عورت پر رجم اور سنگساری کی سزا جاری نہ کی جاتی، کیونکہ جبری زنا میں عورت سرے سے مجرم ہی نہیں تو اس پر سزا جاری کرنے کے کیا معنیٰ؟ اور سزا بھی وہ جو سخت ترین سزا ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت باوجود مجبور ہونے کے سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کی جائے اور مرد باوجود مجرم ہونے کے کوڑوں کی سزا کا مستحق گردانا جائے حاشا و کلا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جرمِ زنا اسلامی شریعت میں قابلِ راضی نامہ نہیں ہے، ورنہ اگر یہ جرم قابلِ راضی نامہ ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ میں متاثرہ فریقین میں ہونے والے راضی نامہ کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر فسخ نہ فرماتے اور اس کے ہوتے ہوئے زانیہ عورت اور زانی مرد پر سزا جاری نہ فرماتے۔

ایک اور واقعہ | عن ابن عمرؓ انہ، قال ان الیھود جاء والی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہٗ ان رجلاً منھم وامرأۃ زنیا فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شان الزنا فقالوا نفضحھم ویجلدون فقال عبد اللہ بن سلامؓ کذبتم ان فیھا الرجم فأتوا بالتوراۃ فنشروھا فجعل احدھم یدہٗ علیٰ اٰیۃ الرجم ثم جعل یقرأ ما قبلھا وما بعدھا۔ فقال لہٗ عبد اللہ ابن سلامؓ ارفع یدک فرفعھا فاذا فیھا اٰیۃ الرجم فقالوا صدق یا محمد فیھا اٰیۃ الرجم فامر بھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرجما۔ قال عبد اللہ بن عمرؓ فرأیت الرجل یحنی علیٰ امرأۃ یقیھا الحجارۃ انتھیٰ (سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۶۱)

(ترجمہ) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہودنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ زنا کے بارے میں تمہاری تورات میں کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان پر کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں، عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں تو زنا کی سزا رجم ہے، انہوں نے تورات کو لا کر کھولا تو ان میں سے ہی ایک شخص نے آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنا شروع کر دیں تو عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیتِ رجم موجود تھی، اس پر انہوں نے کہا کہ عبد اللہ واقعی تم سچے ہو تورات میں آیتِ رجم موجود ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (زانی اور مزنیہ) کے بارہ میں رجم کا حکم فرمایا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ مرد عورت پر جھکتے ہوئے پتھروں سے اس کو بچا رہا تھا۔"

اس حدیث میں یہودیوں کے جس سنگسار شدہ مرد اور عورت کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی باہمی محبّت کا یہ عالم تھا کہ عین سنگساری کے دوران بھی زانی مرد زانیہ عورت پر جھک کر آخر دم تک پتھروں سے اُسے بچانے کی کوشش کرتا رہا، کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ خیال تک دل میں لا سکتا ہے کہ یہاں مرد نے عورت کے ساتھ جو زنا کیا تھا وہ اختیاری نہیں بلکہ زنا بالجبر تھا؟ حالانکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں اصلاً مجرم نہیں نہ وہ سزا کی مستحق ہے، پھر اس پر سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کر کے یہ دوہرا ظلم کیوں کیا گیا؟

زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ھے

ذیل میں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ زنا بالجبر کی

صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر زنا کی حد جاری کی جا سکتی ہے۔

عن وائل ابن حجر قال استکرھت امرأۃ علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدرأ عنھا الحد واقامہ علی الذی اصابھا۔ (جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص۲۲)

(ترجمہ) "وائل ابن حجرؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو آپؐ نے عورت سے حد ساقط کر کے اسے معاف فرما دیا اور زنا کرنے والے مرد پر حد قائم کر دی"۔

وعنہ ان امرأۃ خرجت علیٰ عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترید الصلوٰۃ فتلقاھا رجل فتجللھا فقضی حاجتہ منھا فصاحت وانطلق ومرت عصابۃ من المھاجرین فقالت ان ذٰلک رجل فعل بی کذا وکذا فاخذوا الرجل فاتوا بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لھا اذھبی فقد غفر اللہ لک وقال للرجل الذی وقع علیھا ارجموہ۔

(جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص۳۱۱، ۳۱۲)

(ترجمہ) "یہ بھی وائل ابن حجرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت گھر سے نماز کے ارادہ سے نکلی، راستہ میں اسے ایک شخص ملا جس نے اسے پکڑ کر زبردستی اس سے زنا کیا، اس پر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جس سے گھبرا کر زنا کرنے والا شخص بھاگ گیا، اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت پہنچ گئی، عورت نے انہیں بتایا کہ فلاں آدمی نے مجھ سے جبراً زنا کیا ہے، انہوں نے اس آدمی کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا (اور عورت بھی اس کے ہمراہ تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تجھے معاف کیا ہے اور زانی مرد کے بارے میں رجم کا حکم فرمایا۔ (چنانچہ وہ آپؐ کے حکم سے رجم کر دیا گیا)"۔

اس حدیث کو اوپر والی روایتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو مجموعہ روایاتِ حدیثیہ اور نصوصِ قرآنیہ سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت اسلامی قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر قانونی سزا جاری کی جا سکتی ہے، دوسری یہ کہ قرآن و حدیث میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زنا کے واقعات میں جن لوگوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر واقعات زنا اختیاری سے متعلق تھے نہ کہ زنا بالجبر سے متعلق، ورنہ پھر عورت پر مرد کی طرح ہرگز یہ قانونی سزائیں جاری نہ کی جاتیں ——— بہرحال قرآن و حدیث کی رو سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی

مخفی نہیں ہے کہ اسلامی شریعت نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں، ان میں زنا بالاختیار اور زنا بالجبر میں کوئی فرق تسلیم نہیں کیا گیا ہے، نہ ہی اسلامی شریعت نے ان قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کیا ہے، بلکہ زنا کی یہ دونوں قسمیں اسلام کی نظر میں یکساں جرم ہیں اور مرتکب جرم سزا کا مستوجب ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ اسلام کی قانونی سزائیں دراصل زنا بالرضا ہی کے لیے مقرر کی گئی ہیں، کیونکہ ان قانونی سزاؤں سے اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کثرت زنا سے محفوظ رہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرے میں جو زنا کثیر الوقوع ہے یا ہو سکتا ہے وہ زنا بالجبر نہیں وہ زنا بالرضاء ہے اور اسی کے انسداد کے لیے اسلام نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں۔ تو اگر اس (زنا بالرضاء) کو ان سزاؤں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل کے مغرب سے متاثر بعض مسلم دانشور آخر کس معقول دلیل کی بناء پر زنا بالرضاء کو اسلامی قانون سے مستثنیٰ کر رہے ہیں؟

"کیا اس میں یہ راز پوشیدہ تو نہیں کہ یہ حضرات اپنے اس ملک میں زناکاری کے کاروبار میں قانون کے ذریعہ سے توسیع کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ملک میں یورپین تہذیب کی جڑوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہے ہیں؟ یا اس ملک میں پہلے سے جو عیاشی و فحاشی کا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے اسے یہ حضرات مزید تقویت اور ترقی دینا چاہتے ہیں؟" (اللّٰھم اھدنا وایاھم صراطك المستقیم، آمین)

(جواب جزء ۲) اب دوسرے سوال کا جواب سن لیجئے۔ یہ بات مسلّمات شریعت میں سے ہے اور امت مسلمہ کے ہاں طے شدہ ہے کہ جو حکم قرآن و حدیث میں منصوص طریقہ سے بیان کیا گیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اس پر اسلامی معاشرے میں عملدرآمد بھی رہا ہو، نیز کتاب و سنت سے اس حکم کا کسی مخصوص زمانے کے لیے ہونا یا کسی جزوی مصلحت پر مبنی ہونا بھی معلوم نہ ہو تو ایسے حکم میں تمام امت اور پوری ملت بھی مل کر قیامت تک ادنیٰ سے ادنیٰ ترمیم اور تغیر و تبدیل نہیں کر سکتی۔ ایسی کوئی بھی ترمیم ایک طرف آسمانی شریعت میں بندوں کی طرف سے ایک تحریف ہے اور دوسری طرف ان کی جانب سے ایک مکمل تشریع ہے اور آسمانی شریعتوں میں اُمتیں تحریف کی مجاز نہیں ہیں اور نہ مستقل تشریع کا حق رکھتی ہیں۔ مشرکین مکہ نے اس قسم کی ترمیموں اور تبدیلیوں کا مطالبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے یہ کہا کہ ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ "ہمیں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسمیں

ہماری منشاء کے مطابق کوئی تبدیلی کرو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مطالبہ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ملی : قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔ سورۃ ۔۔) (ترجمہ) "ان سے یہ کہدو کہ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے خدا کے اس قانون میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرسکوں، میرا حق صرف اس قانون کی حرف بحرف پابندی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بذریعہ وحی بھیجا جا رہا ہے"۔ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین اور احکام میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تو دوسرے لوگوں کو ایسی ترمیم اور تبدیلی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے ؟ قرآن کریم نے اس حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی ہے کہ جو لوگ اپنی خود ساختہ قانون سازی کے ذریعہ سے خدائی احکام میں تبدیلی کرتے ہیں پھر لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہمارا بنایا ہوا یہ قانون بھی اسلامی قانون کا حصہ اور مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل ہے، ایسے لوگ خدا کی نظر میں بڑے مبغوض اور عذابِ عظیم کے مستحق ہیں، ارشادِ ربانی ہے :۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (البقرہ)

(ترجمہ) "وہ لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اپنے ہاتھوں سے کوئی کتاب (قانون) لکھ لیتے ہیں، پھر لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا قانون ہے (ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں) کہ اس سے اپنے لیے دنیا کا قلیل منافع حاصل کریں، یہ لوگ ایسی قانون سازی کی وجہ سے بھی مبتلائے عذاب ہوں گے اور جو منافع ان کو اس سے حاصل ہوگا اس کی وجہ سے بھی ہلاکت نصیب ہوگی"۔

بہرحال قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں پوری نوعِ انسانی کے افراد مل کر بھی کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کر نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی نوعیت مستقل تشریع (شریعت سازی) کی ہے اور تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے، البتہ غیر منصوصی مسائل اور معاملات میں ثبوتِ احکام کیلئے منصوصاتِ شرعیہ سے اجتہاد کے ذریعہ سے احکام اخذ کرکے مستنبط کیے جا سکتے ہیں مگر تشریع کا مجاز کوئی بھی فرد بشر نہیں ہو سکتا ـــــ اور جب یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی فرد بشر شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں کر سکتا تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زنا جیسے قبیح جرم کی اسلامی شریعت نے جو قانونی سزائیں مقرر کی ہے اُن سے کوئی بھی با اقتدار جماعت یا ادارہ زنا بالاختیار کو

مستثنیٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

(جواب بحث ۲۳۱ م ر ہا تیسرا سوال کہ حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ قرآن و حدیث نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اُسی کو پیش کر دوں، نیز فقہاء اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسے لوگوں کے حق میں جو احکام صادر کئے ہیں انہیں کو بیان کر دوں۔

قرآن کریم اور تحلیل حرام | یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور پوری ملت اسلامیہ اس پر متفق ہے کہ کائنات عالم کا واحد مالک اور بلا شرکت غیرے حقیقی حاکم اور حکمران صرف اللہ رب العالمین ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خاص ملکیت ہے اور سب کا اصل حاکم وہ ہے۔ جب تمام کائنات کا خالق و مالک وہی ہے تو تمام کا حاکم بھی وہی رہے گا اور تمام کائنات میں حکم اور قانون بھی اُسی کا چلے گا۔ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین۔ "یہ حقیقت ہے کہ پیدائش بھی خاص اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا، اللہ بڑا بابرکت اور تمام جہانوں کا مالک ہے"۔ ان الحکم الا للہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ۔ "حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے، اُسی نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت و پرستش نہ کرو"۔ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔ "وہ اپنے حکم اور فیصلے میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

قانون کی اس بنیادی دفعہ کے تحت اشیاء کی تحریم اور تحلیل دونوں کا حق اور اختیار صرف خالق اشیاء کو حاصل ہے مخلوق کو قطعاً اس کا حق حاصل نہیں ہے، اس بارہ میں قرآن کریم کا فیصلہ انتہائی صاف اور واضح ہے۔ اُس نے جس طرح تحریم حلال (خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جاننے کی قطعی ممانعت ممانعت کر رکھی ہے اور فرمایا ہے کہ: لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ "وہ پاکیزہ چیزیں حرام نہ سمجھو جو خدا نے تمہارے لئے حلال کر رکھی ہیں اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اور فرمایا ہے کہ: لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔ "کیوں حرام کرتے ہو اپنے اوپر وہ چیزیں جو خدا نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں"۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ "تحقیق بڑے خسارہ میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے علم کے بغیر حماقت اور نادانی سے اپنی اولاد کو قتل کیا ہے اور

خدا نے ان کو جو حلال رزق دیا ہے اُسے خدا پر جھوٹ باندھ کر حرام سمجھ رکھا ہے"۔ بعینہٖ اسی طرح قرآنِ کریم نے تحلیلِ حرام (خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے) کی بھی قطعی طور پر ممانعت کر رکھی ہے، ارشادِ ربانی ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلَالٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ۔ "یعنی مت کہو ان چیزوں کو جنہیں تمہاری زبانیں جھوٹ کے طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں، اس کا انجام خدا پر جھوٹ باندھنا ہے"۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْھَدْیَ شَعَآئِرَ اللّٰہِ "اشہرِ حرام اور قربانی کے جانوروں کی ہتک و حرمت کو حلال نہ سمجھو"۔ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ۔ "یہ لوگ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں"۔

ان آیات میں صریح طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تحریم اور تحلیل کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے بالذات کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، یہ حقیقت بھی قرآنِ کریم سے واضح ہے کہ جو چیزیں آسمانی شریعتوں کی رُو سے قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں، انہیں جب بھی کسی نے حلال سمجھنا شروع کیا آسمانی شریعتوں سے اس کا تعلق بحال نہیں رہا ہے بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے کفر اور عالمِ اسلام کے مابین حدِ فاصل مقرر کی ہے کہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو دل سے حرام سمجھنے اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو دل سے حلال جاننے کا مضبوط اعتقاد رکھا جائے، اس اعتقاد کے بغیر کوئی شخص نہ مؤمن سمجھا گیا ہے نہ مسلم ـــــ مثال کے طور پر شرک ہی کو لیجئے، اس کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں آسمانی شریعتوں کی رُو سے حُرمتِ قطعی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جب بھی کسی نے اس کو جائز اور حلال سمجھا ہے تمام آسمانی شریعتوں نے اسے اپنے دائرہ سے خارج تسلیم کیا ہے اور اس کا تعلق ہر آسمانی شریعت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

حدیثِ رسولؐ اور تحلیل و تحریم | قرآنِ کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی تحلیل و تحریم کے بارے میں وہی فیصلہ ملتا ہے جو قرآنِ کریم نے اس بارے میں کیا ہے۔ یعنی سنتِ رسولؐ کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ جس نے خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جانا اس کا اسلامی شریعت سے تعلق بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع رہے گا۔

علماء اور مشائخ کے بارے میں اہلِ کتاب کا عقیدہ | قرآن مجید میں یہودی عوام

اور عیسائیوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے سوا اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا، ارشاد ربانی ہے: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۃ آیت) جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اہل کتاب میں سے ایک یہودی عالم "عدی ابن حاتم" جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ! ہم نے تو کسی عالم یا درویش کو خدا نہیں کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اما کانوا اذا احلوا لهم شیئًا استحلوه واذا حرموا علیهم شیئًا حرموه؟ قال نعم، قال هو ذلك۔ او کما قال (ترمذی) "کیا وہ ایسے نہیں تھے کہ جب ان کے علماء اور مشائخ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب کوئی چیز ان پر حرام کرتے تو وہ اسے حرام سمجھتے؟ عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسے تو تھے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کا شرک تھا۔"

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا کہ خدائی شریعت سے سند حاصل کئے بغیر جب یہود کے علماء اور مشائخ عوام پر کوئی چیز حرام کرتے تو کیا عوام اُسے حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اسی طرح اگر خدائی شریعت سے دلیل حاصل کئے بغیر کسی چیز کو ان کیلئے حلال کرتے تو یہودی عوام اسے حلال نہیں سمجھتے تھے؟ اس کے جواب میں عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسا تو تھا ہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو بے سند تحلیل و تحریم تھی جس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہوئے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ جو بھی شخص یا ادارہ اور جماعت خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے گا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام سمجھے گا اسلام کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

فقہاء اسلام کا فیصلہ | قرآن و حدیث کے ان واضح احکامات کی روشنی میں فقہاء اسلام نے بھی اس بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو قرآن و حدیث کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شرح العقائد" میں لکھا ہے کہ استحلال المعصیۃ کفر اذا ثبت کونها معصیۃ بدلیل قطعی "گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو" آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

وعلیٰ هذا تفرع ما ذکر فی الفتاویٰ من انه اذا اعتقد الحرام حلالًا فان کانت

حرمتہ لعینہ وقد ثبت بدلیل قطعی یکفر والا فلا بان تکون حرمتہ لغیرہ اوثبت بدلیل ظنی۔ وبعضہ لم یفرق بین الحرام لعینہ ولغیرہ وقال من استحل حراماً وقد علم فی دین النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحریمہ کنکاح المحارم کافر۔

(بحوالہ شامی ج ۲ ص۳۱۵، ص۳۱۶)

(ترجمہ) اسی قاعدے پر وہ مسئلہ مبنی ہے جو کتب فتاویٰ میں ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حرام کو حلال جانے تو اگر وہ حرام لذاتہ ہو اور اس کی حرمت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو تو یہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس کی حرمت لغیرہ ہو یا وہ دلیلِ قطعی سے ثابت نہ ہوئی ہو تو کافر نہ ہوگا، اور بعض علماء نے حرام لعینہ اور لغیرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ مطلقاً یہ کہا ہے کہ دونوں کا مستحل کافر ہو گا بشرطیکہ دینِ نبوی میں اس کی حرمت کا ثبوت معلوم ہو جیسے نکاحِ محارم۔"

علامہ ابن عابدینؒ نے مندرجہ بالا دونوں مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

وحاصلہ ان مشروط الکفر علی القول الاول شیئان قطعیۃ الدلیل وکونہ حراماً لعینہ وعلی الثانی یشترط الشرط الاول فقط وقد علمت ترجیحہ۔ اھ

(ترجمہ) "اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ کفر کی شرط بنا بر قول اول دو چیزیں ہیں۔ ایک دلیل کا قطعی ہونا اور دوسرے اس کا حرام لعینہ ہونا۔ اور بنا بر قول ثانی کفر کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ حرمت کی دلیل قطعی ہو اور بس؛ اس قول کا راجح ہونا معلوم ہے۔"

اسی کے قریب قریب وہ مضمون ہے جو تفتازانیؒ نے "شرح العقائد العضدیہ" میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

واستحلال المحرمات کفر ولا بد من التقیید بکون تحریمہ مجمعاً علیہ دون تکون حرمتہ من ضروریات الدین، وبدون القید الثانی ان کان الاجماع مستنداً الی الظن لا یثبت ایضاً وکذا ان کان مستنداً الی دلیل قطعی ولم یکن مشتہراً بحیث یکون من ضروریات الدین۔

(شرح العقائد العضدیۃ ص۱۰۵)

(ترجمہ) "محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ ان کی حرمت اتفاقی ہو، نیز ان کی حرمت ضروریاتِ دین میں سے ہو، اور اگر ان کی حرمت اتفاقی نہ ہو بلکہ اختلافی ہو تو کفر ثابت اصلاً نہ ہوگا اور اگر ان کی

حرمت ضروریات دین میں سے نہ ہو مگر اتفاقی ہو تو اگر یہ اجماع مبنی بر ظن ہو تو پھر بھی کفر ثابت نہ ہوگا، اسی طرح اگر وہ مبنی بر دلیل قطعی ہو مگر دین میں اس کی حرمت اس قدر مشہور نہ ہو چکی ہو کہ ضروریات دین میں شمار ہوتے کے قابل ہو تو اس وقت بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا تصریحات کا ماحصل | فقہاء اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے جو امور بطور ماحصل ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) کسی چیز کی حرمت اگر قطعی ہو اور لذاتہٖ بھی ہو، نیز دینِ نبویؐ میں اس کی حرمت اس قدر مشہور ہوئی ہو کہ وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتی ہو، تو ایسی حرام چیز کو حلال سمجھنا بالاجماع کفر ہے اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) لیکن اگر اس کی حرمت قطعی تو ہو مگر لذاتہٖ نہ ہو یا لذاتہٖ بھی ہو مگر ضروریات دین میں سے نہ ہو تو ایسی چیز کو حلال سمجھنے والے آدمی کا کفر مختلف فیہ ہے، جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کا قطعی ہونا فقط کافی ہے، لذاتہٖ ہونا اور ضروریات دین میں سے ہونا ان کے نزدیک شرط نہیں ہے ان کے نزدیک تو کافر ہے کیونکہ حرمت کی قطعیت دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ اور جن کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کی قطعیت اور اس کا لذاتہٖ ہونا دونوں ضروری ہیں، ان کے نزدیک پہلی صورت میں کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف حرمت کی قطعیت ہے، اور لذاتہٖ حرمت نہیں ہے، اور دوسری صورت میں کفر ہے کیونکہ اس میں حرمتِ قطعیہ کے ساتھ اس کا لذاتہٖ ہونا بھی موجود ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرمت مشہور اور ضروریات دین میں سے ہو ان کے نزدیک ۲ میں کفر اصلاً نہیں ہے کیونکہ یہ حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم زنا کی حرمت پر غور کرتے ہیں تو وہ حرمتِ قطعی بھی ہے اور لذاتہٖ بھی اور اس قدر مشہور بھی ہو چکی ہے کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہو گئی ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنا بالاجماع موجبِ کفر ہوگا ـــــ اس اجماعی فیصلہ کے تحت آپ خود غور فرمائیں کہ جو لوگ محرماتِ شرعیہ کو حلال سمجھ رہے ہیں قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے ان واضح فیصلوں کی روشنی میں ان کا انجام کیا ہوگا؟

ہم اور تکفیر | لیکن ہم بذاتِ خود کسی شخص یا ادارہ پر کفر کا فتویٰ دینے سے اس بناء پر معذور اور قاصر ہیں کہ فتویٰ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ مفتی کو اس بات کے متعلق یقینی علم

حاصل ہو کہ جس شخص یا ادارہ پر وہ کفر کا فتویٰ دے رہا ہے اس کے دل میں قطعیات اور ضروریات دین سے قطعی طور پر انکار پایا جاتا ہے اور یہ علم ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کفر کا فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان ممبران اسمبلی کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کو راہ راست اور راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جنہوں نے زنا بالاختیار کو شرعی سزاؤں سے مستثنیٰ قرار دینے کا غلط اقدام کیا ہے، اور ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اپنے اس فیصلہ پر جلد از جلد نظر ثانی فرما کر خدا و رسول ؐ کی ناراضگی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا خطرہ مول نہ لیں۔ امید ہے جملہ ممبران اسمبلی ہماری اس اپیل کو صدا بصحرا ثابت نہ ہونے دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ (آمین)

قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ایک شخص پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اسلحہ کی نوک پر زبردستی میرے ساتھ بدفعلی کی ہے، لڑکے نے اس واقعہ کی تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے اور معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، ملزم اس فعل بد سے انکاری ہے جبکہ لڑکے کے پاس اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ بھی نہیں البتہ میڈیکل رپورٹ لڑکے کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور مذکورہ شخص اس عمل بد کی وجہ سے مشہور و معروف اور کافی بدنام ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عدالت اس شخص کو اس فعل بد میں شہرت اور میڈیکل رپورٹ کی بناء پر سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی جرم کے اثبات کے لیے محض دعویٰ کرنا کافی نہیں جب تک شریعت کے مطابق شہادت موجود نہ ہو، البتہ قرائن اور شہرت کی وجہ سے جب قاضی (جج) کو اس شخص کے متہم بالفعل ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر محض سیاستۃً سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق اگر میڈیکل رپورٹ اور اس فعل بد میں مذکورہ شخص کی شہرت کے بارے میں عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے مدعی کے ساتھ بدفعلی کی ہے تو عدالت اسے تعزیراً سزا دے سکتی ہے، اور اس قسم کے واقعات میں عدالت اطمینان کر لینے کے بعد مجرم کو سیاستۃً

سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ومن یتھم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسہ واخلدہ فی السجن حتی یتوب لأن شر ھٰذا علی الناس وشر الاول علی الناس۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۷۶ کتاب الحدود باب التعزیر مطلب فی تعزیر المتہم) [1]

❋

---

[1] لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) محض عورت کے کہنے سے مرد پر سیاستہ تعزیر نہیں ہوسکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اخر سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیراً کچھ سزا دی جاسکتی ہے، مگر قاضی آجکل کہاں؟ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے، تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلہ قاضی کے ہے اگر وہ مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرتے ہوں۔ واللہ اعلم
(امداد الاحکام ج ۳ ص ۱۲۸ کتاب الحدود)

كتاب الاشربة

كل مسكر خمر
وكل مسكر حرام

کتاب الاشربۃ

(اشربہ (نشہ آور اشیاء) کے احکام ومسائل)

نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم

سوال:۔ نسوار کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نسوار چونکہ تمباکو سے ہی بنتی ہے لہٰذا اس کا استعمال تمباکو کی طرح فی نفسہٖ مباح اور جائز ہے کیونکہ اس میں نہ نشہ ہے اور نہ مستی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فانہ لم یثبت اسکارہ ولا تفتیرہ ولا اضرارہ بل ثبت لہٗ منافع فھو داخل تحت قاعدۃ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ وان فرض اضرارہٗ للبعض لایلزم منہ تحریمہ علیٰ کل واحد۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۶ کتاب الاشربۃ)

البتہ نسوار کی بدبو کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے نیز اس میں اسراف اور تبذیر کے علاوہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضرِ صحت ہے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا شرب الماء وغیرہ من المباحات بلھو وطرب علیٰ ھیئۃ الفسقۃ حرامٌ۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ)[1]

گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے

سوال:۔ جو شراب گنے کے رس سے بنائی گئی ہو اُس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

---

[1] قال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ: وقد حقق المتاخرون من اھل مذھبنا الحنفیۃ انہٗ لیس بحرامٍ وانما فی تعاطیہ الکراھیۃ وقد قدمنا ان احسن ماقیل فیہ قول الامیر رحمہ اللہ فاختلف فیہ الدخان والورع ترکہ۔

{ الفتاویٰ الکاملیۃ ص۲۸۶ کتاب الحظر والاباحۃ
مطلب فی حکم شرب الدخان فی مجلس قراءۃ القرآن }

الجواب:۔ انگور اور کھجور سے بنائی گئی شراب تو بالاتفاق حرام ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے تو ایسی شراب امام محمد رحمہ اللہ کے مفتی بہ قول کے مطابق حرام ہے کیونکہ یہ نشہ آور شراب ہے، ظاہر حدیث سے ہر مسکر شراب کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

لما اخرجہ الامام مسلمؒ: کل مسکر حرام۔ (الصحیح المسلم ج۲ ص۱۶۷ باب بیان ان کل مسکر حرام)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: والکل حرام عند محمدؒ وبہ یفتی۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ) [۱]

اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے حتیٰ کہ زندگی افیون کھانے میں گذر گئی، اب بوڑھا ہو گیا ہے، ایسے آدمی کا افیون کھانا اور اس کو کھلانا یا اس بارے میں اس سے تعاون کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص افیون کھانے کا ایسا عادی ہے کہ افیون چھڑانے کی صورت میں اس کی موت واقع ہونے کا خدشہ ہو تو افیون کھانا اس کے لیے جائز ہے اور اس کی اعانت کرنا بھی جائز ہے، اور اگر ایسی حالت نہیں تو کھانا اور کھلانا دونوں طرح ناجائز ہے بشرطیکہ ایسا شخص تدریجاً افیون چھوڑنے کی کوشش اپنے اوپر لازم کرلے ورنہ سخت گنہگار ہوگا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: سئل ابن حجر عن من ابتلی باکل نحو الافیون وصار ان لم یاکل منہ هلک اجاب ان علم ذلک قطعًا حل لہ بل وجب لاضطرارہ الی ابقاء روحہ کالمیتۃ للمضطر ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئًا فشیئًا۔ (رد المحتار ج۵ ص۴۰۸ کتاب الاشربۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: کل شراب اسکر فهو حرام۔ رواہ البخاری (تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الهدایۃ ج۴ ص۴۹۸ کتاب الاشربۃ۔

[۲] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: فاقتضیٰ ذلک وجود الاباحۃ بوجود الضرورۃ فی کل حال وجدت الضرورۃ فیها۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۳۶ باب ذکر الضرورۃ المبیحۃ لاکل المیتۃ)

الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم

سوال:۔ یورپی ممالک سے درآمد شدہ خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل شامل ہوتی ہے، تو کیا بدن اور کپڑوں پر ان کی اسپرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسی حالت میں نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جن خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل ملی ہوتی ہے اگر یہ الکحل انگور یا کھجور کی ہو تو بالاتفاق ایسی خوشبو کا استعمال ناجائز ہے کیونکہ خوشبو میں الکحل کا استعمال بلاضرورت ہے اور بلا عذر شرعی شراب کا استعمال خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وحرم الانتفاع بها ولو لسقی دواب او لطین او قطر للتلهی او فی دواء او دهن او طعام او غیر ذلك۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۸۹ کتاب الاشربة)

اگر یہ الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے بنی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، اگرچہ متقدمین علماء نے امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن متاخرین محققین نے عموم بلویٰ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو توسع کی خاطر قابلِ عمل قرار دیا ہے کہ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسرے الکحل ملے پرفیومز کا استعمال حرام نہیں۔

قال العلامة محمد تقی العثمانی: ان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرها لاتتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیره کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذٍ هنالك فسحة فی الاخذ بقول ابی حنیفةؒ عند عموم البلوی۔

{تکملة فتح الملهم ج ۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربة حکم الکحول المسکرة}

تاہم اگر استعمال نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں

سوال:۔ ایک شخص افیون، بھنگ، چرس کے استعمال کا عادی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے اس شخص پر

کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوتا، اگر یہ شخص ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور ترک نہ کرے تو کیا شرعاً اس کے لیے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشۃ والافیون لانہ مفسد للعقل ویصد عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ)

لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے، ان مضر اشیاء کے استعمال کی اجازت نہ عادی کو ہے نہ غیر عادی کو، بلکہ عادی پر واجب ہے کہ ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ کمی کرتا جائے تاکہ ایک وقت آئے اور جان چھوٹ جائے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۰۸ کتاب الاشربۃ)[1]

نیگونہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق

سوال:۔ فیجی آئرلینڈ میں نیگونہ (NAGONA) نامی ایک پودا پایا جاتا ہے جس کی جڑیں خشک کرکے اس میں پانی ملا کر لوگ پیتے ہیں جس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں: ۱۔ پینے کے بعد آدمی خاموش رہتا ہے ۲۔ زیادہ استعمال کرنے سے جوان بوڑھا نظر آتا ہے ۳۔ زیادہ استعمال سے جسم پر سفید لکیریں نکل آتی ہیں۔ ۴۔ ہاتھ سخت اور بدن خشک ہو جاتا ہے ۵۔ بدن میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۶۔ اکثر ممالک میں اس کو نشہ آور سمجھ کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پودے کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ سوال میں ذکر کردہ مضر اثرات کی وجہ سے نیگونہ (Nagona) پودے کی جڑوں کا شربت استعمال کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ بدن پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں جبکہ یہ نشہ آور بھی ہے، شریعتِ مقدسہ نے کسی بھی مضر صحت و بدن چیز کے استعمال سے

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر بن الحدادالیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشۃ والافیون وذٰلک کلہ حرام۔ (الجوهرۃ النیرۃ ج ۲ ص۲۷ کتاب الاشربۃ)
ومثلہٗ فی فتاوی الکاملیۃ ص۲۷ کتاب الاشربۃ۔

منع کیا ہے، جیسے زہر میں نشہ تو نہیں مگر پاک ہے لیکن اس کا استعمال حرام ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : کالسم القاتل فانه حرام مع انه طاهر۔

(ردالمحتار ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربة)

اور اس پودے (نیگونہ) میں تو نشہ بھی ہے لہٰذا اس کا استعمال حرام ہے، اگرچہ اس پودے کا ذکر فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وھکذا یقال فی غیرہ من الاشیاء الجامدة المضرة فی العقل اوغیرہ یحرم تناول القدر المضر دون القلیل۔ اگر نشہ آور کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ وقال محمدؒ ما اسکر کثیرہ فقلیله حرام۔

(ردالمحتار ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربة)[1]

بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک قریب المرگ مریض جس پر ہر قسم کا علاج آزمایا گیا لیکن کارگر نہ ہوا، اس کے لیے ڈاکٹر نے آخری علاج کے طور پر شراب تجویز کی ہے، کیا ایسے مریض کے لیے بقدر ضرورت شراب پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کو تجربات سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ شراب سے مریض کو شفاء مل جائے گی تو ضرورتاً اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ شراب کے علاوہ دوسری دوا نہ ہو اسلئے کہ حالتِ اضطرار میں حرام چیز کا استعمال بقدر ضرورت جائز ہے۔

لما فی الھندیة : ولو ان مریضاً اشار الیه الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعة ائمة بلخ انه ینظر ان کان یعلم یقیناً انه یصح حل له التناول۔ (الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ : وعن ابن عمر انه علیه الصلوٰة والسلام قال ما اسکر کثیرہ فقلیله حرام۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربة)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربة

[2] قال العلامة الکاسانیؒ : انه یحرم شرب قلیلھا وکثیرھا الا عند الضرورة۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱۲ کتاب الاشربة)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۴ ص۲۱۵ کتاب الاشربة۔

بطورِ دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم

سوال :۔ ایک شخص کی قوتِ سامعہ خراب ہے، ڈاکٹروں نے بطور علاج شراب کے چند قطرے خارجی طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی ہے، کیا یہ طریقہ علاج شرعاً جائز ہے؟

الجواب :۔ متقدمین فقہاء کے نزدیک شراب کا داخلی وخارجی استعمال اور اس سے نفع لینا حرام ہے۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ویکرہ الاحتقان بالخمر واقطارھا فی الاحلیل لانه الانتفاع بالمحرم۔ (الھدایة ج۴ ص۵۰۵ کتاب الاشربة)

لیکن متاخرین نے جب بطور تداوی کے شراب کے داخلی استعمال کی اجازت دی ہے تو خارجی استعمال کے مرخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی الھندیة: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔
(الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات) [1]

الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال :۔ جن دوائیوں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اُن کا استعمال ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق جائز ہے یانہیں؟

الجواب :۔ انگریزی ادویات کے استعمال کے بارے میں متاخرین فقہاء کرام کا قول یہ ہے کہ اگر ان ادویات میں شراب یاکسی اور حرام شے کا اختلاط یقینی یا ظنِ غالب کے طور پر معلوم ہو تو ان کا استعمال شرعاً جائز ہے جبکہ اس میں شفاء کا امکان ہو، اگر ان دوائیوں میں الکحل کا صرف احتمال (شک) ہو تو پھر ایسی دوائیوں کے استعمال کرنے میں مزید گنجائش نکلتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: فی النھایة عن الذخیرة یجوز ان

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: اما اذا علم ولیس لہ دواء غیرہ یجوز۔
(ردالمحتار ج۵ ص۲۱۵ باب المتفرقات، مطلب فی التداوی)
ومثلہ فی البحرالرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربة۔

علم فیہ شفاء ولم یعلم دواء اخر۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۴۰ مطلب فی التداوی فی المحرم) ؎۱

افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم

سوال: بطور دوائی افیون کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جس طرح دیگر حرام اشیاء کا بوقتِ ضرورت بطور دوائی استعمال جائز ہے اسی طرح افیون کا استعمال بھی دوائی کے طور پر جائز ہے بشرطیکہ حدِ سکر کو نہ پہنچے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: من غاب عقلہ بالبنج والافیون یقع طلاقہ اذا استعملہ للھو وادخال الافات قصداً لکونہ معصیۃ وان کان للتداوی فلا لعدمھا۔ کذا فی فتح القدیر وھو صریح فی حرمۃ البنج والافیون لا للدواء۔ (رد المحتار ج ۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ) ؎۲

سیون اپ اور کوکا کولا پینے کا حکم

سوال: سیون اپ اور کوکا کولا مشروبات کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں الکحل ملا ہوتا ہے اس لحاظ سے ان مشروبات کا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سیون اپ اور کوکا کولا کے بارے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ان میں الکحل کی ملاوٹ نہیں ہوتی، صرف شک کی بناء پر یہ بات کی گئی ہے، ایسے شک سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ محض شک کی بناء پر اگر کوئی احتیاطاً مذکورہ مشروبات نہ پیئے تو ٹھیک ہے لیکن ان کا پینا حرام نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز ؒ: وھذا بناء علی ان الشک یورث الاحتیاط دون الحرمۃ لان الیقین لا یزول بالشک۔ (شرح المجلۃ الاحکام، المادۃ ۴ ص۲۰) ؎۳

؎۱ و ؎۲ لما فی الھندیۃ: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح ما یقوم مقامہ۔ (الفتاوی الھندیہ ج ۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ۔

؎۳ قال العلامۃ الشیخ الزرقا ؒ: ومعناھا ان ما کان ثابتاً متیقناً لا یرتفع بمجرد طرو الشک علیہ لان الامر الیقینی لا یعقل ان یزیلہ ما ھو اضعف منہ بل ما کان مثلہ او اقوی۔ (شرح القواعد الفقہیہ ص۳۷ القاعدۃ الثالثۃ الیقین لا یزول بالشک)

فتاوٰی رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فقیہ الزمان حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فتاوٰی رشیدیہ میں حقہ کشی کو مباح قرار دیا ہے۔ تو کیا ان کے اس قول کا فقہ حنفی میں کچھ ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حدیث شریف کے ان الفاظ کل دخان حرام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں ۔

الجواب :۔ ذوی العقول اہلِ اسلام پر مخفی نہ ہو کہ حقہ کشی کا حدوث سن ایک ہزار ہجری (۱۰۰۰ھ) کے بعد ہوا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک علماء مذاہب اربعہ کے اس کے بارے میں نظریات رہے ہیں، بعض نے حرمت کا حکم دیا ہے، بعض کراہتِ تحریمیہ کی طرف مائل ہیں اور بعض دوسرے کراہتِ تنزیہیہ کے قائل ہیں اور بعض نے اباحتِ مطلقہ کا حکم لگایا ہے۔

اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبارات مع مالہا و ما علیہا کو حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے اپنے ایک رسالہ "ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان" میں کی ہے۔ مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری اور انتہائی مفید ہے اور پوری تشفی کی امید اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر بھی آپ کے سوال کے حوالے سے یہاں چند ضروری باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں : اضطربت آراء العلماء فیہ فبعضھم قال بکراھتہ وبعضھم قال بحرمتہ وبعضھم باباحتہ وافردوہ بالتالیف وفی شرح الوھبانیۃ للشرنبلالیؒ ۔

ویمنع من بیع الدخان وشربہ
وشاربہ فی الصوم لا شک یفطر

وللعلامۃ الشیخ علی الاجھوری رسالۃ نقل فیھا انہ افتی بحلہ من یعتمد علیہ من ائمۃ المذاھب الاربعۃ قلت والف فی حلہ سیدنا العارف عبد الغنی النابلسی الحنفیؒ رسالۃ سماھا الصلح بین الاخوان فی اباحۃ شرب الدخان واقامۃ الطامۃ الکبرٰی علی القائل بالحرمۃ او بالکراھۃ فانھما حکمان

شرعیان لا بد لهما للبعض لا یلزم منه تحریمهٗ علیٰ کل احد۔ انتہیٰ ۔ یہ تمام عبارات "شامی ج۵ کتاب الاشربۃ" میں موجود ہیں۔

اور عبدالغنی نابلسیؒ "حدیقہ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں لکھتے ہیں: من البدع العادیۃ استعمال التتن والقھوۃ۔ انتہیٰ

اور شیخ عبدالخالق زجاجی زبیدی حنفیؒ اپنے بعض فتاویٰ میں لکھتے ہیں: قد تکلم العلماء المتاخرون فی ذٰلک لانهٗ لم یکن فی القرون السابقۃ فمن مفرط فی ذمه حتی جزم بالحرمۃ ومن مفرط فی مدحه ومنهم من توسط وقال انهٗ مکروہ تحریمًا وھٰذا عندی احسن الاقوال واعدلها اذ لا قاطع بتحریمه ولیس کل موذٍ ومنتن حرامًا والا لکان اکل الثوم والبصل والفجل والکراث حرامًا ھٰذا کله فی شرب دخانه واما اکله وشمهٗ فھو مکروہ تنزیهًا عندی لانها دون شرب دخانه۔ انتہیٰ ملخصًا۔ (یہ عبارات مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۹۶ سے نقل کی گئی ہیں)

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ علماء کے اس اختلاف کا منشا کیا ہے؟ تو ہمارے نزدیک اس اختلاف کا منشا وہی ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ حقہ قریب تین سو برس ہوئے کہ کفار نے نکالا ہے، پھر سب لوگوں میں شائع ہوا، اور اصل میں یہ ایک دوا ہے، بعض امراض کو نافع بھی ہے اور کثرت اس کی مضر ہے جیسا کہ کتب طب سے معلوم ہوتا ہے۔ اب پینے والوں کی مختلف غرضیں ہیں، مختلف مزاج ہیں، مختلف طور ہیں اور مختلف خیال اور مختلف عادتیں ہیں۔ کوئی مرض کے لیے پیتا ہے، کوئی شوقیہ پیتا ہے، کسی کو کچھ نافع ہے کسی کو مضر ہے، کوئی پی کر منہ صاف کرتا ہے، کوئی سڑا لیتا ہے، کوئی احتیاط سے پیتا ہے، کوئی بے احتیاطی سے، کوئی برا سمجھ کر پیتا ہے، کوئی اچھا جان کر پیتا ہے، یہاں تک کہ بعض روزہ میں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، کوئی بہت کثرت سے پیتا ہے، کوئی کبھی کبھی پی لیتا ہے، بعض کو اگر ایک گھنٹہ نہ ملے بے چین ہو جاتے ہیں، بعض کو کئی کئی روز تک خیال نہیں ہوتا۔ پھر تمباکو میں بھی بعض اقسام بہت تیز اور مضر ہیں، بعض کم درجے میں ہیں، کسی میں تو زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کسی میں نوبت نشہ یا فتور کی ہے کسی میں نہیں، کوئی ایسی چیز کے ساتھ مرکب ہے جس سے اس کی خباثت کم ہو جاتی ہے کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح حقہ اور نیچہ میں بھی، بعض نیچہ کے کپڑے پاک ہوتے ہیں کسی کے ناپاک، اور کسی کے مشتبہ، کوئی پیچوان ہے اس میں اثر قلیل آتا ہے، کسی میں زیادہ آتا ہے۔ کوئی

جلد جلد تازہ کیا جاتا ہے، کوئی کئی کئی دن تک سڑتا رہتا ہے، کوئی عام ہے کہ سب کا منہ لگتا ہے جیسے تکیوں کے حقے، کوئی خاص ہے۔ غرض نہ سب پینے والے برابر، نہ سب تمباکو ایک طرح کے، نہ سب حقہ و نیچہ ایک طرح کے، سب متفاوت اور مختلف، ہر ایک کا حکم الگ ہوا۔ پس اگر کسی نے ضرورتِ شدیدہ میں کسی مرض و شواد کے علاج کے لیے احتیاط سے بطور دوا کے کبھی کبھی ایک آدھ بار پی لیا تو چنداں جرم نہیں ہے، اور جو بعد ازالہ مرض بغیر ضرورت کے شوقیہ پیوے جیسا آجکل شائع ہے کہ یہی محفل کی زیب و زینت ہوگئی ہے اور اسی کی خاطر و تواضع رہ گئی اس کے نہ ملنے کی شکائتیں ہوتی ہیں کہ فلانے نے حقہ تک بھی نہیں پلایا اور زبان سے برا کہتے ہوں اور شاید دل میں بھی برا جانتے ہوں مگر ظاہر میں بے باکانہ اس کو پیتے ہیں اور ذرا بھی محجوب و منقبض نہیں ہوتے اور آخر میں مضر بھی ہوتا ہے اور منہ میں برابر بدبو آتی ہے، اور ہر دم منہ میں گھسا رہتا ہے اور حواس میں بھی کدورت آجاتی ہے اور تشبہ اہلِ نار کے ساتھ ہے کہ منہ اور ناک میں سے دھواں نکلتا ہے، اور خود دھواں اور آگ بھی آلہ عذاب کا ہے، اس کے ساتھ متلبس رہتے ہیں، اس طور اس کا عادی ہو جانا بسبب اجتماع ان امور کے بیشک برا اور سخت مکروہ ہے، پھر امور مذکورہ سابق کے تفاوت سے کراہت میں بھی تفاوت ہوگا۔ اور بعض پینے والے جو بداحتیاط ہیں اور سڑے ہوئے حقے اور ناپاک نیچے، تیز تمباکو پینے پیتے نشہ ہو جاتا ہے اور شراب کی سی مدہوشی ہوتی ہے، اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ حاصل یہ کہ کوئی حقہ زیادہ مکروہ کوئی کم مکروہ، کوئی حرام، کوئی ضرورت شدیدہ میں بطور دوا کے ایک آدھ بار مباح۔ اس تقریر پر درمیان اقوال علماء و فقہاء کے، جو اس کی اباحت، کراہت و حرمت میں مختلف ہیں، تطبیق بھی ممکن ہے، پس جیسا موقعہ کسی نے دیکھا ہوگا ویسا کہدیا ہوگا۔ بہر حال پینے والا اس کا اکثر حالتوں میں نہ کل حالتوں میں، گناہ سے خالی نہیں۔" انتہیٰ

حضرت تھانوی کی اس تقریر سے اختلافِ علماء و فقہاء کا منشاء اور ان کے اقوال کی تطبیق پر روشنی پڑگئی۔ دلائل کے اعتبار سے جب علماء و فقہاء کے اختلاف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعد تنقیح دلائل طرفین یہ واضح ہوتا ہے کہ حرمت کا قول تو لائق اعتبار نہ ہے کیونکہ حرمت قطعی دلیل تحریم پر موقوف ہوتی ہے جن علماء نے حرمت کا حکم دیا ہے انہوں نے کوئی قطعی دلیل اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ ان کے تمام ظنی دلائل بھی مخدوش ہیں، جیسا کہ مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ نے "ترویح الجنان" میں اس کی وضاحت کردی ہے۔ اور قول اباحت بلا کراہت بھی خدشات سے خالی نہیں ہے البتہ قول کراہت قابلِ اعتبار

ہو۔ اور بالفرض اگر اس کی حرمت ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس کے مختلف فیہ ہونے میں شک نہیں ہے
جیساکہ عباراتِ سابق سے معلوم ہوا کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی حرمت سے انکار کیا ہے
اور انہوں نے کراہت یا اباحت کا فتویٰ دیا ہے اور کراہت میں بھی بعض نے تحریمی کا قول کیا ہے
اور بعض نے تنزیہی کا۔ علامہ ابو السعودؒ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے اور کراہتِ تنزیہی
اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال ابوالسعود فتكون الكراهة
تنزيهية والمكروه تنزيهاً يجامع الاباحة۔ اگر حضرت گنگوہیؒ نے جن کو حضرت مولانا
شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقیہ النفس کا موزوں خطاب عطا فرمایا تھا، اس کی اباحت کا قول کر کے
فتویٰ دے دیا تو کون سے گناہ کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ نے ان
علماء و فقہاء کے اقوال و آراء اور دلائل کو ترجیح دی ہو جو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ اور خود
حضرت گنگوہیؒ بھی بہت بڑے درجے کے عالم ہیں اور تمام علوم اسلامیہ میں منصبِ امامت اُن
کو حاصل تھا مگر جو خصوصی مناسبت آپ کو فقہ اور حدیث سے تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ یہ علوم آپؒ کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ مشکل مسائل جن کے حل کرنے میں علماء
عصر حیران و پریشان رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے
کہ حضرتؒ نے اپنی تحقیق کی ہو اور ان کی تحقیق میں اس کی اباحت کسی درجہ میں ثابت ہو چکی ہو۔
اس کے علاوہ اگر انہوں نے اباحت کا قول کر کے فتویٰ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی وقت
اور حالت اور موقعہ میں بھی یہ کراہت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، نیز اگر کوئی اس کی اباحت
کا قائل ہو جائے تو یہ کفر تو نہیں، کیونکہ اس کی اباحت، کراہت اور حرمت میں اختلاف تو ہے۔
اور "شرح عقائد نسفی" اور اسی طرح "فتاویٰ بزازیہ" میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حرام مختلف فیہ
کے محلل کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور کل دخان حرام یہ حدیث کے الفاظ نہیں
ہیں بلکہ اصل حدیث اس طرح وارد ہے: كل مسكر خمر و كل مسكر حرام۔
(رواہ مسلم) یا یہ حدیث ہے: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل
مسكر و مفتر۔ (رواہ احمد عن ام سلمةؓ) جب یہ "کل دخان حرام"
حدیث کے الفاظ ہی نہیں ہیں تو ان پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ
فی نفسہٖ بقدرِ ضرورت واضح ہو گیا۔

فقط واللہ اعلم

كتاب القصاص والدية

کتاب القصاص والدیۃ

(قصاص اور دیت کے احکام ومسائل)

قاتل کو معاف کر دینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

سوال: ایک شخص نے دوسرے آدمی پر قتلِ عمد کا دعویٰ دائر کیا، اب اگر مقتول کے ورثاء گواہوں کے سامنے قاتل کو معاف کر دیں تو بعد میں کسی وجہ سے دوبارہ قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: ورثاء کا قاتل کو باقاعدہ معاف کر دینے کے بعد حقِ قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کو دوبارہ مطالبۂ قصاص کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی ایک وارث کے معاف کر دینے سے بھی بقیہ ورثاء کو قصاص لینے کا حق نہیں رہتا۔

وفی الهندیۃ: ومن عفا عن ورثۃ المقتول فلا سبیل الی القصاص۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۶ ص۲۲ الباب السادس فی الصلح والعفو)[1]

صلح ہو جانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا

سوال: ایک آدمی مثلاً زید نے کسی کو عمداً قتل کیا جس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا کہ مقتول کے ورثاء نے دیت لے کر مقدمہ کی پیروی چھوڑ دی جس کی وجہ سے زید پھانسی کی سزا سے بچ گیا لیکن عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا سنا دی ہے کیا یہ سزا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: قتلِ عمد میں قصاص لینا ورثاء کا شرعی حق ہے جبکہ ورثاء قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں اور دیت لے کر صلح بھی کر سکتے ہیں، صورتِ مسئولہ کے مطابق ورثاء

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازی رحمہ اللہ: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۵ بحث تنازع اهل العلم فی معنی قولہ تعالیٰ: فمن عفی لہ من اخیہ شیٔ۔ الآیۃ)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۶ بیان ما یسقط القصاص بعد وجوبہ، کتاب الجنایات۔

نے جب دیت لے کر قاتل کو معاف کر دیا تو حکومت کو مزید سزا دینے کا کوئی حق نہیں، اس لیے اب عدالت کا اسے عمر قید کی سزا سنانا مروجہ قانونی سزا تو ہو سکتی ہے شرعی نہیں۔

لما قال الله تعالیٰ: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ...... فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸)

قال العلامۃ المرغینانیؒ: انها نزلت فی الصلح۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۴۳ کتاب الصلح)[1]

بدلِ صلح صرف قاتل پر ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے باپ کو کسی نے قتل کیا ہے، بیٹا اب صلح کرنا چاہتا ہے تو کیا قاتل کے ورثاء دیت ادا کرنے کے پابند ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صلح کی صورت میں بدل صرف قاتل پر واجب ہے دیگر رشتہ دار صرف بطور احسان تعاون کر سکتے ہیں۔

کما فی الھندیۃ: وکل ارش وجب بالصلح فھو فی مال القاتل۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۲۴ کتاب الصلح)[2]

قتل بالسبب کی دیت کا حکم

سوال:۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کی روٹی میں زہر ملایا لیکن اتفاق سے وہ روٹی کسی دوسرے شخص نے کھالی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی، جب عورت کو پتہ چلا تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی، پکڑے جانے پر سسر نے اس عورت کو قتل کر دیا، زہریلی روٹی کھانے سے مرنے والے کے ورثاء اب اس عورت کے ورثاء سے دیت طلب کرتے ہیں، جب کہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر چکا ہے، اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: من قتل بعد اخذ الدیۃ فعلیہ القتل لایقبل منہ الدیۃ۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۱ بحث تنازع اھل العلم فی معنی قولہ فمن عفی لہ من اخیہ شیءٌ)

[2] قال العلامۃ ابوبکر الجصاص الرازیؒ: دلالۃ الدیۃ ظاھرۃ علی ان الصلح دم العمد وسقوط القود بعفو بعض الاولیاء یوجب الدیۃ فی مال الجانی۔

(الاحکام القرآن للجصاص ج۱ ص۱۵۸ بحث تنازع اھل العلم الخ)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۵۵ بیان من تجب علیہ الدیۃ، کتاب الجنایات۔

الجواب:۔ زہریلی روٹی کھانے سے موت کا واقع ہونا قتل بالسبب ہے، صورتِ مسئولہ میں جس عورت نے روٹی میں زہر ملایا ہے اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور عورت پر کفارہ نہیں، اگرچہ عورت مرگئی ہے لیکن اس کے عاقلہ تو موجود ہیں اُن سے دیت وصول کرکے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: لو زلق بماء صبہ رجل فوقع فی البئر فا لضمان علی الصّاب۔ (ردالمحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات) لہ

مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی مریض کو کوئی ایسی دوائی کھلا دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، تو کیا دوائی کھلانے والے پر دیت یا ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مریض کو دوائی کسی ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق کھلانے سے اس کی موت واقع ہو جائے تو کوئی دیت وضمان نہیں، اور اگر دوائی کھلانے والا نہ ڈاکٹر ہے اور نہ ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق دوائی کھلائی یا تجویز کردہ نسخہ کی مقدار سے زیادہ کھلا دی جس سے مریض کی موت واقع ہوگئی تو اب کھلانے والا ضامن ہے اس پر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تطبب ولا یعلم منہ طب فھو ضامن۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۸۲ کتاب الدیات) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ الزیلعیؒ: موجب القتل بسبب الدیۃ علی العاقلۃ الا الکفارۃ۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۰۲ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات۔

؎۲ قال العلامۃ خلیل احمد السہارنفویؒ: قال الخطابی لا اعلم خلافا ان المعالج اذا تعدّیٰ فتلف المریض ضمن ای الدیۃ ـــــ وفیہ ایضاً: لا ضمان علی حجام ولا ختان ولا متطبب بشرطین احدھما ان یکونوا ذوی حذق وبصارۃ فی صناعتھم فان لم یکن کذالک لم یحل لہ مباشرۃ القطع۔ (حاشیۃ بذل المجھود ج۸ ص۱۰۰ کتاب الدیات)

مقتول کی دیت کے مستحقین | **سوال**:۔ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے والے کے لیے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف سے بطور تاوان ملنے والی رقم میت کی بیوہ کو دی جائے گی یا اس کے بھائیوں کو؟ جبکہ بیوہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب:۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہلاک ہونے والے کی دیت ڈرائیور اور اس کے عاقلہ پر واجب ہے اور یہ دیت میت کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں میت کی بیوی بھی اس کی وارث ہے اگرچہ وہ کسی اور سے نکاح کرلے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: إن القصاص حق جميع الورثة وكذا الدية۔ (الهداية ج۴ ص۵۲۲ كتاب القصاص في ما دون النفس) [1]

بچہ کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مر جائے تو کفارہ اور دیت کا حکم | **سوال**: بچہ ماں کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ماں کے نیچے دب کر مر گیا، اب والدہ کے لیے دیت اور کفارہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں بچے کا مر جانا جاری مجری خطا کی قسم میں آتا ہے جس میں عاقلہ پر دیت اور قاتل پر کفارہ لازم ہوتا ہے۔ آجکل عاقلہ سے دیت کی وصولی اسلامی قانون کے اجراء نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں ماں فراغت ذمہ کے لیے کفارہ ادا کرے گی، نیز بچہ مرتے وقت اگر کسی جائیداد کا مالک ہو تو ماں اس قتل کی وجہ سے بچے کی جائیداد سے محروم ہوگی۔

لما قال الله تبارك وتعالى: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ۔ (سورة النساء آیت ۹۲)

قال العلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله: والرابع ما جرى مجراه مجرى الخطاء كنائم انقلب على رجل فقتله لانه معذور كالمخطئ وموجبه الكفارة

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: والورثة في ذلك كلهم سواء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۳۱۰ فصل في الصلح على المال)
وَمِثْلُهٗ فى التفسيرات احمدية ص۱۹۶۔

الدّیۃ علی العاقلۃ۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)[1]

نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچہ کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب

سوال:۔ نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو وجوبِ دیت اور کفّارہ پر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کنائم انقلب علیٰ رجل فقتلہ، کیا یہ قتلِ خطاء یا اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ کیا بیداری اور نیند میں فرق نہیں ہے؟ اگر فرق نہیں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ رفع القلم عن ثلث النائم حتی استیقظ۔ آپ کی دلیل کنائم انقلب میں لفظ ام موجود نہیں، نیز آیتِ کریمہ وَلَا تضارّ والدۃ بولدھا اگرچہ رضاعت کے بارے میں ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہے، آپ نے اسقاطِ حمل کی دلیل بھی دی ہے لیکن اس میں عورت کا ارادہ ہوتا ہے جبکہ نیند میں ایسا نہیں ہوتا، روزہ کی حالت میں مرد کو احتلام ہو جائے تو روزے کا کفّارہ یا قضا نہیں اس لیے کہ روزہ دار مجبور ہے۔ ازراہِ کرم میرے ان اشکالات کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ (۱) رفع القلم عن ثلث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں پکڑ نہ ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ضمان نہ ہوگا ورنہ قتلِ خطاء میں وجوبِ دیت پر، نماز میں ترکِ واجب پر سجدۂ سہو، مجنون اور بچہ اگر کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر وجوبِ ضمان کا حکم کیونکر لگتا، بچہ اور مجنون اگر کسی کے ساتھ مل کر کسی کو قتل کریں تو اُن کے عاقلہ پر دیت ہے۔

قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ: فتجب الدیۃ ثم ما یجب علی الصبی والمجنون والخاطئ تتحملہ العاقلۃ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۳۶ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: النائم ینقلب علی انسان فیقتلہ فھٰذا القتل فی معنی القتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لا عن قصد لانہ مات بثقلہ فترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارۃ والدیۃ وحرمان المیراث۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۱ کتاب الجنایات)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات۔

(۲) فقہاء نے جو مثال دی ہے کنائم انقلب عَلٰی رَجُلٍ یہ عام قاعدہ ہے اس میں ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سب داخل ہیں، اس سے مراد شخص کلی ہے ماں باپ وغیرہ اس کے افراد ہیں، اس سے ماں کو مستثنیٰ کر کے اوروں کو داخل کرنا غلط ہے۔

(۳) ماں پر وجوب دیت اور کفارہ اس کو ضرر دینا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں، اس طرح تو باپ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ بچے کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ دو۔ ولا مولود له بولده لیکن باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس پر دیت واجب ہے، نیز دیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر بچے کو دودھ دینے سے بالکل معذور ہو تو خاوند اس کو ضرر نہ دے، یہاں عورت بالکل مجبور ہے لیکن نیند میں اگر ماں کے نیچے بچہ دب کر مرجائے تو اس میں اس کی بے احتیاطی کا دخل ضرور ہے، اس لیے علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فان النائم لیس من اهل القصد اصلاً وانما وجبت الکفارة لترك التحرز عن نومه موضع یتوهم قاتلاً والکفارة فی قتل الخطاء انما یجب لترك التحرز۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۲ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)۔

(۴) چونکہ اسقاطِ حمل نہ قتل عمد ہے نہ شبہ عمد اور نہ فعل سببی ہے لعدم التوریث اسقاطِ حمل کے لیے دوائی کھانا اور ماں کا بچے کے ساتھ سونا اختیاری ہے لیکن قتل دونوں صورتوں میں غیر اختیاری ہے[1]

روپے کی شکل میں دیت کی مقدار

سوال:۔ قتلِ خطا کی دیت آجکل رائج کرنسی کے حساب سے کتنے روپے بنتی ہے؟

الجواب:۔ قتلِ خطا کی دیت سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔ کما فی الھندیة۔ ومن العین الف دینار ومن الورق عشرة الاف درهم۔ (الفتاوی الھندیة ج ۶ ص ۵۸ کتاب الدیات)۔

ایک درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ (اوزانِ شرعیہ از مفتی محمد شفیع ص ۱۵)

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: کنائم انقلب علی رجل بیان لما جری مجری الخطاء لان هذا لیس بخطاء حقیقة لعدم قصد النائم الی شیٔ حتی یصیر مخطاء لمقصود ولما وجد فعله حقیقة وجب علیه ما اتلفه کفعل الطفل۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص ۱۰۱ کتاب الجنایات)

اس حساب سے چاندی کی مقدار ۳۶ سیر ۷ چھٹانک ایک تولہ ۸ ماشے بنتی ہے، اس مقدار چاندی کی مارکیٹ ریٹ میں جو قیمت بنتی ہے وہ قتلِ خطا کی دیت ہوگی۔ لہ

دوش (کاندھے) کی ہڈی توڑنے پر حکومتِ عدل کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کو تین آدمیوں نے خوب مارا جس کی وجہ سے اس کی دوش (کاندھے) کی ہڈی ٹوٹ گئی، مضروب نے ان آدمیوں پر دعویٰ کیا کہ مجھے ضمان دیا جائے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں جس مضروب کے کاندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اس کے لیے تینوں ضاربین (مارنے والے) ضامن ہیں، مساوات کی رعایت ممکن نہ ہونے کی وجہ سے اس میں حکومتِ عدل ہے یعنی مضروب جب علاج معالجہ کرانے کے بعد اچھا ہو جائے تو اس کے علاج معالجہ (یعنی ڈاکٹر کی فیس، ادویات وغیرہ) کا جتنا خرچہ بنتا ہو وہ ان تینوں ضاربین سے مضروب کو دلایا جائے گا۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فنقول فی کسر العظام کلھا حکومت عدل الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص ۳۲۸ فصل یجب فیہ أرش غیر مقدر) ۲ ہے

صلح کے بعد اگر زخمی مرجائے تو دیت کا حکم

سوال:۔ دو فریقین میں لڑائی کے بعد صلح ہوگئی، مضروب کے ورثاء نے کہا کہ چونکہ مضروب اس لڑائی میں زخمی ہوا تھا لہٰذا اس کی موت اسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اور واقعی وہ اسی زخم کی وجہ سے فوت ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ زخمی کرنے والے

لہ قال العلامة ابوبکر الجصاص الرازیؒ: فمن الدراھم عشرة آلاف درھم ومن الدنانیر الف دینار۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۳۷)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۵۴ فصل فی وجوب الدیة والکلام فیھا۔

۲ہ قال العلامة ابن نجیمؒ: ولا قصاص فی عظم لقولہ علیہ الصلوٰة والسلام لاقصاص فی العظم وقال عمر وابن مسعودؓ لاقصاص فی عظم الا فی السن۔

(البحر الرائق ج ۸ ص ۳۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

شرعاً دیت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ صلح اور معافی صرف جنایت اور زخم کی ہے اور زخمی اسی جنایت سے پیدا ہونے والے اثرات سے خاموش رہے اور اس زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو زخمی کرنے والے اور جانی پر دیت لازم ہے اور اگر صلح زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں ہو تو اس کے (صلح کے) بعد اگر زخمی مر جائے تو زخم لگانے والے پر کوئی دیت نہیں۔

لما قال الامام المرغینانیؒ: ومن قطع ید رجل فعفا المقطوعة یدہ عن القطع ثم مات من ذٰلک فعلی القاطع الدیة فی ماله وان عفا عن القطع وما یحدث منه ثم مات من ذٰلک فهو عفو عن النفس۔ (الهدایة ج۴ ص۵۸۶ کتاب الجنایات)[1]

رشتۂ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے

سوال:۔ نیند کی حالت میں ماں سے اگر بچہ ہلاک ہو جائے تو عند البعض ماں پر کفارہ نہیں، اس لیے کہ الدر المختار میں ہے: والقتل الموجب للقود اوللکفارۃ وان سقطا بحرمة الابوۃ علی ما مر۔ (ج۵ ص۴۸۹ کتاب الفرائض) یعنی ایسا قتل جو موجب کفارہ یا قصاص ہو تو رشتہ ولادت سے دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔ مہربانی فرما کر الدر المختار کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ ماں سے اگر نیند کی حالت میں بچہ ہلاک ہو جائے تو موجبِ کفارہ و دیت ہے کیونکہ یہ قتلِ خطاء ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: والرابع ماجری مجراه مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتله لانه معذور کالمخطئ وموجبه ای موجب هٰذا النوع من الفعل وما جری مجراه الکفارۃ والدیة علی العاقلة۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامة التمرتاشیؒ: ومن قطع فعفا عن قطعه فمات منه ضمن قاطعه الدیة ولو عفا عن الجنایة او عن القطع وما یحدث منه فهو عفو عن النفس۔
(تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۶۱ فصل فی الفعلین)
ومِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۶ ص۱۱۸ فصل ومن قطع ید رجل۔

اس عبارت سے معلوم ہُوا کہ دیت اور کفّارہ دونوں کا وجوب ہے۔

الدر المختار کی مذکورہ بالا جس عبارت سے عدم قصاص اور کفّارہ معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے کفّارہ ساقط نہیں ہوتا، اس لیے کہ علیٰ ما مرّ سے مراد کتاب الجنایات کی طرف اشارہ ہے اور کتاب الجنایات سے صرف سقوطِ قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیت اور کفّارہ کا وجوب، کتاب الفرائض کی عبارت سہوِ کاتب ہے، وجوبِ کفّارہ کی تائید "درمختار" کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: شربت دواء تسقط لہ عمداً فان کان الولد حیاً فمات فعلیہا الدیۃ و الکفارۃ (رد المحتار ج۵ ص۳۷۹ فصل فی الجنین کتاب الجنایات) حالانکہ یہ نہ قتلِ عمد ہے اور نہ شبہ عمد ۔ قتلِ خطاء اور شبہ عمد کے حکم میں فرق نہیں ہے۔[1]

جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومتِ عدل ہوگی

سوال:۔ ایک بچے کو ٹرک پر جیپ نے ٹکر ماری جس سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بدن پر زخم بھی آئے، بچہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، تو کیا ڈرائیور پر تاوان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جنایت میں قصاص نہ ہو اور مقرر دیت بھی نہ ہو تو وہاں پر حکومتِ عدل ہوتی ہے یعنی حاکم، قاضی یا تجربہ کار ڈاکٹر متاثرہ حصہ کے ٹھیک ہونے کے بعد علاج معالجہ پر ہونے والے اخراجات کا حساب لگا کر زخمی کرنے والے سے وصول کرکے زخمی کو دلوائے جائیں گے۔ بدن کے کسی بھی حصّے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں حکومتِ عدل ہوتی ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے میں حکومتِ عدل ہوگی۔

لما قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: فنقول فی کسر العظام کلہا

---

[1] لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: النائم فینقلب علیٰ انسان فیقتلہ فھو القتل فی معنیٰ قتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لامن قصد لانہ مات بثقلہ فترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارۃ والدیۃ وحرمان المیراث والوصیۃ ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب فی معنیٰ القتل الخطاء)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات ۔

حکومة عدلٍ الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص۳۲۳ فصل یجب فیہ اُرش غیر مقدر)[۱]

والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مرجائے تو موجب ضمان نہیں

سوال:۔ ماں نے بچے کو چولھے کے پاس بٹھا رکھا تھا کہ بچہ اچانک چولھے کی آگ کے ساتھ جل کر مرگیا، تو کیا بچے کی والدہ پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر بچے کی حفاظت سے غافل ہوگئے ہوں یا سرے سے حفاظت ہی نہیں کی ہو جس کی وجہ سے بچہ آگ میں جل کر مرگیا یا کسی اور طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی تو والدین پر یا ان میں سے کسی ایک پر کوئی ضمان نہیں، ہاں ان دونوں کو اللہ سے توبہ استغفار کرنا چاہیئے۔

کما فی الهندیة: وعن ابی القاسم فی الوالدین اذا لم یتعاهد الصبیّ حتّٰی سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شیٔ علیهما الّا التوبة والاستغفار واختیار الفقیه ابی اللیث علیٰ انه لا کفارة علیهما ولا علیٰ احدهما۔

(الفتاوی الهندیة ج ۶ ص۳۳ باب الامر بالجنایة ومسائل الصبیان)[۲]

کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گرنے سے کوئی ہلاک ہوجائے تو موجب ضمان ہے

سوال:۔ ایک بچہ چارپائی پر سویا ہوا تھا اس کی والدہ نے اس کے قریب ہی دیوار کے طاق میں گرم دودھ یا پانی رکھا تھا، جب وہ اس کو اٹھانے لگی تو وہ گرم دودھ یا پانی

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ولا قصاص فی عظم لقوله علیه الصلوٰة والسلام لا قصاص فی عظم وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الّا فی السن۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۳۰۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

[۲] قال الامام قاضی خان رحمه الله: وقال بعضهم لیس علی الوالدین شیٔ الّا الاستغفار وهو الصحیح۔ (فتاوی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۴۴۳ فصل فی اتلاف الجنین)

بچے کے اوپر گرا جس کی وجہ سے بچے کی موت واقع ہوگئی، توکیا بچے کی ماں پر دیت اور ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ والدین سے اس طرح اگر کوئی بچہ ہلاک ہو جائے تو یہ قتل بالسبب کے حکم میں ہے، اس قتل سے قاتل کے عاقلہ پر دیت ہے اور خود اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ بچہ اس کی غلطی سے ہلاک ہوا اسلئے کہ قاتل کے ہاتھ سے گری ہوئی چیز بچے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: وکذٰلک اذا کان یمشی فی الطریق حاملاً سیفاً او حجراً او لبنة او خشبة فسقط من یدہ فقتله لوجود معنی الخطاء فیه وحصوله علیٰ سبیل المباشرة لوصول الآلة بشرة المقتول۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب قتل الذی فی معنی القتل الخطاء)[۱]

سرکاری ملازم کو دورانِ ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں

سوال :۔ ایک آدمی سرکاری ملازم تھا، کام کی زیادتی کی وجہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہوگیا جبکہ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے جس پر اُسے قبل از وقت نوکری سے نکال دیا گیا، کیا حکومت پر اس ملازم کی وجہ سے کوئی ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اس آدمی نے بخوشی یہ ملازمت اختیار کی تھی، اسے معلوم تھا کہ کام زیادہ ہے یا کم، اب اگر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی دماغی نقصان پہنچا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے، اب اس آدمی کا دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے حکومت نہ مباشر ہے نہ سبب ہے، اس لیے حکومت پر کسی قسم کا ضمان نہیں۔ حکومت کا

---

[۱] قال العلامة الزیلعیؒ: ومن حمل شیئاً فی الطریق فسقط علیٰ انسان ضمن سواء تلف بالوقوع او بالعثرة به بعد الوقوع لان حمل المتاع فی الطریق علیٰ رأسه او علیٰ ظهره مباح له لکنه مقید بشرط السلامة بمنزلة الرمی الی الهدف او الصید۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۴۶ باب ما یحدث الرجل فی الطریق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۳۵۱ باب ما یحدث الرجل فی الطریق ۔

یہ قانون بھی ہے کہ وہ سرکاری ملازم جس کا ریٹائرمنٹ سے قبل میڈیکل بورڈ ہو جائے تو حکومت اس کو یکمشت کچھ رقم ادا کر دیتی ہے یہ حکومت کی اچھی پالیسی ہے ۔

فقہاء نے یہاں ایک مثال دی ہے کہ دو آدمی رسہ کشی کر رہے ہوں اور رسی ٹوٹنے کی وجہ سے دونوں پیچھے کی جانب گر کر ہلاک ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے ضامن نہیں کیونکہ دونوں کی ہلاکت ان کے اپنے فعل (زور) سے واقع ہوئی ہے ۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ : فلما سقط علی قفاه علم انه سقط بفعل نفسه وهو مده فقد مات کل واحد منهما من فعل نفسه فلا ضمان علی احد ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۳ مطلب فی المعنی القتل الخطاء) ـلـه

قتل کی نیت سے تلوار اٹھانے والے کے قتل کا حکم

سوال: اگر ایک شخص اپنی جماعت میں سے کسی ایک فرد یا تمام جماعت والوں کو قتل کرنے کے لیے تلوار سونت لے تو کیا اس تلوار سونتنے والے کو وہ شخص یا جماعت اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مشاہر کا خون مباح ہے اس کو قتل کر دینے سے کوئی ضمان لازم نہیں آتا۔

وفی الهندية : ومن شهر علی المسلمين سيفا وجب قتله ولا شئ بقتله وكذلك اذا شهر علی رجل سلاحا فقتله او قتل غيره دفعا عنه فلا يجب بقتله شئ الخ

(الفتاوی الهندية ج۶ ص۷ الباب الثانی فيمن يقتل قصاصاً ومن لا يقتل) ـلـه۲

ـلـه قال العلامة الزيلعی رحمه الله : فان وقعا علی القفا لا تجب لهما دية لان كل واحد منهما مات بقوة نفسه (تبيين الحقائق ج ۶ ص۱۵۱ باب جناية البهيمة)

ومثله فی الهندية ج ۶ ص۳۸ كتاب الجنايات

ـلـه۲ قال العلامة الحصكفیؒ : (ويجب قتل من شهر سيفاً علی المسلمين) يعنی فی الحال كما نص عليه ابن الكمال الخ ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۹۱ فصل فيما يوجب القود ومالا يوجبه)

ومثله فی الهداية ج۴ ص۵۶۷ باب ما يوجب القصاص وما لا يوجب ۔

کسی کی ٹانگ کی دیت

سوال: سڑک پر ایک بچہ جا رہا تھا کہ اچانک زید نے گاڑی سے اُسے ٹکر مار دی جس کی وجہ سے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، تو کیا زید پر کچھ ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب: گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں دیت واجب ہوتی ہے اور جب ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو آدھی دیت واجب ہوتی ہے تاہم یہ دیت حالاً نہیں دی جائے گی بلکہ ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یہ دیت عاقلہ سے وصول کی جائے گی جو مسلمان حاکم اور قاضی کے بغیر کوئی اور ادا نہیں کر سکتا، موجودہ وقت میں عاقلہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں صلح کر لینا بہتر ہے۔

وفی الهندیة: وان کان صاحب الدابة راکباً علی الدابة والدابة تسیران وطئت بیدها أو برجلها یضمن وعلیٰ عاقلته الدیة وتلزمه الکفّارة ویحرم عن المیراث۔ وقال فی الهندیة (ج۶ ص۲۷ الباب السابع فی اعتبار حالة القتل) وفی الرجلین کمال الدیة فی الخطاء وفی احدهما نصف الدیة کذا فی المحیط۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۶ ص۵۰ الباب الثانی عشر فی جنایة البهائم والجنایة علیها) [1]

دیت کی شرعی مقدار

سوال: جناب مفتی صاحب! شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کتنی مقرر فرمائی گئی ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کی مقدار اونٹوں کے اعتبار سے سو اونٹ ہے اور سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار ہے اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: والدیة فی الخطاء مائة من الابل اخماساً عشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون ابن مخاض

---

[1] قال الشیخ علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ضمن الراکب فی طریق العامة) وطئت دابة وما اصابت بیدها أو رجلها او رأسها۔ والرجلان ففیهما الدیة وفی أحدهما نصفها۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۳۸۶ کتاب الجنایات)
وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۴۶۵۔ وفیها ایضاً ص۴۵۹ کتاب الجنایات۔

وعشرون حقة وعشرون جذعة وقال ومن العين الف دينار ومن الورق عشرة الاف درهم - (الهداية ج ۴ ص۵۸۴ کتاب الجنایات) [1]

قتل موجب کفر نہیں

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر قتل کو حرام سمجھتے ہوئے کرے تو قاتل کافر نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمداً ہو اور ایسے قاتل کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، تاہم قتل کو حلال سمجھتے ہوئے کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

قال العلامة بدر الدین العینیؒ : وعندنا ان المؤمن اذا قتل مؤمناً لایکفر بفعله ولایخرج به من الایمان الا ان یقتله استحلالاً۔ (عمدۃ القاری جلد ۱۸ ص۱۸۳) [2]

---

[1] قال الامام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی رحمه الله : فان کان (المقتول) ذکراً خلاف فی ان الواجب بقتله من الابل مائة۔ لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام فی النفس المؤمنة مائة من الابل ولاخلاف ایضاً فی انّ الواجب من الذهب الف دینار لما روی انهٗ علیه الصلوٰۃ والسلام جعل دیة کل ذی عهد فی عهده الف دینار (وقال بعده) واما الواجب من الفضة فقد اختلف فیه قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ عشرة الاف درهم وزن سبعة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۷ ص۲۵۴ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص۱۲۶ کتاب الدیات ۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : واعلم ان قتل النفس بغیر حق من اکبر الکبائر بعد الکفر بالله تعالیٰ وتقبل التوبة منه فان قتل مسلماً ثم تاب قبل التوبة منه لایتحتم دخوله النار بل هو فی مشیئة الله تعالیٰ کسائر اصحاب الکبائر فان دخلها لم یخلد فیها الخ اما الایة فمؤولة بقتله لایمانه او بالاستحلال او بان یراد بالخلود المکث الطویل۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۱۴ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی التفسیرات الاحمدیة ص۵ سورۃ البقرۃ ۔

کسی کو زخمی کرنے پر قصاص کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حملہ کر کے اس کو زخمی کر دے اور زخم سے خون نکل آئے تو اس کے قصاص کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ اگر زخم ایسا ہو کہ جس میں مماثلت ہوسکے تو اس میں قصاص واجب ہے۔

قال العلامة المرغیناني رحمه الله: وفي کل شجة تتحقق فیها المماثلة القصاص انتهی وفي العنایة لقوله تعالیٰ وَالْجُرُوحَ قِصَاص۔ (الهدایة ج۴ ص۵۶۹ باب القصاص فیما دون النفس) [۱]

دانت توڑنے کا قصاص

سوال:۔ اگر کوئی شخص ضرب لگا کر کسی کا دانت توڑ دے تو ضارب سے قصاص اور دیت کا معاملہ کیسے طے کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اس ضارب پر قصاص واجب ہے البتہ مصالحت کے طور پر زخم کا لین دین بھی جائز ہے خواہ ہر دانت کے بدلے میں پانچ سو درہم دیا جائے یا کم و بیش دیا جائے۔

لما في الهندیة: وفي السن القصاص وان کان سن من یقتص منه اکبر من سن الآخر ولا قصاص في عظم الا السن کذا في الهدایة۔ ایضاً: وان شاء ضمنه أورش ستة خمسمائة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۶ ص۱۲،۱۱ الباب الرابع في القصاص فیما دون النفس) [۲]

---

[۱] قال ابوالبرکات عبدالله بن احمد النسفي رحمه الله: و (یقتص) کل شجة یتحقق فیها المماثلة۔ (کنزالدقائق ص۳۹۳ باب القصاص)
وَمِثْلُهٗ في مختصر القدوري ص۱۷۷ کتاب الجنایات۔

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصري رحمه الله: وقال عمر وابن مسعود لا قصاص في عظم الا في السن۔ البحرالرائق ج ص۳۰۶ وفیه ایضاً ص۳۰۵۔ وفي السراجیة في السن الرجل خمسمائة وفي السن المرأت نصف ذٰلك۔
وَمِثْلُهٗ في الدرالمختار علیٰ هامش ردالمختار ج۵ ص۳۵۴،۳۵۳ باب القود فیما دون النفس۔

متسبب اور مباشر پر دیت

سوال :۔ (۱) ایک شخص ونیش کا ڈرائیور ہے اور ونیش وہ مشین ہے جس کے ذریعے کنوئیں سے پتھر وغیرہ نکالے جاتے ہیں، عام معمول کے مطابق جس کنوئیں میں کام شروع تھا اس پر تین آدمی کام کر رہے تھے کہ ونیش کی رسی ٹوٹ گئی اور اس کا ڈول ان تینوں آدمیوں پر گر پڑا جس سے دو آدمی زخمی اور ایک ہلاک ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ شرعی حکم کیا ہے ؟

(۲) دوسرا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس ہلاک ہونے والے شخص کا صرف ایک رشتہ دار موقع پر موجود تھا جبکہ اصل ورثاء پاکستان میں تھے اور یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا تھا اور ہلاک ہونے والے شخص کے اس دور کے رشتہ دار کے پاس اسناد موجود نہیں تھے اس لیے اس کو پاکستان میں تصور کر کے اسناد (کاغذات) پاکستان میں بنا کر بھیجے گئے۔ تو ہلاک ہونے والے شخص کے اس رشتہ دار اور ایک شریک شخص نے جس کے ساتھ سعودی عرب کے اسناد موجود تھے ان دونوں نے سعودی عدالت میں اس ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کے اس رشتہ دار اور شریک کا ڈرائیور کو معاف کر دینے کے بعد اس کے اصل ورثاء یعنی والدا ور بھائیوں کو دعوے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں ؟ اور ڈرائیور کو ان دونوں کی طرف سے معاف کر دینے سے اصل ورثاء کا حق دعوٰے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہلاک ہونے والا شخص اس کام کا ٹھیکیدار اور ونیش کا مالک بھی خود تھا اور یہ اندوہناک واقعہ ونیش کی رسّی کمزور ہونے کی وجہ سے پیش آیا جبکہ ونیش کا مالک رسّی کی اس کمزوری سے آگاہ بھی تھا اور اس نے اس کمزوری کو دُور نہ کیا۔

الجواب :۔ (۱) صورتِ مسئولہ میں یہ قتل (ہلاکت) اقسامِ قتل میں سے ایک قسم جارمجری خطاء میں داخل ہے شرعاً اس قسم کے قتل میں دیت لازم ہوتی ہے جو قاتل ادا کرے گا۔ چونکہ بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول نے خود کمزور رسّی ڈرائیور کو مہیا کی تھی اور بار بار اس کمزوری سے مطلع کرنے کے باوجود لیت ولعل سے کام لیتا رہا اور اس کمزور رسّی کو تبدیل نہ کیا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا۔ تو گویا مقتول خود ہی ایک گونہ اس حادثے کا ذمہ دار ہے اس لیے دیت دونوں (قاتل ومقتول) کے مابین مشترک ہوگا اور مقتول چونکہ فوت ہو چکا ہے لہٰذا اس کا حصّہ دیت ساقط ہوا، باقی قاتل (ڈرائیور) کے

کے ذمے مقتول کے ورثاء کو نصف دیت یعنی پانچ ہزار دراہم چاندی کے یا پانچ سو دینار سونے کے یا اس کی مروجہ قیمت ادا کرنا لازم ہے، مروجہ کرنسی کا حساب کسی ماہر سنار سے لگوایا جائے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: یضمن المتسبب مع المباشر اذا کان للسبب تاثیر یعمل بانفرادہ فی الاتلاف متی انفرد عن المباشر ای اذا تعادلت قوۃ السبب والمباشر او اعتدل السبب والمباشر بان تساوی اثرھا فی الفعل کان المتسبب والمباشر مسئولین معاً عن القتل کان اجتمع علی قیادۃ دابۃ سائق وراکب علیھا فما احدثتہ من تلف کان الضمان علیھما لان سوق الدابۃ وحدہ یؤدی الی التلف وان لم یکن ھناک شخص راکب علیھا وکذلک اذا نخس رجل الدابۃ بأمر راکبھا یکون الضمان علی الاثنین لأن الناخس بمنزلۃ السائق۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۲۴۸ ثالثاً تضمین المتسبب والمباشر معاً)۔

(۲) کسی قاتل کو دیت وغیرہ معاف کرنا شرعاً مقتول کے ان ورثاء کا حق ہے جو اس کی میراث میں حصۂ شرعی کے حقدار ہوں کوئی دوسرا شخص ان کے اس حق میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ڈرائیور کو معاف کرنے والے دونوں حضرات چونکہ مقتول کے حقیقی وارث نہیں تھے ایک تو مقتول کا دُور کا رشتہ دار تھا اور دوسرے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا جبکہ مقتول کے اصل وارث یعنی اس کا باپ زندہ تھا اسلئے ان ہر دو حضرات کی معافی بلا اذنِ باپ صحیح نہیں اور نہ اس سے ڈرائیور کے ذمہ سے دیت ساقط ہوتی ہے لہٰذا قاتل اپنا حصۂ دیت مقتول کے باپ یا اسکے دیگر شرعی ورثاء کو ادا کرے گا تاہم اگر وہ دیت معاف کریں تو پھر اس صورت میں ڈرائیور کے ذمے سے دیت ساقط ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنہ ولا ولایتہ إلا فی مسائل الخ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۵ ص ۱۲۰ کتاب الغصب)

وقال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: ومن لا حق لہ فی العفو ھو الاجنبی غیر الوارث عند الجمھور وغیر الغائب عند المالکیۃ وکذا الاب والجد فی قصاص وجب للصغیر عند المالکیۃ والحنفیۃ لان الصغیر ھو صاحب الحق ولابیہ وجدہ ولایۃ الاستیفاء فقط۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد ۶ ص ۲۹۸ شروط العفو)

اُجرتی قاتل سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حکومتِ پاکستان کے قانون کے متعلق کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی شخص کو پیسوں کے ذریعے یعنی اجرتی قاتل سے قتل کرایا ہے تو اس کی سزا بھی قاتل کے برابر ہے یعنی اس کو بھی قصاصاً قتل کیا جاوے گا۔ شریعتِ مقدسہ میں اجرت پر کسی کو قتل کروانے والے کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں ضابطہ کے مطابق قصاص اجیر پر آتا ہے مستأجر پر نہیں آتا، البتہ مستأجر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: ولو قال اقتل ابی فقتله كان على القاتل دية لابيه۔ (الفتاوىٰ قاضی خان علىٰ هامش الهندية ج۳ ص۴۴۲ کتاب الجنايات ۔ فصل فيمن يقتل قصاصاً وفيمن لا يقتل) [۱]

مقتول کے ورثاء کے ذریعے قصاص کے اجراء کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! امارتِ اسلامی افغانستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے جب قصاص لیا جاتا ہے تو بعض اوقات قاضی مقتول کے وارث کو اسلحہ دے کر اپنی موجودگی میں قصاص کا اجراء کراتا ہے، کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود و قصاص کا اجراء حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے، البتہ ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ حدود کا اجراء صرف حاکمِ وقت بلاواسطہ کرے گا بخلاف قصاص کے کہ حاکم کی موجودگی میں اس کی اجازت پر مقتول کے وارث سے بھی اس کا اجراء کرایا

---

[۱] وفی الهندية: وفی جنايات المنتقىٰ قال ابو يوسف رحمه الله تعالىٰ قال ابو حنيفة رحمه الله تعالىٰ فی رجلٍ قمط رجلاً فطرحه قدام سبع فقتله السبع لم يكن على الذی فعل ذلك قودٌ ولا دية لكنهٗ يعزر و يضرب ويحبس حتىٰ يموت الخ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۶ ص۶ کتاب الجنايات۔ الفصل الثانی فيمن يقتل قصاصاً وفيمن لا يقتل)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۱ ص۹۱،۹۰ المادة ۸۹،۹۰۔

جاسکتا ہے ، اور اگر اس طرح قصاص کا اجراء کرنے سے بعد میں فریقین میں فتنہ و فساد کا خطرہ ہو تو اس کا اجراء بھی قاضی خود کرائے تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے ۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: استیفاء الحدود یکون بواسطة الامام الحاکم واما القصاص فیجوز لولی الدم استیفاؤه بشرط وجود الامام ۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۲۶۳ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم

سوال :۔ اگر کسی قاتل سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے تو کیا اس سے قاتل کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا یا نہیں ؟ یا توبہ و استغفار کرنا بھی لازمی ہے کہ بدون اس کے معاف نہ ہوگا ؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں ۔

الجواب :۔ کسی شخص کو قتل کرنے سے دو قسم کے حق قاتل کے ذمے ہوتے ہیں ایک حق العبد یعنی مقتول کے ورثاء کا حق جو کہ قصاص لینے سے پورا ہو جاتا ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حق ۔ تو حنفیہ کثر اللہ سوادہم کی اس بارے میں رائے یہ ہے کہ قصاص لینے یا مقتول کے ورثاء کے معاف کر دینے سے اگرچہ حق العبد ادا ہوا لیکن اللہ کے حق کی ادائیگی کا کفارہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے ، اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حدود زواجر ہیں جوابر نہیں ، البتہ جمہور علماء کے نزدیک حدود چونکہ جوابر (کفارات) ہیں اسلئے ان کے ہاں قصاص اور عفو سے بھی یہ گناہ ختم ہو جاتا ہے ۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی : اختلف العلماء فی امره کما اختلفوا فی الحدود هل هی زواجر ام جوابر ؟ قال الجمهور: القصاص من القاتل او العفو عنه یکفر اثم القتل لان الحدود کفارات لاهلها وهذا عام لم یختص قتلا من غیره ۔ قال النووی : ظواهر الشرع تقتضی سقوط المطالبة بالعقوبة فی الآخرة ۔ قال الحنفیة: القصاص او العفو لا یکفر اثم القتل لان المقتول المظلوم لا منفعة له فی القصاص وانما القصاص منفعة للاحیاء لیتناهی الناس عن القتل وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ۔ (الآیة) (الفقه الاسلامی وادلته، ج۶ ص۲۶۲ هل القصاص یکفر اثم القتل)

قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا

سوال :۔ ہمارے علاقے میں ایک شخص بڑا ظالم اور بدمعاش ہے ، لوگوں کی

عزت و آبرو اور جان و مال کو ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے، اور اس نے علی الاعلان کئی قتل بھی کیے ہیں جس کا جج (قاضی) صاحب کو بھی بخوبی علم ہے جبکہ لوگ اس کے ڈر اور خوف کے مارے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو بھی تیار نہیں۔ تو کیا جج اپنی معلومات کے حوالے سے اس کو قصاصاً قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے ہاں اس مسئلہ میں دو قسم کی آراء ہیں۔ (۱) متقدمین احناف کے نزدیک قاضی یا جج اپنے علم کے مطابق قصاص لے سکتا ہے (۲) جبکہ متاخرین احناف عدم اجازت کے قائل ہیں کہ قاضی اپنی معلومات کے مطابق قصاص جاری نہیں کر سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یجوز القضاء بعلمه فی القصاص دون الحدود۔
قال ابن عابدینؒ، تحته مبنی علیٰ ان القاضی یقضی بعلمه فی غیر الحدود والفتویٰ الیوم علیٰ عدم جواز القضاء بعلمه مطلقاً۔ (رد المحتار والدر المختار ج۶ ص۵۴۹ کتاب الجنایات)[۱]

حالتِ نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی آدمی نشے کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق نہ کر سکتا ہو اور نہ ہی اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی تمیز رہتی ہو، اب اگر وہ اسی حالت میں غیر اختیاری طور پر کسی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا شرعاً اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ قاتل سے قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا شرعی حق ہے اور وہ بالاتفاق مذاہب اربعہ سکران (نشہ والے) سے ساقط نہیں ہوتا، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ قرآن و سنت کے حکم کا مخاطب ہونے کیلئے نشہ مانع شرعی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلی: القصاص من السکران ویقتص من السکران

---

[۱] قال العلامة وهبة الزحیلی: یجوز للقاضی القضاء بعلمه الشخصی فی القصاص دون الحدود وهذا عند متقدمی الحنفیة وافتی المتاخرون بعدم القضاء بالعلم مطلقاً سداً للذریعة اما قضاء السوء سواء فی القصاص والحدود وام فی الاموال وغیرها۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۲۶۴ الفرق بین القصاص والحدود الاخریٰ)

بشراب محرم باتفاق مذاهب الاربعة لان السکر لاینافی الخطاب الشرعی ای التکلیف فتلزمه کل احکام الشرع وتصح عباراته کلها فی العقود کالبیع ۔ الخ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۶ ص ۲۶۵ شروط القاتل) لہ

مقدارِ دیت سے کم مال پر صلح کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم چند ساتھی مل کر قتل کے سلسلہ میں دو گروپوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فریقین بھی صلح پر آمادہ ہیں، اب اگر ہم مقدارِ دیت سے کم مال پر فیصلہ کریں اور مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہوجائیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ قتلِ عمد سے صلح کرنے کی صورت میں دیت کی مقدار کی پابندی ضروری نہیں ہے بلکہ جتنی مقدار مال پر فریقین راضی ہوجائیں اور صلح کریں تو قاتل پر مقتول کے ورثاء کو اتنی مقدار میں مال ادا کرنا لازم ہوگا چاہے وہ مال مقدارِ دیت سے کم ہو یا زیادہ ۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وصح فی الجنایة العمد مطلقاً ولو فی نفس مع اقرار باکثر من الدیة والارش او باقل لعدم الربٰو ۔ وقال العلامة ابن عابدینؒ: تحت (قوله لعدم الربٰو) لان الواجب فیه القصاص وهو لیس بمال ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۵۳۰ کتاب الدیات) ۲ہ

لہ لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: یجب القود ای القصاص بقتل کل محقون الدم بالنظر لقاتله درر ۔۔۔۔۔۔۔ بشرط کون القاتل مکلفا لما تقرر انه لیس لصبی ومجنون عمد ۔

[الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۵۳۲
کتاب الجنایات ۔ فصل فیما یوجب القود الخ]

۲ہ لما قال العلامة وهبة الزحیلی: یجوز الاعتیاض فی القصاص بخلاف الحدود ومنها حد القذف واجاز الشافعیة المعاوضة فیه ۔

[الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۲۶۴
الفرق بین القصاص والحدود الاخری]

مسوّدہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیّت

مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲)/۸۰ آر، سی، آئی آئی مجریہ ۱۳ ردسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس) ۱۹۸۰ء کا مسوّدہ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر ازروئے فقہ و شریعت نظر ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کر کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ قصاص و دیت میں کل ۹ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے مرسلہ مسوّدہ آرڈیننس جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس ۱۹۸۰ء) پر تفصیلی غور کیا گیا، چونکہ بعض دفعات ایسی تھیں جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً تھا اور ان کا تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے، تعزیراتِ پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے

اور ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فی الوقت جواب دینے سے قاصر ہیں، جیسا کہ دفعہ ۲(۵۔۱)(الف)(ب)، (ج) (۱۰۶)، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۱۱، (۱)(۲)، ۱۲۱ (۱) ۲ تعزیرات پاکستان سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دفعات کے متعلق تجاویز اور ترامیم پیشِ خدمت ہیں:۔

(۱) اس مسودہ میں تقریباً ۳۰ مقامات ایسے ہیں جہاں قیدِ محض یا قیدِ بامشقت کو مختلف مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یا بعض مقامات پر مختلف تعداد میں کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے، تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ یہ تمام سزائیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے ساتھ ساتھ یہ تصریح ضروری کرنی چاہیئے کہ یہ سزائیں محض تعزیرات ہیں جو حکومت کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں ورنہ یہ سزائیں شرعی نہیں ہیں جو کسی خاص نص کے تحت آتی ہوں، البتہ کوڑوں کی سزا کا جن مقامات پر ذکر ہے تو چونکہ یہ غیر منصوص سزاؤں میں ایک شدید ترین سزا ہے لہٰذا اس کے نفاذ میں نہایت احتیاط چاہیئے اور بصورتِ تعزیر دفع فساد کیلئے بعض مواقع پر اس کا اجرا کرنا چاہیئے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت بنے لیکن اس کو کلیہ نہ بنایا جائے۔ مسودہ کے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ سزائیں مذکور ہیں۔ دفعہ (۵) شق ب، ج۔ دفعہ ۱۶، دفعہ ۲۱ ب، دفعہ ۲۳ ب، دفعہ ۳۵ الف، ب، دفعہ ۳۷ الف، ب۔ دفعہ ۳۹، دفعہ ۴۳ ب، ج۔ دفعہ ۴۵ ب، دفعہ ۴۷ ب، دفعہ ۴۸، دفعہ ۵۱ ب، دفعہ ۳۵ ب، دفعہ ۵۸، دفعہ ۶۰، دفعہ ۶۲، دفعہ ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ا، دفعہ ۷۱ ب ۸۱۔ ۸۲ الف ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۴ ج، دفعہ ۹۵، ۹۷ الف ب، دفعہ ۹۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۱۔

(۲) چونکہ یہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیت سے تعلق رکھتا ہے اور شریعت میں قصاص و دیت کے قانون کو حفاظتِ نفس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس میں حفاظتِ نفس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے تاکہ مبادا کسی طریقہ سے مظلوم ورثاء کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ لہٰذا قاتلوں کا پورا پورا محاسبہ ہونا چاہیئے، اور جو لوگ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں یا ان کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں اُن کے لیے بھی از روئے مصلحت کوئی تعزیری قانون مقرر کیا جائے، اگرچہ پناہ دینے والے ایک قوم، ایک قبیلہ یا ایک خاص علاقہ یا حکومت کے بعض افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور نیز اُن علاقوں میں بھی قاتلوں کو گرفتار کرنا چاہیئے جو علاقے پولٹیکل ایجنٹ کے زیرِ نگرانی ہوں جہاں قاتل مفرور ہو کر پناہ لے لیتا ہے۔

(۳) اس مسودہ کے صفحہ ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (ج) میں جہاں بالغ[1] کی تعریف کی گئی ہے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے اور یہ تعریف یوں ہونی چاہیئے کہ :-

"بالغ سے مراد ہر وہ مرد و زن ہے جس پر علاماتِ بلوغ ظاہر ہوئی ہوں مثلاً احبال، حمل یا موئے زیر ناف کا ہونا۔ اور یا عورت سترہ سال اور مرد اٹھارہ[2] سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو۔"

مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ہر اس صورت کو اعتبار دیا جائے گا جو صورت پہلے وقوع پذیر ہو۔

(۴) صفحہ ۴ دفعہ ۱۲ کی تشریح میں جہاں گلا گھونٹنے کی صورت کو قتلِ عمد کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے وہاں یہ تصریح کرنی ضروری ہے کہ اس گلا گھونٹنے کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا حداً[3] نہیں ہوگا بلکہ سیاستہً ہوگا۔

ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص۵ کتاب الجنایات، الباب الثالث)[4]

(ترجمہ) "اور اگر کسی کا گلا گھونٹا گیا تو اس قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر قاتل مشہور گلا گھونٹنے والا ہو جس نے اس کے علاوہ اور لوگوں کے گلے بھی گھونٹے ہوں تو پھر اس کو از روئے مصلحت سیاستہً قتل کیا جائے گا۔

---

[1] سرکاری مسودہ میں بالغ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص ۱۸ سال یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو الخ۔

[2] یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صاحبینؒ کے نزدیک ہر دونوں کے لیے پندرہ سال تک پہنچنا عمرِ بلوغت ہے۔

[3] یعنی گلا گھونٹنے اور مطلق زہر پلانے کو قتلِ عمد کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شرعی اصطلاحات حد اور تعزیر کو بدلنا اور مخلوط کرنا مستقبل میں بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

[4] قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص۴۴۰ کتاب الجنایات، باب القتل)

(۵) مذکورہ بالا صفحہ۱۲ دفعہ ۴ کی مذکورہ شق میں زہر دلانے کی صورت میں جو قتلِ عمد میں شمار کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہ واضح کرنا چاہیئے :-

"کہ اس سے زہر دلانا مراد ہے جسے پلانے والے نے زور اور جبر کرکے بالاکراہ پلایا ہو تو پھر اس میں قصاص اور دیت دونوں نہیں ہیں، البتہ حکومت اس صورت میں بھی دفع فساد کے لیے از روئے مصلحت سیاسۃً تعزیر دے سکتی ہے۔"

جیسا کہ عالمگیری میں اس کی تصریح موجود ہے :-

واذا ناولہ فشرب من غیر ان اکرھہ علیہ لم یکن علیہ قصاص ولا دیۃ سواء علم الشارب بکونہ سما اولم یعلم ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۶ کتاب الجنایات الباب الثانی)

(ترجمہ) "اور جب کسی کو زہر دے کر بغیر کسی زور اور جبر کے پلایا ہو تو اس صورت میں اس پر قصاص اور دیت دونوں واجب نہیں ہیں اگرچہ پینے والے کو اس کے زہر ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔"

صفحہ ۱۲ دفعہ ۱۴ میں قاتل کو بصورت عفو یا صلح کے بعد تعزیراً قتل کرنے میں نہایت ہی احتیاط کرنی چاہیئے تاکہ غیر اسلامی قوانین بالخصوص یہودیت سے امتیاز ہو ۔

(۶) صفحہ ۱۷ دفعہ ۲۸ میں قتل کی صورت میں قاتل کو وراثت سے محرومی کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ یہ قتلِ عمد، شبہ عمد، خطاء، جاری مجریٰ خطا کی صورت میں ہے یعنی ان چار صورتوں کے قتل کی صورت میں قاتل مقتول کی وصیت یا حقِ وراثت سے محروم رہے گا اور قتل بسبب کی صورت میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں رہے گا، جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ کسی دوسرے کی جگہ میں کنواں کھودا اور کوئی شخص اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گیا تو اس کو قتل بسبب کہا جائے گا جس میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا ۔ (ملاحظہ ہو فتاوی الہندیہ)

واما القتل بسبب فمثل حفر البئر ووضع الحجر فی غیر ملکہ وموجبہ اذا تلف بہ ادمی الدیۃ علی العاقلۃ ولا یتعلق بہ الکفارۃ ولا حرمان المیراث عندنا ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳ کتاب الجنایات ۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور قتل بسبب جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ میں کنواں کھودا یا کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ کوئی پتھر رکھا اور اس کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک،

ہوگیا تو اس میں بصورت ہلاکتِ انسان قاتل کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی اور ہمارے مذہب میں اس میں کفّارہ اور وراثت سے محرومی نہیں ہے۔"

(۷) صفحہ ۴۶ دفعہ ۱۱۳ میں سزائے موت کی توثیق کا اختیار جس عدالتِ مرافعہ کو دیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ضرور کرنی چاہیئے کہ "بشرطیکہ اس عدالتِ مرافعہ کا فیصلہ بھی شرعی ہو"۔

(۸) صفحہ ۴۸ دفعہ ۱۲۳ کے آخر میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے: "نیز خاص اور معتمد علیہ اداروں اور اہلِ حل وعقد سے بھی رائے طلب کرنی چاہیئے"۔

(۹) مذکورہ دفعات میں جہاں جرمانہ کا ذکر آیا ہے وہاں جرمانے سے مراد تعزیر یا لضرب یا بالحبس مراد ہو نہ کہ تعزیر بالمال، یہ موجودہ مروجہ جرمانہ ایک غیر شرعی امر ہے۔

مسوّدہ قانون دیت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جن کو دین میں جدت پسندی کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے میں چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی ایک جدت پیدا کرنے کی نام نہاد کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دنیاوی امور میں تو ایسا کرنا ممکن ہے مگر دینی امور اور ان کے مسائل میں اپنی ذہنی ساخت کو داخل کر کے اسلام کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرنا کسی بھی دور کے علماء حق اور مفتیانِ کرام نے گوارا نہیں کیا اور جب بھی کسی مغرب زدہ اور مفسد خیال شخص نے اسلامی قوانین پر قلم اٹھا کر بزعم خود ان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان محافظینِ دین نے ایسے لوگوں کا بھرپور تعاقب کیا اور اُن کے ہر ایک نقطے کا دندان شکن جواب دیا۔

اِسلامی جمہوریہ پاکستان میں جب دیت وقصاص آرڈیننس نافذ ہوا تو اسی "روشن خیال" طبقہ نے اس آرڈیننس کے مسلّمہ نکات کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے رسائل وجرائد اور اخبارات میں مشقِ سخن بنایا۔ روزنامہ "مشرق" میں نام نہاد "محقق" اور "سکالر" نے ان مسلّمہ اور طے شدہ نکات پر سوالات اٹھائے۔ جامعہ حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے اس "محقق" کا بھرپور تعاقب کیا اور قرآن وسُنت کی روشنی میں اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دیا جو اُس وقت دار العلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ہے اب افادۂ عام کے لئے فتاویٰ دار العلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)۔

مسوّدۂ قانونِ دیّت و قصاص کے بعض زیرِ بحث نکات

عورت، غیر مسلم اور نابالغ کی شہادت

روزنامہ مشرق مؤرخہ   میں کسی ایڈووکیٹ کا مضمون بعنوان "دیت اور قصاص کے مسودۂ قانون کا جائزہ، قصاص سے مستثنیٰ 'قاتل'" نظر سے گذرا، مضمون کے عنوان سے بظاہر مضمون نگار کا اخلاص مترشح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالی اور بے معنی بلکہ مفسد اخلاص ہے، مضمون نگار کی اکثر باتیں قرآن و حدیث سے لاتعلقی پر مبنی ہیں کیونکہ صاحبِ مضمون ہر جگہ اپنی رائے سے قرآن و حدیث کو متصادم کرکے اپنی عقلی توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً صاحبِ مضمون لکھتے ہیں:۔

"اسلامی قانون کی بنیاد قرآن و سنت ہے، تمام قوانین حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کے ذریعہ قرآن و سنت کی روشنی میں تشکیل دیئے جانے ضروری ہیں، اجتہاد ہی کے ذریعہ سابقہ فقہاء کی رائے سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ سابقہ فقہاء نے اپنے وقت اور حالات کے تحت قرآن و سنّت کی روشنی میں کسی مسئلہ پر رائے دی تھی، چونکہ وہ حالات اب نہیں رہے اس لیے ان حالات کے تحت قائم شدہ رائے بھی بدلی جاسکتی ہے، موجودہ مجوزہ مسودۂ قصاص و دیت میں سابقہ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حالات کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے ہیں۔"

صاحبِ مضمون کے مذکورہ جملے اس بات پر دال ہیں کہ ائمہ کرام جو اپنے اپنے زمانوں میں محنت و مشقت کرکے لاکھوں مسائل مستنبط کر گئے ہیں، یہ مسائل موجودہ حالات کے تقاضوں کے موافق نہیں ہیں، چند امور چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر کوئی نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں معلوم نہیں کہ مضمون نگار کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اگر ائمہ اربعہؒ میں سے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں تو پھر ان کا یہ نظریہ اور رائے غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو پھر ائمہ مجتہدین کے ان تمام مسائل کو پسِ پشت ڈالنا ہوگا جن کے لیے ائمہ کرام نے سالہا سال تک رات دن ایک کرکے محنت کی ہے اور پھر بھی احادیث اور نصوصِ قرآنیہ سے مسائل کا استنباط کرنا بھی کارے دارد، جو عوام کو تو درکنار خواص کو بھی حاصل نہیں ہے، لہٰذا اس فساد و شر کے دور میں ائمہ کرام کی تقلید کے علاوہ کامیابی کا

اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے بلکہ ہم جیسے لاعلموں کے لیے تقلیدِ شخصی واجب ہے، چونکہ تقلید کا موضوع خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف سید الطائفہ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک دو ارشاد تقلید سے متعلق نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

الامة اجتمعت علی ان یعتمدوا علی السلف فی معرفة الشریعة فالتابعون اعتمدوا فی ذلک علی الصحابة وتبع التابعین و ھکذا فی کل طبقة اعتمد العلماء علی من قبلھم والعقل یدل علی حسن ذلک لان الشریعة لا یعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا یستقیم الا بان یأخذ کل طبقة عمن قبلھا بالاتصال۔

(عقد الجید فی الاجتھاد والتقلید ص۳۶ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "بلاشک تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے سمجھنے میں اسلاف ہی پر اعتماد کرنا ہوگا، تابعین نے صحابہ پر اعتماد کرکے دین کو لیا ہے اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اور ایسا ہی ہر دور کے علماء نے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر دین پر عمل کیا ہے، اور عقلاً بھی یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ شریعت کا دارومدار نقل پر ہے اور نقل سوائے اس اتباعِ اسلاف (تقلید) کے اور کسی طریقہ پر ممکن نہیں۔"

اور چند صفحات آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ مزید فرماتے ہیں :۔

وبما اندرست المذاہب الحقة الا ھذہ الاربعة کان اتباعھا اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنھا خروجاً عن السواد الاعظم۔ (عقد الجید فی الاجتھاد والتقلید ص۳۸ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "اور چوتھی صدی (ہجری) میں ماسوائے ان مذاہبِ اربعہ کے اور کوئی حق مذہب نہ رہا تو ان مذاہب کی تقلید اجماعِ امت اور تقلید نہ کرنا مخالفِ اجماعِ امت ہے۔"

لہٰذا ائمہ کرام نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ آج بھی حالات کے موافق اور مناسب ہیں، اگر کوئی حکم بظاہر ناموافق معلوم ہوتا ہو تو یہ ہمارے ہی فہم کا قصور ہوگا نفس الامر میں یوں نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا حکم فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہ ہو تو پھر مستند علماء اور با اعتماد صاحبِ علم حضرات ایسے جزئیات کا حکم باہم مشورہ کرکے قرآن و حدیث اور فقہ کے ان اصولوں کے مطابق نکال سکتے ہیں جن اصولوں پر فقہ کا دارومدار ہے، لیکن ان حضرات کے لیے بھی خاص شروط ہیں جو کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ "خون کا مسئلہ اور آنکھ کی تبدیلی" پر "مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ" کا بحث و تحقیق کے بعد "انسانی اعضاء کی پیوندکاری" کے نام سے رسالہ جاری کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

لیکن قصاص و دیت یا اس کے علاوہ اور اس جیسے مسائل جن کا حکم صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ تمام کتبِ فقہ میں موجود ہیں تو پھر اس کے باوجود ان کو چھوڑ کر نئے راستے تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے بلکہ ماسوائے تضییع اوقات اور باعثِ اضلال و تضلیل کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ نام نہاد دانشور صاحب اپنے خود ساختہ نظریۂ اجتہاد کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ :۔

"مثلاً مجوزہ آرڈیننس میں قتلِ عمد کے ثبوت کے لیے عورت کی گواہی اور معصوم بچے کی گواہی کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا ہے، دفعہ ۱۰ میں قتلِ عمد کے ثبوت کے لیے دو بالغ مردوں کی گواہی کو ہی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب فقہاء کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا قرآن و سنت میں عورت اور نابالغ کی گواہی کی ممانعت کر دی گئی ہے، قرآن و حدیث میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔"

صاحبِ مضمون کی یہ تجویز نفاذِ شریعت کے لیے معاون نہیں بلکہ مبطل ضرور ہے کیونکہ یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے بلکہ حقیقت میں اسلام کی بیخ کنی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم   کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاید صاحبِ مضمون کو اس حدیث اور آیتِ کریمہ کا علم نہیں جو حدود اور قصاص میں صرف بالغ مردوں کی گواہی کے متعلق وارد ہے، لیکن ان کے عدم علم کی وجہ سے آیت اور حدیث کا عدم وجود لازم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ پابندی ہے کہ قتل کے امور میں صرف اور صرف ۲ بالغ مردوں ہی کی گواہی قابلِ قبول ہے عورتوں کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں :۔

لحدیث الزهري مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ان لا شهادة للنساء في الحدود والقصاص ۔ وقال الله تعالى واستشهدوا شهيدين من رجالكم ۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر خلفائے راشدینؓ میں سے شیخینؓ کے دور تک کسی نے حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ تم دو مردوں کو گواہی کے لیے پیش کرو۔"

اور آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :۔

ولان شهادة النساء فيها شبهة البدلية لان كل اثنين منهن قائمة مقام رجل فلا يقبل فيما يندرئ بالشبهة ۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "اور چونکہ دو عورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہو کر گواہی دینے کی وجہ سے شُبہ بدلیت ہے لہٰذا حدود قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔"

اب صاحبِ مضمون خود غور کریں کہ کیا عورت کی گواہی پر شریعتِ مقدسہ میں کوئی پابندی ہے یا نہیں؟ موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی قتل کو ایک بچہ نے جو کہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے خود دیکھتا ہے وہی اکیلا اس قتل کا گواہ ہے باقی گواہ چشم دید نہیں ہیں بلکہ بچہ ہی واقعاتی گواہ ہے تو اس بچے کی گواہی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، جبکہ فطرتاً ایک بچہ جھوٹ بھی کم بولتا ہے، اسے جھوٹ پڑھایا بھی نہیں جاسکتا، وہ قاتل کو بھی پہچانتا ہے اور آلۂ قتل کو بھی پہچانتا ہے، اپنی زبان سے پورا واقعۂ قتل بتاسکتا ہے، تو پھر اس کی گواہی کو نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔"

واضح ہو کہ ایسے واقعات میں بچے کی گواہی کو اعتبار دینا عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ قرآنِ مجید نے گواہی دینے کے لیے رَجُلَیْن کا لفظ استعمال کیا ہے اور قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت سے بچے کی گواہی کا ناقابلِ قبول ہونا صریح ہے کیونکہ بچے کو رجل نہیں کہا جاسکتا اور نہ اُردو زبان میں بچے کو مرد کہا جاتا ہے، اور عقلاً بھی باطل ہے۔

(۱) فقہاء نے بالاتفاق گواہی کی ادائیگی کے وقت گواہ کا بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ولا تقبل شهادة المملوك والصبي لانها من الولاية ولا ولاية لهما على انفسهما فالاولى ان لا يكون لهما على غيرهما ولاية۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۷۷ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "غلام اور نابالغ کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ گواہی ایک طاقت کا استعمال ہے یہ دونوں عاجز ہو کر غیر پر کیا طاقت استعمال کریں گے۔"

(۲) یہ مسلّمات میں سے ہے کہ گواہی کے لیے عقلِ کامل کا ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاگل کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نابالغ بچے کی گواہی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ ظاہر ہے کہ بچہ کم عقل اور کم ہوشیار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغی کی عمر میں اپنے مستقبل کی کامیابی کو نہیں سمجھتا، بلکہ ایسے بچے کو والدین یا کسی دوسرے سرپرست کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک بچہ اس حیثیت سے کسی ایسے واقعہ کو کہاں من وعن یاد رکھ سکتا ہے اور پھر

ان حالات میں گواہی کا مکمل اظہار بھی نہیں کر سکتا، اس لیے بچے کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض ایک نابالغ لڑکا کسی گواہی کو زبانی یاد کر بھی لے تو عدالت یا کسی مجاز افسر کے سامنے اس کے رعب وجلال اور ہیبت کی وجہ سے مکمل گواہی نہیں سُنا سکتا۔

(۴) نابالغ کی قوتِ ارادی مضبوط نہیں ہوتی اس لیے ڈرانے دھمکانے پر بچہ آسانی سے اپنی گواہی سے منحرف بھی ہو سکتا ہے، حقیقت کو غیر حقیقت اور غیر حقیقت کو حقیقت میں تبدیل کر سکتا ہے، بخلاف بالغ آدمی کے جو اپنی قوتِ ارادی پر مضبوطی سے ڈٹ سکتا ہے، گواہی درست اور صحیح نقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر ایک نابالغ کی گواہی پر عمل کیا جائے تو واللہ اعلم کتنے مفاسد کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صاحبِ مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

—— "غیر مسلم کی گواہی کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام کی روح کے خلاف ہے"——

تو واضح ہو کہ غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم پر درست ہے، جیسا کہ خود مذکورہ مسودۂ آئین کی دفعہ ۱۰ کی شق (ب) میں کہا گیا ہے۔ اس لیے غیر مسلم کی گواہی مسلمان پر درست نہیں ہے اور یہ اسلام کی روحِ انصاف کے مخالف نہیں بلکہ عین موافق ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

وقید بقوله علی مثله لانها لا تقبل علی مسلم ولایة ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً (البحر الرائق ج ۷ ص ۹۴ کتاب الشہادۃ)

(ترجمہ) "یعنی غیر مسلم کی غیر مسلم پر گواہی درست ہے لیکن غیر مسلم کی مسلمان پر گواہی درست نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔"

اور نیز کفار چونکہ فطرتاً اسلام سے بُغض وعناد رکھتے ہیں اور وہ اپنے اسی بُغض وعناد کی وجہ سے اسلام کے ماننے والوں پر نہ جانے کیا کیا جھوٹی گواہی دیں گے جو حقیقت میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک تباہ کن چیز بن جائے گی۔

صاحبِ مضمون مزید لکھتے ہیں :۔

—— "دس سال کی عمر سے اُوپر کے قاتل قصاص سے مستثنیٰ نہ ہونے چاہئیں"——

یہ تجویز بھی مذکورہ بالا تجاویز کی طرح ایک مضحکہ خیز تجویز ہے، کیونکہ شریعت میں مرد کے بلوغ کے لیے کم از کم دس سال کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ کم از کم بارہ سال ہیں لہٰذا دس سال کے

قاتل کو قصاص سے مستثنیٰ نہ کرنا خلافِ شریعت ہے، کیونکہ شریعت میں نابالغ کے فعل پر عدمِ عقل کی وجہ وجہ سے قصاص نہیں ہے، البتہ عاقلہ سے دیت لینا واجب ہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے نابالغ بچوں کا خیال رکھے۔

مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اولاد کے قاتل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔۔۔۔۔کوئی شخص کسی جنسی ترغیب پر اپنی اولاد کو قتل کر دے یا جب چاہے دوسرے لڑکوں کی ترغیب پر وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنے لڑکے کو قتل کر دے، مستوجب قصاص نہیں، یہ استثنیٰ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

(۱) والد کو اولاد کے قتل پر قصاص میں قتل نہ کرنا اہلِ اسلام کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

لا یقاد الوالد بولدہ۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۵۱ ابواب الدیات) ۔۔ (ترجمہ) "باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(۲) والد کی ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد سے نہایت ہی محبت اور شفقت ہوتی ہے اور بتقاضائے شفقتِ پدری کوئی سلیم العقل شخص اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرتا، لہٰذا اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ولان الوالد لایقتل ولدہ غالباً لوفور شفقتہ فیکون ذٰلک شبہۃ فی سقوط القصاص۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ عموماً اپنے بیٹے سے شفقتِ پدری کی وجہ سے بیٹے کو قتل نہیں کرتا تو اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔"

(۳) باپ چونکہ بیٹے کے احیاء اور زندگی کے لیے بظاہر ایک سبب ہے لہٰذا بیٹے کو اب باپ کے خاتمہ کے لیے سبب نہیں بننا چاہیئے۔

ولان الاب لایستحق العقوبۃ بولدہ لانہ سبب لاحیائہ فمن المحال ان یکون الولد سببا لافنائہ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ بیٹے کے قتل پر مستحق قصاص نہیں ہے کیونکہ باپ بیٹے کی زندگی کے لیے ایک سبب تھا تو اب بیٹے کا باپ کے فناء کے لیے سبب نہیں ہونا چاہیئے۔"

(۴) باپ اگر مشرک ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو باوجود مشرک ہونے کے بیٹا باپ کو قتل نہیں کر سکتا تو

قصاص میں کیسے قتل ہوگا۔

و لهذا لا يقتله اذا وجده فى صف المشركين مقاتلته۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۲۹۶ کتاب الجنایات)
(ترجمہ) "اور بیٹا مشرک باپ کو جہاد کے دوران بھی قتل نہیں کر سکتا۔"

علاوہ ازیں اگر ایک باپ باوجود اس قدر احترام کے اپنے کسی لختِ جگر کی زندگی کا چراغ گل کردے تو پھر اس پر دیت واجب ہوگی جو کہ خود اس کے اپنے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی، اور بصورتِ مصلحت عدالت کی استصوابِ رائے سے تعزیر کا بھی مستحق ہے، لیکن از روئے شرع والد پر قصاص نہیں ہے، فتاوٰی ہندیہ میں ہے:۔

وهذه الديات كلها على العاقلة الا فى قتل الاب ابنه عمدا فانها فى ماله فى ثلاث سنين ولا تجب على العاقلة۔ (الفتاوٰی الهندية ج ۶ ص۲۷ کتاب الديات)

(ترجمہ) "دیگر تمام دیات قاتل کے عاقلہ سے لیے جائیں گے البتہ اگر باپ بیٹے کو قتل کردے تو اس کی دیت باپ کے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی عاقلہ پر واجب نہیں ہے۔"

میں آخر میں لاعلم محبانِ دین سے عرض کروں گا کہ دینِ اسلام کا دار و مدار نقل پر ہے عقل پر نہیں لہٰذا خدارا اس میں ذاتی رائے نہ دیجئے، مستند علماء سے بات پوچھ کر سپرد قرطاس کیا کریں تاکہ کسی کی گمراہی کا ذریعہ نہ بنے، اور اگر کوئی خواہ مخواہ بغض و عناد سے کام لے تو پھر اربابِ اقتدار پر لازم ہے کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر اس کا مواخذہ کریں۔

عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ

وفاقی کونسل میں کی گئی تقریر

مسودہ قصاص و دیت پر ۲۵ر جولائی ۱۹۸۴ء کو وفاقی کونسل میں مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی دس منٹ کے محدود وقت میں کی گئی تقریر وفاقی کونسل سیکریٹریٹ کے ضبط شدہ ریکارڈ سے نقل کرکے "ماہنامہ الحق" نے شائع کیا تھا۔ قانون قصاص و دیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے افادۂ عام کے لیے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سمیع الحق: نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

جناب چیئرمین! یہ موضوع مختلف پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے اس لیے دس منٹ میں تو اس کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے، میں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا اس لیے کہ جو اختلافی نوٹ ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں زیادہ تر انہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

حدیث کا تشریعی مقام

سب سے پہلی چیز جو سارے نظریاتی انتشار کی اساس بن جاتی ہے اور جس کی طرف میرے ایک دوست نے بھی اشارہ فرمایا کہ حدیث کی جو عظمت اور حیثیت ہے، اور جو تشریعی مقام ہے اسلام میں حدیث کا، اس پر ان دوستوں کی نظر نہیں پڑتی، قرآن کریم نے واضح طور پہ بار بار حدیث کی تشریعی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو حجت تسلیم کرنا اسلام کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝
(سورۃ النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم (حضور اکرم کو خطاب ہے) کہ یہ لوگ مومن نہیں بن سکتے جب تک تجھے ثالث، فیصلہ کرنے والا اور حَکَم تسلیم نہ کرلیں پھر ان کے دل میں بھی آپؐ کے فیصلوں پر کچھ بوجھ محسوس نہ ہو اور آپ کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کرلیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)	کسی مومن اور مومنہ کو (خواہ وہ مرد ہو یا خاتون) کوئی حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا تو ان کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ (بلکہ وہ لازماً تسلیم کرے گا)۔

ام المؤمنین سیّدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون آئی اور جسم پر نقش ونگار بنانے (گوندھنے) کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا (جیسے آجکل بھی بعض لوگ جسم پر نقش ونگار گوندھتے ہیں) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس خاتون نے اس وقت یہی کہا کہ میں نے تو الٓمّٓ سے وَالنَّاس تک سارے قرآن کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس مسئلے کا ذکر مجھے قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ (اس خاتون کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ قرآنِ کریم میں جو بات ہے صرف وہی حجت ہے) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآنِ کریم کو غور سے پڑھا ہوتا تو تُو ضرور اس کا حکم قرآن میں پالیتی، خاتون نے پھر کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں ہوسکا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا لوقرأتیہ لوجدتیہ یعنی یہ کہ اگر تُو نے غور کیا ہوتا تو تُو معلوم کرلیتی پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ قرآن مجید میں نہیں ہے: مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (سورۃ الحشر ع ۱) یعنی اللہ نے فرمایا "جو حکم تمہیں رسولؐ نے دیا اور جو کچھ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ"۔

جب قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے اور تمام وہ تفصیلات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تو گویا وہ عین قرآن ہیں۔

تو ایک تو بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اس سارے مسئلہ میں حدیث کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا۔ ہمارے فاضل دوست چودھری الطاف وغیرہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں صفحہ ۱۳۴ میں یہاں تک لکھا ہے کہ احادیث جن کا زیادہ تر بلکہ ۹۹ فیصد حصہ اخبارِ احاد پر مشتمل ہے ان میں نہ تو حقانیت ہے اور نہ ہی پورا یقین شامل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم، ان سب سے جو روایت الگ الگ یا ایک ایک راوی کے ذریعہ نقل ہوئیں اور جو اکیلے کسی صحابی نے سُنی اور وہ اُمت کو بیان کی

ان سب کو اخبار احاد کہا جاتا ہے، اب اگر احادیث کے سارے ذخیرے کو یہ کہا جائے کہ ان میں حقانیت ہی نہیں (نعوذ باللہ) تو پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا؟

عورت کی دیت نصف ہونے کی روایات

دوسری بنیادی بات جس پر سارا زور دیا جاتا ہے کہ نصف دیت کے بارے میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی گذارش ہے کہ حدیث کا ایک سلسلہ جو ہے اس مسئلے کا اسی کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ صرف ایک حدیث میں مذکور نہیں ہوا کہ عورت کی دیت نصف ہے بلکہ حدیث کی وہ مستند کتابیں جو صحاح ستہ میں شامل ہیں ان سب میں منقول ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے، ان کی کتاب سُنن النسائی صحاح ستہ میں شامل ہے، مؤطا امام مالک نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جبکہ امت کا ایک بڑا طبقہ امام بخاریؒ کی "صحیح" پر بھی اس کو ترجیح دیتا ہے، گو عام رائے یہی ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری۔ "یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے"۔ مگر امت کا ایک طبقہ خاص کر مغربی ممالک، الجزائر، مراکش، تیونس اور افریقہ کے کئی علاقے وہ مؤطا امام مالکؒ کو بخاری شریف پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنز العمال، نصب الرایہ، اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ ——— نے ان روایات کو نقل کیا ہے روایت بھی ایک سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے، حضرت عثمانؓ سے، حضرت علیؓ سے، حضرت ابوہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے کبار صحابہ کی یہی رائے (نصف دیت کی) تھی۔

اور علامہ کاسانیؒ نے "بدائع الصنائع" میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کی نصف دیت کا جو فیصلہ دیا تھا صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت میں سے کسی نے بھی اس پہ اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اس کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ تمام صحابۂ کرامؓ کا اجماع قرار پایا۔ اس کے بعد یعنی خلفائے راشدین کے بعد ائمہ اربعہؒ کا جب زمانہ آتا ہے تو سارے کے سارے ائمہ کرامؒ اس مسئلے پر متفق نظر آتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قدیم و جدید کسی بھی عالم کا ایک قول اس کے خلاف نہیں سنا۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے حامل ہیں، تو گویا ان سب کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی۔

فقہ جعفریہ بھی متفق ہے

ہمارے دوست علامہ سید محمد رضی مجتہد یہاں تشریف رکھتے ہیں میں ان کی موجودگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فقہ جعفریہ، فقہ زیدیہ اور

شیعہ مکتبِ فکر کے جتنے بھی فقہاء و مجتہد ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت نصف دیت ہے۔ تو ہمارے ان دوستوں کو اس سارے ذخیرے میں سے ایک دو قول ہی ملے ہیں۔

جنابِ والا ! یہ ضروری مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تشریح کرنے کے لیے آپ مجھے ایک دو منٹ اور دیں کیونکہ یہ مسئلہ اس سارے ہنگامے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، تو نصف دیت کے بارے میں صرف ان دو حضرات کا قول پیش کیا گیا ہے، ایک ابوبکر اصم اور دوسرے ابن عُلیہ۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے یہ دوست ان میں سے کسی بھی نام کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے، کبھی اس کو ابن اولیاء لکھتے ہیں کبھی اس کو کیا کہتے ہیں۔

اب ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ ہیں کون لوگ ؟ تو سب سے پہلے ان کی یہ رائے امام ابن قدامہؒ نے "المغنی" میں نقل کی، ان دو حضرات کی رائے نقل کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان راویوں کے علاوہ کسی اور سے (یعنی نامعلوم راوی سے) مذکور ہے کہ ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم یہ کہتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کے مساوی ہے، ان راویوں کا نام تک نہیں لیا گیا۔ پھر ان (عُلیہ اور اصم) کا قول ذکر کرنے کے بعد ابن قدامہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قول پوری امت کے ہاں متروک ہے کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔

اب ہم ان دونوں کو علمِ حدیث کے رجال اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اسماء الرجال کا علم اس امت کا عظیم الشان قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ ہر ہر راوی کو محدثین اور علماء جرح و تعدیل نے پرکھا ہے۔ تو اب سب سے پہلے ابوبکر اصم کو لیتے ہیں، جرح و تعدیل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ انہوں نے ایک کمزور راوی کا نام لے کر کہا کہ میں اس کو بھی ابن عُلیہ پر ترجیح دوں گا۔ امام نسائیؒ نے کہا کہ یہ شخص متروک ہے اور محدثین کے ہاں بالکل مقبول نہیں ہے۔ ابن معینؒ نے کہا کہ یہ متروک ہے۔ اسماء الرجال کی ایک مستند کتاب "لسان المیزان" میں تو ان کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جنابِ چیئرمین : مولانا قبلہ کل بھی یہ بات ہوئی جو آپ بتا رہے ہیں اور آج صبح آپ سے پہلے بھی ایک صاحب نے انہی کتابوں کے حوالے سے یہ چیزیں بتائیں، بار بار کیوں وہی باتیں آپ دُہرا رہے ہیں ؟

مولانا سمیع الحق : میں نے اس مسئلہ پہ یہ اختلافی نوٹ دیا تھا کہ دفعہ ۲۸ کے بارے میں جب قرآنِ کریم، احادیث اور فقہاء کی واضح ہدایات ہیں تو اسے ......

جناب چیئرمین: اس طرح سے دوسروں کا حق مارا جائے گا اور کوئی بات نہیں۔
مولانا سمیع الحق: میں یہ عرض کروں گا کہ یہ نصف دیت کا مسئلہ اتنا واضح، قطعی اور مسلمہ ہے کہ اگر اس کو اسی ایوان میں طے شدہ قرار دیا جاتا اور اس بارے میں اللہ اور رسول نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ہم سب سر تسلیم خم کر لیتے اور اس کو سپریم کورٹ یا کسی اور ادارے کے پاس مزید تفصیل کے لیے نہ بھیجتے تو اچھا ہوتا، کیونکہ اس وقت ہزاروں ایسے کیس ہیں جو اس آرڈی ننس کے نفاذ کے منتظر ہیں، سینکڑوں لوگ جو کال کوٹھڑیوں میں بند ایک ایک لمحہ اس انتظار میں گن رہے ہیں کہ کب یہ نافذ ہوگا اور کب مصلحت کی راہ کھلے گی اور ہمیں انصاف ملے گا۔ اگر اس کو ہم اسی طرح ملتوی کرتے رہے تو اس کے نفاذ میں مزید تاخیر ہو جائے گی۔ پھر اللہ اور اس کے رسول ؐ کے بیان کردہ مسائل و احکام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اس میں نہ تو عورتوں سے زیادتی کی گئی ہے نہ مردوں سے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور غیر مسلم سب کا خالق ہے اور آزاد اور غلام تک سب کے قصاص میں مساوات رکھی گئی ہے اسلام میں۔

صرف دیت کے ایک مسئلہ میں جو صرف قتل خطا کی صورت سے تعلق رکھتا ہے یہ تفصیل ہے، واضح حدود اور ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ ہمارے معزز ارکان اس مسئلے کو بھی جس طرح اس کی تشریح قرآن میں ہے اس طرح رکھ دیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی اس کی تفصیل تھی کہ مقدار نصف دیت ہوگی تو اسی کو رکھا جائے۔

جناب چیئرمین: مولانا صاحب بہت بہت شکریہ!

الابتدائیہ

جب حکومتِ پاکستان نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کیا تو کچھ لوگوں نے ہڑتالوں اور جلاؤ گھیراؤ کے ذریعہ اس آرڈیننس کو ختم کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، مفتیانِ عظام اور دوسرے اہلِ علم حضرات نے اسلام کے اس عادلانہ قانون کی وضاحت اور لوگوں کے شکوک وشبہات دور کرنے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی تاکہ عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بغیر تسلیم ورضا کے رہ نہ جائے ـــــ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے بھی اس آرڈیننس کا اجمالی جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ پیش کیا جو دارالعلوم کے ترجمان رسالہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوا، بعد از اں گوجرانوالہ کے ایک عالمِ دین مولانا سید تصدق بخاری صاحب نے اس پر اپنا تنقیدی نکتۂ نظر پیش کیا وہ بھی نذرِ قارئین ہے، پھر اس کے جواب الجواب میں حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جو کہ ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ـــــ چونکہ ان مضامین کا تعلق بھی فقہ اسلامی کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اس لیے بطورِ افادۂ عام دارالعلوم حقانیہ کے فتاویٰ میں شامل کیا جاتا ہے ـــــ (از مرتب) ـــــ

اسلام کا نظامِ قصاص و دیّت

اجمالی جائزہ و تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب

قصاص و دیت کے اعلان کے بعد جب ڈرائیور برادری کی طرف سے اس پر ملک گیر احتجاج ہوا تو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت سے موضوعِ بحث بنا رہا۔ موجودہ قصاص و دیت کے حکومتی اعلان میں اگر شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہوتے تو اس کی تائید و تصویب اتنے زوردار لہجے میں ہوتی جتنے کہ اس کی مخالفت میں مقالے لکھے گئے۔ بعض اہم امور میں بے احتیاطی اور تساہل کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری دنیا اسلام کے نظامِ قصاص و دیت سے مذاق کرنے پر اتر آئی۔ خدانخواستہ اگر اسلام کی ان فوجداری دفعات میں شرعی تقاضے پورے نہ کیے گئے تو شاید آئندہ کے لیے کوئی بھی اس ملکِ خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جرأت نہ کر سکے۔

تادمِ تحریر اس مسئلہ پر جو مقالات سامنے آئے ہیں ان میں کوئی ایسا مقالہ نظر سے نہیں گذرا جس میں قصاص و دیت کے سرکاری شائع کردہ قانون میں سقم اور کمزوری کے ہوتے ہوئے شرعی نقطہ نظر سے اس کے قابلِ عمل ہونے کو ثابت کیا گیا ہو، اربابِ علم و دانش اور نفاذِ اسلام کے مخلص اصحابِ فکر نے اصلاح کی کوشش کی، کمزوریوں اور اسقام کی نشاندہی کرنے کے بعد متبادل تجاویز پیش کیں۔

دوسری طرف بعض جدت پسندوں نے موجودہ مسوّدہ قانونِ قصاص و دیت میں سقم اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کو اپنا ہدف اور دُرفشانی کا نشانہ بنایا، ایسے رکیک اور غیر معیاری اعتراضات اور شبہات کئے جو کسی مسلمان سے ناقابلِ توقع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اکثر اعتراضات کا منشاء مذہب اور عقیدہ سے ناواقفیت کے علاوہ مروّجہ نام نہاد آزادی اور جدت پسندی کی مذموم خواہش رہی۔

قصاص و دیت کے بارے میں اہم شبہ | قصاص و دیت آرڈیننس کے بعد قصاص و دیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس میں ڈرائیور کو ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے علاوہ خود اس کا فعل بھی موضوع بحث رہا، یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کے ہاتھوں کا قتل قابل مواخذہ جرم نہیں قرار دینا چاہیئے، کسی بھی ڈرائیور کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کو شوقیہ قتل کرے، ڈرائیور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرتا ہے، موت کے منہ میں بیٹھ کر انسان کی خدمت کرتا ہے، آخر اس سے یہ توقع کیسے ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے، جبکہ بسا اوقات ڈرائیور کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں ایکسیڈنٹ کی موت کو قابلِ مواخذہ جرم قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا تصوّر زمانہ قدیم میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں نہیں تھیں اس لیے اس کو خواہ مخواہ قتل کی برائی قسموں میں شمار کرنا لایعنی کوشش ہے۔

قصاص و دیّت کے بارے میں قابلِ تشریح نکات | ان شبہات کے ازالہ کے لیے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایسے غیر معیاری شبہات کا موقع نہ رہے۔

(۱) ایکسیڈنٹ کی صورت میں قتل کی کیا حقیقت ہے اور یہ قتل النفس کی کون سی قسم میں آتا ہے۔

(۲) اسلامی نظامِ قصاص و دیت میں ایسی قسم کے لیے کون سی سزا مقرر ہے اور اس کے اثرات و منافع کیا ہیں؟

(۳) قصاص و دیت آرڈیننس کے مسوّدۂ قانون میں اس اعتبار سے کونسی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

تحفظِ نفس کا محیرالعقول نظام | ایکسیڈنٹ کے قتل کی حقیقت بیان کرنے سے قبل یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام کی رُو سے انسانی نفس کو جو عزت و عظمت اور تقدس حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ ایک اسٹیٹ میں انسان کے خون کو بلا امتیازِ مذہب و عقیدہ ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہے، یہ ممکن نہیں کہ نفسِ محترمہ کا خون رائیگاں ہو، جس صورت میں نفسِ محترمہ سے کسی غیر شرعی طریقہ سے کھیلا گیا تو اس کا حساب لیا جائے گا، اگر قصاص کی صورت میں ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت لازم ہوگی، اگر قاتل معلوم

نہ ہو تو قسامت کی رُو سے اہلِ محلہ سے دیت لی جائے گی ورنہ بصورتِ دیگر حکومت ذمہ دار ہوگی اس لیے فقہاء کرام نے نفسِ محترمہ کے ضیاع کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ۱: قتلِ عمد میں قصاص اور ۲: قتل شبیہ بالعمد، ۳: خطاء ۴: جاری مجرائی خطاء اور ۵: قتل بسبب میں دیت لازمی قرار دی ہے۔ موجودہ زیر بحث مسئلہ کا تعلق "قتلِ خطاء" سے ہے اس لیے دوسری قسموں کی حقیقت بیان کرنے سے قطع نظر ہم صرف قتلِ خطاء کی حقیقت کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایکسیڈنٹ کا قتل "قتلِ خطاء" کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

قتلِ خطاء کی حقیقت

"خطاء" کے عنوان سے یہ واضح ہے کہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قاتل کا ارادہ اور نیت شامل نہیں، گویا "قتلِ خطاء" کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی نیت اور ارادہ کے کسی انسان کے ہاتھ سے دوسرے انسان کی جان ضائع ہو، عموماً اس کی دو صورتیں بنائی جاتی ہیں۔

(۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل ۔

اوّل الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قاتل غلط فہمی کا شکار ہو یعنی کسی انسان کو حیوان سمجھ کر شکار کی نیت سے اسے مارے، اور مؤخر الذکر کا بیان یہ ہے کہ کسی بے احتیاطی یا فنی غلطی سے کسی انسان کی جان اس کے ہاتھ سے ضائع ہو، مثلاً شکار کو مارتے ہوئے اس کی گولی اچانک انسان کو لگے، یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں قاتل کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ بغیر قصد و عمد سے انسان کی جان ضائع ہوئی۔

ایکسیڈنٹ کی صورت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کیونکہ اس میں ڈرائیور کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرے، ڈرائیور تو اپنے مقصد میں مصروفِ عمل ہوتا ہے، شاید کسی بے احتیاطی یا غفلت اور لاپروائی سے کسی انسان کی زندگی اس کے ہاتھوں سے تمام ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات ڈرائیور کی غلطی نہ ہو بلکہ مقتول خود عمداً یا سہواً گاڑی کے آگے آئے، لیکن ایسی صورت میں بھی ڈرائیور کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قتل ہر صورت میں ڈرائیور کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ مثلاً شکار کو مارتے ہوئے کوئی شخص قصداً شکاری کی بندوق کے سامنے کھڑا ہو جائے تو فقہاء کی رائے میں شکاری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بہرحال ایکسیڈنٹ کا قتل، قتلِ خطاء سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

قتلِ خطاء کی سزا

دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں خطاء قابلِ مواخذہ جرم نہ ہو، اگر کوئی شخص کسی کی کوئی قیمتی چیز غلطی سے توڑ دے تو کیا توڑنے والے کو معاف کر دیا جائے گا؟ کہ وہ محض یہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ شریعتِ مقدسہ میں خطاء اور نسیان اخروی اعتبار

قابلِ مواخذہ جرم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"میری امت کا محاسبہ خطا اور بھول پر نہیں ہوگا۔"

لیکن دنیوی احکام کے اعتبار سے اس پر مواخذہ ہے، جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس میں خطاء اور نسیان کوئی عذر نہیں، خاص کر جب کسی چیز کے ضائع ہونے پر ضمان اور تاوان کا مسئلہ ہو۔

قتلِ خطاء بھی دنیاوی احکام کے اعتبار سے قابلِ مواخذہ جرم ہے، اس پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ تین ہیں:۔

(۱) اگر مقتول قاتل کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی موت پر قاتل کو وراثت کا حق پہنچتا ہو تو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل حقِ وراثت سے محروم رہے گا، کیونکہ اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ کہیں قاتل نے جائیداد ہتھیانے کے لیے قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

(۲) دوسری سزا یہ ہے کہ انسانی جان اللہ تعالیٰ کی عظیم مقدس امانت ہے اس میں خیانت کرنے پر قاتل دو مہینے متواتر روزے رکھے گا تاکہ قاتل کو اپنے کیے ہوئے جرم پر ندامت اور افسوس کا احساس ہو۔ اس کا تعلق چونکہ فیما بینہ و بین اللّٰہ ہے اس لیے اس میں جبر اور طاقت کے استعمال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری سزا خون بہا کی ادائیگی ہے تاکہ انسان کا خون ضائع نہ ہو، قتلِ خطا کی صورت میں خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ (۲۹۱۶ تولہ، ۸ ماشہ) چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروّجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔ خون بہا کی اتنی خطیر رقم کی تقرری میں بنیادی فلسفہ مقتول کے زخم خوردہ ورثاء کے لیے تسلّی ہے، ممکن ہے کہ اس مالی تعاون سے ان کے جذبات ٹھنڈے ہوں اور انتقامی جذبہ کا جو لاوا اُن کے دلوں میں اُبل رہا تھا شاید خون بہا کی وصولی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن اتنی بڑی رقم کی ادائیگی شاید قاتل کے بس میں نہ ہو، ممکن ہے کہ تحمل کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکے جس سے دیت کی ادائیگی ناممکن ہو، اس لیے شریعت نے اس کو ممکن بنانے اور قاتل کو ہلاکت کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری "عاقلہ" کے کندھوں پر ڈالی ہے "عاقلہ" سے مراد اہلِ دیوان (دفتری ریکارڈ میں متعلقہ زمرہ) قوم، قبیلہ ہے۔ "عاقلہ" کے تعین میں بنیادی تصور یہ ہے کہ جن لوگوں سے تکلیف اور مصیبت کے وقت قاتل تعاون اور مدد کی امید رکھتا ہو وہی اس کا

عاقلہ متصور ہوگا، موجودہ وقت میں یونین، محکمہ اور کمپنی اس کے ضمن میں آسکتے ہیں، مثلاً سکول کا ایک استاد کہیں قتلِ خطاء کا مرتکب ہو تو اس قتل کی دیت پورے صوبہ کے اساتذہ سے لی جائے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک گمنام شخص کے جرم کی سزا پورے محکمہ والوں کو دی جائے، لیکن اسلامی ذہن رکھنے والا شخص ایسے لایعنی شبہات کا کبھی تصور بھی نہیں کرتا، کیونکہ تمام مسلمان بمنزلہ جسدِ واحد ہیں، ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، مشرق میں رہنے والے کی خوشی اور غم کا احساس مغرب میں رہنے والے مسلمان کو بھی ہوگا۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مصیبت میں مبتلا ہونے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسلام میں قومی وحدت اور یگانگت بنیادی چیز ہے؛ لہٰذا ایسی مصیبت میں کم از کم اس کے عاقلہ کو تعاون کا ہاتھ یقیناً بڑھانا چاہیئے۔

عاقلہ پر دیت کے تعین کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی قوم جب دیت ادا کرے گی تو لازماً قاتل کو ایسے اوصاف اور باتوں سے یاد کرے گی جن کا سننا قاتل کے لیے ناگوار ہوگا۔ ایسے قبیح حالات اور مناظر سے بچنے کے لیے آئندہ ہر ایک شخص نہایت احتیاط سے کام لے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ بھی مہذب طریقہ سے قاتل کو سزا دینے کی ایک صورت ہے، ورنہ ایک معزز شخص لاکھوں روپے قربان کر کے اپنے بارے میں ایسی باتیں سننا گوارا نہیں کرتا۔

دیت کی وصولی کا طریقۂ کار

عاقلہ پر دیت کا جو بوجھ ڈالا گیا ہے یہ کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو، عاقلہ سے دیت مجموعی طور پر تین سالوں میں وصول کی جائے گی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں ایک شخص پر تین سالوں میں چار درہم یعنی چودہ ماشہ چاندی کی قیمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر چاندی کی قیمت ۷۰ روپے فی تولہ ہو تو ایک شخص سے تین سالوں میں صرف ۸۱-۷۱ روپے وصول ہوں گے جو ماہانہ طور پر دو روپے سے بھی کم بنتے ہیں، پھر اگر قریبی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو عاقلہ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تاکہ ایک شخص پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جا سکے۔

پھر دیت کی وصولی کے لیے آسان طریقہ متعین کیا گیا ہے کہ دیت لوگوں کے ماہانہ، ششماہی اور سالانہ وظائف سے منہا کی جائے گی۔ موجودہ دور میں اگر ہر ملازم کی تنخواہ سے ماہانہ دیت کی رقم کاٹی جائے تو شاید ہی دو روپے سے متجاوز ہو جو کہ تنخواہ دار طبقہ پر کوئی خاص بوجھ نہیں۔

اس محیر العقول نظامِ تحفظِ جان سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے، اسلام دینِ فطرت ہے اس میں نہ ظلم کی حوصلہ افزائی ہے اور نہ ظالم کا استیصال مقصود ہے۔ اسلام میں ظالم اور مظلوم دونوں سے تعاون

کیا جاتا ہے۔ ظالم سے تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مظلوم کی طرف ہمدردی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام دیت میں اگر ایک طرف قاتل کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو دوسری طرف عاقلہ پر یہ ذمہ داری ڈال کر اس کے ساتھ سہولت اور آسانی کا رویہ رکھتا ہے، پھر دیت کی وصولی سے مقتول کے غمزدہ ورثاء کے لیے اطمینان دلانے کا ہمدردانہ رویہ اسلام کا انفرادی مقام ہے۔

موجودہ نظام قصاص و دیت کی خامیاں نظام قصاص و دیت کا آرڈیننس کے ذریعہ نافذ کردہ مسودہ کوئی نیا نہیں، اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بہترین کام کیا ہے، اس وقت قصاص و دیت کا سرکاری مسودہ علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو ہم دارالعلوم حقانیہ کے خدام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز حکومت کو بھیجی تھیں جو ماہنامہ الحق جلد ۲۶ شمارہ ۳ میں شائع ہوئی تھیں۔ حالیہ آرڈیننس میں اسلامی خدوخال کی رعایت نہیں رکھی گئی، قتل خطا کی صورت میں صرف ڈرائیور کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرانا اسلام کے عادلانہ نظام کی روح کے منافی ہے، ڈرائیور سے صرف اتنی رقم لی جائے گی جو اس کی برادری کے عام ممبر سے لی جاتی ہے اس میں عاقلہ کو بری الذمہ قرار دینا اسلامی نظام عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے کہ چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے، یہ قیمت تو وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے، پھر حکومت کا یہ فیصلہ بھی غیر دانشمندانہ ہے جس میں دیت کی ذمہ داری انشورنس کمپنی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے کیونکہ انشورنس کمپنی ہر ایک کی عاقلہ نہیں اور بغیر عاقلہ ہونے کے دیت کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محکمہ، یونین اور قوم قبیلہ عاقلہ قرار دے کر ان کو دیت کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں شرعی نظام شہادت کے فقدان کی وجہ سے قصاص و دیت آرڈیننس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع بے سود ہے، موجودہ نظام شہادت کے ہوتے ہوئے اس نظام کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل نظر آتا ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نظام قصاص و دیت کے ساتھ ساتھ نظام شہادت کا بھی شریعت کے مطابق اعلان ہو۔

ایک غلط تاثر کا دفاع

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی مدظلہٗ

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کے مبارک دن ملک میں قصاص و دیت کا قانون نافذ کیا گیا تو دیندار مسلمانوں نے اسے صدر مملکت کا بہترین کارنامہ قرار دیا جو کہ حقیقت کے عین مطابق تھا۔ نئی حکومت قائم ہوئی اور معاًبس ڈرائیوروں کی عام ہڑتال کا سانحہ پیش آیا تو افواہ اڑادی گئی کہ اسلامی قوانین کا برداشت کرنا آسان کام نہیں، یہ تو ایک قانون نافذ کر دینے کا ردِ عمل ہے اور اگر شریعتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر نافذ کر دیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس شرارت کے بین السطور دراصل موجودہ حکومت کو خوفزدہ کرنا ہے کہ وہ سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت کو منظور کرانے کے وعدوں سے پھر جائے اور جس طرح وہ سابقہ حکومت خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لے کر غرق ہوئی ہے اسی طرح یہ بھی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے پہلے غرق ہو جائے۔

ہڑتالیوں سے بات چیت کے بعد اخبارات میں یہ اعلان چھپا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے قانون میں ترمیم کرے اور یہ بتایا جائے کہ ڈرائیور پر جو دیت عائد ہوگی وہ اس کا عاقلہ یعنی یونین وغیرہ برداشت کرے گی نہ کہ وہ ذاتی طور پر۔ اب شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ سے خوف زدہ لوگوں نے پینترا بدلا اور کہنے لگے کہ:۔

"دیکھا! اسلامی قوانین جنہیں ابدی کہا جاتا ہے اس میں طاقت کے بل بوتے پر ترمیم کی جا سکتی ہے اور یہ کہ نفاذِ شریعت کا نعرہ لگانے والے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

دراصل نفاذِ شریعت کے مخالفین کو موجودہ انتخابات سے جو دھچکا لگا ہے وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں۔

اظہارِ حقیقت

حقیقت یہ ہے کہ ہڑتالیوں کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ اسلام کے قانونِ دیت سے نہیں بلکہ اسلام کے قانونِ دیت میں ترمیم کرنے سے پیش

آئی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق سینٹ میں موجود علماء کرام نے قصاص و دیت سے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا اور اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں اس میں پہلے ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے قتلِ خطاء کی دیت مجرم پر نہیں بلکہ عاقلہ یونین پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ تین سال تک اس کو ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن سابق حکومت کے کارندوں نے دانستہ یا نادانستہ، اسلام سے ناواقفیت کی بناء پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اڑا دیا جس سے متاثرین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یعنی اسلامی قانونِ دیت سے سے تم نے ایک لفظ (عاقلہ) اڑا دیا تو پریشانی لاحق ہو گئی اگر تم نے توبہ کی اور حذف شدہ لفظ کو کو واپس لا کر اس قانون کو اسلام کے مطابق کر دیا تو اطمینان ہوا۔ اس لیے ملک کے عوام کو عموماً اور حکمرانوں کو خصوصاً یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ شر اور فساد کا منبع اسلامی قوانین میں ردّ و بدل اور ان سے لاپرواہی ہے نہ کہ اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ۔

شاعرِ مشرق کا یہ پیغام ایک لمحہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے وہ فرماتے ہیں ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

اصل دیت کیا ہے

سو اونٹ یا دس ہزار دراہم؟

جواب مضمون مفتی غلام الرحمٰن صاحب از مولانا سید تصدق بخاری

مؤقر جریدہ "الحق" دسمبر ۱۹۹۰ء موافق جمادی الاول ۱۴۱۱ھ میں حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا مقالہ "اسلام کا نظام قصاص و دیت" نظر سے گذرا تو بڑا قلق ہوا کہ حضرت موصوف کو بھی دیت کی مقدار کے تعین میں سخت ذہول ہوا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "قتل خطاء کی صورت میں یہ خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار تو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی" (الحق ص ۳۶)۔ (ہرگز نہیں) پھر آگے جا کر یوں خامہ فرسا ہیں کہ:

"چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے" (الحق ص ۳۸)

حضرت مولانا صاحب موصوف سے اس ذہول کا ارتکاب اس لیے ہوا ہے کہ وہ اصل دیت کی احادیث مبارکہ پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہیں۔ احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا، چاندی، گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اسی لیے ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی قیامت تک بوقت ضرورت ہوتی ہی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں، اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اسی لیے ان کی تعداد میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی، مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"یہ قیمت تو اس وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے"۔ (الحق ص ۳۸)

موصوف نے جب حکومت کی مقرر کردہ دیت کو غیر شرعی دیت تسلیم کیا ہے تو پھر حضرت موصوف کی تولوں اور ماشوں والی پیش کردہ دیت بدرجہ اولیٰ واتم غیر شرعی ہے کیونکہ جس طرح حکومت نے سونے یا چاندی کو اصل دیت تصور کر کے مزلت پذیر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اسی طرح حضرت صاحب نے دس ہزار دراہم کو اصل دیت تسلیم کر کے بہت ہی بڑی غلطی کا اظہار کیا ہے، آپ خود لکھتے ہیں:۔

"ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار (چھ سو دس) روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے

چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار لازمی ہے۔" (الحق ص۳۸)

درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹوں کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی، مقررہ چیزوں کی صورت میں اس سے کم یا زیادہ دینے سے شرعی دیت ادا نہ ہو گی جیسا کہ عنقریب آرہا ہے۔

۲۹۱۶ تولے ۸ ماشے چاندی کی موجودہ قیمت بحساب ۵۵ روپے فی تولہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار چار سو سترہ روپے بنتی ہے جو کہ شرعی دیت نہیں ہے۔

غور فرمائیے موصوف کی مقرر کردہ دیتِ نفس حکومت کی مقرر کردہ دیتِ نفس سے دس ہزار روپے سے بھی زیادہ کم ہے جو ناقص ہی نہیں بلکہ انقص ہے۔

حکومت نے قصاص و دیت کا جو آرڈیننس ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو جاری کیا وہ ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء موافق ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو نافذ العمل قرار دیا گیا جس کی دفعہ ۳۴ غیر محتاط ڈرائیونگ کے متعلق ناقص ہی نہیں بلکہ انقص تھی اس لیے اس کے خلاف ملک بھر میں زمینی ذرائع آمد و رفت کو معطل کر دینے والی ہڑتال ہوئی۔ مذکورہ آرڈیننس میں یہ مرقوم ہے کہ غیر محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا جو ڈرائیور حادثہ کر کے کسی آدمی کو مار دے گا وہ مرنے والے کے ورثاء کو ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے بطور دیت دے گا۔ اس کے خلاف مظاہرے اور ہڑتال اس لیے ہوئے تھے کہ اس میں بھی دو نقص تھے۔ ایک تو اس میں اصل دیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرا "عاقلہ" کا تعارف نہیں کرایا گیا اور نہ ہی ان کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ہڑتال کا مطلب یہ لینا کہ لوگ اسلامی قوانین کو برداشت نہیں کرتے، سراسر غلطی اور بے اصل ہے۔ درحقیقت یہ ہڑتال اس لیے ہوئی تھی کہ قصاص و دیت کے آرڈیننس میں ناقابلِ برداشت نقائص تھے جن کی تنقیح لازمی ہے۔ پھر انشورنس کمپنی کو دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دینا ہر طرح سے شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے۔

قانونِ دیت ـــ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں

ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری المعافری المصری المتوفی بہا سنہ ثمان وعشرۃ ومائتین (۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء) "الرسالۃ المستطرفۃ" میں رقمطراز ہیں:۔

"پہلا مقتول جس کا خون بہا (دیت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ فتح مکہ

میں ادا فرمایا وہ جنیدب بن اکوع کا ہے، اسے بنو کعب نے قتل کیا تھا، نبی علیہ السلام نے اس کے خون بہا (دیت) میں سو اونٹنیاں دی تھیں۔" (سیرت ابن ھشام ج ۲ ص۴۸۳ باب فتح مکہ)

عن ابن عمر قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی درجۃ الکعبۃ یوم الفتح فقال الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ الا ان قتیل العمد الخطاء بالسوط اوالعصا مائۃ من الابل مغلظۃ منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا۔ (دار قطنی ج ۲ ص۱۰۵ ۔ البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج ۴ ص۳۸۲ ابن ماجۃ ج ۲ ص۸۷۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمائی، پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندہ کو مدد دی اور اس نے تنہا دشمن کے لشکروں کو شکست دی، آگاہ ہو جاؤ خطاء کا مقتول (قتل خطاء) وہ ہے جو کوڑے اور چھڑی سے مارا جائے، اس میں دیت کے سو اونٹ ہیں، ان میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہیں۔"

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت قیمۃ الدیۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینار او ثمانیۃ الاف درھم دیۃ اھل الکتاب یومئذٍ النصف من دیۃ المسلمین قال فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمرؓ فقام خطیباً فقال ان الابل قد غلت قال ففرضھا عمرؓ علی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الْبَقَرَۃِ مائتی بقرۃ وعلی اھل الشاۃ اَلْفَیْ شاۃٍ وعلی اھل الْحُلَلِ مائتی حُلَّۃٍ ۔ قال وترک دیۃ اھل الذمۃ لم یرفعھا فیما رفع من الدیۃ۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۲۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خون بہا کے اونٹوں کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار دراہم تھی اور اہل کتاب کا خون بہا اس زمانہ میں مسلمانوں کے خون بہا سے نصف تھا، جب حضرت عمرؓ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے فرمایا چونکہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اسلئے سونا رکھنے والوں کیلئے ایک ہزار دینار خون بہا مقرر کیا ہے اور چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار دراہم اور گائیں رکھنے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں

رکھنے والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے رکھنے والوں پر کپڑوں کے دو سو جوڑے مقرر کئے ہیں اور ذمّی لوگوں کی دیت وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔"

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درھم۔ (جامع الترمذی ج ۳ ص ۲۲۴)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار دراہم خون بہا (دیت) مقرر کیا تھا۔"

علامۃ ابوالفضل جمال الدین عبداللہ بن محمد بن ابی الحسن مکرم بن احمد ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی المصری ولد ۶۳۰ھ مات فی شعبان ۷۱۱ھ۔
قال وکان اھل الدیۃ الابل ثم قوّمت بعد ذلک بالذھب والفضۃ والبقرۃ والغنم وغیرھا۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۶۱۲)

(ترجمہ) صاحب لسان العربؒ فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں صرف لوگوں کی سہولت کے لیے ان اونٹوں کی قیمت کے برابر، بعد میں سونا و چاندی، گائیں اور بکریاں وغیرہا دیت مقرر کی گئی۔"

اس سے ثابت ہوا کہ دیت میں سونے چاندی کا اعتبار نہیں، اصل دیت جب اونٹ ہی ہیں تو دیت میں سو اونٹ ہی دیتے ہوں گے یا پھر ان کی قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء۔ دو سو گائیوں اور دو ہزار بکریوں کی قیمت بھی ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے سے کہیں زیادہ بنتی ہے لہٰذا ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے کی دیت درست نہیں۔

فقال الشافعی واحمد فی روایۃ محمد بن المنذر الابل فقط فتجب قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (البنایۃ ج ۱۰ ص ۵۸)

(ترجمہ) امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ بھی جو اس کے قائل فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں جو ان کی قیمت ہے اسی قیمت کی دوسری مقرر کردہ اشیاء دیت میں دینا ہوں گی۔"

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصاء مائۃ من الابل مغلّظۃ منھا اربعون فی بطونھا اولادھا۔ وذھب قوم الی ان الدّیۃ المغلّظۃ اربع خمسون وعشرون بنت مخاض وخمس و عشرون بنت لبون وخمس وعشرون حقۃ وخمس وعشرون جذعۃ۔

(معالم التنزیل ج ص ۲۲۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خبردار سو بیشک قتل عمد خطا کوڑے (تازیانے) اور لاٹھی مارنے سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت سو اونٹ ہیں، ان میں چالیس حاملہ (گابھن) اونٹنیاں ہیں جن کے پیٹوں میں ان کے اولاد ہو ـــــ اور ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ بلا شبہ دیتِ مغلّظہ چار قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے ـــــ اوّلاً: ۲۵ ایسی اونٹنیاں جو ایک برس پورا کر کے دوسرے برس میں داخل ہو گئی ہوں ـــ ثانیاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو دو برس پورے کر کے تیسرے میں داخل ہو گئی ہوں ـــــ ثالثاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو تین برس کی ہو کر چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور جفتی کے قابل ہوں ـــــ رابعاً، ۲۵ وہ اونٹنیاں جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی ہوں۔ (امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک)" دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:-

......وانّ فی النفس الدّیۃ مـائۃ من الابل ـ (ابوداؤد، نسائی، ابن خزیمۃ، ابن جارود، ابن حبّان، مسند احمد، بلوغ المرام، کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ قتلِ نفس کی اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں۔

عن جابر بن عبد اللہ قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الدّیۃ علیٰ اھل الابل مائۃ من الابل وعلیٰ اھل البقرۃ مـائتی بقرۃ وعلیٰ اھل الشاۃ الفی شـاۃ وعلیٰ اھل الحلل مائتی حلۃ ـ (تفسیر مظہری ج۲ ص۱۸۹، ابوداؤد عن عطاء بن رباح)

(ترجمہ) "حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑے دیت مقرر فرمائی ہے۔"

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھتے چلئے کہ اصل دیت سو اونٹ ہیں اس لیے آجکل کپڑوں کے دو سو جوڑوں کی دیت ادا نہ ہوگی، بلکہ اگر کپڑے ہی دینے ہوں تو پھر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر کپڑا دینا ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدّہٖ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قال من قتل خطأً فديته من الابل ثلاثون بنت مخاض وثلاثون ابنة لبون وثلاثون حقة وعشر بنی لبون ـــــ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولها علی القری اربع مائة دینار او عدلها من الورق ویقوّمها علی ازمان الابل اذا غلت رفع فی ثمنها واذا اهانت نقص من ثمنها علی نحو الزمان ما کان فبلغ قیمتها علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین اربع مائة دینار الی ثمان مائة دینار او عدلها من الورق ثمانیة آلاف وقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کان عقله فی البقرة من اهل البقرة مائتی بقرة ومن کان عقله فی الشاة علی اهل الشاة الفی شاة۔ (ابن ماجہ ج ۳ ص ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خطاء سے مارا جائے اس کی دیت (۱۰۰) اونٹ ہیں (۳۰) تیس ایسی اونٹنیاں ہیں جو ایک سال کی ہوکر دوسرے سال میں لگی ہوں، اور تیس (۳۰) ایسی اونٹنیاں جو دو سال پورے کرکے تیسرے سال میں لگی ہوں، اور تیس (۳۰) ایسی اونٹنیاں جو تین سال کی ہوکر چوتھے سال میں لگی ہوں، اور دس (۱۰) ایسے اونٹ جو دو دو برس کے ہوکر تیسرے تیسرے برس میں لگے ہوں ـــــ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاؤں والوں پر دیت کی قیمت چارسو دینار لگاتے یا اتنی ہی قیمت کی چاندی، اور دیت کی قیمت اونٹوں کے حساب سے لگاتے، جب اونٹ گراں ہوتے تو دیت بھی گراں (زیادہ) ہوتی اور جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی ارزاں (کم) ہوجاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اونٹ کی قیمت چارسو دینار سے لیکر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی۔"

آجکل اونٹوں کی جگہ اگر گائے بکری دیت میں دی جائے تو ان کی قیمتیں سب سے زیادہ ہیں، بتیل بکری لی جائے تو دوہزار بکریوں کی قیمت تقریبًا چالیس لاکھ روپے بنتی ہے، دودھیل بتیل بکری دوہزار روپے کی کم از کم ۴۰۰۰۰۰۰ = ۲۰۰۰ × ۲۰۰۰ ـــــ چالیس لاکھ روپے۔

میں بازار سے عام بکری کی قیمت معلوم کی تو دوہزار بکریاں دس لاکھ روپے کی بنتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) اگر ایک بکری کی قیمت پانچسو روپے ہو تو دوہزار بکریوں کی قیمت کیا ہوگی؟

۱۰۰۰۰۰۰ = ۲۰۰۰ × ۵۰۰ ـــــ دس لاکھ روپے۔

غور فرمائیے! سو اونٹوں کے بدلے دیت میں اگر دو ہزار بکریاں دی جائیں تو کم از کم دیت دس لاکھ روپے بنتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ سو اونٹوں کی جگہ گائیں رکھنے والوں سے دو سو گائیں دیت میں دلائی جائیں۔

میں نے مویشی منڈی سے قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک عام گائے کم از کم بتیس سو روپے کی ملتی ہے۔

۶۴۰۰۰۰ = ۲۰۰ × ۳۲۰۰ — چھ لاکھ چالیس ہزار۔

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ولد ۷۶۲ھ توفی ۸۵۵ھ) رقمطراز ہیں کہ:-

قال الامام الاسبیجابیؒ قیمۃ کل حُلّۃ خمسون درھما وقیمۃ کل بقرۃ خمسون درھما وقیمۃ کل شاۃ خمسۃ دراھم۔

(البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج۱۰ ص۱۸۵)

(ترجمہ) علامہ اسبیجابیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جوڑا کپڑے کی قیمت پچاس درہم اور ایک گائے کی قیمت پچاس دراہم اور ایک بکری کی قیمت پانچ درہم تھی۔

آٹھ سو دینار، دس ہزار درہم، سو گائیں، ہزار بکریاں، دو سو جوڑے کپڑوں کی قیمتیں سو اونٹوں کی قیمت کے برابر نہ تھیں۔ اس لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اب اونٹوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں لہٰذا سو اونٹوں کے بدلے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں دیت میں دلائی جائیں گی۔

یاد رہے کہ دراہم و دنانیر اور گائیں اور بکریوں وغیرہا کی تعداد اس لیے بڑھتی گھٹتی رہی ہے کہ وہ اصل دیت نہیں، اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ہر زمانہ میں اونٹوں کی اصل قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء کی تعداد بھی بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور رہے گی۔

خیرالقرون میں جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی کم ہو جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل دیت کی قیمت چار سو دینار سے لے کر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی، چاندی کے آٹھ ہزار دراہم اس کے مساوی ہوتے تھے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی

ارشاد فرمایا کہ گائے والوں اور بیل والوں سے دیت میں دو سو گائیں اور بکریوں والوں سے دو ہزار بکریاں لی جائیں۔

ملحوظہ: یہ بات ذہن نشین رہے کہ قتلِ نفس کی اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے سنتِ قائمہ کے مطابق ہر زمانہ میں اونٹوں کی قیمت کے نرخ کے حساب سے ہی دیت ادا کی جائے گی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

کما مر۔ ویُقوّمُها علیٰ اثمانِ الابلِ فاذا غلت رفع قیمتها واذا هاجت رخص نقص من قیمتها۔ الخ (ابو داؤد، نسائی، مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶، مشکوٰۃ ص ۳۰۴)

(ترجمہ" اور قیمت ٹھہراتے (نبی کریمؐ) دیت خطا کی اوپر مول اونٹوں کے پھر جس وقت مہنگے ہوتے اونٹ تو زیادہ کرتے قیمت دیت کی اور جب ظاہر ہوتی ارزانی اونٹوں کی تو قیمت کم کرتے دیت سے" (مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶)

اس حدیث کے تحت شاہ عبد العزیزؒ[1] محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور نواسہ مولانا مخدومنا و مکرمنا حاجی محمد اسحاق[2] روح اللہ روحہ کے شاگرد رشید مولانا قطب الدین[3] ابن محمد محی الدین احراری الدہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ:۔

"کہا طیبیؒ نے یہ دلالت کرتی ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہیں پس اگر نہ ملیں (اونٹ) تو واجب ہوتی ہے قیمت ان کی جس قدر کہ ہو"

(ملاحظہ ہو مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۴ طبع اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک اور جگہ قتلِ عمد کی دیت کی بابت ارشاد ہو رہا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من قتل متعمداً دفع الی اولیاء المقتول فان

---

[1] ولادت: ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۹ء۔ وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء

[2] ولادت: ۱۱۹۷ھ ذی الحجہ۔ وفات ۲۵ رجب ۱۲۶۲ھ۔ محدث لاہوری ثم الدہلوی۔

[3] ولادت: ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۷۹ھ

شاءوا قتلوا، وان شاءوا اخذوا الدیۃ وھی ثلاثون حقۃ وثلاثون جذعۃ واربعون خلفۃ وما صالحوا علیہ فھو لھم۔ (جامع الترمذی جلد ۲ ص ۴۲۱)
(لسان العرب جلد ۱۵ ص ۳۱۳)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی جان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے گا، وہ اگر چاہیں تو قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو دیت لے لیں اور وہ دیت سو اونٹنیاں ہیں، ان میں سے تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں ہیں جو کہ تین برس پورے کر کے چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں، اور تیس ۳۰ وہ جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی، اور چالیس اونٹنیاں گابھن (حاملہ) ہوں گی اور مقتول کے وارث جس بات پر صلح کر کے فیصلہ کر لیں وہی قاتل پر واجب ہو گی۔"

ایک اور جگہ قتلِ خطاء کی اصل دیت بھی سو اونٹ ہی مقرر فرمائے گئے ہیں، ارشادِ نبوی ہے:۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ وعشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔ (ابن ماجہ ج ۳ ص ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۲/۳۳ ھ) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتلِ خطاء کی اصل دیت میں بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں داخل ہو گئی ہوں، اور بیس ۲۰ اونٹنیاں ایسی ہوں جو چار سال پورے کر کے پانچویں سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو دو برس کی ہو کر تیسرے برس میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹ وہ جو ایک ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوئے ہوں۔"

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ و عشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض ۔
(ابوداؤد ج ۲ ص۲۷۷ ، ابن ماجہ ج ۲ ص۱۹۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۔ ابن کثیر ج ۱، ص۵۳۵
نسائی ، ترمذی ، مظہری ج ۲ ص۱۸۷ ، موطا امام مالک ص۲۹۳ باب الدیۃ ، کتاب العقول)

(ترجمہ) ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا خطاء کی اصل دیت (سو اونٹ ہیں) بیس اونٹنیاں وہ جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ ہیں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ ہیں جو دوسرے برس میں لگی ہوں ۔

ھٰذا عند امام احمد وامام اعظم رحمہما اللہ

وان قتیل الخطاء شبہ العمد قتیل السوط والعصاء دیۃ مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادھا یعنی مائۃ من الابل ۔ (دارقطنی ج ۳ ص۱۰۵ ، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص۸۷۷)

(ترجمہ) ”اور قتل خطاء عمد وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے مار دیا جائے اس کی اصل دیت مغلظ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں ۔“

اجمعت الصحابۃ علی المائۃ لکنھم اختلفوا فی سنھا ۔
(البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج ۱۰ ص۲۸۶)

(ترجمہ) ”تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں لیکن ان کی عمروں میں ان کا اختلاف ہے ۔“

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا دیۃ الخطاء شبہ العمد ماکان بالسوط والعصاء مائۃ من الابل منہا اربعون فی بطونہا اولادھا ۔ (نسائی ، ابن ماجہ ، دارمی ، ابوداؤد ، مشکوٰۃ باب الدیات)

(ترجمہ) ”حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مارا جائے وہ خطاء شبہ عمد ہے ، اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں ۔“

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمقدار الدیۃ وانھا مائۃ من الابل ضمنھا حدیث سھل بن ابی حثمۃ فی القتیل الموجود بخیبر وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وداہ بمائۃ من الابل۔ وروی سفیان بن عیینۃ عن علی بن زید بن جدعان عن القاسم بن ربیعۃ عن ابن عمر قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقال الا ان قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا فیہ الدیۃ مغلظۃ مائۃ من الابل اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا۔ وفی کتاب عمرو بن حزم الذی کتبہ لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی النفس مائۃ من الابل۔ وروی عمرو بن دینار عن طاؤس قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیۃ الخطاء مائۃ من الابل۔

{احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص۲۳۲ باب مبلغ الدیۃ من الابل و باب شبہ العمد ج ۲ ص۲۲۹}

(ترجمہ) "ارشادِ نبویؐ ہے کہ دیت کی مقدار سو اونٹ ہیں حضرت سہلؓ کی حدیث اس پر گواہ ہے کہ خیبر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سو اونٹ دیت میں دیئے تھے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتل خطاء العمد وہ ہے جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مار دیا جائے اس کی دیت مغلظ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں گی۔ اور عمرو بن حزم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ قتلِ خطاء کی دیت سو اونٹ ہے ـــــ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ ہی مقرر فرمائی ہے۔"

پھر یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام جصاصؒ فرماتے ہیں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ دیت بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم ہے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ دیت ایک ہزار دینار ہے بلکہ ہر زمانہ میں سو اونٹوں کی قیمت کو دیکھا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص۲۳۵)

بلا شبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں اصل دیت سو اونٹ ہی بتائی ہے، پھر کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں کیا اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

(البنایۃ ج ۴ ص۴۸۲)

اور دیت آزاد مسلم کی سو اونٹ ہے جب اونٹ نہ مل سکیں تو ان کی قیمت واجب ہے جیسا کہ

حضرت عمرؓ نے سو اونٹوں کی قیمت کے برابر سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم دیت کے مقرر کئے تھے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ ذمّی اور معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہے۔ (معالم التنزیل ص۲۴۵)

صاحب البنایہ لکھتے ہیں :-

"یعنی دیت سوائے اونٹوں کے اور کسی چیز کی ثابت نہیں"

حضرت ثوری اور حضرت حسن بن صالح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت میں دراہم و دنانیر دیتے وقت اونٹوں کی قیمتوں کو مدِنظر رکھا گیا ہے، دراہم و دنانیر کی قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں اور ہم نے کتاب میں اسی کو بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ دیت اونٹوں ہی میں موقوف رہی ہے وہ کسی اور چیز سے ثابت نہیں، کیونکہ توقت اسی میں ہے کہ (دیت سو اونٹوں ہی کی) شرع شریف میں وارد ہے اور اسی پر اجماع ہے، اصل دیت کی اونٹوں کے سوا کوئی اور مقدار ہمارے علم میں نہیں، اگر کوئی قاضی اس کا حکم دے تو اُس کے اس حکم کا نفاذ ہی نہ ہوگا کیونکہ دیت میں سو اونٹوں کے سوا کسی اور چیز کا حکم نافذ ہی نہیں ہو سکتا، اصل دیت میں سو اونٹوں کی مقدار پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اُن کا اختلاف صرف اُن کی عمروں کے بارے میں ہے۔ (البنایۃ ج۱۰ ص۲۸۳)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہ جعل الدیۃ من الورق قیمۃ الابل لانہ اصل فی الدیۃ۔ (احکام القرآن للجصاص ج۲ ص۲۳۷)

چاندی سے دیت اونٹوں کی قیمت کے حساب سے دی گئی ہے کیونکہ چاندی اصل دیت نہیں ہے۔

اُونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے

جواب الجواب از مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ

ماہنامہ "الحق" مارچ ۱۹۹۱ء موافق شعبان ۱۴۱۱ھ کے حوالہ سے حضرت مولانا سید تصدق بخاری صاحب زید مجدہم نے "اصل دیت کیا ہے، سو اونٹ یا ہزار درہم" کے عنوان سے دیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، یہ احقر کے اُس مقالہ کا مواخذہ تھا جو دسمبر ۱۹۹۰ء کے "الحق" میں "اسلام کا نظامِ قصاص و دیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اختلافی نقطہ نظر موصوف کو احقر کے مقالہ میں جس بات سے تعلق ہوا ہے وہ دیت کی تقرری میں دس ہزار درہم کے تعین کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دیت کے تعین کا دارومدار اونٹوں پر ہے یعنی اصل دیت سو اُونٹ ہیں، دراہم و دنانیر یا دوسری چیزوں کا ذاتی طور پر کوئی اعتبار نہیں، جہاں کہیں دیت کے فیصلے ہوئے ہیں اُن میں اونٹ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے (حالانکہ ایسا نہیں) موصوف فرماتے ہیں :۔

"احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا چاندی گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اس لیے ہوتی رہی اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں اصل دیت سو اُونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔" (الحق ص ۱۲)

موصوف کے دلائل کا تجزیہ موصوف نے گیارہ صفحات پر مشتمل مضمون میں جن روایات کا سہارا لیا ہے وہ کل پانچ ہیں :۔

(۱) پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، موصوف نے یہ روایت تین دفعہ ذکر کی ہے، پہلی دفعہ سیرتِ ابن ہشام کے حوالہ سے الحق ص ۱۳ پر، دوسری دفعہ معالم التنزیل کے حوالہ سے الحق ص ۱۵ پر اور تیسری دفعہ احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص ۲۱ پر ہے۔ اس روایت میں کسی دراہم و

دنا نیر سے انکار نہیں، صرف یہ آیا ہے کہ قتل خطا کا خون بہا سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی۔

(۲) دوسری اہم روایت جس کے بارے میں موصوف اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس سے اُن کا مؤقف صراحتہً ثابت ہے، یہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کی روایت ہے۔ موصوف نے یہ روایت پہلی دفعہ بحوالہ ابو داؤد (الحق ص۱۳ پر) دوسری بار بحوالہ ابن ماجہ (الحق ص۱۶ پر) تیسری بار بحوالہ ترمذی (الحق ص۱۸ پر) ذکر کی ہے۔ اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ قتل خطا کی دیت سو اونٹنیاں ہیں جن میں تیس دوسرے سال والی، تیس تیسرے سال والی، تیس چوتھے سال والی اور دس اونٹ دوسرے سال والے ہیں۔ البتہ مؤخرالذکر روایت میں تیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، تیس اونٹنیاں پانچویں سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) کی ادائیگی وارد ہے، مزید برآں دراہم و دنانیر اور دوسری چیزوں کا اندازے سے ادائیگی کا حکم بھی وارد ہے ـــــ ایسا ہی موصوف نے یہ روایت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کی دوسری سند سے مشکوٰۃ کے حوالے سے الحق ص۲۱ پر نقل کی ہے جس سے سو اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو موصوف نے ترمذی کے حوالہ سے الحق ص۱۶ پر نقل کی ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف دراھم۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۲۵۹ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کی تقرری کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ اس سے موصوف کے عندیہ کی تردید ہو رہی ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک اصل دیت سو اونٹ ہیں جبکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے اعتبار سے قطع نظر بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

یہ الگ بات ہے کہ احناف نے بارہ ہزار کی جگہ دس ہزار دراہم کو اعتبار کیوں دیا؟ اس کی تحقیق کے لیے احناف کے فقہی ذخائر کی طرف مراجعہ کرنا ہوگا تاہم درہم کی قیمت میں تفاوت کی وجہ سے بعض روایات سے دس ہزار اور بعض سے بارہ ہزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہنا روایات سے ناواقفیت کی دلیل ہے کہ یہ تفاوت اونٹ کی قیمت کے اعتبار پر مبنی ہے۔ دراہم کا اعتبار صرف اس روایت سے نہیں بلکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ (کما سیأتی انشاءاللہ) لیکن موصوف کے مؤقف

کی تردید کے لیے یہ ایک روایت ہی کافی ہے، معلوم نہیں کہ آپ کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(۴) چوتھی روایت حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جو موصوف نے تفسیر مظہری کے حوالہ سے الحق ملا[16] پر نقل کی ہے۔ اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کے علاوہ گائیں والوں پر دو سو گائیں، بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) پانچویں روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے جو موصوف نے ابن ماجہ کے حوالہ سے الحق ملا[19] پر اور ابو داؤد کے حوالہ سے الحق ص[20] پر نقل کی ہے، اس روایت سے بھی اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حضرت طاؤسؒ کی مُرسل روایت احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ملا[21] پر ہے جس سے اونٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، طبیؒ، امام اعظمؒ، ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ کی طرف آپ نے منسوب اقوال پیش کیے ہیں۔

اونٹ کی اصالت کے باوجود تمام روایات پر عمل ممکن نہیں

مولانا موصوف کا عندیہ درج ذیل ہے:-

"درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹ کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ بحساب سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی۔" (الحق ملا[12])

موصوف کے ارشاد کے مطابق اگر ہم سو اونٹ دیت کے لیے اصل مان لیں تو پھر بھی تمام روایات پر عمل ممکن نہیں کیونکہ اونٹ کے بارے میں بھی حدیث کے دیگر ذخائر کی طرف مراجعت سے قطع نظر صرف موصوف نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک نوع کے اختیار کرنے سے دوسری روایات چھوٹ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت کی رُو سے جب سو اُونٹ دیئے جائیں گے تو ان میں چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں گی، لیکن اس کے مقابلہ میں عمرو بن شعیب بن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت موصوف نے نقل کی ہے اس میں ابو داؤد کی روایت میں سو اونٹ کی جگہ قیمت کی ادائیگی وارد ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں سو اونٹ کی ادائیگی میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ان میں تیس ایسی اونٹنیاں ہوں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں،

تیس ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں جا رہی ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں اور دس ایسے اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہو چکے ہوں۔ گویا اس روایت میں سو اونٹ میں چار قسم کا اعتبار ہے، لیکن ترمذی کی روایت میں سو اونٹ میں تثلیث کا اعتبار ہے کہ تیس اونٹنیاں چار سال والی، تیس اونٹنیاں پانچ سال والی، اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بحوالہ ابوداؤد سو اونٹ کی تقسیم میں تخمیس کا اعتبار دیا گیا ہے۔ بیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، بیس اونٹنیاں پانچویں سال والی، بیس اونٹنیاں دو سال والی، بیس اونٹنیاں تین سال والی اور بیس اونٹ تین سال والے ہوں۔

صرف ان الفاظ کو دیکھ کر کسی ایک نوع کے تعین سے دوسری روایات پر عمل ممکن نہیں، لہٰذا محض اونٹ کی اصالت پر قول کر کے روایات کو قابلِ عمل بنانے کی راہ کامیاب نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں قتل کی قسموں کا اعتبار کر کے دیتِ مغلظہ اور دیتِ مخففہ کی صورت نکالنی ہو گی۔

دراہم ودنانیر کو دیت کی قیمت کہنا درست نہیں | دیت کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں معاوضہ کی ماہیت چھپی ہوئی ہے

کیونکہ لغوی اعتبار سے دیت مالی معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ اور از روئے شرع دیت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کی جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ (مظاہرالحق جدید از علامہ قطب الدین، جلد ۳ ص۵۲۳ کتاب الدیات)

گویا دیت حقیقت میں انسان کی قیمت ہے، کیونکہ انسان کی حقیقت میں حیوانیت میں بھی ایک جزء ہے اور حیوان جب ہلاک ہو جائے تو یہ مضمون بالقیمت ہوتا ہے اور قیمت کے تعین کے لیے ایسی چیز کی تقرری ضروری ہوتی ہے جس میں خود تعین ہو تفاوت نہ ہو، مزید برآں ممکن الوصول ہو۔ کسی حیوان کے عوض میں ایسی چیز کو واجب قرار دینا جو متفاوت ہو باہمی نزاع اور فتنہ وفساد کے لیے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جبکہ ممکن الوصول نہ ہونے کی صورت میں تعجیز کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس وجہ سے عقلاً تو اونٹ کا اعتبار ذاتی طور پہ دیت میں بالکل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس کے باطنی معانی کی وجہ سے ان میں یکسانیت ممکن نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ اونٹ مل سکیں، مثلاً ہمارے ملک میں اگر موصوف کے مشورے سے اونٹ کو ہی اعتبار دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کے نفاذ کو مشکل سے مشکل تر بناتا ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ اونٹوں کا ملنا مشکل ہے اور اگر مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ ہی دیئے جائیں تو یہ ان کو الٹا مشقت میں ڈالنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مقتول کے ورثاء

اونٹ اپنے پاس رکھ سکیں اور اگر فروخت کریں تو ملکی رواج نہ ہونے کی وجہ سے ایسی حالت میں اس کو کم سے کم قیمت دی جائے گی۔ لیکن چونکہ حدیث میں سو اونٹ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا عقلی وجوہات سے قطع نظر تثلیث، تربیع یا تخمیس کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا دینا جائز ہے، پھر بھی اونٹوں کی ادائیگی ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا رواج ہو تاکہ ان کو یعنی ورثاء کو آسانی رہے۔ اس کے علاوہ دراہم و دنانیر اپنی جگہ بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے دیت کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ دراہم و دنانیر خلقی طور پر ثمنیت سے متصف ہیں، اس کی مقدار معلوم ہے اور ہر جگہ آسانی سے میسر ہیں بلکہ دنیا کے ہر کونے میں ان کا اعتبار پایا جاتا ہے کیونکہ دنانیر سونے اور دراہم چاندی کے ہوتے ہیں اور سونا چاندی بین الاقوامی لین دین کا ذریعہ ہے اس لیے دیت میں اس کی تقرری سے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنے میں ایک دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اگر ہم اصل دیت اونٹ کو مان کر دراہم و دنانیر اس کا بدل تسلیم کریں تو ایسی حالت میں اونٹ یکمشت نہیں لیے جاتے یہ قاتل کے ذمے محض واجب الادا ہوتے ہیں، اگر دراہم و دنانیر اس کا بدل ہو اور اس کے عوض میں دیئے جائیں تو دراہم و دنانیر کے بارے میں قاضی تین سال کی مدت ادائیگی کے لیے مقرر کر سکتا ہے، لہٰذا پھر ایسی حالت میں بھی یہ قاتل کے ذمہ محض واجب الادا رہیں گے تو یہ "دیناً بدین" "نسیئۃ بنسیئۃ" کی صورت لازم آئے گی جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

دیت کے تعین میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب | یہاں تک تو موصوف کے مضمون کا اجمالی جائزہ تھا اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دراہم و دنانیر کا تعین راقم الحروف کی کوئی خود ساختہ رائے نہیں بلکہ یہ محققین و مجتہدین کی تحقیقات کی روشنی میں مستقل مکاتب فکر کی مستند رائے ہے، بد قسمتی سے مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں سو اونٹ کی اصالت ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کی طرف منسوب کرنے کی زحمت نہیں کی، موصوف نے انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ شاید اپنی صوابدید پر وہ احادیث سے بالذات مسائل مستنبط کر رہے ہیں، آپ نے "الحق ص۱۵" پر "الغایۃ" کے حوالے سے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ایسے پیرایہ میں نقل کیا ہے جیسا کہ ان حضرات کے اقوال آپ کی رائے کے لیے محض تائیدی حیثیت رکھتے ہوں، جبکہ بعض جگہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے غلط فائدہ لیا ہے اور ایسی توجیہ کی ہے جو مالا یرضی بہ قائلہ کے مترادف ہے۔

کاش! اگر موصوف ابتداء ہی سے اپنا مذہبی رشتہ ظاہر کر دیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ آپ کس کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں؟ اس لیے دیت کے بارے میں جملہ مذاہب نقل کرنے کے بعد شاید موصوف کے بارے میں یہ واضح ہو سکے کہ وہ کس مسلک سے وابستہ ہیں تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر عربی عبارات کے بجائے باحوالہ اردو تراجم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے امام شافعیؒ سے دیت کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں، پہلے قول (جس کی نسبت آپؒ کی طرف عراق کے حوالہ سے کی جاتی ہے) کی رُو سے چاندی والوں سے بارہ ہزار دراہم اور سونے والوں سے ایک ہزار دینار لیے جائیں گے جیساکہ اونٹ والوں سے سو اونٹ لیے جاتے ہیں البتہ مصر میں آپؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ دراہم و دنانیر کے تعین کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اصل دیت سو اونٹ ہے، جہاں کہیں دوسری چیزیں مثلاً سونا چاندی لیے جائیں گے تو اس میں اونٹوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

قال الشافعی بمصر لا یؤخذ من اھل الذھب ولا من اھل الورق الا قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۰۷ کتاب الدیات فی النفوس اختلفوا فی الدراہم والدنانیر)

(ترجمہ) "امام شافعیؒ کا قول مصر میں یہ ہے کہ سونا اور چاندی والوں سے سو اونٹ کی قیمت کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جائے گی خواہ قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو"۔

لیکن شوافعؒ کے ہاں مفتیٰ بہ قول مصر کا ہے، گویا ابھی شوافع کے ہاں دیت کی اصل سو اونٹ ہے، سونا اور چاندی یعنی دراہم و دنانیر اگر دیئے جائیں تو اس میں سو اونٹ کی قیمت کا اعتبار ہوگا بذات ان کا دیت سے کوئی تعلق نہیں جیساکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے سوا دوسری چیزیں دیت نہیں"۔

(الام - دار المعرفۃ بیروت ج ۲ ص ۱۰۵)

امام مالکؒ کی رائے امام مالکؒ کے نزدیک سو اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی دیت میں بطورِ اصالت اعتبار ہے۔ علامہ ابنِ رشد فرماتے ہیں:۔

وعمدۃ مالک تقویم عمر بن الخطاب المائۃ من الابل علیٰ اھل الذھب بالف دینار وعلیٰ اھل الورق اثنیٰ عشر الف درھم۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۰۷ کتاب الدیات فی النفوس)

(ترجمہ) "امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے والوں پر (دیت) ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں"۔

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی دو روایات مروی ہیں، ایک روایت میں آپ بھی امام شافعیؒ کی طرح صرف اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں اونٹ کے علاوہ سونے اور چاندی کے بھی قائل ہیں۔ محدثِ اعظم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "جان لیں کہ دیت کی اصالت میں علماء کا اختلاف ہے، پس امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت کی رُو سے اور ابن المنذرؒ کے نزدیک صرف (سو) اونٹ ہیں لہٰذا اُن کی قیمت واجب ہو گی جتنی بھی ہو، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کے علاوہ سونا اور چاندی بھی ہے، یہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول اور امام شافعیؒ کی قدیم رائے ہے۔" (مرقاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۷ ص ۹۳ ابواب الدیات)

ابنِ حزم ظاہریؒ کی رائے

دیت کے بارے میں سب سے سخت ترین لہجہ ابو محمد علی بن حزم ظاہریؒ کا ہے، جن سے دراہم و دنانیر کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں جبکہ دوسرے ائمہ سے کسی نہ کسی درجہ میں دراہم اور دنانیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ مروی ہے لیکن آپ دوٹوک فیصلہ کر کے فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "(قتلِ) عمد اور خطا کی دیت سو اونٹ ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کی قیمت واجب ہو گی۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص ۴۷۱)

مزید لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) "ہماری طرح جن سے اونٹ کے علاوہ دوسرا کوئی قول نقل نہیں یہ ایک عظیم جماعت ہے جن میں زید بن ثابتؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں، ان تمام کی رائے یہ ہے کہ دیت میں سو اونٹ ہیں۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص ۴۷۳)

ان متعدد اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے قارئین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ موصوف مسلک کے اعتبار سے کن کے قریب ہیں اگرچہ آپ نے کسی جگہ اپنے مذہبی رشتہ کے اظہار کی جرأت نہیں کی بلکہ مجتہدانہ اندازِ بیان اختیار کر کے احادیث سے بالذات احکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیت کے بارے میں احناف کثرہم اللہ کا موقف

احناف بھی دیگر فقہی مکاتبِ فکر کی طرح دیت میں اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں لیکن احناف نے اپنا زاویۂ فکر صرف چند روایات تک محدود نہیں رکھا بلکہ

پوری روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اونٹ کے علاوہ سونے (دینار) اور چاندی (دراہم) کے تعین پر بھی قول کیا۔ گویا احناف کے نزدیک سو اونٹ کی طرح ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم بھی دیت کے لیے اصل ہیں۔ اگر کسی علاقہ میں اونٹ ہوں تو وہاں پر دیت میں اونٹ وصول کیے جائیں گے اور اگر کہیں اونٹ نہ ہوں تو پھر علاقہ کی حالت اور عرف کو دیکھ کر سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار دراہم وصول کئے جائیں گے۔

پاکستان میں اونٹوں کا رواج بعض خاص علاقوں تک محدود ہے اس لیے میں نے اپنے مقالہ میں اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کا حساب لگایا تھا، زکوۃ اور دوسرے نصابوں میں چاندی کا اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور عام عرف میں بھی دراہم کا حساب آسان تھا اس لیے احقر نے دس ہزار دراہم کا حساب تولہ اور ماشہ میں بحساب ۳ ۱/۲ ماشہ چاندی فی درہم کے حساب سے دو ہزار نو سو تولہ آٹھ ماشہ چاندی کی قیمت کا مشورہ تھا کیونکہ اس کی قیمت کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا، لیکن میں نے اس سے انکار کب کیا ہے کہ دیت میں اونٹ نہ دیئے جائیں؟ اور نہ احقر اس کی جرأت کر سکتا ہے، ہماری کتابوں میں ان تینوں چیزوں کے بارے میں صراحۃً لکھا ہے، چنانچہ علی بن ابی بکر المرغیناتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

(ترجمہ) "قتلِ خطا میں دیت سو اونٹ ہے ...... سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے حساب سے دس ہزار دراہم ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے دیت ثابت نہیں۔" (ھدایہ جلد ۴ ص۵۹۹ کتاب الدیات)

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور مقلد ہونے کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقتدا اور پیشوا سیدنا امام ابوحنیفہؒ نے جو فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی حدیث سے لازماً ثابت ہے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ نے کوئی بات اپنی طرف سے کہہ کر کسی حدیث کی مخالفت کی ہوگی اور نہ ہم بالذات کسی حدیث یا آیت سے مسائل کے استنباط کی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیتے وقت کسی حدیث یا آیت کے حوالہ کی جگہ کسی مستند فقہی کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، ہمارے فقہاء کرام نے دراہم و دنانیر کی اصالت کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر کے فرمایا ہے :-

قال العلامۃ السرخسیؒ : واختلفوا فی ان الدراہم والدنانیر فی الدیۃ اصل ام باعتبار قیمۃ الابل فالمذھب عندنا انھما اصل۔ (المبسوط ج۲۶ ص۷۵ کتاب الدیات، اختلفوا فی الدراہم والدنانیر)

(ترجمہ) "علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دراہم و دنانیر دیت میں بطور اصالت معتبر ہیں یا قیمت

کے اعتبار سے، تو ہمارے نزدیک (اونٹ کی طرح) یہ دونوں (دراہم و دنانیر بھی) دیت میں اصل ہیں۔"

بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ سیدنا امام ابویوسفؒ اور سیدنا امام محمدؒ کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی رُو سے گائے، بکری اور کپڑوں سے بھی ثابت ہے، گویا صاحبینؒ کے نزدیک دیت کے چھ اصول ہیں، یعنی جس علاقہ میں لوگوں کو اس میں سہولت ہو اُن سے وہی وصول کیا جائے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی یہ رائے امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) "میرے نزدیک حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول صاحبین کا مذہب ہے۔" (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۳ کتاب الدیات)

جبکہ عام کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف اول الذکر تین انواع کی نسبت ہوتی ہے اور مؤخر الذکر تینوں کا ثبوت صرف صاحبینؒ کی رائے تک محدود ہے، پھر اونٹ کی دیت میں بسا اوقات سختی اور شدت بھی پائی جاتی ہے جبکہ دراہم اور دنانیر میں خاص مقدار مقرر ہونے کی وجہ سے سختی کا امکان نہیں، اس لیے جہاں کہیں قتل کی نوعیت سخت ہو تو دیتِ مغلظہ ادا کی جائے گی، پھر یہ شدت دراہم اور دنانیر میں نہیں پائی جاتی ہے اس لیے اونٹ ہی سے ادا کی جائے گی۔ چنانچہ علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:-

(ترجمہ) "اونٹ کے علاوہ کسی دوسری نوع میں تغلیظ ثابت نہیں کیونکہ شرع صرف اسی میں وارد ہے۔" (الہدایہ جلد ۴ ص ۴۹۹ کتاب الدیات)

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک جب دیتِ مغلظہ کی ادائیگی کی ضرورت پڑے تو اونٹ سے چار قسم ادا کیے جائیں گے جن میں پچیس ۲۵ بنت مخاض (دوسرے سال والے)، پچیس ۲۵ بنت لبون (تیسرے سال والے)، پچیس ۲۵ حقہ (چوتھے سال والے) اور پچیس ۲۵ جذعہ (پانچویں سال والے) شامل ہیں، جبکہ دیتِ مخففہ دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار رہے، اور اگر اونٹوں سے ادا کرنا پڑے تو پھر پانچ قسموں سے ادا کی جائے گی جس میں قیمت کے اعتبار سے یقیناً آسانی رہے گی۔

دراہم اور دنانیر کی اصالت احادیث کی رُو سے | مقالہ نگار کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم اور دنانیر کا اعتبار

بطور اصالت دیت میں ثابت نہیں، یہ روایات کے ذخیرہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہر وہ روایت جس سے بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار کا ثبوت ملتا ہو تو وہ آپ کی رائے کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ دراہم میں بارہ ہزار یا دس ہزار کا تفاوت مروجہ سکّہ کی قیمت میں کمی و بیشی پر مبنی ہے۔ ذیل میں چند روایات اس کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں :۔

(۱) امام ترمذیؒ نے "جمع بین البابین" کی عادت اپناتے ہوئے پہلے جب "باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الابل" کا تذکرہ کیا تو اس سے فارغ ہو کر دوسرا باب "ما جآء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم" لایا، آپ نے اس میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت دو سندوں سے لائی ہے کہ :۔

(۱) عن ابن عباسؓ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ جعل الدیۃ اثنیٰ عشر۔
(جامع ترمذی ج ۱ ص۲۵۹ باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) "حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

حضرت ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام ترمذیؒ کے علاوہ امام ابوداؤد، سنن النسائی، اور دارمی نے بھی نقل کی ہے، یہی وہ روایت ہے جو حضرت مولانا نے الحق ص۱۴۱ پر نقل کی ۔ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ :۔

(۲) ان رجل من بنی عدی قتل فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم دیتہ اثنیٰ عشر الفا۔ (مرقاۃ ج ۷ ص۸۳ باب الدیات)

(ترجمہ) "بنی عدی کا ایک آدمی قتل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

(۲) حضرت عمر بن خطابؓ سے امام ابوحنیفہؒ کی سند سے روایت نقل کرتے ہوئے امام محمدؒ فرماتے ہیں :۔

اخبرنا ابوحنیفۃؒ عن الھیثم عن عامر الشعبی عن عبیدۃ السلمانی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال علیٰ اھل الورق من الدیۃ عشرۃ الاف درھم وعلیٰ اھل الذھب الف دینار۔ (کتاب الآثار ص۹٦ کتاب الدیات)

یہ روایت عبیدہ السلمانی سے اس طریقہ پر بھی مروی ہے کہ :۔

بلغنا عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ جعل الدیۃ علیٰ اَھل الْاِبِل مائۃ اِبِل وعلیٰ اھل الورق عشرۃ الاف درھم۔ (المبسوط ج ۲٦ ص۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نظام زندگی کے لیے رجسٹر تیار ہوئے تو آپ نے اُونٹ والوں پر سو اونٹ، سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر کئے۔"

ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نظام زندگی کا دستور مرتب فرما رہے تھے تو اس میں بڑے بڑے صحابہؓ بھی شریک تھے اور آپ کے اس اقدام پر کسی صحابی کا اعتراض منقول نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ نے آپ کی اس رائے کی تصویب کی، گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوا کہ سو اُونٹ کی طرح ہزار دینار اور دس ہزار درہم بھی دیت میں دیئے جا سکتے ہیں، ہمارے لیے یہی اجماع صحابہؓ بڑی سند ہے۔

(۳) حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع الدیۃ علی الناس فی اموالہم علیٰ اھل الابل مائۃ بعیر واھل الشاۃ الفیٰ شاۃ وعلیٰ اھل البقر مائتی بقرۃ وعلیٰ اھل البرود مائتی حلۃ۔ (کتاب الخراج ص۱۵۵ الحدود علیٰ اھل الجنایات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر ان کے اموال میں دیت مقرر فرمائی، پس اونٹ والوں پر سو اونٹ، بکری والوں پر دو ہزار بکریاں، گائے والوں پر دو سو گائیں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے۔"

اس روایت میں اگرچہ دراہم و دنانیر کا تذکرہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کو بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت سے اعتبار دیا جبکہ ہمارے بعض ائمہ سے یہ دوسری چیزیں بھی مروی ہیں، اور بقولِ بعض امام ابوحنیفہؒ سے بھی دراہم و دنانیر کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں روایت آئی ہے۔

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقولہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی اعتبار ہے، آپ فرماتے ہیں:-

ان النبی علیہ السلام قال من سبح فی کلّ یوم ولیلۃ مثل دیّۃ اثنیٰ عشر الف تسبیحۃ فکانّما حرّر رقبۃ من ولد اسمٰعیل۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن رات میں اپنی دیت کی طرح بارہ ہزار دفعہ تسبیحات پڑھیں گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک غلام آزاد کیا۔"

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

"حضرت ابوہریرہؓ رات و دن میں بارہ ہزار تسبیح پڑھتے اور فرماتے کہ میں اپنی دیت کے

اندازہ سے تسبیحات پڑھتا ہوں" (دفاع ابوہریرہ ص ۳۸)

جبکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے دس ہزار دراہم کے بارے میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۸ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۵) عمرو بن حزم سے بھی ایک روایت ہے کہ :-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل الدیۃ من الدراھم اثنی عشر الفا ۔

(المبسوط للسرخسی ج ۲۶ ص ۷۸ کتاب الدیات)

(۶) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ :-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دیۃ کل ذی عمد فی عمد ۱۰ الف دینار ۔

(المبسوط للسرخسی ج ۲۶ ص ۷۸ کتاب الدیات)

(۷) حضرت عثمان کے دور میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر فرمائی ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۸) ایسے ہی حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی دس ہزار دراہم دیت کی روایت منقول ہے ۔

(اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

ان تمام روایات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اونٹ کی طرح دراہم اور دنانیر بھی دیت میں بطور اصالت ثابت ہیں، لہٰذا دس ہزار دراہم کے حساب سے چاندی کی مروجہ قیمت بطور دیت ادا کرنا روایات سے ذہول نہیں بلکہ روایات کے مطابق عمل کرنے کی ایک آسان صورت ہے ۔

کتاب الجہاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

[التوبۃ: ۴۱]

ترجمہ: اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو

باب شرائط الجہاد وآدابہ
(جہاد کے شرائط وآداب کا بیان)

جہاد کے شرائط

سوال:۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تبلیغی جماعت والے حد سے بڑھ گئے ہیں لہٰذا ان پر بجائے تبلیغ کے جہاد فرض ہوتا ہے تو کیا ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے جہاد کی فرضیت کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ اہلِ اقتدار کے علاوہ عوام الناس میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے تبلیغی حضرات پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا ہے ،، اور وہ شرائط یہ ہیں :۔

لما فی الہندیۃ: واما شرائطہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعہد بیننا وبینہم والثانی ان یرجوا لشوکۃ واھل للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التہلکۃ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ شرعاً وشرطہ وحکمہ)[1]

جہاد کی قسمیں

سوال:۔ کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

الجواب:۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) فرضِ عین (۲) فرضِ کفایہ۔ اگر نفیر عام کی صورت میں پیش آئے یعنی دشمن اتنا زیادہ طاقتور ہو کہ قریب والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہے ،، اور اگر بعض لوگ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو دوسروں پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ یعنی بعض افراد کا جہاد کرنا دوسروں سے اس

---

[1] وقال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولا بد لفرضیتہ من قید اٰخر وھو الاستطاعۃ۔ وقال العلامۃ الحصکفیؒ تحتہ وفی السراج وشرط لوجوبہ القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب اسر لم یلزمہ القتال۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر۔

ذمہ داری ساقط کر دیتا ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: کل ما فرض لغیرہٖ فھو فرض کفایۃ اذا حصل المقصود بالبعض والا ففرض عین۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۸ کتاب الجہاد) ؎۱

جہاد کے دوران امیر کی اہمیت

سوال:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب ونظم ونسق برابر کرنے کے لیے امیر بنانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب اور نظم ونسق درست کرنے کیلئے ایک ماہر جنگ کے اصول اور طریقۂ کار سے باخبر، نیک اور متبع سنت امیر کی تقرری سُنتِ نبویؐ ہے، اس لیے جنگ سے پہلے امیر مقرر کرنا اچھا اقدام ہے تاکہ مجاہدین کے نظم ونسق کو برقرار رکھا جا سکے۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنھا ان یؤمر علیھم امیراً لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما بعث جیشاً الا وأمر علیھم امیراً ولان الحاجۃ الی الامیر ماسۃ لانہ لابد من تنفیذ الاحکام وسیاسۃ الرعیۃ ولا یقوم ذلک الا بالامیر لتعذر الرجوع فی کل حادثۃ الی الامام۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ فصل فی بیان ما یندب الیہ الامام...الخ) ؎۲

؎۱ لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: واما بیان کیفیۃ فرضیۃ الجہاد فالامر فیہ لا یخلو من احد وجھین اما ان کان النفیر عاماً واما ان لم یکن النفیر عاماً فھو فرض کفایۃ ومعناہ ان یفترض علیٰ جمیع من ھو اھل الجہاد لکن اذا قام بہ البعض سقط عن الباقین فاما اذا عم النفیر بان ھجم العدو علیٰ بلد فھو فرض عین یفترض علیٰ کل واحد من آحاد المسلمین ممن ھو قادر علیہ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۹ کتاب السیر۔

؎۲ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: قال فی الملتقی وینبغی للامام ان یعرض الجیش عند دخول دار الحرب لیعلم الفارس من الراجل قال فی شرحہ وان یکتب اسماءھم وان یؤمر علیھم من کان بصیراً بامور الحرب وتدبیرھا ولو من الموالی وعلیھم طاعتہ لان مخالفۃ الامیر حرام الا اذا اتفق الاکثر انہ ضرر فیتبع۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۳۴ کتاب الجہاد۔ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہٖ

جہاد کی ذمہ داری کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک شخص کی منگنی ہو چکی ہے لیکن تا حال شادی نہیں ہوئی جبکہ اُسے جہاد پر جانے کا شوق ہے اور والدین کی طرف سے اجازت بھی مل چکی ہے۔ تو کیا اس شخص کا جہاد کے لیے جانا موجبِ مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ جہاد کی فرضیت کے لیے استطاعت یعنی آلاتِ حرب اور قدرت علی الجہاد شرط ہے اس لیے یہ جہاد عوام پر فرضِ عین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے لہٰذا مذکورہ شخص کا جہاد کے لیے جانا یا نہ جانا موجبِ مواخذہ نہیں ہے البتہ جانے سے اجر ضرور ملتا ہے جبکہ نیت صحیح ہو۔

لما قال الشیخ التمرتاشی رحمہ اللہ : ولا بد لفرضیتہ من قید آخر ھو الاستطاعۃ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : تحتہ وفی السراج وشرط لوجوبہ القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب أسر لم یلزمہ القتال ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد) [1]

نفیرِ عام کی تعریف

سوال :۔ نفیرِ عام کا معنیٰ اور تعریف کیا ہے؟ اور کون سی حالت میں نفیرِ عام کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے نفیرِ عام کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جب کفار بلادِ اسلام میں داخل ہو جائیں تو اس وقت ہر ذی قدرت جو اُن بلاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : (تحت قولہ وان ھجم العدو) ای دخل بلدۃ بغتۃ وھٰذہ الحالۃ تسمّی النفیر العام قال فی الاختیار والنفیر العام

---

[1] وفی الھندیۃ : واما شرائطہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجوا الشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۳ کتاب السیر ۔

ان یحتاج الی جمیع المسلمین ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد ۔ مطلب طاعۃ الوالدین فرض کفایۃ)[۱]

افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے

سوال :- کیا افغانستان کا جہاد فرضِ عین ہے یا فرض کفایہ ؟ اگر فرضِ عین ہے تو کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے ؟ اور کیا پاکستان کے لوگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- افغانستان کا جہاد نفیرِ عام ہونے کی وجہ سے فرضِ عین ہے تاہم کمزور اور قدرت نہ رکھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری اہلِ اقتدار اور سربراہوں کی ہے، اس لیے اگرچہ عوام الناس اور رعیت پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا لیکن اُن کے لیے مجاہدین کی اعانت اور ہمدردی کرنا ضروری ہے ۔

لما قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : واما بیان من یفترض علیہ فنقول انہ لا یفترض الاعلی القادر علیہ فمن لا قدرۃ لہ لا جہاد علیہ لان الجہاد بذل الجہد وھو الوسع والطاقۃ بالقتال او المبالغۃ فی عمل القتال ومن لا وسع لہ کیف یبذل الوسع ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر)[۲]

جہادِ کشمیر کی فرضیت کا حکم

سوال :- مسلمانانِ مقبوضہ کشمیر جو کہ عرصۂ دراز سے ایک جابر اور ظالم حکومت کے زیرِ تسلط ہیں، وہاں ان

---

[۱] وفی الھندیۃ : ومعنی النفیر العام ان یخبر اھل مدینۃ ان العدو قد جاء یرید انفسکم وذراریکم واموالکم فاذا اخبروا علی ھذا الوجہ افترض علی کل من قدر علی الجہاد من اھل تلک البلدۃ ان یخرج للجہاد ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر)

[۲] وفی الھندیۃ : واما شرائط اباحتہ فشیان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجوا الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام باجتھادہ لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین ۔

ظالموں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے، ان کے گھر اور جائیداد وغیرہ کو تباہ کیا جارہا ہے، پردہ نشین مسلم عورتوں کی آبروریزی ہو رہی ہے، توکیا ایسی حالت میں اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟ اور ان مظلوم مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ حالات کے پیشِ نظر اس جابر اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے کیونکہ مسلمانانِ کشمیر پر بھارتی حکومت نے جبر و ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جارہا ہے اور ان کی عزت و عصمت کو پائمال کیا جارہا ہے لیکن عوام اور رعیت کا ان کافروں سے مقابلہ دشوار ہے اس لیے تمام تر ذمہ داری اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے، اگر ان کے قریب کی مملکتِ اسلامیہ کفار کا مقابلہ نہ کر سکے تو الاقرب فالاقرب پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد مطلب في الفرق فرض عين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السير الباب الاول في تفسيره)

ومثله في فتح القدير ج ۵ ص۱۹۱ کتاب السير۔

برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم

سوال :- سرزمین برما میں مسلمان بہت عرصہ سے آباد ہیں جبکہ وہاں پر تا حال غیر مسلموں کی حکومت ہے اور گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری ہے تو کیا مسلمانانِ برما پر جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں ؟ اور طاقت نہ رکھنے کی صورت میں ان کے لیے کیا حکم ہے ؟

الجواب :- جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد میں اضافہ ہوجائے تو ان پر وہاں کے کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے ، صورتِ مسئولہ میں برما کے مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے پڑوسی اسلامی ممالک پر ان کی امداد کے لیے جہاد باقاعدہ فرض ہے ، لہٰذا الاقرب فالاقرب شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من ورائهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب ۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۳۰ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية : ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو ويقدرون على الجهاد .... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب ۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره ۔

ومثله في فتح القدير ج ۵ ص۱۹۱ كتاب السير ۔

بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم

سوال :- بوسنیا ہرزیگوینا میں جو جنگ مسلمانوں کے خلاف ہورہی ہے اور ان کا قتلِ عام ہورہا ہے، ان کی عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی ہورہی ہے، مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو پائمال کی جارہی ہے، لیکن وہاں کے مسلمان کمزور و ناتواں ہونے کی وجہ سے کفّار کے مقابلہ سے قاصر ہیں، تو کیا ان کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان کے فساد کو دفع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کرنا تمام ممالک اسلامیہ پر فرض ہے یا نہیں؟

الجواب :- کفّار جب مسلمانوں کے کسی ملک میں داخل ہوجائیں اور وہاں کے مسلمان کفار کا مقابلہ نہ کرسکیں تو ایسی صورت میں جہاد الاقرب فالاقرب پر باقاعدہ فرض ہوجاتا ہے حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، لہٰذا بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی ہر ممکن طریقہ سے اعانت کرنا اور ان کفار کے فساد کو دفع کرنا تمام اسلامی ممالک کی ذمہ داری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد، مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[۱]

---

[۱] وفي الهندية: ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد...... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير- الباب الاول في تفسيره)

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم

سوال:۔ پاکستان جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے اور اس کے بیشتر قوانین غیر شرعی ہیں تو اس کے حکمرانوں کے ساتھ مسلح جہاد کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمان فاسق حکمران کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتل و قتال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ نبویہ اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد اور قتل و مقاتلہ بالاجماع جائز نہیں، البتہ بغیر قتال کے اس کے خلاف آواز اٹھانا اور منکرات سے روکنا خواہ جلسے جلوس سے ہو یا ہڑتال وغیرہ سے ہو ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن ام سلمۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ستکون امراء تتعرفون وتنکرون فمن عرف برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی وتابع قالوا افلا نقاتلہم قال لا ما صلّوا۔ (مسلم شریف ج۲ ص۱۲۹ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار الخ) [1]

جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت

سوال:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کمیونسٹوں کے خلاف ہو رہی ہے کیا یہ شرعی جہاد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کہ کمیونسٹوں اور روسیوں کے خلاف جاری ہے بلاشک وشبہ شرعی جہاد ہے کیونکہ کمیونسٹوں اور روسیوں نے افغانستان پر جبراً قبضہ کر کے وہاں ظلم و زیادتی اور بربریت و درندگی کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کی جان و مال

---

[1] وقال العلامۃ ملا علی القاریؒ: والمراد بالکفر ھنا المعاصی والمعنی لا تنازعوا ولاۃ الامور فی ولایتھم ولا تعترضوا علیھم الا ان تروا منھم منکرا محققا تعلمونہ من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذلک فانکروہ علیھم وقوموا بالحق حیثما کنتم واما الخروج علیھم وقتالھم فمحرم باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین واجمع اھل السنۃ علی ان السلطان لا ینعزل بالفسق لتھیج الفتن فی عزلہ واراقۃ الدماء وتفریق ذات البین فتکون المفسدۃ فی عزلہ اکثر منھا فی بقائہ۔

(مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۷ ص۲۰۰ کتاب الامارۃ والقضاء، الفصل الاول)

ومثلہ فی شرح المسلم للنووی ج۲ ص۱۲۸ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار علی الامراء۔

اور عزت و آبرو کو پامال کیا ہوا ہے اور دینِ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں اس لیے ان غاصبین کے خلاف جنگ کرنا اور ان کے فساد کو رفع کرنا عین جہاد ہے۔

لما قال العلامة ابن الھمامؒ: اورد الجھاد عقیب الحدود لانه بعد ان ناسبھا بوجھین باتحاد المقصود من کل منھما ومن مضمون ھذا الکتاب وھو اخلاء العالم من الفساد ویکون کل منھما حسنًا لحسن لغیرہ وذٰلك الغیر ھو اعلاء کلمة الله تعالٰی یتأدّٰی بفعل نفس المامور به فھو القتال۔ (فتح القدیر ج ۵ ص۱۸۷ کتاب السیر)[1]

سوال: کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم

سوال:۔ کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کیا ان کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی علاقے کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ہو تو ان کے ساتھ اعلانِ جہاد سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے ہاں اگر انہیں پہلے سے اسلام کی دعوت پہنچی ہو تو پھر ان کو دوبارہ دعوت دینا مستحب ہے ضروری نہیں، لیکن دعوت نہ دینے کی صورت میں جہاد کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: فان کان الدعوة لم تبلغھم فعلیھم الافتتاح بالدعوة الی الاسلام باللسان لقوله تعالٰی: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (الآیة) ولا یجوز لھم القتال قبل الدعوة ..... الٰی ان قال فان کانت قد بلغتھم جاز لھم ان یفتتحوا القتال من غیر تجدید الدعوة لما بینا ان الحجة لازمة والعذر فی الحقیقة منقطع وشبھة العذر انقطعت بالتبلیغ مرة لکن مع ھذا الافضل ان لا یفتتحوا القتال الا بعد

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: مناسبة الحدود من حیث ان المقصود منھما اخلاء العالم عن الفساد فکان کل منھما حسنًا لمعنًی فی غیرہ وقال لانه ما فرض لعینه اذ ھو افساد فی نفسه وانما فرض لاعزاز دین الله ودفع الشر عن العباد۔

(البحر الرائق ج۵ ص۷ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ۔

تجدید الدعوة لرجاء الاجابة فی الجملة ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر) ؎۱

کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں

سوال:۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جہاد مشروع ہے اور اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے کیونکہ اقدامی جہاد اگر کفار کے خلاف شروع ہو جائے تو اسلام ایک خونخوار مذہب شمار ہوگا اور اس سے اسلام کی بدنامی ہوگی، کیا واقعی اسلام میں اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے؟

الجواب:۔ اسلام درحقیقت ایک امن پسند دین ہے وہ خونریزی نہیں چاہتا تاہم بوقتِ ضرورت جب دین کو غیر مسلموں سے خطرہ ہو یا اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو تو اسلام اقدامی اور دفاعی دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دیتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی ظلم وجبر کا قائل نہیں ہے ۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: مناسبته للحدود من حیث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد فکان کل منهما حسنٌ لمعنی فی غیره وقال لانه ما فرض لعینه اذ هو افساد فی نفسه وانما فرض لاعزاز دین الله تعالیٰ ودفع الشر عن العباد ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۷۰ کتاب السیر) ؎۲

؎۱ وقال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ولا نقاتل من لا تبلغهم الدعوة الی الاسلام۔ وقال الحصکفی رحمه الله: وهو وان استشهد فی زماننا شرقاً وغرباً لکن لا شك ان فی بلاد الله تعالیٰ من لا شعور له بذٰلك ونَدبُ ندباً من بلغتهم الا اذا تضمن ذٰلك ضرراً ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجهاد ۔ مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له الخ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۵ کتاب السیر۔

؎۲ وقال العلامة ابن عابدین رح: (قوله لاتحاد المقصود) وهو اخلاء الارض عن الفساد (وقوله غیر خفی) لان الحدود اخلاء عن الفسق والجهاد اخلاء عن الکفر۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۱۷ کتاب الجهاد)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۷ کتاب السیر۔

مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں

سوال :- مجاہدین کو لڑائی کے دوران اگر مغلوب ہونے کا یقین ہو اور کمانڈر (امیر) مجاہدین کو حملہ کرنے پر مجبور کرے تو کیا اس صورت میں کمانڈر کا حکم ماننا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر مجاہدین کا اس بات پر یقین ہو کہ کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجاہدین کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے اور ان کے حملے سے کفار کو نقصان اور ضرر کا احتمال بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں کمانڈر (امیر) کے حکم کی تعمیل کرنا مناسب نہیں ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : فاما اذا علم ان لا ينكى فيهم فانهٗ لا يحل له ان يحمل عليهم لانهٗ لا يحصل بحملته شئ من اعزاز الدين ۔
(رد المحتار ج ۴ ص ۱۲۷ كتاب الجهاد۔ مطلب اذا علم انه يقتل يجوز له ان يقاتل) [۱]

والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانا

سوال :- ایک شخص جہاد میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کو اجازت نہیں دیتی، تو کیا یہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جہاد فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا کیونکہ والدین کی اطاعت فرضِ عین ہے اور فرضِ عین کا مرتبہ فرضِ کفایہ پر مقدم ہے ہاں اجازت کی صورت میں جا سکتا ہے، تاہم اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں ۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله : وكذا الولد لا يخرج الا باذن والديه او احدهما اذا كان الآخر ميتاً لان بر الوالدين فرض عين فكان مقدما على

---

[۱] وفى الهندية : وان علموا انهم لا ينتفعون به بيقين بل يتفرقون لا يُطيعونهٗ فى ذلك ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج ۲ ص ۱۹۲ كتاب السير۔ الباب الاول فى تفسيره)
وَمِثْلُهٗ فى التاتارخانية ج ۵ ص ۲۵۶ كتاب السير۔ الفصل العاشر ۔

فرض الکفایۃ والا ان کل سفر لا یؤمن فیہ الہلاک ویشتد فیہ الخطر لا یحل للولد ان یخرج الیہ بغیر اذن والدیہ لانہما یشفقان علی ولدہما فیتضرران بذلک وکل سفر لا یشتد فیہ الخطر یحل لہ ان یخرج الیہ بغیر اذنہما۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۹۸ کتاب السیر) [1]

والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا

سوال: اگر ایک شخص کو اس کے والدین جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں اور دوسرے محارم مثلاً بھائی وغیرہ اجازت نہیں دیتے ہوں تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص ان محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر والدین کے علاوہ دوسرے محارم کسی کو جہاد کیلئے جانے کی اجازت نہیں دیتے ہوں اور جہاد فرض عین نہ ہو اور ان محارم کے ضیاع کا خطرہ بھی نہ ہو تو بغیر ان کی اجازت کے بھی جانا مرخص ہے، البتہ اگر ان کا نفقہ اس پر واجب ہو اور جہاد کے لیے جانے میں ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما غیر ھؤلاء کالزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبۃ علیہ وخاف علیہم الضیعۃ اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۲۰ کتاب الجہاد۔ مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) [2]

---

[1] وقال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یفرض علی صبی وبالغ لہ ابوان او احدہما لان طاعتہما فرض عین۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص۲۳۰ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

[2] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: وفی الذخیرۃ ان من سوی الاصول اذا کرھوا خروجہ للجہاد فان کان یخاف علیہم الضیاع فانہ لا یخرج بغیر اذنہم والا یخرج وکذا امرأتہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۵۲ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

اہل وعیال کیلئے نان ونفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لیے جانا

سوال:۔ ایک آدمی کا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویاں ہیں اور ان کے لیے اس شخص کے علاوہ اور کوئی کمانے والا (کفیل) نہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ شخص اپنے اہل وعیال کا اکیلا ضامن ہے اور ان کا نان ونفقہ اس پر واجب ہے اس لیے اگر ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ شخص جہاد کے لیے نہیں جا سکتا، تاہم اگر ان کے ضائع ہونے یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین: واما غیرھُو کلاء کالزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبۃ علیہ وخاف علیہم الضیعۃ۔ اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجہاد مطلب طاعۃ الوالدین فرض کفایۃ)[1]

جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص کو جہاد پر جانے کا شوق ہے، والدین بھی اجازت دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ بھائیوں سے بھی مشورہ کر لو، تو کیا اس صورت میں اس شخص کے لیے بھائیوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور بغیر بھائیوں کے مشورہ کے جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاد کے لیے جانے میں والدین کے علاوہ کسی دوسرے محارم سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ اگر ان (دیگر رشتہ داروں) کا نان ونفقہ جہاد میں جانے والے پر ہو اور اس کا متبادل انتظام نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہو تو پھر بغیر ان کی

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیم: وفی الذخیرۃ ان من سوی الاصول اذا کرھوا خروجہ للجہاد فان کان یخاف علیہم الضیاع فانہ لایخرج بغیر اذنہم والا یخرج وکذا امرأتہ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر)

ومثلہ فی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

اجازت کے جہاد میں جانا مرخص نہیں تاہم اجازت کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واما غیرهو لاء کزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه یخرج بلا اذنهم الا اذا کانت نفقتهم واجبة علیه وخاف علیهم الضیعة ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) [1]

عالم دین کے لیے جہاد میں جانے کا حکم

سوال:۔ علماء کرام اور مدرسین حضرات جہاد کے دوران بھی اپنے مخصوص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، کیا ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا؟

الجواب:۔ چونکہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور درس و تدریس سے بھی ثباتِ دین اور قیامِ دین مقصود ہے اس لیے فقیہ و عالم کے لیے فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں جہاد کو جانا ضیاعِ دین کا خطرہ ہے لہٰذا علماء کے لیے جہاد میں جانا مناسب نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعالم لیس فی البلدة افقه منه فلیس له الغزو لخوف ضیاعهم سراجیة۔ وعمم فی البزازیة السفر ولا یخفی ان المقید یقید غیره۔ بالاولٰی وفرض عین ان هجم العدو فیخرج الکل ولو بلا اذن۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) [2]

---

[1] وفی الهندیة: واما من سواهم من ذوی الرحم المحرم کبنا ته وبنیه واخواته وعماته واخواله وخالاته وکل ذی رحم محرم منهم اذا کرهوا خروجه للجهاد وکان یشق ذلك علیهم فان کان یخاف علیهم الضیعة بان کانت نفقتهم علیه بان لم یکن لهم مال وکانوا صغاراً او صغائر وکن کبائر الا انه لا ازواج لهن اوکانوا کباراً زمنی لاحرفة لهم فانه لا یخرج بغیر اذنهم وان کان لایخاف علیهم الضیع ...... الی ان قال کان له ان یخرج بلا اذنهم۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر۔

[2] وفی الهندیة: عالم لیس فی البلدة احد افقه منه لیس له ان یغزو لما یدخل علیهم من الضیاعة کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۰ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی السراجیة ص۲۴ کتاب السیر۔ باب الجهاد فرض کفایة۔

سوال:۔ اگر **جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالم اسلام کی ذمّہ داریاں** کفار مسلمانوں کے ملک پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں جیسا کہ رُوس نے جارحیت کرتے ہوئے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، تو کیا افغانستان کی عوام کے علاوہ ہمسایہ اسلامی ممالک پاکستان وغیرہ کی عوام پر روس کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان پر روسی جارحیت سے جہاد کا حکم نفیرِ عام ہے لیکن جہاد کی فرضیت کے لیے یہ شرط ہے کہ قدرت علی الجہاد ہو لہٰذا افغانستان کی عوام اور پاکستان کی عوام کی عدم قدرت کی وجہ سے روسی فوجوں سے مقابلہ دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ فرضیت اہلِ اقتدار اور دونوں ممالک کے سربراہانِ حکومت پر عائد ہوتی ہے اور علی الترتیب الاقرب فالاقرب کی بناء پر حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر روسی جارحیت کے خلاف جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا منها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد، مطلب فى الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) [له]

[له] وفى الهندية: ثم بعد مجئ النفير لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير۔ الباب الاول فى تفسيره)

ومثله فى فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم اربابِ اقتدار کی ذمہ داری ہے

سوال:- موجودہ دور میں مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کافروں نے بزعم خود منصوبے بنا رکھے ہیں جن کے تحت ہر جگہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، تو کیا ایسی حالت میں عالم اسلام کے اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی امداد و نصرت لازم آتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- تمام ممالکِ اسلامیہ اور اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت ضروری ہے اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو اُن کے ساتھ قریب کی اسلامی حکومت پر ان کی اعانت اور یہود و ہنود کے ساتھ جہاد فرض ہو جاتا ہے، اور قدرت نہ رکھنے کی صورت میں شرقاً و غرباً تمام اہلِ اسلام اور اہلِ اقتدار پر جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج عليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو ولم يعجزوا لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليه فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا التدريج۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ كتاب الجهاد، مطلب فى الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) [1]

---

[1] وفى الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير۔ الباب الاول فى تفسيره)

وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۱ كتاب السير۔

لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق

سوال :- تبلیغی حضرات لفظ فی سبیل اللہ کو صرف تبلیغ ہی میں منحصر کرتے ہیں اور جہاد کو کو اس میں شامل نہیں کرتے، کیا ان حضرات کا یہ انحصار درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- لفظ فی سبیل اللہ ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے، دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو محنت ومشقت کی جائے وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لہٰذا دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے افراد اس کا مصداق ہیں، دین کے کسی خاص شعبہ کو متعین طور پر اس کا مصداق ٹھہرا کر دوسرے شعبوں کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : وقد قال فی البدائع فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعیٰ فی طاعۃ اللہ تعالیٰ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجاً۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۶۲) [1]

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- جو شخص کافر حکومت کا جاسوس بن کر مسلمانوں کے خفیہ حالات اس تک پہنچائے یا کافر حکومت کے تعاون سے وہاں کے مسلمانوں کو ستائے تو یہ شخص اگر پکڑا جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر بدون قتل کے کوئی تدبیر اس کی فہمائش کے لیے کارگر نہ ہو تو اُسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ پکڑا جانے والا جاسوس مسلمان ہو اور اگر حربی ہو تو اس کو قتل کرنے میں کوئی کلام نہیں، اگر چہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ سے مسلمان جاسوس کو قتل نہ کرنے کے اقوال مروی ہیں ۔

لما قال العلامۃ الامام القرطبیؒ : فان کان الجاسوس کافراً فقال الاوزاعیؒ یکون نقضاً لعھدہٖ وقال اصبغ: الجاسوس الحربی یقتل والجاسوس المسلم والذمی یعاقبان الا ان تظاھرا علی الاسلام فیقتلان ۔ (الجامع احکام القرآن ج ۸ ص ۵۳ سورۃ الممتحنۃ)

---

[1] لما فی الحدیث : وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع۔ رواہ الترمذی والدارمی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۴ کتاب العلم)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۴۲ کتاب السیر۔

وقال الحافظ العینیؒ وقال القدوریؒ: الجاسوس یقتل وانما نفی القتل عن حاطب لما علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم منہ ولکن مذھب الشافعی وطائفۃ ان الجاسوس المسلم یعزر ولا یجوز قتلہ وان کان ذا ھیئۃ عفی عنہ بھذا الحدیث وعن ابی حنیفۃ والاوزاعی یوجع عقوبۃ ویطال حبسہ وقال ابن وھب من المالکیۃ یقتل الا ان یتوب وعن بعضھم انہ یقتل اذا کانت عادتہ ذلک وبہ قال ابن الماجشون وقال ابن القاسم یضرب عنقہ لانہ لا تعرف توبتہ وبہ قال سحنون ومن قال بقتلہ فقد خالف الحدیث واقوال المتقدمین وقال الاوزاعیؒ فان کان کافراً یکون ناقضاً للعھد وقال اصبغ: الجاسوس الحربی یقتل والمسلم والذمی یعاقبان الا ان یتظاھرا علی الاسلام فیقتلان -

(عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۲۵۶ باب الجاسوس کتاب الجھاد) [1]

---

[1] وقال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی المجتبیٰ: الاصل ان کل شخص رأی مسلماً یزنی ان یحل لہ قتلہ وانما یمتنع خوفاً من ان لا یصدق انہ زنی وعلیٰ ھذا القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ بادنیٰ شیء لہ قیمۃ وجمیع الکبائر والاعونۃ والسعاۃ یباح قتل الکل وثیاب قاتلھم انتھی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذٍ ـــــــــ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ علیہ: (قولہ وجمیع الکبائر) ای اھلھا والظاھر ان المراد بھا المتعدی ضررھا الی الغیر فیکون قولہ والاعونۃ والسعاۃ عطف تفسیر او عطف خاص علی عام فیشمل کل من کان من اھل الفساد کالساحر وقاطع الطریق واللص واللوطی والخناق ونحوھم ممن عم ضررہ ولا ینزجر بغیر القتل قولہ والاعونۃ کانہ جمع معین او عوان بمعناہ والمراد بہ الساعی الی الحکام بالافساد فعطف السعاۃ علیہ عطف تفسیرہ وفی رسالۃ احکام السیاسۃ عن جمع النسفی سئل شیخ الاسلام عن قتل الاعونۃ والظلمۃ والسعاۃ فی ایام الفترۃ قال یباح قتلھم لانھم ساعون فی الارض بالفساد فقیل انھم یمتنعون ذلک فی ایام الفترۃ ویختفون قال ذلک امتناع ضرورۃ ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ" کما نشاھد وسئلنا الشیخ اباشجاع عنہ فقال یباح قتلہ وثیاب قاتلہ قولہ وافتی الناصحی لعل الوجوب بنظر للامام ونوابہ والاباحۃ بنظر لغیرھم۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۹۷، ۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۴۲ فصل فی التعزیر۔

دشمنوں کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مقصود اس سے ان کی شان وشوکت کو ختم کرنا اور ان پر غصّے کا اظہار کرنا ہے اس لیے ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے، اور یہ بھی جہاد میں سے ہے۔

وقال العلامۃ الکاسانیؒ: ولا بأس باحراق حصونھم بالنار واغراقھا بالماء وتخریبھا وھدمھا ونصب المجانیق علیھا لقولہٖ تعالیٰ: یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی المؤمنین ولان کل شیءٍ من باب القتال لما فیہ من قھر العدو وکبتھم وغیظھم۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۰ کتاب السیر)

اہلِ حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران اُن کے باغات اور فصلوں کو تباہ کرنا اور قطع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے ساتھ جنگ کی حالت میں ان کے باغات اور فصلوں کو کاٹنے اور برباد کرنے میں چونکہ ان کی شان وشوکت اور غرور وتکبّر کو توڑنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا دورانِ جہاد اُن کے باغات اور فصلوں وغیرہ کو تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم بلا وجہ مال مویشی اور باغات کو تباہ نہ کیا جائے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: قال وارسلوا علیھم الماء وقطعوا اشجارھم وافسدوا زروعھم لان فی جمیع ذٰلک الحاق الکبت والغیظ بھم وکسر شوکتھم وتفریق

---

[۱] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہٖ وحرقھم) ای احرق دورھم وامتعتھم قالہ عینی والظاھر ان المراد حرق ذاتھم بالمجانیق واذا جازت محاربتھم یحرقھم فمالھم اولیٰ۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجہاد)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۱۹۴ کتاب السیر۔ الباب الثانی فی کیفیۃ القتال۔

جمعهم فيكون مشروعاً. (الهداية ج ۲ ص ۲۵۵ كتاب السير باب كيفية القتال) ۱؎

جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں

سوال: ایک کافر اور منکرِ خدا اگر دورانِ جنگ مجاہدین کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور کلمۂ توحید پڑھ لے، تو کیا اسلام لانے کے بعد اس کا قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حالتِ جنگ میں اگر کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر وحدانیتِ باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا تو شریعتِ مطہرہ میں ایسے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں صرف اس کے اقرارِ ایمان پر ہی اکتفا کر لینا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن نجيمؒ: والكفار اقسام قسم يجحدون الباري جل وعلا واسلامهم اقرارهم بوجوده وقسم يقرون به ولكن ينكرون وحدانيته واسلامهم اقرارهم بوحدانيته۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۳ كتاب السير) ۲؎

جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم

سوال: اگر کسی کا باپ کمیونسٹوں کی طرف سے مجاہدینِ اسلام کے خلاف لڑ رہا ہو تو اس کو قتل کرنا بیٹے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ اسلام میں والدین کے اپنی اولاد پر بہت زیادہ حقوق ہیں

۱؎ وفي الهندية: ونصبوا عليهم المجانيق وحرقوهم وارسلوا عليهم الماء وقطعوا شجرهم وافسدوا زرعهم۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۹۳ كتاب السير، الباب الثاني في كيفية القتال)

وَمِثْلُهُ في البحر الرائق ج ۵ ص ۷۶ كتاب السير۔

۲؎ وفي الهندية: قال القدوري في كتابه الكفار على نوعين فمنهم من يجحد الباري عز وجل ومنهم من يقر به الا انه ينكر وحدانيته كعبدة الاوثان فمن انكره اذا اقر به يحكم باسلامه ومن اقر وجحد وحدانيته اذا اقر بوحدانيته بان قال لا اله الا الله يحكم بالاسلام۔

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۹۵ كتاب السير الباب الثاني في كيفية القتال)

وَمِثْلُهُ في التاتارخانية ج ۵ ص ۲۳۳ كتاب السير الفصل الرابع في بيان ما ينتهي به الامر بالقتال۔

اس لیے کسی کے والدین اگرچہ کافر ہی ہوں پھر بھی اسلام دنیاوی امور میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے، اس بنا پر باپ جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو بیٹے کے لیے باپ پر اقدام علی القتل مرخص نہیں البتہ اگر اسے قتل کیے بغیر کوئی اور تدبیر مناسب ممکن نہ ہو یا باپ سے قتل ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کے پیشِ نظر باپ کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویکرہ ان یبتدء الرجل اباہ من المشرکین فیقتلہ لقولہ تعالیٰ: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (الآیۃ) ولانہ یجب احیاءہ بالانفاق فیناقضہ الاطلاق فی افنائہ فان ادرکہ امتنع علیہ حتی یقتلہ غیرہ لان المقصود یحصل بغیرہ من غیر اقتحامہ الماثم وان قصد الاب قتلہ بحیث لایمکنہ دفعہ الا بقتلہ لاباس بہ لان مقصودہ الدفع الا تری انہ لو شہر الاب سیفہ علی ابنہ ولایمکنہ دفعہ الا بقتلہ یقتلہ لما بینا فہذا اولیٰ۔

(الہدایۃ ج ۲ ص۵۷۲ کتاب السیر، باب کیفیۃ القتال) [1]

کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام

سوال:۔ افغانستان پر روسی قبضہ کے بعد اکثر لوگوں نے ہجرت کر لی لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی اور کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں رہ رہے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کا قتل کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور وہاں کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونسٹوں کی اعانت نہیں کرتے ہوں تو اگرچہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

---

[1] وفی الہندیۃ: ولاباس بان یقتل الرجل من المسلمین کل ذی رحم محرم من المشرکین یبتدأ بہ الا الوالد والوالدۃ والاجداد من قبل الرجال والنساء والجدات۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲ ص۱۹۴ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیۃ القتال)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۱ کتاب السیر۔

لیکن شریعتِ مقدسہ ان کو قصداً وارادۃً قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، البتہ اُن کے اموال کو ضبط کرنا جبکہ اس سے کفار کو فائدہ ہو رہا ہو درست ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنه تعلم من یدخل تحت جوارهم واما نهم من غیر اعانة لهم بنفسه وبماله ولا یکون عینا لهم علینا ولا ردءً دونهم لا یباح قتله وانما هو عاص معصیةً لا تبیح ما عصمه الاسلام من دمه وماله وانما ابیح اخذ اموالهم ایضاً لکونهم یعینون به العدو علی مقاتل الاسلام ومقاومته ومناواته ومناهضته فابیح اخذه لذلك۔

(الفتاوی الکاملیة ص۲۵۱ کتاب الجنایات)[1]

کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم

سوال:۔ کمیونسٹوں کے معاونین اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا قتل جائز ہے؟

الجواب:۔ کمیونسٹ چونکہ اپنے عقائد اور نظریات کی بناء پر اہلِ حرب قرار دیئے گئے ہیں لہٰذا واقعی طور پر جو لوگ کمیونسٹوں کے حامی ہوں اور ان کے ساتھ امداد و تعاون کرتے ہوں تو یہ بھی انہی لوگوں کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کو بھی قتل کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت عن بلدة استولی علیها الکفار وتمکنوا منها فانضم الیهم بعض القبائل والعشائر وصاروا یقاتلون معهم المسلمین وینهبون مالهم وینصحون الکفار ویعینونهم علی اذی المسلمین فکانوا اشدّ ضرراً علی المسلمین من الکفار فما حکم فیهم وهذا حالهم۔ فالجواب انی لم اقف علی حکم هٰؤلاءِ فی کتب مذهبنا معاشر الحنفیة ولکن وقفت عن حکمهم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: قوله بالمجانیق ای یرمی النار بها علیهم لکن جواز التحریق والتغریق مقید کما فی شرح السیر بما اذا لم یتمکنوا من الظفر بهم بدون ذلك بلا مشقة عظیمة فان تمکنوا بدونها فلا یجوز لان فیه اهلاك اطفالهم ونسائهم ومن عندهم من المسلمین۔ (ردالمحتار ج۴ ص۱۲۹ کتاب الجهاد۔ مطلب فی ان الکفار مخاطبون ندبا)
ومثله فی الهدایة ج۲ ص۲۵۶ کتاب السیر۔

فی کتب بعض السادة المالکیة الیٰ ان قال والظاهر ان حکم هٰؤلاء حکم اهل الحرب فی قتلهم واخذ اموالهم واما اولادهم فلا یقتلون ولا یکون فیاً وانما أبیح قتل البالغین منهم لکونهم ردأً للعدو الحرب ومعینون له بانفسهم و حکم الردء اذا لم یقاتل مع العدو حکم المقاتل فاحری اذا قاتل۔

(الفتاوی الکاملیة ص۲۵ کتاب الجنایات) لـه

کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا

سوال:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

الجواب:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور عورتوں کو قصداً و ارادةً قتل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کمیونسٹوں کو اور ان کے گھروں کو تباہ کرنا مقصود ہو تو ان میں جو بچے اور عورتیں غیر ارادی طور پر قتل ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز اگر ان میں سے کوئی ذی رائے ہو یا جنگ کرنے والا ہو یا ان کی سربراہ عورت ہو تو قصداً و ارادةً بھی قتل کئے جا سکتے ہیں تاکہ شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یقتلوا امرأة ولا صبیاً ولا شیخاً فانیاً ومقعداً ولا اعمی لان المبیح للقتل عندنا هو الحراب ولا یتحقق منهم ..... الا ان یکون احد هٰؤلاء ممن له رأی فی الحراب او یکون المرءة ملکة لتعدی ضررها الی العباد وکذا یقتل من قاتل من هٰؤلاء دفعاً للشرّ ولان القتال مبیح حقیقته۔ (الهدایة ج۲ ص۲۵۶ کتاب السیر باب کیفیة القتال) لـه

لـه وقال العلامة الحصکفیؒ: وجمیع الکبائر والاعونة والسعاة یباح قتل الکل ویثاب قاتلهم انتهی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذٍ۔ وقال ابن عابدینؒ بعد قوله وجمیع الکبائر ای اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدی ضررها ای الغیر الیٰ ان قال فیشمل کل من کان من اهل الفساد۔

(ردّ المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

لـه وقال العلامة الکاسانیؒ: اما حال القتال فلا یحل فیها قتل امرءة ولا صبی ولا شیخ فانٍ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۷۷ کتاب السیر۔

دشمن سے اسلحہ لیکر اُسے مجاہدین کے خفیہ راز بتانیوالے کو قتل کرنے کا حکم

سوال: پاکستان یا افغانستان کے بعض قبائلی علاقوں میں کچھ لوگ مجاہدین کو نقصان پہنچانے اور ان کے عسکری راستوں کو قطع کرنے کے لیے روسی کمیونسٹ حکومت سے اسلحہ لیتے ہیں اور مجاہدین کے خفیہ حالات اور مراکز کی اطلاع بھی دشمن کو کرتے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو لوگ مجاہدینِ اسلام کے خلاف کمیونسٹوں یا دیگر مخالفینِ اسلام کے ساتھ کسی بھی قسم کی معاونت کرتے ہوں اور مجاہدینِ اسلام کے خفیہ راز اور عسکری مراکز کی نشاندہی دشمنوں کو کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے، ان کا حکم زنادقہ کا حکم ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنهم من لجأ للمسلمین وصار یقاتل العدو معهم وهو مع ذلك یعین العدو خفیة ویعلمه باحوال عساکر المسلمین ویطلعه علیٰ عوراتهم ویتربص بهم الدوائر وقد اطلع لهم علیٰ کتب کتبها فی ذلك لوقت کثیر من مشائخهم المعروفین بالاجواد...... الیٰ ان قال وحکم اولئك حکم الزنادقة ان اطلع علیهم قتلوا وان لا فامرهم الی الله۔ (الفتاویٰ الکاملیة ص۲۵۱ کتاب الجنایات)[1]

جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا

سوال: کیا مجاہدین کے لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاد کے دوران ہر مناسب طریقے سے دشمن پر رُعب اور دباؤ ڈالنا

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وجمیع الکبائر والاعونة والسعاة یباح قتل کل ویثاب قاتلهم انتهی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل موذٍ۔ وقال ابن عابدینؒ: (تحت قوله وجمیع الکبائر) ای اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدی ضررها الی الغیر فیکون قوله والاعونة والسعاة عطف تفسیر او عطف خاص علی عام فیشمل کل من کان من اهل الفساد کالساحر وقاطع الطریق واللص واللوطی والخناق ونحوهم من عم ضرره ولا ینزجر بغیر القتل قوله والاعونة کانه جمع معین او عوان بمعناه والمراد به الساعی الی الحکام بالافساد فعطف السعاة عطف تفسیر۔

(ردّ المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر)

اور اس کی شان و شوکت کو ٹھیس پہنچانا مشروع ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے مونچھیں بڑھانے کی صورت میں چونکہ دشمن پر رعب پڑنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا ایک اچھا قدم ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ویندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه باظافیره وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارزه والحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔
(البحر الرائق ج۵ ص۷۶ کتاب السیر) ؎۱

دشمن سے تحفظِ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا

سوال:۔ جہاد میں کفار کو ہلاک کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکہ دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنا کسی بھی آسمانی مذہب میں جائز نہیں اس لیے اس کا کسی بھی وقت جائز اور حلال متصور نہیں تاہم بعض مواضع ایسے ہیں جن میں اگر دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے ظاہری دھوکہ اور جھوٹ کے علاوہ کوئی تلافی ممکن نہ ہو تو ایسے مواضع پر جھوٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے تو چونکہ درحقیقت یہ جھوٹ نہیں اس لیے دشمن سے حفاظتِ دین کی خاطر ظاہری دھوکہ اور جھوٹ میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: روی عن علی انه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الحرب خدعة فیه دلیل علی انه لابأس بالخداع فی الحرب ولیس المراد الکذب المحض وانما المراد استعمال المعاریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۰ کتاب السیر، الفصل التاسع فی الخدعة فی الحرب) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة: قالوا لا بأس عن طول الشارب للغزاة لیکون اهیب فی عین العدو وکذا فی الغیاثیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۸ کتاب الکراهیة)

؎۲ قال العلامة العثمانیؒ: بعد ذکر الحدیث ما نصه وفیه علی انه لا بأس للمجاهد ان یخادع قرنه فی حال القتال۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۲۵ کتاب السیر)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة۔ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی۔

جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم

سوال:۔ کفار کے سامنے جنگ کے دوران مسلمانوں کی فوج اپنے مورچوں پر آخری دم تک ثابت قدم رہے گی یا کسی موقعہ پر پیچھے ہٹ جانے کی بھی اجازت موجود ہے ؟

الجواب:۔ کفار کے مقابلہ میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدمی پر مامور ہیں اور ان کا میدان چھوڑنا جرم ہے، لیکن کفار کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہو یا تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کم ہوں لیکن مسلمان فوج کا غالب خیال یہ ہو کہ کفار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ایسی حالت میں دوبارہ تیاری کے لیے پیچھے ہٹ جانا شرعاً جرم نہیں ۔

کما قال اللہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ـ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۱۵) [1]

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: وعلیٰ هذا الغزوات إذا جاءهم جمع من المشركين مالا طاقة لهم به وخافوهم ان یقتلوهم فلا بأس لهم ان ینحازوا إلیٰ بعض امصار المسلمين اوالیٰ بعض جیوشهم والحکم فی هذا الباب لغالب الرأی واکبر الظن دون العدد فان غلب علیٰ ظن الغزاة انهم یقاومونهم یلزمهم الثبات وان کانوا اقل عددًا منهم وان کان غالب ظنهم انهم یغلبون فلا بأس ان ینحازوا الی المسلمین لیستعینوا بهم وان کانوا اکثر عددًا من الکفرة ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر فصل بیان من یفترض)

باب الغنائم وقسمتها
(مالِ غنیمت کے احکام و مسائل)

مالِ غنیمت غانمین کا حق ہے نہ کہ حکومت کا

سوال :۔ کفار کے ساتھ جنگ کے دوران جب اسلامی فوج کافروں کی افواج کو مغلوب کرکے مالِ غنیمت پر قبضہ کرے تو کیا یہ مالِ غنیمت فوج کا حق ہے یا حکومت کا حق ہے ؟

الجواب :۔ شرعی اعتبار سے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کرکے ان میں سے ۱/۵ حصہ بیت المال میں داخل کرکے باقی ۴/۵ حصہ خاص اس فوج پر تقسیم کیا جائے گا جس نے دورانِ جنگ اس مالِ غنیمت پر قبضہ کیا ہو اور اس کے برعکس حکومت کا یہ قانون کہ سارا مالِ غنیمت حکومت کا ہوگا دیگر قوانین کی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی قانون ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کے بھی خلاف ہے ۔

لما قال العلامة المرغيناني رحؒ: ويقسم الامام الغنيمة فيخرج خمسها لقوله تعالىٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِهٖ۔ استثنى الخمس ويقسم اربعة اخماس بين الغانمين لان النبي عليه السلام قسمها بين الغانمين ۔ (الهداية ج۲ ص۲۶ باب الغنائم وقسمتها)[1]

مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے

سوال :۔ جب امیر لشکر میدانِ جنگ میں دشمن کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجاہدین کو چار جماعتوں پر تقسیم کرکے بھیجدے اور ان چار جماعتوں میں سے ایک جماعت اس علاقہ پر قبضہ کرکے مالِ غنیمت پر قبضہ کرلے تو کیا اس مالِ غنیمت میں تمام جماعتیں شریک ہوں گی یا یہ صرف قابض جماعت کا حق ہوگا۔

---

[1] وقال العلامة الحصكفي رحؒ: في المغرب الغنيمة ما نيل من الكفار عنوة والحرب قائمة فتخمس وباقيها للغانمين ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۴ ص۱۳۷ كتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)
وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج۵ ص۲۳۴ كتاب الغنائم وقسمتها، فصل فى كيفية القسمة

الجواب: مذکورہ صورت میں یہ مالِ غنیمت مجاہدین کی تمام جماعتوں کا مشترکہ حق ہے خواہ کسی ایک جماعت نے ہی اس مال پر قبضہ کیا ہو، البتہ اگر امیر لشکر کسی خاص مصلحت کی بناء پر یہ مالِ غنیمت کسی خاص جماعت پر تقسیم کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: قال الردء والمقاتل فی العسکر سواء لاستوائهم فی السبب وهو المجاوزة او شهود الوقعة علی ما عرف وکذلك اذا لم یقاتل لمرض او لغیره لما ذکرنا۔ (الهدایة ج ۲ ص ۲۶۳ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها) [1]

سوال: جہادِ افغانستان | **تنفیل (انعام) نہ ہونے کی صورت میں مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا**

میں ایک مجاہد نے ایک روسی کافر کو ہلاک کر کے اس کی کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا، اب دیگر مجاہدین اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف آپ اکیلے کا حق نہیں بلکہ تمام مجاہدین کا اس میں حق ہے اور یہ مالِ غنیمت ہے جبکہ وہ مجاہد یہ کہتا کہ اس کلاشنکوف پر صرف میرا حق ہے کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے، تو اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟

الجواب: مالِ غنیمت تمام مجاہدین کے درمیان مشترکہ ہوتا ہے کسی ایک مجاہد کا بغیر تقسیم کے مالِ غنیمت میں سے کچھ لینا جائز نہیں، تاہم اگر امیرِ جہاد نے تنفیل (انعام) کا اعلان کیا ہو یعنی جو مجاہد جس حربی کو قتل کرے گا تو مقتول سے جو اسلحہ اُسے حاصل ہوگا وہ اسی کا ہوگا۔ تو ایسی صورت میں اگر کسی مجاہد نے کسی حربی کو قتل کر کے اس کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا تو وہ اسلحہ اسی مجاہد کا حق ہوگا کوئی اور اس کے ساتھ اس اسلحہ میں شریک نہیں ہوگا، اس کے علاوہ جملہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ مال ہے۔

لما فی الهندیة: قال محمدؒ ولا یستحق القاتل سلب المقتول بنفس القتل ما لم

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیه) قال فی البحر وافاد المصنف ان المقاتل وغیره سواء حتی یستحق الجندی الذی لم یقاتل لمرض وغیره وانه لا یتمیز واحد علی آخر بشیء حتی امیر العسکر وهذا بلا خلاف کذا فی الفتح وفی المحیط والمتطوع فی الغزو وصاحب الدیوان سواء۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۱۴۴ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

ومثله فی البحر ج ۵ ص ۸۵ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها۔

ینفل الامام قبل القتال فیقول من قتل قتیلاً فلہٗ سلبہ وھٰذا مذھب علمائنا۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۱۷ کتاب السیر الباب الرابع الفصل الثالث فی التنفل) [۱]

دارالحرب سے مال غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مسلمان کفار کے بہت سارے مال و اسباب پر قبضہ کریں اور اس میں بعض ایسی اشیا بھی شامل ہوں کہ اُن کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو مثلاً حیوانات اور دوسری بھاری اشیاء، تو ایسی اشیاء کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر مقبوضہ اشیاء ایسی ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو (جیسا کہ حیوانات اور بھاری اسلحہ وغیرہ)، تو شریعت کی رُو سے حیوانات کو پہلے ذبح کر کے بعد میں دارالحرب میں چھوڑا جائے تاکہ کفار ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اسلحہ وغیرہ کو کسی ایسی مخفیہ جگہ دفن کیا جائے کہ کفار کو اس کا پتہ نہ چل سکے، بچوں اور عورتوں کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھوک اور پیاس سے دم توڑ جائیں تاکہ کفار کو ان سے تقویت نہ پہنچے اور برتن وغیرہ توڑ دیئے جائیں۔

کما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: وحرم عقر دابۃ شق نقلھا فتذبح وتحرق کما تحرق اسلحۃ وامتعۃ تعذر نقلھا ومالا یحرق منھا یدفن بموضع خفی وتکسر اوانیھم وتراق دھانھم مغایظۃ لھم ویترک صبیان ونساء منھم شق اخراجھا بارض خربۃ حتی یموتوا جوعاً۔ (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۱۴۰ کتاب الجہاد باب المغنم وقسمتہ) [۲]

---

[۱] وقال العلامۃ الکاسانیؒ: ھٰذا اذا نفل الامام فان لم ینفل شیئاً وقتل رجل من الغزاۃ قتیلاً لم یختص بسلبہ عندنا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۵ کتاب السیر)۔ ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۲۶۳ کتاب السیر باب الغنائم وقسمتھا

[۲] قال العلامۃ الکاسانیؒ: وان لم یقدر المسلمون علی حمل ھٰؤلاء ونقلھم الی دارالاسلام لا یحل قتلھم ویترکون فی دارالحرب لان الشرع نھی عن قتلھم ولا قدرۃ علی نقلھم فیترکون ضرورۃ واما الحیوان والسلاح اذا لم یقدروا علی الاخراج الی دارالاسلام اما الحیوان فیذبح ثم یحرق بالنار لئلا یمکنھم الانتفاع بہ اما السلاح فما امکن احراقہ بالنار یحرق ومالا یحتمل الاحراق کالحدید ونحوہ فیدفن بالتراب لئلا یجدوہ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۲ کتاب السیر)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۰۸ کتاب السیر الباب الرابع فی الغنائم وقسمتھا۔ الفصل الاول فی الغنائم۔

دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم

سوال:۔ بعض مسلمان تاجر دارالحرب میں سامانِ تجارت وغیرہ لاتے ہیں اور وہاں خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، اگر مجاہدین ان کے سامان اور مال پر قبضہ کرلیں تو کیا یہ مال وغیرہ مالِ غنیمت شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب کو مالِ تجارت مہیا کرنا مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں کیونکہ اس سے کفار کو تقویت ملتی ہے جو کہ اعانت علی المعصیت کے مترادف ہے اور مجاہدین کا مسلمانوں کے مالِ تجارت پر قبضہ کرنے سے وہ مال مالِ غنیمت شمار نہیں ہوتا بلکہ مالِ غنیمت وہ ہے جو کفار سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: الغنیمة اسمٌ لما یؤخذ من اموال الکفرة بقوة الغزاة وقهر الکفرة۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۷ کتاب الجهاد والمغنم) ۔؎۱

مالِ غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے

سوال:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں اس کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً حرام ہے، یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے کیونکہ اس کی حرمت پر قرآنی نصوص اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) دال ہیں۔

لقوله تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (سورۃ آلِ عمران آیت ۱۶۱) ۔؎۲

؎۱ وقال العلامة الکاسانیؒ: فالغنیمة عندنا اسم للماخوذ من اهل الحرب علی سبیل القهر والغلبة۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۷ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۰۴ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم ثم الفصل الاول فی الغنائم۔

؎۲ وفی الحدیث: عن ابن عباسؓ یقول حدثنی عمر بن الخطابؓ قال قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فلاناً قد استشهد قال کلا قد رأیته فی النار بعباءة قد غلّها قال قم یا عمر فناد انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون ثلاثاً۔ هذا حدیث حسن صحیح غریب۔ (ترمذی ج۱ ص۱۹۱ باب ما جاء فی الغلول)

وَمِثْلُهٗ فی ابی داؤد ج۲ ص۱۴ باب فی تعظیم الغلول۔ کتاب الجهاد۔

مالِ غنیمت کی نیت سے جہاد کرنے کا حکم

سوال:۔ مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے جہاد میں حصہ لینے سے ثواب کی امید کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی آدمی کا جہاد کو جانے سے اگر مقصودِ اصلی مالِ غنیمت ہو تو اُس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں اگر مقصودِ اصلی جہاد اور رضائے الٰہی کا حصول ہو لیکن اس کے ساتھ مالِ غنیمت کا بھی ارادہ ہو تو ثواب ملنے کی امید ہے۔

لما فی الحدیث:۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رجلاً قال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال علیہ السلام لا اجر لہٗ فاعظم ذٰلک علی الناس وقال للرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفہمہ فقال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا قال لا اجر لہٗ فقالوا للرجل عد لرسول اللہ فقال لہ الثالثۃ فقال لا اجر لہٗ۔
(سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۳۴۸ کتاب الجہاد باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)[1]

شہید کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی مجاہد کفار کے ساتھ جنگ کے دوران شہید ہو جائے تو کیا اس کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مجاہدین جب مالِ غنیمت پر قبضہ کر کے دارالاسلام میں لے آئیں یا تقسیم کر لیں اور اس کے بعد کوئی شہید ہو جائے تو ایسی حالت میں اس کا حصہ اس کے

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: ثم تاویلہٗ من وجھین احدھما ان یری انہٗ یرید الجہاد ومرادہٗ فی الحقیقۃ المال فھٰذا کان حال المنافقین ولا اجر لہٗ اویکون معظم مقصودہ المال وفی مثلہٖ قال علیہ السلام للذی استوجر علی الجہاد بدینارین انمالک دینارک فی الدنیا والاٰخرۃ واما اذا کان معظم مقصودہ الجہاد یرغب معہ الغنیمۃ فھو داخل فی قولہٖ تعالیٰ: لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ یعنی التجارۃ فی الحج فکما انہٗ لا یحرم ثواب الحج فکذا الجہاد۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۱۲۰ کتاب الجہاد مطلب فیمن یرید الجہاد مع الغنیمۃ)۔

ورثاء کو دیا جائے گا، اور اگر کوئی دار الحرب میں شہید ہو گیا یا تقسیمِ غنیمت سے پہلے شہید ہو گیا تو ایسی صورت میں اس کے ورثاء کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله : ومن مات من الغانمين في دار الحرب فلا حق له في الغنيمة ومن مات منهم بعد اخراجها الى دار الاسلام فنصيبه لورثته لان الارث يجري في الملك ولا ملك قبل الاحراز وانما الملك بعده۔

(الهداية ج ۲ ص ۲۶۴ كتاب السير باب الغنائم وقسمتها) [1]

مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم

سوال:۔ اگر جہاد میں عورتیں بھی شریک ہوں یعنی وہ زخمیوں کو پانی وغیرہ پلاتی ہوں یا ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں تو مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملے گا یا نہیں جبکہ وہ مردوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہیں ؟

الجواب:۔ یہ مسئلہ علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض حضرات عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مالِ غنیمت میں حصہ دینے کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور دوسرے علماء ان کیلئے مردوں کے برابر حصہ کے قائل نہیں، تاہم یہ حاکمِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ (سہم) مردوں کے حصے سے کم جتنا مناسب سمجھے عورتوں کو مالِ غنیمت سے کچھ مال دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانی رحمه الله : قال في الهداية والكفاية ولا يسهم لمملوك ولا امرأة ولا صبي ولا ذمي ولكن يرضخ لهم اي يعطون قليلاً من كثير فان الرضخة هي الاعطاء كذلك فالرضخ لا يبلغ السهم ولكن دونه على حسب ما يراه الامام - (اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۱۹۰ باب لا يسهم لمملوك ولا امرأة الخ)

---

[1] وقال العلامة التمرتاشي رحمه الله : ولا من مات ثمة قبل قسمة او بيع ولو مات بعد احدهما ثمة او بعد الاحراز بدارنا يورث نصيبه لتاكد ملكه۔

(تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۴۲ كتاب الجهاد باب المغنم)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۲۰۸ كتاب السير الباب الرابع في الغنائم، الفصل الاول في الغنائم۔

باب المستامن

(دارالاسلام میں رہنے والے کفار کے احکام ومسائل)

دارالاسلام بننے کے لیے شرائط

سوال:- دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے کون سی شرائط ہیں؟

الجواب:- فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ احکام میں اسلام کا ظہور ہوجائے تو وہ دارالاسلام شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ودارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیها کجمعةٍ وعیدٍ۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۷۷ کتاب الجهاد۔ قبل باب العشر والخراج والجزیة) [1]

دارالحرب بننے کے لیے شرائط

سوال:- دارالاسلام سے دارالحرب بننے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

الجواب:- دارالاسلام سے دارالحرب بننے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین شرائط کا ہونا ضروری ہے (۱) احکام کفر اس میں ظاہر ہوجائیں (۲) دارالکفر کے ساتھ متصل ہوجائے (۳) مسلمان اور ذمی اپنے امن میں نہ رہ جائے بلکہ کفار کے امن میں داخل ہوجائیں، اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک دارالحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ کفر کے احکام کا ظہور ہوجائے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله:- قال ابوحنیفةؒ انها لا تصیر دار الکفر الا بثلث شرائط احدها ظهور احکام الکفر فیها والثانی ان تکون متاخمة دار الکفر

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: لا خلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۰ کتاب السیر)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب السیر، الباب الخامس فی استیلاء الکفار۔

والثالث ان لایبقی فیھا مسلم ولا ذمی آمنا بالامان الاول وھو امان المسلمین وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ انھا تصیر دار الکفر بظھور احکام الکفر فیھا ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ فصل الاحکام تختلف باختلاف الدارین) ؎

سمندر کا دار الحرب میں داخل ہونا

سوال :۔ آجکل جغرافیائی تقسیم میں سمندر کا کچھ کچھ حصہ قریبی ممالک کے قبضے میں ہوتا ہے جس میں کسی دوسرے ملک کا بغیر اجازت کے داخل ہونا سمندری حدود کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا کافر ممالک کے ساتھ سمندر بھی دار الحرب کے حکم میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ جب کفار مسلمانوں کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سمندری حدود پر بھی قبضہ کر لیں اور بلادِ اسلام سے اس علاقہ کا تعلق ختم ہو جائے تو اس کی سمندری حدود بھی حکماً دار الحرب میں شامل ہو جاتی ہیں ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : قولہ واحرزوھا دارھم ویلحق بھا البحر الملح ونحوہ کمفازۃ لیس وراءھا بلاد الاسلام نقلہ بعضھم عن الحمویؒ فی حاشیۃ ابی السعود عن شرح النظم الھاملی سطح البحر لہ حکم دار الحرب ۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۶ کتاب الجھاد باب استیلاء الکفار)

کسی حربی کی دار الاسلام میں قیام امن کی مدت

سوال :۔ ایک غیر مسلم شخص کسی اسلامی حکومت میں کتنی مدت تک

؎ وفی الھندیۃ : قال محمد فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقی فیھا مومن ولا ذمی آمنا بامانہ الاول الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار) ومثلہ فی تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۷ کتاب الجھاد، قبل باب العشر والخراج والجزیۃ ۔

اجازت حاصل کر کے قیام کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ غیر مسلموں کی عادات واخلاق کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اُن سے اسلامی معاشرہ کو خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک دارالاسلام میں قیام کی اجازت دینا جائز نہیں تاہم اگر حاکم وقت بہتر سمجھے تو زیادہ عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لایمکن حربی مستأمن فینا سنة لئلا یصیر عینا لهم وعونا علینا وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی۔

(الدرالمختار علی هامش ردالمحتار ج۳ ص۲۷۳ کتاب الجهاد۔ فصل فی استئمان الکافر) ؎

غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مجاہدین کچھ کافروں کو قیدی بنالیں اور اسی طرح کافروں نے بھی کچھ مسلمانوں کو قیدی بنایا ہو تو ان غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ شرعاً کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟ کیا انہیں قتل کیا جائے یا ان کے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران جب کفار قیدی بنالئے جائیں تو حاکم وقت کی مرضی ہے کہ چاہے تو ان کو قتل کر دے یا ان کو غلام بنالے یا اُن پر ذمی کے احکام لگا کر چھوڑ دے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دشمن کی قید میں مسلمان قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم قیدیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان سے فدیہ لینے کے بجائے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وهو فی الاساری بالخیار ان شاء قتلهم ...... وان شاء استرقهم وان شاء ترکهم احرارا ذمة

؎ وقال العلامة المرغینانی رحمه الله: واذا دخل الحربی الینا مستأمنا لم یمکن ان یقیم فی دارنا سنة ویقول له الامام ان اقمت تمام السنة وضعت علیك الجزیة۔

(الهدایة ج۲ ص۲۷۸ کتاب السیر، باب المستأمن)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱ فصل من یسع ترکه فی دار الحرب۔

للمسلمین۔۔۔۔۔ الی ان قال ولا یفادی بالاساری عند ابی حنیفۃ وقالا یفادی بھم اساری المسلمین۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۶۱ کتاب السیر۔ باب الغنائم) [1]

حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اجازت نامہ (قانونی دستاویزات) کے بغیر اگر کوئی حربی دارالاسلام میں داخل ہوجائے تو اس کو کوئی سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی ملک میں دارالاسلام کی شرائط پوری ہوں اور وہاں اسلامی حکومت ہو تو کسی حربی کا اس ملک میں حکام کی اجازت کے بغیر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کفار کا جاسوس بن کر آیا ہے، ایسی حالت میں اس کو بطور سزا کے غلام بنالیا جائے، اس لیے کسی حربی کا بغیر حاکم وقت کی اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونا صحیح نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان ومامعہ فیأ ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔ (ردالمحتار ج۴ ص۲۷۲، کتاب الجہاد، فصل فی استئمان الکافر) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وقتل الاساری ان شاء ان لم یسلموا واسترقھم اوترکھم احراراً ذمۃ لنا الامشرکی العرب والمرتدین کماسیجیٔ وحرم منھم ای اطلاقھم مجاناً ولو بعد اسلامھم ابن کمال لتعلق حق الغانمین وجوزہ الشافعی لقولہ تعالیٰ: فَاِمَّا مَنًّا بعد واما فداءً حتی تضع الحرب اوزارھا قلنا نسخ بقولہ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ شرح مجمع وحرم فداءھم بعد تمام الحرب واما قبلہ فیجوز بالمال لا بالاسیر المسلم درر وصدر الشریعۃ وقالا یجوز وھو اظھر الروایتین عن الامام شمنی۔

(ردالمحتار ج۳ ص۲۵۱ کتاب الجہاد، باب المغنم وقسمتہ)

[2] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: لانہ لو دخل دارنا بلا امان فھو ومامعہ فیٔ فان قال دخلت بامان لم یصدق واخذ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۰۱ باب المستأمن)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۷۱ کتاب السیر، باب المستامن۔

افغانستان کے دار الحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جہاد افغانستان کے وقت افغانستان دار الحرب تھا یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی ملک کے دار الحرب بننے کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ جہاد کے وقت افغانستان میں مکمل طور پر نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے افغانستان کا دار الحرب ہونا فقہی نقطۂ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لما قال العلامة بدر الدين محمود بن اسمٰعيل رحمه الله: لا تصير دار حرب الا باجراء احكام الشرك واتصالها بدار الحرب بان لا يكون بينها وبين دار الحرب مصر للمسلمين وان لا يبقى فيها مسلم او ذمي امنا على نفسه بالامان الاول لا يبقى امنا الا بامان المشركين وعندهما باجراء احكام الشرك تصير دار حرب اتصلت او لا وبقي احد بالامان الاول او لا (جامع الفصولين ج۱ ص۱۳ كتاب السير) [1]

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی مملکت میں جب غیر مسلم رہائش پذیر ہوں تو کیا ان کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلموں کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ ان کی سابقہ عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

---

[1] وقال العلامة التمرتاشيؒ: لا تصير دار الاسلام دار حرب الا باموز ثلاثة باجراء الاحكام اهل الشرك وباتصالها بدار الحرب وبان لا يبقى فيها مسلم او ذمي امنا بالامان الاول۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۱۷۵ كتاب الجهاد، فصل استئمان الكافر)

ومثله في الهندية على هامش الهندية ج۲ ص۲۱۲ كتاب السير، باب الرابع في المرتد وما يصير الكافر به مسلماً۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا یحدث بیعۃٌ ولا کنیسۃٌ ولا صومعۃٌ ولا بیت نار ولا مقبرۃ فی دار الاسلام ولو قریۃ فی المختار۔
(تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج ۴ ص۲۹۶ کتاب الجهاد، فصل فی الجزیۃ) [1]

دارالاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم

سوال:۔ آجکل مملکتِ خداداد پاکستان میں عیسائی کھلے عام بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلم دارالاسلام میں اپنے مذہب کی آزادی سے تبلیغ کرتے پھریں؟

الجواب:۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر مسلم آزادی سے مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے بلکہ مسلمان حاکمِ وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں اس عمل سے باز رکھے، جہاں تک دارالاسلام میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو وہ صرف ان کے اہم مذہبوں تک محدود ہے یہاں تک کہ وہ بلند آواز سے اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت بھی نہیں کر سکتے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: وقد حکی ابن تیمیۃ اجماع الفقهاء وسائر الائمۃ رحمهم اللہ علیٰ مراعاۃ تلک الشروط قال ولو لا شهرتها عند الفقهاء لذکرنا الفاظ کل طائفۃ فیها...... ومن جملۃ الشروط ما یعود باخفاء منکرات دینهم وترک اظهارها کمنعهم من اظهار الخمر والناقوس والنیران والاعیاد ونحو ذلک ومنها ما یعود باخفاء شعائر دینهم کاصواتهم بکتابهم۔

{اعلاء السنن ج ۱۲ ص۴۸۸ باب شروط اهل الذمۃ وما یجوز لهم فی دارنا وما لا یجوز لهم}

---

[1] وقال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: واما الکنائس والبیع القدیمۃ فلا یتعرض لها ولا ینهدم شئ منها واما احداث کنیسۃ اُخریٰ یمنعون عنه فیما صار مصراً من امصار المسلمین لقوله علیه السلام لا کنیسۃ فی الاسلام الا فی دار الاسلام۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۱۴ کتاب السیر)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیۃ ج ۲ ص۲۴۷ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیۃ۔

باب معاملات مع الکفّار

(غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احکام ومسائل)

غیر مسلم کو سلام کرنا | **سوال**:۔میں ایک غیر مسلم کمپنی میں ملازم ہوں وہاں میرے کچھ عیسائی اور ہندو دوست ہیں، کیا میں اُن کو سلام کرسکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔کسی بھی غیر مسلم پر سلام کی ابتداء ممنوع ہے کیونکہ کسی کو سلام میں پہل کرنے سے درحقیقت اس شخص کی عظمت پیشِ نظر ہوتی ہے جبکہ مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی غیر مسلم کی عزّت وعظمت اس پر غالب رہے، تاہم بوقتِ ضرورت اسے مناسب الفاظ سے سلام کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفیؒ: و یحرم تعظیمه وتکره مصافحته ولا یبداء بالسّلام الا لحاجة۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۲ کتاب الجہاد) [1]

غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا | **سوال**:۔غیر مسلم کے سلام کا جواب دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کو سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف وعلیك کہنا کافی ہے، تاہم اگر کسی غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طالب ہوکر یوں جواب دیا جائے السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ تو بہتر ہے۔

لما فی الھندیة: واذا کان له حاجة فلا بأس برد سلام علیٰ اھل الذمة

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: وفی السیر لا بأس برد سلام اھل الذمة والنھی عن البداۃ الا اذا کان محتاجًا الیه فلا بأس بھا ایضًا ولکن یکره مصافحتھم۔ (الفتاوی البزازیة علیٰ ھامش الھندیة ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراھیة۔ فصل نوع فی السّلام)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجھاد۔فصل فی الجزیة۔ فروع فی الجزیة۔

ولكن لا يزاد على قوله وعليكم۔ قال الفقيه ابو الليث ان مررت بقوم وفيهم كفار فانت بالخيار انه شئت قلت السلام عليكم وتنوى به المسلمين وان شئت قلت السلام على من اتبع الهدى كذا فى التخيرة۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۲۵ كتاب الكراهية۔ الباب السابع فى السلام الخ) لـه

غیر مسلموں کو عبادت خانے کی طرف راہبری کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے اپنی عبادت کی جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس بارے میں غیر مسلم کی رہبری کرے؟

الجواب:۔ چونکہ ایسے امور میں کسی غیر مسلم کی رہبری کرنے سے اس کی اصلاح کی جگہ بے دینی اور کفر کو تقویت ملنے کا امکان ہے، اس لیے کسی غیر مسلم کے ساتھ ایسے معاملات میں تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے۔

قال اللہ تبارك وتعالىٰ: وَلاَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورة المائدة آیت ۲)

وقال العلامة قاضى خانؒ: ذمى سأل مسلماً عن طريق البيعة لا ينبغى للمسلم ان يدل له على ذلك لانه اعانة على المعصية۔ (فتاوىٰ قاضى خان على هامش الهندية ج۳ ص۵۹۱ الباب الثالث فى الوكالة بالبيع۔ كتاب الوكالة) ٢ـه

غیر مسلم کی عزّت وتوقیر کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے پاس مہمان بن کر آئے تو مسلمان کا اس کی عزت واحترام کے لیے

لـه قال العلامة قاضى خان رحمه الله: اذا سلم اليهودى او النصرانى او المجوسى على مسلم۔ قال محمد رحمه الله: يقول المسلم وعليك ينوى بذلك السلام لحديث مرفوع الى رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال اذا سلموا عليكم فردوا عليهم۔ (فتاوىٰ قاضى خان على هامش الهندية ج۳ ص۲۸۳ كتاب الكراهية)

ومثله فى الدر المختار على هامش ردّ المحتار ج۳ ص۲۸۳ كتاب الجهاد۔

٢ـه وفى الهندية: ذمى سأل مسلما عن طريق البيعة لا ينبغى للمسلم ان يدله على ذلك لانه اعانة على المعصية۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۵۰ كتاب السير الباب الثامن فى الجزية)

ومثله فى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۵۹ كتاب الكراهية الثالث فيما يتعلق بالمناهى۔

محفل میں کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- غیر مسلموں سے مدارات یعنی معاشرتی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر یہ اٹھنا بیٹھنا معاشرہ میں بلا امتیاز مذہب وعقیدہ کسی مہمان کا حق سمجھا جاتا ہو تو ایسی حالت میں یہ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، نیز کسی غیر مسلم کے شر وفساد سے بچنے کے لیے بھی اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرنا جائز ہے بلکہ ایسے تعلقات سے اگر یہ توقع ہو کہ وہ غیر مسلم اسلام قبول کرلے گا تو پھر اسے فرائض منصبی کا تقاضا سمجھے، تاہم اگر اس سے غیر مسلم کے مذہب وعقیدہ یا اس کے کسی غیر اسلامی شعار کی عزت وتوقیر مقصود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وجب علی المسلم عدم تعظیم الکی قال فی الذخیرة اذا دخل یهودی الحمام ان خدمه المسلم طمعاً فی فلوسه فلا بأس به وان تعظیماً له فان کان لیمیل الی الاسلام فکذلک وان لم ینوی شیئاً کره وان قام تعظیماً لذاته وماهو علیه کفر لان رضا بالکفر کفر فکیف بتعظیم الکفر قلت وبه علم انه لو قام له خوفاً من شره فلا بأس بل اذا تحقق الضرورة فقد یجب وقد یستحب علی حسب حال مایتوقعه۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۸۳ کتاب الجهاد) [1]

غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا

سوال :- ایک مسلمان کے لیے کفار اور مشرکین کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کفار کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھولیا جائے دھونے سے پہلے ایسے برتنوں میں کھانا پینا مکروہ ہے تاہم اگر دھوئے بغیر ان میں کھا پی لیا جائے تو جائز مع الکراہت ہے اور ایسا کرنے والا حرام کھانے پینے والوں میں شمار نہ ہوگا بشرطیکہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو، اور اگر علم ہو تو دھونے سے پہلے ان برتنوں میں

---

[1] وفی الهندیة: اذا دخل ذمی علی مسلم فقام له ان قام طمعاً فی میله الی الاسلام فلا بأس به وان فعل ذلك تعظیماً له من غیر ان ینوی شیئاً ماذکرنا او قام طمعاً لغناه کره له ذلك ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۴۸ کتاب الکراهیة الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام الخ
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص۱۱۴ کتاب الجهاد ۔

کھانا پینا جائز نہیں ۔

لقولہٖ علیہ الصلوٰۃ والسلام: تأکل فی اٰنیتھم فان وجدتم غیرانیتھم فلا تأکلوا فیھا فان لم تجدوا فاغسلوھا ثم کلوا فیھا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۵ کتاب الذبائح۔ باب ما جاء فی الصید) ۱؎

غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا

سوال :۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ غیر مسلموں میں جب تک کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو ان کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اعتقادی اختلاف باعثِ کراہت ہے۔

وفی الھندیۃ : ولم یذکر محمدؒ الاکل مع المجوس ومع غیرہ من اھل الشرک انہ ھل یحل ام لا وحکی عن الحاکم الامام عبد الرحمٰن الکاتب انہ ان ابتلی بہ مسلم مرۃ او مرتین لا بأس بہ واما الدوام علیہ فیکرہ کذا فی المحیط ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع عشر فی اھل الذمۃ والاحکام التی تعود الیھم) ۲؎

غیر مسلم کی ملازمت کرنا

سوال :۔ پاکستان سے کئی لوگ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں روزگار کے سلسلہ میں جاتے ہیں اور وہاں غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، تو کیا غیر مسلموں کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ غیر مسلم کی ملازمت کرنا اس طور پر کرنا کہ اس سے اسلام اور مسلما نوں

۱؎ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ : والاکل والشرب فی اوانی المشرکین یکرہ والاکل مع الکفار لو ابتلی بہ المسلم لا بأس لو مرۃ او مرتین اما الدوام علیہ یکرہ۔ (الفتاویٰ البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراھیۃ ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناہی)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الرابع عشر فی اھل الذمۃ۔

۲؎ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ : والاکل مع الکفار لو ابتلی بہ المسلم لا بأس لو مرۃ او مرتین اما الدوام علیہ یکرہ۔ (الفتاویٰ البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراھیۃ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناہی)

کی توہین نہ ہوتی ہو جائز ہے اور اگر اس میں اسلام یا مسلمانوں کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو پھر ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں ۔

لمافی الحدیث: لان خباب بن الارت رضی عمل لعاص بن وائل باجرۃ ولم ینکر علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۳۰۲ باب الاجارۃ)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم

سوال: غیر مسلموں مثلاً ہندوؤں وغیرہ کے متروکہ مال کا صحیح مصرف کیا ہے؟ علاوہ ازیں جو غیر مسلم ایک جگہ سے چلے جائیں اور ان کے املاک وہاں رہ جائیں تو از روئے شریعت اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب: غیر مسلموں کا متروکہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے، اسی طرح جو مال بلاجنگ کے کفار سے حاصل ہو یا جو مال مسلم عاشر لیتا ہے اس کا صحیح مصرف مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کرنا ہے، مثلاً سرحدوں کی حفاظت پر خرچ کرنا، دریاؤں اور نہروں پر پل بنانا، علماء، طلباء اور قاضیوں کے وظائف، اسلامی فوج کی تنخواہیں اور ان کے اہل وعیال کی فلاح وبہبود پر خرچ کرنا وغیرہ ۔

قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومصرف الجزیۃ والخراج ومال التغلبی وھدیتھم للامام وانما یقبلھا اذا وقع عندھم ان قتالنا للدین لا الدنیا جوھرۃ وما أخذ منھم بلاحرب ومنہ ترکۃ ذمی وما أخذہ عاشر منھم ظھیریۃ مصالحنا ۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۰۶ باب العشر والخراج والجزیۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: المسلم اذا اجر نفسہ من الکافر لیخدمہ جاز ویکرہ قال الفضلیؒ لا یجوز فی خدمۃ ومافیہ اضلال بخلاف الزراعۃ والسقی ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارۃ) ـــ ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۵ ص۱۲۵ کتاب الاجارۃ ۔

[2] وقال الامام عبد اللہ بن احمد حافظ الدین النسفیؒ: وما اخذ منھم بلا قتال یصرف فی مصالحنا کسد الثغور وبناء القناطیر والجسور ۔

(کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۱۱۷ کتاب الجھاد)

ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۵۹۹ کتاب الجھاد ۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ کسی ایسے ملک میں جہاں شرعی طریقہ سے جانور ذبح نہ ہوتے ہوں مسلمانوں کے لیے وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا کیسا ہے؟

الجواب: اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے چاہے ذبح کرنے والا ہندو ہو یا سکھ، مجوسی ہو یا پارسی، کسی حال میں بھی ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

قال العلامة ابو بکر الحداد الیمنیؒ: ولا توکل ذبیحة المجوسي والمرتد والوثني لان المرتد لاملة له والوثني مثله واما المجوس فلقوله علیه السلام سنوابهم سنة اهل الکتاب غیر ناکحي نسائهم ولا آکل ذبائحهم الحدیث۔

(الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۴۶ کتاب الذبائح) [۱]

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کہاں تک مذہبی حقوق حاصل ہیں؟ کیا وہ دارالاسلام اپنی مذہبی عبادت و رسومات ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل ہے لیکن اگر وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا طریقہ اختیار کریں تو انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔

لما في الهندیة: ولیس للنصرانی ان یضرب في منزله بالناقوس في مصر المسلمین ولان یجمع فیه بهم انما له أن یصلی فیه ولا ان یخرجوا الصلیب او غیر ذلك من کنائسهم ولو دفعوا اصواتهم بقراءة الزبور والانجیل ان کان فیه اظهار الشرك منعوا عن ذلك وان لم یقع بذلك اظهار الشرك لا یمنعون ویمنعون عن قراءة ذلك

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: لا مجوسي ووثني ومرتد ومحرم وتارك التسمیة عمداً یعني لا تحل ذبیحة هؤلاء۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۶۸ کتاب الذبائح)
ومثله في الهدایة ج ۴ ص ۴۳۴ کتاب الذبائح۔

فی اسواق المسلمین ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۲۵۱ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیة)

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم ممالک سے گوشت، ذبح شدہ مرغی، گھی اور دودھ وغیرہ سے بنی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں درآمد کی جاتی ہیں جبکہ گوشت کے ڈبے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اس کو اسلامی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے"۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گوشت کے علاوہ جو حلال چیزیں غیر مسلم ممالک سے آتی ہوں اور ان میں حرام چیزیں مثلاً شراب یا سُور (خنزیر) کے اجزاء شامل نہ ہوں تو ان چیزوں کا کھانا پینا جائز ہے، البتہ اگر گوشت کے ڈبے پر اسلامی طریقہ سے ذبح ہونے کے لکھے ہوئے الفاظ صحیح ہوں تو پھر اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور اگر دوسرے قرائن اور ذرائع سے ان الفاظ کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں۔

وفی الهندیة : من ارسل اجیرا له مجوسیا او خادما فاشتری لحما فقال اشتریته من یهودی او نصرانی او مسلم وسعه اکله ...... رجل اشتری لحما فلما قبضه فاخبره مسلم ثقة انه قد خالطه لحم الخنزیر لم یسعه ان یاکله ۔ [۲]
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۰۸، ۳۰۹ کتاب الکراهیة۔ الباب الاول)

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : ولیس للنصرانی انه یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر من امصار المسلمین ۔
(الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۲۵۱ کتاب الخراج)
ومثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۵۸۹ کتاب السیر۔ فصل فی اهل الذمة۔

[۲] وقال العلامة فخر الدین حسن بن منصورؒ : مسلم اشتری لحما وقبضه فاخبره مسلم ثقة انه ذبیحة المجوس فانه لا ینبغی للمشتری ان یاکل ولا یطعم غیره لان المخبر اخبر بحرمة العین وبطلان الملك ۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۴۱۶ الباب السادس والعشرون)
ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۲۲۳ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء ۔

اسلامی ملک میں غیر مسلموں کا نئی عبادت گاہ بنانا

سوال:۔ دار الاسلام میں غیر مسلم اپنے لیے نئی عبادت گاہ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ دار الاسلام میں غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تاہم پرانی عبادت گاہیں باقی رکھ سکتے ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ بھی کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی قدیم عبادت گاہ میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شہر میں غیر مسلموں کی کوئی عبادت گاہ ویران ہو جائے تو اسے ازسرِنو آباد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

کما فی الھندیۃ: ان اراد اھل الذمۃ احداث البیع والکنائس او المجوس احداث بیت النار ان اراد و ذلک فی امصار المسلمین وفیما کان من فناء المصر منعوا عن ذلک عند الکل۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۲۴۷ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیۃ) لہ

غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا

سوال:۔ چند دن قبل برطانیہ کی شہزادی پاکستان آئی تو اس کو حکومت کی سرپرستی میں لاہور کی بادشاہی مسجد میں لایا گیا، تو کیا کوئی غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کافر حالتِ جنابت میں نہ ہو اور اس کے بدن پر کوئی ایسی ظاہری نجاست بھی نہ ہو جو مسجد کے آداب کے خلاف ہو تو پھر اس کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

کما فی الھندیۃ: لا بأس بدخول اھل الذمۃ المسجد الحرام وسائر المساجد وھو الصحیح کذا فی المحیط السرخسی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۴۶ کتاب الکراھیۃ الباب الرابع عشر) ۲

لہ قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولا یجوز ان یحدث بیعۃ ولا کنیسۃ ولا صومعۃ ولا بیت نار ولا مقبرۃ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۲ کتاب السیر)

ومثلہ فی فتاوی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۵۹۰ کتاب السیر فصل فی اھل الذمۃ ما یؤخذ الخ

۲ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان الامام السرخسیؒ ذکر فی شرح السیر الکبیر ان ابا سفیان جاء الی المدینۃ ودخل المسجد ولذلک قصۃ قال فھذا دلیل لنا علی مالکؒ بمنعہ المشرک من ان یدخل شیئا من المساجد ثم قال ان الشافعیؒ: قال یمنعونہ من دخول المسجد الحرام خاصۃ للآیۃ انما المشرکون نجس فاما عندنا لا یمنعون کما لا یمنعون عن دخول سائر المساجد ویستوی فی ذلک الحربی والذمی۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۰۱ کتاب الجھاد۔ باب العشر والخراج مطلب فیہ) ــــ ومثلہ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۷۱ کتاب الکراھیۃ۔

مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر اور مرمت کے لیے چندہ دے تو کیا وہ چندہ مسجد میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر کافروں کا چندہ دینے میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احتمال نہ ہو اوران کے مذہب میں اس کی حیثیت قربت اور ثواب کی ہو اور وہ بھی ثواب کی نیت سے دیں تو پھر قبول کرنا اور مسجد کی تعمیر و مرمت پر خرچ کرنا جائز ہے ۔ کیونکہ حنفیہ کے مذہب میں کافر کے وقف کی صحت میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہو پس ظاہر ہے کہ کفار کا چندہ مسجد میں صرف کرنا اہلِ اسلام کے نزدیک تو قربت ہے، کفّار و ہنود مساجد میں جو کچھ دیتے ہیں وہ اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں، لیکن عصرِ حاضر میں غیر مسلموں کی امداد برائے مساجد عموماً مسلمانوں کو کسی نہ کسی مخمصہ سے دوچار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ان شرط وقف الذمی ان یکون قربة عندنا و عندهم کالوقف علی الفقراء او علی مسجد القدس بخلاف الوقف علی بیعة فانهٗ قربة عندهم فقط او علی حج او عمرة فانهٗ قربة عندنا فقط فافادان هذا شرط لوقف الذمی فقط لان وقف المسلم لایشترط کونه قربة عندهم بل عندنا کوقفنا علی حج وعمرة بخلافه علی بیعة فانه غیر قربة عندنا بل عندهم۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۳۹۴ کتاب الوقف) [1]

ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد میں ایک مندر بھی ہے بعض مسلمانوں کا ارادہ ہے کہ اس کی جگہ مسجد بنادی جائے ، تو کیا ہندوؤں کی متروکہ عبادت گاہ

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: واما الاسلام فلیس من شرطه فصح وقف الذمی بشرط کونه قربة عندنا وعندهم کما وقف علی اولاده او علی الفقراء۔ (البحرالرائق ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الوقف)

ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف ۔

کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- اگرچہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں، کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن ہندوؤں کے عبادت خانے کو جوں کا توں رکھ کر اس کو بطور مسجد کے استعمال کرنے سے چونکہ ان کے عبادت خانے کی عظمت و برتری قائم رہنے کا شبہ ہے لہٰذا اسے بطور مسجد استعمال کرنا جائز نہیں تاہم اگر اس کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث میں ہے: عن طلق بن علیؓ قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ انّ بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماء فتوضا وتمضمض ثم صبّہ لنافی اداوۃ وامرنا فقال اُخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروبیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوا ھا مسجدا قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبا، رواہ النسائی ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۶۹ باب المساجد) لہ

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

سوال:- اگر کوئی غیر مسلم کسی خوشی وغیرہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو دعوت دے اور اس کے ساتھ خوراک کے حلال ہونے کی یقین دہانی بھی کرا دے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- اگر اس دعوت کی وجہ سے اسلام متاثر نہ ہوتا ہو تو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، خاص کر اس دعوت میں جہاں پر خوراک کی حلّت کی یقین دہانی بھی ہو۔

لما فی الھندیۃ: ولا بأس بالذھاب الیٰ ضیافۃ اھل الذمۃ ھکذا ذکر محمدؒ

لہ لما ورد فی الحدیث: عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ الحدیث۔

(سنن النسائی ج ۱ ص ۲ کتاب المساجد)

وَمِثْلُہٗ فی مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ) ج ۱ ص ۶۹ کتاب الصلوٰۃ ۔ ابواب المساجد۔

وفی اُضحیۃ النوازل المجوسی اوالنصرانی اذا دعا رجل الی طعامہ تکرہ الاجابۃ وان قال اشتریت اللحم من السوق فان کان الداعی نصرانیًا فلا بأس بہ ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۴۷ کتاب الکراہیۃ ، الباب الرابع عشر) لہ

مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا

سوال :۔ کیا مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس لیے نہیں کہ مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ اسلیئے نہیں کہ یہ عبادت گاہیں شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہیں ۔

کما فی الھندیۃ : یکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ وانما یکرہ من حیث انہٗ مجمع الشیاطین لامن حیث انہٗ لیس لہٗ حق الدخول ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص۳۴۶ کتاب الکراہیۃ ۔ الباب الرابع عشر) ۲لہ

قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم

سوال :۔ مسلمانوں کے لیے قادیانیوں کے ساتھ لین دین یعنی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگرچہ غیر مسلموں سے دنیاوی معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بسا اوقات ان کے کفریہ عقائد مخفی رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ مرتدین کے حکم میں ہو کر ان سے کسی قسم کی تجارت کرنا جائز نہیں ۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغیناقیؒ : ویزیل ملک المرتد عن اموالہ بردتہٖ

لہ قال الامام ابن البزاز الکردریؒ : وان اجابۃ الدعوۃ ولو لاھل الذمۃ سنۃ ۔

(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۳۳ السادس فی التشبیہ)

۲لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ ۔

(رد المحتار ج ۶ ص۳۸۷ کتاب الحظر والاباحۃ ۔ فصل فی البیع)

زوالا مراعی فان اسلم عادت الی حالہا۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۰۱ کتاب السیر) [1]

مُرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا

سوال:۔ جو شخص اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے تو اس سے دوستی اور محبت رکھنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وہ شخص جو دینِ اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے مرتد ہے، اس سے تعلقات اور میل جول رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا مصافحہ کرنا، ملنا جلنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا، رشتۂ عقد و مناکحت قائم کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

کما قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا...... وتکشف شبہتہ ویحبس وجوبا ثلاثۃ ایام فان اسلم فبہا والاقتل لحدیث من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب العشر والخراج والجزیۃ) [2]

قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا

سوال:۔ اگر کوئی قادیانی مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں وغیرہ دے تو کیا ان اینٹوں کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی چونکہ مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مُرتد کے حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے تصرفات موقوف ہوتے ہیں، اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے اس کے تصرفات صحیح ہو جائیں گے اور اگر وہ حالتِ ارتداد

---

[1] قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: ویزیل ملک المرتد عن مالہ زوالاموقوفاً فان اسلم عاد ملکہ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۱۲ کتاب الجہاد۔احکام المرتدین۔

[2] وقال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبہتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم والاقتل۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۲ ص۲۵۳ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیۃ۔

میں ہی مر جائے یا قتل کر دیا جائے یا دارالحرب چلا جائے تو حالتِ ارتداد کے تصرفات باطل ہو جائیں گے۔ لہٰذا کسی بھی قادیانی مُرتد کی طرف سے دی ہوئی اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی سامان مسجد میں لگانا جائز نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: وما باعه او اشتراه او اعتقه او وهبه او رهنه او تصرف فيه من امواله في حال ردته فهو موقوف فان اسلم صحت عقوده وان مات اوقتل اولحق بدارالحرب بطلت۔

(الهداية ج۲ ص۶۰۳ كتاب الجهاد ، باب المرتد) [1]

قادیانی کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:- میرے رشتہ داروں میں ایک شخص قادیانی ہے، اس کے مرنے کے بعد میرے لیے اس کے جنازہ میں شرکت کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قادیانی مُرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اس بناء پر ان میں سے کسی کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہی قادیانیوں کے مذہب کے مطابق موت کی رسومات میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے، اور اگر ایسے رشتہ دار کی تدفین کے لیے اس کا ہم مذہب کوئی آدمی نہ ہو تو تدفین کے شرعی طریقہ سے ہٹ کر صرف زمین میں گڑھا کھود کر اسے دفن کیا جائے گا۔

كما قال العلامة علاؤالدين الحصكفي رحمه الله: اما المرتد فيلقى في حفرة كالكلب۔

(الدر المختار على هامش ردالمحتار ج۱ ص۶۵۲ باب صلوٰة الجنازة) [1]

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: وتوقف مبايعته وعتقه وهبته فان آمن نفذ وان هلك بطل بيان لتصرف حال ردته بعد بيان حكم املاكه قبل ردته

(البحرالرائق ج۵ ص۱۳۳ باب احكام المرتدين)

وَمِثْلُهٗ في فتح القدير ج۵ ص۳۲۰ باب احكام المرتدين۔

[2] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: اما المرتد فلا يغسل ولا يكفن وانما يلقى في حفيرة كالكلب ولا يدفع الى من انتقل الى دينهم۔ (البحرالرائق ج۲ ص۱۹۱ كتاب الجنائز۔ فصل السلطان احق بصلوٰته)

وَمِثْلُهٗ في الخانية على هامش الهندية ج۱ ص۱۹۵ كتاب الجنائز۔

قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا حکم

سوال:- قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی ضروریاتِ دین سے انکار کی بناء پر کافر اور مرتد ہیں اُن کو اہلِ اسلام کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔

کما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرة کالکلب ولا یدفع الی من انتقل الی دینهم۔
(البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل فی السلطان احق بصلاته)[1]

قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا

سوال:- اگر کوئی شخص قادیانی ہو اور اس کا بیٹا مسلمان ہو تو بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد باپ اس کے مال میں میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی اور مسلمان ایک دوسرے کی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے مذکورہ بالا صورت میں قادیانی مرتد کی میراث بیت المال میں داخل کی جائے گی، اسی طرح کوئی قادیانی کسی مسلمان کی میراث میں حقدار نہیں بن سکتا بلکہ مسلمان کی میراث اس کے مسلمان ورثاء میں قاعدہ شرعی کے مطابق تقسیم ہو گی۔

لما قال الشیخ سراج الدین السجاوندیؒ: واما المرتد فلا یرث من احدٍ لا من مسلم ولا من مرتد مثله۔ (السراجی ص۷۵ فصل فی المرتد)[2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: اما المرتد فیلقی فی حفرة کالکلب۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۱ ص۶۵۷ باب صلوٰة الجنازة)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۲ ص۹۴ کتاب الجنائز۔

[2] قال فی الهندیة: المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثله کذا فی المحیط۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اهل الکفر)
وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج ۳ ص۵۸۰ کتاب الفرائض۔

مرتد کی میراث کا حکم | **سوال** :- اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے تو اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کو ملے گا یا مرتد ورثاء کو، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو پھر ترکہ کس کو ملے گا؟

الجواب :- اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے یا قتل ہوجائے تو حالتِ اسلام کا کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد میں کمایا ہوا مال مالِ فئے میں شمار ہوکر بیت المال میں داخل کیا جائے گا، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو حالتِ اسلام میں کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد کا کمایا ہوا مال مرتد ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وان مات او قتل على ردته انتقل ما اكتسبه في اسلامه الى ورثته المسلمين وكان ما اكتسبه في حال ردته فيئا۔ (الهداية ج۲ ص۶۰۱ باب احكام المرتد)[1]

مرزائی کی دعوتِ طعام قبول کرنا | **سوال** :- ہمارے محلے میں چند مرزائی رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی کسی خوشی کے موقعہ پر دعوت کرتے ہیں اور اس میں ہم مسلمانوں کو بھی بلاتے ہیں، کیا مرزائیوں کی دعوت کو قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- مرزائی مرتد ہوکر واجب القتل ہیں، اس لیے مرتد سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا یا اس کے ہاں دعوت کھانا جائز نہیں۔

لما قال شيخ الاسلام حافظ الدين النسفي رحمه الله: يعرض الاسلام على المرتد وتكشف شبهته ويحبس ثلاثة ايام فان اسلم والا قتل۔ (كنز الدقائق على هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احكام المرتدين)[2]

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله وابن عابدين رحمه الله: وان مات او قتل على ردته او حكم بلحاقه ورث كسب اسلامه وارثه المسلم ولو زوجته بشرط العدة (زيلعي) بعد قضاء دين اسلامه وكسب ردته في بعد قضاء دين ردته الخ اما ما اكتسبه في دار الحرب فهو لبنته الذي ارتد ولحق معه اذا مات مرتدا لانه اكتسبه وهو من اهل الحرب وهم يتوارثون فيما بينهم۔ (الدر المختار ورد المحتار ج۳ ص۳۲۸، ۳۲۹ باب المرتد)

ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰، ۱۳۱ باب احكام المرتدين۔

[2] قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشي رحمه الله: ومن ارتد عرض الحاكم عليه الاسلام استحبابا ...... وتكشف شبهته ...... ويحبس وجوبا ثلاثة ايام فان اسلم فبها والا قتل لحديث من بدل دينه فاقتلوه۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد)

ومثله في الهندية ج۲ ص۲۵۳ الباب التاسع في الجزية۔

شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم

سوال:۔ جو شخص حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو، حضرت جبرئیل کی غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا قائل ہونے کے علاوہ امام مہدی کے خروج تک تمام اسلامی احکام کو معطل سمجھتا ہو ایسے شخص کا حکم کیا ہے، کیا ایسے شخص کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو شخص الوہیتِ علیؓ کا عقیدہ رکھتا ہو اور حضرتِ جبرائیلؑ کو غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا معتقد ہو اور تمام اسلامی احکام کو خروجِ امام تک معطل سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور ایسے شخص کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

کما فی الھندیۃ: ویجب اکفار الروافض فی قولھم برجعۃ الاموات الی الدنیا وبتناسخ الارواح وبانتقال روح الالٰہ الی الائمۃ وبقولھم فی خروج امام باطن وبتعطیلھم الامر والنھی الیٰ ان یخرج الامام الباطن وبقولھم ان جبرائیلؑ غلط فی الوحی الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم دون علی بن ابی طالبؓ وھٰؤلاء القوم خارجون عن ملۃ الاسلام واحکامھم احکام المرتدین۔ کذا فی الظھیریۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۲۶۴ کتاب السیر، الباب التاسع)

اور مرتد کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا مذبوحہ کھانا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویزیل ملک المرتد عن اموالہ بردتہ زوالا مراعی فان اسلم عادت الیٰ حالھا..... وباطل بالاتفاق کالنکاح والذبیحۃ لانہ یعتمد الملۃ ولاملۃ لہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۰۲ تا ۶۰۳ باب احکام المرتد، کتاب الجھاد) [1]

---

[1] وقال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ویجب اکفار الروافض فی قولھم یرجع الاموات الی الدنیا وبانتقال الاموات وتناسخ الارواح وانتقال روح الالٰہ الی الائمۃ وان الائمۃ الھۃ وقولھم فی خروج امام باطن وبتعطیلھم الأمر والنھی الیٰ ان یخرج الامام الباطن ..... وھٰؤلاء القوم خارجون عن ملۃ الاسلام واحکامھم احکام المرتدین۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۵۳۸ کتاب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۴ ص۳۱۸ کتاب الفاظ تکون اسلامًا او کفرًا الخ

شیعہ کا مال جبراً لینے کا حکم | **سوال:** شیعوں کے اموال جبراً یا چوری کر کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ شیعہ کے بعض فرقے غیر مسلموں کے حکم میں ہیں لیکن حربی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اموال محفوظ رہیں گے، ان کے اموال کی چوری کرنا یا جبراً لینا جائز ہے یا نہیں؟

قال العلامة الحصکفیؒ: اذا صار ذمیا یجری القصاص بینہ وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمرة وخنزیرہ اذا تلفہ وتجب الدیة علیہ اذا قتلہ خطاء ویجب کف الاذی عنہ۔ وقال ابن عابدینؒ: قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان ہو ومامعہ فیأ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المختار ج ۳ ص۲۷۲ باب المستأمن کتاب الجھاد)[1]

شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا | **سوال:** جو شیعہ ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا اہل سنت والجماعت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شیعوں میں سے جو شخص ضروریاتِ دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں البتہ جس کے عقائد کفریہ نہ ہوں اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الھندیة: ولو قذف عائشة رضی اللہ عنھا بالزنی کفر باللہ .... من انکر امامة ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فھو کافر۔

(الفتاوی الھندیة ج۲ ص۲۶۴ کتاب السیر الباب التاسع فی احکام المرتدین)[2]

---

[1] وفی الھندیة: وتثبت احکام الذمی فی حقہ من منع الخروج الی دار الحرب وجریان القصاص بینہ وبین المسلم وضمان المسلم قیمة خمرہ وخنزیرہ اذا تلفہ ووجوب الدیة اذا قتل خطاء ووجوب کف الاذی عنہ۔

(الفتاوی الھندیة ج۲ ص۲۳۵ کتاب السیر الباب الثامن فی المستأمن)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۷۱ کتاب السیر۔ باب احکام المرتد۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبقذف عائشة رضی اللہ عنھا من نسائہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط وبانکارہ صحبة ابی بکر رضی اللہ عنہ الخ

(البحر الرائق ج۵ ص۱۲۱ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۳ ص۳۲۱ کتاب الجھاد، باب احکام المرتد۔

مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی | **سوال:۔** مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے میراث لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اختلافِ دین و عقیدہ مانع ارث ہے، اس لیے کافر مسلمان کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی مسلمان کو کافر کی میراث دی جاسکتی ہے۔

لما قال شیخ الاسلام محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ : وموانعہ الرق والقتل واختلاف الدین ۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج۵ ص۵۴۲ کتاب الفرائض)[1]

کفار کے لیے دعائیں کرنا | **سوال:۔** اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دعا کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اے اللہ مسلمانوں پر رحم فرما اور کفار کو نیست و نابود فرما۔ تو کیا اس قسم کی دعائیں کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کی دعاؤں کی صحت میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ مسلمانوں کی طرح کفار بھی رحم کے مستحق ہیں ان کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیئے۔ ہمارے اکابرین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے وہ اپنی دعاؤں میں کفار کے لیے بھی رحم کی دعا کیا کرتے تھے۔

وذکر العلامۃ مسلم بن الحجاج القشیریؒ : عن ابی کثیر قال حدثنی ابو ھریرۃ قال کنت ادعو امی الی الاسلام وھی مشرکۃ فدعوتھا یوما فاسمعتنی فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اکرہ فاتیت رسول اللہ علیہ وسلم وانا ابکی قلت یا رسول اللہ انی کنت ادعوا امی الی الاسلام فتابی علیّ فدعوتھا الیوم فاسمعتنی فیك ما اکرہ فادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللھم اھد ام ابی ھریرۃ ۔۔۔الخ (الجامع الصحیح المسلم ج۲ ص۳۰۱ کتاب الفضائل، باب فضائل ابی ھریرۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ : المانع من الارث اربعۃ الرق والقتل ۔۔۔۔۔ واختلاف الدین ۔ (السراجی ص۵ فصل فی موانع الارث) و مثلہ فی البحر الرائق ج۸ ص۴۸۳ کتاب الفرائض ۔

[2] وذکر العلامۃ ابو عیسی الترمذیؒ : عن جابر قالوا یا رسول اللہ احرقتنا نبال ثقیف فادع اللہ علیھم فقال اللھم اھد ثقیفا ۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۲۳۱ ابواب المناقب ۔ باب فی ثقیف وحنیفۃ)

غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل ڈائریکٹر کرسچین ہسپتال ٹیکسلا نے اس بات کے پیش نظر کہ دیر کے غریب عوام علاج معالجہ کے لیے اُن کے قائم کردہ کرسچین ہسپتال ٹیکسلا میں آرہے ہیں، دیر ہی کے ایک گاؤں اخگرام میں ایک ہسپتال بنانے کی منظوری دی ہے اور وہاں پر بائندہ خیل قبیلے کے ایک جرگے نے ۳۲ ایکڑ مشترکہ زمین اس ہسپتال کی تعمیر کے لیے دی ہے۔ جبکہ مقامی طور پر کچھ لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ ہسپتال کی آڑ میں عیسائیت پھیلانے کے لیے تبلیغ کریں گے، پمفلٹ تقسیم کریں گے، مریضوں اور اُن کے تیمارداروں کو عیسائیت کی دعوت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خدشات جب مجوزہ ہسپتال کی انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ لوگ جو شرط لگانا چاہتے ہیں لگا لیں ہم ان کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مذکورہ کے سامنے چند شرائط پیش کی گئیں جو کہ اس نے تسلیم کرلیں اور سرکاری سٹامپ پیپر پر بیان حلفی کی صورت میں لکھ کر سٹیمپ (مُہر) لگا کر دستخط کر دیئے ہیں، یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں :-

۱- اخگرام ہسپتال میں کوئی مسیحی تبلیغ نہ ہوگی۔
۲- مذکورہ ہسپتال میں کوئی مسیحی لٹریچر تقسیم نہ ہوگا۔
۳- اخگرام ہسپتال میں کوئی گرجا گھر تعمیر نہ ہوگا۔
۴- اخگرام ہسپتال میں کوئی صلیب کا نشان نہیں لگایا جائے گا۔
۵- ہسپتال کے بیت الخلاء اسلامی اقدار کے مطابق شمالاً جنوباً بنائے جائیں گے۔
۶- اخگرام ہسپتال کا نام مسیحی نام سے مبرّا ہوگا۔
۷- سٹیشنری پر کسی قسم کی بائیبل مقدس کی آیات طبع نہ ہوں گی۔
۸- اخگرام ہسپتال کی بلڈنگ سادہ اور مضبوط بنائی جائے گی جو کسی بھی سرکاری ہسپتال کی بلڈنگ سے اچھی ہوگی۔
۹- یہ ہسپتال خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرے گا نیز ہسپتال میں جو کوئی مریض آئے گا اس کا علاج کم خرچ اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر کیا جائے گا۔
۱۰- ہسپتال کے احاطے کے اندر ایک طرف مسجد کے لیے جگہ مخصوص کی جائے گی لیکن

مریضوں کی تکلیف کے پیشِ نظر لاؤڈ سپیکر لگانے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل جو کہ عیسائی ہے، کے تعاون سے اس ہسپتال کی تعمیر شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق کرسچئین ہسپتال بنانے والوں نے جرگے کی طرف سے مقرر کردہ جن شرائط کی ہر لحاظ سے پابندی کرنے کا معاہدہ کیا ہے اُن تمام شرائط کا لحاظ اور پابندی کرنے کی صورت میں اس ادارہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ہسپتال بنانا جائز ہے، اگر ہسپتال بنانے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو اس کے بند کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اصولاً تعلیم، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر دُنیاوی امور و معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ اسلام اور اسلامی اقدار اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام کہ ایک اسلامی ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کسی کافر ملک کی امداد و تعاون کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ ملک خالص اسلامی ہے، اس میں کلی طور پر اسلامی قوانین رائج ہیں اور کافر ملک صرف اسلامی قوانین جاری کرنے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا ہے اور اس پر ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بے بنیاد اور من گھڑت الزامات لگا رہا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے مطلع فرمائیں؟

الجواب:۔ کسی مسلمان ملک کے خلاف کسی بھی کافر ملک سے محض دنیاوی مفادات کی خاطر تعاون کرنا یا اس کا آلۂ کار بننا شرعی نقطۂ نظر سے حرام و ناجائز ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کا سربراہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا اور ایسی لادین قیادت کو ختم کر کے صالح اور دیندار شخص کو حاکم مقرر کرنا مسلمان رعایا پر لازم اور ضروری ہے، اسلیے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ تو خود اس پر ظلم کرے گا اور نہ بے بنیاد الزامات کی بنا پر اسے کسی کافر کے حوالے کرنے کا شرعاً مجاز ہے۔

لقولہ علیہ السلام: المؤمن اخو المؤمن لا یظلمہ ویسلمہ۔ (الحدیث)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

امریکہ سی ٹی بی ٹی (CTBT) یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع معاہدہ کے نام سے پاکستان کو اس معاہدہ پر دستخط کرا کے پابند بنانا چاہتا ہے جس سے بظاہر پاکستان کو حاصل ایٹمی توانائی کے استعمال یا اس کی مزید ترقی کو روکنا مقصود ہے۔ کیا شرعاً کسی مسلمان ملک کے حکمرانوں کو اپنی جہادی قوت، آلات و وسائل اور حربی تکنیک کو کفار کے دباؤ یا کسی لالچ کے نتیجے میں اسے محدود اور معطل یا منجمد و مفلوج کرنے کی اجازت ہے؟ اس مسئلہ کی از روئے قرآن و سنت شرعی حیثیت واضح کرنے کے لیے ملک اور عالمِ اسلام کے معروف، معتمد اور ممتاز دینی ادارہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء نے مدلل روشنی ڈالی ہے جو اعیانِ حکومت، ممبران پارلیمنٹ، سیاستدانوں، سائنسدانوں، فوجی اداروں، علماء، دانشوروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے غور و فکر کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی خدمت کو ملک و ملت کے بہتر مستقبل اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

(مولانا) سمیع الحق
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ
۱۰ ستمبر ۱۹۹۸ء

استفتاء

سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی یعنی ایٹمی پروگرام، اس کی توسیع اور ٹیسٹ پر پابندی کا جامع معاہدہ

مملکتِ اسلامیہ پاکستان جو کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمرہ ہے، اس کی تقسیم کا مقصد ہی یہاں پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کا قیام تھا، الحمدللہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور اس نے عالمِ اسلام کے لیے ہر دور میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہود و ہنود اور مغربی ممالک پاکستان کے قیام کے روزِ اوّل ہی سے اس کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مختلف سازشوں سے اس کو آئے دن کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان کے قیام کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئی، اس کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جنگیں ہوئیں اور ہمارے خلاف بدترین جارحیت کی گئی۔ اب جبکہ مقبوضہ کشمیر میں تحریکِ آزادی کے مجاہدین ہندوؤں کے خلاف جہاد میں سرگرمِ عمل ہیں اور پاکستان نے بھی ہر سطح پر خصوصاً بین الاقوامی فورم میں مسئلہ کشمیر اجاگر کیا ہے۔ تو ہندوستان نے تحریکِ آزادی کشمیر کو ختم کرنے اور پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کئے، یہ دھماکے ہندوستان میں واجپائی حکومت نے کئے جس کا بنیادی منشور ہی اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی ہے، یاد رہے کہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو یہ حق مکمل طور پر حاصل تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لئے قرآنی نص کے مطابق ہر ممکن صلاحیت خواہ وہ عسکری ہو یا حربی، حاصل کرے اور ہر لحاظ سے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ - (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

اس وقت حکومتِ پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام یہود و ہنود کے مکروہ عزائم کو بھانپتے ہوئے شروع کیا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنے ذرائع و وسائل اور حیثیت سے بڑھ کر ملک و ملت اور قابلِ فخر سائنسدانوں نے طویل اور صبر آزما ایثار کا مظاہرہ کیا اور اس پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور بمشکل تمام اس کو عالمِ کفر کی خونخوار نظروں سے بچائے رکھا، گویا پوری قوم نے خونِ جگر سے اس پروگرام کی آبیاری کی اور اپنے ملک و ملت و عالمِ اسلام کو ایک نا قابلِ تسخیر ایٹمی قوت بنا کر عالمِ کفر اور بھارت کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا جس سے تمام پاکستانی قوم اور پورے عالمِ اسلام کا سر فخر سے بلند ہوا، قوم کو نئی راہ اور نئی سمت مل گئی اور ہم جو اکیسویں صدی میں عالمِ اسلام اور پاکستان کو ایٹمی قوت کی حیثیت سے (جو کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری طاقت کی معراج سمجھی جاتی ہے) داخل ہو رہے ہیں تو موجودہ حکومت جس نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخطوں کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جو ہمارے قومی و فوجی دفاع کی شہ رگ کو کاٹنے کے مترادف ہے حکومت اس معاہدہ (TBT) پر دستخط کر کے ہمیں ایک بے غیرت، بے حمیت، بزدل اور رسوا اگر قوم بنانا چاہتی ہے اور معاہدے کے بعد ہمیں ہندوستان و اسرائیل کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے بے دست و پا پھینکنے کی کوشش کر رہی ہے خاص کر ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان جس کو ایٹمی پروگرام کو منجمد کرنے کے جامع معاہدے پر دستخط کرنے میں اب تک انکار و تردد ہے اور اگر اس نے دستخط کر بھی دیئے تو اس کی فوجی اور دفاعی ساز و سامان کی صلاحیت، جنگی ٹیکنالوجی اور افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے جس کا مقابلہ ہماری ایٹمی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ خود یہود و نصاریٰ اور عالمی کفر و استعمار کے پانچ بدمعاشوں اور دہشت گردوں نے بھی ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ان کا کوئی ارادہ ہے۔ اس معاہدے پر دستخط کر دینے کے بعد پاکستان اور عالمِ اسلام کا نا قابلِ تصور نقصان ہوگا، چند نقصانات درج ذیل ہیں:-

(۱) کشمیر کی تحریکِ آزادی پر ہر لحاظ سے براہِ راست بُرا اثر پڑے گا۔

(۲) ہندوستان اور عالمِ کفر کے ایٹمی پروگرام زور بر و ترجاری و ساری اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے اور اس کے برعکس ہمارا ایٹمی پروگرام اس معاہدہ کی پابندی کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) بھارت کے مقابلے میں ہماری پوزیشن عسکری، حربی اور سیاسی لحاظ سے کمزور تر ہو جائے گی۔

(۴) معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد عالم کفر کی طرف سے ہم سے نت نئے مطالبات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا مشاہدہ ہم عراق، لیبیا وغیرہ ملکوں میں کر رہے ہیں۔

(۵) ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد عالم اسلام خصوصاً عالم عرب کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا تھا اور اسرائیل اور دوسری استعماری کفری طاقتیں مرعوب ہو گئی تھیں، معاہدے کے بعد ہماری حیثیت محض ایک سوداگر قوم کی سی ہو جائے گی۔

(۶) اگر مستقبل میں عالم اسلام اور عالم کفر کے درمیان کوئی بڑی جنگ شروع ہوئی (جس کی ابتداء امریکہ عراق، لیبیا، سوڈان اور افغانستان سے کر چکا ہے) تو اس میں پاکستان اس معاہدے کے بعد کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۷) اس کے نتیجے میں عالم اسلام اور دوسرے مقامات میں جہادی قوتوں کو شدید دھچکا لگے گا اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

(۸) پاکستان عالم اسلام کو کبھی بھی ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کر سکے گا۔

اس خطرناک صورتحال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء کرام و مفتیان دینِ متین کیا فرماتے ہیں کہ :-

(ا) ملک و ملت کے ان عظیم نقصانات جو کہ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یقینی اور حتمی ہیں کیا موجودہ حکومت کو اس بات کا حق اور اختیار پہنچتا ہے کہ وہ ایک ارب مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے برعکس ذلت و رسوائی کے اس محضر نامے اور اپنی موت و قتل کے پروانے پر دستخط کر دے؟ (اور اس کے صلے میں ہمیں جو موہوم امداد بلکہ خیرات اور بھیک ملے گی کیا وہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی جیبوں میں نہیں جائے گی؟) ان نقصانات اور خطرناک حقائق کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کرنے کیلئے مہم چلانا یا اس کی حمایت کرنا اور اس پر دستخط کرنا دین و شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے جائز ہے یا ناجائز؟

(ب) اور وہ لوگ جو اس پر دستخط کرتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں یا اس پر دستخط کے لیے مہم چلاتے ہیں خواہ وہ حزب اقتدار سے ہوں یا حزب اختلاف سے، سیاستدان ہوں یا بیوروکریٹس اور حکومتی مشنری، ان کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اور آیا یہ لوگ ملک وملت اور اپنے حلف سے انحراف کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

اعداد آلاتِ حرب قرآن کریم کی روشنی میں

اعداد (تیاری) آلاتِ جہاد کے متعلق اللہ تعالے کا ارشاد ہے، وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کے راستے میں وہ پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا" (ترجمہ از معارف القرآن) اس کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذه الآية تدل على ان الاستعداد للجهاد بالنبل والسلاح وتعليم الفروسية فريضة" (تفسیر کبیر ج ۱۵ ص ۱۸۵ سورۃ الانفال) (یہ آیت کریمہ جہاد کے لیے تیاری اسلحہ، تیراندازی اور شہسواری کی تعلیم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اسی آیت کے ضمن میں فوائد عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

—— "مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامانِ جہاد فراہم کریں، نبی اکرم کے عہدِ مبارک میں گھوڑوں کی سواری، شمشیر زنی اور تیراندازی کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب جہاد ہے اسی طرح آئندہ جو اسلحہ وآلاتِ حرب وضرب تیار ہوں وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں"۔ (تفسیر عثمانی ص ۲۴۲ سورۃ الانفال)

لہٰذا اس آیت کے عموم میں موجودہ وقت میں جو آلاتِ حرب وضرب اور سائنس وٹیکنالوجی کی بدولت جو بم اور میزائل وغیرہ تیار کئے گئے ہیں مثلاً کروز میزائل، سکڈ میزائل، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار، یہ تمام مااستطعتم کے عموم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس کاندہلوی اپنی تفسیر معارف القرآن جلد ۳ ص ۲۵۵ سورۃ الانفال پر لکھتے ہیں: لہٰذا اس آیت کی رو سے

مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور اس کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کئے ہیں ہم مسلمانوں پر بھی اسی قسم کے بلکہ ان سے بھی زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر اور شرک کا مقابلہ کرسکیں۔

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال

اسی طرح احادیث کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعداد آلاتِ حرب کی تاکید اور ترغیب فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على المنبر يقول واعدوا لهم ما استطعتم من قوة الا ان القوة الرمى الا ان القوة الرمى الا ان القوة الرمى" (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمى والحث عليه - كتاب الجهاد)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس حال میں کہ آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: اور تیار کرو کافروں کے ساتھ جنگ کے واسطے وہ چیزیں جو تم قوت سے کرسکو، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیراندازی ہے۔"

اس حدیث کی تفسیر میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

ومعنى قوله الا ان القوة الرمى انه من معظم ما يجب اعداده للقوة على قتال العدو ولم ينف به ان يكون غيره من القوة بل عموم اللفظ شامل لجميع ما يستعان به على على العدو ومن سائر انواع السلاح وآلات الحرب۔ (احكام القرآن جلد ۲ ص ۸۵ سورة الانفال)

دوسری روایت ہے: عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله يقول ان الله يدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة صانعه يحتسب فى صنعته الخير والرامى به ومنبله۔

(رواه ابوداؤد بذل المجهود ج ۱۱ ص ۴۲۸ كتاب الجهاد - باب الرمى)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، اس کا بنانے والا جس کے بنانے سے اس کی نیت خیر کی ہو، اور اس کا پھینکنے والا، تیسرا تیر دینے والا تیرانداز کے ہاتھ میں۔"

اس حدیث کے متعلق شارح ابوداؤد مولانا خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں :۔

ولم یکون فی زمن رسول اللہ الا رمی السھام فیدخل بل یعوض عنہ فیہ مایرمی به من الرصاص بالبند وقیه والمدافع وغیر ذلك من آلات الحرب الجدیدة فی هذا الزمان فانها اغنت عن رمی السهام بالقوس وعطلته۔ (بذل المجهود جلد ۱۱ ص ۳۲۸ باب فی الرمی کتاب الجہاد)

فقہائے کرام میں فقہ حنفی کی مشہور و معروف شخصیت علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

یندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه بالاظافیر وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارز۔ فالحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۶ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) "یعنی دار الحرب میں مجاہد کے لیے ناخن بڑھانا باوجودیکہ ناخنوں کا کٹوانا ایک فطری امر ہے، مندوب اور مستحب ہے کیونکہ دورانِ جنگ وجہاد اگر اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور دشمن اس کے بالکل قریب ہو تو ناخنوں کے ذریعہ بھی وہ اپنے دشمن کو دفع کر سکتا ہے، اور اس کی نظیر مونچھوں کو ترشوانا ہے کیونکہ یہ سنت ہے، پھر غازی کے لیے دار الحرب میں مونچھوں کا بڑھانا مستحب ہے تاکہ اس سے اُس کے مقابل دشمن پر رُعب اور دھاک بیٹھ جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کہ مجاہد وغازی کے لیے جہاد میں ممد ومعاون ثابت ہو تو وہ مندوب اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کا وقار اور مشرکین کی تذلیل وتوہین ہے۔"

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا اسلحہ اور جنگی ساز وسامان دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا فرض اور ضروری ہے تاکہ جہاد کے وقت ان کی توجہ اسلحہ کی تیاری پر نہ ہو۔

آلاتِ حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں

جس مسلمان ملک کے پاس یہ آلاتِ حرب (اور وہ بھی جدید ترین شکل میں) ہوں، ان آلات کو ضائع کرنے یا استعمال میں نہ لانے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: عن عقبة بن عامر قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من علم الرمی ثم ترکه فلیس منا او قد عصی۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث۔ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) "حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آپؐ نے فرمایا کہ جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ گنہگار رہوا۔"

مندرجہ بالا حدیث کے ذیل میں شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔
"ھٰذا التشدید عظیم فی نسیان الرمی" بعد علمہ ومکروہ کراھۃ شدیدۃ من ترکہ بلا عذر۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فصل الرمی والحث۔ کتاب الجہاد)

اور اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :" جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں، گویا اُس نے اس میں کوئی نقص دیکھا اور اس کے ساتھ استہزاء کیا اور یہ صورتیں کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتی ہیں، شراح حدیث نے اس نعمت کو نعمتِ خطیرہ سے تعبیر کیا ہے۔" (مرقاۃ ج ۷ ص ۳۱۴ باب اعداد آلۃ الجہاد)

اور یہی حدیث ایک اور روایت میں یوں بیان کی گئی ہے "من تعلم الرمی ثم نسیہ فھی نعمۃ جحدھا۔" (مجموعۃ الفتاوٰی لابن تیمیۃ ج ۲۸ ص ۹ الجہاد)

مختصراً ان احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اعداد آلات حرب مسلمانوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح فن عسکری کو سیکھ کر اس کو ترک کرنا، اسے بھول جانا انتہائی لائق ملامت امر ہے جس کی طرف امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے بصراحت تنبیہ کی ہے۔ موجودہ حالات اور زمانے کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک مسلمان ملک کے پاس جو قوت اور طاقت ہو جس سے دشمنانِ اسلام مرعوب ہوتے ہوں اُس طاقت اور قوت کو ختم کرنا یا اس کو استعمال میں نہ لانا یا اس کو منجمد کرنا اسی وعید کے ضمن میں آتے ہیں ۔

علامہ برہان الدین المرغینانیؒ نے حرمت اکل لحم فرس (یعنی گھوڑے کے گوشت کی حرمت) کی ایک علت یہ بھی لکھی ہے کہ: "ویکرہ لحم الفرس عند ابی حنیفۃؒ .... ولانہ آلۃ ارھاب العدو فیکرہ اکلہ احتراماً لہ ولھذا یضرب لہ بسھم فی الغنیمۃ ولانہ فی اباحتہ تقلیل آلۃ الجہاد۔" (الہدایۃ علی صدر فتح القدیر ج ۸ ص ۴۲۰، ۴۲۱ کتاب الجہاد)
یعنی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے (اس کی ایک علت یہ ہے کہ دشمن کے ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے کا آلہ ہے اس لیے اس کے احترام کی وجہ سے اس کا کھانا مکروہ (تحریمی) ہے اور اسی احترام وعظمت کی بناء پر مالِ غنیمت میں گھوڑے کا مستقل حصہ ہے۔ (اور دوسری علت یہ ہے) کہ اس کی اباحت کی صورت میں آلۂ جہاد کی

تقلیل ہوتی ہے۔"

کفار اور غیر مسلموں کے دباؤ میں آکر ایٹمی صلاحیت اور عسکری قوت کو منجمد یا اس میں تخفیف کرنے کے متعلق کسی بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے کے بارے میں ان نصوصِ قطعیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:-

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ (سورۃ الفرقان آیت ۵۲)

(ترجمہ) "سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کے ساتھ بڑے زور کا۔"

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں: وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (سورۃ ہود ۱۱۳)

(ترجمہ) "اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تم کو لگے گی آگ۔"

ایک اور فرمانِ ربانی ہے کہ: وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲)

(ترجمہ) "کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی۔"

ان نصوص میں تدبر کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری شد ومد کے ساتھ مسلمانوں کو ہر وقت کفار کے مقابلے میں تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور کفار کی طرف معمولی میلان کو بھی موجب دخولِ نار ٹھہرایا ہے۔ اب اگر ہمارے مسلم حکمران یہود وہنود اور نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اس رسوائے زمانہ معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ ربانیہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہو اس کی پابندی ضروری نہیں

اگر تخفیفِ اسلحہ کے متعلق کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہو اور اس کا کنٹرول بھی کفار کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس صورت میں مسلمان اس معاہدہ کے پابند ہیں؟ سو اس بارے میں سب سے پہلے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل آیات سامنے آتی ہیں: (۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام۔" (۲) وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۔ (سورۃ الانفال آیت ۵۸)۔ (ترجمہ) "اور اگر تم کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دو ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز"۔ یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ان کا عہد ان کی طرف اسی صورت میں واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۲۶۹ سورۃ الانفال)

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۵۱، ۵۲) ـــ (ترجمہ) "اے ایمان والو! مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست، وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہیں میں ہے، اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔ اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی، سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی امر اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے"۔

علامہ ابو بکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ: "ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اذلال سے منع فرمایا اور ان کی اہانت اور اذلال کا حکم فرمایا اور اُن سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۳)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے اور اس سلسلے میں تعاون کرنے کی صورت میں جو لوگ کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کا جو مظاہرہ کرتے ہیں اُن کا حشر کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ اس معاہدہ پر دستخط کی صورت میں عقل و ہوش سے کام لے اور اس انجام بد سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیز سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے حامیوں کا یہ کہنا کہ دستخط نہ کرنے کی صورت میں بہ

یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اس کو ان آیات میں عذرِ لنگ قرار دیا گیا ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کے اس معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفار کی طرف سے امداد کے وعدے

کی صورت میں کفار کی طرف سے مالی امداد و تحفظات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے برعکس اعداد آلاتِ حرب کے متعلق جو آیتِ کریمہ ہم نے ذکر کی ہے کہ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" تو اس آیت کے آخر میں فرمانِ ربانی ہے: "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ" اس میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جہادی سامان پر جتنا بھی خرچ کریں گے اس کے متعلق خدائی وعدہ ہے کہ "یوف الیکم" یعنی وہ خرچ تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا دیا جائے گا بغیر کسی کمی کے۔ گویا یہ آیتِ کریمہ تصریح ہے اس بات پر کہ اگر اعداد آلاتِ حرب پر آپ کا کچھ خرچ ہوا ہو اور ضرور ہوتا ہے تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اب اقتصادی پابندیوں کے خوف سے سی ٹی بی ٹی یا این پی ٹی پر دستخط کرنا گویا اللہ کے وعدے سے انحراف ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی عزت و وقار کو مجروح کر کے کفار سے استعانت لینا صحیح نہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

(۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ (آل عمران ۱۱۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وفی هذه الآية دلالة علی انه لا تجوز الاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمین من العمالات والكتبة۔" (احکام القرآن جلد ۲ ص ۴۴ سورۃ آلِ عمران)

اسی آیت یعنی لا تتخذوا بطانة میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہلِ ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح دوسری آیت کریمہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۱) میں بھی اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ "ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے

اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اسی میں ان کی عزت اور برتری ہے"۔ (احکام القرآن جلد۳ ص۱۲۳ سورۃ النساء)

ارشادِ ربّانی ہے: الّذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ایبتغون عندھم العزّۃ فان العزّۃ للّٰہ جمیعًا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۳۹)۔ (ترجمہ "جو لوگ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں کیا وہ ان کے ذریعے قوت وعزت چاہتے ہیں (وہ یاد رکھیں کہ) قوت وعزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے، یعنی قوت وعزت اللہ تعالےٰ کے قوانین میں عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے"۔

مندرجہ بالا تصریحات اور نصوص کی رُو سے کفار سے امداد طلب کرنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس خاطر سے کہ اس میں ہماری عزت ہے بالکل صحیح نہیں، اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ممالک نے جن کافر ملکوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کئے ہیں انہوں نے ایفائے عہد کا خیال نہیں رکھا، پاکستان اور عربوں کے کافروں کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہمارے سامنے ہیں جن سوائے خسارے کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

علامہ ابوبکر الجصاص رازیؒ مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: "وھٰذا یدل علٰی انہٗ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علیٰ غیرھم من الکفار اذا کان متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب وبذالک قال اصحابنا"۔ (احکام القرآن ج۲ ص۳۵۲ سورۃ النساء)

فتویٰ کا خُلاصہ اور حاصل

مذکورہ بالا دلائل جو قرآنِ کریم کی صریح آیات، سنتِ نبویؐ کی واضح ہدایات، مفسرین، محدثین اور فقہاء اُمت کی تشریحات پر مشتمل ہیں اور جن پر تمام فقہی مکاتب کا اجماع ہے، سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:-

(۱) اعداء اسلام کی جارحیت اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دفاع کیلئے ہر قسم کا فوجی سازوسامان، آلاتِ حرب کی تیاری اور اس میں شب وروز ترقی اور دشمن کے ارھاب کے لیے اعداد آلاتِ جہاد فرضِ عین ہے، یہاں تک کہ اسلام کے اساسی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی فرضیت محدود اوقات اور مقدار سے وابستہ ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ کی تیاری غیر محدود، غیر مقید، غیر مؤقت اور تمام ممکنہ استطاعتوں سے وابستہ ہے جسے اللہ نے وَاَعِدُّوا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (الآیۃ) میں بیان فرمایا ہے۔

(ب) دشمنانِ اسلام کے کسی دباؤ اور ترغیب و ترہیب میں آکر ایسا کوئی اقدام یا معاہدہ ہرگز جائز نہیں جس سے فوجی اور حربی تیاریوں میں تعطل پیدا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا تیار شدہ حربی ساز و سامان کے استعمال کو منجمد کیا جا سکتا ہو یا حربی ٹریننگ، مشق اور تربیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا ان سارے امور پر کسی قسم کی قدغن لگ سکتی ہو۔

(ج) سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی کی شکل میں زیرِ بحث معاہدہ میں یہ سارے خطرات، خدشات اور گونا گوں پابندیاں موجود ہیں اس لحاظ سے اس پر کسی بھی مسلمان ملک کیلئے بشمول پاکستان کے دستخط کرنا یا اس کی تحریری اور زبانی کسی قسم کی تائید اور اتفاق کی از روئے قرآن و سنت و اجماع اُمت ہرگز اجازت نہیں، اگر کسی بھی مسلم حکومت کا سربراہ، وزیراعظم یا ممبر پارلیمنٹ یا کوئی عام شہری اس کی موافقت اور تائید کرتا ہے تو وہ قرآن و سنت اور اللہ و رسول کے واضح احکام کی صریح مخالفت اور ان احکام سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین، عقیدہ اور ایمان کی خیر منانی چاہیئے، جان بوجھ کر ایسا کرنے والے ملک و ملت کے غدار ہیں کہ اس طرح وہ ملک کی آزادی، سالمیت اور خود مختاری سلب کرانے جیسے قبیح جرم کے مرتکب ہوں گے۔ از روئے شرع ایسی صورت میں پوری قوم کو دینی، ملی اور قومی جرم کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف ہر قسم کی جد و جہد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو گی۔

کتاب الدعوی والقضاء

البينة على المدعي واليمين على من انكر

کتاب الدعوٰی والقضاء

(دعوٰی اور قضاء کے احکام و مسائل)

قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی اپنے علم پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے فیصلے کا جو طریقۂ کار وضع کیا ہے اور جو قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں قاضی فیصلے کرنے میں ان کا پابند ہے، لہٰذا قاضی یا تو مدعی کے گواہوں پر فیصلہ کرے گا اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ کرے گا، اس طریقے کے مطابق فیصلہ کرنے میں قاضی پر کوئی تہمت وغیرہ لازم نہیں آتی اور فریقین بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر قاضی کو یقینی طور پر کسی فریق کے متعلق معلومات حاصل ہوں کہ یہ حق پر ہے تو اگرچہ متقدمین علماء نے ان یقینی معلومات کے حصول پر قاضی کو فیصلے کا اختیار دیا ہے لیکن معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب چونکہ دورِ حاضر میں قاضیوں پر وہ اعتماد باقی نہیں رہا جو متقدمین کے دور میں تھا اس لیے متاخرین علماء کرام نے قاضی کو تہمت کے اندیشہ سے محفوظ رہنے اور مقضی علیہ کو اطمینان دلانے کی خاطر قاضی کے اپنے علم پر فیصلہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والفتوٰی علیٰ عدمہ فی زماننا کما نقلہ فی الاشباہ عن جامع الفصولین وقید بزماننا لفساد القضاۃ فیہ واصل المذہب الجواز۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۸۳ کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی بعلمہ) [۱]

قاضی کا مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء کا منصب چونکہ بڑا نازک اہمیت کا حامل ہے اس لیے شریعت نے

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ورجح فی جامع الفصولین قول محمد قال وینبغی ان یفتی بہ لما علم من احوال قضاۃ زماننا ثم نقل ان محمدا قال لایقضی القاضی بعلمہ ثم نقل عن عیون المذاہب ان بقولہ یفتی۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۵۸ کتاب القضاء)

ومثلہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۲ ص۳۳۶ کتاب القضاء والشہادۃ والدعاوی۔

تفصیل کے ساتھ اس کے آداب بیان کیے ہیں، دراصل ان تمام آداب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی تہمت سے محفوظ رہے تاکہ اس کا وقار معاشرہ میں قائم رہے، اس لیے شریعت نے قاضی کیلئے ہر اس فعل سے اجتناب کرنا لازمی قرار دیا ہے جس کے صدور سے قاضی کے وقار پر حرف آتا ہے اور فریقین کے اعتماد کے اٹھنے کا ذریعہ بنتا ہو، چونکہ مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے سے قاضی پر تہمت لازم آنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اس پر اعتماد باقی نہیں رہے گا جو کہ قضا کے باب میں مطلوب ہے اس لیے قاضی کے لیے کسی ایک فریق کے ہاں قیام کرنا جائز نہیں۔

كما في الهندية: فاما اذا كانت لصاحب الدعوة خصومة لا يجيب دعوته وان كانت بينهما قرابة او مباسطة قبل القضاء۔ (الفتاوى الهندية ج ۳ ص۳۳۱ الباب التاسع في رزق القاضي) ؎۱

مدعی اور مدعیٰ علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم

سوال:۔ مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک متنازعہ مسئلہ میں مدعی اپنے علاقے کے قاضی سے فیصلہ کرانا چاہتا ہے اور مدعیٰ علیہ اپنے علاقہ کے قاضی سے، تو اس صورت میں کون سے علاقے کے قاضی کو ترجیح دی جائے گی؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے کسی پر دعویٰ کرتا ہے تو مدعی کو حق دیتے وقت بظاہر مدعا علیہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری ہے تو شرعی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو جس قاضی کے پاس جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس کو وہاں مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا اگر مدعی اور مدعا علیہ میں قاضی کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق مدعا علیہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

لما قال العلامة بدر الدين محمد بن اسماعيل الشهير بابن قاضي سماوةؒ: وان كان من المحلتين فاراد المدعي ان يخاصمه الى قاضي محلته وابا ه الآخر قال ابويوسفؒ

؎۱ قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ولا يجيب دعوة خصم وغير معتاد ولو عامة للتهمة۔ (الدر المختار ج۴ ص۳۴۷ كتاب القضاء، مطلب في حكم الهدية للمفتي)
ومِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۷ ص۲۸۱ كتاب العارية۔

العبرة للمدعي قال محمد لا بل للمدعى عليه وبه يفتى . (جامع الفصولين ج ا ص۲۱ الفصل التاسع والثلاثون في المتفرقات) [1]

فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنے کا حکم

سوال:۔ فریقین کے مابین فیصلہ کرتے وقت ثالث نے دونوں فریقوں سے پانچ پانچ کلاشنکوف اپنے پاس رکھیں اور شرط یہ لگائی کہ فیصلہ کا اختیار دینے کے بعد جو کوئی بھی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو اس کی کلاشنکوف بطور جرمانہ ضبط کرلی جائیں گی، دونوں فریقوں نے اس وقت یہ شرط قبول کرلی، چنانچہ فیصلے کے بعد ایک فریق نے فیصلہ ماننے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اس کی پانچ کلاشنکوف ضبط کرلی گئیں، تو کیا اس طرح فیصلے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین نے خوشی سے ثالث کو فیصلے کا اختیار دیا تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار کرنا جائز نہیں بلکہ اس فیصلے کا ماننا فریقین پر لازم ہے اس لیے کہ ایسے فیصلے سے انکار ایک غیر شرعی امر ہے اور کسی غیر شرعی امر کے ارتکاب پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے اگرچہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے لیکن معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کے لیے چونکہ شرعی طریقے سے تعزیرات کا نظام مفقود ہے اور برائیوں کا انسداد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی ایسی طاقت اور قوت موجود نہ ہو جس سے جرائم کا انسداد ہو سکے اور تعزیر بالمال سے اس کا انسداد ہو سکتا ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی اصلاح کی خاطر امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: قال المصنف سمعت من ثقة ان التعزير باخذ المال ان رأى القاضي او الوالي جاز ومن جملة ذلك رجل

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز اللبناني: اذا طلب احد الخصمين في البلدة التي تعدد حكامها المرافعة في حضور حاكم وطلب الآخر المرافعة في حضور حاكم آخر ووقع الاختلاف بينهما على هذا الوجه يرجح الحاكم الذي اختاره المدعى عليه .
(شرح مجلة الاحكام المادة ۱۸۰۳ ص۱۱۷۱ الكتاب السادس عشر في القضاء . الفصل الثالث في وظائف الحاكم)
ومثله في تنقيح الحامدية ج ا ص۳۱۷ كتاب القضاء . باب هل العبرة بقاضي المدعي الخ

لایحضر الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۴ کتاب الحدود، الفصل الاول) [1]

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا دورِ حاضر میں حکومت کے مقرر کردہ جج یا مجسٹریٹ شرعی قاضی کا قائم مقام ہوسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ قاضی کا تقرر دراصل لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے شریعت نے باقاعدہ حدود بیان کی ہیں، اسی طرح منصبِ قضاء پر فائز ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کی ہیں اس لیے اگر ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے حکومتِ وقت جس کو بھی مسلمانوں کے تنازعات ختم کرانے کے لیے جج یا مجسٹریٹ مقرر کرے تو وہ شرعی قاضی کے قائم مقام ہوگا۔ چونکہ قاضی لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے بارے میں وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کو اس بارے میں اختیار حاصل ہے کہ اس کام کے لیے جس کو بھی چاہے مقرر کرسکتی ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ جج شرعی اصول کے موافق ہو اور اس کے فیصلے شرعی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز: الحاکم وکیل من قبل السلطان فی اجراء المحاکمۃ والحکم۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۸۰۰ ص۱۱۶۷ الکتاب السادس عشر، الفصل الثالث) [2]

اہلِ بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اہلِ بدعت جو کہ اعتقادی فاسق ہیں، میں سے کسی کو رؤیتِ ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اعلیٰ منصب (کلیدی اسامی) پر کسی عادل اور پابندِ شریعت شخص کو مقرر کرنا

---

[1] قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: عن ابی یوسفؒ ان التعزیر باخذ الاموال جائز للامام۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۲۰۷ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۵ ص۴۱ باب حد القذف، فصل فی التعزیر۔

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: کل ما یخرج بہ الوکیل عن الوکالۃ یخرج بہ القاضی عن القضاء۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۶ کتاب آداب القاضی، فصل فی بیان ما یخرج بہ الوکیل)

ومثلہ فی الاحکام السلطانیۃ ص۶۵ فی ولایۃ القضاء۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کیونکہ عادل اور نیک آدمی کے تقرر کے بغیر لوگوں کو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرنا دشوار ہے، اور رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ تو دینی امور کا خاص تعلق ہے، تو جو شخص خود بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فسق و فجور میں مبتلا ہو وہ دوسرے مسلمانوں کی عبادات کے تحفظ کا کیا لحاظ رکھے گا، اس لیے حکومت کے لیے مناسب نہیں کہ عادل اور پابندِ شریعت لوگوں کے ہوتے ہوئے اہلِ بدعت میں سے کسی کو اس منصب پر فائز کرے، تاہم جب حکومت نے اس کو مقرر کیا ہو تو دینی امور میں اس کا حکم شرعی قواعد کے تحت نافذ العمل ہوگا جیسا کہ فاسق کا حکم نافذ العمل ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: والفاسق اهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا انه لا ينبغي ان يقلد كما في حكم الشهادة۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۲ كتاب أدب القاضي) [۱]

مُدعیٰ علیہ قسم سے انکار کردے تو فیصلہ مُدعی کے حق میں ہوگا

سوال: جب مدعی اپنے دعوی پر گواہ پیش نہ کرسکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آتی ہے لیکن اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کردے تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: جب شرائط شرعی کے تحت مُدعی کا دعوٰی قاضی کے ہاں سماعت کیلئے منظور ہوجائے تو مُدعیٰ علیہ پر مُدعی کا جواب دینا واجب ہے کہ یا تو مدعی کے حق کا اقرار کرے یا انکار، اگر مدعیٰ علیہ مُدعی کے حق سے انکار کرے تو مدعی پر لازم ہے کہ گواہ پیش کرے اگر مُدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہوجائے تو پھر مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آئے گی اور اگر مُدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر مدعی کا حق لازم ہوجائے گا اور فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني ح: واذا نكل المدعىٰ عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ما ادعىٰ عليه۔ (الهداية ج۳ ص۲۰۲ باب اليمين، كتاب القضاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين ح: والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وان كان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذٍ فيحكم بفتوى غيره۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ كتاب القضاء)

ومِثْلُهٗ في جامع الفصولين ج۱ ص۱۶ الفصل التاسع والثلاثون في المتفرقات۔

[۲] قال العلامة الحصكفي ح: وقضى القاضي عليه بنكوله مرةً لنكوله في مجلس القاضي حقيقةً۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۴ ص۴۲ كتاب الدعوى)

ومِثْلُهٗ في مجلة الاحكام. المادة ۱۸۱۷ ص۶۱۱ كتاب الدعوى، الباب الثاني۔

جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم

سوال:۔ فریقین نے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا، ثالث کے فیصلے کے بعد وہ مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا جج نے چھان بین کے بعد بعینہٖ ثالث کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا، تو کیا جج کے لیے ثالث کے فیصلہ پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے لیے باہمی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں تو وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین پر نافذ ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ عدالت میں پیش کیا جائے تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی قواعد وضوابط کے عین مطابق ہو تو جج کے لیے یہ فیصلہ توڑنا جائز نہیں کیونکہ اس کے توڑنے میں فریقین کا فائدہ نہیں بلکہ انتشار کا سبب بن سکتا ہے البتہ اگر اس کا فیصلہ کسی مختلف فیہ امر میں ہو اور وہ جج کی رائے کے موافق ہو تو پھر جج کے لیے اس کا توڑنا مناسب نہیں اور اگر جج کی رائے کے خلاف ہو تو جج اپنی رائے کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کا اختیار رکھتا ہے اس لیے مذکورہ صورت میں اگر ثالث کا فیصلہ جج کی رائے کے موافق ہو تو جج اس فیصلے کو مدار بنا کر اس پر اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها انه اذا حكم فی فصل مجتهد فيه ثم رفع حكمه الى القاضی ورأيه يخالف رأی الحاكم المحكم له ان يفسخ حكمه ۔(بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب القضاء فصل فی بیان من یصلح للقضاء) [1]

دعوٰی کے اثبات کے لیے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ایک مکان اپنے بیٹے پر فروخت کیا اور مکان کا اسے قبضہ بھی دے دیا، اس کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء نے اس مکان میں شرکت کا دعوٰی کیا اور اپنے دعوٰی کے اثبات کیلئے میت کی طرف سے باقاعدہ وصیت نامہ پیش کیا جس میں مکان ورثاء میں تقسیم کیا گیا ہے، تو کیا

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: ان قضی المحکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حكمه الى قاض مولى من السلطان امضاه ان وافق مذهبه لانه لا فائدة فی نقضه ۔

(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۹ ص۱۱۹۹ الباب الرابع)

ومثلهٗ فی خلاصة الفتاوى ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔ الفصل الرابع ۔

اس تحریری وصیت نامہ کے تحت دوسرے ورثاء کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ از روئے شریعت جو دستاویزات تغیّر و تبدّل سے محفوظ ہوں ان کو اعتبار دے کر اس پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ مکر و فریب نے معاشرہ میں اکثر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے کاغذات میں تمیز مشکل ہوگئی ہے اس لیے اگر تحریری معاہدہ پر باقاعدہ گواہ موجود ہوں تو اس کو اعتبار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ صورتِ مرقومہ میں جو لوگ مکان میں شرکت کا دعوٰی کرتے ہیں اور اپنے دعوٰی کے اثبات کیلئے تحریری وصیت نامہ پیش کرتے ہیں اگر وہ اس پر گواہ پیش کرتے ہیں تو پھر اس وصیت نامہ کی شرعی حیثیت ہوسکتی ہے اور فریقین کے دعوٰی کی چھان بین کے بعد فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم بازؒ:۔ ولا يعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا كان سالماً من شبهة التزوير والتضيع فيعمل به يعني انه يكون مداراً للحكم ولا يحتاج الى الثبوت بوجه آخر۔ (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۳۶ صـ۱۰۹۰ الباب الثاني)[۱]

مُدعی کا مُدعیٰ علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ مقدمہ جیتنے کی صورت میں مُدعی عدالت کا خرچہ مدعیٰ علیہ سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے عدالت میں دعوٰی دائر کرتا ہے تو عدالت کا عملہ اس کے حق کے احیاء کیلئے مصروفِ عمل ہوتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ مدعی کو ہی پہنچتا ہے اور عدالت کی اشیاء کا استعمال اس کے فائدہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان اشیاء کا خرچہ مدعی پر عائد ہوتا ہے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اختیار ہے اگر وہ مقدمہ کے رجسٹرڈ وغیرہ کا خرچہ مُدعی سے وصول کرنا چاہے تو وصول کر سکتا ہے، جب عدالت کا خرچہ مُدعی پر آتا ہے تو مُدعیٰ علیہ کو اس کا ضامن ٹھہرانا اور اس سے خرچہ وصول کرنا

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ فالحاصل ان المدار على انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ماعليه في دفتره الذى يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ صـ۲۱ كتاب الدعوى)
ومثله في تقريرات الرافعي ج ۲ صـ۹۲ كتاب الدعوى۔

شرعاً جائز نہیں ہے۔

كمافي الهندية: وعلى هذا الصحيفة التي يكتب وفيها دعوى المدعين وشهادتهم ان رأى القاضي ان يطلب ذلك من المدعي فله ذلك۔ (الفتاوى الهندية ج ۳ ص۳۳۰ الباب التاسع في رزق القاضي) [1]

حاکم وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم

سوال:- چار بھائیوں کی مشترکہ جائیداد ایک نواب نے کسی قاضی کو بطور عطیہ دے دی، قاضی نے اس جائیداد پر باضابطہ قبضہ کیا اور باقاعدہ نفع حاصل کرتا رہا، مذکورہ نواب کا اقتدار ختم ہوتے ہی ان بھائیوں نے حکومت سے اپنی جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا عدالت میں تقریباً سترہ (۱۷) سال مقدمہ جاری رہنے کے بعد فیصلہ دو بھائیوں کے حق میں ہوا اور باقی دو بھائیوں کو محض اس وجہ سے اپنے حق سے محروم رکھا کہ انہوں نے نواب کو دستخط کر دیئے تھے۔ اب یہ مشترکہ اور غیر منقسم جائیداد قاضی کے قبضہ میں ہے، مذکورہ بھائیوں نے قاضی سے جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے قبضہ میں ہے اور مذکورہ نواب نے مجھے دی ہے اس لیے یہ میرا ہی حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قاضی کے لیے ایسی زمین پر قابض رہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے حاکم صرف اس جائیداد سے عطیات دینے کا حق دیا ہے جو کسی کی مملوکہ نہ ہو اور جو جائیداد پہلے ہی سے کسی کی ملکیت چلی آ رہی ہو اس کا کوئی کسی کو بطور عطیہ یا انعام دینا جائز نہیں، اس لیے مذکورہ نواب نے اپنی حکومت میں جو مملوکہ زمین قاضی کو دی ہے اس پر قاضی کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور خاص کر جب مذکورہ نواب کی حکومت ختم ہونے پر حکومت نے مالکوں کے حق میں فیصلہ کیا ہو تو یہ جائیداد اصل مالکوں کو واپس کی جائے گی قاضی کے لیے اس پر بے جا قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ یہ غصب کے حکم میں ہوگا، اس لیے اگر قاضی کے تصرفات کی وجہ سے اس زمین کو نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوگی۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبدالرشيد البخاريؒ: واذا اراد القاضي ان يكتب السجل ويأخذ على ذلك اجراً يأخذ منه مقدار ما يجوز اخذه لغيره۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۷)

ومثله في منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج ۶ ص۲۷۹ كتاب القضاء الفصل الثاني۔

لما قال العلامة ابوبكر بن مسعود الكاسانیؒ، ولو غصب ارضاً فبنیٰ علیها اوغرس فیها لاینقطع ملك المالك ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردّها فارغة لان الارض بحالها لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۴۹ کتاب الغصب، فصل فی حکم الغصب) [۱]

ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقۂ کار

سوال: بھائیوں کی آپس میں مشترکہ جائیداد تھی، اس پر کسی شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان بھائیوں میں سے ایک بھائی موجود نہیں تو کیا اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ وغیرہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر غائب نے اپنی طرف سے کسی بھائی کو اپنی جائیداد کے تنازعہ کے متعلق مکمل اختیار دیا ہے تو وہ بھائی اس کی طرف سے وکیل بن کر باقاعدہ خصومت کر سکتا ہے اور اس کی موجودگی میں قاضی فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف سے مکمل اختیار نہ دیا ہو تو پھر جو بھائی موجود ہے وہ شریک کی مانند ہو کر جن شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے انہی شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے بھائی کی طرف سے خصم بن سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مشترکہ جائیداد بھائیوں کے قبضہ میں ہو تقسیم نہیں کی گئی ہو اور ایک ہی سبب کے تحت سب بھائیوں کو اس پر ملکیت حاصل ہو تو جو بھائی موجود ہے اس کی موجودگی میں فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو پھر غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ انه ینتصب احدهم عن الباقین بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یدہ وان لاتکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۴۳ کتاب القضاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ، ومن غصب ارضاً فغرس فیها اوبنی قیل له اقلع البناء والغرس وردها وفیه ایضاً فان کانت الارض تنقص بقلع ذلك فللمالك ان یضمن له قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان له۔ (الهدایة ج ۳ ص ۳۷۹ کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب) — ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵-۵۰۱ الفصل الثانی۔

[۲] قال العلامة قاضی سماوةؒ، کون المدعی شیئین بینهما لامحالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضاً وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ماکان المدعی شیئاً واحداً وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب الخ)

ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج ۱ ص ۳۱۳ کتاب القضاء۔

مکرہ کے اقرار پر فیصلے کا حکم

سوال :- ایک شخص پر اپنے باپ کے قتل کا دعویٰ کیا گیا، دعویٰ کے اثبات پر کوئی گواہ بھی پیش نہیں ہوا، صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کی غرض سے مُدعیٰ علیہ نے اقرارِ جرم کیا، جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے اپنے اقرار سے رجوع کرلیا، تو کیا پولیس کے سامنے اقرار کو مدار بنا کر اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کا فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :- اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل موانع میراث میں سے ہے اور باپ کو قتل کرنے سے بیٹا باپ کی میراث سے محروم ہوجاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ قتل کا ثبوت شرعی قواعد و ضوابط کے تحت ثابت ہو، اور قتل کے ثبوت کی دو صورتیں ہیں، ایک معائنہ کی شہادت کہ قتل پر چشم دید گواہ پیش ہو جائیں اور دوسری صورت اپنی مرضی سے قتل کا اقرار کرنا، چونکہ مذکورہ بالا صورت میں صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کے لیے بیٹے نے باپ کے قتل کا اقرار کیا ہے اس لیے یہ شخص مکرہ کے اقرار کے حکم میں ہوگا، جس طرح مکرَہ کا اقرار حجت نہیں ہوتا اسی طرح اس شخص کا اقرار بھی حجت نہیں لہٰذا اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

کما فی الھندیۃ : وکذا الرضا والطوع شرط حتی لایصح اقرار المکرہ کذا فی النھایۃ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۴ ص۱۵۶ کتاب الاقرار، الباب الاول) [1]

شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال :- دو اشخاص کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی ایک شریک کی عدم موجودگی میں دوسرے پر کسی نے دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کیے، قاضی نے شریک کی عدم موجودگی میں مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو کیا جو شریک موجود ہے اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس پر فیصلہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اب غائب شریک واپس آگیا ہے اور دوبارہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو شریک حاضر ہے اگر زمین مذکورہ اس کے قبضہ میں ہو اور تقسیم نہ کی گئی ہو اور غائب شریک اس کا اعتراف بھی کرتا ہو کہ یہ زمین ہم دونوں میں مشترکہ ہے تو اس صورت میں

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ : اقرار المکرہ باطل۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۲۹۶ باب الاقرار۔
وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۵۷۵ ص۸۶۲ کتاب الاقرار۔ الباب الاول۔

جو شریک موجود ہے وہ دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے اور اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس کی موجودگی میں فیصلہ کرنا درست ہے، اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی نے فیصلہ کیا ہو تو یہ فیصلہ صحیح اور نافذالعمل ہوگا۔ اسی بناء پر اگر غائب واپس آجائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ درست نہیں لیکن اگر ان شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو تو جو شریک موجود ہے وہ غائب کی طرف سے خصم بننے کا اہل نہیں اس لیے ایسی صورت میں اگر قاضی غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ صحیح نہیں تو جب وہ حاضر ہو جائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرنا چاہے تو اس کا دعویٰ درست ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: لا یقضی علی غائب ولا لہ الا بحضور نائبه حقیقة کوکیله ووصیه ومتولی الوقف۔

وفی الدر المختار: افاد الکاف عدم الحصر فان احد الورثة کذلک ینتصب خصمًا عن الباقین وکذا احد شریک الدین۔

وفی رد المحتار: انه ینتصب احدهم عن الباقی بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لا تکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۲۷ کتاب الحوالة)[1]

اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پر ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو بارہ سو روپے (۱۲۰۰) بطور قرض دیئے اور اس شخص نے گواہوں کے سامنے بارہ سو روپے (۱۲۰۰) وصولی کا اقرار بھی کیا، جب قرض دینے والے شخص نے مقروض سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مقروض نے دو (۲) آدمی قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت مانگنے کے لیے اس شخص کے پاس بھیجے چنانچہ وہ مزید مہلت دینے پر راضی ہوگیا، کچھ عرصے کے بعد مقروض نے قرض واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، قرض خواہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوة: کون المدعی شیئین بینهما سببیة لا محالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضًا وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما لو کان المدعی شیئًا واحدًا وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب)

ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج ۱ ص ۳۱۳ کتاب القضاء۔

نے مجبور ہوکر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور مقروض کے اقرار پر باقاعدہ گواہ بھی پیش کیے لیکن اس کے باوجود جج نے مقروض کے حق میں فیصلہ سنا دیا، کیا جج کا یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک عاقل بالغ شخص کسی کے حق کا اقرار کرلے تو وہ اپنے اقرار پر ماخوذ ہوتا ہے اور اس کے اقرار کے موافق اس پر ضمان لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں جب مقروض نے ایک دفعہ لوگوں کے سامنے بارہ ۱۲ سو روپے بطور قرض لینے کا اقرار کر لیا تو پھر قرض کی واپسی سے انکار جائز نہیں اور مزید برآں قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت مانگنے کے لیے دو آدمی قرض خواہ کے پاس بھیجنے سے قرض کے اقرار کی مزید تاکید ہوتی ہے اسلیے اگر قرض دہندہ نے مقروض کے اقرار پر گواہ پیش کیے ہوں تو ان گواہوں کے ہوتے ہوئے جج کا اس کے حق میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وكذا لو قال أخّرها عني أو صالحني فاقرار۔[1]
(خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص۱۴۱ كتاب الاقرار الفصل الاول)

باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لیے اعترافِ جرم کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قتل میں باپ بیٹا دونوں شریک تھے عدالت نے جرم ثابت ہونے پر دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیا لیکن بعد میں باپ کو بچانے کی خاطر بیٹے نے اعتراف کیا کہ میں نے مقتول کو اپنی بہن کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا لیکن میرا والد اس میں شریک نہیں تھا، اُس کے اس بیان پر عدالت نے باپ کو سزا سے بری کر دیا اور بیٹے کو عمر قید کی سزا سنادی، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ تو کیا بیٹے کے اس بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے شہادت کو ہر قسم کے خطرات سے تحفظ دلانے کے لیے احتیاط پر مبنی زرّیں اصول مرتب کیے ہیں کیونکہ فیصلے کا اصل دارومدار صحیح شہادت پر ہے، اس میں ذرّہ برابر تغیّر و تبدّل سے فیصلے کی پوری نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے جہاں کہیں بھی

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: لو قال لي عليك الف فقال اتزنه او انتقدها او اجلني به او قضيتكه فهو اقرار۔ (البحر الرائق ج ۷ ص۲۵۱ كتاب الاقرار)
ومِثْلُهٗ في شرح المجلة (۱۵۸۸) ص۱۵۲ الكتاب الثالث عشر في الاقرار۔

اس میں شبہ کا احتمال موجود ہو تو شریعت نے ایسی شہادت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اس بناء پر جس شہادت میں بھی ذاتی منفعت یا باہمی قریبی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کو منفعت دلانے کا تصور پایا جاتا ہو وہ شہادت مقبول نہیں، چونکہ باپ بیٹے کے منافع اکثر ایک ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں۔ صورتِ مذکورہ میں حسبِ بیان جب مجرم نے اعترافِ جرم کیا تو اس وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوا لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی گواہی قبول نہیں لہٰذا بیٹے کے بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لِأَبَوَيْهِ ولاجداده۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ باب من يقبل شهادته ومن لا يقبل) [1]

مُدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص کی زمین اس کے چچا زاد بھائی کے زیرِ قبضہ تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا، بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین چونکہ دیہہ شاملات ہے اور اس کو میں نے آباد کیا ہے اس لیے اب یہ میری ہے، بعد میں اس نے دوبارہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین مجھے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، از روئے شرع اس شخص کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ فقہاءِ کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ مُدعی کے بیانات کا آپس میں "تناقض" نہ ہو، اگر اس کے بیانات میں "تناقض" آجائے تو اس سے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب مدعی نے ایک دفعہ یہ بیان دیا کہ یہ زمین دیہہ شاملات ہے اور میں نے آباد کی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین پہلے سے کسی کی مملوکہ نہیں تھی بلکہ آباد کرنے سے یہ میری مملوکہ بن گئی ہے لیکن بعد میں جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاری رحمه الله :لا يجوز شهادة الوجل لولده ولا لوالده وان علیٰ من قبل الاب والأم ولحافده وان سفل۔
(خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۶۰ الفصل الثانی فی الشهادات)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحكام، المادة ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ الكتاب الخامس عشر، الفصل الثالث۔

مجھے آباؤ اجداد سے تقسیم میں ملی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلے سے میرے آباؤ اجداد کی مملوکہ ہے تو مدعی کے دونوں بیانات کا آپس میں تناقض ہے اس لیے اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها عدم التناقض فی الدعوی وھو ان لایسبق منه ما یناقض دعوٰہ لاستحالة وجود الشیٔ مع ماینا قضه و ینافیه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۳ کتاب الدعوی، فصل فی الشرائط المصححه للدعوی) [1]

ملک اور بیع کے دعوی میں فیصلہ بیع کے گواہوں پر ہوگا

سوال:- ایک شخص نے کسی پر سو کنال زمین فروخت کی اور کاغذات میں مشتری کا نام درج کر دیا اور اس کے عوض آٹھ سو روپے وصول کیے، بعد میں بائع نے دعویٰ کیا کہ میں نے آٹھ سو روپے صرف دس کنال زمین کے عوض وصول کیے ہیں اور باقی ۹۰ کنال بطور امانت دی تھی جبکہ مشتری یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے پوری سو کنال زمین کے آٹھ سو روپے ادا کیے ہیں، دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرتے ہیں، تو اس صورت میں کس کے گواہوں پر فیصلہ کیا جائے گا؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اور بائع ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے اور زمین چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے اس لیے مشتری ذوالید ہے اور بائع خارج، تو عام طور پر فقہاءؒ کے بیان کردہ اصول کے تحت خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوتے ہیں لیکن اگر ذوالید خارج سے شراء کا دعویٰ کرے تو پھر ذوالید کے گواہ خارج پر مقدم کیے جائیں گے، اور حسبِ بیان چونکہ مشتری ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اسلئے اگر طرفین اپنے اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں تو مشتری کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں کے موافق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو برھن الخارج وذوالید علی الشراء منه فذوالید احق۔ (البحرالرائق ج۷ ص۲۴۲ باب دعوی الرجلین) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ:- التناقض یکون مانعا الدعوی الملکیة۔ (مجلة الاحکام، المادہ ۱۶۴۷ ص۹۵۵)
وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولین ج۱ ص۱۲۳ الفصل العاشر فی التناقض فی الدعوی۔

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملك المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولی۔ (الھدایة ج۳ ص۲۲۴ کتاب الدعوی)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۶۳ ص۱۱۳۲ کتاب الدعوی۔ الفصل الثانی۔

حدود بیان کیے بغیر زمین پر ملکیت کے دعوی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر دعوی کیا کہ میں نے اس سے سولہ کنال زمین خریدی ہے اور یہ میری ملکیت ہے، لیکن دعوی میں حدود بیان نہیں کیں، تو کیا حدود بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعوی صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب: کسی بھی دعوی میں یہ ضروری ہے کہ مُدعی کو اپنے مُدعیٰ بہ پر علم حاصل ہو اور اپنے حق کا تعین کر سکتا ہو، کیونکہ اگر مُدعیٰ ہی معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے مُدعی کے حق کی تمیز اور اثبات مشکل ہوگا، چونکہ زمین میں حق کا تعین اور تمیز حدود کے بیان کرنے سے ہوتا ہے اس لیے فقہاء نے زمین پر ملکیت کے دعوی میں حدود کا بیان کرنا شرط قرار دیا ہے کہ حدود کے بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعوی صحیح نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں مُدعی جب تک اپنے دعوی میں زمین کی حدود بیان کرے اس وقت تک اس کا دعوی قابلِ سماعت نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (وان ادعیٰ عقارا ذکر حدوده) لانه لا تعذر التعریف بالاشارة لتعذر النقل فیصار الی التحدید وکما یشترط التحدید فی الدعوی یشترط فی الشهادة۔
(البحر الرائق ج ۷ ص۱۹۷ کتاب الدعوی) [1]

فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم

سوال: ایک شخص کی زمین میں درخت ہے جس کی کچھ شاخیں پڑوسی کے کھیت کی طرف جھکی ہوئی ہیں جن کے سایہ سے اسکی فصل کو نقصان پہنچتا ہے، اب پڑوسی اس شخص سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا پڑوسی کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اسلام میں معاشرتی زندگی میں باہمی اُلفت و محبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس محبت و اُلفت کے بغیر پُرسکون زندگی کا تصور بھی محال ہے، اور یہ اُلفت و رغبت صحیح طریقے سے تب قائم ہو سکتی ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے حقوق کا لحاظ رکھے اور ہر کوئی دوسرے

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ویشترط التحدید فی دعوی العقار کما یشترط فی الشهادة علیه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۶۹ کتاب الدعوی)
ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۱۶۲۳ ص۱۹۱ کتاب الدعوی۔

کو اذیت پہنچانے سے گریز کرے، اس لیے اگر کسی کے تصرفات سے دوسرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسلام نے اس قسم کے تصرفات سے اس کو باز رہنے کی تاکید کی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر درخت کی شاخوں سے پڑوسی کے کھیت کو نقصان پہنچتا ہو تو درخت کے مالک سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر شاخ کو اوپر باندھنے سے پڑوسی کے نقصان کا ازالہ ممکن ہو تو مالک کو شاخیں باندھنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر باندھنے سے بھی نقصان دور نہ ہوتا ہو تو پھر مالک کو شاخیں کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا البتہ درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من امتدت اغصان شجر بستانه الی دار جاره او بستانه فلجاره ان یکلفه تفریغ هوائه بالربط او القطع (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۱۹۶م ص۶۵۶) [1]

عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعویٰ کرنا

سوال:۔ ایک قوم نے اپنی کچھ زمین حکومتِ افغانستان کو عاریۃً دی، حکومت نے اس زمین پر پولیس اسٹیشن (تھانہ) بنایا، تیس ۳۰ سال بعد اب ایک افغان کمانڈر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے اور وہ اس پر آبادی کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے حکومت نے اس زمین پر آبادی کی اجازت دی ہے، از روئے شریعت اس زمین میں مذکورہ کمانڈر کے تصرفات جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین غیر مملوکہ ہو اس میں حاکمِ وقت کو تصرفات کا اختیار حاصل ہے اگر وہ اس زمین میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن جو زمین پہلے سے مملوکہ ہو حاکمِ وقت کو اصل مالک کی مرضی کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے مذکورہ صورت میں جب ایک قوم نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو عاریۃً دے دی تو اس زمین پر اس قوم کی ملکیت برقرار ہے اور وہ جب بھی واپسی کا مطالبہ کرے زمین اُسے واپس کی جائے گی، لہٰذا کمانڈر مذکور کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں آبادی کرنا جائز نہیں، اور جو آبادی وغیرہ کی ہو تو اُسے گرا کر زمین اصل مالکوں کو

---

[1] قال الامام فخرالدین حسن بن منصورؒ: رجلٌ له نخلة فی ملکه وخرج سعفها الی ارض جاره کان للجار ان یقطع ویفرغ هواء ملکه لان من ملک ارضاً ملک ما تحتها الی الثریٰ وما فوقها الی السماء فکان له ان یقطع وهذا اذا کان لایمکنه تفریغ الهواء الا بالقطع۔

(الفتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۱۰۳ باب الصلح فی العقار الخ)

واپس کی جائے گی ۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیھا اولیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیھا ویکلفہ قلع البناء والغرس ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریۃ) [۱]

کسی کی مملوکہ زمین پر قبضہ کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص تیس[۳۰] سال قبل اپنی مملوکہ زمین میں تصرف کرتا رہا، کسی عذر کی وجہ سے اسے وطن چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے تین چچازاد بھائیوں نے اس میں تصرف شروع کر دیا، جب یہ شخص واپس آیا تو اس نے اچھے تعلقات کی وجہ سے ان کو تصرف سے نہیں روکا، اب تقریباً دس[۱۰] سال سے وہ زمین پر قابض ہیں اور زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، مالک کے پاس زمین کی ملکیت پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں، تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ مدتِ مدید تک غیر کی مملوکہ زمین محض تصرف کی وجہ سے کسی کی ملک میں نہیں آسکتی بلکہ ملکیت کے لیے باقاعدہ اسباب مقرر ہیں، ان اسباب میں سے کسی بھی سبب کی عدم موجودگی میں کسی چیز پر ملکیت کا تصور ہی ناممکن ہے اس لیے اگر مالک شہادتِ شرعیہ سے اپنی ملکیت ثابت کرے تو اس کو اپنی زمین واپس کی جائے گی، صورتِ مسئولہ میں چچازاد بھائیوں نے اس پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے یہ سب غاصب ہیں اور غاصب پر مغصوبہ چیز کی واپسی لازم ہے۔ اگر انہوں نے زمین میں تصرفات کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی ۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیھا او بنیٰ قیل لہ اقلع البناء والغرس وردھا (وفیہ ایضاً) فان کانت الارض تنقص بقلع ذٰلک فللمالک ان یضمن لہ قیمۃ البناء وقیمۃ الغرس مقلوعاً ویکونان لہ ۔ (الہدایۃ ج۳ ص۳۷۹ کتاب الغصب) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: استعارۃ الارض لغرس الاشجار والبناء علیھا صحیحۃ لکن للمعیران یرجع عن الاعارۃ متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار و رفع البناء ۔ (مجلۃ الاحکام، المادۃ ۸۳۱ ص۶۰م)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۲ ص۱۹۲ کتاب العاریۃ ۔

[۲] قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومن غصب ارضاً فبنیٰ علیھا او غرس فیھا لا تنقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردھا فارغۃ لان الارض بحالھا لم تتغیر ولم تصر شیئاً اٰخر ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب فصل حکم الغصب) ـــــ وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۹۰۵ ص۵۰۱ الکتاب الثامن الفصل الثانی)

مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں

سوال :- ایک آدمی کافی مدت سے کسی کی زمین پر قابض ہے اور مالک کو باقاعدہ اجارہ دیتا ہے، دریں حالات کسی نے اس زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا، مزارع نے جب دعویٰ کیا تو مدعیٰ علیہ نے چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ زمین تمہاری نہیں ہے اس لیے میں تمہیں فصل کا حصہ نہیں دوں گا، مالک اگر دعویٰ کرے تو دیکھا جائے گا۔ کیا ایسے حالات میں مزارع کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟ اور مدعیٰ علیہ رفع سے انکار میں کہاں تک حق بجانب ہے؟

الجواب : صورتِ مسئولہ میں مزارع کا دعویٰ درست ہے اور جب تک زمین پر مزارع تصرف کر رہا ہو تو اس کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اور مدعیٰ علیہ کا اس سے جان چھڑانا بے سود ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم باز : ولكن اذا غصب الوديعة او المستعار او الماجور او المرهون فللوديع والمستعير والمستاجر والمرتهن ان يدعی بها علی الغاصب وحده ولا يلزم حضور المالك۔ وليس للمالك ان يدعی بها وحده ما لم يحضر هؤلاء (شرح مجلة الاحكام ، المادة ۱۶۳۷ ص ۹۴۱ الفصل الثالث)[1]

زمین کے نامعلوم حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال :- ایک آدمی کسی کی مملوکہ زمین کے کچھ حصہ کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمین میں میرا حصہ ہے اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کرتا ہے کہ اس زمین کا کچھ حصہ میرے والد نے مالکِ زمین کو دیا ہے، لیکن نہ تو اس کو مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ، جبکہ مالکِ زمین اس کی ملکیت سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب :- فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مدعی جس چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو وہ چیز معلوم ہو، اگر مجہول ہو تو پھر اس پر دعویٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اگر مدعیٰ بہ مجہول ہو تو پھر اس پر نہ تو صحیح شہادت قائم ہو سکتی ہے اور نہ

---

[1] لما في الهندية : اذا ادعی رجل دارا في يدي رجل انها في اجارتي آجر فيها فلان وادعی ذواليد انها في اجارتي آجرينها فلان آخر تسمع دعوی المدعی وينتصب صاحب اليد خصما۔
(الفتاوی الهندية ج۴ ص۱۳۷ الباب الخامس فيمن يصلح خصما لغيره)
ومثله في خلاصة الفتاوی ج۴ ص۸۴ كتاب الدعوی۔

صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدعی کو نہ تو مدعیٰ بہ کی مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ، جبکہ زمین کے دعویٰ میں حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے اس لیے اس آدمی کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : معلومیة المال المدعیٰ اذ لا یقضی بمجهول ولا یقال مدعی فیه وبه الاان یتضمن الاخبار۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۴۶۷ کتاب القضاء)[1]

عاریہ پر لی ہوئی زمین سے معیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ

سوال :- ایک شخص نے اپنی زمین کسی کو بطور عاریہ دی ہے اُس نے زمین میں درخت لگائے اور پھر بیچ دیئے لیکن زمین واپس ہونے کے باوجود صرف تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو خود درخت کاٹتا ہے اور نہ مشتری کو کاٹنے دیتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس بارے میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب :- چونکہ عاریت پر زمین دینے والا اس زمین کا مالک ہے اور اپنی زمین میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے، تو جس طرح کسی کو زمین عاریہ پر دینے کا اُسے اختیار ہے اسی طرح اسی زمین کو کسی سے واپس لینے کا بھی اس کو اختیار حاصل ہے، جب بھی وہ اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کرے تو بے چون وچرا اُسے زمین واپس کرنا مستعیر کی ذمہ داری ہے اس لیے عاریہ پر دینے والے کو تنگ کرنے کی غرض سے اپنے لگائے ہوئے درختوں کو چھوڑ دینا جائز نہیں اسلئے اُسے درخت کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

کما قال العلامة سلیم رستم بازؒ : استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء علیها صحیحة لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارة متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحکام، المادة ۸۳۱ ص۴۶۰ الفصل الثانی فی احکام العاریة وضمانها)[2]

---

[1] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ : ومنها ان یکون المدعیٰ معلوماً لتعذر الشهادة والقضاء بالمجهول (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۲ کتاب الدعویٰ فصل الشرائط المصححة للدعویٰ)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۶۱۹ ص۹۱۱ الباب الاوّل، الفصل الاوّل فی شروط صحة الدعویٰ۔

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله : واذا استعار ارضاً لیبنی فیها او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔

(الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)

وَمِثْلُهٗ فی مجمع الضمانات، النوع الثالث ضمان العقار ص۶۶۔

والد کا عقدِ بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال :- ایک شخص کا سسر کراچی میں مقیم تھا اس نے اپنے داماد کو زمین کا کچھ حصہ مکان تعمیر کرنے کے لیے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر زمین لینے سے انکار کر دیا کہ جب تک سسر بیع قطعی پر مجھے زمین نہیں دیتے میں اس پر مکان تعمیر نہیں کروں گا، کچھ عرصہ بعد اس کا بیٹا کراچی سے آیا اور بہنوئی سے کہا کہ مجھے والد نے مکمل اختیار دیا ہے اور اجازت نامہ بھی پیش کیا ہے، اس لیے اگر آپ بیع قطعی پر زمین لینا چاہیں تو میں دینے کو تیار ہوں چنانچہ بہنوئی نے دس ہزار روپے کے عوض زمین خرید لی اور بیع نامہ تحریر کیا جب سسر واپس آیا تو لوگوں نے اس کو اکسایا جس پر اس نے بیع پر زمین دینے سے انکار کر دیا، کیا از روئے شرع سسر زمین واپس لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بشرط صحت سوال اگر واقعی والد نے اپنے بیٹے کو بیع کی اجازت دی ہو تو بیع نافذ ہے اور والد کو بیع رد کرنے کا اختیار نہیں لیکن مشتری کو اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی تھی، اگر مشتری اس پر گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے مطالبہ پر بائع کے والد کو قسم دی جائے گی اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو بیع نافذ ہو کر اس کو واپسی کا حق نہیں اور اگر وہ قسم کھائے تو پھر بیع فضولی کے حکم میں ہو کر والد کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو بیع نافذ نہیں۔

اخرج الامام البیهقیؒ : فکتب ابن عباسؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لو یعطی الناس بدعواهم لادعیٰ رجال اموال قوم ودماءهم ولکن البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (رواه البیهقی ج ۱۰ ص۲۵۲ کتاب الدعویٰ) [۱]

مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ

سوال :- دو اشخاص کے مابین مشترکہ زمین تھی جس میں بعض حصہ بنجر اور بعض قابلِ کاشت تھا، دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس زمین کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے

---

[۱] وذکر الامام مسلمؒ : عن عمرو ابن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی صلی الله علیه وسلم قال البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الدعویٰ)
ومثلهٗ فی الهدایة ج ۳ ص۲۰۳ کتاب الدعویٰ۔

زمین سیراب ہوتی تھی، اب ان میں سے ایک شخص نے اس چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، کیا ایک جاری چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ جاری پانی کے ساتھ عام لوگوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں، تو اگر اس پر کسی کی ملکیت تسلیم کر لی جائے یا کسی کے زیر قبضہ رکھا جائے تو اس میں لوگوں کے حقوق تلف ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعتِ مطہرہ نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا برابر اختیار دیا ہے اور کسی کو بھی ملکاً قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی، لہٰذا حسبِ بیان مذکورہ بالا صورت میں یہ شخص نہ اپنے شریک کو چشمہ سے روک سکتا ہے اور نہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن رجل من مهاجرين من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً اسمعہ یقول المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۱۳۶ باب فی منع الماء) [1]

رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ

سوال: دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ زمین تقسیم کر کے ہر ایک نے اپنے حصہ پر قبضہ کیا، ایک بھائی نے اپنے حصہ کی زمین میں مکان بنایا اور تقریباً تیرہ ۱۳ سال اس میں رہا، بعد میں اس نے اپنا مکان کسی پر فروخت کر دیا، مشتری بھی تقریباً ۶ سال اس میں رہا اب اوّل مالک کے بھائی نے باہمی رنجش کی وجہ سے اس شخص کے مکان اور ساتھ والے دوسرے مکانات کے پانی کا راستہ بند کر دیا ہے، تو کیا کسی کی ملک میں ۶۶ سال سے قائم شدہ پانی کا راستہ کوئی بند کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جب مدتِ دراز سے لوگوں کے مکانات کے پانی کا راستہ قائم ہو تو ملک بدلنے سے اس میں تغیر نہیں آتی بلکہ ہر ایک کو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی ہوگی تاکہ آپس میں الفت و محبت کی فضا قائم رہے، اگر ملک بدلنے سے ہر کوئی اس میں تصرف کرتا رہے کبھی

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: الماء والكلاء والنار مباحة والناس فی هذه الاشياء الثلاثة شركاء۔ (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۲۳۴ ص۶۷۶ الباب الرابع فی شركة الاباحة الفصل الاول) ومثله فی الهداية ج ۴ ص۴۸۳ كتاب الشركة۔

بند کرے اور کبھی کھلا رکھے تو اس سے اہلِ محلہ کو تشویش لاحق ہوگی اور بے چینی کا شکار ہوجائیں گے، اس لیے اگر واقعی پانی کا یہ راستہ پہلے ہی سے قائم ہے تو پھر اس آدمی کو راستہ بند کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ پانی کا یہ راستہ مدتِ دراز سے قائم ہے تو پھر مشتری اور دوسرے مکانات والوں کو گواہوں سے اسی راستے سے پانی گذارنے کا حق ثابت کرنا ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا کان لرجلٍ ارض وللآخر فیھا نھر واراد رب الارض ان لا یجری النھر فی ارضہ لم یکن لہٗ ذٰلک ویترک علیٰ حالہ۔[۱]

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۱۴ کتاب احیاء الموات)

حصہ دار کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ زمین مشترکہ شاملاتِ دیہہ ہے جس میں سرکاری کاغذات کی رُو سے تین سو افراد شریک ہیں، ان میں سے ایک شریک نے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر زمین کسی پر فروخت کردی، شرکاء کی بار بار تنبیہ کے باوجود مشتری نے اس زمین پر مکانات تعمیر کیے، اب دیگر شرکاء زمین خالی کرنے کا مطالبہ کررہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے جبکہ مشتری زمین خالی کرنے سے انکار کرتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ یہ زمین چونکہ میں نے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، تو اس بارے میں اب فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر یہ قطعہ زمین جو کہ شاملاتِ دیہہ ہے حکومت کی طرف سے گاؤں کے لوگوں کو دی گئی ہو تو جن لوگوں کو اس میں حصہ دیا گیا ہے وہ سب اس کے مالک ہیں اس لیے یہ زمین ان سب کی مشترکہ ہوگی اور مشترکہ مال میں ہر ایک شریک دوسرے کے حصہ کے بارہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اجنبی شخص کسی کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں رکھتا اسلئے صورتِ مسئولہ میں شرکاء کی اجازت کے بغیر ان کے حصّہ کی زمین فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا ان کے مطالبہ پر ان کے حصہ کی زمین خالی کراکر ان کے حوالہ کی جائے گی۔

کما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: کل من الشرکاء فی شرکۃ الملک اجنبی فی حصۃ

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: رجل لہ ارض وللآخر نھر یجری فیھا فاراد رب الارض ان یمنع النھر ان یجری فی ارضہ لم یکن لہ ذٰلک۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۱۵ کتاب احیاء الموات)
ومثلہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۲۸ ص ۶۷۳ کتاب احیاء الموات۔

سائرهم فليس احدهم وكيلاً عن الآخر ولا يجوز له من ثم ان يتصرف في حصة شريكه بدون اذنه - (شرح مجلة الاحكام، المادة ١٠٧٥ ص۶۰۱ الباب الاول في شركة الملك الفصل الثاني)[1]

متوفی بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں اسکی ذاتی جائیداد باپ کے ترکہ میں شامل کر کے تقسیم کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص فوت ہوگیا اور اس کے ورثاء میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئے، ان چار بھائیوں میں سے ایک نے والد کے ترکہ کے علاوہ ایک قطعہ زمین کسی اور شخص سے خریدا جو کہ کسی کی شرکت کے بغیر وہ زمین اس کی ملکیت میں آئی، والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل ہی وہ وفات پاگیا اور اس کے ورثاء میں دو معصوم بچے رہ گئے، مرحوم کے بیٹے جب بالغ ہوئے تو انہوں نے اپنے چچوں سے دادا کے ترکہ کی تقسیم کا مطالبہ کیا، اب تک ان کو اپنے والد کی اپنی زرخرید زمین کے بارے میں معلومات نہیں ہوسکیں اور نہ ہی کسی نے اس بارے میں انہیں بتایا لہٰذا دادا کے ترکہ کی تقسیم کے وقت وہ قطعہ زمین ایک چچا کے حصہ میں آگیا، دادا کے ترکہ کے تین حصے کر کے مرحوم کا حصہ اس کے بیٹوں کو دے دیا گیا، تقسیم کے تقریباً ۱۲ سال بعد مرحوم کے بیٹوں کو معلوم ہوا کہ جو قطعہ زمین ان کے فلاں چچا کے حصہ میں آچکی ہے وہ ان کے باپ کی زرخرید اپنی ذاتی ملکیت تھی، اور اس درمیانی عرصہ میں ان کے چچا نے وہ زمین اپنے دوسرے بھائی پر فروخت کر دی، مرحوم کے بیٹوں کو جب علم ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ جو زمین ہمارے والد کی زرخرید ملکیت ہے وہ ہمیں والد کے ترکہ میں دادا کے ترکہ کے علاوہ الگ ملنی چاہیئے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شریعت کی رو سے ان کا دعویٰ درست ہے؟ جبکہ مدعیٰ علیہم اس قطعہ زمین کے مدعی کے والد کے ترکہ سے نہ ہونے اور دادا کے ترکہ سے ہونے کے قائل ہیں، مرحوم کے بیٹوں کے پاس ہر قسم کا ثبوت موجود ہے، اگر شہادت کی ضرورت پڑی تو گواہ کس کے معتبر ہونگے؟

الجواب:- محض مدت دراز کے گذرنے سے کسی کا حق باطل نہیں ہوتا خاص کر ایسی حالت میں جبکہ اس کو اپنے حق کا علم بھی نہ ہو اور لاعلمی کی صورت میں چاہے جتنی بھی تاخیر ہو جائے پھر سماعت دعوے

---

[1] قال العلامة الحصكفيؒ: وكل من شركاء الملك اجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۶۵ كتاب الشركة) ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ كتاب الشركة -

کے لیے مانع نہیں، چونکہ علم نہ ہونے کو فقہاء نے شرعی عذر قرار دیا ہے اور وراثت میں تو اطلاع کے باوجود بھی تاخیر ہو جانے سے دعویٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا اس لیے صورتِ مسئولہ میں میت کے بیٹوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :- ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ینفذ الا فی الوقف والارث ووجود عذر شرعی وبه افتی المفتی ابو السعود۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۰ کتاب القضاء) [1]

جب دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں تو میت کے بیٹے چونکہ قطعہ اراضی کے زرخرید ہونے کے مُدعی ہیں اور ان کے چچا اس کے زرخرید ہونے کی نفی کرتے ہیں، اور دعویٰ میں جب اثبات اور نفی کا تقابل آجائے تو اثبات میں چونکہ زیادت کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور زیادت کے گواہ چونکہ نقصان کے گواہ پر مقدم ہوتے ہیں اس لیے اثبات کے گواہوں کو نفی کے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی اسلیے صورتِ مذکورہ میں میت کے بیٹوں کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ ان کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : فالاصل فیه ان البینة المظهرة للزیادة اولیٰ۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۴۱ کتاب الشرکة) [2]

حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال :- افغان حکومت نے ۱۳۴۲ھ کو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے حکومت انہیں زمین دے گی، ایک قوم نے کسی کی وکالت سے حکومت کو درخواست دی، حکومت نے درخواست منظور کر لی اور اس قوم کو مالکانہ حقوق کے ساتھ زمین دے دی گئی اور باقاعدہ اسناد جاری کی گئیں، ۱۹۸۴ء تک یہ قوم

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : لاتسمع دعوی الدّین والودیعة والعقار الملوك والمیراث بعد ان ترکت خمس عشرة سنة۔ (شرح المجلة، المادة ۱۶۶۰ ص ۹۸۴ الباب الثانی فی مرور الزمان)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۲۸ باب التحالف۔

[2] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : بینة الزیادة اولیٰ۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۶۲ ص ۱۱۳۱ الباب الرابع)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۳ ص ۵۱۲ الباب التاسع فی الشهادة علی النفی والبینات الخ۔

بطور کاشت کار اس سے فائدہ حاصل کرتی رہی، جب اس قوم نے پاکستان ہجرت کی تو مذکورہ بالا زمین ایک اور قوم کو اجارہ پر دے دی، اب اس قوم نے اس زمین پر ملکیت کا دعوٰی کیا ہے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم سے غصب کی گئی تھی، شرعًا اب یہ زمین کس کی ملکیت میں رہے گی؟

الجواب: جو زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو اور موات کے حکم میں ہو یا وہ زمین جو بیت المال کے زیرِ تصرّف ہو اس کے بارے میں حاکمِ وقت کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے بھی چاہے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی قوم کو اس میں سے کچھ دینا چاہے تو اس کو اختیار حاصل ہے اور جس کو بھی حاکمِ وقت کی طرف سے کچھ زمین مل جائے وہ اس کا مالک تصور کیا جائے گا اور یہ زمین شرعی قواعد وضوابط کے تحت اس کے مرنے کے بعد ورثاء میں بھی تقسیم ہوگی لہٰذا حاکمِ وقت کی طرف سے غیر مملوکہ زمین کسی کو دینے کے بعد کسی کو بھی اسے واپس لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وللامام ان یقطع کل موات وکل ما لیس فیہ ملک لاحد ویعمل بما یریٰ انہ خیر للمسلمین واعم نفعًا۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۹۰ فی احکام الاقطاعات من بیت المال۔ باب العُشر والخراج والجزیۃ) [1]

کسی غیر کے نام مندرج زیر قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: سرکاری کاغذات میں ایک شخص کے نام زمین درج ہے اور اس زمین پر ۱۹۳۰ء سے کسی دوسرے شخص نے قبضہ کر رکھا ہے اس زمین میں ایک بہت بڑا درخت تھا جو کہ قابض کاٹ کر گھر لے گیا، زمین کی ملکیت جس شخص کے نام درج ہے اب اس نے زمین پر قبضہ کر کے قابض پر زمین کی ملکیت اور درخت کا دعوٰی کیا، تو مذکورہ صورت میں فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: اگر سرکاری کاغذات صحیح ہوں ان میں دھوکہ، جعل سازی اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا، ان کاغذات کے موافق زمین جس کے نام درج ہو اس کی

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: فالامام یملک اقطاع الموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذٰلک الی عمارۃ البلاد والتصرف فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)
وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۷۲ ص۶۸۸۔

ملکیت تصور کی جائے گی اور درخت بھی اسی کا ہو گا لیکن اگر اس میں جھوٹ و فریب کا احتمال ہو تو متعلقہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے والا خارج ہے اور قابض ذوالید ہے، اس لیے اگر فریقین گواہ قائم کریں تو خارج کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا، اگر خارج کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کے گواہوں پر فیصلہ ہو گا، اگر طرفین میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کو قسم دی جائے گی، اگر قسم سے انکار کرے تو زمین پر خارج کی ملکیت ثابت ہو گی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فان قامت علیٰ ملک مطلق عن الوقت فبینة الخارج اولیٰ-

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعویٰ، فصل فی حکم تعارض الدعوتین) [1]

حکومت کی اجازت سے موات اراضی آباد کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک دفعہ صوبائی حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، چنانچہ ایک علاقہ میں غیر آباد بنجر پہاڑ کے کچھ حصہ پر بعض لوگوں نے محنت کر کے قابلِ کاشت بنایا اور بعض حصہ میں گھر بنائے، لیکن وہاں کے بعض با اثر لوگوں نے جبراً ان لوگوں کی زمینیں چھین لیں اور مکانات بھی خالی کرا لیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حکومتِ وقت کے باقاعدہ اعلان کے بعد اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ بالا پہاڑ پہلے سے کسی کا مملوکہ نہ ہو اور نہ قریبی لوگ اس کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہوں تو حکومتِ وقت کی اجازت کے بعد جو بھی اس کو آباد کرے چاہے کاشت کے قابل بنانے سے آباد کرے یا مکانات تعمیر کرنے سے آباد کرے تو آباد کرنے والا اس کا مالک بن جائے گا، اس لیے اس زمین پر ملکیت ثابت کیے بغیر محض طاقت کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے زمین خالی کرانا سراسر ظلم و زیادتی ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من احیا ارضاً من الاراضی الموات باذن السلطان

---

[1] قال العلامة علاؤالدین التمرتاشیؒ: تقدم حجة خارج فی ملک مطلق علیٰ حجة ذوی الید۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۸۶ باب دعوی الرجلین)

ومثلہ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ کتاب الدعویٰ۔

صادرما لکّا لھا۔(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۷۲ ص۶۸۸ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ) [1]

موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسری اراضی پر بند کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ ایک زمین مدتوں سے ایک شخص کے زیرِ تصرّف چلی آرہی ہے اس کے قریب ایک غیر آباد پہاڑ میں چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی، اب اس غیر آباد پہاڑ کو کسی نے آباد کرکے قرب و جوار میں واقع آباد زمین پر پانی بند کردیا ہے، تو کیا اس شخص کا دوسروں کی اراضی پر پانی بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک غیر آباد زمین جاری چشمہ سے مدتِ دراز تک سیراب ہوتی رہی ہے تو اس غیر آباد زمین پر قبضہ کرکے اس کو آباد کرنے سے قرب و جوار میں واقع اراضی پر اس چشمہ کا پانی بند کرنا جائز نہیں کیونکہ موات اراضی کو آباد کرنے سے اس کے قرب و جوار میں واقع اراضی پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ اس زمین کے متعلقہ حقوق بدستور قائم رہیں گے، جس طرح موات میں پہلے سے قائم شدہ راستہ موات آباد کرنے کی وجہ سے کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح موات میں پہلے سے قائم دوسری اراضی کے پانی کا راستہ روکنا جائز نہیں۔

وفی الھندیۃ: رجل احیا ارضاً میتۃ ثم جاء انسان واحیا اراضی حولھا حتی احاط الاحیاء بجوانبھا الاربعۃ کان لہ ان یتطرق الی ارضہ من الارض التی احیاھا آخر۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۷ کتاب احیاء الاموات، الباب الاول) [2]

مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرّف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک علاقہ میں

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: فالملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفۃؒ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

[2] قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: اذا احیا رجل ارضا من اراضی الموات ثم جاء آخرون ایضاً فاحیوا الاراضی التی فی اطرافھا الاربع یتعین طریق ذلک الشخص فی ارض المحی الاخیر یعنی ان طریقہ تکون منتھاً (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۷۴ ص۶۸۹ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی تنویر الابصار ج۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

چھ سو ایکڑ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں پانچسو افراد شریک ہیں، اب اس میں شریک چند اشخاص نے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر مکانات بنائے اور باغات لگائے دوسرے شرکاء ان کو اس تصرف سے منع کرتے جبکہ یہ اشخاص اس تصرف سے باز نہیں آتے، تو کیا دوسرے شرکاء ان اشخاص کو اس تصرف سے منع کر سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :- اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمین کسی کی مملوکہ نہیں اور موات کے حکم میں ہے تو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا اس کا حقدار ہوگا، اس میں دوسرے شرکاء سے اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی اجازت کے بغیر بھی اس میں تصرف جائز ہے، البتہ اگر یہ زمین حکومت نے ان پانچسو افراد کو دی ہو جیسا کہ عام طور پر مقامی لوگوں میں شاملات زمین قرب وجوار میں موجود اراضی کے تناسب سے دی جاتی ہے، تو یہ زمین سب میں مشترکہ ہوگی اور مشترکہ املاک میں تصرف کرنے سے اگر دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں بعض شرکاء کا تصرف جائز ہے لیکن اگر ان کے تصرف سے دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچتا ہو تو پھر ان شرکاء کا اس زمین میں تصرف جائز نہیں اور دوسرے شرکاء ان کو تصرف سے منع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ : وكل من شركاء الملك اجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة . (الدر المختار ج ۳ ص۳۶۵ كتاب الشركة)

عرصہ دراز تک آمدورفت کی وجہ سے راستہ پر حق مرور کا دعوای کرنے کا حکم

سوال :- دو اشخاص کا ایک راستہ پر تنازعہ ہے ایک شخص یہ دعوای کرتا ہے کہ چونکہ ساٹھ سال سے اس راستہ پر میری آمدورفت جاری ہے اس لیے اب کوئی بھی مجھے اس راستے پر گذرنے سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا شخص یہ دعوای کرتا ہے کہ یہ راستہ میری ملکیت ہے اور محض تعلقات کی وجہ سے میں نے اس شخص کو اس راستہ پر سے گذرنے کی اجازت دی تھی لہٰذا مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اس شخص کو راستے پر گذرنے سے روک دوں، تو کیا زمین کا مالک اس شخص

ل قال العلامة سليم رستم بازؒ : انتفاع الحاضر بالملك المشترك بوجه لا يضر الغائب يعد رضى من الغائب۔ (شرح مجلة الاحكام ، المادة ۱۰۷۹ ص۶۰۲ الباب الاول في شركة الملك)
ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ كتاب الشركة۔

راستے پر گذرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- محض آمد و رفت کی وجہ سے حق مرور کا دعوی کرنا صحیح نہیں بلکہ مدعی پر لازم ہے کہ مدعیٰ علیہ کی مملوکہ زمین میں اپنے لیے راستہ ثابت کرنے پر گواہ پیش کرے، اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

كما فى الهندية : لوادعىٰ علىٰ آخر حق المرور ورقبة الطريق فى داره فالقول صاحب الدار ولو اقام المدعى البينة انه فى هٰذه الدار لم يستحق بهٰذا شيئاً كذا فى الخلاصة ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۳ ص۱۰۴ الباب التاسع فيما يجوز بيعه) ؎

ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعوی میں تاریخ کی تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال :- ایک شخص نے اپنی زمین اپنے بھتیجے پر فروخت کی، پھر دوبارہ خفیہ طور پر وہی زمین اپنے بھائی پر فروخت کی، بائع کا بھتیجا اور بھائی دونوں اپنی اپنی ملکیت کا دعوی کرتے ہیں اور اپنے دعوی پر ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بائع لاپتہ ہے تو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب :- ایک ہی وقت میں دو اشخاص پر زمین فروخت کرنا جائز نہیں یہ سراسر دھوکہ ہے اور اس دھوکہ اور فریب کی وجہ سے دونوں آپس میں دست و گریبان ہیں، صورتِ مذکورہ میں جب بائع نے زمین دو افراد پر فروخت کی تو اگر دونوں اپنے دعوی پر گواہ پیش کریں اور دونوں نے ایک ہی تاریخ پیش کی ہو اور ہر ایک اپنے دعوی کے اثبات پر گواہ پیش کرتا ہو تو زمین فی الحال جس کے قبضہ میں ہے اس کے گواہوں کو دوسرے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی البتہ اگر

؎ قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : ولو ادعىٰ علىٰ آخر حق المرور ورقبة الطريق فى داره القول قول صاحب الدار ولو اقام المدعى البينة انه كان يمر فى هٰذه الدار لم يستحق بهٰذا شيئاً ولو شهدوا ان له طريقا فيها وبينوا حدوده .... يقضىٰ له بذلك ۔

(خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۹۵ كتاب الدعوىٰ ۔ الفصل الثانى)

وَمِثْلُهٗ فى شرح المجلة للعلامة سليم رستم بازؒ، المادة ص۱۱۵۵ فصل فى دعوى الحائط والطريق ۔

دونوں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہوں تو پھر جس کی تاریخ مقدم ہو اس کے گواہ بھی دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوں گے ۔

قال العلامة محمد علاؤالدین آفندیؒ: ولو ادعی الخارج وذوالید بسبب من الاسباب نحو شراء وارث وشبهه فلا یخلوا اما ان یدعیا تلقی الملك من جهة واحد او من جهة اثنین فلو ادعیاه من جهة واحد وبرهنا حکم به لذی الید لو لم یؤرخا او ارخا سواء فلو ارخا وتاریخ احدهما اسبق فهو اولی ۔ (تکملة رد المحتار ج ۲ ص ۱۸ باب دعوی الرجلین)[1]

مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعوے کا جائزہ

سوال :- ایک آدمی نے کسی شخص پر اپنے بیٹے کے قتل کا دعویٰ کیا جبکہ مُدعاعلیہ قتل سے منکر ہے، گواہوں کی شہادت سے قبل مُدعیٰ علیہ نے دعویٰ کو ان الفاظ سے رفع کیا کہ مقتول کے باپ سے میرے بھائی نے قتل کے بارے میں پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو مُدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر اس نے قتل کیا بھی ہو تو میں نے اس کو معاف کر دیا ہے، تو کیا یہ معافی دفع دعویٰ کیلئے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب :- قصاص جاری کرنا چونکہ سنگین نوعیت کا حامل معاملہ ہے کیونکہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اس باب میں شریعت نے مقتول کے ورثاء کے عفوودرگذر کو بڑی اہمیت دی ہے ۔ اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی قاتل کو معاف کر دے تو اس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے ۔ حسب بیان اگر شرعی طریقے سے ثابت ہو جائے کہ مقتول کے والد نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو میں نے معاف کیا ہے، تو اس کا یہ اعتراف اور معافی دعویٰ کے دفاع کے لیے کافی ہے اور اس سے قتل کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے ۔

---

[1] وفی الهندیة : ان کانت فی ید احدهما فهی لذی الید سواء ارخ او لم یؤرخ الا اذا ارخا وتاریخ الخارج اسبق فیقضی بها للخارج کذا فی الکافی ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۷۲ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)

ومثلهٗ فی شرح مجلة الاحکام (۱۱۲۷) کتاب الدعوی ۔

كما في الهندية: ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجلٌ او امرأةٌ او أُم او جدة ومن سواهن من النساء او كان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القصاص فلا سبيل الى القصاص ۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۲۰ الباب السادس في الصلح والعفو والشهادة فيه)[1]

بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعوٰی ملکیت کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین خریدی، خریدنے کے بعد زمین کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد جو زمین اس کے نام درج تھی وہ ورثاء میں تقسیم کر دی گئی اور جو زمین بیٹے کے نام درج تھی وہ اس کے قبضہ میں اپنے حال پر باقی رہی، اب ورثاء نے اس کی زمین میں بھی وراثت کا دعوٰی کیا ہے کہ وراثت کے تحت ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جبکہ بیٹا اپنی زمین میں ان کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اندریں صورت کیا بیٹے کے حصہ کی زمین میں ورثاء کی ملکیت کا دعوٰی صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درحقیقت حالتِ حیات میں باپ اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے بیٹے کے لیے ہبہ ہوتا ہے اور ہبہ کی تمامیت کے لیے قبض شرط ہے اگر موہوب لہ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ نہ کرے تو بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا اس لیے حسبِ بیان اگر واقعی والد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی ہو اور اس کی زندگی میں بیٹے نے اس پر قبضہ کر لیا ہو تو یہ زمین محض اس کی ملکیت ہوگی اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اس لیے اس زمین پر دوسرے ورثاء کا ملکیت کا دعوٰی کرنا صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: ومنها ان يكون الموهوب مقبوضاً حتى لا يثبت الملك للموهوب له قبل القبض وان يكون مقسوماً اذا كان مما يحتمل القسمة۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج۲ ص۹۳ كتاب الهبة)[2]

---

[1] قال العلامة الكاسانيؒ: فاما اذا كان اثنين او اكثر فعفا احدهما سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصيب العافي بالعفو فيسقط نصيب الآخر ضرورة انه لا يتجزأ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۷ كتاب الدعوى)

وَمِثْلُهٗ في الهداية ج۴ ص۵۵۶ كتاب الدعوى۔

[2] لما قال العلامة سليم رستم بازؒ: يملك الموهوب له الموهوب بالقبض۔ (شرح مجلة الاحكام۔ المادة ۸۶۱ ص۴۷۳ البات الثالث)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج۶ ص۱۳۲ فصل حكم الهبة، كتاب الهبة۔

ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: ایک شخص جو کہ اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا اور وہ اپنے ایک ساتھی سے چار ہزار روپے، دوسرے سے دو ہزار روپے اور تیسرے سے ایک ہزار روپیہ لے کر چلا، اس نے کل سات ہزار روپے ایک دلال کو دیئے، دلال نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر میں آپ کو کارتوس دوں گا، یہ شخص جب طے شدہ مقام پر پہنچا تو اس کی موجودگی میں پولیس نے دلال کو گرفتار کر لیا اور کارتوس وغیرہ ضبط کر لیے، یہ شخص خالی ہاتھ وہاں سے واپس آگیا، بعد میں اس کو پتہ چلا کہ یہ سب دلال کا اپنا چکر تھا اور واقعہ بناوٹی تھا، اس لیے اس نے دلال سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن دلال نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا، وہاں سے ناکام واپس لوٹا، جب ساتھیوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے اس سے اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، اس وقت اس شخص نے کہا کہ تم پرواہ نہ کرو تمہاری رقم میں واپس کروں گا، بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے رقم مجھے مضاربت پر دی تھی اس لیے اس ہلاکت کے بعد میں رقم کا ضامن نہیں، جبکہ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رقم قرضِ حسنہ کے طور پر دی تھی۔ فریقین میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہیں، تو اب فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے یہ رقم اسے بطور قرضِ حسنہ دی تھی کیونکہ مدعیٰ علیہ نے جب یہ کہا کہ تم پرواہ نہ کرو میں تمہاری رقم واپس کروں گا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرضِ حسنہ کا قائل تھا، اب یہ تینوں ساتھی مدعی ہیں اور وہ شخص مدعیٰ علیہ چونکہ ساتھیوں کے پاس گواہ موجود نہیں اس لیے البینۃ للمدعی والیمین علی من انکر کے تحت اس شخص کو قسم دی جائے گی اور اگر وہ قسم کھائے کہ میں نے رقم مضاربت پر لی تھی تو مضاربت ثابت ہونے کے بعد وہ ضمان سے بری الذمہ ہوگا کیونکہ مضاربت میں مال مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے اور امانت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو موجبِ ضمان نہیں اس لیے یہاں بھی ضمان لازم نہیں آئے گی۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: فان زاد الھالک علی الربح فلا ضمان علی المضارب لانہ یمین۔

(الھدایۃ ج۳ ص۲۶۴ کتاب المضاربۃ، فصل فی العزل والقسمۃ) [1]

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم باز رحمہ اللہ: اذا تجاوز مقدار الربح سری الی راس المال فلا یضمنہ المضارب سواء کانت المضاربۃ صحیحۃ او فاسدۃ۔ (شرح المجلۃ۔ المادۃ ۱۴۲۷ ص۷۵۷ الباب الرابع۔ الفصل الثالث)

ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربۃ۔

غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ایک شخص سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۵ آدمی کام کرتے تھے، یہ سارے آدمی چونکہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھے اس لیے حکومت نے ان کو گرفتار کرلیا، اب ان آدمیوں میں سے ایک نے اپنے نگران پر دعویٰ کر دیا کہ اس نے ہماری ذمہ داری لی تھی کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور جو بھی نقصان ہوگا میں اس کا ذمہ دار ہوں، جبکہ نگران انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم بھاگ جاؤ لیکن یہ خود نہیں بھاگ سکے اس لیے میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب مذکورہ بیانات کے تحت فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ دراصل جس شخص نے ان لوگوں کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ ان کی طرف سے کفیل بن گیا تھا اور کفالت کے لیے فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف ان امور میں کفالت معتبر ہے جو کفیل کے دائرہ اختیار میں ہو اور جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اس کے بارے میں کفیل [illegible] نہیں، تو غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کو حقِ سکونت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے یہ کفیل کے دائرہ اختیار میں نہیں اس لیے اس بارہ میں اس آدمی کا اپنی طرف سے وکیل بننا صحیح نہیں، تو جب کفالت ہی صحیح نہیں تو نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وكل حق لا يمكن استيفاءه من الكفيل لا يصح الكفالة به كالحدود والقصاص۔ (الهداية ج۳ ص۱۲۰ كتاب الكفالة) [1]

کسی کے عقد پر دوبارہ عقدِ بیع کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ۱۹۶۶ء سے ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے اور حسبِ دستور دوکاندار مالکِ دوکان کو کرایہ ادا کرتا رہا، مالکِ دوکان کے فوت ہونے کے بعد اس کا بیٹا مسلسل کرایہ وصول کرتا رہا، ۱۹۷۷ء میں موجودہ مالکِ دوکان نے اپنی دوکان فروخت

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله: ان يكون المكفول به مقدور الاستيفاء من الكفيل ليكون العقد مفيداً فلا تجوز الكفالة بالحدود والقصاص لتعذر الاستيفاء من الكفيل فلا تفيد الكفالة فائدتها۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۹ كتاب الكفالة ۔ فصل شرائط الكفالة)

ومثله في مجلة الاحكام، المادة ۶۳۲ ص۳۴۴ الفصل الثاني في شرائط الكفالة۔

کرنے کا اظہار کیا تو کرایہ دار نے اس سے پچاس ہزار کے عوض بات کی، رجسٹری کرانے میں تین دن باقی تھے کہ اس دوران ایک شخص نے دلال کی وساطت سے مالکِ دوکان کے پاس جاکر مذکورہ رقم ادا کرتے ہوئے دوکان اپنے نام رجسٹری کرالی اور اس کے ساتھ دوسری دوکان بھی خرید کر اپنے بھائی کے نام رجسٹری کرالی، اب وہ دوکان فی الحال کرایہ دار کے قبضہ میں ہی ہے اور دوسرا شخص دوکان خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے، اندریں حالات اب یہ دوکان کس کا حق بنتی ہے؟ اس بارے میں شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمائیں؟

الجواب:- اگر کرایہ دار اور مالکِ دوکان کے مابین بیع قطعی ہوئی ہو تو کرایہ دار اس مذکورہ عقد سے مالک بن گیا اگرچہ ابھی تک رجسٹری نہ کرائی ہو کیونکہ عقدِ بیع کی تمامیت کے لیے رجسٹری کرانا شرعاً ضروری نہیں۔ جب بیع قطعی سے کرایہ دار مالک بن گیا تو جو دوکان اسکی دوکان کے ساتھ متصل ہے اگر اس دوکان کا کوئی شریک موجود نہ ہو اور نہ اس کے حقوق میں شریک موجود ہو تو پڑوسی ہونے کے ناطے وہ اس دوکان پر شفعہ کا حق رکھتا ہے تو حقِ شفعہ کی رُو سے وہ اس دوکان کو واپس کرا سکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج ۴ ص ۳۷۷ كتاب الشفعة) ؎۱

باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقدِ بیع سے انکار

سوال:- ایک شخص نے تیس سال قبل اپنی زمین شاملاتِ دیہہ سمیت کسی پر فروخت کی، بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض پر لے لی مگر قرض کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے مشتری نے قرض کی رقم کے بدلے زمین بائع پر دوبارہ فروخت کر دی اور واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن واپسی سے قبل ہی وہ وفات پاگیا، اب بائع اس کے بیٹوں سے زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیٹے زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے باپ نے زمین دوبارہ بائع پر فروخت نہیں کی، اب عقدِ بیع پر مدعی کے پاس گواہ موجود نہیں

؎۱ قال العلامة سليم رستم بازؒ: الثالث ان يكون جاراً ملاصقاً للعقار المبيع۔
(شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۰۸ ص ۵۶۳ كتاب الشفعة)
وَمِثْلُهُ في خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۴۵۴ كتاب الشفعة۔

تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر شاملات موات کے حکم میں ہو اور شرعی اصول کے موافق اس شخص نے اس زمین پر قبضہ کرکے اُسے آباد کیا ہو تو اس زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے بیع نافذ ہے، جب بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض لے لی اور اس کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تو بائع کو اس عقد کے تحت زمین واپس لینے کا حق حاصل ہے، اب بائع چونکہ عقدِ بیع کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے مشتری کے مرنے کے بعد بائع کو اس عقد پر گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مشتری کے بیٹوں کو ان کے علم پر قسم دی جائے گی کہ ان کو معلوم نہیں کہ ان کے والد نے رقم کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تھی، اگر وہ اس پر قسم کھالیں تو فیصلہ بیٹوں کے حق میں ہوگا اور اگر انکار کریں تو زمین بائع کو واپس کی جائے گی۔

كما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: والتحليف على فعل غيره يكون على العلم اى انه لا يعلم انه كذلك لعدم علمه بما فعل غيره۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۲۳ کتاب الدعویٰ) [1]

عقدِ مضاربت کے متعلق ایک فیصلے کی تصحیح

سوال:۔ دو آدمیوں نے مضاربت پر کاروبار شروع کیا، ربّ المال نے ۲ لاکھ روپے مضارب کو دے دیئے اور مضارب نے اس رقم سے کپڑے کی دوکان کھول لی اور اس پر اپنے ایک دوست کو بٹھا دیا اکثر اوقات وہی دوکان چلاتا رہا، رُبّ المال نے اس پر ناراضگی ظاہر کی لیکن اس کے باوجود مضارب نے اپنے دوست کو دوکان سے نہیں ہٹایا، نتیجتاً اس کاروبار میں تیرہ ۱۳ ہزار روپے کا نقصان ہوا، ربّ المال نے دعویٰ کیا کہ مضارب نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر تیرہ ۱۳ ہزار روپے کی چوری کی ہے، جب ربّ المال نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مضارب نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس دوکان پر

---

[1] قال العلامة قاضي سماوة: ولو وقع الدعوى على فعل الغير من كل وجه يحلف على العلم حتى لو ادعى على وارث ان اباك اتلفه او سرقه او غصبه مني يحلف على العلم وهذا مذهبنا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۹۴ الفصل الخامس عشر فی التحليف)

ومثله في فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۲ ص۴۱۴ فصل فيما يتعلق بالنكاح من المهر والولد وغير ذلك۔

میرے ۴۵ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ان دونوں نے ثالث مقرر کیا، اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ دوکان رب المال کے پاس رہے گی اور مضارب ۴۵ ہزار روپے خرچہ ادا کرے گا، ثالث کے اس فیصلے کے مطابق رب المال کو ۵۸ ہزار روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ از روئے شریعت یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ دراصل مضارب کاروبار میں رب المال کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے رب المال جن شرائط کے تحت مضارب کو تصرف کا اختیار دے اُن شرائط کی پابندی مضارب پر لازم ہے اگر ان شرائط کی خلاف ورزی کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی ضمان مضارب پر لازم آئے گی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں جب رب المال نے مضارب کے دوست کو دوکان پر بٹھانے سے روکا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے دوست کو بدستور دوکان پر بٹھائے رکھے لہٰذا اگر رب المال شہادت سے یہ ثابت کرے کہ مضارب نے واقعی خیانت کی ہے تو تجارت کے سامان کو فروخت کرکے رب المال کی رقم پوری کی جائے گی اور جو رقم اس سے بچ جائے اس کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، مضارب نے اپنے خرچہ کے لیے جو رقم لی ہے وہ مضارب کی کمائی سے جدا کی جائے گی۔

لما قال العلامة الكاسانيؒ: فاذا خالف شرط رب المال صار بمنزلة الغاصب ويصير المال مضمونا عليه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۸۷ کتاب المضاربة۔ فصل فی حکم المضاربة) [1]

ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ

سوال: ۔ ایک شخص جو کہ اسّی سال سے زمین میں تصرف کر رہا ہے اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ حکومت کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے اس شرط پر دیا کہ ٹیوب ویل کی نوکری میری ہوگی، ٹیوب ویل لگنے کے بعد اس نے نوکری کے لیے کسی اور شخص کو خرچہ وغیرہ دے دیا، اس شخص نے مالک زمین کو دھوکہ میں رکھا اور ٹیوب ویل کی نوکری اپنے نام منظور کرالی، مالک زمین نے

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز: ۔ واذا تجاوز المضارب حد ماذونيته وخالف الشرط كان غاصباً وفي هذه الحال يعود الربح والخسار في تجارته له وعليه واذا تلف مال المضاربة كان ضامناً۔
(شرح مجلة الاحكام۔ المادة ۱۴۲۹ ص۷۵۴ کتاب المضاربة)
ومثله في الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۵۴۲ کتاب المضاربة۔

اس پر دعویٰ کیا کہ یہ نوکری میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس شرط پر حکومت کو زمین دی ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ نوکری میرا حق بنتا ہے کیونکہ یہ زمین مشترکہ ہے اور شاملات ہے جس میں میرا بھی حصہ ہے اگرچہ متعین نہیں کہ ٹیوب ویل کی جگہ میری ہے یا کسی اور کی، مالکِ زمین نے یہ جواب دیا کہ یہ زمین مجھے اسیؔ سال قبل پوری قوم نے دی تھی۔ تو مذکورہ بالا صورت میں ٹیوب ویل کی نوکری کا حقدار کون ہے؟

سوال:۔ اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین شاملاتِ دیہہ ہے اور پوری قوم نے اس شخص کو دی ہے تو یہ شخص اس پر قبضہ کرنے اور تصرف کرنے سے مالک بن گیا ہے، تو جب اسیؔ سال اُس نے اس زمین میں تصرف کیا اور کسی نے اس پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تو اس کی زمین میں کسی اور کو تصرف کا حق نہیں۔ لہٰذا جب اس نے اپنی زمین ٹیوب ویل لگانے کے لیے دے دی تو یہ زمین وقف ہو گئی اور وقف زمین میں واقف جو شرط لگائے اس کی رعایت کی جائے گی۔ تو جس طرح موقوفہ زمین کا منافع واقف اپنے لیے خاص کر سکتا ہے، اسی طرح اگر مالکِ زمین موقوفہ زمین میں ٹیوب ویل کی نوکری اپنے لیے خاص کرے تو یہ اس کا حق ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور شخص اس نوکری کا حقدار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وذکر الفقیہ ابوجعفر انه لو شرط لنفسه ان یأکل من الغلة یجوز عند محمد ولکن الملك لو شرط الغلة لابیه فهو کاشتراطها لنفسه۔
(الفتاویٰ التاتارخانیة ج۵ ص۷۲۲ الفصل الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف) [1]

بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعویٰ کا جائزہ

فریق اوّل ——— فریق ثانی

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین بذاتِ خود تو حاضر نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نمائندے یعنی وکیل بھیج دیئے اور قرآن و سنت کے تحت فیصلے کے لیے تیار ہوئے لہٰذا

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز جعل غلة الوقف والولایة لنفسه عند الثانی وعلیه الفتویٰ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۴۲۴ کتاب الوقف)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۳۹۸ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط الوقف۔

ان کے نمائندوں کے واسطے سے فریقین کے بیانات سن لیے گئے۔

تنقیحات:۔ مندرجہ بالا فریقین کے نمائندوں کے واسطے سے بیانات سن لیے گئے، ان بیانات سے چند امور سامنے آئے۔

(۱) دونوں فریق آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان کے بیان سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں، جائیداد کی تقسیم کو صرف فریقین تک محدود رکھا جاتا ہے، فریقین کے والد کے تصرفات مابعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے اپنی بہنوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

(۲) فریق اول اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے اپنی حین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی، دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جو کہ ارتل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی مقدار اسی ۸۰ کنال آٹھ ۸ مرلے ہے یہ مجھے دی گئی ہے جو کہ سنہ ۱۹۶۶ء و سنہ ۱۹۶۷ء کی بندوبست میں بحال رکھی گئی ہے، فریق مذکورہ کے بیان کی رو سے فریق ثانی نے یہ جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہے جس کے خلاف فریق اول نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران ایک شخص نے ان میں مصالحت کرا دی۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے کی رقم دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو فریق ثانی نے برضاء و رغبت وصول کی ہے اور بطور بینہ سند تحریری سٹامپ پیش کرتا ہے۔

(۴) فریق ثانی کا بیان ہے کہ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی تھی تاہم اچھی [illegible] ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی، فریق اول نے ساز باز کر کے خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جعلی طور پر اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ ہمارے رجوع کرنے پر عدالت نے بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا دفاعی بیان یہ ہے کہ اس نے فریق اول کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ فریق ثانی نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی تھی اور جس جائیداد سے فریق ثانی نے مصالحت کرائی یہ اس کی جائیداد نہیں تھی بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد تھی یہی وجہ ہے کہ فریق ثانی نے ایک ہزار روپیہ فریق اول کو واپس کر کے مصالحت کو کالعدم قرار دیا ہے۔

حقیقتِ حال:- ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین بہنوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں، یہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر باپ نے دیدہ دانستہ طور پر بیٹوں کے نام جائیداد منتقل کر کے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ناجائز اور حرام حرکت ہے اگرچہ قضاءً ایسے اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عند اللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے واحد ذریعہ یہ ہے کہ ورثاء مورث کی ذمہ داری کی فراغت کیلئے ہر صاحب حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے اس کا گرفتار ہونا یقینی امر ہے تاہم قضاءً والد کے تصرفات نافذ رہیں گے۔

شرعی فیصلہ: جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ سرکاری کاغذات میں محض انتقال کا ہونا نہ تو کسی کی ملکیت کی شرعی دلیل ہے اور نہ اس پر ملکیت موقوف ہے اسلئے فریقین کے والد کے مالکانہ تصرفات کے نفاذ کیلئے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں، جو بھی باقاعدہ گواہوں سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ ولا یعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (مجلة الاحکام، المادة ۱۷۳۶ ص۱۰۹۰)

لیکن بعد ازاں جہاں تک فریقین کے تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت کی صورت ہے تو مصالحت کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہوں کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر فریق ثانی کی رضا و رغبت سے مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ ماننے کے بعد نہ خود فریق ثانی اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں لیکن ایسی مصالحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ فریق ثانی جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہو وہ اس کی ملکیت میں ہو ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں باقاعدہ تقسیم کر کے قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر فریق ثانی کی ملکیت باقی نہیں رہتی اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی متنازعہ جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون مملوکاً للمصالح حتی انه اذا صالح علی مالٍ ثم استحق من ید المدعی لم یصح الصلح لانه تبین انه لیس مملوکاً للمصالح فتبین ان الصلح لم یصح۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۴۸ کتاب الصلح، فصل فی ما شرائط التی المصالح علیه)

تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا فریق ثانی کی ملکیت کے ثبوت کے لیے باقاعدہ

گواہوں کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریقِ اول کی ملکیت پر گواہ پیش ہو جائیں تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہو گی ورنہ پھر فریقِ اول کے مطالبہ پر فریقِ ثانی کو ملکیت سے انکار کرنے پر قسم دی جائے گی اگر فریقِ ثانی قسم کھالے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہو گا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔[1]

عقدِ بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال:- **بیاناتِ فریقین**

فریقِ اول: میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے فلاں محدودہ ۱۳ جریب زمین فریقِ ثانی سے مبلغ ساٹھ (۶۰) ہزار روپے کے عوض خریدی، بیع کے وقت دو (۲) ہزار روپے میں نے ادا کیے باقی رقم دو (۲) قسطوں میں ادا کرنی تھی، ایک قسط مبلغ تیس (۳۰) ہزار روپے میں نے ادا کر دیئے اور باقی رقم بھی ادا کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھ سے رقم لے کر میری خریدی ہوئی زمین مجھے دی جائے۔

فریقِ ثانی:- میں اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ قطعہ اراضی جو کہ میرے اور میرے بھائی کے درمیان مشترکہ ہے اپنے بھائی کی اجازت سے فریقِ اول پر فروخت کی ہے لیکن فروخت کرتے وقت میں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر فلاں قطعہ اراضی جو کہ ایک دوسرے شخص کی ملکیت میں ہے مجھ پر فروخت کرے تو میں بھی یہ زمین فروخت کروں گا، اب چونکہ اُس شخص نے مجھ پر اپنی زمین فروخت نہیں کی لہٰذا میں بھی فروخت نہیں کرتا۔

الجواب:- دعویٰ متعلقہ ۱۳ جریب قطعہ اراضی ــــ مُدعی: مشتری (فریقِ اول) مُدعیٰ علیہ: بائع (فریقِ ثانی) فریقین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اگر مُدعیٰ علیہ کا بھائی کے حصہ میں وکیل بالبیع ہونا مبرہن و مسلّم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد فی دفاتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرّر بخطّه ماعليه فی دفتره الذی يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه علی سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوی الحامدية ج۲ ص۲۱ كتاب الدعوی)
وَمِثْلُهٗ فی تقريرات الرافعی ج۲ ص۹۲ كتاب الدعوی۔

[2] قال العلامة سليم رستم بازؒ: يشترط ان يكون المصالح عليه مال المصالح ومِلكه فلو اعطی المصالح مال غيره ليكون بدلاً للصلح فلا يصح صلحه (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۵۴۵ ص۸۳۴ الباب الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۳ ص۲۴۷ كتاب الصلح۔

ہوتو تمام قطعہ اراضی کی بیع درست ہے اور اگر یہ ولایت ثابت نہ ہو تو پھر بائع کا اپنے حصے میں بیع درست ہو کر بھائی کے حصے کی بیع، بیع فضولی کے حکم میں ہو کر اُس کی اجازت پر موقوف ہے، اگر مذکورہ شرط موجود ہو تو تمام زمین کی بیع درست ہو کر بائع بیع توڑنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ بیع میں مذکورہ شرط نہ تو مقتضیاتِ عقد اور نہ مدعاتِ عقد میں سے ہے کہ جس کا ایفاء ضروری ہے اور نہ اس میں بائع مشتری، مبیعہ کو فائدہ ہے کہ جس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الوجیه بعتك الدار بالف علی یقرضنی فلان الاجنبی عشرة دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولاخیار للبائع ۔
(ردالمحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد، مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر الخ)[1]

شفعہ کے دعویٰ میں راستہ کا شریک پڑوسی پر مقدم ہے

فریق اوّل۔ فریق ثانی۔ فریق ثالث

تنازعہ : ایک عورت کی طرف سے فریق اوّل پر فروخت شدہ مکان محدود بحدود اربعہ غرباً جائیداد والدہ فریق اوّل، شرقاً راہ خاص فریق اوّل وثالث وغیرہ، شمالاً مکان فریق ثالث وجنوباً جائیداد والدفریق اوّل واقع ہے ۔

حق تحکیم : مندرجہ بالا فریقین اپنے علاقہ کے معززین کی نگرانی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوئے، مذکورہ جملہ فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کے لیے سرِتسلیم خم کر کے تیار ہوئے اور تحریری طور پر حلفیہ بیان دے کر قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلہ ماننے کے لیے تیار ہوئے ۔

تنقیحات : جملہ فریقین سے فرداً فرداً بحضور فریق آخر بیان لیا گیا اور تحریر میں لاکر ہر ایک سے دستخط لیے گئے، فریقین کے بیانات کی روشنی میں جو تنقیحات سامنے آئیں

---

[1] قال العلامه ابن نجیمؒ : وفی المنتقی قال محمدؒ کل شیٔ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل ای فالشرط باطل کما اذا اشتری دابة علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل کما اذا شرط علی البائع ان یهبه وکل شیٔ یشترطه علی البائع لایفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو جائز وهو بالخیار۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۶ باب بیع الفاسد)
وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹ ۔

وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) فریق اوّل جس نے یہ مکان خریدا ہے وہ خریدے ہوئے مکان کے راستہ میں شریک ہے جبکہ فریق ہذا اور ثالثان کے بیان کے مطابق راہ عام سے جو خاص راستہ جدا ہو کر آگے آتا ہے تو فریق ثالث وغیرہ کے مکان سے گذر کر متنازعہ فروخت شدہ مکان اور فریق اوّل کے گھر کی طرف جاتا ہے جس میں فریق ثالث بھی آمد و رفت رکھتا ہے لیکن ثالثان کے بیان کے مطابق یہ صرف تین اشخاص کا مخصوص راستہ ہے، بایں معنیٰ یہ کسی عام شخص کو اس راستہ پر آمد و رفت کا حق حاصل نہیں گویا یہ ایک خاص راستہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان ھذا میں کسی قسم کی شرکت کا دعویٰ نہیں رکھتا اور نہ اس مکان کا پڑوسی ہے بلکہ محض اس وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کرتا ہے کہ مکان ھذا میرے بھائی کی ملکیت تھا جس کا میں وارث ہوں، یہ مکان میرے بھائی کو باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا جو کہ فروخت ہوتے وقت صرف اور صرف میرا حق ہے اس لیے میری اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مکان لینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) فریق ثالث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں شفعہ کا دعویٰ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے جس کے لیے طلب مواثبت اور طلب اشہاد کے جملہ مراحل کی تکمیل کا دعویدار ہے اگرچہ فریق اوّل موصوف کے مکان اور متنازعہ مکان کے درمیان مسجد کیلئے باقاعدہ وقف راستہ بیان کر کے ہمسایہ ہونے سے انکار کرتا ہے لیکن فریق ثالث اس پر قائم ہے کہ میں نے اس راستہ پر گذرنے کی ان لوگوں کو عارضی اجازت دی تھی لیکن جب انہوں نے مجھ سے باقاعدہ وقف کا مطالبہ کیا اور میں نے انکار کیا تو اس کے بعد اس راستہ کو فریق اوّل یا کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا چنانچہ موصوف اس راستہ کے نہ ہونے پر مصر ہے اور یوں اپنا موقف مضبوط کر رہا ہے کہ فروخت شدہ مکان سے میرے گھر کی دیوار متصل ہے جس سے مجھے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ حق حاصل ہے۔

<u>حقیقت حال</u> :- مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فروخت شدہ مکان جس کے جنوب میں فریق ثالث کا مکان واقع ہے، اس کے بیان کے مطابق وہ جار ملاحق یعنی جڑا اور ملا ہوا پڑوسی ہے جبکہ فریق اوّل متنازعہ مکان کے راستہ میں شریک ہے بایں معنیٰ کہ یہ راستہ عام نہیں بلکہ خاص راستہ ہے جس میں صرف اس گلی میں رہنے والے شرکاء کو آمد و رفت کا حق حاصل ہے

کوئی عام شخص اس راستہ کو اُن کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کا مجاز نہیں ۔

فقہی نظائر :۔ حدیث کی رُو سے جہاں کسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے تو اس میں راستے کی شرکت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ راستہ میں شریک کو دوسرے پڑوسی پر سبقت حاصل ہو گی اسلئے کہ وہ بیعہ کے حقوق میں شریک ہے لہٰذا جب تک شریک فی حقوق المبیعہ دعویدار ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں دیا جاتا ۔

کما فی الحدیث: عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الجار احق بشفعته ینتظر لهاوان کان غائبًا اذا کان طریقهما واحدًا۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۵۷ باب الشفعۃ)

خاص کر وہ راستہ جو خاص افراد کے لیے مخصوص ہو جس راستہ پر گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عام اشخاص کو آمد و رفت کا حق حاصل نہ ہو تو وہ خاص راستہ کہلاتا ہے ۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: الطریق الخاص هو الزقاق الذی لاینفذ ای کما انه لوفتح اصحاب الطریق الخاص منفذاً وَوَصَلُوهُ بالطریق العام کان لهم ان یمنع غیرهم من المرور فیه ۔ (شرح المجلة مادة ۷۰۰ و ص۵۳۷ کتاب الشفعة)

اس حالت میں جو لوگ گلی کے شروع میں رہتے ہوں ان کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے جبکہ گلی کے آخر میں رہائش رکھنے والے کو پوری گلی میں آمد و رفت کا حق حاصل ہوتا ہے ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: فان کانت سکة غیر نافذة ینشعب فیها سکة غیر نافذة وهی مستطیلة فبیعت دارًا فی السفلی فلاهلها الشفعه خاصة دون اهل العلیا ۔

(الهدایة ج ۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعة)

پڑوسی بلاشک وشبہ شفعہ کا حق دار ہے لیکن یہ تب ہے کہ اس میں حق رکھنے والا شریک فی حقوق المبیعہ نہ ہو جیسا کہ شریک فی نفس المبیعہ کو شریک فی حقوق المبیع پر سبقت حاصل ہے ۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ حق الشفعة اولاً للمشارك فی نفس المبیع ثانیًا للخلیط فی حق المبیع ثالثًا للجار الملاصق وما دام الاول طالبًا لیس للآخرین حق الشفعة وما دام الثانی طالبًا فلیس للثالث حق الشفعة ۔ (مجلة الاحکام ۔ المادة ۱۰۰۹ ص۵۶۴ کتاب الشفعة)

شرعی فیصلہ :۔ ان تنقیحات، حقیقت حال اور فقہی نظائر کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فریق اوّل جس نے یہ مکان باقاعدہ بیع قطعی سے خریدا ہے یہ سکۃ غیر نافذہ یعنی خاص راستہ میں اس گھر کی شرکت کا حق رکھتا ہے اور فریق ثالث نے اگرچہ اپنا پڑوس ثابت کرتے ہیں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن پڑوسی ثابت ہونے کے باوجود خاص راستہ میں شرکاء کا حق اس سے زیادہ ہے جبکہ فریقِ ثانی کا محض بھائی ہونے کے ناطہ سے شفعہ کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس کا کوئی حق نہیں، اس لیے فریقِ اوّل کے معاملہ خرید کو درست تسلیم کرکے مکان اس کے قبضہ میں رکھا جائے یہی فریقِ اوّل اس کا زیادہ حقدار ہے[1]

فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعویٰ کا جائزہ | دعویٰ بابت اراضی

بیان فریقِ اوّل: میرے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے اور فی الحال میں نے فریقِ ثانی کو اجارہ پر دی ہے جبکہ اس کا قبضہ میرے پاس ہے۔

بیان فریقِ ثانی: میرے والد نے یہ زمین فریقِ اوّل کے والد پر فروخت نہیں کی پہلے ہی سے اس پر میری ملکیت چلی آرہی ہے اور زمین میرے قبضہ میں ہے، یہاں تک کہ ہائیکورٹ نے بھی میری ملکیت تسلیم کی ہے۔

تنقیحات: دونوں فریق مذکورہ زمین پر ملکیت اور قبضہ کا دعویٰ کرتے ہیں، فریقِ اوّل تو اس وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اور فی الحال محض اجارہ پر دی ہے۔ فریقِ ثانی اس وجہ سے زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین اس کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور وہ فریقِ اول پر فروخت کرنے سے انکار کرتا ہے، مزید برآں اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی پیش کرتا ہے۔

طریقِ فیصلہ: اگر واقعی ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم کی ہو تو اس فیصلے پر

---

[1] (۱) قال العلامة المرغینانیؒ: فالطریق الخاص ان لا یکون نافذاً۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعة)

(۲) قال العلامة ابن نجیمؒ: ولذا لو بیعت دار فی القصوی لم یکن لاهل الاولی شفعة بخلاف اهل القصوی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱ باب التحکیم)

(۳) قال العلامة المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۶ کتاب الشفعة علی الصفحة الاولیٰ من المجلد الرابع)

عملدرآمد کیا جائے گا اس لیے اگر قبضہ فریقِ ثانی کے پاس نہ ہو تو حق قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم نہ کی ہو تو اگر فریقِ اوّل کے پاس گواہ موجود ہوں تو اس کے مطابق فیصلہ فریقِ اول کے حق میں کیا جائے گا اور اگر فریقِ اوّل گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو فریقِ ثانی چونکہ والد کے شراء سے انکار کرتا ہے اس لیے فریقِ ثانی کو اس کے علم پر قسم دی جائے گی کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے والد نے یہ زمین فروخت کی ہے یا نہیں، اگر اس نے قسم اٹھالی تو زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر اس نے قسم اٹھانے سے انکار کیا تو فیصلہ فریقِ اول کے حق میں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ : والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لایعلم کذلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۳۲۷ کتاب الدعوٰی) [1]

فریقین میں سے ہر ایک کا دوسرے کی مقبوضہ جائیداد میں ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

دعوٰی بابت اراضی

بیان مُدعی: میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مذکورہ اراضی محدود بحدودِ اربعہ جو کہ شرقاً زرد مٹی تک، غرباً سبز درخت تک، جنوباً زیتون کے درخت تک اور شمالاً ندی سے نیچے تک ہے یہ میری ملکیت ہے جس نے اس پر قبضہ کیا ہے یہ ظالمانہ قبضہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ چار اشخاص نے میری زمین کی تحدید کے وقت اس پر قسم کھائی ہے اور خود مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

بیان مُدعیٰ علیہ: میں کہتا ہوں کہ مدعی دعویٰ کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اس نے میری زمین کو ظالمانہ طور پر قبضہ میں رکھا ہوا ہے جو مشترکہ پہاڑی تک میرا حق ہے اور میری طرف سے اس پر چار اشخاص نے قسم بھی کھائی ہے اور مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

فریقِ اوّل : مُدعی ——— فریقِ ثانی : مُدعیٰ علیہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃؒ : لو وقع الدعوٰی علیٰ فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباک اتلفہ او سرقہ او غصبہ متی یحلف علی العلم ہذا مذہبنا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف وما یتعلق بہ)

ومثلہ فی فتاوٰی قاضی خان ج۲ ص۴۱۴ کتاب الحدود۔

حقِ تحکیم : مندرجہ بالا فریقین نے علاقہ کے معززین کی سرپرستی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہو کر اپنے فیصلے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی درخواست کی اور اپنے تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلے کے لیے تیار ہو کر سرِ تسلیم خم کر کے علماء کی کمیٹی کو موقع دکھلانے کی خاطر اپنے علاقہ میں لے گئے، علماء کی کمیٹی نے موقع پر جا کر متنازعہ اراضی کا معائنہ کیا، چونکہ فریقین نے پہلے ہی سے ایک ثالث کو اپنے بیانات قلم بند کرائے تھے اس لیے اپنے سابقہ بیانات پر اکتفاء کرتے ہوئے مزید نئے بیانات دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کمیٹی نے فریقین سے بیانات کے متعلق کچھ اہم سوالات پوچھے تاکہ فریقین کی طرف سے بیانات سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکے۔

تنقیحات :۔ دونوں فریقوں کے بیانات سے چند امور معلوم ہوئے :۔

(۱) فریق اول نے اپنے بیان کی رُو سے جس محدود زمین کا دعوٰی کیا ہے اس میں کچھ زمین ایسی ہے جس پر فریق مخالف کا قبضہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف یہ نہیں کہ مُدعی کے دعوٰی کا رَد کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی زمین کا دعوٰی بھی کیا ہے جس پر فریق اول یعنی مُدعی قابض ہے، گویا اندریں صورت دونوں فریق ایک دوسرے کے دعوٰوں کے رَد کے علاوہ کچھ زائد ایسی زمین کا دعوٰی کر رہے ہیں جس پر دوسرا فریق قابض ہے، اگرچہ موقع دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فریقین کے دعاوی میں وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

حقیقتِ حال :۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے قبضہ کو غاصبانہ اور ظالمانہ جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ فریقین کے درمیان نسبتی قرابت بھی قائم ہے، چونکہ فریقین قریبی نسل میں ایک جد پر ملتے ہیں، قرب وجوار کے حالات، موقع دیکھنے اور دوسرے قرائن پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حالات سامنے آتے ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ تنازعہ کسی خانگی دشمنی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں فریق کچھ عرصہ قبل تک ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہ رہے تھے یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے مُردے بھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہوتے تھے، غم اور خوشی میں ایک دوسرے سے باہمی مشارکت قائم تھی، فریقین کے دعوٰوں کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے ارث کا دعوٰی کر رہا ہے، گویا ہر ایک فریق اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میرے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے اور دُوسرے

فریق کا اس میں کوئی حق نہیں ۔

فقہی نقطہ نگاہ سے اختلاف کا جائزہ:۔ از روئے شرع ایسی حالت میں جہاں دو فریق کسی جائیداد پر قابض ہو کر ایسی جائیداد پر وراثت کی وجہ سے ملکیت کا دعوٰی کرے کہ وہ مخالف فریق کی ملکیت میں ہو تو اس دعوٰی کو دعوٰی رجلین سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں طرفین سے گواہ طلب کیے جاتے ہیں لیکن مذکورہ تنازعہ میں بظاہر گواہوں کے گواہی مشکل ہے کیونکہ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کی تمام قوم قولاً یا فعلاً دونوں فریقوں کی طرفداری میں بھٹک گئی ہے، یہاں تک کہ قرب و جوار میں رہنے والے اور حالات سے واقف لوگ حقیقت حال کے اظہار سے چشم پوشی پر مجبور ہیں اور جو قوم ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کر رہی ہے اس کو صحیح حالات کا علم نہیں، علاوہ ازیں اس علاقہ میں کوئی غیر قوم جو کہ دعوٰی میں شریک نہ ہو کسی دوسری قوم کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آپس میں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے، خاص کر جب گواہی میں قسم کھا کر بیان دینا ہو تو اس کے لیے عام لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ قسم کھا کر بیان دینے کا دوسرا نام گواہی ہے، اس لیے جب گواہ میسر نہ ہو تو پھر دوسرے کے دعوٰی کو دفع کرنے کے لیے مدعی کے مطالبہ پر مدعیٰ علیہ کو قسم دی جاتی ہے ۔

لما قال العلامة المرغيناني، وان عجز عن ذٰلك وطلب يمين خصمه استحلف عليها لما روينا ولابد من طلبه لان اليمين حقه انه كيف اضيف اليه بحرف اللام فلابد من طلبه ۔ (الهداية ج۳ ص۲۰۱ كتاب الدعوٰى)

اور خاص کر ایسی صورت میں جب دونوں قابض بھی ہوں اور ایک دوسرے کی مقبوضہ جائیداد کا دعوٰی کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں ہر ایک قسم کھانے کے بعد دوسرے کو اپنے اپنے حصہ پر بحال رکھا جاتا ہے ۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: ادعيا ملكا ارثاً من ابيهما والعين فی ايدهما وفيه ايضاً ان لم يوجد ما يقضی بينهما او ارخا تاريخاً واحداً يقضی بينهما ۔

(شرح مجلة الاحكام - المادة ۱۷۶۱ ص۱۱۲۵ الفصل الثانی)

آخری فیصلہ: ان حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں فریقوں کی قوموں سے پانچ پانچ افراد منتخب کیے جائیں اور طرفین سے منتخب شدہ افراد دوسرے فریق

کے حق نہ ہونے پر قسم اٹھائیں اور جو جائیداد دونوں قوموں کے قبضہ سے باہر ہو تو قسم اٹھانے کے بعد وہ فریقین کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور جو نقصانات ہوئے ہوں اس کا جبیرہ کیا جائے گا۔[1]

قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ

سوال: (بیانِ فریقِ اوّل) ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی کے مشرقی جانب اخیر میں ہمارے کھیتوں اور مکانات کا ایک قدیم راستہ تھا جس پر لوگوں کی آمدورفت ہوتی تھی، اس کے مغربی جانب ایک بڑی ندی بھی تھی اور اس راستے کے کنارے درختوں کا ایک جھاڑ بھی تھا جو کہ اب بھی موجود ہے۔ یہ راستہ ندی کے ساتھ ساتھ پڑوسی کی زمین سے گذر کر جنوب کی طرف ایک بڑے کنوئیں سے گذرتا تھا، کچھ عرصہ سے لوگوں کی اس راستہ پر آمدورفت کم ہونے کی وجہ سے پڑوسی نے رفتہ رفتہ اس راستہ کو ختم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل بند ہوگیا، اس پر ہم نے راستے پر آمدورفت اور اس کی وسعت کا مطالبہ کیا لیکن پڑوسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے ہمیں اپنے قدیم راستے پر گذرنے اور اس کو وسیع کرنے کا حق دیا جائے۔

(بیانِ فریقِ ثانی) میری زمین میں کوئی قدیم راستہ نہیں البتہ کچھ عرصہ قبل میری زمین میں ایک راستہ تھا اور اس پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی لیکن میں نے بطورِ احسان ان کو یہاں سے گذرنے کی اجازت دی تھی، کیونکہ زمین خریدتے وقت مجھے نہ تو یہاں قدیم راستے کی نشاندہی کی گئی اور نہ اس میں کسی قدیم راستے کے نشانات موجود تھے، لہٰذا میری زمین میں قدیم راستے کا دعویٰ بے جا ہے، اس لیے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زمین میں لوگوں کو

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: فاذا ظهر المدعی العجز عن اثبات دعواه حلف المدعیٰ علیه بطلبه۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۴۲/۱۰۹۳ الفصل الثالث فی التحلیف)

وفی الهندیة: دارٌ فی یدی رجل ادعاها رجلان کل واحد منهما یدعی انها داره ورثها عن ابیه فلانٌ واقام علیٰ ذلك بینةً فان لم یؤرخا او ارخا وتاریخهما علی السواء یقضیٰ بدار بینهما۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص ۴۴ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)۔

گذرنے سے روک لوں۔

الجواب:۔ مندرجہ بالا فریقین کے بیاناتِ موقعہ اور معززینِ قوم کی شہادت کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ فریقِ اوّل جس راستے کا دعویٰ کرتا ہے وہ راستہ چند مہینوں اور سالوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ قدیم مُدت سے قائم ہے، بلکہ بعض معمر افراد کے بیانات کے مطابق پچاس ساٹھ سال یہ لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے بلکہ فریقِ اوّل جس راستہ کی نشاندہی کر رہا ہے اس پر درختوں کی باڑ بھی قائم ہے خاص کر ندی سے گذر کر قدیم راستے کی نشاندہی جس مقام سے ہو رہی ہے وہاں درخت کھڑے ہیں اور اس سے آگے گذر کر جس کنوئیں کے قرب و جوار سے راستہ گذرنے کا کہا جا رہا ہے وہاں پر بھی موجودہ وقت میں کسی قدیم راستے کی نشاندہی نہیں ہوتی، اس کے مقابلے میں مطلوبہ راستہ پر آمد و رفت کا اقرار خود فریقِ ثانی کچھ مدت سے کر رہا ہے، اگرچہ یہ لوگ (فریقِ ثانی) یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمین کے خریدنے کے وقت ہمیں کسی قسم کے راستہ کی نشاندہی نہیں کی گئی، لیکن از رُوئے شرع جو راستہ پہلے سے قائم ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر رکھا جائے گا اور اس راستے سے منع کرنے کا حق فریقِ ثانی کو حاصل نہیں جبکہ ابھی تک یہ راستہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہو رہا ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ کر آئندہ کیلئے بھی آمد و رفت کیلئے استعمال کیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: اذا كان لرجلٍ نهر في ارض رجلٍ او ميزاب في دار رجلٍ فاختلفا في ذلك وانكر صاحب الارض والدار ثبوت حقه فالقول قوله وعلى المدعي البينة ان له حق السيل الاجراء الماء فيه الا اذا كان الماء جاريا زمان الخصومة فحينئذ القول قول صاحب الماء۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۷۷ ص۱۰۱۵ كتاب الدعوى۔ الفصل الثالث)[1]

تاہم موجودہ راستہ سے مغربی جانب فریقِ ثانی کی زمین کی طرف تصرف نہیں کیا جائے گا اگر راستہ میں وسعت کی ضرورت پڑے تو مشرقی جانب ندی کو استعمال میں لایا جائے گا۔

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: اذا كان نهر لرجلٍ يجري في ارض غيره فالدار صاحب الارض ان لا يجري النهر في ارضه ترك على حاله لانه مستعمل له باجراء مائه فعند الاختلاف يكون القول قوله۔ (الهداية ج۴ ص۴۸۶ كتاب احياء الموات۔ فصل في الدعوى والاختلاف)

ومثله في الهندية ج۵ ص۴۰۲ الباب الرابع في الدعوى في الشرب۔

گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال: (بیانِ مدعی) میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے گھاس کے ڈھیر میں عمداً زہریلی دوائی ڈالی جس سے میری ایک بھینس، ایک گائے اور ایک بچھڑا ہلاک ہو گئے، اور اس شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار بھی کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے

(بیانِ مدعیٰ علیہ) میں نے مدعی کے گھاس میں نہ زہریلی دوائی ڈالی ہے اور نہ لوگوں کے سامنے اقرار کیا ہے۔

فیصلہ قاضی: مدعی نے اپنے دعویٰ پر دو گواہ پیش کئے اور انہوں نے گواہی دی کہ ہمارے سامنے مدعیٰ علیہ نے اقرار کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے اور مدعی کے مویشی میں نے ہلاک کئے ہیں۔ اس کے بعد مدعیٰ علیہ نے چار گواہ پیش کیے لیکن قاضی صاحب نے یہ کہا کہ جرح کے گواہ شریعت میں منع ہیں، اس لیے فیصلہ مدعی کے گواہوں پر ہوا۔ تو کیا قاضی صاحب کا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: قضاء کا معاملہ چونکہ حساس نوعیت کا حامل ہے اس لیے قاضی کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہر مسئلے کو حل کرنا چاہیئے، چنانچہ ہر فیصلہ کی حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے شریعت نے زرّین اصول مرتب کیے ہیں تاکہ اس بارے میں ہر کسی کی تسلّی ہو جائے اور کوئی بھی فریق عدمِ اطمینان کا شکار نہ ہونے پائے۔ چونکہ فریقین کے درمیان کسی تنازعہ کے فیصلہ میں مدعی کے گواہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کے گواہوں کا شریعتِ مطہرہ کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں اگر قاضی کے ہاں مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت ہو چکی ہو اور وہ پُراعتماد ہوں تو ان گواہوں پر مدعیٰ علیہ کو جرح وغیرہ کا حق نہیں ہے بلکہ قاضی ان گواہوں کی گواہی کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اگر پہلے سے مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت نہ ہوئی ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کو گواہوں پر جرح کا حق حاصل ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفي رحمه الله: لا تقبل الشهادة على جرح مجرد من اثبات حق لله تعالى او للعبد بعد التعديل ولو قبله قبلت اى الشهادة

بل الاخبار ولو من واحد علی الجرح المجرد۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۴ ص۴۲۸ کتاب الشہادات، باب القبول وعدمہ) [1]

نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ | سوال دعویٰ بابت اراضی

بیان فریق اوّل:۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فریقِ ثانی نے ساٹھ ستر سال سے ہماری پدری جائیداد کے ایک قطعہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اس قطعہ اراضی کا کچھ حصہ کسی اور شخص پر فروخت کر دیا ہے، لہٰذا فروخت شدہ قطعہ اراضی اور فریقِ ثانی کے زیرِ تصرّف زمین میری ہے۔

بیان فریقِ ثانی: یہ قطعہ اراضی ہمارے دادا نے فریقِ اوّل کے دادا سے خریدا تھا جو کہ نوے سال سے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، چالیس سال قبل اس سے کچھ حصّہ ہم نے ایک شخص پر فروخت کیا اور بیع پر خبردار ہونے کے باوجود مُدعی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

ان بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ شرعی اصول کے تحت اوّلاً یہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ فریقِ اوّل نے دعویٰ کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی ہے؟ اگر اس نے دیدہ دانستہ بلا عذر دعویٰ میں اتنی تاخیر کی ہو تو اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے، اور اگر اس نے لاعلمی، خوف یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر کی ہو تو پھر اس کا دعویٰ صحیح ہے۔ چونکہ فریقِ ثانی بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اسلیئے اس پر لازم ہے کہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے سو سالہ دو معتمد گواہ پیش کرے، اگر فریقِ ثانی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر فریقِ اوّل کو اس علم پر قسم دی جائے گی کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دادا نے فریقِ ثانی کے دادا پر زمین فروخت کی تھی؟ اگر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ رحمہ اللہ: لا تقبل الشہادۃ علی الجرح المجرد اذا اقام البینۃ علی العدالۃ اما اذا لم یقم للبینۃ علیہا فاخبر مُخبر ان الشہود فساق او اکلوا الربوا فان الحکم لا یجوز قبل ثبوت العدالۃ لاسیما اذا اخبر مخبر ان الشہود فساق۔ (البحرالرائق ج۷ ص۱۰۱ کتاب الشہادۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ للعلامۃ سلیم رستم بازؒ، المادۃ ۱۷۲۴ ص۱۰۷۱ الفصل السادس۔

فریقِ اول قسم اٹھائے تو اس کی قسم پر فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کرے تو پھر فیصلہ فریقِ ثانی کے حق میں کیا جائے گا۔

قال العلامۃ محمود بن اسماعیل الشہیر بقاضی سماوۃ ؒ: ولو وقع الدعوی علیٰ فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباك اتلفہ اوسرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم ھذا اخذ ھبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۲۱ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقہ) لہ

آباؤ اجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

فریقِ اوّل ـــــ فریقِ ثانی

حقِ تحکیم: فریقین بالا نے برضاء و رغبت اپنے متنازعہ متعلقہ قطعہ اراضی تقریباً ایک سو پچاس جریب مع سرکاری کاغذات شرعی فیصلہ کرانے کیلئے دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء میں پیش ہوئے، ایک معزز شخص کے توسط سے فریقین کو فیصلہ کا پابند رکھنے کے لیے ہر ایک فریق سے تین تین سو روپے بطور ضمانت لئے گئے جو اس معزز شخص کے پاس بطور امانت رکھے گئے اور فیصلہ پر عملدرآمد یقینی ہونے پر طے شدہ تاریخ کے مطابق واپس کر دیئے جائیں گے۔

تنقیحات: فریقین کے بیانات سننے کے بعد مندرجہ ذیل امور سامنے آئے:۔

(۱) فریقِ ثانی زیرِ تنازعہ قطعہ اراضی کا قابض ہو کر فریقِ اوّل اس میں ۴/۱ حصہ کی ملکیت کا دعویدار ہے اور بیان کرتا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے آباؤ اجداد سے ہمارے آباؤ اجداد کا مشترکہ کاروبار تھا اور متنازعہ جائیداد مشترکہ کھاتہ سے خریدی گئی ہے جس میں ہمارے باپ مدعیٰ علیہم کے باپ وغیرہ سے ۴/۱ حصہ کا حقدار ہے۔

(۲) فریقِ اوّل اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ایک تحریر پیش کر رہا ہے جو مدعیٰ علیہم کے باپ کے نام منسوب ہے جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ مدعی کا باپ ہمارے ساتھ اس خریدی ہوئی جائیداد میں برابر کا حصہ دار ہے، اگرچہ سرکاری کاغذات میں نام کا اندراج رہ گیا ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کا

لہ قال العلامۃ تمرتاشی ؒ: والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لایعلم کذلك لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۷۳ کتاب الدعویٰ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج ۲ ص ۴۱۴ کتاب الحدود۔

نام درج کیا جائے گا تاہم تحریر پر موقعہ کی تاریخ ڈالی گئی ہے البتہ بعد میں ۱۹۷۵ء کا سال لکھا ہوا نظر آرہا ہے جبکہ توثیق ۱۹۸۶ء میں کی گئی ہے۔

(۳) فریق اوّل علاوہ ازیں حاصلات کی وصولی کا بحیثیّت مالک ہونے اور اس کی حصہ داری کا دعوٰی کرتا ہے کہ ہم نے مُدّتِ دراز تک اس کے حاصلات لیے ہیں جبکہ فریق ثانی محض تبرّع و احسان اور خریداری کے وقت ایک معاہدہ کے تحت کچھ وقت تک اس کی ادائیگی کے قائل ہیں لیکن مُدعیٰ علیہم کے باپ کی موت سے یہ مراعات بھی ختم ہوگئیں، یعنی فریق ثانی کا بیان ہے کہ یہ مراعات ان کو اس معاہدہ کے تحت دی گئی تھیں کہ خریدنے کے بعد زمین کے قبضہ کی وصولی تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ فریق اول کے باپ کے پاس یہ جائیداد اس وقت رہن تھی۔

فیصلہ: از روئے شرع فریق اوّل مُدعی ہے اس لیے دعوٰی کے اثبات کے لیے اُس سے گواہ مانگے گئے لیکن وہ اپنے دعوٰی ملکیت کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے سے قاصر رہا کیونکہ تحریری بیان پر جن گواہوں کے نام ثبت ہیں ان میں سے حسب بیان مُدعی ایک گواہ مخالف فریق سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے لیے گواہی نہیں دیتا جبکہ دوسرا گواہ اکیلے ناکافی ہے اس لیے فریق اوّل یعنی مُدعی کے مطالبہ پر فریق ثانی کو قسم دی گئی، چونکہ یہ دوسرے کے فعل پر قسم ہے اس لیے فریق ثانی کو قسم بالعلم دی گئی[1] قسم کھانے کے بعد جائیداد مذکورہ فریق ثانی کے پاس رہ کر فریقِ اوّل اپنے دعوٰی کے اثبات میں ناکام ہوا۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انه لایعلم انه کذٰلک لعدم علمه بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص۴۷۳ کتاب القضاء)

---

[1] لما قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بقاضی سماوہ رحمه الله: ولو وقع الدعوٰی علیٰ فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان ایاک اتلفه اوسرقه او غصبه منی یحلف علی العلم وهٰذا مذهبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقه)

ومِثلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۴۱۴ باب مایکرہ من الثیاب والحلی والزینة۔

فیصلہ شرعی درباب شفعہ

دعوٰی

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات

بنام

(۱) رحمت اللہ جان ولد نورا جان سکنہ محلہ رحمانیہ نزد رحمانیہ مسجد عیدگاہ میدان مٹھیا نے کالونی، منگھو پیر روڈ کراچی۔

(۲) خان بہادر ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات (مدعا علیہم)

دعوٰی دخلیابی بہ نفاذ حق شفعہ اراضی زرعی مشتمل بر پانچ قطعات معروف بہ ۱۔ اکس ۲۔ شونگرہ ۳۔ للمہ ۴۔ جماعت باڑئی ۵۔ ناغہ غیر آباد بحدود ذیل!

قطعہ ۱۔ اکس: شرقاً: اراضی مدعی۔ غرباً، اراضی گل محمود۔ شمالاً: اراضی عبدالظاہر، جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ برادر مدعی۔

قطعہ ۲۔ شونگرہ:۔ شرقاً اراضی مفتاح الدین (مدعی)، غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ، شمالاً: اراضی مدعی۔ جنوباً اراضی مدعی۔

قطعہ ۳۔ للمہ:۔ شرقاً، اراضی مدعی۔ غرباً: بارانی ندی نالہ۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔

قطعہ ۴۔ جماعت باڑئی،۔ شرقاً، اراضی نیک محمد۔ غرباً، اراضی گل اعظم خان۔ شمالاً، اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی گل اعظم خان۔

قطعہ ۵۔ ناغہ (غیر آباد) شرقاً: اراضی ومکان مدعی۔ غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ شمالاً، راہ عام۔ جنوباً، اراضی عبدالظاہر واقع شگہ مجد رقبہ سیرائی تحصیل وضلع دیر بہ ادائیگی اصل زر ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی درست قیمت فاضل عدالت مقرر کرے۔

مالیت دعوٰی بغرض کورٹ فیس واختیار سماعت مبلغ -/۱۰۰۰۰۰ روپے

بنائے دعوٰی ۹/۹۸/۱۸ کو بیع کا علم واعلان بر شفعہ اندر حدود تحصیل دیر پیدا ہوئی۔

جنابِ عالی! گذارش حسب ذیل ہے :۔

(۱) یہ کہ مدعا علیہ ۱ نے ہر پانچ قطعاتِ الاضیات متدعویہ ازاں مدعا علیہ ۲ بعوض مبلغ ایک لاکھ روپے (.....۱) خفیہ طور پر بیع کی ہوئی ہے اور جملہ لین دین کو اخفاً میں رکھ کر حسب قانونِ مروجہ مدعی کو قبل از بیع کوئی نوٹس نہ دیا ہے۔

(۲) یہ کہ مدعا علیہم نے مدعی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے لیے اگر اپنے خانگی بیع نامہ میں زیادہ رقم درج کی ہو تو وہ فرضی ہوگی، حالانکہ بیع اصل میں ایک لاکھ روپے کے عوض ہوئی ہے اور یہی اراضیات متدعویہ کی بازاری قیمت ہے۔

(۳) یہ کہ مدعی کو مذکورہ بیع کا علم مورخہ ۹۸/۸/۸ کو بوقتِ صبح آٹھ بجے گھر خود بمقام ڈیرہ ہو کر اطلاع دہندہ مسمی عبدالظاہر سکنہ شگی کے رُوبرو فی الفور اور برموقع اپنے حق شفعہ کا اعلان کیا، اور ساتھ ہی اسی روز ہمراہ اطلاع دہندہ اراضیات متدعویہ پر جا کر کاشتکارانِ اراضیات مشفوعہ مسمیان عبدالحمید اور محمد طیب ساکنان شگی کے علاوہ گواہان عباس خان، اجمیر خان وحمیداللہ خان ساکنان سیرائی کی موجودگی میں اپنے حق شفعہ کا پھر اعلان کیا۔

(۴) یہ کہ بعد ازاں بروئے تحریر مورخہ ۹۸/۸/۲۲ کو مدعا علیہ ۱ بذریعہ رجسٹری اے ڈی نوٹس بھیج کر جملہ طلبات اسلامی پورے کئے۔ (نقل رسید نوٹس کارڈ لف ہیں)

(۵) یہ کہ مدعی کا حقِ شفعہ بمقابل مدعا علیہ ۱ ہر لحاظ سے فائق تر ہے۔

(الف) یہ کہ اراضی متدعویہ خاندانی اراضی ہے۔

(ب) یہ کہ اراضی متدعویہ کے پیوست مدعی کی اراضیات ہیں۔

(ج) یہ کہ اراضیاتِ مشفوعہ کے ساتھ مدعی کے جملہ حقوق آب نالش وراہ ہیں۔

اراضی متدعویہ و مدعی کی اراضیات ایک ہی نالہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

(د) یہ کہ مدعا علیہ ۱ علاقہ میں غیر مالک و نیز غیر باشندہ ہے اور اس کا کوئی بھی وصف حق شفعہ نہ ہے۔

(۳) یہ کہ مدعی کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں۔

(۶) یہ کہ ہر چند مدعا علیہم سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حقوقِ مدعی کو تسلیم کر کے اراضیاتِ متدعویہ سے بحق مدعی بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن دستبردار ہو جائے مگر وہ انکاری ہیں جس کی بناء پر

دعویٰ ہذا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۷) بنائے دعویٰ و مالبتِ دعویٰ مندرجہ عنوان عرض دعویٰ ہے۔

(۸) یہ کہ اراضیات متدعویہ تحصیل دیر میں واقع ہے اس لیے عدالت ہذا کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ڈگری دخلیابی بہ نفاذ حقِ شفعہ بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی قیمت فاضل عدالت ہذا مقرر کرے بہ حق مُدعی بمع خرچہ صادر فرمایا جائے۔

العارض

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار سکنہ دیر (مُدعی)

بیانِ حلفی :۔ حلفاً عرض ہے کہ جملہ مراتب برعرض دعویٰ درست ہیں۔

جوابِ دعویٰ منجانب مدعا علیہم

جناب عالی! جوابِ دعویٰ ذیل عرض ہے :۔

تمہیدی عُذرات :۔

(۱) مدعی کو بہ خلافِ مدعا علیہ کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہ ہے۔

(۲) دعویٰ مُدعی مبہم اور ناقص ہے۔

(۳) دعویٰ مُدعی سازشی ہے اور بدنیتی و ایذاء رسانی پر مبنی ہے۔

(۴) حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(۵) اراضی متدعویہ مُدعا علیہ ۲ و برادر خورد (بہادر زیب) جو کہ فالج کا مریض تھا کا حصہ رسدی ملکیت تھا، مُدعی و دُوسرے برادران کے خریدنے سے انکار پر مجبوراً علاج کی غرض سے مسمی متذکرہ پر نزد مدعا علیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار (۳۶۰۰۰۰) روپیہ فروخت کی تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(۶) دعویٰ مُدعی بوجہ عدم اشتمال ضروری فریق نا قابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(۷) مُدعی کو بیعہ کا خوب علم تھا اور بر وقت حسبِ قانون دعویٰ نہ کیا اور اب دعویٰ ھٰذا بہ ایماء عبدالظاہر سازش اور ایذاء رسانی کی خاطر کیا گیا ہے۔

(۸) مُدعی نے حسبِ قانونِ شفعہ پورے نہیں کئے ہیں۔

(۹) مدعی بوجہ قول وفعل میں تضاد کے خود مانع دعوٰی ھٰذا ہے۔
(۱۰) بوجہ عدم چسپانگی کورٹ فیس بھی دعوئ مُدعی ناقابلِ پیش رفت و قابلِ اخراج ہے۔
(۱۱) دعوئ مُدعی از خود زائدالمیعاد ہے۔

واقعاتی عُذرات

(I) فقرہ ۱ جیساکہ مرتب کردہ ہے غلط اور من گھڑت ہے اور انکار ہے۔ بجواب عرض ہے کہ اراضی متدعویہ مدعاعلیہ ۲ و برادر مسمّی بہادر زیب کی حقہ رسدی ملکیت تھی، مسمّی بہادر زیب فالج کا مریض تھا، کے علاج معالجہ کے لیے بعد از اطلاع وخرید نے سے مُدعی ودیگر برادران کے انکار پر مجبوراً نزد مدعاعلیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (۳۶۰۰۰۰) فروخت کی گئی، نقل بیعنامہ لف ہٰذا ہے۔
(II) فقرہ ۲ غلط، بلاجواز اور جھوٹ پر مبنی ہے اس لیے انکار ہے، اراضی متدعویہ کی قیمت اُس وقت -/۳۶۰۰۰۰ روپے تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔
(III) فقرہ ۳ بھی غلط، خلافِ قانون وخلافِ شرع ہے، بیانِ حلفی دریں بارہ لف ہے۔
(IV) فقرہ ۴ غلط، خلافِ قانون ہے، مدعی نے حسبِ قانون طلباتِ اسلامی پورے نہیں کیے ہیں۔
(V) فقرہ ۵ کا بہ تفصیل جواب ذیل عرض ہے:-
(ا) جُز ھٰذا غلط اور بلاجواز ہے۔
(ب) جُز ھٰذا بھی غلط ہے، حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔
(ج) جُز (ج) بھی غلط اور بلاجواز ہے۔
(د) جُز (د) بھی غلط ہے۔
(ہ) جُز (ہ) غلط ہے، مدعی بوجہ تضاد قول وفعل خود مانع عذر ھٰذا ہے۔
(VI) فقرہ ۶ غلط، خلافِ قانون وخلافِ شرع ہے اس لیے انکار ہے اور مدعی کو کوئی بنائے دعوٰی حاصل نہیں۔
(VII) متدعویہ کی قیمت لاکھوں روپے ہے ــــــــــــــ اور کورٹ فیس دعوٰی مُدعی ناقابلِ سماعت وقابلِ اخراج ہے۔
(VIII) فقرہ ۸

فیصلہ

اسلامی قانون میں شفعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی مشروعیت کسی کے ضرر سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس کا حق صرف تین اشخاص یعنی شریک فی نفس المبیع، شریک فی حق المبیع اور پڑوسی کو حاصل ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخليط فی نفس المبيع ثم للخليط فی حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج۴ ص۳۸۷ كتاب الشفعة)

(۱) ان تینوں کو تب حق شفعہ حاصل ہوگا کہ علم ہوتے ہی طلب المواثبہ اور ایسے الفاظ کہے جس سے حق شفعہ کا مطالبہ کرنا ظاہر ہوتا ہو، اس طلب پر گواہ بنانا ضروری نہیں تاہم بہتر ضرور ہے۔

لما فی الهداية: اذا علم الشفيع اشهد فی مجلسه ذلك على المطالبة واعلم ان الطلب على ثلاثة اوجه طلب المواثبة وهو ان يطلبها كما علم حتى لو بلغ الشفيع البيع ولم يطلب شفعته بطلت الشفعة۔ (الهداية ج۴ ص۳۹۰ كتاب الشفعة)

آگے لکھتے ہیں: والاشهاد فيه ليس بلازم انما لنفى التجاحد۔ (الهداية ج۴ ص۳۹۱ كتاب الشفعة)

قال العلامة البابرتیؒ: والاشهاد فی ذلك ليس بشرط۔ العناية شرح الهداية

وفی شرح المجلة: ويلزم الشفيع ان يقول كلاماً يدل على طلب الشفعة فی المجلس الذی سمع فيه عقد البيع فی الحال كقوله انا شفيع المبيع او اطلبه بالشفعة ويقال لهذا طلب المواثبة۔ (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۲ ص۷۸۹ الفصل الثالث)

(۲) طلب المواثبہ کے بعد شفیع پر طلب التقریر والاشہاد کرنا ضروری ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ شفیع بائع یا مشتری یا مشفوعہ زمین وغیرہ کے پاس اپنا طلب شفعہ ظاہر کرے اگرچہ خط کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، مگر بلا عذر شرعی زیادہ تاخیر کرنا مبطل الشفعہ ہے۔

لما فی شرح المجلة: ومدة هذا الطلب ليس على الفور كطلب المواثبة بل هی مقدرة بمدة التمكن من الاشهاد وهذا الطلب لابد منه بعد طلب المواثبة حتى لو تمكن ولو بكتاب او رسول ولم يشهد بطلت شفعته۔ اھ

(شرح المجلة لرستم باز ص۵۹۱ المادة ۱۰۳۰)

اس طلب التقریر پر گواہ بنانا ضروری ہے تاکہ خصم کوئی بات نہ کر سکے۔

لما فی شرح المجلة : ویجب علی الشفیع بعد طلب المواثبة ان یطلب التقریر وان یشهد بان یقول فی حضور رجلین عند العقار المبیع ۔ (درر الحکام شرح مجلة الحکام ج ۲ ص ۷۹۵ کتاب الشفعة)

ورنہ دراصل دونوں طلبات میں گواہ بنانا کوئی شرط نہیں ۔

لانہ قد جرح فی الخانیة والبدائع بان الاشہاد لیس شرطاً فی صحة الطلب المذکور بل انما یجب الاشہاد للتمکن من الاثبات باقامة الشہود فیما اذا انکر الخصم الذی ھو المشتری وقوع طلب التقریر والاشہاد حتیٰ ان الشفیع لو اجری طلب التقریر بلا اشہاد واقر بہ المشتری وصدقہ او نکل المشتری عن الیمین المکلف بہا فیثبت ویتحقق طلب التقریر ۔

(درر الحکام شرح مجلة الحکام ج ۲ ص ۷۹۵ کتاب الشفعة)

(۳) اس سے فراغت کے بعد شفیع پر طلب الخصومة ضروری ہے کہ قاضی یا علاقائی مجسٹریٹ کے پاس شفعہ کا دعویٰ دائر کرے ، لیکن یہ طلب اس وقت ضروری ہے جب مشتری شفیع کو مشفوعہ زمین دینے سے انکاری ہو ، اگر مشتری بغیر عدالتی کارروائی کے شفیع کو مشفوعہ شئے حوالہ کردے تو اس طلب کی کوئی ضرورت نہیں ۔

کما فی شرح المجلة ، ویلزم ان یطلب الشفیع و یدعیٰ فی حضور الحاکم بعد طلب التقریر والاشہاد ویقال لهذا طلب الخصومة والتملك یجب علی الشفیع اذا لم یسلمہ المشتری العقار المشفوع بعد طلب التقریر والاشہاد ان یطلب الشفعة ویدعی فی حضور الحاکم ۔۔۔۔ لو سلم المشتری العقار المشفوع برضائہ للشفیع بناءً علی شفعتہ فلا حاجة لطلب الخصومة بعد ۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۲ ص ۷۹۶)

اس طلب میں ایک ماہ سے کم تک بلا عذر تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ ایک ماہ تک بلا عذرِ شرعی تاخیر مبطلِ شفعہ ہے اور عذرِ شرعی کی وجہ سے کوئی تحدید نہیں ۔

لما فی شرح المجلة : واخر الشفیع طلب الخصومة بعد طلب التقریر والاشہاد من دون عذر شرعی ککونہ فی دیار یسقط حق شفعتہ ۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۲ ص ۸۰۴ م ۱۰۳۴)

قال البابرتیؒ : معناہ اذا ترکہا من غیر عذر لانہم اجمعوا علی انہ اذا ترك بمرض او حبس او غیر ذلك ولم یمکنہ التوکیل بہذا الطلب لا تبطل شفعتہ وان طالت المدة ۔ (العنایة شرح الہدایة)

لہٰذا مثل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ولد عبد المالک سابق سپہ سالار دیر نے

درباب شفعہ جملہ شرعی تقاضے پورے کئے ہیں۔
(۱) زمین کی بیان کردہ حدودات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمّی مفتاح الدین ان اراضی میں حق الشرب والطریق کا اشتراک رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان اراضی کا جار یعنی پڑوسی بھی ہے، اور یہ تو مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں حقِ شفعہ کے اسباب ہیں۔
(۲) اور پھر موصوف نے طلب المواثبہ بھی بروقت علم ہوتے ہی کیا ہے اور ساتھ ہی طلب التقریر والاشہاد بر مشفوعہ زمین کے ساتھ کاشتکاران اراضی کے سامنے مسمّی اجمیر خان، عباس اور حمید اللہ خان کو گواہ بنا کر حقِ شفعہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا اگر مدعا علیہ رحمت اللہ خان ان طلبات کا منکر ہو اور مذکورہ گواہان مسمی مفتاح الدین ولد عبدالمالک (مدعی) کی اس طلب التقریر کی گواہی دیں تو دعوٰی قابلِ سماعت ہے۔
(۳) اور طلب الخصومۃ کی دعوٰی میں تاخیر زائد المیعاد نہیں اس لیے کہ ایک ماہ سے کم کی مدت تک بلا عذرِ شرعی تاخیر کرنا بھی مبطلِ شفعہ نہیں جبکہ موصوف نے ایک ماہ سے بھی کم مدت کی تاخیر کی ہے اور باہمی اصلاح وغیرہ کے لیے بھی کی گئی ہے جیسا کہ تحریری نوٹس اور علاقائی جرگہ کے بیانِ تحریری سے معلوم ہوتا ہے۔
(۴) اور ساتھ ہی آپ کا یہ مطالبہ مدعا علیہ مسمّی رحمت اللہ جان نے علاقائی جرگہ کے سامنے تسلیم کیا ہے اور جرگہ والوں نے فیصلہ بھی مدعی مفتاح الدین کے حق میں کیا ہے جس پر مرسولہ بیان کی تحریر شاہد ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس اراضی کا حقِ شفعہ مدعی مسمّی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو حاصل ہے۔

تاہم اگر مدعیٰ علیہ اس بات پر گواہ پیش کردے کہ مدعی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو ان اراضی کی بیع کی اطلاع طلب المواثبۃ کی تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاموش رہا یا انکار کیا تو پھر مفتاح الدین کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی خاموشی یا انکار سے باطل ہو چکا ہے جیسا کہ ماقبل کی تصریحات سے معلوم ہوا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا

سوال :۔ غلام رسول، غلام حسین اور بخت رسول تین بھائی ہیں، ان کے مابین کاروباری تنازعہ تھا، مؤرخہ ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو ان کے درمیان رُوبرو گواہان یہ فیصلہ بطور راضی نامہ طے پایا کہ آئندہ کے لیے ہم تینوں میں سے جس کے پاس نقد رقم، پنشن اور زر خرید اراضی ہیں سے جس کے نام پر بیع نامہ ہو وہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض یا دعویٰ وغیرہ نہیں کرے گا، راضی نامہ پر تینوں بھائیوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اب راضی نامہ کے آٹھ ماہ بعد بخت رسول نے راضی نامہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ غلام حسین کے پاس ہماری مشترکہ رقم اور زر خرید اراضی ہے اگر وہ نہیں مانتا تو قسم اٹھائے کہ میرے پاس مشترکہ رقم اور زر خرید اراضی نہیں ۔۔۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بخت رسول کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟ اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کر کے اپنے بھائی غلام حسین سے حلف لے لے، جبکہ وہ یہ تمام کاروائی صرف اپنے بھائی کو ذلیل ورسوا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :۔ قانونِ شرعی کے مطابق جب کسی نزاع کے فیصلہ کا حل درکار ہو تو البینۃ علی المُدعی والیمین علیٰ من انکر (الحدیث) کی رُو سے مُدعی کے ذمہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہوں کا پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر مُدعی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو تو مُدعی کے مطالبہ پر مُدعا علیہ سے قسم لی جائے گی ۔ یہ کاروائی تب صحیح اور درست ہوگی اور اس طریقے پر فیصلہ تب کیا جائے گا جب دعویٰ قابلِ سماعت ہو۔

صورتِ مسئولہ میں راضی نامہ کے جملہ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت رسول کا اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف یہ دعویٰ اُس صلح اور راضی نامہ کے بعد کا ہے جو ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو گواہوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے کہ بخت رسول نے اپنا دعویٰ سول جج کی عدالت میں دائر کیا ہے۔ اس لیے شرعاً اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی مُدعی کے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مُدعیٰ علیہ غلام حسین وغیرہ سے یمین (قسم) لینے کی، بشرطیکہ مذکورہ صلح نامہ

شرعی قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس لیے کہ جب کسی نزاع سے متعلق شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق فریقین میں ایک بار صلح ہو جائے تو پھر بدون رضا فریقین کوئی ایک فریق از خود اس کو فسخ (ختم) نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بخت رسول کا راضی نامہ کے بعد غلام حسین پر دعویٰ کرنا شرعاً غیر مسموع اور ناقابل اعتبار ہے اور غلام حسین کو حلف دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: اذا تم الصلح فليس لواحد من الطرفين فقط الرجوع ويملك المدعى بالصلح بدله ولا يبقى له حق فى الدعوى وليس للمدعى عليه ايضًا استرداد بدل الصلح۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۴ ص ۵۶۹ المادة ۱۵۵۶) [1]

مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہو جانا مسقطِ دعویٰ نہیں

سوال:۔ ایک صاحب نے علاقہ دیر میں قاضی کے سامنے ایک قطعہ زمین پر دعویٰ کیا جس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا مگر بدقسمتی سے مقدارِ زمین میں غلطی کر گیا، کاغذات میں وہ زمین پانچ ایکڑ ہے اور مدعی نے دعویٰ میں چار ایکڑ کا ذکر کیا، اس پر قاضی نے اُسے جھوٹا قرار دے کر اس کے دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے، تو کیا واقعی یہ دعویٰ شرعاً ناقابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ ایسا دعویٰ کرتے وقت مدعیٰ بہ کا حدود اربعہ صحیح بیان کرنا ضروری ہوتا ہے مقدار کا بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی مُدعی بوقتِ دعویٰ مقدار کے بیان کرنے میں غلطی کر جائے اور حدود اربعہ درست بیان کیا ہو تو دعویٰ قابلِ سماعت ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں قاضی صاحب نے بلا تحقیق و بلا عذر شرعی دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعى فى بيان الحدود واخطاء فى بيان مقدار ذراع العقار او دونه لا يمنع صحة دعواه۔ (مجلة الاحکام العدلية۔ المادة ۱۶۲۴)

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: تحت هٰذه القاعدة: سواء كان الصلح عن اقرار او انكار او سكوت حتى لو ادعى عليه شيئًا فانكر فصالحه على شئ ثم اقر المدعى عليه لا يلزمه ما اقر به وكذا لو برهن المدعى بعد صلحه لا يقبل لان الصلح عقد لازم ليس لاحدهما نقضه الخ

(شرح مجلة الاحکام لسليم رستم باز ص ۸۲۵ الباب الرابع)

دعوٰی ہبہ کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے

سوال :- زید کا ایک قطعۂ اراضی پر قبضہ اور تصرف ہے اور اس کا دعوٰی ہے کہ یہ زمین مجھے بکر نے ہبہ کی تھی، جبکہ بکر کے بیٹے کا دعوٰی ہے کہ یہ زمین میرے والد کی میراث ہے لہٰذا یہ میرا حق ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ زمین کس کا حق ہے؟

الجواب :- اگر زید اپنا دعوٰی ہبہ معتبر شہادت سے ثابت کرے تو یہ زمین اس کا حق ہے ورنہ بکر کے بیٹے کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ : سُئلت فی رجل ادعٰی علٰی اٰخر عقاراً انه ملکهٗ تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعٰی علیه بانی اشتریته من ابیك حال حیاته وانهٗ فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علٰی خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی هل یکون جواب المدعٰی علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج الٰی بیّنة تشهد لهٗ بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة فاجبت نعم جواب المدعٰی علیه من قبیل دعوٰی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار لهٗ بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الٰی بینة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه الید المدة المذکورة مع الاقرار المذکور ولیس هٰذا من باب ترك الدعوٰی بل من باب المواخذة بالاقرار ومن اقر لشیء لغیره اخذ باقراره ولوکان فی یده احقاباً کثیرة لا تعد افاده المحقق الرملی فی فتاوٰی الخیریة۔ واللہ تعالٰی اعلم۔ (فتاوٰی کاملیة ص۱۲۳ کتاب الدعوٰی) [1]

الحق لایسقط بتقادم الزمان کا مطلب

سوال :- ایک شخص نے آج سے ۳۷ سال پہلے کچھ زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کی اور وہ اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے، اب اس کی وفات کے بعد دیگر ورثاء حقداری کا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : اذا اراد الرجل ان یحلف علٰی فعل نفسه یحلف علی البتات یعنی یحلف علی القطع بان هٰذا الشیٔ کذا ولیس بکذا اما اذا اراد ان یحلف علٰی فعل غیره یحلف علٰی عدم العلم یعنی یحلف علٰی عدم علمه بذالك الشیٔ۔ (شرح المجلة ص۱۱۰۱ المادة ۱۷۴۸)

دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟ جبکہ فتاویٰ انقرویہ جلد ۲ ص۵۸ میں ہے کہ :
وفی المبسوط رجل ترك الدعوی ثلاثًا وثلاثین سنة ولم یکن له مانع من الدعوی ثم ادعیٰ لا تسمع دعواه لان ترك الدعوی مع التمکن علیه یدل علی عدم الحق ظاهرًا۔ انتهٰی
جناب مفتی صاحب! مسئلہ ہٰذا کا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب: شرح المجلہ میں ہے کہ : اذا ترك المورث الدعوی مدة وترکها الوارث ایضًا مدة وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (ج ۵ ص۱۸۷ المادة ۱۶۷)
اس سے معلوم ہوا کہ مورث اور اس کے وارث نے جب اپنا دعویٰ ۳۶ سال تک چھوڑا ہوا اور کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو تو ایسا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے، البتہ جب مدعیٰ علیہ یہ مانتا ہو کہ مدعی کا حقِ ارث ہمارے ذمہ باقی ہے تو پھر سینکڑوں سال گذرنے کے باوجود بھی دعویٰ مسموع ہوگا اور حق دینا ہوگا، اور یہی معنیٰ ہے فقہاء کے اس قول کا کہ الحق لا یسقط بتقادم الزمان ..... [1]

دعویٰ کب تک قابلِ سماعت ہے

سوال: ایک آدمی ایک قطعہ اراضی پر ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے قابض اور اس میں مالکانہ تصرفات کرتا چلا آرہا ہے، اب ایک دوسرا شخص اس قطعہ زمین پر ارث کا دعویٰ کرتا ہے، تو کیا شرعًا اس شخص کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے یا نہیں ؟ اور کیا اس تاخیر سے اس شخص کا استحقاق باطل ہو جاتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: سماعِ دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہوئی جو ۳۶ سال تک پہنچتی ہو، اسی طرح مدعیٰ علیہ کسی طرح مقر بھی نہ ہو اور نہ ہی مدعی اس مدت میں غائب، بچہ اور پاگل بغیر ولی کے ہو۔ اور اگر دعویٰ کرنے میں ۳۶ سال یا اس سے زیادہ مدت گذر جائے، اسی طرح دیگر شرائط بھی قبولِ دعویٰ کی مفقود ہوں تو دعویٰ قابلِ سماعت نہ رہے گا۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی اس دوسرے شخص کا ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد دعوئ ارث

---

[1] لما فی مجلة الاحکام، لا یسقط الحق بتقادم الزمان فاذا اقر المدعیٰ علیه واعترف صراحة فی حضور الحاکم بان حق المدعی عنده فی الحال علی الوجه الذی یدعیه وکان قد مر الزمان علی الدعوی فلا یعتبر مرور الزمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه۔ (شرح المجلہ ص۹۹۶ المادة ۱۶۷۴)

قابلِ سماعت نہیں، تاہم مرورِ زمانہ کی وجہ سے استحقاق باطل نہیں ہوتا، کیونکہ الحق لایسقط بتقادم الزمان۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللہ، قال المتاخرون من اھل الفتویٰ لاتسمع الدعویٰ بعد ست وثلثین سنۃ الا ان یکون المدعی غائبًا اوصبیًا او مجنونًا ولیس لھما ولی او المدعیٰ علیہ امیرا جائرًا۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۷۷ المادۃ ۱۶۶۳)

اذا ترک المورث الدعویٰ مدۃ یترکھا الوارث ایضًا مدۃ وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۸۷ المادۃ ۱۶۷۰) [1]

پاگل کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک پاگل نے کسی شخص کی شرارت اور ایما پر گاؤں کے ایک معزز اور شریف آدمی پر دس ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا جبکہ اس پاگل کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، تو کیا اس کا یہ دعویٰ شرعًا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قوانینِ شرع کے تحت وہ دعویٰ قابلِ سماعت اور صحیح ہوتا ہے جو عاقل، بالغ آدمی کسی پر دائر کرے۔ اور اگر مدعی عاقل، بالغ نہ ہو تو شرعًا اس کا دعویٰ غیر مسموع اور غیر صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال اگر تو اس پاگل شخص نے بلا کسی تحریک کے خود دعویٰ کیا ہو اور اس کا کوئی ولی اس کی ولایت کرکے دعویٰ کی پیروی نہیں کرتا ہو تو شرعًا یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت اور صحیح نہیں ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یشترط ان یکون المدعی والمدعیٰ علیہ عاقلین فدعوی المجنون والصبی غیر الممیز لیست بصحیحۃ ولکن ان یکون اولیاؤھما واوصیاؤھما مدعین او مدعیٰ علیھم فی محلھما۔

[شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۹
الباب الاوّل فی شروط الدعویٰ]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا ترک الدعویٰ ثلاثًا وثلاثین سنۃ ولم یکن مانع من ترک الدعویٰ الخ۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ج۴ ص۳۴۲ مطلب اذا ترک الدعویٰ ثلاثۃ وثلاثین سنۃ لاتسمع)

ومِثْلُہٗ فی فتاویٰ کاملیۃ ص۱۱۳ کتاب الدعویٰ۔

نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم

سوال :- زید نے بکر پر چوری کا دعویٰ کیا جبکہ بکر چوری سے انکار کرتا ہے اور قسم کھانے کے لیے تیار ہے مگر وہ نابالغ ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ پر شرعاً قسم آسکتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر اس کا والد اس کی جگہ قسم کھاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں پر قسم نہیں آتی تو کیا پھر مُدعی قسم کھاسکتا ہے؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں اگر مُدعی (زید) کے پاس اثباتِ دعویٰ کے لیے گواہ نہ ہوں تو پھر بکر ہی کو حلف وقسم دیا جائے گا اس کے باپ کو نہیں، اس لیے کہ قسم کھانے کے لیے بلوغ شرط نہیں اور نہ ہی مدعی کا قسم کھانا شرعاً معتبر ہے۔

قال العلامة علی حیدر : (تحلیف الصبی) اذا کان المدعیٰ علیه صبیاً وکان غیر ماذون له یتوجه علیه الیمین فاذا وجه ونکل فلا یحکم علیه بل یجب تحلیفه بعد البلوغ اما اذا کان ماذوناً فیتوجه الیمین علیه عند بعض الفقهاء ویحکم بیمینه وبنکوله عن الیمین وهذا هو المفتی به الخ - (دُرر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۳۸۹ الباب الثالث فی بیان التحلیف)[1]

مصالحت کے بعد ارث کا دعویٰ کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے اپنی حینِ حیات میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا تھا کہ میرا آبادگھر میرے تین بیٹوں یعنی حبیب خان، قادر خان، افضل خان کا ہے اور سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) رقبہ تعدادی ایک کنال ۹ مرلے دوسرے دو بیٹوں (غلام خان، محمد طفیل) کو دے دیا اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی کہ مسمّی غلام خان اپنے چھوٹے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کا گھر بنا کر دیتے اور اس کی شادی کرنے کے بعد بقیہ ڈاگہ (پلاٹ) کا مالک ہوگا والد صاحب کی وفات کے بعد غلام خان نے اپنے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کی بجائے تین کمروں کا گھر بنا کر دیا اور اس کی شادی بھی کر دی، بعد ازاں والدہ صاحبہ اور جملہ بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ بھی کر دیا جسے سب نے قبول کیا (جس کا اسٹامپ لف ہذا ہے) اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں،

---

[1] وفی الهندية: الصبی الماذون یحلف کالبالغ وبه ناخذ - (الفتاویٰ الهندية ج۴ ص۲۵ کتاب الدعویٰ - الباب الثالث فی الیمین وفیه ثلاثة فصول)

مگر اس فیصلہ کے بعد بھائیوں نے انکار کر دیا اور پھر علاقائی جرگہ نے دوبارہ فیصلہ کیا جس پر سب بھائیوں نے رضامندی ظاہر کر دی جس کا تحریری ثبوت بھی لف ہذا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود تینوں بھائیوں (حبیب خان، قادر خان، افضل خان) نے پھر اس سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) پر دعویٰ ارث کر دیا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیان مذکورہ کی روشنی میں تینوں بھائیوں کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- مذکورہ بالا بیان اور ملفوف اسٹامپ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی زندگی میں بیٹوں میں جائیداد کی تقسیم کا جو فیصلہ کیا تھا اُس وقت سب بھائی اس فیصلہ پر رضامند تھے اور بعد ازاں علاقائی جرگہ کا فیصلہ قبول کر کے آپس میں سب بھائی صلح بھی کر چکے ہیں، لہٰذا مصالحت کے بعد کسی بھی وارث کو اپنی صلح سے رجوع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے مذکورہ سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) میں محمد طفیل کا گھر بن جانے کے بعد باقی حصّہ صرف مسمّی غلام خان کا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی بھی وارث اس میں شراکت کا دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ یہ قطعہ زمین غلام خان کی ملکیت متصوّر ہوگا۔

لما فی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۵۵۶: اذا تم الصلح فلیس لواحد فقط من الفریقین الرجوع عنہ۔ قال الشیخ سلیم رستم باز تحتہ سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتی لو ادعی علیہ شیئاً فانکر فصالحہ علی شیء ثم اقر المدعی علیہ لایلزمہ ما اقر بہ وکذا لو برھن المدعی بعد صلحہ لایقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدھما نقضہ۔ (شرح المجلہ ص۸۴۵ الباب الرابع فی احکام الصلح) [1]

دعویٰ کے ثبوت کے لیے شرعی ضابطہ

سوال: زید سے عمرو نے چوری کی ہے، اب زید عمرو پر دعویٰ (مقدمہ) کرنا چاہتا ہے تو اس

---

[1] وفی الھندیۃ: فوقوع الملک فی البدل وثبوت الملک فی المصالح عنہ ان کان مما یحتمل التملیک کالمال ووقوع البراءۃ عنہ للمدعی علیہ ان کان لایحتمل التملیک کالقصاص ھذا اذا کان الصلح علی الاقرار الخ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۲۲۹ کتاب الصلح)

کے لیے اُسے کیا کرنا چاہیئے ؟ اور اگر زید شرعی تقاضوں کے مطابق عمرو کو چور ثابت کر دے تو جتنا مال اس کا چوری ہُوا ہے اس سے زیادہ عمرو سے لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دعویٰ کے اثبات کے لیے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ مدعی (دعویٰ کرنے والا) قاضی کے سامنے معتبر شہادت پیش کرے اور مُدعیٰ علیہ (منکر) کے ذمہ حلف یعنی قسم کھانا لازم ہے، مگر یہ تب ہے جب مُدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور وہ مُدعیٰ علیہ سے قسم کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ)[1] اور فعل الغیر پر قسم کرنے کی صورت میں قسم علی العلم کی جائے گی۔ اور شہادت یا نکول یعنی قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مُدعی کے لیے صرف وہ چیز ثابت ہوگی جس کا وہ دعویدار ہے اس سے زائد مال لینا اس کے لیے شرعاً درست نہیں۔

ہبۂ تام کے بعد دعویٰ ارث ناقابلِ سماعت ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب ! ہماری والدہ صاحبہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جملہ ترکہ اپنے ایک بیٹے کے نام کر دیا تھا جس کے گواہان اور سرکاری اسٹامپ لف ہٰذا ہے، تو اب ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے والدہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے دعویدار ہیں، تو کیا ان کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حینِ حیات میں ہی اپنی جائیداد وغیرہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو تملیکاً ہبہ کر سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس تملیک شدہ جائیداد میں کسی بھی وارث کا دعویٰ اِرث قابلِ سماعت نہیں، صورتِ مسئولہ میں جب آپ کی والدہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد ایک بیٹے کو تملیکاً دے دی ہے اور اس پر مروجہ قانون کے مطابق تحریر اور گواہ بھی موجود ہیں تو اب ان کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الھندیۃ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جائز

---

[1] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۷ باب الاقضیۃ والشہادات الفصل الثانی)

فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (الفتاوی الہندیہ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الہبۃ) [1]

تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب خان مرحوم، پلوسی، پشاور

بیان مُدعی! ہم نے اپنے حق میں ایک عدد وصیت نامہ + ہبہ نامہ منسلک کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا بیان بھی دیا ہے، لہٰذا میں اپنے بیان میں مزید یہ شامل کرنا چاہتا ہوں کہ :۔

(۱) یہ زمین خریدتے وقت میرے بھائی عالم زیب کی عمر ۹ سال تھی، زمین ۱۰/ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو خریدی گئی اور عالم زیب کی تاریخ پیدائش ۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۸ء ہے، لہٰذا اس سے میرا بڑا بھائی ۴، ۵ سال بڑا ہوگا، دونوں بھائی زمین خریدتے وقت بغیر کمائی کے تھے اور سکول میں پڑھتے تھے جس کا ثبوت بھی منسلک ہے۔

(۲) یہ کہ آٹا مشین میری والدہ صاحبہ کی ہے جو کہ والد صاحب نے انہیں حق مہر میں دی تھی، لیکن اس کا ذکر پہلے والے بیان میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ تنازعہ صرف اور صرف خریدی گئی زمین تک محدود ہے۔

(۳) مزید کوئی ثبوت یا گواہ میرے بیان کے بارے میں درکار ہوں تو آپ کے کہنے پر پیش کر دوں گا۔

(۴) کوئی بھی فیصلہ جرگے کے ممبران جناب سعید جان صاحب اور عبدالحمید کاکا صاحب کا دستخط شدہ ہو میں قبول کروں گا۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائیوں اور اپنی طرف سے اقرار کرتا ہوں کہ جو کوئی فیصلہ شریعت کی رُو سے ہوگا مجھے قابلِ قبول ہوگا۔ (عطاءالرحمٰن ولد حاجی نواب خان ساکن پلوسی، پشاور)

بیان مُدعیٰ علیہ! ہم دونوں بھائی عالم زیب و اورنگزیب پسران حاجی

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثماً فیما صنع۔
{ الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۷۹ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ الخ }

نواب خان مرحوم ساکنان بلوسی ضلع پشاور یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے والدمحترم نے ۶۷ ۱۹ء میں تہکال I نزد تاج آباد میں واقع ۲۲ کنال ۲/۱ ۷ مرلہ زمین اپنے نقد پیسوں سے خریدی تھی۔ والدمحترم نے الاضی مذکورہ کا یہ حصہ مساوی انتقال کچھ اس طرح کرایا کہ ع۱ حاجی نواب خان ولد سربلند کا حصہ ۷ کنال ۲/۱ ۹ مرلے ع۲ عالم زیب ولد حاجی نواب خان کا حصہ ۷ کنال ۹ مرلے ع۳ اورنگزیب ولد حاجی نواب خان ۷ کنال ۹ مرلے کے باقبضہ مالکان ہیں۔

زمین کے انتقال کے وقت ہماری دو سگی بہنیں، سوتیلی والدہ اور دو سوتیلی بہنیں موجود تھیں؛ اس کے بعد ۳۱ سال والدصاحب زندہ رہے؛ اور اس عرصہ میں ہماری سوتیلی والدہ سے سات بھائی اور چار بہنیں پیدا ہوئے۔ (یعنی کل سات بھائی اور چھ بہنیں) بعدازاں ہمارے والدصاحب نے کچھ اور زمین خریدی جس کا انتقال ورجسٹری وغیرہ انہوں نے اپنے نام پر کرایا ہے۔

ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو کچھ زمین دی تھی جس پر والدصاحب نے آبادی کرکے وہاں آٹا پیسنے کی مشین لگائی جو کہ ہم دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ملکیت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہمارے سوتیلے بہن بھائیوں کے حصے کے بارے میں شرعی حکم صادر فرمایا جائے۔

(نوٹ) اس سے پہلے بیان میں ہم اپنے والدصاحب کی جائیداد اور مکانات کے بارے میں تفصیلاً ذکر کرچکے ہیں۔

اورنگزیب ——— عالم زیب

فیصلہ شرعیہ

(۱) فریقِ اوّل : عالم زیب خان و اورنگ زیب خان پسران حاجی نواب خان

(۲) فریقِ ثانی : عطاء الرحمٰن مع برادران پسران حاجی نواب خان۔

ع۱ : فریقین کے بیان کے مطابق حاجی نواب خان مرحوم نے ۱۹۶۷ء میں تاج آباد تہکال (پشاور) میں ۲۲ کنال ۲/۱ ۷ مرلے زمین خریدی؛ اس میں سے ۷ کنال ۲/۱ ۹ زمین حاجی نواب خان نے اپنے نام انتقال کرالی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر عالم زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر اورنگ زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی۔

چونکہ حاجی نواب خان نے خرید کردہ زمین سے ۴ کنال ۸ امرے اپنے دونوں بیٹوں کے نام انکی صغرسنی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ انتقال کرادی ہے لہٰذا اب اس کے یہ دونوں بیٹے (اورنگزیب خان، عالم زیب خان) اس انتقال شدہ زمین کے باقاعدہ مالکان ہیں اور انتقال شدہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی، اس لیے کہ صغرسنی میں شئے موہوبہ پر صغیر کا قبضہ ضروری نہیں ہے، باپ کے قبضہ ہی سے ہبہ تام ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عطاء الرحمٰن و برادران نے اپنے باپ حاجی نواب خان کا جو خط پیش کیا ہے شریعت کی رُو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۱) لما فی الفتاوی الخیریۃ علیٰ ھامش العقود الدریۃ ج ۲ ص۱۰۱۔

(۲) اس لیے کہ اس خط کے ثبوت میں گواہان نہیں ہیں۔

(۳) یہ پیش کردہ خط وصیت نامہ ہے، اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میری جائیداد مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہو، اور شرعی اعتبار سے اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قال العلامۃ قاضی خانؒ، رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون اثما فیما صنع، رجل قال جعلت ھٰذا لولدی فلان کانت ھبۃ، رجل وھب لابنہ الصغیر داراً وھی مشغولۃ بمتاع الاب۔ قال ابو نصرؒ جاز ولا یحتاج الی التفریغ لانہا مشغولۃ بمتاع القابض وھو الاب ۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۲۷۹ کتاب الھبۃ۔ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ والھبۃ للصغیر)

(۲) قال العلامۃ الزیلعیؒ: وھبۃ الاب لطفلہ تتم بالعقد لانہ فی قبض الاب فینوب عن قبض الصغیر لانہ ولیہ۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص۹۵ کتاب الھبۃ)

(۳) لما فی الھندیۃ: رجل اتخذ لولدہ او لتلمیذہ ثیاباً ثم اراد ان یدفع الی ولدہ الاٰخر او تلمیذہ الاٰخر لیس لہ ذٰلک الا اذا بین وقت الاتخاذ انہا عاریۃ ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۴ ص۳۹۲ کتاب الھبۃ الباب السادس فی الھبۃ للصغیر)

(۴) قال العلامۃ الزیلعیؒ: قال وانما یصح الرجوع بتراضیھما او بحکم الحاکم لان ملک الموھوب لہ ثابت فی العین فلا یخرج عن ملکہ الا بالرضاء او بالقضاء ۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص۱۰۱ کتاب الھبۃ)

(۵) قال العلامة ابن نجیمؒ: وکتبنا فی القضاء من الفوائد انہ یعمل بدفتر البیاع والسمسار والصیاف فالخط فیہ حجۃ۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۱۲۵)

(۶) قال العلامۃ قاضی خانؒ: رجل کتب صک وصیۃ وقال للشہود اشہدوا بما فیہ ولم یقرأ وصیتہ علیہم قال علماؤنا لا یجوز للشہود ان یشہدوا بما فیہ وقال بعضہم وسعہم ان یشہدوا والصحیح انہ لایسعہم ان یشہدوا۔
(فتاوی قاضیخان علی ہامش الہندیۃ ج۲ ص۴۸۲ کتاب الشہادات، فصل فی الشاہد یشہد بعد ما اخبر بزوال الحق)

(۷) قال العلامۃ فخر الدین الزیلعیؒ: واما الثالث فلقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام: ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۸۲ کتاب الوصایا)

(۸) قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السلام ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہ الا ولا وصیۃ لوارث۔
(الہدایۃ ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیۃ الخ)

(۲) حق مہر (۳) آٹا مشین

جناب الحاج نواب خان مرحوم نے مسماۃ حسن آرا دختر اوّل خان سے عقد نکاح کرتے وقت حق مہر میں جو ایک عدد رہائشی مکان اور ایک آٹا مشین مسمی کیا ہے اس کی ادائیگی نواب خان مرحوم پر لازم ہے، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا ہو تو اب اس کے جملہ ترکہ سے ادا کیا جائے گا، حق مہر ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ تاہم عالم زیب اور اورنگ زیب جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آٹا مشین کی زمین ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو دی ہے، اس پر آبادی اور آٹا مشین ہمارے والد صاحب نے بنائی ہے، اگر انہوں نے اس دعویٰ کا صحیح ثبوت شرکاء جرگہ کے سامنے پیش کیا ہو تو شرکاء جرگہ صرف اس زمین کی قیمت طے کریں، پھر اگر اورنگزیب وعالم زیب اس زمین کی قیمت لینے پر راضی ہوں تو نواب خان مرحوم کے کل ترکہ سے زمین کی قیمت منہا کرکے ان کے حوالہ کردیں اور آٹا مشین مع زمین حاجی نواب خان کو حق مہر میں دے دیں، اور اگر عالم زیب اور اورنگزیب زمین کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوں تو اس زمین کو خالی کردیں، کیونکہ یہ انکی

سوتیلی والدہ کا حق ہے، اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کا حق اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے کر دے۔ لیکن جب اورنگزیب، عالم زیب کی والدہ اپنے شوہر سے پہلے فوت ہوئی ہے تو اس کی ملکیت میں چاہے آٹھ مشین کی زمین ہو یا دیگر اشیاء، ان میں ۴/۱ حصہ اس کے شوہر نواب خان کو بھی میراث میں ملے گا اور باقی ۴/۳ حصے اس کی اولاد (عالم زیب وغیرہ) کو میراث میں ملیں گے، اب چونکہ شوہر بھی فوت ہو چکا ہے اس لیے اس ۴/۱ حصہ میں بھی (جو کہ بیوی کی طرف سے اس کو میراث میں ملا ہے) نواب خان کے جملہ ورثاء (عالم زیب اور اس کے سگے بہن بھائی مع سوتیلی والدہ و سوتیلے بہن بھائی) شریک ہوں گے، اور اگر مدعی معتبر شہادت سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ (منکر) کو حلف وقسم دیا جائے گا۔ البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۷ باب الاقضیۃ والشہادات) حوالہ حسب ذیل ہے:۔

لما فی الهندية: واذا تزوجها على هذا العبد وهو ملك الغير أو على هذه الدار وهي ملك الغير فالنكاح جائز والتسمية صحيحة فبعد ذلك ينظر ان اجاز صاحب الدار وصاحب العبد ذلك فلها عين المسمى وان لم يجز المستحق لايبطل النكاح ولا التسمية حتى لايجب مهر المثل وانما تجب قيمة المسمى كذا في المحيط۔
(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۳۰۳ كتاب النكاح۔ الباب السابع في المهر)

وقال ایضاً: ولو تزوجها على شئ بعينه وهلك قبل التسليم او استحق فان كان ذلك من ذوات الامثال رجعت على الزوج بالمثل والا فبالقيمة كذا في المحيط۔
(الفتاوى الهندية ج ۱ ص۳۱۶ الباب السابع في المهر۔ الفصل التاسع)

(۴) تقسیم ترکہ میراث

صغرسنی میں عالم زیب و اورنگزیب کے نام مالکانہ طور پر انتقال شدہ زمین اور نواب خان مرحوم کی بیوی کے حق مہر کے علاوہ نواب خان مرحوم کی ملکیت میں جتنا اثاثہ ہو، منقولہ ہو یا غیر منقولہ جائیداد، سب ورثاء اس میں شریک ہوں گے اور تقسیم میراث اس طرح ہو گی کہ سارے ترکہ میراث میں ۸/۱ حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا اور باقی سات حصے نواب خان مرحوم کی دونوں بیویوں کی تمام اولاد میں بایں طور تقسیم ہو گی کہ ہر ایک بھائی کو دو دو حصے اور ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

ارشاد ربانی ہے ، يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۔
(سورۃ النساء آیت ۱۲)

وفی الهندية : واذا اختلط البنون والبنات عصب البنون والبنات فيكون للابن مثل حظ الانثيين - (الفتاوى الہندیہ ج ۶ ص ۴۴۸ كتاب الفرائض، الباب الثانی)

فیصلہ شرعی ما بین سید یوسف شاہ وسلطان شاہ پسران حیات شاہ

فریق اول : سید یوسف شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
فریق ثانی : سید سلطان شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
نمائندہ فریق اول : گل علی شاہ ولد سید یوسف شاہ
نمائندہ فریق ثانی : سید فرمان شاہ ولد سید سلطان شاہ

مندرجہ بالا فریقین کا بیان ان کے نمائندوں کے واسطے سے سنا گیا، دونوں نمائندوں کے بیانات سے چند امور سامنے آئے :-

(۱) فریقین کے بیانات سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ حیات شاہ کی بیٹیوں کو اس کی جائیداد سے محروم رکھا گیا ہے، جائیداد کی تقسیم صرف اسکے بیٹوں تک محدود رکھی گئی، والد کے اپنے تصرفات یا بعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے بیٹیوں کا کوئی تذکرہ فریقین نہیں کرتے بلکہ اس سے پہلوتہی کرتے ہیں ۔

(۲) فریق اول سید یوسف شاہ اس کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے حین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی اس میں دیگر حصص کے علاوہ خسرہ ۸۰۷ جو کہ "ارتل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا رقبہ اسّی کنال آٹھ مرلے ہے، یہ سید یوسف شاہ کو دی گئی ہے جو کہ ۱۹۶۶ء/ ۱۹۶۷ء کی بندوبست اراضی میں بحال رکھی گئی ہے ۔ فریق مذکورہ کے بیان کی رو سے سلطان شاہ نے یہ زمین اپنے نام منتقل کرالی ہے جس کے خلاف یوسف شاہ نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران شاد علی خان نے دونوں میں مصالحت کرادی ۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے نقد دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو کہ فریق ثانی نے برضا و رغبت وصول کیے ہیں اور بطور سند تحریری سٹامپ پیش کرتے ہیں ۔

(۴) فریق ثانی سلطان شاہ کا بیان ہے کہ حیات شاہ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے

درمیان تقسیم کی تھی، تاہم اس میں اچھی اور کمزور زمین کی رعایت کرتے ہوئے ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی۔ فریقِ اول سید یوسف شاہ نے سازباز کرکے خسرہ ۸۰۷ کا بوگس طریقے سے اپنے نام انتقال کرالیا ہے جو کہ عدالت نے میری درخواست پر میرے حق میں بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریقِ ثانی کا دفاعی بیان ہے کہ سلطان شاہ نے سید یوسف شاہ کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ سلطان شاہ نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور جس جائیداد سے سلطان شاہ نے مصالحت کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد ہے، یہی وجہ ہے کہ سلطان شاہ نے ایک ہزار روپے فریقِ اوّل کو واپس کرکے مصالحت کالعدم کر دی ہے۔

نتیجہ بیانات ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں جو کہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر والد نے دیدہ دانستہ طور پر اپنی جائیداد بیٹوں کے نام منتقل کرکے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ایک ناجائز اور حرام حرکت ہے، اگرچہ قضاءً یہ اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عند اللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ورثاء مورث کے فراغتِ ذمہ کے لیے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے انسان کا عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونا یقینی امر ہے۔ تاہم والد کے تصرفات قضاءً نافذ رہیں گے۔ (الفتاوی الہندیہ ج۴ ص۱۲۹)

اصل دعویٰ کے بارے میں شرعی فیصلہ جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں اس کا محض انتقال ورجسٹری ہونا شرعاً نہ کسی کے ملکیت کی دلیل ہے اور نہ اس پر حقِ ملکیت موقوف ہے، اس لیے حیات شاہ کے اپنی جائیداد میں مالکانہ تصرفات کے نفاذ کے لیے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں، جو باقاعدہ گواہان سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک بعد ازاں یوسف شاہ اور سلطان شاہ میں تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت بھی ہوئی ہے تو اس کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہان کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر سلطان شاہ کی رضا ورغبت سے

مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد خود سلطان شاہ اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس مصالحت کے نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطان شاہ جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہے یہ اس کی اپنی ملکیت میں ہو، ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر اس جائیداد پر سلطان شاہ کی ملکیت باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا سلطان شاہ کی ملکیت میں ہونے کے ثبوت کے لیے باقاعدہ گواہان کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ اوّل سلطان شاہ کی ملکیت پر گواہ قائم کرے تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر ان کے مطالبہ پر فریقِ ثانی پر ملکیت سے انکار کر کے اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ ثانی قسم کھائے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مُدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔

اس لیے متعلقہ حاکم فریقین سے گواہان کا مطالبہ کرے یا ان کی قسم پر فیصلہ کرے۔

مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے قسم کس پر ہے؟

سوال:۔ خالد نے واجد پر دعویٰ کیا ہے کہ تم نے مجھ سے گیارہ ہزار روپے قرض لیے ہیں جبکہ واجد اس کا انکار کرتا ہے اور مُدعی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اب قسم مُدعی کو دی جائے گی یا مدعیٰ علیہ کو؟

الجواب:۔ قسم شرعاً مدعیٰ علیہ کے ذمے ہوتی ہے اور مدعی کے اختیار میں دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، صورتِ مسئولہ میں اس تنازع کے حل کے لیے مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے بشرطیکہ مُدعی اس کا طالب بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر۔ وفی روایۃ والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (جامع الترمذی ص۱۶۰ ابواب الاحکام۔ باب ما جاء فی ان البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ)[1]

---

[1] عن ابن عباس رضؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم ادعی ناس دماء رجال واموالہم ولکن الیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (سنن ابن ماجہ ص۱۶۸ ابواب الاحکام۔ باب البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ)

وَمِثْلُہٗ فی صحیح المسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ، باب الیمین علی المدعیٰ علیہ

زمین کے تنازعہ پر فریقین میں شرعی فیصلہ

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ زمین کا ایک ٹکڑا دو فریقوں کے مابین متنازعہ ہے۔
فریقِ اوّل امیر حمزہ وغیرہ نے دعوٰی کیا ہے کہ یہ متنازعہ زمین ہماری ہے، جبکہ فریقِ ثانی دلبر و دین محمد وغیرہ نے فریقِ اول کے دعوٰی کے ردّ میں یہ کہا ہے کہ یہ زمین تمہارے باپ نے ہمارے باپ کو اس مشترکہ مال کے حق کے بدلے میں جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا، دیدی ہے یعنی ہمارے والد پر بیچدی ہے۔
لہٰذا آپ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان قرآن و سنت کی روشنی میں اس تنازعہ کا فیصلہ فرمایا جائے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں فریقِ اول امیر حمزہ وغیرہ مُدّعی ہے، اور فریقِ ثانی دلبر و دین محمد مُدّعیٰ علیہ ہے، فریقِ ثانی نے فریقِ اوّل کے دعوٰی کے رَدّ میں یہ کہا ہے کہ زمین کا یہ متنازعہ ٹکڑا تمہارے مورث (والد) نے ہمارے والد کے حق کے بدلے میں (یعنی ہمارے والد کے اُس مال کے بدلے جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا اور جسے تمہارے مورث (والد) نے خرچ کر لیا تھا) دیدیا ہے (یعنی بیچدیا ہے)۔ تو اب شرعی ضابطہ کے مطابق فیصلہ کی صورت یہ ہوگی کہ دافع اپنے دفع کو معتبر شہادت سے ثابت کرے گا، اثباتِ دفع کی صورت میں فیصلہ مُدّعیٰ علیہ کے حق میں کیا جائے گا، بصورت دیگر مُدّعی دفریقِ اوّل کو حلف علی العلم دیا جاوے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سُئلت فی رجل ادعی علیٰ اٰخر عقاراً انهٗ تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعیٰ علیه باقی اشتریتهٗ من ابیک حال حیاته بکذا او کذا من القروش وانه فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علیٰ خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی هل یکون جواب المدعیٰ علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج إلیٰ بیّنة تشهد لهٗ بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة، فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیه من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرارٌ لهٗ بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الی بیّنة لان کل مدع یحتاج الی البیّنة ولاینفعه وضع الید المدة المذکورة مع الاقرار

المذکور ولیس ھٰذا من باب ترک الدعوٰی بل من باب المواخذہ بالاقرار ومن اقر لشئ لغیرہ اخذ باقرارہ ولو کان فی یدہٖ احقابًا کثیرًا لا تعد الخ
(الفتاوٰی الکاملیۃ ص۱۲۳ کتاب الدعوٰی)

وفی مجلۃ الاحکام : اذا ثبت من ادعی دفع الدعوٰی دفعہ تندفع دعوی المدعی ولا یحلف المدعی الاصلی بطلب صاحب الدفع۔ فان نکل المدعیٰ عن الیمین یثبت دفع المدعیٰ علیہ وان حلف تعود دعواہ الاصلیۃ۔
(المجلۃ الاحکام العدلیۃ المادۃ ۱۶۳۲ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ خالد اتاسی رح : وان کان فعل غیرہ۔ کما اذا کان یقولہ اودعنیہ الغائب او آجرنیہ الیٰ قولہ یحلفہ علی العلم ای علیٰ انہٗ لایعلم ان المدعی بہٖ ودیعۃ اورھن او مستاجر ـــ وھو ھٰذا الثانی ھو المعنی یقول صاحب ردالمحتار ویحلفہ علی العلم لانہ علیٰ فعل الغیر۔ (شرح المجلۃ ج ۵ ص۷۵ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ علی حیدر رح : واذا حلف المدعی تعود دعواہ الاصلیۃ وفی ھٰذہ الحال یکون فی اصل الدعوٰی احتمالان۔ الاحتمال الاوّل : ان تثبت دعوی المدعی نظرًا لکون دفع المدعیٰ علیہ یتضمن الاقرار وفی ھٰذا الحال یحکم باصل الدعوٰی کما ھو فی المثال المذکور آنفًا حیث ان دفع المدعی علیہ بقولہ انی ادیت المبلغ المدعی بہٖ ھو اقرار بالمبلغ المذکور فاذا لم یثبت المدعیٰ علیہ الاداء وحلف المدعی الیمین علیٰ عدم الاداء یحکم علی المدعیٰ علیہ باداء المبلغ المدعی بہٖ للمدعیٰ۔
(دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۴ ص۲۲۴ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی)

دررالحکام کی عبارت مسطورہ سے معلوم ہوا کہ مُدعی فریق کے حلف اٹھانے کی صورت میں جبکہ مُدعیٰ علیہ اپنے دفع کے اثبات سے عاجز آجائے تو جیت مُدعی فریق کی ہوگی یعنی اس صورت میں فیصلہ اس کے حق میں کیا جاوے گا۔

مدعی مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد گواہ پیش کرے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک قطعہ زمین متنازعہ تھی، مدعی گواہوں کو کسی وجہ سے حاضر نہ کرسکا تو مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد فیصلہ کیا گیا، بعدازاں مدعی کو گواہ مل گئے، تو کیا مدعی اب گواہ پیش کرسکتا ہے یا نہیں اور ان کی شہادت قبول ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نزاع کے حل کے لیے گواہ اصل اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اگر مدعی کسی وجہ سے مقدمہ میں گواہ پیش نہ کرسکے اور قاضی مدعیٰ علیہ کو قسم دے کر فیصلہ کر جائے اور بعدازاں مدعی کو گواہ مل جائیں اور وہ ان کو پیش کرنا چاہے تو کرسکتا ہے شرعاً ان کی گواہی قبول ہوگی اور گذشتہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (سوال) هل تقبل البيّنة لو اقامها المدّعی بعد يمين المدعیٰ عليه؟

(الجواب) تسمع البينة وتقبل علی ماهوالصواب كما صرح به فی شرح الملتقیٰ والتنوير وغيرهما من الدعوٰی۔

قال فی التنوير: وتقبل البيّنةُ لواقامها المدعی بعد يمين المدعیٰ عليه عندالعامة وهوالصحيح۔ (العقود الدرّية فی تنقيح الفتاوٰی الحامدية ج۲ ص۲۱/۲۲ كتاب الدعوٰی) [۱]

مدعیٰ علیہ کے تصرفات پر اظہار رضامندی کے بعد دعویٰ کرنا

سوال: ایک آدمی کا مسجد سے متصل ایک

---

[۱] قال العلامة الحصكفیؒ: وتقبل البيّنة لو اقامها المدعی وان قال قبل اليمين لا بيّنة لی بعد يمين المدعیٰ عليه كما تقبل البيّنة بعد القضاء بالنكول عند العامة وهوالصحيح...... ولان اليمين كالخلف عن البيّنة فاذا جاءَ الاصل انتهیٰ حكم الخلف كانهٗ لم يوجد اصلاً۔ (الدرالمختار علیٰ هامش ردّالمحتار ج۴ ص۴۷۲ كتاب الدعوٰی)

ومثلهٗ فی البحرالرائق ج۷ ص۲۰۶ كتاب الدعوٰی۔

کمرہ ہے، اہلِ محلہ نے اس سے کہا کہ یہ کمرہ ہم کو دے دو ہم آپ کو اس کی قیمت دے دیں گے اور اس کمرے کو مسجد میں شامل کردیں گے، اس میں لوگ نمازیں پڑھیں گے، اس پر کمرے کے مالک نے کہا کہ میں روپے نہیں لیتا بلکہ اس کمرے کو مسجد کے لیے بنام خدا وقف کرتا ہوں، اس پر اہلِ محلہ نے اس کمرے کو مسجد میں شامل کرلیا، تقریباً دو سال تک محلہ کے لوگوں نے، خود اس کمرے کے مالک اور اس کے دوسرے بھائیوں نے اس میں نمازیں ادا کیں، مسجد میں باقاعدہ امام بھی مقرر کیا گیا، اب دو سال کے بعد کمرے کے مالک کے دوسرے بھائی نے دعوٰی کیا ہے کہ یہ کمرہ جو مسجد میں شامل کیا گیا ہے میرا ہے اور اپنے بھائی سے بھی اور اہلِ محلہ سے بھی جھگڑتا ہے اور لوگوں کو مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتا، حالانکہ اس آدمی نے خود بھی تقریباً دو سال تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی ہیں اور اپنے بھائی کے فیصلے پر راضی تھا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اب اس آدمی کا دو سال کے بعد مقدمہ چلانا کیسا ہے؟ کیا شرعاً اس کا یہ دعوٰی قابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب اہلِ محلہ نے کمرے کو مسجد میں شامل کرلیا اور مالک نے اس کو بنام خدا مسجد کے لیے وقف کردیا جس پر اس کے سب بھائی بھی راضی تھے اور دو سال تک کسی نے کوئی اعتراض نہیں بھی نہیں کیا تو اس رضامندگی کی وجہ سے ان کا حق دعوٰی ختم ہوگیا ہے اسلئے اب اگر ان میں سے کوئی دعوٰی کرتا ہے تو اس کا دعوٰی ناقابلِ سماعت ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فیمن باع عقاراً وسلمه للمشتری وتصرف فیه زماناً وجاره اوغیره حاضر یری البیع والتسلیم والتصرف وهو ساکت بلامانع ثم یقوم ویدعی انه کله اوبعضه هل لاتسمع دعواه هذه؟ ــــ فالجواب: لاتسمع لما تقرر ان من یری غیره یبیع ارضاً اودارا فتصرف فیه المشتری زماناً والرائی ساکت تسقط دعواه۔ (الفتاوی الکاملیة ص۱۱۴ کتاب الدعوی۔ مطلب لاتسمع دعوی من رأی البیع والتصرف)[1]

---

[1] قال العلامة خیرالدین الرملیؒ: (سئل) فیما لو باع شیئاً وبعض اقاربه یطلع علی بیعه وقبضه وتصرف المشتری فیه زماناً ثم ادعی فیه ملکاً هل تسمع دعواه ام لا ــــ (اجاب) قال کثیر من علمائنا اذا باع شخص عقالاً اوحیواناً اوثوباً اونحوذلك وقبضه المشتری وتصرف فیه تصرف الملاك وبعض اقاربه مطلع علی ذلك ثم ادعاه او ادعی بعضه انه ملکه لاتسمع دعواه لان ذلك اقرار منه بانه ملك البائع قطعاً للاطماع الفاسدة وسد الباب التزویر والتلبیس الخ۔ (الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۶۷ کتاب الدعوی ومطالبه۔ مطلب لو باع شیئاً الخ)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵ کتاب الدعوی۔ باع داراً وقریبه حاضر تترك الدعوی .... الخ

کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعیٰ علیہ کا انکار کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فریقین (فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ اور فریقِ ثانی اجمل خان وغیرہ) نے تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ ہم متفقہ طور پر شرعی فیصلہ کروائیں گے، پھر ایک دینی مدرسہ میں آکر علماء کو یہ تحریر کرکے دے دیا کہ فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ چھ ماہ تک اپنے حق کے ثبوت میں کاغذات پیش کرے گا اور اگر کاغذی طور پر اپنا حق ثابت نہ کرسکا تو اپنا قبضہ چھوڑ دے گا۔ فریقِ ثانی (اجمل خان وغیرہ) نے بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ ٹھیک ہے اگر اس (فریقِ اوّل) نے ثبوت پیش کر دیا تو ہم اس کو یہ حق چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد فریقِ اوّل (محمد خان وغیرہ) نے چھ ماہ تک کاغذی طور پر اپنا حق ثبوت پیش کیا تو اس کے مخالف فریق اجمل خان وغیرہ نے کہا کہ اب ہم بھی اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا اور اپنے تحریری وعدہ سے منحرف ہوگیا، اب آنجناب شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس شخص کا حکم یہ ہے کہ حاکم اس کو مقدمہ چلانے پر مجبور کرے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ فیصلہ کس فریق کے حق میں کیا جاتا ہے۔

قال العلامۃ خالد الاتاسی رحمہ اللّٰہ: اذا اصر المدعیٰ علیہ علیٰ سکوتہ الخ فیحبس حتیٰ یقر او ینکر۔ (شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۸۲۲ ج ۶ ص ۱۱۹ باب فی بیان احکام کتاب القاضی) [1]

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: واذا قال المدعیٰ علیہ لا اقر ولا انکر لا یستحلف بل یحبس لیقر او ینکر الخ۔ (الدر المختار ج ۴ ص ۱۷۴ کتاب الدعویٰ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۰۳ کتاب الدعویٰ۔

مدعی بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ ہی کافی ہے

سوال :۔ امارتِ اسلامی افغانستان کے صوبہ خوست میں ایک متنازعہ زمین پر دو فریقین کے مابین دعویٰ ہے۔ فریقِ اول (مدعی) محمد قاسم ہے اور فریقِ ثانی (مدعیٰ علیہ) محمد قیوم ہے، اس دعویٰ کے تصفیہ کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر دو حکمین مقرر کر لیے، ایک محکم مولانا نورالحق صاحب اور دوسرے محکم مولانا سید گلزار صاحب ہیں۔ مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں نے محکمین علماء کو متنازعہ زمین پر لے جا کر اپنے ہاتھوں سے اشارہ کر کے دکھائی اور محکمین حضرات نے خود مشاہدہ کر کے دیکھ لی۔ اس کے بعد موقعہ پر ہی مدعی محمد قاسم نے اپنا دعویٰ لکھا اور اسی جگہ پر محکمین حضرات کو دے دیا تاکہ وہ اس کو پڑھ کر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ تحریری دعویٰ دیکھ کر محکمین میں سے مولانا سید گلزار صاحب نے کہا کہ یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں زمین مدعیٰ بہا کا حدود اربعہ نہیں لکھا گیا، حدود اربعہ کا لکھنا ضروری ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ:

معلومیۃ المدعی بہ ان کان عقاراً تعیین ببیان حدودہ۔ (شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج ۵ ص۱۴)

اس پر دوسرے محکم مولانا نورالحق صاحب نے کہا کہ صورتِ دعویٰ درست ہے، اس لیے کہ اس متنازعہ زمین پر ہم کھڑے اور حاضر ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لہٰذا حدود لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، دلیل اس کی یہ ہے: والتعریف بالاشارۃ یکون صحیحاً فی کل نوع من المدعی بہ الموجود منقولاً اوکان عقاراً والوصف والتعریف یکون فی المدعی بہ الغائب وغیر الموجود۔ (درر الحکام ج ۴ ص ۱۶۱)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) اگر کسی متنازعہ زمین کو قاضی یا محکم خود حاضر ہو کر مشاہدہ کر لے تو پھر حدود لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اوپر دی گئی صورت میں کون سا محکم فقہ حنفی کے موافق ہے؟ اور جو صورتِ دعویٰ اوپر دی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ کوئی متنازعہ چیز جب مجلسِ قضاء میں برائے تصفیہ حاضر ہو تو اس کے تعین کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، اس کے دیگر صفات اور حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف اشارہ کر دینے سے مدعیٰ بہ کا تعین ہو جاتا ہے، تاہم اگر متنازعہ چیز مجلسِ قضاء میں حاضر نہ ہو تو حکمین یا عدالت میں قاضی یا جج کے سامنے اس چیز کی تعریف بالاوصاف اور حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ نزاع ختم کرنے کے لیے

مدعیٰ بہ سب پر واضح ہوجائے۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ تحکیمین مدعی بہ زمین کے پاس کھڑے ہیں اور اشارہ کے ساتھ اس کی تعیین ممکن ہے، اس کے بعد کوئی جہالت وغیرہ باقی نہیں رہتی، اس لیے حَکَم مولانا نورالحق صاحب کی بات درست ہے۔

لما فی شرح المجلة: معلومیة المدعی بہ تکون بالاشارة اوبالوصف والتعریف هو اذا کان عیناً منقولاً وکان حاضراً فی مجلس المحاکمة فالاشارة کافیة۔ (المادة ۱۶۲۰-درالحکام ج۴ ص۱۸۵ کتاب الدعوی)

وفیہ ایضاً: کذلك لایشترط بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشهرته۔ (المادة ۱۶۲۳- درالحکام ج۴ ص۱۹۶ کتاب الدعوی)

وفیہ المسئالة الثانیة لایشترط عند الامامین بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشهرته لان الشهرة مغنیة عن التحدید وقدحصل المقصود بلاتحدید۔ (درالحکام ج۴ ص۱۹۹ کتاب الدعوی)

مقدارِ مدعیٰ بہ میں غلطی ہوجانا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! زمین کے ایک تنازعہ میں فریقین نے بندہ کو حَکَم بنایا ہے۔ اب مدعی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے اس میں اس نے حدودِ اربعہ تو صحیح بیان کیا ہے مگر مقدارِ زمین کے بیان میں غلطی کرگیا ہے اس زمین کی اصل مقدار ۲۰ کنال ہے جبکہ مدعی نے ۱۶ کنال کا ذکر کیا ہے۔ مدعیٰ علیہ کے وکیل ایک مولوی صاحب ہیں، ان کا کہنا ہے کہ متنازعہ زمین کی مقدار ۲۰ کنال ہے اور مدعی نے ۱۶ کنال ذکر کی ہے اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ صحیح نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب:۔ شرعاً دعویٰ کی صحت کے لیے مدعی کا مدعیٰ بہٖ کا صحیح اور درست حدودِ اربعہ بیان کرنا ضروری ہے، اگر مدعی سے مقدارِ رقبہ بتانے میں غلطی ہوجائے تو اس سے دعویٰ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دعویٰ درست ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور مُدعیٰ علیہ کے وکیل کا دعویٰ کو رد کرنا صحیح نہیں۔

لمافی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطأ فی بیان مقدار ذراع العقار اودونه لایمنع صحة دعواه۔
(مجلة الاحکام المادة ۱۶۲۴)

فیصلہ شرعی بین الفریقین

فریق اوّل : فاروق شاہ ولد احمد شاہ
فریق ثانی : عرب خان ولد شیر علی خان
ساکنان پانی منگی

فقہاء اسلام کے تعریف مدعی اور مدعی علیہ : المدعی من یلتمس خلاف الظاھر و المدعی علیہ من یلتمس بظاھر (شرح المجلۃ لخالد اتاسی - ۵/۵)

وفی الھدایۃ المدعی من یتمسك بغیر الظاھر والمدعی علیہ من یتمسك بظاھر الی آخرہ (۳/۳۰۰)

وقال محمد المدعی علیہ ھو المنکر (الھدایۃ ۳/۳۰۰)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنازع میں دونوں فریقین مدعیان ہیں۔ لہٰذا ہم اولاد دونوں کے دعاوی کا جائزہ لیں گے کہ کونسا دعویٰ اصول شرع کے موافق اور براہین کے ساتھ اپنے مقصد کو ثابت کرتا ہے۔

فاروق شاہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نعیم شاہ نے اپنے جملہ جائیداد کو میرے والد احمد شاہ ولد ابنالی اپنے بھائی کے نام کئی سال پہلے کر دیا تھا۔ اور اس کا سٹام میرے پاس موجود ہے۔
جائزہ یہ دعویٰ کئی وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد کو ثابت کرنے میں ناقص ہے۔

(۱) جس اسٹام کا حوالہ مدعی دعویٰ میں دے چکا ہے اور بیان کے ساتھ وہ اسٹام منسلک ہے اس میں گواہ درج نہیں، جب کہ صرف اسٹام اثبات دعویٰ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا فیصلہ ہے کہ صرف تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

کما قال ابن عابدین : لا یعتمد علی الخط ولا یعمل بمکتوب الوقف الذی علیہ خطوط القضاۃ الماضین - (رد المختار - ۵/۴۳۴) وہ اس لیے کہ الخط یشبہ الخط کی وجہ سے تحریر خبر واحد کے حکم میں ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔

۲- مدعی فاروق شاہ اپنے دعویٰ ارث کے اثبات کے لیے گواہان بھی پیش نہ کر سکا جب کہ مدعی کے ذمہ قانون شرعی کے مطابق اثبات دعویٰ کے لیے گواہان کا پیش کرنا لازمی ہے۔ لقولہ علیہ السلام : البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (الحدیث)

(۳) اگر نعیم شاہ نے اپنا جملہ جائداد اپنے بھائی احمد شاہ کو ہبہ بھی کیا ہو لیکن انہوں نے بھائی کو موھوبہ اراضی قبضے میں نہیں دیا تھا جب کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ شرعی کا ہونا ضروری ہے

بدون اس کے ہبہ صحیح نہیں ہوتا۔ چوں کہ مدعی بھی قبضہ نہ دینے کا مُقر ہے لہٰذا ہبہ تام نہ ہوا۔ اس لیے مدعا علیہ کو حلف دینے کی حاجت نہ رہی۔

کما قال ابراھیم حلبی : الھبۃ ھی تملیك عین بلا عوض و تصح بایجاب و قبول و تتم بالقبض الکامل۔ فان قبض فی المجلس بلا اذن صح و بعدہ لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علی صدر مجمع الانھر ۳/۴۸۹ تا ۴۹۲ کتاب الھبۃ)

قال المرغینانی : الھبۃ عقد مشروع و تصح بالایجاب والقبول والقبض۔ اما الایجاب والقبول فلانہ عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول۔ والقبض لابد منہ لثبوت الملك...... ولنا قولہ علیہ السلام : لا یجوز الھبۃ الامقبوضۃ ...... فان قبضہ الموھوب لہ فی المجلس بغیر اذن الواھب جاز استحساناً وان قبض بعد الافتراق لم یجز۔ (الھدایۃ -۳/ ۲۸۱ کتاب الھبۃ)

وفی مجلۃ الاحکام : تنعقد الھبۃ بالایجاب والقبول وتتم بالقبض قال سلیم رستم باز تحتھا : الکامل لانھا من التبرعات والتبرع لا یتم الا بالقبض۔ (شرح المجلۃ - ۴۶۲)

۴۔ مکتوب (اسٹام) میں ذکر ہے کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ ولد انبالی کا اکیلا وارث ہے۔ جب کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ سے قبل فوت ہو چکا ہے اور وراثت کا تعلق موت کے بعد سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب احمد شاہ نعیم شاہ کا خود وارث نہ بن سکا تو اس کی اولاد بدرجہ اولیٰ وارث نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ نعیم شاہ کا بھائی شیر علی ولد انبالی زندہ ہے۔ لہٰذا نعیم شاہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد شیر علی کے نام ہو گی۔

دعویٰ عرب خان ولد شیر علی : موصوف کا دعویٰ ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنے ہوش و حواس کی سالمیت کے ہوتے ہوئے ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو بارہ دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی کے قیمتاً میرے ہاتھ فروخت کی ہے اور میرے پاس گواہ اسٹام پیپر سرکاری انتقالات کی فوٹو کاپیاں اور نعیم شاہ کی اپنی آواز کی کیسٹ موجود ہے۔

جائزہ ۔ قانون شرعی کے مطابق کسی تنازع کے حل کے لیے اصول یہ ہے کہ مدعی خلاف ظاہر کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرے گا اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہو تو پھر مدعی کے مطالبہ پر مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ لما قال علیہ الصلاۃ والسلام : البینۃ علی المدعی

والیمین علی من انکر (الحدیث)

اس لیے عرب شاہ ولد شیر علی کے ذمہ اثبات دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرنا ہے جوکہ انہوں نے پیش کیے ۔

(۱) چمن خان (۲) عبدالرحمن ۔ پسران قدرت اللہ ساکنان پانئی ۔

نے کلمہ پڑھ کر گواہی دی کہ نعیم شاہ (مرحوم) نے ۵ امرلے مارکیٹ اور تین کنال اراضی مسمی عرب خان ولد شیر علی کے ہاتھ فروخت کی ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں ۔

ان دونوں گواہوں کے علاوہ واحد شاہ، راحت شاہ اور گل نبی نے بھی گواہی دی ۔ کہ نعیم شاہ نے اپنی مارکیٹ اور تین کنال اراضی کا عرب خان کو مالک بنایا ہے ۔ اور نعیم شاہ نے ہمیں گواہ بنایا تھا ۔ ہم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ نعیم شاہ اپنی زندگی میں اس مذکورہ جائیداد کا مالک عرب خان کو ٹھہرایا ہے ۔ اس کے ساتھ اقرارنامہ نمبر ۲۴۶ ، ۱۶ تحریر کردہ ۹۸/۷/۳ ۔ گواہان کے امضائات کے ساتھ پیش کیا جس میں تحریر ہے ۔ من مسمی نعیم شاہ ولد انبالی خان عمر ۵۷ سال ۔ ۔ ۔ ۔ بذریعہ تحریر ہذا مقر ہوں کہ میری ذاتی ملکیتی مارکیٹ واقع چوک پانئی ۵ امرلہ جس میں ۱۲ دکان بعوض ۲۵۰۰۰ ہزار روپے فی دکان جن کی کل قیمت تین لاکھ ہوتی ہے اور علاوہ ازیں ایک کھیت تعدادی تین کنال آبی وفصلی بعوض ڈھائی ہزار فی مرلہ جس کی کل قیمت ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے اور ۴۰ منٹ پانی از ٹیوب ویل نمبر ۱۱ پانی برائے سرابی اراضی جس کی قیمت مبلغ ۷۰۰۰۰ ہزار روپے ہوتی ہے بطریقہ قطعی فروخت کرتا ہوں یہ کل رقم ۵۲۰۰۰۰ لاکھ نقد بوقت سپردگی مارکیٹ و کھیت و پانی وصول کرچکا ہوں مندرجہ بالا مملوکا جائیداد بدست مسمی عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانئی فروخت کردی ہے ۔ تحریر ہذا من مقر نے بہ عقل سلیم اپنی مرضی سے حوالہ کرتا ہوں یہ ملکیت بلاشرکت غیرے میری ذاتی ہے ۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو میں ہر قسم سے اس کا ذمہ دار ہوں گا ۔

العبد نعیم شاہ ولد انبالی ۔ راقم الحروف ملک سردار احمد نمبردار ۔ گواہ مسلم علی ، امیر زیب ولد ظہور علی ، چمن خان ولد قدرت اللہ ، عبدالرحمن ولد قدرت اللہ ۔

اس کے علاوہ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں بھی پیش کیے ۔

اور اس کے ساتھ وہ کیسٹ بھی پیش کی جس میں نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنی مارکیٹ ، تین کنال اراضی مع پانی نمبر عرب خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا اقرار کیا ہے اور کئی لوگوں کو مخاطب کرکے گواہ بنایا ہے ۔

قانون شرعی یہ ہے کہ جب کوئی مدعی اپنا دعویٰ پر بینہ پیش کرنے تو شرعاً قاضی پر لازم ہے کہ اس کے حق میں فیصلہ کرے کما فی مجلۃ الاحکام۔ (المادۃ ۱۸۱۸) ان أثبت المدعی دعواہ بالبینۃ حکم القاضی لہ بذلک۔ قال علی حیدر تحت ھذہ المادۃ ان اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ ای: اذا شھد شھود وجرت تزکیھم سراً وعلانیۃ فظھر انھم عدول ومقبولۃ الشھادۃ حکم القاضی بذلک۔ (درر الحکام۔ ۴/۶۴۵)

لہٰذا گواہان کی گواہی اور بطور تائید اسٹام میں تحریر شدہ اقرار نامہ جس پر گواہوں کے دستخط موجود ہے۔ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں اور ٹیپ شدہ بیان سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی سکنہ پانی نے بقائمئ ہوش و حواس اپنی ذاتی ملکیت ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو ۱۲ عدد دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی نمبر کے عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانی کے ہاتھوں فروخت کی ہے اور اس کو اپنی حیات ہی میں قبضہ دیا ہے جو آج تک عرب خان کے قبضہ میں ہے۔ شریعت مقدسہ میں جب دو فریق کے باہمی رضامندی کے ایک بار ایجاب قبول ہو کر عقد بیع ہو جائے تو پھر کسی کو بھی شرعاً اس عقد کے فسخ کا اختیار نہیں ہے۔

کما فی الھدایۃ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الخ (۳/۲۵)

وفی ملتقی الابحر واذا وجد الایجاب والقبول لزم البیع بلا خیار (بحوالہ مجمع الانھر۔ ۳/۱۰)

وھکذا فی الھندیۃ (۳/۸) وکذا فی فتح القدیر (۵/۴۶۴)

اس لیے جملہ مدعی بہ (تین کنال اراضی مع پانی نمبر اور پندرہ مرلہ مارکیٹ) عرب خان ولد شیر علی کی زر خرید املکیت ہے۔ کسی کا اس پر دعویٰ ارث وغیرہ کرنا شرعاً صحیح نہیں۔

فیصلہ شرعی

فریق اول: فاروق شاہ بن احمد شاہ مدعی۔

فریق ثانی: شیر علی، نعیم شاہ، وغیرہ پسران انبالی۔

فریق اول: فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ہے کہ انبالی (جو شیر علی، نعیم شاہ وغیرہ کا باپ ہے) اور اس کے بھائی میر علی نے آج سے تقریباً ۵۰، ۶۰ سال قبل میرے والد احمد شاہ ولد انبالی کی زوجہ اول امرو بی بی (مرحومہ) جو ۵۰، ۶۰ سال قبل فوت ہو چکی ہے کے جائیداد کو باہمی تقسیم کیا ہے، جب کہ اس جائیداد کا حقدار میرا والد صاحب ہے اس لیے وہ مجھے واپس دیا جائے۔ جبکہ

مدعا علیہان مدعی کے اس دعویٰ ارث کے منکر ہیں۔

جائزہ : قانونِ شرعی کے اندر ارث، وقف وغیرہ کے دعویٰ کے سماع کے لیے ضروری ہے کہ ۳۶ سال کے اندر اندر کیا جائے اگر بلاضرورتِ شرعی ۳۶ سال تک تاخیر کیا جائے تو شرعاً وہ دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔ اتنی مدت کی تاخیر سے سمجھا جائے گا کہ مدعی یہ مدعی کا حق نہیں ورنہ وہ اتنی تاخیر نہ کرتا۔

کما قال ابن عابدین : عن المبسوط اذا ترک الدعوی ثلاثا وثلاثین سنة ولم یکن مانع من الدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواه لان ترک الدعوی مع التمکن یدل علی عدم الحق ظاهرا وفی الجامع الفتوی لا تسمع الدعوی بعد ستة وثلاثین سنة الا ان یکون المدعی غائبا او صبیا او مجنونا ولیس لهما ولی او المدعی علیه امیرا جائرا الی اخره (رد المختار ۶/۷۴۲)

وقال العلامة سلیم رستم باز: اذا مضی علی الدعوی ثلاثون سنة بلا عذر فلا تسمع وان امر السلطان بسماعها۔ (شرح المجلة ۹۸۳)

وقال علی حیدر: لذلک فالدعوی التی تترک سنه وثلاثین سنة بلا عذر لا تسمع مطلقاً حیث ان ترک الدعوی تلک المدة مع الاقتدار علیها وفقدان العذر یدل علی عدم الحق۔

(درر الحکام شرح المجلة ۴/۲۹۵)

• وقال العلامة الخالد اتاسی : عن جامع الفتاوی ان المتاخرین من اهل الفتوی قالوا لا تسمع بعد ستة وثلاثین سنة الا ان یکون المدعی غائبا او صبیا او مجنوناً ولیس لهما ولی او المدعی علیه امیرا جائرا یخاف منه وعللوا ذلک بأن ترک الدعوی جمیع هذه المدة مع تمکن منها دلیل علی عدم الحق ظاهراً۔ (شرح المجلة ۵/۱۶۷)

لہٰذا ان دلائل کے پیشِ نظر فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ارث چونکہ ۶۰ سال گذر جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ جب کہ اس دوران کوئی عذرِ شرعی جو دعویٰ سے مانع ہو موجود نہیں تھا۔ اس لیے شرعاً ان کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہے۔ مدعی یہ انبالی اور اس کے بھائی میر علی کا منصور ہے اور ان کے بعد ان کے ورثاء کا حق ہے۔

باب التحکیم
(ثالثی کے احکام ومسائل)

ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کسی تنازع کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ہر مستحق کو اس کا حق دلانا شریعت میں مطلوب ومقصود ہے اور حق دار کو جہاں کہیں سے بھی اپنے حق کے حصول کا اطمینان حاصل ہو جائے چاہے قاضی کے ذریعے سے ہو یا کسی اور کے ذریعے سے ہو تو اس میں شریعت نے فریقین کو اختیار دیا ہے کہ جس طرح ہر شخص کو دوسرے معاملات میں اپنے اوپر ولایت حاصل ہے اسی طرح تنازعات میں بھی اگر وہ اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حَکَم مقرر کرے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاق رائے ضروری ہے، اگر کوئی بھی فریق ثالث مقرر کرنے سے انکار کرے تو صرف ایک فریق کی رائے سے ثالث مقرر کرنا جائز نہیں۔

کما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵) [۱]

کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ شرعی امور میں غفلت کے مرتکب شخص کو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص سے اس وقت صحیح انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے جب وہ زہد وتقویٰ کی زینت سے آراستہ ہو کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات میں احتیاط سے کام لے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، اور جو شخص زہد وتقویٰ سے خالی ہو اس سے

---

[۱] قال العلامۃ برهان الدین المرغینانیؒ: اذا حَكَّمَ رَجُلَانِ رجلاً فَحَكَمَ بینهما ورضیا بحکمہ جاز۔ (الهدایۃ ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی)

وَمِثْلُهٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۸۴۱ ص۱۱۹۳ الباب الرابع فی المسائل المتعلقۃ بالتحکیم۔

صحیح انصاف کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے ثالث تب صحیح فیصلہ کر سکے گا جب وہ شرعی امور کا پابند ہو اور احکاماتِ شرعیہ کی بجاآوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو لہٰذا ابتداءً فاسق کو ثالث مقرر کرنا درست نہیں لیکن اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے مقرر کر لیا ہو اور اس کا فیصلہ شرعی قواعد و ضوابط کے موافق ہو تو وہ شرعاً نافذ العمل ہوگا، چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو فیصلے سے قبل رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے کوئی بھی فریق فیصلے سے قبل اس کو زائل کر سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وافاد بقولہ لو صلح قاضیاً جواز تحکیم المرأۃ والفاسق لصلاحیتھما للقضاء والاولیٰ ان لا یحکما فاسقاً۔

(البحر الرائق ج ۷ ص ۲۶ باب التحکیم) [1]

دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دراصل فریقین کے تنازعہ کا حل نکالنا اور ہر ایک کو اپنا حق دلانا ثالث کی اہم ذمہ داری ہے اور ثالث یہ ذمہ داری اس وقت صحیح طریقے سے نبھا سکتا ہے جب وہ دینی امور سے واقف ہو کیونکہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر ان حقوق کے تحفظ کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے دینی امور سے واقف عالم کے ہوتے ہوئے کسی غیر عالم کو ثالث مقرر کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر غیر عالم کو ثالث مقرر کیا گیا تو جائز ہے لیکن اس پر لازم ہے کہ تنازعات کے تصفیہ میں ذاتی رائے قائم کرنے سے گریز کرے اور مسائل میں علماء سے رجوع کرے اس لیے کہ اگر اس کا فیصلہ شرعی اصول و ضوابط کے موافق ہو تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: انہ یمکنہ ان یقضی بفتوی غیرہ ومقصود القضاء

---

[1] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:۔ والفاسق اذا حکم یجب ان یجوز عندنا کما مر فی المولی۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۱۳۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج ۴ ص ۳۸۶ کتاب القضاء، باب التحکیم۔

يحصل بہ وهو ايصال الحق الى مستحقه - (الهداية ج ۳ ص ۱۳۲ ادب القاضى) [1]

ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم

سوال: دو بھائیوں نے مشترکہ مال سے ۵۰۰ کنال زمین خریدی ان میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، اس کے وارثوں میں ایک نابالغ بیٹا موجود ہے، بھائی کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی اس کی زمین میں تصرف کرتا رہا، جب متوفی کا بیٹا بالغ ہوا تو اس نے اپنے حصے کی زمین کا مطالبہ کیا، دونوں نے فیصلے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۵ کنال زمین متوفی بھائی کے بیٹے کو دی جائے گی اور باقی زمین دوسرے بھائی کی ملک میں رہے گی، اس وقت اس فیصلے پر دونوں راضی تھے لیکن متوفی کے بیٹے نے بعد میں انکار کیا، تو کیا شریعت کی رو سے ثالث کا یہ فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے اگر ثالث کو کسی متنازعہ معاملہ میں فریقین میں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو اس میں یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، اگر اس کا فیصلہ ان امور میں سے کسی کے بھی خلاف ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، تاہم فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنا حق معاف کرکے ثالث کے فیصلہ کو دوام بخش سکتا ہے، اس لیے حسبِ بیان مذکورہ بالا ثالث کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر متوفی اور زندہ موجود بھائی نے مشترکہ مساوی مال سے زمین خریدی ہو تو اس زمین میں متوفی نصف حصے کا حقدار ہے اور اس کا یہ نصف حصہ اس کے وارثوں میں وراثت کے شرعی اصول کے تحت تقسیم کیا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں ثالث کا فیصلہ چونکہ قرآن کریم اور سنت کے اصول کے منافی ہے اس لیے شرعاً نافذ نہیں، جب نافذ ہی نہیں تو فریقین میں سے ہر کوئی اس کو رد کرسکتا ہے۔

لما قال العلامة ابو بکر بن مسعود الکاسانیؒ: فان وقع فی فصل فیہ نص مفسر من الکتاب او الخبر المتواتر او الاجماع فان وافق قضاءہ ذلک نفذ ولا یحل له النقض

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: لانه یمکنه ان یقضی بعلم غیره بالرجوع الی فتوی غیره من العلماء۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ فصل التحکیم، کتاب آداب القاضی)
ومثلہ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۳ کتاب القضاء۔

لانه وقع صحیحاً قطعاً وان خالف شیئاً من ذلك یردّه لانهٔ وقع باطلاً قطعاً۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۴ کتاب آداب القاضی۔ فصل واما بیان ماینقض من القضایا ..... منها) ۱؎

قاضی اور حَکَم کا فرق

سوال:۔ بعض علاقوں میں لوگ باپ دادا کے قانون کے موافق اپنے فیصلے عدالتوں سے کراتے ہیں، اس میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی نہیں ہوتا، اور بعض لوگوں نے شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے باقاعدہ ایک عالم مقرر کیا ہوتا ہے جو اُن کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کو قاضی تصوّر کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلوں کے بارے میں بااختیار ہو اور ہر خاص وعام پر اس کو یکساں ولایت حاصل ہو کیونکہ اختیارات میں معمولی سی کمی بیشی کے باعث لوگوں میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے قضاء کا مقصد پورا نہیں ہوسکے گا، اور قاضی کو یہ مکمل اختیارات تب حاصل ہوں گے جب اس کو حکومتِ وقت نامزد کرے کیونکہ قاضی حکومت کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور فریقین اپنی مرضی سے جس کو فیصلوں کے لیے مقرر کریں اس کو تو صرف ان لوگوں پر اختیارات حاصل ہوں گے جنہوں نے اس کو مقرر کیا ہو، ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو اختیارات حاصل نہیں، اس لیے اگر لوگ اپنے فیصلوں کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ حَکَم ہوگا قاضی نہیں۔

لما قال العلامة اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: ان المحکم ادنیٰ مرتبة من القاضی لاقتصار حکمه علیٰ من رضی بحکمه وعموم ولایة القاضی۔ (العنایة علیٰ هامش فتح القدیر ج ۷ ص۳۰۶ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی) ۲؎

۱؎ قال العلامة ابن قاضی سماوةؒ: قضایا القضاة ثلاثة اقسام (۱) حُکمٌ بخلاف نص او اجماع وهٰذا باطل فلکل من القضاة نقضه اذا رفع الیه ولیس لاحد ان یجیزه۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۳۳ الفصل الثانی فی القضاء فی المجتهد فیه)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۷ ص۱۱ کتاب ادب القضاء۔ باب التحکیم۔

۲؎ لما قال العلامة الحصکفیؒ: عرفاً تولیة الخصمین حاکماً یحکم بینهما ورکنه علیه مع قبول الآخر۔ (الدرالمختار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۴ ص۳۸۶ باب التحکیم۔ کتاب القضاء)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۷ ص۲۴ کتاب آداب القاضی۔ باب التحکیم۔

معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا | **سوال**:۔ فریقین نے دو آدمیوں کو زمین کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا، بعد میں کسی وجہ سے ایک فریق کا دونوں ثالثوں پر اعتماد باقی نہ رہا اور اس نے فیصلے سے پہلے ان دونوں کو معزول کرنے کا باقاعدہ اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ثالثوں نے فیصلہ کر دیا، تو کیا ثالثوں کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان دونوں آدمیوں کو فریقین نے چونکہ اپنی طرف سے ثالث مقرر کیا ہے لہٰذا فریقین میں سے اگر کوئی بھی ان کو معزول کرنا چاہے تو فیصلے سے قبل ان کو یہ اختیار حاصل ہے، جب ایک فریق نے دونوں ثالثوں پر عدم اعتماد یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو معزول کر دیا تو اب ان کی تحکیم کالعدم ہوگی اور ان کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: لو عزل احد الخصمین قبل الحکم لم ینفذ حکمہ علیہ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۲۹ الفصل الخامس فی التحکیم۔ کتاب القضاء)[1]

فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حَکَم کیلئے اُجرت لینا جائز نہیں | **سوال**: فریقین فیصلہ کے لیے ایک قاضی کے پاس گئے، اُس نے فیصلے پر پندرہ (۱۵) روپے اُجرت پیشگی وصول کی، فریقین کی سستی کی وجہ سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا، اب فریقین قاضی سے اُجرت واپس کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی اُجرت واپس کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سستی تمہاری طرف سے ہوئی ہے اس لیے میں پیشگی لی ہوئی اُجرت واپس نہیں کروں گا، تو کیا قاضی کے لیے فیصلے سے قبل اُجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قاضی شرعی قاضی نہیں کیونکہ قاضی تو حکومت کی طرف سے مقرر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وقال انہ یخرج عن الحکومۃ باحد اسباب ثلاثۃ بالعزل او بانتہاء الحکومۃ نہایتہا بان کان موقتاً فمضی الوقت او یخرج من ان یکون اھلاً للشھادۃ۔

(البحر الرائق ج ۷ ص۲۸ باب التحکیم)

وَ مِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج۴ ص۳۸۷ کتاب القضاء۔ باب التحکیم۔

ہوتا ہے، جب فریقین فیصلے کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ مُحکَّم ہوتا ہے اور تحکیم میں چونکہ فیصلے سے قبل فریقین کو رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے ان میں سے اگر ایک فریق یا دونوں رجوع کر لیں تو یہ تحکیم فسخ ہو جائے گی، جب تحکیم فسخ ہو جائے تو محکم اجرت کا مستحق نہیں رہتا، ان کے مابین اجارہ تحکیم پر ہوتا ہے، جب فریقین رجوع کر لیں تو اجارہ بھی فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اجارہ محض عقد سے لازم نہیں آتا بلکہ جو شرط اس میں لگائی گئی ہو اس کا پورا ہونا ضروری ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محکّم کو یہ رقم لینا جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والاجر لا یلزم بالعقد فلا یجب تسلیمه بل بتعجیله او شرطه فی الاجارة۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۶ کتاب الاجارة) ؎۱

علاقائی اصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال: مروجہ اصلاحی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے کسی فیصلے سے انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علاقائی اصلاحی کمیٹیاں جو کہ اکثر علاقہ کے معززین پر مشتمل ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کے تنازعات ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن فیصلوں کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ فریقین جب ان سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں اور جس فیصلے میں بھی اختیار حکومت کی بجائے عوام کی طرف سے ملتا ہے تو ان اختیارات کے تحت فیصلے کرنے والے کی شرعی حیثیت مثل حَکَم کے ہوتی ہے، تو جس طرح فریقین کو حَکَم کے فیصلے سے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح جب حَکَم فیصلہ کر دے تو پھر فریقین کے لیے اس کا تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے، اسلئے اگر کسی اصلاحی کمیٹی کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار جائز نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمه الله: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

(الهدایة ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم کتاب آداب القاضی) ؎۲

؎۱ قال العلامة سلیم رستم باز: لا تلزم الاجرة بالعقد المطلق یعنی لا یلزم تسلیم بدل الاجارة حالاً بمجرد انعقادها۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۴۶۶ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی المسائل المتعلقة الخ)
ومِثلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۲۹۲ کتاب الاجارة، باب الاجر متی یستحق۔

؎۲ قال العلامة الکاسانیؒ: اذا حکم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب آداب القاضی)
ومِثلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم۔

کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ فریقین میں سے ایک فریق غائب ہے اور ثالثوں نے اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ دوسرے فریق کے حق میں کر دیا، تو کیا ثالثوں کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر فریقین نے ثالثوں کو باقاعدہ فیصلے کا اختیار دیا ہو اور فیصلے سے قبل کسی ایک فریق نے بھی ان سے رجوع نہ کیا ہو تو ثالثوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے بیانات وغیرہ حاصل کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر ثالثوں نے طرفین سے بیانات وغیرہ حاصل نہ کیے ہوں اور محض ایک فریق کے بیانات پر فیصلہ کیا ہو تو وہ فیصلہ جائز نہیں، کیونکہ جس طرح قضاء میں یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ قضاء کے وقت عدالت میں حاضر ہو، اگر وہ خود حاضر نہیں ہونا اور اپنی طرف سے وکیل وغیرہ مقرر کیا ہو تو اس کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مدعیٰ علیہ یا اس کی طرف سے مقرر شدہ خصم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی صورتحال کی پوری وضاحت مشکل ہے تو جب قضاء میں مدعیٰ علیہ کا موجود ہونا ضروری ہے تو تحکیم جو کہ اس سے کم درجہ رکھتی ہے اس میں بطریقِ اولیٰ اس کی موجودگی ضروری ہے لہٰذا ایک فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کا یکطرفہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

قال العلامة المرغیناني رحمه الله: ولا یقضی القاضی علی غائب الا ان یحضر من یقوم مقامه۔ (الهداية ج۳ ص۱۴۲ باب کتاب القاضی الی القاضی) [1]

ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان زمین کی حدود پر تنازعہ ہوا، ان دونوں کے درمیان جرگہ نے فیصلہ کیا اور دونوں اس فیصلے پر راضی ہوئے، ان میں سے ایک نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے اور اس کی حدود نہیں توڑوں گا لیکن تین چار ماہ گذرنے کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حدود بھی توڑ دیئے، تو کیا جرگہ کے فیصلہ کے بعد اس سے انکار کرنا

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله: اما الذی یرجع الی المقضیٰ علیه فحضرته حتی لا یجوز القضاء علی الغائب اذا لم عنه خصم حاضر وهذا عندنا۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۸ کتاب آداب القاضی۔ فصل واما شرائط القضاء فانواعٌ الخ)

ومِثلُهُ فی البحر الرائق ج۷ ص۱۷ باب کتاب القاضی الی القاضی۔

درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر ان دونوں نے اپنی مرضی سے ثالث مقرر کیے ہوں اور مدتِ تحکیم کے اندر ان ثالثوں نے فیصلہ کیا ہو اور ان کا فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو وہ نافذ العمل ہے، کیونکہ تحکیم کی وجہ سے ثالثوں کو ان دونوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے ان کا فیصلہ دونوں فریقوں پر تسلیم کرنا لازم ہے، لہٰذا فیصلہ کے بعد کسی بھی فریق کا اس سے انکار کرنا درست نہیں، اسی قسم توڑنے کے بدلے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

(الهدایة ج ۳ ص۱۴۳ باب کتاب القاضی الی القاضی)[1]

ثالث معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر فریقین کسی کو ثالث مقرر کریں تو ان میں سے کوئی فریق اس کو معزول کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب فریقین اپنی مرضی سے کسی کو ثالث مقرر کریں اور اس کو فیصلے کا اختیار دیدیں تو ثالث کو چونکہ فیصلے کا اختیار ان دونوں کی وجہ سے ملا ہے، اس لیے اگر ثالث کے فیصلے سے قبل کسی بھی فریق کو اس پر اعتماد باقی نہ رہے یا کسی اور وجہ سے اس کو معزول کرنا چاہے تو جیسا کہ قاضی کو فیصلوں کا اختیار حکومت سے مل جاتا ہے اور حکومت کو ہر وقت اس کے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح فریقین میں سے ہر ایک کو ثالث معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من الخصمین عزل الحکم قبل الحکم لانه مقلد من جهتهما فکان لکل منهم عزله وهو من الامور الجائزة فینفرد احدهما بنقضه کما ینفرد احد العاقدین فی مضاربة وشرکة ووکالة۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۷ ص۱۱۹ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم)[2]

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: واذا حکم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب ادب القاضی)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸۔ کتاب الدعوی۔

[2] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (وینفرد احدهما بنقضه) ای التحکیم بعد وقوعه (کما) ینفرد احد العاقدین (فی مضاربة وشرکة ووکالة) بلا التماس طالب۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۸۷ باب التحکیم)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔

فیصلے کے لیے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم

سوال:۔ فریقین نے تنازعہ کے فیصلے کا اختیار چند افراد پر مشتمل کمیٹی کو دیا، فیصلے کے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوگیا، بعض ارکان نے مخالفت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فریق کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، تو کیا ان کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ چونکہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی کو فیصلے کا اختیار فریقین کی طرف سے ملا ہے اس لیے اس کمیٹی کی حیثیت حکم کی طرح ہے اور فریقین فیصلہ کا اختیار دیتے وقت ثالث پر جو بھی شرائط عائد کریں ثالث پر ان کی پابندی کرنا لازمی ہے، اگر ثالث ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرے تو کوئی بھی فریق اس کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں جب فریقین نے اپنے فیصلے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین نے کمیٹی کے تمام ارکان کو فیصلے کا اختیار دیا اور فیصلے میں کمیٹی کے تمام افراد کے اتفاق رائے کو شرط قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر متعدد ثالثوں میں سے ایک بھی فیصلہ کی مخالفت کرے تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ــــــــــ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال جب کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بعض ارکان کا اپنے طور پر فیصلہ کرنا جائز نہیں اس لیے فیصلہ نافذ العمل نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبنانیؒ : اذا تعدد المحكمون على ما ذكر آنفاً يلزم اتفاق رأى كلهم وليس لواحد منهم ان يحكم وحده۔

لہ [شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۴ ص۱۱۹۶
{ الباب الرابع فى المسائل المتعلقة بالتحكيم }

□ □

لہ قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله : ولو حكما رجلين فحكم احدهما لم يجز ولا بد من اتفاقهما على المحكوم به فلو اختلفا لم يجز۔
(البحر الرائق ج ۷ ص۲۶ باب التحكيم)

اِسلامی قوانین ○ جامعیّت واھمیّت

دنیا کے اندر ملکی نظام کو چلانے، شاندار حکومت کرنے اور ملک و ملت میں امن و امان پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات کے تحت قوانین بنائے گئے اور ان کے اجراء و نفاذ کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ بدامنی اور لاقانونیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو نہ پہلے محفوظ تھی نہ اب ہے۔ اس بارے میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ قوانین انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لئے آئے دن ان میں کوئی نہ کوئی تبدیلی سامنے آتی رہتی ہیں جس سے امن و مسائل مزید پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔

اسلامی قوانین چونکہ منزّل من اللہ ہیں اس لئے انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان پر عمل کرکے ہی امن وامان، دہشت گردی جیسے بین الاقوامی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر جامعہ حقانیہ کے مفتی اور استاذالحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "اسلامی قوانین، جامعیت و اہمیت" لکھا جسے شائع کرنے کا اعزاز بھی ماہنامہ الحق نے حاصل کیا۔ اب اس مقالہ کو فقہ اور فتاویٰ کی مناسبت سے افادۂ عوام و خواص کے لیے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

اسلامی قوانین / جامعیّت واہمیّت

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

انسان مَدَنِی الطبع ہونے کی وجہ سے معاشرہ سے اس کا تعلق لازمی ہے۔ تجرد، انفرادیت اور رہبانیت شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح سمجھی جاتی ہے۔ انسان کائناتِ عالم کی خوبصورتی اور زینت ہے، یہ خوبصورتی ایک اچھے معاشرہ کی صورت میں باقی رہے گی، انسان کی ضروریات اور حوائج کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی جملہ ضروریات بذاتِ خود پورا نہیں کرسکتا بلکہ معاشرہ میں رہ کر ایک دوسرے سے فائدہ اور استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

قانون کی حقیقت فائدہ اور استفادہ میں اگر انسان کو کھلے طور پر اجازت دی جائے اور اس پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے تو اس سے انسان کی زندگی تباہ ہوگی۔ ایسی صورت میں جبر و تشدد، حرص و لالچ، ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا۔ انسانی زندگی گذارنے کے لیے، انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات ضروری امر ہے کہ جس میں معاشرہ بربادی سے محفوظ ہو، انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس میں اس کو کسی قانون کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اگر انسان کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن میں اس کا تحفظ قانونی ذریعہ سے نہ ہو تو اس سے اس کی تربیت و تعلیم کا پیارا مرحلہ ضائع ہوسکتا ہے۔ اگر جوانی میں کسی ضابطۂ حیات کی پابندی کا احساس نہ ہو تو اس سے انسان شباب کے وقت ایسی راہ پر چل سکتا ہے جس سے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے، اگر بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت میں انسان کو مکمل تحفظ میسر نہ ہو تو اس سے خودکشی جیسے قبیح امور کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، غرضیکہ انسان زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کے سنوارنے کے لیے اس ضابطۂ حیات کا دوسرا نام "قانون" اور "آئین" ہے۔ علماء قانون کی نظر میں اس کی جامع تعریف یوں کی گئی ہے:۔

"قانون ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں مروجہ مسلمہ، سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کا تحفظ کیا جائے"۔

قانون کی ضرورت اسلام کی نظر میں تو مکلّف انسان قانون اور ضابطے کا پابند ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الدنیا سجن المؤمن"۔ دنیا مسلمان کے لیے ایک جیلخانہ ہے جہاں اس کی ہر ایک حرکت قانون اور ضابطہ کے تحت ہو گی۔ مذہب کے لحاظ سے یہ پابندی لازمی امر ہے۔ آج کے نام نہاد جمہوریت پسند اور حریت پسند لوگ بھی قانون کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے، ان کے ہاں بھی قانون کی پابندی لازمی امر ہے، اگرچہ زبان پر آزادی کا خوشنما نعرہ ہر وقت دھوکہ دینے کے لیے جاری رہتا ہے لیکن ان کی آزادی کی حقیقت صرف اور صرف مذہب اور عقیدہ سے آزادی سے عبارت ہے۔ آج اگر یورپی ممالک کی مثال لی جائے تو وہاں پر قانون کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً لاکھوں لوگ مغربی ممالک میں رہائش چاہتے ہیں لیکن قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں رہائش نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ قانون ہی ان لاکھوں افراد کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کو پابند رکھنا جرم ہو تو پھر سب سے بڑے مجرم آج ترقی یافتہ ممالک ہیں جنہوں نے غریب ممالک کے لوگوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان ممالک میں تاجر و مالک، کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان تعلقات بنانے کا واحد ذریعہ قانون سمجھا جاتا ہے، جب ترقی یافتہ ممالک کی کشتی قانون کے بغیر نہیں چل سکتی تو ترقی پذیر ممالک میں قانون کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قانون کی ابتداء اسلامی نقطہ نظر سے قانون کی ابتداء ہبوطِ آدم سے شروع ہوئی ہے۔ گویا جب انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تو خلافت کے نظم و نسق کے لیے قانون کی ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ موجودہ دور کے قانونی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ خاندان اور قبیلہ کے وجود کے ساتھ ہی دنیا میں قانون کا ظہور ہوا۔

انسان نے حرص اور لالچ سے جب ہم نوع کے حقوق پر دست درازی شروع کی تو حقوق کی حفاظت کے فطری جذبہ نے لوگوں میں قانون کی ضرورت کا احساس ابھارا۔ چنانچہ غیر اختیاری طور پر خاندانوں اور قبیلوں میں عرف، رواج یا دوسرے ایسے قواعد و ضوابط پیدا ہوئے جس کے تحت زندگی گذارنی ضروری ہوئی۔ جوں جوں خاندان اور قبیلہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی تو قانون کی ضرورت میں بھی شدت ہوتی رہی اور قانون کو معاشرہ کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے جدت اور تبدیلی لازم قرار پائی، یہ قانون کے لیے اگرچہ طفولیت کے ادوار تھے، لیکن پھر ایک خاندان اور قبیلہ میں قانون لازمی امر رہا۔ خاندان اور قبیلہ سے انسانی معاشرہ جب ریاست کی شکل میں تبدیل ہوا تو قانون نے دوسرا قدم اٹھایا، اور جب ریاست سے سلطنت اور حکومت کی صورتیں سامنے آئیں تو اس سے

قانون میں اور بھی جدت پیدا ہوئی۔ گویا انسانی زندگی کے اول روز سے ہی قانون کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔

قانون کی قسمیں تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے دو قسم کے قوانین وضع ہوئے۔ پہلی قسم کا قانون وہ ہے جو انسان نے خود اپنے لیے بنایا، مقنن خود بھی اس کا پابند رہا، اس قانون میں عموماً وقت اور حالات کی رعایت ہوتی رہی اور مقنن معاشرہ کے حالات کو مدِنظر رکھ کر قانون مرتب کرتا رہا، جب حالات کی تبدیلی ایک لازمی امر تھا تو اس قانون میں بھی ترمیم و اضافے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا۔ قانون کی اس قسم کو ہم "انسانی قانون" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس کا بنانے والا خود انسان ہوتا ہے اور یہ انسانی دماغ کا اثر ہے۔

دوسری قسم کا قانون وہ ہے جس کا بنانے والا بالائی طاقت رہی، یعنی مقنن نے اپنی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی ضروریات کے لیے قانون وضع کیا، اس میں وقتی مصلحت یا حالات کی ضرورت کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ ابدی ضرورت کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا تھا اس لیے وقت اور ضرورت کی تبدیلی سے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، یہ عمر بھر کے لیے قابلِ عمل رہا، اس قانون کو "رحمانی قانون" کہا جاتا ہے۔

انسانی قانون کی حقیقت آج قانون کا لفظ بول کر معاشرہ میں اس سے اول الذکر قانون مراد لیا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگ جو ذہنی جمود کا شکار ہوتے ہیں ان کے نزدیک قانون صرف انسانی قانون سے عبارت ہے، مذہب یا عقیدہ کا قانون سے کوئی رشتہ نہیں، ان لوگوں کے نزدیک قانون اجتماعی زندگی کا محافظ ہے جبکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کا تعین کرتا ہے جبکہ مذہب خدا اور انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔ یہ رائے حقیقت اور واقعات سے صریح مخالف ہے لہٰذا ایسی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ انسانی قانون نے کچھ اچھے ثمرات بھی دکھائے لیکن "واثمھما اکبر من نفعھما"، یعنی ثمرات سے مضرات زیادہ ہیں۔ قانون کی یہ شکل ہر دور میں مختلف رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں قانون امیر یا خاندانی سربراہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہوتی، خاندانی سربراہ جو قاعدہ یا ضابطہ مقرر کرتا اُسے قانون کا درجہ حاصل ہوتا، کسی کو اس سے مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں بڑی شدت سے اس کا محاسبہ کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انسانی حقوق کے تحفظ کا نیا نعرہ لگا کر جمہوریت کی آواز بلند ہوئی تو اس سے قانون بنانے کے طریقہ کار میں کافی تبدیلی آئی۔ موجودہ وقت کے قانونی ڈھانچہ اور حالات و واقعات خاص کر جمہوری اصول کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی قانون کے بنانے والے تین شعبے ہیں۔

مقننہ کے مختلف شعبے انسانی قانون بنانے میں تین شعبوں کا بڑا دخل ہے، گویا یہ تینوں شعبے انسانی قانون کے ماخذ اور مراجع ہیں اور وہ یہ ہیں :۔

(۱) سربراہِ مملکت (۲) آئین ساز ادارے (۳) عدالتی نظائر

سربراہِ مملکت یہ شعبہ قدیم دور کے خاندانی سربراہ کی ایک جدید شکل ہے، البتہ قدیم دور میں خاندانی سربراہ مختارِ کل ہوتا تھا جبکہ عصرِ حاضر میں اس شعبہ کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سربراہِ مملکت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں نظریۂ ضرورت کے تحت کوئی نہ کوئی قانون ''آرڈیننس'' کی صورت میں نافذ کر سکتا ہے اگرچہ اس کی منظوری کے لیے کسی پارلیمنٹ کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے لیکن پھر بھی قانون بنانے میں سربراہ مملکت کافی دخل رکھتا ہے۔

آئین ساز ادارے قانون بنانے والوں کا دوسرا اہم شعبہ ''آئین ساز'' ادارہ ہے اور جمہوری ممالک میں اس ادارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایسے ادارہ کی محنت اور سعی سے بنا ہوا قانون جدید ذہن والے صحیفہ آسمانی کے برابر سمجھتے ہیں، اس میں ترمیم و منسوخی کا حق بھی اسی ادارہ کو حاصل رہتا ہے، آجکل قومی اور صوبائی اسمبلیاں اور سینٹ کے ادارے اس کے نمونے ہیں، ان اداروں میں کثرتِ رائے سے جو بات سامنے آتی ہے اسی کو ملک کا قانون سمجھا جاتا ہے، اس میں ووٹوں کی کثرت کا اعتبار رہتا ہے، جس بات کی حمایت میں زیادہ ووٹ نکل آئیں تو وہ قانون بن جاتی ہے، گویا کہ اس میں تمام تر فیصلے کثرتِ رائے پر ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے قانونی شکل میں نفاذ کیلئے (Bill) وغیرہ کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے لیکن حتمی منظوری کے بعد اس کو قانونی قالب میں ڈھال کر ملک کے قانون کا مستقل حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

عدالتی نظائر انسانی قانون کا تیسرا ماخذ عدالتی نظائر ہوتے ہیں، کسی جمہوری ملک کی عدالتِ عالیہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون کی تشریح کرتے ہوئے جو فیصلہ کرتی ہے تو ماتحت عدالتیں بھی اس کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکِ عزیز پاکستان کی اعلیٰ عدالت ''سپریم کورٹ'' نے جب کوئی فیصلہ کیا تو ''ہائیکورٹ'' یا ماتحت عدالتیں اس فیصلہ سے متاثر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فیصلوں

اس کا لحاظ رکھتی ہیں تو یہ فیصلے مستقل قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں انسانی قانون یا قانون سازی کو انسان کے بنیادی حقوق کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمانی قانون کی حقیقت

قانون کی دوسری قسم یعنی "رحمانی قانون" کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو اس وقت حضرت آدمؑ سے فرمایا "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸) یعنی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات آئے گا، تیری اولاد کے لیے اس کی تابعداری ضروری ہو گی۔"

انسانی ہدایت کی یہ حقیقت دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۳۵) اے اولادِ آدم تمہارے پاس میرے رسول آئیں گے جو میری آیتیں بیان کریں گے۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ضابطۂ حیات کی تقرری اور تعیین کے لیے دو راہیں متعین کیں۔ ایک راہ "ھُدًی" یعنی ہدایت اور دوسری راہ "رسول" ہے۔ گویا رحمانی قانون کے ماخذ اور مراجع اصولی طور پر یہ دونوں ٹھہرائے گئے۔

رحمانی قانون کے ماخذ

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کتنی کتابیں نازل کیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں، دس صحائف حضرت آدمؑ پر، پچاس صحائف حضرت شیثؑ پر، تیس صحائف حضرت ادریسؑ پر اور دس صحائف حضرت ابراہیمؑ پر اتارے اور چار بڑی کتابیں توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن مجید نازل کیں۔

یہ ایک سو چار کتابیں حقیقت میں رحمانی قانون کے مختلف ایڈیشن اور نسخے ہیں، پھر قانون کا یہ اہم کام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لیا گیا، گویا ماضی میں یہ دو راہ یعنی ھدیٰ اور رسول متعین تھیں، لیکن جب رحمانی قانون کا آخری کامل اور مکمل نسخہ قرآن کی شکل میں خاتم الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور آئندہ کے لیے سلسلۂ نبوت ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کے ساتھ دوسرے دو طریقے اور بھی شامل کیے، جن کو "اجماعِ امت" اور "قیاس" کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)

(ترجمہ) ”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعداری کرو اور اولی الامر کی تابعداری کرو اور اگر کسی چیز میں جھگڑا پڑے تو اللہ اور رسولؐ کے احکام کی طرف رجوع کرو۔“

اس آیت میں رحمانی ہدایت کے ماخذ اربعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون اور رحمانی ہدایت کے چار ماخذ ہیں۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسولؐ سے سنت الرسول، اولی الامر سے اجماع اور فردوہ الی اللہ والرسولؐ سے قیاس کی طرف اشارہ ہے۔

گویا اسلامی قانون کبھی آدمؑ اور مصحف آدم کی شکل میں آیا، کبھی شیثؑ کے پچاس صحیفوں میں آیا، کبھی ادریسؑ اور صحف ادریسؑ کی شکل میں، کبھی ابراہیمؑ اور صحف ابراہیمؑ کی شکل میں وضع ہوا، کبھی داؤدؑ اور زبور، کبھی موسیٰؑ اور توریت اور کبھی عیسیٰؑ اور انجیل کی شکل میں آیا، اور آخری ناقابل ترمیم مسودہ ”قرآن“ کی شکل میں اترا جس کی تفصیل سنت رسولؐ، اجماع امت اور قیاس سے کرائی گئی۔

اسلامی قانون کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات

اسلامی قانون کی خصوصیات اور امتیازات یا تقابلی مطالعہ کے بغیر ہمارے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلے میں ”رحمانی قانون“ انسانی معاشرہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ صرف ہم نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کوئی دوسرا قانون وقت اور حالات کیلئے مناسب نہیں۔

(۱) ڈاکٹر سیموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنت میں گونجتے ہیں۔

(۲) مسٹر ولف کہتا ہے کہ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم و مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

(۳) ڈاکٹر مولیس فرانسیسی لکھتا ہے کہ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں قرآن ان سب سے افضل ہے۔ (علوم القرآن ص ۴۳)

اِسلامی قانون کے اہم شعبے

اگرچہ قانون کے شعبہ "دستوری قانو (Constitutional Law) "انتظامی قانون" (Administrative Law) "خارجہ پالیسی" کا پورا تذکرہ قرآن وحدیث میں موجود ہے اور عملی تجربہ خلفائے راشدین کے دور خلافت میں نمایاں ہے۔ دستوری قانون اور انتظامی قانون اظہر من الشمس ہیں کہ ہمارا دستور قرآن وسنت ہے اور اس میں ہر ایک کے اختیارات محدود ہیں' اور خارجہ پالیسی بھی واضح ہو کہ تعلقات جوڑنے اور توڑنے کے لیے اسلام ہی بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے تاہم غیر مسلم ممالک سے معاملات اور تعلقات رکھنے میں رخصت دے کر تمام دنیا سے خارجی پالیسی بنانے کی اجازت دی ہے لیکن دوستی کا ہاتھ صرف اسلامی ممالک کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔

موجودہ وقت میں بین الاقوامی یا ملکی قوانین کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون کے دو شعبے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ رعیت کی خوشحالی و ترقی اور امن وامان کا مسئلہ ان دونوں شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں پہلا شعبہ شخصی قانون (Personal Law) اور دوسرا شعبہ ملکی قوانین (Public Law) ہے۔ ہم پوری تفصیل بیان کیے بغیر ان دونوں شعبوں کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا راز صرف اسلامی قانون میں مضمر ہے۔

اِسلام کا شخصی قانون

شخصی قانون کا تعلق عموماً فرد اور خاندان سے ہوتا ہے۔ اسلام میں فرد کی اصلاح کیلئے تین چیزیں خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں جو نماز' روزہ' اور حج ہیں' ان تینوں عبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، مفسرین ان تینوں کو امور مصلحہ للنفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تینوں عبادات میں باقاعدگی سے انسان میں اتباع قانون' ایثار اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ابتداء میں ہوتا رہتا ہے۔

ان تینوں امور کے بعد گھرانے اور خاندان کے جوڑنے کے لیے نکاح، مہر، نفقہ، حضانت' طلاق کی دفعات کتاب النکاح میں بیان ہوتی ہیں تاکہ اس سے انسان ایک خوشحال گھرانہ میں زندگی بسر کر سکے اور طلاق کے قانون پر سہولت دی گئی کہ بصورت ناچاقی خلاصی ممکن ہو۔ گذر اوقات کیلئے اسباب ملک میں بیع وشراء (خرید وفروخت) وصیت' ہبہ، شفعہ، وراثت وغیرہ قوانین معاملات میں بیان ہوئے ہیں تاکہ ملکیت کے اسباب متعین ہوں اور کسی کو دوسرے کی جائیداد پر ناجائز قبضہ جمانے کا موقع نہ مل سکے، وفات کی صورت میں میت کی جائیداد میں زور آزمائی، ظلم وستم

اور زیادتی سے بچنے کے لیے وراثت کا عظیم قانون موجود ہے۔

اسلام کا ملکی قانون (Public Law) میں چند چیزوں کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان چیزوں کی حفاظت کو قانون میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۱) حفاظتِ نفس (۲) حفاظتِ نسب (۳) حفاظتِ مذہب (۴) حفاظتِ مال (۵) حفاظتِ عقل (۶) حفاظتِ عزت ـــــ اسلامی قانون میں بحمداللہ ان چھ چیزوں کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسّر نہیں۔

۱۔ حفاظتِ نفس حفاظتِ نفس کے لیے قرآنِ کریم نے دوٹوک اعلان کیا: "کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی" اس سے قصاص کا منصفانہ قانون نافذ ہوا تاکہ کسی شخص کا خون رائیگاں نہ کرنے پائے۔ یہاں تک کہ دوسرے امور میں خطا کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا، یعنی حقوق اللہ میں اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "رفع عن اُمتی الخطاء والنسیان۔ یعنی میری اُمت کی خطا اور بھول معاف ہے۔"

لیکن انسانی قتل میں خطا کی صورت میں کفّارہ اور دیت واجب قرار دی، پھر بھی اگر قاتل کا علم نہ ہو سکے تو پھر محلہ والوں کے لیے "قسامت" کا قانون نافذ کرکے دیت کی وصولی کے لیے عام اہلِ محلّہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسانی نفس تو کیا انسان کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ایک ایک پور کی حفاظت کی گئی کہ ایک پور کے بدلہ میں ۱/۳۰ حصہ دیت واجب ہوگی۔

۲۔ حفاظتِ نسب آج آپ ترقی یافتہ ممالک کی حالت دیکھیں کہ وہ جنسی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کا نسب محفوظ نہیں ہے، اسلام نے نسب کی حفاظت اس انداز میں کی کہ چند سال قبل ہندوستان کی اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ "چادر اور چار دیواری کی حفاظت اگر مقصود ہے تو مسلمانوں کے قانونِ رجم اور حد پر عمل کرنا پڑے گا" ـــــ زنا اور حرام کاری کی ممانعت کے علاوہ فسادِ نسب سے بچنے کے لیے نظر کی حفاظت لازمی قرار دی گئی کہ مسلمان مرد اور عورت کو چاہیئے کہ اپنی نظر نیچے رکھیں۔ پردہ کو لازمی قرار دیکر غیر محرم عورتوں سے خلوت اور ناجائز اختلاط ممنوع قرار دے کر فحش کاری کی بیخ کنی کی گئی، زنا کا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں شادی شدہ مرد اور عورت کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا، ارشادِ ربانی ہے:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (سورۃ النور آیت ۲)
(ترجمہ) "زناکار مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگا دیئے جائیں۔"

۳۔ حفاظتِ مذہب انسان کو عقیدہ اور مذہب سے بڑا پیار ہوتا ہے، اسلام میں "ذمی" کی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہبی اور اعتقادی مسائل میں دخل اندازی ممنوع قرار دی گئی لیکن اسلام جو کہ ابدی اور ازلی مذہب ہے اس کی مخالفت حدِ ارتداد سے کی گئی کہ ،۔
من بدل دینه فاقتلوه ۔ (جس نے دین تبدیل کیا اس کو قتل کر دو۔)

۴۔ حفاظتِ مال مال و دولت کی حفاظت عصرِ حاضر کا بڑا اہم مسئلہ ہے "آج دولت ہماری حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے" اسلام میں پہلے انسان کو حلال خوری کی ترغیب دے کر اس کے حلال مال کی حفاظت یوں کی گئی کہ کسی مسلمان کا مال غیر شرعی طریقہ سے کھانا حرام ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ زنی، چوری اور دھوکہ دہی کو جرم قرار دیا گیا، اگر کوئی شخص کسی کے حلال مال پر دست درازی کرے تو اس پر "حدِ سرقہ" جاری کی جائے گی مستقل حکم دیا گیا:۔
"اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا اَيْدِيَهُمَا ۔ (سورۃ النور آیت ۔) چور مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

۵۔ حفاظتِ عقل عقل انسان کا وہ جوہر ہے جس کو محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے عصرِ حاضر میں منشیات کی وباء عالمی سطح پر حکومتوں کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے، امریکہ سمیت پوری دنیا حیران ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوجوان اس مکروہ نشہ کا شکار ہو کر بالآخر خودکشی پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ لیکن بحیثیت مسلمان میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حدِ شربِ خمر کا مطالعہ کر کے صرف "کتاب الاشربۃ" کے باب کا قانون نافذ کر کے حدِ شربِ خمر کا اجراء کر دیا جائے تو پورے ملک میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور عقل کی یہ حفاظت حدِ شرب الخمر کے اجراء کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

۶۔ حفاظتِ عزت انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے، دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہتک عزت کا قانون ہے لیکن اسلام کی یہ دفعہ سب سے اہم اور نرالی ہے اس میں ایک شخص کسی دوسرے کو زانی یا چور جیسے قبیح الفاظ سے نہیں پکار سکتا ورنہ حدِ قذف کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہر وہ کلمہ جس سے ایک مسلمان کی عزت و وقار پر حرف آتا ہو قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار

غیر اسلامی ممالک اپنی عدالتوں اور ان کے طریقۂ قضا پر بہت نازاں ہیں اور اپنے طریقۂ قضاء کے لیے ہر کسی کو دعوت دیتے ہیں مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اخبارات رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے طریقۂ قضاء میں صاحبِ ثروت اور اثر و رسوخ والے شخص کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہے جبکہ غریب، نادار، کمزور اور بے بس آدمی کو ذلت و رسوائی کے سواء کچھ نہیں ملتا اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا طریقۂ قضاء فطرت کے عین مطابق ہے، جس میں ہر ایک کو پورے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق اس کی دہلیز پر دیا جاتا ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مضمون بعنوان "غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار" لکھا جسے ماہنامہ الحق نے شائع بھی کیا تھا۔ اب افادۂ عام اور فقہ و فتاوٰی کی مناسبت سے فتاوٰی دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

غیر اسلامی ممالک میں قضا کا طریقہ کار

قضا اسلامی تشخص کی تکمیل کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی ناقص اور ادھوری ہے۔ نظام قضا کے ذریعہ محاسبہ اور مواخذہ کی اس اہم دفعہ کی آبیاری ہوتی ہے جس پر اسلامی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ اگر انسان کے انفرادی یا اجتماعی افعال پر اپنی یا کسی قابل تعظیم شخصیت کی نظر نہ ہو یا اس کو آزاد چھوڑ کر اس کے کئے ہوئے افعال پر کوئی باز پرس نہ ہو تو اس سے قوتِ بہیمی کو حوصلہ افزائی کا ایسا موقع مل سکتا ہے جس سے انسانی اقدار مجروح ہوں۔

اسلام کے نظام قضاء و قانون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قضا صرف ایک معاشرتی ضرورت نہیں کہ جس کی حاجت اجتماعی معاشرہ میں محسوس ہو بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا دینی اور مذہبی فریضہ ہے جس کی ضرورت قدم بقدم محسوس ہوتی ہے۔ قضا دیگر عبادات کی طرح ایک مستقل عبادت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھنا مجھے ستر سال کی عبادت سے زیادہ پسند ہے — چنانچہ علماء کرام اسے تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ متصور کرتے ہیں۔

قال الشیخ وهبة الزحیلیؒ: قال بعضهم القضاء امر من امور الدین ومصلحة من مصالح المسلمین تجب العنایة به لان بالناس الیه حاجة عظیمة وهو من انواع القربات الی اللّٰه عز وجل ولذا تولاه الانبیاء علیهم السلام۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۴۸۲ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "بعض علماء فرماتے ہیں کہ قضاء دین کے امور میں سے (ایک اہم) امر ہے اور مسلمانوں کی بہتری کا ایک شعبہ ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہیئے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی یہ ذمہ داری قبول کی"

اس لیے اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رعایت ضروری ہے اس کی ادائیگی کے بغیر مسلمان مسئولیت کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے۔

نظام قضاء کیلئے قوتِ تنفیذی کی ضرورت

ایسی صورت میں نظام قضاء کا نفاذ اور اجراء کسی ولایتِ عامہ یا قوتِ تنفیذی کے وجود پر موقوف نہیں یہی وجہ ہے کہ تحکیم (پنچایت) یعنی کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینا نظام قضاء کا ایک شعبہ ہے اس میں

اگرچہ حَکم یعنی ثالث کی ولایت ناقص ہو کر صرف طرفین تک محدود رہتی ہے، اس میں بھی طرفین فیصلہ کرنے سے قبل بغیر کوئی وجہ بتائے رجوع کا حق قضائے محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب ایک دفعہ ثالث کا فیصلہ صادر ہو جائے تو یہ مستقل قضاء بن کر کسی دوسرے اعلیٰ قاضی کی عدالت میں مرافعہ کے وقت کسی خاص ضرورت کے بغیر اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، طرفین حسب معاہدہ اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظامِ قضاء جزوی طور پر کسی طاقت اور قوت کے استعمال پر موقوف نہیں، یہ الگ بات ہے کہ زیادہ تر القرون کے ان ادوار میں انسان طبعی حرص ولالچ کی وجہ سے کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا اور اپنا حق منوانے کے لیے جملہ وسائل بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس لیے نظامِ قضاء کے مثبت نتائج کے مشاہدہ کیلئے قوتِ تنفیذی کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی برکت سے شرعی فیصلہ کا تقدس اور عظمت بحال رہ سکے۔

غیر اسلامی علاقوں میں نظامِ قضاء کے چند نظائر

مسلمان ممالک کی طرح غیر اسلامی ممالک میں بھی جہاں پر کفار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں مسلمان اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے کے پابند ہیں، جیسا کہ عبادات سے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ایسا ہی حسب طاقت مسلمان اپنے مسائل اسلامی طرزِ حیات میں طے کرنے کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۶۵) ــــ (ترجمہ) "پس تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو منصف نہ جانیں اس جھگڑے میں جو اُن میں اُٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔"

مکی زندگی کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کو یہاں پر غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان اپنے فیصلے اپنے درمیان کرتے تھے، کسی غیر اسلامی فیصلہ کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

ایسا ہی مدنی زندگی میں اگرچہ خاص علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لیکن جو علاقے مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھے وہاں کے کچھ باشندے جب اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے مشرف ہو جاتے تو اپنے فیصلے باہمی مشورہ سے طے کرتے۔

فقہی جزئیات کی تائید فقہاء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جہاں کہیں کفّار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں تو وہ اپنے باہمی منازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی مسلمان قاضی کی تقرری کے پابند رہیں گے، علامہ کمال ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :۔

هٰذا اذا لم يكن سلطان ولا من يجوز منه كما فى بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبه فى المغرب الان وبنسيه وبلاد الحبشه واقروا المسلمين عندهم على مال يؤخذ منهم يجب عليهم ان يتفقوا على واحدٍ منهم يجعلونه واليا فيولى قاضياً ويكون هو الذى يقضى بينهم وكذا ينصبوا لهم اماما يصلى بهم الجمعة ۔ (فتح القدير ج ۶ ص ۳۶۵ كتاب القضاء)

(ترجمہ) ”یہ حکم اس وقت ہے جہاں کہیں حاکم نہ ہو یا کسی کافر سے قضاء قبول کرنے کی کوئی صورت نہ ہو جیسا کہ بعض مغربی اور حبشہ کے ممالک میں ہے، تو جب مسلمان باقاعدہ مال کی ادائیگی کے معاہدہ پر رہ رہے ہوں اُن پر ضروری ہے کہ اپنے درمیان کسی ایک پر اتفاق کر کے اُسے قاضی مقرر کریں جو اُن کے درمیان فیصلے کرے اور ان کے لیے امام مقرر کرے تاکہ وہ ان کو جمعہ (اور عیدین) کی نماز پڑھائے۔“

مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری ایسی حالت میں اگر مسلمان باہمی اتفاق سے کسی ایک معتمد شخص کو اپنا فیصل مقرر کریں تو اس کی حیثیت قاضی کی ہو گی، مسلمان اس کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ رؤیتِ ہلال سے صوم و افطار میں اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور جمعہ و عیدین دیگر شرائط کی رعایت کے بعد اس کی موجودگی میں ادا ہوں گے ۔۔ شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل الشہیر بابن قاضی سماوۃؒ فرماتے ہیں:۔

واما فى بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضى قاضياً بتراضى المسلمين ۔ (جامع الفصولين ج ۱ ص ۱۴ الفصل الاوّل فى القضاء)

(ترجمہ) ”وہ علاقے جہاں پر کفّار کا غلبہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جمعہ و عیدین کا پڑھنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی باقاعدہ قاضی ہو گا۔“

علامہ علاؤالدین الحصکفیؒ اس کی مزید اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

ولو فقد وال لغلبة الكفار وجب على المسلمين تعيين وال ۔ (الدر المختار على هامش ردّ المحتار ج ۴ ص ۳۰۸ كتاب القضاء)

(ترجمہ) ”اگر کفّار غلبہ سے کہیں مسلمان ولایتِ عامہ سے محروم رہیں پھر بھی اپنے لیے والی کی تقرری ان پر ضروری ہے۔“

عصرِ حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں

آجکل دنیا مذہب وعقیدہ، رنگ ونسل اور سوچ وفکر کے حوالہ سے منقسم ہے، عام محاورہ میں جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے، اس میں جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور حکومت کر رہے ہیں تو اپنے جملہ وسائل بروئے کار لاکر اس ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اس ملک کے ہر مسلمان باشندہ کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں بلکہ کسی غیر اسلامی نظام حیات کے تابع ہوں تو ان ممالک میں بھی بقدر استطاعت مسلمان اپنی مذہبی اقدار کی رعایت کرنے کے پابند ہوں گے، عقائد واعمال کی درستگی اور اسلامی طرزِ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا تو انفرادی معاملہ ہے جس میں ان کا کوئی عذر قابلِ سماع نہیں، خاص کر جن ممالک میں مذہبی آزادی ہو، لیکن باہمی جھگڑے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے کرنے کی بظاہر دو صورتیں نظر آتی ہیں۔

پہلی صورت پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اگر کہیں اجتماعی طور پر اس نظام کے قیام سے عاجز ہوں تو خود مذہبی جذبہ کی روشنی میں انفرادی طور پر اپنے معاملات قرآن وحدیث کی روشنی میں طے کریں، ایسی صورت میں کسی غیر اسلامی حکومت کے لیے کسی قسم کی قانونی پیچیدگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی مروجہ قوانین تک نوبت پہنچنے سے قبل ہی مسلمان اپنے معاملات کسی ایسے عالم کے ذریعہ طے کریں جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق متنازعہ معاملات طے کرنے کی اہلیت ہو، اس سلسلہ میں کسی فعّال اسلامی تنظیم کو بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے کہ وہ تنظیم خود مسلمانوں کے معاملات طے کرانے کا انتظام کرے یا کسی اور کے ذریعہ کرانے کا بندوبست کرے۔

انفرادی طریقۂ کار کی کمزوریاں اس طریقہ کار سے اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن پھر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت "تحکیم" کے سوا اور کچھ نہیں اور "تحکیم" کا دائرہ بہت محدود ہے۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں سیاسی طور پر مسلمانوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اوّلاً یہ کہ مسلمانوں کے پاس ایسے نظام کی تنفیذ کے لیے جب تک کسی مروجہ قانون کا سہارا نہ ہو تو محض دینی جذبہ سے اس کے تابع رہنے کے نتائج بہت کم سامنے آئیں گے۔ انسان طبعی طور پر نقصان برداشت کرنے یا کسی معاملہ میں ہار ماننے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان کو اگر شرعی فیصلہ میں اپنا نقصان نظر آئے تو وہ کسی مسلمان فیصلہ کنندہ کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کریگا۔

بلکہ متبادل ذرائع تلاش کر کے رائج الوقت قانون میں اپنا سہارا ڈھونڈے گا۔ علاوہ ازیں شرعی طور پر بھی "محکم" کا اختیار چند مسائل تک محدود ہے، قصاص و دیت اور حدود جیسے مسائل نمٹانے کی اہلیت "محکم" میں نہیں۔ اور اگر کہیں کسی فعال اسلامی تنظیم یا دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی مساعی سے یہ نظام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس کے اچھے نتائج محسوس ہوں تو یہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام کی دلیل ہوگی اور اس سے رائج الوقت حکومت اپنے لیے مستقبل میں خطرہ محسوس کرے گی ممکن ہے کہ اس باہمی تعاون کی وجہ سے مسلمان بعض علاقوں میں اس درجہ میں منظم ہوں کہ ان کے پاس معاشرتی میدان میں عملی طور پر قوت تنفیذی حاصل ہو اور مسلمان جبری طور پر اسلامی فیصلہ ماننے کیلئے تیار ہوں۔ یہ صورت اگرچہ بذاتِ خود بہت اچھے نتائج کی حامل ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہو سکتی ہیں جس سے غیر اسلامی اقتدار اعلیٰ ایسی کامیابی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرے گا۔

دوسری صورت | ایسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان اپنی ذمہ داری ایک دوسرے طریقے سے نباہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قضاء کے تحفظ کے لیے رائج الوقت قوانین کا سہارا لیں، اور یہ موجودہ وقت میں شخصی قوانین کے تحت قابلِ عمل بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان محنت کر کے سیاسی میدان میں اتنا مقام پیدا کر لیں کہ حکومت وقت سے اپنے حقوق منوا سکیں، مسلمان ایسے قوانین کے بنانے پر زور دیں کہ رائج الوقت قوانین میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے، یعنی جو مسلمان ہوگا وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا، ممکن ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ ہر مسئلہ میں ایسے فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے لیکن بعض امور میں یہ حق ملنا بھی مسلمانوں کے لیے موقعہ غنیمت سے کم نہیں کیونکہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو کچھ بھی ہو سکے اس سے روگردانی اور اعراض نہ کیا جائے، ایسی صورت میں علاقائی تحدید کی طرح اگر بعض مسائل تک قاضی کا دائرہ اختیار محدود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نظام قضا میں اس کی گنجائش ہے کہ کسی قاضی کا دائرہ اختیار ایام یا احکام کے اعتبار سے محدود ہو۔ چنانچہ علامہ الماوردیؒ فرماتے ہیں :-

ویجوز ان تکون ولایۃ القاضی مقصورۃ علی حکومۃ بینھما بین خصمین ولا یجوز ان ینفذ النظر الی غیرھما من الخصوم وتکون ولایۃ علی النظر بینھما باقیۃ ما کان التشاجر بینھما باقیا فاذا بت الحکم بینھما زالت ولایۃ .... فلو لم یعین الخصوم وجعل مقصورا علی الایام وقال قلدتک النظر بین الخصوم فی یوم السبت وحدہ جاز نظرہ فیہ بین الخصوم فی جمیع الاعاوی۔ (الاحکام السلطانیہ والولایات ص۲۳) ۔۔۔ (ترجمہ) "یہ جائز ہے کہ کسی

قاضی کا دائرہ اختیار کسی خاص افراد کے فیصلہ تک محدود ہو تو ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، ان مخصوص افراد کے درمیان جب تک یہ معاملہ باقی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جب ان کا فیصلہ ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو گا..... اگر طرفین کا تعین نہ ہو بلکہ خاص ایام میں اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، مثلاً یہ کہ تجھے ہفتہ کے دن فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، تو ہفتہ کے دن جملہ فیصلوں کا اختیار اس کو حاصل ہو گا۔"

غیر اسلامی حکومت سے عہدۂ قضا قبول کرنے کی شرعی حیثیت

اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا کہاں تک جائز ہے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی حکومت کو دوام بخشنے اور اس سے تعاون کی ایک صورت ہے جو تعاون علی المعصیّت کے مترادف ہے؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کسی مذہبی عقیدہ اور تشخص کے مجروح ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر ایسا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں کہیں (غیر اسلامی) حکومت میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کر کے شرکت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی غیر اسلامی قانون کے ذریعہ جب اسلامی قضاء کو دوام بخشا جائے تو ایسے قاضی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں واجب العمل ہو گا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :۔

ولکن اذا ولی الکافر علیھم قاضیًا ورضیہ المسلمون صحت تولیتہ بلا شبہ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کسی کافر نے مسلمانوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق قاضی مقرر کیا تو اس کی یہ تولیت بلا شبہ جائز ہے۔"

ایسا قاضی مسلمانوں کے لیے وہ تمام امور جاری کر سکتا ہے جو دار الاسلام میں ایک قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو۔ چنانچہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں :۔

وکل مصر فیہ وال مسلم من جھۃ الکفار تجوز فیہ اقامۃ الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیھم۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴ الفصل الاول فی القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقہ جس میں کسی کافر بادشاہ کی طرف سے مسلمان گورنر ہو تو اس میں جمعہ و عیدین کی اقامت، خراج، قضاء کی تقرری اور یتیم بچیوں کی شادی کرانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ان پر مقامی طور پر مسلمان کی حکومت ہے۔"

بہرحال کفار کے غلبہ کے وقت ان کی قوت تسلیم کرنا شریعت میں ناجائز نہیں لیکن اگر مسلمانوں کے ترک موالات سے کہیں کافرانہ نظام حکومت متزلزل ہو کر اپنی زندگی پوری کرنے کی حالت میں ہو تو پھر کفر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے، ایسی حالت میں یہ کشتی کسی سنجیدہ اور باوفا ملاح کے حوالے کرنی چاہیئے تاکہ وہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے۔

انصاف کی رعایت نہ ہونے کے وقت عہدۂ قضاء قبول کرنا جائز نہیں

لیکن یہ طریقہ کسی ایسے غیر اسلامی ملک میں اپنانا اُس وقت مرخص ہے جب تک حکومتِ وقت ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی ہو، اگر کہیں ایسی حالت میں مسلمان انصاف قائم نہ رکھ سکتے ہوں تو پھر ظلم و ستم کے لیے آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے ورنہ اپنا مذہبی تشخص ضائع کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ما ذكر المصنف من جواز التقليد من الجائر مقيد بما اذا كان يمكنه من القضاء بالحق اما اذا لم يمكنه فلا كما فى الهداية لان المقصود لا يحصل به۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۲۷۴ كتاب القضاء)

(ترجمہ) "مصنفؒ نے ظالم سے قضاء قبول کرنے کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، یہ اُس وقت ہے جب قاضی انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہو، جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر قضاء قبول کرنا جائز نہیں جیسا کہ ھدایہ میں ہے کیونکہ ایسی صورت میں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔"

اسلام کا نظامِ عدل و انصاف

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

ہر دور میں دنیا کے ہر ملک کے حکمرانوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ ہم ہر ایک کو انصاف فراہم کریں گے اور ہمارے فیصلے عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے، اس آواز میں مسلم اور غیر مسلم ممالک سب شامل ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی عدل و انصاف کے جملہ تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ الٹا نظامِ عدل و انصاف سے تمسخر کیا۔ دنیا بھر کے تمام نظامہائے قوانین میں ایک اسلام کا واحد نظامِ قانون ہے جس میں امیر و فقیر، آقا و غلام، بادشاہ و رعایا، چھوٹے بڑے اثر و رسوخ والے کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے، اسلامی قانون کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں تمام فیصلے عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ عدل و انصاف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سابق نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے ایک جامع اور بہترین مضمون تحریر فرمایا جسے دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا، اب اس مضمون کو اسلامی قانون وفقہ سے مناسبت کی بناء پر عمومی فائدہ کے لیے "فتاویٰ حقانیہ" میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

لفظ عدل قرآن و حدیث میں مختلف مقامات پر مستعمل ہوا ہے جس کے مقابلہ میں ظلم آتا ہے، اہلِ لغت کے ہاں ظلم "گذشتن چیزے در غیر محل آں"[1] کو کہتے ہیں۔ ظلم کے اس مفہوم کے اعتبار سے اس میں بہت وسعت موجود ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ سے لے کر کبائر اور شرک تک کو شامل ہے، مثلاً خداوندِ عالم نے جس مقصد کے لیے انسان کو زبان اور قوتِ گویائی دی ہے اگر زبان کا استعمال اس میں نہ ہو تو یہ ظلم ہے، تو ظلم کے مفہومی اعتبار سے اس کے مقابلہ میں بھی اس جیسی وسعت موجود ہے۔

---

[1] غیاث اللغات ص ۲۸۶۔

عدل کی ہمہ گیری

اعضاءِ انسانی اور انعاماتِ خداوندی کو اپنے محل میں استعمال کرنا عدل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں قیامِ عدل کا مطالبہ بنی آدم سے ہوا ہے وہاں عدل سے یہی عمومی معنیٰ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف عدالت اور حکومت کا فریضہ نہیں ہے بلکہ ہر انسان اس کا مکلّف اور مخاطب ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کیلئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے، وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو انصاف کرنے دیں تو حاکمانہ سزا اور تعزیر کی ضرورت ہے، یہ اقامتِ عدل وانصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑ دیئے لکھے پڑھے تعلیمیافتہ حضرات بھی سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے عوام اسکے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہ وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک اور سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔" (معارف القرآن ج ۲ ص ۵۷۲، ۵۷۱)

قیامِ عدل کے مطالبہ کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ سے ہے اور انسان کے اخلاق و کردار (Character) ظاہر و باطن، عبادات و معاملات، سیاست و مذہب، غرض ہر ایک شعبہ میں عدل کا ہونا ضروری ہے۔ اس تعلقِ عامہ کے پیشِ نظر خداوندِ عالم نے جب انبیاء ورسل کو دنیا میں بھیج کر ان کی وجہ سے رُشد و ہدایت کا درس نوعِ انسان کو دینا چاہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے قیامِ عدل کا مطالبہ بھی کیا جس کی تکمیل کتبِ سماویہ سے کی گئی ہے قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵)	ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف سے۔

شیخ الاسلام والمسلمین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔

"یعنی کتاب اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف

کی راہ پر چلیں، افراط اور تفریط کے راستہ پر قدم نہ ڈالیں"۔ (تفسیر عثمانی ص۱۰)
الغرض بعثتِ انبیاء کے دیگر مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد قیام عدل بھی رہا ہے۔

مروجہ بین الاقوامی قوانین اور ان کے نتائج

آج دنیا کی جس قوم پر بھی آپ نظر ڈالیں تو قیام عدل کا یہ مطالبہ مختلف نعروں اور مختلف انداز سے سنیں گے۔ کہیں مساوات اور برابری، کہیں انصاف اور حقوق کی بحالی کے عنوان سے عوام و خواص رطب اللسان ہیں مگر عملاً یہ عنقا کے مترادف ہے بلکہ دن بدن جرائم اور مظالم میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، قانون عملاً معطل ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں قائم ہیں، جرائم کے انسداد کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جا رہے ہیں لیکن جرائم میں بجائے کمی کے زیادتی ہی ہو رہی ہے ؎

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
میری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

آپ حضرات دو منٹ کے لیے خالی الذہن ہو کر عالمی سطح پر جرائم کے معیار کو دیکھیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ۱۹۸۰ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر گذشتہ چھ سالوں میں راہزنی میں ۷۹ فیصد، چوری میں ۴۷ فیصد اور قتل میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۱۵ ر نومبر ۱۹۸۰ء)

اگر ایک طرف سائنسی دور میں انسدادِ جرائم کے لیے سائنسی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی نت نئے طریقے اختیار کر کے بڑی صفائی سے جرم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے امور ضرور ہونے چاہئیں جو جرائم کی بیخ کنی کرتے ہوئے امن کا معاشرہ (Peaceful Society) مہیا کریں، آپ اقوامِ عالم کے مذاہب اور عقائد کو بھی دیکھ لیں، نام نہاد ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کا مطالعہ کریں، مگر یقین کیجئے کہ اس کا واحد علاج آپ کو آج سے چودہ سو سال پہلے کوہِ صفا پر یَآ اَیُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا کے داعی کے دیئے ہوئے نسخۂ کیمیا میں ملے گا جہاں مجرم جرم کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف اور اعلان کر کے قانون اور انصاف کا مطالبہ کرتا نظر آئے گا۔

نظامِ عدل کا مرکزی نکتہ

اسلام میں قیام عدل کا بنیادی نکتہ (Basic Point) خوفِ خداوندی ہے جس کا تعلق فرد سے لے کر معاشرہ تک

اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک ہے، اگر دل و دماغ میں خوفِ خدا موجود ہو اور نظریہ یہ ہو کہ آج میں جو کام کر رہا ہوں کل قیامت کے روز دربارِ خداوندی میں مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور مجھے ضرور حساب دینا ہوگا۔ تو اس عقیدہ کے بعد ہر انسان قدم بقدم خیال رکھے گا کہ کہیں مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو قیامت میں خسارہ اور ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

عدالت میں عدل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم اور مجسٹریٹ کا اگر یہ عقیدہ ہو اور سامنے ندامت اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے ہوئے مجرم بھی خوفِ خداوندی کے ہتھیار سے مسلح ہوں تو یقین کیجئے کہ ظلم و ناانصافی کا نام ہی عالم سے فنا ہو جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف خیالی یا فرضی تصوّر نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہمارے اسلاف کی تاریخی زندگیوں میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

حضرت ماعزؓ کا واقعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے، آپؐ نے فرمایا اے ماعز لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کر، راوی کہتا ہے کہ ماعزؓ تھوڑے دور گئے تھے کہ پھر لوٹ آئے اور پھر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول مجھے پاک کیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا، تین بار ایسا ہی ہوا، چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کی زنا سے، حضور نبی کریمؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر ماعزؓ کے منہ کو سونگھا تو اسے اس سے شراب کی بو نہ آئی۔ آپؐ نے ماعزؓ سے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کی ہاں مجھ سے زنا ہوا ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی تین ہی دن گذرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ماعز بن مالکؓ کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہے۔ (ترجمة العدالة الاجتماعية فی الاسلام ص ۲۸۹،۲۸۶)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ہی قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت نے بھی اقرارِ جرم کیا تھا جس کے باعث آپؐ کے حکم سے اُسے بھی سنگسار کر دیا گیا۔

رات کی تاریکی میں خوفِ خدا کا اثر خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے جب ایک ایسے مکان کے قریب سے گذرے

جہاں والدہ اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ میں دودھ میں پانی ملاؤں گی لیکن بیٹی انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا حکم ہے کہ دودھ میں ملاوٹ نہ کرو، والدہ کہتی ہے کہ عمرؓ اس وقت کون سا یہاں ہے؟ بیٹی جواب دیتی ہے کہ اگرچہ عمرؓ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس کا خدا جو کہ علیم و خبیر ہے وہ تو موجود ہے۔

اسلامی تاریخ نے خوفِ خداوندی کے اس جذبہ سے شدتِ احساس کے اتنے نمونے اکھٹے کر رکھے ہیں کہ ان کا بالاستیعاب احصاء کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

عرض کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ قیامِ عدل کے لیے خوفِ خداوندی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر رات کی تاریکی میں گھر کی چاردیواری کے اندر اس خدا ترس لڑکی کو دودھ میں ملاوٹ کرنے سے باز رکھنا، ماعز بن مالکؓ کا اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہوکر بارگاہِ نبوت سے بار بار واپس کرنے کے باوجود لوٹ لوٹ کر اپنے جرم کا اقرار کرنا، آخر کون سے جذبہ سے یہ لوگ سرشار تھے؟ یہ وہی جذبہ ہے جسے ہم خوفِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

موانع عدل | عدل کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے واضح طور پر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جو قیامِ عدل کے لیے سب سے بڑے موانع اور رکاوٹیں ہیں، خاص کر شہادت اور قضا میں یہ امور انسان کو انصاف سے ہٹا کر ظلم پر آمادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) قرابت Relation (۲) عداوت ENMITY (۳) مال و دولت Wealth

__قرابت__ : بسا اوقات ایک انسان تعلقات، قرابت اور رشتہ داری کے ماحول سے متاثر ہوکر درست اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً گواہ اپنی شہادت میں ان تعلقات کی بنا پر جھوٹ بول کر ناجائز اور غیر مشروع امور کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، افسر مجاز اپنے بالا افسران کے رعب سے غلط کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح عدل کو چھوڑ کر ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

قرآن مجید میں اس امر کی نشاندہی یوں کی گئی ہے :-

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ (سورۃ ــــ)	اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔

شہادتِ حق اور قرابتیں

خداوند عالم نے ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا :-
" اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو" (بیان القرآن)

گویا قانون اور انصاف کے سامنے رشتہ داری اور قرابت کوئی روک نہیں، والدیت اور ولدیت کے محبوب رشتوں کو بھی قربان کرنا ہوگا، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کے راہنما اصول اور عملی نشانِ راہ موجود ہیں۔

حضرت اسامہؓ کی سفارش پر دربارِ نبوت کا ردِ عمل

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے قبیلہ مخزومی کی ایک عورت سے چوری سرزد ہوگئی، قریش نے باہمی مشورہ کیا کہ اس عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں سفارش کر دینی چاہیئے، اس کام کے لیے سب نے حضرت اسامہؓ کو منتخب کیا کیونکہ وہ رسول اللہ کے محبوب رفیق تھے، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نظرِ شفقت سے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تھے حضرت اسامہؓ بھی اسی طرح آپؐ کے منظورِ نظر تھے) حضرت اسامہؓ نے جب سفارش کی تو بارگاہِ نبوت سے جلال آمیز ارشاد صادر ہوا۔

اتشفع فی حد من حدود اللّٰہ ثم قام فاختطب فقال یاایھا الناس انما اھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللّٰہ لوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔
(دعواتِ حق جلد اول ص ۹۵)

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! بیشک تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی نادار چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے، خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی (خدانخواستہ) چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔

ایک انسان جب کسی اعلیٰ عہدہ اور مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے تعلقات اور رشتہ داری بڑھ جاتی ہے، اجانب اقارب بن جاتے ہیں، مدتوں سے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑ جاتے ہیں، لیکن

مسلمان سے مذہبِ اسلام کا یہی مطالبہ ہے کہ قانونِ شریعت کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح نہ دی جائے۔

عدل فاروقی کی ایک جھلک

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے مبارک دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حکمرانوں کے اعزا اور اقربا کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمنؓ نے جب شراب پی لی تو اس پر بھی حد جاری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ۱۳۴) نیز حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قدامہ بن مظعون (جو آپ کے سالے اور معزز صحابی تھے) کو بھی شراب نوشی کے جرم میں اسّی کوڑے لگوائے۔ (تاریخ اسلام ص۲۰۷)

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی سے گھوڑے کا سودا طے کیا، پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سوار ہونے لگے تو گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ گھوڑا اس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا، دونوں مقدمہ لیکر قاضی شریح کی عدالت میں گئے، قاضی نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فرمایا:-

"امیرالمؤمنین! جو چیز آپ نے خریدی ہے اُسے لے لیجئے ورنہ جس حال میں خریدی تھی اُسی حال میں واپس کیجئے۔"

یہ سنکر حضرت عمرؓ بول اٹھے "اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا"۔ پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ (تاریخ اسلام ص۳۴۴)

امیرالمؤمنین قاضی کی عدالت میں

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمہ میں فریق بن کر عدالت میں حاضر ہوئے، فیصلہ امیرالمؤمنین کے خلاف ہوا اور آپ اسے محسوس نہیں کرتے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ:-

ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ گر گئی جو ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی اپنی زرہ ہے، قاضی شریح نے حسبِ قاعدہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے دو گواہ ایک اپنا بیٹا اور دوسرا اپنا آزاد کردہ غلام قنبر کو حاضر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں بیٹے کی گواہی والد کے لیے درست تھی، لیکن قاضی شریح

نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی گواہی آپ کے لیے درست نہیں ہے' اور دوسرا گواہ جو کہ آزاد کردہ غلام ہے اور اس ایک گواہ کی گواہی سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ زرہ کا فیصلہ نصرانی کے حق میں ہوا، اس فیصلے کا نصرانی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علیؓ کو واپس کر دی، لیکن حضرت علیؓ نے دوبارہ زرہ اُسے دیدی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی اسے عنایت فرمایا۔ (نور الانوار ص۲۲۳)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام عدل کے قیام میں انسان کو کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آقا اور غلام، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج اگر کوئی افسر بالا ماتحت افسر کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو معلوم نہیں اس انصاف کی وجہ سے اس فیصلہ کرنے والے کو کیا کیا سزائیں ملیں گی۔ اگر کسی خوف کی وجہ سے معزول نہ کرے لیکن انتقام کی آگ ہر وقت محکوم علیہ کے ذہن میں سُلگتی رہے گی اور فیصلہ کرنے والا انتظار کی گھڑیاں شمار کرتا رہے گا۔

انصاف کی نظر میں عمر فاروق اور ایک عام آدمی برابر ہیں

لیکن اسلام کے شیدائیوں کو جہاں حق بات نظر آئی وہاں اپنے خلاف فیصلہ پر بھی راضی اور خوش رہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ نزاع ہو گیا، حضرت ابی بن کعبؓ نے زید بن ثابتؓ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا، حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے آپ کی تعظیم کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی بن کعبؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو دعوٰی سے انکار تھا۔ ابی بن کعبؓ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی تو زید بن ثابتؓ نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس ترجیحی سلوک پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں اُس وقت تک تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز الاعمال جلد ۳ ص۱۷۴)

اسلامی نظام عدل نے شاہانِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا

ان مثالوں اور واقعات کا تعلق صرف خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور سے خاص نہیں ہے بلکہ حقانیت اور حق گوئی کا یہ جذبہ ہمیشہ اسلاف اور بزرگانِ دین

کا شیوہ رہا ہے، جہاں حق بات نظر آئی وہاں بادشاہِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ پیش کرتا ہے کہ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں میرا جھگڑا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ گواہ بادشاہ کے پاس ہیں، انہوں نے کہا مُدعی کا مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں، ہادی نے قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کیا اور باغ اپنے مالک کو واپس کر دیا۔

عداوت: دوسری چیز جو نفاذِ عدل کے لیے مانع ہے اور انسان کو ظلم اور ناانصافی کی طرف لے جاتی ہے وہ عداوت اور آپس میں دشمنی ہے، قرآن مجید نے اس امر کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۸)	کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو اور عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اہلِ اسلام کا طرۂ امتیاز

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:۔

"عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل اور انصاف کا ترازو ایسا صحیح اور برابر ہونا چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو جھکا نہ سکے"۔ (تفسیر عثمانی ص)

اور یہی وہ رسم ہے جس کو اہلِ اسلام نے ہمیشہ کے لیے قائم رکھا، مفتوحہ علاقوں میں اسلام کا برتاؤ ہمیشہ کے لیے انسانیت پر مبنی رہا، معاملات اور دیگر حقوق میں غیر مسلموں کو پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کا سفاکانہ کردار

ہم جب اقوامِ عالم اور ایامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور ادیان والے غیر مذہب والوں سے چوپایوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھتے، اور صرف یہ نہیں

بلکہ اسلام کا مقابلہ اگر دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع اور بلند و پاکیزہ نظر آئے گا۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گذر چکا ہے جس میں اندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔

اہلِ مغرب نے اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو آگ میں جلانے تک کی سزا کو جائز رکھا، اور یہی وجہ تھی کہ مذہبی دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلاوجہ وہ سزائیں دیں جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل سکے گی۔

ان عدالتوں اور احتساب کے محکموں نے ایک اندازے کے مطابق ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلایا جن میں ہیئت اور طبیعات کے مشہور عالم برونو (Brunoe) اور گلیلو (Galilio) کو بھی یہی سزا دی گئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۲۶۴، ص۲۶۵)

اہلِ مغرب نے کسی مفتوحہ علاقہ میں مخالفین کے وجود کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کیا جس علاقہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوتے وہاں اعلان کرتے کہ جو ہمارے خیالات اور نظریات سے متفق نہیں وہ ہمارے ملک سے نکل جائے۔ جیسا کہ فرانسیسی جنرل کاسترو نے ۱۹۴۰ء میں دمشق کے گذشتہ انقلاب کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں جس کو ہماری حکومت پسند نہ ہو وہ یہاں سے نکل جائے۔"

اور اس سے ملتی جلتی بات جنرل کاسترو کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص۳۲۵)

روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک موجودہ دور میں دوسری عظیم طاقت روس کا کمیونسٹ بلاک تو غیر کمیونسٹوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، مذہبی رسوم اور عبادت خانوں کو ختم کرنے کا خواہاں ہے، اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک کا اندازہ آپ روسی مسلمانوں کی مساجد اور مدارس سے کئے ہوئے حشر سے لگا سکتے ہیں۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کے ۲۵ ہزار مدارس تھے لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ مدارس بند کر دیئے گئے اور اساتذہ کو گرفتار کر لیا گیا، مدارس کی وہ عمارتیں جن میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں بعض کو مسمار اور بعض کو ضبط کر کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا، اور پچیس سال کے عرصہ میں ایک بھی مذہبی مدرسہ نہ رہا۔

یہی حال مساجد کا تھا، ۳۱ ہزار مساجد آباد تھیں لیکن ۱۹۴۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اب پورے روس میں صرف ۱۳۱۲ مساجد رہ گئی ہیں باقی سب کو شہید کر دیا گیا۔ (تاریخ میں مسلمان قومیں ص ــ)

برطانوی دور کے مظالم روس اور یورپ تو درکنار خود اس پاک و ہند کی تاریخ کو دیکھئے برطانوی گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟

کراچی کے مقدمہ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کا آخر جرم کیا تھا؟ صرف اس قدر کہ مذہب اسلام کے مطابق مسلمان سپاہیوں کو ترکی کی مسلمان افواج کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا جائے۔

ان واقعات اور حالات کو پیش کرنے سے میرا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے اقلیت اور دشمنوں سے وہ کون سا ناروا سلوک ہے جو روا نہ رکھا ہو، عداوت اور دشمنی کی بناء پر وہ کونسی بے انصافی ہے جو استعمال نہ کی گئی ہو۔

دشمنوں سے اسلام کا روادارانہ سلوک مگر اسلام نے اپنے مخالفوں اور اقلیت سے جو حسنِ سلوک کیا اس کا اندازہ آپ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل اور کردار سے کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، ذمیوں کے لیے باقاعدہ حقوق مقرر کئے گئے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا، یہاں تک کہ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو وہی حقوق دیئے جو ان کیلئے تاجدارِ حرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے تھے۔

حقوق کی اقسام کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ جانؔ، مالؔ اور مذہبؔ۔ ان کے سوا اور جتنے بھی حقوق ہیں وہ سب ان ہی کے تحت آ جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عادلانہ دور میں بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدہ میں انہیں جو حقوق دیئے گئے تھے وہ یہ ہیں:۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہلِ ایلیا کو دی۔ یہ امان جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذہب کے لیے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان

پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا"۔
(طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۲۲)

اور یہ حقوق صرف ایلیا والوں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والوں کو یہ حقوق دیئے۔ اہل جرجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ان کی جان، مال، مذہب و شریعت سب کو امان ہے ان میں سے کسی شے میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا"۔ (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۲۲)

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ تھے:۔

"انکی جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے"۔ (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۲۲)

دورِ صدیقیؓ کے عہد نامے

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے گئے:۔

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کیے جائیں اور نہ ان کا کوئی قصر گرایا جائے گا جن میں وہ ضرورت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ مذہبی تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے"۔ (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۲۲)

اور یہ بات صرف کاغذی کارروائی تک محدود نہ تھی بلکہ خلفائے راشدین ہمیشہ کیلئے ماتحت گورنروں کو اس کے متعلق ہدایات جاری فرمایا کرتے تھے، غیر مسلموں سے وہی سلوک برتا جاتا تھا جو سلوک مسلمانوں سے روا رکھا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جارہی ہے، جب سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہیں کیا گیا، پوچھا گیا کیوں؟ جواب ملا سبب نا داری ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے ہیں خدا انہیں قیامت

کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

نادار، مفلس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے بلکہ بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی، چنانچہ حیرہ کے معاہدہ میں اس کی تصریح موجود ہے:۔

"اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آئے یا دولتمندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔"

(کتاب الخراج للقاضی ابویوسفؒ)

حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا اور عہدِ فاروقی میں اس پر باقاعدہ عمل جاری رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے تو قرآنی استدلال سے اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادا نہیں کر سکتا، یہ سُنکر حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد رقم دیکر داروغہ کو پیغام بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ کلام اللہ کی یہ آیت إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں، اور فرمایا خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

حفاظتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ باقاعدہ اس سے قصاص لینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر کے اس سے قصاص لیا۔ (الدرایۃ بحوالہ تاریخ اسلام)

حفاظتِ مال کے بارے میں اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی کسی جائیداد یا مال کو نقصان پہنچاتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ بیت المال سے دلاتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ اسلامی لشکر نے شام کے ایک ذمی کی زراعت کو پامال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم کا معاوضہ دلایا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابویوسف)

ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت

حضرت عمرؓ جس طرح خود ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کرتے تھے ایسے ہی ماتحت گورنروں سے بھی کرواتے، چنانچہ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا کہ:-

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کے مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں طے کی گئی ہیں انہیں پورا کرو۔"

(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

بلکہ حضرت عمرؓ دنیا سے جاتے وقت آئندہ خلیفہ کے لیے جو ہدایات لکھتے ہیں ان میں ذمیوں کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے:-

"میں ان لوگوں کے حق میں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے، اس کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہ دی جائے۔" (تاریخ اسلام ص ۲۲۶)

یہی وہ اسلامی عدل وانصاف ہے جس میں دوست اور دشمن کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے وہ دشمن جو بدترین دشمن تھے، جو مذہب اور عقیدہ کے دشمن تھے اُن سے جب اس قدر انصاف قائم رکھا گیا تو اور کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اسلام نے ظلم کی گنجائش رکھی ہو؟ ان واقعات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے اس فرمانِ خداوندی پر "کسی قوم کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کرے"، کما حقہ، عمل کیا ہے اور امتِ محمدیہ کے لیے قیامت تک ایک عملی نمونہ چھوڑا ہے۔

وہ دشمن جو اپنے کیے ہوئے افعال وکردار کی وجہ سے بڑی بڑی سزاؤں کے مستحق ومنتظر تھے، ندامت اور پشیمانی کی وجہ سے ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی جانیں خطرے میں دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی جان کی حفاظت کے علاوہ مال ومذہب کو بھی محفوظ رکھا اور معاشرہ میں ان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

مال و دولت :- تیسری چیز جو قیامِ عدل وانصاف میں مانع ہے وہ مال ودولت کی فراوانی یا فقدان ہے۔ مثلاً ایک انسان بسا اوقات کسی غریب کی غربت کو دیکھ کر اس پر ترس کھا کر اس کیلئے جھوٹی گواہی دیتا ہے یا پھر غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ اس کے حق میں کر جاتا ہے جس میں ظلم اور زیادتی کا ارتکاب ہوتا ہے، جبکہ آجکل ہمارے معاشرہ میں یہ بہت کم ہوا ہے کہ لوگ غریب

کی غربت سے متاثر ہوئے ہوں۔ دوسری صورت میں انسان بعض اوقات مالدار کی مالداری کی وجہ سے ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے، مالدار سے کچھ طمع اور امید کی خاطر گواہ جھوٹی گواہی دے کر حاکم سے غلط فیصلے کا حکم صادر کراتا ہے جو یقیناً ظلم اور ناانصافی ہے، قرآنِ مجید نے اس کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ (سورۃ النساء آیت ۱۳۵)	اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو خواہش کی انصاف کرنے میں۔

شہادت کے اصول

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو، سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح واقف ہے اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" (

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہیئے تاکہ اس سے بے مروّتی نہ ہو، یا یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں۔ تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع و نقصان نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ اگر امیر ہے تو، غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اس میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے، تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو۔" (بیان القرآن)

چونکہ شہادت اور فیصلہ دونوں میں تسلط علی الغیر موجود ہے، جب گواہی دیتے وقت گواہ ان امور کو مدنظر رکھے گا تو قاضی اور فیصلہ کرنے والا حاکم بطریقِ اولیٰ ان امور کا پابند رہے گا۔

قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت جیب بھرنے کی انتظار میں نہیں بیٹھے گا بلکہ جو حق ہوگا اس کا امضاء کرے گا۔ اسلامی قوانین انصاف کی راہ میں حائل اس مانع اور رکاوٹ کا سخت نوٹس لیا گیا ہے جب صاحب عہدہ کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو تو اپنے اس منصب سے غلط فائدے نہیں اٹھائے گا، ایسی پارٹیوں (دعوتوں) میں شمولیت سے اجتناب کرے گا جو پارٹیاں صرف اس کے عہدہ کی وجہ سے اس کو دی جاتی ہوں۔

رشوت کی اقسام اور ان کے احکام

یہی وجہ ہے کہ رشوت کی تمام اقسام کو لینے والے کے لیے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور رشوت کا مال قبض کرنے سے بھی ملکیت میں نہیں آسکتا بلکہ رشوت میں لیا ہوا مال صاحب مال کو واپس کرنا واجب ہے۔ اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ رشوت کی جملہ اقسام اور ان کے احکام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہاء کرام کے فرمان کے مطابق رشوت کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) رشوت کی پہلی قسم جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں یہ ہے کہ کسی ایسے منصب پر فائز ہونے کے لیے رشوت دے جس منصب کا یہ اہل نہ ہو، چونکہ غیر اہل کا کسی منصب پر فائز کرنا اور فائز ہونا دونوں ناجائز ہیں لہٰذا اس ناجائز کام کے لیے رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں۔

(۲) دوسری قسم رشوت کی یہ ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے حاکم، قاضی، جج یا مجسٹریٹ کو کچھ رقم یا کوئی اور چیز اس لیے دی جائے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے، یہ بھی طرفین کے لیے حرام ہے۔

(۳) رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم یا کوئی چیز اس لیے دی جائے کہ اس سے اپنا جائز کام کرایا جائے، لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ کام جائز ہونے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے شخص کی حق تلفی کا سبب اور ذریعہ نہ ہو، لہٰذا ان شروط کے بعد رشوت دینے کی تو اجازت ہے لیکن رشوت لینا اس صورت میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم اس لیے دی جائے تاکہ اس کے شر اور فساد سے محفوظ رہا جا سکے۔ اپنی جان سے ظلم اور فساد کے دفع کرنے کے لیے کسی کو کچھ دینا تو جائز ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۵۳، ۳۵۴)

جب ایک گواہ اور ایک حاکم یہ نظریہ قائم کرے کہ مجھے کسی بھی مالدار سے کوئی سروکار نہیں، نہ وہ چائے پانی کے انتظار میں ہو اور نہ بخشش کی طمع اور لالچ میں، تو یہ ممکن ہی نہیں

کہ وہ کسی مالدار شخص کی وجہ سے اس سے کسی قسم کی رعایت کرے۔ اسلام میں تو آقا اور غلام، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔

شرعی عدالت میں شاہ و گدا برابر ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاں کہیں امیر اور غریب کے اس امتیازی سلوک کو دیکھتے تو اس سے منع فرماتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان تمام بے جا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں موجود ہے کہ :-

شام کا ایک نامور بادشاہ جبلہ غسانی مسلمان ہو گیا تھا، ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے غصہ میں آکر اس شخص کو تھپڑ مارا، اس شخص نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پا لیا۔

جبلہ نے جواب میں کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔

جبلہ نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے تو میں اس سے باز آتا ہوں لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ (تاریخ اسلام)

آج دنیا میں یہ نظارہ موجود ہے، معاشرہ مختلف قسم کی بے ضابطگیوں کا شکار ہے، امیر اور غریب ایک دوسرے کے مدمقابل بنے ہوئے ہیں۔ امیر اپنے آپ کو مال کی کثرت کی وجہ سے مختلف جرائم کا ارتکاب کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے، جرم کو معیوب نہیں سمجھتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ بات معلوم ہوگی کہ اُمراء کو صرف مال کی بہتات کی وجہ سے بے جا رعائتیں دی گئی ہیں، یہ اس کے نتائج اور اثرات ہیں جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہیں۔

قاضی عدالتوں کو کتاب و سُنّت کا پابند کرانا ہوگا

۹ر فروری ۱۹۸۳ء کو مجوزہ قاضی عدالتوں کے مسودہ پر عام بحث میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا:۔

مولانا سمیع الحق | نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، اما بعد!

جناب چیئرمین | جہاں تک قاضی کورٹس کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کے اور جناب صدر پاکستان کے ارادوں اور عزائم کا تعلق ہے تو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا سب سے بڑا اور پہلا فریضہ اس ملک کے شہریوں کو عدل و انصاف آسانی سے مہیا کرنا ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کی مدتوں سے ایک آرزو ہے، خاص کر ملکِ عزیز پاکستان کے شہریوں کی کہ یہاں انصاف سستا ہو جائے، اس سلسلہ میں جو اصل مسودہ قانون ہے اور جو ہمارے سامنے ہے ایک تو اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ شاید پہلے سے علماء اور اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے حضرات کی نگاہ سے گذرا ہے، حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اس پر اسلامی نظریاتی کونسل جو کہ ملک کے مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے جیّد علماء پر مشتمل ادارہ ہے جس میں وکلاء بھی شامل ہیں، اُن سے کوئی استصوابِ رائے اس بارہ میں نہیں کیا گیا، دوسرا مرحلہ جو اصل مسودۂ قانون پر بنیادی توجہ کا تھا وہ یہ تھا کہ ہم قاضی کورٹس تو قائم کرتے ہیں جو بلاشبہ ایک نہایت مستحسن اقدام ہے، لیکن اصل مسودے میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا کہ یہ عدالتیں کن قوانین کے تحت فیصلے کریں گی؟ یہی مروّجہ قوانین، یہ فوجداری اور دیوانی ضابطے اور یہی پروسیجر اگر قائم رکھنا ہے تو اگر ہم قاضی کا نام جج رکھ دیں اور جج کا نام قاضی رکھ دیں اس سے تو عدالت اسلامی عدل و انصاف مہیا نہ کر سکے گی اور نہ ہی عوام کو عدل و انصاف مل سکے گا، ہم اگر قاضی کو قاضی محمد احمد کہیں یا قاضی نکلسن کہیں یا قاضی ہر بند رائے کہیں، اس سے انصاف نہیں ملتا، یہاں اصل مسودۂ قانون میں یہ وضاحت ہونی چاہیئے تھی کہ......

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | پوائنٹ آف آرڈر، جنابِ والا! یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔

مولانا سمیع الحق | جنابِ والا یہ قاضی کی توہین نہیں ہے۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید جناب والا! یہ قاضی محمد احمد، یا قاضی نکلسن یا قاضی ہر بند رائے، یہ قاضی کی توہین ہے، ان کو کہیں کہ یہ اپنے الفاظ واپس لیں، یہ قاضی کی توہین ہے۔

مولانا سمیع الحق کون سی توہین میں نے کی ہے؟

اخوندزادہ بہرہ ور سعید یہ قاضی نکلسن کیا ہوتا ہے؟

مولانا سمیع الحق آپ جسٹس نکلسن کہیں یا قاضی نکلسن کہیں بات ایک ہی ہے۔ اگر اس کے پاس قانون وہی ہوں جو موجودہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے ہوتے ہیں یعنی انگریزی قانون ہو اور آپ اس کو علامہ نکلسن کہیں یا مولانا نکلسن کہیں یا جسٹس نکلسن کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بنیادی بات سب سے پہلے یہی تھی کہ اصل مسودہ قانون میں یہ واضح ہونا چاہئے تھا کہ یہ تمام عدالتیں قرآن کے مطابق فیصلے کریں گی۔ یہاں متفرقات کے ضمن میں جو تعبیر کے عنوان سے کہا گیا ہے کہ اس سے آرڈیننس کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے قاضی عدالتیں قرآن پاک اور سنت رسول میں مقرر کردہ اسلام کے احکام سے راہنمائی حاصل کریں گی۔ یہ قرآن اور سنت کے ساتھ ایک صریح مذاق ہے، راہنمائی کے لفظ سے قاضی عدالتوں کے قیام کے مقاصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

سید معین الدین پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! THIS IS A MIS STATEMENT OF، اس میں سیکشن نمبر ۵۳ اور ۶۴ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بات قرآن وسنت کے CLEARLY خلاف نہیں ہو سکتی، دو سیکشن میں ایک نہیں دو سیکشن ہیں ۶۴ × ۵۳۔

اطلاق قوانین کے لیے راہنمائی نہیں پابندی لازمی ہے

مولانا سمیع الحق : ایک یاددہانی دے رہا ہوں، اسی کے متعلق کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اس میں ایسی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں یعنی مسودے کے آغاز میں جس قسم کے الفاظ ہیں اس میں یہی درج ہے اور یہاں بھی یہی ہے کہ عدالتیں راہنمائی حاصل کریں گی۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے، آپ قانون دان ہیں، وکلاء حضرات کو بھی پتہ ہے کہ اس سے کوئی قانون اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم تمام آئینوں میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد قرارداد مقاصد لکھ دیتے ہیں اسی طرح قرارداد مقاصد کی طرح یہ بھی ایک ابتدائیہ ہے، تو یہ ایک لازمی اور ضروری شرط ہے کہ تمام قوانین کا اطلاق جو ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا، اور کوئی طریقہ کار دیوانی اور فوجداری ضوابط ہوں کہیں بھی قرآن و سنت کی مخالفت بالکل نہیں کی جائے گی۔ اصل قانون جس کو کہتے ہیں جب تک اسے قرآن و سنت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک

شرعی عدالتیں حق اور انصاف کے طریقہ پر نہیں بنائی جا سکتیں ۔

اس لیے دوسری عرض یہ ہے کہ اصل مسودہ قانون جس پر ہمارے وکلاء حضرات اور دوسرے دوستوں کے جو خدشات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ خدشات بالکل بے جا ہیں یہاں اسلامی نظام عدل کا نام لینے والوں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ان کا یہ ارادہ ہے کہ یہاں عدالتوں میں وکلاء کی جگہ پر اجسٹریٹوں کی جگہ پر علماء قبضہ کر لیں، مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام اور اسلامی عدل و انصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو اسلامی قوانین جاری کرنا ہوں گے اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اس کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد لاء کمیشن کے سامنے مسودہ قانون آیا اور لاء کمیشن کے بعد ہماری فاضل سلیکٹ کمیٹی نے جناب منٹو صاحب کی سرکردگی میں اس رپورٹ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں۔

تو اس پر میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، غالباً مولانا روم نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے جسم پر بھی شیر کا نقشہ یا تصویر ہونی چاہیئے، تو وہ اس قسم کی چیزیں جسم پر بنانے والے ایک شخص کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرے جسم پر شیر کی شکل بنا دو، تو گودنے والے نے شیر کی شکل بنانے کی غرض سے جب اسے سوئی چبھوئی تو اس شخص کو تکلیف ہوئی، وہ چیخا کہ یہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کی تصویر بنا رہا ہوں، اس نے کہا کہ اس وقت کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مثال کے طور پر اس کے سینگ بنا رہا ہوں، مثال کے طور پر اس نے کہا کہ ارے بھائی شیر بغیر سینگ کے بھی ہو سکتا ہے اس سینگ کو چھوڑ دیجیے۔

جناب زیڈ اے سلہری | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! شیر کے تو سینگ نہیں ہوتے یہ مثال ہی غلط دے رہے ہیں تو ان کی بات کو کیسے صحیح مان سکتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوگی، دیکھئے کہتے ہیں کہ شیر کے سینگ بنا رہا تھا۔

مولانا سمیع الحق | شیر یا کوئی دوسرا جانور، میں نے کہا ہے کہ مثال کے طور پر۔ بہر حال میں نے گدھے کا نام تو نہیں لیا، کیا تکلیف ہو گئی ان لوگوں کو، جیسے مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ "گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا"، تو کیا واقعی گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ ___ بہر حال جب اس نے دوبارہ سوئی چبھونی شروع کی تو اس شخص نے کہا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ دم بنا رہا ہوں، اس نے کہا رہنے دو دم کو، دم کے بغیر بھی تو شیر ہو سکتا ہے۔ اور پھر جب اس نے تیسری بار سوئی چبھوئی تو اسے پھر تکلیف ہوئی، کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے

کہا کہ شیر کا سر بنا رہا ہوں، کہنے لگا کہ سر کو بھی چھوڑ دو، تو اُس نے سوئی وغیرہ پھینک دی اور کہا بھئی ایسا شیر تو ہم نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا کہ جس کی نہ دُم ہو، نہ سر ہو نہ پیر ہوں ۔

تو، ہماری سلیکٹ کمیٹی نے بھی اس مسودہ کی ایک ایک دفعہ کو ایسا ہی مجروح اور فسخ کر کے پیش کیا ہے

جناب وائس چیئرمین | مولانا صرف ایک منٹ باقی ہے ۔

مولانا سمیع الحق | اور آج یہ جو بڑھ چڑھ کر سلیکٹ کمیٹی کی تعریف کر رہے ہیں اور اس کی تائید کر رہے ہیں یہ بالکل شیر تو نہیں ایک ڈھانچہ ہے جس پر شیر کا صرف ٹھپہ لگے گا لیکن اس میں توانائی اور شجاعت نہیں ہوگی، تو یہاں ہر اس دفعہ میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں جس سے عدل و انصاف مہیا کرنا اور بھی طویل ہو جائے گا ۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | جب وہ شیر کا صرف ڈھانچہ ہے تو یہ اس شیر سے ڈرتے کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق | جناب ہم ڈرتے نہیں ہم اس شیر کو مکمل شیر انشاء اللہ بنا کر چھوڑیں گے ۔

جناب وائس چیئرمین | تشریف رکھئے ۔

جناب گرداری لال بھاٹیہ | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! کیا انسانوں کے معاملہ میں جانوروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں؟

جناب وائس چیئرمین | آپ تشریف رکھیں ۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! موجودہ جو مسودۂ قانون پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی اسلامی عدل و انصاف کو دُور کر دے گا، ہمارے معزز رکن جناب عبیدالرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی بالادستی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تو اصل جھگڑا وہی ہے کہ ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت اور پھر اس کے بعد تیسری عدالت کے پاس جائے، جیسا کہ صدر صاحب نے ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں پندرہویں صدی میں جا کر فیصلہ ہوگا۔ اس لیے خدا کے واسطے اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالیے اور جو لوگ اس کے منتظر ہیں خدارا ان کے ساتھ تعاون کیجئے تاکہ ان کو عدل و انصاف مل سکے ۔

جناب وائس چیئرمین | آپ مسودے کو اچھی طرح سے پڑھئے پھر سمجھ آ جائے گی ۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! ہم پڑھ چکے ہیں انشاء اللہ اس کی ایک ایک دفعہ کا کامیاب اپریشن کریں گے ۔

کتاب الشهادة

ومن اظلم ممن كتم

شهادة عنده من الله وما

الله بغافل عما تعملون۔

کتاب الشہادۃ

(گواہی کے احکام ومسائل)

سگے بھائی کے لیے گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کی گواہی اپنے سگے بھائی کے حق میں قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائیوں کی املاک چونکہ آپس میں مختلف ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے گواہی دینے میں تہمت لازم نہیں آتی، لہٰذا ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول ہوسکتی ہے۔

وتقبل شهادة الرجل لاخيه وعمه لانعدام التهمة لان الاملاك ومنافعها متباينة ولا بسوطة لبعضهم فى مال البعض۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ كتاب الشهادة باب من يقبل شهادته الخ)

تاہم اگر ان کی املاک ایک ہوں تو پھر جس طرح شریک کی گواہی دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوتی اسی طرح ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ گواہی بعض وجوہ سے اپنی ذات کے لیے ہوگی۔

قال العلامة المرغيناني ؒ: ولا شهادة الشريك لشريكه فيما هو من شركتهما لانه شهادة لنفسه من وجهٍ لاشتراكهما۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ كتاب الشهادة۔ باب من يقبل شهادته الخ) [۱]

نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ نابینا شخص کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کن امور میں اس کی شہادت قبول ہوگی؟

الجواب:۔ چونکہ شہادت (گواہی) کے اکثر امور کا تعلق معائنہ اور مشاہدہ سے ہوتا ہے

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ويقبل شهادة الاخ لاخيه من النسب وان كان ابوهما حيًا۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۵۹ الفصل الثانى فى الشهادات۔ كتاب الشهادات)
وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۳ ص۴۷۵ الباب الرابع، الفصل الثالث فيمن لا تقبل شهادته

اور معائنہ کئے بغیر اس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً اداۓ شہادت کے وقت اشارہ سے اس کی تمیز ہوتی ہو تو قوتِ بینائی کے بغیر ان میں تمیز ناممکن ہے اور بعض امور کا تعلق سماع سے ہوتا ہے لیکن مسموعات میں آپس میں خلط ملط اور ہم مثل ہونے کی وجہ سے اشتباہ لازم آتا ہے اور شہادت میں اشتباہ سے تحرز ضروری ہے لہٰذا نابینا آدمی کی گواہی کسی حال میں درست نہیں۔ تاہم جس شہادت کا تعلق صرف سماع سے ہو مثلاً نکاح، تو وہاں نابینا آدمی کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: ان الاداء يفتقر الى التمييز بالاشارة بين المشهود له والمشهود عليه ولا يميز الاعمى الا بالنغمة وفيه شبهة يمكن التحرز عنها بجنس الشهود والنسبة لتمييز الغائب دون الحاضر وصار كالحدود والقصاص۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۴۷۶ كتاب الشهادة - باب القبول وعدمه) لـه

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

سوال:- وعدہ معاف گواہ کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- وعدہ معاف گواہ کی گواہی شرعاً درست نہیں، کیونکہ وعدہ معافی کی وجہ سے گواہی دینے والا خصم بن جاتا ہے اور اس گواہی سے اُسے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور جس گواہی سے گواہی دینے والے کو فائدہ حاصل ہوتا ہو تو وہ گواہی قابلِ قبول نہیں۔

لما قال الشيخ سليم رستم بازؒ: يشترط ان لا يكون في الشهادة دفع مغرم او جر مغنم يعني ان لا تكون داعية لدفع المضرة او جلب المنفعة۔ (مجلة الاحكام - مادة ۱۷۰۰ ص ۱۰۲۳ شروط فصل في الشهادة الاساسية) لـه

لـه قال العلامة مرغينانيؒ: ان الاداء يفتقر الى التمييز بالاشارة بين المشهود له والمشهود عليه ولا يميز الاعمى الا بالنغمة وفيه شبهة يمكن التحرز عنها بجنس الشهود۔

(الهداية ج ۳ ص ۱۵۹ كتاب الشهادة - باب من يقبل شهادته الخ)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ كتاب الشهادة، فصل في الشرائط في الاصل۔

لـه قال العلامة الحصكفيؒ: ومن الشرائط عدم قرابة ولاد او زوجية او عداوة دنيوية او دفع مغرم او جر مغنم۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۱۱ كتاب الشهادة)

وَمِثْلُهٗ في البزازية على هامش الهندية ج ۵ ص ۲۴۸ نوع في الرجل متى تحل له الشهادة۔

اُجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایسا شخص جو کہ اجرتی قاتل ہو اور اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر چکا ہو تو کیا اس کی گواہی کسی معاملہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی کو بے گناہ قتل کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اس لیے اس حرام فعل کا مرتکب فاسق و فاجر ہے، خصوصاً جبکہ خود اس کا اعتراف بھی کر چکا ہو اور فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً درست نہیں لہٰذا اجرتی قاتل کی گواہی شرعی لحاظ سے درست نہیں۔

لما قال العلامة الشيخ سليم رستم باز: يشترط ان يكون الشاهد عدلاً۔

(شرح مجلة الاحكام۔ مادة ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی الشهادة الاساسية شروط) ؎

داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم

سوال:۔ داڑھی منڈانے یا ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والے کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام ہے جو کہ موجب فسق ہے کیونکہ اس کی مشروعیت احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں وجوب کے درجہ کو پہنچ چکی ہے اس لیے اس فعلِ حرام کا مرتکب فاسق و فاجر ہے اور فاسق کی گواہی شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابوبكر بن مسعود الكاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة على الاطلاق فانها لا تقبل على الاطلاق دونها لقوله تعالى: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ وَالشَّاهِدَ المرضى هُوَ الشَّاهِد العدل۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۸ كتاب الشهادت، فصل فی الشرائط فی الاصل)

لیکن موجودہ معاشرہ کے انحطاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر داڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور گواہی دینے والا داڑھی منڈا معتبر شخص ہو جس کے صدق پر قاضی کو اعتماد حاصل ہو تو پھر داڑھی منڈوانے کے باوجود اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی جامع الفتاوى واما شهادة الفاسق فان تحرى القاضی

؎ قال العلامة ابوبكر بن مسعود الكاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة على الاطلاق فانها لا تقبل على الاطلاق دونها۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۸ كتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۳ ص۱۵۵ كتاب الشهادة۔

الصدق فی شہادتہ تقبل والا فلا ـــــ قال فی الفتاوی القاعدۃ ھذا اذا غلب علیٰ ظنہ صدقہ وھو مما یحفظ درر اول کتاب القضاء وظاھر قولہ وھو مما یحفظ اعتمادہ ـ (رد المحتار ج۴ ص۴۱۴ کتاب الشہادۃ) [۱]

قتل میں عورت کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا قتل کے معاملہ میں عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اس کی گواہی سے قاتل کو سزائے موت دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود کا نفاذ چونکہ یقینی امور پر ہوتا ہے جو کہ معمولی شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، عورتوں کی گواہی میں بدلیت کے شبہ کا احتمال ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود کے نفاذ میں معتبر نہیں، لہٰذا عورت کی گواہی کی بنیاد پر قاتل کو قصاص میں سزائے موت دینا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یقبل فیھا شہادۃ النساء لحدیث الزھریؒ مضت السنۃ من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین من بعدہ ان لا شہادۃ النساء فی الحدود والقصاص ولان فیھا شبھۃ البدلیۃ لقیامھا مقام شہادۃ الرجال فلا تقبل فیما یندریٔ بالشبہات ـ (الھدایۃ ج۳ ص۱۵۳ کتاب الشہادۃ) [۲]

دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا ایک دشمن کی گواہی دوسرے دشمن کے خلاف قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دشمنی عموماً باہمی ضرر رسانی اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے کا سبب بنتی ہے، اس لیے ایک دشمن اگر اپنے مخالف پر گواہی دے تو اس میں ضرر رسانی

---

[۱] قال العلامۃ الشیخ سلیم رستم بازؒ: ویشترط ان یکون الشاھد عدلاً ـ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی شروط الشہادۃ الاسلامیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۱۵۵ کتاب الشہادۃ ـ

[۲] قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنھا الذکورۃ فی الشہادۃ بالحدود والقصاص فلا تقبل فیھا شہادۃ النساء ـ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشہادۃ)
وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳ ـ

کا احتمال موجود ہو کر شریعت کی رُو سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی اگرچہ یہ گواہ عادل ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: ان شہادۃ العدو علی عدوہ لا تقبل وان کان عدلاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۴۸۰ کتاب الشہادات۔ باب القبول وعدمہ)[1]

گواہی کے لیے آمدورفت کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہو اور حکومت اپنی طرف سے اس کو آمدورفت کا خرچہ دینا چاہے تو کیا اس کے لیے خرچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی معاملہ میں گواہی دینا دراصل لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہر شخص کے حقوق کا تحفظ دوسرے پر فرض ہے تو شہادۃ دینا گویا اپنا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا اپنی ایک شرعی ذمہ داری پوری کرنے پر اجرت حاصل کرنا ہے لہٰذا اگر گواہان شہادت پر اجرت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں گواہی پر ذاتی منفعت کے حصول کا شائبہ لازم آتا ہے اور جس گواہی میں ذاتی منفعت کا شبہ ہو وہ شرعاً قبول نہیں لیکن شریعت نے اگر ایک طرف گواہوں کو اجرت لینے سے روکا ہے تو دوسری طرف مشہود لہ کو گواہوں کے اعزاز و اکرام کا درس بھی دیا ہے اس لیے اگر گواہوں کو آمدورفت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہو اور مشہود لہ ان کو آمدورفت کا خرچہ دینا چاہے یا ان کے لیے اپنی خوشی سے کھانے پینے کا بندوبست کرے تو گواہوں کو خرچہ وغیرہ لینا جائز ہے، اس لیے اگر حکومت قانون کے موافق خرچہ دینا چاہے تو اس کا لینا جائز ہے لیکن جو پیسے خرچہ سے زائد ہوں وہ حکومت کو واپس کرے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: لو وضع للشہود طعاماً فاکلوا ان کان مھیئاً من قبل ذٰلک تقبل وان صنعہ لاجلھم لا تقبل وعن محمد لا تقبل فیھما وعن ابی یوسف تقبل فیھما

---

[1] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا یجوز شہادۃ علی الرجل اذا کان بینھما عداوۃ یعنی من امور الدنیا فان کان من امور الدین لا تقبل۔
(خلاصۃ الفتاوٰی ج ۴ ص ۶۰ الفصل الثانی فی الشہادات۔
ومثلہ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز، مادۃ ۱۷۰۲ ص ۱۰۳۴۔

العادة الجارية باطعام من حل محل الانسان ممن يعز عليه شاهدا الا.......... وجزم في الملتقط بالقبول مطلقاً وفي شرح منظومة ابن وهبان للمصنف الفتوی علی قول ابی یوسف

(البحر الرائق ج ۷ ص۵۹ کتاب الشهادة) ؎

قبضہ اور ملکیت میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی زمین سے نہر گذرتی ہے اور دوسرا شخص اس نہر سے اپنی زمین کو مدتوں تک سیراب کرتا رہا، اب دونوں نے اس نہر پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، مالکِ زمین کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ نہر میری زمین سے گذرتی ہے اس لیے یہ میری ملک ہے جبکہ دوسرا شخص اس نہر سے استفادہ کی وجہ سے ملکیت کا دعویدار ہے، اگر دونوں گواہ پیش کریں تو کس کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا؟

الجواب:۔ متنازع فیہ مقدار اگر معروف ومشہور نہ ہو تو اس کی حدود بیان کرنا ضروری ہے اور اگر معروف ومشہور ہو تو پھر حدود بیان کرنا ضروری نہیں۔ فقہاء کرام کی صریح عبارات کے مطابق صحتِ دعویٰ کے بعد طلب بیّنہ وغیرہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں بظاہر دونوں ملک اور ید کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دونوں ید کو ثابت کریں اگر دونوں کا ید ثابت ہو جائے تو پھر ملک پر گواہ طلب کیے جائیں گے، تو ان دونوں میں سے جو بھی اپنے ملک پر گواہ قائم کرے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اگر دونوں گواہ قائم کریں تو پھر مدّعیٰ دونوں میں تقسیم کیا جائے گا اور نہر دونوں کے درمیان مشترک رہے گی کوئی ایک فریق کسی دوسرے کو انتفاع سے منع نہیں کرسکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: واذا ادعى الرجلان ارضاً يعني يدعي كل واحد منهما انها في يده لم يقض انها في يد واحد منهما حتى يقيما البينة انها في ايديهما لان اليد فيها

؎ قال العلامة خير الدين الرملي رحمه الله:۔ سئل ؟ فيما اذا طلبت الشهود الشهادة في مكان بعيد مسافة يومين احتيج الى الركوب فادى المدعي للشاهدين اجرة دابتهما هل تسقط شهادتهما بذلك ام لا، اجاب لا تسقط شهادتهما بذلك كما جزم به في الملتقط۔

(الفتاوى الخيرية على هامش تنقيح الحامدية جلد ۲ ص۳۱ كتاب الشهادة)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۹ کتاب الشهادة۔

غیر مشاهدة لتعذر احضارها وما غاب عن علم القاضی فالبینة تثبته وان اقام احدهما البینة جعلت فی یده لقیام الحجة لان الید حق مقصود وان اقام البینة جعلت فی ایدیهما لما بینا فلا تستحق لاحد هما من غیر حجة - (الهدایة ج۳ ص۲۲۴ کتاب الدعوی فصل فی التنازع بالایدی) ؎

شہادتِ غیر قابض کی قبول ہوگی

سوال:- کسی شخص کے زیرِ تصرف زمین پر دوسرے شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میراث میں ملی ہے جبکہ دونوں کے پاس گواہ بھی موجود ہیں، ازروئے شریعت ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے ؟

الجواب:- زمین جس شخص کے قبضہ میں ہے وہ ذوالید ہے اور دوسرا شخص جو ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے خارج ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ میں اگر دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو تو عام معاملات کی طرح خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوں گے، ذوالید کے گواہوں کو اس وقت ترجیح دی جائے گی جب دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ثبوت موجود ہو، اور اگر ذوالید کی تاریخ خارج کی تاریخ سے اسبق ہو تو اس وقت ذوالید کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی، اور اگر دونوں میں سے صرف ایک کے پاس تاریخ کا ثبوت موجود ہو تو اس صورت میں بالاجماع خارج کے گواہوں کو ذوالید پر ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو کان فی ید احدهما فهو للخارج الا اذا کان تاریخ ذی الید اسبق فهو اولیٰ عند ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ وعند محمدؒ یقضی به للخارج لانه لا عبرة للوقت فی المیراث عنده وان ارخ

؎ قال العلامة فخر الدین القاضی خانؒ: فان اقام احدهما البینة انها فی یده یقضیٰ لهٗ بالید ویصیر هو مدعیٰ علیه والاخر مدعیاً وان قامت البینة لکل واحد منهما فان القاضی یجعل الدار فی یدهما لانهما تساویا فی اثبات الید -
(الفتاوی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۲ ص۳۹۱ فصل فی دعوی الدور والاراضی)
ومثلهٗ فی شرح مجلة الاحکام للشیخ سلیم رستم باز، المادة ۱۷۵۵ ص۱۱۱۱ -

احدهما ولم یورخ الآخر فهو للخارج بالاجماع - (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۱۱۳ کتاب الدعوٰی الفصل الثالث عشر فی العین یتنازع فیہا اثنان) [1]

زیرِ کاشت زمین پر ملکیت کا دعوٰی کرنے میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے

سوال: - ایک شخص ایک زمین بطور کاشت کھاتا رہا، ایک دوسرے شخص نے دعوٰی کیا کہ یہ زمین میری ہے، اس نے جواب میں کہا کہ یہ تو پٹھانوں کا دفتر ہے، یہ کہنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ زمین نہ میری ہے نہ تیری، تو اس صورت میں گواہ کس کے معتبر ہوں گے؟

الجواب: - اگر کاشتکار کے اس کہنے سے کہ "یہ زمین پٹھانوں کا دفتر ہے" مطلب یہ ہو کہ زمین مجھے پٹھانوں نے دی ہے اور میری ملکیت ہے تو اس صورت میں دوسرے شخص کا دعوٰی صحیح ہے اور گواہ اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ یہ خارج ہے اور ملک مطلق کا دعوٰی کرتا ہے، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق ملک مطلق کے مطالبہ میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے اور اگر اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ یہ زمین پٹھانوں نے مجھے صرف کاشت کے لیے دی ہے اور میری ملکیت نہیں تو اس صورت میں کاشتکار خصم نہیں بن سکتا اور مدعی ان لوگوں پر گواہ پیش کرے جن کی اصل ملکیت ہو اور گواہ بہرحال اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ خارج ہے۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز: بینۃ الخارج اولٰی فی دعوی المِلک المطلق الذی لم یبین فیہا تاریخ - (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ فصل فی ترجیح البینات) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن قاضی سماوۃ: واذا کان العین فی ید احدہما ولم یورخا اوارخا سواء یقضی للخارج وان ارخا واحدہما اسبق فہو لا سبقہما وعند محمد للخارج لانہ لاعبرۃ للتاریخ ہنا وان ارخ احدہما لا الآخر فہو للخارج لاجماعاً - (جامع الفصولین ج۱ ص۷۷ الفصل الثامن فی دعوی الخارج مع ذی الید)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین -

[2] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: تقدم حجۃ خارج فی مِلک الخارج -

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوی - فصل حکم تعارض الدعوتین مع تعارض البینتین -

نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ جو لوگ نکاح کی مجلس میں حاضر نہ ہوں اور ان کو محض خبر سے نکاح کا پتہ چلا ہو اور وہ عقدِ نکاح کے بارے میں گواہی دینا چاہیں تو کیا ان کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بعض احکامات کا دارومدار چونکہ گواہی پر ہے اس میں ذرہ برابر بھی ردوبدل آنے سے احکامات میں تبدیلی آجاتی ہے، اس لیے شریعت میں شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت نے اس کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لیے بہت سے شرائط عائد کیے ہیں، ان شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ گواہ جس معاملہ میں گواہی دینا چاہے اس کی پوری نوعیت اس کے سامنے ہو اور یہ نوعیت تب پوری طرح واضح ہوتی ہے جب گواہ خود موجود ہو، اس لیے شہادت میں شریعت نے دیکھنے اور حاضر ہونے کو شرط قرار دیا ہے لیکن بعض ایسے امور جو کہ شہرت سے متعلق ہو کر چشم دید گواہی دینا اس میں مشکل ہو اصل شرط سے مستثنیٰ قرار دیئے ہیں، اگر ان امور کی اطلاع معتمد ذرائع سے حاصل ہو تو ان میں گواہی دینا جائز ہے، ان ہی امور میں سے ایک نکاح بھی ہے لہٰذا اگر کوئی عقدِ نکاح کے وقت مجلس میں موجود نہ ہو اور اس کو معتمد ذرائع سے اس کا علم ہو جائے تو وہ شخص اگر اس پر گواہی دینا چاہے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: ولا يجوز للشاهد ان يشهد بشئٍ لم يعاينه الا النسب والموت والنكاح والدخول۔ (الهداية ج۳ ص۱۵۸ كتاب الشهادة۔فصل من يقبل شهادته الخ) [۱]

اثباتِ زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص عرصۂ دراز تک زمین کے ایک ٹکڑے کی پیداوار

---

[۱] قال العلامة ابن قاضي سماوةؒ: شهدا بنسب اونكاح وقالا سمعناه من قوم لا يتصور اجتماعهم على الكذب لا تقبل وقيل تقبل وفي (عده) اشارة الى ان القبول اصح على ما يأتي۔ (جامع الفصولين ج۱ ص۱۲۴ الفصل الثاني عشرة فيما تسمع فيه الشهادة بلا فصل)

ومِثلُهٗ في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز تحت المادة ۱۶۸۸ ص۱۰۲۷۔

کھاتا رہا، اس پر تعمیر بھی کرائی اور درخت بھی لگوائے، اب ایک دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ زمین میں نے اس کو بطورِ امانت دی تھی اور اس نے مجھے ۱۹۰۰ روپے قرض اس شرط پر دیئے تھے کہ جب وہ اس زمین سے ۱۹۰۰ روپے کے برابر پیداوار حاصل کرے گا تو یہ زمین مجھے واپس کرے گا، لیکن کاشتکار اب اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زمین اس نے مجھے بیع قطعی پر دی تھی، تو اس صورت میں گواہ کس کے مقدم ہوں گے؟

الجواب :- مذکورہ صورت میں کاشتکار جو کہ ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اور ذوالید اگر ملک مطلق کے دعویٰ کی صورت میں شراء کا دعویٰ کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة المرغيناني: وان اقام الخارج البينة على الملك المطلق وصاحب اليد البينة على الشراء منه كان صاحب اليد اولى۔ (الهداية ج۳ ص۲۲۱ كتاب الدعوىٰ باب ما يدعيه الرجلان)

لیکن دوسرا شخص چونکہ خارج ہے فعل زائد یعنی ودیعت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں اصل ملکیت خارج کے لیے مُسلّم ہے اور خارج چونکہ اثباتِ زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے، لہٰذا اگر یہ دوسرا شخص ودیعت پر گواہ قائم کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة ابن نجيم: اذ لو ادعى الخارج الفعل على ذى اليد كالغصب والاجارة والعارية فبينة الخارج اولى۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۴۴ باب دعوى الرجلين)

زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے

سوال :- دو آدمیوں نے ایک قومی مشترک زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور دونوں اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے ہیں، اب ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ساری زمین میری ہے، مجھے وراثت میں ملی ہے، جبکہ دوسرے فریق کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین

لہ قال العلامة الحصكفي رحمه الله: الا اذا ادعى الخارج عليه فعلا كغصب او وديعة او اجارة ونحوها فى رواية دُرر او كان سببا يتكرر كبناء وغرس ونسج خز وزرع بر ونحوه او اشكل على اهل الخبرة فهو للخارج لانه الاصل وانما عدلنا عنه بحديث النتاج۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۴۹۰ باب دعوى الرجلين)

ومِثْلُهٗ فى شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۵۸ ص۱۱۱۸ كتاب الدعوىٰ۔

میرے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہے کیونکہ دونوں کا اس پر قبضہ ہے ، ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے ؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شخص محض زمین آباد کرنے کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو زمین آباد کرنا چونکہ سببِ ملک نہیں اس لیے اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے تاہم اگر یہ زمین موات ثابت ہو جائے جس میں آباد کرنے سے ملکیت ثابت ہو سکتی ہے تو پھر دونوں کا دعویٰ قابلِ سماع ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں دونوں فریقین کے تصرفات اور دعویٰ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مدعی بعض نے زمین کے اس حصہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا جس میں اس کا خصم تصرف کر رہا ہے بلکہ مدعی کل تصرفات کے ہوتے ہوئے مدعی بعض کے حصہ سے تصرفات میں خارجی اور اجنبی ہے، اس لیے اگر دونوں گواہ پیش کریں تو تمام جائیداد کا فیصلہ مدعی کل کے حق میں ہو گا کیونکہ آدھی جائیداد اس کو کسی کے دعویٰ نہ کرنے سے رہ گئی اور بقیہ جائیداد میں مُدعی کل خارج متصور ہو کر ذوالید کے مقابلہ میں خارج کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز ؒ: اذا ادعی اثنان مالاً احدھما بالاستقلال والآخر بالاشتراک وکل منھما متصرف فیہ ای ذو ید علیہ فبینۃ الاستقلال اولیٰ یعنی اذا اراد کلاھما اقامۃ البینۃ ترجح بینۃ الذی ادعی الاشتراک۔[1]
(شرح مجلۃ الاحکام ، المادۃ ۱۷۵۷ ص۱۱۱۲ فصل فی ترجیح البینات)

گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم

سوال:۔ کیا حدود کے جاری کرنے کیلئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا محض شک کی وجہ سے کسی مجرم کو سزائے موت دینا درست ہے ؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے لوگوں کے مال و جان اور عزت و آبرو کے تحفظ

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ:۔ فالاصل فیہ ان البینۃ المظھرۃ للزیادۃ اولیٰ ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۴۱ کتاب الدعوی۔ فصل حکم تعارض الدعوتین۔ الخ)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۲۰۸ باب التحالف۔

کا تہیہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت وآبرو اور مال وجان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے کیونکہ ان چیزوں کے تحفظ کے بغیر سکون وراحت کی زندگی کا تصور بھی محال ہے، ان امور کے تحفظ اور حقوق اللہ کے اجراء کے لیے حدود وقصاص وغیرہ کا اجراء عدیم المثال نظام ہے اس لیے اگر کسی کے وجود یا افعالِ بد سے دوسروں کے مال وجان وغیرہ کو خطرہ ہو تو جرم کے ثابت ہو جانے پر مجرم کو حدود وقصاص کے تحت سزا دی جاسکتی ہے لیکن اگر جرم کے اثبات میں معمولی سی غفلت بھی برتی جائے تو اس میں کسی بے گناہ کی جان یا اس کی عزت وآبرو کے ضیاع کا خطرہ ہے اس لیے جرم کے اثبات کے لیے شریعت نے شہادت میں سختی سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ شبہ کے احتمال کی وجہ سے عورتوں کی گواہی غیر معتبر قرار دی ہے اس لیے صحیح گواہوں کے بغیر محض شک وشبہ کی بناء پر کسی کو سزائے موت دینا ناجائز ہے۔

کما فی الحدیث: عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیرٌ من ان یخطئ فی العقوبۃ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحدود الفصل الثانی) [1]

شرکاء کاروبار کا ایک دوسرے کیلئے گواہی دینا

سوال:۔ دو آدمی ایک کاروبار میں شریک ہیں کیا وہ کاروبار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے لیے گواہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانونِ شہادت کی رو سے ایک شریک دوسرے شریک کیلئے طرفداری کی تہمت کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ان کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں مقبول ہوگی۔

لما فی مجلۃ الحکام: وکذلک لا تقبل شہادۃ الشرکاء لبعضہم فی مال الشرکۃ ولا تقبل شہادۃ الکفیل بالمال للاصیل علی کون المکفول بہ۔ الخ (درر الحکام علی مجلۃ الاحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشہادۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: لان الحدود والقصاص مبناھما علی الدرء والاسقاط بالشبہات۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشہادات۔ فصل واما الشرائط فی الاصل الخ)
ومثلہ فی الہدایۃ ج۲ ص۵۰۷ کتاب الحدود۔

[2] قال العلامۃ علی حیدر: لا تقبل شہادۃ الشرکاء لبعضہم فی مال الشرکۃ۔ (درر الحکام علی مجلۃ الاحکام ج۴ ص۳۹۵)

باپ کا بیٹے کے لیے گواہی دینا

سوال :- جناب مفتی صاحب! اگر باپ عدالت میں جج کے سامنے بیٹے کے حق میں یہ گواہی دے کہ میرے بیٹے نے فلاں شخص سے دعویٰ میں درج شدہ اراضی قطعی بیع سے خریدی ہے، تو کیا باپ کی یہ گواہی بیٹے کے حق میں مقبول ہوگی یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے باپ بیٹے یا بیٹا باپ کیلئے گواہی نہیں دے سکتا اس لیے کہ اس میں طرفداری اور قرابتداری کی تہمت ہے کہ ہو سکتا ہے باپ بیٹے کے حق میں بلاجواز جھوٹی گواہی دے رہا ہو، تو اس تہمت کی وجہ سے اسلام اصول و فروع کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا اسلئے عدالت باپ کی گواہی کی بنیاد پر بیٹے کے حق میں فیصلہ دینے کی شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة المرغیناني: ولا شهادة الوالد لولده وولد ولده ولا شهادة الولد لابویه ولا جدّ ده (اجدادہ) والاصل فیه قوله علیه السلام لا یقبل شهادة الولد لوالده ولا الوالد لولده ولا المرأة لزوجها ولا الزوج لامرأته الخ (الهداية ج ۳ ص۱۶۰ کتاب الشهادة) [۱]

ہیجڑے کی گواہی کا حکم

سوال :- کیا ہیجڑے کی گواہی شرعاً قبول کی جائے گی یا نہیں؟ جبکہ وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچ گانے کا کام بھی کرتا ہو، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب :- جو ہیجڑا عورتوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچتا گاتا بھی ہو تو اس کی گواہی اس کے فسق کی وجہ سے شرعاً مقبول نہیں۔ تاہم جس کے اعضاء اور اداء و انداز میں نرمی ہو اور وہ فسق و فجور کا ارتکاب نہیں کرتا ہو تو وہ صرف نرمی کی بناء پر مردود الشہادت نہیں ہوگا بلکہ شرعاً اس کی گواہی کو قبول کیا جائے گا۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلي: وقال فقهاء الحنفية: لا تقبل شهادة مخنث لفسقه وهو الذی یفعل الردی ویؤتی كالنساء اما الذی فی كلامه

---

[۱] وفی مجلة الاحکام: لا تقبل شهادة الاصل للفرع والفرع للاصل یعنی لا تقبل شهادة الاباء والاجداد والامهات والجدات لاولادهم واحفادهم وبالعكس اعنی شهادة الاولاد والاحفاد للاباء والاجداد والامهات والجدات۔ الخ (درر الحکام علی مجلة الحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشهادة۔ المادة ۱۷۰۰)۔

وفي اعضائه تكسر فهو مقبول الشهادة ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۵۶۶ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة) [1]

تائب فاسق کی گواہی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی پہلے جوا، چوری، زنا وغیرہ قبیح افعال کا ارتکاب کرتا تھا لیکن اب اس نے تمام تمام برائیوں سے توبہ کر لی ہے، تبلیغ میں بھی وقت لگانا شروع کر دیا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اب اگر وہ کسی مجرم پر گواہی دے تو کیا شرعاً اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فاسق وفاجر جب اپنے فسق وفجور سے توبہ کر کے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ شہادت دینے کا شرعاً اہل ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں موصوف کسی بھی مجرم پر گواہی دینے کا اہل ہے اس کو سابقہ جرائم کی وجہ سے گواہی دینے سے نا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: واتفق الفقهاء على أن الفاسق اذا تاب من فسقه تقبل شهادته واستثنى الحنفية المحدود في القذف فانه لا تقبل شهادته عندهم وان تاب۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۵۶۷ المطلب الثالث في شروط اداء الشهادة) [2]

بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا تھا اور دو آدمیوں نے اسے عین قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا، جب قاتل کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی گئی تو اُس نے موقعہ کے ان گواہوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو اغوا کر کے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اُس کی بینائی ختم ہوگئی

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (ولا تقبل شهادة) مخنث بالفتح من يفعل الردى ويؤتى وأما بالكسر فالتكسر المتلين في اعضائه وكلامه خلقة فتقبل۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار جلد۵ ص۴۷۹ كتاب الشهادة۔ باب قبول الشهادة وعدمه)

[2] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: الفاسق اذا تاب تقبل شهادته الا المحدود بقذف۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار جلد۵ ص۴۷۷ كتاب الشهادة۔ باب قبول الشهادة وعدمه)

اب وہ قاتل گرفتار ہوگیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قاتل کے تشدد سے بینائی سے محروم ہوجانے والا شخص عدالت میں اُس قاتل کے خلاف گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود قاتل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

الجواب:۔ حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں اداء شہادت کے لیے چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور بدون ان شرائط کے گواہ اداء شہادت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ان شرائط میں عقل، بلوغ اور اسلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق گواہ اداءِ شہادت کے وقت چونکہ بینائی کی نعمت سے محروم ہے اس لیے وہ حنفیہ کے نزدیک اداءِ شہادت کا اہل نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ وھبة الزحیلی: البصر: یشترط عند ابی حنیفةؒ و محمدؒ والشافعیة ان یکون الشاھد مبصراً فلا تقبل شہادة الاعمیٰ لانه لابد من معرفة المشھود له والاشارة الیه عند الشھادة ولا یمیز الاعمیٰ بین الناس الا بنغمة الصوت و فیه شبھة لان الاصوات تتشابه و تشدد الحنفیة فمنعوا قبول شھادة الاعمیٰ وان کان بصیراً عند تحمل الشھادة۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد ۶ ص۵۶۲ المطلب الثالث شروط اداء الشہادۃ) [1]

قوتِ گویائی سے محروم شخص (گونگے) کی شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی جو کہ بات چیت کرنے کی نعمت سے محروم (گونگا) ہے، اگر وہ خود کسی شخص کو کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھے اور اس کی آواز کو بہچانتا بھی ہو، تو کیا یہ شخص اس مجرم کے خلاف عدالت میں اشارہ کے ساتھ گواہی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کے مطابق مجرم کو سزا وغیرہ دینے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق گواہ میں چند شرائط کا ہونا ضروری

---

[1] لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: لا تقبل من اعمیٰ مطلقاً۔ قال العلامة ابن عابدینؒ، ولنا ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشھود له والمشھود علیه ولا یمیز الاعمیٰ الا بالنغمة وفیه شبھة۔ (رد المحتار والدر المختار ج۵ ص۴۷۶ کتاب الشھادة۔ باب قبول الشھادة وعدمه)

ضروری ہے مثلاً مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل بالغ اور بصیر ہونا وغیرہ، ان شرائط میں ایک شرط قوتِ گویائی کی بھی ہے، اگر کوئی شخص شہادت کی دیگر شرائط تو پوری کرتا ہو مگر وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے تو وہ شہادت کا شرعاً اہل نہیں اور عدالت اُس کی دی ہوئی گواہی پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: النطق! اشترط الحنفية والشافعية والحنابلة ان يكون الشاهد ناطقاً فلا تقبل شهادة الاخرس وان فهمت اشارته لان الاشارة لا تعتبر في الشهادات لانها تتطلب اليقين وانما المطلوب التلفظ بالشهادة - (الفقه الاسلامي وادلته ج ٦ ص ٥٦٤ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة)

گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک مسئلے کا حل مطلوب ہے وہ یہ کہ آجکل بعض لوگ سفید لباس پہن کر خود ساختہ معزز بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں لیکن پسِ پردہ وہ جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر عدالت میں جج کے سامنے کسی مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لیے آئیں اور خود مجرم یا اس کا وکیل ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ موصوف تو خود فلاں فلاں جرم کا مرتکب ہے۔ تو کیا جج حقیقت جاننے کے لیے خفیہ طور پر ان کی عدالت کی تحقیق کر سکتا ہے یا صرف ان کی ظاہری عدالت پر اعتماد کر کے فیصلے کر سکتا ہے؟ فقہاء کرام کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟

الجواب:- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گواہ کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کر کے جج یا قاضی کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے، گواہ کی خفیہ طور پر تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے البتہ حدود اور قصاص کے معاملے میں اس احتیاط کو بروئے کار لانا ان کے ہاں بھی ضروری ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جملہ معاملات اور مقدمات میں گواہ کی خفیہ طور پر عدالتی تحقیق ضروری ہے، متأخرین علماء احناف نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی گواہ کی عدالتی خفیہ تحقیق ضروری ہے، اس لیے کہ خصم (مجرم) یا اس کے وکیل نے گواہ پر اعتراض کیا ہے،

اس لیے جج یا قاضی ایسے گواہ کی خفیہ عدالتی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے صرف گواہ کی سفید پوشی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں ۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي : واكتفى ابو حنيفة بظاهر العدالة في المسلم ولا يسأل عن الشهود حتى يطعن الخصم بهم الا في الحدود والقصاص فانه يسأل عن الشهود وان لم يطعن فيهم الخصوم ودليله على الاكتفاء بظاهر العدالة قوله عليه السلام : المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدودًا في قذف - وَمِثْلُهٗ مروى عن عمر .... وقال الصاحبان والفتوى على قولهما لا بد عن ان يسأل القاضى عن الشهود في السر والعلانية في سائر الحقوق لان القضاء قائم على الحجة وهى شهادة الرجال فلا بد من التعريف على العدالة و في ذلك صيانة للحكم القضائى عن النقص والابطال بسبب الطعن في عدالة الشهود ـ

(الفقه الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۵۶۵ ، ص ۵۶۶ المطلب الثالث فی شروط اداء الشهادة)

علّت زائل ہونے کے بعد اسی مقدمے میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے لیے قاضی کے سامنے یہ شہادت دی کہ میری بیوی کا اپنے بھائی زید پر ایک لاکھ روپیہ (جو کہ اُسے اپنے والد کے ترکہ سے نقدی کی صورت میں ملے تھے) قرضہ ہے لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو ازدواجی رشتے کی بناء پر ردّ کر دیا ۔ اب جبکہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ بائن دے کر رخصت کر دیا ہے تو کیا یہ شخص اسی مقدمہ میں شہادت دے سکتا ہے یا نہیں ؟ کیونکہ وہ عورت اب اس کے لیے اجنبیہ بن گئی ہے ؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے تحت جب ایک بار کسی شخص کی گواہی کسی علت کی بناء پر ردّ کر دی جائے تو اسی مقدّمے میں اس شخص کی شہادت علّت زائل ہونے کے بعد بھی قبول نہیں ہو گی ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاق دینے کے بعد بھی اثباتِ دعوٰی کے لیے اس شخص کی شہادت کار آمد نہیں ۔

لما قال العلامة سليم رستم باز : متى ردّت الشهادة لعلّة ثمّ زالت العلّة فشهد في تلك الحادثة لا تقبل فلو شهد الزوج لزوجته بدعوى فردّت ۔

ثم ابانها وتزوجت غيره ثم شهد لها بتلك الدعوى لم تقبل ۔
(شرح المجلۃ لرستم باز ص۱۰۰۵ المادۃ ۵۵۸ کتاب الاکراہ ۔ الباب الثانی)

شہادۃ میں مشہود لہٗ یا علیہ کا نام مع ولدیت لینا

سوال:۔ ایک آدمی جب کسی کیلئے گواہی دے تو اس کا نام مع ولدیت لے گا یا نہیں؟ اسی طرح جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو تو اس کا نام بھی مع ولدیت کے لے گا یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ گواہی دیتے وقت اگر مشہود لہٗ (جس کے لیے گواہی دیتا ہو) اورمشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہو) عدالت میں موجود ہوں تو گواہ کے لیے ان کے نام مع ولدیت کے لینا ضروری نہیں، صرف اشارہ کرنے سے بھی تعیین ہو جائے گا۔ البتہ اگر دونوں موجود نہ ہوں یا کوئی ایک غیر حاضر ہو تو اس کا نام مع ولدیت کے لے کر گواہی دینا ضروری ہے صرف نام پر اکتفاء کرنے سے بات نہیں بنے گی، تاہم اگر وہ مشہور ومعروف ہو تو شہرت کی وجہ سے صرف نام لینا بھی کفایت کرجاتا ہے ۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یجب ان یشیر الشاھد عند الشہادۃ الی کل من المشھود لہٗ والمشھود علیہ والمشھود بہ اذا کانوا حاضرین فان فعل ذٰلک کفیٰ ولا یلزمہ ان یذکر اسم ابی المشھود لہٗ والمشھود علیہ ولا حدھما اما فی الشہادۃ المتعلقۃ بالمؤکل الغائب او بالمیت فیلزم الشاھد ذکر ابیھما وجدھما ولکن اذا کان کل منھما مشھورًا ومعروفًا فحسب الشاھد ان یذکر اسمہ وشہرتہ لان المقصود الاصلی تعریفہ بوجہ یمیزہ من غیرہ ۔ (شرح المجلۃ الاحکام لرستم باز ص۱۰۱۱ م ۱۶۹۰)[۱]

شہادت کیلئے خود مشاہدہ کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص گواہی دیتے وقت قاضی کے سامنے یہ کہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے یا

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وھی ان علیٰ حاضر یحتاج الشاھد الی الاشارۃ الی ثلاثۃ التی الخصمین والمشھود بہ لو عینا ولادینا وان علیٰ غائب کما فی نقل الشہادۃ او میت فلا بد لقبولھا من نسبتہ الی جدہ فلا یکفی ذکر اسمہ واسم ابیہ وصناعتہ الا اذا کان یعرف بھا ای بالصناعۃ لا محالۃ بان لا یشارکہ فی المصر وغیرہ فلو قضی بلا ذکر الجد نفذ فالمعتبر التعریف لا تکثیر الحروف حتی لو عرف باسمہ فقط او بلقبہ وحدہٗ کفیٰ ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۶۶ کتاب الشہادۃ)
وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۳۰ الباب الاول فی الشہادۃ ۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، جبکہ گواہی دینے والا شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگاتا ہو۔ تو کیا اس شخص کی یہ گواہی اثباتِ جرم کے لیے شرعاً کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گواہی دینے والے کیلئے اگرچہ عادل، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا بھی ضروری ہے مگر قبولِ شہادت کے لیے اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاہد نے مجرم کو جرم کے ارتکاب کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، صرف لوگوں سے سُنکر گواہی دینا قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات لوگوں میں غلط مشہور ہوچکی ہو۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یلزم ان یکون الشھود قد عاینوا بالذات المشھود بہ وان یشھدوا علیٰ ذٰلک الوجہ ولا یجوز ان یشھدوا بالسماع یعنی ان یشھد الشاھد بقولہ سمعت من الناس۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ۔المادۃ ۱۶۸۸) [1]

صرف عورتوں کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا شہادت کے معاملہ میں صرف مرد گواہ کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کہیں صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کے حل کے لیے شرعاً دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا بطور گواہ ہونا ضروری ہے لیکن جہاں کہیں مرد گواہوں کی رسائی ممکن نہ ہو یا وہ ان حالات پر مطلع نہ ہوسکتے ہوں تو اس مجبوری کے تحت صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ اثباتِ دعویٰ ہے اور شرعاً ان کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔

لما فی مجلۃ الاحکام: نصاب الشھادۃ فی حقوق العباد رجلان اورجل وامرأتان ولکن تقبل شھادۃ النساء وحدھن بحق المال فقط فی الحال التی لایمکن اطلاع الرجال علیھا۔

(شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز، المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳ الباب الاول فی الشھادۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ محمد بن الحسین الحنفیؒ: لوقالوا شھدنا لانی سمعنا من الناس فلا تقبل شھادتہ۔ (الفتاوی الانقرویۃ ج ۱ ص۳۹۰ کتاب الشھادۃ۔الباب السادس فی الشھادۃ بالتسامع)

[2] لما قال العلامۃ خالد آتاسیؒ: کالولادۃ فان شھادۃ المرأۃ الواحدۃ فی حق الارث تقبل عندھما خلافاً لابی حنیفۃؒ وبقولھما قال الشافعیؒ واحمد وھو الراجح کما فی الفتح واما فی حق ثبوت النسب فتقبل اجماعاً ۔۔۔ حاصلہ ان شھادۃ النساء بانفرادھن فیما لایطلع علیہ الرجال حجۃ۔
(شرح مجلۃ الاحکام ج ۵ ص۲۰۰ الباب الاول فی الشھادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں | **سوال**:۔ عصرِ حاضر کی سائنسی ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈ شدہ بیان کی بنیاد پر چوری، زنا، قتل وغیرہ کا جرم ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیسٹ کا بیان مثبت للحکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً گواہوں کا عدالت میں حاضر ہوکر قاضی کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں ٹیپ ریکارڈ یا دیگر جدید آلات سے گواہ کا بیان مثبت للحکم نہیں اور نہ قاضی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف ٹیپ ریکارڈ یا دوسرے آلات سے کسی کا بیان سنکر کوئی فیصلہ کرے، اس لیے کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز کے مشابہ ہوسکتی ہے۔

کما فی مجلۃ الاحکام: الشہادۃ ھی الاخبار بلفظ للشہادۃ یعنی یقول اشہد باثبات حق احد ھو فی ذمۃ الاخر فی حضور الحاکم ومواجھۃ الخصمین فیقال للمخبر شاھد وللمخبر لہٗ مشہود لہٗ وللمخبر علیہ مشہود علیہ وللحق مشہود بہٖ۔

قال الشیخ خالد اتاسیؒ: وقولہ فی حضور الحاکم المراد منہ ان یکون الاخبار فی مجلس الحکم فاخبار الحاکم فی غیر مجلس الحکم لایعتبر شہادۃ۔

(شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج ۵ ص ۱۹۹،۲۰۰ الباب الاول فی الشہادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے تصویر کا حکم | **سوال**:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا ہو یا زنا کر رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اچانک اس کی تصویر اتار لے تو کیا وہ تصویر اثباتِ جرم کے لیے قاضی کی عدالت میں پیش کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصویر اور اس سلسلے کے دیگر جدید آلات کو فی زمانہ یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ ذرائع اثباتِ جرائم کے لیے کافی حد تک کارآمد بھی ہیں بشرطیکہ دیگر ذرائع وقرائن انکی تائید کرتے ہوں، اس لیے کہ آجکل کے تکنیکی دور میں تصاویر کے اندر جعلسازی کا قوی امکان موجود ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اتاری گئی تصویر اگرچہ کلی طور پر اثباتِ جرم کے لیے کافی نہیں لیکن اس کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اگر دیگر ذرائع اس کی تائید میں نہ بھی ہوں اور قاضی کو مجرم پر قوی یقین ہو تو وہ اس پر کم از کم تعزیر جاری کرسکتا ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: القرینۃ القاطعۃ ھی الامارۃ البالغۃ حد الیقین

مثلاً اذا خرج احد من دار خالیة مدھوشاً وفی یدہ سکین ملوثة بالدم ودخلت الدار ورؤی فیہا شخص مذبوح فی ذلک الوقت فلا یشتبہ فی کونہ قاتل ذلک الشخص ولا یلتفت الی الاحتمالات الوھمیة الصرفة کالذھاب الی کون شخص المذکور بما قتل نفسہ۔ (مجلۃ الاحکام، المادہ ۱۷۴۱) لہ

سوال: اگر قتل کی کسی واردات میں عین موقع پر کوئی شخص پکڑا جائے کہ | **قاتل کے جسم یا کپڑوں پر مقتول کا خون لگا ہو تو**

اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہو اور اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں۔ ڈاکٹری تحقیق سے مقتول کا خون اور خنجر و کپڑوں پر لگا ہوا خون ایک ہی ہو تو کیا شرعاً اس شخص پر جرم ثابت ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مقتول کے خون اور قاتل کے جسم پر لگے ہوئے خون کا ایک ہونا قتل کے اثبات کا قرینہ ہے۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر مقتول اور قاتل کے کپڑوں اور خنجر پر لگا ہوا خون ایک ثابت ہو جائے تو شرعاً یہ شخص مجرم متصور ہوگا، اور اگر دیگر شواہد بھی تائید کرتے ہوں تو قاتل پر حد جاری کی جائے گی ورنہ قاضی اس پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

لہ لما قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: وفی معین الحکام قال بعض العلماء علی الناظر ان یلحظ الامارات والعلامات اذا تعارضت فما ترجح منہا قضی بجانب الترجیح وھو قوۃ التھمۃ ولا خلاف فی الحکم بہا وتبصرۃ الحکام، قال اللہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ دل علی السیما المراد بہا حال یظہر علی الشخص والامارات ما نحوذۃ من الشریعۃ قال اللہ: (وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ) قال عبد المنعم بن الفرس روی ان اخوۃ یوسف علیہ السلام لما اتوا بقمیص یوسف الی ابیہم یعقوب علیہ تاملہ فلم یجد فیہ حرقاً ولا اثر ناب فاستدل بذلک علی کذبہم وقال متی کان الذئب حلیما یاکل یوسف ولا یخرق قمیصہ۔

(شرح المجلۃ ج ۵ ص ۳۹۱ فی بیان القرینۃ القاطعۃ۔ المادہ ۱۷۴۱)

مسوّدۂ قانونِ شہادت میں
مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم اور تقاریر

اقرار اور اقبالِ جرم | مسوّدہ قانونِ شہادت میں دفعہ ۴۵ کا تعلق اقبالِ جرم اور اقرار سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں، اقبالِ جرم تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے"۔

اس دفعہ کے متعلق مولانا سمیع الحق کی ترمیم (جو کہ فہرست ترامیم میں نمبر ۳۰ پر تھی) یہ تھی کہ اس دفعہ کو یوں بدل دیا جائے:۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں اقبال تصفیہ کن ثبوت بھی ہے اور مانع تقریر مخالف (ESTOPPIL) بھی، اگر کوئی شخص اقبال (اقرار) کرے تو کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال (اقرار) کو اہمیت دے کر فیصلہ کیا جائے"۔

جناب چیئرمین نے یہ ترمیم پڑھ کر ایوان کے سامنے رکھی تو اس کے بارہ میں میاں نعیم الرحمٰن صاحب نے نقطۂ اعتراض اٹھایا کہ یہ ترمیم تقاضوں کے مطابق نہیں تو مسودۂ قانون میں کیسے آسکتی ہے، جناب چیئرمین نے اس ترمیم کی اصل عبارت جو کہ اردو میں تھی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور خود بھی پڑھی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی درست کیا اور پھر محرک کو اس پر بحث کی اجازت دے دی، مولانا نے کہا:۔

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین صاحب! یہ بالکل واضح ہے، ہمارے سامنے جو اصل دفعہ ہے اس میں یہ ہے کہ اقبال تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے۔ تو میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کو ثبوتِ قطعی اس شہادت کی رُو سے نہیں سمجھا گیا ہے کیونکہ انہوں نے انگریزی شہادت ایکٹ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا، لیکن اسلامی قانون میں اقرار کو جس

مفہوم میں لیا گیا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے قطعی ثبوت بھی نہیں یعنی اس سے انکار نہیں کیا (ایل ۱۹۹۰ء)
بھی ہے، واضح اصول   یؤخذ باقرارہٖ آدمی اس کے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

اس مرحلہ پر جناب ملک محمد رمضان صاحب آف بلوچستان نے چیئرمین سے کہا کہ مولانا کی ترمیم کے الفاظ اور معانی کے چکروں میں پڑنے کی بجائے جذبے کو بھی دیکھنا چاہیئے، اگر یہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے تو اسے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر قبول کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔

اس کے بعد چیئرمین نے جناب سید معین الدین شاہ کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی، انہوں نے کہا کہ قوانین آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے قاضی کورٹس پاس کیا ہے، یہاں حقوق کی بات نہیں ہے، یہاں یہ ترمیم زائد ہے قانون میں آ ہی نہیں سکتی۔ اور بھی کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ یہاں جو چیز لانا نہ چاہتے تو یہ حضرات قاضی کورٹس کا حوالہ دے دیتے، اقرار کے متعلق یہی انداز اختیار کیا گیا کہ قاضی کورٹ کا قانون یہی ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا سمیع الحق نے جواب بحث دیتے ہوئے کہا کہ:

مولانا سمیع الحق | جناب والا! میں نے ابھی ایک حصہ بیان کیا تھا، یہاں بار بار ہمیں قاضی کورٹس کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ بڑا عجیب سا نظام ہے کہ اس مسئلے کو دوسری کتاب سے مربوط کیا جائے اور اس کو تیسری سے۔ قانون شہادت تو یہ ہے کہ شہادت کے سارے امور گواہوں کے متعلق ہوں یا حلف کے متعلق ہوں یا اقرار کے متعلق ہوں تو اُسے یکجا رکھا جائے، اس طرح آسانی رہے گی۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک صحیح اور مؤثر ڈھانچہ تیار ہو جائے تو یہاں اگر تفصیلات نہ بھی ذکر کی جائیں۔ تو میں نے ترمیم میں کہا ہے کہ "کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق" یہ اس لیے ضروری ہے کہ اقبال اور اقرار کو بھی شریعت نے کئی شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔ مثلاً اقرار کرنے والا عاقل بالغ ہو گا، اگر نابالغ ہے اور ولی یا سرپرست نے اس کو کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی بالغ کے حکم میں متصور ہو گا۔ اسی طرح اور کئی شرائط ہیں، تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب مقر اقرار کرے، اقبال کرے (بغیر کسی جبر و اکراہ کے) تو اس میں شریعت کے واضح احکامات کو ملحوظ رکھا جائے، جبکہ یہاں معاملہ بالکل مبہم ہے۔ اور دوسرا مانع امر مخالف کا مسئلہ ہے کہ اسلام اقرار کو ثبوتِ قطعی بھی قرار دیتا ہے، اگر یہاں ہم نے اسے ثبوتِ قطعی قرار نہ دیا تو شریعت کا ایک اصول اس سے متاثر ہو جائے گا ـــ اقرار ایک مستقل عظیم الشان باب ہے اسلامی قانون شہادت کا۔ اس کے تقاضوں کو بھی ہر جگہ ملحوظ

رکھتا ہوگا۔ یہ عام مسلّمہ اصول ہے کہ المرء یوخذ باقرارہ ۔ اب ایک شخص نے اگر اقرار کرلیا تو یہاں تو اس کو مانع تقریر مخالف قرار دیا گیا، یعنی ایک شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا بھائی ہے تو وہ اس کا بھائی تو ہوگیا مگر یہ ضروری نہیں کہ اس اقرار سے وہ اس کے باپ کا بیٹا بھی ہو جائے، خلاصہ تو یہی ہے۔ مگر یہاں تو اس کو ثبوتِ قطعی قرار ہی نہیں دیا گیا، اگر ایسا ہی ہو تو پھر اقرار کی کوئی بنیاد اور حیثیت ہی نہ ہوئی۔

اقرار کے شرائط

دوسری گذارش میں نے یہ کی کہ اقرار کو شریعت نے کئی چیزوں سے پابند کر دیا ہے، جیسا کہ ہم نے شاہد کے لیے بھی اہلیت اور شرائط کو ملحوظ رکھا ہے، تو یہاں بھی اگر ہم تفصیلات میں نہیں جاتے تو شہادت کے بعد ایک درجہ تو اقرار کرنے کا ہے، اس کی بھی شرائط ہیں اور کچھ مستثنیات ہیں، وضاحتیں ہیں، تو ان کو میرے اس مختصر جملے میں ملحوظ رکھ دیا جائے کہ شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال کو اہمیت دیں گے، اگر وہ شریعت کے احکام پر پورا نہیں اترتا تو جج کو اختیار ہو کہ وہ اس شخص کے اقرار کو اہمیت نہیں دے گا۔ صرف اتنا معاملہ ہے کہ اس دفعہ کو بھی کسی طرح اسلامی اصولوں کے قریب لایا جائے۔

اس کے بعد جناب چوہدری فقیر اللہ صاحب اور جناب چوہدری الطاف حسین صاحب اور بعض دیگر ارکان نے ترمیم کی مخالفت کی اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب نے ترمیم کی پُرزور تائید کی، اس پر رائے شماری کے بعد جناب چیئرمین نے اسے ساقط قرار دیدیا۔

شادی وغیرہ کا ثبوت

دفعہ ۶۴ کا تعلق شادی وغیرہ کی رشتہ داری کے ثبوت سے ہے اس میں مولانا کی ترمیم یہ تھی کہ اس کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں کہ "یا قوانینِ حدود کی متعلقہ دفعات کے تحت ہو" تاکہ زناکاری کے انسداد کے سلسلہ میں یہ دفعہ بعض صورتوں میں رکاوٹ بن سکے۔ یہاں اصل دفعہ میں تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۴۹۷ الف اور ۴۹۸ ب کا ذکر تھا جبکہ وہ کالعدم ہوچکی تھیں مگر حدود سے متعلقہ دفعات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ جناب حکیم محمد سردار خان صاحب، جناب چوہدری محمد الطاف حسین صاحب، وزیر قانون جناب پیرزادہ صاحب نے بحث میں حصہ لیا اور کہا کہ اس ترمیم کے جملہ تقاضے حدود آرڈیننس سے پورے ہو رہے ہیں البتہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ الف دفعات کا ذکر یہاں زائد ہے اسلئے کہ یہ ریپل ہوچکی ہیں۔ جناب چیئرمین نے اس کے بعد محرک مولانا سمیع الحق کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ جناب چیئرمین!

ہم نے یہ بات مسوّدہ کو ترتیب دیتے وقت مفاہمتی مجلس میں بھی کہی تھی کہ اگر حدود آرڈیننس کے ذکر کی ضرورت نہیں تو پھر تعزیراتِ پاکستان کی ان منسوخ شدہ دفعات (۴۹۷ اور ۴۹۸) کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تو میں حیران تھا کہ جو دفعات منسوخ ہیں ان کا تو ذکر ہے لیکن جو رائج الوقت ہے (یعنی حدود آرڈیننس) اس کا ذکر تک نہیں۔ اس پر جناب چیئرمین نے منسوخ شدہ دفعات کا ذکر ہٹا دیا اور مولانا نے ترمیم واپس لینے کی اجازت شرطیہ طور پر لینی چاہی تو چیئرمین نے کہا کہ شرطیہ اجازت نہیں لی جا سکتی، اس کے بعد ترمیم پیش ہوئی اور گر گئی۔

دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش

دفعہ ۱۲۸ کا تعلق دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش سے ہے کہ ایسی پیدائش بچے کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہوگا۔

مجوزہ ایکٹ ۱۸۷۲ء میں اسے بالکل مبہم چھوڑ دیا گیا تھا، صرف یہ کہ جائز شادی کے دوران بچہ پیدا ہونا اس کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ گویا اگر عقدِ نکاح کے چند دن بعد بھی بچہ پیدا ہو جائے تو اسے حلالی سمجھا جائے گا، جبکہ اسلامی شریعت کی رو سے عقدِ نکاح کے کم از کم ۶ ماہ گذرنے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ ایکٹ انفساخِ نکاح کی صورت میں دوسو اسی یوم کے اندر بعد انفساخ ازدواج تولّد کو جائز ثبوت قرار دے رہا تھا جبکہ فقہاء کرام کے نزدیک کم از کم مدت دو سال ہے۔ یعنی فسخ نکاح (طلاق یا وفات) کے بعد دو سال تک پیدا ہونے والا بچہ بھی حلالی سمجھا جائے گا، سوائے استثنائی صورتوں کے۔ (جو کہ نیچے دفعہ میں آرہی ہیں)

علماء کا اصرار تھا کہ اس دفعہ کو ہر حالت میں شریعت کے مطابق بنانا ہوگا، جبکہ مخالف گروپ وکلاء وغیرہ اس پر آمادہ نہیں تھے، مگر بعد میں مفاہمتی مجالس میں اس پر جناب وزیر قانون وغیرہ کی سعی سے وکلاء حضرات نے اتفاق کر لیا اور اس دفعہ کو علماء کرام نے از سرِ نو مرتب کر کے مسودہ میں شامل کرایا۔

مدتِ حمل

دفعہ ۱۲۸ دورانِ ازدواج پیدائش پختہ ثبوت جائز ہونے کا ہے۔ یہ واقعہ کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے کسی مرد کے ازدواجِ جائز میں رہنے کے چھ ماہ یا اس کے بعد یا اس نکاح کے ختم ہونے سے دو سال کے اندر پیدا ہوا ہو اور اس اثناء میں اس کی ماں بے زوج بھی ہو تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ صحیح النسب بیٹا ہوگا، اِلّا یہ کہ عورت عدت گذر جانے کا اقرار کر چکی ہے اور بچہ کی پیدائش تاریخ اقرار سے ۶ ماہ بعد ہوئی یا شوہر انکاری ہو۔

ایوان میں یہ دفعہ جب سامنے آئی تو حکیم محمد سردار خان اور بعض وکلاء نے پھر اسے ترمیم کے ذریعہ

بدلنا چاہا اور نکاح ختم ہونے کے بعد کی مدت کو ۲۹۵ دن تک محدود کرنا چاہا۔ یہ مسئلہ مدتِ حمل کی اکثر حد پر مبنی ہے۔ بعض ائمہ کے ہاں یہ مدت تین سال اور اس سے بھی زائد ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے کم از کم میعاد پر مبنی ہے، مخالفت کرنے والوں کو یہ میعاد ناممکن اور مضحکہ خیز نظر آرہی تھی جبکہ انگریزی ایکٹ میں عقدِ نکاح کے دو دن بعد بچے کی ولادت کو قانوناً جائز قرار دیئے جاتے پر حیرت اور اچنبھا نہ تھا۔

علماءِ کرام نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس میعاد کی حکمتوں پر روشنی ڈالی اور پیش کردہ ترمیم کی مخالفت کی، وکلاء حضرات نے اپنے مؤقف پر تقریریں کیں اور الحمدللہ کہ رائے شماری کے بعد مخالفانہ ترامیم ساقط ہوگئیں اور اکثریت سے علماء کی پیش کردہ دفعہ منظور ہوگئی۔

اس مسئلہ پر مولانا سمیع الحق نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ :۔

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! یہاں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے کہ بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اس جدید دور میں اگر ہم دس مہینے سے زیادہ دو سال فرض کرلیں تو لوگ ہنسیں گے، گویا اس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ۲۹۵ دن پر زور دیا گیا ہے۔ میں مختصراً دو تین نکات بیان کرتا ہوں۔ ایک تو حکیم محمد سردار خان صاحب کی ترمیم میں بظاہر تعارض ہے، ابتداء میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ۲۹۵ دن میں تبدیل کیا جائے، اور سب مقررین اسی پر زور دے رہے ہیں کہ چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے ایسا ہونا چاہیئے، پھر یہ خود ہی آخر میں بارِ ثبوت والدہ پر ڈالتے ہیں تو وہاں کہتے ہیں کہ ۲۹۵ دن کے بعد اور دو سال کے اندر۔ میں کہتا ہوں کہ جو چیز ترمیم کی ابتداء میں واقعی ناممکن تھی تو پھر آخر میں وہ ممکن کیسے سمجھ لی گئی؟ اگر یہ بات بالکل ناممکن تھی تو پھر ایک ناممکن چیز کے لیے کسی دعویٰ کا بارِ ثبوت والدہ پر ڈالنا کتنے تعجب کی بات ہے، میں ابھی وضاحت سے بات کروں گا۔

چوہدری محمد ادریس تاج | پوائنٹ آف آرڈر! جناب چیئرمین! اگر میں قیاس سے یہ کہوں کہ کسی خاتون کے پیٹ میں بچہ ہے تو آخر وہ میڈیکل چیک اپ آپ کروائیں گے تو پتہ چلے گا، اس طرح تو پتہ نہیں چلے گا۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے، یہ پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہے۔

اکثر مدتِ حمل میں اقوال اور حکمتِ خداوندی

مولانا سمیع الحق | تو اگر ایک چیز ترمیم کے آغاز میں مضحکہ خیز تھی تو وہ ترمیم کے آخر میں کیوں مضحکہ خیز نہیں بنتی؟ میری دوسری گذارش یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی بچے دو دو سال

ماں کے پیٹ میں نہیں رہتے تھے، اور عام حالات جو ہمیں ملتے ہیں اس میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں اس کے باوجود بھی تمام ائمہ نے جو رائے اختیار کی تو یہ نہیں تھا کہ ان میں عقل، تدبر اور یہ ساری باتیں نہیں تھیں اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے نعوذ باللہ ایسی جاہلانہ بات کہہ دی حالانکہ سب ائمہ بنیادی طور پر متفق ہیں کہ ایک سال نہیں ہے اور چاروں ائمہ میں اگر اکثر مدت حمل کے بارے میں اختلاف ہے بھی تو وہ دو سال سے زائد میں ہے، دو سال پر تو سب متفق ہیں، امام شافعیؒ تو تین سال کہتے ہیں، اور امام مالکؒ سے تو چار سے چھ سال تک کے اقوال ملتے ہیں (اس مرحلہ پر کئی ارکان نے مضحکہ خیز انداز میں ان اقوال کا مذاق اڑایا) اب آپ مذاق اڑائیں یا ہنسی کریں بہرحال یہ آپ کا دین ہے پھر سرے سے اس دین سے ہی دستبردار ہو جائیں، خواہ آپ جو بھی کریں آپ کو ان مسائل میں جرأتِ ایمانی کی بات کرنی چاہیئے دین کی باتوں پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے کہ دنیا کیا کہے گی، ایمانداری سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہہ دیں آپ تو پھر آپ کو کتاب و سنت پر مبنی ہر رائے کو ماننا پڑے گا۔

الغرض اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں، اب وجہ کیا تھی کہ میں نے ایسا کہا؟ وجہ یہ تھی کہ یہ کچھ مخصوص حالات ہیں، مثلاً ایک شوہر بیوی کو طلاق دیدیتا ہے یا کوئی خاتون بیچاری بیوہ ہو جاتی ہے تو وہ ہزاروں مصائب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے، اگر اس نے عدت پوری ہونے کا اقرار نہ کیا اور کسی اور سے شادی بھی نہ کی یا شوہر زندہ ہے اور انکار نہیں کرتا، تو ان مخصوص حالات میں اللہ نے ہر جگہ اپنے نظام میں یہ گنجائش رکھی ہے اور احکام میں اسے ملحوظ رکھا کہ کسی انسان کو ناجائز اور حرامی نہ کہا جائے کیونکہ کسی کو ایک دفعہ ناجائز اور حرامی کہہ دینا اس کو زندہ مار دینے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک پاکدامن اور عفیفہ عورت کو اسلام حتی الوسع اس الزام، تہمت اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہے، اب جو دو سال کی گنجائش رکھی گئی ہے تو ایک بیچاری پاکباز عورت جب تک اس کے خلاف ثبوت ثابت نہ ہو تو شریعت اس کو اپنے حال پر رکھتی ہے۔

تیسری گذارش میری یہ ہے کہ یہ امت جو ہے یہ صرف سائنس کے زمانے کے لیے نہیں ہے وہ چودہ سو سال سے ہے اور قیامت تک رہے گی اور ساری بنی نوع انسان کے لیے اسلامی تعلیمات ہیں، ہر جگہ نہ تو سائنس تھی نہ ایکسرے ہیں نہ لیبارٹریاں ہیں نہ اس قسم کے ٹیسٹ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، آج بھی ہماری آبادی کا ۹۵ فیصد علاقہ دیہاتی ہے، جنگلات بھی ہیں، اُمتِ اُمّی کا معنیٰ یہ ہے کہ اسے دینِ فطرت میں تکلفات کا پابند نہ کیا جائے۔ شکریہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت | مروجہ شہادت ایکٹ میں وعدہ معاف گواہ موجود ہے یعنی

کسی شریک جرم کا اقرار اور اس کے اپنے کسی دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف بطور شہادت استعمال ہو سکتا ہے جس کی شرعی نقطہ نظر سے کوئی گنجائش نہیں، باہمی مفاہمت کی مجلس میں نئے مسودہ سے یہ شق حذف کرائی گئی تھی مگر ریٹائرڈ چیف جسٹس بشیر الدین خان صاحب اپنی ترمیم کے ذریعے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے، اس ترمیم پر بڑی زوردار تقریریں ہوئیں، ترمیم کی تائید کو کثریت سمجھا گیا اور وہ منظور ہو گئی۔ اس موقع پر مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا :-

جناب چیئرمین | بہت شکریہ، مولانا سمیع الحق صاحب۔

جناب مولانا سمیع الحق | حضور والا! یہ واضح مسئلہ ہے کہ وہ خود ایک فریق مقدمہ بن گیا ہے اور اس کے بارے میں المغنی نے تصریحات نقل کی ہیں کہ کُلُّ مَنْ خَاصَمَ فِي حَقٍّ لَا تُقْبَلُ شَهَادَتُهُ فِيهِ۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۷) ایک اور روایت میں ہے : قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تقبل شهادةُ لخصم۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریق مقدمہ کی گواہی فریق مخالف کے لیے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ ایک فریق مقدمہ ہے اور اس فریق کے مخالف کو استعمال کرنا ہے جو اس فریق پر بڑی زیادتی ہے، دوسری روایت الدر المختار کی ہے، کل من صار خصماً فی حادثةٍ لا تقبل شهادته فیها۔ (الدر المختار ج ص کتاب الشهادات)

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ: "ہر وہ شخص جو کسی شہادت میں فریق مخالف ہو تو اس میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی"۔ تیسرا یہ کہ وہ گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد عادل نہیں رہا۔ اور شہادت کے لیے صریحاً اصول ہیں کہ وہ عادل ہو، جب خود اس نے یہ اعتراف کیا کہ میں نے قتل کیا ہے، چوری کی ہے، زنا کیا ہے، تو اس کے بعد اس کی شہادت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کو معاف کر دے، کیونکہ اس سے تو حقوق العباد کی حق تلفی ہوگی، حکومت کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم کو معاف کر دے کہ چلو تم نے چوری کی ہے، قتل کیا ہے تو کوئی بات نہیں تجھے معاف دی جاتی ہے، حقوق العباد کو تو حکومت بھی معاف یا ضائع نہیں کر سکتی جب تک کہ متاثرہ شخص اپنا حق خود معاف نہ کر دے۔ یہاں ریاست اور اسٹیٹ کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، تو اسلام کہتا ہے کہ اس کیلئے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں اور غدار کو سخت سزا دی جائے، مگر۔۔۔۔

جناب چیئرمین | شکریہ (یعنی وقت ختم ہو گیا ہے)

اسلام اور خواتین کی شہادت

مجلسِ شوریٰ (وفاقی کونسل) میں مسودۂ قانونِ شہادت پر مولانا سمیع الحق صاحب کی تقریر جسے وفاقی کونسل سیکرٹریٹ نے ضبط کیا، فقہ اور قانونِ شہادت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے نذرِ قارئین ہے۔ (مرتب)

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ط
واذا دعوا الی اللّٰہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون
وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین ہ افی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام
یخافون ان یحیف اللّٰہ علیھم ورسولہ۔ (سورۃ النور)

جناب مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! قانون سے متعلق مسائل بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں، ان حالات میں دس منٹ کی جو پابندی رکھی گئی ہے اور یہ جو تلوار سر پر لٹک رہی ہے تو حیران ہوں کہ میں کس کس مسئلہ پر عرض کروں، بہر حال اگر آپ دس منٹ مزید دیدیں تو یہ آپ کی عنایت ہوگی۔

جناب چیئرمین | نہیں! اگر آپ ۹ منٹ میں ختم کر دیں تو میں شکریہ ادا کروں گا۔

جناب مولانا سمیع الحق | جو مسودہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر تمام معزز ارکان کو بلا کسی اختلاف کے گہری نظر ڈالنی چاہیئے تھی اور اسکی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے تھی، لیکن بد قسمتی سے سارے مسوّدہ میں صرف یہ ایک مسئلہ ایسا اہم بن گیا ہے کہ سارے ایوان کی توجہات اس طرف ہی لگ گئی ہیں، یعنی ؎

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ہمارے مبصرین، وکلاء بھی قرآنِ کریم کی آیات اور مصحف الٰہی کی تفسیر اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں "مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب" کی روشنی میں کرنے لگ گئے ہیں، اکبر نے کہا تھا ؎

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
شیخ صاحب بھی ہوئے ہیں نئی تفسیر کے ساتھ

شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت | تو ہمارے یہ شیوخ حاضر بھی ہوئے تو نئی تفسیر کے ساتھ۔ پیر اشرف صاحب جو اس وقت موجود نہیں ہیں

اور ہمارے علامہ[1] رضی صاحب (شیعہ مجتہد) بھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اپنے اجتہادات ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ جیسے چاہیں انہیں ظاہر کریں، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ شیعہ مسلک بھی نہیں ہے، اہلِ سنت اور اہلِ تشیع اللہ کے فضل و کرم سے قانونِ شہادت میں خواتین کے مسئلہ پر متفق ہیں بلکہ شیعہ تو ہم سے بھی چند قدم آگے ہیں، میں یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ اس بارے میں شیعہ مسلک کیا ہے؟

اسلامی نظریاتی کونسل نے قانونِ شہادت کا جو مسودہ ہمیں بھیجا ہے اس کے صفحہ ۹۵ ضمیمہ (الف) کے ماتحت کونسل کے شیعہ رکن علامہ طالب جوہری صاحب کے اختلافی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صرف حدود میں خواتین کی شہادت مسترد کی گئی ہے اور مقبول نہیں ہے لیکن علامہ طالب جوہری کے نزدیک حدود کے علاوہ طلاق، خلع، وصیت اور نسب میں بھی عورتوں کی گواہی کسی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے، عورتوں کے متعلق مخصوص امور میں ہمارے ہاں صرف ایک عورت کی شہادت کافی ہے، مگر انہوں نے ان امور میں بھی چار عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (مسودہ قانونِ شہادت مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل ص۵۹)

ایک رکن | پوائنٹ آف آرڈر جناب والا! یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ تو زیر بحث نہیں۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھیئے، مولانا اس رپورٹ سے حوالہ پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا! آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ علامہ جوہری کا مسلک ہے؟

مولانا سمیع الحق | نہیں جناب انہوں نے تو لکھا ہے کہ یہ ہماری فقہ جعفریہ میں ہے۔

---

[1] ممبر مجلس شوریٰ اور مشہور شیعہ عالم دین علامہ سید محمد رضی آف کراچی نے مولانا سے قبل پُرجوش انداز میں ایک عورت کی گواہی کافی ہونے پر زور دیا اور کہا کہ عورت امامت کر سکتی ہے اور حکومت بھی، اور میں اپنے اجتہاد کی روشنی میں جرأت سے کہتا ہوں کہ گواہی میں ایک عورت کو کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور بھول جانے سے متعلق آیت کو علت قرار دیا کہ اب نہیں بھولتی تو دو کی بجائے ایک کافی ہے۔ لاہور کے پیر محمد اشرف صاحب نے بھی اپنی تقریر میں ایسا ہی مؤقف اختیار کیا تھا۔ (مرتب)

عورت کی امامت اور حکمرانی | تو عرض یہ ہے کہ شیعہ مسلک خواتین کو معلوم نہیں ہے جس میں ہر مرحلہ پر ان کی شہادت کو قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ رضی صاحب نے عورتوں کی امامت کے بارے میں کہا ہے جو کہ ہمارے ہاں بھی جائز ہے یعنی آپس میں خواتین اگر ایک کمرے میں جمع ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اکٹھی نماز پڑھیں اور ایک عورت ان کی امامت کروا سکتی ہے لیکن عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ پھر عورت کی حکومت کی مثال دی ہے، تو یہ ملکہ سبا کا واقعہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ تو ہمارے نزدیک عورت کی حکومت کے جواز میں پیش کی گئی اس دلیل کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ لن یفلح قوم ولوا امورھم نساءھم (او کما قال علیہ السلام) یعنی اس قوم نے کبھی فلاح نہ پائی جس نے اختیار اور نظامِ اقتدار عورتوں کے سپرد کر دیا۔

حکمت اور علتِ حکم میں فرق | پھر علامہ رضی صاحب نے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کے بعد ارشاد اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے) کو حکم کی علت قرار دیا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ علامہ صاحب کو اس بارہ میں غلط مبحث ہوا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک علت ہوتی ہے اور ایک حکمت۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یاد دلانے کے مسئلہ کو بطورِ علت بیان نہیں کیا ہے بلکہ بطورِ حکمت بیان کیا ہے علت تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قانون بنایا ہے۔ اب کسی قانون کی آپ حکمتیں بیان کریں تو اس حکمت کے ساتھ وہ چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ اگر حکمت بیان کی گئی ہے تو بہتر، نہیں ہے تو پھر بھی وہی حکم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارہ میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الآیۃ) کہ روزے سے تقویٰ حاصل ہو گا، تو روزے کی فرضیت کے لیے تقویٰ علت نہیں ہے، یہ حکمت ہے کہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔

نماز کے بارے میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (الآیۃ) کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے، تو یہ اس کی حکمت ہے علت نہیں، تو اگر ایک شخص کبیرہ گناہ کرتا

ہے تو کیا اُسے اب یہ کہا جائے کہ تم نماز مت پڑھو کیونکہ علت حاصل نہیں ہو رہی ہے، یا اگر تقویٰ آگیا ہے تو تم نماز ہی چھوڑ دو کہ مقصد حاصل ہوگیا تو اب نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ایک شخص کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم روزہ ہی نہ رکھو۔ تو اللہ تعالےٰ نے بطور حکمت اسے بیان کیا، اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی کی دوسری جلد میں ایسی ہی روشنی ڈالی ہے اور سارے مفسرین اسے حکمت قرار دیتے ہیں۔ ...(یہاں مولانا نے کتاب سے اقتباس سنایا.......) تو یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک مصلحت کے تحت بیان فرمائی ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے اگر نہ بھی بیان فرماتے تو بغیر حکمت کے بھی مسلمان اللہ کے احکام ماننے کا پابند ہوتا ہے۔

بہر حال یہ گزارشات ضمناً آگئیں اور میرے دس منٹ کا اہم حصہ تو ان کی نذر ہوگیا، اب اصل موضوع کا کیا کیا جائے؟ علامہ رضی صاحب تو اللہ کے فضل سے بہت وسیع الظرف انسان ہیں، ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی ہے، کھلے دل کے انسان ہیں ـــــ لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ اہلِ سنت کے مسلک کی رو سے اس کی بروقت تردید کروں، وہ اپنے مسلک کی وضاحت جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی قدغن نہیں ہے، یہ ان کا اپنا اجتہاد ہو تو ہو مسلک نہیں ـــــ

جناب چیئرمین صاحب | یہاں خواتین کو بار بار یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم فرائض اور حقوق کو ملحوظ رکھیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

شہادت فرض ہے حق نہیں

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے لیے فرض قرار دی ہیں مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اسی طرح شہادت بھی ایک فرض ہے جو کہ فقہ کا مسئلہ ہے اور سارے فقہاء اور علماء ابواب الشہادت کی کتابوں میں اس کی تصریح کرتے ہیں۔ یہ میرے پاس فقہ کی معتبر ترین کتاب ھدایہ ہے اس کے آغاز میں ہی ہے کہ الشھادۃ فرض..... الخ شہادت ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر عائد کیا گیا ہے ـــ یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو دیدیا اور کسی کو نہیں دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی کے لیے کوئی عبادت لازم کرے کسی کے ذمہ نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خواتین کی نازک ذمہ داریوں اور عقلی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو تمام عبادات میں رعایت بھی دی ہے۔

فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت

یہ شہادت کا مسئلہ بھی اگر وہ سوچیں تو اس میں بھی ان کے لیے رعایت ہے

مثلاً نماز فرض ہے حق نہیں ہے، اب نماز کے لیے بھی یہ کہا گیا ہے کہ دس دن مہینے میں نہیں (عذر ہونے کی وجہ سے) چھٹی ہے کہ جب حضور اکرمؐ سے عورتوں کے نقصانِ دین کے بارہ میں پوچھا گیا تو حضور نے یہی بات دلیل کے طور پر پیش کی۔ اسی طرح روزہ ایک فرض ہے خدا نے روزے میں بھی ان کو رعایت دی ہے کہ جن دنوں میں ان کو عذر ہو وہ دس دن روزہ نہیں رکھیں گی سخت گرمی کے دن ہوں گے مگر انہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے بعد میں اعادہ کریں گی۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے، اس میں ہر مرد پر پابندی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہے تو لازمی طور پر حج پر جائے، مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ (الآیۃ) اس کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں مگر جائے گا ضرور، ہزاروں خطرات مرد کے لیے بھی راستے میں ہوتے ہیں لیکن عورت کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری نگہداشت کرنے والا محرم مرد ہو تو تب تم پر حج فرض ہے ورنہ نہیں، تو یہ کتنی بڑی رعایت ہوئی۔ اور زکوٰۃ وعشر میں بھی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی عورت سے رعایت ہے، مثلاً ڈھائی فیصد مرد پر بھی ہے اور ڈھائی فیصد عورت پر بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس میں رعایت نہ ہوتی تو عورت پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہوتی چاہیئے تھی کیونکہ مرد کے ذمے خدا نے خارجی ذمہ داریاں اور گھر کے تمام اخراجات لگائے ہیں، عورت کا نان ونفقہ اور رہن سہن سب کچھ مرد کے ذمہ ہے۔ مرد کے پاس اگر ہزار روپے ہیں تو اس پر دوگنی چوگنی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں اس کے برعکس اگر عورت کے پاس ہزار روپے ہیں اور کوئی ذمہ داری نہیں، نہ مرد کی کفالت کا فکر ہے اس کو نہ بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے، اس کے اپنے اخراجات بھی مرد پر ہیں، گھر کا نوکر چاکر بھی مرد کے ذمہ ہے، تو گویا پھر تو اس پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہونی چاہیئے تھی لیکن خدا نے اس میں بھی انہیں ایسی کنسیشن (CONCESSION) دی کہ ان پر بھی مردوں کے برابر ڈھائی فیصد ہی ہے۔

کسی غیر مکلّف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنائیں

اب آگے بات آتی ہے شہادت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے شہادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو عورتوں کو اس میں کیوں روکا جاتا ہے؟ تو عرض ہے کہ شہادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب اسے مکلّف ہی نہیں بنایا اور آیاتِ شہادت متوجہ ہی نہیں ہوئیں ان کو مثلاً وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم ہے، تو اب اگر ایک شخص نابالغ ہے اس کو اقیموا الصلوٰۃ متوجہ ہی نہیں ہے، غیر مسلم ہو تب بھی متوجہ نہیں ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح

اتوا الزکوٰۃ ہے ۔ ایک شخص فقیر ہے اور صاحبِ نصاب ہی نہیں ہے تو وہ مرد ہو یا عورت ہو اس کو یہ آیت متوجہ ہی نہیں ہوتی ، اللہ نے جب عورت کو مکلف نہیں بنایا اس فریضے کا ، تو یہ آیات (۱) وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۔ الآیۃ ۔ (۲) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۔ الآیۃ ۔ (۳) كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۔ الآیۃ ۔

یہ ساری آیات ان کو متوجہ ہی نہیں ہیں کہ وہ کہیں کہ ہمیں بھی اس میں مخاطب بنایا گیا ہے ۔ جب کسی طبقہ کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہو تو اس سے وہ آیت مطالبہ ہی نہیں کرتی ۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ یہ تضادات خدا کے کلام میں کیسے ممکن تھے ، جبکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو یہ فرماتے ہیں کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ ۔ الآیۃ کہ گھروں میں بیٹھی رہو ، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں : وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۔ (الآیۃ) کہ کوئی بھی چیز ان سے مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو ۔ ایک طرف تو خدا وند تعالیٰ ان کو (عورتوں کو) پابند بناتا ہے گھر کا ، پھر دوسری طرف ان پر فرض کیسے کرتا ہے کہ وہ عدالتوں میں جا کر گواہیاں دیتی رہیں اور پھرتی رہیں ، اللہ کے کلام میں ایسا تضاد تو ہو نہیں سکتا ۔ ان آیات کا سارا مضمون یہی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں یعنی پردہ کا حکم دیا ہے ، اور دوسری طرف وہ تمام آیاتِ شہادت پیش کی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ عدالتوں میں گھومتی رہو ۔ تو یہ کوئی انسانی قانون اور انسانی لائر (LAWYER) اور انسانی قانون دان تو نہیں ہے ؟ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے ۔ تو ایسی تمام آیات کا مخاطب اللہ تعالیٰ نے صرف مرد کو بنایا ہے نہ کہ عورتوں کو ۔

جناب چیئرمین | مولانا تشریف رکھیں آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے ۔

كتاب القسمة والأكراه

کتاب القسمۃ

(جائیداد کی تقسیم کے احکام و مسائل)

کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء والد کی جائیداد میں اجتماعی طور پر حق رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ تمام جائیداد کی تقسیم کی ضرورت نہیں اُس کا صرف منافع اور آمدنی لے کر آپس میں تقسیم کرتے رہیں گے، لیکن اب ایک وارث اصرار کر رہا ہے کہ میرا حصہ الگ کر دیں اس لیے کہ میں مشترکہ طور پر جائیداد سے منافع لینے کے حق میں نہیں ہوں، کیا اس وارث کے مطالبہ پر جائیداد تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مورث کی وفات کے بعد متروکہ جائیداد میں ورثاء کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصہ کے مطالبہ کا حقدار ہے، ایسی حالت میں جب تقسیم سے متروکہ جائیداد کے منافع ختم نہیں ہوتے ہوں تو ہر ایک وارث اپنے حصہ سے استفادہ کر سکتا ہے، لہٰذا کسی ایک شریک کے مطالبہ پر عمل ہو کر جائیداد تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: وسببھا طلب الشرکاء او بعضھم الانتفاع بملکہ علیٰ وجہ الخلوص وقال شرطھا عدم فوت المنفعۃ بالقسمۃ۔ وقال ابن عابدینؒ: تحت قولہ المنفعۃ ای المعھودۃ وھی ما کانت قبل القسمۃ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۲۸ کتاب القسمۃ)۔[1]

---

[1] قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ: سببھا طلب احد الشرکاء الانتفاع بنصیبہ علی الخلوص ورکنھا مایحصل بہ الافراز والتمیز النصیبین وشرطھا ان لاتفوت منفعۃ بالقسمۃ۔ (العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج ۸ ص۳۴۸ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۲۱۴ الباب الثالث فی بیان مایقسم ومالایقسم ومایجوز من ذٰلک ومالا یجوز۔

نابالغ کے حصّہ کی تقسیم کا حکم

سوال:- چند ورثاء نے مشترکہ جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا اُن میں سے ایک شریک نابالغ تھا، حاکمِ وقت نے نابالغ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے دیگر شرکاء کے مطالبہ پران کی جائیداد تقسیم کردی، شرکاء نے اپنے اپنے حصہ کی جائیداد پر کہ مدت دراز تک اُس میں تصرّفات کئے لیکن اب نابالغ لڑکا بالغ ہونے کے بعد دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کررہا ہے، تو کیا یہ تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کسی نابالغ وارث کے حصہ میں تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے اور نہ نابالغ کسی کو وکیل مقرر کرسکتا ہے، تاہم اگر حاکمِ وقت نابالغ کی نمائندگی کرکے ورثاء سے جائیداد تقسیم کرے تو ایسی تقسیم نافذ ہے اسے توڑنا جائز نہیں، حاکمِ وقت نابالغ کی طرف سے نمائندہ متصور ہوگا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیھم صغیرٌ لا نائب عنہ۔ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: بعدھذا القول اوغائب لا وکیل عنہ لعدم لزومھا حینئذٍ الّا باجازۃ القاضی اوالغائب اوالصبی اذا بلغ۔ (تنویر الابصار والدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۰ کتاب القسمۃ) [1]

کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال:- چند ورثاء میں سے ایک وارث عرصہ دراز سے غائب ہے، اب اگر حاضر ورثاء مورث کی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو اس غائب وارث کے حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جبکہ حاضر ورثاء کو جائیداد تقسیم کیے بغیر نقصان اٹھانا پڑرہا ہے اور غائب شریک تک رسائی کا کوئی قابلِ عمل ذریعہ بھی نہیں ہے؟

---

[1] قال العلامۃ فخر الدین الشھیر بقاضی خانؒ: اذا قسم الورثۃ الترکۃ فیما بینھم بغیر امر القاضی وفی الورثۃ صغیر او غائب او شریک المیت لا تصح القسمۃ الا باجازۃ الغائب او ولی الصغیر او باجازۃ الصبی بعد البلوغ او باجازۃ القاضی قبل البلوغ۔

(فتاوٰی قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۱۵۶ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۸ ص۳۵۱ کتاب القسمۃ۔

الجواب:۔ اگر غائب وارث تک رسائی ممکن ہو تو تقسیم جائیداد کیلئے اس کی ذاتی طور پر حاضری ضروری ہے، تاہم اگر وہ ذاتی طور پر حاضری سے قاصر ہو تو کسی کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کرے اور اگر وہ حاضری سے بلا وجہ پہلو تہی کر رہا ہو تو حاضر ورثاء کے لیے حاکم وقت کا سہارا لینا ضروری ہے کیونکہ حاکم وقت غائب وارث کی طرف سے نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وفیهم صغیر او غائب قسم بینهم ونصب قابض لهما۔ وقال الحصکفیؒ: تحت قول المذکور نظراً الغائب والصغیر ولا بد من البینة علیٰ اصل المیراث عنده خلافاً لهما کما مر۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص۱۸۲ کتاب القسمة)[۱]

قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا

سوال:۔ ایک وسیع رقبہ اراضی ایک قوم کی مشترکہ جائیداد تھی، رؤساء قوم نے باہمی رضامندی سے یہ زمین تقسیم کی لیکن قرعہ اندازی سے کام نہیں لیا گیا، شرکاء میں سے بعض نے اپنے حصہ کی زمین آباد کر لی ہے اور بعض کی زمین تاحال غیر آباد پڑی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرعہ اندازی کے بغیر یہ تقسیم جائز ہے یا دوبارہ تقسیم کی جائے گی؟

الجواب:۔ تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی صرف ایک اصح صورت ہے شرط کے درجہ میں نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر قوم نے اپنے سرکردہ افراد کو باقاعدہ تقسیم کرنے کی اجازت دی ہو تو یہ تقسیم نافذ ہے، ہر ایک حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ پر قائم رہ کر دوبارہ تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: والقرعة لتطییب القلوب وازاحة تهمة المیل

---

[۱] قال العلامة قاضیخانؒ: وذکر الخصاف اذا کان فی الورثة صغیر او غائب لم یکن فی ید الغائب ولا فی ید الصغیر شئ من الترکة بل کان الکل فی ید الحضور الکبار فطلبوا القسمة من القاضی فان القاضی یجعل للصغیر وصیا یقوم بالقسمة ویقبض حقه ویجعل للغائب وکیلا ویأمرهم بالقسمة ۔ (الفتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۱۵۶ فصل فی قسمة الوصی والاب)

حتیٰ لو عین لکل منھم نصیباً من غیر اقتراع جاز لانہ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔
(الہدایۃ ج ۴ ص ۴۱۶ کتاب القسمۃ۔ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)[1]

غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کے اعادہ کا حکم

سوال:۔ چند شرکاء کے درمیان ایک مشترکہ جائیداد تقسیم ہوئی ہر ایک شریک اپنے اپنے حصہ میں مدت دراز تک مالکانہ تصرفات کرتا رہا، اب شرکاء اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ تقسیم کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے شرکاء کے زیر قبضہ جائیداد میں تفاوت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں جب ایک دفعہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے تقسیم ہونے کے بعد جب ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کرنے شروع کئے تو اب معمولی شبہات کی وجہ سے سابقہ تقسیم کو توڑ کر دوبارہ تقسیم کرنا بے سود عمل ہے، تاہم اگر غبن فاحش ہو تو شرکاء کے مطالبہ پر سابقہ تقسیم کالعدم قرار دے کر دوبارہ تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولو ظہر غبن فاحش فی القسمۃ بطلت ولو وقعت بالتراضی فی الاصح۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۷ کتاب القسمۃ)[2]

غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ

سوال:۔ ایک مشترکہ جائیداد تقسیم کر کے مالکان اس پر تصرف کرتے رہے، بعد میں

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ تطییب القلوب اشار الیٰ ان القرعۃ غیر واجبۃ حتیٰ ان القاضی لو عین لکل واحد نصیباً من غیر اقراع جاز لانہ فی معنی القضاء فملک الالزام۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۴ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۵۲ کتاب القسمۃ۔

[2] وقال العلامۃ المرغینانیؒ: ولو اختلفا فی التقویم لم یلتفت الیہ لانہ دعوی الغبن ولا معتبر بہ فی البیع فکذا فی القسمۃ لوجود التراضی الا اذا کانت القسمۃ بقضاء القاضی والغبن الفاحش لان تصرفہ مقید بالعدل۔ (الہدایۃ ج ۴ ص ۴۲۰ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۵۶ کتاب القسمۃ۔

معلوم ہوا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے، کیا اس غلطی کے ازالہ کے لیے دوبارہ تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔اگر تقسیم میں غلطی مبرہن یا مسلّم ہو اور تقسیم توڑنے کے بغیر غلطی کا ازالہ ممکن نہ ہو تو اس کے ازالہ کے لیے تقسیم دوبارہ کی جاسکتی ہے ۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ : واما صفات القسمۃ فانواع منہا ان تکون القسمۃ عادلۃ غیر جائزۃ الیٰ ان قال فاذا وقعت جائزۃ لم یوجد التراضی ولا افراز نصیبہ بکمالہ لبقاء الشرکۃ فی البعض فلم تجز وتعاد وعلیٰ ھٰذا اذا ظہر الغلط فی القسمۃ المبادلۃ بالبینۃ او بالاقرار تستأنف لانہ ظہر انہ لم یستوف حقہ فظہر ان معنی القسمۃ لم یتحقق بکمالہ ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۶ فصل فی صفات القسمۃ۔کتاب القسمۃ)[1]

مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم

سوال:۔جناب مفتی صاحب! ہم دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر ایک پلازہ بنایا اور اس کو کرایہ پر دیدیا، اب ہم اس کے کرایہ کو ہر ماہ بقدر حصہ آپس میں تقسیم کریں یا ایک ماہ کا کرایہ میں لے لوں اور دوسرے ماہ کا میرا بھائی لے، ان دونوں میں کون سی صورت جائز ہے ؟

الجواب: ۔جس طرح عین مال مشترک ہوتا ہے اسی طرح اس کے منافع بھی مشترک ہوتے ہیں، اس منافع کو بھی بقدر حصہ تقسیم کیا جائے گا ۔صورتِ مسئولہ میں کرایہ کی تقسیم شرکاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ جس طرح چاہے کرسکتے ہیں، چاہے تو ہر ماہ کا کرایہ برابر تقسیم کرلیں یا ایک ماہ کا کرایہ ایک بھائی وصول کرے اور دوسرے ماہ کا دوسرا بھائی، دونوں طرح درست ہے ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : (تحت قولہ کذلک) ای یأخذ ھٰذا شہرا والآخر شہرا او یأخذ ھٰذا غلۃ ھٰذہ والآخر غلۃ الاخریٰ ۔ (ردالمحتار ج ۶ ص۲۶۹ کتاب القسمۃ، مطلب فی الرجوع عن القرعۃ)

---

[1] وفی الھندیۃ : عن محمد قاسم قسم داربین رجلین اعطیٰ احدھما اکثر من الآخر غلطا وبنیٰ احدھما فی نصیبہ قال محمدؒ یستقبلون القسمۃ فمن وقع بناءہ فی قسم غیرہ رفع بناءہ ولا یرجعان علی القاسم بقیمۃ البناء ولکنھما یرجعان علیہ بالاجر الذی اخذہ کذا فی الظہیریۃ
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص۲۲۸ الباب الحادی عشر فی دعو الغلط فی القسمۃ)
ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص۲۱۰ کتاب القسمۃ ۔

ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ دو بھائیوں مسمی محمد حنیف اور محمد صدیق نے کچھ زمین مشترکہ طور پر خریدی جس میں نو ہزار روپے (۹۰۰۰/- روپے) محمد صدیق کے تھے اور تین ہزار روپے محمد حنیف کے تھے، بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰/- روپے) کی ۲۴ کنال زمین آج سے تقریباً ۳۲ سال پہلے خریدی گئی اور یہ زمین دونوں بھائیوں کے نام انتقال بھی ہوگئی اور کافی عرصہ تک یہ زمین دونوں بھائیوں کے والد صاحب کے تصرف میں رہی، والد صاحب کی وفات کے بعد آج تک ۱۳ سال سے مذکورہ زمین محمد صدیق کے قبضہ اور تصرّف میں ہے، انتقالِ زمین کے وقت بڑے بھائی محمد حنیف نے تمام اندراجات محمد صدیق سے پوشیدہ رکھے۔

آج سے ۱۳ سال پہلے جب والد صاحب فوت ہوئے تو وفات کے تیسرے دن بڑے بھائی محمد حنیف نے مذکورہ زمین کی تقسیم کی بات کی جبکہ محمد صدیق نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ والد صاحب کے چالیسویں کے بعد زمین کے تمام معاملات طے کرکے تقسیم کریں گے، اس کے بعد محمد صدیق کی موجودگی میں پانچ دن تک محمد حنیف نے پھر زمین تقسیم کرنے کی بات نہیں کی، تو محمد صدیق کسی کام کے سلسلہ میں پشاور چلا گیا، اس کی غیر موجودگی میں محمد حنیف نے چند اشخاص کو جمع کرکے زمین مذکورہ نصف نصف یعنی بارہ بارہ کنال تقسیم کردی جبکہ نہ تو مروّجہ طریقۂ کار اختیار کیا گیا اور نہ ہی اس تقسیم کی کوئی نشاندہی یا حد بندی کی گئی، صرف زبانی معاملہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد جب محمد صدیق گھر آیا اور اسے اس تقسیم کا علم ہوا تو اس نے اس تقسیم اور طریقۂ کار کو فراڈ اور دھوکہ دہی قرار دے کر مسترد کردیا اور کہا کہ میں نے اس زمین کی خرید میں تین حصے قیمت ادا کی ہے لہٰذا میرا حق تین چوتھائی بنتا ہے اور محمد حنیف نے ایک ربع قیمت ادا کی ہے لہٰذا اس کا حق ایک چوتھائی بنتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) آیا زمین کی تقسیم فریقین میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اس کی رضامندی کے بغیر ہوسکتی ہے؟

(۲) کیا ایک فریق اپنی مرضی کے چند اشخاص کو جمع کرکے گواہ بناکر زمین تقسیم کرسکتا ہے؟ جبکہ تحریری اور مروجہ طریقۂ کار کا کوئی ثبوت نہ ہو؟

(۳) محمد صدیق کا دعویٰ اس زمین میں تین چوتھائی کا ہے اور محمد حنیف نصف کا دعویدار ہے تو کیا زمین خریدتے وقت دی گئی رقم کی بنیاد پر اس دعوے کا استحقاق رکھا جاسکتا ہے؟

(۴) کیا اتنا عرصہ گذرنے کے بعد محمد صدیق اپنے دعوے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟
شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنونِ احسان فرمائیں۔

الجواب:۔ شراکتی کاروبار ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے اور یہ ناگزیر ہے، مگر جملہ شرکاء کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھنا بھی فرض ہے، یہ اس لیے کہ اس مشترکہ مال کے ہر ہر جزء میں سب شریک ہوتے ہیں، کوئی بھی حصہ دار یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا مال ہے یا اتنا حصہ ہے، جس کی وجہ سے تقسیم کے وقت سب شرکاء کا حاضر ہونا یا سب کی اجازت ہونا شرعاً ضروری ہے، بدون اجازت یا کسی ایک شریک کے غائب ہونے کی صورت میں دیگر شرکاء مشترکہ مال تقسیم نہیں کرسکتے۔

لما فی الهندیة: ولوکانوا مشترین لم یقسم مع غیبة احدهم وان اقاموا البینة علی الشراء حتی یحضر الغائب۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۱۰ الباب الثالث فی بیان ما یقسم وما لا یقسم)

اسی طرح شرح المجلۃ میں ہے: قسمة الفضولی موقوفة علی الاجازة قولاً وفعلاً فاذا قسم واحد المال المشترک بنفسه لا تکون القسمة جائزة ولکن اذا اجاز اصحابه قولاً۔ (شرح المجلة لرستم باز ص۶۲۳ الفصل الثانی فی شرائط القسمة)

فتاویٰ حامدیہ میں مرقوم ہے: اذا قسم الورثة الترکة بینهم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر او غائب او شریک للمیت لا تصح الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او اجازة الصبی بعد البلوغ۔ (بحوالہ شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۳ الفصل الثانی فی شرائط القسمة)

صاحبِ درر الحکام نے بھی اس قسم کی تقسیم کو لا تجوز القسمة ولا تنفذ کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کی تقسیم ناجائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو تقسیم ہوچکی ہے وہ کالعدم ہے اور نافذ العمل نہیں ہے۔

جو اشیاء مشترکہ طور پر خریدی جائیں اور ابتداءً کسی قسم کا معاہدہ نصف یا ثلث وغیرہ کا نہ ہوا ہو مگر رأس المال کی ادائیگی کے وقت ایک شریک کے حصہ کی رقم زیادہ ہو اور دوسرے شریک کے حصہ کی رقم کم ہو تو پھر اس شے میں حصہ داری رأس المال کے اعتبار سے ہوگی، جس کی رقم زیادہ ہو تو وہ زیادہ حصے کا حقدار ہوگا، اس لیے کہ اگرچہ زبان وقال سے انہوں نے حصہ داری کا تعین نہیں کیا مگر زبانِ حال اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے رقم کی وجہ سے حصہ داری مقرر کی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محمد صدیق کا رأس المال ۹۰۰۰ روپے ہے

جو کل رأس المال کا تین چوتھائی ہے اس لیے محمد صدیق تین چوتھائی کا حقدار ہے اور محمد حنیف کا ایک چوتھائی رأس المال ہے اس لیے اس کا حصّہ زمین بھی ایک چوتھائی ہے، اگرچہ مطلقاً شراکت تنصیف کی صورت اختیار کرتی ہے۔

نظیرہ فی درر الحکام: اذا اختلط دینار احد بدینارین لآخر من جنسہ بصورۃ لاتقبل التمیز ثم ضاع اثنان منہما فیکون الدینار الباقی بینہما مشترکا اثلاثاً ثلثاہ لصاحب الدینارین وثلثہ لصاحب الدینار۔

(درر الحکام ج۳ ص۱۷ المادۃ ۱۰۶۱-الباب الاول فی بیان شرکۃ الملک)

کسی کے حق کے اسقاط میں طویل زمانے کا گذر جانا اسے متاثر نہیں کرتی بلکہ حق کسی صورت میں اور عرصہ دراز کے بعد بھی ساقط نہیں ہوتا لہٰذا محمد صدیق کا دعویٰ استحقاق اتنی مدت کے بعد بھی برقرار ہے اور اس کو دعویداری کا حق حاصل ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: لایسقط الحق بتقادم الزمان۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ص ۱۶۷۴ المادۃ)

(ھٰذا ما ظھر لی واللہ اعلم)

مشترکہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:- ہماری کچھ مشترکہ زمین ہے، اب اس کی تقسیم کا مسئلہ ہے کیونکہ یہ زمین فروع پر تقسیم کرنا ہے جبکہ فروع میں بہت اختلاف ہے اس لیے آسانی کے ساتھ ان پر تقسیم صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتی، لہٰذا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس زمین کی تقسیم کا طریقہ مطلوب ہے؟

الجواب:- میرے نزدیک یہ مشترکہ اراضی اصل مالکان پر وراثت کے قاعدہ کے مطابق تقسیم کی جانی چاہیئے اور پھر ان اصل مالکان سے ان کے فروع کو میراث کے ضابطہ کے مطابق منتقل کی جائے گی اگرچہ فروع کثرت و قلت میں مختلف کیوں نہ ہو۔

* * *

کتاب الاکراہ

(مجبوری کے احکام ومسائل)

حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے آج سے پانچ سال قبل دس کنال زمین ایک لاکھ روپے کی بیع قطعی سے خریدی جس کا ثبوت حکومت کے متعلقہ دفتر میں موجود ہے، موصوف نے مذکورہ زمین پر پولٹری فارم کھولا، بعد میں حکومت نے مذکورہ زمین دس ہزار روپے کے عوض لینا چاہی لیکن مالکِ زمین نے انکار کردیا، حکومت نے جبراً اس کی زمین پر قبضہ کرلیا، تو کیا حکومت کا اس طرح کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر حکومت کا یہ قبضہ کسی معاہدہ کے تحت نہ ہو تو حکومت کا اس طرح کرنا اکراہ کے حکم میں ہے اسلئے یہ بیع المکرہ ہے نافذ نہیں لہٰذا زوالِ اکراہ کے وقت خود مالکِ زمین یا اس کے ورثاء زمین کو واپس لے سکتے ہیں، تاہم جہاں کہیں حکومت اپنے کسی قرض کی وصولی کے لیے ایسا اقدام کرے تو اس میں اکراہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: امر السلطان اكراه وان لم يتوعده وامر غيره لا الا ان يعلم المامور بدلالة الحال انه لو لم يمتثل امره يقتله او يقطع يده او يضربه ضرباً يخاف على نفسه او تلف عضوه۔

(رد المحتار ج۶ ص۱۳۲ مطلب بيع المكره فاسد وزوائده مضمونة بالتعدي)[1]

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: لا يعتبر البيع الذي وقع بالاكراه المعتبر ولا الشراء ولا الايجار ولا الهبة ولا الفراغ ولا الصلح عن مال والاقرار والابراء وتاجيل الدين واسقاط الشفعة ملجئاً كان الاكراه او غير ملجئ۔ (شرح مجلة الاحكام، مادة ۱۰۰۶ ص۵۵۹ الباب الثاني في بيان المسائل التي يتعلق بالاكراه)

ومثله في الهداية ج۳ ص۱۱۳ كتاب الكفالة۔

جبراً نکاح کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو زبردستی اغوا کرکے لے جائے اور پھر بزورِ شمشیر اس کے ساتھ نکاح کرے اور وہ لڑکی جان جانے کے خوف سے مجبوراً اس کو قبول کرے، تو کیا شرعاً یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اس قبول کرنے میں عورت کے اختیار کا بھی کچھ دخل ہے اسلئے یہ نکاح صحیح ہے اور یہ عورت مکرہ کی بیوی شمار ہوگی، اگرچہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لما في الهندية: المرأة اذا اکرهت على النكاح ففعلت صح النكاح۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۵۳ كتاب الاكراه۔ الباب الرابع فى المتفرقات)[1]

جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی عورت کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جبراً اس سے زنا کرے اور وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہوا اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہو جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوئی ہو تو کیا یہ عورت گنہگار ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت باوجود کوشش کے اپنی جان نہ بچاسکی اور نہ اس نے زانی کو تمکین (جگہ) دی ہو لیکن پھر بھی جبراً اس کے ساتھ زنا کیا گیا تو یہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ واما المرأة هل تأثم ذكر شيخ الاسلام ان اكرهت على ان تمكن من نفسها فمكنت تأثم وان لم تمكن وزنى بها فلا وهذا لو بملجئ والافعليه الحد بلاخلاف لا عليها ولكنها تأثم۔ (ردالمحتار ج۶ ص۱۳۷ كتاب الاكراه)[2]

---

[1] لما قال العلامة طاهر بن عبدالرشيد البخاريؒ: ولو اكره على عقد من العقود ان كان عقداً لا يبطله الهزل كالنكاح والطلاق والعتاق جاز العقد۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۲۰۶ كتاب الاكراه)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج۸ ص۷۵ كتاب الاكراه۔

[2] لما فى الهندية: اما المرأة اذا كانت مكرهة على الزنا هل تأثم ذكر شيخ الاسلام فى شرحه فى باب الاكراه على الزنا انها ان اكرهت على ان تمكن من نفسها فمكنت فانها تأثم وان لم تمكن هي من الزنا وزنى بها لا اثم عليها وذكر ايضاً فى الاكراه اذا اكرهت على الزنا فمكنت من نفسها فلا اثم عليها وهذا كله اذا كان الاكراه بوعيد تلف۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۴۸ كتاب الاكراه۔ الباب الثانى)

اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کہنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اپنی جان جانے کے خوف سے کلمۂ کفر زبان سے نکال دے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو کیا ایسا آدمی کافر شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، البتہ اگر ایسا شخص کلمۂ کفر کہنے سے انکار کردے اور قتل کر دیا جائے تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وان اکرہ علی الکفر باللہ تعالیٰ اَوْسبّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم بقطع اوقتل اخص لہٗ ان یظھر ما امر بہٖ علیٰ لسانہ وقلبہ مطمئن بالایمان ...... ویوجر لوصبر لترکہ الاجراء المحرم۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۴،۱۳۵ کتاب الاکراہ)[۱]

حالتِ جبر میں زنا کا حکم

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! آجکل معاشرے کے حالات اخلاقی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، عیاشی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر ہے۔ اگر کسی شخص کو زنا کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان کو یقینی خطرہ ہو تو کیا اس کو بصورتِ مجبوری زنا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زنا کی حرمت شرعاً وعقلاً دونوں طرح ثابت ہے، کسی بھی صورت میں اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اگرچہ کرنے والے کی جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے بناء برصورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے زنا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں اور اگر وہ اس کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ مجرم ہوگا۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وکذٰلک الزنا فانہٗ لا یرخص ولا یباح للرجل

---

[۱] لما قال العلامۃ الشیخ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی المرخص بالاکراہ ھو کاجراء کلمۃ الکفر علی اللسان مع اطمینان القلب بالایمان او سبّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم او الصلاۃ الی الصلیب او اتلاف مال المسلم فھٰذہ الامور لا تباح ولکن یرخص فعلھا عند الاکراہ التام وان امتنع المستکرہ عن فعلھا حتی قتل کان مثاباً ثواب الجھاد۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۵ ص ۳۹۲ البحث الثالث اثر الاکراہ فی التصرفات)

ومثلہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۸ الباب الثانی فیما یحل للمکرہ۔

بالاکراہ مطلقاً ولو فعل اثم لان حرمۃ الزنا ثابتۃ عقلاً قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا۔ وکذا المرأۃ لا یرخص لہا ایضاً عندالاکراہ ولوکان تاماً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث اثرالاکراہ)[1]

کسی مسلمان کو حالتِ جبر میں قتل کرنا

سوال:۔ اگر کسی مسلمان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فلاں آدمی کو قتل کر دے نہیں تو تجھے قتل کر دیا جائے گا، اب اگر یہ شخص اپنی جان بچانے کی غرض سے کسی کو قتل کر دے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اکراہ اور جبر کی صورت میں اگرچہ بعض افعال مباح یا مرخص ہو جاتے ہیں مگر کسی مسلمان کو ناحق قتل اس حکم کے تحت داخل نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ایسے مجبور شخص کیلئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی موت کے خوف سے کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کر دے، اور اگر وہ اس فعل کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ گنہگار ہوگا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی الحرام الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ ھو قتل المسلم بغیر حق او قطع عضو من اعضائہ ولو نملۃ لان القتل حرام محض، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث، اثرالاکراہ)[2]

جبراً شراب پینے پر حد نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کو زبردستی یعنی مجبور کر کے شراب پلادی جائے اور حکومت اسے گرفتار کرے تو کیا شرعاً اس شخص پر حد نافذ ہوگی؟ یعنی اسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اکراہ کی صورت میں جب کسی شخص کو شراب پلادی جائے اور حکومت اُسے

---

[1] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو اکرہ علی الزنا لا یرخص لہ لان فیہ قتل النفس بضیاعہا لکنہ لا یحد استحساناً۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: النوع الذی ولا یباح ولا یرخص بالاکراہ اصلاً فھو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراہ ناقصاً او تاماً لان قتل المسلم بغیر حق لا یحتمل الاباحۃ بحال۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۷۷ کتاب الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۱۳۵ کتاب الاکراہ۔

گرفتار کرے تو شرعاً اس سے حد ساقط ہوگی۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: الحکم الذی یرجع الی الدنیا فی الانواع الثلاثۃ اما النوع الاول فالمکرہ علی الشرب لایجب علیہ الحد اذا کان الاکراہ تاماً لان الحد زاجرا عن المستقبل۔ (بدائع الصنائع جلد ۷ ص۱۷۸ کتاب الاکراہ) [۱]

جبراً زنا کی صورت میں حد کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے جبراً زنا کا ارتکاب کرایا جائے اور حکومت اسے گرفتار کرلے تو کیا شرعاً اس پر حد نافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر بالفرض یہ عورت ہو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں بھی زنا کرنا حرام ہے اور اس کی شرعاً اجازت نہیں، تاہم اگر اکراہ کی صورت تام ہو یعنی یقیناً اس میں جان جانے کا خطرہ ہو تو ارتکاب کی صورت میں بنابرقولِ مفتی بہ حد نافذ نہیں ہوگی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اگرچہ بعض ائمہ کرامؒ کے ہاں مرد پر حد جاری ہوگی۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فاذا اکرھت المرأۃ علی الزنا فلایقام علیھا الحد عند جمھور الفقھاء سواء کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً...... فاذا اکرہ الرجل علی الزنا...... قال الصاحبان: لایجب الحد حالۃ الاکراہ التام سواء کان الاکراہ من السلطان ام من غیرہ ورایھما ھوالراجح عند الحنفیۃ وھو رأی ابی حنیفۃ اخیراً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۴۰۱ المبحث الثالث، النوع الثالث) [۲]

---

[۱] لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: الاکراہ علی شرب الخمر اذا کان الاکراہ تاماً فلا یجب الحد علی المستکرہ علی شرب الخمر اتفاقاً لان الحد شرع زاجراً من الجنایۃ فی المستقبل والشرب المکرہ علیہ لیس جنایۃ بل ھو مباح۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۹ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۳ کتاب الاکراہ۔

[۲] لما فی الھندیۃ: اذا اکرہ الرجل علی الزنا بامرأۃ فزنی بھا کان ابوحنیفۃ اولاً یقول یجب علیہ الحد ثم رجع وقال لاحد علیہ وھو قولھما...... واما المرأۃ فلاحد علیھا ولکنھا تاثم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ۔

مجبورمزنیہ پر حدِزنا کا حکم

سوال :۔ اگر کسی عورت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر وہ زنا نہ کرائے گی تو اُسے اور اس کے مال کو ہلاک کر دیا جائے گا اور وہ اپنی جان اور مال کی ہلاکت کے خوف سے زنا جیسے قبیح عمل کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے تو کیا اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :۔ اکراہ اور جبر چاہے تام ہو یا ناقص دونوں عورت کے حق میں برابر ہیں ، اگر وہ جبر کی کسی بھی صورت میں زنا کا ارتکاب کر جائے تو شبہ کی وجہ سے حد زنا اس سے ساقط ہو جائے گی ۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما فی حق المرأۃ فلا فرق بین الاکراہ التام والناقص ویدرأ بالحد عنہا فی نوعی الاکراہ لانہ لم یوجد منہا فعل الزنا بل الموجود ھو التمکین وقد خرج من ان یکون دلیل الرضا بالاکراہ فیدرأ عنہا الحد ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۸۱ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! اگر مجبوری کی حالت (اکراہ) میں کسی کا مال ہلاک کر دیا جائے تو اُس مال کے تاوان کا ضامن کون ہوگا ؟ کیا جبر و اکراہ کرنے والا اُس مال کا ضمان دے گا یا ہلاک کرنے والا ضامن ہوگا ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اکراہ کی نوعیت بیان نہیں کی گئی ہے اسلئے دونوں صورتوں کا جواب دیا جاتا ہے :

(۱) اگر اکراہ تام ہو یعنی ہلاک کرنے والے کی جان یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ضمان مجبور کرنے والے کے ذمے ہوگا اس لیے کہ مال کو ہلاک کرنے والا آلہ کے مانند ہے ۔

(۲) اگر اکراہ ناقص ہو یعنی اس میں جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ وخوف نہ ہو تو

---

[1] لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی : فاذا اکرھت المرأۃ علی الزنا فلا یقام علیہا الحد عند جمہور الفقہاء سواءً کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۴۰۰ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ ۔الباب الثانی ۔

ضمان ہلاک کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: المکرہ علی اتلاف مال الغیر اذا تلفہ یجب الضمان علی المکرِہ دون المکرَہ اذا کان الاکراہ تامًّا لان المتلف ھو المکرِہ من حیث المعنی وانما المکرَہ بمنزلۃ الآلۃ علی معنی انہ مسلوب الاختیار...... وان کان الاکراہ ناقصا فالضمان علی المکرَہ لان الاکراہ الناقص لا یجعل المکرَہ آلۃ المکرِہ لانہ لا یسلب الاختیار اصلاً فکان الاتلاف من المکرَہ فکان الضمان علیہ ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراہ) لہ

جبراً کھلائے گئے مال کے ضمان کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کو اس بات پر مجبور کردیا جائے کہ وہ فلاں شخص کا مال (مرغی، بکری وغیرہ) کھاجائے ورنہ اس کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا اس مجبوری کے تحت اس نے دوسرے کا مال بغیر اس کی اجازت کے کھالیا کیونکہ نہ کھانے کی صورت میں جانی نقصان کا قوی امکان تھا۔ اب جس آدمی کا مال جبراً کھایا گیا ہے وہ کھانے والے سے اپنے مال کے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً مالکِ مال اس شخص سے تاوان وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ جبر کرنے والے سے مطالبہ کرے؟

الجواب:۔ اگرچہ جبر کی صورت میں مجبور شخص آلہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر کسی کا مال کھانے کی صورت میں اس شخص کا اپنا فعل بھی پایا جاتا ہے اس لیے اُس مال کا ضمان کھانے والے کے ذمے واجب الاداء ہے اور مالکِ مال اسی سے تاوان کا مطالبہ کرے گا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: کذلک لو اکرہ علی ان یأکل مال غیرہ فالضمان علیہ لان ھٰذا النوع من الفعل وھو الاکل مما لا یعمل علیہ الاکراہ

لہ لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فان کان الاکراہ تامًّا فالضمان علی المکرِہ عند الحنفیۃ والحنابلۃ فی الارجح عندھم وبعض الشافعیۃ لان المستکرَہ مسلوب الارادۃ وماھو الآلۃ للمکرِہ ولا ضمان علی الآلۃ اتفاقاً...... وان کان الاکراہ ناقصًا فالضمان علی المستکرَہ عند الحنفیۃ والمالکیۃ الخ

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۳۹۸ کتاب الاکراہ۔ المبحث الثالث)

لانه لا یتصور تحصیله بآلة غیرہ فکان طائعاً علیه فکان الضمان علیه ۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراہ) [1]

مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مہتمم صاحب جامعہ حقانیہ! الحمدللہ آنجناب کی دعاؤں اور مساعی سے افغانستان میں امارتِ اسلامی قائم ہے اور شرعی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے، اب ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ اگر کسی کے ساتھ جبراً (یعنی اسلحہ کی نوک پر) لواطت کی جائے اور وہ دونوں اس قبیح فعل کے کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو کیا حد دونوں پر جاری ہوگی یا صرف فاعل کو سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق مفعول چونکہ مجبورِ محض ہے اور اس کے ساتھ یہ قبیح عمل جبراً (اسلحہ دکھا کر) کیا گیا ہے اس لیے سزا صرف فاعل کو دی جائے گی مفعول اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ظاهر تعلیلهم أن حکم اللواطة کحکم المرأة لعدم الولد فترخص بالملجی الا ان یفرق بکونها اشد حرمة من الزنا لانها لم تبح بطریق ما ولکون قبحها عقلیا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ) [2]

---

[1] قال العلامة شیخ زادہ المشهور بداماد افندی رحمه الله: وان اکرہ علی اتلاف مال مسلم لاحدهما ای بالقتل او القطع رخص الاتلاف ای للمکرہ لان الاتلاف مال الغیر یستباح للضرورة کما فی المخمصة وقد ثبت والضمان علی المکرہ بالکسر لان المکرہ فی حق الاتلاف آلة للمکرہ فلم یلزم علیه الضمان وفیه اشارة الی الاحتراز عن الاکل والتکلم والوطء فان فیها لا یصلح آلة ۔
(مجمع الانهر ج ۴ ص۴۴ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامة محمد بن علی بن محمد الحصنی رحمه الله، وعلی هذا ظاهر تعلیلهم ان حکم اللواطة کحکم المرأة لعدم الولد فترخص بالملجئ الا ان یفرق بکونها اشد حرمة من الزنا لقبحها عقلاً ایضاً ۔
(الدر المنتقی فی ذیل مجمع الانهر ج ۴ ص۴۹ کتاب الاکراہ)

کتاب البیوع

يايها الذين امنوا لا
تاكلوا اموالكم بينكم
بالباطل الا ان تكون
تجارة عن تراضٍ منكم

باب شرائط البیع و ارکانہ

(بیع کے شرائط و ارکان وغیرہ)

خرید و فروخت میں طرفین کی رضامندی کا اعتبار

سوال:۔ آجکل مروّجہ طریقوں کے مطابق ناپ تول میں متفاوت آلات استعمال ہوتے ہیں، کپڑے کے دوکاندار عموماً میٹر پر کپڑا خرید کر گز پر بیچتے ہیں جو میٹر سے کم ہوتا ہے، اسی طرح عام دوکاندار، پختہ سیر سے (جو سو تولہ کا ہوتا ہے) چیز خرید کر کلوگرام (جو کہ ۸۵ تولہ ہوتا ہے) سے فروخت کرتے ہیں، بائع اور مشتری دونوں اس طریقہ ناپ تول سے آگاہ ہونے کے باوجود باہمی رضامندی سے معاملہ طے کر لیتے ہیں، کیا ناپ تول کا یہ طریقہ از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشتری سے ناپ تول کی حقیقت کو مخفی رکھنا دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے جو کہ ناجائز ہے لیکن جہاں کہیں بائع اور مشتری دونوں کی باہمی رضامندی سے معاملہ طے ہو جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۲۹) [1]

مکرہ کی بیع صحیح نہیں ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کی دھمکی دیکر بجبر و اکراہ اس سے ایک ٹریکٹر خرید اجبکہ بائع اس عقد پر بالکل راضی نہیں، تو کیا شرعاً یہ بیع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے خرید و فروخت میں بائع اور مشتری کی رضامندی اور

---

[1] قال العلامۃ الکاسانیؒ: اذا وجدت الاجازۃ من المالك فی الانتہاء وبین وجود الرضا فی التجارۃ عند العقد او بعدہ فیجب العمل باطلاقہا۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۹ کتاب البیوع، فصل: واما الذی یرجع الی ...) ومثلہ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۳۱ کتاب البیوع۔

طیبِ نفس کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا اگر کسی عقد میں بائع کی رضا مفقود ہو اور جبر و اکراہ سے بائع کو مجبور کر کے بیع کی گئی ہو تو یہ بیع صحیح نہیں۔

لما قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: ومنھا الرضا.......... فلا یصح بیع المکرہ اذا باع مکرھا وسلم مکرھا لعدم الرضا۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۷۶ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحۃ فانواع) [۱]

نابالغ کی خرید و فروخت میں اذنِ عُرفی کا اعتبار

سوال:۔ دیہاتوں میں بعض اوقات چھوٹے بچے اور بچیاں دوکان میں بیٹھ کر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرتے ہیں، گاہک کو پتہ نہیں چلتا کہ بچوں کا والد یا سرپرست اس پر راضی ہے یا نہیں؟ جبکہ بچوں کا باپ اس خرید و فروخت پر انہیں منع نہیں کرتا، تو کیا اس طرح بچوں سے اشیاء کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو بچے اور بچیاں نفع اور نقصان کی تمیز کر سکتے ہوں تو باپ کے اذن و اجازت سے ان کی بیع و شراء شرعاً نافذ ہوگی اور اذن صراحۃً اور دلالۃً دونوں طرح درست ہے، پس بچوں کے والدین کی خاموشی اور خرید و فروخت سے انہیں منع نہ کرنا بھی اذن اور اجازت میں داخل ہے لہٰذا ان سے خرید و فروخت مرخّص ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ثم الاذن کما یثبت بالصریح یثبت بالدلالۃ کما اذا رأی عبدہ یبیع ویشتری فسکت یصیر ماذوناً عندنا۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۶۲ کتاب الماذون) [۲]

---

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئٍ الا بطیب نفس منہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۲۵۵ کتاب البیوع، باب الغصب والعاریۃ)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج۴ ص۵۰۳ کتاب البیوع، مطلب فی بیع المکرہ والموقوف۔

[۲] قال فی الھندیۃ: اذا اذن لصبیٍ یعقل البیع والشراء یجوز یرید بہ انہ یعقل معنی البیع والشراء بان عرف ان البیع سالب للملک والشراء جالب عرف الغبن الیسیر من الفاحش لا تفس العبارۃ کذا فی الصغرٰی۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۱۱۱، الباب الثانی عشر فی الصبی والمعتوہ.... الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۸ ص۸۷ کتاب الماذون۔

مجنون کی خرید و فروخت

سوال :۔ ایک آدمی کا دماغی توازن درست نہیں (دیوانہ اور مجنون) ہے، آیا از روئے شریعت اس آدمی کا بیع وشراء جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ شریعتِ مطہرہ نے بیع وشراء کی صحت اور انعقاد کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ عقل کی درستگی کو بھی ضروری اور اہم شرط قرار دیا ہے، چونکہ دیوانہ اور مجنون شخص اچھے بُرے اور نفع ونقصان کی تمیز پر قادر نہیں ہوتا اس لیے مجنون اور دیوانے کی بیع منعقد نہ ہوگی ۔

لما قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : واما شرائطها فمنها ان یکون حرًا فلا تثبت ولایۃ العبد ومنها ان یکون عاقلاً فلا تثبت ولایۃ المجنون ۔
(بدائع الصنائع ج ۳ ص۱۵۳ کتاب البیوع ۔ فصل : واما شرائطها فانواع ۔ الخ) [1]

نرخ کے تعین سے قبل مبیعہ میں تصرف کرنا

سوال :۔ ہمارے علاقے میں زمیندار کپاس کی فصل تیار ہونے پر کارخانے میں بھیج دیتے ہیں ، کارخانہ والے مال تول کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور زمیندار کسی بھی وقت جاکر نرخ طے کر لیتے ہیں، آیا تجارت کا یہ طریقۂ کار درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر کارخانہ والے مال وصول کرکے بطور امانت اپنے پاس رکھیں یا باقاعدہ طور پر نرخ طے کرکے اور رقم کی ادائیگی کی تاریخ طے کرکے اس کو استعمال میں لائیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج یا فساد نہیں، لیکن اگر نرخ طے کرنے سے قبل ہی کارخانہ والے اس کپاس کو اپنے استعمال میں لائیں اور استعمال کے بعد نرخ مقرر کیا جائے تو یہ معاملہ (بیع) فاسد ہے، کپاس کے استعمال سے قبل نرخ مقرر کرنا لازمی ہے ۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ : منها ان یکون المبیع معلوماً وثمنه معلوماً علماً یمنع من المنازعۃ ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۵۶ کتاب البیوع ، فصل : واما شرائط الصحۃ فانواع) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : فشرائط العاقد اثنان العقل والعدد فلا ینعقد بیع مجنون وصبی لا یعقل ۔ (ردالمحتار ج ۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع ۔ مطلب شرائط البیع انواع اربعۃ)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص۲ کتاب البیوع ، الباب الاول فی تعریف البیع ... الخ ۔

[2] قال فی الھندیۃ : ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعۃ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۳ ص۳ کتاب البیوع ، الباب الاول فی تعریف البیع ، ومثلہٗ فی ردالمحتار ج۵ ص۵۰۵ کتاب البیوع مطلب شرائط البیع انواع اربعۃ) ۔

مالِ مسروقہ کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- ایک شخص نے کسی سے کچھ مال خریدا سودا کر لینے اور خریدنے کے بعد اُسے معلوم ہُوا کہ یہ مال چوری کا ہے، تو اب اس خریدے ہوئے مال کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ میں اس بات کی تصریح فرما دی گئی ہے کہ چوری کا مال اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، جس چیز کے متعلق قرائن سے غالب گمان ہو کہ یہ چوری کی ہے تو اس کے خریدنے سے گریز کیا جائے، لیکن اگر غلط فہمی سے خرید لی جائے اور بعد میں حقیقت واضح ہو تو وہ چیز اس کے اصل مالک کو واپس کی جائے، اور مشتری کو بائع سے اپنی رقم کے مطالبے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : لو ظهر غیر حلال ای مسروقًا او مغصوبًا یرجع علیه المشتري -(ردّ المحتار ج۴ ص۱۰۶ کتاب البیوع۔)[1]

کوئی چیز خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

سوال: جناب مفتی صاحب! میں ایک کار ڈیلر ہوں اور کاروں کا کاروبار کرتا ہوں پہلے گاہک سے رقم وصول کر لیتا ہوں بعد میں نئی کار کمپنی سے لے کر گاہک کے حوالے کرتا ہوں، اگر گاہک کو پسند آجائے تو خرید لیتا ہے ورنہ اپنی رقم واپس لے لیتا ہے اور بیع ختم ہو جاتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- متاخرین فقہاء نے صورتِ مذکورہ کے جواز پر تصریح کی ہے کیونکہ بیع کی نیت سے پیشگی رقم دینا بیع نہیں بلکہ بیع کا وعدہ ہے جبکہ حقیقی بیع مبیعہ وصول کرنے کے بعد متحقق ہوتی ہے، لہٰذا بیع تعاطی کی وجہ سے بیع منعقد ہو کر صحیح ہو جاتی ہے اور مشتری کو خیارِ رؤیت کا حق حاصل رہے گا۔ اس لیے کسی چیز کے خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

---

[1] قال ملك العلماء العلامة الکاسانی رحمه الله : ولو باع السارق المسروق من انسان او ملکه منه بوجهٍ من الوجوه فان کان قائمًا فلصاحبه ان یاخذه لانه عین ملکه وللماخوذ منه ان یرجع بالضمان علی السّارق ۔

(بدائع والصنائع ج۵ ص۸۵ کتاب البیوع)

ومثله، فی البحر الرائق ج۶ ص۶۸ کتاب البیوع، باب خیار العیب۔

جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ولو اعطاه الدراهم وجعل یاخذ منه کل یوم خمسة امناء ولم یقل فی الابتداء اشتریت منک یجوز وهذا حلال وان کان نیته وقت الشراء لانه بمجرد النیة لاینعقد وانما ینعقد البیع الآن بالتعاطی والآن المبیع معلوم ینعقد البیع صحیحاً۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۱۶ مطلب البیع بالتعاطی) [1]

مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کرنا

سوال:۔ میں نے ایک شخص کو ہاتھ کاٹنے کی شرط لگا کر کچھ درخت فروخت کئے ہیں لیکن اب وہ مجھے تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو درخت کاٹتا ہے اور نہ ہی سودا واپس کرتا ہے ایسی صورت میں از روئے شریعت مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ باقاعدہ بیع منعقد ہو کر ثمن (قیمت) دیدینے کے بعد مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اسی بناء پر صورت مذکورہ میں بائع کے مطالبہ پر مشتری کو درخت کاٹنے یا دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر مشتری اس کے باوجود کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو بائع قاضی یا اہلِ حل وعقد کے ذریعے اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ویقال للبائع اقلعها وسلم المبیع وکذا اذا کان فیها زرع لان ملک المشتری مشغول بملک البائع فکان علیه تفریغه وتسلیمه کما اذا کان فیه متاع۔ (الهدایة ج۳ ص۳۱ کتاب البیوع، فصل، ومن باع داراً... الخ) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: ویصح البیع بالتعاطی ...... وصورته ان یتفق علی الثمن ثم یاخذ المشتری المتاع ویذهب برضا صاحبه من غیر ان یدفع الثمن او ان یدفع المشتری الثمن للبائع ویذهب بدون قبض المبیع فان البیع لازم علی الصحیح۔

(شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز تحت المادة ۱۷۵ ص۷۹)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة للعلامة خالد الاتاسی، تحت المادة ۱۷۵ ج۱ ص۳۶۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: ویؤمر البائع بقطعهما وتسلیم المبیع عند وجوب تسلیمهما فلو لم ینقد الثمن لم یؤمر به خانیة ــ وقال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله: عند وجوب تسلیمهما) ای تسلیم الارض والشجر وذلک عند نقد المشتری الثمن فلو لم ینقد الثمن لم یؤمر به۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۵۴ مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصوداً۔ وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۳۰۳ کتاب البیوع۔

ٹیلیفون کے ذریعے عقدِ بیع کا حکم

سوال:۔ عصرِ حاضر میں عام طور پر تاجر حضرات دُور دراز کے شہروں اور بیرونِ ممالک سے ٹیلیفون کے ذریعے مال منگواتے ہیں، تو کیا خرید و فروخت کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے خرید و فروخت کے دوران ایجاب و قبول کے لیے اتحادِ مجلس کو ضروری قرار دیا ہے لیکن اتحاد عام ہے خواہ حقیقی ہو یا حکمی، حقیقی تو ظاہر ہے اور حکمی کی صورت یہ ہے کہ ایک مجلس میں ایجاب ہو جائے اور مشتری کو کسی مناسب طریقے سے (بذریعہ خط یا پیغام رساں کی معرفت) اطلاع دی جائے۔ موجودہ دَور میں فقہاء نے اِنسانی ضروریات اور حوائج (ٹیلیفون) کے ذریعے کیے گئے بیع و شراء اور طلاق وغیرہ کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا ہے، لہٰذا ٹیلیفون کے ذریعے اگر کسی چیز کے بارے میں باقاعدہ ایجاب و قبول ہو جائے تو یہ بیع شرعاً نافذ العمل ہوگی۔

لما قال الشیخ محمد کامل ابن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: سئل بعد صلوٰۃ الجمعۃ حضر خبر الشام فی التلغراف لبعض الثغور بانہ ثبت فی الشام رؤیۃ ھلال ..... فاجاب ان السلاطین المسلمین وضعوا التلغراف لتبلیغ الاخبار من البلاد القریبۃ والبعیدۃ فی مدۃ یسیرۃ جداً واقاموا لاعمالہ اشخاصاً مسلمین وانفقوا علیٰ ذلک اموالاً جسیمۃ واستغنوا بہ عن السعاۃ وارسال المکاتیب غالباً فصار قانوناً فی ذلک یخاطب بہ السلاطین بعضھم لبعضھم فی مھمّات الامور وتبعھم الناس علیٰ ذٰلک۔ (فتاویٰ الکاملیۃ ص۲۸۵ مطلب ھل یثبت رمضان بالتلغراف)[1]

بالغ بیٹے کی غیر موجودگی میں اس کی جائیداد فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص کا بالغ بیٹا ہے اور وہ کسی دور جگہ میں رہتا ہے، اس کی غیر موجودگی میں اور اجازت کے بغیر والد اس کی جائیداد فروخت کر دے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

---

[1] قال الدکتور الوھبۃ الزحیلی: البیع بالمراسلۃ او بواسطۃ رسول یصح اتفاقاً ویکون مجلس التعاقد ھو مجلس بلوغ الرسالۃ من العاقد الاول الی العاقد الثانی۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۵۰۳ ثانیاً البیوع بسبب الصّیغۃ)

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ہر انسان کو اپنی ملکیت میں خود مختار قرار دیا ہے جبکہ کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بالغ بیٹا حاضر نہ ہو تو والد کی طرف سے اس کی فروخت کردہ جائیداد بیع فضولی کے زمرہ میں آکر بیٹے کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: یبیع الاب عرض ابنہ الکبیر الغائب لا الحاضر اجماعاً لا عقارہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۹۳۱ مطلب فی نفقۃ قرابۃ غیر الولاد من الرحم المحرم) لہ

جائیداد کی خرید و فروخت پر کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال: ایک آدمی نے "جائیداد کی خرید و فروخت کا با اعتماد ادارہ" کے نام سے ایک دفتر کھول رکھا ہے جہاں وہ زمین کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور اس پر وہ جانبین (یعنی خریدنے اور فروخت کرنے والے) سے دو فیصد کمیشن لیتا ہے، تو کیا اس طرح پر جانبین سے کمیشن لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ایک ہی شخص کو بائع اور مشتری دونوں کی جانب سے وکالت کی ذمہ داری اپنانے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن جانبین کی طرف سے دلال بن سکتا ہے۔ وکیل اور دلال میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وکیل کو مبیعہ میں جائز تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، جبکہ دلال کی ذمہ داری مال خریدنے کی طرف ترغیب دلانا ہوتی ہے اور مبیعہ میں کسی قسم کے تصرف کا اس کو حق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ شخص چونکہ دلال کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس لیے اس کو جانبین سے مناسب کمیشن لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم ایسے ادارے کو پہلے سے مناسب کمیشن کی وضاحت کر دینا ضروری ہے تاکہ بعد میں جھگڑے اور کبیدہ خاطری کا سبب نہ بنے۔

لہ قال العلامۃ عبد العلی البرجندیؒ: یجوز للاب ان یبیع عروض ولد الغائب ابناً کان او بنتاً و تصرف فی ثمنہ اذا کان من جنس نفقتہ ولا یجوز ان یبیع عقارہ لذلک۔ (البرجندی ج ۳ ص ۸۹ کتاب البیوع)۔

ومثلہ فی آداب الاوصیاء علی ھامش جامع الفصولین ج ۲ ص ۱۲۳ فصل فی الاباق والکتابۃ والعتاق...الخ

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : فتجب الدلالة علی البائع او المشتری علیهما بحسب العرف ۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۶ کتاب البیوع) ؎۱

بیع کے نفاذ کا دار و مدار سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں

سوال :- ایک شخص نے کچھ زمین خریدی لیکن لاپرواہی سے حکومتی کاغذات میں اندراج (رجسٹری اور انتقال) کیے بغیر بطور زراعت اُسی آدمی کے حوالہ کر دی جس سے خریدی تھی، اب کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ آدمی اس زمین پر قابض ہو گیا ہے کہ یہ زمین سرکاری کاغذات میں میری ملکیت ہے، تو کیا مشتری بغیر سرکاری کاغذات میں اندراج کے اس زمین کا مالک ہے یا نہیں ؟

الجواب :- شریعت نے بیع کے نفاذ کو سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ نفاذِ بیع کے لیے جانبین کی رضامندی اور ایجاب و قبول کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا سرکاری کاغذات میں اندراج نہ ہونے کے باوجود مذکورہ زمین کے جملہ حقوق مشتری کو حاصل ہوں گے اور اس پر بائع کا قبضہ غصب اور ظلم شمار ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا ۔

لما قال فی مجلة الاحکام : البیع ینعقد بایجاب وقبول ۔

(مجلة الاحکام، المادة ۱۶۷، الفصل الاول فی ما یتعلق برکن البیع) ؎۲

حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کا حقِ فروخت بھی زوجہ ہی کو حاصل ہے

سوال :- ایک شخص نے عقدِ نکاح کے وقت اپنی منکوحہ کو حقِ مہر میں کچھ زمین دیدی، اب یہ شخص حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کو بلا اجازت زوجہ کے فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع خاوند کو

؎۱ قال المفتی محمد شفیع رحمہ اللہ : اگر بائع یعنی مالک کی اجازت سے خود دلال مال کو فروخت کرے تو اس کی اجرت اولاً دلالی بائع کے ذمے ہے اور اگر محض کوشش کرنے والا ہے اور معاملہ کرنے والا ہے فروخت کرنے والا خود بائع ہے تو عرف اور رواج کا اعتبار ہوگا، رواج کے موافق جس کے ذمے دلالی ہوگی اس سے لینا جائز ہوگا۔ (امداد المفتیین الشہیر بفتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۸۲۵ کتاب الاجارۃ) ـــ ومثلہٗ فی تالیفاتِ رشیدیہ ص۴۱۸ کتاب الاجارۃ ۔

؎۲ قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اما القول فالایجاب والقبول وهما رکنه ظاهرة ان الضمیر للایجاب والقبول ۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۸ کتاب البیع ۔

یہ حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب : تحفۂ مہر میں دی ہوئی زمین کے تمام تر مالکانہ حقوق بیوی کو حاصل ہو جاتے ہیں، بیوی کی اجازت کے بغیر شوہر کو تصرف کا حق نہیں ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اس زمین میں شوہر کو ملکیت یا ولایت کا حق حاصل نہیں لہٰذا بلا اجازتِ زوجہ (بیوی) کے بیع نافذ العمل نہ ہوگی۔

وفی الھندیۃ : واما شرائط النفاذ فنوعان الملک او الولایۃ والثانی ان لا یکون فی المبیع حق لغیر البائع ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۳ ص ۳ کتاب البیوع ، الباب الاوّل فی تعریف البیع ..... الخ) [1]

درخت عقدِ بیع میں زمین کے تابع ہیں

سوال : ایک شخص نے کسی سے ایک قطعہ اراضی خریدا لیکن زمین کے کنارے پر واقع درختوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بعد میں دونوں کے درمیان ان درختوں پر اختلاف پیدا ہوگیا، تو کیا یہ درخت از روئے شرع بائع کا حق ہے یا مشتری کا ؟

الجواب : زمین کے فروخت کرتے وقت اس میں مذکورہ اشیاء مثلاً درخت یا آبادی وغیرہ خود بخود عقدِ بیع میں شامل ہوں گے پس اس بناء پر صورتِ مسئولہ میں درخت بھی مشتری کا حق ہیں، البتہ اگر ان مذکورہ اشیاء کو عقدِ بیع کے وقت مستثنیٰ کر کے عقد کیا جائے تو اس وقت یہ اشیاء عقد میں شامل نہیں ہوں گی ۔

لما قال العلامہ ابن نجیم رحمہ اللہ : ویدخل البناء والشجر فی بیع الارض بلا ذکر لکونہ متصلاً بہا للقرار فیدخل تبعاً ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۹۴ کتاب البیع ، فصل : یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [2]

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحؒ : ومنہا وھو شرط انعقاد البیع للبایع ان یکون مملوکاً للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد ۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۴۷ کتاب البیوع ، فصل : واما الذی یرجع الی المعقود علیہ ۔ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب البیوع

[2] قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحؒ : ومن باع ارضاً دخل ما فیہا من النخل والشجر وان لم یسمہ لانہ متصل بہا للقرار فاشبہ البناء ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۲۰۵ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۴۸۵ کتاب البیوع ،

مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا

سوال:- ایک مسجد کی آمدنی اور فنڈ فی الحال مسجد کی ضروریات سے زیادہ ہے، اس سے تجارت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی آمدنی اور فنڈ دراصل مسجد کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن اگر فنڈ مسجد کی ضروریات اور استعمال سے زائد ہو تو اس رقم کو کسی قابلِ نفع تجارت میں لگا کر اس سے حاصل ہونے والے منافع کو مسجد کے فنڈ میں جمع کرتا ہو گا، اس طریقہ سے مسجد کی رقم سے تجارت کرنا جائز ہے بشرطیکہ چندہ دہندگان کی طرف سے کسی تجارت کی اجازت ہو۔

لما قال فی الهندية: متولی المسجد اذا اشترى بمال المسجد حانوتاً او داراً ثم باعها جاز اذا كانت له ولاية الشراء - (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۱۷ الباب الخامس فی ولاية الوقف وتصرف القيم) له

رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا

سوال:- رشوت کے ذریعہ حاصل شدہ مال سے مقبرہ کے لیے جگہ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حصولِ مال کے لیے جائز طریقہ اور مخاطب کی رضا کو شریعتِ مقدسہ نے ضروری قرار دیا ہے، رشوت چونکہ ناجائز ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے، لہٰذا اس کو اصل مالک یا ورثاء کو واپس کرنا ضروری ہے، رشوت کا مال چونکہ اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا، اس بناء پر رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا اور اس میں مسلمان میتوں کو دفنانا جائز نہیں، لہٰذا ایسے مال کے ورثاء یا اصل مالکوں کی موجودگی میں بغیر ان کی رضامندی کے اس رقم کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے ذمہ داری فارغ

له قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: متولی المسجد اذا اشترى بمال المسجد حانوتاً او داراً ثم باعها جاز اذا كانت له ولاية الشراء وفی التجنيس فی الفتاوى قال الامام حسام الدين هذا هو المختار وفی الخانية هو الصحيح -

(التاتارخانية ج۵ ص۸۶۲ كتاب الوقف، مسائل وقف المسجد وقيم المسجد)

ومثله فی السراجية علی هامش الخانية ج۳ ص۱۳۲ كتاب الوقف -

نہیں ہوگی ۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : لومات رجل وکسبہ من ثمن الباذق والظلم واخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولایأخذون منہ شیئًا وھوالاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والایتصدّق لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرّد ۔ (البحرالرائق ج ۸ ص۲۰۱ فصل فی البیع) ۱

کرایہ کی دوکان یامکان پر پیشگی رقم (پگڑی) لینے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض علاقوں میں دوکان یامکان کرایہ پر لیتے وقت پیشگی رقم دینا ضروری ہوتا ہے اور یہ رقم کرایہ کے علاوہ ہوتی ہے جوکہ عرف میں پگڑی کہلاتی ہے، کیا یہ رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بسااوقات ایک آدمی اپنا مکان یا دوکان ایک طویل مدت کے لیے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت بھی وصول کرتا ہے جو پگڑی کہلاتی ہے کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حق دار ہو جاتا ہے کہ ایک طویل مدت یا تاحیات کرایہ داری کو جاری رکھے، بعض حالات میں وہ اپنا یہ حق کسی دوسرے کرایہ دار کو منتقل کرکے اُس سے یہ رقم لے سکتا ہے، اور اگر اصلی مالک دوکان یامکان واپس لینا چاہے تو اُسے یہ رقم واپس کرنا ہوگی ۔

اس مروجہ پگڑی کے بارے میں علماءکرام نے عدم جواز کاقول فرمایا ہے، کیونکہ یہ نہ تو نزول عن الحق ہے اور نہ اُجرتِ معجلہ ہے بلکہ یہ حقِ مجرد کی فروخت ہے جوکہ ناجائز ہے اور یہ پیشگی کی رقم رشوت ہے جوکہ نص قطعی کی رُو سے حرام ہے، لہٰذا مروجہ پگڑی کی رسم شرع کے خلاف ہے ۔

البتہ اس یکمشت رقم کو ایک متعینہ مدت کی پیشگی اُجرت قرار دیا جائے اور متعینہ مدت تک

---

۱ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : فی البزازیۃ اخذ مورثہ رشوۃً اوظلمًا ان علم ذٰلک بعینہٖ لایحل لہ اخذہ والافلہ اخذہ حکمًا امافی الدیانۃ فیتصدق بہٖ بنیۃ ارضاء الخصماء ۔ (ردّ المحتار ج ۵ ص۹۹ مطلب فی من ورث مالاحرامًا ۔

ومثلہٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر ج۴ ص۲۰۵ کتاب الکراھیۃ ۔

کرایہ بھی ختم ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ اجارہ میں شمار ہوگا اور اجارہ کے تمام احکام اس پر جاری ہوکر اس قسم کی رقم کا لینا جائز ہے اور مروجہ رسم پگڑی ناجائز ہے۔

قال الدکتور وھبۃ الزحیلی: الحق المجرد او المحض ھو الذی لا یترك اثراً بالتنازل عنہ صلحاً او ابراءً فلا یجوز الاعتیاض عنہ کحق الولایۃ علی النفس والمال وحق الشفعۃ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۲۱ الحقوق المجردۃ وغیر المجردۃ۔) [1]

دوسرے کے سودے پر سودا کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کی کسی سے گھر خریدنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اسی دوران ایک تیسرے آدمی نے مداخلت کرکے زیادہ قیمت پر وہ مکان خرید لیا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بائع اور مشتری کی بات چیت کے دوران کسی اور کے لیے درمیان میں آکر قیمت بڑھانا نامناسب نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے تاہم باقاعدہ ایجاب وقبول کی صورت میں بیع تام اور صحیح ہے اگرچہ ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یبیع الرجل علی بیع اخیہ ولا یخطب علی خطبۃ اخیہ الا ان یاذن لہ وایضاً عن ابی ھریرۃ ان نبی علیہ السلام نہی ان یستام علی سوم اخیہ۔ (الصحیح لمسلم ج۲ ص۳ باب: تحریم بیع الرجل علی بیع اخیہ وسومہ علی سومہ) [2]

حرام مال سے خرید وفروخت کرنا

سوال:۔ رشوت، سود، جوا اور دیگر حرام طریقوں سے حاصل کی ہوئی رقم سے خرید وفروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع)

[2] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النجش وعن السوم علی سوم غیرہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۶۹ فصل فیما یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۹۹ فصل فیما یکرہ۔

الجواب:۔ رشوت، سود، جوا اور دیگر حرام ذرائع سے حاصل شدہ رقم کا ذاتی ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اس سے فراغتِ ذمّہ کے لیے ضروری ہے کہ اگر اصل مالک زندہ ہوں تو ان کو واپس کرکے ذمہ فارغ کرے ورنہ فقراء اور محتاجوں پر اصل مالکان کی طرف سے صدقہ کردے ۔ اس بناء پر علم کے باوجود ان اشیاء کے عوض خرید و فروخت سے اجتناب ضروری ہے ۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : والحاصل ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیہم والّا فان علم عین الحرام لایحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ وان کان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا یعلم اربابہ ولا شیئ منہ بعینہ حل لہٗ حکماً والاحسن دیانۃ التنزہ عنہ۔
(رد المحتار ج۵/ ۹۹ مطلب فی من ورث مالاً حراماً) [1]

حکومت کی طرف سے روزمرہ استعمال کی اشیاء کے نرخ مقرر کرنا

سوال: بسا اوقات کسی چیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے جبکہ حکومت ایک حد مقرر کرکے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا دیتی ہے، کیا حکومت کے لیے اس قسم کی پابندی لگانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: شریعت کی رُو سے کسی چیز کی خرید و فروخت بائع اور مشتری کی آپس میں رضامندی پر موقوف ہے خواہ وہ قیمت زیادہ ہو یا کم، بعض اشیاء کی کوالٹی میں تفاوت کی وجہ سے اُن کے نرخوں میں بھی تفاوت آجاتا ہے، اسلئے حکومت کو شرعاً یہ حق نہیں کہ کسی چیز کے نرخ متعین کرکے پابندی لگائے کیونکہ اس قسم کی پابندیوں سے عوام پر تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں بھی لوگ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرکے عوام کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : لو مات رجل وکسبہ من ثمن الباذق والظلم او اخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولا یاخذون منہ شیئاً وھو الاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والّا یتصدق بہ لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذّر الرّد ۔
(البحر الرائق ج ۸ ص۲۰۱ فصل فی البیع ۔کتاب الکراھیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۴ ص۲۰۵ کتاب الکراھیۃ ۔

کم قیمت اشیاء مجبوراً مہنگے داموں خریدنا پڑتی ہیں جس سے ملک کی معیشت متاثر ہوسکتی ہے۔ تو اس صورتِ حال میں حکومت معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین سمجھدار لوگوں اور تاجروں کے مشورے سے اشیاء ضروریہ کی قیمتوں کا تعین کرکے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا سکتی ہے تاکہ عوام الناس پریشان نہ ہوں اور ملک کا سرمایہ دار طبقہ غریب لوگوں کی مجبوریوں ناجائز فائدہ نہ اٹھاسکے۔

قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا یسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمة تعدیا فاحشاً بمشورة اهل الرای۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۰۰ کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع)[1]

ڈالڈا گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ اگر ڈالڈا گھی میں اس طرح صفائی پیدا کر دی جائے کہ وہ بالکل دیسی گھی کی طرح نظر آتا ہو تو کیا اس کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصل میں دیسی اور ڈالڈا گھی کی قیمتوں میں کافی فرق ہوتا ہے؟

الجواب:۔ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی سے ایسے گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر ڈالڈا گھی کو دھوکہ اور فریب سے دیسی گھی ظاہر کرکے فروخت کیا جائے تو یہ تذویر اور تلبیس کے مترادف ہوکر ناجائز رہے گا۔

لما جاء فی الحدیث: عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر۔

(صحیح مسلم ج۲ ص۲ کتاب البیوع۔ باب بطلان الحصاۃ۔ الخ)[2]

---

[1] قال العلامة عبد الله بن محمود الموصلیؒ: ولا ینبغی للسلطان ان یسعر علی الناس لما بینا قال الا ان یتعدی ارباب الطعام تعدیا فاحشا فی القیمة فلا بأس بذلك بمشورة اهل الخبرة به لأن فیه صیانة حقوق المسلمین عن الضیاع۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۴ ص۱۶۱ کتاب الکراهیة، فصل فی الاحتکار)

[2] وفی الهندیة: رجل اراد ان یبیع السلعة المعیبة وهو یعلم یجب ان یبینها۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۲۱۰ الباب العشرون فی البیاعات المکروهة والارباح الفاسدة)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۱۰۳ مطلب احکام نقصان المبیع فاسداً۔

زیادہ منافع کیلئے ذخیرہ اندوزی کرنا

سوال:۔ گاؤں یا شہر کی ضرورت کے باوجود ایک شخص غلہ خرید کر ذخیرہ کر لیتا ہے تاکہ مناسب وقت پر فروخت کر کے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تنگی اور عسرت کے دنوں میں غلہ خرید کر مصنوعی گرانی پیدا کرنے کے لیے ذخیرہ کرنا احتکار ہے جو شرعاً حرام ہے، تاہم اگر عوام الناس کی ضروریات کھلی منڈی میں آسانی سے پوری ہوتی ہوں تو پھر کسی چیز کو زیادہ منافع کی خاطر مؤخر کرنا جائز ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجالب مرزوق والمحتکر ملعون۔ (ابن ماجہ ص۱۵۶ باب الحکرہ) [1]

پنشن کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

سوال:۔ آجکل ملازمت کے اختتام (ریٹائرمنٹ) پر سرکاری ملازمین کو حکومت کی طرف سے پنشن کے نام پر کچھ وظیفہ دیا جاتا ہے، اس وظیفے کا کچھ حصہ دورانِ ملازمت ملازم کی تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے اور کچھ گورنمنٹ اپنی طرف سے ملاتی ہے، اس طرح یہ وظیفہ ریٹائر ہونے والے کو حکومت سے رفتہ رفتہ ملتا رہتا ہے، تو اگر اس وظیفہ کو فروخت کر کے یکمشت نقد رقم لے لی جائے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ وظیفہ درحقیقت دورانِ ملازمت محنت اور خدمت کے صلہ میں بطور اعزاز و اکرام کے ملازمت سے ریٹائر ہونے والے کو حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے جس میں بعض حصہ عطاءِ سلطانی اور بعض اپنی محنت کا حصہ ہوتا ہے، اس کی فروخت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کرنا ہے اور ایک اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، تو حکومت کے علاوہ کسی اور پر فروخت کرنا چند خرابیوں کی وجہ سے مشروع نہیں کیونکہ اس میں اُس رقم کو فروخت کیا جاتا ہے جو کہ ابھی اُس کے قبضے میں آئی ہی نہیں، اسلئے

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ویکرہ الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبھائم اذا کان ذٰلک فی بلدٍ یضر الاحتکار باھلہ وکذٰلک التلقی فاما اذا کان لا یضر فلا بأس بہ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۷۲ کتاب الکراھیۃ، فصل فی البیع)
ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان۔

غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اسی لیے فقہاء کی عبارات اور احادیثِ نبوی میں اس قسم کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ثمنین کا آپس میں بیع کی وجہ سے دست بدست اور مثل بمثل ہونا ضروری ہے، جو کہ یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا ان نقصانات اور خرابیوں کی وجہ سے اس (پنشن) کی بیع جائز نہیں۔ یہاں تک گورنمنٹ پر فروخت کرنا ہے تو یہ درحقیقت بیع نہیں بلکہ عطاءِ مؤجل کو معجل بنانا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت نے جو وظیفہ قسط وار حیثیت سے مقرر کیا تھا اب اس زیادہ وظیفہ کو نسبتاً کم کر کے یکمشت لیا جا رہا ہے۔ یعنی پہلی صورت میں تاجیل تھی اور اس میں یکبارگی حاصل کرنا ہے جس میں شرعی طور پر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبیع الدّین لایجوز ولو باعہ من المدیون اَو وَھبہ جاز۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۱۴ - القول فی الدّین) ؎۱

بیع میں اجل مجہول سے بیع فاسد ہو جاتی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کے ساتھ معاملہ طے کیا کہ مجھ سے کچھ رقم لے لے اور اس کے بدلے آئندہ گندم کے موسم میں جو نرخ ہوگا اس کے مطابق مجھے گندم دے دینا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی معاملہ میں وقت کا تعین کرنا ضروری ہے، وقت کا تعین کیے بغیر معاملہ طے کرنا مفضی الی النزاع ہوتا ہے اس لیے شرعاً ایسے معاملات فاسد قرار دیئے جاتے ہیں۔ مذکورہ معاملہ بھی اسی قسم کا ہے، خواہ اسے بیع مطلق قرار دیا جائے یا بیع سلم، البتہ اگر یہ معاملہ قرض کا ہو تو پھر شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة ظفر احمد عثمانیؒ: وقد اجمعوا علیٰ فساد السلم الیٰ اجل مجھول ففساد البیع کذٰلک اَولیٰ کما مر۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۵ ابواب البیع - دلیل فساد البیع الیٰ اجل مجھول) ؎۲

؎۱ قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیع ھٰذہ الدیون من غیر من علیہ والشراء بھا من غیر من علیہ فینظران اضاف البیع والشراء الی الدین لم یجز۔ اھ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۸۲ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحة فانواع)

؎۲ قال العلامة ابن عابدینؒ: رجل باع شیئاً بیعاً جائزاً اوانحرج الثمن الی الحصاد والدیاس قال مفید البیع فی قول ابی حنیفة۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶ کتاب البیوع) ومثلہ فی شرح الوقایة ج۳ ص۶ کتاب البیوع۔

بغیر قیمت طے کی ہوئی بیع وشراء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بغیر قیمت طے کئے مکئی کی کچھ گڈّیاں کسی پر فروخت کر دیں اور یہ کہا کہ ان کا سائز عام گڈی سے زیادہ ہے، لیکن چار مہینے کے بعد خریدار نے لینے سے انکار کر دیا، شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بیع وشراء کرتے وقت قیمت مقرر کرنا ضروری ہے، قیمت کا تعین کئے بغیر معاملہ فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا مذکورہ معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے اس لیے یہ بیع فاسد ہے، دونوں کو چاہیئے کہ اس معاملے کو دوبارہ طے کریں۔

کما فی السنن الکبرٰی مع الجوھر النقی ج ۶ ص۲۴ تحت لا یجوز السلف حتّٰی یکون بثمن معلوم الخ[1]

قبول کا ایجاب کے مطابق ہونا ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی اپنے جملہ مال کو یکمشت فروخت کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرا آدمی وہ مال ادھار لینے کا خواہشمند ہے اور مشتری بائع سے بات بھی کر جاتا ہے مگر بائع اس پر راضی نہیں، تو کیا اس سے بیع تام ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ مشتری بائع کے ایجاب کے مطابق جواب دے یعنی بائع جتنا مال فروخت کرنا چاہتا ہو اتنے مال کے مطابق جواب دے، اگر مشتری بائع کے ایجاب سے زیادہ یا کم لینا چاہتا ہو تو وہ بائع کی رضامندی پر موقوف ہے، اگر وہ اجازت دے تو ٹھیک ورنہ بیع تام نہیں ہو گی۔

لما فی مجلۃ الاحکام: اذا اوجب احد العاقدین ببیع شیئ بشیئ یلزم لصحۃ العقد قبول العاقد الآخر علی الوجہ المطابق للایجاب ولیس لہٗ تبعیض الثمن او الثمن وتفریقھما۔ (شرح المجلۃ الاحکام لرستم باز ص۸۱ المادۃ ۱۷۷ الفصل الثانی فی بیان لزوم موافقۃ القبول والایجاب)

---

[1] قال ابن الھمام رحمہ اللّٰہ: لقولہ علیہ السلام فی کیل معلوم ووزن معلوم الٰی اجل معلوم۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۲۶۲ باب السلم۔
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۵۸ کتاب البیوع۔

باب مایجوز بیعه وما لا یجوز

(جائز اور ناجائز بیع کے مسائل و احکام)

شراب کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ اسلام میں شراب کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟

الجواب : اسلام میں شراب بنص قطعی ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ اس عمل کو شیطانی عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ : اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۹۰) اس لیے شراب کی خرید و فروخت حرام بلکہ بیع باطل ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

وفی الهندیة : فالباطل ما لم یکن محله مالاً متقوماً کما لو اشتری خمراً او خنزیراً او صیداً الحرم ... الخ ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۴۶ کتاب البیوع ، الباب الحادی عشر فی احکام البیع لغیر الجائز) لہ

شراب کی آمدنی کے عوض اشیاء فروخت کرنا

سوال :۔ ایک شخص جو کپڑے کا کاروبار کرتا ہے، اگر اس کو کسی گاہک کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ شراب کی آمدنی کے عوض کپڑا خرید رہا ہے تو اس گاہک پر کپڑا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ مسلمان کے لیے شراب فروشی کو ذریعۂ آمدن بنانا حرام اور ناجائز ہے اور نہ ہی اس آمدنی کے عوض دیگر اشیاء فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ شراب کی فروخت کے عوض آیا ہوا مال مالِ غیر ہے مسلمان اُس کا مالک نہیں بن سکتا۔

لِمَا جَآءَ فِی الْحَدِیْث : ابو حنیفة عن محمد بن قیس الهمدانی عن ابی عامر الثقفی انه

لہ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : الباطل مالا یجوز بحال وله صور منها بیع الدم والخمر والخنزیر ۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۳۹ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامه)
ومِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۵۳ کتاب البیوع باب البیع الفاسد ۔

كان يهدى للنبي صلى الله عليه وسلم رواية مّن خمرٍ..... فقال رسول عليه السلام يا ابا عامر انّ الله تعالىٰ قد حرم الخمر فلا حاجة لنا فى خمرك قال خذ ها فبعها فاستعن بثمنها على حاجتك فقال يا ابا عامر انّ الله تعالىٰ قد حرم شربها و بيعها و اكل ثمنها
(المسند للامام الاعظم ص۳۷۳ باب حرمة ثمن حمر) [1]

دارالحرب میں شراب فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ دارالحرب میں مسلمان کے لیے کفار پر شراب فروختگی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ دارالحرب میں غیر مسلموں کا مال بلا غدر و دھوکہ ان کی خوشی سے جس طرح بھی لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں، لہٰذا ان کا مال مباح ہو کر عقود فاسدہ سے حاصل کرنا اور شراب کے عوض لینا جائز رہے گا، تاہم نصوص کی اطلاق کو دیکھ کر عقود فاسدہ اور شراب فروشی سے اجتناب افضل ہے۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ:۔ ولا بين الحربي والمسلم ثمة ای لا ربوا بينهما فى دارالحرب عندهما خلافاً لابى يوسفؒ وفى البناية وكذا اذا باع خمراً او خنزيراً او ميتةً او قامرهم واخذ المال كل ذلك يحل له۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربا) [2]

شراب ملی ہوئی اشیاء کی خرید و فروخت

سوال: شراب ملی ہوئی اشیاء مثلاً ادویات وغیرہ کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اسلام میں شراب چونکہ حرام اور نجس ہے اس لیے اس سے کسی قسم کا فائدہ لینا جائز نہیں، جس چیز میں شراب شامل ہو جائے وہ چیز حرام اور ناپاک ہو جاتی ہے اگرچہ قلیل مقدار میں کیوں

---

[1] قال المرغينانى رحمہ اللہ:۔ واذا باع المسلم خمراً واخذ ثمنها وعليه دين فانه يكره لصاحب الدين ان ياخذ منه وان كان البايع نصرانياً لا بأس به۔ (الهداية ج۴ ص۴۶۸ كتاب الكراهية)
وَمِثْلُهٗ فى بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۸ كتاب الاستحسان۔

[2] وفى الهندية: دخل مسلم اوذمى دارالحرب بامانٍ اولغيره وعقد مع الحربى عقد الربوا..... اوباع منهم خمراً اوخنزيراً اوميتةً اودماً بمالٍ فذلك كله جائز عند الطرفين۔
(الفتاوى الهندية ج۳ ص۲۴۸ الفصل السادس فى الصرف فى دارالحرب)
وَمِثْلُهٗ فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۱۸۶ باب الربو۔

نہ ہو۔ اس بناء پر جن ادویات اور دیگر اشیاء میں یقیناً یا ظنِ غالب سے معلوم ہو کہ ان میں شراب کی آمیزش ہے اور علاج کسی متبادل دوائی سے ممکن ہو تو ان کی خرید و فروخت اور استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔

لما ورد فی الحدیث : فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم الخمر فلا حاجۃ لنا فی خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها علیٰ حاجتك فقال یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم شربها وبیعها واکل ثمنها ۔ (المسند للامام اعظم ص۳۲۳ کتاب البیوع) [1]

الکحل ملی ادویات کی تجارت کی شرعی حیثیت

سوال :۔ الکحل ملی ہوئی ادویات کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر ادویات میں ملایا گیا الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے کشید کیا گیا ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس دوا کا استعمال ضرورتاً جائز ہے گا بشرطیکہ حدِ سکر تک نہ پہنچا ہو، اور علاج کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے شیخینؒ کے مسلک پر عمل کرنا مرخص ہوگا، تاہم اگر الکحل انگور یا کھجور سے حاصل کیا گیا ہو تو ان دواؤں کا استعمال شدید ضرورت اور اضطرار کے علاوہ جائز نہیں ۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ الکحل دواؤں میں ملانے کے بعد اس کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں اس کی حقیقت ختم ہو کر ان ادویات کا استعمال بالاتفاق جائز ہو گا، لیکن یہ مسئلہ ماہرینِ فنِ طب کی مدد سے ہی حل ہو سکتا ہے ۔

لما قال العلامۃ المفتی تقی عثمانی :۔ وبهذا یتبین حکم الکحول المسکرۃ التی عمت بها البلویٰ الیوم فانها تستعمل فی کثیر من الادویۃ والعطور والمرکبات الاخریٰ فانها ان اتخذت من العنب او التمر فلا سبیل الیٰ حلتها او طهارتها وان اتخذت من غیرهما فالامر فیها سهل علیٰ مذهب ابی حنیفۃؒ ولا یحرم استعمالها للتداوی او لاغراض مباحۃ اخریٰ ما لم تبلغ حد الاسکار لانها انما تستعمل مرکبۃ مع المواد الاخریٰ ولا یحکم بنجاستها اخذ ا بقول ابی حنیفۃؒ ۔ وان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویۃ والعطور وغیرها لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیرہ ۔ (تکملہ فتح الملہم ج۳ ص۶۰۸ کتاب الاشربہ) ۴۴/۶

---

[1] قال محمد بن الحسن الشیبانیؒ : محمد عن یعقوب عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ قال الخمر حرام قلیلها وکثیرها ۔ (الجامع الصغیر ص۳۹۸ کتاب الاشربۃ ۔

منشّیات کی خرید و فروخت

سوال: افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن وغیرہ کی تجارت کا شریعتِ مقدسہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام ہیں لہٰذا حرام شے کی قیمت اور گناہ پر اعانت کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ ان اشیاء سے انسان کی دینی اور دنیوی بربادی لازم آتی ہے۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وصح بیع غیر الخمر لما مر ومفاده صحة بیع الحشیشة والافیون قلت وقد سئل عن بیع الحشیشة ھل یجوز فکتب لا یجوز فیحمل علیٰ انه مراده بعدم الجواز عدم الحل قاله المصنف۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج۶ ص۴۵۴ کتاب الاشربة)[1]

تمباکو کی خرید و فروخت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! تمباکو کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ تمباکو کا استعمال از روئے شرع ممنوع نہیں لہٰذا استعمال کے مرخّص ہونے کی بناء پر اس کی خرید و فروخت میں بھی کوئی قباحت نہیں جبکہ آجکل تمباکو فروشی ایک بہت بڑا ذریعہ معاش بن گیا ہے، غربت اور تنگی کے اس دور میں اس کا کاروبار کرنے میں کوئی شرعی جرم نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وبالجملة ان ثبت فی ھٰذا الدخان اضرار صرف خالٍ من المنافع فیجوز الافتاء بتحریمه ان لم یثبت انتفاعه فالاصل حله مع ان فی الافتاء بحله دفع الحرج عن المسلمین فان اکثرھم مبتلون بتناوله مع ان تحلیله ایسر من تحریمه وما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔ (تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج۲ ص۳۶۶ مسائل وفوائد شتیٰ الخ)[2]

---

[1] قال العلامة الحداد الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذٰلك کله حرام۔ (الجوھرة النیرة ج۲ ص۲۷ کتاب الاشربة۔)

ومِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۲۰۵ کتاب الاشربة۔

[2] قال العلامة ابوالحسنات عبدالحی لکھنویؒ: فی رسالته رفع الالتباس فی حکم تعاطی بشجرة التنباك اما بیعھا وشرائھا فیجوز لامکان الانتفاع بھا۔ (مجموعة الفتاویٰ ج۲ ص۱۲۷ کتاب البیع)

ومِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۶ ص۴۵۹ کتاب الاشربة۔

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی خرید وفروخت

سوال:۔ تلاوتِ قرآن مجید، دینی پروگرام اور خبریں وغیرہ سننے کی غرض سے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کا استعمال جائز امور میں ممکن ہے اس لیے ان کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں، تاہم یہ چیزیں کسی ایسے شخص کو دینا جس سے کسی خیر کی توقع نہ ہو بلکہ محض بے دینی کے امور میں استعمال کا یقین ہو تو تعاون علی المعصیت کے شبہ سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: قلت وافاد كلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريمًا والا فتنزيهًا (نهر) وعبارته وعرف بهذا انه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية به والكبش النطوح۔ (ردالمحتار ج۴ ص۲۶۸ باب البغاة ...الخ) [۱]

آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت

سوال:۔ باجا، ستار اور دیگر آلاتِ موسیقی کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موسیقی چونکہ اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، اس لیے وہ آلات جو محض موسیقی کے لیے استعمال ہوتے ہوں اور بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے ان سے موسیقی کا کام لیا جاتا ہو آلاتِ معاصی ہونے کی وجہ سے ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ اس میں اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے جواز کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ويكره تحريمًا بيع السلاح من اهل الفتنة لانه اعانة على المعصية...... قلت وافاد كلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريمًا والا فتنزيهًا نهر ونظيره كراهة بيع المعازف لان المعصية تقام بها۔ (ردالمحتار ج۴ ص۲۶۸ كتاب السير) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجيمؒ: ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه ومالا فلا ولذا قال انه لا يكره بيع الجارية المغنية والكبش النطوح۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۴۳ باب البغاة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدية ج۲ ص۱۵۳ كتاب الاجارة۔

[۲] قال العلامة ابن نجيمؒ: نظيره بيع المزامير يكره هنا ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه والا فلا۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۴۳ تبغيير يسير۔ آخر كتاب البغاة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقيح الفتاوى الحامدية ج۲ ص۱۵۳ كتاب الاجارة۔

گمراہ کن کتابوں کی تجارت کرنا

سوال:۔ آجکل بعض لوگ بے دینی، فحش گوئی، فرضی ناول شرک وبدعات اور دیگر جرائم پیشہ لوگوں کے حالات اور سوانح پر مشتمل کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، کیا یہ تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے مسلمانوں کو شرک وبدعت، فحش ناول اور لادینیت پھیلانے والی کتابوں کے مطالعہ سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دین سے دوری اور گمراہی کا سبب بنتی ہیں، لہٰذا ایسی کتابوں کے مطالعہ اور تجارت سے اجتناب ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ یہی تاجر لادینیت کا آلۂ کار اور معاون بن جاویں تاہم راسخ العلم علماء کے لیے جواب دہی کی نیت سے ایسی کتابوں کے مطالعہ کی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع کریں۔

لما قال العلامة محمود آلوسیؒ: واستدل بعضهم علی القول بان لهو الحدیث الکتب التی اشتریٰها النضر بن الحارث علیٰ حرمة مطالعة التواریخ الفرس القدیمة وسماع ما فیها وقرأته وفیه بحث ولا یخفیٰ ان فیها من الکذب ما فیها فالاشتغال بها لغیر غرض دینی خوض فی الباطل۔ (روح المعانی ج۲۰ ص۹۹ سورة المائدة) [1]

تعویذات کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض لوگ تعویذات کی خرید وفروخت کا دھندہ اپنائے ہوئے ہوتے ہیں اور لوگوں سے تعویذات کے پیسے وصول کرتے ہیں، کیا تعویذات کے عوض پیسے لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تعویذ چونکہ علاج ومعالجہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اس بناء پر جائز معاملات میں مشروع تعویذ کے عوض پیسے لینا اور دینا دونوں جائز ہیں۔ تاہم تعویذ فروشی کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا مناسب نہیں۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن ابی سعید الخدری ان ناساً من اصحاب النبیّ صلی الله علیه وسلم اتوا علیٰ حی من احیاء العرب فلم یقروهم فبینما هم اذ لدغ

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: اذا اصاب المسلمون الغنائم وکان فیما اصابوا مصحف فیه شیٔ من کتب الیهود والنصاریٰ۔۔۔۔ فانه لا ینبغی للامام ان یقسم ذٰلك فی غنائم المسلمین مخافة ان یقع فی سهم رجل من المسلمین۔۔۔۔ وبیعه من المشرکین مکروه۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج۵ ص۳۱۳ کتاب السیر۔ مسائل قسمة الغنائم)

سید اولئك هل معكم دواءٌ اوراق فقالوا نعم انكم لا تقرون ولا نفعل حتیٰ تجعلوا لنا جعلاً فجعلوا لهم قطيعاً من الشاة فجعلوا يقرء بام القرآن و يجمع بزاقه ويتفل فبرؤا فاتوا بالشاة فقالوا لا ناخذه حتى نسئال النبی عليه السلام فسئالوه فضحك وقال ما ادراك انها رقية خذوها واضربوا لی بسهم- (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۵۴ باب الرقی بفاتحة الکتاب ويذكر عن ابن عباس عن النبی صلی الله عليه وسلم) ؎

اخبارات کی خرید وفروخت

سوال :- اخبارات میں اکثر تصاویر ہوتی ہیں نیز ایسی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، کیا ایسے اخبارات کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اخبارات کی خرید وفروخت کا بنیادی مقصد ملکی اور غیر ملکی حالات وواقعات سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے، باقی رہا تصاویر کا مسئلہ تو اس کا گناہ بنانے والے پر ہر حال میں رہے گا۔ البتہ اگر اخبارات ورسائل وغیرہ شائع کرنے کا مقصد صرف فحاشی اور عریانی کو فروغ دینا ہو اور اس سے معاشرہ کے افراد کی عادات اور اخلاق متاثر ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں ان کی خرید وفروخت سے اجتناب ضروری ہوگا۔

لما قال علی بن سلطان القاری رحمه الله : قال اصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم .... واما اتخاذ المصور بحيوان فان كان معلقاً على حائطٍ سواء كان له ظل ام لا اوثوباً ملبوساً اوعمامة اونحو ذلك فهو حرام واما الوسادة ونحوها مما

؎ قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : ولا بأس بالمعاوضات اذاكتب فيها القرآن .... اختلف فی الاستشفاء بالقرآن بان يقرأ على المريض والملدوغ الفاتحة اويكتب فی ورق ويعلق عليه اوطستٍ ويغسل ويسقی وعن النبی عليه السلام انه كان يعوذ نفسه قال رضی الله عنه وعلى الجواز عمل الناس اليوم وبه وردت الآثار-

(ردالمحتار ج ۶ ص۳۶۴ فصلٌ فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المسلم للامام النووی ج ۲ ص۲۲۴ باب جواز اخذ الاجرة على الرقية۔

یمتھن فلیس بحرام۔ (المرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج۸ ص۲۶۶ باب التصاویر) سلہ

دوسرے ممالک سے مال خرید کر پہنچنے سے پہلے فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے مال منگوا کر پہنچنے سے قبل ہی فروخت کر دیتے ہیں کیونکہ وہ مشتری کا کے نام پر خریدا ہوا مالِ تجارت مشتری کی ملک تصور کرتے ہیں، لہٰذا قبل القبض ان اشیاء کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: باقاعدہ طور پر قبضہ سے قبل مال فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں لیکن آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے جو اشیاء منگواتے ہیں تو ان کے پہنچنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے جس میں بازار کی مندی کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہک کم ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے، لہٰذا ایسے مال کو فروخت کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

(۱) مال منگوانے والا گاہک کے ساتھ بیع کرنے کی بجائے بیع کا وعدہ کرلے کہ مال پہنچتے ہی آپ کے ہاتھوں اتنے داموں کے عوض فروخت کروں گا لہٰذا مال پہنچنے پر بیع درست ہوگی، البتہ اس صورت میں خلاف ورزی اگرچہ وعدہ خلافی ضرور ہے لیکن جانبین میں سے کسی ایک کے انکار کی صورت میں دوسرے کو بیع پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنالیا جائے جو مال پہنچانے کا کاروبار کرتی ہو اور مال پہنچانے کا کرایہ چونکہ خریدار پہ ہوتا ہے اس لیے اس خریدار کے اذن اور اجازت سے بائع جس کو بھی حوالہ کر دے وہ مشتری کی ملک اور قبضہ تصور ہوگا، اگرچہ خریدار اور مشتری اس شخص یا مال بردار کمپنی کا تعین بھی نہ کرے، اس بنا پر جب بھی مال اُس شخص یا مال بردار کمپنی کی تحویل میں آجائے تو یہ خریدار اور مشتری کی ملک تصور ہو کر بیع

لہ قال العلامۃ فخر الدین الشھیر بقاضی خان: واذا سأل الرجل غیرہ الاخبار المحدثۃ فی البلد قال بعضھم یکرہ الاخبار والاستخبار وقال بعضھم لا یکرہ الاستخبار ویکرہ الاخبار والصحیح انہ لا بأس بالاخبار ایضاً لیکون عالماً بالمصالح۔ (خانیہ علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۴۲۵)
ومثلہ فی الصحیح البخاری ج۱ ص۲۸۳ باب کم یجوز الخیار۔

جائز رہے گی۔

مندرجہ بالا دو صورتوں کے علاوہ قبل القبض مال فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: رجل اشتری عبداً ولم یقبضه فامره ان یهبه من فلان ففعل البائع ذٰلك ودفعه الی الموهوب له جازت الهبة و صار المشتری قابضاً وكذا لو امر البائع ان یواجره فلاناً معیناً او غیر معین ففعل جاز وصار المستاجر قابضاً للمشتری اولاً ثم یصیر قابضاً لنفسه والاجر الذی یاخذه البائع من المستاجر یحسبه من الثمن ان كان من جنسه۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱ باب المرابحة والتولیة) ۱؎

کتے کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کتے کی خرید وفروخت از روئے شرع جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جائز فائدے اور نفع کے لیے کتے کی خرید وفروخت کی اجازت دی ہے مثلاً شکار یا چوکیداری یا فصل وغیرہ کی حفاظت کی خاطر کتا خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً مرخص ہے۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ابو حنیفة عن الهیثم عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال رخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثمن كلب الصید۔

(المسند للامام الاعظم ص۳۱۹ باب الرخصة فی ثمن كلب الصید) ۲؎

۱؎ لما قال فی الهندیة: اذا قال المشتری للبائع ابعث الی ابنی واستاجر البائع رجلاً یحمله الی ابنه فهٰذا لیس بقبض والاجر علی البائع الا ان یقول استاجر علیّ من یحمله فقبض الاجیر یكون قبض المشتری ان صدقه انه استاجر ودفع الیه وان انكر استئجاره والدفع الیه فالقول قوله كذا فی التاتارخانیة۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۹ الباب الرابع فی حبس المبیع بالثمن)

ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۱۴۹ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض۔

۲؎ قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: یجوز بیع الكلب ...... ولانه ینتفع به حراسةً واصطیاداً فكان مالاً فیجوز بیعه۔ (الهدایة ج۳ ص۱۰۳ مسائل منثورة، كتاب البیوع)

ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۲۲۷ باب المتفرقات، كتاب البیوع۔

پرندوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ پرندوں کو پکڑ کر فروخت کرتے ہیں، مثلاً چیل، باز، تیتر اور بٹیر وغیرہ پرندوں کو پکڑ کر خوب نفع کماتے ہیں، تو کیا ازروئے شریعت یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے پرندوں کے شکار اور پکڑنے کو جائز قرار دیا ہے اور ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دی ہے، اس معاملہ میں فریقین کی رضامندی سے جو بھی قیمت متعین کی جائے شرعاً مرخص ہوگی، تاہم آپس میں لڑانے کے لیے خرید و فروخت سے اجتناب کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وصح بيع الكلب..... وكذا الطيور التي الجوارح والفهد والبازي يقبلان التعليم فيجوز بيعها على كل حالٍ۔
(رد المحتار ج ۵ ص۲۲۷ باب المتفرقات، کتاب البيوع) [۱]

خنزیر کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اسلام میں خنزیر کی خرید و فروخت کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے چونکہ خنزیر کو نجس العین اور حرام قرار دیا ہے اور خنزیر سے ہر قسم کے انتفاع اور اس کی خرید و فروخت کو بھی ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، اس لیے کسی مسلمان کیلئے اسلامی نقطۂ نظر سے خنزیر کو ذریعۂ آمدن بنانا قطعاً زیبا نہیں، یہی وجہ ہے کہ شرعاً خنزیر جب عقد میں خواہ مبیعہ ہو یا ثمن ہو تو عقد باطل ہے لہٰذا خنزیر کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ تاہم جب اسلامی ملک میں ذمی رہائش پذیر ہوں تو اُن کو آپس میں اس کی خرید و فروخت کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامة مرغيناني : إذا كان احد العوضين اوكلاهما محرّمًا فالبيع فاسد كالبيع بالميتة والدم والخمر والخنزير۔ (الهداية ج۳ ص۵۳ باب البيع الفاسد) [۲]

---

[۱] قال في الهندية : وكذا بيع السنور وسباع الوحش والطير جائز عندنا معلمًا كان اولم يكن كذا في الفتاوى قاضيخان۔ (الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۱۴ الفصل الرابع في بيع الحيوانات)
ومثلهٗ في البرجندي ج۳ ص۱۴ کتاب البيوع۔

[۲] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيدؒ : ولو باع الخمر والخنزير كان باطلاً باعها من مسلم اوملسم۔ (خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۴ كتاب البيوع الباب الرابع في البيع الفاسد واحكامه)
ومثلهٗ في الهندية ج۳ ص۱۲۶ كتاب البيوع الباب الحادي عشر في احكام البيع الغير الجائز۔

مردار جانور کی کھال رنگنے کے بعد فروخت کرنا

سوال: مرے ہوئے غیر مذبوح جانور کی کھال نکال کر باقاعدہ طور پر رنگنے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے غیر مذبوح جانور سے انتفاع ممنوع قرار دیا ہے لیکن اس کی کھال کو باقاعدہ رنگنے یا خشک کرنے کے بعد فروخت کرنا جائز قرار دیا ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عبد اللہ بن عباسؓ اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بشاۃ فقال ھلا استمتعتم باھابھا قالوا انھا میتۃ قال انما حرّم اکلھا۔

(رواہ البخاری ج۱ ص۲۹۶ باب جلود المیتۃ قبل ان تدبغ) [۱]

مُردار جانور کی ہڈیاں فروخت کرنا

سوال: مردار جانور جس کے کھانے سے شریعت نے منع فرمایا ہے، تو کیا ان کی ہڈیوں کو جمع کرکے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں جبکہ اس جانور کو باقاعدہ طور پر ذبح نہیں کیا گیا ہو؟

الجواب: خنزیر کے علاوہ دیگر مردار جانوروں کی کھال رنگنے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں لیکن ہڈی، بال اور اُون کی خرید و فروخت شرعاً مرخص ہے کیونکہ کسی جانور کی موت کی وجہ سے اس کی یہ اشیاء ناپاک نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اگر جانور باقاعدہ مذبوح نہ بھی ہو تو اس کی ہڈی، بال اور اُون کی فروخت جائز اور مرخص ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع عظام المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا وشعرھا ووبرھا والانتفاع بذٰلک کلہ لانھا طاھرۃ لایحلھا الموت لعدم الحیاۃ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل ان تدبغ یعنی لا یجوز بیعہ وبعدہ یباع وینتفع بہ ...... یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۵۵ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد۔

[۲] قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل الدباغ وبعدہ یباع وینتفع بہ کعظم المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا ووبرھا یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ کما یجوز بیع عظم المیتۃ۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۲ ص۱۳۳ کتاب البیع فصل فی البیع الباطل۔

گندگی کھانے والے جانوروں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- بعض جانور مثلاً مرغی اور بکری وغیرہ گندگی اور بدبودار اشیاء کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر ایسی اشیاء کھانے کی وجہ سے ان سے بدبو محسوس ہوتی ہو تو ایسی حالت میں ان کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مذکورہ جانور گندگی کھانے کی وجہ سے بدبودار ہوگئے ہوں تو ایسی صورت میں ان کا کھانا اور خرید وفروخت مکروہ ہے تاہم اگر ان کو گندگی کھانے سے روک لیا جائے اور بدبو زائل ہونے تک بند رکھا جائے تو پھر ان کے کھانے اور خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: الجلالة التی تأکل العذرة کره لحمها وتحبس الجلالة حتی یذهب نتن لحمها وفی المنتقی الجلالة المکروهة التی اذا قربت وجدت منها رائحة فلا تؤکل ولا یشرب لبنها ولا یعمل علیها وتلك حالها ویکره بیعها وهبتها وتلك حالها - (رد المحتار ج۶ ص۳۴۰ کتاب الحظر والاباحة)[1]

ریچھ کو ذبح کرکے روغن نکال کر فروخت کرنا

سوال:- ریچھ کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد اس کے گوشت سے روغن اور تیل نکالا جاتا ہے تاکہ جانوروں کو کھلا کر ان کی قوت بڑھائی جاسکے، تو کیا اس طریقہ سے روغن نکال کر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- باقاعدہ ذبح شرعی سے حرام جانور کا گوشت اور کھال وغیرہ پاک ہوجاتے ہیں، اس بناء پر اس کے گوشت وغیرہ سے روغن یا تیل نکال کر انسانوں کی خوراک کے علاوہ مویشیوں اور دیگر ضروریات کے لیے استعمال کرنا جائز ہے ایسی خرید وفروخت بھی جائز ہے

لما قال فی الهندیة: واما حکمها فطهارة المذبوح وحل اکله من الماکول

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ولا تؤکل الجلالة ولا یشرب لبنها لانه علیه السلام نهی عن اکلها وشرب لبنها والجلالة التی تعتاد اکل الجیف ولا تخلط فیکون لحمها منتنا ولو حبست حتی یزول النتن حلت - (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۲ فصل فی الاکل والشرب)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۳۰۸ الفصل الثانی عشر فی الاجارات والمزارعات -

وطہارۃ غیر الماکول للانتفاع لا لجہۃ الاکل کذا فی محیط السرخسی۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج۵ ص۲۸۲ کتاب المعاملۃ۔الباب الثانی فی المتفرقات) [۱]

قبل الدباغ مردار جانور کی کھال کی فروخت کا حکم

سوال:۔بعض علاقوں میں مردار جانوروں کی کھال اتار کر رنگنے سے قبل ہی فروخت کر دی جاتی ہے، کیا ایسی کھال کا استعمال وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔مردار جانور کے اجزاء سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً ممنوع ہے، لہٰذا اُس کی کھال اتار کر دباغت (رنگنے) سے قبل فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، تاہم کھال کو باقاعدہ دباغت کے بعد استعمال کرنے اور فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا بیع جلود المیتۃ قبل ان تدبغ لانہ غیر منتفع بہ ولا بأس ببیعہا والانتفاع بہا بعد الدباغ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) [۲]

جاندار اشیاء کے مجسموں کی خرید وفروخت

سوال:۔اگر کھلونوں کو مرغ، بطخ، کبوتر اور دیگر جانوروں اور پرندوں کی شکل پر بنایا جائے تو کیا ایسے کھلونوں کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔بلاضرورت تصویر کشی ازروئے شرع ممنوع عمل ہے اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانوروں اور پرندوں کی اشکال والے کھلونوں کی خرید وفروخت سے اجتناب کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک موقع پر اس سے منع کرتے ہوئے یوں فرمایا۔

لما ورد فی الحدیث: فقال ابن عباسؓ لا احدثک الا ما سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] قال فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: فجاز بیعہ ولحوم السباع وشحومھا وجلودھا بعد الزکاۃ کجلود المیتۃ بعد الدباغ حتی یجوز بیعھا والانتفاع بھا فی غیر الاکل لطھارتہ بالزکاۃ۔
(تبیین الحقائق ج۴ ص۵۰ باب البیع الفاسد)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۲ کتاب الاضحیۃ۔

[۲] قال ابن نجیم رحمہ اللہ: (وجلد المیتۃ قبل الدبغ) ای لم یجز بیعہ لانہ غیر منتفع بہ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۱ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۱۱۵ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی بیع المحرم الصید... الخ

يقول سمعته يقول من صور صورة فان الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابداً فربا الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه فقال ويحك ان ابيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر كل شئ ليس فيه روح ۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۶ باب بیع التصاویر التی لیس فیھا روح وما یکرہ من ذلک) [۱]

مُرغیوں کو وزن کر کے فروخت کرنا

سوال:۔ زندہ مُرغیوں کو تول کر (وزن کر کے) فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جاندار اشیاء عددی متفاوت ہونے کی وجہ سے وزناً یا پیمانے کے ذریعے فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ سانس لینے کی وجہ سے ان کے وزن میں گھٹنے بڑھنے کا احتمال ہوتا ہے جو کہ مفضی الی المنازعہ ہے، البتہ دورِ حاضر میں لوگ اس معمولی گھٹنے بڑھنے کو کوئی وقعت نہیں دیتے تو نزاع نہ ہونے کی صورت میں ایسی بیع جائز ہونی چاہیئے کیونکہ فی زمانہ عادات اس پر مبنی ہیں جبکہ ایامِ ماضیہ میں عادت کی وجہ سے ایسی بیع کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے ۔
لما قال المرغینانیؒ: لان الحیوان لا یوزن عادتاً ولا یمکن معرفة ثقله بالوزن لان یخفف نفسه مرة ویثقل اخریٰ۔ (الهدایة ج ۳ ص ۸۳ کتاب البیوع۔ باب الربٰو) [۲]

آزاد عورت کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ بہن یا بیٹی کی شادی کے وقت والد یا سرپرست مہر کے نام سے بہت سی رقم وصول کر کے خود استعمال کرتے ہیں جبکہ اس میں سے تھوڑا بہت جہیز میں بھی لگاتے ہیں، کیا اس طریقہ سے لیے ہوئے مال کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مہر میں مبالغہ بہتر نہیں بلکہ

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: اذا ثبت کراهیة لبسها للتختم ثبت کراهیة بیعها وصنعها لما فیه من الاعانة علیٰ مالا یجوز وکل ما ادیٰ الیٰ ما لا یجوز لا یجوز۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۶۰ فصل فی اللبس)
وَمِثْلُهٗ فی عمدة القاری ج ۲ ص ۳۸ باب بیع التصاویر الخ

[۲] قال ابن الهمامؒ: وانما قلنا ان الحیوان لیس بموزون لانه لا یوزن عادةً فلیس فیه احد المقدرین الشرعیین الوزن او الکیل۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۱۶۲ باب الربا۔ کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی العنایة علیٰ هامش فتح القدیر ج ۶ ص ۱۶۲ باب الربا۔

متوسط درجہ کا ہونا چاہیئے اور مہر جس کے حق میں رکھا جائے تو وہ اسی کا حق ہوگا اُس کی اجازت کے بغیر کسی اور کو اس کے استعمال کا حق نہیں ۔ اور بعض علاقوں کا مذکورہ رواج آزاد عورت کی خرید و فروخت کے مترادف ہے جبکہ ظاہری طور پر اسے مہر کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا یہ ناجائز و حرام ہے۔

لما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ : وبطل بیع مالیس بمال کالدم والمیتۃ والحر

(تنویرالابصار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۵۲ باب البیع الفاسد) [1]

خون کے جل کر راکھ ہو جانے پر اسکی تجارت کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل اکثر بڑے شہروں بلکہ بعض دیہاتوں میں بھی جانوروں کے خون کی تجارت عام ہے کہ مذبح خانوں سے خون جمع کر کے جلا لیا جاتا ہے اور اس کی راکھ کو فارمی مرغیوں کی خوراک تیار کرنے والی فیکٹریوں پر فروخت کر دیا جاتا ہے کیا اس طرح جانوروں کے خون کی تجارت کرنا شرعاً جائز ہے ؟

الجواب :- کسی جانور کا خون اگرچہ مال متقوم نہیں کہ اس کو فروخت کیا جائے لیکن بسا اوقات عرف کی وجہ سے ضرورت کے تحت ایک غیر مال بھی مال بن جاتا ہے اور فقہاء اسلام نے اس کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً گوبر وغیرہ ۔ تو صورتِ مسئولہ کے مطابق آجکل جانوروں کے خون سے چونکہ فارمی مرغیوں کی خوراک بنتی ہے اور ضرورت کے تحت عموماً اس کا کاروبار ہوتا ہے اسلئے بناء بر عرف اس کو مال سمجھا جائے گا۔ اور مذکورہ صورت میں تو وہ خون خون ہی نہیں رہتا بلکہ جل کر راکھ بن جاتا ہے اس لیے جلے ہوئے خون کی تجارت بلا شک و شبہ جائز ہے ۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ : یہ بیوپار جائز ہے ..... ان اقوال کا مقتضاء یہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی قیمت بھی عرفاً ہو جائے تو اسکی بیع و شراء صحیح ہے اور خون کی راکھ تو پاک ہے اس کی بیع صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ (امداد الاحکام جلد۳ ص۳۵۴، ۳۵۵ کتاب البیوع)

خون کی خرید و فروخت کے احکام

سوال :- خون کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خون چونکہ مال متقوم نہیں اسلئے شرعاً اس کے

---

[1] قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ : اذا کان احد العوضین او کلاھما محرماً فالبیع فاسد وکذا اذا کان غیر مملوک کالحر۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۳ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام المادۃ ص۱۲۱ الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ ومالا یجوز)

خرید وفروخت جائز نہیں، تاہم اگر کسی مریض کے لیے شدید ضرورت کے وقت بلاقیمت خون نہ ملتا ہو تو قیمت دے کر اس کے لیے خون خریدنا تداوی بالمحرم کی وجہ سے مرخص ہوگا لیکن خون دینے والے کیلئے قیمت لینا جائز نہیں تاکہ خون متاعِ بازار نہ بن جائے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: بطل بیع ما لیس بمالٍ ای لیس بمال فی سائر الادیان کالدم۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۵۱ مطلب لبیع الموقوف من قسم الصحیح) ۱؎

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض حالات میں کسی مریض کو آنکھ، گردہ یا اور کسی انسانی عضو کی ضرورت ہوتی ہے، تو کیا ان اعضاء کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انسان کو مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ نے مکرم اور مشرف پیدا فرمایا ہے، اسی تکریم اور شرافت کے پیش نظر انسانی اعضاء کی خرید وفروخت جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں انسانی اعضاء متاعِ بازار بن کر اُن کی عظمت متاثر ہو کر اہانت لازم آئے گی، تاہم بامر مجبوری مرخص ہوسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ کمال الدین ابن الہمامؒ: والانتفاع بہ لان الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز ان یکون شیٔ من اجزائہ مہانا و مبتذلا وفی بیعہ اہانۃ لہٗ وکذا فی امتہانہ بالانتفاع۔ (فتح القدیر ج۶ ص۶۳ باب البیع الفاسد) ۲؎

جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنا

سوال: جنگل سے لکڑیوں کو کاٹ کر فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جنگل اگر کسی قوم، قبیلے یا حکومت کی باقاعدہ مملوک اور ملکیت نہ ہو تو اس سے لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے لیکن اگر جنگل کسی کی ملکیت ہو تو چونکہ اس میں

۱؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: لم یجز بیع المیتۃ والدم لانعدام المالیۃ التی ھی رکن البیع۔ (البحر الرائق ج۶ ص۷ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۴۴ باب البیع الفاسد۔

۲؎ قال العلامۃ الکاسانیؒ: والآدمی بجمیع اجزائہ محترم مکرم ولیس من الکرامۃ والاحترام ابتذالہ بالبیع والشراء۔ (البدائع والصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المقصود.....الخ

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۷۲ فصل فی النظر والمس۔ کتاب الحظر والاباحۃ۔

دیگر شرکاء کی حق تلفی کا اندیشہ ہے لہٰذا ان کی رضا مندی کے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والحطب فی ملك رجل لیس لاحدٍ ان یحتطبه بغیر اذنه وان کان غیر ملكٍ فلا باس به ولا یضر نسبته الی قریةٍ اوجماعةٍ اوجماعةٍ مالم یعلم ان ذٰلك ملك لهم وکذٰلك الذرنیخ والکبریت والثمار فی المروج والاودیة۔

(رد المحتار ج ۶ ص۴۴۲ فصل الشرب) [1]

قبرستان کے درخت کاٹنے سے قبل فروخت کرنا

سوال:۔ قبرستان کے درختوں کو کاٹنے سے قبل فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قبرستان کی زمین اگر باضابطہ طور پر وقف کی گئی ہو تو اس زمین کے درخت ذاتی استعمال میں نہیں لائے جاسکتے البتہ ان درختوں میں سے غیر پھلدار درخت قبل القلع فروخت کرنا جائز ہے اور پھلدار درختوں کو قبل القلع فروخت کرنا جائز نہیں اور ان درختوں کو فروخت کرکے حاصل ہونے والی رقم کو قبرستان کی ضروریات میں خرچ کیا جائے گا، کسی شخص کو یہ رقم خود اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: وفی الجامع وفی فتاوٰی ابن الفضل سئل عن اشجار موقوفة مع الارض ایجوز بیعها قال لایجوز قبل القلع کبیع الارض وبعد القلع یجوز۔ وقال ایضاً الاشجار الموقوفة اذا کانت غیر مثمرة یجوز بیعها قبل القلع لانها هی الغلة بعینها والمثمرة لم یجز بیعها الابعد القلع

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: الاشجار التی تنبت بلا غرسٍ فی الجبال المباحة غیر المملوکة (بعض فی یسیر) والقبر والزرنیخ والفیروزج صالشجر فمن اخذ من هٰذه الاشیاء ضمن والحطب فی ملكٍ رجلٍ لیس لاحدٍ ان لحتطبه بغیر اذنه وان کان فی غیر ملكٍ فلا باس به ولاتضر نسبته الی قریة اوجماعة مالم یعلم ان ذٰلك ملك لهم۔

{ شرح المجلة تحت المادة ج۴ ص۱۲۴۳ الفصل الاول فی الاشیاء المباحة۔ }

وَمِثْلُهٗ فی الجامع الفصولین ج۲ ص۲۶۶، ۲۶۷، الفصل الخامس والثلاثون فیما یمنع عنه مالا یمنع

کیناء الوقف والباب لایجوز بیعہ قبل الدفع - (التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۷۵ کتاب الوقف، مسائل وقف الاشجار) [1]

خودرو گھاس کی خرید و فروخت کرنا

سوال:- اگر کسی کی مملوکہ زمین میں خودرو گھاس ہو تو اس کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- خودرو گھاس چاہے مملوکہ زمین میں کیوں نہ ہو کاٹنے سے قبل اس کی خرید و فروخت جائز نہیں، تاہم اگر خودرو گھاس کے لگانے اور حفاظت کرنے میں مالکِ زمین کی محنت بھی شامل ہو مثلاً اس کے اردگرد خندق یا کانٹے دار تار وغیرہ سے حفاظت کرے اور اس کو پانی وغیرہ دے تو اس محنت کی وجہ سے مالکِ زمین کے لیے اس خودرو گھاس کی خرید و فروخت جائز ہوگی۔ بشرطیکہ اس گھاس کو کاٹ کر فروخت کی جائے۔

لما قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم: عن رجلٍ من مھاجرین من اصحاب النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم قال عزوت مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً اسمعہ یقول المسلمین شرکاء فی ثلاث الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج۲ ص۱۲۶) [2]

اپنے مملوکہ درخت سے شہد فروخت کرنا

سوال:- اگر کسی شخص کی اپنی مملوکہ زمین میں درخت ہو اور اس میں شہد کی

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی البزازیۃ وقال الفضلی و بیع الاشجار الموقوفۃ مع الارض لایجوز قبل القلع کبیع الارض۔ وقال ایضاً اذا لم تکن مثمرۃ یجوز بیعھا قبل القلع۔ ایضاً لانہ غلتھا والثمرۃ لاتباع الا بعد القلع کبیع البناء الوقف بحر۔

(تنقیح الفتاوی حامدیۃ ج۱ ص۱۱۵ فی مطلب بیع الاشجار الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۴۱۲ الباب الخامس فی ولایۃ الوقف وتصرف القیم۔

[2] قال فی الھندیۃ: ولایجوز بیع الکلاء واجارتہ وان کان فی ارض مملوکۃ غیر ان لصاحب ان یمنع الدخول فی ارضہ..... ھذا اذا نبت بنفسہ فاما اذا کان سقی الارض واعدھا للانبات فنبت ففی الذخیرہ والمحیط والنوازل یجوز بیعہ لانہ ملکہ وھو مختار الشھید۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۱۰۹ الفصل الثانی فی بیع الثمار وانزال الکروم والاوراق۔الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۷۷ باب البیع الفاسد۔

مکھیاں شہد بنالیں تو اس شہد کی فروخت کا اختیار اس مالکِ زمین کو ہوگا یا ہر شخص اس کو کاٹ کر فروخت کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین میں شہد کی فروخت اور دیگر مالکانہ تصرّفات کا حق صرف زمین کے مالک کو حاصل ہے، کیونکہ شہد درخت کے تابع ہو کر درخت کے حکم میں ہے۔ اس بناء پر چونکہ درخت میں تصرف کا حق صرف مالکِ زمین کو حاصل ہے، اس لیے شہد پر اختیار بھی اسی کو حاصل ہوگا لہٰذا کسی دوسرے شخص کو اس کی فروخت وغیرہ کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بخلاف ما اذا عسل النحل فی ارضه لانه عدمن انزاله فیملکه تبعًا لارضه کالشجر النابت فیه والتراب المجتمع فی ارضه بجریان الماء۔
(الهداية ج۳ ص۱۰۶ مسائل منثورة۔ کتاب البیوع)[1]

خرید کردہ درخت کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا حکم

سوال: ایک شخص نے کسی سے چند درخت خریدے، کاٹتے وقت دونوں میں کچھ تیز گفتگو ہوئی کہ درختوں کو کہاں سے کاٹا جائے، مالکِ زمین اوپر سے کاٹنے پر مصر ہے جبکہ مشتری جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے، کیا ازروئے شریعت اس میں کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع وشراء کے وقت اگر درختوں کا سودا بلا کسی شرط کے ہوا ہو تو مشتری کیلئے درختوں کا جڑ سے اکھاڑنا جائز ہے، لیکن اگر سودا طے کرتے وقت سطحِ زمین سے کاٹنے کی شرط لگائی گئی ہو تو سطحِ زمین سے ہی کاٹنا ہوگا، اور اگر جڑ سے اکھاڑنے کی صورت میں قریبی کنوئیں یا دیوار وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پھر جڑ سے اکھاڑنے کی بجائے سطحِ زمین سے کاٹنا ہوگا۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمه الله: وفیها اذا اشتری شجرة للقلع فانه یومر بقلعها بعروقها ولیس له حفر الارض الی انتهاء العروق بل یقلعها علی العادة الا ان شرط

---

[1] قال ابن نجیم المصری رحمه الله: بخلاف معسل النحل فی ارضه حیث یملکه وان لم تکن ارضه معدة لذلك من انزال الارض حتی یملکه تبعًا لها کالاشجار النابتة۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۲۸ باب المتفرقات۔ کتاب البیوع) ومثله فی ردالمحتار ج۵ ص۲۳۵ کتاب البیوع۔

للبایع القلع علیٰ وجہ الارض او یکون فی القلع من الاصل مضرۃ علی البایع کما اذا کانت بقرب حائطٍ او بئرٍ لانہ یقطعہا علیٰ وجہ الارض ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۹۵ کتاب البیع، فصل ید خل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [1]

باغ کے بعض پھل ظاہر ہوں جبکہ بعض ظاہر نہ ہوں ایسی حالت میں باغ کی فروخت کا حکم

سوال ۔ بعض لوگ باغ کے صرف بعض پھل ظاہر ہونے پر خریدار پر بیچ دیتے ہیں، جبکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ پھل کی مقدار کیا ہوگی یا مستقبل میں اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے، اسی حالت میں اگر باغ فروخت کیا جائے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ ایسی حالت میں درخت میں ایسے پھل بھی ہو سکتے ہیں جن کا ابھی وجود نہیں ہوتا ہے؟

الجواب: ۔ شرعی نقطۂ نظر سے کسی چیز کی فروخت کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مبیعہ عقد کے وقت موجود ہو تاکہ بائع مشتری کو سپرد کر کے اپنی ذمہ داری فارغ کرے ۔ صورتِ مذکورہ میں جو پھل ظاہر ہو خواہ انسان کے کھانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا حیوانات کی، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، لیکن اگر باغ فروخت کرتے وقت پھل ظاہر نہ ہو تو اُس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ ہے کہ پھل ابھی بالکل ظاہر نہ ہو تو یہ عقدِ بیع معدوم ہو کر ناجائز ہوگا ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعض پھل ظاہر ہو لیکن روز بروز باغ میں مزید پھل ظاہر ہوتا رہتا ہو، ایسی حالت میں اگر مالک موجودہ پھل فروخت کرے لیکن جو پھل ابھی ظاہر نہیں ہوئے تو ظاہر المذہب کی رُو سے اس کی بیع فاسد رہے گی ۔

لیکن عمومِ بلویٰ اور ضرورت کو دیکھ کر علماء کرام نے جواز کا فتویٰ دیا ہے ، اور جو پھل ابھی پیدا ہو رہے ہوں تو اس کے لیے باغ کے اجارہ کے عوض مشتری کے لیے

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اشتریٰ شجرۃ للقلع یومر بقلعہا بعروقہا ولیس لہٗ حفر الارض الیٰ انتہاء العروق بل یقلعہا علی العادۃ الا ان شرط البائع القطع علیٰ وجہ الارض او یکون فی القلع من الاصل مضرۃ للبایع لکونہا بقرب حائطٍ او بئرٍ فیقطعہا علیٰ وجہ الارض ۔
(رد المحتار ج۴ ص۵۵ مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصوداً)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۳۵ کتاب البیوع، الفصل الثانی ۔

بھاری حصہ مقرر کر کے بائع کو مثلاً ہزارواں حصہ دینے کے حیلہ کا سہارا لے کر معاملہ جائز رہے گا۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ: والحیلۃ ان یأخذ الشجرۃ معاملۃً علیٰ ان لہٗ جزءً من الف جزءٍ وفی الزرع والحشیش یشتری الموجود ببعض الثمن ویستأجر الارض مدۃً معلومۃ یعلم فیھا الادراک بباقی الثمن وفی الاشجار الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یقول علیٰ انی متی رجعت فی الاذن تکون ماذوناً فی الترک بمثل ملخصاً۔ (الدرالمختار مع ردالمحتار ج۴ ص۵۵۸ کتاب البیوع) [۱]

پکنے تک کی شرط لگا کر کچی فصل خریدنا

سوال:- گندم یا جَو کی کچی فصل پکنے تک چھوڑنے کی شرط سے خریدی جائے اور پکنے پر کاٹی جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہوگی یا نہیں؟ اور جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- گندم، جَو یا دیگر فصلوں کو اس شرط سے خریدنا کہ پکنے پر کاٹوں گا تو یہ صورت ناجائز ہے، البتہ فقہاء نے جواز کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ فصل کو مستقل طور پر قیمتاً خرید کر ایک خاص مدت کے لیے زمین اجارہ پر لی جائے اور معینہ مدت کے اندر فصل کو کاٹ لیا جائے تو اس صورت میں مذکورہ بیع اور پکنے تک فصل کا باقی رکھنا صحیح ہوگا۔

لما قال طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: وان کان البیع بشرط الترک لایجوز۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ...الخ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن الھمام: وفی ثمار الاشجار یشتری الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یفعل فی الاذن فی ترک الثمر علی الشجر وھو ان یأذن المشتری علیٰ انہٗ متی رجع من الاذن کان ماذوناً فی الترک باذنٍ جدیدٍ فیجعلہ علیٰ مثل ھٰذا الشرط۔

(فتح القدیر ج۵ ص۴۹۲ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثالث فیما یجوز بیعہ...الخ۔

[۲] قال طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولو اراد ان یترک فی الارض ویکون لہ الولایۃ الشرعیۃ فالحیلۃ ان یشتری الحشیش واشجار البطیخ ببعض الثمن ویستاجر الارض ببعض الثمن من صاحب الارض ایاماً معلوماً۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ ومالا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۳ ص۳۳ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یدخل فی بیع الاراضی، الخ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے خرید وفروخت کرنا

سوال:۔ ایک چیز کی قیمت ایک ہزار روپے ہے، بیس آدمیوں نے آپس میں ۵۰/۵۰ روپے جمع کرکے یہ فیصلہ کیا کہ قرعہ اندازی کرکے جس کے نام پر یہ چیز نکل آئے تو یہ اس کو دی جائے گی اور باقیماندہ افراد محروم رہ جائیں گے، کیا یہ طریقۂ تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ میں خرید وفروخت کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اُن کے فقدان کی وجہ سے ایسی بیع جائز نہیں، صورتِ مذکورہ میں ایک ممنوع امر یہ ہے کہ اگر نام نکل آئے تو اس کو مبیعہ دیا جائے گا ورنہ نہیں جو کہ شرط فاسد ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہر ایک ممبر اپنا نام نکلنے کا متمنی ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں کہ نکلے یا نہیں، تو گویا بیع علی الخطر الوجود ہونے کی وجہ سے قمار لازم آتا ہے جو کہ بنصِ قرآنی ممنوع ہے اس بناء پر مذکورہ معاملہ شرط فاسد اور قمار کی وجہ سے جائز نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) [1]

تجارتی لائسنس (پرمٹ) کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایک شخص کے پاس حکومت کی طرف سے جاری کردہ تحریری سرٹیفکیٹ کی صورت میں ایک تجارتی لائسنس (پرمٹ) ہے تاکہ درآمد برآمد کے وقت کوئی اعتراض نہ کرے، اب وہ شخص اس اجازت نامہ کو فروخت کرنا چاہتا ہے، یہ لائسنس چونکہ کاغذ کی شکل میں ہوتا ہے تو کیا اس کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عصرِ حاضر میں اکثر ممالک نے تاجروں پر لائسنس کے بغیر درآمد برآمد کی پابندی لگائی ہوئی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ لائسنس ایک مادّی چیز نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو مال دینے یا لینے کا دوسرا نام ہے اور اس لائسنس کے حصول کیلئے چونکہ وقت، کوشش اور

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ماکان مبادلۃ مالٍ بمالٍ یفسد بالشرائط الفاسدۃ ویبطل تعلیقہ۔ ایضاً لدخولہ فی التملیکات لانہا اعم۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۲۴۰ مایبطل بالشرط الفاسد ولا یصح تعلیقہ بہ)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۷۹ باب المتفرقات۔ کتاب البیوع۔

مال صرف کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر حاملِ لائسنس کو تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعے قانونی پوزیشن حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ مختلف قسم کی سہولیات کا حقدار ہو جاتا ہے اور بغیر لائسنس کے مال درآمد برآمد کرنا قانوناً جرم ہوتا ہے اور اس کے مرتکب شخص کو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے، اس لیے یہ لائسنس بڑا قیمتی ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے کروڑوں روپے کی تجارت ممکن ہوتی ہے۔ تو اس طرح تجارتی لائسنس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جا سکتا ہے چونکہ حاملِ لائسنس کو یہ حق اصالتاً ثابت ہے تو اگر وہ عوض لے کر اپنے حق سے دستبردار ہو کر کسی دوسرے کے نام منتقل کر دے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مال کے بدلے اپنے وظائف اور حقوق سے دستبرداری شرعاً مرخص ہے، البتہ اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کا ہو جس کی کسی دوسرے فرد یا کمپنی کو انتقال کی بالکل قانوناً اجازت نہ ہو، تو چونکہ ایسے لائسنس کو کسی دوسرے کے نام منتقل کرنے کی صورت میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب لازم آتا ہے لہٰذا یہ بیع ناجائز ہوگی۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: ولا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالاوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتى كثير باعتباره وعليه فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ. (الدر المختار ج۴ ص۵۱۹ كتاب البيوع)[۱]

اِنعامی بانڈز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- آجکل حکومت نے انعامی بانڈز کے نام سے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے جو کہ مختلف مالیت کے بانڈز کی شکل میں ہے، طریقۂ کار اس کا یہ ہوتا ہے کہ بانڈ حاصل کرنے کے ہر ماہ بعد قرعہ اندازی کی جاتی ہے، قرعہ اندازی میں جو نمبر نکلتے ہیں اُن کے حاملین کو زیادہ رقم دیدی جاتی

---

[۱] قال العلامة خالد الاتاسیؒ: اقول وعلى ما ذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي ان يجوز الاعتياض عن التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال.... كما جاز النزول عن الوظائف و نحوها لا سيما اذا كان صاحب حق العلو فقيراً قد عجز عن اعادة علوه فلو لم يجز ذلك له على الوجه الذي ذكرناه يتضرر فليتامل و ليحرر. (شرح مجلة الاحكام. المادة ۲ ص۱۲۱ ج۱ الفصل الثاني في بيع ما يجوز وما لا يجوز)

وَمِثْلُهٗ في فقهي مقالات ج۱ ص۱۹ بيع حقوق المجردة۔

ہے اور باقی تمام ممبران زیادہ رقم سے محروم ہوکر اپنی جمع شدہ رقم چھوڑتے یا واپس لینے کے مجاز ہوتے ہیں، تو کیا اس طرح انعامی بانڈز کی خرید وفروخت اور اس کے ذریعے حاصل شدہ رقم کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: مذکورہ کاروبار دو وجوہات کی بناء پر مشروع نہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں ربوا پائی جاتی ہے اور اعانت علی الربوا بھی ہے کیونکہ حکومت ان ممبروں سے حاصل ہونے والی رقم کو اندرون ملک اور بیرون ملک مختلف قسم کے سودی معاملات میں استعمال کرتی ہے جو کہ حکومت کے ساتھ سودی معاملات میں تعاون ہے اور مختلف افراد سے جمع ہونے والی رقم کا فائدہ صرف مخصوص افراد حاصل کرتے اور باقیماندہ ممبران محروم ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تمام ممبر اپنی اپنی رقم کے عوض میں زیادہ رقم کے متمنی ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا حصہ علیٰ خطر الوجود ہوتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انعام حاصل ہوتا ہے یا نہیں، لہٰذا یہ قمار کی صورت ہے۔

اس لیے ان وجوہات کی بناء پر مذکورہ کاروبار سود اور قمار کی وجہ سے ناجائز ہے اور چونکہ یہ دونوں نص قرآنی کی رُو سے ناجائز اور حرام ہیں، لہٰذا یہ کاروبار اور اس کے ذریعے ملنے والی رقم کسی بھی مسلمان کی شایانِ شان نہیں۔

لما قال الله تبارك وتعالىٰ: إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) [1]

غیر ملکی ویزا کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: ایک شخص کو اس کے بھائی نے سعودی عرب کا ویزا بھیجا ہے، بعض وجوہات کی بناء پر وہ خود سعودی عرب نہیں جا سکتا اور ویزہ کسی دوسرے شخص پر پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس شخص کے لیے ویزا فروخت کرکے رقم حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: موجودہ دور میں بیشتر ممالک اپنے ملک میں کسی غیر ملکی کو بغیر ویزا کے داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ایک قانونی جرم قرار دیا ہے، جبکہ ویزا بذاتِ خود کوئی مادی چیز تو ہے نہیں

---

[1] لما ورد فی الحدیث: عن جابرٍ قال لعن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الرّبوا وموکله وکاتبه و شاھدیه وقال ھم سواء۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۴ کتاب الربوا)

بلکہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے اور وہاں ایک متعین وقت تک رہنے کا تحریری اجازت نامہ ہے جس کی رُو سے حاملِ ویزا کو مناسب سہولیات بھی حاصل ہوتی ہیں جبکہ بغیر ویزہ کے داخلہ ممنوع ہوتا ہے، چونکہ کسی ملک کے ویزا کے حصول کے لیے کافی وقت اور مال لگایا جاتا ہے اور حاملِ ویزہ کو چونکہ وہاں داخلے اور رہنے کا حق اصالتاً حاصل ہوجاتا ہے لہٰذا اگر وہ اپنے حق اور وظیفہ سے دستبردار ہوکر ویزہ کسی دوسرے کے نام فروخت کرے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مناسب عوض لے کر کسی کو اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا فقہاء نے مرخص قرار دیا ہے لہٰذا ویزہ فروخت کرکے رقم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق شفعۃ وعلیٰ ھذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذھب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع)[1]

انتخابات کے دوران ووٹ کی خرید وفروخت کا مسئلہ

سوال:۔ بعض علاقوں میں انتخابات کے وقت لوگ اُمیدواروں سے بھاری رقم لے کر اپنا ووٹ اس کے حق میں استعمال کرتے ہیں، تو کیا ووٹ کے عوض رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ووٹ جس کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے حق میں ملک وملت کی خیرخواہی کی شہادت ہے، اور ووٹ ایک قسم کی سفارش ہے کہ امیدوار کے لیے متعلقہ عہدے کی سفارش کررہا ہے، ووٹ ایک قسم کا مشورہ ہے کہ یہی امیدوار اس عہدے کا مستحق ہے، لہٰذا ووٹ کی مذکورہ بالا حیثیتوں سے یہ بات عیاں ہے کہ ووٹ مالِ متقوم نہیں، اور کسی بھی چیز کی

---

[1] قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: اقول وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لا سیما اذا کان صاحب حق التعلی فقیراً قد عجز عن اعادۃ علوہ فلو لم یجز ذلک لہ علی الوجہ الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل ولیحرر۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۲ ص۱۲۱ ج۱ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز۔ ومثلہ فی فقہی مقالات ج۱ ص۱۹ بیع حقوق المجردۃ۔

خرید وفروخت کے لیے اُسی چیز کا مالِ متقوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا ووٹ کے بدلے رقم حاصل کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ۔

لما قال الدکتور وھبة الزحیلی : اتفق الفقھاء علیٰ صحة البیع اذا کان المعقود علیه مالاً متقوماً محرزاً موجوداً مقدوراً علیٰ تسلیمه معلوماً للعاقدین لم یتعلق به حق الغیر۔ (الفقه الاسلامی ادلته ج۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع۔ثالثاً ابیوع المنوع لسبب المعقود علیه۔الخ) له

ٹریڈ مارک کی خرید وفروخت

سوال : بعض کمپنیوں اور اداروں کی اپنی تجارتی علامت ہوتی ہے جو کہ حکومت کی طرف سے رجسٹرڈ ہوتی ہے اور اُسے گاہک کو رغبت اور تیزی دلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیا اس کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب : کسی کمپنی کی مصنوعات پر تجارتی علامت یا ٹریڈ مارک رغبت یا بے رغبتی کا سبب ہوتی ہے، اس لیے تاجروں کی نظریں اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے چونکہ موجودہ دور میں التباس اور دھوکہ بازی عام ہونے کی وجہ سے حکومتوں کی جانب سے ان ٹریڈ مارکوں کی رجسٹریشن ہونے لگی اور ایک تاجر کے لیے دوسرے تاجر کا ٹریڈ مارک کا استعمال قانونی طور پر جُرم قرار دیا گیا ہے اس لیے تاجروں کی نظریں اس کی قیمت گو یا مادی بن گئی ہے اور تاجر اسے مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے ہیں اور ٹریڈ مارک کو تحریری سرٹیفکیٹ کی شکل دی گئی ہے۔ یہ تو ایک حق مجرد ہے لیکن اس کے حصول کے لیے چونکہ بے تحاشا مال صرف کیا جاتا ہے گویا کہ وہ تاجر کے لیے ایک ثابت حق بن جاتی ہے جو کہ اس کے لیے اصالتاً ثابت ہے۔ تو فقہاء کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا مرخص ہے لہٰذا ٹریڈ مارک کی فروخت میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ مارک رجسٹرڈ ہو کیونکہ رجسٹریشن کے بغیر یہ علامت قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ اور دوسرا یہ کہ عوام پر دھوکہ اور التباس نہ ہو کہ خود

له قال العلامة الشیخ عبدالرحمٰن الجزائریؒ، ومنها ان یکون المبیع معلوماً للبائع حال البیع ..... وان یکون مقدوراً علیٰ تسلیمه فلا ینعقد بیع المغصوب...... ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة فبیع المجهول جهالة تفضی الی المنازعة غیر صحیح ۔ (کتاب الفقه علیٰ مذاهب الاربعة ج۲ ص۱۶۴ کتاب البیع الرکن الثالث ۔ المعقود علیه) ۔

استعمال کرتا ہے اور اس سے بھی رقم حاصل کرے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فی الاشباہ لایجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة کحق الشفعة وعلیٰ ھٰذا لایجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذھب عدم الاعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۸، ۵۱۹ کتاب البیوع) [1]

بیع بذریعہ نیلام عام

سوال: آجکل بیع وشراء کا یہ طریقہ رائج ہے کہ کسی چیز کو منڈی اور مارکیٹ میں رکھ کر لوگوں میں خریدنے کا اعلان ہوتا ہے، خریدار اپنا اپنا نرخ لگا کر مبیعہ خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں لیکن جو خریدار زیادہ قیمت بتائے تو وہ مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، کیا خرید وفروخت کا یہ طریقہ اپنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی ایک خریدار سے باقاعدہ معاہدہ ہوئے بغیر یونہی متعدد خریداروں کی رائے معلوم کرکے سب سے زیادہ قیمت دینے والے سے ایجاب وقبول کرنا جائز ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بیع من یزید کہا جاتا ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے لیے چند اشیاء فروخت کرنے میں یہ طریقہ اپنایا تھا۔

لما جاء فی الحدیث: عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باع حلسا وقدحا وقال من یشتری ھٰذا الحلس والقدح فقال رجل اخذتھما بدرھم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یزید علی درھم فاعطاہ رجلٌ درھمین فباعھما منہ۔
(ترمذی ج۱ باب ما جاء فی بیع من یزید۔ کتاب البیوع ص۲۳۱) [2]

---

[1] قال العلامة خالد الاتاسیؒ: اقول وعلیٰ ما ذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لاسیما اذا کان صاحب حق العلو فقیرًا قد عجز عن اعادة علوہ فلو لم یجز ذلک لہ علی لوجه الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل ولیحرر۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۲ ج۲ ص۱۲۱ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز۔

وَمِثْلُہٗ فی فقھی مقالات ج۱ ص۱۹ بیع حقوق المجردة۔

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع من یزید (.............) لانہ بیع الفقراء والحاجة ماسة الیہ۔ (الھدایة ج۳ ص۶۹ کتاب البیوع۔ فصل فیما یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۱۰۲ مطلب احکام نقصان المبیع فاسدًا۔

سرکاری کاغذات میں جعلسازی سے خود کو مالک ظاہر کر کے کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین دوسرے شخص کے پاس بطور رہن رکھی تھی لیکن اُس نے سرکاری کاغذات میں دھوکہ اور جعلسازی سے اس زمین کا انتقال اپنے نام پر کرالیا، سرکاری کاغذات میں ردوبدل کی وجہ سے اب یہ شخص اس زمین کو فروخت کرے تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہوگی ؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت اگر یہ زمین کسی کے یہاں تسلیم شدہ یا بذریعہ گواہ ثابت شدہ ہو تو کسی کے غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ سے اس زمین میں شرعاً اُس کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کے تمام تر حقوق بیع حقِ فروخت اصل مالک کو حاصل ہیں، البتہ اس زمین کی فروخت موقوف علیٰ شرط التسلیم ہوگی یعنی جب تک زمین مشتری کے حوالے نہیں کی گئی ہو تو بیع موقوف ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ:۔ منھا ان یکون مقدور التسلیم عند العقد فان کان معجوز التسلیم عندہٗ لا ینعقد۔ (البدائع والصنائع ج۵ ص۱۴۷ کتاب البیوع۔ فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیہ) [۱]

حکومت کی اجازت کے بغیر غیر ملکی اشیاء کی تجارت کرنا

سوال:۔ وہ غیر ملکی اشیاء جن کی خرید وفروخت پر حکومت کی طرف سے پابندی ہو اُس کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

الجواب:۔ جو اشیاء بیرونِ ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اُن پر حکومت تاجروں سے ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ کے نام سے کچھ رقم وصول کرتی ہے، بسا اوقات ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ کر دیا جاتا ہے، اگر یہ ٹیکس مناسب اور جائز انداز میں لیا جاتا ہو اور قومی خزانہ میں

---

[۱] قال طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: واما بیع المغصوب فقد ذکر محمدؒ انہٗ موقوف ان اقر بہ الغاصب ثم البیع وان جحد وللمغصوب منہ بینۃ فکذلک وان لم یکن ولم یسلمہ حتی ھلک ینقض البیع۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۴۰ الباب الرابع فی بیع الفاسد واحکامہ)

وَمِثْلُہٗ فی الجامع الفصولین ج۲ ص۹۰ الفصل الثانی والثلاثون فی بیع الغصب۔

جمع ہوکر قومی مفاد میں استعمال کیا جاتا ہو تو پھر سامانِ تجارت چوری چھپے لانا مناسب نہیں کیونکہ حکومتِ وقت درآمد کردہ اشیاء پر ضروری ٹیکس لگانے کی مجاز ہے، البتہ اگر حکومت ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ کرکے تاجروں کو تنگ کرتی ہو اور ٹیکس کے نام سے وصول کی گئی رقم قومی خزانہ کی بجائے ذاتی خواہشات اور ضروریات میں صرف کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں مال لانے والا ٹیکس سے بچنے کی مناسب تدابیر اختیار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ دروغگوئی، خیانت اور دھوکہ بازی سے بہرحال اجتناب ضروری ہے۔

قال القاضی ابو یعلی محمد بن الحسین الفراءؒ: ان کان البلد ثغرًا یتاخم دار الحرب وکانت اموالھم اذا دخلت دار الاسلام معشورۃ من صلح استقر معھم اثبت فی الدیوان عقد صلحھم وقدر الماخوذ منھم من عشر او خمس او زیادۃ او نقصان منہ وان کان یختلف باختلاف الازمنۃ والاموال فصلت فیہ وکان الدیوان موضوعًا لاخراج رسومہ والاستفاء ما یرفع الیہ من مقادیر الامتعۃ المحمولۃ الیہ۔ (الاحکام السلطانیۃ ص۲۴۶) [۱]

حکومت کی اجازت کے بغیر سرکاری درختوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ سرکاری ملازمین کے ذریعے سرکاری زمین پر اُگے ہوئے درختوں کی خرید و فروخت کا حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ حکومت کی طرف سے اگر ان ملازمین کو سرکاری درختوں کی فروخت کی اجازت ہو اور رقم حاصل کرکے قومی خزانہ میں پہنچتی ہو تو ملازمین کے لیے درختوں کو فروخت کرنے میں شرعًا کوئی حرج نہیں، البتہ اگر ملازم خیانت، بددیانتی اور مار دھاڑ سے فروخت کرتے ہوں تو علم ہونے کے باوجود ان سے خریدنا ناجائز ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے، کیونکہ قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے ان درختوں میں پوری قوم کا حصہ ہے۔

---

[۱] قال فخر الدین الزیلعیؒ: والاصل ان متی عرفنا ما یأخذون منا اخذنا منھم مثلہٗ بذلک امر عمر رضی اللہ عنہ وان لم نعرف اخذنا منھم العشر لقول عمرؓ فان اعیاکم فالعشر وان کان یاخذون الکل لا ناخذ منھم الجمیع الا قدر ما یوصلہ الیٰ مأمنہ فی الصحیح۔

(تبیین الحقائق ج۱ ص۲۸۵ باب العاشر)

ومثلہٗ فی الجامع الصغیر ص۱۰۱ باب فیمن یمر علی العاشر بمال۔

لما فی مجلة الاحکام :۔ لیس للوکیل ان یبیع بانقص مما عینه الموکل یعنی اذا کان الموکل قد عین ثمنا فلیس للوکیل ان یبیع بانقص من ذلک و اذا باع ینعقد البیع موقوفا علی اجازة موکله ۔ اهـ وقال العلامة خالد الاتاسی: ثم لو خالف الوکیل بالبیع وباع وسلم المبیع للمشتری ثم هلک فی ید المشتری یکون الوکیل ضامنا لقیمتہ لانہ بالمخالفة صار غاصبا ۱ھ ۔ شرح المجلة لخالد الاتاسی ۴/ ۴۸۵/ ۴۸۶ مادة ۱۴۹۵[1]

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنا

سوال: بعض لوگ اندرونِ ملک مخصوص علاقوں سے دیگر علاقوں تک کپڑا، برتن اور دیگر سامان خفیہ طریقے سے لے جاتے ہیں جبکہ بعض اوقات حکومت کے کارندے ان کو پکڑ کر ان کا سامان ضبط کرکے نیلام کر دیتے ہیں، کیا ان ضبط شدہ اشیاء کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ سامان اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا ہے کیونکہ حکومت کیلئے رعایا کے اموال ضبط کرنا مناسب نہیں، لہٰذا ایسا سامان اصل مالک کے ملک سے خارج نہ ہونے کی وجہ سے واجب الرد ہے، اس بناء پر ضبط شدہ مال کی خرید و فروخت جائز نہیں اور حکومت کی اندرونِ ملک انتقالِ اشیاء پر پابندی لگانا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولیس للامام ان یخرج شیئًا من یداحدٍ الا بحق ثابت معروف ۔ (ردّ المحتار ج ۴ ص ۱۸۰ مطلب القول الذی لیدان الارض ملکه وان کانت خراجیة) [2]

---

[1] قال العلامة القاضی ابو یعلی الحنبلی رحمه الله : فاما اعشار الاموال المنتقلة فی دار الاسلام من بلدٍ الی بلدٍ فمحرمة لا یبیحها شرع ولا یسوغها اجتهاد ولا هی من سیاسات العدل وقلما تکون الا فی البلاد الجائرة ولذلك قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یدخل الجنة صاحب مکس ۔

(الاحکام السلطانیة ص ۲۴۶ فصل فی وضع الیلون ۔ القسم الثانی اعشار الاموال)

وَمِثْلُهٗ محمد حامد الفقی علی هامش الاحکام السلطانیة ص ۲۴۶

غیر محفوظ سرکاری کاغذات کے ذریعے جائیداد وغیرہ کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ملکی قانون کے تحت ایک شخص سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال) کے ذریعے اپنی جائیداد وغیرہ فروخت کرسکتا ہے، ان کاغذات کے اعتبار اور عدم اعتبار کے متعلق شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ازروئے شرع جو سرکاری کاغذات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں تو اُن کو قابلِ اعتبار قرار دے کر ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، موجودہ حالات میں چونکہ رشوت، جھوٹ، دھوکہ اور فریب ہر جگہ غالب ہو چکا ہے اس بناء پر دورِ حاضر میں صرف کاغذات کے ذریعے خرید و فروخت مناسب نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام: لا یعمل بالخط والختم واحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (المجلة المادة ۱۷۳۶ الباب الثانی۔ الفصل الاول فی الحجج الخطیة) [1]

وقف شدہ زمین کو فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین کو مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کیا، وقف کے بعد اُس زمین کو وہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا اِس واقف کو موقوفہ زمین کی فروخت کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زمین کو وقف کر دینے کے بعد شرعاً زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے بشرطیکہ وقف کی شرائط کا لحاظ کر کے وقف تام ہو۔ وقف کر دینے کے بعد زمین میں واقف کو کسی قسم کے ذاتی یا مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں رہتا، لہٰذا اس زمین کے

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهراً وعلیه فما یوجد فی دفتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما علیه فی دفتره الذی یقرب من الیقین انه لا یکتب فیه سبیل التجرید والهزل یعمل به۔
(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲۱ مطلب فی دفاتر التجار حادثة فی تاجر له دفتر)

خرید و فروخت یا ہبہ کا مجاز نہیں ہے اور نہ اس زمین میں وراثت جاری ہو سکتی ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۱۶ کتاب الوقف) [1]

مسجد کا ضرورت سے زائد سامان فروخت کرنا

سوال: اگر کسی قصبہ کے لوگ اپنے قصبہ سے مکمل طور پر کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور اس قصبہ میں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو کیا ایسی حالت میں مسجد کا سامان فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر حقیقتاً قصبہ والے مکمل طور پر اپنے قصبہ سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور وہاں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو اس صورت میں چونکہ مسجد کو ایسے ہی چھوڑنے پر اسکے سامان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا ایسی کسی بھی مسجد کی اشیاء فروخت کرنا جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا، البتہ مسجد کی زمین کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو سکتی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: قلت لکن الفرق غیر ظاھر فلیتأمل والذی ینبغی متابعۃ المشائخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد او حوض کما افتی بہ الامام ابوشجاع والامام الحلوانی وکفی بھم قدوۃ ولا سیما فی زماننا فان المسجد او غیرہ من رباط او حوض اذا لم ینقل یأخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد وکذلک اوقافہ یأکلھا النظار او غیرھم وفی فتاوی النسفی سئل شیخ عن اھل قریۃ رحلوا وتداعی مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ یستولون علی خشبۃ و ینقلونہ الی دورھم ھل لواحد لاھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: فاذا تم ای الوقف فلا یملک ولا یعار ولا یرھن۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱، ۲۲۲ ... الصدقۃ۔ فصل واما حکم الوقف الجائز ... الخ۔

الثمن یصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد قال نعم۔

(ردّ المحتار ج ۴ ص۳۶۱ مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ) [1]

غیر موقوف قبرستان کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے ایک قطعہ زمین خریدا جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جگہ قبرستان کی ہے، لیکن تقریباً ساٹھ سال سے اس میں کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا ہے اور اس قطعۂ زمین کو مالک نے قبرستان کے لیے وقف بھی نہیں کیا تھا، کیا اب مالکِ زمین کو اس کی فروخت کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر موقوف قبرستان میں اگر یہ یقین ہو کہ اموات کی لاشیں ختم ہو کر خاک بن گئی ہیں تو ایسی صورت میں اس کا مالک اس زمین میں ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا مجاز ہو گا، البتہ اگر وقف کا شائبہ بھی موجود ہو تو موقوفہ قبرستان کی خرید و فروخت یا دیگر مالکانہ تصرفات کا حق اس کو حاصل نہیں۔

لما قال الشیخ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی رحمہ اللہ:۔ ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (التبیین الحقائق ج ۱ ص۲۴۶ باب الجنائز) [2]

وصولِ حق کے لیے غاصب کی جائیداد فروخت کرنا جائز ہے

سوال: میرے ایک رشتہ دار نے میری ملکیتی زمین سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال وغیرہ) میں جعلسازی سے ردّ و بدل کر کے فروخت

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ:۔ حشیش المسجد اذا کان لہ قیمۃ فلا هل المسجد ان یبیعوها وان رفعوا الی الحاکم فهو احب وکذا الحباب والنعش اذا افسدا فلا هل المسجد ان یبیعوها وان رفعوا الی الحاکم فهو احب۔

(الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۵ ص۸۵۵ کتاب الوقف مسائل وقف المساجد)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج ۲ ص۴۵۸ الباب الحادی عشر فی المسجد ومایتعلق بہ۔

[2] قال العلامہ ابن عابدینؒ:۔ ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (ردّ المحتار ج ۲ ص۲۳۳ مطلب فی دفن المیّت)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی مکان اٰخر۔

کردیا ہے، میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اس زمین کو مجھے واپس کردے لیکن وہ کسی طرح بھی زمین واپس کرنے کو تیار نہیں ہے، اب میرے اس رشتہ دار کو چند وجوہات کی بنا پر ملک چھوڑنا پڑ گیا ہے جبکہ اس کا دو کنال رقبہ میرے قبضے میں ہے، تو کیا میرے لیے اس دو کنال رقبہ کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب:۔ بشرط صحتِ سوال کسی کے غاصبانہ قبضہ کرنے سے آپ کی زمین اُسکی ملکیت نہیں بن سکتی اور نہ ہی ناجائز طور پر سرکاری کاغذات میں تبدیلی کرکے فروخت کردینے سے شرعاً ملکیت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ زمین میں مالک کو باقاعدہ طور پر ہر قسم کے تصرفات کا حق حاصل ہے اپنے حق کے حصول کے لیے غاصب کی منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کی فروخت کرکے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قال ونقل جد والدی لامه الجمال الاشقر فی شرحه للقدوری ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاوعتهم فی الحقوق والفتوی الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مالٍ کان لاسیما فی دیارنا لمداومتهم للعقوق۔ (رد المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة) [1]

بُت فروشی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ بتوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں، از روئے شرع یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بُت چونکہ آلۂ معاصی اور شرک پرستی میں معین ہیں، لہٰذا اعانت علی المعصیت کی بناء پر ان کی خرید وفروخت جائز نہیں، علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بُت فروشی سے منع فرمایا ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وفیه ان ابن ابی لیلی والشافعی یطلقان اخذ خلاف جنس حقه للمجانسة فی المالیة وقالا هو الاوسع ویجوز الاخذ به وان لم یکن مذهبنا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة۔
(البحر الرائق ج۵ ص۵۶ کتاب السرقة)
ومثله فی الدر المنتقی علی صدر المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة۔

اخرج الامام البخاری رحمہ اللہ: عن جابر بن عبد اللہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عام الفتح وھو بمکۃ ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص ۲۹۸ باب البیع المیتۃ والاصنام) [۱]

غصب شدہ املاک کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض اوقات علاقائی جھگڑوں میں ایک قوم دوسری قوم کو مغلوب کر کے اس کی تمام جائیداد مال مویشی وغیرہ پر غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ کر کے ضبط کر لیتی ہے، تو کیا اس غاصب قوم سے مغلوب قوم کی غصب شدہ جائیداد خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے مال وجان پر غاصبانہ قبضہ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس طرح قبضہ شدہ جائیداد وغیرہ کسی فریق کی ملکیت بن سکتی ہے بلکہ ان غصب شدہ املاک کی واپسی شریعت مقدسہ نے واجب قرار دی ہے، اس بناء پر یہ قبضہ غصب شمار ہو کر اصل مالکوں یا ورثاء کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر اصل مالک یا ورثاء معلوم نہ ہوں تو اُن کی طرف سے فقراء ومساکین پر صدقہ کر کے اپنا ذمہ فارغ کر لیں، لہٰذا مشتری کو اگر یہ علم ہو کہ جو جائیداد وہ خرید رہا ہے وہ غصب کردہ اور ظلم وجبر سے ہتھیائی گئی ہے تو پھر اس کے لیے وہ جائیداد اور مال مویشی وغیرہ خریدنا جائز نہیں، اور جو بیع ہو جائے وہ بیع فضولی کے حکم میں ہو کر موقوف رہے گی۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ منہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۵۵ کتاب الغصب) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ علی بن سلطان محمد القاریؒ: حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام وان کانت من ذہب او فضۃ۔ (المرقاۃ ج ۶ ص ۲۹ باب الکسب وطلب الحلال۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُہٗ فی عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۵۴ باب بیع المیتۃ والاصنام۔

[۲] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: الغصب فی الشریعۃ اخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجہ یزیل یدہ ..... وعلی الغاصب رد العین المغصوبۃ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۳۷۰ کتاب الغصب)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۰۸ کتاب الغصب۔

بیٹے پر زمین فروخت کرنا | سوال:۔ کیا شریعتِ اسلامیہ میں والد اپنی مملوکہ زمین بیٹے پر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والد اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر قسم کے تصرفات کا حق رکھنے کے علاوہ جس پر بھی چاہے فروخت کرسکتا ہے، لہٰذا بیٹے پر زمین فروخت کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی یہ شرعاً ممنوع ہے۔

لما قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ:۔ دارٌ لرجل اومشترك بين الاب والرجل وللاب ابن صغير له ام فقالت اشتريت هذه الدار لابنی بماله والاب حاضر اواشتريت منكما لابنی بماله فقال بعنا وقع الملك للابن۔

(البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۳۶۷ باب الثانی فی بیع الاب والام والوصی) [۱]

باریک کپڑے کی تجارت کرنا | سوال: باریک کپڑے پہننے سے عموماً بدن صاف نظر آتا ہے کیا ایسے باریک کپڑے کی تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا باریک کپڑا جو دوہرا کرکے زیبِ تن کرنے کے باوجود بدن نظر آتا ہو تو ایسا کپڑا بے حیائی اور عریانی کا پیش خیمہ بننے اور پردہ متاثر ہونے کے باوجود فروخت کرنا درحقیقت اعانت علی المعصیۃ کے مترادف ہے، اس لیے ایسے کپڑوں کی تجارت سے اجتناب کرنا چاہیے تاہم ایجاب وقبول سے بیع تام ہوگی۔

لما قال العلامۃ محمد بن محمد ابن البزاز الکردویؒ: وبيع المكعب المفضض للرجال اذا علم انه يشتريه للبسه يكره۔ (البزازیہ علی ہامش الہندیہ ج۴ ص۳۵۲ الثالث فی المتفرقات) [۲]

---

[۱] لما قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضيخانؒ: امرءة قالت لزوجها وبينهما ولد صغير اشتريت منك دارك هذه لابننا بكذا وقال الاب بعتها جاز لان الاب لما قبل البيع فقد جاز شرائها للصغير فيجوز۔ (الخانية على هامش الهندية ج۲ ص۲۸۶ باب فی بيع غير المالك)

ومثله فی شرح مجلة الاحكام لسليم رستم باز تحت المادة ۱۶۷ ص۸۷۔

[۲] قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والا فتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل انه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام (رد المحتار ج۶ ص۳۹۲ كتاب الحظر والاباحة)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ نعيم بتغير يسير، فی آخر باب البغاة۔

کفار کے ملبوسات کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم اقوام کے عیسائی کے ملبوسات مثلاً پتلون اور ٹائی وغیرہ کی خرید و فروخت کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ وہ اشیاء جو بلا تغیر و تبدیل بے دینی اور معصیت کا آلہ ہوں یا کسی غیر مسلم قوم کا شعار ہوں ایسی اشیاء کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا ضروری ہے کیونکہ استعمال کی ممانعت خرید و فروخت کی ممانعت کی دلیل ہے تاکہ اعانت علی المعصیت کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والافتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل ان ه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام خياطاً امره ان يخذ له ثوباً على ذى الفساق يكره له ان يفعل لانه سبب التشبّه با لمجوس والفسقة۔[1]

(رد المحتار ج۶ ص۳۹۲ فصل فى البيع ۔ كتاب الكراهية)

غیر مسلموں کی متروکہ جائیداد فروخت کا حکم

سوال:۔ تقسیم ملک کے نتیجہ میں ہندوؤں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ان کی جائیدادیں وغیرہ رہ گئی ہیں ایک شخص نے کچھ حصہ پر قبضہ کرکے اُسے اپنی ملکیت میں لے لیا ہے، کیا اُس کے لیے اِس جائیداد کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم اقوام کی متروکہ جائیداد اور دیگر اشیاء چونکہ بیت المال اور قومی خزانہ کا حق بنتا ہے، اس بناء پر ذاتی مفاد کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر حکومت کی باضابطہ اجازت سے فروخت کی جائے اور رقم قومی خزانہ میں جمع ہو تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی۔

لما قال على بن ابى بكر المرغينانىؒ: وما اوجف المسلمون عليه من اموال اهل الحرب بغير قتال يصرف فى مصالح المسلمين كما يصرف الخراج قالوا هو مثل الاراضى التى اجلوا اهلها عنها۔ (الهداية ج۲ ص۵۶۴ باب المستأمن)[2]

---

[1] قال النبى صلى الله عليه وسلم: عن ابن عمرؓ قال قال عليه الصلوٰة والسلام من تشبّه بقوم فهو منهم۔ (ابو داؤد ج۲ ص۲۰۳ كتاب اللباس)۔ ومثله فى البحر الرائق ج۸ ص۱۴۳ كتاب الكراهية۔

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ: وما اخذ منهم بلا حرب ولا قهر كالهدية والصلح فهو لا غنيمة ولا فيئ وحكمه حكم الفيئ لا يخمس ويوضع فى بيت المال۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۸ مطلب فى بيان معنى الغنيمة والفيئ)

ومثله فى فتح القدير ج۵ ص۲۷۲ كتاب البيوع۔

بلا اجازت کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال :۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے ان کے حصّہ سے محروم کر دیتے ہیں، تو کیا ان لوگوں سے ایسی اراضی یا دیگر جائیداد خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بہنوں اور بیٹیوں کو جائیداد میں ان کے مقررہ حصّے سے محروم کرنا اسلامی تعلیمات کو پامال کرنے کے مترادف ہے اور ان کے حصّہ پر اُن کی رضامندی کے بغیر قبضہ کرکے فروخت کرنا مغصوبہ زمین کی فروخت کے حکم میں ہے، لہٰذا اُن کی اجازت کے بغیر فروخت کردہ زمین بیع فضولی کے حکم میں شمار ہو کر حصّہ داروں (بیٹیوں اور بہنوں) کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر وہ اجازت دیں تو بیع نافذ ہوگی ورنہ نہیں ۔

قال العلامة سلیم رستم باز : کلٌّ واحد من الشرکاء فی شرکة الملك اجنبی فی حصّة سائرهم فلیس احدهم وکیلاً عن الآخر ولا یجوز لاحدٍ منهم ان یتصرف فی حصّة شریکه بدون اذنه ۔ (شرح مجلة الاحکام ، المادة ۱۰۷۵ ص ۶۰۱ الفصل الثانی فی بیان کیفیة التصرف فی الاعیان المشترکة) [1]

حقِ تعلّی کی فروخت کا حکم

سوال :۔ موجودہ دور میں بعض مقامات میں لوگوں کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین فروخت کرتے وقت یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ آپ کو دس فٹ کے اندر اندر ایک چھت بنانے کی اجازت ہوگی، اگر دس فٹ سے مکان اونچا کرنا ہو تو اس کی بھی قیمت ادا کرنا ہوگی، البتہ اس کی قیمت نیچے والے حصّہ سے کم ہوگی ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زمین فروخت کرتے وقت اس قسم کی شرط عائد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ فضا مال نہیں کیونکہ اس کا احراز ممکن نہیں، اور حقوقِ مجردہ کی فروخت شرعاً ممنوع ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ نیچے والی منزل

---

[1] قال فی الهندیة : ولا یجوز لاحدهما ان یتصرف فی نصیب الآخر الا بامره وکل واحدٍ منهما کالاجنبی فی نصیب صاحبه ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۳۰۱ الفصل الاوّل فی بیان انواع الشرکة)
وَمِثْلُهٗ فی البرجندی ج ۳ ص ۱۳۲ کتاب الشرکة ۔

ایک آدمی کی ہو اور اوپر والی منزل کسی دوسرے کی ہو اور خدانخواستہ دونوں گر جائیں تو اوپر والا اپنا حق نیچے والے پر فروخت کردے تو یہ بیع ناجائز ہوگی کیونکہ یہ حق تعلی ہے اور حقِ تعلی کی فروخت سے فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: سفل وعلو بین رَجُلَیْنِ انھدما فباع صاحب العلو علوہ لم یجز لان الھواء لیس بمالٍ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیه فانواع) [1]

شرط لگا کر کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی پر اپنا گھر فروخت کرتے وقت یہ شرط لگا دی کہ میں آٹھ مہینے تک اس گھر میں رہوں گا، کیا اس شرط کے ساتھ یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گھر کی بیع کو اس شرط پر موقوف رکھا گیا کہ اگر مشتری اس شرط کو قبول نہ کرتا تو بائع اس پر راضی نہ ہوتا تو یہ بیع فاسد ہوگی کیونکہ شریعتِ مقدسہ نے بیع و شرائع کے دوران ہر اُس شرط کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں کسی ایک جانب یا مبیعہ کو فائدہ ہو، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں بیع فاسد تصور ہوگی۔ تاہم اگر بیع کو اس شرط پر موقوف نہیں کیا گیا بلکہ مشورے کی حیثیت سے رکھا گیا تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں جس کے نتیجے میں اس کی رعایت ضروری نہیں بلکہ شرط کی رعایت احسان کے مترادف ہوگی۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا بیع بشرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدھما او لمبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد) [2]

کسی چیز پر قبضہ کر لینے کے بعد زائد قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے ایک گاڑی ایک لاکھ روپے میں

---

[1] قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: لان حق التعلی لیس بمال لان المال مایمکن احرازہ۔ (الھدایة علی صدر فتح القدیر ج۶ ص۱۶۶ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: لو کان فی الشرط منفعة لاحد المتعاقدین بان شرط البائع ان یقرض المشتری او علی القلب یفسد العقد۔ (خلاصة الفتاوی ج۳ ص۵۰ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی البیع) ومثلہ فی الھندیة ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع الخ۔

خریدی اور قبضہ کر کے دوسرے شخص پر دو لاکھ روپے میں فروخت کر دی، دوسرے شخص نے خرید کر تیسرے آدمی پر دو لاکھ دس ہزار روپے میں فروخت کر دی، تو کیا یہ معاملہ سود در سود ہے یا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: شریعت نے قبل القبض کسی چیز میں تصرف کی اجازت نہیں دی ہے لیکن باقاعدہ طور پر کسی چیز کو قبضہ کر کے فروخت کرنے کو مشروع رکھا ہے، لہٰذا بائع اور مشتری کے درمیان جو بھی قیمت مقرر ہو جائے وہی صحیح اور مشروع ہے۔

قال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ: ھو مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔

(فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)[۱]

بغیر زمین کے پانی فروخت کرنا

سوال: اگر کسی زمین کا حق شرب بغیر زمین کے فروخت کیا جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہو گی یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے ماء محرز (یعنی وہ پانی جو کسی برتن میں محفوظ ہو) کے علاوہ عام پانی کو مباح الاصل قرار دیا ہے اور زمین کا حق شرب زمین کے توابع میں شمار کیا ہے۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر بلا تذکرہ شرب زمین فروخت کی جائے تو زمین کے ساتھ حق شرب خود بخود شامل ہو گا۔ لہٰذا مفتیٰ بہ اور ظاہر الروایۃ قول کے مطابق مستقل طور پر حق شرب کی خرید و فروخت، ہبہ یا تصدق وغیرہ جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولا یباع الشرب ولا یوھب ولا یؤجر ولا یتصدق بہ لانہ لیس بمال متقوم فی ظاھر الروایۃ وعلیہ الفتوٰی۔ (رد المحتار ج ۵ ص۸۰ باب البیع الفاسد)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ جلال الدین رحمہ اللہ: البیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔

(کفایۃ شرح الھدایۃ فی ذیل فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)

ومثلہ فی العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج ۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع۔

[۲] قال العلامۃ قاضیخانؒ: ولا یجوز بیع مسیل الماء وھبتہ ولا بیع الطریق بدون الارض وکذلک بیع الشرب۔

(فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۲ ص۱۵۴ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)

ومثلہ فی شرح المجلۃ تحت المادۃ ۲۱۶ ص۱۰۵، الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ وما لا یجوز۔

کسی گاڑی کی متوقع آمدنی فروخت کرنا

سوال:۔ دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ طور پر ایک بس خریدی، اب دونوں میں سے ایک نے کہا کہ بس کا تمام تر سالانہ منافع مجھے اتنی رقم پر فروخت کر دو، تو کیا یہ عقد شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت کے لیے شریعت نے مبیعہ کی موجودگی ضروری قرار دی ہے، صورتِ مذکورہ میں چونکہ سالانہ منافع یا اصل نامعلوم اور معدوم ہے، لہٰذا یہ بیع معدوم کے زمرہ میں شمار ہو کر باطل ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: منها ان یکون موجودًا فلا ینعقد بیع المعدوم وماله خطر العدم۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۳۸ کتاب البیوع فصل واما الذی یرجع الی المعقود الخ)[1]

مقررہ نرخوں سے زیادہ قیمت پر مال فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کھاد کی ایجنسی کھول رکھی ہے اور وہ گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کردہ نرخوں پر کھاد فروخت کرتا ہے، بعض اوقات کھاد شارٹ ہونے کی وجہ سے مارکیٹ میں کم ملتی ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہی ڈیلر کھاد زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں یہ کھاد ڈیلر گورنمنٹ کا وکیل نہیں کیونکہ کاروبار کا تمام تر منافع مالک ہی کو ملتا ہے لیکن اس نے گورنمنٹ سے کھاد مقررہ نرخوں پر فروخت کرنے کا عہد و پیمان کر رکھا ہے اور گورنمنٹ اُسے نرخ بتا کر کھاد دیتی ہے، لہٰذا اس سے زائد نرخ پر فروخت کرنے میں بدعہدی لازم آتی ہے اور زائد نرخوں پر فروخت کرنے سے جھوٹ، مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی، بے رحمی اور بے جا سختی لازم آتی ہے، اس لیے اس سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وبیع مالیس فی ملکه لبطلان المعدوم اذ من شرط المعقود علیه ان یکون موجودًا مالاً متقومًا فی نفسه۔
(ردالمحتار ج۵ ص۵۸ کتاب البیوع مطلب الآدمی مکرم شرعاً ولو کافراً)
ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۱ کتاب البیوع۔

ـلـه قال الله تبارك وتعالىٰ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۴)

بیع میں اجنبی کے فعل کی شرط لگانا

سوال:- ایک شخص نے کسی پر اس شرط سے زمین فروخت کی کہ فلاں شخص مجھ پر معینہ قطعہ اراضی فروخت کرے گا اور اگر اس نے فروخت نہ کی تو میں بیع واپس کرنے کا مجاز ہوں گا، باقاعدہ بیع کے بعد اُس شخص نے اس پر معینہ قطعۂ اراضی فروخت کرنے سے انکار کر دیا، تو اب بائع کہتا ہے کہ چونکہ میں نے اپنی زمین کی واپسی کی شرط لگائی تھی لہٰذا میں اپنی بیع کو منسوخ کرتا ہوں، تو کیا اس کو اپنی زمین واپس لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیع میں وہ شروط پورے کرنے ہوتے ہیں جو کہ بیع کے مقتضیات یا لوازماتِ عقد میں سے ہوں، تو شرط مذکورہ چونکہ ملازمات اور مقتضیات میں سے نہیں اور نہ ہی مفسد للعقد ہے کیونکہ اسے اجنبی کے فعل سے معلق کیا گیا ہے، اس بناء پر یہ عقد صحیح ہو کر شرط فاسد شمار ہوگی، پس بائع کو زمین واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وفی المنتقی قال محمد کل شئ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل (ای فا لشرط باطل منحة الخالق) کما اذا اشتری دابة علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۸۶ باب البیع الفاسد) ـٰـه

ایجاب وقبول کے وقت مبیعہ کو مشتری کے حوالہ کرنے کے لیے چند دن کی مہلت کی شرط لگانا

سوال:- عقدِ بیع کے دوران یہ شرط لگانا کہ مبیعہ ابھی نہیں بلکہ چند دن حوالہ کروں گا، تو کیا بائع کے لیے یہ شرط لگانا شرعاً

ـلـه قال العلامة التمرتاشیؒ: ولا یسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمة تعدیا فاحشا فیسعر بمشورة اهل الرای۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۰۰ کتاب الکراهیة۔ فصل فی البیع)

ـٰـه قال العلامة ابن عابدینؒ: المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الولوالجیة بعتك الدار بالف علی ان یقرضنی فلان الاجنبی عشرة دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولاخیار للبائع۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۸۵ مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر بعد العقد او قبله)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۸۹ ص ۸۹

جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرط مذکورہ نہ تو بیع کے مقتضیات میں سے ہے اور نہ ملازمات میں سے ہے بلکہ بائع کے فائدہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بیع کیا گیا ہے اور مبیعہ حوالہ کرنے میں مہلت کی شرط لگانا فقہاء نے شرطِ فاسد قرار دیا ہے، اسی بناء پر مذکورہ شرط بھی ناجائز ہے، البتہ اگر رقم پیشگی بطورِ وعدہ چند دن بعد مبیعہ حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو بیع استجرار کی رُو سے یہ پیشگی رقم وعدۂ بیع شمار ہو کر مبیعہ حوالہ کرتے وقت بیع منعقد ہو جائے گی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع عینًا علیٰ ان لا یسلمه الیٰ رأس الشهر فالبیع فاسد لان الاجل فی المبیع العین باطل فیکون شرطًا فاسدًا وهذا لان الاجل شرع ترفیهًا فیلیق بالدیون دون الاعیان۔ (الهدایة ج۳ ص۶۳ باب البیع الفاسد) [۱]

نفع کی خاطر گاہک کو دوسری دوکان سے سودا لینے کیلئے قرض پر رقم دینا

سوال: ایک شخص کسی دوکاندار سے کوئی چیز قرض پر خریدنا چاہتا ہے لیکن وہ چیز دوکاندار کے پاس نہیں ہے اور دوکاندار اس شرط پر گاہک کو قرض رقم دیتا ہے کہ مجھے اتنا منافع دو گے، تو کیا ایسا کرنا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ دوکاندار گاہک کو قرض رقم دے کر منافع کا مطالبہ کرتا ہے قرض دینے کی صورت میں کسی قسم کا منافع حاصل کرنا شرعًا ممنوع ہے، اسلئے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شرط لگا کر قرض دینے سے شرط پر عمل لازم نہیں ہے، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں قرض لینے کے بعد نہ تو گاہک کو منافع دینا ضروری ہے اور نہ دوکاندار کو لینا جائز ہے۔

لما قال النبی صلی الله علیه وسلم: کل قرض جرّ نفعًا فهو ربوا۔ (نصب الرایة ج۴ ص۶۰ کتاب الحوالة) [۲]

---

[۱] قال فی الهندیة: اذا شرط الاجل فی المبیع العین فسد العقد وان شرط الاجل فی الثمن والثمن دین فان کان الاجل معلومًا جاز البیع وان کان مجهولًا فسد البیع۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۳۲ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع الخ)
ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۸۵ باب البیع الفاسد۔

[۲] قال الحصکفیؒ: القرض بالشرط حرام والشرط لغو۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۵ ص۱۶۶ فصل فی القرض)
ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۸۷ کتاب البیوع، باب المتفرقات۔

عیب دار اشیاء کی خرید و فروخت کرنا

سوال:- ایک دوکاندار کے پاس مختلف اقسام کی گندم ہے جسے وہ مختلف نرخوں میں فروخت کرتا ہے، اگر دوکاندار ان مختلف اقسام کی گندم کو ملاکر ایک علیٰحدہ قسم نکالے جس میں ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کی گندم شامل ہو، تو کیا یہ طریقۂ تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر دوکاندار گندم کی حقیقت چھپاکر خریدار پر اعلیٰ قیمت پر فروخت کرے تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر گاہک کو بتاکر فروخت کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بائع کی نشاندہی کے بعد عیب دار چیز کی فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، کسی چیز کے عیب کو چھپاکر فروخت کرنا گناہ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لایحل کتمان العیب فی مبیع او ثمن لان الغش حرام۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۷ کتاب البیوع، باب خیار العیب)[1]

نقد رقم قرض دینے کی بجائے کوئی چیز مہنگی دینا

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے تین ہزار روپے قرض لینا چاہا، بجائے قرض رقم کے اس نے ایک کپڑا ساڑھے تین ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کیا جبکہ بازار میں اس کپڑے کی قیمت تین ہزار روپے ہے، ضرورت مند نے کپڑا لیکر بازار میں اسکو تین ہزار روپے میں فروخت کر دیا، اس صورت میں قرض دینے والے کو پانچسو روپے منافع ملا اور ضرورتمند کو تین ہزار روپے ملے، جبکہ بعد میں کپڑا لینے والا شخص کپڑا دینے والے کو تین ہزار روپے کی بجائے تین ہزار پانچسو روپے ادا کرے گا، تو کیا از روئے شرع یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ اس صورت میں قرض دے کر ضرورتمند کی خیرخواہی کی بجائے مفاد پرستی نمایاں نظر آتی ہے لیکن بیع کی جملہ شرائط کی رعایت کی وجہ سے یہ عقد جائز ہے، اس صورت میں مشتری کا مقصد اور ضروریات پوری ہو جاتی ہیں جبکہ بائع کو بوجہ نسیئہ مروجہ قیمت سے زیادہ

---

[1] قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: اذا اطلع المشتری علیٰ عیب المبیع فھو بالخیار ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۴۲ باب خیار العیب، کتاب البیوع)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۵ باب خیار العیب۔ کتاب البیوع۔

رقم ملتی ہے جس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ نقد کی نسبت اُدھار میں زیادہ قیمت لگانا جائز ہے۔

لما قال العلامۃ کمال الدین ابن الھمام رحمہ اللہ: کان یحتاج المدیون فیأبی المسئول ان یقرض بل ان یبیع ما یساوی عشرۃ بخمسۃ عشر الی اجل فیشتریہ المدیون ویبیعہ فی السوق بعشرۃ حالۃ ولا بأس فی ھذا فان الرجل تام لہ قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیہ دائماً بل ھو مندوب فان ترکہ بمجرد رغبۃ منہ الی زیادۃ الدنیا فمکروہ او لعارض یعذر بہ فلا -------- ومالم ترجع الیہ العین التی خرجت منہ لا یسمّی بیع العینۃ لانہ من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً والا فکلُّ بیعٍ بیع العینۃ ـ (فتح القدیر ج۶ ص۳۲۴ الکفالۃ) [1]

آٹا پیسنے کے عوض اناج جمع کرکے فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل بعض علاقوں میں مشین سے آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ لی جاتی ہے، تو کیا آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا اور اسے جمع کرکے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا جائز ہے لہٰذا آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ جمع کرکے اپنے لیے استعمال کرنا یا فروخت کرنا دونوں طرح جائز ہے، البتہ پسے ہوئے آٹا سے خصوصی طور پر مزدوری مقرر کرکے لینا قفیز الطحان کے حکم میں ہو کر اجارہ فاسدہ رہے گا۔

لما قال ابن عابدین رحمہ اللہ: استاجر بغلاً لیحمل طعاماً ببعضہ او ثوراً لیطحن بُرّہ

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: فان لم یعد کما اذا باعہ المدیون فی السوق فلا کراھۃ فیہ بل خلاف الاولیٰ لان الاجل قابلہ قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیہ دائماً بل ھو مندوب ومالم ترجع الیہ العین التی خرجت منہ لا یسمّی بیع العینۃ لانہ من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً والا فکلُّ بیع بیع العینۃ واقرہ فی البحر والنھر والشرنبلالی وھو ظاھر وجعلہ السیّد ابو السعود محمل قول ابی یوسفؒ وحمل قول محمدؒ والحدیث علیٰ صورۃ العود۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۲۶ کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب بیع العینۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۳۵ کتاب الکفالۃ۔

ببعضٍ دقیقه فسدت .... والحیلة ان یفرز الاجر اولاً او یسمی قفیزاً بلا تعین ثم یعطیه قفیزاً منه فیجوز قال الرملی وبه علم بالاولیٰ الجواز مایفعل فی دیارنا من اخذ الاجرة من الحنطة والدراھم معاً ولا شك فی جوازہ۔

(ردالمحتار ج ۶ ص ۵۷ کتاب الحظر والاباحة۔فصل فی البیع) لہ

مشترکہ زمین سے اپنا حصّہ فروخت کرنا

سوال:۔ چند آدمیوں کے درمیان دس کنال مشترکہ زمین ہے، ان میں سے ایک حصّہ دار اپنا حصّہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا شریعتِ مقدّسہ میں مشترکہ زمین سے کسی حصّہ دار کو اپنا حصّہ فروخت کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ زمین سے اپنا معلوم حصّہ فروخت کرنا از روئے شرع جائز ہے اگرچہ تقسیم نہ ہوئی ہو، تاہم اگر اپنا حصّہ فروخت کرتے وقت معلوم نہ ہو کہ مثلاً ثلث ہے یا ربع، ایک کنال ہے یا دو کنال، تو ایسی صورت میں یہ بیع جہالت کی وجہ سے باطل شمار ہو کر ناجائز ہوگی۔

لما قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع حصة شائعةٍ معلومة کالنصف والثلث والعشر من عقار مملوك قبل الافراز صحیح لانه لایشترط فی صحة البیع الافراز عند التسلیم لا تفاقھم علیٰ صحة بیع مشاع لایمکن افرازہ۔ (شرح مجلّة الاحکام تحت المادة ۲۱۴/۲۱۵ ص ۱۰۳)ےلہ

لہ قال فی الھندیة: والحیلة فی ذٰلك لمن اراد الجواز ان یشترط صاحب الحنطة قفیزاً من الدقیق الجید ولم یقل من ھٰذہ الحنطة۔ (الفتاوٰی الھندیة ج۴ ص ۴۴۴، کتاب الاجارة، الفصل فی قفیز الطحان وماھو فی معناہ)۔

وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلّة لسلیم رستم باز تحت المادة ص ۲۶۔

۲ہ قال محمود بن اسماعیل الشھیر بابن قاضی سماوةؒ: اما بیعه فقسمان یحتمل القسمة اولا وکل قسم علیٰ وجھین اما ان باع من اجنبی او من شریکه فالوجه الاوّل وھو البیع من اجنبی علیٰ صنفین واما ان کان الکل له فباع نصفه اوکان بین اثنین فباع احدھما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع کلھا۔ (جامع الفصولین ج ۲ ص ۸۳ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل الشیوع)

وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۲۲۶ کتاب البیوع۔

مشترکہ طور پر خریدی ہوئی چیز سے اپنا حصہ نکالنے کا طریقہ

سوال:- چند ساتھیوں نے آپس میں رقم جمع کرکے ایک چیز خریدی، چند ماہ کے استعمال کے بعد ان میں سے ایک نے اپنا حصہ واپس لینا چاہا تو کیا اُس ساتھی کو اس چیز کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے رقم واپس کی جائے گی یا قیمتِ خرید کے حساب سے؟ جبکہ استعمال کی وجہ سے اُس چیز کی قیمت کافی کم ہوگئی ہو؟

الجواب:- کوئی چیز مشترکہ طور پر خرید کر استعمال کرنے کے بعد جب کوئی حصہ دار اپنا حصہ واپس لینا چاہے تو اس کو موجودہ وقت کی قیمت کے اعتبار سے رقم واپس کی جائے گی نہ کہ قیمتِ خرید کے مطابق، کیونکہ کسی چیز کے استعمال کرنے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسکی قیمت میں بھی ضرور اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے۔

لما قال علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: ولو تراضيا ان تقوم الكتب ويأخذ كل بعضها بالقيمة لو كان بالتراضي جاز والا لا۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۶ ص۲۶۱ كتاب الحظر والاباحة)[1]

زیادہ منافع کی اُمید پر کسی چیز کی فروخت میں تاخیر کرنا

سوال:- کاروبار کے سلسلے میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے شہر سے حیوانات کی خوراک یا غلّہ وغیرہ لائے اور اس وقت مارکیٹ میں مندی ہو، اب یہ شخص اس امید پر مال کی فروخت چند ماہ کے لیے مؤخر کردے تاکہ بعد میں منافع زیادہ ملے۔ کیا اس شخص کا یہ اقدام ذخیرہ اندوزی کے دائرہ میں آکر حرام ہے یا جواز کی گنجائش ہے؟

الجواب:- ذخیرہ اندوزی میں بنیادی طور پر مقامی لوگوں کی حق تلفی کرکے اپنے منافع و فوائد پیشِ نظر ہوتے ہیں لیکن کسی دوسرے شہر سے اجناس وغیرہ اپنے شہر یا گاؤں کو منتقل کرنے سے اس گاؤں والوں کا حق نہیں رہتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا یہ اقدام جائز ہے کیونکہ اس میں مقامی لوگوں کی حق تلفی نہیں ہوتی، تاہم مسلمانوں کو تکلیف میں دیکھتے ہوئے

---

[1] قال فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندي رحمه الله: والعبد الواحد والدابة الواحدة يباع ويقسم ثمنها لانها لا تحتمل القسمة وكذلك كل ما يكون في تبعيضه ضرر۔

(الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۱۵۰ كتاب القسمة)

ومثله في شرح المجلة لسليم رستم باز تحت المادة ۱۱۴۲ ص۶۳۳۔

ذاتی مفادات کو ترجیح دینا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ومن احتکر غلّة ضیعته او ما جلبه من بلدٍ اٰخر فلیس بمحتکر۔ (الهداية ج۴ ص۴۷۱ کتاب الکراهية فصل فی البیع)[1]

بیع قطعی سے انحراف درست نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے کسی بہ خوشی و رضا اپنی دوکان پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کی اور مشتری نے کچھ رقم ادا کرکے باقی کا وعدہ کیا، چند دنوں کے بعد یہی بائع کسی اور آدمی کے ساتھ دوکان کا سودا کرنا چاہتا ہے، کیا بائع کے لیے اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باضابطہ طور پر ایجاب و قبول کے بعد بائع بیع فسخ کرکے مبیعہ کو کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا شرعاً حق نہیں رکھتا، البتہ اگر بائع اور مشتری نے آپس میں باہمی رضامندی سے بیع فسخ کر لی تو بائع کے لیے مبیعہ کسی دوسرے کو دینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحدٍ منهما من عیبٍ او عدم رؤیةٍ۔ (الهداية ج۳ ص۲۵ کتاب البیوع)[2]

بائع اور مشتری کا ایک بار تولنے پر اکتفاء کرنا

سوال:۔ جب موزونی یا مکیلی اشیاء ناپ تول کے حساب سے خریدی جائیں، اگر مشتری کے سامنے ایک دفعہ جب چیز تولی جائے تو کیا مشتری کے لیے دوبارہ تولنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی چیز کو ناپ تول کے حساب سے خرید کر جب طرفین کی موجودگی میں اس

---

[1] قال فی الهندية: ومن اشتریٰ طعامًا فی مصرٍ و جلبه الی مصرٍ اٰخر واحتکره فیه فانه لا یکره هٰکذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندية ج۳ ص۲۱۳ فصل فی الاحتکار، کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: البیع یلزم بایجاب وقبول ای حکم البیع یلزم بهما لانه جعلهما غیره وانه یلزم بهما مع ان البیع لیس الا هما لانهما اکناه۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۶۲ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی التبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

معلوم چیز کو ناپ تول لیا جائے تو مشتری کو دوبارہ ناپ تول کی ضرورت نہیں بلکہ خریدنے کے بعد دونوں کی موجودگی میں ہی تو لنا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : قال فی الخانية لو اشتری کیلیًا مکایلةً او موزونًا موازنةً فکال البائع بحضرة المشتری۔ قال الامام ابن الفضل یکفیه کیل البائع ویجوز له ان یتصرف فیه قبل ان یکیله ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۵۱ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض) ؎۱

شرکاء کا اپنے حصص کا کسی ایک شریک کے ہاتھ فروخت کرنا

سوال :- چند شرکاء آپس میں مشترکہ طور پر کوئی چیز خریدتے ہیں خریدنے کے بعد آپس میں یہ شرکاء بولی کر کے جو زیادہ قیمت پر آمادہ ہو تو وہ مبیعہ لیکر ہر ایک شریک کو اپنی رقم مع منافع واپس کرتا ہے، تو کیا یہ معاملہ شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں چونکہ تمام شرکاء مشترکہ طور پر کوئی چیز لے کر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے والا ہو تو مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، پس اس میں اگر نیلام سے طے شدہ رقم اپنے حصّہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ جائز رہے گا ورنہ مجموعہ کو خریدنا جس میں اپنا حصّہ بھی شامل ہو جائز نہیں۔

لما قال فی مجلة الاحکام : الشریك مخیر ان شاء باع حصته من شریکه وان شاء باعها من اجنبی بدون اذن شریکه ۔ لکن فی صور خلط الاموال واختلاطها التی بینّاها فی الفصل الاوّل ۔ (مجلة الاحکام المادة ۱۰۸۸ ص۱۲۱) ؎۲

؎۱ قال ابن نجیمؒ : اما اذا کاله فی حضرته فانه یغنی عن کیله وهو الصحیح لان المبیع صار معلومًا بکیل واحد ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۸ ، فصل فی بیان التصرف فی المبیع والثمن قبل قبضه) ومِثلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۸۵ کتاب البیوع ۔

؎۲ قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : وکل من شرکاء الملك اجنبی فی مال صاحبه، فصح له بیع حصته ولو من غیر شریکه بلا اذن الا فی صورة الخلط ۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۰۰ کتاب الشرکة ۔ مطلب الحق ان الدین یملك) ومِثلُهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ ۔

قرض کو فروخت کرنا

سوال: میں سعودی عرب میں کاروبار کرتا تھا وہاں میرا کسی قسم دس ہزار روپے قرضہ ہے لیکن اب وہاں جانا اور اپنا قرض وصول کرنا بہت ہی مشکل ہے اس لیے میں یہ قرض کسی پہ نو (۹) ہزار روپے پر فروخت کرنا چاہتا ہوں، کیا قرض کی رقم اس طرح فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: مقروض کے علاوہ کسی اور پر قرض فروخت کرنا فقہاء نے ممنوع قرار دیا ہے صورتِ مذکورہ میں چونکہ نقد نو ہزار روپے کے بدلے قرض کے دس ہزار روپے لیے جاتے ہیں جو کہ ربٰوا نسیئہ کی وجہ سے اس کا خرید نا حرام ہوگا۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : وبیع الدّین لا یجوز ولو باعہ من المدیون او وھبہ جاز۔ (الاشباہ والنظائر ج ۴ ص۱۲ المادۃ م۱۶ کتاب البیوع)

غیر مسلموں کی متروکہ اشیاء فروخت کرنا

سوال: کسی ملک میں غیر مسلم کچھ عرصہ تک آباد رہنے کے بعد وہاں سے چلے جائیں تو ان کی باقیماندہ اشیاء کا کیا حکم ہے ؟ کیا ان کو فروخت کرکے حاصل ہونے والی قیمت کو ذاتی استعمال میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: کسی مسلم ملک سے غیر مسلم اقوام کے چلے جانے کے بعد ان کی رہ جانے والی جائیداد یا دیگر اشیاء ذاتی مفاد کے لیے فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے بلکہ ان اشیاء کو یا ان کی قیمت کو بیت المال کے حوالہ کرنا ہوگا، اور اگر بیت المال کا کوئی قابلِ اعتماد انتظام نہ ہو بلکہ اُس میں ان اشیاء کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کسی ایسی جگہ میں خرچ کرنا مناسب ہے جہاں سے عمومی مفادات وابستہ ہوں، ایسے اموال کے لیے دینی مدارس اور درسگاہیں بہترین مقاماتِ مصرف ہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ : وما اوجف المسلمون علیہم من اموال

لـه قال ملك العلماء علامه کاسانی رحمه الله : بيع هذه الديون من غير من عليه والشراء بها من غير من عليه فينظر ان اضاف البيع والشراء الی الدين لم يجز۔
(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۸۲ فصل واما شرائط الصحة)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی تنقیح حامدیۃ ج ۲ ص۲۴۹ کتاب المداینات۔

اهل الحرب بغیر قتال یصرف علیہ فی مصالح المسلمین کما یصرف الخراج قالوا هو مثل الاراضی التی اجلوا اهلها عنها۔ (الهدایة ج ۲ ص۵۶۴ کتاب السیر، فصل: واذا دخل الحربی الینا۔ الخ)[۱]

ہم جنس موزونی اشیاء کو بلا وزن فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں کچھ اشیاء بغیر تول کے فروخت کی جاتی ہیں، پس اگر بعض موزونی اشیاء مثلاً پیاز، لہسن وغیرہ اندازہ سے بغیر تول کے اپنی ہم جنس پر فروخت کی جائیں تو از روئے شرع یہ بیع درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ موزونی اشیاء بغیر تول کے اپنی جنس پر فروخت کرنا اور تبادلہ میں لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں ربٰوا (سُود) کا شُبہ پایا جاتا ہے، پس یہی شبہ حقیقی ربٰوا کے قائم مقام ہو کر بیع جائز نہ ہوگی۔

لما قال علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز بیع الطعام والحبوب مکایلة و مجازفة وهذا اذا باعه بخلاف جنسه لقوله علیه السلام اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم بعد ان یکون یداً بید بخلاف ما اذا باعه بجنسه مجازفة لما فیه من احتمال الربٰوا۔ (الهدایة ج ۳ ص۲۷ کتاب البیوع)[۲]

گڑ کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں گڑ صاف کرنے کے لیے

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وما اخذ منهم بلا حرب ولا قهر کالهدیة والصلح فهو لا غنیمة ولا فیئٌ وحکمه حکم الفیٔ لا یخمس ویوضع فی بیت المال۔
(رد المحتار ج ۴ ص۱۳۸ باب المغنم وقسمته، مطلب فی بیان معنی الغنیمة والفیٔ)
وَمِثْلُهُ فی فتح القدیر ج ۵ ص۲۷۳ کتاب السیر۔

[۲] قال ابن نجیم رحمه الله: ویباع الطعام کیلاً وجزافاً للحدیث البخاری فاذا اختلف هذه الاصناف فبیعوا کیف شئتم ولا یرد علیه بیع الجنس بالجنس من الربٰوا مجازفةً لما سیأتی فی الربٰوا من انه غیر جائز الا اذا کان قلیلاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۸۲ کتاب البیوع)
وَمثلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۴۷۹ کتاب البیوع۔

رنگ کاٹ (خاص قسم کا کیمیکل) استعمال کیا جاتا ہے تاکہ سفید ہو کر قیمت بڑھ جائے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور بیع پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب:۔ اگر گڑ کی صفائی اور اس کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر رنگ کاٹ کے استعمال کا مقصد ادنیٰ قسم کو اعلیٰ ظاہر کرنا ہو یا مشتری کی تلبیس اور اسے دھوکہ دینا مقصود ہو تو یہ ملاوٹ کے مترادف ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مرّ برجل یبیع طعامًا فسئله کیف تبیعه فاخبره فاوحی الیه ان ادخل یدك فادخل یده فیه فاذا هو مبلول فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس منّا مَنْ غَشّ۔

(ابوداؤد ج۲ ص۱۳۳ باب نهی عن الغش۔کتاب البیوع)[1]

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت (کاروبار) کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جمعہ کے دن جب وقت داخل ہونے پر اذان دی جائے تو اُس وقت جمعہ کے متعلقہ امور کے علاوہ دیگر امور میں مصروف ہونا مناسب نہیں، اس بنا پر جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جمعہ کی سعی اور تیاری متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کو موقوف کر دینا چاہیئے۔

لما قال الله تبارك وتعالیٰ: يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورة الجمعة آیت ۹)[2]

---

[1] قال فی الهندیة: ویکره ان یلبس الجید بالردی وان یصبغ اللحم بالزعفران۔
(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۲۱۵ فصل فی الاحتکار)

وَمِثْلُهُ فی ردالمحتار ج۵ ص۱۰۲ باب البیع الفاسد، بعد مطلب احکام نقصان المبیع فاسدًا۔

[2] لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: والبیع عند اذان الجمعة قال الله تعالیٰ وذروا البیع ثم فیه اخلال بواجب السعی علی بعض الوجوه وقد ذکرنا الاذان المعتبر فیه فی کتاب الصلوة کل ذلك یکره لما ذکرنا ولا یفسد به البیع۔ (الهدایة ج۳ ص۴۹ فصل فیما یکره۔کتاب البیوع)

وَمِثْلُهُ فی البحرالرائق ج۶ ص۹۹ فصل فی البیع الفاسد۔

ضرورت سے زائد روٹیاں جمع کرکے فروخت کرنا

سوال:۔ بعض لوگ ضرورت سے زائد روٹیاں (ٹکڑے وغیرہ) جمع کرکے فروخت کرتے ہیں تو کیا ان روٹیوں کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید وفروخت کے لیے بنیادی طور پر کسی چیز کا مال متقوم ہونا لازمی ہے، اس بناء پر روٹی اور آٹا چونکہ مال متقوم میں سے ہے لہٰذا اسکی خرید وفروخت شرعًا جائز ہے۔

لما قال فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: وشرطه ان یکون فی العقد عوضان کل واحد منهما مال یتحقق رکن البیع وهو مبادلة المال بالمال۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۱۰۶ فصل فی قبض المشتری المبیع فی البیع الفاسد بامر البائع) [1]

کاریز کا پانی فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں پانی کی کمی دُور کرنے کے لیے کاریز استعمال کئے جاتے ہیں، تو کیا ان کاریزوں سے حاصل ہونے والا پانی فروخت کرنا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کاریز کو نہر جاری کے حکم میں شمار کیا ہے، نہر کے پانی کی طرح کاریز کا پانی بھی مملوک اور محرز نہیں اسلئے کاریز کا پانی فروخت کرنا جائز نہیں، تاہم اگر اس کو باقاعدہ طور پر محرز کرکے فروخت کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: والثالث اذا دخل الماء فی المقاسم فحق الشفعة ثابت..... ولان البئر ونحوها ما وضع للاحراز ولایملك المباح بدونه کالظبی اذا تکنس فی ارضه۔ (الهدایة ج۴ ص۴۸۲ فصول فی مسائل الشرب) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وقید بقوله وکل من عوضیه مال لیخرج البیع بالمیتة وکل بیع باطل۔ (البحرالرائق ج۶ ص۹۲ فصل فی البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی حاشیة الشلبی علی هامش تبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: والقناة مجری الماء تحت الارض ---- لانه نهر فی الحقیقة تعتبر بالنهر ولان الانهار والابار والحیاض لم توضع للاحراز والمباح لایملك الا بالاحراز۔ (البحرالرائق ج۸ ص۲۱۲ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۶ ص۴۳۹ کتاب احیاء الموات۔

بیع فضولی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کی مملوکہ زمین اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اس کے بھائی نے فروخت کر دی، اب وہ اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہے، اس کے اصرار کے باوجود بھی مشتری واپس کرنے پر رضامند نہیں، تو اب مذکورہ زمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ کسی کی مملوکہ زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر شرعاً کسی کو بھی تصرف کا حق حاصل نہیں لہٰذا جو زمین کسی کی بذریعہ شہادت ثابت شدہ و تسلیم شدہ ملکیت ہو تو اُس میں کسی اور کا تصرف درست نہیں اور وہ شرعاً اپنی ملکیتی زمین واپس لینے کا مجاز ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع ملك غیرہ بغیر امرہ فالمالك بالخیار ان شاء اجاز البیع وان شاء فسخ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۹۰ کتاب البیوع۔ فصل فی بیع الفضولی) [1]

جانوروں کے خون کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ جانوروں کا خون بیچنا کیسا ہے، اور اس سے انتفاع کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خون بذاتِ خود ایک نجس شے ہے اور اسلام نے اس کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے، اس سے بلا ضرورتِ شرعی انتفاع لینا بھی صحیح نہیں، لہٰذا جانوروں کے خون کی خرید و فروخت اور اس سے انتفاع دونوں صحیح نہیں ہے۔

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: بطل بیع مالیس بمالٍ کالدم والمیتۃ۔ (تنویر الابصار ج۴ ص۱۱۲ کتاب البیوع) [2]

کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۱۷۳)

کما قال الرسولﷺ: ان اللہ اذا حرم علیٰ قوم اکل شئ حرم علیھم ثمنہ۔

(اعلاء السنن ج ۱۴ ص۸۰ ابواب البیوع الفاسدۃ۔ باب حرمۃ بیع الخمر الخ)

---

[1] قال العلامہ ابن عابدین رحمہ اللہ: شرائط النفاذ اثنان الملك او الولایۃ وان لایکون فی البیع حق لغیر البائع فلم ینفذ بیع الفضولی۔ (ردالمحتار ج۴ ص۵۰۵ کتاب البیوع، مطلب شرائط البیع انواعٌ اربعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع ... الخ۔

[2] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بیع المیتۃ والدم والحر باطل لانھا لیست اموالاً فلا تکون محلاً للبیع۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۳ باب الفاسد۔ کتاب البیوع)

مشترکہ جائیداد اور اراضی کی بیع وشراء کا حکم

سوال:۔ مشترکہ جائیداد اور اراضی کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد کی خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ اس میں تمام شرکاء کی رضامندی شامل ہو کیونکہ ہر ایک اپنے حصہ کا مالک ہے اور مالک اپنے حصہ میں تصرف کرسکتا ہے، لہٰذا یہ بیع صحیح ہے فاسد نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: اذ باع احد الشریکین نصفها فان ثم یجوز البیع فی نصف الدار لان بیع المالك انصرف الی نصیبه باع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع۔ (تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۲۵ کتاب البیوع)[1]

مشتری کا بائع کو دھوکا دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے بغبنِ فاحش زمین خریدی، اب وہ تیرہ چودہ سال کے بعد یہ زمین بائع کو واپس کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ ایسی خرید و فروخت جس میں ایک دوسرے کو دھوکا دیا گیا ہو تو فریقین کو اسے رَد کرنے کا اختیار ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وان غر المشتری البائع اوبا العکس اوغره الدلال فله الرّد۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۶۸ باب المرابحة والتولیة)

لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اس غبن کے معلوم ہونے سے پہلے مشتری نے مبیع میں تصرف نہ کیا ہو ورنہ بائع نے ثمن میں تصرف کیا ہو جس سے ان کی رضا معلوم ہوتی ہے۔

کما قوله علیه السلام: نهی عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر۔ (اعلاء السنن ج۴ ص۸۹)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: هذا لانه بالبیع صار شرکة ملك حتی لا یجوز لکل واحد منهما ان یتصرف فی نصیب الاخر ثم بالقصد بعد ذلك صار شرکة عقد فیجوز لکل واحد منهما ان یتصرف فی نصیب صاحبه۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۱۷ کتاب البیوع)

[2] قال العلامة خالد اتاسیؒ: اذا غرّ احد المتبایعین الاخر وتحقق ان فی البیع غبناً فاحشاً فللمغبون ان یفسخ البیع حینئذٍ۔ (شرح المجلة ج۱ ص۱۹۹ الفصل السابع)۔

قربانی کے لیے خرید ے گئے حاملہ جانور کی واپسی کا حکم

سوال :- ایک آدمی نے کسی سے قربانی کے لیے جانور خریدا، بیع ہو جانے کے بعد مشتری کو علم ہوا کہ وہ تو حاملہ ہے، کیا صرف اس وجہ سے اس کو واپس کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بیع تام ہو جانے کے بعد جب کسی جانور میں عیب کا پتہ چلے اور وہ بائع کے ہاں سے ہی اس جانور میں موجود ہو اور بائع نے بتایا بھی نہ ہو تو اس وجہ سے مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، کسی جانور کا حاملہ ہونا کوئی عیب نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں، تاہم اقالہ کی صورت میں مبیعہ واپس کیا جا سکتا ہے ۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : نعم لہ ردھا بعیب الحبل والحبل عیب فی الجاریۃ لا فی البھائم ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۲۷۰ کتاب البیوع - باب الخیارات)[لہ]

بیع فسخ کرنے کی صورت میں بائع پر جرمانہ لگانا

سوال :- دو آدمیوں نے کچھ مشترکہ زمین فروخت کی اور مشتری سے کچھ رقم نقد لے لی اور بقیہ رقم رجسٹری کی تکمیل تک مؤخر کو دی گئی اور اس کے ساتھ مشتری نے یہ شرط لگائی کہ اگر بائع نے زمین واپس لی تو اسے پچیس ۲۵ روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا، کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے ؟

الجواب :- مذکورہ صورت میں اگر یہ شرط اور رقم کی وصولی وغیرہ بیع کے ایجاب و قبول کے وقت لگائی گئی ہو تو یہ بیع فاسد ہے اور اس سے ہر ایک بلا رضائے غیر فسخ کر سکتا ہے، نیز فسخ کی صورت میں وصول کردہ رقم واپس کرنا ضروری ہے، تاہم فسخ کرنے والے سے جرمانہ لینا جائز نہیں اور اگر ایجاب و قبول کے بعد ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : طلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر

لہ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ : رجل اشتریٰ حمارًا واحبلھا لایردھا بالعیب ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۳ ص۴۷ باب خیار العیب ، کتاب البیوع)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۴۵ باب خیار العیب ۔

بعد العقد او قبله لايقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لاحدهما او فيه نفع مبيع هو اهل الاستحقاق بنفع۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۶ باب بيع الفاسد) [1]

وقتِ معین تک ثمن کی ادائیگی کا اختیار دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے متعلق کہ اگر بائع مشتری سے یہ کہے کہ اگر تو شام تک مجھے رقم ادا کر دے تو تیرے اور میرے درمیان معاملہ باقی ورنہ رد ہوگا، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

الجواب:۔ اس طرح کی بیع کرنا بیع کی صحت کے منافی نہیں، لہٰذا اگر صورت مسئولہ کے مطابق اگر مشتری نے شام تک طے شدہ رقم بائع کو ادا نہ کی تو استحساناً بیع ختم ہو جائے گی۔

قال العلامة المرغيناني: وعن باع على انه ان لم ينقد الثمن الى ثلثة ايام فلا بيع بينهما جاز۔ (الهداية ج۳ ص۳۴ باب خيار الشرط) [2]

پشیمان ہونے پر رقم واپس کرنا لازم ہے

سوال:ایک شخص نے کسی سے مکان خریدا اور کچھ بیعانہ رقم بھی اسے دے دی، مگر ایجاب وقبول اور مبیعہ پر قبضہ کرنے کے بعد کسی وجہ سے مشتری مکان خریدنے پر پشیمان ہو گیا اور بائع کو مکان واپس کرکے ادا کردہ رقم واپس لینا چاہتا ہے۔تو کیا مشتری مکان واپس کرکے بائع سے اپنی رقم لینے کا شرعاً حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب: بائع کے لئے بیعانہ کی رقم لینا حرام ہے، بلکہ بائع اپنے مبیع پر قبضہ کے بعد ثمن مشتری کو واپس کر دے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: فان شرط اكثر منه او اقل فالشرط باطل

---

[1] كما في الحديث قوله عليه السلام: كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل فبطل الشرط الواحد وكل مالم يعقد اه به۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۱۳ باب النهي عن البيع بالشرط)

ومثله في الهداية ج۳ ص۴۳ كتاب البيوع۔ باب بيع الفاسد۔

[2] قال العلامة ابن عابدين: فان نقد الثمن تم البيع وان لم ينقد انفسخ البيع وفي بعضها فسد البيع ولو باع عبد على انه ان لم ينقد المشترى الثمن الى ثلثه ايام فلا بيع صح استحساناً۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۹ كتاب البيوع)

ویرد مثل الثمن الاوّل لقوله علیہ السلام من اقال نادمًا بیعتہ اقال اللہ عثراتہ یوم القیامۃ۔ (الہدایۃ ج۳ ص۱۷ باب الاقالۃ)[۱]

بیع میں بیعانہ ضبط کرنے کے رواج کا شرعی حکم

سوال:- کسی شخص نے ایک مکان فروخت کیا اور رواج کے مطابق مشتری سے کچھ رقم بطور بیعانہ بھی لے لی، اور اس بیع میں فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی کہ ایک مدتِ معین تک اگر بائع انکار کر دے تو وہ مشتری کو دس ہزار روپے بطور جرمانہ دے گا، اور اگر مشتری مقررہ مدت میں باقی رقم ادا کر کے اس مکان کی رجسٹری نہ کرا سکا تو بیعانہ کی رقم ضبط کر لی جائے گی۔ اس کے کسی وجہ سے مشتری اس شرط کو پورا نہ کر سکا تو کیا بائع کو بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں مشروط عقدِ بیع فاسد ہے اور متعاقدین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، نیز بائع کو بیعانہ ضبط کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔[۲]

کما قولہ علیہ السلام: نہی عن بیع العربان (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۲۷ باب النہی عن بیع العربان)

کلوگرام کے حساب سے کوئی چیز خرید کر سیر کے حساب سے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:- ایک شخص بیرونِ ملک سے کچھ چیزیں کلوگرام کے حساب سے خرید کر اپنے ملک میں سیر کے حساب سے فروخت کرتا ہے، اسی طرح وہاں سے کپڑا میٹر کے حساب سے خرید کر اپنے وطن میں اُسے گز کے حساب سے فروخت کرتا ہے، تو کیا اس کا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق خرید و فروخت کا یہ طریقہ بالکل جائز ہے

---

[۱] قال العلامۃ ابن الہمامؒ: وحقیقۃ الفسخ لیس الا رفع الاوّل کان لم یکن فیثبت الحال الاوّل وثبوت الحال الاوّل ہو برجوع عین الثمن الاوّل الی مالکہ کان لم یدخل فی الوجود غیرہ وہو یستلزم تعیین الاوّل۔ (فتح القدیر ج۶ ص۱۱۴ باب الاقالۃ)

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ: کل شرط لا یقتضیہ العقد وفیہ منفعۃ لاحد المتعاقدین او للمعقود علیہ وہو من اہل الاستحقاق یفسدہ۔ (الہدایۃ ج۳ ص۶۲ باب البیع الفاسد)

بشرطیکہ اس میں کوئی دھوکا نہ ہو۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: یجوز بیع الطعام والحبوب مکایلۃ ومجازفۃ ـــ قال ویجوز باناء بعینہ لا یعرف مقدارہ وبوزن حجر بعینہ لا یعرف مقدارہ لان الجہالۃ لا تفضی الی المنازعۃ۔ (الہدایۃ ج ۳ ص ۲۷ کتاب البیوع) [1]

نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:۔

(۱) کیا کسی نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) دو نابالغ بھائیوں میں سے ایک، اپنے دوسرے بھائی کی جائیداد فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اُس کو اِس کا علم بھی نہ ہو؟

(۳) شفعہ کا حق نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے یا جوار (قُرب) کی وجہ سے؟

الجواب:۔ (۱) کسی اجنبی کو نابالغ کی جائیداد بدون اس کی رضا کے فروخت کرنا درست نہیں، تاہم باپ کو منفعت کے پیش نظر تصرف کا حق ہے۔

(۲) اگر یہ فروخت کنندہ بذاتِ خود یتیم ہو اور اس کے ساتھ نابالغ اور غیر عاقل بھی ہو تو اس کی خرید و فروخت کالعدم و نامنظور ہے

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وشرط اھلیۃ المتعاقدین یکونہما عاقلین لا یشترط البلوغ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۵ کتاب البیوع)

(۳) اور شفعہ کا حق نسبتِ نسب کی بجائے شرکت اور جوار (قُرب) کی وجہ سے زیادہ حاصل ہے۔

قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا اکرہ الرجل علی بیع مالہ اوعلی شراء سلعۃ اوعلی ان یقر لرجل بالف یواجر دارہ واکرہ علی ذلک

---

[1] قال العلامۃ بدر الدین العینی رحمہ اللہ: یباع الطعام کیلا ای من حیث الکیل ویباع ایضاً وجزاماً لان بکل منہما یصیر معلوماً أما المکایلۃ فظاہر واما الجزاف فلانہ بالاشارۃ تنفع الجہالۃ۔ (عینی شرح کنز ج ۲ ص ۳ تحت فی بیان احکام البیوع) ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۸۲ تحت احکام البیوع۔

بالقتل او بالضرب الشديد و بالحبس فباع او اشترىٰ فهو بالخيار ان شاء مضى البيع وان شاء فسخه بالمبيع - (الهداية ج۳ ص۳۳۳ كتاب البيوع)[1]

بائع کا منفعت کی شرط لگانا باطل ہے

سوال :- ایک شخص نے کسی پر ایک مکان بطور رہن یہ شرط لگا کر فروخت کر دیا کہ جب رقم واپس کی جائے گی تو مکان بھی واپس مل جائے گا، تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہے ؟

الجواب :- جس بیع میں بائع کی منفعت کے لیے ایسی شرط لگائی گئی ہو تو وہ بیع فاسد ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں اس سے ممانعت کی گئی ہے ۔

قال العلامة المرغينانيؒ : وكل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد المتعاقدين او للمعقود عليه وهو من اهل الاستحقاق يفسده العقد -

(الهداية ج۳ ص۶۲ كتاب البيوع ، باب البيع الفاسد)[2]

رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے بیع وشراء کا حکم

سوال :- ایک گاؤں کے مکینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے گاؤں کی چیزیں مثلاً انڈے، مرغیاں وغیرہ فلاں خاص شخص ہی کو فروخت کریں گے، نیز وہ اس معین شخص پر یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ تو ہم کو بیس روپے ماہانہ چندہ دے گا جسے ہم رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کریں گے، تو کیا خرید و فروخت کیلئے ایسی شرط

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : (وقوله بالجور) القضاء بخلاف الحق اما عن خطاء او عمد وكل على وجهين اما فى حقه تعالىٰ او حق العبد فالخطاء فى حق العبد اما ان يمكن فيه لتدارك والرد او لا فان امكن بان قضى بمال او صدقة او طلاق او عتاق ... يبطل القضاء - (رد المحتار ج۴ ص۳۸۰ كتاب القضاء مطلب فيما لو قضى بالجور)

وايضاً (وقف بيع مال الغير) لو الغير بالغاً عاقلاً فلو صغيراً او مجنوناً لم ينعقد اصلاً كما فى الزواهد معزياً للحاوى - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۱۵۲ كتاب الوقف)

[2] قال العلامة المرغينانيؒ : كل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعه لاحد المتعاقدين الى اخره - (الهداية ج۳ ص۶۲ باب بيع الفاسد)

ومثله فى خلاصة الفتاوىٰ ج۳ ص۵۴ كتاب البيوع - باب البيع الفاسد -

لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ درج بالا صورت میں منصوبہ بندی سے ایک معین شخص سے خرید وفروخت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ذخیرہ اندوزی اور روزہ مرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھانا مقصود نہ ہو، البتہ چندہ دینے کی شرط لگانا جائز نہیں، ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے چندہ دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وفی مجلۃ الاحکام : البیع بشرط لیس فیہ نفع لاحد لعاقدین یصح والشرط لغو۔ (مجلۃ الاحکام ص۸۹ المادۃ ۱۸۹ کتاب البیوع ۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع)[۱]

موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ موہوبہ زمین کو باقاعدہ ہبہ کے بعد فروخت کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سے واہب کو رجوع کا حق بھی ختم ہوجاتا ہے ۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز ؒ : اذا باع الموھوب لہ الموھوب او اخرجہ عن ملکہ بالھبۃ والتسلیم لایبقیٰ للواھب حق الرجوع ۔ (شرح المجلۃ ۔المادۃ ۸۶۶ ص۴۸۰ تحت احکام الھبۃ)[۲]

الکحل کی تجارت کا حکم

سوال :۔ آجکل بعض ادویات میں الکحل استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا کاروبار رواج پکڑ چکا ہے، تو کیا الکحل کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں ؟

---

[۱] قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانی ؒ: لو شرطا فی البیع نفعاً علیٰ اجنبی کما اذا باعہ شیئاً بشرط ان یقرضہ فلان عشرۃ دراھم فالبیع صحیح والشرط لغو۔ (شرح مجلۃ الاحکام ص۸۹ المادۃ ۱۸۹ کتاب البیوع ۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع)

[۲] قال العلامۃ ابن نجیم ؒ: خروج الھبۃ من ملک الموھوب لہٗ بالکلیۃ بان باع الھبۃ او وھبھا (البحر الرائق ج۷ ص۲۹۳ تحت باب الرجوع فی الھبۃ)

الجواب: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اشربہ اربعہ کے علاوہ جب شراب دیگر اناج واشیاء سے بنائی گئی ہو تو بصورت شرعی مجبوری استعمال کرنا جائز ہے تو اس کی تجارت کی بھی گنجائش موجود ہے۔ موجودہ الکحل (جو کہ شراب ہی کی ایک قسم ہے) چونکہ پٹرول، بھوسہ، مکئی وغیرہ اشیاء سے بنائی جاتی ہے اور ضرورتاً بہت ساری ادویات، رنگوں کے علاوہ دیگر کیمیکلز میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اس لیے بناء برقول امام ابو حنیفہؒ اس کی خرید و فروخت جائز ہے، موجودہ دور میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: الشراب لغة كل مائع يشرب واصطلاحاً ما يسكر والمحرم منها اربعة...... وصح بيع غير الخمر - قال ابن عابدينؒ: (تحت قوله صح بيع غير الخمر) اى عنده خلافاً لهما فى البيع والضمان لكن الفتوى على قوله فى البيع - (ردالمحتار ج۶ ص۴۵۴ كتاب الاشربة)[۱]

حیوانات کی ادھار بیع کا حکم

سوال: ایک آدمی نے دوسرے شخص سے کہا کہ آپ اس سال مجھے اپنا بیل دے دیں، میں اس کے عوض میں آئندہ سال دوسرا بیل دے دوں گا، تو کیا شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ صورت میں حیوان کی بیع حیوان کے بدلے میں بصورتِ قرض ہے، جو کہ شرعاً حرام ہے، اس لیے دونوں عاقدین کی یہ عقدِ بیع جائز نہیں۔

عن ابن عمرؓ ان النبى صلى الله عليه وسلم نهى بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً - (معانى الآثار ج۲ ص۲۲۹ باب النهى عن بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً)[۲]

---

[۱] قال العلامة المرغينانىؒ: الاشربة المحرمة اربعة........ وقد بينا المعنى من قبل الا ان حرمة هذه الاشربة دون حرمة الخمر حتى لا يكفر مستحلها ويكفر مستحل الخمر..... ويجوز بيعها ويضمن متلفها عند ابى حنيفةؒ خلافاً لهما فيهما الخ - (الهداية ج۴ ص۴۹۲ كتاب الاشربة)

[۲] قال الشيخ ظفر احمد العثمانىؒ: لا يجوز بيع شئ من الحيوان من الرقيق ولا غيره بشئ من الحيوانات الرقيق ولا غيره نسيئة لان الحيوان لا يجوز فيه السلم اى التاجيل وقال عن عبد الله بن مسعودؓ انه نهى السلم فى الحيوان - (اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۸۵ باب النهى عن بيع الحيوان بالحيوان نسيئةً)

ومثله فى كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ج۲ ص۳۰۸ كتاب البيع، اركان السلم -

خشک و تر کھجور میں تفاضل

سوال:۔ تیار کھجور جو کہ عام طور پر بازار میں ملتی ہے اگر اس کو تر یعنی کچی کھجور سے (جو کہ ابھی تک درخت پر ہے) دوگنا زیادہ وزن سے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بازار میں دونوں کی قیمت میں بہت فرق ہے، مثلاً تر کھجور فی کلو دس روپے اور تیار کھجور تیس روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کی جاتی ہے۔

الجواب:۔ احناف کے نزدیک رطب اور تمر دونوں ایک جنس سے ہیں اس لیے ان کی بیع برابر سرابر کی جائے گی، زیادتی ربٰو (سود) میں داخل ہے، لہٰذا تر کھجور کو عام کھجور کے مقابلہ میں دوگنا وزن یا قیمت پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلاً بمثل عند ابي حنيفةؒ وقالا لا يجوز لقوله عليه السلام حين سئل عنه او ينقص اذا جف فقيل نعم فقال عليه السلام لا اذا وله ان الرطب تمر لقوله عليه السلام حين أهدى اليه رطب أ وكل تمر خيبر هكذا اسماه تمراً وبيع التمر بالتمر بمثله جائز۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج۶ ص۱۶۸ باب الربٰو) [1]

مختلف ممالک کی کرنسی کی تجارت کا حکم

سوال:۔ آجکل صراف بازار میں ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے زیادہ داموں بیچنے کا رواج عام ہے، مثلاً ایک آدمی نے امریکی ڈالر ایک دن قبل پچاس ۵۰ روپے کا لیا ہے اب وہ اس کو پچپن ۵۵ روپے میں فروخت کرتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دو ملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے اور اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف الاجناس اشیاء

---

[1] قال العلامة اکمل الدين البابرتیؒ: (قال ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلاً بمثل) بيع الرطب بالتمر متفاضلاً لا يجوز بالاجماع ومثلاً بمثل جوزه ابو حنيفةؒ خاصة وقالا لا يجوز۔

(العناية على هامش فتح القدير ج۶ ص۱۶۸ باب الربٰو)

ومثله في الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۱۸۱ باب الربٰو۔

کو تفاضل کے ساتھ بیچنا جائز ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے تفاضل کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وان عدما ...... حلا کہروی بمرو یین لعدم العلۃ فبقی علی اصل الاباحۃ وان وجد احدهما ای القدرۃ وحدہ او الجنس حل الفضل وحرم النساء ولو مع التساوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۷۲ باب الربٰو، مطلب فی الابراء عن الرباء) [1]

قبل القبض کسی چیز کی فروخت کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! میں جائیداد کی خرید و فروخت (پراپرٹی) کا کاروبار کرتا ہوں، اس تجارت میں بعض اوقات زمین اور مکانات وغیرہ کا اس کے مالک سے قبضہ لے لیا جاتا ہے تاکہ اس کو کسی اور شخص پر فروخت کر دیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ قبل القبض کسی چیز کا فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے، البتہ احناف کے نزدیک زمین اس حکم سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا زمین پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع کرنا جائز ہے۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ: أما البیع الاعیان غیر المنقولۃ قبل قبضها کبیع الارض والضیاع والنخیل والدور ونحو ذلک من الاشیاء الثابتۃ التی لا یخشیٰ هلاکها فانہ یصح۔ (کتاب الفقہ علی مذاهب الاربعۃ ج ۲ ص ۲۳۴ کتاب البیع، مبحث التصرف فی المبیع) [2]

---

[1] قال العلامۃ برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء لعدم العلۃ المحرمۃ والاصل فیہ الاباحۃ واذا وجدا حرم التفاضل والنساء لوجود العلۃ واذا وجد احدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء۔
(الهدایۃ علی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربٰو)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربٰو۔

[2] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: والثالث لا یجوز بیع مبیع قبل قبضہ الا الدور والارض قالہ ابو حنیفۃ وابو یوسف۔ (رحمہم اللہ)
(اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۳۶ باب النهی عن بیع المشتری قبل القبض)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۸۱ فصل شرائط صحۃ البیع۔

قسطوں کے اختتام سے قبل گاڑی کو پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار کون ہے ؟

سوال:۔ اگر ایک گاڑی قسطوں پر خریدی جائے اور قسطوں کی مکمل ادائیگی سے قبل اگر گاڑی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نقصان بائع کا متصور ہوگا یا مشتری کا؟ قرآن وسنت سے جواب عنایت فرماکر مشکور فرمائیں ؟

الجواب:۔ بیع چاہے نقد رقم سے ہو یا اُدھار سے، ایجاب وقبول کر لینے اور قبضہ ہو جانے پر بیع تام ہو جاتی اور مبیع مشتری کی ملکیت بن جاتی ہے، اس کے بعد مبیعہ کو جو نقصان پہنچے گا وہ مشتری کا ہوگا، بائع پر رجوع صحیح نہیں، تاہم اگر مبیعہ بائع کی ملکیت میں ہلاک ہو جائے تو نقصان بائع پہ ہوگا۔

قال العلامة سليم رستم باز :۔ المبيع اذا هلك فى يد البائع قبل ان يقبضه المشترى يهلك من مال البائع ولاشئ على المشترى ...... اذا هلك المبيع بعد القبض هلك من مال المشترى ولا شئ على البائع۔ (شرح مجلة الاحكام۔ المادة ۲۹۳، ۲۹۴ صفحہ ۱۵۰ الفصل الخامس) [1]

قسط لیٹ ہونے کی وجہ سے مبیع واپس نہیں ہو سکتا

سوال: گاڑیوں کی تجارت کرنے والے بعض لوگ قسطوں میں گاڑی فروخت کرتے وقت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر مشتری نے اتنی مدت میں تمام قسطیں ادا نہ کیں تو ادا کی گئی اقساط ضبط متصور ہوں گی اور مبیعہ میری ملکیت ہوگا، اور دونوں (بائع اور مشتری) ان شرائط پر دستخط کرتے ہیں۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ بعض اقساط لیٹ ہو جانے یعنی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع مبیعہ کو واپس لینے کا

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانى رحمه الله :۔ ولو قبضه المشترى وهلك فى يده فى مدة الخيار ضمنه بالقيمة ...... ولو هلك فى يد البائع انفسخ البيع لاشئ على المشترى اعتبارًا بالبيع الصحيح المطلق۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج ۵ ص ۵۰۴ كتاب البيوع)

وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج ۵ ص ۵۰۴ كتاب البيوع۔

شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت میں ایجاب و قبول کر لینے سے بیع تام ہو جاتی ہے، اس کے بعد فریقین میں سے کسی کو بھی شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر مبیعہ پر ہاتھ ڈالے۔ اسی بناء پر صورت مسئولہ میں اس قسم کی شرائط طے کرنا لغو ہے، رقم بدستور مشتری کے ذمے واجب الادا ہے، اور اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو قانون کا سہارا لے کر رقم وصول کی جاسکتی ہے، اس طرح لیت و لعل کرنے سے اس کے ذمہ باقی اقساط ختم نہیں ہو جاتیں اور نہ بائع بغیر اس کی رضامندی کے مبیعہ واپس لے سکتا ہے۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز رحمہ اللہ: اذا کان البیع لازماً فلیس لاحد المتبایعین الرجوع عنہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۳۷۵ ص۱۱۳ الفصل الثانی فی احکام انواع البیوع) [۱]

گاہکوں کو مختلف قیمتوں پر سودا بیچنے کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دوکاندار حضرات ایک گاہک کو ایک دام سے کوئی چیز دیتا ہے جبکہ دوسرے گاہک کو وہی چیز کسی اور دام سے دیتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا کہ دونوں گاہکوں میں برابری کرنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ بیع نام ہے ایک مال کو دوسرے مال سے باہمی رضامندی سے تبدیل کرنا، شریعت نے اس معاملے میں کسی کو پابند نہیں کیا ہے، اس لیے دوکاندار کا ایسا کرنا جائز ہے تاہم ناجائز منافع سے پرہیز کیا جائے۔

قال العلامۃ علی حیدر رحمہ اللہ: وجاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقہیۃ بانہ مبادلۃ المال بالمال بالرضا۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۱ ص۱۰۶ مقدمۃ فی بیان الاصطلاحات الفقہیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ علی حیدر رحمہ اللہ: لیس لاحد المتبایعین او ورثتہ فی البیع النافذ اللازم ان یرجع عنہ رضاء الآخر بوجہ من الوجوہ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۱ ص۳۴۰ الفصل الثانی فی بیان احکام انواع البیع)

[۲] قال العلامۃ ابن الہمام رحمہ اللہ: فقال فخر الاسلام البیع لغۃ مبادلۃ المال بالمال وکذا فی الشرع لکن زید فیہ قید التراضی۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۵۵ کتاب البیوع)
ومثلہ فی کنز الدقائق ص۲۲۷ کتاب البیوع۔

تجارت میں منافع کا تعین نہیں

سوال :۔ بعض تاجر ایک چیز جس قیمت سے خریدتے ہیں پھر اس کو دوگنا، سہ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ کیا اسلام نے منافع کے لیے کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال کے منافع کی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی، یہ دونوں عاقدین کا باہمی معاملہ ہے، جس طرح طے پاجائے اسی طرح جائز ہے البتہ اس حد تک منافع لینا کہ جس سے لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو خلافِ مروت ہے، حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

قال العلامة علی حیدر رحمه اللّٰه: جاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیة بانه مبادلة المال بالمال بالرضاء۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۱۰۶ مقدمه فی بیان الاصطلاحات الفقهیة) [۱]

بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال فروخت کرنا

سوال :۔ کیا بیوی اپنے شوہر کی مملوکہ چیز بغیر اس کی اجازت کے فروخت کر سکتی ہے یا نہیں، مطلع ہوجانے پر شوہر کو اپنی چیز واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ بیوی باوجود قربت کے شوہر کے مال میں بمنزلہ اجنبیہ کے ہے جس میں اس کے تصرفات، تصرفاتِ فضولی کے حکم میں ہے، علم ہوجانے پر شوہر کو اختیار ہے کہ وہ ایسی بیع کو باقی رکھے یا مسترد کرے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه اللّٰه: کل تصرف صدر منه تملیکاً کان کبیع وتزویج او اسقاطاً کطلاق واعتاق وله مجیز ای لهذا التصرف من یقدر علی اجازته حال وقوعه انعقد موقوفاً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۰۶ فصل فی الفضولی کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابوالبرکات النسفی رحمه اللّٰه: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔ (کنز الدقائق ص۲۲۷ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۵۵ کتاب البیوع۔

[۲] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه اللّٰه: البیع الذی یتعلق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفاً علی اجازة ذلک الاٰخر۔ (مجلة الاحکام ۔المادة ۳۶۸ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۳۹۱۔ الباب السابع۔ تحت المادة ۳۶۸۔

بجلی کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بجلی کی بیع وشرا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بجلی کوئی عین نہیں ہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مبیعہ کا عین ہونا ضروری نہیں اس لیے اگر کوئی چیز عین نہ ہو مگر عرفاً وہ مال سمجھی جاتی ہو تو اس کی بیع جائز ہے، لہٰذا بجلی اگرچہ عین نہیں لیکن اس کی بیع وشراء جائز ہے اس لیے کہ اس قسم کی اشیاء مالیت میں داخل ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: المالیۃ تثبت بتمول الناس کافۃ او بعضھم۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع مطلب فی تعریف المال والملک)[1]

ڈرافٹ کی رسید کی بیع کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی سعودی عرب میں محنت مزدوری کرتا ہے، اگر وہ ڈرافٹ کے ذریعے کچھ پیسے پاکستان اپنے اہل وعیال کے لیے بھیجے اور کسی وجہ سے وہ ڈرافٹ لیٹ ہو جائے اور اس کے اہل خانہ کو رقم کی اشد ضرورت ہو تو کیا میں ان کے اہل خانہ سے اس ڈرافٹ کی مالیت کے عوض وہ ڈرافٹ خرید سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ ڈرافٹ بل اگرچہ فی ذاتہ ایک سادہ کاغذ ہے جس کی کوئی ذاتی قدر وقیمت نہیں مگر اس وقت وہ ایک معین رقم کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے اس وقت بناء بر عرف وہ بھی قیمتی مال بن چکا ہے اس لیے اس کو اتنی قیمت کے بدلے خریدنا جائز ہے جتنی کہ اس کی مالیت ہے، اسی طرح ٹریول چیک اور بانڈز وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: والمالیۃ تثبت بتمول الناس کافۃ او بعضھم۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع، مطلب فی تعریف المال والملک)[2]

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: المال ھو کل عین ذات قیمۃ مادیۃ بین الناس۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۳۴۵ الفصل الاول عقد البیع)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المنتقی علیٰ ھامش مجمع الانھر ج۲ ص۳ کتاب البیوع۔

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: المال ھو کل عین ذات قیمۃ مادیۃ بین الناس۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۳۴۵ کتاب البیوع)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المنتقی علیٰ ھامش مجمع الانھر ج۲ ص۳ کتاب البیوع۔

زندہ مرغی کو تول کر فروخت کرنا

سوال :۔ آجکل بازار میں زندہ مرغیاں تول کر فروخت کی جاتی ہیں جبکہ ان کا گوشت حساب شدہ وزن سے کم ہوتا ہے، تو کیا ایسا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ چونکہ زندہ مرغیوں کے مروجہ طریقہ بیع میں پولٹری فارم والا مشتری پر صرف گوشت فروخت نہیں کرتا بلکہ وہ زندہ مرغی فروخت کرتا ہے اس لیے اصل مبیع معلوم ہونے کی وجہ سے ایسا معاملہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : البیع شرعاً مبادلۃ شیٔ مرغوب فیہ بمثلہ ...... علیٰ وجہ مفید مخصوص ای بایجاب اوتعاط اھ۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۵ کتاب البیوع)[1]

مرغیوں کی بیٹ کو بطور کھاد فروخت کرنا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! آجکل مالکان پولٹری فارم مرغیوں کی بیٹ کو بصورت کھاد زمینداروں پر فروخت کر دیتے ہیں، کیا شرعی ایسی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟ نیز اس بیع سے وصول شدہ رقم کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ پولٹری فارم کی کھاد صرف مرغیوں کی بیٹ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں چاول کا چھلکا، مٹی اور لکڑی وغیرہ کا برادہ اور دیگر کئی اشیاء خلط ملط ہوتی ہیں اس لیے اس کو فروخت کرنا مرخص اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بھی جائز اور حلال ہے، فقہی ذخائر میں اس کے نظائر موجود ہیں ۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : ورجیع الآدمی لم یغلب علیہ التراب فلو مغلوباً بہ جاز کسرقین وبعر واکتفی فی البحر بمجرد خلط

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : البیع : واصطلاحاً عند الحنفیۃ مبادلۃ مال بمال علیٰ وجہ مخصوص اوھو مبادلۃ شیٔ مرغوب فیہ بمثلہ علیٰ وجہ مخصوص ای بایجاب اوتعاط اھ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۳۴۴ ـ الفصل الاول عقد البیع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۷۳ کتاب البیوع۔

بتواب۔ قال ابن عابدینؒ تحته و یجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع به والوقود به۔ (ردالمحتار ج۴ ص۱۱۳ فصل بیع الفاسد۔ قبل مطلب الآدمی مکرم شرعاً وکافراً)[1]

تصنیف یا طباعت کے حقوق فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل تصنیف وتالیف اور طباعت کے حقوق کی تجارت عام ہے، مصنف حضرات اپنی تصانیف کے مسودے تاجران کتب پر مہنگے داموں فروخت کردیتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حق تصنیف اگرچہ حقوق مجردہ سے متعلق ہے مگر حقوق مجردہ کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت وابستہ ہو جیسے حق وظیفہ وغیرہ۔ (۲) دوسرے وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت متعلق نہیں جیسے حق شفعہ وغیرہ۔ شریعت اسلامی میں مالی منفعت والے حقوق سے دستبرداری کے عوض مال لینا جائز ہے۔ حق تصنیف کے ساتھ بھی دورِ حاضر میں چونکہ مالی منفعت وابستہ ہے اس لیے اس کی بیع وشراء جائز ہے، فقہی اصطلاح میں اس کو حق اسبقیت کہا جاتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة کحق الشفعة وعلی هذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالأوقاف وفیها فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبار وعلیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال۔
الدر المختار علی ردالمحتار ج۴ ص۱۶ کتاب البیوع[2]

---

[1] قال الشیخ وهبة الزحیلی: ولا بأس ببیع السرقین اوالسرجین وهو الزبل وبیع البعر لانه منتفع به لأنه یلقی فی الارض لاستکثار الریع فکان مالاً والمال محل للبیع۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج۴ ص۴۲۶ بیع النجس والمتنجس)

[2] قال العلامة خالد اتاسیؒ: اقول علی ماذکره من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی أن یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... کما جاز النزول عن الوظائف ونحوها لاسیما اذا کان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادة علوه فلولم یجز ذلك له علی الوجه الذی ذکرناه یتضرر فلیتأمل ولیحرر۔ (شرح مجلة الاحکام۔ مادة ۲۱۶ ج۲ ص۱۲۱ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز ومالا یجوز)
ومثله فی نظام الفتاوی ج۲ ص۳۱۴ کتاب المعاملات۔

فارمی مرغیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ آجکل جو فارمی مرغیاں فروخت ہو رہی ہیں ان کو جو خوراک دی جاتی ہے اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ خشک خون بھی ہوتا ہے جو کہ حرام ہے، تو کیا اس طرح خون کھانے والی مرغیوں کی خرید وفروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ان مرغیوں میں نجاست اور خون ملی ہوئی خوراک کھلانے کی وجہ سے بدبو پیدا ہو جاتی ہو تو پھر ان کا کھانا ناجائز اور خرید وفروخت مکروہ ہے، اور اگر ان مرغیوں کو نجاست اور خون وغیرہ کھلانا بند کر کے پاک غذا کھلائی جائے یہاں تک کہ ان کی بدبو بالکل ختم ہو جائے تو پھر ان کا کھانا، بیع وشراء اور ہبہ وغیرہ سب درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الملتقی المکروہ الجلالة التی اذا قربت وجد منها رائحة فلا تؤکل ولا یشرب لبنها ولا یعمل علیها ولا یکره بیعها وهبتها وفی تلك حالها۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار جلد ۵ ص۲۱۵ کتاب الذبائح) [۱]

چونکہ اس بارے میں تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرغیوں کی غذا میں خون یا دوسرے نجس اجزاء نہایت کم مقدار میں ہوتے ہیں، دوم یہ کہ اس غذا کی تیاری میں کیمیکلز استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خون اور دیگر نجس اجزاء کی ماہیت بدل جاتی ہے، لہٰذا قلبِ ماہیت اور اجزاء نجسہ کے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے فارمی مرغیوں کا کھانا، ان کی خرید وفروخت اور ہبہ وغیرہ سب درست اور جائز ہے۔

---

[۱] وفی الهندیة: انما تکون جلالة اذا نتن وتغیر لحمها ووجدت منه ریح منتنة فهی الجلالة حینئذٍ لا یشرب لبنها ولا یؤکل لحمها وبیعها وهبتها جائز هذا اذا کانت لا تخلط ولا تأکل الا العذرة غالبًا الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۲۸۹ الباب الثانی فی بیان ما یؤکل من الحیوان وما لا)
ومثله فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۲۳ کتاب الکراهیة۔

کُتیا کا دودھ پینے والے گائے کے بچے کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ گائے کا بچہ اگر کُتیا کا دودھ پی لے اور مالک کو پتہ لگ جائے کہ اس بچھڑے نے کتیا کا دودھ پیا ہے، اب اگر مالک اس کو فروخت کرنا چاہے تو کیا اس کی خرید و فروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر گائے کے اس بچے نے چند دن بعد پاک خوراک کھالی ہو تو پھر اس کی خرید و فروخت کرنا اور کھانا لا بأس بہ ہے ورنہ کراہت سے خالی نہیں۔

لما فی الهندیة: الجدی اذا کان یربی بلبن الاتان والخنزیران اعتلف ایاماً فلا بأس بمنزلة الجلالة والجلالة اذا حبست ایاماً فعلفت لا بأس بها فکذا هذا۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۹۰ الباب الثانی فی بیان ما یؤکل من الحیوان وما لا یؤکل) [1]

بائع اول کا مشتری ثانی سے واپس خرید نا جائز ہے

سوال:- زید نے عمرو پر ایک گاڑی نقد رقم پر فروخت کی، بعد میں عمرو نے وہ گاڑی بکر کو تین، چار مہینے کے قرض پر دے دی، اب اگر زید اس گاڑی کو بکر سے فروخت کردہ قیمت سے کچھ کم یا زیادہ قیمت پر خرید لے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اسے سود کا معاملہ قرار دیتے ہیں تو کیا واقعی یہ سود ہی معاملہ ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں بائع اول کے لیے یہ مبیعہ مشتری ثانی سے اُس قیمت سے کم یا زیادہ پر خریدنا جائز ہے جس قیمت پر اس نے مشتری اول پر بیچا تھا اس میں سود کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

لما فی الهندیة: ولو باع المشتری من رجل ثم ان البائع الاول اشتراه

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: وکره لحمهما ای الجلالة ...... کما حل اکل جدی غذا بلبن خنزیر لان لحمه لا یتغیر وما غذی به یصیر مستهلکاً۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۴۰ کتاب الحظر والاباحة)

ومثله فی البحر الرائق ج۸ ص۱۸۲ کتاب الکراهیة۔

من المشتری الثانی باقل مما باع جاز۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۳۲ الفصل العاشر فی بیع شیئین احدهما لا یجوز البیع فیه ......) ؎۱

نابالغ یتیموں کی جائیداد کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ چار یتیم بھائی ہیں جن میں سے ایک بالغ اور تین نابالغ ہیں، جن کا کابل شہر (افغانستان) میں ایک مکان ہے، اب وہاں کے حالات کی خرابی اور کمیونسٹ انقلاب کے پیش نظر بالغ بھائی اس مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہے کیونکہ خطرہ ہے کہ مکان غصب نہ ہو جائے، تو کیا ان تین نابالغ اور ایک بالغ بھائی کے مشورے سے اس مکان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں اگر مکان نہ بیچنے سے ان یتیموں کا نقصان ہو رہا ہو تو اس کو بیچ دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ان کے لیے کوئی دوسرا محفوظ پلاٹ، مکان یا زمین خرید لی جائے یا وہ صورت اختیار کی جائے جس میں ان یتیموں کو فائدہ ہو، ضرر اور نقصان نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز شراء مالا بد للصغیر منه وبیعه ای بیع مالا بد للصغیر منه لاخ وعم وام۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۶ فصل فی البیع، کتاب الحظر والاباحة) ؎۲

؎۱ قال العلامة الحصکفیؒ: المشتری اذا باع المبیع من آخر قبل نقد الثمن جاز للبائع شراؤه منه بالاقل۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۱۶۷ باب الاقالة)
ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۴ باب الاقالة۔

؎۲ قال العلامة ابن نجیمؒ: وشراء مالا بد للصغیر منه وبیعه للعم والام والملتقط...... یعنی یجوز لهؤلاء الثلاثة ان یشتروا للصغیر ویبیعوا مالا بد منه وذلک مثل النفقة والسکونة ولانه لو لم یکن لهم ذلک لتضرر الصغیر وهو ممنوع۔ (البحر الرائق ج۸ ص۲۰۹ فصل فی البیع، کتاب الکراهیة)

ژالہ باری سے متاثر ہونے والی مچھلیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض اوقات بارش اور ژالہ باری کی وجہ سے مچھلیاں پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہیں جو کہ بظاہر مری ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان میں کسی قسم کی بدبو اور تعفن نہیں ہوتی، تو بعض لوگ ان مچھلیوں کو اکٹھا کرکے فروخت کرتے ہیں، تو کیا اس طرح کی مچھلیوں کا کھانا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو مچھلی طبعی موت سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید وفروخت برائے خوراک جائز نہیں ہے اور جو مچھلی کسی عارضی سبب مثلاً بارش یا اولے وغیرہ پڑنے کی وجہ سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید وفروخت جائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ کی بیع بھی درست ہے۔

لما فی الهندية: والاصل ان السمك متى مات بسبب حادث حل اكله وان مات حتف انفه لابسبب ظاهر لا يحل اكله۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۴۲۸ الباب السادس فى الصيد السمك)[۱]

بیعہ میں زیادتی بائع کا حق ہے

سوال:۔ ایک شخص نے دو[۲] جریب زمین فروخت کی اور اس کا حدود اربعہ بھی لکھ کر دیدیا اور ہر جریب کی قیمت بھی متعین کرلی، بیع کے بعد زمین مذکورہ کی پیمائش کی گئی تو وہ متعین مقدار سے زائد نکلی، اب یہ زائد زمین مشتری کا حق ہے یا بائع کا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مقدارِ متعینہ سے زائد زمین بائع کا حق ہے، البتہ مشتری کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو وہ اس بیعہ کو چھوڑ دے یا پھر اضافی رقم بائع کو ادا کرکے کل بیعہ لے لے۔

---

[۱] قال العلامة الحصكفيؒ: ولا يحل حيوان مائى الا السمك الذى مات بآفة ولو متولداً فى ماء نجس ولو طافية مجروحة وهبانية غير الطافى على وجه الماء الذى مات حتف انفه۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۱۶ كتاب الذبائح)

ومثلهٗ فى البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۲ فصل فى ما يحل وما لا يحل۔

لما فی الهندیة: ولو قال بعت منك هذا الثوب او هذه الارض على انها عشرة اذرع كل ذراع بدرهم فوجدها عشرة لزمته بعشرة دراهم ولاخیار له وان وجدها خمسة عشر ذراعاً فهو بالخیار ان شاء اخذ الجمیع كل ذراع بدرهم وان شاء ترکها۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۲۴ الفصل الثامن فی جهالة المبیع او الثمن) [1]

تصاویر کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں تصاویر کا کاروبار کرتا ہوں، کیا یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی آمدنی حلال ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی ذی روح کی فوٹو اور تصاویر بنانا اور ان کی خرید و فروخت ناجائز اور حرام ہے، ظاہر ہے کہ ناجائز اور حرام کاروبار سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز ہی ہوتی ہے۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عون ابن ابی جحیفة عن ابیه ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نهیٰ عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن اکل الربوٰ وموکله والواشمة والمستوشمة والمصور۔ (صحیح البخاری ج ۲ ص۸۸۱ باب من لعن المصور۔ کتاب اللباس) [2]

زقوم کا پھل کھانے اور اس کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ زقوم (تھوہر) کا پھل

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وان زاد شئ علیه فهو للبائع لان البیع وقع علی مقدار معین والقدر لیس بوصف۔
(البحر الرائق ج۵ ص۲۸۸ کتاب البیع)

[2] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولایجوز علی الغناء والنوح والملاهی لان المعصیة لا یتصور استحقاقها بالعقد فلا یجب علیه الاجر من غیر ان یستحق علیه لان المبادلة لا تکون الا عند الاستحقاق۔
(البحر الرائق ج۸ ص۲۰ باب الاجارة الفاسدة)

بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اور آجکل بازاروں میں اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زقوم جہنم کا درخت ہے اس لیے اس کا پھل کھانا اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ دنیا کے زقوم اور جہنم کے زقوم میں زمین آسمان کا فرق ہے اور زقوم کے پھل میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے لہٰذا اس کا کھانا اور خرید و فروخت دونوں جائز ہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: (البیع) شرعاً مبادلة شئ مرغوب فیہ بمثلہ خرج غیر المرغوب کتراب ومیتة ودم الخ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۴ کتاب البیوع) له

اجرت قبل القبض کی خرید و فروخت کا حکم | زید ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے۔ اس کے ہاں کاروبار کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دوسرے اشخاص سے گاڑیاں کرایہ پر لیتا ہے اور اُجرت کی رسید دے دیتا ہے۔ مگر اُجرت کام ختم ہونے کے بعد دیتا ہے۔ اب اگر گاڑی کے مالک کو پیسوں کی ضرورت ہو۔ اور وہ اس رسید کو ٹھیکیدار یا کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو کیا وہ اس طرح شرعاً کر سکتا ہے یا نہیں۔ بیّنوا توجروا ٥

الجواب:۔ بیع کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ بائع کو مبیعہ پر ملکِ تام حاصل ہو اور مبیعہ قبل القبض پر چونکہ ملکیتِ تام حاصل نہیں ہوتی اس لیے ایسی بیع درست نہیں ہوتی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں چونکہ موجر نے اُجرت کو قبل القبض فروخت کیا ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لا یملک الاجرة الا بواحد من

له قال العلامة ابن نجیمؒ: (البیع) ھو مبادلة المال بالمال بالتراضی ..... وفی کشف الکبیر المال مایمیل الیہ الطبع .... والمالیة انما ثبت بتمول الناس کافة او بتقوم البعض والتقوم یثبت بھا وبإباحة الانتفاع لہ شرعاً۔
(البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۶ کتاب البیع)

هٰذہ الاربعة والمراد انه لا يستحقها المؤجر الا بذلك......لكن ليس له بيعها قبل قبضها ۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۰۰ کتاب الاجارۃ) [۱]

گدھوں اور کتوں کے گوشت کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض ممالک میں گدھوں اور کتوں کا گوشت بازار میں فروخت کیا جاتا ہے تو کیا گدھے اور کتے کو ذبح کرکے ان کا گوشت وغیرہ فروخت کرنا عندالاحناف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گدھے اور کتے کو اگر باقاعدہ ذبح کیا گیا ہو تو پھر ان کا گوشت اور چمڑا بیچنا جائز ہے، لیکن فروخت کرنے کے جواز سے کھانے کا جواز لازم نہیں آتا۔

لما فی الهندية: و يجوز بيع لحوم السباع والحمر المذبوحة فی الرواية الصحيحة ولا يجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا فی محيط السرخسی واما جلود السباع والحمر والبغال فما كانت مذبوحة او مدبوغة جاز بيعها وما لا فلا۔ (الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۱۵ الفصل الخامس فی بيع المحرم الصيد و فی بيع المحرمات) [۲]

شیر اور ریچھ کی چربی کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ شیر اور ریچھ کی چربی کو حکماء اور طبیب حضرات خرید کر اسے مختلف امراض میں دوائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو کیا ان درندوں کی چربی کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ چربی مذبوح شیر اور ریچھ کی ہو تو اس کی تجارت جائز ہے جبکہ

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: قوله وما يستجره الانسان الخ ذكر فی البحر ان من شرائط المعقود عليه ان يكون موجوداً فلم ينعقد بيع المعدوم الخ
(رد المحتار ج۴ ص۱۳ مطلب فی بيع الاستجرار)
ومثله فی الهندية ج۳ ص۳ كتاب البيوع۔

[۲] قال العلامة ابن عابدين رح: قوله وجلد ميتة قيد بها لانها لو كانت مذبوحة ذباح لحمها او جلدها جاز لانه يطهر بالزكاة الا الخنزير خانية۔
(رد المحتار حاشية على الدر المختار ج۴ ص۱۲۷ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد فی مسائل)

مردار، ریچھ اور شیر کی چربی کی تجارت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية : ويجوز بيع لحوم السباع والحمر المذبوحة في الرواية الصحيحة ولا يجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا في محيط السرخسي۔
(الفتاویٰ الهندية ج ۳ ص ۱۱۵ الفصل الخامس فی بيع المحرم الصيد و فی بيع المحرمات) [1]

ذبح سے پہلے کھال کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ قربانی کے جانور کی کھال قربانی کرنے سے پہلے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قربانی کرنے سے پہلے جانور کے چرم وغیرہ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية : ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا يجوز فان ذبح بعد ذلك وتنزع الجلد والكرش وسلم لا ينقلب العقد جائزاً كذا في الذخيرة۔
{الفتاویٰ الهندية ج ۳ ص ۱۲۹ الفصل التاسع في بيوع الاشياء المتصلة بغيرها ....}

صحیح چیز میں ردّی کی ملاوٹ کرکے فروخت کرنا

سوال :۔ ایک شخص اعلیٰ قسم کی مکئی زیادہ قیمت پر اور ادنیٰ یعنی ردّی قسم کی مکئی کم قیمت پر خریدتا ہے پھر ان دونوں کو ملا کر ان کے معیار کے مطابق نرخ مقرر کرکے فروخت کرتا ہے، تو اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر خریدنے والے کو اس ملاوٹ کے متعلق بتا دیا جائے اور پھر بھی

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : قوله وجلد ميتة قيد بها لانها لو كانت مذبوحة فباع لحمها او جلدها جاز لانه يطهر بالذكوة الا الخنزير خانية۔
(رد المحتار حاشية على الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۷ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد في مسائل)
وقال ايضاً : بخلاف الودك اى دهن الميتة لانه جزءها فلا يكون مالاً ابن ملك فلا يجوز بيعه الخ۔ (رد المحتار حاشية على الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۸ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد)
وَمِثْلُهٗ فی الخانية على هامش الهندية ج ۲ ص ۱۵۳ باب بيع الفاسد۔

خرید لیتا ہے تو یہ معاملہ لا بأس بہ ہوگا، اور اگر خریدار کو اس ملاوٹ کے متعلق نہ بتایا جائے اور وہ اسے عمدہ اور ملاوٹ سے پاک شئی سمجھ رہا ہو تو یہ معاملہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہے: من غشنا فلیس منّا۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر برجل یبیع طعاما فسالہ کیف تبیع؟ فاخبرہ فاوحیٰ الیہ ان ادخل یدک فیہ فادخل یدہ فیہ فاذا ھو مبلول فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من غش۔ (بذل المجھود فی حل ابی داؤد ج۵ ص۱۲۴ کتاب البیوع۔ باب فی النھی عن الغش) [۱]

زبانی سودا بیع بالمعدوم کے حکم میں ہے

سوال:۔ احمد نے زید کے ساتھ ایک سودا کیا کہ کل کو سو افغانی (افغان کرنسی) ایک روپیہ چھ آنے پر دوں گا، دوسرے دن احمد نے بکر سے سو افغانی کا ایک روپیہ چار آنے پر سودا کیا، یہ صرف زبانی کلامی سودا تھا، کسی طرف سے قبضہ نہیں ہوا تھا، اب احمد بکر کو زید کے سامنے لاکر زید سے دو آنے منافع لے کر چلا گیا اور باقی معاملہ کو زید اور بکر کے درمیان چھوڑ دیا، تو اب یہ دو آنے منافع احمد کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مبیعہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں صرف زبانی سودا کرنے سے بیع تام نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی زید اور احمد کے مابین بیع تام نہیں ہوئی لہٰذا زید کے لیے یہ دو آنے منافع لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الھندیۃ: ومنھا فی المبیع وھو ان یکون موجوداً فلا ینعقد بیع المعدوم وما لہ خطر العدم۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۲ کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علی صبرۃ طعام فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعہ بللا فقال ماھذا یا صاحب الطعام قال اصابتہ السماء یا رسول اللہ فقال افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي۔

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۴۸ کتاب البیوع۔ باب المنھی عنھا من البیوع۔ الفصل الاول)

[۲] قال العلامۃ الحصکفیؒ: لان رکن البیع مبادلۃ المال بالمال ولم یوجد والمعدوم کبیع حق التعلی.....لانہ معدوم۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۱۱۳ باب بیع الفاسد مطلب فی بیع المغیب فی الارض)

مشتری کی ٹال مٹول میں بیع کو فسخ کرنا

سوال:۔ اگر بیع ہو جانے کے بعد مشتری ثمن (قیمت) ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو کیا بائع بیع کو فسخ کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ آجکل یہ ایک رواج بن چکا ہے؟

الجواب:۔ بیع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے صورتِ مسئولہ میں مشتری کے ٹال مٹول کرنے پر چونکہ بائع راضی نہیں کہ مشتری نہ تو قیمت ادا کرتا ہے اور نہ ہی چیز واپس کرتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے بائع کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: لان المشتری لما جحد کان فسخا من جهته اذ الفسخ یثبت به کما اذا تجاحد فاذا عزم البائع علی ترك الخصومة تم الفسخ بمجرد العزم...... ولانه لما تعذر استیفاء الثمن من المشتری فات رضا البائع فیستقل بفسخه۔ (البحر الرائق ج ۷ ص۳۶ مسائل شتیٰ، باب التحکیم)

ادائیگی ثمن کے غیر متعین وقت کا حکم

سوال:۔ آجکل ایک عام رواج ہے کہ گاہک جب کسی جاننے والے دوکاندار کے پاس چلا جاتا ہے تو سودا سلف خریدنے کے بعد اُسے کہہ دیتا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا لیکن ادائیگی کا وقت مقرر نہیں کرتا، تو کیا اس قسم کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اُدھار کی بیع میں جب تک ثمن کی ادائیگی کے وقت کا تعین نہ کیا جائے تو وہ بیع فاسد ہوگی، مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ بیع ہو جانے کے بعد گاہک نے دوکاندار سے کہا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا، لہٰذا اگر دوکاندار بخوشی اسے قبول کرلے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: وصح بثمن حال وهو الاصل ومؤجل الی معلوم لئلا یفضی الی النزاع۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص۲۵ مطلب فی التأجیل الی اجل مجهول)[1]

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: قوله وصح بثمن حال و باجل معلوم ای البیع لاطلاق النصوص وفی السراج الوهاج ان الحلول مقتضی العقد وموجبه والاجل لایثبت بالشرط قید بعلم الاجل لان جهالة تفضی الی النزاع۔
(البحر الرائق ج۵ ص۲۷۹ کتاب البیع)

مُردار جانوروں کی ہڈیوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :- اگر کسی جگہ کوئی جانور مردار ہو جائے اور مالک اس کو باہر پھینک دے تو کیا اس کی ہڈیوں کو فروخت کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا گوشت کی طرح ہڈیوں کی بیع بھی ناجائز ہے؟

الجواب :- ویسے تو شرعاً کسی بھی غیر مذبوحہ جانور کی بیع جائز نہیں مگر اس حکم سے اُس کے بعض اجزاء مثلاً ہڈیاں، بال اور سینگ وغیرہ مستثنیٰ ہیں لہٰذا مردار جانور کے ان اجزاء کی خرید و فروخت جائز ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله : وبيع جلود الميتات باطل اذا لم تكن مذبوحة او مدبوغة و يجوز بيع عظامها و عصبها و صوفها و ظلفها و قرنها ۔ (الفتاویٰ قاضی خان علی هامش الهندية ج۲ ص۱۳۳ فصل فی البیع الباطل)[1]

واؤچر کو فروخت کرنے کا حکم

سوال :- ہم لوگ تمباکو کمپنی والوں پر فروخت کرتے ہیں اور کمپنی والے نقد ادائیگی کی بجائے اس رقم کی رسید جسے واؤچر کہا جاتا ہے، دیدیتے ہیں، تو کیا ہم اس رسید (واؤچر) کو بوقتِ ضرورت کم قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- واؤچر بذاتِ خود کاغذ کا ایک بے قیمت پُرزہ ہے مگر اس رقم کی وجہ سے قیمتی بن جاتا ہے اس لیے اس کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن واؤچر میں درج رقم سے کم پر فروخت کرنا سُود سے خالی نہیں اس لیے ناجائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : (الربا) قال فی البحر فضل احد المتجانسين نعم هذا يناسب تعريف الكنز بقوله فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال ۔

(رد المحتار حاشیہ علی الدر المختار ج۴ ص۱۹۶ باب الربو)[2]

---

[1] وفی الهندية : اما شعر الميتة وعظمها وصوفها وقرنها فلا بأس بالانتفاع بها وبيع ذلك كله جائز ۔ (الفتاویٰ الهندية ج۳ ص۱۱۵ الفصل الخامس فی بیع المحرمات)

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ : فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال ای فضل احد المتجانسين على الآخر بالعيار الشرعی ای الكيل والوزن ۔ (البحر الرائق جلد۶ ص۱۲۴ باب الربو)

بیع قبل القبض کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے ...۳ ہزار کلوگرام مال کا زبانی سودا کیا لیکن مال نہیں اٹھایا بلکہ بائع کے پاس ہی پڑا ہے، چند دن بعد اس مال کی مارکیٹ میں قیمت بڑھ جاتی ہے تو مشتری بائع سے کہتا ہے کہ آپ مجھے منافع دے کر مال اپنے پاس ہی رکھیں، تو کیا مشتری کے لیے یہ منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ میں مبیعہ پر قبضہ کرنے سے قبل اس کو کسی پر فروخت کرنا جائز نہیں، اس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی بظاہر بیع المنقول قبل القبض ہے اس لیے اس کی بیع جائز نہیں۔

لما فی الهندیة: فنقول من حکم المبیع اذا کان منقولا ان لا یجوز بیعه قبل القبض الی ان قال واما اذا تصرف فیه مع بائعه فان باعه منه لم یجز بیعه اصلا قبل القبض۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۳ ص۱۳ الفصل الثالث فی معرفة المبیع والثمن والتصرف) [۱]

مبیعہ کو دوبارہ بائع پر فروخت کرنے کی شرط لگانا

سوال:- بعض لوگ کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری کے ساتھ یہ شرط لگاتے ہیں کہ جب میرے پاس پیسے آجائیں تو اس چیز کو مجھ پر دوبارہ فروخت کروگے یا جب تم فروخت کرنا چاہو تو معاملہ میرے ساتھ ہی ہوگا کسی اور پر فروخت نہیں کروگے۔ تو کیا بیع کرتے وقت اس قسم کی شرائط لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے بیع پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

الجواب:- بیع میں اس قسم کی شرائط جن میں بائع یا مشتری یا مبیعہ کو کوئی فائدہ ہو، لگانا شرعاً جائز نہیں، اس قسم کی شرائط سے کاروبار (بیع) فاسد ہوجاتا ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ کی بیع فاسد ہے۔

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: وهو لا یصح به القبض ...... وقیل بالقبض لان العقد فی ذاته صحیح غیر انه لا یجب علی المشتری دفع الثمن لعدم القبض۔ (رد المحتار ج ۴ ص۴۸ مطلب اشتریٰ دارًا ماجورة لا یطالب بالثمن قبل قبضها)

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا بیع بشرط عطف علیٰ الی النیروز یعنی الاصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدهما اوفیه نفع لمبیع۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۴ ص۱۳۵ مطلب فی البیع بشرط الفاسد) [۱]

سونے کے زیورات کی اُدھار تجارت کا حکم

سوال:۔ ہم چند پاکستانی دوست ملائیشیا میں پہلے کپڑے کی ادھار تجارت کرتے تھے لیکن اب کپڑے کی تجارت کا بہت مندہ ہے جبکہ سونے کے زیورات مثلاً انگوٹھیاں، بالیاں، جھومر اور دوسری اشیاء کی زبردست مانگ ہے تو ہم نے یہ تجارت شروع کردی، اب ہم سونے کے یہ زیورات ادھار پر بیچتے ہیں اور ماہانہ قسطوار یہ رقم ہمیں واپس ملتی ہے، اب کسی نے بتایا ہے کہ اس طرح ادھار پر سونے کی تجارت جائز نہیں ہے لیکن عدم جواز کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی، لہٰذا آپ اس کے جواز اور عدم جواز کی وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر سونے کی تجارت اس طریقہ سے ہو کہ سونا نقد ہو اور روپیہ اُدھار جیسا کہ سوال میں ہے تو پھر یہ تجارت جائز ہے اس لیے کہ یہ دونوں مختلف الاجناس اشیاء ہیں، اور اگر دونوں ادھار پر ہوں تو پھر ناجائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیه) سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار ج۴ ص۲۰۵ باب الربوٰ، کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: ولو باع شیئاً علیٰ ان یهب له المشتری او یتصدق علیه او یبیع منه شیئاً او یقرضه کان فاسداً۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع والتی لا تفسده)

[۲] لما فی الهندیة: وروی الحسن عن ابی حنیفةؒ اذا اشتری فلوساً بدراهم ولیس عند هٰذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم ان احدهما دفع وتفرقا جاز وان لم ینقد واحد منهما حتی تفرقا لم یجز کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۲۲۴ الفصل الثالث فی بیع الفلوس)

ومِثلُهٗ فی الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۵ ص۲ کتاب الصرف۔

جعل سازی کے ذریعے ویزے فروخت کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل بعض لوگ پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ پر اصل فوٹو کو تبدیل کرکے جعلسازی سے کسی دوسرے شخص کو سمندر پار ممالک میں بھیجتے ہیں اور اس پر بھاری رقم لیتے ہیں۔ تو کیا ان لوگوں کا یہ کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- ویزہ اگرچہ کاغذ کا ایک پرزہ ہوتا ہے مگر متعلقہ ملک کی حکومت کی طرف سے اسے قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے لہٰذا قانونی دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو بیچنا اور اس کی بھاری قیمت لینا شرعاً جائز ہے۔ لیکن کسی خاص (نامی نیٹ) ویزہ میں تصویر تبدیل کرکے کسی دوسرے شخص پر فروخت کرنا سراسر دھوکہ ہے اور نہ ہی ایسے ویزے کی کوئی قانونی حیثیت ہوتی ہے، لہٰذا دھوکہ دہی اور غیر قانونی طریقے سے کسی پر ویزہ فروخت کرکے بھاری رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ ویزہ کے عوض پیسے لینا قانونی تحفظ کی بناء پر تو جائز ہے نہ کہ دھوکہ دہی کے ذریعے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : (قوله فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال) ۔ قال العلامة العينیؒ : فی فتاواه ليس شیٔ يعتمد عليه ولكن العلماء والحكام مشوا ذلك للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً يقع فيه نزاع ۔

(ردالمحتار جلد۴ ص۵۱۹ كتاب البيوع مطلب فی النزول عن الوظائف بالمال)

گندے انڈے فروخت کرنے کا حکم

سوال :- ایک دوکاندار نے اپنے گاہک پر کچھ انڈے فروخت کیے، گھر جاکر اس نے جونہی انڈے توڑے تو وہ گندے نکل آئے، تو کیا گاہک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ گندے انڈے دکاندار کو واپس کرکے اس سے اپنی رقم لے لے؟

الجواب :- انڈے جب خراب ہوجائیں تو وہ مال نہیں رہتا، ان کا فروخت کرنا جائز نہیں اگر کہیں ایسا معاملہ ہوگیا ہو اور گاہک ان گندے انڈوں کو استعمال میں نہ لایا ہو تو اس کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوکاندار کو گندے انڈے واپس کرکے اس سے اپنے پیسے لے لے۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ من اشترى بيضاً او بطيخاً او قثاءً او خياراً او جوزاً فكسره فوجده فاسداً فان لم ينتفع به رجع بالثمن لانه ليس بمال فكان البيع باطلاً ۔

(الهداية جلد۳ ص۲۷ باب البيع الفاسد)

باب فی الخیار

(بیع میں خیار کے مسائل واحکام)

خیارِ رؤیت کا حکم

سوال:۔ اگر ایک چیز ایسی حالت میں خریدی جائے کہ مشتری نے اصالتاً یا وکالتاً نہ دیکھی ہو اور دیکھنے کے بعد مشتری کو پسند نہ آئے تو کیا وہ اس کو واپس کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو چیز بغیر دیکھے خریدی جائے تو بیع کی حقیقت موجود ہوکر معاملہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا، تاہم مشتری کو دیکھنے پر اختیار حاصل ہے، اگر اسے پسند نہ ہو تو وہ بغیر کوئی وجہ بتلائے بائع کو واپس کرسکتا ہے، تاہم اگر خریدنے پر آمادہ ہو تو پھر پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانی رحؒ:۔ ومن اشترٰی شیئاً لم یرہ فا لبیع جائز ولہ الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ۔

(الھدایۃ ج۳ ص۴۲ کتاب البیوع۔ باب خیار الرویۃ)[1]

غبنِ فاحش کا مسئلہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے زمین خریدی، لیکن خریدتے وقت دلال یا بائع نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے وہ زمین ایسی قیمت پر فروخت کی جو کہ عام مارکیٹ کے حساب سے کہیں زیادہ تھی، تو کیا اس بنا پر مشتری یہ زمین بائع کو شرعاً واپس کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مشتری نے ان تمام حالات کو جانتے ہوئے بھی اس زمین میں تصرف کیا ہو اور اس کے مالکانہ تصرفات پر کچھ مدت گذر گئی ہو تو پھر اس کو واپس کرنے کا حق

---

[1] قال فی الھندیۃ: من اشترٰی شیئاً لم یرہ فلہ الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردّ سواء راٰہ علی الصفۃ التی وصفت لہٗ او علٰی خلافھا۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۳ ص۵۷ الباب السابع فی خیار الرؤیۃ)

ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۶ ص۲۶ باب خیار الرؤیۃ۔

حاصل نہیں، کیونکہ غبنِ فاحش میں اگرچہ مشتری کو مبیعہ واپس کرتے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اس پر علم کے باوجود تصرفات کرنے سے یہ حق باقی نہیں رہتا۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: المشتری الذی حصل لہ تغریر اذا اطلع علی الغبن الفاحش ثم تصرف فی المبیع تصرف الملاک سقط حق فسخہ کما .... لوسقی الارض المبیعۃ او غرسھا الی غیر ذلک من التصرفات الدالۃ علی الرضا۔ (شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۳۵۹ ص۲۱۴) لہ

جملہ عیوب سے برأت کا اعلان کرکے کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری سے یوں کہا کہ اس چیز کے نقائص کے بارے میں اگر کچھ کہنا ہو تو اب کہہ لے ورنہ بعد میں میں کسی قسم کے عیب کا ذمہ دار نہیں ہوں گا، کیا بائع کا مشتری کو اس طرح کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت میں بیع بشرط برأت من العیوب درست ہے کہ بائع مبیعہ کے تمام عیوب سے برأت کا اعلان اور اظہار کرے، اس طرح کرنے سے بعد میں تنازعہ اور کبیدہ خاطری کی گنجائش نہیں رہتی اس لیے اس شرط پر کوئی معاملہ کرنا شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأۃ من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأۃ عن الحقوق المجھولۃ لا یصح عندہ ویصح عندنا لعدم افضائہ الی المنازعۃ ویدخل فیہ الموجود والحادث بعد العقد قبل القبض فلا یرد بعیب بان قال بعتک ھذا العبد علی انی بری من کل عیب۔ (ردالمحتار ج۵ ص۴۲ تحت مطلب فی البیع بشرط البرأۃ من کل عیب) ؎۲

لہ قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ:۔ کل تصرف یدل علی الرضا بعد العلم بہ یمنع الرد والرجوع بالنقص .... وسقی الارض وزراعتھا وکسح الکرم رضاء۔
(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۴ ص۳۵۱/۳۵۲ کتاب البیوع۔ باب الخیار)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۳ ص۷۵ کتاب البیوع۔

؎۲ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأۃ من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأۃ من الحقوق المجھولۃ لا تصح عندہ وتصح عندنا لعدم افضائہ الی المنازعۃ۔
(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ ج۱ ص۲۴۳ جواب السوال باب خیار الرؤیۃ)
ومثلہ فی شرح المجلۃ لسلیم رستم باز تحت المادۃ ۱۸۹ ص۸۹

بیع بالوفاء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے دس ہزار روپے کے عوض زمین کی بیع قطعی کرکے مشتری سے معاوضہ نقد وصول کرلیا ہے اور اب اس زمین میں بائع کا کوئی دخل نہیں رہا، لیکن بیع اس شرط سے طے کی کہ میعادِ مقررہ میں رقم واپس ہونے پر زمین واپس کی جائے گی۔ تو کیا بیع مذکورہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اصل قواعد کی رُو سے یہ معاملہ رہن ہو کر اس زمین سے انتفاع حرام ہوگا اور اگر اس معاملہ کو بیع تصور کیا جائے تو مشروط ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے، تاہم بحالت اضطرار بائع کے لیے متاخرین کے فتویٰ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے لیکن بلا ضرورتِ شدیدہ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وبیع الوفاء ذکرته هنا تبعاً للدرر وصورته ان یبیعه العین بالف علی انه اذا ردعلیه الثمن رد العین...... قیل هو رهن قال منا انفاعن جواهر الفتاوٰی انه الصحیح وقیل بیع یفید الانتفاع به هذا محتمل لاحد القولین، الاوّل انه بیع صحیح مفید لبعض احکامه من حل الانتفاع به الا انه لایملك بیعه وقال الزیلعیؒ فی الاکراہ وعلیه الفتوٰی۔ الثانی القول الجامع لبعض المحققین انه فاسد فی حق بعض الاحکام کحل الانزال ومنافع المبیع ورهن فی حق البعض حتٰی لم یملك المشتری بیعه من آخر ولا رهنه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۲۷۷ کتاب البیوع۔ باب الصرف مطلب بیع الوفاء)[1]

اطلاع علی العیب کا حکم

سوال:۔ زید نے عمر کو ایک چیز فروخت کرتے وقت یہ کہا کہ اس چیز میں فلاں عیب ہے، مشتری (عمر) نے زید سے کہا کوئی بات نہیں ہے اور وہ چیز خرید لی، مشتری نے اس پر قبضہ بھی کرلیا اور اس میں تصرف بھی کیا، اب ایک سال کے بعد مشتری اس عیب کی وجہ سے

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: القول الثامن الجامع لبعض المحققین انه فاسد فی حق بعض الاحکام حتٰی ملك کل منهما الفسخ وصحیح فی بعض الاحکام کحل الانزال ومنافع المبیع ورهن فی حق البعض (بحذف یسیر) وینبغی ان لا یعدل فی الافتاء عن القول الجامع

(البحر الرائق ج۶ ص۸ باب خیار الشرط، تحت "فرع")

وَمِثْلُهٗ فی التبیین الحقائق ج۵ ص۱۸۳ باب خیار الشرط۔

بلیعہ واپس کرنا چاہتا ہے، تو کیا اسے واپسی کا اختیار ہے؟

الجواب:۔ بائع جب مشتری کو مبیعہ میں عیب پر مطلع کر دے اور اطلاع علی العیب کے بعد مشتری بیع تام کر کے بلیعہ پر قبضہ اور تصرف کرنے کے بعد بائع کو اس عیب کی وجہ سے واپس کرنا چاہے تو شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل نہیں، تاہم اگر بائع و مشتری باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحؒ : بعد اطلاع المشتری علی عیب فی المبیع اذا تصرّف فیہ تصرّف الملک سقط خیارہ مثلاً وعرض المشتری المبیع للبیع بعد اطلاعہ علی عیب قدیم فیہ کان عرض المبیع للبیع رضی بالعیب فلا یردہ بعد ذٰلک ۔ (شرح المجلۃ ص۱۸۵ المادۃ ۳۴۴)

عدم رؤیت کی وجہ سے تبادلۂ زمین منسوخ کرنا

سوال:۔ دو دوستوں (زید اور عمر) نے آپس میں بن دیکھے زمین کا تبادلہ کیا تھا لیکن بعد میں ایک (زید) کی زمین بنجر اور دوسرے (عمر) کی زمین زرخیز نکلی، تو کیا زید سے عمر اپنی زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع و شراء اور تبادلہ کی صورت میں عاقدین کا بلیعہ یا عوضین کو دیکھ لینا ضروری ہے، اگر کوئی تبادلہ یا سودا بن دیکھے ہو جائے تو عدم رؤیت کی وجہ سے دونوں کو اپنی اپنی چیز واپس لینے اور دینے کا حق حاصل ہے، لہٰذا عمر زید سے اپنی زرخیز زمین واپس لے سکتا ہے ۔

قال الشیخ ابن الهمامؒ: ولنا قولہ علیہ السلام من اشتریٰ شیئاً لم یرہ فلہُ الخیار اذا راٰہ ۔ (فتح القدیر ج۶ ص۳۳۶ باب الخیار)

قال العلامۃ برهان الدین المرغینانیؒ : من اشتریٰ شیئاً لم یرہ فلہ الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع ثمنہ وان شاء

لہ لما فی الهندیۃ ، الاصل ان المشتری متی تصرف فی المشتری بعد العلم بالعیب تصرّف الملک بطل حقہ فی الرّد ۔

(الفتاویٰ الهندیۃ ج۳ ص۷۵ کتاب البیوع ، باب الخیار)

ردّہ سواء الخ (الهداية ج ۳ ص ۵۷ باب خیار العیب) [1]

عیب دار چیز کی خرید و فروخت

سوال: عیب دار اشیاء کی بیع وشراء (خرید و فروخت) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بیع میں مبیعہ کا مال متقوم ہونا ضروری ہے، عیب ایک خارجی شے ہے اس لیے عیب دار اشیاء کی بیع جائز ہے بشرطیکہ عیب کو چھپایا نہ جائے۔

عن زید بن ثابت انہٗ قال من باع غلامًا بالبراءۃ فھو برئ من کل عیب وکذٰلک الیٰ اٰخرہ۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۹۲ باب البیع بالبراءۃ من کل عیب) [2]

غیر ملکی ویزوں کی خرید و فروخت میں خیارِ عیب کا حکم

سوال: زید نے عمرو سے الریاض (سعودی عرب) کا ویزا اس شرط پر خرید اکہ کفیل الریاض کا رہنے والا ہوگا، اب عمرو الریاض میں زید کے لیے کفیل کا انتظام کرنے سے قاصر رہا جس کی وجہ سے زید نے کچھ عرصہ پہاڑوں میں حکومت سے چوری چھپے گذارا، بالآخر مجبوراً اپنے آپ کو سعودی حکومت کے حوالہ کردیا جس نے قانونی کارروائی کے بعد اُسے واپس پاکستان بھیج دیا، زید نے عمرو کو پاکستانی کرنسی میں ۴۰ ہزار روپے نقد دیئے تھے اور مزید ۳۰ ہزار کا وعدہ کیا تھا تو اب اس صورت میں زید عمرو کو حسبِ وعدہ ۳۰ ہزار روپے دینے کا پابند ہے یا عمرو زید کو چالیس ہزار روپے واپس کرے گا؟ شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر سعودی عرب کا ویزا بیع کے وقت موجود تھا

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: رجل اشترٰی ارضًا اوکرمًا فظھر ان شربه فکان علٰی ناوقة ای میزاب توضع علٰی ظھر نھر او موضع اٰخر کان له ان یردلان ذٰلک یعد عیبا عند الناس الخ المشتری بالخیار ان شاء امسکھا بجمیع الثمن وان شاء ردّ۔ (تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۲۷۶ کتاب البیوع، باب الخیار)

[2] قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: واذا اطلع المشتری علی العیب فی المبیع فھو بالخیار وان شاء اخذہٗ بجمیع الثمن وان شاء ردّہ۔ (الهداية ج ۳ ص ۲۳ باب خیار العیب)
ومثلهٗ فی رد المحتار ج ۴ ص ۱۰۰ باب خیار العیب۔

اور اس میں الریاض شہر کے ہی کسی باشندہ کی کفالت کا ذکر تھا مگر الریاض پہنچنے پر کفالت کا معاملہ معاہدہ کے برعکس نکلا تو اس میں مشتری کو نقص وفسخ کا حق حاصل ہے۔

لما فی الھندیۃ: وان اشتری ثوباً علیٰ انہ عشرۃ اذرع بعشرۃ الیٰ قولہ فالمشتری بالخیار الیٰ قولہ وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فیختل رضاہ فیتخیر الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۲۴ الفصل الثامن فی جھالۃ المبیع او الثمن) لہ

اور اختمال مذکورہ صورت میں بھی ظاہر ہے کہ وصف مرغوب فوت ہوا ہے، لہٰذا مشتری کو نقص کا اختیار حاصل ہے۔

خیارِ رؤیت ناقابلِ انتقال حق ہے

سوال:۔ ہمارے والد صاحب نے کراچی سے کچھ مال منگوایا اور مال پہنچنے سے قبل والد صاحب فوت ہو گئے، جب مال آیا تو وہ عیب دار نکلا جو کہ ہمیں پسند نہیں، اب ہم اس مال کو واپس کرنا چاہتے ہیں مگر کمپنی والے نہیں مانتے، تو کیا شرعاً ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اس مال میں خیارِ رؤیت کا حق استعمال کر کے مال واپس کر دیں؟

الجواب:۔ خیار رؤیت ایسا حق ہے کہ جس میں ارث جاری نہیں ہوتا اور نہ یہ ورثا کی طرف منتقل ہوتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے والد صاحب نے مال کو نہیں بھی دیکھا ہو اور ان کے انتقال کے بعد پسند نہ آنے پر آپ کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ خیار رؤیت کا حق استعمال کر کے اُسے واپس کریں کیونکہ بیع تام ہو چکی ہے، تاہم اگر کمپنی والے اقالہ کرنا چاہیں تو صحیح ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: خیار الرؤیۃ لاینتقل الی الوارث فاذا مات المشتری قبل ان یری المبیع لزم البیع ولا خیار لوارثہ۔ وقال العلامۃ رستم باز: لان خیار الرؤیۃ لیس الا مجرد ارادۃ ومشیئۃ وھذا وصف فلا یمکن انتقالہ الی الوارث۔ (شرح مجلۃ الاحکام ص ۱۸۱ المادۃ ۳۲۱ باب الخیارات)

لہ قال العلامۃ الحصکفیؒ: ثم الخیارات بلغت سبعۃ عشر الثلاثۃ..... وفوات وصف مرغوب فیہ۔ قال ابن عابدینؒ: ھوما یذکرہ فی ھذا الباب فی قولہ اشتری عبداً بشرط خبزہ او کتبہ الخ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۵۱،۵۰ باب خیار الشرط)
ومثلہ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۲۴ باب خیار الشرط۔

باب الاقالۃ

(سودا واپس کرنے کے احکام و مسائل)

اقالہ میں طرفین کا رضامند ہونا

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان باقاعدہ عقد (سودا) ہو جانے کے بعد اگر ایک فریق واپسی کی خواہش کرے لیکن دوسرا فریق اس پر رضامند نہ ہو، تو کیا واپسی کا خواہش مند جبراً اپنا حق واپسی منوا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باقاعدہ ایجاب و قبول کے بعد عقدِ بیع لازم ہو کر کسی ایک کو جبراً عقد ختم کرنے کا حق حاصل نہیں، تاہم اگر اقالہ کی صورت ہو تو اس کے لیے طرفین کی رضامندی ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : من شرائطها اتحاد المجلس ورضا المتعاقدین لان الکلام فی رفع عقد لازم واما رفع ما لیس بلازم فلمن له الخیار بعلم صاحبه لا برضاه بحر ۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۲۱ باب الاقالة) [1]

اقالہ میں قیمت کم کرنے کی شرط لگانا

سوال: انعقادِ بیع کے بعد اگر طرفین اس شرط پر بیع فسخ کرنا چاہیں کہ مشتری بائع کو ادا کی ہوئی رقم میں سے کچھ چھوڑے گا، کیا شرعاً دونوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع فسخ کرتے وقت اگر بائع اور مشتری قیمت کم کرنے کی شرط لگاتے ہیں تو دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ ہو کر بائع مشتری کو پوری رقم واپس کرے گا، رقم منہا کرنے کی شرط کالعدم ہو کر باطل رہے گی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمه الله : الاقالة جائزة فی البیع

---

[1] قال فی الهندیة : وشرط صحة الاقالة رضاء المتقائلین ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۳ ص ۱۵۷ الباب الثالث عشر فی الاقالة)

ومثله فی شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم باز، تحت المادة ۱۹۰ ص ۹۲

بمثل الثمن الاوّل فان شرط اکثر منہ او اقل فالشرط باطل ویرد مثل الثمن الاوّل۔
(الہدایۃ ج۳ ص۴۷ باب الاقالۃ) لہ

فروخت شدہ چیز کو کم قیمت پر واپس لینا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو قرض پر اونٹ فروخت کیا، قیمت کی ادائیگی کے وقت مشتری نے ادائیگی سے انکار کرتے ہوئے مبیع واپس کرنا چاہا، اب بائع مشتری سے اونٹ اسی قیمت پر یا اس سے کم قیمت پر واپس لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں باقاعدہ طور پر ایجاب وقبول ہو کر بیع قطعی ہو چکی ہے جس سے مبیعہ بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں آچکا ہے لیکن اب اگر مشتری بیع فسخ کر کے مبیعہ واپس کرنا چاہتا ہے تو بائع کو مبیعہ سابقہ قیمت پر یا اس سے زائد قیمت پر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم یہ جائز نہیں کہ بائع مبیعہ کو کم قیمت پر واپس لے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لو باع شیئاً اصالۃً بنفسہ او وکیلہ او وکالۃ عن غیرہ لیس لہ شراءہ باقل لا لنفسہ ولا لغیرہ۔
(رد المحتار ج۵ ص۷۴ باب البیع الفاسد، مطلب فی التداوی بلبن البنت۔الخ) ۲ہ

مبیعہ پسند نہ آنے پر واپس کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے دوسرے آدمی پر کوئی چیز اس شرط پر فروخت کی کہ یہ فلاں کمپنی کی مصنوعات

لہ قال العلامۃ سلیم رستم باز رحمہ اللہ: الثالث انہا لا تفسد الشرط الفاسد وان لم تصح تعلیقھا بہ بل یکون الشرط لغواً فلو تقایلا علی ان یؤخر المشتری الثمن سنۃ او علی ان یحط منہ خمسین صحت الاقالۃ لا التاخیر والحط۔
(شرح مجلۃ الاحکام لسلیم رستم باز ص۹۱ المادۃ ۱۹۰ الفصل الخامس فی الاقالۃ)
ومثلہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۱۵۶ الباب الثالث عشر فی الاقالۃ۔

۲ہ قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: شراء ما باع باقل مما باع من الذی اشتراہ او من وارثہ قبل نقد الثمن لنفسہ او لغیرہ........ فاسد عندنا۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۴۱ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامہ)
ومثلہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد والتی لا تفسدہ۔

ہیں سے ہے جو کہ عمدہ اور اعلیٰ معیار کی حامل ہے، لیکن خریدنے کے بعد اس چیز کی حقیقت کچھ اور نکلی، تو کیا اس وجہ سے مشتری کو مبیعہ واپس کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ بیع کے وقت کسی چیز کے بیان کیے ہوئے ایسے اوصاف (جن کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے) کا مبیعہ میں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ عدم موجودگی کی صورت میں مشتری کو کل قیمت پر لینے یا بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل رہے گا۔ اس بناء پر مذکورہ صورت میں کمپنی کی مصنوعات بوقتِ بیع بیان کردہ اوصاف یعنی عمدگی اور پائیداری سے عاری معلوم ہوں تو مشتری کو کل قیمت پر لینے یا واپس کرنے کا حق حاصل ہے۔

لما قال فی الهندية: وان اشترى ثوبًا على انه عشرة اذرع بعشرة او ارضًا على انها مائة اذرع بمائةٍ فوجدها اقل فالمشتری بالخيار ان شاء اخذها بجميع الثمن وان شاء ترك وان وجدها اكثر من الذراع الذی سماه فهو للمشتری علی خيار للبائع وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فيختل رضاه ولا يحط شئ من الثمن كذا فی الكافی۔ (الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۲۴ الفصل الثامن) [1]

اقالہ کی صورت میں رقم میں زیادتی جائز نہیں

سوال:۔ زید نے اپنا کھیت بکر پر مبلغ ایک لاکھ روپے میں فروخت کر دیا، بکر نے موقع پر دس ہزار روپے زید کو پیشگی دیدیئے اور بقایا رقم چند دنوں کے بعد دینے کا وعدہ کیا، ایک مہینہ گذرنے کے بعد زید نے اپنا کھیت بکر سے واپس لینا چاہا اور کہا کہ میں کھیت کو فروخت نہیں کرتا ہوں، اور بکر کو اس کی اصل رقم دس ہزار روپے کے علاوہ پانچ ہزار روپے بطور پشیمانی بھی دیئے، تو کیا بکر کے لیے

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: اشترى من آخر فرسًا ذكر البائع انها من نسل خيل فلان لفرس مشهور بالجودة ثم تبين كذبه هل له الرد ام لا فاجاب اذا اشتراها بناءً على ما وصف له بثمن لولم يصفها بهذه الصفة لاتشترى بذلك الثمن والتفاوت بين الثمنين فاحش وهى لا تساوى ما اشتراها به له الرد اذا تبين خلاف ذلك۔ (تنقيح فتاوى حامدية ج۱ ص۲۲۳ باب الخيارات)

ومثلهٗ فی شرح مجلة الاحكام، تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹ باب الخيارات۔

یہ پانچ ہزار روپے بطور پشیمانی کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں ایجاب وقبول کے بعد اگرچہ بیع منعقد ہوچکی تھی اور زید زمین کو واپس لینے کا مجاز نہیں تھا مگر جب بکر نے بیع فسخ کرنے پر رضامندگی ظاہر کی اور بیع کو ختم کر دیا (اسے شرعاً اقالہ کہا جاتا ہے) تو اس کے بدلے میں بکر کے لیے زید سے بصورتِ جرمانہ اور پشیمانی کے اپنی اصل رقم کے علاوہ مزید کچھ رقم لینا حلال نہیں ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لا یحل مال امرءٍ مسلم الا عن طیب قلبہ انتھی۔
(مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۲۵۵ باب الغصب والعاریۃ) [1]

ثمن خرچ ہوجانے سے اقالہ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک آدمی کسی زمیندار سے خریدی ہوئی چیز اسے واپس کرنا چاہتا ہے اور زمیندار بھی واپسی پر راضی ہے لیکن جو رقم اس نے مشتری سے لی تھی وہ اس سے ختم ہوچکی ہے، اب زمیندار مشتری سے کہتا ہے کہ تم مجھے یہ چیز واپس کردو لیکن پیسے ایک ماہ کے بعد ملیں گے۔ تو کیا ایسا اقالہ کرنا جائز ہے جبکہ واقعتاً زمیندار کے پاس پیسے نہیں ہیں؟

الجواب:۔ ثمن (پیسوں) کا تلف یا ختم ہوجانا اقالہ کے انعقاد کیلئے مانع نہیں ہے، اسلئے اگر دونوں متعاقدین باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہتے ہوں اور مشتری رقم کی واپسی کا انتظار کرسکتا ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: ھلاک الثمن ای تلفہ لا یمنع صحۃ الاقالۃ۔ قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: وذلک لان الاقالۃ رفع البیع والاصل فی البیع المبیع لا الثمن ولھذا الوھلک المبیع قبل القبض یبطل البیع بخلاف ھلاک الثمن۔
(شرح مجلۃ الاحکام ص۹۵ المادۃ ۱۹۶ فصل فی الاقالۃ)

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: قولہ وتصح بمثل الثمن الاول حتی لو کان الثمن عشرۃ دنانیر فدفع الیہ دراھم ثم تقابلا وقد رخصت الدنانیر رجع بالدنانیر لا بما دفع وکذا الورد لعیب الخ۔
(رد المحتار علی ہامش الدر المختار ج۴ ص۱۶۵ باب الاقالۃ)
ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۴ باب الاقالۃ۔

باب المرابحة والتولية
(بیع مرابحہ و تولیۃ کے احکام و مسائل)

بیع مرابحہ میں منافع کی مقدار متعین نہیں

سوال:۔ ایک دوکاندار عام طور پر مارکیٹ سے زائد نرخ پر سودا فروخت کرتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ نیز کیا شریعت نے کسی چیز کی فروخت پر منافع کی کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت مقدسہ نے خرید و فروخت کو بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی پر موقوف رکھا ہے، بائع اور مشتری جس نرخ پر بھی متفق ہوں وہی نرخ شرعاً جائز ہے۔ فقہاء نے بیع مرابحہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ربح کی تعین نہیں فرمائی ہے، البتہ بازار کے عام نرخوں سے زائد پر فروخت کرنا جائز تو ہے مگر خلافِ مروت ہے۔

لما قال فی الهندیة: ومن اشترٰی شیئًا واغلٰی فی ثمنه جاز۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۳ ص۱۶۱ کتاب البیوع، الباب الرابع عشر فی المرابحة والتولیة ..الخ)[۱]

بیع مرابحہ میں شبہ خیانت سے اجتناب ضروری ہے

سوال:۔ اگر کسی چیز کو ادھار سے خریدا جائے تو فروخت کرتے وقت اُس کو یہ بتلانا ضروری ہے کہ میں نے اس کو اتنی قیمت میں ادھار خریدا ہے اور اتنے نفع میں فروخت کرتا ہوں؟

الجواب:۔ بیع مرابحہ کا دارو مدار دیانت و امانت پر ہے، اس میں ہر اس قدم سے اجتناب ضروری ہے جس سے شبہ خیانت ہو، چونکہ ادھار میں عموماً نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے اس لیے ادھار سے خریدی ہوئی چیز اگر گاہک کو قیمت خرید بتا کر فروخت کرے تو اصل قیمت کے ساتھ ادھار کا اظہار بھی ضروری ہے۔

---

[۱] قال العلامة جلال الدین الخوارزمیؒ: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔

الکفایة فی ذیل فتح القدیر ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۴ ص۴۵۵ کتاب البیوع۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ومن اشتریٰ غلاماً بالف درهم نسیئة فباعه بربح مائة ولم یبین فعلم المشتری فان شاء رده وان شاء قبل لان للاجل شبهاً بالمبیع الایریٰ انهٗ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ (الهداية ج۳ ص۷۶ باب المرابحة والتولية) له

بیع مرابحہ میں گز اور میٹر کے تعین کی ضرورت

سوال:۔ کپڑے کا ایک دوکاندار بعض کپڑا گز کے حساب سے اور بعض میٹر کے حساب سے خریدتا ہے اور گاہک کو ایک روپیہ فی گز منافع لے کر بیچتا ہے اور بل دکھا کر میٹر اور گز کی تفصیل طے کئے بغیر معاملہ طے ہو جاتا ہے، کیا دوکاندار کے لیے ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ گاہک کو کسی چیز کی قیمتِ خرید بتا کر فروخت کرنا بیع مرابحہ ہے، میٹر اور گز میں چونکہ تقریباً ساڑھے تین انچ فرق ہے اس لیے میٹر کے حساب سے خریدے ہوئے کپڑے کو میٹر اور گز کا تعین کئے بغیر فروخت کرنے میں خیانت کا قوی احتمال ہے اس لیے معاملہ کو یوں مبہم کر کے چھوڑنا جائز نہیں ہے، دوکاندار کو چاہیئے کہ اول تو گاہک کو قیمتِ خرید بتائے ہی نہیں اور اگر قیمتِ خرید بتائے تو پھر گز اور میٹر کا فرق بتا دینا بھی انتہائی ضروری ہے۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ولهذا کان مبناهما علی الامانة والاحتراز عن الخيانة وعن شبهتها۔ (الهداية ج۳ ص۷۳ باب المرابحة والتولية) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ : اشتراه بالفٍ نسیئةً وباع بربح مائة بلا بیان خیر المشتری۔

وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : ای بعین رده واخذه بالف ومائة حالة لان للاجل شبهاً بالمبیع الا تریٰ انهٗ یزاد فی الثمن لاجله۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۵ ص۱۴۲/۱۴۱، مطلب اشتریٰ من شریکه سلعة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۴ باب المرابحة والتولية۔

[۲] قال العلامة الکاسانی رحمه الله : فالاصل فیه ان بیع المرابحة والتولية بیع امانة .... نتجب صیانتها عن الخیانة وعن سبب الخیانة والتهمة لان التحرز عن ذٰلک کله واجب ما امکن۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۳ باب المرابحة والتولية)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۳۸ باب المرابحة والتولية۔

آمدورفت کا خرچہ خریدی گئی چیز کی اصل قیمت میں ملانا

سوال:۔ ایک دوکاندار کوئی چیز خریدنے کے لیے کسی دوسرے شہر جائے تو اس پر جو خرچہ آمدورفت وغیرہ آتا ہے وہ اگر اس چیز کی قیمتِ خرید میں شمار کرکے فروخت کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ کسی چیز کے خریدتے وقت اس پر آنے والے اخراجات عقدِ مرابحہ کی صورت میں قیمتِ خرید میں ملاکر گاہک سے وصول کرنا شبۂ خیانت کا مقتضی ہے اس لیے از روئے شرع یہ جائز نہیں کہ بائع اصل قیمت بتاتے وقت یہ اضافی اخراجات بھی اس میں ضم کرے۔ تاہم قیمتِ خرید سے قطع نظر کرکے بائع فروخت کرنے کے لیے جو معیار مقرر کرے اس میں اصل قیمت کے ساتھ اضافی اخراجات بھی شامل ہوں اور مشتری اور بائع کے درمیان باہمی رضامندی سے کسی قیمت پر اتفاق ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: لایضم نفقة نفسه ای فی سفره ککسوته وطعامه ومرکبه وغسل ثیابه۔ (رد المحتار ج۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولية)[۱]

کسی چیز کی قیمتِ خرید میں اضافی اخراجات ملانے کی صورت

سوال:۔ بیرونِ ملک سے سامانِ تجارت منگوانے کی صورت میں مختلف سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی اور دوسرے اخراجات سے قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ ایک چیز کی قیمت بین الاقوامی منڈی میں ایک ہزار روپے ہو تو یہاں پہنچتے پہنچتے اس کے جملہ اخراجات دس ہزار روپے سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تو کیا یہاں اس چیز کو ان کئی گنا اضافی اخراجات کے ساتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سامانِ تجارت پر آنے والے اخراجات کو قیمتِ خرید میں ضم کرنا مرتخص ہے اس صورت میں اضافی اخراجات خریدے ہوئے مال پر تقسیم کرکے گاہک سے وصول کرنے میں

---

[۱] لما قال فی الهندیة: ولا یحمل علیه ما انفق علیه فی سفره من طعامٍ ولا کراءٍ ولا مؤنةٍ لانعدام العرف فیه ظاهراً کذا فی المبسوط۔
(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۶۲ الباب الرابع عشر فی المرابحة والتولية)
ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۱۱ کتاب البیوع، باب المرابحة والتولية۔

شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم شبۂ خیانت سے بچنے کے لیے اگر قیمتِ خرید بتانے کی ضرورت محسوس ہو تو اضافی اخراجات ملا کر قیمتِ خرید بتانا دیانت کے خلاف ہے، البتہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز ان یضیف الی رأس المال اجرة القصار والطراز والصبغ والفتل واجرة حمل الطعام ویقول قام علیّ بکذا ولا یقول اشتریته بکذا کیلا یکون کاذبًا۔ (الهداية ج۳ ص۴۳ باب المرابحة والتولية) [۱]

بیع مرابحہ میں خیانت کے باعث مشتری کا مبیعہ واپس کرنا

سوال: مشتری اگر بائع پر اعتماد کر کے دو فیصد منافع دینے پر تیار ہو جس کے نتیجے میں بائع نے چار ہزار کی خریدی ہوئی چیز مشتری پر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، بعد میں مشتری کو کسی ذریعہ سے بائع کے جھوٹ پر آگاہی ہوئی کہ یہ چیز تو اس نے چار ہزار میں خریدی تھی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مشتری بائع سے ادا کی گئی زائد رقم (ایک ہزار بیس روپے) واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بیع مرابحہ میں جب بائع کی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم طے شدہ قیمت میں کمی کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں مشتری یا تو خریدی ہوئی چیز بائع کو واپس کر کے اپنی پوری رقم واپس لے لے یا پھر طے شدہ پوری قیمت ادا کرے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علی خیانة فی المرابحة فھو بالخیار عند ابی حنیفة رحمہ اللہ ان شاء اخذه بجمیع الثمن وان شاء ترکه۔ (الهداية ج۳ ص۵۷ باب المرابحة والتولية) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: ولهٰذا ان یضم الی رأس المال اجر القصار والصبغ والطراز والفتل وحمل الطعام وسوق الغنم ویقول قام علیّ بکذا ولا یقول اشتریته لانه کذب۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۰ باب التولیة والمرابحة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۳۵ کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة)

[۲] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: فان ظهر خیانته فی مرابحة باقراره او برهان علی ذٰلک او بنکوله عن الیمین اخذه المشتری بکل ثمنه او ردّه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۳۷ کتاب البیوع باب المرابحة والتولیة۔

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۶ باب المرابحة والتولیة۔

سیل ٹیکس قیمتِ خرید میں ملانے کا حکم

سوال:۔ حکومت تاجروں اور چھوٹے دوکانداروں سے سیلز ٹیکس کے نام سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے تو کیا بائع کے لیے اتنی مقدار رقم مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا اور مشتری سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ سیلز ٹیکس یا دیگر ٹیکس چونکہ جائز حدود سے نکل کر ظلم و تعدّی کے دائرہ میں داخل ہیں اور اس میں کسی امیر یا غریب کی تمیز بھی نہیں، شرح ٹیکس بھی اتنی زیادہ ہے کہ دینے والا اس کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہے اس بناء پر سیلز ٹیکس بالکل اُس رقم کی طرح ہے جو راستے میں تاجروں سے ظلماً و جبراً وصول کی جاتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو قیمتِ خرید بتاتے وقت اس میں ٹیکس کا اضافہ ضم کرنے میں خیانت کا پہلو غالب ہو جاتا ہے، تاہم اگر بائع مشتری کو قیمتِ خرید بتائے بغیر جملہ ٹیکسوں کا حساب کر کے اُس سے کسی قیمت پر اتفاق کرلے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: لايضم اجر الطبيب ...... وما يؤخذ في الطريق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمّه هٰذا هو الاصل كما علمت فليكن المعول عليه۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولية)

ضلع ٹیکس، پل ٹیکس، محصول چونگی وغیرہ اخراجات اصل قیمت میں ملانا

سوال:۔ پل ٹیکس، ضلع ٹیکس، راہداری اور محصول چونگی وغیرہ کے اخراجات مبیعہ کی اصل قیمت سے ملانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آجکل حکومت کے عائد کردہ مذکورہ بالا ٹیکس ظالمانہ اور جابرانہ صورت اختیار کر چکے ہیں، ان اضافی اخراجات کا مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا یا نہ ملانا تجار کی عادت اور عرف پر موقوف ہوگا، پس اگر تجار کی عادت اور عرف ملانے کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہے ورنہ اضافی اخراجات کا اصل قیمت میں ملانا جائز نہیں۔

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله:۔ هي اي التولية بيع بثمن سابق والمرابحة بيع وبزيادة۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۱۰۱ باب المرابحة والتولية)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج ۳ ص۱۶۳ كتاب البيوع۔ باب المرابحة والتولية۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصکفی رحمہ اللہ : لا یضم اجر الطبیب .... وما یأخذ فی الطریق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمه هذا هو الاصل کما علمت فلیکن المعوّل علیه۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولیة) لہ

قسطوں میں اشیاء کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آج کل بعض کاروباری ادارے عوام کی سہولت کے لیے روزمرہ استعمال کی اشیاء قسطوں میں فروخت کرتے ہیں لیکن نقد ادائیگی کی نسبت اقساط میں خریدنے کی صورت میں زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، تو کیا بذریعہ اقساط حکومتی یا بعض پرائیویٹ اداروں سے اشیاء ضروریہ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دورِ حاضر میں اقساط کے ذریعے روزمرہ استعمال کی چیزوں کی خرید و فروخت کا رواج عام ہوچکا ہے کیونکہ کم آمدنی اور متوسط طبقہ کے لوگ مہنگائی اور تنگدستی کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیزیں نقد ادائیگی کرکے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہٰذا انہیں ضروری اشیاء اور دیگر سامان وغیرہ مجبوراً قسطوں میں خریدنا پڑتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بائع اسی وقت اپنا سامان خریدار کی طلب پر اس کے حوالے کردیتا ہے جبکہ خریدار اُس چیز کی قیمت نقد ادا نہیں کرتا بلکہ طے شدہ قسطوں کی صورت میں ادا کرتا ہے، اس طریقہ پر کوئی چیز خریدنے کی صورت میں اس کی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے، اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے جبکہ قسطوں میں ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔

مذکورہ طریقۂ بیع میں صرف یہی ایک پیچیدگی نظر آتی ہے کہ ادھار خریدنے کی صورت میں قیمت زیادہ اور نقد خریدنے کی صورت میں قیمت کم دینی پڑتی ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء و محدثین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں زیادہ قیمت لگانا شرعاً مرخص ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ عاقدین کسی ایک قیمت پر متفق ہوں

لہ قال العلامة ابن نجیم المصری ؒ: والذی یوخذ فی الطریق من الظلم لایضم الا فی موضع جرت العادة فیه بینهم بالضم ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱ باب المرابحة والتولیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۶۳ کتاب البیوع باب المرابحة والتولیة ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر بائع یہ کہے کہ یہ چیز میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور طرفین کسی ایک نرخ پر اتفاق کئے بغیر جدا ہوئے تو یہ بیع ناجائز ہے، البتہ اگر اسی مجلس میں نقد یا ادھار میں سے کسی ایک قیمت پر دونوں کا اتفاق ہو گیا تو بیع جائز ہے یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نقد اور ادھار کی بجائے مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں مقرر کی جائیں، مثلاً نقد سو روپے میں جبکہ ادھار ایک سو بیس روپے میں، اور یہ ادھار ایک ماہ کے لیے ہوگا، اور اگر ادھار دو ماہ کا ہو تو ایک سو پچاس روپے میں، اور اگر ادھار تین ماہ کے لیے ہو تو اور بھی زیادہ قیمت ہوگی۔ تو جس طرح نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو اسی طرح مدتوں کے اختلاف کی بنا پر بھی قیمتوں میں اختلاف جائز ہے، کیونکہ بیع کی ان دونوں قسموں میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عاقدین کے درمیان عقدِ بیع میں مختلف مدتوں اور قیمتوں کے درمیان کسی ایک مدت اور قیمت کا تعین ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا کہ ایک ماہ تک رقم ادا کروگے تو اتنی قیمت، دو ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت اور تین ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت، اور اگر تعین کئے بغیر جدا ہوئے تو جہالت لازم ہو کر بیع ناجائز ہے۔

قال الامام ترمذی رحمہ اللہ : تحت ھٰذا الحدیث نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃٍ وقد فسر بعض اھل العلم قالوا بیعتین فی بیعۃ ان یقول ابیعك ھٰذا الثوب بنقدٍ لعشرۃ وبنسئۃٍ لعشرین ولا یفارقہ احد البیعین فان فارقہ فلا بأس بہ اذا کانت العقدۃ علیٰ احدٍ منھما۔ (الترمذی ج ۱ ص ۲۳۳ کتاب البیوع۔ باب ما جاء فی النھی عن بیعتین فی بیعۃ) [1]

ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا | سوال :- بعض اوقات ایک چیز

---

[1] قال العلامۃ علی ابن ابی بکر المرغیناتی رحمہ اللہ : لان للاجل شبھًا بالمبیع الا یریٰ انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔

(الھدایۃ ج ۳ ص ۷۶ باب المرابحۃ والتولیۃ، کتاب البیوع)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۱۵ باب المرابحۃ والتولیۃ۔

نقدادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر جبکہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر ملتی ہے، کیا نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی مرخص ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مجلسِ عقد میں مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کرلی جائے۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: لان للاجل شبھاً بالمبیع الا یریٰ انہٗ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ (الھدایة ج۳ ص۷۶ کتاب البیوع۔ باب المرابحة والتولیة) [۱]

بیع مرابحہ میں دھوکہ سے لی گئی زائد رقم پر رجوع کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے شوتل (جانوروں کا چارا) خریدنا چاہا اور اُس سے اس کا نرخ پوچھا تو اس نے بتایا کہ بوری کے حساب سے ۴۵ روپے فی بوری مجھے پڑتی ہے اور آپ کو میں ۵۰ روپے فی بوری کے حساب سے دوں گا، وہ شخص اس سے بوریاں خرید لیتا ہے اور بعد میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ بازار میں تو اس کا ریٹ ۴۸ روپے فی بوری ہے، اب شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ بائع سے زیادہ لی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ بیع مرابحہ کی ہے، بیع مرابحہ میں عاقدین کے مابین جو بھی طے پاگیا وہی اس چیز کی قیمت ہے، البتہ غبن فاحش کی صورت میں مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس سودے کو طے شدہ قیمت پر قبول کرے یا واپس کرکے بائع سے اپنے پیسے واپس لے لے، نقصان یا زیادتی کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علیٰ خیانة فی المرابحة فھو بالخیار۔ (الھدایة ج۳ ص۵۵ باب المرابحة والتولیة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ:۔ لان للاجل الا تریٰ انہٗ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔
(البحر الرائق ج۶ ص۱۱۴ کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۶ ص۱۳۳ کتاب البیوع۔ باب المرابحة والتولیة۔

[۲] قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمہ اللہ: فان خان فی مرابحة اخذ بکل ثمنہ۔
(کنز الدقائق علیٰ ھامش البحر الرائق ج۳ ص۱۱۰ تحت باب المرابحة)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص۱۴۷ باب المرابحة والتولیة۔

بیع کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک دوکاندار آٹھ آنے کی چیز دو روپے میں فروخت کرتا ہے لیکن اپنی قیمتِ خرید کو خفیہ رکھتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسا کرنا جائز اور حلال تو ہے مگر خلافِ مروت ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مناسب قیمت پر فروخت کرے، قیمتِ خرید کو ظاہر کیے بغیر مبیع بیچنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ولو اشتری ثوبًا بالعشر دراھم رقمہٗ اثنی عشر فباعہ مرابحۃ علی الرقم بغیر بیان جاز اذا کان الرقم معلومًا والربح معلومًا ولا یکون خیانۃ لانہ صادق لکن لا یقول اشتریتہ لانہ یکون کاذبًا فیہ۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۳ فی تحت بیان فی المرابحۃ) [1]

بیع مرابحہ میں فیصدی کے ساتھ منافع کے تعین کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص بیع مرابحہ کرتے وقت اصل قیمت سے زائد رقم کیلئے فیصدی کا سہارا لے، مثلاً زید (تاجر) بکر (گاہک) سے کہتا ہے کہ میں آپ سے اس مال میں پانچ فیصد منافع لوں گا، تو کیا یہ عقد جائز ہے؟ کیا یہ سود کے زمرے میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ مرابحہ میں اس نوعیت سے منافع کا تعین کرنا اگرچہ آجکل کے سودی لین دین کے ساتھ مشابہ ضرور ہے مگر حقیقت میں یہ سود نہیں لہٰذا صرف مشابہت کی بناء پر اس کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق منافع کا تعین فیصد کے اعتبار سے کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس عقد میں بیع مرابحہ کے جملہ لوازمات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: المرابحۃ نقل ما ملکہ بالعقد الاول بالثمن الاول مع زیادۃ ربح والتولیۃ نقل ما ملکہ بالعقد الاول بالثمن الاول من غیر زیادۃ ربح والبیعان جائزان۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۴ باب المرابحۃ والتولیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۱ تحت باب المرابحۃ والتولیۃ۔

وضاحت

★

آجکل بلکہ زمانہ قدیم سے بازار میں ایک رواج چلا آرہا ہے کہ تاجر حضرات کوئی چیز نقد ادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور اُدھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں۔ اہل علم حضرات نے اس کی شرعی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ الحق میں بھی اس موضوع پر ایک طویل سلسلہ بحث چلا تھا، اس بحث میں مولانا طاسین صاحب کراچی، مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی نے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا جبکہ دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے دارالعلوم کا مؤقف دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب افادہ عام کے لیے اس سلسلہ بحث کو فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ ——— (از مرتب) ———

اُدھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مجلس علمی کراچی

زیر نظر مضمون میں میرا اصل مقصد جس خاص مسئلہ کی شرعی حیثیت سے بحث و تحقیق کرنا ہے وہ مسئلہ ہے کہ اُدھار پر کوئی چیز اُس قیمت سے زائد پر فروخت کرنا جو قیمت اس چیز کی بازار میں بصورت نقد رائج ہو، مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں عام طور پر بصورت نقد ایک سو روپے ہے اس کو مثلاً ایک سال کے اُدھار پر ایک سو پچاس روپے میں فروخت کرنا اور خریدنا۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی اس میں جس معاشی معاملے کا ذکر ہے قرآن و حدیث کی رُو سے یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز معاملہ؟ اس بحث و تحقیق میں اس کا تعین کرنا اصل مقصود ہے، اور یہ اس لیے کہ متعدد اشخاص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور یہ ایک زندہ مسئلہ ہونے کے ساتھ اپنے اثرات و معروضی نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور ضروری مسئلہ بھی ہے۔

بحث کے شروع میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت میں کسی مسئلہ و معاملہ کے متعلق شرعی حکم صرف وہی ہو سکتا ہے جس کا تفصیلی یا اجمالی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو کیونکہ شریعت اسلامی کا حقیقی ماخذ و سرچشمہ صرف قرآن و حدیث ہیں لہٰذا اصلاً اس بحث کا دائرہ انہی تک محدود رہے گا، تعامل صحابہ کرام رض در اصل کتاب و سنت پر مبنی ہے۔ لہٰذا کسی مسئلہ اور معاملہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ محدثین کرام کے ہاں حدیث کا جو وسیع مفہوم ہے اس میں آثار صحابہ رض بھی شامل ہیں، مطلب یہ کہ کسی معاملہ کے شرعی جواز و عدم جواز کے متعلق صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اس فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے جج حضرات کسی فقیہ کے قول کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب اس کے ساتھ قرآن و حدیث کی کوئی دلیل موجود ہو کیونکہ دستور مملکت خداداد پاکستان کے اندر صرف قرآن و حدیث کو اسلامی احکام کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔

اصل مسئلہ پر بحث سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے تو یہ قرآن و حدیث کی رُو سے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی

آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے، اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔ قرآن وحدیث میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم ہے اس سے بھی صریح طور پر اُس ادھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو۔ کسی ضرورتمند کو ادھار پر اس کی ضرورت کی چیز اسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو قرضِ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے جو کہ بڑے اجر و ثواب کا نیک عمل ہے، بعض احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے جو نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب و مستحسن عمل ہے۔

اسی طرح بیع مرابحہ کی وہ شکل بھی قطعی طور پر جائز ہے جس میں فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت بھی صحیح بتلائی گئی اور اس پر نفع کی مقدار بھی صرف اتنی لگائی گئی ہو جو تاجروں کے ہاں اور بازار کے عام رواج کے مطابق ہو یا اس سے بھی کم ہو، مثلاً اگر بازار میں عام طور پر نفع کی مقدار دس فیصد رائج ہو اور مرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت پر زیادہ سے زیادہ دس فیصد منافع لگائے، مثلاً جو چیز اس کو سو روپے میں پڑی ہے اس پر نفع دس روپے یا اس سے کم لگا کر بیع مرابحہ کے طور پر فروخت کرے تو اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر بازار میں عام نرخ کے مطابق ایک چیز کی قیمت ایک سو روپے تھی اور مرابحت کی شکل میں بھی وہ ایک سو روپے میں ہی فروخت کی گئی یا مثلاً رعایت کے ساتھ ایک سو پانچ روپے میں فروخت کی گئی تو بیع مرابحہ کی یہ صورت بالکل جائز ہوتی ہے اور شرعی طور پر یہ معاملہ قطعاً درست ہوتا ہے کیونکہ اس میں فریقین معاملہ کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے، اور یہ اس وجہ سے موجود ہوتی ہے کہ اس میں ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا اس کی مرضی کے مطابق معاوضہ پایا جاتا ہے جو قلبی رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہے بخلاف مرابحت کی ایسی شکل کے کہ جس میں فروخت کرنے والا خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز بازار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نفع پر فروخت کرتا ہے، مثلاً یہ دیکھتے ہوئے کہ خریدار نقد ادائیگی نہیں کر سکتا کچھ عرصہ کے ادھار پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ادھار کی وجہ سے نفع دس فیصد کی بجائے بیس یا تیس فیصد لگا دیتا ہے، اس صورت میں خریدار کی اگرچہ ظاہری طور پر رضامندی موجود ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیز وہ ادھار کی وجہ سے مثلاً ڈیڑھ سو روپے میں خرید رہا ہے وہ بازار میں بصورتِ نقد سو روپے میں ملتی ہے اور یہ کہ فروخت کرنے والا دوسرا فریق اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس روپے کا اضافہ کر رہا ہے چنانچہ وہ ضرورت کے تحت لے تو لیتا ہے لیکن دل سے خوش نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے لیے پچاس روپے کا مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا مرابحہ کی یہ شکل بلحاظ حقیقت

درست نہیں ہوتی بلکہ باطل معاملہ کی تعریف میں آتی ہے، اس کی مزید کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ اُدھار کی صورت میں کوئی چیز نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو انتہائی تلاش وجستجو کے باوجود مجھے قرآنِ کریم، احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معاملہ مذکورہ کا جواز نکلتا اور ثابت ہوتا ہو۔ البتہ عدم جواز کے متعلق قرآن، حدیث اور آثارِ صحابہؓ میں واضح اور قطعی دلائل ملتے ہیں۔ تحریم ربوٰ سے متعلق جو آیات، احادیث اور آثار ہیں ان سے معاملہ زیرِ بحث کا قطعی طور پر ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ قرآنِ حکیم نے عہدِ جاہلیت کی جس متعارف ربوٰ کو قطعی طور پر حرام وممنوع قرار دیا ہے اُس کی چند شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی تھی کہ ایک شخص دوسرے پر کوئی چیز اُدھار بیچتا تو مدتِ قرض کے لحاظ سے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا۔ مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں ایک سو درہم ہوتی ایک سال کے اُدھار پر ڈیڑھ سو درہم میں بیچتا، پھر جب ایک سال کے بعد بھی مقروض ڈیڑھ سو درہم ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ اس سے کہتا میں مدتِ قرض میں مزید اتنا اضافہ کر دیتا ہوں تم اپنے ذمہ رقم کی مقدار اتنی بڑھا دو اور یہ قرض کی رقم کی مقدار مزید ایک سال کے لیے دوسو درہم کر دی جاتی، پھر اگر دوسری مدت میں بھی وہ ادا نہ کرسکتا تو مزید مہلت کے عوض قرض کی رقم میں مزید اضافہ کر دیا جاتا، اس طرح بڑھتے بڑھتے یہ رقم اصل کے کئی گنا ہوجاتی یعنی اَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً بن جاتی، یہی حال نقد کے قرض میں بھی ہوتا، ایک آدمی دوسرے کو مثلاً ایک سو درہم ایک سال کے لیے قرض دیتا تو اس مدت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کر دیا جاتا جو درمیان میں ہر ماہ یا سال کے بعد یکمشت اصل کے ساتھ واجب الادا ہوتا، جیساکہ موجودہ بینکاری نظام میں ہوتا ہے۔ غرضیکہ قرآنِ حکیم نے ربٰوا النسیئۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا اُن میں سے ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربوٰ کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے:۔

(۱) عن زید بن اسلم رضی اللّٰہ عنه قال کان الربٰوا الّذی اذن اللّٰہ فیه بالحرب لمن لم یترکه عند الجاهلیة یکون للرجل علی رجل حق الی اجل فاذا حل الاجل قال صاحب الحق اتقضی ام تربی فان قضاه اخذ منه والا طواه۔ (جامع الاصول ج ۱ ص ۴۷۹ رقم حدیث ۳۰۴ باب الربٰو الفرع الثالث فی احادیث متفرقہ)

(ترجمہ) "حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا وہ ربوٰ جس کو ترک نہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اعلانِ جنگ فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے پر ایک خاص

مدت کے لیے حق یعنی دین و قرض ہوتا پس جب مقررہ وقت آتا تو صاحبِ حق یعنی قرض خواہ اپنے مقروض سے کہتا ادا کرتے ہو یا مزید مہلت کے عوض مالِ قرض میں اضافہ کرتے ہو؟ اگر وہ ادا کرتا تو ٹھیک معاملہ ختم کر دیتا ورنہ اس کو ہر مرتبہ بڑھاتا چلا جاتا۔"

(۲) عن مجاھدؓ انہٗ قال فی ربوا الذی نھی اللہ عنہ کان فی الجاھلیۃ یکون للرجل علی الرجل دین فیقول لک کذا وکذا وتؤخر عنی فیؤخر عنہ۔ (تفسیر الطبری ج ۳ ص ۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت مجاہدؒ نے فرمایا وہ ربو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل یہ ہوتی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر واجب الادا دین (قرض) ہوتا تو جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو مقروض آدمی اپنے قرض خواہ سے کہتا مہلت بڑھا دو اور مطالبہ مؤخر کر دو اس کے بدلے آپ کے لیے اتنا اتنا مزید ہوگا چنانچہ وہ مطالبہ مؤخر کر کے مہلت بڑھا دیتا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔"

(۳) عن سعید بن جبیرؓ قال ان الرجل کان یکون لہٗ علی الرجل المال فاذا حل الاجل طلبہ من صاحبہ فیقول المطلوب اخر عنی وازید ک فی مالک فیفعلان ذلک۔ (تفسیر الدر المنثور ج ۱ ص ۳۶۵ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت سعید بن جبیرؓ نے ربو جاہلی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر بطور قرض مال ہوتا پھر جب قرض کی مقررہ مدت پوری ہوتی تو قرض والا اپنے مقروض سے اپنا مال طلب کرتا پھر اگر مقروض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو مقروض سے کہتا مجھے مزید مہلت دیجئے میں اس کے عوض آپ کے مال میں آپ کے لیے اضافہ کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ آپس میں ایسا کر لیتے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔"

(۴) عن قتادۃؓ قال ان ربوا الجاھلیۃ یبیع الرجل البیع الی اجل مسمی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبہ قضاء زادہ واخر عنہ۔ (تفسیر الطبری ج ۳ ص ۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ربو جاہلی کی ایک شکل یہ تھی کہ ایک آدمی اپنی کوئی چیز ایک خاص وقت تک کے لیے قرض پر بیچتا پھر جب وہ خاص وقت آتا اور اس کے مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو مال بڑھا کر مزید مہلت دے دیتا۔"

(۵) عن عطاء ابن ابی رباح قال کانت ثقیف تداین فی بنی المغیرۃ فی الجاھلیۃ فاذا حل الاجل قالوا نزیدکم وتؤخرون۔ (تفسیر الدر المنثور ج ۲ ص ۱۲۸ سورۃ آل عمران آیت ۱۳۰)

(ترجمہ) "حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے فرمایا عہد جاہلیت میں بنو ثقیف، بنو المغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنو المغیرہ، بنو ثقیف سے کہتے ہم تمہارا مال زیادہ کر دیتے ہیں

آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجئے"

ان مذکورہ روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربٰو الجاہلی جس کا دوسرا نام ربٰوالنسیئۃ ہے، قرض کا ایسا معاملہ تھا جس میں مہلت اور مدتِ قرض کے عوض مال قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا خواہ وہ قرض نقد کی صورت میں ہو یا کسی فروخت کردہ چیز کی قیمت کی صورت میں، اور یہ کہ اس کو قرآنِ حکیم نے حرام و ممنوع ٹھہرا کر اس خیال کی نفی اور تردید کر دی کہ قرض دینے والا مہلت قرض کے عوض مقروض سے قرض کے اصل مال پر کچھ بھی زائد مال مل سکتا ہے۔

یہاں یہ مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ اکابر مفسرین کرام کی کچھ عبارات پیش کر دوں جو انہوں نے ربائے جاہلی کی تفسیر میں فرمائی ہیں تاکہ حقیقتِ حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔ چنانچہ امام ابوبکر الجصاصؒ اپنی جلیل القدر فقہی تفسیر میں ربٰو کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

والربٰوا الذی کانت العرب تعرفہ وتفعلہ انما کان قرض الدراھم والدنانیر الی اجل بزیادۃ علیٰ مقدار ما استقرضہ علیٰ ما یتراضون بہ ھٰذا کان المتعارف المشھور عندھم۔

(احکام القرآن ج ۱ ص۵۵۲ باب الربٰو)

(ترجمہ) "وہ ربٰوا جس کو اہلِ عرب جانتے پہچانتے اور کیا کرتے تھے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک دراہم و دنانیر کے قرض کا معاملہ تھا جس میں یہ طے پاتا تھا کہ قرض کے اصل مال پر کچھ زائد بھی ضرور لینا دینا ہوگا، ربٰو کا یہی معاملہ عربوں کے ہاں متعارف اور مشہور تھا"

اس سے کچھ آگے ایک اور عبارت اس طرح ہے:۔

و لم یکن تعاملھم بالربٰو الاعلی الوجہ الذی ذکرنا من قرض دراھم ودنانیر الی اجل مع شرط الزیادۃ۔ (احکام القرآن ج ۱ ص۵۵۳ باب الربٰو)

(ترجمہ) "عربوں کے اندر جس ربٰو پر عملدرآمد تھا اس کی وہی شکل تھی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی ایک خاص مدت تک دراہم و دنانیر کا قرض جس کے ساتھ زیادتی کی شرط ہوتی تھی"

پھر دو صفحات کے بعد ایک تیسری عبارت کچھ اس طرح ہے:۔

انہ معلوم ان الربٰو الجاھلیۃ انما کان قرضاً مؤجلاً بزیادۃ مشروطۃ فکانت الزیادۃ بدلاً من الاجل، فابطلہ اللہ وحرمہ وقال وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لاتظلمون ولا تظلمون۔ (احکام القرآن ج ۱ ص۵۵۴ باب الربٰو، من ابواب الربٰو الذی تضمنت الآیۃ تحریمہ)

(ترجمہ) "یہ ایک معلوم اور جانی ہوئی بات ہے کہ عہدِ جاہلیت کی ربٰو سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ

زیادتی کی شرط کے ساتھ میعادی قرض کا معاملہ تھا اور اس میں قرض کے اصل مال پر جو زیادتی ہوتی تھی وہ مدت اور مہلتِ قرض کا بدل سمجھی جاتی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا اور فرمایا اگر تم اس سے توبہ کرکے باز آجاؤ تو پھر تمہارے لیے صرف تمہارے اصل اموال ہیں جو تم نے بطور قرض دیئے تھے نہ تم ان پر کچھ زائد لیکر اپنے مقروضوں پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل اموال روک کر تم پر ظلم کریں۔"

واضح رہے کہ یہاں ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں۔

اس تیسری عبارت میں جو بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ قرض کے اصل مال پر جو زیادتی مشروط ہوتی تھی وہ اجل یعنی مدتِ قرض کا عوض اور بدل سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے مفسر امام فخر الدین الرازیؒ نے اپنی عظیم المرتبت تفسیر مفاتیح الغیب میں جو کہ تفسیر الکبیر کے نام سے معروف ہے، ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اما الربٰو النسیئة فهو الامر الذی کان مشهورًا متعارفًا فی الجاهلیة وذلك انهم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذوا کل شهر قدرًا معینًا ویکون رأس المال باقیًا، ثم اذا حل الدّین طالبوا المدیون برأس المال فان تعذر علیه الاداء زادوا فی الحق والاجل فهٰذا هو الربٰو الّذی کانوا فی الجاهلیة یتعاملون۔ (تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۹۱ سورة البقرہ)

(ترجمہ) "البتہ ربٰو النسیئۃ جو عہدِ جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھی عملاً اس کی شکل اس طرح تھی کہ بعض لوگ اپنا مال دوسروں کو بطور قرض اس شرط پر دیتے کہ وہ ہر ماہ اپنے مقروض سے خاص مقدار میں کچھ مال بطور سود لیتے رہیں گے اور قرض کا اصل مال اپنی حالت پر باقی رہے گا پھر جب ادائیگی مقررہ وقت آتا تو وہ مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے پھر اگر اس کے لیے ادائیگی مشکل ہوتی تو اپنے حق اور قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیتے، پس یہی وہ ربٰو تھی جس کا لوگ عہدِ جاہلیت میں لین دین اور کاروبار کرتے تھے۔"

اسی تفسیر میں ربٰو سے متعلق ایک اور عبارت کچھ اس طرح ہے:۔

کان الرجل فی الجاهلیة اذا کان له علی انسان مائة درهم الی الاجل فاذا جاء الاجل ولم یکن المدیون واجدًا لذٰلك قال زدنی فی المال حتّی ازید فی الاجل فربما جعله مائتین۔ (تفسیر الکبیر ج ۹ ص ۲ سورة آلِ عمران آیۃ ۱۳۰)

(ترجمہ) "زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی کے کسی انسان پر ایک خاص وقت کیلئے ایک سو درہم قرض ہوتے پھر جب وہ وقت آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کیلئے مال نہ ہوتا تو وہ کہتا تم میرے حق میں اضافہ کر دو تاکہ میں اجل کو زیادہ کر دوں پس بسا اوقات وہ سو درہم کے دو سو درہم کر دیتا۔"

مذکورہ عبارات میں اس کی تصریح ہے کہ عہدِ جاہلیت کی ربٰو جس کو قرآن مجید نے قطعی حرام بتلایا ہے اس کے اندر جو مرکزی تصوّر کارفرما تھا وہ یہ کہ مقرض یعنی قرض دینے والا مدتِ قرض کے بدلے قرض کے اصل مال پر کچھ زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہے، قرآن کریم نے اس ربٰو کو حرام قرار دے کر اور یہ فرما کر کہ مقرض اپنے اصل مال پر جو کچھ بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے، تصوّر مذکور کی نفی کردی ہے، گویا یہ فرمایا کہ اجل اور مدتِ قرض کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مال کا بدل بن سکتی ہو اور جس کا کوئی معاوضہ لیا دیا جا سکتا ہو۔

یہاں تک ربٰو الجاہلی اور ربٰو النسیئۃ کی حقیقت و ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اور عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں جب ہم اپنے زیرِ بحث معاملے کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے منشاء و مقاصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو النسیئۃ جیسا معاملہ ہے، وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر لیا جاتے والا زائد مال بلا عوض ہوتا اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح زیر بحث معاملہ میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لیے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیرِ بحث بیع المؤجل کے معاملہ میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیداوار محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر کسی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ربٰو النسیئۃ کے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری تشیب و فراز رونما ہوتا اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیرِ بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربٰو النسیئۃ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربٰو النسیئۃ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے، وہ سب زیرِ بحث بیع مؤجل کے معاملہ سے بھی لا محالہ ظہور میں آتی ہیں لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ

ہے کہ اس معاملہ کا بھی وہی شرعی حکم ہونا چاہئیے، جو معاملہ ربٰو النسیئۃ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں صرف لفظی فرق ہے جس کا عقود و معاملات میں شرعاً کوئی لحاظ اور اعتبار نہیں ہوتا۔ الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والالمبا مسلّم قاعدہ کلیہ ہے ۔

قرآن مجید کی جس دوسری آیت سے معاملۂ زیر بحث کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی اور اس کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ ہے :۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۔ (سورۃ النساء آیت ۲۹)

(ترجمہ) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کا طریقہ ہو جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔"

اس آیتِ کریمہ کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّہ میں باطل طریقہ سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت ہے اور اِلَّا حرفِ استثناء کے بعد دوسرے حصّہ میں ایسی تجارت کے طریقہ سے ایک دوسرے کا مال لینے کی اجازت ہے جس میں ہر فریق کی حقیقی اور دلی رضامندی پائی جاتی ہو۔ پہلے حصّہ میں جو لفظ باطل ہے وہ حق کی ضد ہے، اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ناحق کیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کرام نے باطل کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول پیش کیا ہے :۔

الباطل هو کل ما یوخذ من الانسان بغیر عوض. (تفسیر الکبیر ج۱۰ صنـ سورۃ النساء آیت ۳۰)

(ترجمہ) "ہر وہ مال لینا باطل ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے۔"

علامہ رشید الرضا باطل کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اِمّا الباطل مالم یکن فی مقابلۃ شئ حقیقی۔ (تفسیر المنار صـ)

(ترجمہ) "باطل وہ ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں نہ ہو یعنی اس کے بالمقابل کوئی حقیقی چیز نہ ہو۔"

لہٰذا آیت مذکورہ کے پہلے حصہ کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر عوض کے نہ لو، یعنی معاوضے کے معاملات میں ایک دوسرے کا مال بغیر ایسے عوض کے نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں اس کے برابر ہو کیونکہ کسی مال کا صحیح عوض اور بدل صرف وہ ہوتا ہے جو قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو، بنا بریں آیتِ کریمہ کے پہلے حصہ کی رُو سے ہر وہ معاشی معاملہ باطل اور ممنوع قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کے مال کا دوسرے سے عوض موجود ہی نہ ہو یا عوض تو موجود ہو لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے اس مال کے مساوی نہ ہو۔ آیت کریمہ کے دوسرے حصّہ

میں معاوضے کے صرف اس معاملہ کو باطل سے مستثنےٰ اور جائز بتلایا گیا ہے جس میں ہر فریق کیلئے اس کی چیز کا بدل موجود ہوتا لہٰذا فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے، چونکہ تجارت یعنی بیع و شراء کا معاملہ ایسا ہی ہے اس میں بائع کو اپنی چیز کا عوض ثمن اور قیمت کی شکل میں اور مشتری کو اپنی چیز کا عوض خریدی ہوئی شے یعنی مبیع کی شکل میں ملتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع مشتری کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز اُس قیمت سے زائد پہ بیچ دیتا ہے۔ جو عام طور پر بازار میں اس چیز کی ہوتی ہے، یا بعض دفعہ مشتری بائع کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی چیز اُس قیمت سے کم پہ خرید لیتا ہے جو بازار میں عام طور پہ ہوتی ہے، لہٰذا بیع و شرائع کی ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی اس وجہ سے کہ اس کے لیے اس کی چیز کا پورا اور صحیح عوض و بدل موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیع و شراء کا ایسا معاملہ کسی ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز و ممنوع قرار پاتا ہے۔ جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملۂ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ربٰو کا معاملہ حرام و ممنوع رہتا ہے بلکہ حقیقت میں رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا صحیح عوض و بدل موجود ہونا ہے، وہ موجود ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود ہونا ہے اور موجود نہ ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود نہ ہونا ہے۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملۂ زیرِ بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے کیونکہ اس میں بیچنے والا ادھار کی وجہ سے اپنی سو روپے کی چیز جو ڈیڑھ سو میں بیچتا ہے تو اس میں خریدار سے جو پچاس روپے زائد لیتا ہے ان کا کوئی عوض اس کی طرف سے خریدار کے لیے موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا ہے جس کو آیت کے اندر باطل سے تعبیر کر کے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، نیز بیع و شرائع کا یہ ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کی چیز کا عوض موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کی رضامندی موجود نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ اس میں خریدار کے لیے مذکورہ بالا مثال کے مطابق پچاس روپے کا عوض موجود نہیں ہوتا جو قرض کی وجہ سے بیچنے والا خریدار سے لیتا ہے لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی بھی موجود نہیں ہوتی لہٰذا اس پہلو سے بھی یہ معاملہ ناجائز اور ممنوع قرار پاتا ہے۔

زیرِ بحث معاملہ کی شرعی حیثیت سے متعلق جہاں تک احادیثِ نبویہ کا تعلق ہے تو متعدد احادیث سے بھی اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، ان بکثرت احادیث سے بھی جن میں ربٰو کی سختی کے ساتھ مذمت اور ممانعت ہے، طوالت سے بچتے ہوئے میں ان کو یہاں نقل اور ذکر نہیں کر رہا، بیع علینہ کی ممانعت

سے متعلق جو احادیث ہیں ان سے بھی اس معاملے کا عدم جواز مفہوم و مستنبط ہوتا ہے البتہ یہاں میں اس حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں ربٰو النسیۃ کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے جو کہ حدیث کی بعض کتابوں میں ان الفاظ سے موجود ہے :-

عن علیؓ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل قرض جر منفعۃ فھو ربٰا - (بلوغ المرام مترجم ص ۱۷۳ حدیث ۸۸۲)

(ترجمہ) "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے"

مطلب یہ کہ جو قرض، قرض دینے والے کیلئے قرض لینے والے کی طرف سے مالی منفعت کا سبب اور ذریعہ بنتا ہو وہ ربٰو ہے - اس حدیث کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ سند کے لحاظ سے اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس کے مضمون کی تائید چونکہ متعدد آثارِ صحابۂ کرامؓ سے ہوتی ہے لہٰذا اس کو ہمیشہ قابلِ اعتماد سمجھا گیا اور فقہاء کرام اس سے استدلال کرتے رہے ہیں، صحابۂ کرامؓ کے وہ آثار جن سے اس حدیث کو تقویت ملتی ہے سنن الکبرٰی للبیہقیؒ اور اعلاء السنن وغیرہ میں مذکور ہیں۔ ان آثار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرض دینے والا قرض کی وجہ سے اپنے مقروض سے کسی طرح کا کوئی مادی فائدہ اٹھائے اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، میں بغرض اختصار ان کو یہاں نقل نہیں کر رہا جو دیکھنا چاہے کتب مذکورہ میں دیکھ سکتا ہے - مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ نے ربٰو کے موضوع پر اپنے رسالہ کشف الدجیٰ میں ان کو یکجا جمع کر دیا ہے - جو امداد الفتاوٰی میں بھی شامل ہے -

بہرحال اس حدیث کی رُو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو شخص مثلاً ایک سو روپے کی چیز ادھار پر ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرتا ہے وہ پچاس روپے جو زائد لیتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرض سے فائدہ اٹھاتا اور منفعت اندوز ہوتا ہے، اگر قرض نہ ہوتا تو نقد کی صورت میں اس کو اس چیز کے صرف سو روپے ملتے، پھر جب یہ معاملہ حدیث مذکور کے مطابق ربٰو کی تعریف میں آتا ہے تو اس کا بھی وہی شرعی حکم ہو سکتا ہے جو ربٰو و سود کا ہے یعنی حرام و ناجائز ہونا۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس کی بناء پر پورے وثوق و یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث معاملہ قرآن و حدیث کی رُو سے حرام اور ناجائز معاملہ ہے -

اس کے بعد یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بعض علماء کرام نے اپنی کتابوں میں بطور فتویٰ لکھا ہے کہ معاملہ مذکور شرعاً جائز معاملہ ہے یعنی شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زائد قیمت پر بیچی جائے، چنانچہ اسی فتوے کے پیش نظر بلا سود بینکاری کے لیے سود کے متبادل جو معاملات تجویز کیے گئے ہیں ان میں سے ایک معاملہ یہ بھی ہے گویا بینک کو اس کی اجازت دیدی گئی ہے کہ اس سے اگر کوئی شخص مشین وغیرہ خریدنے کے لیے قرضہ مانگے تو وہ اس کو سود پر نقد دینے کی بجائے اس سے یہ کہے کہ میں تیری مطلوبہ چیز خرید کر تم کو ایک سال کے اُدھار پر دیدیتا ہوں اور ادھار کی وجہ سے مرابحہ کے نام پر اس کی اتنی قیمت لگائے جو بازار کی مروجہ قیمت سے کہیں زائد ہو، مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز جو مجھے سو روپے میں پڑی ہے پچاس روپے کے نفع کے ساتھ بیچتا ہوں تم ایک سو پچاس روپے ایک سال کے بعد ادا کر دینا، مطلب یہ کہ اس طرح کے معاملہ کو بینک کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے جو حقیقت میں اپنے مقصد اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو کی طرح کا معاملہ ہے اگرچہ اس کو بیع مرابحہ اور بیع مؤجل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویسے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا، بیع مرابحہ بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب اس میں ربح و نفع کی مقدار بازار کے عام عرف و رواج کے مطابق ہو، اسی بیع مؤجل بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب بیچی جانے والی چیز کی قیمت اُدھار میں بھی اتنی ہی ہو جتنی نقد کی صورت میں تھی۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات علماء کرام معاملہ زیر بحث کو شرعاً جائز سمجھتے اور کہتے ہیں ان کے وہ دلائل کیا ہیں جن کی بنا پر وہ ادھار کی چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کو جائز و درست مانتے ہیں لیکن اس بارے میں نہ میں اُن حضرات میں سے کسی کا اسم گرامی ذکر کروں گا اور نہ اس کتاب کا نام لکھوں گا جس میں کسی نے ایسا لکھا ہے بلکہ صرف وہ دلائل ذکر کروں گا جو ان حضرات نے اپنے مؤقف کے ثبوت میں پیش فرمائے ہیں اور فیصلہ اہل علم حضرات پر چھوڑ دوں گا جو استدلال اور استنباط کے مختلف طریقوں کا غیر معمولی علم و فہم رکھتے، صحیح اور غلط استدلال کے درمیان تمیز کر سکتے اور فیصلہ کرنے میں انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔

قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران و متعجب ہوں گے کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ تو قرآن مجید کی کوئی آیت پیش کرتے ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث، نہ آثار صحابہؓ میں سے کوئی اثر، نہ ائمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلّمہ قواعد فقہیہ میں سے کوئی قاعدہ پیش فرماتے ہیں بلکہ اس کے ثبوت میں بطور دلیل فقہ حنفی کی دو مشہور کتابوں مبسوط اور

ہدآیہ کی ایک ایسی عبارت پیش کرتے ہیں جس سے کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا خریدنا شریعتِ اسلامی کی رو سے جائز ہے۔ مَیں اُس عبارت کو پیش کرنے سے پہلے جس سے ان حضرات نے استدلال فرمایا ہے اُس سیاق وسباق کا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں وہ عبارت ذکر ہوئی ہے تاکہ حقیقتِ واقعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جس سیاق وسباق میں وہ عبارت واقع ہے اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ فقہ حنفی کی مذکورہ بالا کتابوں میں جہاں بیع مرابحہ کی بحث ہے اس میں بیع المرابحہ کی فقہی تعریف، اس کی صحت کی شرائط اور اس کی مختلف شکلوں اور ان کے متعلق شرعی احکام کا بیان ہے۔ بیع مرابحہ کی تعریف جن الفاظ میں کی گئی ہے اردو زبان میں اس کا مطلب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے بیع مرابحہ خرید و فروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں ایک شخص یہ کہہ کر اپنی کوئی چیز دُوسرے پر فروخت کرتا ہے کہ یہ چیز مَیں نے اتنے میں خریدی یا مجھے اتنے میں پڑی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں اور دوسرا اس پر اعتماد و بھروسہ کر کے وہ چیز خرید لیتا ہے گویا اس میں کوئی چیز اس کی قیمتِ خرید پر متعین نفع کے ساتھ بیچی خریدی جاتی ہے، چونکہ اس بیع میں سچائی اور دیانتداری بنیادی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کو بیع الامانۃ بھی کہا جاتا ہے، اس بیع کی صحت اور تکمیل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ حقیقتًا جھوٹ اور خیانت موجود نہ ہو بلکہ اس کا شبہ بھی نہ پایا جاتا ہو، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ معاملہ طے پا جانے کے بعد اگر جھوٹ و خیانت کا شبہ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو اس کے ردّ و قبول کا خیار ہوتا ہے یعنی چاہے تو اس کو برقرار رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔

بیع المرابحہ کی وہ شکلیں جن میں جھوٹ و خیانت کے شبہ کی بنا پر خریدار کو معاملہ طے ہو جانے کے بعد ردّ و قبول کا خیار ہوتا ہے ان میں سے ایک شکل جس کا امام محمد الشیبانیؒ نے اپنی کتاب جامع الصغیر میں ذکر کیا ہے، اس طرح ہے:۔

من اشترٰی غلامًا بالف درھم نسیئۃ فباعہ بربح مائۃ درھم ولم یبین فعلم المشتری فان شاء ردہ وان شاء قبل۔ (جامع الصغیر ص ۳۴۸ باب فی المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "ایک شخص نے ایک غلام ایک ہزار درہم میں اُدھار پر خریدا اور پھر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو فروخت کر دیا اور خریدار کو یہ نہیں بتلایا کہ میں نے ایک ہزار درہم میں اُدھار پر خریدا تھا، معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو اس کا علم ہوا تو ایسی صورت میں اس کو ردّ و قبول دونوں کا اختیار ہوتا ہے۔"

جامع الصغیر میں امام محمد الشیبانیؒ نے عبارت مذکورہ کے بعد اس کی کوئی توجیہہ نہیں فرمائی کہ اس صورت میں خریدار کو معاملے کے رَدّ کا کیوں اختیار ہوتا ہے، اس کی عقلی طور پر کیا وجہ ہے ؟ لیکن بعد کے بعض حنفی فقہاء کرام نے مذکورہ جزیئے کو نقل کرنے کے بعد اس کی توجیہہ بھی لکھی ہے شمس الائمۃ السرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط میں اس کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

قال رحمه الله واذا اشترى شيئًا نسيئة فليس له ان يبيعه مرابحة حتى يتبين انه اشتراه نسيئة لان بيع المرابحة بيع الامانة تنفى عنه كل تهمة وجناية ويتحرز فيه من كل كذب وفى معاريض الكلام شبهة فلا يجوز استعمالها فى بيع المرابحة ثم الانسان فى العادة يشترى الشئ بالنسيئة باكثر مما يشترى بالنقد - (المبسوط ج ۱۳ ص ۷۸ باب المرابحة والتولية)

اس عبارت کا وہ حصہ جو اس بحث کا مقصود ہے یہ ہے:-

ثم الانسان فى العادة يشترى الشئ بالنسيئة باكثر مما يشترى بالنقد-

(ترجمہ) پھر انسان عادۃً ادھار کی چیز اس قیمت سے زائد پر خرید لیتا ہے جو نقد کی صورت میں ہوتی ہے"۔

مطلب یہ کہ ادھار پر خریدی ہوئی چیز جب مرابحہ کے طور پر فروخت کی جائے تو امانتداری اور راست گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ فروخت کرنے والا خریدار کو صاف بتلادے کہ یہ شے میں نے ادھار پر اتنے میں خریدی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں"، اور یہ بتا دینا اس لیے ضروری ہے کہ حاجتمند انسان جب کوئی شے ادھار پر خریدتا ہے تو عادتاً بمقابلہ نقد کے زیادہ قیمت پر خرید لیتا ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہ چیز بھی اس نے اپنی حاجتمندی اور ناداری کی وجہ سے زیادہ قیمت پر خرید لی ہو جو بصورت نقد بازار میں اس کی نہ ہو، اور اب چونکہ وہ نقد کی صورت میں فروخت کر رہا ہے ادھار کی صورت میں نہیں کر رہا لہٰذا اس پر لازم ہے کہ خریدار کو اس حقیقت سے آگاہ کرے، چنانچہ آگاہ ہوجانے کے بعد بھی اگر وہ اس کو مطلوبہ قیمت پر خرید لیتا ہے تو پھر اس کو طے شدہ معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا بخلاف اس صورت کے کہ وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہیں کرتا اور معاملہ طے پا جانے کے بعد اسے اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس معاملے کو فسخ کر سکتا ہے۔

المبسوط کی مذکورہ عبارت میں جس انسان اور اسکی عادت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ وہی ہوسکتا ہے جو کسی چیز کا حاجتمند ہو اور ناداری کی وجہ سے نقد پر نہ خرید سکتا ہو اور وہ چیز اس کو نقد کی قیمت پر بطور قرض حسنہ کے بھی نہ مل سکتی ہو، ایسا انسان اپنی حاجت براری کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہ ادھار دینے والے کی مرضی کے مطابق زیادہ قیمت پر خرید لے۔ اور لفظ عادت کا مطلب ہے کہ ایسا ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ

ایسا لازماً اور دائماً ہوتا ہے، کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرضِ حسنہ کی اسلامی تعلیم پر عمل کرنے والے اور ربٰو کی ہر شکل سے بچنے اور اجتناب کرنے والے متقی مسلمان جب کسی حاجتمند انسان کو اس کی ضرورت کی چیز اُدھار پر دیتے ہیں تو اسی قیمت پر دیتے ہیں جو بصورت نقد یا بازار میں اس کی رائج ہوتی اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر نہیں دیتے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مادی فائدہ کے بغیر کسی کو قرض نہیں دیتے اور اپنے معاشی معاملات میں اسلامی اصول و احکام اور حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتے، اسی لیے ایسے لوگوں کا رویہ اور طرزِ عمل شریعتِ اسلامی کی رُو سے جائز و درست نہیں تھا۔ شمس الائمہ السرخسیؒ کی مذکورہ عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ ان کے نزدیک لوگوں کی مذکورہ عادت شرعاً جائز و درست عادت ہے، رہا یہ سوال کہ پھر انھوں نے اس کو ناجائز کیوں نہیں لکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ان کا مقصد اس عادت کے جواز و عدمِ جواز سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد بیع المرابحہ کی ایک خاص شکل سے متعلق امام محمدؒ کے مذکورہ قول کی توجیہ کرنا ہے جو عادت مذکور کے ناجائز ہونے کی شکل میں بھی ہو جاتی ہے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت کے بعد اب میں صاحب الھدایہ علامہ المرغینانیؒ کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جس سے زیرِ بحث معاملے کے جواز کے لیے استدلال فرمایا گیا ہے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:-

قال من اشترٰی غلاماً بالف درھم نسیئة فباعه بربح مائة ولم یبین، فعلم المشتری فان شاء ردہ وان شاء قبل لان للاجل شبھا بالمبیع الا یرٰی انه یزداد فی الثمن لاجل الاجل والشبھة فی ھٰذا ملحقة بالحقیقة فصار کانه اشترٰی شیئین وباع احدھما مرابحة بثمنھما۔ (ھدایه اخیرین ص ۵۷، ۵۸ باب المرابحة والتولیة)

(ترجمہ) "امام محمدؒ نے کہا جس نے ایک ہزار درہم کے بدلے ایک غلام ادھار پر خریدا اور پھر مرابحہ کے طور پر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو بیچ ڈالا اور خریدار کو نہیں بتلایا کہ میں نے یہ ادھار پر خریدا تھا بعد میں خریدار کو اس کا علم ہوا، پس اب اگر وہ چاہے تو اس کو رد کر دے اور چاہے تو اس کو قبول کر سکتا ہے کیونکہ اجل یعنی قرض کی مہلت اور مدت بیچی جانے والی چیز سے کچھ مشابہت رکھتی ہے کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور چونکہ مرابحت کے باب میں شبہ مبیع کو حقیقت مبیع سے ملحق کر دیا گیا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ گویا بیچنے والے نے جس قیمت میں دو چیزیں خریدی تھیں یعنی غلام اور اجل، اس قیمت پر ان میں سے ایک یعنی غلام کو بیچ دیا۔"

اس عبارت میں مقصود بحث اس کا وہ حصہ ہے جس میں صاحب ہدایہ نے امام محمدؒ کے قول مذکور کی توجیہ بیان فرمائی ہے یعنی مرابحہ کی مذکورہ شکل میں معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو معاملہ فسخ کرنے کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے، عقلی طور پر اسکی وجہ کیا ہے، وہ وجہ صاحب ہدایہ کے نزدیک مرابحہ کی اس شکل میں شبہ خیانت کا پایا جانا ہے جس سے بیع مرابحہ کو پاک ہونا چاہیئے کیونکہ بیع المرابحہ بیع الامانۃ ہے اور شبہ خیانت کی جو وضاحت انہوں نے فرمائی ہے وہ یہ کہ جو شخص ادھار پر کوئی چیز خریدتا ہے اس کے متعلق گو یقین نہ سہی لیکن یہ شبہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اس نے جس قیمت میں وہ چیز خریدی ہے وہ قیمت تنہا اس چیز کی نہ ہو بلکہ ادھار کی جو اجل اور مہلت ہے اس کی بھی ہو کیونکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ادھار کی مہلت اور مدت کی وجہ سے فروخت کی جانے والی چیز کی قیمت بڑھا دیتے ہیں، لہٰذا ادھار پر خریدی ہوئی ہر چیز کے متعلق یہ شبہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اسکی جو قیمت ہے وہ تنہا اس کی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اجل اور مہلت ادھار کی بھی ہو بنا بریں جو شخص نقد کی صورت میں بھی اس شئے کی وہی قیمت وصول کرتا ہے جو ادھار کی صورت میں اس شئے کی تھی تو گویا وہ دو چیزوں کی قیمت ایک چیز سے وصول کرتا ہے کیونکہ نقد کی صورت میں اجل نہیں ہوتی صرف چیز ہوتی ہے لہٰذا وہ ایک طرح کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے جو مرابحہ کے معاملہ میں عیب ہے اور چونکہ مبیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں خریدار کو ردّ و قبول کا خیار ہوتا ہے لہٰذا بیع المرابحہ کی اس شکل میں بھی خریدار کو ردّ و قبول کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس توجیہ کے ضمن میں علامہ مرغینانیؒ نے اپنی اس بات کی تائید میں کہ اجل، مبیع سے کچھ مشابہ ہے فرمایا الایری انہ یزداد فی الثمن لاجل الاجل کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل یعنی ادھار کی مدت کی وجہ سے شے کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، اس سے بعض اہل علم حضرات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ادھار کی چیز کی قیمت بمقابلہ نقد کے بڑھا دینا شریعت اسلامی کی رُو سے جائز ہے، حالانکہ عبارت مذکورہ سے یہ مطلب بالکل نہیں نکلتا۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے بلحاظ واقعہ بالکل درست ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں یعنی ادھار کی چیز کی قیمت زیادہ کر دیتے ہیں لیکن ان کا ایسا کرنا قرآن وحدیث کی رُو سے جائز ہوتا ہے یا ناجائز؟ عبارت مذکورہ کے کسی لفظ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا اسلیئے کہ صاحب ہدایہ کا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اجل کی مبیع سے کچھ مشابہت یا اجل کے مبیع ہونے کا شبہ ہے کیونکہ کچھ لوگ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرتے ہیں، یہاں ان کا مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا اور یہ بتلانا نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ ہدایہ کے شارحین نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ فتح القدیر، بنایۃ، غایۃ اور کفایۃ وغیرہ کو دیکھ لیجئے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اجل کیوجہ سے شئے کے ثمن میں اضافہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح کسی کا اس کو ناجائز نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں پر مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا ہے ہی نہیں، نیز جو معاملہ بدیہی طور پر

ناجائز ہو اس کو ناجائز لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بہر حال کسی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کا اصل معیار قرآن وحدیث اور ان کے رسول والا مقام ہیں، چنانچہ جو معاملہ ان کے مطابق ہو وہ جائز اور جو مطابق نہ ہو بلکہ خلاف ہو وہ ناجائز قرار پاتا ہے۔ لوگوں کا اس کو کرنا یا نہ کرنا اس کے جواز و عدم جواز کا کوئی معیار نہیں ورنہ شریعت ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔

علاوہ ازیں اگر مذکورہ عبارت یعنی یزاد فی الثمن لاجل الاجل سے یہ مفہوم ہے کہ اجل یعنی مہلت قرض کسی ثمن وقیمت کا عوض وبدل بن سکتی ہے تو تین سطروں کے بعد خود صاحب ہدایہ نے واضح الفاظ سے اس کی نفی کر دی ہے، فرمایا "وان استهلکہ ثم علم لزمه بالف ومائة لان الاجل لا یقابله شیئ من الثمن" اور اگر مذکورہ مثال میں خریدار نے خریدنے کے بعد غلام کو ہلاک یا فروخت کر دیا یعنی اس کے ہاتھ میں نہ رہا اور پھر اس کو یہ علم ہوا کہ وہ ایک غلام ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا گیا تھا اور ایک سو درہم منافع کے ساتھ مجھ پر فروخت کیا گیا تو اب وہ فروخت کرنے والے سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا اور اس کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو گیارہ سو روپے آپ کو دیئے ہیں ان میں جو اجل کا عوض تھے وہ مجھے واپس کر دو کیونکہ اجل ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابلہ میں کوئی ثمن نہیں ہو سکتا۔ "لان الاجل لا یقابله شیئ من الثمن" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اجل اور مہلت ادھار کے بالمقابل کوئی مال لینا دینا جائز نہیں۔ اور چونکہ ہمارے زیر بحث معاملہ میں بصورت ادھار نقد کے مقابلہ میں جو زائد قیمت لگائی جاتی ہے وہ اجل اور مدت ادھار کی وجہ سے لگائی جاتی ہے، لہٰذا ھدایہ کی اس دوسری عبارت سے الٹا اس معاملے کا ناجائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ المبسوط اور الہدایہ کی جن عبارات سے معاملہ زیر بحث کے جواز کے لیے استدلال کیا گیا ہے، اگر کچھ بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ استدلال بے جان نظر آتا ہے اور ان عبارات سے کسی طرح اس معاملے کا جواز نہیں نکلتا جبکہ اس کے مقابلہ میں عدم جواز کے دلائل قرآن وحدیث سے تعلق رکھتے اور مضبوط ومستحکم دلائل ہیں جو قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے عرض کیے گئے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس مسئلہ پر از سر نو پڑھیں اور غور وفکر کریں گے اور پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس معاملے کی شرعی حیثیت کا تعین فرمائیں گے

جواب اوّل

حضرت العلامہ مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہٗ کلاچی

استفتاء:- بخدمت گرامی استاذِ محترم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! گذارش یہ ہے کہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک بابت رجب ۱۴۱۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا طاسین صاحب کا ایک مضمون آیا ہے جس میں انہوں نے بیع نقد اور نسیہ میں قیمت کے فرق کو ناجائز قرار دیا ہے اور حرام تک سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ہمارے اکابرین اسے جائز قرار دیتے رہے ہیں، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ امدادیہ میں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امداد المفتین میں، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہٗ نے احسن الفتاویٰ میں اور مفتی کل ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ کفایت المفتی میں ہے۔

ان سب حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے ـــــ آپ صحیح صورتحال سے مطلع فرمائیں کہ ان دونوں باتوں میں تعارض ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس کو صحیح سمجھا جائے اور پوچھنے والوں کو کیا بتلایا جائے ـــــ اگر اجازت ہو تو آپ کا جواب تطبیق یا ترجیح کا الحق کو بھیج دوں ـــــ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الحق بھی مولانا طاسین صاحب کی رائے کی تائید میں ہے کیونکہ اس نے بلا کسی نکیر کے اس کو شائع کیا ہے۔

حافظ عبدالقیوم حقانی خطیب جامع مسجد لوہاراں کلاچی ۲۸ رجب ۱۴۱۲ھ

الجواب:- دونوں فتوؤں میں تعارض ظاہر ہے ـــــ اکابر علماء مذکورین فی السوال کے فتویٰ کو غلط سمجھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، حضرت مولانا طاسین صاحب کا مضمون الحق میں ادھورا ہے میثاق میں غالباً پورا ہے، اور مجھے کسی صاحب نے اُن کے مضمون کا عکس (فوٹوسٹیٹ) بھی بھیجا ہے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں دو باتیں فرمائی ہیں میں مختصراً ان پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ جواز کا فتویٰ دینے والوں کے پاس دلیل ہدایہ اور مبسوط کی یہ عبارت ہے الا تری انہ یزاد الثمن لاجل الاجل، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ

معاملہ جائز بھی ہے انھوں نے مرابحہ کی بحث میں صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کر دیا ہے اس کو جائز کہنے کی بات نہیں کی ـــــ دوسری بات یہ کہ جائز کہنے والوں کے پاس قرآن وسنت کی کوئی دلیل تو کیا کسی مجتہد کا قول بھی نہیں۔

اس ناکارہ کے ناتمام مطالعہ کے مطابق حضرت مولانا کی یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں آپ کا یہ فرمانا کہ علامہ سرخسیؒ نے صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے خود اسے جائز نہیں فرمایا، اس کے لیے ناظرین کو علامہ سرخسی رحمہ اللہ کی مبسوط جلد ۱۳ ص۸ ملاحظہ فرمالینا چاہیئے، عبارت یہ ہے :۔

واذا عقد العقد علیٰ انہٗ الیٰ اجل کذا بکذا و بالنقد بکذا او قال الیٰ شھرٍ بکذا والیٰ شھرین بکذا اوھو فاسد لانہٗ لم یعاملہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ ولنھی النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن شرطین فی بیع وھٰذا ھو تفسیر الشرطین فی بیع ۔

(ترجمہ) "جب عقد اس طرح کیا جائے کہ اجل پر قیمت اتنی ہے اور نقد پر اتنی یا ایک مہینہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی اور دو ماہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی، تو یہ عقد فاسد ہوگا اور فاسد اسلیئے ہو گا کہ معاملہ میں ثمن معلوم نہ ہو سکا تردد میں چھیڑ دیا، اور اس لیے بھی فاسد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے اور شرطین فی بیع کے یہی معنی ہیں، (یعنی ثمن یا مبیعہ میں تردد)"

آپ نے دیکھا کہ اس صورت کے فساد کی وجہ علامہ سرخسیؒ نے تردد فی الثمن کو کہا ہے جو اصولِ بیع کے بھی خلاف ہے اور نصِ صریح کے بھی۔ علامہ سرخسیؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ صورت چونکہ ربٰو النسیئۃ میں داخل ہے اس لیے فاسد ہے ـــــ اس پر بھی اگر اطمینان نہیں تو علامہ سرخسیؒ کی اس عبارت کے ساتھ متصل یہ صریح عبارت بھی پڑھ لیجئے، آپ فرماتے ہیں :۔

وھٰذا اذا افترقا علیٰ ھٰذا فان کان یتراضیان بینھما ولم یتفرقا حتّٰی قاطعہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ واتمّا العقد فھو جائز لانھما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحۃ العقد ۔

(ترجمہ) "یعنی فساد اس صورت کا اس وقت ہے کہ جب بائع اور مشتری اسی متردد انہ حالت میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں، لیکن اگر وہ دونوں راضی ہو گئے اور جدا ہونے سے پہلے پہلے ثمن معلوم کر لیا اور عقد کو اتمام تک پہنچا دیا (یعنی ایک ہی صورت اجل والی یا نقد والی متعین کر لی) تو پھر یہ عقد جائز ہے کیونکہ اب بائع اور مشتری صحتِ عقد کی شرط کو پورا کر کے آپس میں جدا ہو گئے ہیں"

تو ایسی صورت میں نہ تو بیع کے عام اصول کی خلاف ورزی ہوتی کہ نہ ثمن مجہول ہے اور نہ مبیع

اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی خلاف ورزی ہوتی کیونکہ شرطین فی بیع کے معنی علامہ سرخسیؒ نے یہی بیان فرمائے کہ ثمن وغیرہ میں یہ تردد ہو یا یہ یا وہ، جیساکہ انہوں نے فرمایا وھذا ھو الشرطین فی بیع۔ اب آپ خود ہی فرمائیں کہ مولانا کی اس تاویل میں کتنی جان ہے کہ علامہ سرخسیؒ نے لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے کہ جواز کا فتوٰی دیا ہے۔

دوسری بات کہ مجوزین کے پاس کسی مجتہد کا قول بھی نہیں ہے (اس سے اتنا تو بہرحال معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے نزدیک غیر مجتہد کے لیے (جیسے کہ ہم سب ہیں) مجتہد کا قول بھی دلیل شرعی ہے) تو اس کے لیے کتاب الاصل المعروف بالمبسوط کا صفحہ ۱۹ جلد ۵ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ واضح رہے کہ کتاب کی لوح پر یہ عبارت درج ہے اور جس میں غالباً کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

کتاب الاصل المعروف بالمبسوط

للامام الحافظ المجتھد الربانی ابی عبداللّٰہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللّٰہ تعالٰی

آپؒ فرماتے ہیں: واذا باع الرجل بیعاً فقال ھو بالنسیئۃ بکذا وبالنقد بکذا کذا او قال الی اجل کذا بکذا۔ وکذا فافترقا علی ھذا فانہ لایجوز بلغنا عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ نھی عن شرطین فی بیع قال محمدؒ حدثنا بذلک ابوحنیفۃؒ رفعہ الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم " یعنی جب کوئی اس طرح بیع کرے کہ قرض پر اتنی قیمت ہے اور نقد پر اتنی یا ایک ماہ کی مدت پر اس کی قیمت یہ ہے اور دو ماہ کی مہلت پر قیمت وہ ہے اور پھر تردد کی حالت میں بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے، یعنی ثمن وغیرہ کا تردد، جیساکہ شرح سرخسیؒ میں پہلے گذر چکا ہے"

کتاب الاصل کی یہ عبارت اس لیے نقل کی گئی ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو کہ زیر بحث صورت کو جائز کہنے والوں کے پاس کسی مجتہد کا قول ہے یا نہیں۔ باقی رہے وہ بہت سے دلائل اور کثیر عبارتیں جو آپ نے اپنے مضمون میں تحریر فرمائی ہیں تو ان کی تفصیل میں گئے بغیر اتنا عرض ہے کہ مولانا کے خیال میں زیر بحث صورت ربٰو بالنسیئۃ میں داخل ہے اور مجوزین کے نزدیک جن میں صاحب ھدایہ اور صاحب مبسوط (سرخسیؒ) اور خود مجتہد ربانی امام محمد شیبانیؒ شامل ہیں، یہ صورت ربٰو النسیئۃ میں داخل نہیں ہے ورنہ اس کے عدم جواز کو صورت تردد تک محدود نہ رکھتے اور تعیین صورت یا نقد یا نسیہ پر جواز کا فتوٰی نہ دیتے اور صاف فرما دیتے کہ یہ صورت ربٰوا النسیئۃ کی ہے اس لیے حرام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اجل ایک وصف ہے اور وصف کا نہ کوئی عوض لیا جا سکتا ہے نہ دیا جا سکتا ہے

لیکن وصف مرغوب کی وجہ سے قیمت بڑھ سکتی ہے اور نامرغوب کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے۔ دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اصول بتادیا کہ جیّدھا وردیہا سواءٌ، جیّد اور ردّی کا مقابلہ ہو بھی تو برابر برابر لینا ہوگا جودت کے عوض زیادتی نہ دے سکتے ہو نہ لے سکتے ہو، بہترین کھجور کے ایک سیر کے بدلہ میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں سیر کے بدلے سیر آجاتا اور دوسرا سیر وصف جودت کے عوض میں لیا جاتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ لیکن خود ہی حیلہ کی یہ صورت بتلادی کہ ردّی کھجور کو کم قیمت پر بیچ ڈالو یعنی ایک سیر کے دو سیر فروخت کردو اور پھر بہتر کھجور کو زیادہ قیمت سے لے لو۔ تو کیا بہترین کھجور کی قیمت کا اضافہ اس وصف مرغوب کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اس عقلی اور فطری بات کا انکار آخر کون کرسکتا ہے کہ مرغوب چیز کی قیمت بمقابلہ نامرغوب کے زیادہ ہوگی، اسکے باوجود یہ صورت جائز نہیں کہ ایک سیر بہتر کھجور کے بدلہ میں معمولی کھجور کا ایک سیر تو سیر کے مقابلہ میں ہو اور دوسرا سیر جودت کے مقابلہ میں ہو، اور اسی طرح یہ بھی ناجائز ہے کہ بہتر کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر اور مثلاً ایک روپیہ بھی ساتھ دیدیا جائے کیونکہ اس صورت میں یہ روپیہ یا دوسرا سیر وصف کے عوض ثابت ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں حالانکہ بہتر کھجور کو عام کھجوروں کے نرخ سے زیادہ قیمت پر خریدنا بالکل جائز ہے حالانکہ یہاں بھی قیمت کی زیادتی وصف کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔ یہی معاملہ ہے اجل کا بھی ۔۔۔ کہ نفس اجل کا عوض لینا ناجائز ہے لیکن بوجہ اجل کے قیمت کا بڑھ جانا فطری اور عقلی بات ہے اور شریعت نے اس کو منع نہیں فرمایا، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصف کے متعلق فرمایا کہ بہتر کھجور کو زیادہ قیمت سے خرید لیا کرو۔ اسی کو فقہاء اسلام نے فرمایا ان الاجل لایقابلہ الثمن اور وان الثمن یزاد لاجل الاجل۔ نفس اجل پر عوض لینے کی وہی صورت ہے جو آپ کی عبارات میں بھی ہے اور جس کو ربوا النسیئۃ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ عقد ہوا اس پر کہ ایک ماہ کے بعد اس مبیعہ کا ایک روپیہ دے دو اور جب مشتری نے ایک ماہ کے بعد روپیہ نہیں دیا تو بائع نے کہا کہ چلو دوسری مہلت پر دے دو لیکن چار آنے بڑھا کر، تو یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ اجل ہی کو بیچا گیا۔ لیکن اجل ایک وصف مرغوب ہے کہ مشتری کو فوری رقم نہیں دینی پڑتی اور آسانی سے اپنا کام چلالیتا ہے، ہاں جنس اور قدر ایک ہونے کی صورت میں اس آسانی سے کام چلانے کا اعتبار نہیں کیونکہ اموال ربویہ ہیں اور نص کے خلاف اس لیے اس کی قیمت بڑھ گئی جیسے جید کھجور کی قیمت بوجہ جودت کے بڑھ گئی ۔۔۔ حالانکہ صرف جودت کا عوض نہ اپنی جنس سے دیا جاسکتا ہے نہ غیر جنس سے، جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں۔

بہرحال فقہاء کرام حتیٰ کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیر بحث صورت ربٰو النسیئۃ میں داخل نہیں بلکہ اس مسئلہ میں اب مولانا (طاسین صاحب) کے ہمخیال حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم کا اسی مسئلہ پر ایک مضمون جنوری کے "حکمت قرآن" میں چھپ چکا ہے جس میں انہوں نے بہت سی وہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے جو کہ مولانا کے مضمون میں ہیں کہ سود سے اس بیع مؤجل کا فرق دو وجوہ سے ہے کہ یہ دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن مہنگا بتلا دیتا ہے نیز مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر آگے دیکھا کہ یہ زیر بحث صورت اگرچہ عین ربٰو تو نہیں مگر یہاں بھی ذہنیت وہی سود خوارانہ ہے، پھر کہتے ہیں کہ یہ مقصد اور مفاسد کے لحاظ سے ایک حرام حیلہ ہے یا اگر نرم الفاظ استعمال کئے جائیں تو مکروہ اور شریعتِ اسلامی کے اصل مزاج کے خلاف ایک حیلہ ہے۔ (اگر حضرت مفتی صاحب مرحوم بقید حیات ہوتے تو ان سے اسلام کے اصل مزاج اور غیر اصل مزاج کا فرق دریافت کیا جاتا) بہرحال مفتی صاحب کے نزدیک بھی ان عبارات سے مسئلہ زیر بحث یقینی طور پر ثابت نہیں کیونکہ ربٰو النسیئۃ اور اس صورت میں دو وجہوں سے فرق ہے، ربٰو النسیئۃ عین سود ہے جبکہ یہ عین سود نہیں اس کو حرام کہنے کی بجائے مکروہ کہنے کی گنجائش ہے۔

باقی رہی مولانا کی یہ جذباتی بات کہ اس سے مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تو گذارش یہ ہے کہ اگر ضروریاتِ زندگی کی بنیادی چیزیں مثلاً اشیاء خورد و نوش، علاج و ادویات کی چیزیں ستر پوشی کا عام لباس حتیٰ کہ جانوروں کا چارہ اور گھاس وغیرہ کمیاب ہونے کی وجہ سے مہنگے داموں بیچی جائیں تو وہ یقیناً حرام اور عذابِ الٰہی کا باعث ہے۔ مگر اس میں نہ تو مؤجل اور معجل کا فرق ہے، اگر نقد کی صورت میں ایسا کرے تو بھی کبیرہ گناہ اور اجل کی صورت میں ایسا کرے تو بھی عذابِ الٰہی کا مستحق، اور نہ بایں معنیٰ کہ وہ بیع ہی نہیں ہوتی، بیع ہوگئی، طے شدہ دام دینے پڑیں گے ہاں بوقت ضرورت حکومت تسعیر سے کام لے سکتی ہے اور اس کی مخالفت پر تعزیر کا حق بھی رکھتی ہے۔ مگر اس سے زیر بحث مسئلہ کو مطلقاً حرام اور سود کہنا یا بار بار قطعی حرام کہنا مناسب نہیں، اس سے یا تو تمام فقہاء مجتہدین اور ان کے متبعین کی تجہیل لازم آتی ہے یا تفسیق، جو کسی طرح بھی اخلافِ صالحین کے شایانِ شان نہیں، تجہیل اس لیے کہ یہ روایات اور عبارات عام معروف ہیں اور یقیناً مولانا صاحب کے پیش نظر ہوں گی اور تفسیق اس صورت میں کہ جان بوجھ کر ان سے چشم پوشی کی اور لوگوں کو غلط راستہ پر ڈالا اگر اخلاف اسی طرح بیباکی سے اسلاف کو بدنام کرتے رہے تو نفاذِ اسلام و شریعت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے سے رہا۔ والامر بید اللہ۔ علاوہ ازیں یہ کاروبار، قرض پر مال خریدنا ہمیشہ مجبوری سے ہی نہیں ہوتا

بلکہ زیادہ تر صورتیں ایسی ہیں کہ کاروباری لوگ اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے ایسا کرتے ہیں تو ایسے میں ظاہر ہے کہ گناہ بھی نہیں، اسی طرح وہ اشیاء جو صرف عیاشی کے لیے خریدی جاتی ہیں یا زیادہ سہولت کے لیے ان کو گراں قیمت پر دینے میں بھی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ فقط واللہ اعلم

الحق کو بھیجنے میں کوئی حرج نہیں، باقی ان کا خیال تو ان کو ہی معلوم ہوگا، شاید تکمیلِ مضمون کے بعد کوئی تائید یا ترمیم و تردید لکھیں۔ بہتر ہے کہ "حکمتِ قرآن" لاہور کو بھی بھیج دیا جائے کیونکہ انہوں نے اس موضوع پر مختلف مقالات شائع کرنے کی پیشکش کی ہے۔

جواب از

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

یہ مضمون درحقیقت حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے اس مضمون کا تجزیہ اور تفصیلی تجزیہ ہے جو مجلہ "الحق" کی جلد ۲۷ کے شمارہ ۴/۳ میں "ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ قبل ازیں حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کا وقیع مضمون بھی "الحق" کے حوالہ سے بطور جواب قارئین کرام کی نذر سے گذرا ہوگا جس میں کافی حد تک زیر بحث مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اول الذکر مضمون نگار کی اسلامی اور جدید معاشیات پر عمیق نظر اور متعلقہ فن میں وافر معلومات رکھنے سے کسی کو انکار نہیں، موصوف کا ملک کی اُن چند گنتی چنی شخصیات میں شمار ہوتا ہے، جن کو اہلِ نظر جدید معاشی نظام میں اسلامی نظامِ معیشت کا وکیل سمجھتے ہیں۔ آپ کی علمی کاوشیں "مجلس علمی" میں ادبی اور ریسرچ و تحقیق کے میدان میں مسلّم ہیں، بایں ہمہ ممکن ہے کہ موصوف کی زیر بحث مسئلہ میں رائے وقتی مصلحت یا مروّجہ حالات و واقعات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے موزوں ہو لیکن شرعی نقطہ نظر سے موصوف کے اٹھائے ہوئے نکات قابلِ توجہ ہی نہیں بلکہ محلِ نظر بھی ہیں۔ موصوف کی رائے کہ "ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی حرام اور ناجائز ہے" کے تجزیہ سے قبل ہم قرآن وحدیث کے حوالہ سے مسئلہ کا ایک طائرانہ مطالعہ کرکے داخلی اور خارجی قرائن کی رُو سے اس کا جائزہ لیں گے لیکن اس سے قبل مسئلہ کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کرام کسی الجھن اور غلط فہمی کے شکار نہ ہوں۔

قدیم معاشرہ کے مطالعہ سے قطع نظر موجودہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی ایسے معاشی مسائل میں

جکڑی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی ضرورت کی کسی چیز کو یکمشت نقد خرید نے کی طاقت [illegible] رکھتا ہو تو اپنی آمدنی اور قوتِ برداشت کو مدنظر رکھ کر ماہانہ یا سالانہ قسط وار خرید نے پر تیار ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ بائع نقد گاہک یعنی یکمشت زرِ بیع ملنے کی صورت میں ادھار پر فروخت کرنے کے لیے بہت کم آمادہ ہوگا (معاملات میں تقویٰ اور دیانتداری کی بات اگرچہ اس سے الگ ہے) کیونکہ اُدھار کی صورت میں اس کی مالی منفعت لازمی طور پر متاثر ہوگی، اس لیے بائع کو اُدھار پر آمادہ کرنے کے لیے قیمتِ فروخت میں نقد کی نسبت سے کچھ زیادتی رکھی جاتی ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر نقد کی حالت میں اس چیز کی قیمت کھلی مارکیٹ میں ایک سو روپے ہو تو ادھار کی وجہ سے اس کی قیمت ایک سو بیس روپے تک پہنچ جاتی ہے' اب بائع کا ادھار کی وجہ سے قیمت میں بیس روپے کا اضافہ وصول کرنے یا مُشتری کے ایسے معاملہ کے ارتکاب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ میرے ناقص خیال میں دوسرے عام فہم مسائل کی طرح اس کا جواب بھی نہایت آسان الفاظ میں دیا جاسکتا ہے لیکن موصوف کے علمی و تحقیقی مزاج اور باریک بینی نے اس کو ایک نظری اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیا۔

آسان اور سہل ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اٹھانوے فیصد فقہ حنفی کے مقلّد ہیں، شاید ملک کے طول و عرض میں "تبحّر فی العلم" والے حضرات بہت کم تعداد میں ہوں لیکن مجتہدین فی الشرع، فی المذہب، فی المسائل کے رُتبہ تک پہنچنے والے تو درکنار اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح کے پایہ کا بھی کوئی شخص نظر نہیں آتا، ایسے علمی انحطاط کے حوالے سے ہمیں سیدنا امام ابوحنیفہؒ یا ان کے مذہب کے مسلّمہ قواعد و ضوابط کی رُو سے مسلک کے ذیلی مجتہدین میں سے کسی ایک کے فرمودات پر اعتماد کرتے ہوئے اصل مراجع یعنی آیتِ قرآنی یا حدیث کے مطالبہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ایسے نازک مرحلہ پر طبقہ ثالثہ کے سرخیل علامہ سرخسیؒ یا طبقہ خامسہ کے نامور فقیہ صاحبِ ہدایہ (علامہ مرغینانیؒ) کے قول پر بغیر کسی تاویل اور حیل و حُجّت کے اعتماد کرنا ہمارا فریضۂ منصبی میں سے ہے۔

قدیم فقہی ذخائر میں کسی واضح جُزئیہ کے میسّر ہونے کے باوجود اصل مراجع یعنی قرآن و حدیث سے کسی دلیل کا مطالبہ کرنا درحقیقت مجتہدین کا کام ہے، اس لیے موصوف کا یہ تمہیدی بیان اکابرینِ اُمت کی رائے سے موافقت نہیں رکھتا کہ:

"کسی معاملہ کے شرعی جواز و عدمِ جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی اُس نص اور دلیل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس کی بنا پر اُس

فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے۔" (ماہنامہ الحق ج ۲۷ شمارہ ۳ ص ۲۱)

مقلد کی ذمہ داری

میرے خیال میں مقلد کو تسلیم و رضا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ورنہ شاید ایسے بے موقع لب کشائی سے اپنے مذہب و مسلک پر بدگمانی کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ دھونا نہ پڑیں۔ بارہویں صدی کے نامور فقیہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ اصول افتاء کے ضمن میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فاقول ان هذا الشرط (اعنی لا یحل ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا) کان فی زمانهم اما فی زماننا فیکتفی بالحفظ کما فی القنیة وغیرها فیحل الافتاء بقول بل یجب وان لم من این قال۔ (شرح عقود رسم المفتی ص ۲۷ فلیس الا القول بالتفصیل)

(ترجمہ) "میرے خیال میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کہ "ہمارے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک اصل مرجع معلوم نہ ہو" کا اشتراط ان کے اپنے دور میں تھا ہمارے وقت میں محض مذہب کی جزئیات پر فتویٰ دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ امام نے کس دلیل کی روشنی میں یہ بات کہی ہے۔"

مقلدین کو دلیل کا مطالبہ کرنا مقلدین کا کام نہیں بلکہ مجتہدین کا کام ہے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:۔

ولاشک ان هذا خاص بالمفتی المجتهد دون المقلد المحض فان التقلید هو الاخذ بغیر معرفة دلیل۔ (شرح عقود رسم المفتی ص ۲۸ فلیس الا القول بالتفصیل)

(ترجمہ) "اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیل کا مطالبہ کرنا مجتہد کا کام ہے اور مقلد کے لئے تو بغیر دلیل کے مطالبہ کرنے کے صرف جزئیہ پر عمل کرنے سے اور کوئی چارہ نہیں۔"

دلیل کے مطالبہ کی حقیقت

کیونکہ دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ متعلقہ مسئلہ میں صرف قرآن حکیم کی آیت یا حدیث کا اجمالی تذکرہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے اجمالی علم کارآمد ہے جو ابتداء ہی سے فقہی اقوال پر قناعت کا نظریہ نہ رکھتا ہو بلکہ دلیل کا مطالبہ کرتے وقت اس میں مذہب و مسلک کے قواعد و ضوابط کی رُو سے طریقہ استدلال اور پھر داخلی و خارجی قرائن کے حوالہ سے پرکھنے کی صلاحیت ضروری ہے اور متعلقہ مسلک کے جملہ مسائل پر علم بھی ضروری ہے تاکہ سیاق و سباق کے حوالہ سے مسئلہ پر پورا علم رکھے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی علمی بصیرت اس معیار پر پہنچی ہوئی ہو تو تقلید کی جگہ یہ خود

مجتہد بننے کا حقدار ہے پھر اس کو تقلید کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، جیسا کہ علامہ موصوفؒ مزید فرماتے ہیں:۔

لان معرفة الدليل انما تكون للمجتهد لتوقفها على معرفة سلامته من المعارض وهي متوقفة على استقراء الادلة كلها ولا يقدر على ذلك الا المجتهد اما مجرد معرفة ان المجتهد الفلاني اخذ الحكم الفلاني من الدليل الفلاني فلا فائدة فيها۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۷ فليس الا القول بالتفصيل)

(ترجمہ) "دلیل کی پہچان مجتہد کا وظیفہ ہے کیونکہ اس کے لیے دلیل کے معارضہ سے محفوظ ہونے کا علم ضروری ہے جس کے لیے جملہ دلائل کا استقراء ضروری ہے اور اس پر مجتہد کے سوا اور کوئی قادر نہیں تاہم محض یہ جاننا کہ فلاں امام نے فلاں دلیل سے یہ حکم لیا ہے کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں"۔

ہم تو مقلد ہیں اور ہمارے لیے علامہ مرغینانیؒ یا علامہ سرخسیؒ کا جزئیہ تو درکنار بلکہ محض حضرت تھانویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کی رائے بھی حرفِ آخر ہے، تقلید کے حوالہ سے ہم ان ائمہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے اصل مراجع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن یہاں زیر بحث مسئلہ میں مولانا محترم اور آپ کے ہمنوا حضرات کی تسلی کے لیے اپنے طالبعلمانہ مطالعہ کے حوالہ سے چند حوالہ جات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ قارئین پر واضح ہو کہ فقہاء کا یہ مسئلہ ان کی ذاتی اختراع یا عندیہ نہیں بلکہ اس کی تائید میں منصوص واقعات، آیت اور حدیث بطور استناد کے موجود ہیں۔

زیر نظر مسئلہ میں قیمت میں زیادتی کی حقیقت

اس کی پوری حقیقت تو انشاء اللہ آئندہ صفحات میں موصوف کے مضمون کے تجزیہ کے بعد واضح ہو جائے گی کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں یہ تفاوت کیا ادھار کا عوض ہے یا ادھار کی وجہ سے ہے، دونوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تاکہ منصوص حرام و ناجائز کاروبار "ربوا النسیئۃ" سے اس کا فرق ہو سکے۔ سرِ دست ہم یہ مقدمہ رکھ کر دلائل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں یہ تفاوت ادھار کا معاوضہ نہیں، حقیقت میں ایسا کبھی نہیں کہ زرِ بیع میں کچھ قیمت مبیعہ کی ہے اور کچھ قیمت اس اجل کی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت کوئی ایک دوسرے سے الگ ہو سکے بلکہ معاشرتی اور واقعاتی نظائر و حالات کو مدنظر رکھ نقد میں ادھار کی نسبت منافع، فوائد اور دوسری خوبیوں کی فراوانی کی وجہ سے

کچھ زیادتی آتی ہے تاہم آسانی کے لیے اسے یوں تعبیر کرسکتے ہیں کہ "ان الزیادۃ ھٰھنا لاجل الاجل لا لعوض الاجل" یعنی "یہاں پر زیادتی ادھار کی وجہ سے ہے ادھار کے عوض میں نہیں"۔
قرآن وحدیث میں اس کے متعدد نظائر پائے جاتے ہیں جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آتی ہے بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعض واقعات عملی طور پر اس کے شاہد ہیں۔

قرآن سے استدلال

قرآن مجید کی "آیت المداینہ" پر سوچ وفکر کرنے سے شاید اس حقیقت شناسی کے لیے مواد مل سکے کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں تفاوت جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک کیے ہوئے عقدِ سلم کے معاملہ کو اپنی کتاب میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۔۔۔) کی رو سے حلال قرار دے کر اجازت دی ہے"۔ (تفسیر المظہری جلد ۱ ص ۴۱۲ سورۃ البقرہ)

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں:

لا بأس بالطعام الموصوف بسعر معلوم الی اجل معلوم۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۳۰۰)

(ترجمہ) "مقررہ مدت تک مقررہ نرخ پر معلوم غلہ کے کاروبار میں کوئی حرج نہیں"۔

معلوم ہوا کہ آیت مداینہ بنیادی طور پر "عقدِ سلم" کے بارے میں ہے اور عقد سلم کی تعریف علماء نے یوں کی ہے: "بیع اجل بعاجل"۔ (فتح القدیر جلد ۶ ص ۲۰۴ باب السلم)

اس اجمال کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی مشتری مقررہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے مثلاً کسی شخص کو ایک ہزار روپے دیکر یہ معاہدہ کرے کہ یہ رقم پیشگی وصول کرکے فلاں وقت مجھے گندم اس نرخ کے اعتبار سے دینے کے پابند رہوگے اور بائع بھی مقررہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے رقم وصول کرکے معاہدہ قبول کرے تو اسے "عقدِ سلم" کہا جاتا ہے۔ خیر القرون کے دور سے لیکر آج تک بغیر کسی انکار کے یہ معاملات جائز اور مشروع ہیں۔ "عقدِ سلم" کی ماہیت پر غور وخوض کرنے کے بعد یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں کہ مشتری وقتی طور پر یکمشت زرِ سلم کی ادائیگی پر تیار ہوکر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کے لیے انتظار کس جذبہ کے تحت کرتا ہے؟ کیا اس کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا کوئی حسین جذبہ کارفرما ہے؟ کبھی نہیں! اگر خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تو قرضۂ حسنہ کی صورت میں بائع سے اس آڑے وقت میں تعاون کا ہاتھ بڑھا دیتا، متعدد شرائط کی رعایت کرکے پیشگی رقم دیکر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کا

انتظار کرنے سے بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بارِ گراں کے تحمل کے عوض اس کو مقررہ وقت پر مبیعہ ارزاں قیمت پر میسر ہو کیونکہ عقدِ سلم میں مبیعہ بازار کی قیمت سے بائع کو عموماً سستا پڑتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ عقدِ سلم کی مشروعیت میں اس فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

انما ابیح علیٰ خلاف القیاس رفع حاجۃ الفقیر حالاعن نفقۃ عیالہ القادر علی المسلم فیہ مالاً وحاجۃ المشتری الی الاستبیاح لعیالہ وھو بالسلم اسھل اذیکون المبیع فی المسلم نازلاً عن قیمتہ فی البیع غالباً۔ (التفسیر المظہری ج۔۱ ص۴۲۱ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ)"عقدِ سلم خلاف القیاس ہونے کے باوجود اس وجہ سے جائز قرار دیا کہ اس میں بائع اپنی خستہ حالی میں بچوں کے لیے خرچہ کا بندوبست کر کے مستقبل میں اسکی ادائیگی پر قادر ہو کر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جبکہ مشتری کو سلم میں فائدہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً عقدِ سلم میں قیمت مروجہ قیمت سے ارزاں ہوتی ہے۔"

معلوم ہوا کہ عقدِ سلم میں زرِ بیع کی پیشگی ادائیگی اور مبیعہ کی تاخیر سے قیمت کی مارکیٹ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی، عقدِ سلم میں ادھار یعنی نسیہ لازمی شرط ہے، اگر اس میں ادھار نہ ہو تو سلم کی حقیقت ختم ہو جائے گی، لہٰذا جب بیع عاجل بعاجل میں نسیہ اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا آنا ممنوع نہیں، سود کے زمرہ میں نہیں آتا تو زیرِ نظر معاملہ یعنی ادھار میں جو بیع عاجل بعاجل کی مخصوص صورت میں قیمت کا تفاوت کیوں ممنوع قرار دیا جا رہا ہے، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عقدِ سلم خلاف القیاس وارد ہو کر اس پر دوسرا معاملہ قیاس نہیں کیا جاتا کیونکہ عقدِ سلم غیر موجود مبیعہ کی فروخت کے جواز کی حیثیت سے خلاف القیاس ہے نہ ہم اس پر کوئی قیاس کرتے ہیں بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نقداً اور ادھار میں مبیعہ یا ثمن کا متاثر ہو کر کمی یا زیادتی کا آنا مشروع معاملہ ہے رِبٰو بالنسیہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عملی واقعہ سے استدلال

نسیہ کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آنے کے جواز کی نشاندہی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا تعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں "باب شراء النبیؐ بالنسیئۃ" کے عنوان سے باب باندھ کر یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر نقد کی طرح بعض اوقات ادھار پر بھی ضروریاتِ زندگی خریدیں، اس باب میں امام بخاریؒ نے اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت لائی ہے جس میں

آپ فرماتی ہیں :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتری طعاماً من یھودی الی اجل ورھنہ درعا من حدید ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۱ باب الرھن عند الیھود وغیرھم)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ غلّہ ادھار پر خریدا اور اپنا لوہے کا بنا ہوا ایک درع اس کے پاس رہن میں رکھا۔"

امام بخاریؒ نے یہ روایت متعدد بار مختلف مسائل میں نقل کی ہے، اس لیے نسیہ پر معاملہ کا جواز ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ موصوف بھی اپنے مقالہ کی ابتدا میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

> "جہاں تک اُدھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے قرآن و حدیث کی رُو سے قطعی طور پر جائز ہے، اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔" (ماہنامہ الحق جلد ۲۷ شمارہ ۳ ص ۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جیسے دوسرے معاملات کے مطالعہ سے قطع نظر ہم یہودی سے مذکورہ معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں، ایک متعصب دشمنِ اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اور پھر اس کے بعد روزمرہ ضرورت آنے والی چیز "درع" کو رہن کرنے کے پسِ پردہ واقعات کے جائزہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اس میں زیرِ نظر مسئلہ کے جواز کے لیے قوی مستدل موجود ہے۔ اس پسِ پردہ حقیقت کے جاننے کے لیے ہمیں اس واقعہ کا مطالعہ مدینہ منورہ کے معاشی حالات کو مدنظر رکھ کر کرنا ہوگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہو تو اس کا گاہک بھی زیادہ ہوتا ہے اور جب خریدار زیادہ ہوں تو اس چیز کے بدلنے کے مواقع وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، ایسے وقت میں بائع ادھار کی نسبت سے نقد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے الّا یہ کہ ادھار میں اگر کہیں مالی منفعت بہ نسبت نقد کے زیادہ ہو تو پھر وہ صوابدید پر فیصلہ کرتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ کے وقت مدینہ منورہ کی معاشی حالت کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مدینہ منورہ میں غلّہ کی بہت زیادہ ضرورت تھی، عموماً لوگوں کو بیرونی قافلوں کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب کسی قافلہ کے آنے کی خوشخبری سنائی جاتی تو بسا اوقات فاقہ زدہ معاشرہ کی حالت غیر ہو جاتی

اوراپنی جان کی خبر تک نہ رہتی، چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ کو تجارتی قافلہ آنے کی خبر اس وقت ملی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمارہے تھے تو صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے چھوڑ کر قافلہ کی طرف دوڑ پڑے جس پر سورۃ الجمعہ کی آخری آیتیں نازل ہوئیں ۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت مدینہ منورہ میں خرید وفروخت کی مارکیٹ پر یہودی چھائے ہوئے تھے وہ قافلہ والوں سے غلہ خرید کر بعد میں من مانی قیمت پر فروخت کرتے تھے ان کو نقد کا گاہک ایسی ضرورت کی اشیاء میں لازمی طور پر میسّر تھا، یہ لوگ نقد کی نسبت ادھار کو ترجیح کسی شوق کی وجہ سے نہیں دیتے تھے بلکہ مالی منفعت کی خاطر یہ لوگ ادھار کا معاملہ کرتے تھے، ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھار کے معاملہ سے غالب گمان یہ ہے کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں قیمت کا تفاوت لازمی طور پر اختیار کیا گیا ہوگا ورنہ نقد کے گاہک ملنے کے باوجود یہودی کو ادھار کا معاملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مالی منفعت اور زیادہ قیمت کی وصولی کے سوا یہودی کے اس اقدام کے لیے اور کوئی دوسرا محرک نظر نہیں آتا۔

اس میں اس کا احتمال بھی نہیں کہ یہودی نے کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض احسان کے جذبہ سے حسنِ سلوک کر کے محض نقد کی قیمت پر بطور ادھار دیا ہو کیونکہ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا کے مصرح ہونے کے باوجود یہودیوں جیسی متعصب قوم سے مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہی، حسن سلوک اور مواسات کے جذبات کی توقع کرنا بے سود ہے ۔ بلکہ حدیث میں ورهنه درعه کے الفاظ سے بھی خیر خواہی کے جذبہ کی تردید ہو رہی ہے، آخر کار جب ہمدردی مقصود تھی آپؐ سے توثیق کے لیے رہن کا مطالبہ کیوں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی درعہ بطور رہن رکھنے کے لیے کیسے تیار ہوئے جو آپؐ کی مجاہدانہ زندگی کی روزمرہ ضرورت تھی ۔

یہ ایسے امور ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں نسیہ کی صورت میں نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی گئی ہو ۔

خیرالقرون میں زیرِ بحث مسئلہ کا عملی ثبوت

مذکورہ شہادات کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی زندگی میں بھی ہمیں ایسا واضح، غیر مبہم اور

ٹھوس ثبوت ملتا ہے جس سے مسئلہ کی شرعی حیثیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے جواز میں صحابہ کرامؓ کے دور میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور صحابہ کرامؓ خود ایسے معاملات کرتے تھے، سیدہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ کے واقعہ میں اس کی صریح دلیل موجود ہے۔ امام احمدؒ روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے، لیکن صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سیدنا امام ابو حنیفہؒ کے واسطہ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان امرأة قالت لعائشةؓ ان زيد بن ارقم باعني جاريته بثمانمائة درهم ثم اشتراها مني فقالت ابلغيه عني ان الله قد ابطل جهاده مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لم يتب۔ (فتح القدير ج ٦ ص ٨٢ باب البيع الفاسد)

(ترجمہ) "ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کی کہ زید بن ارقمؓ نے مجھ پر ایک لونڈی آٹھ سو درہم میں فروخت کر کے دوبارہ چھ سو درہم میں خریدی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا میری طرف سے زید بن ارقمؓ کو یہ پیغام پہنچاؤ کہ اگر اس نے اپنے اس کئے ہوئے کام سے توبہ نہ کی تو اللہ تعالےٰ اس کا وہ جہاد ضائع کر دے گا جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں کیا ہے"۔

اگرچہ اس روایت میں نقد اور نسیہ (ادھار) کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن مسند احمد کی روایت میں اس پر یہ اضافہ آیا ہے:۔

انی بعث من زید غلاما بثمانمائة درهم نسیئة واشتریته بستمائة نقد۔ (فتح القدیر ج ٦ ص ٨٢ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "کہ میں نے اس سے آٹھ سو درہم ادھار پر غلام خرید کر چھ سو درہم نقد پر دوبارہ اس پر فروخت کیا ہے"۔

اس روایت کو دیکھ کر کسی کے ذہن میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے، کیونکہ زید بن ارقمؓ کے اس معاملہ میں نقد کی قیمت اگر چھ سو درہم ہے تو ادھار کی قیمت آٹھ سو درہم مقرر کی جا رہی ہے۔

شاید اس پر کسی کو شبہ ہو، ممکن ہے کہ یہ حضرت زید بن ارقمؓ کا انفرادی عمل ہو اور دوسرے صحابہؓ آپؓ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس پر مطلع ہو کر بہت سخت الفاظ میں پیغام بھیجا کہ اگر اس نے اپنے کیے ہوئے کام سے رجوع نہ کیا تو اس کا جہاد جیسا مبارک عمل بھی ضائع ہو جائے گا، گویا آپ نے یہ اقدام گناہ کبیرہ سمجھ کر دوسرے اعمال کے لیے مبطل قرار دیا۔

لیکن یہ شبہ بے بنیاد ہے کیونکہ یہاں پر حضرت زید بن ارقم رض کے اس معاملہ میں دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ نقد اور اُدھار کی قیمت میں آپ نے تفاوت رکھا، دوسری چیز یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فروخت کئے ہوئے غلام یا لونڈی کو دوبارہ کم قیمت پر قبل نقد الثمن خرید کر بظاہر سودی معاملہ کا ارتکاب کیا، حضرت عائشہ رض کے انکار کا تعلق اول الذکر مسئلہ سے نہیں بلکہ اتنی شدت سے انکار آپ نے دوسرے معاملہ کو مدنظر رکھ کر کیا، آپ نے اسے ربٰو کی ایک ذیلی شکل قرار دے کر اس پر ربٰو کی آیت تلاوت کی، پھر ربٰو کا تعلق بھی اول معاملہ سے نہیں تھا یعنی نسیہ میں اس چیز کی قیمت آٹھ سو روپے مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، اگر صرف یہ عقد ہوتا تو اس پر انکار کی گنجائش نہ رہتی لیکن دوسرے معاملہ میں کہ اپنی ہی فروخت کی ہوئی چیز کو قبل نقص الثمن کم قیمت پر خریدنے میں سودی عناصر نظر آرہے تھے اس لیے آپ نے انکار کیا اور پہلا معاملہ بھی اس اعتبار سے درست نہ رہا کہ دوسرا حرام معاملہ کی پوری عمارت اس پر بنی ہوئی تھی، اس لیے حضرت عائشہ رض نے دونوں پر انکار کرکے فرمایا کہ بُری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی، علامہ جلال الدین الخوارزمی رح اس تفرقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

وانما ذمت البيع الاول وان كان جائزا عندها لانها صارت ذريعة الى البيع الثانى هو موسوم بالفساد - (الكفاية على الهداية - فتح القدير ج ۲ باب البيع الفاسد)

(ترجمہ) "آپ نے پہلی بیع کی مذمت بھی کی حالانکہ یہ آپ کے ہاں بھی جائز معاملہ تھا کیونکہ یہ دوسرے ناجائز اور فاسد عقد کے لیے ذریعہ تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں "بئس ما اشتريت واشتريت" بری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی" عقد ثانی با اعتبار وجود مؤخر ہونے کے باوجود آپ نے ذم کرتے ہوئے پہلے ذکر کیا کیونکہ بنیادی طور پر اس کی مذمت مقصود تھی ۔

حضرت زید بن ارقم رض کے اس تفاوت پر اقدام اور حضرت عائشہ رض کا اس تفاوت پر خاموشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادھار کے معاملہ میں قیمت کا تفاوت خیر القرون کے معاشرہ میں بھی مروج تھا اس پر کوئی انکار نہیں کر رہے تھے اور نہ کسی نے اس کو "ربٰو النسیئۃ" میں شمار کیا ۔

مختلف الجنس اشیاء کے تبادلہ میں تفاضل حقیقی و حکمی دونوں جائز ہیں

از روئے شرع خرید و فروخت کا معاملہ عاقدین کی باہمی رضامندی پر مشتمل ہے لیکن اموال ربویہ میں ان پر چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں "اشیاء ستہ" کا حدیث

سے جہاں دوسرے ائمہ نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق علّت نکال کر ربو کی شکلیں متعین کیں تو احناف نے "جنس و قدر" کی علّت نکالی، اس لیے جہاں کہیں دونوں علّتیں پائی جاتی ہیں وہاں پر احناف نے تفاضلِ حقیقی اور تفاضلِ حکمی (نسیہ) دونوں حرام قرار دیں، مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے پر گندم کے عوض گندم فروخت کرتا ہے تو ایک من کے بدلے میں جیسا کہ دو من خریدنا حرام ہے، ایسا ہی تفاضلِ حکمی (کہ ایک چیز وصول کر کے دوسرے کی وصولی کے لیے مہلت دی جائے) بھی حرام ہے اور اگر کہیں جنس و قدر میں سے کوئی ایک علّت پائی جائے تو وہاں پر تفاضلِ حکمی تو حرام ہے لیکن تفاضلِ حقیقی میں کوئی حرج نہیں اسلئے کہ ایک من گندم کے عوض دو من مکئی لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس میں نسیہ حرام ہے" اور جہاں کہیں جنس و قدر دونوں نہ ہوں تو مختلف الجنس اشیاء میں "واذا اختلف الجنسان فبیعوا کیف شئتم" کی رو سے تفاضلِ حقیقی اور حکمی دونوں حلال ہیں۔

زیرِ نظر معاملہ میں ثمن اور مبیعہ دونوں مختلف جنس ہیں جن کے درمیان قدر بھی مشترک نہیں اس لیے تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے، تاہم نسیہ اور نقد کے مابین تفاوت کا اعتبار کرنا عقد کی تکمیل کے بعد ثانوی امور ہیں جن کا عقد کے قوام سے کوئی تعلق نہیں۔

نقد و نسیہ کی قیمت میں تفاوت کا جواز ائمہ کا اختلافی مسئلہ ہے

ائمہ کرام کے درمیان زیرِ نظر مسئلہ میں اتفاق ہونے کی نشاندہی ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت زید بن ارقمؓ کی سابقہ روایت پیش کی جاتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص اگر کوئی چیز نسیہ اور ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے اور پھر بغیر کسی ثمن کی ادائیگی کے دوبارہ اپنی فروخت کی ہوئی چیز بغیر کسی ثالث کے حائل ہونے کے نقد پر کم قیمت سے خریدے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ثالث کے حائل نہ ہونے کے بغیر بھی یہ عقد جائز ہے لیکن احناف کے نزدیک ثالث کے حائل ہونے کے بغیر یہ عقد ناجائز ہے تاہم اگر درمیان میں ثالث آجائے اور فروخت کرتے وقت نسیہ کی وجہ سے اس کی قیمت پانچسو روپے رکھی گئی تھی لیکن دوبارہ بائع نے نقد رقم دے کر اپنی فروخت کی ہوئی چیز کم قیمت یعنی چارسو روپے پر خریدی تو پھر شوافع کی طرح احناف کے نزدیک بھی جائز ہے ایسا ہی ثمن کی وصولی کے بعد جواز اتفاقی ہے۔ علامہ کمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

وقید بقوله قبل نقد الثمن لان ما بعده یجوز بالاجماع

باقل الثمن - (فتح القدیر ج ۶ ص۶۸ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "ثمن کی ادائیگی سے قبل مسئلہ کی تقیید سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر معاملہ بعد نقد الثمن کا ہو تو پھر بالاتفاق جائز ہے۔"

اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اصل قیمت کی زیادت میں جیسا کہ نقد میں زیادتی کا احتمال ہے تو "حالۃ او نسیئۃ" کے عموم سے نسیہ کا بھی احتمال ہے تو نسیہ میں زیادہ قیمت مقرر کرکے بعد میں کم قیمت نقد پر خرید نے سے ہمارے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مقالہ نگار کے اندازِ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیرِ نظر مسئلہ فقہ حنفی میں شاید صرف ان دو کتابوں تک محدود ہے لیکن حقیقت میں یوں نہیں ہے بلکہ فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ نے یہ مسئلہ علاؤ الدین الحصکفیؒ کی عبارت کی شرح میں "ردالمحتار علی الدر المختار" جلد۴ ص۱۵۸ پر، اور ابن نجیم المصریؒ نے البحر الرائق جلد ۶ ص۱۱۴ پر یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، اگرچہ اکثر فقہاء نے جو علت بیان کی ہے وہ ایک نظر آتی ہے لیکن میرے خیال میں فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس میں یہ مسئلہ نہ ہو۔ لیکن محض فقہی ذخائر سے عبارات کا نقل کرنا موصوف کے نزدیک کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں اس لیے عبارات کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ زیرِ نظر مسئلہ کے عدم جواز کے بارے میں کسی ایک کتاب میں بھی کوئی صریح جزئیہ نہیں ملتا، اس لیے موصوف کو اپنے مؤقف کے اثبات کے لیے دوسرے جزئیات کا سہارا لینا پڑا، اگر یہ کہیں ناجائز ہوتا تو اتنے ضخیم فقہی ذخائر میں کہیں نہ کہیں اس پر تصریح ضرور ہوتی۔

موصوف کے مقالہ کا جائزہ

یہاں تک اصل مسئلہ کے جواز کے بارے میں بات ہو رہی تھی اب ہم ذرا آگے قدم بڑھاتے ہوئے موصوف کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جن کی وجہ سے موجودہ معاملہ ناجائز اور حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ دو قسطوں پر مشتمل مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدم جواز کا نظریہ تین باتوں پر مبنی ہے:۔

(۱) ربوا النسیئۃ: آپ کے نزدیک زیرِ نظر مسئلہ "ربوا النسیئۃ" کی ایک ذیلی قسم ہے، کبریٰ تو مسلمات دین میں سے ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے ربوٰ کی جملہ قسمیں حرام ہیں، اس لیے یہ معاملہ بھی حرام ہے ظاہر بات ہے کہ کبریٰ کے تسلیم ہونے کی وجہ سے اس پر بحث کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن صغریٰ

ایک نظری مسئلہ ہونے کی وجہ سے کافی غور وخوض کا محتاج تھا اس لیے موصوف نے اس پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے، چنانچہ پہلی قسط کا ۴/۲ سے زائد حصہ اس پر مشتمل ہے، موصوف فرماتے ہیں :۔

"غرضیکہ قرآن کریم نے ربٰوا النسیئۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا ان میں ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربٰو کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے"۔ (الحق ج ۲۷ ش ۳ ص۲۳)

آپ نے ربٰوا النسیئۃ کی حقیقت زید بن اسلمؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؓ، قتادہؓ، اور عطاء بن ابی رباح جیسے بلند پایہ اکابرین کے حوالہ سے نقل کرکے یہ کوشش کی ہے کہ یہی حقیقت ربٰو زیر نظر مسئلہ میں بھی کارفرما ہے۔ پھر مزید وضاحت کے لیے آپ نے ابوبکر الجصاصؒ اور امام فخر الدین رازیؒ کے اقوال کا سہارا بھی لیا ہے جن میں ربٰوا النسیئۃ کی حقیقت بیان ہوتی ہے، اس خیال کو مزید تقویت دیتے ہوئے موصوف نے ان اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو سُود کی وجہ سے معاشرہ پر پڑتے ہیں، آپ کے خیال میں یہی زیر نظر معاملہ کے بھی اثرات ہیں ۔

(۲) بیع باطل :موصوف نے جس دوسری حقیقت پر زیر نظر مسئلہ کے عدم جواز کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی ہے وہ بیع باطل کی تعریف ہے، آپ حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ اور علامہ رشید رضا کے حوالہ سے بیع باطل کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بعد ازاں مروجہ معاملہ پر یہی حقیقت منطبق کرکے فرماتے ہیں :۔

"آیت مذکورہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملہ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے"۔

(الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ ص۳۶)

(۳) تیسری چیز جو موصوف اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کرتے ہیں وہ قرض میں کسی منفعت کی حرمت کا حکم ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے"۔ موصوف اس روایت کے آخر میں فرماتے ہیں :۔

"بہرحال اس حدیث کی رو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے"۔ (الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ ص۳۶)

اس کے علاوہ موصوف کے مقالہ کے آخر میں ہدایہ اور مبسوط سرخسی کے واضح جزئیات سے جان چھڑانے کے لیے ایسی کمزور اور رکیک توجیہات کی گئی ہیں جو "توجیہ بما لایرضٰی قائلہ" کا مصداق ہے۔ ان توجیہات کی حقیقت، قوام وثبات یا ضعف وکمزوری کے لیے قارئین کرام حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کے مقالہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم آئندہ موصوف کے ان تین نکات پر بحث کریں گے جو بزعم مقالہ نگار زیر نظر مسئلہ کی حرمت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلی وجہ کی کمزوری | جہاں تک زیر نظر معاملہ کو "ربٰوا النسیۃ" کی قسم قرار دینے کی بات ہے تو ربٰو کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جو ادھار کے معاملہ کو بھی سمیٹ سکے، چند وجوہات کی وجہ سے ادھار کا معاملہ ربٰو النسیۃ سے مختلف ہے۔

۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "ربٰوا النسیۃ" میں اجل کو باقاعدہ مستقل مبیعہ کی حیثیت سے اعتبار دیا جاتا ہے۔ موصوف کے مقالہ کے حوالہ سے اکابرین امت سے اس کی جو حقیقت نقل کی گئی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقررہ مدت کے خاتمہ پر دائن مدیون کے پاس جاکر کہہ دیتا کہ میرا فلاں رقم جو تیرے ذمہ ہے وہ ادا کرو۔ اگر ابھی ادا نہیں کرتے ہو تو اتنی مدت کے بعد مجھے اس مدت کے عوض مقررہ رقم کے ساتھ مزید اتنی رقم دوگے۔ عروض کی طرح اجل کی کمی اور زیادتی کو دیکھ کر قیمت لگائی جاتی اجل میں مالیت وتقوم کی حقیقت معدوم ہونے کی وجہ سے دائن کو اصل رقم پر بغیر کسی معاوضہ کے زیادت دی جاتی۔ جس کو قرآن نے حرام قرار دیا۔ شیخ عبدالرحمن الجزیری ربٰوا کی تقسیم کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وینقسم الی قسمین الاول ربٰو النسیئۃ وھو ان تکون الزیادۃ المذکورۃ فی مقابلۃ تاخیر الدفع۔۔۔۔۔ لا خلاف بین ائمۃ المسلمین فی تحریم ربٰو النسیئۃ وھو کبیرۃ من الکبائر بلا نزاع۔ (الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ج ۲ ص ۲۴۵ مباحث الربٰو)

(ترجمہ) "ربٰو کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم "ربٰو النسیئۃ" ہے، یہ وہ قسم ہے کہ جس میں مذکورہ زیادتی تاخیر سے دینے کے مقابلہ میں دی جاتی ہے۔۔۔۔ اکابرین امت میں اس کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں یہ بالاتفاق گناہ کبیرہ ہے۔"

یہی وہ حقیقت ہے جو مفسرین، محدثین، فقہاء اور دوسرے ارباب تحقیق کی تحریرات میں نظر آتی ہے شاید تعبیر میں کوئی مبالغہ نہ ہو کہ ہم اس سے یوں کہیں کہ یہ زیادتی اجل کا معاوضہ ہے۔
لیکن اس کے مقابلہ میں زیر نظر معاملہ میں یہ مفروضہ زیادتی معاوضہ کی حیثیت سے نظر نہیں

آتی، نہ مقررہ میعاد کی کوئی قیمت مقرر کی جاتی اور نہ اس کو عاقدین مبیعہ کا کوئی جز تسلیم کرتے ہیں تاکہ کسی وقت مقررہ قیمت، مبیعہ اور اجل پر تقسیم ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ عام فقہاء اس زیادتی کیلئے بعوض الاجل کی جگہ "لاجل الاجل" کی علت ذکر کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ ابن عابدینؒ اور ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں: ویزاد فی الثمن لاجلہ۔ گویا دونوں کا بنیادی فرق یہی ٹھہرا کہ ادھار کے معاملہ میں زیادتی "لاجل الاجل" اور "ربوٰ النسیئۃ" میں زیادتی بعوض الاجل ہے، ایسے واضح فرق ہونے کے باوجود پھر بھی یہ معاملہ ربوٰ کی ذیلی قسم قرار دینا غلط فہمی یا سینہ زوری ہے۔ تاہم یہ فرق باریک ہے، شاید اس فرق کی مزید وضاحت ایک مثال سے ہو سکے مثلاً ایک شخص کراچی سے پشاور تک ریل گاڑی میں سفر کرتا ہے تو اصل کرایہ تین سو روپے ہے جو کسی بھی گاڑی میں اپنے لیے سیٹ مقررہ مسافت تک اس قیمت پہ لے سکتا ہے لیکن اسی گاڑی میں ائیر کنڈیشن سیٹ کا کرایہ پانچسو روپے لگایا جاتا ہے لہٰذا دونوں کرایوں کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل کرایہ تو تین سو روپے ہے لیکن موخر الذکر سیٹ کے کرایہ میں یہ اضافہ محض سہولیات اور مراعات کے اضافہ کی وجہ سے ہے یہ اضافہ کسی سہولت کا معاوضہ نہیں۔

ایسا ہی یہاں پر بھی معاملہ ہے کہ ادھار میں یہ زیادتی کسی اجل کا معاوضہ نہیں کہ اس کو حرام اور ممنوعہ معاملات میں شمار کیا جا سکے بلکہ یہ النقد خیر من النسیئۃ کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤخر ادائیگی کی وجہ سے مقرر کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ نقد وصولی میں مشتری کو بروقت ادائیگی کی زحمت ہو لیکن بائع کو فائدہ ہوگا جبکہ تاخیر سے ادائیگی میں مشتری کو سہولت دی جاتی ہے اور بائع کے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے قیمتِ فروخت نسبتاً زیادہ لگائی جاتی ہے تاکہ بائع بطیب خاطر ادائیگی کے لیے تیار رہے اور مشتری بھی اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے خوشی سے وہ قیمت ادا کرے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ حرام معاملہ میں ایسی دو اشیاء کا تبادلہ ہے جن کی جنس اور قدر آپس میں متحد ہے۔ چونکہ دائن جب مدیون سے معاہدہ کے اختتام پر یہ کہتا ہے کہ اگر ابھی میرے پیسے مثلاً ایک ہزار روپے نہیں دیتے ہو تو چھ مہینوں کے بعد ایک ہزار کی جگہ پندرہ سو روپے دو گے گویا اس میں تبادلہ عوض اور ثمن کا نہیں رہا، چونکہ اختتام معاہدہ پر دائن کا حق مبیعہ نہیں رہتا بلکہ مبیعہ کی قیمت رہی تو تبادلہ رقم کا رقم سے آیا، ایسی حالت میں لازمی بات ہے کہ جنس اور قدر کی موجودگی میں تفاضل حقیقی اور حکمی دونوں آئے جو کہ قطعی حرام ہے۔

لیکن زیرِ نظر معاملہ میں یہ صورت بالکل نہیں، یہاں پر تبادلہ مبیعہ اور ثمن کا ہے، اوّل ہی سے بائع اور مشتری کے درمیان ایجاب و قبول میں یہی قیمت منظور تنظر رکھی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں جہاں بیع مطلق کی تعریف صادق آتی ہو یعنی مبیعہ اور ثمن کا تبادلہ ہو تو تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں بائع اور مشتری کے درمیان نقد قیمت پر معاہدہ طے پائے اور بعد ازاں مشتری نقد ادائیگی سے قاصر ہو اور یکسی معاوضہ کی وجہ سے ثمن کی ادائیگی نہ کرے تو اس وقت یہ لازمی طور پر ربو النسیئۃ کے مترادف ہے کیونکہ نقد ادائیگی پر معاہدہ کے وقت بائع کا حق ابھی مقررہ ثمن کی مقدار میں متعین ہوا تو ابھی اجل کی وجہ سے زیادتی نہیں اس مقررہ حق کے مقابلہ میں ہے جو ناجائز ہے۔

دوسری وجہ کی کمزوری | جہاں تک موصوف کی دلیل کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے تو یہ بھی شبہ سے خالی نہیں، یہ مشکل ہے کہ بیع باطل کی تعریف زیرِ نظر معاملہ پر صادق ہو۔ اس کے بطلان کے لیے ہم پہلے ایک مقدمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ عقدِ بیع میں ایجاب و قبول کے بعد جب تک اس عقد کا فسخ ہو کر کسی دوسرے معاملہ کی تجدید نہ ہو تو کمی اور زیادتی کی نسبت اصل عقد کی طرف جائے گی۔ مثلاً بائع اور مشتری ایجاب و قبول کر کے معاہدہ کریں اور بعد ازاں بائع مقررہ مبیعہ کے ساتھ یا مشتری مقررہ قیمت سے کوئی زیادتی ادا کرے تو اس کی نسبت اصل عقد کی طرف کی جائے گی، چنانچہ استحقاق کی صورت میں یہ کمی اور زیادتی لازمی طور پر ظاہر ہوگی۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں :۔

ویجوز للمشتری ان یزید للبائع فی الثمن و یجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع ویجوز ان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک فالزیادۃ والحط یلتحقان باصل العقد عندنا۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۵۲ کتاب البیوع)

(ترجمہ) "مشتری کے لیے جائز ہے کہ وہ بائع کے لیے قیمت میں زیادتی کرے جبکہ بائع مشتری کو مبیعہ میں اضافہ کر سکتا ہے اور قیمت میں کمی بھی جائز ہے، استحقاق ان تمام سے متعلق ہوگا، پس کمی اور زیادتی ہمارے نزدیک اصل عقد سے ملحق ہوتی ہے"۔

اس قاعدہ پر چلتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر معاملہ میں قیمت میں یہ زیادتی اصل مبیعہ کے عوض میں آتی ہے اگر قیمت نقد کی صورت میں کم ہو یا ادھار کی صورت میں زیادہ ہو ہر دو صورتوں میں مبیعہ کی قیمت سمجھی جائے گی۔ تو بیع باطل کی تعریف "ما یؤخذ من الانسان بغیر عوض" یا "مالم یکن فی مقابلۃ

شئ حقیقی "مروجہ معاملہ پر کبھی صادق نہیں آتی، اس میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بائع کو زیادتی بغیر عوض ملی بلکہ تمام قیمت مبیعہ کی ہے، اصل اور اضافہ دونوں کے درمیان ایسا شدید اتصال موجود ہے کہ دونوں کی دوسرے سے جدائی متصور نہیں، یہ کبھی نہیں کہا جاتا ہے کہ اس قیمت کا اتنا حصہ مبیعہ کا ہے اور اتنا حصہ درمیان میں اجل کا ہے، آخر کار "اجل" میں اتنی قوت کہاں ہے جس کو مبیعہ شمار کیا جا سکے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

لان الاجل فی نفسہ لیس بمال فلا یقابلہ شئ حقیقۃ اذا لم یشترط زیادۃ الثمن بمقابلتہ قصدًا ویزاد فی الثمن لاجلہ اذا ذکر الاجل بمقابلۃ زیادۃ الثمن قصدًا۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۵۸ باب المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "کیونکہ اجل بذاتِ خود کوئی مال نہیں، پس حقیقت میں جب ثمن کی زیادت قصدًا اس کے عوض میں شمار نہیں کی گئی ہو تو کوئی چیز اس کا معاوضہ نہیں، البتہ قیمت میں زیادتی کی جا سکتی ہے جبکہ اجل زیادتِ ثمن کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہو۔"

بہرحال بیع باطل کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اس لیے لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ کی رُو سے یہ ناجائز نہیں بلکہ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ کی رو سے جائز ہے۔ قسط وار ادائیگی کی صورت میں مشتری کی سہولت کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا بے جا نہیں کہ مشتری بیک وقت ادائیگی کے تحمل کے بوجھ سے چھٹکارا پا کر معمولی اضافہ برداشت کرنے پر لازمی طور پر خوش ہو گا ورنہ ممکن ہے کہ مشتری کو بیک وقت ادائیگی کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کہیں مبیعہ کی خریداری سے محروم ہونا پڑے۔ اس لیے مشتری کی رضامندی نہ ہونے کا دعویٰ کرنا خلافِ واقع ہے، یہ الگ بات ہے کہ اگر بائع احسان سے کام لے کر کم قیمت پر مبیعہ فروخت کرنے پر تیار ہو تو اس سے مشتری کو خوشی حاصل ہو گی، لیکن اس سے مزید ایک خوشی کی اور صورت بھی ہے کہ بائع محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے مبیعہ بغیر کسی عوض کے مجاناً مشتری کے حوالہ کرے لیکن اس کو معاشرہ کا لازمی حصہ قرار دینا یا ہر ایک کو احسان کا پابند کرنا شریعت کے عادلانہ نظام سے متصادم ہے کیونکہ شریعت کسی پر ایسے اضافی بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں البتہ تقویٰ اور نیکی حاصل کرنے کے دروازے دونوں پر ہر وقت کھلے ہیں۔

تیسری وجہ کی کمزوری

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کہ "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے۔" کا حکم بھی بظاہر اس معاملہ پر چسپاں کرنا

مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ یہ حکم وہاں ہے جہاں قرض کی موجودگی میں دائن مدیون سے کسی مادی منفعت کا استفادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم وہاں ہو سکتا ہے جہاں قرض کا معاملہ باعتبار وجود منفعت کے حصول سے مقدم ہو، لیکن یہاں پر معاملہ کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ پہلے قرض دیکر پھر منفعت کا معاملہ کیا جائے، بلکہ اس معاملہ کی ہم یوں تعبیر کرسکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی وجہ سے فائدہ یعنی مشتری کو رقم دینے میں سہولت کا فائدہ اور بائع کو قیمت میں مالی فائدہ آیا، گویا ظاہری انتفاع کا دائرہ ایسا بھی نہیں جو صرف دائن کی ذات تک محدود ہے بلکہ دائن اور مدیون دونوں اس فائدہ سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں تاہم کسی غیر واقعی اور امکانی احتمال شبہ انتفاع کی وجہ سے ممکن ہے اس عقد پر غیر مستحسن کا حکم لگایا جاتا ہے جو خواص کے دائرہ تک محدود رہتا ہے لیکن اس کو بالکل حرام اور ناجائز قرار دینے کا حکم دوسرے اصول سے بھی متصادم ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی اس کاروبار میں مبتلا ہے ایسے کسی جواز کے احتمال کے ہوتے ہوئے حرام کے کھاتے میں ڈالنا دانشمندی نہیں، جہاں کہیں جواز کا امکان ہو اور یہ احتمال کسی شرعی نص سے بظاہر متصادم نہ ہو تو جواز کے معاملہ کے لیے ایسے احتمال کو بنیاد بنانا اوفق بالروایت والدرایت ہے اگرچہ حرمت کے لیے دوسری جانب میں کوئی احتمال نظر آتا ہے، تاہم تقویٰ کا میدان اس سے الگ ہے جس کے لیے ایسے مشتبہات سے بچنا بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔

باب السلم

(بیع سلم کے مسائل واحکام)

بیع سلم کی حقیقت

سوال:۔ ایک کمپنی اپنی مصنوعات بیرون میں فروخت کرے تو ایک قیمت لگاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان کو پیشگی رقم دے دے تو کمپنی اُسے خصوصی رعایت دیتی ہے اور مقررہ قیمت سے کم وصول کرکے حسب وعدہ اپنی مصنوعات اسے دیتی ہے، کیا کسی کمپنی یا فیکٹری کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی کمپنی کو پیشگی رقم دے کر مقررہ وقت پر رعائتی قیمت سے اس کی مصنوعات خریدنا عقد سلم کے حکم میں ہے، ایسا عقد اُس وقت جائز ہے جب اس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں:۔ ۱۔ جنس معلوم ہو، ۲۔ نوع معلوم ہو، ۳۔ صفت معلوم ہو، ۴۔ قدر اور اندازہ معلوم ہو، ۵۔ مدت معلوم ہو، کم از کم ایک ماہ ہو، ۶۔ راس المال معلوم ہو، ۷۔ مطلوبہ چیز دینے کا مکان معلوم ہو، ۸۔ جدائی سے قبل راس المال پر قبضہ ہو۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۵ ص۲۱۶)

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: السلم هو ...... شرعاً بیع آجلٍ وهو المسلم فیه بعاجلٍ وهو راس المال۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۲۰۹ باب السلم) [1]

مالدار کے لیے بیع سلم کی اجازت

سوال:۔ کیا شریعتِ مطہرہ میں غنی کیلئے بیع سلم کی اجازت ہے یا یہ بیع صرف غرباء کے لیے خاص ہے؟

الجواب:۔ عقد سلم کے جواز میں اگرچہ غرباء اور فقراء کی ضرورت بنیادی طور پر محرک اور سبب ہے لیکن ضرورت کی موجودگی ایک خفیہ معاملہ ہے جس پر ہر کسی کو مطلع ہونا مشکل ہے، اس لئے شریعت نے ایسی حالت میں بیع سلم میں شرائط کی موجودگی کو اعتبار دے کر غرباء اور امراء دونوں

---

[1] قال العلامة ابن الهمام رحمہ اللہ: معناه الشرعی بیع آجل بعاجل ...... وسیذکر المصنف شرائطه۔ (فتح القدیر ج۶ ص۲۰۴ باب السلم)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۷۸ باب السلم۔

کے لیے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ سفر کی حالت میں مشقت اور تکلیف سے قطع نظر کر کے محض سفر کو مشقت کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولما كان جوازه للحاجة وهي باطنة انيط بامر ظاهر كما هو المستمر في قواعد الشرع كالسفر للمشقة ونحوه وهو ذكر الاجل فلم يلتفت بعد ذلك الى كون المبيع معدومًا عند المسلم اليه حقيقة او موجودًا قادرًا هو عليه۔ (فتح القدير ج۶ ص۲۱۸ باب السلم)[1]

کرنسی نوٹوں میں بیع سلم کی اجازت ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے امریکی ڈالر وصول کر کے ان کے عوض میں پاکستانی کرنسی نوٹ دینے کی میعاد کر کے معاملہ طے کیا کہ تین ماہ بعد پاکستانی کرنسی نوٹ ادا کروں گا، کیا مذکورہ طریقہ سے معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کرنسی نوٹ چونکہ خلقی طور پر ثمن نہیں بلکہ عرف اور رواج کی وجہ سے ثمن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لیے ثمن عرفی بننے کے بعد اس میں کوئی قدر نہ رہی بلکہ عددِ متقارب کے حکم میں آ کر عقدِ سلم کے جواز کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ پس اگر سلم کی شرائط کی رعایت کر کے کوئی شخص ایسا معاملہ کرے تو بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر سود خوری کے لیے یہ طریقہ اپنایا جائے تو پھر اس سے اجتناب بہتر رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين ابوبكر الكاساني رحمه الله: واما السلم في الفلوس عددًا فجائز عند ابي حنيفة وابي يوسف وعند محمد لا يجوز بناءً على ان الفلوس اثمان عنده فلا يجوز السلم فيها كما لا يجوز السلم في الدراهم والدنانير وعندهما ثمنيتها ليست بلازمة بل تحمل الزوال لانها ثبتت بالاصطلاح فتزول

---

[1] قال العلامة جلال الدين الخوارزمي: قلنا شرعيته لرفع حاجة المفاليس والافلاس امر باطن لا يمكن الوقوف على حقيقته والشرع بنى هذه الرخصة على الحاجة...... والبيع بالخسران دليل الحاجة ونظيره اقامة السفر مقام المشقة اقامة النكاح مقام الماء في النسب۔ (الكفاية في ذيل فتح القدير ج۶ ص۲۱۹ باب السلم، قادرًا تحت قوله: لو كان قادرًا على التسليم لم يوجد المرخص)
ومثله في العناية على هامش فتح القدير ج۶ ص۲۱۷ باب السلم۔

بالاصطلاح ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۰۸ باب السلم، فصل: واما الذی یرجع الی المسلم فیہ فانواع) لے

بیع سلم میں تمام قیمت کی وصولی ضروری ہے

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان دو ہزار روپے پر دس من اناج کا عقد اس شرط پر ہوا کہ سولہ سو روپے حالاً ادا کرے گا، جبکہ چار سو روپے دو ماہ بعد اناج وصول کرتے وقت ادا کرے گا، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع سلم میں راس المال کا تعین اور عقدِ مجلس میں ادائیگی لازم ہے لہٰذا اگر رأس المال کے قبض کرنے سے قبل اگر طرفین جدا ہوئے تو یہ بیع درست نہ ہوگی، تاہم رأس المال کا جتنا حصہ ادا کیا گیا ہو اتنے میں ہی سلم جاری ہوگا، پس مذکورہ معاملہ میں بھی آٹھ من اناج میں بیع سلم درست ہو کر دو من میں باطل ہوگی، البتہ اگر مجلس برخواست کرنے سے قبل تمام رقم ادا کر دی جائے تو عقد جائز ہے۔

وفی الهندیة: السادس ان یکون مقبوضاً فی مجلس السلم سواء کان رأس المال دیناً او عیناً عند عامة العلماء استحسانا وسواء قبض فی اول المجلس او فی آخره لان ساعات المجلس لها حکم ساعة واحدة وکذا لو لم یقبض حتی قاما یمشیان فقبض قبل ان یفترقا بابدانهما جاز۔اھ

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۲۹ الباب الثامن عشر فی السلم) ؎۲

لے قال العلامة ابن نجیمؒ: ویصح فی العددی المتقارب کالبیض والجوز والفلس لانه عددی یمکن ضبطه فیصح السلم فیه وقیل لا یصح عند محمدؒ لانه ثمن مادام یروج وظاهر الروایة عن الکل الجواز۔

(البحر الرائق ج۶ ص۱۵۶ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۵ ص۲۱۰ باب السلم۔

؎۲ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وبقی من الشروط قبض رأس المال ولو عیناً قبل الافتراق بابدانهما وان ناما او سارا فرسخا او اکثر۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله قبض رأس المال) فلو انتقض القبض بطل السلم۔ اھ

(ردالمحتار ج۵ ص۲۱۶ کتاب البیوع۔ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۲ ص۳۴ باب السلم۔

جانوروں میں بیع سلم کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیوانات میں بیع سلم شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب : حیوانات میں بیع سلم کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چونکہ بیع سلم کے لیے مبیعہ کا وزنی، کیلی یا عددیاتِ متقاربہ ہونا ضروری ہے اور حیوانات ان میں سے کسی بھی قسم میں داخل نہیں، اس لیے حنفیہ کے نزدیک حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یسلفون فی الثمر فقال من اسلف فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم۔ (جامع الترمذی ج۱ ص۲۴۵ باب ما جاء فی السلف فی الطعام والتمر) [1]

مالکانِ رسائل وجرائد کا خریداروں سے پیشگی قیمت لینا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! آجکل مذہبی اور غیر مذہبی رسائل وجرائد کے مالکان خریداروں سے سالانہ چندہ کی رقم پیشگی وصول کر لیتے ہیں جبکہ پورے سال کا رسالہ انہیں بعد میں وصول ہوتا ہے۔ تو کیا مالکان رسائل و جرائد کا پیشگی رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب : رسائل وجرائد کی سالانہ رقم پیشگی لینے کا معاملہ بیع سلم کا معاملہ ہے جو شرعاً جائز۔ ہے اسلیے کہ اس میں اصل معاملہ کاغذ کا ہوتا ہے اور وہ سال بھر بازار میں موجود رہتا ہے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: السلم شرعاً بیع آجل وھو المسلم

---

[1] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن السلف فی الحیوان، اخرجہ الحاکم فی المستدرک ج۲ ص۵۲ وقال صحیح الاسناد۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۱۹ باب النھی عن السلف فی الحیوان)

ومثلہٗ فی ردالمحتار ج۵ ص۲۱۱ باب السلم۔

فیہ بعاجل وھو رأس المال ورکنہ رکن البیع حتی ینعقد بلفظ بیع فی الصح...... وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس کبر وتمر و بیان نوع کمستقی او بعلی وصفتہ وقدر و اجل و بیان قدر رأس المال اھ
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۲۱۴٬۲۱۲ باب السلم) [1]

جوس کے کریٹوں میں بیع سلم کا حکم

سوال:- شربت اور جوس بنانے والی کمپنیوں کا اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کمپنی اپنے کسی ڈیلر کو عام ریٹ پر مثلاً ۶۲ روپے فی کریٹ دیتی ہے لیکن اگر ڈیلر کمپنی کو یہ رقم سیزن سے کچھ مدت پہلے ادا کردے تو کمپنی اُسے ۵۲ روپے فی کریٹ دیدیتی ہے اس طرح سے ڈیلر کو دس روپے فی کریٹ بچت ہو جاتی ہے، یہ طریقہ خرید وفروخت میعاد مقرر اور غیر مقرر دونوں طرح کا ہوتا ہے، تو کیا یہ طریقہ بیع شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر یہ بیع، بیع سلم کے طریقے سے ہو تو شرائط سلم کی موجودگی میں بیع درست ہوگی، بیع سلم کی شرائط یہ ہیں، ۱۔ جنس معلوم ہو ۲۔ مال کی قسم معلوم ہو ۳۔ صفت معلوم ہو ۴۔ مقدار معلوم ہو ۵۔ مدت کا تعین ہو ۶۔ مبیع کے ادا کرنے کی جگہ مقرر ہو۔
(اشراق نوری شرح قدوری ص۱۳۴ باب السلم) اور اگر پیشگی کی یہ رقم کمپنی کو بطور قرض دی جاتی ہو تو بموجب حدیث کل قرض جر نفعاً فھو ربوا یہ سودی معاملہ ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس ونوع ...... وصفۃ ...... وقدر ...... واجل واقلہ فی السلم شھر ...... و بیان مکان الایفاء للمسلم فیہ الخ
(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۳۱ باب السلم)

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وھو ان یسلم عوضاً حاضراً فی عوض موصوف فی الذمۃ الی اجل .... الثامن ان یکون جنس المسلم فیہ ای المبیع موجوداً فی الاسواق بنوعہ وصفتہ من وقت العقد الی حلول اجل التسلیم ولا یتوھم انقطاعہ عن ایدی الناس۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۵۹۸٬۶۰۸ المطلب الثانی تعریف السلم)

مسلّم فیہ ناپید ہو جائے تو .... | **سوال**:۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بیع سلم کرے اور وقتِ معینہ سے قبل ہی وہ شے ناپید ہو جائے تو کیا مشتری اس کے بدلے کوئی اور چیز لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع سلم میں جب مسلم فیہ (جس کے بارے میں بیع ہوئی ہے) اگر مدتِ معینہ میں ناپید ہو جائے اور مسلم الیہ (بائع) ادا کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں مشتری کو اختیار ہے کہ وہ مسلم فیہ تک انتظار کرے یا اپنے پیسے واپس لے لے، اس کے بدلے میں دوسری چیز لینا شرعاً جائز نہیں، تاہم عقد ختم کرنے یعنی اپنی رقم واپس لینے کے بعد نئے سرے سے عقد بیع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو انقطع بعد الاستحقاق خیر ب السلم بین انتظار وجوده والفسخ واخذ رأس المال۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۴ ص ۲۳۹ باب السلم)[1]

جانبین سے موزونی اشیاء میں بیع سلم جائز نہیں | **سوال**:۔ ایک آدمی نے چند بوری چینی ۸۱۰ روپے فی بوری کے حساب سے ایک شخص پر ۲/۱-۲ ماہ کی میعاد پر فروخت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آپ اس وقت مجھے سرسول دیں گے، جبکہ معاہدہ کرتے وقت سرسول کی قیمت ۱۰۱۶ روپے فی من تھی، جب میعاد پوری ہو گئی تو سرسول کی قیمت تقریباً گیارہ سو روپے فی من تھی، اس پر اُس شخص نے سرسول دینے سے انکار کر دیا، بالآخر ۹۰۰ روپے فی من پر فیصلہ ہوا، تو اب یہ نفع یعنی ۲۹۰ روپے فی من لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بظاہر بیع سلم کی یہ صورت ناجائز ہے لہٰذا فریقین اس عقد کو ختم کر کے اپنا اپنا مال یا اس کا مثل اگر عین مال موجود نہ ہو واپس لے لیں، اور اگر سلم کی تمام شرائط موجود بھی ہوں تب بھی چینی اور سرسوں میں سلم جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اس بیع پر بیع فاسد کا حکم جاری ہوگا کیونکہ یہ عقدِ ربو ہے اور عقدِ ربو بیع فاسد کے حکم میں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : من جملة صور البیع الفاسد

---

[1] وفی الھندیة : ولا یجوز ان یأخذ عوض رأس المال شیئاً من غیر جنسه فان اعطاه من جنس اجود منه او اردأ فی الصفة الخ

(الفتاوی الھندیة ج ۳ ص ۱۸۶ الفصل الثالث فیما یتعلق بقبض رأس المال والمسلم فیه)

جملة العقود الربوية۔ (رد المحتار علیٰ حاشیہ الدر المختار ج۴ ص۱۹۷ باب الربوٰ)

وقال العلامۃ خالد الآتاسیؒ، ثم اعلم ان اسلام الموزون فی الموزون والمکیل فی الموزون لا یصح لوجود علی الربوٰ واحدهما الخ۔ (شرح المجلۃ ج۲ ص۲۸۶ باب السلم)[1]

چلغوزی میں بیع سلم کا حکم

سوال:- ہمارے علاقے (ایجنسی وزیرستان) میں لوگ چلغوزی کے دانوں میں بیع سلم کرتے ہیں، یہ چلغوزی پورے ملک کی مختلف مارکیٹوں میں سال کے بارہ مہینے ہر وقت سکتی ہے جبکہ ہمارے علاقے میں ابھی تک درختوں میں ہے، تو کیا ایسی چلغوزی میں بیع سلم جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- یہ ظاہر ہے کہ بیع سلم اس جدید چلغوزی میں ہے جو ابھی تک درختوں پر ہے اور مارکیٹ میں ابھی نہیں پہنچی ہے اور مارکیٹ میں موجود بھی نہیں ہے اس لیے یہ بیع سلم درست نہیں۔

لما فی الہندیۃ: السادس ان یکون المسلم فیہ موجوداً من حین العقد الی حین المحل حتی لو کان منقطعا عند العقد موجوداً عند المحل وعلی العکس او منقطعاً فیما بین ذلک وھو موجودٌ عند العقد والمحل لا یجوز کذا فی فتح القدیر وحد الوجود ان لا ینقطع من السوق وحد الانقطاع ان لا یوجد فی السوق وان کان یوجد فی البیوت ھٰکذا فی السراج الوھاج۔

(الفتاوٰی الہندیۃ ج۳ ص۱۸۰ الباب الثامن عشر فی السَّلَم۔ الفصل الاول)[2]

---

[1] وفی الہندیۃ: العاشر ان لا یشمل البدلین احد وصفی علۃ ربا الفضل وھو القدر او الجنس وھٰذا مطرد الا فی الاثمان فانہ یجوز اسلامھا فی الموزونات لحاجۃ الناس۔

(الفتاوٰی الہندیۃ ج۳ ص۱۸۰، ۱۸۱ الباب الثامن عشر فی السَّلَم۔ الفصل الاول)

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ولا فی حنطۃ حدیثۃ قبل حدوثھا لانھا منقطعۃ فی الحال وکونھا موجودۃ وقت العقد الی وقت المحل شرط فتح القدیر۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۳ باب السلم)

ومِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۵۵ باب السلم۔

افیون میں بیع سَلَم جائز ہے

سوال :- ایک شخص مثلاً زید نے بکر سے کہا کہ مجھے ایک ہزار روپے دے دو، اس کے بدلے میں میں آئندہ سال فصل کے موقع پر ایک سیر افیون دیدوں گا، جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگلے سال افیون کی قیمت تین ہزار روپے فی سیر ہوگی، تو کیا یہ معاملہ سودی تو نہیں ہے یا جائز ہے ؟

الجواب :- پہلے تو افیون کی بیع سے بلا ضرورت احتراز کرنا لازم ہے لیکن مال متقوم ہونے کی وجہ سے صورتِ مسئولہ میں جو عقد کیا گیا ہے یہ بیع سَلَم کی صورت ہے لہٰذا اگر بیع سَلَم کی تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو جائز ہے۔ آئندہ سال افیون کی قیمت کی کمی یا زیادتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ : (السلم) هو.... بیع آجل .... بعاجل..... و رکنه رکن البیع ....ویصح فیما امکن ضبط صفته ومعرفة قدره کمکیل وموزون الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۲۶ باب السَّلَم) [1]

کپڑے میں بیع سَلَم کا حکم

سوال :- اگر کوئی تاجر کسی فیکٹری کے مالک سے اس طرح معاملہ طے کرے کہ آئندہ سال گرمی کے موسم میں مجھے اتنے تھان کپڑا درکار ہوگا اور جملہ شرائط طے کرکے رقم فیکٹری کے مالک کے حوالے کردے تو کیا یہ سودا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ بیع سَلَم کا مسئلہ ہے لہٰذا سودا طے کرتے وقت اگر اس کے جملہ اوصاف، مقدار، کپڑا کس چیز سے بنا ہوگا، وغیرہ کی وضاحت کردی جائے تو شرعاً یہ سودا جائز ہے۔

لمافی مجلة الاحکام : الکرباس والجوخ وامثالهما من المذروعات یلزم تعیین طولها وعرضها ورقتها ومن ای شئ نسیج ومن نسیج ای محل هی ۔

{ شرح المجلة لرستم باز ص۲۱۸ المادة ص۳۸۵
الفصل الثالث فی السَّلَم }

---

[1] وفی الهندیة : ان یکون السلم فیه موجوداً من حین العقد الی حین المحل.... ان یکون السلم فیه مما یتعین بالتعیین۔ وهکذا شروط اُخر۔
(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۸۰ باب السلم)

کتاب

الربٰو

يا ايها الذين امنوا لا

تاكلوا الربوٰا اضعافا

مضاعفة واتقوا الله تفلحون۔

کتاب الرّبٰوا

(سُود کے احکام ومسائل)

سُود کی حقیقت

سوال: جناب مفتی صاحب! سود کی تعریف کیا ہے اور یہ کن کن چیزوں میں کن صورتوں میں پایا جاتا ہے؟

الجواب: قرض دار کو کچھ رقم ایک خاص مدت کے لیے اس شرط کے ساتھ دینا کہ واپس کرتے وقت اصل زر سے زائد دے گا، سُود کہلاتا ہے اور اسے اُدھار کا سود کہتے ہیں۔

لما قال الامام الجصاص الرازیؒ: هو القرض المشروط فیه الاجل وزیادة مال علی المستقرض۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۴۶۹ باب البیع)

ایک ربٰو معاملاتِ بیع وشراء کا ہے، حضور انورؐ نے اس بارے میں چھ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ آپس میں ان کا تبادلہ برابر ہونا چاہیئے، وہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور انگور ہیں۔ ان اشیاء میں سُود کی علت عندالاحناف قدر (پیمانہ) اور جنس ہے، اگر جنس بدل جائے اور کوئی چیز وزنی اور کیلی نہ ہو تو پھر تبادلے میں کمی بیشی جائز ہے، اگر کسی بھی چیز کے اندر قدر اور جنس ہو تو تبادلہ کے وقت کمی یا زیادتی کی تو یہ سُود ہوگا، ان میں اُدھار کا معاملہ بھی سُود ہوگا۔ اگر سُود کی دونوں علتوں میں سے ایک علت پائی جائے تو کمی بیشی جائز ہوگی لیکن اُدھار پھر بھی سُود کے زمرہ میں آئے گا۔

قال الحصکفیؒ: الربا وشرعا فضل ولو حکماً فدخل ربا النسیئة والبیوع الفاسدة فکلها من الربوا خال عن العوض بمعیار شرعی وهو الکیل والوزن مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضة وعلة القدر مع الجنس وان وجد احرم الفضل والنساء وان وجد احدهما حل الفضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۱۷۶ باب الربوا) [۱]

---

[۱] لما فی الهندیة: وهو فی الشرع عبارة عن فضل مال لا یقابله عوض فی معاوضة مال بمال وهو محرم فی کل مکیل وموزون بیع مع جنسه وعلته القدر والجنس وان وجد القدر والجنس حرم الفضل والنساء وان وجد احدهما وعدم الآخر حل الفضل وحرم النساء۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۱۷ باب الربوا)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۳۴ باب الربوا۔

سُود سے بچنے کا حیلہ سوال:۔ آجکل بینک لوگوں کو ٹریکٹر خرید کر دیتا ہے، پھر بینک نے ٹریکٹر کمپنی کو جتنی رقم ادا کی ہوتی ہے اُس رقم کو گاہک سے بمع سُود کے قسط وار وصول کرتا ہے، کیا اس سُود سے بچنے کا کوئی حیلہ ہے؟

الجواب:۔ (۱) اگر بینک کمپنی سے ٹریکٹر خرید کر خود آگے بیچتا ہے تو قسط وار زیادہ رقم قیمتِ خرید سے وصول کر سکتا ہے اور ثمن کی یہ زیادتی اُدھار کی وجہ سے ہے جو کہ شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامة المرغیناني رحمه الله: الا یرٰی انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔
(الهدایة ج۳ ص۷۴ باب الربٰو)

(۲) اگر بینک گاہک کا وکیل بن کر ٹریکٹر اپنے مؤکل کو خرید شدہ قیمت سے زیادہ پر دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے کیونکہ وکیل اپنے مؤکل کی شرائط کے مطابق چلے گا۔

لما قال العلامة الکاساني رحمه الله: اذا قال له اشتر لی جاریة بالف درهم فاشتری جاریة باکثر من الالف تلزم الوکیل دون المؤکل لانه خالف امر المؤکل فیصیر مشتریاً لنفسه۔
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۹ بیان فی حکم التوکیل)

(۳) بینک نے مثلاً گاہک کی طرف سے کمپنی کو ایک لاکھ روپے دے دیئے اور گاہک سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے، ٹریکٹر گاہک نے کمپنی سے خرید لیا لیکن اب بینک کی رقم اس کے ذمہ قرض ہے اور بینک زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ بینک اپنے ایک لاکھ کے عوض گاہک سے زمین وغیرہ خرید کر اپنے قبضہ میں لے لے پھر اس زمین کو گاہک کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کر دے اور قسط وار ڈیڑھ لاکھ وصول کرتا رہے۔

قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: رجل له علیٰ آخر عشرة دراهم فاراد ان یؤجلها الی السنة ویأخذ منه ثلاثة عشر فالحیلة ان یشتری منه بتلك العشرة متاعاً ویقبض المتاع منه وقیمة المتاع عشرة ثم یبیع المتاع منه بثلاثة عشر الیٰ سنة۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۲۶ باب الربٰو) [1]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبدالرشید البخاري رحمه الله: رجل له آخر عشرة دراهم فاراد ان یؤجلها الی سنة ویأخذ منه ثلاثة عشر فالحیلة ان یشتری منه بتلك العشرة متاعاً ویقبض المتاع منه وقیمة المتاع عشرة ثم یبیع المتاع منه بثلاثة عشر الیٰ سنة۔ (خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۰۲ باب الربٰو)

سُودی رقم کا مصرف

سوال:۔ بینک کی طرف سے منافع کی شکل میں ملنے والی سودی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اول تو بینک میں رقم رکھنے سے گریز ہی کرنا چاہیئے اور اگر مجبوراً حفاظت کی نیت سے رکھ دی جائے تو اس پر جو سود منافع کی صورت میں ملتا ہے وہ وہ بینک والوں کے لیے نہ چھوڑے بلکہ اُن سے لے کر غرباء اور فقراء پر بلا نیتِ ثواب صدقہ کردے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کما لو غصب عبداً وآجرہ فینقص فی ھذہ الاجارۃ...... وان استغله تنقصه الاستغلال او آجر المستعار ونقص ضمن النقصان وتصدق بما بقی من الغلة والاجرۃ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویؤمر ان یتصدق بھا لاستفادتھا ببدل خبیث وھو التصرف فی مال الغیر۔ (الدر المختار ورد المحتار ج ۴ ص۱۸۸ کتاب الغصب)[1]

گڑ، گندم قرض پر دے کر واپسی کے وقت زیادتی کی شرط لگانا سُود ہے

سوال: ایک شخص نے کسی آدمی سے گڑ اور گندم ایک خاص پیمانہ کے مطابق خاص مدت کے لیے قرض لیا اور وقت معین پر واپسی کے ساتھ زیادتی کی شرط لگادی کہ قرض ادا کرتے وقت اتنی مقدار میں گڑ اور گندم ساتھ زیادہ بھی دوں گا، کیا اس طرح معاملہ کرنا از روئے شرع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اشیاء ربویہ میں باہم قرض و اقراض جائز ہے لیکن واپسی کے وقت مساوات شرط ہے، گندم تو منصوص ہے، حدیث میں مساوات کی شرط ہے اور گڑ میں اس منصوص کی علت قدر اور جنس پائی جاتی ہے، لہٰذا گندم اور گڑ واپس کرتے وقت زیادتی کی شرط سُود ہے۔

---

[1] لما قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: ولو بلغ المال الخبیث نصاباً لا یجب فیه الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص۸۶ کتاب الزکوٰۃ۔ الفصل الثانی فی المصرف)

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمہ اللہ : الحنطة بالحنطة مثلاً بمثل يداً بيدٍ والفضل ربٰو وعد الاشياء الستة ۔
(الهداية ج۳ ص۷۷ باب الربٰوا) ؎۱

سُود پر قرضہ دینا ناجائز ہے

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! کیا سُود پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ سود پر قرضہ دینا شرعی طور پر قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں صراحتاً اس کی ممانعت ہے، اس لیے سُود پر قرضہ دینا جائز نہیں ہے ۔

لما قال اللہ تعالیٰ : احل اللہ البیع وحرم الربٰو ۔ (سورة البقرة آیت ۲۷۵) ؎۲

دَینِ مؤجل میں کمی کرکے معجل وصول کرنا حرام ہے

سوال :۔ ایک شخص کا دوسرے آدمی کے ذمہ پانچ ہزار روپے قرض تھا، مقروض نے اس میں کمی کا مطالبہ کیا، قرض خواہ نے کہا کہ دو ہزار روپے اس شرط پر کم کرکے معاف کرتا ہوں کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً واپس کر دو تو مقرض کا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ قرض خواہ کا مقروض کو اس شرط پر دو ہزار روپے معاف کرنا کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً وصول کرے ناجائز ہے، عقد میں جو مدت مقرر کی گئی تھی یہ اس کا عوض ہے، دَینِ مؤجل کو معجل کر رہا ہے اور یہ حرام ہے ۔

قال الامام الجصاص الرازی رحمہ اللہ : الرجل یکون علیہ الف درہم دَینٍ مؤجل

؎۱ قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : كل قرض جر نفعاً حرام اذا كان مشروطاً ۔
(ردالمحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربٰوا ۔ مطلب كل قرض جر نفعاً حرام)
وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج۶ ص۲۵۴ باب الرّبٰوا ۔

؎۲ وفى الهندية : قال محمدؒ فى كتاب الصرف ان ابا حنيفةؒ كان يكره كل قرض جرّ منفعة ۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۳ ص۲۶۴ فصل فى الصرف)
وَمِثْلُهٗ فى الهداية ج۳ ص۱۳۱ كتاب الحوالة ۔

فیصالحہ منہ علی خمس مائۃ حالہ فلا یجوز۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص۱۸۷) [۱]

قرض دے کر نفع متعین کرنا ناجائز ہے

سوال:۔ ایک آدمی کو کاروبار کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، کسی دوسرے آدمی نے کہا کہ اس شرط پر سرمایہ دوں گا کہ دس فیصد منافع مجھے ضرور دوگے، کیا اس شرط پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ روپے بطور قرض دے کر اس پر دس فیصد یا کوئی بھی فیصد منافع مقرر کرنا سود ہے جو کہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کل قرض جر نفعاً حرام ای اذا کان مشروطاً کما علم مما نقلہ عن البحر۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۶۶ باب الربو۔ مطلب کل قرض جر نفعا حرام) [۲]

مساوی حقوق کے وقت قرعہ اندازی سود نہیں

سوال:۔ چند آدمی ہر ماہ کچھ رقم جمع کرتے ہیں اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے جس کا نام نکل آتا ہے تو وہ جمع شدہ رقم لے لیتا ہے پھر ہر ماہ اپنے حصے کی رقم جمع کرتا رہتا ہے لیکن قرعہ اندازی سے اس کا نام نکل جاتا ہے، اس طرح باری باری قرعہ اندازی میں ہر ایک کا نام آتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرعہ اندازی سود ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ چند افراد کا اس طرح ہر ماہ برابر برابر رقم جمع کر کے قرعہ اندازی کے

---

[۱] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: لو کانت لہ الف مؤجلۃ فصالحہ علی خمس مائۃ حالۃ لم یجز لان المعجل خیر من المؤجل وھو غیر مستحق بالعقد فیکون بازاء ما حطہ عنہ وذٰلک اعتیاض عن الاجل وھو حرام۔

(الھدایۃ ج ۳ ص۲۵۱ باب الصلح فی الدَّین)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص۷ کتاب الصلح۔

[۲] قال العلامۃ قاضی ثناء اللہؒ: قولہ وحرم الربو والمعنٰی ان اللہ تعالٰی حرم الزیادۃ فی القرض علی القدر المرفوع۔ (تفسیر مظھری ج ۱ ص۲۹۹ سورۃ البقرہ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القرآن للجصاص ج ۲ ص۱۸۹ سورۃ البقرہ۔

ذریعے کسی ایک کو دینا امداد باہمی اور قرض ہے اس میں تملک اور تملیک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک شریک چاہتا ہے کہ اس بار جمع کی گئی رقم مجھے مل جائے، تو رفع نزاع اور خوش دلی کے لیے قرعہ اندازی کر لیتے ہیں، جہاں سب شرکاء کے حقوق مساوی ہوں وہاں طیبِ خاطر کے لیے قرعہ ڈالنا جائز ہوتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویکتب اسامیھم ویقرع لتطییب القلوب۔

(ردالمحتار ج۵ ص۱۶۶ کتاب القسمة) ؎

مشتری کے ہاتھ مبیع نفع کی شرط پر بیچنے کا وعدہ سود نہیں

سوال:۔ زید بکر کو سود پر قرضہ دینا چاہتا تھا لیکن بکر نے انکار کر دیا، اس پر دونوں نے سود سے بچنے کے لیے ایک حیلہ سوچا، زید نے بکر سے کہا کہ میں تمہیں دو ہزار روپے دیتا ہوں آپ اس کا کپڑا خرید یں اور آنے جانے کا خرچہ اور کرایہ بھی تمہیں دوں گا، مال اپنے قبضے میں لے لوں گا پھر ایک آنہ فی روپیہ نفع کے حساب سے ادھار پر آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، تو کیا سود سے بچنے کا یہ حیلہ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ سود سے بچنے کا مذکورہ حیلہ درست ہے، بکر زید کا وکیل بن کر مال خرید ے اور زید کے حوالے کر دے پھر زید بکر کے ہاتھ دو ہزار کا کپڑا ایک آنہ فی روپیہ منافع کے حساب سے اُدھار پر فروخت کر دے تو یہ بیع صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں زید نفع پر اپنا مال بکر کے ہاتھ بیچ رہا ہے اگرچہ سودا ادھار ہے، اس میں کسی قسم کا سُود نہیں، زید نے صرف ابتداءً بکر کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ مال آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، یہ بھی کوئی ناجائز بات نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمه الله: کل حیلة یحتال بها الرجل یتخلص

؎ قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمه الله: لا لأن القرعة یتعلق بها حکم بل لتطییب النفوس ولورود السنة بها ولان ذٰلك انفیٰ للتهمة فکان سنة۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۹ کتاب القسمة)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۲ کتاب القسمة۔

بھا عن حرام او یتوصل بھا الیٰ حلال فھی حسنۃ۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۳۱۹ کتاب الحیل)[1]

سُودی رقم کے عوض سودی رقم دے کر ذمّہ فارغ کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کی بینک میں کچھ رقم تھی جس پر اس کا سود جمع ہو گیا، اب اس شخص نے اپنی کسی ضرورت کے لیے بینک سے کچھ رقم قرض لی، اس پر بھی بینک کا سُود آیا، کیا یہ شخص اپنا سود بینک کے سود کے عوض قبل القبض یا بعد القبض دے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بینک میں رقم رکھنا دونوں طرف سے سودی معاملہ ہے، بینک میں رقم رکھنا یا بینک کی کسی کے ذمہ رقم دونوں قوی دَین ہیں، دونوں جب ایک دوسرے کو اپنا اپنا سود چھوڑ رہے ہیں تو یہ بیع مقاصہ اور سود سے نفع حاصل کرنا ہے، اس لیے سود کی حرمت کی وجہ سے یہ معاملہ بھی حرام ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵)[2]

شئ مرہونہ سے نفع کی شرط سُود ہے

سوال:۔ زید سے عمرو نے پانچسو روپے قرض لیے اور اپنی کچھ زمین زید کے پاس اس شرط پر گروی رکھی کہ زمین کی پیداوار میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، شرعًا اس معاملہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ اگر زید نے قرضہ اس شرط پر دیا ہے کہ شئ مرہونہ سے انتفاع لے گا تو یہ حرام ہے کیونکہ کل قرض جرّ نفعًا فھو ربوا کے حکم میں آئے گا۔ اذا کان مشروطاً

---

[1] قال العلامۃ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللّٰہ: وکل حیلۃ یحتال بھا الرجل لیتخلص بھا عن حرام اولیتوصل بھا الیٰ حلال فھی حسنۃ۔

(شرح المجلۃ ج۲ ص۲۵۲ احکام الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۳۹۰ کتاب الحیل۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللّٰہ: کل قرض جرّ نفعًا حرام۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القرآن للجصاصؒ ج۲ ص۱۸۹ سورۃ البقرۃ۔

صار قرضاً فیہ منفعة وهو ربوا والافلا بأس، اگر نفع کی شرط نہ بھی لگائی ہو پھر بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: والغالب من احوال الناس انهم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف کالمشروط وهو مما یعین المنع۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۱۰، ۳۱۱ کتاب الرهن) [۱]

اشتراکِ قدر (پیمانہ) کی صورت میں اُدھار تبادلہ ناجائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کو مکئی کی ضرورت ہے اور وہ کسی زمیندار سے معاہدہ کے تحت خاص مقدار میں مکئی لیتا ہے، اس زمیندار سے یہ کہتا ہے کہ میں تین ماہ بعد اتنی مقدار میں اس کے بدلے میں گندم دوں گا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کے اُدھار کا تبادلہ شرعاً جائز نہیں، اگرچہ مکئی اور گندم کی جنس مختلف ہے لیکن مکئی اور گندم دونوں کیلی ہیں یعنی پیمانہ سے یہ دونوں تولے جاتے ہیں، دو چیزوں کے تبادلہ میں جب جنس یا قدر میں اشتراک ہو تو تفاضل جائز ہے اور اُدھار ناجائز، اس کو ربا النسیئہ کہتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وان وجد احدهما ای القدر وحده او الجنس وحده حل التفاضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۹۹ باب الربوٰ) [۲]

---

[۱] قال الامام ابوبکر الجصاص الرازیؒ: قال ابوحنیفةؒ وابویوسفؒ ومحمدؒ والحسن بن زیادؒ و زفرؒ لایجوز للمرتهن الانتفاع بشیئ من الرهن ولا للراهن ایضاً۔
(الاحکام القرآن ج ۱ ص ۵۳۱ باب ضمان الرهن)
ومثلهٗ فی الاشباه والنظائر ج ۳ ص ۲۴۴ کتاب الرهن۔

[۲] قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: والنساء فقط باحدهما ای وحرم التأخیر لا الفضل بوجود القدر فقط او الجنس فقط۔
(البحر الرائق ج ۶ ص ۱۲۸ باب الربوٰ)
ومثلهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۷۹ باب الربوٰ۔

نفع کی شرط پر قرض رقم دینا سُود ہے

سوال :۔ ایک دوکاندار سے کسی گاہک نے کوئی چیز خریدنی چاہی جبکہ وہ چیز اس دوکاندار کے پاس نہ تھی اور اس نے گاہک سے کہا کہ مجھ سے یہ رقم لے کر خود اپنے لیے مطلوبہ چیز خرید لو لیکن میری رقم مجھے واپس کرتے وقت اصل زر کے ساتھ اتنا منافع بھی دینا ہوگا، شرعاً اس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ مذکورہ دوکاندار کا یہ فعل بعینہٖ ربوا کا معاملہ ہے کیونکہ گاہک کو قرض رقم دے کر واپسی کے لیے اپنی اصل رقم سے زیادتی کی شرط لگا رہا ہے جو کہ سُود ہے، دکاندار کو صرف اپنی قرض رقم واپس لینے کا حق ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: الذھب بالذھب مثلاً بمثل وزناً بوزنٍ یداً بیدٍ والفضل ربٰو۔ (الھدایة ج۳ ص۱۰۶ کتاب الصرف) [1]

اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا سُود نہیں ہے

سوال: ایک دوکاندار ایک شئے کی جو نقد قیمت لگاتا ہے جب اُسی شئے کو اُدھار پر بیچتا ہے تو قیمت بڑھا دیتا ہے، کیا اس طرح کرنا سُود تو نہیں ؟

الجواب :۔ کوئی چیز اُدھار پر بیچنے کی وجہ سے اس کی قیمت میں زیادتی جائز ہے اس لیے کہ اُدھار کے مقابلے میں نقد رقم کے فوائد اور منافع زیادہ ہیں، مثل مشہور ہے کہ " نو نقد اچھے تیرہ ادھار بُرے " اس لیے نقد اور ادھار سودے کی قیمت میں تفاوت رکھنا جائز ہے۔

قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: الا یری انہٗ یزاد

---

[1] قال العلامة الزیلعی رحمہ اللہ: اذا بیع جنس الاثمان بجنسہٖ کالذھب بالذھب او الفضة بالفضة یشترط فیہ التساوی والتقابض قبل الافتراق ولا یجوز التفاضل فیہ۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۱۳۵ کتاب الصرف)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۶ ص۱۹۲ کتاب الصرف۔

فی الثمن لاجل الاجل - (الهداية ج۳ ص۷۶ باب المرابحة والتولية) ؎۱

اشیاء ربویہ میں قرض کا معاملہ

سوال:- اشیاء ربویہ میں خرید و فروخت کے وقت برابری اور نقد کا معاملہ ہوتا ہے ادھار کا معاملہ ان میں صحیح نہیں ہوتا، اگر ایک آدمی کسی کو گندم قرض دے کر یہ کہے کہ تین ماہ بعد میری قرض گندم واپس کرنی ہوگی، ان اشیاء میں قرض کا معاملہ از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب:- اشیاء ربویہ میں خرید و فروخت کے معاملہ کے وقت کمی زیادتی اور اُدھار ناجائز ہے لیکن قرض کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ قرض تبرّع اور احسان ہے اس کا کچھ عوض نہیں ہوتا بلکہ مقررہ مدت کے بعد اس شئے کا بدل واپس کیا جاتا ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: ان القرض تبرع الا یری انه لا یقابله عوض للحال .... کان المستقرض انتفع بالعین مدة ثم رد عین ما قبض وان کان یرد بدل فی الحقیقة - (بدائع الصنائع ج۷ ص۳۹۶ کتاب القرض)

قال الکاسانیؒ: فیختص جوازه بماله مثل - (" " ص۳۹۵ " ") ؎۲

الحاصل یہ کہ قرض مثلی اشیاء میں جائز ہے۔

نقد رقم کو قسط وار کرکے زیادہ وصول کرنا

سوال:- ایک آدمی نے اپنا ٹرک ایک شخص کے ہاتھ فروخت کیا اور

؎۱ قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصداً فاعتبر مالاً فی المرابحة احترازاً عن شبهة الخیانة ولم یعتبر مالاً فی حق الرجوع عملاً بالحقیقة۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۷۷ باب الربوا)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۱۵ باب المرابحة والتولیة۔

؎۲ وفی الهندية: ویجوز القرض فیما هو من ذوات الامثال کالمکیل والموزون والعددی المتقارب کالبیض - (الفتاوی الهندية ج۳ ص۲۰۱ باب فی القرض والاستقراض)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المختار ج۴ ص۱۷۱ باب القرض۔

کچھ رقم نقد دے کر مشتری سے کہا کہ وہ بقایا رقم مبلغ تین ہزار روپے قسط وار ہر ماہ مجھے ادا کرتا رہے، اسی دوران ٹرک کے مالک کو رقم کی ضرورت پڑ گئی تو اس نے کسی تیسرے شخص سے چالیس ہزار روپے نقد لے کر مشتری کو اس کے حوالہ کر دیا اور اسے یہ کہا کہ وہ ستر ہزار روپے قسط وار آپ کو ادا کرتا رہے گا، یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ بائع کا مشتری کو اس طرح کسی تیسرے شخص کے حوالہ کرنا صحیح نہیں یہ بعینہٖ ربوا ہے کیونکہ اس صورت میں تیسرا شخص چالیس۴۰ ہزار روپے نقد دے کر ستر۷۰ ہزار قسط وار وصول کرے گا تیس۳۰ ہزار روپے اس کو سود کے مل رہے ہیں، اس لیے یہ معاملہ شرعاً ناجائز و حرام ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [۱]

مضاربت کا منافع سُود نہیں

سوال:۔ میرے بھائی نے مجھ سے بیس ہزار روپے کاروبار کے لیے اس شرط پر لیے کہ اس پر جو منافع ہو گا اس کا نصف آپ کا اور نصف میرا ہو گا، اس نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ میں ہر ماہ حساب کتاب نہیں کر سکتا اس لیے اندازہ اور تحری سے حساب لگا کر منافع دے دیا کروں گا، اس طرح وہ مجھے کبھی ۱۰۰ روپے اور کبھی ۳۰۰ روپے دیتا رہا اور اس میں کمی بیشی ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد مجھے تردد ہوا کہ یہ تو سود ہے اس لیے میں نے بھائی سے اس سلسلہ کو ختم کرنے کی بات کی، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ سودی معاملہ نہیں ہے بلکہ مضاربت کی ایک صورت ہے اور نفع کو تحری سے معلوم کرنا مفضی الی الجہالۃ نہیں ہے اس لیے یہ صورت جائز ہے، مضاربت میں ایسی شرط لگانا جو جہالت فی الربح کا باعث ہو ناجائز ہے۔

کما نقل الشیخ علاؤ الدین بن محمد الحصکفیؒ من الجلالیۃ: کل شرط یوجب جہالۃ

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: وقد نہی الرسول علیہ السلام عن قرض جرّ نفعاً۔ (الہدایۃ ج ۳ ص ۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج ۴ ص ۸۵ کتاب الحوالۃ۔

فی الربح او یقطع الشرکۃ فیہ یفسدھا والا یطل الشرط وصح العقد اعتبارًا بالوکالۃ اھ
(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۵۴۰ کتاب المضاربۃ) لہ

بینک ڈرافٹ کی شرعی حیثیت

سوال:۔ آجکل لوگ بینک کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ڈرافٹ کی شکل میں رقم بھیجتے ہیں جس پر بینک والے بھیجی جانے والی رقم سے کچھ زیادہ وصول کرتے ہیں، کیا یہ سود ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینک کے ذریعے ڈرافٹ کی شکل میں رقم ارسال کرنا بینک کو قرض دینا ہے امانت نہیں، کیونکہ رقم بدلتی بھی ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں بینک ذمہ دار بھی ہوتا ہے اس لیے زیادتی کی شرط سود ہے البتہ اس میں یہ تاویل کرنی ممکن ہے کہ زیادتی رقم کو کتابت اور فارم وغیرہ کی فیس قرار دیا جائے، اس طرح سفتجہ کی شکل بن جائے گی جس کو فقہاء کرام نے مکروہ کہا ہے، ابتلائے عام کی وجہ سے اس میں جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے کیونکہ پوری دنیا میں یہ طریقہ رائج ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاویٰ" میں منی آرڈر کے بارہ میں یہی تحقیق کی ہے۔ لہ

لہ وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: الرابع ان یکون الربح بینھما شائعًا کالنصف والثلث لاسھمًا معینًا یقطع الشرکۃ کمائۃ درھم والخامس ان یکون نصیب کل منھما معلومًا فکل شرط یؤدی الی الجھالۃ الربح فھی فاسدۃ وما لا فلا۔ اھ
(البحر الرائق ج۷ ص۲۶۴ کتاب المضاربۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۲۸۷ کتاب المضاربۃ۔ الفصل الاوّل۔

لہ قال العلامۃ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرا اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ مناسب ہے۔
(امداد الفتاویٰ ج۳ ص۱۴۶ کتاب الربوا)

ڈاکخانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع لینے کا حکم

سوال: ڈاک خانہ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے، سال بعد اس پر نفع ملتا ہے، اس نفع کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: جس طرح بینک سے سود لینا منع ہے اسی طرح ڈاک خانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع (سود) لینا بھی منع ہے، سود کی حقیقت جہاں بھی پائی جائے وہ حرام ہوگی۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [1]

بیع محاقلہ ربٰو (سود) میں داخل ہے

سوال: جو گیہوں ابھی بالیوں میں موجود ہو اس کو صاف کئے ہوئے گیہوں کے عوض فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جن چھ چیزوں کے تبادلہ میں برابری (نقد قیمت اور دست بدست ہونا ضروری ہے اُن میں گندم بھی داخل ہے، اس کے تبادلہ کے وقت جب جنس ایک ہو تو کمی بیشی یا ادھار سود شمار ہوگا، کھیت میں کھڑی گندم کی فصل کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض فروخت کرنا بیع محاقلہ ہے جبکہ بیع محاقلہ ربٰو (سود) میں داخل ہے، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: نہی عن المزابنۃ والمحاقلۃ فالمزابنۃ ماذکرنا والمحاقلۃ بیع الحنطۃ فی سنبلھا بحنطۃ۔

(الھدایۃ ج۳ ص۵۶ باب بیع الفاسد) [2]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وقد نہی الرسول علیہ السلام عن قرض جرّ نفعاً۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۴۴ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن الھمامؒ: نہی رسول اللہ عن المزابنۃ والمحاقلۃ۔

(فتح القدیر ج۶ ص۵۳ باب بیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۷۶ باب بیع الفاسد۔

پی ایل ایس (غیر سودی کھاتہ)

سوال :۔ آج کل لوگ بینکوں میں پی ایل ایس کے نام سے اکاؤنٹ کھولتے ہیں، کیا اس کھاتہ میں رقم جمع کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بینکوں کے تمام معاملات سود سے منسلک ہیں، حکومت نے سود سے بچنے کے لیے نفع نقصان کے نام سے یہ شاخ کھولی ہے لیکن اس کا صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا مشکوک ہے، اگرچہ حکومت اور بینکوں کی انتظامیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں سودی عنصر نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ پی ایل ایس میں بھی اکاؤنٹ نہ کھولا جائے، احتیاط اسی میں ہے اس لیے کہ سود بہت بڑا گناہ ہے، بشبہ سود اس میں ترک ہی بہتر ہے۔

لما اخرجه الامام ابوداوُدؒ : لما لعن رسول اللہ آكل الربوا ومؤكله وكاتبه و شاهديه و قال وهوسواء۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۴۷۳ باب الربوٰ) [1]

انعامی بانڈز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ آجکل پرائز بانڈز پر انعامات ملنے کا رواج عام ہے، کیا ایسا انعام لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب : پرائز بانڈز (انعامی بانڈز) سود اور قمار (جُوا) کی مثل ہیں، حکومت کے بجٹ میں جب بھی خسارہ ہوتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے مختلف حیلے بہانے اختیار کرتی ہے، انعامی بانڈز بھی حکومتی بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، خرید شدہ بانڈز کی قیمت پر سود لگتا ہے اور جو سود بنتا ہے اس کو قرعہ اندازی کے ذریعے جُوا بنا دیا جاتا ہے، چند افراد کے نام ہی قرعہ نکلتا ہے اور باقی فی الحال محروم رہ جاتے ہیں، لہٰذا سود اور قمار کی وجہ سے ان بانڈز کی خرید و فروخت اور ان پر نکلا ہوا

---

[1] کما ورد فی الحدیث : عن جابر رضی اللہ عنه قال لعن رسول اللہ (صلی اللہ علیه وسلم) اکل الرّبوٰا وموکله وکاتبه وشاهديه وقال وهو سواء۔

(مسلم شریف ج ۲ ص۲۷ باب الربوٰ)

وَمِثْلُهٗ فی الترمذی ج ۱ ص۲۲۹ باب ما جاء فی اکل الربوٰ، ابواب البیوع۔

انعام لینا شرعاً جائز نہیں ۔

قال اللہ تعالیٰ: (۱) اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (البقرۃ ۲۷۵)

(۲) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ۔ (المائدۃ ۹۰) [1]

مروجہ کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں مساوات شرط ہے

سوال :۔ایک ملک کی کرنسی یعنی نوٹوں کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ آجکل دُنیا میں رائج الوقت کرنسی نوٹوں کی حیثیت ثمنِ عرفی کی ہے جن کو ہم فلوس نافقہ کہہ سکتے ہیں ۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک فلوس نافقہ کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے ۔اس لئے ان کے ہاں ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ بھی کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔

لیکن امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ، اس لیے کہ آجکل پوری دنیا میں کاغذی کرنسی کا رواج ہے ، سونا چاندی بالکل مبیعہ ہوکر رہ گئی ہے ، اگر اس کے تبادلہ میں تفاضل کی اجازت دے دی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا لہٰذا امام محمدؒ کے قول کے مطابق کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں تفاضل کو ناجائز قرار دینا چاہیئے ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : قولہ فلس بفلسین ھٰذا عندھما وقال محمدؒ لایجوز۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۱۸ باب الربٰو) [2]

دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا منع ہے

سوال :۔کیا مسلمان کے لیے دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا جائز ہے یا نہیں ؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ : ولاخلاف بین اھل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرۃ من القمار ۔ (الاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۲۹ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص ۱۳۱ کتاب الحوالۃ ۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : صح بیع الفلس بفلسین معینین عندھما وقال محمد لایجوز۔ (البحرالرائق ج ۶ ص ۱۳۱ باب الربٰو)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۱۸ الباب الربٰو، الفصل السادس فی تفسیرالربٰو واحکامہ۔

الجواب:۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن سود کی حرمت کے بارے میں قرآن وحدیث میں نصوص مطلق ہیں، جس سے ہر جگہ سود کی حرمت معلوم ہوتی ہے، جمہور علماء اور امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دارالحرب میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا حرام ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود نہ لیا جائے۔

قال الامام المرغینانیؒ: ولا بین المسلم والحربی فی دار الحرب خلافاً لابی یوسفؒ والشافعیؒ۔ (الهداية ج۳ ص۸۷ باب الربٰو) [1]

دارالاسلام میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا جائز نہیں

سوال:۔ دارالاسلام میں جو غیر مسلم ذمّی رہتے ہیں اور دیگر کفار جب مالِ تجارت وغیرہ لے کر کچھ عرصہ کے لیے آئیں تو اُن سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآن وحدیث میں مطلقاً سُود کی حُرمت مذکور ہے، اور فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ کسی ذمی غیر مسلم سے سُود لینا منع ہے، اس لیے دارالاسلام میں کسی غیر مسلم سے سُود لینا ناجائز ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: بخلاف المستأمن منهم لان ماله صار محظوراً بعقد الامان۔ (الهداية ج۳ ص۸۷ باب الربٰو) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ای لا رِبَا بینهما فی دار الحرب عندهما خلافاً لابی یوسفؒ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربٰو)

[1] قال العلامة الزیلعی رحمه الله: وقال ابویوسفؒ والشافعیؒ لا یجوز لان المسلم التزم بالامان ان لا یتملل اموالهم الا بالعقد۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربٰو)

[2] قال العلامة ابن الهمامؒ: بخلاف المستأمن منهم عندنا لان ماله صار محظوراً بالامان۔ (فتح القدیر ج۶ ص۱۷۸ باب الربٰو)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربٰو۔

تفسیر عبارت لَارِبَا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَ الْحَرْبِیِّ

سوال: فقہ حنفی کی کتابوں میں صراحتاً مذکور ہے: ولاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے، برائے مہربانی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب: اوّل تو اس میں اختلاف ہے، جمہور علماء اور امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ اور پیش کردہ عبارت کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ دارالحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین سرے سے سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا کیونکہ حربی کا مال مباح اُسے کسی بھی طریقے سے حاصل کیا جائے تو وہ جائز ہوتا ہے، اس لیے فقہاء کرام اس عبارت کی تشریح میں فرماتے ہیں: ولان مالھم مباح فی دارھم فبای طریق اخذہ المسلم اخذ مالاً مباحاً اذ لم یکن فیہ غدر۔ فقہاء کرام نے اس کے لیے لفظ جواز استعمال نہیں کیا، حدیث میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

قال العلامہ برھان الدین المرغینانیؒ: لاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ (الھدایۃ ج۳ ص۸۷ باب الربوٰ) [1] یہاں بھی ربوٰ (سود) کی نفی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ اور سود کا مسئلہ

سوال: ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ حکومت تنخواہ کا کچھ حصہ وضع کرتی رہتی ہے اور ہر سال کے بعد اس رقم پر سود لگتا ہے، اختتام ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو مع سود کے ادا کر دیتی ہے، اس رقم کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: حکومت کی طرف سے سرکاری ملازم کو جو رقم اختتام ملازمت کے وقت ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں کیونکہ سود دو آدمیوں کے مابین عقد ہوتا ہے جبکہ دونوں طرف سے مال ہو اور مال ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم کی تنخواہ سے جو

---

[1] قال الامام ابن الھمامؒ: ولان مالھم مباح واطلاق النصوص فی مال محظور وانما یحرم علی المسلم اذا کان بطریق الغدر فاذا لم یاخذ غدراً فبای طریق یاخذ ہ حل بعد کونہ برضا۔ (فتح القدیر ج۶ ص۱۷۸ باب الربوٰ)

ومثلہ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربوٰ۔

رقم کٹتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی ۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں : قوله بل بالتعجيل او بشرطيه او بالاستيفاء او بالتمكن اى لا يملك الاجرة الا بواحد من هذه الاربعة۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۳) اس رقم پر ابھی مالک کا قبضہ نہیں ہوا اور نہ ہی اسکے وکیل نے قبضہ کیا ہے، اس کے تصرفات اس میں نافذ نہیں، ایسی رقم کے ساتھ حکومت کا معاملہ یکطرفہ ہے، اس جمع شدہ رقم کو اگر حکومت سود پر دے یا کوئی اور معاملہ کرے یا اس پر خود سود لگائے یہ سب یکطرفہ کارروائی ہے، اختتام ملازمت پر جب حکومت یہ رقم ملازم کو دے تو حکومت کی طرف سے اجرت ہی کہلائے گی، اس طرح یہ رقم اجرت کا جزء مؤجل ہوگی نہ کہ سود۔ [۱]

جی پی فنڈ کی رقم حصول سے قبل کسی کمپنی یا بنیک کو سود پر دینے کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی سرکاری ملازم درخواست دے کر جی پی فنڈ کی رقم کٹتی کمپنی یا بنیک کے حوالے کر کے اس پر سود حاصل کرے تو اس سودی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

الجواب :۔ کوئی بھی سرکاری ملازم اگر درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بنیک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کر دے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی، وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے لہٰذا کمپنی وکیل کے اعتبار سے جتنا سودی کاروبار کرے گی وہ ایسا ہوگا جیسے یہ خود اس میں ملوث ہے، کیونکہ ملازم نے باختیار خود یہ رقم کمپنی کے حوالہ کی ہے، یہ سودی رقم دوبارہ حکومت کے خزانہ میں جا کر جمع ہو جاتی ہے، اختتام ملازمت پر جب یہ رقم ملازم کو ملے گی تو سودی رقم ہوگی اس کو وہ شرعاً اپنے مصرف میں نہیں لا سکتا۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله : وقد نهى الرسول عليه السلام عن قرض جر نفعاً۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۳۱ كتاب الحوالة) [۲]

---

[۱] قال الشيخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ : جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام پر رقم ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص ۲)

وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوٰی ج ۳ ص ۱۴۸ کتاب الربوٰ ۔

[۲] قال الشيخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ : اگر بنیک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دے تو یہ شرعاً بھی سود ہوگا جس کا لینا ملازم کے لیے قطعاً حرام ہوگا۔

(پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص ۲۶)

ملازم کی اجازت سے اس کی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کی کٹوتی کا حکم

سوال:۔ کوئی بھی سرکاری ملازم جب اپنی تنخواہ سے بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم کٹوائے اور وہ جمع ہوتی جائے تو اختتامِ ملازمت (ریٹائرمنٹ) کے وقت اس جمع شدہ رقم کے ساتھ حکومت کی طرف سے جو مزید رقم دی جاتی ہے ازروئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس صورت میں پراویڈنٹ فنڈ کے ساتھ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مزید رقم تشبہ بالربوٰ ہے، اگر یہ ملازم اپنی اُجرت وصول کرنے سے قبل یہ رقم کٹواتا ہے لیکن پھر بھی اپنی اجرت میں تصرف ہے اور سود خوری کا ذریعہ بننے کا قوی احتمال ہے لہٰذا ایسی رقم سے اجتناب ہی کیا جائے خواہ محکمہ سے وصول کرے یا نہ کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام اذا کان مشروطا۔
(رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ باب الربوٰ۔ مطلب کل قرض جرّ نفعاً حرام) [1]

گاڑی دلوانے کے عوض اصل رقم سے زائد کا مطالبہ کرنا سود ہے

سوال:۔ آجکل ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں یہ رواج ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنے پیسوں سے گاڑی خرید کر دیتا ہے اور اس سے یہ اقرار نامہ تحریر کراتا ہے کہ سال یا دو سال کے بعد دو لاکھ کی جگہ تین لاکھ دے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کاروبار کی مذکورہ صورت سودی ہے اسلئے کہ گاڑی خریدنے والا مشتری کا وکیل ہے اور گاڑی کی رقم مشتری کے ذمے قرض ہے جبکہ قرض پر منافع لینا شرعاً ربوٰ (سود) ہے البتہ یہ جائز ہے کہ پہلے گاڑی اپنے لیے خریدے اور پھر تین لاکھ روپے میں مشتری پر فروخت کر دے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: کل قرضٍ جرّ نفعاً حرامٌ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ فصل فی القرض) [2]

---

[1] قال الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ: پراویڈنٹ فنڈ میں رقم اپنے اختیار سے کٹوائی جائے تو اس میں تشبہ بالربوٰ بھی ہے اور ذریعہ سود بنا لینے کا خطرہ بھی ہے اسلئے اس سے اجتناب کیا جائے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص۴)
و مثلہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۵۴ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: القرض الذی جرّ منفعۃ قال الحنفیۃ فی الراجح عندھم کل قرضٍ جرّ نفعاً حرامٌ اذا کان مشروطاً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۷۲۴ فصل فی القرض)

اِنعامی اسکیموں کا حکم

سوال:۔ کسی انعامی سکیم یا دیگر انعامی ٹکٹوں کا کاروبار کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس میں ملنے والے انعام کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کی انعامی سکیموں پر جوئے کی تعریف صادق آتی ہے اسلئے کسی انعامی سکیم یا دیگر کسی بھی قسم کی انعامی ٹکٹوں کا کاروبار شرعاً جائز نہیں اور اس سے ملنے والی انعامی رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اکتسب حراماً واشتری بہ..... تصدق بالربح والّا لا وھٰذا قیاس وقال ابوبکر کلاھما سواء ولا یطیب لہٗ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۴ ص ۲۱۹ مطلب اذا اکتسب حراماً ثم کنار)[1]

غیر ملکی کرنسی کو اضافی قیمت پر خریدنا

سوال:۔ آجکل غیر ملکی کرنسی کی خرید و فروخت کا کاروبار عام ہے، تاجر لوگ غیر ملکی کرنسی کم قیمت پر خرید کر زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، مثلاً سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس طرح غیر ملکی کرنسی کی خرید و فروخت سود میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سود متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اشیاء ایک ہی جنس سے ہو، اگر جنس مختلف ہو جائے تو ان میں تفاضل (یعنی) جائز ہے۔ موجودہ دور میں مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے، اس لیے ان کی خرید و فروخت میں کمی بیشی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ایک سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابوالحسن القدوریؒ: فاذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء واذا وجد حرم التفاضل والنساء واذا وجد احدھما وعدم الاٰخر حل التفاضل وحرم النساء۔ (مختصر القدوری علیٰ صدر اللباب ج ۱ ص ۱۲۱ باب الربوٰ)

---

[1] وفی الھندیۃ: کان المال بمقابلۃ المعصیۃ فکان الاخذ معصیۃ والسبیل فی المعاصی ردھا وذٰلک ھٰھنا برد المأخوذ ان تمکن من ردہ بان عرف صاحبہ وبالتصدق بہ ان لم یعرفہ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۴۹ الباب الخامس عشر فی الکسب۔ کتاب الکراھیۃ)

بینک کی تعمیر کے لیے زمین دینا

سوال: بینک بنانے کے لیے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو قیمتاً دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حکومت کو بینک بنانے کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے، کیونکہ زمین دینے والے کو زمین کے عوض سود سے حاصل شدہ رقم ملے گی۔ اور دوسرا یہ کہ بینک کا موجودہ نظام اندرون ملک و بیرونِ ملک بڑے بڑے سودی کاروباروں میں پھنسا ہوا ہے جبکہ زمین دینے کی صورت میں اعانت علی المعصیت لازم ہے، پس جس طرح سود سے اجتناب ضروری ہے اسی طرح سودی نظام کو سہارا دینا بھی مناسب نہیں۔ اس بناء پر حکومت کو بینک کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال الله تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۲) [1]

پرانے کرنسی نوٹ نئے نوٹوں کے ساتھ کم قیمت پر تبدیل کرنا

سوال: پرانے کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لئے طریقہ کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص پھٹے پرانے نوٹ نئے نوٹوں سے تبدیل کرنا چاہتا ہے تو بینک اس سے کچھ کٹوتی کرتا ہے۔ مثلاً سو روپے کے پھٹے پرانے نوٹ کے بدلے میں نئے نوٹ پانچ یا دس روپے کم ملتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: مروّجہ کرنسی کی حیثیت فلوس نافقہ کی ہے اس میں صفت ثمنیت عرف کی وجہ سے آئی ہے۔ فلوس نافقہ کی باہمی تفاضل کے ساتھ بیچنے میں احناف کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے ہاں ان کی باہمی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے جبکہ امام محمدؒ کے ہاں جائز نہیں۔ اگرچہ عموی طور پر ربا (سود) سے بچنے کے لئے فی زماننا امام محمدؒ کا قول مفتی بہ ہے مگر پھٹے پرانے نوٹوں کا بینک کے ساتھ تبادلے میں کافی پیچیدگیاں ہیں۔

---

[1] قال العلامۃ سلطان بن علی القاری رحمہ اللہ: عن جابرؓ قال لعن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ قال النواوی فیہ تصریح بتحریم کتابۃ المترابیین والشہادۃ علیہما وبتحریم الاعانۃ علی الباطل وقال ہم سواء۔
(المرقاۃ ج۶ ص۵۹ باب الربٰوا۔ الفصل الاول)
وَمِثْلُہٗ فی الجامع الصغیر ص۴۲۹ باب الربٰو۔

لہٰذا ان پیچیدگیوں کی وجہ سے شیخین کے فتویٰ کی بنا پر پھٹے پرانے نوٹوں کو نئے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی پر تبدیل کرنا جائز ہے،

کما قال العلامة مرغینانی: ویجوز بیع الفلس بالفلسین باعیانهما عند ابی حنیفة وابی یوسف وقال محمد لا یجوز الخ۔ (الهداية على البناية ۱۰/ ص۲۱۷ کتاب البیوع۔ باب الربا)

زمین کا زمین سے تبادلہ جائز ہے

سوال: ایک شخص اپنی زمین کا مخصوص حصہ دوسرے شخص کو زمین کی معینہ مقدار کے عوض دیتا ہے تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب: اموالِ ربویہ میں زیادتی اس وقت حرام ہے جب جنس اور قدر ایک ہو ورنہ کسی ایک کی موجودگی میں تفاضل جائز ہے لہٰذا زمین کا زمین کے عوض فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: سئل فیما اذا کان لزید قطعة ارض جارية فی ملکه فباعه من عمرو بقطعة ارض مثلها بیع مقائضة بیعاً باتاً شرعیاً مسلماً لدی بینةٍ شرعیة فهل صح البیع المزبور۔ الجواب نعم۔

(تنقیح الفتاوی الحامدية ج۱ ص۲۶۴ کتاب البیوع) [1]

گندم اور مکئی کا تبادلہ

سوال: گندم اور مکئی کا تبادلہ کبھی برابر اور کبھی کبھار کمی بیشی سے کیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی دست بدست اور کبھی اُدھار سے معاملہ طے ہوجاتا ہے، کیا اس طریقہ سے گندم اور مکئی کا تبادلہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: گندم اور مکئی کا تبادلہ اگر دست بدست ہو تو جائز ہے خواہ ایک کم اور دوسرا زیادہ کیوں نہ ہو لیکن اُدھار درست طریقہ نہیں کیونکہ دونوں قدر میں متحد اور جنس میں مختلف ہیں اس لیے ادھار پر بیچنے سے اجتناب کیا جائے۔

---

[1] قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع المقایضة بیع العین بالعین ای مبادلة مالٍ بمال غیر النقدین ثم ان اتفقا جنساً وقدراً اشترط لصحتها تساوی البدلین وتعینهما۔

(شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۱۲۲ ج۲ ص۱)

وَمثلهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۸ تحت قوله والنساء فقط بادراهما۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فیہ الاباحة واذا وجد حرم التفاضل والنساء لوجود العلة واذا وجد احدھما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء مثل ان یسلم ھرویاً فی ھروی وحنطة فی شعیر فحرمة ربا الفضل بالوصفین وحرمة النسیاء باحدھما۔ (الھدایة ج۳ ص۸۱ باب الربوٰ) [1]

فصل کے بدلے اناج دینا

سوال:۔ ایک شخص کو غلّہ کی ضرورت ہے لیکن فصل ابھی تیار نہیں ہوئی، ایسی حالت میں اگر وہ کسی سے تیار غلہ خرید کر اس کے عوض کھیت میں کھڑی فصل دے دے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ایسی صورت میں تیار غلہ کے بدلے میں وہ غلّہ لیا جاتا ہے جو کہ کھیت میں ہے اور اس کی مقدار معلوم نہیں صرف تخمیناً اس کا اندازہ کر کے فروخت کیا جاتا ہے، چونکہ غلہ کی غلّہ کے بدلے فروخت میں مقدار معلوم کرنا ضروری ہے ورنہ اس میں ربٰو (سود) کا شبہ باقی رہتا ہے اس لیے مذکورہ صورت تبادلہ کی جائز نہیں۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا یجوز...... بیع المزابنة...... والمحاقلة فالمزابنة ماذکرنا والمحاقلة بیع الحنطة فی سنبلها بحنطة مثل کیلها خرصاً ولانه باع مکیلاً بمکیل من جنسه فلا یجوز بیع بطریق الخرص کما اذا کان موضوعین علی الارض۔ (الھدایة ج۳ ص۵۲ باب ما یجوز وما لا یجوز) [2]

---

[1] قال السلیم رستم باز اللبنانیؒ: بیع المقایضة بیع العین بالعین ای مبادلة مال بمال غیر النقدین وشرط صحة المقایضة التساوی فی التقایض ان اتفقا جنساً وقدراً کبیع حنطة بحنطة والا فالتقایض لا التساوی کبیع کر حنطة بکری شعیر۔
(شرح المجلة تحت المادة ۱۲۳ ص۱۴ کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۸ باب الربوٰ۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: والمزابنة ای لم یجز بیع المزابنة لنهیه صلی الله علیه وسلم عن بیع المزابنة والمحاقلة۔ والمحاقلة بیع الطعام فی سنبله بالبر۔
(البحر الرائق ج۶ ص۷۶ تحت قوله والمزابنة کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۶ ص۵۳ باب البیع الفاسد۔

سونا چاندی قرض کی صورت میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر زرگر (سنار) حضرات سونا اور چاندی گاہک کو نقد مثلاً ۶۰۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں اور اگر قرض پر دیں تو ۶۵۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں، تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب تحریر فرمائیں؟

الجواب :- موجودہ کرنسی نوٹ نہ سونے چاندی کی طرح ثمن خلقی اور نہ سونے چاندی کی رسید بلکہ قانونی تحفظ اور تقرر کی بناء پر ثمن عرفی یعنی فلوس نافقہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جو جنسیت میں سونے چاندی سے الگ ہے، اسی طرح سونا چاندی مقدوری ہے، بخلاف موجودہ کرنسی کے کہ وہ عددی ہے، اس لیے دونوں کی باہمی تجارت تفاضل اور ادھار دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ احدالعوضین (دونوں میں سے کسی ایک پر قبضہ ہو چکا ہو۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سونے چاندی کو نقد ۶۰۰/- روپے فی تولہ اور ادھار کی صورت میں ۶۵۰/- روپے فی تولہ فروخت کرنا جائز ہے مگر عندالعقد سونے چاندی پر مشتری کا قبضہ کرنا صحتِ بیع کے لیے ضروری ہے بدون اس کے بیع صحیح نہیں ہوگی۔

لما قال العلامۃ مفتی محمد تقی عثمانی : لیکن اس زمانے میں علماء اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو ان کاغذی نوٹوں کو ثمن عرفی کے طور پر مال قرار دیتی تھی۔
(فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۳ دنیا کے کرنسی نظام میں ... الخ)

وقال ایضاً : اسی طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ (فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۱)

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : باع فلوساً بمثلها او بدراهم او بدنانير فان نقد احدهما جاز وان تفرقا بلا قبض احدهما فلا یجز۔

(الدر المختار ج ۴ ص۲۰۴ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراہم)

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : سئل الحانوتی عن بیع الذهب فالفلوس نسيئة فاجاب بانه يجوز اذا قبض احد البدلين۔

(رد المحتار ج ۴ ص۲۰۵ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراہم)

اسٹیٹ لائف کمپنی کی دجل و تلبیس

اور

بیمہ کی شرعی حیثیت پر دارالعلوم حقانیہ کا اصل فتویٰ

سودی نظام کی محافظ حکومت اور ایک بیمہ کمپنی کی دجل و تلبیس کا تازہ شاہکار ذیل کا وہ جعلی فتویٰ ہے جو انہوں نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی حضرت مولانا محمد فرید مدظلہ سے منسوب کر کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے، جس پر مفتی صاحب موصوف کے دستخط اور فتویٰ نمبر دونوں جعلی ہیں۔

استفتاء کے جواب میں مفتی صاحب سے منسوب جعلی فتویٰ کی عبارت درج ذیل ہے:۔

جواب:۔ "ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ دینی مسائل گذرا اوقات بدنیتی سے پیدا ہوتے ہیں برصغیر کی اکثریت جن علماء کی پیروی کرتی ہے اکثر کا فتویٰ بیمہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

اس بات میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شراکت کا مسئلہ بظاہر قابل اعتراض نہیں ہے پس اگر بیمہ کمپنی ان رقوم سے تجارت، صنعت، خدمات اور دیگر شعبوں میں ممبران کو منافع کی شکل میں کچھ نہ کچھ دیتی ہے تو قابلِ اعتراض نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ سائل نے اپنی غیر مقدمی تحریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ سچ ہے کہ تمام حوالہ جات (اشارہ) وہ مشہور اور تسلیم شدہ حقائق ہیں اور اس میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار و افتراق سے بچنے کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اس کو بار بار پیچیدہ مسئلہ نہ بنایا جائے۔ الغرض سود سے مراد وہ رقم ہے جو قرض دی جائے یا لی جائے"۔

اہل علم، قارئین اور حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ اور ان کے طرزِ تحریر سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ جعلی فتویٰ کی یہ عبارت کس قدر بودی اور جہالت پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا اصل فتویٰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے ماہنامہ الحق میں شائع ہو چکا ہے، ذیل میں وہی فتویٰ دوبارہ نذرِ قارئین ہے تاکہ سودی نظام کی محافظ حکومت کا شرمناک کردار اور بیمہ کمپنی کی جعل سازی اور دجل و فریب بے نقاب ہو جائے۔ (مرتب)

بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت

سوال: یہاں پر تمام ملک (انگلینڈ) میں ایسی کمپنیاں ہیں، جو کہ آدمی کو انشورنس (بیمہ) کر کے اس سے جوان سے کے قواعد کے مطابق خرچ ہوتا ہے وہ لے کر اس کو اس کے بعد اس معینہ مدت کے اندر یہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر اس کو کچھ ہو جائے تو اس کو ایک اچھی خاصی رقم جتنی کہ اس طرح کی پالیسی کرنے وقت عائد ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے باقیماندہ وارثوں کو دے دیتے ہیں اس کے علاوہ یہاں پر کام بھی جب ہی ملتا ہے کہ یہاں کے گورنمنٹ کے قانون کے مطابق انشورنس پہلے کرنی پڑتی ہے۔ آپ ازراہ کرم اس کے متعلق پوری تفصیل لکھیں کہ اسلامی قوانین اس قسم کی چیزوں کے کرنے پر کسی طرح کی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے۔ امید ہے آپ اس کی پوری تحقیق کر کے ہمیں اچھی طرح آگاہ کریں گے۔ ہماری کمیٹی کی طرف سے آپ تمام بزرگوں کو سلام مسنون قبول ہو۔

الجواب: ہمارے علم کی حد تک بیمۂ زندگی کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ یہ بیمہ اشخاص اور کمپنیوں کے درمیان ایک خاص قسم کا معاملہ اور عقد ہے جس میں افراد اور کمپنیوں کے مابین ان کے قوانین کے تحت حسب ذیل چند امور طے پاتے ہیں۔

(۱) بیمہ دار شخص ایک معین مقدار کی رقم (مثلاً ایک ہزار روپیہ) معینہ مدت مثلاً ایک سال یا دو سال تک بالاقساط ادا کرتا ہے۔ اور کمپنیاں اس کو معینہ منافع سالانہ پیش کرتی ہیں۔

(۲) یہ رقم کمپنیاں جس کام میں چاہیں صرف کر لیتی ہیں، خواہ وہ کام جائز ہوں جیسے عمارات وغیرہ) یا ناجائز ہوں جیسے سودی لین دین کے معاملات۔

(۳) بیمہ شدہ شخص اگر معینہ مدت تک بقید حیات رہے۔ اور پوری معین رقم بالاقساط اس نے کمپنی کو ادا کر دی زرہ کمپنی سے یکمشت یا بالاقساط مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ مقررہ مدت سے پہلے مر جائے۔ تو زر بیمہ کا مستحق اس کے ورثاء میں سے وہ شخص ہوگا۔ جو اس نے نامزد کیا ہو۔

(۴) بالفرض اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل اقساط کی ادائیگی کو بند کر کے عقد بیمہ کو فسخ کرنا چاہے، تو جتنی رقم اس نے بالاقساط کمپنی کو ادا کی ہے۔ اس کو وہ رقم واپس نہیں ملے گی۔

اگر درحقیقت "بیمۂ زندگی" کی حقیقت یہی ہو جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ تو اس کو ہم درج ذیل وجوہ کی بنا پر ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔

وجہ اول: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں ایک طرف سود پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ کمپنی اس کو سالانہ

معینہ منافع پیش کرتی ہے ۔نیز معینہ مدت تک زندہ رہنے ۔اور تمام اقساط ادا کرنے کی صورت میں بیمہ دار شخص اقساط کی مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور کمپنی سے وہ اس کو یک مشت بھی لے سکتا ہے۔ اور بالاقساط بھی۔ اور یہ سود کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

وجہ دوم : دوسری طرف یہ عقد میسر اور قمار پر مشتمل ہے۔ کیوں کہ اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے پہلے مر جائے تو اس صورت میں ایک خطیر رقم کا مالک وہ شخص بن جاتا ہے جو بیمہ دار شخص نے کمپنی کے سامنے نامزد کیا ہے ۔اور اس میں میسر اور قمار کا معنی پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں محض ایک امر اتفاقی کی وجہ سے کثیر رقم نامزد شدہ شخص کی ملک میں آگئی ۔ جیسی میسر اور میں آجاتی ہے اور چونکہ اسلامی شریعت نے سود اور قمار کو قطعی طور حرام قرار دیا ہے ۔ لہٰذا بیمہ کا یہ مقصد بھی ان دونوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل عقد بیمہ کو فسخ کر کے اقساط کی ادائیگی کو روکنا چاہے ۔ تو اس صورت میں کمپنی اس تمام رقم کی مالک قرار پائے گی۔ جو اقساط کی صورت میں اس نے کمپنی کو ادا کی ہے۔ اور یہ بھی میسر اور قمار ہے۔

وجہ سوم : عقد بیمہ کے ناجائز اور حرام ہونے کے لیے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس بیمہ دار شخص کی موت کی صورت میں کمپنی کو اس کی ادا کردہ تمام رقم کا مالک صرف وہ شخص ہوتا ہے جو اس نے نامزد کیا ہے اور باقی تمام ورثاء اس رقم سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں ۔حالانکہ اسلامی قانون وراثت کی رو سے اس رقم میں وہ تمام ورثاء بھی حقدار ہیں۔ جو شرعاً اس کے جائز ورثاء ہوں اس بنا پر اس عقد میں بعض تقادیر پر شرعی قانون وراثت کی صریح طور پر خلاف ورزی بھی پائی جاتی ہے۔ جو یقیناً ناجائز ہے۔

وجہ چہارم : مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ اس عقد بیمہ کے حرام اور ناجائز ہونے کے لیے چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس کمپنی کے ساتھ تعاون علی الاثم والعدوان بھی پایا جاتا ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے یہ عمل ناجائز ہے۔ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان ۔ کیونکہ کمپنی نہ رو ئے قانون اس بات کی پابند نہیں ہے کہ اس رقم کو وہ لازماً جائز اور مباح کاموں میں صرف کرے گی۔ بلکہ وہ اس کو سودی لین دین کے معاملات میں بھی صرف کر سکتی ہے ،، بہر حال شرعی قوانین اور احکام کی روشنی میں بیمہ زندگی کے بارہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر جائز عقد نہیں بلکہ حرام ہے"

ایک اشکال اور اس کا جواب

سوال ہو سکتا ہے کہ ہماری مندرجہ بالا معروضات پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ بیمہ زندگی کا یہ عقد اور معاملہ عقد مضاربت کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے کیوں کہ جس طرح مضاربت میں ایک طرف سے سرمایہ ہوتا ہے

اور دوسری طرف سے محنت اور منافع رب المال اور مضارب دونوں کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح بیمہ زندگی میں جس بیمہ شدہ شخص کی طرف سے سرمایہ ہوتا ہے اور کسی کی طرف سے محنت۔ اور منافع سرمایہ کار اور کمپنی دونوں کے درمیان تقسیم کئے جاتے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم عقد بیمہ کو مضاربت کی طرح جائز قرار دیں۔

الجواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ "بیمہ زندگی" کا معاملہ تصور جدیدہ میں سے ہے اور شریعت میں اس کے متعلق کوئی صریح نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ اور اس قسم کے معاملات کے احکام معلوم کرنے کے لیے اس میں کوئی چارہ نہیں کہ ایسے جدید معاملات کو کسی ایسے عقد اور معاملہ سے ملحق کیا جائے جس میں شریعت نے اپنا کوئی منصوص حکم بیان کیا ہو۔ اور جس کے ساتھ یہ جدید قسم کے عقود اور معاملات زیادہ مشابہت رکھتے ہوں۔ اس طرح منصوص معاملات اور عقود میں سے جو بھی عقد اور معاملہ ایسا مل جائے گا جس سے جدید معاملات اور عقود زیادہ مشابہ اور مطابق ہوں تو دونوں پر ایک قسم کا حکم جاری کیا جائے گا۔ مگر یہاں مصیبت یہ ہے کہ بیمۂ زندگی کا الحاق عقد مضاربت سے حسب ذیل چند وجوہ سے صحیح نہیں ہے اگرچہ بظاہر دونوں کے درمیان مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک نوعیت کے معاملات اور عقود ہیں۔ اور دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے۔ جن وجوہ سے ہم اس الحاق کو صحیح تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱: بیمہ اور مضاربت میں کئی بنیادی فرق موجود ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے مثلاً مضاربت میں شرط صحت بالاجماع یہ تسلیم کی گئی ہے کہ اس میں منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر ہو۔ اور مضارب رب المال میں سے کسی ایک کو معین منافع نہیں ملیں گے بلکہ اس کا اشتراط عقد مضاربت کے لیے مفسد قرار دیا گیا ہے۔ بخلاف بیمہ کے کہ اس میں سرمایہ کار کو معین منافع (مثلاً دس فی صد) سالانہ ملا کرتے ہیں اور نسبت کی بنیاد پر منافع کی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں مضاربت کی طرح یہ نہیں ہوتا ہے کہ منافع میں سے نصف حصہ یا ثلث اور یا ربع وغیرہ کسی ایک فریق کو ملے گا۔ اور باقیماندہ منافع دوسرے فریق کو ملیں گے اس فرق کو سامنے رکھ کر اصول اجتہاد اور قوانین قیاس اس بات کے متقاضی ہیں کہ بیمہ کو مضاربت پر قیاس کر کے دونوں کا حکم ایک نہ قرار دیا جائے۔

۲: دوسری وجہ یہ ہے کہ بیمہ اور مضاربت میں ایک اور فرق بھی ایسا پایا جاتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ۔

مضاربت میں اگر نقصان واقع ہو تو سرمایہ کار (رب المال) کو وہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اور بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ یہاں سرمایہ کار کو منافع ہی منافع ملتے ہیں۔ اور نقصان سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ کمپنی کو اگر کوئی نقصان پیش آجائے تو کمپنی ہی اس کا ذمہ دار ہوگی بیمہ دار شخص پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔

۳۔ پھر اس پر مزید یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہو جائے۔ تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے جتنا کہ ان کے مورث نے مضارب کو سپرد کیا تھا۔ اور اس سے زائد رقم ہرگز انہیں نہیں مل سکتی۔ برخلاف اس کے بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا نقصان ہو جائے تو اس کی موت کے بعد جس شخص کو زر بیمہ ملنے والا ہے وہ ایک بڑی رقم یعنی زر بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے یہ ایک ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارع علیہ السلام نے روکا ہے۔ کیوں کہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے۔ کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے۔ کیوں کہ بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے کہ آج انہوں نے بیمہ کرایا۔ اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کر لیا۔ اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔

۴۔ اس کے علاوہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار مر جائے تو مضارب کے پاس اس کی جو رقم ہے وہ تمام وارثین کے مابین شرعی قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی۔ اس کے برخلاف بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا انتقال ہو جائے تو زر بیمہ کا مستحق صرف وہی شخص ہوتا ہے جو بیمہ دار نے نامزد کیا ہو اور باقی وارثین اس میں اصلاً حقدار نہیں ہوتے ہیں یہ ایک طرف ان پر عظیم ظلم ہے اور دوسری طرف اس میں اسلام کے قانون وراثت کی صریح خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔ .... ان جو بری فروق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے۔ اور کوئی عالم اس کے جواز کا قائل نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب کہ اس میں سود اور قمار بھی پائے جاتے ہیں۔ جو قطعی طور پر حرام ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ انہیں بعض وجوہ ایسے ہیں جو اس کے جواز حلت کے متقاضی ہیں مگر اس سے بھی تو انکار ممکن نہیں ہے کہ اس عقد میں ایسی بھی وجوہ پائی جاتی ہیں۔ جو اس کے عدم جواز اور حرمت کے متقاضی ہیں جیسا کہ اوپر بالتفصیل بیان کی گئیں تو حضورؐ کے اس ارشاد کے بموجب دع ما یریبک الی ما لا یریبک، اس عقد سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ اس میں احتیاط کا پہلو راجح ہے۔ حضورؐ نے ایسے ہی معاملات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام علی الحلال۔ اسی سے علماء اصول حدیث اور اصول فقہ نے یہ قانون بنایا ہے کہ بوقت تعارض محرّم کو مبیح پر ترجیح حاصل ہوگی۔

فقط واللہ اعلم

سود لینے دینے پر گواہ بننا اور حالتِ اضطرار میں سود دینے کا حکم

سوال :- (۱) ایک آدمی سود دیتا ہے، دوسرا دیتا ہے اور چند افراد اس سودی معاملے میں گواہ بن جاتے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان تینوں کا کیا حکم ہے؟
(۲) اگر کوئی شخص حالتِ اضطرار میں ہو تو کیا اس کے لیے سود پر قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ دینے والے کا کیا حکم ہے؟

الجواب :- (۱) سودی لین دین ایسا حرام قطعی عمل ہے کہ جس پر قرآنی آیات، احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کا اجماع دال ہے، اسکی حرمت میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں، سود خوری کو اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر جرم قرار دیا گیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں سود خور، سود دینے والے، لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والوں کو بھی برابر کی سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے اور ان سب پر لعنت کی گئی ہے ــــ صحیح مسلم اور دوسری کتبِ احادیث میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ :-
لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰو و مؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء ـ
البنایہ میں ہے : قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ اکل الربٰو و مؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ اذا علموا بہ ملعونون علیٰ لسانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اھ ـ
اس لیے سودی لین دین کرنے، اس پر گواہ بننے اور اسکی دستاویز لکھنے سے پرہیز کیا جائے ـ
(۲) اگر کوئی انتہاء حالتِ اضطرار میں ہو اور کوئی دوسرا راستہ اس کو اپنی ضرورتِ شدیدہ کو پورا کرنے کے لیے نظر نہ آتا ہو اور ضرورت بھی اس درجے کی ہو جو اس کے لیے موت و حیات سے وابستہ ہو تو اس صورت میں مجبوری کے تحت گنجائش موجود ہے لیکن سود لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ـ
کما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ : قلتُ ، وقد قالت الفقہاء بجواز اعطاء الرشوۃ للمضطر لدفع مضرۃ لا تندفع الا باعطائہ واما اخذ الرشوۃ فلا یجوز بحال والربٰو والرشوۃ من باب واحد فمقتضاہ ان یجوز اعطاء الربٰو للمضطر لدفع مضرۃ لا تندفع الا باعطائہ واما اخذ الربٰو فلا یجوز اصلاً ـ اھ (امداد الاحکام ج ۳ ص ۲۴ کتاب الربٰو)

☆ ☆ ☆

کتاب

الرهن

وإن كنتم على سفرٍ
ولم تجدوا كاتباً
فرهان مقبوضة

کتاب الرّھن

(رہن کے مسائل واحکام)

مرہونہ زمین کے اخراجات کی ذمّہ داری کا حکم

سوال:۔ اگر زمین مرہونہ ہو اور مُرتہن نے بغیر کسی انتفاع کے سرکاری آبیانے اور ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کچھ رقم اداکی۔ کیا مرہونہ زمین کی واپسی کے وقت مرتہن کو راہن سے ان اخراجات کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر راہن کی اجازت سے مرتہن مرہونہ زمین پر رقم خرچ کرے تو اجازت کی وجہ سے مُرتہن مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر مرتہن کئے ہوئے اخراجات میں متبرع ہے، راہن سے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا ہے۔

لما قال الامام ابن البزاز الکردریؒ: اخذ السلطان الخراج والعُشر من المرتہن لایرجع علی الرھن لانہ ان تطوع فھو متبرع ان مکرھا فقد ظلمہ السلطان والمظلوم لایرجع الا علی الظالم اھ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۵۹ نوع نفقۃ الرّھن) [1]

مرہونہ سے اِنتفاع کا حُکم

سوال:۔ اگر مالک مرتہن کو مرہونہ سے فائدہ لینے کی اجازت دے دے تو کیا اس کی اجازت کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتہن کے لیے مرہونہ سے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ مالک کی باقاعدہ اجازت اس کی مملوکہ چیز سے انتفاع لینے گنجائش کی صورت مہیا کرکے جواز کی دلیل بن سکتی ہے لیکن مرتہن کو راہن کی طرف سے جو اجازت

---

[1] لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ رحمہ اللہ: کل من الراھن والمرتھن اذا نفق علی الرھن ما لیس علیہ بدون اذن الآخر یکون متبرعًا ولیس لہٗ ان یطالب الآخر بما انفق۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۷۲۵ ص۳۹۹ کتاب الرھن)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۴۵۵ الباب الرابع فی نفقۃ الرھن۔

دی جاتی ہے اس کے پس منظر میں کون سے جذبات کارفرما ہیں
جس کی وجہ سے مالک اپنی ملکیت سے اپنی ضرورت کے باوجود دوسرے کو استفادہ کا موقعہ دیتا ہے ، راہن اور مرتہن کے باہمی معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مرتہن کو یہ موقعہ اس کے قرض کے عوض دیا جاتا ہے جو کہ مالک دے چکا ہے ، مالک مرتہن کے احسان سے مجبور ہو کر بلا چون وچرا مرتہن کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اجازت دے دیتا ہے ، اس کی یہ اجازت مجبوری کی اجازت ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام ؒ نے تصریح کی ہے کہ مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے رہن سے انتفاع لینے کی گنجائش نہیں ہے ۔

لما قال العلامة السيد احمد الطحطاويؒ :(تحت قوله وسيجئ آخرهن) قلت والغالب من احوال الناس انهم يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع والله تعالىٰ اعلم انتهىٰ (حاشية الطحطاوى على الدرالمختار ج ۴ ص۲۳۲ كتاب الرهن) ؎

راہن سبب ملک نہیں

سوال :- اگر کسی شخص کے پاس مدتوں سے زمین بطور رہن ہو تو کیا اس سے مرتہن کی ملکیت ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں اور راہن کو کب تک ملکیت کے دعویٰ کا حق حاصل ہے ؟

الجواب :- رہن صرف ایک وثیقہ اور ذریعہ اعتماد ہے جس سے مرتہن مرہونہ چیز کا مالک نہیں بن سکتا اس کا مالک راہن ہی رہے گا ، جب چاہے مرتہن کو قرض ادا کر کے مرہونہ شئے واپس لے سکتا ہے تاہم مالک قرض کی ادائیگی کے بغیر مرہونہ کی واپسی کا حق نہیں رکھتا ۔

؎ قال العلامة ابن عابدينؒ : والغالب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع ـ والله تعالىٰ اعلم ـ (رد المحتار ج ۶ ص ۴۸۲ كتاب الرهن)

لما قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: الرهن امانة عند المرتهن کالودیعة۔
(الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۸۶ کتاب الرهن، الباب الرابع فی اعارته) [1]

مرتہن کا بلا اجازتِ مالک مرہونہ سے اِنتفاع موجبِ ضمان ہے

سوال:۔اگر مرتہن نے مالک کی اجازت کے بغیر مرہونہ سے فائدہ حاصل کیا تو کیا مالک کو اس سے تاوان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔مفتیٰ بہ قول کی رُو سے جب مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے اِنتفاع لینا مرخص نہیں ہے تو اجازت کے بغیر یہ مالک کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے، اس لیے مالک اس سے ضمان کے مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

لما قال العلامة قاضی خان رحمه الله: رجلٌ استقرض دراهم واسکن المقرض فی دارہٖ قالوا یجب اجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنه فی دارہٖ عوضًا منفعة القرض لامجانًا فیجب اجر المثل علی المقرض۔ [2]
(الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۲ ص۳۰۹ کتاب القرض)

مرہونہ کے اجارہ کا حکم

سوال:۔اگر مرتہن مرہونہ سے اِنتفاع لے کر راہن کو اجارہ دیا کرے تو کیا اس سے مرتہن کیلئے

---

[1] قال المحدث والفقیه علی بن سلطان محمد القاریؒ: ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لایغلق الرهن۔ أی عقدہ (الرهن) ای المرهون (من صاحبه) أما لك (الذی رهنه) أی صاحبه بحیث یزول عنه منفعته بل یکون المرهون کالباقی فی ملك الراهن۔ (المرقاة شرح مشکوٰة ج۶ ص۹۳ کتاب الرهن)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: رجلٌ استقرض دراهم واسکن المقرض فی دارہ قالوا یجب اجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنه فی دارہ عوضًا عن منفعة القرض لامجانًا۔ (رد المحتار ج۶ ص۶۳ کتاب القرض)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۲۳ کتاب القرض۔

انتفاع کے جواز کی صورت پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب: - اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین ہر اس شخص کو اجارہ کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے اجارہ پر دے سکتا ہے جس پر اعتماد ہو، خواہ مرتہن ہو یا اور کوئی شخص، لیکن جہاں کہیں مالک اور آجر کے درمیان اس سے قبل رہن کا معاملہ موجود ہو تو رہن کے بعد اجارہ کی تجدید معاہدہ سے سابقہ عقدِ رہن ختم ہو کر باقی نہیں رہتا اور مرتہن کے انتفاع لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم راہن مقررہ مدت کے بعد بغیر کسی قرض کی ادائیگی کے اپنی رہن مرتہن سے واپس لے سکتا ہے اور مرتہن واپس کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما الاجارة فالمستأجر ان کان هو الراهن فهی باطلة..... وان هو المرتهن وجدد القبض للاجارة..... بطل الرهن والأجرة للراهن۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۵۱۱ کتاب الرهن) [1]

مرہونہ میں مالک کا تصرّف مرتہن کی اجازت پر موقوف ہے

سوال: - کیا راہن کو بحیثیت مالک مرہونہ میں مالکانہ حقوق کے اجراء کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟ یا اگر مالک مرہونہ کو فروخت کردے تو کیا یہ بیع نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب: - رہن سے مالک کی ملکیت اگرچہ زائل نہیں ہوتی لیکن مرتہن کے حقوق کی وابستگی کی وجہ سے مالک کے جملہ مالکانہ تصرفات مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوں گے اس لیے مالک کی مرہونہ کے فروخت کا معاملہ مرتہن کی اجازت کا محتاج ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: توقف بیع الراهن رهنه علی اجازة مرتهنه او قضاء دینه فان وجد أحدهما نفذ وصار ثمنه رهناً - قال العلامة ابن عابدینؒ: وکذا انو قف علی اجازة الراهن بیع المرتهن فان اجاز جاز والا فلا - انتهی۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۵۰۶ کتاب الرهن) [2]

---

[1] لما فی الهندیة: وکذلک لو استأجره المرتهن صحت الاجارة وبطل الرهن اذا جدد القبض للاجارة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن... الخ)
ومثله فی العنایة شرح الهدایة علی هامش فتح القدیر ج ۹ ص ۱۱۷ کتاب الرهن۔

[2] لما قال الشیخ سلیم رستم باز: لو باع الراهن الرهن بدون رضی المرتهن لا ینفذ البیع ولا یطرأ خلل علی حق الحبس الثابت للمرتهن ولکن اذا قضی الراهن الدین نفذ البیع وکذا لو اجاز المرتهن ذلک البیع فانه ینفذ۔ (شرح المجلة الاحکام، مادة ۷۴۷ ص ۲۳۴ بیع الوفاء)
ومثله فی الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۴۶۲ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن۔

مرہونہ زمین چھڑائے بغیر کسی دوسرے پر فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں کہ

زید نے اپنی آبائی ملکیتی زمین عمرو کے پاس رہن رکھی، کچھ مدت کے بعد زید نے اپنی مرہونہ زمین عمرو سے فک کرائے بغیر خالد کو اس شرط پر فروخت کر دی کہ اگر میری یہ زمین جو کہ عمرو کے پاس رہن ہے ایکٹ میں آ گئی تو وہ زر رہن جس پر زمین رہن کی گئی ہے وہ مرتہن (عمرو) کو نہ دو گے بلکہ مجھے دو گے۔ اب زید اس بیع قطعی کرنے سے پشیمان ہے اور خالد سے کہتا ہے کہ مجھے بیع قطعی کا انتقال واپس کر دو، حالانکہ اب تک خالد کا اس زمین پر قبضہ ہوا ہی نہیں بلکہ مرتہن (عمرو) کے قبضہ میں ہے اب اس بیع قطعی کا عند الشرع کیا حکم ہے؟ فاسد ہے یا صحیح؟ اگر فاسد ہے تو واجب الرد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کا جواب ۲ دو شق پر تحریر کیا جاتا ہے:

(۱) راہن کا مرہونہ زمین میں تصرف قبل از سقوط از رہن فی المرہون ۲ دو قسم ہے۔ ایک وہ تصرف ہے جو قابل فسخ ہے مثلاً بیع، کتابت، اجارہ، ہبہ، صدقہ، اقرار و — دوسرا وہ تصرف ہے جس میں فسخ کا احتمال نہ ہو، جیسا کہ عتق، تدبیر، استیلاد — قسم دوم تصرف خارج از بحث ہے اور قسم اول کے تصرف (جو کہ فسخ کا احتمال رکھتا ہے) کا حکم یہ ہے کہ یہ تصرف بغیر رضائے مرتہن کے نافذ نہیں ہوتا اور مرتہن کا حق حبس مرہونہ میں باطل نہیں ہوتا یعنی اس قسم کا تصرف اگر راہن کرے تو وہ مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، اگر وہ اجازت دے تو تب نافذ ہوگا۔ اور مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جب تک وہ اپنا زر رہن وصول نہ کرلے اس وقت تک مرہونہ کو اپنے پاس بند رکھے۔ اور جب راہن مرتہن کو اپنا دین ادا کر دے اور مرہونہ کو بند رکھنے کا حق باطل ہو جاتا ہے، تو راہن کا وہ سابق تصرف جو کہ موقوف تھا اب نافذ ہو جائے گا۔ یہ تفصیل فتاوی عالمگیری جلد ۵ ص ۴۸۷ کی مندرجہ ذیل عبارت سے لی گئی ہے:۔

تصرف الراهن قبل سقوط الدين في المرهون اما تصرف يلحقه الفسخ كالبيع والكتابة والاجارة والهبة والصدقة والاقرار ونحوها وتصرف لا يحتمل الفسخ كالعتق والتدبير والاستيلاد. اما الذي يلحقه الفسخ لا ينفذ بغير رضاء المرتهن ولا يبطل حقه في الحبس واذا قضى الدين وبطل حقه في الحبس نفذت التصرفات كلها۔

اسی طرح اگر مرتہن نے زر رہن وصول کرنے سے پہلے اجازت دے دی تو نافذ ہو جائے گی اور اب پھر رہن رہن نہیں رہے گا مگر زر رہن بہر حال خود راہن کے ذمہ ہوگا اور اجازت دینے سے مرتہن کا حق باطل نہیں ہوگا۔ اور اس صورت میں اگر یہ تصرف بیع ہو تو اب بجائے مرہونہ کے اس کا ثمن (زر بیع) مرہون ہوگا۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری میں اسی صفحہ (جلد ۵ صفحہ ۴۸۷) پر ہے:

و لو اجاز المرتهن تصرف الراهن نفذ و خرج من ان يكون رهنًا والدين على حاله وفى البيع يكون الثمن رهنًا مكان المبيع ... الخ

فقہاء کی اس تحقیق کی روشنی میں صورت مسئولہ میں راہن نے جو تصرف کیا ہے وہ بیع کا تصرف ہے پس وہ اجازت مرتہن پر موقوف ہوگا۔ اب اگر عمرو (مرتہن) نے راہن (زید) کو اجازت دی ہو تو اس کا یہ تصرف نافذ ہوگا اور عمرو (مرتہن) کا زر رہن زید کے ذمہ لازم ہے اور اگر عمرو (مرتہن) نے اجازت نہ دی ہو تو یہ بیع موقوف ہے اور تا وصولی زر رہن عمرو (مرتہن) زمین مرہونہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔

(۲) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ایسی شرائط جو ملائم عقد نہ ہوں ان سے عقد بیع فاسد ہوتا ہے جس کی تفصیل فقہاء نے یوں کی ہے، الدر المختار میں ہے: ولا بيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لاحدهما او فيه نفع لمبيع الخ ___ علامہ شامیؒ بصورت تنبیہ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: قوله وفيه نفع لاحدهما الماء بالنفع ما شرط من احد المتعاقدين على الآخر (ج ۴ صفحہ ۱۶۷)

اور بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ مشتری بیع کا مالک ہو جاتا ہے یعنی بیع فاسد مفید للملک ہے اور ہر ایک پر بائع اور مشتری میں سے اس کا فسخ واجب ہے قبل القبض، اور اسی طرح بعد القبض بھی، جب تک کہ مبیع مشتری کے ہاتھ میں باقی ہو، اور اس میں مرافع الی القاضی کی شرط نہیں ہے کیونکہ جو چیز شرعاً واجب ہوتی ہے وہ قضاء قاضی کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کسی نے بائع یا مشتری میں سے کسی نے اس کے باقی رکھنے پر اصرار کیا تو قاضی کو جبراً اسے فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

علامہ فرماتے ہیں: ويجب على كل واحد منهما فسخه قبل القبض ويكون امتناعًا عنه او بعده ما دام المبيع بحاله فى يد المشترى للفساد لانه معصية فيجب رفعها ولذا لا يشترط فيه قضاء قاضٍ لان الواجب شرعًا لا يحتاج

للقضاء واذا امر احدهما على امساكه وعلم به القاضی فله فسخه جبرًا عليهما حقًا للشرع۔ (رد المختار بهامش الشامی ج۴ ص۱۷۳)

اس تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے صورت مسئولہ میں مرتہن (زید) کی اجازت سے راہن نے مشتری (خالد) سے جو عقدِ بیع کیا ہے میرے نزدیک یہ بیع فاسد ہے کیونکہ زید نے عین عقد میں جو شرط لگائی ہے کہ اگر میری زمین ایکٹ میں آگئی تو زرِ رہن مرتہن کو نہ دو گے بلکہ مجھے دو گے اور مشتری (خالد) نے اس کو منظور کیا، تو یہ ایک ایسی شرط ہے جو نہ عقد کی مقتضٰی ہے اور نہ ملائم عقد ہے اور اس میں احد المتعاقدین (زید بائع) کو نفع ہے لہٰذا اس سے بیع فاسد ہوگئی ہے اور اس کا فسخ کرنا واجب ہے۔ پس زید اس کو فسخ کر سکتا ہے کیونکہ مشتری (خالد) نے ابھی تک قبضہ بھی نہیں کیا ہے، اگر زید اس بیع کے باقی رکھنے پر اصرار کرے تو بذریعہ عدالت فسخ کرایا جا سکتا ہے۔ هٰذا هو الذی یعلم ما ذکر فی کتب منذ هینا و ن لم ینشرح به القلب و لم تطمئن به النفس فان للمقال فیه مجالاً۔ (فقط واللہ اعلم)

غیر مسلم کی مرہونہ زمین سے انتفاع

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور ہندو بھی رہتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے مراسم بھی ہیں۔ خرید و فروخت، اجارہ، شادی و غمی اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت وغیرہ، گویا دنیاوی طور پر ایک دوسرے سے لین دین رہتا ہے۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہندو نے مجھ سے پچاس ہزار روپے قرض لیے اور اپنی مملوکہ زمین میرے پاس رہن رکھوائی۔ تو کیا میں اس زمین میں فصل وغیرہ کاشت کر سکتا ہوں اور اس کی آمدنی میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض علماء کرام سے ہم نے سنا ہے کہ مرہونہ زمین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ برائے مہربانی مسئلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب: یہاں تک تو سب کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی مرہونہ چیز سے انتفاع لینا جائز نہیں لیکن بعض علماء کرام کے نزدیک غیر مسلم حربی کا مال مباح ہے، اس لیے ہندو کی مرہونہ زمین سے فائدہ لینا آپ کے لیے جائز ہے البتہ پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے رہونہ سے انتفاع درست نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی: الجواب: بعض علماء کے قول پر ربیاح مال الحرب رضاءً ولو بعقد فاسد) جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۳ ص۴۶۶ کتاب الرہن)

مرہونہ زمین کے محاصل راہن کو واپس کرنا لازم ہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ یار حسین (ضلع صوابی) میں قرض لینے دینے کے سلسلہ میں یہ رواج ہے کہ قرض رقم دینے والا اس کے عوض میں کچھ زمین رہن رکھ لیتا ہے اور اس مرہونہ زمین سے اُسے (مرتہن کو) انتفاع لینے کی راہن کی طرف سے اجازت ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل بندہ نے ایک استفتاء بھیجا تھا جس کے جواب میں آنجناب نے راہن کی اجازت کے باوجود مرہونہ زمین سے انتفاع لینے کو ناجائز تحریر فرمایا تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مرہونہ زمین سے فائدہ حاصل کیا ہو اور اسے استعمال بھی کیا ہو تو وہ اپنے آپ کو اس سے کس طرح فارغ الذمہ کر سکتا ہے اور اس کی عملاً کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ مرہونہ زمین انتفاع لینا راہن کی اجازت کے باوجود بھی مفتیٰ بہ قول کے مطابق ناجائز و حرام ہے۔ اب اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے فارغ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ مرہونہ زمین سے اس نے جو محاصل لیے ہیں وہ جملہ محاصل یا ان کی قیمت راہن کو واپس کر دے تب اس کا ذمہ فارغ ہوگا۔

لما قال العلامۃ محمد عبدالحی الکھنوی ؒ: (الجواب) بکر کو اس محاصل کا واپس کرنا لازم ہے اور بکر کو اس محاصل سے نفع حاصل کرنا جائز نہ تھا اور ایک روپیہ کے عوض میں اس محاصل کو نہیں بیچ سکتا، البتہ کل محاصل کے واپس کر دینے سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ (مجموعۃ الفتاویٰ (اردو) ج ۳ ص ۱۲۹ کتاب الرہن)

❋ ❋

كتاب
الاجارة

اعطوا الأجير أجره
قبل ان يجف عرقه

کتاب الاجارۃ
(اجارہ کے احکام ومسائل)

عقدِ اجارہ میں تعیینِ مدت ضروری ہے

سوال :۔ مؤجر نے مستاجر کو بغیر تعیینِ مُدّت کے دوکان اجارہ پر دے دی، اب چند سال بعد ہر چیز کے نرخ بڑھ جانے کی وجہ سے دوکان کا مالک بھی کرایہ بڑھانا چاہتا ہے لیکن مستاجر نہ تو دوکان خالی کرنے کو تیار ہے اور نہ ہی پہلے کرایہ سے زیادہ دینے کو تیار ہے جبکہ مؤجر حکومتی قانون کی وجہ سے مجبور ہے، کیونکہ حکومت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مُستاجر (کرایہ دار) خود دوکان خالی نہ کرے مؤجر (مالکِ دوکان) اس کو بیدخل نہیں کر سکتا اور کرایہ میں کمی بیشی کرنا بھی حکومت کے اختیار میں ہے، کیا اس صورت میں مستاجر گنہگار تو نہیں ہوگا؟

الجواب :۔ بشرطِ صحتِ سوال یہ اجارہ فاسد ہے، مؤجر کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ مستاجر سے ہر ماہ کے شروع میں دوکان خالی کرنے یا کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کرے ورنہ بصورتِ دیگر عقدِ اجارہ فسخ کر سکتا ہے، اس مطالبہ میں مستاجر کا لیت ولعل کرنا حرام ہے اور انکار کی صورت میں مستاجر پر مؤجر کا مطلوبہ کرایہ دینا لازم ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله :۔ آجر حانوتاً كل شهر بكذا اجاز في واحد فقط وفسد في الباقي لجهالتها والاصل انه متى دخل كل فيما لا يعرف منتهاه تعين ادناه واذا مضى الشهر فلكل فسخها بشرط حضور الآخر لانتهاء العقد الصحيح ۔

(رد المحتار ج ۶ ص۵۰ باب الاجارة الفاسدة) [1]

---

[1] قال العلامة ابن بزاز رحمه الله : آجر داره كل شهر بكذ اينعقد عند رأس كل شهر ولكل خيار الفسخ عند رأس كل شهر فلو ابرأ المستاجر عن اجرة الابد لايصح الا عن شهر واحد ۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۵ ص۱۷ كتاب الاجارات، الفصل الثاني في صفتها)

وَمِثْلُهٗ في مجلة الاحكام، مادة ۴۹۳ ص۲۴۳ الفصل الرابع في المسائل التي تتعلق بمدة الاجارة ۔

طویل مدت کے لیے زمین اجارہ پر دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی ذاتی مملوکہ اراضی کسی دوسرے شخص کو پچاس سال کے لیے اجارہ پر دے دی ہے، کیا اپنی مملوکہ زمین طویل مدت کے لیے اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین طویل مدت کے لیے اجارہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ دیگر شرائط فاسدہ سے اجارہ خالی ہو، خواہ اجرت کم مقرر ہوئی ہو یا زیادہ۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: والمنافع تارة تصير معلومة بالمدة كاستيجار الدور للسكنىٰ والارضين للزراعة فيصح العقد على مدة معلومة اى مدة كانت لان المدة اذا كانت معلومة كان قدر المنفعة فيها معلوماً اذا كانت المنفعة لا تتفاوت وقوله اى مدة كانت اشارة الى انه يجوز طالت المدة اوقصرت لكونها معلومة۔ (الهداية ج۳ ص۲۹۴ كتاب الاجارات) [1]

معروف اُجرت پر اجارہ کا حکم

سوال:۔ ہمارے ہاں تین مزدور پچاس روپے یومیہ کے حساب سے مزدوری کرتے ہیں، چونکہ کام کے وقت میں صبح کے کھانے کا وقت ہوتا ہے اس لیے صبح کا کھانا ہمارے گھر سے ملتا ہے، درمیان میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اب مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ چونکہ رمضان المبارک میں صبح کا کھانا نہیں ملتا اس لیے ہمیں پچاس کے ساٹھ روپے دیہاڑی ملنی چاہیئے، تو کیا ان مزدوروں کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر ماہِ رمضان المبارک میں یہ اجرت برضا ورغبت جانبین کی طرف سے مقرر ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ مقدار معروف ہو تو تب بھی درست ہے ورنہ بصورتِ دیگر یہ اجارۂ فاسدہ کے حکم میں ہے جو صحیح نہیں۔

---

[1] قال العلامة اكمل الدين البابرتي: ولا فرق بين طويل المدة وقصيرها عندنا اذا كانت بحيث يعيش اليها العاقدان لان الحاجة التى جوزت الاجارة لها قد تمس الى ذلك۔
(العناية على هامش فتح القدير ج۸ ص۸/۷ كتاب الاجارات)
وَمِثْلُهٗ فى الجوهرة النيرة ج۱ ص۳۱۷ كتاب الاجارات۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز رحمہ: لو استاجر احد اجیرا علی ان یعمل یوما یعمل من طلوع الشمس الی العصر او الی الغروب علی وفق عرف البلدۃ فی شان العمل۔ (شرح مجلۃ الاحکام لسلیم، مادۃ ۴۹۵ ص۲۷۴ الکتاب الثانی فی الاجارۃ۔ الباب الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدۃ الاجارۃ) لہ

مجہول الوقت کا عقدِ اجارہ

سوال:۔ ایک ملازم نے مالک مکان سے پانچسو روپیہ کرایہ پر مکان لے لیا، چند ماہ بعد اس نے مالکِ مکان ماہانہ سے کہا کہ میں تین ماہ کی چھٹی پر اپنے گھر جا رہا ہوں واپس آکر اس مکان کو دوبارہ کرایہ پر لوں گا اور ملازم اپنا سامان اسی مکان میں رکھ کر چلا گیا، اب ان دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہو گیا ہے، مالک مکان کا مؤقف یہ ہے کہ چونکہ تمہارا سامان اسی مکان میں پڑا رہا ہے اور جاتے وقت تم نے عقد کو ختم بھی نہیں کیا تھا لہٰذا تمہیں ان تین ماہ کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑے گا جبکہ ملازم کا کہنا ہے کہ چونکہ میں نے جاتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ واپس آکر نئے سرے سے کرایہ پر لوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجارہ ختم ہوگیا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کا مؤقف درست ہے؟ نیز کیا ملازم (کرایہ دار) ان تین ماہ کا کرایہ ادا کرنے کا شرعاً پابند ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب مدت کا تعین نہیں ہوا ہے صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ ماہانہ کرایہ پانچسو روپے ہوگا تو اس صورت میں کرایہ دار اور مالکِ مکان ہر ایک کو مہینہ کے اختتام پر ایک دوسرے کی موجودگی میں اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا جب ملازم نے واضح طور پر مالکِ مکان سے یہ کہہ دیا کہ چھٹیوں کے بعد واپس آکر میں اس مکان کو

لہ قال العلامۃ قاضیخان: رجل استاجر اجیرا یوما یعمل لہ کذا قالوا ان کان العرف بینھم انھم یعملون من طلوع الشمس الی العصر فھو علی ذلک وان کان العرف انھم یعملون من طلوع الشمس الی غروب الشمس فھو علی ذلک وان کان العرف مشترکا فھو علی طلوع الشمس الی غروبھا اعتبارا بالذکرالیوم۔ (الفتاوی قاضیخان مع السراجیۃ ج۳ ص۳۳ کتاب الاجارات فصل فی اجارۃ الدواب والضمان فیما یجب وفیما لا یجب)۔
ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۶ کتاب الاجارۃ۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیھا عقد الاجارۃ۔

دوبارہ کرایہ پر لوں گا تو یہ اجارہ ملازم کے گھر جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے لہٰذا یہ ملازم ان تین ماہ کا کرایہ دینے کا پابند نہیں ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: لو استوجر عقاراً کل شھر بکذا من دون بیان عدد الاشھر یصح العقد فی شھر واحد فقط ویفسد فی بقیة الشھور لجہالتھا والاصل انه متی دخلت لفظة کل فیما لا یعرف منتھاہ تعین ادناہ (در منتقیٰ) لکن عند ختام الشھر الاول لکل من الآجر والمستاجر فسخ الاجارۃ فی الیوم ولیلتہ من الشھر الثانی الذی یلیہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام لسلیم، مادۃ ۴۹۲ ص۲۷۲ کتاب التدی فی الاجارات، باب الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدۃ الاجارۃ) ۱؎

گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینا

سوال: آجکل بعض دوکاندار لوگ گاڑی والوں کو ٹائر کرایہ پر دیتے ہیں، کیا اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: اجارہ نام ہے کسی چیز کے منافع سے اجرت کے عوض فائدہ حاصل کرنا، بشرطیکہ اس میں جملہ شرائطِ اجارہ موجود ہوں، اسلئے اگر صورتِ مسئولہ میں مدت اور کرایہ معلوم و متعین ہو تو گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یشترط ان تکون الاجرۃ معلومۃ ــ یشترط فی الاجارۃ ان تکون المنفعۃ معلومۃ بوجہ یکون مانعاً للمنازعۃ۔ (شرح المجلۃ لرستم باز، مادۃ: ۴۵۰، ۴۵۱ ص۲۵۴ الفصل الثالث فی شروط صحۃ الاجارۃ) ۲؎

۱؎ قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: ومن استاجر داراً کل شھر بدراھم فالعقد صحیح فی شھر واحد فاسد فی بقیۃ الشھور الا ان یسمی جملۃ الشھور معلومۃ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۰۲ کتاب الاجارات۔ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷ کتاب الاجارۃ۔ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

۲؎ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: فی شرح الطحاوی عقد الاجارۃ لایجوز الا ان یبین البدل من الجانبین جمیعاً اما بیان المنفعۃ فباحدی معان ثلاثۃ بیان الوقت وھو الاجل و بیان العمل و بیان المکان۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۱۰۳، الفصل السادس فی الاجارۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۲ ص۱۰۳ کتاب الاجارۃ۔

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں ہونے والے درختوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے اس کی مملوکہ زمین دس بارہ سال تک کاشت کرنے کے لیے اجارہ پر لی ہے، اب اس زمین میں درخت بھی ہیں تو کیا شرعاً یہ درخت مُوجِر (مالکِ زمین) کے ہیں یا مستاجر (کاشتکار) کے؟

الجواب:۔ اگر یہ درخت مالکِ زمین نے لگائے ہوں اور خدمت کاشتکار نے کی ہو تو یہ درخت مالکِ زمین کے ہوں گے اور خدمت کرنے والے کو خدمت کا معاوضہ ملے گا اور اگر درخت اجارہ دار نے مالکِ زمین کی اجازت سے لگائے ہوں تب بھی یہی حکم ہے اور اگر بلا اجازتِ مالک کے لگائے ہوں تو درخت اجارہ دار کے ہوں گے اور مالکِ زمین کو زمین سے انتفاع کا اجرِ مثل دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللّٰہ:۔ وقد اطال صاحب التنقیح الکلام فی تحقیق ھٰذہ المسئلۃ قال فالحاصل ان من زرع ارض غیرہ بلا اذنہ علی وجہ الغصب فان کانت الارض ملکاً اعدّھا ربھا للزراعۃ اعتبر العرف فی الحصۃ ان کان ثمۃ عرف والا فان اعدّھا للایجار فالخارج کلہ للزارع وعلیہ اجر مثلھا لربھا والا فان انتقصت فعلیہ النقصان والا فلا شئ علیہ۔ (فتاوٰی کاملیۃ ص۲۹ کتاب الاجارۃ) [1]

اجارہ کردہ چیز کی مرمت کا خرچہ مستاجر کے ذمہ لگانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں زمیندار زمین کی کاشت کے لیے زرعی مشینری اجارہ پر لیتے ہیں، مالکِ مشین اور زمیندار کے مابین عقد ہوتا ہے کہ آمدنی کا تیسرا حصہ مالکِ مشین کا ہوگا اور اگر مشین خراب ہو جائے تو مرمت کا خرچہ زمیندار

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ: فالحاصل ان من زرع ارض غیرہ بلا اذنہ ولو علی وجہ الغصب فان کانت الارض ملکاً واعدّھا ربھا للزراعۃ اعتبر العرف فی الحصۃ ان کان ثمۃ عرف والا فان اعدّھا للایجار فالخارج کلہ للزارع وعلیہ اجر مثلھا لربھا والا فان انتقصت فعلیہ النقصان والا فلا شئ علیہ۔
(تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۴۳ کتاب الغصب)
ومثلہٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۱۹۵ کتاب الاجارۃ۔

کے ذمّہ ہوگا، تو کیا اس طرح کا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کا اجارہ دو وجوہ کی بناء پر فاسد ہے (۱) اس میں اجرت متعین نہیں ہے (۲) یہ کہ مشین کی مرمّت مستاجر (زمیندار) کے ذمّے لگائی گئی ہے، اور اس شرط کا لگانا اجارہ کو فاسد کرتا ہے لہٰذا مستاجر پر اجرِ مسمّٰی واجب نہیں بلکہ اجرِ مثل واجب ہے، بشرطیکہ اجرِ مثل مقرر کردہ کرایہ سے زیادہ نہ ہو ورنہ بصورتِ دیگر مقرر کردہ کرایہ لازم ہوگا۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: وكذا لو استاجر داراً او حانوتاً سنة بمائة درهم على ان يرمّها المستاجر كان على المستاجر اجر المثل بالغاً ما بلغ لانه لما شرط المرمة على المستاجر صارت المرمة من الاجر فيصير الاجر مجهولاً قاما اذا كان فساد الاجارة بحكم شرط فاسد۔ (الفتاوی قاضیخان ج۳ ص۲۱ کتاب الاجارات۔ باب الاجارة الفاسدة) [1]

تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑی تو تنخواہ نہیں ملے گی۔ اجارہ فاسد ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اس شرط پر نوکر رکھا کہ اگر تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑ دے گا تو تنخواہ نہیں دوں گا، مگر اس شخص (نوکر) نے تین ماہ سے پہلے ہی نوکری چھوڑ دی، تو کیا یہ شخص نوکری کے ایام کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اجارہ میں اس قسم کی شرائط لگانا صحیح نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان دونوں کا اجارہ فاسد ہے، اس لیے نوکر کو اجرِ مثل دیا جائے گا بشرطیکہ اجرِ مسمّٰی سے کم ہو۔

---

[1] قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمه الله: سئلت عمن استاجر داراً باجر مجهول هل تفسد الاجارة فالجواب نعم قال فی جامع الفصولین كل جهالة تؤثر فی البيع تؤثر فی الاجارة وتفسد بها العقد سواء كانت الجهالة فی الاجرة والمدة او العمل المستاجر عليه ويجب اجر المثل فی فاسدها ولا يجاوز بها المسمّٰی ثم لا يجاوز المسمّٰی لو علم الاجر والا يجب بالغاً ما بلغ فلو استاجر بيتاً سنة بمائة على ان يرمّها المستاجر فعليه اجر مثله بالغاً ما بلغ اذ المرمّة لما شرطت على المستاجر صارت من الاجر وجهل الاجر۔ اھ

(فتاویٰ کاملیة ص۱۹۹ کتاب الاجارة، مطلب تفسد الاجارة بجهالة الاجر)

ومثلهٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۳۲ باب الاجارة الفاسدة۔

وفی الهندیة: وان تکاراها الیٰ بغداد علیٰ انها ان بلغته بغداد فله اجر عشرة دراهم والافلا شئ له فالاجارة فاسدة وعلیه اجر مثلها بقدر ما سار علیها۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۴۳۔ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیه لمکان الشرط) [۱]

اجارۂ فاسد کی ایک اور صورت

سوال:۔ ایک شخص اپنا تجارتی مال بذریعہ ٹرک بنوں سے لاہور لے جانا چاہتا ہے، ٹرک کے مالک اور مال والے کے درمیان معاہدہ کچھ اس طرح ہوا کہ ٹرک کے مالک کو راستے میں ٹیکس والوں کو ادائیگی رقم کی ذمہ داری قبول کرنے پر دس ہزار روپے ملیں گے ورنہ بصورتِ دیگر صرف پانچ ہزار روپے کرایہ کے ملیں گے۔ کیا ایسا عقدِ اجارہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ فاسد ہے اور اجارۂ فاسد کا حکم یہ ہے کہ ایسی مزدوری جتنی اُجرت مروج ہو وہ دی جائے گی اور جو کچھ طے ہوا ہے وہ نہ دیا جائے گا، لیکن اگر مروج زیادہ ہو اور فریقین کے درمیان طے شدہ اجرت کم ہو تو طے شدہ اجرت ہی دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدها) کجهالة ماجور او اُجرة او مُدة او عمل وکشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار اومغارمها وعشر او خراج او مؤنة۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۶/۴۷ باب الاجارة الفاسدة) [۲]

حیوان کو نصف پر رکھنا

سوال:۔ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو گائے یا بھینس کا بچہ اس شرط پر دے کہ وہ اس کی تربیت کرے اور پالے پوسے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے فروخت کرکے قیمت آپس میں برابر برابر تقسیم کریں گے، کیا ایسا

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: وان بلغت بغداد فله کذا والافلا شئ له فهی فاسدة وعلیه اجر مثل ما سار علیها۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارة الفاسدة)
وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۱۷ باب الاجارة الفاسدة۔

[۲] وفی الهندیة: والاجارة تفسدها الشروط التی لایقتضیها العقد کما اذا شرط علی الاجیر الخاص ضمان ما تلف بفعله الخ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۴۲ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیه)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارة الفاسدة۔

عقدِ اجارہ کرنا شرعاً جائز ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو پھر جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

الجواب: یہ اجارہ قفیز الطحان کے حکم میں ہے، لہٰذا اس پر اجارۂ فاسدہ کا حکم لگایا جائے گا۔ لعدم تعیین الاجرۃ ولعدم تعیین المدۃ۔ جانبین کو چاہیئے کہ مدت اور اجرت کی تعیین کریں اور مدت ختم ہونے کے بعد اجیر کو متعین قیمت کے عوض نصف گائے دی جائے۔

وفی الھندیۃ: دفع بقرۃ الیٰ رجل علیٰ ان یعلفھا وما یکون من اللبن والسمن بینھما انصافاً فالاجارۃ فاسدۃ وعلیٰ صاحب البقرۃ للرجل اجر قیامہ وقیمۃ علفہ اُن علفھا من علف۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۴۵ کتاب الاجارۃ۔ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وماھو فی معناہ) [۱]

مزدوری میں زمین دینا

سوال: کیا مزدور کو مزدوری کے عوض میں زمین دینا جائز ہے جبکہ عقد میں رقم دینا طے کیا گیا ہو؟

الجواب: عقدِ اجارہ کی اجرت میں ہر وہ چیز دینا جائز ہے جو مالِ متقوم ہو لہٰذا مزدور کو مزدوری میں زمین دینا جائز ہے اگرچہ ابتداءِ عقد میں رقم دینے کا معاہدہ ہی ہو چکا ہو۔

وفی الھندیۃ: وماصلح ان یکون ثمناً فی البیع کالنقود والمکیل والموزون صلح ان یکون اجرۃ فی الاجارۃ ومالا یصلح ثمناً لا یصلح اُجرۃ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۲ کتاب الاجارۃ فی الباب الاوّل) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: وفی فتاوی النسفی رجل دفع بقرۃ الیٰ رجل بالعلف منھا صفۃ وھی التی بالفارسیۃ کاوینم سود بان دفع علیٰ ما یحصل من اللبن والسمن بینھما نصفان فھٰذا فاسد والحادث کلہ لصاحب البقرۃ والاجارۃ فاسدۃ۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۱۴ کتاب الاجارات، ومایتصل بھٰذا)
ومِثلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۵ ص۳۷ کتاب الاجارۃ۔ النوع الثالث فی الدواب۔

[۲] قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: ماصلح بدلاً فی البیع یصلح بدلاً فی الاجارۃ۔
(مجلۃ الاحکام مادۃ ۴۶۳ ص۲۶ فی بدل الاجارۃ)
ومِثلُہٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۹۸ کتاب الاجارۃ۔

اجارہ میں زمیندار کو کاشت کی عام اجازت دینا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی زمین بایں طور عقدِ اجارہ پر دیدے کہ آپ جو چاہیں اس میں کاشت کریں، تو کیا از روئے شرع ایسا عقد کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ عقدِ اجارہ میں اگرچہ فصل وغیرہ کا تعین کرنا ضروری ہے بدون تعین کے اجارہ فاسد ہوگا، لیکن اگر مؤجر نے متاجر کو اس بات کی عام اجازت دی ہو کہ وہ جو چاہے اس میں کاشت کرسکتا ہے، تو اس صورت میں شرعاً یہ اجارہ صحیح اور درست متصور ہوگا۔

وفی الهندية : ولابد فی اجارة الاراضی من بيان مايستاجر له من الزراعة والغرس والبناء وغيرذٰلك فان لم يبين كانت الاجارة فاسدة الا اذاجعل له ان ينتفع بماشاء هٰكذا فی البدائع ۔ (الفتاوٰی الهندية ج۴ ص۴۴۲ كتاب الاجارة ۔ الباب الخامس عشر فی بيان مايجوز من الاجارة ومالايجوز) [1]

اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر پر نہ ہو

سوال:۔ بعض علاقوں میں رواج ہے کہ ایک آدمی کسی زمیندار سے نصف آمدن پر زمین اجارہ کرتا ہے اور پھر اس زمین کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ دو تہائی پر اجارہ کرتا ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا اجارہ پر لی ہوئی زمین کسی دوسرے شخص کو اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مستاجر کے لیے اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر کے ساتھ نہ ہو اور اُجرتِ اولیٰ یا اس سے کم پر ہوں اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ پر ہو تو اضافی رقم کو فقراء پر تصدق کردے۔ ہاں دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: اوّل یہ کہ اجارہ ثانیہ خلافِ جنس

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله : ولايصح العقد حتٰی يسمّی مايزرع فيها لانها قد تستاجر للزراعة ولغيرها ومايزرع فيها متفاوت فلابد من التعيين كی لايقع المنازعة او يقول ان يزرع فيها ماشاء لانه لما فوّض الخيرة اليه ارتفعت الجهالة المفضية الی المنازعة ۔ (الهداية ج۳ ص۲۹۶ كتاب الاجارات باب مايجوز من الاجارة ومايكون خلافًا فيها)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی الكاملية ص۱۹۱ كتاب الاجارة ۔

پر ہو، دوم یہ کہ مستاجر اجارہ کی ہوئی چیز کی اصلاح کرے، مثلاً اگر مکان ہو تو اس کی مرمت اور سفیدی وغیرہ کرے یا زمین ہو تو اس کی نالیوں وغیرہ کو ٹھیک کرے۔ ان دو صورتوں میں اجارۂ دوم اجارۂ اوّل سے زیادہ پر بھی جائز ہے۔

وفی الهندية: واذا استاجر دارًا وقبضها ثم اجرها فانه يجوز ان اجرها بمثل ما استاجرها او اقل وان آجرها باكثر مما استاجرها فهى جائزة ايضًا الا انه ان كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الاولى فان الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها وان كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد فى الدار زيادة كما لو وتد فيها وتدًا او حفر فيها بيرًا او اصلح ابوابها او شيئًا من حوائطها طابت له الزيادة۔
(الفتاوى الهندية ج ۴ ص۴۲۵ كتاب الاجارة۔ الباب السابع فى اجارة المستاجر) [۱]

مستاجر یا مؤجر کی موت سے اجارہ کا ختم ہونا

سوال: اگر دو آدمیوں کے درمیان چند سالوں کے لیے کوئی عقدِ اجارہ ہو جائے لیکن اسی مدت کے اندر مؤجر یا مستاجر کی موت واقع ہو جائے تو کیا اس کے بعد بھی عقدِ اجارہ باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب: اگر متعاقدین نے عقدِ اجارہ اپنے لیے کیا ہو تو دونوں میں کسی ایک کی موت واقع ہو جانے سے عقدِ اجارہ فسخ ہو جائے گا لہٰذا اُن کے پسماندگان کیلئے عقد کی تجدید ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: واذا مات احد المتعاقدين وقد عقد الاجارة لنفسه انفسخت الاجارة۔ (الهداية ج ۳ ص۳۱۳ كتاب الاجارة۔ باب فسخ الاجارة) [۲]

---

[۱] قال ابن عابدينؒ: (قوله المستاجر ان يوجر المؤجر الخ) اى ما استاجره بمثل الاجرة الاولى او بانقص، فلو باكثر تصدق بالفضل الا فى مسئلتين كما مر اول باب ما يجوز من الاجارة۔ (رد المحتار ج ۶ ص۹۱ مسائل شتى مطلب فى اجارة المستاجر.... الخ)
وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوى ج ۳ ص۱۲۵ كتاب الاجارات فى الجنس الثانى۔

[۲] قال العلامة ابو البركات النسفىؒ: وتنفسخ بموت احد المتعاقدين ان عقدها لنفسه وان عقدها لغيره لا۔ (كنز الدقائق ص۱۳۰ كتاب الاجارة)
وَمِثْلُهٗ فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۸۳ كتاب الاجارة۔

جعلی سند پر بھرتی ہونے والے ملازم کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ حکومت نے سکولوں میں دینیات پڑھانے کے لیے اساتذہ کی بھرتی کا اشتہار شائع کیا اور یہ شرط لگائی کہ امیدوار کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو، اس پر ایک شخص نے کسی دینی مدرسے کے مہتمم کو پیسے دے کر اپنے نام کی جعلی سند لے لی اور انٹرویو کے دوران پیش کر کے بھرتی ہوگیا، تو کیا اس طرح بھرتی ہونے والے اس استاد کو حکومت کی طرف سے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ اس کے لیے شرعاً حلال ہے یا حرام ؟

الجواب:۔ عقدِ اجارہ سے ملنے والی اُجرت کی حلت کا دارومدار اس کام کا اہل ہونے پر ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر مفوضہ ڈیوٹی کا اہل ہو تو تنخواہ حلال ہوگی ورنہ حرام، لیکن دھوکہ دہی، رشوت دینے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوگا۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: واما رکنها فهو الایجاب والقبول والارتباط بینهما واما شرط جوازها فثلاثة اشیاء اجر معلوم وعین معلوم وبدل معلوم ومحاسنها دفع الحاجة بقلیل المنفعة واما حکمها فوقوع الملك فی البدلین ساعة فساعة ۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۳ کتاب الاجارة) [1]

امامِ مسجد میں اہلیت نہ ہو تو اُسے معزول کیا جاسکتا ہے

سوال:۔ ایک شخص کافی عرصے سے ایک مسجد کا امام چلا آرہا ہے لیکن اب اس کے مقتدیوں میں سے بعض لوگ اسے امامت سے معزول کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مسجد کی امامت اجارہ کے حکم میں ہے، اگر اجیر میں ذمہ داری ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہے تو اجارہ فسخ کرنا جائز ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی الصغری رجل استاجر

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: لایجوز عقدها حتی یعلم البدل والمنفعة وبیان المنفعة باحد ثلاث بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل والمکان فالاجر ببیان النقد ۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص۱ کتاب الاجارات)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارة ۔

رَجُلاً لیعلّمه حرفة کذا هٰذه السنة فمضی نصف السنة و لم یعلّمه شیئاً فللمستاجر ان یفسخ الاجارة ۔ (خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۴۱ کتاب الاجارة الفصل السابع فی فسخ الاجارة) لہ

امامتِ مسجد اور تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی امامت اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز کہتے ہیں، لیکن یہ اُس دور کی بات ہے جب اہلِ علم اور خادمینِ دین کی معاشی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی تھیں لیکن بعد میں جب حکومتوں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا تو فقہاء کرام نے تعلیمِ قرآن اور شعائرِ دینیہ کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اُجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیدیا تاکہ دین کے یہ خادم دنیا کے دیگر کاموں سے ہٹ کر دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینی کام میں لگے رہیں۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ:۔ وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القراٰن الیوم لانه ظهر التوانی فی الامور الدینیة ففی الامتناع یضیع حفظ القراٰن وعلیه الفتوٰی ۔ (الهدایة ج۳ ص۳۰۱ کتاب الاجارات) ٢ـه

لہ وفی الهندیة: واذا استاجر استاذاً لیعلّمه هٰذا العمل فی هٰذه السنة فمضی نصف السنة فلم یعلّمه شیئاً فللمستاجر ان یفسخ مارأیت روایة فی هٰذا لکن افتی الشیخ الامام علیّ الاسبیجابی فافتیت انا ایضاً، کذا فی الصغرٰی ۔

(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۶۱ کتاب الاجارة ۔ الباب التاسع عشر)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۵ ص۳۹ کتاب الاجارة نوع فی تعلیم القراٰن والحرف ۔

٢ـه قال العلامة ابن عابدینؒ: اعلم ان عامة کتب المذهب من متون وشروح وفتاوٰی کلها متفقة علی ان الاستیجار علی الطاعات لایصح عندنا واستثنی المتاخرون من مشائخ بلخ تعلیم القراٰن فجوزوا الاستیجار علیه وعللوا ذٰلك فی شروح الهدایة وغیرها بما مرّ و بالضرورة وهی خوف ضیاع القراٰن لانه انقطعت العطایا من بیت المال وعدم الحرص علی الدفع بطریق الحسبة لیشتغلوا له معلمون به بمعاشهم ولایعلمون احداً ولضیع القراٰن فافتی المتاخرون بالجواز لذٰلك ۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۳۷ ۔ الفتوٰی علی جواز الاجارة علی تعلیم القراٰن)

وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۳۶۴ کتاب الاجارة ۔

نکاح خوانی پر اُجرت لینے کا مسئلہ

سوال:- کیا نکاح پڑھانے پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نکاح پڑھنے پر اُجرت لینا فقہاءِ کرام کے ہاں مختلف فیہ ہے، چونکہ اس میں ایک گونہ تعلیم وتلقین بھی ہے اور تعلیم وتلقین پر اجرت لینا مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز ہے اس لیے فقہاءِ کرام نے اس میں اجرت کے جواز کو قولِ راجح قرار دیا ہے لہٰذا بناء برایں نکاح پڑھنے پر اُجرت لینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: اختلف المشائخ فی الدلالة فی النکاح هل یکون لها الاجر قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضلؒ لا اجر لها لانه لا منفعة للزوج من کلامها بغیر عقد وانما منفعة الزوج فی العقد والعقد ما قام بها وقال غیره من المشائخ لها اجر مثلها لان معظم الامر فی النکاح یقوم بالدلالة فان النکاح لا یکون الا بمقدمات تکون من الدلالة فکان لها اجر المثل بمنزلة الدلال فی البیع فانه یستحق الاجر۔ (الفتاویٰ قاضیخان ج۳ ص۲ باب الاجارة الفاسدة) [1]

اجیرِ خاص کو ڈیوٹی کے اوقات میں کوئی دوسرا کام کرنا جائز نہیں

سوال:- زید ایک سکول ٹیچر ہے کیا وہ سکول ڈیوٹی کے دوران کسی قریبی مسجد میں امامت کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: سکول ٹیچر چونکہ اجیرِ خاص ہوتا ہے اور اجیرِ خاص کے لیے ڈیوٹی کے اوقات میں دوسری ملازمت کرنا جائز نہیں، ورنہ اس کی تنخواہ سے بقدرِ غیر حاضری کے کٹوتی کی جائے گی۔ البتہ چھٹی یا تفریح کے وقت میں اگر وہ کوئی دوسرا کام کرنا چاہے تو بلاشک کرسکتا ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت میں اگر اس کا عملِ تدریس متاثر نہیں

---

[1] وفی الهندیة: الدلالة فی النکاح لاتستوجب الاجر وبه یفتی الفضلی فی فتاواه وغیره من مشائخ زماننا کانوا یفتون بوجوب اجر المثل وبه یفتی کذا فی جواهر الاخلاطی۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۴۵۱ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر مشغولا لغیره)
ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۱۷ کتاب الاجارة۔

ہونا ہو تو امامت کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ ولو عمل نقص من اُجرتہ بقدر ما عمل فتاوی نوازل ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجیر) [1]

اجیرِ خاص اپنا کام دوسرے آدمی سے نہیں کرا سکتا

سوال :۔ زید ایک سکول ٹیچر ہے لیکن بجائے زید کے اس کا بھائی عمرو سکول میں ڈیوٹی دیتا ہے ، تو کیا زید کا ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں زید اجیرِ خاص ہے اور اجیرِ خاص شرعاً کسی دوسرے شخص سے اپنا کام نہیں کرا سکتا ورنہ کسی حادثہ کی صورت میں تمام تر ذمہ داری اس کی ہوگی ، لہٰذا زید کے لیے ایسا کرنا ناجائز ہے ۔

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ : الاجیر الذی استوجب علی ان یعمل بنفسہ لیس لہٗ ان یستعمل غیرہٗ مثلاً لو اعطیٰ احد جبۃ لخیاط علیٰ ان یخیطھا بنفسہ بکذا درہم فلیس للخیاط علیٰ ان یخیطھا لغیرہ بل یلزم ان یخیطھا بنفسہ وان خاطھا بغیرہ وتلفت فھو ضامن ۔ (مجلۃ الاحکام ، مادۃ ۵۷۱ ص۳۰۶ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی) [2]

اجیرِ خاص کا استحقاق

سوال :۔ اگر کسی علاقے کے سرکاری سکول میں طلباء نہ ہوں اور وہاں اساتذہ کا تقرر ہو چکا ہو جبکہ اساتذہ طلباء کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکول حاضر نہیں ہوتے ، تو کیا ان اساتذہ کو گورنمنٹ سے

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ : وانما سمی اجیر وحد لانہ لایمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الاجر مستحقا وان نقص العمل ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۱۰ کتاب الاجارات ، باب ضمان الاجیر)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لسلیم ، مادۃ ۴۲۲ ص۲۳۲ الکتاب الثانی فی الاجارۃ ۔ الباب الاول

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ : واذا شرط علی الصانع ان یعمل بنفسہ فلیس لہ ان یستعمل غیرہ لان المعقود علیہ اتصال العمل فی محل بعینہ فیستحق عینہ کالمنفعۃ فی محل بعینہ ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۹۶ کتاب الاجارات ۔ باب الاجر متی یستحق)

وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج۸ ص۲۱

تنخواہ لینا جائز ہے ؟

الجواب:۔ سکولوں کے اساتذہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں لہٰذا سکولوں میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہونے کی وجہ سے ہی تنخواہ کے مستحق ہوں گے، بصورتِ دیگر عدمِ حاضری کی وجہ سے تنخواہ لینے کے مقدار نہیں ہوں گے ۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله :۔ والاجير الخاص الذی يستحق الاجرة بتسليم نفسه فی المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة او لرعی الغنم ۔

(الهداية ج۳ ص۳۰۸ کتاب الاجارات ۔ باب ضمان الاجير)[1]

ملازم کے لیے مفوضہ ڈیوٹی کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص فوج میں ملازم ہے، عموماً عصر کی نماز کے وقت افسرانِ بالا کی جانب سے گراؤنڈ میں حاضر ہونے کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ ایک طرف نماز باجماعت کی فضیلت اور دوسری جانب افسروں کا حکم ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو نمازِ عصر سے پہلے گراؤنڈ میں پہنچنے کا حکم ملتا ہے، اس صورت میں اگر چند فوجی جوان مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو عنداللہ گنہگار تو نہیں ہونگے ؟

الجواب:۔ ایسے شخص کے لیے ڈیوٹی کے معین وقت پر پہنچنا ضروری ہے، تاہم اگر مسجد کی جماعت نہ ملے تو چند افراد مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو درست ہے، لیکن فرض نماز چھوڑنا بھی جائز نہیں اور نہ ہی وقت سے پہلے نماز پڑھنا جائز ہے اس لیے کہ ملازم کو ڈیوٹی کے اوقات میں فرائض کے علاوہ دیگر امور میں مشغول رہنا صحیح نہیں ہے ۔

وفی الهندية : وفی الفتاوی الفضلی رحمه الله :۔ اذا استاجر رجلاً يوماً ليعمل كذا فعليه ان يعمل ذلك العمل الی تمام المدة ولا يشتغل بشیء آخر سوی المكتوبة

---

[1] قال العلامة ابوالبركات النسفی رحمه الله :۔ والخاص يستحق الاجر بتسليم نفسه فی المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة او لرعی الغنم ۔

(كنزالدقائق ص۳٦۷ کتاب الاجارات ۔ باب ضمان الاجير)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النيرة ج۱ ص۳۲۳ کتاب الاجارة ۔

وفی فتاوی اھل سمرقند قد قال بعض مشائخنا رحمھم اللہ تعالیٰ ان لہ یؤدی السنۃ ایضاً واتفقوا انہٗ لا یؤدی نفلاً وعلیہ الفتویٰ کذا فی الذخیرۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۶ کتاب الاجارۃ۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیھا عقد الاجارۃ) [۱]

مال چوری ہونے کی صورت میں اجیرِ خاص پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید ایک دوکان کا مالک ہے اور دوکان کا کاروبار چلانے کیلئے اس نے ایک منشی رکھا ہوا ہے، منشی سے کسی نے دھوکہ سے مال چوری کر لیا تو کیا منشی چوری ہونے والے مال کا ضامن ہوگا یا کہ زید یہ نقصان برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ اجیرِ خاص کے ہاتھوں میں مال بحکمِ امانت ہے اور چوری کی صورت میں امین پر ضمان نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چوری ہونے والا مال کا منشی ضامن نہیں ہے بلکہ سارا بوجھ زید پر ہے۔ تاہم اگر اس چوری میں منشی ملوث ہو تو ضمان لیا جائے گا۔

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ:۔ والاجیر الخاص امین حتیٰ انہٗ لا یضمن المال الذی تلف فی یدہٖ بغیر صنعہ وکذا لا یضمن المال الذی تلف بعملہٖ بلا تعد ایضاً۔

(مجلۃ الاحکام، مادۃ نمبر ۶۱۰ ص۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان الاجیر) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ) بل ولا ان یصلی النافلۃ قال فی التتارخانیۃ وفی فتاوی الفضلی واذا استاجر رجلاً یوماً یعمل کذا فعلیہ ان یعمل ذلک العمل الی تمام المدۃ ولا یشتغل بشیء آخر سوی المکتوبۃ وفی فتاوی سمرقند وقد قال بعض مشائخنا رحمھم اللہ تعالیٰ لہٗ ان یؤدی السنۃ ایضاً و اتفقوا انہ لا یؤدی نفلاً وعلیہ الفتویٰ۔ (رد المحتار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجیر، مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلۃ)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام مادۃ ۲۳۶ ص۱۲۰ کتاب الاجارۃ فی بیان مایدخل فی البیع بدون ذکر صریح ومالا یدخل۔

[۲] قال العلامۃ ابن عابدینؒ:۔ قال فی جامع الفصولین استوجر رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع منھا شیءٌ قیل ضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لو ضاع من خارج الحجرۃ لانہٗ اجیر مشترک وقیل لا فی الصحیح وبہ یفتیٰ لانہٗ اجیر خاص۔

(رد المحتار ج۶ ص۷۱ باب ضمان الاجیر، مطلب فی الحارس والخاناتی)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۷۱ کتاب الاجارات، باب ضمان الاجیر۔

ٹیوب ویل کا پانی اجارہ پر دینے کا حکم

سوال:- اگر ٹیوب ویل کے مالک اور مالکِ زمین کے درمیان اس شرط پر عقد ہو جائے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کے لیے پانی کے عوض ٹیوب ویل کے مالک کو پچاس روپے فی گھنٹہ دے گا، تو کیا ایسا عقد شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مُدت اور اُجرت دونوں متعین ہے اور جب اُجرت اور مُدت متعین ہو تو ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ایسا معاملہ کرنا درست ہے۔

قال العلامة ابن بزاز الكردري: ولا يجوز عقدها حتى يعلم البدل والمنفعة وبيان المنفعة باحد ثلاث بيان الوقت وهو الاجل وبيان العمل والمكان فالاجر يبيان النقد وهو على غالب نقد البلد. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۱۱ كتاب الاجارات الاول في المقدمة) [1]

دینی مدارس کے لیے کمیشن پر چندہ کرنا جائز نہیں

سوال:- بعض دینی مدارس کے مہتممین حضرات کسی شخص کو چندہ کے لیے بھیجدیتے ہیں جبکہ ان کے درمیان یہ طے ہوتا ہے کہ جمع ہونے والے چندہ میں سے تیسرا حصہ اس سفیر کو ملے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- عقدِ اجارہ میں یہ ضروری ہے کہ اُجرت متعین ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ کے عقدِ اجارہ میں اُجرت متعین نہیں اس لیے یہ عقد فاسد ہے،
البتہ سفیر کو مدرسہ میں لازم رکھ کر اس کی تنخواہ مقرر کی جائے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: في شرح الطحاوي عقد الاجارة لا يجوز الا ان يبين البدل من الجانبين جميعاً اما بيان المنفعة فباحدى معان ثلاثة بيان الوقت وهو الاجل وبيان العمل و بيان المكان اما الاجرة ان كان دراهم او دنانير فالشرط بيان القدر۔

(خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۰۳ كتاب الاجارات، اما الاول في المقدمة... الخ)

ومثله في مجلة الاحكام، مادة نمبر ۴۵۰ ص۲۵۴ الفصل الثالث في شروط صحة الاجارة۔

لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدھا) کجھالۃ ماجور او اجرۃ -
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶ باب الاجارۃ الفاسدۃ) ؎

مدرسینِ دینی وعصری مدارس کیلئے چھٹیوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال:۔ مدارس میں ایک معروف طریقہ ہے کہ مدرسین حضرات شعبان کے شروع سے لے کر شوال کے آخر تک چھٹیوں پر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سال کے درمیان میں بھی کبھی تو باجازتِ مہتمم اور کبھی بغیر اجازت کے چھٹی کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود مہتممین حضرات ان کو باقاعدہ تنخواہ دیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

الجواب:۔ ایامِ تعطیلات ایامِ عمل کے تابع ہوتے ہیں اس لیے چھٹیوں کی تنخواہ لینا ناجائز نہیں ہے، جب مدرسہ کے مہتمم اور معطین کے درمیان شرائط طے شدہ ہوں تو دونوں ان شرائط کے پابند ہوں گے لیکن اس میں معطین چندہ کی اجازت قولاً یا حالاً ضروری ہے اس لیے کہ مہتممین حضرات ان معطین کے وکیل ہوتے ہیں، اور اگر معطین کی اجازت ورضا نہ ہو تو مہتمم اپنے گھر سے تنخواہ دے گا۔ البتہ بیماری، عیدین اور دوسری ضروریات کی چھٹیوں کے بارے میں اگر مدرسہ کا کوئی مدوّن قانون ہو تو اس پر عمل درآمد ہوگا ورنہ جو عمل اور رویہ اہلِ مدارس کے نزدیک معروف ہو اُس پر عمل ہوگا اور معروف یہ ہے اساتذہ سے چھٹیوں کی تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، تاہم جانبین پر لازم ہے کہ تنخواہ دیتے اور لیتے وقت اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : ومنھا البطالۃ فی المدارس کایام الاعیاد ویوم عاشوراء

؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وقد ضبطہ الشیخ ابوالحسن الکرخیؒ فی مختصرہ فقال اذا کان ماوقع علیہ عقد الاجارۃ مجھولاً فی نفسہ او فی اجرۃ او فی مدۃ الاجارۃ او فی العمل المستاجر علیہ فالاجارۃ فاسدۃ وکل جھالۃ تدخل فی البیع فتفسدہ من جھۃ الجھالۃ فکذلک ھی فی الاجارۃ ۔ اھ
(البحر الرائق ج ۷ ص۳۱۲ باب الاجارۃ الفاسدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی کاملیۃ ص۱۹۲ کتاب الاجارۃ ۔

وشهر رمضان فی درس الفقه لم ار ها صریحۃ فی کلامهم والمسئلۃ فیها علی وجهین فان کانت مشروطۃ لم یسقط من المعلوم شیٔ والا فینبغی ان یلحق ببطالۃ القاضی و قد اختلفوا فی اخذ القاضی مارتب من بیت المال فی یوم بطالته ـ

(الاشباہ والنظائر ص۹۵) لہ

مسلمان کا کفار کے ساتھ نوکری کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل اکثر مسلمان امریکہ، برطانیہ اور جاپان وغیرہ ممالک میں نوکری کی غرض سے جاتے ہیں اور وہاں کافروں کے ساتھ نوکری کرتے ہیں، کیا کسی مسلمان کو کفار کے ساتھ نوکری کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے ایک مسلمان کی عزت و عظمت کا بہت خیال رکھا ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی اپنی عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیئے، اس بناء پر جس نوکری میں ایک مسلمان کی تذلیل و تنقیص ہوتی ہو تو وہ اس کو نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایک مسلمان کو کسی کافر کے ہاں کوئی ایسی نوکری ملتی ہو جس میں اس کی اہانت اور ذلت نہ ہوتی ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں اگرچہ خلافِ اولیٰ ضرور ہے ۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ :۔ ولو استأجر ذمی مسلما لیخدمه ذکر فی الاصل انه یجوز واکرہ للمسلم خدمۃ الذمی اما الکراھۃ فلان الاستخدام استذلال فکان اجارۃ المسلم نفسه منه اذلالا لنفسه ولیس للمسلم ان یذل نفسه خصوصاً بخدمۃ الکافر۔ (بدائع الصنائع ج۴ ص۱۸۹ فصل واما شرائط الرکن) ۲ہ

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ :حیث کانت البطالۃ فی یوم الثلاثاء والجمعۃ وفی رمضان والعیدین یحل الاخذ وکذا لو بطل فی یوم غیر معتاد لتحریر درس الا اذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیه ـ قال الفقیه ابو اللیث من یأخذ الاجر من طلبۃ العلم فی یوم لا درس فیه ارجو ان یکون جائزاً۔ (ردالمحتار ج۳ ص۴۱۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلۃ لرستم باز۔ المادۃ ۴۹۵ ص۲۷۲ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی)

۲ہ قال العلامۃ قاضیخانؒ :مسلم آجر نفسه من نصرانی ان استأجره لعمل غیر الخدمۃ جاز وان آجر نفسه للخدمۃ قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل لا یجوز وذکر القدوری انه یجوز یکرہ له خدمۃ الکافر۔ (الفتاوی قاضی خان ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارات، الفصل العاشر فی الحظر والاباحۃ ۔

ریڈیو کی مرمت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:۔ ریڈیو جو کہ عموماً گانے بجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں قرآن مجید کی تلاوت، دینی تقاریر اور خبریں بھی نشر کی جاتی ہیں، اگر وہ خراب ہوجائے تو کیا اس کی درستگی پر مکینک کو اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اپنے اصل کے لحاظ سے ناجائز نہیں ہے اس کو اصلاحی، سائنسی، معلوماتی اور تربیتی مقاصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور جو چیز فی نفسہ برائی کے لیے نہ ہو مگر لوگ اس کو برائی کے لیے استعمال کرتے ہوں تو فقہاء نے اس کی خرید و فروخت اور اس پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، ہاں اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اس کو (ریڈیو کو) گانے بجانے اور خرافات کیلئے استعمال کرتا ہے تو اس کی مرمت بھی ناجائز ہے اور اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

قال العلامة ابن بزاز الكردريؒ: ولا تجوز الاجارة على الغناء والنَّوح ولو عمل لا اجر له۔ (البزازية على هامش الهندية ج ۵ ص۳۲ نوع فى المتفرقات وقبيل الاجارة على المعاصى) لـه

بیل کی گائے سے جفتی کرانے پر اُجرت لینا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں بعض لوگ گائے کی جفتی کرنے کے لیے بیل پالتے ہیں اور اس پر متعین اُجرت لیتے ہیں، کیا یہ اُجرت لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ اُجرت کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو وہ اس شخص کی ملکیت ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں گائے کا حمل ٹھہرانا کسی کے بس کی بات نہیں اس لیے اس پر اُجرت لینا ناجائز ہے، اس کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی اس سے منع کیا گیا ہے۔

قال العلامة ابن نجيمؒ:۔ يعنى لا يجوز اخذ اُجرة عساب التيس لقوله عليه الصلوٰة والسلام

لـه قال العلامة الحصكفىؒ: (لا تصح الاجارة لعسب التيس) وهو نزوة على الاناث (و) لا (لاجل المعاصى مثل الغناء والنَّوح والملاهى) ولو اخذ بلا شرط يباح۔
(الدر المختار على هامش ردالمحتار ج ۵ ص۳۸ مطلب فى الاستيجار على المعاصى)
ومِثْلُهٗ فى بدائع الصنائع ج ۴ ص۱۸۹ كتاب الاجارة۔

ان من السحت عسب التیس ومھر البغی ولانہٗ عمل لا یقدر علیہ وھو الاحبال فلا یجوز اخذ الأجرۃ علیہ ولا اخذ المال بمقابلۃ الماء وھو نجس لا قیمۃ لہ فلا یجوز والمراد ھنا استیجار التیس لینزو علی الغنم ویحبلھا باجر۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۱۹ باب الاجارۃ الفاسدۃ) لہ

فوٹوگرافی پر اجرت لینا

سوال:۔ فوٹوگرافی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کو ذریعۂ معاش بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی جاندار کی تصویر بنانا یا بنوانا سخت گناہ کا کام ہے، البتہ اشد ضرورت (یعنی عمرہ یا حج کے لیے پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کے لیے) کے موقع پر مرخص ہے مگر پھر بھی اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:۔ ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لانہٗ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد۔

(الھدایۃ ج ۳ ص۳۰۳ کتاب الاجارات) ۲لہ

فلنگ وصول کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مال مویشی والے لوگ کسی کے پہاڑ یا زمین پر جاکر قیام کرتے ہیں اور اپنے مویشیوں کو چراتے ہیں جبکہ گاؤں والے یا مالکانِ اراضی "فلنگ" کے نام سے کچھ رقم ان سے وصول کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر فلنگ تو در وگھاس کا معاوضہ ہے تو پھر جائز نہیں کیونکہ اس میں مالک کی محنت کو کوئی دخل نہیں، اور اگر مملوکہ زمین یا پہاڑ پر رہائش اور قیام کرنے کا معاوضہ ہو تو باقاعدہ عقد اجارہ کی صورت میں یہ مال جائز رہے گا۔

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ لا تصح الاجارۃ لعسب التیس) لانہ عمل لا یقدر علیہ وھو الاحبال۔ (رد المحتار ج ۶ ص۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۳۰۳ کتاب الاجارات۔

۲لہ قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: ولا یجوز علی الغناء والنوح والملاھی۔

(کنز الدقائق ص۳۶۴ کتاب الاجارات)

ومثلہٗ فی رد المحتار ج ۶ ص۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وتصح اجارة ارض لبناءٍ وغرس وسائر الانتفاعات کطبخ آجر وخزفٍ ومقیل ومراحٍ والمقیل مکان القیلولة والمراح بالضم مأوی الماشیة حتی تلزم الأجرة بالتسلیم امکن زراعتها ام لا۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۳۰ باب ما یجوز من الاجارة وما یکون خلافاً فیها)[۱]

بینک کی چوکیداری کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا بینک کی چوکیداری کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینکوں کا موجودہ نظام اگرچہ سودی نظام ہے جو شرعاً ممنوع ہے، مگر چوکیداری کا تعلق چونکہ براہ راست بینک کے سودی معاملات سے نہیں ہے، اس لیے بینک کی چوکیداری میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر ہو سکے تو اجتناب ہی کیا جائے۔

وفی الهندیة: مسلم آجر من مجوسی لیوقد النار لا بأس به کذا فی الخلاصة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر...الخ)[۲]

بینک کی ملازمت کرنا

سوال:۔ کیا بینک کی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ آجکل اکثر بینکوں میں سودی کاروبار کا طریقہ رائج ہے جبکہ قرآن وسنت میں سود کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں اور سودی معاملات کے لکھنے، لکھوانے اور شہادت دینے والوں کو بھی سود خوروں کے برابر قرار دیا ہے، اس بناء پر بینک کا ملازم یا تو کاتبین میں سے ہوگا یا شاہدوں میں سے ہوگا جو کہ لعنت کے زمرے میں

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: فاذا عرفت ذلك ظهر لك صحة الاجارات الواقعة فی زماننا من ان یستأجر الارض مقیلاً ومراحاً قاصداً بذلك الزام الاجر لتمکن منها مطلقاً سواء شملها الماء وامکن زراعتها ام لا۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۱ باب ما یجوز من الاجارة وما یکون خلافاً فیها)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام، تحت المادة ۴۸۴ ص۲۷۱ الباب الرابع فی المسائل...بمدة الاجارة۔

[۲] قال العلامة سراج الدینؒ: آجر نفسه من مجوسی لیوقد له النار لا بأس۔ (فتاوی سراجیة علی هامش قاضیخان ص۱۰۲ کتاب الاجارة۔ باب ما یکره من الاجارة وما لا یکره)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارة الفصل العاشر فی الحضر والاباحة۔

داخل ہے، اس لیے بینک کی ملازمت سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا۔ (صحیح مسلم ج۲ ص۲۷ باب الربٰوا) [1]

خلافِ شرع کام کرنے کی اُجرت لینا

سوال:۔ کیا حجامت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس میں داڑھی کو مونڈنے اور انگریزی طرز کے بال بنانے پڑتے ہیں اور اس پر اجرت بھی لی جاتی ہے۔ اس مسئلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ حجامت کا پیشہ اختیار کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ سر کے بال خلافِ شرع بنانا اور داڑھی منڈھانا گناہ ہے اور گناہ کے کام پر کمائی حرام ہے، لہٰذا اس قسم کے ناجائز کاموں سے پرہیز ہی کیا جائے۔

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا یجوز الاستیجار علی شیٔ من الغنا والنوح والمزامیر۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۳ ص۱۱۶ کتاب الاجارات جنس اٰخر فی المتفرقات) [2]

تعویذ پر اُجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ اگر برکت، بیماری سے شفا یا کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قرآنِ مجید کی کوئی آیت لکھ کر تعویذ بنا دیا جائے تو کیا اس پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہاءِ کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ تعویذات پر اُجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ تعویذ خلافِ شرع امور کے لیے نہ ہو۔

---

[1] لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا وقال ھم سواء۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۲ ص۲۴۴ باب الربٰوا)

وَمِثْلُہٗ فی الصحیح البخاری ج۲ ص۸۸۱ کتاب اللباس باب من لعن المصور۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لانہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۰۱ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۶ ص۵۵ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: لان المتقدمين المانعين الاستیجار مطلقاً جوزوا الرقية بالاجرة ولو بالقرآن کما ذکره الطحاوی لانها لیست عبادة محضة بل من التداوی۔ (رد المحتار ج۶ ص۵۵ باب الاجارة الفاسدة۔ مطلب تحریر مہم فی عدم جواز الاستیجار... الخ)[1]

دلالی کی اجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل کاروباری حلقوں میں دلالی کا رواج بہت زیادہ ہے اور اس پر اُجرت بھی لی جاتی ہے، تو کیا دلالی کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دلالی پر اُجرت لینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے مگر مجبوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے قولِ جواز پر فتویٰ دیا گیا ہے بشرطیکہ اُجرت معیّن ہو اور دیگر مفاسد سے خالی ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم۔ وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن اُجرة السمسار فقال ارجوا انه لا بأس به وان کان فی الاصل فاسداً لکثرة التعامل وکثیر من هٰذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۶۳ باب الاجارة الفاسدة۔ مطلب فی اُجرة الدلال)۔[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واما حدیث الرهط الذین رقوا لدیغا بالفاتحة واخذ واجعلا فسألوا النبی صلی الله علیه وسلم فقال احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله فمعناه اذا رقیتم به کما نقله العینی فی شرح البخاری عن بعض اصحابنا وقال ان الرقیة بالقرآن لیست بقربة ای لان المقصود بها الاستشفاء دون الثواب۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۳۹ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی صحیح البخاری ج۲ ص۸۵۴ باب الرقی بالقرآن والمعوذات)

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الاصل اجرة السمسار والمغاری والحمامی والصکاك وما لا تقدیر فیه للوقت ولا مقدار لما یستحق بالعقد لکن للناس فیه حاجة جاز وان کان فی الاصل فاسداً۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۳ ص۱۱۶ کتاب الاجارات۔ جنس اٰخر فی المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳۰ کتاب الاجارات۔

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال:۔ سکولوں کے اساتذہ نے حکومت کو اپنے کچھ مطالبات پیش کئے لیکن حکومت نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا، بار بار کی یاددہانی کے باوجود بھی حکومت نے نہ مانا تو اساتذہ نے مجبور ہو کر ہڑتال کر دی اور طالب علموں کو پڑھانا چھوڑ دیا لیکن خود سکولوں میں باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے، تو کیا ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ چونکہ جمہوری حکومتوں میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے، نیز اساتذہ چونکہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں اور اجیر صرف حاضری دینے سے بھی تنخواہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: لو استوجر استاذ لتعلیم علم او صنعة وسمیت الاجرة فان ذکرت مدة انعقدت الاجارة صحیحة علی المدة حتی ان الاستاذ یستحق الاجرة بوجوده حاضراً مهیئا للتعلیم تعلم التلمیذ او لم یتعلم۔ (مجلة الاحکام، مادۃ ۵۶۲ ص ۲۰۵ کتاب الاجارۃ۔ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی) [1]

مریض کی تشخیص کرنے پر ڈاکٹروں کی فیس کا حکم

سوال:۔ آجکل پرائیویٹ ہسپتالوں کی بہتات ہے جہاں ڈاکٹر حضرات مریض کی صرف تشخیص کی بھاری فیس لیتے ہیں، کیا مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا بھاری فیسیں لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا فیس لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة خیر الدین الرملیؒ: سئل فی رجل داء فی انفه اتفق مع طبیب علی

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وهو الموافق لتصریح المتون بانه یستحق الاجر بتسلیم نفسه فی المدة وان لم یعمل۔ (ردّ المحتار ج ۶ ص ۷۰ باب ضمان الاجیر۔ مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلة)

ومثلهٗ فی الفتاوی الکاملیة ص ۱۹۵ کتاب الاجارہ۔ مطلب فی الاجیر الخاص۔

مداواته وجعل لهٗ اجرة ولم یضرب لذٰلك مدة ودا واه فما الحکم (الجواب) للطبیب اجرة مثله وما انفق فی ثمن الادویة لفساد الاجارة علی الوجه المذکور۔

(فتاوٰی خیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۲ کتاب الاجارة) [1]

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں افیون کاشت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو اپنی زمین اجارہ پر دیدی، متاجر نے اس میں افیون کاشت کر دی، تو کیا اس پر اجرت لینا جائز ہے ؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق اس طرح زمین پر اجرت لینا حرام نہیں ہے جیسا کہ فقہاء کی عبارات سے واضح ہے، کیونکہ مالک زمین نے ارتکاب معصیت کے لیے زمین تو نہیں دی ہے جبکہ افیون کی ایک خاص مقدار کا ادویات میں استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: ولا بأس لمسلم ان یواجر داره من ذمی لیسکنها وان شرب فیه الخمر او عبد فیه الصلیب او ادخل فیه الخنازیر فذٰلك لا یلحق المسلم۔ (فتاوٰی قاضی خان مع سراجیة ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات، باب الاجارة الفاسدة) [2]

عذر کی صورت میں اجارہ فسخ کرنا

سوال:۔ متاجر یا موجر میں سے اگر کوئی اجارہ فسخ کرنا چاہے تو شرعاً اس کی کیا تفصیل ہے ؟

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: سئل فی رجل به دار فی ظهره اتفق مع طبیب علی مداواته وجعل اجرة ولم یضرب له مدة و داواه ویرید الطبیب اجرة مثله وما انفقه فی ثمن الادویة فهل لهٗ ذٰلك (الجواب) نعم والمسئلة فی الخیریة من الاجارة۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵۱،۱۵۲ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۸۰ باب فسخ الاجارة۔ مطلب فسق المستاجر لیس عذراً فی الفسخ۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: واذا استاجر الذمی من المسلم داراً لیسکنها فلا بأس به وان شرب الخمر او عبد فیه الصلیب لم یلحق المسلم شیٔ کما لو اجر داره من فاسق یعص الله فیها۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۳ ص۱۵ کتاب الاجارات۔ الفصل العاشر فی الحظر والاباحة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۴ ص۴۵ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذ کان المستاجر۔ الخ

الجواب: مؤجر یا مستاجر میں سے کسی ایک کو بھی اگر واقعتاً عذر پیش آئے تو وہ یکطرفہ طور پر اجارہ فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے، مثلاً کسی شخص نے بار برداری کے لیے جانور کرایہ پر لیا تھا پھر اس کی آنکھیں ضائع ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ جانور بیکار ہوگیا تو اس صورت میں میں مستاجر اجارہ فسخ کرسکتا ہے۔

وفی الهندیة: واذا تحقق العذر ومست الحاجة الی النقض هل یتفرد صاحب العذر بالنقض او یحتاج الی القضاء او الرضاء اختلف الروایات فیه والصحیح ان العذر اذا کان ظاهر یتفرد وان کان مشتبهاً لا یتفرد کذا فی فتاوی قاضی خان۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۵۸ کتاب الاجارة۔ الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر) [1]

نااہلی اجارہ فسخ کرنے کیلئے عذر ہے

سوال: کسی مدرسہ کا مہتمم اپنے ایک مدرس کو تعلیمی سال کے درمیان میں اس وجہ سے فارغ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری پڑھائی سے طلباء مطمئن نہیں ہیں جبکہ مدرس کا کہنا ہے کہ مہتمم خود یا دوسرے مدرسین میرے درس میں آکر دیکھیں، اگر واقعتاً وہ میری تدریس میں نقص محسوس کریں تو بے شک مہتمم صاحب مجھے تدریس سے فارغ کردیں ورنہ بصورت دیگر میری بے عزتی سے باز رہیں، اس قضیہ میں شرعی فیصلہ سے مستفید فرمائیں، مہربانی ہوگی؟

الجواب: اگر مدرس واقعی تدریس کرنے کا اہل نہ ہو تو مہتمم مدرسہ کو اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم اس میں صرف مہتمم کے بیان کا اعتبار نہیں ہے کہ مدرس تدریس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس میں مدرس کی بات معقول نظر آتی ہے کہ خود مہتمم صاحب میری اہلیت کا جائزہ لیں یا کسی دوسرے مدرس سے فیصلہ کروائیں، عام مدارس کے قواعد وضوابط کی روشنی میں کسی مدرس کو دوران سال فارغ کرنا مروت کے خلاف ہے۔

وفی الهندیة: اذا استاجر استاذ لیعلمه هذا العمل فی هذه السنة فمضی نصف السنة فلم

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: الاجارة عقد لازم لا تنفسخ بغیر عذر الا اذا وقعت علی استهلاک عین کالاستکتاب فلصاحب الورق فسخها بلا عذر۔ (الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۱ کتاب الاجارة)

ومثله فی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۲ ص۳۵۲ کتاب الاجارة۔ فصل فیما تنقض به الاجارة وما لا تنقض به

يعلمه شيئاً فللمستاجر ان يفسخ - (الفتاوى الهندية ج۴ ص۴۶۰ كتاب الاجارة - في الباب السابع عشر في فسخ الاجارة بالعذر) [1]

اجارہ پردی ہوئی چیز کی بیع موقوف ہے

سوال:- زید نے ایک دوکان جو کہ دو بھائیوں کی ملکیت ہے، دس سال کیلئے اجارہ پر لی ہے اور سارا کرایہ پیشگی ادا کر دیا ہے اور فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی ہے کہ ان دس سالوں کے درمیان مالکِ دوکان نہ تو دوکان فروخت کریں گے اور نہ ہی رہن پر دیں گے، لیکن پانچ سال کے بعد ایک بھائی نے اپنا نصف حصہ زید کے ہاتھ فروخت کر دیا، اب زید یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ طے شدہ دس سال کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اب نئے سرے سے دوبارہ معاہدہ ہوگا اور مجھے آٹھ ہزار ماہانہ کرایہ دو گے، تو کیا اس طرح زید کو معاہدۂ اول فسخ کرنے اور کرایہ بڑھانے کا شرعاً حق پہنچتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق مالکِ دوکان کی بیع نافذ ہے لیکن دس سال ختم ہونے سے پہلے نہ تو مشتری اس پر قبضہ کر سکتا ہے اور نہ ہی مالکِ دوکان کرایہ دار کو نکال سکتا ہے، اسی طرح از سرِ نو کرایہ بڑھانے کا معاہدہ کرنا بھی بے جا ہے۔ البتہ دس سال پورا ہونے کے بعد بیع بھی نافذ العمل ہوگی اور کرایہ بھی بڑھایا جا سکے گا۔

قال العلامة خالد الاتاسيؒ: لو باع الآجر المأجور بدون اذن المستاجر كان البيع نافذاً بين البائع والمشترى وان لم يكن نافذ بحق المستاجر حتى انه بعد انقضاء مدة الاجارة يلزم البيع فى حق المشترى وليس له الامتناع عن اخذ المبيع الا ان يطلب تسليمه له من البائع قبل انقضاء مدة الاجارة الخ - (مجلة الاحكام، ماده نمبر ۵۹۰ ص۳۱۵ الفصل الثانى فى تصرف العاقدين فى المأجور بعد العقد) [2]

---

[1] قال العلامة ابن بزازؒ: استاجر معلماً لتعليم ولده القرآن والحرفة فى سنة فمضت ستة اشهر ولم يعلم شيئاً له فسخ الاجارة - (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۳۹ كتاب الاجارة - نوع فى تعليم القرآن والحرف)
وَمِثْلُهٗ فى الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳۹ كتاب الاجارة -

[2] قال العلامة محمد كامل الطرابلسيؒ: سئلت عمن استاجر داراً ثم باعها لآخر حتى تبطل الاجارة بهذا البيع فالجواب انه رفع للخير الرملى مثل هذا السوال فاجاب عنه بما نصه لا يبطل الاجارة بهذا البيع بالاجماع وحكم البيع انه موقوف يصح ولا ينفذ وليس لغير المشترى فسخه والمشترى بالخيار علم اولم يعلم فى الاصح - و فى الخانية يتوقف على الاجارة المستاجر فى اصح الروايات -
(فتاوى كامليه ص۱۹۴ كتاب الاجاره، مطلب استاجر داراً ثم باعها كان البيع موقوفاً)
وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۴۳ كتاب الاجارات -

میوزک سنٹر کے لیے دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:۔ آجکل اکثر مارکیٹوں میں میوزک سنٹروں کے لیے مخصوص دوکانیں بنائی جاتی ہیں اور پھر کرایہ پر دی جاتی ہیں، کیا یہ کرایہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معاصی کے امور کے لیے مکان یا دوکان کرایہ پر دینے میں چونکہ گناہ میں اجیر بذات شریک نہیں اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکان یا دوکان کے اجارہ لینے میں کوئی قباحت نہیں جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک یہ اجارہ قبیح ہے تاہم چونکہ اس میں تعاون علی الاثم کا ایک گونا ہونا موجود ہے اس لیے اس قسم کے افعالِ قبیحہ کے لیے مکان یا دوکان کو اجارہ (کرایہ) پر دینا کراہت سے خالی نہیں۔

وفی الهندية: واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا یسکنها فلا بأس بذلك وان شرب فيها الخمر اوعبد فيها الصليب او ادخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فی ذلك بأس لان المسلم لا يؤاجرها لذلك انما آجرها للسكنی كذا فی المحيط۔ (الفتاوى الهندية ج۴ ص۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا كان المستاجر مشغولاً بغيره)[۱]

پگڑی دے کر دوکان یا مکان کرایہ پر لینے کا حکم

سوال:۔ آجکل کاروباری لوگوں میں یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ ایک بھاری رقم (جس کو عرف میں پگڑی کہا جاتا ہے) دے کر دوکان کرایہ پر لیا جاتا ہے۔ کیا پگڑی دے کر دوکان کرایہ پر لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ دوکانات یا دیگر کاروباری مکانات پر پگڑی دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) پگڑی اگر دوکاندار کو بصورتِ رشوت یا رہن دی جاتی ہو تو مالکِ دوکان اور کرایہ دار دونوں

---

[۱] قال العلامة سراج الدين رحمه الله: آجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار او بيعة او كنيسة او يباع فيه الخمر لا بأس به عند ابی حنيفةؒ خلافًا لهما۔ (فتاوى سراجية على هامش قاضيخان ج۲ ص۱۲۱ كتاب الاجارة۔ باب ما يكره من الاجارة وما لا يكره)
ومثله فی خلاصة الفتاوى ج۳ ص۱۲۹ كتاب الاجارات۔ الفصل العاشر فی الحضر والاباحة۔

کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (۲) اور اگر اجرتِ معجلہ کی صورت میں ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة محمد خالد الاتاسی رحمه الله: تلزم الاجرة بالتعجيل يعني لو سلم المستاجر الاجرة نقداً ملكها الآجر وليس للمستاجر استردادها سواء كانت الاجارة منجزة او مضافة۔ [الهندية]۔ (مجلة الاحكام، مادة ۴۶۷ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی بيان المسائل المتعلقة بسبب لزوم الاجرة وكيفية استحقاق الاجرة) ۱؎

آفات کی وجہ سے اجرت ساقط ہوتی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے دس کنال زمین اجارہ پر لے کر اس میں گندم کاشت کی، اس کے بعد حکومت نے قریبی قصبے کو سیلاب سے بچانے کے لیے اس زمین سے بہت ساری مٹی اٹھالی جس سے زمین کو بہت نقصان پہنچا اور فصل بالکل تباہ ہوگئی، تو اس صورت میں اجارہ کی رقم مؤجر کو دینا پڑے گی یا کہ نہیں؟

الجواب:۔ حکومت کے مٹی اٹھانے کی وجہ سے اگر یہ زمین نا قابلِ کاشت ہو گئی ہو تو نا قابلِ کاشت ہونے کے بعد والی مدت کی اجرت ساقط ہو جائے گی اور نا قابلِ کاشت ہونے سے قبل کی اُجر ساقط نہ ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدين: فاذا استاجرها للزراعة فاصطلم الزرع آفة وجب منها ما قبل الاصطلام وسقط ما بعده۔ (رد المحتار ج۶ ص۷۶ باب ضمان الاجير۔ مبحث اختلاف المؤجر والمستاجر) ۲؎

۱؎ قال العلامة ابن نجيم: فی شرح الطحاوی الاجرة لا تخلو اما ان تكون معجلة او مؤجلة او منجمة او مسكوتا عنها فان كانت معجلة فان له ان يتملكها وله ان يطالب بها وان كانت مؤجلة فليس له ان يطالب الا بعد الاجل وان كانت منجمة فله ان يطالب عند كل نجم۔ (البحر الرائق ج۸ ص۵ كتاب الاجارات)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۰۳ كتاب الاجارة۔

۲؎ قال العلامة ابن البزاز الكردری: استاجر ارضا للزراعة فزرعها واصاب الزرع آفة او غرق الارض فعليه الاجر على الكمال ولو غرق قبل الزرع فلا اجر عليه قال فی المحيط والفتوى على انه اذا بقی بعد هلاك الزرع مدة لا يتمكن من اعادة الزراعة لا يجب الزراعة الاجر على المستاجر والا يجب اذا تمكن من زراعة مثل الاول۔

(البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۵۹ الباب الثالث فی الضياع والعقار)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۴ ص۴۶۱ الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر۔

جن شروط سے بیع فاسد ہوتی ہے انہی شروط سے عقدِ اجارہ بھی فاسد ہوتا ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی دوسرے آدمی سے بیس ہزار روپے سالانہ اجارہ پر زمین لے کر پانچ ہزار روپے پیشگی دیئے اور یہ شرط لگائی کہ اگر مستاجر میعاد پوری ہونے سے قبل زمین چھوڑنا چاہے تو بھی مالکِ زمین کو پانچ ہزار روپے پورے دینے پڑیں گے، تو کیا ایسا اجارہ شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ شروطِ فاسدہ کی وجہ سے درست نہیں ہے کیونکہ اس میں تعیینِ مدت نہیں ہے، ہاں اگر اقالہ کا وعدہ صلبِ عقد میں ہوا ہے تو ناجائز نہیں ہے لیکن بقدرِ مدت کے رقم ملے گی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع (مما مر) يفسدها) كجهالة ماجور او اجرة او مدة او عمل وكشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار او مغارمها وعشر او خراج او مؤنة۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۴۶ باب الاجارة الفاسدة)[۱]

گودام سے چوری ہونے والے مال میں چوکیدار پر ضمان نہیں

سوال: گودام جہاں مختلف لوگوں کا غلہ اور دیگر سامان رکھا ہوتا ہے وہاں سے اگر کسی کا سامان گم ہو جائے تو ضمان کس پر ہے جبکہ گودام کی حفاظت کے لیے چوکیدار بھی موجود ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں گودام کے چوکیدار پر ضمان نہیں ہے اور نہ ہی مستاجر ضامن ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: قال في جامع الفصولين استوجر

---

[۱] قال العلامة محمد كامل الطرابلسي: ففي التنوير وشرحه للعلائي تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع يفسدها كجهالة ماجور واجرة او مدة او عمل الخ (فتاوى كاملية ص۱۹۲ كتاب الاجارة۔ مطلب تفسد الاجارة باشتراط الترميم ونحوه)

ومثله في البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ كتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة۔

رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع شئ قیل یضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لوضاع من خارج الحجرة لانه اجیر مشترك وقیل لا فی الصحیح وبه یفتی لانه اجیر خاص الایری انه لو اراد ان یشغل نفسه فی صنع آخر لم یکن لہٗ ذٰلك ولو ضاع من داخلها بان نقب اللص فلا یضمن۔

(شرح مجلة الاحکام مادة ۶۱۰ ص ۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان) [1]

کسی سفارتخانے سے ویزہ نکلوانے پر رقم لینا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص کسی غیر ملکی سفارت خانہ سے ویزہ لینا چاہتا ہے جس پر کل دس ہزار روپے خرچ آتا ہے، لیکن چند وجوہات کی بناء پر وہ ویزہ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اب ایک دوسرا آدمی اُسے یہ کہتا ہے کہ اگر تم مجھے تیس ہزار روپے دے دو تو میں تمہارے لیے ویزے کا انتظام کر سکتا ہوں، اور دونوں کے درمیان تیس ہزار روپے پر معاہدہ ہو گیا، تو کیا اس صورت میں یہ رقم لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر ویزہ اس شخص کا حق بنتا ہو مگر بغیر رشوت کے حاصل نہیں کرسکتا ہو تو پھر دینے والے کے لیے رشوت حرام نہیں ہے البتہ لینے والے کے لیے حرام ہے ہاں اگر اس آدمی کو باقاعدہ طور پر ایک یا دونوں کے لیے اجیر بنا دیا جائے تو پھر لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله :۔ اهل بلدة ثقلت علیهم المؤنات فاستاجروا رجالاً باجر معلوم لیذهب الی السلطان ویرفع القصة لیخفف عنهم السلطان نوع تخفیف واخذ الاجر من عامة اهل البلدة من الاغنیاء والفقراء قالوا ان کان بحال لو ذهب الی بلدة السلطان یتهیأ له اصلاح الامر فی یوم او یومین

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: نقب حانوت رجل واخذ متاعه لا یضمن حارس الحوانیت علی ما علیه الفتوی لان الامتعة محروسة یا بوابها وحیطانها والحارس یحرس الابواب۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص ۹۲ نوع المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۲ ص ۱۱۶ کتاب الاجارة۔

جازت الاجارة وان کان بحال لا یحصل المقصود فی یوم او یومین وانما یحصل فی مدة فان وقتوا الاجارة وقتاً جازت الاجارة وله کل المسمّٰی وان لم یوقتوا افسدت الاجارة وکان له اجر المثل علی اهل البلدة علی قدر مؤنتهم ومنافعهم۔ [1]
(فتاویٰ قاضی خان ج۳ ص۱۸ باب الاجارة الفاسدة)

مسئلہ قفیز الطحان کا حکم

جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقے میں آٹا پیسنے والی مشینیں عام ہیں، لوگ آٹا پسوانے کے لیے گندم وغیرہ لاتے ہیں اور مالکِ مشین نقد کی بجائے بیسواں یا تیسواں حصہ آٹا پیسنے کے عوض اجرت کے طور پر لیتے ہیں، کیا ایسا اجارہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ صورت قبیلہ قفیز الطحان سے ہے یعنی کسی ایسی چیز کو اجرت میں متعین کرنا ہے جو اجیر کے عمل سے وجود میں آتی ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے اجارہ سے منع فرمایا ہے، اس کے صحیح یا ناجائز ہونے پر بہت سی صورتیں موقوف ہیں، ہاں اگر بغیر تعین کے اسی جنس سے پہلے یا بعد میں اُجرت دی جائے تو بالاتفاق جائز ہے۔ مشائخ بلخ نے اپنے علاقہ میں ابتلاءِ عوام وخواص کی بناء پر روٹی کے بارے میں جواز کا فتویٰ دیا ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن آجکل چونکہ اکثر بلاد میں یہ طریقہ مروج ہے، مگر قفیز الطحان کا مسئلہ جوں کا توں رہے گا، عرف کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

---

[1] وفی الهندية: فی الکبریٰ اهل بلدة ثقلت علیهم مؤنات العمل فاستاجروا رجلاً باجرة معلومة لیذهب ویرفع امرهم الی السلطان الاعظم لیخفف عنهم بعض الحیف واخذ الاجرة من عامتهم غنیهم وفقیرهم ذکر هٰهنا انه ان کان بحال لو ذهب الی بلد السلطان تهیأ له اصلاح الامر یوماً او یومین جازت الاجارة وان کان بحال لا یحصل ذٰلک الا بمدة فان وقتوا للاجارة وقتاً معلوماً فالاجارة جائزة والاجر کله له وانه لو لم یوقتوا فهی فاسدة وله اجر مثله۔
(الفتاویٰ الهندية ج۴ ص۵۲۶ الباب الثانی والثلاثون فی المتفرقات۔
ومثله فی شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم مادة ۵۷۰ ص۳۰۶ الفصل الرابع فی اجارة الآدمی۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ومن دفع الى حائك غزلاً لينسجه بالنصف فله اجر مثله وكذا اذا استاجر حماراً يحمل عليه طعاماً بقفيز منه فالاجارة فاسدة لانه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عنه۔

(الهداية ج ۳ ص۳۰۵ باب الاجارة الفاسدة كتاب الاجارات) لہ

شامی کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! شامی کی مندرجہ ذیل عبارت کی وضاحت مطلوب ہے:۔ عن المحیط ما اخذ ته الزانیة ان کان بعقد الاجارة فحلال عند ابی حنیفة لان اجر المثل فی الاجارة الفاسدة طیب۔ کیا واقعی امام صاحبؒ زنا پر اجرت کو حلال سمجھتے تھے؟

الجواب:۔ اولاً تو امام صاحبؒ کی طرف اس کی نسبت ہی صحیح نہیں، اس لیے کہ امام صاحبؒ جیسی متقی اور باکباز شخصیت یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے کہ زنا جیسے قبیح عمل پر اجرت لینا حلال ہے۔

قال العلامة الرافعیؒ: لم ار فیه ولیعبد عن الامام المعروف بالورع۔ (التقریرات ج ۲ ص۲۶۳ باب الاجارة الفاسدة) البتہ بصورت صحت توجیہ یہ ممکن ہے کہ اجارہ میں اصل معقود علیہ زنا نہیں بلکہ ایک امر مباح مثلاً گھر کا کام کاج ہے مگر اس کے ساتھ زنا بطور شرط ٹھہرائی جائے جیسے اجارۂ فاسدہ ہو جاتا ہے لیکن اصل عقد کی وجہ سے اُجرت حلال ہے اگرچہ اس کے ضمن میں زنا بھی ہوتا رہے۔

لہ قال العلامة الحصكفي رحمة الله: ولو دفع غزلاً لاخر لينسجه له بنصفه اى بنصف الغزل اواستاجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه او ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت فى الكل لانه استاجره بجزء من عمله والاصل فى ذلك نهيه صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان وقدمناه فى بيع الوفاء والحيلة ان يفرز الاجر اولا او يسمى قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۵۶ باب الاجارة الفاسدة)

ومثله فى الهندية ج ۴ ص۴۴۴ الفصل الثالث فى قفيز الطحان۔

اجارہ پر جانور پالنے کا طریقہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل یہ رواج عام ہے کہ مالدار آدمی کسی تنگدست کے لیے جانور خریدتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم اسے پالو اس کا جو بچہ ہوگا وہ دونوں کا مشترکہ ہوگا۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس کے جواز کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اُجرت مجہول ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں، البتہ اس کے جواز کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مالدار آدمی جانور سے کر اس کی قیمت لگا دے اور پھر نصف نصف کرے اور چرانے والا اس کو قبول کر کے نصف قیمت ادا کرنے لگے تو اُسے نصف قیمت کی ادائیگی سے بری کر دے اور پھر اس سے کہے کہ تم اس کی پرورش کرو اور اس سے ہونے والا بچہ ہم دونوں کا مشترکہ ہوگا، اگر وہ منظور کرے تب تو دونوں اس جانور کے بچے میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں ورنہ نہیں۔

مشروط میعاد سے قبل دوکان خالی کرنے پر کل میعاد کے کرایہ کا حکم

سوال:۔ کسی شخص نے ایک دوکان تین سال کے لیے کرایہ پر لی، مالکِ دوکان نے کرایہ دار سے یہ طے کیا کہ چاہے تم اس میں پورے تین سال تک کاروبار کرو یا کم، کرایہ تین سال کا ہی ادا کرو گے، کرایہ دار نے یہ شرط قبول کر کے کاروبار شروع کر دیا، ایک سال کے اندر اندر دو مرتبہ دوکان سے چوری ہوگئی، کرایہ دار مالکِ دوکان اور اس کے بیٹوں پر شک کرتا ہے جبکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں کہ دعویٰ کو ثابت کر سکے۔ اور اب وہ اس عذر کی بناء پر دوکان خالی کرنا چاہتا ہے مگر مالکِ دوکان پورے تین سال کا کرایہ لینے پر مصر ہے، یاد رہے کہ مقررہ میعاد پوری ہونے پر دو سال باقی ہیں۔ تو کیا مالکِ دکان بقیہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حسبِ معاہدہ اگرچہ دوکان کا مالک جملہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے مگر عذرِ شرعی کی بناء پر دوکان خالی کرنے کے بعد والی میعاد کا کرایہ وصول نہیں کر سکتا اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: یہ خالی کرنا اگر کسی عذر سے ہے تو کل کرایہ وصول نہ کیا جاوے گا ورنہ وصول کیا جاوے گا۔

۔ (امداد الفتاویٰ ج۳ ص۳۸۷ کتاب الاجارہ)

رشوت کے ذریعے حاصل کیے ہوئے ٹھیکہ کی کمائی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے رشوت دے کر کسی کام کا ٹھیکہ حاصل کیا، پھر شرعی حدود کی خلاف کیے بغیر وہ کام پورا کر کے کچھ کمایا، تو کیا یہ کمائی اس شخص کے لیے حلال اور جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رشوت یا دیگر غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا ٹھیکہ یا کوئی بھی کام فی نفسہٖ جائز نہیں، اور پھر شرعی حدود کی خلاف ورزی کیے بغیر وہ عمل کر کے کچھ کمانا اس عامل کیلئے قابلِ اعتراض نہیں، اگرچہ رشوت دینا اور لینا حرام ہے۔

وفی الهندیة: سئل محمد بن مقاتل رحمه الله تعالیٰ عن رجلٍ سرق ما رئ واساله الیٰ ارضه وکرمه فأجاب انه یطیب لهٗ ما خرج بمنزلة رجل غصب شعیرًا او تبنًا وسمن به دابة فانه یجب علیه مثل ما غصب وما زاد فی الدابة طیب لهٗ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۷۴، ۳۷۵ کتاب الکراهیة، الباب الثلاثون فی المتفرقات)

کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! عصرِ حاضر میں کمیشن کا بہت رواج ہے، مثلاً ایک کاریگر کسی شخص کے لیے دوکان سے سامان لینے جاتا ہے، وہ شخص کاریگر پر اعتماد کرتا ہے کہ میرے لیے عمدہ سامان کم قیمت پر خریدے گا۔ جبکہ بائع (دکاندار) کاریگر کو کمیشن دے کر کم قیمت کا سامان اس پر مہنگے داموں فروخت کرتا ہے، شرعاً اس کمیشن کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دوکاندار (بائع) طرف سے اس خریدار (کاریگر) کو کوئی رقم وغیرہ دینا ناجائز نہیں ہے، تجار کی طرف سے یہ اکرام تجارت کو فروغ دینے کیلئے کیا جاتا ہے اور یہ اصولِ تجارت میں شمار ہے البتہ اس کاریگر کے لیے یہ رقم لینا اُس وقت جائز ہے جبکہ وہ باقاعدہ تک و دو سے وہ چیز خریدے اور پہلے سے کمیشن لینے کی شرط نہ لگائے اور طمع سے دل کو خالی کرے، یعنی دل میں یہ فیصلہ کرے کہ اگر یہ دوکاندار مجھے کمیشن نہ بھی دے تو میں سوائے طبعی بوجھ کے دیگر اثر سے متاثر نہ ہوں گا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو قضی حاجته بلا شرط ولا طمع فاهدی الیه بعد ذٰلك فهو حلال لا بأس به۔ (ردالمحتار ج ۴ ص۳۶۲ فی اقسام الرشوۃ)

ولما قال العلامة الکاسانیؒ: والقیاس فی استئجار الظئر بطعامها وکسوتها انه لا یجوز وهو قول ابی یوسف ومحمدؒ لجهالة الاجرة وهی الطعام والکسوة الا ان اباحنیفةؒ استحسن الجواز بالنص وهو قوله عزوجل وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف من غیر فصل بین ما اذا کانت الوالدة منکوحة او مطلقة وقوله عزوجل وعلی الوارث مثل ذلک ای الرزق والکسوة وذلک یکون بعد موت المولود...... وقولهما الاجرة مجهولة مسلم لکن الجهالة لا تمنع صحة العقد لعینها بل لافضائها الی المنازعة وجهالة الاجرة فی هذا الباب لا تفضی الی المنازعة لان العادة جرت بالمسامحة مع الاظار والتوسیع علیهن شفقة علی الاولاد فاشبهت جهالة القفیز من الصبرة۔

(بدائع الصنائع ج۴ ص۱۹۳ کتاب الاجارة. مطلب فیما یرجع الی المعقود علیہ)

کام میں رکاوٹ پیدا ہونے کے خوف سے ٹھیکیدار کا افسران بالا کو رشوت دینا

سوال: جناب مفتی صاحب! درج ذیل مسئلہ کے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(۱) ایک آدمی سرکاری ٹھیکہ لیتا ہے تو سرکاری آفیسر اس سے بارہ یا پندرہ فیصد ضرور کمیشن لیتے ہیں اور اگر کوئی ٹھیکیدار کمیشن نہ دے تو اس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں نیز سرکاری آفیسر اس کمیشن کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کام کی نگرانی کرتے ہیں، اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ٹھیکیدار بامر مجبوری مذکورہ کمیشن دیتا ہے کیونکہ اس کا ذریعۂ معاش یہی ہے۔ تو کیا ٹھیکیدار کے لیے اس طرح ٹھیکہ لینا جائز ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) روزہ کی خاطر اگر کوئی عورت ایسی گولی استعمال کرے کہ اس کا حیض رک جائے تو کیا روزہ کی خاطر حیض روکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) ٹھیکہ دینے کے بدلے جو افسران ٹھیکیدار سے کمیشن کے نام پر پیسے لیتے ہیں وہ رشوت میں داخل ہے، کام کی نگرانی کرنا ان کا فریضۂ منصبی ہے، اس کے بدلے وہ حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر ٹھیکیدار ٹھیکہ لینے کا حقدار ہو اور بغیر رشوت کے اسے ٹھیکہ نہ دیا جاتا ہو تو بحالتِ مجبوری اس کو تو رشوت دینا مرخص ہے مگر افسران بالا کیلئے لینا ہرگز حلال نہیں۔ ٹھیکیداری کرنا ایک مباح کام ہے اصول اور دیانتداری سے کرنا چاہیئے۔

(۲) حیض بند کرنے کے لیے گولیاں استعمال کرنا کوئی ممنوع عمل نہیں اور نہ اس سے روزے پر کوئی فرق پڑتا ہے تاہم اگر طبی لحاظ سے ایسا کرنا مضر ہو تو اس سے اجتناب کرنا ہی مناسب ہے۔

امام مسجد کا حقِ امامت سے زیادہ چھٹیاں کرنا

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب مہینے میں دس دن غائب رہتے ہیں اور بیس دن حاضر، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ اتنی غیر حاضری کیوں کرتے ہیں؟ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارا امام ہوں یہ میرا حق ہے، تمہیں مجھ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ تو کیا اتنی زیادہ غیر حاضریاں کرنا واقعی شرعاً امام کا حق ہے، اگر ہے تو کتنے دن تک امام غیر حاضری کر سکتا ہے؟ تفصیلی جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ تنخواہ دار شخص کی تعطیلات کا دار و مدار عرف پر مبنی ہے عرف میں جتنے ایام اس کی تعطیل کے ہوں گے اتنے دن چھٹی کرنا اس کا حق ہے، باقی عرف سے زیادہ چھٹیاں کرنا قابلِ گرفت ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ کے نزدیک سال بھر میں پندرہ دن تک کی چھٹی قابلِ معافی ہے۔ لہٰذا مذکورہ امام مسجد اگر سال یا مہینہ میں عرف (طے شدہ معاہدہ) کے مطابق غیر حاضر رہتا ہو تو اس کا مواخذہ کرنا درست نہیں اور اگر عرف سے زیادہ غیر حاضر رہتا ہو تو قابلِ گرفت ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما یترك الامامة لزیادة...... فی الرساتیق اسبوعاً او نحوه او لمصیبة او لاستراحة فلا بأس به ومثله عفو فی العادة والشرع۔ (رد المحتار بحوالہ عزیز الفتاوی ج۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

نمازِ جنازہ پڑھانے کی اُجرت لینا

سوال:۔ بعض علاقوں میں رواج ہے کہ جب کوئی امام مسجد کسی میت کا جنازہ پڑھائے تو میت کے ورثاء اس کو ایک جوڑا کپڑے اور کچھ نقدی بھی دیتے ہیں، اُمراء کے علاوہ فقراء اور نادار لوگ بھی اس رسم کو پورا کرنے پر مجبور ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھنا یا پڑھانا فرضِ کفایہ ہے اور اس کا حکم

لہ قال العلامة مفتی عزیز الرحمٰنؒ: اس کا حاصل یہ ہے کہ امام کو اپنی ضروریات یا راحت کیلئے ایک ہفتہ یا اس کے قریب یعنی پندرہ دن سے کم تک غیر حاضری عرفاً و شرعاً جائز ہے۔ پھر آگے تصریح کی ہے کہ ظاہراً مراد یہ ہے کہ اگر سال بھر میں ہفتہ دو ہفتے غیر حاضری ہو تو معاف ہے۔

(عزیز الفتاوی (فتاوی دار العلوم دیوبند) جلد۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینے کی طرح ہے، جس طرح عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اسی طرح نمازِ جنازہ بھی چونکہ عبادات میں شمار ہے اس لیے اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ تاہم اگر میت کے ورثاء اپنی خوشی سے جنازہ پڑھانے والے کو بلا تعین اور بلا معروف اور مروج ہونے کے کچھ دینا چاہتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دینے اور لینے والے دونوں کی نیت بھی درست ہو۔ اور ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال تاج الشریعة فی شرح الهداية ان القرآن بالاجرة لایستحق الثواب للمیت ولا للقاری...... لولا اجرة ما قرأ احد لاحد فی هذا الزمان۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۵ کتاب الاجارة مطلب فی الاستیجار علی الطاعات) [1]

گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل بعض سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے اپنے ملازمین میں ایک سکیم متعارف کرائی ہے کہ جو افراد مقررہ مدت سے پہلے نوکری چھوڑ دیں تو ادارہ ان کو بقیہ مدت کا معاوضہ اور دیگر مراعات دے گا۔ تو گیا نوکری چھوڑنے کے عوض یہ معاوضہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ وظیفہ کا شمار حقوقِ مجردہ میں ہوتا ہے جس کے عوض مالی معاوضہ یا کسی قسم کی مراعات لینا حرام و ناجائز ہے، مگر موجودہ ملکی قوانین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا

---

[1] لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمنؒ: (الجواب) نمازِ جنازہ پڑھانے کی وجہ سے روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے کہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ و عبادت ہے اور عبادت پر روپیہ پیسہ لینا جائز نہیں جیسا کہ تلاوتِ قرآن مجید پر روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے، اور دینے والا اور لینے والا اگرچہ معاوضہ اور اُجرت کا نام نہ لیویں لیکن بحکم المعروف کالمشروط جب کہ یہ لینا دینا بعد نمازِ جنازہ و تلاوتِ کلام اللہ معروف ہوگیا ہے اور نمازِ جنازہ پڑھنے پڑھانے والے اور قرآن شریف پڑھنے والے اسی خیال اور نیت سے پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ ہم کو روپیہ پیسہ ملے گا لہٰذا یہ لینا دینا ناجائز ہے۔ (عزیز الفتاوٰی (فتاوٰی دار العلوم دیوبند) جلد ۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

ہے کہ اس قسم کی مراعات ملازمین کے ایسے حقوق ہیں کہ بغیر کسی ملازم کی اجازت و رضامندگی کے کوئی اور ان مراعات کو حاصل نہیں کر سکتا، نیز قانونی تحفظ کی وجہ سے یہ حقوق ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اس لیے متاخرین فقہاء کرام نے اس قسم کے (حق النزول) حقوق سے دستبردار ہو کر مالی معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، حکومت کی گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی حیثیت بھی انہی حقوق کی طرح ہے، اس لیے ملازمین کا اپنی مدتِ ملازمت ختم ہونے سے قبل استعفاء دینے کے عوض سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے پیسے لینا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: قوله ويفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال، قال العلامة العينيؒ: فى فتاوه ليس للنزول شئ يعتمد عليه ولكن العلماء والحكام مشوا ذلك للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً يقع فيه نزاع..... فى باب القسم بين الزوجات انه سمع من بعض شيوخه الكبار انه يمكن ان يحكم بصحة النزول عن الوظائف الدينية قياساً على ترك المرأة قسمها لصاحبتها لان كلا منهما مجرد اسقاط..... واستدل بعضهم للجواز بنزول سيدنا الحسن بن على رضى الله عنه عن الخلافة لمعاوية رضى الله تعالى عنه على عوض وهو ظاهر ايضاً وهذا اولى مما قدمنا فى الوقف عن الخيرية من عدم الجواز ومن ان للمفروغ له الرجوع بالبدل بناء على ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص وانه لا يجوز الاعتياض عن مجرد الحق لما علمت من ان الجواز ليس مبنيا على اعتبار العرف الخاص بل على ما ذكرنا من نظائره الدالة عليه وأن عدم جواز الاعتياض عن الحق ليس على اطلاقه ورأيت بخط بعض العلماء عن المفتى ابى السعود انه افتى بجواز اخذ العوض فى حق القرار والتصرف وعدم صحة الرجوع وبالجملة فالمسئلة ظنية والنظائر متشابهة للبحث فيها مجال۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۵۰۹، کتاب البیوع مطلب فى النزول عن الوظائف بمال)[1]

---

[1] لما قال العلامة خالد الاتاسيؒ، اقول وعلى ما ذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغى ان يجوز الاعتياض عن حق التعلى وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال لان هذه الحقوق لم تثبت لاصحابها لاجل دفع الضرر عنهم بل تثبت لهم ابتداء بحق شرعى..... فاذا نزل عنه لغيره بمال معلوم ينبغى ان يجوز ذلك على وجه الفراغ والصلح لا على وجه البيع كما جاز النزول عن الوظائف۔

(شرح المجلة لخالد الاتاسى ج ۲ ص ۱۲، کتاب البیوع قبل الفصل الثالث)

نائی (حجام) کو دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:۔ کیا کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینا جائز ہے؟ جبکہ یہ لوگوں کی داڑھی مونڈتے اور بال یہودیوں کی طرح بناتے ہیں، حالانکہ ارشاد قرآنی ہے: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ الخ (یعنی گناہ کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو) اس لحاظ سے کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینے والا تعاون علی المعصیت کا مرتکب تو نہیں ہوگا؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ حجامت کا پیشہ ایک ضروری عمل ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اس میں شرعی حدود وقیود کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اگر اس میں خلاف شرع عمل کیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کام (حجامت وغیرہ) کے لیے دوکان یا مکان کرایہ پر دینا بھی تعاون علی المعصیت ہے جو بنص قرآنی حرام ہے لہٰذا خلافِ شرع حجامت بنانے والے نائی (حجام) کو مکان یا دوکان کرایہ پر دینا صحیح نہیں اور نہ اس کی آمدنی درست ہے۔

اجارہ فاسدہ کے جواز کی صورت

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی ٹیکسی کسی ڈرائیور کو اس شرط پر دی کہ تم اس کو چلاؤ جو منافع ہوگا اس میں سے ۶۰ فیصد میرا ہوگا اور ۴۰ فیصد آپ کا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ اجارہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اجارہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ مقدار اجرت اور مدت وغیرہ متعین ہو اگر کہیں اجرت یا مدت میں جہالت آجائے تو اجارہ فاسد ہو جائے گا اسلئے کہ جہالت مفضی الی النزاع ہوتی ہے اور عموماً جھگڑا اور فساد پیدا کرتی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اُجرت اگرچہ مجہول ہے جس کی وجہ سے اجارہ فاسد ہونا چاہیئے، مگر آجکل چونکہ اس طرح کے معاملات بکثرت ہوتے ہیں اور لوگ ایسے معاملہ کو مفضی الی النزاع نہیں بناتے، اسلئے مذکورہ معاملہ بھی درست ہے کیونکہ فساد نہ ہونے کی صورت میں معاملہ فی ذاتہ درست اور صحیح ہوتا ہے البتہ کسی فاسد وصف کی وجہ سے اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جب اس فساد کی علت ختم ہو جائے تو وہ معاملہ اپنے حال پر باقی رہتا ہے۔ فقہی ذخائر میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں اور ویسے بھی عموم بلویٰ کی وجہ سے احکام تبدیل ہوتے ہی رہتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: الفاسد من العقود ما کان مشروعاً باصله دون وصفه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۵ باب الاجارة الفاسدة)

بداخلاقی کی بناء پر مدرسے سے خارج کیے گئے مدرس کیلئے پورے سال کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:۔

(۱) کسی بھی دینی مدرسہ میں ایک مدرس سال بھر کا اجیر ہوتا ہے، کیا اس کا وظیفہ سالانہ اُجرت کی بنیاد پر ہوتا ہے یا ماہانہ اُجرت کی بنیاد پر، اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) یہ کہ ایک مدرسہ کے مدرس کو مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ نے اخلاقی جرائم میں ملوث ہونے اور دیگر غیر اخلاقی حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکال دیا ہے، تو کیا ایسا مدرس سال کے باقی دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دینی مدارس کے مدرس کی حیثیت اجیرِ خاص کی ہے اور وہ اُجرت کا تب مستحق ہوتا ہے جب وہ مدرسہ کے عمل کے لیے اپنے آپ کو مدرسہ کے حوالے کر دے اور ساتھ ہی اس میں مدرسہ کی طرف سے تفویض کردہ کام کرنے کی صلاحیت بھی ہو، اگر کسی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت مفقود ہو جائے اور وہ نااہل ثابت ہو جائے اور مدرسہ کی انتظامیہ اس کو نااہلیت کی بناء پر ذمہ داری (ملازمت) سے سبکدوش کر دے تو وہ سال کے بقیہ دنوں کی تنخواہ کا حقدار نہ ہوگا اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ بلاضرورت اور بغیر کسی معقول عذر کے اس کو قبل از وقت مقررہ سبکدوش کر دے تو وہ سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا حقدار ہے۔

(۲) لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر مدرس کو اخلاقی جرائم اور دیگر ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکالا گیا ہو تو اس کو سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ دینی مدارس میں عرف کی بناء پر ایک مدرس اپنی پوری صلاحیت اور اہلیت کے ساتھ سال بھر کا اجیر ہوتا ہے اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ اس کو بلاضرورت و بلاعذر کے نکالنا چاہے تو اس مدرس کو بقیہ ایام کی تنخواہ دی جائے گی۔

لما فی مجلۃ الاحکام: الاجیر یستحق الاجرۃ اذا کان فی مدۃ الاجارۃ حاضراً للعمل ولا یشترط عملہ بالفعل ولکن لیس لہٗ ان یمتنع عن العمل واذا امتنع لا یستحق الاجرۃ۔ (درر احکام فی شرح مجلۃ الاحکام ج ۱ ص۴۵۸)

لما فی احسن الفتاویٰ: اگر مدرس کو واقعتہً نااہلیت کی بناء پر معزول کیا گیا ہے تو وہ شعبان تک کی تنخواہ کا مستحق نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ج ۷ ص۲۸۶)

وفی احسن الفتاوی : طلباء کم ہونے کا عذر قابلِ قبول نہیں، اگر مہتمم نے بلاضرورت مدرس رکھا ہے تو پورے سال کی تنخواہ اپنے پاس سے دے کیونکہ عقد تدریس مسانہہ ہے ۔
(احسن الفتاوی ج ۷ ص ۲۹۵)

وھکذا فی احسن الفتاوی : مدرسین سے عقد مسانہہ ہے لہٰذا بہرصورت ابتداءِ شوال سے انتہاءِ رمضان تک پوری تنخواہ دی جائے گی۔ (احسن الفتاوی ج ۷ ص ۲۸۲)

یہاں یہ یاد رہے کہ احسن الفتاوی سے مؤخر الذکر حوالجات کا مقصد یہ ہے کہ مدرس میں صلاحیت اور اہلیت ہونے کے باوجود اہلِ اہتمام اس کو بلاوجہ شرعی معزول کریں تو مابعد کے مہینوں کی تنخواہ کا مدرس حقدار ہے، ورنہ نااہلیت کی وجہ سے برطرفی کی صورت میں مابعد کے مہینوں کی تنخواہ نہیں ۔

ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ دینی مدرسہ کے ایک مدرس نے مدرسہ کی سالانہ تعطیلات کے بعد مدرسہ کی انتظامیہ کو اپنا استعفا پیش کر دیا۔ تو کیا عند الشرع اور قوانین مدارس دینیہ کی رُو سے یہ مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ فقہاءِ کرام نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، مگر اس کے لیے فقہاء کی عبارتوں سے چند شرائط بھی معلوم ہوتی ہیں ؛

(۱) ایک یہ کہ مدرس کے ساتھ پہلے سے یہ طے نہیں کیا گیا ہو کہ آپ کو ایامِ تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی، جو کچھ تنخواہ تمہارے لیے مقرر ہے وہ صرف ایامِ تدریس ہی میں تمہیں دی جایا کرے گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مدرس ایامِ تعطیل کے بعد بھی کام کرنے (تدریس) کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی طرف سے کام کو چھوڑے بھی نہیں ۔

تو جب یہ دو شرطیں موجود ہوں تو پھر مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، کیونکہ یہ تعطیلات بھی ایک طرح سے تدریس ہی کے حکم میں ہیں کہ ان میں آئندہ تدریس کے لیے مدرس کو آرام اور استراحت ملتی ہے جو آئندہ کام کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر تقرری کے وقت ہی مدرس سے یہ طے کر لیا جائے کہ آپ کو صرف تدریس کے دنوں کی تنخواہ

ملے گی ایام تعطیل کی نہیں، تو اس صورت میں مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوگا، شرعی قانون یہ ہے کہ الشرط املک ـــــ اسی طرح اگر عرف وہاں منتظمین مدارس کا یہ ہو کہ عام مدرسین اور ملازمین کو تعطیلات کے دنوں کی تنخواہ نہ ملا کرتی ہو تو اس صورت میں بھی ایام تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی کہ المعروف کالمشروط اور العادۃ محکمۃ۔

نیز اگر کوئی مدرس مزید کام کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوئے خود استعفا پیش کرکے کام کرنا چھوڑ دے تو پھر بھی وہ تنخواہ کا مستحق اس بناء پر نہیں ہے کہ نہ تو تدریس کا کام اس نے کیا ہے نہ تعطیلات آئندہ کے لیے کام کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

درمختار (جلد ۳ صفحہ ۵۲۵) میں ہے: وھل یأخذ المدرس ایام البطالۃ کعید و رمضان؟ لم أرہ وینبغی الحاقہ ببطالۃ القاضی واختلفوا فیھا والاصح انہ یأخذ لانھا للاستراحۃ (اشباہ عن قاعدۃ العادۃ محکمۃ) اھ

علامہ شامیؒ اس عبارت کے تحت لکھتے ہیں: قال فی الاشباہ وقد اختلفوا فی اخذ القاضی ما فی بیت المال فی یوم البطالۃ فقال فی المحیط انہ یاخذ لانہ یستریح للیوم الثانی وقیل لا اھ وفی المنیۃ القاضی یستحق الکفایۃ من بیت المال فی یوم البطالۃ فی الاصح وفی الوھبانیۃ انہ الاظھر فینبغی ان یکون کذلک فی المدرس لان یوم البطالۃ للاستراحۃ وفی الحقیقۃ تکون للمطالعۃ والتحریر عند ذوی الھمۃ۔ اھ (الدرالمختار جلد ۳ صفحہ ۵۲۵)

ان عبارتوں میں استحقاق کے لیے علت استراحت بیان کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ استحقاق اس وقت ہوتا ہے جب آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو اور کام کو خود نہ چھوڑے تو تعطیل کا حکم چونکہ تدریس کا ہوگا اور حکماً یہ سمجھا جائے گا کہ مدرس تعطیل کے ایام میں برسرکار ہے اور گویا وہ تدریس ہی میں مشغول ہے اس لیے وہ تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا۔

صورت مسئولہ میں چونکہ مدرس نے خود استعفا دے کر آئندہ کام نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اس لیے تعطیل کے ایام اس کے حق میں آئندہ تدریس کے لیے ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتے ہیں اور حقیقتاً تدریس میں مشغول بھی نہیں ہے اس لیے ایام تعطیل کی تنخواہ کا بھی مستحق نہیں رہے گا۔

داخلہ و ماہانہ فیس کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ آجکل بعض دینی مدارس میں بھی سالانہ یا ماہانہ فیس لی جاتی ہے۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے جبکہ فیس کی رقم سے

طلباء کی بود و باش اور مدرسہ کے مدرسین اور دیگر ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کیا جاتا ہے

الجواب :۔ یہ کوئی جبری معاملہ نہیں بلکہ داخلہ لینے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس شرط کو منظور کرکے داخلہ لے یا شرط نا منظور کرکے داخلہ نہ لے۔ اور نہ یہ اجرت ہے بلکہ اس کی حیثیت چندہ کی ہے اور چندہ میں شرط لگانا جائز ہے۔ کما فی امداد الاحکام ۳/ ۶۰۲۔ الجواب :۔ جائز ہے کیونکہ یہ اُجرت نہیں اور چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا۔ جس کو منظور نہ ہوگی اس کو عدم داخلہ کا اختیار ہوگا۔

اُجرت الدلال پر اشکال کا جواب

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! فتاویٰ حقانیہ ۶/ ۲۰۰ میں دلالی پر اجرت لینے کو جائز لکھا گیا ہے۔ اس پر مجھے اشکال پیدا ہوا ہے کہ دلالی پر اُجرت قفیز الطحان کی طرح ہے اس لئے کہ ایک تو دلال جزء من العمل لے رہا ہے۔ اور دوم دلال قادر بقدرۃ الغیر ہے کیونکہ جب تک اس چیز کو دوسرا شخص خریدے گا نہیں دلال فروخت کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ براہ کرم میری اس اشکال کو حل فرمائیں۔

الجواب :۔ دراصل دلالی کی اُجرت کے جواز کا فتویٰ خلاف القیاس ہے۔ اور یہ فتویٰ عوام کی سہولت اور حاجت کی وجہ سے دیا گیا ہے لما قال ابن عابدین (قولہ اومدۃ) الا فیما استثنیٰ قال فی البزازیہ اجارۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاکی ما لا یقدر فیہ الوقت ولا قدر العمل تجوز لما کان للناس بہ حاجۃ ویطیب الاجر الماخوذ لو قدر اجر المثل اھ (رد المحتار ۵/ ۳۲ کتاب الاجارۃ)

سفارش پر اجرت لینے کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص اپنے کسی جائز کام کے لیے کسی سے افسران بالا کے ہاں سفارش کرائے تاکہ وہ اس کا کام کر دیں، تو کیا سفارش کرنے والا شخص اپنے اس عمل (سفارش) پر اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی کے جائز کام کی سفارش کرنا کار ثواب ہے، اس کے علاوہ مال غیر متقوم بھی ہے، اس لیے ان دونوں وجوہ کی بناء پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی ؒ: (الجواب) وجہ منع صرف اجرت علی الطاعۃ میں منحصر نہیں، یہ بھی احد الوجوہ ہے، دوسری وجہ منع کی اس عمل کا غیر متقوم عند الشرع ہونا ہے جیسا کہ فقہاء نے اجارہ اشجار التجفیف الثیاب کو منع کہا ہے، پس شفاعت بھی غیر متقوم ہے ۔۔۔ الخ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الاجارہ)

زمین اجارہ پر دینے کی ایک قسم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی زمین کاشتکاروں کو اس شرط پر دیتے ہیں کہ مثلاً دس کنال زمین پر ہر چھ ماہ بعد فی کنال پانچ من گندم اور پانچ من مکئی کاشتکار مالکِ زمین کو دے گا اور فصل کی کاشت پر اٹھنے والے اخراجات کاشتکار کے ذمہ ہوں گے اور اسے مکمل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جو فصل چاہے کاشت کرے مگر مالکِ زمین کو وہ فصلانہ کے طور پر گندم اور مکئی ہی دے گا۔ تو کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں بیان کردہ صورت مزارعت کی نہیں بلکہ اجارہ کی ہے اور اجارہ میں ہر وہ چیز اجرت بن سکتی ہے جس کا تجارت میں ثمن بننا صحیح ہو، چونکہ گندم اور مکئی دونوں مال متقوم ہیں اسلئے ان کو اجرت قرار دینا صحیح ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: و ما یصلح ثمنا یصلح اجرة۔ (الھدایة ج ۳ کتاب الاجارة)

اور اسی طرح زمین کو اجارہ پر دینا بھی شرعاً درست ہے اس لیے کہ اجارہ کا مقصد کسی چیز سے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ ایضاً: و یجوز استیجار الارض للزراعة لانها منفعة مقصودة وللستاجر الشرب والطریق۔ (الھدایة ج ص کتاب الاجارة)

مگر اس معاملہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ:۔

(۱) مدت اجارہ کا تعین ہو۔

(۲) جو چیز کاشت کرنی ہو وہ بیان کر دی جائے یا کاشتکار کو مکمل اختیار دیا جائے جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں درج ہے۔

(۳) اجرت میں گندم یا مکئی کے ساتھ اسی زمین کی پیداوار کی قید نہ لگائی جائے اور نہ اس زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار کی شرط لگائے البتہ جو گندم یا مکئی اجرت کے طور پر لینی ہو اس کی صفت اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط کا پہلے سے تعین کر لیا جائے تاکہ عقد اجارہ میں کوئی نامناسب حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ (فقط واللہ اعلم)

کتاب
الشفعة

جار الدار احق بالدار من غيره

کتاب الشفعۃ
(شفعہ کے احکام ومسائل)

شُفعہ کے حقدار

سوال:۔ از روئے شرع شُفعہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے سب سے پہلے شریک فی نفس المبیعہ کو شُفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس کے بعد شریک فی حقوق المبیع کو جبکہ آخر میں جار (ہمسایہ) کو شُفعہ کا حقدار ٹھہرایا ہے۔

لما قال الشیخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: الشُّفعۃ واجبۃٌ للخلیط فی نفس المبیع ثمّ للخلیط فی حق المبیع کالمشرب والطریق ثمّ للجار۔
(مُختصر القدوری ص۱۲۰ کتاب الشُّفعۃ) لہ

تبادلہ میں حقِ شفعہ کا اثبات

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی قطعہ کا دوسرے شخص کی زمین سے تبادلہ کرے تو کیا اس تبادلہ سے حقِ شفعہ ثابت ہوگا یا نہیں؟ اگر شفیع زمین کو لینا چاہے تو اس کے ذمہ زمین کی ادائیگی لازم ہوگی یا قیمت دینا ہوگی؟

الجواب:۔ جہاں تک شفعہ کے اثبات کا مسئلہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عقار کے تبادلہ میں ہر ایک کو شفعہ کا حق حاصل رہتا ہے، اس لیے کہ حقِ شفعہ کے تمامتر وجوہات یہاں بھی موجود ہو سکتے ہیں، تاہم زمین ذوات القیم ہونے کی وجہ سے زمین کی جگہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اشتریٰ دارًا بعوض

لہ قال العلامۃ ابوالبرکات محمود النسفیؒ: وتجب للخلیط فی نفس المبیع ثمّ فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصًا ثمّ للجار الملاحق۔
(کنز الدقائق ص۴۰۲ کتاب الشّفعۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۱۹،۲۲۰ کتاب الشفعۃ۔

اخذھا الشفیع بقیمتہ لانہٗ من ذوات القیم...... وان باع عقاراً بعقار اخذ الشفیع کل واحد منھما بقیمۃ الآخر لانہ بدلہ وھو من ذوات القیم فیأخذہ بقیمتہ ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۳۹۶ کتاب الشفعۃ) [۱]

حقِ شفعہ کو فروخت کرنا

سوال:۔ اگر شفیع مشتری سے حقِ شفعہ کے عوض مال طلب کر کے اپنا حقِ شفعہ چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کرے تو شفیع کے لیے مشتری سے ایسی رقم لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ساقط کرنے کے عوض رقم لینا حرام اور واجب الرد ہے کیونکہ یہ حق مجرد ہے جس کے ذریعے خود سے صرف ضرر دور کرنا مقصود ہے حصولِ منفعت نہیں، تاہم اگر شفیع ایسی حرمت پر اقدام کرے تو اس سے حقِ شفعہ ساقط ہو کر مشتری کی ملکیت خریدی ہوئی جائیداد میں مؤکد ہو جاتی ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ : وان صالح من شفعتہ علی عوض بطلت شفعتہ ورد العوض ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۰۴ کتاب الشفعۃ) [۲]

قبل البیع مصالحت سے حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر باقاعدہ خرید و فروخت سے قبل ہی شفیع نے مشتری سے معاہدہ کر کے مصالحت کی ہو تو کیا بیع کے بعد دوبارہ شفیع کو دعویٰ شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: حقِ شفعہ کا ثبوت بیع پر مرتب ہوتا ہے، قبل البیع چونکہ اس کی

---

[۱] قال الشیخ ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ : ومن اشتریٰ داراً بعوض اخذ الشفیع بقیمتہ لانہ من ذوات القیم وان اشتریھا بمکیل اوموزون اخذھا بمثلہ لانہٗ من ذوات الامثال ۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۱ ص۳۴۱ کتاب الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۳۱ کتاب الشفعۃ ۔

[۲] قال العلامۃ ابوالبرکات محمود النسفیؒ : وتبطل بالصلح عن شفعتہ علیٰ عوض وعلیہ ردہ ۔ (کنز الدقائق ص۴۰۵ کتاب الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل بہ حق الشفعۃ ۔

کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اس لیے خرید فروخت سے قبل ایسی مصالحت اسقاطِ شفعہ پر مؤثر نہیں بلکہ بیع کے بعد شفیع کو بدستور حقِ شفعہ حاصل رہے گا ۔

لما قال العلامة علاؤ الدين ابو بكر الكاسانيؒ: ولا يصح تسليم الشفعة قبل البيع لانه اسقاط الحق واسقاط الحق قبل وجوبه ووجود سبب وجوبه محالٌ۔ (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج ۵ ص۱۹ كتاب الشفعة) ۱؎

متعدد شفعاء میں سے بعض کے اسقاط سے دوسرے متاثر نہیں ہوتے

سوال: اگر متعدد افراد شفعہ کا حق رکھتے ہوں اور ان میں سے بعض اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو کیا اس سے دوسرے شرکاء پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب: حقِ شفعہ میں ہر حقدار کا استحقاق مستقل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کے اپنے حق سے دستبردار ہونے سے دوسرے حقدار کا حق زائل نہیں ہوتا بلکہ قبل القضاء کسی ایک شریک کا اسقاط کرنے سے دیگر تمام شرکاء کو فائدہ ہوگا جس کی رو سے دوسرے شرکاء اس کے جملہ حق شفعہ کے حقدار ہوں گے ۔

لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن علي الزيلعيؒ: ولو اسقط بعضهم حقه قبل القضاء لهم كان لمن بقي ان يأخذ الكل لان السبب لاستحقاق الكل قد وجد.... بخلاف ما اذا اسقط حقه بعد القضاء حيث لا يكون له ان يأخذ نصيب التارك لانه بالقضاء قطع حق كل واحد منهم في نصيب الآخر۔
(تبيين الحقائق ج۵ ص۲۴۱ كتاب الشفعة) ۲؎

۱؎ وذكر في الهندية: تسليم الشفعة قبل البيع لا يصح وبعده صحيح۔
(الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فيما يبطل به الشفعة)
ومثله في شرح المجلة لشيخ سليم رستم باز مادة ۱۰۲۳ ـ

۲؎ قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: (اسقط بعضهم حقه) من الشفعة (بعد القضاء) فلو قبله فلمن بقي اخذ الكل لزوال المزاحمة (ليس لمن بقي اخذ نصيب التارك) لانه بالقضاء قطع حق كل واحد منهم في نصيب الأخر۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲۰/۲۲۱ كتاب الشفعة)
ومثله في البحر الرائق شرح كنز الدقائق ج۸ ص۱۲۸ كتاب الشفعة ۔

دھوکہ دہی سے حقِ شفعہ متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ بسا اوقات بائع اور مشتری باہم کسی ایک رقم پر اتفاق کرکے شفیع پر اتنی بڑی رقم ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے مبیعہ کا لینا شفیع کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس صورت میں اگر شفیع ناقابلِ تحمل قیمت کی وجہ سے شفعہ چھوڑ دے اور بعد میں کسی معتبر ذریعہ سے ان کا دھوکہ ظاہر ہوکر اصل قیمت معلوم ہو جائے تو کیا سابقہ اسقاط کے بعد بھی شفیع اپنا حقِ شفعہ استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسے دھوکے سے حقِ شفعہ کے اسقاط پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جب بھی شفیع پر بائع اور مشتری کے دھوکہ کی حقیقت ظاہر ہو تو سابقہ اسقاط کا اعتبار نہیں رہتا اب بھی شفیع اپنا حق استعمال کرکے مشتری سے مبیعہ لے سکتا ہے۔

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: واذا بلغ الشفیع انها بیعت بالف فسلم الشفعة ثم علم انها بیعت باقل من ذٰلك او بحنطة او شعیر قیمتها الف او اکثر فتسلیمه باطل وله الشفعة۔ (مختصر القدوری ص۱۶۴ کتاب الشفعة) [1]

مشترکہ زمین کا کچھ حصہ خریدنے سے حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک زمین جو کہ چند اشخاص کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک نے دوسرے ساتھی کا حصہ خرید لیا تو باقی شرکاء نے اس پر حقِ شفعہ کا دعویٰ کردیا، تو کیا از روئے شرع یہ مشتری اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ حقِ شفعہ میں شریک ہوگا یا بسبب شراء اس کا حق ساقط متصور ہوگا؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی شراکت دار کا حصہ خریدنا کوئی ایسا فعل نہیں جس سے مشتری کی بیزاری سمجھی جائے، بلکہ بسا اوقات کسی زمین یا گھر کی خریداری سے حقِ شفعہ کا اثبات مقصود ہوتا ہے اس لیے خریدار دوسرے شفعاء کے ساتھ شفعہ

---

[1] لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا بلغ الشفیع انها بیعت بالف درهم فسلم ثم علم انها بیعت باقل او بحنطة او شعیر قیمتها الف او اکثر فتسلیمه باطل وله الشفعة۔ (الهدایة ج۴ ص۴۰۵ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۴۰۵ کتاب الشفعة۔

بیں شریک رہے گا۔

لما قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعة بینھم علیٰ عدد رؤسھم ولا یعتبر اختلاف الاملاک۔

(الھدایة ج۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعة) [1]

وقف شدہ زمین پر کسی کو شفعہ کا حق نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی جائداد جزوی یا کلی طور پر کسی مسجد یا مدرسہ کے لیے باقاعدہ وقف کر دے تو کیا اس سے اس کے شرکاء یا ہمسایہ کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حق شفعہ کے ثبوت کے لیے مالی معاوضہ کا ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے، وقف میں یہ حقیقت مفقود ہوتی ہے، اس میں واقف کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے مسجد، مدرسہ یا کسی دوسرے رفاہی ادارہ کے لیے وقف کی ہوئی چیز پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: الشفعة تملیک البقعة جبرا علی المشتری بما قام علیہ .... ولا شفعة فی الوقف۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۱۶، ص۲۲۳ کتاب الشفعة) [2]

برساتی نالے سے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا وہ خشک نالہ جس میں صرف بارش کا پانی بہتا ہو، سے حق شفعہ ثابت

---

[1] قال الشیخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعة بینھم علیٰ عدد رؤسھم ولا یعتبر باختلاف الاملاک۔ (مختصر القدوری ص۱۶۴ کتاب الشفعة)

ومثلہ فی شرح مجلة الاحکام للشیخ سلیم رستم بازؒ ص۵۶۶ مادة ۱۰۱۳۔

[2] لما قال الشیخ سلیم رستم بازؒ: الشفعة ھی تملیک الملک المشتری بما قام علی المشتری من الثمن۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۹۵۰ ص۵۳۷)

وقال ایضاً: ولا تجری الشفعة فی السفینة وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضی الامیریة۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۱۰۱۷ ص۵۶۸)

ومثلہ فی کنز الدقائق ص۴۰۳ وتنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۲ کتاب الشفعة۔

ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے جہاں کسی کو شریک فی حقوق المبیع میں شفعہ کا حق دیا ہے وہاں اس میں یہ شرط بھی رکھی ہے کہ حقوقِ خاص انہی کا منتفاع ہو۔ چونکہ خشک نالے میں یہ شرط مفقود ہے اس لیے اس سے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة ابوالبرکات احمد بن محمود النسفیؒ: تجب للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصًا۔ (کنزالدقائق ص۴۲ کتاب الشفعة) [1]

تاخیر سے حقِ شفعہ کا بطلان

سوال: طلب مواثبت واشہاد کی جملہ ذمہ داریوں کے نباہنے کے بعد طلبِ خصومت میں کتنی مدت تک تاخیر سے ایسے حق پر اثر نہیں پڑتا؟

الجواب: مفتی بہ قول کی رُو سے بغیر کسی معقول عذر کے ایک مہینہ تک تاخیر کرنا قابلِ تحمل ہے، اتنی مدت میں اپنے حق کے حصول سے غفلت اختیار کرنا حق چھوڑنے کے مترادف ہے، نیز بلاوجہ اتنی تاخیر کرنا بسا اوقات مشتری کی ایذاء رسانی کا باعث بنتی ہے۔

لما قال العلامة فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: قال شیخ الاسلام الفتوٰی الیوم علیٰ أنه اذا أخر شهرًا اسقطت الشفعة لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار بالغیر۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۳ کتاب الشفعة) [2]

---

[1] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: والثانی ان یکون خلیطاً فی حق المبیع کالاشتراك فی حق الشرب الخاص والطریق الخاص۔

(شرح مجلة الاحکام مادة ۱۰۰۸ ص۵۶۳)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲ کتاب الشفعة۔

[2] وذکر فی الهندیة: عن محمدؒ وزفرؒ رحمهما الله وهو روایة عن ابی یوسفؒ ان أسهل وترك المخاصمة شهرًا من غیر عذر تبطل شفعته والفتوٰی علیٰ قولهما۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۵ ص۱۷۳ الباب التاسع فیما یبطل به الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعة۔

غیر مسلم کو حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک عیسائی صاحب جائیداد ہے اس کے قریب ایک مسلمان نے اپنی زمین کسی دوسرے مسلمان پر فروخت کی، اب اس غیر مسلم عیسائی نے اُس زمین پر شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے، تو کیا کسی غیر مسلم کو مسلمان کی زمین پر شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے جس طرح ایک مسلمان کو شفعہ کا حق دیا ہے تو اسی طرح کافر (غیر مسلم) کو بھی شراکت یا جوار کی وجہ سے مبیعہ پر شفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اُس عیسائی کا دعویٰ شفعہ درست ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: أما اسلام الشفیع فلیس بشرط لوجوب الشفعة فتجب لاهل الذمة فیما بینهم وللذمی علی المسلم لان هذا حق التملك علی المشتری بمنزلة الشراء منه والکافر والمسلم فی ذٰلك سواء لانه من الامور الدنیویة۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۶ فصل شرائط الشفعة)[1]

حمل کو بھی حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آج سے تقریباً ۱۴، ۱۵ سال پہلے میں نے ایک قطعہ زمین خریدا تھا، اب اس پر ایک نوجوان (جس کی عمر بھی ۱۴، ۱۵ سال کے لگ بھگ ہے) شفعہ کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور میرا غالب گمان یہ ہے کہ جس وقت میں نے زمین خریدی تھی یہ لڑکا اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، کیا اس لڑکے کو حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آپ کی خریداری کے وقت اگر یہ لڑکا پیدا ہو چکا تھا تو اس کو بالغ ہونے تک شفعہ کا حق حاصل ہے، اور اگر پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ماں کے پیٹ میں تھا پھر بھی شریعتِ اسلامی اس کو شفعہ کا حق دار قرار دیتی ہے بشرطیکہ آپ کے زمین خریدنے

---

[1] قال الشیخ وهبة الزحیلی: وتثبت الشفعة عند المالکیة والشافعیة والظاهریة للذمی الکافر علی المسلم کما قال الحنفیة...... واتفق الفقهاء علی ان الشفعة تثبت للذمی علی الذمی۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۰۳ المبحث الثالث الشفیع)

ومثله فی اللباب شرح الکتاب (المیدانی) ج۲ ص۴۴ کتاب الشفعة۔

اور بچے کی ولادت بیں کم ازکم چھ ماہ کی مدت ہو اور اگر اس سے زیادہ ہو تو پھر حقِ شفعہ باطل ہے۔

وفی الهندية: والحمل فی استحقاق الشفعة والكبير سواء فان وضعت لاقل من ستة اشهر منذ وقع الشراء فله الشفعة وان جاءت به لستة اشهر فصاعدا منذ وقع الشراء فانه لا شفعة له لانه لم يثبت وجوده وقت البيع۔ (الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۱۹۱ الباب الثانی عشر فی شفعة الصبی) [1]

حقِ شفعہ سنِ بلوغ تک موقوف ہوگا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میری صغر سنی میں میری زمین کے قریب کچھ زمین فروخت ہوئی تھی، اُس زمانے میں میرا کوئی ولی نہیں تھا اور اب میں بالغ ہو چکا ہوں تو کیا اس زمین پر مجھے شرعاً حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ ایک صاحب نے مجھے کہا ہے کہ مدتِ طویلہ گذر جانے کی وجہ سے آپ کا حقِ شفعہ باطل ہو چکا ہے مہربانی فرماکر شریعت کے مطابق میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ شریعتِ اسلامی میں یہ ہے کہ جب شفیع نابالغ ہو تو اُس کے باپ دادا کو شفیع کے لیے حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا چاہیئے لیکن جس کا کوئی بھی ولی نہ ہو تو تو یہ حق اُس کے سنِ بلوغ تک باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر حقیقتاً اُس وقت آپ کا کوئی ولی نہیں تھا اور آپ اب بالغ ہوئے ہیں تو آپ کو شفعہ کا حق حاصل ہے، ایسی صورت میں مدتِ طویلہ کا گذرنا آپ کے حقِ شفعہ کو باطل نہیں کرتا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: الجواب نعم وفی الاصل الوصی يطلب الشفعة للصغير ويقوم مقامه فی لوازمها كالاب والجد...... فان لم يكن له احد من هؤلاء فهو علی شفعته اذا ادرك فاذا ادرك وقد

---

[1] قال العلامة محمد الشهير الطوروی رحمه الله: صح تسليمهم الشفعة من الاب والوصی والوكيل يعنی ان الحمل والصغير فی استحقاق الشفعة كالكبير لاستوائهما فی سببه فيقوم بالطلب والاخذ والتسليم من يقوم مقامهما الخ (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۲۶ فی اخر كتاب الشفعة)

ثبت له خیار البلوغ والشفعة۔اھ (تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعة) ؎۱

بیع فاسد پر شفعہ کرنا

سوال:۔ کیا بیع فاسد میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے کلی طور پر نکل چکا ہو، بیع فاسد میں مبیعہ چونکہ بائع کی ملکیت میں حق فسخ کے اسقاط تک باقی رہتا ہے اس لیے حق فسخ یا مبیعہ کو واپسی کے اسقاط تک شفیع کو شفعہ کرنے کا شرعاً اختیار نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۲۶: یشترط ان یزول ملك البائع عن المبیع بناء علیہ لا تجری الشفعة فی البیع الفاسد ما لم یسقط استرداد البائع۔

(درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۸۴۷ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) ؎۲

شفعہ کا ہبہ صحیح نہیں

سوال:۔ کیا کوئی شخص اپنا حق شفعہ کسی پر فروخت یا بلاعوض ہبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفعہ ایک ایسا حق ہے جو نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بطور ہبہ کسی کو دیا جا سکتا ہے، اگر کسی نے ایسی کر دیا تو اس کا حق شفعہ اس سے ساقط ہو جائے گا۔

قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ: ویبطلها صلحه منها علی عوضٍ... ویبطلها

؎۱ قال العلامة علی بن محمد الجماعیؒ: ذکر فی الخانیة ان الخصم هو الصغار فی طلب الشفعة لهم وعلیهم الآباء والاجداد ..... علی الترتیب السالف فی فصل البیع وفی الاصل الوصی یطلب الشفعة للیتیم ویقوم بلوازمها کالاب والجد وان لم یکن واحد منهم فهو علی شفعته اذا ادرك .... وقال محمدؒ لا تبطل الشفعة ویقدر علی الاخذ بعد البلوغ فاذا بلغ وقد ثبت له خیار البلوغ۔ (آداب الاوصیاء علی هامش جامع الفصولین ج۲ ص۲۲۱ فصل فی الشفعة)

؎۲ قال الشیخ وهبة الزحیلی: الشرط الثالث ان یکون العقد صحیحاً اتفق الفقهاء علی هذا الشرط لان المطلوب هو زوال حق البائع فی المبیع فلا تثبت الشفعة فی المشتری شراء فاسداً۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۲۱ المبحث الخامس شروط الشفعة)

ومثله فی الهندیة ج۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعة۔ الباب الاول۔

بیع شفعت لمال - قال ابن عابدینؒ لانها لیست بحق متقرر فی المحل بل مجرد حق التملك فلا یصح الاعتیاض عنه - (رد المحتار ج ۶ ص۲۲۱ کتاب الشفعۃ - باب ما یبطلها)[۱]

بیع وفاء پر شفعہ کا حکم

سوال :- کیا بیع الوفاء میں شفیع مبیعہ پر شفعہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- شفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے مکمل طور پر نکل جائے، چونکہ بیع الوفاء میں مبیعہ ابھی تک بائع کی ملکیت میں ہے اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بیع الوفاء میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ : الشرط الاول : خروج العقار عن ملك صاحبه خروجاً باتاً یجب ان یزول ملك البائع عن العقار المبیع من طریق البات النهائی - (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۸ المبحث الخامس شروط الشفعة)[۲]

اموالِ منقولہ پر شفعہ صحیح نہیں

سوال :- جناب مفتی صاحب! کیا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب :- شفعہ وہ حق ہے جو ایک شخص کو اموالِ غیر منقولہ میں خریداری یا تبادلہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت نہیں اس لیے کہ حقِ شفعہ کی مشروعیت جس فلسفہ ضرر کی وجہ سے ہوتی ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

وفی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۱۷ : یشترط ان یکون المشفوع ملکاً عقاریاً

---

[۱] قال العلامة المیدانی رحمه الله : وان صالح من حق شفعته علی عوض اخذه اوباعه ایاه بطلت الشفعة لوجود الاعراض ویرد العوض لبطلان الصلح والبیع لانها مجرد حق التملك فلا یصح الاعتیاض عنه لأنه رشوة -

(اللباب شرح الکتاب (التسهیر بمیدانی) ج ۲ ص۲۷ کتاب الشفعة)

[۲] وفی الهندیة : ومنها زوال ملك البائع عن المبیع فاذا لم یزل فلا تجب الشفعة کما فی البیع بشرط الخیار - (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۱۶۰ کتاب الشفعة - الباب الاول)

بناءً علیہ لا تحتری الشفعة فی السفینة وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضی الامیریة۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۶۷۲ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) ؎

قتلِ عمد کے عوض لی گئی زمین پر شفعہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی آدمی کو قتل کر دیا، علاقائی جرگہ نے راضی نامہ کرتے ہوئے قاتل کی طرف سے کچھ زمین اور ایک لاکھ روپے نقد مع سوڑہ مقتول کی اولاد کو دینے کا فیصلہ کیا۔ اب اس زمین کے قریب ایک مال دار آدمی کی زمین ہے اور اس نے عدالت میں شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے اور کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے اس زمین کی قیمت ۶۰ ہزار روپے ظاہر کی جبکہ حقیقت میں وہ زمین تین چار لاکھ روپے کی ہے۔ تو کیا اس طرح قتلِ عمد پر صلح کے عوض لی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ثبوتِ شفعہ کے لیے چونکہ مشفوع زمین کے عوض معاوضہ کا ہونا ضروری ہے جو صورتِ مسئولہ میں مفقود ہے، اس بناء پر فقہاء کرام نے قتلِ عمد کی صلح میں دی ہوئی زمین پر حقِ شفعہ کو معدوم قرار دیا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی اس زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة علی حیدر رحمه الله: والصلح عن دم العمد فلا تثبت الشفعة لانه لو تثبت الشفعة فیه للزم ان یأخذه الشفیع اما بقیمته او مجاناً ولا یمکن الاخذ بالقیمة لأن المالك لذلك العقار لم یملکه بقیمته

؎ قال الشیخ وهبة الزحیلی: اتفق المسلمون علی ان الشفعة حق فی العقار من دور وارضین وبساتین وبئر وما یتبعها من بناء وشجر واختلفوا فیما عداها فقررت المذاهب الاربعة انه لا شفعة فی منقول کالحیوان والثیاب والعروض التجاریة اهـ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۷۹۵ المبحث الثانی، محل الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی اللباب شرح الکتاب ج۲ ص۴۴ کتاب الشفعة۔

حتیٰ یستطیع الشفیع اخذہ بالقیمۃ ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص۷۲۲ المادۃ ۱۰۲۱، الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعۃ) [1]

حق مہر میں دی گئی زمین پر شفعہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص بوقت نکاح اپنی بیوی کو حق مہر میں کچھ زمین دیدے تو کیا اس زمین پر کسی کو حق شفعہ حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حق شفعہ کے ثبوت کے لیے معاوضۂ مالی ہونا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے اس لیے احناف کے ہاں حق مہر میں دی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابوالحسن القدوری رحمہ اللہ : ولا شفعۃ فی الدار التی یتزوج الرجل علیھا اویخالع المرأۃ بھا ۔ (الکتاب الشھیر بمختصر القدوری علیٰ صدر اللباب ج ۲ ص۴۵ کتاب الشفعۃ) [2]

صلح میں دی گئی جائیداد پر شفعہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی آدمی پر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کیا جبکہ مدعا علیہ اس سے منکر ہے لیکن مدعی کچھ زور آور ہے، اس پر علاقائی جرگہ نے دونوں کے

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : لکن اختلفوا فی التملک بعوض غیر مالی فالمھر وبدل الخلع واجر طبیب او حمام مثلاً او اجرۃ دار او عوض فی الصلح عن دم عمد فقال الحنفیۃ والحنابلۃ یشترط ان یکون عقد المعاوضۃ مال بمال فلا شفعۃ اذا کان العوض غیر مال کما فی ھٰذہ الاحوال لان الشئ فی المعاوضۃ غیر المالیۃ یشبہ الموھوب والموروث ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۸۲۰ المبحث الخامس شروط الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۱۶۰ کتاب الشفعۃ ۔ الباب الاوّل ۔

[2] وفی الھندیۃ : ولاتجب الشفعۃ فی دار جعلت مھر امرأۃ او اجرۃ او عوض عتق اھ ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعۃ ۔ الباب الاوّل ۔

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۶ ص۲۳۶ کتاب الشفعۃ ۔ باب ما تثبت ھی فیہ اولا تثبت ۔

درمیان اس طرح فیصلہ کیا کہ مدعا علیہ مُدعی کو پانچ کنال زمین دے گا، جو کہ مدعا علیہ نے مدعی کو دیدی ہے۔ اب ایک تیسرا آدمی اس زمین پر شفعہ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ثبوت کے لیے اموالِ غیر منقولہ کا باہمی معاملہ مال کے عوض ہونا ضروری ہے، صورتِ مسئولہ میں معاملہ مالی ہے اگرچہ ایسا مصالحتاً ہی ہوا ہے لیکن اس کے باوجود تیسرے شخص کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنها عقد المعاوضۃ وھو البیع اوماھو فی معناہ فلا تجب الشفعۃ فیما لیس ببیع ولا بمعنی البیع حتی لا تجب بالھبۃ والصدقۃ والمیراث والوصیۃ...... وتجب الشفعۃ فی الدار التی ھی بدل الصلح سواء کان الصلح علی الدار عن اقرار او انکار او سکوت لوجود معنی المعاوضۃ ۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱ کتاب الشفعۃ وجوب الشفعۃ)[1]

طلبِ اشہاد کے وقت حدود اربعہ بیان کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص طلبِ اشہاد گواہوں کے سامنے کر رہا ہو تو کیا اس کو مبیعہ پر حقِ شفعہ کے اثبات کی وجہ اور مبیعہ کا حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ جب شفیع طلبِ مواثبت کے بعد گواہوں کے سامنے طلبِ اشہاد کر رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مبیعہ کا حدودِ اربعہ اور اپنا تعلق بیان کرے تاکہ بات میں کوئی پوشیدگی باقی نہ رہے۔

قال العلامۃ عبد الرحمٰن شیخ زادہؒ: او یشھد علی المشتری ولو غیر ذی ید بان یقول لہ اطلب منک الشفعۃ فی دار اشتریتھا من فلان حدودھا کذا او انا شفیعھا بالشرکۃ فی الدار او الطریق لہ او بالجوار بدار حدودھا کذا فسلمھا

---

[1] وفی الھندیۃ: منھا عقد المعاوضۃ وھو البیع او ماھو بمعناہ فلا تجب الشفعۃ بما لیس ببیع ولا بمعنی البیع...... وکذا تجب فی الدار المصالح عنھا عن اقرار۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعۃ۔ الباب الاول)

لی فلا بد ان یبین حدود الدارین مع کل واحدۃ من مراتب الثبوت ۔
(مجمع الانہر ج ۲ ص۴۷۲ کتاب الشفعۃ) لے

طلب اشہاد میں تعدادِ شہداء کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! کیا طلب اشہاد کے لیے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا نہیں، اور کیا اس میں بھی دیگر معاملات کی طرح تعداد شہداء و دیگر شرائط کا ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ طلب مواثبت کے بعد شفیع کے لیے ضروری ہے کہ وہ گواہوں کے سامنے مبیعہ کے پاس یا بائع و مشتری میں سے کسی کے سامنے اپنے شفعہ کو طلب کرے مگر گواہوں کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ ۲ دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، (۱) یا تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے۔ (۲) یا پھر عدالت کی شرط لازمی ہے ۔

اور صاحبینؒ کے نزدیک کوئی شرط ضروری نہیں، متاخرین نے امام صاحبؒ کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے ۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : ویشترط فی ھٰذا الطلب ان یکون علی فور الطلب الاوّل والاشھاد علیہ بان یشھد الشفیع علی رغبتہ بالشفعۃ رجلین اورجل وامرأتین۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۸۲۹ مراحل طلب الشفعۃ) ۲ے

لے قال العلامۃ علی حیدرؒ: اویقول خطاباً للمشتری سواء کان المشتری قابضاً المشفوع ام کان غیر قابض فی حضور نصاب الشھادۃ من الشھود انک اشتریت العقار المحدود بالحدود الفلانیۃ وبما انی خلیط فی حق المبیع مثلاً فانا شفیعھا وقد طلبت المواثبۃ وانی اطلبھا الآن ایضاً وانتم ایھا الشاھد ان اشھدا ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص۷۹۰ تحت المادۃ ۱۰۳۲ الفصل الثالث)

۲ے قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : ھل تشترط فیہ العدد والعدالۃ اختلف اصحابنا فقال ابو حنیفۃؒ یشترط احد ھٰذین اما العدد فی المخبر رجلان او رجل وامرأتان واما العدالۃ۔ وقال ابو یوسفؒ و محمدؒ لا یشترط فیہ العدد ولا العدالۃ ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۷ فصل بیان ما یتأکد بہ حق الشفعۃ)
ومثلہٗ فی مجموعۃ قوانین اسلام ج ۶ ص۲۲۲۴ کتاب الشفعۃ ۔

حقِ شفعہ میں شریک فی الشرب مقدم ہے

سوال :- ایک جگہ زمین کا ایک ٹکڑا فروخت ہوا، اس پر دو آدمیوں نے حقِ شفعہ دائر کر دیا ہے مگر دونوں کے اسباب مختلف ہیں، ان میں سے ایک آدمی بائع کے ساتھ راستے میں شریک ہے اور دوسرا پانی میں شرکت کا دعوٰی کرتا ہے۔ تو ان دونوں میں سے کس کو شفعہ کا صحیح حقدار سمجھا جائے گا؟

الجواب :- شفعہ کے ثبوت کے لیے اگرچہ دونوں اسباب مساوی ہیں لیکن باعتبارِ ضرر راستے کا شریک زیادہ مقدم ہے۔ اس لیے علماء نے شریک فی حق الشرب کو راستے کے حق میں شریک پر مقدم کیا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں پانی کا شریک حقِ شفعہ میں دوسرے پر مقدم ہے۔

فی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۱۶ : حق الشرب مقدم علیٰ حق الطریق۔

قال العلامۃ علی حیدرؒ : تحتہا یعنی حق الشرب وحق الطریق وان کانا متساویین من حیث کونہما من اسباب الشفعۃ لکن فی حال اجتماعہا یقدم حق الشرب علیٰ حق الطریق۔ (دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص ۷۶۶ قبل الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعۃ) [1]

مہرِ مسمّٰی کے عوض میں ملنے والی زمین شفعہ کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! نے شادی کے وقت بیوی کو حقِ مہر میں پچاس ہزار روپیہ لکھوا دیا، اب عورت نے حقِ مہر کا مطالبہ کیا ہے تو شوہر نے نقدی نہ ہونے کی وجہ سے بیوی کو کچھ زمین دے دی، اس پر اُس کے شوہر کے بھائی نے جو اُس کے ساتھ اِس زمین میں شریک ہے حقِ شفعہ کا دعوٰی کر دیا ہے، تو کیا اس کو شرعاً شفعہ کا حق حاصل ہے؟

---

[1] قال العلامۃ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ : لو شارکہ احد فی الشرب و آخر فی الطریق فصاحب الشرب اولیٰ من صاحب الطریق۔

(الدر المنتقی علیٰ ھامش مجمع الانہر ج ۲ ص ۴۷۲ کتاب الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ لخالد الاتاسی ص ۸۵۲ المادۃ ۱۰۱۶ قبل الفصل الثانی۔

الجواب:۔ حق مہر میں بیوی کو جو زمین دے دی جائے اگرچہ شرعاً اس پر شفعہ ثابت نہیں ہوتا، مگر صورتِ مسئولہ میں معاملہ الگ ہے، یہ زمین عورت کو اُس پچاس ہزار روپے نقد حق مہر کے عوض دی گئی ہے جو کہ ایک مالی معاملہ ہے، اس لیے شوہر کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

وفی الھندیۃ: ولو تزوجھا علیٰ مھر مسمّٰی ثمّ باعھا بذلک المھر دارًا تجب للشفیع فیھا الشفعۃ وکذلک اذا تزوجھا علیٰ غیر مھر وفرض لھا القاضی مھرا ثمّ باعھا بذلک المفروض تجب للشفیع فیھا الشفعۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۱۶۲ کتاب الشفعۃ۔ الباب الاوّل) ؎۱

تحفہ کے عوض میں ملنے والی زمین پر شفعہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص اپنے دوست کیلئے تحفہ میں امریکہ کا ویزہ لایا تو دوست نے شکریہ کے طور پر اپنی جائیداد میں سے کچھ اس کے نام ہبہ کر دی، واہب کے بھائی کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے اِس پر شفعہ کر دیا، تو کیا واہب کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی ہوئی زمین پر اگرچہ شفعہ صحیح نہیں مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ معاملہ مالی ہے اس لیے فقہاء کرام نے شفعاء کو حقِ شفعہ کے ثبوت کی تصریح کی ہے بشرطیکہ جانبین نے اپنے اپنے موہوبہ پر قبضہ کر لیا ہو۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: لا تجب بالھبۃ والصدقۃ والمیراث والوصیۃ ...... وان کانت الھبۃ بشرط العوض فان تقابضا وجبت الشفعۃ لوجود معنی المعاوضۃ عند التقابض۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱ فصل شرائط وجوب الشفعۃ) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذ لو جعلت بدل مھر المثل او المسمّٰی عند العقد او بعدہٗ تثبت فیہ الشفعۃ لانہ مبادلۃ مال بمال لانہ بدل عما فی ذمتہ من المھر۔ (ردالمحتار ج۶ ص۲۳۷ کتاب الشفعۃ۔ باب ما تثبت ھی فیہ اولا تثبت)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲ کتاب الشفعۃ، فصل فی شرائط وجوب الشفعۃ۔

؎۲ وفی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۲۲: الھبۃ بشرط العوض فی حکم البیع بناء علیہ لو وھب وسلم احد دارہ المملوکۃ لآخر بشرط العوض یکون جارہ الملاصق شفیعا۔

(درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۷۲ الفصل الثانی فی شرائط الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۷۲ الفصل الثانی فی شرائط الشفعۃ۔

زمین کا تبادلہ کرنے پر حقِ شفعہ ثابت ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! دو آدمیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زمینوں کا تبادلہ کیا اور دونوں کے شفعاء بھی موجود ہیں، اب ان دونوں میں سے کس زمین پر شفعہ کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ چونکہ دونوں بدلین اموالِ غیر منقولہ ہیں اور معاملہ بھی مالی ہے اس لیے دونوں کی زمین قابلِ شفعہ ہے لہٰذا دونوں کے شفعاء کو حقِ شفعہ حاصل ہے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: منها معاوضة المال بالمال فلا تجب فی معاوضة المال بغیر المال ...... ومنها معاوضة عین المال بالمال فلا تجب فی معاوضة عین المال بمالیس بعین المال۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲ فصل شرائط وجوب الشفعة) لے

بحیثیت کرایہ دار کسی کا حقِ شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنا مکان کسی ایسے شخص پر فروخت کرے جو بداخلاق اور بدکردار ہو تو کیا اس کا پڑوسی جو کہ اس کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہتا ہو اس پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہ حنفی میں شفعہ کے استحقاق کے لیے شفیع کا اپنے ذریعہ شفعہ کا مالک کا مالک ہونا ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں شفیع چونکہ مکان کا اصلی مالک نہیں بلکہ کرایہ دار ہے اس لیے اس کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ملك الشفیع وقت الشراء فی الدار التی یاخذها بالشفعة لان سبب الاستحقاق جوار الملك والسبب انما ینعقد سببًا عند وجود الشرط۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴ فصل شرائط وجوب الشفعة) ٣ے

لے قال الشیخ وهبة الزحیلی: وان بیع عقار بعقار (مقایضة) وکان شفیعهما واحدًا اخذ الشفیع کل واحد من العقارین بقیمة الآخر لانه بدل وهو من ذوات القیم فیاخذه بقیمته وان اختلف شفیعهما یاخذ شفیع کل منهما ماله فیه الشفعة بقیمة الآخر۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۱ المبحث الرابع فی احکام الشفعة)

٢ے قال الشیخ وهبة الزحیلی: اتفق الفقهاء علی شرط کون الشفیع مالکًا مایشفع به قبل البیع واختلفوا فی استمرار الملك حتی القضاء بالشفعة علی رائین فقال الحنفیة یشترط استمرار ملك الشفیع حتی یقضی له بالشفعة اھ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۲۲ المبحث الخامس شروط الشفعة الشرط الرابع)

رجسٹری یا انتقال نہ ہونے کی صورت میں شفعہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی دوسرے پر اپنی دس کنال زمین فروخت کی لیکن ابھی تک قانونی طور پر باضابطہ رجسٹری نہیں ہوسکی، توکیا شفعہ کا حق دار اس زمین پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے بیع ایجاب وقبول سے تام ہوجاتی ہے، مروجہ قانون کے مطابق رجسٹری یا انتقال کی ضرورت نہیں، شفعہ کے لیے نفس ایجاب وقبول ہی کافی ہے۔

وفی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۲۱: الشفعة لا تثبت الا بعقد البیع البات الصحیح۔
(درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۷۲۲ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة)[۱]

مشتری کے مرنے سے شفیع کا حق شفعہ باطل نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک آدمی مثلاً زید نے عمرو کے متصل کچھ زمین خریدی مگر عمرو کو اس کی خبر نہ ہوئی اور اس دوران میں زید کا انتقال ہوگیا، ایک ہفتہ بعد عمرو کو زمین خریدنے کی خبر ہوئی، اب عمرو شفعہ کرنا چاہتا ہے توکیا وہ میت پر شفعہ کرے یا اس کے وارثوں پر؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ مشتری (خریدنے والے) کے مرنے سے شفیع کا حق شفعہ باطل نہیں ہوتا بلکہ شفعہ کا دعوی کرنا بدستور باقی ہے، البتہ مشتری کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء سے حق شفعہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔

قال الامام القدوریؒ: واذا مات المشتری لم تسقط الشفعة۔
(مختصر القدوری ص۹۲ کتاب الشفعة)[۲]

---

[۱] قال الشیخ وهبة الزحیلی: الشرط الاول خروج العقار عن ملك صاحبه خروجاً باتاً یجب ان یزول ملك البائع عن العقار المبیع من طریق البیع البات النهائی اللازم الذی لاخیار فیه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۸ المبحث الخامس شروط الشفعة)

[۲] وفی الهندیة: ولاتبطل بموت المشتری وللشفیع ان یأخذ من ورثته۔ الخ
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل به حق الشفعة بعد ثبوته ومالا یبطل)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۰۲ کتاب الشفعة، باب ما تبطل به الشفعة۔

شفیع برابر ہوں تو دونوں شفعہ کا حق رکھتے ہیں

سوال :- ایک گھر دو گھروں کے درمیان واقع ہے، تینوں گھروں کی پشت اور دروازے بھی ایک طرف ہیں اور راستہ بھی سب کا ایک ہے، اب درمیان والا گھر ایک پڑوسی نے خرید لیا ہے تو کیا دوسرا پڑوسی شفعہ کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورت مسئولہ میں دوسرے پڑوسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے اور شفعہ کرنے کے بعد یہ خریدا ہوا گھر دونوں پڑوسیوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الهندية : ولو انّ رجلاً اشترى داراً وهو شفيعها ثمّ جاء شفيع مثله قضى القاضى بنصفها وان جاء له شفيع اٰخر اولىٰ منه فان القاضى يقضى له بجميع الدار وان جاء شفيع دونه فلا شفعة له۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۷۸ الباب السادس فى الدار اذا بيعت ولها شفعاء)

کسی کے حق شفعہ کو ختم کرنے کے لیے اصل رقم سے زائد لکھوانا

سوال :- آجکل مکان یا زمین کی خرید و فروخت میں یہ بات عام ہے کہ مشتری بلیعہ پر کسی کے شفعہ کرنے کے خوف سے بائع سے اصل رقم سے کئی گنا زائد رقم مثلاً دو لاکھ کی بجائے چار لاکھ روپے لکھوا لیتا ہے اور بائع بھی اس پر راضی ہوتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں مشتری کا ایسا کرنا شفیع کے حق شفعہ کو دھوکہ اور فریب سے ساقط کرنے کے مترادف ہے اس لیے اس کا یہ عمل موجبِ گناہ ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ : اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۱۶۴)

---

[۱] قال العلامة الحصكفیؒ : وكذا لوكان الشريك غائباً فطلب الحاضر يقضى له بالشفعة (كلها (ثمّ) اذا حضر وطلب قضى له بها) فلو مثل الاوّل قضى له بنصفه ولو فوقه فبكله ولو دونه منعه الخ۔ قال العلامة ابن عابدينؒ تحت قوله (فلو مثل الاوّل) اى لوكان الذى حضر مثل الاوّل كشريكين اوجارين الخ۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار جلد۶ ص۲۲۲ كتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوى ج۴ ص۲۵۵ كتاب الشفعة، الفصل الثانى فى المقدمة۔

مسوّدۂ قانونِ شفعہ پر مجلسِ شوریٰ میں کی گئی تقریر

قانونِ شفعہ کا مسودہ ایوان میں پیش ہونے پر ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو دن بھر اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوئی کہ اس مسودہ کو عوام کی رائے سے حاصل کرنے کے لیے مشتہر کیا جائے اور آئندہ کسی موقعہ پر اسے زیرِ غور لایا جائے۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس ضمن میں ایوان میں مختصر مگر پُرمغز اور مدلل تقریر کی جسے قانونِ شفعہ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

— مُرتّب —

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق | یہ ایک اسلامی قانون کا مسوّدہ ہے اور یہ پہلا اسلامی قانون ہے جو اس ایوان میں آیا ہے، اصولی طور پر مجلسِ شوریٰ کا اہم مقصد اس ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا ہے، اور اس سمت میں یہ ایک اہم آئٹم ہے۔ مجلسِ شوریٰ کے لیے جو راہنما اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں یہ ہے کہ ہم نے اسلامی نظام کے نفاذ کو تیز کرنے میں مدد دینا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے علاوہ بھی دو اور اسلامی قانون قاضیوں کے کورٹ اور دیت و قصاص کے متعلق تھے وہ بھی سٹینڈنگ کمیٹی کی نظرِ کرم سے مؤخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور اگر اب اس مسودہ کی تاخیر اور التواء کے لیے بھی آج تحاریک پیش کی جا رہی ہیں، تو اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ افسوسناک معاملہ ہوگا اور اس کا بڑا خراب اثر پڑے گا۔ ہماری حالت تو اسلامی نظام کے نفاذ کے بارہ میں یہ ہوگئی ہے کہ ؎

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

یہاں کچھ حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس مسودہ کو عوام کی استصوابِ رائے کے لیے مشتہر کیا جائے، اگرچہ یہ مقصد پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے، لیکن اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسلام ہمیں یہ حق دیتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے عوام سے

اجازت لی جائے اور اس کے بارے میں عوام سے استصواب کریں؟ خدا اور رسولؐ کے طے شدہ قوانین اور احکام کے بارے میں اسلام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس کے بارے میں عوام سے پوچھیں۔ ہمارے عوام بہت اچھے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ عوام نے استصواب کے نتیجے میں کسی اسلامی قانون کو مسترد کر دیا، تو کیا یہاں حاکمیت عوام کی ہے یا حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، یہ عوام والی بات کے دَور سے تو ہم گذر چکے ہیں اور اس کا خمیازہ بھی ہم نے بہت بھگت لیا ہے۔ یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ تو اس لحاظ سے میری گذارش یہ ہے کہ اسے اہم ترین مسئلہ سمجھا جائے۔ یہاں ایک بزرگ نے کہا تھا کہ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں جان و مال اور جائیداد کے حقوق کے تحفظ اور دوسروں کے ظلم و تعدی اور زیادتی سے بچنے کا سوال ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مال اور جائیداد کا تحفظ اور کسی کے ظلم و زیادتی سے بچانا اور بچنا یہ ایک اہم ترین سوال ہے۔ تو اس لحاظ سے میں تمام معزز ممبران سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دینی جذبہ اور پوری گرمجوشی کے ساتھ اس مسودے کا خیر مقدم کریں اور اس پر بحث کریں۔ یہ پہلا مسوّدہ ہے جو عرصہ دراز کے بعد اسلامی قوانین پر مبنی یہاں آیا ہے۔ آپ سب خوش قسمت ہیں کہ آپ کے سامنے ایسا مسودہ آیا ہے، اس میں اگر کچھ خامیاں، خرابیاں اور اختلافات ہیں بھی تو وہ ترامیم کی شکل میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جائیں گی اور ان کا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان معروضات کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(رپورٹنگ وفاقی کونسل سیکرٹریٹ)

۱۲؍ اپریل ۱۹۸۲ء کی شام کی نشست میں مولانا سمیع الحق نے شفعہ کے مسودہ پر تقریر کی، وفاقی کونسل کے سیکرٹریٹ کی قلمبند شدہ تقریر حسب ذیل ہے۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

جناب چیئرمین! میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، کافی حضرات اس موضوع پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ شفعہ کے اس قانون کے بارے میں کچھ بنیادی نکتے اٹھائے گئے ہیں میں ان کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے فاضل مقرر کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ قرآن مجید میں

شفعہ کے بارے میں احکام نہیں ہیں، تو یہ ایک بنیادی غلط فہمی ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے، حالانکہ شریعت کا بنیادی ماخذ جس طرح قرآن کریم ہے اسی طرح سنتِ نبوی بھی ہے۔ اگر ہم ہر چیز کو قرآن میں تلاش کریں گے تو ہمیں پانچ وقت کی نمازوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ قرآن کی کسی آیت میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ مغرب کے تین رکعت فرض ہیں اور کسی آیت میں یہ نہیں کہ فجر کے دو فرض ہیں اور عصر کے چار ہیں نہ ان مخصوص اوقات کا تفصیلات کے ساتھ ذکر ہے ــــ اسی طرح زکوٰۃ کی تفصیلات بھی قرآن کریم میں نہیں ہیں لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی ہے اور مقادیر بیان کئے ہیں۔

تو جناب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات جو حضورؐ نے فرمائی اور ہمیں مستند طریقہ سے پہنچ گئی اسے ہم قرآنِ کریم اور دین ہی کا حکم سمجھیں گے۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے، ایک صحابی سے کسی خاتون نے دریافت کیا کہ جسم کو کھرچ کھرچ کر اس میں رنگ بھرنے کا مسئلہ کیسا ہے؟ صحابی نے کہا کہ یہ سختی سے منع ہے، قرآن میں اس کا حکم موجود ہے، خاتون نے کہا میں الٓمٓ سے لیکر والناس تک قرآنِ کریم پڑھتی ہوں اس میں تو اس چھوٹے سے مسئلہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، صحابی نے کہا کہ لو قرأتیہ لوجدتیہ اگر تم نے قرآن کو غور سے پڑھا ہوتا تو اس حکم کو وہاں پایا ہوتا۔ صحابی نے فرمایا قرآنِ کریم میں ہے: مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کہ جو حکم تمہیں رسول نے دیا اس پر سختی سے عمل کرو اور جن باتوں سے آپؐ نے منع کیا ان سے منع ہو جاؤ۔ یہ ایک اصول ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ اب اس مسئلہ میں حضورؐ نے جو راہنمائی دی ہے وہ بھی گویا قرآن ہی کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ قرآن کے ساتھ سُنّت کو بھی ہمارے آئین میں بنیادی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چونکہ کچھ ارکان نے شفعہ کے سلسلہ میں واضح احادیث کا مطالبہ کیا ہے تو ایوان کے سامنے بھی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ لانا چاہتا ہوں جن میں ان افراد کی تفصیل موجود ہے جنہیں شفعہ کا حق دیا گیا ہے۔

مولانا سمیع الحق: جناب والا! جائیداد میں شریک خلیط کا سب سے پہلا درجہ ہے، اس کے بعد جو حقوق میں شریک ہے اس کا درجہ ہے، تیسرے نمبر پر جار ہے یعنی پڑوسی۔ تو یہاں سب سے پہلے میں شریک کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف سے نقل کرتا ہوں، یہ امام مسلم کی کتاب ہے اور صحیح بخاری کی طرح اس کا درجہ ہے۔

عن جابرٍ قال قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالشفعۃ فی کل شرکۃ لم تقسم ربعۃ او حائطاً لا یصلح ان یبیع حتّٰی یؤذن شریکہ فان شاء اخذ وان شاء ترك فاذا باع ولم

يؤذنه فهو احق به۔ (الدراية في تخريج احاديث الهداية۔ حديث ۸۸۸ كتاب الشفعة)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے فیصلہ دیا شفعہ میں مشترک حصہ میں جب تک وہ تقسیم نہ ہوا ہو خواہ وہ مکان ہو یا باغ تو اس میں شفعہ کا حق ہوگا شریک کو جو ملکیت میں شریک ہو"۔ پھر اس میں قضٰی رسول اللہ کا لفظ ہے کہ صرف فرمایا نہیں بلکہ فیصلہ دیا حضورؐ نے، قضٰی کا مطلب فیصلہ دینا ہے جس کا ایک فاضل رکن نے مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے بھی ایک روایت نقل کی ہے:۔

لقوله عليه السلام: بالشفعة في كل ما لم يقسم فاذا وقعت الحدود و صرفت الطرق فلا شفعة۔ (الهداية ج۴ ص۳۸۷ كتاب الشفعة)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ کا ہر اس چیز میں فیصلہ کیا جو ہنوز تقسیم نہ کی گئی ہو اور شرکت باقی ہو لیکن جب اس کی حدود متعین اور راستے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تو اب (بر بنائے شرکت) شفعہ نہیں رہا"۔

شفعہ ان تمام جائیدادوں میں ہے جب تک وہ تقسیم نہ ہوئی ہوں۔ آگے حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا: فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة۔ مثلاً اگر چار بھائیوں کی مشترکہ زمین ہے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا اور اس کی حد بندی کر دی یا حقوق میں اشتراک ہے اور راستے الگ کر دیئے گئے تو پھر اس پر شفعہ کا کوئی حق نہیں۔۔۔ اس سے ایک دوسری بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ دو بھائیوں میں زمین مشترک تھی، اب اس ملکیت میں شراکت کی وجہ سے ان کو شفعہ کا حق تھا لیکن جب زمین تقسیم ہو گئی تو ان کا حق شفعہ نہیں رہا اب اگر رشتہ داری کی وجہ سے بھی ان کو شفعہ کا حق مل سکتا ہوتا تو حضورؐ یہ نہ فرماتے کہ اب حق شفعہ نہیں رہا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دو سگے بھائیوں میں یا باپ اور بیٹے میں بھی اگر زمین تقسیم ہو گئی تو پھر (بر بنائے شراکت) شفعہ کا حق نہیں ہوگا کیونکہ ملکیت میں اب شراکت نہیں ہے، پھر جوار (پڑوسی) کی وجہ سے اگر وہ چاہے گا تو حقِ جوار کی وجہ سے اس کو شفعہ کا حق حاصل ہوگا جس میں اجنبی اور رشتہ دار سب برابر ہیں۔ یہ تو شریک کے بارے میں حدیث ہے، اسی طرح جار (پڑوسی) کے حق شفعہ کو دیکھئے۔ امام ابو داؤدؒ کی کتاب (سنن ابی داؤد) صحیح اور مستند ہے تمام مسلمانوں کے نزدیک، اس میں حضورؐ سے روایت ہے کہ جار الدار احق بدار الجار والارض جو مکان کا پڑوسی ہے یا جو زمین کا پڑوسی ہے وہ اس پڑوسی ہونے کی وجہ سے حقدار ہے اگرچہ شریک فی الملک نہ ہو اور شریک فی الحقوق بھی نہ ہو مگر اس کا حق ہوگا۔ اب ترتیب کیا ہے تینوں کی؟ وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین فرما دی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الشريك احق من الخليط

والخليط احق من الشفيع۔ (اوکما قال)۔ (الهدایۃ ج ۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعۃ)
یہاں اجتہاد کی باتیں ہو رہی ہیں مگر یہ اجتہاد کی باتیں نہیں، اجتہاد تو وہاں ہوگا جہاں حضور اکرمؐ سے پوری راہنمائی نہ حاصل ہوئی ہو۔ تو حضورؐ نے تو سب کچھ فرمادیا، حقدار اور ان کی ترتیب بھی متعین کردی کہ ملکیت میں شراکت دار جو ہوگا اس کا پہلا نمبر ہے خلیط سے، خلیط وہ ہے جس کے صرف حقوق ہوں۔ پھر فرمایا کہ الخلیط احق من الشفیع، جب خلیط اور پڑوسی کا مقابلہ آئے گا تو جو حقوق میں شریک ہے، جو ملکیت میں شریک ہے ان کا حق پہلے ہوگا، اس کے بعد جو جوار والا ہے اس کا حق ہے۔

اسی طرح سنن اربعہ ابوداؤد و ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مذکور ہے:۔

عن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعۃ جارہ ینتظر بہا وان کان غائباً اذا کان طریقھا واحداً۔ (ابوداؤد، مسند احمد، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی)۔ (الدرایۃ فی تخریج احادیث، رقم حدیث ۸۸۹ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اگر وہ غائب (غیر موجود) ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے مگر یہ شفعہ اُس وقت ہوگا جبکہ دونوں ہمسایوں کا راستہ ایک ہو۔"

جو پڑوسی ہے اور اس کا تیسرے نمبر پر حق بنتا ہے تو اب وہ حقدار ہوگا اجنبی لوگوں سے، رشتہ داروں سے اور مختلف طبقہ کے لوگوں سے اس کا انتظار کیا جائے اگر وہ موجود نہ ہو۔ ینتظر بہا وان کان غائباً۔ آگے یہ بھی فرمایا کہ جب راستہ ایک ہے تو اُسے ترجیح دی جائے گی۔

دوسری روایت حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی ہے جو کہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

عن ابی رافع مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الجار احق بسقبہ قیل یارسول اللہ ماسقبہ قال شفعتہ۔ (الهدایۃ ج ۴ ص۳۸۷ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "یعنی پڑوسی اس زمین کا قریب اور نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے، صحابہؓ نے سقب کے بارہ میں دریافت کیا تو فرمایا کہ اس سے مراد شفعہ میں اس کا استحقاق ہے، وہ قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے۔

اسی طرح ترمذی میں روایت ہے الجار احق بشفعتہ ـــــــ یہ میں نے مختصراً حضورؐ کی چند روایات پیش کی ہیں کہ حضورؐ نے ان تین شفعا رہی میں حقِ شفعہ کو مخصوص، محدود اور محصور کیا ہے اب یہاں ایک سوال اٹھایا گیا کہ جس وقت یہ مسودہ عوام میں مشتہر کیا گیا تھا کہ ان تینوں میں ہم کیوں محدود کریں جبکہ اوروں کی صریح مخالفت تو نہیں۔

جنابِ والا! یہاں مختلف حضرات تقریریں کرتے ہیں، ان کی تمہید عجیب جوش و خروش کی ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری تائید کی طرف آرہے ہیں، دلائل ہمارے حق میں دیتے ہیں اور آخر میں یکدم پلٹ جاتے ہیں۔ ان کی تقریروں میں تضادات ہوتے ہیں، آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ شفعہ کے اس مسئلے میں کوئی ابہام یا کوئی پریشانی ہے ہی نہیں، کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ ان تین سے بھی زیادہ کو دیا جائے، کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ان تین میں سے بھی کم کرکے ان کو محدود کیا جائے، تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ ابہام اور پریشانیاں کس چیز سے پیدا ہوگئی ہیں؟ اب کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ چونکہ حضورؐ نے اوروں کی نفی تو نہیں کی اور انما کا کلمہ نہیں آیا۔ حالانکہ یہ ایک علمی اصطلاح ہے اور قواعدِ لغت کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ کلمۂ حصر نہیں ہے یعنی حضورِ اقدسؐ نے یہ تو نہیں فرمایا انما الشفعة للشریك الخ کہ شفعہ ان تین تک محدود ہے کیونکہ انما حصر کا ہے اور وہ کلمہ نہیں اوروں کو بھی ملنا چاہیئے۔ اور دلیل ان لوگوں نے یہ پیش کی ہے کہ آیتِ زکوٰۃ میں ہے کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ مصارفِ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے اِنَّمَا کے کلمہ سے مخصوص کر دیئے ہیں، اب جو آٹھ مصارف ہیں ان میں ہم نویں اور دسویں مصرف کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے، ایک چیز کو محصور کرنے کے لیے انما کا حرف اور حصر کے کلمات ضروری نہیں ہوتے، الف لام اختصاص وہ بھی تخصیص کے لیے آتا ہے، جیسے الحمد للہ ہے، اب اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حمد اور تعریف و ستائش ساری اللہ کے لیے ہے کسی اور کو ہم حمد میں شریک نہیں کر سکتے ورنہ وہ کفر ہو جائے گا حالانکہ یہاں انما تو نہیں۔ اب الحمد میں "ل" اختصاص کے لیے ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک جملہ کا مقام مؤخر ہو جاتا ہے اور اس کو مقدم کر لیا جاتا ہے وہ بھی حصر کا فائدہ دیتا ہے اور تخصیص ثابت کرتا ہے، مثلاً نعبد ایاك ہونا چاہیئے تھا نماز میں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، مگر وہاں یہ کہ ایاك نعبد، ہم خاص تیری عبادت کرتے ہیں کسی اور کی نہیں کر سکتے۔ یہ حصر کس چیز سے ثابت ہوا؟ کسی جملہ کا حق دوسری جگہ تھا لیکن وہاں سے پہلے آیا اور اس کو پہلے کر دیا۔ یہ تقدیم ما حقه التاخیر کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ نہیں آیا اس ایوان میں مگر زید، تو یہ استثناء بھی حصر کے لیے مفید ہو گیا۔ ما جاءنی من القوم الا زیدٌ۔ اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضورِ اقدسؐ کے

زمانہ میں جب سارے حالات آپؐ کے سامنے تھے، حضورؐ اور صحابہؓ کے رشتہ دار بھی تھے اور مختلف طبقے موجود تھے، آپؐ کو پتہ تھا کہ تکلیف لاحق ہو سکتی ہے، مگر شفعہ کا حق ان لوگوں کو نہ دیا۔ آج کہا جاتا ہے کہ شفعہ کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کو نقصان سے بچایا جائے یعنی دفع ضرر مقصود ہے مگر یہ بھی ایک علمی اصطلاح ہے اسے حکمت کہتے ہیں علت نہیں کہتے، دفع ضرر حکمت ہے اور علت اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ حکمت کے طور پر ایک چیز پیش کر دے مگر وہ علت نہیں ہوتی حکمت و مصلحت ہوتی ہے، علت ہوتی تو ہم دفع ضرر کو عام کر دیتے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں کہا گیا کہ ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وجہ بھی بیان کر دی کہ شاید ایک خاتون بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا سکتی ہے۔ فتذکر احدٰھما الاخریٰ مقصد بھول سے بچنا ہے، وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب اگر ایک خاتون بہت بڑی عالمہ ہے، اس کا حافظہ مسلّم ہے ہمیں پتہ ہے کہ وہ نہیں بھولتی تو اس قانون کو بدل تو نہیں سکتے کہ اس ایک کی شہادت مرد کے برابر ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو حکمت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نماز پڑھو تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں نماز نہیں پڑھتا اس لیے کہ میں متقی نہیں بن سکتا لہٰذا نماز ہی چھوڑ دوں۔ نماز کی علت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہ خطرات اوروں نے ظاہر کئے ہوں گے لیکن حضور اکرمؐ نے کسی کو یہ حق نہیں دیا، حضورؐ کی نظر بڑی وسیع تھی اور شفقت بھی سب سے بڑھ کر تھی۔

اب اگر ہم اس موضوع کو لیں کہ ضرر سے بچانا مقصود ہے تو پھر میرے خیال میں شفعہ کے جو قوانین انگریزی دور کے جاری ہیں ان کے تحت ایک دوکاندار اور کرایہ دار کو بھی حق ملنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی ضرر ہے، اگر وہ دکان خالی کرتا ہے تو اس کو ضرر پہنچے گا تو کیوں نہ اس کو شفعہ کا حق دیا جائے، یا اگر کوئی کرایہ دار ہے اور وہ مکان خالی کرتا ہے تو اس کو بھی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ آپ ایک ملازم رکھتے ہیں اور پھر کسی وجہ سے اپنا کاروبار چھوڑ دیتے ہیں تو نظریہ دفع ضرر کے تحت اس ملازم کو بھی شفعہ کا حق ہوگا؟ اسی طرح میں نے زمین بیچی تھی آج اس کا دوسرا شخص مالک ہے اس نے تیسرے کو بیچ دی، تو پہلا مالک یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا بھی حق ہونا چاہیئے کیونکہ میں بھی کسی وقت اس زمین کا مالک تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ بڑا طویل ہو جائے گا، اسلئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر مزارعین کو حق دینے کا مسئلہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح فرض کر لیا گیا کہ اگر میں نے زمین بیچ دی تو اس سے مزارع کو نقصان پہنچے گا اور مشتری لازماً مزارع کو بے دخل کر دے گا، اگر مزارع محنت کرتا ہے، دیانتدار اور با اصول ہے تو جس طرح میں نے اسے رکھا تھا اسی طرح دوسرا خریدار بھی اسکی ایمانداری کی وجہ سے اسے رکھے

لے گا۔ محنتی اور ایماندار ملازم کی تلاش تو ہر وقت رہتی ہے، لیکن اگر وہ محنت نہیں کرتا تو پھر تو مالک کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے نکال سکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مالک کو بھی ضرر سے بچانا ضروری ہے اور ملازم کو بھی بچانا ضروری ہے، ضرر سے سب کو بچانا مقصود ہے کسی ایک طبقہ کو نہیں، قانون میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی خاص فرد کا کیا ہوگا، کسی ایک طبقے کا کیا بنے گا، مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ایک مجرم کو ۱۴ سال قید کی سزا دیتے ہیں اور اسے جیل میں ڈال دیتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اہل و عیال پر کیا گذرے گی، وہ بھوکے پیاسے رہیں گے، ان کا کوئی کفیل نہیں ہوگا، پھر آپ کو یہ حق کہاں ہے کہ آپ اس کو جیل میں ڈالیں۔

ایک شخص قتل کرتا ہے اور عدالت کی طرف سے اُسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس کے خاندان کا کیا بنے گا؟ اور انہیں کتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا؟ مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے، پھر تو آپ چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتے، اس لیے کہ اس کے اہل و عیال بھوکے رہیں گے اور اس کی ساری زندگی تکلیف میں گذرے گی، تو قانون مفادِ عامہ کے لیے بنایا جاتا ہے۔

یہاں اس ایوان میں مزارع اور غیر مزارع، رشتہ دار اور فلاں اور فلاں یہ ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے کہ گویا شریعت نے اس معاملہ میں کوئی راہنمائی کی نہیں! حالانکہ فقہ میں تمام تفصیلات موجود ہیں، خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عباسیہ میں کئی کئی منزلہ مکانات اور عمارتیں موجود تھیں، یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ آج اٹھایا جائے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ یہ تین طبقے تو ہر دور میں شفعہ کے حقدار رہے ہیں، حضور اکرمؐ سے لے کر انگریزی دور کے آخر تک کسی قانون میں، کسی دورِ حکومت میں، خلافتِ عباسیہ، خلافتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں خلافتِ مغلیہ میں کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ جو حق حضورؐ نے دیا اس پر تمام صحابہ کرامؓ اور ائمہ کرامؒ نے اتفاق کیا، اسے کہتے ہیں تعاملِ اُمت۔ اب اگر ایک امام نے جار کے حق کی مخالفت کر بھی لی لیکن دوسرے تو متفق ہیں۔ اس کو اصطلاح میں اجماعِ مرکب کہتے ہیں کہ ان تین سے زیادہ پر کسی کا اختلاف نہیں۔ پھر صحابہ کرامؓ کا دور آیا، ائمہ کرامؒ کا دور آیا، اہلِ بیت کا دور آیا لیکن کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔

بہرحال میں اپنی باتیں سمیٹ کر عرض کروں گا کہ یہاں حاجی سیف اللہ صاحب نے ایک بات کہی اور مجھے افسوس ہے کہ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اگر ہر مسئلہ میں شریعت اور قانون میں فرقہ وارانہ اختلافات

کو ابھارا جائے گا تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، توجیہات اور تشریحات میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ یہ تو آپ کے قانون دان اور وکلاء حضرات بھی ایک مقدمہ میں متفق نہیں ہو سکتے، جج صاحبان کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہر ایک کا فیصلہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر تو آپ اس سارے نظامِ عدل کو دریا میں ڈال دیں، پھر تو آپ عدالتی نظام چلا ہی نہیں سکتے، تو اصول میں کبھی اختلاف نہیں رہا۔

ہمارے پاس اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ آئی ہے، اس کونسل میں شیعہ علماء، بریلوی اور دیوبندی علماء، جج، وکلاء اور جدید عالم موجود تھے، ان سب نے متفقہ طور پر یہ رپورٹ پیش کی، شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مجھ سے خود شیعہ عالم علامہ رضی نے کہا کہ ہم نے ایسا کوئی اختلافی جملہ نہیں کہا۔ ہم سنی تو ان باتوں میں بڑے وسیع النظر ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اسلامی فقہ کی عظیم کتاب ھدایہ ہے جس کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھایا جاتا ہے، اس میں تمام تفصیلات موجود ہیں کہ حقِ شفعہ کس کو ہے کس کو نہیں ہے، منقولہ جائیداد میں ہے یا غیر منقولہ میں ہے، پانی کی صورت کیا ہوگی، فلٹوں کا نظام کیا ہوگا، اور ساری وضاحتیں اس میں موجود ہیں۔ مثلاً تین منزلہ عمارت کی صورت میں ایک شخص نچلی منزل پر رہتا ہے، اوپر والی منزل کا راستہ تیسری منزل پر ہے، اس کی سیڑھیاں تیسری منزل والے پر آتی ہیں اور دوسری منزل والے کی سیڑھیاں الگ راستہ پر ہوں تو شفعہ کا حق وہ کہتے ہیں کہ پہلے والے کو ہوگا، اگر نیچے والے نے بیچ دیا تو پہلے والے کو ہوگا، اور اگر اوپر والے نے بیچ دیا تو نیچے والے کو ہوگا، درمیان والا متصل ہے، لیکن وہ چونکہ جار ہے، پڑوسی ہے تو حقوق میں شریک نہیں ہے اس کا نمبر تیسرا ہے ـــــ تو یہاں ایک جملہ اختلافات کا کہا گیا۔ اسلام کے قوانین کی نظروں میں فروعی اختلافات اور فرقے نہیں ہوتے، یہاں تک کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی نہیں کی جاتی۔ میرے سامنے ھدایہ کی کتاب ہے میں اس کتاب سے ایک جملہ پڑھ کر سناتا ہوں:۔

والمسلم والذمی فی الشفعۃ سواء" یعنی مسلمان اور غیر مسلم شفعہ کے تمام حقوق میں برابر ہیں"ـــــ اگر ایک عیسائی ہمارے پڑوس میں ہے اور جار کی ساری سہولتیں اسے حاصل ہیں اور دوسرا جو کہ مسلمان ہے اور ایک ڈگری درجہ اس کو بعد میں رہا ہے تو اس کو شفعہ کا حق نہیں ہوگا عیسائی کا درجہ پہلے ہوگا، کیونکہ احکام عام ہیں، سبب جو شفعہ کا ہے اس میں مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں ـــــ صاحبِ ہدایہ کا قول ہے: للعمومات ولا نھما یستویان فی السبب والحکمۃ فیستویان فی الاستحقاق، اس لیے استحقاق میں دونوں برابر ہیں ـــــ اس سے قبل ایک دوست نے

اسلام میں غلامی کی بات چھیڑ دی تھی ، یہ عجیب بات ہے، کیا یہ غلامی اسلام کے لیے ایک دھبہ ہے ؟ بات شفعہ کی ہوتی ہے تو مسئلہ غلامی کا چھیڑ دیا جاتا ہے ، کل کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں حرمتِ خمر کی بات ؟ کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں مخلوط ڈانس کی بات ؟ (زور دار تالیاں) بھائی! اسلام نے تو غلاموں کو آسمان تک پہنچایا ہے ، اسلام نے غلامی کو ختم کیا ۔ اس شفعہ کے مسئلہ ہی کو لیجئے، اسی ھدایہ کا ایک اور جملہ شفعہ کے سلسلہ میں آتا ہے کہ : ولھذا یستوی فیہ الذَّکَرُ وَ الْاُنثیٰ والصغیر والکبیر والباغی والعادل والحر والعبد اذا کان ماذونًا او مکاتبًا ۔ اور چھوٹا اور بڑا اس کے حق میں برابر ہیں ، اور سننے کی بات آگے ہے کہ آزاد انسان اور غلام انسان بھی اس میں بالکل برابر ہیں ۔ یعنی اسلام نے تو غلام کو بھی ان تمام قوانین میں آزاد کے برابر حق دیا ہے ۔

تو جناب! میں ان گذارشات کے ساتھ، چونکہ کافی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ۔

مسوّدہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲)/ ۸۰ آر، سی، آئی، آئی مجریہ ۱۲ / دسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت شفعہ آرڈیننس ۱۹۸۰ء کا مسودۂ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر از روئے فقہ و شریعت نظر ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کر کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ شفعہ آرڈیننس میں کل ۱۳ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے مُرسلہ مسوّدہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء کی بعض دفعات کے متعلق چند اہم تجاویز اسلامی نقطہ نظر سے ارسالِ خدمت ہیں، لیکن واضح ہو کہ یہ تجاویز صرف اُن دفعات کے متعلق ہیں جو مفصل اور غیر مخدوش ہیں، ورنہ جو دفعات ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھیں ان کے متعلق ہم جواب دینے اور رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔

مثال کے طور پر صـ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (۳) اور ایسے ہی صـ۹ دفعہ ۲ میں شق ۲ مخدوش اور مبہم ہیں جو ہمارے لیے قابلِ فہم نہیں ہیں اس لیے ان کے متعلق ہم رائے نہیں دے سکتے، نیز اُن دفعات کے متعلق بھی ہم رائے نہیں دے سکتے جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً ہے اور تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ صـ۱۲ پر دفعہ ۳ کا مجموعہ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ کا ایکٹ ۴۳۔ اور اسی صفحہ کی دفعہ ۳۱ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ ایکٹ ۵۔ صفحہ ۱۳ پر دفعہ ۳۳ میں قانون میعاد سماعت ۱۹۰۸ کے ایکٹ ۹ میں شامل امور۔ اور صـ۱۴ کی دفعہ ۳۶ کی شق الف اور شق ۳۔ ان دفعات سے تعلق رکھتی ہیں جن کے مجمل ہونے کی وجہ سے ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ سے رائے دینے سے قاصر ہیں، اس لیے کہ تعزیرات پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر غیر مبہم اور تفصیلی دفعات کے متعلق تجاویز پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) اس مسودہ کے صـ۲ پر دفعہ ۲ کی شق ۴ میں ہے کہ کسی جائیداد غیر منقولہ کے بہتر انتظام کی غرض سے یا جائز طریقہ سے ذاتی استعمال میں لانے کے لیے تبادلہ کرنے کی صورت میں اگر تملیک و تملک کی حیثیت اور غرض سے ہو تو پھر اس صورت کو حق شفعہ سے مستثنیٰ کرنا از روئے شرع درست نہیں بلکہ یہ بھی ان صورتوں میں سے ہونا چاہیئے جن میں حق شفعہ شفیع کے لیے ثابت ہے۔

(۲) صـ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (د م) کے آخر میں[1] یہ اضافہ بھی ضروری ہے کہ شُفعہ اُس جائیداد میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کی صورت میں اقرار، انکار یا سکوت میں دی جائے اور یا کسی جائیداد غیر منقولہ سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے، اس کے لیے حوالہ ملاحظہ ہو:۔

وتجب الشفعة في الدار التي هي بدل الصلح سواء كان الصلح عن الدار عن اقرار او انكار او سكوت وكذا تجب في الدار المصالح۔

(الفتاوی الهندية ج۵ ص۱۶۰ كتاب الشفعة۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور شفعہ اس جائیداد غیر منقولہ میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کے بدل میں دی جائے خواہ یہ صلح اقرار، انکار یا سکوت کی صورت میں ہو، اور نیز شفعہ اس جائیداد میں بھی واجب ہوگا جس سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے۔"

---

[1] آرڈیننس کے مسودہ کی عبارت میں صلح کی وہ صورتیں جن میں شرعاً شُفعہ ثابت ہے مذکور نہیں ہیں۔

(۳) مجوزہ دفعہ ۱۳ پر طلب مواثبت کی تعریف "مجلس" کے ساتھ یہ اضافہ بھی ضروری ہے:۔
"اگرچہ اس مجلس میں یہ شفیع اکیلا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ طلب مواثبت شفیع کیلئے اس کے مطلع ہونے کے فوراً بعد ضروری ہے، اس طلب میں اس کے لیے کسی دوسرے لوگوں کے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں"

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی القهستانی یجب الطلب وان لم یکن عنده احد لئلا تسقط الشفعة دیانةً ولیتمکن من الحلف عند الحاجة کما فی النهایة۔

(رد المحتار ج ۵ ص۱۴۳ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "اور یہ طلب مواثبت اس کے لیے) ضروری ہے اگرچہ اس کے ہاں کوئی بھی موجود نہ ہو تاکہ اس کا حق شفعہ دیانتاً ساقط نہ ہوجائے اور بوقت ضرورت قسم کھانے میں بھی سچا ہو کر قسم کھا سکے"

(۴) ایسا ہی مذکورہ مجوزہ کی دفعہ ۱۳ کی شق ۳ میں یہ تصریح کرنی بھی ضروری ہے کہ "طلب اشہاد شفیع کی ذات سے خاص نہیں ہے بلکہ یہ طلب اشہاد شفیع بذات خود یا بوقت ضرورت رسالتہً یا وکالتہً بھی کرسکتا ہے"

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: اذا باع رجل وعلم بالشراء وهو فی طریق مکة فطلب طلب المواثبة وعجز عن طلب الاشهاد بنفسه یؤکل آخر حتی یطلب الشفعه فلو لم یفعل ومضی المدة بطلت شفعته۔

(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۴۵۶ کتاب الشفعة)

قال العلامة الحصکفیؒ، وهذا الطلب لا بد منه حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشهد بطلت شفعته۔ (الدر المختار علی هامش رد المختار ج ۵ ص۱۴۳ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "یہ طلب اشہاد شفیع کے لیے ضروری ہے یہاں تک کہ یہ طلب اشہاد کسی خط یا کسی آدمی کو بھیج کر بھی ممکن ہو اور شفیع طلب نہ کرے تو اس کا حق شفعہ باطل ہوگا"

اور نیز اس دفعہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلب اشہاد بائع یا مشتری یا مبیعہ ہر تینوں میں سے کسی ایک کے ہاں جو بھی اس کو میسر ہو کر سکتا ہے البتہ بائع کے ہاں اس وقت طلب اشہاد کرے گا جب تک مبیعہ اس کے ہاں موجود ہو جبکہ مذکورہ دفعہ ۱۳ میں صرف مبیعہ (جائیداد غیر منقولہ) کے ہاں طلب اشہاد کی کفایت پر تصریح نہیں کی گئی ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ثم یشهد علی البائع لو عند العقار فی یدہ او علی المشتری وان لم یکن ذا ید لانہٗ مالک او عند العقار۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "اور پھر شفیع بہ طلب اشہاد بائع کے ہاں کرے گا اگر مبیعہ اس کی ملکیت میں ہو۔ اور یا مشتری کے ہاں کرے گا اگرچہ یہ مبیعہ اس کے ہاں موجود نہ ہو کیونکہ وہ مالک ہے اور یا جائداد غیر منقولہ کے ہاں کرے گا۔"

(۵) ایسا ہی اسی صفحہ ۷ کی دفعہ ۱۳ کے عنوان تشریح کی شق ۴ میں بھی یہ اضافہ ضروری ہے کہ "شفیع ہر دونوں کو طلب کرنے کے بعد جائیداد غیر منقولہ کے لینے کے لیے عدالت سے رجوع بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ کے اندر اندر ضرور کرے گا اور اگر بلا کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ میں دعویٰ دائر نہ کرے تو اس کا حق شفعہ اس ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے باطل ہوگا۔"

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی الجامع الخانی الفتوی الیوم علی قول محمدؒ لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "لوگوں کے اپنے حقوق کے مطالبہ میں اضرار کو مدنظر رکھتے ہوئے آجکل فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے کہ بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جاتا ہے۔"

تاہم بصورت کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی صورت میں بھی حق شفعہ باطل نہیں ہوگا جیسا کہ رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۴ کی مذکورہ بالا عبارت سے چند سطر پہلے علامہ ابن عابدینؒ رقمطراز ہیں:۔

فلو عذر او سفر او عدم قاض یری الشفعۃ بالجوار فی بلدہ لا تسقط اتفاقاً۔
(رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "اور بصورت واقعی عذر ہونے کے مثلاً بیماری یا سفر یا اس علاقہ میں قاضی کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شفعہ بالجوار کر سکے، تو ان صورتوں میں مہینہ سے زائد مدت بقدر عذر تاخیر کرنے سے بالاتفاق حق شفعہ باطل نہیں ہوگا۔"

بناء بریں صورت ص ۱۳ کی دفعہ ۳۳ پر میعاد سماعت جو کہ ساٹھ ۶۰ دن مقرر کی گئی ہے، اگر اس میعاد سماعت سے مراد طلب خصومت یعنی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کا وقت مراد ہو تو پھر ساٹھ ۶۰ دن تک تاخیر کرنے کے باوجود حق شفعہ کا باطل نہ ہونا مفتی بہ قول سے مخالف

ہے کیونکہ مفتی بہ قول صرف ایک ماہ تک ہے"، اور اگر میعادِ سماعت سے مراد حاکم کے لیے فیصلہ کرنے کی مدت مراد ہو تو پھر شریعت میں تحدید نہیں ہے بلکہ جتنا ممکن ہو سکے قاضی یا حاکم فیصلہ کر سکے گا۔[1]

(۶) صفحہ ۸ کی دفعہ ۱۶ کے آخر میں یہ اضافہ بھی ضروری ہے: "گویا اسے بیراضی بائع اور مشتری کے مابین معاہدۂ بیع کی صورت میں ملی ہے لہٰذا اس پر احکام بیع، خیارِ رؤیت، خیارِ عیب اور عندالاستحقاق شفیع کے لیے رجوع بالثمن کا حق بھی ثابت ہوگا البتہ ضمان غرور کا مطالبہ بصورتِ استحقاق شفیع نہیں کر سکتا"، اس لیے ملاحظہ ہو فتاوٰی ہندیہ:-

واذا قضی القاضی او اسلم المشتری تثبت بینهما احکام البیع من خیار رویته وخیار عیب والرجوع بالثمن عند الاستحقاق الا ان الشفیع لا یرجع بضمان الغرور-

(الفتاوٰی الهندیة ج ۵ ص ۱۷۶ کتاب الشفعة الباب الخامس فی الحکم بالشفعة)

(ترجمہ) "اور جب قاضی یا حاکم شفیع کے حق میں فیصلہ کرے یا مشتری برضا خود مبیعہ شفیع کو چھوڑ دے تو اب شفیع اور بائع کے درمیان یہ ایک معاہدۂ بیع تسلیم ہوگا اور اس پر احکام بیع جاری ہونگے"۔

جس کی رو سے شفیع کے لیے خیارِ رویت، خیارِ عیب اور بصورتِ استحقاق رجوع بالثمن کا حق حاصل ہے، البتہ شفیع بائع پر بصورتِ استحقاق ضمانِ غرور کا حق رجوع نہیں رکھتا ہے یعنی شفیع بائع سے ضمانِ غرور کے مطالبہ کا مجاز نہیں ہے۔

(۷) صفحہ ۸ کی دفعہ ۱۷ میں شفیع کی موت کی صورت میں حق شفعہ شفیع کے قانونی ورثاء کو منتقل کرنا خلافِ فقہ حنفی ہے[3] بلکہ قاضی یا حاکم کا اس شفیع کے حق میں فیصلہ کرنے سے قبل اگر شفیع مر جائے تو اس کا حق شفعہ باطل ہو کر شفیع کے ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، البتہ مشتری کی موت سے حقِ شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملاحظہ ہو فتاوٰی ہندیہ:-

واما الضروری فنحو ان یموت الشفیع بعد الطلبین قبل الاخذ بالشفعة فتبطل شفعته

---

[1] سرکاری مسودہ میں ساٹھ دن کی میعادِ سماعت مقرر کی گئی ہے جبکہ یہ میعاد نہ تو قرآن کی کسی آیت میں ہے نہ حدیث میں، اور نہ ہی یہ کسی فقیہ کا قول ہے، شرعاً اس کی بہ تفصیل سے جو تبصرہ میں ذکر کی گئی ہے۔

[2] مسودہ میں معاہدۂ بیع کو مطلق رکھا گیا ہے جبکہ شرعاً ضمان غرور اس سے مستثنیٰ ہے۔

[3] جس ملک کی ۹۰ فیصد سے زائد آبادی حنفی المسلک ہو وہاں اسکے خلاف قانون سازی کرنا یقیناً مذہبی مداخلت کے مترادف ہے۔

وھٰذا عندنا ولا تبطل بموت المشتری وللشفیع ان یاخذ من وارثہ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص۱۸۲ کتاب الشفعۃ۔الباب التاسع فیما یبطل بہ الخ) [1]

(ترجمہ) "اگر شفیع دونوں طلب (طلب مواثبت وطلب اشہاد) کر کے فیصلہ ہونے سے قبل فوت ہو جائے تو اس کی موت سے اس کا حق شفعہ باطل ہوگا اور اس کے قانونی ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، اور یہ ہمارا مذہب ہے، البتہ مشتری کی موت سے حق شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ شفیع مشتری کے ورثاء سے یہ جائیداد شفعہ کر کے لے سکتا ہے۔"

نیز مذکورہ آرڈر کے ص۹ کی دفعہ ۳ سے بھی یہ دفعہ متصادم ہے کیونکہ اس دفعہ میں یہاں پر تصریح ہے کہ حق شفعہ ناقابلِ انتقال اور ناقابلِ تقسیم ہے۔

(۸) صفحہ ۹ کی دفعہ ۲۳ کی شق ۲ میں کسی قانون کے ساتھ شرعی قانون کا اضافہ ضروری ہے لہٰذا پھر اصل عبارت یوں ہوگی: "اور یا مقامِ مقتدرہ نے کسی شرعی قانون کے تحت حاصل کرلی ہو اُس پر شفعہ کا دعویٰ نہیں ہوگا۔"

(۹) صفحہ ۱۰ دفعہ ۲۴ میں مدعی سے زرِ شفعہ جمع کرانے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور زرِ شفعہ جمع نہ کرانے کی صورت میں شفعہ کا دعویٰ خارج کرنا شریعت کے موافق نہیں ہے کیونکہ زرِ شفعہ شفیع سے جمع کرانا شریعت میں تو مطلوب نہیں اور برائے اعتمادِ عدالت استصواب رائے میں ممنوع نہیں ہے لیکن اعتماد کی صورت صرف زرِ شفعہ کے جمع کرنے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر شفیع کسی اور طریقے سے عدالت کو مطمئن کر کے اسے صرف کفیل (ضامن) دیدے تو پھر بھی دعویٰ شفعہ صحیح ہوگا، قاضی یا حاکم اسکی باقاعدہ سماعت کر کے فیصلہ کر سکتا ہے اور زرِ شفعہ جمع نہ ہونے کی صورت میں دعویٰ خارج نہیں ہوگا تاہم شفیع کو عقار کا قبضہ بغیر زرِ شفعہ کی وصولی کے نہیں دیا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو فتاوٰی الہندیہ)

ولا یلزم الشفیع احضار الثمن وقت الدعوٰی بل یجوز المنازعۃ وان لم یحضر الثمن الی مجلس القاضی فاذا قضی لہٗ بالشفعۃ لہٗ احضار الثمن۔ ولو دفع الثمن بعد ما قال ادفع الثمن الیہ لا تبطل بالاجماع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۱۷۲ کتاب الشفعۃ۔ الباب الخامس الخ)

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللّٰہ: اما الضروری نحو ان یموت الشفیع بعد الطلبین قبل الاخذ بالشفعۃ فتبطل شفعتہ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲ کتاب الشفعۃ۔ فصل بیان ما یبطل بہ حق الشفعۃ)

(ترجمہ) "شفیع پر دعوٰی شفعہ کے وقت زرِ شفعہ قاضی یا حاکم کے ہاں جمع کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ بغیر زرِ شفعہ کے حاضر کرنے کے دعوٰی کی سماعت کر سکتا ہے، البتہ فیصلہ کے بعد شفیع پر زرِ شفعہ جمع کرنا ضروری ہے۔ (اور چند سطر کے بعد فرماتے ہیں) اور اگر شفیع وعدہ کر کے وقتی طور پر زرِ شفعہ جمع نہ کرائے تو پھر بالاتفاق اس کا حقِ شفعہ باطل نہیں ہوگا۔"

(۱۰) صفحہ ۱۲ کی دفعہ ۲۹ پر مذکورہ اداروں کو حقِ شفعہ کے اسقاط کا جو حق دیا گیا ہے اس میں چونکہ حق تلفی کا بہت قوی امکان ہے، لہٰذا یہ اختیار مذکورہ اداروں کو نہیں دینا چاہیئے بلکہ صفحہ ۹ پر دفعہ ۲۲ کے تحت جو استثناء کیا گیا ہے اس پر ہی اکتفاء کرنا چاہیئے۔

(۱۱) صفحہ ۱۳ دفعہ ۳۴ کے مطابق اطلاع نامہ کی صورت میں صرف اطلاعِ عامہ کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اطلاعِ عامہ کے علاوہ رجسٹری منظور کرنے والا رجسٹرار یا انتقال کی تصدیق کرنے والا افسرِ مال اکنالجمنٹ (واپسی رسید) رجسٹری یا انتقال کی اطلاع شریک، خلیط اور جار کو خصوصی طور پر رجسٹری یا ہرکارے کی وساطت سے دینا ضروری قرار دیا جائے۔ کیونکہ صرف اطلاع عام کی صورت میں حق تلفی کا قوی امکان موجود ہے۔ نیز مذکورہ اطلاع کو ایک ہفتہ تک محدود رکھنا صرف عدالت کی رائے ہے ورنہ شریعت میں یہ تحدید نہیں ہے۔

(۱۲) صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۶ میں اس آرڈیننس کے اجراء سے قبل کئے ہوئے معاہدۂ بیع کے قابلِ سماعت ہونے کے لیے صرف ۶۰ دن مقرر کرنا بھی عدالت کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے، اس طرح غیر شرعی قانون کو شرعی قانون کا نام دینا بہت ہی خطرناک ہے۔

(۱۳) مذکورہ صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۴ (۵) کے تحت اس قانون سے جن مقدمات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یہ بھی محض عدالت کی اپنی رائے ہو سکتی ہے ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ تمام مقدمات کا فیصلہ شرعی لحاظ سے ہو جائے

کتاب الشرکة

فان كانوا اكثر
من ذالك فهم
شركاء فى الثلث

کتاب الشرکۃ

(شراکت کے احکام ومسائل)

موروثی جائیداد کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ چند بھائی موروثی جائیداد میں مشترکہ طور پر اس طرح محنت کر رہے ہیں کہ ان کی کمائی میں تمیز کرنا مشکل ہے، اب ان میں سے ایک بھائی دوسرے بھائیوں کی کمائی سے انکار کر رہا ہے اور ان کو رأس المال کے نفع سے محروم کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر تمام بھائی آپس میں ایسا کاروبار کر رہے ہوں کہ ان کی محنت میں تمیز نہ ہوتی ہو بلکہ مکمل طور پر مشترکہ ہو تو اس محنت کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع میں تمام بھائی برابر کے حصہ دار ہوں گے کوئی بھی شریک پورے مال کا دعویدار نہیں ہوسکتا، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں کسی ایک بھائی کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کو ان کی محنت سے محروم کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ ابیھم ونما المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)[1]

مشترکہ مال بذریعہ بولی خریدنے کا حکم

سوال:۔ چند آدمی مشترکہ طور پر کسی چیز کو خریدتے ہیں پھر آپس میں اس پر بولی کرتے ہیں کہ جو شریک زیادہ بولی دے گا تو وہ اس چیز کا مالک ہوگا، اس کے بعد زیادہ بولی دینے والا شریک دیگر شرکاء کو

---

[1] وقال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: فاذا کان سعیھم واحداً ولم یتمیز ما حصلہ کل واحد منھم بعملہ یکون ماجمعوہ مشترکاً بینھم بالسویۃ ان اختلفوا فی العمل والرأی۔

(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۳۶۱ ص۷۲۵ الکتاب العاشر)

ومثلہ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۹۵ کتاب الشرکۃ۔

اپنے اپنے حصہ کی رقم مع منافع کے واپس کرتا ہے، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: صورت مذکورہ میں چونکہ تمام شرکاء مشترکہ طور پر کوئی چیز خرید کر پھر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ بولی دیتا ہے مال اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس نیلام سے حاصل ہونے والی رقم کامیاب بولی دہندہ کے اپنے حصہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہوگا اور اگر اپنا حصہ بھی بولی میں قیمتاً لینا پڑے تو پھر جائز نہ ہوگا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: الشريك مخير ان شاء باع حصته من شريكه و ان شاء باعها عن اجنبي بدون اذن شريكه راجع الى المادة ۲۱۵ لكن في صور خلط الاموال واختلاطها التي بيناها في الفصل الاول لا يسوغ لاحد الشريكين الخ

(شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر)[1]

شریک کی موت سے شرکت کا ختم ہونا

سوال: دو آدمی آپس میں مشترکہ کاروبار کرتے تھے کہ ان میں ایک کا انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا شریک کی موت سے شرکت ختم ہو جاتی ہے یا برقرار رہتی ہے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: شراکت کے دوران جب کسی ایک شریک کا انتقال ہو جائے تو شرکت خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور دوسرا شریک فوت شدہ کے مال میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن على الزيلعيؒ: وتبطل الشركة بموت احدهما ولو حكماً...... ولا فرق بين ان يعلم موت صاحبه اولا يعلم لانه عزل حكمي۔

(تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة)[2]

---

[1] قال العلامة الحصكفيؒ: وكل من شركاء الملك اجنبي في مال صاحبه فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا اذن الا في صورة الخلط لماليهما كنطة بشعير وبناء وثمر وزرع۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۰۰ كتاب الشركة)

ومثله في شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر۔

[2] وقال في الهندية: وتبطل الشركة بموت احدهما علم به الشريك اولا۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس في الشركة الفاسدة)

ومثله في الشلبي على تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة۔

مشترکہ کاروبار کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ کاروبار شروع کیا، دونوں نے اپنا اپنا رأس المال جمع کیا، کاروبار شروع کرتے وقت ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی گئی کہ آپس میں منافع کس نسبت سے تقسیم ہوگا، جبکہ دورانِ کاروبار ایک شریک نے دوسرے کی نسبت کم مشقت برداشت کی، تو اس صورت میں مشترکہ کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم شرعاً کس طرح ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ شرکتِ عنان کی صورت ہے اور یہ شرکت درست اور صحیح ہے اور چونکہ بوقتِ عقد کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے لہٰذا فقہاء کی تصریحات کے مطابق جب ایک شریک نے کام بھی نہیں کیا ہو اور ربح کے متعلق کسی کمی اور زیادتی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہو تو ربح (منافع) رأس المال کے مطابق تقسیم ہوگا اور اگر رأس المال دونوں کا برابر ہو تو منافع برابر ہوگا ورنہ رأس المال کی کمی بیشی کی صورت میں منافع بھی کم وبیش ہوگا۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: والربح بینھما علی قدر رأس مالھما۔ (تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص۹۴ کتاب الشرکۃ) [1]

مشترکہ زمین میں سے اپنا حصہ فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر دو آدمیوں کے مابین زمین مشترکہ ہو اور غیر منقسم ہو تو اگر ان میں سے ایک آدمی اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو کیا شرعاً اس کو اپنا حصہ فروخت کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی زمین جو دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ہر ایک حصہ دار اپنا حصہ

---

[1] وقال فی الھندیۃ: واما شرط جوازھا تکون راس المال عیناً حاضراً اوغائباً عن مجلس العقد لکن مشار الیہ والمساواۃ فی رأس المال لیست بشرط ویجوز التفاضل فی الربح مع تساویھما فی رأس المال کذا فی محیط السرخسی۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۱۹ الباب الثالث فی شرکۃ العنان)

ومثلہ فی رد المحتار ج ۴ ص۳۱۲ کتاب الشرکۃ۔

قبل از تقسیم فروخت کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: - یصح بیع حصة شائعة معلومة کالنصف والعشر من عقار مملوک قبل الاقرار۔ (شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۲۱۴ ص ۱۰۳ - الکتاب العام) ^۱

شرکاء کی غیر حاضری میں مشترکہ زمین پر کاشت کا حکم

سوال:- ایک زمین چند آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے اور ہر سال بعض لوگ اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں جبکہ ان شرکاء میں سے چند غائب ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعض شرکاء کے غائب ہونے کی صورت میں اس مشترکہ زمین میں کاشت کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر یہ زمین شرعی ملک سے مشترکہ ہو تو غائبین کے حصص میں کاشت کرنا اُن کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہر ایک اپنے اپنے حصۂ ملکیت میں کاشت کرے گا، تاہم اگر دلالتاً غائب کی اجازت موجود ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین: وفی القنیة عن واقعات الناطفی ارض بینهما فغاب احدهما فللشریک ان یزرع نصفها ولو اراد ذلک فی ذلک فی العام الثانی یزرع ماکان زرع۔ (تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۹۱ کتاب الشرکة) ^۲

---

^۱ قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوة: اما بیعه فقسمان قبل القسمة اولاً وکل قسم علی وجهین اما ان باع عن اجنبی او من شریکه فالوجه الاول وهو البیع من اجنبی علی صنفین واما ان کان الکل له فباع نصفه او کان بین اثنین فباع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع کلها۔ (جامع الفصولین ج ۲ ص ۸۲ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل البیع واحکامه)
وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۲۷۶ کتاب البیوع باب الخیار۔

^۲ وقال فی الهندیة: وفی الارض له ان یزرعها کلها علی المفتی به ان کان الزرع ینفعها فاذا جاء شریکه زرعها مثل تلک المدة وان کان الزرع ینقصها او الترک ینفعها فلیس له ان یزرعها۔
(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۳۴۱ کتاب الشرکة۔ الباب السادس فی المتفرقات)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۶۷ کتاب الشرکة۔

مشترکہ مال کسی کو عاریۃً دینے کا حکم

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقہ میں ایک عالمِ دین کا انتقال ہوگیا ہے اور ترکہ میں کچھ اموال رہ گئے ہیں، ورثاء میں اس کے چند بیٹے ہی ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایک اپنے باپ کے متروکہ مال سے کسی کو عاریۃً کچھ دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے دوسرے بھائی اِس وجہ سے اُس پر ناراض ہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں باپ کے متروکہ اموال چونکہ اس کے تمام بیٹوں کے مابین مشترکہ ہیں اس لیے کوئی بھی شریک مشترکہ اموال میں سے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کوئی چیز کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا، کیونکہ شرکاء کے حصے ایک دوسرے کے ساتھ ودیعت (امانت) ہوتے ہیں۔

قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: حصۃ احد الشریکین فی حکم الودیعۃ فی ید الآخر فاذا اودع احدھما المال المشترک عند آخر بدون اذن فتلف کان ضامنا حصۃ شریکہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام، تحت المادۃ ۱۰۸۷ ص۶۰۸ الکتاب العاشر)[1]

مُشترکہ جائیداد میں بلا اجازتِ شریک تصرفات کرنے کا حکم

سوال: دو حقیقی بھائیوں کی کچھ مشترکہ زمین تھی، ان میں سے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی غیر موجودگی میں ساری زمین فروخت کر دی، جب دوسرے بھائی کو پتہ چلا تو اس نے زمین فروخت کرنے سے انکار کر دیا، تو کیا اس دوسرے بھائی کا انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ جائیداد ان کی زرِ خرید ہو یا اِرث کے ذریعہ انہیں ملی ہو تو اس میں کسی ایک بھائی کا تصرّف دوسرے کی اجازت کے بغیر درست نہیں، اس لیے یہ بیع ناراض بھائی کے حصہ کی اراضی میں نافذ العمل نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: فشرکۃ الاملاک العین یرثھا رجلان او یشتریانھا

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: نعم والسر فی ذلک ان الشریک حکمہ فی حصۃ شریکہ حکم المودع۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۸۷ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی الکاملیۃ ص۵۰ کتاب الشرکۃ۔

فلا یجوز لاحدھما ان یتصرف فی نصیب الآخر الا باذنہ وکل واحد منھما فی نصیب صاحبہ کالاجنبی ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۶۲۴ کتاب الشرکۃ)[1]

مشترکہ دیوار کی تعمیر کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں کے مابین ایک مشترکہ دیوار تھی جس کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر اس کو گرادیا گیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کی دوبارہ تعمیر کا خرچہ مشترکہ ہوگا یا گرانے والے پر ہوگا؟

الجواب:۔ قواعدِ فقہیہ کی رُو سے مشترکہ دیوار کی تعمیر کے جملہ اخراجات اور تاوان دونوں کے ذمہ ہوگا کوئی ایک فریق اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : وفی جامع الفصولین حائط بینھما وخیف سقوطہ فاراد احدھما نقضہ وابی الآخر یجبر علی نقضہ .... ونصف قیمۃ البناء لو انفق بلا امر القاضی ونقل ھذا الحکم فی شرح الوھبانیۃ عن الذخیرۃ فی مسئلۃ انھدام السفل وقال انہ الصحیح المختار للفتوٰی۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ کتاب الشرکۃ مطلب فیما اذا ... من العمارۃ)[2]

اقرار سے شرکت کا ثبوت

سوال:۔ ایک آدمی کا کسی کے ساتھ زمین کا تنازعہ عدالت میں چل رہا تھا اُس نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہا کہ تم بھی اس دعوٰی میں میرے ساتھ شریک ہوجاؤ اور جب میں مقدمہ جیت لوں گا

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ای وکل واحد من الشریکین ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ لغیر الشریک الا باذنہ لعدم تضمنھا الوکالۃ ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۶۷ کتاب الشرکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۳۸۴ کتاب الشرکۃ۔

[2] وقال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ : فلطالب البناء ان یبنی باذنِ الحاکم ویرجع علی شریکہ بحصۃ من نفقۃ البناء ۔

(شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۳۱۸ ص۷۰۳ الکتاب العاشر)

وَمِثْلُہٗ فی جامع الفصولین ج۲ ص۲۱۴ الفصل الرابع والثلاثون فی الاحکام۔

تو اس میں تمہیں بھی حصہ دوں گا، اب جبکہ مقر نے مقدمہ جیت لیا ہے تو کیا مقرلہٗ اس کے ساتھ زمین میں شریک متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ مذکورہ صورت میں اس شخص نے خود ہی اپنے مقابل کے لیے ان الفاظ سے اقرار کیا ہے کہ "تم بھی اس میں میرے ساتھ شریک ہو"، لہٰذا اس اقرار کی وجہ سے اس کا شریک کردہ شخص مذکورہ قطعہ اراضی میں شریک متصور ہوگا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا اقر الحر العاقل البالغ بحق لزمه اقراره مجهولاً کان ما اقر به او معلوماً۔ (الهداية ج۳ ص۲۳۱ کتاب الاقرار)

مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا پھلدار درخت لگانا

سوال:۔ ایک شخص کے چند بیٹے تھے، ان میں سے ایک نے باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں ایک باغ لگایا، اب یہ باغ لگانے والا اس میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں مانتا، تو کیا ازروئے شریعت اس باغ میں دوسرے بھائیوں کا حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں جس بیٹے نے باغ اور درخت لگائے ہوں تو یہ باغ اور درخت وغیرہ اسی کی ملکیت سمجھے جائیں گے خواہ دوسرے بھائیوں کی اجازت سے لگایا ہو یا بغیر اجازت کے، کیونکہ اجازت کی صورت میں زمین کی تقسیم کے دوران اگر یہ پھلدار درخت کسی دوسرے بھائی کے حصہ میں آئیں تو اسے ان درختوں کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ورنہ اکھاڑنا ہوں گے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: (بنی احدهما) ای احد الشریکین (بغیر إذن الآخر) فی عقار مشترك بینهما (فطلب شریکه رفع بنائه قسم) العقار (فان وقع البناء) فی نصیب البانی فبها ونعمت (والا هدم) البناء

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: المرأ مؤاخذ باقراره۔
(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۷۹ ص۵۳ المقالة الاولیٰ)
ومثله فی جامع الفصولین ج۲ ص۴۴ الفصل الثالث والعشرون۔

وحکم الغرس کذٰلک ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۸ کتاب القسمۃ) لہ

مشترکہ کتب شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی کو عاریۃً دینا جائز نہیں

سوال:۔ ایک عالم دین کا انتقال ہوگیا اور اس نے ترکہ میں کافی کتابیں چھوڑیں، ورثاء میں بالغ اور نابالغ دونوں موجود ہیں، ان میں ایک بڑا بیٹا گھر کے اخراجات کا ذمہ دار ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کوئی کتاب مطالعہ کے لیے مانگے تو اس کے لیے مشترکہ ترکہ میں سے کوئی کتاب دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ ورثاء میں نابالغ اولاد بھی موجود ہے اور تمام ورثاء اس ترکۂ کتب میں شریک ہیں جبکہ نابالغ اولاد کا مال باپ بھی کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا تو بڑا بھائی تو بطریقِ اولیٰ نہیں دے سکتا۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لیس للاب اعارۃ مال طفلہ لعدم البدل وکذ القاضی والوصی۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۸۳۲ ص۴۶۱ الکتاب السادس) ۲ہ

مشترکہ ٹیوب ویل کے پانی سے کسی شریک کو روکنا جائز نہیں

سوال:۔ چند آدمیوں نے مشترکہ ٹیوب ویل نصب کرنے کے لیے کچھ پیسے اکٹھے کئے لیکن بدقسمتی سے جو جگہ انہوں نے ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تھی وہاں پانی نہ نکلا، ان میں سے ایک آدمی نے دوسری جگہ ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تو وہاں سے پانی نکل آیا، اب یہ آدمی باقی شرکاء کو پانی سے منع کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ جگہ وہ نہیں جس کا انتخاب باہمی مشورہ سے

لہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: واذا بنی فی الارض المشترکۃ بغیر اذن الشریک لہٗ اَنْ یُنْقَضَ بناؤہٗ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۱۰۰ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی الکاملیۃ ج ص۵۳ کتاب الشرکۃ۔

۲ہ وقال العلامۃ محمد بن محمودؒ: ذکر فی النوازل لیس لوالد الصغیر ان یعیر متاع ولدہ الصغیر۔ (احکام الصغار علیٰ ہامش جامع الفصولین ج۱ ص۱۷۰ فی مسائل العاریۃ)
ومِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۳۷۲ الکتاب التاسع المتفرقات کتاب العاریۃ۔

ہوا تھا تاہم اس کے جملہ اخراجات مشترکہ رقم سے ادا کیے گئے ہیں، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب: بشرطِ صحتِ سوال جب مشترکہ مال سے ٹیوب ویل لگایا گیا ہے تو جملہ شرکاء اس سے استفادہ کے حقدار رہیں گے جگہ کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبناني رحمه الله: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً في الملك المشترك باذن الآخر لكن لا يجوز له ان يتصرف تصرفاً مضراً بالشريك۔ (شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۷۱ ص۶۰۶ الكتاب العاشر)[1]

مچھلی کا شکار کرنے میں شرکت کا حکم

سوال: چند آدمی باہمی طور پر مچھلی کا شکار کرنے کے لیے معاہدہ کرتے ہیں، معاہدہ کے مطابق ضروری نہیں کہ جملہ شرکاء محنت کریں تاہم آلاتِ شکار کی خریداری مشترکہ مال سے ہوتی ہے اور ملازم کا ماہانہ خرچہ بھی مشترکہ طور پر برداشت کرتے ہیں، تو کیا شرکت کا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: چونکہ مچھلی پکڑنے کی شراکت اور اشیاء شرعاً ناجائز معاملہ ہے، لہٰذا مذکورہ صورت کا معاملہ بھی جائز نہیں اور اس میں مچھلی اس کا حق ہے جس نے پکڑی ہو۔ تاہم اگر وقتی طور پر چند افراد اکٹھے ہو مچھلی کا شکار کریں اور آخر میں باہمی طور پر تقسیم کریں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال العلامة الشيخ البزاز رحمه الله: اشتركا في الاصطياد و نصبا شبكة او ارسلا كلباً لهما فالصيد بينهما انصافاً۔

(فتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۲۳۷ كتاب الشركة)

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: لا تصح شركة في احتطاب و

---

[1] وقال في الهندية: ولا يجوز لاحدهما ان يتصرف في نصيب الآخر الا بامره وكل واحد منهما كالاجنبي في نصيب صاحبه۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۰۱ كتاب الشركة۔ الباب الاول۔)

و مثله في تنقيح الحامدية ج۱ ص۸۷ كتاب الشركة۔

احتشاش و اصطیاد و استقاء و سائر مباحات۔

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)[1]

مشترکہ ایئر کنڈیشنر فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ چند ساتھیوں نے مشترکہ طور پر ایک ایئر کنڈیشنر خریدا اور تمام ساتھی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے، اب ان میں سے کچھ ساتھی اس گھر کو چھوڑتے ہیں اور ایئر کنڈیشنر کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، تو کیا اس کی اول قیمت معتبر ہوگی یا مستعمل کی؟ کیونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابلِ قسمت چیز ہے؟

الجواب:۔ چونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابلِ قسمت چیز ہے اور مشترکہ طور پر خریدا گیا ہے اس لیے یہ تمام ساتھیوں کے مابین مشترکہ ہوگا، کچھ مدت گذرنے کے بعد اب اگر چند ساتھی اس گھر کو چھوڑنا چاہتے ہوں تو انہیں مستعمل ایئر کنڈیشنر کی قیمت کے لحاظ سے حصہ دیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشهیر بقاضیخانؒ: والعبد الواحد والدابۃ الواحدۃ یباع ویقسم ثمنها لانها لا تحتمل القسمۃ۔

(فتاوٰی خانیۃ علی هامش الهندیۃ ج۳ ص۱۵ کتاب القسمۃ)[2]

مشترکہ مال سے حج کرنے کا حکم

سوال:۔ زید اور عمرو دو بھائی ہیں اور مشترکہ گھر میں رہائش پذیر ہیں، جب ان پر حج فرض ہوا تو

---

[1] لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الشرکۃ فی الاحتطاب والاصطیاد واما اصطادہ کل واحد منهما او احتطبه فهو له دون صاحبه۔ (الهدایۃ ج۲ ص۵۹۷ کتاب الشرکۃ)

ومثلهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۰۹ کتاب الشرکۃ۔

[2] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی الجوهرۃ لا تقسم الکتب بین الورثۃ ولکن ینتفع کل بالمهایاۃ ولا تقسم بالاوراق ولو برضاهم وکذا لو کان کتاباً ذا مجلدات کثیرۃ ولو تراضیا ان تقوم الکتب ویأخذ کل بعضها بالقیمۃ لو کان بالتراضی جاز والا لا۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۱ کتاب القسمۃ)

ومثلهٗ فی شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۱۴۲ ص۶۶۳ الکتاب الاشربۃ۔

زید چونکہ بڑا بھائی تھا اس لیے اس نے مشترکہ مال سے فریضۂ حج ادا کیا، بعد میں دونوں جدا ہو گئے ہیں تو اب عمرو زید سے حج پر صرف شدہ رقم سے اپنے حصّے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا عمرو کا یہ مطالبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت چونکہ شرکتِ ملک کی ایک صورت ہے لہٰذا اس کا حکم یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے حصہ میں تصرّف کرنے میں اجنبی ہے اس لیے زید عمرو کا ضامن ہوگا اور اس کے ذمہ عمرو کا نصف دَین شرعاً لازم ہے، لہٰذا عمرو زید سے اپنے حصے کا شرعاً مطالبہ کر سکتا ہے، تاہم اگر اس کی اجازت سے حج کیا ہو تو تبرع ہونے کی صورت میں دوبارہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان کل واحدٍ من الشریکین شرکۃ ملكٍ ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه كغیر الشریك من الاجانب الا باذنه لعدم تضمنها الوکالة۔
(تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۸۸ کتاب الشرکة) [1]

مشترکہ زمین میں چشمہ کے پانی سے شریک کو منع کرنا جائز نہیں

سوال:۔ زید اور عمرو کے مابین ایک زمین مشترکہ تھی جس میں سے کچھ زمین بنجر اور کچھ قابلِ کاشت تھی، کچھ وقت تک دونوں اس سے فائدہ حاصل کرتے رہے، نیز اس زمین میں پانی کا ایک چشمہ بھی تھا، حال ہی میں زید نے عمرو کو اس چشمہ کے پانی سے منع کر دیا ہے، تو کیا زید کا عمرو کو چشمہ کے پانی سے منع کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین کا مشترکہ ہونا مبرہن اور مسلّم ہو تو زید کا عمرو کو چشمہ وغیرہ سے منع کرنا از روئے شریعت جائز نہیں ہے کیونکہ اس چشمہ میں جس طرح زید کا حق بنتا ہے اسی طرح عمرو کا بھی حق بنتا ہے، لہٰذا زید کا عمرو کے ساتھ یہ رویّہ

---

[1] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الآخر لکن لا یجوز له ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔ (شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۷۲ ص۶۱۰ الکتاب العاشر)
ومِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکة۔

شرعاً درست نہیں۔

لما ورد فی الحدیث : المسلمون شرکاء فی ثلٰثٍ فی الماءِ والکلاءِ والنار۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۳۶ کتاب البیوع۔ باب فی منع الماء) لہ

اموالِ مشترکہ میں سے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال :- دو آدمیوں کے مابین مشترکہ کاروبار ہے، ان مشترکہ اموال میں سے زکوٰۃ دینے کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اگر ایک شریک ان اموال میں سے جن میں زکوٰۃ واجب ہو زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو اس کا دوسرا ساتھی اس کے زکوٰۃ نہ دینے سے گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب :- جب دو آدمیوں کی آپس میں کاروباری شراکت ہو تو ہر ایک اپنے حصہ سے زکوٰۃ دینے کا ذمہ دار ہے کسی ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی ایک شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ دینے کا مجاز ہے اور بلا اجازت شریک زکوٰۃ نکالنے کی صورت میں دوسرا شریک ضامن قرار دیا جائے گا، لہٰذا اگر دوسرا شریک زکوٰۃ ادا نہ بھی کرتا ہو تو کاروبار میں شریک رکھنے سے کوئی حرج لازم نہیں آتا تاہم اگر زکوٰۃ نہ دینے والے کی محفل و مجلس اور باہمی اشتراک سے اس کے اعمال و اخلاق متأثر ہوتے ہوں تو پھر ایسی حالت میں اس شخص کے ساتھ کاروبار میں شرکت کرنے سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : (ولم یزک مال الآخر الّا باذنہ) ای احدھما لانہ لیس من جنس التجارۃ فلا یکون وکیلاً عنہ فی اداءھا الّا ان یأذن لہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۷ کتاب الشرکۃ) لہ ۲

لہ قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الماء والکلاء والنار مباحۃ والناس فی ھذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۲۳۴ ص۶۷۹ الکتاب العاشر)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۸۵ کتاب الشرکۃ۔

لہ ۲ قال العلامۃ فخرالدین الزیلعیؒ : (ولم یزک مال الآخر) لایزکی کل واحد منھما نصیب صاحبہ لانہ لم یأذن لہ فیھا لان الاذن بینھما وقع فی التجارۃ والزکوٰۃ لیست منھا۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۳۲۳ کتاب الشرکۃ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۳۳۶ کتاب الشرکۃ۔ الباب السادس فی المتفرقات۔

اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کا حکم

سوال: ایک آدمی فوت ہوگیا، اس کے ۲ دو بیٹے رہ گئے، ایک بالغ جبکہ دوسرا نابالغ ہے، تو کیا یہ بالغ اور بڑا بھائی اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کرنا شرعاً درست نہیں، البتہ اگر دیگر بھائی بالغ ہوں تو اُن کی اجازت سے مشترکہ اموال سے مہمان نوازی اور دیگر تبرعات کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان کل واحدٍ من الشریکین شرکۃ ملک ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ کغیر الشریک من الاجانب الا باذنہ لعدم تضمنہا الوکالۃ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکۃ)

شریک کو شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے

سوال: چند آدمیوں نے مل کر مشترکہ کاروبار شروع کیا اور سامانِ تجارت کی خرید و فروخت کرتے رہے، ان میں سے اچانک ایک شریک نے شرکت سے انکار کر دیا کہ میں آپ کے ساتھ شرکت کا معاملہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ تو کیا دیگر شرکاء کے مشورہ کے بغیر کسی شریک کے لیے شرکت کو فسخ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شرکاء میں سے ہر کسی شریک کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسرے شرکاء کی اجازت اور مشورہ کے بغیر جب چاہے اپنی شرکت کو ختم کر دے، اس صورت میں اشیاءِ مشترکہ کی قیمت لگا کر اصل زر بقدرِ حصہ اور منافع بقدرِ شرح تقسیم کر لیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اشترکا واشتریا امتعۃ ثم قال احدہما لا اعمل

لہ قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملک المشترک باذن الآخر لکن لا یجوز لہٗ ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریک۔
(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۷۱ ص۶۰۰ الکتاب العاشر)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکۃ۔

معك بالشركة وغاب فباع الحاضر الامتعة فالحاصل للبائع وعليه قيمة المتاع لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه واحدهما يملك فسخها وان كان المال عروضًا بخلاف المضاربة وهو المختار ۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۲۷ کتاب الشرکة) لہ

باپ اور بیٹے کی مشترکہ کمائی کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا اور اس میں کافی پیسے کمائے اب سوال یہ ہے کہ یہ پیسے باپ اور بیٹے کے مابین مساوی تقسیم ہوں گے یا صرف باپ کی ملکیت شمار ہوں گے ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں باپ اور بیٹے نے مشترکہ کاروبار سے جو پیسے کمائے ہیں وہ باپ کی ملکیت شمار ہوں گے کیونکہ بیٹا باپ کا معین اور مددگار ہوتا ہے لہٰذا باپ اپنی زندگی میں اس میں جو بھی تصرّف چاہے کر سکتا ہے، تاہم اگر رأس المال دونوں کا مشترکہ ہو اور معاہدہ بھی یہی ہوا ہو تو منافع بھی دونوں میں مساوی تقسیم ہوگا ۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : الابّ والابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للاب ان كان الابن في عياله لكونه معينا له الا ترى انه لو غرس شجرة تكون للاب ۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکة ۔فصل فی الشرکة الفاسدة) لہ۲

لہ لما قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله : وصورته اشتركا و اشتريا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل معك بالشركة .... لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معهُ احدهما يملك فسخها ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۵ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۲ ص۳۳۵ کتاب الشرکة ۔

لہ۲ وقال فی الهندية : ابٌ وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للاب اذا كان الابن في عيال الاب لكونه معينًا لهٗ ۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۲۹ الباب التاسع فی شرکة الوجوه)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی الکاملیة ج۱ ص۵۱ کتاب الشرکة ۔

مشترکہ زمین میں بلا اجازتِ شریک کے باغ لگانا

سوال:۔ ایک زمین دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے جس میں ایک شریک نے دوسرے کی اجازت کے بغیر مالٹا کے پودے لگا دیئے، چند سال کے بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریکِ ثانی نے کہا کہ یہ پودے چونکہ مشترکہ زمین میں لگائے گئے ہیں اس لیے ان میں میرا بھی مکمل حصہ ہے لیکن شریکِ اول انکار کر رہا ہے، تو آیا اس کا یہ انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ زمین دونوں شرکاء کے مابین تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے اور دوسرے شریک کے حصہ میں پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑے اور اگر زمین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پودے نہیں اکھاڑے جائیں گے اور دوسرا شریک پہلے والے کو ان پودوں کی قیمت ادا کرے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: بنی احدھما ای احد الشریکین بغیر اذن الآخر فی عقار مشترک بینھما فطلب شریکہ رفع بنائہ قسم العقار فان وقع البناء فی نصیب البانی فبھا ونعمت والا ھدم البناء وحکم الغرس۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۶ ص۲۶۸ کتاب القسمة)

کسی کی گائے بطور شرکت پالنا

سوال:۔ ایک شخص نے گائے خرید کر کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر پالنے کے لیے دے دی کہ دودھ سب تمہارا ہوگا اور اس سے جو بچے پیدا ہوں وہ میرے ہوں گے، تو کیا اس قسم کی شرط لگانا اور ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

لہ وقال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ: ان الارض تقسم بینھما فما وقع فی نصیب غیر البانی یرفع...... وافتٰی شیخ آفندی فی غرس الاشجار من احد الشریکین فی الارض المشترکة بمثل ذلک۔ (من البناء)

(فتاویٰ کاملیة ج۱ ص۵۳ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُهٗ فی سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۲۷ باب فی زرع ارض قوم بغیر اذن صاحبھا۔

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں گائے کا دودھ اور اس کے بچے سب مالک کے ہیں اور پالنے والے کو اُجرتِ مثل دی جائے گی کیونکہ یہ اجارہ فاسدہ ہے اور اجارۂ فاسد میں کام کرنے والے کو اجرِ مثل ملتا ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ: لا یصح ذلك وما حدث فهو لصاحب البقرة وللآخر مثل علفه واجر مثله کما فی الرد۔

(فتاویٰ کاملیة ص۵۵ کتاب الشرکة)[1]

مشترکہ زمین میں شرکاء کی اجازت کے بغیر مکان بنانا

سوال:۔ ایک غیر آباد قطعہ اراضی چند افراد میں مشترک ہے، ان میں سے ایک شریک نے بلا اجازت شرکاء کے اور تقسیم سے پہلے ہی اس میں ایک مکان تعمیر کیا، تو کیا اس شخص کا بغیر شرکاء کی اجازت کے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا تصرف کرنا دیگر شرکاء کی اجازت پر موقوف ہے، اور صورتِ مذکورہ میں اس شخص نے چونکہ شرکاء کی اجازت کے بغیر اور قبل از تقسیم مکان بنایا ہے اس لیے اس کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: اذا بنی احد الشرکاء لنفسه فی الملك المشترك القابل للقسمة بدون اذن الآخرین ثم طلب الآخرون القسمة تقسم فان خرج ذلك البناء فی نصیب بانیه فبها وان خرج فی نصیب الآخر فله ان یکلف بانیه هدمه ورفعه۔ (شرح مجلة الاحکام المادة ۱۱۷۳ ص۶۲۴)[2]

---

[1] وقال فی الهندیة: وعلی هذا اذا دفع البقرة الی انسان بالعلف لیکون الحادث بینهما نصفین فما حدث فهو لصاحب البقرة ولذلك الرجل مثل العلف الذی علفها واجر مثله فیما قام علیها۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس فی الشرکة الفاسدة)

ومثله حاشیة منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۸۴ کتاب الشرکة۔

[2] وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسی: واذا بنی فی الارض المشترکة بغیر اذن الشریك له ان ینقض بناءه۔ (فتاوی کاملیة ج ص۵۱ کتاب الشرکة)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکة۔

خودرو گھاس مشترک ہوتا ہے

سوال:۔ ایک مشترکہ زمین جو کسی کی خاص ملکیت نہیں، گاؤں والوں میں سے ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس مشترکہ زمین میں اُگے ہوئے خودرو گھاس کو رہن پر دے دے یا فروخت کرے تو کیا اس شخص کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خودرو گھاس خواہ مملوکہ زمین میں ہو یا غیر مملوکہ زمین میں، ہر حال میں وہ کسی کی ملک نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ بالا شخص کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: المسلمون شرکاء فی ثلٰث فی الماء والکلاء والنار۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۳۶ کتاب البیوع۔ باب فی منع الماء)

آمدن و اخراجات میں شریک بھائیوں کی کمائی کا حکم

سوال:۔ دو بھائی آپس میں آمدنی اور گھر کے تمام اخراجات میں شریک تھے، ان میں سے ایک بھائی انگلینڈ چلا گیا وہاں اس نے کافی مال جمع کیا اور واپس آکر ایک مکان خریدا، اس بھائی کی عدم موجودگی میں دوسرا بھائی گاؤں میں ہی محنت مزدوری کرکے خود بھی کھاتا رہا اور اس کے اہل و عیال کو بھی کھلاتا رہا، لیکن جس بھائی نے مکان خریدا ہے اب وہ اس میں دوسرے بھائی کے حصہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے، تو کیا شرعاً یہ دونوں بھائی اس مکان میں برابر کے شریک ہوں گے یا جس بھائی نے خریدا ہے اس کا ہی ہوگا؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شرکت ہے وہ شرکتِ فاسدہ ہے، لہٰذا اگر دونوں بھائیوں کے اموال آپس میں غیر متمیز ہوں تو ان میں مساوی انداز میں تقسیم ہوں گے اور اگر دونوں کے اموال متمیز ہوں تو ہر ایک بھائی اپنے اپنے حصے کا حقدار ہوگا، اور اس بھائی کے مکان میں دوسرے بھائی کو حصہ دینا کوئی شرعی امر نہیں بلکہ محض

لہ وقال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ: الماء والکلاء والنار مباحۃ والناس فی ھذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء۔

(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۳۴ ص ۶۷۹ الکتاب العاشر)

ومثلہ فی الھدایۃ ج ۴ ص ۴۸۵ کتاب احیاء الموات۔

رواجی امر ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: یؤخذ من هٰذا ما افتٰی بہ فی الخیریة فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دارٍ واحدة واخذ کل منهما یکتسب علی حدة ویجمعان کسبهما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز فاجاب بانهٗ بینهما سویة۔
(رد المحتار ج۳ ص۳۲۵ کتاب الشرکة۔ فصل فی الشرکة الفاسدة)[1]

مشترکہ ندی سے انتفاع کا حکم

سوال:۔ ایک ندی دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک شریک دوسرے کو منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اس ندی سے نفع نہیں اٹھا سکتے اور میں آپ کا اس میں حق نہیں مانتا، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ شریک اپنے ساتھی کی اجازت کے بغیر اس ندی سے نفع حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ ندی کا مشترک ہونا مبرہن اور مسلّم ہو تو ان شرکاء میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصہ میں مستقل تصرف کرنے کا مالک ہے اور ملکِ مشترک میں دوسرے ساتھی کی اجازت سے تصرف کرنے کا مجاز ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الاٰخر لکن لا یجوز لهٗ ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔
(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۰۷۱ ص۶۱۰ الکتاب العاشر)

---

[1] وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: فاذا کان سعیهم واحداً ولم یتمیز ما حصله کل واحدٍ منهم بعمله یکون ما جمعوه مشترکاً بینهم بالسویة وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً کما افتٰی بہ فی الخیریة وما اشتراه احدهم لنفسه یکون لهٗ ویضمن حصة شرکائه من ثمنه اذا دفعه من المال المشترك۔ (فتاوٰی کاملیة ج۱ ص۵ کتاب الشرکة)
ومثلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۹۶ کتاب الشرکة۔

[2] وقال العلامة ابن عابدینؒ: ان کل واحد من الشریکین شرکة ملك ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه کغیر الشریك من الاجانب الا باذنه لعدم تضمنها الوکالة۔
(تنقیح الحامدیة ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکة)
ومثلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکة۔

مزدور جو کچھ کمائے وہ اسی کی ملکیتِ خاص ہوتا ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیرونِ ملک چلا گیا اور وہاں چند سال مزدوری کرنے کے بعد پھر اپنے وطن واپس آ گیا اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اپنے بھائیوں اور والدین سے جدا ہو گیا، اس موقع پر اس نے یہ کہا کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے وہ خاص میری ملکیت ہے جبکہ اس کے بھائیوں نے یہ کہا کہ نہیں تمہاری کمائی میں ہمارا بھی حصہ بنتا ہے تو کیا اس کے دوسرے بھائیوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعت کی رو سے کسی مزدور کی کمائی ہوئی رقم اُسی کی ملکِ خاص ہوتی ہے اور اُس کی اِس کمائی میں کوئی بھی شریک نہیں، کیونکہ کمائی اور مزدوری کمانے والے کی ملکِ خاص ہوتی ہے، البتہ اُس پر مشترکہ مال سے جو کچھ خرچ کیا گیا ہو تو وہ واپس لیا جا سکتا ہے ۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ : وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً کما افتی بہ فی الخیریة وما اشتراہ احدھم لنفسہ یکون لہٗ ویضمن حصّة شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک ۔ (فتاویٰ کاملیة ج ۱ ص۵ کتاب الشرکة)[1]

اولاد اور باپ کی مشترکہ تجارت میں اولاد کا حصہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب ! میری کپڑے کی دوکان ہے جس کا کل سرمایہ میرا اپنا ہے دوکان میں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے شروع کی اور اب دوکان کا سرمایہ دس لاکھ روپے تک بڑھ گیا ہے، اس کاروبار کو ترقی دینے میں میرے دو بیٹوں نے بھی میرا ساتھ دیا ہے، دونوں بیٹے اس وقت سے لے کر آج تک اکٹھے رہے ہیں، اب ان میں سے ایک بیٹا جدا ہونا چاہتا ہے اور مجھ سے اس دوکان میں حصہ داری کا مطالبہ کرتا ہے ۔ آنجناب سے شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے ؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق آپ کے بیٹے کاروبار میں آپ کے معاون تھے نہ کہ شریک، اس لیے ان میں سے کسی ایک بیٹے کو بھی دوکان میں حصہ داری کے دعویٰ کا

---

[1] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ : وما اشتراہ احدھم لنفسہ یکون لہٗ ویضمن شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک وکل ما استدانہ احدھم یطالب بہ وحدہٗ ۔

(شرح مجلة الاحکام ۔ المادة ۱۳۶۱ ص۷۲۵ الکتاب العاشر)

ومثلہٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۹۲ کتاب الشرکة ۔

شرعاً کوئی حق نہیں، اور اگر آپ اس بیٹے کو کچھ بھی نہ دیں تو شرعاً آپ پر کوئی گناہ نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ اس بیٹے کو بھی احساناً کچھ نہ کچھ دے دیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیٔ ثم اجتمع لهما مال یکون کله للاب اذا کان الابن فی عیاله واجاب خیر الرملی عن سوال اٰخر بقوله حیث کان من جملة عیاله والمعینین له فی اموره واحواله فجمیع ما حصله بکده وتعبه فهو ملك خاص لابیه لاشیٔ له فیه حیث لم یکن له مال .لو اجتمع له بالکسب جملة اموال لانه فی ذٰلك لابیه معین۔ (فتاوٰی حامدیة ج۲ ص۱۸ کتاب الشرکة)[۱]

اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا ترجیح ہوا اس سے زیادت کے رجوع کا حق کسی کو بھی نہیں۔ نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لیے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدون کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کرسکتا ہے اور اگر ان کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کرسکتا۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۱۶ کتاب الشرکة)

❄ ❄

---

[۱] قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اسکی صورت کیا تھی؟ آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم یا سرمایہ ہبۃً دیدیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگاکر لڑکا شریک تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبۃً نہیں دی نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو ملاکر وہ کاروبار میں شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ویسے ہی بدون رقم دیئے کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوتی۔ پس صورت اولیٰ میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور ہر شخص اپنی رقم و سرمایہ کی نسبت سے اس وقت اصل و نفع میں مستحق ہوگا۔ اور صورت ثانی میں شرکت ہی نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملک ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر زیادہ خرچ ہوا

كتاب

المضاربة

كتاب المضاربة

(مضاربت کے احکام ومسائل)

مضاربت کی حقیقت

سوال: جناب مفتی صاحب! مضاربت کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب: مضاربت رب المال اور مضارب کے باہمی اشتراک کا وہ فائدہ مند معاملہ ہے جس میں رب المال کو اس کے مال کی وجہ سے اور مضارب کو محنت کی وجہ سے حصہ دیا جاتا ہے، ایسی حالت میں دونوں کے لیے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہوتی ہے جو شرعی قواعد وضوابط کی روشنی میں ان کے درمیان طے پایا ہو۔

قال العلامة ابوالبرکات النسفیؒ: هی شرکة بمال من جانب والمضارب امین وبالتصرف وکیل وبالربح شریک وبالفساد اجیر وبالخلاف غاصب وباشتراط کل الربح له مستقرض وباشتراطه لرب المال مستبضع وانما تصح بما تصح به الشرکة۔

(کنزالدقائق ص۳۳۹ کتاب المضاربة) [1]

مضاربت میں منافع کی تعیین کرنا

سوال: عمرو نے بکر کو دس ہزار روپے تجارت کے لیے دیئے اور بکر پر شرط عائد کر دی کہ آپ مجھے سالانہ ایک ہزار روپے دیں گے بقایا منافع جتنا بھی ہوگا وہ آپ کا ہوگا، تو کیا ایسا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مضارب یا رب المال کا کسی خاص مقدار میں منافع کا اپنے لیے متعین کرنا خواہ ماہانہ ہو یا سالانہ، مفسدِ عقد ہے، اس لیے ایسی صورت میں مضاربت فاسد رہے گی۔

قال العلامه ابوبکر الکاسانیؒ: ومنها ان یکون المشروط لکلِّ واحدٍ منهما

---

[1] قال العلامة القدوری رحمه الله: المضاربة عقد یقع علی الشرکة فی الربح بمال من احد الشریکین وعمل من الآخر ولا تصح المضاربة الا بالمال الذی بیّنّا ان الشرکة تصح به۔ (مختصر القدوری، کتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۲۵۶ کتاب المضاربة۔

من المضارب وربّ المال من الربح جزأً شائعاً نصفاً او ثلثاً اوربعاً فان شرطاعدداً مقدراً بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او اکثر والباقی للآخر لایجوز والمضاربة فاسدة۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۸۵ فصل واما شرائط الرکن فبعضها یرجع الخ) ؎۱

عقدِ مضاربت میں رأس المال کا نقدی ہونا ضروری ہے

سوال:۔ زید نے عمرو کے ہاتھ بیس ہزار روپے کا مال فروخت کیا اور قیمت وصول نہیں کی بلکہ قرض رہتے دیا، بعد میں دونوں میں اس طرح کا عقد ہو گیا کہ زید نے عمرو سے کہا کہ اُن بیس ہزار روپوں کے ساتھ آپ تجارت کریں جو میرے آپ کے ذمے قرض ہے اور منافع کی صورت میں اولاً عمرو زید کو دو ہزار روپے ادا کرے گا اور بقایا رأس المال سے جو بھی نفع آئے گا وہ دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہو گا، کیا مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ مضاربت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ عقدِ مضاربت میں مال کا نقد دینا ضروری ہے نہ کہ قرض کا مال، البتہ اس طرح کا عقد کرنا کہ رُبّ المال کا کسی آدمی کے ذمّے قرض ہو اور مضارب کو اجازت دے دے کہ آپ اُس قرض کو وصول کر کے اُس سے تجارت کریں تو یہ صورت درست ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ واما المضاربة بدینٍ فان علی المضارب لم یجز وان علی ثالث جاز وکرہ۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار ج ۵ ص ۶۴۷ کتاب المضاربة) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة: ومنها ان یکون نصیب المضارب من الربح معلوماً علیٰ وجه لاتنقطع به الشرکة فی الربح کذا فی المحیط۔ فان قال علیٰ ان لك من الربح مائة درهم او شرط مع النصف او الثلث عشرة دراهم لاتصح المضاربة کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص ۲۸۷ کتاب المضاربة۔ الباب الاوّل فی تفسیرها ورکنها وشرائطها)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۶۴ کتاب المضاربة۔

؎۲ وفی الهندیة: (ومنها) ان یکون رأس المال عیناً لادیناً فالمضاربة بالدیون لاتجوز حتی ان من کان له علی آخر الف درهم فامرہ صاحب الدَّین ان یعمل بها مضاربة لاتجوز المضاربة کذا فی النهایة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۴ ص ۲۸۶ کتاب المضاربة۔ الباب الاوّل فی تفسیرها ورکنها وشرائطها)۔ وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۲۵۸ کتاب الصلوٰة۔

مضارب کے نفقہ کا حکم

سوال:- دورانِ تجارت مضارب کی خوراک و پوشاک کا خرچہ کس کی ذمہ داری ہے؟

الجواب:- مضارب مال کی تجارت اپنے شہر میں کرے تو اُس کی خوراک وغیرہ کا خرچہ مالِ مضاربت سے نکالنا جائز نہیں، ہاں اگر اپنے شہر سے باہر تجارت کرے تو خوراک و پوشاک کا خرچہ اور دیگر ضروریاتِ زندگی مالِ مضاربت سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ:- واما تفسیر النفقۃ التی فی مال المضاربۃ فالکسوۃ والطعام والادام والشراب واجر الاجیر وفراش ینام علیہ وعلف دابتہ التی یرکبھا فی سفرہ ویتصرف فی حوائجہ وغسل ثیابہ ودھن السراج والحطب ونحو ذٰلک ولاخلاف بین اصحابنا فی ھٰذہ الجملۃ لان المضارب لا بد لہ منھا فکان الاذن ثابتًا من ربّ المال دلالۃ۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۰۶ فصل واما بیان حکم المضاربۃ)[1]

مضاربت میں خسارہ کی ذمہ داری کا مسئلہ

سوال:- مضارب کی محنت کے باوجود اگر معاملہ فائدہ مند نہ رہے اور مضارب کو آئے دن ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو جس کے نتیجے میں اصل رقم سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں تو ایسے حالات میں تاوان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

الجواب:- مضاربت ربّ المال اور مضارب کے باہمی اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں ربّ المال کے ساتھ مضارب کی محنت شامل ہوتی ہے، نقصان کی صورت میں دونوں کا متاثر ہونا ظاہر ہے، اگر ربّ المال کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے تو مضارب کی بھی دن رات کی محنت ضائع ہوتی ہے، مالی نقصان کا بوجھ مضارب پر ڈالنا بے انصافی کے مترادف ہے، اسی لیے مضارب پر مالی نقصان کی ذمہ داری کی شرط کرنا مفسد ہے، جو نقصان ہو وہ پہلے منافع

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: وفی الاصل المضارب ما دام یعمل فی المصر فنفقتہ فی مالہ وان کان المصر کبیرا او ھو قائم فی جانب آخر للتجارۃ۔

(خلاصۃ الفتاوٰی ج ۴ ص۱۸۹ الفصل الثالث فی نفقۃ المضارب ومؤنتہ)

ومِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز، مادۃ ۱۴۱۹ الفصل الثالث فی احکام المضاربۃ۔

سے منہا کیا جائے گا، اگر اس سے بھی متجاوز ہو تو پھر رأس المال سے منہا کیا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفی الجلالیة کل شرط یوجب جهالة فی الربح او یقطع الشرکة فیه یفسدها والا بطل الشرط کشرط الخسران علی المضارب۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج۵ ص۶۴۸ کتاب المضاربة) [1]

مضاربت میں فریقین منافع کے حقدار کب بنتے ہیں

سوال: رب المال اور مضارب کے درمیان معاہدہ ہوا کہ مضارب دوسرے شہروں سے مال فروخت کرے گا اور منافع نصف نصف ہوگا، اب رب المال نے مضارب سے مال فروخت ہونے سے پہلے کہا کہ یہاں کے بھاؤ کے حساب سے درآمد کردہ مال میں بیس ہزار روپے منافع ہوتا ہے لہٰذا آپ مجھے دس ہزار روپے دے دیں، تو کیا رب المال کا ایسا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ جب تک منافع کا ظہور نہ ہو جائے رب المال کو ایسا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور منافع مال بیچنے کے بعد ہوتا ہے، اور اگر فریقین کے مابین اس طرح کا معاہدہ ہو چکا ہو تو یہ مضاربت فاسد ہے اس کو فوراً توڑ دینا چاہیئے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: واشار المصنف الیٰ ان المضارب ان ینفق علیٰ نفسه من مال المضاربة فی السفر قبل الربح والیٰ انه لو لم یظهر الربح لا شئ علی المضارب۔

(البحر الرائق ج۷ ص۲۷ کتاب المضاربة) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: الضرر والخسار یعود فی کل حال علیٰ ربّ المال واذا شرط کونه مشترکاً بینه وبین المضارب فلا یعتبر ذٰلك الشرط۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۱۴۲۸ ص۷۵۶ الفصل الثالث فی بیان احکام المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۲۵۸ کتاب المضاربة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: فاذا ظهر الربح فهو شریکه بحصته من الربح۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة۔ الفصل الاوّل فی المقدمة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۶۵۸ کتاب المضاربة۔

حکومتی جرمانہ رب المال پر آئے گا یا مضارب پر

سوال:۔ زید نے عمرو کو دس ہزار روپے افیون کی تجارت کے لیے دیئے، عمرو افیون خرید کر بڑی احتیاط کے ساتھ آرہا تھا کہ راستے میں پولیس نے اُسے گرفتار کر کے مال بھی ضبط کر لیا اور تین ہزار روپے جرمانہ بھی لے لیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ تین ہزار روپے رب المال (زید) کے ذمے ہے یا مضارب (عمرو) کے ذمے، جبکہ افیون کی تجارت حکومت کی طرف سے سخت جرم ہے؟

الجواب:۔ نقصانِ جرم کی اگر مالک نے ذمہ داری قبول کر لی ہے تو مالک پر ضمان لازم ہے ورنہ مضارب پر آئے گا۔ البحر الرائق جلد ۲ ص۲۶۷ میں ہے، ولا رُجُوع له فیما انفقه فی الخصومة لتقاضی الدَّیْن۔ جب دَین (قرض) کے مقدمے کا خرچ مالک پر نہیں آتا ہے تو جرم کا ضمان کس طرح مالک پر آئے گا۔

وفی الهندیة: الاصل ان ما یفعله المضارب ثلاثة انواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وهو ما یکون من باب المضاربة وتوابعها ومن جملته التوکیل بالبیع والشرا للحاجة والرهن والارتهان والاجارة والاستئجار والایداع والابضاع والمسافرة و نوع لا یملکه بمطلق العقد ویملکه اذا قیل له اعمل برأیك وهو ما یحتمل ان یلحق به فیلحق به عند وجود الدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة او شرکة الی غیره وخلط مال المضاربة بماله او بمال غیره ونوع لا یملکه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأیك الا ان ینص علیه رب المال وهو کالاستدانة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۹۱ الباب الرابع فیما یملك المضارب من التصرفات ولا یملك)[1]

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: والاصل ان ما یفعله المضارب ثلثة انواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وهو ما یکون من باب المضاربة وتوابعها الخ (الی ان قال) ونوع لا یملکه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأیك (الا ان) ینص علیه رب المال۔

(الهدایة ج۳ ص۲۶۵ فصل فیما یفعله المضارب)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۸۹ الفصل الثانی فیما یملك المضارب۔

دوکان کے اخراجات مضارب پر عائد کرنا

سوال:۔ رب المال اور مضارب کے درمیان ایسا معاہدہ کرنا کہ نفع نقصان میں باہم شریک ہوں یعنی ایک تہائی رب المال کا اور دو تہائی مضارب کا ہوگا، اس کے علاوہ دوکان کے اخراجات بھی مضارب کے ذمے ہوں گے، کیا ایسا معاہدہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ دوکان کے اخراجات رأس المال سے ادا کرنا جائز ہیں البتہ مضارب کو تاوان میں شریک کرنا ناجائز ہے اور مضارب پر تاوان کی ادائیگی مشروط کرنا بھی باطل ہے، تاوان کی صورت میں اگر مضارب قصوروار نہ ہو تو منافع سے منہا کیا جائے گا اور اگر منافع سے پوری ادائیگی ممکن نہ ہو تو رأس المال سے ادا کیا جائے گا۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز ؒ: واذا تلف بعض مال المضاربۃ یحسب فی اول الامر من الربح ولا یسری الی رأس المال واذا تجاوز مقدار الربح وسری الی رأس المال فلا یضمنہ المضارب سواء کانت المضاربۃ صحیحۃ او فاسدۃ۔

(شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۴۲۷ ص ۷۵۶، ۷۵۷)[1]

مضاربت کے قواعد وضوابط پر عرف کا اثر

سوال:۔ مروجہ کرنسی نوٹ مضاربت کے لیے کافی ہیں یا سونا چاندی خرید کر دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مروجہ کرنسی نوٹ چونکہ ثمن عرفی کے حکم میں ہیں اور معاشرہ میں ان سے خرید وفروخت کی جاتی ہے اس لیے مضاربت کے لیے ان کا دینا ہی کافی ہے۔

قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: المضاربۃ لا تجوز بغیر الدراھم والدنانیر مکیلاً کان او موزوناً او عروضاً فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللہ تعالیٰ وقال محمد رحمہ اللہ تجوز بالفلوس الرائجۃ عدداً ولا

---

[1] قال العلامۃ المرغینانی ؒ: من مال المضاربۃ فھو من الربح دون رأس المال لان الربح تابع (الی ان قال) فان زاد الھالک علی الربح فلا ضمان علی المضارب لانہ امین۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۲۶۴ فصل فی العزل والقسمۃ، کتاب المضاربۃ)
ومثلہ فی رد المحتار ج ۵ ص ۶۵۸ فصل فی المتفرقات، کتاب المضاربۃ۔

تجوز بالذهب والفضة اذا لم تکن مضروبة فی روایة الاصل)
(فتاویٰ خانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۱۶۱ کتاب المضاربة)[۱]

جیوان کو مضاربت میں دینے کا حکم

سوال: مضارب کا رب المال سے جانور لینا باین شرط کہ میں اس کو پالوں گا اور اس کی نسل پیدا ہونے کی صورت میں موافق شرط تقسیم کریں گے، کیا مضاربت کی یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حیوان کو مضاربت پر دینا عقد فاسد ہے، ہاں اگر حیوان کو دیتے وقت یہ کہدے کہ اس جانور کو بیچ دو اور اس رقم پر عمل مضاربت کرو تو یہ جائز ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: بشرط ان یکون رأس المال مالا تصح به الشرکة فلا یجوز ان یکون العقار والعروض والدین فی ذمة رأس مال فی المضاربة لکن رب المال اذا اعطی شیئا من العروض الی المضارب وقال بع هذا واعمل بثمنه مضاربة وقبل المضارب وقبض ذلك المال وباعه واتخذ نقود ثمنه رأس المال للتجارة کانت المضاربة صحیحة۔ (مجلة الاحکام، مادة ۱۴۰۹ ص۲۴۵ الفصل الثانی فی شروط المضاربة)[۲]

مالِ مضاربت سے خریدی ہوئی بکری کے دودھ کا حکم

سوال: مضارب نے باجازت رب المال بکری

---

[۱] قال العلامة ابوبکر الحداد الیمنی رحمه الله: (قوله ولا یصح المضاربة الا بالمال الذی بیّنّا ان الشرکة تصح به) یعنی انها لا تصح الا بالدراهم والدنانیر فاما الفلوس فعلی الخلاف الذی بیّناه فی الشرکة وهو عند محمد تجوز المضاربة بها وعندهما لا تجوز۔
(الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۲۵ کتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی عینی شرح کنز ص۵۰۲ کتاب المضاربة۔

[۲] وفی الهندیة: لو دفع الیه عرضا او عبدا فقال بعه واقبض ثمنه واعمل به مضاربة فباعه بدراهم او دنانیر وتصرف فیها جازت المضاربة کذا فی محیط السرخسی۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۲۶۸ کتاب المضاربة۔ الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها وحکمها۔)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة۔

خریدی اب اس کا دودھ مضارب کی ملکیت ہوگی یا کہ رب المال کی؟

الجواب:۔ دودھ، اون وغیرہ تمام کے تمام مالِ مضاربت یا ربح میں داخل ہے، ان کا استعمال بغیر اجازت کے ممنوع ہے۔ ان چیزوں کی قیمت حسبِ ضابطۂ فقہاء کبھی تو رأس المال میں داخل ہوتی ہے اور کبھی ربح (منافع) ہیں۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: المضارب امین فرأس المال فی یده فی حکم الودیعة اما من حیث تصرفه فی رأس المال فهو وکیل رب المال واذا ربح کان شریکًا فیه۔ (مجلة الاحکام۔ مادة ۱۴۱۳ ص۷۴۸ الفصل الثانی فی احکام المضاربة)[۱]

مضارب کا معاہدہ کے خلاف کام کرنا

سوال:۔ زید نے بکر کو بیس ہزار روپے عقدِ مضاربت پر کپڑوں کی تجارت کے لیے دیئے، بکر نے خلافِ معاہدہ تیل کی تجارت شروع کردی اور اس میں خسارہ اٹھانا پڑا، از روئے شرع شریف نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

الجواب:۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے پر نقصان کی تمام ذمہ داری بکر (مضارب) پر عائد ہوتی ہے لہٰذا بکر زید کو تمام رأس المال یعنی بیس ہزار روپے ادا کرے گا۔

وفی الهندیة: ان خص له رب المال التصرف فی بلد بعینه او فی سلعة بعینها تتقید به ولم یجز له ان یتجاوز ذلک (الیٰ ان قال) فان اخرج الی غیر ذلک البلد فاشتریٰ ضمن وکان ذلک له وله ربحه۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۲۹۷ الباب السادس فیما یشترط علی المضارب من الشروط)[۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: فاذا ظهر الربح فهو شریکه بحصته من الربح۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۵۰ کتاب المضاربة۔

[۲] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: اذا خالف المضارب رب المال بعد مانهاه بقوله لاتذهب بمال المضاربة الی المحل الفلانی اولا تبع بالنسیئة فذهب بمال المضاربة الی ذلک المحل فتلف المال او باع بالنسیئة فهلک الثمن کان المضارب ضامنًا۔

(مجلة الاحکام مادة ۱۴۲۲ ص۵۵۹ الفصل الثالث فی احکام المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۶۵۱ کتاب المضاربة۔

مدرسے کا فنڈ چندہ دہندگان کی اجازت سے مضاربت پر دینا

سوال:۔ کیا مدرسے کا فنڈ بمشورہ متولیان و اراکین مدرسہ مضاربت پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مدرسے کا فنڈ ضروریات مدرسہ سے زائد ہو تو چندہ دہندگان کی اجازت اور متولیانِ مدرسہ کے مشورہ سے اس سے تجارت کرنا مرخص ہے۔

وفی الهندية: القيم اذا اشترى من غلة المسجد حانوتاً او داراً ان يستغل ويباع عند الحاجة جاز ان كان ولاية الشراء۔ (الفتاوى الهندية ج٢ ص٤٦٣ الباب الثانى فى الوقف على المسجد وتصرف القيم وغيره فى مال الوقف عليه) [1]

مال کی موجودگی میں مضاربت کو ختم کرنے کا حکم

سوال:۔ زید نے خالد کو مضاربت کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے اب کچھ وقت گذرنے کے بعد زید اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے جبکہ خالد کے پاس ابھی کچھ مال باقی ہے، تو کیا مال کی موجودگی میں زید اپنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عاقدین مضاربت کو ختم کرنا چاہتے ہوں تو جب تک مالِ مضاربت ختم نہیں ہوتا اس وقت تک رب المال اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ نہیں کر سکتا اور نہ مضارب کو معزول کرنے سے اس کے تصرفات ختم ہوں گے۔

لما قال العلامة المرغينانى رح: واعلم المضارب بعزله والمال عروض فله ان يبيعها ولا يمنعه العزل من ذلك لأن حقه قد ثبت فى الربح انما يظهر بالقسمة وهى تبتنى على رأس المال وانما ينض بالبيع۔
(الهداية ج٣ ص٢٦ كتاب المضاربة)

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى رح: الفاضل عن وقف المسجد يشترى مستقلاً للمسجد حانوتاً او داراً۔ (خلاصة الفتاوى ج٤ ص٤٢٣ الفصل الرابع فى المسجد واوقافه ومسائله)
ومثله فى الخانية على هامش الهندية ج٣ ص٣١٣ فصل فى وقف المنقول۔

مضاربت ختم کرنے سے روکنے اور عقدِ مضاربت کیلئے تعین مدت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک دو مسئلوں کی وضاحت مطلوب ہے، مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی رو سے جواب عنایت فرمائیں ؟

(۱) دو آدمیوں نے مل کر مضاربت کے عنوان سے کاروبار شروع کیا، ان دونوں کا معاملہ چار سال تک جاری رہا، اب ایک ساتھی دوسرے سے جدا ہونا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ساتھی کا یہ کہنا ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں تم مجھ سے جدا نہیں ہوسکتے، کیا واقعی دوسرے ساتھی کو منع کرنے کا اختیار ہے ؟

(۲) ان دونوں نے عقدِ مضاربت کرتے وقت چار سال کی مدت بھی مقرر کی تھی۔ تو کیا مضاربت میں مدت مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ (۱) عقدِ مضاربت فریقین میں سے جو بھی چاہے اور جس وقت چاہے ختم کرسکتا ہے مگر عقد فسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے ساتھی کو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ لیکن اس فسخ کا اطلاق اس وقت صحیح ہوگا جب مال نقدی کی شکل میں موجود ہو، اگر مال اثاثہ (عروض) کی صورت میں ہو تو پھر مضارب کو اثاثہ فروخت کرنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ اصل نفع متعین ہو جائے جس کیلئے عقد ہوا تھا۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: وأما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غیر لازم ولکل واحد منهما اعنی رب المال والمضارب الفسخ لکن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه ویشترط ایضاً ان یکون رأس المال عیناً وقت العقد دراهم او دنانیر حتی لو نهی رب المال المضارب عن التصرف ورأس المال عروض وقت النهی لم یصح نهیه وله ان یبیعها لانه یحتاج الی بیعها بالدراهم والدنانیر لیظهر الربح فکان النهی والفسخ ابطالاً لحقه فی التصرف فلا یملك ذلك وان کان رأس المال دراهم او دنانیر وقت الفسخ والنهی صح الفسخ والنهی۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۰۹ کتاب المضاربة)

(۲) اسی طرح عقدِ مضاربت کیلئے احناف کے ہاں وقت متعین کرنا بھی صحیح ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ولنا ان المضاربة توکیل والتوکیل یحتمل التخصیص بوقت دون وقت۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۹۹ کتاب المضاربة)

لہٰذا اگر صورتِ مسئولہ میں عقدِ مضاربت کا وقت بھی مقرر ہو اور سرمایہ بھی نقدی کی شکل میں ہو تو پھر دوسرے ساتھی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ساتھی کو عقد مضاربت کے فسخ کرنے سے منع کرے یا روکے۔

كتاب الوكالة الحوالة

فتقبلها ربها بقبولٍ
حسنٍ وانبتها نباتا
حسناً وكفلها زكريا

قال اجعلنى خزائن
الارض انى حفيظ عليم

کتاب الوکالۃ والکفالۃ

(وکالت کے احکام و مسائل)

نابالغ کو وکیل بنانا

سوال :۔ مساجد، مدارس یا دوسرے رفاہی کاموں کے لیے چندہ کرتے وقت بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ گھروں سے عورتیں چھوٹے بچوں کو چندہ دے کر بھیج دیتی ہیں، تو کیا ایک نابالغ بچہ والدہ یا والد کی طرف سے کچھ رقم لے جا کر وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر بچہ سمجھدار ہو تو اس کو وکیل بنانے میں کوئی حرج نہیں تاہم مذکورہ صورت میں بچہ وکیل نہیں بلکہ صرف نمائندہ ہے جس کو فقہاء کرام رسول کے نام سے یاد کرتے ہیں اس لیے نابالغ بچوں کے ہاتھ خیرات وغیرہ بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني : قال و يجوز ان يقبل في الهدية والاذن قول العبد والجارية والصبي لان الهدايا تبعث عادة على ايدى هؤلاء وكذا لا يمكنهم استصحاب الشهود على الاذن عند الضرب في الارض والمبايعة في السوق فلو لم يقبل قولهم يؤدى الى الحرج ۔ (الهداية ج۴ ص۴۵۲ كتاب الكراهية) [1]

وکالت میں علم ہونا ضروری ہے

سوال :۔ بعض علاقوں میں نکاح پڑھاتے وقت لڑکی سے باقاعدہ اجازت لینے کی بجائے کسی ایسے شخص کو وکیل مقرر کر کے ایجاب و قبول کرایا جاتا ہے کہ جس کے بارے میں لڑکی کو علم تک نہیں ہوتا ہے، کیا کسی ایسے شخص کے ایجاب و قبول کو اعتبار دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ کسی کا وکیل بننے کے لیے مؤکل کی طرف سے باقاعدہ اجازت کا ہونا

---

[1] قال العلامة الحصكفي : ويقبل قول المملوك ولو انثى والصبى في الهدية سواء اخبر باهداء المولى غيره او نفسه والاذن سواء كان بالتجارة او بدخول الدار ۔ قال ابن عابدين تحته قال في المنح بان قال عبد او جارية او صبى هذه هدية اهداها اليك سيدى او ابي ..... انما يقبل قول هؤلاء فيها لان الهدية تبعث عادة على ايدى هؤلاء ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۴۵ كتاب الكراهية)

ضروری ہے، صورتِ مذکورہ میں ایسا نکاح نکاحِ فضولی کے حکم میں ہے، اگر لڑکی علم ہوجانے کے بعد اجازت دے دے تو نکاح منعقد رہے گا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واصل هٰذا ان تصرفات الفضولی التی لها مجیز حالة العقد منعقدة موقوفة علی اجازة المجیز من البیع والاجارة والنکاح والطلاق ونحوها فان اجاز ینفذ والا فیبطل۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۲۸ کتاب الوکالة۔ الفصل الثالث)[1]

نکاح میں نابالغ کی وکالت کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں رواج ہے کہ شادی کے وقت جب نکاح پڑھایا جاتا ہے تو لڑکی سے اجازت لینے کے لیے کسی نابالغ لڑکے کو بھیجا جاتا ہے اور پھر اس لڑکے کا والد یا کوئی دوسرا رشتہ دار وکیل بن کر ایجاب وقبول کر لیتا ہے، تو کیا ایسی وکالت از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً وکالت کے لیے وکیل کا عاقل وبالغ ہونا ضروری ہے بنابریں نابالغ لڑکے کی وکالت درست نہیں ہے، صورتِ مسئولہ میں نابالغ لڑکا چونکہ اخبار عن الوکالت کرتا ہے اس لیے لڑکے کا یہ اخبار عن الوکالت درست ہوتا ہے، اور اسی طرح یہ لڑکا رسول کے حکم میں ہے اور رسالت میں احکام مرسل کو راجع ہوتے ہیں نہ کہ رسول کو۔

قال العلامة محمد بن محمود الاستروشنیؒ: والحاصل ان الوکالة تثبت باخبار رجل واحد حراً کان عبداً عدلاً کان اوفاسقاً صبیاً او بالغاً۔ (جامع احکام الصغار علی هامش جامع الفصولین ج۱ ص۲۸ مسئلة الوکالة)[2]

توکیل میں فریقِ مخالف کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کرنا چاہے تو

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: وفی کل موضع لاینفذ فعل الوکیل فالعقد موقوف علی اجازة المؤکل۔ (ردالمحتار ج ۲ ص۳۴۴ کتاب الکفالة)

[2] وقال العلامة سلیم رستم بازؒ: تعود حقوق العقد فی الرسالة الی المرسل ولا تتعلق بالرسول اصلاً۔ (شرح المجلة الاحکام۔ م ۱۴۶۲ ص۷۸۳ کتاب الوکالة)

کیا اس میں فریقِ مخالف کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:- وکیل مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور یہ اس کا ذاتی حق ہے، اس لیے توکیل کا جواز فریقِ مخالف کی رائے پر موقوف نہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وکیل کے ذریعہ کسی حق کے لزوم کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تقرری میں فریقِ مخالف کی رائے شامل ہو جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک اس کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:- قال ابوحنیفہ رحمہ اللہ لا یجوز التوکیل بالخصومۃ من غیر رضاء الخصم الا ان یکون المؤکل مریضاً او غائباً مسیرۃ ثلاثۃ ایام فصاعداً وقالا یجوز التوکیل بغیر رضاء الخصم وھو قول الشافعی رحمہ اللہ ولا خلاف فی الجواز انما الخلاف فی اللزوم۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۷۷ کتاب الوکالۃ) [1]

وکیل سے رقم ضائع ہونے کی صورت میں ذمہ دار کون ہوگا

سوال:- کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے اگر رقم گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ کیا وکیل اس مال کا ضامن ہوگا یا سارا نقصان مؤکل کے ذمے آئے گا؟

الجواب:- کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے رقم اگر مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد گم ہو جائے اور بائع کو ابھی روپے نہ دیئے ہوں تو اس کی ذمہ داری مؤکل پر عائد ہوگی اور وہ وکیل پر رجوع کا حق نہیں رکھتا ہے، اور اگر مؤکل نے وہ چیز خریدنے کے بعد رقم وکیل کو دی ہو اور بائع کو دینے سے قبل وہ گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری وکیل پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: اذا رفع الثمن الی انسان الف درھم فامرہٗ ان یشتری بھا جاریۃً فاشتریٰ ثم ھلک ثمن قبل ان ینقض البائع یھلک من مال الآمر فان رفع الآمر الالف الی الوکیل بعد

---

[1] وقال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من المدعی والمدعیٰ علیہ ان یوکل من شاء بالخصومۃ ولا یشترط رضاء الآخر۔ (شرح المجلۃ الاحکام۔م ۱۵۱۶ ص۸۲۰ الفصل الخامس فی الوکالۃ بالخصوم)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۱۵۴ الفصل الرابع فی الوکالۃ بالبیع۔

ما اشتری فهلك قبل ان ينقض البائع يهلك من مال المامور۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۵۹ الفصل الرابع فی الوكالة بالشراء) ؎۱

وکیل پر ضمان کا حکم

سوال :۔ وکیل کا مبیعہ خریدنے کے بعد اگر مبیعہ راستہ میں کہیں ضائع ہو جائے تو یہ کس کا نقصان متصور ہوگا؟ وکیل یا مؤکل کا؟

الجواب :۔ وکیل چونکہ مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ تمام تر ذمہ داری مؤکل کے فائدے کے لیے اٹھاتا ہے اس لیے مبیعہ کی ہلاکت کا نقصان مؤکل کو اٹھانا پڑے گا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: فان هلك المبيع فی يده قبل حبسه هلك من مال المؤکل ولم يسقط الثمن لان يده کید المؤکل فاذا لم يحبسه يصير المؤکل قابضًا بيده۔ (الهداية ج۳ ص۱۸۱/۱۸۲ کتاب الوكالة بالبيع والشراء) ؎۲

وکیل کا مدعی پر اقرار کرنا

سوال :۔ اگر مدعیٰ علیہ کی طرف سے وکیل نے نمائندگی کرتے ہوئے مدعی کا حق تسلیم کر لیا لیکن مدعیٰ علیہ اب بھی اس سے انکار کر رہا ہے، تو کیا وکیل کا کسی کے حق پر اقرار کرنا مؤکل (مدعیٰ علیہ) کے حق میں لازم متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب :۔ وکیل کا کسی کی نمائندگی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف مؤکل کے دنیاوی مفادات کا تحفظ کرے بلکہ شرعی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسکے جائز حق کے بارے

؎۱ وقال العلامة ابن نجیم رحمه الله، ولم يذكر المؤلف هنا حكم ما اذا وكله بشراء شئ ودفع الثمن اليه فهلك فی يده قال فی البزازية وفی جامع الفصولين دفع اليه الفًا ليشتری به فاشتری وقبل ان ينقده للبائع هلك فمن مال الآمر وان اشتری ثم نقد المؤکل فهلك الثمن قبل دفعه الى البائع عند المؤکل يهلك من مال الوكيل۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵٦ باب الوكالة بالبيع والشراء)

؎۲ وقال العلامة ابن نجیمؒ: فلو هلك فی يده قبل حبسه هلك من مال المؤکل ولم يسقط الثمن لان يده کید المؤکل فاذا لم يحبس يصير المؤکل قابضًا بيده۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵٦ باب الوكالة بالبيع والشراء)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۵۸ الفصل الخامس فی الوكالة بالشراء۔

میں اقرار بھی کرسکتا ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں وکیل کا اقرار کرنا مُدعیٰ علیہ کے حق میں لازم متصوّر ہوگا بشرطیکہ یہ اقرار قاضی کے حضور میں ہو لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ حکم عام ہے خواہ قاضی کے حضور میں ہو یا کسی دوسری محفل میں ہو۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا اقر الوکیل بالخصومة علیٰ مؤکله عند القاضی جاز اقراره علیه ولا یجوز عند غیر القاضی عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله استحساناً الّا انه یخرج من الوکالة وقال ابو یوسفؒ یجوز اقراره علیه وان اقر فی غیر مجلس القضاء۔ (الهدایة ج ۳ ص۱۹۵ باب الوکالة بالخصومة والقبض) ؎۱

توکیل بالنکاح میں شہادت ضروری نہیں

سوال:۔ لڑکی کی طرف سے نکاح کے معاملہ میں وکیل مقرر کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے جاتے ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فلاں عورت نے اس کو وکیل مقرر کیا ہے، ایسی حالت میں اگر ایک آدمی اجمالی گواہی پر اکتفاء کرے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ توکیل شہادت پر موقوف نہیں بلکہ وکیل کو جب باعتماد ذرائع سے وکالت کی خبر پہنچے تو وکیل مؤکل کے لیے تصرّف کرسکتا ہے، صورت مذکورہ میں ایک وکیل کا بیان ہی کافی ہے تاہم اگر دونوں گواہی دیدیں تو کل کو کسی وقت بھی انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم انهٗ لا یشترط الشهادة

؎۱ وقال العلامة ابن نجیمؒ: ولو اقر الوکیل بالخصومة عند القاضی صحّ والّا لا ان اقر علیٰ مؤکله عند غیر القاضی لا یصح عندهما استحساناً وخرج به عن الوکالة وصحح ابو یوسفؒ اقراره مطلقاً وابطله زفر مطلقاً وهو القیاس لکونه ما موراً بالخصومة وهی منازعة والاقرار ضدها لانهٗ مسالمة فالامر بالشیٔ لا یتناول ضده وجه الاستحسان ان التوکیل صحیح وصحته تتناول ما یملك وذلك مطلق الجواب دون احدهما عیناً فیصرف الیه تحریاً للصحة۔ (البحر الرائق ج۷ ص۱۸۱ باب الوکالة بالخصومة والقبض)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۰۱ کتاب الدعوی، الفصل الخامس۔

علی الوکالۃ بالنکاح۔ (ردالمحتار ج۲ ص۳۵۲ کتاب النکاح، باب الاولیاء الخ)[1]

مروجہ وکالت کوبطور پیشہ اختیار کرنا

سوال:۔ موجودہ دور میں وکلاء ملکی قوانین کی رو سے مدعی اور مدعیٰ علیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے طرفین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں، تو کیا وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ موجودہ ملکی قوانین میں سے جو قوانین شریعتِ اسلامیہ سے متصادم ہوں تو ان کے مطابق مقدمات کی پیروی کرنا اور فیصلہ کرنا اور ان پر معاوضات لینا تمام کے تمام غیراسلامی ہیں، شریعتِ مقدسہ میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم ان کے ذریعے سے اپنے جائز حقوق لینا اور ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنا مرخص ہے اور جو قوانین قوانینِ شریعت سے متصادم نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس پر وکیل کا معاوضات لینا مرخص ہے اور جوازِ اُجرت توکیل کے لیے یہ تاویل کافی ہے کہ واقعی وکیل جو اُجرت لیتا ہے وہ ایک خاص وقت اور خاص دن میں محبوس رہنے کی اُجرت لیتا ہے جوکہ فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے۔ الحاصل یہ کہ پیشۂ وکالت فی نفسہٖ جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ وکیل جائز مقدمات کی پیروی کرتا ہو۔

لما قال الدکتور الشیخ وھبۃ الزحیلی: تصح الوکالۃ باجرٍ وبغیر اجرٍ لان النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یبعث عمالہ لقبض الصدقات ویجعل لہم عمولۃ فاذا تمت الوکالۃ باجرٍ لزم العقد یکون للوکیل حکم الاجیرای انہٗ یلزم الوکیل بتنفیذ العمل ولیس لہ التخلی عنہ بدون عذرٍ یبیح لہٗ ذٰلک واذا لم یذکروا الاجر صراحۃً حکم العرف فان کانت ماجورۃً عادۃً کتوکیل المحامین وسماسرۃ البیع والشراء لزم اجر المثل ویدفعہٗ احد العاقدین بحسب العرف وان کانت غیر ماجورۃ عرفاً کانت

---

[1] وفی الھندیۃ: یصح التوکیل بالنکاح وان لم یحضرہ الشھود کذا فی التاتارخانیۃ ناقلاً عن خواھر زادہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۲۹۴ الباب السادس فی الوکالۃ بالنکاح وغیرھا)
ومِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج۳ ص۱۳۷ کتاب النکاح، فصل: حاصلہ لبعض مسائل الوکیل والفضولی الخ

مجاناً او تبرعاً عملاً بالاصل فی الوکالات وھو ان تکون بغیر اجرٍ علیٰ سبیل التعاون فی الخیر وھٰذا النوع لا یلزم فیہ المضی فی العمل بل للوکیل التخلی عنہ فی ای وقت وھٰذا مذھب الحنفیۃ والمالکیۃ والحنابلۃ۔

وقال الشافعیۃ الوکالۃ ولو بجعل جائزۃ ای غیر لازمۃ من الجانبین۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۱۵۱ تعریف الوکالۃ ومشروعیتھا)

وکیل کا دوسرے کو وکیل بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنا مال لاہور منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنایا اور اس نے اپنی طرف سے ایک دوسرے شخص کو وکیل بنا کر مال فروخت کرنے کے لیے لاہور روانہ کر دیا، تو کیا وکیل اوّل کا دوسرے شخص کو وکیل بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مؤکل نے اس کو عمومی وکیل مقرر کیا ہو کہ میرا مال فروخت کرو چاہے تم خود جاؤ یا کسی اور کو بھیجو تو اس صورت میں وکالتِ عمومی کی وجہ سے وکیل اوّل کا دوسرے کو وکیل بنانا درست ہے، اور اگر مؤکل کی طرف سے عمومی وکالت نہ ہو تو پھر وکیلِ اوّل کا یہ اقدام صحیح نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: فان کانت عامۃ یملك ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الاصل فیما یخرج مخرج العموم اجراؤہٗ علیٰ عمومہ وان کانت خاصۃ فلیس لہٗ ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الوکیل یتصرف بتفویض المؤکل فیملك قدر ما فوض الیہ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۵ فصل فی حکم التوکیل) [1]

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ان کانت الوکالۃ خاصۃ اومقیدۃ بان یعمل الوکیل بنفسہ لم یجز لہٗ توکیل غیرہ فیما وکل فیہ وان کانت الوکالۃ مطلقۃ او عامۃ بان قال لہٗ اصنع ما شئت جاز لہٗ توکیل الغیر ویکون ھٰذا الغیر وکیلاً مع الاوّل عن المؤکل۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۱۶۰ ھل للوکیل توکیل غیرہ)

گارنٹی سے کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص مثلاً زید عمارتی سازوسامان (ہارڈ ویئر) کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے اور بعض کمپنیاں اپنا مال اس پر گارنٹی سے فروخت کرتی ہیں مثلاً پانی کی ٹینکیاں، ٹوٹیاں، پانی کے پائپ، بیلچے، کدال وغیرہ۔ ان میں سے بعض اشیاء کی گارنٹی پانچ سال، بعض کی دس سال اور بعض کی گارنٹی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب زید کسی پر مذکورہ چیزیں بیچتا ہے تو اسی گارنٹی سے بیچتا ہے، اگر گارنٹی کی مدت میں اگر فروخت کردہ چیز خراب ہوجائے تو مشتری وہ چیز زید کو واپس کردیتا ہے اور زید وہ چیز کمپنی کو بھیج دیتا ہے اور کمپنی والے اس کے عوض میں یا تو نئی چیز دیدیتے ہیں یا اس کو ہی بالکل درست کردیتے۔ اس طرح کرنے سے عام لوگ گارنٹی شدہ چیزیں خریدنے میں زیادہ رغبت ظاہر کرتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کی بیع ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے ایک مولوی صاحب سے سُنا ہے کہ یہ بیع مشروط ہونے کی بناء پر فاسد ہے۔ لہٰذا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیلاً وضاحت فرمائی جائے۔

الجواب:۔ دورِ حاضر میں بعض کمپنیاں اپنی مصنوعات کی خریداری پر گاہک کو سال دو سال یا لائف ٹائم کی گارنٹی دیتی ہیں، یہ گارنٹی صورت کے لحاظ سے کفالۃ بدرک ہے۔ (درک کے معنیٰ حصولِ صاحب یعنی پانے کے ہیں۔ یعنی اگر مشتری مبیعہ میں کوئی عیب پائے تو بائع اس کا کفیل ہوگا۔ (مصباح اللغات ص۲۳۶) جبکہ کفالہ بدرکہ بالاجماع صحیح ہے۔ اسی طرح خود کفالہ میں بھی فقہاء کے ہاں توسع پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کفالہ بلکہ اکثر معاملات کا تعلق عرف کے ساتھ ہے۔ آجکل کوئی چیز فروخت کرتے وقت گارنٹی دینا کاروبار کا ایک اہم جُزو بن گیا ہے، چونکہ آجکل دو نمبر (نقلی) چیزیں عام تیار ہوتی ہیں جس کی وجہ سے گارنٹی دینا اور لینا ناگزیر ہوگیا ہے، اور ویسے بھی عام طور پر عالمی اور ملکی منڈیوں میں ایک رواج سا بن گیا ہے کہ لوگ گارنٹی والی چیز بلا کسی حیل و حجت کے خرید لیتے ہیں، لہٰذا آجکل گارنٹی پر خرید و فروخت کرنا عرف اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

كما في البدائع الصنائع: ولان الكفالة جوازها بالعرف۔ (جلد ۶ ص۳)
وكما في الهداية: واما الكفالة بالمال فجائزة معلوماً كالمكفول به الى ان قال اوبما يدركك في هذا البيع لان مبنى الكفالة على التوسع فيتحمل فيها الجهالة وعلى الكفالة بدرك اجماع۔ (جلد۳ ص۱۱۶) وكما في العناية: تكفلت عنه بمالك

عليه او بما يدركك في هذا البيع يعني من الضمان بعد ان كان دينًا صحيحًا لان مبنى الكفالة على التوسع فانها تبرع ـــ وبعد اسطر : وعلى الكفالة بدرك بفتح الراء وسكونها وهو التبعة دليل على جوازها بالمجهول لا يصح. وفيه اشارة الى نفي قول من يقول ان الضمان بالمجهول لا يصح لانه التزام مال فلا يصح مجهولاً كالثمن في البيع وقلنا الضمان بدرك صحيح بالاجماع وهو ضمان بالمجهول. الخ (العناية على هامش فتح القدير ج ۶ ص ۲۹۸، ۲۹۹) ـــ وكما في فتاوى قاضيخان : رجل باع دارًا وكفل رجل المشتري بما ادركه فيها من درك فاخذ المشتري بذالك عنه رهنًا ذكر في الاصل انّ الرهن باطل ولا ضمان على المرتهن والكفالة جائزة - (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج ۳ ص ۶۴)

وکیل کا منصب وکالت کے خلاف کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہم نے ایک آدمی کو اپنی طرف سے گاڑی خریدنے کا وکیل بنایا تھا کہ ہمارے لیے گاڑی خرید لو، اس نے کسی اور سے ہمارے لیے گاڑی خریدنے کی بجائے اپنی ہی گاڑی ہم پر بیچ دی۔ تو کیا یہ وکیل اپنی چیز ہمارے اوپر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے علم میں بھی نہ ہو اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے اپنی گاڑی آپ کو دی ہے اور ہم اس سے انکاری ہیں؟

الجواب:۔ وکالت ایک ایسا معاملہ ہے جس میں مؤکل اپنے وکیل پر اعتماد کرکے اپنی ذمہ داری اس کو سونپتا ہے، اس لیے وکیل کا اس معاملہ میں ایسا قدم اٹھانا جو منصب وکالت کے خلاف ہو اور اس میں دھوکہ دہی کا شبہ ہو جائز نہیں، لہٰذا اس میں جو معاملہ سامنے آجائے وہ منعقد نہیں ہوگا۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی دھوکہ دہی اور غرر کا عنصر موجود ہے اس لیے یہ معاملہ کالعدم ہے۔

لما في الدر المختار : حيث لم يكن مخالفًا دفعًا للغرر. قال ابن عابدينؒ : تحت قوله دفعًا للغرر...... وفيه الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه لان الواحد لا يكون مشتريًا وبائعًا فيبيعه من غيره ثم اشتريه منه .(رد المحتار ج ۴ ص ۴۲۵ كتاب الوكالة)

تاہم اگر مؤکل کی طرف سے کلی اجازت ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ : وان امره المؤكل انه يبيعه من نفسه او اولاده الصغار او ممن لا تقبل شهادته فباع منه جاز. (رد المحتار ج ۴ ص ۴۲۵ كتاب الوكالة)

کتاب الحوالۃ

(حوالہ کے مسائل واحکام)

محیل کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی ہوئی مہلت کا محتال علیہ میں اعتبار

سوال: ایک شخص پر قرض کی ادائیگی کے لیے قرض دہندہ کی طرف سے ایک سال کی مہلت دی گئی تھی، قرض خواہ نے وہ رقم ایک دوسرے شخص کے حوالہ کی، لیکن اب دائن محتال علیہ (دوسرے شخص) سے فوری ادائیگی کا مطالبہ مطالبہ کرتا ہے، کیا اس کو یہ اختیار حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: جو مہلت اور وقت مدیون (قرض خواہ) کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی گئی تھی اُسی مہلت کا اعتبار ہوگا لہٰذا دائن (قرض دہندہ) کا قبل از وقت قرض کی ادائیگی کا محتال علیہ سے مطالبہ کرنا بلا جواز اور بے جا ہے۔

لما قال العلامة کمال الدین محمد بن عبد الواحدؒ: والمطلقة المؤجلة لہٗ علیٰ رجلٍ الف الیٰ سنةٍ فأحال الطالب علیہ الیٰ سنةٍ کانت علیہ الیٰ سنةٍ ولو حصلت الحوالة مبھمة لم یذکرہ محمد رحمہ اللہ وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة لانہٗ تحمل ما علی الاصیل بای صفة کان۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۳۵۵ کتاب الحوالة)[1]

حوالہ میں دائن کی رضامندی ضروری ہے

سوال: کیا کسی دوسرے شخص کو قرض کی ادائیگی کے لیے حوالہ کرنے

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الفتح تنقسم الحوالة المطلقة الیٰ حالة ومؤجلة فالحالة ان یحیل الطالب بالف ھی علی المحیل حالة فتکون علی المحتال علیہ حالة لان الحوالة تحویل الدَّین فیتحول بصفة التی علی الاصیل والمؤجلة ان تکون الف الیٰ سنة ولو ابھمھا ما یذکر محمد وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۹ کتاب الحوالة)

وَمِثْلُہٗ فی منحة الخالق علیٰ ھامش البحر الرائق ج ۶ ص ۲۴۸ کتاب الحوالة۔

میں دائن کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قرض کی وصولی میں تمام لوگ یکساں نہیں ہوتے اس لیے مدیون کا دائن کو کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کرنے میں یہ ضروری ہے کہ اس کی رائے شامل ہو ایسا نہ ہو کہ کسی ایسے آدمی کو حوالہ کرے جس سے وصولی پر دائن قدرت نہیں رکھتا ہو جو اس کی رقم ضائع ہونے کے مترادف ہے ۔

لما قال العلامة المرغیناني رحؒ: وتصح الحوالة برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیہ - (الھدایة ج۳ ص۱۲۹ کتاب الحوالة) [1]

حوالہ کرنے کے بعد مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص اپنے قرض کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص پر ڈال دے، کچھ مدت تک تو وہ دائن کے مطالبہ سے بے فکر رہا لیکن جب اس کو احساس ہوا کہ متعلقہ شخص بھی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تو کیا دائن مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ جب دَین کی ادائیگی کی ذمہ داری دائن کی رضامندی سے کسی دوسرے شخص پر ڈال دی جائے اور اس شخص نے یہ ذمہ داری قبول بھی کر لی ہو تو اب دائن مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا بلکہ محتال علیہ سے (جس نے ذمہ داری قبول کر لی ہے) قرض کا مطالبہ کرے گا اور مدیون بری الذمہ متصور ہوگا ۔

لما قال العلامة المرغیناني رحؒ: واذا تمت الحوالة بریٔ المحیل من الدّین بالقبول وقال زفر رحؒ لا یبرأ اعتباراً بالکفالة اذ کل واحد منھما عقد توثق وقال ولا یرجع المحتال علی المحیل الا ان یتوی حقه - (الھدایة ج۳ ص۱۲۹ کتاب الحوالة) [2]

---

[1] وقال العلامة التمرتاشي رحؒ: وشرط لصحتها رضاء الکل بلا خلاف الا فی الاول - (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۱ کتاب الحوالة) ــــ ومِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۱۷۱ کتاب الحوالة -

[2] قال العلامة الزیلعي رحؒ: ویبرأ المحیل بالقبول من الدّین وقال زفر رحؒ لا یبرأ لان المقصود بھا التوثیق وقال ثم اختلفوا فی البراءة فقال ابو یوسف رحؒ یبرأ عن المطالبة والدّین وقال محمد رحؒ یبرأ عن المطالبة لا عن الدّین - (تبیین الحقائق ج۴ ص۱۷۱ کتاب الحوالة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۷ کتاب الحوالة -

مجہول چیز کی ذمہ داری لینا

سوال :- ایک شخص کسی دوکاندار سے قرض پر سودا خریدتا ہے لیکن دوکاندار کو اس پر اعتماد نہیں ہے، ایک دوسرا شخص دوکاندار کو اعتماد دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس شخص کو قرض پر سودا دیدیا کرو، اس کی جتنی رقم ہوگی اُس کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں گا، تو کیا ایک مجہول چیز کی ذمہ داری اٹھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کسی شخص کی طرف سے مال کی ذمہ داری لینا "کفالہ" ہے جس میں بنیادی محرک اور عمل ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ایسے امور میں معمولی جہل قابلِ برداشت ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دوسرے شخص کا پہلے کی ذمہ داری قبول کرنا درست ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني: اما الكفالة بالمال فجائزة معلوماً كان المكفول به مجهولاً اذا كان دَيْناً صحيحاً مثل ان يقول تكفلت عنه بألف اوبمالك عليه اوبما يدركك في هذا البيع لان مبنى الكفالة على التوسع فيتحمل فيه الجهالة وعلى الكفالة بالدرك اجماعٌ وكفى به حُجّةً - (الهداية ج ۳ ص ۱۱۴ كتاب الكفالة) [1]

کفیل اور مکفول عنہ کے مابین ثمن میں اختلاف

سوال :- ایک شخص نے اپنے قرض دہندہ کو قرض کی ادائیگی کے لیے جو شخص کفیل مقرر کیا تھا اس کا مالک سے اس بات پر جھگڑا پیدا ہوا کہ مالک اس سے دس ہزار روپے مانگتا ہے جبکہ کفیل پانچ ہزار روپے کی ادائیگی پر مقر ہے، کیا ایسی حالت میں مدیون کے دس ہزار روپے کے اقرار کرنے سے کفیل سے زیادہ رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- مدیون پر دس ہزار روپے کی رقم اگر شواہد سے ثابت ہو جائے اور کفیل نے تمام تر رقم کی ذمہ داری قبول ہو تو تمام رقم کی ادائیگی کفیل پر لازم ہوگی،

---

[1] وقال العلامة الكاساني: وكون المكفول به معلوم الذات في انواع الكفالات اومعلوم القدر في الدين ليس بشرط حتى لو كفل باحد شيئين غير عين بان كفل بنفس رجل اوبما عليه وهو الف جاز وعليه احدهما ايهما شاء لان هذه جهالة مقدور الدفع بالبيان فلا تمنع جواز الكفالة - (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹ كتاب الكفالة)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج ۶ ص ۲۰۶ كتاب الكفالة -

اور اگر گواہ نہوں تو کفیل کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، تاہم مکفول عنہ کا دعویٰ کفیل پر لازم نہیں بلکہ خود اس سے حسب اقرار رقم وصول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغیناني رحمه الله: فان قال تکفلت بما لك علیه فقامت البینة بالف علیه ضمنه الکفیل لان الثابت بالبینة کالثابت معاینة فیتحقق ما علیه فیصح الضمان به وان لم تقم البینة فالقول قول الکفیل مع یمینه فی مقدار ما یعترف به لانه منکر للزیادة فان اعترف المکفول عنه باکثر من ذلك لم یصدق علی کفیله لانه اقرار علی الغیر ولا ولایة له علیه ویصدق فی حق نفسه لولایته علیها۔

(الهدایة ج ۳ ص۱۱۸ کتاب الکفالة) له

محتال علیہ کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی کچھ مقروض ہے اور اس نے قرض کی ادائیگی بغیر میری رضامندی کے میرے حوالے کر دی ہے، تو کیا دائن مجھ سے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حوالہ میں چونکہ محتال علیہ کی رضا ضروری ہے اس لیے بدون رضا اس پر قرض کے لیے رجوع کرنا درست نہیں لہٰذا یہ حوالہ صحیح نہیں اور دائن کا آپ سے قرض کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفي رحمه الله: شرط لصحتها رضا الکل بلا خلاف۔ قال ابن عابدین رحمه الله: قوله رضا الکل واما رضا الثالث وهو المحتال علیه فلانها التزام الدین ولا لزوم بلا التزام۔ (رد المحتار ج ۴ ص۳۴۲ کتاب الحوالة)

له وقال العلامة ابن نجیم المصري رحمه الله: فان کفل بماله علیه فبرهن علی الف لزمه لان الثابت بالبینة کالثابت عیاناً ولا یکون قول الطالب حجة علیه کما لا یکون حجة علی الاصیل لانه مدع ۔ ولا صدق الکفیل فیما اقر بحلفه ولا ینفذ قول المطلوب علی الکفیل ای وان لم یبرهن فالقول الکفیل فیما یقر به مع یمینه علی نفی العلم لا علی البینات کما فی الایضاح ولا یکون قول المطلوب حجة علیه لانه اقرار علی الغیر۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۲۲۳ کتاب الکفالة)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۶ ص۳۰۳ کتاب الکفالة۔

کتاب الهبة

تهادوا تحابوا

کِتَابُ الہِبَة

(ہبہ کے مسائل واحکام)

ہبہ میں عرف کا اعتبار ہے

سوال :- عمرو کے تین بیٹے ہیں اور تینوں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور تینوں مختلف شہروں میں ملازمت کے سلسلہ میں رہائش پذیر ہیں اور اپنی تنخواہوں میں سے ہر ماہ ایک مخصوص رقم اپنے والد کے نام بھیجدیتے ہیں اور والد اس رقم کو گھر کے مشترکہ کھانہ میں خرچ کرتے ہیں، تو بیٹوں کی یہ کمائی باپ (عمرو) کی ملکیت ہے یاکہ اس کے بیٹوں کی ملکیت تصور کی جائے گی ؟

الجواب :- اگر بیٹوں نے اپنی رقومات کے متعلق ہبہ وغیرہ کی تعیین نہ کی ہو تو قواعد کی رُو سے المعروف کا لمشروط کے تحت چونکہ عموماً اسی طرح بیٹے والدین کو بطورِ ہبہ رقم دیا کرتے ہیں اس لیے یہ رقم والد کی ملکیت متصور ہوگی۔

قال العلامة خیرالدین الرملیؒ : سئل فیما یرسله الشخص الیٰ غیره فی الاعراس ونحوها هل یکون حکمه حکم القرض فیلزم الوفاء به ام لا (اجاب) ان کان العرف قاضیًا بانهم یدفعونه علیٰ وجه البدل یلزم الوفاء به ان مثلیا فبمثله وان قیمیا فبقیمته وان کان العرف بخلاف ذٰلك بان کانوا یدفعونه علیٰ وجه الهبة ولا ینظرون فی ذٰلك الیٰ اعطاء البدل فحکمه حکم الهبة فی سائر احکامه فلا رجوع فیه بعد الهلاك والاستهلاك والاصل فیه ان المعروف عرفًا کالمشروط شرطًا۔ واللّٰه اعلم (فتاوٰی خیریة علیٰ هامش الفتاوٰی الحامدیة ج۲ ص۱۲۳ مطلب هبت ابنه وابن ابنه مجددًا) [1]

---

[1] قال العلامة محمد خالد الاتاسیؒ : وفی الفتاوٰی الخیریة مانصه سئل فیما یرسله الشخص الیٰ غیره فی الاعراس ونحوها هل یکون حکمه حکم القرض فیلزم الوفاء به ام لا اجاب ان کان العرف بانهم یدفعونه علیٰ وجه البدل یلزم الوفاء به ان مثلیا فبمثله ان قیمیا فبقیمته وان کان العرف بخلاف ذٰلك بان کانوا یدفعونه علیٰ وجه الهبة ولا ینظرون فی ذٰلك الیٰ اعطاء البدل فحکمه حکم الهبة فی سائر احکامه فلا رجوع فیه بعد الهلاك والاستهلاك والاصل فیه ان المعروف عرفًا کالمشروط شرطًا۔ (شرح مجلة الاحکام ج۳ ص۳۰۰ الباب الثالث فی بیان احکام الهبة)

ومِثلُهٗ فی فتاوٰی کاملیة ص۱۸۱ کتاب الهبة۔

تملیک بھی ہبہ کے مترادف ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص ہبہ کرتے وقت تملیک کا لفظ استعمال کرے تو کیا اس صورت میں ہبہ اور تملیک الگ الگ ہیں یا دونوں ایک ہیں؟

الجواب:۔ لغت کے اعتبار سے تملیک عام ہے اور ہبہ خاص ہے لیکن موجودہ عرف میں تملیک اور ہبہ دونوں ایک دوسرے کے مترادف استعمال ہوتے ہیں اسلئے صرف لفظِ تملیک سے بھی ہبہ ہی متصور ہوگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: ھی تملیک العین مجاناً ای بلا عوض۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار جلد ۵ ص۶۸۷ کتاب الھبۃ) ؎۱

ناقابلِ تقسیم اشیاء کے ہبہ کا حکم

جو اشیاء ناقابلِ تقسیم ہوں ان کا ہبہ کرنا کیسا ہے؟ مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لیے رکھا، تین حصے بیوی کو ہبہ کیے اور تین حصے بھائی کو ہبہ کئے، کیا اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اشیاء کی دو قسمیں ہیں ۱۔ ناقابلِ تقسیم ۲۔ قابلِ تقسیم۔ اس لیے جو اشیاء قابلِ تقسیم ہیں ان کا ہبہ کرنا قبل التقسیم صحیح نہیں، البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو ان کا ہبہ کرنا شرعاً جائز ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا ہبہ صحیح ہے۔

قال العلامہ خوارزمیؒ: ھبۃ المشاع فیما لا یقسم جائزۃ یعنی بہ ما لا یحتمل القسمۃ ای لا یبقی منتفعاً بعد القسمۃ اصلاً کعبد واحد او دابۃ واحدۃ۔
(الکفایۃ فی ذیل فتح القدیر ج ۷ ص۴۸۸ کتاب الھبۃ) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ محمد اتاسیؒ: الھبۃ تملیک مال لآخر بلا عوض۔
(مجلۃ الاحکام مادۃ ۸۳۳ ص۴۶۲ الکتاب السابع فی الھبۃ)
ومِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الھبۃ۔

؎۲ قال العلامۃ قاضی خانؒ: وفیما لا یقسم کالعبد والدابۃ والثوب والحمام یجوز ھبۃ المشاع من الشریک وغیرہ فی قولھم۔ (الفتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۶۷ کتاب الھبۃ فصل فی ھبۃ المشاع)
ومِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۲۸۵ کتاب الھبۃ۔

قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں

سوال: زید کے آٹھ بیٹے، تین بیٹیاں اور دو بیویاں ہیں، اس نے اپنی زندگی ہی میں بیویوں اور بیٹیوں کو کچھ دیئے بغیر اپنی کل جائیداد کا ۳/۲ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۳/۱ حصہ باقی لڑکوں کو ہبہ کردی جو کہ الگ الگ ماؤں کی اولاد ہیں، کیا اس کے ۳/۱ حصہ والے تین بیٹے دوبارہ بطریقِ شرعی میراث کی تقسیم کا حق رکھتے ہیں؟

الجواب: چونکہ کسی شخص کا اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر مال تقسیم کرنا ہبہ ہوتا ہے اور تمام فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں، پس صورتِ مسئولہ میں اگر زید نے سب بیٹوں کا حصہ جدا کیا ہو اور قبضہ بھی دے دیا ہو تو یہ ہبہ درست اور نافذ ہے ورنہ مشترکہ جائیداد کا ۳/۲ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۳/۱ حصہ تین بیٹوں کو ہبہ کرنا درست نہیں لہٰذا زید کے مرنے کے بعد جملہ جائیداد دوبارہ تمام ورثاء پر تقسیم کی جائے گی جس میں بیٹیاں، بیٹے اور دونوں بیویاں بھی شریک ہوں گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: وفی الاصل ومن شرائطها الهبة الافراز حتی لا یجوز هبة المشاع فیما یحتمل القسمة کالبیت والدار والارض ونحوها وان کان لا یحتمل القسمة یجوز کالبئر والحمام والرحی۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۹ کتاب الهبة۔ الفصل الثالث فیما یکون خطیاء وفیما لا یکون) [1]

اجارہ پر دی ہوئی زمین کا ہبہ کرنا

سوال: ایک شخص نے اپنی ایسی زمین بیٹے یا بیٹی کو ہبہ کی جس پر مدتوں سے مزارع (کاشتکار) خیمہ زن ہیں اور کاشتکار سے کیے ہوئے معاہدہ میں بھی ابھی کافی وقت باقی ہے، کیا ایسی صورت میں مَوْهُوْب لَهٗ مزارع کو زمین سے بیدخل کرسکتا ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملك عند ابی حنیفة وفی القهستانی لا تفید الملك وهو المختار کما فی المضمرات۔ (ردالمحتار ج۵ ص۶۹۲ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۳ کتاب الهبة۔

الجواب:۔ کسی بالغ یا نابالغ بچے کو جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ ہبہ کرنا صحیح اور درست ہے اور ہبہ سے ان کی ملکیت میں بھی داخل ہوجائے گی، مگر اجارہ پر دی ہوئی زمین کے ساتھ مزارع (کاشتکار) کا حق متعلق ہونے کی وجہ سے زمین ناقابلِ تملیک ہوتی ہے جو کہ ہبہ کی صحت کے لیے بنیادی شرط ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس زمین کا ہبہ شرائط کے فقدان کی وجہ سے صحیح نہیں لہٰذا عدم صحت کی بناء پر موہوب لہ کاشتکار کو بیدخل نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمه الله: سئلت عن رجل وهب لابنه الصغیر دارًا وفیها ساکن باجر هل تجوز هٰذه الهبة فالجواب انها لا تجوز. قال فی الهندیة رجل وهب دارًا لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال یعنی محمّد لا تجوز۔ (فتاوٰی کاملیة ص۱۸۱ کتاب الهبة)[۱]

موہوبہ جائیداد کا سرکاری کاغذات میں انتقال کا حکم

سوال: زید نے اپنی ملکیتی دس کنال زمین بکر کو ہبہ کردی لیکن سرکاری کاغذات میں ابھی تک انتقال نہیں ہوا ہے، تو کیا بکر کو موہوبہ زمین کا مالک سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی صحت کے لیے تین امور کا ہونا ضروری ہے (۱) ایجاب (۲) قبول (۳) قبض۔ لہٰذا اگر باقاعدہ طور پر ان تین امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہبہ ہوچکا ہو تو بلاشک وشبہ وہ زمین کا مالک ہے، سرکاری کاغذات میں انتقال ہونے یا نہ ہونے سے شرعاً ہبہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: تنعقد الهبة بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔ (مجلة الاحکام مادة ۸۳۷ ص۴۶۲ الفصل الاوّل فی بیان المسائل المتعلقة برکن الهبة وقبضها)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی المنتقی عند محمدؒ رجل وهب دارًا لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال لا یجوز ولو کان بغیر اجر او کان فیها الواهب فالهبة جائزة کذا فی التتارخانیة۔
(منحة الخالق علی البحر الرائق ج ۷ ص۲۸۸ کتاب الهبة)
ومثلهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علٰی هامش الهندیة ج ۶ ص۲۳۸۔

[۲] قال الامام قدوریؒ: الهبة تصح بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔ (مختصر القدوری ص۱۴۳ کتاب الهبة)
ومثلهٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الهبة۔

ہبۂ عمریٰ ناقابلِ رجوع ہے

سوال:۔ تین بھائیوں نے بوقتِ تقسیم جائیداد اپنے حصّہ سے اپنی والدہ کو ضروریات پوری کرنے کیلئے دو کنال زمین دی تھی، والدہ نے مذکورہ دو کنال زمین اپنے نواسے خالد کو ہبہ کر دی، اب والدہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زمینِ مذکورہ خالد سے واپس لینا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ معاملہ ہبۂ عمریٰ کا ہے، معمرلہٗ (والدہ) مذکورہ دو کنال زمین کی خود مختار مالکہ بن گئی ہے لہٰذا نواسے کو اُن کا ہبہ کرنا جائز ہے اور بیٹوں کا رجوع کرنا مردود ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: (واعمرتك هذا الشئ) لان العمریٰ تملیك للحال فتثبت الهبة ویبطل ما اقتضاه من شرط الرجوع وكذلك لو شرط الرجوع صریحًا یبطل شرطه ایضًا۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۸۵ کتاب الهبة)[1]

موت اور عوض کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے

سوال:۔ زید نے بکر کو اپنی زمین عوضاً ہبہ کر دی، بعد میں اس کی وفات ہو گئی، اب تیس سال بعد زید کے ورثاء بکر سے اس زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا ان کو شرعاً رجوع کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عوض لینے یا متعاقدین میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا صورتِ مرقومہ میں زید کے ورثاء کو زمین واپس لینے کا حق نہیں پہنچتا بلکہ زمین بکر کی ملکیت رہے گی۔

قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمه الله: صح الرجوع فیها ومنع الرجوع دمع خزقه فالدال الزیادة المتصلة کالغرس والبناء والسمن

---

[1] قال العلامة ابو بکر ابن حداد الیمنی رحمه الله: والعمریٰ جائزة للمعمر فی حال حیاته ولورثته من بعد موته ومعناه ان یجعل داره له عمره واذا مات یردّها علیه فیصح التملیك ویبطل الشرط والهبة لاتبطل بالشروط الفاسدة۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۱۸ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۲۸۴ کتاب الهبة۔

والمیم موت احد المتعاقدین والعین العوض۔

(کنز الدقائق ص۳۵۴ کتاب الھبۃ) [1]

متعدد آدمیوں کا کسی ایک شخص کو کوئی چیز ہبہ کرنا

سوال:- جاوید اور خالد کا ایک مشترکہ گھر ہے، دونوں بخوشی و رضا عامر کے نام ہبہ کرنا چاہتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مشترکہ جائیداد میں بوجہ اشتراک کسی ایک شریک کا اپنا حصہ بغیر تقسیم کے کسی کو ہبہ کرنا صحیح نہیں لیکن جب شیوع کی یہ صورت درمیان سے نکل جائے تو پھر مشترکہ جائیداد کو اتفاق رائے سے ہبہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ہبہ کرنا درست اور صحیح ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: (وھب اثنان دارا لواحد صح) لعدم الشیوع۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۵ ص۶۹۷ کتاب الھبۃ) [2]

ہبہ کے لیے ایجاب وقبول پر تلفظ ضروری نہیں بلکہ قرائن ہی کافی ہے

سوال:- زید کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے تین بیٹوں عمر، بکر اور خالد کو حینِ حیات میں شادیاں کرا کے ہر ایک کو رہائش کے لیے الگ الگ گھر دے دیئے، زید کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ کسی کو دے دیتا ہے تو واپس نہیں لیتا ہے، زید کے مذکورہ تینوں بیٹوں کے پاس اُس کے کچھ زیورات بھی ہیں، جب عمر نے اپنے والد (زید) کو وہ زیور واپس کرنا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر زیور عمر کو واپس کر دیا کہ یہ

---

[1] قال الامام القدوری رحمہ اللہ: او اذا وھب لاجنبی ھبۃ فلہ الرجوع فیھا الا ان یعوضہ عنھا او یزید زیادۃ متصلۃ او یموت احد المتعاقدین۔

(مختصر القدوری ص۱۴۲ کتاب الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۶۹۹ کتاب الھبۃ۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا وھب اثنان من واحد داراً جاز لانھما سلّماھا جملۃ وھو قد قبضھا جملۃ فلا شیوع وان وھبھا واحد من اثنین لا یجوز عند ابی حنیفۃ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۸۸ کتاب الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۴ کتاب الھبۃ۔

زیور آپ کا ہی ہے اور جو زیور دوسرے بھائیوں کے پاس ہے وہ اُن کا ہے۔ اندریں صورت شرعی نقطہ نگاہ سے مذکورہ مکانات اور زیور وغیرہ پانچوں بھائیوں کے مشترکہ متصور ہوں گے یا صرف عمرو، بکر اور خالد کی ملکیت ہوگی؟

الجواب: ۔صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید نے اپنے تین بیٹوں (عمر، بکر اور خالد) کو علیحدہ علیحدہ مکانات دیدیئے ہیں تو اگرچہ زید نے صراحتاً ہبہ کا لفظ نہیں کہا ہے لیکن ظاہر قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ ہبہ ہے اور ہبہ میں تملیک قریبہ کے لیے کافی ہے لہٰذا یہ شرعاً ہبہ ہے اس لیے زید کی وفات کے بعد اس میں بقایا ترکہ کی طرح میراث جاری نہ ہوگی بلکہ یہ ان تینوں بھائیوں کی ملکیت ہوگی اور اپنے والد (زید) کے باقی ترکہ میں پانچوں بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله :۔قلتُ فقد افاد ان التلفظ بالايجاب والقبول لايشترط بل تكفي القرائن الدالة على التمليك كمن دفع لفقير شيئًا وقبضه و لم يتلفظ واحد منهما بشئ ۔ (ردالمحتار ج۵ ص۶۸۸ كتاب الهبة) [1]

والدین کا اولاد کے مال کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے

سوال:۔سلمٰی نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام زمین اپنے دو بھائیوں کو ہبہ کر دی اور اپنی اکلوتی نابالغ لڑکی سکینہ کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، اب جبکہ سکینہ بالغ ہوگئی ہے تو وہ اپنے والد کے ترکہ میں سے اپنے حصۂ شرعی کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا سکینہ کا یہ مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کی ماں اپنے شوہر کی جملہ زمین ہبہ کر چکی ہے؟

الجواب:۔ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ موہوبہ چیز واہب کی ذاتی ملکیت ہو اس میں کسی اور کا حصہ نہ ہو، شرعاً کسی دوسرے کا حصہ بغیر اس کی اجازت کے ہبہ کرنے کا کسی کو اختیار

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله :۔والاذن نوعان صريح ودلالة (الى ان قال) و اما الدلالة فهى ان يقبض الموهوب له العين فى المجلس ولا ينهاه الواجب فيجوز قبضه استحسانا۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۴ كتاب الهبة فصل واما الشرائط فانواع بعضها يرجع الى نفس الركن)

وَمِثْلُهٗ فى مجلة الاحكام، مادہ ع۸۴۲ ص۳۶۴ كتاب الهبة ۔

حاصل نہیں اگرچہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو، بنا برایں صورتِ مسئولہ میں سلمیٰ اپنا حصۂ میراث تو بھائیوں کو ہبہ کرسکتی ہے اپنی بیٹی (سکینہ) کا حصہ ہبہ نہیں کرسکتی، اس لیے سکینہ کا مطالبہ جائز اور صحیح ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: ولا یجوز للاب ان یهب شیئاً من مال ولده الصغیر بعوض وغیر عوض لانها تبرع ابتداءً اھ۔ (فتاوىٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۲۸۰ فصل فی هبة الوالد لولده والهبة للصغیر، کتاب الهبة) ؎۱

شروطِ فاسدہ سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا

سوال:۔ بہن نے بھائیوں کو اپنی زمین بایں شرط ہبہ کرکے دیدی کہ اس موہوبہ زمین کے عوض بھائی اُسے کچھ زمین دیں گے، کیا یہ ہبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عوض مجہول القدر ہے اور شرط فاسد ہے لہٰذا ہبہ درست ہے اور بھائیوں پر عوض میں بہن کو کوئی زمین دینا لازم نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) حکمها انها لا تبطل بالشروط الفاسدة (فهبة عبد علیٰ ان یعتقه تصح ویبطل الشرط۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۶۸۹ کتاب الهبة) ؎۲

مشروط ہبہ کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کو اس شرط پر زمین ہبۃً دیدی کہ وہ تاحیات زید کی خدمت کرے گا، لیکن بکر نے کچھ عرصہ کے بعد زید کی خدمت کرنا چھوڑ دی، تو کیا خدمت نہ کرنے کی وجہ سے زید کو موہوبہ زمین کے واپس

؎۱ قال العلامة ابن البزازؒ: لا یجوز الهبة لابنه الصغیر ایضاً کما لا یجوز للبائع۔ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۵ کتاب الهبة الجنس الثالث فی هبة الصغیر)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار ج۵ ص۶۸۵ کتاب الهبة۔)

؎۲ قال العلامة ابن نجیمؒ: والهبة لا تبطل بالشروط الفاسدة فدخل فیه کل عقد لا یبطل بالشروط الفاسدة کالنکاح والخلع والصدقة والصلح عن دم العمد والعتق فیصح ویبطل الاستثناء۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۹۶ کتاب الهبة۔ فصل ومن وهب امة الا حملها)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۱۷ کتاب الهبة۔

لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے نزدیک اگرچہ ہبہ میں رجوع کرنا جائز ہے مگر کراہت سے خالی نہیں لیکن جب ہبہ کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا گیا تو عدم شرط کی صورت میں رجوع کرنا بلاکراہت جائز ہے اگرچہ بالفاظ دیگر ہبہ منعقد ہی نہیں ہوا ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: والدلیل علیٰ ھٰذا ما ذکر فی کتاب الحج اذا ترکت المرأۃ مھرھا علی الزوج علیٰ ان یحج بھا وقبل الزوج ذٰلک ولم یحج بھا کان المھر علیہ علیٰ حالہ والفتویٰ علیٰ ھٰذا القول۔

[فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۸۲ کتاب الھبۃ فصل فی ھبۃ المرأۃ مھرھا من الزوج۔] [1]

ہبہ سے رجوع کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ کیا واہب موہوب لہٗ سے ہبہ کی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب:۔ واہب اور موہوب لہٗ کی رضامندی سے یا حاکم واپسی کا حکم کرے اور دوسرے موانع بھی موجود نہ ہوں تو رجوع جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ورنہ بصورتِ دیگر رجوع کرنا حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: (صح الرجوع فیھا بعد القبض) اما قبلہ فلم تتم الھبۃ (مع انتفاع مانعہ) الآتی (وان کرہ) الرجوع

---

[1] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: والھبۃ لاتصح بدون الرضا وعلیٰ ھٰذا لو قال وھبت مھری منک علیٰ ان لاتظلمنی وعلیٰ ان یحج بی او علیٰ ان یھب لی کذا وان لم یکن ھٰذا شرطاً فی الھبۃ لایعود المھر۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۳۹۶ کتاب الھبۃ۔ فی الجنس الثانی)

ومثلہ فی شرح المجلۃ للعلامۃ محمد خالد اتاسیؒ ج۳ ص۳۶۸ کتاب الھبۃ الفصل الاول فی بیان المسائل المتعلقۃ برکن الھبۃ وقبضھا۔

(تحریماً) وقیل تنزیہا نہا ۔ (رد المحتار ج ۵ ص۶۹۸ کتاب الہبۃ۔ باب الرجوع فی الہبۃ) لہ

موہوبہ زمین کے فروخت کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کیا موہوب لہٗ موہوبہ زمین کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر باقاعدہ طور پر شرعی ہبہ ہوچکا ہے تو موہوب لہٗ اس کا خود مختار مالک ہے اور اس میں اس کو ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: واما اصل الحکم فھو ثبوت الملک للموھوب لہٗ فی الموھوب من غیر عوض۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۲۷ فصل واما حکم الہبۃ فالکلام فیہ فی ثلاث مواضع) ۲ہ

رشتہ داروں کو ہبہ کرنے سے حقِ رجوع ساقط ہوجاتا ہے

سوال:- والد نے اپنی کل جائیداد اپنے بیٹے کے نام ہبہ کردی ہے، تو کیا اب والد کو شرعاً رجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی رشتہ دار کو اگرچہ ہبہ تملیک بلاعوض ہوچکا ہو تو اس صورت میں بھی رجوع جائز نہیں لہٰذا والد کو اپنی اولاد سے ہبہ واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

لہ قال العلامۃ محمد خالد الاتاسیؒ: للواھب ان یرجع عن الھبۃ والھدیۃ بعد القبض برضی الموھوب لہٗ وان لم یرض الموھوب لہ راجع الواھب الحاکم وللحاکم فسخ الھبۃ ان لم یکن ثمۃ مانع من موانع الرجوع ۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۸۶۴ ص۴۷۵ الباب الثالث فی احکام الھبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۲۷۵ فصل فی الرجوع فی الہبۃ۔

۲ہ قال العلامہ ابن عابدینؒ رحمہ اللہ: (ھی تملیک العین مجاناً) ای بلاعوض۔ (ردّ المحتار ج ۵ ص۶۸۷ کتاب الہبۃ)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الہبۃ۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله : وان وهب هبة لذی رحم محرم لم يرجع فيها لقوله عليه السلام اذا كانت الهبة لذی رحم محرم لم يرجع فيها رواه البيهقی (الهداية ج ۳ ص ۲۸۷ کتاب الهبة - باب ما يصلح رجوعه ومالا يصلح) [1]

اولاد کے ہبہ میں تفاضل کا حکم

سوال: کسی شخص کا اپنی اولاد کو ہبہ دینے میں کمی بیشی کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں بحالتِ صحت و ہوش و حواس اپنی تمام جائیداد بعض اولاد کو ہبہ کر دی اور بعض کو محروم رکھا اور اس سے دوسروں کا اضرار اور ان کو بلا وجہ محروم کرنا مقصود ہو تو اگرچہ قضاءً یہ ہبہ نافذ رہے گا لیکن دیاناً گنہگار ہوگا۔ اور اگر کسی شرعی عذر مثلاً ایذا رسانی، ظلم و زیادتی اور نافرمانی کی وجہ سے محروم رکھا تو گنہگار نہ ہوگا بلکہ بقدرِ قوت سے زیادہ نہیں دینا چاہیئے تاکہ اعانت علی المعصیت لازم نہ آئے لیکن قضاءً ہر صورت میں ہبہ نافذ رہے گا، اور اگر کوئی وجہ تفاضل موجود نہ ہو تو مرد و زن کے درمیان تسویہ کرنا افضل ہے۔

قال العلامة ابن البزاز الكندیؒ : الافضل فی هبة الابن والبنت التثليث كالميراث وعندنا فی التنصيف وهو المختار ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز وهو آثم نص عليه محمدؒ ولو خص بعض اولاده لزيادة رشده لا بأس به وان كانا سواء لايفعله وان اراد ان يصرف ماله الى الخير وابنه فاسق فالصرف الى الخير افضل من تركه له لانه اعانة على المعصية وكذا لو كان ابنه فاسقاً لايعطيه اكثر من قوته - (البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۲۳۷ الجنس الثالث فی هبة الصغير) [2]

---

[1] قال العلامة ابوالبركات النسفیؒ : فلو وهب الذی رحم محرم منه لا يرجع فيها - (كنز الدقائق ص ۳۵۵ كتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحكام، مادة ۸۶۶ ص ۴۷۶ کتاب الهبة الباب الثالث فی احكام الهبة -

[2] قال العلامة القاضی خانؒ : وروی المعلیؒ عن ابی یوسفؒ انه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوی بينهم يعطی للابنة مثل ما يعطی للابن -

(الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندية ج ۳ ص ۲۷۹ فصل فی هبة الوالد لولده)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۸ کتاب الهبة -

ہبہ کے لیے واہب کی رضامندی ضروری ہے

سوال:- باپ نے اپنی بیٹی کو ہبہ میں کچھ سامان اور نقدی دیدی، بیٹی نے بقدرِ ضرورت اس میں سے لے لیا اور جو باقی بچا وہ باپ کو ہبہ کر دیا، کیا شرعاً یہ ہبہ صحیح ہے؟

الجواب:- اگر یہ ہبہ بلا جبر و اکراہ کے اپنی خوشی اور رضامندی سے ہو تو شرعاً صحیح ہے کیونکہ مہرِ مسمّٰی معجل بعد القبض عورت کی ملک ہے اور اس میں اس کا تصرف نافذ ہے۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمه الله: يلزم فی الهبة رضا الواهب فلا تصح الهبة التی وقعت بالجبر والاکراه۔

(مجلة الاحکام، مادة ۸۶۰ ص۴۷۲ الباب الثانی فی شرائط الهبة) [1]

مرض الموت میں کیا گیا ہبہ درست نہیں

سوال:- ایک شخص نے مرض الموت میں اپنی کل جائیداد اپنی بیٹیوں اور بیوی کو دیئے بغیر اپنے چھ بیٹوں میں تقسیم کر دی جبکہ بیٹوں میں سے ایک بیٹا تقسیم جائیداد کے وقت نابالغ اور غیر موجود تھا، نابالغ لڑکا جو کہ اب بالغ ہو گیا ہے اس تقسیم سے راضی نہیں ہے۔ تو شریعت اس کو اجازت دیتی ہے کہ باقی بھائیوں سے جائیداد کی ازسرِنو تقسیم کرائے؟

الجواب:- یہ تقسیم میراث نہیں ہے بلکہ یہ ہبہ ہے اور مرض الموت میں کیا گیا ہبہ کالعدم ہے، جب تک کہ سب ورثاء اس پر راضی نہ ہوں۔ اور یہاں تو ایک دوسرا مانع بھی موجود ہے کہ ایک لڑکا ان میں سے نابالغ ہے اور نابالغ رضا کا

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردی رحمه الله: قال لها وهی لا تعلم العربیة قولی وهبت مهری منك فقالت وهبت لا تصح بخلاف الطلاق والعتاق لان الرضا شرط جواز الهبة۔ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۵ نوع فی هبة المهر وغیره)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۱ فصل فی هبة المرأة مهرها من الزوج۔

اہل نہیں ہے اس لیے یہ تقسیم اور ہبہ درست نہیں ہے لہٰذا تمام وارثوں پر نئے سرے سے
قاعدہ میراث سے تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وھب فی مرضہ ولم یسلم حتی
مات بطلت الھبۃ لانہ وان کان وصیۃ حتی اعتبر فیہ الثلث فھو
ھبۃ حقیقۃ فیحتاج الی القبض۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۵ ص۷۰۷
باب الرجوع فی الھبۃ) [فروع] لہ

پوتے کو زمین ہبہ کرنے کے بعد خود اس پر قابض رہنے کا حکم

سوال: میرے باپ کا میرے دادا کی زندگی میں
ہی انتقال ہوگیا تو دادا نے ۱۰ کنال زمین میرے نام کردی لیکن یہ زمین دادا کی وفات تک اُن
کے قبضہ میں ہی رہی، تو کیا اب میں اپنے چچوں سے زمین کا مطالبہ کرسکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب: ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ واہب موہوبہ شئے کو موہوب لہ
کے قبضہ میں دے دے، جب تک ہبہ شدہ چیز پر قبضہ نہ کرلیا جائے اس وقت ہبہ تام
نہیں ہوتا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ ہبہ تام نہیں ہوا ہے اسلئے دادا کی وفات کے بعد
جملہ مال ان کے بیٹوں یعنی آپ کے چچوں کا ہے، آپ کو شرعاً رجوع کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وان وھب لہ اجنبی تتم بقبض ولیہ وھو
احد اربعۃ الاب ثم وصیہ ثم الجد ثم وصیہ۔ وقال ایضاً وتتم الھبۃ
بالقبض الکامل فیشترط القبض قبل الموت۔ (الدر المختار علی صدر
رد المحتار ج۵ ص۶۹۵، ۶۹۶ کتاب الھبۃ) ؂ہ

لہ قال العلامۃ محمد خالد اتاسی رحمہ اللہ: واذا وھب واحد فی مرض موتہ
شیئاً لاحد ورثتہ وبعد وفاتہ لم یجز سائر الورثۃ لاتصح تلک الھبۃ۔
(شرح مجلۃ الاحکام - مادۃ ۸۷۹ ص۳۸۳ الفصل الثانی فی ھبۃ المریض)
ومثلہ فی الھدایۃ ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا۔

؂ہ قال المفتی عزیز الرحمٰن رح: اس صورت میں ہبہ صحیح نہیں اور ورثاء میں تقسیم ہوگا۔
(عزیز الفتاوی الشہیر بفتاوی دار العلوم دیوبند ج۱ ص۶۷۸ کتاب الھبۃ)

چوری کا ہبہ شدہ مال اصل مالک کو لوٹانا واجب ہے

سوال:- ایک شخص نے کسی کو چوری کا مال ہبہ کیا، کچھ مدت کے بعد اس مال کا اصلی مالک بھی آگیا اور اس نے موہوب لہٗ سے اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس نے یہ کہہ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ مال فلاں شخص نے مجھے ہبہ کیا ہے لہٰذا تم اس سے مطالبہ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس شخص (اصلی مالک) کا موہوب لہٗ سے اپنے مال کا مطالبہ کرنا درست ہے اور کیا اس کے ذمے مال واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر کسی نے چوری کا مال اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو ہبہ کیا ہو اور بعد میں اس کا اصلی مالک آجائے تو چوری کا موہوبہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کیا جائے گا اور اس کا دونوں سے مطالبہ کرنا درست ہے، البتہ جس کے پاس وہ مال موجود ہے اس پر واپس کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: (سوال) زید نے عمرو کی ایک چیز چرائی اور بکر کو ہبہ کر دی اور بکر نے خالد کو ہبہ کر دی، اب معلوم ہوا کہ زید نے چوری کی تھی، اس حالت میں شئے مسروقہ کا ادا کرنا کس کے ذمے واجب ہوگا؟

(الجواب) جس کے پاس اب ہے اس پر رد واجب ہے اور اگر اس کو خبر نہ ہو تو جس کو خبر ہو اس پر خبر کرنا واجب ہے اور اگر اس صاحب خبر کو ہبہ میں بھی دخل ہے تو اس پر استخلاص اور استرداد میں بھی سعی واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد۳ ص۵۷۵ کتاب الہبہ)

قرائن بھی تکمیلِ ہبہ کے لیے کافی ہیں

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرے بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے مجھے کچھ رقم دی، میں نے وہ رقم بیٹی کی شادی پر خرچ کر دی، اس بات کو تقریباً بیس سال گذر چکے ہیں اور اس دوران بڑے بھائی نے رقم کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا، یہاں یہ یاد رہے کہ جب بڑے بھائی نے مجھے رقم دی تھی تو اس نے قرض یا واپسی کی کوئی تصریح یا وضاحت وغیرہ نہیں کی تھی اور نہ اس کو واپسی کی کوئی امید تھی، اب ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد مجھ سے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تو کیا شرعاً بھائی کی اولاد کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- ہبہ کی تکمیل کے لیے ایجاب و قبول یعنی ہبہ کی تصریح ضروری نہیں قرائن بھی تلفظ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ صورتِ مذکورہ کے مطابق بیس سال تک بھائی کا مطالبہ نہ کرنا،

اور رقم دے کر واپسی کی امید نہ رکھنا اور نہ ہی قرض کی تصریح کرنا، یہ سب چیزیں اس بات پر دال ہیں کہ آپ کو بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے جو رقم دی تھی وہ بطور ہبہ تھی، اس لیے اب اس کی اولاد کو رقم کی واپسی کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: قلت فقد افاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لایشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیك لکن دفع الی الفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما نشئ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۴ ص۵۰۸ کتاب الهبة)[۱]

بیوی کا ہبہ کردہ حق مہر میں رجوع کرنا

سوال:۔ ایک عورت نے اپنا حق مہر شوہر کو ہبہ کر دیا، چند سال کے بعد کسی گھریلو ناچاقی کی وجہ سے اب وہ عورت شوہر سے حق مہر کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا شرعاً اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زوجین کا رشتہ قرابت داری کا رشتہ ہے، ان میں سے جو بھی دوسرے کو ہبہ کر دے تو بعد میں اس کو رجوع کرنے اختیار نہیں۔ اسی طرح صورتِ مسئولہ میں بھی جب بیوی نے ایک بار اپنا حق مہر شوہر کو ہبہ کر دیا تو اب اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وکذلك ما وهب احد الزوجین للاٰخر لان المقصود فیها الصلة کما فی القرابة۔ (الهدایه جلد۳ ص۲۸۴ کتاب الهبه)[۲]

بچوں کے مال میں تصرّف کرنا

سوال:۔ بعض یورپی ممالک مثلاً برطانیہ میں نابالغ بچوں کے لیے حکومت کی طرف سے کچھ وظیفہ مقرر ہوتا ہے جو صرف بچے کی تعلیم وتربیت پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے، اب اگر والدین اس پر

---

[۱] قال العلامة داماد آفندیؒ: قالوا لو وضع ماله فی طریق لیکون ملکاً لرافع جاز فلا یشترط التصریح بالهبة۔ (الدر المنتقی فی شرح الملتقی فی ذیل مجمع الانهر ج۳ ص۴۹۰ کتاب الهبة)
ومثله فی امداد الفتاوٰی ج۳ ص۲۶۶ کتاب الهبة۔

[۲] لما فی الهندیة: اذا وهب احد الزوجین لصاحبه لایرجع فی الهبة وان انقطع النکاح بینهما۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۴ ص۳۸۶ کتاب الهبة، فصل رجوع فی الهبة)

قبضہ کر کے اس سے کوئی چیز خرید کر اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو تحفے کے طور پر دیدیں تو کیا شرعاً والدین کو یہ حق ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس طرح کریں تو کیا وہ ضامن ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو وظیفہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے حکومت مقرر کرتی ہے وہ صرف بچوں ہی کا حق ہے، اس کو صرف بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم پر خرچ کیا جائے گا، وظیفہ کی یہ رقم والدین کے ہاتھوں میں امانت ہوتی ہے، والدین کے لیے جائز نہیں کہ بلا عذر شرعی اس کو اپنے اوپر خرچ کریں یا اپنے کسی رشتہ دار یا احباب کو تحفہ کے طور پر دیں، اگر وہ اس طرح کریں گے تو ضامن ہوں گے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یجوز ان یھب شیئاً من مال طفلہ ولو بعوض۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۷۰۷ کتاب الھبۃ قبل باب الرجوع فی الھبۃ) لہ

بے اولاد شخص کا زندگی میں اپنا مال تقسیم کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں ایک بیمار اور عمر رسیدہ آدمی ہوں، میری کوئی اولاد نہیں صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، ایک بڑے بھائی کا بیٹا ہے اور دوسرا چھوٹے بھائی کا بیٹا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کر دوں۔ آپ سے استدعا ہے کہ شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس بارے میں میری راہنمائی کریں؟

الجواب:۔ اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی اپنے ورثاء میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اس کا اختیار ہے کہ جتنا جتنا چاہیں ورثاء میں تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے کل مال کا ۸/۱ حصہ اپنی بیوی کے نام کر دیں اور باقی مال کے دو برابر حصے کر کے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اور اگر اس مال سے اپنے لیے بھی کچھ رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا

لہ لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: ماں باپ وغیرہ کو بچے کا مال کسی کو قرض دینا بھی صحیح نہیں بلکہ خود قرض لینا بھی صحیح نہیں۔ (بہشتی زیور ص۳۹۹ بچوں کو دینے کا بیان، کتاب الہبۃ والاجارۃ)

ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبيؒ : هي تمليك عين بلا عوض وتصح بايجاب و قبول وتتم بالقبض الكامل فان قبض في المجلس بلا اذن صح وبعده لا بد من الاذن۔ (ملتقى الابحر على هامش مجمع الانهر ج ۳ ص ۴۸۹ كتاب الهبة)

صرف انتقال کردینے سے ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے سرکاری ملازمت کے دوران کچھ زمین خریدی تھی لیکن بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے انہیں اس زمین کا انتقال اپنے دو بیٹوں کے نام کرانا پڑا مگر آخری دم تک زمین ان کے قبضہ میں نہیں دی، موت تک خود متصرف رہے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد اب وہ دونوں بھائی اپنے نام انتقال شدہ زمین کو اپنی موہوبہ زمین سمجھتے ہیں اور دوسرے بہن بھائیوں کو اس میں سے حصہ دینے کو تیار نہیں۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا شرعاً واقعی یہ انتقال شدہ زمین ان کی موہوبہ زمین ہے اور اس میں کسی دوسرے وارث کا کوئی حق نہیں؟

الجواب: ہبہ میں جس طرح ایجاب وقبول ضروری ہے اسی طرح ہبہ تام ہونے کے لیے موہوبہ چیز پر قابض ہونا بھی لازمی عمل ہے، بغیر قبضہ کے صرف ایجاب وقبول یا کاغذی قانونی کاروائی سے ہبہ تام نہیں ہو سکتا۔ بعینہ اسی طرح آپ کے والد صاحب نے خریدی ہوئی زمین قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے مصلحتاً اپنے دو بیٹوں کے نام انتقال کرادی اور آخری دم تک ان کے قبضے میں نہیں دی اس لیے ہبہ تام نہیں ہوا، موصوف کی وفات کے بعد سب ورثاء حصہ شرعی کے مطابق برابر کے شریک ہیں، جن دو بھائیوں کے نام صرف زمین کا انتقال ہو چکا ہے وہ دیگر ورثاء (بہن بھائیوں) کو ان کے حق سے محروم کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة اشرف على التهانويؒ : (الجواب) اس صورت میں عمرو نے محفوظی جائیداد کے واسطے ایک حیلہ کیا ہے، پس زید کسی طرح اس جائیداد کا مالک نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ تو استیلاء حاکم اس جائیداد پر پایا گیا کہ یوں کہیں کہ حاکم کی طرف سے زید کی ملکیت ہو گی اور نہ قبضہ زید کا اس جائیداد پر مالکانہ

پایا گیا۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۳ ص ۴۱۴ کتاب الدعویٰ) ؎

صرف منافع کے حصول کیلئے دی ہوئی چیز کا ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال:۔ زید کے باپ نے ایک ٹیکسی موٹر کار خرید کر اس شرط پر زید کے حوالے کی کہ اس کے ذریعے مزدوری کر کے اپنے اہل و عیال کے لیے نان و نفقہ پیدا کرو مگر گاڑی میری ہوگی، اس معاہدے پر گواہ بھی موجود ہیں، اب جبکہ زید کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ گاڑی پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو اس کا اصلی مالک قرار دے رہا ہے اور دوسرے ورثاء کو حصہ دینے سے انکاری ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیان مذکورہ بالا کے مطابق کیا واقعی زید اس گاڑی کا واحد مالک ہے یا دوسرے ورثاء کا بھی اس میں حصہ شرعی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال زید اس گاڑی کا واحد مالک نہیں، والد کے انتقال کے بعد جملہ ورثاء اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، اس لیے کہ والد نے ٹیکسی اس کو صرف منافع حاصل کرنے کے لیے خرید کر دی تھی، رأس المال کو اس کے قبضے میں نہیں دیا تھا کہ جس کی بناء پر زید کو گاڑی کا مالک تصور کیا جا سکے، لہٰذا زید کا والد کے انتقال کے بعد اپنے آپ کو گاڑی کا واحد مالک سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

؎ لما قال المفتی عبد الرحیم: (الجواب) والد اگر کسی مصلحت سے اپنے کسی بیٹے کے نام مکان خریدے تو وہ بیٹا محض اس کے نام پر خریدنے کی وجہ سے شرعی طور پر اس مکان کا مالک شمار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۹ ص ۲۸۶ کتاب الہبۃ)

كتاب الغصب والوديعة والعارية

ليس على المستعير غير المغل ضمان ولا على المستودع غير المغل ضمان

کتاب الغصب

(غصب کے مسائل واحکام)

غاصب کا قبضہ

سوال:- کیا غاصب کا قبضہ از روئے شرع قبضہ سمجھا جائیگا؟

الجواب:- غاصب کے قبضے کا شریعت میں کچھ وزن نہیں اسی طرح جائیداد مغصوبہ میں غاصب کا تصرف کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ہاں جب مالِ مغصوبہ کا نام تبدیل ہو جائے یا اس کا اعظم منافع ختم کر دیا جائے تو اس وقت وہ غاصب کا مال کہلائے گا جیسے کسی نے گندم چرائی اور اس سے روٹی پکائی، لیکن غاصب کو ضمان ادا کرنا پڑے گا اور ضمان ادا کرنے سے قبل مالِ مغصوبہ سے انتفاع لینا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:- واذا تغيرت العين بفعل الغاصب حتى زال اسمها واعظم منافعها زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدي بدلها۔

(الهداية ج ۳ ص۳۷۴ كتاب الغصب۔فصل فيما يتغير بفعل الغاصب)[1]

مالک کو اطلاع کیے بغیر ادائِ حق سے برأت کا حکم

سوال:- زید بکر کے ہاں محنت مزدوری کرتا ہے، اس دوران اُس نے بکر کی ایک قیمتی گھڑی چرالی، زید اب اپنے اس فعل پر نادم ہے اور بکر بھی زندہ

---

[1] قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: اذا غير الغاصب المال المغصوب على بصورة يتبدل بها اسمه يكون ضامناً ويبقى المال المغصوب له مثلاً لو كان المال المغصوب حنطة وجعلها الغاصب بالطحن دقيقاً فانه يضمن مثل الحنطة ويكون الدقيق له كما ان من غصب حنطة غيره وزرعها في ارضه يكون ضامناً للحنطة والمحصول له۔

(شرح مجلة الاحكام، مادة ۸۹۹ ص۲۹۵/ج۳ الباب الاول في احكام الغصب)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج ۵ ص۱۲۱ كتاب الغصب، الباب الثاني في احكام المغصوب اذا تغير بفعل الغاصب اوغيره۔

ہے، لیکن واپس کرنے میں اگر بکر کو پتہ چل گیا تو زید کو خدشہ ہے کہ وہ میری بے عزتی کرے گا، اب زید کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ بے عزتی بھی نہ ہو اور آخرت کے مواخذہ سے بچ سکے؟

الجواب: کسی مسلمان کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا یا اس کو چوری کرنا حرام اور ناجائز ہے اور اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، اس لیے زید کو ہر حال میں گھڑی واپس کردینی چاہیئے اور اگر ظاہراً واپس کرتے میں بے عزتی کا خطرہ ہو تو کسی خفیہ تدبیر سے پہنچا دی جائے، مالک کو اطلاع دینا ضروری نہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله :- (قوله ویبرأ برد ها) ای ردّ العین المغصوبة الی المغصوب منه - (رد المحتار ج۶ ص۱۸۲ کتاب الغصب، مطلب فی ردّ المغصوب... الخ) ؎۱

بلا اِذن دوسروں کے جانور ذبح کرنے کا حکم

سوال: اگر بوقت ضرورت کسی دوسرے شخص کے جانور کو بغیر اس کی اجازت کے ذبح کرلیا جائے اور بعد میں قیمت طے کرکے دے دی جائے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کرنا شرعاً ناجائز اور غصب ہے، مالک کو اختیار ہے کہ وہ زندہ جانور کی قیمت لے اور مذبوح جانور ذابح کے حوالہ کرے یا مذبوح جانور کو لے کر ذبح کی وجہ سے اس کی قیمت میں جو کمی آئی ہے وہ غاصب سے پوری کرے۔ البتہ اگر اذنِ عرفی موجود ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی العمادیة فی فصل ۳۲ ومن ذبح شاة غیره فمالکها بالخیار ان شاء ضمنه قیمتها وسلمها الیه وان شاء اخذها وغرمها النقصان۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۵ کتاب الغصب) ؎۲

؎۱ قال العلامة قاضیخانؒ: غصب دراهم انسان من کیسه ثم ردها فی کیسه وهو لا یعلم یبرأ۔ (فتاوی خانیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۱۷۹ جنس آخر فی المتفرقات) ــــ ومثلهٗ فی مجلة الاحکام لرستم باز، المادة ۸۹۲ ص۴۹۲۔

؎۲ قال العلامة قاضیخانؒ: رجل ذبح شاة انسان ظلماً فصاحبها بالخیار ان شاء ترك المذبوح علیه وضمنه قیمتها وان شاء اخذ المذبوح وضمنه النقصان۔ (فتاوی خانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۴۵ کتاب الغصب)
ومثلهٗ فی الهدایة ج۴ ص۳۷۸ کتاب الغصب۔

مغصوبہ زمین کی واپسی کے بعد حاصل کردہ منافع کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کی زمین غصب کرلی اور اس سے دس سال تک پیداوار حاصل کرتا رہا جس کا ایک مخصوص حصہ مساجد اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرتا رہا اور کچھ حصہ پیداوار کا اپنے استعمال میں لاتا رہا، کافی کوشش کے بعد بکر نے اپنی غصب کی ہوئی اپنی زمین زید سے واپس لے لی، تو کیا بکر زید سے رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے، زمانۂ غصب میں جو کچھ بھی مغصوبہ سے حاصل ہوا ہو وہ مغصوب عنہ کا حق ہے۔ بنابریں بکر اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد اور دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے مگر علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرِ مزارعت دینا لازم ہوگا۔

وفی الهندية: وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذره لنفسه بغير اذن صاحب الارض هل لصاحب الارض ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف فی تلك القرية انهم يزرعون الارض بثلث الخارج او ربعه او نصفه او بشیء مقدر شائع يجب ذلك القدر الذی جری به العرف۔ (الفتاوی الهندية ج۵ ص۱۴۳ الباب العاشر فی زراعة الارض المغصوب به) [۱]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فالحاصل ان من زرع ارض غيره بلا اذنه ولو على وجه الغصب فان كانت الارض ملكاً واعدها ربها للزراعة اعتبر العرف فی الحصة ان كان ثمة عرف والا فان اعدها للايجار فالخارج كله للزارع وعليه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعليه النقصان والا فلا شیء عليه۔

(تنقيح الحامدية ج۲ ص۱۴۲ كتاب الغصب)

ومثله فی الفتاوی الكاملية ص۲۰۹ كتاب الغصب۔

بغیر اجازت کے کسی کی زمین سے مٹی لانا

سوال:۔ زید کی مملوکہ زمین میں ایک ٹیلہ ہے لوگ اس سے مٹی لے آتے ہیں، زید کسی کو منع بھی نہیں کرتا، تو کیا زید کی اجازت کے بغیر اُس ٹیلے سے مٹی لانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اصول یہ ہے کہ کسی کی مملوکہ زمین سے مٹی وغیرہ لانا بغیر اس کی اجازت کے جائز نہیں، لیکن اجازت کے لیے صراحتاً کہنا ضروری نہیں قرینہ اجازت بھی کافی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ زید اپنی زمین سے مٹی لینے سے کسی کو منع نہیں کرتا تو یہ اجازت پر دال ہے، اس لیے اُس سے اجازت لیے بغیر بھی مٹی لائی جا سکتی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا سقی ارضه وشجره وزرعه ونصب دولاب ونحوها من نهر غیره وقناته وبئره الا باذنه لان الحق له فیتوقف علی اذنه۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۱ ص۴۳۹ فصل الشرب) [۱]

بلا کرایہ سفر کرنے پر ذمہ سے فارغ ہونے کا طریقہ

سوال:۔ میں دو تین بار کراچی سے پشاور تک ریل میں بغیر ٹکٹ کے آیا ہوں، اُس وقت مجھے کوئی خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام ناجائز کر رہا ہوں، اب میں چاہتا ہوں کہ اس حقِ غیر سے کسی طرح اپنا ذمہ فارغ کر سکوں، مہربانی فرما کر اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ بس یا ریل میں بغیر کرایہ ادا کیے سفر کرنا جائز نہیں، کرایہ کے پیسے ادا کرنا واجب ہے اور اگر کبھی بغیر کرایہ کے سفر کیا گیا تو اس کی ادائیگی اور ذمہ سے فارغ ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس ادارے سے اتنی مسافت کا ٹکٹ خرید کر استعمال میں لائے بغیر اُسے ضائع کر دیا جائے تو اس سے حق ادا ہو جائے گا۔ جہاں تک آپ کے مسئلہ کا تعلق ہے تو آپ اس طرح کریں کہ جتنی بار آپ کراچی سے پشاور بغیر کرایہ ادا کیے آئے ہیں اتنی دفعہ کرایہ کا حساب کر کے اتنی مالیت کی ٹکٹ خرید کر اُسے ضائع کر دیں، اس طرح آپ کا ذمہ فارغ ہو

---

[۱] لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: اسی سے معلوم ہوا کہ بغیر اجازتِ مالک کے اپنے کھیت کو پانی دینا یا مٹی لانا جائز نہیں ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص۴۵۲ کتاب الغصب)

جائے گا۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: (الجواب) زید کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ میرے ذمہ کتنا کرایہ واجب ہے، اسی قدر داموں کا ایک ٹکٹ اسی ریلوے کا خرید کر اس ٹکٹ کو ضائع کردے اس سے کام نہ لے، حق واجب کمپنی کا ادا ہو جاوے گا۔ (امداد الفتاوی ج ۳ ص ۴۴۶ کتاب الغصب)

پرنالہ بند کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ ایک صاحب کے مکان کے عقب (پچھواڑے) میں میری مملوکہ زمین ہے اب میں اس پر مکان بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کے مکان کا پرنالہ میری زمین کی طرف ہے میں نے اس کو پرنالہ بند کرنے کا کہا تو اس نے انکار کر دیا اور اصلاحی جرگہ میں میرے خلاف شکایت کر دی۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مجھے شرعاً اس کا پرنالہ بند کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ جگہ واقعی آپ کی ملکیت ہے اور پرنالے کا پانی آپ ہی کی مملوکہ زمین پر گرتا ہو تو آپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ آپ اس پرنالہ کو بند کر دیں، اور اگر پرنالہ کا پانی گرنے کی جگہ صاحب مکان کی ملکیت ہو تو پھر آپ کو پرنالہ بند کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ومن اشتری بیتاً فی دارٍ ومنزلاً اومسکناً لم یکن لہٗ طریق الا ان یشتریہ بکل حق ھو لہ المرافقہ او بکل قلیل وکثیر وکذا الشرب والمسیل۔ (الہدایہ جلد۳ ص۸۸ کتاب البیوع، باب الحقوق)[۱]

❋

---

[۱] لما قال الشیخ مولانا اشرف علی التھانویؒ: مسیل یعنی پرنالہ و بدرو وغیرہ نکالنا حقوق ملک سے ہے جو شخص اس جگہ کا مالک ہے اس کو ہر طرح تصرف کا حق پہنچتا ہے، پس یہ شخص جو حق پرنالہ ہمسایہ کو زائل کرنا چاہتا ہے، اگر وہ پرنالہ گرنے کی جگہ اس شخص کی مملوک ہے اور اب تک بطور تبرع و احسان و رعایت ہمسایہ کو پانی ڈالنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اب زائل کرنا چاہتا ہے اور پرنالہ بند کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے، اپنی ملک کا اختیار ہے اور اگر یہ جگہ ہمسایہ کی مملوک ہے تو اس شخص کو اس کا پرنالہ بند کرنا جائز نہیں کہ یہ غصب ہے۔
(امداد الفتاوی جلد۳ ص۴۴۵ کتاب الغصب)

کتاب الودیعة والعاریة

(امانت اور عاریت کے مسائل واحکام)

امین کو امانت میں تصرف کا حق ہے

سوال:۔ کسی امین کو امانت میں تصرفات کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ امین پر امانت کی حفاظت لازمی ہے اس کی حفاظت کے لیے جو بھی تدبیر اختیار کرنا پڑے کر سکتا ہے مگر حفاظتی تدابیر کے علاوہ دیگر تصرفات کرنا جائز ہے بصورت ہلاکت ضامن ہوگا۔

وفی الهندیة: والودیعة لا تودع ولا تعار ولا تؤجر ولا ترهن وان فعل شیئًا منها ضمن کذا فی البحر الرائق۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۳۸ کتاب الودیعة)[1]

امانت ضائع ہو جانے پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو کچھ رقم کاروبار کے لیے دی، عمرو کاروبار کے سلسلے میں سفر پر چلا گیا، سفر کے دوران اس نے رقم اپنے رفیقِ سفر کو دے دی جس سے کسی نے وہ رقم چوری کرلی، تو کیا زید اب عمرو سے ضمان کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ محمود سے یہ رقم برفاقت عمرو ضائع ہوگئی ہے لہٰذا ان دونوں میں سے کسی پر ضمان نہیں ہے، تاہم اگر عمرو محمود سے جدا ہو چکا تھا تو ہلاکت کی صورت میں عمرو زید کا ضامن ہوگا۔

قال العلامة سلیم رستم باز: ثم اعلم ان المستودع الاول انما یضمن اذا اودع الودیعة وهلکت بعد ان فارقها واما قبله فلا ضمان علی احد لان الثانی قبض المال من ید امین کما مر والاول لا یکون بالدفع ضمینًا مالم یفارق بحضوره

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: والودیعة لا تودع ولا تعار ولا تؤجر ولا ترهن وان فعل شیئًا منها ضمن۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۹۱ کتاب العاریة) ــــ ومثله فی شرح مجلة الاحکام، ماده ۷۷۱ ص۲۲۶ الباب الاول فی عمومیة الامانات۔

رایۃ فاذا فارق فقد ترک الحفظ اللازم بالتزامہ فیضمن بترکہ .(مجمع الانہر)

(شرح مجلۃ الاحکام، مادۃ ۷۹۰ ص۴۳۸) ۱؎

امانت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال :- امانت کی حفاظت کرنے پر اُجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر حفظِ ودیعت کو مودع پر شرط کرکے اجرت مقرر کردی جائے تو جائز ہے اور اس صورت میں اگر مودع سے شئے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہوجائے جس سے بچنا ممکن تھا تو مودع ضامن ہے ورنہ ضامن نہیں۔

وفی مجلۃ الاحکام : الودیعۃ امانۃ فی ید الودیع فاذا ھلکت بلا تعدٍ منہ وبدون صنعہ وتقصیرہ فی الحفظ لا یضمن ولکن اذا کان الایداع باُجرۃ فھلکت اوضاعت بسبب یمکن التحرز عنہ لزم المستودع ضمانھا)

(شرح مجلۃ الاحکام۔ مادۃ ۷۷۷ ص۴۳۱ فی احکام الودیعۃ وضمانھا) ۲؎

مودع کی وفات پر ورثاء کو مطالبہ کا حق ہے

سوال :- زید کی امانت بکر کے پاس رکھی ہوئی تھی کہ اچانک زید کی وفات ہوگئی، اس کے پسماندگان میں بیوی بچے ہیں لیکن ناقابلِ اعتماد ہیں، تو بکر یہ امانت کس کے حوالے کرے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ میں زید کے ورثاء کے مطالبے پر امانت کی واپسی ضروری ہے،

۱؎ قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : فافاد ان المودع لا یودع فان اودع فھلکت عند الثانی ان لم یفارق الاول لا ضمان علیٰ واحدٍ منھما وان فارقہ ضمن الاول عند ابی حنیفۃ ولا یضمن الثانی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۷۴ کتاب الودیعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۴ ص۳۰۳ کتاب الودیعۃ۔ الثانی فیما یکون اضاعۃ۔ الخ

۲؎ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : وفی آخر کتاب الغصب من شرح الطحاوی المودع اذا شرط الاجر للمودع علیٰ حفظ الودیعۃ صح ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۸۹ الفصل السادس فی المتفرقات)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۳۷۳ الباب التاسع فی المتفرقات۔

لیکن اگر بہ یقین یا غالب ظن ہو کہ ورثاء اس مال کو ضائع کر دیں گے تو پچیس سال کی عمر تک نہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: واذا مات رب الودیعۃ فالوارث خصم فی طلب الودیعۃ کذا فی المبسوط۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۴ ص۳۵۴ الباب السابع فی رد الودیعۃ)[1]

امانت کے ضائع ہونے کے خدشہ کی صورت میں فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی امانت کے بارے میں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور مالک تک رسائی بھی مشکل ہو تو ایسی صورت میں امانت کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے؟ کیا اسے فروخت کر کے رقم مالک کو دی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ امانت میں بنیادی طور پر مالک کے حقوق کی رعایت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ امانت میں خیانت حرام اور ناجائز ہے، امانت مالک کو اصل حالت میں واپس کرنا مودع کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں امانت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں مالک سے رابطہ کر کے اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے اور اگر کسی وجہ سے مالک سے رابطہ ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں حاکمِ وقت کو اطلاع دے کر تحفظِ امانت کی صورت تلاش کی جائے، اور اگر حاکمِ وقت سے بھی رابطہ کی صورت میسّر نہ ہو تو پھر اہل رائے سے مشورہ کر کے امانت کو فروخت کر کے اس کی قیمت مالک کے لیے محفوظ رکھی جائے۔ تاہم ان تمام صورتوں میں مالک سے ہمدردی کا جذبہ محرک رہے گا اور اگر حتی المقدور کوشش کے باوجود امانت ضائع ہوگئی تو محافظ پر کوئی تاوان لازم نہیں۔

قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللّٰہ:۔ اذا کان صاحب الودیعۃ غائبًا غیبۃ منقطعۃ بحیث لا یعلم موتہ ولا حیاتہ یحفظھا المستودع الیٰ ان یعلم موت صاحبھا اما اذا کانت الودیعۃ مما یفسد بالمکث یبیعھا المستودع باذن الحاکم ویحفظ ثمنھا امانۃ عندہ لکن اذا لم

---

[1] قال العلامۃ خالد اتاسی رحمہ اللّٰہ، واذا مات المودع تسلم الودیعۃ لوارثتہ (مجلۃ الاحکام مادۃ ۸۰۲ ص۲۴۶ الفصل الثانی۔ فی احکام الودیعۃ وضمانتھا) ومثلہٗ فی ردالمحتار ج۵ ص۶۶۶ کتاب الودیعۃ۔

يبيعها فقسدت بالمكث لايضمن ۔ (مجلۃ الاحکام، مادۃ ۷۸۹ ص۴۳۵ الفصل الثانی فی احکام الودیعۃ)[1]

عاریۃً دی ہوئی چیز کے واپس لینے کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو اپنی زمین پھلوں کی کاشت کے لیے عاریتاً دیدی اور عمرو نو سال تک اس زمین سے پیداوار حاصل کرتا رہا، لیکن اب زید پیداوار میں حصہ مانگتا ہے اور زمین بھی واپس لینا چاہتا ہے۔ کیا از روئے شریعت زید کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی زمین واپس لے؟ اور کیا زید پیداوار میں حصہ لینے کا حق دار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ زید نے عمرو کو زمین عاریتاً دی ہے اس لیے زید کو اپنی زمین واپس لینے کا حق تو حاصل ہے لیکن اسکی پیداوار میں حصہ لینے کا حقدار نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین: (ولو اعار ارضاً للبناء والغرس صح) للعلم بالمنفعۃ (وله ان یرجع متی شاء)۔ (رد المحتار ج۵ ص۶۸۳ کتاب العاریۃ)[2]

معیر یا مستعیر کی موت سے اعارہ فسخ ہوتا ہے

سوال:۔ رشید خان فرید خان کی خدمت کرتا ہے، فرید خان نے خدمت کے عوض میں رشید خان کو دس کنال زمین دیدی، رشید خان زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتا رہا، اب جبکہ رشید خان بوڑھا ہو گیا ہے اور خدمت کرنے کے قابل نہیں رہا تو فرید خان نے مذکورہ زمین رشید خان سے لے کر اس کے بیٹے جاوید خان کو دے دی، کچھ وقت گذرنے کے بعد فرید خان کی جائیداد کسی وجہ سے حکومت نے

---

[1] وفی الهندیۃ: اذا کانت الودیعۃ شیئاً یخاف علیه الفساد وصاحب الودیعۃ غائب فان رفع الامر الی القاضی حتی یبیعه جاز وهو الاولیٰ وان لم یرفع حتی فسدت لاضمان علیه لانه حفظ الودیعۃ علیٰ ما امر به کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۴ ص۳۴۲ الباب الرابع، کتاب الودیعۃ)

ومثله فی فتاویٰ سراجیۃ علیٰ هامش قاضی خان ج۴ ص۳۵۴ کتاب الودیعۃ۔

[2] قال العلامۃ المرغینانی: واذا استعار ارضاً لیبنی فیها او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔ (الهدایۃ ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریۃ)

ومثله فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۹۳ کتاب العاریۃ۔

ضبط کرلی لیکن جاوید خان کی دس کنال زمین بدستور اس کے تصرف میں ہے۔اب جاوید خان کا دوسرا بھائی سلیم خان دعویدار ہے کہ چونکہ یہ زمین ہمارے والد صاحب کی ملکیت ہے اس لیے میں بھی اس زمین میں حقدار ہوں۔کیا ازروئے شرع سلیم خان کا اس زمین میں کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معاملہ کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرید خان نے رشید خان کو جو زمین دی تھی وہ عاریتاً دی تھی نہ کہ بطورِ ملکیت، اس لیے کہ جب رشید خان بوڑھا ہوگیا تو زمین واپس لے کر اس کے لڑکے جاوید خان کو دے دی، لہٰذا معلوم ہوگیا کہ یہ دینا عاریتاً تھا نہ کہ بطور تملیکاً، اس لیے مذکورہ زمین اگر فرید خان زندہ ہو تو اس کی ملکیت ہے نہ کہ رشید خان اور بیٹوں کی، اور اگر فرید خان فوت ہوچکا ہے تو یہ زمین اس کے وارثوں کی ہے اور اعارہ بسبب اس کی وفات کے فسخ ہوچکا ہے۔

قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: تنفسخ الاعارة بموت المعیر او المستعیر۔

(مجلة الاحکام۔مادة ۸۰۷ ص۴۴۸ الباب الثالث الفصل الاول) [1]

معیر اور مستعیر کا اجارہ اور عاریت میں اختلاف

سوال: زید نے بکر سے مکان کے لیے لکڑیاں حاصل کیں اور لکڑیاں واپس کرتے وقت بکر نے دعویٰ کیا کہ لکڑیاں اجارہ پر دی گئی تھیں نہ کہ عاریتاً، جبکہ زید کا کہنا ہے کہ لکڑیاں عاریتاً حاصل کی گئی تھیں، اب اس اختلاف کو حل کرنے میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر بکر گواہوں کے ذریعے سے یہ ثابت کردے کہ زید نے لکڑیاں اجارہ پر حاصل کی تھیں تو زید اجرت دینے کا پابند ہوگا ورنہ عاریتاً پر محمول ہوگا اور کرایہ دینے سے بری ہوگا۔

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: واذا مات المستعیر او المعیر تبطل الاعارة کما تبطل الاجارة بموت احد المتعاقدین۔

(فتاویٰ خانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۳۸۲ فصل فیما یضمن المستعیر)

وَمِثْلُهٗ فی سراجیة علیٰ هامش فتاویٰ قاضی خان ج۳ ص۸۲ کتاب العاریة۔

وفی الهندیة :واذا قال اعرتنی دابتك وهلكت وقال المالك غصبتها منی فلاضمان علیه ان لم یکن رکبها فان کان قد رکبها فهو ضامن وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتکها وقد رکبها وهلکت من رکوبه فالقول قول الراکب ولاضمان علیه کذا فی المحیط - (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۷۲ کتاب العاریة، الباب الثامن فی الاختلاف الواقع فی هذا الباب والشهادة فیه) ؎۱

امانت رکھنے والا واپس نہ آئے تو امانت کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص کسی کے پاس کچھ رقم بطور امانت رکھے اور وہ امانت لینے کے لیے واپس نہ آئے تو امین اُس رقم کے ساتھ کیا کرے؟

الجواب:- امین کو اگر امانت رکھنے والے کا اتہ پتہ معلوم نہ ہو پھر بھی اسے چاہیئے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے امانت پہنچانے کی کوشش کرے ورنہ اسکی موت کی صورت میں اس کے ورثاء کے حوالے کردے، اور اگر کوشش کے باوجود اس کا یا اس کے ورثاء کا علم نہ ہو سکے تو خود اس مال کو امانت رکھنے والے کی طرف سے صدقہ کردے یا صدقہ کی نیت کرجائے، البتہ اگر امین فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، اور اگر صدقہ کرنے کے بعد مال کا مالک واپس آجائے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے یا صدقہ رہنے دے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله :فینتفع الرافع بها لو فقیراً والا تصدق بها علی فقیر ولو علی اصله وفرعه وعرسه..... فان جاء مالکها بعد التصدق خیر بین اجازة فعله ولو بعد هلاکها وله ثوابها او تضمینه -

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۲۷۹-۲۸۰ کتاب اللقیط)

؎۱ قال العلامة خیر الدین الرملیؒ : وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتکها وهلکت من رکوبه فالقول قول الراکب ولاضمان علیه کذا ذکره کثیر من علمائنا -

(فتاوی خیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۱ کتاب العاریة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۳۱۴ کتاب الاجارات -

مجبوری کے تحت امانت فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آج سے دو سال قبل ایک افغان مہاجر نے ہمارے پاس دو بوری گندم امانت رکھی تھی اور خود کہیں چلا گیا، اس کے بعد سے آج تک ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہمیں اس کے گھر بار کا کوئی علم ہے، جبکہ اس کی گندم پڑی پڑی خراب ہو رہی ہے۔ ان حالات میں شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے اس کا کوئی حل بتائیں؟ کیا ہم اس گندم کو فروخت کر کے اس کی قیمت بطور امانت محفوظ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ بلا ضرورت شدیدہ کسی کی امانت میں تصرف کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا تاہم مجبوری کے تحت بہت سارے محظورات میں بھی گنجائش نکل آتی ہے۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی ضرورتِ شدیدہ ہے اس لیے شرعاً آپ عدالت سے اجازت لیکر اس گندم کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو اپنے پاس بطورِ امانت محفوظ رکھیں لیکن اگر عدالت تک رسائی ممکن نہ ہو اور گندم کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو پھر چند مسلمانوں کے سامنے اسے فروخت کر کے رقم محفوظ رکھیں۔

لما فی الهندية: وان كانت الوديعة شيئاً لا يمكن ان يؤاجر فالقاضي يأمره بأن ينفق من ماله يوماً او يومين او ثلاثة رجاء ان يحضر المالك ولا يأمره بالانفاق زيادة على ذلك هل بل يأمره بالبيع و امساك الثمن۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۲ كتاب الوديعة) [1]

❋

---

[1] وقال مولانا عبد الكريم: وفى العالمگيرية: وان كانت الوديعة شيئاً لا يمكن ان يؤاجر فالقاضي يأمره بأن ينفق من ماله يوماً او يومين او ثلاثة رجاء ان يحضر المالك ولا يأمره بالانفاق زيادة على ذلك بل يامره بالبيع و امساك الثمن۔ اھ

وفى ديارنا لا يمكن الرفع إلى القاضي فجماعة المسلمين قائمة مقامه۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں بکرے کو فروخت کر کے اس کی قیمت امانت میں رکھنی چاہیئے، مگر خود تنہا فروخت نہ کرے بلکہ چند معتبر مسلمانوں کی رائے سے فروخت کرے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۶۱۳ کتاب الودیعۃ)

كتاب احياء الموات والمزارعة

من احيا ارضا
ميتة فهي له

کتاب احیاء الموات

(بنجر زمین کو آباد کرنے کے احکام و مسائل)

ایسی زمین آباد کرنا جس کے مالکان لاپتہ ہوں

سوال:۔ ایک قطعۂ زمین قیامِ پاکستان سے قبل کا بیکار پڑا ہے، اس کے مالکان اسی وقت سے افغانستان چلے گئے تھے، اس کے بعد سے آج تک اس زمین کے ساتھ اُن کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب اگر کوئی اس زمین کو آباد کرے تو کیا وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں اور عرصۂ دراز سے غیر آباد پڑی ہے اور قریب کے دیہات کے مصالح و منافع اس سے متعلق نہیں تو حکومت کی اجازت سے جو بھی آباد کرے گا مالک بن جائے گا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰی ارضًا میتۃ فھی لہٗ۔

(سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) [1]

اگر اذنِ امام نہ ہو تو احیاءِ موات میں ملکیت کے ثبوت کا حکم

سوال:۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احیاءِ موات میں اذنِ امام شرط ہے، سوال یہ ہے کہ جہاں امام نہ ہو وہاں احیاء موات سے ملکیت کیسے ثابت ہوگی؟

الجواب:۔ احیاءِ موات کے لیے امام صاحبؒ کے نزدیک حکومت کی اجازت ضروری ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک اذنِ امام شرط نہیں، اگرچہ اس مسئلہ میں راجح قول امام صاحبؒ کا ہے لیکن جہاں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے گا، بہ

---

[1] اخرجہ الامام ابوداؤدؒ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰی ارضًا میتۃ فھی لہ ولیس لعرقٍ ظالم حق۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات)

وَمثلہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۰ کتاب احیاء الموات۔

معاشرتی حالات کے زیادہ موافق ہوگا، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی اذنِ امام شرط نہیں، ظاہر حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

اخرجہ الامام ترمذیؒ: قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم من احییٰ ارضاً میتۃ فھی لہٗ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) ؎۱

احیاءِ موات میں راجح قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے

سوال:۔ ایک بنجر زمین کو چند افراد نے قابلِ کاشت بنایا ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ افراد اس زمین کے مالک نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے حکومت سے باضابطہ اجازت نہیں لی ہے، سوال یہ ہے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر احیاءِ موات سے ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے بادشاہِ وقت کی اجازت ضروری ہے یا نہیں، اس میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک بادشاہ کی اجازت ضروری ہے صاحبینؒ کے نزدیک ضروری نہیں لیکن امام صاحبؒ کا قول راجح ہے اور متونِ فقہ میں یہی قول مذکور ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وقول الامام ھو المختار ولذا قدمہ فی الخانیۃ والملتقٰی کعادتھما وبہ اخذ الطحاوی وعلیہ المتون۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) ؎۲

لیکن جہاں کہیں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

؎۱ قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: وقالا یملکہ من احیاہ ولا یشترط فیہ اذن الامام علیہ الصلوٰۃ والسلام من عمر ارضاً لیست لاحد فھو احق بھا۔

(تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

؎۲ لما فی الھندیۃ: ومن احیاہ باذن الامام ملکہ وھٰذا عند ابی حنیفۃؒ و قالا یملکہ من احیاہ ولا یشترط فیہ اذن الامام .... والملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفۃؒ وعند ابی یوسفؒ ومحمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔ الباب الاوّل۔

سوال :- آبادی سے دور ایک | جنگل کو آپس میں تقسیم کرنے سے لوگ اس کے مالک نہیں بن سکتے

درخت دار جنگل ہے، اگر لوگ اس کو آپس میں تقسیم کرلیں تو کیا وہ اس کے مالک بن سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :- ایسا درخت دار جنگل جو کسی کی ملکیت نہ ہو تمام لوگوں کے لیے مباح ہوتا ہے، اس کے ساتھ تمام لوگوں کے منافع متعلق ہوتے ہیں، ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کو قابلِ کاشت بنا لے تو وہ اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

لما فی الهندیة : وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطباً لاهلها ومرعیٰ لهم لا یکون مواتاً۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۸۲ کتاب احیاء الموات) [1]

ایسی زمین جس میں جنگل ہو موات میں داخل نہیں۔

سوال :- بعض لوگ کسی غیر آباد | بنجر زمین پر محض نشانات لگانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

زمین کو اپنی ملکیت میں لانے کے لیے اس کے اردگرد پتھروں کی دیوار بنا دیتے ہیں تو کیا ایسی زمین پر صرف نشانات لگانے یا دیوار بنا دینے سے کوئی اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بنجر اور غیر آباد زمین کی ملکیت اس وقت ثابت ہو گی جب اس کو قابلِ کاشت بنا لیا جائے، اس میں کھیتی باڑی کی جائے یا کسی قسم کی تعمیر کی جائے، کسی قسم کے نشانات لگانے یا پتھروں کی دیوار بنا کر حد بندی کرنے سے کوئی اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : ومن حجر ارضاً ای منع غیره منها بوضع

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله : ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر بل یترك لهم ومطرحاً لحصائدهم لتعلق حقهم به فلم یکن مواتاً وکذا لو کان محتطباً۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)

ومثله فی البدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی

علامته من حجر او غیرہ ثم اھملھا ثلٰث سنین دفعت الی غیرہٖ قبلھا ھو احق بھا وان لم یملکھا لانہ انما یملکھا بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر۔
(الدر المختار علی ھامش رد المختار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)[1]

غیر مملوکہ مشترکہ چراگاہ کی زمین آباد کرنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

سوال: ایک زمین دو گاؤں والوں کے مابین صدیوں سے مشترکہ چراگاہ کے طور پر چلی آ رہی ہے اور یہ غیر آباد زمین کسی کی ملکیت بھی نہیں ہے، اس کا کچھ حصہ بعض لوگوں نے کافی عرصے سے آباد کر کے اُسے قابلِ کاشت بنایا ہوا ہے، اب اس مشترکہ زمین کی کل تقسیم ہو رہی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا آباد شدہ زمین آباد کرنے والوں کی ملکیت ہوگی یا کل تقسیم میں اس کی تقسیم بھی ہوگی؟

الجواب: اگر اس زمین سے دونوں گاؤں کے لوگوں کی ضروریات مثلاً چراگاہ یا محطبہ (جنگل) وغیرہ وابستہ ہوں تو یہ موات کے حکم میں نہیں، اُسے آباد کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں اور نہ ہی محض آباد کرنے سے کسی کی ملکیت ثابت ہوگی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آباد شدہ زمین بھی کل تقسیم میں داخل ہوگی۔

لما فی الھندیۃ: وکذا ما کان خارج البلدۃ من مرافقھا محتطباً لاھلھا ومرعی لھم لا یکون مواتاً حتی لا یملک الامام اقطاعھا۔ انتھی
(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء موات)[2]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: لان التحجیر لیس باحیاء لیملکہ بہ لان الاحیاء انما ھو العمارۃ التحجیر للاعلام۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۲۹ کتاب احیاء موات)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

[2] قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر بل یترک مرعی لھم ومطرحاً لحصائدھم لتعلق حقھم بہ فلم یکن مواتاً وکذا لو کان محتطباً۔
(تنویر الابصار علی ھامش رد المختار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)
وَمِثْلُہٗ فی البدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی۔

بنجر زمین کو آپس میں تقسیم کر کے آباد کرنا

سوال :۔ اگر کسی علاقہ کی زمین بنجر پڑی ہو اور وہاں کے سرکردہ افراد اس کو وہاں کے تمام افراد میں تقسیم کر دیں، اس کے بعد کچھ صاحبِ استطاعت اسے آباد کر لیں اور کچھ لوگ آباد نہ کر سکیں تو کیا آباد کنندگان کے لیے ان زمینوں کے حاصلات جائز ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایسی تقسیم کے بعد جو آدمی بھی اپنے حصہ کی زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اس کے حاصلات اس کے لیے جائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین حقیقت میں غیر آباد ہے صرف برائے نام سب لوگ اس میں شریک ہیں کہ اس علاقہ کی زمین ہے۔

واخرج الامام ابوداؤدؒ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃً فھی لہٗ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات) [1]

احیاء موات کا حق ہر ایک کو حاصل ہے

سوال :۔ موجودہ معاشرہ میں بعض لوگ حجام، لوہار، ترکھان، جولاہا وغیرہ کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو گھٹیا تصور کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ کسی غیر آباد زمین کو آباد کر لیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا حق نہیں، کیا ایسا کرنا اور کہنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ احادیث اور کتب فقہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ جو کوئی بھی کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، کسی بھی فقیہ نے اس مسئلہ میں اس قسم کی تخصیص بیان نہیں کی۔ احیاء موات کے حکم میں تعمیم ہے۔ من احییٰ ارضاً میتۃً فھی لہٗ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) اس حدیث میں لفظ مَنْ عام ہے، اس عموم میں بلا دلیل تخصیص کرنا صحیح نہیں۔ فقہاء کرام نے بھی لفظ مَنْ استعمال کیا ہے: ومن احیاء باذن الامام ملکہ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵) بلکہ ذمی غیر مسلم بھی احیاء موات سے مالک بن سکتا ہے جبکہ حجام، جولاہا اور لوہار، ترکھان وغیرہ تو مسلمان ہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ ، ویملکہ الذمی بالاحیاء

---

[1] اخرجہ الامام ترمذی رحمہ اللہ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات ۔

لما یملکہ المسلم - (الھدایۃ ج ۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات) ؎۱

غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا بلا شرکتِ غیرے اس کا مالک ہوتا ہے

سوال:- ہم نے کچھ غیر آباد زمین کو سترہ سال قبل آباد کیا تھا، کیا شرعاً اس میں ہمارے ساتھ کوئی اور شریک ہو سکتا ہے؟

الجواب:- اگر یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں تھی اور نہ اہلِ قریہ کے منافع اس کے ساتھ وابستہ تھے تو آپ بلا شرکتِ غیرے اس زمین کے مالک ہیں بشرطیکہ حکومت کی اجازت سے آباد کی ہو، کیونکہ مردہ زمین کو آباد کرنے والا ہی اس کا مالک ہوتا ہے کسی کا بھی ایسی زمین کے ساتھ حق متعلق نہیں ہوتا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ - (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب ما ذکر فی احیاء ارض الموات) ؎۲

(ترجمہ) "جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا یعنی قابلِ کاشت بنایا وہ زمین اسی کی ہے"

مفادِ عامہ سے خارج رقبے کو آباد کرنے والا مالک متصور ہوتا ہے

سوال:- اگر کسی علاقے میں پہاڑی اور غیر آباد بنجر زمین کو وہاں کے رہنے والے لوگ آباد کر لیں تو کیا وہ آباد کرنے سے اس کے مالک بن جاتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ علاقہ کے بعض با اثر لوگ ان کی ملکیت کے ثابت ہونے کی مخالفت کرتے ہیں؟

الجواب:- جو پہاڑ کسی کی ملکیت نہ ہوں اور ان کا تعلق علاقے کے مفادِ عامہ سے بھی نہ ہو تو اس کو باقاعدہ حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا شریعت کی رو سے

؎۱ لما فی الھندیۃ: عند ابی یوسفؒ و محمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۰ کتاب احیاء الموات۔

؎۲ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ ولیس لعرق ظالم حقٌ۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی فتح الودود حاشیۃ ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات۔

اس کا مالک متصور ہوگا۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ: اذا احیا مسلم او ذمی ارضاً غیر منتفع بها ولیست لمملوکۃ لمسلم ولا ذمی وھی بعیدۃ من القریۃ ملکها و اعتبر محمدؒ عدم ارتفاق اھل القریۃ وبه یفتی۔

(الدر المختار علی ھامش ردالمحتار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) [۱]

غیر مسلم کیلئے احیاء موات کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ہندو اور سکھ بھی رہتے ہیں، انہوں نے حکومت کی اجازت سے گاؤں کی بنجر زمین کو آباد کیا اور اب اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں، تو کیا یہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ موات کی احیاء کرنے والے کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں، اگر کوئی غیر مسلم بھی حکومتِ وقت کی اجازت سے علاقے کی بنجر زمین کو آباد کرے تو وہ اس کی ملکیت متصور ہوگی۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بنجر زمین کو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والے ہندو اور سکھ اس کے مالک متصور ہوں گے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا احیی مسلم او ذمی ارضا غیر منتفع بها ولیست بمملوکۃ لمسلم ولا ذمی ..... ملکها ان اذن له الامام فی ذلک وقالا یملکها بلا اذنه وھذا لو مسلماً فلو ذمیا شرط الاذن اتفاقاً۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص۲۷۷ کتاب احیاء الموات) [۲]

---

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی له۔

(سنن الترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب ما ذکر فی احیاء ارض الموات)

ومثله فی البدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی۔

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویملکه الذمی بالاحیاء کما یملکه المسلم لان الاحیاء سبب الملک الا ان عند ابی حنیفۃؒ اذن الامام من شرطه فیستویان فیه کما فی سائر اسباب الملک حتی الاستیلاء علی اصلنا۔

(الهدایۃ ج۴ ص۴۷۷ کتاب احیاء الموات)

موات کی تعریف

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! موات کسے کہتے ہیں، اور کون کون سی زمینیں اس میں داخل ہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ زمین جو گاؤں یا شہر سے باہر ہو اور اس پر کسی کی ملکیت نہ ہو اور نہ اس کے ساتھ کسی کا کوئی حق وابستہ ہو اور نہ وہ شہر یا گاؤں کے متعلقہ امور سے وابستہ ہو اس کو موات کہا جاتا ہے، لہٰذا جن زمینوں میں یہ شرائط پائی جائیں وہ موات میں داخل ہیں۔

قال العلامة الکاسانیؒ: فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا واحد ولا حقاله خاصًا فلا یکون داخل البلد مواتٌ اصلاً۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب احیاء الموات) [1]

صرف قبضہ سبب ملک نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص گاؤں کی بنجر زمین (شاملات) پر قبضہ کرکے سرکاری کاغذات میں اپنے نام انتقال کرائے لیکن اُسے آباد نہ کرے بلکہ کئی سالوں سے اسی طرح بنجر رہنے دے تو کیا حاکمِ وقت یا اس کا نائب یعنی تحصیلدار وغیرہ وہی زمین کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے یا نہیں تاکہ وہ اس کو آباد کرے؟

الجواب:۔ موات کی ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ حاکمِ وقت یا اس کے نائب (تحصیلدار وغیرہ) کی اجازت سے بنجر زمین پر قبضہ کرکے اسے آباد کرے یعنی قابلِ کاشت بنائے صرف اس پر قبضہ کرنا سببِ ملک نہیں، اس لیے اگر حاکمِ وقت یا اس کا نائب وہ زمین کسی دوسرے شخص کو دینا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے تاہم

---

[1] وفی الهندیة: فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا واحد ولاحقًاله خاصا فلایکون داخل البلد موات اصلاً وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لاهلها و مرعیً لهم لا یکون مواتًا حتی لایملك الامام اقطاعها وکذلك ارض الملح والقار ونحوها مما لایستغنی عنها المسلمون ارض موات حتی لا یجوز للامام ان یقطعها لاحد۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۸۵ کتاب احیاء الموات)

حاکم کو تین سال تک انتظار کرنا ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ومن حجر الارض ای منع غیرہ منها بوضع علامة من حجر او غیرہ ثم اهملها ثلاث سنین دفعت الی غیرہ وقبلها هو احق بها وان لم یملکها لانہ انما یملکها بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر۔
(الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)[۱]

لیز موجبِ ملک نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب! بعض دفعہ حکومت کسی بنجر قطعہ زمین کو سنّو سال یا اس سے کم وبیش مدت کے لیے کسی شخص کو لیز یا پٹہ پر دے دیتی ہے اور اس شخص سے سالانہ یا جملہ مدتِ لیز کی رقم بصورتِ اجارہ وصول کرتی ہے، اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اس مدت کے گذر جانے کے بعد یہ زمین حکومت کو واپس کر دی جائے گی۔ تو کیا لیز (پٹہ) پر زمین لینے والا آدمی اس زمین کا مالک بن جائے گا نہیں؟

الجواب: اجارہ و لیز موجبِ ملک نہیں، یہ آدمی صرف اُتنی مدت تک ہی اس زمین سے انتفاع حاصل کرسکتا ہے جتنی مدت تک زمین لیز وغیرہ پر حاصل کی گئی ہو، مدتِ اجارہ ختم ہونے کے بعد زمین حکومت کو واپس کی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ لیز یا اجارہ پر زمین لینے والا شخص اسے فروخت نہیں کرسکتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: او ارضا بشرط ان یثنیها ان یحرثها او یکری انهارها العظام او یسرقنها لبقاء اثر هذہ الافعال لرب الارض فلو لم تبق لم تفسد۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قوله (بشرط ان یثنیها) فان کان اثرہ یبقی بعد انتهاء العقد یفسد لان فیه منفعة لرب الارض والا فلا۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۱ کتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة)

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: ومن حجر ارضا ولم یعمرها ثلاث سنین اخذها الامام ودفعها الی غیرہ لان الدفع الی الاول کان لیعمرها فتحصل المنفعة للمسلمین من حیث العُشر والخراج فاذا لم یحصل یدفعه الی غیرہ تحصیلا للمقصود لان التحجیر لیس باحیاء لیملکه به۔
(الهدایة ج ۴ ص۴۷۲ کتاب احیاء الموات)

سرکاری شاملات زمین پر کسی کے قبضہ سے اِحیاء کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں کے قریب پرانی زمین ہے جوکہ ارضِ موات یعنی شاملاتِ دیہہ ہے، اب ایک آدمی نے جوکہ دوسرے علاقہ سے آیا ہے اس شاملات زمین کا کچھ حصّہ اپنے نام پر انتقال کرالیا ہے، کیا اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاملات زمین کا اپنے نام انتقال کرالے، واضح ہو کہ یہ زمین گاؤں سے تقریباً ۲ کلومیٹر دور ہے، اس بارے میں شرعی حکم صادر فرماکر ممنون فرمائیں؟

الجواب:۔ ایسی سرکاری شاملات جس سے اہلِ دیہہ کے مرافق متعلق ہوں، اس کا اِحیاء درست نہیں ہے اور اسی وجہ سے ایسی زمین کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسے تمام اہلِ دیہہ کے منافع اور مرافق کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور اگر اہلِ دیہہ کا اس سے مشترکہ مفاد وابستہ نہ ہو تو اس کا اِحیاء درست ہے مگر اس کے لیے اِذنِ امام (یعنی حاکمِ وقت کی اجازت) شرط اور ضروری ہے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: اذا احیا مسلم او ذمی ارضاً غیر منتفع بہا ولیست بمملوکۃ لمسلم ولا ذمی فلو مملوکہ لم تکن مواتا فلو لم یعرف مالکہا فھی لقصۃ یتصرف فیہا الامام ــــ وھی بعیدۃ من القریۃ اذا صاح من باقصی العامر لا یسمع بہا صوتہ ملکہا عند ابی یوسف رح ان اذن لہ الامام فی ذلك وھو المختار ان اذن لہ الامام فی ذلك یملکہا بلا اذنہ الخ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۰۶، ۳۰۷ کتاب احیاء الموات) [1]

---

[1] وفی الھندیۃ ، قال القدوری فما کان عادیاً الیٰ قدم خرابہ لا مالك لہٗ اوکان مملوکاً فی الاسلام لا یعرف لہٗ مالك بعینہ وھو بعیدٌ عن القریۃ ــــــ وبعد اسطر قال وملك فی الموات یثبت باحیاءِ باذن الامام الخ
{الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۳۸۶
کتاب احیاء الموات}

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں صورت کہ ۱۹۴۷ء میں علاقۂ کشمیر پر مسلمانوں نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں کئی ہندو مارے گئے، کئی روپوشں ہو کر بھاگ گئے، بعدہٗ مسلمانوں نے ان کے مال و متاع پر قبضہ کر کے اپنے استعمال میں لائے اور ان کے مکانوں، مندروں اور گرجوں وغیرہ کی چادریں اکھیڑ کر اپنے ملک میں لائے اور یہاں مساجد کی تعمیر میں ان کو استعمال کیا۔ اب ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ ہندوؤں کے متروکہ مکانوں اور مندروں وغیرہ کی چادریں مساجد کی تعمیر میں استعمال کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور ایسی مساجد میں نماز باجماعت ادا کرنا ناجائز ہے، اوران چادروں کو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خرید بھی نہیں۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایسی چادریں اور اس طرح کا دیگر سازوسامان مساجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور ایسی مساجد عند الشریعت مسجد کا حکم رکھتی ہیں یا نہیں؟ نیز مسلمانوں کے لیے ایسی چادروں اور دوسرے سامان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب :۔ سب سے پہلے تو یہ بات تحقیق طلب اور قابلِ غور ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے کشمیر میں ہندوؤں پر جو حملے کیے ہیں اس کو شرعاً جہاد کہا جا سکتا ہے یا نہیں! ہمارے نزدیک تو کتبِ فقہ سے جہاد کے متعلق جو کچھ ثابت اور معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاد مقرر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ہو جائے اور اسلام معزز ہو اور کفر کے تمام قواعد اور رسم و رواج نیست و نابود ہوں۔ بناء علیہ فقہاء کرام نے وجوبِ جہاد کے لیے چند شرائط لکھے ہیں: اوّل یہ کہ مسلمان اتنی تعداد میں ہوں کہ جس سے شان و شوکت پیدا ہو۔ دوم یہ کہ ان کا خرچ بھی مہیا ہو۔ سوم یہ کہ ان کے لیے امن و حفاظت کی جگہ بھی ہو کہ کفار کے شر سے نجات حاصل ہو اور عند الحاجت کام آوے۔ اور اگر مسلمانوں کو یقین ہو کہ غلبہ کفار کو ہو گا تو اس صورت میں جہاد فرض نہیں ہے۔ "جامع الرموز" میں ہے: الجہاد فرض عین بشرط القدرة على القتال والسلاح وأنواد والراحلة ..... انتہی ـــــ اور فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: والثانی ان یرجوا الشوكة والقوة لاهل الاسلام وان كان لا يرجوا الشوكة للمسلمين في القتال فانه لا يحل له القتال لما فيه من القاء نفسه في التهلكة .....

اسی طرح درمختار، شامی اور فتح القدیر میں بھی مذکور ہے۔

اب اس تفصیل کی روشنی میں ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں پر مسلمانوں کے حملوں کو اگر جہاد کہا جاوے اور اس دوران جو کچھ املاکِ کفار یعنی ہندوؤں کے اموال میں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت ہے اور اس کا ذاتی استعمال میں لانا، خرید و فروخت کرنا، اور مساجد کی تعمیر میں لگانا درست ہے اور وہ مساجد بہرحال شرعی مسجد ہوں گی اور ان میں نمازیں پڑھنا درست ہے۔ (فقط واللہ اعلم)

گاؤں یا شہر کے قریب بنجر زمین آباد کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک قطعہ اراضی بنجر پڑا ہے جس میں گاؤں کے لوگ اپنے جانور وغیرہ چراتے ہیں اور اپنے مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ لاتے ہیں، اب ایک شخص تحصیلدار کی اجازت سے اس کو آباد کرنا چاہتا ہے جبکہ ایسا کرنے میں گاؤں کے لوگوں کی اکثریت کا نقصان ہے۔ تو کیا شرعاً یہ قطعہ زمین آباد کرنا جائز ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ کسی بنجر زمین کو آباد کرنا اور اس کو کارآمد بنانا تو ایک اچھا عمل ہے مگر اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ گاؤں یا شہر والوں کا نقصان نہ ہو، اسی طرح وہ زمین گاؤں یا شہر کے قریب نہ ہو کہ لوگ اس سے اجتماعی طور پر فائدہ اٹھاتے ہوں صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ بنجر زمین چونکہ گاؤں کے قریب ہے اور گاؤں والے اس کو بطور چراگاہ استعمال کرتے ہیں اس لیے اس زمین کو تحصیلدار کی اجازت کے باوجود آباد کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں گاؤں والوں کا اجتماعی نقصان ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني، لا يجوز احياء ما تقرب من العامر و يترك مرعىً لاهل القرية و مطرحاً لحصائدهم لتحقق حاجتهم اليها حقيقتها او دليلها على ما بيناه فلا يكون مواتاً لتعلق حقهم بها بمنزلة الطريق والنهر ـ الخ (الهداية ج ۴ ص ۴۷۸ كتاب احياء الموات)

تحدیدِ ملکیتِ زمین

انفرادی اور شخصی ملکیت

موجودہ دور میں معاشی اور اقتصادی بدحالی کی اصل وجہ اصولِ دین اور احکامِ اسلام سے بُعد ہے۔ جب تک ہم اسلام کے عمدہ، بہترین اور ابدی اصولوں پر عمل پیرا رہیں گے من حیث قوم و ملک ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے۔ اسلام کے انہی زرین اصولوں سے دوری ہی کا نتیجہ ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں متمول اور سفید پوش طبقہ کے درمیان معاشی تفاوت کی وجہ سے اقتصادی زبوں حالی پیدا ہو چکی ہے اور پورا ملک اس وقت بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ ملک کی اکثر سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں نے اپنے طور پر اس کا یہ حل نکالا کہ عارضی یا مستقل طور پر ملکیتِ زمین کی تحدید کر دی جائے اور اس کو قانونی شکل دینے کے لیے کوشش بھی کی گئی، جس پر علماء کرام نے حکومت کے اس موقف پر شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی۔ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ نے بھی "تحدیدِ ملکیتِ زمین کے دلائل کا ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک جامع مضمون لکھا جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے "انفرادی اور شخصی ملکیت" کے عنوان سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ ماہنامہ الحق نے ان ہر دو گرانقدر مضامین کو شائع کیا، جنہیں اب افادۂ عام کے لیے فتاویٰ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

تحدیدِ ملکیتِ زمین کے دلائل کا ایک جائزہ

اسلام میں اسکی کوئی گنجائش نہیں

ملک کے متمول اور فقراء کے درمیان معاشی تفاوت اور اقتصادی بدحالی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے مقرر کردہ اصول اور احکام سے بُعد ہوتا گیا۔ اموال کے حقوق ادا نہ ہوئے اور استحصال زر میں حلال و حرام کی تمیز نہ کی گئی، نتیجہ میں وہ شدید بحران رونما ہوا جس سے پورا ملک دوچار ہے۔ اس کا علاج زمینوں کی ملکیت کی حد تک اکثر سیاسی جماعتیں یہ تجویز کر رہی ہیں کہ زمین کی ملکیت کی ایک خاص حد مقرر کی جائے۔ یہاں تک کہ بعض مذہبی جماعتوں سے بھی اس سلسلہ میں بے احتیاطی ہوئی اور عارضی طور پر یا مستقلاً تحدید ملکیت زمین کو اپنے منشوروں میں جگہ دی حالانکہ معاشی بے اعتدالی اور بدحالی کے فساد کا علاج تحدیدِ ملک سے نہیں ہو سکتا۔ عملی اور واقعاتی تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے۔ کہ اس علاج سے مرض تو زائل ہو نہیں سکتا۔ مگر دین میں بلا دلیل ایک گونہ تحریف و ترمیم کا ارتکاب ہو جائے گا۔ اور مسئلہ بھی اپنی جگہ لاینحل رہے گا۔

اگر زمینداروں کے پاس سو سوا سو ایکڑ زمین چھوڑ کر زائد اس سے لے لی جائے اور حکومت اس زائد زمین کو ملک کے تمام بے زمین افراد پر موافق ضرورت تقسیم کرے تو ملک کی آبادی کے تناسب سے یہ محدود زمین ہرگز سب افراد تک نہیں پہنچ سکتی۔ بعض کو دی جائے اور بعض محروم رہیں۔ تو فساد اپنی جگہ قائم رہا۔ پھر اس تحدید شریعت کے کئی احکام مثلاً میراث وغیرہ منسوخ اور معطل ہو جائیں گے۔ پھر جبکہ لبسا اوقات اربابِ اقتدار ایسے عارضی اور مصلحتی قوانین کو دائمی حیثیت دے دیتے ہیں تو قانونِ وراثت مستقل طور پر معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ سب یہ تحدید سوشلزم

کیلئے سنگ بنیاد ہے، کیونکہ تحدید ہی کے دلائل سے سرے سے شخصی ملکیت میں نفی ہو سکتی ہے۔
(ج) جن نظائر اور شواہد کو کھینچ تان کر تحدید ملکیت کے لئے وجہ جواز بنایا جاتا ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے ٹھیک اسی طرح عزل، اسقاط حمل وغیرہ نظائر و شواہد کے بناء پر تحدید نسل (خاندانی منصوبہ بندی) کیلئے بھی وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ اگر وہ تحدید جائز نہیں تو یہ کیوں جائز ہے۔؟

نظائر اور شواہد کا جائزہ | بعض حضرات نے حاکم وقت کو اقتصادی بدحالی دور کرنے کے لئے تحدید ملکیت کے اصول بنانے کا اختیار دیا ہے اور اسی ضمن میں کچھ دلائل پیش کئے ہیں۔ ہم اس کا بھی مختصراً جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

(الف) اس میں شک نہیں کہ فقراء اور مساکین کو اگر ضروریات زندگی میسر نہ ہوں اور ہلاکت کا خطرہ ہو تو حکومت ذخیرہ اندوزی کرنے والوں سے جبری طور پر غلہ وغیرہ لیکر فقراء کی حاجت برآری کر سکتی ہے اور فقراء بھی براہ راست اضطراری حالت میں بغیر رضاء مالک غلہ وغیرہ لیکر اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں لازمی ہے کہ تنگی اور ضرورت ختم ہونے پر اس کے مالکوں کو معاوضہ دیا جائے۔ قال فی الدر المختار لو خاف الامام علی اھل بلد الھلاک اخذ الطعام من المحتکرین وفرق علیھم فاذا وجد واسعۃ ردوا مثلہ، ومن اضطر لمال غیرہ وخاف الھلاک تناولہ بلا رضاہ ونقلہ الزیلعی عن الاختیار واقرہ۔ (الدر المختار ج ص)

اور علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی المحلی ج ۵ ص ۴۵۲ میں لکھا ہے کہ اغنیاء پر فرض ہے کہ فقراء کی ضروریات کو پورا کریں اور حاکم وقت کے لئے جائز ہے کہ اغنیاء کو اس بات پر مجبور کرے علامہ کی اصل عبارت یہ ہے۔

وفرض علی الاغنیاء من اھل کل بلد ان یقوموا بفقرائھم ویجبرھم السلطان علی ذلک ان لم تقم الزکوٰۃ بھم ولا فی سائر اموال المسلمین بھم فیقام لھم بما یأکلون من القوت الذی لابد منہ ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذلک وبمسکن یکنھم من المطر والصیف والشمس وعیون المارۃ۔ انتھٰی۔

لیکن ابن حزم مالکان اموال کو معاوضہ دینے کا بھی قائل نہیں اور یہ اسکی تفردات میں سے ہے۔ الغرض ضرورت کے وقت اغنیاء کے اموال سے فقراء کی حاجت برآری فرض ہے مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ وقت زمین کے قانونی مالکوں سے زمین چھین کر

بے زمین لوگوں کو زمین بھی فراہم کرے گا۔

ب۔ رہا ابوعبیدہ بن الجراحؓ کا جہاد کے دوران تین سو ساتھیوں کو اپنا اپنا تمام توشہ اکھٹا کرنے کا حکم دینا (بخاری ص۶۲۵) اور اس سے اپنا مدعیٰ ثابت کرنا تو اس سے بھی تحدید ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس واقعہ میں نہ تو یہ توشے ابوعبیدہؓ کی ملکیت بنائے گئے تھے اور نہ اوقاف کی طرح غیر مملوکہ تھے۔ بلکہ ان میں ملکیت شخصی بہرحال باقی تھی اور اباحت کی شکل میں ایک دوسرے کے راشن سے فائدہ اٹھانے کا کہا گیا تھا۔ غزوۂ خیبر میں ستو کا اکھٹا کر کے یکساں تقسیم کرنے کی بھی یہی حقیقت ہے۔

ج۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت بلالؓ کو دی گئی وادیٔ عقیق کی زمین واپس لے لینے کو بھی تحدید ملکیت کیلئے پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ زمین غیرآباد (موات) تھی حضرت عمر نے صرف وہی حصہ اس سے واپس لیا جو انہوں نے آباد نہیں کیا اور جو آباد اور زیر کاشت لایا گیا تھا۔ اُسے واپس نہیں لیا (رواہ یحییٰ بن آدم عن عبداللہ بن ابی بکر کذافی التعلیق علی الاموال ص۲۹) اور یہ اب بھی جائز ہے کہ جب ایک شخص تین سال کے اندر اندر ارض موات کو آباد نہ کرے تو حکومت وقت اس کو واپس لے سکتی ہے، کیونکہ ارض موات میں آباد کرانے سے قبل صرف قبضہ سے ملکیت ثابت ہی نہیں ہوتی، ہدایہ میں ہے:

فبقی غیر مملوک کما کان هو الصحیح (ج ۴ ص۴۶۳)

ایسی زمین غیرآباد ہونے کی وجہ سے مملوک ہی نہیں ہوتی بلکہ غیر مملوک ہے۔

د۔ اس میں شک نہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجاہدین کی خوشی اور طیب خاطر سے قبیلۂ ہوازن کے وفد کو ان کے قیدی واپس دے دیئے تھے۔ (بخاری ص۶۱۸) مگر اس سے بھی تحدید ملک کا جواز معلوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اولاً تو یہ احتمال موجود ہے کہ یہ واپسی تقسیم سے قبل ہوئی ہو۔ جیسا کہ ابن کثیر کی رائے ہے کہ:

وظاهر سیاق حدیث عمرو بن شعیب الذی اوردہ محمد بن اسحٰق عن ابیه عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ردّ الی هوازن سبیهم قبل القسمة. (تاریخ ابن کثیر ج۵ ص۳۵۵)

حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے بنوہوازن کو ان کے قیدی تقسیم سے پہلے پہلے واپس کر دئے تھے۔

اس احتمال کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت شخصی ثابت ہی نہیں ہوئی تھی، جبکہ تحدید ملکیت میں تو شخصی ملکیت کا ازالہ ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ واپسی تقسیم کے بعد ہوئی، جیسا کہ بخاری کی روایت وقد کنت استأنیت بکم سے مفہوم ہوتا ہے تو اس سے بھی حاکمانہ اور جبری طور پر ملکیت چھین لینے یا اسے محدود کر دینے کا جواز نہیں نکالا جا سکتا، اس لئے کہ یہاں واپسی طیب خاطر یعنی پوری رضا و رغبت سے ہوئی تھی اور اس طیب خاطر کی پوری رعایت اور تحقیق کر کے ایسا کیا گیا۔ اور ایسی واپسی اب بھی بالاجماع جائز ہے۔

پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ اکثر مجاہدین نے قیدیوں کو مفت واپس کیا اور جن افراد مثلاً اقرع بن حابس اور عیینہ اور ان کی قوم نے مفت واپس کرنے سے انکار کیا (البدایۃ والنہایۃ ج۴ ص۳۵۳) اور انہیں معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تو وہ عوض بھی قیمت اور ثمن نہیں تھا۔ کیونکہ اس وعدہ میں نہ ثمن کی مقدار معلوم تھی اور نہ اجل متعین تھا اور شریعت میں ایسی خرید و فروخت جائز ہی نہیں جس میں نہ قیمت معلوم ہو، نہ ادائیگی کی میعاد، یہاں تک کہ اس معاملہ میں تو ثمن کی ادائیگی اور اس کا تحقق بھی غیر یقینی تھا، جس پر بخاری کے یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ کہ ومن احب منکم ان یکون علی حظہ حتی نعطیہ ایاہ من اول مایفیئ اللہ علینا فلیفعل۔ (جو تم ہی سے چاہے کہ اگر ہمیں اللہ نے مال غنیمت ہی سے کچھ دیدیا تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔) ان الفاظ سے بھی یہی واضح ہو رہا ہے۔ پس اس حدیث سے بھی تحدید ملک یا تبدیل ملک کا استدلال غیر صحیح ہے۔

۵۔ پانچویں دلیل تحدید ملکیت کے لئے فقہاء کرام کے قاعدہ تحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام کی پیش کی گئی ہے، یعنی کسی عام ضرر کے ازالہ کی خاطر ضرر خاصہ برداشت کیا جائے، لیکن اس قاعدہ سے بھی تحدید ملکیت کے جواز کا استنباط درست نہیں، کیونکہ اس ملک میں ہر بے زمین شخص کو تو تکلیف اور مصیبت لاحق نہیں ہوتی، لاکھوں لوگ جو زمین کے مالک نہیں ہیں، مگر نہ ننگے ہیں نہ بھوکے بلکہ دیگر معاشی ذرائع کی وجہ سے آسودہ حال ہیں۔ ثانیاً کہ ضرر عام اگر موجود ہے تو دونوں طرف کو اور دونوں صورتوں میں ہے۔ البتہ طالبین تحدید عموماً وہ لوگ ہیں جو سوشلسٹ اقوام اور نظریات سے متاثر ہیں۔ اور عموماً ان کے دلوں میں حلال و حرام کی تمیز اور آخرت کا احساس نہیں، مذہب ان کے نزدیک ثانوی حیثیت کا حامل ہے، پیٹ

بقیہ : تحدید ملکیت زمین کے مسائل سے مذہب کو خاطر خواہ تعلق نہیں ثالثاً یہ کہ اس شر و فساد کے زمانہ میں جبکہ حکام و امراء عموماً بے دین خائن اور بددیانت ہوتے ہیں۔ مفاد پرستی، رشوت ستانی، سفارش اور اقرباء پروری ان کا شیوہ ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کو اراضی کی تحدید اور تصرف کی باگ ڈور سپرد کر دینا درحقیقت قوم اور ملک کی تباہی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیت المال اور اوقاف کے حکام پر خیانت کے اثرات ظاہر ہونے لگیں تو انہیں مسلمانوں کے اموال مصادرۃً لینے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کرنا حکام کو حرام خوری اور خیانت کا دروازہ کھول دینا ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار ج ۴ ص ۲۸۵)

الغرض تحدید ملکیت کے جواز میں جبکہ دینی و علمی لحاظ سے بیشمار فتنوں اور اقتصادی و مالی لحاظ سے بیشمار حق تلفیوں اور بد دیانتیوں کا خطرہ ہے تو کیوں بے احتیاطی سے کام لیکر فتنوں کا دروازہ کھولا جائے۔ لہٰذا تحدید ملکیت کے جواز یا حکومت کو اس کا حق دینے کا فتویٰ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور میرا اس سے قطعاً اتفاق نہیں ۔۔۔۔

محمد فرید خادم دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ

❋

انفرادی اور شخصی ملکیت

جذبۂ نصح و خیر خواہی کی بناء پر "جماعت اسلامی" سے ایک گذارش کرنی ہے جو کسی قومی و ملی موثر پر حکمتِ عملی کا سہارا اسے لیتی ہے۔ حالانکہ ان کے قائد مودودی صاحب کے الفاظ میں "کسی مقصد کی برتری کے لئے صرف مقصد کا اعلیٰ ہونا کافی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کے ذرائع اور خطوط بھی بے لاگ اور پاکیزہ ہونے چاہئیں" مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ مقصد برآری کی خاطر جماعت نہ صرف یہ کہ طریقِ کار کی صحت کا خیال نہیں رکھتی بلکہ دین کے ایک ایک اصول کو سیاست کے خراد پر چڑھا دیتی ہے۔ اس وقت جماعت اسلامی کا انتخابی منشور سامنے آچکا ہے۔ اس میں زراعت کے عنوان میں زمین کی ملکیت مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان اور مشرقی پاکستان میں ۱۰۰ بیگھہ تک محدود کردی گئی ہے اور تمہید میں کہا گیا ہے کہ

"غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں" قطع نظر اس بات کے کہ شریعت کا مذکورہ قاعدہ کن حالات اور کن غیر معمولی تدابیر پر منطبق ہوتا ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے نہ تو زمین کے بارہ میں کسی قسم کی تحدید کی ہے اور نہ دیگر اموال و املاک میں انفرادی اور شخصی ملکیت کی کسی قسم کی حد بندی گوارا کی ہے۔ جائز اور حلال ذرائع سے جتنی بھی ملکیت حاصل کی جائے شریعت نہ صرف اسے جائز بلکہ اللہ تعالےٰ کی ایک نعمت قرار دیتی ہے۔ قرآن و حدیث ایسے نصوص و شواہد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نہ تو حالات کی نزاکت اور وقت کی رو میں بہہ کر ان کی تاویل کرسکتے ہیں اور نہ سوشلزم کا ہوا کھڑا کرکے اس کے ڈر سے اسلام کے کسی مسئلہ میں تحریف اور تحدید کرسکتے ہیں۔ اسلام غیر محدود ملکیت سے نہیں روکتا، البتہ وہ مالک کو اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کا پابند بنا کر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت

ملکیت کی تحدید کرتا جاتا ہے، یہ زکوٰۃ و عشر، یہ صدقات اور ہبات اور سب سے بڑھ کر اسلام کا قانونِ میراث تحدیدِ ملکیت نہیں تو اور کیا ہے مگر لامحدود کو محدود بنانے کا یہ منصوبہ قدرت کا بنایا ہوا ہے۔ ہم اس میں اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی، ہم مجرموں اور معاشرہ کی حق تلفی کرنے والوں کا ہاتھ توڑ سکتے ہیں، مگر انہیں کسی حلال کمائی کے ایک پیسہ سے نہیں روک سکتے۔

حکمتِ عملی کی پالیسی ہمیں حالات کا مقابلہ اور خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے۔ مگر یہ اصلاح ایسی نہیں کہ دین کے کسی اصول پر قینچی چلا کر فساد کا ایک اور دروازہ کھول بیٹھیں۔ دین کا مسئلہ بہرحال اپنی جگہ رہے گا۔ جماعت اسلامی اسے ہماری ناعاقبت اندیشی سمجھے یا کچھ اور ہم تو اس "حکمتِ عملی" کو بہرحال دین کے لئے زہرِ قاتل سمجھیں گے۔ اگر جماعت اسلامی غیر معمولی حالات کی وجہ سے ۲۰۰ ایکڑ تک زمین کی تحدید کو غیر معمولی تدبیر اور دین کے اصول سے غیر متصادم سمجھتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کل سوشلسٹ اور کمیونسٹ اسی دلیل سے ملکیتِ زمین کا حق قطعی طور پر چھین کر اسے "غیر معمولی تدبیر" اور دین کے اصول سے "غیر متصادم" قرار نہ دے بیٹھیں، اگر جماعت کی طرف سے دین کے اصول کی کوئی واضح تشریح بھی ہو جائے تو معاملہ صاف ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی چاہا اس نے کسی چیز کو اصول اور پھر جب چاہا تو "اسلام کے اصولوں سے غیر متصادم"، کا فتویٰ لگا کر اسی اصول کو حکمتِ عملی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ آہ! اصولِ اسلام کی اس بے دردی سے پامالی۔ جنگِ آزادی میں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کو لات اور منات کہا گیا، مگر بعد میں یہی چیز اصل الاصول بن گئی۔ عورت کی امارت اور حکومت کو ہر حال میں اسلام سے متصادم کہا گیا، پھر یہی چیز وقت کا اہم ترین جہاد قرار پایا، انتخابی جدوجہد کو خلافِ شریعت کہا گیا، پھر یہی مشغلۂ روزگار بن گیا، مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کی تقدیس ہر حال میں قائم رکھنے پر زور دیا گیا، مگر پھر اس راہ کی ہر گری پڑی چیز کو گلے سے لگا کر رفیق جادۂ منزل بنایا گیا، اور اب مسئلہ ملکیت زمین میں گو دا سے

عارضی کہا گیا) ایک ایسا مؤقف اختیار کیا گیا جس کی مخالفت خود عمر بھر کا شیوہ بنا رہا تھا کا للتی نقضت غـزلہا من بعد قوۃ انکاثا معلوم نہیں جماعت کے عمائدین اس نئے اجتہاد اور حکمتِ عملی کی کیا توجیہہ کریں، تاویل جو بھی مگر یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ فلاں فلاں جماعتوں نے بھی ایسا کیا اور فلاں بزرگ نے بھی ایسا کہا ہے۔ اگر ایک چیز کا برائی ہونا ثابت ہوجائے تو اس کے وزن میں اس بات سے کمی نہیں آسکتی کہ اور لوگ بھی ایسا کرتے ہیں، ایسی بات تو جرائم کی تاریخ میں بھی کسی نے نہیں کہی کہ میں اگرچہ مجرم ہوں مگر یہ تو ایک ایسا جرم ہے کہ ع درشہرِ شمار وزکنند ـــ اور نہ کسی عدالت نے مجرم کے اس مؤقف کو قابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ تعدیل صحابہؓ، اور دیگر علمی و فقہی مسائل اور اب لاہوری مرزائیوں[۱] کے بارہ میں جماعت کا یہی عذرِ گناہ سامنے آچکا ہے۔ مگر غلط بات غلط ہے خواہ اس کا کہنے والا کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اب رہا ملکیتِ شخصی کو سلب کرنا یا اسے محدود کرنا۔

شخصی ملکیت کے شواہد | تو جہاں تک اصل مسئلہ انفرادی اور شخصی ملکیت کا تعلق ہے، خواہ املاک منقولہ ہوں یا غیر منقولہ ہوں اسلام نے اسے انسان کا فطری حق بنایا ہے نہ تو اس کی تحدید کی جاسکتی ہے اور نہ عصرِ حاضر کے لادینی اقتصادی نظاموں کے علمبردار اس میں قطع برید کرسکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے آیت اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون میں انسان کی شخصی ملکیت پر مہر ثبت کر دی ہے اور قرآن کی بے شمار آئتیں اس جملہ فھم لھا مالکون (پس وہ اس کے مالک ہیں) کی تائید کرتی ہیں۔ جو لوگ ان الارض للہ (زمین اللہ کی ہے) قسم کی آیات کو آگے پیچھے سے کاٹ

---

[۱] مولانا مودودی نے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ لاہوری پارٹی کے مرزائی نہ مسلمان ہیں نہ کافر (س)

کر اپنے مدعی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہاں متصلاً اللہ نے خود یورثہا من یشاء (وہ جسے چاہے زمین کا وارث بنا دے) یا اس کے ہم معنی الفاظ میں انفرادی ملکیت بیان کر کے ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ قل اللّٰھمّ مالک الملک کے ساتھ توتی الملک من تشاء بھی ہے اور والذین یکنزون الذھب والفضۃ کے ساتھ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ کی قید انسان کی انفرادی مالکیت کا اعلان کر رہی ہے، پھر وہ اسے اپنی ملکیت میں ہر جائز تصرف کرنے اور اسے اپنی ملکیت سے منتقل کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔ چنانچہ بیع، شرا، ہبہ، تملیک، اعتاق، تدبیر، کتابت، اجارہ، اعارہ، مزارعت، وقف، رہن، قرض، صدقہ، وصیت، میراث وغیرہ اس تصرف کے شواہد عدل ہیں۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے مسلمان کے مال و دولت میں ناجائز دست اندازی سے بچنے کو ایمان کی اولین علامت قرار دیتا ہے۔ ظلم و تعدی، چوری، ڈاکہ، خیانت، غصب، لوٹ کھسوٹ، جبر و استحصال کو حرام قرار دے کر اسلام انسان کے شخصی ملکیت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔ وہ یکساں طور پر سرمایہ دار اور غریب دونوں کو ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ) سے مخاطب کرتا ہے۔ الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ (الحدیث) (خبردار کسی ایک کا مال دوسرے کو بغیر اس کی مرضی کے حلال نہیں) ارشاد نبوی ہے"

سوشلزم کی بنیاد ظلم و استحصال اور مادیت | پس جو لوگ سوشلزم کو تمام معاشی خرابیوں کا مداوا سمجھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اللہ بھیجے ہوئے عادلانہ نظام اسلام کے تمام اصول و فروع کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ اور انسان کے تمام حقوق کی پائمالی و بربادی کا ایک ایسا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف غریب اپنے رہے سہے سکھ اور چین سے محروم ہو جائے بلکہ پوری قوم چند خونخوار درندوں کی جماعت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے، اسلام کے مذکورہ تمام اصول کو ایک طرف رکھ کر ایک لمحہ کے لئے فرض کر لیں کہ سوشلزم آجاتا ہے اور وہ پوری قوم کو حق ملکیت سے محروم کر کے اللہ کی دی ہوئی تمام دولت

اور وسائلِ معاشں کو ایک پارٹی کے حوالے کر دیتا ہے، تو کیا وہ پارٹی انسانیت کو اسکے تمام حقوق دلادے گی۔ اور کیا وہ پارٹی موجودہ معاشرہ ہی سے ابھر کر سامنے آئی ہوگی یا آسمان سے فرشتوں کی شکل میں اترے گی۔ لیکن اگر اس کی اٹھان اس معاشرہ سے ہو جس کا مشت نمونہ خبروار ۳۰۳ بدعنوان افسروں کی شکل میں سامنے آچکا ہے اور اس کا حل وعقد اس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں ہو جو فائل کی سطح پر بڑے بڑے پراجیکٹ کھڑے کر کے پھر اسے نذرِ سیلاب بھی کر دیتی ہے، اور اس طرح کروڑوں روپے ہضم کر کے فائل داخل دفتر کر دیتی ہے — تو خدارا ذرا سوچیے کہ ایسے لوگوں کا لایا ہوا سوشلزم یا کوئی بھی معاشی نظام انسان کے مال و جان اور اس کے حقوق میں مساوات قائم رکھ سکے گا —؟ ہرگز نہیں۔ سوشلزم کی بنیاد تاریخ کی مادی تعبیر پر ہے جس میں نہ خوفِ خدا کی گنجائش ہے، نہ محاسبۂ آخرت کی، اور نہ کسی تو تنقید اور نصیحت کی۔

مساوات یعنی مواسات استحصال نہیں احتساب | اس کے مقابلہ میں اسلام ہے جو ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو ہر لمحہ اور ہر عمل میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، آخرت کا محاسبہ اس کے دل میں رچا بسا ہوتا ہے، ہر فرد کو دوسرے پر ظلم و غصب اور ہر برائی سے روکنے کا پورا حق ہے، اور وہ امیر کو بھی چاہے تو تلوار سے درست کر سکتا ہے، وہ اگر اسلامی قلمرو کے دوسرے سرے پر کسی کتے کے بھوک و پیاس سے مر جانے کی خبر سنتا ہے تو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے تڑپنے لگتا ہے وہ ہر انسان کی بھوک و پیاس کو اپنی حاجت سمجھتا ہے اور جذبۂ ایثار سے خود فقیر رہ کر دوسروں کو اپنی متاع کا مالک بنا دیتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کی بنیاد مساوات پر نہیں بلکہ مؤاسات پر رکھی، وہ معاشی ناہمواری کو جبر سے نہیں بلکہ ایمان اور یقین کی بیداری سے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے ایسا معاشرہ قائم کیا خلافتِ راشدہ اس کی واضح مثال ہے۔

سوشلزم اور گھر گھر کا بھیدی | دوسری طرف سوشلسٹوں کے طور طریقے تھے، اور جبر و ظلم کی

اساس پر ایک ایسی عمارت اٹھائی گئی جو نصف صدی میں دم توڑتی نظر آنے لگی ہے۔" "تاریخ کی اس مادی تعبیر" پر تازہ چانٹا حال ہی میں روس کے سیکرٹری جنرل برزنیف نے یہ کہہ کر رسید کیا کہ روس میں سوشلسٹ نظام عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ اور اس طرح فشھد شاھدٌ من اھلھا کا ایک نمونہ سامنے آگیا ــــ الغرض ہمارے پاس معاشی اور معاشرتی یگانگت کے لئے اسلام جیسا نسخۂ کیمیا موجود ہے، مگر افسوس اور صد افسوس کہ نہ تو ہم نے اسے سمجھا نہ پرکھا اور نہ کبھی آزمایا ومن لم یذق لم یدر۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سوشلزم عیار لیڈروں کا دام فریب | ہماری اس بے علمی اور حقیقت سے بیخبری سے موجودہ دور کے ابن الوقت سیاست دانوں نے خوب فائدہ اٹھایا بیچارے عوام اسے اپنی ساری بربادیوں کا تریاق سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگے اور اس حقیقت سے غافل ہو گئے کہ چور راہی کمین گاہ تک پہنچا کر رہی سہی پونجی سے بھی ہمیں محروم کر دے گا۔ بات ناشائستہ سی ہے مگر مثال خوب چسپاں رہے گی کہ ہمارے علاقہ میں بچے کا ختنہ کراتے وقت عموماً بچے کو اِدھر اُدھر کی بھول بھلیوں میں بہلایا جاتا ہے اور ختنہ کا عین موقعہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں وہ دیکھو سونے کی چڑیا اڑ رہی ہے اور ابھی تیرے قدموں میں ہے۔ بچہ شوق سے نگاہ اٹھاتا ہے اور ادھر اپنے جسم کے ایک حصہ سے محروم۔ تو ہمارے ہاں سوشلزم کی مثال اُسی "سونے کی چڑیا" کی سی ہے جس سے عیار لیڈر خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں ــــ (فروری ۱۹۷۸ء)

❋

کتاب المزارعت

(مزارعت کے احکام و مسائل)

مزارعت کی چند صورتیں

سوال:۔ ہمارے معاشرہ میں علاقائی سطح پر مزارعت کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں مالکِ زمین کو تخم کھینتی باڑی یا دوسرے اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے مالکِ زمین پر یہ ذمہ داری عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت کا معاملہ ظاہر الروایۃ کی رُو سے تین صورتوں میں جائز ہے:۔

(۱) زمین اور تخم ایک طرف سے ہو اور بیل و عمل (محنت) دوسری طرف سے۔

(۲) زمین ایک طرف سے اور عمل و گائے و تخم دوسری طرف سے۔

(۳) زمین، بیل اور تخم ایک طرف سے اور عمل (محنت) دوسری طرف سے۔

ان جملہ تین صورتوں میں مزارعت کا معاملہ شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامۃ ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: اذا کانت الارض والبذر لواحدٍ والعمل والبقر لواحدٍ جازت المزارعۃ وان کانت الارض لواحدٍ والعمل والبقر والبذر لآخر جازت المزارعۃ وان کانت الارض والبذر والبقر لواحدٍ والعمل لآخر جازت۔ (مختصر القدوری ص۲۰۸ کتاب المزارعۃ)[1]

فصل کی کٹائی کی ذمہ داری کا حکم

سوال: بعض علاقوں میں مالکِ زمین کسان (مزارع) پر دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ فصل کے تیار ہونے پر کاٹ کر صفائی کر کے مالک کے گھر پہنچائے گا، کیا

---

[1] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: (وکذا) صحت (و لوکان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر) و (الارض لہٗ والباقی للآخر) او (العمل لہٗ والباقی للآخر) فهذہ الثلاثۃ جائزۃٌ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۷۸ کتاب المزارعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۲۴ کتاب المزارعۃ۔

کسان (مزارعہ) کیلئے ان شرائط کی پابندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ظاہر الروایۃ میں گنجائش نہ ہونے کے باوجود متاخرین علماء نے عرف کو مدنظر رکھتے ہوئے قاضی ابو یوسفؒ کی رائے کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ کسان (مزارعہ) پر فصل کاٹنے اور تیار کرنے کی ذمہ داری ڈالنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم فصل کو مالکِ زمین کے گھر پہنچانے کی ذمہ داری کی نشاندہی عام کتابوں میں نہیں ملتی البتہ اگر کسان بطورِ احسان یہ فریضہ سرانجام دے تو ایسا عمل طرفین کے باہمی تعلقات پر اچھے اثرات مرتب ہونے کا باعث بنتا ہے۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفیؒ: (وصح اشتراط العمل) کحصاد و دیاس ونصف علی العامل وعند الثانی علی العامل وھوالاصح ، وعلیہ الفتوٰی۔

(الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج ۶ ص۲۸۲ کتاب المزارعت) [1]

کسان (مزارعہ) کا مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر فصل سے کچھ لینا

سوال:۔ مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر کسان فصل سے کوئی چیز لے سکتا ہے یا نہیں ؟ ایسا ہی بعض چیزیں بوقتِ ضرورت گھر لے جاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مزارعت سے مراد اگر بٹائی کا نظام (مزارعت بالنصف وغیرہ) ہو تو مالکِ زمین کاشتکار کے ساتھ شریک ہے اور شراکت میں بغیر اجازتِ شریک کے کوئی چیز بھی اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، تاہم کسی معمولی چیز (جس کی عرف میں اجازت ہو) استعمال کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ، اور اگر مزارعت سے مراد اجارہ ہو تو تمام آمدنی کسان کی ہوتی ہے اس لیے مالکِ زمین سے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔

---

[1] لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ ، (اقول) تلخص من ھذا أن الصحیح صحۃ اشتراط العمل علی العامل وبہ صرح فی متن التنویر والملتقی۔

(تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۲۰۵ کتاب المزارعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج ۵ ص۲۸۳ کتاب المزارعۃ۔

لما رواہ الامام علی بن عمر الدارقطنیؒ : عن عمرو بن یثربی قال شھدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع بمنٰی فسمعتہٗ یقول لا یحل لامرء من مال اخیہ شئ الا ما طابت بہ نفسہ ۔ انتہی

(سنن الدار قطنی ج ۳ ص ۲۵ رقم ۸۹ کتاب البیوع) ؎۱

کاشتکار سے بطور ضمانت کچھ رقم رکھنا

سوال:۔ اگر مالک زمین کاشتکار سے کچھ رقم بطور زرِ ضمانت اپنے پاس رکھے تاکہ کاشتکار معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرسکے اور مالکِ زمین بے جا نقصان سے بچ سکے، شرعاً زمین کے مالک کے اس اقدام کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب:۔ مالکِ زمین کے لیے بطور اعتماد کوئی چیز رکھنے کے جواز کے نظائر موجود ہیں تاہم شرعی رُو سے یہ زمین رہن شمار ہوگی جس سے مرتہن (مالک) مرہونہ سے استفادہ کا حق نہیں رکھتا، عموماً کچھ رقم بطور ضمانت رکھ کر مالکِ زمین اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے جس کا اسے شرعاً حق نہیں ۔

لما قال العلامۃ قاضی خانؒ : لو استاجر خیاطاً لیخیط لہ ثوباً واخذ من الخیاط رھناً بالخیاط جاز۔ انتہی (الفتاوٰی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۵۹۸ کتاب المزارعۃ) ؎۲

مزارعت پر موت کے اثرات

سوال:۔ مزارعہ کی وفات پر اگر اولاد عقدِ مزارعت کو باقی رکھنا چاہتی ہو لیکن مالک زمین اس پر راضی نہ ہو تو کیا اس صورت میں مزارعہ کے ورثاء کو منوانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

؎۱ لما ذکر الشیخ ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد الخطیبؒ : وعن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۵۵ باب الغصب والعاریۃ، الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی نصب الرایۃ ج ۴ ص ۱۶۹ کتاب الغصب ۔

؎۲ وفی الھندیۃ : لو استاجر خیاطاً لیخیط لہٗ ثوباً واخذ من الخیاط رھناً بالخیاط جاز۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص ۴۳۵ الفصل الثالث فیما یجوز الارتھان الخ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لشیخ سلیم رستم باز ص ۳۸۷ تحت مادۃ ۷۰۱

الجواب: عاقدین میں سے کسی ایک کی وفات سے مزارعت کا معاہدہ ختم ہوجاتا ہے، تاہم جو فصل زمین میں موجود ہو تو اس کے پکنے تک انتظار کرنا ہوگا، البتہ اگر مزارعہ کے ورثاء فصل کو چھوڑنا چاہتے ہوں یا چھوڑنا چاہتے ہوں تو ان کو اس کے خلاف پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: بخلاف ما لو مات رب الارض والزرع بقلٌ فان العمل فیه جمیعاً علی العامل أو ورثته لبقاء مدة العقد والعقد یوجب علی العامل عملاً یحتاج الیه الی انتهاء الزرع کما مر ولو مات قبل البذر بطلت ولاشئ لکرب به کما مر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۲۸۱، ص۲۸۲ کتاب المزارعت) [1]

قدیم قبرستان میں زراعت کا حکم

سوال: ایک قدیم قبرستان جس پر سو سال سے زائد مدت گذر گئی ہے اور اس میں قبریں بھی دکھائی نہیں دیتیں ہیں، تو کیا ایسے قبرستان سے دوسرے فوائد مثلاً زراعت وغیرہ لیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: کسی قبرستان کی قدامت کے لیے مدت کا کوئی تعیین نہیں ہے، تاہم فقہاء کرام کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہوں کہ مُردوں کے ابدان بظاہر اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں ایسے قبرستان کا دوسرے

---

[1] لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفیؒ: (وتبطل بموت احدهما) لانها اجارةٌ وهی تبطل بموت أحد المتعاقدین اذا عقدها لا نفسهما وقد بیناه فی الاجارة وهذا علی اطلاقه هو جواب القیاس وفی الاستحسان اذا مات أحدهما وقد نبت الزرع یبقی عقد الاجارة حتی یستحصد ذلك الزرع ثم تبطل فی الباقی لان فی ابقاء العقد حتی یستحصدها مراعاة الحقین فیعمل العامل أو ورثته علی حاله فاذا حصد یقسم علی ما شرطا ولا ضرورة فی الباقی فتبطل ولو مات رب الارض قبل المزارعة بعد ماکرب الارض وحفر الانهار انتقضت المزارعة لانه لیس فی ذلك اتلاف مال علی المزارع ولا شئ للعمل بمقابلة العمل۔ انتهی (تبیین الحقائق ج ۵ ص۲۸۲ کتاب المزارعة)۔
ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۶۲ کتاب المزارعة۔

مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز ہے، اگر دوبارہ اس میں مُردے دفن کئے جائیں تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبرستان ذاتی ہو تو اپنے حصے میں آبادی کرنا یا زراعت کے لیے استعمال کرنا بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۶ کتاب المزارعة)[۱]

افیون کی کاشت کا حکم

سوال: افیون کی کاشت کا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم ہے؟

الجواب: افیون ایک ایسی چیز ہے جس سے عصرِ حاضر میں خطرناک اور مہلک ترین منشیات (یعنی ہیروئن وغیرہ) تیار کی جاتی ہیں جس سے پوری دنیا تباہی اور بربادی کی لپیٹ میں ہے اور اس کے مضر محض ہونے پر پوری دنیا متفق ہے، اس لیے اس کی کاشت اور خرید و فروخت کے جواز کے کوئی خاص دلائل نہیں پائے جاتے بلکہ عام اقوال اس کی حرمت کے مؤید ہیں۔ تاہم اگر افیون کا استعمال دوائی تک محدود ہو یا تخمِ افیون (خشخاش) حاصل کرنا مقصود ہو تو پھر ان ضروریات کے مطابق محدود پیمانے پر اس کی کاشت کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن معاشرہ میں یہ نیت بہت کم پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ویحرم أکل الحشیشة والافیون لکن دون حرمة الخمر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربة)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیره وزرعه والبناء علیه۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۹۵ کتاب المزارعة)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۱۶۷ کتاب المزارعة۔

[۲] لما قال العلامة شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ: ولا یجوز اکل الحشیشة والافیون وذلک کله حرام۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۷ کتاب الاشربة)۔
ومثله فی الفتاوی الکاملیة ص۲۷ کتاب الاشربة۔

تمباکو کی کاشت جائز ہے

سوال:۔ سگریٹ یا نسوار کے لیے جو تمباکو استعمال ہوتا ہے شرعی نقطہ نظر سے اس کی کاشت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بعض فوائد کے باوجود جدید تحقیق کی رو سے اگرچہ تمباکو نوشی کے مضرات پائے جاتے ہیں لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنا تا حال ثابت نہیں جس کی وجہ سے اس کو مضر محض شمار کر کے محرمات کی فہرست میں شمار کیا جائے، اس لیے فقہاء کے اقوال سے اباحت کا حکم معلوم ہوتا ہے، دریں حال تمباکو کی کاشت اور خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (شرب الدخان) فانہ لم یثبت اسکارہ ولا تغیرہ ولا اضرارہ بل ثبت لہ منافع فھو داخل تحت قاعدة الأصل فی الاشیاء الاباحة۔

(رد المحتار ج۶ ص۴۵۹ کتاب الاشربة) [1]

بھنگ کی کاشت کا حکم

سوال:۔ بھنگ ایک نشہ آور بوٹی ہے جس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، کیا اس کی کاشت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھنگ چونکہ نشہ آور اشیاء کی فہرست میں شامل ہے اس لیے اس کی خرید و فروخت اور مزارعت شرعاً ناجائز ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ویحرم أکل البنج والحشیشة والافیون لکن دون حرمة الخمر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربة) [2]

---

[1] قال العلامة المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: وقد حقق المتأخرون من اھل مذھبنا الحنفیة انہ (شرب الدخان) لیس بحرام وانما فی تعاطیہ الکراھة و قد منا ان احسن ما قیل فیہ قول الامیر رحمہ اللہ وا ختلف فی الدخان والورع ترکہ۔ (الفتاوی الکاملیة ص۲۸۶ کتاب الکراھیة۔ مطلب فی حکم شرب الدخان)

[2] قال العلامة شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز أکل البنج والحشیشة والافیون وذلک کلہ حرام۔

(الجوھرة النیرة ج۲ ص۲۷ کتاب الاشربة)

ومثلہ فی الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیة ج۳ ص۲۳۱ کتاب الاشربة۔

مزارع کی طرف سے تخم کے باوجود مالکِ زمین کا اس پر کھاد وغیرہ کے اشتراط سے مزارعت کا حکم

سوال:۔ اگر مالکِ زمین (رب الارض) کاشتکار (مزارع) پر کھاد وغیرہ امور کی اشتراط کرے جبکہ تخم (بیج) بھی کاشتکار کی طرف سے ہو تو کیا ان امور کے اشتراط کی وجہ سے مزارعت فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت میں جب تخم (بیج) مزارع کی طرف سے ہو تو کھاد جیسے امور کی اشتراط علی المزارع کی وجہ سے مزارعت فاسد نہیں ہوتی بلکہ متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور فتویٰ بھی متأخرین فقہاء کے قول پر ہے۔

وفی الهندية: اذا شرط رب الارض والبذر من المزارع ان يسرقنها قيل تفسد المزارعة عند المتقدمين ولا تفسد عند المتاخرين والفتوىٰ على قول المتاخرين۔ كذا فی جواهر الاخلاطی۔

{الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۴۴ كتاب المزارعة
الباب الثالث فی الشروط فی المزارعة}

ھدایہ کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! ھدایہ کی اس عبارت "لاتجوز المزارعة والمساقات عند ابی حنيفة" کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مزارعت کی جملہ انواع نا جائز ہیں؟ جبکہ احادیثِ مبارکہ مزارعت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

الجواب:۔ مزارعت کے مسئلہ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف جتنے بھی اقوال منسوب ہیں اگر اُن میں نظرِ عمیق سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ امام ابوحنیفہؒ کا ان اقوال سے مقصد مطلق عدمِ جواز کا نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ کوئی مالکِ زمین کاشتکاروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ان کی محنت کو شیرِ مادر سمجھ کر ہڑپ نہ کر جائے، اسی طرح باہمی تنازعات اور جھگڑوں سے معاشرہ پاک وصاف ہو کیونکہ معاشرے میں جھگڑے عموماً اسی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اسی طرح مالکِ زمین عزیمت پر عمل کر کے اپنی زمین کسی غریب آدمی کو کاشت کیلئے مفت دیدے ۔ اسلئے علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے حاوی القدسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے: کرهها ابوحنيفةؒ ولعينه اشد النهى۔

(فیض الباری ج۳ ص۲۲۵ کتاب المزارعت)

چشمہ کے پانی سے منع کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں موضع بھکن ملکوٹ تحصیل و ضلع ایبٹ آباد میں پینے کے صاف پانی کی سخت قلت ہے ہماری خواتین کو چار کلومیٹر دور سے پانی لانا پڑتا ہے، جبکہ اتنے ہی فاصلے پر سرکاری جنگل میں پانی وافر مقدار میں نالے میں بہہ رہا ہے۔ ہم نے کوشش کر کے گورنمنٹ سے ایک سکیم منظور کرائی اور گاؤں کو پانی سپلائی کرنے کے لیے باقاعدہ ٹینکی تعمیر کر کے پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا، ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے آکر ٹینکی توڑ دی اور پائپ لائن بھی اکھاڑ دی، ان کا مؤقف یہ ہے کہ اس جنگل پر ہمارے حقوق زیادہ ہیں اسلئے ہم اس کا پانی آپ لوگوں کو نہیں دیں گے۔ جبکہ پانی وافر مقدار میں ہے، دوسرے یہ کہ یہ پانی اس گاؤں والوں کے نہ تو پینے کے کام آتا ہے اور نہ ہی وہ اس اپنی زمینیں سیراب کرتے ہیں، یہ لوگ صرف اور صرف ضد پر قائم ہیں۔

جناب عالی! قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ صادر فرما کر ہمیں اس مشکل سے نکالیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے؟

الجواب:۔ پانی، آگ اور گھاس سب مشترکہ اموال ہیں، کوئی بھی شخص کسی کو ان سے منع نہیں کر سکتا، تاہم جو اس پانی کے قریب ہو اوّلاً اس کا حق ہے اور جو اس سے زائد ہو وہ دوسرے لوگ بغیر اس کی اجازت کے استعمال کر سکتے ہیں، کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو اس کے استعمال سے منع کرے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق سرکاری جنگل کا پانی آپ سب لوگوں کا مشترکہ پانی ہے ساتھ والے گاؤں کے لوگوں کا اس سے منع کرنا بے انصافی اور ناجائز ہے، ان کو شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ آپ لوگوں کو اس پانی کے استعمال سے منع کریں۔

لما فی الهندیة: ماء البحار ولکل واحد من الناس فیها حق الشفعة وسقی الاراضی حتی ان من اراد ان یکری نهراً منها الی الارض لم یمنع من ذلک ...... والثانی ماء الاودیة العظام لجیحون وسیحون ودجلة والفرات للناس فیه حق الشفعة علی الاطلاق وحق سقی الاراضی بان احی واحد ارضاً میتة وکری منه نهراً یسقیها ان کان لا یضر بالعامة ولا یکون نهراً فی ملک احد لانها مباحة فی الاصل ـــــ والاصل فیه قوله علیه السلام الناس شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار۔

(الهدایة ج۴ ص۴۸۲ مسائل الشرب)

كتاب الذبائح والصيد

ولا تاكلوا مما لم يذكر
اسم الله عليه وانه لفسق

واذا حللتم
فاصطادوا

کتاب الذبائح

(ذبح کرنے کے احکام ومسائل)

ذبح کے لیے اللہ کا نام لینا ہی کافی ہے

سوال: اگر ایک شخص کوئی جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنے کی بجائے دوسرے ایسے کلمات ذکر کرے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں استعمال ہوتے ہوں تو کیا اس سے ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب: ذبیحہ کی حلت کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا کافی ہے جس کی تخصیص مذکورہ بالا کلمات سے نہیں بلکہ ہر آن کلمات سے ذبح کرنا جائز ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہوں۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: (والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء) وغیره (فلا یحل بقوله اللّٰهم اغفرلی) لانه دعاء وسوال (بخلاف الحمد للّٰه وسبحان اللّٰه مریدًا به التسمیة) فانه یحل۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۱ کتاب الذبائح) [۱]

معاونِ ذابح کے لیے تسمیہ کا حکم

سوال: مذبوحہ کی حلت کے لیے اگرچہ ذابح کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص ذابح سے تعاون کر رہا ہو تو کیا اس کے لیے بھی ذابح کی طرح تسمیہ کہنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس کے تسمیہ ترک کرنے سے مذبوحہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: اگر معاون کی حیثیت اس درجہ کی ہو کہ ذابح کا کردار اس کے بغیر نامکمل ہو، یہاں تک کہ چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کرنے میں دونوں شریک کار ہوں تو ہر ایک کے لیے تسمیہ کہنا ضروری ہے اور ہر ایک مستقل ذابح شمار ہوگا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: وفیها اراد التضحیة فوضع یده مع ید القصاب

---

[۱] لما قال الشیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: وان قال بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم فهو حسن والشرط هو الذکر الخالص المجرد علیٰ ما قال ابن مسعود جردوا التسمیة..... ولو قال سبحان اللّٰه والحمد للّٰه ولا اله الا اللّٰه یرید التسمیة اجزء لان الماموربه ذکر اللّٰه علیٰ وجه التعظیم۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷۶ کتاب الذبائح)

فی الذبح واعانته علی الذبح سمی کل وجوباً فلو ترکہا احدھما اوظن ان تسمیۃ احدھما تکفی حرمۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۳۴ کتاب الاضحیۃ) [1]

ذبح فوق العقدہ کا حکم

سوال: شریعتِ مقدسہ میں ذبح فوق العقدہ کا کیا حکم ہے، اور اس سے جانور کی حلت و حرمت پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟

الجواب: ذبح میں اصل چیز حلقوم، مری اور دو رگوں کا کاٹنا ضروری ہے جو عقدہ کے نیچے جمع ہوتے ہیں اس لیے تحت العقدہ ذبح کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم اگر ماہرین ذبح یہ کہیں کہ یہ اعضاء عقدہ کے اوپر کٹ جاتے ہیں تو بلا شبہ جانور حلال ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ ذبح تحت العقدہ ہو۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: والذبح بین الحلق واللبۃ وفی الجامع الصغیر لا بأس بالذبح فی الحلق کلہ وسطہ واعلاہ واسفلہ۔

(الھدایۃ ج۴ ص۴۳۵ کتاب الذبائح) [2]

کسی جانور کا حرکت کرنا یا خون نکلنا باعثِ حلت ہے

سوال: اگر کسی جانور میں بظاہر زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ہوں لیکن ذبح کرنے کے بعد اس سے خون نکل آئے یا وہ حرکت کرے تو کیا اس سے وہ جانور حلال تصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جب کسی جانور میں ظاہری علاماتِ حیات مفقود ہوں لیکن بوقتِ ذبح

---

[1] لما قال العلامۃ الفرغانی رحمہ اللہ: رجل اراد ان یضحی فوضع صاحب الشاۃ مع ید القصاب فی الذبح واعانہ علی الذبح حتی صار ذابحاً مع القصاب۔ قال الشیخ الامام رحمہ اللہ تعالیٰ یجب علی کل واحد منھما التسمیۃ حتی لو ترک احدھما التسمیۃ لاتحل الذبیحۃ۔
(الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۳۵۵ کتاب الاضحیۃ۔ فصل فی مسائل متفرقۃ)

[2] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وذکاۃ (الاختیار ذبح بین الحلق واللبۃ بالفتح المنحر من الصدر (وعروقہ الحلقوم) کلہ وسطہ او اعلاہ او اسفلہ وھو مجری النفس۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۴ کتاب الذبائح)
و مثلہ فی العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج۸ ص۴۱۲ کتاب الذبائح۔

حرکت کرے یا اتنا خون نکل آئے جتنا کہ زندہ جانور سے نکلتا ہو تو اس کی زندگی کے لیے یہ علامت کافی ہے اور اس سے یہ جانور حلال سمجھا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: ذبح شاة مريضة فتحركت او خرج الدم حلت والا لا ان لم تدر حياته. قال ابن عابدينؒ (قوله او خرج الدم) كما يخرج من الحي. (رد المحتار ج۶ ص۳۰۸ كتاب الذبائح)[۱]

بوقتِ ذبح جانور کا سر تن سے جدا کرنا مکروہ ہے

سوال:۔ ذبح کرتے وقت اگر ذابح سے جانور کا سر کٹ جائے تو کیا اس سے مذبوحہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ذبح کرتے وقت ذبیحہ کا سر کٹ جانے سے ذبح پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کا گوشت حلال اور کھانے کے قابل ہے، تاہم جانور کے ٹھنڈا ہونے سے قبل اس کا سر کاٹنا بوجہ غیر ضروری تعذیب کے کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال الامام ابو الحسين احمد بن محمد البغداديؒ: ومن بلغ بالسكين النخاع وقطع الرأس كره له ذلك وتوكل ذبيحته. (مختصر القدوری ص۲۷۶ کتاب الذبائح)[۲]

بوجۂ حادثہ سر کٹنے کے بعد جانور کا حکم

سوال:۔ اگر کسی جانور کا سر کسی حادثہ میں تن سے جدا ہو جائے تو باقیماندہ بدن پر چھری پھیرنے سے وہ جانور حلال ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: رجل ذبح شاة او بقرة وتحركت بعد الذبح خرج منها دم مسفوح تحل وكذا ان تحركت ولم يخرج الدم او خرج الدم ولم يتحرك ..... وفي شرح الطحاوي وخروج الدم لا يدل على الحيوٰة الا اذا كان يخرج كما يخرج من الحي. (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۰۶ كتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ في الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۰۵ كتاب الذبائح۔

[۲] لما قال الامام عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي ويكره ان يبلغ بالسكين النخاع او يقطع الرأس وتؤكل. (الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۱۲ كتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۶ كتاب الذبائح۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق سر کٹنے کے بعد وہ رگیں اگر باقی ہوں جن کو کاٹنے سے جانور حلال ہوتا ہو تو یہ جانور حلال ہوگا صرف چھری پھیرنا کافی نہیں۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: ولو انتزع الذئب رأس الشاة وبقيت حية تحل بالذبح بين اللبة واللحيين وفيه..... شاة قطع الذئب اوداجها وهي حية لا تذكى لفوات محل الذبح۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۰۸ كتاب الذبائح)[1]

دانت یا ناخن وغیرہ سے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ حلال جانور قریب المرگ ہو اور چھری وغیرہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے مُردار ہونے کا خطرہ ہو تو کیا دانت، ناخن یا کسی تیز دھار پتھر سے جانور کا ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی ہنگامی حالت میں چاقو یا چھری دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ناخن، دانت یا تیز دھار پتھر وغیرہ سے جانور کا ذبح کرنا صحیح اور درست ہے بشرطیکہ ناخن اور دانت نکلے ہوئے ہوں ورنہ انگلیوں میں بڑھے ہوئے ناخن یا منہ کے دانتوں سے جانور ذبح کرنا جائز نہیں، لیکن انسان کے قابلِ احترام اجزاء ہونے کی وجہ سے نکلے ہوئے دانتوں یا ناخنوں سے جانور ذبح کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة ابو عبدالله محمد بن الحسن الشيبانيؒ: ظفر منزوعٌ أوْ قرن أوْ عظم أوْ سنٌّ منزوعة ذبح به فانهر الدم وأخرى الاوداج لم يكن بأس بأكله واكره هذا الذبح، وان ذبح بظفر او بسن غير منزوعة فهي ميتةٌ۔ (الجامع الصغير ص۳۸۶ كتاب الذبائح)[2]

---

[1] ذكر في الهندية: ولو انتزع الذئب رأس الشاة وهي حية تحل بالذبح بين اللبة واللحيين...... شاة قطع الذئب اوداجها وهي لا تذكى لفوات محل الذبح۔
(الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۹۱ كتاب الذبائح۔ الباب الثالث في المتفرقات)

[2] قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: ويجوز بالظفر والسن والقرن اذا كان منزوعًا حتى لا يكون بأكله بأسٌ الا ان يكره هذا الذبح..... بخلاف غير المنزوع لانه يقتل بالثقل فيكون في معنى المنخنقة۔ (الهداية ج۴ ص۴۳۶ كتاب الذبائح)
ومثلهٗ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۱ كتاب الذبائح۔

مشینی ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ آجکل جدید سائنسی آلات سے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، شریعتِ مقدسہ میں مشینی ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے شریعتِ مقدسہ نے چند شرائط رکھی ہیں:۔
(۱) ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا (۲) بوقتِ ذبح تسمیہ پڑھنا (۳) تحت العقد ذبح کرنا۔
لہٰذا اگر جدید سائنسی آلات سے ذبح کرنے میں مذکورہ شرائط موجود ہوں تو ذبیحہ حلال ہوگا اور اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، بصورتِ دیگر ایسا ذبیحہ حلال نہیں اور نہ اس کا کھانا جائز ہے۔

لما قال الامام ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: وذبیحة المسلم والکتابی حلال ولا تؤکل ذبیحة المرتد والمجوسی والوثنی والمحرم وان ترک التسمیة عمداً فالذبیحة میتة لا تؤکل وان ترکھا ناسیاً اُکل والذبح بین الحلق واللبة والعروق التی تقطع فی الزکاة اربعة الحلقوم والمری والودجان۔
(مختصر القدوری ص۲۷۶ کتاب الذبائح) [1]

خاص مواقع کے ذبح کا حکم

سوال:۔ بعض دفعہ خاص اسباب کی موجودگی میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا ہے، مثلاً بیمار کو جب صحتیابی ملے تو اس کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے یا کسی اہم تقریب کے انعقاد پر مہمان نوازی کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے، تو کیا ان خاص اسباب کی وجہ سے اس کی حلّت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں وہ ذبیحہ حرام ہے جو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا گیا ہو، مذکورہ بالا صورتوں میں غیر اللہ کا تقدس و تقرب نہیں بلکہ شکرِ الٰہی پیشِ نظر ہوتا ہے اس لیے اس ذبیحہ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] قال الامام عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلیؒ: والذکاة الاختیاریة وھی الذبح فی الحلق واللبة والاضطراریة وھی الجرح فی ای موضع اتفق وشرطھما التسمیة وکون الذابح مسلماً اوکتابیاً۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹ کتاب الذبائح)
ومثلہ فی کنزالدقائق ص۴۱۶ کتاب الذبائح۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : (ولو ذبح للضیف یحرم) وعلیٰ ھذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض او شفاء منہ لا شك فی حلہ لان القصد منہ التصدق ۔ (رد المحتار ج ۶ ص۳۰۹ کتاب الذبائح) [۱]

اہلِ کتاب کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ موجودہ دور کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں ذابح کا مسلمان یا اہلِ کتاب ہونا ضروری ہے، اسلئے عیسائی اور یہودی اگر اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کی پیروی کے دعویدار ہوں تو ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ تاہم موجودہ دور کی جدت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی ایسے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہیں جو اُن کے مذہب کے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ان کا ذبیحہ کھانے سے احتراز کیا جائے۔

لما قال العلامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ : حل ذبیحۃ مسلم و کتابی ۔ الخ (کنز الدقائق ص۴۱۶ کتاب الذبائح) [۲]

اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علماء محققین کے نزدیک موجودہ دور کے اہلِ تشیع تعصب اور بغض و عناد کی وجہ سے ایسے عقائد کے معتقد ہیں جو موجبِ کفر ہیں، ایسے کفریہ عقائد رکھنے

---

[۱] قال العلامۃ المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ : وعلیٰ ھذا فالذبح عند وضع الجدار وعروض مرض وشفاء منہ لا شك فی حلہ لان القصد منہ التصدق ۔ (الفتاوی الکاملیۃ ص۲۳۹ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر للحمویؒ ج ۳ ص۲۳۰ کتاب الذبائح ۔

[۲] قال الشیخ ابوالحسین احمد بن محمد البغدادیؒ : وذبیحۃ المسلم والکتابی حلال ۔ (مختصر القدوری ص۲۷۵ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹ کتاب الذبائح ۔

کی وجہ سے ان کے ذبیحہ کا حکم مرتدین کا ہو کر کھانے کے قابل نہیں ۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: الرافضی ان کان یسب الشیخین ویلعنهما فهو کافرٌ وان کان یفضل علیًّا علیٰ ابی بکر وعمر رضی الله عنهم لایکون کافرًا لکنهٗ مبتدعٌ ۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۳۸۱ کتاب الکراهیة)[1]

گائے کے گوشت کی حلت کا حکم

سوال:۔ بعض واعظین سے اکثر ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جو گائے کے گوشت سے نفرت دلاتی ہیں، کیا گائے کا گوشت کھانا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ازروئے شرع گائے ان حیوانات کی فہرست میں داخل ہے جو چیر پھاڑ کر نہیں کھاتے، اس لیے اس کی حلت میں کوئی شک نہیں، فقہاء کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گائے تو درکنار بلکہ اس کے پیٹ میں زندہ بچے کو اگر ذبح کیا جائے تو وہ بھی حلال ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: بقرة تعسّرت ولادتها فادخل ربها یده وذبح الولد حل وان جرحه فی غیر محل الذبح وان لم یقدر علیٰ ذبحه حل وان قدر لا ۔ (ردالمحتار ج ۶ ص۳۰۳ کتاب الذبائح)[2]

چوری کیے گئے جانور کے گوشت کا حکم

سوال: چوری کئے گئے یا کسی مغصوبہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] لما قال العلامة مُلا علی القاریؒ: قلتُ: وَهٰذا فی غیر حق الرافضة الخارجة فی زماننا فانهم یعتقدون کفر اکثر الصحابة فضلاً عن سائر اهل السنة والجماعة فهم کفرة بالاجماع بلا نزاع ۔ (مرقاة شرح مشکوٰة ج ۹ ص۱۳۷ کتاب الفتن)
وَمِثْلُهٗ فی شرح الفقه الاکبر ص۱۷۲ الکبیرة لاتخرج المؤمن عن الایمان ۔

[2] قال العلامة الاستاذ محمد الشهیر بالطوریؒ: لو ان بقرة تعسر علیها الولادة فادخل صاحبها یده وذبح الولد حل اکله وان جرحها فی غیر موضع الذبح اذا کان لا یقدر علیٰ ذبحه یحل وان کان یقدر لا یحل ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۱ کتاب الذبائح)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۲۸۷ کتاب الذبائح ۔ الباب الاول ۔

الجواب:۔ حلال جانور کی حلت وحرمت کے احکام پر سرقہ اور غصب مؤثر نہیں ہوتے بشرطیکہ ذابح مسلمان ہو اور ذبح کے وقت ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تاہم سارق اور غاصب پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: غصب شاة وضحی بھا ان اخذھا مالکھا وضمنه النقصان لا یقع عن الاضحیة وان ضمنه قیمتھا حیة وقعت عنھا لانھا صارت ملکًا من وقت الغصب۔ (الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۶ ص۲۹۱ کتاب الاضحیة) [1]

خرگوش حلال جانور ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خرگوش کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اہل تشیع اس کی حرمت کے قائل ہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے خرگوش کو حلال جانور قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: (و) حل (غراب الزرع) الذی یأکل الحب (والارنب والعقعق)۔ (تنویر الابصار علی صدر الدر المختار ج۶ ص۳۰۵ کتاب الذبائح) [2]

کوّے کی حلت وحرمت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کوّے کی حلت وحرمت کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کوّے کو عربی میں غُراب کہا جاتا ہے، فقہاء کرام کے اقوال سے

---

[1] لما قال العلامة طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: اذا غصب شاة وضحی بھا لا یجوز و صاحبھا بالخیار ان شاء اخذھا ناقصة ویضمنه النقصان ولا یجوز عن الاضحیة وان شاء ضمنه قیمتھا حیة فتصیر الشاة ملکًا للغاصب من وقت الغصب فیجوز عند الثلاثة رحمھم اللہ استحسانًا۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۱۶ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهُ فی الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۰۳ الباب السابع فی التضحیة عن الغیر۔

[2] واخرجه الامام ابوعیسی الترمذیؒ فی سننه: عن ھشام بن زید قال سمعت انسا یقول انفجنا ارنبًا بمر الظھران فسعی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم خلفھا فادرکتھا فاخذتھا فاتیت بھا ابا طلحة فذبحھا بمروة فبعث معی بفخذھا او بورکھا الی النبی صلی اللہ علیه وسلم فاکله قلت اکله قال قبله۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۱ م (کتاب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الارنب))

وَمِثْلُهُ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۲ کتاب الذبائح۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں (۱) بعض کوّے ایسے ہوتے ہیں جو صرف مردار اور اور نجس چیزیں کھاتے ہیں، غواب (کوّے) کی یہ قسم حرام ہے۔ (۲) دوسری قسم کے کوّے وہ ہیں جو کھانے میں صرف دانے (پاکیزہ چیزیں) استعمال کرتے ہیں، مردار نہیں کھاتے، ان کا کھانا حلال ہے۔ (۳) کوّوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کی خوراک حرام اور حلال سے مرکب ہوتی ہے، یعنی مردار بھی کھا لیتے ہیں اور پاکیزہ چیزیں بھی ۔ قاضی ابو یوسفؒ اگرچہ اس کی کراہت کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے اور فتویٰ آپؒ ہی کے قول پر ہے۔

لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن على الزيلعيؒ: والغراب ثلاثة انواع يأكل الجيف فحسب فانه لا يؤكل ونوع يأكل الحب فقط فانه يؤكل ونوع يخلط بينهم وهو ايضاً يؤكل عند ابى حنيفةؒ وهو العقعق لانه كالدجاج وعن ابى يوسف رحمه الله انه يكره لان غالب ماكوله الجيف والاول اصح ۔ انتهى

(تبيين الحقائق ج ۵ ص۲۹۵ كتاب الذبائح) [1]

ہُدہُد کھانے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! ہُدہُد کا گوشت کھانا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اسلام میں ہر اُس پرندے کا کھانا حرام ہے جو اپنی خوراک (شکار) چیر پھاڑ کر کھاتا ہو، ہُدہُد کا شمار چونکہ ایسے پرندوں میں نہیں ہوتا جو چیر پھاڑ کر کھاتے ہیں اس لیے اس کے کھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، تاہم بعض فقہاء کرام نے اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لیے اجتناب ہی بہتر ہے۔

---

[1] لما قال العلامة الاستاذ محمد الشهير بالطورى رحمه الله: والغراب ثلاثة انواع نوعٌ يأكل الجيف فحسب فانهٗ لا يؤكل ونوعٌ يأكل الحب فحسب فانه يؤكل ونوع يخلط بينهما وهو ايضاً يؤكل عند الامام وهو العقعق لانه يأكل الدجاج وعن ابى يوسفؒ انهٗ يكره أكله لانهٗ غالب أكله الجيف والاوّل اصح۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۲ كتاب الذبائح)

ومثلهٗ فى مجمع الانهر شرح الملتقى الابحر ج ۲ ص۵۱۳ كتاب الذبائح ۔

لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحدادؒ الیمنیؒ: وکذا لا بأس باکل العقعق والھدھد والحمام والعصافیر لان عامۃ اکلھا الحب والثمار
(الجوھرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۷۹ کتاب الذبائح) ۱؎
وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ویکرہ الصرد والھدھد۔
(ردالمحتار ج۶ ص۳۰۶ کتاب الذبائح) ۱؎

موطوء جانور (چارپائے) کا شرعی حکم

سوال:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنے سے اس فعل کی قباحت اور حرمت سے قطع نظر اس کے گوشت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی حلال جانور سے ایسے مکروہ فعل کے کرنے سے اس کا گوشت یا دودھ حرام نہیں ہوتا ہے، تاہم ایسے حیوان کی موجودگی اس غیر فطری عمل کے تذکرہ اور یاددہانی کا ذریعہ ضرور ہے، اس لیے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ ایسے جانور کو ذبح کرکے اس کا گوشت جلا دیا جائے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ شناعت دائمی نہ رہے تاہم کسی دور دراز علاقہ میں لے جاکر فروخت کرنے سے بھی ایسے جانور کو دور کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن الھمامؒ: (والذی یروی انہ تذبح البھیمۃ وتحرق ذلک لقطع) امتداد (التحدث بہ) کلما رؤیت فیتاذی الفاعل بہ ولیس بواجب واذا ذبحت وھی مما لا تؤکل ضمن قیمتھا...... وان کانت مما تؤکل اکلت وضمن عند ابی حنیفۃؒ وعند ابی یوسفؒ لا تؤکل۔ (فتح القدیر شرح الھدایۃ ج۵ ص۴۵ کتاب الذبائح) ۲؎

۱؎ قال الامام ابوالیث السمرقندیؒ الفقیہ الکامل: ولا بأس باکل العقعق عند ابی حنیفۃؒ وکذا لا بأس بالھدھد۔ (الفتاویٰ النوازل ص۲۳۶ کتاب الذبائح)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۲۹ کتاب الذبائح۔الباب الثانی۔

۲؎ قال العلامۃ ابن نجیمؒ: والذی انھا تذبح البھیمۃ وتحریم فذلک لقطع التحدث بہ ولیس بواجب قالوا ان کانت الدابۃ مما لا تاکل لحمھا تذبح وتحرق لما ذکرنا وان کانت مما تؤکل تذبح وتؤکل عند ابی حنیفۃ وقالا تحرق ھذا ایضاً۔ (البحرالرائق ج۵ ص۱۷ کتاب الذبائح)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص۲۶ کتاب الحدود، مطلب فی وطء الدابۃ۔

یورپ کے ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کا حکم

سوال:۔جناب مفتی صاحب! بلادِ عرب میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا وغیرہ یورپی ممالک سے بند ڈبوں میں مرغی اور دیگر جانوروں کا گوشت آتا ہے اور ان ڈبوں پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ حلال طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، تو کیا ایسے گوشت کا استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ ایسے گوشت کے بارے میں اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس کے ذابحین مسلمان ہیں اور انہوں نے اسلامی طریقہ سے ذبح کیا ہے تو فتویٰ کی رُو سے اس کا استعمال کرنا مرخص ہے مگر تقویٰ کی رُو سے اس سلسلہ میں عصرِ حاضر کی دیگر بے احتیاطیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے استعمال سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : وزکوٰة الإختیار ذبح اطلق واللبة...... والمری والودجان..... وشرط کون الذابح مسلماً حلالاً خارج الحرم .... والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۶ کتاب الذبائح)[۱]

غیر فطری طریقہ کی پیداوار غیر ملکی گائے کا حکم

سوال:۔بعض نسل کی گائیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی نسل کشی کے لئے خنزیر کا مادہ منویہ بذریعہ ٹیسٹ ٹیوب یا بذریعہ حُقنی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے، ایسی گائے کو جرمنی یا غیر ملکی گائے کہا جاتا ہے۔ایسی گائے کے گوشت کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔حیوانات کی نسل مادہ سے ثابت ہوتی ہے، نر کے مادۂ منویہ کا کوئی

---

[۱] وفی الهندیة : الاختیاریة فرکنها الذبح فیما یذبح من الشاة......... والذبح هو فری الاوداج ومحله ما بین اللبة واللحیین ..... منها ان یکون مسلماً اوکتابیاً.....منها التسمیة حالة الزکاة عندنا......منها ان یرید بها التسمیة علی الذبیحة..... منها قیام اصل الحیاة فی المستأنس وقت الذبح ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۲۸۵،۲۸۶ کتاب الذبائح۔ الباب الاول)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۳۴ کتاب الذبائح ۔

اعتبار نہیں ہوتا، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بکری کے ساتھ کوئی درندہ جفتی کرے تو بچہ ماں کے تابع ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق برمتی کی مذکورہ گائے کو ذبح کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا یعنی اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: فان كان متولداً من الوحشي والانسي فالعبرة للام فان كانت اهلية يجوز والا فلا حتى ان البقرة الاهلية اذا نزعها ثور وحشي فولدت ولداً فانه يجوز ان يضحي به وان كانت البقرة وحشية والثور اهليا لم يجز لان الاصل في الولد الام لانه ينفصل عن الام۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص ۶۹ کتاب الذبائح) [1]

بوقتِ ذبح عمداً تسمیہ چھوڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت قصداً و عمداً بسم اللہ چھوڑ دے تو کیا یہ ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں ذبح کرتے وقت بسم اللہ الخ قصداً و عمداً ترک کرنا ذبیحہ کے مردار ہونے کا سبب ہے، لہٰذا بوقتِ ذبح عمداً بسم اللہ ترک کرنے سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے جس سے کسی بھی قسم کا انتفاع جائز نہیں، نہ خود کھا سکتا ہے اور نہ دوسروں کو کھلا سکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ان ترك التسمية عمداً لا يسع الاجتهاد ولو قضى القاضي بجواز بيعه لا ينفذ۔

(الهداية على صدر فتح القدير ج ۸ ص ۵۷ کتاب الذبائح) [2]

---

[1] قال العلامة ابوبكر الجصاص الرازيؒ: الا ترى ان حمارة اهلية لو ولدت من حمار وحشي لم يؤكل ولدها ولو ولدت حمارة وحشية من حمار اهلي أكل ولدها فكان الولد تابعاً لامه دون ابيه۔ (احكام القرآن ج ۵ ص ۳ سورة النحل)

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ: ولا تحل ذبيحة من تعمد ترك التسمية مسلماً او كتابيا لنص القرآن ولانعقاد الاجماع۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۲۹۹ كتاب الذبائح)

ومثله في الهداية ج ۴ ص ۴۳۵ كتاب الذبائح۔

حلال جانور کے حرام اجزاء | **سوال:** حلال مذبوحہ کے بدن سے کون کون سی چیزیں کھانا حرام ہیں؟

الجواب:۔ حلال جانور کا شرعی طریقہ سے ذبح ہونے کے باوجود اس کے سات مندرجہ ذیل اعضاء کا کھانا حرام ہے:۔ (۱) پتّا (۲) مثانہ (۳) غدود (۴) فرج (۵) ذکر، (۶) خصیتین اور (۷) دم مسفوح۔

لما قال العلامة محمد بن حسن الشیبانیؒ: عن مجاهد قال کره رسول الله صلی الله علیه وسلم من الشاة سبعاً: المرار والمثانة والغدة والحیاء والذکر والانثیین والدم۔ انتهی (کتاب الآثار ص۱۷۹ باب ما یکره من الشاة الدم وغیره)[1]

جانور کو گولی مار کر ذبح کرنا | **سوال:**۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم لوگ بیلہ کہتے ہیں، گاؤں والے اس میں اپنے مال مویشی چھوڑ دیتے ہیں جس میں کبھی کبھی کوئی جانور وحشی بھی ہو جاتا ہے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتا تو لوگ اس کو گولی مار کر گرا لیتے ہیں اور پھر اس کو ذبح کرتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: گولی مار کر گرانے کے بعد اگر جانور میں جان باقی ہو اور فوراً اس کو شرعی طریقہ سے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا ورنہ نہیں، البتہ کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بلاوجہ گولی مارنا ظلم و زیادتی اور موجب گناہ ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وحل المذبوح بقطع ای ثلاث منها اذ للاکثر حکم الکل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۵ کتاب الذبائح)

◎

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الکاسانیؒ: واما بیان ما یحرم اکله من اجزاء الحیوان المأکول فالذی یحرم اکله منه سبعة الدم المسفوح والذکر والانثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۱ کتاب الذبائح)
ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب الذبائح۔

خنزیر کی حرمت میں فلسفہ

سوال :- جنابِ مفتی صاحب! یہاں جاپان میں عموماً خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض مسلمان جو کہ عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں وہ بھی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گائے اور خنزیر کے گوشت میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا گوشت ایک ہی طرح کا ہوتا ہے بلکہ خنزیر کا گوشت گائے کے گوشت سے لذیذ ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں خنزیر کا گوشت حرام قرار دینے کا کیا فلسفہ ہے؟

الجواب :- اسلامی نقطہ نظر سے کسی چیز کی حلت اور حرمت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز کو حلال فرما دیں وہ حلال ہوتی ہے اور جس کو حرام فرما دیں وہ حرام ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کو قیاس آرائی کی اجازت نہیں کہ وہ ادھر اُدھر صغریٰ وکبریٰ ملا کر کسی چیز پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف حیوانات کی طرح گائے کو بھی حلال قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ...... وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ۝

(سورۃ الانعام پ۸ آیت ۔۔۔)

(ترجمہ) "آٹھ نر و مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم، آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو ..... اور گائے میں دو قسم، آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو۔"

مشہور مفسرِ قرآن علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں :-

ثمّ بين اصناف الانعام الیٰ غنم .... الابل ذکورها واناثها وبقر کذلك وانهٗ تعالیٰ لم یحرم شیئاً من ذٰلك ولا شیئاً من اولادها بل کلها مخلوقة لبنی اٰدم اکلا ورکوبًا وحمولة وحلبًا وغیر ذٰلك من وجوه المنافع۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۳)

(ترجمہ) "پھر اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی اقسام کو بیان کیا ..... حتیٰ کہ اونٹ اس کا نر و مادہ اور اسی طرح گائے بھی، بیشک اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اور ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی حرام نہیں کیا بلکہ یہ سارے کے سارے بنی آدم کے کھانے، سواری، باربرداری اور دودھ وغیرہ منافع کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔"

اس لیے گائے کے حلال ہونے میں شک کرنا صحیح نہیں ـــــ اور خنزیر کو بعض دیگر حیوانات کی طرح حرام قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

قُلْ لَا اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا۔ (سورۃ الانعام پ۸ آیت ۔)

(ترجمہ) "آپؐ فرمادیں کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ کو پہنچتی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سؤر کا کہ وہ ناپاک اور ناجائز ہے"۔

اور اسی پر امت کا اجماع ہے، علامہ دمیریؒ فرماتے ہیں :۔

"خنزیر نجس العین ہے اور اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں" (حیات الحیوان (اردو) ج ۲ ص۱۶۱ الخنزیر)

خنزیر کی حرمت پر قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہ و تابعین اس کثرت سے دال ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے ان کے ہوتے ہوئے اس کا کھانا حلال نہیں۔

شریعت جس چیز کو حرام کرتی ہے اس میں اس حکم کے علاوہ دیگر مضرات بھی ہوتے ہیں جو انسانی بدن یا اس کے اخلاق کے لیے صحیح نہیں ہوتے۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خنزیر کی حرمت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

(۱) اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، بےغیرت اور دیوث ہے، اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر (انسانی) بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہوگا کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلّم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بد ہی ہوگا، جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصہ حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے، پس جبکہ یہ امر مسلّم ہے کہ تغیّرِ بدن و تغیّرِ اخلاق کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے، لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھانے سے شریعتِ اسلامیہ نے منع فرما دیا۔

(۲) خنزیر یعنی خوک نجاست کی طرف بہت زیادہ مائل ہے خصوصاً انسان کا فضلہ یعنی براز اس کی خوراک ہے، اس کا گوشت اسی نجاست سے پیدا ہوتا ہے، پس اس کا گوشت کھانا گویا

اپنی نجاست کھاتا ہے ۔

(۳) صاحب مخزن الادویہ فسادِ گوشت خوک اور اس کی حرمت کی تیرہ وجوہ ذیل میں تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرتِ انسانی کے برخلاف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"گوشت خوک مواد خلط غلیظ است و مورث حرص شدید و صداع مزمن، دوادالفیل، واوجاع المفاصل وفسادِ عقل و زوالِ مروت وغیرت وحمیت و باعثِ فحش است واکثرے از فرق غیر اسلامی آں را می خورند وقبل از ظہور نورِ اسلام گوشت آں را در بازار ہا می فروختند و بعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع وموقوف گردید لبسیار کثیف و بدہیئت است ۔"

(احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۰۴)

(۴) سؤر کا گوشت ایک بیماری کا باعث بنتا ہے جو کہ آنکھوں کی ایک بیماری ہے اور اس کا نام ٹرکنی اوسس ہے جو کہ صحرائی آب وہوا میں بہت جلد اثر کرتی ہے ۔

باقی رہا مسئلہ گائے وغیرہ کا تو مولانا اشرف علی تھانوی اس بارے میں فرماتے ہیں :۔

(۱) یہ سارے جانور دراصل مزاجِ انسانی کے موافق اور ستھرے ومعتدل المزاج ہوتے ہیں اس لیے حلال ٹھہرائے گئے ہیں اور ان جانوروں کو خدا تعالیٰ نے بہیمۃ الانعام فرمایا ہے، اور اسی توافق و اعتدال کے سبب دنیا میں زیادہ تر انہیں جانوروں کا گوشت بنی آدم استعمال کرتے ہیں، فطرتِ انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ جیسا کہ بنی آدم کی خوراک کا کچھ حصہ نباتات سے ہوتا ہے ایسا ہی کچھ حصہ اس کا حیوانات سے ہوا اور اس کی خوراک کے لیے حیوانات بھی وہ مقرر ہونے مناسب تھے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا ۔

(۲) جبکہ انسان جامع جلال وجمال ہے تو اس کی خوراک میں بھی جلال وجمال دونوں کا ہونا مناسب تھا لہٰذا انسان کی خوراک کے لیے وہ جانور مقرر ہوئے جن میں جمال و جلال ہر دو صفات موجود ہیں ۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۱۷)

مزید تفصیل کے لیے "حیات الحیوان" از علامہ دمیری رحمہ اللہ کی طرف مراجعت کریں، مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا حکم ہی کافی ہے ۔ (ہو الموفق والمعین)

کچھوا کھانے کا حکم

سوال: جنابِ مفتی صاحب! کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ دریائی جانور سب پاک ہیں اس لیے کچھوا کھانا بھی جائز ہے، جبکہ کچھ لوگوں کے نزدیک اس کا کھانا درست نہیں، شریعتِ مطہرہ کے احکامات کی روشنی میں بتائیں کہ کچھوا کھانا حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک دریائی جانوروں میں سے فقط مچھلی حلال ہے، باقی سب حرام، لہٰذا کچھوا (شمشتی) کھانا بھی حرام ہے۔

قال العلامة المرغیناني: ولا یوکل من حیوان الماء الا السمك۔

(الهدایة ج۴ ص۴۴۲ کتاب الذبائح)

درندوں کی حرمت کا فلسفہ

سوال:۔ بعض اوقات میرے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ شریعتِ مقدسہ نے جو شیر، ریچھ، گیدڑ وغیرہ درندوں کو حرام قرار دیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے اور کس فلسفہ کے تحت یہ درندے حرام قرار دیئے گئے ہیں، ازراہِ کرم تسلی بخش جواب دے کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ ایک مسلمان کے لیے کسی چیز کے بارے میں حلت و حرمت کا اعتقاد کسی فلسفے کے تحت نہیں ہونا چاہیئے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہوئے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں حلت و حرمت کا حکم بغیر کسی حکمت کے نہیں فرماتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سارے درندے جانور جن کی سرشت و فطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور صولت سے زخم پہنچانا اور جن میں سخت دلی ہے سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا ہے: او یأ کل احد یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے یعنی اس کو کوئی نہیں کھاتا۔ وجہ حرمت ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا، اسی واسطے ہر شکاری پرندے کے کھانے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا۔" (احکامِ اسلام عقل کی نظر میں ص۲۰۵ کتاب الاکل والشرب)

کتاب الصّید
(شکار کرنے کے احکام و مسائل)

جال سے شکار کرنا جائز ہے

سوال:۔ بعض علاقوں میں مچھلی یا پرندوں کے شکار کے لیے جال استعمال کیا جاتا ہے جس میں عموماً پرندوں کو سبز باغ دکھا کر پکڑا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ دھوکہ دہی کے دائرہ میں ہو کر شکار پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شکار قرآن وحدیث کی رو سے مباح ہے، ایسے مباح امر کے حصول کے لیے کسی حیلہ کا اختیار کرنا شرعاً ممنوع نہیں، جال سے شکار کرنا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے فقہاء کی عام عبارتیں اس کے جواز پر دال ہیں۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: رجلٌ حفر فی ارضه حفیرة فوقع فیها صیدًا فجاء رجلٌ واخذه قال الصید یکون للآخذ وان کان صاحب الارض اتخذ تلك الحفیرة لاجل الصید فهو احق بالصید۔ (الفتاوٰی قاضی خان علٰی هامش الهندیة ج ۳ ص ۳۵۹ کتاب الصید والذبائح) [۱]

بندوق سے شکار کرنے کا حکم

سوال:۔ بندوق یا غلیل سے کیا ہوا شکار اگر ذبح نہ ہو سکے تو اس کے کھانے کا کیا حکم ہے؟ اگر بندوق یا غلیل کی گولی سے شکار زخمی ہو کر مر جائے تو کیا یہ جرح ذبح کے لیے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز خود جارح نہ ہو بلکہ زور

---

[۱] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: لمن نصب فسطاطًا بارض صید فی ارض رجل او انکسر به جله فیها او وقع فیه بحیث لایقدر علی البراح فاخذه انسان ونازعه صاحب ان کان صاحب الارض بحیث لو مدّ یده یصل الیه فهو له وان کان بعیدًا لایصل الیه یده لو مدّه فهو للآخذ۔ (الفتاوٰی البزازیة علٰی هامش الهندیة ج ۶ ص ۳۰۳ الباب الخامس فی تملیك الصید) ومثله فی الهندیة ج ۵ ص ۴۱۸ الباب الثانی فی تملیك ما به الصید الخ۔

سے شکار کو زخمی کرے اور وہ اس سے مر جائے تو یہ موقوذہ کے حکم میں ہو کر حلال نہیں،
بندوق اور غلیل کی گولی خود جارح نہیں بلکہ عموماً جانور اس کے زور (پریشر) سے زخمی ہوتا
ہے اس لیے اُس کی حلت کے لیے یہ جرح کافی نہیں، تاہم اگر حیوان میں کچھ حیات باقی ہو اور
اس کو ذبح کر لیا جائے تو پھر کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: ولا یحل صید البندقة والحجر والمعراض والعصا
وما اشبه ذلك وان جرح ذلك۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۶۰
کتاب الصید والذبائح) ؎

سوال: مجروح شکار اگر چند لمحے زندہ رہ سکتا ہو یا اضطراری موت سے محفوظ ہو جائے تو	مجروح شکار کا ذبح کرنا ضروری ہے

اس کی حلت کے لیے زخمی ہونا ہی کافی ہے یا اس کا ذبح کرنا ضروری ہے؟

الجواب: مجروح شکار جب کچھ دیر زندہ ہو یا کم از کم اضطراری موت سے بچ
سکتا ہو تو شرعاً ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ جرح ذبح اختیاری کے حکم میں ہے اور یہ
اس وقت کار آمد ہے جب تک ذبح اختیاری قابلِ عمل نہ ہو۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: وقال اصحابنا رحمهم الله لو جرحه السهم او الکلب
فادرکه لکن لم یأخذه حتی مات فان کان فی وقت لو اخذه یمکنه ذبحه فلم یأخذ حتی مات لم یؤکل لان
الذبح صار مقدوراً علیه فخرج الجرح من ان یکون ذکاة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۵۱ کتاب الصید)

؎ عن ابراهیم بن عدی بن حاتمؒ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رمیت فسمیت فخزقت
فکل وان لم تخزق فلا تأکل ولا تأکل من المعراض الا ما ذکیت ولا تأکل من البندقة الا ما ذکیت۔ (رواه احمد)
(نیل الاوطار ج۸ ص۱۴۳ کتاب الصید، باب النهی عن الرمی بالبندق وما فی معناه)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج۶ ص۴۷۱ کتاب الصید۔

؎ قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ولا بد من ذبح صید مستأنس لان ذکاة الاضطرار
انما یصار الیها عند العجز عن ذکاة الاختیار (وکفی جرح نعم) کبقر وغنم (توحش) فیجرح
کصید (او تعذر ذبحه) کان تردی فی بئر او ند او صال حتی لو قتله المصول علیه مریداً
ذکاته حل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۰۳ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۱ کتاب الذبائح۔

شکار کا کٹا ہوا عضو کھانا جائز نہیں

سوال:۔ اگر شکار کرنے وقت تیر یا کسی اور تیز دھار آلہ سے زندہ جانور سے کوئی عضو الگ ہو جائے اور بعد میں وہ جانور ذبح کر لیا جائے تو اس کٹے ہوئے عضو کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی زندہ جانور سے اس کا کوئی عضو آلۂ شکار سے کٹ کر الگ ہو جائے تو اُس جانور کے ذبح کرنے سے وہ عضو حلال نہیں ہوتا اس لیے اس الگ شدہ عضو کو کھانا شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابو بکر بن علی الحدادالیمنیؒ: (قوله واذا رمی صیداً فقطع عضواً منه أکل الصید لما بیناه ولا یؤکل العضو) لقوله علیه السلام ما ابین من الحی فهو میت والعضو بهذه الصفة لان المبان منه حی حقیقة لقیام الحیاة فیه۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۷۴ کتاب الصید) [1]

دریاؤں میں موجود مچھلیوں کو بیچنا جائز نہیں

سوال:۔ بعض دریاؤں میں مچھلیوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حکومت ان دریاؤں کو بطور ذریعہ آمدنی استعمال کرتی ہے اور ایسی جگہوں پر اُن لوگوں کو مچھلی کا شکار کرنے کی اجازت دیتی ہے جو حکومت کو ایک خاص رقم ادا کرتے ہیں، عُرف میں اس اجازت کو ٹھیکہ کہا جاتا ہے، کیا شرعاً اس طرح معاملہ طے کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ملکیت کے لیے جہاں فروخت (بیع) بطور سبب استعمال ہوتا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ جو چیز فروخت کرنی مقصود ہو اس کی تسلیم بائع (فروخت کرنے والے) کے دائرہ اختیار میں ہو اور جہاں کہیں فروخت کی ہوئی چیز سے بائع

---

[1] قال العلامة اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: قال (وان رمی صیداً) اذا قطع بالرمی عضواً من الصید لما بیناه ان الرمی مع الجرح مبیح وقد وجد ولا یؤکل العضو ان امکن حیاته بعد الابانة وان لم یمکن أکلا۔ (العنایة شرح الهدایة علی هامش فتح القدیر ج ۹ ص۱۶۱ کتاب الصید)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار مع رد المحتار ج ۶ ص۴۷۳ کتاب الصید۔

مشتری کے حوالے کرنے سے قاصر ہو تو وہاں پر بائع کا یہ معاملہ ناجائز ہو کر اس کے لیے یہ رقم لینا ناجائز ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں حکومت کا یہ ٹھیکیداری معاملہ ایک بے بنیاد معاملہ ہے، تاہم اگر ٹھیکیدار محنت کرے اور مچھلی کا شکار کر کے فروخت کرے تو شکار کرنے سے اس کی ملکیت ثابت ہو کر اس کی آمدنی اس کے لیے حلال ہو گی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولا يجوز بيع السمك قبل ان يصطاد لانه باع مالا يملكه ولا في حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لانه غير مقدور التسليم۔ (الهداية ج ۳ ص ۵۵ كتاب الصيد)[۱]

شکاری کُتّے کے شکار کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں لوگ شکار کے لیے کُتّے پالتے ہیں اور ان کو شکار کی تعلیم دیتے ہیں اور پھر ان سے شکار کھیلتے ہیں۔ تو اگر وہ کُتا شکار کو پکڑ لے اور خود نہ کھائے بلکہ مالک کے پاس لے آئے لیکن وہ شکار راستے ہی میں اُس کے مُنہ میں مر جائے تو کیا اس شکار کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے شکار کی غرض سے کُتا پالنے اور اس کے ذریعے شکار کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ اُس کو شکار کرنے کی تعلیم دی گئی ہو اور وہ شکار پکڑ کر مالک کے پاس لے آئے لیکن خود اس سے نہ کھائے تو ایسے کتے کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے اگرچہ وہ جانور کُتے کے منہ میں ہی ختم ہو جائے لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مالک نے شکار پکڑنے کے لئے کُتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہو، بدون اس کے شکار حلال نہیں۔

لقوله تعالىٰ: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (سورة المائدة آيت ۴)

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: (قوله والسمك قبل الصيد اى لم يجز بيعه لكونه باع مالا يملكه فيكون باطلاً اطلقه فشمل ما اذا كان فى حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لكونه غير مقدور التسليم۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۷۳ كتاب الصيد)
ومثله فى فتح القدير ج ۶ ص ۴۹ كتاب الصيد۔

چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ دونوں جانور اپنی درندگی اور خونخواری کی وجہ سے تعلیم کے قابل نہیں ہوتے اس لیے فقہاء نے ان کے ذریعے شکار کرنے کو نا جائز قرار دیا ہے۔ تاہم اگر یہ دونوں جانور تعلیم یافتہ ہو کر شکار کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ علت کی بناء پر ان کے شکار کو نا جائز قرار دیا گیا تھا وہ مفقود ہو چکا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فلا یجوز الصید بذیب واسد لعدم قابلیتهما للتعلیم فانهما لا یعملان للغیر الاسد لعلو همته والذیب لخساسته۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶۳ کتاب الصید)

قال العلامة ابن عابدینؒ: وحاصله البحث فی استثناء الخنزیر والاسد والذیب وفی التعلیل لان الشرط فی ظاهر الروایة قبول التعلیم فیحل بکل معلم ولو خنزیر۔ (رد المحتار ج ۶ ص۴۶۴ کتاب الصید) [1]

شوقیہ طور پر شکار کھیلنے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ بعض موذی جانوروں مثلاً گیدڑ وغیرہ کا شکار شوقیہ طور پر کرتے ہیں، اس سے ان لوگوں کا مقصود صرف کھیل تماشا ہوتا ہے، کیا شرعاً ایسا شکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی جانور کا شکار اس غرض سے کرنا چاہیئے کہ اس سے کچھ نفع حاصل ہو، صرف کھیل تماشا کے طور پر شکار کرنا جائز نہیں خصوصاً حرام جانور کا شکار کہ جس سے کوئی ظاہراً فائدہ نہ پہنچتا ہو مگر وہ جانور کھیت وغیرہ کو نقصان پہنچاتا ہو تو پھر اسے مارنا جائز اور رخصت ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلی: ویکره الصید لهواً لانه عبث لقوله علیه السلام

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی: واستثنیٰ ابو یوسفؒ من ذٰلک الاسد والذئب لانهما لا یعملان لغیرهما الاسد لعلو همته والذیب لخساسته والحق بعضهم الحدأة لخساستها والخنزیر مستثنیٰ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۳ ص۲۰۴ الفصل الثانی فی الصید)

لاتتخذوا شيئًا فيه الروح غرضًا اى هدفًا من قتل عصفورًا عبثًا عج الى الله يوم القيامة يقول يا رب ان فلانًا قتلنى عبثًا ولم يقتلنى منفعة ۔

(الفقه الاسلامی وادلتہ ج ۳ ص۶۹۳ الفصل الثانی فی الصید) لہ

تجارت کی غرض سے شکار کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب دارالعلوم حقانیہ! ہم چند ساتھی اجتماعی طور پر دریائے سندھ میں مچھلی کا شکار کرتے ہیں اور پھر اُسے فروخت کر دیتے ہیں، ایک صاحب کا کہنا ہے کہ شکار صرف کھانے کی حد تک جائز ہے تجارت کے لیے شکار جائز نہیں۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ تجارت کی غرض سے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ بعض علماء کے ہاں شکار کو بطورِ پیشہ اختیار کرنا مکروہ ہے مگر راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق تجارت کے لیے شکار کرنا مباح ہے اس میں حرمت کا کوئی شائبہ نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: هو مباح الا لمحرم فى غير الحرم اوللتلهى كما هو ظاهر او حرفة على ما فى الاشباه قال المصنفؒ وانما زدته تبعًا له والا فالتحقيق عندى اباحة اتخاذه حرفة لانه نوع من الاكتساب وكل انواع الكسب فى الاباحة سواء على المذهب الصحيح۔

(الدرالمختار على صدر ردالمحتار ج۶ ص۴۶۲ كتاب الصيد) لہ

لہ لما قال العلامة الحصكفيؒ: هو مباح بخمسة عشر شرطًا ...... الا المحرم فى غير الحرم اوللتلهى كما هو ظاهر۔ قال العلامة ابن عابدينؒ فى مجمع الفتاوىٰ: ويكره للتلهى۔ (الدرالمختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۴۶۱،۴۶۲ كتاب الصيد)

لہ قال العلامة ابن عابدينؒ: وفى التاتارخانية قال ابويوسفؒ اذا طلب الصيد لهوًا ولعبًا فلا خير فيه واكرهه وان طلب منه مايحتاج اليه من بيع او ادام او حاجة اخرى فلا بأس۔

ردّ المحتار ج۶ ص۴۶۲ كتاب الصيد)

کتاب الاضحیة

بسم الله الرحمن الرحيم

قل إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين

١٤٠٥ھ

كتبه الفقير نفيس الحسيني غفر الله ذنوبه وستر عيوبه
لاهور، پاكستان

کتاب الاضحیۃ

(قربانی کے احکام ومسائل)

نصابِ قربانی کا معیار

سوال:۔ قربانی کے وجوب کے لیے شریعتِ مطہرہ میں نصاب کے معیار کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص اپنے حوائجِ اصلیہ اور قرض کے علاوہ ۷½ تولے سونا یا ۵۲½ تولے چاندی یا اس مقدار سے زائد نقد مالیت کا مالک ہو تو ایسے شخص پر شرعاً قربانی کرنا لازم ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: قال ابو حنیفة الموسر الذی له مائتا درهم او یساوی مائتی درهم سوی المسکن والخادم والثیاب التی یلبس ومتاع البیت الذی یحتاج الیه وهذا اذا بقی له الی ان یذبح الاضحیة۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۰۹ کتاب الاضحیة) [1]

قربانی کے ایام کا حکم

سوال:۔ قربانی کتنے دنوں تک کرنا جائز ہے؟ نیز اس میں جلدی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآن وسُنت کی روشنی میں ایام النحر (قربانی کے دن) تین ہیں، یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ متعین دن ہیں، تاہم پہلے دن (۱۰ ذی الحجہ) قربانی کرنا افضل ہے۔

لما ذکر العلامة محمود آلوسیؒ فی تفسیره: وعن تها ثلاثة ایام یوم العید ویومان

---

[1] لما ذکر فی الهندیة: (اما شرائط الوجوب) منها الیسار وهو ما یتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما یتعلق به وجوب الزکوٰة ...... والموسر فی ظاهر الروایة من له مائتا درهم او عشرون دینارًا او شئ یبلغ ذلك سوی سکنه ومتاع سکنه ومرکوبه وخادمه فی حاجته التی لا یستغنی عنها۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۲۹۲ کتاب الأضحیة۔ الباب الاول فی تفسیرها)

ومِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۶ ص۳۱۲ کتاب الأضحیة۔

وبعدہ..... لماروی عن عمر وعلی وابن عمر وابن عباسٍ و انسٍ و ابی ھریرۃ رضی اللہ عنھم انھم قالوا ایام النحر ثلاثۃ افضلھا اوّلھا وقد قالوا سماعًا لأن الرأی لایھتدی الی المقادیر۔ (روح المعانی ج۲۷ ص۱۴۵) [1]

اُضحیہ (قربانی کے جانور) کی عمر

سوال: شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے لیے جانور کی عمر کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے لیے مختلف اجناس کے حیوانات میں مختلف عمروں کا اعتبار کیا ہے۔ اونٹ میں پانچ سال، گائے بھینس میں دو سال، دنبہ اور بکری میں ایک سال کا تعین کیا ہے تاہم اگر دنبہ موٹا تازہ ہو اور ایک سال کا دکھائی دیتا ہو تو پھر اس میں چھ ماہ کی عمر کے دنبے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغیناتی: ویجزئ من ذلک کلہ الثنی فصاعدًا الاالضان فان الجذع منہ یجزی..... اذ کانت عظیمۃ لوخلط بالثنیان یشتبہ علی الناظر من بعیدٍ والجذع من الضأن ما تحت لہٗ ستۃ اشھر فی مذھب الفقھاء..... والثنی منھا ومن المعز ابن سنۃ ومن البقر ابن سنتین ومن الابل ابن خمس سنین ویدخل فی البقر الجاموس لانہٗ من جنسہ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۴۷ کتاب الاضحیۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغیناتی: وھی جائزۃ فی ثلاثۃ ایام یوم النحر ویومان بعدہ لما روی عن عمر وعلی وابن عباس رضی اللہ عنھم انھم قالوا ایام النحر ثلثۃ افضلھا اوّلھا۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۴۳ کتاب الاضحیۃ) ـــــــ قال الحافظ قاسم بن قطلوبغا: قولہٗ روی عن عمر وعلی وابن عباس۔ قلتُ روی الطحاوی فی الاحکام اثر علی وابن عباسٍ۔

(منیۃ الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الھدایۃ للزیلعی ص۵۶ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۱۹ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال الشیخ ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: (قولہٗ یجزی فی ذلک الثنی فصاعدًا الا الضان فان الجذع منہ یجزی) یعنی اذا کان عظیمًا بحیث اذا خلط بالثنایا یشتبہ علی الناظر من بعید فا لجذع من الضان ما تم لہٗ ستۃ اشھر وقیل سبعۃ والثنی منھا ومن المعز مالہٗ سنۃ وطعن فی الثانیۃ ومن البقر مالہ سنتان وطعن فی الثالثۃ ومن الابل مالہ خمس سنین وطعن فی السادسۃ ویدخل فی البقر الجوامیس لانھا من جنسھا۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۰ کتاب الاضحیۃ۔

شرکاءِ قربانی کی تعداد **سوال:۔** گائے، بھینس وغیرہ کی قربانی میں کتنے اشخاص شریک ہوسکتے ہیں؟

الجواب:۔ گائے بھینس کی قربانی میں شرعاً سات حصوں کی حد مقرر ہے اس سے زائد حصوں کی گنجائش نہیں تاہم سات سے کم حصوں میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: و لا یجوز بعیر واحد ولا بقرة واحدة عن اکثر من سبعة و یجوز ذلک عن سبعة او اقل من ذلک۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۰ کتاب الاضحیة)[1]

شرکاءِ قربانی کی نیت کا حکم **سوال:۔** اگر قربانی کے شرکاء کی نیت قربت کی حیثیت مختلف ہو، مثلاً بعض نے وجوب اور بعض نے نفل کی نیت کی ہو تو کیا اس سے قربانی متاثر ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور (گائے بھینس وغیرہ) میں شراکت کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ سب کی نیت حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو، اگرچہ مختلف انواع کی قربات ہوں، لہٰذا متنفلین و واجبین کی قربانی صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو ارادوا القربة الاضحیة او غیرها من اجزاءهم سواء کانت القربة واجبة او تطوعاً او وجبت علی البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة او اختلفت (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۱ کتاب الاضحیة)[2]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: والتقدیر بالسبع یمنع الزیادة کما لا یمنع النقصان حتی لو کانت الشرکاء فی البدنة او البقرة ثمانیة لم یجزهم ولو کانوا اقل من ثمانیة الا ان نصیب واحد منهم اقل من السبع لا یجوز ایضاً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۱۵ کتاب الاضحیة)

ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

[2] قال العلامة محمد الشهیر بالطوریؒ: تجوز عن سبعة بشرط قصد الکل القربة واختلاف الجهات فیما لا یضر کالقران والمتعة والاضحیة لاتحاد المقصود و هو القربة۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۷۷ کتاب الاضحیة)

ومثلهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

شرکتِ اضطراری میں قربانی کا وجوب

سوال:۔ اگر والد کی وفات کے بعد چند بیٹے اس کے وارث ہوں، جائداد متروکہ کو بحالِ خود رکھ کر جملہ برادران اس سے استفادہ کرتے رہیں لیکن تقسیم کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، ہر بھائی کا حصہ نصاب کی مقدار سے زائد ہو، کیا اس صورت میں جملہ برادران ایک قربانی کریں گے یا ہر ایک پر قربانی مستقل طور پر واجب ہو گی؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں جبکہ ہر ایک بھائی کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہو تو سبب کے متحقق ہونے پر ہر ایک کی ملکیت کا استقلالاً اعتبار ہو گا، ملکیت متحقق ہونے پر شرکت مانع نہیں، اس لیے ہر ایک پر الگ الگ قربانی واجب ہو گی، مشترکہ طور پر ایک قربانی کرنے سے کسی ایک کا بھی ذمہ فارغ نہیں ہو گا

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: الاضحیۃ واجبۃ علی کل حر مسلم موسر فی یوم الاضحٰی یذبح عن نفسہٖ۔ انتہی

(مختصر القدوری ص۲۷۸ کتاب الاضحیۃ)[1]

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی کو شریک کرنا

سوال:۔ قربانی کے لیے جانور خریدنے کے بعد کسی کو اس میں شریک کیا جائے تو کیا اس طرح کرنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل سات افراد تک کی شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ایک دفعہ چند افراد مل کر قربانی کا جانور خریدیں اور ان میں سے کسی ایک شخص کی قربانی نفلی ہو تو ایسی حالت میں کسی کو بعد ازاں شریک کرنا جائز نہیں البتہ اگر تمام حصہ داروں کی قربانی واجب ہو تو پھر کسی کو شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ قربانی میں شرکت کا دائرہ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل تک محدود رکھا گیا ہو۔

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ: تجب علی حر مسلم مقیم موسر عن نفسہٖ۔ انتہی (کنز الدقائق ص۴۲۲ کتاب الاضحیۃ)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۱ کتاب الاضحیۃ۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ : ولو اشتری بقرۃ یرید ان یضحی بها عن نفسه ثم اشرك فیها ستة معه جاز استحسانًا ..... والاحسن ان یفعل ذلك قبل الشراء لیکون ابعد عن الخلاف ۔ (الهدایة ج۴ ص۴۴۳ کتاب الاضحیة) [له]

نابالغ کی قربانی کا حکم

سوال :۔ کیا صاحبِ نصاب نابالغ پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ اور وجوب کی ادائیگی باپ یا ولی اپنے مال سے کرے گا یا نابالغ کے مال سے کی جائے گی؟

الجواب :۔ صاحبِ نصاب نابالغ پر شرعًا قربانی واجب ہے اور ادائیگی وجوب اس کے مال سے کی جائے گی۔ [ع]

لما قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ : واما البلوغ والعقل فلیسا من شرائط الوجوب فی قول ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ ..... حتی تجب الاضحیة فی مال الصبی والمجنون اذا کان موسرین ۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۴ کتاب الاضحیة) [له]

میت کے لیے قربانی کا حکم

سوال :۔ کیا میت کی حصہ داری سے دیگر شرکاء کی قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ قربانی میں میت کی یا حصہ داری کے بعد مرنے والے کی شراکت شرعًا نقصان دہ نہیں، جملہ شرکاء کی قربانی درست اور صحیح ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : (وان مات احد السبعة) المشترکین فی البدنة

[له] قال العلامة الحصکفیؒ : (وصح اشتراك ستة فی بدنة شریت لاضحیة) ای ان نوی وقت الشراء الاشتراك صح استحسانًا والا لا (استحسانًا وذا) ای الاشتراك (قبل الشراء احب ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۷ کتاب الاضحیة)

ومثله فی الهندیة ج۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق به الشرکة فی الضحایا ۔

[۲له] قال العلامة ابن عابدینؒ : (وقوله یضحی عن ولده الصغیر من ماله) ای مال الصغیر ومثله المجنون ۔ قال فی البدائع اما البلوغ والعقل فلیسا من شرائط الوجوب فی قولهما ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۱۶ کتاب الاضحیة)

[ع] البتہ اکثر علماء نے نابالغ اور مجنون کے مال پر قربانی کے عدم وجوب کو راجح قرار دیا ہے (مرتب)

(وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح) عن الكل استحسانًا لقصد القربة من الكل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۶ کتاب الاضحیۃ) [1]

بلاعذرِ شرعی قربانی چھوڑ دینا

سوال: قربانی واجب ہونے کے باوجود بلاعذر شرعی چھوڑ دی جائے اور قربانی کے ایام گذر جائیں تو پشیمانی کے احساس کے طور پر کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: قربانی واجب شرعی ہے بلا عذر ترک کرنا موجب گناہ ہے، تاہم قربانی کے دن گذرنے کے بعد اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اسکی طرف سے قبول کرے، اور اگر کوئی قربانی کو اپنے اوپر خود واجب کرلے یا فقیر قربانی کے لیے جانور خرید دے تو اس صورت میں زندہ جانور کو صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر ان كان واجب على نفسه أو كان فقيرًا وقد اشترى الأضحية تصدق بها حية و ان كان غنيًا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشترى لانها واجبة على الغني وتجب على الفقير بالشراء بقيمة۔ (الهداية ج ۴ ص۴۴۳ كتاب الاضحية) [2]

قربانی کے جانور کو تبدیل کرنا

سوال: ایک شخص نے قربانی کے لیے جانور خریدا، بعد ازاں محض اس لالچ کی وجہ سے فروخت کرنا کہ دوسرا کم قیمت والا جانور مل جائے تو کچھ رقم کا فائدہ ہوگا، تو کیا اس صورت میں اُس

---

[1] قال العلامة علاؤ الدين الكاساني: إذا اشترك سبعة في بدنة فمات احدهم قبل الذبح فرضي ورثته ان يذبح عن الميت جاز استحسانًا۔
(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج ۵ ص۷۲ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُهُ في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۳۱۵ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلي: فان مضت ولم يذبح فان كان فقيرًا وقد اشترى تصدق بها حية وان كان غنيًا تصدق بثمنها اشتراها أو لا۔
(الاختيار لتعليل المختار ج ۵ ص۱۹ كتاب الاضحية)
وَمِثْلُهُ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۰ کتاب الاضحیۃ۔

خریدے ہوئے جانور کو فروخت کرکے دوسرا جانور خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر قربانی کرنے والا غنی ہو اور اس پر قربانی واجب ہو تو ایسی حالت میں خریدنے سے جانور متعین نہیں ہوتا اس لیے اس حال میں تبدیلی مرخص ہے لیکن اگر قربانی نفلی ہو جو کہ خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے پھر اس میں تبدیلی مرخص نہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ایسی صورت میں زائد رقم بچے تو اس کا تصدق کیا جائے گا، بلکہ فقہاء نے صورتِ اولیٰ میں بھی زائد رقم کے تصدق کو اولیٰ قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وفي الاصل اشترى اضحية ثم باعها جاز في ظاهر الرواية ولو اشترى مثلها وضحى بها ان كانت الثانى مثل الاولى اوخيراً منها جاز لا يلزمه شيء آخر، وان كان دون الاولى تصدق بفضل القيمتين۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۱۹ كتاب الاضحية)[۱]

قربانی کے جانور سے انتفاع کا حکم

سوال:- کیا قربانی کے جانور سے دودھ لینا یا سواری کیلئے استعمال کرکے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قربانی کے جانور سے انتفاع لینا شرعاً درست نہیں بلکہ اس کے دودھ کو ٹھنڈے پانی سے خشک کیا جائے گا، تاہم اگر دودھ یا بال وغیرہ اجزاء سے انتفاع لیا جائے تو بعینہٖ اس اجزاء کو یا اس کی قیمت کو فقراء میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: (قوله يكره الانتفاع بلبنها) فان كانت التضحية قريبة ينضح ضرعها بالماء البارد الاحلبه وتصدق به۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۹ كتاب الاضحية)[۲]

---

[۱] وذكر في الهندية: رجل اشترى شاة للاضحية واوجبها بلسانه ثم اشترى اخرى جاز له بيع الاولى في قول ابي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى وان كانت الثانية شراً من الاولى وذبح الثانية فانه يتصدق بفضل ما بين القيمتين۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۹۴ الباب الثاني في وجوب الاضحية بالنذر)

[۲] قال العلامة ابن البزاز الكردريؒ: ويكره حلبها وجز صوفها قبل الذبح وينتفع به فان فعله تصدق به...... وان في ضرعها لبن يخاف عليه تضح ضرعها بالماء البارد او فرجها بالماء البارد اذ قربت ايام النحر وان بعدت يحلبها ويتصدق باللبن وما اصاب من اللبن تصدق بمثله اوقيمته وكذا الصوف۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۲۹۴ كتاب الاضحية السادس في الانتفاع)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۲۱ كتاب الاضحية۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ | سوال :- شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے گوشت کو حصہ داروں اور فقراء میں تقسیم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب :- شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں حصہ داروں کو جائز رکھا ہے لہٰذا گوشت کو شرکاء آپس میں ایسے طریقے سے تقسیم کریں جس میں کسی کی حق تلفی کا امکان نہ ہو تاہم فقراء پر صدقہ کے لیے وزن کرنا ضروری نہیں۔

لما قال العلامہ فخرالدین حسن بن الفرغانیؒ : سبعة ضحوا بقرة واقتسموا لحمها وزناً جاز لان بیع اللحم باللحم وزناً بمثل مثلاً جائز فکذلك القسمة فان اقتسموا جزافاً لا یجوز اعتباراً بالبیع ۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۱ فصل فیما یجوز فی الضحایا ... الخ) [1]

قربانی کے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کرنا | سوال :- کیا قربانی کا سارا گوشت خود رکھا جاسکتا ہے یا تین حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے؟ اس کی تقسیم کے صحیح طریقہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب :- قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا مندوب ہے۔ ایک حصہ فقراء پر تقسیم کیا جائے، دوسرا حصہ عزیز و اقرباء کو کھلایا جائے اور تیسرا حصہ اپنے لیے رکھ لیا جائے، تاہم اگر سارا گوشت صدقہ کردیا جائے یا اپنے لیے ذخیرہ کرلیا جائے تو بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ : والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث ... ولو تصدق بالکل جاز ولو حبس الکل لنفسه جاز ۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۸۱) [2]

[1] قال العلامة شمس الدین محمد بن عبدالله التمرتاشیؒ : ویقسم اللحم وزناً لا جزافاً ۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۷ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۹۰ الباب الرابع فیما یجوز من الاضحیة ۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ : والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث ویستحب ان یاکل منها ولو حبس الکل لنفسه جاز لان القربة فی الاراقة والتصدق باللحم تطوع ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۰۰ الباب السادس فیما یستحب من الاضحیة ۔

میت کی طرف سے کی گئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال:۔ کیا میت کی طرف سے کی گئی قربانی کا گوشت خود کھایا جا سکتا ہے یا صدقہ کرنا لازمی ہے؟

الجواب:۔ اموات کی طرف سے ذبح شدہ قربانی کے جانور کا گوشت خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا جائز ہے بشرطیکہ قربانی میت کی وصیت سے نہ کی گئی ہو ورنہ وصیت کی صورت میں صدقہ کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: ولو ضحی عن میت من مال نفسه بغیر امر المیت جاز وله ان یتناول منه ولا تلزمه ان یتصدق به لانها لم تصر ملکاً للمیت..... وان ضحی عن میت من مال المیت بامر المیت یلزمه التصدق بلحمه ولا یتناول منه لان الاضحیة عن المیت۔ (الفتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۲ فصل فیما یجوز فی الاضحیة ما لا یجوز) [1]

نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال:۔ نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا کیا حکم ہے؟ کیا قربانی کرنے والا اس میں سے خود کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر کی ہوئی قربانی بھی قربت الی اللہ کا ذریعہ ہے لیکن ناذر اپنی قربانی کا گوشت نذر کی وجہ سے خود نہیں کھا سکتا بلکہ تمام گوشت فقراء میں تقسیم کرنا لازمی ہو گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو فقیراً ولو ذبحها تصدق بلحمها ولو نقصها تصدق بقیمة النقصان ایضاً ولا یأکل الناذر منها فان اکل تصدق بقیمة ما اکل۔ وفی حاشیة رد المحتار: او فقیراً شراها وان ذبح لا یأکل منها۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۱ کتاب الاضحیة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: من ضحی عن المیت یصنع کما یصنع فی اضحیة نفسه من التصدق والاکل والاجر للمیت والملک للذابح۔ قال الصدر والمختار انه ان کان الاضحیة بامر المیت لا یأکل منها والا یأکل۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۶ کتاب الاضحیة) ـــ ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیة۔

[2] قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: ان وجبت بالنذر فلیس لصاحبها ان یأکل منها شیئاً ولا ان یطعم غیره من الاغنیاء سواء کان الناذر غنیاً او فقیراً لان سبیلها التصدق ولیس للمتصدق ان یأکل صدقته ولا ان یطعم الاغنیاء۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۸ کتاب الاضحیة) ومثله فی الهندیة ج۵ ص۳۰۰ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب۔

چرمِ قربانی کا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنا

سوال:۔ چرمِ قربانی یا اسکی قیمت مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چرمِ قربانی از قبیل تطوعات ہے، اس لیے بعینہٖ کھال کو مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں یا اغنیاء کو تملیکاً دینا اور استعمال کرنا شرعاً مباح ہے، البتہ کھال کی قیمت کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں، اس کے علاوہ دیگر امور میں استعمال کرنا ناجائز عمل ہے، تاہم اگر بعینہٖ کھال کسی غنی کو تملیکاً بغیر توکیل وحیلہ کے حوالے کی جائے تو غنی کا اپنی طرف سے کھال کی قیمت مسجد یا مدرسہ اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرنے سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویتصدق بجلدها او یعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو (او یبدله بما ینتفع به باقیاً) کما مر (لا بمستهلك کخل ولحم ونحوه کدراهم (فان بیع اللحم والجلد به) بمستهلك (او بدراهم تصدق بثمنه)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیة) [1]

صاحب نصاب کو چرمِ قربانی دینا جائز ہے

سوال: کیا صاحب نصاب امام مسجد یا دیگر اشخاص کو چرمِ قربانی دینا یا خود استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ راجح اور مفتیٰ بہ قول کی رو سے چرمِ قربانی صدقاتِ نافلہ کے زمرے میں ہے، اس لیے بعینہٖ چرمِ قربانی کو خود استعمال کرنا اور اپنی اولاد یا دیگر

---

[1] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ویجوز الانتفاع بجلد الاضحیة والهدی والمتعة والتطوع بان یتخذ فروا او بساطا او جرابا او غربالا وله ان یشتری به متاع البیت کالغربال والجراب والخف ولا یشتری به الخل والمری واللحم ولا بأس ببیعه بالدراهم لیتصدقها ولیس له ان یبیعه بالدراهم لینفقها علی نفسه ولو فعل ذلك یتصدق بثمنه۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲۱، ص۳۲۲ کتاب الاضحیة)
ومثله فی الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۲۹۴ السادس فی الانتفاع کتاب الاضحیة۔

اغنیاء کو دینا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ : (ویتصدق بجلدھا او یعمل منہ نحو غربال وجراب) وقربۃ سفرۃ ودلو (او یبدل بما ینتفع بہ باقیاً۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیۃ)[1]

قربانی کا گوشت اُجرت میں دینا جائز نہیں

سوال :- اگر قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت اور صاف کرتے وقت کسی شخص سے مدد لی جائے اور پھر اس کو گوشت یا جزِ اضحیہ حق الخدمت کے طور پر دیا جائے تو اس سے قربانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

الجواب :- قربانی کی حقیقت محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے (اراقۃ الدم) خون بہانے تک محدود ہے، تاہم ایسے مقدس فعل میں کسی قول یا خودغرضی کا شائبہ ہونا اس کے فلسفہ سے متصادم ہے، اس لیے قربانی کے کسی جزء کو ذاتی مقاصد کے لیے فروخت کرنا یا کسی کو حق الخدمت میں دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ شمس الدین محمد بن عبداللہ التمرتاشیؒ : (ولا یعطی اجر الجزار منہا) لانہ کبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیۃ)[2]

داغدار جانور کی قربانی کا حکم

سوال :- داغدار جانور کی قربانی کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب :- داغ، دھبہ ایسے عیوب نہیں جو قربانی کرنے سے مانع ہوں، لہٰذا داغدار

---

[1] لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر الحدادالیمنیؒ : (قولہ ویتصدق بجلدھا) لانھا جزء منھا (قولہ او یعمل منہ آلۃ تستعمل فی البیت) کالنطع والجراب والغربال ولا بأس ان یتخذ فروا لنفسہ۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۸ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال العلامۃ علاؤ الدین ابوبکر الکاسانیؒ : ولا ان یعطی اجر الجزار والذابح منھا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۸۱ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص۱۹ کتاب الاضحیۃ۔

جانور کی قربانی صحیح اور درست ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: والتي بها كيٌّ والتي لا ينزل لها لبن من غير علة والتي لها ولد يجوز۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲۱ کتاب الضحیة) [1]

نکیل والے جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ کسی جانور کی ناک میں نکیل (نتھ) ڈالنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قربانی کے جانور میں کسی عضو کا ثلث سے زیادہ عیب دار ہونا قربانی پر اثرانداز ہوتا ہے، ثلث یا ثلث سے کم قربانی سے مانع نہیں، چونکہ نکیل ڈالنے سے جانور کی ناک میں معمولی سا سوراخ ہوجاتا ہے جس کا قربانی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

لما قال الامام المجتهد ابو عبد الله محمد بن الحسن الشيبانيؒ: وان قطع من الذنب او الأذن والألية الثلث او اقل اجزاه وان كان اكثر لم يجز۔ (الجامع الصغير ص۳۸۷ کتاب الضحیة) [2]

سینگ کا ٹوٹ جانا مانع قربانی نہیں

سوال:۔ اگر کسی جانور کے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ جائیں تو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں اس عیب کو معیوب قرار دیا ہے جو جانور کے منافع اور خوبصورتی میں رکاوٹ بنتا ہو، چنانچہ سینگ جانور کا ایسا جزء نہیں جس کے نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے منافع یا خوبصورتی میں فرق آتا ہو، لہٰذا اس قسم کے جانور کی قربانی میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ سینگ دماغ کی ہڈی

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: تجوز الضحية بالمجبوب..... والتي لها كيٌّ والتي لا لسان لها في الغنم۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۲۹۷ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب۔

[2] قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: وان قطع من الذنب او الأذن او العين او الألية الثلث او اقل اجزاه وان كان اكثر لم يجز لان الثلث تنفذ فيه الوصية من غير رضا الورثة فاعتبر قليلاً۔ (الهداية ج۴ ص۴۴۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۶ ص۳۲۴ کتاب الاضحیة۔

تک نہ ٹوٹا ہو۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ ویضحی بالجماء) ھی التی لا قرن لہا خلقۃ وکذا العظماء التی ذھب قرنہا بالکسر الی المخ لم یجز۔

(رد المحتار ج ۶ ص۳۲۳ کتاب الاضحیۃ)[1]

حاملہ جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر قربانی کے لیے خریدا گیا جانور (گائے، بکری وغیرہ) حاملہ نکل آئے تو کیا اس کی قربانی جائز ہے یا اس کو تبدیل کیا جائے گا؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ میں عیب دار جانور کی قربانی صحیح نہیں لیکن حمل کوئی ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع بنے، تاہم چونکہ اس میں بلاضرورت ایک دوسری جان کا ضیاع ہے اس لیے حاملہ کی قربانی کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامۃ جلال الدین الخوارزمیؒ: رجل لہٗ شاۃ حاملٌ فاراد ذبحھا تقارب الولادۃ یکرہ ذبحھا لان فیہ تضییعاً لما فی بطنہا من غیر فائدۃ۔

(الکفایۃ شرح الھدایۃ فی ذیل فتح القدیر ج ۸ ص۴۱۷ کتاب الاضحیۃ)[2]

خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی کا مسئلہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جانور کے نر یا مادہ ہونے کی تمیز مشکل ہو اور دونوں کی علامات موجود ہوں تو چونکہ ایسے جانور کے گوشت کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے

---

[1] قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ:۔ وتجزی الجماء وھی التی لا قرن لہا خلقۃ وکذا مکسورۃ القرن .... فان بلغ الکسر المشاش لا تجزیہ المشاش رؤس العظام۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۶ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۶ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال العلامۃ المحقق محمد الشھیر بالطوریؒ: ویکرہ ذبح الشاۃ اذا تقارب ولادتہا لانہ یضیع ما فی بطنہا۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۱ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۶ ص۳۰۴ کتاب الذبائح۔

ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : ولا بالخنثی لان لحمها لاینضج۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۲۵ کتاب الاضحیة) [۱]

خصی جانور کی قربانی کا حکم

سوال :۔ شریعت مقدسہ میں خصی جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ جانور کے انصاء سے اس کے گوشت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لیے خصی جانور کی قربانی نہ صرف جائز ہے بلکہ فقہاء نے مستحب کہا ہے ۔

لما قال العلامة ابوبکر بن علی الحدّاد الیمنیؒ : قوله یجوز ان یضحی .... والخصی لانه اطیب لحما من غیر الخصی ۔قال ابو حنیفةؒ ما زاد فی لحمه انفع مما ذهب من خصیته ۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیة) [۲]

قربانی کیلئے جانور خرید کر موٹا کرنا

سوال :۔ اگر کوئی شخص دس ذی الحجہ سے دو تین ماہ قبل قربانی کے لیے جانور خریدے اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرے تو کیا اس شخص کو اس عمل کا ثواب ملے گا نہیں ؟

الجواب :۔ قربانی کے لیے پہلے سے جانور خریدنا اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرنا مستحب اور باعث اجر و ثواب عمل ہے ۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ : (الجواب) قربانی کا جانور پہلے سے خریدنا اور اس کو موٹا تازہ کرنا مستحب ہے۔ الخ (امداد الاحکام جلد ۴ ص۱۹۰، کتاب الصید والذبائح والاضحیة)

---

[۱] لما ذکر فی الهندیة : لاتجوز التضحیة بالشاة الخنثی لان لحمها لاینضج۔
(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۲۹۹ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب)

[۲] لما ورد فی الحدیث : عن جابر بن عبد الله قال ذبح النبی صلی الله علیه وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۳۸۲ کتاب الاضحیة)
ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۸۰ کتاب الاضحیة ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربانی کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص پیارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کرے تو یہ قربانی ہو جائے گی یا نہیں اور اس میں ثواب ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درست ہے اور اس میں ثواب بھی ہوتا ہے اور اس کے گوشت کا حکم اپنی قربانی کے گوشت جیسا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص۵۸۹ کتاب قربانی اور عقیقہ کے مسائل)

قربانی کے جانور کے دانت دیکھنا

سوال:۔ ہمارے علاقے کے اکثر لوگ قربانی کا جانور خریدتے وقت اس کے دانت ضرور دیکھتے ہیں اگر کسی جانور کے سامنے والے دو دانت نہ نکلے ہوں تو اس کو قربانی کے لیے نہیں خریدتے چاہے اس جانور کی عمر پوری ہی کیوں نہ ہو۔ تو کیا قربانی کرنے کے لیے جانور کے سامنے کے دو دانتوں کا نکل آنا ضروری ہے یا نہیں؟ وضاحت سے اس مسئلے کو بیان فرمایا جائے۔

الجواب:۔ علماء احناف کے نزدیک قربانی کے لیے جو جانور متعین کیا جائے اس کی عمر کا خیال رکھنا ضروری ہے دانتوں کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے اگر کسی جانور کی عمر پوری ہو تو اس کی قربانی بلاشک وشبہ جائز ہے چاہے اس کے دانت نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں، چونکہ اس عمر میں عموماً جانوروں کے دانت نکل آتے ہیں اس لیے بطور علامت دیکھے جاتے ہیں۔ ویسے آجکل دھوکہ دہی کا عام رواج ہے، لوگ چند پیسوں کی خاطر کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے کم عمر جانور کی عمر پوری بناتے ہیں اس لیے دانتوں کا دیکھنا مناسب ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وصح الجذع ذو ستة اشهر من الضأن ان كان بحيث لو خلط بالثنايا لا يمكن التميز من بعد وصح الثني فصاعداً من الثلاثة والثني هو ابن خمس من الابل وحولين من البقر والجاموس وحول من الشاة. (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۳۲۱،۳۲۲ كتاب الاضحية)[۱]

---

[۱] لما قال الشيخ المفتي عبد الرحيم: عمر پوری ہونی ضروری ہے، دانت کی علامت ہو یا نہ ہو۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد۳ ص۱۸۷ کتاب الاضحیہ)

عورت کے حقِ مہر پر قربانی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو حق مہر میں ۔ اتولہ سونا بشکل زیورات دیا ہے، اس کے علاوہ عورت کے کے پاس کوئی نقدی وغیرہ نہیں، تو کیا یہ عورت قربانی کرے گی یا نہیں؟ جبکہ اس کا شوہر اب اتنا مالدار نہیں رہا کہ وہ خود قربانی کر سکے؟

الجواب:۔ جب کسی کے پاس ۷½ تولہ سونا موجود ہو چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو یا اینٹ کی شکل میں اور اس پر کوئی قرضہ وغیرہ نہ ہو تو یہ شخص صاحب نصاب ہے اس کے ذمے قربانی کرنا لازم ہے ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت کے ذمے قربانی کرنا واجب ہے وہ ہر صورت میں قربانی کرے گی، موصوفہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پہ لاگو نہ ہوگی ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وشرائطها: الاسلام والاقامة والیسار الذی یتعلق به وجوب صدقة الفطر کما مر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۱۲ کتاب الاضحیة) [1]

گذشتہ سالوں کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے گذشتہ کئی سالوں کی قربانی رہ گئی ہو اور وہ اس کی قضاء کرنا چاہے تو شرعاً اس کا کیا طریقہ ہوگا کہ اس کا ذمہ فارغ ہو جائے؟

الجواب:۔ گذشتہ سالوں کی رہ جانے والی قربانی کی قضاء کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے سالوں کی قربانی رہ گئی ہو تو ہر سال کی قربانی کے بدلے اس کی قیمت فقراء و مساکین میں صدقہ کر دے اور اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی مغفرت بھی مانگے ۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وتصدق بقیمتها غنی شراها اولا لتعلقها بذمته بشرائها اولاً فالمراد بالقیمة قیمة شاة تجزی فیها۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۱ کتاب الاضحیة) [2]

---

[1] لما قال العلامة مفتی عبد الرحیمؒ: جب عورتیں صاحب نصاب ہیں تو اُن پر قربانی کرنا واجب ہے کہ اپنے پیسے سے قربانی کریں خود کے پاس رقم نہ ہو تو شوہر کے پاس سے لے کر قربانی کریں، یا شوہر عورتوں سے اجازت لیکر ان کی طرف سے قربانی کریں تو واجب قربانی ادا ہو جائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۳ ص ۱۸ کتاب الاضحیہ)

لما قال العلامة وهبة الزحیلی: ولو ترکت التضحیة حتی مضی وقتها...... واما الغنی اذا لم یشتر الاضحیة فیتصدق بقیمة شاة علی الصحیح۔ (الفقه الاسلامی وادلته، ج ص ۶۰۷ کتاب الاضحیة۔ المبحث الثالث، وقت التضحیة)

قربانی کی بجائے قیمت

ہمارے ملک اور بعض اسلامی ممالک میں دین کی روح سے نابلد ایسے روشن خیال اور تجدد زدہ افراد کی کمی نہیں جو آئے دن اپنی تحقیق و اجتہاد کی چھری اسلامی شعائر اور قطعی و متواتر احکام و عبادات پر چلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی عید الاضحیٰ کے موقعہ پر ایسے شوشے شوشے چھوڑ دیئے جاتے ہیں کہ قربانی کرنا جانوروں کی ضیاع ہے۔ اس سے قومی سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔ اور بجائے قربانی کے اس کی قیمت کو رفاہی کاموں میں لگانا چاہیئے۔ علماء اسلام نے تفصیل سے ایسے شبہات اور وسوسہ اندازیوں کے معقول جوابات دیئے ہیں۔ اس دفعہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس ۱۳۹۶ھ کے نوٹس میں الجزائری اخبار الشعب مجریہ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ میں شائع شدہ ایک الجزائری فتویٰ لایا گیا ہے، جس میں حج کے موقعہ پر قربانی کی بجائے اس کی نقد قیمت تقسیم کرنے کا کہا گیا تھا۔ رابطہ کی مجلس تاسیسی نے تفصیلی دلائل کے ساتھ ایک فتویٰ میں اس نظریہ کو غیر اسلامی قرار دیا کہ قرآن و سنت کے واضح نصوص نبی کریم علیہ السلام کے عمل، قولی و عملی ہدایات اور عہدِ نبوت سے لے کر اب تک صحابہ کرامؓ اور امتِ مسلمہ کے تعامل سے ثابت شدہ مسائل و عبادات میں کسی رائے زنی کی گنجائش نہیں، تقرب الی اللہ خود ساختہ طریقوں سے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرنے سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنے میں ہے کسی کام کے اقتصادی اور معاشی مصالح کے پہلو تب تلاش کئے جا سکتے ہیں جہاں امت کے اجماعی فیصلوں اور نصوص قطعی پر زد نہ پڑے اس لئے استدلال ذبائح بالثمن جیسے لایعنی مباحث کا دروازہ کھولنا ابتداع اور مداخلت فی الدین کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مذکورہ بالا قراردادوں میں اسلامی نقطۂ نظر اور جمہور اہلسنت کے عقائد کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے اس لئے ایسی قراردادیں عالم اسلام کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اطمینانِ قلب و زیادتِ ایمان کا باعث ہیں۔ دوسری طرف مغرب سے متاثر خام اذہان کو بھی تنبیہ ہو جاتی ہے۔ کہ ایسے مسائل میں عالم اسلام کی اکثریت کسی بھی ملحدانہ خیالات کی روادار نہیں۔

عقیقہ کی مشروعیت کا فلسفہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! عقیقہ کی مشروعیت کا کیا فلسفہ ہے، اسلام نے اس کا کیوں حکم دیا ہے؟ تفصیلاً وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ احکام شرعیہ کی مشروعیت میں بعض حکمتیں پنہاں ہوتی ہیں، عقیقہ کی مشروعیت اور ساتویں دن کی رعایت کی بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں، نفس مشروعیت کی حکمتوں اور فلسفوں کی طرف فیلسوف اسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ:۔

وکان فیھا مصالح کثیرۃ راجعۃ الی المصلحۃ الملیۃ والمدنیۃ والنفسیۃ فابقاھا النبی ﷺ وعمل بھا ورغب الناس فیھا۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج۲ ص۲۱۲)

(ترجمہ) "عقیقہ میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کا تعلق مصالح نفسیہ مدنیہ اور ملیہ سے تھا، ان مصالح کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کو باقی رکھا، خود بھی اس پر عمل کیا اور لوگوں کو بھی اس کی رغبت دلائی۔"

عقیقہ کے فوائد سے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(۱)۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بچے کا اپنے سے نسب کا متعارف کرانا ایک ضروری امر ہے تاکہ معاشرہ والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بچہ فلاں شخص کا بیٹا ہے اور کوئی شخص اسکے متعلق ناپسندیدہ بات نہ کہہ سکے، اس کے تعارف کے لیے ایک صورت یہ بھی تھی کہ یہ شخص خود گلی کوچوں میں پکارتا پھرے کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات ناگوار تھی، اس لیے جب لوگوں کو عقیقہ پر بلایا جائے یا ان کے پاس گوشت بھیجا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص کے ہاں بچہ یا بچی پیدا ہوئی ہے۔

(۲)۔ عقیقہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان میں سخاوت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، بخل اور کنجوسی جیسی مذموم صفت سے بچنے کی ایک تدبیر ہے جو انسان کی خوبی شمار ہوتی ہے۔

عقیقہ کے مذہبی اور ملی فائدہ

عقیقہ کے مذہبی اور ملی فوائد میں سے ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں ملت ابراہیمی سے تعلق کا مظاہرہ ہوتا ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں بچہ پیدا ہونے پر زرد رنگ کے پانی میں اس کو رنگ دیا جاتا ہے جس کو یہ لوگ "معمودیہ (بپتسمہ)" کہتے ہیں اور اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ۔)

(ترجمہ) "ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا ہے اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے اور ہم تو اسی اللہ کے پرستار ہیں۔"

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نسبت ملتِ ابراہیمی سے واضح کریں، مسلمانوں کے عام معاشرتی افعال میں ایسے طریقے ہونے چاہئیں جس سے ملتِ ابراہیمیؑ کا تعلق معلوم ہوتا ہو، ملتِ ابراہیمی میں یہ متعارف تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی جگہ ایک دُنبہ ذبح کیا تھا۔

علاوہ ازیں مشہور افعال میں سے حج بھی ہے جس میں ذبح کرنا اور بال منڈوانا بھی ہے۔ تو عقیقہ کرنے سے ملتِ ابراہیمی کے ان متعارف افعال اور امور سے نسبت پیدا ہوتی ہے اس لیے مذہبی تعلق کے مظاہرہ کے لیے ایک عظیم صورت ہے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں تابعداری اور انقیاد کا ایک نمونہ ہے، کیونکہ بچے کی پیدائش پر اس عقیقہ سے ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس نے اپنا یہ بیٹا ہی اس کے دربار میں پیش کیا جو اتباع اور فرمانبرداری کی معراج ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۴۲/۱۴۳)

عقیقہ کرنے میں ایک نکتہ اور راز یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنا بچہ بڑا پیارا ہوتا ہے، بچے کی پیدائش پر والدین کو بہت ہی خوشی ہوتی ہے اور مستقبل کی امیدوں کی سوچ و فکر سے گھر کا ہر فرد خوشی کی وجہ سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا، ہر ایک کا دل فرحت و سرور سے لبریز ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ بطور تشکر کچھ تصدق ہو اور تصدق کی بہترین صورت یہ قربانی یعنی عقیقہ ہے۔

(الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص۲۸۳ المبحث الثالث مشکلۃ اللحوم۔ الخ)

عقیقہ کے فوائد میں سے اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ عقیقہ کا گوشت فقراء اور مساکین، دوستوں اور رشتہ داروں کو پیٹ بھر کر کھلانے سے طبعی طور پر ان کے دلوں سے دُعائیں نکلیں گی جس سے بچہ کا مستقبل روشن ہوگا، عقیقہ فقراء اور مساکین، دوست و احباب کی دعاؤں کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تسبیع کی رعایت کا فلسفہ | یہ بات ثابت ہے کہ عقیقہ میں بہتر یہ ہے کہ یہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں: "اگر بچہ کی پیدائش کے وقت یہ ضروری قرار دیا جائے تو ممکن ہے کہ اس سے بچے کے والدین کو تکلیف ہو، کیونکہ اس وقت ایک تو گھر کے لوگ بچہ اور اس کی ماں کی خبر گیری میں مصروف اور مشغول ہوتے ہیں، ایسے وقت میں ان کو عقیقہ کا حکم کرنا ان کے لیے کہیں تکلیف کا باعث نہ بنے، علاوہ ازیں ایسے اوقات میں کبھی کبھار جانور ملنے میں بھی دشواری ہوتی ہے، فوراً لزوم کی صورت میں پورا گھرانہ ان تمام مشکلات سے دوچار ہوگا، اس لیے مسنون یہ رہا کہ عقیقہ ساتویں دن ہو جس کے لیے ایک ہفتہ قابلِ اعتماد مدت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۴۳)

عقیقہ کے لیے جانور متعین کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص عقیقہ کے لیے کوئی جانور متعین کر دے مگر زیادہ پیسے ملنے کے لالچ یا کسی اور فائدہ کی غرض سے وہ شخص اسے فروخت کرکے کوئی دوسرا جانور ذبح کر دے تو کیا اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ عقیقہ چونکہ شرعاً واجب نہیں اس لیے اگر کسی شخص نے عقیقہ کیلئے کوئی جانور متعین کیا لیکن بعد میں اس نے کسی وجہ سے دوسرا جانور ذبح کیا تو اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو گئی، متعین کردہ جانور ذبح کرنا ضروری نہیں۔

مُردہ بچے کے عقیقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد فوت ہو جائے تو کیا اس بچے کا عقیقہ کرنا مستحب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا مستحب ہے لیکن یہ استحباب صرف زندہ بچے تک محدود ہے مُردہ بچے کے عقیقہ کا استحباب ثابت نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیمؒ: مرحوم بچہ کے عقیقہ کا مستحب ہونا ثابت نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد۲ ص۹۴ کتاب الاضحیہ)

بچے کا عقیقہ کس پر ہے

سوال:۔ بچے کا عقیقہ کرنا والدین میں سے کس کے ذمے لازم ہے؟

الجواب:۔ بچے کا نان ونفقہ والدین میں سے جس کے ذمے واجب ہو تو استطاعت ہونے کی صورت میں بچے کا عقیقہ کرنا بھی اُسی پر لازم ہے، استطاعت نہ ہونے کی صورت میں کسی کے ذمے لازم نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیم: جس کے ذمے بچہ کا نفقہ واجب ہے اسی کے ذمہ عقیقہ بھی ہے، باپ کی حیثیت نہ ہو تو ماں عقیقہ کرے۔

(فتاویٰ رحیمیہ جلد۲ ص۹۴ کتاب الاضحیہ)

قربانی اور مسائل عید قربان

دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے ماہنامہ الحق میں افادۂ عام کے لیے "قربانی اور مسائل عید قربان" کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ فتاویٰ اور مسائل کی مناسبت سے یہاں درج کیا جاتا ہے ——— مرتب ———

قربانی اور قرآن قربانی اسلام کی مُہتم بالشان عبادت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی مرتبہ (آٹھ سورتوں میں) خداوندکریم نے قربانی اور متعلقاتِ قربانی، اس کی اہمیت اور حکمت و فلسفہ، مختلف اُمتوں میں اس کی شکل و صورت پر روشنی ڈالی ہے، اور امتِ مسلمہ ملتِ ابراہیمی کے لیے اسے دینی شعار اور امتیازی نشان قرار دیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ. (سورۃ الحج ۳۴)

(ترجمہ) "اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ اللہ کے دیئے گئے مویشیوں پر اس کا نام بلند کریں"

جیسا کہ خود آیتِ کریمہ سے واضح ہے، یہاں منسک سے مراد ذبح کرنا (قربانی دینا) ہے۔ محققین اور تمام اکابر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔ (قرطبی، مراح للنوویؒ، فتح القدیر للشوکانیؒ وغیرہ)

قربانی کی حکمت اور فوائد کے بارہ میں ارشادِ ربانی ہے:۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (سورۃ الحج آیت ۳۷)

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کا گوشت پوست اور خون نہیں پہنچتا مگر اس کے ہاں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"

سورۃ الکوثر میں واضح اور قطعی حکم ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (سورۃ الکوثر ۲)۔ (ترجمہ) "پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو"

قربانی اور حدیث (۱) عن ابن عمرؓ قال اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۷۷ ابواب الاضاحی)

(ترجمہ) "حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس برس تک مدینہ منورہ میں رہے اور برابر قربانی کرتے رہے"

(۲) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ عید قربان کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں اونٹ یا کسی دوسرے جانور کی قربانی کرتے۔ (مسند احمد و نسائی) ۱؎

(۳) حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں گندم گوں رنگ کے دو مینڈھے قربان کیے۔ (بخاری نیز کتاب اختلاف الحدیث للشافعی علی الام ج ۷ ص ۲۸) ۲؎

(۴) بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہراتؓ کی طرف سے گائے کی قربانی کی۔ ۳؎

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر صاحب وسعت پر سال بھر میں ایک قربانی واجب ہے۔ (ابن ماجہ ص ۲۳۳) ۴؎

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود قربانی نہ دی وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ ۵؎

(۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔ (مشکوٰۃ) ۶؎

(۸) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ عید قربان کے دن ابن آدم کا کوئی عمل قربانی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں، قیامت کے دن قربانی کے جانور کے سینگ، بال، سُم تک اعمالِ حسنہ کو بھاری کر دیں گے، اس کے خون کے قطرے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتے ہیں۔ تو طیبِ نفس (دل کی خوشی) سے قربانی کرتے رہو۔ (ترمذی، ابن ماجہ) ۷؎

(۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ہر بال کے بدلے تمہارے لیے نیکی ہے۔ (سنن ابن ماجہ) ۸؎

سبحان اللہ! کیا ٹھکانہ ہے رحمتِ خداوندی کا کہ اتنی بڑی دولت میسر ہو اور پھر بھی مسلمان کوتاہی کرے، مومن کی شان تو یہ ہے کہ قربانی اگر اس پر واجب نہ بھی ہو تب بھی ثواب اور نیکیوں کا یہ خزانہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شرائط وجوب قربانی | قربانی واجب ہونے کی شرائط یہ ہیں:-

(۱) اسلام (غیر مسلم پر واجب نہیں) (۲) اقامت (مسافر پر واجب نہیں) (۳) حریت یعنی آزاد ہونا۔ (غلام پر واجب نہیں) اس کے لیے مرد ہونا شرط نہیں عورتوں پر بھی واجب ہے، نابالغ پر نہ خود واجب ہے نہ اس کی طرف سے اس کے ولی پر واجب ہے۔ کما فی ظاھر

الروایۃ وبہ الفتویٰ۔ [9] (۴) تونگری یعنی جو مسلمان اتنا مالدار ہو کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو اس پر عید کے دن صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے چاہے وہ مال تجارت ہو یا نہ ہو اور چاہے اس پر پورا سال گذر چکا ہو یا نہ گذرا ہو۔ (بہشتی زیور) [10]

قربانی کے جانور اونٹ، گائے، بکری کی تمام انواع (نر، مادہ، خصی، غیر خصی) کی قربانی ہو سکتی ہے بھینس گائے میں شمار ہے اور بھیڑ یا دنبہ بکری میں ہیں۔ گائے، بھینس، اونٹ ان سب میں سات آدمی بھی شریک کر سکتے ہیں جبکہ کسی کا ساتویں حصہ سے کم نہ ہو۔ اگر کسی گائے یا اونٹ میں سات یا اس سے کم آدمی شریک ہوئے تو سب کی قربانی درست ہے اور اگر آٹھ یا زیادہ ہوئے تو سب کی قربانی نہ ہو گی [11]

جانور کی عمر اونٹ پانچ سال کا، گائے بھینس دو سال کی، بکری ایک سال کی، اس سے کم عمر کی قربانی جائز نہیں، ہاں اگر دنبہ یا بھیڑ اتنا موٹا تازہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو چھ مہینے کی عمر والے کی بھی قربانی درست ہے [12]

کانے اور اندھے جانور کی قربانی جائز نہیں۔ اگر ایک کان تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹ گیا یا دُم تہائی یا اس سے زیادہ کٹ گئی (یہ پیدائشی نہ ہوں) تو قربانی درست نہیں۔ اتنا لاغر جس کی ہڈیوں میں مغز نہ ہو یا ایسا لنگڑا جو تین پاؤں سے چل سکتا ہے، چوتھا پاؤں رکھ نہیں سکتا یا اس سے چل نہیں سکتا اس کی قربانی درست نہیں۔ جس کے سارے یا آدھے سے زیادہ دانت نہ ہوں اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں مگر جڑیں سالم نہ ہوں یا خصی ہو اس کی قربانی درست ہے [13]

خنثیٰ جانور جس میں نر و مادہ دونوں کی علامتیں ہوں اور جلّالہ جو صرف غلیظ چیزیں کھاتا ہو یا جس کی ٹانگ کٹی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔ اور اگر جانور خریدنے کے بعد ایسا کوئی عیب پیدا ہو تو اس کے بدلے میں دوسرا جانور خریدے۔ ہاں اگر غریب آدمی ہو جس پر قربانی واجب نہ ہو تو اس کے واسطے درست ہے کہ وہی قربانی کر دے [14]

قربانی کے اوقات (۱) قربانی کا وقت بقرعید یعنی دس ذی الحجہ کی طلوعِ صبح صادق سے بارہویں کے غروبِ آفتاب تک ہے۔ پہلا دن دس ذی الحجہ سب سے افضل ہے، پھر گیارہ ذی الحجہ پھر بارہ ذی الحجہ کا درجہ ہے [15]

(۲) بقرعید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں، ہاں دیہات یا قصبوں والے جہاں

نمازِ عید نہ ہوتی ہو نمازِ فجر کے بعد قربانی کرسکتے ہیں [16]

(۳) رات کو ذبح کرنا بہتر نہیں، شاید اندھیرے میں کوئی رگ نہ کٹے اور قربانی درست نہ ہو [17]

(۴) اگر بارہویں کے غروبِ آفتاب سے پہلے مقیم ہوگیا تو بگر ہوگیا تو قربانی کرنا واجب ہے [18]

(۵) قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اولیٰ ہے ورنہ کسی اور سے بھی کرانا جائز ہے [19]

(٦) قربانی کے جانور کو قبلہ رخ لٹاکر پہلے یہ دعا پڑھے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کہہ کر ذبح کرے اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے: اللّٰھم تقبلہ منّی کما تقبلت من حبیبك محمد و خلیلك ابراھیم علیھم السلام [20]

(۷) زبان سے نیّت کرنا ضروری نہیں، دل کا ارادہ بھی کافی ہے [21]

(۸) اگر قربانی واجب ہو اور قربانی کے دن بغیر قربانی کیے گذر جائیں تو بعد میں بھیڑ یا بکری کی قیمت دیدی جائے اور اگر جانور خرید لیا گیا ہو تو بعینہٖ وہی خیرات کر دیا جائے [22]

گوشت اور کھال کا حکم

(۱) قربانی دینے والا قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے خویش و اقارب، غنی و فقراء سب کو دے سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ کم از کم تہائی حصّہ خیرات کر دے، اس سے کمی نہ کرے [23]

(۲) اگر سات آدمی قربانی میں شریک ہوں تو گوشت اندازے سے نہ بانٹیں بلکہ صحیح تول کر تقسیم کریں ورنہ گناہ ہوگا [24]

(۳) قربانی کی کھال یا اس کی قیمت خیرات کر دیں اور ان لوگوں کو دیں جو زکوٰۃ و صدقہ فطر کے مستحق ہیں۔ قیمت میں جو پیسے ملیں وہی خیرات کر دیں، اگر تبدیل کر کے دیئے تو بُری بات ہے مگر ادا ہو جائیں گے [25]

(۴) کھال کو اپنے کام میں [illegible] مثلاً اس سے رسّی بٹوائی یا چھلنی یا ڈول یا جلد بنوائی۔ (بہشتی زیور)

(۵) گوشت یا چربی یا چمڑا قصائی یا کسی اور کو تنخواہ یا مزدوری میں دینے کا حکم نہیں [27]

(٦) قربانی کی رسّی جھول وغیرہ بھی خیرات کر دینی چاہیئے [28]

(۷) اگر اپنی خوشی سے کسی مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے قربانی کی جائے تو اس قربانی کے گوشت

میں سے کھانا یا کھلانا اور بانٹنا سب درست ہے جس طرح اپنی قربانی کا حکم ہے۔ (بہشتی زیور)[29]

تکبیراتِ تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک شہری مقیم کو ہر نمازِ پنجگانہ کے بعد جو جماعتِ مستحبہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو ایک بار بلند آواز سے تکبیر کہنا واجب ہے اگر زیادہ بار کہے تو افضل ہے اسے تکبیرِ تشریق کہتے ہیں جو یہ ہے: اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ[30]

عید کی سنتیں

حجامت بنوانا، غسل کرنا، اچھے سے اچھا لباس پہننا (جو میسر ہو) سرمہ لگانا، میسر ہو تو خوشبو لگانا۔ اس عید میں نمازِ عید سے پہلے کچھ نہ کھانا چاہیئے بلکہ افضل یہ ہے کہ واپس آکر قربانی کرے اور اس کا گوشت کھائے، اس عید میں عیدگاہ جاتے ہوئے بلند آواز سے یہ تکبیر پڑھے: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ عیدگاہ میں وقت سے پہلے جانا اور شروع صفوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنا، واپسی پر عیدگاہ سے جس راستے سے گیا تھا اس کی بجائے دوسرے راستے سے آنا بھی سنت ہے۔

نمازِ عید کی نیت

دو رکعت نماز عید الاضحیٰ مع چھ تکبیراتِ واجب کے، بندگی اللہ تعالیٰ کی، منہ طرف قبلہ شریف کے، پیچھے اس امام کے،

پہلی رکعت میں ثناء کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھنے سے پہلے امام صاحب تین بار اللہ اکبر کہیں گے، مقتدی بھی اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، پہلی دو بار تکبیر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں اور حسبِ معمول امام صاحب کے ساتھ رکعت پوری کریں۔ دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے تین بار تکبیرات کہیں گے، مقتدی حسبِ سابق اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں، چوتھی بار اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جائیں۔

خطبہ

نمازِ عید کے بعد خطبہ ہوتا ہے جس کا سننا واجب ہے، کچھ لوگ خطبہ ختم ہونے سے پہلے عیدگاہ سے چلے جاتے ہیں، خواہ خطیب کی آواز سنائی دے یا نہ دے خطبہ ختم ہونے تک اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

---

[1] عن عبد اللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یذبح او ینحر بالمصلّی۔ (سنن النسائی ج۲ ص۲۰۳ باب ذبح الامام اضحیتہ بالمصلّی)

[2] عن انسؓ قال ضحّی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکبشین املحین اقرنین ذبحھما

بیدہ ولیسمّی وکبر ووضع رجلہ علیٰ صفاحھما۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۳۵، باب التکبیرات عند الذبح — سُنن النسائی ج ۲ ص۲۰۳ باب الکبش کتاب الاضحیۃ)

۳ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیھا وحاضت بسرق قبل ان تدخل مکۃ وھی تبکی فقال مالکِ اَنُفستِ قالت نعم قال ان ھٰذا امر کتبہ اللہ علیٰ بنات آدم فاقضی مایقضی الحاج غیر ان لا تطوفی بالبیت فلماکنا بمنیً اتیت بلحم بقر فقلت ماھٰذا قالوا ضحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ازواجہ بالبقر۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۳۲ باب الاضحیۃ للمسافر والنساء)

۴ عن مخنف بن سلیم قال کنا وقوفا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعرفۃ فقال یَاَیھا الناس ان علیٰ اھل بیت فی کل عام اضحیۃ وعتیرۃ أتدرون ماالعتیرۃ ھی التی یسمیھا الناس الرجبیۃ۔

(ابن ماجہ ص۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اَم لا)

۵ عن ابی ھریرہؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہٗ سعۃ ولم یضح فلایقربن مصلانا۔ (ابن ماجۃ ص۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اَم لا)

۶ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۱۲۹ باب فی الاضحیۃ۔ الفصل الثالث)

۷ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ماعمل ابن آدم یوم النحر عملاً احبّ الی اللہ عزّوجل من ھراقۃ دم وانہٗ لیاتی یوم القیٰمۃ بقرونھا واظلافھا واشعارھا وان الدم لیقع من اللہ عزّوجل بمکان قبل ان یقع الارض فطیبوابھا نفسا۔ (ابن ماجۃ ص۲۲۶ باب ثواب الاضحیۃ)

۸ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم قالوا فمالنا فیھا یارسول اللہ قال بکل شعرۃ حسنۃ قالوا فالصوف یارسول اللہ قال بکل شعرۃ من الصوف حسنۃ۔

(ابن ماجہ ص۲۲۶)

۹ قال العلامۃ الکاسانیؒ: بشروط وجوب قربانی، الاسلام، الاقامۃ، حریۃ

ولا تجب (علی الصبی) فی ظاهر الروایۃ ولکن الافضل ان یفعل ذلک۔
(بدائع الصنائع ج ۵ ص۶۴ کتاب الاضحیۃ)

لے بہشتی زیور ص۲۵ حصہ تیسرا۔

لہ قال العلامۃ الزیلعیؒ: (والاضحیۃ من الابل والبقر والغنم) لان جواز التضحیۃ بہذہ الاشیاء عرف شرعاً بالنص علی خلاف القیاس فیقتصر علیہا۔
(تبیین الحقائق ج ۶ ص۷ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ویدخل فی کل جنس نوعہ والذکر والانثیٰ منہ الی قولہ والمعز نوع من الغنم والجاموس نوع من البقر بدلیل انہ یضم ذلک الی الغنم والبقر فی باب الزکوٰۃ۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۶۹ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرۃ واحدۃ عن اکثر من سبعۃ ویجوز ذلک عن سبعۃ۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۷ کتاب الاضحیۃ)

۲لہ لما فی الہندیۃ: فلا یجوز شیئ مما ذکرنا من الابل والبقر والغنم عن الاضحیۃ الا الثنی من کل جنس والا الجذع من الضأن خاصۃ اذا کان عظیما الی قولہ قالوا الجذع من الغنم ابن ستۃ اشہر والثنی ابن سنۃ والجذع من البقر ابن سنۃ والثنی منہ ابن سنتین والجذع من الابل ابن اربع سنین والثنی ابن خمس۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص۲۹۷ الباب الخامس)

۳لہ لما فی الہندیۃ: ولا تجوز العمیاء والعوراء البین عورہا الی قولہ ولو ذہب بعض ہذہ الاعضاء دون بعض من الاذن والالیۃ والذنب والعین۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص۲۹۸ الباب الخامس)

وفی جامع انہ اذا کان ذہب الثلث او اقل جاز وان کان اکثر من الثلث لا یجوز۔ وروی ابو یوسف رحمہ اللہ انہ ان کان ذہب الثلث لا یجوز وان کان اقل من ذلک جاز۔ وقال ابو یوسف رحمہ اللہ ذکرت لابی حنیفۃ رحمہ اللہ فقال قولی مثل ذلک۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص۲۹۸ الباب الخامس کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: فلو مہزولۃ لم یجز الی قولہ المہزولۃ التی لا مخ فی عظامہا۔ (شرح تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص۲۲۷ کتاب الاضحیۃ)

۱۳ـہ قال العلامۃ التمرتاشیؒ : ولا بالخنثیٰ لان لحمھا لا ینضج (شرح تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۸ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : والعرجاء التی تمشی بثلاثۃ قوائم وتجافی الرابع عن الارض لا تجوز الاضحیۃ بھا (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۶ کتاب الاضحیۃ)

قال المرغینانیؒ : واما الھتماء وھی التی لا اسنان لھا فعن ابی یوسفؒ انہٗ یعتبر فی الاسنان الکثرۃ والقلۃ وعنہ ان بقی ما یمکن الاعتلاف بہ اجزأ ۔

ویجوز ان یضحی بالجماء وھی التی لا قرن لھا لان القرن لا یتعلق بہ مقصود وکذا مکسورۃ القرن لما قلنا والخصی لان لحمھا اطیب۔ (الہدایۃ ج ۴ ص ۴۴۸ کتاب الاضحیۃ)

قال الحصکفیؒ : واشتراھا سلیمۃ یعتب بعیب مانع من التضحیۃ کان علیہ ان یقیم غیرھا مقامھا ان کان غنیاً وان کان فقیراً یجزیہ ذٰلک لان الوجوب علی الغنی بالشرع ابتداءً لا بالشراء ۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۹ کتاب الاضحیۃ)

۱۵ـہ قال العلامۃ الکاسانیؒ : فلا یجوز لاحد ان یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الاول من ایام النحر ۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۷۳ کتاب الاضحیۃ)

۱۶ـہ وایام النحر ثلاثۃ یوم الاضحی وھو یوم العاشر من ذی الحجۃ الخ ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص ۶۵ کتاب الاضحیۃ)

۱۷ـہ والمستحب ذبحھا بالنہار دون اللیل لانہٗ امکن لاستفاد العروق کذا فی الجوھرۃ النیرۃ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۶ کتاب الاضحیۃ)

۱۸ـہ لما فی الھندیۃ : لو کان مسافراً فی اول الوقت ثم اقام فی آخرہ تجب علیہ ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۲ کتاب الاضحیۃ ۔ باب شرائط الوجوب)

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ : ولو جاء یوم الاضحی ولا مال لہٗ ثم استفاد مائتی درھم ولا دَین علیہ وجبت الاضحیۃ ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۰۹ کتاب الاضحیۃ)

لما فی الھندیۃ : وھٰکذا لو کان فقیراً فی اوّل الوقت ثم ایسر فی آخرہ تجب علیہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۲۹۲ کتاب الاضحیۃ باب حکم الوجوب)

۱۹؎ لما فی الہندیۃ : والافضل ان یذبح اضحیتہ بیدہ ان کان یحسن الذبح لان الاولیٰ فی القربات ان یتولی بنفسہ وان کان لایحسن الذبح فالافضل ان یستعین بغیرہ ولکن ینبغی ان یشھدھا بنفسہ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۵ ص ۳۰۰ کتاب الاضحیۃ۔ الباب الخامس)

۲۰؎ عن جابرؓ قال ذبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین فلما وجھھما قال انی وجھت وجھی الخ (مشکوٰۃ ص ۱۲۸ کتاب الاضحیۃ۔ الفصل الثانی)

۲۱؎ قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولایشترط ان یقول بلسانہ ما نوی بقلبہ کما فی الصلوٰۃ۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۱۹ کتاب الاضحیۃ)

۲۲؎ اذا اوجب شاۃ بعینھا او اشتراھا لیضحی بھا فمضت ایام النحر قبل ان یذبحھا تصدق بھا حیۃ ولا یاکل من لحمھا لانہ انتقل الواجب من اراقۃ الدم الی التصدق وان لم یوجب ولم یشتر وھو موسر وقد مضت ایامھا تصدق بقیمۃ شاۃ تجزی للاضحیۃ۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۶ کتاب الاضحیۃ)

۲۳؎ قال العلامۃ الحصکفیؒ : ویاکل من لحم الاضحیۃ ویوکل غنیاً ویدخر وندب ان لاینقص التصدق عن الثلث۔ (الدر المختار علی رد المحتار ج ۵ ص ۲۲۴ کتاب الاضحیۃ)

۲۴؎ قال العلامۃ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ : سبعۃ ضحوا وارادوا ان یقسموا اللحم بینھم ان اقتسموھا وزنا جاز فان اقتسموھا جزافا ان جعلوا مع اللحم شیئاً من السقط کالراس والاکراع یجوز فان لم یجعلوا لایجوز۔

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۱۵ کتاب الاضحیۃ)

۲۵؎ ولا بأس بالدراھم لیتصدقھا ولیس لہ ان یبیعہ بالدراھم لینفقھا علی نفسہ ولو فعل ذلک یتصدق بثمنہ۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۲۲ کتاب الاضحیۃ)

۲۶؎ ویجوز الانتفاع بجلد الاضحیۃ والھدی والمتعۃ والتطوع بان یتخذہ فروًا او بساطاً او جراباً او غربالا الخ

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۲۱ کتاب الاضحیۃ)

۲۷؎ لما فی الہندیۃ : ولایحل بیع شحمھا واطرافھا وراسھا وصوفھا

وو برها وشعرها ولبنها الـذى يحلبه منها بعشبحها بشئ لا يمكن الانتفاع به إلا باستهلاك عينه من الدراهم والدنانير والماكولات والمشروبات ولا ان يعطى آجر الجزار والذابح منها۔ (الفتاوى الهندية ج ۵ ص۳۰۱ كتاب الاضحية)

۲۸۔ لما فى الهندية: واذ ذبحها تصدق بجلالها وقلائدها كذا فى السراجية۔
(الفتاوى الهندية ج ۵ ص۳۰۱ كتاب الاضحية۔ الباب السادس)

۲۹۔ قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: سئل نصيرؒ عن رجل ضحى عن الميت قال الاجر له والملك لهذا وفى الفتاوى ان كان بامر الميت المختار انه لا يتناول۔ وقال فى باب الباء إن ضحى بغير امره المختار انه يتناول۔
(خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۳۲۲ كتاب الاضحية)

۳۰۔ لما فى الهندية: اما صفته فانه واجب واما عدده وماهيته فهو أن يقول مرة واحدة الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله والله اكبر الله اكبر ولله الحمد۔
وأما شروطه فاقامة ومصر ومكتوبة وجماعة مستحبة واما وقته فاوله عقيب صلوٰة الفجر من يوم عرفة وآخره فى قول ابى يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ عقيب صلوٰة العصر من آخر ايام التشريق والفتوىٰ على قولهما۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۵۲ الباب السابع)
ويستحب يوم الفطر للرجل الاغتسال والسواك ولبس احسن ثيابه ويستحب التختم والتطيب واستحب فى عيد الفطر ان يأكل قبل الخروج الى المصلى الاكل قبل صلوٰة يوم الاضحى لا يكره لكن يستحب له أن لا يفعل ويستحب ان يكون أول تناولهم من لحوم الأضاحى ويكبر فى الطريق فى الأضحى جهرًا۔
وكيفية صلوٰتها: ان ينوى صلوٰة العيد بقلبه ويقول بلسانه أصلى صلوٰة العيد لله تعالىٰ الخ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص۱۴۹ باب صلوٰة العيدين)
ثم يكبر للتحريمة ...... ثم يكبر الامام والقوم تكبيرات الزوائد ثلاثًا يرفع يديه للامام والقوم فى كل منها ثم يكبر الامام والقوم تكبيرات الزوائد ثلاثًا ويرفع يديه فيها كما فى الركعة الاولىٰ۔ (طحطاوى ص۲۹۱ باب العيدين)

⊞ ⊞

کتاب الوصیة

ان الله تعالى تصدق عليكم

بثلث اموالكم زيادة في

اعمالكم فضعوها حيث شئتم

کتاب الوصیّۃ

(وصیّت کے احکام و مسائل)

وارث کے لیے وصیت کرنا باطل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے کل مال کی وصیت پوتے کے لیے کر دی جبکہ اس کی پوتیاں اور بہنیں بھی موجود ہیں، تو کیا یہ وصیت شرعاً درست اور نافذ ہوگی یا نہیں؟ تفصیلاً جواب مطلوب ہے؟

الجواب:۔ ورثاء کے حقوق قانونِ وراثت کے مطابق متعین ہیں، اور مورث ورثاء کو وصیت کر کے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی کا حق نہیں رکھتا، جس وارث کے لیے وصیت کی جائے اس کی تنفیذ دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اگر دیگر ورثاء اجازت نہ دیں تو وصیت کالعدم رہے گی تاہم بصورتِ اجازت وصیت پر عمل کرنے کے اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام: ان اللّٰہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقّہ اَلا لا وصیۃ لوارث ولانہ یتأذی البعض بایثار البعض ففی تجویزہ قطعیۃ الرّحم ولانہ حیف بالحدیث الّذی رویناہ۔

(الھدایۃ ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا) [1]

نابالغ اولاد کی شادیاں کرانے کیلئے وصیت کا حکم

سوال:۔ زید نے اپنی بالغ اولاد کی شادیاں کر دی ہیں، کیا وہ اپنی نابالغ اولاد کی شادی کے لیے اپنی جائیداد میں سے شرعاً کسی حصہ کی وصیت

---

[1] عن عمرو بن خارجۃ خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ان اللّٰہ قد اعطی کل ذی حق حقہ اَلا لا وصیّۃ لوارث۔

(سنن النسائیؒ ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا، باب ابطال الوصیۃ للوارث)

کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اولاد کی شادیاں کرانا والد کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ احسان کا معاملہ ہے زندگی میں تو باپ کو اپنی جائیداد میں تصرّف کا مکمل اختیار حاصل ہے، لیکن مرنے کے بعد اولاد کے لیے ایسے اضافی اخراجات کی وصیت کالعدم رہے گی۔

کما قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: إِنَّ اللّٰہَ أَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ أَلَا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ۔

(سنن النسائی ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا باب ابطال الوصیۃ للوارث) ؎۱

وصیّت مملوکہ جائیداد میں نافذ ہے

سوال:۔ زید نے بکر کے لیے اپنی جائیداد میں پانچویں حصے کی وصیت کی، پھر اپنے بیٹے خالد کو بعض جائیداد متفرق جگہوں میں دے دی، تاہم وفات کے وقت اس کی ملکیت میں کچھ جائیداد ضرور تھی، کیا ایسی حالت میں وصیّت تمام جائیداد میں نافذ ہو گی جس میں بیٹے کو دی ہوئی جائیداد بھی شامل ہے یا صرف موت کے وقت مملوکہ جائیداد میں وصیّت نافذ ہو گی؟

الجواب:۔ وصیّت درحقیقت مرتے وقت نافذ ہوتی ہے اس لیے موت کے وقت جو جائیداد باقی ہو اس میں وصیت معتبر ہو گی، چونکہ موت سے قبل وصیت کرنے والا اپنی جملہ جائیداد میں مالکانہ تصرّفات کا حق محفوظ رکھتا ہے اس لیے اُسے وصیت سے قولاً یا عملاً رجوع کا حق بھی حاصل ہے، لہٰذا بیٹے کو جو جائیداد زندگی میں دی ہو وہ اُس کی ملکیّت ہو گی البتہ باقیماندہ جائیداد سے پانچواں حصہ موصٰی لہٗ کو دیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث مابقی بعد الدّین۔

(مقدمۃ السراجی ص۳) ؎۲

؎۱ لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللّٰہ:۔ ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السّلام: ان اللّٰہ اعطی کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث۔

(الھدایۃ ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا)

؎۲ وفی الھندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث مایبقی بعد الکفن والدّین۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض) ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ کتاب الفرائض۔

کل مال کے ثلث سے زائد میں وصیت معتبر نہیں

سوال:- ایک عورت نے زندگی میں اپنی کل جائیداد غیر منقولہ رائج الوقت ملکی قانون کے تحت بذریعہ رجسٹری محلہ کی مسجد کے لیے اس شرط کے ساتھ وقف کی کہ میری وفات تک یہ جائیداد میری رہے گی، میرے مرنے کے بعد کل اثاثہ یعنی سوئی سلائی تک مسجد کی ملکیت ہوگی، اور اس بات کے گواہ بھی موجود ہیں۔ جبکہ مرحومہ کے ورثاء میں ماموں زاد بھائی کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جس کے بارے میں مرحومہ نے بتایا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو جو کچھ دینا تھا وہ اپنے ہاتھوں سے دے دیا ہے اب اسے اور کچھ نہ دوں گی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مرحومہ کی موت کے بعد اس کے رشتہ داروں کو کچھ ملے گا یا نہیں؟ یا اس کا جملہ اثاثہ مسجد کے لیے ہی وقف ہوگا؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا یہ وقف وصیت سے متعلق ہے اور وصیت کل مال کے ثلث سے زائد میں معتبر نہیں۔ یعنی کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کا صرف ۱/۳ حصہ مسجد کے لیے وقف ہوگا اور ۲/۳ حصہ میں ارث جاری ہوگی، کیونکہ وصیت کے ذریعے کوئی اپنے ورثاء کو میراث سے محروم نہیں کرسکتا۔

قال العلامۃ محمد علاؤ الدین افندیؒ: الارث جبری لایسقط بالاسقاط۔

(تکملۃ ردالمحتار ج۱ ص۳۵۹ مطلب واقعۃ الفتوی۔ کتاب الدعوی)

قال العلامۃ السجاوندیؒ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔

(مقدمۃ السراجی ص۳)[1]

میت کی زبانی وصیت سے مسجد پر خرچ کرنا

سوال:- زید نے وفات سے دو ماہ قبل مسجد کے لیے دس ہزار روپے دینے کا کہا تھا جن میں سے اس نے دو سو پچاس روپے مسجد پر خرچ بھی کر دیئے لیکن بقیہ رقم وفات تک وہ کسی وجہ سے خرچ نہ کرسکا، تو کیا مرحوم کے ترکہ سے یہ رقم مسجد پر خرچ

---

[1] وفی الھندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الکفن والدین ......
ثم یقسم الباقی بین الورثۃ علی سہام المیراث۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض)

کی جائے گی یا نہیں، جبکہ مرحوم کی وصیت پر گواہ بھی موجود ہیں؟

الجواب: اگر مرحوم کی وصیت کے بارے میں اس کے ورثاء اقرار کرتے ہوں یا اس پر گواہ موجود ہوں اور جائیداد متروکہ کے ثلث سے اس کی ادائیگی ممکن ہو تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

قال العلامة السجاوندی رحمہ اللہ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔ (مقدمۃ السراجی ص۳) [1]

وصیت کی وجہ سے وارث حقِ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال: ایک عورت جو کہ لاولد ہے نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری زرعی جائیداد اور مکان میرے دونوں دیوروں کو برابر برابر دیدی جائے کیونکہ ان دونوں نے میری بیماری پر کافی مال خرچ کیا ہے اور آئندہ بھی میری تجہیز و تکفین پر خرچ کریں گے، اس لیے میرے کسی دوسرے اقارب کو میری جائیداد میں کوئی حق حاصل نہیں، جبکہ اس کی وفات کے بعد اس کے دو چچازاد بھائی زندہ ہیں، تو کیا شرعاً ان دونوں کو مرحومہ کی میراث میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب: شریعت کے مطابق کفن و دفن پر جو خرچ ہوگا وہ ترکہ سے لیا جائے گا اور باقی جائیداد کے ثلث سے وصیت پوری کی جائے گی اس لیے کہ ثلث سے زیادہ وصیت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں اور بقیہ مال ورثاء پر تقسیم ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کے دونوں دیوروں کو ثلث مال ملنے کے بعد باقی مال اس کے دونوں چچازاد بھائیوں کا ہوگا۔

قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ مرتبۃ الاول یبدأ بتکفینہ وتجہیزہ من غیر تبذیر ولا تقتیر..... ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین ثم یقسم الباقی بین ورثتہ بالکتاب والسنۃ والاجماع الامۃ۔ (مقدمۃ السراجی ص۳) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن البزاز رحمہ اللہ: وتبرعات المریض کالھبۃ والصدقۃ........ من الثلث۔ (البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۳۴ کتاب الوصایا)

[2] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: قال ولا تجوز بما زاد علی الثلث لقول النبی علیہ السلام فی حدیث سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ الثلث والثلث کثیر۔ (الھدایۃ ص۶۵۳ کتاب الوصایا۔ باب صفۃ الوصیۃ)

وصیّت صرف ثلث مال میں نافذ ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص زندگی میں ہی اپنے مال کی وصیّت کرے تو اس کی وصیّت کتنے مال میں نافذ ہوگی یا کہ اس کا جملہ مال وصیّت کے مطابق خرچ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ وصیّت میت کے کل مال کے صرف ثلث میں جاری ہوگی یعنی میت کی وصیّت کو اس کے ثلث مال سے پورا کیا جائے گا اور باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشیدؒ : ثمّ تُقضٰی دیونُہٗ من جمیع مابقی من مالہ ثمّ تنفذ وصایاہ من ثلثِ مابقی بعد الدَّین الخ

(السراجی ص۳) ؎۱

وصیّت سے رجوع صحیح ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مال میں مخصوص حصہ کی وصیّت کرے اور اسے اسٹامپ پر تحریر بھی کر دے لیکن چند دن بعد وصیت کرنے والا کچھ ذاتی ناراضگی کی وجہ سے وصیّت سے رجوع کر لیتا ہے، تو کیا اس شخص کا وصیّت سے رجوع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیّت سے رجوع کرنا صحیح ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب وصیّت کنندہ نے اپنے وصیّت نامہ سے رجوع کر لیا تو بعد الموت وصی کو کچھ نہیں ملے گا۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ : ویجوز للموصی الرجوع عن الوصیّۃ واذا صرح بالرجوع اوفعل مایدل علی الرجوع کان رجُوعًا ۔ (الہدایۃ ج۴ ص۶۴۴ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیّۃ مایجوز من ذٰلک الخ) ؎۲

؎۱ وفی الہندیۃ : ثمّ تنفذ وصایاہ من ثلث مایبقٰی بعد الکفن والدَّین الّا ان تجیز الورثۃ اکثر من الثلث الخ۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض الباب الاول فی تعریفہا وفیما یتعلق بالترکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج۴ ص۶۵۱ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیۃ مایجوز من ذٰلک الخ۔

؎۲ وفی الہندیۃ : ویصح للموصی الرجوع عن الوصیّۃ ثمّ الرجوع قد یثبت صریحاً وقد یثبت دلالۃ الخ۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج۶ ص۹۲ کتاب الوصایا۔الباب الاول فی تفسیرہا وشرط جوازہا وحکمہا الخ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی قاضیخان ج۴ ص۴۳۲ کتاب الوصایا۔ فصل فیما یکون رجوعاً عن الوصیۃ الخ

غیر مسلم کو وصیّت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک مسلمان کا اپنے مال میں کسی غیر مسلم کے لئے وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو یہ وصیت کتنے مال میں جاری ہوگی؟

الجواب:۔ اسلام میں وصیت کا دائرہ وسیع ہے مسلمان کے علاوہ غیر مسلم کے لئے بھی وصیت کرنا درست ہے اور اس کا اجراء صرف ثلث مال میں ہوگا۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: اما کونه مسلماً فلیس بشرط حتٰی لوکان ذمیًا فاوصی لهٗ مسلم او ذمی جاز۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۴۱ کتاب الوصایا) [1]

اثباتِ وصیت کے لیے شہادت ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے یہ دعوٰی کیا کہ فلاں شخص نے میرے لیے اتنے مال کی وصیت کی ہے جبکہ مرحوم کے ورثاء اس وصیت کے منکر ہیں مگر مدعی کے پاس گواہ موجود ہیں، تو کیا شرعاً ورثاء کا انکار مرحوم کی وصیت کو ختم کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر معاملات اور عقود کے اثبات کیلئے گواہوں کی گواہی موجبِ اثبات ہے بالکل اسی طرح وصیّت بھی گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے گی اور اس سے ورثاء کے انکار کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔

لما قال العلامۃ الدکتور وهبۃ الزحیلی: وتثبت الوصیّۃ بطرق الاثبات الشرعیۃ کالشهادۃ والکتابۃ۔

[الفقه الاسلامی وادلته ج ۸ ص۱۲۶
البحث السابع اثبات الوصیّۃ]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویجوز ان یوصی المسلم للکافر والکافر للمسلم فالاوّل لقوله تعالٰی: لاینهاکم اللّٰه عن الّذین لم یقاتلوکم فی الدین۔

(الهدایۃ ج۴ ص۶۴۱ کتاب الوصایا)

موصی لہ کا موصی سے پہلے وفات پاجانے پر وصیت کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ایک دوست کے لیے ایک قطعہ اراضی کا وصیت نامہ لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین تمہاری ہے، لیکن والد صاحب کا یہ دوست ان کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا، اب میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوست کے بیٹے اس قطعہ اراضی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا شرعاً ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ وصیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ موصی لہ وصیت کرنے والے کی وفات تک زندہ ہو تب وہ وصیت کا اہل ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر اگر موصی لہٗ وصیت کرنے والے کی زندگی میں ہی فوت ہوجائے تو وصیت باطل ہوجائے گی، اس لیے صورتِ مسئولہ میں وصیت کا مال وصیت کرنے والے کا حق ہے موصی لہٗ کی اولاد کا دعویٰ استحقاق درست نہیں۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللّٰہ: وتبطل بموت الموصی لہ قبل موت الموصی لان العقد وقع لہ لا لغیرہ فلا یمکن ایقاء علیٰ غیرہ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۹۴ کتاب الوصایا، فصل تبطل الوصیۃ)[1]

وصی کو معزول کرنا جائز ہے

سوال: ۔ اگر کوئی شخص کسی کو وصی مقرر کرے اور پھر چند دنوں کے بعد اس کو معزول کر کے کسی اور کو وصی مقرر کرے تو کیا شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایک دفعہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد پھر اس کو معزول کر سکے؟

الجواب: ۔ موصی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد

---

[1] قال العلامۃ وھبہ الزحیلی: موت الموصی لہ المعین قبل موت الموصی تبطل بہ الوصیۃ باتفاق المذاھب الاربعۃ لان الوصیۃ عطیۃ و قد صادفت المعطی میتاً فلا تصح کالھبۃ للمیّت۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۸ ص۱۱۶ المبحث الرابع مبطلات الوصیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۴۵۳ کتاب الوصایا۔

پھر اس کو معزول کر دے لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وصی کو اس کی معزولی کی اطلاع ہو جائے ۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: فالوصیۃ تبطل بالنص علی الابطال....اما النص فنحو ان یقول ابطلتُ الوصیۃ التی اوصیتہا لفلان او فسختھا او نقضتھا الخ ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۹۴ کتاب الوصایا ، فصل بیان ما تبطل بہ الوصیّۃ) ؎۱

وصیت کی ملکیت کے لیے قبول کرنا ضروری ہے

سوال :۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مرنے کے بعد ایک مخصوص مال کی وصیت کر جائے تو کیا اس شخص کی صرف وصیت سے موصی لہٗ اس مخصوص مال کا مالک بن جائے گا یا اس کا قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہے ؟

الجواب :۔ وصیت ایک عقد ہے اور حنفیہ کا اصول ہے کہ ہر عقد کی تکمیل کے لیے قبول کرنا ضروری ہوتا ہے ، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی مُوصی لہٗ کا وصیت کو قبول کرنا لازمی امر ہے بدون اس کے وہ اُس چیز کا مالک نہیں بن سکتا ، لیکن قبول کرنے میں واضح الفاظ کا کہنا ضروری نہیں نفس قبضہ میں لینا بھی کافی ہے ۔

قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: حکم الوصیۃ بمعنی الاثر المترتب علی الشئ ھو انتقال ملکیۃ الموصی بہ الی الموصی لہ مِلکاً جدیداً بقبول الموصی لہٗ بعد وفاۃ الموصی وبہ تلزم الوصیۃ بالاتفاق ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۸ ص۲۲ کتاب الوصایا ، وقت ثبوت ملکیۃ الموصی بہ) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی ، والرجوع اما ان یکون صریحًا او دلالۃ فالرجوع الصریح: ما کان بلفظ ھو نص فی الرجوع مثل قول الموصی رجعت عن وصیتی لفلان او ترکتھا او ابطلتھا او نقضتھا او ما اوصیت بہ لفلان ھو لورثتی ونحوہ ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۸ ص۱۱۴ المبحث الرابع ، مبطلات الوصیۃ)

؎۲ قال العلامۃ الکاسانیؒ: وملک بدون القبول اوبدون عدم الرد ووقوع الیاس عنہ ولم یوجد القبول منہ ولا وقع الیاس عن الرد ما دام حیا فلا یعتق ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۳۲ کتاب الوصایا ، فصل رکن الوصیّۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۶ ص۹ کتاب الوصایا ، الباب الاول ۔

مبہم وصیّت کا حکم | سوال :۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ سے وصیت کرے کہ میرے مال سے کچھ حصہ فلاں شخص کو دیدیا جائے مگر اس نے اس مال کی تعین نہ کی ہو تو کیا وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد موصیٰ لہٗ کو وہ مبہم مال دیا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :۔ شرعاً تو ایسی وصیت صحیح ہے البتہ ابہام کی وجہ سے وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد اس کا تعین ورثاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ موصی لہٗ کو جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، تاہم اگر وصیت کرنے والے نے اپنی زندگی میں ہی اس مال کو متعین کر دیا ہو تو بعد الموت وہی مال دینا پڑے گا بشرطیکہ وہ مال میت کے کل ترکہ کے ثلث سے زیادہ نہ ہو۔

قال العلامة الكاساني رحمه الله : منها ما اذا أوصى لرجل بجزء ماله او بنصيب من ماله او بطائفة من ماله او ببعض او بشقص من ماله فان بين في حياته شيئًا والا اعطاه الورثة بعد موته ماشاء والان هذه الالفاظ تحتمل القليل والكثير فيصح البيان فيه ما دام حيا ومن ورثته اذا مات لانهم قائمون مقامه۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۵۶ كتاب الوصايا، فصل شرائط الوصية)

مجنون (پاگل) اور نابالغ کی وصیّت کا حکم | سوال :۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی مجنون یا نابالغ کسی کے لیے وصیت کر جائے تو کیا اس کے مرنے کے بعد موصی لہٗ اُس مال کا مالک متصور ہو گا یا نہیں ؟

الجواب :۔ نابالغ اور مجنون چونکہ تصرفات کا حق نہیں رکھتے اس لیے شرعاً ان کی وصیت کا بھی کوئی اعتبار نہیں ،لہٰذا مجنون کی وصیت سے موصی لہٗ اس مال کا مالک متصور نہ ہوگا۔

قال العلامة الكاساني رحمه الله : ومنها ان يكون من اهل التبرع في الوصية بالمال ومايتعلق به لان الوصية بذلك تبرع بايجابه بعد موته فلا بد من اهلية التبرع فلا تصح من الصبي والمجنون لانهما ليسا من

اهل التبرع لکونه من التصرفات

(البدائع والصنائع جلد ۷ ص۳۳۴ کتاب الوصایا، فصل فی الشرائط م) لـه

پوتے کے لیے وصیت کا حکم

سوال:۔ اگر دادا پوتے کے لیے اپنے بیٹوں کے برابر حصہ میراث کی وصیت کرے تو کیا اس کی وصیت پوتے کو چچوں کے برابر حصۂ میراث ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کے لیے وصیت کرنا اگرچہ صحیح ہے مگر یہ وصیت میت کے ثلث مال میں جاری ہوگی، ثلث مال سے زیادہ پوتے کو نہیں ملے گا۔ تاہم اگر ثلث مال اتنا ہو کہ بیٹوں کے حصص کے برابر بنتا ہو تو وصیت کے مطابق برابر حصہ ملے گا، مثلاً مرحوم کے دو بیٹے اور ایک پوتا ہو تو مال کے تین حصے کرکے ایک ایک حصہ ہر ایک کو ملے گا۔

کما فی الہندیۃ: یعتبر کونه وارثا اوغیر وارث وقت الموت لا وقت الوصیّة حتی لواوصی لاخیه وھو وارث ثم ولد له ابن صحت الوصیة للاخ ولو اوصی لاخیه وله ابن ثم مات الابن قبل موت الموصی بطلت الوصیّة للاخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص۹۰ کتاب الوصایا۔ الباب الاول)۔

وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنے کسی دوست کے لیے کچھ مال کی وصیت کرے لیکن مرنے سے پہلے اس کو منسوخ کر دے، تو کیا اس شخص کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیت چونکہ امر استحبابی ہے اس لیے اگر موصی وصیت کرنے کے بعد اس سے رجوع کرلے اور اپنی ماقبل وصیت کو باطل کردے تو یہ اس کا شرعاً حق بنتا ہے اور اس رجوع سے وہ وصیت باطل ہو جائے گی، چاہے رجوع

لـه وفی الہندیة: ولا تصح الوصیة الا ممن یصح تبرعه فلا تصح من المجنون والمکاتب والماذون الخ۔ (الفتاوی الہندیة ج ۶ ص۹۲ کتاب الوصایا، الباب الاول)

قولاً ہو یا عملاً یا تحریراً۔

قال العلامة الکاسانیؒ: الموصی حتی یملك الرجوع عنه ما دام حیا لان الموجود قبل موته مجرد ایجاب، وانه یحتمل الرجوع فی عقد المعاوضة فهی بالتبرع اولی۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۷۸ کتاب الوصایا، فصل صفة هذا العقد)[1]

موصی بہ پر صرف قبضہ کرنا بھی کافی ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! وصیت کو قبول کرنے کے لیے "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنا ضروری ہے یا کہ صرف موصی بہ قبضہ کر لینے سے موصی لہٗ کی قبولیت پوری ہو جائے گی؟

الجواب: "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنے سے جس طرح قبول کرنا پورا ہوتا ہے تو اسی طرح دلالۃً وفعلاً جو قبول کرنے کو واضح کرتے ہوں سے بھی پورا ہوتا ہے الفاظ سے قبول کرنا ضروری نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وفی البدائع رکنها الایجاب والقبول وقال زفر الایجاب فقط قلت والمراد بالایجاب ما یعم الصریح والدلالة بأن یموت الموصی له بعد موت الموصی بلا قبول۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص۶۵۰ کتاب الوصایا)[2]

وصی کا موصی کے انتقال کے بعد وصیت کو رد کرنا

سوال: ایک صاحب نے کسی کو اپنا وصی بنایا اور اُس نے

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی: تبطل الوصیة باسباب اما من الموصی کرجوعه عن الوصیة او زوال اهلیته او ردته۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۸ ص۱۱۲ المبحث الرابع، مبطلات الوصیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۶ ص۹۳ کتاب الوصایا، الباب الاول۔

[2] وفی الهندیة: ویشترط فی الوصیة القبول صریحًا او دلالة وذلك بان یموت الموصی له قبل الرد والقبول فیکون موته قبولاً فترثها ورثته۔
(الفتاوی الهندیة ج ۶ ص۹۰ کتاب الوصایا، الباب الاول فی تفسیرها)

قبول بھی کر لیا اور اس بات پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہا، اب وہ موصی کی وفات کے بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے، تو کیا وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک آدمی کسی شخص کو وصی مقرر کرے اور وہ وصیت کو قبول کرکے اس پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہے تو وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد وصی ہونے کی ذمہ داری کو پورا کرنا اس پر لازم ہوگا اور وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

قال العلامة محمد الطوری رحمہ اللہ: واذا اوصی الیہ فقبل قبل موتہ اوبعدہ ثم رد لم یخرج لان الموصی ما اوصی الا الی من یعتمد علیہ من الاصدقاء والامناء الخ۔ (البحر الرائق ج۸ ص۴۵۷ کتاب الوصایا)

بیٹے کی موجودگی میں بھائی کے لیے وصیت کرنا

سوال:۔ ایک بھائی غریب اور نادار ہے جبکہ دوسرا بھائی امیر و مالدار ہے، دونوں بھائیوں کی اولاد بھی موجود ہے۔ اب اگر مالدار بھائی اپنے غریب بھائی کے لیے اپنے مال میں سے کچھ مخصوص رقم کی وصیت کرے تو کیا اپنی اولاد کی موجودگی میں بھائی کے حق میں وصیت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائی اگرچہ وارث ہے مگر اپنی اولاد یعنی بیٹوں کی موجودگی میں وہ بمنزلہ اجنبی کے ہے جبکہ شریعتِ مطہرہ میں اجنبی کے لیے ایک تہائی مال تک کی وصیت جائز ہے، لہٰذا بیٹوں کی موجودگی میں غریب بھائی کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے، البتہ اگر مخصوص مال کل مال کے ایک تہائی سے متجاوز ہو تو وہ ورثاء کے اختیار میں ہوگا۔

وفی الھندیۃ: یعتبر کونہ وارثا اوغیر وارث وقت الموت لا وقت الوصیۃ حتی لو اوصی لاخیہ وھو وارث ثم ولد لہ ابن صحت الوصیۃ للاخ ولو اوصی لاخیہ ولہ ابن ثم مات الابن قبل موت الموصی بطلت الوصیۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۹۰ کتاب الوصایا۔الباب الاول)

شیخ احمد کی طرف منسوب وصیّت نامہ کی شرعی حیثیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءدین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ گذشتہ کافی عرصہ سے پاک وہند میں بار بار ایک وصیت نامہ شائع ہورہا ہے جس کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ رسولِ مقبول علیہ السلام کے نام سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ یہ وصیت نامہ بصورتِ اشتہار مختلف عنوانات سے بار بار مختلف مضامین کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور سادہ لوح مسلمانوں کو ترغیب وترہیب دے دے کر اس کی تشہیر واشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ کیا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے؟ اور کیا ایک ایسے غیر یقینی طریقے سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اس کا منسوب کرنا جائز ہے؟ اس اشتہار (وصیت نامہ) کی شرعی حیثیت اور شرعاً اس کی اشاعت پر روشنی ڈالیں؟

الجواب:۔ مذکورہ وصیت نامہ بشکل اعلان واشتہار نصف صدی سے مختلف امصار و بلاد میں بار بار چھپ رہا ہے اور اس کے مندرجات کے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے علماء کرام نے بار بار اس کی تردید کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس قسم کے وصیت نامے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، کیونکہ اس کے مندرجات بالکل بیہودہ، غلط اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ آج سے کافی عرصہ قبل حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمتہ نے اس من گھڑت کہانی کی سختی سے تردید کی۔ چنانچہ اس بارہ میں ان کا مفصل فتویٰ امداد الفتاوی جلد ۴ ص ۵۰۶، ۵۰۷ پر موجود ہے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی اور جہالت کا نتیجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے یقینی ثابت شدہ اور قطعی ارشادات وتعلیمات (جو کہ بشکل قرآن وسنت مدوّن ومنضبط موجود ہیں) کی ترویج واشاعت کی طرف تو توجہ نہیں مگر دوسری طرف علماء کرام کے بار بار اعلانات اور وضاحتوں کے باوجود ایک بے سروپا اور بے ثبوت افسانے کی ترویج واشاعت میں ایک دوسرے سے سبقت لے کر دانستہ ونادانستہ وعیداتِ نبوی کے مصداق بن رہے ہیں ارشادِ نبوی ہے:۔

من کذب علیّ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ (الحدیث)

(ترجمہ) "جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا پس وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنائے"۔

یہ اور اس کے علاوہ بیشمار نصوص و احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ کریمؐ اور مذہب کے نام منسوب رطب و یابس پر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے عمل نہیں کرنا چاہیئے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات و ارشادات کو دروغگوئی اور جعلسازوں کی دسیسہ کاریوں اور من گھڑت باتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کے اسلاف نے فنِ حدیث، فنِ اصولِ حدیث، فنِ اسماء الرجال کے ناموں سے عظیم الشان علوم و فنون مدوّن کئے اور محدّثین نے ایک ایک روایت کو شریعت و عقل، فہم و درایت، ادراک و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح و ضعیف کو ایک دوسرے سے جدا کر کے رکھ دیا اور معمولی قرائن کی وجہ سے بھی جو روایت کے خلافِ شرع ہونے پر دال تھے احادیث کو موضوع کہہ دیا۔ ایک طرف اتنی حزم و احتیاط، اتنا تقویٰ اور دینی بصیرت کی یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف یہ ہمارے سادہ لوح مسلمان بھائی اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے ایک موضوع، بے اصل اور من گھڑت وصیّت نامہ کی اشاعت میں دن رات مصروف ہیں، حالانکہ معمولی توجّہ اور عقل و دانش سے کام لیا جائے تو اس کا خلافِ اصل اور بے سند و دلیل ہونا واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل ہے محض ایک فرضی نام سے منسوب کردہ ایسے مضامین کی کیا حیثیت ہے جو از روئے شرع قرآن و سُنّت کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ مثلاً ان مختلف النوع وصیّت ناموں سے بعض منتخب باتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں:-

(ا) اس وصیّت نامہ کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ نبوی کی طرف کی جاتی ہے (الف) اور یہ ہمیشہ اسی نام اور لقب سے شائع ہوتا ہے، حالانکہ آج تک شیخ احمد کے نام سے روضۂ اقدس کا کوئی خادم نہیں گذرا۔ (ب) اور پھر تعجّب ہے کہ یہ ایک ہی شخص اتنی بڑی عمر پاوے (ج) پھر یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ ایک شخص کے علاوہ کسی اور خادمِ روضۂ نبوی یا عالمِ اسلام کے دیگر اکابر اولیاء، بزرگانِ دین اور عبادِ مقرّبین کو خواب میں اس قسم کی وعیدات و تہدیدات اور وصیّت کیوں نہیں کی گئی؟ (د) اور اگر بالفرض یہ قصّہ صحیح بھی ہوتا تو خود حرمین الشریفین (مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ) میں اس کی شہرت زیادہ ہونی چاہیئے تھی؟ حالانکہ پوری دنیا سے مسلمانوں کی آمد و رفت اور رسل و رسائل کے باوجود وہاں اس وصیّت نامے کا نام و نشان بھی نہیں، اور اگر اس قصّہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہیں خواب دیکھنے والے نے یہ قصّہ سنایا اور پھر کن راویوں نے کن وسائط سے یہ واقعہ

ہندوستان تک پہنچا اور یہاں کس ثقہ اور معتمد شخص نے اسے سُنا اور پھر کس نے اس کے اردو تراجم کر کے لوگوں میں اس کی اشاعت کی؟ ظاہر ہے کہ ایک ایسی روایت جس کا نہ راوی معلوم ہے نہ سند اور نہ درمیانی وسائط، اور نہ اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے محض ایک من گھڑت اور تراشیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جعلی یا موضوع ہدایت کی اشاعت و روایت نصاً اور اجماعاً حرام ہے بلکہ بعض محدثین کے نزدیک تو کفر ہے۔

(۲) اس میں لکھا ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ساٹھ ہزار آدمی مرے جن میں سے کوئی بھی ایمان دار نہ تھا۔ اور بعض وصیت ناموں کے مطابق سترہ لاکھ مسلمان کلمہ گو مرے اور ان میں صرف سترہ آدمی صحیح مسلمان تھے۔

یہ مضمون بھی اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی ارشادات کے خلاف ہے ارشادِ خداوندی ہے:۔

وسعت رحمتی علیٰ غضبی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

نیز ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی اکثر مسلمان توبہ کر کے اور کلمہ پڑھتے ہوئے مرتے ہیں جو خاتمہ بالخیر ہونے کی علامت ہے۔

(۳) اسی طرح اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ "تارک الصلوٰۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں"۔ یہ حکم صاف طور پر حدیث کے خلاف ہے، ارشادِ نبوی ہے: صلّوا علیٰ کلّ برّ و فاجر۔ یعنی ہر نیک اور بدکار مسلمان پر نمازِ جنازہ پڑھو۔

(۴) اس میں علاماتِ قیامت اور قربِ قیامت کے ضمن میں بعض ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا روایات واحادیث میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، مثلاً:۔

(الف) ایک ستارہ آسمان پر طلوع ہوگا (ب) قرآن مجید کے حروف اڑ جائیں گے۔

(۵) اس میں بعض ایسی چیزوں کی ترغیب و تعلیم ہے جن کا حرام اور بدعت قطعی ہونا بدلائلِ شرعیہ ثابت ہو چکا ہے، مثلاً:۔

(الف) تخصیص شربت کی شہدائے کربلا کے واسطے (ب) اور کھیر حضرت خاتونِ جنت رض کے واسطے (ج) اور پلاؤ حضرت غوث الاعظم رح کے واسطے۔

(۶) اسی طرح آجکل کے مروجہ مولود شریف اور قوالیاں جو کہ تمام شرع و عقل کے خلاف ہیں جیسا کہ اس وصیت نامہ کے بارے میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۵۰۷

یں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

(۷) اس میں بعض ایسی چیزیں ذکر ہیں جن سے (العیاذ باللہ) خاکم بدہن حضور فخر کائنات سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین وتحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور حضورؐ کی شان شفاعتِ کبریٰ ورحمۃ للعالمینی اور محبوبیت ومقبولیت بارگاہِ خداوندی پر زد پڑتی ہے، مثلاً:۔

"جس نے اس وصیت نامہ کی تشہیر کی اس کی اور اس کے پورے خاندان کی شفاعت کی جائے گی اور انہیں جنت میں جگہ دلوائی جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا" گویا محض ایک فرضی خواب کی وجہ سے مسلمانوں کی نجات وشفاعت کے لیے ایک ایسی شرط لازمی کر دی گئی ہے جس کا نہ قرآن میں ذکر ہے نہ احادیث میں۔

اگر واقعی ایمان کی مقبولیت اور انسان کی مغفرت وشفاعت کے لیے اس وصیت نامہ کی تشہیر ضروری قرار دی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کروڑوں مسلمان، علماء وصلحاء، اہل اللہ اور بزرگانِ دین سب کے سب محروم الشفاعت اور مستحق جہنم ٹھہریں گے جنہوں نے اس وصیت نامہ کی تشہیر نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں؛ اس من گھڑت اور بے سروپا داستان کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔

ایک اور وصیت نامہ جو کہ ملتان سے مشتہر کیا گیا ہے اس میں حسب ذیل عبارتیں موجود ہیں:۔

(الف) اے شیخ احمد میں خدائے عزوجل سے بہت شرمندہ ہوں۔

(ب) اس وجہ سے میں خداوند کریم اور فرشتوں کو منہ نہیں دکھا سکتا۔

(ج) اے شیخ احمد میری امت کو کہہ دے کہ تمہاری بدولت خداوند کریم سے بہت شرمندہ ہوں۔

(د) میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اپنے خدا سے معافی چاہتا ہوں، اے شیخ احمد تو بھی یہ وصیت نامہ لوگوں پہنچا دے تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔ (ملاحظہ ہو مختلف طبقوں کے علماء کا فتویٰ مطبوعہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ص۱۶ ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء)

اس قسم کے جملوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس، شانِ شفاعت اور وجاہت وعظمت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلام دشمن آریوں اور عیسائیوں کی سازش معلوم ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضۂ رسالت اور تبلیغ کی ذمہ داریوں کو بالکل واحسن اور انتہائی تمام وکمال سے ادا کر کے سبکدوش ہو گئے اور بارگاہِ خداوندی سے رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً اور فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ نیز وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ اور لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ اور دیگر بے شمار بشارات وانعامات پا کر شفیع المذنبین اور

رحمۃ للعالمین کے مقام پر فائز ہوئے۔ اب امت کی بدکرداری اور گنہگار ہونے کا کوئی عذر اور بوجھ اور بازپرس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نہیں اور نہ ہماری بداعمالیوں کا وبال آپ پر ہے جس کی وجہ سے معاذ اللہ آپ کو شرمندہ ہونا پڑے، وہ اپنے فریضہ سے بھی ہزارہا درجہ زیادہ پیغام رشد و ہدایت خداوندی انسانیت تک پہنچا کر اپنے فریضۂ تبلیغ سے باحسن وجوہ سرخرو ہوچکے ہیں۔

اس وصیت نامہ کی اشاعت کی طرف توجہ دیتے ہوئے لوگوں کو لاکھوں کروڑوں روپے کے لالچ اور خوف وعذاب، تباہی وبربادی سے ڈرایا دھمکایا جارہا ہے۔ اور پھر "سُنا ہے" کہہ کر کامیابی اور بربادی کے بعض فرضی افسانے لکھے ہوئے ہیں، جبکہ نہ تو سنانے والا معلوم اور نہ ہی سننے والا معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہرگز اس کے تمام مندرجات اور مضامین کو صحیح نہ سمجھنا چاہیئے، البتہ جو باتیں قرآن وحدیث اور دین کی کتابوں میں لکھی ہیں ان کے موافق نیک راہ پر چلنے اور نبی کریمؐ کی سُنت کو مضبوطی سے تھام کر بُری راہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، جھوٹی اور بے اصل باتوں کی نسبت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا بہت بڑا بھاری گناہ ہے۔ اسلئے ازروئے شرع ایسے مضمون کی اشاعت کرنے والا سخت گنہگار ہوگا۔ اگر کسی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات، مبشرات ومنذرات کے پڑھنے، سیکھنے اور انہیں شائع کرنے کا شوق ہو تو یہ تمام تعلیمات احادیث شریف کی مستند کتابوں میں موجود ہیں، ان کے پڑھنے، سیکھنے، عمل کرنے اور شائع کرنے سے ایمانی جذبہ اور عشقِ نبوی کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

وصیت نامہ کی تحریر وارث کے حق میں نافذ نہیں

سوال:- جناب مفتی صاحب! گذارش ہے کہ میرے والد صاحب کا حال ہی میں انتقال ہُوا ہے، وفات سے تقریباً آٹھ سال قبل یعنی ۹۱/۱/۲۴ کو ایک اقرار نامہ تحریر کیا جس میں انہوں نے اپنا ملکیتی دس مرلہ زمین کا پلاٹ اپنی بیٹی (میری سگی بہن ہما شاہجہان) کے نام کیا تھا، بعد میں ۴/۷/۹۲ کو انہوں نے ایک دوسرا اقرار نامہ تحریر کیا جس میں مذکورہ بالا دس مرلہ کا پلاٹ اپنی دوسری بیوی (میری سوتیلی والدہ) اور اس کے بیٹے (میرے سوتیلے بھائی) کے نام کیا۔ بعد ازاں ۲۱/۸/۹۶ کو میرے والد صاحب نے ایک وصیت نامہ تحریر کیا جس میں یہی مذکورہ زمین اپنی دوسری بیوی کے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں (میرے سوتیلے

بھائی بہنیں) کے نام کر دی، بعد ازاں اپنی وفات سے چند روز قبل یعنی ۲۴/۱/۹۹ کو ایک اور وصیت نامہ تحریر کیا جس میں مجھے مذکورہ بالا زمین کا مختارِ خاص بنا کر ہدایت کی گئی ہے کہ اس زمین کو بیچ کر میری دوسری بیوی کے بچوں (میرے سوتیلے بھائی بہنیں) کی پرورش اور تربیت پر صرف کرنا۔

جنابِ عالیٰ! مندرجہ بالا صورتحال کے پیشِ نظر آپ سے التماس ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں کہ مذکورہ بالا چار دستاویزات میں سے کس پر عمل کیا جائے؟ عین نوازش ہوگی۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ دو مسئلوں پر محیط ہے:۔

(۱) **ھبۃ**: جوکہ موصوف نے اپنی دس مرلہ زمین کو ہبہ کیا ہے اور شریعتِ اسلامی میں ہبہ نافذ العمل ہے مگر اس کی تکمیل قبض پر موقوف ہے۔ اگر موہوبہ چیز پر قبضہ نہ کیا جائے تو صرف زبان سے کہنے یا تحریری اقرار نامہ سے ہبہ تام نہیں ہوتا، اور جب کسی رشتہ دار کو کوئی چیز ہبہ کر دی جائے اور وہ اس کے قبضہ میں دے دی جائے تو پھر اس سے رجوع کرنا شرعاً صحیح نہیں اور نہ واہب کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا اگر موصوف نے مذکورہ زمین اپنی دختر مسماۃ شاہجہان کے قبضہ میں دے دی تھی تو اب موصوفہ کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں، والد کا ہبہ سے رجوع یا تنسیخی کا اسٹامپ کارآمد نہیں، اور اگر قبضہ میں نہیں دیا ہو تو والد کا کسی وقت بھی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا صحیح ہے اور ہبہ کا اقرار نامہ بحق مسماۃ شاہجہان بی بی ناکارہ اور منسوخ متصور ہوگا۔

لما قال المرغینانیؒ: الھبۃ عقد مشروع تصح بالایجاب والقبول والقبض، اما الایجاب والقبول فلانہ عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول والقبض لابد منہ لثبوت الملک اھ (الھدایۃ ج۳ ص۲۸۱ کتاب الھبۃ)

لما قال المرغینانیؒ: وان وھب ھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا لقولہ علیہ السلام اذا کانت الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا لان المقصود صلۃ الرحم وقد حصل۔

(الھدایۃ ج۳ ص۲۸۷ کتاب الھبۃ باب مایصح رجوعہ)

(۲) **وصیت**: باقی اسٹامپ کا تعلق وصیت کے ساتھ ہے، شرعاً وصیت کے نفاذ کیلئے چند شرائط ہیں:۔

(۱) وصیت کا نفاذ مال کے صرف ایک تہائی یعنی ۱/۳ میں ہوتا ہے ۔
(۲) دوسرے یہ کہ موصی لہ یعنی جس شخص کے لیے وصیت کی گئی ہو وہ اس کے مال کا وارث نہ ہو، اس لیے کہ وارث کے لیے وصیت کرنا شرعاً جائز نہیں ۔

لہٰذا اسی بناء پر باقی تین اسٹامپ اپنے ورثاء یعنی اولاد کے لیے وصیت کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے نافذ العمل نہیں بلکہ اس میں جملہ ورثاء کا حق وراثت ہے، شرعاً ان (تین) اقرارناموں پر عمل کرنا جائز نہیں ۔ تاہم وصیت کے مطابق مسمی مظفر داد اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کا ان کے حصہ شرعی میں کفیل ہوگا، اقرارنامہ کی کفالت مال متعین کی ہے جو ناکارہ اور غیر صحیح ہے ۔

لما فی الهدایة: ولا تجوز بما زاد علی الثلث لقوله علیه السلام وحدیث سعد بن ابی وقاص رضی الثلث والثلث کثیر ۔اھ ایضاً ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام ان الله تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقه لا وصیة للوارث الخ ۔

(الهدایة ج۴ ص۶۵۱، ۶۵۲ کتاب الوصایا)

(واللہ اعلم وعلمہ اتم)

کتاب الفرائض

تعلموا الفرائض وعلموها الناس

کتاب الفرائض
(میراث کے احکام ومسائل)

قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا

سوال:- ایک شخص نے اپنے بھائی کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے قتل کر دیا اور مرحوم کے عصبہ میں سے اس قاتل بھائی کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو کیا قاتل کو مقتول بھائی کی میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- قصداً عمداً یا خطاءً ہر حالت میں قتل بسبب حرمانِ ارث ہے، اس لیے صورتِ مذکورہ میں مقتول کی جائیداد اس کے دوسرے ورثاء کو دی جائے گی قاتل بھائی کے وجود کا اعتبار نہیں بلکہ بوجہ مانع یہ کالعدم رہے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: المانع من الارث اربعة......... والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص او الکفارة۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع)[۱]

دادا کی موجودگی میں چچا کی میراث سے محرومی کا حکم

سوال:- ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں دادا اور چچا کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو مرنے والے کی میراث شرعاً کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:- بشرط صدق وثبوت اگر ورثاء کی تعداد درست ہو تو بعد از ادائے حقوق متقدمہ علی الارث تمام جائیداد دادا کو بطور عصوبت دی جائے گی، اور چچا چونکہ عصبہ بعیدہ ہے اسلئے وہ دادا کی موجودگی میں میراث سے محروم رہے گا۔ نقشہ ملاحظہ ہو:-

مسئلہ ۱

دادا	چچا
۱/۱ (کل ترکہ کا حقدار)	محجوب

[۱] وفی الهندیة: القاتل بغیر حق لا یرث من المقتول شیئاً عندنا سواء قتله عمداً او خطاءً وکذلك کل قاتل هو فی معنی الخاطئ..... وقتل الصبی والمجنون والمعتوه والمبرسم والموسوس یوجب حرمان المیراث لان الحرمان یثبت جزاء قتل محظور الخ

(الفتاوی الهندیة ج ۶ ص۴۵۴ الباب الخامس فی الموانع)

قال العلامة السجاوندیؒ :۔ اما الاب فله احوال ثلث والتعصیب المحض وذلك عند عدم الولد وولد الابن وان سفل .... والجد الصحیح کالاب عند عدم الاب ۔

(السراجی صک باب معرفة الفروض) [1]

اختلافِ دین مانع ارث ہے

سوال :۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی عورت سے نکاح کرلے تو موت کی صورت میں میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ عیسائی عورت سے اگرچہ نکاح جائز ہے لیکن یہ میاں بیوی عقائد میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کی میراث سے محروم رہیں گے کیونکہ اختلافِ دین مانع ارث ہے ۔

قال العلامة السجاوندیؒ : المانع من الارث اربعة..... واختلاف الدینین ای اسلاماً وکفراً ۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) [2]

خاوند اور بہن میں جائیداد کی تقسیم کا حکم

سوال :۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد خاوند اور ایک بہن وارث چھوڑے ہیں جبکہ عصبات کوئی نہیں، مہربانی کرکے شریعت کی روشنی میں دونوں کا حصہ متعین فرمادیں ؟

الجواب :۔ اگر مرحومہ کے ورثاء میں خاوند اور ایک اعیانی بہن کے علاوہ اور کوئی زندہ نہ ہو تو کل جائیداد کا نصف خاوند کو اور باقی نصف بہن کو دیا جائے گا، نقشہ ملاحظہ ہو :۔

مسئلہ ۲	
زوج (خاوند)	بہن
(۱)	(۱)

قال العلامة السجاوندی رحمہ اللہ : واما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد

---

[1] وفی الهندية : فالاقرب العصبات ..... ثم الاب ثم الجد اب الاب وهم ای العصبة کل من لیس له سهم مقدر .... واذا انفرد اخذ جمیع المال ۔

(الفتاوی الهندية ج۶ ص۴۵۱ الباب الثالث فی العصبات)

[2] وفی الهندية : واختلاف الدین ایضاً یمنع الارث والمراد به الاختلاف بین الاسلام والکفر ۔ (الفتاوی الهندية ج۶ ص۴۵۴ باب الموانع)

وولد الابن وان سفل ۔ (السراجی ص۷ باب معرفة الفروض ومستحقیها)

وقال ایضاً: واما للاخوات لاب وام فاحوال خمس النصف للواحدة ۔

(السراجی ص۱۱ فصل فی النساء) [1]

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث سے محرومی

سوال:۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کا ایک بیٹا زندہ ہے لیکن دوسرا بیٹا جو کہ اس کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا اب اس کے بیٹے زندہ ہیں، تو کیا دادا کی میراث میں سے مرحوم کے ایک بیٹے کی موجودگی میں فوت شدہ بیٹے کی اولاد کا کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ بیٹا قریبی عصبہ ہے اور پوتا اس سے بعید ہے، قریبی وارث کی موجودگی میں بعید کے ورثاء حقِ وراثت سے محروم رہتے ہیں، اس لیے تمام جائیداد بیٹے کا حق ہے پوتے کو کچھ نہیں ملے گا، تاہم اگر بیٹا دل کی خوشی سے اسے کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں ۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اولٰھم بالمیراث جزء المیّت ای البنون ثم بنوھم ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات) [2]

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علّاتی بھائی میراث سے محروم رہے گا

سوال:۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علّاتی بھائی رہ گئے ہیں، شریعتِ مطہرہ کی

---

[1] قال اللہ تبارک وتعالیٰ: (۱) وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۔ (سورة النساء ۱۲) ۔ (۲) اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۔ (سورة النساء ۱۷۶)

[2] قال العلامة السرخسیؒ: وا ولاد الابن یقومون مقام اولاد الصلب عند عدم اولاد الصلب فی جمیع ما ذکرنا لقوله تعالیٰ: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۔ واسم الاولاد یتناول اولاد الابن مجازاً.......فان اجتمع اولاد الصلب واولاد الابن فان کان فی اولاد الصلب ذکر فلا شئ لاولاد الابن ذکوراً او اناثاً او مختلطین لان المذکر او لاد الصلب مستحق لجمیع المال باعتبار حقیقة الاسم ۔ (المبسوط للسرخسی ج ۲۹ ص۱۴۱ کتاب الفرائض)

روشنی میں مرحوم کی جائیداد ان ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:- بشرطِ صحتِ سوال اگر مرحوم کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علاتی بھائی ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا اقربی عصبہ یا ذوی الفروض نہ ہو تو بعد از ادائے حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کے پانچ حصے کر کے ہر ایک حقیقی بھائی کو دو دو حصے (۲/۵، ۲/۵) اور ایک حصہ (۱/۵) حقیقی بہن کو دیا جائے گا اور اعیانی بھائیوں کی موجودگی میں علاتی بھائی حقِ وراثت سے محروم رہیں گے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: واما للاخوات لاب وام ..... ومع الاخ لاب وام للذکر مثل حظ الانثیین یصرن بہ عصبة لاستوائهم فی القرابة الی المیت۔

(السراجی ص۱۰ فصل فی النساء)

وایضاً: لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات کالاخ لاب وام فانه مقدم علی الاخ لاب اجماعاً۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)[1]

بیٹے، بیٹی میں میراث کی تقسیم اور نواسی کا اس سے محروم ہونا

سوال:- ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک نواسی وارث چھوڑے ہیں شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ان ورثاء میں مرحومہ کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:- حسبِ بیانِ سائل صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ بعد از ادائے حقوق مقدمہ علی الارث تین حصے کر کے ایک حصہ بیٹی کو اور دو حصے بیٹے کو ملیں گے اور نواسی چونکہ ذوی الارحام میں سے ہے لہٰذا عصبات کی موجودگی میں یہ میراث سے محروم رہے گی، نقشہ ملاحظہ ہو:-

مرحومہ

بیٹا	بیٹی	نواسی
۲	۱	محروم

---

[1] وفی الهندیة: اختان لابوین واخت لاب فالمال للاختین فرضاً ورداً ولا شئ للاخت لاب فان کان منهما اخوها عصبها فلهما الباقی وهو الثلث للذکر مثل حظ الانثیین۔

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۲ الباب الرابع فی الحجب)

قال العلامة السجاوندیؒ: اما البنات الصلب فاحوال ثلث .... ومع الابن للذکر مثل حظ الانثیین وھو یعصبھن۔ (السراجی ص۸ فصل فی النساء) [1]

صرف والد ہی کا بیٹے کی تمام جائیداد کا وارث ہونا

سوال:- اگر ایک آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف اس کا والد باقی ہو تو از روئے شریعتِ مقدسہ مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:- بشرطِ صحتِ سوال مرحوم کا تمام ترکہ بعد از ادائے ماوجب تقدیمہ علی الارث اس کے والد کو بطورِ عصوبیت ملے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما الاب فلہ احوال ثلث .... والتعصیب المحض وذلک عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۶ باب معرفۃ الفروض)

وایضاً: والعصبۃ کل من یأخذ ما ابقتہ اصحاب الفرائض وعند الانفراد یحرز جمیع المال۔ (مقدمۃ السراجی ص۳) [2]

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بہن کی میراث سے محرومی

سوال:- ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن وارث چھوڑے جبکہ ان کے علاوہ ذوی الفروض اور عصبہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے، تو مرحومہ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر واقعی مرحومہ کے ورثاء میں ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی عصبہ یا ذوی الفروض زندہ نہ ہو تو بعد از اداءِ حقوقِ مقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کا مستحق اس کا اعیانی بھائی

---

[1] قال اللہ تبارک وتعالیٰ:- يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (سورۃ النساء آیت ۱۱)

[2] وفی الھندیۃ: فاقرب العصبات ...... ثم الاب، وھم ای العصبۃ کل من لیس لہ سھام مقدرۃ ویأخذ ما بقی من سھام ذوی الفروض واذا انفرد اخذ جمیع المال۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۴۵۱ الباب الثالث العصبات)

ہے اور اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بہن کو کچھ نہیں ملتا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: ثم جزء ابیہ ای الاخوة۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)

وایضاً: ویسقط بنوالعلّات ایضا بالاخ لابٍ واُمٍّ۔ (السراجی ص۱۱ باب معرفة الفروض)[ل]

نافرمان بیٹے کا باپ کی میراث میں استحقاق

سوال:۔ ایک شخص اپنے باپ کا نافرمان ہونے کے ساتھ اُسے گالی گلوچ بھی دیتا ہے تو کیا یہ شخص باپ کے مرنے کے بعد میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، لیکن یہ میراث سے محرومی کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ ارث اضطراراً ورثاء کی طرف منتقل ہوتی ہے، اس لیے نافرمان بیٹا فرمانبردار بیٹے کی طرح میراث لے سکتا ہے۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین افندیؒ: الارث جبریٌّ لا یسقط بالاسقاط۔
(تکملة رد المحتار ج ۱ ص۳۵۹ مطلب واقعة الفتوٰی۔ کتاب الدعوٰی)

وراثت کے لیے محض رشتہ دار ہونا کافی نہیں

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک عورت فوت ہوگئی ہے جس کے ورثاء میں کوئی بھی عصبہ، ذوی الفروض یا ذوی الارحام موجود نہیں صرف خاوند کے بھتیجے ہیں، تو کیا مرحومہ کی میراث میں سے اس کے خاوند کے بھتیجوں کو حصہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی عورت کے خاوند کے بھتیجے خاوند کے تو عصبہ ہیں لیکن اس کی بیوی سے اس کا کوئی خاص رشتہ نہیں جو سببِ ارث بن جائے صرف خاوند کی قرابت کی وجہ سے بیوی کی میراث میں ان کو حق نہیں دیا جا سکتا اور نہ یہ کسی حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حالت میں تو ان کے درمیان اجنبیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا آپس میں نکاح بھی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس عورت کے شرعی ورثاء

[ل] قال اللّٰه تعالیٰ: وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ۔ (سورة النساء ۱۷۶)

لما فی الحدیث: ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات۔
(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ترکہ بیت المال میں جائے گا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانی ؒ: ثم بیت المال أی إذا لم یوجد احد من المذکورین توضع التركة فی بیت المال۔ (السراجیۃ ص۱۱) لہ

نکاحِ فاسد سے پیدا ہونے والی اولاد کا وراثت سے محروم ہونا

سوال: ایک شخص نے زوجۂ غیر سے نکاح کیا اور اس نکاح سے اس کی اولاد بھی پیدا ہوئی، تو کیا یہ اولاد ماں کے اس دوسرے خاوند سے میراث لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زوجۂ غیر کے ساتھ نکاح کرنا نکاح فاسد ہے اور نکاح فاسد کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہو وہ اگرچہ ثابت النسب ہوگی لیکن باپ کی میراث میں حقدار نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ویثبت النسب واما الارث فلا یثبت۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۲ ص۳۸۲ باب ثبوت النسب) ؎۲

رواجی قبضہ کا اعتبار نہیں

سوال:۔ ایک شخص کے مرنے کے بعد جائز ورثاء میں دو بیوگان کے علاوہ اس کے بہن بھائی تھے لیکن انگریزی قانون (رواج) کے مطابق مرحوم کی دونوں بیویاں اس کی جائیداد پر قابض تھیں، اب اس کی ایک بیوی فوت ہو چکی ہے تو یہ ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں صرف رواجی قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے دونوں بیویاں مرحوم کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ کل جائیداد کے صرف ۱/۴ حصہ کی حقدار ہوں گی جبکہ بقیہ جائیداد مرحوم کے ان ورثاء میں تقسیم ہوگی جو اسکی

لہ لما فی الھندیۃ: فیبدأ بالفروض النسبیۃ بقدر حقوقھم ثم ذوی الارحام ثم مولی الموالاۃ۔۔۔۔۔۔ ثم الموصی لہ بجمیع المال ثم بیت المال۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض الباب الاول)

؎۲ قال العلامۃ الرافعی رحمہ اللہ: وعبارۃ ابی سعود ولا توارث بین الزوجین فی الفاسد۔ (تقریرات ج۱ ص۱۹۷ باب ثبوت النسب)

موت کے وقت زندہ تھے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: امّا للزوجات فحالتان الربع للواحدة فصاعدةً عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۷ فصل فی اصحاب الفروض)[1]

مجرم کا پھانسی گھاٹ میں ہونا مرض الموت کے حکم میں نہیں

سوال:- اگر کوئی شخص قتل کے الزام میں قید خانہ میں محبوس ہو تو کیا اس کا اقرار اور جائیداد وغیرہ میں تصرفات مرض الموت کے حکم میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:- جس شخص کو قتل کے الزام میں عدالت کی طرف سے سزائے موت (پھانسی) کا حکم ہو چکا ہو یا قتل کے جرم میں حوالات یا قید خانہ میں محبوس ہو، اُس کی یہ حالت مرض الموت کے مانند نہیں سمجھی جائے گی، اس کے تمام معاملات مثل صحت کے جاری و نافذ ہوں گے البتہ جس وقت قید سے نکال کر مقتل (پھانسی دیئے جانے کی جگہ) کی طرف روانہ کر دیا جائے تو قید خانہ سے نکالنے کے بعد پھانسی ہونے تک جتنی دیر لگے گی وہ مرض الموت کے مانند ہوگی، اس حالت میں اگر اس نے کوئی تصرف مثلاً اقرار وغیرہ کیا ہو تو وہ مرض الموت کے تصرفات کی طرح ناقابلِ قبول ہے۔ اور اگر اس روز پھانسی کی سزا کسی وجہ سے ملتوی ہو جائے یا اس کا حکم بالکل منسوخ ہو جائے تو قید خانہ سے نکل کر پھانسی گھاٹ تک آنے کی حالت مرض الموت کے مانند نہ رہے گی یعنی مثل صحت کے سمجھی جائے گی اور اس حالت میں جو تصرفات کئے تھے وہ جاری اور درست سمجھے جائیں گے۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو کان محصوراً او محبوساً فی حد او قصاص او واقفاً فی صف القتال فهو فی حکم الصحیح ــــ وقد ذکر محمدؒ فی الاصل مسائل تدل علیٰ ان الشرط خوف الهلاک علیٰ طریق الغلبة لاکونه صاحب فراش فانه قال: اذا اخرج الرجل للقصاص او الرجم فهو فی حکم المریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۳ ص۵۸ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض)[2]

[1] لقوله تعالیٰ: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ۔ (سورة النساء ۱۲)

[2] وفی الهندیة: ولو اعید المخرج للقتل الی الحبس او رجع المبارز بعد المبارزة الی الصف صار فی حکم الصحیح کالمریض اذا برأ من مرضه۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۴۶۳ الباب الخامس فی طلاق المریض)

طویل بیماری مرض الموت شمار ہوگی

سوال:۔ از روئے شرع مرض الموت کے تصرفات محدود ہیں جس میں بسا اوقات میت کے تصرفات موقوف سمجھے جاتے ہیں لیکن بعض بیماریاں سالوں تک ممتد رہتی ہیں کیا ایسی ممتد بیماری کو مرض الموت کہا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مرض الموت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ چند دنوں تک محدود ہو بلکہ کبھی مرض الموت کی مدت طویل بھی ہوسکتی ہے، تاہم جو بیماری عمومی حیثیت اختیار کر جائے جیسا کہ آجکل فوران الدم (بلڈ پریشر) ذیابیطس (شوگر) یا امراض قلب میں مبتلا ہونے مرض الموت میں شمار کرنا مشکل ہے، کیونکہ یہ بیماریاں اگرچہ فوری طور پر موت کا سبب بن سکتی ہیں لیکن مدتوں تک محیط ہونے سے بھی خالی نہیں۔

قال العلامة ابن البزازی رحمه الله: ولو طال المرض وصد بحال لا یخاف علیه الموت کالفالج او صار مدنفًا او یابس الشق لا یکون حکم المرض الا اذا تغیر حاله عن ذٰلک ومات من ذٰلک التغیر فما فعل فی حال التغیر فمن الثلث۔
(الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۶ ص ۴۳۴ کتاب الوصایا)[1]

شرعی بیت المال نہ ہونے کی صورت میں میراث کا حکم

سوال:۔ اگر کسی میت کے اقسام ثلاثہ (ذوی الفروض، عصبات، ذوی الارحام) ورثاء میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو اور شرعی بیت المال بھی نہ ہو تو اس کے ترکہ کا کیا کیا جائے گا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مطلوب ہے؟

الجواب:۔ جب شرعی بیت المال موجود نہ ہو تو مسئولہ صورت کے مطابق میراث

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: والمقعد والمفلوج والاشل والمسلول ان تطاول ذٰلک ولم یخف منه الموت فهبته من کل المال لانه اذا تقادم العهد صار من طبعه کالعمی والعرج وهٰذا لان المانع من التصرف فی مرض الموت ومرض الموت لا یکون سببًا للموت غالبًا وانما یکون سببًا للموت اذا کان بحیث یزداد حالًا فحالًا [illegible] آخره الموت۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۴۲۸ قبیل باب العتق فی المرض والوصیة بالعتق)

کو ایک امین (امانت دار شخص) کے ہاتھ میں دے دیا جائے تاکہ وہ ایسے فقراء جن کا کوئی سرپرست وغیرہ نہ ہو پر اس طرح خرچ کرے کہ ان فقراء کا نفقہ، تداوی، کفن دفن وغیرہ اس ترکہ سے پورا کرے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واما الرابع (ای الضوائع مثل ما لا یکون له اناثا وارثونا) فمصرفه المشهور هو اللقیط الفقیر والفقراء الذین لا اولیاء لهم فیعطی منه نفقتهم وأدویتهم وکفنهم وعقل جنایتهم۔ (رد المحتار ج۲ ص۵۸ مطلب فی بیان بیوت المال ومصارفها، قبل باب المصرف)

حینِ حیات میں جائیداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ

سوال:۔ ایک شخص کی ایک بیوی، دو بیٹے، تین بیٹیاں، ایک پوتی اور دو پوتے ہیں جن کا والد فوت ہو چکا ہے، اب یہ شخص زندگی میں ہی اپنی جائیداد ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس کی صورت کس طرح ہونی چاہیئے؟ کیا پوتوں اور پوتیوں کو بیٹوں اور بیٹیوں کے برابر حصہ دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی ان کو محروم رکھے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم درحقیقت ہبہ ہے جس میں مالک کو کُلی اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے تقسیم کرے اور اولاد کا اس پر باقاعدہ قبضہ کر لینے کے بعد وہی تقسیم نافذ رہے گی، تاہم کسی وارث کو بلا وجہ میراث سے محروم کرنا سراسر زیادتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ زندگی میں ہی اولاد میں جائیداد تقسیم کرنے والے کو ایسا طریقہ اپنانا چاہیئے کہ اگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم کرنے کی نوبت آئے تو اسی طرح تقسیم ہوتی۔ لہٰذا مسئولہ صورت میں بھی اس شخص کو چاہیئے کہ وہ کل جائیداد کے ۵۶ حصے کر کے ثمن کل جائیداد کا (۵۶/۷) بیوی کو اور ہر ایک بیٹے کو ۵۶/۱۴، ۵۶/۱۴ حصہ اور بیٹی کو ۵۶/۷ حصے کے حساب سے تقسیم کرے، اور جہاں تک پوتوں اور پوتیوں کا تعلق ہے تو بہتر یہ ہے کہ دادا اپنی زندگی میں ہی ان کو کچھ دے دے تاکہ اس کے مرنے کے بعد قانونی تنازعات پیدا نہ ہو جائیں لیکن اگر دادا پوتوں اور پوتیوں کو کچھ نہ دینا چاہے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: الا فضل فی هبة الابن والبنت التثلیث کالمیراث۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص۲۳۷ کتاب الهبة۔ الجنس الثالث)

نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ ۵۶

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی
۷	۱۴	۱۴	۷	۷	۷

بذریعہ اعلانِ عاق نامہ بیٹے کو میراث سے محروم کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے سے ناراض ہو اور اسی ناراضگی کی وجہ سے اخبار وغیرہ میں بذریعہ اشتہار اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے اُسے عاق کرنے کا اعلان کردے، تو کیا باپ کی وفات کے بعد عاق شدہ بیٹا میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وراثت ایک اضطراری حق ہے کوئی شخص اپنی طرف سے اس حق کو زائل یا ختم نہیں کرسکتا، اس لیے باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا بھی میراث کا حقدار ہے، تاہم اگر یہ شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد اور منقولہ سرمایہ اپنے ورثاء میں تقسیم کردے اور ان کو باضابطہ مالک بنادے تو اس صورت میں باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا حقِ ارث کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین آفندیؒ: الارث جبریؒ لایسقط بالاسقاط۔ (تکملة ردّ المحتار ج ۱ ص۳۵۹ مطلب واقعة الفتوی۔ کتاب الدعوی)[1]

---

[1] وذکر الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن ابراهیم عن الاسود عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت اشتریت بریرة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اشتریها فان الولاء لمن اعتق۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۲ ص۹۹۹ کتاب الفرائض باب الولاء لمن اعتق الخ)

ومثلهٗ فی امداد الفتاوی ج ۴ ص۳۶۴ کتاب الفرائض۔

کفار کے ہاں قید شخص کی میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا ایک بھائی کشمیر میں جہاد کے دوران انڈین فوج کے ہاتھوں قید ہوگیا ہے، اب دوسرے بھائی والد صاحب کے ترکہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا قیدی بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ اس کی رہائی کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔

الجواب:۔ جب کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں قید ہوجائے تو وہ تا وقت موت یا ارتداد عام مسلمانوں کی طرح میراث کا حقدار ہے، لہٰذا آپ کا وہ بھائی جو دشمن کی قید میں ہے باپ کی میراث میں برابر کا حقدار ہے اس کی رہائی یا موت کی مصدقہ اطلاع تک اس کا حصہ محفوظ رکھا جائے۔

قال السید شریف الجرجانیؒ: حکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فیرث ویورث منہ لأن المسلم من اھل دار الاسلام اینما کان۔ (الشریفیۃ صـ۱۴۲ فصل فی الاسیر) [1]

شیعہ سُنّی کے مابین میراث کا حکم

سوال:۔ کیا کوئی شیعہ کسی سُنّی کے مال میں شرعاً میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعہ (روافض) کے مختلف گروہ ہیں جو شیعہ کفریہ عقائد مثلاً الوہیتِ حضرت علیؓ اور قذفِ سیدہ حضرت عائشہؓ وغیرہ کے قائل ہوں تو اختلافِ دین کی وجہ سے شیعہ سُنّی کا وارث نہیں ہوسکتا البتہ جو شیعہ غالی نہ ہوں تو صرف بدعت مانع ارث نہیں۔

قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: والمانع من الارث الا ربعۃ......

---

[1] وفی الھندیۃ: وحکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فان فارق دینہ فحکمہ حکم المرتد فان لم یعلم ردتہ ولاحیاتہ ولاموتہ فحکمہ حکم المفقود۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ صـ۴۵۷ الباب الثامن فی المفقود والاسیر الخ)

وَمثلہٗ فی السراجی صـ۷۵ فصل فی الاسیر۔

والقتل الذی یتعلق بہ وجوب القصاص او الکفارۃ ..... واختلاف الدینین ای اسلاماً وکفراً۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) [1]

مُرتد کسی مسلمان کی میراث کا حقدار نہیں

سوال:۔ میرا بھائی امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا وہاں وہ عیسائی بن گیا، توکیا والد صاحب کی وفات کے بعد اس کو میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ وہ اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کرتا ہے۔

الجواب:۔ ارتداد مانع ارث ہے۔ اسی بناء پر مُرتد ہونے کی وجہ سے آپ کا بھائی بھی باپ کے مالِ وراثت کا حقدار نہیں رہا۔

قال العلامۃ سید شریف جرجانیؒ: واما المرتد فلا یرث من احد لامن مسلم ولامن مرتد مثلہ لانہٗ جانٍ بارتدادہ فلا یستحق الصلۃ الشرعیۃ التی ھی الارث بل یحرم عقوبۃ ما لقاتل بغیر حق۔ (الشریفیۃ ص۱۳۱ فصل فی المرتد) [2]

مرتدہ عورت کے ترکہ کا حکم

سوال:۔ ایک مسلمان عورت روس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئی تو وہاں وہ اسلام کو چھوڑ کر مُرتد ہوگئی، اور اب اس کا انتقال ہوگیا ہے تو شرعاً کون اس کے ترکہ کا حقدار ہے؟

الجواب:۔ ارتداد اگرچہ مانع ارث ہے مگر عورت اس سے مستثنیٰ ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس مرتدہ عورت کی موت کے بعد اس کا ترکہ اُس کے وُرثاء میں

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: اختلاف الملتین اسلاماً وکفراً۔ قال السید احمد الطحطاویؒ ای من جھۃ الاسلام والکفر اما اختلافہما من جھۃ الیھودیۃ والنصرانیۃ فلا یکون مانعاً وھذا التقیید لا بد منہ ...... واما عدم توریث الکافر من المسلم فبالاجماع۔

(طحطاوی حاشیۃ الدر المختار ج۴ ص۳۷۸ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُہٗ فی امداد الفتاوٰی ج۴ ص۳۵۵ کتاب الفرائض۔

[2] وفی الھندیۃ: المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثلہ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اھل الکفر)

وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۲۷ فصل فی المرتد۔

بطریقۂ شرعی تقسیم ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: وکسب المرتدۃ جمیعًا ای سواء اکتسبتہ فی اسلامہا اوفی ردتہا قبل اللحوق بدار الحرب لورثتہا المسلمین بلاخلاف بین اصحابنا۔ (الشریفیۃ ص۱۲۰ فصل فی المرتد) [1]

ہیجڑے کی میراث کی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک ہیجڑا جس کی داڑھی بھی ہے اگر اُس کا باپ، ماں یا کوئی اور رشتہ دار مرجائے تو میراث میں اس کا کتنا حصہ ہوگا؟

الجواب:۔ اگر ہیجڑے پر مردوں کے آثار موجود ہوں تو اُسے مردوں جتنا حصہ ملے گا اور اگر عورتوں کے آثار زیادہ ہوں تو عورتوں جتنے حصے کا حقدار ہوگا، چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس ہیجڑے کی داڑھی آچکی ہے جو کہ مردوں کی علامت ہے اس لیے اس کا حصۂ میراث مردوں جتنا ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: فلابد أن یزول الاشکال بظہور العلامۃ لانہ ان جامع بذکرہ اونبتت لہٗ لحیتہ اواحتلم کاحتلام الرّجل فھو رجلٌ۔
(الشریفیۃ ص۱۲۵ فصل فی الخنثیٰ) [2]

مرنے والے کا قرضہ نکل آنے پر تقسیمِ ترکہ کالعدم ہوجاتی ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بیٹا طاہر جمال تقریبًا ۱۳ سال ملائشیا میں رہا، جب وہ گاؤں واپس آیا

---

[1] وفی الھندیۃ: والمرتدۃ اذا ماتت قسم مالھا بین ورثتھا علیٰ فرائض اللّٰہ تعالیٰ سواء کان کسب الاسلام اوکسب الردۃ کلا الکسبین یصیر میراثًا عنھا۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اھل الکفر)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۵۷ فصل فی المرتد۔

[2] وفی الھندیۃ: فاذا بلغ الخنثیٰ وخرجت لحیتہ اووصل الی النساء فھو رجلٌ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۷ الباب التاسع فی میراث الخنثیٰ)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی ص۶۵ فصل فی الخنثیٰ۔

تو یہاں ہم نے قرضہ لے کر اس کی شادی کی، کچھ عرصہ بعد وہ سخت بیمار ہوگیا تو اس کا علاج بھی قرضہ لے کر کرایا اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہوگیا، بعد از وفات بینک میں اس کے ۱۴ لاکھ روپے موجود تھے جو کہ بذریعہ عدالت ورثاء میں تقسیم کئے گئے، اس کے بعد اس کے ذمے کافی قرضہ نکل آیا۔ تو کیا اس قرضہ کی ادائیگی کے لیے ورثاء سے رجوع کیا جاسکتا ہے یا نہیں یا اس قرضہ کو ادا کرنے کا میں ہی ذمہ دار ہوں؟

الجواب:۔ کسی کی وفات کے بعد اس کے جملہ مال سے اوّلاً چار حقوق منہا کئے جائیں گے اور پھر بقیہ مال ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الهندیة : الترکة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز المیت ودفنه والدّین والوصیة والمیراث فیبدأ اولاً بجهازه وکفنه ومایحتاج الیه فی دفنه بالمعروف ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض)

قال الشیخ السید شریف الجرجانیؒ : ثم تقضی دیونه من جمیع مابقی من ماله ای یبدأ بقضاء دینه من جمیع ماله الباقی بعد التجهیز والتکفین وهذا هو الثانی فی الابتداء ۔ (الشریفیة ص۵ کتاب الفرائض)

اور اگر لاعلمی یا دھوکہ دہی کی وجہ سے مرنے والے کا جملہ ترکہ اس کے ورثاء میں تقسیم ہو جائے تو یہ تقسیم صحیح نہیں بلکہ از سرِ نو قرضہ وغیرہ منہا کر کے بقیہ میراث کو ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

کما فی مجلة الاحکام : اذا ظهر دَین علی المیت بعد قسمة الترکة تنسخ القسمة۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ : تحت مادة سواءکان الدّین محیطاً بالترکة اولا امّا الاوّل فظاهر لانه یمنع الملك فیمنع التصرف واما الثانی فتعلق حق الغرباء بالترکة شائعاً ولان القسمة مؤخرة عن قضاء الدین لحق المیّت ۔

(شرح المجلة ص۶۴۱ الفصل السابع فی فسخ القسمة واقالتها)

لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال صورتِ مسئولہ میں بھی مرحوم بیٹے کے ذمہ قرض کی ادائیگی اس کے باپ کے ذمے نہیں بلکہ تقسیمِ وراثت کالعدم متصوّر ہو کر جملہ ترکہ سے قرضہ منہا کیا جائے گا اور بقیہ مال ورثاء میں تقسیم ہوگا، اس لیے مرحوم کے باپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دیگر ورثاء (دین وقرض) کی ادائیگی کرے چاہے ورثاء میں اس کی بیوہ ہو یا ماں باپ ہوں۔

رضاعت موجب میراث رشتہ نہیں

سوال:- کیا رضاعی بیٹے کو باپ کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ مرحوم کے اس رضاعی بیٹے کے علاوہ چچازاد بھائی بھی ہیں؟

الجواب:- وراثت کے حقدار صرف نسبی بھائی ہیں لہٰذا مرحوم کی جملہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے چچازاد بھائیوں کو ملے گی، رضاعی بیٹے کا اس کی میراث سے کوئی واسطہ نہیں۔

قال العلامۃ سراج الدین السجاوندیؒ: ثم یقسم الباقی بین ورثتہ بالکتاب والسنۃ واجماع الامۃ فیبدأ باصحاب الفرائض هم الذین لهم سهام مقدرۃ فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ ثم بالعصبات من جهۃ النسب الخ۔ (السراجی ص۴ کتاب الفرائض) [1]

متبنیٰ کو میراث دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، محلے کے ایک دوست نے اُسے اپنا بیٹا دیدیا، اس شخص نے بحیثیت باپ اس بچے کی پرورش کی، تو کیا اس شخص کی وفات کے بعد یہ لڑکا اس کی میراث کا مالک متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ یہ لڑکا مرحوم کا حقیقی نہیں بلکہ منہ بولا بیٹا ہے اور کسی کو متبنیٰ بنانا کوئی سببِ میراث رشتہ نہیں جس کی وجہ سے کوئی کسی کا وارث بن جائے، اس لیے مرحوم کا مال اس کے دیگر رشتہ داروں میں تقسیم ہوگا اور لڑکے کو بطور حقِ وراثت کچھ نہیں ملے گا البتہ اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں تملیکاً اس کو کچھ دیا ہو تو وہ اس کا مالک ہے اور مرحوم کا کوئی رشتہ دار اس میں وراثت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

قال العلامۃ سراج الدین السجاوندیؒ: العصبات النسبیۃ ۔۔۔۔۔۔ وهم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص۱۸،۱۹ باب العصبات) [2]

---

[1] قال العلامۃ عبداللّٰہ بن المودود الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
ومثلہٗ فی الهندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

[2] قال العلامۃ الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
ومثلہٗ فی الهندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

سوتیلا باپ میراث سے محروم ہے

سوال:۔ ایک آدمی کا انتقال ہوگیا ہے اس کے ورثاء میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور ایک سوتیلا باپ موجود ہیں، مرحوم کی میراث ان میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب: حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد باقیماندہ مال مرحوم کی بیوہ اور دو بیٹوں میں تقسیم ہوگا جبکہ سوتیلا باپ حقِ میراث سے محروم ہوگا اس لیے کہ دونوں کے درمیان موجبِ ارث کوئی رشتہ داری نہیں۔

۱۶ = ۲ × ۸

بیٹا	بیٹا	بیوہ
۱۶/۷	۱۶/۷	۱۶/۲

قال العلامة السجاوندیؒ: العصبات النسبية...... وهم اربعة اصناف جزء الميت واصله وجزء ابيه وجزء جده۔ (السراجي ص۱۹ باب العصبات)[۱]

سوتیلے بیٹے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی بیوہ عورت سے شادی کی جبکہ بوقتِ نکاح اس عورت کا مرحوم شوہر سے ایک بیٹا بھی تھا جس نے اس آدمی کے گھر میں پرورش پائی اور وہ بھی اس کو اپنا بیٹا سمجھتا رہا، اب یہ آدمی فوت ہوگیا ہے تو کیا یہ لڑکا اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ میراث میں شریک ہوگا یا نہیں، یاد رہے کہ اس لڑکے کے یہ بھائی اس کی ماں (یعنی اس عورت کے دوسرے شوہر) سے ہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مرحوم اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان کوئی موجبِ میراث رشتہ نہیں اسلئے مرحوم کا ترکہ اس کے حقیقی بیٹوں کا ہے اور یہ لڑکا میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامة الموصلیؒ: ويستحق الارث برحم ونكاح وولاء۔
(الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۸۶ كتاب الفرائض)[۲]

---

[۱] قال العلامة الموصلیؒ: ويستحق الارث برحم ونكاح وولاء...... ثم اصله وهو الاب والجد ثم جزء ابيه ثم بنوهم الخ۔ (الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۸۶ كتاب الفرائض)
ومثله في الهندية ج۶ ص۴۴۷ كتاب الفرائض، الباب الاول۔

[۲] وفي الهندية: ويستحق الارث باحدى خصال ثلاث بالنسب وهو القرابة والسبب وهو الزوجية والولاء۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۴۷ كتاب الفرائض، الباب الاول)

دو بیویوں کی اولاد میں میراث کی تقسیم کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے میرے علاوہ میری دو بہنیں بھی ہیں، اور دوسری بیوی سے تین بیٹے ہیں جبکہ میری والدہ کا والد صاحب سے پہلے انتقال ہو گیا ہے، تو کیا والد صاحب کا ترکہ ان کی سب اولاد میں برابر تقسیم ہوگا یا ہم حقیقی بہن بھائی کو کم اور دوسروں کو زیادہ ملے گا؟

الجواب :- میراث کی تقسیم میت کے ساتھ رشتے کی بناء پر ہوتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے ساتھ اس کی دونوں بیویوں کی اولاد کا حق برابر ہے اس لیے آپ سب میں حصۂ شرعی کے مطابق میراث تقسیم ہوگی، یعنی ماں کے حصے کے علاوہ مال کے دو حصے ایک بھائی اور دو بہنوں کو ملیں گے اور تین حصے دوسرے تین بھائیوں کو ملیں گے۔

٨٠ = ١٠ × ٨

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
١٠/٨٠	١٤/٨٠	١٤/٨٠	١٤/٨٠	١٤/٨٠	٧/٨٠	٧/٨٠

قال العلامة السجاوندیؒ: العصبات النسبية وهم اربعة اصناف جزء الميت واصله وجزء ابيه وجزء جده الاقرب فالاقرب يرجحون بقرب الدرجة اولهم بالميراث جزء الميت اي البنون۔ (السراجي ص ١٩ باب العصبات) [1]

مہر میں شوہر کا حصۂ ارث

سوال :- ایک عورت کو شادی کے بعد کسی وجہ سے اس کے انتقال تک اس کا حق مہر نہیں ملا جبکہ اس عورت کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے صرف ایک باپ، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، تو اب مہر کس کا حق ہے؟

الجواب :- حقِ مہر بھی مرحومہ کے ترکہ میں شامل ہے اس لیے مرحومہ کے دیگر اموال

---

[1] قال العلامة الموصلي رحمه الله: عصبة بنفسه وهو كل ذكر لا يدخل في نسبته الى الميت انثى واقربهم جزء الميت وهو بنوه۔
(الاختيار لتعليل المختار ج ٥ ص ٩٢ فصل في العصبات)
ومثله في الهندية ج ٦ ص ٤٥١ الباب الثالث في العصبات۔

کی طرح اس کے مہر کی رقم بھی شوہر اور باپ کے درمیان تقسیم ہو گی یعنی آدھا مہر شوہر کو اور آدھا باپ کو ملے گا بھائی محروم ہوں گے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد الخ۔ (السراجی ص۹ باب معرفة الفروض الخ)[1]

کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنا

سوال: کیا کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز ہے، اگر نہیں تو محروم کرنے والے کا فیصلہ نافذ ہو گا یا نہیں؟

الجواب: کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز نہیں، ایسا کرنے والا گنہگار ہو گا تاہم جو فیصلہ وہ کر چکا ہے (یعنی اپنی زندگی میں اپنے جملہ اموالِ منقولہ وغیر منقولہ کو دیگر ورثاء میں تقسیم کر دے) نافذ ہو گا اور اس کی موت کے بعد محروم ہونے والا وارث حقِ میراث کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو وهب جميع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمد هکذا فی العیون۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة قبل الفصل الثانی)[2]

بیٹیوں کو میراث سے محروم کرنا گناہ ہے

سوال: بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ باپ کے ترکہ میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

---

[1] قال العلامة الموصلیؒ: ثم تقضی دیونه ..... والربع فی فرضها وفرض الزوج والنصف فی فرض الزوج۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۵، ۹۲ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الاوّل۔

[2] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (فتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس فی الهبة للصغیر۔

الجواب:۔ باپ کے مرنے کے بعد جس طرح بیٹے اس کی میراث میں ارث کے حقدار ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی ترکہ میں شرعاً حقدار ہیں اور یہ حق ان کو اسلام نے دیا ہے اس لیے انہیں اس شرعی حق سے محروم کرنا ناجائز و حرام ہے ۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : ولو وهب جميع ماله لابنه جاز في القضاء وهو آثم نص عن محمد هكذا في العيون ۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۰۰ كتاب الهبة قبل الفصل الاول) [1]

ولد الزنا اور ولد الملاعنة کی میراث کا حکم

سوال:۔ جس بچے کے نسب کی باپ لعان کے ذریعے نفی کر دے اور پھر میاں بیوی کے مابین رشتہ ازدواج بھی ختم ہو جائے ، اب سوال یہ ہے کہ جب یہ بچہ مر جائے تو اس کی میراث باپ کو ملے گی یا ماں اور اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ جس بچے کا نسب بذریعہ لعان باپ سے منقطع ہو جائے تو وہ ولد الزنا کی طرح ہے ، اب چونکہ اس کا رشتہ نسب صرف ماں سے ثابت ہے اس لیے اس کی میراث بھی ماں اور اس کے رشتہ دار لیں گے اور باپ حق میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامة الموصليؒ : وعصبة ولد الزنا وولد الملاعنة موالي امهما لانه لا اب له والنبي صلى الله عليه وسلم الحق ولد الملاعنة بامه فصار كشخص لا قرابة له من جهة الاب فيرثه قرابة امه ويرثهم ۔ (الاختيار لتعليل المختار ج۵ ص۹۴ فصل في العصبات) [2]

---

[1] قال العلامة قاضي خان رحمه الله : رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء ويكون آثما فيما صنع ۔ (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۳ ص۲۷۹ فصل في هبة الوالد لولده)

ومثله في الهندية ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس في الهبة الصغير ۔

[2] قال العلامة الحصكفيؒ : وعصبة ولد الزنا وولد الملاعنة مولى الام ..... وهي ان ولد الزنا يرث من امه ميراث اخ لام ..... وولد الملاعنة يرث من توأمه ميراث اخ لابوين ۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۵ ص۴۹۵ كتاب الفرائض)

ومثله في امداد الفتاوى ج۴ ص۳۴۰ كتاب الفرائض ۔

دو رشتہ والے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی فوت ہوگیا ہے اور اس کے ورثاء میں ایک بیوہ مسماۃ گل بلنہ، دوسرا وارث مسمی جمعہ گل جو کہ باپ کے رشتے سے چچازاد بھائی اور ماں کے رشتہ سے سوتیلا بھائی ہے دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسمی جمعہ گل کو مرحوم کی میراث میں کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب:۔ مرحوم کے ترکہ میں مسمی جمعہ گل کو دو حصے ملیں گے، ایک اخیافی بھائی ہونے کے ناطے سے اور دوسرا عصوبت کی وجہ سے، اس لیے تقسیم میراث میں مرحوم کی بیوہ کو ۱/۴ حصہ ملے گا اور باقی مال جمعہ گل کا ہوگا بشرطیکہ کوئی اور وارث نہ ہو۔

۴

بیوہ	جمعہ گل
۱/۴	۳/۴

پنشن کی رقم میں میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں ایک آدمی کا انتقال ہوگیا ہے جو کہ فوج میں ملازم تھا اس نے اپنی پنشن بیوی کے نام پر اس عنوان سے کی تھی کہ میری وفات کے بعد میری پنشن میری بیوہ کو دی جائے، اب اس کی وفات کے بعد اس کے دوسرے ورثاء پنشن میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، تو کیا مرحوم کی بیوہ کے علاوہ دیگر ورثاء کا بھی پنشن میں حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پنشن کا وظیفہ مال مملوکہ نہیں بلکہ سرکار کی طرف سے ایک عطیہ ہوتا ہے بناءبریں وجہ یہ وظیفہ تقسیم میراث سے مستثنیٰ ہوگا، سرکار جس کو چاہے اور جتنا چاہے دے سکتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے کاغذات اس کی بیوہ کے نام ہیں اور سرکار بھی اس پر راضی ہے اس لیے یہ پنشن صرف بیوہ کا حق ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: چونکہ میراث مملوکہ اموال میں جاری ہوتی ہے اور یہ وظیفہ محض تبرع واحسان سرکار کا ہے بدون قبضہ کے مملوک نہیں ہوتا لہٰذا آئندہ جو وظیفہ ملے گا اس میں میراث جاری نہیں ہوگی، سرکار کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تقسیم کردے۔ الخ (امداد الفتاویٰ جلد۴ ص۳۴۲ کتاب الفرائض)

میت کی جملہ مملوکہ اشیاء میں ارث جاری ہونے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! کیا میراث صرف میت کی جائیداد میں جاری ہوگی یا گھر اور اس کے سازوسامان اور نقدی میں بھی جاری ہوگی؟

الجواب :- کسی کی ملکیت میں جو کچھ بھی ہو اس کے مرنے کے بعد وہ سب ترکہ شمار ہوگا، چاہے مرحوم کی جائیداد ہو یا نقدی، گھر ہو یا اس کا سازوسامان، ان سب اشیاء میں ارث جاری ہوگی اور ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ : قال علماؤنا رحمہم اللہ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ۔

قال المحشی تحت لفظ الترکۃ : والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیاً عن تعلق حق الغیر بعینہ وان کان حق الغیر متعلقاً بعینہ کالرھن والعبد الجانی والمشتری قبل القبض قال صاحبہ یقدم علی التجھیز کما فی حال حیاتہ الخ۔

(الشریفیۃ شرح السراجی ص۳ کتاب الفرائض)[1]

مفقود الخبر کے ترکہ کی تقسیم کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص کئی سالوں سے لاپتہ ہو اور ہر ممکن ذریعہ سے تلاش کے باوجود اس کا اتہ پتہ معلوم نہ ہوسکے تو اس کی جائیداد کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ اس کے ورثاء میں تقسیم کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب :- شریعتِ مقدسہ میں مفقود الخبر ۹۰ سال تک زندہ اور اپنی جائیداد کا مالک ہوتا ہے، اس لیے جب تک مفقود الخبر کی عمر ۹۰ سال نہ ہو جائے اور مسلمان حاکم اس کی موت کا فیصلہ نہ کردے اُس وقت تک اس کی جائیداد کو تقسیم نہیں کیا جائے گا، جب مسلمان حاکم یا قاضی کی طرف سے اس کی موت کی تصدیق و فیصلہ ہو جائے تو اُس وقت موجود ورثاء میں اس کی جملہ جائیداد بطور میراث تقسیم ہوگی اور فوت شدہ ورثاء

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ : والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیاً عن تعلق حق الغیر بعینہ الخ۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۲۲۹ کتاب الفرائض)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔

محروم ہوں گے۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: المفقود حیٌّ فی مالہٖ حتی لایرث منہ احدٌ ومیتٌ فی مال غیرہٖ حتی لا ترث من احد ویوقف مالہ حتی یصح موتہ او تمضی علیہ مدۃ۔ واختلف الروایات فی تلک المدۃ وبعد اسطر قال بعضہم تسعون سنۃ وعلیہ الفتوٰی الخ۔ (السراجی ص۵۵،۵۶ فصل فی المفقود) [1]

عصبہ کی موجودگی میں ترکہ میں نواسیوں کے حصہ کا حکم

سوال:- ایک عورت فوت ہوگئی ہے اس کے ورثاء میں دو نواسیاں (بیٹی کی بیٹیاں)، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، اب نواسیوں کو نانی کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ ان کی والدہ نانی سے قبل ہی فوت ہوگئی ہے؟

الجواب:- نواسیوں کا شمار ذوالارحام میں ہوتا ہے، عصبہ کی عدم موجودگی میں ان کو نانا یا نانی کی میراث میں حصہ ملے گا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحومہ کے دو بھائی ہیں جو اس کے عصبہ میں سے ہیں اس لیے اس کا جملہ ترکہ اس کے شوہر اور بھائیوں میں بقدرِ حصۂ شرعی تقسیم ہوگا اور نواسیاں محروم ہوں گی۔

وفی الھندیۃ: وانما یرث ذوی الارحام اذا لم یکن احد من اصحاب الفرائض ممن یرد علیہ ولم یکن عصبۃ الخ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ص۴۵۹ ج۶ الباب العاشر فی ذوی الارحام) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: قال مشائخنا رحمہم اللہ مدار مسئلۃ المفقود علی حرف واحد ان المفقود یعتبر حیًا فی مالہ ومیتًا فی مال غیرہٖ حتی ینقضی من یعلم انہ لا یعیش الی مثل تلک المدۃ لا تموت اقرانہ وبعد ذلک یعتبر میتا فی مالہ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۶ الباب الثامن فی المفقود والاسیر)

[2] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: ولا شیٔ لذوی الارحام مع العصبۃ او مع صاحب الفرائض الخ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۲۱۹ جنس آخر فی ذوی الارحام واما الصنف الرابع الخ)
وَمِثْلُہٗ فی السراجی باب ذوی الارحام ص۳۵

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی کا میراث سے محروم ہونا

سوال :- یہاں ہمارے علاقہ میں ایک شخص فوت ہو گیا ہے جس کے ورثاء میں تین بیٹیاں، ایک اعیانی بہن اور بھائی، ایک علاتی بھائی زندہ ہیں، تو کیا اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں سوتیلے یعنی باپ شریک بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں ؟

الجواب :- اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں علاتی اور اخیافی بہن بھائی کی میراث سے محروم ہوں گے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ اس کی تین بیٹیوں اور اعیانی بہن بھائی میں تقسیم ہوگا اور سوتیلا بھائی محروم ہوگا، نقشہ درج ذیل ہے :-

$9 = 3 \times 3$

مسـ

بنت	بنت	بنت	اخ للاب و ام	اخ للاب	اخت لاب وام
۲/۹	۲/۹	۲/۹	۲/۹	محروم	۱/۹

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشید : ان ذی القرابتین اولیٰ من ذی قرابة واحدة ذکراً کان او انثیٰ لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الأم یتوارثون بنی العلات کالاخ لاب ام اذا صارت عصبة مع البنت اولیٰ من الاخ لاب الخ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

میراث میں مطلقہ کے حصے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی عدت گذر جانے کے بعد اس شخص کا انتقال ہو گیا اب اس کی مطلقہ بیوی حقِ میراث کا دعویٰ کرتی ہے، تو کیا اس کو سابقہ خاوند کے ترکہ سے حصہ ملے گا یا نہیں ؟

الجواب :- مطلقہ عورت عدت گذر جانے کے بعد خاوند کے لیے اجنبی بن جاتی ہے، اس لیے مطلقہ کو عدت گذر جانے کے بعد میراث میں حصہ نہیں ملے گا کیونکہ میت کے ورثاء کا حق ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مطلقہ کا دعویٰ ارث صحیح نہیں ہے۔

وفی الهندیة : ولو طلقها طلاقا بائنا او ثلاثا ثم مات وهی فی العدة فكذلك عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات

لم ترث الخ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المریض) لہ

بیوی کا کفن شوہر کے ذمّہ ہے

سوال:۔ اگر کوئی عورت فوت ہوجائے اور اس کے ورثاء میں شوہر، بھائی اور باپ زندہ ہے، تو کیا اُس عورت کا کفن اس کے مہر سے بنایا جائے گا یا اس کا جملہ خرچہ شوہر برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ چونکہ کفن عورت کا لباس ہے اور لباس شرعاً شوہر کے ذمّے واجب ہوتا ہے، لہٰذا جب عورت فوت ہوجائے تو اس کے کفن کا خرچہ شوہر برداشت کرے گا اس کے حق مہر سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واختلف فی الزوج والفتوٰی علیٰ وجوب کفنها علیه عند الثانی وان ترکت مالاً خانیة ورجحه فی البحر بانه الظاهر لانه ککسوتها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۸۱۰ باب صلوٰة الجنائز) لہ

اپنا حصّہ میراث کسی دوسرے حصہ دار پر فروخت کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب کا چند ماہ قبل انتقال ہوگیا ہے اور انہوں نے کافی جائیداد ترکہ میں چھوڑی ہے، میں ایک غریب آدمی ہوں کیا میں اپنا حصّہ میراث اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک بھائی پر فروخت کرسکتا ہوں یا نہیں؟ جبکہ میرے علاوہ دوسرے ورثاء ابھی جائیداد کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے؟

الجواب:۔ آپ چونکہ اپنے والد صاحب کے فوت ہوجانے کے بعد ان کے ترکہ میں

لہ قال العلامة قاضی خان رحمه الله: وان ابانها بغیر سوالها ثم مات وهی فی العدة ورثته عندنا وان مات بعد انقضاء العدة لم ترث الخ۔

(فتاوٰی قاضیخان ج ۲ ص۲۷۳ کتاب الطلاق فصل فی المعتدة التی ترث)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص۱۰۹ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض۔

لہ وفی الهندیة: ومن لم یکن له مال فالکفن علیٰ من تجب علیه النفقة الا الزوج فی قوله محمدؒ وعلیٰ ابی یوسفؒ یجب الکفن علی الزوج وان ترکت مالا وعلیه الفتوٰی هٰکذا فی قاضی خان۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۶۱ الفصل الثالث فی التکفین)۔ وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ فصل فی غسل المیت الخ

حصۂ شرعی کے حقدار ہیں اور وہ حصہ آپ کی ملکیت ہے اس لیے آپ کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے حصہ کی جائیداد تقسیم سے قبل یا بعد اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک پر فروخت کردیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز بیع احدھما نصیبہ من شریکہ وجمیع الصور ومن غیر شریکہ بغیر اذنہ۔

(الھدایۃ ج۲ ص۵۸۸ کتاب الشرکۃ)[1]

چار بیویوں کا خاوند کے ترکہ میں حصۂ شرعی

سوال:- ایک شخص کی چار بیویاں ہیں اور اس کی وفات کے بعد چاروں زندہ ہیں، تو کیا ہر ایک کو خاوند کے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا یا سب کا حصۂ شرعی آٹھواں ہے جو ان میں برابر تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:- اسلام نے اولاد کی موجودگی میں بیوی کے لیے آٹھواں حصہ مقرر کیا ہے، چاہے کسی کی ایک بیوی ہو یا زیادہ، اور اگر اولاد نہ ہو تو ۴/۱ حصہ اس کیلئے مقرر ہے اس لیے صورت مسئولہ میں مرحوم کی کل جائیداد کا ۸/۱ حصہ اس کی چاروں بیواؤں میں برابر تقسیم کیا جائے گا اور باقی ترکہ مرحوم کی اولاد اور دوسرے ورثاء کو دیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما للزوجات فحالتان الربع للواحدۃ فصاعدۃً عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۷/۸ باب معرفۃ الفروض)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ: ان الشرکۃ اذا کانت بینھما من الابتداء بان اشتریا حنطۃ او ورثاھا کانت کل حبۃ مشترکۃ بینھما فلیبع کل منھما نصیبہ شائعًا جائز من الشریک والاجنبی۔

(فتح القدیر ج۶ ص۱۵۴ کتاب الشرکۃ)

[2] وفی الھندیۃ: وللزوجۃ الربع عند عدمھما والثمن مع احدھما والزوجات والواحدۃ یشترکن فی الربع والثمن وعلیہ الاجماع۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض)

[3] ومثلہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض۔

پہلے شوہر کا میراث میں حصّہ نہیں ہے

سوال: کسی مطلقہ عورت نے ایک دوسرے مرد سے نکاح کر لیا اور چند سال اس کے ساتھ زندگی گذارنے کے بعد فوت ہوگئی، اب اس کے ترکہ میں دونوں خاوندوں کا مال ہے، پہلا شوہر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرے والے مہر میں مجھے ۴/۱ حصہ مال ملنا چاہیے جبکہ اس عورت کے شوہر ثانی سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بھی ہیں، کیا شرعاً پہلے خاوند کو عورت کے ترکہ میں حصّہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب: طلاق دے کر عدت گذر جانے کے بعد میاں بیوی کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں جبکہ میراث کے لیے رشتہ ارث ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جہاں تک عورت کے پہلے شوہر کے حق مہر کا تعلق ہے تو وہ عورت کی ملکیت ہے اس میں سابقہ شوہر کا کوئی تعلق نہیں اسلئے عورت کا جملہ ترکہ اس کے شوہر ثانی، تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں تقسیم ہوگا۔

مرحومہ ۴ × ۸ = ۳۲

شوہر اول	شوہر ثانی	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
محروم	۸/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۳/۳۲	۳/۳۲

وفی الهندیة: لو طلقها طلاقاً بائناً او ثلاثاً ثم مات وهی فی العدة فكذلك عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات لم ترث وهذا اذا طلقها من غير سؤالها فاما اذا طلقها بسؤالها فلا ميراث لها۔

(الفتاوى الهندية ج۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المريض)

بھتیجوں کی موجودگی میں بھتیجیاں میراث سے محروم ہوں گی

سوال: ایک شخص کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف چھ بھتیجے اور چار بھتیجیاں زندہ ہیں، اب بھتیجیاں چچا کے ترکہ میں میراث کا مطالبہ کرتی ہیں، تو کیا ان کو شرعاً چچا کے ترکہ میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں مرحوم کے جملہ ترکہ میں صرف اس کے بھتیجے حقدار ہیں اور بھتیجیوں کو چچا کے ترکہ سے کچھ بھی نہیں ملے گا وہ شرعاً محروم ہوں گی، مرحوم کا جملہ ترکہ چھ بھتیجوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ : العصبات النسبية.... ثم جزء ابيه ای الاخوة ثم بنوهم وان سفلوا ثم جزء جده ۔ (السراجی ص۱۲ باب العصبات) ؎۱

نکاحِ ثانی کرنے سے عورت کا حصہ میراث ختم نہیں ہوتا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب ۱۹۸۶ء میں فوت ہو گئے ہیں اور انہوں نے نقد رقم کے علاوہ کچھ جائیداد بھی ترکہ میں چھوڑی ہے، والد صاحب کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی والدہ نے دوسرا نکاح کر لیا، اب وہ والد صاحب کے جملہ ترکہ میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہی ہیں، تو کیا شرعاً والدہ کا اس ترکہ میں حصہ بنتا ہے یا نہیں جبکہ انہوں نے نکاحِ ثانی بھی کر لیا ہے؟

الجواب :۔ میاں بیوی کا رشتہ موجبِ ارث رشتہ ہے، خاوند کی وفات کے بعد وہ ترکہ میں حصہ شرعی کی حقدار ہے، عدت گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کرنے سے میراث میں حصہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے آپ کی والدہ کا اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ میں حصۂ شرعی کا دعویٰ صحیح ہے جو کہ اس کو دینا چاہیئے ۔

لقوله تعالیٰ : وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ (سورة النساء آیت ۱۲) ؎۲

؎۱ وفی الهندية : وباقی العصبات ينفرد بالميراث ذكورهم دون اخواتهم وهم اربعة ايضاً العم وابن العم وابن الاخ وابن المعتق الخ

الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۵۱

الباب الثالث فی العصبات

؎۲ قال العلامة السجاوندی رحمه الله : اما للزوجات فحالتان الربع للواحدة فصاعدة عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل ۔

(السراجی ص۸،۷ باب معرفة الفروض ومستحقيها)

ومثله فی الهندية ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض ۔

اولاد کی موجودگی میں والدین کا حصۂ شرعی متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا اولاد کی موجودگی میں والدین کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ والدین کا معقول ذریعہ آمدنی بھی ہے اور اولاد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں؟

الجواب:۔ ولدیت کا رشتہ موجب اِرث ہے اولاد کا وجود اس کے لیے مانع نہیں اور نہ والدین کے ذرائع آمدنی سے ان کا حصۂ میراث متاثر ہوتا ہے، اس لیے اولاد کی موجودگی میں بھی والدین کو ۱/۶ حصۂ میراث ملے گا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ج۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱) [۱]

حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم میں میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا شوہر سیلاب میں ڈوب کر فوت ہوگیا ہے، حکومت نے سیلاب میں مرنے والوں کی بیواؤں کو ۵۰/۵۰ ہزار روپے امداد کے طور پر دیئے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرے چار معصوم بچے ہیں اور اس امدادی رقم کے علاوہ میری گذران کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں، اب میرا سسر اس ۵۰ ہزار روپے میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً حکومت کی طرف سے ملنے والی اس امدادی رقم میں میرے سسر کا کوئی حصہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جو مال حکومت نے مرحوم کی بیوہ کو دیا ہے وہ حکومتی امداد ہے جو مرحوم کی بیوہ کے ساتھ مخصوص ہے اس میں میراث کے احکام جاری نہیں ہوں گے اس لیے کہ یہ مال مرحوم کا ترکہ نہیں ہے جبکہ میراث

---

[۱] قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما الاب ..... وھو السدس وذٰلک مع الابن او ابن الابن وان سفل ..... اما الام فاحوال ثلث السدس مع الولد او ولد الابن وان اسفل
(السراجی ص ۶، ۱۱ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۶ ص ۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الثانی فی ذوی الفروض۔

ترکہ میں جاری ہوتی ہے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ : تحت قوله (یبدأ من ترکة المیت) المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیا عن تعلق حق الغیر بعینه۔
(البحر الرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض)[1]

باپ کی زندگی میں میراث کا دعویٰ کرنا

سوال:۔ ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی جملہ جائیداد کو فروخت کرنا چاہتا ہے مگر اس کا ایک بیٹا اُسے جائیداد فروخت کرنے سے روک رہا ہے اور اپنے حصہ کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا بیٹا باپ کی زندگی میں اس سے اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باپ اپنی مملوکہ جائیداد میں خود مختار ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے، کوئی بیٹا اس کو شرعاً منع نہیں کرسکتا، اور نہ ہی باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمدؒ۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة، قبیل الفصل الثانی)[2]

---

[1] قال العلامة الدکتور وهبة الزحیلی: الموروث هو الترکة ویسمی أیضاً میراثا وارثا وهو ما یترکه المورث من المال او الحقوق التی یمکن ارثها عنه کحق القصاص وحبس المبیع لاستیفاء الثمن وحبس المرهون لاستیفاد الدین۔ (الفقه الاسلامی وادلته جلد ۸ ص۲۴۹ الباب السادس المیراث)

[2] قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹ الباب السادس فی الهبة الصغیر۔

منافع بھی ترکہ میں شامل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب کسی کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے جس میں والد صاحب کے چار لاکھ روپے تھے، مشترکہ کاروبار بڑے اچھے طریقے سے چل رہا تھا کہ اچانک والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اب دس سال بعد ہم اس سرمایہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس چار لاکھ روپے کے ساتھ ۲ لاکھ منافع بھی ہوچکا ہے، تو کیا اب ہم تقسیم چار لاکھ کی کریں گے یا منافع کی رقم بھی شامل کرنی ہوگی؟

الجواب:۔ منافع چونکہ شرعاً اصل زر کا تابع ہوتا ہے، اس لیے منافع اور اصل رقم کو ملاکر تقسیم کیا جائے گا، یعنی آپ لوگ کل ۶ لاکھ روپے آپس تقسیم کریں گے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: تحت قوله (يبدأ من تركة الميت الخ) المراد من التركة ما تركه الميت خالياً من تعلق حق الغير بعينه الخ

(البحر الرائق ج ۸ ص۴۸۹ كتاب الفرائض) [۱]

قبر کے لیے جگہ کی قیمت میّت کے ترکہ سے دی جائے گی

سوال:۔ اکثر شہری علاقوں میں قبر کے لیے جگہ قیمتاً ملتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبر کی قیمت کس مال سے ادا کی جائے گی یعنی میت کے ترکہ سے واجب الادا ہوگی یا ورثاء اپنے مال سے دیں گے؟

الجواب:۔ میّت کے کفن دفن یعنی تجہیز و تکفین پر آنے والے اخراجات میت کے جملہ ترکہ سے ادا کیے جائیں گے۔ لہٰذا جہاں کہیں قبر کی جگہ قیمتاً ملتی ہو تو اس کی قیمت میت کے ترکہ سے ادا کی جائے گی۔

وفی الهندية: التركة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز الميّت ودفنه والدّين والوصيّة والميراث فيبدأ اولاً بجهازه وكفنه وما

---

[۱] قال العلامة وهبة الزحيلی: الموروث هو التركة ويسمى ايضاً ميراثاً وهو ما يتركه المورث من المال او الحقوق التي يمكن ارثها عنه كحق القصاص وحبس المبيع لاستيفاء الثمن وحبس المرهون لاستيفاء الرهن۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۸ ص۲۴۹ الباب السادس الميراث)

یحتاج الیہ فی دفنہ بالمعروف۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۴۴۷ الباب الاول، کتاب الفرائض) [1]

قبر کھودنے والوں کی مزدوری کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں قبر کھودنے کی مزدوری لی جاتی ہے، تو کیا قبر کھودنے والوں کی مزدوری میت کے ترکہ سے ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میت کی تجہیز و تکفین پر جتنا بھی خرچہ آئے وہ اس کے ترکہ سے ہی ادا کیا جائے گا، تاہم اگر ورثاء اپنی طرف سے دینا چاہیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمھم اللہ تعالیٰ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ مرتبۃ الاول یبدأ بتکفینہ و تجھیزہ من غیر تبذیر ولا تقتیر الخ

(السراجی ص۳،۲ کتاب الفرائض) [2]

شوہر بیوی کے مال میں حصۂ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کو اسکے شوہر نے شادی کے ایک سال بعد اپنے گھر سے نکال دیا لیکن طلاق نہیں دی، چار پانچ سال کے بعد وہ ہمارے ہاں ہی فوت ہوگئی، اب اس کا شوہر ہماری بہن کے مال میں حصۂ میراث کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا شرعاً مرحومہ کے مال میں اس کا

---

[1] قال العلامۃ السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمھم اللہ تعالیٰ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ مرتبۃ الاولیٰ یبدأ بتکفینہ وتجھیزہ من غیر تبذیر ولا تقتیر ثم تقضی دیونہ من جمیع مابقی من مالہ الخ۔ (السراجی ص۳،۲)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض الاول فی اصحاب الفرائض۔

[2] وفی الھندیۃ: الترکۃ تتعلق بھا حقوق اربعۃ جھاز المیت ودفنہ والدّین والوصیۃ والمیراث فیبدأ اولاً بجھازہ وکفنہ ومایحتاج الیہ فی دفنہ بالمعروف۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاوّل)

وَمِثْلُہٗ فی البحرالرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض۔

حصہ بنتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ میراث کے حصص اضطراری ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں اور بدون موانع شرعی کے ساقط نہیں ہوتے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جب شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو شوہر ہونے کے ناطے سے وہ بیوی کے ترکہ میں نصف یا ربع کا شرعاً حقدار ہے۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ ۔ (سورۃ النساء ۱۲) [1]

بہن کے مال میں بہن اور بھائیوں کا حصہ

سوال:۔ محترم جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کا انتقال ہوگیا ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں صرف شوہر، ماں، ہم چھ بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں، کیا مرحومہ کے ترکہ میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کی نہ کوئی اولاد ہو اور نہ باپ، تو اس کے مال میں بہن و بھائی سب حصۂ شرعی کے حقدار ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ اس کی ماں، شوہر، بہن اور بھائیوں میں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مرحومہ ۶ × ۱۳ = ۷۸

ماں	شوہر	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن
۱۳/۷۸	۳۹/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۲/۷۸

وفی الهندية: فالنسبية ثلاثة انواع عصبة بنفسه وهو كل ذكر لا يدخل

---

[1] قال العلامة السجاوندیؒ رحمه الله: اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد وولد الابن وان سفل۔
(السراجي ص۷ باب معرفة الفروض ومستحقيها)
ومثله فی البزازية علی هامش الهندية ج۶ ص۴۵۳ كتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض۔

فی نسبتہ الی المیت انثی وھم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۴۵۱ کتاب الفرائض، الباب الثالث فی العصبات) لہ

ظالم باپ کا بیٹے کے ترکہ میں حصۂ میراث کا حکم

سوال:۔ ایک شخص بہت بڑا ظالم ہے اور اس نے اپنے بیٹے پر بہت ظلم کئے ہیں، اب اس کا بیٹا فوت ہوگیا ہے، تو کیا ایسے ظالم باپ کو بھی بیٹے کی میراث میں حصہ ملے گا؟

الجواب:۔ میراث کے حصص شرعاً مقرر شدہ ہیں ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کرنا جائز نہیں اور نہ بدون موانع شرعی کے یہ حصص ساقط ہوسکتے ہیں، اس لئے صورت مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کے مال میں حصۂ شرعی کا حقدار ہے، ظلم کی وجہ سے اس کا حق ساقط نہیں ہوسکتا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ۔

(سورۃ النساء پ۴ آیت ۱۱) ٢ہ

لہ قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما العصبۃ بنفسہ فکل ذکر لاتدخل فی نسبتہ الی المیت انثی وھو اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)

٢ہ لما فی الھندیۃ: اما الرجال فالاول الاب فلہ ثلاثۃ احوال الفرض المحض وھو السدس مع الابن وابن الابن وان سفل والتعصیب المحض وذلک لا یخلف غیرہ فلہ جمیع المال بالعصوبۃ وکذا اذا اجتمع مع ذی فرض لیس بولد ولا ولد الابن کزوج وأم وجدۃ فیأخذ والفرض فرضہ فالباقی للاب بالعصوبۃ الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الاول)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض۔

نافرمان بیوی کا شوہر کی میراث میں حصہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی نافرمان ہے اور بلاوجہ ہر وقت شوہر سے جھگڑتی رہتی ہے، اور اگر اسی حالت میں اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا اس عورت کو شوہر کی میراث سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ میراث میں حصص کا تعین منجانب اللہ مقرر ہے جو کہ بدون موانع شرعی کے کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا، چاہے وارث فرمانبردار ہو یا نافرمان، اس لیے مذکورہ صورت میں بھی نافرمان بیوی کو شوہر کے مال میں چوتھایا آٹھواں حصہ ملے گا۔

لقوله تعالیٰ: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۲)[1]

حربی ذمی کا وارث نہیں ہو سکتا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم پاکستان میں وفات پا جائے اور وہ یہاں کا شہری ہو اور اس کا باپ ہندوستان میں رہتا ہو تو کیا یہ باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصۂ شرعی کا حقدار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اختلافِ دارین (دارالحرب اور دارالاسلام) بھی مانع ارث ہے، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصے کا حقدار نہیں ہوگا اور مرنے والے کا جملہ مال دارالاسلام (پاکستان) میں رہنے والے اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: لاخلاف بین اصحابنا ان الکافر الحربی لا یرث الذمی سواء کان الحربی مستامنا فی دارنا او فی دار الحرب اهل الذمة یرث بعضهم بعضاً۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۵۰۱ کتاب الفرائض)

---

[1] لما قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: ونصیب الزوجة الربع مع کل الورثة الا مع الولد او ولد الابن فلها معهم الثمن بکل حال واحدة او اکثر یشترکن فی ذلك۔ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۵۰ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

بہن کا اپنے بھائی کے ترکہ میں میراث کا حکم

سوال: کیا بہن اپنے بھائی کے ترکہ میں سے میراث کی حقدار ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کن حالات میں؟ اور کیا اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: عورت اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کی حقدار ہوتی ہے مگر اپنے بھائی کے ذاتی مال وجائیداد میں حقدار نہیں ہوتی خصوصاً جب بھائی زندہ ہو اور وفات کی صورت میں شرعی ضابطہ کے مطابق کبھی حقدار ہوگی اور کبھی نہیں۔

وفی الهندية: الخامسة الاخوات لابّ وأمّ للواحدة النّصف وللثنتين فصاعداً الثلثان ومع الاخ لابّ وأمّ للذكر مثل حظّ الانثيين ولهن الباقي مع البنات او بنات الابن۔ السادسة الاخوات لابّ وهنّ كالاخوات لابوين عند عدمهنّ — ولهن السدس مع الاخت لابّ وأمّ تكملة الثلثين ولا يرثن مع الاختين لابّ وأمّ الاان يكون معهن اخ فيعصبهن — السابعة للاخوات لام للواحدة السدس وللثنتين فصاعداً الثلث — ويسقط الاخوة والاخوات بالابن وابن الابن وان سفل وبالاب بالاتفاق وبالجد عند ابي حنيفة رحمه الله۔
(الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۵۰ كتاب الفرائض. الباب الثاني في ذوي الفروض)[1]

---

[1] قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: فيبدأ بذوي الفروض وهم اثنا عشر من النسب ثلاثة من الرجال (هم الاب والجد والاخ لام) وسبعة من النساء (هن البنت وبنت الابن والاخت الشقيقة والاخت لاب والاخت لام والجدة واثنان من السبب وهما الزوجان الخ

{الدرالمختار مع ردالمحتار
ج ۵ ص۵۳۸ كتاب الفرائض}

ومثله في البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۴۵۳ كتاب الفرائض، الفصل الاول في اصحاب الفرائض۔

فتاویٰ حقانیہ

٦

[illegible]

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ

ودیگر مفتیان کرام دارالعلوم حقانیہ

نگرانی و اہتمام

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ

ترتیب

مفتی مختار اللہ حقانی

ناشر

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک